دوسرا ایڈیشن

حصہ سوم

تاریخِ اُمّتِ مُسلمہ

74 ھجری تا 656 ھجری

- خلافت بنو امیہ و بنو عباس
- خلافت عباسیہ کی معاصر آزاد مسلم حکومتیں
- ائمہ اربعہ اور عظیم مجددین و مصلحین کے کارنامے
- فرقوں کے آغاز اور ظہور کی تاریخ
- باطل فرقوں کی حکومتیں
- اہم شبہات کے جوابات

تقریظ

شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب دامت برکاتہم العالیہ

کاوش

مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ

استاذ تاریخ اسلام جامعۃ الرشید کراچی

تاریخ اُمتِ مسلمہ
حصہ سوم

تاریخ امتِ مسلمہ

خلفائے بنو مروان

تا

سقوطِ خلافتِ عباسیہ بغداد

۷۳ھ تا ۶۵۶ھ

(692ء تا 1258ء)

حصہ سوم

تحقیق

مؤرخِ اسلام مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ

بلاک A-1، گلستانِ جوہر، یونیورسٹی روڈ، کراچی
0321-3135009|0321-2000870
www.almanhalpublisher.com
almanhalpublisher@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Jamia-Uloom-Islamiyyah
(University of Islamic Sciences)
Allama Muhammad Yousuf Banuri Town
Karachi - Pakistan.

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن
کراتشی ۷۴۸۰۰ - پاکستان

Ref. No. ____________

Date. ____________

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین.

اما بعد:

روایتی علوم میں سے علم التاریخ ایک ایسا موضوع ہے جس کی ضرورت کا انکار بھی مشکل ہے اور اس پر کلی اعتماد کی گنجائش بھی کم ہے جس کی دو بنیادی وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ تاریخی روایات کی سند حزم واحتیاط کے اس اعزاز سے عموماً محروم رہتی ہیں جو حزم واحتیاط حدیثی روایات کو حاصل ہے۔ دوسرا یہ کہ تاریخی روایات میں مؤرخ ذاتی تأثرات اور ماحولیاتی اثرات سے بہت کم محفوظ رہ پاتا ہے، اس لئے بلا امتیاز تاریخی روایات کو اعتماد واستناد کے درجے پر رکھ کر نظریہ وفکر قائم کرنا عموماً فکری انحراف کی طرف دھکیل دیتا ہے، اس لئے تاریخ کے طالب علم کو تاریخ کا مطالعہ کرنے سے قبل کم از کم تین امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

۱..... مطالعہ تاریخ سے پہلے ایسے مبادی تاریخ کا استحضار درکار ہے، جن میں امت مسلمہ کے مسلمہ افکار اور فکری بنیادوں کا بیان ہو، جسے آپ مطالعۂ تاریخ کے بنیادی اصول اور ضروری آداب سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

۲..... مطالعۂ تاریخ کے لئے مستند اور غیر مستند مآخذ، منصف مزاج اور غیر محتاط مؤرخین کے بارے میں آگاہی بھی ہونی چاہیے۔

۳..... بسا اوقات نامور مؤرخین کے ہاں مشہور مآخذ میں بھی علی سبیل التذکرہ بہتیری غیر ثقہ روایات در آئی ہیں، اس لئے تاریخی مآخذ کے محاسن اور مساوی ہر دو کے بارے میں معتمد معیارات اور واضح اشارات کا ادراک بھی ضروری ہے۔

مطالعۂ تاریخ کے لئے یہ قابل لحاظ بنیادی امور، کتب تاریخ یا ان کے متعلقات میں یکجا، مربوط ومرتب انداز میں بہت کم ہی دستیاب ہوتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ با توفیق اہل علم سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہتا، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ”تاریخ امت مسلمہ“ کے نام سے ایک مجموعہ ہمارے سامنے آیا ہے، جس میں درج بالا تینوں بنیادی امور کا لحاظ پایا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ (جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں) یہ مجموعہ، روایات میں احتیاط، فکر ومیلان میں اعتدال، حسنِ ترتیب اور جودتِ تعبیر کے لحاظ سے منفرد اور معیاری کاوش ہے۔ امید ہے یہ مجموعہ عوام وخواص سب کے لئے یکساں مفید ہوگا۔ ان شاء اللہ! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کاوش کو قبولیتِ تامہ اور مقبولیتِ عامہ سے ہم کنار فرمائے، آمین! وما ذلک علی اللہ بعزیز

وصلی اللہ وسلم علی سید المرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین.

فقط والسلام

عبد الرزاق اسکندر

(مولانا ڈاکٹر) عبد الرزاق اسکندر
مہتمم جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

P.O. Box: 3465 Karachi Code No. 74800, Phone: (0092-21) - 34913570 - 34912683 - 34915966 - 34123366 - 34121152
Fax: (0092-21) - 34919531, Karachi Pakistan. URL: www.banuri.edu.pk , E-mail: info@banuri.edu.pk

حضرت مولانا ڈاکٹر منظور احمد مینگل صاحب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لولیہ والصلوۃ علی نبیہ

امابعد!

یقیناً آج امت مسلمہ خارجی یلغار و داخلی خلفشار کی وجہ سے انتہائی بھیانک قسم کے بحران سے دوچار ہو چکی ہے اور آئے دن راہ نجات دارتقاء سے دن بدن دور بھٹکتے ہوئے تنزلی کے دلدل میں دھنستی جارہی ہے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ جہاں قرآن سنت سے درساً وعملاً دوری ہے وہیں اپنے اکابر واسلاف کی تاریخ عزیمت سے لاعلمی بھی ہے جو کہ کسی بھی عظیم سانحہ ولاعلاج موذی روحانی مرض سے کم نہیں۔

فضلاً علی ھذا اگر کوئی ایک آدھ شخص علم تاریخ سے شغف رکھتا بھی ہے تو اس کا واسطہ ایسی تاریخ کے ساتھ پڑتا ہے جو اس کے ذہن میں اسلاف کے خلاف زہریلا بیج بن کراُگتا ہے اور یہ نام نہاد تاریخ اسلامی دین اسلام کے دفاع کے بجائے اسلام کے قلعے میں نقب زنی کا کام دیتی ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر العیاذ باللہ تاریخ اسلامی میں ایسی من گھڑت اسرائیلی روایات ہیں جو قرآن وسنت کے ساتھ تصادم کے زمرے میں آتی ہیں ایسی روایات سے انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام جیسی معصوم عن الخطاء ہستیاں بھی محفوظ نہ رہیں۔

ایسے میں بلاشک تاریخ اسلام سے آشنائی حد درجہ ضروری ہے تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ امت پر حالات کی سختی وپستی، خارجی یلغار، داخلی خلفشار، سیاسی عدم استحکام، باہم نااتفاقی وناچاقی اور دشمنان اسلام کی رکیک چالیں اور ان سے آگاہی کے ساتھ ان تمام چیزوں کا سدباب وتدراک کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے اور اس بارے میں ہمارے اکابر واسلاف کا عمل کیا تھا یہ سب ہمیں اسلام کی تاریخ سے ہی ممکن ہے۔ جس کے لیے صحیح ومستند واہیات سے پاک قرآن وسنت سے غیر مزاحم تاریخ اسلامی کا علم ہونا ضروری تھا۔

جس کے لیے ہمارے برادر مکرم مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ استاذ تاریخ اسلام جامعۃ الرشید کراچی جو کہ کئی کتب کے مصنف بھی ہیں جناب موصوف نے ماشاء اللہ کافی بڑھیا جدوجہد کی ہے جو کہ بندہ کی طرف سے بالخصوص اور امت مسلمہ کی طرف سے بالعموم لائق تحسین وآفرین ہیں۔

اللہ تعالیٰ جناب موصوف کی اس کاوش کو دارین میں باعث نجات وترقی کا سبب بنائے اور قارئین کے لیے استفادہ عامہ کا سبب بنائے۔

منظوم تقریظ برائے

''تاریخ امت مسلمہ''

منجانب: شاعرِ اسلام، حضرت اثر جونپوری مدظلہ العالی

بابِ جہد و عزم و استقلال جب وا ہو گیا
مہرباں اک بندۂ مخلص پہ مولیٰ ہو گیا
اک مورخ پھر کمربستہ ہوا جی جان سے
کاوشیں برسوں کی آخر رنگ لائیں شان سے
امتِ سرکار ﷺ کو انمول تحفہ دے گیا
وہ جواں ایسا ضعیفوں سے جو بازی لے گیا
رہ گئے حیران خود قرطاس و خامہ کیا کہوں
پا گیا انجام ایسا کارنامہ کیا کہوں
فکر کی پرواز پہنچی رفعتِ مریخ پر
جب قلم اس نے اٹھایا طائرِ تاریخ پر
ہار کر ہتھیار ڈالے خارِ قال و قیل نے
یوں بکھیرے علم کے ریحان اسماعیل نے
شہرِ یادِ رفتگاں ایسا سجا کر رکھ دیا
آئینہ پیشِ مسلماں گویا لا کر رکھ دیا

عکس اپنا جس میں سارے اہلِ ایماں دیکھ لیں
کس طرح سے مشکلیں ہوتی ہیں آساں دیکھ لیں
کس طرح جھیلی مشقت سیدِ ابرار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے
پرچمِ دیں کیسے لہرایا مرے سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے
کس اندھیرے میں ہوئے روشن ہدایت کے چراغ
کس طرح سینچا صحابہؓ نے لہو سے دیں کا باغ
اک طرف اوجِ ثریا کا نظارہ پرحلل
اک طرف تحت الثریٰ کا خارزارِ جاں گسل
ایک طرف ایثار، تقویٰ اور اخوت بے مثال
دوسری جانب تعصب، حرصِ مسند، حبِ مال
پہلا طبقہ مستحق نعمتِ دنیا و دیں
دوسرے طبقے کا کوئی مرکز و محور نہیں
اے خدا آہِ اثر پر کھول دے بابِ اثر
جیتے جی تعبیر پائے جلد ہی خوابِ اثر
پھر سے دکھلا عہدِ زریں شوکتِ اسلام کا
پھر سے نقارہ بجے دنیا میں تیرے نام کا
کاوش اسمٰعیل ریحاں کی خدا مقبول کر
غنچۂ اخلاص کو خلدِ بریں کا پھول کر

فہرست مضامین

❀❀❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین سے چند باتیں

امت کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اب ہم اس دور میں داخل ہو رہے ہیں جس میں سیاسی طور پر صحابہ کرام کا کردار ختم ہو چکا ہے۔ بلاشبہ اس دور کے ابتدائی سالوں میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جیسے علم و فضل کے پیکر موجود تھے مگر یہ حضرات سیاسی معاملات سے جو تاریخ کا غالب حصہ بنا کرتے ہیں، لاتعلق تھے اور اپنی پوری توجہ علمی و تربیتی سرگرمیوں پر مرکوز کیے ہوئے تھے۔ تقریباً یہی حال ان بقیہ چند صحابہ کا تھا جو پہلی صدی ہجری کے آخر تک گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔ غرض اب ہم جس دور کے اوراق پلٹنے لگے ہیں اس میں کوئی ایسی جلیل القدر شخصیت نہ تھی جس کے ساتھ سیاسی کش مکش کو مشاجراتِ صحابہ کی طرح کا نازک معاملہ قرار دیا جا سکے۔

قارئین سے مخفی نہیں کہ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے خلاف باغی تحریک کے آغاز سے لے کر ۷۳ھ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے زمانے تک ہم نے واقعات کی چھان بین اور شخصیات کے احوال کی تحقیق میں ان سخت شرائط کا لحاظ کیا ہے جو محدثین حدیث نقل کرنے کے لیے اختیار کرتے تھے۔ ہم گزشتہ جلد کے آغاز میں ان شرائط کی ضرورت پر تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں اور یہ ثابت کر چکے ہیں کہ صحابہ کرام کے دور کے باہمی مناقشات اور سیاسی اختلافات کی صحیح تصویر اور توجیہ اسی وقت سامنے آ سکتی ہے جب ہم تاریخ مرتب کرنے کے لیے صحیح السند روایات کو معیار بنائیں اور ان سے متعارض ضعیف روایات کو رد کر دیں۔ اسلام کی عظیم شخصیات کے بارے میں ان کے مخالف گروہوں کی پھیلائی ہوئی مشکوک اور موضوع روایات کے مضرات سے محفوظ رہنے کا یہی ایک طریقہ ہے اور اب تک ہم اسی کو استعمال کرتے رہے ہیں۔

اب ہم صحابہ کرام کی جگہ اگلی نسل کو حالات کی باگ ڈور سنبھالے دیکھتے ہیں۔ اس نئی نسل میں صحابہ کے تربیتی سانچے میں ڈھلے ہوئے نیک و صالح افراد بھی تھے اور ان کی صحبت و تربیت سے محروم بدعمل و بدکردار لوگ بھی۔ ان میں محمد بن قاسم، طارق بن زیاد اور عمر بن عبدالعزیز جیسی ہستیاں بھی تھیں جنہوں نے امت کے لیے عظیم الشان کارنامے انجام دیے اور ایسے لوگ بھی تھے جو صحبتِ صالح میں رہ کر بھی تزکیہ نفس اور تربیت باطنی سے بہرہ ور نہ ہوئے اور امت

ایسے افراد بھی تھے جن کے بعض حالات قابلِ رشک ہیں مگر بعض اوقات وہ فتنہ و فساد کے لیے ضرر رساں ثابت ہوئے۔ کچھ ایسے افراد بھی تھے جن کے بعض حالات قابلِ رشک ہیں مگر بعض اوقات وہ فتنہ و فساد میں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی تھے جو ایک مدت تک امت کے لیے باعثِ زحمت ثابت ہوئے مگر آخری برسوں میں ان کا کردار قابلِ تعریف رہا۔ یہ کوئی انہونی نہیں۔ تاریخ کے ہر دور اور دنیا کے ہر معاشرے میں ایسے افراد کی مثالیں ہیں جنھوں نے بھلے بُرے، ملے جُلے کام کیے۔ کچھ مفید اور باعثِ اجر تو کچھ مضر اور موجبِ گناہ۔

◆◆◆

پہلی صدی ہجری کے آخری عشروں میں جامعیت اور اعتدال و استقامت کی حامل وہ جماعت دنیا سے رخصت ہو رہی تھی جس کا ہر فرد "اَلصحابةُ کُلُّھم عدُول." کے معیار کے تحت تنقید سے بالاتر تھا۔ ان کی جگہ وہ لوگ لے رہے تھے جن کے بارے میں محدثین و فقہاء "ھم رجال و نحن رجال." کا معیار لے کر ہر فرد کو جانچتے اور پرکھتے ہیں۔ ان میں سے بہترین لوگ بھی اپنے تمام فضائل و مناقب کے باوجود کسی ادنیٰ صحابی کے برابر نہیں ہو سکتے تھے اور امت کی کسی اجتماعی ضرورت مثلاً کسی علمی بحث یا سیاست میں راہِ صواب کی جستجو کے لیے اہلِ علم نے ان پر تنقید کا حق محفوظ رکھا ہے۔ اسی لیے محدثین نے ان میں سے کسی کو ثقہ، کسی کو صدوق، کسی کو ضعیف اور کسی کو نا قابلِ اعتماد قرار دیا ہے۔ ان حضرات میں سے جو ثقہ، حجت اور پیشوائے امت مانے گئے ہیں، ان پر جرح کے لیے یقیناً تاریخی روایت کا صحیح السند ہونا ضروری ہوگا۔ لیکن جو لوگ اس مقام و مرتبے کے نہیں، اگر ان کے حالات کے بارے میں کسی ضعیف روایت سے استدلال کی ضرورت پڑے تو عقلی اصول کے لحاظ سے اس میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ ہم نے اگلے دور میں ایسے متعدد مواقع پر سند پر بحث کیے بغیر ضعیف روایات کو بھی لے لیا ہے۔

زمانے اور رجال کے فرق کے علاوہ ضعیف روایات کو لینے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس اگلے دور کے تاریخی واقعات کے بارے میں صحیح یا حسن روایات (چاہے تاریخی ہوں یا حدیثی) بہت کم ہیں۔ بہت سے حالات و واقعات کے بارے میں ہمیں ایک بھی صحیح یا حسن روایت نہیں ملتی۔ اب اگر ہم یہاں بھی یہی معیار باقی رکھنے کی کوشش کریں جو دورِ صحابہ کے احوال میں طے کیا تھا تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم اپنی تاریخ کے ایک بہت بڑے حصے سے محروم ہو کر اپنے ماضی سے کٹ جائیں گے۔ علاوہ ازیں اگلے دور کے حالات کا بیشتر حصہ خلفاء اور بادشاہوں کی تخت نشینی، معزولی، فتوحات، مہمات اور بغاوتوں جیسے حالات سے متعلق ہے۔ پس ایسے مباحث میں عام ذرائع کی خبر (اگر قطعی طور پر درایت کے خلاف نہ ہو تو) معتبر ہونی چاہیے، جیسا کہ آج بھی دنیا کے احوال کے لیے ہمارا انحصار عام خبروں پر ہے۔

اس لیے ہم ان مذکورہ دو عوامل کے پیشِ نظر اگلے ادوار میں روایات لینے میں کچھ کشادگی اختیار کریں گے۔ تاہم احتیاط اور درایت کا اصول کارفرما رہے گا۔ جہاں تحقیق کی ضرورت محسوس ہوگی وہاں روایت کو اصولِ درایت پر جانچیں گے اور کوشش کریں گے کہ قدیم ترین مآخذ ہی کا حوالہ دے کر واقعے کی تہہ تک پہنچیں تاکہ من گھڑت باتوں اور گمراہی سے حتی الامکان احتراز ہو سکے۔ مگر عام واقعات میں جہاں کوئی اختلاف نہیں، وہاں متاخرین مثلاً: حافظ ابن کثیر،
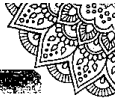
علامہ ابن اثیر اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ کا حوالہ ان شاء اللہ کافی ہوگا۔

◆◆◆

تاریخ کے طلبہ عام طور پر ایک بہت بڑے مغالطے میں مبتلا رہتے ہیں۔ان کے ذہنوں میں یہ خیال جاگزیں ہو جاتا ہے کہ تاریخ کوئی الگ دنیا ہے اور اسلامی احکام کسی اور دنیا کے لیے ہیں۔اسی لیے قرآن مجید، حدیث اور فقہ میں اسلامی احکام اور آداب کے تحت وہ تعلیمات پڑھنے کے دوران جن کا تعلق حکومت، سیاست اور اُمت کی قیادت سے ہے، بہت کم افراد کے اذہان میں یہ بات آتی ہے کہ ان تعلیمات کی عملی تشکیل، ماضی وحال کے واقعات پر ان کی تطبیق اور پیش آمدہ قضایا میں ان سے رہنمائی نہایت ضروری ہے۔

دوسری طرف تاریخ میں سیاسی بحرانوں، خانہ جنگیوں، سلطنتوں کے انحطاط اور قوموں کے زوال کے واقعات پڑھتے وقت بہت کم لوگوں کو یہ خیال آتا ہے کہ ان بھیانک حالات کا سب سے بڑا سبب ان ہدایات سے روگردانی ہے جو اسلام نے ہمیں دی ہیں۔اس ذہنیت کے پیچھے دراصل سیکولر مؤرخین اور مستشرقین کی وہ جدوجہد کارفرما ہے جس میں وہ مدتِ دراز سے مشغول ہیں۔اس جدوجہد کا محور دین ودنیا کو الگ، حکومت ومذہب کا تعلق منقطع اور سیاست کو دینی رجحانات اور مذہبی اخلاقیات سے عاری کرنا ہے۔افسوس کہ اس وقت مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کی بہت بڑی تعداد اسی ذہنیت کو اپنا چکی ہے اور سیاست میں اسلام کا کوئی حصہ ماننے کے لیے تیار نہیں۔ایسی سیاست کے بارے میں ڈاکٹر محمد اقبال بجا فرما گئے ہیں:

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

تاریخِ اُمت کے گزشتہ دو حصوں کی طرح اس حصے میں بھی پوری کوشش کی گئی ہے کہ دین اور سیاست کے اس تعلق کو سامنے رکھتے ہوئے، تاریخی انقلابات کو واضح کیا جائے۔تاکہ قارئین کو یہ یقین آجائے کہ ماضی میں بھی ہماری ہر شکست اور ہر خانہ جنگی کا اصل سبب اسلامی اخلاق واقدار اور دینی سیاست سے بے اعتنائی تھا اور حال میں بھی ایسے ہر بحران کا علاج مومنانہ اخلاق اپنانے اور دین کے مطابق سیاست کرنے میں منحصر ہے۔

تاریخ کی تنقیح اور ترتیبِ جدید کا یہ سفر جاری ہے اور ان شاء اللہ جاری رہے گا۔قارئین سے ہمت، صحت، عافیت اور قبولیت کے لیے دعاؤں کی عاجزانہ درخواست ہے۔

محمد اسماعیل ریحان

اتوار۔۴رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ

۲۰ مئی ۲۰۱۸ء۔بعد مغرب

پہلا باب

خلافتِ بنو مروان

٧٣ هجری تا ١٣٢ هجری
٦٩٢ عیسوی تا ٧٤٩ عیسوی

عبدالملک بن مروان

جمادی الاولیٰ ۷۳ھ......تا......شوال ۸۶ھ

اکتوبر 692ء......تا......اکتوبر 705ء

۱۷ جمادی الاولیٰ ۷۳ھ سے پورے عالم اسلام پر عبدالملک بن مروان کی حکومت کا دور شروع ہوتا ہے جس کے بعد ۱۳۲ھ تک اسی کی اولاد عالمِ اسلام کی سربراہی کے فرائض انجام دیتی رہی۔ ہم نے دورِ حاضر کے عام مؤرخین کے برخلاف اس حکومت کو ''خلافتِ بنو مروان'' سے موسوم کیا ہے؛ اس لیے کہ ''بنو امیہ'' ایک بہت بڑا قبیلہ تھا جس کی دیگر شاخیں اس نئی حکومت میں شریک نہ تھیں۔ خلفائے راشدین کے بعد بنو امیہ کے دو خاندان برسرِ اقتدار رہے ہیں:

پہلا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا خانوادہ تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا سلسلۂ نسب ''معاویہ بن ابی سفیان بن حرب بن امیہ'' ہے۔ اس گھرانے میں ان کے بعد یزید اور معاویہ بن یزید حکمران ہوئے۔ یہ بنو امیہ کی سفیانی شاخ تھی جس کی حکومت یہیں ختم ہوگئی۔

اس کے بعد عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا دور شروع ہوا تھا جس کے دوران مروان بن الحکم نے ایک باغی کے طور پر مزاحمت کر کے حکومت چھیننے کی کوشش کی۔ مروان کا سلسلۂ نسب ''مروان بن الحکم بن العاص بن امیہ'' ہے۔ آگے چل کر مروان کی اولاد ہی برسرِ اقتدار رہی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی اولاد یا بنو امیہ کے دیگر گھرانوں کا اس میں اس کے سوا کوئی حصہ نہ تھا کہ ان کے بعض افراد مملکت کے کچھ ذیلی عہدوں پر تھے۔ اسی لیے قدیم مؤرخین نے بھی اس حکمران خانوادے کے لیے ''بنو مروان'' یا ''آلِ مروان'' کی اصطلاح کثرت سے استعمال کی ہے اور ہم نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

عبدالملک۔ خلیفہ یا بادشاہ؟

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے ساتھ ہی حجاز بھی عبدالملک کے آگے سرنگوں ہوگیا تھا۔ شام، مصر، افریقہ اور عراق پہلے ہی اس کے قبضے میں آچکے تھے۔ یوں دنیائے اسلام میں اب کوئی اس کا مدمقابل نہیں تھا؛ اس لیے ہر جگہ عوام و خواص نے اس کی بیعت کر لی تھی۔

بنو مروان کی اس حکومت کا قیام یقیناً قانونی و شرعی طریقے سے نہیں ہوا تھا بلکہ یہ حکومت ایک منظم و مسلسل بغاوت

کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی مگر قائم ہو جانے کے بعد اس کے وجود سے انکار بھی ممکن نہ تھا۔ اس حقیقت کو قبول کیے بغیر چارہ نہ تھا کہ اب عالم اسلام کی سیاسی وعسکری امامت اولادِ مروان کی گرفت میں ہے۔ رہی یہ بات کہ اس حکومت کو بادشاہت کہا جائے گا یا خلافت؟ تو اس بارے میں معتدل رائے یہ ہے کہ اس قسم کی حکومت ساخت کے لحاظ سے ملوکیت کے زمرے میں آتی ہے لیکن اگر حکمران میں خلیفہ کی ضروری صفات موجود ہوں اور وہ قرآن وسنت کے نظام کو معطل نہ کرے اور شریعت ہی کو آئینِ مملکت کے طور پر نافذ رکھے اور مسلم عوام اس حکومت کو سیاسی مرکزِ وحدت کی حیثیت سے تسلیم کر لیں تو اسے ''خلافت'' کہنے کی گنجائش ہے، چاہے خلیفہ میں ذاتی خرابیاں یا کمزوریاں ہوں۔ یہ خلافت، خلافت راشدہ کی طرح اسوہ یا قابل تقلید نمونہ نہیں ہوگی مگر اسے ''خلافتِ عامہ'' کا مقام دیا جائے گا اور اس کی موجودگی میں کسی دوسرے فرد کے لیے خلافت کا دعویٰ درست نہیں ہوگا تا کہ مسلمان سیاسی وحدت کے رشتے میں منسلک رہیں۔

غرض اسلام نے ایسے مواقع پر بھی راہ نمائی کی ہے کہ مسلمان ایسی صورت حال کا کس طرح سامنا کریں گے۔ قرآن وسنت اور عقل ونقل کے دلائل سے استفادہ کرتے ہوئے فقہائے امت نے یہ ضابطہ طے کیا ہے کہ جو حاکم مسلمانوں کی رضا کے بغیر بزورِ شمشیر ان پر مسلط ہو جائے اسے خلیفہ یا امام مان لیا جائے گا۔ اس کے بعد وہ چاہے مظالم کا مرتکب بھی ہو مگر اس کی زیادتیوں پر صبر اور جائز امور میں اس کی اطاعت کی جائے گی۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اکثر علماء کا موقف یہ ہے کہ ظالم حاکم کی اطاعت پر صبر کرنا، اس کے خلاف خروج سے بہتر ہے؛ اس لیے کہ اس کے مقابلے اور بغاوت کی صورت میں امن کی جگہ خوف، خون ریزی، نادان لوگوں کی دست درازی، مسلمانوں پر تاخت وتاراج اور زمین میں فساد کا خدشہ ہے۔''[1]

یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام نے جب آپ ﷺ کی زبانی سنا کہ اگلے دور میں ظالم امراء مسلط ہوں گے تو عرض کیا:

''کیا ہم ان سے مقابلہ نہ کریں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں جب تک وہ نماز قائم رکھیں۔''[2]

اسی لیے علماء امت نے عبدالملک بن مروان اور اس کے جانشینوں کو خلفاء میں شمار کیا ہے۔ ان کے لیے خلیفہ کا لقب ''امیر المؤمنین'' ہی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اسی لیے جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے عبدالملک کو مراسلہ لکھ کر بیعت کی تو ''امیر المومنین'' کا لقب استعمال کیا۔ اس مراسلے کا متن یہ تھا:

''اللہ کے بندے امیر المؤمنین عبدالملک کے نام! میں اللہ کے بندے امیر المؤمنین کے لیے حسب طاقت اطاعت وفرمانبرداری کا اقرار کرتا ہوں۔ میرے بیٹے بھی اس کا اقرار کرتے ہیں۔''[3]

اسی طرح محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے بھی، جو سیاسی قضیوں سے لاتعلق تھے، بیعت کر لی اور درج ذیل مکتوب بھیجا:

① تفسیر القرطبی: ۱۰۹/۲، ط دار الکتب المصریة ② صحیح مسلم، ح: ۴۹۱۰، کتاب الامارة، باب خیار الائمة و شرارهم

③ "لما بایع الناس عبد الملک کتب الیه عبد الله بن عمر: "الی عبد الله عبد الملک امیر المومنین. انی اقر بالسمع والطاعة لعبد الله عبد الملک امیر المؤمنین علی سنة الله وسنة رسوله فیما استطعت وان بنی قد اقروا بذلک." (صحیح البخاری، ح: ۷۲۰۵، کتاب الاحکام، باب کیف یبایع الامام الناس)
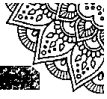
''میں نے امت کو اختلاف کرتے دیکھا تو گوشہ نشین ہو گیا۔ اب امرِ خلافت آپ کے پاس آ گیا ہے اور لوگوں نے آپ سے بیعت کر لی ہے تو میں بھی انہی میں شامل ہوں۔ میں آپ کے نائب حجاج کے ہاتھ پر آپ سے بیعت کرتا ہوں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ امان فراہم کریں اور ایفائے عہد کا وعدہ کریں کہ وعدہ خلافی میں کوئی خیر نہیں۔''

عبدالملک نے جواب میں لکھا: ''میں آپ کو اللہ اور رسول کا ذمہ دے کر یقین دلاتا ہوں کہ آپ اور آپ کے رفقاء کو کوئی گزند نہیں پہنچائی جائے گی۔''[1]

عبدالملک کی خلافت کے قیام کے بعد محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ ۸۰ھ میں وفات پا گئے۔[2]

بنو مروان کی سیاست:

بنو مروان کے حکمران اپنے طور پر مسلمانوں کی ایک مضبوط حکومت قائم کرنا چاہتے تھے اور اس کی قابلیت بھی رکھتے تھے۔ وہ فنونِ حرب اور سیاست کے طور طریقوں سے واقف تھے۔ عبدالملک اور اس کی اولاد میں سے بیشتر منصب خلافت کی اکثر شرائط پر بھی پورے اترتے تھے۔ اگر چہ ان میں سے بعض خلفاء بے اعتدالیوں، زیادتیوں اور سیاسی لغزشوں میں ملوث ہوئے مگر ان میں سے اکثر خلفاء عام حالات میں رعایا پرور تھے۔ عدل سے انحراف اور مظالم کی مثالیں ہمیں عموماً ان مواقع پر دکھائی دیتی ہیں جب ان کو کسی بغاوت کا سامنا ہو یا جب انتقالِ اقتدار کا مرحلہ درپیش ہو اور ان سب سے بڑھ کر جب اقتدار ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہو رہا ہو۔ ایسے مواقع پر ہر صاحب اقتدار و اختیار اپنے خلاف مزاحمت کے امکانات مٹانے کے لیے خون ریزی میں باک محسوس نہیں کرتا تھا۔

بنو مروان کا منشور:

امت کی تاریخ کی ابتدائی صدیوں میں ہمیں بارہا ایسے تجربات سے واسطہ پڑتا ہے کہ ایک عادل حاکم کی حکومت کو ختم کرنے والا طالع آزما جب خود مسندِ اقتدار پر بیٹھا تو گزشتہ حاکم کی طرح رعایا پرور، رحم دل اور اُمت کا خیر خواہ ثابت ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں خیر غالب تھی اور لوگوں کی دینی، نظریاتی اور اخلاقی تربیت نسبتاً بہتر تھی۔ اکثر سیاست دان قوم کے ہمدرد تھے۔ البتہ بعض اوقات وہ کسی غلط فہمی، کسی سازش، کسی ذاتی انتقام یا قبائلی دشمنی کی بنا پر عادل حکام کے خلاف بغاوت کر دیتے تھے مگر جب بغاوت میں کامیاب ہو کر خود حکومت بناتے تھے تو عموماً رعایا پروری کا معاملہ کرتے تھے۔ ان کے پاس کوئی الگ دین، کوئی اسلام شکن منشور یا نیا دستور نہیں تھا جس کے ذریعے وہ اُمت کو قصداً کسی گمراہی میں دھکیلتے۔ بلکہ عدالتوں میں شرعی قانون ہی رائج تھا جس کا حکمران بھی لحاظ کرتے تھے؛ اس لیے ان کے دور میں اندرونی استحکام بھی تھا اور بیرونی فتوحات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

یہاں ایک اہم حقیقت ملحوظ رکھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ کوئی نظام سیاسی تنازعات کے حل اور قیامِ امن کے لیے

---

[1] طبقات ابن سعد: ۵/۱۱۰، ط دار صادر
[2] انساب الاشراف: ۳/۲۹۳، ط دار الفکر

چاہے کتنا ہی جامع پروگرام فراہم کرتا ہو، وہ اسی وقت تک کارآمد ہوتا ہے جب سیاست دانوں میں افہام و تفہیم کا مادّہ باقی ہو۔ بصورتِ دیگر سیاسی لوگ دلیل اور قواعد و قوانین کے دفاتر بالائے طاق رکھ کر طاقت سے مسئلے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نتیجۃً ایک فریق کے چاروں شانے چت ہونے یا دونوں کے برباد ہونے کی صورت میں نکلتا ہے۔ جن لوگوں کو ہم شمشیر و سناں کے بل پر اقتدار حاصل کرتا دیکھتے ہیں، ایسا نہیں تھا کہ وہ سب طبعی طور پر سفاک اور ظالم تھے بلکہ ان کی اکثریت کو عام زندگی میں ہم مہربان، شریف اور نرم دل پاتے ہیں۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس دور کے لوگ دلیل کی بجائے تلوار سے فیصلے کے عادی ہو چکے تھے؛ اس لیے ہر کسی کو سیاسی جدوجہد میں تلوار پر انحصار کرنا پڑا۔

انتقالِ اقتدار کے مربوط آئینی نظام کی ضرورت:

ایسے مختلف تلخ تجربات کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اصل خرابی انتقالِ اقتدار کی رسم میں تھی۔ بالادست طبقے کے سیاسی شعور میں سرایت کرنے والے جمود کی وجہ سے انتقالِ اقتدار کے لیے کوئی مربوط لائحۂ عمل وضع نہیں کیا گیا۔ اگر قرآن و سنت کی روشنی میں کوئی ایسا سیاسی نظام وضع کر لیا جاتا جس کے ذریعے انتقالِ اقتدار کا مرحلہ بغیر کشت و خون کے انجام پاتا تو امتِ مسلمہ بہت سے مصائب سے بچ سکتی تھی۔ قرآن مجید نے بہترین انسان کی کسوٹی ''سب سے زیادہ متقی'' مقرر کی ہے۔[1] قرآن و سنت نے ایسے شخص کے انتخاب کے لیے شورائیت اور استیناس (لوگوں کی رضا و رغبت) جیسے بنیادی اصول دیے ہیں۔ حکومت کا مقصد، حکمران کی شرائط اور ذمہ داریاں بھی واضح کر دی ہیں۔ اس بارے میں فقہاء نے باقاعدہ کتابیں تصنیف کی ہیں جیسے امام محمد رحمۃ اللہ کی ''السیر الکبیر''، امام غزالی کی ''التبر المسبوک''، علامہ ماوردی کی ''الاحکام السلطانیۃ'' اور طرطوشی کی ''سراج الملوک''۔ قرآن و حدیث، تعاملِ خلفائے راشدین اور فقہی ذخیرے سے مدد لے کر انتقالِ اقتدار کا کوئی محفوظ و مامون نظام وضع کر لینا قطعاً مشکل نہ تھا۔

اس سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فارمولے کو ترقی دے کر انتقالِ اقتدار کے لیے ایک مستقل نظام کی شکل دی جا سکتی تھی۔ ایک سیاسی دستور اور آئین بنایا جا سکتا تھا۔ مثلاً امت کے سو بہترین بزرگ اور اصحاب علم و فضل کی ایک شوریٰ بنا دی جاتی۔ کسی بھی حکمران کو منتخب کرنے کا اختیار انہی کے پاس ہوتا۔ ان میں دارالخلافہ کے حضرات بھی ہوتے اور دوسرے صوبوں اور بڑے شہروں کے بھی۔ یہ حضرات خلافت کے لیے پانچ یا دس بہترین لوگوں کو نامزد کرتے۔ پھر باہم مشورے کے ذریعے ان میں سے بہترین کو چن لیتے۔ اگر ان میں اتفاق رائے نہ ہوتا تو اس مجلس شوریٰ میں رائے شماری کا طریقہ اختیار کیا جا سکتا تھا جیسے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی چھ رکنی کمیٹی نے کیا تھا۔ رفعِ اختلاف اور اتفاق رائے کی پختگی کے لیے عوامی حلقوں سے بھی رائے لی جا سکتی تھی جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنانے کے لیے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے گھر گھر جا کر لوگوں سے رائے لی۔ اس عمل کو باقاعدہ رائے شماری کی شکل دینا بھی کوئی مشکل نہ تھا۔ یہ بھی طے کیا جا سکتا تھا کہ اضطراری حالت کے سوا سابق حکمران کا کوئی

[1] إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ (سورۃ الحجرات، آیت: ۱۳)

قریبی عزیز، بھائی، بیٹا وغیرہ حکمران مقرر نہیں ہوگا جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا اہتمام کیا تھا۔ آئین میں کوئی شق رکھ کر ایسی ترتیب بنائی جاسکتی تھی جس کے ذریعے مختلف علاقوں اور مختلف قبائل کے بہترین افراد کو شرکت اقتدار کا موقع ملتا رہے اور خلافت پر ایک طبقہ مسلط نہ رہے اور دوسروں کو شکوہ شکایت نہ ہو۔ حاکم یا خلیفہ پر یہ پابندی لگائی جاسکتی تھی کہ اس کے احکام کا اجراء تحریر کے بغیر نہ ہوگا اور تحریر پر فقہاء کی طرف سے جواز کی مہر ہوگی تاکہ حکمِ حاکم حدودِ شرع سے متجاوز نہ ہو۔ شرعی اوامر ونواہی کے تحت آنے والے معاملات اور مباح حدود کے خالص انتظامی معاملات کو الگ الگ رکھنے کا سسٹم بھی بنایا جاسکتا تھا۔ شریعت کی پاسداری نہ کرنے، غیر اخلاقی کاموں میں ملوث ہونے اور ذاتی اغراض کو ملت کے مفاد پر مقدم رکھنے والے حاکم کو معزول کرنے والی ایک بااختیار کمیٹی بھی نظام کا حصہ بنائی جاسکتی تھی۔ یہ آخری دونوں شقیں بعض عثمانی خلفاء نے اپنے آئین میں داخل کی تھیں۔ غرض اسلامی تاریخ کے کسی بھی دور اور کسی بھی معاشرے میں حدیثی وفقہی ذخیرے سے کام لے کر ایک مامون، منظم اور محفوظ نظام کا نفاذ کیا جاسکتا تھا۔

سیاسی نظام میں جمود کی اصل وجہ:

مگر یہ سب تب ہوتا جب اہلِ سیاست کا طبقہ اس کے لیے تیار ہوتا۔ جب اہلِ سیاست موروثی اصول پر ڈٹ کر تلوار کے زور پر اقتدار حاصل کرنے اور اسے اپنے خاندانوں میں باقی رکھنے کا اصول اختیار کیے رہے، تو فقہاء ومجتہدین کی کاوشیں بھی کتابوں ہی میں دبی رہ گئیں۔ اگر ایسی کوئی ترتیب نافذ ہوتی اور امت کے اصحابِ تدبیر اور اہلِ شمشیر اس کی پاسداری کرتے تو ہمیں اقتدار کے زینے خون آلود دکھائی نہ دیتے۔ ایسا ہوتا تو ہماری تاریخ میں المیوں کا دورانیہ بہت کم رہ جاتا؛ کیوں کہ ان خاندانوں کے اکثر افراد حکمرانی کے اوصاف سے آراستہ تھے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت اور اس کے پس پردہ امکانات

عبدالملک کی خلافت کے آغاز میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا جو آخری دور کے عظیم صحابی تھے اور سارے عالم اسلام میں نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ ہر سال حج کیا کرتے تھے۔ ۷۳ھ میں حسب معمول حج کیا۔ منیٰ میں شیطان کو کنکریاں مارتے ہوئے آپ رضی اللہ عنہ اونٹنی پر سوار تھے۔ حجاج بن یوسف کے کارندے یہاں بھی اسلحہ تانے گھوم رہے تھے۔ شدید رش اور دھکم پیل کے دوران انہی میں سے کسی کا نیزہ آپ رضی اللہ عنہ کے تلوے کو لگ گیا۔ تلوے کے علاوہ انگوٹھے اور ساتھ والی انگلی کی درمیانی جھلی کٹ گئی۔ اتنا خون بہا کہ پاؤں سواری کی رکاب سے چپک گیا۔[1] آپ رضی اللہ عنہ عبادت میں ایسے منہمک تھے کہ احساس تک نہ ہوا۔ صاحبزادے سالم نے خون دیکھ کر آگاہ کیا۔[2] سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے رکاب میں چپکا پاؤں باہر نکالا،[3] عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اسی حال میں مناسک پورے کیے۔[4]

---

① صحیح البخاری، ح: ٩٦٦، کتاب الجمعة، باب ما یکرہ من حمل السلاح فی العید والحرم؛ طبقات ابن سعد: ١٨٦/٤، ١٨٧، ط دار صادر

② طبقات ابن سعد: ١٨٥/٤، ١٨٦ ③ صحیح البخاری، ح: ٩٦٦ ④ طبقات ابن سعد: ١٨٥/٤، ١٨٦

حجاج بن یوسف عیادت کے لیے ان کی رہائش گاہ پر آیا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بستر پر لیٹے تھے۔ حجاج نے سلام کیا، آپ نے جواب دیا۔ اس نے پوچھا: ''کیسے ہیں؟'' فرمایا: ''صحیح سلامت۔''

حجاج نے پوچھا: ''آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے پاؤں پر زخم کس نے لگایا؟''

فرمایا: ''نہیں۔''[1]

حجاج نے کہا: ''میں اس سے آپ کا بدلہ لوں گا۔''

فرمایا: ''اللہ ہی اس سے بدلہ لے گا۔ اللہ ہی اس کا بدلہ لے گا۔''[2]

حجاج نے جاتے جاتے کہا: ''مجھے معلوم ہو جائے تو بخدا اس آدمی کو قتل کرا دوں۔''[3]

دوسری بار عیادت کے لیے آیا تو پھر یہی سوال پوچھا کہ کس نے زخم لگایا؟

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم ہی نے مجھے قتل کرایا ہے۔''

حجاج نے پوچھا: ''وہ کیسے؟''

فرمایا: ''حرم کی حدود میں جہاں ہتھیار لے جانا حلال نہیں ہے وہاں اسلحہ اٹھانے کی اجازت تمھی نے دی، پس مجھے تمہارے ہی کسی آدمی کا ہتھیار لگ گیا۔''[4]

حجاج ایک بار پھر عیادت کے لیے آیا تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے ملنا پسند نہیں کیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ حجاج غضب ناک ہو کر لوٹ گیا۔[5]

اگرچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے براہ راست حجاج کو قاتل نہیں کہا مگر اس سے ناراض ضرور تھے۔

وفات سے پہلے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

''مجھے دنیا میں تین چیزوں کے سوا کوئی حسرت نہیں رہی: گرمیوں میں روزے کی پیاس کی، راتوں کی عبادت کی اور اس بات کی کہ میں اس باغی جماعت سے لڑائی میں کیوں شریک نہ ہوا جو ہم پر ٹوٹ پڑی تھی۔''

آپ کے شاگرد سعید بن جبیر رحمہ اللہ کے مطابق یہاں باغی جماعت سے حجاج کی فوج مراد تھی جس نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف یورش کی تھی۔[6]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ یکم محرم ۷۴ھ کو ۸۴ سال کی عمر میں مکہ میں فوت ہوئے۔ مکہ میں دفن ہونے والے آخری صحابی

---

① صحيح البخاری، ح: ۹٦٧، كتاب الجمعة، باب ما يكره من حمل السلاح في العيد والحرم؛ طبقات ابن سعد: ١٨٥/٤

② مجمع الزوائد، ح: ١٥٨٧٠، قال الهيثمي رواه الطبراني باسنادين و رجال هذا ثقات ③ طبقات ابن سعد: ١٨٥/٤، ط دار صادر

④ صحيح البخاری، ح: ۹٦٦، ۹٦٧، كتاب الجمعة، باب ما يكره من حمل السلاح في العيد والحرم ؛ طبقات ابن سعد: ١٨٧/٤

⑤ طبقات ابن سعد: ١٨٦/٤

⑥ عن سعيد بن جبير قال لما حضر ابن عمر رضي الله عنه الموت قال: "اني لم اقاتل هذه الفئة الباغية التي نزلت بنا، يعني الحجاج." (قيام الليل لمحمد بن نصر المروزي: ٦٢/١ ؛ وصايا العلماء عند حضور الموت لابن زبر الربعي م٣٧٩هـ)
یہ سند متصل ہے جس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ متعدد محدثین نے اسے اپنی کتب میں نقل کیا ہے۔

آپ ہی تھے۔ آپ نے دو ہزار چھ سو تیس (۲۶۳۰) احادیث کا ذخیرہ چھوڑا۔ [1]

چوں کہ آپ مکہ سے ہجرت کر چکے تھے اس لیے یہاں دفن ہونے سے غیرت آ رہی تھی۔ چنانچہ وفات سے پہلے وصیت کر دی تھی کہ مجھے حرم کی حدود سے باہر دفن کیا جائے مگر حجاج نہ مانا۔ نماز جنازہ اسی نے پڑھائی اور مکہ میں مہاجرین کے قبرستان ''مُحصَّب'' میں دفن کرایا۔ [2]

کیا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو حجاج نے قتل کرایا تھا؟

وفات سے پہلے آپ کے اور حجاج کے درمیان رنجش ہو چکی تھی جس کی وجہ حجاج کی بدلحاظی اور تندخوئی تھی۔ آپ عبدالملک کی بیعت کر چکے تھے، اس کے باوجود ایک بار حجاج نے آپ کو رقعہ لکھا تھا:

''مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم خلافت کے طلب گار ہو مگر یہ منصب کسی کمزور، کنجوس اور جذباتی شخص کے لیے نہیں۔''

آپ رضی اللہ عنہ نے جواب لکھا:

''تم نے خلافت طلب کرنے کا ذکر کیا ہے تو میں نے کبھی یہ منصب طلب نہیں کیا، اس سے مجھے کوئی سرو کار نہیں رہا۔ رہی کمزوری، بخل اور جذباتی ہونے کی تو جو شخص اللہ کی کتاب کو حفظ کر لے وہ کمزور نہیں ہو سکتا اور جو زکوٰۃ ادا کرتا ہو وہ بخیل نہیں ہو سکتا اور جو تم نے جذباتی پن کی بات ذکر کی ہے تو بچہ اگر خود کو باپ کی بجائے کسی اور سے منسوب کرے تو مجھ سمیت کون ہوگا جسے غیرت نہ آئے۔''

مطلب یہ تھا کہ کچھ نہ کچھ جذباتی پن ہر شخص میں ہوتا ہے۔ اس سے کوئی خالی نہیں۔ [3]

حجاج ایک دن تقریر کرتے ہوئے کہہ رہا تھا: ''عبداللہ بن زبیر نے کلام اللہ کو بدل ڈالا۔''

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا:

''اللہ کے دشمن! تو نے جھوٹ کہا، بلکہ تو نے حرم شریف کا احترام پامال کر ڈالا۔ بیت اللہ کو تباہ کر دیا۔''

حجاج بھڑک کر بولا:

''تم بوڑھے ہو، سٹھیا گئے ہو۔ کوئی بعید نہیں کہ تمہاری گردن اڑا دی جائے اور بچے تمہاری لاش گھسیٹتے پھریں۔'' [4]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''اگر تم دوبارہ ایسی بات کرو گے تو میں بھی دوبارہ یہی کہوں گا۔'' [5]

یہ تکرار عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے کچھ دنوں بعد ہوئی تھی۔ اسی لیے مؤرخین کے بقول حجاج ہی نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کرایا تھا۔ اس نے کسی کو متعین کیا تھا کہ موقع پا کر انہیں زہریلا نیزہ چبھو دے۔ [6]

---

① البدایة والنھایة: ۲۳۷/۱۲، ۲۳۸ ② طبقات ابن سعد: ۱۸۷/۴، ط دارصادر

③ مجمع الزوائد، ح: ۱۵۸۶۷، قال الھیثمی: رواہ الطبرانی ورجالہ ثقات الا انہ مرسل

④ طبقات ابن سعد: ۱۸۴/۴، عن مسلم بن ابراھیم بسند صحیح ⑤ سیر اعلام النبلاء: ۲۳۰/۳

⑥ امر الحجاج بعض مسودتہ فاخذ حربة مسمومة وضرب بھا رجل ابن عمر. (سیر اعلام النبلاء: ۲۳۰/۳ ...... قال المحشی، رجالہ ثقات)

خوارج کی شورش

حکمرانوں کی طرف سے طاقت کے تجربات اور موروثیت پر اصرار نے خوارج کی شورش پسندی کو مزید تیز کر دیا تھا۔ عبدالملک کو مسند خلافت پر بیٹھنے کے بعد سب سے پہلے انہی سے پالا پڑا۔ خوارج اپنے طور پر شورائیت کے قائل تھے اور ان کے نزدیک ہر مسلمان جو بہادر اور متقی ہو، حکمرانی کا اہل تھا چاہے وہ عربی ہو یا عجمی، قریشی ہو یا غیر قریشی۔ ان کے نزدیک گناہ یا ظلم کے ارتکاب سے حاکم معزول ہو جاتا تھا اور لوگوں پر اس کی بیعت فسخ کر دینا لازم ہو جاتا تھا۔ اس لیے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے لے کر عبدالملک تک کسی بھی خلیفہ کو برحق نہیں مانتے تھے؛ کیوں کہ ان کے نزدیک یہ سب گناہ و ظلم کے مرتکب ہو چکے تھے۔

چوں کہ ان کا نظام بہت سادہ اور شرائطِ احتساب بہت کڑی تھیں جن کے مطابق ہر کسی کو حاکم پر جرح و تنقید کا حق بھی تھا، اس لیے نوجوانوں کو خارجیت بہت بھاتی تھی۔ مگر نقصان یہ تھا کہ خود خوارج کے عقائد و نظریات اور سیاسی تصورات بڑے سطحی تھے جنہیں کہیں بھی استحکام اور قرار نہ تھا۔ اسی لیے خوارج میں جلدی جلدی نئے گروہ بنتے چلے جاتے تھے، امراء بدلتے رہتے تھے۔ ان کی زندگی خانہ بدوشوں کی سی تھی۔ کوئی مستقل ٹھکانہ ملتا نہ جائے قرار۔

بہر حال حکمرانوں کے یہ پرانے حریف نئے ولولے سے عبدالملک کے مقابلے پر نکل آئے تھے۔ ان کا جو گروہ بحرین میں ابوفُدَیک کی سرکردگی میں سراپا بغاوت چلا آ رہا تھا، اسے ۷۳ھ میں عبدالملک کے جرنیل عمر بن عبداللہ نے دس ہزار فوج کے ساتھ حملہ کر کے خون ریز جنگ کے بعد کچل ڈالا اور ابوفُدَیک مارا گیا۔ ①

تاہم خوارج کے بڑے گروہ ''ازارِقہ'' نے پورے فارس اور عراق میں مسلسل غارت گری سے ہل چل مچا رکھی تھی اور اموی افواج کو جو عبدالعزیز بن عبداللہ کے زیر کمان تھیں، شکست دے ڈالی تھی۔

آخر عبدالملک نے براہ راست اپنے حکم سے عراق کے سب سے تجربہ کار جرنیل مُہَلَّب بن ابی صفرہ کو یہ مہم سونپی جو اس سے پہلے خوارج سے جنگوں کا طویل تجربہ رکھتے تھے۔ مُہَلَّب فوج لے کر خوارج کے مقابلے کے لیے ''رامَھُرمُز'' کے محاذ پر روانہ ہوئے جہاں خوارج کا زور سب سے زیادہ تھا۔ مگر جنگ سے پہلے ہی کوفہ کے حاکم بشیر بن مروان کی موت کی خبر آ گئی جسے سن کر اکثر فوج قیادت کی اجازت کے بغیر واپس چلی آئی۔ یہ صورت حال اگر بغاوت نہیں تو عملی طور پر اعتراف شکست کے مترادف ضرور تھی جس کے بعد عراق پر خوارج کا تسلط مزید بڑھ جانا یقینی تھا۔ ②

① تاریخ الطبری: ۱۹۳/۶

② تاریخ الطبری: ۱۹۶/۶ تا ۱۹۸

کوفہ میں حجاج بن یوسف کا ہیبت ناک خطبہ:

اس موقع پر عبدالملک نے ضرورت محسوس کی کہ عراق پر گرفت مضبوط کرنے کے لیے کسی سخت ترین منتظم کو آزمانا چاہیے چنانچہ اس نے ۳۵ سالہ حجاج بن یوسف کو ۷۵ھ میں حجاز کی امارت سے ہٹا کر عراق کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔ وہ ماہ رمضان میں صرف بارہ سواروں کے ساتھ کوفہ پہنچا۔ سیدھا جامع مسجد میں داخل ہوا اور اعلان کر کے عوام کو جمع کر لیا۔ منہ کو عمامے کے شملے سے ڈھانکے جب وہ منبر پر کھڑا ہوا تو کچھ دیر چپ رہا۔ بہت سے شریر لوگ ہاتھوں میں کنکر لیے نئے حاکم کی خاطر تواضع کے لیے تیار تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو شروع سے فتنہ وفساد کے عادی تھے اور حکام کو تنگ کرنا ان کی عادت تھی۔ حجاج ان کے تیور دیکھتا رہا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس کی آواز نے سناٹے کو توڑ دیا:

أَنَـــا ابْــنُ جَلا وَ طَلاَّعُ الثَّــنَــايَـــا　　مَتــىٰ أَضَــعِ الْـعِـمَــامَةَ تَعْـرِفُـوْنِـي

''میں اندھیروں کو چیر دینے والا آفتاب ہوں، گھاٹیاں عبور کرنے کا ماہر ہوں۔
جب میں عمامہ اتاروں گا تو تم مجھے پہچان لو گے۔''

یہ کہہ کر اس نے منہ سے نقاب ہٹا دیا۔ لوگ کانپ گئے۔ ہاتھوں سے کنکریاں گر گئیں۔ پھر حجاج نے وہ آتش بار تقریر کی جس کا ہر جملہ حاضرین کو دہلانے کے لیے کافی تھا۔ اس نے کہا:

''لوگو! میں برائی سے اس کی حیثیت کے مطابق معاملہ کرتا ہوں۔ جو جیسا کرتا ہے ویسا سلوک کرتا ہوں۔ میں بہت سے سروں کو دیکھ رہا ہوں جن کے کٹنے کا وقت آ چکا ہے۔ بہت سے عمامے اور ڈاڑھیاں خون سے رنگین ہونے کو ہیں۔ عراق کے لوگو! مجھے دبایا نہیں جا سکتا۔ میرا تقرر سوچ سمجھ کر کیا گیا ہے۔ امیر المؤمنین نے اپنے ترکش کے سارے تیر نکال کر ان کی سختی کو جانچا اور جو سب سے سخت محسوس ہوا سے تمہاری طرف چلایا۔ تم ایک طویل زمانے سے فتنہ وفساد اور سرکشی کے عادی چلے آ رہے ہو مگر اب یاد رکھو! میں تمہاری کھال اس طرح ادھیڑ دوں گا جیسے درخت کی چھال اتاری جاتی ہے۔ تمہیں کانٹے دار جھاڑیوں کی طرح کاٹ ڈالوں گا۔ تمہیں اس طرح ماروں گا جیسے سرکش اونٹ کو پیٹا جاتا ہے۔ میں تلوار سے تمہاری اس طرح خبر لوں گا کہ تمہارے بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہو جائیں گی۔ سنو! باغی جماعتوں سے دور رہو اور راہ راست پر آ جاؤ۔ اگر باغی کامیاب ہو گئے تو نہ خراج وصول ہو گا نہ سرحدوں کی حفاظت ممکن ہو گی۔ اللہ کی قسم! جب میں کوئی وعدہ کرتا ہوں تو اسے پورا کرتا ہوں۔ کسی بات کا عزم کر لوں تو اسے کر کے چھوڑتا ہوں۔ جس باغیانہ انداز میں تم مُہلّب کا ساتھ چھوڑ کر آئے ہو، وہ مجھے معلوم ہے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تین دن بعد میں جس شخص کو بھی یہاں دیکھوں گا، اس کی گردن اڑا دوں گا اور جائیداد ضبط کر لوں گا۔''

اس تقریر نے لوگوں کے ہوش اڑا دیے۔ وہ گم صم حجاج کے ڈراؤنے چہرے کو دیکھتے رہ گئے۔ اس کے بعد حجاج نے اپنے نقیب کو حکم دیا کہ اہل کوفہ کے نام خلیفہ عبدالملک کا مراسلہ سرعام سنائے۔

ابھی مراسلے کے ابتدائی الفاظ ''السلام علیکم'' ہی پڑھے گئے تھے کہ حجاج بن یوسف حاضرین پر برس پڑا اور بولا:

''امیر المومنین تمھیں سلام کہہ رہے ہیں اور تم جواب تک نہیں دیتے۔''

فضا یک دم ''وعلیکم السلام'' کی آوازوں سے گونج اٹھی۔

حجاج نے کہا: ''اللہ کی قسم! میں تمھیں ادب سکھا کر رہوں گا۔''

اس کے بعد خلیفہ کا خط سنایا گیا اور اہل کوفہ ساری اکڑفوں بھول کر محاذ پر جانے کے لیے دوڑ پڑے۔ کوفہ کے پُل پر شدید رش ہوگیا۔ تیسرے دن کوفہ خالی ہو چکا تھا۔ تمام مرد محاذ کی طرف نکل چکے تھے۔ ①

عمیر بن ضابی کو سزائے موت:

اسی دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک سرکاری اہلکار زخمی حالت میں حجاج کے پاس آیا اور بتایا:

''ایک بوڑھا شخص محاذ پر جانے سے انکار کرتا ہے۔ میری تاکید پر اس نے مجھے زخمی کر دیا ہے۔''

حجاج نے حکم دیا کہ اسے پکڑ کر لایا جائے۔ اسے حاضر کیا گیا تو حجاج نے اس سے انکار کی وجہ پوچھی۔ اس نے کہا: ''میں بہت بوڑھا ہوں، بیمار اور ضعیف ہوں۔'' ساتھ ہی کہا: ''میں اپنی جگہ اپنے دو کڑیل جوان بیٹوں کو فوج میں بھیج چکا ہوں۔'' اتنے میں حجاج کے ساتھ موقع پر موجود ایک امیر عَنْبَسَہ بن سعید نے اسے پہچان لیا کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش میں شریک شیعہ عمیر بن ضابی ہے۔

اس نے حجاج سے پوچھا: ''آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟'' حجاج نے نفی میں جواب دیا۔

عَنْبَسَہ نے کہا: ''یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں میں سے ایک ہے۔ یہ وہی شخص ہے جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو اس نے نعش کو طمانچہ بھی مارا تھا اور جسم پر کود کر پسلیاں چکنا چور کر دی تھیں۔''

حجاج کا طیش سے برا حال ہوگیا۔ پوچھا: ''کیا تم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے جنگ کی تھی؟'' بولا: ''ہاں!''

حجاج نے پوچھا: ''کیوں؟''

بولا: ''اس لیے کہ میرے بوڑھے باپ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جیل میں ڈال دیا تھا۔''

حجاج کو کچھ یاد آ گیا، فوراً کہا: ''اچھا تو تم وہی جس نے شعر کہا تھا:

هَمَمْتُ وَلَمْ اَفْعَلْ وَكِدْتُ وَلَيْتَنِيْ تَرَكْتُ عَلٰى عُثْمَانَ تَبْكِيْ حَلَائِلُهٗ

''میں نے ارادہ کیا مگر اس پر عمل نہ کر سکا، حالاں کہ ایسا کرنے کے قریب تھا۔
کاش کہ میں عثمان کو ایسی حالت میں چھوڑتا کہ اس کی بیویاں اس پر نوحہ کر رہی ہوتیں۔'' ②

---

① تاریخ الطبری: ۲۰۲/۶ تا ۲۰۶

② عمیر بن ضابی کا ذکر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف خفیہ تحریک اور محاصرے کے ضمن میں آ چکا ہے۔ اس نے بغاوت اور محاصرے میں شرکت کی تھی اور شہادت کے بعد لاش کی بے حرمتی بھی کی تھی مگر براہ راست قاتلانہ وار کرنے والوں میں شامل نہیں تھا۔ اس کے مذکورہ شعر سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قتل کی کارروائی میں خود حصہ لینا چاہتا تھا مگر نہ لے پایا۔

گزشتہ خلفاء نے قتل میں ملوث ہونے کا کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے اس پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ بہرکیف اب کوفہ خالی ہوجانے کے حادثاتی موقع پر اپنی بدتمیزی کی وجہ سے وہ سرکاری اہلکاروں کی نگاہ اور حجاج کی پکڑ میں آ گیا تھا۔

اس نے غلط بیانی میں کوئی فائدہ نہ دیکھتے ہوئے جرم کا اعتراف کرلیا۔ شاید اسے امید تھی کہ سچ بول دینے پر حجاج اس کے بڑھاپے کا لحاظ کر کے چھوڑ دے گا۔ مگر حجاج نے ایک لمحے کے تامل کے بعد اس کے بارے میں فیصلہ سناتے ہوئے کہا: ''تمہارے قتل ہی میں کوفہ و بصرہ کی بھلائی لگتی ہے۔''

حجاج کا مطلب یہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغاوت کی وجہ سے یہ شخص مجرم تو بہر حال ہے ہی۔ اس کے علاوہ اس وقت اس کے قتل سے لوگ مرعوب ہوں گے کہ حجاج سرکاری حکم کی پاسداری میں کوتاہی کرنے پر کسی بوڑھے کو بھی نہیں بخشتا۔ چنانچہ حجاج کے اشارے پر پہرے دار نے عمیر بن ضابی کا سر قلم کر دیا۔ [1]

قطری بن فجاۃ خارجی کی سرکوبی:

حجاج کے حکم پر کوفہ کے ہزاروں رضا کار محاذ پر پہنچے تو مُہلّب نے انہیں لے کر ازارقی گروہ کے خوارج سے نبرد آزمائی شروع کی۔ اب ان کا سردار قطَری بن فُجاۃ تھا۔ مُہلّب نے مختلف محاذوں پر ڈیڑھ سال تک ان کا متواتر تعاقب کیا مگر قطَری بن فُجاۃ ہاتھ میں نہ آیا۔ وہ ایک میدان سے پسپا ہوتا تو دوسری جگہ شکست کا بدلہ لے لیتا۔ وہ نہایت بہادر، اور ہوشیار جنگجو ہونے کے علاوہ نامور شاعر بھی تھا۔

۷۷ھ میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ قطَری کے گروہ میں پھوٹ پڑ گئی۔ ہوا یہ کہ اس کے ایک عہدے دار نے کسی نامور خارجی کو قتل کر دیا۔ خارجیوں نے آ کر قطَری سے مطالبہ کیا کہ قاتل کو ہمارے سپرد کیا جائے تاکہ ہم اسے اپنے ساتھی کے بدلے قتل کریں۔ مگر قطَری نے یہ کہہ کر اس عہدے دار سے قصاص تک نہ لیا کہ یہ قاتل کی خطائے اجتہادی ہے۔ اس پر گروہ کے اکثر لوگوں نے قطَری کو بے انصاف قرار دے دیا اور الگ ہوکر عبدرب کبیر کی قیادت میں الگ گروہ بنالیا اور قطَری سے زور آزمائی کرنے لگے۔

حجاج بن یوسف نے خوارج میں پھوٹ پڑنے کی اطلاع ملتے ہی مُہلّب کو حریف پر فیصلہ کن حملہ کرنے کا حکم دیا۔ مُہلّب نے کچھ دنوں تک توقف کیا اور خارجیوں کے ان دونوں گروہوں کو آپس میں لڑنے مرنے دیا۔ جب وہ لڑ بھڑ کر تھوڑے رہ گئے تو پہلے عبدرب کبیر کے گروہ کو کچلا اور پھر قطری کا تعاقب کرتے کرتے اس کے پیچھے طبرستان کے فلک بوس پہاڑوں کا رخ کیا۔ یہ ۷۹ھ کا واقعہ ہے۔

یہاں ایک خون ریز جھڑپ میں قطری کی بچی کھچی جمعیت بھی کام آ گئی۔ وہ خود فرار ہونے کی کوشش میں پہاڑ کی ڈھلوان سے پھسل گیا اور لڑھکتے ہوئے نیچے جا گرا۔ ادھر سے ایک لالچی دیہاتی کا گزر ہوا۔

قطَری نے جو شدید زخمی تھا، پانی مانگا۔ دیہاتی نے کہا: ''پہلے کچھ دے تو پانی پلاؤں۔''

[1] تاریخ الطبری: ۲۰۸،۲۰۷/۶

قطَری نے کہا: "تجھے شرم نہیں آتی، میرے پاس ان ہتھیاروں کے سوا کچھ نہیں۔ پہلے پانی پلاؤ تو اسلحہ دے دوں گا۔" دیہاتی بولا: "نہیں، پہلے اسلحہ دو۔"

قطَری نے انکار کیا تو دیہاتی پہاڑ کی ڈھلوان پر چڑھ گیا اور وہاں سے ایک بہت بڑا پتھر لڑھکا دیا جس کی ضرب سے قطَری ادھ موا ہو گیا۔ اتنے میں مُہَلَّب کے سپاہی آن پہنچے اور اس کا سر قلم کر دیا۔ ①

شَبیب خارجی سے معرکہ:

عین انہی ایام میں خوارج کا ایک گروہ "اَلصُّفرِیَّۃ" نمودار ہوا جس کا قائد شَبیب بن یزید بن نعیم شیبانی تھا۔ یہ جنگ آزما اور دلیر سردار ۷۶ھ سے ۷۷ھ تک الجزیرہ اور عراق کے میدانی علاقوں میں سرگرم رہا۔ اس زبردست جنگجو نے مٹھی بھر افراد کے ساتھ سرکاری افواج اور ان کی کمک پر آنے والے شامی سپاہیوں کو پے در پے شکستیں دیں۔

عبدالملک اور حجاج بن یوسف بدل بدل کر قابل سے قابل جرنیل اور بہتر سے بہتر سپاہی مقابلے میں بھیجتے رہے مگر شَبیب سب کو نیچا دکھاتا رہا۔ اس نے حارث بن عُمیرہ کو آمد کے قریب شکست دی پھر سفیان بن ابوالعالیہ، سَورہ بن حُر، جَزل بن سعید کندی، سعید بن مُجالِد، سُوید بن عبدالرحمٰن اور عثمان بن قَطَن جیسے تجربہ کار سالار کئی کئی ہزار کے لشکر لے کر حجاج کی طرف سے یکے بعد دیگرے اس کے خلاف بھیجے گئے مگر یہ سب کو مار بھگاتا رہا۔

پھر زائدہ بن قُدامہ اور زَحر بن قیس دس ہزار فوج لے کر نکلے، انہیں بھی شکست ہوئی۔ صرف عبدالرحمٰن بن اشعث کے مقابلے میں شَبیب کا پلہ کمزور رہا اور وہ عبدالرحمٰن کی حکمت عملی دیکھ کر مقابلے میں نہ آیا مگر اس کے بعد اگلی جنگ میں اس نے سالارِ کوفہ عثمان بن قَطَن کو مار ڈالا۔ اگلے مقابلے میں حجاج نے عتاب بن ورقاء کو ۵۰ ہزار کا لشکرِ جرار دے کر بھیجا۔ گویا عراق کی پوری طاقت جھونک ڈالی۔ ساباط کے قریب گھمسان کا رن پڑا۔ شَبیب کے پاس صرف ایک ہزار جانباز تھے، مگر اس نے اتنے بڑے لشکر کو اس بری طرح شکست دی کہ سپہ سالار عتاب بھی مارا گیا۔ ②

ایک خارجی عورت کی دلیری:

شَبیب دو برس تک الجزیرہ سے وادیٔ عراق تک کے علاقے سے خراج وصول کرتا رہا۔ اس گروہ کا کسی شہر یا قلعے میں مسکن نہ تھا بلکہ یہ ہر آن سپاہیوں کی طرح گشت کرتا رہتا تھا۔ شَبیب کی جرأت کا یہ عالم تھا کہ جمادی الآخرہ ۷۶ھ میں سوید اور عثمان کو "حیرہ" کے قریب زک پہنچانے کے بعد وہ گنتی کے چند افراد کے ساتھ جن میں اس کی شمشیر زن بیوی غزالہ بھی شامل تھی، سیدھا کوفہ میں گھس گیا اور وہاں کے کئی اعیان عَنبَسہ بن ابوسفیان کے آزاد کردہ غلام ابوسلیم، ابواللیث بن ابوسلیم، عدی بن عُمر واور ازہر بن عبیداللہ کو قتل کر ڈالا۔ اس کی بیوی غزالہ جامع مسجد کوفہ میں داخل ہوئی، اپنی روزانہ کی عبادت اور ذکر کا معمول پورا کیا۔ پھر مسجد کے منبر پر چڑھ گئی جس کی اس نے نذر مان رکھی تھی۔ شَبیب کوفہ میں ایک طوفان کی طرح آیا اور نکل گیا۔ ③

---

① تاریخ الطبری: ۳۰۸/۶ تا ۳۱۰ ② تاریخ الطبری: ۲۱۹/۶ تا ۲۹۶ ③ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۷۴

حجاج اس وقت بصرہ میں تھا۔ یہ اطلاع ملنے پر تیزی سے کوفہ واپس پہنچا۔ اس نے عراقی افواج کو بالکل بے کار تصور کر کے شام سے عبدالملک کے بھیجے ہوئے امدادی دستوں اور خاص اپنے موالی کو ساتھ لیا اور خود شبیب کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا۔ کوفہ کے باہر اس نے شبیب کو جالیا۔ دو دن تک خون ریز جنگ کے بعد شبیب کو پہلی بار شکست ہوئی اور وہ پسپا ہو گیا۔ حجاج نے اسے دم لینے کا موقع نہ دیا اور تعاقب میں تازہ دم فوجیں بھیج دیں۔

آخر ۷۷ھ میں اہواز کے قریب دریا کے کنارے ہولناک معرکہ ہوا۔ دن بھر لڑائی کے باوجود مٹھی بھر خارجی ڈٹے رہے۔ شام کو جنگ عارضی طور پر رکی تو شبیب نے دریا پر کشتیوں کا پل بنوایا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھوڑوں پر سوار ہو کر یہ پل عبور کرنے لگا تا کہ دریا کے پار دشمن سے محفوظ رہ کر ساتھیوں کو آرام دے۔ اچانک پل کے درمیان اس کا گھوڑا بدکا، شبیب دریا میں جا گرا اور اس کے منہ سے نکلا:

﴿لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا﴾

ایک غوطہ کھا کر وہ ابھرا اور بولا:

﴿ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ﴾

پھر لہروں میں گم ہو گیا۔ اس طرح یہ بہادر جسے بڑی سے بڑی فوج نہ ختم کر سکی پانی کی لہروں کی نذر ہو گیا۔ تب جا کر حجاج اور عبدالملک کو ایک سخت جان دشمن سے نجات ملی جو ہزار ڈیڑھ ہزار سواروں کے ساتھ دو سال تک ان کے لیے دردِ سر بنا رہا۔[1]

شبیب کے مقابلے میں کئی گنا عراقی افواج کی مسلسل ہزیموں کی ایک بڑی وجہ خود حجاج کا رویہ تھا۔ وہ لوگوں کو ڈرا دھمکا کر جنگ کے لیے ہانکتا تھا۔ ایسے میں فوجیں جذبے اور ولولے سے کہاں لڑ سکتی تھیں۔ آگے کنواں پیچھے کھائی کے ماحول میں ان کا رہا سہا اعتماد بھی ختم ہو جاتا تھا۔

◆◆◆

---

① تاریخ الطبری: ۲۶۸/۶ تا ۲۸٤، ۷۶ھ تا ۷۷ھ کے حالات

جہاد کا احیاء...... افریقہ کی فتوحات

ہم پڑھ چکے ہیں کہ یزید بن معاویہ کے آخری ایام میں ایک بربر سردار کُسَیلہ نے بغاوت کر کے فاتح افریقہ عقبہ بن نافع کو شہید کر دیا تھا اور شمالی افریقہ میں مسلمانوں کی چھاؤنی قیروان تک اسلامی مقبوضات کو چھین لیا تھا۔ اس کے بعد عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اندرونی شورشوں کی وجہ سے مسلمان دوبارہ افریقہ پر حملہ نہ کر سکے۔ پانچ سال تک قیروان سمیت پورے تیونس پر کُسَیلہ قابض رہا۔

زُہَیر بن قیس کی شہادت:

۶۹ھ میں عبدالملک کے بھائی عبدالعزیز حاکم مصر نے زُہَیر بن قیس کی سرکردگی میں یہاں ایک لشکر بھیجا۔ کُسَیلہ گھبرا کر قیروان سے بھاگ نکلا مگر زہیر بن قیس نے تعاقب کر کے ''ممس'' کے مقام پر اسے شکست فاش دے دی۔ کُسَیلہ اپنے اکثر ساتھیوں سمیت مارا گیا۔

واپسی میں زُہیر بن قیس کو سسلی کے بحری لشکر کی اطلاع ملی جو بحیرہ روم کے ساحل سے بَرقہ پر حملے کے لیے پیش قدمی کر رہا تھا۔ زُہیر تیز رفتار سواروں کی مختصر سی فوج کے ساتھ انہیں روکنے کے لیے پہنچ گئے۔ یہاں زوردار معرکہ ہوا جس میں زُہیر اپنے ساتھیوں سمیت شہید ہو گئے تاہم حریف کسی اسلامی شہر پر قبضہ نہ کر سکا۔ بَرقہ اور قیروان محفوظ رہے۔[1] عبدالملک کو اس شکست کا سخت صدمہ ہوا مگر دیگر مہمات کی وجہ سے کچھ نہ کر پایا۔

حسان بن نعمان کے کارنامے:

۷۴ھ میں عبدالملک نے پورے عالم اسلام کی زمام اقتدار سنبھالنے کے بعد حسان بن نعمان کی قیادت میں چالیس ہزار کا لشکر جرار افریقہ بھیجا تاکہ پوری شمالی پٹی سے شورشوں اور بغاوتوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔

ان دنوں شمالی افریقہ میں بحیرۂ روم کا ساحلی شہر ''قَرطاجَنہ'' اقتصادی اور عسکری لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ حسان بن نعمان نے یہاں چڑھائی کی۔ رومیوں، فرنگیوں اور بربروں کا بہت بڑا لشکر یہاں جمع تھا مگر آخر کار انہیں شکست ہوئی۔ وہ کشتیوں میں بیٹھ کر سسلی کی طرف نکل گئے اور قَرطاجَنہ فتح ہو گیا۔

حسان بن نعمان نے کچھ دنوں تک قیروان میں ٹھہر کر تازہ افواج تیار کیں۔ اب ان کا ہدف ''کوہِ اُوراس'' کے

---

[1] فتوح البلدان للبلاذری، ص ۲۲۷؛ الاستقصاء لاخبار دول المغرب الاقصی للسلاوی: ۱/۱۴۷، ۱۴۸

فلک بوس قلعے تھے جہاں بربروں سمیت بہت بڑی افرادی قوت موجود تھی۔ان کی قیادت ایک نہایت مکار جادوگرنی کیا کرتی تھی جس کی عمر سو سال سے متجاوز تھی۔اس کے تین بیٹے امور حکومت کے نگران تھے۔مراکش کے شہر طنجہ سے الجزائر تک اس کا راج تھا۔حسان بن نعمان جب افواج لے کر ''کوہِ اوراس'' پہنچے تو جادوگرنی کے پیروکاروں نے اس شدت سے مقابلہ کیا کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔ان کی بہت بڑی تعداد شہید اور گرفتار ہوگئی۔باقی ماندہ فوج پسپا ہوتے ہوتے قیروان سے بھی پیچھے قابس کی سرحد تک چلی گئی۔حریف افواج نے قیروان سے قابس تک تمام علاقے پر قبضہ کرلیا۔جادوگرنی کا خیال تھا کہ مسلمان دولت کے لیے فوج کشی کیا کرتے ہیں؛اس لیے اس نے مراکش سے تیونس کی آخری حدود تک تمام شہروں کو تباہ کرادیا اور وہاں کی زراعت،تجارت اور آبادی اجاڑ کر رکھ دی۔

پانچ سال تک جادوگرنی کا یہاں قبضہ برقرار رہا۔اس دوران جادوگرنی کے حامی بعض بربر قبائل بھی ملکی معیشت کی تباہی سے تنگ آچکے تھے؛اس لیے وہ مسلمانوں کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوگئے۔۷۹ھ میں عبدالملک نے حسان بن نعمان کو تازہ افواج بھیج کر دوبارہ یلغار کا حکم دیا۔اس بار فتح ونصرت نے قدم چومے۔جادوگرنی کے حامی پسپا ہوتے چلے گئے۔آخر میں جادوگرنی خود مقابلے پر آئی اور قتل ہوئی۔اس کا سر قلم کردیا گیا۔اس وقت اس کی عمر ۱۲۷ سال تھی۔اس نے ۳۵ برس تک حکومت کی تھی۔حسان بن نعمان نے اس کے مرکز ''کوہستان اوراس'' پر بھی قبضہ کرلیا۔جادوگرنی کے پیروکار کئی بربر قبائل اس موقع پر اسلام لے آئے اور آئندہ اسلام کے سچے وفادار ثابت ہوئے۔

جادوگرنی سے گزشتہ جنگ میں ایک نامور سپاہی خالد بن یزید بن قیس گرفتار ہوگیا تھا۔جادوگرنی نے اسے اچھی طرح اپنے پاس رکھا۔حسان بن نعمان نے اس حسن سلوک کے بدلے جادوگرنی کے بیٹوں کی جان بخشی کردی اور انہیں نومسلم بربروں کی الگ فوج بنا کر اس کا افسر مقرر کردیا۔اس طرح پورے شمالی افریقہ پر مسلمانوں کا قبضہ اتنا مستحکم ہوگیا کہ آئندہ یہ علاقے دوبارہ کبھی دشمنوں کے قبضے میں نہ گئے۔ان فتوحات کے ایک سال بعد ۸۰ھ میں حسان بن نعمان کی وفات ہوگئی۔[1]

◆◆◆

---

[1] الاستقصاء لاخبار دول المغرب الاقصیٰ: ۱۴۹/۱، ۱۵۰

عبدالرحمٰن بن اَشعَث کا خروج

عبدالملک بن مروان کی زندگی کا آخری اور سب سے کڑا امتحان عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث کی بغاوت تھی۔ اس عالی حوصلہ اور جنگ آزما سالار کو خراسان کے محاذ پر بھیجا گیا تھا تا کہ وہاں کی مسلسل بغاوتوں پر قابو پایا جائے۔ دراصل جنوبی خراسان میں مقامی آتش پرست سردار رُتبیل مسلمانوں کے لیے دردِ سر بنا ہوا تھا۔[1] رُتبیل نے ۷۴ھ میں علم بغاوت بلند کیا تو اس پر قابو پانے کے لیے یکے بعد دیگرے پہلے عبداللہ بن امیہ اور پھر عبیداللہ بن ابی بکرہ نے فوج کشی کی مگر دونوں کو شدید ہزیمت اٹھا کر واپس آنا پڑا۔ رُتبیل کا طریقِ جنگ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے لیے راستہ چھوڑ کر افواج کو دائیں بائیں پھیلا دیتا تھا۔ جب مسلمان پیش قدمی کر کے تنگ گھاٹیوں میں آ جاتے تو وہ انہیں گھیر لیتا تھا۔

۸۰ھ میں جب حجاج بن یوسف نے عبدالرحمٰن بن اشعث کو بیس ہزار سپاہ دے کر اس محاذ پر بھیجا تو اس ماہر جنگجو نے سابقہ تجربات اور نقصانات کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت محتاط پیش قدمی کی۔ وہ تھوڑے تھوڑے علاقے پر قبضہ کر کے اس کی حفاظت کا مکمل بندوبست کرتا اور پھر آگے قدم بڑھاتا۔ اس طرح رُتبیل کے جال میں پھنسے بغیر اس نے موسم سرما سے پہلے جنوبی خراسان کا آدھا حصہ بازیاب کرا لیا۔ اس کے بعد پڑاؤ ڈال کر حجاج کو فتوحات کی اطلاعات دیتے ہوئے لکھا: ”اس سال ہم نے جتنے علاقے پر قبضہ کر لیا ہے وہ کافی ہے۔ اگلے علاقوں کا جائزہ لے کر ہم آئندہ سال پھر پیش قدمی کریں گے اور آخری حدود تک قبضہ کر لیں گے۔“[2]

خروج کے اسباب:

حجاج بن یوسف کو عبدالرحمٰن بن اشعث سے پہلے ہی کچھ حسد تھا۔ یہ خط پڑھ کر اس نے پیش قدمی روکنے کے منصوبے کو مسترد کر دیا اور جواب میں لکھا: ”تمہاری تحریر دشمن سے صلح جوئی کے ذہن کی عکاسی کر رہی ہے۔ یہ وہ دشمن ہے جس نے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ اللہ کی قسم! تمہاری تجویز کسی منصوبہ بندی پر نہیں بزدلی پر مبنی ہے۔ فوراً آگے بڑھو اور دشمن کے قلعے کو مسمار کر دو اور سپاہیوں کو قتل کرتے چلے جاؤ۔“

ابھی عبدالرحمٰن یہ خط پڑھ کر شش و پنج میں تھے کہ حجاج کا دوسرا تاکیدی خط ملا جس میں لکھا تھا:

”آگے بڑھ کر دشمن کی سرزمین کو روند ڈالو ورنہ فوج کی کمان اپنے بھائی کو دے کر الگ ہو جاؤ۔“

---

① رُتبیل وسطی خراسان یا موجودہ افغانستان کے مجوسی بادشاہوں کا لقب تھا جن کا مرکز کابل تھا۔ یہاں کا ہر بادشاہ رُتبیل کہلاتا تھا۔

② البدایة والنهایة: ۳۰۷/۱۲، ۳۰۸؛ الکامل فی التاریخ، سنة ۸۱ هجری

حجاج کی یہ بے جا سختی عبدالرحمٰن بن اَشعَث جیسے اعلیٰ افسر کے لیے سخت صدمے کا باعث بنی۔ اسے یقین ہوگیا کہ حجاج صرف دشمنی نکالنے کے لیے اسے موت کے منہ میں دھکیلنا چاہتا ہے لہٰذا اس نے فوج کو جمع کر کے تقریر کی اور کہا:

''میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ تمہاری بہتری کے لیے میں نے فوج کشی کو اگلے سال تک ملتوی کیا تھا۔ تمہارے تمام تجربہ کار افسران اس رائے میں میری تائید کر چکے ہیں مگر حجاج اسے ہماری کمزوری پر محمول کر رہا ہے اور ان حدود میں یلغار پر اصرار کر رہا ہے جہاں ہمارے کتنے ہی بھائی جلد بازی اور عاقبت نااندیشی کی وجہ سے ہلاک ہو چکے ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ اس معاملے میں کیا کرنا چاہیے؟''

یہ سنتے ہی فوج کے امراء جو زیادہ تر کوفہ اور بصرہ کے تھے، بھڑک اٹھے اور بولے: ''ہم حجاج کی بات ہرگز نہیں مانیں گے۔'' ایک امیر نے کہا: ''چلو حجاج کو اپنے شہروں سے نکال دو۔'' دوسرے نے کہا: ''حجاج اللہ کا دشمن ہے۔ اسے معزول کر کے عبدالرحمٰن بن اَشعَث کے ہاتھ پر بیعت کرلو۔''

سب نے اس پکار پر لبیک کہا اور عبدالرحمٰن بن اَشعَث سے بیعت کر کے عہد کیا کہ حجاج کو عراق سے نکال کر ہی دم لیں گے۔ چوں کہ حجاج کے رویے اور بعض خلافِ اسلام اقدامات سے بھی نالاں تھے اس لیے فوج کے علاوہ نامور علماء و قراء، فقہاء اور محدثین کی بھی بڑی تعداد اس مہم میں شریک ہوگئی جن میں سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور امام شعبی رحمہ اللہ جیسے بزرگ بھی شامل تھے۔ ان حضرات کے شرکت کے سبب کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''قراء حضرات نے جو کہ حاملینِ قرآن اور صالحین تھے، عراق میں حجاج کے ظلم، نمازوں اور نمازِ جمعہ میں اس کی تاخیر کی وجہ سے خروج کیا تھا۔ یہ بنوامیہ کا واہیات طریقہ تھا جیسا کہ اس کی خبر نبی ﷺ نے دی تھی کہ تم پر ایسے امراء مسلط ہوں گے جو نمازوں کو ضائع کریں گے۔''[1]

عبدالرحمٰن بن اَشعَث نے پہلے اپنے حریف رُتبیل سے صلح کرلی تا کہ پشت سے حملے کا خطرہ نہ رہے۔ پھر عراق کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ اس لشکر کا نعرہ ''یا ثارات الصَّلوۃ'' (ہائے نماز کا انتقام) تھا؛ کیوں کہ حجاج نمازوں میں اکثر دیر کرا دیتا تھا۔[2] حجاج کو یہ اطلاع ملی تو دارالخلافہ اطلاع بھیج کر کمک منگوائی، اس موقع پر عالمِ اسلام کے مایہ ناز جرنیل مُہلَّب بن ابی صفرہ نے ایک طرف تو عبدالرحمٰن بن اَشعَث کو خط لکھ کر خانہ جنگی کی آگ پھیلانے سے منع کیا۔ دوسری طرف حجاج کو مشورہ دیتے ہوئے اپنے مراسلے میں لکھا: ''عراقیوں کی حالت ڈھلوان پر بہنے والے برساتی پانی سے مختلف نہیں۔ یہ لوگ ہر کام جوش و خروش سے شروع کرتے ہیں اور پھر اہل و عیال کی محبت میں پڑ کر رک جاتے ہیں۔ انہیں آنے دیں۔ وطن پہنچتے ہی وہ بیوی بچوں میں مشغول ہو جائیں گے۔''[3]

---

① سیر اعلام النبلاء: ۴/۳۰۶ والحدیث اخرجہ الامام مسلم والترمذی وابو داؤد ولفظ مسلم: کیف انت اذا کانت علیک امراء یؤخرون الصلوۃ عن وقتها او یمیتون الصلوۃ عن وقتها۔ (صحیح مسلم، ح:۱۴۹۷، کتاب الصلوۃ، باب کراهیة تاخیر الصلوۃ عن وقتها)

② العبر فی خبر من غبر، سنة ۸۳ھ

③ تاریخ الطبری: ۶/۳۴۰

پہلا معرکہ...... حجاج کو شکست:

حجاج نے اس قیمتی رائے کو نظر انداز کر کے مقابلے کے لیے فوج بھیج دی جس نے "تستر" کے قریب ابن اشعث کے لشکر سے ٹکر لی جو خراسان کی سمت سے آرہا تھا۔ زوردار لڑائی کے بعد حجاج کی فوج کو شکست ہوئی، مفرور سپاہی ۱۰ ذوالحجہ کو عین اس وقت بصرہ پہنچے جب حجاج نمازِ عیدالاضحیٰ کا خطبہ دے رہا تھا۔ شکست کی خبر سن کر حجاج فوراً بصرہ سے بھاگ نکلا۔ عبدالرحمٰن بن اشعث تعاقب کرتے ہوئے شہر میں داخل ہو گیا۔ ۱۰ ذوالحجہ ۸۱ھ کو وہ شہر پر قابض ہو چکا تھا۔ اس وقت حجاج کو مُہلَّب کی نصیحت یاد آئی مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ①

دَیرِ جَماجم کا محاذ:

۸۲ھ کے آغاز سے وسط تک عبدالرحمٰن بن اشعث اور حجاج کی فوجوں میں جھڑپیں اور لڑائیاں ہوتی رہیں۔ کبھی ایک جیتتا کبھی دوسرا۔ کوفہ اور بصرہ کبھی ایک کے قبضے میں آتے کبھی دوسرے کے۔ اس دوران بصرہ کے باہر فریقین میں دو بڑی لڑائیاں ہوئیں: ایک محرم کے آغاز میں "زَاوِیہ" کے مقام پر۔ دوسری صفر کے آغاز میں "ظَہْرُ المِرْبَد" کے میدان میں۔ ان میں فریقین کا بھاری جانی نقصان ہوا۔ آخر میں حجاج کا پلہ بھاری رہا اور اس نے بصرہ واپس لے لیا۔

تاہم عبدالرحمٰن بن اشعث باقی فوج کے ساتھ کوفہ پہنچ گیا۔ وہاں زبردست استقبال ہوا۔ اس کے حامی پہلے سے بھی زیادہ ہو گئے اور ان کی تعداد دو لاکھ تک پہنچ گئی۔ ۸۳ھ کے آغاز میں عبدالرحمٰن بن اشعث نے اس لشکر جرار کے ساتھ حجاج سے فیصلہ کن مقابلے کے لیے کوچ کیا۔ بصرہ سے حجاج بھی شامی سپاہیوں کو لے کر نکلا۔ دونوں فوجیں لڑائی کے لیے مناسب میدان کی تلاش میں دریائے فرات کے دونوں کناروں پر ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔

آخر ماہِ ربیع الاوّل میں حجاج نے "دَیرِ قُرّہ" اور ابن اشعث نے "دیر الجماجم" کے پاس پڑاؤ ڈالا۔ جماجم، جَمْجَمَۃ (کھوپڑی) کی جمع ہے۔ زمانہ جاہلیت میں یہاں عربوں اور ایرانیوں کی جنگ ہوئی تھی، فاتح عربوں نے مقتول دشمنوں کی کھوپڑیوں کو یہاں ایک مندر کے پاس نصب کیا تھا؛ اس لیے یہ جگہ "دیر الجماجم" (کھوپڑیوں کا آستانہ) کہلانے لگی۔ یہ مقام کوفہ سے ۲۱ میل جنوب میں تھا۔ ②

فریقین نے ایک طویل جنگ کی تیاری کے لیے مورچہ بندی کے ذریعے پڑاؤ محفوظ بنائے جس کے بعد جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ ربیع الاول سے جمادی الاولیٰ تک تقریباً تین ماہ انفرادی مقابلوں اور جھڑپوں کا سلسلہ جاری رہا۔ عراقیوں کو کوفہ سے مسلسل خوراک ورسد مل رہی تھی؛ اس لیے ان کی حالت مضبوط تھی جبکہ حجاج کا لشکر اپنی رسد کے مرکز دِمشق سے دور ہونے کے باعث غذا کی کمیابی کا شکار ہو چکا تھا۔ ابن اشعث کے پڑاؤ میں نامور محدثین کی موجودگی نے جگہ جگہ علمی حلقے لگا دیے تھے؛ اس لیے ذخیرۂ احادیث میں متعدد روایات ہیں جن میں مذکور ہے کہ یہ حدیث فلاں تابعی نے دیر جماجم میں سنائی۔ کہا جاتا ہے کہ ابن اشعث کے ساتھ خروج میں شریک ہونے والے نامور علماء و قراء کی تعداد پانچ سو تھی جبکہ غیر

---

① تاریخ الطبری: ۳۴۰/۶ ؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۸۱
② معجم البلدان: ۵۰۳/۲

معروف اہل علم ہزاروں تھے۔ جنگ میں ان علماء اور قراء کے دستے الگ الگ پرچموں تلے لڑا کرتے تھے۔ [1]

ان دنوں حسن بصری رحمہ اللہ لوگوں کو شورش سے منع کر رہے تھے جبکہ ان کے بھائی سعید رحمہ اللہ اس کے داعی تھے۔

ایک دن سعید رحمہ اللہ نے حسن بصری رحمہ اللہ سے کہا: ''ہم نے خلیفہ کی بیعت نہیں توڑی، ہم ان کو معزول کرنا نہیں چاہتے، البتہ ہم اس پر ناراض ہیں کہ خلیفہ نے ہمارے اوپر حجاج کو کیوں مسلط کیا۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ خلیفہ حجاج کو معزول کردے، تو اب بتایئے کہ کل جب ہمارا اہلِ شام سے آمنا سامنا ہوگا تو ان کا ہمارے ساتھ کیا رویہ ہوگا؟''

حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: ''حجاج اللہ کا عذاب ہے، اس کا مقابلہ تلوار سے نہ کرو۔'' پھر فرمایا: ''اہلِ شام کے متعلق میرا گمان ہے کہ اگر حجاج انہیں دنیا کے لقمے کھلا دے تو وہ انہیں جس کام کا بھی کہے گا، وہ اسے کر گزریں گے۔''

اُدھر دِمشق میں عبدالملک خانہ جنگی کی اس آگ کو پورے عراق میں پھیلتے دیکھ کر سخت فکر مند تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ لوگ درحقیقت حجاج کی بدسلوکی سے تنگ آ کر آمادۂ پیکار ہوئے ہیں۔ اس نے اپنے بھائی محمد کو بھیج کر عبدالرحمٰن بن اَشعث اور تمام منحرف عراقی امراء کو پیش کش کی کہ ''اگر وہ جنگ ترک کر دیں تو حجاج کو عراق سے برطرف کر دیا جائے گا، عراقی افواج کی تنخواہیں شامی افواج کے برابر کر دی جائیں گی، عبدالرحمٰن بن اَشعث کو تاحیات اس کے پسندیدہ شہر کی حکومت دے دی جائے گی لیکن اگر وہ جنگ پر تلے رہیں گے تو حجاج ہی ان پر مسلط رہے گا اور اسے اختیار ہوگا کہ جس طرح چاہے مخالفین پر قابو پائے۔'' [2]

اس فراخ دلانہ پیش کش سے ابن اَشعث کی مہم کا اصل مقصد پورا ہو رہا تھا؛ اس لیے وہ اسے قبول کرنا چاہتا تھا مگر اس کے حامیوں کے ارادے اب کہیں آگے بڑھ چکے تھے۔ انہوں نے بیک زبان انکار کرتے ہوئے کہا: ''اللہ نے دشمن کو تباہ کر دیا ہے۔ اس پر بھوک، تنگی اور ذلت مسلط ہے۔ ہم تعداد میں زیادہ اور مالی لحاظ سے مضبوط ہیں۔ ہم کبھی ان شرائط کو قبول نہیں کریں گے۔'' یوں عراقی امراء نے خود حجاج کے عراق پر مسلط رہنے کا راستہ ہموار کر دیا۔ عبدالملک کی طرف سے جنگ کے تمام اختیارات حجاج کو سونپ دیے گئے کہ وہ جس طرح چاہے دشمنوں کا قلع قمع کرے۔ [3]

فیصلہ کن جنگ، ابن اَشعث کی شکست اور حجاج کا انتقام:

مذاکرات ناکام اور صلح کے امکانات ختم ہو جانے کے بعد فریقین زیادہ شدت سے لڑائی پر تل گئے۔ ابن اَشعث کے ساتھ ایک لاکھ پیشہ ور سپاہی اور ایک لاکھ رضا کار تھے۔ دونوں حریف خندقوں کی اوٹ سے حملے کرتے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ۱۴ جمادی الآخرہ ۸۳ھ کو متحارب افواج کھلے میدان میں نکل آئیں۔ ایک نہایت خون ریز تصادم ہوا جس میں انجام کار عراقیوں کی کثرت تعداد اور جوش وخروش پر شامیوں کی تنظیم، ثابت قدمی اور تجربہ کاری غالب

---

[1] تاریخ الطبری: ٦/٣٤٦ تا ٣٤٩؛ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ٢٨٦
اس خروج میں شریک علماء وقراء کے احوال جاننے کے لیے دیکھیے: تاریخ الاسلام للذھبی وفیات: ۸۱ھ تا ۱۰۰ھ

[2] طبقات ابن سعد: ٧/١٦٤، باسناد صحیح برجاله رجال البخاری ومسلم

[3] تاریخ الطبری: ٦/٣٤٦ تا ٣٤٩

آ گئی۔ عراقی بڑی تعداد میں قتل ہوئے اور باقی منتشر ہو گئے۔ عبدالرحمن بن اشعث بچ نکلا۔[1]

حجاج نے کوفہ پہنچ کر لوگوں سے بزورِ شمشیر بیعت لی، جس نے چوں چراں کی اسے قتل کر ڈالا۔ ادھر ابن اشعث نے بصرہ پہنچ کر دوبارہ فوج مرتب کی۔ شکست خوردہ اور منتشر سپاہی ایک بار پھر اس کے گرد جمع ہو گئے۔

شعبان ۸۳ھ میں بصرہ کے شمال مشرق میں اہواز کے قریب دُجیل (مسکن) نامی مقام پر ایک بار پھر دونوں حریف آمنے سامنے ہوئے۔ پندرہ روز کی زور آزمائی کے بعد آخر ابن اشعث کو شکستِ فاش ہوئی۔ وہ فرار ہو کر خراسان چلا گیا اور رتبیل کے پاس پناہ لی۔ حجاج بن یوسف اس کے درپے رہا۔ اس نے رتبیل کو جنگ کی دھمکی دے کر ابن اشعث کو پناہ دینے کے انجام سے ڈرایا۔ نیز سات برس کا خراج معاف کرنے اور جنگ بندی کا وعدہ کیا۔ آخر رتبیل نے عبدالرحمن بن اشعث کا سر قلم کر کے حجاج کے پاس بھیج دیا۔ یہ ۸۵ھ کا واقعہ ہے۔ اس طرح اس عظیم جرنیل کی زندگی ایک حسرتناک انجام پر ختم ہوگئی۔[2] ابن اشعث کو ٹھکانے لگانے کے ساتھ حجاج بن یوسف نے عراق میں حکومت کے باغیوں کو چن چن کر ختم کیا۔ جنگ کے بعد اس نے جن گرفتار شدگان کو قتل کرایا ان کی تعداد چار سے پانچ ہزار تک بتائی جاتی ہے۔[3] صحیح العقیدہ شیعانِ علی بڑی تعداد میں خروج میں شامل تھے؛ کیوں کہ خود سپہ سالار عبدالرحمن بن اشعث، حضرت قیس بن اشعث رضی اللہ عنہ کا پوتا تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نامور جرنیل تھے۔ ان کے ساتھ غالی شیعہ بھی شریکِ جنگ تھے۔ مشہور شیعہ راوی محمد بن سائب کلبی بھی اہلِ کوفہ کے ہمراہ ابن اشعث کے ساتھ تھا۔[4]

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد بھی اس خروج میں شامل تھے اور اسی کی پاداش میں انہیں قتل کیا گیا۔[5]

کمیل بن زیاد کا قتل:

قیدیوں میں کوفہ کا ایک بہت بوڑھا عابد و زاہد شخص کُمیل بن زیاد نخعی بھی تھا[6] جسے چارپائی پر ڈال کر حجاج کے پاس

① تاریخ الطبری: ۳۶۱/۶ تا ۳۶۳

② تاریخ الطبری: ۳۸۹/۶ تا ۳۹۳

③ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۲۸۷

④ طبقات ابن سعد: ۳۵۸/۶، ۳۵۹

⑤ العبر فی خبر من غبر، سنة: ۸۳ھ

⑥ کمیل بن زیاد کی شخصیت قابلِ غور ہے۔ محدثین اور ائمہ جرح و تعدیل اسے ثقہ مانتے ہیں۔ امام بخاری نے کمیل بن زیاد کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت لینے والوں میں شمار کیا ہے۔ (التاریخ الکبیر: ۲۴۳/۷) اصحابِ جرح و تعدیل نے اسے ثقہ کہا ہے۔ (الثقات للعجلی: ۲۲۸/۲؛ الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم: ۱۷۴/۷، ۱۷۵؛ الثقات لابن حبان: ۳۴۱/۵) مسند احمد، مسند اسحاق بن راہویہ، مسند ابی داؤد طیالسی، مصنف ابن ابی شیبہ میں اس کی روایات ملتی ہیں جو زیادہ تر حضرت علی اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے منقول ہیں۔ دوسری طرف تاریخی روایات بتاتی ہیں کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش میں شامل ہوا تھا۔ اس سے قبل ان پر قاتلانہ حملہ کرنے کی بھی کوشش کر چکا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ (الفتنة ووقعة الجمل لسیف بن عمر، ص ۸۳؛ تاریخ الطبری: ۴۰۳/۴، ۴۰۴) بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نعش کو طمانچہ مارا تھا۔ ایسے شخص کو بھلا کیسے ثقہ مانا جا سکتا ہے؟

غور کرنے پر یہ سمجھ آتا ہے کہ چونکہ کمیل بن زیاد کی طرف منسوب مذکورہ جرائم کا ذکر فقط ایک ضعیف راوی سیف بن عمر کی تاریخی روایات میں ہے؛ اس لیے محدثین نے اس مواد کو جرح کے طور پر قابلِ اعتناء نہیں سمجھا۔ نعش کو طمانچہ مارنے کی روایت تو بالکل جھوٹ ہے، یہ ناپاک حرکت عمیر ضابی نے کی تھی جس کا ذکر گزر چکا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کمیل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مخالف ان بغاة میں شامل تھا جنہیں عثمانی تحریک کے لوگ مجازاً "قتلۂ عثمان" کہتے تھے اور غالباً وہ تائب بھی ہو گیا تھا۔ اگر وہ قاتل ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مصاحب نہ ہوتا، نیز حضرت علی اور پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما اس سے درگزر نہ کرتے۔

لایا گیا۔ وہ ابن اشعث کی بغاوت میں اپنے قبیلے سمیت سرگرم رہا تھا۔ حجاج اسے دیکھ کر بولا:

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں گھسنے والوں میں سے اس کے سوا کوئی باقی نہیں۔''[1]

پھر اسے مخاطب کر کے کہا: ''اے نخعی! تو اجتماعی معاملے میں اپاہج ہے اور فتنے میں کودنے کے لیے صحیح و سالم!! حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے تجھ سے درگزر کیا اور عطیات میں شریک کیا، یزید اور خلیفہ عبدالملک نے بھی تجھے معاف کیا۔ پھر بنو تمیم کا ایک اعرابی (ابن اشعث) آیا تو تو اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔[2] میں تو بس چاہتا تھا کہ تجھے قتل کرنے کا مجھے کوئی بہانہ مل جائے۔'' یہ کہہ کر اس کا سر قلم کرا دیا۔[3]

قراء و علماء جو مقتول یا شریک جنگ ہوئے:

ابن اشعث کے ساتھ خروج میں شریک بہت سے علماء دوران جنگ قتل ہوئے، بعض لاپتا ہو گئے، کچھ کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا اور کچھ کو جان کی امان مل گئی۔ ان علماء و قراء حضرات میں مسلم بن یسار مزنی رحمہ اللہ بھی تھے جو نامور فقیہ اور عابد و زاہد تھے۔ جن کا نماز میں خشوع و خضوع اور انہماک ضرب المثل تھا۔ دوران جنگ وہ ایک طرف کھڑے رہے، تلوار چلائی نہ تیر پھینکا۔ معرکے کے دوران قتل ہونے والوں میں عقبہ بن عبدالغافر، عقبہ بن وساج اور میمون بن ابی شبیب رحمہم اللہ بھی تھے جو عراق کے قراء و محدثین میں شمار ہوتے تھے۔[4]

ان میں عبداللہ بن غالب جہنی رحمہ اللہ بھی تھے جن کی قبر سے مدتوں مشک کی مہک آتی رہی۔[5] ابو مرانہ عجلی، عبد الرحمٰن بن زید الکوفی، ابوالجوزاء الربعی، ابوالبختری الطائی رحمہم اللہ بھی قتل ہوئے جن سے محدثین نے روایات لی ہیں۔[6]

عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ اور عبداللہ بن شداد رحمہ اللہ دونوں کبار تابعین اور بلند پایہ محدثین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ دُجیل کی جنگ میں شکست کے بعد دونوں نے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیے اور پھر ان کا کوئی اتا پتا نہ چل سکا۔ بظاہر دونوں ڈوب گئے تھے۔[7]

گرفتاری کے بعد قتل کیے جانے والوں میں عمران بن عصام الضبعی رحمہ اللہ بھی تھے جو بصرہ کے عابد و زاہد آدمی تھے۔ انہیں حجاج کے سامنے لایا گیا تو حجاج نے کہا: ''گواہی دو کہ تم نے کفر کا ارتکاب کیا۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔''

وہ بولے: ''واللہ جب سے اللہ کو مانا ہے، کبھی کفر نہیں کیا۔'' حجاج نے ان کی گردن کٹوا دی۔[8]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''گرفتار شدگان میں سے جو کفر کا اقرار کرتا، حجاج اسے چھوڑ دیتا۔ ورنہ قتل کرا دیتا۔''[9]

---

① المعرفة والتاریخ: ۴۸۱/۲ ② المحن، ص ۲۲۹ ③ تاریخ الطبری: ۳۶۵/۶

④ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۲۸۶؛ التاریخ الاوسط للبخاری: ۱۸۰/۱؛ تاریخ الاسلام للذهبی، وفیات: ۸۱ھ تا ۱۰۰ھ

⑤ الثقات لابن حبان: ۲۰/۵

⑥ الاكمال فی ذكر من له روایة فی مسند الامام احمد سوی من ذكر فی تهذیب الكمال، ص ۲۶۲؛ التاریخ الاوسط: ۱۸۰/۱؛ تاریخ الاسلام للذهبی، وفیات: ۸۱ھ تا ۱۰۰ھ

⑦ الاصابة: ۱۲/۵، ترجمة: عبد الله بن شداد ⑧ البدایة و النهایة: ۳۴۸/۱۲ ⑨ سیر اعلام النبلاء: ۳۰۷/۴

تاہم بعض علماء و محدثین میدانِ جنگ سے بچ نکلے اور بعد میں حکومت کی انتقامی کارروائیوں سے بھی محفوظ رہے۔ ان میں سیار بن سلامہ ابوالمنہال، مالک بن دینار، نضر بن انس بن مالک، ابوعبیدہ بن عبداللہ بن مسعود، مرہ بن دباب، طلحہ بن مصرف، زبیدہ بن الحارث الایامی، عطاء بن سائب، ابونجید جہضمی، ابوالشیخ ہنائی اور سعید بن ابی الحسن رحمہم اللہ قابلِ ذکر ہیں۔ اہلِ بصرہ کے اصرار پر حضرت حسن بصری رحمہ اللہ بھی اس جنگ میں بادل نخواستہ شریک ہوئے تھے،[1] اس لیے وہ حجاج کے عتاب سے بچنے کے لیے اس کی موت تک روپوش رہے۔[2]

امام شعبی رحمہ اللہ سے سلوک:

اہل کوفہ میں امام شعبی محدث ہونے کے علاوہ سب سے بڑے قاری شمار ہوتے تھے۔ انہیں زعیم القراء (بڑے قاری صاحب) کہا جاتا تھا۔ معرکہ جماجم میں شکست کے بعد وہ روپوش ہوگئے۔ آخر ایک مدت بعد حجاج کے سامنے آئے۔ حجاج نے ان سے پوچھا: ''اللہ کے دشمن کا ساتھ کیوں دیا؟''

شعبی رحمہ اللہ نے نہایت ہی فصیح و بلیغ عربی میں کہا: ''ہمارا سینہ بنجر تھا اور مسکن ناسازگار۔ خوف ہمارا اوڑھنا اور بچھونا تھا اور فتنہ اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ ہم معصوم پرہیزگار ہیں نہ کہ زورآور بدمعاش۔''

حجاج یہ بلیغ فقرے سن کر جھوم اٹھا، بولا: ''اوہ! تمہارے باپ کی خیر، اچھا جاسکتے ہو۔''[3]

یہ نمونہ تھا تابعین کی ذہانت کا۔ غلط بیانی کیے بغیر خود کو حکومت کے عتاب سے بچالیا۔

دیرِ جماجم کے حریت پسند مخلص تھے:

اس میں شک نہیں کہ دیرِ جماجم کے اکثر حریت پسند مخلص تھے، اللہ کے دین کو خالص خلافتِ راشدہ کے انداز میں نافذ کر کے نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا چاہتے تھے۔ ان شاء اللہ ان کے مقتولین کے ساتھ اللہ کے ہاں رحمت و مغفرت کا معاملہ ہوا ہوگا۔ تاریخ میں مرقوم ہے کہ ان میں سے بعض کی قبریں خوشبو سے مہکتی رہیں۔ ان کا یہ عمل بہادری و حمیت کے لحاظ سے قابلِ فخر ہے اسی لیے علمائے اسلام ان کے ناموں کے ساتھ ''رحمہ اللہ'' لگاتے ہیں۔ ان لوگوں کو مجرم قرار دینا درست نہیں بلکہ اسلاف کا کہنا ہے: ''اہل جماجم اور اہل حرہ سے بہتر خروج کرنے والی جماعت کوئی نہیں۔''[4]

مگر دوسری طرف یہ بھی حقیقت تھی کہ اس خروج کا نتیجہ امت کے اجتماعی نقصان کی شکل میں نکلا، اس میں جلیل القدر علماء و مشائخ کے قتل سے امت کا بہت بڑا علمی و روحانی سرمایہ ضائع ہوا۔ اس نقصان کا اندازہ خروج میں شامل بعض حضرات کو پہلے سے تھا۔ حسن بصری رحمہ اللہ اسی لیے شرکت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر عبدالرحمٰن ابن اشعث سے کچھ مشیروں نے کہہ دیا: ''اگر آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کے گرد پروانہ وار لڑیں تو حسن کو ضرور بلوایئے۔''

---

① تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۸۶ تا ۲۸۸؛ البدایۃ و النھایۃ: ۳۴۶/۱۲ تا ۳۴۸؛ تاریخ الاسلام للذھبی، وفیات: ۸۱ھ تا ۱۰۰ھ

② البدایۃ والنھایۃ: ۵۵۲/۱۲ ③ الطبقات الکبریٰ لابن سعد: ۲۴۹/۶؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۸۸

④ العلل ومعرفۃ الرجال للامام احمد بروایۃ ابنہ عبد اللہ: ۱۶۸/۲

آخر حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کو با دلِ نخواستہ آنا پڑا۔ ①

بعض بزرگوں کو جنگ کے دوران معاملے کے مشکوک ہونے کا احساس ہو گیا تھا؛ اس لیے وہ عملی طور پر حصہ لینے سے گریز کرتے رہے۔ ان میں ایک مسلم بن یسار نخعی رحمہ اللہ تھے جو دورانِ جنگ چپ چاپ کھڑے تھے، نہ تیر چلاتے تھے نہ تلوار۔ جنگ کے بعد کہنے لگے: ''اللہ کا شکر ہے میں نے تیر چلایا نہ نیزہ نہ تلوار۔''

ان کے شاگرد ابوقلابہ نے کہا: ''آپ خود تو نہیں لڑے مگر اتنے لوگ آپ کو دیکھ کر یہ خیال کیے ہوئے تھے کہ مسلم بن یسار ہمارے ساتھ ہیں جو حق کے سوا کسی بات کے لیے نہیں لڑتے۔ آپ کی سرپرستی کی وجہ سے لڑتے لڑتے انہوں نے جان دے دی۔ ان لوگوں کی ذمہ داری کس پر ہے؟''

یہ سن کر مسلم بن یسار رحمہ اللہ اس قدر روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ ②

لڑائی میں شریک ایک بزرگ زبید بن الحارث رحمہ اللہ نے ایک بار کسی کو ہنستے دیکھا تو فرمایا: ''اگر تم معرکہ جماجم میں شریک ہوتے تو اس طرح نہ ہنستے۔ کاش! میرا ہاتھ کلائی سے کٹ چکا ہوتا اور میں اس لڑائی میں شامل نہ ہوا ہوتا۔'' ③

اس دور کے ایک بزرگ کہتے ہیں: ''ابن اشعث کے ساتھ قتل ہونے والا کوئی فرد ایسا نہیں تھا جس کے مرنے کی کسی کو خوشی ہوئی ہو۔ بچنے والا کوئی ایسا نہ تھا جو اللہ کا شکر ادا نہ کرتا ہو کہ وہ بچ گیا۔'' ④

تلخ تجربات کے بعد فقہاء کا سیاسیاتِ شرعیہ پر از سرِ نو غور و فکر:

اس قسم کے چند تلخ ترین تجربات کے بعد ہم پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی ہجری کے ابتدائی چند عشروں میں امت کے علماء و فقہاء اور اصحابِ فتویٰ کو پوری سنجیدگی سے مسلمانوں کے سیاسی مسائل کا حل قرآن و سنت سے کشید کرتا دیکھتے ہیں۔ اس سے پہلے چوں کہ عام طور پر ان مسائل کو اتنی عمیق نگاہوں سے دیکھا نہیں گیا تھا؛ اس لیے کئی نامور اہلِ علم اصحابِ فتویٰ بھی قرآن و سنت کی بعض ظاہری نصوص ہی سے ہدایت لینے پر اکتفا کر لیتے تھے۔

مثلاً مشہور حدیث ہے: ''مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ''

''تم میں سے جو کسی برائی کو دیکھے تو اسے بزورِ قوت روک دے۔'' ⑤

اسے دیکھ کر اس دور میں بہت سے اہلِ علم ظالم حکومت کے خلاف خروج کے جواز کے قائل تھے، بہت سے بزرگ دیگر احادیث کی بناء پر اس سے منع کرتے تھے۔ غرض خروج کی شرائط کے بارے میں فقہاء کی کوئی ایک متفقہ رائے نہیں تھی مگر جب سانحۂ حرہ اور معرکہ دیرِ جماجم جیسے واقعات میں امت کو بار بار انفرادی، عسکری، اقتصادی و سیاسی لحاظ سے ناقابلِ برداشت نقصانات اٹھانا پڑے تو سنجیدہ اور عمیق غور و فکر کے بعد دوسری صدی ہجری کے دوران اہل سنت و

---

① تاریخ دمشق: ۱۴۷/۵۸ ؛ التاریخ الکبیر للبخاری: ۳۰۲/۲

② تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۵۷

③ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۸۷

④ سنن ابی داؤد، ح: ۴۳۴۰، کتاب الملاحم، باب الامر والنھی، قال الالبانی: صحیح۔

⑤ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۸۶

الجماعت کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ حکام کے ظلم وستم پر صبر وتحمل کرنا اور خروج نہ کرنا واجب ہے۔
اس کا یہ مطلب نہیں کہ حالات کو بدلتا دیکھ کر فقہاء نے اپنے طور پر دین میں تبدیلی کر لی تھی اور یہ نئے احکام ایجاد کر لیے۔ ہرگز نہیں بلکہ یہ ہدایات قرآن وسنت کی نصوص میں پہلے سے موجود تھیں۔ جب علماء وفقہاء نے بار بار کے سیاسی بحرانوں کو دیکھا تو سوچا، ان ہدایات کو تلاش کیا جائے جن پر عمل پیرا ہو کر اس قسم کے نقصانات سے بچا جا سکے اور اگر نصوص اس بارے میں بظاہر متعارض دکھائی دیتی ہیں تو تعارض دور کر کے اصل بات کو سمجھا جائے۔
اس تحقیق کے نتیجے میں ان پر قرآن وسنت میں موجود یہ ہدایات بالکل واضح ہو گئیں کہ اگر حاکم چاہے ذاتی طور پر فاسق وفاجر ہو اور رعایا کی حق تلفی بھی کرتا ہو تب بھی ان کے خلاف مسلح جدوجہد نہ کی جائے، بلکہ زبانی اظہارِ حق اور تبلیغ و ترغیب کے ذریعے معاشرے میں ہر سطح پر ذہنی تبدیلی لانے کی کوشش کی جائے جیسا کہ اس بارے میں صحیح حدیث موجود ہے۔ عوف بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا:
''تمہارے بہترین حکام وہ ہیں کہ تمہیں ان سے محبت ہو اور انہیں تم سے۔ تم ان کے لیے دعائیں کرو وہ تمہارے لیے۔ تمہارے بدترین حکام وہ ہیں کہ تم ان سے نفرت کرو وہ تم سے۔ تم ان پر لعنت کرو وہ تم پر۔''
صحابہ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! اس صورت میں ہم ان سے بغاوت نہ کریں؟''
فرمایا: ''نہیں، جب تک وہ نماز کو باقی رکھیں۔'' (تین بار فرمایا) پھر فرمایا: ''خبردار! جو اپنے حاکم کو اللہ کی نافرمانی کرتا دیکھے تو اس گناہ سے نفرت کرے مگر حاکم کی اطاعت سے دست بردار نہ ہو۔''[1]
صحیح مسلم ہی کی دوسری روایت میں ہے کہ صحابہ نے عرض کیا: ''کیا ہم تلوار کے زور سے ایسے حکام کو نہ ہٹا دیں؟''
فرمایا: ''نہیں، جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں ایسا نہ کرنا۔ البتہ جب تم حکام کو ناگوار کام کرتا دیکھو تو ان کے عمل سے نفرت کرو مگر طاعت سے دست کشی مت کرو۔''[2]
ایک حدیث میں ہے: ''تمہارے اوپر ایسے حکام مسلط ہوں گے کہ تم انہیں پہچان کر ان پر تنقید کرو گے۔ جس نے (ان کو) برا سمجھا وہ محفوظ رہا۔ جس نے تنقید کی وہ بھی سلامت رہا۔ ہاں مگر جو (ان کے برے عمل پر) راضی رہا اور ان کی پیروی کر لی (وہ ہلاک ہو گیا)۔''[3]
ان ہدایات سے واضح ہو جاتا ہے کہ ظالم وفاسق حکام کے خلاف مسلح خروج نہ کیا جائے۔ ہاں ان کی اطاعت صرف جائز چیزوں میں کی جائے، ناجائز حکم نہ مانا جائے۔ ایسے حالات میں حدیث میں یہاں تک تاکید کی گئی ہے کہ:
''كُنْ عَبْدَ اللّٰهِ الْمَقْتُولَ وَلَا تَكُنْ عَبْدَاللّٰهِ الْقَاتِلَ.''

---

① صحیح مسلم، ح: ۴۹۱۰، کتاب الامارۃ، باب خیار الائمۃ و شرارھم
② صحیح مسلم، ح: ۴۹۱۱
③ صحیح مسلم، ح: ۴۹۰۷، کتاب الامارۃ، باب وجوب الانکار علی الامراء فیما یخالف الشرع

”مقتول بندہ بن جانا، مگر قاتل بندہ مت بننا۔“ [1]

ایک حدیث میں ہے: ”مسلمان آدمی پر سننا اور ماننا لازم ہے چاہے وہ بات اسے پسند ہو یا نہ ہو سوائے گناہ کی بات کے۔ اگر گناہ کی بات کا حکم دیا جائے تو پھر نہ تو سننے کی گنجائش ہے نہ ماننے کی۔“ [2]

خروج کن شرائط کے تحت جائز ہوگا:

ان تمام روایات کو سامنے رکھ کر فقہاء نے یہ طے کیا کہ اگر حکومت کا ظلم اور اس کی بے دینی اس حد تک بڑھ جائے کہ وہ نماز پر پابندی لگا دیں، اسی طرح دیگر فرائض و واجبات کی ادائیگی میں رکاوٹ بنیں اور شعائر دینیہ کو مٹانے کے درپے ہوں، تو پھر ان کے خلاف خروج واجب ہو جاتا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس کوشش میں کامیابی اور نظام کو سنبھالنے کے امکانات روشن ہوں اور خروج کے نتیجے میں پہلے سے زیادہ فساد پھیلنے کا خطرہ نہ ہو۔

صرف معتزلہ اور خوارج کا مذہب یہ رہا ہے کہ وہ ہر صورت میں فاسق حاکم کے خلاف خروج کو ضروری کہتے ہیں۔ [3]

◆◆◆

---

① مسند احمد، ح: ٢١٠٦٤، ٢١٠٦٥ ؛ مسند ابن ابی شیبة، ح: ٤٠٢

② السنن الکبریٰ للبیهقی، ح: ٥٣٣٤

③ الفقه الاسلامی وادلته: ٨/٣١٧، ٣١٨

بیٹوں کے لیے ولی عہدی کی بیعت

خراسان میں رُتبیل کے ہاتھوں ابن اشعث کا قتل ۸۵ھ میں ہوا تھا۔[1] اس کے بعد عبدالملک کو پورے اطمینان سے حکومت کے اندرونی نظم ونسق کو بہتر بنانے کا موقع مل گیا۔ خلافت کے پائے بنومروان میں مستحکم کرنے کے لیے وہ چاہتا تھا کہ اپنے بیٹوں کو ولی عہد بنادے مگر مروان نے عبدالملک کے بعد اس کے بھائی عبدالعزیز کو ولی عہدِ ثانی بنایا تھا؛ اس لیے عبدالملک کی اس خواہش کا پورا ہونا مشکل تھا۔ تاہم تقدیر نے اس کا ساتھ دیا اور ۸۵ھ میں عبدالعزیز کی وفات ہوگئی۔[2]

عبدالملک چاہتا تھا کہ اُس کے بیٹے دین دار بھی رہیں اور صاحب اقتدار بھی۔ اس نے اپنے بیٹوں: ولید اور سلیمان کی ولی عہدی پر غور کرنے کے بعد ایک دن انہیں بلا کر پوچھا: ''کیا تم نے کبھی فعلِ حرام کا ارتکاب کیا ہے؟''

دونوں بولے: ''اللہ کی قسم! کبھی نہیں۔''

عبدالملک نے کہا: ''رب کعبہ کی قسم! تم اس امر خلافت کو ضرور پالو گے۔''[3]

تب عبدالملک نے پورے اعتماد کے ساتھ اپنے بیٹے ولید اور اس کے بعد سلیمان کے لیے ولی عہدی کی بیعت لے لی۔[4] اس طرح موروثیت اسلامی خلافت کا ایسا جزو لازم بن گئی جسے بار بار سخت نقصانات اٹھانے کے باوجود نظام سیاست سے آخر تک جدا نہ کیا جا سکا۔

سعید بن مسیب رحمہ اللہ پر تشدد کی روایت:

شاہ معین الدین ندوی نے اپنی ''تاریخ اسلام'' میں لکھا ہے کہ مدینہ میں سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے ولی عہدی کی بیعت سے انکار کیا تو ہشام بن عبدالملک حاکم مدینہ نے ان پر بڑی سختیاں کیں، کوڑوں سے پٹوایا اور تشہیر کرا کے قید کر دیا۔[5] اس بارے میں یہ ملحوظ رہے کہ یہ حاکم مدینہ ہشام بن عبدالملک نہیں، ہشام بن اسماعیل تھا۔ شاہ معین الدین ندوی مرحوم سے فروگزاشت ہوئی ہے۔ طبری اور تمام تواریخ میں ہشام بن اسماعیل ہی لکھا ہے۔ ہشام بن عبدالملک جو بعد میں خلیفہ بنا، بڑا منصف مزاج اور بردبار انسان تھا۔

---

① تاریخ الطبری: ۳۹۲/۶

② تاریخ الطبری: ۴۱۴/۶

③ تاریخ الطبری: ۴۱۲/۶، ۴۱۳

④ تاریخ الطبری: ۴۱۶/۶، ۴۱۷

⑤ تاریخ اسلام، شاہ معین الدین ندوی: ۴۲۲/۱

دوسری بات یہ کہ یہ واقعہ اس حد تک ثابت ہے کہ کوڑے لگائے گئے تھے۔ تشہیر کرانے اور قید میں ڈالنے کی بات کسی صحیح روایت میں نہیں۔ چونکہ اس واقعے کو واقدی جیسے ضعیف راویوں نے زیادہ تفصیل سے نقل کیا ہے؛ اس لیے غالباً یہ اضافی باتیں جو مبالغے پر مبنی ہیں، ضعیف راویوں کی طرف سے شامل کی گئی ہیں۔ واللہ اعلم

تیسری بات یہ ہے کہ عبدالملک نے اس سزا کو ناپسند کر کے گورنر کو ملامت آمیز خط لکھا تھا اور کہا تھا:

''سعید بن مسیب صلہ رحمی کے حق دار ہیں نہ کہ مار پیٹ کے۔ ان سے مخالفت کا کوئی اندیشہ نہیں۔''[1]

عبدالملک کی وفات:

شوال ۸۶ھ میں عبدالملک مرض الموت میں مبتلا ہوا۔ کسی نے پوچھا: ''کیا محسوس کر رہے ہیں؟''

جواب دیا: ''بالکل ویسا جیسا کہ اللہ نے فرمایا:

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ

(اور تم ہمارے پاس تنہا تنہا آ گئے جس طرح ہم نے تم کو اوّل بار پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا، اس کو اپنے پیچھے ہی چھوڑ آئے۔)[2]

نزع کا عالم طاری ہوا تو بیٹا ولید رو پڑا۔ عبدالملک نے کہا: ''یہ لڑکیوں کی طرح رونا کیسا؟''

پھر کہا: ''ولید! جو ذمہ داری تمہیں سونپ کر جا رہا ہوں اس کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا۔ بھائیوں کے ساتھ اختلاف سے بچنا، ایک ماں کے بچوں کی طرح رہنا، بہنوں سے اچھا سلوک کرنا، جنگ کے موقع پر بہادری دکھانا کہ جنگ کسی کی موت کو وقت سے پہلے نہیں لا سکتی۔ بھلائی کے موقع پر ہدایت کے مینار بن جانا کہ بھلائی آدمی کا نام زندہ رکھتی ہے، دلوں کو محبت سے بھر دیتی ہے اور زبانوں پر مدح جاری کر دیتی ہے۔ حجاج بن یوسف کی عزت کرنا کہ اس نے تمہارے لیے شہروں کو فتح اور دشمنوں کو مغلوب کیا ہے۔''

پھر حکم دیا کہ مجھے ذرا بٹھا دو۔ بٹھایا گیا تو حکم دیا: ''تمام دروازے کھول دیے جائیں۔''

تازہ ہوا اندر آئی تو ایک گہرا سانس لیا اور کہا: ''دنیا! تو کتنی مزے دار ہے مگر تیری طویل مدت بھی مختصر ہے، تیرا زیادہ سامان بھی کم ہے، ہم سب تیرے دھوکے کا شکار رہے۔''

ہوا کے دوش پر کسی دھوبی کے کپڑے دھونے کی آواز آئی۔ پوچھا: ''یہ کون ہے؟''

لوگوں نے کہا: ''دھوبی ہے۔'' عبدالملک بولا: ''کاش! میں بھی ایک دھوبی ہوتا، روزانہ ایک دن کی مزدوری پر گزارہ کرتا، امرِ خلافت میرے ذمے نہ پڑا ہوتا، اللہ کی اطاعت میں لگا رہتا۔''[3]

۱۵ شوال ۸۶ھ کو ۶۰ سال کی عمر میں اس کی وفات ہوگئی۔ دمشق میں تدفین ہوئی۔[4]

① تاریخ الطبری: ۴۱۷/۶
② سورۃ الانعام، آیت: ۹۴
③ البدایۃ والنہایۃ: ۳۹۲/۱۲ تا ۳۹۵
④ تاریخ الطبری: ۴۱۸/۶، ۴۱۹

صحیح قول کے مطابق اس کی خلافت کی مدت ۱۳ سال ۵ ماہ بنتی ہے۔ محققین کے نزدیک اس سے پہلے نو سال کا عرصہ (۶۴ھ تا ۷۳ھ) اس نے ایک آزاد باغی حکمران کی حیثیت سے گزارا تھا۔ اس مدت کو خلافت میں شمار کرنا اسلامی سیاست کے اصول کے خلاف ہے۔

اولاد:

اولاد میں سولہ لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ لڑکوں میں ولید، سلیمان، یزید، ہشام، مَسلَمہ، منذر اور عنبسہ مشہور ہوئے۔ ①
لڑکیوں میں فاطمہ اس کی بڑی چہیتی تھی۔ عبدالملک نے اسے یمن کے قدیم بادشاہ ماریہ کی دو بالیوں کے علاوہ ایک نادر و نایاب موتی دیا تھا جس کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں تھی۔ ②

یہی لڑکی بعد میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے نکاح میں آئی اور اپنی پرہیزگاری، سخاوت، عبادت اور مجاہدے کی وجہ سے اسلامی تاریخ میں ناقابل فراموش مقام حاصل کیا۔ ③

◆◆◆

① البدایة والنهایة: ۳۹۶/۱۲
② البدایة والنهایة: ۳۹۳/۱۲
③ البدایة والنهایة: ۳۹۳/۱۲

عبدالملک کی زندگی پر ایک تبصرہ

عبدالملک کی زندگی ہمیں تین حصوں میں بٹی دکھائی دیتی ہے: پہلا دور نوجوانی سے ۳۸ سال کی عمر تک کا ہے جس میں وہ ایک عالم، عابد اور مجاہد دکھائی دیتا ہے۔ اکثر تلاوت، ذکر، نوافل اور احادیث سننے سنانے میں مشغول رہتا تھا۔ وہ افریقہ کے بعض معرکوں میں دادِ شجاعت بھی دے چکا تھا اور جہاد کے کئی تمغے اس کے سینے پر سجے تھے۔ اس کا زیادہ تر وقت یکسوئی میں گزرتا تھا۔ اس کے باوجود اس کی قائدانہ صلاحیتوں کو ذہین لوگ تاڑ لیتے تھے۔

یزید بن معاویہ اور وہ ایک ہی سال یعنی ۲۶ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ دونوں میں زیادہ راہ و رسم نہیں تھی مگر یزید اس کی خوبیوں کا معترف تھا۔ ایک بار یزید اپنے سالار مُہلّب بن ابی صفرہ سے بات چیت کر رہا تھا کہ دربان نے کہا: ''عبد الملک بن مروان باریابی کی اجازت چاہتے ہیں۔'' یزید نے کہا: ''ہم نے اس کی اور اس کے باپ کی درخواست پوری کر دی ہے، پھر کیا کام ہے؟'' دربان بولا: ''وہ کہہ رہے ہیں کہ صرف کھڑے کھڑے کوئی بات کریں گے، بیٹھیں گے نہیں۔'' یزید نے کہا: ''اچھا آنے دو۔''

چند لمحوں بعد قاریوں کے انداز میں عمامہ باندھے اور شملہ آگے سے پیچھے کی طرف لٹکائے ایک خوبصورت نوجوان اندر آیا۔ اس نے یزید سے مختصر سی بات کی۔ یزید نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ نوجوان واپس مڑا تو یزید دیر تک اسے جاتا دیکھتا رہا۔ پھر مُہلّب سے کہا: ''اہلِ کتاب کہتے ہیں کہ یہ نوجوان عن قریب حکومت سنبھالے گا۔''

مُہلّب نے کہا: ''اللہ بہتر جانتا ہے۔ لیکن ایسا ہوا تو (خیر ہے؛ کیوں کہ) یہ پاک باز مسلمان اور اپنے خاندان کا اعتدال پسند انسان ہے۔''[1]

عبدالملک کی زندگی کا دوسرا دور ۶۴ھ سے ۷۳ھ تک ہے جس میں وہ شام کا غیر قانونی حاکم تھا اور کسی بھی قیمت پر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شرعی خلافت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ ۷۰ھ میں جب رومیوں نے مسلمانوں کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عالم اسلام کی سرحدوں پر تاخت و تاراج شروع کی تو عبدالملک نے ہر ہفتے ایک ہزار دینار ادا کرنے کی پیش کش کر کے ان سے صلح کر لی تاکہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے ڈٹ کر مقابلہ کیا جا سکے۔ یہ طرزِ عمل دورِ صحابہ کی سیاست کے برعکس تھا؛ کیوں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایسے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صلح کر کے ان کے شانہ بشانہ عالم اسلام کے دفاع کے لیے لڑنے کے عزم کا اظہار کیا تھا جس سے مرعوب ہو کر قیصر پسپا ہو گیا تھا۔

① تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۲۶۲

عبدالملک کی رومیوں سے صلح کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ اسلام کی تاریخ میں پہلی کمزوری تھی جو پیدا ہوئی۔ جس کا سبب صرف باہمی اختلاف تھا۔''[1] اسی اقتدار کے لیے عبدالملک نے حجاج کی تیغ ستم کو بے نیام کیا اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی جائز اور عادل خلافت کا خاتمہ کر دیا۔

تیسرا دور عبدالملک کی خلافت قائم ہونے کے بعد کا ہے۔ ان ۱۳ سالوں میں ہم اسے ایک ذمہ دار اور معتدل مزاج حکمران کے روپ میں دیکھتے ہیں جو سخت ضرورت پر سزا بھی دیتا ہے اور عام طور پر درگزر کا معاملہ کرتا ہے۔ جو فاتح اور خوش بخت ہے۔ جس کو ہر دشمن پر فتح نصیب ہوتی ہے۔ رعایا اس کے گن گاتی ہے اور اہل علم و فضل اس کے گرد جمع ہوتے ہیں۔

حلیہ اور علم و فضل:

عبدالملک میانہ قامت اور خوبصورت تھا۔ جسم بھاری تھا نہ دبلا پتلا۔ آنکھیں بڑی تھیں اور ناک ستواں۔ سر اور ڈاڑھی کے بال جلدی سفید ہو گئے تھے۔[2]

کسی نے پوچھا: ''آپ کے بال اتنی جلدی کیسے سفید ہو گئے؟''

جواب دیا: ''اپنی عقل کا دوسروں سے موازنہ کرتے کرتے۔''

بڑا عالم فاضل آدمی تھا۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ اس دور میں مدینہ منورہ میں چار بڑے فقہاء تھے:

سعید بن مسیب رحمہ اللہ، عروہ بن زبیر رحمہ اللہ، قبیصہ بن ذویب رحمہ اللہ اور چوتھا عبدالملک۔[3]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے: ''لوگوں کے ہاں بیٹے پیدا ہوتے ہیں مگر مروان کے ہاں یہ باپ پیدا ہوا ہے۔''[4]

مشہور محدث و تابعی نافع رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''میں نے مدینہ میں عبدالملک سے بڑھ کر مجاہدہ کرنے والا اور اس سے بڑا فقیہ اور قرآن مجید کا قاری کوئی نہیں دیکھا۔''[5]

بعض روایات میں ہے کہ جب اسے مروان کی موت اور اپنے حکمران بننے کی اطلاع ملی تو اس وقت وہ تلاوت قرآن میں مشغول تھا۔ یہ خبر سنتے ہی کلام پاک کو بند کر کے بولا: ''یہ آخری ملاقات ہے۔''[6]

مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ حکمران بن کر اسے قرآن مجید سے کوئی واسطہ نہیں رہا تھا بلکہ مراد یہ تھی کہ حکومتی فرائض اور ذمہ داریوں میں مشغولیت کے بعد اب دل جمعی سے تلاوت کا وقت نہیں ملے گا؛ اس لیے اس نے یہ الفاظ رنج اور افسوس کے طور پر کہے تھے۔

امام شعبی رحمہ اللہ فرماتے تھے: ''میں جن علماء سے بھی ملا، عبدالملک کے سوا ہر ایک پر خود کو فائق پایا۔ عبدالملک سے جب بھی کسی حدیث یا شعر پر گفتگو ہوتی تھی وہ معلومات میں کچھ اضافہ ہی کر دیا کرتا تھا۔''[7]

---

[1] العبر فی خبر من غبر: ۵۸/۱ [2] البدایة والنهایة: ۳۷۸/۱۲ [3] تاریخ دمشق: ۱۲۰/۳۷
[4] تاریخ دمشق: ۱۲۱/۳۷ [5] طبقات ابن سعد: ۲۳٤/۵
[6] تاریخ بغداد للخطیب البغدادی: ۳۸۹/۱۰ [7] تاریخ دمشق: ۱۲٤/۳۷

خوش مزاجی......ایک لطیفہ:

عقل وفراست میں یکتا تھا۔ طبیعت میں سنجیدگی غالب تھی مگر خوش مزاجی کی حس بالکل مردہ بھی نہیں ہوئی تھی۔ ایک بار اس نے ایک باغی کا سر قلم کرنے کا حکم دیا تو وہ بولا: ''مجھے یہ صلہ نہیں ملنا چاہیے۔''

پوچھا: ''پھر کیا صلہ ملنا چاہیے؟''

بولا: ''میں تو بغاوت میں آپ کے بھلے کے لیے شریک ہوا تھا؛ کیوں کہ میں منحوس مشہور ہوں۔ جس کے ساتھ شامل ہوتا ہوں اسے شکست ہی ہوتی ہے۔ میں آپ کے مخالفین میں باقی رہوں تو یہ آپ کے لیے ایک لاکھ سپاہیوں سے بڑھ کر ہوگا۔'' عبدالملک ہنس پڑا اور اسے آزاد کر دیا۔ [1]

رومیوں سے جہاد:

اگر چہ وقتی مصلحت کے تحت عبدالملک نے رومیوں سے صلح کر لی تھی مگر خلیفہ بننے کے ایک ڈیڑھ سال بعد اس نے رومیوں سے گرما و سرما کے جہاد کا وہ سلسلہ پھر شروع کر دیا جو دورِ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ میں جاری تھا۔

۷۵ھ کے موسم گرما میں اس نے اپنے بھائی محمد بن مروان کو لشکر دے کر رومی سرحد پر جہاد کے لیے بھیجا۔ اس سال جمادی الاولیٰ میں ابان بن ولید بن عقبہ نے رومیوں سے جنگ کی اور انہیں شکست دی۔ [2]

اگلے برس محمد بن مروان نے پھر پیش قدمی کی اور مَلَطیہ تک پہنچ گیا۔ [3]

۷۷ھ میں اس کے ولی عہد ولید بن عبدالملک نے فوج لے کر مالٹا سے مَصِّیصہ تک پیش قدمی کی۔ [4]

۷۸ھ میں مُحرِز بن ابی مُحرِز نے ایشیائے کوچک میں رومیوں کو پسپا کر کے ''اَرْقَلَہ'' فتح کر لیا۔ [5]

۷۹ھ میں ولید بن عبدالملک نے مَلَطیہ کے محاذ پر فوجی مہم کی قیادت کی۔ [6]

دِمشق کے کذاب کی سرکوبی:

عبدالملک عقیدے کا پکا مسلمان تھا۔ بدعقیدگی کو برداشت نہیں کرتا تھا۔ اس دور میں حارث بن سعید نامی ایک کذاب نے جامع مسجد دِمشق میں زہد وعبادت سے ایک بڑے حلقے کو متاثر کر رکھا تھا۔ اس کے جنات سے تعلقات تھے۔ ان کے بل پر کرامات دکھایا کرتا تھا۔ مسجد میں نصب سنگ مرمر پر انگلی مارتا تو وہاں سے تسبیح کی آوازیں آتیں۔ سردی میں گرمی اور گرمی میں سردی کے پھل اس کے پاس موجود ہوتے۔ جو لوگ اس کے پکے مرید بن جاتے ان کے سامنے خفیہ طور پر نبوت کا دعویٰ کیا کرتا تھا۔ کتنے لوگ اس طرح بے دین ہو گئے۔

ایک ہوشیار آدمی قاسم کو یہ چکر پتا چل گیا۔ اس نے قاضی شہر کو بتا دیا۔ بات عبدالملک تک پہنچ گئی۔ حارث کذاب کی تلاش شروع کی گئی تو وہ بھنک ملتے ہی روپوش ہو گیا اور بہت تلاش کے بعد بھی نہ ملا۔

---

① البدایة والنہایة: ۹/۳۸۸　② تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۷۰　③ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۷۵

④ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۷۶　⑤ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۷۷　⑥ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۷۸

ایک دن اس کے دو منحرف مریدوں نے آ کر عبدالملک کو بتایا کہ کذاب بیت المقدس میں ایک مرید خاص کی حویلی میں چھپا ہوا ہے۔ عبدالملک یہ سنتے ہی خود سپاہی لے کر دمشق سے بیت المقدس روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس حویلی کی خفیہ نگرانی شروع کرا دی۔ ایک شب کارروائی کا فیصلہ کیا گیا۔ عبدالملک نے درجنوں سپاہی اس حویلی کے گرد دور دور تک پھیلا دیے اور انہیں ہدایت دی کہ آواز سنتے ہی شمعیں جلا دینا۔

اس کے بعد اپنے جاسوس کو جو کذاب کے مرید کا بھیس بدلے ہوئے تھا حویلی کی طرف بھیجا۔ وہ حویلی کے دروازے پر پہنچا تو پہرے دار نے منع کر دیا اور کہا: ''ابھی اللہ کے نبی آرام فرما رہے ہیں۔''

کذاب کی اندر موجودگی کا یقین ہوتے ہی مخبر نے اشارہ دے دیا۔ عبدالملک کی ہدایت کے مطابق گھیرا ڈالنے والوں نے سینکڑوں شمعیں روشن کر دیں کہ گویا رات میں دن نکل آیا۔ کچھ سپاہی اندر گھس کر حارث کذاب کو تلاش کرنے لگے۔ اس کے مریدوں نے کہا: ''اللہ کے نبی تو حضرت عیسیٰ کی طرح آسمان پر چلے گئے ہیں۔''

سپاہیوں نے تلاش جاری رکھی۔ بہت ڈھونڈنے پر آخر کار ایک سرنگ دریافت ہوئی۔ وہ اسی میں دبکا ہوا مل گیا۔ اسے باندھ کر عبدالملک کے پاس لایا گیا۔ اس نے اسے قید کر کے علماء و فقہاء کے ذریعے توبہ کی تلقین کی مگر وہ نہ مانا۔ آخر عبدالملک نے حکم دیا کہ اسے سولی دے دی جائے۔

جب جلاد نے سولی پر باندھ کر اسے نیزہ مارا تو یوں محسوس ہوا جیسے نیزہ کسی لوہے سے ٹکرا گیا ہے۔ نیزے کی نوک مڑ گئی تھی۔ یہ دیکھ کر عبدالملک نے کہا: ''کم بخت! اللہ کا ذکر کر کے نیزہ مارا تھا؟'' جلاد بولا: ''نہیں۔''

عبدالملک نے کہا: ''اللہ کا ذکر کرتے ہوئے ضرب لگا۔''

جلاد نے ذکر کر کے وار کیا تو نیزہ پار اور کذاب مردار ہو گیا۔ اصل میں پہلے جنات اور شیطانوں نے کذاب کی حفاظت کی تھی اور نیزے کو ناکارہ کر دیا تھا۔ ذکرِ الٰہی سے وہ اثرات دور ہو گئے اور جنات و شیاطین بھاگ گئے۔

اس واقعے سے جہاں عبدالملک کی دینی حمیت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں اس کی علمی صلاحیت اور فقاہت بھی ظاہر ہوتی ہے؛ کیوں کہ یہ بات کوئی سنت کا ماہر ہی جان سکتا ہے کہ جنات کو دور کرنے میں ذکر اللہ کی خاص تاثیر ہے۔

اس دور کے ایک بزرگ علاء بن زیاد کہتے ہیں: ''مجھے عبدالملک کے اس کام پر جتنا رشک آتا ہے اتنا کسی شے پر نہیں؛ کیوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی حدیث سنی ہے کہ میری امت میں تیس جھوٹے نبی پیدا ہوں گے۔ ہر ایک کہے گا کہ میں نبی ہوں۔ جو ایسا کہے اسے قتل کر دو۔ جو ان میں سے کسی کو قتل کرے گا وہ جنت میں جائے گا۔''[1]

عبدالملک دینی شعائر کا احترام کرتا تھا۔ ایک بار سفر میں اس سے ایک معمولی سا سکہ کسی گندے کنویں میں گر گیا۔ اس نے مزدوروں کو تیرہ دینار (تقریباً چھ تولہ سونا) دے کر وہ سکہ نکلوایا۔ کسی نے ایک سکے کی خاطر اتنے دینار خرچ کرنے پر حیرت کا اظہار کیا اور اس کی وجہ پوچھی تو عبدالملک نے کہا: ''اس پر اللہ کا نام لکھا تھا۔''[2]

[1] البداية والنهاية: ۲۸۵/۱۲ تا ۲۹۰

[2] تاريخ دمشق: ۱۴۰،۱۳۹/۳۷

تعمیری وترقیاتی کارنامے

عبدالملک کو مسلسل شورشوں اور آزمائشوں سے سابقہ پڑتا رہا؛ اس لیے اسے تعمیری وترقیاتی کاموں کا زیادہ موقع نہ مل سکا۔ اس کے باوجود اس کے کچھ کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔

اِسلامی سکے کا اِجراء:

عالم اسلام میں اب تک ہر قسم کے سکے رائج تھے۔ اپنی کوئی خاص کرنسی نہیں تھی۔ حجاز، عراق اور شام کے دراہم اور دینار الگ الگ معیار کے تھے۔ ان میں رومی، فارسی اور مصری سکے بھی کثرت سے استعمال ہوتے تھے۔ وزن کے لحاظ سے ان کی قیمت کا اندازہ کرلیا جاتا تھا۔ عبدالملک پہلا حکمران ہے جس نے مسلمانوں کی الگ کرنسی کی ضرورت محسوس کی اور ۷۶ھ میں نیا سکہ متعارف کرایا۔ اس فیصلے کی ایک فوری وجہ یہ بھی تھی کہ عبدالملک کے دور میں اہم خطوط اور فرامین کو "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَد" اور حضور اکرم ﷺ پر درود وسلام کے ساتھ شروع کیا جاتا تھا۔ غیر مسلم بادشاہوں کو یہ ناگوار گزرتا تھا۔ ایک بار قیصرِ روم نے اپنے خط میں لکھ دیا: ''آپ نے اپنی تحریروں پر اپنے رسول کے ذکر کا جو نیا طریقہ شروع کیا ہے اسے بند کریں۔ ورنہ ہم اپنے سکوں پر ایسی تحریر کندہ کرائیں گے جو آپ کو بری لگے گی۔''

عبدالملک سخت فکر مند ہوا۔ اس نے خالد بن یزید بن معاویہ کو بلا کر ماجرا سنایا۔ خالد نے کہا:

''بے فکر رہیں۔ ان کے سکے بند کرادیں اور اپنے سکے ڈھال لیں۔''

عبدالملک نے خوش ہو کر کہا: ''تم نے میری فکر دور کردی اللہ تم کو غم سے دور رکھے۔''

خالد بن یزید اسلامی تاریخ کا پہلا کیمیا دان اور دھاتوں کی ڈھلائی کا ماہر تھا۔ اس نے دِمَشق میں پہلی اسلامی ٹکسال لگا کر اُمت کو اغیار کی کرنسی سے نجات دلائی۔ [1]

دفتری نظام کو عربی زبان میں منتقل کرانا:

خلفائے راشدین کے دور سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات تک مسلمانوں کے علمی طبقے کی زیادہ توجہ قرآن و حدیث کے علوم کو محفوظ کرنے اور پھیلانے پر مرکوز رہی تھی۔ علم فقہ بھی اس کا لازمی جزو تھا۔ اس کے ساتھ شعروادب اور فصاحت و بلاغت کے چرچے بہت تھے۔ حکومتی نظام سے متعلقہ فنون یعنی: ریاضی، معاشیات اور دفتری حساب کتاب جاننے والے لوگ تھے ضرور مگر بہت تھوڑے؛ اس لیے شہروں اور صوبوں کی آمدن وخرچ، افواج کے اخراجات سمیت حساب کتاب کے معاملات میں اکثر فارسی اور رومی لوگوں سے کام لیا جاتا تھا۔ عراق وایران کا سارا دفتری نظام کسریٰ کے دور کی طرح فارسی میں تھا جسے مقامی لوگ ہی انجام دیتے تھے۔ اسی طرح شام، مصر اور افریقہ کا سارا دفتری حساب کتاب قیصر کے دور کی طرح رومی زبان میں تھا جسے ریاضی کے ماہر نصرانی ملازم انجام دیتے تھے۔

---

[1] عیون الاخبار: ۲۹۶/۱، ط العلمیۃ ؛ الاوائل للعسکری، ص ۲۵۴، ط دار البشیر ؛ تاریخ طبری: ۲۵۶/۶

جب تک مسلمانوں پر عرب کا سادہ تمدن حاوی تھا وہ نئے فنون کے جھمیلوں سے کتراتے تھے مگر جب نصف صدی بعد لوگوں پر شہری تہذیب وتمدن غالب آنے لگا تو آہستہ آہستہ ان فنون کو سمجھنے والے مسلمان بھی معاشرے میں اُبھرنے لگے۔ عبدالملک کو عرصے سے فکر تھی کہ کسی طرح سارا دفتری نظام عربی میں منتقل کیا جائے تاکہ مسلمانوں کے لیے اسے پڑھنا، سمجھنا اور انجام دینا آسان ہو۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور سے شام میں مرکزی دفاتر کا میر منشی سرجون نامی ایک نصرانی چلا آ رہا تھا۔ عبدالملک اسے برخواست کرنا چاہتا تھا۔ خوش قسمتی سے عالم اسلام کو اردن کے ناظم مالیات سلیمان بن سعد کی شکل میں اس وقت ایک ایسا ماہر میسر تھا جو عربی اور رومی کو یکساں جانتا تھا۔ عبدالملک نے اسے بلوا کر کہا:

''مسلمانوں کے معاملات کا نصاریٰ کے ہاتھوں میں ہونا مجھے شروع سے ناپسند ہے۔ میں اپنے والد مروان کو یہ کہنا چاہتا تھا مگر بعض وجوہ سے نہ کہہ پایا۔ اب تم یہ کام سنبھالو۔''

سلیمان بن سعد نے کام میں حائل بعض فنی مشکلات کے تحت پس و پیش کی مگر عبدالملک نے حوصلہ دلا کر آمادہ کر لیا۔ اس دوران سرجون سخت بیمار پڑ گیا۔ عبدالملک نے اس سے پوچھا: ''آپ کے بعد یہ کام کون انجام دے سکتا ہے؟'' اس نے ایک نصرانی کا نام لیا اور ساتھ ہی کہا: ''اگر مسلمان ملازم چاہیے تو پھر سلیمان بن سعد سب سے موزوں ہے۔'' اس طرح یہ اہم کام سلیمان بن سعد کو دے دیا گیا۔

سلیمان نے مرکزی ناظم مالیات کا عہدہ سنبھالتے ہی تمام حساب کتاب اور دفتری فائلوں کو عربی میں منتقل کرانا شروع کیا۔ اس دور کے لحاظ سے یہ کام بے حد مشکل تھا کہ لکھنے، پڑھنے، نقل کرنے، کاغذات کو محفوظ اور منتقل کرنے کے موجودہ وسائل بالکل نہیں تھے۔ غالباً اسی لیے گزشتہ خلفاء اس میں تأمل کرتے رہے کہ کہیں نظام بہتر ہونے کی بجائے ابتر نہ ہو جائے مگر عبدالملک کی ہمت اور سلیمان بن سعد کی لیاقت نے یہ کر دکھایا۔ اس کے ساتھ ہی سلطنت کے ملازم رومی منشیوں کو اطلاع دے دی گئی کہ سب اپنے لیے کوئی اور روزگار تلاش کر لیں۔ [1]

نئے شہر:

عبدالملک کے دور میں کئی نئے شہر بسائے گئے اور قدیم اجاڑ شہروں کو دوبارہ آباد کیا گیا۔ آذربائی جان کے قدیم شہر بیلقان، اردبیل اور برذعۃ اسلامی دور تک ویران ہو چکے تھے۔ عبدالملک کے دور میں مقامی گورنروں نے انہیں دوبارہ آباد کیا۔ اسی علاقے میں ''المشوی'' نامی ایک نیا شہر تعمیر کیا گیا۔ [2]

عراق پر گرفت مضبوط رکھنے، بڑھتی ہوئی شہری آبادی کو رہائش دینے اور افواج کی سہولت کے لیے اس کے گورنر حجاج نے عراق کا مشہور شہر ''واسط'' تعمیر کیا۔ اس کی فصیل، سرکاری عمارتوں اور جامع مسجد پر بے پناہ رقم خرچ کی گئی۔ چوں کہ یہ شہر کوفہ اور بصرہ کے وسط میں تھا؛ اس لیے اس کا نام واسط پڑ گیا۔ [3]

① تاریخ ابن خلدون، مقدمہ: ۱/ ۳۰۳، ۳۰۴، تاریخ دمشق: ۲۲/ ۳۲۰
② معجم البلدان: ۵/ ۳۴۸
③ فتوح البلدان، ص ۲۰۳

خدماتِ حرمین:

عبدالملک نے حرم شریف کی بڑی خدمت کی۔ کعبہ کے ستونوں پر بالائی جانب پچاس پچاس مثقال سونا لگوایا۔ ①
ہر سال خانہ کعبہ کے لیے ریشم کا غلاف اور مسجد نبوی میں خوشبو کے لیے بخورات اور عود دان بھیجا کرتا تھا۔ ۸۰ھ میں مکہ میں بڑا سیلاب آیا۔ وادی مکہ کی ساری آبادی زیر آب آگئی اور شہریوں کو بڑے نقصانات اٹھانا پڑے۔ عبدالملک نے آئندہ سیلاب کی روک تھام کے لیے وادی کے کناروں پر گلیوں میں اور ارد گرد بند اور پشتے تعمیر کرا دیے۔ اس طرح مکہ سیلاب سے محفوظ ہو گیا۔ ②

بیت المقدس کی خدمت:

عبدالملک نے قبلہ اول کی خدمت کو بھی نظر انداز نہ کیا۔ ۷۲ھ میں بیت المقدس میں صخرۂ مقدسہ پر وہ عظیم الشان گنبد تعمیر کرایا جو آج تک ہر زائر سے خراج تحسین وصول کر رہا ہے۔ اس مبارک کام کے لیے وہ خود بے پناہ دولت لے کر معماروں اور ماہرین تعمیر کے ساتھ بیت المقدس پہنچا اور رجاء بن حیوہ رحمہ اللہ جیسی نیک ہستی کو یہ کام سونپ کر ہدایت کی کہ تعمیر پر بلا توقف رقم خرچ کی جائے۔ گنبد صخرہ کو ایک عمارت کی طرح تعمیر کیا گیا۔ اس کے چار دروازے بنائے گئے۔ چھت پر ساج کی لکڑی کے ۶۰ ہزار ٹکڑوں سے نقاشی کی گئی۔ ایک ہزار شمعوں سے روشنی کا انتظام کیا گیا۔ حرم مسجد اقصیٰ کے لیے بیس دروازے بنائے گئے۔ اندر روشنی کے لیے پانچ ہزار قندیلیں نصب کی گئیں اور پچاس گنبد تعمیر کیے گئے۔ تعمیر مکمل ہوگئی تو صخرہ کی زیارت کا وقت مقرر کیا گیا۔ مشک و زعفران سے اسے اتنا مہکایا گیا کہ جو شخص زیارت کے لیے آتا دن بھر اس کے کپڑوں پر خوشبو آتی رہتی تھی، اسے دیکھ کر لوگ کہتے تھے یہ آج صخرہ کی زیارت کو گیا تھا۔ ③

تعمیر مساجد:

اس کے نائبین نے مساجد کی تعمیر، توسیع اور مرمت پر توجہ دی۔ محمد بن مروان نے برذعہ کی مسجد از سر نو بنوائی۔ ④
واسط میں جامع مسجد تعمیر ہوئی۔ ⑤ عبدالعزیز بن مروان نے مصر کی جامع مسجد کی تجدید و توسیع کرائی۔ ⑥

اندازِ سیاست:

عبدالملک کا کہنا تھا کہ فقط حکام کی نیک سیرتی عوام کو نہیں سدھار سکتی جب تک لوگ خود نہ سدھرنا چاہیں۔ وہ کہتا تھا:

"لوگو! ہمارے ساتھ انصاف کرو۔ تم ہمیں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی سیرت پر دیکھنا چاہتے ہو اور تم خود ہماری اصلاح میں اور اپنی ذات میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی رعایا کی سیرت پر نہیں چلتے۔"

طبعی طور پر وہ بلا ضرورت خون ریزی کو ناپسند کرتا تھا اور عوام کے جان و مال اور عزت کی حفاظت کی کوشش کرتا تھا۔

① اخبار مکۃ للازرقی: ۲/ ۷۱، ط دار الاندلس
② اخبار مکہ للازرقی: ۲/ ۱۶۸، ۱۶۹
③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۲/ ۱۰ تا ۴۴
④ فتوح البلدان، ص ۲۰۳
⑤ فتوح البلدان، ص ۱۴۰
⑥ تاریخ الخلفاء، ص ۱۶۲، ط مکتبۃ نزار
⑦ [illegible] الاخبار ۲/ ۳۲۰

اگر کسی عہدے دار کی زیادتی کی خبر ملتی تو اس کا ازالہ کر دیتا تھا۔ ابن اَشعث کی بغاوت فرو کرنے کے لیے حجاج نے بہت سے لوگوں کو قتل کرایا اور اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ان میں خوب رقم تقسیم کی تھی۔ عبدالملک کو اطلاع ملی تو لکھا:

''مجھے خون ریزی میں تمہارے حد سے تجاوز کرنے اور مال میں فضول خرچی کی خبر ملی ہے۔ میں یہ دونوں باتیں برداشت نہیں کر سکتا۔ امیر المؤمنین اللہ کا امین ہے۔ اس کے نزدیک کسی کا حق روکنا یا بغیر حق کے دینا دونوں برابر ہیں۔ امیر المؤمنین تم کو پہلے حکم دے چکے ہیں کہ کسی نے قتل عمد کیا ہو تو اس سے قصاص لو، قتل خطاء ہو جائے تو دیت لو۔ اگر (ظلم وستم) سے تمہارا مقصد یہ تھا کہ لوگ میرے وفادار ہو جائیں تو اس میں لوگوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس طرح لوگ تمہارے تابع ہو جائیں گے تو اس میں تمہارا کوئی فائدہ نہیں۔ تم کو میری طرف سے نرمی اور شدت برداشت کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اطاعت میں تمہاری بھلائی اور سرکشی میں تمہاری تباہی ہے۔ جب تمہیں کسی باغی گروہ کے خلاف فتح نصیب ہو تو صلح کے خواہش مند لوگوں اور قیدیوں کو ہرگز قتل نہ کرو۔''

حجاج نے جواب میں اپنے فعل کی وجوہ پیش کرتے ہوئے آخر میں لکھا: ''جو کچھ ہو چکا، سو ہو چکا۔ آئندہ کے لیے آپ ایک حد مقرر کر دیں تاکہ میں اس سے تجاوز نہ کروں۔''[1]

بڑوں سے ملاقات میں چار امور ملحوظ رہیں:

عبدالملک کو مدح وستائش اور جھوٹ سے نفرت تھی۔ کوئی سفیر آتا تو عبدالملک اسے کہتا:

''چار باتیں چھوڑ کر جو چاہو کہہ دو: میری چاپلوسی نہ کرنا، جو نہ پوچھوں اس کے بارے میں مت بتانا، جھوٹ نہ بولنا اور رعایا پر غصہ مت دلانا، اس کو میرے رحم وکرم کی ضرورت ہے۔''

ایک شخص نے الگ ملاقات کی اجازت مانگی تو کہا: ''اس شرط پر کہ میری تعریفیں نہ کرنا، میں خود کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ جھوٹ نہ بولنا، جھوٹے کی بات کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ کسی کی چغلی مت لگانا۔''[2]

اولاد کی تربیت کے اصول:

اولاد کی تعلیم وتربیت کے لیے اسماعیل بن عبداللہ کو مقرر کیا تھا اور یہ ہدایات دی تھیں:

''انہیں جس طرح قرآن مجید سکھاتے ہو اسی طرح سچ بولنا سکھانا، گھٹیا عادات سے بچانا؛ کیوں کہ یہ صاحبزادے سب سے زیادہ بدلحاظ اور بے ادب ہوا کرتے ہیں۔ انہیں نوکروں چاکروں میں مت گھرے رہنے دینا کہ وہ انہیں بگاڑ دیں گے۔ عقل وشعور کا پیکر بنانا تاکہ وہ سربلند رہیں۔ انہیں غذا میں گوشت کھلانا تاکہ بدن مضبوط ہوں۔ شعر وادب سے روشناس کرانا تاکہ معزز اور شریف بنیں۔ انہیں مسواک سنت کے مطابق دائیں سے بائیں کرنا سکھانا۔ پانی کو گھونٹ گھونٹ پینے کی عادت ڈلوانا، غٹاغٹ پینے سے بچانا۔ جب سزا دینا ہو تو سب کے سامنے نہیں، الگ لے جا کر دینا تاکہ ان کو سبکی محسوس نہ ہو۔''[3]

[1] مروج الذھب: ۳/۳۴۱، ۳۴۲ ط اللبنانیة [2] البدایة والنھایة: ۱۲/۳۸۷ [3] البدایة والنھایة: ۱۲/۳۸۸

رقتِ قلب:

وہ رقتِ قلب کی صفت سے محروم نہ تھا۔ نصیحت پر رو پڑتا تھا۔ زرّ بن حُبیش رحمہ اللہ نے مکتوب میں اسے نصیحت کی:

''امیر المؤمنین آپ کو اپنی صحت دیکھتے ہوئے لمبی عمر کی حرص نہیں ہونی چاہیے کہ آپ خود کو خوب جانتے ہیں۔ جب اولاد ہو جائے، جسم پرانا ہو جائے، امراض پے در پے آنے لگیں تو سمجھئے کھیتی کٹنے کا وقت آ گیا۔''

یہ جملے پڑھ کر عبدالملک اتنا رویا کہ رومال بھیگ گیا۔[1]

ایک بار خطبے میں کہا: ''الٰہی! میرے گناہ بہت زیادہ ہیں مگر تیری تھوڑی سی مغفرت بھی ان سے بڑھ کر ہے۔ تو اپنی ذرا سی مغفرت سے میرے ڈھیروں گناہ معاف کر دے۔'' یہ کہتے ہوئے اس پر گریہ طاری تھا۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کو یہ جملے پہنچے تو رو پڑے اور بولے: ''یہ کلام اس قابل ہے کہ آبِ زر سے لکھا جائے۔''[2]

موت کو اکثر یاد کرتا تھا۔ اکیلے کھانا کھانے کی عادت نہ تھی۔ ایک بار دستر خوان بچھایا گیا تو باری باری خالد بن عبداللہ، امیہ بن عبداللہ، خلاد بن یزید اور دوسرے دوستوں کو بلوایا۔ ہر بار دربان نے یہی جواب دیا: ''وہ تو وفات پا گئے۔'' رو پڑا اور بولا:

ذَهَبَتْ لِدَاتِي وَانْقَضَتْ أَيَّامُهُمْ ‏ ‏ وَغَبَرْتُ بَعْدَهُمْ وَلَسْتُ بِخَالِدِ

''میرے معاصر چلے گئے، ان کے دن ختم ہو گئے۔ میں باقی رہ گیا مگر کون سا ہمیشہ رہوں گا۔''[3]

صحابہ کرام اور اہلِ بیتِ عظام کا لحاظ:

اس کے نائبین سے بعض صحابہ کرام کو تکالیف پہنچی تھیں مگر وہ خود دلی طور پر صحابہ کا بڑا احترام کرتا تھا۔ حجاج بن یوسف جب ابن اشعث کی بغاوت کے شعلے ٹھنڈے کر کے شہریوں سے تفتیش کرنے لگا تو انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو بھی بلوایا اور بڑی درشتی سے پیش آیا۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ اس وقت چپ رہے۔[4] بعد میں عبدالملک کو یہ شکایتی خط لکھا:

''اگر کوئی آدمی صرف ایک رات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پناہ دیتا یا خدمت کرتا تو نصرانی اس کا مقام پہچانتے اور اس کی قدر و منزلت کرتے۔ اگر کوئی موسیٰ علیہ السلام کی ایک دن خدمت کرتا تو یہودی اس کا مرتبہ ملحوظ رکھتے۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خادم اور صحابی ہوں مگر حجاج نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے، بدسلوکی اور بدگوئی کی ہے۔ آپ اسے روکیے۔ والسلام''

عبدالملک خط پڑھ کر رو پڑا۔ پھر شدید غصے کی حالت میں حجاج کو خط لکھا،[5] جس کا مضمون یہ تھا:

''یوسف کے بیٹے! کیا تم طائف میں اپنے باپ دادا کا پیشہ بھول گئے جو کنویں کھودتے اور پشتے بناتے تھے، کمر پر پتھر لاد کر لے جاتے تھے۔ تمہاری یہ جرأت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بدتمیزی کرو۔ میرا خط ملتے ہی خود چل کر جاؤ اور ان سے معافی مانگو۔''

---

[1] البداية والنهاية: ۳۹۰/۱۲ [2] البداية والنهاية: ۳۹۱/۱۲ [3] البداية والنهاية: ۳۹۲/۱۲

[4] المعجم الكبير للطبراني: ۲٤۷/۱ [5] تاريخ دمشق: ۱٤۱/۳۷ ؛ الاخبار الطوال، ص ۳۲۳، ۳۲٤

حجاج کو یہ خط ملا تو ہوش ٹھکانے آ گئے۔ فوراً اپنے درباریوں سمیت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے دولت کدے پر پیدل چل کر گیا۔ عبدالملک کا خط انہیں پڑھوایا۔ معافی مانگی اور درخواست کی کہ امیر المومنین کو خط لکھ کر میری خلاصی کرائیں۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ امیر المومنین کو جزائے خیر عطا کرے، مجھے ان سے یہی امید تھی۔''

پھر عبدالملک کو حجاج کی معافی اور اپنے راضی ہونے کا خط لکھ دیا۔[1]

عبدالملک کو اہل بیت کا احترام ملحوظ رہتا تھا۔ حجاج کو ایک خط میں لکھا: ''اہل بیت کے خون میں مجھ کو ملوث ہونے سے بچانا۔ گزشتہ حکمرانوں نے ایسا کیا تھا، حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تو ان کی حکومت چھن گئی۔''[2]

حق گوئی کی قدر دانی:

وہ حق بات منہ پر کہنے والے علماء کی قدر کرتا تھا۔ ۷۵ھ میں حج کے لیے گیا تو اس کے ایک امیر نے اہلِ مدینہ سے خطاب کرتے ہوئے گزشتہ حوادث (جنگِ حرہ وغیرہ) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''تمہاری مثال ایسی ہے جیسے اللہ نے ان بستی والوں کے بارے میں فرمایا:

كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ[3]

(وہ بڑے امن واطمینان میں تھے اور ان کے کھانے پینے کی چیزیں بڑی فراغت سے ہر چہار طرف سے ان کے پاس پہنچا کرتی تھیں۔ سو انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کی، اس پر اللہ نے ان کو ان کی حرکات کے سبب ایک محیط قحط اور خوف کا مزا چکھایا۔)

یہ سن کر ایک مدنی بزرگ ابن عبد رحمہ اللہ نے فوراً تردید کی اور فرمایا:

''تم نے جھوٹ کہا، ہم ایسے نہیں۔ تم اگلی آیت پڑھو:

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ[4]

(اور ان کے پاس انہی میں سے ایک رسول آیا پس انہوں نے رسول کو جھٹلایا۔)

ہم تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہیں۔''

یہ سن کر حاکم کے کارندے ان کو پکڑ کر عبدالملک کے پاس لے گئے۔ اس نے آزاد کرتے ہوئے کہا: ''میں تو درگزر کرتا ہوں مگر کسی اور کے سامنے ایسی باتیں کرو گے تو وہ برداشت نہ کرے گا۔'' یہ کہہ کر چھ سو دینار بطور انعام دیے۔[5]

① الاخبار الطوال، ص ۳۲۴

② انساب الأشراف: ۲۳۳/۷، ط دار الفکر۔ نوٹ: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خود بنو مروان بھی یزید کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل سے بری الذمہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ ڈرتے تھے کہ جس طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کی نحوست سے بنو سفیان حکومت سے محروم ہو گئے، اسی طرح ہمارا بھی یہی انجام نہ ہو۔

③ سورۃ النحل، آیت: ۱۱۲ ④ سورۃ النحل، آیت: ۱۱۳

⑤ طبقات ابن سعد: ۵/ ۲۳۲، ۱۳۱، ط دار صادر

حرام وحلال کا خیال:

کھانے پینے، وضع قطع اور رہن سہن میں وہ حلال وحرام کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ اس کے طرزِ عمل کو امام زہری رحمہ اللہ جیسے محدث دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے۔ ان سے کسی نے پوچھا: "کیا سونے کے تار سے دانت کسوانا جائز ہے؟" جواب دیا: "ہاں عبدالملک ایسا کرتا تھا۔"[1]

اگر عبدالملک کا رہن سہن شریعت کے مطابق نہ ہوتا تو امام زہری اس کے فعل کو دلیل کے طور پر کبھی پیش نہ کرتے۔

خلاصہ کلام:

عبدالملک کی حکومت کا قیام ناجائز طور پر کشت وخون کے ذریعے ہوا تھا مگر بہر حال وہ ایک زبردست سیاست دان اور قابل انسان تھا جس نے تمام مخالفین کو زیر کر کے چین کی سرحد سے مراکش تک ایک متحدہ اسلامی سلطنت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس میں خوبیاں بھی تھیں اور عیوب بھی۔ اگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے محاذ آرائی، سعید بن جبیر رحمہ اللہ کے قتل اور حجاج کے مظالم کے دھبے اس کے دامن پر نہ ہوتے تو بلاشبہ وہ دورِ تابعین کا سب سے قابل رشک حکمران قرار پاتا۔

ہم عبدالملک کے دور میں عالم اسلام میں اندرونی کشمکش کو ختم ہوتا دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد برسہا برس تک عالم اسلام متحد، سربلند، خوشحال اور ثروت مند دکھائی دیتا ہے اور اس کے جانشین ولید کے ایام میں پھر سے شاندار فتوحات کا آغاز ہوتا ہے۔

---

[1] طبقات ابن سعد: ۲۳۵/۵، ط دار صادر

ولید بن عبدالملک

شوال ۸۶ھ......تا ربیع الاول ۹۶ھ

اکتوبر705ء......تا......دسمبر714ء

عبدالملک بن مروان نے تمام مخالفین کا صفایا کر کے ایک مضبوط اور متحد سلطنت قائم کر دی تھی۔ اب اس کے جانشین اس کا پھل پانے والے تھے جن میں ولید بن عبدالملک سرفہرست تھا۔ ولید کی ولادت ۵۰ھ میں ہوئی تھی۔ وہ عبدالملک بن مروان کا بڑا بیٹا تھا۔ عبدالملک خود بہت عالم فاضل شخص تھا؛ اس لیے ولید کی تعلیم و تربیت میں اس نے اپنے طور پر کوئی کسر نہ چھوڑی مگر وہ کسی طور پڑھ لکھ نہ سکا۔

زبان و بیان اور عربی ادب میں اتنا کمزور تھا کہ گفتگو میں صرف و نحو کی بکثرت غلطیاں کرتا تھا۔ عربی میں زبر زیر پیش کی اونچ نیچ اور تبدیلی سے کلام کا مطلب بسا اوقات بالکل تبدیل ہو جاتا ہے۔ ولید کو ایسی صورتحال سے اکثر سابقہ پڑتا تھا۔ ایسے میں اس کے ہم نشینوں اس کی مراد کی تشریح کرنا پڑتی تھی۔

ایک لطیفہ:

ایک بار کوئی شخص اس سے ملنے آیا۔ ولید نے اس کی رشتہ داریاں پوچھتے ہوئے کہا: "مَنْ خَتَنَكَ؟"

(عربی قاعدے کے لحاظ سے یہاں خَتَنُكَ نون کے پیش کے ساتھ ہونا چاہیے۔ زبر لگ جانے سے مطلب بن گیا، تیرا ختنہ کس نے کیا ہے؟) اس شخص نے کہا: "حجام نے۔"

لوگوں نے اسے سمجھایا کہ امیر المؤمنین کی مراد ہے: "مَنْ خَتَنُكَ؟" (تمہارا سسرال کون ہے؟)

تب اس شخص نے اپنے سسرالی خاندان کا نام بتایا۔[1]

تاہم اس کے باوجود اس میں حکمرانی کی خداداد صلاحیتیں موجود تھیں؛ اس لیے وہ بنو مروان کے ان خلفاء میں شمار ہوا جن کا دور "عہدِ زریں" کہلاتا ہے۔ مسندِ خلافت سنبھالتے ہوئے وہ ۳۶ سال کا ہو چکا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے ایسے باصلاحیت اور ماہر سپہ سالار میسر آئے جو ایک زمانے میں بہت کم جمع ہوتے ہیں۔

[1] العبر فی خبر من غبر: ۸۵/۱

ان میں محمد بن قاسم، قُتَیبَہ بن مسلم، موسیٰ بن نُصَیر اور طارق بن زیاد کے نام تاریخ کے افق پر ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ ولید کا چھوٹا بھائی مَسلَمَہ بن عبدالملک بھی اپنے زمانے کا مایہ ناز جرنیل تھا۔ ولید کے عہدِ خلافت میں ان مجاہدوں نے جہادی مہمات شروع کیں تو اسلام کا پرچم چین سے لے کر فرانس کی سرحدوں تک لہرانے لگا۔ اس دس سالہ مدت میں وسطِ ایشیا، خوارزم، خراسان کے آخری اضلاع اور ایشیائے کوچک کے کئی اہم شہر فتح ہوئے۔ ان تمام فتوحات سے بڑھ کر سندھ اور اَندَلُس کی فتح تھی جس نے ایک طرف برصغیر میں اسلام کا دروازہ کھول دیا اور دوسری طرف مسلمان پہلی بار یورپ میں ایک اسلامی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مشرق میں ان کی فتوحات کا اصل منصوبہ ساز حجاج بن یوسف تھا جو عبدالملک کے زمانے سے پورے عراق و ایران کا حاکم تھا اور خراسان سے لے کر سرحداتِ برصغیر تک کا سارا انتظام اسی کے ماتحت عہدے دار اور جرنیل چلایا کرتے تھے۔[①]

مغرب میں افریقہ اور بحیرۂ روم کے ساحلوں سے ملحق سارا علاقہ گورنر موسیٰ بن نُصَیر کی تحویل میں تھا۔ یہی دونوں قائدین دنیا کے نقشے سامنے رکھ کر مشرق و مغرب کی فتوحات کے منصوبے بناتے اور خلیفہ سے منظوری لے کر افواج کو آگے بڑھاتے۔ مشرقی محاذ کے لیے حجاج بن یوسف کو محمد بن قاسم اور قُتَیبَہ بن مسلم جیسے سپہ سالار میسر آئے جبکہ مغرب میں موسیٰ بن نُصَیر کی فتوحات کے خواب کو طارق بن زیاد جیسے جرنیل نے تعبیر بخشی۔[②]

آیئے ولید بن عبدالملک کے دور کی ان شاندار فتوحات کا الگ الگ جائزہ لیتے ہیں۔

◆◆◆

---

① آج کل خراسان ایران کا ایک صوبہ ہے جبکہ اس زمانے میں خراسان کا اطلاق ایک وسیع علاقے پر ہوتا تھا جس کے مرکزی شہر تین تھے: ہرات، نیشاپور اور مرو۔ پھر ان تین عظیم الشان شہروں کے اردگرد پھیلے ہوئے درجنوں چھوٹے شہر اور سینکڑوں قصبے اور دیہات خراسان میں شمار ہوتے تھے۔ آج کل ہرات افغانستان کا، نیشاپور ایران کا اور مَرْو (میری) ترکمانستان کا حصہ ہے۔ یوں قدیم خراسان ان تین ممالک میں بٹ کر اس طرح مبہم ہوگیا ہے کہ اسے تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بہرکیف ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قدیم خراسان میں افغانستان کا مغربی اور جنوب مغربی، ایران کا مشرقی اور شمال مشرقی جبکہ ترکمانستان کا جنوبی اور جنوب مشرقی علاقہ شامل تھا۔

یہ حدود مشرق میں افغانستان کے وسطی صوبے بامیان، شمال میں دریائے آمو، جنوب میں زاہدان اور مغرب میں اصفہان تک وسیع ہیں۔ بعض علماء نے خراسان کو تین اضلاع میں تقسیم کیا ہے: پہلے ضلعے میں نیشاپور، ہرات، بادغیس اور طوس شامل ہیں۔ دوسرا ضلع مرو، نساء، ابیورد، سرخس اور آمل کے علاوہ دریائے آمو کے جنوب اور مغرب میں واقع شہروں پر مشتمل ہے۔ تیسرا ضلع بامیان، بغلان اور بدخشاں پر مشتمل ہے۔

(معجم البلدان للحموی: ۳۰۶،۳۰۵/۲ ؛ مراصد الاطلاع علیٰ اسماء الامکنة والبقاع لصفی الدین عبدالمؤمن القطیعی البغدادی: ۴۵۶/۱)

② المختصر فی اخبار البشر: ۱۹۸/۱ تا ۱۰۰ ؛ تاریخ الخلفاء، ص ۱۶۸، ط نزار

قُتَیبہ بن مسلم الباہلی کی فتوحات

ولید بن عبدالملک کے زمانے کا ایک اہم کارنامہ وسطِ ایشیا کی فتوحات ہیں۔ وسط ایشیا وہ وسیع علاقہ ہے جو چین کی سرحد سے خراسان تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کا زرخیز ترین علاقہ ''ماوراء النہر'' ہے جو دریائے سیحون (سیر دریا) اور دریائے جیحون (دریائے آمو) کے درمیان آباد ہے۔ یہاں سمرقند، بخارا، ترمذ، خوارزم، ہزاراسپ، اور خیوا جیسے قدیم اور گنجان شہر واقع تھے۔ اس علاقے کو ترکستان بھی کہا جاتا تھا۔ اسے خاقان چین کا ماتحت صوبہ تصور کیا جاتا تھا۔ یہاں کے تمام حاکم اسے خراج دیتے تھے اور اس کے بدلے خاقان چین ضرورت پڑنے پر فوج اور کمک کے ذریعے بیرونی حملہ آوروں سے انہیں تحفظ دیتا تھا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یہاں خاصا علاقہ فتح ہوا تھا اور بہت سے چھوٹے بڑے سردار باج گزار بن گئے تھے مگر موقع ملتے ہی یہ لوگ بغاوت کر دیتے تھے۔ اکثر ایسے واقعات میں خاقانِ چین کی پشت پناہی شامل ہوتی تھی۔ اس لحاظ سے یہاں اب تک اسلامی خلافت کے پائے مضبوط نہیں ہوئے تھے۔

آخر کار ۸۵ھ میں عراق کے گورنر حجاج بن یوسف نے یہاں مکمل قبضے کی منصوبہ بندی کی اور قُتَیبہ بن مسلم الباہلی کو خراسان کا گورنر مقرر کر کے یہ مہم انہیں سونپ دی۔ خراسان کا مرکز موجودہ جمہوریہ ترکمانستان کا شہر ''مرو'' تھا جسے اب ''میری'' کہا جاتا ہے۔ قُتَیبہ نے یہاں فوج مرتب کی اور دریائے آمو عبور کر کے ترکستان پر یلغار کر دی۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ ان دنوں ترکستانی امراء میں باہمی لڑائی جھگڑے چل رہے تھے۔ لہٰذا کئی علاقے فوراً زیرِ نگین آ گئے۔ اسی یلغار میں قُتَیبہ کے نائب سالاروں نے فرغانہ اور کاشان کے اضلاع فتح کر لیے۔

اگلے برس ۸۷ھ میں قُتَیبہ نے دوبارہ ''مرو'' سے کوچ کیا اور ''آمو'' دریا پار کر کے بخارا کے نواحی شہر ''بیکند'' پر حملہ کیا۔ یہاں فریقین میں زبردست لڑائی ہوتی رہی۔ یہ محاذ اتنا سخت تھا کہ حجاج بن یوسف کو مستقل فکر لگی رہتی تھی۔ اس کے حکم سے عراق کی مساجد میں نمازوں کے بعد مجاہدین کی فتح کے لیے باقاعدگی سے دعائیں کی جاتی تھیں۔

آخر مسلمان ایک دن حریف کو میدان جنگ سے پسپا کر کے تعاقب کرتے ہوئے شہر پر قابض ہو گئے۔ قُتَیبہ نے یہاں ایک مسلمان حاکم کا کچھ فوج کے ساتھ تقرر کیا اور واپس روانہ ہوئے۔ ابھی راستے میں تھے کہ ''بیکند'' میں بغاوت ہو گئی، مقامی لوگوں نے مسلمان حاکم کو ماتحت سپاہیوں سمیت قتل کر ڈالا تھا۔ قُتَیبہ نے پلٹ کر دوبارہ شہر کو گھیر لیا اور نقب لگا کر فصیلِ شہر کو توڑ ڈالا۔ اہلِ شہر نے مصالحت کی کوشش کی مگر قُتَیبہ کو ان پر اعتبار نہ تھا؛ اس لیے بزورِ شمشیر یہاں قبضہ کیا

اور مقابلے میں آنے والے تمام سپاہیوں کو قتل کر کے دم لیا۔ اس فتح میں اسلحے اور مال و دولت کے بے پناہ ذخائر ہاتھ لگے۔ ۸۸ھ میں قُتَیبَہ نے ایک بار پھر وسطِ ایشیا پر یلغار کی اور مختلف قبائل کو مسخر کیا۔ ①

خاقان چین کی امدادی فوج سے مقابلہ:

چین کا خاقان قُتَیبَہ کی فوج کشی کو بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس دوران اس نے ایک بڑی فوج مرتب کر لی تھی اور مسلمانوں پر کاری ضرب لگانے کے لیے موقعے کی تلاش میں تھا۔ جب قُتَیبَہ وسطِ ایشیا کی مہم سے واپس ہوئے تو خاقان چین نے اپنے بھانجے "کورن غابون" کو دو لاکھ کے ٹڈی دل لشکر کے ساتھ ان پر پشت سے حملے کے لیے بھیج دیا۔

قُتَیبَہ بن مسلم اگلے دستوں کے ساتھ دریائے آمو کے قریب پہنچ چکے تھے کہ چینی افواج نے ان کے پچھلے دستوں پر حملہ کر دیا جو قُتَیبَہ کے بھائی عبدالرحمٰن بن مسلم کی کمان میں تھے۔ لشکر کا یہ حصہ قُتَیبَہ سے ایک میل دور تھا۔ عبدالرحمٰن نے بڑی دلیری سے اس اچانک حملے کا سامنا کیا اور ساتھ ہی قُتَیبَہ کو اطلاع بھیج دی۔ قُتَیبَہ پلٹ کر تیزی سے اس وادی میں آئے جہاں عبدالرحمٰن چینی افواج سے لڑ رہا تھا، مسلمانوں کے قدم اکھڑنے کو تھے مگر قُتَیبَہ کے آجانے سے ان کی ہمت بندھ گئی۔ قُتَیبَہ نے فوج کی کمان سنبھال کر چند زوردار حملے کیے اور چینی افواج کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد مسلمان ترمذ جانے والی شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے دریائے آمو عبور کر کے بحفاظت اپنے مرکز مَرْو پہنچ گئے۔ ②

بخارا کی فتح:

بخارا وسطِ ایشیا کا قدیم ترین اور نہایت گنجان آباد شہر تھا۔ اسے گزشتہ خلفاء کے زمانے میں فتح کیا جا چکا تھا مگر ترک سردار بار بار بغاوت کر دیا کرتے تھے۔ یہی صورتحال سمرقند اور وسطِ ایشیا کے دوسرے شہروں کی تھی۔ قُتَیبَہ بن مسلم نے اس سرزمین کو بغاوت اور شورش سے پاک کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ انہوں نے ۸۹ھ میں بخارا پر ایک آزمائشی حملہ کیا اور محاذ سے حجاج بن یوسف کو شہر کا پورا نقشہ بنوا کر بھیجا۔ حجاج نے اندازہ لگا لیا کہ موجودہ تیاری کے ساتھ شہر فتح نہیں ہو سکے گا؛ اس لیے قُتَیبَہ کو واپسی کا حکم دیا۔ اگلے سال قُتَیبَہ نے بڑے پیمانے پر تیاری کر کے دوبارہ بخارا کو گھیر لیا۔ اس دوران گرد و نواح کے ترک سردار اپنی فوجوں کے ساتھ اہلِ بخارا کی مدد کے لیے آن پہنچے۔ انہیں دیکھ کر بخارا کی فوج بھی میدان میں نکل آئی۔ ان سب نے مل کر صف بندی کی۔ ترک خاقان اور اس کا شہزادہ خود لشکر میں موجود تھے۔

آخر دونوں افواج میں گھمسان کا رن پڑا۔ قلب لشکر میں قبیلہ ازد کے دستے تھے جو ترکوں کے ٹڈی دل کا دباؤ برداشت نہ کر سکے اور ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ پسپا ہوتے ہوتے اپنی خیمہ گاہ تک جا پہنچے۔ مسلمان خواتین یہ دیکھ کر خیموں سے نکل آئیں اور انہیں واپس دھکیلنے لگیں۔ اس دوران اسلامی لشکر کے دائیں اور بائیں بازو نے ترکوں پر جاں توڑ حملے شروع کر دیے۔ ترک لاشوں کے ڈھیر چھوڑتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگے۔ ان کی بڑی تعداد تتر بتر ہو گئی۔ باقی فوج نے ٹیلوں کے ایک سلسلے پر چڑھ کر دوبارہ صف بندی کر لی۔ قُتَیبَہ بن مسلم نے یہ منظر دیکھا تو آواز لگائی: "کون ہے جو انہیں پسپا کرے۔"

① الکامل فی التاریخ، تحت ۸۶ھ تا ۸۸ھ

② الکامل فی التاریخ، سنة سن ۸۸ھ

سپہ سالار کے ہمراہ آگے بڑھے، قُتَیبَہ نے خوش ہو کر کہا: ”یہ دن بھی تمہارے گزشتہ کارناموں جیسا ہے۔“
دوسرے دن سپہ سالار وکیع نے تمیمیے کے پیادہ دستوں کو خود سنبھالا، گھڑسواروں کو ھُرَیم بن ابی طَحْمَہ کی کمان میں دے دیے اور سب سے پہلے چکر کاٹ کر ترکوں کے عقب سے حملے کے لیے پیش قدمی کی۔ راستے میں ایک بڑی نہر آ گئی جس میں پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ وکیع نے آواز لگائی: ”جو شہادت کے لیے تیار ہو، وہ نہر عبور کر کے دکھائے۔“
پیادوں میں سے آٹھ سو مجاہد نہر کے پار پہنچ گئے۔ وکیع نے انہی کو لے کر ترکوں پر دھاوا بول دیا۔ ادھر سے ہریم نے گھڑسواروں کو لے کر دوسری سمت سے حملہ کر دیا۔ ترک جو اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھے، بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ خاقان اور اس کا بیٹا بھی زخمی ہوئے مگر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ [1]

قُتَیبَہ بن مسلم خراسان میں:

شمالی خراسان (شمالی افغانستان) میں شورشوں اور بغاوتوں کا سلسلہ ایک مدت سے جاری تھا۔ اس صورتحال پر قابو پانے کا سہرا بھی قُتَیبَہ بن مسلم کے سر ہے جنہوں نے اس علاقے میں موقع محل کی مناسبت سے کہیں نرمی و مذاکرات کا راستہ اپنایا اور کہیں قوتِ بازو سے کام لیا۔ اس تدبیر سے بادغیس (شمالی افغانستان) کا سردار نَیزَک ان کا معاون بن گیا اور اس نے بعض معرکوں میں بڑھ چڑھ کر دادِ شجاعت دی۔

نَیزَک ایک عرصے تک مسلمانوں کا معاون رہا مگر ترکستان میں قُتَیبَہ بن مسلم کی مسلسل فتوحات دیکھ کر وہ مسلمانوں کی قوت سے خطرہ محسوس کرنے لگا لہٰذا اس نے بلخ، فاریاب، طالقان اور جوزجان سمیت شمالی افغانستان کے تمام شہروں کے سرداروں کو ملا کر بغاوت کا پرچم بلند کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے کابل کے حکمران کو بھی مسلمانوں کے خلاف اکسا کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ تخار کا قبائلی حاکم جَبغُوَیہ بھی نیزک سے مرعوب و متاثر تھا، اس کے کہنے پر اس نے تخار میں بغاوت کر دی اور مقامی مسلمان حاکم کو وہاں سے بے دخل کر دیا۔ قُتَیبَہ بن مسلم کو یہ خبر اس وقت ملی جب کہ ان کا لشکر تیار نہ تھا۔
بہر حال انہوں نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن مسلم کو بارہ ہزار سپاہی دے کر ”بروقان“ میں ٹھہرنے اور موسم سرما گزرتے ہی تخار کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد انہوں نے خود نیشاپور سے بھاری کمک منگوا کر طالقان پر حملہ کر دیا اور یہاں کے باغیوں کو کسی رعایت کے بغیر تہ تیغ کر دیا۔
سردیاں گزرنے کے بعد ۹۱ھ میں انہوں نے فاریاب، جوزجان اور بلخ کو یکے بعد دیگرے کسی خونریزی کے بغیر دوبارہ فتح کر لیا۔ نَیزَک اپنے جتھے کے ساتھ اسی علاقے میں مورچہ بندی کر رہا تھا۔ قُتَیبَہ اپنے بھائی عبدالرحمٰن کے ساتھ اس کے تعاقب میں آگے بڑھتے گئے۔ نَیزَک ”خُلم“ کی انتہائی دشوار گزار گھاٹی سے (جو مزار شریف سے ۵۰ کلو میٹر مشرق میں ہے) سے گزر کر بغلان پہنچ گیا اور گھاٹی پر پہرہ بٹھا دیا۔ ”خُلم“ گھاٹی کے منہ پر ایک قلعہ تھا جس کا محل وقوع ایسا تھا کہ یہاں چند آدمیوں کی مدد سے بڑی سے بڑی فوج کی پیش قدمی روکی جا سکتی تھی۔

[1] الکامل فی التاریخ: سنۃ سن ۹۰ھ

قُتَیبَہ کئی دن نشیب میں پڑاؤ ڈالے آگے بڑھنے کی تدبیریں سوچتے رہے، خوش قسمتی سے ایک مقامی آدمی مسلمانوں سے آملا، اس نے قُتَیبَہ کو قلعے کے عقب تک پہنچنے کا ایک خفیہ راستہ بتا دیا۔ مسلمان اس راستے سے گزر کر قلعہ پر متعین باغیوں پر ٹوٹ پڑے اور راستہ صاف کر دیا۔ قُتَیبَہ نے براہِ راست نیزک کے تعاقب میں بغلان کی طرف بڑھنے کی بجائے سمنگان کا رخ کیا اور وہاں سے نیزک کے پیچھے روانہ ہوئے۔ نیزک اس دوران بغلان سے فرار ہو کر وادیِ فرغانہ پہنچ گیا تھا اور ''کرز'' نامی ایک ناقابلِ تسخیر گھاٹی میں روپوش تھا۔ تخارکا حاکم جبغویہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ قُتَیبَہ نے ''کرز'' گھاٹی کا محاصرہ کر لیا، اس گھاٹی کو گھوڑے اور خچر بھی عبور نہیں کر سکتے تھے؛ اس لئے قُتَیبَہ نے دو ماہ تک محاصرہ جاری رکھا۔ آخر کار محصورین بھوک، پیاس، سردی اور خارش کی بیماری سے تنگ آ گئے، قُتَیبَہ نے انہیں بات چیت کے ذریعے باہر بلوایا۔ جبغویہ کی جاں بخشی کر دی گئی مگر نیزک نے دو سال سے اسلامی لشکر کو تنگ کر رکھا تھا، اس کا جرم ناقابلِ معافی تھا لہٰذا اس کا سر قلم کر کے خلیفہ کے پاس دِمشق بھجوا دیا گیا۔ ①

خوارزم کی فتح:

وسطِ ایشیا میں خوارزم کا علاقہ بھی بہت اہمیت کا حامل تھا جس کے حکمران کا لقب ''خوارزم شاہ'' چلا آتا تھا۔ ۹۳ھ میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کے حکم سے قُتَیبَہ بن مسلم نے یہاں پہلی بار فوج کشی کی۔ خوارزم شاہ برائے نام حکمران تھا، اس کا بھائی خرزاد ریاست کے تمام انتظامات پر مسلط تھا۔ خوارزم شاہ اس صورتحال سے نہایت پریشان تھا، اس نے قُتَیبَہ بن مسلم سے خفیہ خط وکتابت کر کے اس شرط پر حلقہ بگوشی منظور کر لی کہ مسلمان اسے خرزاد کی زیادتیوں سے نجات دلائیں گے۔ قُتَیبَہ بن مسلم نے اس پیش کش کو منظور کر لیا اور فوج لے کر مرو سے کوچ کیا۔

خوارزم شاہ اپنی فوج لے کر نکلا تو قُتَیبَہ بن مسلم دوسری طرف مڑ گئے۔ خوارزم شاہ نے فوج کو دشمن کی واپسی کی خبر سنا کر جشن منانے کا حکم دیا۔ جشن جاری تھا کہ اطلاع ملی، قُتَیبَہ کی فوج سر پر آن پہنچی ہے اور ہزار اسپ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ یہ سب کچھ قُتَیبَہ اور خوارزم شاہ کے درمیان طے شدہ منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا۔

اب خوارزم شاہ نے امرائے فوج کو سمجھایا کہ مسلمانوں سے لڑنا بے سود ہے۔ وہ ہم سے کہیں بڑی فوجوں کو شکست دے چکے ہیں۔ فوج کو قائل کر کے خوارزم شاہ نے قُتَیبَہ کی طرف صلح کے سفیر بھیج دیے۔ یوں سرزمین خوارزم بغیر کسی کشت وخون کے اسلامی پرچم کے سائے تلے آ گئی۔

قُتَیبَہ نے خوارزم کی فتح کے بعد وعدے کے مطابق خوارزم شاہ کے بھائی خرزاد کا تعاقب کر کے اس کا خاتمہ کر دیا۔ ②

سمرقند کی فتح:

وسطِ ایشیا میں اب سمرقند وہ آخری مورچہ تھا جہاں ترکوں کی پسپا ہونے والی ساری طاقت مجتمع ہو چکی تھی۔ اس شہر کی فصیل ناقابلِ تسخیر شمار ہوتی تھی؛ اس لیے پورے ''ماوراء النہر'' میں اس سے زیادہ محفوظ شہر اور کوئی نہ تھا۔ سمرقند اور اس

① الکامل فی التاریخ، سنة: ۹۰ھ۔۹۱ھ ② الکامل فی التاریخ، سنة: سن ۹۳ھ

کے گردونواح کا علاقہ صُغد کہلاتا تھا۔ قُتَیبہ کو یہاں کے سرداروں کی بدعہدیوں سے بڑی تکلیف تھی۔ خوارزم کی فتح کے بعد قُتَیبہ کا کہنا تھا:

''اہل خوارزم اور اہل سمرقند کی مثال ایسی ہے جیسے بنو قریظہ اور بنو نضیر کی۔'' یعنی یہ لوگ حضور اکرم ﷺ کے زمانے کے یہودی قبائل کی طرح مسلمانوں کے خلاف جنگ کی آگ بھڑکاتے رہتے ہیں۔

قُتَیبہ بن مسلم خوارزم کے محاذ سے واپسی کے لیے تیار ہوئے تو ان کے مشیر مُجَشّر بن مُزاحم نے کہا:

''اگر آپ سمرقند پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں تو اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں۔ وہ لوگ آپ کو خوارزم میں مشغول تصور کر کے ابھی بے فکر ہیں۔''

قُتَیبہ نے پوچھا: ''یہاں سے سمرقند کا راستہ کتنے دن کا ہے؟''

مشیر نے کہا: ''دس دن کا۔''

قُتَیبہ نے اسے بڑی سختی سے رازداری کی تاکید کی۔ پھر فوج کو اپنی چھاؤنی مرو کی طرف کوچ کا حکم دیا مگر ساتھ ہی اپنے بھائی عبدالرحمٰن کو خفیہ احکام دے دیے کہ راستے میں فوج کا ایک حصہ سمرقند کی طرف روانہ کر دیا جائے۔

فوج کے مرو کے راستے پر جانے سے یہی خبر مشہور ہوئی کہ مسلمان واپس جا رہے ہیں۔ راستے سے فوج کا ایک حصہ سمرقند کی طرف مڑ گیا۔ یوں قُتَیبہ نے ان مجاہدین کے ساتھ اچانک سمرقند پہنچ کر محاصرہ کر لیا۔ اگرچہ سمرقند کی افواج لڑائی کے لیے تیار نہ تھیں مگر پھر بھی ان کا دم خم اتنا تھا کہ ایک ماہ تک مسلمانوں کو روکے رکھا۔ ساتھ ہی خاقان کو امدادی فوجیں روانہ کرنے کا پیغام بھیج دیا۔

خاقان نے ترک شہزادوں اور مشہور نوابوں کی قیادت میں بڑی خاموشی سے ایک لشکر تیار کر کے کمک کے لیے بھیج دیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ رات کو سمرقند پہنچ کر قُتَیبہ کے لشکر پر بے خبری میں پشت سے حملہ کر دیا جائے۔ قُتَیبہ کو مخبروں سے یہ اطلاع مل گئی۔ انہوں نے اپنے سالار صالح بن مسلم کو چھ سو چنیدہ سپاہی دے کر امدادی لشکر پر راستے میں شب خون مارنے کا حکم دیا۔ صالح تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ ترکوں کے امدادی لشکر کے راستے میں کھڑا ہو گیا اور باقی سپاہیوں کو شاہراہ کے دائیں بائیں چھپا دیا۔ نصف شب کے وقت جونہی ترک یہاں پہنچے، صالح نے جارحانہ حملہ کر دیا۔ ادھر سے دائیں بائیں چھپے ہوئے سپاہی بھی ان پر ٹوٹ پڑے۔ رات کی تاریکی میں یہ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ حملہ آور کتنے ہیں؛ اس لیے ترکوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ عین اسی وقت قُتَیبہ خود مزید سپاہی لے کر پہنچ گئے اور ترکوں کو بری طرح شکست دی۔ ان کے بڑے بڑے سردار اور شہزادے گرفتار ہو گئے۔

قُتَیبہ نے اب سمرقند پر سخت ترین حملے شروع کیے اور منجنیقوں سے سنگ باری تیز کرا دی۔ وہ اس شہر کی فلک بوس فصیلوں کو دیکھ کر کہا کرتے تھے: ''اے سمرقند! کب تک تو شیطانوں کو پناہ دیے رکھے گا۔''

آخر شہر کی فصیل کا ایک حصہ ٹوٹ گیا۔ اگلے دن صبح سویرے مسلمانوں نے فصیل پر ہلہ بول دیا۔ اہل سمرقند فصیلوں

سے تیروں کی بارش کر رہے تھے، مگر مسلمان ڈھالوں کی اوٹ میں آگے بڑھتے رہے اور آخر کار شگاف پر قابض ہو گئے۔

امدادی فوج کی شکست اور فصیل ٹوٹ جانے سے اہل سمرقند کی ہمت پست ہو چکی تھی۔ انہوں نے صلح کی درخواست کی۔ قُتَیبہ بن مسلم نے درج ذیل شرائط پر یہ درخواست منظور کر لی:

① مقامی فوج سمرقند سے نکل جائے گی اور مسلمان فاتحانہ طور پر شہر میں داخل ہوں گے۔
② یہاں مسجد تعمیر کی جائے گی اور نمازِ جمعہ ادا ہوگی۔
③ اہل سمرقند ہر سال بارہ لاکھ دینار خراج ادا کریں گے۔
④ اہل سمرقند اس سال تیس ہزار گھڑ سوار مسلمانوں کی مدد کے لیے دیں گے۔

ان شرائط پر یہ تاریخی شہر فتح ہوا۔ مسلمانوں نے شہر میں داخل ہوتے ہوئے وقار و تحمل کا ثبوت دیا۔ شہریوں کی کسی چیز کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ اس علاقے میں بُت پرستی عام تھی۔ قُتَیبہ نے اس بدعقیدگی کو مٹانے کے لیے بُتوں کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پجاریوں کو معلوم ہوا تو بولے:

''ہم آپ کی خیر خواہی کے طور پر بتا رہے ہیں۔ ان بتوں کو گزند پہنچانے کی کوشش کرنے والا ہلاک ہو جاتا ہے۔''

قُتَیبہ نے کوئی پروانہ کی اور بُتوں کو آگ لگا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بُت پرستوں کے باطل معبود کوئلہ بن گئے۔[1]

خوارزم اور سمرقند جیسے اہم صوبوں کا ایک ہی سال میں فتح کر لینا قُتَیبہ بن مسلم کا بہت بڑا کارنامہ شمار ہوا۔ اگلے سال ۹۴ھ میں اس مردِ مجاہد نے چین کی سرحد کے قریب واقع شاش (تاشقند) اور فرغانہ کو بھی فتح کر لیا۔[2]

چین کی سرحد پر:

وسطِ ایشیا میں بار بار ہونے والی بغاوتوں کو شہ دینے میں چین کی حکومت کا بڑا ہاتھ رہتا تھا؛ اس لیے جب تک خاقانِ چین کا سرنیچا نہ کر دیا جاتا، وسطِ ایشیا میں امن قائم ہونا ممکن نہیں تھا؛ اس لیے دو برس کی تیاری کے بعد قُتَیبہ بن مسلم نے ۹۶ھ میں چین کی طرف پیش قدمی کی اور قسم کھائی کہ جب تک اسلامی لشکر بزورِ قوت چینی حکومت سے خراج وصول نہ کر لے، واپسی نہیں ہوگی۔ قُتَیبہ نے خود سرحد پر پڑاؤ ڈالا جبکہ ان کے سالاروں نے آگے یلغار کرتے ہوئے چین کا سرحدی ضلع کاشغر فتح کر لیا۔

خاقانِ چین وسطِ ایشیا میں اپنی باج گزار ریاستوں کو اسلام کے پرچم تلے دیکھ کر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اگر اسے اسلامی افواج کے چین کی سرحد پر آ جانے کی اطلاع نہ ملتی تو شاید وہ کچھ ہی دنوں میں وسطِ ایشیا کو دوبارہ فتح کرنے کی کوشش کرتا، مگر اب اسے یہی بہتر محسوس ہوا کہ بات چیت کر کے کسی طرح اپنا ملک بچا لیا جائے۔ بے پناہ طاقت کا مالک ہونے کے باوجود وہ تکبیر کے نعروں سے مرعوب ہو چکا تھا۔

اس نے مذاکرات کے لیے قُتَیبہ سے سفارتی وفد طلب کیا۔ قُتَیبہ نے ہُبَیرَہ بن مُشَمْرَج کو دس معزز مسلمانوں کے

① الكامل في التاريخ، سنة ۹۳هـ
② الكامل في التاريخ، سنة ۹٤هـ

ساتھ دربارِ چین میں بھیج دیا۔ خاقان چین آخر تک مسلمانوں کو مرعوب کر کے واپسی پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ کئی ملاقاتوں کے بعد آخر اس نے کہا:

''اپنے سردار سے کہہ دو کہ وہ لوٹ جائے۔ مجھے تمہاری فوج کی تعداد کا علم ہے۔ اگر تم باز نہ آئے تو میں ایسی فوج بھیجوں گا جو تمہارا نام ونشان مٹا دے گی۔''

ہُبَیرَہ بن مُشَمرِج نے کہا: ''آپ ایسی قوم کی تعداد کم کیسے کہہ سکتے ہیں جس کا ایک سرا چین کی سرحد پر ہے اور دوسرا شام میں۔ ہم موت سے نہیں ڈرتے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ جہاد میں جان دینا ہمارے لیے عزت کی بات ہے؛ اس لیے ہم کو قتل ہو جانے سے نہ کوئی عار ہے نہ خوف۔ ہمارے امیر نے قسم کھائی ہے کہ جب تک اپنے قدموں سے تمہاری سرزمین پامال کر کے خراج وصول نہ کر لیں وہ واپس نہیں جائیں گے۔''

اس جواب نے نفسیاتی طور پر خاقان کو پسپا کر دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ مسلمان عزم کے پکے ہیں۔ اس نے خراج کی خطیر رقم اور بہت سے تحائف دے کر وفد کو واپس بھیجا۔ قُتَیبَہ کا مقصد بھی صرف خاقان چین کو مرعوب کر کے اسے باغیوں کی سرپرستی سے روکنا تھا۔ یہ مقصد بخیر وخوبی حاصل ہو گیا تھا۔

عالم اسلام کی سرحدیں اب چین سے جا ملی تھیں۔ پے در پے فتوحات نے پورے عالم اسلام میں قُتَیبَہ کی معرکہ دائی کی دھوم مچا دی تھی۔ ①

◆◆◆

① الكامل في التاريخ، سنة ٩٦ھ

فتح اَندَلُس

اندلس کا محلِ وقوع اور جغرافیہ:

اَندَلُس ایک جزیرہ نما ہے۔ اس کے مشرق اور جنوب میں بحیرۂ روم ہے۔ شمال مغرب اور جنوب مغرب میں بحرِ اوقیانوس (بحرِ ظلمات یا اٹلانٹک سی) ہے۔ مغرب میں اس کی سرحد پرتگال سے اور شمال میں فرانس سے جا ملتی ہے۔

اس ملک کو یونانیوں نے ''آئبیریا'' کے نام سے پکارا، رومیوں نے اسے ''ہسپانیہ'' کہا اور عربوں نے اسے ''اَنْدُلُس'' کا نام دیا۔ عرب جغرافیہ دان ادریسی کے قول کے مطابق اس ملک کا طول تقریباً گیارہ سو میل اور عرض چھ سو میل کے لگ بھگ ہے۔ قرطبہ، غرناطہ، مرسیہ، المریہ، مالقہ، بسطہ، البلاطہ، بطلیوس، شریسہ، طلیطلہ، سرقسطہ، طرطوشہ اور قستالیہ یہاں کے مشہور صوبے رہے ہیں۔ جبل الثلج، الشارات، البشارات، جبل البرانس اور جبل الطارق مشہور پہاڑی سلسلے ہیں۔ دو درجن کے لگ بھگ دریا ان بلند و بالا پہاڑوں سے بہہ کر سرزمین اَندَلُس کے چپے چپے کو سیراب کرتے ہوئے بحیرہ روم اور بحر اوقیانوس میں جا گرتے ہیں۔ ان میں دریائے وادی الکبیر اور دریائے نیکس زیادہ مشہور ہیں۔

اَندَلُس آب و ہوا کے لحاظ سے یورپ کے تمام ممالک سے بہتر اور معتدل ہے۔ چاندی، سونا، پارا، قیمتی پتھر اور عمارتی پتھر یہاں کی خاص معدنیات ہیں۔ گیہوں، مکئی، چنا، سنترے، بادام، انار، کیلا، آڑو، صندل، زعفران، ادرک اور عود یہاں کی اہم پیداوار شمار ہوتی ہیں۔ [1]

اِسلام سے پہلے اندلس کی تاریخ:

زمانہ قبل از مسیح سے اَندَلُس پر رومیوں کی حکومت چلی آ رہی تھی مگر ولادتِ عیسیٰ علیہ السلام کے پانچ صدیوں بعد وسطی اور مشرقی یورپ سے غیر متمدن گاتھ قوم کے طوفانی حملوں نے اَندَلُس کی رومی سلطنت کے پرخچے اڑا دیے اور ۵۰۰ء میں یہ ملک گاتھ قوم کے وحشیوں کے ہاتھ آ گیا۔ اگرچہ گاتھ عیسائی مذہب قبول کر چکے تھے، مگر عیسیٰ علیہ السلام کے سچے دین کے مٹ جانے کے بعد وہ بھی کفر و شرک کی وادیوں میں بھٹکنے لگے۔ دو صدیوں تک یہ ملک گاتھ قوم کے ہاتھوں یرغمال بنا رہا۔ ان کے دورِ حکومت میں پادریوں کو کھلی چھٹی تھی کہ وہ جو چاہیں کرتے پھریں، چنانچہ اَندَلُس کی غیر عیسائی اقلیتیں پادریوں کے ظلم و ستم کے بوجھ تلے سسک رہی تھیں۔

گاتھ قوم کے آخری بادشاہ وٹیزا نے جب پادریوں کی زیادتیوں سے عوام کو گھٹ گھٹ کر مرتے دیکھا تو اس نے

---

[1] صفۃ جزیرۃ الاَندَلُس: ۳۲/۱، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد اوّل، مادہ: اَندَلُس

مذہب کے نام پر انسانیت کے اس استحصال کو روکنے کا ارادہ کیا مگر پادریوں کا اثر ورسوخ بادشاہ سے کہیں بڑھ کر تھا۔ انہوں نے سازشیں کرکے وٹیزا کو معزول کرادیا اور ایک تشدد پسند فوجی جرنیل راڈرک (لرزیق) کو تخت شاہی پر لا بٹھایا۔ ①

اندلس پر صحابہ کرام کی لشکر کشی:

یورپ زمانہ نبوت ہی سے صحابہ کرام کی نگاہوں میں تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے **قُسطَنطِینیہ** کے جہاد میں شرکت کرنے والوں کے لئے جنت کی بشارت نے صحابہ کرام میں سے ہر معمر و جوان کو مشرقی یورپ کی طرف بھیجے جانے والے لشکروں میں شرکت کے لئے اپنا نام پیش کرنے کے لیے بے تاب کررکھا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ **قُسطَنطِینیہ** کی خلیج تک یلغار کرچکے تھے مگر تین اطراف میں سمندر سے گھرے شہر کی جغرافیائی قلعہ بندی نے حملے کو تقریباً ناممکن بنا رکھا تھا۔ آخر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے طویل صلاح ومشورے کے بعد فیصلہ کیا کہ پہلے مغربی یورپ پر یلغار کرکے اسپین پر قبضہ کیا جائے، اس کے بعد راستے میں حائل ہونے والے ممالک فتح کرتے ہوئے مسلمان **قُسطَنطِینیہ** تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ یوں اَندَلُس پر حملوں کا آغاز ہوا۔

اس وقت تک شمالی اور مغربی افریقہ کے بیشتر علاقے مسلمان فتح کرچکے تھے۔ افریقہ کے شمال میں بحیرۂ روم بہتا ہے جسے بحیرۂ متوسط بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مشرق سے مغرب کی طرف بہتے ہوئے بتدریج تنگ ہوتا جاتا ہے اور مراکش کے ساحل ''سَبتَہ'' پر ایک آبنائے کی شکل اختیار کرلیتا ہے جس کے دوسرے کنارے پر اَندَلُس کا مشہور ساحل ''الجزیرۃ الخضراء'' واقع ہے۔ یہاں سمندر کا عرض تقریباً ۲۰ کلومیٹر رہ جاتا ہے۔ ۲۷ھ میں خلیفہ سوم کے حکم سے ایک لشکر نے یہی سمندر عبور کرکے اَندَلُس پر حملہ کیا اور کچھ علاقہ فتح کرلیا۔ اَندَلُس میں مسلمانوں کا یہ پہلا قدم تھا۔ مگر یہ فتح پائیدار نہ تھی۔ ② آخرکار ولید بن الملک کے دورِ خلافت میں اس خطے کو پوری طرح مسخر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

موسیٰ بن نُصیر، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رفاقت سے مراکش کی گورنری تک:

اس زمانے میں افریقہ کے گورنر موسیٰ بن نُصیر رحمہ اللہ تھے، ان کا شمار تابعین میں ہوتا ہے۔ ۱۹ھ میں پیدا ہوئے تھے، وہ حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے روایتِ حدیث کرتے تھے، بڑے بھاری بھرکم انسان تھے، انہیں بحری جنگوں کا بڑا تجربہ تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں قبرص میں تعمیراتی کاموں کی ذمہ داری سونپی تھی۔ موسیٰ بن نُصیر کو دیکھ کر وہ فرماتے تھے:

''حکمران کو چاہیے کہ ایسے لحیم شحیم آدمی کو معاون بنائے۔''

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے دور میں موسیٰ بن نُصیر رحمہ اللہ نے ان کی بیعت کرلی، معرکہ مرج راہط میں وہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی حمایت میں مروان بن الحکم کے بالمقابل شمشیر بکف ہوئے مگر بعد میں اہلِ شام کو غالب ہوتا دیکھ کر وہ مروان کے بیٹے عبدالعزیز (عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے والد) کی پناہ میں چلے گئے۔ ③

---

① نفح الطیب: ۱/۱۳۷ تا ۱۴۰؛ الکامل فی التاریخ، سنۃ ۹۲ھ
② الکامل فی التاریخ: ۲/۴۶۶
③ تاریخ دمشق: ۶۱/۲۱۲، ۲۱۳

عبدالعزیز کو مصر کی گورنری ملی تو موسیٰ بن نُصیر رحمہ اللہ کو ان کے وزیر کا رتبہ حاصل ہوا۔ ۷۹ھ میں انہیں افریقہ کا گورنر بنا دیا گیا۔ انہوں نے اسی سال مراکش پر یلغار کی اور خود فوج لے کر ان بربر قبائل پر حملہ کیا جنہوں نے اپنے سردار کُسیلہ کی قیادت میں ۶۴ھ میں عقبہ بن نافع کو غداری کر کے قتل کیا تھا۔ موسیٰ بن نُصیر رحمہ اللہ نے دو سال یہاں جہاد جاری رکھا، اس دوران کُسیلہ اور اس کا لشکر مسلسل پسپا ہوتا رہا۔ موسیٰ بن نُصیر رحمہ اللہ ۸۱ھ میں ان کے بیس ہزار افراد کو قیدی بنا کر واپس ہوئے۔ اگلے دس برسوں میں انہوں نے شمالی افریقہ کے باغیوں کی مکمل سرکوبی کر کے صنہاجہ، قولہ اور سوسِ اقصیٰ بھی فتح کر لیے۔ ایک لاکھ سے زائد بربری جنگجو قیدی بنے جن میں سے بہت سے اسلام قبول کر کے لشکرِ محمدی کے سپاہی بن گئے۔ ۸۹ھ میں موسیٰ کی فوجوں نے سسلی اور اندلس کے درمیان سمندر میں واقع دو اہم جزیروں: مَیُورقہ اور منُورقہ کو فتح کر لیا۔ اب بحیرۂ روم میں مسلمانوں کے بحری جہازوں کا راج تھا اور وہ دشمن کے جزائر پر حملے کرنے کے لیے آزاد تھے۔ محرم ۹۳ھ میں اسلامی سلطنت کی حدود مراکش کے شہر طنجہ تک پہنچ گئیں۔ یوں افریقہ کی اسلامی حکومت پہلی بار اتنی مستحکم ہوئی کہ اب اسے مرکز بنا کر یورپ پر حملہ کیا جا سکتا تھا۔ ①

طارق بن زیاد: غلامی سے طنجہ کی حکومت تک:

موسیٰ بن نُصیر رحمہ اللہ نے طنجہ میں اپنے آزاد کردہ غلام طارق بن زیاد کو نائب مقرر کر دیا۔ طارق بن زیاد کا نام اسلام کے ان عظیم جرنیلوں کی فہرست میں شامل ہے جن کی قوتِ ایمانی، اولوالعزمی، معرکہ دانی اور جنگ آزمائی نے ساری دنیا سے اپنا لوہا منوایا ہے۔ وہ جرأت، شجاعت، استقامت اور عزیمت کا پیکر تھے۔ ان کا تعلق افریقہ کے بربر قبائل سے تھا جو اسلام سے پہلے مار دھاڑ اور قتل و غارت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، مگر جب اسلام کی روشنی افریقہ کے گھنے جنگلات اور تپتے ہوئے صحراؤں تک پہنچی تو بربر قبائل اسلام کی فتوحات کا ہراول دستہ ثابت ہوئے۔

ان کی ایک بڑی تعداد جو مراکش کی ابتدائی جنگوں میں غلام بنالی گئی تھی، قبولِ اسلام کے بعد اپنے مسلمان آقاؤں کی قیادت میں بڑی بے جگری سے ہر معرکے میں حصہ لیتی رہی۔ طارق بن زیاد شروع میں موسیٰ بن نُصیر رحمہ اللہ کے غلام تھے، انہوں نے موسیٰ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ طارق کی خداداد صلاحیتوں سے متاثر ہو کر موسیٰ بن نُصیر رحمہ اللہ نے انہیں آزاد کر دیا تھا اور بعد میں مراکش کے فوجی مستقر ''طنجہ'' کا حاکم مقرر کر دیا۔ ②

طنجہ کے ساحل پر بحیرۂ روم کی لہریں بحر اوقیانوس سے جا ملتی ہیں۔ یہاں سے مغرب کی جانب نگاہ ڈالیں تو بحر اوقیانوس کی موجیں آسمان کے آخری کنارے تک متلاطم نظر آتی ہیں جبکہ شمال میں بحیرۂ روم کے پار جنوبی اسپین کے بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیاں دوربین کے بغیر دیکھی جا سکتی ہیں۔ چالیس کلومیٹر کے لگ بھگ یہ فاصلہ طارق بن زیاد جیسے اولوالعزم سپاہیوں کے لیے کچھ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ مجاہدین آ بنائے کے پار اسپین کے ساحل کی دھندلی لکیر پر نگاہ

① تاریخ دِمَشق: ۶۱/۲۱۵، ۲۱۷؛ فتوح البلدان، ص ۲۲۸؛ نفح الطیب: ۱/۲۳۰

② البیان المغرب فی اخبار الأندلس و المغرب: ۱/۴۳؛ الاعلام للزرِکلی: ۳/۲۱۷؛ تاریخ الاسلام للذھبی: ۶/۳۳۹

ڈال کر اس سرزمین کے مظلوم باسیوں کو جبر و جور کی حکمرانی سے نجات دلانا اور اس ظلمت کدے میں دین کے چراغ جلانا چاہتے تھے مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ امیر موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ کو خلیفہ کی طرف سے اجازت مل جاتی۔ ①

کاؤنٹ جولین اور فلورنڈا:

موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ اسپین پر حملے کے لئے سنجیدہ تھے مگر اس سے قبل وہ مراکش کے ساحل پر طَنجہ کے قریب واقع نصرانیوں کے آخری مضبوط مرکز سَبتہ پر قبضہ کرنا ضروری سمجھتے تھے، جو اسپین کے بادشاہ راڈرک کے نائب کاؤنٹ جولین کا مضبوط گڑھ تھا اور کاؤنٹ جولین بڑا جنگجو کمانڈر تھا۔

اسلامی لشکر دو حملوں کے باوجود سَبتہ کو اس کے آہنی ہاتھوں سے نہیں چھین سکا تھا۔ سَبتہ کے نصرانی سالار کی کامیاب مزاحمت اور دیگر مہمات میں موسیٰ بن نُصَیر کی مصروفیات کے باعث ممکن تھا کہ اسپین پر مجاہدین اسلام کے عمومی حملے کا منصوبہ مزید مؤخر ہو جاتا مگر اچانک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس کے بعد اس نیک کام میں دیر کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ ②

حاکمِ سَبتہ کاؤنٹ جولین کی بیٹی فلورنڈا اسپین کے دارالحکومت طلیطلہ (تولیڈو) میں راڈرک کے محل میں تعلیم و تربیت حاصل کر رہی تھی۔ راڈرک پرلے درجے کا بے حیا، عیاش اور درندہ صفت انسان تھا۔ اس نے فلورنڈا کی عصمت پامال کر دی۔ مظلوم لڑکی نے باپ کو خفیہ مراسلہ بھیج کر اس قیامت کی خبر دی، کاؤنٹ جولین غصے سے بے تاب ہو گیا مگر کیا کرتا، خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس میں بادشاہ کے ظلم کے خلاف احتجاج کی سکت نہ تھی۔ آخر کار اس نے تہیہ کر لیا کہ عرب کے جانبازوں کو اسپین کا راستہ دکھا کر وہ راڈرک سے اس زیادتی کا بدلہ لے گا۔ اس نے اپنی ناراضگی کو پوشیدہ رکھا اور دارالحکومت پہنچ کر بادشاہ کے سامنے نہایت مؤدبانہ اور نیازمندانہ انداز میں التجا کی:

''فلورنڈا کی ماں موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا ہے، اسے میرے ساتھ سَبتہ جانے کی اجازت عنایت کیجیے۔''

راڈرک نے اسے اصل واقعے سے لاعلم سمجھتے ہوئے اس کی اجازت دے دی۔ جولین فلورنڈا کو لے کر روانہ ہوا تو راڈرک نے کہا: ''میں نے سنا ہے کہ افریقہ کے باز بہت عمدہ ہوتے ہیں، میرے لیے چند باز بھجوا دینا۔''

جولین نے جواب دیا: ''میں ایسے باز بھیجوں گا جو آپ نے کبھی نہ دیکھے ہوں گے۔''

سَبتہ پہنچتے ہی جولین نے موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ سے رابطہ کیا اور انہیں اپنی حمایت کا یقین دلاتے ہوئے فوراً اسپین پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ نے موقع غنیمت جانتے ہوئے دربار خلافت سے اجازت مانگی، خلیفہ ولید نے کہا کہ چھاپہ مار حملے کرو۔ مسلمانوں کو سمندر کی ہولناکیوں میں مت ڈالو۔

موسیٰ رحمہ اللہ نے جواب بھیجا: ''یہ بڑا سمندر نہیں، محض خلیج ہے۔ اَندَلُس کا ساحل سامنے دکھائی دیتا ہے۔''

آخر ولید نے اس شرط پر اجازت دے دی کہ پہلے چھاپہ مار حملہ کر کے دشمن کی طاقت دیکھ لی جائے۔ ③

① الکامل فی التاریخ، سنة ۹۲ھ؛ نفح الطیب: ۱/۲۳۰

② نفح الطیب: ۱/۲۳۱؛ فتوح البلدان، ص ۲۲۸

③ الکامل فی التاریخ، سنة ۹۲ھ؛ قصة العرب فی اسبانیا سٹینلے لین پول (تعریب علی جازم؛ لک) ص۱۸، ۱۹؛ نفح الطیب: ۱/۲۵۱، ۲۵۲

موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ نے اجازت ملتے ہی پہلے رمضان ۹۱ھ میں طَرِیف بن مالک کی قیادت میں ایک چھاپہ مار فوج بھیجی، اس کے بعد شیخ ابوزُرعہ کی کمان میں رضا کار بربروں نے آبنائے عبور کر کے ساحل اَندَلُس پر کامیاب حملے کیے۔ یہ حملے ''ریکی'' کی حیثیت رکھتے تھے جن سے مسلمانوں نے حالات کے سازگار ہونے کا اندازہ کرلیا۔

رمضان ۹۲ھ (۷۱۱ء) میں موسیٰ بن نُصَیر کی منصوبہ بندی کے مطابق طارق بن زیاد نے تین سو عرب اور ۶ ہزار ۷ سو بربر سپاہیوں کے ساتھ کشتیوں پر سوار ہو کر اسپین کا رُخ کیا۔ کاؤنٹ جولین راہنمائی کے لیے ان کے ساتھ تھا۔[1]

غیبی بشارت:

راستے میں طارق بن زیاد کو خواب میں جناب رسول اللہ ﷺ کی زیارت ہوئی۔ دیکھا کہ نبی الملاحم ﷺ مہاجرین وانصار کی مسلح جماعت کے ساتھ تشریف فرما ہیں اور فرما رہے ہیں: ''اے طارق! اسی شان سے قدم بڑھاتے رہو۔''

پھر دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے ساتھ اَندَلُس میں داخل ہو رہے ہیں۔ طارق بن زیاد نے خواب میں خود کو اس مقدس جماعت کے پیچھے پیچھے اَندَلُس میں داخل ہوتے دیکھا۔ مسلمانوں نے اس خواب کو ایک غیبی بشارت سمجھا، جس سے ان کا حوصلہ بلند تر اور عزم پختہ تر ہوگیا۔ انہوں نے اسے فتح کا پیش خیمہ یقین کیا۔

منگل ۵ رجب ۹۲ھ (۷۱۱ء) کو اسلامی لشکر اَندَلُس کے ساحل پر ایک فلک بوس پہاڑ کے سامنے لنگر انداز ہوا۔ یہ پہاڑ بعد میں جبل الطارق کے نام سے مشہور ہوا۔ آج کل اسے جبرالٹر کہا جاتا ہے۔[2]

ہر ملک ملکِ ماست:

مشہور ہے کہ طارق بن زیاد رحمہ اللہ نے اَندَلُس کے ساحل پر لنگر انداز ہوتے ہی اپنے بحری بیڑے کو نذر آتش کرا دیا تھا، ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ ان کے سپاہیوں کے دلوں میں فرار کا کوئی وسوسہ نہ آنے پائے اور وہ فتح یا شہادت کے سوا کسی تیسری صورت کا تصور تک نہ کریں۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اس واقعے کو منظوم انداز میں یوں پیش کیا ہے:

طارق چو برکنارۂ اَندَلُس سفینہ سوخت
گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن، باز چوں رسیم؟
ترکِ سبب زروئے شریعت کجا رواست؟
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر بُرد و گفت
ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

(طارق بن زیاد نے جب اَندَلُس کے ساحل پر اپنے سفینے جلا دیے تو لوگوں نے کہا: ''عقل کی نگاہ میں آپ کا یہ کام غلط ہے، ہم وطن سے دور ہیں، واپس کیسے جائیں گے؟'' اسباب و ذرائع کو

---

[1] الکامل فی التاریخ، سنة ۹۲ھ ؛ نفح الطیب: ۲۵۴،۲۵۳/۱
[2] نفح الطیب: ۲۵۴،۲۳۱/۱

ترک کرنا ازروئے شرع بھلا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟ طارق نے تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہنس کر کہا: ''ہر ملک ہمارا ملک ہے؛ اس لیے کہ وہ ہمارے پروردگار کا ملک ہے۔'' ①

طارق بن زیاد نے چند روز جبل الطارق پر قیام کرنے کے بعد پہلے پہاڑ کے سامنے واقع شہر قرطاجنہ (کارتیہ) اور پھر جزیرۃ الخضراء پر کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر قبضہ کر لیا۔

ڈیوک تھیوڈومر جو جنوبی اسپین کے ساحلی علاقوں کا گورنر تھا، طارق کی پیش قدمی سے سراسیمہ ہوگیا۔ اس نے لشکر تیار کر کے ایک مقام پر طارق سے مقابلہ کیا، مگر منہ کی کھائی اور الٹے پاؤں وسطی اسپین کی طرف پسپا ہوگیا۔ ساتھ ہی اس نے تیز رفتار قاصد کے ذریعے راڈرک کو یہ پیغام بھیجا: ''ہماری سرزمین پر ایسے لوگوں نے حملہ کیا ہے کہ ہم نہیں جانتے وہ آسمان سے نازل ہوئے ہیں یا زمین سے نکل آئے ہیں۔'' ②

بارہ ہزار بمقابلہ ایک لاکھ:

مسلمانوں کی پیش قدمی کی اطلاع سے راڈرک کے اوسان خطا ہوگئے۔ اس کے لیے یہ خبر مزید پریشانی کا باعث بنی کہ اس فوج کی راہنمائی کاؤنٹ جولین کر رہا ہے۔ راڈرک نے فوج کی عام بھرتی کا اعلان کیا، مذہب اور وطن کے نام پر اپنے بہت سے مخالفین اور گاتھ خاندان کے شہزادوں کو بھی ساتھ ملایا اور قرطبہ کے دریائے وادی الکبیر کے پار ایک فوجی کیمپ بنا کر ایک لاکھ سپاہیوں کا ٹڈی دل لشکر تیار کر لیا۔ طارق بن زیاد کے پاس اس وقت صرف سات ہزار سپاہی تھے۔ مراکش میں موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ کو پل پل کی اطلاعات مل رہی تھیں۔ دشمن کی اتنی بڑی جمعیت کا حال سن کر انہوں نے طارق کے لیے ۵ ہزار سپاہیوں کی کمک بھیج دی۔ یوں مجاہدین اسلام کی تعداد بارہ ہزار ہوگئی۔ ③

---

① طارق بن زیاد کے کشتیاں جلانے کا یہ قصہ بہت مشہور مگر بوجوہ مشکوک ہے۔ تاریخ میں اس کا ذکر سب سے پہلے محمد بن عبداللہ طالبی شریف الادریسی (م ۵۶۰ھ) کی تصنیف میں ملتا ہے۔ وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ عرب سپاہی طارق کی جرأت پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ طارق نے یہ اقدام کر کے ان کے شبہات کی نفی کر دی۔ ان العرب لا تثق به واراد ان ینفي عن نفسه التهمة فامر باحراق المراكب التي جاز بها فبرئ بذالك مما اتهم به. (نزہۃ المشتاق: ۲/۵۴۰) پھر ابن کردبوس (م ۵۷۵ھ) نے یہی نقل کیا ہے۔ (الاکتفاء فی اخبار الخلفاء: ۲/۱۰۰۷، ط مدینہ منورہ)

گیارہویں صدی ہجری کے مؤرخ المقری نے نقل کیا ہے کہ راڈرک کے افسران نے یہ اسے اطلاع دی تھی کہ مسلمان اپنی کشتیاں جلا کر آئے ہیں تاکہ واپسی سے مایوس ہوجائیں۔ قد حرقوا مراكبهم ياسا لانفسهم من التعلق بها. ﴿نفح الطیب: ۱/۲۵۸، ط دار صادر﴾

الادریسی اور ابن کردبوس چھٹی اور المقری گیارہویں صدی ہجری کے مؤرخ ہیں۔ انہوں نے کسی قدیم ماخذ یا سند کا حوالہ نہیں دیا؛ اس لیے ان بیانات کی استنادی حیثیت کمزور ہوجاتی ہے۔ بعض مؤرخین نے طارق بن زیاد کی تقریر میں ایک ایسا جملہ ''این المفر البحر من ورائكم والعدو امامكم'' نقل کیا ہے جس سے یہ امکان نکالا جاسکتا ہے کہ مسلمان اندلس میں داخل ہوتے وقت اپنا بحری بیڑا جلا چکے ہوں۔ (نفح الطیب: ۱/۲۴۰) بہرکیف قدیم مآخذ میں کشتیاں جلانے کا ذکر صراحتاً کہیں نہیں ملا۔ یہ پہلو بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ جنگ سے پہلے اپنی فوج کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنا طارق بن زیاد کے پیش نظر تھا تبھی مراکش سے مزید کمک طلب کی گئی تھی۔ واپسی کا راستہ کھلا رکھنا کمک سے کہیں زیادہ ضروری تھا تاکہ شکست کی صورت میں مکمل تباہی سے بچاؤ ہوسکے۔ اس پہلو کو دیکھتے ہوئے سپہ سالار کا کشتیاں جلا کر واپسی کا راستہ خود مسدود کر دینا ناممکن نہ سہی مگر محلِ نظر ضرور ہے۔ ہم کشتیاں جلانے کے واقعے کا انکار نہیں کر رہے بلکہ اس کی تحقیق کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ ابوعبداللہ الذہبی نے ''اباطیل یجب ان تمحی من التاریخ'' میں اس پر مفصل کلام کیا ہے اور کشتیاں جلانے کو ایک کمزور دعویٰ قرار دیا ہے۔

② الكامل في التاريخ، سنة ۹۲ھ ؛ نفح الطيب: ۱/۲٤۰

③ نفح الطيب: ۱/۲۳۲ ؛ الكامل في التاريخ: ٤/٤۰

راڈرک اپنے سپاہیوں کے سیل بے کراں کے ساتھ جنوبی اَندلُس کی طرف تیزی سے پیش قدمی کرتا ہوا دریائے گوڈالیٹ کے دائیں کنارے تک آن پہنچا، طارق بھی اپنے مجاہدوں کے ہمراہ اس مقام تک آ چکے تھے۔

دونوں فوجیں بحرمحیط کے ساحل سے لگ بھگ پانچ سات میل دور ٹریس کی وادی میں (جسے وادیٔ لکّہ یا گوڈالیٹ کہا جاتا ہے) فروکش ہوئیں اور جنگ کی تیاریوں کو آخری شکل دینے لگیں۔[1] مسلمانوں سے ٹکر لینے سے قبل ان کی فوج کا جائزہ لینا ضروری سمجھتے ہوئے راڈرک نے اپنے جاسوسوں کو مسلمانوں کے روپ میں اسلامی کیمپ کی طرف روانہ کیا، یہ جاسوس اسلامی لشکر میں گھوم پھر کر حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا وہ ان کے لیے نہایت حوصلہ شکن تھا۔ مسلمانوں کے جوش و جذبے سے تمتماتے ہوئے چہروں اور وطن سے دوری کے باوجود ان کے انداز و اطوار میں اطمینان اور بے خوفی کی جھلک نے ان کے دلوں میں مجاہدین کی ہیبت بٹھا دی۔

جاسوسوں نے واپس جا کر راڈرک سے کہا: ''یہ حملہ آور یا اپنی موت کے طلب گار ہیں یا آپ کی سرزمین کے۔ انہوں نے اپنے بحری جہاز بھی جلا دیے ہیں تاکہ واپسی سے مایوس ہو جائیں اور اس سرزمین پر ثابت قدمی کے ساتھ صفیں بنا چکے ہیں۔''[2]

طارق بن زیاد کا تاریخی خطاب:

طارق بن زیاد ایک ماہر سپہ سالار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شعلہ بیان خطیب بھی تھے، اگرچہ وہ افریقی بربر تھے، مگر عربی روانی سے بول سکتے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کن لڑائی سے قبل رات کو اپنے سپاہیوں کے سامنے ایک ولولہ انگیز تقریر کی جس کا ایک ایک لفظ ایمان کی جاوداں حرارت لئے ہوئے ہے اور جس کا ہر جملہ آج بھی روح کی گہرائیوں میں اترتا اور خون کی گردش تیز کرتا محسوس ہوتا ہے، طارق نے کہا:

''اے لوگو! بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟ تمہارے پس پشت سمندر ہے اور آگے دشمن ہے۔ اللہ کی قسم!

---

① میدانِ جنگ کے بارے میں مشہور رائے یہی ہے کہ جنگ وادیٔ لکّہ (دریائے گوڈالیٹ کے کنارے) میں واقع ہوئی تھی مگر یہاں ایک دوسری رائے بھی ہے جس کے مطابق یہ جنگ وادیٔ بکّہ (جھیل لاجنڈا کے ساحل پر) میں ہوئی تھی۔ مولانا غلام رسول مہر مرحوم لکھتے ہیں:

''ہسپانیہ کے جنوبی و غربی گوشے میں دو دریا بہتے ہیں جن کے درمیان خاصا فاصلہ ہے: ایک دریائے لطہ یا لکّہ ہے۔ دوسرا دریائے برباط یا بکّہ ہے۔ جس کے راستے میں جھیل لاجنڈا آتی ہے۔ اس دریا کے کنارے دو بڑے شہر آباد ہیں: ایک برباط اور دوسرا بکّہ۔ لہٰذا دریا کے دو نام پڑ گئے۔ اب یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ طارق اور راڈرک میں فیصلہ کن جنگ البحیرہ (جھیل لاجنڈا) کے قریب وادی برباط یا وادیٔ بکّہ میں ہوئی تھی۔ (اطلس فتوحاتِ اسلامی: ص ۲۶۰، بحوالہ حاشیہ انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم: ۱/ ۱۸، حاشیہ مولانا غلام رسول مہر)

② نفح الطیب للمقری: ۱/ ۲۵۸

بعض عرب ماہرین لغات کا کہنا ہے کہ ہسپانوی زبان میں ''کشتیاں جلانا'' ایک استعارہ ہے جس کا مطلب ہے: ''اپنی ساری طاقت خرچ کر دینا، یعنی جنگ کرو یا مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' (احرقتُ کُلَّ سُفُنی ...... ای، بذلت کُلَّ طاقتی بمعنیٰ قاتلوا او موتوا.)

پس عین ممکن ہے کہ مسلمانوں کے عزم مصمم یا طارق بن زیاد کی تقریر کو کسی اسپینی نے اپنے محاورے کے مطابق نقل کر کے کشتیاں جلانے کا لفظ استعمال کیا ہو اور بعد والوں نے اسے حقیقت پر محمول کر لیا ہو۔

تمہارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ تم ڈٹ جاؤ اور ثابت قدم رہو۔ اچھی طرح جان لو کہ تمہاری حیثیت اس جزیرہ نما میں اس یتیم سے بھی گئی گزری ہے جو کمینوں کے دستر خوان پر ہو۔

تمہارا حریف لشکر اور اسلحہ کے ساتھ تمہارے مقابلے پر آ چکا ہے، اس کے پاس کھانے پینے کا سامان بھی کافی ہے۔ جبکہ تمہارا یہ حال ہے کہ تلواروں کے سوا تمہارے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔ خوراک بھی تمہیں اسی قدر مہیا ہو سکتی ہے جتنی تم دشمن سے چھین سکو۔ اگر تمہارا وقت اسی طرح بے سروسامانی کے عالم میں گزرتا رہا اور تم نے کچھ نہ کیا تو تمہارا بھرم کھل جائے گا۔ جو لوگ تم سے مرعوب ہیں وہ تمہارے مقابلے میں جری ہو جائیں گے؛ لہٰذا تم اس سرکش قوم کو شکست دے کر انجام کی رسوائی سے خود کو بچا لو۔ وہ قلعہ بند شہروں سے نکل کر تمہارے سامنے آ گئے ہیں۔ اگر تم موت کے لیے تیار ہو تو اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھا سکتے ہو۔

جس بات سے میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں میں خود بھی اس سے غافل نہیں ہوں۔ میں تمہیں ایسے راستے پر لے چلوں گا جس میں زندگی سب سے زیادہ بے قیمت شمار ہوتی ہے۔ یاد رکھو! اگر تم نے کچھ وقت تکالیف پر صبر کر لیا تو زمانہ دراز عیش و راحت سے گزارو گے۔

خوب اچھی طرح سمجھ لو میں تمہیں جو دعوت دے رہا ہوں اس کو قبول کرنے والا سب سے پہلا شخص میں خود ہوں۔ جیسے ہی دونوں فوجیں آپس میں بھڑیں گی، میں ان کفار کے سربراہ لذریق (راڈرک) پر حملہ کر کے ان شاء اللہ اسے قتل کر دوں گا، تم بھی میرے ساتھ حملہ آور ہونا۔ اگر میں لذریق (راڈرک) کو قتل کرنے کے بعد شہید ہو گیا تو تمہارا کام پورا کر جاؤں گا، پھر تم کسی بہادر، بیدار مغز آدمی کو امیر بنا لینا اور اگر میں لذریق کو مارنے سے پہلے قتل ہو گیا تو تم میرے اس عزم کو پورا کر دینا اور تم خود اس پر حملہ آور ہونا۔ یقیناً اس کے قتل سے اس جزیرہ نما کی فتح کا منصوبہ کامیاب ہو جائے گا؛ اس لئے کہ اس کے بعد دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے گا۔''[1]

معرکۂ وادی لَکّہ:

یہ رمضان کا مہینہ تھا، ۲۷ویں شب تھی، مسلمان رات بھر عبادت و ریاضت، ذکر و تلاوت اور دعاؤں میں مشغول رہے۔ تلواریں اور خنجر تیز کر لیے گئے، گھوڑوں پر زینیں کس لی گئیں، افق پر سحر کے آثار نمودار ہوئے تو سرزمینِ اندلس پر مجاہدین کی اذانیں ہوا کے دوش پر دور دور تک سنائی دے رہی تھیں۔

نمازِ فجر کے بعد مجاہدین اسلام میدان جنگ میں صف آراء ہوئے یہ ۲۷ رمضان المبارک ۹۲ھ (۱۹ جولائی ۷۱۱ء) کی تاریخی صبح تھی۔ یہ وہی یادگار دن تھا جس میں طارق بن زیاد کے دل سے نکلنے والی دعاؤں کو اقبال مرحوم کے تخیل نے زبان بخش کر اس شہرۂ آفاق نظم میں ڈھال دیا:

[1] نفح الطیب: ۱/۲۴۰، ۲۴۱

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی
خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے

جنگ کے نقارے پر چوٹ پڑی اور دونوں لشکر ایک دوسرے پر پل پڑے۔ بارہ ہزار افراد پر مشتمل اسلامی لشکر کے اکثر سپاہی پیدل تھے۔ ان کے پاس ننگی تلواروں، عربی کمانوں اور نیزوں کے سوا کوئی اسلحہ نہ تھا، جبکہ راڈرک کی اکثر فوج گھڑ سوار تھی۔ وہ زرہ بکتروں میں ملبوس تھے اور ہر قسم کا بہترین اسلحہ انہیں مہیا تھا۔ ان کے لیے خوراک و رسد اور کمک کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔ خود راڈرک بڑے غرور کے ساتھ قلب لشکر میں پہیوں والے شاندار مرصع تخت پر بیٹھا تھا، اس تخت کے آگے دو گھوڑے جوتے گئے تھے۔ راڈرک اس متحرک تخت پر بیٹھے بیٹھے اپنی فوج کا جائزہ لے رہا تھا اور اسے احکامات دے رہا تھا۔ گھمسان کی جنگ میں دونوں فریقوں کا جوش و خروش قابل دید تھا۔ نصرانیوں کے گھڑ سوار دستے جب گرد و غبار کے بادل اڑاتے پیادہ مسلم سپاہیوں پر حملہ آور ہوتے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کے سامنے آنے والی ہر شے تہہ و بالا ہو جائے گی اور مزاحمت کرنے والے مسلمان گھوڑوں کے سموں تلے کچلے جائیں گے، مگر صحابہ کرام کے تربیت یافتہ تابعین کی سرکردگی میں لڑنے والے بربر مجاہدین اپنی جگہ سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹتے۔

ان کی صفوں میں ذرہ برابر رخنہ پیدا نہ ہوتا، وہ حملہ آور گھڑ سواروں کو نیزوں کی انیوں اور تلواروں کی دھاروں پر رکھ لیتے اور ان کی بڑی تعداد کو خاک و خون میں لت پت کر کے بقیہ دشمنوں کو پیچھے ہٹ جانے پر مجبور کر دیتے۔

یہ یادگار جنگ ایک دو نہیں، پورے آٹھ روز تک بڑی شدت سے جاری رہی، شروع میں عیسائیوں کے حوصلے اپنی تعداد کی کثرت کے باعث بلند تھے۔ مجاہدین اسلام کی عددی کمی کو وہ اپنی فتح کا پیش خیمہ سمجھ رہے تھے، مگر چند روز کے خوں ریز معرکوں نے نصرانیوں کو یہ یقین دلا دیا کہ ان کا مقابلہ ایک ایسی قوم سے ہے، جس کو محض عددی اکثریت اور اسلحے کی برتری کی بناء پر شکست دینا ناممکن ہے۔

۵ شوال کو دونوں فریق لڑتے لڑتے نڈھال ہو چکے تھے، تاہم مسلمانوں کے حوصلے بلند تھے اور ان کی روحانی قوت اور ایمانی جوش و جذبے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا جبکہ نصرانیوں کے نہ صرف کس بل نکل چکے تھے بلکہ ان کی ہمت بھی جواب دے چکی تھی۔ لڑائی کے دوران مجاہدین نے نصرانیوں میں کم ہمتی کے آثار محسوس کر کے ان کے دونوں بازوؤں پر چند جارحانہ حملے کر کے ان کی صفیں چیر دیں اور انہیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ لشکر کے دائیں اور بائیں حصے کی شکست کے باوجود راڈرک لشکر کے مرکزی دستے کو بڑی پامردی سے لڑاتا رہا۔ یہ دیکھ کر طارق بن زیاد اپنے کچھ جانثاروں کے ساتھ حریف کے قلب کی صفوں میں گھس گئے، ان کی نظر راڈرک پر پڑی تو للکار کر کہا: ''یہی ہے عیسائیوں

کا بادشاہ' اور اس کے محافظوں کے گھیرے کو توڑتے ہوئے اس طرف بڑھے، راڈرک موت کو اپنی طرف لپکتے دیکھ کر بدحواس ہو کر بھاگ نکلا اور پھر اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ دریائے گوڈالیٹ کے کنارے دلدل میں اس کا سفید گھوڑا پھنسا ہوا ملا، اس کا ایک جواہرات سے مرصّع زرتار کرتا اور ایک سنہرا موزہ بھی اس دلدل میں پایا گیا، جس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ جان بچانے کے لیے دریا میں کود کر غرق ہو چکا ہے۔

راڈرک کے فرار ہوتے ہی دشمن نے میدان خالی کر دیا تھا۔ جب لاشوں کو شمار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ تین ہزار مسلمان شہید ہوئے ہیں جبکہ عیسائی مقتولین اَن گنت تھے۔[1] وادیٔ لَکّہ کا یہ معرکہ اَندَلُس کی فتح کی کلید بن گیا، عیسائی اس کے بعد کہیں قدم جما کر نہ لڑ سکے اور مسلمان دشمنوں کے شہروں کو آسانی سے فتح کرتے چلے گئے۔

طارق بن زیاد اچھے شاعر بھی تھے۔ انہوں نے فتوحات کی خوشی میں یہ اشعار کہے:

رَكِبْنَا سَفِيْنًا بِالْمَجَازِ مُقَيَّرًا ۔۔۔ عَسَى اَنْ يَكُوْنَ اللّٰهُ مِنَّا قَدِ اشْتَرٰى

''ہم آبنائے میں ایسی کشتیوں پر سوار ہوئے جن کی درزیں تارکول سے بند کی گئی تھیں،

اس امید میں کہ اللہ نے خرید لیا ہے......''

نُفُوْسًا وَاَمْوَالاً وَ اَهْلاً بِجَنَّةٍ ۔۔۔ اِذَا مَا اشْتَهَيْنَا الشَّيْءَ فِيْهَا تَيَسَّرَا

''......ہم سے ہماری جان، مال اور اہل وعیال کو۔ اس جنت کے بدلے میں

کہ جس میں جب بھی ہمیں کسی شے کی خواہش ہوگی وہ ہمیں مل جائے گی۔''

وَلَسْنَا نُبَالِيْ كَيْفَ سَالَتْ نُفُوْسُنَا ۔۔۔ اِذَا نَحْنُ اَدْرَكْنَا الَّذِيْ كَانَ اَجْدَرَا

''ہمیں اس کی کچھ پروا نہیں کہ کس طرح ہماری جانیں لگا تار قربان ہو رہی ہیں۔

اس لیے کہ ہمیں اس سے کہیں زیادہ قابل قدر شے (یعنی جنت) بدلے میں حاصل ہو رہی ہے۔''[2]

جنوبی اور وسطی اندلس کی فتح:

وادیٔ لکّہ کی شاندار فتح کے بعد طارق بن زیاد نے موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ سے پوچھے بغیر کاؤنٹ جولین کے مشورے پر لشکر کو کئی حصوں میں بانٹ کر الگ الگ سمتوں میں بھیجا اور کچھ ہی مدت میں غرناطہ اور مالقہ سمیت جنوبی اَندَلُس کے اکثر اضلاع فتح کر لیے۔ اس کے بعد وسطی اَندَلُس کا رُخ کیا اور قُرطُبہ بھی مسخر کر لیا۔[3] اس دوران موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ کی طرف سے طارق کو پیغام بھیجا گیا کہ قُرطُبہ سے آگے یلغار مت کرنا[4] مگر کاؤنٹ جولین نے طارق کو سمجھایا کہ اس وقت اَندَلُس کے سارے شہر خالی پڑے ہیں اور انہیں فتح کرنا بہت آسان ہے؛ اس لیے آپ فوراً طلیطلہ کی طرف بڑھیں۔ آخر ربیع الآخر ۹۳ھ میں طارق نے پیش قدمی کر کے اَندَلُس کے پایۂ تخت طُلَیطُلَہ پر بھی قبضہ کر لیا۔[5]

---

① الكامل في التاريخ،سنة ٩٢هـ ؛ نفح الطيب: ١/ ٢٤٠، ٢٤٢، ٢٥٧، ٢٥٨، ٢٥٩، ٢٦٠ ② نفح الطيب: ١/ ٢٦٥
③ الكامل في التاريخ: ٤/ ٤١ ④ فتوح البلدان،ص ٢٢٨ ⑤ الكامل في التاريخ: ٤/ ٤١

شاہی محل کے خزانے سے مسلمانوں کو گاتھ بادشاہوں کے چوبیس ۲۴ تاج ملے۔ ہر تاج پر اس کے استعمال کنندہ بادشاہ کا نام اور اس کی مدت حکومت کندہ تھی۔ اَندَلُس پر اس وقت تک گاتھ خاندان کے ۲۴ بادشاہ حکومت کر چکے تھے، ہر بادشاہ کے لیے نیا تاج بنوایا جاتا تھا اور مرنے والے بادشاہ کا تاج شاہی خزانے میں جمع کر دیا جاتا تھا۔ اللہ عزوجل نے اسلام کی برکت سے یورپ کے حکمرانوں کے بیش قیمت تاج جنہیں کوئی چھونے کی ہمت نہ کرسکتا تھا، مسلمانوں کے قدموں میں ڈھیر کر دیے تھے۔[1]

موسیٰ بن نصیر رحمہ اللہ کی آمد اور اس کی اصل وجوہ:

طارق بن زیاد کے پاس زیادہ فوج نہ تھی۔ پھر مختلف شہروں کی فتح میں مشغولیت کے باعث وہ بکھر چکی تھی؛ اس لیے شدید خطرہ تھا کہ کہیں ہسپانوی بغاوت نہ کر دیں؛ اس لیے طارق نے امیر موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ سے کمک طلب کی۔ امیر موسیٰ رحمہ اللہ نے مراسلہ بھیج کر طارق کو جلد بازی سے منع کیا[2] اور اٹھارہ ہزار سپاہیوں کو لے کر خود اَندَلُس روانہ ہوئے۔ اس فوج میں متعدد تابعین اور ایک صحابی مُنَیذر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔[3]

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ نے طارق بن زیاد کی فتوحات سے جلن کے باعث اَندَلُس کا رُخ کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ طارق کی طرح انہیں بھی شہرت ملے۔ یہ بعض راویوں کا قیاس تو ہوسکتا ہے، کوئی پُختہ بات نہیں؛ کیوں کہ موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ نے اس سے قبل افریقہ میں جو فتوحات حاصل کی تھیں، وہ تاریخ میں ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی تھیں، پھر اَندَلُس کی بھی مہم انہی کی زیرِ نگرانی تھی، طارق بن زیاد کی حیثیت تو نائب کی تھی۔

اور بالفرض موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ کو حسد ہوتا تو طارق کی برطرفی کا فرمان جاری کرنا یا اَندَلُس پہنچ کر ساری مہم کو اپنے ہاتھ میں لے لینا کیا مشکل تھا؟ مگر وادیٔ لَکّـہ کے معرکے کے بعد پورے ایک سال تک موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ نے ایسا کچھ نہ کیا۔ موسیٰ بن نُصَیر اَندَلُس کی مہم پر اس وقت گئے جب وسیع وعریض مفتوحہ علاقوں کا نظم ونسق سنبھالنے، باقی ماندہ علاقے فتح کرنے اور پھر شمالی اَندَلُس سے فرانس میں داخل ہونے کے لیے بڑی تعداد میں افواج اور عملے کی ضرورت تھی۔ علامہ مُقَّرِی نے لکھا ہے کہ موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ کا ہدف یہ تھا کہ وہ اَندَلُس کی گھاٹیوں کو عبور کر کے پورے یورپ کو فتح کرتے ہوئے قُسطَنطِینیّہ پہنچ جائیں۔[4]

موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ کی طوفانی فتوحات:

رمضان ۹۳ھ میں موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ اَندَلُس کے ساحل "الجزیرۃ الخضراء" پر اترے۔ انہوں نے مشرق کی طرف سے اپنی یورش کا آغاز کیا اور راستے کے شہروں: شَذُونَہ، قُرمُونہ اور باجہ کو یکے بعد دیگرے فتح کرتے چلے گئے۔

---

[1] نفح الطیب: ۲۸۹/۱ ؛ تاریخ اَندَلُس، مولانا ریاست علی ندوی، ص ۹۳،۹۲ مع حواشی

[2] التاریخ الأندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ لدکتور عبدالرحمن علی، ص ۶۸ [3] نفح الطیب: ۲۷۸،۲۷۷/۱

[4] نفح الطیب: ۲۳۳/۱ ..... یہ اسکیم حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی تھی۔ انہوں نے ۲۷ھ میں افریقہ کے گورنر کو لکھا تھا: إن القسطنطینیۃ إنما تفتح من قبل البحر وأنتم إذا فتحتم الأندلس فأنتم شرکاء لمن یفتح قسطنطینیۃ فی الأجر آخر الزمان. (البدایۃ والنہایۃ: ۲۲۶/۱۰)

اشبیلیہ کو سخت محاصرے اور خونریز جنگ کے بعد مسخر کیا گیا۔ اس کے بعد اَندَلُس کے قدیم پایۂ تخت ''ماردہ'' کا محاصرہ بھی بہت طویل ثابت ہوا۔ آخر رمضان ۹۴ھ میں یہ شہر ایک معاہدے کے تحت فتح کر لیا گیا۔[1]

اُدھر طُلَیْطِلَہ کی فتح کے بعد طارق نے مزید پیش قدمی کی اور اَندَلُس کے شمال مغربی کوہستانی علاقوں: وادی الحجارہ اور اِسْتَرْقَہ تک فتح کا پرچم لہرا کر واپس طُلَیْطِلَہ آ گئے۔[2]

موسیٰ بن نُصیر اور طارق کی ملاقات:

ذوالقعدہ ۹۴ھ میں موسیٰ کی افواج مشرقی اَندَلُس کو فتح کرتے ہوئے طُلَیْطِلَہ سے ڈیڑھ سو کلومیٹر مغرب میں طَلَبِیرَہ پہنچ گئیں۔ طارق بن زیاد نے طُلَیْطِلَہ سے طَلَبِیرَہ آ کر اپنے امیر کی خدمت میں حاضری دی۔[3]

موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ نے ممانعت کے باوجود پیش قدمی کرنے پر طارق کو ڈانٹ ڈپٹ کی۔[4] طارق نے کمالِ نظم وضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُف تک نہ کی اور کہا: ''میں آپ کا غلام ہوں، یہ فتوحات آپ ہی کے نام ہیں۔''[5]

الغرض تابع داری کا مظاہرہ کر کے طارق نے اپنی لغزش کی ایسی تلافی کی کہ موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ مطمئن ہو گئے۔[6]

بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے:

کچھ دنوں بعد موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ نے طارق کو ان فتوحات پر مبارک باد دیتے ہوئے کہا: ''امیر المومنین ولید نے انعام کے طور پر تمہیں اَندَلُس میں اپنا نائب منتخب کر لیا ہے۔ اب تم یہاں کی نعمتوں سے خوب لطف اندوز ہوتے رہو۔''

مگر طارق نے کہا: اللہ کی قسم! میں اس وقت تک نہیں رکوں گا جب تک بحرِ ظلمات (بحرِ اوقیانوس) پہنچ کر اپنا گھوڑا اِس میں نہ ڈال دوں۔''[7]

---

① الكامل في التاريخ: ٤/٤١؛ نفح الطيب: ١/٢٦٩ تا ٢٧١ ② الكامل في التاريخ: ٤/٤١

③ البيان المغرب في اخبار الاندلس والمغرب: ٢/١٦؛ التاريخ الأندُلسي من الفتح الاسلامي الى سقوط غرناطه لدكتور عبدالرحمن علي، ص ٨٣

④ البيان المغرب في اخبار الاندلس والمغرب: ٢/١٦

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ موسیٰ نے طارق کو حکم عدولی پر کوڑے مارے اور سرعام بے عزتی کی، بعض نے لکھا ہے کہ سر منڈوایا اور کچھ دنوں تک قید میں رکھا۔ مگر یہ باتیں کسی معتبر حوالے سے ثابت نہیں ہوسکیں۔ ہاں پیش قدمی روکنے کا حکم نہ ماننے پر موسیٰ کا طارق سے باز پرس کرنا بالکل قرینِ قیاس ہے؛ کیوں کہ ایسے اقدام سے مسلمانوں کو خطرہ لاحق ہوسکتا تھا۔ مگر اس میں کیا شک ہے کہ طارق کی ہر مہم جوئی کا نتیجہ فتح کی صورت میں نکلا تھا۔ یہی موسیٰ کا مقصد تھا۔ اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے اتنی ناراضی کہ سزا دی جائے اور قید کر دیا جائے، قرینِ قیاس نہیں۔ ابن عذاری نے اتنا ذکر کیا ہے: فوبخه موسىٰ وغضب عليه. اس کے بعد سزا دینے کے کمزور اقوال کو قیل سے نقل کیا ہے۔ قيل انه وضع السوط علىٰ راسه، و قيل انه ضربه اسواطا كثيرة وحلق راسه. (البيان المغرب في اخبار الاندلس والمغرب: ٢/١٦) نیز بعد کے حالات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ موسیٰ اور طارق کے درمیان آخر تک باہمی اعتماد قائم تھا؛ اسی لیے موسیٰ نے طارق کو اپنی نیابت پر برقرار رکھا، ورنہ ان کے پاس جرنیلوں کی کوئی کمی نہ تھی۔

اسی طرح مشہور ہے کہ طارق بن زیاد کو ایک شہر سے حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہیرے جواہرات سے مرصع میز ملا تھا، طارق نے موسیٰ کو پیش کرنے سے پہلے اس کا ایک پایہ توڑ کر چھپا لیا۔ (الكامل في التاريخ: ٤/٤٢) یہ بھی ایک بے سند روایت ہے۔ دکتور عبدالرحمن علی نے ''التاریخ الاندلسی'' میں اس الزام کے بے سروپا ہونے پر تفصیلی بحث کی ہے۔

⑤ سير اعلام النبلاء: ٤/٥٠٠ ⑥ فتوح البلدان، ص ٢٢٨ ⑦ نفح الطيب: ١/٢٤٢

شمالی اندلس کی فتوحات:

اگلے چند ماہ میں موسیٰ بن نُصیر رحمۃ اللہ علیہ اور طارق بن زیاد نے اپنی افواج شمالی اَندلُس میں پھیلا دیں، بعض معرکے دونوں نے مل کر لڑے اور بعض مواقع پر الگ الگ خطوط پر پیش قدمی کی، بعض مقامات پر چھاپہ مار دستے بھیجے اور بعض مہمات پر فوج کی قیادت بذاتِ خود کی۔ موسیٰ کا رُخ زیادہ تر شمال مشرق جبکہ طارق کا شمال مغرب کی طرف رہا۔ موسیٰ نے صوبۂ سرقُسطہ اور طارق نے صوبۂ جلیقیہ فتح کر لیے۔ ایک سال کے اندر اندر مسلم افواج کے ہراول دستے کوہ البرت سے گزر کر فرانس کی سرحدوں میں داخل ہو چکے تھے، جنوبی فرانس کا شہر قرقشونہ فتح ہو گیا تھا اور باقی شہران کے دھاووں کی زد میں تھے۔ ①

◆◆◆

① التاریخ الأندَلُسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطہ لدکتور عبدالرحمن علی، ص ۸۵ تا ۹۵

برصغیر میں مسلمانوں کی فتوحات کا آغاز

دنیا کے نقشے پر برصغیر (ہندوستان) زمانۂ قدیم ہی سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ درحقیقت ملک نہیں مختلف قوموں اور نسلوں پر مشتمل ایک چھوٹا براعظم ہے۔ شمال میں کوہِ قراقرم اسے چین سے جدا کرتا ہے۔ اس کی مغربی سرحدیں ایران سے ملتی ہیں۔ شمال مغرب میں اس کی حدود دریائے سندھ تک ہیں۔ اس کے بعض حکمرانوں نے کوہِ ہندوکش تک بھی حکومت کی ہے۔ شمال مشرق میں کوہِ ہمالیہ اسے تبت سے جدا کرتا ہے۔ اس کی تین سمتوں میں سمندر ہے۔ جنوب مشرق میں یہ خلیج بنگال، جنوب میں بحرِ ہند اور جنوب مغرب میں بحیرۂ عرب سے گھرا ہوا ہے۔ [1]

برصغیر کی قومیں:

وسطی برصغیر کے زرخیز علاقوں میں کاشتکاری کرنے والی قدیم قوموں کو ''دراوڑ'' کہا جاتا تھا۔ دو ہزار سال قبل از مسیح میں وسط ایشیا کے آریا قبائل کوہ سلیمان کے درّوں سے پنجاب میں اترے۔ انہوں نے مقامی لوگوں کو مغلوب کر کے اپنی حکومتیں قائم کیں۔ ان کے مذہبی پیشوا ''برہمن'' کہلائے جنہوں نے بت پرستی کو عام کیا اور خود کو خدا کا نائب قرار دیا۔ حکومتی ذمہ داریاں آریہ سرداروں کے سپرد ہوئیں جو ''کھشتری'' کہلانے لگے۔ زراعت اور صنعت وتجارت سے وابستہ لوگوں کو ''ویش'' کہا جانے لگا۔ غلام بنائے جانے والے مقامی لوگوں اور ان کی آل اولاد کو ''شودر'' کا نام دے کر پیدائشی گنہگار اور ناپاک ٹھہرایا گیا جن کا جینا مرنا اونچی ذات والوں کے لیے تھا۔ ذات پات کے اس نظام کے خلاف جنوبی ہندوستان کے ایک شہزادے سدارتھ نے (جو گوتم بدھ کے نام سے مشہور ہوا) بغاوت کی اور ایک الگ مذہب مدون کیا جس میں ذات پات کی قیود نہیں تھیں۔ اس مذہب کو ''بدھ مت'' کہا جاتا ہے۔ [2]

برصغیر کی ریاستیں:

آریاؤں نے پنجاب سے آگے بڑھ کر وسطی ہندوستان میں گنگا جمنا کی وادی کو پسند کیا اور اس سرزمین کا نام ''آریہ ورت'' رکھا۔ حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے وقت یہاں راجا ہرش کی حکومت تھی جس نے جنوبی پنجاب، قنوج، بنگال، اڑیسہ اور مالوہ کو فتح کر کے ایک مضبوط حکومت قائم کی۔ پھر سندھ اور نیپال کو زیرنگیں کر کے شمالی ہندوستان کو یکجا کر ڈالا۔ ۶۴۷ء (۲۷ھ) میں اس کی موت کے بعد راجپوتوں نے شمالی ہندوستان میں کئی آزاد ریاستیں قائم کر لیں۔ ان میں سب سے بڑی ریاست ''قنوج'' تھی جس میں راجپوتانہ اور مالوہ کی ریاستیں بھی شامل تھیں۔ جنوبی ہندوستان

① تاریخ برصغیر از پروفیسر ایم اے جمیل، ص ۱۱، ۱۲

② تاریخ برصغیر از پروفیسر ایم اے جمیل، ص ۱۴ تا ۱۷

ایک الگ ریاست تصور کیا جاتا تھا۔ بنگال، بہار اور سندھ بھی الگ الگ حکمرانوں کے زیرِ نگین تھے۔

خلفائے راشدین کے زمانے سے مسلمانوں نے برصغیر پر حملے شروع کر دیے تھے، مگر اس دوران سپاہِ اسلام کی بڑی تعداد خراسان، افریقہ اور سلطنتِ روما کی سرحدوں پر مصروف تھی اور برِصغیر پر یلغار کی حیثیت چھاپہ مار کارروائیوں کی سی تھی۔ مسلمانوں نے یہاں بہت سی فتوحات حاصل کیں مگر کبھی کسی صوبے پر باقاعدہ قبضہ کر کے وہاں کے لوگوں پر جزیہ یا خراج مقرر نہیں کیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلامی لشکر درہ خیبر کے راستے پیش قدمی کر کے لاہور تک پہنچا تھا مگر یہاں بھی دشمن کو زک پہنچانے کے بعد افواج واپس ہو گئی تھیں۔ دراصل برصغیر ایک بہت بڑی دنیا تھی جس میں اندھا دھند گھس جانا سخت نقصان کا باعث ہو سکتا تھا؛ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں مسلمانوں کی پیش قدمی بہت محتاط رہی۔[1]

عرب خواتین کے قافلے پر داہر کے سپاہیوں کا حملہ:

برصغیر میں سندھ کی مملکت اس وقت ایک وسیع و عریض راجدھانی تھی جو شمالاً جنوباً بحیرۂ عرب کے ساحل سے ملتان تک اور شرقاً غرباً راجپوتانہ سے مکران تک پھیلی ہوئی تھی۔ بالائی سندھ کا مرکز ''اروڑ'' اور زیریں سندھ کا ''برہمن آباد'' تھا۔ سندھ کے بت پرست حکمران ایک مدت سے ایرانیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف محاذ بنائے ہوئے تھے۔ بلوچستان میں اسلامی افواج کے خلاف صف بندی میں ایرانی اور سندھی شانہ بشانہ کھڑے دکھائی دیتے تھے؛ اس لیے خلفائے اسلام سندھ کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم وہ ایک مدت تک یہاں کوئی بڑا حملہ نہ کر سکے۔

ولید بن عبدالملک کے دور میں ایک ایسا سانحہ پیش آیا کہ مسلمانوں کو برصغیر میں مستقل حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ اس دور میں یہ علاقہ راجہ داہر کے زیرِ نگین تھا۔ اس کا باپ راجہ چچ مشہور جنگجو تھا جس نے سندھ کے طول و عرض کو فتح کر کے ایک بہت بڑی سلطنت قائم کر دی تھی۔ یہ لوگ برہمن تھے جب کہ ان کی رعایا میں بڑی تعداد بدھ مت کے پیروکاروں کی تھی۔ داہر ان پر ظلم و ستم کرتا تھا جس کے باعث رعایا اس سے بہت نالاں تھی۔ داہر کی بدفطرتی کا یہ حال تھا کہ سگی بہن سے شادی رچائے ہوئے تھا۔[2]

عرب تاجر اسلام سے پہلے بھی ہندوستان کے ساحلوں پر آتے جاتے اور تجارت کیا کرتے تھے۔ ان کا زیادہ تر رخ جنوبی ہندوستان کی طرف ہوتا تھا۔ تاجروں کے کاروان جزیرۃ العرب سے عراق جاتے اور وہاں بصرہ کے قریب خلیج فارس سے کشتیوں اور بحری جہازوں کے ذریعے ہندوستان کے ساحلوں تک جا پہنچتے۔ ایک راستہ یمن کی بندرگاہ کا بھی تھا جہاں سے برصغیر کا ساحل زیادہ دور نہیں۔ اسلامی دور میں تجارت کو مزید ترقی ہوئی تو برصغیر میں عرب تاجروں کی آمد و رفت بھی زیادہ ہوئی۔ برصغیر میں سراندیپ (سری لنکا) کا جزیرہ تجارتی سرگرمیوں کا بہت بڑا

---

[1] تاریخ ہند، از ڈاکٹر مقصود جودھری، ص ۲۳، ۲۴

[2] فتح نامۂ سندھ (المعروف بہ چچ نامہ) از علی بن حامد بن ابی بکر الکوفی، ص ۵۰ تا ۵۵؛ تاریخ سندھ از عبدالحلیم شرر، ص ۷۳؛ تاریخ سندھ از میر معصوم شاہ بھکری، ص ۱۸

مرکز تھا۔ گزشتہ خلفاء کے دور میں بہت سے عرب تاجر مستقل طور پر یہاں آباد ہو گئے تھے۔ ولید بن عبدالملک کے دور میں ان میں سے کچھ تاجر وفات پا گئے اور ان کے کنبے اب وطن واپس جانا چاہتے تھے۔ ان میں بڑی تعداد خواتین کی تھی۔ سری لنکا کا راجہ ایک رعایا پرور حکمران تھا اور اسلامی خلافت سے دوستانہ مراسم رکھتا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ مرحوم عرب تاجروں کے پس ماندگان واپس جانا چاہتے ہیں تو اس نے کئی کشتیوں میں ان کے سفر کا انتظام کر دیا اور خلیفہ ولید کے لیے بیش قیمت تحائف بھی ساتھ کر دیے جن میں ہیرے، موتی، دیدہ زیب پوشاکیں اور برتن شامل تھے۔

کچھ سرکاری اہلکاروں کی نگرانی میں یہ قافلہ ساحلِ برصغیر کے ساتھ ساتھ ہوتا ہوا خلیج فارس کی طرف جا رہا تھا تاکہ بصرہ کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہو۔ اس دوران جب اس کا گزر سندھ کے ساحل دیبل کے قریب سے ہوا تو یہاں کے جہاز رانوں نے کشتیوں کو گھیر لیا۔ سراندیپ کے اہلکاروں نے یہ منظر دیکھ کر کہا:

''ہم مسلمانوں کے خلیفہ کے پاس جا رہے ہیں، یہ مال اور ساز و سامان انہی کے لیے ہے۔''

مگر حملہ آوروں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے عورتوں کو گرفتار کر لیا اور سارا سامان لوٹ لیا۔ ساتھ ہی کہا:

''اگر رہائی چاہیے تو اس کا تاوان ادا کرنا ہوگا۔''

اس وقت قبیلہ بنی یربوع کی ایک خاتون نے چیخ کر کہا: ''اے حجاج! اے حجاج! مدد کو پہنچ!''

چند خوش قسمت مسلمان اس موقع پر جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ سیدھا حجاج کے پاس پہنچے اور ان خواتین کی فریاد سنائی۔ یہ ماجرا سنتے ہی حجاج کے منہ سے نکلا: ''شاید میں سو رہا تھا۔ اس آواز نے مجھے جگا دیا ہے۔''

پھر وہ بے تابانہ پکار اٹھا: ''لبیک! لبیک!''

اس نے فوراً ایک سفیر کے ہاتھ راجہ داہر کو مراسلہ بھیجا کہ ان قیدیوں کو آزاد کر دیا جائے اور لوٹا ہوا مال و اسباب واپس دیا جائے۔ بصورتِ دیگر ریاستِ سندھ کو سخت نتائج بھگتنا ہوں گے۔

حجاج نے سفیر کو یہ تاکید بھی کی کہ وہ اغوا کیے جانے والے قافلے کا پتا لگا کر ان کا حال احوال معلوم کرے۔

سفیر سندھ پہنچا اور حجاج کا پیغام پہنچایا۔ داہر نے طاقت کے نشے میں اس مراسلے کی کوئی پروا نہ کی اور بات کو ٹالتے ہوئے کہہ دیا: ''یہ کام سمندری ڈاکوؤں کا ہے۔ ان پر ہمارا بس نہیں چلتا۔''[1]

عبیداللہ بن نبہان اور بُدَیل بن طہفہ سندھ میں:

مگر حجاج جیسے جہاندیدہ انسان کو ان حیلہ جوئیوں سے دھوکا نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس نے دربارِ خلافت سے سندھ میں جہاد کی اجازت طلب کی اور منظوری ملتے ہی بلوچستان کے حاکم عبیداللہ بن نبہان کو سندھ میں پیش قدمی کا حکم دے دیا۔ عبیداللہ بن نبہان محاذ پر پہنچے تو زبردست جنگ ہوئی۔ عبیداللہ شہید ہو گئے اور فوج کو پسپا ہونا پڑا۔[2]

---

① چچ نامہ، ص ۸۹، ۹۰ ② ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتا نے ''چچ نامہ'' کے حواشی میں خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ جنگ موجودہ کراچی کے ساحل پر ہوئی تھی اور کلفٹن میں واقع عبداللہ شاہ غازی کا مزار درحقیقت انہی عبیداللہ بن نبہان کا ہے۔ واللہ اعلم

حجاج کو خبر ہوئی تو اپنے دوسرے جرنیل بُدَیل بن طِہفَہ کو جو بنو بجیلہ سے تعلق رکھتے تھے، اس مہم پر بھیجا۔ اس جنگ میں حریف فوج نے ہاتھی بھی استعمال کیے جنہیں دیکھ کر عربوں کے گھوڑے بدک رہے تھے۔ بدیل بڑے دلیر انسان تھے۔ فوج کو ہمت دلاتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور ہاتھیوں تک جا پہنچے۔ ہاتھیوں نے حملہ کیا تو بدیل کا گھوڑا بدکنے لگا۔ بدیل نے اپنا عمامہ اتار کر گھوڑے کی آنکھوں پر باندھ دیا اور اسے ایڑ لگا کر مردانہ وار دشمن کے جمگھٹے میں گھس گئے۔ شہید ہونے سے پہلے وہ اپنے ہاتھ سے ۸۰ دشمنوں کو موت کی نیند سلا چکے تھے۔ ان کی شہادت کے بعد اسلامی لشکر کو ایک بار پھر پیچھے ہٹنا پڑا۔

بُدَیل کی شہادت اور مسلمانوں کی شکست کی خبر نے حجاج بن یوسف کو سخت متفکر کر دیا۔ بدیل بن طہفہ بہت قابل جرنیل تھے، اپنی بے مثل شجاعت اور قابلیت کی وجہ سے حجاج کے پسندیدہ سالاروں میں شامل تھے۔ حجاج کا چین اور آرام لٹ گیا۔ وہ ہر اذان کے بعد بُدَیل کے لیے دعائے رحمت کرتا اور اس شکست کا بدلہ لینے کا عزم دہراتا۔

حجاج سمجھ چکا تھا کہ سندھ کے راجہ کی طاقت اندازے سے کہیں بڑھ کر ہے اور جب تک پورے سندھ پر قبضہ کر کے اس ظالم کی طاقت کو پارہ پارہ نہیں کر دیا جاتا، مسلمانوں کی عزت بھی خطرے میں رہے گی اور ان کے تجارتی راستے بھی۔ آخر حجاج نے خلیفہ ولید بن عبدالملک سے اجازت طلب کی کہ برصغیر میں ایک بڑی مہم شروع کرنے کی اجازت دی جائے۔ ولید کو گزشتہ مہمات کی ناکامیوں کے بعد برصغیر میں پیش قدمی پر اطمینان نہیں رہا تھا، اس نے جواب بھیجا:

> ''یہ دور دراز کا محاذ ہے جہاں جاہل لوگ آباد ہیں۔ وہاں جہاد کے لیے جس قدر سامان جنگ اور افرادی قوت درکار ہے، اس پر خطیر اخراجات صرف ہوں گے، بے حد مشقت سہنا پڑے گی۔ ہر بار مسلمان وہاں جا کر ضایع ہو جاتے ہیں۔ اس بارے میں مزید غور کرنا چاہیے۔''

خلیفہ کا مکتوب حجاج کی امیدوں کے خلاف تھا مگر وہ مایوس نہ ہوا بلکہ اس مہم کی ساری ذمہ داری اپنے سر لیتے ہوئے دوبارہ عریضہ بھیجا:

> ''امیر المؤمنین! ایک مدت ہوگئی کہ مسلمان قیدی کافروں کے چنگل میں اذیتیں سہہ رہے ہیں۔ وہاں لشکر اسلام کو جو شکست ہوئی ہے اس کا انتقام لینا بھی ضروری ہے۔ ان مسلمان قیدیوں کو رہا کرانا بھی ناگزیر ہے۔ امیر المؤمنین نے اپنے والا نامے میں فرمایا ہے کہ محاذ بہت دور ہے اور اس مہم پر بے پناہ لاگت آئے گی تو میں امیر المؤمنین کو یقین دلاتا ہوں کہ دارالخلافہ کے خزانے سے اس مہم پر جتنا بھی خرچہ ہوگا، اس سے دوگنی رقم ان شاء اللہ فتح کے بعد مرکزی خزانے میں واپس جمع کرا دی جائے گی۔''[1]

محمد بن قاسم کا انتخاب:

حجاج کا یہ مراسلہ کچھ ایسا اثر انگیز تھا کہ ولید کو اجازت دینا ہی پڑی۔ منظوری ملتے ہی حجاج نے بڑے پیمانے پر جنگی

[1] چچ نامہ، ص ۹۱ تا ۹۶ ؛ فتوح البلدان، ص ۴۱۹، ۴۲۰

تیاریاں شروع کر دیں۔ دارالخلافہ سے چھ ہزار شامی سپاہیوں کی کمک منگوائی اور اس مہم کی قیادت کے لیے بصرہ کے سابق حاکم قاسم بن محمد کے نوجوان بیٹے محمد بن القاسم کا انتخاب کیا جو اس وقت فارس کی سرحدوں پر تعینات تھا۔ محمد بن القاسم حجاج کے داماد اور بھتیجے تھے۔ انہیں جنگوں کا لگ بھگ دس سال کا تجربہ تھا۔ انہوں نے لشکروں کی قیادت اس وقت سے شروع کر دی تھی جب ان کی عمر صرف سترہ سال تھی۔ ۸۳ھ میں حجاج بن یوسف نے انہیں فارس کا حاکم بنا کر کرد باغیوں کی سرکوبی کا حکم دیا تھا، محمد بن قاسم نے باغیوں کا صفایا کر ڈالا تھا۔①

اتنی کم عمری میں اتنی بڑی کامیابی پر ایک شاعر یزید بن حکم نے کہا تھا:

إِنَّ الشَّجَاعَةَ وَالسَّمَاحَةَ وَالنَّدٰى ... لِمُحَمَّدِ بْنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدِ

قَادَ الْجُيُوْشَ لِسَبْعَ عَشْرَةَ حِجَّةً ... يَا قُرْبَ ذٰلِكَ سُؤْدَدًا مِنْ مَوْلِدِ

''بے شک دلیری، سخاوت اور کرم نوازی قاسم بن محمد کے بیٹے محمد کے لیے طے ہو چکی ہے۔ اس نے سترہ سال کی عمر میں لشکروں کی قیادت کی۔ واہ واہ۔ پیدائش کے بعد یہ قیادت کتنی جلد مل گئی۔''②

سندھ کی مہم کے لیے حجاج بن یوسف نے بڑے بڑے تجربہ کار امراء کی جگہ نوجوان محمد بن قاسم کو اس لیے چنا کہ اس مہم کے لیے غیر معمولی وفاداری، جذبۂ مہم جوئی اور مرکز کے احکام کی حرف بحرف اطاعت کی ضرورت تھی؛ کیوں کہ مہم کا سارا نقشہ حجاج کے ذہن میں تھا۔ اسے ایسا قائد چاہیے تھا جو اس کے اشارے کو سمجھے اور بے دریغ خطرات میں کود جائے۔ قبیلہ بنو ثقیف کے اس جوہر تابدار میں یہ تمام اوصاف موجود تھے۔③

محمد بن قاسم کی عمر......ایک غلط فہمی کا ازالہ:

عام خیال ہے کہ سندھ پر حملے کے وقت محمد بن قاسم کی عمر ۱۷ سال تھی۔ مگر یہ بات درست نہیں۔ تحقیقی بات یہ ہے کہ اس وقت محمد بن قاسم کی عمر ۲۷ سال تھی۔④

---

① تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۲۸۸، تاریخ الاسلام للذہبی حوادث: ۸۳ھ

② الکامل فی التاریخ: ۶۳/۴، تاریخ دمشق: ۱۶۴/۶۵

بعض روایات میں یہ شعر اس طرح ہے: سَاسَ الرِّجَالَ لِسَبْعَ عَشْرَةَ حِجَّةً......وَلِدَاتُه اِذْ ذَاكَ فِي اَشْغَالِ

(اس نے سترہ سال کا ہو کر مردوں کی قیادت کی جبکہ اس کے ہم عمر اس وقت کھیل کود میں مشغول ہوتے ہیں۔)

③ چچ نامہ، ص ۹۴، ۹۵، ۹۶

④ ایک قول کے مطابق ابن قاسم کی ولادت ۶۲ھ کی ہے۔ اس لحاظ سے سندھ کی مہم کے وقت ان کی عمر ۳۰ سال بنتی ہے۔ (الاعلام للزرکلی: ۳۳۳/۶ مع حاشیہ)

جن حضرات نے سندھ پر حملے کے وقت محمد بن قاسم کو سترہ سال کا قرار دیا ہے، ان کی واحد دلیل یہی شعر ہے۔ حالانکہ یہ شعر سندھ کی نہیں فارس کی مہم جوئی سے متعلق ہے۔ ۹۲ھ میں سندھ کی مہم کے وقت محمد بن قاسم کو سترہ سال کا مانا جائے تو نو سال پہلے فارس کا حاکم بنتے وقت ان کی عمر ۸ سال ماننا پڑے گی جو ناممکن ہے؛ اس لیے درست بات یہ ہے کہ فارس کا حاکم بنتے وقت ان کی عمر سترہ سال تھی۔ وہ اشعار جن میں سترہ سال کی عمر میں لشکر کی قیادت سنبھالنے پر اس کی تعریف کی گئی ہے، سندھ کی نہیں، فارس کی مہم سے متعلق ہیں۔ ان اشعار کا جائزہ لیں تو ان میں سندھ پر حملے کا کوئی ذکر نہیں۔ صرف اس بات پر تعجب ظاہر کیا گیا ہے کہ اس نوجوان نے سترہ سال کی عمر میں لشکر کی کمان شروع کر دی اور ظاہر ہے پہلی بار لشکر کی کمان انہوں نے فارس میں کی تھی۔ سندھ کی جنگ ان کی دوسری بڑی مہم تھی۔

قرین قیاس بھی یہی ہے کہ سندھ جیسے مشکل محاذ پر جہاں کئی نامور جرنیل شکست کھا چکے تھے، کوئی تجربہ کار شخص ہی قائد بنتا نہ کہ ایسا نوجوان جو پہلی بار قیادت کر رہا ہو۔ نیز حجاج نے خلیفہ ولید سے بہت اصرار کر کے اس مہم کی منظوری لی تھی۔ بعید ہے کہ وہ کسی نو آموز لڑکے کو اتنی سخت جنگ میں جھونکنے کا خطرہ مول لیتا۔

لشکر کشی کے انتظامات اور حجاج بن یوسف کی باریک بینی:

حجاج بن یوسف نے لشکر کو تمام آلات اور ضروری سامان کے ساتھ تیار کیا۔ قلعہ شکن منجنیقوں اور آتش زنی کے لیے بارودی مسالے سے لے کر دھاگے تک ہر چیز ساتھ رکھی۔ عرب سپاہی سالن پکانے کے لیے سرکہ استعمال کرتے تھے جو سندھ میں کم یاب تھا۔ سندھ کی گرمی کے باعث بوتلوں میں بھیجا گیا سرکہ بھی خراب ہو سکتا تھا؛ اس لیے حجاج نے سرکے کو روئی میں بھگو کر سایے میں خشک کرایا اور اس روئی کی بوریاں اس ہدایت کے ساتھ روانہ کر دیں کہ جب بھی ضرورت ہو، اس روئی کو پانی میں بھگو کر حسبِ ضرورت سرکہ حاصل کر لیا جائے۔ اس ساز و سامان میں سب سے عجیب چیز ''عروس'' نامی منجنیق تھی جسے پانچ سو آدمی مل کر چلاتے تھے۔ اس سے پہلے کی تاریخ میں اتنی بڑی منجنیق کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ لشکر کی روانگی سے قبل حجاج بن یوسف نے نمازِ جمعہ کے اجتماع سے ایک پر جوش خطاب کیا۔ اس تقریر کا ہر جملہ اس کی دینی غیرت و حمیت کا آئینہ دار ہے۔ اس نے کہا:

''زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ جنگ کی مثال کنوئیں کے ڈول کی سی ہے، کبھی اوپر، کبھی نیچے۔ وقت دو دھاری تلوار کی طرح ہے، کبھی ہمارے حق میں ہوتا ہے، کبھی ہمارے خلاف۔ کبھی ہمیں فتح ہوتی ہے تو کبھی شکست۔ ناکامی پر صبر و تحمل اختیار کرنا چاہیے تاکہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں میں اضافہ ہو اور حادثے کا زخم مندمل ہو جائے۔ ہم اپنے منعمِ حقیقی اللہ بزرگ و برتر کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور اس کے کرم سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ہم پر اپنی نعمتیں باقی رکھے گا۔ اپنی مہربانی کا دروازہ کبھی بند نہ کرے گا۔

سندھ کے محاذ پر شہید ہونے والے بُدَیل کی آواز ہر لمحہ میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ میں ہر وقت اس پکار کے جواب میں لبیک لبیک کہتا ہوں۔ اللہ کی قسم! اگر اس لشکر کشی میں مجھے پورے عراق کی دولت اور اپنا سب کچھ نچھاور کرنا پڑے، تب بھی میں یہ مہم انجام دیے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گا۔''

لشکر کو رخصت کرتے ہوئے حجاج نے سپہ سالار محمد بن قاسم کو کہا:

''شیراز کے راستے سے جانا اور منزل بمنزل رکنا، یہاں تک کہ سامان رسد تمہارے پاس پہنچ جائے۔''

محمد بن قاسم رحمہ اللہ حجاج کی ہدایت کے مطابق شیراز پہنچے، جب دمشق سے بھیجا جانے والا عسکری ساز و سامان آ گیا تو اسے کشتیوں کے ذریعے دیبل کی طرف روانہ کیا اور خود خشکی کے راستے مکران کا رخ کیا جو اس زمانے میں برصغیر کے ساتھ عالم اسلام کی آخری سرحد تھی۔

مکران میں چند دن کی تیاری کے بعد اسلام کے اس سجیلے نوجوان جرنیل نے بت کدۂ ہندوستان میں قدم رکھا۔ ''پنج گور'' اور ''بیلہ'' (لس بیلہ) مسخر کرتے ہوئے لشکر تیزی سے ساحل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ اس دوران ایک اور مسلم جرنیل جہم بن زحر بھی لشکر سے آن ملا۔ یہاں محمد بن قاسم کو حجاج بن یوسف کا مکتوب ملا جس میں تحریر تھا:

''جب دیبل کے قریب پہنچ جاؤ تو پڑاؤ کے وقت بہت چوکنا رہنا۔ خندقیں کھود کر خیمہ گاہ کو محفوظ بنانا۔ اکثر بیدار رہنا۔ لشکر میں جتنے لوگ قرآن مجید پڑھنا جانتے ہوں وہ سب (پڑاؤ کے دوران) تلاوت میں مشغول رہیں۔ باقی لوگ دعائیں کرتے رہیں۔ محنت اور مجاہدے کے ساتھ ہوشیار رہنا اور وقار وسکون اختیار کرنا۔ اللہ کا ذکر ہر وقت تمہاری زبان پر رہے۔ اللہ سے مدد ونصرت طلب کرتے رہنا تاکہ اللہ تمہارا حامی وناصر بن جائے۔ لاحول ولاقوۃ کا کثرت سے ورد کرتے رہا کرو، یہ وظیفہ تمہارا مددگار ہوگا۔ دیبل کے سامنے پہنچ کر خیمے لگاؤ تو ان کے گرد اٹھارہ فٹ چوڑی اور نو فٹ گہری خندق بنوانا، خندق کے گرد نو فٹ اونچا پشتہ لگوانا۔ دشمنوں کی نعرہ بازی اور فحش گوئی کے ردعمل میں کبھی جنگ شروع نہ کرنا۔ دشمن سے سامنا ہو تو ساکت رہنا۔ جب تک میرا حکم نہ ملے جنگ شروع نہ کرنا۔ جونہی میرا کوئی مکتوب ملے اسے پڑھنا اور تفصیل سے جواب لکھ بھیجنا۔ اس کام کو کھانے پینے سے بھی پہلے کرنا۔ میری ہدایات پر عمل پیرا رہنا۔ ان شاء اللہ کامیاب رہو گے۔''[1]

محمد بن قاسم کا سندھ میں پہلا قدم ۔ دیبل کا محاصرہ:

جمادی الآخرہ ۹۲ھ (مارچ ۷۱۱ء) کے ایام تھے جب محمد بن قاسم کا لشکر حب ندی عبور کر کے بندمراد کے قریب سے سندھ کی حدود میں داخل ہوا اور موجودہ شہر کراچی سے جو اس وقت محض ایک صحرا تھا، گزرتا ہوا دیبل پہنچ گیا۔ اس وقت بھی دریائے سندھ نے وادیٔ مہران کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ دریا کی مغربی جانب دیبل، نیرون (نیرون کوٹ، حیدرآباد) اور سدوستان (سیوستان، سیہون شریف) مشہور شہر تھے۔ مشرقی سمت میں سانکڑا (سانگھڑ)، بیٹ (بھٹ شاہ)، جاہم (جام صاحب)، جیور (خیرپور)، کاجی کاٹ (کوٹ ڈیجی)، راوڑ (رانی پور) اور ''ارور'' (اروڑ) جیسے شہر اور قلعے تھے۔ ان سب سے بڑھ کر برہمن آباد (نزد شہداد پور) تھا جو راجہ داہر کا پایۂ تخت تھا۔

محمد بن قاسم اپنی فوج کے ساتھ جمعے کے دن دیبل کے سامنے گھوڑے سے اترے۔ سفری انتظامات اتنے مربوط تھے کہ اسی دن سمندر کے راستے بحری فوج بھی ساز وسامان اور قلعہ شکن آلات کے ساتھ پہنچی۔

دیبل کا مقامی تلفظ ''دیول'' تھا جو ''دیوتا کی عبادت گاہ'' یا ''مندر'' کے ہم معنی لفظ ہے۔ یہاں کا مندر بہت مشہور تھا جس کا گنبد ساٹھ فٹ بلند تھا۔ مندر میں صرف پجاریوں کی تعداد سات سو تک تھی۔ دیبل کے جنوب میں سمندر اور مشرق میں دریائے سندھ تھا۔ شہر کے سامنے آکر دریائے سندھ کا پانی بحیرۂ عرب میں مل جاتا تھا۔ یہاں اترنے والا تجارتی ساز وسامان، کشتیوں کے ذریعے دریائے سندھ کے راستے دور دراز کے شہروں کو باآسانی پہنچتا تھا؛ اس لیے دیبل کی تجارتی اور عسکری اہمیت بہت زیادہ تھی۔ مسلمان طویل محاصرے کی تیاری کر کے آئے تھے؛ اس لیے سپاہی پڑاؤ ڈالنے لگے۔ رات تک خیموں کا شہر آباد ہو گیا جس میں ہر دستے کے افراد الگ الگ انتظامات اور پرچموں کے ساتھ مقیم تھے۔ کیمپ کے گرد خندق کھود دی گئی۔ خندق کے سامنے مٹی کا پشتہ لگا کر اس پر جھنڈے نصب کر دیے گئے۔

[1] چچ نامہ، ص ۹۷ تا ۱۰٤ ؛ فتوح البلدان، ص ٤۲۰

وہاں نیزہ بردار کھڑے ہوگئے تاکہ دشمن کے اچانک حملے کو روکا جا سکے۔

کیمپ تیار ہوتے ہی محمد بن قاسم نے منجنیقوں کو نصب کرایا اور شہر پر سنگ باری شروع کر دی۔ شہر والے محصور ہو کر مزاحمت کرتے رہے۔ حجاج بن یوسف بصرہ میں بیٹھ کر اس محاذ کی ایک ایک بات کی خبر رکھتا تھا۔ اس کے حکم کے مطابق ہر تیسرے دن محمد بن قاسم تمام حالات لکھ کر اسے بھیج دیتے۔ حجاج ان پر غور کر کے تازہ ہدایات روانہ کرتا۔ کئی ہفتے گزر گئے مگر دیبل کی فصیلیں سرنگوں نہ ہو سکیں۔

شہر کے درمیان مندر کا فلک بوس گنبد میلوں دور سے دکھائی دیتا تھا جس پر ایک سرخ رنگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ شہر والوں کا عقیدہ تھا کہ جب تک یہ جھنڈا نہیں گرتا انہیں شکست نہیں ہو سکتی۔ محمد بن قاسم کو یہ اطلاع ملی تو منجنیق اندازوں کو مندر کا جھنڈا گرانے کا حکم دیا۔ انہوں نے کئی دنوں تک نشانہ لگانے کی کوشش کی مگر پتھر چوک جاتے تھے۔ عروس منجنیق بھی اس کوشش میں ناکام رہی۔ محمد بن قاسم نے حجاج کو تفصیل سے یہ صورتحال لکھ بھیجی۔ اس نے نقشے پر غور کر کے سمجھ لیا کہ منجنیق سے نشانہ صحیح نہیں باندھا جا رہا۔ اس نے جواب میں لکھا:

''عروس کو تھوڑا سا مشرق کی طرف موڑ دو۔ اور اسے ایک زاویہ (ایک ڈگری) کم کر کے نشانہ لگاؤ۔''

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حجاج بن یوسف کو آلاتِ جنگ کے استعمال پر کس قدر عبور حاصل تھا۔[1]

دیبل فتح ہو گیا:

محمد بن قاسم نے اس ترتیب کے مطابق نشانہ باندھ کر سنگ باری کی تو عروس کا پتھر سیدھا مندر کے گنبد کو جا کر لگا۔ گنبد کے ٹوٹتے اور جھنڈے کے گرتے ہی دیبل کے بت پرستوں کو شکست کا یقین ہو گیا۔ مگر ان کے خیال میں دیوتاؤں کے غضب سے بچنے کے لیے لڑتے لڑتے مر جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ شہر کے دروازے کھول کر میدان میں آ گئے۔ محمد بن قاسم کو اسی وقت کا انتظار تھا۔ مسلم شمشیر زن ان کا اشارہ پاتے ہی صف بستہ ہو کر ان سے بھڑ گئے۔ زبردست کشت و خون کے بعد ہندو لاشوں کے ڈھیر چھوڑتے ہوئے شہر کی طرف بھاگے اور دروازے بند کر لیے تاہم اسلامی فوج تعاقب کرتے ہوئے فصیل تک پہنچ چکی تھی۔ محمد بن قاسم کی ہدایت پر فصیل پھلانگنے کے ماہر سپاہی آنکڑے ڈال کر رسیوں کے سہارے اوپر چڑھ گئے اور فصیل پر دست بدست لڑائی ہونے لگی۔ جلد ہی یہاں سے بھی دشمنوں کا صفایا ہو گیا۔ کوفہ کے ایک شہری نے جس کا تعلق قبیلہ بنو مراد سے تھا، سندھ کے اس پہلے مفتوحہ شہر پر اسلامی پرچم نصب کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ دیبل کے مفرور سپاہی راجہ داہر کے پاس چلے گئے اور اسے شکست کا حال سنایا۔ محمد بن قاسم نے شہر پر قبضہ کرنے کے بعد مقامی لوگوں سے بہت اچھا سلوک کیا۔ چار ہزار مسلمانوں کو یہاں آباد کر کے برصغیر میں پہلی مسلم آبادی کی داغ بیل ڈالی اور اس خطے کی پہلی مسجد تعمیر کرائی۔

[1] فتوح البلدان، ص ۴۲۰، ۴۲۱؛ تاریخ یعقوبی، ص ۲۲۶؛ الکامل فی التاریخ: ۱۸/۴، ۱۹،
یاد رہے کہ ابن اثیر نے تمام مؤرخین کے برخلاف فتح سندھ کو ۸۹ھ کے تحت بیان کیا ہے جو درست نہیں۔

عام حالات میں مسلمانوں کے لیے دیبل کی فتح بھی ایک بڑی کامیابی تھی مگر حجاج بن یوسف کا اصل ہدف راجہ داہر کی سرکوبی کرنا تھا جس نے مسلمان خواتین کو قیدی بنایا تھا۔[1]

وادیٔ مہران کے مشرقی حصے کی فتح:

راجہ اس وقت اپنے مرکز ''اروڑ'' میں تھا۔ یہ مقام اس زمانے میں سندھ کا پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے بہت بارونق تھا۔ ضلع سکھر میں روہڑی کے جنوب مشرق میں اب بھی ''اروڑ'' کے کھنڈرات موجود ہیں۔ مگر محمد بن قاسم نے پہلے دریائے سندھ کے مغربی علاقوں پر قبضہ مستحکم کرنا ضروری سمجھا تاکہ دریا عبور کرکے اروڑ پر حملے کے دوران پشت سے کسی حملے کا خدشہ نہ ہو۔ چنانچہ لشکرِ اسلام نے نیرون کوٹ (حیدرآباد) کی طرف کوچ کیا۔ مسلمانوں کے حسنِ سلوک اور مہربانی کی شہرت ہر طرف ہو چکی تھی؛ اس لیے یہاں کے حاکم بھدرکن نے صلح کر لی اور شہر کے دروازے کھول کر اسلامی افواج کا پرتپاک استقبال کیا۔ مسلمانوں کی دعوت کی اور ان کی سواریوں کے لیے چارے کا بندوبست بھی کیا۔

محمد بن قاسم نے دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر پیش قدمی کرتے ہوئے، دریا کی نہر عبور کی تو سامنے وادیٔ مہران کا زرخیز علاقہ تھا جہاں سموں سرداروں کی جاگیریں تھیں۔ یہ لوگ راجہ داہر کے ظلم وستم سے نالاں تھے؛ اس لیے انہوں نے اسلامی لشکر کو خوش آمدید کہا اور خراج کی ادائیگی منظور کر لی۔ اسلامی افواج وادیٔ مہران میں جہاں بھی پہنچیں لوگ حلقہ بگوش بنتے گئے۔ یہاں تک کہ لشکر سیوستان (سیہون) تک پہنچ گیا۔

یہاں کا راجہ ''بجرا'' اپنی رعایا اور امراء کی مرضی کے خلاف جنگ پر آمادہ تھا۔ اسلامی لشکر کے پہنچنے پر اس نے جنگ کا نقارہ پیٹ دیا۔ اس دوران شہر کے معزز لوگوں نے محمد بن قاسم کو پیغام بھیج دیا:

''ہم سب راجہ سے نفرت کرتے ہیں۔ ہمیں اس جنگ سے کوئی واسطہ نہیں۔ راجہ کے پاس فوج بھی زیادہ نہیں۔''

اس پیغام سے مسلمانوں کی ہمت اور بڑھ گئی، محاصرہ مزید ایک ہفتے تک جاری رہا۔ آخرکار بجرا مایوسی کے عالم میں رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر راجہ داہر کے پاس بھاگ گیا، اہلِ شہر نے دروازے کھول کر مسلمانوں کا خیر مقدم کیا۔

ایسا لگتا ہے کہ سیہون اور اس کے آس پاس کے شہر فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم کا ارادہ تھا کہ دریائے سندھ کے مغربی کنارے کے ساتھ لاڑکانہ یا شکارپور تک آگے بڑھا جائے اور روہڑی کے قریب سے دریا عبور کرکے پایۂ تخت اروڑ پر حملہ کیا جائے، مگر حجاج بن یوسف کا منصوبہ مختلف تھا۔ اس نے حکم دیا کہ مسلمان فوراً واپس پلٹیں اور نیرون کوٹ (حیدرآباد) سے بھیٹ (بھٹ شاہ) تک دفاعی لائن بنا کر دریا کے پار اتریں۔[2]

دریائے سندھ کے پار:

محمد بن قاسم نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ نیرون (حیدرآباد) واپس آئے اور کچھ دنوں کی تیاری کے بعد بھیٹ کی طرف روانہ

① چچ نامہ، ص ۱۰۷ تا ۱۱۰ ؛ فتوح البلدان، ص ۴۲۱ ؛ تاریخ یعقوبی، ص ۲۲۶
② چچ نامہ، ص ۱۱۱ تا ۱۲۲

ہو گئے۔ اس دوران راجہ داہر کو محمد بن قاسم کی مسلسل فتوحات کی اطلاعات مل رہی تھیں۔ گرفتار شدہ مسلم خواتین ابھی تک اروڑ کے قلعے میں اس کے زیرِ قبضہ تھیں۔ اگر داہر میں عقل نامی کوئی چیز ہوتی تو وہ ان خواتین کو واپس بھیج کر مجاہدینِ اسلام کی تیز دھار شمشیروں سے بچنے کی کوشش کرتا۔ مگر وہ پرلے درجے کا ضدی اور مغرور انسان تھا۔ اسے اپنی طاقت پر اندھا بھروسہ تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے تمام ماتحت راجے مسلمانوں کو روکنے میں ناکام رہے ہیں تو وہ اپنی تمام فوج جمع کر کے خود قیادت کرتے ہوئے اروڑ سے جنوب مشرق کی طرف روانہ ہوا اور کوٹ ڈیجی کے عظیم قلعے میں ڈیرے ڈال کر فوج کے بڑے حصے کو دریائے سندھ کی طرف بھیج دیا تاکہ مسلمانوں کو دریا عبور کرنے سے روک دیا جائے۔

ادھر لشکرِ اسلام یلغار کرتا ہوا بھیٹ (بھاٹیہ، بھٹ شاہ) کے سامنے پہنچ گیا تھا جو دریا کے دوسرے کنارے پر تھا۔ حجاج کے حکم کے مطابق محمد بن قاسم نے تمام فوج اور خیمہ گاہ کو دریائے سندھ کے پار لے جانے کی تیاری کی مگر اس دوران راجہ داہر کی افواج دریا کی دوسری سمت نمودار ہو چکی تھیں۔ حجاج بن یوسف کی ہدایت کی حکمت اب ظاہر ہوئی؛ کیوں کہ اگر مسلمان اس وقت سیہون میں ہوتے تو پشت سے گھر جاتے اور ان کی واپسی کا کوئی راستہ نہ ہوتا۔

لشکرِ اسلام نے دریائے سندھ عبور کرنے کی تیاری کی تو پر جوش لہروں کے ساتھ دوسرے کنارے پر تعینات داہر کے تیر انداز دستے بھی ان کا امتحان لینے کے لیے تیار تھے۔

اس زمانے میں دریا عبور کرنے کے لیے کشتیوں کا پل بنایا جاتا تھا۔ کشتیوں کو مضبوط رسوں کے ذریعے آپس میں باندھ کر دریا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جوڑ دیا جاتا تھا جس پر سے فوج گزرتی چلی جاتی تھی۔ مگر یہاں مسلمان جونہی کشتیوں کا پل بنانے کی کوشش کرتے، تیروں کی بارش ان کے کام میں رکاوٹ بن جاتی۔

آخر کار محمد بن قاسم نے کشتیوں کو دریا کے درمیان باندھنے کی بجائے ایک اور ترکیب پر عمل کیا۔ انہوں نے دریا کے پاٹ کی چوڑائی کا صحیح اندازہ لگا کر دریا کے اسی کنارے پر کشتیوں کی ایک طویل زنجیر بنائی۔ اس زنجیر کا ایک سرا ایک مضبوط کھونٹے سے باندھ کر باقی حصے کو دریا کے بہاؤ پر چھوڑ دیا گیا۔ پانی کا بہاؤ خود بخود کشتیوں کے اس پل کو دھکیل کر دوسرے کنارے پر لے گیا۔ کشتیوں میں بیٹھے سپاہی ڈھالوں کے ذریعے خود کو دشمن کے تیروں سے بچاتے رہے اور دوسرے کنارے پر پہنچتے ہی دشمن پر پل پڑے۔ دشمن کو ساحل سے ہٹانے کے بعد کشتیوں کے پل کو دوسری سمت باندھ دیا گیا۔ اس کے بعد سارا لشکر آرام سے دریا کے پار آ گیا۔[1]

راجہ داہر کے پسپا ہونے والے سپاہیوں نے جام کے قلعے میں جا کر پناہ لی۔ اب بھیٹ کا شہر سامنے تھا۔ یہاں کا راجہ "موکا" راجہ داہر کا ماتحت تھا۔ یہ سب لوگ راجہ داہر کے جبر و تشدد سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ محمد بن قاسم نے "راجہ موکا" کو مذاکرات کے ذریعے اطاعت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تو اس نے جواب میں لکھا:

"اگر میں جنگ کیے بغیر ہتھیار ڈال دوں تو میرے خاندان کی رسوائی ہوگی۔ بہتر ہوگا کہ میں ایک چھوٹے سے دستے

[1] چچ نامہ، علی بن حامد الکوفی، ص ۱۲٤ تا ۱۳۳ ؛ فتوح البلدان، ص ٤٢١

کے ساتھ سانکڑا (سانگھڑ) کی طرف نکل جاؤں اور آپ اس دوران ایک ہزار سپاہی بھیج کر مجھے گرفتار کر لیں۔"
محمد بن قاسم نے تجویز سے اتفاق کیا۔ راجہ موکا سانکڑا (سانگھڑ) کی طرف روانہ ہوا اور ادھر محمد بن قاسم کے سالار بنانہ بن حنظلہ نے منصوبے کے مطابق تعاقب کر کے اسے گرفتار کر لیا۔ محمد بن قاسم نے راجہ موکا کی بڑی خاطر مدارات کی۔ اسے ایک لاکھ درہم نقد دیے اور ساتھ ہی پروانہ لکھ دیا کہ بھیٹ کی حکومت نسل در نسل اسی کے پاس رہے گی۔[1]

راجہ داہر سے فیصلہ کن معرکہ:

محمد بن قاسم اپنے چھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ جے پور (خیر پور) پر قبضہ کرتے ہوئے آگے بڑھے جہاں راجہ داہر اپنی ٹڈی دل افواج کے ساتھ فیصلہ کن مقابلے کے لیے موجود تھا۔ اس کی کمان میں دس ہزار گھڑ سوار اور تیس ہزار پیادے تھے۔ پہلی صف میں خوفناک ہاتھیوں کا غول تھا۔ داہر خود لشکر کے پیچھے ایک سفید ہاتھی پر سوار تھا۔ اس کے گرد باندیوں کا جھرمٹ تھا جو اسے مورچھل سے پنکھا جھل رہی تھیں۔ یکم رمضان ۹۲ھ کو جنگ شروع ہوئی، جون کے گرم ترین مہینے میں سندھ کی تپتی ہوئی زمین پر دونوں فوجیں پوری طاقت سے آپس میں ٹکراتی رہیں۔ دس دن تک صبح سے شام تک لڑائی ہوتی رہی مگر ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا۔

آخر ۱۰ رمضان ۹۲ھ کو فیصلہ کن معرکہ ہوا۔ فریقین نے اپنی پوری جان لڑا دی۔ ہاتھیوں کا غول مسلمانوں کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہو رہا تھا۔ راجہ داہر خود ہاتھی پر سوار فوج کو لڑا رہا تھا۔ اس کے پاس ایک تیز دھار چکر تھا جسے گھما کر وہ قریب آنے والے ہر دشمن کا سر الگ کر دیتا تھا۔ اس دوران محمد بن قاسم نے ہاتھیوں کو بھگانے کے لیے آتش زنی کے ہتھیاروں سے مدد لی۔ آگ کے شعلے برستے دیکھ کر ہاتھی بدک گئے اور اپنی ہی فوج کو روندتے ہوئے بھاگ نکلے۔ راجہ داہر کا ہاتھی بھی الٹے پاؤں بھاگا اور اپنی خیمہ گاہ کے پیچھے واقع ندی میں گھس کر بیٹھ گیا تاکہ شعلہ گرنے تو وہ پانی میں لوٹ لگا کر خود کو بچا سکے۔ فیل بان نے بڑی مشکل سے اسے اٹھایا مگر ہاتھی نے میدان جنگ کا رخ نہ کیا اور قلعے کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ راجہ داہر ہاتھی سے اتر گیا اور پا پیادہ لڑتا رہا مگر اس کے سپاہیوں کے قدم اکھڑتے جا رہے تھے۔ ہاتھیوں سے نجات پانے کے بعد اب مسلمان بڑھ چڑھ کر حملے کر رہے تھے۔ راجہ داہر بھی ان کی زد سے نہ بچ سکا۔ قاسم بن ثعلبہ نامی ایک عرب مجاہد اس کے محافظوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور اپنی شمشیر داہر کے جسم کے پار کر دی۔ راجہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ قاسم بن ثعلبہ قادر الکلام شاعر تھا۔ اس نے اپنے کارنامے پر فخر کرتے ہوئے یہ اشعار پڑھے جو تاریخ کی کتب میں محفوظ ہیں اور راجہ داہر کی عبرت ناک موت کا پورا نقشہ کھینچ دیتے ہیں:

اَلْخَیْلُ تَشْهَدُ یَوْمَ دَاهِرَ وَالْقَنَا ... وَمُحَمَّدُ بْنُ الْقَاسِمِ بْنُ مُحَمَّدِ
اِنِّیْ فَرَجْتُ الْجَمْعَ غَیْرَ مُعَرِّدٍ ... حَتّٰی عَلَوْتُ عَظِیْمَهُمْ بِمُهَنَّدِ
فَتَرَكْتُهُ تَحْتَ الْعَجَاجِ مُجَنْدَلًا ... مُتَعَفِّرَ الْخَدَّیْنِ غَیْرَ مُوَسَّدِ

[1] چچ نامہ، ص ۱۳۳ تا ۱۳۶

’’گھڑ سوار بھی گواہ ہیں اور محمد بن قاسم بن محمد بھی، کہ داہر سے معرکے کے دن میں جمگھٹے کو چیر کر آگے بڑھا اور ان کے بادشاہ کے سر پر ہندوستانی تلوار بلند کی، میں اسے گرد و غبار کے پردے میں اس طرح چھوڑ آیا کہ وہ کسی تکیے کے بغیر خاک و خون میں پڑا تھا اور اس کے گال مٹی سے لت پت تھے۔‘‘[1]

راجہ کے مرنے کے بعد اس کے فوجیوں کا حوصلہ ٹوٹ گیا تاہم وہ شام تک برابر لڑتے رہے۔ تب تک ہزاروں لاشیں گریں اور میدانِ جنگ میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ سورج غروب ہونے سے پہلے داہر کی فوج تتر بتر ہو چکی تھی اور سندھ میں اسلامی حکومت کا سنگ بنیاد نصب ہو رہا تھا۔

راجہ داہر کی باقی ماندہ فوج راوڑ (رانی پور) کے قلعے میں تھی جہاں شاہی خاندان کی ایک رانی جنگ کی تیاری کر رہی تھی۔ محمد بن قاسم نے بلاتاخیر یلغار کر کے راوڑ کا محاصرہ کر لیا اور ایک خونریز جنگ کے بعد قلعے کو فتح کر لیا۔ مسلمانوں کو قلعے میں داخل ہوتا دیکھ کر رانی نے اپنی کنیزوں سمیت خود کو آگ کے الاؤ میں ڈال کر خودکشی کر لی۔[2]

عرب خواتین کی بازیابی:

ان پے درپے فتوحات کے باوجود محمد بن قاسم کو سخت فکر لاحق تھی؛ کیوں کہ گرفتار شدہ عرب خواتین اب تک بازیاب نہیں ہو سکی تھیں۔ ادھر راجہ داہر کا وزیر با تدبیر ’’سی ساکر‘‘ کسی طرح محمد بن قاسم کی خوشنودی چاہتا تھا۔ اس نے نہ صرف ان عرب خواتین کو آزاد کر دیا بلکہ خود انہیں لے کر مسلمانوں کے پاس آیا۔ اس سے محمد بن قاسم کو بے انتہا خوشی ہوئی؛ کیوں کہ اس مہم کا اصل مقصد پورا ہو گیا تھا۔ محمد بن قاسم نے اس کارنامے پر سی ساکر کو اتنی عزت دی کہ اسے پہلے کی طرح اپنی حکومت کا وزیر بنا دیا اور اہل سندھ کے ہر معاملے میں اس سے مشورے لینے کا اہتمام کیا۔[3]

برہمن آباد کی فتح:

راجہ داہر کا بیٹا جے سنگھ اب بھی اپنی حکومت کو کسی نہ کسی طرح قائم رکھنے کی تگ و دو کر رہا تھا۔ اس نے برہمن آباد کو مرکز بنا کر نئی افواج مرتب کر لی تھیں۔ محمد بن قاسم نے مفتوحہ علاقوں کے انتظامات درست کرنے کے بعد ۹۴ھ میں برہمن آباد کا رخ کیا۔ جے سنگھ نے محاصرے میں آنے میں جان کا خطرہ محسوس کیا؛ اس لیے شہر سے باہر نکل گیا۔

محمد بن قاسم کی فوج نے برہمن آباد کو گھیرے میں لے لیا اور محاصرانہ جنگ شروع ہو گئی۔ شہر کی فصیل بہت مستحکم تھی،

---

① الکامل فی التاریخ: ۱۹/٤ ؛ چچ نامہ، ص ۱۵۸ تا ۱۸۱ ؛ فتوح البلدان، ص ٤۲۲ ؛ تاریخ سندھ از میر معصوم شاہ بھکری، ص ۲٤

② چچ نامہ، ص ۱۹۲ تا ۱۹۵ ؛ فتوح البلدان، ص ٤۲۲ ؛ تاریخ ابن خلدون: ۷٦/۳

چچ نامہ کے مطابق خودکشی کرنے والی داہر کی بہن مائی بائی تھی، جبکہ بلاذری کے مطابق اس کی بیوی تھی۔ دونوں روایات کو ملانے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ داہر کی بہن تھی جسے داہر نے بیوی بنا رکھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ گرفتاری سے بچنے کے لیے مائی بائی نے ایسا کیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے ہندوؤں کی رسم ’’ستی‘‘ نبھائی ہو جس میں شوہر کی موت پر بیوی خودکشی کرتی ہے۔

ہندو لاشوں کو الاؤ میں جلاتے ہیں جسے ’’چِتا‘‘ کہا جاتا ہے۔ ’’ستی‘‘ کے مطابق شوہر کی لاش کے ساتھ عورت بھی اسی ’’چِتا‘‘ میں جل کر جان دے دیتی ہے۔ ایسی عورت کو ہندو مقدس مانتے ہیں اور اسے ’’دیوی‘‘ کا درجہ دیتے ہیں (نعوذ باللہ)۔

③ چچ نامہ، ص ۱۹۹، ۲۰۰ ؛ فتوح البلدان: ص ۱٤۱ تا ۱٤۳؛ فتوح البلدان: ص ٤۲۲ ؛ تاریخ یعقوبی، ص ۲۲٦

کر دیے۔ طویل مدت تک جنگ کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ اس دوران جے سنگھ نے ایک جتھا تیار کر کے مسلمانوں کی رسد بند کرنے کی کوشش کی مگر مسلمانوں کے جوابی حملے میں اسے سخت زک اٹھانا پڑی اور وہ سندھ کی حکمرانی کو بھول کر کشمیر کی طرف بھاگ نکلا۔ برہمن آباد کا محاصرہ طویل ہوتا گیا۔ مقامی فوج بسا اوقات باہر نکل کر حملہ کرتی اور پھر شہر میں گھس جاتی۔ شہری محمد بن قاسم کی رعایا پروری کی شہرت سن چکے تھے؛ اس لیے انہوں نے محاصرے سے تنگ آ کر شہر مسلمانوں کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک دن جنگ کے بعد وہ پسپا ہوئے تو شہر کے دروازے جان بوجھ کر کھلے چھوڑ دیے۔ مسلمان تعاقب کرتے ہوئے شہر میں داخل ہو گئے۔ اس طرح یہ شہر بھی زیرِ نگین ہو گیا۔ راجہ داہر کی ایک بیوی رانی لاڈی یہاں مقیم تھی۔ اس نے اسلام قبول کر لیا اور محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف کی اجازت سے اس سے نکاح کر لیا۔ ①

اروڑ کا معرکہ:

اب سندھ میں مزاحمت کی صرف ایک چنگاری باقی رہ گئی تھی۔ یہ راجہ داہر کا چھوٹا لڑکا گوپی تھا جو لوگوں کو یقین دلا رہا تھا کہ راجہ داہر زندہ ہے اور تازہ افواج تیار کرنے کے لیے ہندوستان گیا ہوا ہے۔ اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر ہزاروں سپاہی اس کے گرد جمع ہو گئے تھے جن کی مدد سے اس نے پایۂ تخت اروڑ میں جنگ کی پوری تیاری کر لی تھی۔ محمد بن قاسم یہ اطلاعات ملنے پر سیدھا اروڑ پہنچے، ان کے کہنے پر رانی لاڈی نے خود اہلِ شہر کو یقین دلایا کہ داہر مر چکا ہے۔ اہلِ شہر شروع میں نہ مانے اور گوپی کی قیادت میں برابر لڑتے رہے۔ مگر کچھ دنوں بعد گوپی فرار ہو گیا اور اہلِ شہر نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیے کہ بدھ کے صنم کدے کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ محمد بن قاسم نے اہلِ علم سے مشورہ کر کے صنم کدے کو کلیسا اور آتش کدے کے حکم میں شمار کیا اور اسے باقی رہنے دیا۔ ②

ملتان کی فتح:

وادیٔ مہران "باب الاسلام" بن چکی تھی مگر محمد بن قاسم کی ایمانی توانائی انہیں مزید فتوحات کے لیے آمادہ کر رہی تھی۔ انہوں نے حجاج بن یوسف سے اجازت لے کر آگے یلغار کی۔ ③ اسکلندہ (کندھ کوٹ) گھمسان کی جنگ کے بعد مسخر ہوا۔ اب اسلامی افواج پنجاب کے سرسبز میدانوں میں آگے بڑھ رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے شہر اور قلعے تیزی سے فتح ہوتے گئے اور محمد بن قاسم نے ملتان پہنچ کر دم لیا۔ یہ اس زمانے میں بدھ مت کے پیروکاروں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہاں کے راجہ گور سنگھ کی طاقت کا سکہ پورے پنجاب میں مانا جاتا تھا۔

① چچ نامہ، ص ۲۰۵ تا ۲۰۸ ؛ فتوح البلدان، ص ۴۲۲، ۴۲۳ ...... برہمن آباد کے کھنڈرات حیدرآباد کے شمال مغرب میں کوئی ساٹھ میل دور ہیں۔ یہ جگہ شہداد پور سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ مسلمانوں نے عباسی دور میں اس کے قریب ایک اور شہر بسایا جو منصورہ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ بنو عباس کے دور کا مشہور اور بارونق شہر تھا۔ یاقوت حموی کے بقول یہ دریائے سندھ کی دو شاخوں یا دو نہروں کے درمیان واقع تھا اور ملتان سے اس کا فاصلہ بارہ منازل (تقریباً دو سو میل یا پونے تین سو کلومیٹر) تھا۔ بعد میں منصورہ بھی ویران ہو گیا۔ (معجم البلدان: ج ٤، تحت منصورہ)

② چچ نامہ، ص ۲۲۱ تا ۲۳٤ ؛ فتوح البلدان، ص ۴۲۳ ..... اروڑ کے کھنڈرات روہڑی سے گیارہ کلومیٹر جنوب مشرق میں دریائے سندھ کی ایک شاخ "ناراواہ" کے مغربی کنارے پر اب بھی موجود ہیں۔ عرب مؤرخین نے اس شہر کو عموماً "الور" کہہ کر یاد کیا ہے۔

③ یہاں چچ نامہ میں "آب بیاس" عبور کرنے کا ذکر ہے۔ سندھ سے ملتان کی راہ میں دریائے بیاس قطعاً نہیں آتا۔ پس ممکن ہے یہ دریائے سندھ کی کوئی نہر ہو۔

محمد بن قاسم کے ملتان پہنچتے ہی زوردار معرکے شروع ہوگئے۔ گورسنگھ کی فوج کو قلعے کی حفاظت حاصل تھی اور سامان رسد بھی بکثرت تھا۔ ادھر مسلمانوں کے پاس خوراک کے ذخائر کم تھے؛ اس لیے یہ مہم بہت مشکل ثابت ہوئی۔ محاصرہ طویل ہوا تو مسلمان سواری کے جانور ذبح کر کے کھانے پر مجبور ہوگئے۔ قریب تھا کہ فوج بے حال ہو کر واپسی پر مجبور ہو جاتی کہ اچانک ایک اطلاع نے جنگ کا نقشہ پلٹ دیا۔ ایک مقامی شخص نے مسلمانوں کو فصیل کے کمزور حصوں کا پتا بتادیا۔ محمد بن قاسم نے فوراً منجنیقوں سے ان حصوں پر سنگ باری شروع کرادی۔ آخر فصیل ٹوٹ گئی۔ گورسنگھ کے سپاہی مجبور ہو کر کھلے میدان میں نکل آئے۔ یہاں وہ مسلمانوں کے تند و تیز دھاووں کا سامنا نہ کرسکے اور پسپا ہو کر بکھر گئے۔

فتح کے بعد جب ملتان کے بدھ مندر کا جائزہ لیا گیا تو بے تحاشہ دولت نکلی۔ مندر کا خزانہ ۲۷ فٹ لمبے اور ۱۵ فٹ چوڑے کمرے پر مشتمل تھا جو سونے سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ وزن کے لحاظ سے یہ سونا کئی سو من تھا۔[1]

حجاج بن یوسف نے اس مہم پر چھ کروڑ درہم خرچ کیے تھے۔ جب مال غنیمت کے ساتھ راجہ داہر کا سر اس کے سامنے رکھا گیا تو اس نے مال غنیمت کو شمار کرایا، وہ بارہ کروڑ درہم کے برابر نکلا۔ حجاج نے بے ساختہ کہا:

''ہم نے اپنا انتقام بھی لے لیا اور داہر کا سر بھی۔ اور جتنا خرچ کیا اللہ نے اس سے دوگنا عطا فرمادیا۔''[2]

محمد بن قاسم ولید بن عبدالملک کی وفات تک سندھ اور پنجاب کی فتوحات میں مشغول رہے۔ ملتان کے بعد دیپال پور فتح ہوا، پھر اسلامی افواج وسطی ہندوستان میں یلغار کرتے ہوئے قنوج تک پہنچ گئیں۔[3] اسی دوران ولید بن عبد الملک کی وفات ہوگئی اور نئے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے محمد بن قاسم کو معزول کردیا۔ محمد بن قاسم کے حسنِ سلوک، مہربانی اور کرم نوازی نے مقامی لوگوں کے دل جیت لیے تھے؛ اس لیے یہاں بے شمار لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

---

① چچ نامہ، ص ۲۳۶ تا ۲۴۱ ؛ فتوح البلدان: ۴۲۳ ؛ تاریخ یعقوبی، ص ۲۲۶

② الکامل فی التاریخ: ۴/ ۲۰: سنة ۸۹ھ

ملحوظات: (۱) سندھ کی ان فتوحات کی اکثر تفاصیل علی بن حامد کوفی کی تصنیف ''چچ نامہ'' کے فارسی نسخے سے نقل کی گئی ہیں جو ڈاکٹر عمر داؤد پوتا کے حواشی کے ساتھ حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا۔ چچ نامہ اس موضوع پر قدیم اور مستند ماخذ ہے اور اس کا سب سے بہترین اور تصحیح شدہ نسخہ یہی ہے۔

(۲) سندھ کی فتوحات کے ضمن میں جن مقامات کے نام آئے ہیں، ان کی تعیین کے بارے میں علمائے تاریخ و ماہرین آثار قدیمہ کے درمیان شدید اختلافات ہیں، برہمن آباد اور اروڑ کے سوا کسی مقام کے بارے میں اتفاقِ رائے نہیں پایا جاتا۔ دیبل کے بارے میں ٹھٹھہ، شاہ بندر، کیٹی بندر اور کراچی کا قول بھی موجود ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ دیبل وہی جگہ ہے جہاں اب کراچی کی پورٹ محمد بن قاسم تعمیر کی گئی ہے۔ ڈاکٹر عمر داؤد پوتا نے کئی قرائن کو جمع کر کے یہ حتمی رائے دی ہے کہ دیبل، لاہری بندر کا پرانا نام ہے۔ محکمہ آثار قدیمہ پاکستان کی جانب سے شائع شدہ کتاب ''بھنبھور'' کے مطابق دیبل دراصل 'بھنبھور' ہی کا دوسرا نام تھا۔ بھنبھور کے کھنڈرات کراچی سے کوئی چالیس میل دور حیدرآباد جانے والی شاہراہ کے کنارے واقع ہیں، یہاں ایک مسجد کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ سمندر کا پانی ایک پتلی خلیج کی شکل میں یہاں تک پہنچتا ہے۔ اگرچہ بھنبھور کے کھنڈرات دریائے سندھ سے بہت دور ہیں (جبکہ دیبل دریا کے کنارے تھا) مگر ممکن ہے زلزلوں اور دیگر قدرتی حوادث کے باعث دریا نے رُخ تبدیل کرلیا ہو۔ ہاں! یہ اشکال باقی رہ جاتا ہے کہ قدیم ماخذ میں بھنبھور نامی شہر کا ذکر دیبل سے الگ کیوں آتا ہے؟

بیٹ کو بہاولپور کے نواح میں بھی بتایا گیا ہے۔ جیہم (جو ہمارے نزدیک جام صاحب ہے) کو جھمپیر بھی کہا گیا ہے۔ بعض نے راوڑ کو موجودہ حیدرآباد اور نیرون کوٹ کو حیدرآباد سے کچھ فاصلے پر ''جھرک'' کے مقام پر قرار دیا ہے۔ ہم نے تمام اختلافات کو سامنے رکھتے ہوئے سندھ کے نقشے، محمد بن قاسم کی ممکنہ یلغار کے خطوط اور طبعی و عسکری قرائن کی روشنی میں اندازے لگا کر ان مقامات کی تعیین کی ہے مگر اس میں غلطی کا امکان بہرحال موجود ہے۔

③ تاریخ سندھ از میر معصوم شاہ بھکری، ص ۲۹

سندھ کے اکثر لوگ اگرچہ اپنی بت پرستی پر قائم تھے اس کے باوجود وہ محمد بن قاسم سے محبت کرتے تھے۔ اس دلنواز نوجوان کی واپسی پر وہ زار و قطار روتے رہے۔ بہت سے بت خانوں میں پجاریوں نے احتراماً اس کے مجسمے بنا کر رکھ لیے۔[1] یہ بات ان لوگوں کی تردید کے لیے کافی ہے جو مسلم فاتحین کو ظالم، خونی اور لٹیرا مشہور کرتے ہیں۔ اگر مسلم فاتحین نے غیر مسلموں پر ظلم و جبر کیا ہوتا تو مقامی لوگ کبھی ان سے اس طرح اظہارِ عقیدت نہ کرتے۔

حجاج بن یوسف کی وفات

ولید بن عبدالملک کے دور میں ۲۷ رمضان ۹۵ ہجری کو عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کا ۵۵ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۷۳ھ میں عبدالملک کی طرف سے حجاز کا گورنر بنا تھا۔ اس کے بعد ۲۲ سال تک وہ حکومت کا ستون رہا۔[2]
وہ نہایت دلیر، ذہین اور قابل انسان تھا، بنو مروان کی حکومت کے پائے مستحکم کرنے میں اس کا بہت بڑا کردار تھا۔ اس کے بعد سندھ اور وسطِ ایشیا کی فتوحات بھی اسی کے عزم اور منصوبہ بندی کا نتیجہ تھیں۔ قرآن مجید سے بے حد شغف رکھتا تھا اور پابندی سے تلاوت کیا کرتا تھا۔[3]

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اس کے مظالم کی وجہ سے اس سے نفرت کرتے تھے مگر ساتھ یہ بھی فرمایا کرتے تھے:

''قرآن مجید میں اس کے انہماک پر مجھے رشک آتا ہے۔''[4]

پورے عراق کا حاکم ہونے کے باوجود اس کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ اس کا تمام اثاثہ قرآن مجید کا ایک نسخہ، ایک تلوار، ایک گھوڑے اور ایک سو (۱۰۰) زرہوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان زرہوں کے بارے میں وہ وصیت کر چکا تھا کہ ایک تہائی ملک کی اندرونی شورشوں کی سرکوبی کے لیے اور دو تہائی بیرون ملک جہاد میں استعمال کی جائیں۔[5]

سعید بن جُبیر رحمہ اللہ کا قتل:

وفات سے کچھ مدت پہلے حجاج نے مشہور تابعی سعید بن جُبیر رحمہ اللہ کو قتل کرایا تھا۔ سعید بن جُبیر بارہ سال پہلے حجاج کے خلاف عبدالرحمن بن اشعث کے خروج میں شریک رہے تھے، شکست کے بعد وہ حجاز چلے گئے تھے اور کئی سال سے وہاں روپوش تھے۔ مکہ کے گورنر خالد بن عبداللہ قسری نے انہیں گرفتار کر لیا اور عبدالملک کے حکم کے مطابق حجاج کے پاس بھیج دیا۔ حجاج نے ان سے سختی سے باز پرس کی، پوچھا: ''سعید! تم نے ہمارے خلاف بغاوت کیوں کی؟''

وہ بولے: ''اللہ امیر کو سلامت رکھے! میں عام سا مسلمان ہوں۔ کبھی درست کام کرتا ہوں، کبھی غلط۔''

حجاج نے کہا: ''امیر المؤمنین کی بیعت کیوں توڑی؟''

---

[1] فتوح البلدان، ص ٤٢٤ [2] الاعلام زِرِکلی: ١٦٨/٢؛ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ٣٠٧؛ البدایة والنهایة: ١٢/٥١١، ٥٥٠

[3] البدایة والنهایة: ١٢/٥١١، ٥٤٩ [4] البدایة والنهایة: ١٢/٥٥٠، ٥٥١ [5] البدایة والنهایة: ١٢/٥٥٢

نوٹ: حجاج کے سادہ طرزِ زندگی کی یہ روایات ضعیف اسناد سے منقول ہیں مگر انہیں مسترد کرنے کی کوئی وجہ نہیں؛ کیوں کہ نصِ قرآنی: فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (سورۃ الشمس، آیت:۸) کے مطابق انسان میں خیر و شر دونوں قسم کا مادہ رکھا گیا ہے اور اکثر لوگوں سے دونوں کا صدور ہوتا رہتا ہے۔ پس حجاج کی برائیوں کو دیکھ کر اس کی مذکورہ خوبیوں کا انکار کرنا بھی تعصب ہوگا اور اس کی یہ خوبیاں دیکھ کر اس کے مظالم کی تمام روایات کو جھوٹ قرار دے دینا بھی ایک خوش فہمی ہوگی۔

سعید رحمۃ اللہ نے کہا: ''ابن اشعث نے مجھ سے اپنی وفاداری پر بیعت لی تھی اور قسم دی تھی۔''

حجاج بھڑک کر بولا: ''تمہیں یاد نہیں! میں نے عبداللہ بن زبیر کو قتل کرنے کے بعد مکہ میں تم لوگوں سے خلیفہ کی وفاداری پر بیعت لی تھی، پھر میں کوفہ کا گورنر بن کر آیا، یہاں پھر تم لوگوں سے بیعت لی۔ تم امیرالمؤمنین کی دو بیعتیں بھول گئے، اس جولاہے کے بچے کی بیعت یاد رہی۔''

حجاج ان کا نام اور مقام جانتا تھا مگر انہیں مرعوب کرنے کے لیے پوچھا: ''بتاؤ! کیا نام ہے تمہارا؟''

فرمایا: ''میرا نام سعید ہے۔'' (یعنی سعادت مند)

حجاج نے کہا: ''کس کے بیٹے ہو؟'' سعید بن جبیر رحمۃ اللہ بولے: ''جبیر کا۔'' (جُبیر کے معنی اصلاح کی ہوئی چیز)

حجاج نے طنز کرتے ہوئے کہا: ''نہیں تم شقی بن کسیر ہو۔'' (شقی یعنی بدبخت، کسیر یعنی ٹوٹی پھوٹی چیز)

سعید بن جبیر رحمۃ اللہ نے فرمایا: ''میری والدہ میرا نام تجھ سے بہتر جانتی تھیں۔''

حجاج نے کہا: ''تم بھی بدبخت ہو اور تمہاری ماں بھی۔''

سعید بن جبیر رحمۃ اللہ نے تحمل سے کہا: ''خوش بختی اور بدبختی کا معاملہ تمہارے اختیار میں نہیں۔''

حجاج نے بگڑ کر کہا: ''دیکھو! اب میں تمہیں کس طرح موت کے گھاٹ اتارنے والا ہوں۔''

سعید رحمۃ اللہ نے بے ساختہ کہا: ''مطلب یہ کہ میری ماں نے میرا نام درست رکھا تھا۔'' (یعنی تم جیسے ظالم کے ہاتھوں مر کر میں شہید ہو جاؤں گا تو میرے سعادت مند ہونے میں کیا شک ہوگا۔)

حجاج نے کہا: ''کیا تم نے بغاوت کر کے کفر کا ارتکاب نہیں کیا؟''

سعید بولے: ''نہیں، جب سے ایمان لایا ہوں، کبھی کفر نہیں کیا۔''

حجاج نے غصے سے کہا: ''دیکھنا اب میں تمہیں کس طرح زندگی کے بدلے جہنم رسید کرتا ہوں۔''

سعید بن جُبیر رحمۃ اللہ بولے: ''اگر میں جانتا کہ موت تمہارے اختیار میں ہے تو تمہی کو معبود بنا لیتا۔ مگر میرا عقیدہ ہے: لا الٰہ الا اللہ۔''

حجاج تلملا کر بولا: ''بتاؤ میں تمہیں کس طرح قتل کروں؟''

سعید رحمۃ اللہ نے اطمینان سے کہا: ''جس طرح اپنے لیے پسند کرو۔ آگے بدلہ تمہارا منتظر ہے۔''

حجاج نے کہا: ''تیرے لیے ہلاکت ہو۔''

سعید رحمۃ اللہ بولے: ''ہلاکت اس کے لیے ہے جو جنت سے محروم کر کے جہنم میں داخل کر دیا جائے۔''

آخرکار حجاج نے جلاد کو حکم دیا کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔

سعید بن جبیر رحمۃ اللہ سزائے موت کے لیے باہر لائے گئے تو ہنس پڑے۔ حجاج کو پتا چلا تو پھر بلایا اور پوچھا: ''تم کس بات پر ہنسے؟''

سعید رحمہ اللہ بولے: ”تمہاری اللہ کے بارے میں جرأت دیکھ کر اور اللہ تعالیٰ کے حلم پر۔“

حجاج نے جلاد سے کہا: ”میرے سامنے ان کی گردن اڑاؤ۔“

سعید رحمہ اللہ نے کہا: ”اچھا میں دو رکعت نماز پڑھ لوں۔“

یہ کہہ کر نماز پڑھی۔ پھر قبلہ رخ ہو کر کہا:

﴿اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ﴾

”میں نے اپنا منہ اس پاک ذات کی طرف کیا جس نے آسمان زمین بنائے اور میں سب طرف سے ہٹ کر ادھر متوجہ ہوا اور میں مشرکین میں سے نہیں۔“

حجاج نے کہا: ”اس کا منہ قبلے کی طرف سے ہٹا کر نصاریٰ کے قبلے کی طرف کر دو جنہوں نے اپنے دین میں تفریق کی اور اختلاف پیدا کیا۔“

سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا منہ ادھر کر دیا گیا تو وہ بولے:

﴿اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾

”تم جس طرف بھی منہ پھیرو ادھر بھی اللہ موجود ہے۔“

حجاج نے زچ ہو کر کہا: ”اسے اوندھا لٹا دو۔ ہم تو ظاہر پر عمل کرنے کے ذمہ دار ہیں۔“

سعید رحمہ اللہ بولے:

﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِیْهَا نُعِیْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى﴾

”ہم نے زمین ہی سے تم کو پیدا کیا ہے اور اسی میں تم کو لوٹائیں گے اور اس سے پھر دوبارہ اٹھائیں گے۔“

حجاج نے حکم دیا: ”قتل کر دو۔“

سعید رحمہ اللہ نے کہا: ”میں تمہیں اس بات کا گواہ بناتا ہوں:

”اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ.“

تم اس گواہی کو محفوظ رکھنا، قیامت کے دن ملو گے تو لے لوں گا۔“

پھر دعا کی: ”یا اللہ! میرے بعد اسے کسی پر ظلم کی مہلت نہ دینا۔“

آخر کار انہیں اوندھا لٹا کر گردن کاٹ دی گئی۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن

شہادت کے بعد ان کے جسم سے بہت زیادہ خون نکلا، حجاج کو حیرت ہوئی۔ طبیب سے وجہ پوچھی۔ اس نے کہا: ”ان کا دل بالکل مطمئن تھا، دل میں قتل کا ذرا بھی خوف نہیں تھا؛ اس لیے دورانِ خون اپنی اصلی حالت رہا۔ عام لوگوں کا خون موت کے خوف سے پہلے ہی خشک ہو جاتا ہے۔“

سعید بن جُبیر رحمہ اللہ کی عمر ۵۰ سال کے لگ بھگ تھی۔ اپنے دور میں صف اول کے عابد وزاہد اور فقیہ ومحدث تھے۔
امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے تھے: ''اس زمانے میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو علوم میں ان کا محتاج نہ ہو۔''[1]
یہ دردناک واقعہ ۹۵ ہجری کا ہے۔
سعید بن جُبیر رحمہ اللہ کے قتل کی اطلاع سے عالم اسلام کے علمی وروحانی حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کو معلوم ہوا تو دعا کی: ''اے اللہ! اے ظالموں کی کمر توڑنے والے! حجاج کی کمر توڑ دے۔''[2]
ایسا ہی ہوا۔ حجاج بن یوسف اس واقعے کے چند دن بعد شدید بیمار پڑ گیا۔ یہ معدے کا کینسر تھا جس نے اسے بالکل لاغر اور نحیف کر دیا۔ طبیبوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ شکم میں کیڑے پڑ چکے ہیں۔ مرض کا اثر دماغ پر بھی ہوا اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگا۔ جب بھی آنکھ لگتی تو دیکھتا کہ سعید بن جبیر رحمہ اللہ اس کا گریبان پکڑ کر پوچھ رہے ہیں:
''اللہ کے دشمن! مجھے کیوں قتل کیا؟''
حجاج ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا اور کہتا: ''میرا سعید سے کیا لینا دینا، مجھے ان سے کیا سروکار۔''
اسی حال میں کچھ دنوں بعد اس کی موت واقع ہوگئی۔[3]

کلمۂ حق بلند کرنا قابلِ تحسین ہے:

سعید بن جُبیر کے واقعے میں یہ بات ملحوظ رہے کہ ان کا مسلح خروج میں شریک ہونا اس زمانے میں مختلف فیہ مسئلہ تھا مگر ان کا حجاج کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنا ہر دور میں قابل تقلید رہا ہے اور رہے گا۔ قیامت تک ان کی حق گوئی پر علمائے اُمت فخر کر سکتے ہیں۔ شریعت، بدکردار اور ظالم حکام کی اصلاح کے لیے علماء پر ہی یہ ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ وہ سچی بات کہیں اور برحق مسئلہ بیان کریں۔ یہ الگ بات ہے کہ کہیں موقع کے لحاظ سے اسلوب دعوتی اور حکیمانہ ہونا چاہیے اور کہیں ظالم کا سرنیچا کرنے کے لیے بانگ دہل صدائے حق بلند کرنا ضروری ہوتا ہے جیسے سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کیا۔ اس کے برعکس یہاں حجاج کا کردار بلاشبہ ظالمانہ تھا؛ کیوں کہ جب باغیوں کی جمعیت منتشر ہو چکی ہو تو شریعت ایسی حالت میں باغی قیدیوں کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ یہاں بغاوت کچلی جا چکی تھی، لوگ منتشر ہو گئے تھے؛ اس لیے سعید بن جُبیر رحمہ اللہ سے کوئی خطرہ نہ تھا مگر حجاج نے انہیں اور اس طرح کے متعدد تابعین کو چن چن کر قتل کرایا کیوں کہ حجاج کے نظریات میں بے حد تشدد تھا۔ وہ حکومت سے بغاوت کو کفر کہتا تھا۔ اس کا باغی قیدیوں سے مطالبہ ہوتا تھا کہ ان کی توبہ تب قبول ہوگی جب کہ وہ اپنے اقدام کو کفر مانیں اور کفر سے توبہ کریں۔ اگر وہ خود کو مسلمان کہتے تو حجاج انہیں کفر وارتداد کا مرتکب مان کر قتل کرا دیتا تھا۔ اس عمل کے ظلم اور اس نظریے کے گمراہی ہونے میں کوئی شک نہیں۔

❖❖❖

---

[1] البداية والنهاية: ۱۲/۴۶۵ تا ۴۷۰؛ المحن، ص ۲۳۳ تا ۲۳۶
[2] تاريخ خليفة بن خياط، ص ۳۰۷
[3] البداية والنهاية: ۱۲/۴۶۵ تا ۴۷۰

حجاج بن یوسف کے کردار کا محاکمہ

حجاج بن یوسف اُمتِ مسلمہ کی ان شخصیات میں سے ہے جو انتہائی متنازعہ رہی ہیں۔اس کا کردار بعض معاملات میں قابل رشک ہے اور بعض میں افسوس ناک۔مختلف روایات کو سامنے رکھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ حجاج خوارج کی طرح دینی شدت پسندی کا شکار تھا۔اس کے ساتھ وہ بدتمیز، سفاک اور بے دریغ قتل کرانے والا بھی تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ حجاج ایک عسکری ماہر مگر جابر سیاست دان اور ایک متلون مزاج شخص تھا۔شاید ایک ہی جسم میں دو انسان بستے تھے۔ایک ضدی، سنگ دل اور مغرور۔دوسرا غیور اور قومی حمیت سے لبریز۔اس کے قریبی لوگ بھی نہیں سمجھ سکتے تھے کہ کب کس بات پر اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ہاں دو باتیں اس میں بہرحال مستقل دکھائی دیتی ہیں: ایک حکومت کی انتہائی وفاداری، دوسرے سخت گیری اور خودرائی۔اس کے بعض اجتہادات عجیب وغریب تھے۔مثلاً اس کے نزدیک حکومت کی اطاعت نمازوں کی طرح فرض عین تھی اور وہ اس سے سرتابی کرنے والے کو فرض کا منکر شمار کرتا تھا، اسے کافر اور واجب القتل مانتا تھا۔اس کے ہاتھوں اکثر لوگ اسی ''اجتہاد'' کا نشانہ بنے۔بغاوت کو کفر سمجھتا اور گرفتار ہونے والے باغیوں سے مطالبہ کرتا کہ اپنے کفر کا اقرار کر کے توبہ کرو۔جو اس میں ہچکچاتا قتل کر دیا جاتا۔[1]

حجاج کی خونریزی:

حجاج کی خونریزی، مظالم اور سخت گیری کے بارے میں کچھ باتیں مبالغہ آمیز بھی ہیں۔مگر کچھ باتیں صحیح سند سے منقول ہیں۔امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں ثقہ محدثین کے سلسلۂ سند سے نقل کیا ہے کہ حجاج بن یوسف نے ایک لاکھ بیس ہزار افراد کو گرفتاری کے بعد قتل کرایا تھا۔[2] جبکہ میدان جنگ میں اس کے مقتولین حدِ شمار سے باہر ہیں۔

حجاج کے مظالم، ضعیف روایات میں:

تاریخی روایات میں صحابہ کرام، بزرگوں اور معزز شہریوں پر حجاج بن یوسف کے مظالم کا ذکر بکثرت ہے۔ان میں سے کچھ روایات ضعیف ہیں اور کچھ صحیح السند۔یہ ثابت ہے کہ عبدالملک نے حجاج بن یوسف کو ۷۵ھ میں مکہ کے ساتھ مدینہ کا والی بھی بنا دیا تھا، اس طرح پورا حجاز اس کے زیر تسلط آ گیا تھا۔بعض روایات میں ہے کہ مدینہ آ کر اس نے

---

① تهذيب التهذيب: ۲/ ۲۱۰، ط دکن

② عن هشام بن حسان قال :احصوا ما قتل الحجاج صبراً فبلغ مائة الف وعشرين الف قتيل. (سنن الترمذی، ح: ۲۲۲۰ .باب ماجاء فی ثقیف كذاب و مبير) قال الالبانی: صحيح...... وهشام بن حسان هو محدث بصرى، كان شابا فی ايام الحجاج، كان اعلم الناس بحديث الحسن البصری وابن سيرين.توفی سنة۱٤۸ من الهجرة.قال الذهبی:هشام بن حسان من الثقات احتج به اهل الصحاح.(تاريخ الاسلام للذهبی: ۹/ ۳۲۰)

شہریوں کو ڈرایا دھمکایا اور سخت رویہ اپنایا۔ وہ اہل مدینہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک سمجھتا تھا۔

مدینہ کے جس بھی شہری پر اسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالفت کا شک ہوا، اس کی تذلیل کی اور اس کے جسم پر گرم سیسے سے داغ لگوائے جو غلامی کی علامت ہوا کرتی تھی۔

سہل بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں فوت ہونے والے آخری صحابی تھے۔ ۹۱ھ میں فوت ہوئے۔

ایک روایت میں ہے کہ حجاج نے انہیں بلوا کر کہا: ''تم نے امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کی مدد نہیں کی، وجہ کیا تھی؟''

وہ بولے: ''میں نے مدد کی تھی۔''

حجاج نے کہا: ''جھوٹ بولتے ہو۔'' یہ کہہ کر ان کی گردن پر سیسے کا داغ لگوادیا۔ [1]

بزرگ مدنی صحابی جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو (جن کی عمر اس وقت ۹۰ سال کی تھی) بلوا کر ان کے ہاتھ پر داغ لگوایا۔

جب حجاج کوفہ گیا تو وہاں خادم رسول صلی اللہ علیہ وسلم انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی گردن پر داغ لگوایا۔ [2]

ایک روایت میں ہے کہ حجاج کوفہ کا گورنر بن کر گیا تو ابن اشعث کی بغاوت کے معاملے میں سب لوگوں کے ساتھ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو بھی تفتیش کے لیے بلوایا۔ جب وہ آئے تو حجاج نے کہا:

''ارے گندے آدمی! ہر فتنے میں سرگرداں! کبھی علی کے ساتھ، کبھی ابن زبیر کے ساتھ، کبھی ابن اشعث کے ساتھ۔ اللہ کی قسم! تجھے جڑ سے اکھاڑ دوں گا، گوہ کی طرح گھسیٹوں گا۔''

انس رضی اللہ عنہ نے نرمی سے فرمایا: ''اللہ بھلا کرے، کون مراد ہے؟''

حجاج نے کہا: ''ارے بہرے! تو ہی مراد ہے۔'' انس رضی اللہ عنہ انا للہ پڑھتے ہوئے لوٹ گئے اور فرمایا:

''اگر اپنے بچوں کا خیال نہ آ گیا ہوتا تو ایسا جواب دیتا کہ وہ ہمیشہ کے لیے گنگ ہو جاتا۔'' [3]

بنوامیہ کی حمایت اور بنو ہاشم کی مخالفت میں وہ ناصبیت کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل تسلیم نہیں کرتا تھا۔ ایک عالم یحییٰ بن یعمر رحمہ اللہ نے اس موضوع پر اسے لاجواب کر دیا۔ حجاج نے ان کی دلیل کو تسلیم کر لیا مگر ساتھ ہی انہیں اس حق گوئی کی پاداش میں جلاوطن کر دیا۔ [4]

---

[1] تاریخ الطبری: ۱۹۵/۶، عن الواقدی۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اس واقعے کے چار برس بعد ۷۸ھ میں فوت ہوئے۔ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ اس واقعے کے سولہ برس بعد ۹۱ھ میں تقریباً ۱۰۰ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔

[2] تاریخ الطبری: ۱۹۵/۶

[3] المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۴۷/۱، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ..... سند میں قطن بن یزید کو سارق حدیث کہا گیا ہے۔ جعفر بن سلیمان صدوق شیعی ہیں۔ علی بن زید (جدعان) حافظ ابن حجر کے نزدیک ضعیف اور دار قطنی کے بقول ''لین'' ہیں۔ حافظ ذہبی نے انہیں ''لیس بالثبت'' کہا ہے۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ اس واقعے کے وقت ۸۵ برس کے تھے۔ اس کے ۱۸ سال بعد ۹۳ھ میں ۱۰۳ سال کی عمر پا کر دنیا سے رخصت ہوئے۔

[4] السنن الکبریٰ للبیہقی، ح: ۱۱۹۲۸ باسنادین، فی احدھما بشر بن مہران وھو متروک وفی الاخر صالح بن موسیٰ الطلحی وھو متروک ایضاً..... ملحوظہ: اگرچہ یہ ضعیف روایات کا مواد ہے مگر صحیح روایات سے حجاج کی جو زیادتیاں ثابت ہیں، انہیں دیکھتے ہوئے ان ضعیف روایات میں بیان کیے گئے مظالم میں کوئی خاص مبالغہ محسوس نہیں ہوتا۔ صحیح روایات میں مذکور حجاج کی کارستانیاں آگے آ رہی ہیں۔

حجاج کی زیادتیوں کا ثبوت، صحیح روایات سے:

صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حجاج ایک بے رحم اور سخت گیر انسان تھا جو اپنی پالیسی کے خلاف کوئی معمولی بات بھی برداشت نہیں کرتا تھا اور اس پر سخت ترین سزائیں دیتا تھا۔ ''صحیح البخاری'' میں ہے کہ لوگوں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حجاج کے سلوک کی شکایت کی تو انہوں نے صبر کی تلقین کی اور فرمایا: ''میں نے تمہارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ تم پر کوئی زمانہ ایسا نہ آئے گا کہ اگلا زمانہ اُس سے زیادہ برا نہ ہو، یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جاملو۔''[1]

صحابہ کرام اور صحابیات بھی اس کے شر سے محفوظ نہ تھے۔ جیسا کہ اس کا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو قتل کرانا، اس کارنامے پر فخر کرنا، ان کی لاش کو الٹا لٹکانا اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آنا صحیح مسلم اور مسند احمد میں مذکور ہے۔[2] صحیح مسلم میں ہے کہ اس نے سلمہ بن اَکوَع رضی اللہ عنہ کو جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سے ربذہ کے دیہات میں رہائش پذیر تھے، بڑی سختی سے ڈانٹا اور کہا: ''ارے اَکوَع کے بیٹے! تو الٹے پاؤں دین سے ہٹ گیا، دیہاتی بن گیا۔'' وہ شائستگی سے بولے: ''نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیہات میں رہنے کی اجازت دی تھی۔''[3]

حجاج کے بعض محاسن، صحیح روایات میں:

بعض اوقات وہ نصیحت کی بات پر ہاتھ روک بھی لیتا تھا۔ صحیح روایت ہے کہ حجاج ایک تابعی عباس بن سہل کو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے وفاداری کے الزام میں پیٹ رہا تھا کہ ان کے والد سہل بن سعد رضی اللہ عنہ جو بہت بوڑھے تھے، آ گئے۔ حجاج نے پٹائی روک دی۔ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''کیا تم ہمارے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کا لحاظ نہیں رکھو گے؟'' وہ بولا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے بارے میں کیا وصیت فرمائی ہے؟'' فرمایا: ''یہ کہ انصار کے اچھوں سے اچھا سلوک کرنا اور بروں سے درگزر کرنا۔'' یہ سن کر حجاج نے عباس کو چھوڑ دیا۔[4]

حجاج کی فصاحت و بلاغت اور زورِ خطابت ضرب المثل ہے۔ وہ لوگوں کو عمدہ وعظ و نصیحت کرتا تھا۔ اس کے مظالم کی شہرت کے باوجود بعض محدثین نے اس کے خطبات کے ٹکڑے نقل کیے ہیں۔ امام مسلم نے اَعمش کے حوالے سے حجاج کے ایک خطبے کا یہ جملہ نقل کیا ہے: ''قرآن مجید کو اس طرح جمع کرو جیسے جبرئیل علیہ السلام نے جمع کیا تھا۔''[5]

---

[1] صحیح البخاری، ح: ۷۰٦۸، کتاب الفتن: باب لایاتی زمان الاالذی بعدہ شرمنہ

[2] صحیح مسلم، ح: ٦٦٦۰؛ مسند احمد، ح: ۲٦۹۷٤

[3] صحیح البخاری، ح: ۷۰۸۷؛ صحیح مسلم، ح: ٤۹۳۲، کتاب الامارۃ، باب تحریم رجوع المهاجر الیٰ استیطان وطنه ......
یہ ۷۴ ہجری کا واقعہ ہے جب حجاج ۳۴ سال کا تھا اور سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ تقریباً ۸۰ سال کے۔ اگر ان کی جگہ کوئی عام آدمی ہوتا تب بھی ایک معمر شخص سے اس طرح کا لب ولہجہ اختیار کرنا اخلاق و مروّت کے خلاف تھا۔ حجاج کے اس برتاؤ کو بدتمیزی اور غرور کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔

[4] صحیح ابن حبان، ح: ۷۲۸۷؛ مسند ابو یعلی، ح: ۷۵۳۲؛ المعجم الاوسط للطبرانی، ح: ۸۳۵
صحیح مسلم، ح: ۳۱۹۲، کتاب الحج، باب رمی الجمرۃ ......

[5] مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ حجاج ثقہ راوی تھا۔ حافظ ذہبی اس کا تعارف یوں کراتے ہیں: ''کان ظلوماً، جباراً، ناصبیا، خبیثاً، سفاکاً للدماء. (سیر اعلام النبلاء: ٤/۳٤۳، الرسالۃ) امام نسائی فرماتے ہیں: لیس بثقة ولا مامون. ﴿تاریخ الاسلام ذہبی: ۲/۱۰۷۱، بشار﴾

یہ بھی صحیح سند سے ثابت ہے کہ وہ حج کے مناسک میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا اتباع کرتا تھا اور عبدالملک نے اسے اس بارے میں تاکید کی تھی کہ مناسک میں ان کی تعلیم پر چلنا۔ (1)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اس کے تعلقات تھے۔ عمدہ سند کی ایک روایت میں ہے کہ حجاج نے انس رضی اللہ عنہ کو بلایا اور اپنی سرکاری مہر انہیں دے کر کہا: ''آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں، ان کا عمل اور طریقہ دیکھ چکے ہیں۔ یہ میری مہر آپ کے پاس ہے، میں کوئی کام آپ کے حکم کے بغیر نہیں کروں گا۔''

پھر ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی سخت ترین سزا کے بارے میں پوچھا۔ (2)

بعض صحیح روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کبھی کبھار حجاج کو سرعام ٹوک بھی دیتے تھے۔ ایک بار حجاج تقریر میں وضو کا طریقہ بتا رہا تھا۔ مگر اس نے قرآنی آیت ﴿فَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ کو جان بوجھ کر ایک ایسی قرأت میں پڑھا جو جمہور علماء و قرّاء کے نزدیک معروف نہیں۔

یہ سن کر انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اللہ سچا ہے اور حجاج جھوٹا۔'' (3)

ایک بار حجاج نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نافذ کردہ شدید ترین سزا کا پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ کچھ لوگ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے اور مسلمانوں کے اونٹ لوٹ کر لے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے دو کی آنکھیں گرم سلائیوں سے داغ دیں، دو کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے اور دو کو سولی پر چڑھا دیا۔ (4)

معلوم ہوا کہ حجاج کا حضرت انس رضی اللہ عنہ جیسے صحابہ سے اتنا تعلق ضرور تھا کہ وہ ان سے احادیث پوچھتا تھا۔

---

(1) صحیح البخاری، ح: ۱٦٦٢، ۱٦٦٣، کتاب الحج، باب قصر الخطبة بعرفة

ان پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ حجاج کا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے قتل سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر اول تو تاریخی روایات اسے ثابت کرتی ہیں۔ دوسرے درایت کے لحاظ سے بھی یہ ہرگز بعید نہیں۔ صحیح روایات شاہد ہیں کہ وہ صرف اس بناء پر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کی تمنا کرتا تھا کہ ان کا مصحف، مصحفِ عثمانی سے ذرا مختلف تھا۔ نیز صحیح مسلم کی روایت سے ثابت ہے کہ اس نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو قتل کر کے فخر کیا، انہیں منافق قرار دیا اور حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کی بزرگی اور ضعف کا لحاظ کیے بغیر ان کے ساتھ سخت گستاخی برتی۔ ایسے شخص کے بارے میں کیسے حسنِ ظن کیا جا سکتا ہے کہ اس نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی بزرگی کا کوئی لحاظ کیا ہوگا؛ اسی لیے محدثین نے اپنی تصانیف میں ''ذکر کذاب ثقيف ومبيرها'' کا ذکر کرتے ہوئے ''مبیر'' یعنی سفاک اور خونخوار کا مصداق حجاج بن یوسف ہی کو قرار دیا ہے۔

(2) مسند ابی عوانة: ٤/٨٤ باسناد صحیح متصل، ط دار المعرفة

سند یہ ہے: اسحاق بن سيار الضبعي (بعض نسخوں میں اسحٰق بن یسار النصیبی ہے جو غلط ہے) عمرو بن عاصم، سلام بن مسكين ابو روح، سمعت ثابت البناني۔ اسحٰق بن سیار الحافظ الثبت ہیں۔ عمرو بن عاصم کلابی متوفی ۲۱۳ھ صدوق، صحیح البخاری و مسلم کے راوی ہیں۔ سلام بن مسکین متوفی ١٦٧ھ ثقہ ہیں۔ ثابت البنانی متوفی ۱۲۰ھ ثقہ ہیں۔ تمام روایات کو سامنے رکھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شروع میں حجاج کا رویہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے ساتھ حقارت آمیز تھا مگر بعد میں جب عبدالملک نے اس برتاؤ پر اسے ڈانٹا (جس کا ذکر پیچھے آ چکا ہے) تو اس نے اپنی روش درست کر لی۔ انہیں اپنی مہر بھی دی، ان سے احادیث بھی معلوم کیں اور پھر ان پر اپنے من مانے اجتہاد کے ساتھ عمل بھی کیا۔

(3) السنن الکبریٰ للبیهقی: ۱/۱۱۷، ط العلمية

(4) صحیح البخاری، ح: ٥٦٨٥، کتاب الطب، باب الدواء بألبان الإبل

حجاج کے ظالمانہ اجتہادات اور بُرے فیصلے۔ صحیح روایات میں:

مگر حجاج خود ساختہ مجتہد بن کر احادیث سے خود ہی مسائل کا استخراج کرتا تھا۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے عبرت ناک سزاؤں کی روایت سننے کے بعد وہ مسلمانوں پر اسی قسم کی سزائیں جاری کرنے میں جری ہو گیا۔ اس نے منبر پر چڑھ کر لوگوں کو اس قسم کی سزائیں دینے پر فخر ظاہر کیا اور کہا: ''ہمیں انس رضی اللہ عنہ نے بتایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی نافرمانی پر ہاتھ پاؤں کٹواتے اور آنکھیں پھوڑتے تھے۔ تو کیا ہم اللہ کی نافرمانی پر ایسی سزائیں نہ دیں؟؟''①

کچھ مدت بعد انس بن مالک رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے معلوم کرایا کہ انہوں نے حجاج کو کون سی حدیث سنائی تھی۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث دہرائی تو عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے فرمایا: ''کاش! آپ حجاج کو یہ حدیث نہ سناتے تو بہتر تھا۔ وہ لوگ (جن پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سخت سزا جاری کی تھی) مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملے تھے اور مدینہ کی چراگاہ پر لوٹ مار کے مرتکب ہوئے تھے۔ حجاج نے اس حدیث کی بنیاد پر ان لوگوں کا خون حلال سمجھ لیا ہے جنہوں نے نہ اسلام سے خارج ہونے کا ارادہ کیا ہے نہ مشرکین میں شامل ہونے کا۔''②

حسن بصری رحمہ اللہ بھی فرماتے تھے: ''کاش! انس رضی اللہ عنہ نے حجاج کو یہ حدیث نہ سنائی ہوتی۔''③

خود انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''میں کسی بات پر اتنا پشیمان نہیں ہوا جتنا حجاج کو یہ حدیث سنا کر پشیمان ہوں۔''④ غرض حجاج کا صحابہ سے علمی استفادہ بھی ثابت ہے اور عوام پر ظلم و ستم بھی۔

حجاج بسا اوقات عوامی اجتماعات کے مواقع پر نمازوں کو تاخیر سے پڑھاتا تھا جس سے انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور بہت سے اکابر سخت نالاں تھے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نماز میں تاخیر پر افسوس کی وجہ سے فرمایا کرتے تھے: ''میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی کوئی بات نماز کے سوا باقی نہیں دیکھتا تھا مگر اب نمازیں بھی ضائع ہونے لگیں۔''⑤

ایک بار حجاج کے نماز میں تاخیر کرنے سے تنگ آ کر انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے اسے تنبیہ کا ارادہ کیا مگر ساتھیوں نے ان کی جان کے خوف سے انہیں منع کر دیا۔ آخر وہ سواری پر بیٹھ کر یہ کہتے ہوئے گھر واپس چل دیے:

''اب تو کلمۂ شہادت کے سوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔''⑥

حجاج کے نظریے کے مطابق خلیفہ اور حاکم کی اطاعت فرض عین تھی اور اس میں ذرا سی سرتابی سے آدمی باغی اور کافر

---

① مسند ابی عوانة: ٤/٨٤، ط دار المعرفة بیروت ② المعجم الأوسط، ح: ٦٤٧٧، ط دار الحرمین

③ صحیح البخاری، ح: ٥٦٨٥

④ فتح الباری: ١٠/١٤٢

⑤ صحیح البخاری، ح: ٥٢٩، ٥٣٠

⑥ سمعت ثابتا البناني قال كنا مع أنس بن مالك فأخر الحجاج الصلاة فقام أنس يريد أن يكلمه فنهاه إخوانه شفقة عليه منه فخرج فركب دابته فقال في مسيره ذلك والله ما أعرف شيئا مما كنا عليه على عهد النبي ﷺ إلا شهادة أن لا إله إلا الله فقال رجل فالصلاة يا أبا حمزة قال قد جعلتم الظهر عند المغرب أفتلك كانت صلاة رسول الله ﷺ. (فتح الباری: ٢/١٣)

ثابت ہو جاتا تھا۔ ایک بار اس نے مسجد میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

''اللہ کی قسم! اگر میں لوگوں کو مسجد کے ایک دروازے سے نکلنے کا کہوں اور وہ دوسرے دروازے سے نکلیں تو میرے لیے ان کا خون بھی حلال ہے اور مال بھی۔ اگر میں قبیلہ ربیعہ کو مضر کے بدلے سزا دوں تو یہ اللہ کی طرف سے میرے لیے حلال ہے۔''[1]

وہ قرآن کو رسمِ عثمانی کے مطابق عام کرنا چاہتا تھا جو ایک قابلِ تعریف بات تھی مگر چونکہ اس کی طبیعت میں تشدد تھا؛ اس لیے وہ دورِ خلافت راشدہ کے ان بزرگ صحابہ کرام پر کھلی تنقید کرتا تھا جن کے نسخے رسمِ عثمانی کے مطابق نہ تھے۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ذکر بڑی نفرت سے یوں کیا کرتا تھا:

''افسوس ہے ہذیل کے غلام پر! وہ سمجھتا تھا کہ وہ اللہ کا قرآن پڑھتا رہا۔ نہیں وہ تو عرب بدوؤں کے رجزیہ اشعار پڑھتا رہا۔ اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ نازل نہیں کیا تھا۔''[2]

حجاج یہ بھی کہتا تھا: ''اگر میں عبداللہ بن مسعود کو پالیتا تو انہیں قتل کر کے چھوڑتا۔''[3] یہ غصہ صرف اس وجہ سے تھا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قراءت اور مصحف عثمانی سے بعض جگہ مختلف تھی۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سورتوں کو سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران اور سورۂ نساء کہا کرتے تھے اور یہی تمام صحابہ اور تمام علمائے اسلام اور قرائے کرام کا طرز رہا ہے، مگر حجاج بن یوسف کی طبیعت میں افراط و تفریط کا یہ عالم تھا کہ وہ ایسا کہنا بے ادبی شمار کرتا تھا اور کہا کرتا تھا: ''سورتوں کو سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران اور سورۂ نساء نہ کہا کرو بلکہ یوں کہا کرو: وہ سورہ جس میں گائے کا ذکر آیا ہے، وہ سورہ جس میں آل عمران کا ذکر آیا ہے۔''[4]

اس کے تشدد کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اللہ کی بے پایاں رحمت، مغفرت اور تھوڑے عمل پر زیادہ ثواب کی حدیثوں پر بھی اسے شک ہوتا تھا۔ چنانچہ شبِ قدر کی احادیث اس کے خیال میں مشکوک تھیں۔[5]

حجاج کی بعض خوبیاں اور نیکیاں۔ ضعیف روایات میں:

ان تمام باتوں کے باوجود اس میں کچھ خیر بھی تھی۔ سندھ کی فتح اس کا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔ وہ قرآن مجید کو رسمِ عثمانی اور نسخۂ عثمانی کے مطابق عام کرنے کا زبردست داعی تھا۔ قرآن مجید کے حروف پر نقطے اور اعراب لگانا اس کی حسناتِ جاریہ میں شامل ہے۔[6]

---

① سنن ابی داؤد، ح: ٤٦٤٥، قال الالبانی: صحیح الاسناد۔ ② سنن ابی داؤد، ح: ٤٦٤٥، قال الالبانی: صحیح الاسناد۔

③ رواہ ابن ابی الدنیا باسناد حدثنی واصل بن عبدالاعلیٰ، قال حدثنا ابوبکر بن عیاش عن عاصم قال سمعتہ یعنی الحجاج بن یوسف (ثم نقل خطبتہ و فیہ) واللّٰہ لو اخذت ربیعۃ بمضر لکان حلالا لی. یا عجباہ من عبد ہذیل زعم انہ یقرأ قرآنا من عنداللّٰہ فواللّٰہ ما ہو الا رجز من رجز الاعراب واللّٰہ لو ادرکت عبد ہذیل لضربت عنقہ. (الاشراف فی منازل الاشراف، ص١٣٥) وہذا اسناد متصل صحیح، وہذہ الروایۃ ایضا فی مستدرک حاکم، ح: ٦٣٥٢، فی اسنادہ ابوعمر احمد بن عبدالجبار وہو ضعیف۔

④ صحیح البخاری، ح: ١٧٥٠، کتاب الحج، باب یکبر مع کل حصاۃ

⑤ مصنف عبد الرزاق، ح: ٧٧٠١ ⑥ وفیات الاعیان: ٣٢/٢ ط دار صادر

ایک بوڑھے کی گالیاں سن کر درگزر:

اکثر وہ بے رحم اور سفاک نظر آتا ہے مگر کئی مواقع پر وہ سخت ترین گستاخی کو بھی کسی معمولی وجہ سے نظر انداز کر جاتا تھا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے واپس وہ مدینہ منورہ کے پاس پہنچا تو ایک بوڑھا ملا۔ حجاج نے پوچھا:

''مدینہ والوں کا کیا حال ہے؟''

بوڑھا بولا: ''بہت برا۔ نبی کے حواری کا بیٹا شہید کر دیا گیا۔''

حجاج نے پوچھا: ''کس نے شہید کیا؟''

بولا: ''بدمعاش، ملعون حجاج نے۔ اس پر اللہ کی لعنت، فرشتوں کی لعنت، وہ ہلاک ہو، اسے اللہ کا ذرا خوف نہیں۔''

حجاج بھڑک اٹھا اور گرج کر کہا: ''ارے بڈھے! حجاج کو دیکھ کر پہچان لے گا۔''

بولا: ''ہاں بالکل۔ اللہ حجاج کو بھلائی کی پہچان نہ کرائے، اسے کسی مصیبت سے نہ بچائے۔''

حجاج نے منہ سے نقاب ہٹا دیا اور بولا: ''بڈھے ابھی تیرا خون بہے گا تو پتہ چلے گا۔''

چالاک بوڑھے نے حجاج کو پہچان کر فوراً انداز بدل لیا، بولا: ''حجاج! واللہ یہ تو بڑی عجیب بات ہو گئی۔ اگر تم مجھے پہچانتے تو ایسی بات نہ کہتے۔ میں عباس بن ابی داؤد ہوں، مجھے روزانہ پانچ بار پاگل پن کا دورہ پڑتا ہے۔''

حجاج بولا: ''جا بھاگ جا۔ اللہ تیری بیماری دور نہ کرے۔''[1]

قصور کا اعتراف:

حجاج اکثر ہمیں ضدی دکھائی دیتا ہے لیکن کبھی کبھار وہ اپنی غلطی کا کھلے دل سے اعتراف بھی کرتا تھا۔ گورنر بننے سے پہلے ایک بار اس نے حج کے لیے جاتے ہوئے مسجد نبوی میں نماز ادا کی۔ صف میں سعید بن المسیب رحمہ اللہ اس کے ساتھ کھڑے تھے۔ حجاج سجدے میں جھکنے اور اٹھنے میں امام سے پہل کر جاتا تھا۔ امام نے سلام پھیرا اور نماز ختم ہو گئی تو سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے حجاج کا دامن پکڑ کر اسے روک لیا۔ پھر اپنی تسبیحات سے فارغ ہو کر جوتا اٹھا لیا اور ڈانٹ کر کہا:

''ارے چور! ارے خائن! تو اس طرح نماز پڑھتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اس جوتے سے تیری خبر لوں۔''

حجاج نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے کچھ مدت بعد وہ مدینہ کا گورنر بن کر آیا تو لوگ ڈرے کہ حجاج اب سعید بن مسیب سے انتقام لے گا مگر اس نے سعید رحمہ اللہ کے پاس حاضری دے کر کہا: ''وہ فقرے آپ ہی نے کہے تھے۔''

سعید رحمہ اللہ نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا: ''ہاں میں نے کہے تھے۔''

حجاج بولا: ''اللہ آپ جیسے استاد کو بہترین جزائے خیر دے۔ میں نے اس دن کے بعد جب بھی نماز پڑھی آپ کی بات یاد آجاتی تھی۔''[2]

---

[1] البدایة والنهایة: ۱۲/۵۱۶، ۵۱۷

[2] تاریخ دمشق: ۱۲/۱۱۹، ۱۲۰؛ البدایة والنهایة: ۱۲/۵۱۳

حجاج کی سیرت کا خلاصہ۔ حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ میں:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس میں زبردست شجاعت بھی تھی اور اس کی تلوار میں خون ریزی بھی۔ وہ معمولی شبے پر انسانی جانوں کے قتل جیسے فعل کا ارتکاب بکثرت کر گزرتا تھا حالاں کہ اللہ نے اس اقدام کو ناحق بالکل حرام قرار دیا ہے۔ وہ اپنے خیال میں زیاد کے مشابہ بنتا تھا اور زیاد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشابہ بننے کی کوشش کرتا تھا جب کہ یہ لوگ اس پائے کے بالکل نہیں تھے۔''[1]

آخری لمحات میں حجاج کے الفاظ:

اس دور کے عام لوگ تو حجاج کو منافق بلکہ کافر تک کہا کرتے تھے۔ اہل علم بھی اسے سخت گناہ گار اور ظالم سمجھتے تھے۔

حجاج کو بھی معلوم تھا کہ لوگوں میں اس کی شہرت کیسی ہے، اسی لیے وہ آخری لمحات میں یہ اشعار پڑھ رہا تھا:

يَـارَبِّ قَـدْ حَلَفَ الْاَعْدَاءُ وَاجْتَهَدُوْا ... بِـاَنَّـنِيْ رَجُـلٌ مِنْ سَـاكِـنِـي الـنَّـارِ

اَيَـحْـلِـفُـوْنَ عَـلٰى عَـمْـيَاءَ وَيْـحَهُـمْ ... مَـا عِـلْـمُهُـمْ بِـعَظِـيْمِ عَفْوِ الْغَفَّارِ

اِنَّ الْـمَـوَالِـيْ اِذَا شَـابَـتْ عَبِيْدُهُـمْ ... فِـيْ رِقِّهِـمْ عَـتَـقُـوْهُـمْ عِتْقَ اَبْـرَارِ

وَاَنْـتَ يَـا خَـالِقِيْ اَوْلٰـى بِذَا كَـرَمًا ... قَـدْ شِبْتُ فِـي الـرِّقِّ فَاَعْتِقْنِيْ مِنَ النَّارِ

''اے اللہ! میرے مخالفین پختہ قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ میں جہنمی ہوں۔ ان کا ستیاناس کہ وہ ایک اَن دیکھی بات پر کیوں قسمیں کھا رہے ہیں، انہیں غفار کی بے پناہ مغفرت کا کوئی اندازہ نہیں۔ غلام جب بوڑھے ہو جاتے ہیں تو مہربان مالک انہیں آزاد کر دیا کرتے ہیں۔ میرے خالق! تو ان سے کہیں زیادہ مہربان ہے۔ میں غلامی میں بوڑھا ہو چکا ہوں، پس مجھے آگ سے آزاد فرما دے۔''

اس کے بعد دعا کی: ''اے اللہ! تو مجھے معاف کر کے دکھا دے؛ کیوں کہ لوگ کہتے ہیں کہ تو مجھے معاف نہیں کرے گا۔'' کچھ دیر بعد اس کی روح پرواز کر گئی۔ یہ واقعہ ۲۷ رمضان ۹۵ھ کا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اپنی ہر مجلس میں حجاج کے لیے بددُعائیں کرتے تھے۔ انہیں جب حجاج کی موت کی خبر ملی تو سجدے میں گر گئے۔ حجاج کے خوف سے وہ روپوش تھے، اس اطلاع پر باہر آ گئے اور لوگوں سے اس کی موت کا حال پوچھا۔ جب لوگوں نے بتایا کہ وہ مرتے وقت یہ الفاظ کہہ رہا تھا تو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے حیرت سے پوچھا:

''کیا واقعی؟''

لوگوں نے تصدیق کی تو حسن بصری رحمہ اللہ کے منہ سے نکلا: ''کیا پتا اس کی بخشش ہو ہی جائے۔''[2]

◆◆◆

① البداية والنهاية: ١٢/ ٥١٠

② البداية والنهاية: ١٢/ ٥٤٥ تا ٥٥٢

ولید کے تعمیری وترقیاتی کارنامے

مشرق ومغرب میں حیرت انگیز فتوحات کے علاوہ ولید بن عبدالملک کا دور رفاہی خدمات اور تعمیری وترقیاتی منصوبوں کے لحاظ سے بھی قابلِ رشک تھا۔ اس نے پورے عالم اسلام میں راستوں کو ہموار اور بہتر بنایا، تمام شہروں کی جامع مساجد کی توسیع اور تعمیرِ نو کرائی، جابجا نہروں کی کھدائی کا منصوبہ شروع کرایا۔ [1]

کئی کارناموں میں اسے پہل کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ پہلا حکمران تھا جس کے حکم سے شاہراہوں پر ہر ایک میل کے بعد علامتی تختیاں (سنگِ میل) نصب کی گئیں۔ یہ کام ۸۸ھ (۷۰۷ء) میں ہوا۔ [2] اس نے پہلی بار مملکت میں حفظانِ صحت کا شعبہ قائم کیا اور جگہ جگہ شفاخانے اور ہسپتال کھلوائے۔ اسی طرح وہ پہلا حکمران ہے جس نے نابیناؤں کی رہنمائی اور معذور شہریوں کی دیکھ بھال کے لیے خدمت گاروں کا تقرر کیا اور ان کے لیے ماہانہ امدادی رقوم مختص کیں۔ گداگری کا پیشہ ممنوع قرار دیا اور تمام ضرورت مندوں کے لیے سرکاری فنڈز جاری کر دیے۔ ماہِ رمضان میں سرکاری طور پر مساجد میں افطار کا انتظام شروع کرایا۔ نظامِ مملکت پر اس کی گرفت مضبوط تھی اور تمام شعبے فعال تھے۔ [3]

جامع مسجد دِمشق کی تعمیر:

جامع مسجد دِمشق کی تعمیر ولید کا سب سے بڑا تعمیراتی کارنامہ شمار ہوتا ہے۔ یہ عمارت شہر کے بالکل وسط میں تھی، اس عمارت کی تاریخ یہ تھی کہ زمانہ قدیم میں یہ ستارہ پرست یونانیوں کی عبادت گاہ تھی۔ رومی یونانیوں پر غالب آئے تو یہ عمارت گرجے میں تبدیل کر دی گئی۔ یہ ایک وسیع احاطہ تھا جس کے مشرقی حصے میں نصاریٰ نے قربان گاہیں بنا رکھی تھیں۔ اسے ''چرچ یوحنا'' کہا جاتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمانوں نے دِمشق پر دو طرفہ حملہ کر کے نصف حصہ صلح کے ساتھ اور نصف بزورِ شمشیر فتح کیا۔ صلح کے ساتھ فتح کیے گئے علاقے میں نصاریٰ کے گرجوں کو اُسی طرح قائم رکھنے کا معاہدہ ہوا۔ بزورِ شمشیر فتح کردہ علاقے میں یہ معاہدہ نہ تھا۔ شہر کو ناپ کر مشرقی اور مغربی ضلع میں تقسیم کیا گیا تو یہ گرجا عین وسط میں آیا۔ اسے بھی تقسیم کر لیا گیا۔ مشرقی حصہ جہاں جانور ذبح کیے جاتے تھے، مسلمانوں کے حصے میں آ گیا۔ اسلامی لشکر کے امیر ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے یہاں مسجد کی بنیاد رکھی اور نمازوں کی امامت کرائی۔ [4]

---

① كتاب العيون والحدائق(جزء الوليد بن عبدالملك) لابن مسكويه، ص ٣ ② تاريخ الطبرى: ٤٩٧/٦

③ تاريخ الخلفاء، ص١٦٨، ط نزار ؛ تاريخ يعقوبى: ص ٢٢٧ ؛ تاريخ الطبرى: ٤٩٦/٦

④ البداية والنهاية: ١٢/ ٥٦٠ تا ٥٦٥، نيز ٥٩٠

ولید بن عبدالملک کے دور تک نمازیوں کی کثرت کے باعث مسجد بہت تنگ ہوگئی تھی، چرچ بالکل ساتھ تھا اور نصرانی رسومات کی آوازیں نمازیوں کی یکسوئی میں خلل ڈالتی تھیں۔ آخر ولید بن عبدالملک نے پادریوں سے گرجا خریدنا ضروری سمجھا اور پیش کش کی کہ انہیں شہر کے اطراف میں وسیع اراضی دی جائے گی جہاں وہ چار گرجے بنا سکتے ہیں، اس کے ساتھ خطیر رقم بھی پیش کی۔ پادریوں نے انکار کر دیا اور وہ عہد نامہ دکھایا جس کے مطابق مسلمان شہر کے مغربی حصے میں تمام گرجوں کو باقی رکھنے کے پابند تھے۔ یہ سن کر ولید نے کہا: ''اچھا تو پھر مشرقی حصے کا ''کلیسا توما'' اس معاہدے میں داخل نہیں ہے، میں اسے منہدم کر کے مسجد میں تبدیل کر دوں گا۔''

''کلیسا توما'' نصرانیوں کے نزدیک بہت مقدس تھا، اس لیے انہوں نے گھبرا کر اپنی ضد چھوڑ دی اور ولید کی پیش کش قبول کر کے مسجد سے متصل قدیم چرچ مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔[1]

یوں دِمَشق کے عین وسط میں پہلی صدی ہجری کی سب سے بڑی مسجد تعمیر ہونا شروع ہوئی۔ تعمیری سامان ہندوستان، فارس اور مراکش تک سے منگوایا گیا تھا۔ جزیرہ قبرص سے اٹھارہ کشتیوں پر سونا چاندی لاد کر لایا گیا۔ پوری دنیا میں اس تعمیری کام کی دھوم تھی۔ قیصرِ روم نے مسلمانوں سے تعلقات بہتر بنانے کے لیے مینا کاری اور گل کاری کا عمدہ سامان بھیجا تھا۔ سنگِ مرمر اور سنگِ سماق کی اعلیٰ ترین اقسام تلاش کر کے دیواروں اور ستونوں کو سجایا گیا۔ ایک ایک ستون پر لاکھوں روپے خرچ ہوئے تھے۔ گنبد اور مینار کے لیے بنیادیں اتنی گہری کھودی گئیں کہ پانی نکل آیا۔[2]

روشنی کے لیے سینکڑوں قندیلیں لگائی گئی تھیں۔ ان میں سے چھ سو قندیلیں سونے کی زنجیروں کے ساتھ لٹکائی گئی تھیں۔ مسجد کی کشادگی کا یہ عالم تھا کہ اس میں بیس ہزار افراد آسانی سے جمع ہو سکتے تھے۔ پوری عمارت سنگِ مرمر کی تھی۔ درمیان میں مختلف رنگوں کے پتھر رنگینی بکھیرتے تھے۔ دروازوں پر سونے کے پانی کا ملمع تھا۔ آیاتِ قرآنیہ کی خطاطی نے محرابی دروازوں اور دیواروں کو ایک عجیب حسن عطا کر دیا تھا۔ محرابوں میں بڑی نفاست اور نزاکت کے ساتھ گراں قیمت موتی اور ہیرے نصب کیے گئے تھے۔ عمارت کی چھت میں ساج کی لکڑی استعمال کی گئی تھی جو سرما میں گرم اور گرما میں ٹھنڈی رہتی ہے اور صدیوں تک خراب نہیں ہوتی۔ اوپر سیسے کی چادر چڑھائی گئی تھی جس کی وجہ سے بارش کا ایک قطرہ اندر نہیں ٹپکتا تھا۔[3]

تعمیر کا کام ۸۷ھ میں شروع ہوا، پانچ سال بعد نماز کا آغاز ہو گیا۔ آرائش، خطاطی اور مینا کاری کا کام بیس سال میں مکمل ہوا۔ تعمیراتی عمل میں بارہ ہزار معماروں اور مزدوروں نے حصہ لیا تھا۔[4] ایک اندازے کے مطابق اس منصوبے پر ۵۶ لاکھ دینار خرچ ہوئے تھے۔[5] مسجد کی تعمیر مکمل ہوئی تو بڑی بڑی ہستیاں یہاں آئیں۔ بصرہ سے

① البدایة والنهایة: ۱۲/۵٦۵ تا ۵٦۷؛ مروج الذهب: ۳/۳٦۵، ۳٦٦

② احسن التقاسیم فی معرفة الاقالیم للمقدسی، ص ۱۵۷ تا ۱۵۹؛ مسالك الابصار للعمری: ۳/۵۱۸؛ تاریخ دِمَشق: ۲/۲٦۱

③ احسن التقاسیم، ص ۱۵۷ تا ۵۹؛ تاریخ دِمَشق: ۲/۲٦۳ ④ شذرات الذهب فی خبر من ذهب لابن عماد الحنبلی: ۱/۳۵۳

⑤ البدایة والنهایة: ۱۲/۵۷۵. یہ رقم آج کل کے تقریباً چودہ کروڑ ڈالر (چودہ ارب روپے) کے برابر ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ دمشق تشریف لائے اور ولید بن عبدالملک کے پیچھے اس مسجد میں نماز ادا کی۔ یہ ۹۲ھ کا واقعہ ہے۔ اس کے اگلے برس ۹۳ھ میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ وفات پا گئے۔[1]

اسی مسجد کے مشرقی مینار پر قیامت کے قریب نمازِ فجر کی اقامت کے دوران حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا۔ وہ دو فرشتوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے مینار پر اتریں گے اور مسلمانوں کی قیادت کرتے ہوئے دجال کو قتل کریں گے۔[2]

جامع مسجدِ دمشق پر غیر مسلم سفیر کا تبصرہ:

یہ عالی شان مسجد اپنے زمانے میں دنیا کی ان عمارتوں میں شامل تھی جنھیں دیکھنے سیاح دور دراز سے آتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے دورِ حکومت میں مسجد کی اس قدر آرائش وزیبائش خصوصاً سونے چاندی کے استعمال کو بے جا خرچہ شمار کر کے ارادہ کیا تھا کہ بعض قیمتی اشیاء عمارت سے اتار کر بیت المال میں داخل کر دی جائیں۔ انھی دنوں رومی سلطنت کا سفیر شام آیا اور جامع اموی کو دیکھ کر غش کھا کر گر پڑا۔ افاقہ ہوا تو کہنے لگا: ''میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مسلمان ایسی عمارت بنا سکتے ہیں۔ ہم رومی آپس میں کہا کرتے تھے کہ عربوں کا عروج چند روزہ ہے مگر یہ تعمیر دیکھ کر میں سمجھ گیا ہوں کہ ان کا اقتدار باقی رہے گا۔'' حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو اس کے تاثرات معلوم ہوئے تو اپنا ارادہ بدل دیا اور فرمایا: ''اگر واقعی اس عمارت سے غیر مسلموں کو حسد ہو رہا ہے تو اسے باقی رہنے دو۔''[3]

مسجدِ نبوی کی تعمیر و توسیع:

ولید بن عبدالملک کا ایک اور بڑا تعمیراتی کارنامہ مسجدِ نبوی کی تعمیرِ نو اور توسیع ہے۔ اس سے قبل مسجد نبوی کی آخری توسیع حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوئی تھی جسے ولید کے دور میں نصف صدی سے زیادہ مدت گزر چکی تھی۔ اس دوران آبادی میں اضافے کی وجہ سے مسجد کے نمازیوں اور زائرین کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ موجودہ عمارت اتنے بڑے مجمعے کے لیے بالکل ناکافی ثابت ہو رہی تھی؛ اس لیے یہ منصوبہ وقت کی اہم ضرورت تھا۔

اس عظیم الشان منصوبے کا آغاز ۸۸ ہجری میں ہوا۔ اس وقت مدینہ کے گورنر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تھے۔ ولید نے انھیں لکھا کہ مسجد نبوی کی قدیم عمارت کو منہدم کر کے اسے از سر نو تعمیر کرایا جائے، مسجد کے ساتھ واقع امہات المؤمنین کے حجرے اور پڑوسیوں کے مکانات خرید کر انھیں مسجد کی حدود میں شامل کر لیا جائے۔ جو لوگ اپنا مکان فروخت کرنے میں پس و پیش کریں ان سے جبری طور پر زمین لے کر قیمت ادا کر دی جائے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس حکم کے مطابق مسجد نبوی کی توسیع کے لیے لوگوں سے گفتگو کی۔ سب نے دلی رضامندی سے اپنے مکانات حوالے کر دیے۔ چونکہ قدیم عمارت سے لوگوں کو دلی لگاؤ تھا اس لیے اس کے انہدام کا کام شروع کرنے کی کسی کو ہمت نہیں ہوتی تھی؛ اس لیے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مدینہ منورہ کے اکابر کو جمع کیا تاکہ

---

① البدایة والنہایة: ۵۹۰/۱۲ ② صحیح مسلم، ح: ۷۵۶۰، الفتن واشراط الساعة، باب ذکر الدجال

③ البدایة والنہایة: ۵۸۲،۵۸۱/۱۲؛ العیون والحدائق، ص ۱۱

ان کی موجودگی میں یہ منصوبہ شروع ہوا اور اس کے کارِ خیر ہونے میں کسی کو شک وشبہ نہ رہے۔ ان اکابر میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پوتے قاسم بن محمد رحمہ اللہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے فرزند عبداللہ اور کئی بزرگ شامل تھے۔ ان اکابر کی نگرانی میں یہ کام شروع ہوا۔ مسجدِ نبوی کے قبلہ کی سمت کی دیوار مزید آگے بڑھا دی گئی۔ امہات المؤمنین اور پڑوسیوں کے مکانات مسجد میں شامل ہونے کے بعد مسجد کا طول اور عرض تین تین سو فٹ ہوگیا۔ قیصر روم نے ولید بن عبدالملک کی فرمائش پر اس تعمیراتی منصوبے کے لیے ایک لاکھ مثقال سونا اور بڑی مقدار میں مینا کاری اور نقاشی کا سامان بھیجا۔ [1]

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے غیر معمولی توجہ اور شوق سے اس منصوبے پر کام کیا تھا اور ولید نے اس کے لیے بے پناہ مالی وسائل خرچ کیے تھے۔ صرف قبلہ رخ دیوار کی نقاشی اور سجاوٹ پر ۴۵ ہزار دینار (تقریباً گیارہ کروڑ ۲۵ لاکھ روپے) صرف ہوئے تھے۔ مسجد کے صحن میں ایک فوارہ بھی لگایا گیا تھا جس سے مسجد کی خوبصورتی کو چار چاند لگ گئے تھے۔ یہ منصوبہ تین سال میں مکمل ہوا جس پر سارے عالم اسلام نے ولید بن عبدالملک کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ عمارت کی تکمیل کے بعد ۹۱ھ میں ولید بن عبدالملک خود روضۂ اطہر کی زیارت کے لیے حاضر ہوا اور مسجد کے تعمیراتی کام کی خوب تعریف کی۔ ساتھ ہی اہلِ مدینہ کو دل کھول کر نقد رقم اور دیگر تحائف سے نہال کر دیا۔ [2]

ولید بن عبدالملک کی وفات:

ہفتہ ۱۵ ربیع الاول ۹۶ھ کو خلیفہ ولید بن عبدالملک کا انتقال ہوگیا۔ اس کی عمر ۵۱ سال تھی، اس نے نو سال پانچ ماہ حکومت کی تھی۔ ذاتی زندگی میں وہ نیک وصالح انسان تھا۔ سرکاری مصروفیات کے ہجوم میں بھی روزانہ دس پارے تلاوت کرنا اس کا معمول تھا۔ عام حکمرانوں کے برعکس اپنے بھائیوں سے بڑی محبت کرتا اور ان کے حقوق کا پورا خیال رکھتا تھا۔ طبعی طور پر اتنا شریف اور سلیم الفطرت تھا کہ کہا کرتا تھا:

''اگر قرآن مجید میں قومِ لوط کا ذکر نہ ہوتا تو میں کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ کوئی ایسی گری ہوئی حرکت بھی کر سکتا ہے۔'' [3]

بعض مؤرخین نے ولید کی ان صفات کے ساتھ یہ بھی ذکر کیا ہے کہ وہ بڑا ظالم وجابر شخص تھا۔ یہ بات اس لحاظ سے درست ہے کہ اس نے حجاج بن یوسف کو کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔ اس کا غصہ بھی مشہور ہے، جس پر وہ کبھی قابو پا لیتا تھا اور کبھی بے قابو ہو جاتا تھا۔ تاہم وہ اتنا سفاک، بے رحم اور متکبر نہ تھا جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ [4]

---

① تاریخ الطبری: ٦/٤٣٥، ٤٣٦

② وفاء الوفاء: ٢/٩٣، ٩٤، ٩٧؛ العیون والحدائق، ص ١١؛ تاریخ الطبری: ٦/٤٣٦

③ العبر فی خبر من غبر: ١/٨٦ ؛ دول الاسلام للذھبی: ١/٨٤ ؛ تاریخ یعقوبی: ٢٢٧ ؛ مروج الذھب للمسعودی: ٣/٣٧٤

④ حافظ ابنِ کثیر کا خیال ہے کہ مؤرخین کو واقدی کی ایک روایت سے غلط فہمی ہوئی ہے، جس میں منقول ہے: ''ولید جابر اور سخت سزائیں دینے والا تھا۔ غصہ آتا تو اس پر قابو نہیں رکھ سکتا تھا، ضدی تھا، بہت زیادہ کھانے پینے، مباشرت کرنے اور طلاقیں دینے کا عادی تھا، کہا جاتا ہے کہ اس نے باندیوں کے علاوہ ۶۳ عورتوں سے شادی کر رکھی تھی۔'' حافظ ابنِ کثیر یہ روایت نقل کر کے لکھتے ہیں: ''اس سے ولید بن یزید فاسق مراد ہوگا نہ کہ ولید بن عبدالملک جو کہ جامع دمشق کا بانی ہے۔'' (البدایة والنھایة: ١٢/٦٠٩، ٦١٠) ولید کے غیظ وغضب اور ہیبت کا تو انکار نہیں کیا جا سکتا مگر اس پر عیش وعشرت میں انہماک اور شرعی حد سے زیادہ نکاحوں کا الزام کسی نے نہیں لگایا، بلکہ سخت گیری کے ساتھ ہی اس کی سادگی اور جفاکشی بھی مشہور ہے۔ اس کے برعکس ولید بن یزید کی عیاشی اور نالائقی دیگر روایات کے باعث ثابت ہے؛ اس لیے حافظ ابنِ کثیر نے یہ رائے قائم کی ہے جو بلاشبہ درست ہے۔

سلیمان بن عبدالملک

ربیع الاوّل ۹۶ھ......تا......صفر ۹۹ھ

دسمبر 714ء......تا......اکتوبر 717ء

سلیمان بن عبدالملک کے دورِ خلافت کو بنو مروان کے احتساب کا زمانہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کے باپ عبدالملک کا دور اندرونی مخالفین کو ختم کرنے اور بڑے بھائی ولید کا زمانہ بیرونی فتوحات حاصل کرنے میں گزرا۔ قدرتی طور پر اس طرح نظامِ حکومت فوج کے ہاتھوں میں آ گیا تھا؛ کیوں کہ یہ تمام مہمات فوج کے بل بوتے پر انجام دی جا رہی تھیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ایوانِ اقتدار کے اندر اور باہر فوجی جرنیلوں کے اختیارات بے پناہ بڑھ گئے جس کی وجہ سے بدعنوانی، مظالم اور ناانصافی جیسے ناپسندیدہ عناصر نظامِ مملکت میں در آئے۔ قوم کے بہی خواہوں کو اس صورتحال پر تشویش تھی مگر ولید نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔

دراصل عسکری مہمات کے جویاں ولید بن عبدالملک کی طبیعت میں کچھ تیزی ہونا ایک فطری سی بات تھی، یہی مزاج اس کے بہت سے ماتحتوں میں سرایت کر گیا تھا۔ حجاج بن یوسف جو عراق سے لے کر خراسان اور ہندوستانی مقبوضات تک کا حاکم تھا، اسی بے لچک رویے اور سخت گیر پالیسی کا عادی تھا؛ اس لیے جب حکومت کی طرف سے کسی فرد یا گروہ کے خلاف کارروائی کی جاتی تو اس کا انداز اٹل ہوتا تھا اور بعض اوقات بے گناہ لوگ بھی اس کی زد میں آ جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ولید کے دور میں حکام کا رعب داب ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ اس سخت پالیسی کی زد میں علماء، مشائخ اور بزرگانِ دین بھی آ جاتے تھے۔ سعید بن جُبیر رحمہ اللہ کے قتل کا دردناک واقعہ اس کی ایک واضح مثال ہے۔

سیاسی سوچ کے حامل حکومت کے بعض اہم ارکان اس طرزِ عمل کو ناپسند کرتے تھے،۔ ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جہاں تک ہو سکے لوگوں کو حکومتی عتاب سے بچایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو عوام سے نرمی برتی جائے۔

سلیمان بن عبدالملک طبیعت، مزاج اور سوچ میں اپنے بڑے بھائی ولید سے مختلف تھا۔ ان کے باپ عبدالملک میں شجاعت، حربی مہارت اور جبر و قہر کے ساتھ سیاست و تدبر، فیاضی اور تعمیری و علمی و ادبی ذوق کی صفات بیک وقت موجود تھیں۔ قدرتِ الٰہیہ نے ان صفات کو ولید اور سلیمان میں اس طرح تقسیم کر دیا کہ سپاہیانہ اوصاف اور تعمیراتی ذوق

ولید کی قسمت میں آئے جبکہ سیاسی سوچ، علم وادب، عدل وانصاف اور سخاوت وفیاضی سلیمان کے دامن میں۔

امرائے بنومروان میں گروہ بندی:

پالیسی کے اختلاف کی وجہ سے امرائے بنومروان میں دو گروہ بن چکے تھے: سخت گیر پالیسی کے حامیوں میں ولید، حجاج اور اس جیسے کچھ امراء شامل تھے۔ نرم پالیسی کے قائل عہدے داروں میں عمر بن عبدالعزیز، سلیمان بن عبدالملک اور رجاء بن حَیوۃ پیش پیش تھے۔ پہلے گروہ کا ذوق یہ تھا کہ شمشیر بکف ہو کر زیادہ سے زیادہ علاقوں پر اسلام کا جھنڈا نصب کیا جائے اور حکومت کے آڑے آنے والی ہر شے کو کچل دیا جائے۔ دوسرے گروہ کی سوچ یہ تھی کہ زیادہ رقبے کی بجائے موجودہ علاقے کے استحکام پر توجہ دی جائے اور لطف وکرم سے عوام کے دلوں کو جیتا جائے۔

عمر بن عبدالعزیز اور حجاج بن یوسف کے مابین کش مکش:

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ حجاج سے اس قدر نالاں تھے کہ ان کی مدینہ منورہ کی گورنری کے ایام میں ایک بار حجاج بن یوسف کو امارتِ حج سونپ دی گئی۔ قاعدے کے مطابق مدینہ کا گورنر، ہر امیرِ حج کو تمام سہولتیں پہنچانے کا پابند ہوتا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز کو یہ گوارا نہ ہوا۔ انہوں نے خلیفہ ولید کو مراسلہ بھیج کر حجاج کی خاطر مدارات سے معذرت کر لی۔ ولید نے حجاج کو لکھ بھیجا: ''عمر بن عبدالعزیز نے تمہاری مہمانی سے معذرت کر لی ہے، مناسب نہیں کہ تم ایسے شخص کو مہمانی کی زحمت دو جو اس پر آمادہ نہیں۔'' چنانچہ حجاج کو مدینہ سے کترا کر مکہ جانا پڑا۔ ①

رائے کے اختلاف سے شروع ہونے والی یہ دراڑ ولید کے آخری ایام تک بہت گہری ہو چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے حجاج بن یوسف کے مظالم کی شکایت ولید بن عبدالملک سے کی تو ولید نے حجاج کی طرف داری کرتے ہوئے عمر بن عبدالعزیز کو مدینہ کی امارت سے معزول کر دیا۔ ②

حجاج فوت ہوا تو عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائے اور فرمایا: ''اللہ نے حجاج کا زمانہ ختم کر دیا۔ میرا سر اس کی بارگاہ میں جھکا جا رہا ہے۔'' عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس موقع پر خلیفہ ولید سے حجاج کی موت کی رسمی تعزیت بھی نہ کی۔ ولید یہ محسوس کیے بغیر نہ رہا اور وجہ پوچھ بیٹھا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے یہ کہہ کر جان چھڑائی:

''حجاج ہمارے گھر کا فرد تھا، دوسروں کو مجھ سے تعزیت کرنی چاہیے نہ کہ مجھے دوسروں سے۔'' ③

حکومتی پالیسی پر تنقید کی وجہ سے عمر بن عبدالعزیز کو متعدد بار ولید کے مزید عتاب کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ایک دن ولید نے خلافِ معمول انہیں دوپہر کے وقت بلوا لیا۔ یہ گئے تو دیکھا کہ خلیفہ کے ماتھے پر بل ہیں اور افسرِ خاص خالد بن ریان تلوار سونتے کھڑا ہے۔ ولید نے انہیں دیکھتے ہی گرج کر کہا: ''جو شخص خلفاء کو برا بھلا کہتا ہے اس کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ اسے قتل کر دیا جائے یا نہیں؟'' عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ خاموش رہے۔

① سيرة عمر بن عبد العزيز لابن عبد الحكم، ص ٢٩
② تاريخ الطبری: ٤٨١/٦، ٤٨٢
③ سيرة عمر بن عبد العزيز لابن عبد الحكم، ص ٢٨

ولید نے ڈانٹ کر کہا: ''جواب کیوں نہیں دیتے؟'' یہ پھر بھی چپ رہے۔ ولید نے پھر سوال دہرایا۔
عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بولے: ''کیا قتل کرنے کا ارادہ ہے؟'' ولید نے کہا: ''نہیں، سوال خلفاء کی عیب جوئی کا ہے؟'' عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بولے: ''میرے خیال میں خلفاء کی اہانت کے مرتکب کو سزا دی جاسکتی ہے۔''
ولید نے سر اٹھا کر خالد بن ریان کو دیکھا، عمر رحمہ اللہ سمجھے کہ اب قتل کا حکم ہوگا مگر ولید کی زبان کو کسی غیبی طاقت نے روک لیا تھا۔ وہ یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا: ''یہ ان لوگوں میں سب سے زیادہ مغرور آدمی ہے۔''[1]

ولید اور سلیمان کے مابین کش مکش:

ان واقعات کے بعد ولید اپنے بھائی سلیمان کی ولی عہدی منسوخ کرنے کا سوچنے لگا جو عبدالملک کی وصیت کے مطابق دوسرا ولی عہد تھا۔ ولید اس کی جگہ اپنے بیٹے عبدالعزیز کو جانشین بنانا چاہتا تھا۔ حجاج بن یوسف، قُتَیبَہ بن مسلم اور محمد بن قاسم جیسے نامور فوجی جرنیل اس بارے میں خلیفہ کے ہم خیال تھے مگر عمر بن عبدالعزیز نے یہ کہہ کر اس رائے کی مخالفت کی کہ (عبدالملک کے دور میں) ہم سے سلیمان کی ولی عہدی کا عہد لے لیا گیا تھا۔ اس پر ولید کو اتنا غصہ آیا کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو ایک کوٹھری میں بند کرکے اوپر سے مٹی کا پلستر کرادیا۔ آخر گھر کی بعض خواتین کی سفارش پر تین دن بعد انہیں آزاد کیا گیا، اس وقت وہ مرنے کے قریب ہو چکے تھے۔

اس دوران حجاج فوت ہوگیا اور ۵ ماہ بعد ولید بھی اپنے بیٹے کی ولی عہدی کی بیعت لینے سے قبل دنیا سے رخصت ہوگیا۔ چنانچہ عبدالملک کی قدیم وصیت کے مطابق سلیمان خلیفہ بن گیا۔ وہ بھی ایک سیاست دان کا بیٹا تھا۔ اسے اپنے بھائی کے عزائم کی سن گن مل چکی تھی؛ اس لیے وہ ولید کے وفادار امراء سے خطرہ محسوس کرنے لگا۔[2]

سلیمان نے ولید کے جرنیلوں کو کیوں معزول کیا؟

اس وقت عالم اسلام میں سابق خلیفہ کے جرنیلوں کی پیش قدمی کی صورتحال یہ تھی کہ مشرق میں قُتَیبَہ بن مسلم کی فوج چین کی سرحد پر تھی۔ محمد بن قاسم نے ملتان کو مسخر کرنے کے بعد راجپوتانہ پر یلغار شروع کردی تھی۔ اَندلُس کے گورنر موسیٰ بن نُصَیر نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے منصوبے کے مطابق پہلے فرانس اور پھر پورے یورپ کو زیرِ نگین کرکے مغرب کی طرف سے قُسطَنطِینیَہ پر حملے کا عزم کیا ہوا تھا۔

ان جرنیلوں پر اعتماد کرکے انہیں آگے بڑھنے کا موقع دیا جاتا تو امید تھی کہ اسلامی خلافت کا رقبہ مزید لاکھوں مربع میل وسیع ہوجاتا۔ خاص کر یورپ میں اس وقت زبردست سیاسی انتشار اور خانہ جنگی نے مسلمانوں کے لیے فتوحات کی راہ ہموار کر رکھی تھی؛ اس لیے ضروری تھا کہ یہ موقع ضائع نہ کیا جاتا۔ تاہم دوسری طرف یہ امکان بھی تھا کہ یہ جرنیل سابق خلیفہ سے گہری وابستگی اور موجودہ خلیفہ سے اختلافِ رائے کی بناء پر کہیں اپنے اپنے علاقوں میں بغاوت کرکے خود مختار حکومتیں نہ بنالیں۔ اگر ایسا ہوتا تو عالمِ اسلام ٹکڑوں میں بٹ کر کمزور ہوجاتا۔ سود و زیاں کے ان امکانات پر غور

[1] سیرۃ عمر لابن عبد الحکم، ص ۳۰
[2] تاریخ ابی زرعۃ الدِمَشقی، ص ۵۱۹؛ البدایۃ والنہایۃ: ۶۱۳/۱۲؛ تاریخ دِمَشق: ۳۶۹/۳۶

کر کے سلیمان بن عبدالملک کو محسوس ہوا کہ مزید فتوحات کی بجائے استحکام زیادہ اہم ہے۔ چنانچہ اس نے پہلی فرصت میں ان امراء اور سپہ سالاروں کو معزول کرنا شروع کر دیا جو حجاج بن یوسف کے مقرب یا ولید کے خاص وفادار تھے۔

قُتَیبہ بن مسلم کا قتل:

سلیمان بن عبدالملک کے خدشات بعض جرنیلوں کے بارے میں درست ثابت ہوئے۔ چین کی سرحدوں پر لشکر کشی کرنے والے فاتح قُتَیبہ بن مسلم نے سلیمان کے تخت نشین ہوتے ہی دربارِ خلافت میں مراسلہ لکھ بھیجا کہ اگر مجھے معزول کیا گیا تو میں بغاوت کردوں گا۔ سلیمان نے تحمل سے کام لیتے ہوئے جواب میں قُتَیبہ کو عہدے کی بحالی کا اطمینان دلایا۔ مگر قُتَیبہ کو مرکزِ خلافت سے اس قدر بدگمانی تھی کہ خلیفہ کا جواب ملنے سے پہلے ہی بغاوت کا اعلان کر دیا اور اپنے حامیوں کو خلیفہ سے لڑنے پر ابھارا۔ کچھ سرداروں نے بات مان لی اور کچھ نے خلیفہ سے وفاداری باقی رکھنے پر اصرار کیا۔ اس طرح قُتَیبہ کی فوج میں پھوٹ پڑ گئی اور باہم جنگ کی نوبت آ گئی۔

قُتَیبہ کے حامی کم اور خلیفہ کے وفادار زیادہ تھے؛ اس لیے لڑائی میں قُتَیبہ کو شکست ہوئی۔ خلیفہ کے وفادار افسران نے قُتَیبہ کا سر قلم کر کے دِمَشق بھیج دیا۔ یوں عالمِ اسلام کا یہ نہایت قابل جرنیل امورِ سیاست میں غلط فہمی کا شکار ہو کر اپنوں کے ہاتھوں ایک دردناک انجام کو پہنچا۔ یہ واقعہ سلیمان کی خلافت کے پہلے سال یعنی ۹۶ھ کا ہے۔[1]

محمد بن قاسم کے قتل کا سانحہ:

قُتَیبہ بن مسلم کی طرح فاتحِ سندھ محمد بن قاسم کو بھی حجاج اور ولید کے ہاں بلند مرتبہ حاصل تھا۔ قُتَیبہ جیسے پختہ عمر جرنیل کو بغاوت کرتا دیکھنے کے بعد اگر سلیمان سندھ فتح کرنے والے اس نوجوان سے بھی خطرہ محسوس کرتا تو کوئی عجیب بات نہ تھی۔ تاہم سلیمان بن عبدالملک نے تخت نشین ہونے کے بعد کئی ماہ تک ایسا کوئی فیصلہ نہ کیا۔ ادھر محمد بن قاسم کے ذہن میں بھی کسی باغیانہ اقدام کا خیال تک نہ تھا۔

اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا کہ سلیمان بن عبدالملک نے یکدم محمد بن قاسم کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ اس کا سبب یہ بنا کہ محمد بن قاسم نے راجہ داہر کی دو شہزادیوں: سری دیوی اور پرمل دیوی کو گرفتار کر کے عزت واحترام کے ساتھ دِمَشق بھیج دیا تھا۔ خلیفہ نے ایک دن ان سے حال احوال پوچھا تو ایک شہزادی کو محمد بن قاسم سے اپنے باپ داہر کا بدلہ لینے کا حیلہ سوجھا۔ اس نے محمد بن قاسم پر اپنی عصمت دری کرنے کا جھوٹا الزام لگا دیا۔ خلیفہ یہ سن کر مشتعل ہو گیا۔

چنانچہ دربارِ خلافت کے حکم کے تحت محمد بن قاسم کو عین اس وقت معزول کر دیا گیا جب لشکرِ اسلام کا ایک حصہ دریائے گنگا کے کنارے آباد راجدھانی قنوج تک پہنچ چکا تھا اور دوسرا حصہ خود محمد بن قاسم کی کمان میں راجھستان کے وسطی شہر ''اودھے پور'' سے کوچ کر کے وسطی ہندوستان کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا۔[2]

---

[1] تاریخ الطبری: ۶/۵۰۶ تا ۵۲۲؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۹۶ ھ

[2] چچ نامہ، ص ۲۴۱ تا ۲۴۴

دربارِ خلافت سے یزید بن ابی کبشہ کو یہ احکامات دے کر بھیجا گیا کہ محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے عراق منتقل کر دیا جائے۔ چونکہ محمد بن قاسم نے مفتوحہ علاقوں میں عدل وانصاف اور مہربانی سے حکومت کر کے لوگوں کے دل جیت لیے تھے؛ اس لیے رعایا اس پر سخت دل گرفتہ ہوئی۔ محمد بن قاسم کے مداح چاہتے تھے کہ واپسی اور گرفتاری کے احکامات کی تعمیل نہ کی جائے اور یہاں آزاد حکومت قائم کر لی جائے۔

محمد بن قاسم کے لیے ایسا کرنا کوئی مشکل نہ تھا مگر اس دور اندیش نوجوان نے ذاتی مفاد پر قومی سلامتی کو ترجیح دی اور امت کے مابین کسی خانہ جنگی کا سبب بننا گوارا نہ کیا۔ ابن قاسم نے انکار کا ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر صرف اتنا کہا:

اَضَاعُونِی وَاَیَّ فَتًی اَضَاعُوْا لِیَوْمِ کَرِیْہَۃٍ وَ سَدَادِ ثَغْرٍ

"انہوں نے مجھے ضائع کر دیا۔ افسوس کیسے جوان کو ضائع کر دیا

جو جنگ کے دن اور سرحدوں کی حفاظت میں ان کے کام آتا۔"

محمد بن قاسم نے خود کو یزید بن ابی کبشہ کے حوالے کر دیا جس نے اس مردِ میدان کو ایک خطرناک مجرم کی طرح زنجیروں میں جکڑ کر عراق روانہ کر دیا۔

عراق کا نیا حاکم صالح بن عبدالرحمٰن، حجاج بن یوسف اور اس کے وفاداروں کا سخت مخالف تھا۔ ایک مدت پہلے اس کے بھائی کو جو خارجی گروہ سے تعلق رکھتا تھا، حجاج نے قتل کرا دیا تھا۔ حجاج تو مر چکا تھا؛ اس لیے صالح بن عبدالرحمٰن اپنے بھائی کا انتقام حجاج کے داماد سے لینے پر تل گیا۔ اس نے محمد بن قاسم کو واسط کے جیل خانے میں ڈال کر ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا۔ کال کوٹھری کی گھٹن میں محمد بن قاسم نے جو دردناک اشعار کہے، وہ ان کے ایک قادرالکلام شاعر ہونے کا کافی ثبوت ہیں۔ ان اشعار کا ہر مصرعہ دلوں کے تار جھنجھوڑ دیتا ہے۔ ابن قاسم نے کہا تھا:

فَلَئِنْ ثَوَیْتُ بِوَاسِطٍ وَ بِاَرْضِہَا رَہْنَ الْحَدِیْدِ مُکَبَّلًا مَغْلُوْلًا

"اگر آج میں واسط کے قید خانے اور اس سرزمین میں بیڑی اور طوق میں جکڑا ہوا ہوں تو کیا ہوا۔"

فَلَرُبَّ فِتْیَۃِ فَارِسٍ قَدْ رُعْتُہَا وَلَرُبَّ قِرْنٍ قَدْ تَرَکْتُ قَتِیْلًا

"میں نے کتنے ہی شہسواروں کے ہوش اڑا دیے، اور کتنے مدمقابل قتل کر کے چھوڑے۔"

مرکزِ خلافت سے اپنی وفاداری کا حال بیان کرتے ہوئے اس نے کہا:

اَتَنْسٰی بَنُوْ مَرْوَانَ سَمْعِیْ وَ طَاعَتِیْ وَاِنِّیْ عَلٰی مَا فَاتَنِیْ لَصَبُوْرُ

"کیا بنو مروان نے میری وفاداری اور اطاعت کو فراموش کر دیا،

حالانکہ مجھ سے کچھ چھن جائے تو میں صبر کا عادی ہوں۔"

فَتَحْتُ لَہُمْ مَا بَیْنَ سَابُوْرَ بِالْقَنَا اِلَی الْہِنْدِ مِنْہُمْ زَاحِفٌ وَمُغِیْرُ

"میں نے انہیں سابور سے لے کر ہندوستان تک کا علاقہ نیزے کے وار سے فتح کر کے دیا

جہاں کے لوگ جنگ کے ماہر ہیں اور چھاپہ مار حملوں کے بھی۔"

وَلَوْ كُنْتُ اَجْمَعْتُ الْقَرَارَ لَوُطِّئَتْ　　اِنَاثٌ اُعِدَّتْ لِلْوَغٰى وَ ذُكُوْرُ

"اگر میں (سندھ میں) جم جانے کا عزم کر لیتا تو کتنے ہی مرد و زن ماتم کرنے پر مجبور ہو جاتے۔"

وَمَا دَخَلَتْ خَيْلُ السَّكَاسِكِ عَسْكَرِيْ　　وَلَا كَانَ مِنْ عَكٍّ عَلَىَّ اَمِيْرُ

"نہ سکاسک کے گھڑسوار میری فوجی خیمہ گاہ میں داخل ہوتے، نہ عک کا کوئی فرد مجھ پر امیر مقرر ہوتا۔"

وَلَا كُنْتُ لِلْعَبْدِ الْمَزُوْنِيِّ تَابِعًا　　فَيَا لَكَ دَهْرٌ بِالْكِرَامِ عَثُوْرُ

"اور نہ ہی میں مزونی غلام کا ماتحت بنتا۔ آہ! زمانہ شریفوں کو کس طرح ٹھوکر مارتا ہے۔"[1]

آخر کار صالح بن عبدالرحمٰن نے سخت اذیتیں دینے کے بعد محمد بن قاسم کو قتل کر دیا۔ یہ واقعہ ۹۸ھ کا ہے۔ اس طرح اُمتِ مسلمہ کا ایک نہایت جری، قابل اور ہر دلعزیز سپہ سالار اپنوں کی ناقدری کی نذر ہو گیا۔

محمد بن قاسم کی موت کے بعد داہر کی بیٹیوں نے خلیفہ کے سامنے اپنے جھوٹ کا اقرار کرتے ہوئے کہا: "محمد بن قاسم نے ہمارے ساتھ بھائیوں جیسا برتاؤ کیا تھا۔ ہم نے اس پر جھوٹا الزام لگایا تھا تا کہ باپ کے خون کا بدلہ لیں۔"

یہ سن کر خلیفہ کا پشیمانی سے برا حال ہو گیا۔ اس نے داہر کی بیٹیوں کو قید خانے میں ڈال دیا اور رنج و غم سے اپنی انگلیاں چبانے لگا۔[2] مگر اب یہ پچھتاوا اس جوانِ رعنا کو واپس نہیں لا سکتا تھا جو برصغیر کے تاریک افق پر صبح کا ستارہ بن کر ابھرا تھا۔ برصغیر کے مسلمان آج بھی اس فاتح کے احسان مند ہیں جس کی بدولت انہیں توحید کی نعمت عطا ہوئی۔

اپنے ہوں یا پرائے شرافت اور شجاعت کے اس پیکر کو بھی یاد کرتے رہے۔ ہندوستان کے باشندے محمد بن قاسم کو یاد کر کے مدتوں رویا کرتے تھے۔ بہت سے ہندوؤں نے بت خانوں میں محمد بن قاسم کی تصاویر اور مجسمے بنائے اور اس مجاہد کو دیوتا کا درجہ دینے لگے۔ صدیوں سے حکمرانوں کے جبر و تشدد کا سامنا کرنے والے یہ لوگ سوچتے تھے کہ طاقت اور اختیار رکھنے والا کوئی انسان اتنا مہربان نہیں ہو سکتا۔ اتنی کرم نوازی خدا ہی کر سکتا ہے۔[3]

موسیٰ بن نُصیر رحمہ اللہ سے سلوک:

اَندلُس کے فاتح موسیٰ بن نُصَیر بھی ولید کے مقرب سپہ سالاروں میں شمار ہوتے تھے؛ اس لیے سلیمان بن عبدالملک ان پر بھی پوری طرح اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ طارق بن زیاد کو بھی موسیٰ کا معتمد ہونے کی وجہ سے مشکوک سمجھا گیا۔

---

① الکامل فی التاریخ: ۶۲/۴، ۶۳ ...... سکاسک سے مراد یزید بن ابی کبشہ کا قبیلہ ہے جس کے سپاہیوں نے آ کر محمد بن قاسم کو گرفتار کیا تھا۔ اسی طرح عک اور مزون قبائل کے افسران بھی محمد بن قاسم کی قید و بند اور ستم رسانی میں شریک تھے۔

② چچ نامہ، ص ۲۴۵　　③ فتوح البلدان، ص ۴۲۴

نوٹ: چچ نامہ کے مؤلف نے جو روایت نقل کی ہے اس میں محمد بن قاسم کے قتل کا حکم خلیفہ ولید کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اسی روایت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ محمد بن قاسم کو ایک صندوق میں بند کر کے سندھ سے روانہ کیا گیا اور دم گھٹنے سے راستے میں موت واقع ہو گئی۔ مگر یہ روایت تمام مؤرخین کے بیانات کے بالکل خلاف ہے۔ محمد بن قاسم کا سلیمان کے دور میں اس کے حکم سے گرفتار ہونا اور واسط تک زندہ سلامت پہنچنا اور وہاں قتل کیا جانا ایک متفقہ امر ہے۔

موسیٰ بن نُصیر رحمہ اللہ اور طارق کو سابق خلیفہ ولید بن عبدالملک نے اپنے آخری ایام میں دِمشق بلا لیا تھا تاکہ اَندَلُس کی شاندار فتح پر انہیں انعام واکرام سے نوازے۔ موسیٰ بن نُصیر رحمہ اللہ نے اَندَلُس میں اپنے بیٹے عبدالعزیز کو نائب بنایا اور خود مالِ غنیمت کے انبار لادے جمادی الاولیٰ ۹۶ھ کے آغاز میں دارالخلافہ پہنچے تو خلیفہ ولید کو شدید علیل پایا۔ خلیفہ نے ان کا غیر معمولی اعزاز واکرام کیا۔ جمادی الآخرہ کے وسط میں خلیفہ ولید کی وفات ہوگئی۔ سلیمان نے مسند نشین ہوتے ہی موسیٰ بن نُصیر رحمہ اللہ کو اَندَلُس کی نیابت سے معزول کردیا۔ موسیٰ نے حکم پر سر جھکا دیا۔[①]

موسیٰ کی بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ ایک بار اعلیٰ افسر یزید بن مُہلّب نے ان سے پوچھا: ”جب آپ کو اَندَلُس میں سب کچھ میسر تھا تو آپ اپنی عزت قوت کے اس مرکز میں کیوں نہ ٹھہر گئے۔ (خلیفہ کے پاس حاضری کا حکم مان کر) خود کو خطرے میں کیوں ڈالا؟“ موسیٰ بن نُصیر کا جواب تھا: ”واللہ! اگر میں وہاں رہتا تو حکمران میرا بال تک بیکا نہ کرسکتے۔ مگر مجھے فقط اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشی درکار تھی، اطاعت اور جماعت کے حلقے سے نکلنا مجھے گوارا نہ تھا۔“[②]

سلیمان کو موسیٰ بن نُصیر رحمہ اللہ سے کچھ مدت تک بداعتمادی رہی۔ بعد میں سلیمان کی غلط فہمی دور ہوگئی اور وہ موسیٰ کو اپنا مصاحب بنا کر ان کے تجربات سے فائدہ اٹھاتا رہا۔ قُسطنطینیہ پر حملے کا منصوبہ بناتے وقت سلیمان نے موسیٰ سے بطورِ خاص مشورہ لیا۔ موسیٰ پر اعتماد کی علامت یہ بھی ہے کہ اَندَلُس کا انتظام موسیٰ کے بیٹے عبدالعزیز کے پاس رہا۔[③]

موسیٰ بن نُصیر کی وفات:

موسیٰ بن نُصیر رحمہ اللہ کی عمر ۷۸ برس ہوچکی تھی، ان کی خواہش تھی کہ مدینہ منورہ میں وفات ہو اور بقیع کی خاک نصیب ہو۔ ۹۷ھ میں سلیمان بن عبدالملک حج کے لیے روانہ ہوا تو موسیٰ بن نُصیر کو بھی ہمراہ لے لیا۔ مدینہ منورہ پہنچ کر موسیٰ رحمہ اللہ کی وفات ہوگئی اور وہیں تدفین ہوئی۔ اس طرح افریقہ اور اَندَلُس کے اس فاتح کی آخری تمنا بھی پوری ہوگئی۔[④]

موسیٰ بن نُصیر رحمہ اللہ کی وفات حج کے مبارک سفر میں ہوئی جو ان کی خدمات کی عنداللہ قبولیت کی علامت ہے۔

موسیٰ نے نہ صرف زمین کو فتح کیا تھا بلکہ مفتوحہ علاقوں میں مبلغین اور قاریوں کا تقرر کرکے اسلام کی دعوت اور علمِ دین کو بھی عام کیا۔ ان کوششوں سے مقامی باشندوں خاص کر بربر قبائل کی بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا۔[⑤]

ان کارناموں کی وجہ سے آج تک موسیٰ بن نُصیر رحمہ اللہ کا نام نہایت عزت واحترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

① البداية والنهاية: ۶۳۰/۱۲؛ التاريخ الأندلسي، ص ۱۲۶، ۱۲۷

② البيان المغرب في اخبار الاندلس والمغرب: ۲۱/۲
بعض روایات میں ہے کہ سلیمان نے موسیٰ کو قید و بند اور ذلت ونکبت میں مبتلا رکھا اور بھاری جرمانہ عائد کیا جسے وہ ادا نہ کرسکے اور اسی تباہ حالی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ مگر یہ روایات مبالغہ آرائی پر مبنی ہیں۔ دیگر روایات کے مطابق موسیٰ نے مالِ غنیمت میں سے افسران اور سپاہ پر جو رقم ضابطے سے ہٹ کر خرچ کی تھی، اس کے باعث سلیمان نے ان کا احتساب کیا اور اس پوچھ گچھ کے دوران سلیمان نے انہیں بے عزت کرنے کی قسم کھالی اور پھر قسم پوری کرنے کے لیے انہیں چند گھنٹے دھوپ میں کھڑا رکھا، ان پر غشی طاری ہوئی تو سلیمان کو خود اپنی حرکت پر ندامت ہوئی اور اس کے بعد وہ آخر تک موسیٰ کی بڑی قدر ومنزلت کرتا رہا۔ اس دوران موسیٰ نے بھی دس لاکھ دینار کی خطیر رقم ادا کرکے اپنا حساب صاف کردیا۔ (البيان المغرب في اخبار الاندلس والمغرب: ۲/ ۲۰، ۲۱؛ التاريخ الأندلسي، ص ۱۲۶، ۱۲۷،

③ البيان المغرب: ۲/ ۲۰، ۲۱؛ سير اعلام النبلاء: ۴۹۹/۴

④ التاريخ الأندلسي، ص ۱۲۷، ۱۲۸

⑤ البيان المغرب: ۱۴۲/۱

طارق بن زیاد کی گوشہ نشینی:

طارق بن زیاد کو بھی اَندَلُس کی فتح سے دِمَشق واپسی کے بعد دوبارہ کسی بڑی فوجی مہم کی قیادت کرتے نہیں دیکھا گیا۔ سلیمان بن عبدالملک کو طارق سے کوئی ناراضی نہ تھی بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا کہ وہ اس معرکہ آزما سالار کو دوبارہ اَندَلُس بھیجنا چاہتا تھا مگر نامعلوم وجوہ سے اس ارادے پر عمل درآمد نہ ہوسکا۔ ①

اس اسلامی بطلِ جلیل کی بقیہ زندگی گمنامی میں گزری، یہاں تک کہ ان کی وفات کا سال بھی مؤرخین کو معلوم نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امت کو افتراق و انتشار اور دربارِ خلافت کو خدشات سے بچانے کے لیے انہوں نے خود ہی گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی تاکہ جتھہ بندی کی کوئی صورت نہ پیدا ہو۔

اللہ کے یہ نیک بندے سندھ، وسطِ ایشیا اور اَندَلُس جیسی وسیع سرزمینوں کو مسلمانوں کے حوالے کر کے خود ایک کوڑی لیے بغیر دنیا سے چلے گئے۔ کیسے بے غرض اور بے لوث لوگ تھے۔ ان کے کارنامے بھی عظیم تھے اور کردار بھی۔

جرنیلوں سے سلوک میں سلیمان بن عبدالملک کا کردار:

عظیم اسلامی جرنیلوں سے سلیمان کے نامناسب برتاؤ کی وجوہ اور اس کی کیفیت کو ہم نے محتاط انداز میں نقل کر دیا ہے۔ بعض مؤرخین نے اس بارے میں کچھ مبالغہ آمیز واقعات نقل کیے ہیں جن کی تصدیق کرنا مشکل ہے۔ ان واقعات کو لے کر سلیمان بن عبدالملک کو بے رحم، کم عقل اور وہمی ثابت کیا گیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ ہم نے احتیاط کے ساتھ جو واقعات مستند مآخذ سے نقل کیے ہیں، ان کے پیشِ نظر سلیمان خواہ مخواہ کسی سے انتقام [illegible] تھا۔ قُتَیبَہ بن مسلم کے بارے میں تو سلیمان کو سرے سے کوئی الزام نہیں دیا جا سکتا۔ سلیمان نے انہیں [illegible] باقی رکھنے کی یقین دہانی لکھ بھیجی تھی مگر قُتَیبَہ نے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر خط پڑھنے سے پہلے ہی بغاوت کر دی [illegible] انجام افسوس ناک ہوا۔ سلیمان نے محمد بن قاسم کو بھی عہدے پر باقی رکھا تھا۔ البتہ بعد میں ہندو شہزادی کی غلط شکایت سے مشتعل ہو کر ان کی گرفتاری کا حکم دیا تھا۔ قتل میں سلیمان براہِ راست شامل نہیں تھا بلکہ یہ کارروائی صالح بن عبدالرحمن کی تھی۔ تاہم فاتحِ سندھ پر جو بھی ظلم ہوا، اس کے چھینٹوں سے سلیمان کا دامن بچا ہوا نہیں۔ خود سلیمان کو اس کا احساس تھا اور وہ اس سانحے پر بعد میں افسوس کرتا رہا۔

موسیٰ بن نُصَیر اور طارق کو اس نے اَندَلُس سے معزول ضرور کیا جس کی وجہ سے یورپ میں فتوحات کا ریلا رک گیا مگر سلیمان کے نزدیک یہ اقدام اس لیے ضروری تھا کہ اتنا دور دراز صوبہ کہیں موسیٰ کی خاندانی مملکت میں نہ بدل جائے۔ غالباً موسیٰ کا اپنی اولاد کو اَندَلُس کا نائب بنا دینا اس شبہے کی تقویت کا باعث بنا۔ چاہے موسیٰ کے ذہن میں ایسا خیال نہ ہو مگر خلیفہ کو شکوک نے گھیر لیا۔ بہر کیف مؤرخین اقرار کرتے ہیں کہ سلیمان اگر محمد بن قاسم اور موسیٰ پر بھروسہ

---

① نفح الطيب: ۱۳/۳

کرتا اور ان کی مہمات مزید دس پندرہ سال جاری رہتیں تو شاید آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

اَندَلُس کے نائب حکمران عبدالعزیز کا قتل:

اَندَلُس سے موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ کی معزولی نے ایک طرف تو فرانس اور یورپ کی طرف مسلمانوں کی یلغار کو ملتوی کرا دیا۔ دوسری طرف خود مفتوحہ اَندَلُس میں بھی مسلمانوں کی حکومت کمزور ہوگئی۔ موسیٰ رحمہ اللہ وہاں اپنے بیٹے عبدالعزیز کو نائب بنا کر آئے تھے۔ سلیمان کو پسند نہ تھا کہ وہاں کسی ایک خاندان کی اجارہ داری ہو۔ تاہم اس سے پہلے کہ عبدالعزیز کو اَندَلُس سے معزول کیا جاتا، مقامی مسلمان افسران نے عبدالعزیز کو قتل کر دیا۔

دراصل عبدالعزیز نے اَندَلُس کے سابق بادشاہ راڈرک کی بیٹی سے نکاح کر لیا تھا جو اپنے مذہب نصرانیت پر قائم تھی۔ عبدالعزیز اس بیوی کی بڑی دلداری کرتا تھا۔ اس کی فرمائش پر کبھی کبھار گھر میں یورپی حکمرانوں جیسا تاج پہن لیا کرتا تھا۔ افسرانِ فوج کو اس کی بھنک پڑ گئی۔ ساتھ ہی یہ افواہ پھیل گئی کہ وہ بیوی کی محبت میں نصرانی ہوگیا ہے۔ چنانچہ بپھرے ہوئے سپاہیوں نے حملہ کر کے عبدالعزیز کو قتل کر ڈالا۔ اس وقت وہ مسجد میں نمازِ فجر کی امامت کر رہا تھا۔

بعض مؤرخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس افواہ کو پھیلانے میں خلیفہ کا ہاتھ تھا مگر اس بات کی کوئی پختہ روایت موجود نہیں۔ بہر حال یہ طے ہے کہ عبدالعزیز نیک سیرت اور دین دار آدمی تھا، تہجد کا پابند اور کثرت سے نفلی روزے رکھنے کا عادی تھا۔ وہ نصرانیت قبول کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کا قتل بہر حال کسی غلط فہمی یا سازش کے تحت ہوا تھا۔[1]

سلیمان کے عہد کی اصلاحات:

سلیمان کا دور بیرونی فتوحات کے لحاظ سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ تاہم اندرونی اصلاحات پر اس نے بہت توجہ دی۔ ولید کے دور میں خلافتِ بنو مروان فتوحات، تمدنی ترقی اور معیشت و اقتصادیات میں اس مقام پر پہنچ چکی تھی کہ ان پہلوؤں پر مزید توجہ کی فوری ضرورت نہیں تھی۔ اس کی جگہ اندرونی کمزوریوں کو دور کرنا زیادہ اہم ہوگیا تھا۔ سلیمان نے اس حقیقت کو سمجھ لیا۔

اس سلسلے میں سرکاری حکام اور افسران کی اصلاح سب سے زیادہ ضروری تھی جن کے سخت اور غیر محتاط طرزِ عمل کی وجہ سے خلافت کا ادارہ بھی بدنام ہو رہا تھا۔ گزشتہ بعض خلفاء کے ظالم مشہور ہو جانے کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ حجاج بن یوسف اور اس جیسے بعض گورنر اور ان کے ماتحت جب ظلم کیا کرتے تھے تو خلفاء کی طرف سے ان زیادتیوں کے ازالے کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ اس لیے یہ خلفاء خود بھی ظلم میں ملوث سمجھے جاتے تھے۔ بہر حال سلیمان نے تخت نشینی کے ساتھ ہی مظالم کے ازالے کا کام شروع کر دیا۔ جلاوطن لوگوں کو واپسی کی اجازت دی۔ شک و شبہے کی بناء پر قید کیے لوگوں کو آزاد کر دیا۔ حکام اور افسران کا احتساب کیا مگر اس سلسلے میں بعض جگہ ظالم حکام کے بے قصور ماتحت بھی اس دارو گیر کی زد میں

---

① الكامل في التاريخ، سنة ۹۷ھ

آ گئے جیسا کہ حجاج سے تعلق رکھنے کی بناء پر محمد بن قاسم جیسا فاتح زیرِ عتاب آ گیا۔ سلیمان نے کچھ مذہبی اصلاحات بھی کیں۔ گورنر نمازوں میں تاخیر کرنے لگے تھے۔ سلیمان نے انہیں مستحب اوقات میں نمازوں کی تاکید کی۔ ①

مسجد الحرام میں پانی کی قلت دور کرنے کے لیے اس نے ''کوہِ ثبیر'' کے دامن میں سنگِ مرمر کا ایک بہت بڑا تالاب بنوایا جس میں پہاڑی چشموں کا پانی جمع ہوتا تھا۔ پھر تالاب کا پانی پائپ لائن کے ذریعے مسجد الحرام کے صحن میں جا پہنچتا تھا جہاں سنگ مرمر کا ایک اور چھوٹا تالاب تھا جس میں پانی فوارے کی شکل میں ابلتا تھا۔ اس فوارے کی وجہ سے مکہ میں میٹھے پانی کی افراط ہو گئی اور مسجد الحرام کی خوبصورتی بھی بڑھ گئی۔ ②

◆◆◆

سلیمان بن عبد الملک کے عہد کی فتوحات

سلیمان کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ گزشتہ دور کے نامور جرنیلوں کی معزولی کی وجہ سے جہاد کا سلسلہ رک گیا ہے جس کے باعث دربارِ خلافت کی ساکھ بھی مجروح ہوئی ہے۔ سلیمان اس کوتاہی کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے جلد ہی اس نے اپنے نامور جرنیلوں کو مختلف محاذوں کی مہمات سونپ دیں اور انہیں غیر معمولی امداف دیے۔

طبرستان کی فتح:

سلیمان نے ۹۷ھ میں خراسان میں یزید بن مُہَلَّب کو تعینات کیا جو بنوامیہ کے سابق جرنیل مُہَلَّب بن ابی صفرہ کا بیٹا اور بڑا نامور سپاہی تھا۔ یزید بن مُہَلَّب نے بحیرۂ کیسپین کے رخ پر یلغار کی اور اس کے اردگرد ناقابلِ عبور کوہستانی سلسلے میں آباد ان کافر اقوام سے جہاد شروع کیا جن کی شورش پسندی اور لوٹ مار طویل مدت سے مسلمانوں کے لیے دردِ سر بنی ہوئی تھی۔ یزید کی یہ مہمات ایک طویل مدت تک جاری رہیں۔ کئی جگہ گھمسان کی جنگیں ہوئیں اور فتح نے یزید کے قدم چومے۔ کئی خونریز معرکوں کے بعد اس خطے کے اہم ترین ضلعے ''طبرستان'' کے حاکم نے بھاری رقم دے کر یزید سے صلح کر لی۔

یزید نے اس کے بعد جُرجان کے باغیوں کے خلاف کارروائی شروع کی اور دشوار گزار پہاڑی درّوں سے گزر کر جُرجان کے قلعے تک جا پہنچا۔ سخت محاصرے کے بعد آخر دشمنوں کو شکست ہوئی۔ اس طرح یہ مہم ۹۸ھ میں تکمیل کو پہنچی۔ یزید بن مُہَلَّب نے ان اقوام کو مسخر کرنے کے بعد ''جُرجان'' کو باقاعدہ شہر کے انداز میں تعمیر کرا کے یہاں مسلمانوں کو آباد کر دیا۔ اس طرح یہ علاقے باقاعدہ طور پر اسلامی خلافت کا حصہ بن گئے۔ ③

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۱۶۹، ط نزار

② تاریخ یعقوبی، ص ۲۲۸

③ المنتظم لابن جوزی: سنة ۹۷ھ، ۹۸ھ

قُسطَنطِینیہ کا جہاد:

سلیمان بن عبدالملک چاہتا تھا کہ ولید کے دور کی فتوحات کی یادیں ایک بار پھر تازہ ہوں اور سندھ و اندَلُس کی فتح سے بڑھ کر کوئی جہادی کارنامہ انجام دیا جائے۔ اس سوچ کے تحت اس نے بازنطینی رومی سلطنت کے پایۂ تخت قُسطَنطِینیَہ کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔ دنیا کے اس عظیم الشان تاریخی شہر پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں فوج کشی کی گئی تھی جو کامیابی سے ہم کنار نہ ہوسکی۔ اس کے بعد کسی نے دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ ان دنوں بازنطینی سلطنت سخت داخلی انتشار سے گزر رہی تھی۔ قیصر نسطاط دوئم کے دور سے جو خانہ جنگی شروع ہوئی تھی وہ موجودہ قیصر ''تیدوس سوئم'' کے دورِ حکومت میں بھی جاری تھی؛ اس لیے بازنطینیوں کو شکست دینے کا یہ بہترین موقع تھا۔

سلیمان نے اس مہم کا بیڑا اُٹھایا تو اسے احساس ہوا کہ محمد بن قاسم اور قُتَیبَہ بن مسلم جیسے شمشیر زنوں کی عدم موجودگی میں یہ یلغار اس وقت تک نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی جب تک وہ خود فوج کے ساتھ نہ نکلے۔ یہ بڑے حوصلے کا کام تھا۔ گزشتہ خلفاء میں سے کسی نے اتنی دور دراز کے محاذ پر بذاتِ خود پیش قدمی نہیں کی تھی۔ پھر سلیمان طبعی طور پر ناز و نعمت کا عادی اور آرام پسند تھا؛ اس لیے اس سے ایسی ہمت کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی مگر ایک بار عزم کر لینے کے بعد یہ بندۂ خدا کسی مشکل کو خاطر میں نہ لایا اور ۹۸ھ میں زبردست جنگی ساز و سامان کے ساتھ بہت بڑی فوج مرتب کر کے بیٹوں اور اہل و عیال سمیت اس کٹھن مہم پر نکل پڑا۔ عمر بن عبدالعزیز اور رجاء بن حَیوَہ مشیر کے طور پر ساتھ تھے۔ اس کے علاوہ بنو امیہ کے دیگر شہزادے اور نامور امراء بھی ہم رکاب تھے۔ یہ فوج کشی بحری اور بری دونوں جانب سے ہو رہی تھی۔

سلیمان کو خود جنگ کی کمان کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ فوج کا سپہ سالار اس کا چھوٹا بھائی مَسلَمہ بن عبدالملک تھا جو ایک کہنہ مشق افسر اور نامور غازی تھا۔ سلیمان فوج کی پشت پناہی اور کمک کے انتظامات کے لیے سرحدی قلعے ''دابق'' میں خیمہ زن ہوگیا جبکہ مَسلَمہ ایشیائے کوچک کے آخری سرے ''عَمُوریَہ'' سے ہوکر قُسطَنطِینیَہ کی خلیج تک پہنچ گیا۔ یہاں بحری بیڑا بھی اس سے آن ملا۔ مَسلَمہ نے خلیج عبور کر کے رومی پایۂ تخت کا سمندری راستہ بند کر دیا اور خشکی کی سمت سے بھی محاصرہ کر لیا۔

مسلمانوں کو اس فوج کشی میں ایک رومی سیاست دان لیون کی خفیہ مدد حاصل تھی۔ یہ شخص بے حد چالاک تھا اور قیصرِ روم کو مسلمانوں کے حملے سے ڈرا کر اسے برطرف کرنا اور خود تاج و تخت ہتھیانا چاہتا تھا۔ اسی نے مَسلَمہ کو اپنے تعاون کا یقین دلا کر محاصرہ کرنے کا مشورہ دیا تھا اور طے کیا تھا کہ اگر قُسطَنطِینیَہ کی حکومت اسے مل جائے تو وہ اس ملک کا خزانہ مسلمانوں کے حوالے کر کے ایک ماتحت حکمران کی حیثیت سے رہے گا۔

جب محاصرے کی سختی سے قیصرِ روم کی ہمت جواب دینے لگی تو لیون نے اگلی چال چلی اور رومی امراء کو دعوت دی کہ وہ اسے بادشاہ بنالیں، وہ مسلمانوں کو بھگا دے گا۔ امراء نے اس پر اعتماد کر کے موجودہ قیصر کو برطرف کر دیا اور لیون کو

تخت پر بٹھا دیا۔ لیون کا اصل مقصد پورا ہوگیا تھا؛ لہٰذا تخت نشین ہونے کے بعد اس نے مسلمانوں سے معاہدے کو پسِ پشت ڈال دیا اور جنگ بدستور جاری رکھی۔

مَسلمہ نے طے کرلیا کہ وہ فتح حاصل کیے بغیر واپس نہیں جائے گا۔ سلیمان کی طرف سے کمک اور خوراک و رسد کا سلسلہ جاری تھا، پھر بھی مَسلمہ نے احتیاط کے طور پر گرد و نواح کی زمینوں میں فصلیں کاشت کرادیں تاکہ کسی بھی طرح غذا کی کمی کی نوبت نہ آنے پائے۔

اس دوران موسمِ سرما شروع ہوگیا۔ تقدیر کی بات کہ عام معمول کے خلاف بہت زیادہ برف باری ہونے لگی۔ اسلامی فوج اس قدر سخت سردی کی عادی نہیں تھی، ہزاروں سپاہی بیمار پڑ گئے۔ سینکڑوں افراد جاں بحق ہوگئے۔ کاشت کی گئی فصلیں ضایع ہوگئیں۔ برف باری نے سپلائی لائن بھی مسدود کردی اور سپاہی غذا کی کمی کا شکار ہوگئے۔ اس صورتِ حال میں واپسی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مَسلَمہ نے بار بار قاصد بھیج کر سلیمان سے واپسی کی اجازت طلب کی جو اب بھی ''دابق'' کی خیمہ گاہ میں فروکش تھا۔ شاہی خاندان اور امرائے بنوامیہ کے یہاں اجتماع کی وجہ سے اس وقت ''دابق'' کا کیمپ ایک شہر کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

سلیمان یہیں ٹھہرا رہا اور فتح کے بغیر واپس جانے کے لیے تیار نہ ہوا۔ موسم یہاں بھی سخت تھا۔ سلیمان خود بھی شدید بیمار پڑ چکا تھا مگر اسے ناکام واپسی گوارا نہ تھی۔ ایک دن وہ ایک شخص کے جنازے میں شریک ہوا۔ دابق کے ایک کھیت میں نعش کو دفنا دیا گیا۔ سلیمان جو کہ موت اور آخرت کو کثرت سے یاد کیا کرتا تھا، قبر کی مٹی ہاتھ میں لے کر کہنے لگا:

''یہ مٹی کتنی عمدہ اور پاکیزہ ہے۔''

ایک دو دن بعد وہ نہا دھو کر نئی پوشاک آراستہ کیے آئینہ دیکھ رہا تھا۔ اپنا حسن دیکھ کر اس کے منہ سے نکلا:

''میں ہوں جوان بادشاہ!''

ایک باندی پاس کھڑی تھی۔ سلیمان نے اس سے پوچھا: ''کیا دیکھ رہی ہو؟''

اس نے برجستہ یہ اشعار پڑھ دیے:

أَنْتَ نِعْمَ الْمَتَاعُ لَوْ كُنْتَ تَبْقَى ... غَيْرَ أَنْ لَا بَقَاءَ لِلْإِنْسَانِ

لَيْسَ فِيمَا عَلِمْتُهُ فِيكَ عَيْبٌ ... كَانَ فِي النَّاسِ غَيْرَ أَنَّكَ فَانٍ

''اگر آپ باقی رہ سکتے تو آپ بہترین زادِ سفر ہوتے۔ مگر انسان کے نصیب میں باقی رہنا نہیں۔ جہاں تک میں جانتی ہوں آپ میں ایسا کوئی عیب نہیں جو دوسرے لوگوں میں ہو، سوائے اس کے کہ آپ فانی ہیں۔''[1]

ان واقعات میں گویا سلیمان کی موت کی آہٹ چھپی تھی۔

---

[1] الكامل في التاريخ، سنة ٩٩

سلیمان کی علالت اور وفات...... عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی بطور جانشین نامزدگی:

کچھ دنوں بعد موسم کی شدت نے راستوں کو بالکل مسدود کر دیا اور محاذِ جنگ سے مواصلاتی رابطہ بالکل منقطع ہوگیا۔ اسی حال میں سلیمان کا وقتِ اجل آن پہنچا۔ اس کا بڑا لڑکا ایوب جسے اس نے جانشین مقرر کیا تھا، کچھ مدت پہلے وفات پا گیا تھا؛ اس لیے اسے اپنے جانشین کی فکر ہوئی۔ اس کا جوان لڑکا داؤد محاذِ جنگ پر تھا۔ سلیمان نے اسی کو جانشین نامزد کرنا چاہا اور اپنے مشیر رجاء بن حَیوَہ سے پوچھا: ''میرے بیٹے داؤد کے بارے میں کیا مشورہ ہے؟''

رجاء نے کہا: ''ان کا کچھ پتا نہیں، زندہ بھی ہیں یا نہیں۔''

سلیمان نے کہا: ''اچھا میرے دیگر بیٹوں کو قمیصیں اور چادریں پہنا کر میرے پاس لاؤ۔''

ان بچوں کو یہ درباری لباس پہنا کر سامنے لایا گیا۔ بچے چھوٹے تھے؛ اس لیے قمیصیں اور چادریں زمین پر گھسٹ رہی تھیں۔ سلیمان حسرت بھرے لہجے میں بولا:

اِنَّ بَنِیَّ صِبْیَۃٌ صِغَارٌ   قَدْ اَفْلَحَ مَنْ کَانَ لَہٗ کِبَارٌ

''میرے بچے چھوٹے اور کم سن ہیں۔ وہ شخص کامیاب ہے جسے کے بیٹے بڑے ہوں۔''

عمر بن عبدالعزیز ساتھ کھڑے تھے، تسلی دیتے ہوئے بولے: ''امیرالمؤمنین! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی﴾

''بے شک کامیاب ہے وہ شخص جو سنور گیا، جس نے اللہ کا ذکر کیا اور نماز ادا کی۔''

پھر سلیمان نے کہا: ''ان کی کمر پر تلواریں باندھ کر انہیں میرے پاس لاؤ۔''

حکم کی تعمیل ہوئی۔ بچوں کو اس طرح لایا گیا تو تلواریں ان کے ساتھ گھسٹتی آ رہی تھیں۔

سلیمان یہ دیکھ کر رنجیدہ لہجے میں بولا:

اِنَّ بَنِیَّ صِبْیَۃٌ صَیْفِیُوْن   قَدْ اَفْلَحَ مَنْ کَانَ لَہٗ رِبْعِیُوْن

''میرے بچے چھوٹے اور ادھیڑ عمری کی اولاد ہیں۔ وہ شخص کامیاب ہے جس کی اولاد نوجوانی میں پیدا ہوئی ہو۔''

عمر بن عبدالعزیز نے پھر تسلی دیتے ہوئے کہا: ''امیرالمؤمنین! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی﴾

''بے شک کامیاب ہے وہ شخص جو سنور گیا، جس نے اللہ کا ذکر کیا اور نماز ادا کی۔''

سلیمان کی نگاہ اب عمر بن عبدالعزیز پر ٹک گئی۔ سمجھ گیا کہ ان سے بہتر جانشین کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا: ''اللہ کی قسم! میں ایسے شخص کو مقرر کر کے جاؤں گا جس میں شیطان کا کوئی عمل دخل نہ ہوگا۔''

اس نے تنہائی میں رجاء بن حَیوَہ سے پوچھا: ''عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں کیا رائے ہے؟''

رجاء نے کہا: ''وہ بڑے عالم فاضل اور نیک مسلمان ہیں۔''

سلیمان نے کہا: ''اللہ کی قسم! میرا بھی یہی خیال ہے لیکن اگر میں عبدالملک کی اولاد کو بالکل نظر انداز کر کے انہیں خلیفہ بنا دوں تو یہ لوگ ان کی حکومت قائم نہیں رہنے دیں گے؛ اس لیے عمر کو خلیفہ اور یزید بن عبدالملک کو ان کا ولی عہد نامزد کر دیتا ہوں۔ اس طرح خاندان کے لوگ مطمئن ہو کر عمر کی خلافت مان لیں گے۔''

رجاء نے تائید کی۔ سلیمان نے فوراً اپنے ہاتھ سے یہ وصیت نامہ لکھ دیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم!

''یہ تحریر اللہ کے بندے سلیمان بن عبدالملک امیر المؤمنین کی طرف سے عمر بن عبدالعزیز کے لیے ہے۔ میں نے تمہیں اپنے بعد خلیفہ بنایا اور تمہارے بعد یزید بن عبدالملک کو۔

اے مسلمانو! کہنا سننا، اور تابع داری کرنا۔ اللہ سے ڈرتے رہنا۔ آپس میں اختلاف نہ کرنا ورنہ اغیار تمہاری جانب حریصانہ نگاہیں ڈالنے لگیں گے۔''

سلیمان نے وصیت نامے کو مہر بند کر کے رجاء کے حوالے کر دیا اور تاکید کی کہ وہ خاندان کے عمائد کو جمع کریں اور عمر بن عبدالعزیز کا نام ظاہر کیے بغیر ان سے نامزد کیے گئے خلیفہ کے لیے بیعت لے لیں۔

رجاء نے اسی وقت جا کر شاہی خاندان کے عمائد اور امرائے فوج سے اگلے خلیفہ کی بیعت لے لی۔ سب نے بیعت کر لی۔ اس کے کچھ دیر بعد پینتالیس سالہ سلیمان بن عبدالملک کی روح پرواز کر گئی۔ یہ واقعہ ۲۰ صفر ۹۹ھ کا ہے۔

رجاء نے مصلحت کے طور پر اس خبر کو پوشیدہ رکھا۔ مرحوم خلیفہ کی لاش کو تکیوں کے سہارے بٹھا دیا گیا اور ایک ہوشیار خادم کو ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے بعد امراء کے مجمعے میں اعلان کیا گیا کہ خلیفہ اپنے جانشین کے لیے اپنے سامنے بھی بیعت لینا چاہتے ہیں۔ سب لوگ ایک ایک کر کے سلیمان کے خیمے میں گئے۔ ہر شخص خیمے کے دروازے پر کھڑا ہو کر سلام عرض کرتا۔ خادم یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ خلیفہ بیماری کی وجہ سے جواب دینے سے قاصر ہے، اس کی طرف سے خود جواب دیتا اور پھر کہتا: ''امیر المؤمنین چاہتے ہیں کہ آپ ولی عہد کی بیعت و اطاعت پر قائم رہیں۔''

ہر امیر اور شہزادہ اس کا وعدہ کر کے لوٹ جاتا۔ اس طرح عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی بیعت لینے کا مرحلہ کامیابی سے تکمیل کو پہنچا۔[1] یہ تمام کارروائی پایۂ تخت سے سینکڑوں میل دور ''دابق'' کی فوجی چھاؤنی میں ہو رہی تھی۔

عمر بن عبدالعزیز مروجہ سیاست کی آلودگیاں دیکھنے کے بعد طبعی طور پر سرکاری عہدوں سے بددل تھے؛ اس لیے ان کے دل میں حکمرانی کی ذرا بھی حرص نہ تھی، مگر انہیں یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ کہیں وصیت نامے میں ان کا نام نہ لکھ دیا گیا ہو؛ اس لیے وہ رجاء بن حَیوَہ سے ملے اور قسم دے کر کہا: ''مجھے ڈر ہے وصیت میرے بارے میں نہ ہو۔ آپ کو قسم دے کر کہتا ہوں کہ اگر ایسی بات ہے تو مجھے بتا دیں تاکہ میں پہلے ہی استعفاء دے دوں۔''

[1] سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم، ص۳۳؛ الکامل فی التاریخ، تحت ۹۹ھ

رجاء نے کہا: ''میں ایک حرف بھی نہیں بتا سکتا۔''

اس پر عمر بن عبدالعزیز بہت ناراض ہو کر واپس ہو گئے۔ [1]

سلیمان کی تجہیز و تدفین سے پہلے رجاء بن حیوہ نے حکمران خانوادے کے شہزادوں اور عمائد کو جمع کر کے ایک بار پھر ان سے سابق خلیفہ کے وصیت نامے کی پاسداری کی بیعت لی۔ جب سب نے پختہ عہد و اقرار کر لیا تب وصیت نامے کی عبارت کا اعلان کرتے ہوئے کہا گیا: ''میں نے اپنے بعد عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ مقرر کیا ہے۔''

شہزادہ ہشام بن عبدالملک جو خلافت کا سب سے زیادہ امیدوار تھا، یہ سنتے ہی ''ہائے'' کہتے ہوئے گھٹنوں کے بل گر گیا۔ ایک شامی امیر نے تلوار سونت کر کہا: ''امیر المؤمنین کے حکم پر ہائے کہتے ہو!!''

اتنے میں وصیت نامے کی بقیہ عبارت پڑھی گئی۔

''اور میں نے عمر بن عبدالعزیز کے بعد یزید بن عبدالملک کو خلیفہ مقرر کیا۔ تم سنو اور مانو۔''

یہ سن کر ہشام بن عبدالملک نے کہا: ''ہم نے سنا اور مانا۔''

اس کے بعد سلیمان بن عبدالملک کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ میت قلعے سے باہر لائی گئی اور تدفین عمل میں آئی۔ [2]

سلیمان کا اپنی اولاد کی جگہ عمر بن عبدالعزیز کو جانشین مقرر کرنا نہایت برمحل اور بے حد مبارک فیصلہ تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے وہ ذاتی اغراض اور خاندانی مفادات پر امت کے نفع کو ترجیح دیتا تھا۔ اس نیک فیصلے سے کس قدر خیر ظاہر ہوئی۔ یہ ہم آگے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے حالات کے تحت پڑھیں گے۔

◆◆◆

سلیمان بن عبدالملک کے دور پر ایک نگاہ:

سلیمان بن عبدالملک کا دورِ حکومت مختصر تھا۔ اسے صرف دو سال اور آٹھ ماہ کا وقت ملا۔ اس کا قیام دِمشق کی بجائے زیادہ تر فلسطین کے شہر ''رملہ'' میں ہوا کرتا تھا۔ اپنے بھائی ولید کے دورِ خلافت میں اسے فلسطین کا منتظم بنایا گیا تو اس مقام کی قدرتی خوش نمائی اسے بے حد پسند آئی۔ اس وقت رملہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ سلیمان نے یہاں اپنے قیام کے لیے کچھ عمارتیں بنوائیں۔ خلیفہ بننے کے بعد اس نے ''رملہ'' کو خاص توجہ سے تعمیر کرایا۔ یہاں قلعہ، محل، سرکاری عمارتیں، باغ، تالاب اور حوض بنوائے۔ ایک جامع مسجد تعمیر کی اور لوگوں کو بڑی تعداد میں یہاں آباد کیا۔ اس طرح یہ قصبہ ایک خوبصورت شہر کی شکل اختیار کر گیا۔ سلیمان کے یہاں طویل قیام کی وجہ سے اس شہر نے عارضی دارالخلافہ کا اعزاز بھی پا لیا۔ [3]

---

① الکامل فی التاریخ فی التاریخ: سنة ۹۹ھ

② طبقات ابن سعد: ۳۳۵/۵، ۳۳۶ ط دار صادر؛ سیرة عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم، ص ۳۶

③ معجم البلدان: ۶۹/۳ تحت رملة؛ تاریخ یعقوبی، ص ۲۲۸

سلیمان کا شمار بنو مروان کے نیک سیرت خلفاء میں ہوتا ہے۔ چونکہ اس نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جیسے شخص کو جانشین بنایا تھا؛ اس لیے علماء اسے ''مفتاح الخیر'' (بھلائی کی چابی) کہہ کر یاد کرتے رہے۔

اس نے معمولی قصور یا شک وشبے کی بناء پر بند کیے جانے والے لوگوں کو آزاد کرنے کا حکم دیا تو اکثر قید خانے خالی ہوگئے۔ عوام اس کی نرم دلی اور سخاوت کے باعث اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ آخرت کی باتوں پر زار و قطار رو پڑنا اس کی عادت تھی۔[1]

✦✦✦

① البدایة والنهایة: ۶۴۳/۱۲ تا ۶۴۶ ؛ تاریخ الخلفاء، ص۱۶۹، ۱۷۰ ؛ الکامل فی التاریخ: سنة ۹۹ هـ

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ

صفر ۹۹ھ ...... تا ...... رجب ۱۰۱ھ

ستمبر 717ء ...... تا ...... فروری 720ء

بنو مروان اپنے دور کی سب سے مضبوط، عالی شان اور عسکری بنیادوں پر نہایت مستحکم حکومت کے مالک تھے۔ بظاہر یہ ممکن نہ تھا کہ ان کے نظامِ حکومت پر کوئی اندرونی یا بیرونی اصلاحی تحریک بزورِ قوت اثر انداز ہوسکتی۔ ماضی میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے حکومت کو شورائی بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے عوامی طاقت کے ذریعے جو کوشش کی تھی وہ اہلِ کوفہ کی پست ہمتی و بے وفائی اور حکام کی سختی کی نذر ہوگئی تھی۔ اس کے بعد عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ شورائی حکومت کے قیام میں کامیاب ہوجانے کے بعد بھی بنو مروان کی مسلسل مزاحمت کے باعث اپنی اصلاحات کا کوئی پائیدار نقش چھوڑے بغیر بساطِ سیاست سے ہٹا دیے گئے۔

اب دردمندانِ قوم کے نزدیک حکومت میں پیدا شدہ خرابیوں کی اصلاح کی ایک ہی صورت رہ گئی تھی اور وہ یہ کہ خود حکمران خاندان سے کوئی اولوالعزم بندۂ خدا اُٹھے اور نظامِ حکومت کو ازسرِ نو خلافتِ راشدہ کی بنیادوں پر استوار کرنے کا بیڑا اٹھائے۔ آخر پہلی صدی ہجری کے اختتام پر مشیتِ الٰہیہ نے یہ کرشمہ کر دکھایا اور اس عظیم کام کے لیے اس ''عمر ثانی'' کا انتخاب کیا جسے خواب میں دیکھ کر عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ چونکتے ہوئے بیدار ہوئے تھے اور کہہ اٹھے تھے:

''عمر کی اولاد میں سے یہ کون ہے جس کا نام بھی عمر ہوگا اور سیرت بھی عمر جیسی۔''[1]

عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا پڑنواسا:

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ خلافتِ بنو مروان کے بانی مروان بن الحکم کے پوتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پڑنواسے تھے۔ بنو مروان اور فاروقی خاندان کا یہ ملاپ ان دنوں ہوا تھا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دودھ میں پانی ملانے کی ممانعت کی تھی۔ وہ ایک رات گشت پر تھے کہ ایک گھر سے آواز آئی، کوئی عورت کہہ رہی تھی:

''بیٹی صبح ہونے والی ہے، دودھ میں پانی ملا دے۔''

---

① سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبد الحکم، ص ۲۴

لڑکی نے جواب دیا: ''اماں! آپ کو معلوم نہیں کہ امیر المؤمنین نے اس سے منع کر دیا ہے۔''
ماں کی آواز آئی: ''امیر المؤمنین اس وقت کہاں ہیں، انہیں بھلا کیا خبر؟''
بیٹی نے جواب دیا: ''امیر المؤمنین کو چاہے خبر نہ ہو، اللہ تو دیکھ رہا ہے۔''
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس گھر کو نگاہ میں رکھا اور اپنے بیٹے عاصم کو اس لڑکی سے نکاح کی ترغیب دیتے ہوئے کہا:
''تم اس لڑکی کو نکاح کا پیام دو۔ مجھے امید ہے کہ اس سے ایسا جوان پیدا ہوگا جو سارے عرب پر حکومت کرے گا۔''
عاصم نے اس سے نکاح کر لیا۔ اس خاتون سے ام عاصم پیدا ہوئیں جن کا نکاح مروان بن الحکم کے بیٹے عبدالعزیز سے ہوا۔ عبدالعزیز اکیس سال تک مصر کے گورنر رہے۔ ۶۳ھ میں ان کے ہاں عمر کی ولادت ہوئی۔ ①

تعلیم وتربیت:

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی پرورش اور تعلیم وتربیت بڑی خوشحالی میں ہوئی۔ بچپن ہی میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ بارہ تیرہ سال کے ہوئے تو والد نے انہیں تعلیم وتربیت کے لیے مدینہ منورہ بھیج دیا۔ مدینہ کے مشہور محدث صالح بن کیسان کو ان کا اتالیق مقرر کیا اور ان سے عمر کی خیر خبر لیتے رہے۔ ایک بار معلوم ہوا کہ عمر نے بال سنوارنے میں مشغولیت کی وجہ سے نماز میں تاخیر کر دی۔ فوراً مصر سے ایک ہرکارہ بھیجا جس نے آتے ہی کچھ کہے سنے بغیر ان کے بال کاٹ ڈالے۔ تربیت کے اس اثر کی وجہ سے عمر سنتوں کی پابندی اور علم وفضل میں وہ اپنے تمام خاندان پر فوقیت لے گئے۔ انہوں نے شہرِ نبوی کے عمر رسیدہ صحابہ: سہل بن سعد، سائب بن یزید اور عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم سے بھی حدیث نبوی سماعت کی۔ ان کے اساتذہ میں عروہ بن زبیر اور سعید بن مسیب رحمہما اللہ بھی شامل تھے۔
انس بن مالک رضی اللہ عنہ ایک بار مدینہ منورہ تشریف لائے، عمر بن عبدالعزیز کے پیچھے نماز پڑھنے کا موقع ملا تو فرمایا:
''میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے ملتی جلتی نماز جیسی اس نوجوان کی دیکھی ہے، ویسی کسی کی نہیں دیکھی۔''
عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا رنگ گندمی، چہرہ حسین اور ستواں، ڈاڑھی خوبصورت اور جسم توانا وسڈول تھا، البتہ خلافت کے بعد سخت مجاہدے کی وجہ سے آپ دبلے پتلے ہوگئے تھے اور آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ ②
دولت کی ریل پیل کی وجہ سے ان کی زندگی بنو مروان کے ناز ونعمت میں پلے ہوئے شہزادوں کی سی تھی۔ اپنے زمانے کے سب سے خوش لباس انسان شمار ہوتے تھے۔ قیمتی سے قیمتی پوشاک اور عمدہ سے عمدہ خوشبوئیں استعمال کیا کرتے تھے۔ جس گلی سے گزر جاتے وہ دیر تک عطر سے مہکتی رہتی۔ جو لباس ایک بار استعمال کر لیتے، دوبارہ اس کی باری نہ آتی۔ ناز ونعمت نے ان کی طبیعت اور چال میں ایک خاص نزاکت پیدا کر دی تھی؛ اس لیے ان کے ناز وادا سے چلنے کا ایک نرالا انداز تھا۔ یہ انداز ''عمریہ'' (عمری اسٹائل) کے نام سے مشہور ہوگیا تھا۔ مدینہ کے بچے اور بچیاں اس

① سيرة عمر بن عبدالعزيز لابن عبد الحكم، ص ۲۳، ۲۴؛ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن جوزی، ص ۹
② سیر اعلام النبلاء: ۵/۱۱۵، ۱۱۶

کی نقل کر کے خوش ہوتے تھے۔ ①

آپ کو دیکھ کر دور اندیش لوگ کہا اٹھتے تھے کہ یہ نوجوان آگے چل کر غیر معمولی رتبہ پائے گا۔ خالد بن یزید نے آپ کے متعلق اپنے ایک ملاقاتی سے کہا تھا: ''تمہاری زندگی رہی تو تم اس نوجوان کو ہدایت کا امام دیکھو گے۔'' ②

گورنری کے دور میں:

آپ شروع سے حکام کی سختی اور استبداد کو معاشرے کے لیے زہرِ قاتل تصور کرتے تھے۔ ولید بن عبدالملک چونکہ سپاہی پیشہ حکمران تھا؛ اس لیے اس نے اکثر صوبوں میں فوجی مزاج کے گورنر مقرر کیے تھے جن کی سخت گیری دیکھ کر عمر بن عبدالعزیز کہا کرتے تھے: ''شام میں ولید، عراق میں حجاج بن یوسف، یمن میں اس کا بھائی محمد بن یوسف، مصر میں قرۃ بن شریک اور حجاز میں عثمان بن حیان مری۔ اللہ کی زمین ظلم سے بھر چکی ہے۔'' ③

ولید بن عبدالملک نے اپنے دور میں جب انہیں مدینہ منورہ کا گورنر بنایا تو انہوں نے ایک مثالی حاکم کا کردار پیش کرنے کی کوشش کی اور اپنے حسنِ سلوک اور عمدہ کردار سے رعایا کے دل جیت لیے۔ عمر بن عبدالعزیز کے ذہن میں شروع سے حکومتِ اسلامیہ کا وہ نقشہ جاگزیں تھا جو خلفائے راشدین کے دور میں دکھائی دیتا تھا، جس کا ڈھانچا قرآن وسنت کی نصوص میں موجود ہے اور جس کی تفصیلات وہ سیرت اور تاریخ کی روایات میں پڑھتے اور سنتے رہے۔ وہ شخصی حکومت کے حق میں نہ تھے اور جانتے تھے کہ ایسا نظامِ حکومت چاہے جواز کی حد میں ہو، مگر اسلام کے عالمگیر مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتا؛ اس لیے وہ حکومت میں عالم فاضل مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ شراکت اور شورائیت واستیناس کی ترویج کے قائل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ گورنری کا عہدہ سنبھالتے ہی انہوں نے مدینہ منورہ کے علماء وفقہاء اور عمائد کو بلا کر کہا: ''میں نے آپ حضرات کو ایسے کام کے لیے زحمت دی ہے کہ اس میں میرا ہاتھ بٹانے سے آپ کو ثواب ملے گا۔ آپ حق کے حمایتی قرار پائیں گے۔ میں کوئی کام آپ کی رائے اور مشورے کے بغیر انجام نہیں دوں گا۔ جب آپ کسی کو ظلم کرتا دیکھیں یا آپ کو کسی کے ظلم وزیادتی کی اطلاع ملے تو آپ مجھے ضرور اطلاع دیجیے۔''

ان علماء وفقہاء میں قاسم بن محمد، عروۃ بن الزبیر، سالم بن عبداللہ بن عمر، ابوبکر بن عَمر و بن حزم اور سعید بن المسیب جیسے اساطینِ علم شامل تھے۔ عمر بن عبدالعزیز ان سے مشورے لیتے اور ان کا نہایت احترام کرتے تھے۔ ④ سعید بن المسیب رحمہ اللہ کسی خلیفہ یا امیر کے پاس نہ جاتے تھے مگر عمر بن عبدالعزیز کے پاس جانے سے انہیں انکار نہ تھا۔ ⑤

مدینہ میں قیام کے دوران عمر بن عبدالعزیز مسجد نبوی میں بکثرت ذکر وعبادت میں مشغول رہتے تھے۔ نمازِ فجر کے لیے مسجد میں آتے تو اسی جگہ بیٹھ کر مصحف لے کر تلاوت شروع کر دیتے، اور اتنا روتے کہ ڈاڑھی تر ہو جاتی۔ ⑥

① سیرت عمر بن عبد العزیز لابن جوزی، ص ٤١؛ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم، ص٢٦

② البدایة والنهایة: سنة ١٠١ هـ، ترجمة: عمر بن عبد العزیز ③ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم، ص١٤٦

④ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن جوزی، ص ٤١؛ سیرة عمر لابن عبد الحکم، ص٢٧؛ طبقات ابن سعد متمم التابعین، ص ١٢٥؛ طبقات ابن سعد: ٣٨٢/٢، ط صادر

⑤ سیرة عمر لابن عبد الحکم، ص ٢٧ ⑥ سیرة عمر بن عبد العزیز لابن جوزی، ص ٤٢

وہ تابعینِ کرام کا پورا احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ ایک شب مسجدِ نبوی میں نوافل کے دوران نہایت خوش الحانی سے تلاوت کر رہے تھے۔ سعید بن مسیب رحمہ اللہ بھی مسجد میں قریب ہی کہیں تھے۔ انہیں ناگوار گزرا۔ اپنے غلام سے کہا:

''اس قرأت کرنے والے کو یہاں سے ہٹاؤ، اس کی آواز ہمیں پریشان کر رہی ہے۔''

غلام اپنی جگہ سے نہ ہلا اور حضرت عمر رحمہ اللہ بدستور اپنے دھیان میں مصروفِ تلاوت رہے۔ کچھ دیر بعد سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے غلام سے دوبارہ کہا: ''ارے! میں نے کہا نہیں کہ اسے یہاں سے ہٹاؤ۔''

غلام بولا: ''حضرت! مسجد ہماری جاگیر تو نہیں۔''

اس دوران حضرت عمر رحمہ اللہ کے کانوں میں یہ آواز پڑ گئی۔ وہ فوراً اٹھے اور مسجد کے دوسرے کونے میں چلے گئے۔

ایک بار آپ نے اپنے قاصد کو حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ کے پاس ایک مسئلہ پوچھنے کے لیے بھیجا۔ اس نے غلطی سے جا کر کہہ دیا کہ امیر صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ سعید بن مسیب رحمہ اللہ کسی خلیفہ یا امیر کے ہاں جانا پسند نہ کرتے تھے مگر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا بلاوا بارِ خاطر نہ ہوا۔ وہ چلے آئے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے انہیں آتے دیکھا تو معذرت کی اور فرمایا: ''ہم نے قاصد کو آپ سے مسئلہ پوچھنے کے لیے بھیجا تھا۔ اس نے غلطی سے آپ کو آنے کا کہہ دیا۔ خدارا! آپ واپس اپنی جگہ تشریف لے جائیے۔ قاصد وہیں آ کر آپ سے مسئلہ دریافت کرے گا۔''[1]

مظالم سے بددلی اور انقلاب کی ضرورت کا احساس:

مدینہ کی اس حکومت کے دوران دو واقعات ایسے پیش آئے جنہوں نے آپ کے دل و دماغ کو جھنجوڑ ڈالا۔ ایک بار آپ نے ایک شخص کو کسی جرم کی بناء پر جیل میں ڈال دیا۔ جس قدر سزا کا وہ مستحق تھا، اتنی مدت گزر گئی، تب بھی آپ نے اسے آزاد نہ کیا۔ آپ کا خادمِ خاص ''مزاحم'' ایک متقی انسان تھا جو اکثر آپ کو اچھی رائے دیتا تھا۔ اس نے قیدی کی سفارش کرتے ہوئے اسے آزاد کر دینے کا مشورہ دیا۔ عمر بن عبدالعزیز مجرم سے بہت ناراض تھے؛ اس لیے سفارش رد کر دی۔ تب مزاحم نے سارے آداب بالائے طاق رکھ کر کہا:

''عمر! میں آپ کو اس رات سے ڈراتا ہوں جو قیامت پر جا کر ختم ہوگی۔ جس کی صبح کو یومِ حشر قائم ہوگا۔''

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کہا کرتے تھے: ''مزاحم کے الفاظ نے گویا میری آنکھوں سے پردے ہٹا دیے۔''[2]

دوسرا واقعہ ۹۳ھ میں پیش آیا جس نے ان کے دل کو مروجہ سیاسی نظام اور انتظامی ڈھانچے سے بددل کر دیا۔ یہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے خبیب رحمہ اللہ کا سزا کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو جانا تھا۔[3] خبیب رحمہ اللہ کی کسی حرکت سے طیش میں آ کر خلیفہ ولید نے حکم دیا تھا کہ انہیں سو کوڑے مار کر سر پر یخ بستہ پانی کی مشک چھوڑی جائے اور سخت سردی میں مسجد کے باہر کھڑا رکھا جائے۔ عمر بن عبدالعزیز نے یہ سزا تو جاری کر دی، مگر اس تشدد سے خبیب رحمہ اللہ کی حالت غیر ہوگئی اور وہ بستر پر پڑ گئے۔ عمر بن عبدالعزیز کو اب فکر لاحق ہوئی۔ برابر ان کی تیمارداری کرتے رہے۔

[1] سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم، ص ۲۷ [2] تاریخ دمشق: ۳۷۵/۵۷، ۳۷۶ [3] تاریخ الطبری: ۴۸۲/۶

تاہم خبیب رحمہ اللہ جانبر نہ ہو سکے اور خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ایک شخص یہ افسوس ناک خبر لے کر قصرِ امارت پہنچا، دیکھا عمر بن عبدالعزیز بے چینی کے عالم میں اٹھ اٹھ کر بیٹھتے اور بیٹھ بیٹھ کر اٹھتے ہیں۔ اس شخص کو دیکھتے ہی عمر بن عبدالعزیز نے پوچھا: ''مریض کا کیا حال ہے؟'' جواب ملا: ''دنیا سے رخصت ہو گیا۔'' عمر بن عبدالعزیز یہ سنتے ہی چکرا کر زمین پر گر پڑے۔ چند لمحوں کی غشی کے بعد ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' پڑھتے ہوئے اٹھے اور گورنری سے استعفیٰ دے دیا۔ عمر بھر وہ خود کو خبیب رحمہ اللہ کی موت کا ذمہ دار سمجھ کر آخرت کی جواب دہی سے خوف زدہ رہے۔ کوئی بڑے بڑے کارناموں پر ان کی تعریف کرتا تو بے ساختہ فرماتے: ''جو خبیب کے ساتھ کیا اس کا کیا ہوگا۔''[1]

مدینہ کی گورنری سے معزول ہونے کے بعد آپ جب وہاں سے کوچ کرنے لگے تو دیارِ نبوی کے چھوٹ جانے کی وجہ سے غم کا ایک سمندر آپ کے دل میں موجزن تھا۔ آپ نے پلٹ کر شہرِ نبوی کو دیکھا اور اپنے خادم سے کہا:

''مزاحم! میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ہم ان لوگوں میں سے نہ ہوں جنہیں مدینہ باہر نکال پھینکتا ہے۔''[2]

عمر بن عبدالعزیز، ولید بن عبدالملک کے دربار میں:

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ دمشق چلے آئے، ولید بن عبدالملک نے انہیں اپنے مصاحبین میں شامل کر لیا۔ اس دور میں بھی آپ برابر حق گوئی کا فریضہ انجام دیتے رہے اور اس بارے میں جان کے خطرات کی بھی پروا نہ کی۔

ایک بار آپ نے ولید بن عبدالملک سے تنہائی میں ملاقات کا وقت لیا اور فرمایا:

''اللہ کے نزدیک شرک کے بعد خونریزی سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں، آپ کے حکام لوگوں کو بے دریغ قتل کر دیتے ہیں اور محض سخن سازی کے لیے لکھ دیتے ہیں کہ اس مقتول کا جرم یہ تھا۔ اس بارے میں باز پرس آپ ہی سے ہوگی اور آپ ہی کی گرفت ہوگی؛ اس لیے تمام حکام کو لکھ دیجیے کہ کوئی کسی کو سزائے موت نہ دے بلکہ اس کا جرم آپ کو لکھ بھیجے، پھر آپ خود غور و فکر کر کے اس کا فیصلہ کریں۔''

ولید کو یہ مشورہ پسند آیا۔ اس نے فوراً تمام گورنروں کو یہ حکم لکھ بھیجا۔ حجاج بن یوسف کے سوا کسی نے اس پر ناگواری ظاہر نہ کی۔ مگر حجاج کو یہ حکم بڑا شاق گزرا۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ حکم خاص اسی کو بھیجا گیا ہے۔ اس نے تفتیش کرائی تو پتا چلا کہ خلیفہ کو یہ مشورہ عمر بن عبدالعزیز نے دیا ہے۔ حجاج نے ولید کو اپنے سفاکانہ کارناموں کے بارے میں مطمئن کرنے کے لیے ایک چال چلی۔ اس نے ایک دیہات کے خارجی کو بلوایا جو نہایت بدمزاج اور اکھڑ مشہور تھا۔ حجاج نے اس سے پوچھا: ''معاویہ کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟'' اس نے ان کی عیب جوئی شروع کر دی۔ حجاج نے کہا: ''یزید کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' اس نے یزید کو بے نقط گالیاں دیں۔ حجاج نے پوچھا: ''عبدالملک کے بارے میں کیا رائے ہے؟'' اس نے کہا: ''ظالم تھا۔'' حجاج نے کہا: ''اور ولید بن عبدالملک؟''

خارجی نے کہا: ''یہ تو سب سے بڑا ظالم ہے کہ اسی نے تجھ جیسے ظالم کو جان بوجھ کر ہم پر مسلط کیا ہے۔''

[1] سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن جوزی، ص ۴۳، ۴۴

[2] سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبد الحکم، ص ۳۱، ۳۲

حجاج نے اس خارجی کو دارالخلافہ بھیج دیا اور ساتھ ہی ولید کے نام یہ رقعہ ارسال کیا:

''میں اپنے دین کے بارے میں نہایت محتاط ہوں۔ جس رعایا پر آپ نے مجھے حاکم بنایا ہے، اس کی سب سے زیادہ حفاظت کرتا ہوں۔ میں اس بات سے نہایت احتراز کرتا ہوں کہ کسی ایسے شخص کو قتل کروں جو قتل کا سزاوار نہ ہو۔ لیجیے! اب میں آپ کے پاس ایک شخص کو بھیج رہا ہوں۔ میں اس جیسے فاسد خیالات رکھنے والے لوگوں کو قتل کیا کرتا تھا۔ اب آپ جانیے اور یہ شخص۔''

ولید نے بھرے دربار میں جہاں عمر بن عبدالعزیز بھی موجود تھے، اس شخص سے پوچھا:

''میرے بارے میں کیا کہتے ہو؟'' اس نے کہا: ''ظالم، جابر۔''

ولید نے کہا: ''اور عبدالملک؟'' خارجی نے کہا: ''جبار، سرکش۔''

ولید نے کہا: ''اور معاویہ؟'' خارجی نے کہا: ''ظالم۔''

ولید نے اپنے پولیس افسر خالد بن ریان کو اشارہ کیا کہ اس کا سر اُڑا دو۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔

دربار برخاست ہوا تو ولید نے خالد بن ریان کو بھیج کر عمر بن عبدالعزیز کو اپنی رہائش گاہ پر بلوایا اور پوچھا:

''ہم نے جو کیا، وہ ٹھیک تھا یا غلط؟''

عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:

''آپ نے قتل کر کے اچھا نہیں کیا۔ بہتر تھا کہ اسے جیل بھیج دیتے، یا تو وہ توبہ کر لیتا یا موت اسے آ لیتی۔''

ولید نے کہا: ''اس نے بھرے دربار میں مجھے اور میرے باپ عبدالملک کو گالیاں دیں اور وہ تھا بھی خارجی۔ پھر بھی تم کہتے ہو کہ میں نے اسے قتل کر کے ٹھیک نہیں کیا۔''

عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:

''اللہ کی قسم! میں اسے جائز نہیں سمجھتا۔ آپ اسے قید بھی کر سکتے تھے۔ اور معاف کر دیتے تو بہت بہتر ہوتا۔''

ولید یہ سن کر غصے سے کھڑا ہو گیا اور وہاں سے چلا گیا۔ خالد بن ریان نے عمر بن عبدالعزیز سے کہا:

''آپ نے امیر المؤمنین کو ایسا صاف جواب دے دیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ مجھے آپ کا سر قلم کرنے کا حکم دیا جائے گا۔''

عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ''اگر تمہیں یہ حکم ملتا تو تم ایسا کرتے؟''

خالد نے کہا: ''اللہ کی قسم! ایسا ہی کرتا۔''

عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ''میری نظروں سے دور ہو جا۔''[1]

غرض عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ ولید کے دربار میں بھی ہر موقع پر جان کی پروا کیے بغیر سچی بات کہتے رہے۔

---

① سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبد الحکم، ص ۱۱۹ تا ۱۲۱

عمر بن عبدالعزیز اور سلیمان بن عبدالملک کے تعلقات:

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور سلیمان بن عبدالملک میں نوجوانی کے زمانے سے گہری دوستی تھی۔ دونوں چچازاد بھی تھے سو ہم ذوق و ہم مزاج بھی؛ اس لیے باہم بڑی بے تکلفی تھی۔ دونوں عبادت گزار اور خداترس تھے۔ سلیمان طبیعت کے لحاظ سے آسائش پسند، خوش خوراک اور زیب و زینت کا دلدادہ تھا۔ عمر بن عبدالعزیز بھی اس زمانے میں اللہ کی نعمتوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے عادی تھے۔ عمر بن عبدالعزیز میں تدبّر اور فکرِ آخرت کا مادّہ زیادہ تھا؛ اس لیے گاہے گاہے سلیمان کو نصیحتیں کرتے رہتے تھے۔ سلیمان کے خلیفہ بننے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ [1]

ایک بار سلیمان بن عبدالملک اور عمر بن عبدالعزیز سفر میں ساتھ تھے۔ اس دور کے امراء سفر میں عمدہ خیموں اور بھاری بھرکم سازوسامان کے ساتھ چلا کرتے تھے، خدام کا قافلہ سامان لے کر آگے روانہ ہوتا اور شام کو جہاں پڑاؤ کرنا ہوتا، وہاں خیمے اور بستر وغیرہ لگا دیتا۔ بعد میں امراء آکر وہاں آرام کرتے۔ ایک موقع پر عمر بن عبدالعزیز اپنا سامان پہلے نہ بھیج سکے۔ شام کو جب پڑاؤ پر پہنچے تو ہر شخص اپنے اپنے خیمے میں جا کر آرام کرنے لگا۔ عمر بن عبدالعزیز کہیں دکھائی نہ دیے۔ سلیمان ان کی تلاش میں نکلا تو وہ ویرانے میں ایک درخت تلے تنہا رو رہے تھے۔ سلیمان نے وجہ پوچھی تو فرمایا:

''امیرالمؤمنین! قیامت کا دن یاد آ گیا۔ یہاں جس نے سامان آگے بھیجا، اسے مل گیا۔ جس نے نہیں بھیجا، اسے منزل پر کچھ نہ ملا۔'' [2] مطلب یہ تھا کہ آخرت کے لیے بھی اگر ہم نے سامان پہلے سے نہ بھیجا تو ہمارا وہاں کیا حال ہوگا۔

ایک بار حج کے لیے سلیمان کے ساتھ جانا ہوا۔ راستے میں گرج چمک کے ساتھ شدید بارش شروع ہو گئی۔

سلیمان سہم کر کہنے لگا: ''عمر! یہ گرج چمک دیکھ رہے ہو۔''

آپ نے کہا: ''یہ تو اللہ کی رحمت کا حال ہے۔ اگر یہ اللہ کے غضب کے ساتھ ہوتی پھر کیا حال ہوتا۔'' [3]

سلیمان آپ سے سات سال بڑا تھا اور خلیفہ بھی، اس کے باوجود آپ کی نصیحتوں کو اکثر بلا چوں چراں مان لیتا تھا۔ آپ بھی نصیحت میں حکمت اور موقع محل کا لحاظ رکھا کرتے تھے۔ [4]

ایک بار حج کے سفر کے دوران سلیمان بن عبدالملک کو اونگھ آ گئی۔ اس دوران جذام کے مریضوں کی ایک ٹولی وہاں سے گزری جس کے شوروغل سے سلیمان کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے حالتِ غضب میں حکم دے دیا کہ انہیں زندہ جلا دیا جائے۔ افسران پریشان ہو گئے مگر حکم ماننے بغیر چارہ نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ خلیفہ کے پاس گئے اور اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ پھر فرمایا:

''آپ نے کبھی ان مصیبت زدہ جذامیوں سے بھی زیادہ تکلیف میں کسی کو دیکھا ہے۔ اللہ آپ کو عافیت میں رکھے۔ آپ انہیں علاقے سے نکال دینے کا حکم دیں تو بہتر ہوگا۔''

---

[1] البدایة والنهایة: ۱۲/ ۶۴۳ تا ۶۴۶

[2] سیرة عمر بن عبدالعزیز لابن عبد الحکم، ص ۲۷، ۲۸

[3] سیرة عمر بن عبدالعزیز لابن عبد الحکم، ص ۳۰

[4] تاریخ الخلفاء، ص ۱۶۹، ط نزار

سلیمان کا غصہ اتر چکا تھا، اس نے کہا: ''ہاں انہیں علاقے سے نکال دو۔''

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے متعلقہ افسران کو تازہ حکم سنا دیا۔ یوں ان بے چاروں کی جان بچ گئی۔ ①

کبھی کبھار آپ سخت رویہ بھی اختیار کرتے اور سلیمان کے مرتبے کا ذرا لحاظ نہ کرتے۔

عمر بن عبدالعزیز کی بہنوں کو خاندان کی وراثت سے شرعاً حصہ ملنا چاہیے تھا مگر عبدالملک وصیت کر گیا تھا کہ حصہ نہ دیا جائے۔ سلیمان خلیفہ بنا تو عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس سلسلے میں اس سے گفتگو کی۔ سلیمان نے بات کو اہمیت نہ دیتے ہوئے کہا: ''خلیفہ عبدالملک نے اس بارے میں ایک وصیت چھوڑی تھی کہ انہیں حصہ نہیں دیا جائے گا۔''

عمر رحمہ اللہ اپنے موقف پر قائم رہے تو سلیمان نے خادم سے کہا: ''ذرا خلیفہ عبدالملک کا وصیت نامہ لانا۔''

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے چوٹ کرتے ہوئے کہا: ''امیر المؤمنین! کیا آپ نے قرآن مجید منگوایا ہے؟''

یہ سن کر سلیمان گنگ ہو گیا مگر اس کا لڑکا ایوب غرور میں آ کر عمر رحمہ اللہ سے کہنے لگا:

''اب آپ ایسی باتیں کر رہے ہیں کہ شاید آپ کا سر قلم ہو جائے۔''

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بولے: ''بیٹے! اگر تمہیں حکومت ملی تو مسلمانوں پر اس سے بڑھ کر مصائب ٹوٹ سکتے ہیں۔''

سلیمان اپنے بیٹے کو ڈانٹ کر چپ کرانے لگا تو عمر رحمہ اللہ بولے:

''اگر اس نے جہالت دکھائی ہے تو ہم نے بھی برداشت نہیں کیا۔'' ②

آپ کی انہی اعلیٰ صفات کے پیش نظر سلیمان بن عبدالملک نے وفات سے پہلے رجاء بن حَیوَہ کے مشورے کے ساتھ خلافت کے لیے آپ کا نام طے کر دیا تھا۔

◆◆◆

① سيرة عمر بن عبد العزيز لابن عبد الحكم، ص ٣٠، ٣١

② سيرة عمر بن عبد العزيز لابن عبد الحكم، ص ٣١

دورِ خلافت عمرِ ثانی

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی خلافت ۲۲ صفر ۹۹ھ کو ایشیائے کوچک کے علاقے ''دابق'' کے معسکر میں نمازِ مغرب سے کچھ دیر پہلے عمل میں آئی تھی۔ آپ رحمہ اللہ نے پہلے نمازِ مغرب پڑھائی۔ پھر سلیمان کی نمازِ جنازہ اور تدفین سے فارغ ہوئے۔ خلافت کی ذمہ داری سر پر پڑتے ہی آپ کے دل کی دنیا بدل چکی تھی۔ آپ صحابہ کرام جیسی قناعت پسند، پرہیزگار، خداترس اور غریب پرور حکمرانی کا نمونہ ایک بار پھر دنیا کو دکھانا چاہتے ہیں۔ آپ کے احساسِ ذمہ داری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سلیمان کی تدفین سے فارغ ہوکر آپ رحمہ اللہ بڑے غمزدہ تھے۔ لوگ حیران تھے کہ اتنی بڑی حکومت مل جانے پر خوش ہونے کی بجائے مغموم ہیں۔ اس رنج و غم کا سبب پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

''مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی اس سلطنت کا ایک بھی شخص ایسا نہیں جس کا حق اس کے کہے بغیر مجھ پر لازم نہ ہوگیا ہو۔''[1]

تین فوری احکام:

سلیمان کی تدفین سے فارغ ہوتے ہی آپ نے قلم دان اور کاغذ منگوایا اور اپنے ہاتھ سے احکام نامے تحریر کرنے لگے۔ لوگ یہ دیکھ کر سرگوشیاں کرنے لگے کہ ایسی بھی کیا جلدی تھی، قیام گاہ پہنچ کر آرام سے جو چاہے کرتے۔ مگر آپ کے نزدیک ان احکام کے اجراء میں ایک لمحہ کی تاخیر بھی جائز نہ تھی۔

آپ نے فوری طور پر تین مراسلے لکھے: پہلا مراسلہ مَسلمہ بن عبدالملک کے لیے تھا جو **قُسطَنطِینیّہ** کے محاذ پر اسلامی فوج کا سپہ سالار تھا، کئی ماہ کی مہم جوئی کے باوجود یہ شہر فتح نہیں ہوسکا تھا جس پر غضب ناک ہوکر سلیمان نے قسم کھائی تھی کہ وہ مرتے دم تک اس فوج کو واپس نہیں آنے دے گا۔ اب وہاں مسلمان موسم کی شدت اور رسد کے مسدود ہوجانے کے باعث جاں بلب تھے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اس صورتحال سے سخت نالاں تھے۔ آپ سمجھتے تھے کہ فوج کو واپس بلاکر مکمل تباہی سے بچانا ضروری ہے؛ اس لیے آپ نے فوراً فوج کو واپسی کی اجازت دے دی۔

آپ نے دوسرے مراسلے میں مصر کے گورنر اسامہ بن زید تنوخی کی برطرفی اور گرفتاری کا حکم جاری کیا۔ یہ شخص بڑا بے رحم تھا اور معمولی جرائم اور شکوک وشبہات پر ملزموں کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیتا تھا۔ لوگ اس کی سخت گیری سے تنگ تھے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے حکم جاری کیا کہ اسے گرفتار کرکے ہر فوجی چھاؤنی کے قید خانے میں ایک ایک سال رکھا جائے۔ اسے ہتھکڑی اور بیڑی لگی رہے۔ صرف نمازوں کی ادائیگی کے لیے اسے کھولا جائے۔

[1] البدایة والنهایة: ۱۲/ ۶۹۰؛ الکامل فی التاریخ: سنة ۱۰۱ھ

تیسرا حکم نامہ افریقہ کے حاکم یزید بن ابی مسلم کی برطرفی کا تھا۔ یہ بھی ایک بدکردار انسان تھا، خدا رسیدہ ہونے کا ڈھونگ رچاتا اور رعایا پر ظلم کرتا تھا۔ اس کی حالت یہ تھی کہ سخت سزائیں جاری کرنے کے احکام کے ساتھ ساتھ تسبیح پڑھتا رہتا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ایسے ظالم حکام کے سخت مخالف تھے؛ اس لیے آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہ ہوا کہ اپنے اختیار کے تحت ایسے لوگوں کو حکومت میں باقی رکھیں۔ [1]

سرکاری پروٹوکول قبول کرنے سے انکار:

اس کام سے فارغ ہوئے تو آپ کی خدمت میں شاندار شاہی سواریاں لائی گئیں۔ آپ نے پوچھا: ''یہ کیا؟''

امراء نے کہا: ''یہ بالکل نئی سواریاں ہیں جن پر پہلے کوئی سوار نہیں ہوا۔ نیا خلیفہ انہی پر سواری کرتا ہے۔''

آپ نے اسے فضول خرچی شمار کیا اور اپنے خادم خاص مزاحم سے کہا: ''انہیں بیت المال میں داخل کر دو۔''

یہ کہہ کر خود اپنے خچر پر سوار ہو گئے۔ [2] حفاظتی دستے کا افسر نیزہ تھامے آپ کے ساتھ چلنے لگا۔ آپ نے فرمایا:

''پرے ہٹو! مجھے تم سے کوئی مطلب نہیں۔ میں ایک عام سا مسلمان ہوں۔'' [3]

گزشتہ خلیفہ کا سامان نئے خلیفہ کی ملکیت ہونے کی رسم کا خاتمہ:

قیام گاہ پہنچے تو آپ کو وہ نئے قالین اور بستر پیش کیے گئے جنہیں نیا خلیفہ استعمال کرتا ہے۔ آپ نے انہیں بھی بیت المال میں جمع کرا دیا۔ دراصل گزشتہ چند خلفاء کے زمانے سے یہ رواج چلا آ رہا تھا کہ خلیفہ کی موت پر اس کی جو چیزیں استعمال شدہ ہوتیں وہ اس کی اولاد میں تقسیم کر دی جاتیں۔ جو چیزیں غیر مستعمل اور بالکل نئی حالت میں ہوتیں وہ نئے خلیفہ کو تحفے کے طور پر پیش کر دی جاتیں۔ سلیمان کی آخری رسومات سے فارغ ہوتے ہی اس کے گھر والوں اور بچوں نے اس کے کپڑے پہن پہن کر اتارنے شروع کر دیے۔ یہی حال اس کے جوتوں اور دیگر اشیاء کا ہوا۔ عطریات کی شیشیاں انڈیلی جاتی رہیں۔ ساری رات یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر بھی اس کا بہت سا سامان غیر استعمال شدہ رہا۔ صبح ان لوگوں نے عمر بن عبدالعزیز کو سامان کے دو ذخیرے دکھائے اور کہا: ''یہ سامان ہمارا ہے اور یہ آپ کا۔'' عمر بن عبدالعزیز نے اس تقسیم کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے کہا: ''یہ استعمال شدہ چیزیں ہیں، یہ سلیمان کی اولاد کا حق ہیں۔ یہ غیر استعمال شدہ چیزیں ہیں جو نئے خلیفہ کی ہو جاتی ہیں۔'' آپ نے اس خلافِ شرع رواج کو ختم کراتے ہوئے کہا: ''یہ چیزیں میری ہیں نہ سلیمان کی اور نہ تمہاری۔'' یہ کہہ کر آواز لگائی: ''مزاحم! یہ سب بیت المال میں جمع کر دو۔''

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی دنیا سے یہ بے رغبتی دیکھ کر امرائے مملکت پریشان ہو گئے۔ انہوں نے آپس میں کہا:

''چلو عمر نے لباس، سواریاں، قالین اور عطریات تو مسترد کر دیے۔ اب ایک ہی صورت ہے۔ ان کے سامنے سابق خلیفہ کی باندیاں پیش کرتے ہیں۔ اگر یہ ان کو پسند کرنے لگے تو سمجھو کام بن گیا ورنہ کوئی امید نہیں۔''

---

[1] سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم، ص ۳۶، ۳۷
[2] سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم، ص ۳۸
[3] اخبار ابی حفص عمر لابی بکر محمد بن الحسین الآجری، ص ۵۵، ۵۶

حضرت عمر رحمہ اللہ کے سامنے یہ باندیاں پیش کی گئیں جو پورے عالمِ اسلام کی حسین ترین لڑکیاں تھیں۔ امراء کو جہاں بھی ایسی کسی باندی کا پتا چلتا وہ اس کے مالک پر دباؤ ڈال کر اسے خرید کر ہی چھوڑتے۔ وہ فروخت نہ کرتا تو جبراً چھین لیتے۔ پھر یہ باندیاں خلیفہ کو خوش کر کے اپنا مرتبہ اونچا کرانے کے لیے خاص خاص مواقع پر پیش کی جاتیں۔

عمر بن عبدالعزیز کو یہ سارے رواج معلوم تھے اور وہ انہیں سخت ناپسند کرتے تھے؛ اس لیے باندیاں سامنے آئیں تو آپ نے ہر ایک سے اس کا اور اس کے اصل مالک کا (جس پر دباؤ ڈال کر اسے حاصل کیا گیا تھا) نام پوچھا۔ ان میں سے بیشتر دور دراز کے شہروں اور علاقوں کی تھیں۔ آپ نے ہر باندی کو اس کے اصل مالک کے پاس روانہ کر دیا۔

آپ کی دین پر اس قدر پختگی دیکھ کر امرائے مملکت کو یقین ہو گیا کہ یہ شخص شریعت کے معاملے میں کسی قسم کی لچک کا قائل نہیں۔ [1]

یہی نہیں بلکہ آپ نے اپنی ذاتی ملکیت میں پہلے سے موجود باندیوں کو بھی کہہ دیا:

''مجھ پر ایسی ذمہ داری آپڑی ہے کہ اب تم پر کوئی توجہ نہ دے سکوں گا۔ جس نے رہنا ہو رہے، جو جانا چاہے وہ آزاد ہے۔''

وہ سب رونے لگیں۔ مگر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اپنی ذمہ داری سے مجبور تھے۔ [2]

❖❖ ❖

[1] سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم، ص ۳۸، ۳۹

[2] اخبار ابی حفص للآجری، ص ۵۵

خلافتِ عمر ثانی سے قبل رائج سیاسی و معاشرتی خرابیاں

اب عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اگرچہ دنیا کی اس سب سے بڑی اور عظیم الشان حکومت کے سربراہ تھے جس کے خزانے لبالب بھرے ہوئے تھے، جس کی بلند اقبالی فلک کو چھو رہی تھی، جس کی افواج بڑی سے بڑی مخالف مملکت کو مسخر کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں، جس کا پایۂ تخت یورپ تک سے خراج وصول کر رہا تھا، جس کی طنابیں چین سے اندلس تک وسیع تھیں اور جس کے اندرونی و بیرونی مخالفین ایک عرصے سے مرعوب و مغلوب تھے؛ لہٰذا بظاہر یہ حکومت پھولوں کی سیج اور عیش و راحت کا مرقع تھی مگر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جیسا دین کی صحیح سمجھ رکھنے اور معاشرے کو گہرائی میں اتر کر دیکھنے بھالنے والا شخص اس صورتحال سے مطمئن نہیں، سخت اندیش ناک تھا۔

یہ ۹۹ھ چل رہا تھا۔ گزشتہ لگ بھگ چالیس سال میں واقع ہونے والے امت کی تاریخ کے جو اتار چڑھاؤ عمر بن عبدالعزیز کے سامنے تھے، وہ ہمیں بھی ملحوظ رکھنا ہوں گے۔ اس کے بغیر ہم اگلے دور کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے۔

تاریخ کے طالب علم کو یہاں بہت بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ اس نے ان چالیس برسوں میں گزرنے والے خلفاء میں سے اکثر کو عالم فاضل، بلند ہمت اور صاحبِ شمشیر و تدبیر حکمرانوں کے طور پڑھا ہوتا ہے۔ ولید بن عبدالملک علمی لحاظ سے کمزور سہی مگر اس کے دور کی عالمگیر فتوحات اس کی ہمت اور قابلیت کی گواہی دیتی ہیں۔ اس کے بعد وہ سلیمان کی نیکی اور شرافت کے بارے میں پڑھتا ہے کہ مؤرخین اسے ''مفتاح الخیر'' کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ ان تمام خلفاء کے دور میں ہونے والی علمی، تمدنی اور تعمیری سرگرمیوں کا ذکر بھی اس کے سامنے آتا ہے۔

تاہم اس کے بعد عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے زمانے میں جب وہ نظام حکومت کی اصلاح اور گزشتہ خلفاء کی زیادتیوں کی تلافی کی سرگزشت پڑھتا ہے تو شش و پنج میں پڑ جاتا ہے؛ کیوں کہ اگر گزشتہ خلفاء نیک کردار تھے تو پھر ان کے ظلم و ستم کے ذکر اور نظام کی اصلاح کا سوال بے معنیٰ ہو جاتا ہے۔ اور اگر مظالم کی روک تھام اور اصلاحات کی یہ کوششیں کوئی من گھڑت چیز نہیں، تو گزشتہ خلفاء کی سیرت کے بارے میں کیا گمان رکھا جائے؟

عام طور پر اس سوال کے جواب میں افراط و تفریط کا انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ ایک طبقہ اس پر کچھ اس طرح تبصرہ کرتا ہے جیسے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے پہلے کے اموی خلفاء پرلے درجے کے بدقماش، سراپا ظلم و بہیمیت بلکہ کافر و منافق تھے۔ اس قسم کے بعض مبصرین تو یہ سلسلہ صحابیِ رسول حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تک دراز کر دیتے ہیں۔

دوسری طرف ایک طبقہ جو بنوامیہ کی غیر معمولی مدح و ستائش کا قائل ہے، کہتا ہے یہ تمام اموی و مروانی خلفاء مثالی

حکمران اور غلطیوں سے بالکل پاک تھے، ان کے دور میں کوئی ظلم وستم نہ تھا۔ ان کی زیادتیوں اور معائب پر مبنی تمام روایات ناقابلِ اعتبار ہیں۔ یہ سوچ بھی بے جا عقیدت پر مبنی ہے۔ اگر اسے مان لیا جائے تو پھر عمر بن عبدالعزیز کی ان اصلاحات کا کوئی مطلب نہیں رہتا جن کی ساری امت قائل رہی ہے اور جن کی بناء پر انہیں اُمت کے ''مجددین'' اور ''مصلحین'' میں شمار کیا جاتا ہے۔ بنوامیہ کی مبالغہ آمیز عقیدت پر مبنی یہ غلط طرزِ فکر درحقیقت تاریخ کی ضعیف نہیں، صحیح السند روایات پر بھی پانی پھیر دینے کے مترادف ہے۔

اس دور کی حکومت اور معاشرے میں خرابیاں کس قسم کی تھیں؟

حقیقت اور اعتدال کا دامن تھامتے ہوئے تاریخ کی معتبر روایات کی روشنی میں اس تمام دور کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ حکومت اور معاشرے میں کچھ خرابیاں ضرور پیدا ہوگئی تھیں جن کا زیادہ تر تعلق سیاسی طرزِ عمل اور مالی معاملات سے تھا۔ سیاسی کمزوریوں کا آغاز تو یزید کے دور ہی سے ہوگیا تھا۔ انہی خامیوں نے بنومروان کے زمانے میں خطرناک شکل اختیار کر لی اور ساتھ ہی مالی معاملات بھی شفاف نہ رہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خلفائے بنوامیہ میں سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا دورِ حکومت بڑا کامیاب تھا مگر بعد میں تدریجاً کمزوریاں پیدا ہوئیں اور بڑھتی رہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات ۶۰ ھ میں ہوئی تھی۔ ان کی حکومت نہ صرف فتوحات، استحکام اور مسلمانوں کے سیاسی عروج کے لحاظ سے قابلِ رشک تھی بلکہ اس میں عدل وانصاف کی فراہمی، قانون شریعت کی بالادستی، ضمیر کی آزادی اور حقوق العباد کی نگہداشت کا معیار بھی برقرار تھا۔ ہاں اگر گزشتہ ادوار کی بہ نسبت کوئی بڑی تبدیلی آئی تھی تو یہ کہ انہوں نے مجلسِ شوریٰ کو شام کے عمائد اور مملکت کے اصحابِ سیف میں محدود کر دیا تھا؛ کیوں کہ وہ بدلتے ہوئے حالات میں قومی یک جہتی اور فتنہ وفساد سے حفاظت کے لیے اس کو ضروری سمجھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے محدود شورائیت کے ساتھ یزید کی ولی عہدی طے کر دی تھی۔ اپنے اس فیصلے میں جو حدِ جواز میں تھا، وہ بالکل نیک نیت اور مخلص تھے۔ ان کا مقامِ اجتہاد اور شرفِ صحابیت ان کے بارے میں حسنِ ظن کو لازم کرتا ہے۔ وہ عالم الغیب نہ تھے کہ ان فتنوں کو دیکھ لیتے جو آگے چل کر پیش آئے۔ تاہم ان کے جانشین یزید کے دور میں کمزوریوں کی ابتداء ہوگئی تھی جن کی ذمہ داری یزید ہی کے سر ہے؛ کیوں کہ اگر وہ اپنے والد ماجد کی وصیتوں پر عمل کرتے ہوئے خود رائی سے اجتناب اور اکابر وافاضل کے مشوروں پر عمل کا التزام کرتا تو اس کا دورِ حکومت باعث فتن نہ بنتا۔[1] ہم یزید کے ذاتی کردار کو نظر انداز کر دیں تب بھی یہ حقیقت کسی طرح چھپائی نہیں جاسکتی کہ اس کے دور میں جن خرابیوں کا آغاز ہوا وہ پھر بڑھتی چلی گئیں۔[2]

---

[1] حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ وصیتیں تاریخِ اُمتِ مسلمہ حصہ دوم میں گزر چکی ہیں۔ اصل حوالے کے لیے دیکھئے: البدایہ والنہایہ: ۱۱/۶۴۴،۶۴۵

[2] قال الشیخ عبداللطیف بن عبدالرحمن: "ان اکثر غلاۃ اهل الاسلام من عهد یزید بن معاویة، حاشا عمر بن عبدالعزیز رحمه الله، ومن شاء الله من بنی امیة، قد وقع منهم ما وقع من الجرأة والحوادث العظام. (عیون الرسائل والاجوبة عن المسائل: ۲/۸۷۵، مکتبة الرشد ریاض)

دورِ یزید بن معاویہ پر ایک نگاہ:

یزید کے عہدِ حکومت میں شورائیت محدود تر ہوئی اور خود رائی پر اصرار بڑھ گیا۔ تاریخ میں کوئی ہلکی سی جھلک بھی نہیں ملتی کہ حضرت حسین اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ سیاسی اختلاف کے حل کے لیے یزید نے شورائیت کا اہتمام کیا ہو۔ بلکہ یہ ثابت ہے کہ ان دونوں بزرگوں کو بیعت پر اس قدر مجبور کیا گیا کہ انہیں سرکاری دباؤ سے بچنے کے لیے دیارِ رسول چھوڑ کر جانا پڑا۔ حضرت نعمان بن بشیر، حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ جیسے اکابر جوامت کے اتحاد کی مصلحت کی خاطر یزید سے بیعت کر چکے تھے، یقیناً اس حق میں نہ تھے کہ ان بزرگوں سے ایسا سلوک کیا جائے۔ اگر یزید ان سے مشورہ کرتا تو یہ حضرات اسے وہ راستہ نہ دکھاتے جو اس نے اختیار کیا۔

اگرچہ بعض معاملات میں یزید کا مشورہ کرنا بھی منقول ہے چنانچہ اس نے سرجون نصرانی سے مشورہ کر کے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو کوفہ سے معزول کیا تھا۔[1] نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کا مشورہ مان کر اہلِ بیت کی مستورات سے اچھا سلوک کیا تھا[2] اور اپنی فوج کے ہاتھوں مدینہ کی تباہی کے بعد نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کے مشورے سے وہاں خوراک بھیجی تھی۔[3]

حکمرانوں کی خود رائی اور من مانی:

تاہم کئی اہم معاملات میں یزید اپنی غلط رائے پر مصر دکھائی دیتا ہے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو وہ طوق اور زنجیروں میں جکڑنے کی قسم کھاتا ہے اور اس بارے میں اپنے بیٹے معاویہ سمیت سب کی رائے نظر انداز کر دیتا ہے۔ مدینہ پر حملے کے فیصلے میں وہ عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ اور بعض جلیل القدر تابعین کی سفارش رد کر دیتا ہے۔[4]

اس دور میں حکام کی للّٰہیت، مقبولیت اور محبوبیت کی بجائے ان کی سخت گیری اور دبدبے کو کامیاب حکمرانی کی ضمانت سمجھ لیا گیا تھا؛ اسی لیے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ جیسے عالم فاضل اور بصیرت مند صحابی کو معزول کر کے کوفہ کی گورنری عبیداللہ بن زیاد کو دے دی گئی۔ اسی طرح حجاز سے ولید بن عتبہ جیسے عمر رسیدہ اور بردبار آدمی کو ہٹا کر عمرو بن سعید کا تقرر کر دیا گیا۔ اہلِ مدینہ کی شورش پر قابو پانے کے لیے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے اپنی خدمات پیش کی تھیں اور انہیں امید تھی کہ وہ خاندانی تعلقات کی بناء پر بلا کشت وخون معاملہ حل کر لیں گے مگر یزید نے ان کی جگہ مسلم بن عقبہ جیسے ظالم وجابر انسان کو وہاں بھیجا جس نے کوئی لحاظ کیے بغیر مدینۃ الرسول میں خونریزی اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔[5]

جرنیلوں کے بے پناہ اختیارات:

اس دور میں گورنروں اور جرنیلوں کے اختیارات حد سے متجاوز ہو گئے اور ان کے مظالم اور زیادتیوں کو قانون سے بالاتر تصور کر لیا گیا۔ عبیداللہ بن زیاد، عمر بن سعد اور شمر بن ذی الجوشن حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے پورے قافلے کے

---

[1] تاریخ الطبری: ۵/۳۴۸ بروایت عمار بسند حسن [2] المحن لابی العرب التمیمی، ص ۱۳۴، ۱۳۵
[3] البدایۃ والنہایۃ: ۱۱ / ۶۵۵
[4] طبقات ابن سعد: ۵/۱۴۵ ط صادر ؛ طبقات ابن سعد، متمم الصحابۃ طبقہ خامسہ: ۲/۴۳، ۴۴ ؛ تاریخ دِمَشق: ۲۳/۴۷۴
[5] تاریخ دِمَشق: ۲۴/۴۷۸ ؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۱۴

قتل کے براہِ راست ذمہ دار تھے مگران میں سے کسی سے کبھی برائے نام بھی کوئی پوچھ گچھ نہیں کی گئی۔

مدینہ منورہ میں لوٹ مار کرنے والے سپاہی سرکار کی دسترس سے باہر تو نہ تھے۔اس اقدام کو یزید کی مرضی کے بغیر ہی مان لیا جائے تب بھی یہ بات تو طے ہے کہ اس جرم عظیم میں شریک افراد کو کوئی سزا دینا تو درکنار انہیں کوئی تنبیہ کرنا بھی ثابت نہیں۔اس طرزِ عمل نے ایک طرف عوام میں حکام سے نفرت کو جنم دیا تو دوسری طرف حکام کی اگلی کھیپ کو یہ یقین دلایا کہ حکومت کے قیام واستحکام کے لیے کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔

یزید کے ایک جلیل القدر صحابی کی اولاد ہونے کے ناطے ہم مان لیتے ہیں کہ اس کا اور اس کے نائبین کا طرزِ عمل ایک عارضی معاملہ تھا نہ کہ کوئی مستقل پالیسی۔ بالفاظِ دیگر یہ کچھ غلط اقدامات تھے جو حکام کی حماقت کے سبب پے در پے صادر ہوئے۔مگر آگے چل کر سرکاری وفاداروں نے ان غلط اقدامات کی بے جا وکالت شروع کی تو بہت سے اذہان میں ''غلط'' ہی کو ''صحیح'' کا مقام مل گیا اور آگے چل کر بعض حکمرانوں کے دور میں اُس صحیح اسلامی طرزِ حکومت کو جو سراسر بے غرضی، ایثار، قربانی، رحم دلی، خیر خواہی اور ہمدردی پر مبنی تھی، ایک پرانے سکے کی حیثیت دے دی گئی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کی ولی عہدی کا فیصلہ کرتے ہوئے موروثی حکمرانی کو کسی اصول کے طور پر طے نہیں کیا تھا بلکہ اپنے زمانے کے حالات کے تحت یہ ان کا ایک انتظامی فیصلہ تھا تاہم آگے چل کر جب یزید نے بھی اپنے بیٹے معاویہ کو جانشین بنا دیا تو یہ حقیقت کسی سے مخفی نہ رہی کہ اب مسلمانوں کی سیاست میں موروثیت کا عنصر پختہ تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ مسلمانوں کی خوش نصیبی تھی کہ یزید کے بیٹے معاویہ نے باپ کے فیصلے کے عواقب کو بھانپ لیا اور مسلمانوں کے سیاسی معاملات کو شوریٰ کے حوالے کر کے سابقہ غلطی کی تلافی کی کوشش کی جس کے باعث حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو پورے عالمِ اسلام میں کسی جبر واکراہ کے بغیر خواص کی شورائیت اور عوامی رضا کے تحت خلافت کا ادارہ مثالی انداز میں چلانے کا موقع ملا مگر عبیداللہ بن زیاد کی سازش، مروان بن الحکم کے ناجائز دعوائے خلافت اور بعض امرائے بنوامیہ کے تعصب کے سبب اتحاد واتفاق کی اس فضا کی جگہ بہت جلد فتنہ وفساد کی آندھیاں چلنے لگیں جن کے تھپیڑے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ عمر بھر برداشت کرتے رہے۔

مسلمانوں پر بزورِ شمشیر حکومت کرنے کی ذہنیت عبدالملک بن مروان کے دور میں نقطۂ عروج پر پہنچ گئی جس کے کھلے مظاہرے حجاج بن یوسف کی بیس سالہ گورنری کے دوران دکھائی دیتے رہے۔مسلمانوں کے جائز اور محبوب خلیفہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اسی سفاکی کی نذر ہوئے اور ان کی لاش کے ساتھ وہی سلوک ہوا جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے برتا گیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی عبدالملک نے یکے بعد دیگرے اپنی اولاد کو جانشین نامزد کر کے موروثیت کو ایک اصولِ موضوعہ کی حیثیت دے دی۔حالانکہ اگر خاندانی مرتبہ ہی جانشینی کی بڑی وجہ بن سکتا تو پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خانوادۂ اقدس اس امر کا سب سے زیادہ حق دار تھا اور ایسے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بعد حضرت عباس یا حضرت علی رضی اللہ عنہما جیسے کسی قریبی رشتہ دار کو جانشین بنا جاتے۔مگر نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پسند کیا نہ ہی مسلمانوں کی اجتماعی بصیرت نے۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

کے بعد اسلام کے لیے سب سے زیادہ قربانی، سب سے زیادہ بزرگی وتقویٰ اور زیادہ علم وبصیرت کی بناء پر رائے عامہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر متفق ہوگئی۔ بعد کے خلفائے راشدین میں سے بھی کسی نے اپنی اولاد بلکہ اپنے کسی رشتہ دار کو بھی جانشین مقرر نہیں کیا تھا۔ پس بنوامیہ کے دور میں رواج پانے والا موروثی طرز، خلافت راشدہ سے کوئی میل نہیں رکھتا تھا۔

عبدالملک کے دور میں معاملات کی باگ ڈور پوری طرح ایک گھرانے کے ہاتھ میں آچکی تھی اور حکمران کی اللہ اور بندوں کے سامنے جوابدہی کا وہ تصور جو خلافتِ راشدہ کا طرۂ امتیاز تھا، فراموش کردیا گیا تھا؛ اس لیے خلافت پر شخصی حکمرانی کی چھاپ گہری ہوتی چلی گئی اور اس میں بادشاہت اور ملوکیت کے عجمی خدوخال واضح ہوتے چلے گئے۔

ہمیں ذاتی زندگی کے حوالے سے عبدالملک اور اس کے بیٹوں: ولید اور سلیمان کی دین داری میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ یہ سب نماز روزے کے پابند، اسلامی وضع قطع کے حامل، رقص وسرود اور شراب وکباب سے مجتنب اور قومی غیرت وحمیت سے آراستہ تھے۔ ہم ''الاغانی'' جیسی قصص وحکایات کی کتب میں جمع شدہ بہت سی ضعیف وبے سند روایات کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے جنھیں پڑھ کر ان خلفاء کی زندگی کا بہت ہی بدنما تصور سامنے آتا ہے۔ تاہم یہ بات طے ہے کہ بنومروان کی حکومت میں انتظامی انداز واطوار اور سیاسی تصورات اس نہج پر نہ رہے جو دورِ صحابہ میں تھے۔

حکمران خاندان میں چاہے شراب نوشی اور دیگر معاصی کا کھلے بندوں دور دورہ نہ ہو مگر شہزادوں اور امراء کا جائز تنعم اور تفریحات میں غیر معمولی انہماک ایک حقیقت ہے۔ چنانچہ سلیمان بن عبدالملک کے دسترخوان کی تفاصیل جو مؤرخین بیان کرتے ہیں، وہ حیران کن ہیں۔ اسی طرح ان خلفاء اور شہزادوں کے ملبوسات، باندیوں، جوتوں اور سواریوں کے قصے بھی عجمی بادشاہوں کی یادیں تازہ کرتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی توہین وتنقیص:

اس کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی برائی عمالِ حکومت میں سیاسی تعصب کی پیدا ہوگئی تھی۔ جس کی وجہ سے ایک طرف یزید، مروان اور عبدالملک کے فضائل ومناقب پر زور دیا جارہا تھا اور دوسری طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بنوامیہ کا حریف قرار دے کر ان پر بے محابا طعن وتشنیع کی جاتی تھی تاکہ لوگ اہلِ بیت اور ساداتِ کرام کی طرف مائل نہ ہوں۔[1]

اموی حکام سب وشتم کی اپنی ناپاک حرکت کے بارے میں خود یہ اعتراف کرتے تھے کہ ایسا اس لیے کیا جاتا ہے کہ لوگ سادات کی جگہ ہمیں حکمرانی کا اہل سمجھیں۔ ایک بار مروان بن الحکم نے امام زین العابدین رحمہ اللہ سے کہا: ''ہمیں بچانے والا آپ کے آقا (حضرت علی رضی اللہ عنہ) سے بڑھ کر کوئی نہ تھا۔'' یہ سن کر امام زین العابدین رحمہ اللہ نے پوچھا: ''پھر تم کیوں انہیں منبروں پر ہدفِ طعن بناتے ہو؟'' مروان نے کہا: ''ہماری حکومت اس کے بغیر نہیں چلتی۔''

---

[1] قال مروان لعلي بن الحسين: ما كان احد اكف عن صاحبنا من صاحبكم، قال: فلم تشتمونه على المنابر فقال: "لايستقيم لنا هذا الا بهذا." (انساب الاشراف: ۱۸۴/۲، ط دار الفكر؛ تاريخ دمشق: ۴۳۸/۴۲)

یزید نے محمد بن حنیفہ کے سامنے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل پر جہاں اپنے رنج وغم کا اظہار کیا، وہیں یہ کہہ کر ان پر ناجائز طعن بھی کیا: ''بے شک حسین نے مجھ پر ظلم کیا اور مجھ سے قطع رحمی کی۔'' ساتھ ہی یہ بھی کہا: ''میرا خیال ہے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم حسین کی عیب جوئی کرتے ہیں اور ان کی مذمت کرتے ہیں۔ اللہ کی قسم! ہم ایسا اس لیے نہیں کرتے کہ آپ (سادات کرام) محبوب اور معزز نہ رہیں، بلکہ ہم تو لوگوں کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہم ہرگز یہ برداشت نہیں کرتے کہ کوئی اس اقتدار میں ہم سے تنازعہ کرے جس کے لیے اللہ نے ہمیں چن لیا ہے اور یہ منصب ہمارے لیے خاص کر دیا ہے۔''[①]

یہی نہیں بلکہ بعض گستاخ حکام برملا لعنت ملامت کرتے اور دوسروں کو اس کی ترغیب دیتے تھے۔ چنانچہ مدینہ کے ایک مروانی گورنر نے حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ جیسے بزرگ اور معمر صحابی سے فرمائش کی کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر لعنت کریں۔ حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب بیان کر کے اس گورنر کی توقع کو خاک میں ملا دیا۔[②]

مدینہ منورہ کی ناقدری:

اُمویوں کو ہجرتِ مدینہ کا شرف حاصل نہ تھا، انہیں مکہ ہی سے زیادہ تعلق خاطر رہا کہ وہ ان کا آبائی وطن تھا۔ دوسری طرف وہ اہلِ مدینہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں ملوث سمجھتے تھے؛ اس لیے اہلِ مدینہ سے انہیں ویسی محبت نہ تھی جو ایک مسلمان کے دل میں ہونی چاہیے، اس تعصب کا سرِ عام مظاہرہ اس طرح ہوتا تھا کہ مروان بن الحکم خطبے میں مکہ کے فضائل تو نقل کرتا مگر مدینہ اور اہلِ مدینہ کے فضائل کو قصداً بیان نہ کرتا، حالانکہ وہ عالم آدمی تھا۔ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے ایک بار اس حرکت پر ٹوکا تو کہنے لگا: ''ہاں (مدینہ کی فضیلت کے متعلق) کچھ سنا تو ہے۔''[③]

بیت المال میں اسراف۔ نصیحت پر اشتعال:

اس دور میں سخت گیری، تشدد اور مالی بدعنوانی رواج پا چکی تھی۔ حکام کے لیے بیت المال سے وصول کیا جانے والا خرچ ضرورت کے درجے سے بڑھ کر عیش و تنعم کی حد میں داخل ہو چکا تھا۔ نصیحت کرنے والوں کو بعض اوقات جھڑکیاں سننا پڑتی تھیں۔ نامور محدث ابو وائل رحمہ اللہ کچھ مدت تک عراق کے گورنر عبید اللہ بن زیاد کے خزانچی رہے تھے۔ ایک بار ان کے پاس سرکاری کارندہ رقعہ لے کر آیا کہ باورچی خانے کے لیے آٹھ سو درہم دے دیے جائیں۔

① آجرنا اللہ وایا ك فی الحسین بن علی، فواللہ لئن كان نقصـ ك لقد نقصنی ولئن كان اوجعـ ك فقد اوجعنی، ولو انی انا الذی ولیت امره لم استطع دفع الموت منه الا بجز اصابعی او بذهاب نواظری لفديته بذا ك، وان كان قد ظلمنی وقطع رحمی، ولا احسبه الا قد بلغـ ك انا نقوم به فننال منه ونذمه، وايم اللہ مانفعل ذا ك لئلا تكونوا الاحباء الاعزاء، ولكنا نريد اعلام الناس بانا لا نرضیٰ الا بان لا ننازع امراً خصنا اللہ به وانتخبنا اللہ له. (انساب الاشراف: ۲۷۷/۳)

② صحیح البخاری، ح: ۳۷۰۳، باب مناقب علی رضی اللہ عنہ؛ صحیح مسلم، ح: ۶۲۸۲، فضائل الصحابة، باب فضائل علی رضی اللہ عنہ

بنو امیہ چونکہ خطبے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تنقیص کرتے تھے؛ اسی لیے بعض لوگ خطبے سے اٹھ کر چلے جاتے تھے۔ اس پر بنو امیہ کے بعض گورنروں نے خطبے کو نماز عید سے قبل کرنے کی بدعت شروع کر دی تاکہ لوگوں کو خواہی نخواہی یہ سمع خراشی جھیلنا پڑے۔ امام سرخسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

حتی أحدث بنو أمية الخطبة قبل الصلاة لأنهم كانوا فی خطبتهم يتكلمون بما لا يحل فكان الناس لا يجلسون بعد الصلاة لسماعها فأحدثوها قبل الصلاة ليسمعها الناس. (المبسوط: ۳۷/۲)

③ صحیح مسلم، ح: ۳۳۸۲، کتاب الحج، باب فضل المدینة

ابو وائل رحمہ اللہ عبیداللہ بن زیاد کے پاس گئے اور اسے سمجھایا کہ کھانے پینے پر اس قدر فضول خرچی نہیں ہونی چاہیے۔ عبیداللہ بن زیاد نے بگڑ کر انہیں اسی وقت ملازمت سے فارغ کر دیا اور کہا: ''چابیاں رکھ دو اور چلے جاؤ۔''[1]

عبادات میں بدعات:

حکام سیاسی اہداف کو مذہبی فرائض پر ترجیح دے کر بدعات ایجاد کرنے لگے تھے۔ مروان کا بیٹا بشر جو مصعب بن زبیر کے قتل کے بعد عراق کا حاکم بنا تھا، ایک خوش اخلاق اور سخی انسان تھا۔[2] مگر سامعین کو متوجہ رکھنے کے لیے وہ جمعہ و عیدین کے خطبے میں ہاتھوں کو خوب حرکت دیتا تھا۔ آخر ایک دن عمارہ بن رُوَیبہ رضی اللہ عنہ کو کہنا پڑا:

''اللہ ان ہاتھوں کا بُرا کرے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فقط انگشتِ شہادت سے اشارہ کرتے دیکھا تھا۔''[3]

نمازِ جمعہ میں تاخیر:

بنو مروان کے بعض امراء جمعے کے اجتماعات میں لمبی تقاریر کر کے نمازوں کو اس قدر مؤخر کر دیتے تھے کہ قضا ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا تھا۔[4] اگرچہ ایسا ہر جگہ نہیں ہوتا تھا بلکہ مدینہ منورہ سمیت اکثر و بیشتر شہروں اور دیہاتوں میں نمازیں وقت پر ہی ادا کی جاتی تھیں مگر حکومت کے اہم مراکز مثلاً دِمَشق، کوفہ اور بصرہ میں یہی صورتحال تھی۔[5]

یہ تاخیر سیاسی مصلحت کی خاطر کی جاتی تھی تاکہ خطبے میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی شرکت ہو سکے اور انہیں حکومتی کارگزاری اور خلفاء کی مدح وستائش دیر تک سنائی جائے۔[6]

اگر کوئی بے چارا اُٹھ کر حاکم کو یاد دلا دیتا کہ نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے تو اس کی شامت آ جاتی۔

یزید بن نعامہ الضبی رحمہ اللہ[7] اس صورتحال سے پریشان ہو کر بار بار حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے کہتے:

''ہم ہر چیز میں بے بس ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ نمازوں میں بھی بے بس ہیں۔''

---

① سیر اعلام النبلاء: ٤/١٦٦ ② سیر اعلام النبلاء: ٤/١٤٥

③ صحیح مسلم، ح:٢٠٥٣، کتاب الجمعة، باب تخفیف الصلوة والخطبة

④ عن عثمان بن ابی رواد اخی عبد العزیز بن ابی رواد قال سمعت الزھری یقول: دخلت علی انس بن مالک بدمشق وھو یبکی فقلت مایبکیک فقال: لا أعرف شیئا مما أدرکت إلا ھذہ الصلاة وھذہ الصلاة قد ضیعت. (صحیح البخاری، ح: ٥٣٠، کتاب مواقیت الصلوة، باب تضییع الصلوة عن وقتھا)

حافظ ابن حجر نے محدثین کی قوی اسناد سے بنوامیہ کے متعدد حکام کی مثالیں پیش کی ہیں جو خطبوں کو طویل کر کے نمازوں کو قضا ہونے کے قریب کر دیتے تھے، جس کے باعث مجمع میں موجود بعض صحابہ اور تابعین اشاروں سے نمازیں ادا کرتے تھے؛ کیوں کہ اگر وہ قیام اور رکوع وسجود کے ساتھ نماز پڑھتے تو اموی حکام اسے کھلی مخالفت تصور کر کے قتل کی سزا دیتے تھے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اسی لیے حجاج کے پیچھے نماز ترک کر دی تھی۔ (فتح الباری: ٢/١٤)

⑤ قال الحافظ: " تنبیہ. اطلاق انس محمول علیٰ ما شاھدہ من امراء الشام والبصرة خاصة والا فسیاتی فی ھذا الکتاب انه قدم المدینة فقال ما انکرت شیئا الا انکم لا تقیمون الصفوف."(فتح الباری:٢/١٤)

قال ابن الجوزی فی شرح ھذا الحدیث: الظاھر من انس انه یشیر الیٰ ما یصنع الحجاج فانه کان یؤخر الصلوٰة جداً یوم الجمعة متشاغلا بمدح عبدالملک و ما یتعلق به. (کشف المشکل من حدیث الصحیحین:٣/٢٧٥،ط دار الوطن)

وانظر کلام الحافظ ابن حجر العسقلانی فی شرح ھذا الحدیث(فتح الباری: ٢/١٨٠)

⑥ کبار تابعین اور ثقہ رواۃ میں سے ہیں۔ بعض نے انہیں صحابی بھی شمار کیا ہے مگر درست یہ ہے کہ تابعی ہیں۔ (تہذیب الکمال: ٣٢/٢٥٥، ٢٥٦)

حسن بصری رحمہ اللہ جانتے تھے کہ یزید بن نعامہ حکام کے سامنے احتجاج کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ فرماتے تھے:

''تم کچھ بھی نہیں کر پاؤ گے۔ فقط اپنی جان کو حکام کے سامنے رکھ دو گے۔''

ایک بار حجاج کے نائب، حاکمِ بصرہ حکم بن ایوب نے جمعے کا خطبہ اس قدر طویل کیا کہ غروبِ آفتاب کا وقت قریب ہوگیا۔ اس دن یزید بن نعامہ رحمہ اللہ سے بالکل برداشت نہ ہوسکا۔ انہوں آواز لگادی: ''نماز! نماز!''

اس پر سپاہیوں نے پہلے انہیں ڈرایا دھمکایا اور داڑھی اور گریبان سے پکڑ کر پیٹ پر تلواروں کے دستوں سے ضربیں لگائیں۔ پھر وہ انہیں گھسیٹ کر منبر کے پاس لے گئے جہاں حکم بن ایوب خطبہ روک چکا تھا۔

یزید بن نعامہ رحمہ اللہ اس کے سامنے لائے گئے تو اس نے کہا:

''تو دیوانہ تو نہیں ہے؟ کیا ہم نماز ہی میں مشغول نہیں؟'' (مطلب یہ تھا کہ خطبہ بھی نماز ہی جیسا ہے۔)

یزید بن نعامہ رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اللہ امیر کا بھلا کرے، کیا قرآن مجید سے افضل کلام بھی کوئی ہے؟''

حکم بن ایوب نے کہا: ''نہیں''

یزید بن نعامہ رحمہ اللہ نے کہا: ''اللہ امیر کا بھلا کرے، اگر کوئی شخص قرآن مجید کھول کر صبح سے رات تک تلاوت کرتا رہے تو کیا یہ عمل نمازوں کے بدلے بھی کافی ہوجائے گا؟''

حکم بن ایوب نے لاجواب ہوکر کہا: ''میرا خیال ہے کہ تو دیوانہ ہے۔''

یہ کہہ کر سپاہیوں سے کہا: ''اسے گرفتار کرلو۔''

اس دوران اکثر نمازی بالکل خاموش تھے۔ مگر اِکا دُکا افراد ان کی جان بچانے کے لیے کہہ رہے تھے:

''یہ شخص پاگل ہے۔ یہ مجنون ہے۔''

یزید بن نعامہ رحمہ اللہ قسم کھا کر کہتے تھے کہ گرفتاری سے کہیں زیادہ صدمہ مجھے لوگوں کے رویے سے ہوا۔

حاکمِ بصرہ نے انہیں قید کرنے کے بعد حجاج بن یوسف کو درجِ ذیل مراسلہ لکھا:

''بنوضَبّہ کا ایک شخص جمعے کے خطبے کے دوران کھڑا ہوکر نماز نماز کی صدا لگا رہا تھا۔ میرے سامنے کچھ عادل لوگوں نے گواہی دی ہے کہ یہ شخص پاگل ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟''

حجاج نے جواب میں لکھا: ''اگر عادل لوگ گواہی دیتے ہیں کہ یہ مجنون ہے تو چھوڑ دو۔ ورنہ اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کاٹ دو، آنکھیں پھوڑ دو اور سولی پر لٹکا دو۔''

آخر کئی شہریوں نے حلفی بیان دیا کہ یہ مجنون ہے۔ اس پر انہیں چھوڑ دیا گیا۔

کچھ مدت بعد یزید بن نعامہ رحمہ اللہ کے ایک عزیز کی وفات ہوگئی۔ وہ اس کی نمازِ جنازہ اور تدفین میں شریک ہوئے۔ دفن کے بعد وہ لوگوں کو اللہ کے خوف، فکرِ آخرت اور قبر وحشر کے بارے میں نصیحت کر رہے تھے کہ اچانک حاکمِ بصرہ حکم بن ایوب اپنے خاص نیزہ بردار دستے کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ تمام لوگ وحشت زدہ ہوکر بھاگ گئے مگر

یزید بن نعامہ رحمۃ اللہ علیہ وہیں کھڑے رہے۔ حکم بن ایوب ان کے سر پر آ کھڑا ہوا اور بولا:

''دوسرے لوگوں کی طرح تم کیوں نہیں بھاگے؟''

یزید بن نعامہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''اللہ امیر کا بھلا کرے! میرا دامن کسی الزام سے داغ دار نہیں اور مجھے اطمینان ہے کہ میں امیر کی موجودگی میں مامون ہوں۔''

حکم بن ایوب خاموش ہو گیا مگر اس کے پولیس افسر عبدالملک بن مُہلّب نے انہیں پہچان لیا اور یکدم بولا:

''امیر صاحب! آپ جانتے بھی ہیں یہ کون ہے؟'' حکم بن ایوب نے حیرت سے پوچھا: ''کون ہے یہ؟''

پولیس افسر نے کہا: ''یہ وہی تو ہے جس نے جمعے کے خطبے میں دخل اندازی کی تھی۔''

یہ سنتے ہی حاکم طیش میں آ گیا اور بولا: ''اوہ! تم تو بڑے دلیر ہو۔'' پھر سپاہیوں سے کہا: ''اسے پکڑ لو۔'' انہیں سزا کے طور پر چار سو کوڑے مارے گئے اور حجاج کی موت تک وہ اس کی خصوصی جیل میں قید رہے جسے ''دیماس'' کہا جاتا تھا۔[1]

سرکار کی اطاعت فرض عین:

شخصی حکومت کے تصورات نے حکام کی ذہنیت یہ بنادی تھی کہ لوگوں پر سرکار کی اطاعت فرضِ عین ہے اور جو ایسا نہ کرے اسے کڑی سے کڑی سزا دی جا سکتی ہے؛ اسی لیے حجاج بن یوسف کہا کرتا تھا:

''اللہ کی قسم! اگر میں لوگوں کو مسجد کے ایک دروازے سے نکلنے کا کہوں اور وہ دوسرے دروازے سے نکلیں تو میرے لیے ان کا خون بھی حلال ہے اور مال بھی۔''[2]

جاگیروں کی دوڑ، اقربا پروری اور عیش و تنعم:

شہزادوں اور امراء میں بڑی بڑی جاگیریں حاصل کرنے اور اس کے لیے جائز و ناجائز کی پرواہ نہ کرنے کا رجحان بھی عام تھا۔ دباؤ اور اثر و رسوخ کی بناء پر کچھ حاصل کر لینا اور اپنوں کو بے جا نوازنا ایک عام سی بات تھی۔ رشوت ستانی کا مرض بھی سرکاری عمال میں پیدا ہو چکا تھا۔ حکمران خاندان کی املاک، جائیدادوں، دولت اور عیش و تنعم کے ساز و سامان میں بہت بڑا حصہ ایسا تھا جو ناجائز ذرائع پر مشتمل تھا اور جس کی شریعت میں کوئی گنجائش نہ تھی۔

---

[1] وكتب الحكم إلى الحجاج أن رجلا من بني ضبة قام يوم الجمعة قال الصلاة وأنا أخطب وقد شهد الشهود العدول عندي انه مجنون فكتب إليه الحجاج إن كانت قامت الشهود العدول انه مجنون فخل سبيله وإلا فاقطع يديه ورجليه واسمر عينيه واصلبه قال فشهدوا عند الحكم أني مجنون فخلى عني. قال المعلى عن يزيد الضبي مات أخ لنا فتبعنا جنازته فصلينا عليه فلما دفن تنحيت في عصابة فذكرنا الله وذكرنا معادنا فإنا كذلك إذ رأينا نواصي الخيل والخيل والحراب فلما رآه أصحابي قاموا وتركوني وحدي فجاء الحكم حتى وقف علي فقال ما كنتم تصنعون قلت أصلح الله الأمير مات صاحب لنا فصلينا عليه ودفن فقعدنا نذكر ربنا ونذكر معادنا ونذكر ما صار إليه قال ما منعك أن تفر كما فروا قلت أصلح الله الأمير انا ابرأ من ذلك ساحة وآمن للأمير من أن افر قال فسكت الحكم فقال عبد الملك بن المُهَلَّب وكان على شرطته تدري من هذا قال من هذا قال هذا المتكلم يوم الجمعة قال فغضب الحكم وقال أما إنك لجريء خذاه قال فأخذت فضربني أربعمائة سوط فما دريت حين تركني من شدة ما ضربني قال وبعثني إلى واسط فكنت في ديماس الحجاج حتى مات الحجاج. (مسندابی یعلیٰ: ٥٣٦/٢، ط دار المامون...... قال المحقق: رجاله رجال الصحيح)

[2] والله لو أمرت الناس أن يخرجوا من باب من أبواب المسجد فخرجوا من باب آخر لحلت لي دماؤهم وأموالهم. (سنن ابی داوٗد، ح: ٤٦٤٥، بسند صحیح)

غرض عمر بن عبدالعزیز کے مسند نشین ہونے تک جو سیاسی خرابیاں بہت نمایاں دکھائی دیتی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

① موروثی حکمرانی اور شخصی حکومت

② شورائیت کا محدود ہونا

③ عوام کو اخلاق اور محبت سے قائل کرنے کی بجائے سختی کے ساتھ تابع دار رکھنے کی پالیسی

④ سیاسی مخالفین کو دبانے اور کچلنے کی آزادی سمجھنا

⑤ نائبین اور جرنیلوں کے اختیارات میں غیر معمولی اضافہ

⑥ سیاسی عناد کی بناء پر ماضی کی بزرگ شخصیات حتیٰ کہ بعض اکابر صحابہ پر بھی سب وشتم کرنا

⑦ سنت مطہرہ کی جگہ محض سیاسی اغراض کے لیے بعض بدعات کا اجراء

اسی طرح مالی معاملات میں درج ذیل کمزوریاں دکھائی دیتی ہیں:

❶ حکمران خاندان کی آمدن کا بے حد وحساب ہونا

❷ شاہانہ طرز زندگی اور مباحات میں انہماک

❸ بیت المال کی آمدن وخرچ میں جائز وناجائز کا فرق نہ کرنا

❹ حکام کا اپنے اثر ورسوخ، دباؤ یا جبر واکراہ کے ذریعے من پسند جاگیریں، عمارتیں یا کنیزیں حاصل کرنا

❺ ناجائز ٹیکس عائد کرنا

معاشرے میں پیدا ہونے والے امراض:

حکام کی زندگیوں کی ان خامیوں اور کمزوریوں کے اثرات پورے معاشرے پر پڑ رہے تھے؛ اس لیے عوام میں بھی خرابیاں اور بداعمالیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ یہ بُرائیاں عقائد سے لے کر اعمال اور مزاج تک کو محیط ہو رہی تھی۔

خوارج اور روافض زیر زمین سرگرم تھے۔ ان کی دعوت اندر ہی اندر کام کر کے لوگوں کو صحیح عقیدے سے منحرف کر رہی تھی۔ اعلیٰ افسران کی شہ پر ناصبیت بھی پھیل رہی تھی۔ بعض لوگ تقدیر جیسے نازک مسئلے کو چھیڑنا مشغلہ تصور کرتے تھے۔[①] شراب نوشی کا رواج ہو چلا تھا۔ ذمیوں کو شراب کی خرید وفروخت کی جو قانونی سہولت حاصل تھی اس سے فاسق مسلمان فائدہ اٹھا رہے تھے اور ان سے چوری چھپے خرید کر شراب پینے لگے تھے۔[②] بعض لوگ راگ رنگ کے رسیا تھے اور موسیقی سے دل بہلاتے۔[③] بعض علاقوں میں جاہلانہ رسوم کے مطابق خواتین جنازے کے ساتھ بال بکھیرتے، نوحہ کرتے ہوئے نکلنے لگی تھیں۔[④] غیر شرعی تصویر سازی کا گناہ بھی ہونے لگا تھا۔[⑤]

---

① طبقات ابن سعد: ۱۹۷/۷، ط دار صادر ② طبقات ابن سعد: ۳۶۵/۵، ۳۸۰؛ سیرۃ عمر لابن عبدالحکم، ص ۸۶، ۹۰

③ سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۱۱۱، ۱۳۳

④ سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۹۳، ۹۴ ⑤ سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن جوزی، ص ۹۸

اگر مجموعی طور پران تمام خرابیوں کا خلاصہ نکالا جائے تو پانچ چیزیں ہوں گی:

1. سیاسی نظام کا شورائیت پر استوار نہ ہونا
2. بدعنوانی
3. مظالم
4. اخلاقی واعتقادی کمزوریاں
5. بدعات اور گناہوں کا بڑھتا ہوا رجحان

لہٰذا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جیسے دانا، حساس اور دردمند انسان یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ امورِ سیاست ومعاشرت میں فوری اصلاحات ناگزیر ہیں۔ ورنہ حکومت کا بار اٹھانا بے سود بلکہ آخرت کے لحاظ سے سخت خطرے کی بات ہے۔

❖❖❖

ایک مثالی حکومت ظہور پذیر ہوتی ہے

تین دن کی سوچ بچار کے بعد آپ نے طے کرلیا کہ اب کیا کرنا ہے۔ آپ نے اصلاح کا عمل اپنی ذات سے شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ خلافت کے بارے میں آپ کا وہی نقطہ نظر تھا جو حضرت حسین، عبداللہ بن زبیر اور اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا جس کے مطابق خلافت خالق کے نظام کی بالادستی اور مخلوق کے حقوق کی حفاظت کا شورائی ادارہ ہے جس کے ذمہ دار کا تقرر مسلم اکابر اور اعیان کے استیناس، شورائیت اور رضا مندی ہی سے ہونا چاہیے۔ اس لیے مروجہ ضابطے کے تحت خلیفہ بننے کے باوجود آپ کا دل مطمئن نہ تھا۔

سربراہی عوام کی رضامندی پر منحصر:

آخرکار عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اس عہدے سے دست برداری پر آمادہ ہوگئے اور مسلمانوں کو جمع کرکے کہا:

''حضرات! میری خواہش اور عام مسلمانوں کی رائے لیے بغیر مجھ پر خلافت کی ذمہ داری ڈال دی گئی ہے؛ اس لیے میری بیعت کا جو طوق آپ کی گردنوں میں ہے میں خود اسے اتارے دیتا ہوں۔ آپ حضرات جسے چاہیں اپنا سربراہ مقرر کرلیں۔''

مگر لوگوں نے بیک زبان کہا:

''ہم آپ کی خلافت پر راضی ہیں۔ آپ اللہ کا نام لے کر کام شروع کریں۔''

آپ کو اطمینان ہوگیا کہ لوگ آپ کی سربراہی پر رضامند ہیں۔ اب آپ نے اس ذمہ داری کی نزاکت اور گراں باری کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے اللہ کی طرف سے ایک امتحان سمجھ کر قبول کیا اور لوگوں کو مخاطب کرکے فرمایا:

''امابعد! حضرت محمد ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ آپ ﷺ پر اتاری گئی کتاب قرآن مجید کے بعد کوئی اور کتاب نہیں آئے گی۔ جو چیز اللہ نے حلال کردی وہ قیامت تک حلال ہے۔ جسے اس نے حرام کردیا وہ قیامت تک کے لیے حرام ہے۔ میں اپنی طرف سے کوئی فیصلہ مسلط نہیں کروں گا۔ صرف اللہ کے احکام کو نافذ کروں گا۔ اپنی طرف سے کوئی نئی بات پیدا نہیں کروں گا۔ صرف (شریعت کی) تابع داری کروں گا۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ اللہ کی نافرمانی میں اپنی اطاعت کرائے۔ میں تمہارا کوئی ممتاز آدمی نہیں۔ ایک عام امتی ہوں۔ ہاں! اللہ نے تمہارے مقابلے میں مجھ پر زیادہ ذمہ داری ڈال دی ہے۔

میں تمہیں تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہوں؛ کیوں کہ اللہ کا خوف ہر چیز کا متبادل بن جاتا ہے مگر اس کا متبادل کچھ اور نہیں۔

لوگو! اپنے اعمال آخرت کے لیے کرو۔ جو آخرت کے لیے اعمال کرتا ہے، اللہ اس کی دنیا کے کام بھی بنا دیتا ہے۔ اپنے باطن کی اصلاح کر لو۔ اللہ تمہارے ظاہر کو بھی اچھا بنا دے گا۔

موت کو کثرت سے یاد کرو۔ اس کی آمد سے پہلے پہلے اس کی اچھی طرح تیاری کر لو۔ یہ لذتوں کو مٹا دینے والی چیز ہے۔ دیکھو! آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک تمہارے باپ دادا میں سے کوئی ایسا نہیں گزرا جسے موت سے استثناء ملا ہو۔

یاد رکھو! یہ امت اللہ کی ذات، اس کے رسول ﷺ اور اس کی کتاب کے بارے میں متفرق نہیں ہوئی۔ بلکہ دینار و درہم کے سبب اس میں پھوٹ پڑی ہے۔ یاد رہے کہ میں کسی کو ناحق نہیں دوں گا اور کسی سے اس کا حق نہیں روکوں گا۔ لوگو! جو اللہ کی اطاعت کرے تم پر اس کی اطاعت کرنا لازم ہے۔ جو اللہ کی نافرمانی کرے، اس کی اطاعت کی کوئی گنجائش نہیں۔

تم میری اطاعت اس وقت تک کرو جب تک میں اللہ کی اطاعت کرتا رہوں۔ جب میں اللہ کی نافرمانی کرنے لگوں تو میری تابع داری تمہارے ذمے نہیں۔"[1]

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا یہ خطبہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ وہ اقتدار کے مقاصد میں خلفائے راشدین کی فکر و نظر سے بالکل ہم آہنگ تھے اور بطورِ حکمران کسی خلافِ شرع کام کے اجراء کی گنجائش محسوس کرتے تھے نہ عوام کے لیے ایسے کسی حکم کی پیروی درست سمجھتے تھے۔

اصلاح کی ابتداء اپنے گھر اور خاندان سے

آپ کے اصلاحی کاموں کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ خود آپ کا اپنا خاندان تھا جو ایک طویل مدت سے اس شاہانہ اور آزادانہ طرزِ حیات کا عادی تھا۔ آپ کو سب سے پہلے انہی کی مخالفت کا سامنا تھا۔ یہ لوگ آپ کی برادری بلکہ کنبہ تھے۔ آپ کی اہلیہ فاطمہ، عبدالملک بن مروان کی چہیتی صاحبزادی تھیں جس کے دو بھائی سابق خلفاء تھے۔

آپ نے اپنی قوتِ ایمانی اور خداداد ہمت سے کام لے کر ان تمام رکاوٹوں کو نظر انداز کر دیا۔ ایک سچے اور کھرے مصلح کی طرح اصلاح کا کام سب سے پہلے اپنی ذات اور اپنے گھر سے شروع کیا۔ وہ تمام شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ ختم کر دیے جو پہلے حکمرانوں نے عجمی بادشاہوں سے متاثر ہو کر شروع کر دیے تھے۔ اس کی جگہ وہ سادہ اور فقیرانہ رہن سہن اختیار کیا جو خلفائے راشدین کا تھا۔ اس وقت آپ کی موروثی جاگیریں بہت بڑی تھیں جن کی سالانہ آمدن ۴۰ ہزار دینار

[1] اخبار ابی حفص عمر، ص ۵۵ تا ۵۷

تھی، آپ نے یک لخت یہ تمام جائیدادیں اور جاگیریں واپس کر دیں جو مشکوک طریقے سے وراثت میں ملی تھیں۔ صرف چار سو دینار سالانہ آمدن کی وہ مختصر سی جائیداد اپنے پاس رہنے دی جو کسی شک وشبہ سے پاک تھی۔ ①

اپنی اہلیہ کے زیورات اور زروجواہر بھی بیت المال میں داخل کر دیے تاکہ دوسروں کے احتساب کے وقت کوئی ان پر انگلی نہ اٹھا سکے۔ ② عیش وتعیش کا اپنا ذاتی سامان قالین، پردے، قیمتی لباس، عطریات اور غلام تک فروخت کر کے قیمت بیت المال میں جمع کرا دی۔ ③

سربراہ کے امتیازات کا خاتمہ:

آپ نے سربراہِ مملکت کے طور پر اپنے لیے کوئی امتیازی شان اختیار نہ کی۔ پہلے دربار میں لوگ خلیفہ کی آمد پر السلام علیکم کہا کرتے تھے اور ادب سے کھڑے رہتے۔ آپ نے سنت کے عین مطابق سلام کی ابتداء خود کرنا شروع کی۔ لوگوں کو اپنی موجودگی میں کھڑے ہونے سے منع کر دیا، فرمایا: ''تم کھڑے ہوئے تو میں بھی کھڑا رہوں گا۔ تم بیٹھو گے تو میں بیٹھوں گا۔ وہ دن آنے کو ہے جب انسان اللہ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔'' ④

ناجائز املاک کی واپسی:

پھر آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اہل خاندان کو جمع کر کے اس عزم کا اظہار کیا کہ ناجائز یا مشکوک ذرائع سے حاصل کردہ ہر جاگیر واپس کی جائے گی اور امت کی دولت اسے لوٹائی جائے گی۔ خاندان کے لوگوں نے سخت برہمی ظاہر کی مگر آپ اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے۔ آپ نے مسجد میں مسلمانوں کو جمع کر کے اعلان کیا:

''گزشتہ خلفاء نے ہم اہل خاندان کو ایسی جاگیریں اور ایسے تحائف دیے جن کو دینا جائز تھا نہ لینا۔ میں یہ جاگیریں اصل حق داروں کو واپس کرتا ہوں اور اپنی ذات اور اپنے خاندان سے اس کا آغاز کرتا ہوں۔''

یہ کہہ کر آپ نے جائیدادوں کے کاغذات منگوائے۔ آپ کا خادم مزاحم ان کاغذات کو پڑھ کر سناتا جاتا اور آپ قینچی سے کاٹ کاٹ کر پھینکتے جاتے۔ صبح سے لے کر ظہر تک یہ سلسلہ جاری رہا اور آپ نے اپنی اور اپنے خاندان کی تمام مشکوک جائیدادیں واپس کر دیں۔ ⑤

اپنی اور اپنی اہلیہ کی انگوٹھیاں بھی بیت المال میں:

آپ کی انگوٹھی میں ولید بن عبدالملک کا دیا ہوا ایک قیمتی نگینہ جڑا تھا جو مراکش کے خراج کی مد میں آیا تھا۔ آپ نے وہ نگینہ نکال کر بیت المال میں جمع کرا دیا۔ ⑥ اہلیہ کے پاس اس کے باپ خلیفہ عبدالملک کی دی ہوئی ایک بیش قیمت انگشتری باقی رہ گئی تھی۔ آپ نے صاف کہہ دیا: ''یا تو اسے بیت المال میں داخل کرو۔ یا مجھ سے الگ ہو جاؤ۔''

---

① سنن ابی داؤد، ح: ۲۹۷۲، کتاب الخراج، باب فی صفایا
② سیرت عمر بن عبدالعزیز لابن عبد الحکم، ص ۵۸
③ اخبار ابی حفص، ص ۵۷
④ سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم، ص ۳۹، ۴۰
⑤ سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن جوزی، ص ۱۲۷
⑥ طبقات ابن سعد: ۳۴۱/۵

وفا شعار بیوی نے فوراً وہ انگشتری بیت المال کے لیے دے دی۔ [1]

امراء کا احتساب:

خالق اور مخلوق سے اپنا اور اپنے گھر والوں کا معاملہ صاف کرنے کے بعد آپ دوسرے امراء کے احتساب کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ نے اعلان کیا کہ حکمران خاندان کے کسی بھی فرد کے خلاف رعایا میں سے کسی کا کوئی دعویٰ ہو تو وہ اسے پیش کرے۔ بہت سے لوگوں نے حاضر ہو کر مختلف حکام، امراء اور شہزادوں کے خلاف دعویٰ ثابت کر دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا بھی لحاظ نہ کیا۔ دوسرے شہروں کے حکام کے نام تاکیدی احکام بھیج کر ہر جگہ غصب شدہ املاک اور چیزیں حق داروں کو واپس دلوانا شروع کر دیں۔ [2]

شہزادے کی بھی رعایت نہ کی:

ولید بن عبدالملک کے ایک بیٹے رَوح نے حمص میں کچھ لوگوں کی دکانیں غصب کر رکھی تھیں۔ رَوح کا کہنا تھا کہ اسے یہ دکانیں جاگیر میں ملی ہیں۔ دکان کے اصل مالکان نے شہادتوں اور ثبوتوں کے ساتھ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے ہاں فریاد کی۔ آپ نے رَوح بن ولید کو حکم دیا کہ دکانیں واپس کر دو۔

وہ بولا: ''میرے پاس خلیفہ ولید بن عبدالملک کی تحریر موجود ہے۔''

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے فرمایا:

''جب دکانیں ان لوگوں کی ہیں اور اس کے ثبوت موجود ہیں تو خلیفہ ولید کی تحریر کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔''

مجلس برخاست ہوئی تو روح نے باہر جا کر ان فریادیوں کو دھمکانا شروع کر دیا۔ انہوں نے عمر بن عبدالعزیز کو آگاہ کر دیا۔ آپ نے اپنے پولیس افسر کعب بن حامد سے کہا:

''رَوح کے پاس جاؤ۔ اگر وہ دکانیں ان کے حوالے کر دے تو ٹھیک، ورنہ اس کا سر کاٹ لاؤ۔''

رَوح کو یہ اطلاع مل گئی۔ اس دوران کعب بن حامد بھی آن پہنچا اور تلوار کو میان سے ایک بالشت کھینچ کر کہا:

''ان کی دکانوں کا قبضہ انہیں دے دو..... ورنہ.....'' رَوح کانپنے لگا اور دکانیں مالکان کے حوالے کر دیں۔ [3]

فدک کا مسئلہ:

فدک کی زمین کا مسئلہ بھی آپ نے بڑی اہمیت سے حل کیا۔ اس زمین کی آمدن نبی اکرم ﷺ اپنے خاندان کی

---

[1] سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن جوزی، ص۱۲۷، ۱۲۸ [2] طبقات ابن سعد: ۲۵۲/۵،

ملحوظہ: یاد رہے کہ بعض مؤرخین نے ان مظالم کا سلسلہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تک دراز کیا ہے اور کہا ہے کہ جاگیروں پر قبضے کا یہ سلسلہ اسی دور سے شروع ہو گیا تھا۔ حالانکہ اس بارے میں قدیم مآخذ میں صرف واقدی کی یہ روایت ملتی ہے:

ما زال عمر بن عبد العزیز یردّ المظالم من لدن معاویۃ الی ان استخلف من ایدی معاویۃ ویزید بن معاویۃ حقوقا.

واقدی کا ضعف ظاہر ہے، اس ضعیف روایت کی بنا پر ایک صحابی کے مقام کو مجروح کرنا جائز نہیں ہوگا جیسا کہ ہم یہ اصول شروع میں واضح کر چکے ہیں۔

[3] سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم، ص ۵۷، ۵۸

ضروریات میں خرچ کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد بنو ہاشم کا خیال تھا کہ یہ زمین وراثت میں انہیں ملے گی مگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انبیائے کرام کی وراثت جاری نہ ہونے کی حدیث کے پیش نظر اسے خاندانِ نبوت میں تقسیم نہ فرمایا بلکہ سرکاری زمین قرار دے کر اس کا اختیار اپنے پاس رکھا، تاہم اس کی آمدن اسی طرح خاندانِ نبوت پر خرچ فرماتے رہے۔ بعد کے خلفاء بھی اسی پر عمل پیرا رہے۔ تاہم مروان بن الحکم نے اپنے دور میں فدک کی آمدن اپنے کنبے کے لیے جاری کردی۔ یہی زمین عمر بن عبدالعزیز کے حصے میں آئی۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس غلطی کی اصلاح کی اور فدک کی آمدن خلفائے راشدین کے دور کی طرح دوبارہ بنو ہاشم کے لیے مخصوص کردی۔ ①

خاندان کا دباؤ مسترد:

حکمران خاندان کے شہزادے اس صورتحال سے بڑے پریشان تھے۔ انہوں نے عمر بن عبدالعزیز کی پھوپھی فاطمہ بنت مروان کو ان کے پاس بھیجا۔ عمر بن عبدالعزیز اپنی اس پھوپھی کا بڑا احترام کرتے تھے۔ پھوپھی نے کہا:

''میں نے اہلِ خاندان کو دیکھا ہے کہ وہ تمہارے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔ ڈر ہے کہ کسی دن تمہارے خلاف اٹھ نہ کھڑے ہوں۔''

آپ نے فرمایا: ''قیامت کے دن سے بڑھ کر کسی اور چیز سے ڈروں تو اللہ کرے اس چیز سے محفوظ نہ رہوں۔''

پھوپھی یہ سن کر واپس لوٹ گئیں اور کنبے والوں سے کہا: ''یہ سب تمہارا اپنا کیا دھرا ہے۔ تم عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے خاندان سے لڑکی بیاہ لائے تو لڑکا اپنے نانا پر چلا گیا۔'' ②

اس کے بعد ہشام بن عبدالملک نے خاندان کی نمائندگی کرتے ہوئے بات چیت کی اور کہا: ''جو کام آپ کے زمانے سے متعلق ہیں، وہ ضرور کیجیے مگر گزشتہ خلفاء جو کچھ کر گئے ہیں، اسے اسی حالت پر رہنے دیں۔''

آپ نے جواب دیا: ''اگر ایک معاملے میں تمہارے پاس دو حکم نامے آئیں۔ ایک امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا اور دوسرا عبدالملک کا، تو کس پر عمل کرو گے؟''

ہشام نے جواب دیا: ''جو حکم نامہ پہلے کا ہو، اسی پر عمل کروں گا۔''

آپ نے فرمایا: ''تو پھر ان سب دستاویزات سے پہلے میرے پاس کتاب اللہ آچکی ہے۔ اب کوئی چیز چاہے مجھ سے پہلے زمانے کی ہو یا اس زمانے کی، میں اس بارے میں کتاب اللہ پر عمل کروں گا۔''

ہشام لاجواب ہو کر واپس ہو گیا۔ ③

---

① سنن ابی داؤد، ح: ۲۹۷۴، کتاب الخراج ؛ سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم، ص ۵۸
بعض تواریخ میں منقول یہ بات درست نہیں کہ عمر بن عبدالعزیز نے سادات کو فدک کا مالک بنا دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ زمین خلفائے راشدین کے دور میں بھی سرکاری اراضی ہی میں شمار ہوتی تھی، البتہ اس کی آمدن کا مصرف سادات کو قرار دے دیا گیا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز نے اسی طرز کو دوبارہ جاری کردیا۔

② سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن جوزی، ص ۱۱۷ ؛ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۱۰۱ھ

③ سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن جوزی، ص ۱۴۰

دوست کا لحاظ نہ کیا:

اموی امیر عَنبَسہ بن سعید، عمر بن عبدالعزیز کا پرانا دوست تھا، سابق خلیفہ سلیمان نے اس کے لیے بیس ہزار دینار کی ادائیگی کا حکم جاری کیا تھا۔ ساری کارروائی مکمل ہو چکی تھی، صرف خزانے سے وصولی باقی تھی کہ سلیمان کی وفات ہو گئی۔ اب عَنبَسہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس آیا اور ماجرا سنا کر کہا کہ اس رقم کی ادائیگی کی منظوری دی جائے۔

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے پوچھا: ''کتنی رقم ہے؟'' عَنبَسہ نے کہا: ''بیس ہزار دینار۔''

آپ نے حیرت سے کہا: ''بیس ہزار دینار!! اتنی رقم سے تو چار ہزار مسلمانوں کے گھروں کی کفالت ہو سکتی ہے۔ اتنی رقم میں ایک ہی آدمی کو کیسے دے دوں۔ واللہ! میرے پاس اس کی کوئی گنجائش نہیں۔''

عَنبَسہ نے یہ سن کر ان پر چوٹ کی اور کہا: ''امیر المؤمنین! کوہ ورس کی زمین کا کیا ہو گا؟''

یہ زمین عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی اولاد کے نام تھی۔ یہ سنتے ہی وہ بولے: ''تم نے خوب یاد دلایا، میں اسے بھول ہی گیا تھا۔'' یہ کہہ کر اس زمین کے کاغذات منگوائے اور سب کو پرزے پرزے کر دیا۔

خاندان بنو امیہ کے کچھ لوگ دروازے کے باہر کان لگائے کھڑے تھے، انہیں امید تھی کہ اگر خلیفہ نے اپنے جگری دوست عَنبَسہ کے لیے گنجائش رکھی تو ہمارا بھی بھلا ہو جائے گا۔ جب عَنبَسہ نے انہیں باہر آ کر حال سنایا تو انہوں نے اسے کہا: ''خلیفہ سے جا کر کہو، باہر برادری والے جمع ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ یا تو ہمارے وہ عطیات جاری کریں جو ہمیں پہلے ملا کرتے تھے ورنہ ہمیں دوسرے ملکوں میں ہجرت کرنے کی اجازت دیں۔''

عَنبَسہ نے اندر آ کر یہ پیغام دیا تو آپ نے فرمایا: ''وہ جہاں جانا چاہیں انہیں اس کی اجازت ہے۔''[1]

پھوپھی کی درخواست مسترد:

ایک بار آپ کی پھوپھی آئیں، دیکھا امیر المؤمنین دسترخوان پر بیٹھے ہیں، چھوٹی چھوٹی روٹیوں، زیتون کے تیل اور نمک کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھوپھی نے کہا: ''کھانا تو بہتر کھایا کرو۔''

آپ نے فرمایا: ''ایسا ضرور کرتا مگر اس کی گنجائش ہی نہیں نکلتی۔''

پھوپھی نے کہا: ''تمہارے چچا عبدالملک مجھے خاطر خواہ وظیفہ دیا کرتے تھے۔ پھر تمہارے بھائی ولید نے اس میں اضافہ بھی کیا مگر تم نے تو اسے سرے سے بند ہی کر دیا۔''

آپ نے کہا: ''پھوپھی صاحبہ! میرے چچا عبدالملک اور میرے بھائی ولید اور سلیمان آپ کو جس مال سے دیا کرتے تھے وہ مسلمانوں کا تھا۔ وہ مال میرا نہیں کہ میں اس میں سے آپ کو دیا کروں۔ ہاں! اگر آپ چاہیں تو میں اپنے ذاتی مال سے دے دیا کروں۔''

---

①② سیرۃ ① سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم، ص ۵۵، ۵۶

وہ بولیں: ’’تمہارا ذاتی مال کتنا ہے؟‘‘
فرمایا: ’’وہی دو سو دینار (سالانہ) تنخواہ جو مجھے ملتی ہے۔‘‘
پھوپھی بولیں: ’’میں تمہاری تنخواہ کا کیا کروں گی!‘‘
فرمایا: ’’اس کے سوا میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوں۔‘‘ پھوپھی یہ سن کر واپس چلی گئیں۔ [1]

عمر بن عبدالعزیز کی اصلاحات

حجاج بن یوسف کی سخت گیر پالیسی نے بنو مروان کی حکومت میں تلوار اور کوڑے کی زبان عام کر دی تھی۔ اس کی وجہ سے شہری خوف و ہراس میں مبتلا رہتے تھے۔ حکومت مخالف سرگرمیوں کی روک تھام کے لیے شک کی بنیاد پر لوگوں کو پکڑنا، زد و کوب کرنا اور ماورائے قانون قتل کر دینا حاکم کا حق سمجھا جاتا تھا۔ آپ نے اس طرزِ عمل کو بالکل تبدیل کر دیا۔ جو حکام اور افسران ماضی میں عوام کے ساتھ سختی میں مشہور تھے، انہیں فوراً برطرف کر دیا۔ ان کی جگہ نیک، متقی اور ہمدرد افراد کا تقرر کیا۔ انہیں تاکیدی احکام بھیجے کہ کسی مسلم یا غیر مسلم شہری کو شک کی بنیاد پر گرفتار یا زد و کوب نہ کیا جائے۔ کسی کو خلافِ شرع کوڑے نہ لگائے جائیں۔ کسی کو قتل کرنے یا ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزا مجھ سے پوچھے بغیر نہ دی جائے۔ [2]

یہ وہی طرزِ عمل تھا جو نبیِ اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین نے دنیا کو سکھایا تھا۔

جرائم کی تفتیش کے بارے میں اسوۂ حسنہ:

حضور نبیِ اکرم ﷺ کبھی شک و شبہے کی بناء پر سزا نہیں دیتے تھے۔ تفتیش کے لیے تشدد سے منع کرتے ہوئے عبوری سوال و جواب (cross-question) جیسے متبادل طریقے استعمال فرماتے تھے۔ غزوۂ بدر میں حریف کی تعداد جاننا بہت ضروری تھا۔ جنگ سے پہلے قریش کے بعض غلام مسلمانوں کے ہاتھ لگ گئے۔ وہ انہیں مار پیٹ کر معلومات لینے کی کوشش کرنے لگے، قیدی لاعلمی ظاہر کرتے رہے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے دیکھا تو مار پیٹ سے منع فرما دیا اور ان سے روزانہ ذبح کیے جانے والے اونٹوں کی تعداد پوچھی جو انہوں نے نو یا دس بتائی۔ اس سے آپ ﷺ نے درست اندازہ لگایا کہ حریف کی تعداد نو سو سے ایک ہزار کے درمیان ہے۔ [3]

خلفائے راشدین کی حکمتِ عملی:

دورِ خلافتِ راشدہ میں نہ صرف یہ کہ شک کی بناء پر کسی کو بغاوت کی سزا دینے کی پالیسی نہ تھی بلکہ حدود و قصاص کو چھوڑ کر دیگر جرائم کی سزاؤں میں غیر مسلموں پر بھی تشدد نہیں کیا جاتا تھا۔ اگر کبھی اتفاقاً کسی نے غلطی سے ایسا کر بھی دیا تو اکابر صحابہ فوراً اس سے منع کر دیتے تھے۔ ایک بار شام میں کچھ غیر مسلموں کو خراج ادا نہ کرنے کی وجہ سے تنبیہ کے

---

[1] سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم، ص ٦٠
[2] تاریخ الطبری: ٤/٢٨٣
[3] صحیح مسلم، ح: ٦٨٢٣، ٦٨٢٤، کتاب البر والصلة، باب الوعید الشدید لمن عذب الناس بغیر حق ؛ مسند احمد، ح: ١٥٣٣٠

لیے دھوپ میں کھڑا کر دیا گیا۔

ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو اسے ظلم وستم میں شمار کیا اور فرمایا: ''میں نے نبی اکرم ﷺ سے سنا ہے کہ اللہ ان لوگوں کو عذاب دے گا جو بندوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔'' یہ حدیث سنتے ہی حکام نے ان لوگوں کو چھوڑ دیا۔[1]

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اسی بناء پر شر پسندوں کے خلاف کوئی سخت اقدام نہیں کیا اور مشکوک افراد کو قید کر کے شورش پر قابو پانے کی تدبیر اختیار نہیں۔ اور اسی لیے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن سبا کو شام میں لوگوں سے مشکوک طور پر ملتے جلتے دیکھ کر بھی اس کے خلاف کارروائی سے اجتناب کیا۔[2] حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کی جانب سے شورش پسندوں کے خلاف کارروائی میں حزم واحتیاط کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

تفتیش میں تشدد کا رجحان اور اس کے نقصانات:

مگر یزید کے دور میں تشدد کی بنیاد پڑ گئی۔ پھر عبدالملک کے عہدِ حکومت میں حجاج بن یوسف اور اس کے ماتحتوں نے مخالفین کو چن چن کر مارا۔ حکام کا ذہن یہ بن گیا تھا کہ اگر ہر جگہ شریعت کے ضابطۂ اخلاق کی من وعن تابع داری کی جائے تو شر پسند عناصر کو پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے؛ اس لیے عوامی مصلحت اور تدبیرِ مملکت کے پیشِ نظر انہیں ماورائے قانونِ شرع پکڑنا اور سزا دینا درست ہے۔ اس سوچ کے حامل لوگ چاہے اپنے لحاظ سے کتنے ہی مخلص کیوں نہ ہوں مگر اس طرزِ فکر کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ بندوں کی اصلاح کی فکر اللہ سے کہیں زیادہ ہمیں ہے اور معاشرے کی بہتری کے لیے ہماری حکمتِ عملی اللہ کی تدبیر سے زیادہ کارگر ہے۔

عملی طور پر بھی اس پالیسی کا نقصان سامنے آچکا تھا۔ اس طرح اگر چہ بظاہر شر پسند دب جاتے تھے مگر جو بے گناہ لوگ شک کی بناء پر حکومتی سختیوں کا نشانہ بنتے تھے، وہ انتقامی جذبات سے لبریز ہو کر بعد میں شورش پسندوں کی نئی کھیپ بن کر سامنے آتے تھے۔ خوارج کے بار بار ظہور کی ایک وجہ یہی جذبۂ انتقام تھا ورنہ یہ فتنہ کب کا ختم ہو چکا ہوتا؛ کیوں کہ کوئی پختہ علمی بنیاد اس گروہ کے پاس ہرگز نہ تھی۔

عمر بن عبدالعزیز کا سزائیں نافذ کرنے میں اسوۂ حسنہ کے مطابق اعتدال:

عمر بن عبدالعزیز نے اس قضیے میں نہ صرف سرکاری پالیسی کو تبدیل کر کے خلفائے راشدین کی سنت کے مطابق بنایا بلکہ اس سلسلے میں ماتحت حکام کی مسلسل ذہن سازی کرتے رہے کہ اصل کامیابی قانونِ شرع کی بالادستی اور اس کی پیروی میں ہے نہ کہ مصالحِ ملکی کے لیے حدودِ شرع سے تجاوز کرنے میں۔ گزشتہ دور کے گورنر بلا تأمل قتل اور ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزائیں جاری کر دیتے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز نے اس پر پابندی لگا دی اور حکم جاری کیا:

''مجھے بتائے بغیر کسی کو قتل یا اعضاء قطع کرنے کی سزا مت دینا۔''

---

[1] صحیح مسلم، ح: ۲۶۱۳؛ سنن ابی داؤد، ح: ۳۰۴۷

[2] تاریخ الطبری: ۲۸۳/۴

مُوصل میں ایک امیر یحییٰ غسانی کی تقرری ہوئی۔ اس شہر میں چوروں اور ڈاکوؤں نے ادھم مچار کھا تھا۔ امراء کی عام ذہنیت کے مطابق یحییٰ غسانی کا بھی یہی خیال تھا کہ جب تک لوگوں کو شک کی بنیاد پر گرفتار نہیں کیا جائے گا، یہ وارداتیں بند نہیں ہوسکتیں۔ اس نے بذریعۂ مراسلہ آپ سے دریافت کیا: ''کیا میں لوگوں کو شبہے کی بنیاد پر گرفتار اور الزام کی بنیاد پر زدوکوب کرسکتا ہوں؟ یا صرف ثبوت کی بنیاد پر انہیں پکڑوں اور سنت کے مطابق معاملہ کروں؟''

آپ نے جواب میں لکھا: ''صرف شرعی ثبوت ملنے پر سنت کے مطابق کارروائی کرو۔ اگر شرعی قانون کی پیروی سے لوگوں کی اصلاح نہیں ہوتی تو اللہ ان کی اصلاح نہ کرے۔''[1]

ایک موقعے پر فرمایا: ''جن کی اصلاح ظلم کے بغیر نہ ہو، اللہ ان کی اصلاح نہ کرے۔ میں لوگوں کی اصلاح کے لیے اپنے دین کو برباد نہیں کرسکتا۔''[2]

ایک بار خراسان کے والی نے عمر بن عبدالعزیز کو لکھا: ''یہاں کے لوگوں کا رویہ بہت بگڑا ہوا ہے۔ انہیں تلوار اور کوڑے کے سوا کوئی چیز درست نہیں کرسکتی۔ اگر امیر المؤمنین مناسب سمجھیں تو اس کی اجازت دے دیں۔''

آپ نے جواب میں لکھا: ''تمہارا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ان لوگوں کو تلوار اور کوڑے کے سوا کوئی چیز صحیح نہیں کرسکتی۔ ان کو عدل وانصاف اور حق کی ادائیگی درست کرسکتی ہے۔ جہاں تک ہوسکے اس کو عام کرو۔''[3]

اپنے ایک نائب کو آپ نے اس بارے میں درج ذیل اصول تحریر فرمایا:

''شیطانی وساوس اور حکومت کے ظلم وستم کے ہوتے ہوئے انسان کی اصلاح نہیں ہوسکتی؛ اس لیے میرا مراسلہ ملتے ہی ہر حق دار کو اس کا حق ادا کردو۔''[4]

شاتم رسول کے سوا کسی کی توہین کرنے والے کو سزائے موت نہیں ہوسکتی:

سابق دور کے گورنر، خلیفہ کے بارے میں گالم گلوچ پر سزائے موت دینا درست سمجھتے تھے۔ مدینہ کے قاضی نے ایک خارجی کو گرفتار کیا۔ وہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو گالیاں دینے لگا۔ قاضی نے اسے سزائے موت دینے کا ارادہ کیا مگر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی ہدایت کے مطابق پہلے مراسلہ بھیج کر ان سے منظوری طلب کی۔ انہوں نے جواب دیا:

---

① انساب الاشراف: ۱٤٧/٨

② سیرة عمر بن عبد العزیز لابن جوزی، ص۱۱۷، ۱۱۸؛ تاریخ الخلفاء، ص ۱۷۸، ط نزار ...... اسی روایت میں یحییٰ غسانی بتاتے ہیں کہ اس ہدایت پر عمل کرنے سے موصل میں ایسا امن قائم ہوا کہ وہاں چوری اور نقب زنی کی وارداتیں پورے ملک میں سب سے کم شرح پر آگئیں۔

③ سیرت عمر بن عبدالعزیز لابن عبد الحکم، ص ۱۰۶ ...... یہ ویسا ہی جواب تھا جیسا کہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے شک کی بناء پر مسلم بن عقیل پر ہاتھ ڈالنے سے انکار کرکے کہا تھا: ''اللہ کی اطاعت کرکے کمزور اور بے بس کہلانا مجھے اللہ کی نافرمانی کرکے طاقتور کہلانے سے زیادہ پسند ہے۔'' (تاریخ الطبری: ٥/ ٣٤٨) مگر نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کے اس طرز عمل کو یزید نے ناپسند کیا اور انہیں معزول کرکے عبیداللہ بن زیاد کا تقرر کرتے ہوئے اسے یہ حکم دیا تھا: ''جن لوگوں پر شک ہو انہیں گرفتار کرلو۔ جس پر کوئی الزام ہو اسے پکڑلو۔'' (تاریخ الطبری: ٣٨١/٥ ؛ الاخبار الطوال: ٢٤٢/١)
تب سے بنوامیہ کے حکمرانوں میں پکڑ دھکڑ میں سختی اور ظلم وتشدد کا عنصر برابر پنپ رہا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس زیادتی کی روک تھام کو اپنا فرض سمجھا۔

④ تاریخ الخلفاء، ص ١٨١، ط نزار ⑤ طبقات ابن سعد: ٣٦٨/٥، ط صادر

''حضور اکرم ﷺ کے سوا کسی پر سب وشتم کرنے کی سزا موت نہیں ہوسکتی۔ تم اس شخص کو قید کرلو تا کہ مسلمان اس کے شر سے بچے رہیں۔ ہر مہینے اسے توبہ کی دعوت دو، مان جائے تو چھوڑ دینا۔''①

ظالم افسران کا محاسبہ اور مواخذہ:

آپ نے نہ صرف مظالم کے ازالے پر اکتفا کیا بلکہ گزشتہ ادوار کے ان تمام افسران کا کڑا احتساب کیا جن سے عوام تنگ آئے ہوئے تھے۔ حجاج بن یوسف کے خاندان ''بنوعقیل'' کو جس کے افسران سخت گیری میں مشہور تھے، عراق سے جلاوطن کر کے یمن بھیج دیا۔②

خالد بن ریان، خلیفہ ولید بن عبدالملک کا مشیرِ خاص اور سیکورٹی کا ذمہ دار تھا۔ پوری مملکت پر اس کا دبدبہ طاری رہتا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز نے اسے معزول کرتے ہوئے دعا کی: ''الٰہی! میں نے اسے گرایا ہے، تو اسے دوبارہ اوپر نہ آنے دے۔'' اس کے بعد رعب وہیبت کا یہ پیکر ایسا گم نام ہوا کہ کسی کو اس کے جینے مرنے کی بھی خبر نہ تھی۔③

سرکاری ہیبت کا خاتمہ:

آپ نے عوام پر چھائی سرکاری ہیبت دور کر کے حکام تک ان کی رسائی کو آسان بنایا۔ ہر صوبے کے حکام کو خطوط لکھے کہ عوام کو اپنے تک پہنچنے کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں دی جائیں۔ افسران کی شکایات پہنچانے یا حکومت کو اچھی تجاویز دینے کی حوصلہ افزائی کی۔ ہر سال حج کے موقع پر اعلان کیا جاتا کہ جو شخص کسی حاکم کے ظلم کی اطلاع یا کوئی اچھا مشورہ دے گا اسے ایک سو سے تین سو دینار تک انعام دیا جائے گا۔④

یوں آپ نے نچلی سطح پر شورائیت کا ماحول بنایا جس سے فضا میں موجود گھٹن اور حبس کم ہوا۔ لوگوں کو محسوس ہونے لگا کہ وہ غلام نہیں، حکومت کے کاروبار میں شریک ہیں۔

متوسط طبقے کے لوگوں پر اعتماد:

آپ متوسط طبقے کو بہت اہمیت دیا کرتے تھے۔ شہروں کے مرکزی حکام کا تقرر آپ خود فرماتے تھے اور انہیں حکم دیتے تھے کہ اپنے افسروں اور مشیروں کا انتخاب متوسط طبقے سے کریں۔ آپ فرماتے تھے:

''یہ بہترین لوگ ہیں۔ حق کا دامن نہیں چھوڑتے اور باطل کی طرف مائل نہیں ہوتے۔''⑤

ذمیوں اور موالی پر رحم:

گزشتہ خلفاء کے دور میں موالی اور ذمّی غیر منصفانہ سلوک کا نشانہ بنتے رہے تھے۔ موالی وہ لوگ تھے جو خود یا ان کے باپ دادا غلام یا جنگی قیدی بننے کے بعد آزاد ہوئے۔ پہلی صدی ہجری کے اواخر کے مسلم معاشرے میں ان کی

---

① سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم، ص ۱۴۶، ۱۴۷ ② سیرت عمر بن عبد العزیز لابن جوزی، ص ۱۰۹
③ سیرت عمر لابن عبد الحکم، ص ۳۰
④ سیرت عمر لابن عبد الحکم، ص ۱۲۱، ۱۲۲؛ سیرت عمر لابن جوزی، ص ۹۰
⑤ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم، ص ۱۴۶

تعداد لاکھوں میں تھی۔ موالی کی تین قسمیں تھیں:

1. جن کا عربوں سے عتاق کا تعلق تھا (یعنی وہ کسی عرب خاندان کے آزاد کردہ تھے۔) انہیں ''مولیٰ عتاقہ'' کہا جاتا تھا۔
2. جن کا عربوں سے موالاۃ (باہمی تعاون) کا معاہدہ تھا۔ انہیں ''مولیٰ موالاۃ'' کہا جاتا تھا۔
3. عام موالیجن کا کسی عرب خاندان سے ''موالاۃ'' یا ''عتاق'' کا تعلق نہ تھا اور وہ اپنی مدد آپ کے تحت گزارا کرتے تھے۔ جہاں ان کا بس جواب دے جاتا، وہاں وہ مکمل طور پر حکومت کے رحم وکرم پر ہوتے تھے۔

اسلام نے موالی کو امتیازی سلوک کا نشانہ نہیں بنایا تھا۔ حضرت بلالِ حبشی، حضرت زید بن الحارثہ، حضرت خباب بن الارت اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہم موالی ہونے کے باوجود صحابہ کی اعلیٰ صف میں شمار کیے گئے۔ مگر بنومروان نے موالی کے ساتھ امتیازی سلوک کیا۔ اگرچہ پہلی دو قسموں کے موالی نسبتاً بہتر حالت میں تھے، چنانچہ ان میں سے علم وفضل سے آراستہ افرادِ اُمت کے قائد اور امام بھی مانے گئے جیسا کہ مدینہ میں نافع مولیٰ عبداللہ بن عمر اور ربیعۃ الرأی اپنے دور کے امام تھے۔ مکہ میں مجاہد بن جبر، عطاء بن ابی رباح اور عکرمہ مولیٰ ابن عباس جیسے فقہاء کا طوطی بولتا تھا۔ بصرہ میں حسن البصری اور شام میں مکحول کا شہرہ تھا، رحمۃ اللہ علیہم۔ نیز بنواُمیہ کے بعض موالی اپنی شجاعت اور سپہ گری کے باعث اعلیٰ سرکاری عہدوں خصوصاً فوجی مناصب پر بھی فائز ہوئے جیسا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مولیٰ نُصیر، ان کے صاحبزادے موسیٰ بن نُصیر اور موسیٰ کے مولیٰ طارق بن زیاد۔ بنوامیہ کی حکومت کے قیام اور استحکام میں ان موالی کا بڑا کردار تھا۔

مگر بنومروان نے عام موالی کو نہ صرف نظر انداز کر دیا بلکہ انہیں عام مسلمانوں سے کم تر حیثیت دی۔ خصوصاً عراق میں یہ تعصب زیادہ تھا۔ وہاں نہ تو موالی کو امامتِ صلوٰۃ کے لیے مقرر کیا جاتا تھا نہ ہی عہدۂ قضا کے قابل سمجھا جاتا تھا۔[1] حجاج بن یوسف کو موالی ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ ایک بار اس نے موالی کے متعلق خطبۂ جمعہ میں کہا:

> ''یہ لوگ اس قابل ہیں کہ انہیں خوب مارا جائے اور اچھی طرح کاٹا جائے۔ اللہ کی قسم! اگر میں لاٹھی کا اشارہ کردوں تو ان کا نام ونشان تک مٹا دیا جائے۔''[2]

اسلام لانے کے باوجود انہیں وہ عطیات اور وظائف نہیں دیے جاتے تھے جو دیگر مسلمانوں کو ملا کرتے تھے۔ الٹا ان پر یہ کہہ کر جزیہ لاگو رکھا جاتا تھا کہ یہ لوگ محض جزیے سے بچنے کے لیے اسلام لائے ہیں[3] حالانکہ اسلام ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کے ایمان پر شک کیا جائے اور نومسلموں پر جزیہ برقرار رکھا جائے۔ درحقیقت بنومروان کے اس فعلِ بد کی وجہ یہ تھی کہ غیر مسلموں کے مشرف بااسلام ہونے سے انہیں بیت المال کی اس آمدن کے گھٹ جانے کا اندیشہ تھا جس کا خطیر حصہ ان کے ذاتی مصارف پر خرچ ہو رہا تھا۔

---

1. تاریخ الاسلام للذھبی: ۳۶۷/۶، ت تدمری؛ البدایۃ والنہایۃ: ۴۶۴/۱۲
2. عن الأعمش قال سمعت الحجاج یقول علی المنبر: هذه الحمراء هبر هبر اما واللّٰہ لو قد قرعت عصا بعصا لأذرنهم كالأمس الذاهب یعنی الموالی. (سنن ابی داؤد، ح: ۴۶۴۴، کتاب السنة، باب الخلفاء. اسناده صحیح)
3. فتوح مصر والمغرب، ص ۱۸۲

چنانچہ جب حجاج بن یوسف کو اس کے نائبین نے لکھا کہ دیہی علاقوں کے ذِمّی بہت بڑی تعداد میں مسلمان ہو کر کوفہ اور بصرہ میں آباد ہوتے جا رہے ہیں اور اس کے باعث خراج اور جزیہ کی آمدن کم ہوتی جا رہی ہے تو حجاج بن یوسف نے حکم جاری کیا کہ ان لوگوں کو شہروں سے نکال کر ان پر دوبارہ جزیہ عائد کر دیا جائے۔ اس حکم کے مطابق جب انہیں بصرہ اور کوفہ سے نکالا جانے لگا تو وہ روتے جاتے تھے۔ انہیں سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کہاں جائیں اور کسے اپنی فریاد سنائیں۔ ان کی حالت دیکھ کر مقامی علماء بھی لرز گئے اور ان کے جبری اخراج کے وقت وہ بھی اشک بار تھے۔[1]

یہی وجہ تھی کہ جب عبدالرحمٰن بن اشعث نے حجاج کے خلاف خروج کیا تو اسی قسم کی زیادتیوں کے باعث یہ موالی پورے جوش کے ساتھ اس خروج میں میں شریک رہے۔[2] اس قسم کے حادثات سے دوچار ہونے کے بعد بنو مروان کی روش میں کوئی فرق نہ آیا اور موالی سے بے انصافی باقی رہی۔

موالی کے بارے میں حکام کو تاکیدی مراسلہ:

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے برسرِ اقتدار آ کر اس خلافِ اسلام امتیاز کو ختم کیا۔ موالی اور نو مسلموں کو وہ تمام حقوق مہیا کیے جو عام مسلمانوں کو حاصل تھے۔ انہوں نے اپنے حکام کو لکھا:

> ''جو نصرانی، یہودی اور مجوسی آج جزیہ ادا کرتے ہیں، ان میں سے جو بھی اسلام لے آئے، وہ مسلمانوں میں گھل مل کر رہے، اس کے وہی حقوق ہوں گے جو مسلمانوں کے حقوق ہیں، اس پر وہی ذمہ داریاں عائد ہوں گی جو مسلمانوں پر عائد ہیں۔ مسلمانوں پر لازم ہوگا کہ اس سے گھل مل کر رہیں۔''[3]

آپ نے اپنے حکام کو یہ بھی ہدایت کی: ''ذِمّیوں میں سے جو اسلام لے آئے، اس سے جزیہ نہ لو۔''[4]

مصر میں ابن خذامر رحمہ اللہ (عبداللہ بن یزید) بہت بڑے عالم تھے جو نسلاً موالی تھے۔ سلیمان بن عبدالملک کے دور میں وہ ایک بار مصری وفد کے ساتھ دربارِ دمشق میں آئے تھے۔ وفد کے باقی لوگوں نے سلیمان کی ہر بات کا جواب دیا مگر ابن خذامر اس دوران بالکل خاموش رہے۔ جب باہر نکلے تو عمر بن عبدالعزیز نے ان سے پوچھا:

> ''آپ کیوں خاموش تھے؟'' انہوں نے فرمایا: ''جھوٹ بولنے پر اللہ کا خوف تھا۔''

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ان کی یہ صفت یاد رکھی۔ جب خلیفہ بنے تو مصر کے بڑے بڑے عرب علماء کو چھوڑ کر انہی کو وہاں کا قاضی القضاۃ مقرر کیا۔[5] حضرت حسن بصری رحمہ اللہ بھی موالی تھے اور ولید کے دور میں حجاج کے خوف سے بارہ سال تک روپوش رہے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے انہیں بصرہ کا قاضی مقرر کیا۔[6]

---

① تاريخ الطبري: ٦/٣٨١؛ الكامل في التاريخ: ٣/٤٩١: سنة سن ٨١
② تاريخ الطبري: ٦/٣٨١؛ الكامل في التاريخ: ٣/٤٩١: سنة سن ٨١
③ سيرت عمر بن عبد العزيز لابن عبد الحكم، ص ٨٤
④ المواعظ والآثار بذكر الخطط والآثار (الخطط المقريزي) ١/١٤٧
⑤ کتاب الولاۃ والقضاۃ للکندی، ص ٢٤٥
⑥ المعرفة والتاريخ: ٢/٤٩

حکومت کے اہداف کی بلندی

آل مروان کے گزشتہ حکمرانوں نے سرحدوں کی حفاظت، فتوحات، دشمنوں کی سرکوبی، ظاہری شان وشوکت کے اظہار اور محصولات وآمدن کی کثرت ہی کو حکمرانی کے بڑے مقاصد سمجھ رکھا تھا۔ عوام کی دنیاوی بہتری اور حقوق کی حفاظت تو ایک درجے میں ان کے پیشِ نظر تھی مگر لوگوں کی آخرت کی انہیں کوئی فکر تھی نہ ان کی ہدایت یا گمراہی سے کوئی خاص واسطہ۔ ان کاموں کو وہ علماء ومشائخ کی ذمہ داری سمجھتے تھے۔

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس ذہنیت کو تبدیل کیا۔ انہوں نے یہ حقیقت تسلیم کرائی کہ حکومت کا مقصد بندوں کو دین ودنیا دونوں میدانوں میں کامیاب کرانا ہے۔ اور اگر دین ودنیا میں تعارض ہو جائے تو دین کو ترجیح دی جائے گی۔ چنانچہ اپنے دورِ خلافت میں انہوں نے حکومت کے استحکام وثروت اور دیگر منافع پر دینی اغراض کو ترجیح دی۔ دینی فائدے کے مقابلے میں مالی نقصان کی کبھی پروا نہ کی۔

ہم ہل چلا کر اپنا پیٹ بھریں:

ان کی سیرت وکردار اور ان کے نائبین کے اخلاق سے متاثر ہو کر غیر مسلم شہری (ذمی) بڑی تعداد میں مسلمان ہونے لگے تھے۔ ان پر عائد شرعی ٹیکس ''جزیہ'' حکومت کی آمدن کا بہت بڑا ذریعہ تھا۔ ذمیوں کی تعداد کم ہونے سے جزیے کی شرح بھی تیزی سے گھٹنے لگی جس پر بعض صوبوں کے گورنروں کو تشویش تھی مگر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اس پر خوش تھے۔ ایک حاکم نے سرکاری خزانہ خالی ہونے کا اندیشہ ظاہر کیا تو آپ نے جواب دیا:

> ''مجھے بڑی خوشی ہوگی کہ سب غیر مسلم مسلمان ہو جائیں اور (جزیہ کی رقم بند ہو جانے کی وجہ سے) ہم اور تم کھیتوں میں ہل چلا کر اپنا پیٹ بھریں۔''[1]

حضور ﷺ ہادی تھے نہ کہ ٹیکس وصول کرنے والے:

یمن کے غیر مسلموں سے خراج کی ایک مقدار طے چلی آرہی تھی چاہے فصل زیادہ ہوتی یا کم۔ آپ کو معلوم ہوا تو اس سے منع کر کے حکم دیا کہ فصل کے لحاظ سے خراج عائد کیا جائے۔ اگر پورے یمن سے ایک مٹھی اناج وصول ہو تو میں اس پر راضی ہوں۔[2] آپ کا کہنا تھا: ''حضرت محمد ﷺ ہادی ورہنما بنا کر بھیجے گئے تھے نہ کہ ٹیکس وصول کرنے والے۔''[3]

ٹیکس اٹھا دیے گئے:

آپ نے شرعی محاصل کے سوا گزشتہ دور میں رائج ٹیکسوں کی تمام اقسام موقوف کر دیں، بری اور بحری تجارت کو آزاد کر دیا، کسٹم ڈیوٹی معاف کر دی اور ہر طرح کی پابندیاں اٹھا دیں۔[4]

---

① سیرت عمر بن عبد العزیز لابن جوزی، ص ۱۱۹، ۱۲۰؛ حلیۃ الاولیاء: ۵/۳۰۵ط السعادۃ

② سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم، ص ۱۰۸ ③ کتاب الخراج لامام ابو یوسف، ص ۱۴۴، ط المکتبۃ الازھریۃ

④ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم، ص ۸۳، ۱۴۱؛ عمر بن عبدالعزیز معالم التجدید والاصلاح للصلابی، ص ۲۷۰، ۲۸۰

چنگی خانے ختم:

گزشتہ خلفاء کے دور میں شاہراہوں پر چنگی خانے قائم تھے، گزرنے والے تجارتی قافلوں سے ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے تمام چنگی خانے ختم کر دیے۔ فلسطین کے ساحل پر بحری تجارت سے ٹیکس وصول کرنے والا ایک بڑا چنگی خانہ تھا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے فلسطین کے حاکم کو حکم دیا کہ اپنے ہاں کے چنگی خانے کو مسمار کر دو اور اس کی باقیات سمندر میں غرق کر دو۔ ①

افسران کا تہواروں پر تحفے وصول کرنا ممنوع:

گزشتہ دور کے حکام ذمیوں کے تہواروں پر ان سے تحائف وصول کرتے، افسران جب ان کے علاقوں میں جاتے تو سفری اخراجات بھی ان سے لیتے اور ان کی ضیافتیں کھاتے۔ کاشتکاروں کی آمدن پر کٹوتیاں بھی لاگو تھیں۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے یہ تمام سلسلے موقوف کر دیے۔ ②

حکمران خاندان کے تجارت میں حصہ لینے پر پابندی:

حکمران خاندان کے بہت سے لوگ تجارت میں سرمایہ لگا کر مارکیٹ پر حاوی ہو رہے تھے۔ بظاہر یہ کوئی ناجائز کام نہ تھا مگر آپ نے اس پر پابندی عائد کر دی؛ ③ کیوں کہ تجارت میں شامل ہونے کے بعد حکام کی توجہ عوامی فائدے کی جگہ اپنے مالی فائدے پر مرکوز ہو جاتی ہے جس سے پورا معاشرہ ابتری کا شکار ہو سکتا ہے۔

حیوانات کے حقوق کی تاکید:

حیوانات تک کے حقوق آپ کی نگاہ میں تھے، بعض علاقوں میں اونٹوں پر ایک ہزار رطل تک بوجھ لادا جاتا تھا۔ آپ نے حکم دیا کہ ایک اونٹ پر چھ سو رطل سے زیادہ وزن نہ لادا جائے۔ جانوروں کو سخت لگامیں ڈالنے اور انہیں لوہے سے پیٹنے کا رواج بھی عام تھا۔ آپ نے اسے ممنوع قرار دے دیا۔ ④

❖❖❖

خلیفہ کی سادہ اور زاہدانہ زندگی

خلافت کے بعد ذاتی زندگی میں آپ نے اس قدر زہد و قناعت اور سادگی اختیار کی جس کی مثال دوسرے حکمرانوں میں تو کجا، فقیروں اور درویشوں کے ہاں ملنا بھی مشکل ہے۔ پہلے آپ عرب کے خوشحال ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے مگر خلیفہ بننے کے بعد آپ آرام و آسائش کا نام تک بھول گئے تھے۔ سرکاری خزانے سے آپ کی ذاتی آمدن بس اتنی تھی کہ بمشکل گھر میں دو وقت کی روٹی پکتی۔ اور کبھی اس کی بھی نوبت نہ آتی۔

① طبقات ابن سعد: ٥/ ٣٩٢؛ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن جوزی، ص ١١٣
② سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم، ص ١٤١
③ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم، ص ٨٧ ④ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ١٤١

گھر میں پیاز کے سوا کچھ نہ تھا:

ایک دن آپ گھر تشریف لائے تو آپ کی بچیاں منہ پر ہاتھ رکھ کر آپ سے بات کرنے لگیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آج گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔ سب نے کچے پیاز کھا کر گزارا کیا ہے۔ آپ نے یہ دیکھ کر روتے ہوئے فرمایا:

''میری بیٹیو! کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ تم اچھے اچھے کھانے کھایا کرو مگر تمہارا باپ جہنم میں جائے۔''

آپ کے اپنے کھانے کا معمول بہت سادہ تھا گھر والے جو میسر ہوتا، پکا کر ایک برتن میں ڈھانک کر رکھ دیتے۔ آپ کو اپنے کاموں سے فراغت کے لیے درمیان میں کچھ وقت ملتا تو آ کر نوش فرما لیتے۔ ①

حج کا شوق اور تنگ دستی:

حج اور زیارتِ مدینہ کا بے حد شوق تھا مگر دنیا کی سب سے بڑی مملکت کے حکمران بننے کے بعد ملکیت میں اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ سفرِ حج کے اخراجات پورے ہوتے۔ ایک بار حج کے ایام آئے تو خادم مزاحم سے پوچھنے لگے:

''تمہارے پاس کچھ ہے؟'' وہ بولا: ''دس بارہ دینار ہیں۔'' آپ نے فرمایا: ''بھلا اس سے کیا ہوگا''

بعد میں کسی حلال ذریعے سے کوئی بڑی رقم آ گئی۔ مزاحم نے مبارک باد دیتے ہوئے یاد دلایا کہ اب حج کے سفر کا خرچہ پورا ہو جائے گا۔ مگر آپ نے وہ رقم سرکاری خزانے میں جمع کرا دی اور فرمایا:

''ہم اس مال سے بہت مدت تک فائدہ اٹھا چکے۔ اب اس پر مسلمانوں کا حق ہے۔'' ②

جاؤ تم آزاد ہو:

کسی کو اس تنگ دستی میں اپنا ساتھ دینے پر مجبور نہ کرتے تھے۔ آپ کے پاس اپنی ضروریات کے لیے ایک غلام اور ایک گھوڑا رہ گیا تھا۔ ایک دن غلام سے حال احوال پوچھا تو وہ بولا:

''دنیا میں سبھی مزے میں ہیں، سوائے میرے، آپ کے اور اس گھوڑے کے۔'' فرمایا: ''جاؤ۔ تم آزاد ہو۔'' ③

لباس میں سادگی:

لباس میں اس قدر سادگی تھی کہ جو مل جاتا پہن لیتے۔ آپ کے ایک رفیق کا کہنا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز جب شہزادے تھے تو مجھے اپنے لباس کے لیے کپڑا خرید کر لانے کا کہا۔ میں آٹھ سو درہم کا بہترین کپڑا خرید لایا جب انہیں سلوا کر پیش کیا گیا تو اس پر ہاتھ پھیر کر بولے: ''یہ کتنا کھردرا اور سخت ہے!'' خلیفہ بننے کے بعد ایک بار کپڑا منگوایا تو آٹھ درہم کا کپڑا پیش کیا گیا۔ اسے دیکھ کر بولے: ''کتنا نرم اور ملائم ہے۔'' ④

جمعہ کی نماز کے لیے بھی معمولی لباس ہوتا جس میں پیوند لگے ہوتے تھے۔ لوگ توجہ دلاتے کہ نیا لباس زیب تن فرمائیں مگر آپ اسے پسند نہ فرماتے۔ ⑤

---

① سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۵۴، ۴۳ ② سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۵۹
③ ایضاً ص ۴۷ ④ ایضاً، ص ۴۸، طبقات ابن سعد: ۳۳۴/۵ ⑤ الطبقات الکبریٰ لابن سعد: ۴۰۲/۵

ایک جوڑے میں گزارا:

آخر میں آپ کے پاس بس ایک ہی جوڑا رہ گیا تھا۔ ہر جمعے کو اسے دھو کر دوبارہ پہن لیتے تھے۔ بعض اوقات لباس سوکھنے میں دیر ہو جانے کی وجہ سے نمازِ جمعہ کے لیے نکلنے میں بھی تاخیر ہو جاتی۔ [1]

اپنے کام اپنے ہاتھ سے:

چھوٹے چھوٹے کام بلا تکلف خود ہی کر لیتے تھے۔ ایک رات آپ کام کر رہے تھے کہ چراغ گل ہو گیا۔ آپ اٹھے اور اسے دوبارہ جلانے لگے۔ کسی نے کہا: ''آپ نے کیوں زحمت کی، ہم کر دیتے۔''

آپ نے بے ساختہ فرمایا: ''جب میں اٹھا تھا تب بھی عمر بن عبدالعزیز تھا۔ جب بیٹھا ہوں تب بھی وہی ہوں۔'' [2]

سرکاری اخراجات میں احتیاط:

احتیاط کا یہ عالم تھا کہ بیت المال کی رقم سے خریدی گئی شمع صرف سرکاری کاموں ہی کے وقت جلائی جاتی۔ اگر کبھی سرکاری گفتگو کے دوران کوئی شخص ذاتی موضوعات پر بات کرنے لگتا تو آپ سرکاری شمع گل کر کے فوراً ذاتی شمع جلاتے، پھر اس سے بات چیت کرتے۔ [3] سرکاری مد میں آیا ہوا مشک تولتے تو اپنی ناک بند کر لیتے کہ کہیں اس کے ناجائز استعمال میں ملوث نہ ہو جاؤں۔ ہاتھ پر لگے ہوئے مشک کو بھی اچھی طرح دھو لیتے۔ کسی نے اس قدر احتیاط پر حیرت کا اظہار کیا تو فرمایا: ''مشک کا فائدہ اس کے سوا بھلا اور کیا ہے کہ اس کی خوشبو سونگھی جائے۔'' [4]

بیت المال کے چولہے پر اپنے لیے پانی گرم کرنے سے اجتناب:

بیت المال کے چولہے پر گرم کیے پانی کے استعمال سے بھی اجتناب کرتے کہ کہیں بدعنوانی میں ملوث نہ ہو جاؤں۔ آپ کا غلام کئی دنوں تک بیت المال کے باورچی خانے سے وضو کا پانی گرم کر کے لاتا رہا۔ آپ کو معلوم ہوا تو مزاحم سے کہا: ''اتنی مقدار پانی گرم کر کے دیکھو کہ کتنا ایندھن خرچ ہوتا ہے۔ پھر اندازہ لگاؤ کہ ان تمام دنوں میں کتنا ایندھن خرچ ہوا ہوگا۔ اتنا ایندھن خرید کے بیت المال میں جمع کرا دو۔'' [5]

ایک بار سخت سردی میں آپ کو غسل کی ضرورت پیش آئی۔ گھر میں گرم پانی کا انتظام نہ تھا۔ آپ ٹھنڈے پانی سے نہانے کی تیاری کرنے لگے۔ تب آپ کو قسم دے کر کہا گیا کہ اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالیں۔ بیت المال کے باورچی خانے سے آپ کے لیے گرم پانی منگوا لیتے ہیں، آپ اس کی قیمت سرکاری خزانے میں جمع کرا دیجیے گا۔ آپ نے مشورہ مان لیا۔ غسل کے بعد پانی گرم کرنے کی قیمت بیت المال میں داخل فرما دی۔ [6]

---

① سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ٤٨
② سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ١٣٧
③ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ٤٤
④ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ٤٥
⑤ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ٤٥
⑥ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ٤٥، ٤٦

سرکاری سواری ذاتی کام کے لیے استعمال کرنے سے احتراز:

اسی احتیاط کی وجہ سے آپ سرکاری سواری کو کسی ذاتی کام کے لیے استعمال نہ ہونے دیتے۔ آپ کو شہد کے ساتھ روٹی کھانا پسند تھا۔ ایک بار گھر میں شہد ختم ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں ڈاک کے خچر سرکاری کاموں کے لیے مختلف شہروں کے درمیان مسلسل رواں دواں رہتے تھے۔ اہلیہ نے غلام کو بھیج کر دوسرے شہر سے شہد منگوا لیا جو ڈاک کے خچروں پر آیا، آپ کو معلوم ہوا تو فرمایا: ''کیا مسلمانوں کے جانور عمر کی خواہش پوری کرنے کے لیے تھکائے جائیں گے۔'' وہ شہد فروخت کرا کے قیمت سرکاری خزانے کو دے دی۔[1]

ایک بار اردن کے حاکم نے آپ کو کھجوروں کی دو ٹوکریاں بھیجیں۔ آپ کو معلوم ہوا کہ یہ تحفہ سرکاری ڈاک کے جانوروں پر لدا ہوا پہنچا ہے۔ آپ نے کہا: ''مسلمانوں کی ڈاک کے جانوروں پر میرا کوئی حق نہ تھا۔'' یہ کہہ کر حکم دیا کہ یہ ٹوکریاں فروخت کر کے قیمت بیت المال میں جمع کر دی جائے۔[2]

دوسروں کو زہد و قناعت کا سبق:

سادگی اور احتیاط اپنے تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ دوسروں کو بھی بڑے مناسب پیرائے میں اس کی تلقین فرماتے رہتے۔ بنو مروان جو پہلے سرکاری خزانے سے بے تحاشا خرچ کرتے تھے، اب اپنا حصہ بالکل نپا تلا پانے لگے تھے اور اس بناء پر وہ سخت ناراض تھے۔[3] انہی میں عمر بن عبدالعزیز کا سالا مَسلَمَہ بن عبدالملک بھی تھا جو بنو مروان کا نہایت دلیر سپہ سالار تھا، تاہم کھانے پینے میں بڑا فضول خرچ تھا۔ عمر بن عبدالعزیز نے اس کی اصلاح کرنے کے لیے ایک دن اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی۔ وہ آیا تو آپ نے جان بوجھ کر کھانا بہت دیر سے منگوایا۔ تب تک بھوک سے مَسلَمَہ کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ کھانا صرف دال روٹی پر مشتمل تھا۔ مَسلَمَہ نے تیز بھوک کی وجہ سے خوب رغبت سے کھایا۔ جب وہ سیر ہو گیا تو آپ نے خصوصی لذیذ کھانے منگوائے۔ مَسلَمَہ نے انہیں دیکھ کر کہا:

''اب تو ایک لقمے کی گنجائش بھی نہیں۔''

آپ نے فرمایا: ''جب پیٹ اس طرح بھی بھر سکتا ہے تو پھر کھانے میں ایسے تکلفات کر کے جہنم میں جانے کی کیا ضرورت۔'' مَسلَمَہ کو بات سمجھ آ گئی اور اس نے اپنی اصلاح کر لی۔[4]

آپ سرکاری کاغذ کے استعمال تک میں احتیاط کا مشورہ دیتے۔ نائبین اور کاتبوں کو ہدایت دیتے:

''قلم کی نوک باریک رکھو۔ ملا ملا کر لکھو۔ ایک پرچے میں بہت سی باتیں لکھ دو۔ مسلمانوں کو ایسے لمبے چوڑے خرچوں کی ضرورت نہیں جن سے سرکاری خزانے پر بوجھ پڑتا ہو۔''[5]

---

① اخبار ابی حفص، ص ٥٤ ② سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ٥٢

③ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ٦٠

④ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ٤٩

⑤ تاریخ الطبری: ٥٧١/٦ ؛ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم، ص ٦١

تاہم آپ سرکاری ملازمین کے لیے تنخواہوں کا معقول بندوبست کرتے تھے تاکہ وہ کسی ناجائز ذریعۂ آمدن میں ملوث نہ ہوں۔ آپ نے اعلیٰ افسران کی تنخواہ تین سو دینار مقرر کی ہوئی تھی۔ کسی نے حیرت سے پوچھا کہ ان کی تنخواہیں اتنی زیادہ اور آپ کی اتنی کم کیوں ہے؟ تو آپ نے اپنا بازو کھول کر کہا: ''یہ گوشت مسلمانوں کے سرکاری مال سے ہی پلتا رہا۔ اب میں اس پر مسلمانوں کا مال دوبارہ خرچ نہیں کرنا چاہتا۔''[1]

آپ کی دفتری زندگی کا ایک منظر:

آپ کا زیادہ تر وقت اپنے دفتر میں مختلف شہروں سے آنے والی درخواستوں کو پڑھنے، ان پر کارروائی کرنے اور فریادیوں سے ملنے میں گزرتا۔ مدینہ منورہ کے ایک غلام ابن زیاد کا بیان ہے:

''مجھے میرے آقا نے کچھ ضروریات کے لیے ان کی خدمت میں دِمشق بھیجا۔ میں ان کی مجلس میں پہنچا تو دروازے پر کھڑے ہو کر ''السلام علیکم'' کہا۔ عمر بصرہ سے آئی ہوئی درخواستیں سن رہے تھے اور ٹھنڈی آہیں بھر رہے تھے۔ ایک کاتب ان کے جوابی احکام لکھتا جا رہا تھا۔ عمر ''وعلیکم السلام'' کہہ کر اپنے کام میں مشغول رہے۔ میں نے قریب جا کر دوبارہ ''السلام علیکم'' کہا۔ وہ بولے: ''ہم نے پہلی بار ہی پہچان لیا تھا۔ دوبارہ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ تم دروازے کے پاس بیٹھو۔'' عمر رحمہ اللہ اپنے کام سے فارغ ہوئے تو سب کو باہر جانے کا کہا، یہاں تک کہ خادم بھی باہر چلا گیا۔ اب وہ خود چل کر میرے پاس آئے اور اہلِ مدینہ کے مردوں، خواتین اور دیگر لوگوں میں سے ایک ایک کا حال پوچھتے رہے۔ پھر مدینہ میں اپنی طرف سے بھیجے گئے کچھ احکامات کے بارے میں پوچھا کہ ان کا نفاذ ہوا کہ نہیں۔

آخر میں کہا: ''تم دیکھ رہے ہو ناں میں کتنی بڑی مشقت میں پڑ گیا ہوں۔''

یہ کہہ کر اتنا روئے کہ مجھے ان کے رونے پر رحم آنے لگا۔ میں نے کہا:

''آپ کے نیک کاموں کی وجہ سے مجھے آپ کے لیے خیر ہی کی توقع ہے۔''

وہ بولے: ''نہیں نہیں میں ایسا کہاں! میں ایسا کہاں!'' یہ کہہ کر پھر زاروقطار رونے لگے۔

میں ان کے پاس کچھ دنوں تک قیام پذیر رہا۔ انہوں نے میرے آقا کی ضروریات پوری کر دیں۔ پھر اسے خط لکھا کہ یہ غلام مجھے فروخت کر دو۔ ساتھ ہی اپنے قالین کے نیچے سے بیس دینار نکال کر مجھے دیے کہ ان سے مدد لو۔ میں نے انکار کیا تو بولے: ''لے لو۔ یہ میری اپنی تنخواہ میں سے ہیں۔'' وہ اصرار کرتے رہے۔ آخر مجھے لینا ہی پڑے۔ میں نے ان کا خط آقا کو دیا (آقا نے تاڑ لیا کہ عمر اس غلام کو خرید کر آزاد کرنا چاہتے ہیں۔) فروخت کرنے کی بجائے آقا نے مجھے آزاد کر دیا۔''[2]

---

[1] سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ٤٤، ٤٥

[2] اخبار ابی حفص، ص ٦٨، ٦٩

ایوانِ اقتدار میں نظریاتی اور عملی اصلاح کی کوششیں

رائج شدہ سیاسی نظام کو توڑنا آپ کے بس سے باہر تھا۔ مگر آپ نے ان حالات میں اپنے محدود اختیارات کو ممکنہ حد تک بہترین طور پر استعمال کر کے بعد والوں کو یہ سبق دیا کہ اگر اخلاصِ نیت، سوزِ جگر، ایثار و قربانی، اور ہمت و جرأت سے کام لیا جائے اور حکمتِ عملی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے تو انسان کسی بھی ماحول میں رہتے ہوئے اور کسی بھی درجے کے اختیارات کا حامل ہوتے ہوئے غیر معمولی کارنامے انجام دے سکتا ہے۔ آپ نے ایوانِ اقتدار کے اندر سے نیک سیرت حکام کی ایک نئی کھیپ پیدا کرنے کی ان تھک کوشش کی۔ آپ کی گفتگو، خطبات اور مراسلوں سے ماتحتوں کی اخلاقی و نظریاتی تربیت کی یہ سعیِ مسلسل خوب عیاں ہوتی ہے۔ آپ اپنے مراسلوں میں نائبین کو تقویٰ اور اتباعِ شریعت کی تلقین کرتے۔ انہیں اپنے اپنے علاقے میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کی طرف متوجہ کرتے اور بتاتے کہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت کا اصل مقصد یہی تھا جو آپ ﷺ کی نیابت میں یہ ذمہ داری اب ہم پر عائد ہو چکی ہے۔[1]

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید:

آپ گورنروں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے) کی تلقین کرتے اور بتاتے کہ اس فریضے کی اہمیت کیا ہے اور اس کے رک جانے سے کیا کیا وبال آیا کرتے ہیں۔[2] فوجی افسران کو نمازیں بروقت ادا کرنے کی تلقین کرتے۔ انہیں علم دین سیکھنے اور سکھانے کی ترغیب دیتے۔[3] حکام کو شرعی سزاؤں کی حقیقت اور مقاصد سے آگاہ کرتے اور تعزیرات میں احتیاط اور اعتدال سے کام لینے کی تاکید کرتے۔[4]

معاصی کی روک تھام کی کوششیں:

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مملکت میں پیدا شدہ اخلاقی خرابیوں کی طرف بھی متوجہ رہتے۔ عمال کو خواتین کی نوحہ گری اور جنازوں میں شرکت کو روکنے اور پردے کا اہتمام کرانے کی تلقین فرماتے۔[5]

نبیذ جیسے مشروبات کے استعمال میں عوام کی بے احتیاطی بھی آپ سے پوشیدہ نہیں تھی۔ بعض لوگ نشہ آور نبیذ پینے لگے تھے اور بعض ایک قدم آگے بڑھ کر مے نوشی تک پہنچ گئے تھے۔ آپ جائز اور ناجائز مشروبات کی وضاحت کرتے اور مے نوشی کی روک تھام کا حکم دیتے تھے۔[6]

مشاجرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور فرقہ بندی:

پہلی صدی ہجری کے وسط میں صحابہ کے مشاجرات کے بارے میں طرح طرح کی آراء قائم ہو چکی تھیں۔ ان آراء

---

① سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۸۲، ۸۳ ② سیرت عمر بن عبد العزیز لابن جوزی، ص ۱۱۲، ۱۴۳

③ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۷۲، ۷۳ ؛ سیرت عمر بن عبد العزیز، لابن جوزی، ص ۱۲۲

④ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن جوزی، ص ۱۲۱، ۱۲۳ ⑤ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۹۳، ۹۴

⑥ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن جوزی، ص ۱۲۲

سے پیدا ہونے والا اختلافِ رائے اُمت کو متعدد فرقوں میں تقسیم کر چکا تھا۔ ایک طبقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب بیان کرتے ہوئے حضرت طلحہ، زبیر اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کو برا بھلا کہتا تھا۔ دوسری طرف بنواُمیہ کے بہت سے لوگوں کی نگاہ میں کسی بھی اُموی حکمران کی مخالفت کرنے والا شخص غاصب اور بے راہ رو تھا چاہے وہ کوئی صحابی ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ایسے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو اسی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کے بارے میں باطل روایات بھی پھیلاتے رہتے تھے۔

محدثین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں رائے درست کر دی:

عمر بن عبدالعزیز بھی ایک مدت تک اپنے خاندان کی اسی سوچ سے متاثر رہے تھے مگر خوش قسمتی سے انہیں مدینہ منورہ کا علمی ماحول ملا جو شام اور عراق کے تعصب سے پاک تھا اور جہاں سنتِ نبویہ کی مہک ہر جھونکے میں رچی بسی تھی۔ چنانچہ مدینہ میں انہیں ایسے مشائخِ حدیث میسر آئے جنہوں نے ان کی سنتِ مطہرہ کے عین مطابق علمی و نظریاتی تربیت کی۔ ان میں عبیداللہ بن عبداللہ بھی تھے۔ انہیں معلوم ہوا کہ عمر بن عبدالعزیز بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عیب جوئی کرتے ہیں۔ انہوں نے ایک دن عمر بن عبدالعزیز کو کہا:

''تمہیں کب معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اہلِ بدر سے راضی ہونے کے بعد دوبارہ ان سے ناراض ہوا تھا؟''

عمر استاذ کا اشارہ سمجھ گئے۔ بولے: ''میں اللہ کے سامنے توبہ کرتا ہوں اور آپ سے بھی معذرت کرتا ہوں۔ اللہ کی قسم! میں دوبارہ ایسا نہیں کروں گا۔'' اس کے بعد وہ ہمیشہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکرِ خیر کے ساتھ ہی کیا کرتے تھے۔[1]

انہی محدثین نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی ان کی رائے مثبت کر دی۔ ہوا یہ کہ ایک بار عمر بن عبدالعزیز نے ابن ابی ملیکہ سے کہا: ''میرے دل میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے کچھ کراہت ہے۔'' ابن ابی ملیکہ نے فوراً فرمایا: ''اگر آپ انہیں دیکھ لیتے تو کہتے کہ نہ ان جیسا دعا کرنے والا کوئی ہے نہ ان کی طرح نماز ادا کرنے والا۔''[2]

اپنی زبانوں کو صحابہ کے خلاف آلودہ نہ کریں:

یوں اہلِ علم کی صحبت و تربیت کی بدولت عمر بن عبدالعزیز کا نظریہ معتدل اور درست ہو گیا۔ پھر جب وہ خلیفہ بنے تو لوگوں میں پھیلنے والے ان غلط عقائد و نظریات کی اصلاح پر خاص توجہ دی اور سنت سے منحرف شدہ ہر نئی چیز کو درست کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ یہ بھی جان گئے کہ مشاجراتِ صحابہ کے متعلق معاشرے میں پھیلی ہوئی روایات کو جانچنا آسان کام نہیں، اس لیے قلب کو محفوظ رکھنے کا عمومی نسخہ یہی ہے کہ اس موضوع کو نہ چھیڑا جائے۔

---

① تاریخ دمشق: ٤٥/١٣٦؛ سیر اعلام النبلاء: ٥/١١٧؛ البدایة والنهایة: ١٢/٦٧٨، ٦٧٩
یہ عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود الہذلی المدنی تھے، مدینہ کے فقہائے سبعہ میں شمار ہوتے تھے، ۱۰۵ھ میں فوت ہوئے، صحاح ستہ میں ان کی روایات موجود ہیں۔ (سیر اعلام النبلاء: ٤/٤٧٣، ٤٧٤)

② حلیة الاولیاء: ١/٣٣٥...... یہ عبداللہ بن عبیداللہ ابن ابی ملیکہ فقہائے مکہ میں شمار ہوتے تھے۔ صحاح ستہ میں ان کی روایات ہیں۔ ۱۱۷ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ (سیر اعلام النبلاء: ٥/٨٩، ٩٠)

چنانچہ ایک بار جب ان سے مشاجرات کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:

''یہ وہ خون ہیں جن سے اللہ نے ہمارے ہاتھوں کو بچایا۔ بھلا ہم اپنی زبانوں کو ان سے محفوظ کیوں نہ رکھیں۔''[1]

صحابہ کی مثال آنکھوں جیسی ہے:

آپ مشاجرات کے حوالے سے صحابہ کرام کے بارے میں فرماتے تھے: ''صحابہ کرام کی مثال آنکھوں کی سی ہے۔ آنکھیں دکھنے لگیں تو ان کا علاج یہ ہے کہ انہیں ہاتھ نہ لگایا جائے۔''[2]

خطبوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تنقید کی بندش:

بنومروان کے بعض حکام نمازِ جمعہ کے خطبے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تنقید کرتے تھے جس سے دین دار لوگوں کو بہت دکھ ہوتا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ایک خصوصی فرمان کے ذریعے حکام کو اس حرکت سے منع کر دیا۔[3]

انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تنقید کی جگہ خطبے میں اس آیتِ کریمہ کی تلاوت شروع کی:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰى وَیَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ[4]

(بے شک اللہ تعالیٰ اعتدال اور احسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم فرماتے ہیں اور کھلی برائی اور مطلق برائی اور ظلم کرنے سے منع فرماتے ہیں۔)[5]

---

① طبقات ابن سعد: ۳۹٤/٥ ② الانصاف للباقلانی، ص ٦٦

③ طبقات ابن سعد: ۳۹۳/٥

یاد رہے کہ جن روایات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کا اجراء حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ تحقیق کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ ثابت شدہ بات اتنی ہے کہ بنومروان کے بعض متعصب حکام اس حرکت میں ملوث تھے۔

مگر بعض حضرات نے بنوامیہ کے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر طعن وتشنیع کرنے کا سرے سے انکار کر دیا ہے اور اسی ضمن میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اسے بند کرانے کو بھی کتب تاریخ میں منقول افسانہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کے اس حکم کی کوئی صحیح روایت موجود نہیں اور طبقات ابن سعد کی جس روایت میں ایسا منقول ہے، وہ نہایت ضعیف ہے۔ اس کے بعد انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مناقب بیان فرما کر اپنے دعوے کو تقویت دینے کی کوشش کی ہے اور فرمایا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے قطعاً بعید ہے کہ وہ یہ رسم جاری کرتے۔ (عمر بن عبدالعزیز، معالم التجدید والاصلاح لدکتور علی محمد الصلابی، ص ۱۲٤)

یہ بات تو درست ہے کہ یہ الزام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر نہیں لگایا جا سکتا مگر یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ بنوامیہ کے دور میں ایسا ہوتا ہی نہیں تھا۔ اموی عمال کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تنقیص کرنا کتب حدیث کی متعدد صحیح اور حسن روایات میں موجود ہے۔ اس کا انکار محض تعصب ہے۔ (ہم حصہ دوئم کے باب ازالۂ شبہات میں اس پر کافی کلام کر چکے ہیں) البتہ عمر بن عبدالعزیز کا اس پر پابندی لگانا فقط ضعیف روایات میں ہے مگر یہ ضعف وجہ انکار نہیں بن سکتا؛ کیوں کہ ایک عادل خلیفہ کی کسی نیکی کے ثبوت کے لیے بہت پختہ شہادتیں پیش کرنا ضروری نہیں، اس بارے میں ضعیف روایت بھی کافی ہو سکتی ہے۔ پس یہ مان لینا چاہیے کہ یہ برائی عمر بن عبدالعزیز نے ختم کی۔ اگر اسے تسلیم نہ کیا جائے تو پھر خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنوامیہ میں رائج یہ برائی (جس کا ثبوت صحیح اور حسن روایات میں ہے) بعد کے دور میں کب اور کس نے ختم کی؟ عمر بن عبدالعزیز کے سوا کون سا حکمران تھا جس کی فکر وسعی سے یہ تبدیلی آئی؟ اگر ہم عمر بن عبدالعزیز کو اس برائی کا مٹانے والا نہ مانیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بنوامیہ کے پورے دور میں یہ برائی اسی طرح جاری رہی۔ اس سے تو بنوامیہ کا رہا سہا دفاع بھی ختم ہو جائے گا اور ان کے سارے خلفاء اس الزام کی زد میں رہیں گے۔ جبکہ تاریخی ریکارڈ کے مطابق عمر بن عبدالعزیز کے بعد اس بری رسم کے مناظر معدوم ہیں اور بعد کے خلفاء اس الزام سے محفوظ ہیں۔

④ سورۃ النحل، آیت: ۹۰ ⑤ العاشر من مشیخۃ البغدادیۃ لابی طاہر السلفی، ص ٦٢

گزشتہ خلفاء کے ذکر میں احتیاط:

عمر بن عبدالعزیز کا عزیمت پر مبنی طرزِ عمل گزشتہ خلفاء کی کارکردگی کے بارے میں سوال پیدا کررہا تھا کہ آخران کے بارے میں کیا رائے رکھی جائے؟ انہیں ظالم وجابر کہا جائے یا کچھ اور؟ عبدالملک کے پوتے عبدالرحمٰن بن سلیمان سے اس موضوع پر بات کرتے ہوئے عمر بن عبدالعزیز نے بڑی خوش اسلوبی سے ایک معتدل رائے دی جس میں گزشتہ حکمرانوں کی کردارکشی تھی نہ اپنی بڑائی۔ آپ ان خلفاء کو بھی ایک آزمائش کا شکار سمجھتے تھے اور خود کو بھی۔

آپ نے فرمایا: ''عبدالرحمٰن! میں تمہارے دادا عبدالملک کے ساتھ بھی رہا، ان کی تیمارداری اور تدفین میں شریک رہا۔ میں نے ان سے بڑھ کر دنیاوی معاملات کا ماہر کسی کو نہیں پایا۔ پھر یہ ذمہ داری تمہارے چچا ولید پر آئی میں ان کے ساتھ رہا، ان کی عیادت اور تدفین میں شریک رہا۔ میں نے دنیا پر غلبہ پانے والا ان سے بڑھ کر کوئی اور نہ دیکھا۔ پھر یہ منصب تمہارے باپ سلیمان کو ملا۔ میں ان کے ساتھ رہا، ان کی بیماری اور تدفین میں شامل رہا۔ میں نے ان سے زیادہ دنیا کو استعمال کرنے والا کوئی اور نہیں دیکھا۔ اب یہ دنیا میرے سامنے ہے اور مجھے میرے دین سے ہٹانے کی کوشش کررہی ہے۔'' یہ کہہ کر آپ اس قدر روئے کہ چیخیں نکل گئیں۔ ①

سنتِ نبویہ کی اشاعت:

آپ علم دین کی اشاعت کا زبردست ولولہ رکھتے تھے۔ خود بھی بہت بڑے عالم فاضل اور فقیہ تھے۔ اس زمانے تک سنتِ نبویہ کو لکھ کر جمع کرنے کا زیادہ رواج نہیں ہوا تھا۔ اکثر ذخیرہ محدثین کے حافظے میں محفوظ تھا۔ آپ نے یہ خطرہ محسوس کرتے ہوئے کہ شاید اگلی نسلوں کے حافظے اتنے قوی نہ ہوں، پوری مملکت کے محدثین اور علماء کو تاکید کی کہ وہ احادیث کو تحریری طور پر جمع کریں۔ مدینہ منورہ کے جلیل القدر محدث ابوبکر بن حزم رحمہ اللہ کو آپ نے مدینہ کا والی مقرر کیا تھا۔ انہیں اور ابن شہاب زہری رحمہ اللہ کو خاص طور پر اس عظیم علمی خدمت کی طرف متوجہ کیا اور لکھا کہ اگر ایسا نہ ہوا تو مجھے خدشہ ہے کہ علماء کی اس نسل کے ختم ہوتے ہی سنتِ نبویہ بھی دنیا سے مٹ جائے۔ ②

مغازی، سیرتِ نبویہ اور مناقبِ صحابہ کے درس کا اجراء:

آپ نے ''سیرتِ نبویہ'' کو ایک مستقل علم کی شکل میں مدون کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ اس دور میں سیرت کو ''علم مغازی'' کہا جاتا تھا جس کے سب سے بڑے ماہر عاصم بن عمر تھے۔ آپ کے حکم سے انہوں نے دِمشق کی جامع اموی میں مغازی، سیرتِ نبویہ اور مناقبِ صحابہ کا درس دینا شروع کیا۔ ③

---

① سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۱۳۵

② کتب عمر بن عبد العزیز إلی أبی بکر بن حزم انظر ما کان من حدیث رسول اللہ ﷺ فاکتبہ فإنی خفت دروس العلم وذھاب العلماء ولا تقبل إلا حدیث النبی ولتفشوا العلم ولتجلسوا حتی یعلم من لا یعلم فإن العلم لا یھلك حتی یکون سرا. (صحیح البخاری، کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم؛ جامع بیان العلم لابن عبدالبر، ح:۴۳۸)

③ تهذیب التهذیب: ۵/۵۳، ۵۴، ترجمة: عاصم بن عمر، یہ عاصم بن عمر بن قتادۃ ہیں، انہیں عاصم بن قتادۃ بھی کہا جاتا ہے۔

علماء کے لیے وظائف:

آپ نے اپنے گورنروں کو ہدایت جاری کی کہ وہ قرآن وسنت کی حفاظت اور اشاعت میں مشغول علماء کے لیے صوبائی بیت المال سے اتنے وظائف جاری کریں جس کے بعد انہیں کسب معاش کی فکر نہ رہے تاکہ وہ یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہیں۔[1] اس کے ساتھ ہی آپ نے علمی خدمات میں مشغول ان علماء کے لیے سو،سو دینار (تقریباً اڑھائی لاکھ روپے) کے وظائف مقرر کر دیے تاکہ وہ یکسوئی اور دل جمعی سے اپنے کام میں لگے رہیں۔[2]
ان طلبہ کے بھی سرکاری وظائف مقرر کیے جو علمِ دین سیکھنے میں منہمک تھے۔[3]

دین کی تبلیغ:

دین کی دعوت کو آپ خلافتِ اسلامیہ کی اہم ذمہ داری سمجھتے تھے؛ اس لیے آپ نے جہاں اندرونی طور پر اسلام کا عملی نفاذ کیا، وہاں بیرونی دنیا کو بھی اسلام کی دعوت دی۔ ہندوستان کے سات راجاؤں کو آپ کی طرف سے دعوتی خطوط گئے۔ آپ نے اسلام کی ترغیب دینے کے ساتھ ان سے وعدہ کیا کہ اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو انہی کو ان کی سلطنتوں پر حکمران باقی رکھا جائے گا اور ان کے حقوق اور فرائض وہی ہوں گے جو دوسرے مسلمانوں کے ہیں۔ ان راجاؤں کو آپ کی سیرت کی خبریں مل چکی تھیں؛ اس لیے ان سب نے اسلام قبول کر لیا اور اپنے نام عربوں جیسے رکھ لیے۔ اسی طرح آپ کی دعوت پر حبشہ میں بھی قبائل مشرف باسلام ہوئے۔[4]

مراکش میں بربر قبائل کی بہت بڑی تعداد آباد تھی۔ آپ کے نائب اسماعیل بن عبداللہ نے وہاں بڑے عدل وانصاف کا مظاہرہ کیا جس سے بربر قبائل بہت متاثر ہوئے۔ اسماعیل بن عبداللہ انہیں اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان کے سرداروں کے نام خود ایک مراسلہ لکھ کر دعوتِ اسلام دی۔ اس کے نتیجے میں وہاں بربر قبائل جوق در جوق مشرف باسلام ہوئے۔[5]

وسطِ ایشیا میں مسلمان فتوحات حاصل کر چکے تھے مگر وہاں اسلام پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے وہاں کے قبائلی عمائد کو بھی دعوتی خطوط لکھے۔ جو لوگ اسلام لائے ان کا خراج معاف کر دیا گیا۔[6]

قبائلی عصبیت کو مٹانے کی فکر:

بنومروان کی حکومت خالص عرب عناصر پر مشتمل تھی جس کی مشینری میں غالب حصہ قریش کا تھا۔ قریش کی شاخ اوپر جا کر مضر سے ملتی تھی جس کے دیگر بہت سے قبائل پورے عالم اسلام میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے بالمقابل عربوں کا دوسرا بڑا قبیلہ ربیعہ کا تھا جس کا تعلق یمن سے تھا اور اس کے درجنوں ذیلی قبائل عراق، شام اور حجاز میں موجود تھے۔

---

① سیرت عمر بن عبد العزیز لابن جوزی، ص ۱۲۳ ② المعرفة و التاریخ: ۳۸٤/۲ ③ جامع بیان العلم: ٦٤٧/۱
④ فتوح البلدان، ص ٤۲٥ ...... تاریخ میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ یہ کن ریاستوں کے راجگان تھے۔
⑤ فتوح البلدان، ص ۲۲۸، ۲۲۹ ⑥ فتوح البلدان، ص ٤۱۱

اسلام نے قبائل کے امتیازات کو مٹا دیا تھا مگر اب ایک عرصے سے قبائلی عصبیت دوبارہ اہمیت اختیار کرنے لگی تھی۔
جنگوں میں اپنے اپنے قبائل کے نعرے لگانے کا رواج شروع ہو گیا تھا۔ گزشتہ خلفاء شاید بعض مصلحتوں کے تحت اس رجحان سے چشم پوشی کرتے رہے تھے مگر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی دور اندیش نگاہوں نے فوراً بھانپ لیا کہ اگر یہ دراڑ گہری ہوئی تو آگے چل کر پورے عالم اسلام کو افتراق اور خانہ جنگی کی آگ میں دھکیل کر رہے گی۔
آپ نے فوری طور پر ایک مراسلہ لکھ کر اس کی نقول پورے عالم اسلام میں مشتہر کرائیں۔ اس میں قرآن کی آیات، احادیث اور تاریخی آثار کے حوالے دے کر اسلام سے قبل عربوں کی حالت اور ان کے انتشار، حضور اکرم ﷺ کی بعثت، اسلام کی بنیاد پر عرب قبائل کے اتحاد اور دنیا پر ان کے غلبے کا ذکر کر کے مسلمانوں کو کامل اتحاد و اتفاق کی تلقین کی گئی تھی، افتراق انگیز قبائلی نعروں کو ختم کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ آخر میں آپ نے لکھا تھا:

"اس خط کے لکھنے کی وجہ دیہات کے ان جاہل اور اجڈ باشندوں کی حرکات کی اطلاع ہے جو نئے نئے حاکم بنے ہیں، جن کو احکام الٰہی کا علم نہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ جنگ میں قبیلہ مضر اور کچھ لوگ قبیلہ یمن کا سہارا لیتے ہیں۔ سبحان اللہ! انہیں ہلاکت اور رسوائی کا کس قدر شوق ہے؟ کیا انہوں نے اللہ کا ارشاد نہیں سنا:
﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔
ہر وہ شخص جو میرا یہ خط پڑھے یا سنے، میں اسے نہایت شد و مد کے ساتھ خبردار کرتا ہوں کہ اسلام کے سوا کسی اور قلعے کو اختیار نہ کرنا۔ اللہ، اس کے رسول، اور اہلِ ایمان کے سوا کسی کو اپنا حمایتی نہ سمجھنا۔ میں اس بات پر اللہ کو گواہ بناتا ہوں جس کے قبضے میں ساری مخلوق ہے اور جو ہر ایک کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔"[1]

❖❖❖

جوہرِ کردار...... اللہ کا خوف اور فکرِ آخرت

اللہ کا خوف، موت کی یاد، فکرِ آخرت، جہنم کا ڈر، اور جنت کا شوق آپ کی شخصیت کے سب سے نمایاں عناصر اور آپ کے کردار کی بنیادی طاقت تھے۔ یہی وہ چیز تھی جس نے خلیفہ بنتے ہی آپ کو شدید احساسِ ذمہ داری میں مبتلا کیا اور آپ کی کایا پلٹ دی۔ یہی وہ جوہر تھا جس کے ہوتے ہوئے اتنی بڑی سلطنت کے وسائل اور اس قدر اعلیٰ اختیارات بھی آپ کو کسی مادی نفعے کی طرف مائل نہ کر سکے۔

ایک بار سورۃ اللیل پڑھتے ہوئے اس آیت پر پہنچے...... ﴿فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى﴾ (پس میں ڈرا چکا تمہیں ایک بھڑکتی ہوئی آگ سے) تو جہنم کے خوف سے آواز بند ہوگئی۔ آگے پڑھنے کی کوشش کی مگر نہ پڑھ سکے۔[2]

---

① سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۹۰ تا ۹۳
② سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۴۷

دابق کی راتیں اور جہنم کا خوف:

کبھی کبھی آپ کو اپنی سابقہ خوش حال زندگی کا خیال آتا جسے زیادہ مدت نہیں گزری تھی تو آخرت کا سوچ کر اسے دوبارہ اپنانے سے ڈرتے تھے۔ سلیمان بن عبدالملک کے ساتھ جہاد کے لیے نکل کر بنو مروان نے ''دابق'' میں اکٹھے بڑے پر رونق دن گزارے تھے۔ ایک شب اپنی اہلیہ فاطمہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر آپ نے کہا:

''فاطمہ! تمہیں دابق کی راتیں یاد ہیں۔ تب ہم آج کی بہ نسبت بہت خوشحال تھے۔''

وہ بولیں: ''امیر المؤمنین! اگر آپ چاہیں تو آج اللہ نے ہمیں اس سے کہیں زیادہ اختیار دے رکھا ہے۔''

آپ سسکیاں بھر کر رو دیے اور یہ کہتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئے:

''فاطمہ! میں جہنم کی آگ سے ڈرتا ہوں۔ اگر اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بہت بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔''[1]

موت کے بعد مجھے دیکھنا:

مدینہ منورہ آپ کے ایک ملاقاتی طویل عرصے بعد آپ سے ملنے آئے تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ آپ نے اس طرح دیکھنے کی وجہ پوچھی تو وہ بولے: ''آپ کا بدن اتنا لاغر ہو گیا ہے، بال جھڑ گئے ہیں، رنگ تبدیل ہو گیا ہے۔''

آپ نے فرمایا: ''میری موت کے تین دن بعد مجھے قبر میں جھانک کر دیکھنا۔ میری آنکھیں رخساروں پر ڈھلک چکی ہوں گی، ناک اور منہ پیپ اور کیڑوں سے بھرے ہوں گے۔ اس وقت تو تم مجھے اتنا بھی نہ پہچان پاؤ گے۔''[2]

چھٹی کروں تو کام بڑھ جائے گا:

آپ زندگی کا ایک ایک دن اور ایک ایک لمحہ قیمتی سمجھتے ہوئے مسلسل اہم ترین ذمہ داریوں میں مصروف رہتے تھے۔ چھٹی کا کوئی سوال نہ تھا۔ ایک دن کسی نے کہا: ''امیر المؤمنین! آپ ایک دن چھٹی کر لیں اور کہیں سیر کے لیے نکلیں تو بہتر ہوگا۔'' فرمایا: ''پھر اس دن کا کام میرے بدلے کون کرے گا؟'' کہا گیا: ''اگلے دن کر لیجیے گا۔''

فرمایا: ''ایک دن کا کام ہی مجھے نڈھال کر دیتا ہے۔ دو دن کا کام جمع ہو گیا تو کیا حال ہوگا۔''[3]

جنت کے سوا کچھ نہیں چاہیے:

ایک بار آپ نے اپنے خادم مُزاحم سے کہا: ''اللہ نے مجھے بڑی حوصلہ مند طبیعت دی ہے۔ میں جس مقام پر بھی فائز ہوا، اس سے بلند تر کی تمنا کرتا رہا۔ اب میں اس مرتبے پر پہنچ گیا ہوں کہ اس سے اونچا کوئی اور منصب ہے ہی نہیں۔ بس میری بلند ہمت طبیعت صرف جنت کی آرزو مند ہے۔''[4]

---

[1] سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۴۷، ۴۸

[2] سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۵۲، ۵۳

[3] سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۵۵

[4] سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۵۹

آنسوؤں سے انگیٹھی بجھ گئی:

جنت کے شوق اور دوزخ کے خوف سے رونے کا یہ عالم تھا کہ ان کے ایک معاصر کہتے تھے:

''معلوم ہوتا ہے جنت اور دوزخ صرف عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور حسن بصری رحمہ اللہ کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔''[1]

ایک بار کسی نے کہہ دیا: ''اگر ساری دنیا جنت میں گئی اور آپ دوزخ میں، تو آپ کو کیا فائدہ۔ اور اگر ساری دنیا دوزخ میں گئی اور آپ جنت میں تو آپ کا کیا نقصان۔''

یہ سن کر آپ اس قدر روئے کہ (آنسوؤں سے) سامنے رکھی ہوئی انگیٹھی بجھ گئی۔[2]

فکر مندی کی انتہاء:

گھر میں آپ کی فکر اور کڑھن کا کیا حال ہوتا تھا! آپ کی اہلیہ فرماتی ہیں کہ میں ان کے کمرے میں گئی تو دیکھا مصلے پر بیٹھے رو رہے ہیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو فرمایا:

''میں نے امتِ محمدیہ کے معاملات اپنے ذمہ لے لیے۔ سوچتا ہوں کوئی بھوکا فقیر ہے، کوئی بے سہارا مریض ہے، کوئی مظلوم و مجبور ہے۔ کوئی مجاہد ہے۔ کوئی بے وطن قیدی ہے۔ کوئی بوڑھا ضعیف اور کوئی عیال دار مفلس ہے۔ میرا رب قیامت کے دن پوچھے گا کہ میں نے ان کے لیے کیا کیا؟ اور حضرت محمد ﷺ میرے مقابل مدعی ہوں گے۔ ڈر ہے کہ مقدمہ میرے خلاف ثابت نہ ہو جائے۔ پس خود پر ترس کھا کر رو رہا ہوں۔''[3]

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ فکرِ آخرت میں کس قدر ڈوب کر اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو رہے تھے جو اللہ کی طرف سے آپ پر آ پڑی تھی۔

سہل، عبدالملک اور مزاحم ...... خاص معاونین:

خاندان کے ان مخالفین کے مقابلے میں آپ کا بھائی سہل، نوجوان بیٹا عبدالملک اور آپ کا خادم مزاحم جو آپ ہی کی طرح نہایت نیک سیرت اور متقی تھے، سچائی اور عزیمت کے راستے میں آپ کے حامی تھے۔[4]

عبدالملک کی فکرِ آخرت کا یہ حال تھا کہ خلیفہ بننے کے بعد پہلے دن آپ ظہر کی نماز سے پہلے قیلولہ کر رہے تھے کہ اس نوجوان نے آ کر آپ کو اٹھا دیا اور کہا:

''اباجی! آپ آرام کر رہے ہیں! کیا لوگوں پر ہونے والی زیادتیوں کا ازالہ نہ فرمائیں گے؟''

آپ نے کہا: ''بیٹا! رات سلیمان کی تدفین کی وجہ سے جاگتے گزاری ہے۔ کچھ دیر آرام کر لوں۔ ظہر کے بعد ان ذمہ داریوں کو دیکھوں گا۔'' بیٹے نے کہا: ''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ظہر تک آپ زندہ رہیں گے۔''

---

[1] صفة الصفوة لابن جوزي: ۱۳۸/۲

[2] سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۹۴

[3] الکامل في التاریخ: ۱۱۹/٤

[4] سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۵۰

یہ سنتے ہی آپ نے بیٹے کو قریب بلا کر پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا:

''اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے تم جیسا بیٹا دیا جو دین کے کاموں میں معاون ہے۔''

آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور مجمع میں جا کر اصلاحات کا اعلان کیا۔[1]

ایک دن کچھ امراء نے عبدالملک کو کہا: ''آپ کے والد ہمارے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں، ہماری املاک چھین لیں، ہمارے بڑوں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ ان سے کہو کہ باز آ جائیں۔ ہم اس صورتحال کو برداشت نہیں کر سکتے۔''

عبدالملک نے آ کر ان کا پیغام دے دیا۔ عمر بن عبدالعزیز کے چہرے پر رنج کے آثار ابھرے تو عبدالملک نے کہا:

''امیر المؤمنین! آپ جو کر رہے ہیں کرتے جائیے۔ ان لوگوں کا غصہ ہمارے اوپر اسی لیے ہے کہ ہم اللہ کی رضا کو ترجیح دیتے ہیں۔''

عمر بن عبدالعزیز نے خوش ہو کر کہا: ''اللہ تمھیں جزائے خیر دے میرے بیٹے۔''

پھر دعا کی:

''اللہ کا شکر ہے جس نے میرے بچے عبدالملک اور میرے خادم مزاحم کے ذریعے میری کمر مضبوط کر رکھی ہے۔''[2]

خلافت کو شورائی طرز پر لے جانے کا خیال اور بنو مروان کی مخالفت

عمر بن عبدالعزیز ایک لگے بندھے نظام کے اندر سربراہِ حکومت بنے تھے۔ اس نظام کو توڑنا ان کے بس میں نہ تھا؛ کیوں کہ اگر آپ اسے توڑتے تو جن امراء اور شہزادوں کے بل پر یہ نظام چل رہا تھا وہ سب سے پہلے آپ کے خلاف کھڑے ہو جاتے۔ آپ یہ کام کر گزرنا چاہتے تھے مگر اس کے لیے ماحول سازگار نہ تھا۔ آپ کی یہ پس و پیش آپ کے نیک سیرت بیٹے عبدالملک سے پوشیدہ نہ تھی۔ ایک دن اس نے کہہ ہی ڈالا:

''اباجی! آپ نے ایسے کاموں کو ملتوی کر رکھا ہے جن کے بارے میں ہمارا خیال تھا کہ آپ اختیار مل جانے کے بعد ان میں ایک گھنٹہ بھی تاخیر نہ کریں گے۔ میں چاہتا ہوں آپ انھیں جلد از جلد کر گزریں۔''

آپ نے فرمایا: ''بیٹا! تمھاری رائے بہت اچھی ہے مگر اللہ کی قسم! میں ان لوگوں کو دین کی کسی بھی بات پر لاتے ہوئے دنیا کی کچھ نہ کچھ گنجائش دے کر ان کے دلوں کو بہلاتا رہتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں ان کی طرف سے کوئی ایسا ردعمل نہ شروع ہو جائے جسے میں سہار نہ سکوں۔''[3]

ایک بار خاندان کے کچھ لوگوں نے آپ کے طرزِ حکومت اور اصلاحی اقدامات پر تنقید کی تو آپ نے غصے میں آ کر کہا: ''بنو مروان کو ذبح ہونا ہوگا۔ اور یہ ذبح میرے ہاتھ سے ہوگا۔''[4]

---

① سمط النجوم العوالي: ۳۷۱/۳؛ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن الجوزی، ص ۳۰۱

② سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۵۰، ۵۱ ③ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۵۷

④ طبقات ابن سعد: ۳۴۴/۵، ط صادر

خلافت کے اہل، قاسم بن محمد:

''بنو مروان کے ذبح'' سے آپ کی مراد یہ تھی کہ خلافت کو بنو مروان سے نکال کر مسلمانوں کی شوریٰ کے حوالے کر دیا جائے گا جیسا کہ ایک موقع پر آپ نے یہ بات کھل کر کہی۔ بنو مروان کے عمائد جمع ہو کر آپ پر طعنہ زنی کرنے لگے۔ آپ نے تنگ آ کر کہا: ''اللہ کی قسم! اگر تم لوگ دوبارہ اس طرح جمع ہوئے تو میں اپنی سواری لے کر سیدھا مدینہ منورہ چلا جاؤں گا اور خلافت کو شوریٰ کے حوالے کر دوں گا۔ سربراہی کا اہل شخص میری نظر میں ہے یعنی قاسم بن محمد۔''[1]

تاہم عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اس ارادے پر عمل نہ کر سکے؛ کیوں کہ آپ کو قوی اندیشہ تھا کہ ایسی صورت میں امرائے خاندان اس فیصلے کو مسترد کر کے بغاوت کر دیں گے اور امت میں ایک بار پھر اسی قسم کی خانہ جنگی چھڑ جائے گی جیسی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو مسترد کر کے شروع کی گئی تھی۔

معاونین کا انتقال:

آپ کی خلافت کے تیسرے سال پہلے آپ کے بھائی سہل کا انتقال ہوا، پھر عبدالملک کا۔ جلد ہی مزاحم بھی رخصت ہو گیا۔ یہ تینوں آپ کے مضبوط سہارے تھے۔ مزاحم کو دفناتے ہوئے آپ فرما رہے تھے: ''مزاحم! اللہ تم پر رحمت کرے۔ تم دنیا کے کاموں میں بھی میرے بہترین مددگار تھے اور آخرت کے معاملے میں بھی بہترین مشیر تھے۔''[2]

گھر واپس آئے، اچھی طرح وضو کر کے دو نفل پڑھے اور یہ دعا کی:

> ''یا اللہ! تو نے سہل، عبدالملک اور مزاحم کو اپنے پاس بلا لیا۔ تو جانتا ہے وہ میرے معاون تھے۔ اب مجھے تجھ سے محبت زیادہ ہو گئی ہے، تیرے پاس موجود شے کی رغبت بڑھ گئی ہے۔ مجھے بھی اپنے پاس اس طرح بلا لے کہ نہ میں نے کسی پر زیادتی کی ہو، نہ کسی کے حق کو ضائع کیا ہو۔''

اس دعا کے بعد آپ بیمار پڑے اور کچھ دنوں بعد دنیا سے رخصت ہو گئے۔[3]

---

① طبقات ابن سعد: ۵/۳۴۴، ط صادر

نوٹ: حضرت قاسم بن محمد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سگے پوتے اور اُمت کے بلند ترین فقہاء اور محدثین میں سے ایک تھے۔ ان کے والد محمد بن ابی بکر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت میں شریک ہوئے تھے مگر آخری لمحات میں انہیں توبہ کی توفیق ہو گئی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں مصر کا گورنر بنایا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے لڑائی میں وہ گرفتار ہو کر قتل کیے گئے۔ ان کے یتیم بچے قاسم کی پرورش پھوپھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کی جس کی وجہ سے یہ قاسم بن محمد جلیل القدر تابعین میں شمار ہوئے۔ اس دور میں مدینہ منورہ کے فقہائے سبعہ مشہور تھے جن میں سے ایک یہ تھے۔ عمر ۷۰ یا ۷۲ سال تھی۔ (وفیات الاعیان: ۴/۵۹، ۶۰) سفیان بن عیینہ فرماتے تھے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی احادیث کو سب سے زیادہ جاننے والے تین افراد ہیں: قاسم بن محمد، عروۃ بن زبیر، عمرۃ بنت عبدالرحمٰن۔ کہا جاتا تھا کہ قاسم، رجاء بن حیوہ اور ابن سیرین روایات کو لفظ بلفظ نقل کرتے تھے جبکہ حسن بصری، ابراہیم اور شعبی مفہوم نقل کرتے تھے۔ انہیں دیکھنے والے یہ بھی کہتے تھے کہ ان سے زیادہ ذہین آدمی ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ قاسم بن محمد کی ولادت کی کہیں تصریح نہیں ملی۔ وفات میں کئی اقوال ہیں مگر خلیفہ بن خیاط کا قول راجح معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۷ھ کے اواخر میں وفات ہوئی۔ (تہذیب الکمال: ۲۳/۴۲۷ تا ۴۳۵)

کیوں کہ ان کے والد کا قتل ۳۸ ہجری میں ہوا تھا۔ غالباً اس سے ایک دو سال پہلے ان کی ولادت ہوئی تھی، اس طرح ان کی عمر ۷۰، ۷۲ سال بنتی ہے۔

② سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۱۰۵

③ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۱۰۱

آخری خطبہ اور لوگوں سے بے زاری:

وفات سے پہلے جمعے کے دن مسجد میں زندگی کا آخری خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

''لوگو! نہ تم بے کار پیدا کیے گئے ہو، نہ ہی تمہیں کسی پوچھ گچھ کے بغیر چھوڑا جائے گا۔ تمہیں ایک جگہ لوٹ کر جانا ہے جہاں اللہ تمہارے بارے میں فیصلہ کرے گا۔ وہ شخص ناکام و نامراد ہے جو اللہ کی اس رحمت سے باہر نکل جائے جو ہر شے کو محیط ہے اور اس جنت سے محروم ہو جائے جو زمین و آسمان سے زیادہ وسیع ہے۔ سنو! کل کے دن امن اسی کو نصیب ہوگا جو اللہ سے ڈرتا اور خوف کھاتا رہے، جو فانی شے کو باقی رہنے والی شے کے بدلے، تھوڑی کو زیادہ کے عوض، اور خوف کو اطمینان کے بدلے بیچ ڈالے۔ کیا تم غور نہیں کرتے کہ تم سب مرحوم لوگوں کی اولاد ہو۔ اور تمہاری جگہ عن قریب دوسرے لوگ آجائیں گے۔ پس موت کے آنے سے پہلے اللہ سے ڈرو۔ اللہ کی قسم! میں یہ باتیں اس حالت میں کر رہا ہوں کہ مجھے خود سے بڑا گناہ گار کوئی نہیں دکھائی دیتا۔ میں اللہ سے معافی چاہتا ہوں اور اس کے حضور توبہ کرتا ہوں۔''[1]

اس دن آپ نے محسوس کیا کہ کچھ لوگ اس وعظ و نصیحت سے اکتا رہے ہیں۔ آپ کو یہ بات بہت گراں گزری۔ گھر تشریف لائے۔ جمعہ کے دن آپ اپنے بچوں سے قرآن مجید سنا کرتے تھے۔ انہیں جمع کیا اور تلاوت کا کہا۔ ایک بچے نے یہ آیات پڑھنا شروع کیں:

﴿طٰسٓمّٓ ٭ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ٭ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ٭ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ﴾

''یہ واضح کتاب کی آیات ہیں۔ شاید آپ ان کے ایمان نہ لانے پر اپنی جان دے دیں گے، اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے ایک بڑی نشانی نازل کر دیں، پھر ان کی گردنیں اس نشانی سے پست ہو جائیں۔''[2]

عمر بن عبدالعزیز کے دل سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔ فرمایا: ''اللہ جل شانہ نے اس بچے کے ذریعے مجھے تسلی دے دی ہے۔'' پھر دعا فرمائی: ''الٰہی! میں ان سے اکتا گیا ہوں اور یہ لوگ مجھ سے۔ تو مجھے ان سے راحت دے دے اور انہیں مجھ سے۔'' اس دعا کے بعد آپ کو اگلا جمعہ پڑھانا نصیب نہ ہوا۔[3]

خوارج سے مناظرہ اور آپ کی طلب مہلت:

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دور خلافت میں پورے عالم اسلام میں مکمل امن رہا۔ کہیں کوئی شورش نہ ہوئی، البتہ آپ کی وفات سے کچھ دن پہلے عراق میں بُسطام نامی ایک خارجی نے جو ''شوذب'' کے لقب سے مشہور تھا، مٹھی بھر آدمی جمع کر کے بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا۔ خوارج آپ کی سیرت و کردار کے معترف تھے مگر ان کا مطالبہ تھا کہ آپ گزشتہ خلفاء کو ظالم و جابر قرار دے کر انہیں لعنت ملامت کریں۔

---

① تاریخ الطبری: ٥٧١/٦ ② سورۃ الشعراء، آیات: ١ تا ٤ ③ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ٩٩

عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ چاہتے تو چند ہزار سپاہی بھیج کر بُسطام کو کچل سکتے تھے مگر ایک دوراندیش اور امن پسند قائد کی طرح آپ نے اسے بزورِ قوت دبانے کی بجائے مذاکرات کی دعوت دی اور کہا:

''خوں ریزی سے بھلا کیا حاصل ہوگا۔ آکر مجھ سے بات کرلو۔ میں حق پر ہوا تو تم مان لینا۔ اگر تم حق پر ہوگے تو میں اپنے طرزِ عمل پر غور کرلوں گا۔''[1]

بُسطام نے دو نمائندے بھیج دیے۔ ان کی جامہ تلاشی لی گئی۔ غیر مسلح حالت میں وہ آپ کے پاس آئے اور دو بدو گفتگو کی۔ آپ نے نصوصِ شرعیہ و تاریخ و آثار کی روشنی میں ان سے جس قوتِ استدلال اور نفسیات شناسی کے ساتھ بات کی اس سے آپ کی علمی گہرائی، ذہانت اور غیر معمولی فہم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

آپ نے ان سے پوچھا: ''بتاؤ تمہیں کیا چیز خروج اور بغاوت پر آمادہ کرتی ہے؟''

وہ بولے: ''ہم آپ پر کوئی الزام نہیں لگاتے۔ آپ عدل و انصاف اور احسان کے عادی ہیں۔ بس ایک چیز میں آپ سے اختلاف ہے۔ اگر آپ اسے مان لیں تو ہم آپ کے ساتھ ہیں ورنہ نہیں۔''

آپ کے دریافت کرنے پر وہ بولے: ''آپ کا طریقۂ کار آپ کے خاندان والوں سے الگ ہے۔ آپ ان کے کاموں کو مظالم سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ پس اگر آپ ہدایت پر ہیں اور وہ گمراہی پر تو آپ ان سے برأت کا اظہار کرتے ہوئے ان پر لعنت کریں۔ آپ سے ہمارے اتحاد کی یہی شرط ہے۔''

آپ نے فرمایا: ''میں جانتا ہوں تم لوگ دنیا طلب کرنے نہیں نکلے۔ آخرت ہی کے طلب گار ہو۔ مگر تم لغزش میں پڑ گئے ہو۔ میں تم سے کچھ پوچھتا ہوں، تم اپنے علم کے مطابق سچ سچ بتانا۔

ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما تو تمہارے بھی بزرگوں میں سے ہیں۔ وہ تمہارے نزدیک بھی نجات یافتہ ہیں۔ تم جانتے ہو کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں مرتدین سے قتال کیا، قیدی بھی بنایا اور مالِ غنیمت بھی چھینا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو ان قیدیوں کو آزاد کردیا۔ مگر (عمل کے اس اختلاف کے باوجود) کیا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عمر سے یا عمر نے ابوبکر سے بے زاری ظاہر کی؟ یا تم ان دونوں میں سے کسی ایک سے بیزاری ظاہر کرتے ہو؟''

وہ بولے: ''جی بالکل نہیں۔''

آپ نے کہا: ''اچھا اہلِ نہروان تمہارے نزدیک بزرگ اور نجات یافتہ لوگ تھے۔ ان میں سے کوفہ والے خوارج نے نہ کسی کو ہراساں کیا، نہ قتل کیا، نہ کسی کا مال لوٹا۔ بصرہ کے خوارج نے عبداللہ بن وہب کی قیادت میں خروج کیا تو عبداللہ بن خباب اور ان کی باندی کو قتل کیا۔ عرب قبیلے بنوقطیعہ پر حملہ کرکے مردوں، عورتوں اور بچوں سمیت سب کو قتل کیا یہاں تک کہ بچوں کو پکڑ کر ابلتی ہانڈیوں میں ڈالا۔ (عمل کے اس اختلاف کے باوجود) کیا کوفہ کے خوارج نے بصرہ کے خوارج سے، یا بصرہ والوں نے کوفہ والوں سے برأت ظاہر کی، اور کیا تم ان دونوں میں سے کسی ایک گروہ سے بے زاری کا اظہار کرتے ہو؟''

[1] تاریخ الطبری: ٥٥٦/٦

وہ بولے: ''جی بالکل نہیں۔''

آپ نے پوچھا: ''اچھا یہ بتاؤ دین ایک ہیں یا دو؟''

وہ بولے: ''ایک ہی ہے۔''

فرمایا: ''کیا یہ ممکن ہے کہ دین میں ایک چیز کی اجازت تمہیں مل جائے اور مجھے نہ ملے؟''

بولے: ''نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔''

فرمایا: ''پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے طرزِ عمل میں اختلاف کے باوجود ان دونوں کو ایک دوسرے سے محبت کی اجازت تھی! تمہیں ان دونوں سے محبت کی اجازت ہے۔ بصرہ اور کوفہ کے خوارج کو خون اور اموال کی حرمت کے مسائل پر باہمی اختلافات کے باوجود ایک دوسرے سے محبت کی اجازت تھی۔ تمہیں ان دونوں جماعتوں سے محبت روا ہے۔ مگر مجھے چھوٹ نہیں کہ اپنے خاندان سے اختلاف ہو جانے پر انہیں لعنت ملامت نہ کروں۔ اگر گناہ گاروں کو لعنت ملامت کرنا کوئی فریضہ ہے تو تم ہی بتاؤ تم نے فرعون یا ہامان پر کتنی بار لعنت کی ہے؟''

خارجیوں میں سے ایک نے کہا: ''شاید ایک بار بھی نہیں۔''

آپ نے فرمایا: ''بس بات یہ ہے کہ تم جاہل لوگ ہو۔ جو چاہتے ہو اس میں لغزش کر جاتے ہو۔ تم انسانوں کی وہ بات برداشت کر لیتے ہو جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برداشت نہیں کیا۔ اور ان چیزوں کو برداشت نہیں کرتے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برداشت کیا۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک قابلِ سزا تھے وہ تمہارے نزدیک قابلِ معافی ہیں۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک قابلِ معافی تھے وہ تمہارے نزدیک قابلِ سزا ہیں۔''

وہ بولے: ''نہیں ہم تو ایسے نہیں۔''

آپ نے کہا: ''ابھی تمہیں اس کا اقرار کرنا پڑے گا۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بت پرستوں کی طرف مبعوث ہوئے۔ انہیں بت پرستی چھوڑنے اور کلمۂ شہادت کی دعوت دی۔ جس نے یہ کلمہ پڑھ لیا اس کی جان و مال محفوظ ہو گئے، وہ مسلمانوں کے برابر ہو گیا۔ جس نے نہیں پڑھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے جہاد کیا۔'' خارجی بولے: ''ہاں بالکل''

فرمایا: ''مگر آج تم بت پرستی چھوڑ کر کلمۂ شہادت پڑھنے والوں سے بیزار ہو، ان پر لعنت کرتے ہو، ان سے لڑ رہے ہو، ان کا خون حلال سمجھتے ہو۔ باقی یہود و نصاریٰ سمیت ساری قومیں جو کلمے کا انکار کرتی ہیں، تم ان کا خون حرام سمجھتے ہو۔''

یہ سن کر خوارج لاجواب ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا:

''میں نے اس سے زیادہ واضح دلائل کبھی نہیں سنے۔'' اس نے اپنے نظریے سے توبہ کر لی۔

دوسرے نے کہا: ''میں اپنی قوم کے پاس جا کر ان دلائل پر ان کی رائے لے لوں۔ شاید وہ کوئی جواب دے دیں۔''

آپ نے فرمایا: ''تمہاری مرضی۔''[1]

---

[1] سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۱۱۲ تا ۱۱۵

آخر میں خوارج نے کہا: ''آپ اپنے بعد یزید بن عبدالملک کو خلیفہ کے طور پر برقرار رکھ رہے ہیں۔ آخر یہ کیوں؟''
آپ نے فرمایا: ''یہ میری نہیں، سلیمان کی طرف سے طے شدہ بات ہے۔''
انہوں نے کہا: ''اگر آپ کو کوئی امانت سونپی جائے اور آپ وہ کسی نااہل کے پاس رکھوا دیں تو کیا آپ امانت کا حق ادا کرنے والے شمار ہوں گے؟'' آپ سوچ میں پڑ گئے اور فرمایا: ''اچھا مجھے تین دن کی مہلت دے دو۔''[1]
بعض روایات میں ہے کہ خوارج کو رخصت کرنے کے بعد آپ بار بار کہتے رہے:
''یزید کے معاملے نے مجھے ہلاک کر ڈالا۔ اس بارے میں (خارجی کی) دلیل سے میں ہار گیا۔ أَسْتَغْفِرُ اللّٰه۔''[2]

◆◆◆

آخری ایام اور سانحۂ وفات

آپ خلافت کو شورائیت میں ڈھالنے کے لیے سنجیدگی سے سوچ رہے تھے کہ بیمار پڑ گئے اور چند دن بعد آپ کی وفات ہوگئی۔ یہ واقعہ ۲۰ رجب ۱۰۱ھ کا ہے۔ اس وقت آپ کی عمر چالیس سال کے قریب تھی۔
ایک رائے یہ ہے کہ بیماری طبعی تھی۔ فکرِ آخرت اور خشیتِ الٰہیہ سے آپ کی جان گھل گئی تھی۔[3] دوسری رائے یہ کہ آپ کو اپنے ہی خاندان کے مخالفین نے زہر دیا تھا تاکہ خلافت خاندان سے باہر جانے کی نوبت نہ آئے۔[4]

آخری لمحات اور اولاد کو وصیت:

وقتِ رحلت قریب دیکھ کر آپ نے ولی عہد یزید بن عبدالملک کے نام وصیت نامہ لکھوایا جس میں اسے تاکید کی:

''تمہیں تقویٰ اختیار کرنا چاہیے اور رعایا کا خیال رکھنا چاہیے۔ میری طرح تم بھی تھوڑے ہی دن زندہ رہو گے۔ یہاں تک کہ اس ذات سے جا ملو گے جو باریک بین اور خبردار ہے۔ غفلت میں کوئی ایسی لغزش ہونے سے بچتے رہنا جس کی تم تلافی نہ کرسکو۔''[5]

آپ کا سالا مَسلمہ بن عبدالملک آپ کا خیرخواہ تھا۔ وہ آخری وقت میں آپ کے پاس آیا۔ آپ کے لباس کی بوسیدگی دیکھ کر برداشت نہ کرسکا۔ بہن سے کہنے لگا: ''ان کی قمیص تو دھو دیا کرو۔''
وہ بولیں: ''اللہ کی قسم! کوئی اور قمیص ہے ہی نہیں۔ ہم اسے دھوئیں تو یہ کیا پہنیں گے؟''[6]
مَسلمہ نے آپ کی تنگ دستی کا خیال کر کے سو دینار پیش کیے اور بولا: ''جہاں چاہیں ان کی وصیت فرمادیں۔''

---

[1] تاریخ الطبری: ۵۵۶/۶
[2] الکامل فی التاریخ: ۱۰۴/٤؛ سنة ۱۰۰ھ
[3] حلیة الأولیاء: ۳٤۳/۵
[4] تاریخ الطبری: ۵۵۶/۶
جس طرح یہ کیس دبا دیا گیا اور کوئی تفتیش نہیں کی گئی اس سے بنو مروان کے اس جرم میں ملوث ہونے کا امکان پختہ ہوجاتا ہے۔
[5] سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۱۰۷؛ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن جوزی، ص ۳۱۸
[6] سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ٤۸

آپ نے کہا: ''اس سے بہتر بات یہ ہوگی کہ تم یہ رقم وہیں لوٹا دو جہاں سے لی گئی ہے۔''

مَسلمہ نے بے ساختہ کہا: ''امیر المؤمنین! اللہ آپ کو جزائے خیر عنایت کرے۔ آپ نے سخت دلوں کو نرم کر دیا۔ آپ نے ہمارے خاندان کا نام صالحین میں شامل کرا دیا۔''[1]

پھر ان کے گھر کی حالت دیکھ کر کہا: ''آپ نے اپنے بچوں کو مال سے محروم ہی رکھا۔ اب مجھے ہی اپنے گھر کے بارے میں کوئی وصیت کر دیں تو ہم آپ کے گھر کا خرچہ اٹھاتے رہیں گے۔''

آپ سہارا لے کر اٹھ بیٹھے اور فرمایا:

''میں نے اپنے بچوں کو کسی حق سے محروم نہیں رکھا۔ ہاں ناحق چیز انہیں کھلانے سے پرہیز کیا ہے۔ باقی رہی اولاد کے لیے وصیت کی بات..... تو یاد رکھو! صالح بندوں کا والی خود اللہ ہے۔ میری اولاد اگر صالح ہے تو اللہ اسے غنی رکھے گا۔ اگر وہ بدکردار ہے تو مجھے ان کے گناہوں میں مالی تعاون کی کوئی ضرورت نہیں۔''

پھر اپنے بچوں کو پاس بلوایا۔ اشک بار آنکھوں اور بھرائی ہوئی آواز کے ساتھ گویا ہوئے:

''بچو! میں تمہارے لیے بڑی خیر کی چیز چھوڑے جا رہا ہوں۔ تم مسلم اور غیر مسلم شہریوں میں سے جس سے بھی ملو گے وہ خود پر تمہارا حق سمجھ کر تمہاری عزت کریں گے۔ بچو! میرے سامنے دو راستے تھے: ایک یہ کہ تمہیں مالدار بنا دیتا اور خود جہنم میں جاتا۔ دوسرا یہ کہ تمہیں تنگ دست رکھتا اور جنت میں جاتا؛ اس لیے میں نے تمہیں تنگ دست رکھنا ہی پسند کیا۔ چلو! اللہ تمہاری حفاظت فرمائے، تمہیں رزق عطا کرے۔''[2]

پھر سب کو کمرے سے باہر جانے کا حکم دیا اور کہا: ''مجھے ایک ایسی مخلوق دکھائی دے رہی ہے جو انسان ہے نہ جن۔''

لوگ کمرے سے نکلے تو انہیں آپ کے تلاوت کرنے کی آواز آئی:

﴿تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾[3]

(وہ آخرت والا گھر تو ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں نہ تو بڑائی چاہتے ہیں اور نہ فساد۔ اور آخری انجام پرہیزگاروں کے حق میں ہوگا۔)

پھر ایک گہرا سکوت چھا گیا۔ کچھ دیر بعد لوگ اندر آئے تو پہلی صدی ہجری کے اس مجدد کی روح جسدِ خاکی سے پرواز کر چکی تھی۔ چہرہ کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا، آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر اطمینان و سکون کا عجیب عالم تھا۔[4]

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

---

① سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۱۰۹
② سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۱۰۱
③ سورۃ القصص، آیت: ۸۳
④ سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۱۰۱

عمرِ ثانی کی اصلاحات کا معاشرے پر اثر

عمر بن عبدالعزیز کی اصلاحات سے بظاہر ایسا لگتا تھا کہ حکومت کا خزانہ خالی، حکام کا اختیار کمزور اور سربراہ کا رعب ودبدبہ زائل ہو جائے گا جس کا نتیجہ مملکت کی تباہی کے سوا کچھ نہ نکلے گا۔ امرائے بنو مروان ان کے اقدامات کی مخالفت کرتے ہوئے یہی ذہن رکھتے تھے۔ مگر عمر بن عبدالعزیز جانتے تھے کہ مملکت وحکومت کی ترقی، خالق کی حدود میں رہتے ہوئے مخلوق کی خدمت پر منحصر ہے۔ خالق کی خوشنودی کے لیے عوام کی جتنی زیادہ خدمت کی جائے گی، حکومت اتنی ہی توانا اور روبہ ترقی ہوگی۔ چنانچہ آپ کی اصلاحات کے اثرات پہلے ہی سال معاشرے میں دکھائی دینے لگے۔

اندرونی شورشیں ختم:

پورے ملک میں کہیں اندرونی شورشوں کا نام ونشان نہ رہا۔ خوارج جو گزشتہ نصف صدی سے پورے عالم اسلام کے لیے وبالِ جان بنے ہوئے تھے، آپ کا طرزِ سیاست دیکھ کر جمع ہوئے اور طے کیا کہ اس حکمران سے لڑنا ہمارے لیے کسی بھی طور پر جائز نہیں۔[1] غرض اس دور میں ملکی امن وامان مثالی ہو گیا۔

زکوٰۃ کے حق دار نایاب ہو گئے:

لوگ اتنے خوشحال ہوئے کہ دو سال کے اندر غریب لوگ متوسط طبقے میں شامل ہو گئے۔ یحییٰ بن سعید کو افریقہ کا گورنر مقرر کیا گیا (جو دنیا کا سب سے غریب براعظم شمار ہوتا آیا ہے)۔ یحییٰ بن سعید زکوٰۃ وصول کرنے کے بعد جب مستحق افراد کی تلاش میں نکلے تو ایک فرد بھی نہ ملا۔ آخر انہوں نے زکوٰۃ کی رقم سے غلام خرید کر آزاد کیے۔[2]

ایک اور قریشی بزرگ کا بیان ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کے مختصر سے دورِ خلافت میں لوگ اتنے خوشحال ہو گئے تھے کہ زکوٰۃ وصدقات کی بڑی بڑی رقمیں لے کر آتے کہ جہاں مناسب ہو خرچ کر دی جائیں مگر سرکاری افسران انہیں مجبوراً واپس کرتے کہ ہمیں بھی کوئی زکوٰۃ وصول کرنے والا نہیں ملتا۔ اس مختصر سے دور میں عالم اسلام کی کل آبادی میں غربت کی شرح صفر ہو گئی۔ ڈھونڈے سے بھی کوئی زکوٰۃ قبول کرنے والا نہ ملتا تھا۔[3]

طلبہ کی تعداد بڑھ گئی:

تعلیم کا رجحان بہت عام ہو گیا تھا۔ پہلے کے مقابلے میں طلبہ کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ ان کے دور کے ایک معلم ضحاک

---

[1] اخبار ابی حفص، ص ٦٢، ٦٣ [2] سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ٦٥

[3] سیرت عمر لابن عبدالحکم، ص ١١٠

بن مزاحم کے مکتب میں تین ہزار بچے داخل تھے۔[1]

لوگوں کے مزاج اور رجحانات میں تبدیلی:

لوگوں کے رجحانات اور مزاج واطوار بھی بدلنے لگے۔اس دور کے ایک راوی کا کہنا ہے کہ ولید کے زمانے میں جب لوگ جمع ہوتے تو عمارتوں اور طرزِ تعمیر کا ذکر ہوتا تھا؛ کیوں کہ ولید تعمیراتی کاموں کا شوقین تھا۔سلیمان کے زمانے میں لوگوں کی مجالس میں کھانے پینے، لذتوں اور باندیوں کی باتیں ہوتیں کہ سلیمان ان نعمتوں سے بھرپور طور پر لطف اندوز ہونے کا قائل تھا۔مگر عمر بن عبدالعزیز کے دور میں نیکی، عبادت، تقویٰ اور خیر کے کاموں کا ذکر سب سے زیادہ ہوتا۔ جہاں کچھ لوگ جمع ہوتے تو آپس میں پوچھتے: ''تم نے کل کتنی تلاوت کی۔قرآن مجید کب ختم کرو گے۔روزے کتنے رکھے۔''[2] یہ حکمران کے مزاج اور سیرت وکردار کا اثر تھا جو پوری قوم پر پڑ رہا تھا۔

بیرونی فتوحات کیوں نہ ہوئیں؟

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دور میں بیرونی فتوحات بالکل نہیں ہوئیں پھر بھی آپ کا دورِ حکومت مسلم تاریخ کا عہدِ زرّیں کہلاتا ہے۔اس بندۂ خدا نے دیکھ لیا تھا کہ ولید کے دور میں سندھ سے اندلس تک پھیل جانے والی اسلامی سطوت وشوکت کی بلند عمارت میں دراڑیں پڑتی جارہی ہیں اور اس عمارت کی مرمت کیے بغیر اسے مزید بلند کرتے چلے جانا پوری تعمیر کو داؤ پر لگانے کے مترادف ہے؛ اس لیے عمر بن عبدالعزیز کی پالیسی میں سلطنت کی توسیع سرے سے شامل ہی نہیں تھی۔بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ یہ فیصلہ بالکل صحیح تھا۔سچ یہ ہے کہ اگر عمر بن عبدالعزیز کو پندرہ بیس سال مل جاتے تو عالم اسلام کا نقشہ بدل جاتا اور ہماری تاریخ شاید کچھ اور ہوتی۔مگر اللہ کی حکمتوں کو کون سمجھ سکتا ہے۔اس دور کے سیاست دانوں نے اس نعمتِ الٰہیہ کی جو ناقدری کی، شاید وہ اللہ کو پسند نہ آئی، پس اس رجلِ رشید کو مختصر مدت کے بعد واپس بلا لیا گیا۔

بہرکیف آپ کے دور کی اصلاحات نے مسلمانوں کو خلافتِ راشدہ کا نمونہ دکھا کر ان میں جو نئی روح پھونکی وہ ایوانِ اقتدار میں چاہے زیادہ عرصے تک نمایاں نہیں رہی مگر امت کے اجتماعی شعور میں اس کا نقشہ ایسا جما کہ آج تک اس کا اثر باقی ہے اور ہر سچے مصلحِ قوم کے لیے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی سیرت مشعلِ راہ ہے۔

قیصرِ روم بھی آپ کی نیک سیرتی سے متاثر:

سلطنتِ روم سے مسلمانوں کے تعلقات کشیدہ چلے آتے تھے۔تاہم قیصرِ روم حضرت عمر بن عبدالعزیز کی نیک سیرتی سے متاثر اور ان کے فضل وکمال کا قائل تھا۔اس دور کا یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کا سفیر روم کے

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ٤/٦٠٠

یہ ضحاک بن مزاحم مشہور مفسر بھی تھے، ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ حمل میں دو سال تک رہے تھے اور دانتوں سمیت پیدا ہوئے تھے۔١٠٢ھ میں فوت ہوئے۔

[2] تاریخ الطبری: ٦/٤٩٧؛ تجارب الامم لابن مسکویہ: ٢/٤٢٢

دورے پر گیا۔ وہاں قیام کے دوران کسی قلعے کے کونے سے تلاوت کی آواز آئی، دیکھا تو ایک نابینا شخص چکی میں گندم پیس رہا تھا۔ سفیر نے اس کا حال پوچھا تو نابینا شخص نے کہا: ''مجھے ایک مدت پہلے گرفتار کیا گیا تھا۔ قیصر نے نصرانیت قبول کرنے کی تلقین کی تھی اور انکار پر آنکھیں پھوڑ دینے کی دھمکی دی تھی۔ میں نے آنکھوں سے محرومی قبول کر لی۔ اس نے آنکھوں میں گرم سلائیاں ڈال کر مجھے اندھا کر دیا۔ اب میں ان کی قید میں گندم پیسا کرتا ہوں۔''

سفیر نے دِمشق واپس آکر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو یہ واقعہ سنایا تو ان کے آنسو بہہ پڑے۔ فوراً اس قیدی کا نام مع ولدیت درج کر کے قیصر کے نام مراسلہ لکھا:

''مجھے خبر ملی ہے کہ یہ مسلمان قیدی تمہاری قید میں ہے۔ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اسے آزاد کر دو، ورنہ میں تمہاری طرف ایسا لشکر بھیجوں گا جس کا پہلا حصہ تمہارے سامنے اور آخری میرے پاس ہوگا۔''

سفیر یہ خط لے کر قیصر کے پاس پہنچا۔ اس نے خط پڑھ کر کہا:

''ہم اس نیک سیرت آدمی کو حملے کی زحمت نہیں دیں گے۔ ہم قیدی کو آزاد کر دیں گے۔''

دو چار دن بعد سفیر دوبارہ قیصر کے دربار میں گیا تو دیکھا وہ تخت سے نیچے افسردہ بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے سفیر کو دیکھتے ہی کہا: ''خبر آئی ہے کہ نیک سیرت شخص کا انتقال ہو گیا ہے۔''

پھر قدرے خاموشی کے بعد کہنے لگا:

''جب کوئی نیک سیرت انسان برے لوگوں کے درمیان ہو تو وہ زیادہ مدت نہیں ٹھہرا کرتا۔''

سفیر قیدی کی بازیابی سے مایوس ہو کر لوٹنے لگا تو قیصر نے کہا:

''یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اس نیک آدمی سے ایک وعدہ کریں اور اس کے مرجانے کے بعد مکر جائیں۔''

یہ کہہ کر اس نے قیدی کو آزاد کر کے سفیر کے ساتھ بھیج دیا۔

اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کی صفات نے غیر مسلم دنیا پر بھی اپنا سکہ جما دیا تھا۔ [1]

وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَآءُ. (کمال وہ ہے جس کا دشمن بھی اعتراف کریں۔)

ترقیاتی کام

اس دوران پوری مملکت میں تعمیری و ترقیاتی کام معمول کے مطابق جاری رہے۔ مگر چونکہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی اصلاحات کے مقابلے میں یہ کام کوئی بڑی حیثیت نہیں رکھتے تھے؛ اس لیے عام تواریخ میں ان کا ذکر بہت کم آتا ہے۔

[1] سیرت عمر بن عبد العزیز لابن عبدالحکم، ص ۱٤۸

ابن عبدالحکم ہی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے قیصر کے ہاں قید تمام مسلمان قیدیوں کی رہائی کا معاہدہ کر لیا تھا اور اپنے ایک نمائندے کو بھیج کر تمام قیدیوں کا فدیہ ادا کرنے کا انتظام کر لیا تھا اور اس بارے میں قیدیوں کے نام ایک مکتوب بھی لکھا تھا، نیز ہر قیدی کے لیے پانچ پانچ دینار بھی بھیجے تھے۔ (سیرت عمر: ص ۱٤٤) غالباً قیصر نے ان قیدیوں کی رہائی کے بعد بھی مذکورہ نابینا قیدی کو آزاد نہیں کیا تھا؛ اسی لیے عمر بن عبدالعزیز کو دھمکی آمیز خط لکھنا پڑا۔

تاہم بعض مثالیں پیش کی جا رہی ہیں:

قرطبہ کا پُل:

اَندُلس کے حاکم نے عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے دریائے قرطبہ پر ایک عظیم الشان پل تعمیر کرایا تھا جس کی بلندی نوے (۹۰) فٹ، چوڑائی تیس فٹ اور لمبائی بارہ سو فٹ تھی۔ ①

سرکاری آمدن میں اضافہ ہوگیا:

عجیب بات یہ ہے کہ ناجائز اور مشکوک ذرائع آمدن پر پابندی عائد کرنے اور عوام کی فلاح و بہبود پر بے دریغ خرچ کرنے کے باوجود سرکاری خزانے میں رقم کبھی کم نہیں ہوتی تھی بلکہ بعض صوبوں میں آمدن پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ عراق کی محصولات کی مقدار حجاج بن یوسف کے دور کے مقابلے میں چار گنا زیادہ ہو چکی تھی؛ اس لیے آپ فرمایا کرتے تھے: ''حجاج کو دین کا سلیقہ تھا نہ دنیا کا۔ وہ اپنے مظالم کے باوجود عراق سے دو کروڑ اسّی لاکھ سے زیادہ وصول نہ کر سکا اور میرے زمانے میں کسی ظلم و زیادتی کے بغیر یہ رقم بارہ کروڑ چالیس لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔'' ②

◆◆ ◆

عمر بن عبدالعزیز کی محبوبیت و مقبولیت، ایک لمحۂ فکریہ

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا کمال یہ تھا کہ ان کے عدل اور نیک سیرتی نے اندرونِ ملک شیعانِ علی، شیعانِ معاویہ، ناصبیوں اور خارجیوں سمیت تمام گروہی اختلافات کو مٹا ڈالا اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب مسلمان بھائی بھائی دکھائی دینے لگے۔ عمر بن عبدالعزیز سب کے محبوب اور سب کے نزدیک مقبول تھے۔

آج بھی کسی فرقے کا کوئی عالم ایسا نہیں جو عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے حسنِ کردار کا گواہ نہ ہو۔ ڈھونڈنے سے بھی ایسا کوئی نہیں ملے گا جو عمر بن عبدالعزیز کا ادب و احترام نہ کرتا ہو۔

---

① نفح الطیب: ۴۸۰/۱

اہم اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ پُل آج بھی باقی ہے۔ حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ نے ایک سفر میں اس پل کا مشاہدہ کیا۔ وہ اس کا حال یوں تحریر فرماتے ہیں:
''آج یہ ایک عام قسم کا پل معلوم ہوتا ہے جو بوسیدگی کی وجہ سے خستہ حالت میں نظر آتا ہے لیکن کسی وقت یہ ساری دنیا کا سب سے عظیم الشان پل سمجھا جاتا تھا۔ اور چونکہ دنیا بھر میں اتنا پختہ، اتنا وسیع اور اتنا مضبوط پل کوئی اور نہ تھا؛ اس لیے یہ دنیا کے عجائب میں شمار ہوتا تھا۔ مسلمانوں سے پہلے یہاں ایک معمولی سا کمزور پل تھا جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو انہوں نے دِمَشق میں بیٹھ کر قرطبہ کی ضروریات کا اندازہ لگایا اور اندلس کے گورنر سمح بن مالک خولانی کو حکم دیا کہ وہ وادی الکبیر پر ایک مستحکم پل تعمیر کریں، چنانچہ ۱۰۱ھ میں ایک ماہر تعمیرات عبدالرحمٰن بن عبیداللہ الغافقی کی نگرانی میں یہ عالی شان پل تعمیر کیا گیا جس کا طول آٹھ سو ہاتھ اور چوڑائی چالیس گز سے زیادہ تھی اور یہ دریا کی سطح سے ساٹھ ہاتھ بلند تھا۔ اس کے نیچے اٹھارہ خوبصورت در تعمیر کیے گئے تھے اور اس کے اوپر انیس بُرج بنائے گئے تھے۔ اس وقت دنیا بھر میں اس پل کی کوئی نظیر نہیں تھی؛ اس لیے اس دور کا ایک مؤرخ لکھتا ہے: ان قنطرة قرطبة احدی اعاجیب الدنیا ''قرطبہ کا پل دنیا کے عجائب میں سے ایک عجوبہ ہے۔'' (نفح الطیب: ۲۶/۱) اس پل کی توسیع اور مرمت بار بار ہوتی رہی لیکن بنیادی طور پر یہ اب بھی وہی پل ہے جو مسلمانوں نے تعمیر کیا تھا۔''
(اندلس میں چند روز، ص ۵۹، ۶۰، طادارۃ المعارف کراچی، سن طباعت ۲۰۰۶ء)

② روضة الاخبار المنتخب من ربیع الابرار، ص ۷۹؛ معجم البلدان: ۲۷۴/۳؛ المنتظم لابن الجوزی: ۳۱۰/۴

لمحۂ فکریہ ہے کہ آخر اسلامی احکام واقدار کے مکمل پابند انسان، دوستوں دشمنوں سب کے ہاں قابلِ احترام کیوں ہیں؟ حد ہے یہ کہ غیر مسلم بھی ان کا نام عزت سے لیتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان ذوالنورین اور حضرت علی المرتضیٰ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھ لیں جنہیں منصف مزاج غیر مسلم مورخ بھی خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ان سب کے کمالات کی بنیاد یہ تھی کہ وہ اسلامی اخلاق سے آراستہ حقیقی اور پختہ مسلمان تھے۔

ایک جگہ رہ کر پوری دنیا پر اثر!!

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے خلافت کا یہ پورا دور دِمشق کے اپنے دفتر، مسجد اور گھر ہی میں گزارا۔ اس دوران کوئی سفر کیا نہ کسی فوجی مہم کی قیادت۔ ایک جگہ بیٹھے بیٹھے آپ نے وہ کچھ کر دکھایا جو آج کل لمبے لمبے دورے اور دور دراز کے سفر کرنے والے سیاست دان ایک صدی میں کر کے نہیں دکھا سکتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر اپنے اختیارات کو صحیح استعمال کیا جائے، نائبین اور ماتحت اچھے چنے جائیں اور وقت ضایع کیے بغیر دیانت داری، خود احتسابی اور خدا خوفی کے ساتھ کام کیا جائے تو ایک کونے میں رہ کر بھی پوری دنیا پر اثرات ڈالے جا سکتے ہیں۔

اِصلاحی کوششوں کی دو خصوصیات:

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی اصلاحی کوششوں کی دو خصوصیات خاص طور پر ہمارے لیے قابلِ غور ہیں: ایک یہ کہ آپ نے اصلاح کی ابتداء اپنی ذات اور اپنے گھر سے کی۔ دوسرے یہ کہ آپ نے دستیاب وسائل اور اختیارات ہی کو بہترین طور پر استعمال کرنے پر توجہ مرکوز رکھی۔ اختیارات اور وسائل کے اضافے کے درپے نہ ہوئے۔

ایک مدت سے دنیا کو سدھارنے کا جذبہ رکھنے والے دو بنیادی غلطیاں کرتے چلے آرہے ہیں: پہلی یہ کہ اپنے نفس اور اپنے گھر کی اصلاح کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ پہلے ساری دنیا ظلم وستم، بدعنوانی، فحاشی اور لاقانونیت سے پاک ہو جائے۔ اس کوشش میں اگر اپنے ذاتی نیک اعمال میں کچھ کمی بھی ہو تو خیر ہے۔ نمازیں چھوٹ جائیں، صورت اور لباس سنت کے مطابق نہ ہو، دعا، ذکر وتلاوت کا بالکل وقت نہ نکلے، تھوڑا بہت مشکوک بلکہ حرام مال بھی استعمال میں آتا ہے تو کوئی حرج نہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ اعمال کی یہ کمی ذاتی معاملہ ہے جس پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں، عظیم قومی خدمات بہر حال ان چھوٹی موٹی کمزوریوں کا مداوا کر دیں گی۔

اس سوچ کے نتیجے میں قوم کے سامنے اصلاح کی آواز تو لگ جاتی ہے مگر اس کے پیچھے کوئی جیتا جاگتا عملی کردار ایسا نہیں ہوتا جسے دیکھ کر سبق حاصل کیا جا سکے۔ عمر بن عبدالعزیز نے اس خطرناک غلطی سے خود کو پوری طرح بچایا۔

دوسری غلطی جو مدتِ دراز سے آج تک رائج چلی آرہی ہے اور نیچے سے لے کر بلند ترین سطح تک دہرائی جارہی ہے، وہ یہ ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کی دعوے دار ہر قوت اپنے اختیارات، وسائل اور حلقۂ اثر میں اضافے کے لیے سرگرم رہتی ہے اور اسی کو اولین ترجیح قرار دے دیتی ہے۔ اگر کوئی افسر ہے تو وہ یہ سوچتا ہے کہ جب تک وہ اعلیٰ افسر نہ بن جائے، کسی قسم کی اصلاحی کوشش میں لگنا بے نتیجہ رہے گا؛ اس لیے وہ اصلاح کی کوشش کو مزید ترقی پر منحصر سمجھ کر یا تو اس

کے لیے ہر جائز وناجائز حربے استعمال کرنے پر ضمیر کو مطمئن کر لیتا ہے جس کی وجہ سے معاشرے میں ایک اور بگڑے ہوئے فرد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یا وہ بالکل مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے جیسا کہ معاشرے کی اکثریت کا وطیرہ ہے۔ یہی سوچ اعلیٰ افسران بلکہ حکمران تک کی ہوتی ہے۔

ملک کے گورنر اور وزراء اگر تبدیلی کے لیے نیک نیت ہوں، تب بھی اپنے موجودہ اختیارات، طاقت اور مادی و افرادی وسائل کو معاشرے کی اصلاح کے لیے ناکافی تصور کرتے ہیں؛ اس لیے اپنے دورِ اقتدار میں ان کی کوشش اختیارات کو بڑھانے کی قانونی جنگ لڑنے، طاقت میں اضافے کے لیے مخالفین کو کچلنے، مادی وسائل میں اضافے کے لیے اپنا بینک بیلنس بڑھانے اور افرادی قوت کو جمع کرنے کے لیے عوام کو جھوٹے بیانات سے مطمئن کرنے اور اپنی کارکردگی کے راگ الاپنے میں گزر جاتا ہے۔

اصلاح کے دعوے دار حزبِ مخالف کے سیاست دانوں کا وقت حکومت میں آنے کی سعی میں گزرتا رہتا ہے۔ انہی کوششوں میں عمر بیت جاتی ہے۔ اصلاحی تحریکوں اور اداروں کے سربراہ دوسری تحریکوں، تنظیموں اور اداروں کو نیچا دکھانے، ان کے افراد کو اپنے ساتھ ملانے اور انہیں ملنے والی امداد کے مواقع اپنی طرف منتقل کرنے کے لیے سرگرم رہتے ہیں۔ ایک طویل مدت سے اس قسم کی کوششیں جاری ہیں جن کا نتیجہ صرف تخریب، فتنہ وفساد اور عوام کی ہر اصلاحی تحریک سے مایوسی کی شکل میں نکل رہا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا طرزِ عمل سامنے رکھیں تو ہم میں سے ہر شخص ابھی سے صحت مند تبدیلی کا آغاز کر سکتا ہے۔ ہم کلرک ہیں یا افسر۔ کسی ادارے کے سربراہ ہیں یا مدرس ومعلم۔ کسی چھوٹی سی تنظیم کے رکن ہیں یا کسی بڑی تحریک کے قائد۔ سپہ سالار ہیں یا معمولی سرکاری افسر، سربراہِ مملکت ہیں یا کچھ اور۔ ہم اولاً اپنی ذاتی کارکردگی درست کریں اور ثانیاً دستیاب وسائل کے بہترین استعمال پر توجہ مرکوز رکھیں۔

یہ انبیائے کرام، خلفائے راشدین اور کامیاب مصلحین کا وہ طرزِ عمل ہے جس سے قدرتی اور فطری طور پر صالح اثرات آگے منتقل ہونے لگتے ہیں۔ مصنوعی نہیں حقیقی طور پر افرادی، مالی اور اختیاراتی وسائل بڑھتے چلے جاتے ہیں مگر ہماری نظر تب بھی وسائل پر نہیں، اپنی کارکردگی پر ہونی چاہیے۔ ہر لمحے اپنا احتساب کارکردگی کو بہترین بناتا ہے اور بہترین کارکردگی فطری انداز میں ضرورت کے مطابق وسائل کو خود وصول کر لیتی ہے۔ اللہ کی طرف سے اصلاح کا نظام یہی چلا آ رہا ہے: من کان للّٰہ کان اللّٰہ لہ.

اور بقولِ اقبال:

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں ۔۔۔ یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے بعد:

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اپنی زندگی میں بھی خاندانِ بنوامیہ میں نہایت ممتاز اور نیک نام تھے اور وفات کے

بعد قابلِ احترام رہے، ان کے بعد بنوامیہ کے جتنے بھی حکمران آئے، وہ اس پر فخر کیا کرتے تھے کہ اس خانوادے میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسی ایک مثال پیدا ہوئی۔ تاہم یہ حکمران قدم بقدم عمر بن عبدالعزیز کے نقشِ راہ پر نہ چلے۔ آخر کیوں؟ غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ حکام کے زاویۂ نگاہ کا فرق تھا۔ سوال یہ تھا کہ آیا مملکت کا انتظام چلانے میں پرامن اور وفادار شہریوں کے اطمینان وسکون اور تحفظ واعتماد کو برقرار رکھنے کی اہمیت زیادہ ہے یا مخالف، مجرم اور سرکش عناصر کو ختم کرنا زیادہ ضروری ہے؟

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا تصورِ عوام کے بارے میں ایسا تھا جیسے شفیق باپ کا بیٹے کے متعلق۔ وہ مملکت کو اپنے گھر کی طرح اور اس کے شہریوں کو اپنے کنبے کی مانند سمجھتے تھے۔ عوام کے بارے میں ان کا تصور یہ تھا کہ اجتماعی طور پر وہ خیر کی طرف مائل ہوتے ہیں، تخریب اور سرکشی کی طرف ان کا رجحان صرف اس وقت بڑھتا ہے جب انہیں ان کے حقوق پورے نہ دیے جائیں؛ اس لیے آپ مملکت کے عوام کو پرامن اور وفادار شہریوں کی حیثیت دیتے ہوئے ان کے اطمینان وسکون اور تحفظ واعتماد کو ہر قیمت پر برقرار رکھنے کو ترجیح دیتے تھے۔ مخالف اور سرکش عناصر کو ختم کرنے کے درپے ہونا آپ کے نزدیک دوسرے درجے کی ذمہ داری تھی۔

دیگر حکمرانوں کی سوچ اس سے مختلف تھی۔ عموماً یہ حکمران بھی ملک وملت کے ساتھ مخلص اور وقارِ قوم کی بلندی کے لیے کوشاں تھے، تبھی ان کے دور میں اہم فتوحات ہوئیں اور بے شمار ترقیاتی کام ہوئے۔ تاہم ان کا زاویۂ نگاہ عوام کے بارے میں یہ تھا کہ لوگ طبعی طور پر شریر بچوں کی طرح سرکشی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ بھلے مانس کم ہوتے ہیں؛ اس لیے ان کی مخالفت اور تخریب پر قابو پانا، شریف لوگوں کے تحفظ واعتماد کو قائم رکھنے سے کہیں زیادہ ضروری ہے؛ کیوں کہ وفادار عوام تو بہرحال وفادار رہیں گے چاہے خوش ہو کر چاہے خوف وہراس میں مبتلا رہ کر۔

اسی لیے بنو مروان کے اکثر عمائد کو عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی اصلاحات سے اختلاف تھا۔ وہ ان کی غیر معمولی احتیاط اور عوام کی خیر خواہی کے اس قدر اہتمام کو مبالغے پر مبنی سمجھتے تھے۔ تاہم انہوں نے زبانی کلامی اعتراض سے بڑھ کر کبھی کچھ نہ کیا اور عملاً ان اصلاحات میں رکاوٹ نہ ڈالی۔ یہ بھی بڑی بات تھی کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے حکم پر چاہے بادلِ نخواستہ ہی سہی، انہوں نے اپنی اکثر جائیدادوں سے بے دخلی بھی گوارا کر لی تھی۔

ہاں ایک چیز ان کے لیے بالکل ناقابلِ برداشت تھی، وہ تھی حکومت کی خاندان سے باہر منتقلی۔ جب انہوں نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو اس پر آمادہ پایا تو خاندانی تعصب کی بناء پر اسے قبول نہ کر سکے۔ کسی روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو کس نے زہر دیا تھا۔ تاہم یہ بات طے ہے کہ اس سے قبل عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ شورائی حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہے کہ اگر وہ ایسا کوئی فیصلہ کر گزرتے تو اس کا نفاذ نہ ہو پاتا، اہلِ خاندان اس پر ہرگز اتفاق نہ کرتے اور بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھتے، غالباً اسی لیے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے قصداً آخر تک ایسا کوئی اعلان نہیں کیا ورنہ زہر خورانی کے بعد بھی وہ چاہتے تو آخری لمحات میں ایسا کر سکتے تھے۔

بہر کیف عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی مساعی رائیگاں نہیں گئی۔ اگلے دور میں نہ صرف بنو مروان بلکہ دیگر خاندانوں اور سلطنتوں کے بعض حکمرانوں کی سیرت پر بھی عمر بن عبدالعزیز کے کردار کا سایہ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ مہدی عباسی، المہتدی، نورالدین زنگی، صلاح الدین ایوبی اور خلیفہ ظاہر باللہ کی زندگیاں اس کی واضح مثالیں ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد والوں میں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے پائے کا کوئی نہیں تھا۔

آج ہر نیا حکمران تمام خرابیوں کا الزام اپنے پیشرو پر عائد کر کے نہ صرف خود کو اصلاحِ احوال سے بری الذمہ سمجھ لیتا ہے بلکہ بھیانک جرائم کے ارتکاب میں بھی خود کو معذور تصور کر لیتا ہے جس کے باعث ہر شعبے میں بُرائیاں بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ عمر بن عبدالعزیز کو بھی خلافت ایسے موقع پر ملی تھی جب گزشتہ حکمرانوں کی غلطیوں کے باعث معاشرہ بگڑ رہا تھا مگر عمر بن عبدالعزیز نے کسی کو الزام دینے کی بجائے نیک نیتی سے اصلاحِ احوال کی کوشش کی اور مختصر وقت میں بہت کچھ بدل کر دکھا دیا۔ آج بھی ان کی اصلاحی کاوشوں کے خطوط سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

◆◆◆

یزید بن عبدالملک (یزید ثانی)

رجب ۱۰۱ھ......تا......شعبان ۱۰۵ھ

فروری 720ء......تا......جنوری 724ء

یزید اپنے بڑے بھائی سلیمان کی وصیت کے مطابق عمر بن عبدالعزیز کے بعد مسندِ خلافت پر بیٹھا۔ وہ عبدالملک کا تیسرا بیٹا تھا جو حکمران بنا۔ بنوامیہ میں یزید نامی یہ دوسرا خلیفہ تھا؛ اس لیے اسے ''یزید ثانی'' کہا جاتا ہے۔ اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی اصلاحات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی مگر ظاہر ہے وہ حوصلہ اور تحمل اس میں نہ تھا؛ اس لیے وہ ان کی پوری طرح پیروی نہ کر پایا۔

اندرونی خطرات:

یزید ثانی کو بعض اندرونی بغاوتوں سے پالا پڑا جس کا اس نے مستعدی سے تدارک کیا۔

عمر بن عبدالعزیز کے آخری ایام میں خوارج اٹھ کھڑے ہوئے تھے مگر حکومت سے ان کے مذاکرات چل رہے تھے۔ سرکاری فوجیں اور خوارج عراق میں آمنے سامنے خیمہ زن تھے۔ اس دوران کسی حتمی فیصلے سے پہلے ہی عمر بن عبدالعزیز کی وفات ہوگئی۔ ان کی وفات کی اطلاع مشہور ہوتے ہی مذاکرات کا دروازہ بند ہوگیا اور خوارج اور سرکاری افواج کے درمیان جھڑپیں شروع ہوگئیں۔ شروع میں خوارج غالب آتے رہے مگر آخر میں جب دارالخلافہ سے مَسلَمَہ بن عبدالملک تازہ دم افواج لے کر آیا تو خوارج کو پسپا ہونا پڑا۔[1]

دوسرا فتنہ یزید بن مُہلَّب کا تھا۔ یہ بنوامیہ کے نامور فاتح مُہلَّب بن ابی صفرہ کا فرزند اور نہایت عالی مرتبہ سپہ سالار تھا۔ سلیمان کے دور میں اسی نے طبرستان فتح کیا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز نے اپنے ایام خلافت میں اس سے مال غنیمت کے خمس کا حساب طلب کیا تھا جو یہ نہ دے سکا۔ اس پر اسے قید کر دیا گیا۔ عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے بعد یہ جیل سے فرار ہوگیا اور عراق جا کر بغاوت کا اعلان کر دیا۔ یہاں اس کے خاندان اور بھائیوں کا بڑا اثر و رسوخ تھا؛ اس لیے بہت سے لوگ ان کے گرد جمع ہوگئے۔ شروع شروع میں یزید بن مُہلَّب کو کامیابی ہوئی، بصرہ اور کوفہ پر اس کا قبضہ ہوگیا۔

[1] الکامل فی التاریخ: سنة ۱۰۱ھ

آخرکار یزیدِ ثانی نے مَسلَمہ بن عبدالملک کو لشکرِ جرار دے کر اس کی طرف بھیجا۔ ''انبار'' کے قریب ایک خونریز جنگ میں مُہلّب کو شکست ہوئی۔ وہ خود مارا گیا اور اس کے بھائی بلوچستان کی طرف فرار ہو گئے۔ یہاں انہوں نے قندابیل کے حاکم کے پاس پناہ لی تاہم یزیدِ ثانی نے تعاقب کرا کے سب کو قتل کرا دیا۔ ①

تیسرا خطرہ وسطِ ایشیا میں ترکوں کی بغاوت کا تھا جس کے پیچھے اس بار بھی خاقان چین کا ہاتھ تھا۔ یزیدِ ثانی کی طرف سے بھیجے گئے سالار اس پر پوری طرح قابو نہ پا سکے تو یزیدِ ثانی نے ۱۰۳ھ میں یہاں سعید بن ہُبَیرہ جیسے تجربہ کار امیر کو تعینات کیا جس نے پے در پے جنگیں لڑ کر صُغد، کَش اور نَسَف سمیت ماوراء النہر کے تمام مخدوش علاقوں پر قابو پا لیا۔ ②

چوتھا خطرہ بحیرۂ خزر (کیسپین سی) کے ساتھ آباد مقبوضہ علاقوں میں شورش ابھرنے کا تھا۔ یہ نہایت فلک بوس پہاڑوں کا پرخطر علاقہ تھا جس میں مہم جوئی بہت مشکل تھی۔ یزیدِ ثانی نے جَرّاح بن عبداللہ کو آرمینیا کا حاکم مقرر کر کے یہ مہم اس کے سپرد کی۔ جرّاح نے جاں توڑ لڑائیوں کے بعد باغیوں کو کچل دیا اور پورے علاقے میں امن وامان قائم ہو گیا۔ ③

بیرونی مہمات......فرانس پر حملہ:

یزیدِ ثانی کے دور میں بیرونی مہمات بھی ہوئیں۔ اَندلُس کی اسلامی فوج نے مقامی حاکم سمح بن مالک کی قیادت میں فرانس پر یلغار کی۔ جبال البرانس (کوہِ پرنیز) کو عبور کرتے ہوئے اسلامی فوج فرانس کی حدود میں داخل ہوئی۔ راستے میں پہلی ریاست ''نارمن'' آتی تھی۔ سمح بن مالک نے محاصرہ کیا تو مقامی نواب حلقۂ اطاعت میں داخل ہو گئے۔

اب مسلمان ریاست ایکی ٹن کی طرف بڑھے اور اس کے پایۂ تخت ''ٹولوس'' کا محاصرہ کر لیا۔ تاہم اس دوران وہاں کا حاکم ڈیوک آف ایکی ٹن جو شہر سے باہر تھا، بھاری لشکر لے کر مقابلے پر پہنچ گیا۔ گھمسان کی جنگ کے دوران امیر سمح دشمن کی صفوں میں گھستے چلے گئے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ مسلمانوں کی بڑی تعداد اس معرکے میں کام آئی۔ باقی لشکر عبدالرحمٰن غافقی کی قیادت میں پسپا ہو کر فرانس کی حدود کے اندر کوہِ پرنیز پر آکر خیمہ زن ہو گیا۔

یزیدِ ثانی کے آخری ایام میں اَندلُس کے نئے حاکم عَنبَسہ بن سُحَیم نے دوبارہ فوج کشی کی اور ''کرکسون'' سمیت کچھ علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ ''سپٹی مینیا'' کے پورے علاقے نے اطاعت قبول کر لی۔ عنبسہ نے اب وسطی فرانس کا رخ کیا اور دریائے رہون کی وادی سے گزر کر ''لیانس'' کو فتح کیا۔ اس کے بعد اسلامی فوج ''برگنڈی'' اور ''اوٹن'' پر فتح کے پرچم گاڑتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

فرانسیسیوں نے مسلمانوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے چھاپہ مار حملے شروع کر دیے جس سے مسلمانوں کو خاصی دقت پیش آنے لگی۔ ایسے ایک حملے کو پسپا کرنے کی کوشش کے دوران امیر عَنبَسہ کو شدید زخم آئے جو مہلک ثابت ہوئے۔ ان کی شہادت کے بعد مسلمان پیچھے ہٹ کر ''ناربونہ'' آگئے۔ ④

① تاریخ الطبری: ۵۸۴/۶ تا ۶۰۵
② الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۰۳ھ، ۱۰۴ھ
③ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۰۴ھ
④ التاریخ الاسلامی العام: ۳۱۵ تا ۳۱۷

ابھی یہ مہمات جاری تھیں کہ یزیدِ ثانی نے ۲۵ شعبان ۱۰۵ھ کو ’’دق وسل‘‘ کے مرض میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔ ①

اس کی عمر ۳۴ سال تھی۔ چار سال ایک ماہ تک حکومت کا موقع ملا۔ وفات سے پہلے اس نے اپنے بعد اپنے بھائی ہشام اور پھر اپنے بیٹے ولید کو جانشین مقرر کر دیا تھا۔ ②

سیرت و کردار:

یزیدِ ثانی کی سیرت و کردار کے بارے میں کئی منفی روایات مشہور ہیں جو سند کے لحاظ سے سخت مشکوک ہیں؛ کیوں کہ ان کے راوی ضعیف و کذاب یا مجہول ہیں۔ ان میں سے ایک روایت کے مطابق یزیدِ ثانی نے چالیس دن تک عمر بن عبدالعزیز کی پیروی کی، اس کے بعد چالیس بوڑھوں نے اس کے سامنے گواہی دی کہ اللہ نے خلفاء سے حساب کتاب معاف کر رکھا ہے۔ یہ سن کر یزید نے عمر بن عبدالعزیز کی اصلاحات منسوخ کر کے پھر سابقہ حکام کا طرز اختیار کر لیا۔

سند کے لحاظ سے بے حیثیت ہونے کے علاوہ یہ روایت درایتاً بھی قابلِ قبول نہیں؛ کیوں کہ کوئی مسلمان جسے دین کا تھوڑا بہت بھی علم ہو، وہ حساب معاف ہونے کا عقیدہ نہیں اپنا سکتا۔ نیز اگر ایسا ہوتا تو اس دور کے علماء و فقہاءِ حکومت کے رنگ ڈھنگ اس حد تک بدلتے دیکھ کر فوراً اس بدعقیدگی کی تردید کرتے۔

ایک روایت کے مطابق یزیدِ ثانی اپنی ایک باندی کا دل و جان سے عاشق تھا۔ باندی کے مرنے پر وہ غم سے ایسا نڈھال ہوا کہ اسی صدمے سے مر گیا۔ اس قصے کو طبری نے مدائنی سے بسند منقطع نقل کیا ہے جبکہ بلاذری نے انساب الاشراف میں اسے ابن جُعْدُبَہ اور ہیثم بن عدی جیسے متروک اور کذاب راویوں سے نقل کیا ہے۔ جن کا نام ہی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ یہ ایک من گھڑت قصہ ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں۔ بعض مؤرخین نے یزیدِ ثانی کو عیاش اور شرابی کہا ہے۔ یہ بھی کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو عمر بن عبدالعزیز اسے جانشین برقرار نہ رکھتے۔

ہاں یہ درست ہے کہ کارکردگی کے لحاظ سے وہ عمر بن عبدالعزیز جیسی احتیاط و امانت کا مظاہرہ نہ کر پایا۔ ظاہر ہے عزیمت پر چلنے والے لوگ کم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی جواز کی حدود میں رہے تو اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

یہ ثابت نہیں کہ یزیدِ ثانی یا بعد میں بنو مروان کے کسی خلیفہ نے باقاعدہ طور پر عمر بن عبدالعزیز کی اصلاحات ختم کرنے کا حکم دیا ہو۔ قرائن بتاتے ہیں کہ یہ اصلاحات بڑی حد تک برقرار رہیں جیسا کہ اس پر سبھی کا اتفاق ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف بدگوئی پر قانوناً جو قدغن لگائی وہ بعد میں ہمیشہ باقی رہی۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ عمرِ ثانی کی اصلاحات جس ولولے اور جذبے پر مبنی تھیں، وہ بعد کے خلفاء میں نہ تھا؛ اس لیے آہستہ آہستہ ان کے نفاذ کی طرف توجہ کم ہوتی گئی اور آخر کار نظامِ حکومت پر بعض ایسی خرابیاں حاوی ہو گئیں جو سلطنت کے خاتمے کا پیش خیمہ بن گئیں۔ ان خرابیوں کا ذکر بنو مروان کی حکومت کے خاتمے پر تفصیل سے کیا جائے گا۔

---

① البدایة والنهایة: ۱۵/۱۳ ...... امام احمد بن حنبل یزید بن عبدالملک سے حدیث کی روایت کو جائز قرار دیتے تھے۔ وسألته عن يزيد بن عبدالملك بن مروان فقال: هذا افضل من ذاك يعنى يزيد بن معاوية، قلت: يذكر عنه الحديث؟ قال: نعم. (المنتخب من علل الخلال از ابن قدامه، ص ۲۳۷)

ہشام بن عبدالملک

شعبان ۱۰۵ھ......تا......ربیع الآخر ۱۲۵ھ
فروری 724ء......تا......فروری 743ء

ہشام بن عبدالملک علم وفضل، تدبر وسیاست اور ہمت وشجاعت میں ہو بہو باپ پر گیا تھا۔ وہ سپاہی پیشہ انسان تھا۔ اس کی تخت نشینی کے بعد جہادی مہمات وفتوحات کے لیے افواج مسلسل نکلتی رہیں۔ وہ بہت حوصلہ مند انسان تھا۔ اس کی خلافت کا زمانہ بھی بنومروان میں سب سے طویل رہا۔ وہ مملکت کا دائرہ وسیع کرنے کی مسلسل کوشش کرتا رہا۔

جہادِ سندھ:

ہشام کے دور میں سندھ کا محاذ ایک بار پھر گرم ہوگیا۔ راجا داہر کے بیٹے جے سنگھ نے عمر بن عبدالعزیز کے دور میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ ہشام کے زمانے میں وہ مرتد ہو کر مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ سندھ کا حاکم جنید بن عبدالرحمٰن نہایت بہادر اور آزمودہ کار سپاہی تھا۔ اس نے دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر جے سنگھ کی یلغار کا سامنا کیا۔ لڑائی میں جے سنگھ کو شکستِ فاش ہوئی اور وہ زندہ گرفتار کر لیا گیا۔ جنید نے اسے قتل کرا دیا۔ اس کے بعد جنید نے محمد بن قاسم کے مفتوحہ علاقے میں توسیع کا ارادہ کیا اور نئی افواج تیار کر کے انہیں مشرق کی سمت راجھستان، رن کچھ اور گجرات تک پھیلا دیا۔ سندھ میں جنید کا تقرر ۱۰۷ھ میں ہوا تھا۔ تب سے وہ اپنی معزولی (۱۱۱ھ) تک یہاں مسلسل مہمات میں مصروف رہا۔ اس دوران ماروا ڑ، اجین اور مالوہ سمیت بہت بڑا علاقہ اسلامی عمل داری میں شامل ہو گیا۔[1]

سندھ میں اسلامی مرکز ''منصورہ'' کی تعمیر:

جنید کو ۱۱۱ھ میں خراسان بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد بعض نااہل نائبین کی وجہ سے سندھ کے حالات قابو میں نہ رہ سکے اور چند ہی برسوں میں یہاں کے اکثر مفتوحہ علاقے باغیوں کے قبضے میں چلے گئے۔ آخر حکم بن عوانہ نامی ایک افسر نے آکر محمد بن قاسم کے بیٹے عمرو بن محمد کی مدد سے یہاں کچھ علاقے دوبارہ فتح کیے اور دریائے سندھ کے مشرق میں مسلمانوں کا ایک محفوظ شہر ''منصورہ'' آباد کیا جو آگے چل کر سندھ میں مسلمانوں کا مرکز بنا۔[2]

---

① الکامل فی التاریخ: ۱۷۶/٤؛ فتوح البلدان، ص ٤٢٥
② فتوح البلدان، ص ٤٢٦، ٤٢٧

مہماتِ ترکستان:

ہشام کے دور کا دوسرا بڑا واقعہ ترکستان یعنی وسطِ ایشیا پر خاقانِ چین کا حملہ تھا۔ اس علاقے میں ابھی اسلام پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ چین کا ہر خاقان، یہاں اپنے آباؤ اجداد کے صدیوں پرانے اثر ورسوخ کو برقرار رکھنے کی سرتوڑ کوشش کرتا آرہا تھا؛ اس لیے یہاں بار بار بغاوتیں ہوتی تھیں۔

۱۰۹ھ میں ہشام بن عبدالملک نے اَشرَس بن عبداللہ کو یہاں کا حاکم مقرر کیا۔ اَشرَس بڑا عالم فاضل اور نیک و صالح انسان تھا۔ اس نے بغاوتوں پر قابو پانے کا بہترین طریقہ یہی سمجھا کہ مقامی لوگوں میں اسلام کی بھرپور تبلیغ کی جائے تاکہ وہ مشرف باسلام ہو کر حکومت کے صحیح وفادار ثابت ہوں۔ اشرس کے بھیجے گئے مبلغین کی کوششوں سے ایک سال کے اندر اندر سمرقند اور گردونواح کے لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے اور اپنے علاقوں میں کثرت سے نئی مساجد آباد کیں۔

اس موقع پر حکومت نے ایک بڑی غلطی کردی وہ یہ کہ ان نومسلموں سے جزیہ معاف نہ کیا گیا جو ان کا شرعی حق تھا۔ اس صورتحال سے یہ نومسلم حکومت سے بداعتماد ہوگئے۔ کئی سرکاری امیر بھی حکومت کے اس اقدام پر نکتہ چینی کرتے رہے مگر جب حکومت نے اپنا فیصلہ تبدیل نہ کیا تو یہ سرکاری امیر نومسلم لوگوں کی حمایت میں کھڑے ہوگئے۔ اس طرح ترکستان میں بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔[1]

جب سرکاری افواج ان باغیوں کو کچلنے کے لیے نکلیں تو باغی سرداروں نے حکومت کے مقابلے میں اپنی طاقت کم محسوس کر کے خاقانِ چین سے فوجی امداد طلب کی۔ بخارا اور سغد کے بہت سے نومسلم مرتد ہو کر خاقانِ چین سے جاملے جسے ایسے ہی موقعے کا انتظار تھا۔ وہ اپنی فوجیں لے کر ان کی مدد کے لیے آن پہنچا اور تقریباً پورے ماوراء النہر پر تسلط حاصل کر لیا۔

اَشرس یہ صورتحال دیکھ کر اپنے مستقر ''مَرْو'' سے نکلا اور دریائے آمو کے کنارے آکر یکے بعد دیگرے کئی جرنیلوں کو خاقان کے مقابلے میں بھیجا۔ کئی ماہ تک جھڑپوں کا سلسلہ چلتا رہا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر اشرس خود آمو دریا عبور کر کے ماوراء النہر میں داخل ہوا اور پہلے بیکند کا رخ کیا۔ اس علاقے میں پانی کی قلت تھی۔ حریف نے مسلمانوں کے راستے میں آنے والے تالاب خشک کر دیے اور نہروں کا پانی بند کر دیا۔ مسلمان بیکند کے قریب پہنچے تو پیاس سے جاں بلب تھے۔ ادھر سے دشمن سروں پر آن پہنچا تھا۔ پیاس کی شدت کے باعث مسلمان سپاہیوں میں لڑنے کی ذرا بھی طاقت نہیں تھی۔ قریب تھا کہ سب ہتھیار ڈال کر گرفتار ہو جاتے کہ ایک عرب سردار حارث بن سُریج نے للکار کر کہا:

''مسلمانو! پیاسا مرنے کی بجائے تلوار کا وار سہہ کر مرنا عزت کی بات بھی ہے اور اجر وثواب کی بھی۔''

یہ سنتے ہی مردہ جسموں میں حرارت دوڑ گئی اور سب تلواریں سونت کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ ترک اس غیر متوقع حملے

[1] تاریخ الطبری: ۷/۵٤ تا ۵٦

سے حواس باختہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے اور مسلمان آگے بڑھتے ہوئے ایک نہر تک پہنچ گئے۔

یہاں سب نے پیاس بجھائی، جانوروں کو سیراب کیا، بہت سے مجاہدین نے غسل بھی کیا۔ اس کے بعد تازہ دم ہو کر دوبارہ مقابلے کے لیے نکلے۔ دن بھر غضب کی لڑائی ہوتی رہی۔ ترکوں کا ٹڈی دل لشکر آسانی سے شکست کھانے والا نہ تھا۔ یہ دیکھ کر قَطَن بن قُتَیبہ اور اسحٰق بن محمد نامی دو عرب افسران نے بنو تمیم اور بنو قیس کے چنیدہ جوانوں کو جمع کر کے ان سے موت پر بیعت لی اور دشمن پر یک بارگی حملہ کر دیا۔

ثابت بن قُطنہ نامی ایک بزرگ نے آواز لگائی: ''میں ان سے لڑائی کا خوب تجربہ رکھتا ہوں۔''

یہ کہہ کر بہترین سواروں کو ساتھ لے کر حریف پر چل پڑے۔

وہ کہہ رہے تھے: ''اللہ کی قسم! بنو امیہ مجھے زنجیروں میں جکڑا نہ دیکھ پائیں گے۔''

لڑتے لڑتے آخر وہ زخمی ہو کر گر پڑے۔ آخری لمحات میں ان کے لبوں پر یہ دعا تھی:

''اے اللہ! میں کل ابن بُسطام کا مہمان تھا، آج شام تیرا مہمان بننا چاہتا ہوں۔ جنت دے کر میزبانی کر۔''

ثابت کے ساتھ اس معرکے میں صَخر بن مسلم اور عبدالملک بن دِثار جیسے نامور غازیوں نے شہادت پائی۔ یہ ہولناک جنگ رات کا اندھیرا پھیلنے پر ختم ہوئی۔

اس کے بعد خراسان اور ماوراء النہر میں مسلمانوں اور خاقان کے درمیان کئی جنگیں ہوئیں۔ آخر کار یہ سلسلہ ایک صلح نامے پر ختم ہوا اور حریف افواج اپنے اپنے علاقوں کی طرف لوٹ گئیں۔

دِمشق میں ہشام بن عبدالملک وسطِ ایشیا کی اس صورتحال پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اس نے دیکھا کہ فیصلہ کن فتح نہیں ہو رہی تو اشرس بن عبداللہ کو معزول کر کے ۱۱۱ھ میں سندھ کے حاکم جنید بن عبدالرحمٰن کو یہاں تعینات کر دیا۔

جنید ایک کہنہ مشق اور نہایت دلیر جرنیل تھا۔ اس نے ''مرو'' پہنچتے ہی افواج کو منظم کیا اور آمو دریا عبور کر کے بڑی مستعدی سے باغیوں اور خاقان سے جنگ چھیڑ دی۔ خاقان کی افواج کو شکست ہوئی اور اس کا چچا زاد بھائی گرفتار کر لیا گیا۔ وقتی طور پر بغاوت دب گئی۔[1]

تاہم باغی اندر ہی اندر تیاری میں مصروف رہے۔ اگلے سال انہوں نے پھر سر اٹھایا اور خاقان نے ان کا ساتھ دیا۔ بغاوت کے شعلے سب سے پہلے ''تخار'' میں بھڑکے۔ جنید بن عبدالرحمٰن نے اپنے مستقر ''مَرو'' سے افواج لے کر اُدھر کا رخ کیا تو ترکوں نے منصوبے کے مطابق سمرقند کے چاروں طرف بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ خاقان چین خود اپنا ٹڈی دل لشکر لے کر وہاں پہنچ گیا اور شہر کے قریب پڑاؤ ڈال دیا۔

سمرقند کے حاکم سَورہ بن حُر کے پاس باغیوں کی اتنی بڑی جمعیت کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ اس نے جنید بن عبدالرحمٰن کو اطلاع دے کر مدد طلب کی۔

---

[1] تاریخ الطبری: ۶۹،۶۸/۷

جنید ''تخار'' کے محاذ سے فارغ نہیں ہوا تھا۔ اس نئی شورش نے مزید پریشان کن صورتحال پیدا کردی تھی۔ تاہم سمرقند وسطِ ایشیا کا مرکز تھا؛ اس لیے اس کی حفاظت کہیں زیادہ اہم تھی۔ جنید نے فوری طور پر اپنے پاس موجود فوج کے ساتھ سمرقند روانگی کا فیصلہ کرلیا۔ بعض تجربہ کار افسران نے اس فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا:

''یہ معرکہ ترکوں سے ہے۔ اس کے لیے کم از کم پچاس ہزار افراد کی فراہمی ضروری ہے۔ ابھی ہماری افواج مختلف محاذوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ انہیں جمع کرکے پھر سمرقند بھیجا جائے۔''

جنید بن عبدالرحمٰن نے یہ سن کر ایک سرد آہ بھری اور کہا:

''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ادھر میرا بھائی سَوْرَہ بن حُر مصیبت میں گرفتار ہے اور میں پچاس ہزار افراد جمع ہونے کا انتظار کرتا رہوں۔''

یہ کہہ کر فوج کو سمرقند کی طرف کوچ کا حکم دیا۔ یہ مختصر سی فوج منزلیں مارتی بڑی تیزی سے پہاڑی سلسلے عبور کرتی ہوئی سمرقند کے قریب پہنچ گئی۔

باغی ترکوں اور خاقانِ چین کو جب معلوم ہوا کہ جنید بن عبدالرحمٰن خود اہلِ سمرقند کے لیے کمک لے کر آرہا ہے تو اسے روکنا زیادہ ضروری سمجھا اور تھوڑی سی فوج سمرقند کے سامنے چھوڑ کر جنید سے مقابلے کے لیے روانہ ہوگئے۔

جنید ابھی سمرقند سے کوئی چالیس میل (تقریباً ۶۵ کلومیٹر) دور تھا کہ خاقان اپنے لشکر جرار کے ساتھ دیوار بن کر سامنے آگیا۔ جنید نے ایک پہاڑ کو پشت پر رکھ کر خاقان کی فوج کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور تعداد کی کمی کے باوجود دشمن کو غالب نہ آنے دیا۔ تاہم وہ حریف کو میدان سے ہٹا کر سمرقند پہنچنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ دو دن تک یہ جنگ جاری رہی اور مسلمانوں کا پلہ کمزور پڑنے لگا۔

آخر جنید نے تیز رفتار قاصد بھیج کر سَوْرَہ بن حُر کو پیغام دیا:

''ہم صرف دو دن کی مسافت پر خاقان سے نبرد آزما ہیں۔ تم فوج لے کر نہر کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے حریف کی پشت پر حملہ کردو تو ہم جنگ جیت سکتے ہیں۔''

یہ پیغام ملتے ہی سَوْرَہ بن حُر سمرقند کی بارہ ہزار فوج کو لے کر نکل پڑا مگر اس سے ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ جنید کے بتائے ہوئے راستے کی بجائے ایک اور سمت سے پیش قدمی کی۔ ادھر ترکوں نے ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ انہوں نے سورۃ بن جبر کی فوج کو گھیر لیا۔ سورہ نے ان کی صفیں چیر کر نکلنے کی کوشش کی، اس دھاوے میں ترکوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ انہوں نے سورہ کا راستہ روکنے کے لیے جنگل میں آگ لگادی۔ بہت سے مسلمان اس کی لپیٹ میں آگئے۔ اب ترکوں نے مسلمانوں کو گھیر کر اس طرح روندا کہ بارہ ہزار میں سے بمشکل صرف دو ہزار جان بچا کر نکل سکے، باقی سب وہیں شہید ہوگئے۔ خود سَوْرَہ بن حُر کا گھوڑا بدکا اور وہ زمین پر گر پڑا؛ جس سے ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ زخم کی شدت اور بے تحاشا خون بہہ جانے کی وجہ سے آخر سَوْرَہ نے بھی جامِ شہادت نوش کیا۔

جنید کو سمرقند کی امدادی فوج کی تباہی اور سَورَہ کی شہادت کی اطلاع ملی تو اس نے واپسی کا ارادہ کر لیا مگر اس دوران خاقان کی فوج نے اسے ہر طرف سے گھیر لیا تھا۔

مقابلے کے سوا کوئی صورت باقی نہ دیکھ کر جنید بن عبدالرحمٰن اپنے سپاہیوں کے ساتھ سر پر کفن باندھ کے میدان میں نکل آیا۔ اس کے ساتھ غلاموں کی خاصی تعداد تھی۔ اس نے اعلان کیا:

''جو غلام آج جاں توڑ لڑائی لڑے گا وہ آزاد ہے۔''

اس کے ساتھ ہی مسلمانوں نے حریف پر زوردار حملہ کر دیا۔ ترکوں نے بھی جنگ جیتنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اس دن بنوازد کے یکے بعد دیگرے اٹھارہ علم بردار شہید ہوئے مگر انہوں نے پرچم اسلام کو گرنے نہ دیا۔ یہ جنگ اس شدت کی تھی کہ دونوں لشکروں نے اپنی ساری طاقت جھونک ڈالی اور سپاہی لڑتے لڑتے اتنے نڈھال ہو گئے کہ تلواروں کی ضربوں میں کوئی زور نہ رہا۔ آخر لوگ تلواریں پھینک کر خالی ہاتھ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہونے لگے۔ جمعے کے دن شروع ہونے والی یہ لڑائی ہفتے کی دوپہر تک برابر جاری رہی۔ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد شہید ہوئی جس میں سینکڑوں نامور جرنیل، غازی اور مجاہد شامل تھے۔ گھڑ سوار فوج تقریباً ساری ہی کٹ گئی تھی۔ صرف پیادہ سپاہی کسی قدر محفوظ تھے۔

جنید نے اس صورتحال میں پیچھے ہٹ کر ان پیادہ سپاہیوں کو منظم کیا۔ اب دشمن کی صفیں چیر کر نکلنے یا شہید ہو جانے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ ترک جب ان کی طرف بڑھے تو ایک عمر رسیدہ مجاہد زیاد بن الحارث نے کہا:

''مجھے ان سے جنگوں کا ستر سالہ تجربہ ہے۔ ان کو اپنے قریب آنے دو، پھر یکایک حملہ کرو۔''

مسلمانوں نے ایسا ہی کیا، ترک جوں ہی قریب آئے، یہ ان کی صفیں الٹتے ہوئے گھیرے سے دور نکل گئے۔

خاقان یہ منظر دیکھ کر بولا:

''عرب جب ہر طرف سے گھر جاتے ہیں تو پھر مرنے کے لیے لڑتے ہیں۔''

جنید ان باقی ماندہ سپاہیوں کے ساتھ سمرقند میں داخل ہو گیا۔ ابھی جنگ ختم نہیں ہوئی تھی۔ خاقان چین لشکر کے ساتھ باہر موجود تھا اور کسی بھی وقت شہر کا محاصرہ کر سکتا تھا۔ جنید نے اس خطرے کے پیش نظر فوری طور پر خلیفہ ہشام بن عبدالملک کو مراسلہ لکھ کر کمک طلب کی اور احساس دلایا کہ تاخیر کی صورت میں پورا وسطِ ایشیا مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل سکتا ہے۔ ہشام نے پیغام ملتے ہی کوفہ اور بصرہ کی چھاؤنیوں سے بیس ہزار تازہ دم سپاہیوں کی کمک، بھاری مقدار میں اسلحہ اور نقد رقم روانہ کر دی۔ ساتھ ہی جنید کو کہا کہ وہ سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ان کی تنخواہیں بڑھا سکتا ہے۔

امدادی افواج کے بروقت پہنچنے سے سمرقند میں مقیم مسلمانوں کی ہمت بڑھ گئی۔ ادھر خاقان نے سمرقند کا دفاع مضبوط دیکھ کر یہاں حملے کا ارادہ ترک کر دیا اور بخارا کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔

جنید یہ اطلاع ملتے ہی خاقان کے تعاقب میں نکل پڑا اور اسے راستے ہی میں جا لیا۔ یکم رمضان ۱۱۲ھ کو فریقین میں مقابلہ ہوا۔ جنید کے حملے میں خاقان کے بہت سے سپاہی مارے گئے اور وہ باقی فوج کو محفوظ رکھنے کے لیے بخارا کا

ارادہ ملتوی کر کے واپس ہو گیا۔

خاقان کو اس طرح ناکام پسپا کر دینا جنید کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ جنید بن عبدالرحمٰن ۱۱۶ھ تک وسطِ ایشیا کا گورنر رہا۔ اس کے بعد اسے معزول کر دیا گیا۔ معزولی کے چند دنوں بعد ہی اس مردِ مجاہد کا انتقال ہو گیا۔

۱۱۹ھ میں خاقانِ چین نے ایک بار پھر وسطِ ایشیا میں مداخلت کی۔ دریائے آمو کے پار اس کا مقابلہ خراسان کے نئے گورنر اسد بن عبداللہ قسری سے ہوا۔ خاقان کو یہاں پھر شکستِ فاش ہوئی اور وہ بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔

اگلے سال اس نے پھر یلغار کی مگر اس دوران اس کا اپنے معتمد سردار ''کورصول'' سے جھگڑا ہو گیا۔ بات اتنی بڑھی کہ اس سردار نے بغاوت کر دی۔ ایک شب اس نے اچانک حملہ کر کے خاقان کو قتل کر ڈالا۔

''کورصول'' بہت معرکہ آزما سردار تھا، ۷۲ جنگیں لڑ چکا تھا؛ اس لیے ترکوں نے اسی کو اپنا ''خاقان'' بنالیا۔

اس دوران وسطِ ایشیا میں نصر بن سیّار نامی نئے گورنر کا تقرر ہوا۔ یہ بہت نیک سیرت آدمی اور اعلیٰ پائے کا منتظم تھا۔ اس نے ہر شعبے کو بڑی ترقی دی۔ خلیفہ سے اجازت لے کر نومسلموں سے جزیہ لینا بند کرایا۔ خراج اور محصولات کی بدعنوانیوں کو دور کیا۔ مظالم کی تحقیقات کرا کے عوام کو فوری انصاف فراہم کیا۔ اس طرح نومسلموں کی شکایات دور ہو گئیں اور وہ بغاوتوں کا حصہ بننے سے باز آ گئے۔

اس کے بعد اس نے نئے خاقان ''کورصول'' سے نمٹنے کی تیاری کی اور اس کے مقبوضہ علاقوں پر مختلف سمتوں سے فوج کشی شروع کی۔ کورصول خود مقابلے پر نکلا۔ دریائے شاش کے پاس فریقین میں ہولناک تصادم ہوا۔ اس لڑائی میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ آخر کار ''کورصول'' گرفتار ہو گیا اور ترکوں کو شکستِ فاش ہوئی۔ وہ مسلمانوں کا بڑا خطرناک دشمن تھا؛ اس لیے اسے قتل کر دیا گیا۔ ①

نصر بن سیّار نے ایک عرب امیر قاسم بن بخیت کے ہاتھ فیصلہ کن فتح کی خوشخبری دمشق روانہ کر دی۔ ہشام بن عبدالملک بڑی بے چینی سے ترکستان کے محاذ کی خبروں کا منتظر رہتا تھا۔ قاسم بن بخیت نے ایوانِ خلافت کے دروازے پر آ کر تکبیر کا نعرہ لگایا۔ پھر مسلسل تکبیر کہتے ہوئے دربار میں پہنچا اور آواز لگائی:

''امیر المؤمنین کو فتح مبارک۔''

جواب میں ہشام نے بھی تکبیر کا نعرہ بلند کیا اور تخت سے اتر کر سجدے میں گر گیا۔ ②

''کورصول'' کے بعد ترکوں کا کوئی قائد باقی نہیں رہا تھا۔ وہ خود سالہا سال کی جنگوں سے اکتا چکے تھے۔ ادھر مقامی باشندے بھی اب ان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے؛ اس لیے انہوں نے کچھ شرائط پیش کر کے مستقل صلح کی درخواست کی۔ گزشتہ حکام یہ شرائط مسترد کر رہے تھے مگر نصر بن سیّار نے انہیں قبول کر لیا۔

اس طرح ایک طویل عرصے بعد ترکستان میں امن وامان قائم ہوا۔ ③

① تاریخ الطبری: ۸۴/۷ تا ۱۲۶ ② تاریخ الطبری: ۱۲۶/۷، ۱۲۷ ③ تاریخ الطبری: ۸۴/۷تا۱۲۷

گرجستان اور آرمینیا کا جہاد:

۱۰۶ھ میں بحیرۂ کیسپین کے ساحلوں پر آرمینیا اور بلادِ خزر پر جرّاح بن عبداللہ حکمی نے جہادی مہمات انجام دیں۔ لان کے سرکش قبائل خراج اور جزیہ دینا منظور کرکے سرنگوں ہوئے۔

۱۱۲ھ میں قبائل نے پھر بغاوت کی اور خاقان چین کے بیٹے کی قیادت میں جمع ہوکر پورے آذربائی جان پر تسلط حاصل کرلیا۔ ان کے فتنے کی روک تھام کے لیے جرّاح نے وادی سبلان کے دریا پر ایک پل تعمیر کرایا جو'جسرِ جرّاح' کے نام سے مشہور ہوا۔

اس دوران باغیوں نے آذربائی جان کے اسلامی شہر''اردبیل'' کا محاصرہ کرلیا۔ جرّاح بن عبداللہ نے یہ اطلاع ملتے ہی اردبیل کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر محاصرہ کرنے والے باغیوں پر حملہ کردیا۔ یہاں نہایت شدید جنگ ہوئی جس میں جرّاح بن عبداللہ نے شہادت پائی۔ یہ واقعہ ۲۲ رمضان ۱۱۲ھ کا ہے۔

باغیوں نے اردبیل کو محاصرے کے بعد فتح کرلیا اور یہاں کے ہزاروں مسلمان مردوزن کو قیدی بنالیا۔ ان کی ہمت اتنی بڑھی کہ عراق کے شہر موصل کے مضافات بھی ان کی تاخت وتاراج کی زد میں آگئے۔

ادھر ہشام بن عبدالملک نے جرّاح کی شہادت کی خبر ملتے ہی سعید بن عمرو حرشی کو کچھ چنے ہوئے عرب جانبازوں کے ساتھ ڈاک کے گھوڑوں پر محاذ کی طرف روانہ کردیا تھا۔ یہ لوگ دن رات سفر کرتے ہوئے بروقت محاذ پر پہنچے اور فوج کی قیادت سنبھال لی۔ خاقان کا بیٹا اس وقت اسلامی شہر''ورثان'' کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ حرشی نے فوراً برق رفتار قاصد کے ہاتھ اہلِ شہر کو پیغام بھیجا کہ دوتین دن مزید دفاع کرو، کمک آیا چاہتی ہے۔

اس سے پہلے کہ قاصد شہر میں داخل ہوتا، حریف سپاہیوں نے اسے گرفتار کرلیا۔ خاقان کے بیٹے نے اسے مجبور کیا کہ وہ اہلِ شہر کو ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دے۔ قاصد نے مصلحت کے طور پر حامی بھرلی مگر شہر کی دیوار کے سامنے جاکر صدا لگادی: ''شہر کا بھرپور دفاع کرو۔ دودن میں کمک پہنچ جائے گی۔''

دشمنوں نے تلملا کر قاصد کو مارڈالا مگر وہ اپنا کام کرچکا تھا۔ محصور مسلمان پہلے مایوس ہوکر ہتھیار ڈالنے کا سوچ رہے تھے۔ کمک کی خبر سن کر انہوں نے پھر سے بھرپور دفاع شروع کردیا۔

خاقان کے بیٹے نے یہ صورتحال دیکھ کر مزید لڑائی بے سود خیال کی اور واپس روانہ ہوگیا۔ اس نے مسلمان قیدیوں اور مالِ غنیمت کے ذخائر کو بیل گاڑیوں پر لادا ہوا تھا۔ ان قیدیوں میں سابق مسلمان سپہ سالار جرّاح بن عبداللہ کے بیوی بچے بھی تھے۔ یہ لشکر کئی حصوں میں بٹا ہوا الگ الگ سفر کررہا تھا۔

اس دوران حرشی نے محاذ پر پہنچ کر حریف کا تعاقب شروع کردیا تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے کچھ سواروں کو ان کی خبر لانے کے لیے بھیجا۔ انہوں نے رات کے وقت واپس آکر بتایا کہ ایک جگہ باغی بے فکر سورہے ہیں، پہرے کا کوئی خاص انتظام نہیں ہے۔ حرشی نے جرنیلوں سے مشورہ کرکے اسی وقت حریف کی خیمہ گاہ پر شب خون مارنے کا حکم دیا۔

اس کارروائی میں باغی بری طرح پسپا ہوئے اور بہت سے مسلمان قیدیوں کو آزاد کرا لیا گیا۔ایسا ہی شب خون حریف کی ایک اور خیمہ گاہ پر مارا گیا۔یہاں سے چھڑائے جانے والے قیدیوں میں جراح بن عبداللہ کے اہل وعیال بھی تھے۔

خاقان کا بیٹا ان چھاپہ مار کارروائیوں سے تنگ آکر واپس پلٹا اور لشکر کو دوبارہ مرتب کر کے مسلمانوں کو دعوتِ مبارزت دی۔زوردار معرکہ ہوا جس میں دشمن کی عددی طاقت کے سامنے مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔یہ منظر دیکھ کر حریف کی قید میں موجود مسلمان مرد وزن دہائی دینے اور تکبیر کے نعرے بلند کرنے لگے۔

حَرشی نے یہ پکار سن کر فوج کو للکارا اور قدم جما کر دشمن پر ایسا سخت جوابی حملہ کیا کہ تھوڑی ہی دیر میں حریف میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔مسلمانوں نے دریائے اَرس تک ان کا تعاقب کیا اور تمام مالِ غنیمت اور قیدیوں کو بازیاب کرا لیا۔

خاقان کے بیٹے نے یہاں سے شکست کھا کر کچھ دنوں بعد دریائے بیلقان کے کنارے دوبارہ صف بندی کی۔یہاں فیصلہ کن جنگ میں مسلمانوں نے دشمن کی صفوں کو توڑ کر انہیں اتنا پیچھے دھکیلا کہ ان کی اکثریت دریا میں غرق ہوگئی۔سعید حَرشی نے خلیفہ کو فتح کی بشارت لکھ بھیجی۔[1]

۱۰۷ھ میں اسد بن عبداللہ نے گرجستان پر حملہ کیا مگر یہ مہم خوراک ورسد کم پڑ جانے کی وجہ سے ادھوری رہی۔

۱۱۰ھ میں مَسلَمہ بن عبدالملک نے دوبارہ یہاں فوج کشی کی اور گرجستان کے پایۂ تخت تفلیس تک جا پہنچے۔یہاں کوہستانی سلسلے کے بڑے درّے پر جسے "باب" کہا جاتا ہے،خزری قبائل کی بہت بڑی جمعیت نے مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔اس دوران شدید بارش شروع ہوگئی،ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ ہوگیا۔اس بناء پر اس جہاد کو "غزوۃ الطین" کہا جاتا ہے۔تین ہفتوں تک خوں ریز جنگ جاری رہی۔آخر ۲۳ جمادی الآخرہ ۱۱۰ھ کو مَسلَمہ نے حریف کو میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

شوال ۱۱۲ھ میں مَسلَمہ نے برف باری کے موسم میں یہاں پھر یلغار کی اور حریف کے کئی قلعے اور شہر فتح کر لیے۔مَسلَمہ نے درۂ باب سے ترکوں کی یلغار روکنے کے لیے مستقل مورچے کے طور پر ایک قلعہ تعمیر کرایا اور یہاں الگ فوج مقرر کر دی۔مَسلَمہ کی یہ مہمات ۱۱۳ھ تک جاری رہیں۔[2]

ہشام کے دور میں اَندلُس میں عقبہ بن نافع کے بیٹے عبداللہ بن عقبہ نے بھی نصرانی حکام کے خلاف کئی کامیاب جنگیں لڑیں اور یہ ثابت کر دیا کہ جب تک مسلمان جہاد کا ولولہ رکھتے ہیں،اَندلُس کو دوبارہ نصرانی مملکت نہیں بنایا جاسکتا۔[3]

رومیوں سے معرکے:

ہشام کے دور میں ایشیائے کوچک کے محاذ پر رومی افواج سے بھی معرکے جاری رہے۔ہشام کے بھائی،بیٹے اور چچازاد مانے ہوئے شمشیرزن تھے۔ان میں مَسلَمہ بن عبدالملک،سعید بن عبدالملک،مروان بن محمد بن مروان،معاویہ بن ہشام،سلیمان بن ہشام،محمد بن ہشام اور سعید بن ہشام کے نام قابلِ ذکر ہیں جو اس کے بیس سالہ طویل

[1] تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۳۴۰ تا ۳۴۳ [2] تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۳۴۳ تا ۳۴۶ [3] تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۳۴۷

دورِ حکومت میں بار بار اسلامی افواج کی قیادت کرتے ہوئے حریف کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوئے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کی طرح ہشام نے سردی اور گرمی میں جہادِ روم کے لیے الگ الگ افواج بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس دور میں مَسلَمہ بن عبدالملک کے جہادی کارناموں نے رومیوں پر مسلمانوں کی سابقہ ہیبت پھر سے طاری کر دی۔ ①

۱۱۴ھ کے جہاد میں ہشام کے بیٹے معاویہ نے ایک جہادی مہم میں رومی سپہ سالار قسطنطین کو زندہ گرفتار کرلیا۔ اسی سال ہشام کے چچازاد مروان بن محمد نے روس کی سرحدوں پر حملہ کیا اور کامیاب واپس لوٹا۔ آرمینیا، گرجستان، سرحداتِ روس اور بلادِ خزر میں مروان بن محمد کی مہمات ۱۲۱ھ تک جاری رہیں۔ ②

بحیرۂ روم کا جزیرہ صِقِلّیہ (سسلی) ایک طویل عرصے سے خلفائے اسلام کی نگاہوں میں تھا جہاں سے اکثر رومی بحریہ اسلامی ساحلوں پر حملے کیا کرتی تھی؛ اس لیے صِقِلّیہ پر قبضہ بہت ضروری ہوگیا تھا۔ تاہم ابتداء میں یہاں چھاپہ مار کارروائیاں کی گئیں۔

۱۱۵ھ میں عبیدہ بن عبدالرحمٰن نے حملہ کیا جو رومیوں کے بحری بیڑے کی زبردست مزاحمت کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکا۔ اگلے سال دوبارہ حملہ کیا گیا۔ واپسی میں رومی بحریہ نے مسلمانوں کو گھیر لیا۔ زبردست جنگ کے بعد اکثر مسلمان نرغے سے نکل گئے تاہم کئی بڑے افسران گرفتار ہوگئے جن میں عُمرو بن عثمان، سلیمان بن عثمان، عبدالرحمٰن بن زیاد اور مغیرہ بن زیاد قابلِ ذکر ہیں۔ چھ سال بعد بھاری زرِ فدیہ دے کر انہیں آزاد کرالیا گیا۔ ③

۱۲۲ھ میں مراکش کے حاکم ابن حَبحاب کے حکم سے حبیب بن ابی فہرہ نامی امیر نے صِقِلّیہ کو فتح کرنے کے لیے بڑا حملہ کیا۔ اسلامی بحریہ نے ساحل پر تعینات رومی فوج کو شکست دے کر یہاں کے پایۂ تخت سرقوسہ کا محاصرہ کرلیا۔ شہر والوں نے کچھ دن بعد ہتھیار ڈال دیے اور یہاں مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ حبیب پورے جزیرے کو فتح کرنا چاہتا تھا مگر اس دوران افریقہ میں بربر قبائل نے بغاوت برپا کردی جس کی وجہ سے حاکمِ مراکش نے حبیب کو واپس بلالیا۔ ④

بربروں کی بغاوت:

بربروں کی یہ بغاوت بڑی خطرناک تھی جس نے خلافتِ بنومروان کی چولیں ہلا ڈالیں اور ان کی بہت بڑی عسکری قوت کو تباہ کر ڈالا۔ مؤرخین کے مطابق اس بغاوت کی بڑی وجہ طَنجہ کے حاکم عمر بن عبداللہ المرادی کا نومسلم بربروں کے ساتھ نامناسب رویہ تھا۔ اس نے نومسلم بربروں پر ناجائز ٹیکس بھی عائد کردیے تھے۔ بربروں کی بڑی تعداد اسلام قبول کرچکی تھی مگر ان میں صدیوں سے رچی ہوئی سخت مزاجی، جہالت اور اخلاقی کمزوریاں موجود تھیں۔ اس بناء پر

① تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۳۱۶ تا ۳۵۵
② تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۳۴۵
③ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۳۴۷
④ الکامل فی التاریخ: سنة ۱۲۲ھ

عرب افسران انہیں بدتہذیب گردانتے تھے، نتیجہ یہ نکلا کہ بربر بھی عربوں کو مغرور سمجھ کر ان سے نفرت کرنے لگے۔

اس میں شک نہیں کہ کچھ لسانی ونسلی خصوصیات فطری ہوا کرتی ہیں مگر اسلام نے ان کی بناء پر تعصب کو سخت معیوب قرار دیا ہے؛ کیوں کہ اس سے معاشرے میں انتشار اور منافرت کو ہوا ملتی ہے۔ دوسری صدی ہجری میں نسلی منافرت بڑی تیزی سے معاشرے میں سرایت کر رہی تھی۔ قبیلے، زبان اور نسل پر فخر کرنا عام سی بات بن گئی تھی۔

اس خرابی کی بناء پر بہت سے بربر مسلم حکومت سے بددل ہو کر تیزی سے خوارج کے نظریات کو قبول کرنے لگے اور مَیسَرہ نامی ایک خارجی کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ اس وقت مراکش کی افواج سسلی کی مہم پر گئی ہوئی تھیں۔ بربروں نے میدان خالی دیکھ کر رمضان ۱۲۲ھ میں اعلانِ بغاوت کر دیا اور طنجہ پر قبضہ کر کے بڑی بے دردی سے عربوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ سسلی میں جہاد کے لیے گئی ہوئی فوج اس ہنگامے کی بناء پر مہم ادھوری چھوڑ کر طنجہ واپس لوٹی اور عرب عمائد نے جمع ہو کر طنجہ کے مضافات میں بربروں پر دھاوا بولا مگر فتح یاب نہ ہو سکے۔ کچھ دنوں بعد بربروں نے خود ہی مَیسَرہ کی سخت مزاجی سے تنگ آ کر اسے قتل کر دیا اور ایک بربر سردار خالد بن حُمید کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔

افریقہ کے گورنر ابن حَبحاب نے اس فتنے کو کچلنے کی مہم خالد بن حبیب فہری کے سپرد کی۔ ذوالحجہ ۱۲۲ھ میں دریائے کدر کے کنارے نہایت خونریز معرکہ لڑا گیا جس میں خالد بن حبیب اور عثمان بن ابی عبیدہ سمیت عربوں کے بڑے بڑے شرفاء کام آئے؛ اس لیے اس معرکے کو ''معرکۂ اشراف'' کہا جاتا ہے۔ اندلس میں بھی بربر قبائل کی بڑی تعداد تھی۔ انہیں مراکش میں بربروں کی شورش کی خبر ملی تو وہ بھی اندلس میں حکومت کے خلاف کھڑے ہو گئے۔

ہشام بن عبدالملک کو یہ اطلاعات ملیں تو اس نے ۱۲۳ھ میں کُلثوم بن عِیاض کو تیس ہزار سپاہی دے کر مراکش سے اندلس تک بربروں کی سرکوبی کے لیے روانہ کر دیا۔ ساتھ ہی مصر، تیونس اور لیبیا کے حکام کو احکام روانہ کر دیے کہ وہ اپنی اپنی فوجیں اس مہم میں شامل کر دیں۔ کلثوم راستے میں پڑنے والے شہروں کی افواج کو ساتھ ملاتا ہوا مراکش پہنچا تو اس کے سپاہیوں کی تعداد ۷۰ ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ اس فوج نے طنجہ کے قریب بربروں سے ٹکر لی۔ عرب بہت بہادری سے لڑے مگر بربروں کے سیلاب کے آگے ان کی پیش نہ گئی اور آخر انہیں بری طرح شکست ہوئی۔ ایک تہائی فوج تہہ تیغ ہو گئی۔ سپہ سالار کُلثوم بن عِیاض سمیت بڑے بڑے افسران اس جنگ کی نذر ہو گئے۔

ہشام کو اس سانحے کی اطلاع ملی تو اس نے قسم کھائی کہ وہ اس فتنے کو مٹا کر دم لے گا چاہے اسے اپنی اولاد سمیت میدانِ جنگ میں نکلنا پڑے۔ اس نے حنظلہ بن صفوان کو مزید تیس ہزار فوج دے کر اس مہم کے لیے روانہ کیا۔ حنظلہ نے تیونس پہنچ کر قیروان کو اپنا مرکز بنایا؛ کیوں کہ اس وقت بربر مراکش سے آگے بڑھ کر الجزائر اور لیبیا پر بھی قابض ہو چکے تھے۔ حنظلہ کے قیروان پہنچتے ہی بربروں نے دو لشکروں میں بٹ کر قیروان کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ حنظلہ نے ایک لشکر کو خود مار بھگایا اور دوسرے کے مقابلے میں اپنے ایک سالار کو بھیجا جو شکست کھا کر واپس آ گیا۔

آخر بربر ہر طرف سے جمع ہو کر قیروان کے سامنے قریب آ گئے۔ ان کی تعداد تین لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ حنظلہ نے

شہر سے تین میل آگے آکران کا سامنا کیا۔ یہ ایسا موقع تھا کہ شکست کی صورت میں مصر ہی نہیں دِمشق کا بچنا بھی مشکل نظر آتا تھا۔ علماء نے اس موقعے پر جہاد کی ترغیب دے کر سپاہیوں کا لہو گرمایا۔ عرب خواتین نے اپنی عصمت کی دہائی دے کر مردانِ عرب کی غیرت کو جھنجھوڑا۔ اس کے بعد جنگ شروع ہوئی تو عرب جان پر کھیل گئے۔ ان کے نامور شمشیر زن اس شدومد سے لڑے کہ تلواریں ٹوٹ ٹوٹ کر گرتی رہیں اور نیزے دہرے ہو گئے۔

آخر بربروں کو شکستِ فاش ہوئی اور وہ دولاکھ لاشیں میدانِ جنگ میں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس طرح اللہ نے اُمتِ مسلمہ کو ایک سخت خطرے سے محفوظ رکھا۔ ورنہ بربروں کا اقتدار عربوں سے چن چن کر بدلہ لینے میں صرف ہوتا اور ان میں شامل خوارج غلبہ پاکر نہ معلوم اُمتِ مسلمہ کا کیا حشر کرتے۔ [1]

جہادِ فرانس:

ہشام بن عبدالملک کا دورِ حکومت جہادِ فرانس کے حوالے سے مشہور ہے۔ اس نے عبدالرحمٰن الغافقی کو اَندَلُس کا حاکم مقرر کیا جو تجربے اور شجاعت میں عرب کا مانا ہوا جرنیل تھا۔ غافقی نے اَندَلُس کے انتظامات کو بہتر بنایا اور مسلسل تیاری کے بعد ۱۱۴ھ میں آٹھ ہزار جنگ آزمودہ سپاہی لے کر ایک بار پھر فرانس کا رخ کیا۔

اس زمانے میں فرانس میں دو بڑی حکومتیں تھیں: جنوب میں گاتھ خاندان کا ڈیوک آف ایکی ٹن حکمران تھا جس کی ریاست پر یزیدِ ثانی کے دور میں حملہ ہوا تھا۔ فرانس کے وسطی اور شمالی علاقوں میں ''میرو دنجی'' خاندان کی بادشاہت تھی، جس میں بادشاہ کے اختیارات برائے نام ہی تھے۔ سیاہ وسپید کا اصل مالک سپہ سالار ''چارلس مائل'' تھا۔ فرانس کی یہ دونوں مملکتیں آپس میں اختلافات کا شکار تھیں۔ ڈیوک اور چارلس مائل ایک دوسرے سے بیزار تھے۔

عبدالرحمٰن الغافقی جب فرانس کی سرحدوں میں داخل ہوئے تو پہلے ڈیوک کی ریاست زد میں آئی۔ ڈیوک نے پہاڑوں کے دامن میں صف بندی کر کے بڑے جوش وخروش سے معرکہ لڑا مگر اسے شکست کھا کر بھاگنا پڑا اور مسلمان دریائے گاران کی سرسبز وشاداب وادیوں پر قابض ہوتے ہوئے بورڈیو کی بندرگاہ تک پہنچ گئے۔ یہاں ڈیوک کے ساز وسامان کا بہت بڑا ذخیرہ تھا جو مسلمانوں کے ہاتھ لگ گیا۔

اسلامی افواج نے شمال کا رخ کیا تو دریائے ڈاردون پر ڈیوک ایک بار پھر تازہ دم لشکر لیے مزاحمت کے لیے تیار نظر آیا۔ عبدالرحمٰن الغافقی نے یہاں بھی اسے شکست دے کر پسپائی پر مجبور کر دیا۔ اسلامی افواج دریا عبور کر کے ''پائی ٹیرس'' پہنچیں جہاں ''سینٹ ہالاری'' کا مشہور زمانہ گرجا تھا۔ قلعے کی دیوار پر اسلامی پرچم نصب کر کے مسلمان ''ٹورس'' کی طرف بڑھنے لگے۔ [2]

ڈیوک آف ایکی ٹن کو یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کی یہ یلغار کوئی ایک حکمران ہرگز نہیں روک سکتا اور اگر اس کی فوری

---

① تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۳۵۳ تا ۳۵۶؛ الکامل فی التاریخ: سنة ۱۱۷ھ؛ الاستقصاء لاخبار دول المغرب الاقصیٰ: ۱ ص ۱٦٤ تا ۱۷۰

② ''ٹورس'' انگریزی اسپیلنگ کے مطابق ہے ورنہ اس کا فرانسیسی تلفظ ''توغ'' ہے۔

روک تھام نہ کی گئی تو پورا فرانس ان کے زیرِ نگین ہوجائے گا۔اس نے اپنے دیرینہ حریف چارلس مائل سے سابقہ رنجش فراموش کر کے فوری امداد طلب کی۔

مائل حالات کی نزاکت کو پہلے ہی بھانپ چکا تھا۔فرانس کے دیگر نواب بھی اس کے ہم خیال تھے۔اس نے مسلمانوں کے حملے کو نصرانیت کی فنا و بقا کا مسئلہ بنا کر دیگر یورپی ملکوں کو بھی اتحادی بنالیا؛لہٰذا فرانس کے علاوہ جرمنی اور پرتگال کے عیسائی نواب بھی اپنی اپنی فوجیں لے کر اس کے پاس پہنچ گئے۔یوں مائل قوم کے دفاع کے نام پر ایک بہت بڑا متحدہ لشکر ترتیب دینے میں کامیاب ہوگیا۔یہ لشکرِ جرار پیش قدمی کرتے ہوئے ''تورس'' کی وادیوں میں پہنچا جہاں اسلامی لشکر خیمہ زن تھا۔مسلمانوں کو اتنی بڑی فوج سے سامنا ہونے کی توقع نہ تھی۔دشمن کی بے پناہ افرادی قوت کے بالمقابل آٹھ ہزار مسلمان کسی شمار میں نہ تھے؛اس لیے بظاہر پیچھے ہٹ جانے کی حکمتِ عملی مناسب تھی مگر عبدالرحمٰن الغافقی نے پیٹھ دکھانا شجاعت و بسالت کی اس روایت کے خلاف تصور کیا جو مسلمانوں کا طرۂ امتیاز تھی۔نیز پسپائی میں یہ امر یقینی تھا کہ دشمن جری ہو کر تعاقب کرے گا اور مسلمان پست حوصلہ ہو کر کٹتے چلے جائیں گے؛اس لیے الغافقی نے اللہ پر بھروسہ کر کے میدان میں موجود رہنے کو ترجیح دی۔یورپی افواج تعداد میں برتری کے باوجود حملے میں ابتداء کی ہمت نہ کرسکیں اور ایک ہفتے تک شش و پنج کی حالت میں رہیں۔ادھر جنگ میں تاخیر مسلمانوں کے لیے خوراک و رسد کی کمی کا باعث ہوسکتی تھی؛اس لیے آخر عبدالرحمٰن الغافقی نے خود حملے کا آغاز کر دیا۔صبح سے شام تک نہایت شدومد سے جنگ جاری رہی،فریقین کے ہزاروں افراد کٹ گئے۔شام تک پلہ برابر رہا۔

دوسرے دن بھی سہ پہر تک گھمسان کی جنگ جاری رہی۔مسلمانوں کی بڑی تعداد زخمی اور تھکن سے چور تھی جبکہ یورپی خیمہ گاہ میں بے شمار تازہ دم دستے موجود تھے۔سہ پہر کے وقت ڈیوک آف ایکی ٹن نے محفوظ دستوں کے ساتھ یک بارگی حملہ کیا جس سے مسلمانوں کی ایک طرف کی صفیں ٹوٹ گئیں۔یہ دیکھ کر فرانسیسیوں نے زوردار دھاوا بول دیا۔مسلمانوں کے قدم اکھڑتے دیکھ کر عبدالرحمٰن الغافقی انہیں ہمت دلانے کے لیے خود دشمن کی صفوں میں گھستے چلے گئے اور بدن پر اَن گنت زخم کھا کر آخر کار شہادت سے ہم کنار ہوئے۔ان کی شہادت نے مسلمانوں میں ایک نیا جوش پیدا کر دیا۔وہ شام تک برابر لڑتے رہے اور میدانِ جنگ سے منہ نہ پھیرا۔

سورج غروب ہونے پر حریف افواج اپنی اپنی خیمہ گاہوں میں چلی گئیں۔مسلمان امراء مشورہ کر کے راتوں رات منظم انداز میں پسپا ہوگئے۔صبح اتحادی افواج نے ان کی خیمہ گاہ خالی دیکھی تاہم ان پر مسلمانوں کی دلیری کا اس قدر رعب چھا چکا تھا کہ انہوں نے ان کا تعاقب کرنے کی ہمت نہ کی۔یورپی مؤرخین کے مطابق یہ جنگ ۱۵ شعبان ۱۱۴ھ(۹ اکتوبر ۷۳۲ء) کو لڑی گئی تھی۔چارلس یہ جنگ جیت کر مغربی دنیا کا ہیرو بن گیا۔اسی کارنامے کی وجہ سے اسے ''مائل'' یعنی ''ہتھوڑے'' کا لقب ملا۔یورپی مؤرخین کے نزدیک اس جنگ کو نہایت اہمیت حاصل ہے۔اگر یہاں اتحادیوں کو شکست ہوجاتی تو نہ صرف فرانس بلکہ کئی دیگر یورپی ممالک بھی دوسری صدی ہجری میں اسلامی خلافت کا

حصہ بن چکے ہوتے۔ عبدالرحمٰن الغافقی اور ہزاروں مجاہدین کی یہ شہادت گاہ ''بلاط الشہداء'' کے نام سے مشہور ہے۔[1]

اَندلُس کا استحکام اور ترقی:

فرانس میں مہم جوئی کی ناکامی کے بعد مسلمانوں نے اَندلُس کے استحکام اور ترقی پر توجہ مرکوز کر دی۔ ۱۱۶ھ میں یہاں عقبہ بن حجاج کا تقرر ہوا جس نے اس ملک کی تمام انتظامی کمزوریوں کو دور کر کے یہاں ہر شعبے کو بڑی ترقی دی۔ شاہراہوں کی حفاظت کے لیے گھڑسوار پولیس کا الگ محکمہ شروع کیا۔ ہر گاؤں اور بستی میں عدالتیں قائم کیں، نئی مساجد اور مدارس کی بنیاد رکھی۔ بددیانت اور خائن افسران کو کسی رعایت کے بغیر برطرف کر دیا گیا۔ اس طرح اَندلُس کا شمار امن وامان اور ترقی کے لحاظ سے عالمِ اسلام کے مثالی صوبوں میں ہونے لگا۔[2]

عرب قبائل کی باہمی عصبیت میں اضافہ:

یزیدِ ثانی کے زمانے سے عرب قبائل میں مضری اور یمنی کی بنیاد پر افتراق پیدا ہونے لگا تھا۔ یزیدِ ثانی نے یمنی قبائل کے اقتدار کو خاص طور پر گھٹایا اور اس مقصد کے لیے خراسان کی حکومت پہلے اپنے بھائی مَسلَمہ اور پھر عمر بن ہبیرہ کو دی۔ ہشام نے کوشش کی کہ حکومتی عہدوں کے حوالے سے ان دونوں قبائل میں توازن رکھے۔ اس نے حکومت سنبھالتے ہی نئے عہدے داروں کے تقرر میں یمنی قبائل کو فوقیت دے کر ان کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یمن کے ایک کمزور قبیلے ''قسر'' کے سردار خالد بن عبداللہ قسری کو عراق اور اس کے بھائی اسد بن عبداللہ کو خراسان کا حاکم بنادیا۔[3] اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یمنی عہدے داروں نے بالادستی حاصل کر کے مضری افسران سے بدلہ لینا شروع کر دیا۔

چنانچہ پندرہ سال بعد ہشام کی ترجیحات تبدیل ہو گئیں اور وہ ایک بار پھر قبیلہ مضر کے عمائد کو اوپر لانے لگا۔ اس نے ۱۲۰ھ میں خالد بن عبداللہ کو معزول کر کے اس کی جگہ مضری قبیلے کے یوسف بن عمر کو عراق کا حاکم بنادیا۔ اسی سال حاکمِ خراسان اسد بن عبداللہ قسری کا بھی انتقال ہو گیا۔ ہشام نے اس کی جگہ قبیلہ مضر کے نصر بن سیار کو والی بنادیا۔ اس سے یمن والوں میں احساسِ محرومی پیدا ہونے لگا جس کا لاوا ہشام کے بعد پھوٹ پڑا۔[4]

① التاریخ الاندلسی، ص۱۹۳ تا۲۰۳؛ نفح الطیب: ۱/۲۸۶ تا ۲۹۰؛ دولة الاسلام فی الاندلس للشیخ عبداللہ عنان: ۱/۱۹۲ تا ۱۱۱

② الکامل فی التاریخ: ۴/۲۲۴؛ البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۲/۲۹، ۳۰ ۱۱۳/ ۱۱۴

③ تاریخ الطبری: ۷/۲۶

نوٹ: خالد بن عبداللہ قسری اپنی شجاعت، سخاوت اور دیگر صفاتِ محمودہ کے باوجود ناصبی نظریات کا حامل تھا۔ امام یحییٰ بن معین فرماتے تھے کہ وہ بُرا آدمی تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہتا تھا۔ (تاریخ دمشق: ۶/۱۹۰؛ میزان الاعتدال: ۱/۶۳۳)

ایک روایت کے مطابق وہ خلیفہ کو پیغمبر پر بھی ترجیح دیتا تھا، مگر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسے مشکوک قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ بات ''العقد الفرید'' کے مؤلف (ابن عبدربہ) نے مشہور کی ہے جو تشیع شنیع میں مبتلا تھے مگر ہمارے شیخ حافظ ذہبی بھی دھوکا کھا گئے اور ان کی تعریف کر دی۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/۲۰۲، ۲۰۳)

راقم عرض کرتا ہے کہ القسری کے بارے میں مذکورہ روایت مشکوک ہونا تو قابلِ تسلیم ہے مگر حافظ ابن کثیر کا ابن عبدربہ پر تشیعِ شنیع کا الزام عائد کرنا درست معلوم نہیں ہوتا اور حافظ ذہبی کی رائے درست لگتی ہے؛ کیوں کہ ''العقد الفرید'' میں ابن عبدربہ نے روافض کی بُرائیاں کھل کر طشت ازبام کی ہیں۔ (ملاحظہ ہو: العقد الفرید: ۲/۲۴۵ تا ۲۵۱) کوئی غالی شیعہ بھلا ایسی جسارت کیوں کرنے لگا؟

④ الکامل فی التاریخ: سنة ۱۲۰ھ؛ البدایة والنہایة: ۱۳/۹۴

فرقہ بندی اور تعصب کا اصل حل:

اس مسئلے کا اصل حل وہی تھا جو عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اختیار کیا تھا کہ تمام قبائلی عصبیتوں کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت اور اطاعت میں دبا دیا جائے۔ ہشام کی پالیسی کے مطابق ایک قبیلے کو آگے اور دوسرے کو پیچھے کرنے سے طاقت کے توازن میں تو فرق پڑا مگر اندرونی نفرتیں برقرار رہیں اور نفرت کا لاوا پکتا رہا۔

ہشام کے بعد آنے والے خلفاء نے بھی اس کا کوئی مناسب حل نہ نکالا جس کا نتیجہ آگے چل کر یہ نکلا کہ عربوں کی سطوت وہیبت ماند پڑ گئی اور اسلامی سیاست کی زمام اہلِ عجم کے ہاتھ میں آ گئی۔

زید بن علی رحمہ اللہ کا خروج اور قتل:

ہشام کے دور کا ایک الم ناک واقعہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے زید بن علی رحمہ اللہ کا خروج تھا۔ یہ حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کے صاحبزادے اور حضرت باقر رحمہ اللہ کے بھائی تھے۔ علم وفضل اور زہد وعبادت میں اپنے زمانے کے چنے ہوئے لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ [1]

زید بن علی رحمہ اللہ نے کوفہ کے بعض امراء کے ورغلانے پر ۱۲۲ھ میں خلیفہ ہشام کے خلاف خروج کیا جو ناکام رہا اور زید بن علی رحمہ اللہ اس کوشش میں جان کی بازی ہار گئے۔ [2]

مَسلَمہ بن عبدالملک کی رحلت:

۱۲۱ھ میں ہشام کے بھائی مَسلَمہ بن عبدالملک کی وفات ہوگئی۔ یہ اپنے دور کا بہت بڑا غازی اور مجاہد انسان تھا جس کی خدمات پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''مَسلَمہ کے کارنامے مشہور اور اس کی مساعی قابلِ قدر ہیں۔ اس کی جہادی مہمات مسلسل اور دور دراز مقامات پر جاری رہیں۔ اس نے کتنے ہی قلعے اور علاقے فتح کیے۔ اپنے عزم اور ہوشیاری سے کئی ایوان اور خطے سرنگوں کیے۔ وہ جہادی مہمات اور فتوحات کی کثرت، قوتِ ارادی اور جنگ جوئی کے لحاظ سے اپنے دور میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی مثال تھا۔ اس کے ساتھ سخاوت، سخن دانی، شرافت، حسب ونسب، دین داری اور پرہیز گاری کی خوبیوں سے بھی مالا مال تھا۔ اللہ اس پر رحمت فرمائے۔'' [3]

---

① سادات حضرات عموماً صحیح اسلامی عقائد ونظریات کے حامل بلکہ اس کے بہترین علم بردار تھے۔ اگر بعض سادات کو کوئی اختلاف تھا تو اتنا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے افضل سمجھتے تھے۔ زید بن علی رحمہ اللہ کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ فضیلت میں تمام صحابہ سے افضل تھے۔ مگر باقی صحابہ کا مقام ومرتبہ بھی اپنی جگہ تھا اور سب اپنی اپنی جگہ برحق تھے۔ (مقالات الاسلامیین لابی الحسن الاشعری: ۱/۶۹؛ التنبیه والرد علی اهل الاهواء والبدع لابی الحسین المطلی العسقلانی، ص ۳٤)

② الکامل فی التاریخ: سنة ۱۲۲ھ۔
زید بن علی کے خروج کا واقعہ ہم آگے عباسی تحریک کے تحت تفصیل سے بیان کریں گے۔

③ البدایة والنهایة: ۱۳/۱۰۳

ہشام بن عبدالملک کی وفات:

بنو مروان کا آخری باعظمت فرمانروا ہشام بن عبدالملک بیمار ہو کر ۶ ربیع الآخر ۱۲۵ھ کو دنیا سے رخصت ہوا۔ اس کی عمر ۵۵ سال تھی۔ اس کی خلافت کا زمانہ تقریباً انیس سال آٹھ ماہ تھا۔ اس کا قیام دِمشق کی بجائے کچھ فاصلے پر ''رصافہ'' نامی شہر میں تھا۔ قبر بھی وہیں ہے۔[1]

سیرت وخصوصیات

ہشام بن عبدالملک ذاتی طور پر نہایت شریف، بہادر، نیک اور پرہیزگار انسان تھا۔ عمر بن عبدالعزیز کی سیرت پر عمل کی کوشش کرتا تھا۔ طبیعت میں حلم اور بردباری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ایک بار کسی نے اس کو کھری کھری سنا ڈالیں تو جواب میں صرف اتنا کہا: ''اپنے حکمران کو ایسا کہنا مناسب نہیں۔''

ایک شخص کو ایسے ہی موقع پر جواب دیا: ''مجھے ایسا کہہ رہے ہو حالانکہ میں تمہارا خلیفہ ہوں۔''

اس کے زیادہ سے زیادہ غصے کا اظہار جو منقول ہے، وہ یہ ہے کہ کسی شخص پر غضب ناک ہو کر کہا:

''چپ ہو جاؤ، ورنہ ایک کوڑا ماروں گا۔''

بہت کم کسی کو ڈانٹتا تھا۔ ایک بار کسی پر غصہ آ گیا اور کچھ نازیبا الفاظ کہہ دیے۔ وہ شخص بولا:

''خلیفۃ اللہ ہو کر اس قسم کے الفاظ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی؟''

ہشام یہ سن کر سخت نادم ہوا، بولا: ''مجھ سے بدلہ لے لو۔''

وہ بولا: ''کیا ایسے الفاظ کہہ کر میں بھی تمہارے جیسا احمق بنوں؟''

ہشام بولا: ''اچھا اس کا تاوان لے لو۔''

وہ اس پر بھی راضی نہ ہوا تو ہشام نے کہا: ''اچھا پھر اللہ کے لیے معاف کر دو۔''

وہ بولا: ''ہاں اللہ کے لیے معاف ہے۔''

ہشام نے کہا: ''اللہ کی قسم! آئندہ کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گا۔''[2]

نمازِ جمعہ میں حاضر نہ ہونے پر شہزادے کو سرزنش:

اولاد کو دینی فرائض کی پابندی کی تلقین کرتا اور کوتاہی پر مناسب سرزنش کرتا۔ ایک بار اس کا ایک بیٹا جمعے کی نماز میں شریک نہ ہوا۔ ہشام نے پوچھ گچھ کی تو بولا: ''سواری نہیں ملی۔''

ہشام نے کہا: ''تو کیا پیدل نہیں جا سکتے تھے۔'' یہ کہہ کر اس کے لیے ایک سال تک سواری پر پابندی لگا دی۔[3]

---

[1] تاریخ الطبری: ۲۰۰/۷ تا ۲۰۲

[2] البدایۃ والنہایۃ: ۱۵۱/۱۳، ۱۵۲

[3] البدایۃ والنہایۃ: ۱۵۳/۱۳

موسیقی سے احتراز۔ ایک لطیفہ:

گانے بجانے اور مے نوشی جیسے گناہوں سے نہ صرف خود اور اپنے خاندان کو بچا کر رکھا بلکہ معاشرے میں بھی ان چیزوں کو نہ پنپنے دیا۔ اس قسم کی خرافات میں ملوث لوگوں کو وہ مناسب سزا دیتا تھا۔

ایسے واقعات سے متعلق ایک لطیفہ یہ ہے کہ ایک بار موسیقی کا عادی کوئی بوڑھا پکڑ کر لایا گیا۔ ہشام نے کہا:

''اس کا طنبورہ اسی کے سر پر مار کر توڑ دو۔''

حکم کی تعمیل ہوئی اور وہ بوڑھا رونے لگا۔ ہشام کے خادم نے اسے کہا: ''اب چپ ہو جاؤ، صبر کرو۔''

وہ بولا: ''پٹائی پر نہیں، اس ناقدری پر رو رہا ہوں کہ خلیفہ نے بربط کو طنبورہ کہا۔''[1]

جہاد کا ولولہ:

ہشام کو جہاد کا بڑا ولولہ تھا۔ ہر وقت افواج کو مستعد اور متحرک رکھتا تھا۔ محاذِ جنگ کی بڑی فکر رہتی تھی۔ بڑے اہتمام سے جنگوں کی خبریں سنا کرتا تھا۔ ایک دن خراسان سے آنے والے ایک افسر نے کہا:

''ہمیں خبر ملی کہ خاقان جوز جان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم نے حملہ کر کے اسے پسپا کر دیا۔ پھر ہم تعاقب کرتے ہوئے خاقان کی خیمہ گاہ میں داخل ہو گئے اور اسے لوٹ لیا۔''

یہ سنتے ہی ہشام جو تکیہ لگائے ہوئے تھا، سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بے تابی سے بولا:

''کیا کہا! تم لوگوں نے خاقان کی خیمہ گاہ کو بھی لوٹ لیا۔''

افسر نے کہا: ''جی ہاں۔''

ہشام نے پوچھا: ''پھر کیا ہوا؟''

افسر نے کہا: ''دشمن اپنے علاقے کی طرف واپس چلے گئے۔''

ہشام اس پر بہت خوش ہوا۔[2]

وہ علماء کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا اور ان سے مشورہ لیتا تھا، امام ابن شہاب الزہری اس کے مشیروں میں شامل تھے۔[3]

بزرگانِ دین سے تعلق:

بزرگوں کی خدمت کو سعادت سمجھتا تھا۔ سالم بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے مسجد الحرام میں ملاقات ہوئی تو پوچھا: ''کوئی ضرورت ہو تو فرمائیے۔'' وہ بولے: ''اللہ کے گھر میں غیر کے آگے ضرورت پیش کرتے ہوئے حیا آتی ہے۔''

جب سالم بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ عبادت سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلے تو ہشام پیچھے پیچھے آیا اور کہنے لگا: ''اب تو آپ مسجد سے باہر ہیں۔ اب فرمائیے۔'' وہ بولے: ''دنیا کی ضرورت کہوں یا آخرت کی؟'' ہشام نے کہا: ''دنیا کی!''

سالم نے کہا: ''میں نے دنیا اس سے بھی نہیں مانگی جو مالکِ حقیقی ہے، تو اس سے بھلا کیا مانگنا جو مالک ہے ہی نہیں۔''[4]

[1] البدایة والنهایة: ۱۵۷/۱۳ [2] تاریخ الطبری: ۱۲٦/۷ [3] سیر اعلام النبلاء: ۷۱/۵ [4] المنتظم: ۱۱٤/۷، ۱۱۵

ایک بار ابوحازم رحمہ اللہ سے پوچھا: ''حضرت! اس اقتدار کے ہوتے ہوئے نجات کا راستہ کیا ہے؟''
وہ بولے: ''کسی شے کو اسی وقت لو جب کہ اس کا لینا حلال ہو۔ اسی مصرف پر خرچ کرو جو برحق ہو۔''
ہشام نے کہا: ''اس کی مکمل پابندی کی طاقت بھلا کون رکھ سکتا ہے۔''
ابوحازم رحمہ اللہ بولے: ''وہ جو جہنم سے بھاگنا چاہتا ہو۔''[1]

بہترین آڈٹ سسٹم:

ہشام بیت المال کی آمدن وخرچ میں بے حد احتیاط کرتا تھا۔ اس کے دور میں آمدن وخرچ سے متعلق ہر چھوٹی سی چھوٹی چیز کا حساب کتاب تاریخ وار رجسٹروں میں مندرج کیا جانے لگا۔

یہ ریکارڈ اتنا پختہ اور درست تھا کہ برسوں بعد جب بنوامیہ کا سرکاری ریکارڈ عباسی خلفاء کے ہاتھ لگا تو ان کے ماہرین نے اسے چیک کر کے اعتراف کیا کہ ہشام کے دور جیسا صاف وشفاف مالی حساب کتاب کہیں اور نہیں دیکھا گیا۔[2]

اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ بیت المال کی آمدن میں کوئی ناجائز رقم شامل نہ ہونے پائے، اس نے حکم دیا تھا کہ محاصل کی رقم اس وقت تک قبول نہیں کی جائے جب تک چالیس آدمی گواہی نہ دیں کہ یہ رقم بالکل جائز اور حلال ہے۔[3]

خلاصۂ کلام:

ہشام کا دور فتوحات، تعمیراتی وترقیاتی کاموں، کرپشن پر قابو، معیشت کی ترقی اور عدل وانصاف کے لحاظ سے قابلِ تعریف تھا۔ تاہم اس دور میں چہار سو بغاوتیں بھی ہوتی رہیں۔ سندھ میں جے سنگھ نے بغاوت کی، وسطِ ایشیا میں نومسلم ترک اٹھ کھڑے ہوئے۔ افریقہ اور اندلس میں بربر اور خوارج ایک عذاب بن کر عربوں کے قتلِ عام پر تل گئے۔ شیعانِ علی اور بنوعباس نے اپنی خفیہ رکنیت سازی شروع کی اور ان کے بعض بزرگوں اور قائدین نے مسلح خروج بھی کیا۔ بعض مقامات پر بغاوتوں کے پیچھے خاقانِ چین جیسے غیر مسلم حکمرانوں کا ہاتھ تھا۔ بعض مقامات پر صوبے داروں کا نومسلم باشندوں سے نامناسب سلوک بھی اشتعال اور شورش انگیزی کی وجہ بنا۔ اگر کوئی اور حکمران ہوتا تو بہت مشکل تھا کہ اس قدر فتنوں کا مقابلہ کر پاتا۔ مگر ہشام نے باغیوں کو ہر جگہ دبا کر مملکتِ اسلامیہ کو متحد رکھا۔

تاہم فتنوں اور بغاوتوں کا تسلسل یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ فضا بنومروان کے خلاف ہوتی جارہی ہے اور ذرا سی غفلت اور کوتاہی سے حالات کی باگ ہاتھوں سے نکل سکتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہشام کے دنیا سے رخصت ہونے پر جب اقتدار کمزور حکمرانوں کو ملا تو بنومروان کی حکومت اس تیزی سے زوال کا شکار ہوئی کہ سات سال کے اندر اندر اس کی بساط اُلٹ گئی۔

❖❖ ❖

---

[1] المعرفة والتاریخ: ۶۷۹/۱
[2] الکامل فی التاریخ: سنة ۱۲۵ھ
[3] تاریخ الخلفاء، ص ۱۸۵، ط نزار

ولید بن یزید بن عبدالملک (ولیدِ ثانی)

ربیع الآخر ۱۲۵ھ......تا......جمادی الآخرہ ۱۲۶ھ

فروری 743ء......تا......اپریل 744ء

ہشام کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا ولید بن یزید خلیفہ بن گیا۔ بنو مروان میں ولید نامی یہ دوسرا خلیفہ تھا؛ اس لیے اسے ''ولیدِ ثانی'' کہا جاتا ہے۔ اس کی عیش پسندی اور بدکرداری کے سبب بعض مؤرخین اسے ''ولیدِ فاسق'' کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ اس کا باپ یزید بن عبدالملک ۱۰۵ھ میں اپنی وفات سے پہلے بالترتیب پہلے اپنے بھائی ہشام اور پھر بیٹے ولید کے لیے خلافت طے کر گیا تھا۔ اس وقت ولید تقریباً پندرہ سال کا تھا۔ [1]

باپ کے مرنے پر اس نے اپنے چچا ہشام کی خلافت کو دل سے قبول نہ کیا اور امورِ سلطنت سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسے سیاست کا کوئی تجربہ حاصل نہ ہوا۔ اس کے روز و شب بے کار گزرتے رہے۔

ہشام نے اس کی اصلاح کی بڑی کوشش کی۔ اس کے بداخلاق دوستوں کو اس سے دور کر دیا۔ نہ سدھرنے پر تنبیہ کے لیے جیب خرچ بند کر دیا مگر ولید ثانی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ الٹا چچا سے اس کی نفرت میں اضافہ ہو گیا۔ بات اتنی بڑھی کہ وہ شام چھوڑ کر اردن اپنی ذاتی جاگیر پر چلا گیا اور چچا کی وفات تک وہیں رہا۔ ہشام کے مصاحب امام زہری رحمہ اللہ اس پر زور دیتے رہے کہ وہ اس نالائق لڑکے کی ولی عہدی منسوخ کر دے۔ آخر ہشام بھی بھتیجے کی اصلاح سے ناامید ہو کر یہی سوچنے لگا۔ مگر کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اس کے ایامِ حیات پورے ہو گئے اور وہ اس حال میں فوت ہوا کہ مملکت کے ولی عہد کے طور پر ایک ناتجربہ کار، کم ہمت اور لاپرواہ انسان کا نام طے تھا۔ [2]

ہشام کی غلطی:

یہ ماننا پڑے گا کہ طویل اور کامیاب دورِ حکومت کے باوجود ہشام نے بڑی غلطی کی کہ اپنے بعد اُمت کی قیادت کے لیے کسی مناسب اور اہل فرد کا تقرر نہیں کیا۔ حالانکہ یہ کام اسے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا؛ کیوں کہ موت کا کوئی

① سیر اعلام النبلاء: ۳۷۱/۵

② البدایة والنهایة: ۱۶۰/۱۳ تا ۱۶۳؛ سیر اعلام النبلاء: ۳۷۱/۵

وقت مقرر نہیں۔ ہشام کو اس کام کے لیے کھلا وقت ملا تھا مگر جب وہ فوت ہوا تو وہ نوجوان جو اس کے بعد حکومت کے لیے نامزد تھا، طرح طرح کی بداخلاقیوں کا شکار ہو چکا تھا۔

یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ ہشام ولید کی غلط حرکات دیکھ کر بھی اسے ولی عہدی سے معزول کرنے میں اتنی پس وپیش کیوں کرتا رہا۔ اس کی وجہ وہی موروثی نظام حکومت کا اصول تھا جو چاہے کہیں لکھا ہوا نہ تھا، مگر اب وہ ایک دستورِ مملکت کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ ولید کو اس کے باپ نے ولی عہد نامزد کر رکھا تھا۔ اگر اس کی ولی عہدی منسوخ کی جاتی تو ولید کے باپ کے وفادار امراء اور اس کے قریبی رشتہ دار بغاوت پر تُل جاتے؛ کیوں کہ وہ سب انتقالِ اقتدار کے مرحلے میں اسی دستورِ مملکت کو مانتے تھے؛ اس لیے ہشام کی سوچ دل ہی میں رہی اور چاہنے کے باوجود وہ ایک نااہل شخص کو جانشینی سے معزول نہ کر سکا۔ اس کی وفات کے بعد بہرصورت سخت ضرورت تھی کہ امرائے حکومت مل کر ولید ثانی کی ولی عہدی کو منسوخ کر دیتے اور امت کے کسی مناسب آدمی کو اس اعلیٰ منصب کے لیے چنتے مگر موروثی نظام حکومت کی خرابی اپنا رنگ دکھا کر رہی۔ امراء نے ولید ثانی کی حکومت پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔

درحقیقت دورِ خلافتِ راشدہ کو چھوڑ کر امت کی پوری تاریخ کا یہ بہت بڑا المیہ رہا ہے کہ انتقالِ اقتدار کے مرحلے پر مناسب ترین آدمی کو زمامِ قیادت سونپنے کا کوئی باقاعدہ سسٹم نہیں بنایا گیا۔ اسلام نے شورائیت، رضا، افاضلِ اُمت کی نمائندگی اور لوگوں کی ذہنی ہم آہنگی کے ساتھ انتقالِ اقتدار کا جو نظام دیا تھا، اسے اپنی اصل سے ہٹا کر ایک محدود اور خاندانی شورائیت پر لانے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ انتقالِ اقتدار کا مرحلہ شفاف اور محفوظ نہ رہا۔ اس میں ذاتی، خاندانی اور گھریلو اغراض شامل ہو گئیں۔ چونکہ یہ اغراض مختلف ہوا کرتی ہیں؛ لہٰذا یہ ماحول ہمیشہ اُمت میں انتشار، تنازعات اور خانہ جنگیوں کی بنیاد بنتا رہا۔ اگر اجتماعی سیاسی شعور سے کام لے کر کم از کم انتقالِ اقتدار کے مرحلے کے لیے خاندانی مفادات کو پسِ پشت ڈال کر صرف امت کی فلاح و بہبود کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قابل ترین فرد کے چناؤ کا سسٹم تشکیل دے لیا جاتا تو ہمیں بنوامیہ سے لے کر اورنگ زیب عالم گیر تک اس قسم کے سانحوں کا تسلسل نہ دکھائی دیتا کہ مستحکم وعالی شان سلطنتیں کسی نااہل فرد کے برسرِ اقتدار آتے ہی چند سالوں کے اندر اندر رُو بہ زوال ہو کر ختم ہو گئیں۔

ولید کی تباہ کن سیاست۔ قابل امراء کی معزولی:

ہشام بن عبدالملک کے بعد اُمت کے بھلے برے کا اختیار ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں آ گیا جو علم، تجربے اور معاملہ فہمی سے کوسوں دور تھا۔ اس نے ایسے حالات میں حکومت سنبھالی تھی کہ باغیوں اور شورش پسندوں کو ابھی دبایا گیا تھا۔ اس جان کاہ مہم میں ہشام جیسے فولادی انسان اور اس کے درجنوں اولوالعزم جرنیلوں کو کئی سال لگے تھے۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ امن وعافیت کے اس ماحول کو پائیدار بنانے کے لیے اَن تھک محنت کی جاتی اور ذاتی اغراض ومفادات سے بالاتر ہو کر صرف اور صرف قوم کی بھلائی کو مدِ نظر رکھا جاتا۔

مگر ولیدِ ثانی نے حکومت سنبھالتے ہی نفرت کی سیاست کا کھیل شروع کر دیا۔ اس نے اپنے چچا سے نفرت کا اظہار

کرتے ہوئے اس کے تمام قابلِ اعتماد امراء کو بیک جنبشِ قلم برطرف کر دیا۔ یہ وہ امراء تھے جنہوں نے پورے ملک کو برسوں سے سنبھال رکھا تھا اور وہ سیاست کی اونچ نیچ سے خوب واقف تھے۔ ان امراء کو ولیدِ ثانی سے کوئی عقیدت نہ تھی مگر نظم وضبط کی پابندی اور مرکزِ خلافت کے احترام میں انہوں نے خاموشی سے اپنی برطرفی قبول کر لی۔ ان میں سے بعض افسران کو ولیدِ ثانی نے قید کرا دیا۔ بعض کو سخت سزائیں دیں۔ بعض گوشہ نشین یا روپوش ہو گئے۔ ولیدِ ثانی نے ان کی جگہ نااہل اور خوشامدی قسم کے لوگوں کو اہم عہدے سونپ دیے۔ اپنے بعد اپنے دو بیٹوں کو یکے بعد دیگرے ولی عہد مقرر کر دیا۔ اس طرح پوری مملکت کا نظام تہہ وبالا ہونے کے اسباب پورے ہو گئے۔ [1]

عرب عصبیت کو فروغ:

شاید مملکت اس حالت میں بھی ایک آدھ صدی گزار لیتی مگر اس دوران ولیدِ ثانی کی بعض حرکات نے عرب قبائل کی باہمی عصبیت کو مزید ہوا دے دی۔ بنوامیہ کے وفادار عرب قبائل میں بہت بڑی طاقت یمنی عربوں کی تھی؛ اس لیے بنوامیہ ان کی بڑی خاطر مدارت کرتے تھے۔ ہشام بن عبدالملک نے بھی انہیں بڑی عزت دی تھی۔

مگر ولیدِ ثانی نے یمنی قبائل کو نظر انداز کر کے مضری عربوں کو حد سے زیادہ نوازنا شروع کر دیا۔ خالد بن عبداللہ قسری یمنی قبائل کا ممتاز سردار تھا جو ہشام کے دور میں پندرہ سال تک عراق کا والی رہنے کے بعد معزول اور پھر گرفتار ہوا تھا۔ اس وقت تو چند ماہ کی قید کے بعد ہشام کی مداخلت پر اسے رہائی مل گئی تھی اور وہ جہاد کے لیے سرحدوں پر چلا گیا تھا۔ مگر ولیدِ ثانی نے حکومت سنبھالتے ہی اسے گرفتار کر کے حاکمِ عراق یوسف بن عمر کے حوالے کر دیا جس نے اسے سخت تشدد کا نشانہ بنا کر قتل کرا دیا۔ [2]

ولیدِ ثانی کے خلاف بغاوت:

اس قسم کے واقعات سے عربوں میں قبائلی عصبیت بڑھتی چلی گئی۔ یمنی قبائل ولیدِ ثانی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ولیدِ ثانی کے چچازاد بھائی، یزید بن ولید کے ہاتھ پر بیعت کر کے حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ ترتیب دے ڈالا۔ کارروائی اس طرح ہوئی کہ یزید بن ولید اپنے دو اڑھائی سو خاص آدمیوں کے ساتھ دِمشق پہنچا۔ ایک شب اس نے چالیس افراد کے ساتھ جامع اموی میں نمازِ عشاء ادا کی۔ اس مسجد کی محراب سے ایک دروازہ قصرِ خلافت میں کھلتا تھا جس سے خلیفہ کی آمد ورفت ہوا کرتی تھی۔ تمام نمازیوں کے چلے جانے کے بعد یزید بن ولید نے مسجد کے چوکیداروں کو حراست میں لے لیا اور محراب کی سمت کا دروازہ توڑ کر محل میں گھس گیا اور بڑی آسانی سے سرکاری خزانے اور محل پر قبضہ کر لیا۔ بہت سے امراء نے اس سے بیعت کر لی۔

ولیدِ ثانی ایک دوسرے محل میں تھا۔ یزید نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ ولید پہلے باہر نکل کر لڑتا رہا مگر جب مقابلہ بے سود دیکھا تو محل میں مورچہ بند ہو گیا اور آواز لگائی: ''کوئی شریف آدمی ہے تو آ کر بات کرے۔''

---

[1] البداية والنهاية: ١٣/١٦٥، ١٦٦

[2] الکامل فی التاریخ: سنة ١٢٦ھ

ایک امیر نے دروازے پر جا کر کہا:

''ہمیں آپ سے کوئی دشمنی نہیں مگر آپ کی مے نوشی، اللہ کے دین کی توہین اور زنا کاری ہمیں برداشت نہیں۔''

ولید نے کہا: ''بھائی! تم نے حد کر دی۔ کچھ زیادہ کہہ گئے۔ اللہ نے جو حلال لذتیں دی ہیں وہ میرے لیے کافی ہیں۔''

مخالفین جب اسے قتل کرنے کے لیے قصرِ خلافت میں گھسنے لگے تو وہ کہنے لگا:

''جس طرح عثمان رضی اللہ عنہ تلاوت کرتے ہوئے شہید ہوئے، میں اسی طرح مرنا چاہتا ہوں۔''

یہ کہہ کر قرآن مجید کھولا اور تلاوت میں مصروف ہو گیا۔ اسی دوران باغیوں نے اندر آ کر اسے مار ڈالا۔ یہ واقعہ ۲۷ جمادی الآخرہ ۱۲۶ھ کا ہے۔ ولید ثانی کا دورِ اقتدار ایک سال تین ماہ بنتا ہے۔ اس کی عمر ۳۶ سال تھی۔ ①

ولید ثانی سے متعلق مشکوک روایات:

ولید ثانی کی نااہلی اور فسق و فجور پر مؤرخین کا اتفاق ہے۔ یہ بھی طے ہے کہ بنو مروان کی حکومت کو شکستہ کرنے میں اس کے غلط فیصلوں بلکہ حماقتوں کا بڑا دخل تھا۔ تاہم اس کی برائیوں سے متعلق بعض روایات مبالغہ آمیز ہیں۔ دراصل ولید ثانی اپنے مظالم اور غلط اقدامات کی وجہ سے بہت بدنام ہو چکا تھا اور عوام و خواص سبھی اس کے خلاف تھے؛ اس لیے کچھ مخالفین نے انتقامی طور پر اس کے بارے میں الحاد اور بے دینی کے واقعات مشہور کر دیے مثلاً یہ کہ اس نے کعبہ کی چھت پر بیٹھ کر مے نوشی کا ارادہ کیا تھا، قرآن مجید کی توہین کی تھی، بعض کفریہ اشعار بھی اس کی طرف منسوب ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا یزید بن معاویہ کے بارے میں محرم خواتین سے بدکاری کی روایات مشہور کی گئیں۔ چونکہ مخالفت کی فضا عام تھی اور بدنام شخص کے متعلق ہر گری پڑی بات مان لی جاتی ہے؛ اس لیے ان روایات کو بلا تأمل قبول کر لیا گیا۔

بہر حال بعض محتاط علماء و محدثین ولید ثانی کے بارے میں کفر و بے دینی کی ان روایات کو درست نہیں سمجھتے تھے۔ یہ تو ثابت ہے کہ وہ عیاش اور نالائق آدمی تھا اور بعض منکرات سے احتراز نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس کی طرف کفر و زندیقیت کی نسبت درست نہیں۔ اس کی طرف سے اپنے بیٹوں کی ولی عہدی کے اعلان کے لیے جو فرمان جاری کیا گیا تھا، اس کی عبارتوں سے واضح ہوتا ہے کہ وہ عملی طور پر چاہے گیا گزرا ہو مگر اعتقادی طور پر شریعتِ محمدیہ ہی کو راہِ نجات مانتا تھا۔ اس کے ایک فرمان میں تحریر تھا: ''اللہ اسے ہلاک کرے جو گمراہ اور سرکش ہو کر نیکی و تقویٰ کا راستہ چھوڑ دے۔ جو بھی صورتحال پیش آئے اس میں اللہ کی اطاعت کو لازم پکڑو۔'' ②

وہ اپنے ہم نشینوں سے کہا کرتا تھا: ''موسیقی کا شوق شہوت کو بڑھاتا اور شراب جیسا اثر کرتا ہے۔ اگر تمہیں موسیقی سے واسطہ رکھنا ہے تو پھر عورتوں سے دور رہو؛ کیوں کہ گانا زنا کا منتر ہے۔ میرے نزدیک موسیقی پیاس کی شدت میں پانی سے زیادہ لذیذ ہے مگر اس کے باوجود میں یہی کہہ رہا ہوں؛ کیوں کہ حق بات اس لائق ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے۔'' ③

---

① تاریخ الطبری: ۷/۲٤٦؛ سیر اعلام النبلاء: ۵/۳۷۳؛ الکامل فی التاریخ: سنة ۱۲٦ ھ ② تاریخ الطبری: ۷/۲۲۱

③ الکامل فی التاریخ: سنة ۱۲٦ ھ

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ولید ثانی موسیقی اور مے نوشی جیسے کبیرہ گناہوں میں ضرور ملوث تھا مگر وہ ان چیزوں کو گناہ تسلیم کرتا تھا اور زنا کاری کو ان سے کہیں زیادہ بُرا سمجھتا تھا۔ وہ گناہ گار ضرور تھا مگر شریعت کا منکر اور ملحد نہ تھا۔

عباسی دور کے خلیفہ مہدی کے سامنے کسی نے ولید ثانی کو زندیق اور کافر کہا تو مجلس میں موجود ایک فقیہ ابو علاثہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے: ''امیر المؤمنین! مجھے ولید کے ایک دوست نے جو اس کی نجی محفلوں میں شریک رہتا تھا، بتایا ہے کہ ولید پینے پلانے اور لہو و لعب میں مشغولیت کے باوجود نماز کا وقت آتے ہی لباس تبدیل کرتا اور اچھی طرح وضو کر کے نماز ادا کرتا۔''

یہ سن کر مہدی نے اس گواہی کو قبول کیا اور کہا: ''اللہ آپ کو برکت دے۔''[1]

برائیوں کے ساتھ اس میں سخاوت کی خوبی نمایاں تھی۔ اس نے سپاہیوں اور سرکاری ملازموں کی تنخواہیں بڑھا دی تھیں۔ محتاجوں، معذوروں اور اپاہجوں کی دیکھ بھال پر خوب خرچ کرتا تھا۔[2] خود بھی قادر الکلام شاعر تھا اور شعراء کو بڑھ چڑھ کر انعامات دیا کرتا تھا۔[3]

◆◆ ◆

---

① الكامل في التاريخ: سنة: ۱۲۶ھ

② الكامل في التاريخ: ۲۸۸/٤ تحت: ۱۲۵ھ

③ مروج الذهب: ٥٢/٤، ٥٣ ؛ الفخري في الآداب السلطانية لابن الطقطقي، ص ۱۳۳، ط دار القلم بيروت

یزید بن ولید بن عبدالملک (یزید ثالث)

جمادی الآخرہ ۱۲۶ھ......تا......ذوالحجہ ۱۲۶ھ

اپریل 744ء......تا......اکتوبر 744ء

ولید بن یزید کو قتل کر کے برسراقتدار آنے والا اس کا چچازاد یزید بن ولید نیک سیرت، سادہ منش اور کفایت شعار تھا۔ اموی حکمرانوں میں یہ یزید نامی تیسرا خلیفہ تھا؛ اس لیے اسے ''یزیدِ ثالث'' کہا جاتا ہے۔ اس نے ولید کے رائج کردہ سرکاری اخراجات میں اسراف کو ختم کر دیا اور تنخواہیں کم کر دیں، اسی وجہ سے مخالفین اسے ''یزید ناقص'' کہنے لگے۔ بنوامیہ کے عادل خلفاء میں عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ اس کا نام لیا جاتا ہے۔[1]

اس کی پالیسی اس کی پہلی تقریر سے ظاہر ہے جس میں اس نے کہا تھا:

''میں اس وقت تک نہ کوئی نئی عمارت بنواؤں گا، نہ نئی نہر کھدواؤں گا جب تک سرحدوں کی حفاظت کے انتظامات اور ضرورت مندوں کی حاجات پوری نہ ہو جائیں۔ میں اپنا دروازہ ضرورت مندوں کے لیے کبھی بند نہیں کروں گا۔ تمہارا وظیفہ اور راشن تمہیں حسبِ معمول ملتا رہے گا۔ حقوق کے لحاظ سے دور اور قریب والوں میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ جو کچھ میں نے کہا اگر اس پر عمل کرتا رہوں تو میری اطاعت تم پر لازم ہے۔ اگر ایسا نہ کروں تو تم مجھے معزول کر دو۔ اگر کوئی نیک و صالح آدمی ان باتوں کی پابندی کا وعدہ کرے اور تم اس کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہو تو میں سب سے پہلے اس سے بیعت کروں گا۔''[2]

مؤرخ ابن الطقطقی یزید ثالث کا یہ خطبہ نقل کر کے فرماتے ہیں:

''اس زمانے کی نسبت سے اور اس دور کی اصطلاح کے اعتبار سے یہ بیان اچھا تھا؛ کیوں کہ ان لوگوں کے ہاں قیادت کے لیے یہ صفات معتبر شمار ہوتی تھیں۔ رہی آج ہمارے دور کی بات، تو اگر آج کوئی بادشاہ اس پر فخر کرے کہ اس نے کوئی نہر نہیں کھدوائی اور کوئی تعمیراتی کام نہیں کرایا اور اپنی رعایا کو دعوت دے کہ وہ اس کی جگہ دوسرے کو مقرر کر دیں تو لوگ ایسے شخص کو بے وقوف تصور کریں گے۔

① البدایة والنهایة: ۱۳/۱۹۱، ۱۹۲
② الفخری فی الآداب السلطانیة لابن الطقطقی، ص ۱۳۴

نگران لوگوں کی اصطلاح میں یہ مناسب تھا کہ حکمران دوسرے کو حکمرانی سونپ دے۔،،①

یزید ثالث کا سابق خلیفہ کو قتل کر کے برسرِ اقتدار آنا چاہے وقت کی ضرورت سہی مگر تھی تو بغاوت۔ اور بغاوت کی وجوہ کچھ بھی ہوں، اس کا بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ عوام کے دلوں سے حکمرانوں کا وقار اٹھ جاتا ہے۔ ماتحت امراء میں آئندہ بھی حکمرانوں کے خلاف شمشیر سونتنے اور بغاوتیں کرنے کی ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر ولید ثانی کے قتل میں قبائلی عصبیت بھی کارفرما تھی۔ یزید ثالث یمنی قبائل کے ذریعے برسرِ اقتدار آیا تھا۔ ان تلواروں کا نشانہ بننے والا ولید جو اپنے دورِ اقتدار میں ہر طبقے میں بدنام تھا، قتل ہونے کے بعد اپنے قبیلے کے نزدیک مظلوم بن گیا چنانچہ اکثر قریشی اور اموی عمائد نئے حکمران کے خلاف ہو گئے۔ حمص، فلسطین اور اردن میں بغاوتیں ہوئیں جنھیں سرکاری افواج نے بڑی مشکل سے ختم کیا۔

مگر اس جھنجھٹ سے پیچھا چھوٹا ہی تھا کہ کچھ ہی دنوں بعد الجزیرہ کے اموی حاکم مروان بن محمد نے بغاوت کر دی۔ یزید ثالث نے موصل اور آذربائی جان کی حکومت پیش کر کے اسے دوبارہ وفاداری پر آمادہ کیا۔

یزید ثالث کو صرف چھ مہینے تک حکومت کا موقع ملا۔ وہ طاعون کے مرض میں مبتلا ہوا اور ۲۰ ذوالحجہ ۱۲۶ھ کو وفات پا گیا۔ اس کی عمر ۴۶ سال تھی۔②

❖❖ ❖

① الفخری فی الآداب السلطانیة لابن الطقطقی، ص ۱۳۴،۱۳۵
یہ بھی ظاہر ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد حکمرانوں کے مزاج میں یہ تبدیلی عمر بن عبدالعزیز کے مثالی کردار کی وجہ سے ظاہر ہوئی تھی ورنہ ان سے پہلے بنو مروان کے حکمرانوں میں یہ صفات نہیں تھیں بلکہ طاقت کے بل بوتے پر حکومت کا رنگ زیادہ نمایاں تھا۔

② البدایة والنهایة: ۱۳/۱۹۱، ۱۹۲؛ الکامل فی التاریخ: سنة ۱۲۶ھ ؛ تاریخ الخلفاء، ص ۱۸۹، ط نزار

اِبراہیم بن ولید بن عبدالملک

ذوالحجہ ۱۲۶ھ......تا......صفر ۱۲۷ھ

اکتوبر 744ء......تا......دسمبر 744ء

یزید ثالث کے بعد اس کا بھائی ابراہیم تخت نشین ہوا۔ تاہم اس کی خلافت برائے نام ہی تھی۔ عام طور پر اس کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا گیا۔

اس کے خلیفہ بنتے ہی الجزیرہ کے حاکم مروان بن محمد نے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ ولید ثانی کے بیٹوں کو رہا کیا جائے جنہیں یزید ثالث نے گرفتار کیا تھا۔ یہ مطالبہ مسترد کر دیا گیا اور مروان نے افواج لے کر شام پر چڑھائی کر دی۔ اس نے قنسرین اور حمص پر قابض ہوتے ہوئے سیدھا دِمشق کا رخ کیا۔

ابراہیم نے سلیمان بن ہشام کو ایک لاکھ سپاہی دے کر مقابلے کے لیے بھیجا۔ صفر ۱۲۷ھ میں سرکاری افواج اور مروان کے حامیوں میں زوردار جنگ ہوئی جس میں سرکاری افواج کو شکست ہوئی۔

اس دوران شامی امراء نے ایک حماقت یہ کی کہ ولید ثانی کے گرفتار شدہ دونوں بیٹوں کو قتل کر دیا تاکہ مستقبل میں ان میں سے کسی کے خلیفہ بننے کا امکان نہ رہے۔

ادھر مروان یلغار کرتا ہوا دِمشق پہنچ گیا۔ ابراہیم شہر سے فرار ہو گیا۔ مروان نے آسانی سے پایہ تخت پر قبضہ کر لیا۔[1] صفر ۱۲۷ھ کو ابراہیم کی معزولی کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کی حکومت دو ماہ بھی پورے نہ کر سکی۔

✦✦ ✦

(۱) الکامل فی التاریخ: سنة ۱۲۶ھ، ۱۲۷ھ؛ تاریخ الخلفاء، ص ۱۸۹

مروان بن محمد بن مروان (مروانِ ثانی)

صفر۱۲۷ھ......تا......ذوالحجہ۱۳۲ھ

دسمبر744ء......تا......اگست750ء

مروان بن محمد (مروانِ ثانی) ایک پختہ عمر، جہاں دیدہ اور بہادر انسان تھا۔ اس نے وسعتِ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سابق حکمران ابراہیم کو تخت سے ہٹانے پر اکتفا کیا اور اس کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہ کی۔

مروان نے جب خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو نظام حکومت بہت کمزور ہو چکا تھا۔ مروان نے پانچ سال دس ماہ تک حکومت کی اور اس دوران سلطنت کی بقا کی ان تھک کوشش جاری رکھی۔ اس کی سخت کوشی اور جفاکشی کی وجہ سے لوگ اسے حمار (گدھے) سے تشبیہ دینے لگے اور بعد میں مخالفین نے اس نازیبا لفظ کو طنزاً اس کے نام کا حصہ بنا دیا۔

بہرکیف بگڑتے حالات کی طوفان خیز موجوں کے سامنے بند باندھنے کی تمام کوششیں اکارت گئیں اور آخرکار مروان بن محمد پر بنوامیہ کی سیادت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے دور میں حالات کی خرابی اور مملکت کی کمزوری کی چار بڑی وجوہ تھیں:

① اندرونی بغاوتیں اور شورشیں جو سرکش امراء اور خوارج کی شکل میں ابھر رہی تھیں۔

② یمنی اور مضری قبائل کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی جو خانہ جنگی کی شکل اختیار کر رہی تھی۔

③ خود خاندانِ بنوامیہ اور امرائے بنومروان کے مابین اختلافات اور عدم اعتماد کا ماحول۔

④ بنوہاشم کی خفیہ دعوت جو ملک کو ایک انقلاب کی طرف لے جا رہی تھی۔

جہاں تک اندرونی بغاوتوں اور شورشوں کا تعلق ہے، ان میں سب سے پہلے اسے شام کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ دراصل مروان مضری قبائل کا حامی تھا جبکہ شام میں یمنی قبائل کی کثرت تھی۔ انہوں نے شام کے مختلف شہروں میں اس کی بیعت سے انکار کر دیا۔ مروان نے ہر جگہ فوج کشی کر کے ان باغیوں کو بزورِ شمشیر سرنگوں کیا۔

کچھ عرصے بعد یہ باغی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے لڑکے سلیمان کی قیادت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی تعداد ۷ ہزار تک پہنچ گئی۔ مروان نے خساف کے مقام پر ایک قہر انگیز جنگ لڑ کر انہیں پسپا کیا۔[1]

[1] الکامل فی التاریخ: ۳۳۹/٤، سنة ۱۲۷ھ

کچھ ہی مدت بعد عراق میں ضحاک بن قیس نامی ایک بڑے معرکہ آزما خارجی سردار نے بغاوت کر دی اور کوفہ پر قابض ہو گیا کئی ماہ تک وہ سرکاری افواج کے لیے دردِ سر بنا رہا۔ آخر میں وہ فتح یاب ہوتا ہوا شام کی طرف بڑھا۔ حران کے مقام پر مروان نے خود اس کا سامنا کیا۔ اس لڑائی میں ضحاک مارا گیا اور اس کا باقی لشکر دو تین چھوٹی چھوٹی جنگوں کے بعد عراق کی طرف پسپا ہو گیا۔ مروان کے جرنیلوں نے ان کا تعاقب کیا اور عراق میں ہر جگہ انہیں تہ تیغ کر کے ان کا صفایا کر دیا۔

کچھ مدت بعد ایک اور خارجی سردار ابوحمزہ مکہ معظمہ پر قابض ہو گیا اور پھر مدینہ منورہ کی طرف بڑھا۔ اہل مدینہ نے باہر آ کر اس کا مقابلہ کیا مگر ایسی شکست کھائی کہ مدینہ کا شاید ہی کوئی گھر مقتولین سے خالی رہا ہو۔ ابوحمزہ مدینہ پر قبضہ کر کے شام کی طرف بڑھا۔ مروان نے اس کی پیش قدمی روکنے کے لیے چار ہزار سپاہی روانہ کیے جنہوں نے ابوحمزہ کو شکست دے کر حجاز کو ان کے وجود سے پاک کر دیا۔ اس کارروائی میں ابوحمزہ بھی مارا گیا۔ خوارج سے یہ لڑائیاں مروان کی تخت نشینی کے ساتھ شروع ہوئیں اور تین سال سے زائد عرصے تک جاری رہیں۔[1]

بہر حال یہ لڑائیاں حکومت کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھیں؛ کیوں کہ گزشتہ تمام خلفاء کو ایسی اندرونی مہمات کا سامنا رہا تھا۔ اصل خطرہ جس نے بنو مروان کی جڑوں کو کاٹ ڈالا، بنو ہاشم کی تحریک تھی جس کا حال تفصیل سے آگے پیش کیا جا رہا ہے۔

✦✦ ✦

---

① الكامل في التاريخ: ٤/ ٣٣١ تا ٣٥٨، سنة ١٢٧هـ تا ١٣٠هـ

سرگزشتِ دعوتِ بنی ہاشم...... چند اُصولی باتیں

بنومروان کے دور میں حُکام کے جور و جبر اور خوف و دبدبے نے عوام کی بہت بڑی تعداد کو کم ہمت اور خودغرض بنا دیا تھا۔ قابل، حق گو، دیانت دار اور متقی لوگ آہستہ آہستہ سرکاری عہدوں سے دور ہوتے چلے گئے تھے۔ دوسری طرف عوام نے بھی حکومت کے بھلے بُرے یا حکمران کی نیکی یا بدی سے سروکار رکھنا چھوڑ دیا۔ وہ یکے بعد دیگرے ایک ہی خاندان کے لوگوں کی تخت نشینی کا نظارہ کرنے کے لیے رہ گئے تھے۔ اسلام کا وسیع البنیاد شورائی نظام پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ اس صورتحال میں بنوہاشم کے کچھ لوگوں نے بنواُمیہ کا تختہ الٹنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ چونکہ عوام کی بہت بڑی تعداد بنومروان کی موروثی حکومت سے بےزار تھی؛ اس لیے اس تحریک کو بہت جلد مقبولیت حاصل ہو گئی۔

بعض لوگ بنوامیہ اور بنوہاشم کے مابین کسی بھی قسم کے سیاسی اختلاف کا انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بنوامیہ کے خلاف بنوہاشم (یعنی بنوعباس یا بنوفاطمہ) نے کبھی کوئی تحریک چلائی ہی نہیں۔ اسی طرح وہ عباسی خلافت کے قیام کے دوران کشت وخوں کا بھی سرے سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کسی خونریزی کے بغیر بنوعباس کی حکومت قائم ہو گئی تھی اور بنوامیہ کے امراء کو کوئی گزند نہیں پہنچائی گئی۔

اتنا تو درست ہے کہ بنوہاشم اور بنوامیہ کی سیاسی کش مکش کے بارے بعض باتیں مبالغے اور جعل سازی پر مبنی ہیں، اسی طرح بنوعباس کی خلافت میں بنوامیہ پر مظالم کی روایات میں بھی یقیناً بعض اضافی چیزیں شامل کی گئی ہیں۔ مگر ہر بات کو سبائی روایات کی کرشمہ سازی کہہ کر اس کا انکار کر دینا بھی کوئی منصفانہ طرزِ عمل نہیں ہے۔ ایک اتنا بڑا انقلاب جو چین کی سرحد سے اَندلس تک وسیع خلافت کو چند سالوں میں لپیٹ کر رکھ دے، کسی غیر معمولی تحریک، طاقت ور اسباب، زبردست عوامی ذہن سازی اور سخت کش مکش کے بغیر برپا ہو جانا ممکن نہ تھا۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خود عباسی خلفاء کے زمانے میں مرتب کی گئی کتبِ تاریخ میں یہ باتیں اسی طرح منقول ہیں۔ کچھ لوگ بنواُمیہ کے معایب کا کلی طور پر انکار کرتے ہوئے کہہ دیتے ہیں کہ ان کے دور کے سارے حالات ان کی مخالف سیاسی پارٹی بنوعباس کے دورِ حکومت میں مرتب کیے گئے؛ اس لیے ان کے خلاف لکھی جانے والی تمام روایات جھوٹی ہیں۔ اوّل تو یہ بات خود درست نہیں۔ مانا کہ بنوامیہ کے بعض معایب من گھڑت ہیں اور اسی لیے ہم نے اُموی دور کے احوال میں روایات کی خاص طور پر چھان بین کی ہے مگر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس دور کے سب اہلِ قلم حکام کے زرخرید نہ تھے کہ سب کچھ انہی کی مرضی کے مطابق گھڑ گھڑ کر لکھتے رہتے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر بنوامیہ کے

خلفاء کی فتوحات اوران کی کسی بھی خوبی کا ذکران مصادرِ تاریخیہ میں نہ ملتا جو بنوعباس کے دور میں مرتب کیے گئے۔اگر بنوعباس کو اہلِ علم کے قلم پر اتنا ہی قابو ہوتا تو پھر عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں بھی معایب گھڑ کر پیش کر دیے جاتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بنوعباس کے دور میں مرتب کیے گئے تاریخی مصادر میں ان کے بارے میں ایک منفی جملہ بھی منقول نہیں۔ ولید کی فتوحات پوری تفصیل سے مذکور ہیں۔اسی طرح عبدالملک کی سیاسی مہارت اور غیرت وحمیت، سلیمان کی شرافت وسخاوت اور ہشام کی بردباری اور سیاست دانی بھی انہی مصادر سے ہم تک پہنچی ہے؛اس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ بنوعباس کے دور کے تمام تاریخی مصادر شیعی روایات سے بھرے ہوئے ہیں۔

درحقیقت خروج اور انقلاب کے دوران پیش آنے والے بعض ناخوشگوار واقعات اس زمانے کے ایسے پختہ حقائق تھے جن کا کوئی صحیح العقل انسان انکار نہیں کرسکتا تھا؛اسی لیے عباسی خلفاء نے اپنے دور میں ان کے مرتب اور شائع ہونے پر کوئی قدغن نہیں لگائی۔ پھر ہمارے سامنے تاریخ کا ایک ایسا مأخذ''انساب الاشراف''موجود ہے جو عباسی خلیفہ المتوکل کے خاص درباری البلاذری (م ۲۷۹ھ) نے مرتب کیا تھا۔ بلاذری خود اہل سنت مؤرخ تھے اور المتوکل بھی سنت کا پابند اور سبائیت کا سخت مخالف تھا؛اس لیے ہم عباسی تحریک کے ناخوش گوار واقعات کے متعلق''انساب الاشراف''پر کسی اور مأخذ کی بہ نسبت زیادہ اعتماد کرسکتے ہیں۔ دوسرا اہم مأخذ ابن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) کی تاریخ ہے۔ یہ بھی عباسی دور میں مرتب کردہ مشہور ترین تاریخ ہے۔امام طبری درباری مؤرخ نہ تھے؛لہٰذا بنوعباس کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کے بارے میں تاریخِ طبری کے مواد پر اعتماد کیا جاسکتا ہے سوائے اس کے کہ کوئی روایت سنداً ناقابلِ اعتماد ہو یا کسی دوسری روایت سے تعارض کی وجہ سے مشکوک ہوجائے یا دیگر مضبوط قرائن اس روایت کی نفی کرتے ہوں۔

اگلے صفحات میں ہم بنوامیہ کی حکومت کے خلاف بنوہاشم کی تحریک اور انقلاب کی جو روداد پیش کر رہے ہیں اس میں بنیادی طور پر''انساب الاشراف''اور''تاریخِ طبری''پر اعتماد کیا گیا ہے جن میں اس تحریک کے حالات بڑی تفصیل سے قلم بند کیے گئے ہیں۔اس کے علاوہ تیسری صدی ہجری کے ایک اور اہم ماخذ''اخبار الدولۃ العباسیہ''سے بھی قدرے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ بھی عباسی خلفاء کے دور میں مرتب کردہ دستاویز ہے۔

باقی مواد حافظ ذہبی رحمہ اللہ کی''سیر اعلام النبلاء''اور''تاریخ دِمَشق''سے لیا گیا ہے۔حافظ ذہبی رحمہ اللہ رجال پر گہری نگاہ رکھنے والے عالم اور مؤرخ تھے،سیر اعلام النبلاء میں انہوں نے مشاہیرِ امت کے احوال بڑی حد تک محتاط انداز میں جمع کیے ہیں؛لہٰذا ہم اس پر اعتماد کرسکتے ہیں۔تاریخ دِمَشق میں صحیح وسقیم ہر طرح کا مواد ہے تاہم ہم نے حوالوں کا ہر جگہ التزام کیا ہے؛اس لیے اگر اہلِ علم کتبِ رجال کا حوالہ دیتے ہوئے کسی روایت میں کسی سبائی یا کذاب راوی کی نشاندہی کے ساتھ اس پر شک کا اظہار کریں تو یقیناً ان کی بات کا وزن ہوگا۔تاہم یہ درست نہ ہوگا کہ صرف کسی روایت کو اپنے ذوق یا توقع کے خلاف دیکھ کر بلاتحقیق اسے''سبائیت زدہ''مان لیا جائے۔

بنو ہاشم کی انقلابی دعوت

دوسری صدی ہجری کے آغاز میں شیعانِ علی میں اندرونی طور پر گروہ بندی ہو چکی تھی۔ایک گروہ زید بن علی رحمہ اللہ کا عقیدت مند تھا۔دوسرا ان کے بھائی حضرت باقر رحمہ اللہ کا حلقہ بگوش تھا۔یہ دونوں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سگے پوتے اور صفِ اوّل کے علماء وصلحاء میں سے تھے۔

اسی دور میں کچھ لوگ ایسے بھی ابھرے جو بنو فاطمہ کی محبت کی آڑ لے کر باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث ہوئے۔اس دور کی تاریخ میں شیعانِ علی کے ایک حامی سردار حارث بن سُریج کا نام بہت مشہور ہے جس نے ۱۱۶ھ میں خراسان میں بغاوت کی تھی۔اس نے سیاہ لباس کو شعار بنا کر لوگوں کو سادات سے بیعت کی دعوت دی تھی اور شمالی افغانستان کے علاقے فاریاب میں چار ہزار مسلح افراد جمع کر لیے تھے۔بلخ کے حاکم نصر بن سَیار کو مقابلے میں شکست دینے کے بعد حارث بن شریح کی جمعیت ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔آخر بنوامیہ کے ایک امیر عاصم بن عبداللہ نے کئی جنگوں کے بعد ۱۱۷ھ میں اس بغاوت کا زور توڑا۔[1] اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس بغاوت کے پیچھے بنو فاطمہ کے بزرگوں: حضرت محمد باقر یا جعفر صادق رحمہما اللہ کا کوئی ہاتھ ہو۔

تیسرا گروہ وہ تھا جو سادات سے عقیدت کے اظہار میں اس قدر مبالغہ آرائی کرتا تھا کہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سمیت گزشتہ تمام خلفاء کو ظالم اور غاصب قرار دیتا تھا۔اس گروہ کے لوگ درحقیقت شعوری یا غیر شعوری طور پر سبائی تحریک کے لیے کام کر رہے تھے اور شیعانِ علی میں گھل مل کر انہیں بار بار حکومت کے خلاف بغاوت پر اکساتے تھے۔ اس دور کی تواریخ میں اس گروہ کے کسی سربراہ کا نام مذکور نہیں۔اس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ ان کی قیادت خفیہ ہاتھوں میں تھی۔تاہم علانیہ طور پر یہ لوگ ساداتِ کرام ہی کو اپنا قائد قرار دیتے تھے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے زید بن علی سیاسی لحاظ سے بنوامیہ کے مخالف تھے۔ان کی خواہش تھی کہ خلافت بنو ہاشم کے بزرگوں کو ملنی چاہیے۔مگر یہ بات ثابت ہے کہ وہ اور تمام اکابر سادات انتہاء پسند شیعوں (سبائیوں) کی بدعقیدگی سے بے زار تھے۔زید بن علی فرمایا کرتے تھے: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ شکر گزار بندوں کے امام تھے۔''

وہ یہ بھی فرماتے تھے: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بے زاری ظاہر کرنا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بے زاری کے مترادف ہے۔''[2]

ہشام کے آخری ایام میں ایک واقعے کی وجہ سے زید بن علی رحمہ اللہ اچانک حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

[1] المنتظم لابن الجوزی:۱۶۹/۷
[2] سیر اعلام النبلاء:۳۹۰/۵

خروج کی وجوہات:

ہوا یہ تھا کہ کچھ مدت پہلے حاکم عراق خالد بن عبداللہ قسری کو معزول کر کے حراست میں لے لیا گیا تھا۔ گرفتاری کے بعد جب اس سے سرکاری خزانے کا حساب کتاب پوچھا تو اس نے جھوٹ موٹ کہہ دیا کہ میں نے حضرت زید بن علی کے پاس بے شمار دولت امانت کے طور پر رکھوائی ہوئی ہے۔ یہی غلط بیانی اس نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پوتے داؤد بن علی کے بارے میں کی۔ خالد بن عبداللہ کے بیٹے یزید سے پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے الزام میں یہ اضافی ٹکڑا بھی لگا دیا کہ یہ سادات حضرات بغاوت کی تیاری کر رہے ہیں۔

یہ بات خلیفہ ہشام تک پہنچی۔ اس نے مدینہ کے گورنر کو کہا کہ ان دونوں حضرات کو دِمشق بھیج دیا جائے۔

مدینہ کے گورنر نے ان حضرات کو بلا کر ماجرا پوچھا۔ انہوں نے قسمیں کھا کر ان الزامات کی تردید کی۔ گورنر نے کہا: ''آپ حضرات میرے نزدیک سچے ہیں۔ مگر خلیفہ نے آپ کو طلب کیا ہے؛ اس لیے آپ کا وہاں جانا ضروری ہے۔''

یہ حضرات دِمشق پہنچے۔ ہشام بن عبدالملک نے ان سے حقیقت پوچھی۔ داؤد بن علی نے کہا:

''بات صرف اتنی ہوئی تھی کہ میں خالد بن عبداللہ کے پاس عراق گیا تھا۔ اس نے مجھے ایک لاکھ درہم ہدیے کے طور پر دیے تھے۔ کوئی مال اس نے امانت کے طور پر نہیں رکھوایا۔''

اب ہشام، حضرت زید بن علی رحمہ اللہ کی طرف متوجہ ہوا اور بولا: ''سنا ہے کہ آپ خلافت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔''

زید بن علی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''امیر المؤمنین! جو بات آپ تک پہنچی ہے، وہ درست نہیں۔''

ہشام نے کہا: ''میرے خیال میں بات اسی طرح ہے۔''

حضرت زید بن علی رحمہ اللہ نے کہا: ''میں قسم کھانے کو تیار ہوں۔''

ہشام نے کہا: ''قسم کھالیں تب بھی یقین نہیں کر سکتا۔''

زید بن علی رحمہ اللہ نے کہا: ''اللہ تعالیٰ اس شخص کی عزت گھٹا دیتا ہے جو اس کے نام کی قسم پر یقین نہ کرے۔''

یہ سن کر ہشام نرم پڑ گیا۔ اس نے مزید پوچھ گچھ نہ کی اور کہا: ''آپ جا سکتے ہیں۔''

حضرت زید بن علی رحمہ اللہ تفتیش کے اس عمل کی وجہ سے حکومت سے کبیدہ خاطر ضرور ہو گئے تھے؛ اس لیے ہشام کے ہاں سے نکلے تو فرمایا: ''ذلیل ہے جو زندگی کو ترجیح دے۔''[1]

ہشام نے معاملے کو پوری طرح صاف کرنے کے لیے ان حضرات کو عراق بھیجنے کا فیصلہ کیا اور وہاں کے گورنر یوسف بن عمر کو لکھا: ''ان حضرات نے میرے سامنے اپنی برأت پر قسمیں کھائی ہیں۔ میں نے ان کی قسموں کا یقین کر کے انہیں بری قرار دے دیا ہے۔ اب میں انہیں تمہارے پاس اس لیے بھیج رہا ہوں کہ انہیں خالد بن عبداللہ کے سامنے بٹھاؤ تاکہ یہ اس کے منہ پر اس کو جھٹلا سکیں۔''

---

[1] تاریخ دمشق: ۱۹/۴۶۶، ۴۶۷

یہ حضرات کوفہ گئے تو یوسف بن عمر نے ان کا اعزاز واکرام کیا اور خالد بن عبداللہ کو ان کے سامنے بٹھا کر کہا:

''یہ امیر المؤمنین کا خط موجود ہے کہ ان حضرات کی قسموں پر اعتبار کرتے ہوئے امیر المؤمنین نے ان کو بری مان لیا ہے۔ اب اگر تمہارے پاس اپنے الزامات کا کوئی گواہ ہے تو پیش کرو۔''

خالد کوئی گواہ پیش نہ کر سکا۔ یوں مکمل طور پر ثابت ہو گیا کہ الزامات جھوٹے ہیں۔ یوسف بن عمر نے خالد بن عبداللہ کو لعنت ملامت کی اور ان حضرات کو بری قرار دے دیا۔

معاملہ بحسن وخوبی نمٹ چکا تھا مگر کوفہ کے شیعانِ علی نے اس موقع پر سادات سے ہمدردی جتاتے ہوئے ایک اور خونچکاں داستان رقم کر دی۔ حضرت زید بن علی رحمہ اللہ اس کے بعد بھی چند ہفتے کوفہ میں قیام پذیر رہے۔ اس دوران شیعانِ علی ان سے ملتے رہے۔ انہوں نے اکابر سادات کو تفتیشی مراحل سے گزارنے کے حکومتی رویے کی سخت مذمت کرتے ہوئے اپنی جانی ومالی خدمات پیش کیں اور یقین دلایا کہ وہ حکم دیں تو حکومت کا تختہ الٹنا کوئی مشکل نہیں۔ ①

اکثر شیعانِ علی نے یہ پیش کش غیر مشروط طور پر کی تاہم شر پسند شیعہ عناصر نے کہا:

''ہم آپ کی مدد کے لیے اس شرط پر تیار ہیں کہ آپ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما پر سب وشتم کریں۔''

حضرت زید بن علی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''نہیں بلکہ میں تو ان سے محبت کرتا ہوں۔''

انتہا پسند شیعہ عناصر تلملا اٹھے اور یہ کہتے ہوئے الگ ہو گئے:

''اگر آپ کا یہ عقیدہ ہے تو ہم آپ سے رفض (بیزاری) ظاہر کرتے ہیں۔''②

اس طرح روافض پہلی بار اتنے کھل کر بے نقاب ہوئے کہ ان کے گروہ کو باقی شیعانِ علی سے الگ ہونا پڑا۔

شیعانِ علی تین جماعتوں میں تقسیم:

اب شیعانِ علی میں تین واضح جماعتیں بن گئیں:

❶ روافض ❷ زیدیہ ❸ شیعانِ بنو فاطمہ یا علوی

① حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے بغض وعداوت رکھنے والا اور حضرت زید بن علی اور دیگر شیعانِ علی سے بے زاری ظاہر کرنے والا گروہ ''روافض'' کے نام سے مشہور ہوا۔

② شیعانِ علی کے جو لوگ حضرت زید کے ہم مسلک اور ان کی مسلح جدوجہد کے موقف پر برقرار رہے وہ ''زیدیہ'' کے نام سے جانے گئے۔ اس جماعت کے لوگ اب بھی بعض مسلم ممالک میں موجود ہیں۔ شیعہ فرقوں میں یہ اعتدال پسند جماعت ہے، اہلِ سنت سے اس کا بڑا اختلاف دو مسائل میں ہے: پہلا یہ کہ زیدیہ فاسق اور ظالم حکام کے خلاف خروج کو واجب مانتے ہیں۔ اہلِ سنت کا مسلک یہ نہیں۔

① تاریخ الطبری: ۷/۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸

② سیر اعلام النبلاء: ۵/۳۹۰

دوسرے یہ کہ زیدیہ کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام صحابہ سے افضل ہیں۔ اہل سنت کے نزدیک ان کا مقام حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم کے بعد ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس جماعت کا یہ عقیدہ برحق ہے کہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما عادل تھے۔ اور ان کا یہ عقیدہ باطل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان دونوں حضرات سے افضل تھے۔''[1]

③ شیعانِ علی کی تیسری جماعت وہ تھی جو حضرت باقر اور حضرت جعفر صادق کے ساتھ وابستہ رہی اور حکومت کے خلاف خروج میں شریک نہ ہوئی۔ یہ حضرات شیعان بنو فاطمہ یا علوی کہلاتے تھے۔ روافض سے یہ بھی بے زار تھے۔ خلفائے راشدین کے متعلق ان کا عقیدہ وہی تھا جو حضرت زید بن علی کا تھا۔ حضرت جعفر صادق سے کسی نے کہا:

''روافض آپ کے چچا زید بن علی سے بے زاری ظاہر کرتے ہیں۔''

انہوں نے فرمایا: ''ان سے بے زاری ظاہر کرنے والوں سے اللہ بھی بے زار ہے۔ اللہ کی قسم! وہ ہم سب سے زیادہ قرآن مجید کے قاری، دین کے فقیہ اور صلہ رحمی کے عادی تھے۔ اب کون ہے جو کہ ان جیسا ہو۔''[2]

شیعانِ علی زید بن علی کو خروج پر ابھارتے ہیں:

کچھ دن کوفہ میں گزار کر زید بن علی رحمہ اللہ مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔ شیعانِ علی ان کے پیچھے پیچھے آئے اور عذیب کے قریب ایک بار پھر ان سے ملاقات کر کے بڑے اصرار کے ساتھ خروج پر آمادہ کرنے لگے۔ انہوں نے پورے وثوق سے کہا: ''آپ واپس تشریف لے چلیں۔ عراق کے گورنر یوسف کی کوئی حیثیت نہیں۔ ہم کوفہ آپ کو لے کر دیں گے۔''[3]

زید بن علی کو خیر خواہوں نے منع کیا:

تقدیر کی بات کہ زید بن علی رحمہ اللہ ان کی باتوں پر یقین کر کے خروج پر کمر بستہ ہو گئے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پوتے داؤد بن علی جو مدینہ سے ان کے ساتھ تھے، انہیں روکنے لگے۔ انہوں نے کہا:

''ان لوگوں کی باتوں سے دھوکا نہ کھایئے۔ اہلِ بیت کی تاریخ میں آپ کے لیے عبرت کا کافی سامان ہے۔ آپ کے جدِ امجد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ انہوں نے کیا رویہ رکھا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زخمی کیا۔ ان کا خیمہ تک لوٹ لیا۔ آپ کے دادا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قسمیں کھا کر بلوایا اور انہیں بے یار و مددگار چھوڑنے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ شہید کرا کے دم لیا۔''

حضرت زید رحمہ اللہ شاید اپنے چچازاد کی باتوں پر غور کرتے مگر شیعانِ علی جو ساتھ ہی بیٹھے تھے، فوراً بول اٹھے:

''حضرت! یہ چاہتے ہیں آپ غالب نہ آئیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت پر ان (بنو عباس) کا زیادہ حق ہے۔''

داؤد بن علی، زید بن علی کو سمجھانے میں کامیاب نہ ہوئے تو مدینہ روانہ ہو گئے اور زید بن علی کوفہ لوٹ گئے۔[4]

---

① البداية والنهاية: ١٠٧/١٣
② سير اعلام النبلاء: ٣٩٠/٥
③ تاريخ دمشق: ٤٧٨/٩
④ تاريخ الطبري: ١٦٩/٧

کوفہ میں چالیس ہزار افراد نے ان سے بیعت کر لی۔ تاہم شہر کے دور اندیش حضرات نے انہیں اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

شیعانِ علی کے ایک ممتاز فرد سلمہ بن کُہیل رحمہ اللہ جو صدوق شیعی محدثین میں شمار ہوتے ہیں، آئے اور فرمایا:
''قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ آپ سے کتنے لوگوں نے بیعت کی ہے؟'' فرمایا: ''چالیس ہزار نے۔''
سلمہ نے پوچھا: ''آپ کے دادا (حضرت حسین رضی اللہ عنہ) سے کتنے لوگ بیعت ہوئے تھے؟'' فرمایا: ''۸۰ ہزار''
سلمہ نے پوچھا: ''ان کا ساتھ دینے والے کتنے تھے؟'' فرمایا: ''کوئی تین سو۔''
سلمہ نے پوچھا: ''قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ آپ کے دادا افضل تھے یا آپ؟'' فرمایا: ''میرے دادا''
پوچھا: ''آپ کا زمانہ بہتر ہے یا آپ کے دادا کا زمانہ بہتر تھا؟'' بولے: ''میرے دادا کا زمانہ''
سلمہ نے کہا: ''پھر بھی آپ کو ان لوگوں سے وفا کی امید ہے جب کہ وہ آپ کے دادا کے ساتھ دغا کر چکے ہیں!!''
زید بن علی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اب تو بیعت ہو چکی۔ وہ مجھ پر اور ان پر لازم ہو گئی ہے۔''
سلمہ بن کہیل رحمہ اللہ نے یہ سنا تو مایوس ہو کر لوٹ گئے۔ [1]

زید بن علی کا خروج اور قتل:

آخر زید بن علی رحمہ اللہ نے اہلِ کوفہ کی باتوں پر یقین کرتے ہوئے خروج کا اعلان کر دیا۔

اس لڑائی کی ان تمام تفصیلات کو جو فقط ابو مخنف شیعی سے منقول ہیں، ہم نظر انداز کرتے ہیں۔ اتنی بات طے ہے کہ لڑائی کوفہ شہر کے اندر ہوئی تھی۔ جب زید بن علی رحمہ اللہ مسلح ہو کر حکومت کے مقابلے میں نکلے تو ان کے ساتھیوں کی تعداد ایک ہزار بھی نہ تھی۔ سرکاری فوج نے آسانی سے ان پر قابو پا لیا۔ زید بن علی رحمہ اللہ اس جھڑپ کے دوران لڑتے لڑتے قتل ہو گئے۔ یہ واقعہ ۱۲۲ھ کا ہے۔ [2]

زید بن علی رحمہ اللہ کے قتل پر خلیفہ ہشام کا رنج:

خلیفہ ہشام بن عبدالملک جو طبعاً نرم دل تھا، زید بن علی کے خلاف کسی سخت کارروائی کے حق میں نہ تھا۔ کوفہ میں جو سب کچھ اچانک ہوا اس کی خلیفہ ہشام کو بالکل توقع نہ تھی۔ جب اسے زید بن علی رحمہ اللہ کے قتل کی اطلاع ہوئی تو غمگین ہو کر کہا: ''کاش! میں اپنا سب کچھ نثار کر کے انہیں بچا لیتا۔'' [3]

زید بن علی کا مقام علمائے اُمت کی نگاہ میں:

زید بن علی رحمہ اللہ کی عظمت اہل سنت و اہل تشیع سب کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
''وہ علم، تقدس اور پارسائی کے اونچے مقام پر تھے۔ انہوں نے خروج کیا اور شہادت پائی۔'' [4]

---

[1] تاریخ الطبری: ۱۶۹/۷
[2] تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۳۵۳
[3] البدایة والنهایة: ۱۵۲/۱۳
[4] سیر اعلام النبلاء: ۳۸۹/۵

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

”وہ علمائے صالحین میں سے تھے۔ان سے ایک غلطی ہو گئی پس انہیں شہادت ملی جو آخرت میں ان کے لیے درجات کی بلندی کا سبب ہو گی۔“[1]

اسلاف نے انہیں شہید اس لیے قرار دیا ہے کہ وہ فقیہ و مجتہد تھے اور ان کا خروج کسی شرعی تاویل کے تحت تھا؛ اس لیے ان کے اقدام کو غلطی کہتے ہوئے بھی باعثِ اجر مانا گیا ہے۔

زید بن علی کے بعد ان کے صاحبزادے یحییٰ حکومت کی گرفت سے بچنے کے لیے خراسان چلے گئے اور کوشش کی کہ ایک بار پھر بنو ہاشم کے حامیوں کو اپنے گرد جمع کریں مگر خراسان کے حاکم نصر بن سَیار نے انہیں گرفتار کر کے قتل کرا دیا۔[2]

کیا بزرگانِ بنو ہاشم عقیدۂ امامت کی وجہ سے خروج کرتے رہے؟

یہ سوال باقی رہتا ہے کہ آخر حضرت زید کے نزدیک خروج کی وجہِ جواز کیا تھی؟

چونکہ ان کے موقف کے دلائل کسی صحیح روایت میں منقول نہیں؛ اس لیے ہم قرائن ہی سے کچھ اندازے لگا سکتے ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سادات کو خلافت کا بہتر حق دار تصور کرتے تھے۔خانوادۂ سادات کے بعض دوسرے بزرگوں مثلاً: محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کے بیٹے ابو ہاشم عبداللہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پوتے محمد بن علی کے بارے میں ثابت ہے کہ وہ یہی رائے رکھتے تھے۔تاہم نہ صرف جمہور علمائے امت نے اس خیال میں انقلاب پسند سادات کی تائید نہیں کی بلکہ اس دور میں سادات کے سرخیل حضرت محمد باقر رحمہ اللہ اور حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ جیسے نمایاں ترین اکابر بھی ایسی ہر تحریک سے الگ رہے۔

اہلِ تشیع کا دعویٰ ہے کہ عقیدۂ امامت، اُمت میں شروع سے چلا آ رہا ہے اور اسی لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد بزرگانِ سادات موقع بموقع خروج کرتے رہے اور ان کی کوششیں اس بات کی دلیل ہیں کہ عقیدۂ امامت دین کے اصول میں سے ہے اور اُمت کی روحانی و سیاسی قیادت کا حق صرف اور صرف اہلِ بیت کو ہے۔

مگر یہ بالکل بے بنیاد بات ہے۔قرآن و سنت کا مطالعہ کرنے والے کسی شخص سے یہ حقیقت ڈھکی چھپی نہیں کہ اسلامی تعلیمات میں فضیلت کا مدار ایمان، عملِ صالح اور تقویٰ ہے نہ کہ حسب و نسب اور خاندانی بزرگی۔خاندانی بزرگی اللہ کی ایک غیر اختیاری نعمت ہے جو یقیناً اسلام میں قابلِ احترام ہے لیکن فضیلت کا اصل معیار تقویٰ ہی ہے۔صحابہ کرام کے دور میں فضیلت کا اصل معیار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ سے زیادہ معیت و رفاقت اور اسلام کے لیے بڑی سے بڑی قربانیاں دینا تھا۔یہی وجہ تھی کہ کسی کو اس میں شک نہ تھا کہ اُمتِ مسلمہ میں سب سے افضل حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما ہیں؛ کیوں کہ اسلام کے لیے ان کی قربانیاں سب سے زیادہ تھیں۔

[1] تاریخ الاسلام للذھبی: ۸/۱۰۵، ت تدمری
[2] انساب الاشراف: ۱/۴۳۷

اس دور کے مسلمانوں نے جو دین کی بہتر سمجھ رکھتے تھے، پیغمبر کی نیابت اور جانشینی کے لیے ہمیشہ انہی صفات کو ملحوظ رکھ کر فیصلہ کیا۔ نسبی قرابت اور رشتہ داری اس وقت کوئی معیار نہ تھا ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کو پہلا خلیفہ مقرر کیا جاتا۔

خلافت وامامت کے بارے میں حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کا ذہن:

بعض حضرات صحیح بخاری کی ایک روایت پیش کر کے دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما صرف اپنے خاندان کی خلافت کے قائل تھے۔ اس روایت کے مطابق حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کچھ پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر زور دیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر پوچھ لیا جائے کہ خلافت کس کے لیے طے ہوگی، سادات کے لیے یا دوسروں کے لیے؟ اگر ہمارے لیے طے ہو تو ہمیں اطمینان ہو جائے گا، اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے دوسروں کے لیے طے کرنا چاہتے ہوں تو ہم انہیں مشورہ دیں گے کہ وہ یہ ذمہ داری ہمیں سونپ کر جائیں۔

مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس معاملے میں کچھ پوچھنے سے معذرت کر لی اور فرمایا:

''اگر ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں پوچھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم منع فرمادیں تو بعد میں لوگ ہمیں کبھی بھی اقتدار نہیں دیں گے؛ اس لیے اللہ کی قسم! میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔''[1]

مگر اس روایت سے بھلا یہ کہاں ثابت ہو رہا ہے کہ امامت کا جو عقیدہ اہلِ تشیع میں مروج ہے، وہی حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا عقیدہ تھا؟ روایت کا مطلب تو صاف ظاہر ہے۔ یعنی ان حضرات کے نزدیک ایک امکان تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی میں نسبی قرابت کی اہمیت بھی ملحوظ ہوگی، اور یہ حضرات پوری نیک نیتی سے یہ سمجھتے تھے کہ خلیفہ کا سادات سے ہونا مسلمانوں کی اجتماعیت اور پائیدار اتحاد کا سبب بن سکتا ہے۔

مگر اسی روایت سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر کبھی سادات کی امامت و نیابت کے لیے کوئی وصیت نہیں فرمائی تھی ورنہ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما اس موقع پر خاموش رہنے کا فیصلہ نہ کرتے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کا نفاذ ضرور یاد دلاتے۔ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں وضاحت اسی لیے نہ مانگی کہ ابھی تو سادات کے لیے امرِ خلافت کی گنجائش نکلتی ہے۔ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح الفاظ میں منع کر دیا تو یہ گنجائش بالکل ختم ہو جائے گی۔

چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ دیکھتے رہے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اپنے گھر والوں کو قربانیوں میں آگے اور مناصب میں پیچھے رکھا؛ اس لیے ان کا یہ سوچنا بالکل برمحل تھا کہ کہیں اپنے منہ سے عہدہ مانگنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ناراض نہ کر دے۔ وہ احادیث بھی ان کے سامنے تھیں جن میں عہدے اور مناصب طلب کرنے کی برائی منقول ہے؛ اس لیے انہوں نے اس معاملے میں سکوت اختیار کرنا ہی بہتر سمجھا۔

اس روایت سے تو مزید پختگی سے ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک سادات کا اقتدار کوئی شرعی عقیدہ نہ تھا بلکہ یہ ایک وقتی رائے تھی جسے وہ اس وقت انتظامی لحاظ سے بہتر سمجھ رہے تھے۔

[1] صحیح البخاری، ح: ۴۱۸۲، ۶۲۶۶

یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما وصیت و امامت کے نہیں خلافت کے قائل تھے اور ان دونوں حضرات نے باہم مشورہ کر کے حضور ﷺ سے جس جانشینی کی بات کرنا چاہی تھی، وہ خلافت ہی تھی؛ کیوں کہ بعد میں اس منصب پر آنے والے حضرات خلیفہ اور امیر المؤمنین کہلائے ہیں۔ حتیٰ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی حکومت سنبھالنے کے بعد خلیفہ اور امیر المؤمنین کہلاتے رہے، نہ کہ ''امام'' اور ''وصی''۔

ہاں چونکہ احادیث میں متعدد مقامات پر حکمران کے لیے ''امام'' اور حکمرانی کے لیے ''امامت'' کا لفظ آیا ہے؛ اس لیے فقہی اصطلاح میں حکام کے لیے امام اور خلافت کے لیے امامت کا لفظ بھی رائج ہو گیا۔ مگر ظاہر ہے اس امام اور اس امامت کا شیعوں کے عقیدۂ امامت سے کوئی تعلق نہیں۔ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے ذہن میں عقیدۂ امامت کا دور دور تک کوئی خیال نہ ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ حضرات جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اجماعِ اُمت میں شامل ہوئے اور ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بھی وفادار اور مددگار رہے، انہوں نے کبھی خلافت یا امامت کا دعویٰ نہیں کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ برملا کہتے تھے:

اَیُّھَا النَّاس! اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَمْ یَعْهَدْ اِلَیْنَا فِی هٰذِهِ الْاِمَارَةِ شَیْئًا.

''لوگو! رسول اللہ ﷺ نے اس حکومت کے معاملے میں ہمارے لیے کوئی وصیت نہیں فرمائی۔''[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کا عقیدہ سبائیوں نے پھیلایا:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد گزشتہ خلفاء کی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اتفاق بھی اسلام کے لیے ان کی قربانیوں اور شرفِ صحابیت میں باقی ساری اُمت پر فضیلت کی وجہ سے ہوا تھا۔ نیز بہت سے لوگوں کے لیے ان کی خلافت کا یہ پہلو بھی خوش گوار تھا کہ پہلی بار حضور اکرم ﷺ کے کسی قریبی رشتہ دار کو اقتدار ملا۔ حضور اکرم ﷺ سے محبت کی بناء پر ان کی یہ خوشی ایک طبعی چیز تھی مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذہن میں کسی عقیدۂ امامت کا تصور تھا نہ ان کی اولاد اور حامیوں کے ذہن میں۔ ہاں سبائیوں نے اسی وقت سے ان کے ''وصی'' اور سابق خلفاء کے غاصب ہونے کا خیال پھیلانا شروع کر دیا تھا اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے متعدد مواقع پر گزشتہ خلفاء سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کر کے اس نظریے سے بے زاری ظاہر کی تھی، پھر بھی سبائی گروہ چپکے چپکے اپنے نظریات کا پرچار کرتا رہا۔ لوگوں کو گروہی عصبیت پر پختہ کرنے کے لیے امام کے معصوم اور واجب الاطاعت ہونے کا نظریہ بھی ایجاد کر لیا گیا۔ لیکن کسی صحیح روایت سے یہ ثابت نہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سمیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کسی بیٹے کا یہ ذہن ہو۔ بلکہ کسی صحیح روایت سے یہ بھی ثابت نہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو عراق بلانے والے شیعانِ علی یہ عقیدہ رکھتے ہوں۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب کربلا میں شہید ہوئے تو سبائی گروہ نے شیعانِ علی میں یہ غلط فہمی پھیلانا شروع کر دی کہ

---

[1] دلائل النبوۃ: ۲۲۳/۷؛ تاریخ دمشق: ۲۹۲/۳۰، بسند حسن

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنا حقِ امامت وصول کرنے آرہے تھے جس کا قیام شرعاً فرض تھا اور اسی مقصد کے لیے انہوں نے جان دے دی۔ یوں اس پروپیگنڈے میں نئی جان پڑ گئی۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد کا نظریہ:

اکابر سادات، بنو عباس کے ہوں یا خانوادۂ علی کے، قرآن وسنت سے ہٹ کر کسی عقیدے کے حامل نہ تھے؛ اس لیے پہلی صدی ہجری کے اواخر تک ان کی طرف سے نہ تو وصیت، امامت اور عصمتِ ائمہ کی ترویج کا کوئی ثبوت ملتا ہے نہ کسی حکومت مخالف سرگرمی کا۔ بلکہ یہ حضرات عمر بھر موقع بموقع اس بدعقیدگی کی تردید کرتے رہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت زین العابدین رحمہ اللہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ذکر کرتے ہوئے انہیں ''صدیق'' کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ بدعقیدہ لوگوں کو اس پر حیرت ہوتی تو فرماتے: ''میں اسے صدیق کیوں نہ کہوں جسے مجھ سے بہت بہتر ہستیوں نے صدیق کہا، یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین وانصار نے۔ جو انہیں صدیق نہ کہے، اللہ اسے سچا نہ کرے۔ جاؤ ابوبکر وعمر سے محبت کرو۔ پھر جو کچھ بھی ہو اس کی ذمہ داری میری گردن پر ہے۔'' [1]

ان کے سامنے کسی نے حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم پر تنقید کی تو برداشت نہ کر سکے اور انہیں برملا برا بھلا کہا۔

آپ فرماتے تھے کہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل بالکل ناحق ہوا تھا۔ [2]

حضرت محمد باقر رحمہ اللہ کا عقیدہ:

ان کے صاحبزادے محمد باقر رحمہ اللہ کا عقیدہ بھی یہی تھا۔ یہ محمد باقر جو ابوجعفر کی کنیت سے مشہور ہیں، خود بھی بہت عالم فاضل اور عبادت گزار بزرگ تھے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے بقول: ''انہوں نے علم وعمل، سیادت وشرافت، ثقاہت اور پاکیزگی کو جمع کر لیا تھا۔ وہ امام، مجتہد اور قرآن مجید کی بکثرت تلاوت کرنے والے تھے۔'' [3]

ایک شیعی راوی ابن فضیل نے ایک دوسرے شیعی راوی سالم بن ابی حفصہ سے حضرت باقر رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے: ''ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے محبت کرو، ان کے دشمنوں سے بیزاری ظاہر کرو، یہ حضرات ہدایت کے امام تھے۔'' [4]

ایک باران سے پوچھا گیا: ''کیا اہلِ بیت میں سے کوئی ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو بُرا بھلا کہتا ہے؟''

فرمایا: ''نہیں۔ تم بھی ان دونوں سے محبت کرو، ان سے دوستی رکھو، ان کے لیے استغفار کرو۔'' [5]

محمد باقر رحمہ اللہ یہ بھی فرماتے تھے: ''میں نے اپنے اہلِ بیت میں سے جسے بھی دیکھا ہے وہ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے محبت کرنے والا ہے۔'' [6] مشہور شیعہ راوی جابر جعفی نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

''اولادِ فاطمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں بہترین بات ہی کہی جائے گی۔'' [7]

---

① تاریخ دمشق: ۳۸۹/۴۱؛ سیر اعلام النبلاء: ۳۹۵/۴
② طبقات ابن سعد: ۲۱۶/۵، ط دار صادر
③ سیر اعلام النبلاء: ۴۰۲/۴
④ سیر اعلام النبلاء: ۴۰۲/۴
⑤ طبقات ابن سعد: ۳۲۱/۵
⑥ تاریخ دمشق: ۲۸۵/۵۴
⑦ تاریخ دمشق: ۲۸۴/۵۴؛ سیر اعلام النبلاء: ۴۰۶/۴

جناب محمد باقر بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ذکر ''صدیق'' کہہ کر کیا کرتے تھے۔ایک بار کسی نے اس پر ٹوک دیا تو آپ نے قبلہ رخ ہو کر فرمایا: ''ہاں! وہ صدیق ہیں، ہاں! وہ صدیق ہیں۔جو انہیں صدیق نہ کہے، اللہ اسے دنیا و آخرت میں سچا نہ ہونے دے۔''[1]

شیعہ راوی سالم بن ابی حفصہ کا چشم دید بیان ہے کہ وفات کے وقت ان کی زبان پر یہ الفاظ تھے:

''یا اللہ! میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے دوستی اور محبت رکھتا ہوں۔اگر میرے دل میں اس کے سوا کچھ اور ہو تو مجھے قیامت کے دن حضرت محمد ﷺ کی شفاعت سے محروم کردے۔''[2] یاد رہے کہ ان حضرات کی خلفائے ثلاثہ کے خاندان سے قریبی رشتہ داریاں بھی تھیں۔حضرت محمد باقر کی زوجہ فروہ بنت قاسم، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سگی پڑپوتی تھیں۔[3]

ایک بار ان سے آیت ﴿اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا﴾ کی تفسیر پوچھی گئی کہ یہاں ''الذین آمنوا'' سے کیا مراد ہے؟ تو فرمایا ''حضور ﷺ کے صحابہ''

سوال کرنے والے نے کہا: ''لوگ تو کہتے ہیں اس سے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔''

محمد باقر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی انہی صحابہ میں شامل ہیں۔''[4]

شیعی راوی ابوعبداللہ جعفی کی روایت ہے کہ محمد باقر رحمہ اللہ سے پوچھا گیا:

''کیا تلوار کے دستے پر سونے چاندی کی ملمع کاری جائز ہے؟''

وہ بولے: ''ہاں بالکل؛ کیوں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار پر ملمع کاری کی تھی۔''[5]

ایک بار فرمایا:

''عراق کے کچھ لوگ ہم سے محبت کے دعوے دار ہیں اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر طعن و تشنیع کرتے ہیں اور وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ میں نے انہیں اس کا حکم دیا ہے۔انہیں بتا دو کہ میں ان سے بری ہوں۔اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے، اگر مجھے اقتدار مل جاتا تو میں اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے ان کا خون بہا دیتا۔''[6]

حضرت محمد باقر رحمہ اللہ کی وفات ۱۱۴ھ یا ۱۱۷ھ میں خلیفہ ہشام کے دور میں ہوئی تھی۔وہ فرماتے تھے:

''ہم بنو امیہ کے حکام کے پیچھے تقیہ کیے بغیر نماز پڑھتے ہیں اور میں اپنے باپ (زین العابدین) کے بارے میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ وہ بھی ان کے پیچھے بلا تقیہ نماز ادا کیا کرتے تھے۔''[7]

حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کا عقیدہ و نظریہ:

حضرت محمد باقر رحمہ اللہ کے فرزند حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ بھی عقیدے اور عمل میں قرآن و سنت پر پوری طرح

[1] حلیۃ الاولیاء: ۱۸٤/۳؛ تاریخ دِمَشق: ۲۸۳/٥٤ ؛سیر اعلام النبلاء: ٤۰۸/٤

[2] تاریخ دِمَشق: ۲۸٦/٥٤

[3] سیر اعلام النبلاء: ٤۰٦/٤

[4] حلیۃ الاولیاء: ۱۸٥/۳؛ تاریخ دِمَشق: ۲۹۰/٥٤

[5] حلیۃ الاولیاء: ۱۸٤/۳

[6] حلیۃ الاولیاء: ۱۸٥/۳

[7] طبقات ابن سعد: ۲۱۳/٥، ط صادر

عمل پیرا تھے۔ان کی والدہ فروہ بنت قاسم، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پڑپوتی تھیں۔ان کی نانی اسماء بنت عبدالرحمٰن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی نواسی تھیں؛ اسی لیے حضرت جعفر صادق فرماتے تھے: ''میں دو طرح سے ابو بکر کا بیٹا ہوں۔''

امام شافعی رحمہ اللہ ان کے بارے میں فرماتے تھے: ''جعفر ثقہ راوی ہیں۔''

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے تھے: ''میں نے جعفر بن محمد سے بڑا فقیہ نہیں دیکھا۔''①

جعفر صادق رحمہ اللہ سے کسی نے حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا:

''تم ایسے حضرات کے بارے میں پوچھتے ہو جو جنت کے پھل کھا چکے۔''②

جعفر صادق رحمہ اللہ فرماتے تھے: ''جو شخص سمجھتا ہے کہ میں امام معصوم ہوں جس کی اطاعت فرض ہے تو میں اس سے بے زار ہوں اور جو مجھے حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے لاتعلق سمجھتا ہے میں اس سے بھی بے زار ہوں۔''③

محمد بن حنفیہ اور بزرگانِ بنو عباس کا سیاسی موقف:

بنو ہاشم کی سب سے بڑی انقلابی جماعت بنو عباس کو سمجھا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ بنو عباس کے ایک فرد محمد بن علی اور ان کی اولاد کے سوا کسی نے خروج اور طلبِ اقتدار کا راستہ نہیں چنا تھا۔

یہ بات طے ہے کہ بنو عباس کے جد امجد حضرت عباس رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے قریبی دوست تھے۔ پھر ان کے لختِ جگر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد عمر بھر کسی قسم کی سیاسی سرگرمی میں شرکت نہیں کی تھی۔ وہ عبدالملک بن مروان کے دور تک زندہ رہے اور ہمیشہ سیاسی جھگڑوں سے کنارہ کش رہے۔عبدالملک بن مروان کے نام ان کا بیعت نامہ صحیح روایت میں منقول ہے۔④

مشہور ہے کہ شیعانِ علی نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد منصبِ امامت حضرت زین العابدین کے سپرد کرنا چاہا۔ان کی معذرت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے محمد بن حنفیہ کو یہی پیش کش کی تو انہوں نے منصبِ امامت کو سنبھال لیا۔مگر یہ باتیں کسی معتبر سند سے ثابت نہیں۔اس کے برعکس یہ ثابت ہے کہ محمد بن حنفیہ عمر بھر سیاست سے لاتعلق رہے۔نہ ہی انہوں نے منصبِ امامت سنبھالا تھا نہ انہیں عقیدۂ امامت سے کوئی واسطہ تھا۔اگر ایسا ہوتا تو وہ بنو مروان کی حکومت قبول نہ کرتے جبکہ انہوں نے عبدالملک بن مروان سے بیعت کی تھی اور درج ذیل مراسلہ بھیجا تھا:

''میں نے امت کو اختلاف کرتے دیکھا تو گوشہ نشین ہو گیا۔اب امرِ خلافت آپ کے پاس آ گیا ہے اور لوگوں نے آپ سے بیعت کر لی ہے تو میں بھی انہی میں شامل ہوں۔میں آپ کے نائب حجاج کے ہاتھ پر آپ سے بیعت کرتا ہوں۔''⑤

---

① سیر اعلام النبلاء: ۲۵۵/۶ تا ۲۵۸ ② تاریخ الاسلام للذهبی: ۹۱/۹،ت تدمری ؛سیر اعلام النبلاء: ۲۵۹/۶
قال الشیخ شعیب الارناؤط:"وهذا الذی قاله منتزع من قوله صلی اللہ علیه وسلم :انما نسمة المؤمن یعلق فی شجر الجنة حتی یرجعه اللہ الی جسمه یوم یبعثه،اخرجه المالك فی المؤطا والنسائی والترمذی وابن ماجة. (حاشیة سیر اعلام النبلاء: ۲۵۹/۶)
③ سیر اعلام النبلاء: ۲۵۹/۶ ④ صحیح البخاری،ح: ۷۲۰۵
⑤ سیر اعلام النبلاء: ۱۲۸/۴

معلوم ہوا کہ ان حضرات کی طرف باغیانہ سرگرمیوں کی باتیں اہلِ تشیع نے غلط طور پر منسوب کر دی ہیں۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے بیٹے علی رحمہ اللہ بھی خلفائے بنومروان کے وفادار اور سیاسی کش مکش سے الگ تھلگ رہے، خلفائے بنوامیہ نے انہیں دِمشق کے مضافاتی گاؤں ''حُمَیمہ'' کے آس پاس جاگیریں بھی دے دی تھیں؛ اس لیے وہ حجاز سے نقل مکانی کر کے اسی گاؤں میں آ گئے تھے۔[1]

وہ اکثر اوقات مسجد میں گزارتے، روزانہ پانچ سو نوافل پڑھتے۔ مسافروں کی میزبانی کرتے، غریبوں پر خوب خرچ کرتے۔[2] خلفاء سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ کبھی کبھی دِمشق جا کر خلفاء سے ملاقات کرتے تھے۔ ایک بار صبح کے ناشتے پر ہشام بن عبدالملک کے پاس گئے۔ ہشام نے انہیں آتے دیکھا تو حاضرین سے بے اختیار کہا:

''قریش کے سردارو! کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرو، یہ وہ ہیں کہ جہاں لوگ سرنگوں ہوتے ہیں وہاں یہ سربلند رہتے ہیں۔''[3]

علی بن عبداللہ رحمہ اللہ کی وفات کے بعد پہلی صدی ہجری کے اختتام پر اسی گاؤں سے ان کے بیٹے یعنی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پوتے محمد بن علی نے خفیہ طور پر حکومت مخالف تحریک شروع کی۔[4]

انقلابی تحریک کے بانی...... محمد بن حنفیہ کے بیٹے عبداللہ ابو ہاشم:

محمد بن علی عباسی کو یہ راہ دِکھانے والے صاحب محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کے چھوٹے بیٹے عبداللہ ابو ہاشم تھے۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے بنومروان کے خلاف خفیہ انقلابی تحریک کی بنیاد ڈالی۔[5] حالانکہ ان کے بڑے بھائی حسن بن محمد بڑے محتاط، متقی اور علم وفضل سے آراستہ انسان تھے۔ وہ کسی سیاسی تنازعے میں حصہ دار نہ بنے۔ محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ بھی ایسی سرگرمیوں سے بےزار تھے۔[6] تاہم عبداللہ ابو ہاشم نے اپنے بڑوں کے نقشِ قدم کو چھوڑ کر خروج کے لیے سوچ بچار شروع کر دی۔ اس کی بڑی وجہ سبائی تحریک کے اثرات تھے۔ یہ عبداللہ ابو ہاشم، خانوادۂ سادات کے پہلے بزرگ تھے جن کے نظریات میں کچھ خلل واقع ہوا تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ عبداللہ سبائیوں کی پیروی کرتے تھے۔[7] حافظ ذہبی رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں کہ یہ سبائیوں کے پیروکار تھے، سبائیوں کی روایات کو جمع کرنا ان کا مشغلہ تھا۔[8]

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۲۸۵/۵ [2] انساب الاشراف: ۷۵/٤ [3] اخبار الدولة العباسية، ص ۱٤۱

[4] انساب الاشراف: ۷۹/٤، ۸۰ [5] سیر اعلام النبلاء: ٤/ ۱۲۹ [6] سیر اعلام النبلاء: ٤/ ۱۳۰

[7] التاریخ الکبیر: ۱۸۷/۵ [8] سیر اعلام النبلاء: ۱۲۹/٤، ۱۳۰

نوٹ: جرح کے باوجود یہ عبداللہ محدثین کے نزدیک معتبر ہیں۔ (سنن الترمذی: ح: ۱۷۹٤) ثقة و کان شیعیاً (الثقات للعجلی، ص ۲۷۷، ط دار الباز) امام بخاری، امام مسلم اور امام مالک رحمہم اللہ سمیت کئی محدثین نے ان سے روایت لی ہے۔ خیبر کے موقع پر حرمتِ متعہ کی حدیث کے راویوں میں سے ایک یہ بھی ہیں۔ (صحیح البخاری، ح: ۵۵۲۳؛ صحیح مسلم، ح: ۳٤۹۷؛ موطا مالک، ح: ۱۹۹۳؛ سنن الترمذی: ح: ۱۷۹٤)

رہی یہ بات کہ ایسے مشکوک فرد سے امام بخاری نے روایت کیسے لے لی؟ تو راقم کے نزدیک اس کا وہی جواب ہے جو مروان بن الحکم جیسے فرد سے روایت لینے کا ہے۔ مروان کی روایات کو بھی امام بخاری منفرداً نقل کرتے ہیں یعنی کسی دوسرے یقینی ثقہ راوی مثلاً مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کو ساتھ ملا لیتے ہیں۔ پس اسی طرح عبداللہ ابو ہاشم کی روایت لیتے ہوئے بھی وہ ان کے ثقہ بھائی حسن بن محمد کو ساتھ ملا لیتے ہیں۔ نیز ایسا لگتا ہے کہ سبائیوں سے متاثر ہونے کے باوجود عبداللہ کے عقائد پوری طرح ان جیسے نہ تھے جس کی دلیل ان کا متعہ کی حرمت کی روایت نقل کرنا ہے۔ غالباً اسی لیے محتاط محدثین نے بھی ان سے نقلِ روایت کو جائز سمجھا ہے۔

یہ ولید بن عبدالملک کا زمانہ تھا۔ کوفہ کے شیعانِ علی اکثر ان کے پاس آتے جاتے تھے اور انہیں انقلاب کے لیے اکساتے تھے۔ سادات کے دیگر اکابر ان کی سرگرمیوں کو پسند نہیں کرتے تھے؛ اس لیے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے زید رحمہ اللہ نے خلیفہ ولید کو جا کر اس خفیہ تحریک کا بتادیا۔ ولید بن عبدالملک نے ابوہاشم کو قید کر دیا۔ پھر عون بن محمد بن حنفیہ اور حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کی سفارش پر چھوڑ دیا۔[1]

غرض اکابر سادات سے ہٹ کر اس منفرد سوچ اور نظریے کی بناء پر عبداللہ ابوہاشم وہ پہلے شخص ثابت ہوئے جنہوں نے بنوامیہ کے خلاف ایک انقلابی تحریک کے تصور کو وجود بخشا۔

عبداللہ ابوہاشم کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی؛ اس لیے ۹۸ھ میں وفات پاتے ہوئے انہوں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پوتے محمد بن علی کو اس انقلابی تحریک کی قیادت سونپ دی۔[2]

مشہور ہے کہ عبداللہ ابوہاشم کو خلیفہ ولید یا خلیفہ سلیمان نے زہر دے کر قتل کرایا تھا مگر یہ کوئی پختہ بات نہیں۔[3]

ایک اہم سوال:

یہاں ایک اہم سوال بڑی شدت سے ابھرتا ہے جس کے جوابات سے عموماً مؤرخین کترا کر گزر گئے ہیں۔ مگر ہم جس انداز سے تاریخ بیان کرتے آرہے ہیں اور اسلامی سیاست کے جن اصولوں کو گزشتہ اوراق میں بار بار دہرا چکے ہیں، ان کے پیشِ نظر اس سوال کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ دورِ حاضر کا نوجوان ذہن اس کا جواب پائے بغیر مطمئن نہیں ہوسکتا؛ اس لیے ہم اس الجھن کو حل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آخر ان حضرات کو حکومت مخالف تحریک چلانے کی کیا ضرورت تھی؟ جبکہ اشد ضرورت کے بغیر حکمرانوں کے خلاف خروج کے بارے میں سخت وعیدیں موجود ہیں۔ پھر جس صورتحال میں خروج کی اجازت ہے، اسے بنومروان کے دور پر منطبق کرنا مشکل ہے۔ اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ حکمران کے ذاتی فسق کی وجہ سے خروج جائز نہیں ہوتا۔ یہ بھی طے ہے کہ بنومروان کے جن خلفاء کے دور میں یہ تحریک چلی ان میں سے اکثر فسق و فجور سے بری تھے۔ پھر جمہور صحابہ اور ائمہ مجتہدین کے نزدیک خروج کا جواز یا وجوب کفرِ بواح (کھلم کھلا کفر) کے ارتکاب پر ہوا کرتا ہے۔ ادھر یہ بات بھی ظاہر ہے کہ اس دور میں کفرِ بواح کا ارتکاب ہرگز نہیں ہورہا تھا۔ بنومروان کے شروع کے خلفاء اور ان کے عمال ظلم وستم اور ناجائز مال گیری میں ضرور ملوث ہوئے مگر انہوں نے بھی کوئی کفرِ بواح نہیں کیا تھا۔

اگر ایک اُموی خلیفہ ولید ثانی کی طرف کفریہ افعال کے ارتکاب کی ضعیف روایات کو مان بھی لیا جائے تو اس کے خلاف خروج کی ذمہ داری یزید بن ولید نے انجام دے کر اس کی حکومت ختم کردی تھی۔

---

① اخبار الدولة العباسية، ص ۱۷٤ تا ۱۷٦

② سیر اعلام النبلاء: ٤/۱۲۹

③ عباسی دور کے قدیم مأخذ "اخبار الدولة العباسية" میں اس روایت کو "فقد زعم بعض الناس" (بعض لوگوں کا خیال ہے) کہہ کر بیان کیا گیا ہے۔ (اخبار الدولة العباسية، ص ۱۸۸)

ادھر صورتحال یہ تھی کہ ولید ثانی سے بہت پہلے محمد بن حنفیہ کے بیٹے ابو ہاشم عبداللہ علوی نے خفیہ تحریک شروع کی تھی اور پھر ان کے جانشین محمد بن علی عباسی خفیہ طور پر انقلاب کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ نیز ہشام بن عبدالملک جیسے محتاط اور بردبار حکمران کے دور میں حضرت زید بن علی نے خروج کیا تھا۔ تو آخر ان حضرات کے خروج کا اصل محرک کیا تھا؟

بزرگانِ بنو ہاشم کی اکثریت کا سیاسی موقف:

پہلی صدی ہجری کے اختتام اور دوسری صدی کے آغاز میں موجود بزرگانِ بنو ہاشم میں سے زیادہ تر کسی بھی قسم کے سیاسی معاملات میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے بلکہ علمی، ایمانی، اخلاقی اور روحانی خدمات میں مشغول تھے۔ یہ حضرات عبادت گزار، عالم فاضل اور متقی و پرہیز گار اور عقائد و نظریات میں جمہور علمائے اُمت کے ہم نوا تھے۔ یہ درست ہے کہ ان میں سے بعض حضرات حکومت میں تبدیلی اور سادات کی حکومت کے خواہاں تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ یہ حضرات حکومت کو خلافتِ راشدہ کے طرز پر دیکھنا چاہتے تھے اور ان کے خیال میں یہ ذمہ داری سادات بہتر انجام دے سکتے تھے۔ نیز بنو امیہ کے دور میں ہونے والے واقعۂ کربلا اور اس جیسے بعض سانحوں کی خراشیں ان کے دلوں پر باقی تھیں؛ اس لیے کچھ حضرات حکومت سے طبعی طور پر ناخوش تھے، تاہم اس تاثر اور سوچ کے باوجود بزرگانِ بنو ہاشم کی اکثریت عملی طور پر کسی بھی حکومت مخالف سرگرمی میں ملوث نہیں رہی۔

ہمارے خیال میں اکثر سادات کے خروج سے گریز کی بڑی وجہ یہی تھی کہ دیگر علماء کی طرح ان کے نزدیک بھی وہ شرائط پوری نہیں ہو رہی تھیں جن کے پیشِ نظر خروج جائز یا واجب ہوتا ہے۔ شرائط کو نظر انداز کر کے خروج کرنا شرعی وعید کے زمرے میں آتا ہے اور اس کے باعث کہیں زیادہ فساد پھیل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

یہ سادات کی اکثریت کا ذہن تھا تاہم انقلابی تحریک چلانے والے بنو ہاشم کی سوچ کچھ الگ اور نظریہ جمہور اُمت سے کچھ ہٹ کر تھا۔ یہ حضرات امامت کا ویسا عقیدہ تو نہیں رکھتے تھے جیسا روافض کا ہے مگر سبائی پروپیگنڈے سے متاثر ضرور تھے۔ اسی طرح خروج کی شرائط کے بارے میں بھی ان کا ذہن جمہور اُمت سے الگ تھا۔

عبداللہ ابو ہاشم اور محمد بن علی نے تحریک کیوں چلائی؟

تحریک چلانے والے حضرات جانتے تھے کہ سادات کی خلافت، شریعت کا کوئی اصولِ موضوعہ ہرگز نہیں بلکہ شریعت میں خاندانی حکمرانی اور موروثیت کوئی پسندیدہ چیز بھی نہیں لیکن دوسری طرف وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ بنو مروان نے اپنے خاندان کی موروثی حکومت کو ایک اصولِ موضوعہ بنا دیا ہے اور عوام بھی شاہی طرز کے اس اصول کے عادی ہو گئے ہیں۔ ان حالات میں ان حضرات کا یہ سوچنا ایک طبعی بات تھی کہ اگر بدلتے ہوئے حالات میں حکومت کا معیار موروثی و نسبی شرافت ہی مان لیا گیا ہے تو پھر نبی اکرم ﷺ کا خاندان امرِ خلافت کا زیادہ حق دار ہے جو ہر حکمران خاندان سے کہیں افضل و اشرف ہے۔

یہ بات نہ صرف ان حضرات کے ذہنوں میں تھی بلکہ کبھی اُمتی دو اور دو چار کی طرح اس حقیقت کو بدیہی طور پر سمجھتے

اور محسوس کرتے تھے؛ اسی لیے حافظ ذہبی رحمہ اللہ حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کے احوال میں لکھتے ہیں:

''ان کی شان بڑی عجیب تھی اور اللہ کی قسم! وہ اسی لائق تھے اور اپنی شرافت، سیادت، علم، للّٰہیت اور کمالِ عقل کی وجہ سے امامتِ عظمیٰ کے حق دار تھے۔''①

امام زین العابدین رحمہ اللہ کی شان میں فرزدق کا ناقابلِ فراموش فی البدیہہ قصیدہ:

اگر خلفائے بنو مروان لوگوں کے جسموں پر حکومت کرتے تھے تو ساداتِ کرام کی حکومت دلوں پر تھی۔ عالم اسلام میں ان حضرات کی قدر و منزلت کا اندازہ اس واقعے سے ہوسکتا ہے کہ ہشام بن عبدالملک اپنے بھائی ولید کی خلافت کے زمانے میں حج کے لیے آیا اور طواف کے دوران حجرِ اسود کا استلام کرنا چاہا مگر ہجوم کی کثرت کی وجہ سے نہ کرسکا۔ دور کھڑے ہو کر اشارے سے استلام کرلیا۔ اتنے میں حضرت زین العابدین رحمہ اللہ تشریف لائے۔ انہیں دیکھتے ہی مجمع یکدم کائی کی طرح چھٹ گیا اور انہیں راستہ ملتا چلا گیا، وہ اطمینان سے حجرِ اسود تک پہنچے اور اسے بوسہ دے کر طواف میں مشغول ہوگئے۔ ہشام نے تعجب سے پوچھا: ''یہ کون ہیں؟''

فرزدق شاعر پاس کھڑا تھا۔ فوراً بول اٹھا:

هٰذَا الَّذِیْ تَعْرِفُ الْبَطْحَاءُ وَطْأَتَهُ ۔۔۔ وَالْبَیْتُ یَعْرِفُهُ وَالْحِلُّ وَالْحَرَمُ

''یہ وہ ہستی ہیں کہ خاکِ مکہ ان کے قدموں کا لمس پہچانتی ہے...... بیت اللہ بھی انہیں جانتا ہے، حرم اور غیر حرم بھی۔

هٰذَا ابْنُ خَیْرِ عِبَادِ اللّٰهِ كُلِّهِمِ ۔۔۔ هٰذَا التَّقِیُّ النَّقِیُّ الطَّاهِرُ الْعَلَمُ

یہ اللہ کے سب سے برگزیدہ بندے کی اولاد ہیں...... یہ متقی، پاک باز، پاکیزہ اور عظیم الشان ہستی ہیں۔

إِذَا رَأَتْهُ قُرَیْشٌ قَالَ قَائِلُهَا ۔۔۔ إِلٰی مَكَارِمِ هٰذَا یَنْتَهِی الْكَرَمُ

جب قریش انہیں دیکھتے ہیں تو کہہ اٹھتے ہیں .... کہ ان کی بزرگیوں پر بزرگی کی انتہاء ہوجاتی ہے۔

یُغْضِی حَیَاءً وَیُغْضٰی مِنْ مَهَابَتِهِ ۔۔۔ فَمَا یُكَلَّمُ إِلَّا حِیْنَ یَبْتَسِمُ

یہ حیاء کی وجہ سے نگاہ جھکاتے ہیں اور لوگ ان کے رعب کی وجہ سے نگاہ نیچی رکھتے ہیں۔

ان سے تب ہی بات کی جاسکتی ہے جب یہ مسکرادیں۔

هٰذَا ابْنُ فَاطِمَةَ إِنْ كُنْتَ جَاهِلَهُ ۔۔۔ بِجَدِّهِ أَنْبِیَاءُ اللّٰهِ قَدْ خُتِمُوْا

اگر تم نہیں جانتے تو جان لو کہ یہ فاطمہ کے بیٹے ہیں...... ان کے نانا پر اللہ کے نبیوں کا سلسلہ ختم ہوگیا ہے۔''②

سادات کو عوام سے بھرپور تعاون کی اُمید کیوں تھی؟

معاشرے میں ساداتِ کرام کی اس محبوبیت و مقبولیت اور توقیر و تعظیم کے علاوہ سانحۂ کربلا، وقعۂ حرہ، حصارِ کعبہ اور

① سیر اعلام النبلاء: ۳۹۸/٤

② مجمع الزوائد: ۱۵۱۸۵؛ تاریخ الاسلام الذہبی: ۴۳۸/۶، ت تدمری؛ البدایة والنہایة: ۵۹۱/۱۱

شہادتِ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے لے کر حجاج بن یوسف کے مظالم اور محمد بن قاسم کی اذیت ناک موت تک کتنے ہی واقعات اور سانحے ایسے گزرے تھے جن کی وجہ سے عوام کی اچھی خاصی تعداد حکومت سے بددل چلی آرہی تھی۔ اگرچہ ہر حکمران ایسے سانحوں کا ذمہ دار نہ تھا مگر یہ بات ذہنوں میں رچ بس گئی تھی کہ بنو امیہ ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے ناکام ہوگئے ہیں اور اب انہیں ہٹا کر دوسری پارٹی کو اقتدار کا موقع دینا چاہیے۔ سبائی اس انقلاب سے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے درپے تھے۔ ان کے پروپیگنڈے نے اس تاثر کو مزید شدت سے پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

ان پہلوؤں کے پیش نظر بنو ہاشم کے یہ قائدین بہر صورت خروج کرنا چاہتے تھے۔ یہ حضرات سمجھتے تھے کہ موجودہ طرزِ حکومت میں آنے والا بگاڑ فقط وعظ و نصیحت، حکمران کی اصلاح یا حاکم کی تبدیلی سے ختم نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے کوئی انقلاب لا کر پورے خاندانی نظام کو یکسر تبدیل کرنا ہوگا۔ ان کے خیال میں خروج کے جواز کے لیے حکام کا ظالم یا فاسق ہونا کوئی ضروری نہ تھا۔ بلکہ گزشتہ حکام کے مظالم کی بنیاد پر موجودہ حکومت کا تختہ الٹ دینا بالکل جائز تھا؛ کیوں کہ یہ سب ایک ہی خاندان کے حکمران ہونے کی حیثیت سے ایک ہی سیاسی گروہ تھے جس کی پالیسیاں یکساں تھیں۔

غالباً ان حضرات کو قوی امید تھی کہ اگر حکومت کے خلاف کوئی تحریک چلائی جائے تو عوام ان کا بھرپور ساتھ دیں گے اور کسی بڑے خون خرابے کے بغیر ان کی حکومت بن جائے گی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ توقع غلط نہ تھی۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ اس بارے میں فرماتے ہیں:

> ''آلِ عباس سے لوگ محبت کرتے تھے، اسی طرح آلِ علی سے بھی محبت کرتے تھے۔ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل سے محبت اور آلِ مروان سے نفرت کی وجہ سے چاہتے تھے کہ حکومت ان (بنو ہاشم) کو مل جائے۔ ایک زمانے تک لوگ اسی حالت پر رہے، یہاں تک کہ اس کے اسباب مہیا ہوگئے اور ان کی حکومت آگئی جو خراسان سے ظاہر ہوئی۔'' [1]

❖❖ ❖

---

[1] ولكن آل العباس كان الناس يحبونهم ويحبون آل عليّ، ويودّون ان الامريؤول اليهم حُبا لآل رسول الله صلى الله عليه وسلم، وبغضا في آلِ مروان بن الحكم، فبقوا على ذالك زمانا حتىٰ تهيأت لهم الاسباب، واقبلت دولتهم وظهرت من خراسان. (سير اعلام النبلاء: ٦/٥٨)

محمد بن علی عباسی کی تحریک

محمد بن علی وہ دوسرے فرد تھے جنہوں نے اپنے بڑوں کی سیاست بیزار روش چھوڑ کر عبداللہ ابو ہاشم کی پیروی کی اور انقلابی تحریک کو پروان چڑھایا۔ انہوں نے دِمشق کے قریبی دیہات ''حُمَیْمَہ'' ہی کو جہاں ان کی رہائش تھی، خفیہ مرکز بنایا۔ بظاہر ان کا سارا وقت عبادت میں گزرتا تھا۔ یہاں ان کا موروثی باغ تھا جس میں پانچ سو درخت لگے تھے۔ محمد بن علی روزانہ ہر درخت کے نیچے دو رکعت نفل ادا کرتے تھے۔ ①

تحریک کی تاسیس اور ڈھانچا:

۱۰۲ھ میں انہوں نے بنو ہاشم کی حکومت قائم کرنے کے لیے ایک خفیہ تحریک کا آغاز کیا اور اپنے خاص مریدوں کو اس مقصد کے لیے خراسان بھیجا۔ جب وہاں ستر افراد ہم خیال بن گئے تو ان میں سے بارہ کو 'داعی' مقرر کر دیا گیا۔ ②

ہر داعی کے تیار کردہ لوگوں میں سے بارہ نقیب منتخب ہوئے۔ ہر نقیب کے ماتحت ۷۰ عامل کام کرنے لگے۔ ان میں سے کوئی بھی ''امام'' سے واقف نہ تھا۔ امام کے نائب کو 'داعی الدعاۃ'' کا نام دیا گیا۔ جن لوگوں سے ''امام'' کے لیے بیعت لی گئی ان کی فہرستیں بنائی گئیں۔ ③ بیعت کرنے والوں کے ذمے تھا کہ وہ اپنی آمدن کا پانچواں حصہ (بیس فیصد) سالانہ ''امام'' کو دیں۔ داعیوں کی وساطت سے یہ رقم امام کو پہنچتی تھی جسے تحریک کی ضروریات پر خرچ کیا جاتا تھا۔ ④

حکومت کے ڈر سے رکنیت سازی کا کام بہت احتیاط سے ہو رہا تھا۔ اس بات کو خفیہ رکھا گیا کہ بیعت کس شخص کے لیے لی جارہی ہے تاکہ اگر حکومت کسی داعی کو گرفتار کر بھی لے تو تحریک کے پیشوا کے خلاف کوئی گواہی نہ مل سکے۔ ⑤

خراسان کو میدانِ دعوت کیوں بنایا گیا؟

تاہم محمد بن علی نے پہلے سے ٹھان رکھا تھا کہ خلافت بنو عباس میں لائی جائے گی نہ کہ بنو فاطمہ میں؛ لہٰذا انہوں نے سب سے زیادہ توجہ خراسان پر دی۔ ان کا کہنا تھا کہ خراسانی کسی مکتبِ فکر سے وابستہ نہیں، ان کے خالی الذہن ہونے سے فائدہ اٹھا کر ان کی افرادی کثرت اور قوت وشجاعت کو کام میں لایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ خراسان کو دعوتِ انقلاب

---

① انساب الاشراف: ۸۷/٤ ② انساب الاشراف: ۸۲/٤

عام طور پر مؤرخین نے لکھا ہے کہ محمد بن علی نے یہ تحریک ۱۰۰ھ میں شروع کر دی تھی۔ (تاریخ الطبری: سنۃ ۱۰۰) مگر امام طبری نے اسے بلا سند نقل کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں امام بلاذری نے مدائنی کی سند سے نقل کیا ہے کہ تحریک کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب خوارج نے افریقہ کے گورنر یزید بن ابی مسلم کو قتل کیا تھا۔ یہ واقعہ بالاتفاق ۱۰۲ھ کا ہے یعنی یزید بن عبدالملک کے دورِ خلافت کا۔ (سیر اعلام النبلاء: ۵۹۳/۴، ۵۹۴) ۱۰۰ھ میں تحریک شروع ہونا عقلاً بھی بعید ہے؛ کیوں کہ اس وقت عمر بن عبدالعزیز کی حکومت تھی جن سے اپنے پرائے سبھی خوش تھے۔ ایسے میں محمد بن علی کی دعوت عام ہونے کی کوئی امید نہیں ہوسکتی تھی۔

③ التاریخ الاسلامی، محمود شاکر: ٤١/٥ تا ٤٤؛ اخبار الدولۃ العباسیۃ، ص ۱۹۱، ۲۱۹ تا ۲۲۲

④ الاعلام زرکلی: ۲۷۱/٦

⑤ تاریخ ابن خلدون: ۲۱۷/۳

کا اصل میدان بنایا گیا۔ ①

مرکز کے لیے عراق کو کیوں پسند کیا گیا؟

عراق کی زمین بھی اس تحریک کے لیے زرخیز تھی کیوں کہ وہاں بنوامیہ کے مخالفین اور شیعانِ علی بکثرت تھے اور محمد بن علی چاہتے تھے کہ شیعانِ علی کے تمام گروہوں کو اس تحریک میں شامل کیا جائے۔ چنانچہ عراق کے شہر کوفہ کو جو شیعانِ علی کا گڑھ ہونے کے علاوہ عالم اسلام کے وسط میں بھی واقع تھا تحریک کا مرکز بنایا گیا۔ محمد بن علی نے اپنی رہائش حُمیمہ میں ہی رکھی تاکہ حکومت شک نہ کرے کہ دِمشق کے اتنے قریب رہ کر وہ کوئی حکومت مخالف تحریک چلا سکتے ہیں۔ ان کے پاس فقط ان کے خاص مرید کبھی کبھار آتے تھے اور وہ بھی تاجروں یا حاجیوں کی شکل میں۔ یہی خاص مرید کوفہ میں رہ کر اس تحریک کو چلا رہے تھے۔ تمام احکام کوفہ سے خراسان روانہ ہوتے تھے۔ پھر خراسان کی خبریں پہلے کوفہ آتی تھیں اور وہاں سے حُمیمہ پہنچا دی جاتی تھیں۔ ②

عراق اور خراسان کے لوگوں کی عباسی تحریک میں دلچسپی کی وجہ:

عراق اور خراسان کے بہت سے لوگ عجمی قومیت کے تعصب کی وجہ سے عربوں کے اقتدار کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے حکومت کی تبدیلی کی اس تحریک میں بڑے جوش وخروش سے حصہ لیا؛ کیوں کہ انہیں امید تھی کہ اس طرح نئے حکومتی نظام میں عجمیوں کو معقول حصہ مل سکے گا۔ انقلابیوں کا شعار (خاص نعرہ) ''الرضا من آل محمد'' (آلِ محمد پر اعتماد) تھا۔ ظاہر ہے رسول اللہ ﷺ کی آل واولاد کی قیادت ہر مسلمان کے لیے طبعی طور پر ایک محبوب چیز ہے؛ اس لیے لوگ تیزی سے اس سے متفق ہوتے چلے گئے۔ عباسی حضرات حقیقت میں خلافت ہی کا قیام چاہتے تھے مگر اس وقت سبائیوں سمیت شیعانِ علی کے ہر گروہ کو ساتھ ملائے رکھنے کے لیے انہوں نے اپنی دعوت میں ''امام'' اور ''امامت'' جیسے الفاظ استعمال کیے۔ حقیقت اس وقت کھل گئی جب اپنی حکومت قائم کرنے کے بعد انہوں نے شیعی عقیدۂ امامت کی جگہ خلیفہ اور خلافت ہی کی اصطلاحات استعمال کیں۔ وقت کے لحاظ سے امام اور امامت کا چرچا محض ایک سیاسی حکمتِ عملی تھی تاکہ روافض سمیت ہر گروہ اسے اپنے لیے مفیدِ مطلب سمجھے اور عوام کو تاثر ملے کہ اس دعوت کے پیچھے ایک غیر معمولی عبقری ''امام'' موجود ہے۔ ③

بنو فاطمہ کو ملانے میں بھی کامیابی:

بنو ہاشم کی ایک اور جماعت بھی شیعانِ علی کے تعاون سے انقلاب کے لیے سرگرم تھی۔ اس جماعت کے اکابر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے تھے۔ اگرچہ ان میں سے حضرت زین العابدین، ان کے بیٹے حضرت باقر رحمہ اللہ اور پوتے حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ نے عمر بھر بنوامیہ کے خلاف کسی سرگرمی میں حصہ نہ لیا۔ مگر ان میں انقلابی سوچ رکھنے والے

① انساب الاشراف: ٨١/٤ ② التاریخ الاسلامی، محمود شاکر: ٤١/٥ تا ٤٤

③ اخبار الدولة العباسیة، ص ١٨٠ تا ٢٠٠؛ انساب الاشراف: ٨٠/٤ تا ٨٧

کچھ لوگ بھی تھے جن میں مدینہ منورہ میں کے ایک بزرگ عبداللہ بن حسن رحمۃ اللہ اور ان کے بیٹے محمد اور ابراہیم پیش پیش تھے۔ محمد بن علی نے ان سب کو ساتھ ملالیا۔ وہ ہر سال مدینہ جاتے جہاں ان حضرات سے خفیہ ملاقاتیں ہوتیں۔ [1]

بنو فاطمہ نے کبھی بھرپور تیاری کے ساتھ خروج نہیں کیا تھا۔ حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ کے فرزند زید بن علی رحمۃ اللہ نے ہشام بن عبدالملک کے دور میں آناً فاناً مسلح خروج کیا اور قتل ہوئے، اس کے فوراً بعد ان کے صاحبزادے یحییٰ خراسان سے اٹھے اور ان کا بھی یہی انجام ہوا۔ مگر محمد بن علی جنہوں نے اپنی تحریک کی تخم پاشی ۱۰۲ھ میں شروع کی تھی، ۲۲ سال تک زیر زمین سرگرمیوں میں مصروف رہے اور کوئی اعلانیہ شورش برپا نہ کی۔ بلکہ وہ اموی خلفاء سے ملتے ملاتے رہے اور انہیں حتی الامکان اپنی طرف سے مطمئن رکھا۔ خلفاء بھی ان کا اعزاز واکرام کرتے رہے۔ [2]

ہشام بن عبدالملک کا شک کے باوجود محمد بن علی سے تسامح:

خلفاء کو کبھی کبھار ان داعیوں کی حرکات کا علم ہو جاتا تھا مگر انہیں اندازہ نہ تھا کہ اس کی جڑیں کتنی دور دور تک پھیل چکی ہیں۔ انہیں اپنی حکومت کی مضبوطی پر اعتماد تھا۔ بعض اوقات ایسے داعیوں کو گرفتار بھی کر لیا جاتا۔ مگر تحریک برابر چلتی رہی۔ محمد بن علی ہر سال مدینہ منورہ جاتے اور لوگوں پر دل کھول کر خرچ کرتے، نسبی شرافت کے ساتھ اس سخاوت نے انہیں مزید مقبول بنا دیا۔ [3] ہشام کو اپنے آخری سالوں میں فقط اتنی سن گن ملی تھی کہ محمد بن علی خلافت کے خواہش مند ہیں جس پر اس نے انہیں قید کرنے کا ارادہ کر لیا تھا مگر پھر بعض مشیروں کے سمجھانے پر درگزر کرنا بہتر سمجھا۔ [4] دراصل امویوں کو قطعاً اندازہ نہ تھا کہ ان کے پایۂ تخت کے قریبی گاؤں سے ایک تحریک نکل کر پورے ملک میں پھیل چکی ہے۔

محمد بن علی کو مناسب وقت کا انتظار:

اس قدر تیاری کے باوجود محمد بن علی کو انقلاب کے لیے زیادہ مناسب وقت کا انتظار تھا۔ وہ ایسے وقت کے منتظر تھے جب حکومت میں شدید انتشار پیدا ہو چکا ہو اور حکمران کو اپنوں کی بغاوت کا سامنا ہو۔ محمد بن علی کہتے تھے:

> ''بنو امیہ کی حکومت گرانے کا ایک موقع تب ملا تھا جب یزید بن معاویہ کی موت ہوئی۔ دوسرا موقع پہلی صدی ہجری کے اختتام پر ملا۔ تیسرا موقع افریقہ کی بغاوت ہے۔ اب ہمارے مددگار مشرق سے نمودار ہوں گے یہاں تک کہ ان کے گھوڑے مراکش جا پہنچیں گے۔'' [5]

---

[1] انساب الاشراف: ۴/ ۸۰ تا ۸۷

[2] انساب الاشراف: ۴/ ۸۴، ۸۶، ۸۷

[3] انساب الاشراف: ۴/ ۸۶

[4] انساب الاشراف: ۴/ ۸۵

[5] انساب الاشراف: ۴/ ۸۲

محمد بن علی کی گفتگو کا پس منظر یہ ہے کہ (۱) یزید بن معاویہ کی موت کے بعد خلافتِ زبیریہ قائم ہوئی مگر بنو مروان اور خوارج نے خانہ جنگی شروع کردی جو نو سال تک رہی۔ (۲) عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے فوراً بعد ۱۰۱ھ میں ایک طرف یزید بن مُہلّب، دوسری طرف خوارج اور تیسری طرف ترکوں نے بغاوت کر کے عالم اسلام کو ہلا ڈالا۔ (۳) ۱۲۲ھ میں افریقہ میں بربروں نے بہت بڑی بغاوت کر کے بنو امیہ کو سخت زخم لگائے۔ محمد بن علی کا مطلب یہ تھا کہ پہلے دو مواقع پر اگر بنو ہاشم کھڑے ہو جاتے تو انہیں حکومت مل سکتی تھی مگر انہوں نے یہ مواقع ضائع کر دیے۔ تیسرا موقع محمد بن علی کی زندگی میں ہی ملا جس کے بعد ان کے داعیوں نے بھرپور کام شروع کر دیا۔ پھر مزید موقع خود عربوں کی خانہ جنگی نے پیدا کر دیا۔

تحریک کی خاطر عقائد ونظریات میں تساہل اور ابہام کی پالیسی:

محمد بن علی کے بارے میں کسی بدعقیدگی کی وضاحت نہیں ملتی۔ البتہ خروج کی شرائط کے بارے میں وہ جمہور علماء کے ہم نوانہ تھے بلکہ ان کے نزدیک حکمران کے صالح ہونے سے بھی خروج کا حکم ساقط نہیں ہوتا تھا۔ ان کے خیال میں بنوامیہ بحیثیت خاندان کے نااہل تھے؛ اسی لیے ہشام بن عبدالملک جیسے شریف شخص کے دور میں بھی انہوں نے اپنی تحریک جاری رکھی۔ غالباً وہ ہر مسلمان کی طرح حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کا احترام تو کرتے تھے مگر سرِ عام ان کی مدح وتوصیف خلافِ مصلحت سمجھتے تھے۔ شاید ان کے سامنے اپنے چچا زید بن علی کا حال تھا جو حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے اظہارِ عقیدت کرنے کی وجہ سے سبائی گروہ کی افرادی اور ابلاغی طاقت سے محروم ہوئے۔

محمد بن علی نے سبائی گروہ کو اپنے ساتھ منسلک رکھنے کے لیے ایک دنیا دار سیاست دان کی طرح اسلام کے سیاسی نظریات اور گزشتہ شخصیات کے بارے میں اپنی ذاتی رائے کو مبہم کر رکھا۔ انہوں نے سیاسی مصلحت کے تحت ''خلیفہ'' اور ''خلافت'' کی جگہ ''امام'' اور ''امامت'' کی اصطلاحات استعمال کیں، اسی طرح یہ پرچار بھی کیا کہ بنوہاشم کی موجودگی میں کسی اور کو امامت کا حق نہیں؛ لہٰذا بنوامیہ کے سبھی حکام ظالم اور غاصب چلے آتے ہیں۔ اسی بناء پر محمد بن علی کے داعی بنوامیہ اور بنومروان کے مظالم اور برائیاں بیان کر کے عوام کو اشتعال دلاتے رہے۔ اس مقصد کے لیے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض احادیث کو خاص طور سے بیان کیا جانے لگا۔

سیاسی مفاد کے لیے دین میں تساہل کے خطرناک مضمرات:

مگر سیاسی مفاد کے لیے دینی تعبیرات میں ترامیم، حدودِ شرع سے تجاوز اور ماتحتوں کو تھوڑے سے نظریاتی انحراف کی گنجائش دینے کے نتائج بڑے خطرناک نکلے اور نچلے طبقے نے بات کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔ بعض داعیوں نے سیاسی حربے کے طور پر نہ صرف تاریخی روایات میں کچھ اضافے کر لیے بلکہ کچھ احادیث بھی از خود گھڑ لیں۔ خصوصاً سبائی گروہ نے جو اس تحریک میں بہت سرگرم تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دیگر خلفاء پر فضیلت کے بارے میں درجنوں جعلی احادیث مشہور کر دیں اور عراق وایران کے بہت سے جاہلوں نے بڑی تیزی سے یہ عقیدہ قبول کیا۔

اس دور کے ایک مشہور محدث اعمش سلیمان بن مہران رحمہ اللہ (م ۱۴۷ھ) اس معاشرتی تبدیلی پر حیران ہو کر فرماتے تھے: ''مجھے ہرگز توقع نہ تھی کہ میں ایسے زمانے تک زندہ رہوں گا جس میں ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فوقیت دی جانے لگے گی۔''[1]

چونکہ تحریک کے دوران اگلے خلیفہ کا کوئی تعین نہ تھا کہ وہ بنوہاشم کے کس خاندان سے ہوگا؛ اس لیے علوی اور فاطمی خاندان کے عقیدت مند بھی اس امید پر کام کر رہے تھے کہ خلافت اولادِ علی کو ملے گی۔ تاہم عباسی خانوادے کے خاص داعی پیش بندی کے طور پر ایسی روایات مشتہر کر رہے تھے جن سے عباسیوں کی فوقیت ثابت ہو۔ مثلاً: مشہور کیا

[1] المعرفة والتاريخ للفسوی: ۲/ ۷٦٤، ط مؤسسة الرسالة

گیا کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو خبر دی تھی کہ ایک دن خلافت ان کی اولاد میں آ کر رہے گی۔ [1]

اموی دور میں پیش آنے والے سانحوں اور ان کے حکام کی برائیوں میں بھی مبالغہ آرائی کی گئی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف فرضی مظالم منسوب کر دیے گئے۔ واقعۂ کربلا کی جزئیات اور سخت گیر اموی حکام کی برائیوں میں اشتعال انگیز اضافی مواد شامل کر دیا گیا۔ اس پروپیگنڈے سے عوام ہی نہیں، بعض بڑے بڑے سرکاری افسران اور افواج کے امراء بھی متاثر ہو کر اس انقلابی تحریک میں شامل ہو گئے۔ غرض بنوعباس کے یہ سیاست دان حکومت حاصل کرنے کی تگ و دو میں اس شدت کے ساتھ مصروف ہوئے کہ انہوں نے وقتی مصلحتوں اور سیاسی اغراض کے لیے بعض دینی اقدار اور بعض شرعی احکام کو نظر انداز کرنا گوارا کر لیا۔ یوں وہ نظام حکومت کی جن خرابیوں کے سد باب کا دعویٰ کر کے کھڑے ہوئے تھے، پہلے دن سے خود ان میں مبتلا ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک میں اس دور کے عظیم المرتبت فقہاء، محدثین اور مصلحین کی نمائندگی قطعاً دکھائی نہیں دیتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ بنوہاشم کے دیگر بزرگوں کے برعکس ان عباسی قائدین کو فقط سیاست دان سمجھا گیا اور علمائے تاریخ نے ان کا ذکر "رحمہ اللہ" یا "حضرت" جیسے آداب کے ساتھ نہیں کیا۔

حکام کی طرف سے عباسی داعیوں کی پکڑ دھکڑ:

اس دوران حکام کو عباسی تحریک کی سن گن مل گئی تھی، گورنروں نے جاسوس پھیلا دیے تھے جن کی اطلاعات پر جا بجا چھاپے مارے جا رہے تھے۔ عراق کے گورنر خالد بن عبداللہ قسری نے اس بارے میں بہت سختی برتی۔ کوئی بھی عباسی داعی اس کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ عموماً بلا دریغ اس کی گردن اڑا دیتا۔ وہ لوگ خوش قسمت ہوتے جو دو تین سو کوڑے کھا کر چھوٹ جاتے۔ [2]

محمد بن علی کی وفات اور ابراہیم کی جانشینی:

۱۲۵ھ میں ۷۰ سالہ محمد بن علی نے وفات پائی۔ [3] اس سے قبل انہوں نے اپنے بیٹے ابراہیم کو جانشین مقرر کر دیا تھا۔ ابراہیم نے تحریک کو مزید منظم کیا اور عراق، خراسان، مصر اور حجاز سمیت ہر صوبے کے مستقل ذمہ دار مقرر کر دیے۔ [4]

ابو مسلم خراسانی:

اس دوران ابراہیم کو ابو مسلم خراسانی جیسا زیرک، کایاں اور وفادار نوجوان مل گیا جس کی زباں آوری، ہوشیاری، موقع شناسی اور مکر و فریب میں مہارت نے چند ہی سالوں میں پامیر کی چوٹیوں سے لے کر فرات کے ساحل تک لوگوں

---

① قال الذهبی: هذا الخبر لا یصح. (سیر اعلام النبلاء: ۶/۵۸)
"اخبار الدولۃ العباسیۃ" اور دیگر کتب تاریخ میں بنوعباس کے فضائل کی ایسی متعدد روایات دیکھی جا سکتی ہیں جن کا حدیث کی کسی کتاب میں کوئی وجود نہیں۔

② انساب الاشراف: ۴/۱۱۷ ... فائدہ: محمد بن علی خوبصورت اور قد آور تھے۔ ان کے والد علی ان سے بھی بلند تھے، ان کے والد عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قد مزید اونچا تھا مگر ان کا سر اپنے والد عباس رضی اللہ عنہ کے کندھے تک آتا تھا۔ اس سے عباس رضی اللہ عنہ کے قد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ (تاریخ الاسلام، ذہبی: ۸/۲۲۴)

③ انساب الاشراف: ۴/۸۰، اگرچہ ان کی وفات کے بارے میں مشہور قول ۱۲۴ھ کا ہے مگر حافظ ابن کثیر نے ۱۲۵ھ کو صحیح قرار دیا ہے۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/۱۳۱) واقدی کے بقول محمد بن علی کی وفات ولید بن یزید کے قتل (جمادی الآخرہ ۱۲۶ھ) سے کچھ عرصہ قبل ہوئی تھی۔ (انساب الاشراف: ۴/۸۰)

④ انساب الاشراف: ۴/۱۱۴۳ تا ۱۱۷

کو بنو امیہ کے خلاف کھڑا کر دیا۔ ایرانی النسل ابو مسلم خراسانی کا اصل نام عبدالرحمٰن بن مسلم تھا۔ ۱۰۰ھ میں اصفہان میں پیدا ہوا تھا۔ دیکھنے میں پستہ قد، گندمی رنگت اور دھیمی آواز والا مگر حقیقت میں بڑے بڑے قد آور سیاست دانوں پر فائق۔ وہ صبر و تحمل اور رازداری کو اپنی کامیابی کا راز قرار دیتا تھا۔[1]

وہ ۱۲۰ھ میں محمد بن علی کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کا معتمدِ خاص بنا۔ ان کی وفات کے بعد ۱۲۵ھ میں ابراہیم کا دستِ راست بنا اور ۱۲۸ھ میں خراسان کا داعی مقرر ہو کر وہاں پہنچا۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۲۸ سال تھی۔ اس نے بہت جلد ہزاروں لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیا۔ اب اسے مناسب موقع کا انتظار تھا کہ کب بنو مروان کی طاقت شکستہ ہو اور خروج کا عملی اعلان کیا جائے۔[2]

یمنی اور مضری تعصب عروج پر، مساجد میں منبر الگ الگ:

عباسی تحریک کے بانیوں کی قسمت اچھی تھی کہ ہشام بن عبدالملک کے بعد ولید ثانی کی نااہلی نے پورے ملک پر مرکز کی گرفت کو کمزور کر دیا۔ ولید ثانی کو قتل کر کے یزید ثالث برسرِ اقتدار آیا مگر ابھی وہ سابقہ انتظامی کوتاہیوں کی تلافی نہ کر پایا تھا کہ چل بسا۔ پھر ابراہیم آیا ہی تھا کہ مروان بن محمد نے اسے چلتا کر دیا۔ اس سیاسی بحران سے صوبے داروں میں خود سری اور لاپرواہی پیدا ہوگئی۔ دوسری طرف بنو مروان نے عہدوں، عطیات اور دیگر مراحمِ خسروانہ میں عربی اور عجمی کا جو تعصب روا رکھا تھا، وہ رنگ بدل کر خود عربوں میں باہم پیدا ہو گیا اور عرب قبائل ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

اسلام نے تعصب کے خاتمے کے لیے عدل، ایثار اور بے غرضی کی تعلیم دی ہے۔ اس کی جگہ جب غرض مندی، نفع اندوزی اور دوسروں پر زیادتی عادت میں شامل ہو جائے تو پھر تعصب روپ بدل بدل کر معاشرے کو متحارب بناتا جاتا ہے، یہاں تک کہ انسان اپنی ذات کے سوا کسی کا نہیں سوچتا اور اپنے بھائیوں کا گلا کاٹنے پر بھی تیار ہو جاتا ہے۔ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں مسلم معاشرے کو ایسے ہی تجربے سے گزرنا پڑا۔ جب اسلامی اُخوت کے بندھن کمزور پڑے تو طرح طرح کے تعصب ابھرتے چلے گئے۔ ان میں سب سے خطرناک کش مکش خود عربوں کے مابین یمنی اور مضری عصبیت کی تھی۔ عالم اسلام کے مقتدر عہدوں پر فائز اکثر لوگ انہی دو میں سے کسی ایک سے تعلق رکھتے تھے۔

جب ان عرب عہدے داروں کے درمیان نفرت کی آگ بھڑکی تو خود دارالخلافہ دِمَشق میں یہ حال ہو گیا کہ یمنیوں اور مضریوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے ساتھ نماز ادا کرنے تک کا روادار نہ رہا۔ شہر کی ہر مسجد میں دو محرابیں قائم کر لی گئیں، جامع اُموی میں دو امام دو منبروں پر الگ الگ خطبے دیتے تھے اور الگ الگ امامت کراتے تھے۔[3]

---

[1] البداية والنهاية: ۳٤٢/۱۳

[2] سير اعلام النبلاء: ٤۹/٦

[3] البداية والنهاية: ۲٥۹/۱۳

قبائلی عصبیت کے باعث خراسان میں سرکاری افواج باہم برسر پیکار:

نیا اموی خلیفہ مروان بن محمد مضری قبائل کا حامی تھا اور یمنی قبائل کو دبانا چاہتا تھا۔ خراسان میں اس کا نائب نصر بن سیار بھی مضری تھا۔ خلیفہ کی دیکھا دیکھی وہ بھی یمنی قبائل کے خلاف سرگرم تھا۔ اس طرز عمل سے دلبرداشتہ ہو کر خراسان کے یمنی قبائل نے گورنر کی مخالفت شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے خراسان کی صورتحال دِمشق سے کہیں زیادہ خراب ہوگئی۔ یمنی قبائل کے سردار جُدَیع بن علی کرمانی نے قبیلہ ربیعہ کے عمائد کو ساتھ ملا کر اعلانِ بغاوت کر دیا۔ یہ دیکھ کر مضری قبائل نصر بن سَیار کے گرد جمع ہو گئے۔ یوں سرکاری افواج آپس میں برسرِ پیکار ہو گئیں اور انہیں یہ موقع ہی نہ ملا کہ وہ خراسان میں ابھرنے والی تیسری طاقت ابومسلم خراسانی کی سرگرمیوں کی روک تھام کرتیں۔

اس دوران ابومسلم خراسان کے مختلف حصوں میں اپنی گرفت مضبوط کرنے کے بعد متوازی سیاسی قوت بن کر سامنے آگیا۔ خراسان میں باہم نبرد آزما سرکاری افواج کے دونوں گروہوں نے اپنی طاقت بڑھانے کے لیے اس کی حمایت حاصل کرنے میں دلچسپی لی۔ ابومسلم دونوں فریقوں سے الگ الگ بات چیت کر کے انہیں اپنی حمایت کا یقین دلاتا رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ متحارب سرکاری فوجیں اس باغی کی سرکوبی کی ذمہ داری کو بھلا کر باہم لڑتی رہیں۔

ان نفرتوں میں اس وقت اور اضافہ ہو گیا جب نصر بن سَیار نے مخالف گروہ کے سردار جُدَیع بن علی کرمانی کو دھوکے سے بلا کر قتل کرا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح بغاوت کا زور تھم جائے گا مگر باغیوں نے مقتول کے بیٹے علی بن جُدَیع کے پرچم تلے جمع ہو کر پہلے سے بڑھ کر شدت پسندی اختیار کر لی۔[1]

ابومسلم ویسے تو سارے عربوں کا دشمن تھا مگر اس کی دشمنی کا پہلا ہدف قبیلہ مضر تھا؛ کیوں کہ قریش اور بنوامیہ اسی کی شاخ تھے۔ اس کے پیشوا ابراہیم بن محمد کی بھی تاکید تھی کہ عربوں کو فنا کر دیا جائے۔[2] جب کئی ماہ کی خانہ جنگی سے مضر کی قوت شکستہ ہوگئی تو ابومسلم نے نصر بن سیار کے مخالف عرب قبائل سے اتحاد کر لیا اور کھل کر حکومت کے مقابلے پر آ گیا۔

نصر بن سیار حکومتی افواج کی کمزوری دیکھ کر بھانپ گیا کہ بنومروان کی حکومت کا سورج غروب ہونے کو ہے۔ اس نے فوری طور پر خلیفہ مروان بن محمد کو مراسلے میں ابومسلم کی بڑھتی ہوئی قوت سے خبردار کر کے درج ذیل اشعار لکھے:

أَرَىٰ بَيْنَ الرَّمَادِ وَمِيضَ نَارٍ ... وَأَخْشَىٰ أَنْ يَكُونَ بِهَا ضِرَامُ

مجھے راکھ میں دبی ہوئی آگ کی چنگاریاں دکھائی دے رہی ہیں...... میں ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ بھڑک نہ اٹھیں

فَإِنَّ النَّارَ بِالْعُودَيْنِ يُذْكَىٰ ... وَإِنَّ الْحَرْبَ مَبْدَأُهَا كَلَامُ

بے شک آگ دو لکڑیوں سے جلائی جاتی ہے......اور جنگ کا آغاز باتوں سے ہوتا ہے۔

فَقُلْتُ مِنَ التَّعَجُّبِ لَيْتَ شِعْرِي ... أَأَيْقَاظٌ بَنِي أُمَيَّةَ أَمْ نِيَامُ

میں نے حیران ہو کر کہا کہ کاش! میں جان سکتا.........بنوامیہ بیدار ہیں یا محوِ خواب۔

[1] تاریخ الطبری: ۷/۳۵۳ تا ۳۷۱؛ الکامل فی التاریخ: ۴/۳۵۸ تا ۳۶۰

[2] البدایة والنهایة: ۱۳/۲۴۷

حقیقت یہ ہے کہ عربوں کا مقدر سو چکا تھا۔ یہ نیند اس قدر گہری تھی کہ بار بار جھنجھوڑے جانے کے باوجود عربوں کو ہوش نہ آیا اور وہ زوال کی کھائی کے کنارے باہم دست و گریباں رہے۔

نصر بن سیار کو اس وقت بھاری کمک کی ضرورت تھی تاکہ وہ ابومسلم اور اس کے حامی باغی عرب قبائل کی سرکوبی کر سکے مگر یہ وہی دن تھے جب مروان بن محمد خوارج سے لڑ رہا تھا؛ اس لیے کہیں سے کمک بھیجے کا انتظام نہ ہو سکا۔ نصر بن سیار نے یکے بعد دیگرے کئی مراسلے بھیجے مگر دربارِ خلافت سے اسے کوئی مدد نہ ملی۔ ①

عباسی امام ابراہیم کی گرفتاری اور سزائے موت:

حکومت نے امام ابراہیم کی جاسوسی شروع کرا رکھی تھی جو شام ہی میں مقیم تھے۔ اس کوشش کے نتیجے میں ابومسلم کا ایک خط اور اس کے جواب میں ابراہیم کا مراسلہ پکڑا گیا۔ اس خط و کتابت میں خراسان میں تعینات تمام عرب سرداروں اور سپاہیوں کو قتل کر دینے کا عندیہ بھی تھا۔

مروان بن محمد نے یہ پختہ ثبوت ہاتھ لگ جانے پر ابراہیم کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیے۔ ابراہیم کو پیش کیا گیا تو مروان نے ان سے عباسی تحریک کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ ابراہیم نے لاعلمی ظاہر کی۔ مروان نے وہ خطوط پیش کر دیے۔ ابراہیم کے پاس کوئی جواب نہ رہا۔ مروان نے انہیں قتل کرا دیا۔ ②

---

① البداية والنهاية: ۱۳/۲۲٤ تا ۲۳۵

② تاریخ الطبری: ۷/٤۳۵ تا ٤۳۷ ، انساب الاشراف: ٤/۱۲۱، ۱۲۲

ابوالعباس سفّاح کا ظہور

ابراہیم کے دو بھائی تھے: ابوالعباس سفاح اور ابوجعفر منصور۔ آگے چل کر یہی دونوں خلافتِ بنوعباس کے مؤسس بنے۔ ابراہیم کے قتل ہوتے ہی یہ دونوں شام سے فرار ہو کر عراق پہنچ گئے۔ یہاں انہوں نے کوفہ میں اپنے حامیوں کے پاس پناہ لی۔ ادھر سے ابومسلم خراسانی آن پہنچا۔ اس مجلسِ مشاورت میں ابوالعباس سفاح کو عباسی تحریک کا نیا امام مان لیا گیا۔ سفاح نے قیادت سنبھالتے ہی ابومسلم کو یہ حکم دے کر دوبارہ خراسان بھیجا کہ ایک مقررہ تاریخ میں پورے خراسان کے عباسی رضا کار منظر عام پر آجائیں۔

مقررہ تاریخ کو سرحداتِ فارس سے خراسان کی آخری حدود تک ہر شہر کے عباسی رضا کار سیاہ لباس پہنے باہر نکل آئے۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ ہم بنوہاشم کے ساتھ ہیں۔ حاکمِ خراسان نصر بن سیار یہ انقلاب دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ عرب متحد نہ ہوئے تو ان کی ہلاکت یقینی ہے۔ اس نے باغی عرب قبائل کو صلح کا پیغام دیا اور یہ اشعار لکھ بھیجے:

اَبْلِغْ رَبِیْعَةَ فِیْ مَرْوٍ وَاِخْوَتَهَا　　اَنْ یَغْضَبُوْا قَبْلَ اَنْ لَایَنْفَعَ الْغَضَبُ

ربیعہ قبیلے اور ان کے اتحادیوں کو مَرْو شہر میں یہ بات پہنچادو

کہ وہ غضب ناک بنیں اس سے پہلے کہ غضب ناک ہونا بے سود ہو جائے۔

مَابَالُکُمْ تُنْشِبُوْنَ الْحَرْبَ بَیْنَکُمْ　　کَاَنَّ اَهْلَ الْحِجٰی عَنْ رَأیِکُمْ غُیَّبُ

تمہیں کیا ہوا کہ تم آپس میں لڑ رہے ہو...... گویا کہ اہلِ عقل تمہارے درمیان ہیں ہی نہیں۔

وَتَتْرُکُوْنَ عَدُوًّا قَدْ اَحَاطَ بِکُمْ　　مِمَّنْ تَاَشَّبَ لَادِیْنَ وَلَا حَسَبُ

تم اس دشمن کو چھوڑ بیٹھے ہو جو تم پر چڑھائی کرنے والا ہے...... جس کا کوئی دین ہے نہ حسب نسب۔

لَا عَرَبٌ مِثْلُکُمْ فِی النَّاسِ نَعْرِفُهُمْ　　وَلَا صَمِیْمُ الْمَوَالِیْ اِنْ هُمْ نُسِبُوْا

نہ یہ لوگ تم جیسے عرب ہیں کہ ہم انہیں پہچانتے ہوں...... نہ یہ اپنی نسبت میں خالص آزاد کردہ غلام ہیں۔

قَوْمًا یَدِیْنُوْنَ دِیْنًا مَا سَمِعْتُ بِهٖ　　عَنِ الرَّسُوْلِ وَلَا جَاءَتْ بِهِ الْکُتُبُ

یہ ایسا دین مانتے ہیں جسے ہم نے نہ رسول ﷺ سے سنا اور نہ ہی اس بارے میں آسمانی کتب آئیں۔

فَمَنْ یَکُنْ سَائِلٌ عَنْ اَصْلِ دِیْنِهِمْ　　فَاِنَّ دِیْنَهُمْ اَنْ تَهْلِكَ الْعَرَبُ

پس جو ان کا اصل دین جاننا چاہتا ہے تو وہ جان لے کہ ان کا دین بس یہی ہے کہ عرب ہلاک ہو جائیں۔

یہ اشعار کام کر گئے۔ ربیعہ اور یمنی قبائل نے مضر قبائل سے متحد ہو کر ابو مسلم خراسانی سے نمٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ زبردست تیاری کے بعد نصر بن سیار کی قیادت میں عربوں کا یہ متحدہ لشکر ابو مسلم کی سرکوبی کے لیے میدان میں نکلا۔ مگر ابو مسلم بھی بلا کا عیار تھا۔ اس نے یمنی قبائل کے سردار علی بن جُدَیع کو یہ چبھتا ہوا پیغام بھیجا:

''تمہاری غیرت کو کیا ہوا! جس شخص نے کل تمہارے باپ کو قتل کیا تھا تم آج اسی کے جھنڈے تلے لڑ رہے ہو۔''

اس پیغام نے علی کو متذبذب کر دیا اور وہ نصر بن سیار کا ساتھ چھوڑ کر چلا گیا۔ یوں ایک فیصلہ کن جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اس کے فوراً بعد یمنی قبائل اور ربیعہ نے ابو مسلم خراسانی سے اتحاد کر لیا اور نصر بن سیار پھر اکیلا رہ گیا۔

ابو مسلم خراسانی کے پاس اب ایک لاکھ سے زائد مسلح افراد کی طاقت تھی۔ اس نے بلا تاخیر خراسان میں بنوامیہ کے مرکز ''مَرْو'' کی طرف فوجیں بھیج دیں۔ نصر بن سیار بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگا اور ابو مسلم نے ''مَرْو'' پر قابض ہو کر تمام عرب سرداروں کو قتل کر دیا۔ مَرْو پر قبضے کے بعد ابو مسلم نے کسی مشکل کے بغیر سمرقند سے لے کر عراق کی آخری حدود تک ہر شہر میں اپنے گورنر مقرر کر دیے۔ ابو مسلم عربوں سے دلی دشمنی رکھتا تھا؛ اس لیے جب وہ طاقت کے لحاظ سے خود کفیل ہو گیا تو اس نے اپنے اتحادی عرب سردار علی بن جُدَیع کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا۔[1]

ابو مسلم خراسانی کی ''عرب دشمن مہم'' عباسی پیشواؤں کی ہدایت پر شروع ہوئی تھی۔ اس کا بدترین نتیجہ نہ صرف اُمتِ مسلمہ بلکہ خود عباسیوں کو بھی بھگتنا پڑا۔ اس دور میں عرب قبائل بڑی تعداد میں خراسان و ایران میں آباد تھے۔ یہ عرب قبائل صحابہ کے دور میں یہاں آئے تھے اور ان علاقوں میں لگ بھگ ایک صدی سے ان کے اثرات پڑ رہے تھے جس کے باعث اب یہاں کی تہذیب پر عربی رنگ چڑھنے لگا تھا۔ اگر ابو مسلم خراسانی نہ آتا تو شاید آج ایران، افغانستان، وسطِ ایشیا اور ہندوستان میں بھی عربی زبان اسی طرح عام ہوتی جیسے عراق، شام، مصر، تیونس، الجزائر اور مراکش میں ہے۔ عجمی تمدن دوسری صدی ہجری ہی میں مٹ چکا ہوتا اور پورا عالم اسلام لسانی وثقافتی لحاظ سے ایک ہی رنگ میں رنگا دکھائی دیتا۔ مگر ابو مسلم خراسانی نے عجم میں آباد عربوں کو اس طرح برباد کیا کہ ان میں سے ہزاروں قتل ہوئے اور لاتعداد فرار ہو کر عراق، شام، جزیرۃ العرب اور مصر چلے گئے، یوں جاں بلب ایرانی وخراسانی تہذیب دوبارہ اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر اسے کبھی دبایا نہ جاسکا۔ یہی عجمی تمدن اور روسائے عجم کا اثر ورسوخ خود عباسیوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب بنا اور مامون و معتصم جیسے خلفاء کے گزرتے ہی عجمیوں نے خلافت کو یرغمال بنا لیا۔

مروان بن محمد کی لشکر کشی اور شکستِ فاش:

مروان بن محمد اس دوران دن کا آرام اور راتوں کی نیند تج کر خوارج کی بغاوت کو دبانے میں مصروف تھا۔ اگر اسے چند ماہ پہلے بھی اس مہم سے فرصت مل جاتی تو شاید وہ ابو مسلم خراسانی سے مقابلے کی تیاری کر لیتا۔ مگر بدقسمتی سے وہ

---

[1] تاریخ الطبری: ۳۷۷/۷ تا ۳۸۸ ؛ الکامل فی التاریخ: ۳٦۰/٤ تا ۳٦۹

حجاز اور شام کے ان سرکش عناصر کو لگام دینے میں اس وقت کامیاب ہوا جب پورے خراسان اور ایران وعراق پر ابو مسلم کا قبضہ مکمل ہو چکا تھا۔ مروان اس کے باوجود ہمت نہ ہارا۔ آخری کوشش کے طور پر وہ الجزیرہ اور شام کی تمام عسکری جمعیت اکٹھی کر کے موصل کے قریب دریائے زاب کے کنارے آکر خیمہ زن ہوا۔ اس کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار سپاہی تھے۔ اِدھر سے سفاح کا چچا عبداللہ بن علی اپنے رضا کاروں کو لے کر مقابلے پر آیا۔ مروان نے بڑی پامردی سے جنگ کی مگر اُدھر پے در پے فتوحات سے حوصلہ پانے والے عباسیوں کا سیلاب تھا اور اِدھر مسلسل جنگوں سے تھکا ماندہ ایک حکمران جس کی حکومت زوال وادبار کے آخری درجے کو پہنچ چکی تھی۔

نتیجہ یہ نکلا کہ مروان بن محمد کی ذاتی شجاعت اور ہمت کچھ کام نہ آئی۔ اس کی فوج ایک خونریز جنگ کے بعد میدان کو اس افراتفری کے عالم میں چھوڑ کر بھاگی کہ ہزاروں سپاہی دریا کی نذر ہوگئے۔ ڈوبنے والوں میں صرف اموی امراء اور شہزادوں کی تعداد تین سو کے لگ بھگ تھی۔ انہی میں ولید بن عبدالملک کا بیٹا سابق خلیفہ ابراہیم بھی تھا۔ یہ واقعہ ۱۱ جمادی الآخرہ ۱۳۲ھ کا ہے۔[1] یوں دریائے زاب کی خون بار موجوں میں اُموی خلافت کا وہ سورج جو صرف آٹھ برس پہلے نصف النہار پر تھا، اس طرح ڈوبا کہ اسے پھر کبھی طلوع ہونا نصیب نہ ہوا۔

دِمشق پر عباسیوں کا قبضہ اور اموی شہزادوں کا قتلِ عام:

مروان شکست کھا کر مُوصِل کی طرف نکل گیا مگر عباسی فوجیں اس کے تعاقب میں تھیں۔ وہ شام پہنچا مگر وہاں بھی ہر شہر میں بغاوت پھوٹ رہی تھی اور امراء عباسیوں سے اظہارِ وفاداری کے لیے تیار تھے۔ مروان شام کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر مصر پہنچ گیا۔ اِدھر رمضان ۱۳۲ھ میں عبداللہ بن علی عباسی افواج کو لیے امویوں کے پایۂ تخت دِمَشق کے سامنے آن پہنچا اور کسی دشواری کے بغیر اسے فتح کر لیا۔[2]

عبداللہ بن علی سخت گیر انسان تھا، اس نے دِمَشق پر قبضہ کرنے کے بعد عمر بن عبدالعزیز کے سوا، بنوامیہ کے تمام سابقہ خلفاء کی قبریں کھدوا ڈالیں اور ان کی بچی کھچی ہڈیوں کو جمع کر کے نذرِ آتش کر دیا۔[3]

پھر اس نے دِمَشق سے بنوامیہ کے بہت سے شہزادوں اور ارکان کو جان کی امان دے کر ساتھ لیا اور رملہ سے بارہ میل دور نہر ابی فُطرُس کے کنارے پڑاؤ ڈال کر حکم دیا کہ اموی عمائد کو غیر مسلح کر کے حاضر کیا جائے۔ انہیں ایک ایک کر کے نام بنام بلایا گیا۔ یہ اسّی سے کچھ زائد افراد تھے۔ عبداللہ بن علی نے انہیں بندھوا دیا۔ پھر اپنے خراسانی ساتھیوں کو حکم دیا، وہ مکوں، لاتوں اور لاٹھیوں سے ان پر ٹوٹ پڑے یہاں تک کہ ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا۔[4]

---

[1] البداية والنهاية: ۲۵۴/۱۳ تا ۲۵۶؛ تاريخ الطبری تحت ۱۳۲ھ؛ تاريخ خليفة بن خياط، ص ۴۰۳

[2] تاريخ خليفة بن خياط، ص ۴۰۰ تا ۴۰۴؛ الكامل في التاريخ: ۱۸/۵، ۱۹

[3] انساب الاشراف للبلاذری: ۱۰۴/۴

[4] انساب الاشراف: ۳۳۱/۹؛ ۱۰۴/۴

عباسیوں کے مظالم کی مذکورہ دونوں روایات عباسی خلیفہ متوکل کے معتمد بلاذری نے نقل کی ہیں۔ کسی اور نے نقل کی ہوتیں تو ہم اسے مبالغہ آمیزی تصور کرتے۔

مروان بن محمد کا انجام:

مروان کو مصر میں یہ اطلاع ملی تو روتے روتے ہلکان ہوگیا۔ اسے بنوعباس سے کسی نرمی کی توقع نہ رہی، لہٰذا دریائے نیل عبور کر کے افریقہ میں پناہ لینے نکل کھڑا ہوا۔ مگر اس دوران عباسی سپاہی اس کا تعاقب کرتے ہوئے قریب پہنچ چکے تھے۔ مروان راستے میں تھکن اور نیند سے بے حال ہو کر بوصیر نامی قصبے کے کسی گرجے میں آرام کے لیے ٹھہرا ہوا تھا کہ عباسی سپاہی نوہ لیتے ہوئے وہاں تک پہنچ گئے اور کسی تردد کے بغیر اسے وہیں موت کی نیند سلا دیا۔ اس طرح خلفائے بنوامیہ کا یہ آخری بہادر حکمران پیوندِ خاک ہوگیا۔ یہ واقعہ ۲۷ ذوالحجہ ۱۳۲ھ کا ہے۔

اس کا سر کاٹ کر عباسی پیشوا ابوالعباس سَفاح کے پاس بھیج دیا گیا جس نے کٹا ہوا سر دیکھ کر سجدۂ شکر ادا کیا اور کہا:

''اللہ کا احسان ہے جس نے ہمیں تجھ پر غلبہ دیا، تیرے اور تیرے خاندان سے ہمارا حساب بے باق کر دیا۔''

مروان بن محمد کی عمر ۵۸ سال تھی، پانچ سال دس ماہ حکومت کی جس میں اسے ایک دن بھی چین کا نہیں ملا۔ اگر اسے اتنے مہیب فتنوں سے پالا نہ پڑا ہوتا تو شاید وہ ایک بڑا کشور کشا ثابت ہوتا۔[1]

مروان کی والدہ کا تعلق کردستان سے تھا، وہ ایک نہایت صابر اور بلند ہمت خاتون تھی۔ مروان کی موت کے بعد، خاندان کی دیگر مستورات اور بچوں کے ساتھ افریقہ کے جنگلوں میں چھپتی چھپاتی رہی۔ اس سفر میں شریک ایک شخص کا کہنا ہے کہ پاپیادہ چل چل کر اس کے پاؤں چھلنی ہو جاتے تھے مگر لبوں سے ایک بار بھی آہ نہ نکلتی تھی۔[2]

آخری اموی خلیفہ اساطینِ اُمت کی نگاہ میں:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وہ گورا، نیلی آنکھوں، لمبی ڈاڑھی اور بڑے سر والا تھا۔ قد درمیانہ تھا، خضاب نہیں لگاتا تھا۔ ہشام نے ۱۱۴ھ میں اسے آذربائی جان، الجزیرۃ اور آرمینیا کا حاکم بنایا تھا۔ اس نے کئی سالوں میں بہت سے شہر اور متعدد قلعے فتح کیے۔'' ''جہاد کبھی نہیں چھوڑتا تھا۔ تُرک، خزر اور لان قبائل کے مختلف گروہوں سے جنگیں کر کے انہیں شکست دی اور مسخر کیا۔'' ''شجاع، بہادر، آگے بڑھ کر لڑنے والا اور مدبر انسان تھا۔ مگر جس کا ساتھ اللہ چھوڑ دے، وہ بے آسرا ہو جاتا ہے۔''[3]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''وہ شہ سواری، معرکہ آزمائی، مردانگی اور ہوشیاری میں مشہور تھا۔''[4]

اس کے حریف بھی اس کی خوبیوں کو خراج تحسین پیش کیے بغیر نہ رہ سکے۔ عباسی خلیفہ منصور نے ایک بار کہا: ''اللہ مروان کا بھلا کرے۔ کتنا ہوشیار، زیرک اور سرکاری اخراجات میں کس قدر محتاط انسان تھا۔'' اس کا بیٹا مہدی بول اٹھا: ''تو پھر آپ نے اسے قتل کیوں کیا؟'' منصور بولا: ''اللہ کے علم اور تقدیر میں یہی لکھا تھا۔''[5]

① تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ٤٠٠ تا ٤٠٤؛ انساب الاشراف: ۳۲۱/۹، ۳۲۲، ۳۲۷؛ الکامل فی التاریخ: ۱۸/۵ تا ۲۰

② تاریخ دمشق: ۱۱۲/۱۲، تر: الحجاج بن قتیبۃ ③ البدایۃ والنہایۃ: ۲۶۳/۱۳

④ تاریخ الاسلام للذہبی: ۵۳٤/۸

⑤ تاریخ دمشق: ۳۲۳/۵۷

بنوسفیان و بنومروان کے دور پر ایک نگاہ

بنوامیہ کی حکومت لگ بھگ ۸۳ سال تک رہی۔ چوبیس سال تک اقتدار بنوامیہ کی سفیانی شاخ کے پاس رہا جس میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، یزید اور معاویہ بن یزید خلیفہ ہوئے۔ بنومروان کی حکومت ۶۴ھ سے ۱۳۲ھ تک تقریباً ۵۹ سال رہی جس میں عبدالملک، ولید، سلیمان، عمر بن عبدالعزیز اور دیگر خلفاء سمیت کُل دس حکمران گزرے۔

فتوحات کے لحاظ سے بنوامیہ کے بعد ان کی ہم پلہ کوئی اسلامی حکومت کہیں قائم نہیں ہو سکی۔ صرف ولید بن عبدالملک کے دور کی فتوحات دیکھی جائیں تو بنوعباس اپنے پانچ صد سالہ دور میں اس کا چوتھائی علاقہ بھی فتح نہیں کر سکے۔ علوم وفنون اور ترقیاتی کاموں کے لحاظ سے بھی یہ نہایت شاندار دور تھا جیسا کہ مختلف خلفاء کے حالات کے تحت ان کے کارناموں کی بہت سی مثالیں گزر چکی ہیں۔

تاہم اپنے بہت سے محاسن کے باوجود بنوامیہ کے بیشتر خلفاء سیاسی اُمور میں خود کو شرعی مسئولیت سے بالاتر سمجھتے تھے، یہ اس دور کی سلطنتوں کا ایک عام مزاج تھا جو مسلم حکمرانوں میں دَر آیا تھا اور بعد میں دیگر حکمران خانوادوں میں بھی اس مزاج کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ خلفاء اپنے سیاسی مصالح اور بالخصوص اقتدار کو بچانے کے بارے میں شریعتِ مطہرہ کی پابندیوں کو جب چاہتے توڑ دیتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پورے اُموی دور میں اعلیٰ حکام سے لے کر عام افسران تک سبھی اسلام کے بہترین نظام حیات ہونے کے قائل تھے۔ اگر ولید بن یزید جیسا کوئی حکمران حد سے آگے بڑھا تو اس کی حکومت کو خود امرائے دولت نے ٹھکرا دیا۔ ملک کا قانون اسلامی ہی تھا، عام حالات میں تمام اُمور اسی کی روشنی میں انجام دیے جاتے تھے اور عدالتوں میں اسی کی رو سے فیصلے ہوا کرتے تھے، مگر عموماً حکمران سیاسی مفاد کے لیے جائز یا ناجائز کی پروا نہیں کرتے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اس مزاج کی اصلاح پر کمربستہ رہے، ان کی مساعی کا اثر بعد کے چند خلفاء میں واضح دکھائی دیتا ہے۔

ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حکمران بھی انسان ہوتے ہیں اور ان سے بھی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ پس اگر یہ لغزشیں نجی زندگی سے متعلق ہوں اور ان کا قوم پر منفی اثر نہ پڑتا ہو تو انہیں نظر انداز کر دینا ہی مناسب ہے۔

بیشتر مؤرخین نے تاریخ کو حکمرانوں کی سوانح کے طور پر مرتب کیا اور نہ صرف یہ کہ حکام کے نجی حالات کو بہت اہمیت دی ہے بلکہ اس بارے میں ہر طرح کی بھلی بُری، رطب ویابس باتوں کو بھی جمع کرتے چلے گئے جبکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس طرز کا نقصان یہ ہوا کہ تاریخ کی صحیح حیثیت کہ وہ ایک اُمت، ایک قوم وملت اور ایک معاشرے کی تصویر ہے، پس منظر میں چلی گئی اور حکام کی بعض خامیاں دیکھ کر پورے مسلم معاشرے کو اسی پر قیاس کر لیا گیا۔

دولتِ بنوامیہ (بنوسفیان و بنومروان) کے زوال کے اسباب

عام خیال ہے کہ بنوامیہ کی عظیم الشان حکومت کا زوال ولید ثانی کی تخت نشینی کے ساتھ شروع ہوا تھا مگر درحقیقت اس کی شکستگی کے اصل اسباب بہت پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ ذیل میں ہم ان اسباب پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں:

① اس زوال کا بنیادی سبب شورائیت اور عوام کی ذہنی ہم آہنگی کے اصولوں پر مبنی اسلامی نظامِ سیاست کی پوری پاسداری نہ کرنا اور شورائی نظام کی جگہ بادشاہت سے ملتا جلتا خاندانی اور موروثی طرزِ حکومت اختیار کرنا تھا۔ حکومت ایک خاندان میں منحصر ہو جانے سے دوسرے قبیلوں اور خاندانوں میں حسد اور عداوت کے جذبات پیدا ہوئے اور حکومت مخالف تحریکوں کو تقویت ملی۔

② خاندان کے اندر انتقالِ اقتدار کے لیے بھی کوئی مربوط لائحہ عمل اور معیار نہیں طے کیا گیا بلکہ ولی عہدی کو طے شدہ اصول کی حیثیت حاصل رہی۔ کم عمر لڑکے بھی جن کی قابلیت کا ابھی کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا، ولی عہد بنا دیے جاتے تھے۔ ولی عہد اگر جوان ہو کر نالائق ثابت ہوتا تب بھی اقتدار اسی کو ملتا۔

③ یکے بعد دیگرے ایک سے زائد ولی عہد بنانے کا رواج بھی پڑ گیا۔ اس سے کئی خرابیاں پیدا ہوئیں۔ خود خاندان میں پھوٹ پڑنے لگی؛ کیوں کہ پہلا ولی عہد حکمران بننے کے بعد عموماً دوسرے کو برطرف کر کے اپنی اولاد کو ولی عہد بنانا چاہتا۔ یہ دیکھ کر محروم کیا جانے والا ولی عہد بغاوت پر آمادہ ہو جاتا اور کچھ امراء اس کے حمایتی بن جاتے۔ ہشام کے بعد دمشق میں ہونے والی اکھاڑ پچھاڑ کی بڑی وجہ یہی تھی۔

④ بنوامیہ کے بعض حکمرانوں کے غلط سیاسی اقدامات اور بعض ماتحت گورنروں کے مظالم نے بھی عوام کو حکومت سے متنفر کیا۔ خصوصاً یزید کے دور میں وقوع پذیر ہونے والے سانحۂ کربلا، واقعہ حرہ اور حجاج بن یوسف کے ہاتھوں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور سعید بن جُبیر رحمہ اللہ جیسے بزرگوں کی شہادت نے علماء، فقہاء اور بزرگانِ امت کی بڑی تعداد کو حکومت سے بددل کر دیا تھا۔ اسی نفرت اور بے زاری کی وجہ سے عبدالرحمٰن بن اَشعث کے خروج میں محدثین اور مشائخ کی بھاری تعداد شریک رہی۔ ان المیوں کا اثر ایک صدی بعد اس وقت بھی باقی تھا جب بنوعباس نے خروج کیا۔ بنوعباس مظالم کے ازالے، انصاف کی فراہمی اور ظالموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا منشور لے کر کھڑے ہوئے تھے؛ اس لیے لوگوں نے اس پرکشش نعرے پر لبیک کہا۔

⑤ بعض خلفاء جیسے یزید بن معاویہ اور ولید ثانی کے فسق و فجور نے بھی عوام و خواص کو حکومت سے بے زار کیا۔

⑥ بدعقیدہ جماعتوں خصوصاً سبائیہ اور خوارج نے خلافتِ بنوامیہ کو سخت نقصانات سے دوچار کیا۔ خوارج کھلے عام لڑ کر حکومت کو مختلف نازک ترین مواقع پر شدید آزمائشوں سے دوچار کرتے رہے۔ سبائیہ شیعانِ علی کو استعمال کرکے اندورنِ خانہ حکومت مخالف جذبات بھڑکاتے اور لوگوں کو حکام سے متنفر کرتے رہے۔ سبائیہ نے شیعانِ علی کی خاصی تعداد کو اس بارے میں ہم خیال بنالیا تھا کہ حکومت صرف سادات کا حق ہے۔

سبائی گروہ کی خفیہ فکری وابلاغی سازشوں سے بہت سے شیعوں میں عقیدۂ امامت بھی سرایت کرچکا تھا۔ ایسے لوگوں کو حکومت کے خلاف کھڑا کرنے کے لیے کسی اور دلیل کی ضرورت نہ تھی۔ بزرگانِ بنوعباس نے خود اس عقیدے کا قائل نہ ہوتے ہوئے بھی محض سیاسی مصلحت کے طور پر ''خلافت'' کے ہدف کو ''امامت'' کے لفافے میں پیش کرکے ان بدعقیدہ لوگوں کو اپنے گرد جمع رکھا تاکہ اپنی طاقت میں اضافہ کرکے حکومت کا تختہ الٹیں۔

⑦ بنوامیہ نے خالص عربوں کی حکومت قائم کی تھی۔ دیگر قوموں کو اعلیٰ عہدوں سے دور ہی رکھا جاتا تھا۔ اس کی حکمت چاہے کچھ بھی ہو مگر اس سے عجمی لوگوں میں احساسِ محرومی کا پیدا ہونا فطری بات تھی؛ اس لیے انہوں نے حکومت کی تبدیلی کا خیر مقدم کیا اور بنوعباس کا ساتھ دیا۔ شاہ معین الدین ندوی مرحوم لکھتے ہیں:

> ''عجمیوں کے دل سے ان کی حکومت کے زوال کا داغ مٹانہ تھا۔ اور ان کے دماغ میں ہمیشہ عربوں سے انتقام کے خیالات پرورش پاتے رہے لیکن ان کے مقابلے میں علانیہ اٹھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی؛ اس لیے خفیہ سازشیں کیا کرتے تھے اور عربی حکومت کو نقصان پہنچانے والی جو تحریک شروع ہوتی اس میں شریک ہوجاتے تھے اور اس کے مبلغ بن جاتے تھے۔ چنانچہ اس قسم کی اکثر تحریکیں سرزمین عجم ہی سے اٹھیں یا کم از کم انہیں فروغ یہیں حاصل ہوا۔ خلافت کے بارے میں اہل بیت اور غیر اہلِ بیت کے مسئلے کو بھی سب سے زیادہ عجمیوں ہی نے بڑھایا اور اسی سرزمین پروہ پروان چڑھا۔ چنانچہ اہلِ بیت کے شیعہ زیادہ تر عجمی تھے۔''[1]

لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ سارے عجمی اسلام کے دشمن تھے بلکہ یہ معاندانہ سوچ ان کے بعض سیاست دانوں اور ان کے حلقہ بگوشوں کی تھی۔ باقی عجمی عوام میں ملے جلے ہر طرح کے لوگ تھے۔ ان کی بڑی تعداد مخلص مسلمانوں پر مشتمل تھی جو صحیح العقیدہ اور امت کے خیر خواہ تھے۔ امام ابوحنیفہ اور امام بخاری سے لے کر سلطان محمود غزنوی، صلاح الدین ایوبی اور ترکانِ عثمان جیسے عجمی مسلمانوں نے مختلف ادوار میں اسلام کی جو خدمت کی وہ ایک مستقل تاریخ ہے۔

⑧ بنوامیہ کی عربی حکومت یمنی اور مضری قبائل کے اتحاد کے بل بوتے پر قائم تھی۔ جب ان قبائل کے درمیان باہمی عداوت کے شعلے بھڑکے اور وہ آپس میں دست وگریباں ہوئے تو عالمِ اسلام سے بنوامیہ کی بساط آنا فانا لپٹ گئی۔

❖❖❖

[1] تاریخ اسلام شاہ معین الدین ندوی: ۱/۵۸۷

بنوعباس کی کامیابی کی وجوہات

بنوامیہ کے خلاف بنوعباس کا کامیاب ہونا اُمت کی تاریخ میں خروج کا پہلا کامیاب تجربہ تھا۔اس کامیابی کی اہم وجوہ درج ذیل ہیں:

① بنوامیہ کے خلاف کئی جماعتوں نے خروج کیا تھا۔یہ جماعتیں ہر بار عجلت پسندی کی وجہ سے پوری تیاری کیے بغیر میدان میں آئیں اور ناکام ہوتی گئیں۔مثلاً خانوادۂ بنوہاشم کے بزرگ حضرت زید بن علی نے عملی اقدام کے لیے مناسب موقع کا انتظار نہیں کیا۔انہوں نے خلفائے بنومروان کے دورِ عروج میں خروج کیا اور شکست کھائی۔ تاہم ان بار بار کے کچوکوں سے بنوامیہ کی حکومت غیر محسوس طور پر کچھ نہ کچھ کمزور ہوتی رہی۔ان سب کے بعد بنوعباس کے سیاسی قائدین نے کام شروع کیا اور سب سے الگ انداز میں اپنی دعوت خفیہ طور پر چلائی۔

② عباسی قائدین میں حزم واحتیاط،معاملہ فہمی اور دور اندیشی کی صفات خاندانی طور پر موجود تھیں؛اس لیے انہوں نے حکومت کے دورِ عروج میں اپنی تحریک کو پوشیدہ رکھا اور مکمل تیاری تک اپنی قوت کو ایک بار بھی ضایع نہیں کیا۔

③ بنوعباس نے خروج کے لیے مناسب ترین وقت کا انتظار کیا اور راست اقدام اس وقت کیا جب حکومت اندرونی خانہ جنگیوں سے بالکل کمزور ہو چکی تھی اور کوئی مزید دھچکا سہنے کے قابل نہ تھی۔

④ بنوعباس نے تحریک کے لیے عوامی نفسیات کا مطالعہ کیا اور ''دعوتِ آلِ محمد'' جیسے نہایت مؤثر نعرے مقرر کیے۔

⑤ بنوامیہ کی حکومت میں عجمیوں کو کلیدی عہدوں سے دور رکھا گیا تھا۔بنوعباس نے انہی کو خوش کن وعدوں سے گرویدہ بنا کر اپنے ساتھ ملایا اور ان کی قوت کو کامیابی سے استعمال کیا۔

⑥ بنوعباس کی تنظیم سازی بہت بھرپور اور مربوط تھی۔راست اقدام سے پہلے وہ اندرونی سطح پر نفوذ کر چکے تھے اور عوام اور حکومت کے درمیان ربط وضبط کی جڑیں کاٹ کر ایک غیر اعلانیہ متوازی حکومت بنا چکے تھے۔یہی وجہ تھی کہ ابومسلم خراسانی کے ایک حکم پر پورا خراسان سیاہ لباس پہن کر اٹھ کھڑا ہوا۔

⑦ بنوعباس ہاشمی تھے،حضور اکرم ﷺ کی قرابت کے باعث شرافتِ نسبی میں بنوامیہ سے بہت بڑھ کر تھے؛اس لیے جب عام لوگوں کے سامنے دو خاندانی حکومتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا فیصلہ کن لمحہ آیا تو انہوں نے ہاشمیوں کو اُمویوں پر ترجیح دی۔

⑧ بنوعباس نے اپنی تحریک میں خبر رسانی کا نظام بہت فعال بنایا تھا،انہیں حکام کے عزائم کی پل پل خبر ملتی رہتی تھی۔اس کے برعکس بنوامیہ کے آخری حکمرانوں نے اس شعبے پر کوئی توجہ نہیں دی۔بلکہ موصول ہونے والی خبروں کو بھی وہ نظر انداز کرتے رہے جس کے نتیجے میں فریق مخالف مضبوط تر ہوتا گیا اور حکومت کے پاس بحران سے

نمٹنے کا وقت تنگ ہوتے ہوتے آخر کار ختم ہوگیا۔

بنوعباس کا دین وعقیدہ:

ہم نے گزشتہ صفحات میں سادات ِکرام کا جوعقیدہ دلائل سے ثابت کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ عباسی تحریک کے پیشوا بھی بنیادی طور پر قرآن وسنت کے مطابق عقائد ونظریات کے حامل تھے۔ اس بات کا ایک اور بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس تحریک کے نتیجے میں برسر اقتدار آنے والے خلفاء جنہوں نے پانچ صدیوں تک حکومت کی، ان میں سے فقط مامون، معتصم اور واثق معتزلی تھے جبکہ فقط ایک خلیفہ الناصر شیعہ تھا۔ ایک دو ایسے تھے جو تشیع کی طرف مائل تھے۔ ان پانچ چھ کو چھوڑ کر باقی سب عباسی خلفاء اہلِ سنت تھے۔ اگر چند خلفاء تشیع یا اعتزال میں مبتلا ہوئے تو اس سے پرانے علوی بزرگان اکابر بنوعباس پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ تاہم یہ بات بھی ظاہر ہے کہ انقلاب کے قائدین نے تحریک کے دوران سیاسی تدبیر کے طور پر دین کے بعض مسلمہ نظریات سے چشم پوشی کی اور ''سادات'' کو خلافت کا اصل حق دار مشہور کرتے ہوئے ''امام'' اور ''امامت'' جیسے الفاظ استعمال کیے تاکہ شیعوں کے تمام گروہ یہاں تک کہ سبائی بھی ان کے ساتھ رہیں۔ ورنہ حقیقت میں بنوامیہ سے ان کا اختلاف اعتقادی نہیں، محض سیاسی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حکومت حاصل کرنے کے بعد بنوعباس کے پہلے خلیفہ سفاح نے اپنی پہلی تقریر میں سبائیوں سے کھل کر بے زاری ظاہر کردی۔ ①

بعد میں اہلِ تشیع کے شدت پسند گروہوں نے سیاسی اختلافات کی ان عارضی حدود پر الگ عقائد کی مستقل دیواریں تعمیر کرلیں۔ یہ وہی عقائد تھے جو سبائی گروہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے سے پھیلاتا آرہا تھا۔ انہی میں یہ عقیدہ بھی شامل تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی ہیں جن کی موجودگی میں کسی اور کی خلافت درست نہیں۔ اسی عقیدے کی بناء پر پہلے تینوں خلفاء کو غاصب اور ظالم کہا جاتا تھا۔

اہلِ تشیع میں سبائیوں کی اس نظریاتی محنت نے دوسری صدی ہجری تک اس عقیدے کو عام کردیا۔ اس نظریاتی محنت کے دوران بزرگانِ بنوہاشم کی حکومت مخالف تحریکات کو نیا رنگ دیا گیا۔ ایسی روایات بلکہ کتب گھڑی گئیں جن سے یہ ظاہر ہو کہ یہ حضرات بھی عقیدۂ امامت کے قائل تھے اور سمجھتے تھے کہ امام کی موجودگی میں کوئی دوسرا شخص حکمرانی کے قابل نہیں ہوسکتا اور اسی لیے بزرگانِ بنوہاشم خلفائے بنوامیہ وبنومروان کے خلاف خروج کرتے رہے۔

اس محنت کے نتیجے میں بنوہاشم کے بزرگوں کے گرد جمع ہونے والے بہت سے لوگوں کی آل اولاد دوسری صدی ہجری کے اواخر تک عقیدۂ امامت کی قائل ہوگئی۔ اس دوران جب مؤرخین نے اُمت کی تاریخ سے متعلقہ مواد جمع کرنا شروع کیا تو اس انبار میں وہ روایات بھی شامل ہوگئیں جنہیں سبائیوں نے پھیلایا تھا جن میں کہیں اکابر صحابہ کی کردار کشی تھی اور کہیں سادات ِکرام کے بارے میں یہ تاثر دیا گیا تھا کہ وہ عقیدۂ امامت کے قائل بلکہ اس کے داعی تھے اور حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کو ظالم اور غاصب سمجھتے تھے۔ حالانکہ یہ سب نرا جھوٹ اور محض ایک بہتان ہے۔

① تاریخ الطبری: ۷/۴۲۵

جدول عہدِ بنوامیہ مع خلافتِ زبیریہ

آغاز وانجام

نمبر	حکمران	حکومت کے آغاز و انتہاء کی تاریخ	انجام
۱	امیر معاویہ رضی اللہ عنہ	جمادی الاولیٰ ۴۱ھ تا ۴ رجب ۶۰ھ ستمبر ۶۶۱ء تا ۲۱ اپریل ۶۸۰ء	طبعی وفات
۲	یزید بن معاویہ	رجب ۶۰ھ تا ۱۴ ربیع الاول ۶۴ھ اواخر اپریل ۶۸۰ء تا ۲۲ نومبر ۶۸۳ء	طبعی وفات
۳	معاویہ بن یزید	۱۴ ربیع الاول ۶۴ھ تا ۲۴ ربیع الآخر ۲۲ نومبر ۶۸۳ء تا ۳۱ دسمبر ۶۸۳ء	طبعی وفات
۴	عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ	۹ رجب ۶۴ھ تا ۱۷ جمادی الاولیٰ ۷۳ھ ۱۴ مارچ ۶۸۴ء تا ۱۶ اکتوبر ۶۹۲ء	شہید کیے گئے
۵	مروان بن الحکم	ذوالقعدہ ۶۴ھ تا ۳ رمضان ۶۵ھ جولائی ۶۸۴ء تا ۶ مئی ۶۸۴ء	محلاتی سازش میں قتل
۶	عبدالملک بن مروان	۱۷ جمادی الاولیٰ ۷۳ھ تا ۱۵ شوال ۸۶ھ ۱۶ اکتوبر ۶۹۲ء تا ۲۰ اکتوبر ۷۰۵ء	طبعی وفات
۷	ولید بن عبدالملک	۱۵ شوال ۸۶ھ تا ۱۵ ربیع الاول ۹۶ء ۲۰ اکتوبر ۷۰۵ء تا ۹ دسمبر ۷۱۴ء	طبعی وفات
۸	سلیمان بن عبدالملک	۱۵ ربیع الاول ۹۶ء تا ۲۰ صفر ۹۹ء ۹ دسمبر ۷۱۴ء تا ۱۱۳ اکتوبر ۷۱۷ء	طبعی وفات
۹	عمر بن عبدالعزیز	۲۰ صفر ۹۹ء تا ۲۰ رجب ۱۰۱ھ ۱۱۳ اکتوبر ۷۱۷ء تا ۱۶ فروری ۷۲۰ء	زہر دیا گیا
۱۰	یزید بن عبدالملک	۲۰ رجب ۱۰۱ھ تا ۲۵ شعبان ۱۰۵ھ ۱۶ فروری ۷۲۰ء تا ۷ فروری ۷۲۴ء	طبعی وفات
۱۱	ہشام بن عبدالملک	۲۵ شعبان ۱۰۵ھ تا ۶ ربیع الآخر ۱۲۵ھ ۷ فروری ۷۲۴ء تا ۱۸ فروری ۷۴۳ء	طبعی وفات

۱۲ ولید بن یزید بن عبدالملک	۶ ربیع الآخر ۱۲۵ھ تا ۲۷ جمادی الآخرہ ۱۲۶ھ ۱۸ فروری ۷۴۳ء تا ۱۲۷ اپریل ۷۴۴ء	قتل کیا گیا
۱۳ یزیدِ ثالث	۲۷ جمادی الآخرہ ۱۲۶ھ تا ۲۰ ذوالحجہ ۱۲۶ھ ۱۲۷ پریل ۷۴۴ء تا ۱۱۴ کتوبر ۷۴۴ء	طبعی وفات
۱۴ ابراہیم بن ولید	۲۰ ذوالحجہ ۱۲۶ھ تا ۱۴ صفر ۱۲۷ھ ۱۱۴ کتوبر ۷۴۴ء تا ۶ دسمبر ۷۴۴ء	معزول کیا گیا
۱۵ مروانِ ثانی	۱۴ صفر ۱۲۷ھ تا ۲۷ ذوالحجہ ۱۳۲ھ ۶ دسمبر ۷۴۴ء تا ۱۷ اگست ۷۵۰ء	قتل کیا گیا

❖❖ ❖

جدول عہدِ بنوامیہ (بنوسفیان و بنومروان) مع خلافتِ زبیریہ

حالات و انقلابات

نمبر	حکمران	حکومت	کردار	خاص انقلاب
۱	حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ	۴۱ھ تا ۶۰ھ ۶۶۱ء تا ۶۸۰ء	صحابی	اموی خلافت کا قیام
۲	یزید بن معاویہ	۶۰ھ تا ۶۴ھ ۶۸۰ء تا ۶۸۳ء	ظالم و فاسق	سانحہ کربلا، سانحہ حرہ
۳	معاویہ بن یزید	۶۴ھ ۶۸۳ء	نیک سیرت	چالیس دن کے بعد حکومت شوریٰ کے حوالے
۴	عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ	۶۴ھ تا ۷۳ھ ۶۸۴ء تا ۶۹۲ء	صحابی	بنوسفیان و بنومروان کی حکمرانی کے درمیان شرعی خلیفہ رہے۔
۵	مروان بن الحکم	۶۴ھ تا ۶۵ھ ۶۸۴ء تا ۶۸۵ء	عالم فاضل مگر بعض نہایت غلط کاموں میں ملوث	عبداللہ بن زبیر کی شرعی خلافت کے بالمقابل شام میں امویوں کی باغیانہ حکومت قائم کی

۶	عبدالملک بن مروان	۷۳ھ تا ۸۶ھ ۶۹۲ء تا ۷۰۵ء	عالم فاضل، بہترین صلاحیتوں کا مالک مگر ظلم و ستم کی سرپرستی میں ملوث	عبداللہ بن زبیر کی خلافت ختم کر کے پورے عالم اسلام پر قبضہ کیا۔ حجاج بن یوسف کا عروج
۷	ولید بن عبدالملک	۸۶ھ تا ۹۶ھ ۷۰۵ء تا ۷۱۴ء	جفاکش، فاتح، سخت گیر	سندھ، وسطِ ایشیا اور اندلس کی فتح
۸	سلیمان بن عبدالملک	۹۶ھ تا ۹۹ھ ۷۱۴ء تا ۷۱۷ء	نیک سیرت، بعض بے اعتدالیاں صادر ہوئیں	فتوحات کا سلسلہ رک گیا۔
۹	عمر بن عبدالعزیز	۹۹ھ تا ۱۰۱ھ ۷۱۷ء تا ۷۲۰ء	خلافتِ راشدہ کا روشن عکس	احیائے شریعت اور مظالم کا احتساب
۱۰	یزید بن عبدالملک	۱۰۱ھ تا ۱۰۵ھ ۷۲۰ء تا ۷۲۳ء	متوسط	بنوعباس کی خفیہ تحریک شروع، خوارج اور ترکوں کی بغاوتیں
۱۱	ہشام بن عبدالملک	۱۰۵ھ تا ۱۲۵ھ ۷۲۳ء تا ۷۴۳ء	نیک سیرت	زید بن علی کا خروج۔ فرانس کا جہاد۔ ترکوں پر فتح
۱۲	ولید بن یزید بن عبدالملک	۱۲۵ھ تا ۱۲۶ھ ۷۴۳ء تا ۷۴۴ء	فاسق وفاجر	حکومت کمزور ہونا شروع ہوگئی
۱۳	یزید ثالث	جمادی الآخرہ تا ذو الحجہ ۱۲۶ھ اپریل تا اکتوبر ۷۴۴ء	نیک سیرت	بہت مختصر حکومت کی
۱۴	ابراہیم بن ولید	ذوالحجہ ۱۲۶ھ تا صفر ۱۲۷ھ اکتوبر تا دسمبر ۷۴۴ء	برائے نام حکومت	حکومت زوال کی طرف گامزن
۱۵	مروانِ ثانی	۱۲۷ھ تا ۱۳۲ھ دسمبر ۷۴۴ء تا اگست ۷۵۰ء	نیک سیرت، بہادر	آخری اموی حکمران۔ بنوعباس کا علانیہ خروج۔ مروانیوں کو شکست فاش

اُمتِ مُسلمہ کی تاریخ میں غیر سیاسی مشاہیر کا کردار

اُمتِ مسلمہ کی ایک خصوصیت

ہم تاریخ امت کے ایک بڑے مرحلے سے گزر چکے ہیں۔اس ضمن میں سیرتِ نبویہ، سیرتِ خلفائے راشدین اور خلفائے بنوامیہ کے حالات کا ہم نے اس حد تک مطالعہ کرلیا ہے جو ہماری رہنمائی، عبرت اور عام معلومات کے لیے کافی ہو۔تاہم یہ ذہن میں رہے کہ اُمت کی تاریخ محض حکمرانوں کے حالات کا نام نہیں۔ بلکہ یہ ان سب افراد کے کارناموں کا مرقع ہے جن کی مساعی سے اُمت مسلمہ کسی بھی شعبے میں بہرہ مند ہوئی۔

پس جہاں تاریخ میں حکام کے حالات اور سیاسی انقلابات کا ذکر ضروری ہے وہیں ان دیگر محسن شخصیات کی جدوجہد اور مساعی کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے جنھوں نے سیاست سے ہٹ کر دعوتِ دین، علم، تزکیہ واصلاح اور دیگر شعبوں میں امت کو فائدہ پہنچایا اور اس کی تعمیر وترقی اور نشوونما کے لیے اپنی زندگیاں وقف کیں۔ دراصل ہمارا ہدف یہ ہے کہ تاریخ کا ہر وہ گوشہ قارئین کے سامنے لائیں جس سے انہیں فکری ونظریاتی، سیاسی اور اخلاقی لحاظ سے کوئی روشنی ملنے کا امکان ہو۔ چاہے اس کا تعلق حکمرانوں کے حالات سے ہو یا دوسرے مشاہیر سے۔ جو مواد اس مقصد سے غیر متعلق ہو، چاہے وہ تاریخی ریکارڈ میں محفوظ ہو، ہم اسے نقل کرنا لایعنی سمجھتے ہیں۔ ہم ان شاء اللہ تاریخ کے ہر حصے کے اختتام میں اس دور کی منتخب شخصیات کا تذکرہ پیش کریں گے جن کے کارناموں پر مسلمانوں کو فخر رہے گا۔

❖❖❖

آخری دین ہونے کے باعث اسلام کا زمانہ تاقیامت اور دائرہ کار تمام قوموں اور اقالیم کو محیط ہے؛ اس لیے نظریاتی، معاشرتی، سیاسی، تہذیبی اور اخلاقی تغیرات کی ہولناک لہروں کا جتنا سامنا اسلام کو کرنا پڑا، کسی دوسری اُمت کی سرگزشت یا کسی اور قوم کی تاریخ میں اس کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ پس اللہ نے اس دینِ مبین کو ایسی توانائی بخش دی کہ یہ ہر طوفان کا سامنا کر سکے اور ہر سیلابِ بلا سے بسلامت گزر جائے۔ زمانے کے تغیرات اور منفی انقلابات کے مقابلے میں اس دین کو مستحکم رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور پر تین انتظامات فرمادیے:

پہلا یہ کہ دینِ اسلام کے متن قرآن مجید کو کسی بھی قسم کی کمی بیشی سے بالکل محفوظ فرمادیا۔

دوسرا یہ کہ حضور ﷺ کی سنت کے ذریعے اسلام کی کامل تشریحات مہیا فرمادیں اور شریعت کو صحابہ کی زندگیوں میں عملاً سمو کر اتنا نکھار دیا کہ دین اپنی تمام تر تفاصیل کے ساتھ محفوظ ہوگیا اور اس میں کسی شبہے کی گنجائش نہ رہی۔

مشیتِ الٰہیہ نے تیسرا انتظام یہ کیا کہ اس امت کو تاریخ کے ہر موڑ، معاشرے کے ہر انقلاب اور گردشِ ایام کے ہر

مرحلے پر ایسے رجالِ کار مہیا فرمادیے جو اسلام کی خالص اور اصل تعلیمات کو انسانی زندگیوں میں اتارتے رہے، پس ہزار ہا مخالفانہ کوششوں کے باوجود ان نفوسِ قدسیہ کے دم سے یہ دین اپنی اصل صورت میں تروتازہ چلا آرہا ہے۔

امت مسلمہ میں ایسی شخصیات کا وجود، دراصل اللہ کی تکوینی حکمت کا تقاضا اور اسلام کا زندہ کرشمہ ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام اللہ کا آخری دین ہے، جو زندگی کے ہر شعبے میں بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ اللہ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہوئے اس میں زمان ومکان کی ہر تبدیلی، معاشرے کے لاکھوں تغیرات اور مخالف حالات کے ان گنت تھپیڑوں کو برداشت کرکے زندہ رہنے اور قوموں کو پائندہ وتابندہ رکھنے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھ دی ہے۔

اگر دیگر مذاہب کی تاریخ پر غور کیا جائے تو ان کے بگاڑ کی سب سے بڑی وجہ یہی دکھائی دیتی ہے کہ وہاں مصلحین اور مجددین کی حد درجہ کمی تھی۔ مسیحیت جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے توحید کا پیغام پیش کیا تھا، سینٹ پال (پولس) کی تجدید کے روپ میں تحریف کے بعد اپنی روح اور حقیقت بالکل کھو بیٹھی اور تثلیث کا عقیدہ اپنا کر شرک کا گورکھ دھندا بن گئی۔ یہی داستان یہودیت اور دیگر مذاہب کی ہے کہ ان کی اصلاح کا دعویٰ کرنے والوں نے انہیں مزید بگاڑ دیا۔

اُمتِ مسلمہ کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اسے ہر دور میں دین کے ایسے محافظ میسر رہے، جنہوں نے دین میں تحریف کی ہر کوشش کو ناکام بنایا اور اسلامی معاشرے کا قبلہ درست رکھنے کا فریضہ انجام دیا۔ پس اسلام کی تاریخ میں کبھی ایسا وقت نہیں آیا جب مسلمان ایک امت کی حیثیت سے گمراہ ہوگئے ہوں۔ کوئی ایسا زمانہ نہیں گزرا کہ ان کے سوادِ اعظم نے اسلام کے نام پر کسی اور مذہب کی پیروی شروع کردی ہو اور ہر طرف گمراہی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا ہو۔

پہلی صدی ہجری میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت تک مسلمانوں کی سیاسی، روحانی اور علمی قیادت صحابہ کرام کے پاس تھی۔ ان اکابر صحابہ کے حالات تاریخ امت کے حصہ اوّل اور حصہ دوم میں خاصی وضاحت سے ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ اس کے بعد جب خلفائے اسلام نے اپنی سیاسی مصلحتوں کے تحت اسلامی اصولوں کی پوری طرح پاسداری چھوڑ دی تو مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر نے نظریاتی، علمی اور روحانی رہنمائی کے لیے ان نیک اور پاکباز ہستیوں کی طرف رخ کیا جنہیں ''تابعینِ کرام'' کہا جاتا ہے۔

دینی اور سیاسی قیادت کی تقسیم:

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت اور بنو مروان کی قیادت کے ساتھ اُمت کی تاریخ میں جو سب سے بڑی تبدیلی آئی، وہ یہ تھی کہ امت کی دینی اور سیاسی قیادت دو الگ الگ حصوں میں تقسیم ہونا شروع ہوگئی۔ اور چند برسوں میں یہ فاصلے ایک ایسی خلیج میں تبدیل ہوگئے جو صدیوں بعد بھی پُر نہ ہوئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے لے کر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ تک جتنے بھی صحابہ کو حکومت ملی، ان سب کو اپنے دور اور بعد میں بھی دینی پیشوا تسلیم کیا جاتا رہا۔ جہاں سیاسی طور پر ان کے احکام نافذ ہوتے تھے وہاں روایتِ حدیث اور دینی فتاویٰ میں بھی ان کو ایک مستند حیثیت حاصل رہی۔

درحقیقت اسلامی خلافت کے مقاصد میں دینی رہنمائی ایک بنیادی ہدف کی حیثیت رکھتی ہے اور خلفاء سیاسی و

انتظامی امور انجام دینے کے ساتھ ساتھ دینی معاملات میں بھی اُمت کے لیے حجت اور دلیل کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسلامی خلیفہ کا کام صرف یہ نہیں تھا کہ وہ پیداوار سے محصولات وصول کرے، گورنروں کا عزل ونصب طے کرے اور سرحدوں کی حفاظت کرے۔ یہ امور تو غیر مسلم حکمران بھی انجام دیا کرتے ہیں۔ اسلامی خلفاء کی امتیازی خوبی یہ تھی کہ وہ ان معاملات کے ساتھ ساتھ اصلاحِ عقائد، احکام شریعت کے نفاذ، اسلام کی نشر واشاعت اور اخلاقی تربیت میں بھی رعایا کے لیے ایک نمونہ ہوا کرتے تھے۔ لوگ دنیاوی امور کی طرح دینی معاملات بھی ان کی رہبری میں انجام دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات خلفائے راشدین، حضرت حسن، حضرت معاویہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے اقوال وافعال اور فیصلوں کو بعد کے تمام ادوار میں فقہی مستدلات کی حیثیت دی گئی۔ مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ دینی رہنمائی کا سلسلہ بہت جلد حکمرانوں کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔

یہ درست ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مقابل آنے والے مروان بن الحکم اور عبدالملک بن مروان بھی اچھی علمی قابلیت رکھتے تھے مگر انہیں قابلِ رشک اسلامی رہنماؤں میں شمار نہیں کیا گیا۔ بنو مروان میں فقط عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ واحد مثال ہیں جن کے فتاویٰ پر اعتماد کیا گیا۔ ان کے بعد ہمیں صدیوں تک کوئی ایسا خلیفہ نہیں دکھائی دیتا جسے دینی رہنمائی میں اُمت کا بھروسہ نصیب ہوا ہو۔ اگرچہ بنو عباس کے دورِ زوال تک خلفاء میں روایتِ حدیث کا ذوق موجود تھا اور بعض خلفاء سے بعض محدثین نے اِکا دُکا روایات نقل بھی کی ہیں مگر جمہور علماء نے کسی کو دینی پیشوا کی حیثیت نہیں دی۔ ظاہر ہے اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ یہ خلفاء علمِ دین سے بے بہرہ تھے۔ بلکہ اس دور میں ہر حکمران اپنی اولاد کو علومِ دینیہ سے آراستہ کرنے کی کوشش کرتا تھا؛ اس لیے چند ایک کو چھوڑ کر سبھی عالم فاضل تھے۔ عمل کے لحاظ سے بھی تقریباً سبھی صوم وصلوٰۃ کے پابند اور اسلامی وضع قطع کے حامل تھے۔ پھر بھی امت کے اجتماعی ضمیر نے ان کو وہ حیثیت نہیں دی جو حضرات خلفائے راشدین، حضرت حسن، حضرت معاویہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کو نصیب تھی۔ آخر کیوں؟

ذرا سا غور کرنے سے یہ واضح ہو جائے گا کہ بعد کے بیشتر حکمران ذاتی طور پر علم وفضل سے آراستہ ہونے اور اعمالِ صالحہ کی پابندی کے باوجود، سیاسی ضروریات کے سامنے دینی مصالح کو قربان کرنے کے مرتکب رہے تھے۔ چاہے یہ غلطی سب حکمرانوں نے نہ کی ہو اور کرنے والوں نے چند ایک بار ہی کی ہو، مگر اس قسم کے واقعات سے حکومت اور حکمرانوں کی امانت ودیانت پر ایسے دھبے لگ گئے کہ مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر دینی رہنمائی لینے میں ان سے مطمئن نہ رہا۔ عباسی خلفاء میں منصور بہت بڑا فقیہ اور حافظِ حدیث تھا، اس کا بیٹا مہدی علم وفضل، عدل وانصاف اور امانت ودیانت میں معروف تھا مگر حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے مہدی یا اس کے باپ سے احکام کے بارے میں استدلال کیا ہو۔“[1]

پس یہ صورتحال پیدا ہو جانے پر امتِ مسلمہ کے اجتماعی شعور نے دینی نظام کو سنبھالنے کے لیے ایک نئی شکل اختیار

[1] "ما علمتُ احدا احتجَّ بالمهدی و لا بابیه فی الاحکام." (تاریخ اسلام للذهبی: ۱۰/۴۳۶، ت تدمری)

کرلی۔ وہ یہ کہ سیاسی معاملات حکمرانوں کے ہاتھ میں رہنے دیے جائیں اور دینی معاملات میں فقط ان علمائے راسخین سے رہنمائی لی جائے جن کی امانت و دیانت پر کسی حرف گیری کی گنجائش نہیں اور جن کا دامن ہر لحاظ سے بے داغ ہے۔

سیاسی قیادت کے بارے میں امت کا موقف:

سیاسی قیادت حکمرانوں کے سپرد رہنے کا مطلب یہ تھا کہ اس زمینی حقیقت کو تسلیم کرلیا گیا کہ حکمرانوں نے حکومت کو بزورِ شمشیر حاصل کرلیا ہے۔ چونکہ نئے سیاسی نظام میں سیاست کا سرچشمہ عسکری طاقت ہی تھی؛ اس لیے یہ بھی طے تھا کہ طاقت کے بغیر حکومت گرانا، بنانا اور چلانا ممکن نہیں۔ رعایا جس میں عوام وخواص سب شامل تھے، اس طاقت سے محروم تھی؛ اس لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ نئے حکمرانوں کو حکمران مانا جائے اور ان سے بیعت کرلی جائے۔ در حقیقت طاقت کے بل پر برسرِ اقتدار آنے والے حکمران بے دین نہ تھے کہ ان کے خلاف بغاوت لازم ہوتی۔ ملک کی عدالتوں میں انہوں نے کسی کفریہ قانون کو نافذ نہیں کیا تھا۔ عدالتوں میں قاضی مقرر تھے جو لوگوں کے تنازعات شریعت کی روشنی میں حل کرتے تھے۔ ذاتی طور پر بھی ان میں سے اکثر دین دار تھے۔ کمی اگر تھی تو یہ کہ ان کی سیاست دینی حدود کی پابند نہیں رہتی تھی۔ یہ غلطی بنوامیہ کے اکثر حکمران بھی کرتے رہے اور بنوعباس بھی۔ اگر اُمت نے ان کی حکومت کو قبول کیا تو اس لیے نہیں کہ یہ حکومت خلافتِ راشدہ کی طرح مثالی تھی بلکہ اس لیے کہ قوم کم از کم خانہ جنگی اور فتنہ وفساد سے محفوظ رہے، عدالتیں کھلی رہیں، جمعہ، عید اور حج کے اجتماعات کسی اختلاف کے بغیر انجام پاتے رہیں، سرحدیں محفوظ ہوں اور کفار سے جہاد ممکن رہے۔

پس ہم عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو اگر عبدالملک بن مروان کی بیعت کرتا دیکھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ان کی حکمرانی کو مثالی حکومت سمجھتے تھے بلکہ درحقیقت ان حضرات نے اس زمینی حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ اُمت کی زمامِ سیاست اب انہی لوگوں کے پاس ہے اور ان سے بیعت کر کے ہی امت کے اتحاد و اتفاق اور ملکی امن وامان کو بچایا جاسکتا ہے۔

دینی قیادت کے بارے میں امت کا موقف:

سیاست سے ہٹ کر باقی معاملات کے بارے میں امت کی رائے عامہ کا فیصلہ یہ تھا کہ اس بارے میں حکمرانوں سے رہنمائی نہیں لی جائے گی بلکہ ان اہلِ علم کی طرف رجوع کیا جائے گا جن کی امانت و دیانت شک وشبے سے بالاتر ہے اور جن کی گفتار و کردار میں کوئی تضاد نہیں۔ دینی قیادت کے یہ محور الگ الگ علاقوں کے برگزیدہ اہلِ علم تھے۔ پہلی صدی ہجری کے اواخر تک ان میں عبداللہ بن عمر اور انس بن مالک رضی اللہ عنہما جیسے چند طویل العمر صحابہ اور متعدد کبار تابعین بھی شامل تھے۔ بعد میں یہ منصب تابعین سے ائمہ مجتہدین کو منتقل ہوگیا۔

دینی رہنمائی کے ان مراکز میں بظاہر کوئی وحدت نہ تھی بلکہ سب اپنے اپنے طور پر الگ الگ کام کر رہے تھے اور بسا اوقات دلائل کی روشنی میں ایک علمی حلقے کے فتاویٰ دوسرے سے مختلف بھی ہوتے تھے۔ تاہم چونکہ ان سب ابحاث

میں دلائل کا منبع قرآن وسنت ہی تھے؛اس لیے فروعی اختلافات کے باوجود اصولی طور پر تمام علمی حلقے اوران سے وابستہ لوگ ایک ہی دین پر کار بند رہے اور یوں امت کا سوادِ اعظم اصولِ دین کے اعتبار سے ہر جگہ اور ہر زمانے میں متحد رہا۔ گمراہ فرقوں کو چھوڑ کر عالم اسلام کے تمام خطوں میں مسلمان ایک عقیدے اور ایک نظریے پر قائم رہے اور آج تک چلے آرہے ہیں۔ ان کی دینی قیادت بھی آج تک علماء وفقہاء ہی کرتے آرہے ہیں۔

اس کے برعکس سیاسی قیادت دوسری صدی ہجری ہی میں اختلافات کا شکار ہوگئی۔ بنوامیہ کو ہٹا کر بنوعباس برسر اقتدار آئے مگر اندلس بدستور امویوں کے ہاتھوں میں رہا۔ چوتھی صدی ہجری میں بنوعباس کے زوال کے بعد جگہ جگہ صوبے داروں نے خودمختار سلاطین کی حیثیت اختیار کرلی اور پھر صدیوں تک وہی امت کے سیاہ وسپید کے مالک رہے۔ عباسی خلفاء کی حیثیت بس اتنی رہ گئی کہ جمعے اور عید کے خطبے میں ان کا نام لیا جاتا تھا اور سلاطین کی تخت نشینی کے وقت خلیفہ کی طرف سے انہیں سندِ حکومت دی جاتی تھی۔

حکمرانوں کا دینی قیادت کے ساتھ طرزِ عمل:

رہی یہ بات کہ سیاسی قیادت کا دین اور دینی قیادت کے ساتھ معاملہ کیا رہا تو اس بارے میں حکمرانوں کا طرزِ عمل اپنے اپنے زمانے یا فکر ونظر کے لحاظ سے الگ الگ رہا۔ بہت سے خلفاء وسلاطین ذاتی زندگیوں میں دینی اقدار کی پابندی کرنے کے ساتھ ساتھ ملکی انتظامات میں بھی دین پروری کا ثبوت دیتے تھے، شعائرِ اسلامیہ کا خیال رکھتے تھے، نمازیں باجماعت پڑھتے بلکہ پڑھاتے تھے، جمعہ، عیدین اور حج کی قیادت کرتے تھے۔ ان میں سے بعض کا کردار جہاد فی سبیل اللہ کے حوالے سے بھی شاندار رہا۔ اکثر حکمران علم کی اشاعت، مساجد کی تعمیر اور علمائے دین کے اعزاز واکرام کے خوگر تھے۔ علماء وطلبہ اور دینی خدمات میں لگنے والوں کے لیے وظائف جاری کرتے تھے۔ بزرگانِ دین کو بیش قیمت ہدایا بھیجتے اور اسے اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ شاید ہی کوئی حکمران ایسا ہو جس کے دربار میں کئی کئی علماء وفقہاء نہ ہوں۔ بیشتر حکام تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف اور افتاء وغیرہ کی خدمات کو عام کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے اور ایسی بہت سی خدمات میں ان کا معقول حصہ تھا۔

تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ دینی قیادت کے ذمہ دار بزرگ بلاضرورتِ شدیدہ حکمرانوں کی قربت اختیار کرنے اور ان سے تعاون لینے سے گریز کرتے رہے۔ ان کی اکثریت خود کفالتی کی زندگی گزارتی رہی۔ انہوں نے حکام کے تعاون کے مواقع پر غیر معمولی استغناء کا مظاہرہ کیا اور سرکاری سرپرستی سے آزاد رہ کر دینی خدمات انجام دیں تاکہ ان کی غیر جانبداری اُمت کے نزدیک شک وشبہے سے بالاتر رہے اور ان پر کسی کی اغراض کی خاطر دین کو بدلنے کی تہمت نہ لگائی جاسکے۔ دوسری صدی ہجری میں اقتدار بنوعباس کو منتقل ہونے کے باوجود ملوکیت کا دور جاری رہا بلکہ پہلے سے زیادہ مستحکم ہوگیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب محدثین نے راویوں کی چھان بین اور تحقیق شروع کی اور اس معاملے میں حد درجے باریک بینی، احتیاط اور غیر جانبداری سے کام لے کر علمِ رجال کو علومِ اسلامیہ کا ایسا سرمایہ بنادیا جس کی نظیر دنیا

کی کسی قوم میں نہیں۔اس ذمہ داری کو ادا کرنے والے علماء اتنے با کردار تھے کہ سچائی نہیں چھپاتے تھے چاہے انہیں منہ مانگی دولت پیش کی جاتی۔عفان بن مسلم رحمہ اللہ بصرہ کے ثقہ محدث تھے۔انہیں کسی نے دس ہزار دینار پیش کیے کہ وہ ایک شخص کو عادل (معتبر) یا غیر عادل کچھ بھی نہ کہیں۔دوسرے لوگوں نے بھی انہیں مشورہ دیا کہ آپ اس بارے میں سکوت اختیار کریں اور اس شخص کے متعلق کچھ نہ فرمائیں۔مگر انہوں نے فرمایا:''میں حق بات کو چھپا نہیں سکتا۔''[1]

حدیہ تھی کہ راویوں میں عابد و زاہد لوگ بھی تھے اور مروان، منصور اور حجاج بن یوسف جیسے خلفاء و امراء بھی۔مگر محدثین نے نہایت بے باکی کے ساتھ سب کا کچا چٹھا اُمت کے سامنے رکھ دیا اور انہیں وہی مقام دیا جو علمی کسوٹی پر انہیں ملنا چاہیے تھا۔امام وکیع رحمہ اللہ دوسری صدی ہجری کے عظیم محدث تھے۔ان کے والد عالم فاضل تھے مگر ساتھ ہی سرکاری خزانچی تھے۔اس بناء پر امام وکیع رحمہ اللہ جب ان کی روایت نقل کرتے تو تنہا ان کی روایت نہیں لاتے تھے بلکہ کسی اور محدث کی سند بھی تائیداً ساتھ ملا لیتے تھے۔یہ دینی امور کو سرکاری عہدوں کے منفی اثر سے بچانے کی انتہاء تھی۔[2]

اگر دینی قائدین کبھی حکمران کے قریب گئے یا بعض اوقات دینی اور قومی ضروریات کے تحت انہوں نے عدلیہ اور دربار میں اہم عہدے قبول کیے بھی تو دینی مصلحتوں کے مقابلے میں حکومتی اغراض کی کوئی پروا نہیں کی۔امت کے اجتماعی شعور نے انہی علمائے راسخین پر بھروسہ کیا جو درباروں سے الگ رہے یا حکام کی قربت کے باوجود دینی معاملات میں کسی سمجھوتے پر تیار نہیں ہوئے اور جس موقف کو حق سمجھا اس کی خاطر کوڑے بھی کھائے، قید و بند کی سختیاں بھی برداشت کیں مگر کبھی حکمرانوں سے سودے بازی پر تیار نہ ہوئے۔یہی علمائے حق کا فریضہ اور یہی کردار ان کے شایانِ شان تھا۔اس کے برخلاف اہلِ علم میں سے جنہوں نے سرکاری مفادات کے تحت دینی اقدار میں لچک دکھائی تو وہ اسی وقت اُمت کے اعتماد سے محروم ہوگئے۔بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اکثر حکام کے دلوں میں بھی انہی علماء کی زیادہ عزت تھی جو حکومتی تعاون سے مستغنی اور درباروں سے گریزاں رہتے تھے۔جو علماء ذاتی مفادات مثلاً بھاری تنخواہوں اور منصب و شہرت کے لیے حکمرانوں کے آلۂ کار بنتے تھے، ان کی عزت خود سرکاری حلقوں میں بھی کچھ نہیں رہتی تھی۔

ذیل میں ہم چند ایسے جلیل القدر تابعین کا ذکر کر رہے ہیں جنہوں نے دینی اور سیاسی قیادت کی تقسیم کے وقت دینی رہنمائی کے خلا کو پر کیا اور اپنی غیر معمولی طاقتِ ایمانی، علمی استعداد، قوتِ کلام اور اولوالعزمی سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کو صحیح نظریے اور صراطِ مستقیم پر برقرار رکھا اور انہیں اجتماعی طور پر اعتقادی خرابیوں کے بھنور میں پھنسنے اور مادہ پرستی کی دلدل میں دھنسنے سے بچائے رکھا۔ان میں سے اکثر وہ تھے جو سرکاری مناصب سے مکمل طور پر احتراز کرتے رہے تاہم بعض مثالیں سرکاری عہدوں پر رہ کر خدمتِ دین کرنے کی بھی موجود ہیں کہ اس کا جواز موجود تھا۔

---

[1] الثقات للعجلی: ۲/۱۴۰، ط الدار

[2] تهذيب التهذيب: ۱۱/۱۳۰

حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ

سعید بن مسیب رحمہ اللہ عالمِ اسلام کی وہ مایہ ناز ہستی ہیں جنہیں "سید التابعین" (تابعین کا سردار) کہا جاتا ہے۔ ان کی ذات علم وعمل، اہتمام شریعت و پابندئ سنت، جرأت وصداقت، حق گوئی و بے باکی اور اخلاق وآداب کا ایسا گلدستہ تھی جس کی خوشبو آج تک مہک رہی ہے۔

ولادت...... تحصیل علم:

ان کی ولادت ۱۵ھ میں مدینہ منورہ میں ہوئی۔ عمر بھر دیارِ رسول ہی میں رہے۔ یہاں حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ام سلمہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمرو، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہم جیسے اکابر صحابہ کی صحبت اٹھائی اور ان سے علومِ نبوت کو جمع کیا۔

وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے داماد تھے۔ اس خصوصی رشتے کی وجہ سے ان سے غیر معمولی قرب رہا۔ کہا جاتا ہے کہ ان سے بڑھ کر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے علوم کسی نے حاصل نہیں کیے۔[1]

مدینہ کے مفتی:

سعید بن مسیب رحمہ اللہ مدینہ منورہ کے مفتی شمار ہوتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم کے عدالتی فیصلوں کا علم ان سے بڑھ کر کسی کو نہ تھا۔[2]

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مدینہ کے حاکم بنے تو ان سے رائے لیے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتے تھے۔ دیگر علماء عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے پاس آتے تھے مگر سعید بن میسّب رحمہ اللہ کے پاس یہ خود حاضر ہوتے تھے۔ ایک بار کوئی مسئلہ پوچھنے کی ضرورت پڑی تو خادم کو ان کے پاس بھیجا۔ وہ انہیں بلا لایا۔

انہیں دیکھ کر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نادم ہو گئے اور بولے:

"خادم کو غلط فہمی ہو گئی۔ میرا مطلب یہ تھا کہ وہ آپ سے آپ کی مجلس میں مسئلہ پوچھ لیتا۔"[3]

---

① سير اعلام النبلاء: ٤/٢١٨، ٢١٩

② طبقات ابن سعد: ٥/١٢٠، ط. صادر

③ سير اعلام النبلاء: ٤/٢٢٤، ٢٢٥

حافظے کا کمال اور تواضع کی انتہاء:

حافظے کا یہ عالم تھا کہ جو بات ایک بار سن یا دیکھ لیتے، سالہا سال بعد بھی وہ من وعن یاد ہوتی۔ اس علم وفضل کے باجود تواضع اور انکساری کا یہ حال تھا کہ ان کے ہم نشینوں کے بقول وہ خود کو اللہ کی بارگاہ میں ایک مکھی سے بھی زیادہ حقیر تصور کرتے تھے۔[1]

حکام سے استغناء:

سعید بن مسیّب رحمہ اللہ کی طبیعت میں استغناء، خودداری اور امراء وحکام سے بے نیازی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ دیگر اہلِ علم وفضل کی طرح بیت المال سے آپ کا وظیفہ بھی جاری تھا مگر آپ نے کبھی وصول نہیں کیا۔ جب کہا جاتا کہ آکر اپنا حق وصول کرلیں تو بڑی بے نیازی سے فرماتے: ''مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔''[2]

وقعہ حرہ:

آپ نے خلفائے راشدین کے سنہرے دور سے لے کر یزید اور عبدالملک جیسے حکمرانوں کا زمانہ بھی دیکھا۔ آپ کی زندگی کا سب سے المناک تجربہ وقعہ حرہ تھا جو یزید کے دور میں رونما ہوا۔ شامی امیر مسلم بن عقبہ نے اس مہم میں نہ صرف میدانِ جنگ میں بلکہ شہر کے اندر بھی لوگوں کو قتل کیا۔ اس کے بعد کتنے ہی شرفاء کو گرفتار کر کے توہین آمیز الفاظ پر بیعت لینے کی کوشش کی اور انکار کی صورت میں انہیں قتل کرادیا۔ انہی گرفتار شدگان میں سعید بن مسیّب رحمہ اللہ بھی شامل تھے حالانکہ وہ جنگ میں شریک نہ تھے مگر مسلم بن عقبہ انہیں بھی قتل کرنے پر تل گیا۔ لوگوں نے یہ کہہ کر ان کی جان بخشی کرائی کہ یہ ایک مجنون شخص ہے۔[3]

اس قسم کے واقعات کے باعث سعید بن مسیّب رحمہ اللہ حکام سے اس قدر بددل ہوئے کہ عمر بھر کے لیے ان سے لاتعلقی اختیار کرلی۔ اگرچہ بعد میں آنے والے بیشتر خلفاء اور حکام آپ کی بہت عزت کرتے تھے مگر آپ نے کبھی انہیں قابلِ التفات نہ سمجھا اور ان کی حمایت یا حاشیہ برداری تو دور کنار، کبھی ان کے پاس بیٹھنا بھی گوارا نہ کیا۔

عبدالملک اور سعید بن مسیّب:

عبدالملک بن مروان ۷۵ھ میں حج کے موقع پر مدینہ آیا۔[4] ایک دن دوپہر کو سستا رہا تھا کہ کچھ آوازوں سے اس کے آرام میں خلل پڑا۔ اس نے خادم کو کہا: ''دیکھو مسجد میں ہمارا کوئی نیا واعظ آیا ہے۔'' خادم نے جا کر دیکھا بھالا تو مسجد نبوی میں سعید بن مسیّب رحمہ اللہ اپنے حلقے میں درس دے رہے تھے۔ خادم نے حلقے کے قریب جا کر انہیں انگلی سے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور واپس چل دیا۔ کچھ دور جا کر جب دیکھا کہ سعید رحمہ اللہ اس کے پیچھے نہیں آرہے تو واپس پلٹا۔ دیکھا وہ اسی طرح درس دے رہے ہیں۔ خادم نے قریب جا کر سرگوشی میں کہا: ''آپ نے دیکھا نہیں میں آپ

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۴/۲۲۴، ۲۲۵
[2] سیر اعلام النبلاء: ۴/۲۲۶
[3] تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۳۹ بسند صحیح ؛ تذکرۃ الحفاظ للذھبی: ۱/۴۵
[4] تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۷۲

کو اشارہ کر رہا تھا۔"

سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے دریافت فرمایا: "کیا کام ہے؟" خادم بولا: "امیر المؤمنین بلا رہے ہیں۔"

سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے پوچھا: "کیا میرا نام لے کر بلوایا ہے؟"

خادم نے کہا: "نہیں، انہوں نے یہ کہا تھا کہ دیکھو مسجد میں ہمارا کوئی نیا واعظ ہے۔ مجھے یہاں آپ کے سوا ایسا کوئی دکھائی نہیں دیا۔" آپ نے لاپرواہی سے فرمایا: "جا کر امیر المؤمنین کو بتا دو کہ میں ان کے واعظوں میں سے نہیں۔"

خادم سخت جز بز ہو کر یہ بڑبڑاتے ہوئے واپس ہو گیا کہ مجھے تو یہ بوڑھا پاگل معلوم ہوتا ہے۔

اس نے عبدالملک کو جا کر یہ ماجرا سنایا تو وہ بولا: "یہ سعید بن مسیب ہی ہو سکتے ہیں۔ انہیں رہنے دو۔"[1]

عبدالملک بہر حال ان سے ملنا چاہتا تھا؛ اس لیے مدینہ سے رخصت ہوتے ہوئے مسجد نبوی کے دروازے پر آیا اور ہرکارے کو کہا: "سعید کو بلا لاؤ، مگر انہیں تنگ نہ کرنا۔"

اس نے جا کر کہا: "امیر المؤمنین مسجد کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

آپ نے فرمایا: "نہ امیر المؤمنین کو میری ضرورت ہے نہ مجھے اس کی۔ اگر اسے مجھ سے کوئی کام ہے بھی تو وہ پورا نہیں کیا جائے گا۔" ہرکارے نے عبدالملک کو یہ جواب پہنچایا، اس نے کہا: "دوبارہ جاؤ۔ انہیں ستانا نہیں، کہنا کہ امیر المؤمنین صرف بات کرنا چاہتے ہیں۔"

ہرکارے نے جا کر یہ بات کہی۔ سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے پھر یہی جواب دیا۔ ہرکارے کو طیش آ گیا۔ بولا: "اگر امیر المؤمنین کی طرف سے ہاتھ روکنے کا پیشگی حکم نہ دیا جاتا تو میں اس بار تمہارا سر کاٹ کر لے جاتا۔ امیر المؤمنین تم سے بات کرنا چاہتے ہیں اور تم آگے سے ایسا جواب دیتے ہو۔"

سعید بن مسیب رحمہ اللہ اس وقت چادر لپیٹے، اکڑوں بیٹھے تھے۔ اسی بے نیازی سے بولے:

"اگر امیر المؤمنین نے میرے ساتھ بھلائی کرنا چاہی ہے تو وہ تمہاری قسمت، اور اگر وہ کچھ اور سلوک کرنا چاہیں تو اللہ کی قسم! میں بھی اپنی نشست اس وقت تک نہ بدلوں گا، وہ جو کرنا چاہیں کر لیں۔"

ہرکارے نے جا کر عبدالملک کو یہ جواب دیا تو اس نے بے ساختہ کہا:

"اللہ ان پر رحم کرے۔ انہوں نے استقامت ہی اختیار کی۔"[2]

سرکاری عتاب کا سامنا:

سعید بن مسیب رحمہ اللہ اپنے بے لچک رویے کی وجہ سے بعض حکام کے مظالم کا نشانہ بھی بنے۔ اگرچہ اس بارے میں بیشتر روایات جو واقدی وغیرہ سے منقول ہیں، کسی قدر مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہیں۔ مگر صحیح سند سے اتنا ثابت ہے کہ

---

① سیر اعلام النبلاء: ٤/٢٢٦

② طبقات ابن سعد: ٥/١٢٩

مدینہ میں بنو مروان کے گورنر ہشام بن اسماعیل نے آپ کو ایک سو کوڑے لگائے تھے۔[1]

یہ سزا اس لیے دی گئی کہ عبدالملک بن مروان نے ۸۴ھ میں اپنے بیٹوں: ولید اور سلیمان کے لیے ولی عہدی کی بیعت لینا چاہی تھی مگر سعید بن مسیب رحمہ اللہ کا کہنا تھا کہ میں تا قیامت بیک وقت دو افراد کی بیعت نہیں کر سکتا۔ یعنی ان کے نزدیک خلیفہ کی زندگی میں ولی عہد کی بیعت لینا جائز نہ تھا۔[2] غالباً ان کے سامنے وہ حدیث تھی جس میں بیک وقت دو حکمرانوں کی بیعت سے منع کیا گیا ہے۔[3]

جب خبر مشہور ہوئی کہ ولی عہدی کی بیعت لی جانے والی ہے تو سعید بن مسیب رحمہ اللہ کے دوستوں کو فکر ہوئی کہ یہ اپنے بے لچک موقف کی وجہ سے عتاب شاہی کی زد میں آ کر رہیں گے۔ لہٰذا ایک دوست نے انہیں کہا:

''آپ کہیں اور چلے جائیں؛ کیوں کہ یہاں آپ گورنر ہشام بن اسماعیل کی نگاہوں میں ہیں۔''

وہ بولے: ''میں اس شہر کو نہیں چھوڑ سکتا جہاں چالیس برسوں سے ہوں۔''

دوست نے کہا: ''تو پھر عمرہ کرنے چلے جائیں۔''

سعید رحمہ اللہ بولے: ''کیا میں اپنا پیسہ ایسی چیز میں خرچ کروں اور اپنے بدن کو ایسی محنت میں تھکاؤں جس میں حسنِ نیت نہ ہو۔'' (یعنی عمرہ کرنا ہو تو خالص عبادت کے لیے جانا چاہیے نہ کہ کسی مصیبت سے بھاگنے کے لیے۔)

دوست نے کہا: ''تو پھر بیعت ہی کر لیں۔''

سعید رحمہ اللہ نے کہا: ''اگر تمہارا دل اندھا ہو چکا ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔''

آخر ہشام بن اسماعیل نے ولی عہدی کی بیعت لینے کے لیے لوگوں کو جمع کیا۔ سعید بن مسیب نے بیعت سے انکار کر دیا۔[4] جب گورنر نے زیادہ زور دیا تو آپ نے فرمایا:

''اگر عبدالملک چاہتا ہے کہ میں ولید کی بیعت کروں تو وہ خود استعفیٰ دے دے۔''

---

① حلیۃ الاولیاء: ۲/ ۱۷۰، بسند متصل صحیح

احوال الرواۃ: ابونعیم (۳۳۶ھ تا ۴۳۰ھ) ..... ثقہ اور علامہ ہیں۔ ﴿سیر اعلام النبلاء: ۱۷/ ۴۶۲﴾

ابوبکر بن مالک القطیعی (م ۳۶۸ھ) صدوق ہیں۔ ﴿طبقات الحنابلۃ لابن ابی یعلیٰ: ۲/ ۴﴾

عبداللہ بن احمد بن حنبل ثقہ۔ ﴿تقریب التہذیب، تر: ۳۲۰۵﴾

شیبان بن فروخ صدوق وہمی، مسلم کے راوی۔ ﴿تقریب التہذیب، تر: ۲۸۳۴﴾

سلام بن مسکین ثقہ مگر متہم بالقدر بخاری و مسلم کے راوی۔ ﴿تقریب التہذیب، تر: ۲۷۱۰﴾

عمران بن عبداللہ الخزاعی صدوق بخاری کے راوی ہیں۔ ﴿تقریب التہذیب، تر: ۵۱۵۹﴾

② حلیۃ الاولیاء: ۲/ ۱۷۰، بسند متصل صحیح

③ حدیث میں ہے: عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم: اذا بویع لخلیفتین فاقتلوا الآخر منھما. (جب دو خلفاء سے بیعت لی جائے تو دوسرے کو قتل کر دو۔ ﴿مسلم، ح: ۴۹۰۵، کتاب الامارۃ﴾ تاہم اکثر صحابہ و تابعین کے نزدیک ولی عہد کی بیعت جائز تھی؛ کیوں کہ حدیث کا مطلب اس شخص کو قتل کرنا ہے جو ایک خلیفہ کی موجودگی میں خود خلافت کا مدعی بن جائے، اس حکم کا مقصد امت میں انتشار کو روکنا ہے۔ ولی عہد سے بیعت کرنے میں انتشار نہیں بلکہ اتحاد ہے۔

④ حلیۃ الاولیاء: ۲/ ۱۷۰، ۱۷۱

ہشام بن اسماعیل نے کہا: ''اچھا اتنا ہی کر لیں کہ لوگوں کے سامنے میرے پاس اس دروازے سے آئیں اور چپ چاپ دوسرے دروازے سے نکل جائیں تا کہ کم از کم باہر کھڑے لوگ یہ سمجھیں کہ آپ نے بیعت کر لی ہے۔''

آپ نے اس سے بھی انکار کر دیا اور فرمایا: ''میں اپنی وجہ سے کسی کو دھوکے میں نہیں ڈالوں گا۔''[1]

ہشام نے جھلا کر سزا کے طور پر انہیں کوڑے لگوائے۔ اس کے علاوہ ان کے حلقۂ درس پر پابندی عائد کر دی گئی۔[2]

عبدالملک کو اس کارروائی کا پتا چلا تو گورنر کو عتاب آمیز مکتوب بھیجا جس میں لکھا تھا:

''تمہیں چاہیے تھا کہ سعید بن مسیب کو زدوکوب کرنے کی بجائے ان سے مہربانی کا معاملہ کرتے۔ ہم جانتے ہیں ان سے مخالفت کا کوئی خطرہ نہیں۔''

عبدالملک نے ایک خط سعید بن مسیب رحمہ اللہ کو بھی لکھا جس میں اس کارروائی سے لاتعلقی کا اظہار کیا گیا تھا۔

سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے خط پڑھ کر کہا: ''میرے اور ظالموں کے مابین اللہ ہی فیصلہ کرے گا۔''[3]

یہ حضرت سعید رحمہ اللہ کی احتیاط تھی کہ حکام کی سختی کا نشانہ بن کر بھی کسی فرد یا خاندان کا نام لے کر بددعا نہیں کی۔ بعض رفقاء کہا کرتے کہ آپ بنوامیہ کے لیے بددعا کریں۔ مگر آپ صرف یہ دعا کرتے: ''الٰہی! اپنے دین کو عزت دے۔ اپنے نیک بندوں کو غالب فرما اور اپنے دشمنوں کو رسوا کر کے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو عافیت عطا کر۔''[4]

بیٹی کے لیے شہزادے کا رشتہ مسترد:

امراء وحکام سے بے نیازی کا یہ حال تھا کہ عبدالملک نے اپنے بیٹے کے لیے ان کی صاحبزادی کا رشتہ مانگا تھا۔ یہ لڑکی حسنِ سیرت وصورت، علمی وعملی کمالات اور شرافتِ نسب میں یکتا تھی۔ سعید بن مسیب رحمہ اللہ چاہتے تو رشتہ قبول کر کے حکمران کے سمدھی بن سکتے تھے مگر آپ نے بڑے استغناء کے ساتھ یہ رشتہ مسترد کر دیا۔ اس کی جگہ آپ نے ایک غریب عالم کثیر بن ابی وداعہ کو یہ رشتہ دیا جو بعد میں نامور محدث ہوئے۔ وہ یہ واقعہ خود اس طرح سناتے ہیں:

میری اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ میں اس وجہ سے کئی دن سعید بن مسیب رحمہ اللہ کی مجلس میں حاضر نہ ہو سکا۔ جب جانا ہوا تو انہوں نے غیر حاضری کی وجہ پوچھی، میں نے ماجرا سنایا تو بولے: ''مجھے خبر کر دی ہوتی۔ میں بھی جنازے میں آ جاتا۔'' پھر پوچھا: ''نکاح کے لیے کوئی اور خاتون تلاش کی؟''

میں نے کہا: ''میں غریب آدمی بس دو تین درہم کا مالک ہوں، بھلا کون رشتہ دے گا؟''

فرمایا: ''میں۔''

میں نے حیران ہو کر کہا: ''آپ رشتہ دیں گے؟''

وہ بولے: ''ہاں بالکل۔''

---

[1] تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۸۹، ۲۹۰

[2] حلیۃ الاولیاء: ۱۷۰/۲، ۱۷۱، ۱۷۲

[3] طبقات ابن سعد: ۱۲۵/۵، ۱۲۶

[4] طبقات ابن سعد: ۱۲۸/۵

پھر اسی مجلس میں اسی وقت میرا نکاح اپنی بیٹی سے پڑھا دیا۔ میں گھر آیا تو خوشی سے بے حال تھا مگر فکر تھی کہ گھر بسانے کے لیے اب کس سے قرض مانگوں؟ مغرب کی نماز پڑھ کر گھر لوٹا۔ دن کو روزہ رکھا تھا۔ رات کا کھانا جوزیتون کا تیل اور روٹی تھا، کھانے لگا۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔

پوچھا: ''کون ہے؟''

جواب ملا: ''سعید!''

میرا ذہن سعید نام کے ہر آدمی کی طرف گیا مگر یہ خیال نہ آیا کہ سعید بن مسیب ہوں گے؛ کیوں کہ چالیس سال سے وہ اپنے گھر سے مسجد کے سوا کہیں نہیں گئے تھے۔ دروازہ کھولا تو سعید بن مسیب رحمہ اللہ کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ عرض کیا: ''حضرت! آپ نے کیوں تکلیف کی؟ مجھے بلوا لیا ہوتا!!''

وہ بولے: ''نہیں! تمھارا حق تھا کہ میں تمھارے پاس آتا۔ تم تنہا آدمی تھے، اب شادی کر چکے ہو۔ مجھے اچھا نہ لگا کہ تم رات تنہا گزارو۔ یہ تمھاری اہلیہ میرے ساتھ آئی ہے۔''

میں نے دیکھا تو ان کی صاحبزادی چادر میں لپٹی کھڑی تھیں۔ سعید رحمہ اللہ نے بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر اسے دروازے سے اندر کیا اور کواڑ بند کر کے تشریف لے گئے۔ لڑکی شرم وحیا کی وجہ سے ایک طرف گر گئی۔ میں نے جلدی سے چراغ پر ایک پیالہ رکھ دیا تاکہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ پھر چھت پر چڑھ کر ہمسایوں کو آواز دی۔ وہ آئے اور پوچھنے لگے، کیا ہوا؟ میں نے ماجرا سنا دیا۔

اتنے میں میری والدہ بھی آ گئیں اور یہ قصہ سن کر بولیں: ''اگر لڑکی کو چھوا تو میں تمھارا منہ بھی نہ دیکھوں گی۔ میں تین دن میں اس کو تیار کر کے پھر تمھارے پاس بھیجوں گی۔''

تین دن بعد رخصتی ہوئی۔ میں نے لڑکی کو دیکھا تو نہایت حسین وجمیل، قرآن پاک کی حافظہ، سنت کی عالمہ اور شوہر کے حقوق کا پورا لحاظ کرنے والی تھی۔

ایک ماہ بعد میں سعید بن مسیب رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ سبق پڑھا رہے تھے، جب فارغ ہوئے اور سب لوگ چلے گئے تو پوچھنے لگے: ''اسے کیسا پایا؟''

میں نے کہا: ''ایسا بہترین کہ دوست کو خوشی ہو اور دشمن کا دل جلے۔''

بولے: ''اگر اس سے کوئی شکایت ہو تو لاٹھی سے خبر لینا۔''

میں گھر لوٹا تو سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے پیچھے سے بیس ہزار درہم کا ہدیہ بھیجا۔''[1]

اس واقعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک دنیاوی مال ومنصب کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ ورنہ کون ہوگا جو اپنی بیٹی کے لیے شہزادے کا رشتہ ٹھکرا کر ایک غریب عالم کو ترجیح دے۔

[1] حلیۃ الأولیاء: ۲/۱۶۷، ۱۶۸

ولید بن عبدالملک سے بے نیازی کا معاملہ:

ایک عبدالملک ہی نہیں ہر حاکم کے ساتھ ان کا رویہ اسی بے نیازی کا تھا۔ ولید بن عبدالملک خلیفہ بننے کے بعد مدینہ آیا تو دیکھا سعید رحمہ اللہ مسجد میں حلقے کے درمیان کھڑے احادیث کا درس دے رہے ہیں۔

ولید نے پوچھا: ''یہ کون صاحب ہیں؟''

کہا گیا: ''سعید بن مسیب''

ولید نے کچھ دیر انتظار کیا۔ جب سعید رحمہ اللہ درس دے کر بیٹھ گئے تو اس نے خادم کو بھیجا کہ انہیں بلا لاؤ۔

خادم نے جا کر یہ حکم سنایا تو سعید بن مسیب رحمہ اللہ بولے: ''تمہیں شاید نام میں مغالطہ ہو گیا ہے۔ خلیفہ نے کسی اور کو بلوایا ہوگا۔'' خادم نے واپس آکر یہ جواب سنایا تو ولید کو طیش آگیا اور انہیں سزا دینے کا ارادہ کیا مگر اس کے مشیروں نے کہا: ''امیر المؤمنین! یہ مدینہ کے مفتی، قریش کے سردار اور آپ کے والد کے دوست ہیں۔ اس سے پہلے بھی کسی حکمران نے توقع نہیں کی کہ یہ اس کے پاس حاضری دیں۔''

یہ سن کر ولید انہیں طلب کرنے کے ارادے سے باز آگیا۔ [1]

نماز درست کرانے پر حجاج بن یوسف شکر گزار:

حجاج بن یوسف کا ظلم و ستم مشہور ہے اور اکابر سے اس کی گستاخیوں کے واقعات صحیح روایات سے ثابت ہیں تاہم سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے وہ بھی متاثر تھا اور ان کا احترام کرتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حجاج کی نماز انہی کی تنبیہ کی وجہ سے درست ہوئی تھی۔ ایک بار خود کسی نے سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے پوچھا:

''حجاج آپ کو نہ اپنے پاس حاضر ہونے کا حکم دیتا ہے، نہ شہر بدر کرتا ہے، نہ تنگ کرتا ہے۔ یہ کیوں؟''

آپ نے فرمایا: ''مجھے اور تو کوئی وجہ معلوم نہیں۔ ہاں ایک بار وہ اپنے باپ کے ساتھ نماز پڑھنے آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ رکوع سجدہ ٹھیک سے نہیں کرتا۔ میں نے تنبیہ کے لیے کنکریوں کی مٹھی بھر کر اسے پھینک ماری۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد سے اس نے اپنی نماز درست کر لی۔'' [2]

آپ فرمایا کرتے تھے: ''جب بھی ظالموں کے حامیوں پر نگاہ پڑے تو (کم از کم) دل سے انہیں برا سمجھو۔ ورنہ خطرہ ہے کہ کہیں تمہارے اعمال سلب نہ ہو جائیں۔'' [3]

تعبیر میں مہارت:

آپ خوابوں کی تعبیر کے بہت بڑے ماہر تھے۔ یہ فن آپ نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے سیکھا تھا اور انہوں نے اپنے والد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے۔ ایک بار ایک شخص نے آکر کہا: ''میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں نے عبدالملک

---

① طبقات ابن سعد: ۱۳۰/۵
② طبقات ابن سعد: ۱۲۹/۵
③ سیر اعلام النبلاء: ۲۳۲/۴

بن مروان کو پچھاڑ دیا اور اسے اوندھا کر کے اس کی پشت میں چار میخیں گاڑ دی ہیں۔''
آپ نے فوراً کہا: ''یہ خواب تم نے نہیں دیکھا۔'' وہ بولا: ''میں نے ہی دیکھا ہے۔''
آپ نے فرمایا: ''جب تک مجھے خواب دیکھنے والے کا نام نہ بتاؤ گے، میں تعبیر نہیں دوں گا۔''
آخر اس شخص نے کہا: ''یہ خواب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے دیکھا ہے اور انہوں نے ہی مجھے بھیجا ہے۔''
آپ نے فرمایا: ''اس کی تعبیر یہ ہے کہ عبدالملک، ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو قتل کر دے گا۔ پھر عبدالملک کے چار بیٹے خلیفہ بنیں گے۔''[1]

ایک شخص نے خواب بتایا کہ میں سایے سے دھوپ میں چلا گیا ہوں۔ آپ نے فرمایا: ''اگر تیرا خواب سچا ہے تو تُو اسلام سے نکل جائے گا۔'' وہ بولا: ''دراصل میں نے یوں دیکھا ہے کہ مجھے سایے سے دھوپ میں بھیج دیا گیا ہے۔''
آپ نے فرمایا: ''تو تجھے کفر پر مجبور کیا جائے گا۔'' ایسا ہی ہوا۔ وہ شخص کسی لڑائی میں کفار کا قیدی بنا۔ اسے کافر بننے پر مجبور کیا گیا۔ بعد میں وہ رہائی پا کر واپس آیا اور لوگوں کو یہ ماجرا سنایا۔[2]
ایک شخص نے خواب دیکھا کہ وہ آگ میں گھس گیا ہے۔
آپ نے فرمایا: ''تم سمندر کا سفر کرو گے، پھر جلد مر جاؤ گے۔'' ایسا ہی ہوا۔[3]

تقویٰ، خود احتسابی اور خودداری:

نماز با جماعت کے سخت پابند تھے۔ چالیس سال تک کبھی نماز باجماعت فوت نہیں ہوئی۔ اکثر اذان سے پہلے ہی مسجد میں موجود ہوتے۔ ایک بار خود فرمایا:
''تیس سال سے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اذان سے پہلے میں مسجد میں نہ ہوں۔''[4]
خود احتسابی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۸۴ سال کی عمر میں بھی آپ اپنے نفس کے شر سے ڈرتے تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے: ''مجھے اپنے نفس پر سب سے زیادہ ڈر عورتوں کے فتنے میں پڑ جانے کا ہے۔''
کسی نے کہا: ''نہ تو آپ جیسے کو عورتوں کی طرف میلان ہوتا ہے، نہ عورتوں کو آپ جیسے شخص میں کوئی رغبت ہو سکتی ہے۔ پھر یہ ڈر کیسا؟''
آپ نے فرمایا: ''ہاں اس کے باوجود بات وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔''[5]

کسب حلال پر زور:

خود کفیل ہونے کو دین داری کا حصہ اور رزقِ حلال کو سراسر خیر تصور کرتے تھے۔ فرماتے تھے:
''اس شخص میں کوئی بھلائی نہیں جو راہِ حق میں خرچ کرنے اور دوسروں کے آگے ذلت سے بچنے کے لیے حلال مال

---

① طبقات ابن سعد: ۱۲۳/۵ ② طبقات ابن سعد: ۱۲۵/۵ ③ طبقات ابن سعد: ۱۲۴/۵، ۱۲۵
④ حلیۃ الاولیاء: ۱۶۲/۲، ۱۶۳ ⑤ طبقات ابن سعد: ۱۳۶/۵ ؛ حلیۃ الاولیاء: ۲/ ۱۶۶

نہ کمائے۔"[1]

مگر اس کے ساتھ آپ توکل اور استغناء میں بھی کامل تھے۔ فرماتے تھے:

"جو اللہ پر بھروسہ کر کے مستغنی رہے، دوسرے محتاج بن کر اس کے پاس آتے ہیں۔"[2]

اصل عبادت منکرات سے اجتناب ہے:

آپ کثرتِ ذکر اور طویل نوافل سے زیادہ زور اس بات پر دیتے تھے کہ لوگ گناہوں سے بچیں۔ ایک بار ان کے خادم نے کہا: "میرے خیال میں وہ لوگ سب سے زیادہ نیک ہیں جو ظہر کی نماز پڑھ کر عصر تک مسجد میں بیٹھے عبادت کرتے رہتے ہیں۔" آپ نے فرمایا: "اصل عبادت یہ نہیں۔ بلکہ اصل عبادت اللہ کی قدرت میں غور کرنا اور ان چیزوں سے بچنا ہے جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔"[3]

آپ مستجاب الدعوات تھے:

آپ مستجاب الدعوات مشہور تھے۔ آپ کی بددعا فوراً لگتی تھی۔ ایک شخص حضرت علی اور طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم کی مذمت کر رہا تھا۔ آپ نے منع کیا مگر وہ نہ مانا۔ آپ نے کہا: "اگر تو جھوٹا ہے تو اللہ تیرا چہرہ سیاہ کر دے۔"

اس بددعا کے اثر سے چند دنوں میں اس کا پورا چہرہ سیاہ ہو گیا۔ باقی بدن بالکل پہلے کی طرح گورا چٹا رہا۔[4]

وفات:

آپ کی وفات ۹۴ھ میں ہوئی۔ وفات سے پہلے ایسے سخت بیمار ہوئے کہ اٹھنا مشکل ہو گیا۔ بستر پر چت لیٹ کر اشاروں سے نمازیں ادا کرتے تھے۔ بار بار غشی طاری ہوتی تھی۔ اس دوران نافع رحمہ اللہ نے آ کر ان کی چارپائی قبلہ رخ کرادی۔ جب ہوش آیا تو پوچھا: "میری چارپائی قبلہ رخ کس نے کرائی، کیا نافع نے؟"

لوگوں نے اثبات میں جواب دیا تو فرمانے لگے:

"اگر میں اہلِ قبلہ اور امتِ محمدیہ میں سے نہ ہوتا تو چارپائی کو قبلہ رخ کر دینے سے بھلا کیا فائدہ ہوتا!!"

آپ ترکے میں کچھ رقم چھوڑے جا رہے تھے۔ اس بارے میں فرمایا:

"اے اللہ! تو جانتا ہے میں نے فقط اپنے دین اور عزت کو بچانے کے لیے یہ مال پاس رکھا تھا"

آخری وصیت کے طور پر فرمایا: "میرے جنازے میں نہ کوئی ماتم کرنے والا ساتھ چلے نہ خوشبو کی دھونی دی جائے۔ تجہیز و تکفین میں جلدی کی جائے۔ اگر اللہ کے ہاں میرے لیے خیر ہوئی تو وہ جگہ میرے لیے تم سے بہتر ہے۔" یہ بھی فرمایا: "میرے جنازے کا اعلان نہ کیا جائے۔ بس چار آدمی کافی ہیں جو مجھے میرے رب کے پاس پہنچا دیں۔"[5]

---

[1] حلیۃ الاولیاء: ۲/ ۱۷۳
[2] حلیۃ الاولیاء: ۲/ ۱۷۳
[3] طبقات ابن سعد: ۵/ ۱۳۵
[4] طبقات ابن سعد: ۵/ ۱۳۶
[5] سیر اعلام النبلاء: ۴/ ۲۴۵،۲۴۴

حضرت سعید بن جُبیر رحمۃ اللہ

سعید بن جُبیر رحمہ اللہ بھی پہلی صدی ہجری کی ان ہستیوں میں سے ہیں جو علم وعمل کی دنیا کے بادشاہ شمار ہوئے۔ امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ سعید تابعین کے بڑے ائمہ میں سے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، زہد وعبادت اور راست بازی وصداقت کے میدانوں میں وہ صفِ اوّل کے جوان مرد تھے۔ [1]

تعلیم وتربیت:

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نسلاً موالی یعنی عجمی غلام زادے تھے مگر بڑے بڑے عرب مشائخ نے آپ کی خوشہ چینی کی۔

ان کی تعلیم وتربیت کے زمانے میں اکابر صحابہ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے تاہم حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابوسعید خدری، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم جیسے اساطینِ امت موجود تھے۔ سعید بن جُبیر رحمہ اللہ نے ان سے خوب استفادہ کیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے انہوں نے بطورِ خاص فیض حاصل کیا۔ اس حلقۂ درس میں تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، بلاغت اور تاریخ سمیت جملہ علوم و فنون کی خوشبو مہکتی تھی۔ سعید بن جُبیر رحمہ اللہ نے ان تمام علوم کو حرزِ جاں بنالیا۔ [2]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی علمی مجالس میں جو بھی سوال وجواب ہوتے، سعید بن جُبیر رحمہ اللہ انہیں یاد کرتے اور اپنے اوراق پر لکھ بھی لیتے۔ کبھی کبھی سوالات کی اس قدر کثرت ہوتی کہ سعید بن جُبیر رحمہ اللہ کے تمام اوراق بھر جاتے اور انہیں اپنی ہتھیلیوں پر لکھنے کی نوبت آجاتی۔ [3]

علمی مقام:

آپ پہلے حجاز میں سکونت پذیر تھے۔ پھر عراق آگئے۔ یہاں کچھ مدت فارس اور اصفہان میں گزاری۔ آخر میں کوفہ میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ اس وقت عراق میں موالی کو نہ تو امام مقرر کیا جاتا تھا نہ ہی قاضی۔ مگر حجاج بن یوسف نے ان کی تکریم کرتے ہوئے انہیں جامع مسجد کا امام اور پھر کوفہ کا قاضی مقرر کر دیا۔ [4]

وہ نامور حافظ وقاری تھے۔ قرأت اور تفسیر کا علم عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے سیکھا تھا۔ اس کے علاوہ منہال بن عمرو اور ابوعمرو بن العلاء رحمہما اللہ جیسے نامور قراء سے تجوید سیکھی تھی۔ [5]

---

[1] تهذيب الأسماء واللغات للنووي: ١/ ٢١٦
[2] وفيات الأعيان: ٢/ ٣٧١
[3] طبقات ابن سعد: ٦/ ٢٥٧
[4] وفيات الأعيان: ٢/ ٣٧٢، ٣٧٣
[5] وفيات الأعيان: ٢/ ٣٧١

کثرت سے تلاوت کرتے اور اکثر دوراتوں میں پورا قرآن ختم کر دیتے تھے۔ایک بار بیت اللہ میں داخل ہوئے اور وہاں ایک رکعت میں پورا قرآن ختم کیا۔[1]

خوش الحانی کو پسند کرتے تھے مگر گا کر قرآن پڑھنے سے سختی کے ساتھ منع کرتے تھے۔[2]

رمضان المبارک میں آپ تراویح کی امامت کرتے تو عجب سماں ہوتا۔ایک شب حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی قرأت سناتے۔اگلی شب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت اپناتے۔اسی طرح روزانہ تمام مشہور ومتواتر قراٴتوں کو بدل بدل کر اس خوبی کے ساتھ قرآن مجید سناتے کہ سامعین وجد میں آجاتے۔[3]

آیات کے شان نزول اور تفسیر پر اتنا عبور حاصل تھا کہ جب آپ کے سامنے کوئی آیت پڑھی جاتی تو آپ فوراً اس کے سیاق وسباق، شان نزول، تفسیر اور مطالب سے آگاہ فرمادیتے۔[4] حدیث میں آپ کی مہارت کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ بعض اوقات عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اپنی موجودگی میں انہیں حدیث سنانے کا حکم دیتے تھے۔[5]

فقہ کی تعلیم بھی زیادہ تر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے سیکھی تھی۔عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے بعد وہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے دامن سے وابستہ رہے اور خاص طور پر ان سے افتاء کا فن سیکھا۔یوں وہ جوانی ہی میں اپنے دور کے ائمہ اسلام میں شامل ہوگئے۔[6] فقہ میں اتنا کمال حاصل کیا کہ کوفہ کے قاضی مقرر ہوئے۔خود عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ان کے فتاویٰ پر اعتماد کرتے تھے۔اگر کوفہ سے کوئی ان کے پاس مکہ آکر مسئلہ پوچھتا تو ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے:

''کیا تمہارے ہاں سعید بن جُبیر نہیں؟''[7]

ریاضی اور میراث کے مسائل پر ایسا ملکہ حاصل تھا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ایسے مسائل پوچھنے والوں سے کہتے:

''سعید بن جُبیر کے پاس جاؤ۔وہ بتائیں گے۔''[8]

جب مدینہ تشریف لاتے تو یہاں کے علماء وطلبہ بھی آپ سے میراث سیکھتے۔حضرت زین العابدین رحمہ اللہ جیسے پیکرِ علم فرماتے ہیں: ''جب سعید رحمہ اللہ ہمارے ہاں سے گزرتے تو ہم ان سے میراث کے مسائل پوچھتے۔''[9]

آپ کے وعظ میں بڑی تاثیر تھی۔روزانہ فجر اور عصر کے بعد آپ وعظ فرمایا کرتے تھے۔[10]

عبادت وریاضت:

سعید بن جُبیر رحمہ اللہ صرف عالم ہی نہیں، بہت بڑے ولی اور عابد وزاہد بھی تھے۔اللہ کی یاد اور فکرِ آخرت میں اس قدر روتے تھے کہ بینائی کمزور ہوگئی تھی۔[11]

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ٤/٣٢٤
[2] طبقات ابن سعد: ٦/٢٦٠
[3] وفیات الاعیان: ٢/٣٧١
[4] طبقات ابن سعد: ٦/٢٦٢
[5] طبقات ابن سعد: ٦/٢٥٦
[6] طبقات ابن سعد: ٦/٢٥٨
[7] طبقات ابن سعد: ٦/٢٥٧
[8] طبقات ابن سعد: ٦/٢٥٨
[9] طبقات ابن سعد: ٦/٢٥٨
[10] طبقات ابن سعد: ٦/٢٥٩
[11] کتاب الزهد للامام احمد بن حنبل، ص ٣٠٠

ہر سال ایک بار حج اور ایک بار عمرے کے لیے تشریف لے جاتے۔ عموماً کوفہ ہی سے احرام باندھ کر چلا کرتے تھے۔ اس طرح سال میں آپ کے پانچ چھ ماہ سفر ہی میں گزرا کرتے تھے۔ [1]

ماہ رمضان میں عبادت بہت بڑھ جاتی تھی۔ مغرب سے عشاء تک کا وقت تلاوت میں گزرتا۔ بعض اوقات ایک ہی نشست میں قرآن مجید پورا کر دیتے۔ اپنے محلے کی مسجد میں اعتکاف بھی کیا کرتے۔ [2]

آپ کی دعا یا بددعا فوراً لگتی تھی۔ آپ کے گھر میں مرغا تھا جس کی بانگ پر آپ سحری کے وقت بیدار ہوتے تھے۔ ایک بار مرغے نے بانگ نہ دی اور آپ تہجد کے لیے نہ اٹھ سکے۔ اس پر سخت رنج ہوا اور مرغے کے بارے میں منہ سے نکل گیا: ''اللہ اسے گونگا کرے، اسے ہوا کیا تھا؟''

اس کے بعد مرغا واقعی گونگا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر ان کی والدہ نے کہا: ''بیٹا! آئندہ کبھی کسی کو بددعا نہ دینا۔'' [3]

آپ نے اس نصیحت کو پلے باندھ لیا اور عمر بھر کسی کو بددعا نہ دی۔

خروج میں شرکت اور سزائے موت:

سعید بن جُبیر رحمہ اللہ حجاج کے مظالم سے تنگ آنے والے عوام کے ساتھ مل کر عبدالرحمٰن بن اشعث کی بغاوت میں شریک ہو گئے تھے۔ یہ کوشش ناکام رہی تھی۔ آپ اس کے بعد کئی سال تک حجاز میں روپوش رہے۔ آخر کار گورنر خالد بن عبداللہ قسری آپ کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ آپ کو حجاج کے پاس عراق بھیج دیا گیا جس نے سختی سے پوچھ گچھ کے بعد سر قلم کرا دیا۔ یہ واقعہ شعبان ۹۵ھ کا ہے۔ سزائے موت سے پہلے آپ نے حجاج کے بارے میں کہا تھا کہ اللہ اسے کسی اور پر مسلط نہ ہونے دے۔ ایسا ہی ہوا اور حجاج چند ہی دن بعد بیمار ہو کر مر گیا۔ [4]

❖❖❖

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ٤/٣٢٥

[2] وفیات الاعیان: ٢/٣٧١؛ طبقات ابن سعد: ٦/٢٦١

[3] حلیۃ الاولیاء: ٤/٢٧٤

[4] البدایۃ والنہایۃ: ١٢/٤٦٥ تا ٤٧٠

امام عامر بن شراحیل الشعبی رحمہ اللہ

عامر بن شراحیل الشعبی رحمہ اللہ بھی اموی دور کے ان علماء وفضلاء میں سے ہیں جن کے کمالات کا ساری دنیا اعتراف کرتی تھی۔ ان کا تعلق یمن کے عرب قبیلے حمیر کی ایک شاخ ''بنوشعب'' سے تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں پیدا ہوئے۔ سنِ ولادت ۱۹ھ بتایا جاتا ہے۔ آپ ہلکے پھلکے اور دبلے پتلے تھے۔[1]

علمی مقام:

شعبی رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سمیت کم وبیش پانچ سو صحابہ کی زیارت کی تھی اور پچاس کے لگ بھگ صحابہ کرام سے علمی استفادہ کیا تھا جن میں حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت سعید بن زید، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت ابوہریرہ، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ام سلمہ، حضرت میمونہ، حضرت اسماء بنت عمیس، حضرت عدی بن حاتم، حضرت اسامہ بن زید، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عمران بن حصین، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت حسن بن علی، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن عمرو، اور حضرت عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہم جیسی ہستیاں شامل تھیں۔

آپ کا قیام کوفہ میں تھا تاہم عراق میں مختار ثقفی کے زمانے میں آپ عارضی طور پر مدینہ آ گئے تھے۔ یہاں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آٹھ ماہ تک فیض حاصل کیا تھا۔[2]

محنت وریاضت......حافظہ اور ذہانت:

علم حاصل کرنے کے لیے آپ نے بڑی مشقت اٹھائی تھی۔ ملکوں ملکوں کی خاک چھانی تھی۔ کسی نے پوچھا کہ آپ نے اتنا علم کیسے حاصل کر لیا؟ تو فرمایا: ''مصائب کو بھلا کر، شہروں شہروں گھوم پھر کر، گدھے کی مانند صبر کر کے، اور کوے کی طرح سویرے سویرے بیدار ہو کر۔''[3] اس طرح آپ اپنے دور کے اتنے بڑے علامہ بن گئے کہ علمائے مشرق ومغرب کے علوم کو محفوظ کر لیا۔ فرماتے تھے کہ گزشتہ بیس سال سے کوئی حدیث ایسی نہیں سنی جو مجھے پہلے سے یاد نہ ہو۔[4] قرآن مجید کے اتنے بلند پایہ قاری تھے کہ انہیں ''زعیم القراء'' (بڑے قاری صاحب) کہا جاتا تھا۔[5] آپ کا حافظہ زمانے کے عجائبات میں سے تھا۔ کبھی کوئی چیز لکھ کر محفوظ کرنے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ جو سنتے تھے حرف بحرف

---

① طبقات ابن سعد: ۲۴۷،۲۴۶/۶ ② سیر اعلام النبلاء: ۳۰۱،۲۹۷/۴ ③ سیر اعلام النبلاء: ۳۰۰/۴
④ سیر اعلام النبلاء: ۳۰۱/۴ ⑤ تذکرۃ الحفاظ: ۶۷/۱

یاد رہتا تھا۔ خود فرماتے تھے کہ مجھے کبھی کوئی روایت لکھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ جو روایت سنتا فوراً یاد ہو جاتی، کبھی سنانے والے کو دہرانے کا نہیں کہا۔ ①

اخلاق اور مزاج:

اخلاق اور دریا دلی کا یہ حال تھا کہ برادری میں کوئی بھی شخص مقروض مرجاتا تو اس کا قرضہ ادا کر دیتے۔ عمر بھر کبھی کسی غلام یا خادم پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ زہد و استغناء ایسا تھا کہ لوگ جن چیزوں کو پسندیدگی اور رشک سے دیکھتے، آپ ان کی طرف نگاہ اٹھانا بھی گوارا نہ کرتے۔ ②

طبیعت کے لحاظ سے بڑے ہنس مکھ تھے تاہم علمی بحث کے وقت نہایت سنجیدہ ہو جاتے تھے۔ اہلِ علم کی ذمہ داری کا اس قدر احساس تھا کبھی کہہ اٹھتے تھے: ''کاش! اتنا علم حاصل نہ کیا ہوتا!!'' ③

ایسا کہنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اپنے دور کے پیشوا تھے، سیکھی ہوئی ہر چیز پر عمل کرنا، جاہلوں کو آگاہ کرنا اور غلطیوں سے منع کرنا ان کے ذمے تھا۔ پھر علم کی وجہ سے انسان فخر، ریاکاری اور دنیاوی مال و منصب کے حصول میں مبتلا ہو سکتا ہے؛ اس لیے یہ حضرات اپنے علمی مقام سے خود ڈرتے تھے کہ کہیں اللہ کے ہاں پکڑ نہ ہو جائے۔

حدیث اور عقائد کی حفاظت کے لیے شعبی رحمہ اللہ کی غیر معمولی کوششیں:

شعبی رحمہ اللہ ایسے دور میں امت کے علمی رہنما بنے تھے جب قیادت و سیادت کی زمام صحابہ کرام سے تابعین کو منتقل ہو رہی تھی۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سر اٹھانے والے فتنوں اور بعد میں پیش آنے والے متعدد سانحوں اور خانہ جنگیوں کو بچشم خود دیکھا بھالا تھا۔ ان شورشوں کا بڑا مرکز عراق تھا جہاں وہ سکونت پذیر تھے۔ یہاں ایک طرف شیعانِ علی، سادات کی محبت اور مدح و توصیف میں مبالغہ کرنے لگے تھے، دوسری طرف خوارج اور شام کے ناصبی ان حضرات کی مذمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے تھے۔ افراط و تفریط کے اس ماحول میں ہر مکتب فکر اپنے مخالفین کی ضد میں طرح طرح کی رطب و یابس روایات جمع یا وضع کر کے اپنے موقف کے لیے دلائل فراہم کر رہا تھا۔ سبائی گروہ اکابر صحابہ کے خلاف نفرت انگیز روایات پھیلا کر تشیع میں نقب لگا رہا تھا اور اسے بتدریج رفض کی طرف لیے جا رہا تھا۔ ابوصخر خزاعی (کثیر عزہ م ۱۰۸ھ) جیسے بعض شعراء بھی اپنے کلام سے اس قسم کی کوششوں کو تقویت دے رہے تھے۔ ④ اس طرح اسلام کے متوازی ایک مختلف اسلام وجود میں آ رہا تھا۔

شعبی رحمہ اللہ نے کوفہ کا وہ دور بھی دیکھا تھا جب یہاں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تلامذہ کی فقاہت کا طوطی بولتا تھا جن کے دم سے مساجد اس طرح آباد تھیں کہ یہ حضرات ''مساجد کی قندیلیں'' کہلاتے تھے۔ پھر انہوں نے وہ دور دیکھا جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہاں آمد کے بعد ان کے شاگردوں نے بھی حدیث اور فقہ کے حلقوں کو عزت بخشی۔ ⑤

---

① سیر اعلام النبلاء: ۲۹۷/۴، ۳۰۱ ② سیر اعلام النبلاء: ۲۹۹/۴ ③ سیر اعلام النبلاء: ۳۰۳/۴

④ العبرفی خبر من غبر: ۱۰۱/۱ ⑤ سیر اعلام النبلاء: ۳۰۹/۴

شعبی رحمہ اللہ نے ان میں سے متعدد ہستیوں سے اکتسابِ علم کیا۔

شعبی رحمہ اللہ ان دقیق النظر ائمہ حدیث میں سے تھے جن میں فطری طور پر ''رجالِ حدیث'' کو پرکھنے کا ملکہ موجود تھا۔ اس لیے وہ فرقِ مراتب کا پورا لحاظ کرتے تھے۔ شعبی رحمہ اللہ پہلے شیعانِ علی میں شامل تھے۔ مگر جب ان کے متشدد لوگوں کی مبالغہ آرائیاں دیکھیں تو ان سے کنارہ کش ہو گئے اور ان کی غلطیوں کو طشت از بام کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ [1]

شیعانِ علی میں جہاں بلند پایہ عالم فاضل شخصیات شامل تھیں وہاں ان میں ایسے حضرات بھی تھے جو تقویٰ اور زہد و عبادت میں بلند مرتبہ مگر دینی فہم اور فقاہت کے اعتبار سے کسی شمار میں نہ تھے۔ چنانچہ امام شعبی رحمہ اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک مصاحب صعصہ بن صوحان رحمہ اللہ کے بارے میں برملا کہتے تھے: ''وہ خطیب ضرور تھے مگر فقیہ نہیں۔''

بعض ایسے افراد بھی شامل تھے جو طبعی طور پر تشدد پسند اور تنگ نظر تھے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حلقے میں اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے انہیں جلیل القدر تابعی تصور کر لیا گیا تھا جیسا کہ ابن صبور۔ شعبی رحمہ اللہ ان کے بارے میں اپنی رائے یوں بتاتے تھے: ''میں ابن صبور سے ملا تھا۔ نہ وہ فقیہ تھے، نہ ان میں کوئی بھلائی تھی۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کی طرف خود کو منسوب کرنے والے سبائی بھی تیزی سے متحرک ہو گئے تھے اور طرح طرح کے نئے عقیدوں اور جھوٹی روایات کا پرچار کر رہے تھے۔ شعبی رحمہ اللہ ایسے لوگوں سے بھی ملے اور ان کی حقیقت کو کھول کر رکھ دیا۔ ان میں ایک رشید ہجری بھی تھا جو عاشقِ اہل بیت کے طور پر بہت مشہور تھا۔ شعبی رحمہ اللہ نے اس کی شہرت سنی تو ملنے میں دیر نہ کی، رشید ہجری نے اس ملاقات میں دعویٰ کیا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کچھ ہی دنوں پہلے مدینہ میں ملا ہے۔ وہ زندہ ہیں، اور انہوں نے کچھ پیش گوئیاں کی ہیں جو پوری ہوں گی۔ رشید ہجری کا کہنا تھا کہ یہ باتیں آلِ محمد کے اسرار میں سے ہیں۔ شعبی رحمہ اللہ رشید ہجری کی ان خرافات پر لعنت بھیجتے ہوئے وہاں سے نکلے۔ بعد میں حکومت نے رشید ہجری کو اسی قسم کے دعووں کی پاداش میں سزائے موت دے دی۔ [2]

شعبی رحمہ اللہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے عقائد و نظریات کی اس تبدیلی کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور گمراہی کے اس ریلے کے سامنے بند باندھنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

اس دور میں اہلِ تشیع کا ایک نیا فرقہ ''کیسانیہ'' نمودار ہو چکا تھا۔ یہ ایک معما تھا کہ اس کی بنیاد کس نے رکھی، کوئی کہتا کہ اس کا بانی مختار ثقفی تھا۔ کچھ لوگ کہتے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک آزاد کردہ غلام کیسان نے اس کی داغ بیل ڈالی، بعض لوگ اسے محمد بن حنفیہ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ [3] اس فرقے کے لوگ صحابہ کرام اور امہات المؤمنین سے اظہارِ نفرت کیا کرتے تھے۔ شعبی رحمہ اللہ برملا کہتے تھے کہ اس سوچ کے حامل لوگ سنت کے مخالف ہیں۔ [4]

① طبقات ابن سعد: ۲٤٨/٦   ② سیر اعلام النبلاء: ٣٠٩/٤، ٣١٠

③ الملل والنحل للشہرستانی: ١٤٧/١، ط مؤسسة الحلبی

اہل تشیع میں سبائیہ کے بعد یہ دوسرا غالی فرقہ تھا۔ اثنا عشریوں اور اسماعیلیوں وغیرہ کا ظہور بہت بعد میں ہوا۔

④ سیر اعلام النبلاء: ٣٠٠/٤

تشیع میں مبالغہ کرنے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تمام صحابہ سے افضل قرار دینے لگے تھے۔ صحیح العقیدہ لوگوں میں سے بھی بعض لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر فضیلت کے قائل تھے۔ شعبی رحمہ اللہ نے ان نظریات کی پرزور مخالفت کی۔ وہ صحابہ اور خلفائے راشدین کے مراتب کی وضاحت کرتے ہوئے اکثر کہا کرتے تھے: ''میں پانچ سو سے زائد صحابہ سے ملا ہوں، سب ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ والی ترتیب کے قائل تھے۔''①

یہ بھی فرماتے تھے: ''اس امت میں کسی کے بارے میں اتنا جھوٹ نہیں گھڑا گیا جتنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں۔''②

صحابہ کرام کا اتنا احترام کرتے تھے کہ ایک بار ان کی مجلس میں بڑے بڑے علماء بیٹھے کہ حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا ایک پوتا آ گیا۔ شعبی رحمہ اللہ نے فوراً تکیہ منگوایا اور انہیں احترام کے ساتھ بٹھایا۔ کسی نے کہا:

''اتنے بڑے بڑے مشائخ کی موجودگی میں ایک لڑکے کا اتنا اکرام۔''

فرمایا: ''ہاں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے دادا کو تکیہ پیش کیا تھا۔''③

شعبی رحمہ اللہ نے حدیث کی جو خدمت کی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ امام ابوحنیفہ، عاصم الاحول، ابن ابی لیلیٰ، عطاء بن سائب اور ابوبکر الہذلی رحمہم اللہ جیسے فقہاء و محدثین ان کے شاگرد تھے۔④

ان کے درسِ حدیث کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ روایات کو زبانی سناتے اور حفظ یاد کرنے پر زور دیتے تھے۔ لکھنے کے قائل نہیں تھے؛ اس لیے ان کے سبھی تلامذہ حفاظِ حدیث تھے۔ عام اساتذۂ حدیث کسی خاص ترتیب کے بغیر روایات نقل کرتے تھے مگر شعبی رحمہ اللہ کی ایک خاص جدت یہ تھی کہ وہ ہر موضوع اور مسئلے سے متعلق احادیث کو الگ الگ بیان کرتے تھے مثلاً کہتے: ''یہ طلاق سے متعلق روایات ہیں۔'' پھر اسی مسئلے سے متعلق روایات سناتے چلے جاتے۔ اس طرزِ روایت نے آگے چل کر کتبِ حدیث میں ابواب اور عنوانات کی بنیاد ڈال دی۔⑤

روافض کی پہچان...... شعبی رحمہ اللہ کی دِقتِ نگاہ کا کرشمہ:

اس زمانے میں رفض اپنی ابتدائی شکل میں تھا۔ روافض عقیدے میں عام اہل تشیع سے الگ تھے۔ عام شیعانِ علی کے عقائد تقریباً وہی تھے جو جمہور امتِ مسلمہ کے ہیں۔ عراق بالخصوص کوفہ کے اَن گنت فقہاء و محدثین اسی قسم کے تشیع کے حامل تھے۔ سب ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم سمیت تمام صحابہ سے عقیدت رکھتے تھے۔ ابن عبد ربہ لکھتے ہیں:

''شیعہ وہ لوگ تھے جو علی رضی اللہ عنہ کو عثمان رضی اللہ عنہ پر فوقیت دیتے تھے اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت کرتے تھے۔''⑥

امام ابوداؤد رحمہ اللہ کہتے تھے:

''میں نے کوفہ میں جس محدث سے بھی حدیث لکھی وہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی افضلیت کا قائل تھا۔''⑦

---

① سیر اعلام النبلاء: ٣٠١/٤ ③ سیر اعلام النبلاء: ٣٠٧/٤ ④ سیر اعلام النبلاء: ٣٠٩/٤
② سیر اعلام النبلاء: ٢٩٧/٤ ⑤ تدریب الراوی، ص ٩٤ ⑥ العقد الفرید: ٢٤٥/٢
⑦ معجم ابن الاعرابی: ١٧٢/١

مگر رفض اندرونِ خانہ اہلِ تشیع کو اپنی طرف مائل کر رہا تھا۔ شعبی رحمہ اللہ پہلے شخص تھے جنہوں نے روافض کو ایک الگ فرقے اور مذہب کے طور پر پہچانا اور ان کے خفیہ عقائد سے اس ابتدائی دور میں ہی اس قدر آگاہی حاصل کرلی کہ حیرت ہوتی ہے۔ انہوں نے اس فرقے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار پورے شدومد سے اس طرح کیا:

''روافض اس امت کے یہودی ہیں۔ روافض اسلام سے ویسا ہی بغض رکھتے ہیں جیسا یہودیت نصرانیت سے۔ رافضی رغبت یا خدا خوفی کے سبب نہیں بلکہ مسلمانوں سے دشمنی اور سرکشی کی وجہ سے اسلام لائے ہیں۔ اِن کی سرشت یہودیوں ہی جیسی ہے۔ یہود نے کہا کہ حکومت صرف آل داؤد کا حق ہے، روافض نے کہا حکومت صرف آل ابی طالب کا حق ہے۔ یہود نے کہا مسیح موعود کے آنے تک جہاد منسوخ ہے۔ روافض کہتے ہیں امام منتظر کے آنے تک جہاد ممنوع ہے۔ یہودی شام کی عبادت کو ستاروں کے جگمگانے تک مؤخر کرتے ہیں۔ روافض بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ یہودی ہر مسلم کا خون مباح سمجھتے ہیں اور یہی روافض کا عقیدہ ہے۔ یہود نے تورات میں تحریف کر دی۔ روافض نے قرآن کو تحریف شدہ قرار دے دیا۔ یہودی جبریل سے نفرت کرتے ہیں اور کہتے ہیں: وہ ہمارا دشمن ہے۔ رافضی کہتے ہیں: جبریل نے علی کی جگہ محمد پر وحی غلطی سے نازل کر دی۔ یہودی بھی اونٹ کا گوشت نہیں کھاتے اور روافض بھی۔ مگر یہود و نصاریٰ پھر بھی روافض سے بہتر ہیں؛ کیوں کہ اگر یہود سے پوچھا جائے: تمہارے بہترین لوگ کون ہیں؟ وہ کہیں گے: اصحابِ موسیٰ۔ عیسائیوں سے پوچھا جائے: تمہارے بہترین لوگ کون ہیں؟ جواب دیں گے: اصحابِ عیسیٰ۔ مگر روافض سے پوچھو: تمہارے بدترین لوگ کون ہیں؟ وہ کہیں گے: اصحابِ محمد۔''[1]

حکومتی حلقوں میں شعبی رحمہ اللہ کا مقام:

حکومتی حلقوں میں انہیں بڑی عزت حاصل تھی۔ حجاج کی جب ان سے ملاقات ہوئی تو اس نے ان سے کچھ علمی سوالات پوچھے اور برمحل جوابات سے متاثر ہو کر انہیں ان کے قبیلے شعب اور ہمدان کے وظائف کا نگران بنا دیا اور ایک معقول تنخواہ مقرر کر دی۔[2]

علم وعمل کے ساتھ ان کی ذہانت، معاملہ فہمی اور قدرتِ کلام بھی مشہور تھی۔ عبدالملک بن مروان ان کا اتنا مداح تھا کہ ایک بار قیصر روم کے پاس انہی کو سفیر بنا کر بھیجا۔ قیصر ان کی سفارتی مہارت، برجستہ گوئی اور فطانت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے واپسی پر ایک بند رقعہ ان کے حوالے کر دیا کہ اپنے بادشاہ کو دے دینا۔

شعبی رحمہ اللہ عبدالملک کے پاس دمشق آئے اور لفافہ اس کے حوالے کر دیا۔ عبدالملک نے رقعہ پڑھ کر کہا:

''آپ کو معلوم ہے قیصر نے کیا لکھا ہے؟''

---

① شرح اصول الاعتقاد لابی القاسم الالکائی، ح:۲۸۲۳؛ العقد الفرید: ۲/ ۲۴۹

② سیر اعلام النبلاء: ۴/ ۳۰۴

شعبی رحمہ اللہ نے کہا: "اس نے کیا لکھا ہے امیر المؤمنین!"

عبدالملک نے کہا: "اس نے مجھے لکھا ہے کہ مجھے تمہاری قوم پر حیرت ہے۔ اس نے تمہاری جگہ تمہارے سفیر کو خلیفہ کیوں نہ منتخب کر لیا۔"

شعبی رحمہ اللہ نے کہا: "امیر المؤمنین اس نے آپ کو دیکھا نہیں، اس لیے ایسا لکھا ہے؟"

عبدالملک نے کہا: "شعبی! قیصر مجھے تمہارے خلاف مشتعل کر کے تمہیں قتل کرانا چاہتا تھا۔"

یہ بات قیصر تک پہنچی تو اس نے کہا: "واقعی میرا مقصد یہی تھا۔"[1]

خروج میں شرکت، روپوشی اور جاں بخشی:

شعبی رحمہ اللہ کو اس عزت اور قدر و منزلت کے باجود ایک سخت ابتلاء کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ یہ عبدالرحمن بن اشعث کا خروج تھا جس میں شعبی رحمہ اللہ اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ سمیت متعدد علماء و قراء نے حصہ لیا تھا۔ چونکہ کوفہ کے اکثر قاری اس میں شریک تھے؛ اس لیے شیخ القراء ہوتے ہوئے بھی امام شعبی رحمہ اللہ اس ہجوم میں شامل ہو گئے۔

شکست کے بعد شعبی رحمہ اللہ ایک مدت تک روپوش رہے۔ اس دوران حجاج نے خراسان اور ترکستان میں قُتَیبَہ بن مسلم کی زیرِ قیادت جہادی لشکر روانہ کیے اور منادی کرا دی کہ جو باغی قُتَیبَہ کے لشکر میں شامل ہو جائے اس کی سزا معاف کر دی جائے گی۔ شعبی بھی موقع غنیمت سمجھ کر قُتَیبَہ کے لشکر میں شامل ہو گئے اور مدتِ دراز تک گمنامی کے ساتھ جہادی خدمات انجام دیتے رہے۔ فرغانہ کی مہم کے بعد قُتَیبَہ نے فتح کا حال لکھوا کر حجاج کو بھیجنا چاہا تو کوئی مناسب انشاء پرداز نہ ملا۔ شعبی رحمہ اللہ نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ قُتَیبَہ نے ان کا نام پتا پوچھا تو شعبی رحمہ اللہ نے کہا:

"یہ نہ پوچھیں، اس بارے میں مجھے معذور سمجھیں۔"

قُتَیبَہ نے بھی اصرار نہ کیا اور ان سے فتح نامہ لکھوا کر حجاج کو بھیج دیا۔ حجاج اندازِ تحریر سے سمجھ گیا کہ یہ شعبی رحمہ اللہ کا کلام ہے۔ فوراً قُتَیبَہ کو لکھا:

"میرا یہ خط پڑھتے ہی جان لو کہ تمہارا خط لکھنے والا آدمی شعبی ہے۔ اگر وہ تم سے بچ نکلا تو میں تمہارے ہاتھ پاؤں کٹوا دوں گا اور معزول کر دوں گا۔"

قُتَیبَہ نے انہیں حجاج کے خط سے آگاہ کر کے کہا: "میں اس سے پہلے آپ کو نہیں پہچانتا تھا۔ آپ جہاں چاہیں نکل جایئے۔ میں حجاج کے سامنے کوئی بھی قسم کھا لوں گا۔"

شعبی رحمہ اللہ نے کہا: "مجھ جیسا آدمی چھپ نہیں سکے گا۔"

قُتَیبَہ نے کہا: "آپ بہتر سمجھتے ہیں۔"

آخر قُتَیبَہ نے انہیں قیدی بنا کر عراق روانہ کر دیا جہاں حجاج واسط میں قیام پذیر تھا۔ واسط کے باہر شعبی رحمہ اللہ کو

[1] سیر اعلام النبلاء: ۳۰۴/۴

ایک اموی افسر یزید بن ابی مسلم ملا جوان کا ہمدرد تھا۔ وہ انہیں سمجھا تا رہا کہ حجاج کا سامنا کس طرح کیا جائے۔ دونوں نے آپس میں طے کر لیا کہ حجاج کے سامنے کیا کچھ کہا جائے گا۔

قُتیبہ کی ہدایات کے مطابق واسط کے قریب ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں اور اسی حال میں حجاج کے سامنے لایا گیا۔ حجاج نے دیکھتے ہی کہا: ''نہ مرحبا نہ خوش آمدید! میں نے تمہاری تنخواہ بڑھا دی، شہر کا امام بنایا، سفیر بنا کر خلیفہ کے پاس بھیجا۔ پھر بھی تم نے ہمارے خلاف خروج کیا۔''

شعبی رحمہ اللہ چپ چاپ سنتے رہے۔ حجاج دل کی بھڑاس نکال چکا تو بولا: ''اب تم کہو۔''

شعبی رحمہ اللہ بولے: ''اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ آپ نے جو کہا بالکل صحیح ہے۔ آپ نے ایسا ہی کیا۔ مگر ہم بھی آپ سے الگ ہو کر کبھی چین کی نیند نہ سو سکے۔ میں نادم ہوں اور اس حق راستے کو پہچان گیا ہوں جس سے بھٹک گیا تھا۔ اس کا اظہار میں نے امیر یزید بن ابی مسلم کے سامنے کر کے امان کی درخواست دے دی تھی۔''

حجاج غصے سے یزید بن ابی مسلم کی طرف پلٹا اور بولا: ''تم نے مجھے اطلاع نہیں دی۔''

وہ بولا: ''جی دیگر اہم کاموں میں لگ کر بھول گیا تھا۔''

حجاج نے شعبی سے پوچھا: ''مگر تم نے اللہ کے دشمن کا ساتھ کیوں دیا؟''

شعبی رحمہ اللہ نے نہایت ہی فصیح و بلیغ عربی میں کہا: ''ہمارا سینہ بنجر تھا اور مسکن ناساز گار۔ خوف ہمارا اوڑھنا اور بچھونا تھا اور فتنہ اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ ہم معصوم پرہیز گار ہیں نہ زور آور بدکار۔ اب وقت ہے کہ آپ خون معاف کر کے توبہ کا موقع دیں۔''

حجاج یہ بلیغ فقرے سن کر جھوم اٹھا، بولا:

''اوہ! تمہارے باپ کی خیر! ٹھیک ہے۔ اچھا! میں نے معاف کیا۔ تم جا سکتے ہو۔''[1]

وفات:

آپ نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جیسے نیک سیرت حکمران کا زمانہ بھی پایا اور اس آخری دور میں کہنہ سالی کے باوجود کوفہ کے قاضی رہے۔ علم و فضل کے اس امام نے ۱۰۴ھ میں کوفہ میں وفات پائی۔ عمر اسّی سال کے لگ بھگ تھی۔[2]

❖❖ ❖

---

① سیر اعلام النبلاء: ۴/۳۰۴، ۳۰۵؛ الطبقات الکبری لابن سعد: ۶/۲۴۹؛ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۲۸۸

② العبر فی خبر من غبر: سنة ۱۰۴ھ ؛ سیر اعلام النبلاء: ۴/۳۱۸

حضرت حسن بصری بن یسار رحمہ اللہ

حسن بصری رحمہ اللہ پہلی صدی ہجری کی وہ شخصیت ہیں جنھوں نے اس زمانے میں جب اموی خلفاء کی فتوحات عروج پر تھیں اور ہر سمت سے مال و دولت کے خزانے عالم اسلام میں کھنچے چلے آ رہے تھے، مسلمانوں کو مادیت کے طوفان، اخلاقی برائیوں کی کھائی اور اعتقادی خرابیوں کے جال میں پھنسنے اور ظاہر بینی کا عادی ہو کر اعمال باطنی سے بے گانہ ہو جانے سے بچانے میں اہم کردار ادا کیا۔

خاندان ونسب:

حسن بصری رحمہ اللہ ایک آزاد کردہ غلام یسار کے لڑکے تھے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں عراق سے قیدی بن کر آئے تھے۔ وہ مدینہ منورہ میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے غلام رہے اور پھر آزاد کر دیے گئے۔ اسی دوران ۲۱ھ میں حسن بصری رحمہ اللہ کی ولادت ہوئی۔ انہوں نے ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں پرورش پائی۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا ان سے گھر کے ضروری کام کراتیں اور تعلیم کے لیے اکابر صحابہ کے حلقوں میں بھی بھیجتیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انہیں دینی فقاہت اور عوام میں مقبولیت کی دعا دی تھی۔[1] چودہ سال کی عمر میں وہ قرآن مجید حفظ کر چکے تھے۔[2]

نوجوانی کا دور اور تحصیل علم:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جبکہ وہ نوجوان تھے، بصرہ آ گئے۔ وہ نہایت خوبصورت، تندرست و توانا اور بڑے طویل قامت تھے۔ خوش لباسی کا خیال رکھتے تھے۔ عموماً سیاہ عمامہ باندھا کرتے تھے۔ سردی میں سبز جبہ اور دھاری دار چادر پہنتے۔ گرمی میں سوتی کرتا شلوار اور یمنی چادر زیب تن فرماتے۔ کہا کرتے تھے:

”مومن اپنے کپڑوں کے ذریعے اپنے دین کی حفاظت کرتا ہے۔“[3]

مطلب یہ تھا کہ مومن کو خواہ مخواہ گھٹیا اور بوسیدہ کپڑے پہن کر خود کو ضرورت مند اور امداد کا مستحق نہیں ظاہر کرنا چاہیے بلکہ حسبِ استطاعت مناسب لباس استعمال کرنا چاہیے تاکہ عزتِ نفس پامال نہ ہو۔

حسن بصری رحمہ اللہ جہاد کا بڑا شغف رکھتے تھے اور مشرقی سرحدوں پر ہونے والی جہادی مہمات میں جاتے رہتے تھے۔ ان کی شجاعت اور دلیری کی دھوم ہر طرف تھی۔[4]

① سیر اعلام النبلاء: ٤/٥٦٥
② سیر اعلام النبلاء: ٤/٥٧٥
③ سیر اعلام النبلاء: ٤/٥٧٧
④ سیر اعلام النبلاء: ٤/٥٧٢

مُہلّب بن ابی صفرہ جیسے نامور اسلامی جرنیلوں کے ساتھ ان کی نشست و برخاست رہتی۔ مُہلّب کو جب کفار کے خلاف جہاد کے لیے جانا ہوتا تو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ ساتھ ہوتے۔ سخت ترین معرکوں میں انہیں صفِ اوّل میں رکھا جاتا تھا۔[1]

انہوں نے زیادہ تر علمی استفادہ عمران بن حصین، مغیرۃ بن شعبہ، عبدالرحمٰن بن سمرہ، سمرۃ بن جندب، نعمان بن بشیر اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے کیا۔ عام طور پر انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شاگرد سمجھا جاتا ہے۔ مگر محدثین کے نزدیک ان کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے براہِ راست استفادہ ثابت نہیں ہے۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اقوال اور احادیث دوسروں سے سن کر نقل کیے ہیں۔[2]

عالم اسلام میں ان کا مقام:

حسن بصری رحمہ اللہ نے حضراتِ صحابہ کی روحانیت، ایمانی کیفیت، باطنی روشنی، علم وفضل، فہم وفراست اور تجربات کو اچھی طرح جذب کر لیا اور علم تفسیر وحدیث کے بحرِ ذخار اور تزکیہ وتربیت کے شجرِ سایہ دار بن گئے۔ جلد ہی اپنی علمی، عملی اور روحانی خوبیوں کی بدولت وہ عالم اسلام کے ممتاز ترین فرد شمار ہونے لگے۔ ان کے عقیدت مندوں کا حلقہ پوری اسلامی دنیا میں پھیل گیا۔

مکہ اور مدینہ ہر دور میں اہلِ فضل وکمال کا گہوارہ رہے ہیں۔ کوئی بیرونی شخصیت یہاں کے علماء کو کم ہی متاثر کر پاتی ہے مگر حسن بصری رحمہ اللہ کے کمالات کا اعتراف حرم کے بزرگ بھی کرتے تھے اور ان کے وعظ سن کر کہا کرتے تھے:

''ہم نے ایسا شخص پہلے نہیں دیکھا۔''[3]

ان کے علم کی وسعت کا یہ حال تھا کہ دس دس برس ان کی مجلس اور محفل میں بیٹھنے والوں کا کہنا تھا کہ ہم ہر روز ان سے کوئی نہ کوئی نئی بات سنا کرتے ہیں۔[4]

حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کہتے تھے: ''حسن بصری کا کلام انبیائے کرام کے کلام سے مشابہ ہے۔''[5]

ایک عرصے تک وہ بصرہ کے مفتی رہے۔ ان کے فیصلوں اور آراء پر صحابہ کرام کو پورا اعتماد تھا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو وہ فرماتے: ''حسن سے پوچھ لیا کرو۔ انہیں یاد ہے۔ ہم بھول گئے۔''

امت کے پیش آمدہ مسائل ہوں یا لوگوں کے ذاتی قضیے، وہ بہت مناسب حل اور بہترین رائے پیش کیا کرتے تھے۔ بصرہ کے ایک کہنہ سال بزرگ ابوقتادہ العدوی رحمہ اللہ فرماتے تھے: ''اس استاد کا دامن تھامے رہو؛ کیوں کہ میں نے ان سے بڑھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملتی جلتی فراست والا کوئی نہیں دیکھا۔''[6]

---

① المعرفة والتاريخ: ٤٩/٢؛ سير اعلام النبلاء: ٥٧٩/٤
② سير اعلام النبلاء: ٥٦٦/٤
③ تاريخ دعوت وعزيمت: ٥٧/١، بحواله دائرة المعارف بستاني: ٤٤/٧
④ تاريخ دعوت وعزيمت: ٥٦/١، بحواله دائرة المعارف بستاني: ٤٤/٧
⑤ سير اعلام النبلاء: ٥٨٥/٤
⑥ سير اعلام النبلاء: ٥٧٣/٤

اس دور کے ایک محدث ایوب سختیانی رحمہ اللہ فرماتے تھے:

''اگر تم حسن کے پاس بیٹھتے تو کہتے، میں نے اس سے پہلے کوئی فقیہ دیکھا ہی نہیں۔''①

اخلاق وکردار:

ان کی زندگی صحابہ کی زندگی کے بہت مشابہ تھی۔ چال ڈھال، رہن سہن، مزاج وعادات، اخلاق واطوار اور وعظ و گفتگو میں وہ صحابہ کا عکس دکھائی دیتے تھے۔ ابو بردہ رحمہ اللہ فرماتے تھے:

''میں نے ان سے بڑھ کر اصحابِ رسول سے مشابہ آدمی کوئی نہیں دیکھا۔''②

صاحبِ طبقات محمد بن سعد رحمہ اللہ انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''وہ کمالات کے جامع، عالم، بلند مرتبہ، فقیہ اور معتبر راوی تھے، ان کی بات حجت سمجھی تھی۔ عبادت گزار، فصیح وبلیغ اور حسین وجمیل تھے۔''③

قوتِ کلام اور دعوتی واصلاحی کوششیں:

سب کا اتفاق ہے کہ وہ بڑے شیریں بیان تھے۔ قوتِ کلام کا یہ عالم تھا کہ اہلِ نظر انہیں حجاج بن یوسف سے زیادہ قادر الکلام مانتے تھے جو اس دور کا سب سے بڑا خطیب شمار ہوتا تھا۔ وہ جو بات کہتے وہ دل سے نکلتی اور سیدھا دل پر اثر انداز ہوتی تھی، ان کے الفاظ عقلِ سلیم کے عین مطابق ہوتے تھے۔ ان کی باتوں میں شہد کی سی مٹھاس تھی۔ ان کی گفتگو زخمی دلوں کا مرہم اور بیمار روحوں کا علاج تھی۔④

مادّیت اور ہوسِ زر کی مذمت:

وعظ ونصیحت کے دوران قلبی کیفیات ہر جملے میں شامل رہتیں۔ حضور ﷺ، صحابہ کرام اور قیامت کا ذکر کرتے ہوئے اکثر اشک بار ہوجاتے تھے۔ وہ تاریخ کے اتار چڑھاؤ اور معاشرے میں آنے والی تبدیلیوں پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ انہوں نے دورِ فاروقی میں آنکھ کھولی جب مجاہدینِ اسلام کا ریلا ہر ایوانِ باطل کو بہائے لے جا رہا تھا۔ دورِ عثمانِ غنی کی فتوحات اور مال ودولت کی اس کثرت کا انہوں نے بچشم خود مشاہدہ کیا جس سے حضورِ اکرم ﷺ نے امت کو خبردار کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''اللہ کی قسم! مجھے تمہارے فقر وفاقے سے کوئی ڈر نہیں۔ بلکہ مجھے ڈر یہ ہے کہ کہیں تم پر دنیا یوں کشادہ نہ ہوجائے جیسے پہلے امتوں کے لیے کشادہ ہوئی تھی، پھر تم دنیا کا لالچ اسی طرح کرنے لگو جیسے پہلے لوگوں نے کیا تھا اور پھر دنیا تمہیں اسی طرح ہلاک کرے جیسے انہیں ہلاک کیا تھا۔''⑤

صحابۂ کرام کے نفوسِ قدسیہ مال ودولت کی کثرت کے باوجود اس کے مہلکات سے دامن بچائے رہے مگر بعد

① سیر اعلام النبلاء: ٥٨٥/٤ ② سیر اعلام النبلاء: ٥٧٢/٤
② سیر اعلام النبلاء: ٥٧٢/٤
③ معجم الادباء للحموی: ٢١١٣/٥، ط الغرب الاسلامی
⑤ صحیح البخاری، ح: ٤٠١٥، کتاب المغازی

میں آنے والا معاشرہ مادیّت کے اس فتنے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ حسن بصری رحمہ اللہ اسی معاشرے کے ایک فرد تھے اور اس تبدیلی کو بڑی سنجیدگی سے محسوس کرتے تھے۔ اپنی تقاریر میں وہ اکثر دولت کی ہوس اور پیسے کی محبت کی سخت مذمت کرتے۔ قسم کھا کر کہا کرتے تھے: ''جو شخص بھی درہم کی عزت کرے گا، اللہ اسے ذلت میں ضرور مبتلا کرے گا۔''[1]

فرماتے تھے: ''دینار اور درہم کتنے برے ساتھی ہیں۔ جب تک جدا نہ ہوں تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔''[2]

فکرِ آخرت کا اہتمام:

ان کے نزدیک دنیا کی محبت کا علاج یہ تھا کہ لوگوں کو فکرِ آخرت دلائی جائے۔ بار بار قیامت اور جنت و جہنم کا تذکرہ کیا جائے۔ فانی دنیا کی جگہ ہمیشہ کی زندگی کی فکر عام ہوتا کہ دنیا کی محبت دل سے نکلے اور نفس مادیت کی جگہ روحانیت کی طرف مائل ہو۔ وہ اپنی تقاریر میں اکثر آخرت کا ذکر اس طرح کرتے کہ لوگ اشک بار ہوئے بغیر نہ رہتے۔ وہ قرآن مجید کو ایمان و یقین کی کیفیت کے ساتھ پڑھنے پر زور دیتے اور اسے فکرِ آخرت کا سب سے بہترین ذریعہ قرار دیتے۔ فرمایا کرتے تھے: ''اے ابن آدم! اگر تو قرآن مجید پڑھے اور اس پر ایمان رکھے تو دنیا میں تیرا غم زیادہ ہوجائے، تیرا خوف بڑھ جائے، تیرے رونے دھونے میں اضافہ ہوجائے۔''[3]

یہ صرف ان کا قال ہی نہیں حال بھی تھا۔ ان سے ملنے والے لوگ کہتے تھے کہ وہ اکثر فکرِ آخرت میں ڈوبے رہتے تھے۔ ان پر ایسی گہری سنجیدگی طاری رہتی تھی جیسے ابھی ابھی کوئی مصیبت ٹوٹی ہو۔[4]

موت، جنت اور جہنم کے تذکرے:

ان کی مجلس میں موت، جنت اور جہنم کے بکثرت تذکرے ہوتے۔ فرماتے تھے:

''موت نے دنیا کو خوار کردیا ہے۔ اس نے یہاں کسی عقل والے کے لیے خوشی کا موقع ہی نہیں چھوڑا۔''[5]

فرماتے تھے: ''ابن آدم! تو دنوں کا مجموعہ ہے۔ جب بھی ایک دن گزرتا ہے تو تیرا کچھ حصہ بھی گزر جاتا ہے۔''[6]

کبھی بڑے درد سے کہا کرتے: ''جنت کسی بھی امت کے لیے ایسی آراستہ نہیں ہوئی جیسی اس امت کے لیے، پھر بھی تمہیں اس کا کوئی عاشق دکھائی نہ دے گا۔''[7]

گناہوں سے اجتناب اور توبہ پر زور:

وہ اکثر توبہ کی اہمیت پر زور دیتے اور اس میں تاخیر سے ڈراتے، فرماتے تھے:

''اے ابن آدم! گناہ کو ترک کردینے کی مشقت توبہ کی مشقت سے کم ہے۔ تجھے کیا معلوم کہ تو کوئی کبیرہ گناہ ایسا کرے جس کے بعد توبہ کی مہلت ہی نصیب نہ ہو۔''[8]

---

① كتاب الزهد للامام احمد بن حنبل، ص ۲۱۹
② سير اعلام النبلاء: ۵۷۶/۴
③ كتاب الزهد، للامام احمد، ص ۲۱۰
④ حلية الاولياء: ۱۳۳/۲، ۱۳۴
⑤ كتاب الزهد، للامام احمد بن حنبل، ص ۲۰۹
⑥ حلية الاولياء: ۱۴۸/۲
⑦ سير اعلام النبلاء: ۵۷۸/۴
⑧ كتاب الزهد، للامام احمد بن حنبل، ص ۲۲۶

گناہوں سے خود بھی لرزاں وترساں رہتے اور دوسروں کو بھی اس سے ڈراتے۔ فرمایا کرتے تھے:

''ہم ہنستے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ کو ہمارے ایسے ویسے کاموں کی خبر ہے۔''[1]

عشقِ رسالت مآب ﷺ:

حسن بصری رحمہ اللہ سچے عاشقِ رسول تھے۔ ان کے نزدیک مادہ پرستی اور نفسانی خواہشات کی اسیری کا علاج سیرتِ رسول سے روشنی حاصل کرنا تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ امت کا آقائے نامدار ﷺ سے رشتۂ محبت وعقیدت ایسا پختہ ہو کہ ہر تعلق پر یہی جذبہ غالب آجائے۔ وہ لوگوں کو سیرت کے واقعات بکثرت سناتے۔ حضور ﷺ کی جدائی میں کھجور کے تنے کی گریہ وزاری کا واقعہ اکثر دہراتے اور کبھی روئے بغیر اسے پورا نہ کرپاتے۔ پھر فرماتے:

''اللہ کے بندو! ایک کھجور کا تنا رسول اللہ ﷺ کے عشق میں روتا تھا۔ تمہیں تو اس سے کہیں زیادہ رونا چاہیے۔''[2]

فرزدق کی توبہ:

آپ کے داعیانہ و مصلحانہ جذبے کا اظہار چلتے پھرتے بھی ہوتا رہتا تھا۔ آپ ایک جنازے میں شریک تھے۔ مشہور شاعر فرزدق بھی آپ کے ساتھ چل رہا تھا۔ وہ کہنے لگا: ''حضرت! لوگ ہمیں ساتھ دیکھ کر یہی سوچتے ہوں گے کہ بصرہ کا بہترین آدمی بصرہ کے بدترین انسان کے ساتھ ہے۔''

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: ''نہیں نہیں! نہ تو میں سب سے بہتر ہوں، نہ تم سب سے بُرے ہو۔ بصرہ میں کتنے مشرک ہیں جن سے تم بہتر ہو، اور دو بوسیدہ چادروں میں لپٹے کتنے بوڑھے ایسے ہیں جو حسن سے بہتر ہیں۔ مگر اچھا یہ بتاؤ تم نے موت کے لیے کیا تیاری کی ہے؟''

وہ بولا: ''لا الٰہ الا اللہ کا قائل تو ہوں۔''

فرمایا: ''مگر لا الٰہ الا اللہ کہنے سے کچھ شرائط عائد ہو جاتی ہیں۔''

فرزدق نے کہا: ''کیا توبہ کی کوئی صورت ہے؟''

فرمایا: ''کیوں نہیں؟''

فرزدق نے کہا: ''پاکباز عورتوں کے بارے میں جو شعر گوئی کی ہے، اس کا کیا ہوگا؟''

فرمایا: ''توبہ کرلو، اور عہد کرو کہ آئندہ ایسا نہیں کرو گے۔''

فرزدق نے فوراً کہا: ''عہد کرتا ہوں کہ پھر نہ کروں گا۔''

کچھ دنوں بعد فرزدق کا انتقال ہو گیا۔ کسی نے اسے خواب میں دیکھا تو پوچھا: ''تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟''

جواب دیا: ''حسن بصری کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا، اس کے سبب اللہ نے مغفرت فرما دی۔''[3]

---

[1] حلیة الاولیاء: ۱۳۴/۲ [2] مسند ابن الجعد، ح: ۳۲۱۹؛ المعجم الاوسط للطبرانی، ح: ۱۴۰۸

[3] الکامل فی اللغات والادب للمبرد: ۱۰۱/۱؛ امالی القالی: ۳۰۸/۲؛ سیر اعلام النبلاء: ۵۸۴/۴

صحابہ کرام سے عقیدت ومحبت پر زور:

اس دور میں عالم اسلام کو مادیت کے فتنے کے ساتھ ان اعتقادی خرابیوں سے بھی پالا پڑا جن کا سبب خود رائی اور اسلاف سے بے زاری کا مرض تھا۔ ان میں سبائی، ناصبی، خوارج سبھی شامل تھے۔ ان فتنوں نے عالم اسلام کے دل ودماغ پر مہلک حملے کیے۔ اگر حسن بصری رحمہ اللہ جیسے اساطینِ امت نہ ہوتے تو گمراہیوں کے یہ طوفان مسلمانوں کو بالکل برباد کر دیتے۔

حسن بصری رحمہ اللہ نے معاشرے کی ان تبدیلیوں پر نگاہ رکھتے ہوئے اپنے مواعظ اور خطبات سے ایک طویل عرصے تک پوری دلسوزی سے امت کی درست رہنمائی کی۔ وہ جس علاقے یعنی عراق میں سکونت پذیر تھے، وہ فتنوں کا مرکز بن چکا تھا۔ کوفہ میں سبائی اور بصرہ میں خوارج زور وشور سے سرگرم تھے۔ حسن بصری رحمہ اللہ جیسے بزرگوں کی مساعیٔ جمیلہ کی بدولت عالم اسلام کے ان مرکزی شہروں کی آبادی کا بڑا حصہ صحیح دین پر قائم اور اسلاف کے ساتھ پیوست رہا۔ وہ صحابہ کرام کے عاشق تھے اور ان اعتقادی خرابیوں سے بچنے کا ذریعہ ان کے نزدیک یہی تھا کہ صحابہ پر اعتمادِ کامل کیا جائے۔ وہ اُمت کو صحابہ کی پیروی کی ترغیب دیتے تھے۔ ان کے حافظے میں اکابر صحابہ اور امہات المؤمنین کی کتنی ہی دلکش یادیں جاگزیں تھیں۔ وہ اپنے بچپن اور لڑکپن میں دیکھا ہوا دورِ صحابہ کا ایک ایک منظر دہرایا کرتے تھے۔ کبھی فرماتے:

''میں امہات المؤمنین کے حجروں میں جاتا تو میرا ہاتھ چھت کو لگتا تھا، اس وقت میں قریب البلوغ تھا۔''[1]

کبھی کہتے: ''میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مسجد میں سوتے ہوئے دیکھا، مؤذن نے آکر انہیں بیدار کیا تو کنکریوں کے نشانات ان کے جسم پر پڑ چکے تھے۔''[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بلوائیوں کی شورش کو انہوں نے بچشم خود دیکھا تھا اور اس سانحے کی بعض تفصیلات بڑے دکھ کے ساتھ سنایا کرتے تھے۔ کہتے تھے: ''جب مسجد نبوی میں بلوائیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو نمازِ جمعہ سے روکا تو ان پر کنکریوں کی اس طرح بوچھاڑ کی کہ آسمان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بے ہوش ہوگئے اور دو آدمی سہارا دے کر انہیں گھر لے گئے۔''[3]

فرماتے تھے: ''جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو میں چودہ برس کا تھا۔''[4]

ایک بار صحابہ کے حالات کے ساتھ اپنے دور کے مسلمانوں کا موازنہ کرتے ہوئے فرمایا:

''وہ حضرات اللہ کے سامنے کھڑے رہتے، پھر چہروں کو خاک پر رکھ دیتے اور سجدے میں پڑ جاتے۔ اپنے رب کے خوف سے ان کے گالوں پر اشکوں کی لڑیاں بہتی تھیں۔ آخر کوئی بات تو تھی جس کی وجہ سے وہ لوگ راتیں آنکھوں میں کاٹ دیتے تھے۔ کوئی تو بات تھی جس کی وجہ سے وہ دن میں سہمے سہمے رہتے تھے۔''

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ٤/٥٦٩

[2] سیر اعلام النبلاء: ٤/٥٦٨

[3] سیر اعلام النبلاء: ٤/٥٦٨

[4] سیر اعلام النبلاء: ٤/٥٦٩

پھر فرمایا: ”اللہ کی قسم! اللہ کے وہ بندے، سچے اور پکے ثابت ہوئے۔ جو زبان سے کہا، اس پر عمل کیا۔ مگر تم صرف تمناؤں میں مشغول ہو۔ لوگو! ان تمناؤں سے باز آؤ؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ صرف تمنا کی بدولت نہ دنیا سے کچھ دیتا ہے نہ آخرت سے۔“[1]

وہ صحابہ کرام کو مؤمن کی صفات کا نمونہ قرار دیتے تھے اور فرماتے تھے:

”مؤمن اللہ کے سوا کسی کی مدد نہیں چاہتا۔ مجلس میں باوقار، تنہائی میں شکر گزار، روزی پر قناعت کرنے والا، آرام و آسائش کی حالت میں شکر کرنے والا، مصیبت میں صبر کرنے والا، غافلوں کے درمیان ہو تو ذکر میں اور ذاکرین کے درمیان ہو تو استغفار میں مشغول رہتا ہے۔ یہ شان تھی صحابہ کرام کی۔ جب تک وہ دنیا میں رہے، اسی شان سے جیے۔ جب گئے تو اسی آن بان کے ساتھ گئے۔ مسلمانو! تمہارے اسلاف کا نمونہ تو یہ تھا۔ جب تم نے اللہ کے ساتھ اپنا معاملہ بدل دیا تو اللہ نے بھی اپنا معاملہ بدل دیا۔“[2]

وہ صحابہ کرام کو یاد کرتے ہوئے فرماتے تھے:

”میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا اور ان میں سے بعض کی صحبت پائی ہے جنہیں نہ تو دنیا کی کسی شے کے آنے پر خوشی ہوتی تھی اور نہ ہی اس کی کسی چیز کے جانے پر غم ہوتا تھا۔ دنیا ان کی نگاہ میں مٹی سے بھی بے قدر تھی۔ وہ لوگ پچاس ساٹھ سال تک اس طرح زندگی گزار گئے کہ نہ تو ان کے لیے کوئی جوڑا تہہ کر کے رکھا گیا، نہ ہی ان کے لیے کوئی ہانڈی چولہے پر چڑھائی گئی۔ ان کے اور زمین کے درمیان کوئی چیز قطعاً حائل نہیں ہوتی تھی، انہوں نے کبھی گھر میں فرمائش کر کے کوئی کھانا نہیں پکوایا۔ جب رات آتی تو وہ حضرات نماز میں کھڑے ہو جاتے، چہروں کو خاک پر رکھ دیتے، ان کے آنسو ان کے گالوں پر بہتے تھے۔ وہ حضرات اللہ سے اپنی گردنوں (کی دوزخ سے) رہائی کی مناجات کرتے تھے۔ جب وہ کوئی نیکی کرتے تھے تو اس کے تشکر میں پگھل جاتے اور اللہ سے دعا کرتے کہ وہ اسے قبول کرلے۔ جب ان سے کوئی برائی ہو جاتی تو غمزدہ ہو کر اللہ سے استغفار کرتے۔ وہ اسی طرح تھے اور اسی طرح رہے۔ واللہ! وہ گناہوں سے معصوم نہ تھے مگر انہوں نے استغفار کے ذریعے نجات پائی۔

لوگو! تمہاری حالت یہ ہے کہ تمہاری عمر کم ہوتی جا رہی ہے، اعمال مندرج ہوتے جا رہے ہیں، اور اللہ کی قسم! موت تمہاری گردنوں تک آ چکی ہے اور جہنم تمہارے سامنے ہے۔ پس تم کسی بھی دن اللہ کا فیصلہ آ جانے کے منتظر رہو۔“[3]

---

① مختصر قیام اللیل، محمد بن نصر المروزی، ص ۴۳

② تاریخ دعوت وعزیمت: ۱/۵۹ بحوالہ الحسن البصری لابن جوزی، ص ۶۹، ۷۰؛ وانظر "الیقین" لابن ابی الدنیا، ص ۴۷

③ مختصر قیام اللیل، الفہ محمد بن نصر المروزی واختصرہ المقریزی، ص ۴۷

اپنی تقاریر میں کہا کرتے تھے:

''ابن آدم تجھ پر افسوس! کیا تو اللہ سے مقابلے کی طاقت رکھتا ہے؟ میں نے ستر بدری صحابہ کو دیکھا جن کا لباس محض اُون تھا۔ اگر تم انہیں دیکھتے تو کہتے کہ یہ مجنون ہیں۔ اور اگر وہ تمہارے اچھے لوگوں کو دیکھتے تو کہتے یہ کم نصیب ہیں اور تمہارے بُروں کو دیکھتے تو کہتے: ان کا اللہ اور آخرت پر ایمان ہی نہیں۔ اللہ کی قسم! میں نے تو ایسی ہستیاں دیکھی ہیں کہ دنیا ان کی نگاہوں میں پیروں میں لگی مٹی کے برابر بھی نہ تھی۔ ان کے پاس شام کے وقت بس اتنی خوراک ہوتی کہ گھر والوں کا پیٹ بھر سکے۔ مگر وہ کہتے تھے: میں یہ سب خود کیسے کھالوں۔ آدھا کھاؤں گا اور آدھا صدقہ کروں گا کہ شاید دوسرے ہم سے زیادہ بھوکے ہوں۔''[1]

نفاق کے بارے میں ان کی وقیع رائے:

وہ علمی حلقوں میں پھیلے ہوئے اس خیال کی تردید کرتے تھے کہ ''نفاق'' صرف حضور ﷺ کے دور تک محدود تھا۔ وہ اس حقیقت کو واشگاف کرتے تھے کہ جس طرح کفر و شرک اور دیگر اعتقادی امراض ہر دور میں موجود رہے ہیں، اسی طرح نفاق کی بیماری بھی ہر معاشرے میں پنپ سکتی ہے۔ مسلمانوں میں سرایت کر جانے والی نفس پرستی کو وہ چھپی ہوئی منافقت قرار دیتے تھے۔ اپنے مواعظ میں اکثر یہ آیت قرآنی پڑھتے:

﴿اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾

''کیا تو نے نہیں دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنالیا ہے۔''[2]

پھر اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے:

''اس سے مراد منافق ہے۔ اور منافق وہ ہے کہ اسے جس بھی چیز کی خواہش ہو، اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔''[3]

آپ کے نزدیک منافق نہ صرف موجود تھے بلکہ معاشرے میں پوری طرح سرگرم اور متحرک تھے۔ کسی نے پوچھا:

''کیا منافق اب بھی ہیں؟''

فرمایا: ''اگر وہ بصرہ کی گلیوں سے نکل جائیں تو یقیناً مجھے یہ گلیاں ویران لگیں گی۔''[4]

لوگوں کی تین اقسام:

آپ اپنے معاشرے کے لوگوں کا بڑی گہرائی سے تجزیہ کرتے تھے۔ ایک بار فرمایا:

''لوگ تین قسم کے ہیں: مؤمن، کافر اور منافق۔ جہاں تک مؤمن کا تعلق ہے، وہ اللہ عزوجل کی اطاعت پر کاربند ہے۔ رہا کافر تو اسے اللہ نے ذلیل کردیا ہے جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔ جہاں تک منافقین کی بات ہے تو وہ یہاں وہاں گھروں، کمروں اور راستوں میں موجود ہیں، ان سے اللہ کی پناہ۔

① حلیة الاولیاء: ۱۳۴/۲ ② سورة الجاثیه، آیت: ۲۳

③ سیر اعلام النبلاء: ۵۷۰/۴، ۵۷۱ ④ صفة النفاق، لابی بکر الفریابی، ص ۱۴۴

واللہ! انہوں نے اپنے رب کو نہیں پہچانا۔ بلکہ گندے کاموں کے ذریعے اپنے رب کے انکار کا ثبوت دیا ہے۔ ظلم ظاہر ہوگیا۔ علم گھٹ گیا۔ سُنت متروک ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ منافق حیران و سرگردان ہیں۔ نہ تو یہ یہود و نصاریٰ ہیں نہ مجوسی کہ انہیں (اسلامی اعمال نہ کرنے میں) معذور سمجھا جائے۔''[1]

آپ کے نزدیک بے عملی نفاق اور اللہ کی طرف سے توفیق سلب ہونے کی واضح علامت تھی۔ آپ فرماتے تھے:

''مؤمن نے اپنا دین لوگوں سے اخذ نہیں کیا بلکہ دین اس کے پاس اللہ عزوجل کی طرف سے آیا ہے پس اس نے اسے قبول کرلیا ہے جبکہ منافق نے لوگوں کو زبان تو دے دی ہے (زبانی اظہارِ ایمان کر دیا ہے) مگر اللہ نے اس کے دل (کو حق قبول کرنے) اور (ظاہر کو) عمل سے روک دیا ہے۔''[2]

خوں خوار منافق اور مال و جاہ پرست منافق:

آپ کے تجزیے کے مطابق مسلم معاشرے میں موجود منافق دو قسم کے تھے: ایک وہ جو مسلمانوں کا خون بہانا جائز سمجھتے تھے۔ دوسرے وہ جو مال و جاہ کے پجاری تھے۔ آپ فرماتے تھے:

''منافق دو قسم کے لوگ ہیں جو اسلامی معاشرے میں ظاہر ہوئے ہیں: ایک وہ جس کا نظریہ بُرا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ جنت اسی کو ملے گی جس کا نظریہ اس کی طرح ہے، تو ان لوگوں نے مسلمانوں پر تلوار بے نیام کر دی، ان کے خون بہادیے اور ان کی عزتیں حلال کر دیں۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو دنیا کے پجاری ہیں۔ اسی کی خاطر غضب ناک ہوتے ہیں، اس کے لیے جنگ کرتے ہیں اور اس کو طلب کرتے ہیں۔''[3]

حکام میں مرضِ نفاق کی طرف اشارہ:

آپ اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگوں میں بھی نفاق کو واضح دیکھتے تھے اور نہایت افسوس کے ساتھ فرماتے تھے:

''اللہ کی شان کہ اس اُمت کو کیسے کیسے منافقوں سے پالا پڑا، جو اس پر غالب آ گئے اور جو اس پر اپنی اغراض کو ترجیح دیتے ہیں۔''[4]

مؤمن اور منافق کا فرق:

مؤمن اور منافق کا فرق بتاتے ہوئے آپ کہا کرتے تھے:

''مؤمن جانتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ کہا، وہ ویسا ہی ہے۔ مؤمن عمل میں بھی سب سے آگے ہوتا ہے اور خوف میں بھی۔ اگر پہاڑ کے برابر صدقہ بھی کر دے تو بے خوف نہیں ہوتا۔ اس کی نیکی اور بھلائی جس قدر بڑھتی ہے، خوف بھی اسی قدر بڑھتا جاتا ہے۔ جبکہ منافق کہتا ہے: لوگ بہت زیادہ ہیں۔ میری بھی مغفرت ہوجائے گی۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔ پس وہ برے عمل کر کے اللہ سے تمنائیں وابستہ کرتا رہتا ہے۔''[5]

[1] صفة النفاق وذمّ المنافقين للفريابي، ص ۹۱ باسناد صحيح
[2] صفة النفاق وذمّ المنافقين للفريابي، ص ۹۱ باسناد صحيح
[3] ايضاً، ص ۹۱ باسناد صحيح
[4] ايضاً، ص ۹۱ باسناد صحيح
[5] حلية الاولياء: ۱۵۳/۲

اہلِ علم کے لیے تزکیۂ نفس اور اصلاح باطن پر زور:

حسن بصری تزکیۂ نفس اور اصلاح باطن پر بہت زور دیتے تھے۔ باطنی بیماریاں: تکبر، حسد، بغض، بخل اور ریاکاری عوام ہی میں نہیں اہلِ علم وفضل میں بھی سرایت کرنے لگی تھیں۔ آپ کے نزدیک اصل عالم وفقیہ وہی تھا جو باطنی خرابیوں سے پاک، عابد وزاہد اور متقی ہو۔ آپ فرماتے تھے:

''فقیہ تو وہ ہے جو حرصِ دنیا سے بے نیاز ہو۔ اپنے گناہ پر نگاہ رکھتا ہو، اپنے رب کی عبادت پابندی سے کرتا ہو۔''[1]

آپ فرماتے تھے: ''جب انسان علم حاصل کرتا ہے تو اس کا اظہار اس کے خشوع، دنیا سے بے رغبتی، اس کی زبان اور اس کی نگاہ سے ہوجاتا ہے۔''[2]

اہلِ علم کی دنیا طلبی پر اظہارِ افسوس:

دینی خدمت میں لگنے والوں کو امراء کے سامنے ہاتھ پھیلاتے دیکھ کر آپ کو بڑی غیرت آتی تھی اور اس طرزِ عمل پر سخت تنقید کرتے تھے۔ ایک بار چند قاریوں کو گورنر ابن ہبیرہ کی دہلیز پر انتظار میں بیٹھے دیکھا تو ناراض ہو کر فرمایا:

''کیا تم اِن ناپاک لوگوں کے پاس جانا چاہتے ہو! تمہارا اِن سے ملنا کوئی نیک وصالح لوگوں کی ملاقات کی طرح نہیں ہوگا۔ اللہ تمہیں رسوا کرے۔ تم نے تو قاریوں کو بے عزت کردیا۔ اگر تم ان لوگوں کی دنیا سے بے نیاز رہتے تو یہ لوگ تمہاری دینی خدمات میں دلچسپی لیتے۔ مگر تم ان کی دنیا کے پیچھے پڑے تو یہ لوگ تم سے بے پروا ہوگئے۔''[3]

امراضِ باطنہ کے علاج کی خصوصی مجلس:

حسن بصری رحمہ اللہ ان امراضِ باطنہ کے علاج کے لیے خصوصی نشست منعقد کرتے تھے۔ اس لحاظ سے آپ کو فنِ تزکیۂ باطن کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ تیسری صدی ہجری کے ایک بزرگ ابوسعید اعرابی کا بیان ہے:

''حسن بصری رحمہ اللہ کی ایک مجلس گھر میں ہوتی تھی اور ایک مسجد میں۔ مسجد کی مجلس میں وہ حدیث، تفسیر، فقہ اور تمام علوم کی تعلیم دیتے۔ وہاں کچھ لوگ ان سے حدیث کی روایتیں سننے آیا کرتے تھے، کچھ قرآن مجید اور تفسیر سیکھنے، کچھ بلاغت اور عربیت میں مہارت حاصل کرنے۔ گھر کی مجلس میں ان کے خاص رفقاء ہوتے تھے جیسے عمرو بن عبید، عبدالواحد بن زید، صالح المری۔ یہ سب زہد وعبادت میں مشہور تھے۔ ان کے ساتھ مجلس میں حسن بصری رحمہ اللہ زہد وعبادت اور باطنی کیفیات کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اس دوران اگر کوئی شخص کوئی اور مسئلہ چھیڑتا تو آپ ناراض ہو کر فرماتے:

''یہ خلوت کی مجلس ہمارے ان بھائیوں کے ساتھ مذاکرے کے لیے خاص ہے۔''[4]

---

① حلیۃ الاولیاء: ۱۴۷/۲؛ کتاب الزھد، للامام احمد بن حنبل، ص ۲۱۶

② کتاب الزھد، للامام احمد بن حنبل، ص ۲۱۱ ③ سیر اعلام النبلاء: ۵۸۶/۴

④ سیر اعلام النبلاء: ۵۷۹/۴

بے باکانہ حق گوئی:

ان کی کوششیں صرف مسجد اور مدرسے تک محدود نہ تھیں بلکہ وہ حکام کی غلطیوں پر بھی روک ٹوک کرتے تھے۔کوئی دنیاوی ترغیب یا خوف انہیں سچی بات سے نہیں روک سکتا تھا۔ان کے بصرہ میں قیام کے دوران ایک سے زائد مواقع پر عراقیوں نے خلفاء کے خلاف بغاوت کی۔جواب میں حکام نے بھی سخت کارروائی کی۔ایسے مواقع پر جہاں باغی غالب ہوتے وہ عوام کو اپنا ساتھ دینے پر اکساتے۔جہاں حکام کا بس چلتا وہ لوگوں کو اپنی صفوں میں لڑنے پر مجبور کرتے۔ایسے مواقع پر حسن بصری رحمہ اللہ کا قول اور عمل یہ تھا کہ اس مسلم برادر کشی میں کسی بھی فریق کا ساتھ نہ دیا جائے۔ان کی یہ رائے سن کر ایک شامی نے سوال کر دیا:''کیا امیر المؤمنین کا ساتھ بھی نہ دیا جائے؟''

آپ نے پورے جوش کے ساتھ ہاتھ بلند کر کے کہا:''ہاں!نہ امیر المؤمنین کا،نہ امیر المؤمنین کا۔''[1]

اس حق گوئی کی بناء پر حجاج آپ کا مخالف تھا اور آپ اس کے خوف سے ایک مدت تک روپوش بھی رہے۔[2] اس دوران پیاری بیٹی کا انتقال ہوا تو اس کی نمازِ جنازہ بھی نہ پڑھ سکے بلکہ محمد بن سیرین کو پیغام بھیجا کہ وہ پڑھا دیں۔[3]

ظالم حکام کے خلاف درست تدبیر:

ان حالات کے باوجود حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے تھے:

''اللہ کی قسم!اللہ نے حجاج کو عذاب کے طور پر تمہارے اوپر مسلط کیا ہے۔پس تم اللہ کے عذاب کا مقابلہ تلوار سے مت کرو۔بلکہ تم پر لازم ہے کہ سکون اور عاجزی اختیار کرو۔''[4]

آپ لوگوں کو ظالموں کے خلاف خروج سے منع کرتے تھے اور فرماتے تھے:

''اگر لوگ حکمران کی طرف سے آنے والی آزمائش پر صبر کریں تو بہت جلد ان پر سے تکلیف دور کر دی جائے مگر وہ بے صبری کا مظاہرہ کر کے تلوار اٹھاتے ہیں تو انہیں حکمران ہی کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔پھر اللہ کی قسم!انہیں ایک دن بھی خیر نصیب نہیں ہوتی۔''[5]

زندگی کے آخری دور میں حکمرانوں کے ہاں آپ کا مقام ومرتبہ:

حجاج کی موت کے بعد آپ نے روپوشی ختم کر دی،اپنی زندگی کے یہ آخری پندرہ سال آپ نے اس طرح گزارے کہ نہ صرف بڑے بڑے فقہاء ومحدثین بلکہ خلفاء بھی آپ کی طرف رجوع کرتے تھے اور آپ کے فضائل کا اعتراف کرتے تھے۔اموی جرنیل مَسلَمَہ بن عبدالملک نے بصرہ کے کسی شہری سے ان کا حال پوچھا تو اس نے کہا:

''میں ان کا پڑوسی ہوں۔ان کی مجلس میں شریک ہوتا ہوں۔ظاہر اور باطن کے یکساں ہونے اور قول

---

① طبقات ابن سعد: ۷/ ۱٦٤

② سیر اعلام النبلاء: ٤/ ٦١٠؛ طبقات ابن سعد: ۷/ ۲۰٤

③ طبقات ابن سعد: ۷/ ۱٦٤ باسناد صحیح، رجاله رجال البخاري ومسلم

④ البداية والنهاية: ۱۲/ ٥٥٢

⑤ طبقات ابن سعد: ۷/ ۱٦٤ باسناد ضعيف

وفعل کی مطابقت میں ان سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ اگر کسی کام کا کہیں تو اسے پورا کر کے ہی بیٹھتے ہیں۔ اگر کسی بات کا دوسروں کو حکم دیں تو خود اس پر عمل کرنے میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔ اگر کسی شے سے دوسروں کو منع کریں تو خود سب سے بڑھ کر اس چیز سے پرہیز کرتے ہیں۔ میں نے انہیں لوگوں سے بے نیاز دیکھا ہے جبکہ لوگ ان کے محتاج ہیں۔"

مَسلَمہ نے کہا: "بس بس! جس قوم میں ایسا شخص ہو وہ گمراہ نہیں ہو سکتی۔"[1]

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے نام تاریخی مکتوب۔ امام عادل کی صفات:

عمر بن عبدالعزیز خلیفہ بنے تو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کو بصرہ کا قاضی مقرر کر دیا[2] اور اپنے منشورِ حکومت کے لیے ان سے رہنمائی لیتے رہے۔ ایک مکتوب میں انہوں نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے عادل حکمران کی صفات کے بارے میں دریافت کیا۔[3] حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا جواب ایسا تھا کسی بڑے سے بڑے مفکر اور ادیب کے کلام میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ دُنیا کے کسی قوم کے لٹریچر میں نہ تو عادل حکمران کی ایسی تعریف ہے نہ ہی حکمران کے لیے ایسا نصیحت نامہ۔ اس کلام کی ہر ہر سطر دلوں کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا:

"امیر المؤمنین! جان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے امامِ عادل کو ہر کج روی کی درستگی، ہر حد سے بڑھنے والے کے اعتدال، ہر فسادی کی اصلاح، ہر کمزور کی قوت، ہر مظلوم کے انصاف اور ہر فریادی کی پناہ کا ذریعہ بنایا ہے۔

امیر المؤمنین! امام عادل اس چرواہے کی طرح ہوتا ہے جو اپنے اونٹوں کے ریوڑ پر مہربان ہو، جو محتاط اور نرم خو ہو، جو ریوڑ کے لیے بہترین چراگاہ ڈھونڈے، اُسے ہلاکت کی وادیوں سے بچائے، درندوں سے محفوظ رکھے اور سردی وگرمی سے اس کی حفاظت کرے۔

امیر المؤمنین! امام عادل بچوں پر شفقت کرنے والے باپ کی طرح ہوتا ہے، ان کے بچپن میں انہیں کما کر کھلاتا ہے، ان کے لڑکپن میں انہیں تعلیم دیتا ہے۔ اپنی زندگی میں ان کے لیے کمائی کرتا ہے اور اپنی وفات کے بعد کے لیے انہیں ذخیرہ دے کر جاتا ہے۔

امیر المؤمنین! امام عادل شفیق ماں کی مانند ہوتا ہے جو اولاد کے لیے نہایت نرم دل ہوتی ہے، حمل میں ان کا بوجھ اٹھاتی ہے، تکلیف اٹھا کر انہیں جنتی ہے۔ بچپن میں انہیں پالتی ہے۔ ان کے جاگنے پر جاگتی اور ان کے سکون پر مطمئن ہوتی ہے۔ کبھی انہیں دودھ پلاتی اور کبھی دودھ چھڑاتی ہے۔ اس کی عافیت پر خوش اور اس کی تکلیف پر غمگین ہوتی ہے۔

[1] اخبار القضاۃ للوکیع: ۲/۱۲ [2] المعرفۃ والتاریخ: ۲/۴۹

[3] حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے جواب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک عراق میں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی اصلاحات کا اثر ظاہر نہیں ہوا تھا۔ یعنی عمر بن عبدالعزیز نے حکومت سنبھالتے ہی حضرت حسن بصری کو مکتوب بھیج کر رہنمائی کی درخواست کی تھی اور انہوں نے جواب میں یہ مفصل نصیحت نامہ ارسال کر دیا تھا۔

امیرالمؤمنین! امام عادل کی حیثیت ایسی ہے جیسے اعضاء کے درمیان قلب کی۔ قلب درست ہو تو اعضاء درست رہتے ہیں، وہ خراب ہو تو یہ بھی خراب ہو جاتے ہیں۔

امیرالمؤمنین! امام عادل اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان کھڑا ہوتا ہے۔ اللہ کا کلام سن کر انہیں سناتا ہے۔ اللہ (کے حکم) کو دیکھتا اور انہیں دکھاتا ہے۔ اللہ کا تابع رہتا اور انہیں تابع رکھتا ہے۔ پس امیر المؤمنین! آپ اللہ کی دی ہوئی ملکیت میں اُس غلام کی طرح مت بنئے جسے اس کا آقا امانت سونپے، اپنا مال اور اولاد اس کی حفاظت میں دے مگر وہ مال میں خیانت کرے اور اولاد سے بے رُخی برتے، پس وہ آقا کے گھر والوں کو مفلس اور اس کے مال کو تباہ کر دے۔

امیرالمؤمنین! یاد رکھیے! اللہ نے کچھ حدود طے کی ہیں تاکہ بُری اور بے حیائی کی باتوں سے لوگوں کو روکے۔ پس کیا حال ہوگا اگر ان حدود کے محافظ ہی ان کا ارتکاب کریں۔ اللہ نے اپنے بندوں کی حیات کے لیے قصاص کا حکم نازل کیا ہے، پس کیا حال ہوگا اگر بندوں کو وہی شخص قتل کرے جس کے ذمے ان کا قصاص لینا ہے؟

امیرالمؤمنین! آپ موت اور اس کے بعد کی زندگی اور اس وقت اپنے ساتھیوں اور مددگاروں کی کمی کو یاد رکھیں اور قیامت کے بڑے ہولناک وقت کے لیے تیاری کر لیں۔

امیرالمؤمنین! جان لیں کہ آپ جس گھر میں ہیں، آپ کے لیے اس کے علاوہ بھی ایک گھر ہے، جس میں آپ کو طویل عرصے قیام کرنا ہے۔ آپ کے دوست آپ سے جدا ہو جائیں گے۔ ایک گڑھے میں آپ کو اکیلا تنہا چھوڑ جائیں گے۔ پس آپ وہ چیز تیار رکھیں جو اس دن آپ کا ساتھ دے جب آدمی اپنے بھائی، اپنی ماں، اپنے باپ، اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگتا پھرے گا۔

امیرالمؤمنین! اس وقت کو یاد رکھیں جب قبروں میں جو کچھ ہے وہ ظاہر ہوگا اور جو دلوں میں ہے وہ سامنے آجائے گا۔ راز کھل جائیں گے۔ اعمال نامہ کوئی چھوٹی بڑی بات شمار کیے بغیر نہ چھوڑے گا۔

امیرالمؤمنین! ابھی موت سے قبل اُمید کے ختم ہونے سے پہلے پہلے آپ کو مہلت ہے۔ امیرالمؤمنین! اللہ کے بندوں پر جاہلوں کی طرح حکم نہ چلائیں۔ انہیں ظالموں کی راہ پر مت لے جائیں۔ کمزوروں پر متکبر لوگوں کو مسلط نہ کریں؛ کیوں کہ یہ لوگ کسی مؤمن کے بارے میں نہ تو رشتے کا لحاظ کرتے ہیں نہ کسی عہد کا۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو پھر آپ اپنے گناہوں کے ساتھ ان کے گناہوں کا بار بھی اٹھائیں گے۔ اپنے بوجھ کے ساتھ ان کا بوجھ بھی آپ کو لادنا پڑے گا۔ آپ کو وہ لوگ دھوکے میں نہ ڈالیں جو ایسا لطف اٹھا رہے ہیں جو آپ کی مصیبت کا ذریعہ بنے گا۔ وہ دنیا کے ایسے مزے لوٹ رہے ہیں جن کی وجہ سے آپ آخرت کے مزوں سے محروم ہو جائیں گے۔ اپنے آج کے اقتدار کو مت دیکھیے۔ بلکہ کل اپنے اس وقت کے اختیار کو

دیکھیں جب آپ موت کے پھندوں میں گرفتار ہوں گے، آپ کو فرشتوں، انبیاء اور رسولوں کے مجمعے میں اللہ کے سامنے کھڑا کیا جائے گا جبکہ تمام چہرے اس حی و قیوم کے سامنے جھکے ہوں گے۔

امیر المؤمنین! میں آپ کو ویسی نصیحت نہیں کر سکا جیسی مجھ سے پہلے سمجھ دار لوگ کیا کرتے تھے مگر میں نے آپ کے لیے شفقت اور خیر خواہی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میرے مکتوب کو اس دوست کی تیمارداری سمجھیے جو کڑوی دوا پلاتا ہے؛ کیوں کہ اس میں صحت و عافیت کی اُمید ہوتی ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ [1]

تاریخ گواہی دیتی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے حسن بصری رحمہ اللہ کے اس مکتوب کو حرزِ جان بنا کر رکھا اور اپنے عمل سے یہ ثابت کر کے دکھایا کہ امام عادل درحقیقت کیسا ہوتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز کے ہاتھوں برپا ہونے والے انقلاب کے پیچھے حسن بصری رحمہ اللہ کی جو علمی و فکری مساعی اور دردِ دل کارفرما تھا، مذکورہ مراسلہ اس کا واضح ثبوت ہے۔

وفات:

حسن بصری رحمہ اللہ نے ساٹھ سال تک اصلاح و دعوت کے فرائض انجام دینے کے بعد رجب ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔ آپ کی عمر ۸۸ سال تھی۔ وفات سے پہلے بے ہوشی طاری ہوئی۔ پھر ذرا افاقہ ہوا تو فرمایا:

''تم نے جگا دیا، میں تو باغات اور نہروں میں اور عزت کے مقام میں تھا۔''

کچھ دیر بعد آپ نے جان خالقِ حقیقی کے سپرد کر دی۔ نمازِ جمعہ کے بعد جنازہ ہوا جس میں اس قدر ہجوم تھا کہ اس شہر کے گلی کوچے سنسان ہو گئے۔ بصرہ کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ اس دن جامع مسجد میں عصر کی نماز باجماعت نہ ہو سکی؛ کیوں کہ شہر کے سب لوگ تدفین میں شرکت کے لیے قبرستان گئے ہوئے تھے۔ [2]

ان کی جامعیت اور مقبولیت:

حسن بصری رحمہ اللہ کی خداداد مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمان تو مسلمان غیر مسلم بھی ان کے کمالات کا اعتراف کرتے رہے۔ ان کی جامعیت کو بیان کرتے ہوئے تیسری صدی ہجری کا ایک غیر مسلم مؤرخ ثابت بن قرۃ کہہ اٹھا کہ وہ امت محمدیہ کی ان ممتاز ترین شخصیات میں سے ایک ہیں جو دوسری قوموں کے لیے قابلِ رشک ہیں۔ ثابت بن قرۃ لکھتا ہے:

''وہ علم و تقویٰ، زہد و پرہیز گاری، پاکیزہ طبعی و نرم دلی، للّٰہیت و شائستہ مزاجی، فقہ و معرفت اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے ایک تابندہ ستارے تھے...... ان کا ظاہر ان کے باطن کے عین مطابق تھا۔ انہوں نے سات دہائیاں اس طرح گزاریں کہ کبھی ان کی زبان سے کوئی گرا ہوا لفظ نہیں سُنا گیا۔ ان پر کسی بے ہودگی کا الزام تک نہیں لگا۔ وہ سلیم الطبع، خوبصورت اور معزز تھے۔ ان کی مجلس

[1] العقد الفرید: ۹/۱ ، ۱۰ ؛ التذکرۃ الحمدونیۃ: ۱۸۵/۳، ۱۸۶، ط دار صادر

[2] سیر اعلام النبلاء: ۵۸۷/۴

میں ہر قسم کے افراد تھے اور ہر کوئی ان سے استفادہ کرتا تھا۔ کوئی حدیث سن رہا ہے، کوئی تفسیر سیکھ رہا ہے، کوئی فقہ کے درس میں بیٹھا ہے، کوئی کلام عرب (کی باریکیاں) جان رہا ہے، کوئی ان کے ملفوظات لکھ رہا ہے، کوئی فتویٰ لے رہا ہے، کوئی مقدمات حل کرنے اور قاضی کی ذمہ داریاں ادا کرنے کی تربیت لے رہا ہے، کوئی وعظ سن رہا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک وسیع سمندر ہیں جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے، یا ایک چراغ ہیں جو روشنی پھیلا رہا ہے۔ حکمرانوں کے سامنے دوٹوک کلام، بہترین الفاظ اور کھلے دل کے ساتھ نیکی کا حکم دینے، گناہوں سے روکنے اور کلمۂ حق بلند کرنے میں ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ وہ خطابت میں حجاج بن یوسف اور اُس جیسوں کے ہم پلہ تھے جبکہ دین کا رنگ، علم کی رونق اور تقویٰ کی رحم دلی اس پر مستزاد تھی۔ انہیں اللہ کی خاطر کسی کی ملامت کی پروا نہ تھی، کوئی چمک دار چیز انہیں اللہ سے غافل نہیں کرتی تھی۔ قتادہ جیسے مفسر، عَمرو بن عبید اور واصل بن عطاء جیسے مناظر، ابن ابی اسحٰق جیسے نحوی اور فرقد جیسے نکتہ رس لوگ ان کی کرسی کے نیچے بیٹھا کرتے تھے۔ کون ہے جو ان جیسا ہو؟ اور کون ہے جو ان کی جگہ لے سکے۔''[1]

◆◆ ◆

---

[1] معجم الأدباء للحموی: ۲۱۱۳/۵

حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ

ابوبکر محمد ابن سیرین رحمہ اللہ بھی اس دور کے ان علمائے کبار میں شامل ہیں جن کی علمی و اصلاحی کوششوں سے دنیا آج تک فیض یاب ہوتی آ رہی ہے۔

خاندان، بچپن اور تحصیل علم کا زمانہ:

آپ بھی ایک غلام گھرانے کی اولاد تھے مگر اُمت کے سردار شمار ہوئے۔ آپ کی والدہ صفیہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی آزاد کردہ باندی تھیں۔ والد سیرین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عراق سے مدینہ لائے جانے والے قیدیوں میں شامل تھے، یہ غلامی درحقیقت ہزار آزادیوں سے بڑھ کر تھی؛ کیوں کہ وہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے حصے میں آئے تھے۔ اسی گھر میں محمد بن سیرین رحمہ اللہ کی ولادت ۲۱ ہجری میں ہوئی۔ خادم رسول انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی طویل صحبت اور دیگر صحابہ کے فیض نے انہیں علم وعمل کا پیکر بنا دیا۔ انہوں نے تیس صحابہ کرام سے علم حاصل کیا تھا جن میں حضرت ابوہریرہ، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عدی بن حاتم اور عمران بن حصین رضی اللہ عنہم جیسے اصحاب شامل تھے۔ [1]

علمی صلاحیت:

وہ ذہانت اور حافظے کے اعتبار سے تاریخ کی چند مثالی شخصیات میں شمار ہوتے ہیں۔ احادیث کے بڑے پختہ حافظ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام لفظ بلفظ یاد تھا۔ ایک حرف اِدھر اُدھر نہیں ہوتا تھا۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ مدینہ سے بصرہ منتقل ہوئے تو یہ بھی ان کے ساتھ آ گئے۔ ان کی زندگی کا زیادہ حصہ بصرہ میں گزرا۔ ان کی علمی پختگی اور فقاہت روز بروز دنیا پر عیاں ہوتی گئی۔ کہا جاتا تھا کہ بصرہ میں ان سے بڑا فقیہ اور کوئی نہیں۔ [2]

وہ ریاضی کے ماہر تھے۔ فقہی معاملات خصوصاً میراث کے مسائل پر انہیں زبردست عبور حاصل تھا۔ میراث کا مشکل سے مشکل مسئلہ پل جھپکنے میں حل کر لیتے تھے۔ [3]

حسن بصری رحمہ اللہ کی طرح آپ بھی معاشرے میں مال و دولت کی کثرت کے باعث در آنے والے نفس پرستی کے آثار سے اندیشہ کرتے تھے۔ آپ خواہشاتِ نفس کی پیروی کو سخت خطرناک سمجھتے تھے اور اسے دین سے انحراف کے مترادف قرار دیتے تھے۔ آپ خطرہ محسوس کرتے تھے کہ جو لوگ اللہ کی رضا اور رسول کی اطاعت پر نفس کی خوشی کو ترجیح

---

① سیر اعلام النبلاء: ۶۰۶/٤، ۶۰۷، نیز ۶۲۲
② طبقات ابن سعد: ۱۹۶/۷
③ التاریخ الکبیر للبخاری: ۹۰/۱

دیتے ہیں، وہ کسی بھی وقت دین سے خارج ہو سکتے ہیں۔ آپ فرماتے تھے:

"نفس کے غلام، ارتداد کی طرف سب سے پہلے لپکتے ہیں۔"[①]

اُصولِ حدیث کی تدوین:

آپ نے حدیثِ رسول کے لیے سند کی تحقیق کے اہتمام پر بطورِ خاص زور دیا اور اس سلسلے میں رہنما اصول پیش کیے۔ آپ کا یہ قول علمائے حدیث کے نزدیک ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے:

"إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ، فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَأْخُذُوْنَ دِيْنَكُم."

"بے شک یہ علم، دین ہے۔ پس تم دیکھا بھالا کرو کہ اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو۔"[②]

آپ ایسے راویوں سے حدیث نقل کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے جو کسی بدعت، نظریاتی کج روی یا نفس پرستی میں مبتلا ہوں۔ آپ فرماتے تھے: "ہم ایسے لوگوں سے روایت نہیں سننا چاہتے۔ انہیں عزت نصیب نہ ہو۔"

اہلِ تشیع کے برخلاف آپ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی امانت و دیانت کو غیر مشکوک مانتے تھے اور فرماتے تھے:

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر حدیث رسول کے بارے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔"[③]

تقویٰ اور پرہیز گاری:

محمد ابن سیرین رحمہ اللہ کے تقویٰ اور پرہیز گاری کا یہ عالم تھا کہ کہا جاتا تھا:

"انہیں جس طرح چاہو آزما لو۔ وہ سب سے زیادہ متقی اور نفس پر سب زیادہ قابو رکھنے والے ثابت ہوں گے۔"[④]

آپ نہایت عبادت گزار تھے۔ ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزہ رکھنا آپ کا معمول تھا۔[⑤]

ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ تجارت آپ کا پیشہ تھا۔ بازار اکثر آنا جانا ہوتا تھا۔ بازار سے گزرتے تو بھی زبان پر اللہ کا ذکر ہوتا۔[⑥]

ناجائز منافع سے بچنے کے لیے اصل سرمایہ تلف کر دیا:

آپ تجارت کرتے تھے۔ اس میں نہ صرف ناجائز نفع خوری بلکہ مشکوک فائدے سے بھی بچتے تھے۔ گاہکوں کو نقصان سے بچانے کے لیے بڑے سے بڑا نقصان برداشت کر لیتے تھے۔[⑦] ایک بار آپ کے روغنِ زیتون کے کسی برتن سے مرا ہوا چوہا نکلا۔ یہ معلوم نہ ہوا کہ کون سے برتن سے نکلا ہے۔ آپ نے وہ سارا تیل بہا دیا۔ حالانکہ وہ آپ نے چالیس ہزار درہم قرض لے کر خریدا تھا۔ جب اس کی ادائیگی بروقت نہ ہوئی تو قرض خواہوں نے مقدمہ کر دیا جس کے باعث آپ کو کچھ مدت جیل میں بھی رہنا پڑا۔ مگر لوگوں کو حرام کھلا کر نفع وصول کرنا آپ کو گوارا نہ ہوا۔[⑧]

① سیر اعلام النبلاء: ٤/ ٦١٠
② مقدمہ صحیح مسلم، ص ١١
③ سیر اعلام النبلاء: ٤/ ٦١٢
④ طبقات ابن سعد: ٧/ ١٩٦
⑤ طبقات ابن سعد: ٧/ ٢٠٠
⑥ سیر اعلام النبلاء: ٤/ ٦١٠
⑦ طبقات ابن سعد: ٧/ ١٩٨، ١٩٩
⑧ سیر اعلام النبلاء: ٤/ ٦٠٩، ٦١٣

سزا برداشت۔ حکومت سے خیانت ناقابلِ برداشت:

جیل میں آپ کی پرہیزگاری مثالی رہی۔ جیل خانے کا داروغہ آپ کا عقیدت مند تھا۔ وہ آپ سے کہتا تھا:

"آپ کو اجازت ہے، رات کو چپکے سے گھر تشریف لے جایا کریں۔ صبح واپس آجایا کریں۔"

آپ جواب میں فرماتے: "اللہ کی قسم! میں حکومت سے خیانت میں تمہارا ساتھی نہیں بنوں گا۔"[1]

اپنا کڑا محاسبہ:

آپ وعظ و تقریر کے عادی نہ تھے، اس سے کہیں زیادہ آپ اپنے عمل سے لوگوں کے سامنے ایک اچھے مسلمان کا نمونہ پیش کرتے تھے۔ خود کو ہمیشہ ایک عام آدمی سمجھتے تھے۔ اپنا کڑا محاسبہ کرتے۔ اپنی غلطیوں پر ہر لمحے نگاہ رکھتے۔ بھول چوک کی فوری تلافی کرتے۔ زبان سے نکلے ہوئے ایک غلط لفظ پر بھی سب کے سامنے اپنا احتساب کر ڈالتے۔ ایک بار کسی آدمی کا ذکر کرتے ہوئے آپ کے منہ سے نکل گیا: "وہ کالا شخص!"

پھر یکدم چونکے اور پشیمان ہو کر فرمایا: "إنا للہ! یہ تو میں نے اس کی غیبت کر ڈالی۔"[2]

تجارت میں نقصان ہو جانے کے سبب عمر کا ایک دور آپ نے بڑی تنگ دستی میں گزارا۔ آپ اس کی وجوہ پر غور کرتے تو خود ہی کو قصوروار ٹھہراتے۔ مدتوں پہلے آپ نے کسی شخص کو اس کی مفلسی پر شرم دلائی تھی۔ اس بات کو جب بھی یاد کرتے نادم ہو جاتے۔ ایک بار فرمایا:

"تیس سال پہلے میں نے ایک گناہ کیا تھا، آج میری یہ مفلسی اسی کی سزا ہے۔"[3]

آپ کی یہ بات ابوسلیمان دارانی رحمہ اللہ کو پہنچی تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھے:

"یقیناً ان حضرات کے گناہ بہت کم تھے جو کسی مصیبت کے آنے پر سمجھ جاتے تھے کہ کس بات کی سزا ہے۔ آج ہمارے گناہ اتنے ہیں کہ ہمیں سمجھ نہیں آسکتا کہ کونسی پریشانی کس گناہ کی سزا ہے۔"[4]

خوش خلقی اور خوش لباسی:

آپ کی طبیعت میں ذرا بھی خشکی نہ تھی۔ بڑے خوش مزاج تھے۔ بات بات پر ہنستے مسکراتے تھے۔ لیکن اللہ کی یاد سے ایک پل غافل نہ ہوتے تھے۔ جب اللہ اور رسول کی بات آتی یا کوئی دینی مسئلہ پوچھا جاتا تو آپ کا رنگ بدل جاتا، ادب واحترام اور سنجیدگی کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ ایسے میں لگتا کہ یہ وہ شخص ہے ہی نہیں جو کچھ دیر پہلے خوش وخرم دکھائی دے رہا تھا۔[5] آپ مہندی کا خضاب لگاتے تھے، سفید عمامے کے ساتھ اچھے اور صاف کپڑے زیب تن کرتے۔ گھریلو زندگی بڑی شائستہ اور باوقار تھی۔ اپنی والدہ کا نہایت احترام کرتے۔ ان سے ہمیشہ بڑی دھیمی آواز سے گفتگو کرتے۔ ان کے لیے بہترین اور ملائم ترین کپڑا پسند کر کے لے جاتے۔[6]

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ٤/٦١٦، ٦١٧
[2] سیر اعلام النبلاء: ٤/٦١٥
[3] سیر اعلام النبلاء: ٤/٦١٣
[4] حلیة الاولیاء: ٢/٢٧١
[5] المعرفة والتاریخ: ٢/٦٤
[6] سیر اعلام النبلاء: ٤/٦١٩

مہدی بن میمون رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''میں نے محمد بن سیرین کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو باتیں سنا رہے ہیں، اشعار پڑھ رہے ہیں اور ہنسے جا رہے ہیں مگر جب حدیث شریف سنانے لگتے تو یکدم سنجیدہ ہو جاتے تھے۔''①

اس طرح اپنے عمل سے آپ ایک متوازن زندگی اور معتدل مزاج کا نمونہ پیش کرتے ہوئے یہ بتاتے تھے کہ ہنسنا بولنا دین میں منع نہیں ہے، نہ اس سے پرہیزگاری اور تقویٰ پر کوئی اثر پڑتا ہے مگر اللہ اور رسول کے تذکرے اور دینی معاملات میں ادب واحترام اور وقار کا دامن تھامنا ضروری ہے۔

حکام سے لاتعلقی:

محمد ابن سیرین رحمہ اللہ خود کفیل رہنے کے قائل تھے۔ حسن بصری رحمہ اللہ حکام سے ملتے بھی تھے اور ان کی غلطیوں پر تنقید بھی کیا کرتے تھے۔ مگر ابن سیرین رحمہ اللہ حکمرانوں سے بالکل لاتعلق رہتے تھے۔ ان کی حمایت کرتے نہ مخالفت۔ تعریف کرتے نہ مذمت۔② حکام کے ہدیے لینے سے بھی سخت پرہیز کرتے تھے۔ اس میں کسی اچھے برے حاکم کا استثناء نہ تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جیسے خلیفۂ عادل نے ہدیہ بھیجا مگر آپ نے وہ بھی قبول نہ کیا۔③

علم تعبیر کے امام:

جس چیز نے آپ کو تاریخ میں سب سے زیادہ شہرت بخشی وہ علم تعبیر میں آپ کی مہارت تھی۔ یہ ایک خداداد نعمت تھی جو شاید ہی اس قدر فراوانی سے کسی اور کو نصیب ہوئی ہو۔ اس فن میں آپ ضرب المثل تھے۔ اس موضوع پر آپ کی تصنیف ''تعبیر الرؤیا'' ہر دور میں معروف ومقبول رہی ہے۔ یہ اسلامی لٹریچر کی قدیم ترین کتب میں سے ایک ہے۔

آپ عجیب وغریب خوابوں کی ایسی برمحل اور درست تعبیر نکالتے کہ لوگ حیرت زدہ رہ جاتے۔

ایک شخص خوارج کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگا تھا۔ اس نے آکر آپ سے عرض کیا: ''میں نے خواب دیکھا کہ کچھ لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جنازہ لیے جا رہے ہیں اور میں ساتھ ساتھ ہوں۔''

آپ نے فرمایا: ''تم ایسے لوگوں کے ساتھ ہو گئے ہو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو دفن کر رہے ہیں۔''④

ایک شخص نے آکر کہا: ''میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میرے ہاتھ میں پانی کا پیالہ ہے۔ پھر پیالہ ٹوٹ جاتا ہے اور پانی بچ جاتا ہے۔'' آپ نے فرمایا: ''تمہاری بیوی کے ہاں ولادت ہوگی۔ بچہ باقی رہے گا اور بیوی مرجائے گی۔''

بالکل ویسا ہی ہوا جیسا آپ نے فرمایا تھا۔⑤

فنِ تعبیر پر آپ کی علمی یادگار ''تفسیر الاحلام'' ہر دور میں مشہور و معروف رہی ہے جس میں مختلف قسم کے خوابوں کی تعبیریں بتائی گئی ہیں۔ یہ اسلامی کتب خانوں میں موجود پہلی صدی ہجری کی گنی چنی تصانیف میں سے ایک ہے۔

① سیر اعلام النبلاء: ٦١٢/٤
② سیر اعلام النبلاء: ٦١٥/٤
③ سیر اعلام النبلاء: ٦١٥/٤
④ سیر اعلام النبلاء: ٦١٧/٤
⑤ سیر اعلام النبلاء: ٦١٧/٤

وفات حسرت آیات:

آپ نے اپنی وفات کا اندازہ بھی ایک خواب کی تعبیر سے لگا لیا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ جوزاء ستارے ثریا سے آگے نکل گئے۔ بیدار ہوئے تو اپنی وصیت لکھوانا شروع کر دی اور فرمایا: ''حسن بصری مجھ سے پہلے وفات پا جائیں گے۔ پھر ان کے پیچھے میں بھی چلا جاؤں گا۔ ان کا مقام مجھ سے بالاتر ہے۔''[1]

ایسا ہی ہوا۔ رجب حضرت میں حسن بصری رحمہ اللہ فوت ہوئے اور اس کے تین ماہ دس دن بعد شوال ۱۱۰ھ میں محمد بن سیرین رحمہ اللہ نے وفات پائی۔[2]

ورثاء کو آخری وصیت:

ورثاء کو آپ کی آخری وصیت یہ تھی:

''اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا۔ اپنی اصلاح کرتے رہنا۔ اگر مؤمن ہو تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنا۔ اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لیے یہ دین پسند کر لیا ہے، پس تم مسلمان ہی رہ کر مرنا۔ اپنے انصار بھائیوں اور آزاد کردہ غلاموں کا خیال نہ چھوڑنا۔ پاکبازی، زناکاری سے بہتر ہے اور سچائی جھوٹ سے اعلیٰ ہے۔''[3]

آپ کی وفات کے بعد کسی نے خواب دیکھا کہ آپ کے بارے میں کہا جا رہا ہے:

''وہ ایسے مقام پر ہیں کہ جو چاہیں اور جو خواہش کریں انہیں میسر ہے۔''

ایک شخص نے خود ابن سیرین رحمہ اللہ کو خواب میں دیکھا، ان کا اور حسن بصری رحمہ اللہ کا حال پوچھا۔ آپ نے فرمایا:

''وہ مجھ سے ستر درجے اوپر ہیں۔''

اس شخص نے پوچھا: ''یہ کیوں؟ ہم تو آپ کو زیادہ بلند مرتبہ سمجھتے تھے۔''

آپ نے جواب دیا: ''اپنے خوف اور غم کے سبب۔''[4]

❖❖ ❖

---

① حلیۃ الاولیاء: ۲/۲۷۷

② سیر اعلام النبلاء: ٤/٦٢١

③ طبقات ابن سعد: ۷/۲۰۵

④ سیر اعلام النبلاء: ٤/٦٢٢

عالم اسلام میں مذہبی اختلافات اور علمائے اُمت کا کردار

بنوامیہ کے دورزوال تک عالم اسلام میں مذہبی اختلافات خاصے گہرے ہو چکے تھے۔ اکثر اختلافات کی بنیاد کچھ سوالات تھے جن کا تعلق صحابہ کرام کے کردار اور ان کے دور میں رونما ہونے والے سیاسی تنازعات سے تھا۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور تک مسلمانوں میں کوئی سیاسی اختلاف تھا نہ مذہبی۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ثابت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کردار کو ایک سازش کے تحت متنازعہ بنا کر ان کے خلاف شورش کی گئی۔ یہیں سے مسلمانوں میں ان سیاسی اختلافات نے جنم لیا جن کے نتیجے میں جمل اور صفین جیسے سانحے پیش آئے جن کے بارے میں خود بخود کئی سوالات پیدا ہوئے۔ مثلاً یہ کہ جنگِ جمل وصفین اور جنگِ نہروان میں کونسا فریق حق پر تھا؟ کسی فریق کے حق یا باطل پر ہونے کے دلائل کیا ہیں؟ اگر کوئی فریق غیر جانب دار رہا تو آخر کیوں؟ اس کے پاس کیا دلیل تھی؟

بلاشبہ صحابہ کرام کے درمیان رونما ہونے والے اختلافات اعتقادی نوعیت کے ہرگز نہ تھے، تاہم مختلف حلقوں سے وابستہ لوگوں نے بعد میں اپنے اپنے حلقے کے موقف کو مضبوط کرنے کے لیے مذہبی بنیادیں بھی تلاش کیں۔ اس تلاش میں بعض لوگوں نے اعتدال کا دامن تھاما اور صرف قرآن مجید اور صحیح احادیث کو اپنا راہ نما بنایا۔ یہ لوگ سیاسی اختلافات کے بارے میں صراطِ مستقیم پر قائم رہے۔ ان کا تعلق کوفہ سے ہو یا دمشق سے، یمن سے ہو یا حجاز سے، ان کا اختلاف ایک حد سے آگے نہ بڑھا۔ یہی لوگ امت کا سوادِ اعظم تھے جو اہلِ سنت والجماعت کے نام سے ممتاز ہوئے۔

تاہم بعض لوگوں نے اپنے اپنے گروہوں کو دینی بنیادیں فراہم کرنے میں مبالغے بلکہ جعل سازی سے کام لیا۔ انہوں نے اپنی جماعت کی حمایت اور فریقِ مخالف کی مذمت میں نہ صرف ضعیف باتوں کا سہارا لیا بلکہ خود ساختہ روایات بھی عام کیں۔ پھر مختلف الخیال گروہوں کے مابین یہ کش مکش صرف بحث ومباحثے تک ہی محدود نہیں رہی تھی بلکہ ان کی وجہ سے کشت وخون کے واقعات بھی پیش آئے تھے جس سے بہت سے لوگوں میں اعتدال کی جگہ اشتعال بڑھتا گیا اور وہ کسی ایک فریق کی حمایت اور دوسرے کی مذمت میں حدود وقیود سے آزاد ہونے لگے۔ اس طرح سیاسی گروہ آگے چل کر الگ الگ مذہبی فرقے بنتے چلے گئے۔ کوئی شیعانِ علی بنے اور کوئی شیعانِ عثمان اور شیعانِ معاویہ۔

بعض گمراہ فرقے خود کو کسی صحابی کی طرف منسوب نہیں کرتے تھے بلکہ خودرائی پر مصر تھے جیسے خوارج۔ تشیع میں انتہاپسند لوگ اعتقادی مسائل میں بھی کتاب وسنت سے منحرف تھے جیسے سبائی جن کے بارے میں ہم متعدد مقامات پر بتا چکے ہیں کہ ان کی داغ بیل عبداللہ بن سبا یہودی نے رکھی تھی۔ سبائیوں کے علاوہ بھی بعض فرقے یہود نے ایک

سوچی سمجھی سازش کے تحت پیدا کیے تھے جیسے جہمیہ۔ بعض فرقہ بندیوں پر نصرانیت کے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں جیسے "فرقۂ قدریہ" کا بانی سنسویہ پہلے نصرانی تھا۔ عراق ایسے اختلافات کا سب سے بڑا مرکز تھا؛ کیوں کہ جمل، صفین، نہروان، کربلا اور دیر جماجم جیسے بڑے بڑے معرکے اور انقلابات یہیں پیش آئے تھے؛ اس لیے یہاں ہر وقت ایک جماعت کے برحق اور دوسرے کے باطل ہونے کی بحث چلتی رہتی تھی۔ خود اہلِ عراق کی افتادِ طبع بھی نت نئے خیالات قبول کرنے اور شورشوں میں کود پڑنے کی تھی؛ اس لیے اکثر نئے فرقوں نے یہیں سے جنم لیا۔ حتیٰ کہ اُموی دور ہی میں یہاں بعض مدعیانِ نبوت تک پیدا ہو چکے تھے۔ کوفہ کے گورنر خالد بن عبداللہ قسری نے ایک مدعیٔ نبوت کو گرفتار کر کے اس سے نبوت کی دلیل مانگی تو اس نے دعویٰ کیا کہ اس پر قرآن نازل ہوا ہے۔ پھر یہ تک بندی سنائی:

"اِنَّا اَعْطَيْنَا كَ الْجَمَاهِر، فَصَلِّ لِرَبِّ لَكَ وَلَاتُجَاهِر، وَلَا تُطِعْ كُلَّ كَافِرٍ وَفَاجِر."

(ہم نے تجھے بڑی چیزیں دیں، پس تو اپنے رب کی نماز پڑھ اور کھلی نافرمانی مت کر اور کسی کافر و فاجر کی پیروی نہ کر۔)

گورنر نے اسے سولی دینے کا حکم دیا۔ جب اسے قتل کیا جا رہا تھا تو وہ کہہ رہا تھا:

"اِنَّا اَعْطَيْنَا كَ الْعَمُوْد، فَصَلِّ لِرَبِّ لَكَ عَلٰى عُوْد، فَاَنَا ضَامِنٌ اَنْ لَا تَعُوْد."

(ہم نے تجھے یہ کھمبا عنایت کیا۔ پس تو اپنے رب کے لیے نماز پڑھ لکڑی پر۔ میں ذمہ دار ہوں کہ تو واپس نہ آئے گا۔)

اسی گورنر کے دور میں مغیرہ نامی ایک شخص پکڑا گیا جو مردوں کو زندہ کرنے کا دعوے دار تھا۔ گورنر نے اسے بھی سزائے موت دی۔[1] غرض ایسے لوگ کم نہ تھے جو عراق و خراسان کے ماحول میں بد دینی کی تحریکوں کے پنپنے کی گنجائش دیکھ کر میدان میں اترتے رہے۔ تاہم زیادہ پھلنے پھولنے والے فرقے چند ہی تھے۔

اکثر فرقوں کا آغاز مشاجراتِ صحابہ پر رائے زنی سے ہوا تھا۔ خانہ جنگیوں کے بعد جب امن قائم ہوا تو ہر جماعت کے لوگ اپنی اپنی جگہ ان المناک واقعات کو یاد کر کے مضطرب ہوتے تھے اور اپنی اپنی عقل سے ان کا تجزیہ کرتے تھے۔ عراق و شام میں جاری مباحثوں کا اہم ترین سوال یہ تھا اگر ہم مشاجرات میں برحق تھے تو دوسرے فریق کو کیا کہیں گے؟ اگر ہم حق پر نہ تھے اور ہم نے ناحق خون خرابے میں ہاتھ رنگے تھے تو ہماری حیثیت کیا ہے؟ قرآن کی اس آیت کا کیا مطلب ہوگا جس میں کہا گیا ہے: وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا

(اور جو کوئی بھی کسی مومن کو قتل کرے جان بوجھ کر تو اس کا بدلہ ہے جہنم، اس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔)[2]

لوگوں نے اس مسئلے کو الگ الگ پہلوؤں سے دیکھ کر مختلف آراء قائم کر لیں۔ پھر ہر رائے سے کئی فرعی نتائج نکلے تو وہ لوگ ان پر بھی اصرار کرنے لگے۔ ان کے مخالفین نے ان کے تجزیے کو شدومد سے مسترد کر کے اس کے بالکل برعکس رائے لے آئی۔ ایسے میں کوئی تیسری جماعت اٹھی اور فریقین کو متشدد قرار دے کر ایک نئی اور بزعمِ خود "معتدل" رائے پیش کر دی۔ جس رائے پر کچھ لوگ جمع ہو گئے وہ ایک مستقل فرقہ بن گیا۔ یوں درج ذیل فرقے نمودار ہو گئے:

[1] البداية والنهاية: ۱۳/ ۲۲۰ تحت ۱۲۶ھ

[2] سورۃ النساء، آیت: ۹۳

① شیعہ

اب شیعانِ علی چونکہ خود کو حق پر کہتے تھے؛ اس لیے ان کے متشدد لوگوں نے طے کر دیا کہ جمل اور صفین کی جنگوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالفین ناحق قتل عمد کے مرتکب ہوئے تھے؛ اس لیے وہ نہ صرف گناہِ کبیرہ کے مرتکب تھے بلکہ آیتِ مذکورہ کے مطابق جہنمی بھی تھے، ان سے منقول کوئی بھی حدیث قابلِ قبول نہیں۔ یہ تشیع میں تشدد کا پہلا قدم تھا۔

پھر چونکہ سبائی گروہ شیعانِ علی میں گھل مل کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وصی رسول اللہ ہونے کا پرچار کر رہا تھا؛ لہٰذا متشدد شیعوں نے اس بات کو بھی اپنا عقیدہ بنالیا۔ اس عقیدے کی وجہ سے کچھ اور سوال پیدا ہوئے مثلاً یہ کہ امام کا تعین شرعاً کیسے ہوتا ہے؟ امام کی پیروی نہ کرنے والوں کا حکم کیا ہے؟ ان کے جوابات بنانے میں گمراہی کا سفر تیز تر ہوگیا۔ یہاں تک کہ دوسری صدی ہجری میں شیعوں کی اکثریت چند بالکل نئے نظریات کی حامل بن گئی جن کا خلاصہ یہ ہے:

* ''امامت'' ایک مخصوص منصب ہے جو سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تفویض ہوا تھا، وہ امام اور وصیِ رسول اللہ تھے۔ وہ امت میں سب سے افضل تھے۔ ان کے مخالفین کا حشر کفار کے ساتھ ہوگا۔
* حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد کے سوا امامت کسی کا حق نہیں۔
* امام معصوم اور مفترض الطاعۃ ہوتا ہے، اس کی تابعداری اسی طرح فرض ہے جیسے نبی کی۔

شیعۂ متقدمین اور شیعۂ تفضیلیہ کو چھوڑ کر اہلِ تشیع کے باقی سب گروہ ان عقائد پر متفق تھے۔

اس کے بعد بعض باتوں میں ان کی آراء الگ الگ تھیں۔ کچھ شیعہ کہتے تھے کہ چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے گزشتہ خلفاء کی حکومت مان لی تھی اور ان سے بیعت کر کے ان کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہے تھے؛ اس لیے ہم اپنے امام کے فعل پر اعتراض نہیں کر سکتے۔ بعض گروہ کہتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے تینوں خلفاء: ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم غاصب اور ظالم تھے۔ ان کو خلیفہ ماننے والے بھی گمراہ تھے؛ کیوں کہ انہوں نے رسول کی وصیت کا انکار کر کے حقدارِ امامت کو خلیفہ نہیں بننے دیا۔ کچھ گروہ اس سے بڑھ کر تینوں خلفاء اور انہیں خلیفہ ماننے والوں کو کافر بھی قرار دیتے تھے۔

البتہ زیدیہ کہتے تھے کہ افضل کی موجودگی میں غیر افضل کی حکومت درست ہے۔ پس حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کم درجہ ہونے کے باوجود گزشتہ خلفاء کی حکومت جائز تھی اور ان کی تکفیر ناجائز ہے۔ ساتھ ہی ان کا موقف یہ تھا کہ امام اولادِ فاطمہ میں سے ہونا چاہیے بشرطیکہ وہ حکمرانوں کے مقابلے میں امامت کا دعویٰ لے کر کھڑا ہو اور خروج کرے۔ ①

---

① الملل والنحل للشہرستانی: ۱/۱۱۰ تا ۱۲۱، ط مؤسسۃ الحلبی

جس دور کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اس دور تک شیعوں کے گروہوں کا اختلاف تقریباً اسی حد تک تھا۔ مگر پھر جب یہ مسئلہ شدت کے ساتھ اٹھا کہ منصب امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کس بیٹے کی نسل میں ہوگا تو شیعوں کی دھڑے بندی کی رفتار تیز ہوئی۔ کسی نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ، کسی نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور کسی نے حضرت محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کی اولاد کو امامت کا حق دار مانا۔ پھر ہر مزعومہ امام کی وفات کے بعد ان کی اولاد کے بارے میں یہی سوال پیدا ہوتا رہا اور الگ الگ اماموں کے پیروکار نئے شیعی فرقے بنتے رہے۔ ان میں سے ہر فرقہ اپنے الگ تشخص کو قائم رکھنے کے لیے جو نظریات گھڑتا رہا، وہ رفتہ رفتہ قطعی عقائد کی حیثیت اختیار کر گئے۔

④ نواصب

شیعانِ معاویہ، شیعانِ علی کی طرف سے لگائے گئے ناحق خونریزی کے الزام کو قبول نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے انتہا پسند لوگ اُلٹا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جمل اور صفین میں قتلِ عمد کا مجرم اور گناہ گار کہتے تھے۔ پھر انہوں نے شیعانِ علی کے ہر رہنما کی مذمت شروع کر دی اور شیعوں کی نگاہ میں کھٹکنے والے ہر شخص کی ستائش کو عادت بنالیا۔ یہ لوگ ناصبی کہلائے۔ اسی ضد میں انہوں نے ایک طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سادات کی مخالفت شروع کی اور دوسری طرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حمایت میں جعلی روایات بنا کر انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بہتر مشہور کر دیا۔ مروان اور یزید کے جعلی فضائل و مناقب بھی پھیلائے گئے اور انہیں حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما پر فوقیت دی گئی۔ حجاج بن یوسف کو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں برحق کہا گیا۔ ناصبیوں کے تعصب کا یہ عالم تھا کہ وہ بنواُمیہ کے ظالم امراء کی کھلی بُرائی کو ماننے سے بھی انکار کر دیتے تھے۔ مثلاً یزید بن ابی مسلم کو بتایا گیا کہ حجاج بن یوسف کی قبر سے چیخنے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ یزید بن ابی مسلم پریشان ہو کر حجاج کی قبر پر گیا۔ وہاں یہ آواز خود سنی تو بڑی عقیدت کے ساتھ کہنے لگا:

''ابو محمد! اللہ آپ پر رحمت فرمائے، آپ نے نہ تو اپنی زندگی میں نمازِ تہجد چھوڑی اور نہ ہی مرنے کے بعد۔''[1]

ناصبیوں کا سب سے متشدد گروہ ''یزیدی'' تھا۔ اس کا بانی عدی بن مسافر نامی ایک اموی شخص تھا جو ۱۳۲ھ میں عباسیوں کے ہاتھوں اموی خلافت کے خاتمے کے بعد شمالی عراق کے پہاڑی علاقوں میں روپوش ہو گیا تھا۔ اس نے بنوہاشم کی دشمنی اور امویوں کی منتشر طاقت کو جمع کرنے کے لیے یزید بن معاویہ کو ایک مقدس شخصیت کے طور پر مشہور کرنا شروع کر دیا اور کہا کہ یزید بن معاویہ وہ سفیانی ہے جس کی پیش گوئی احادیث میں ہے اور وہ عن قریب دنیا میں دوبارہ ظاہر ہو کر اسے انصاف سے بھر دے گا۔ شیعوں کی ضد میں بہت سے لوگوں نے اس موقف کو اختیار کر لیا۔[2]

سنت سے انحراف۔ انکارِ حدیث یا جعلی احادیث سازی:

پہلی اور دوسری صدی ہجری میں ناصبی ہوں یا شیعہ، اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود ان کی اکثریت جمہور مسلمین کی طرح قرآن و حدیث کو اصل شرعی مآخذ کا درجہ دیتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ جب سنت کے ماہر علماء سے ان کی بحث ہوتی تو انہیں عموماً لاجواب ہونا پڑتا؛ کیوں کہ جن شرعی مآخذ کو وہ مانتے تھے، وہ مختلف فیہ مسائل میں ان کا ساتھ نہیں دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ شیعوں اور ناصبیوں کی اکثریت پر اپنے مزعومہ نظریات کی غلطی واضح ہوتی چلی گئی اور ان کی بہت بڑی تعداد جس میں ضد یا ہٹ دھرمی نہ تھی، جمہور مسلمین میں ضم ہو گئی۔

مگر دونوں طرف ایسے لوگ بھی تھے جو کسی طور پر بھی اپنے الگ تشخص سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ تھے اور انہیں اپنے مزعومہ نظریات کو چھوڑنا کسی بھی طرح گوارا نہ تھا چاہے وہ قرآن و حدیث کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔

① المنتظم لابن الجوزی: ۵/۷ ② الموسوعۃ المیسرۃ فی الادیان والمذاھب: ۳۷۱/۱، ۳۷۲

ایسے لوگ جان بوجھ کر ایسی سمت بڑھتے گئے جہاں جاکر جمہور مسلمین سے ملاپ کا کوئی امکان نہ رہے۔ قرآن مجید کا کھلم کھلا انکار کرنا تو بہت مشکل تھا؛ اس لیے متشدد شیعوں (روافض) اور متشدد ناصبیوں (یزیدیوں) دونوں نے جمہور مسلمین سے انحراف کے لیے سنتِ رسول کا انکار کردیا۔ مگر اس انحراف میں روافض اور یزیدیوں کا طریق کار الگ الگ تھا۔ روافض نے یہ کام بڑی پُرکاری اور ہوشیاری کے ساتھ کیا اور سنت کے مروجہ مآخذ، حدیثی روایات اور اسناد کے بالمقابل اپنے مآخذ، اپنی روایات اور اپنی اسناد وضع کرلیں اور قرآن مجید کو بھی تحریف شدہ قرار دیا۔ (یہ کام تیسری صدی ہجری میں ہوا، جس کی تفصیل ہم بنوعباس کے دورِ زوال کے حالات میں بیان کریں گے۔)

یزیدیوں نے یہ کام دوسری صدی ہجری کے وسط میں سادہ بلکہ احمقانہ انداز میں کیا اور کوئی متبادل پیش کیے بغیر حدیث کا صاف انکار کردیا۔ وہ سنتِ نبویہ سے رہنمائی لینے کے قائل نہ رہے بلکہ فقط قرآنِ مجید پر اکتفا کرلیا۔

پھر ان کے جاہل رہنماؤں نے قرآن کی تفسیر بھی اپنی مرضی سے اس قدر غلط کی کہ وہ دین کے مُسلمات کے منکر بن گئے اور قرآن میں بھی تحریف کرتے چلے گئے۔ آخر کار وہ قرآن سے بھی محروم ہوکر بالکل بے دین بن گئے۔

اس انحراف کی ابتداء کچھ اس طرح ہوئی کہ یزیدیہ فرقے کے نزدیک یزید کی محبت ایمان کا معیار تھی اور اس پر لعنت کرنا کفر تھا۔ ان کے نزدیک سانحۂ کربلا سے یزید بالکل بری الذمہ تھا۔ بالفرض اگر وہ ملوث تھا تب بھی اسے لعنت کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس حد تک تو جمہور اہلِ سنت والجماعت بھی قائل تھے کہ احتیاطاً یزید پر لعنت نہ کی جائے۔

مگر یزیدیوں کا اُمت سے انحراف اس بات پر تھا کہ وہ یزید کی محبت کو ایمان کی علامت اور اس پر لعنت کو کفر قرار دیتے تھے۔ اپنے موقف کو مضبوط کرنے کے لیے ان کی اگلی نسل نے یہ بات گھڑی کہ لعنت کرنا ایسی قبیح حرکت ہے کہ کفار پر بھی جائز نہیں۔ بعد میں جب ان کے سامنے یہ مسئلہ آیا کہ قرآن مجید میں شیطان پر لعنت کی گئی ہے تو یزیدیوں کے بعض انتہا پسندوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں ابلیس یا کفار وغیرہ پر لعنت کی گئی ہے وہ بعد کے لوگوں کا اضافہ ہے، اللہ ایسے قبیح کلام سے پاک ہے۔ چنانچہ اس مقام پر آکر یزیدیوں نے ابلیس پر بھی لعنت کو ناجائز قرار دے دیا اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے مذہب کو پختہ کرنے کے لیے قرآن پاک کے نسخوں سے لعنت کے الفاظ مٹا دیے۔ ظاہری بات ہے کہ یہاں آکر یہ فرقہ اسلام سے خارج ہوگیا۔ مگر بات یہاں پر ختم نہیں ہوئی، اگلے مرحلے میں ان کے کچھ لوگوں نے ابلیس کو ایک مقدس ہستی مان لیا، ان کا کہنا تھا کہ ابلیس پکا موحد تھا جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کرکے عقیدۂ توحید پر پختگی کا ثبوت دیا۔ اللہ نے اسے دھتکارا نہیں، بلکہ یزیدی جماعت کی رہنمائی کے لیے دنیا میں بھیجا ہے۔ صدیوں تک یہ فرقہ خاموشی سے پرورش پاتا رہا اور اس کے پیشوا خفیہ رہے۔ بنوعباس کے انتہائی زوال کے زمانے میں ان کے کچھ پیشوا مشہور بھی ہوئے جن میں شمس الدین ابومحمد (م ۵۹۱ھ) شیخ فخر الدین (م ۶۵۵ھ) زین الدین یوسف (۷۲۵ھ) اور شیخ عزالدین (م ۷۴۱ھ) نمایاں تھے۔[1]

[1] الموسوعة الميسرة في الأديان والمذاهب: ۱/۳۷۲ تا ۳۷۶

یزیدی فرقے کے لوگ اب بھی عراق اور شام میں پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ یزید اور ابلیس کے فضائل بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابلیس ''طاؤس الملآئکۃ'' تھا۔ ①

بہر حال یزیدی فرقہ جمہور مسلمین سے دور ہٹ کر ایک نہایت محدود دائرے میں سمٹ گیا اور اس کے شیطانی افکار کبھی بھی اُمت میں مقبولیت حاصل نہ کر سکے۔ دوسری طرف وہ ناصبی جو قرآن وسنت کے قائل رہے، انہیں اپنے موقف کے خلاف واضح احادیث دیکھنے کے بعد یا تو اپنے غلط نظریات سے رجوع کرنا پڑا یا منکرِ حدیث بن کر بے دینی کے راستے پر نکلنا پڑا۔ چونکہ اُس دور میں انکارِ حدیث کو خوشنما ملبوسات فراہم کرنے والا کوئی مستشرق موجود نہ تھا؛ اس لیے انکارِ حدیث کی کھائی میں کودنے کی جسارت بہت کم لوگوں نے کی۔ یوں رفتہ رفتہ تیسری چوتھی صدی ہجری تک ناصبی تقریباً ناپید ہو گئے۔ ②

③ خوارج

شیعوں اور ناصبیوں کی اعتقادی کش مکش کے درمیان خوارج نے اپنے طور پر یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ جمل اور صفین وغیرہ میں دونوں ہی فریق مجرم تھے۔ دونوں نے ناحق خون بہایا تھا جو گناہِ کبیرہ ہے۔ چونکہ قرآن مجید نے اس گناہ کے مرتکب کو جہنمی بھی کہا ہے؛ لہٰذا فریقین جہنمی بھی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کی حمایت کرنے والے بھی گمراہ ہیں۔

پھر انہوں نے مزید آگے بڑھ کر کہا کہ چونکہ ہمیشہ جہنم میں رہنا کافروں کی سزا ہے؛ اس لیے یہ لوگ کافر بھی ہیں۔

اگلے مرحلے میں انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ صرف قتلِ عمد نہیں بلکہ ہر گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر اور پکا جہنمی ہے۔

خوارج کے نظریات آیاتِ قرآنی کے لفظی معنیٰ سے ماخوذ تھے۔ سنت اور فقہ سے انہیں دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ متشددانہ مزاج کی وجہ سے خوارج ہر حکومت سے برسرِ پیکار رہے اور حکمرانوں نے بھی ان کی سرکوبی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس طرح رفتہ رفتہ خوارج کا دائرہ بہت محدود رہ گیا۔ خوارج کے عقائد کا خلاصہ یہ تھا:

* حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما برحق تھے۔

---

① یوٹیوب پر یزیدی فرقے کے بعض جاہل پیشواؤں کے بیانات دیکھے جا سکتے ہیں جن میں ابلیس کی تعریف کی جا رہی ہے۔ شام کی حالیہ خانہ جنگی میں بہت سے یزیدی بے گھر ہوئے ہیں۔ اقوام متحدہ ان کے تحفظ کے لیے غیر معمولی طور پر سرگرم ہے۔ یہ چیزیں بھی یوٹیوب پر موجود ہیں۔
یاد رہے کہ کردستان اور آرمینیا میں بھی ''یزیدی'' مذہب کے پیروکار موجود ہیں مگر ان کا مذہب بالکل الگ ہے۔ یہ لوگ فارس کے مانوی مذہب کا ایک نیا روپ ہیں، ان کی نسبت یزید بن معاویہ کی طرف نہیں بلکہ ''یزداں'' یعنی فارسیوں کے نزدیک ''خالقِ خیر'' کی طرف ہے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ: مقالہ، یزیدی)

② لگ بھگ سو سال قبل مستشرقین اور شام کے عیسائی مؤرخین اور سیکولر پروفیسروں نے ناصبی فرقے کا دوبارہ احیاء کرنے کی کوشش شروع کی اور یزید کی محبت وعقیدت کے ذریعے اس فرقہ بندی کا بیج بونے کی کوشش کی۔ اس کارستانی میں فرنچ مشنری ہنری لامینس (م ۱۹۳۷ء) نمایاں رہا جو مشنریوں کے رسالے ''البشیر'' کا مدیر بھی تھا۔ مسلمانوں کو مغالطے میں ڈالنے کے لیے اس نے یزید کے دفاع میں ''خلافتِ یزید'' لکھی جو بظاہر تحقیقی مگر حقیقت میں مردہ مروانی وناصبی گروہ کو زندہ کرنے کی ایک سازش تھی۔ ۱۹۶۹ء میں بغداد کی شارع رشید پر ''دعوۃ احیاء الاموية اليزيدية'' کا مرکز قائم ہوا۔ مستشرق فلپ حِتی (م ۱۹۷۸ء) نے ''ہسٹری اوف دی عرب'' میں یزید کو ایک ہیرو بنا کر پیش کیا۔ ان کتب نے برصغیر میں بھی یزید کی حمایت کی تحریک کو تقویت دی اور محمود عباسی نے ایک نیا مکتب فکر پیدا کر دیا جو ''یزیدیوں'' کی طرح یزید کی محبت کو ایمان کی علامت سمجھتا ہے اور یزید کے خلاف کچھ کہنے سننے سے ایمان ضائع ہو جانے کا خدشہ محسوس کرتا ہے۔

* حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی اپنی خلافت کی ابتداء میں برحق رہے، آخر میں انہوں نے شریعت اور انصاف کا راستہ چھوڑ دیا۔ وہ معزول کیے جانے کے مستحق تھے اور ان کا قتل درست تھا۔
* حضرت علی رضی اللہ عنہ پہلے ٹھیک تھے، جب انہوں نے غیر اللہ کا فیصلہ ماننے پر رضا مندی ظاہر کی تو گمراہ ہو گئے۔
* جنگِ صفین کے شرکاء، تحکیم کے دونوں حَکَم (ابو موسیٰ اشعری اور عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہما)، حَکَم بنانے والے (حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما) اور ان کے فیصلے پر رضا مند (یعنی فریقین کے تمام) لوگ گناہ گار تھے۔
* حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت طلحہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہم سمیت جنگِ جمل میں شریک تمام لوگ گناہ گار تھے۔
* گناہِ کبیرہ کفر ہی کی ایک شکل بلکہ اس کے ہم معنیٰ ہے۔ پس اگر گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا تائب نہ ہو تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔ (اسی لیے خوارج اکثر صحابہ کو گمراہ ہی نہیں بلکہ کافر بھی کہتے تھے، نیز ان پر لعنت بھیجنے اور ان کے خلاف گالم گلوچ سے بھی نہیں شرماتے تھے۔)
* عام مسلمان کافر ہیں؛ کیوں کہ وہ گناہوں سے پاک نہیں اور وہ حضرت عثمان و علی رضی اللہ عنہما کو اپنا پیشوا مانتے ہیں۔
* حاکمیت صرف اللہ کے لیے خاص ہے۔ بندوں کا بنایا ہوا کوئی قانون یا ضابطہ قابلِ قبول نہیں۔
* خلیفہ کا قریشی ہونا شرط نہیں۔ کسی بھی رنگ و نسل کا آدمی خلیفہ بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ نیک و صالح ہو۔
* خلیفہ کی اطاعت اس وقت تک واجب ہے جب تک وہ دین کی مکمل پاسداری کرے۔ اگر وہ نیکی اور تقویٰ سے ذرا بھی منحرف ہو تو اسے معزول کرنا یا اس کے خلاف تلوار اٹھا کر جنگ کرنا فرض ہے۔
* اسلامی فقہ کا ماٰخذ فقط قرآن مجید ہے۔ حدیث اور اجماع حجت نہیں۔

خوارج کے اہم فرقے:

خوارج کے گروہوں میں کچھ نظریاتی اختلاف بھی تھا۔ ان کے اہم فرقے درج ذیل تھے:

نجدیہ:

جزیرۃ العرب سے تعلق رکھنے والا ان کا ایک بڑا گروہ جو ''نجدیہ'' کہلاتا تھا، یہ موقف رکھتا تھا کہ خلافت وحکومت کا قیام غیر ضروری ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے اپنے طور پر شریعت پر چلیں اور دوسروں کے حقوق ادا کریں۔ ہاں اگر وہ خود کسی انتظامی مصلحت سے اپنا حکمران چننا چاہیں تو اس کی رخصت موجود ہے۔

ازارقہ:

عراق میں سرگرم گروہ جو ''ازارقہ'' کہلاتا تھا، یہ سمجھتا تھا کہ ان کے سوا تمام کلمہ گو مشرک ہیں۔ ان کے پیچھے نماز جائز ہے نہ ان کی شادی غمی میں شرکت۔ ان کے مرد وزن اور بچے سب واجب القتل ہیں، ان کا مال لوٹنا جائز ہے۔ یہ خارجی اپنے ان ساتھیوں کو بھی کافر کہتے تھے جو ان کے ساتھ جنگ کے لیے نہیں نکلتے تھے۔ ان کے نزدیک مخالفین سے بددیانتی، خیانت اور دھوکہ دہی جائز تھی۔ مسلمانوں کی بہ نسبت ان کے ہاں غیر مسلموں کو جان و مال کا تحفظ زیادہ نصیب تھا۔

اِباضِیہ:

خوارج کا اعتدال پسند فرقہ ''اِباضِیہ'' تھا۔ یہ لوگ دوسرے مسلمانوں کو احتیاطاً مشرک نہیں بلکہ ''غیر مؤمن'' قرار دیتے تھے، ان کی گواہی قبول کرتے تھے، ان کے ساتھ نکاح و توارث جائز مانتے تھے، ان کے علاقے کو دارالحرب نہیں بلکہ دارالتوحید کی حیثیت دیتے تھے۔ البتہ ان کی حکومتوں کے سیاسی و عسکری مراکز کو وہ اس امان سے مستثنیٰ کرتے تھے۔ مسلمانوں سے دھوکہ اور ان پر چھپ کر حملہ ان کے نزدیک درست نہ تھا، البتہ کھلم کھلا لڑائی جائز تھی۔ [1]

④ مُرجئہ

صحابہ کرام کے دور کی سیاسی کش مکش میں بہت سے صحابہ و تابعین ان تنازعات کو ایک فتنہ سمجھ کر بالکل غیر جانب دار رہے تھے۔ بہت سے لوگ اس بارے میں تذبذب کا شکار تھے کہ فریقین میں سے برحق کون ہے؛ اس لیے وہ لاتعلق رہے۔ یہ حضرات مسلمانوں کے باہمی اختلاف اور لڑائیوں سے بیزار تھے مگر مشاجرات کے فریقین میں سے کسی کو برا نہیں کہتے تھے بلکہ تمام اکابر کا احترام کرتے تھے۔ یہ بعض محتاط صحابہ اور تابعین کا مسلک تھا جو اپنی جگہ درست تھا۔

مگر بعد میں کچھ لوگوں نے غیر جانبداری کو ایک مستقل نظریہ بنا کر اس میں شدت اختیار کر لی۔ پھر اس موقف کی فروعات نکال کر ہر فرع کے حق میں دلائل تلاش کیے۔ یہ لوگ مرجئہ کہلائے۔

مرجئہ فرقے کی ابتداء ایک ہاشمی بزرگ حضرت حسن بن محمد رحمہ اللہ سے ہوئی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پوتے اور محمد بن حنفیہ کے فرزند تھے۔ انہیں ثقہ راوی اور عالم فاضل ہستی مانا گیا ہے۔ چونکہ ایک طرف خوارج حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے تعلق ظاہر کرتے تھے اور حضرت عثمان و علی رضی اللہ عنہما سے بیزار تھے۔ دوسری طرف سبائی حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم سے بیزاری ظاہر کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مرتبے کو حد سے بڑھا رہے تھے۔ ایسے میں حضرت حسن بن محمد رحمہ اللہ نے مسلمانوں کے باہمی جھگڑے دور کرنے کے لیے بطورِ مصلحت ایک نیا موقف اختیار کیا۔ [2] اس موقف کا اظہار پہلی بار اس طرح ہوا کہ ان کی مجلس میں کچھ ہم نشینوں نے حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کے بارے میں بحث شروع کر دی اور حد سے بڑھنے لگے۔ حسن بن محمد رحمہ اللہ کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر بولے:

''میں نے تمہاری باتیں سن لیں۔ مجھے سب سے بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کے قضیے کو مؤخر رکھا جائے۔ نہ ان سے وابستگی ظاہر کی جائے نہ ان کی مخالفت کی جائے۔''

حسن بن محمد رحمہ اللہ کی مجلس میں شامل کچھ لوگوں نے اس قول کی زور و شور سے تشہیر شروع کر دی۔ [3]

[1] خوارج کے فرقوں کی تاریخ کے لیے دیکھیے:
الفرق بین الفرق، للامام عبدالقاهر الاسفرائنی: ۱/۵۵ تا ۸۳ ؛ الملل والنحل للشهرستانی: ۱/۱۱۴ تا ۱۳۷، ط مؤسسة الحلبی

[2] تاریخ الاسلام للذهبی: ۶/۳۳۱، ۳۳۲، ت تدمری

[3] تاریخ دمشق: ۱۳/۳۸۰، ۳۸۱

حسن بن محمد رحمہ اللہ نے اس موضوع پر ایک رسالہ بھی لکھا اور اسے اپنی مجالس میں سنوانے لگے۔ اس میں کہا گیا تھا:

''ہم اپنی حمایت اللہ اور اس کے رسول سے متعلق کرتے ہیں اور اپنے اماموں: ابوبکر وعمر سے راضی ہیں کہ ان کی اطاعت کی جائے۔ ہم اس بات پر ناراض ہیں کہ ان کی نافرمانی کی جائے۔ ہم فرقہ بندی کو دور کر رہے ہیں؛ کیوں کہ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما پر امت میں کوئی لڑائی نہیں تھی۔ ان کے بارے میں دعوے میں اختلاف نہ تھا۔ ان کے معاملے میں کوئی شک نہیں تھا۔ ارجاء (بحث سے لاتعلق رہنا) اس معاملے میں ہے جو لوگوں سے مخفی ہے اور وہ لوگ اس کے وقوع میں حاضر نہ تھے۔ پس جو ہمارے ارجاء کو غلط کہے اور پوچھے کہ یہ ارجاء کب سے ثابت ہے تو ہم کہیں گے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے۔ جب فرعون نے انہیں کہا: فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی (گزشتہ قوموں کے بارے میں کیا خیال ہے) تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا: قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ (ان کا حال میرے رب کے ہاں کتاب میں محفوظ ہے۔)''[1]

چونکہ یہ دل کو لگنے والی بات تھی؛ اس لیے بہت لوگوں نے اسے پسند کیا، مگر چونکہ وہ ایک نیا نظریہ تھا؛ اس لیے ایک نئے فرقے کی بنیاد بن گیا۔ حسن بن محمد رحمہ اللہ کے اس موقف پر ان کے والد محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ سخت ناراض تھے۔ ایک بار طیش میں آکر لاٹھی سے ان کا سر پھاڑ دیا اور فرمایا: ''کیا تم اپنے دادا علی رضی اللہ عنہ سے بھی وابستگی ظاہر نہیں کرو گے؟''[2]

آخری عمر میں جب حسن بن محمد رحمہ اللہ نے خود دیکھا کہ ان کے موقف کی وجہ سے اُمت مجتمع نہیں ہوئی بلکہ مختلف الخیال گروہوں میں ایک نئے گروہ کا اضافہ ہو گیا ہے، تو وہ بہت نادم ہوئے۔ اس قول کی تشہیر اور رسالہ لکھنے پر افسوس کرتے ہوئے وہ فرماتے تھے: ''کاش! میں اس سے پہلے ہی مر گیا ہوتا۔''[3]

جس طرح تشیع ترقی کرتے کرتے کئی فرقوں میں تبدیل ہو کر گمراہی بن گیا، اسی طرح ''ارجاء'' بھی اگلی نسل میں جا کر ایک مستقل فرقہ بن گیا۔[4] مرجئہ کے متقدمین فقط اتنا کہتے تھے کہ مشاجراتِ صحابہ کے بارے میں ہم سکوت

① تاریخ الاسلام للذھبی: ۶/۳۲۳، ت تدمری

② تاریخ دمشق: ۱۳/۳۸۱

③ تاریخ دمشق: ۱۳/۳۸۰، ۳۸۱

④ نوٹ: حسن بن محمد کی وفات ۱۰۱ ہجری میں ہوئی (تاریخ خلیفہ بن خیاط ص ۳۲۵) جس طرح شیعہ متقدمین کا انحراف معمولی تھا اور انہیں گمراہ نہیں سمجھا جا سکتا، اسی طرح حسن بن محمد کا تفرد بھی معمولی تھا، جس کی نظیر قرنِ اول میں موجود تھی؛ اس لیے انہیں ثقہ اور معتبر عالم مانا گیا ہے۔
اگرچہ علمائے جرح وتعدیل نے انہیں ارجاء کا بانی قرار دیا ہے۔ (وھو اول من وضع الارجاء: الثقات للعجلی: ۱/۳۰۰؛ ھو اول من تکلم بالارجاء۔ موسوعۃ اقوال الدار قطنی: ۱/۲۰۹) مگر حافظ ابن حجر نے تصریح کی ہے کہ ان کا عقیدہ بعد والے مرجئہ جیسا نہیں تھا۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ''وہ ارجاء، جس میں حسن بن محمد نے کلام کیا تھا، وہ نہیں جس پر اہل سنت عیب لگاتے ہیں جو کہ ایمان سے متعلق ہے۔'' پھر حسن بن محمد کے رسالے کی مذکورہ عبارت (جو ہم نے متن میں نقل کی ہے) پیش کر کے فرماتے ہیں: ''پس حسن کے کلام کا مطلب یہ تھا کہ فتنے میں باہم قتال کرنے والی دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک کے مخطی یا مصیب ہونے کا قطعی طور پر فیصلہ نہ کیا جائے اور ان کا معاملہ مؤخر کر دیا جائے۔ رہا وہ ارجاء جو ایمان سے متعلق ہے، حسن بن محمد نے اس کا ارتکاب نہیں کیا؛ اس لیے ان پر کوئی عیب نہیں۔'' (تھذیب التھذیب: ۲/۳۲۱، ط حیدر آباد دکن)

کرتے ہیں۔ نہ کسی کو مرتد سمجھتے ہیں نہ کسی کی مخالفت کرتے ہیں۔ سب کو ہم یکساں صحیح مسلمان سمجھتے ہیں۔ [illegible]

مرگئے مرتے ہیں ہم توقف کے قائل ہیں [illegible] مشاجرات میں کسی [illegible] حق [illegible] صحیح مسلمان ہے [illegible] مؤمن کتنا بھی گناہ کرے [illegible] جنت میں [illegible] پڑھنے پر جنت کی خوشخبری دی گئی [illegible] کی حقیقت میں عمل شامل نہیں [illegible] یہاں تک [illegible] کوئی گناہ [illegible] نقصان نہیں پہنچا سکتا [illegible] جنت میں [illegible] ایمان ہے۔ مغفرت کے لیے اتنا کافی ہے کہ انسان بحالت ایمان مرے۔[1]

ان کے بعض [illegible] مبالغہ کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ کوئی آدمی دل میں ایمان رکھتا ہو تو اگر وہ اسلامی ملک میں رہتے ہوئے بھی [illegible] زبان سے کفر [illegible] بتوں کو سجدے کرتا رہے تب بھی وہ جنتی ہے۔[3]

مرجئہ کے خیالات نفسانی خواہشات کا راستہ کھولتے تھے، اس لیے ضعیف الایمان لوگوں نے انہیں تیزی سے قبول کیا۔ یوں نہ صرف ذاتی زندگیوں میں فسق وفجور کے راستے کھل گئے بلکہ طاقت ور لوگ کمزوروں کے حقوق پر ڈاکے ڈالنے اور ان پر ظلم کرنے میں بھی بے باک ہونے لگے۔ آگے چل کر مرجئہ میں بھی کئی فرقے بن گئے۔ تاہم ان فرقوں میں قدر مشترک یہی تھی کہ وہ ایمان کو کافی اور عمل کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔

⑤ معتزلہ

خوارج اور مرجئہ کی آراء کے درمیان دوسری صدی ہجری میں کچھ لوگ اپنے طور پر ''اعتدال'' کا ثبوت دیتے ہوئے درمیانی راہ نکالنے لگے اور انہوں نے ایک نئی بات یہ نکالی کہ گناہِ کبیرہ کرنے والا مؤمن تو نہیں رہ سکتا مگر وہ کافر بھی نہیں ہوتا۔ وہ ایمان اور کفر کے درمیان ہوتا ہے۔ اس نظریے کے بانی بصرہ کے دو جید علماء: واصل بن عطاء (۸۰ھ۔ ۱۳۱ھ) اور عمرو بن عبید (م ۱۴۵ھ) تھے۔ دونوں امام حسن بصری رحمہ اللہ کے تلامذہ تھے۔

① سنن الترمذی، ح: ۲٦۳۸، ابواب الایمان، باب فیمن یموت وھو یشھد ان لا الہ الا اللہ

② مرجئہ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں دو قول ہیں: پہلا یہ کہ ارجاء کا مطلب تاخیر ہے۔ یہ لوگ عمل کو ایمان سے مؤخر کرتے تھے (یا گزشتہ بزرگوں کے معاملے کو مؤخر کرتے تھے) اس لیے انہیں مرجئہ کہا جانے لگا۔ (التبصیر فی الدین للطاھر الاسفرائنی، ص ۹۷) دوسرا قول یہ ہے کہ ''رجا'' امید کو کہتے ہیں جو حد سے بڑھ جائے تو خوش فہمی بن جاتی ہے۔ مرجئہ بھی درحقیقت خوش فہمی میں مبتلا ایک طبقہ تھا جو ہر قسم کی بدعملی بلکہ گمراہی کو بھی سند جواز دے رہا تھا۔ (الوافی بالوفیات: ۳٤/ ۲۵۷)

③ الملل والنحل للشھرستانی: ۱/۱۳۹ تا ۱٤۵، ط مؤسسۃ الحلبی

ایک دن حسن بصری رحمہ اللہ کے حلقے میں کسی شخص نے سوال اٹھایا:

''حضرت! خوارج کی جماعت کبیرہ گناہ کرنے والوں کو کافر قرار دیتی ہے، اور جماعتِ مرجئہ کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لیے ''ارجاء'' کی قائل ہے اور کہتی ہے کہ جس طرح کفر کے ساتھ نیکی نفع نہیں دیتی اسی طرح ایمان کے ساتھ گناہ کوئی نقصان نہیں دیتا۔ تو اس بارے میں ہم کیا عقیدہ رکھیں؟''

اس سے پہلے کہ حسن بصری رحمہ اللہ سوال کا جواب دیتے، واصل بن عطاء نے کھڑے ہو کر کہا:

''میرے نزدیک کبیرہ گناہ کرنے والا نہ تو علی الاطلاق کافر ہے نہ ہی وہ علی الاطلاق مؤمن ہے۔ بلکہ وہ دونوں کے بیچ بیچ میں ہے، نہ مؤمن ہے نہ کافر۔''

یہ کہہ کر وہ مسجد کے ایک ستون کے پاس جا کھڑا ہوا اور اپنے ہم خیال لوگوں کو اپنے گرد جمع کرنے لگا۔

واصل کی یہ باتیں سن کر حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اِعْتَزَلَ عَنَّا وَاصِل.'' (واصل ہم سے الگ ہو گیا ہے۔)[1]

چنانچہ یہ لوگ ''معتزلہ'' کہلانے لگے۔ واصل کے خیالات عَمر و بن عبید کو بھی پسند آئے اور دونوں کی کوشش سے ایک مستقل فرقہ وجود میں آ گیا۔[2] یہ لوگ خود کو 'اصحاب العدل والتوحید' کہتے تھے۔ مرجئہ کے برخلاف انہوں نے یہ پرچار کیا کہ ایمان کے ساتھ عمل صالح ایسا لازم و ملزوم ہے کہ اس کے بغیر ایمان بھی قبول نہیں۔ تاہم ایسے گناہ گار کلمہ گو کو کافر نہیں کہا جائے گا بلکہ وہ مؤمن اور کافر کے درمیانی درجے پر ہے۔ البتہ جو کلمہ گو کسی کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو اور توبہ کیے بغیر مر جائے تو وہ پکا دوزخی ہے، اس کا حشر کفار کے ساتھ ہو گا اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔[3]

معتزلہ نے سیاسی اصولوں میں بھی سوادِ اعظم سے اختلاف کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ عدل وانصاف ترک کرنے والی حکومت کے خلاف خروج واجب ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس کی قدرت موجود ہو۔ بعض سیاسی نظریات میں معتزلہ کا باہم اختلاف بھی تھا۔ بعض معتزلی علماء، خوارج کی طرح یہ کہتے تھے کہ خلیفہ کا قریشی ہونا ضروری نہیں۔ بہتر ہے کہ خلیفہ کسی کمزور قبیلے سے مقرر کیا جائے تاکہ ضرورت پڑنے پر اسے ہٹانا آسان ہو۔ بعض کے نزدیک امام یا خلیفہ کا تقرر غیر ضروری تھا، یہ امت کے ذمے تھا کہ وہ خود عدل پر قائم رہے۔

معتزلہ نے صحابہ کے اختلافات کے بارے میں بھی بے باکی سے آراء پیش کیں۔ بعض نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر بھی نکتہ چینی کی۔ عمرو بن عبید کہتا تھا کہ جنگِ جمل اور صفین میں شریک دونوں فریق فاسق تھے۔ واصل بن عطاء کی رائے تھی کہ کوئی ایک فریق فاسق تھا مگر یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کون سا تھا؛ اسی لیے وہ کہتا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ اگر میرے سامنے ایک گٹھی ترکاری کے بارے میں بھی گواہی دیں تو میں قبول نہیں کروں گا؛

---

[1] الملل والنحل للشهر ستانی: ۱/۴۳، ۴۸

[2] سیر اعلام النبلاء: ۶/۱۰۴، ۱۰۵

[3] مقالات الاسلامیین للاشعری: ۱/۲۱۳؛ الفصل في الملل والاهواء والنحل لابن حزم: ۴/۱۴۸، ۴۹؛ الفرق بین الفرق: ۹۴، ۹۵

کیوں کہ ان حضرات کے فاسق ہونے کا احتمال موجود ہے۔[1] (نعوذ باللہ)

⑥ جبریہ

پہلی صدی ہجری میں اہلِ شام اور اہلِ عراق کے درمیان مختلف پہلوؤں سے نظریات کا تصادم جاری تھا۔ اہلِ شام کا سب سے کمزور پہلو، بدنامی کے وہ داغ تھے جو کربلا، واقعۂ حرہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت جیسے کئی سانحوں کی شکل میں ان کے دامن پر لگے تھے اور کسی طرح مٹائے نہیں مٹتے تھے۔

ایسے میں شام کے کچھ عقل پرستوں نے ماضی کے جھگڑوں کو دفن کرنے کے لیے ''جبر'' کا نظریہ پیش کیا جس کا حاصل یہ تھا کہ انسان بالکل مجبورِ محض ہے۔ سب کچھ کرنے والا صرف اللہ ہے؛ اس لیے جمل، صفین، کربلا، واقعۂ حرہ اور شہادتِ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سمیت کسی بھی سانحے کی ذمہ داری کسی انسان پر عائد نہیں ہوتی۔

یہ فرقہ جبریہ کہلایا۔ اس فرقے کا کہنا تھا کہ انسان تقدیر کا اس قدر پابند ہے کہ اس کے اختیار میں کچھ ہے ہی نہیں۔ جب فرقہ جہمیہ نے زور پکڑا تو فرقہ جبریہ بھی اسی کا حصہ بن گیا۔ (جہمیہ کا ذکر آگے آ رہا ہے۔)[2]

⑦ قدریہ

شام کے عقل پرستوں کی اس جسارت کی تردید کے لیے عراق کے ایک شخص سوسن (سَنْسَوَیْہ) نے آواز بلند کی۔ وہ پہلے نصرانی تھا۔ پھر مشرف باسلام ہوا۔ جبریہ کی طرح وہ بھی ''تقدیر'' جیسے نازک ترین مسئلے کو اپنی عقل سے کریدنے لگا حالانکہ اس مسئلے کو زیرِ بحث لانے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر منع فرمایا تھا۔ سوسن نے سوچ بچار کے بعد از خود یہ فیصلہ دے دیا کہ تقدیر کوئی چیز نہیں بلکہ انسان پوری طرح بااختیار اور اپنے تمام اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔

بصرہ کا ایک عالم مَعبَد جہنی (م ۸۰ھ) اس کی باتوں سے کچھ متاثر ہو کر عقیدۂ تقدیر پر بحث کرنے لگا۔ مَعبد جہنی حجاج کے خلاف جماجم کی جنگ میں بھی شریک ہوا اور گرفتاری کے بعد قتل کر دیا گیا۔ مگر اس سے قبل غَیلان قدری نامی ایک فتنہ باز شخص اس سے یہ خیالات قبول کر چکا تھا۔ وہ انہیں زیادہ شد و مد سے پھیلانے لگا۔

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو اطلاع ہوئی کہ غَیلان تقدیر کا منکر ہے تو اس کو طلب کیا اور سمجھایا۔ اس نے ان کے سامنے تائب ہونے کا اعلان کیا۔ مگر ان کی وفات کے بعد دوبارہ اس فاسد عقیدے کی اشاعت شروع کر دی۔ آخر خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے اس کے خلاف کارروائی کی اور اسے سزائے موت دے دی گئی۔

غَیلان کے خیالات سے متاثر ہونے والے لوگ زیادہ تر عقل پرست ہی تھے جو مسئلہ تقدیر کو ایک ریاضیاتی سوال کی

① الفرق بین الفرق: ۹۹، ۱۰۰؛ الملل والنحل للشهرستانی: ۴۹/۱

نوٹ: معتزلہ نے فلسفے اور عقلیات سے متاثر ہو کر مزید بہت سی نئی موشگافیاں کیں مگر جس دور کی ہم بات کر رہے ہیں، اس وقت تک وہ ابحاث شروع نہیں ہوئی تھیں، بلکہ اس وقت معتزلی فرقہ ابتدائی مراحل میں تھا؛ اس لیے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

② اعتقادات المسلمین والمشرکین، فخر الدین رازی: ۶۸/۱؛ اہل سنت والجماعت، علامہ سید سلیمان ندوی، ص ۳۴

طرح حل کرنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ ''قَدَرِیَّہ'' کہلاتے تھے اور آگے چل کر وہ دوسرے عقل پرست گروہوں میں ضم ہو گئے۔ [1]

(۸) جہمیہ

جس طرح شیعہ فرقے کی بنیاد عبداللہ بن سبا یہودی نے رکھی تھی، اسی طرح جہمی مذہب کا اصل بانی طالوت نامی ایک یہودی تھا۔ یہ شخص لَبِید بن اعصم یہودی کا بھانجا تھا۔ [2] طالوت نے کچھ نئے عقیدے پیش کیے مثلاً اللہ ہر جگہ اور ہر چیز میں بذاتِ خود موجود ہے۔ اس کے شاگرد بیان بن سمعان نے یہ باتیں آگے پھیلائیں۔

دِمشق کا ایک شخص جعد بن درہم اس کا خاص مرید بنا اور اس نے ہشام بن عبدالملک کے دور میں، ان عقائد کو نئے اضافوں کے ساتھ ایک اسلامی فکر کے طور پر پیش کیا۔ اس نے بڑے فرقوں کے مابین جاری کش مکش سے بے زاری ظاہر کرتے ہوئے اصولِ دین تبدیل کر دیے اور ظاہر کیا کہ نصوص پر بھروسہ کر کے کوئی زیرِ بحث مسئلہ حل نہیں ہو سکتا؛ لہٰذا ہر بحث کو عقلی دلائل پر موقوف قرار دیا جائے یعنی جو چیز عقل کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے۔

اُمت میں یہی وہ پہلا شخص تھا جس نے قرآن مجید کے مخلوق ہونے کی بحث چھیڑی۔ وہ ہر اس عقیدے کی نفی کرتا تھا جو عقل میں مشکل سے آتا ہو۔ چنانچہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنانے اور موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہونے کا بھی انکار کر دیا حالانکہ ان واقعات کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔

جعد بن درہم کے خیالات مشہور ہوئے تو حکومت نے اسے تلاش کیا۔ وہ دِمشق سے بھاگ کر عراق چلا گیا۔ یہاں اس نے کئی شاگرد پیدا کیے۔ آخر کار والی عراق خالد بن عبداللہ قسری نے اسے گرفتار کر کے سزائے موت دے دی۔ [3]

جعد کے شاگردوں میں سمرقند کے ایک مفکر جہم بن صفوان نے اس فرقے کو باقاعدہ ایک شکل دی؛ اس لیے یہ فرقہ اسی کی طرف منسوب ہو کر جہمیہ کہلایا۔ جہم ایک عقل پرست ادیب اور مناظر تھا۔ وہ آخری اموی خلفاء کے مقابلے میں نکلنے والے ایک باغی حارث بن سُریج کی فوج میں قاضی مقرر تھا۔ اپنے استاد جعد کی طرح جہم بن صفوان بھی قرآن و سنت میں اللہ کی صفات سے متعلق کئی نصوص کو خلافِ عقل کہہ کر ان کا انکار کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کرنے کو وہ بھی ناممکن کہتا تھا۔ غرض اس نے بہت سی صفاتِ باری تعالیٰ کا انکار کر دیا۔ وہ انسان سے اختیار کی کلی طور پر نفی کرتا تھا اور اسے نباتات و جمادات کی طرح مجبورِ محض قرار دیتا تھا۔ وہ اللہ کے علم کے دائمی اور جنت اور دوزخ کے ابدی ہونے کا بھی منکر تھا۔ اس کا فتنہ حد سے بڑھا تو آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد کے گورنر نصر بن سیّار نے اسے گرفتار کر کے سزائے موت دے دی۔ جہم بن صفوان کے عقلیت پسندانہ افکار سے معتزلی علماء خاصے متاثر ہوئے اور بعد میں انہوں نے کئی نظریات میں اس کی تقلید کی۔ [4]

---

[1] الاعلام للزرکلی: ۷/۲٦٤، ۲٦٥؛ سیر اعلام النبلاء: ٤/۱۸٦، ۱۸۷

[2] لبید وہ بد بخت یہودی تھا جس نے حضورِ اکرم ﷺ پر سحر کرانے کی سازش کی تھی۔ (صحیح البخاری، ح: ۵۷٦۵، کتاب الطب، باب هل یستخرج السحر)

[3] تاریخ دمشق: ۷۲/۹۹، ۱۰۰؛ البدایة والنهایة: ۱۳/۱٤۸، ۱۹۹: سنة ۱۲٤ھ و ۱۲٦ھ

[4] الوافی بالوفیات للصفدی: ۱۱/۱٦۰، ۱٦۱

صفاتِ باری تعالیٰ کا انکار ''تعطیل'' کہلاتا ہے۔ یہ جہم کا مذہب تھا۔ اس کی تردید میں خراسان کے ایک مفسر مقاتل بن سلیمان نے اتنی شدت دکھائی کہ اللہ کی صفات کو بندوں کی صفات کی طرح دیکھا بھالا مشہور کر دیا۔ یوں اللہ کی ''تجسیم'' کا عقیدہ پیدا ہوا اور کچھ لوگ سمجھنے لگے کہ (نعوذ باللہ) اللہ بھی ہماری طرح زبان، کان اور آنکھیں استعمال کرتا ہے۔[1]

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ فرقہ بندیوں کے تمام سلسلوں کی اصل بنیاد آٹھ مکاتب فکر تھے:

① شیعہ ② خوارج ③ نواصب ④ مرجئہ
⑤ معتزلہ ⑥ جبریہ ⑦ قدریہ ⑧ جہمیہ

ان میں سے پہلے چار ایک دوسرے کے ردِ عمل اور ضد میں راہِ مستقیم سے بھٹکے تھے جبکہ آخری چار عقل پر حد سے زیادہ انحصار کر کے گمراہ ہوئے تھے۔ انہی مکاتب فکر سے آگے چل کر بیسیوں فرقوں نے جنم لیا۔

اہلِ سنت والجماعت کا ممتاز گروہ:

ان مختلف الخیال شدت پسند گروہوں کے درمیان اُمتِ مسلمہ کی اکثریت انہی عقائد ونظریات پر کاربند تھی جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ سے ثابت تھے اور جنہیں صحابہ کرام، تابعین اور علماء وفقہاء اپنے اپنے حلقوں میں بیان کرتے آ رہے تھے۔ اکثر گمراہ فرقوں کا اصل استدلال جعلی روایات یا عقلی دلائل سے تھا۔ قرآن مجید کی نصوص ان کے حق میں نہ جاتی تھیں۔ تاہم اہلِ باطل قرآن کا صاف انکار کرنے کی ہمت نہیں کرتے تھے بلکہ آیات کی تاویلات کرتے تھے۔ احادیث اور صحابہ کے اجماعی فیصلوں کا وہ کھل کر انکار کرتے تھے۔

پس حق اور باطل کے درمیان بڑا فرق یہ ظاہر ہوا کہ اہلِ حق:

❶ احادیث صحیحہ یعنی سنت کے پابند تھے اور ❷ اجماعِ صحابہ کو مانتے تھے۔

جبکہ اہلِ باطل: ① جعلی روایات یا عقلیات کے اسیر تھے۔ ② ہر معاملے میں من مانی تاویلات کرتے تھے۔

اپنے اور اہلِ باطل کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنے کے لیے اُمتِ مسلمہ کے سوادِ اعظم نے جو عالم اسلام کی ۹۰ فی صد سے زائد آبادی پر مشتمل تھا، ایسا عنوان اختیار کیا جس سے امتیاز کی اصل بنیادیں واضح ہو جائیں، پس پہلی صدی ہجری میں ہی صحیح احادیث پر عمل پیرا لوگوں کے لیے ''سُنّۃ'' کا لفظ بولا جانے لگا جو بعد میں مزید وضاحت کے ساتھ ''اھل السنۃ والجماعۃ'' بن گیا۔ اسی اکثریتی طبقے کو عرب دنیا میں ''السنۃ'' اور عجم میں ''سُنّی'' کہا جاتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے بعض مکاتیب میں ''اہل السنۃ'' کا لفظ موجود ہے۔[2] اہلِ سنت اور دیگر گروہوں کے موقف میں ایک اہم فرق یہ تھا کہ صحابہ کرام کے بارے میں اہلِ سنت کی رائے افراط وتفریط سے پاک اور قرآن وسنت کے عین مطابق تھی۔

---

① تذکرۃ الحفاظ للذھبی: ۱/۱۲۰؛ سیر اعلام النبلاء: ۷/۲۰۱، ۲۰۲

② سیرت عمر لابن الجوزی، ص ۸۵

مشہور محدث مسروق بن اجدع رحمہ اللہ (م ۶۳ھ) فرماتے تھے:

"حُبُّ اَبِیْ بَکْرٍ وَ عُمَرَ وَمَعْرِفَةُ فَضْلِهِمَا مِنَ السُّنَّةِ."

"ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی محبت اور ان کی فضیلت کا اقرار اہلِ سنت کی نشانی ہے۔" [1]

بالکل یہی الفاظ مشہور تابعی امام شعبی رحمہ اللہ سے منقول ہیں۔ [2]

امام شعبی رحمہ اللہ یہ بھی فرماتے تھے:

"امت کے چار فرقے ہو چکے ہیں: ایک وہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شیدائی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مخالف ہیں۔ دوسرے وہ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے شیدائی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالف ہیں۔ تیسرے وہ جو دونوں سے محبت کرتے ہیں۔ چوتھے جو دونوں کے مخالف ہیں۔" [3]

امام شعبی رحمہ اللہ لوگوں کو نصیحت کرتے تھے:

"نیک مسلمانوں اور بنوہاشم کے صالحین سے محبت رکھو، مگر شیعہ مت بنو۔ اپنے علم کی حد تک اچھی توقع رکھو مگر مرجئہ مت بنو۔ جان لو کہ نیکی اللہ کی توفیق سے ہے اور برائی اپنے نفس کی طرف سے ہے مگر قدری نہ بنو اور جسے (اچھا) عمل کرتے دیکھو، اس سے محبت رکھو۔" [4]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے تھے:

"اَلسُّنَّةُ اَنْ تُفَضِّلَ الشَّيْخَيْنِ وَتُحِبَّ الْخَتَنَيْنِ وَتَرَى الْمَسْحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ."

"اہلِ سنت ہونے کی علامت یہ ہے کہ تم شیخین (حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما) کو افضل مانو، دونوں دامادوں (حضرت عثمان وعلی رضی اللہ عنہما) سے محبت رکھو اور موزوں پر مسح کو جائز سمجھو۔" [5]

اُمت کے یہ متفق علیہ عقائد اور اصولِ دین اب تک کسی الگ نوشتے کی شکل میں مرتب نہیں تھے۔ ہر علاقے کے اکابر اپنے اپنے طور پر نصوصِ قرآنی، روایاتِ حدیث اور آثارِ صحابہ کی روشنی میں ان مسائل کو موقع بموقع بیان کرتے رہتے تھے۔ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں اعتقادی ونظریاتی فتنوں کے پھیلاؤ کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اُمت کے ان متفقہ عقائد کو جو قرآن وسنت سے ثابت ہیں اور جن پر صحابہ وتابعین کا اجماع رہا ہے، مستقل طور پر مرتب کر کے پیش کیا جائے۔ یہ کارنامہ جس شخصیت کے ذریعے وجود میں آیا، وہ امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہیں۔

---

[1] المعرفة والتاريخ للفسوى: ۸۱۳/۳
[2] سير اعلام النبلاء: ۳۱۰/۴
[3] سير اعلام النبلاء: ۳۰۸/۴
[4] طبقات ابن سعد: ۲۴۸/۶
[5] تحفة الفقهاء للسمرقندى: ۳۲۸/۳؛ البدائع والصنائع للكاسانى: ۱۱۶/۵، ۱۱۷؛ العناية شرح الهداية: ۱۱۴/۹؛ البحر الرائق: ۱۷۳/۱
موزوں پر مسح کو اہل سنت کی خاص نشانیوں میں اس لیے شمار کیا گیا کہ روافض اس کے منکر ہیں۔ آج کل اس سنت پر عمل کرنے والے لوگ بہت کم ہیں۔ اسے عام کرنے کی ضرورت ہے۔ سہولت بھی ہے اور سنت کو زندہ کرنے کا بیش بہا ثواب بھی۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ...... ایک تاریخ ساز شخصیت

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا اصل نام نعمان بن ثابت ہے۔ان کا خاندان کابل میں آباد تھا۔ان کے دادا جن کا نام زُوطی یا زَوطی تھا،حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کی کسی جنگ میں گرفتار ہوئے اور کوفہ لائے گئے۔انہوں نے اسلام قبول کیا اور بنی تیم اللہ کی وِلاء (معاشرتی سرپرستی) میں رہے۔انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اتنا تعلق تھا کہ کبھی کبھی خدمتِ عالیہ میں ہدیے بھیجا کرتے تھے۔امام صاحب کے والد جناب ثابت بھی بچپن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں برکت کی دعا دی تھی۔اسی کوفہ میں امام ابوحنیفہ ۸۰ھ (۶۹۹ء) میں پیدا ہوئے۔اس وقت عبدالملک بن مروان کا دورِ خلافت تھا اور عراق کا گورنر حجاج بن یوسف تھا۔جب حجاج کا انتقال ہوا تو امام صاحب پندرہ برس کے ہو چکے تھے۔انہوں نے عمر کی ۵۲ بہاریں بنوامیہ کے عہد میں دیکھیں۔۱۸ برس بنوعباس کے دور میں گزارے اور آخر کار منصور عباسی کے عہد میں ۱۵۰ھ (۷۶۷ء) کے دوران دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔[1]

ان کے دور کی پُرآشوبی:

اپنی ستر سالہ زندگی میں انہوں نے عالم اسلام کے بڑے بڑے انقلابات کا مشاہدہ کیا۔حجاج کے زمانے کے مظالم دیکھے اور ولید کے فتح مند لشکروں کے کارنامے سنے۔عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا بابرکت دور عین نوجوانی میں دیکھا۔پھر عراق پر یزید بن مُہلّب، خالد بن عبداللہ قسری، نصر بن سَیّار اور یزید بن عمر بن ہُبَیرہ جیسے نامی گرامی امراء کی حکومتوں کا مشاہدہ کیا۔عباسی تحریک ان کے سامنے ہی برپا ہوئی جس کا بڑا مرکز یہی کوفہ تھا۔بغداد کی تعمیر سے پہلے کوفہ ہی بنوعباس کا انتظامی مرکز رہا۔یہ شہر مختلف فقہی مذاہب، اختلافِ قراآت اور اعتقادی بحثوں کا میدان بھی تھا۔یہ زمانہ اُموی خلافت کے عروج کا تھا، اس دوران امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ یکسوئی کے ساتھ تحصیلِ علم میں مشغول رہے۔انہوں نے قراءت، حدیث، تفسیر، نحو، ادب اور ان تمام علوم میں مہارت حاصل کی جو اہلِ علم کے لیے ضروری سمجھے جاتے تھے۔[2]

اعتقادی بحثوں اور مناظروں میں مہارت:

چونکہ اس دور میں اعتقادی فتنے تیزی سے نشوونما پا رہے تھے؛ اس لیے معاشرے کی ضرورت کے پیش نظر ان کی دلچسپی کا رخ علم عقائد، ردِ فتن اور مناظرے کی طرف ہوگیا۔عین جوانی میں وہ اس فن میں ممتاز مقام حاصل کر چکے

① مناقب ابی حنیفۃ مکی: ۱/۳۴ تا ۳۶؛ الجواھر المضیۃ: ۱/۲۷، ط میر محمد کتب خانہ؛ ابوحنیفۃ حیاتہ وعصرہ از محمد ابو زھرہ، ص ۳۶ تا ۴۰

② مناقب ابی حنیفۃ، کردری: ۱/۶۵، ۶۶

تھے۔ امام صاحب ایک مدت تک ان مباحثوں اور مناظروں میں مشغول رہے۔ کوفہ کے علاوہ مذہبی اختلافات کا دوسرا مرکز بصرہ تھا۔ امام صاحب کئی بار وہاں گئے اور وہاں رہ کر خوارج اور دیگر فرقوں سے مناظرے کرتے رہے۔[1]

زفر بن ہذیل رحمہ اللہ کے بقول امام صاحب رحمہ اللہ خود فرماتے تھے:

''میں نے اعتقادی بحثوں میں ایسا مقام حاصل کر لیا تھا کہ میری طرف اشارے کیے جاتے تھے۔''[2]

یہ بات ظاہر ہے کہ مناظرہ بازی کے لیے مختلف مذاہب کے اختلافات کے علم کے علاوہ ذہانت، حاضر جوابی اور عقلی استدلال کی غیر معمولی صلاحیت ضروری ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مناظرانہ مصروفیات سے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ وہ شروع سے ان صفات میں اعلیٰ درجہ رکھتے تھے؛ اسی لیے علی بن عاصم رحمہ اللہ کہتے تھے:

''اگر تمام زمین والوں کی عقل ایک پلڑے میں رکھی جائے اور ابوحنیفہ کی عقل دوسرے پلڑے میں تو وہ ان سب سے وزنی نکلے گی۔''[3]

ان کی ذہانت اور حاضر جوابی:

دو واقعات سے ان کی ذہانت اور حاضر جوابی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

کوفہ میں ایک شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یہودی قرار دیتا تھا۔ امام صاحب رحمہ اللہ کو پتا چلا تو اس سے جا کر ملے اور فرمایا: ''تمہاری بیٹی کے لیے رشتہ لایا ہوں۔'' وہ بولا: ''کس کا؟''

امام صاحب بولے: ''ایسے آدمی کا جو شریف، مالدار اور سخی ہے، حافظ قرآن اور تہجد گزار ہے۔ اللہ کے خوف سے بکثرت رونے والا ہے۔'' وہ خوش ہو کر بولا: ''میں تو اس سے کم صفات والے پر بھی راضی ہوں۔''

امام صاحب بولے: ''مگر اس میں ایک عیب ہے۔ وہ یہودی ہے۔''

وہ شخص بگڑ کر بولا: ''سبحان اللہ! آپ میری بیٹی ایک یہودی کو دینا چاہتے ہیں؟''

---

[1] مناقب ابی حنیفہ مکی: ۵۹/۱

[2] "کنت انظر فی الکلام حتی بلغت فیہ مبلغا یشار الی فیہ بالاصابع." (مناقب ابی حنیفۃ مکی: ۵۵/۱)

تنبیہ: مذکورہ روایت میں امام صاحب کی مناظرانہ صلاحیت کو ''علم کلام میں مہارت'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور بعض حضرات نے اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا ہے کہ امام صاحب نے فلسفے اور منطق میں بھی ملکہ حاصل کیا ہوگا؛ کیوں کہ اس کے بغیر ''علم کلام'' میں دخل نہیں دیا جا سکتا۔ مگر درحقیقت امام صاحب کی مناظرانہ صلاحیت کو ''علم کلام میں مہارت'' کا نام دینا، تعبیر کی غلطی ہے؛ کیوں کہ امام صاحب کے دور میں مناظرے اور اعتقادی مباحثے ضرور ہوا کرتے تھے مگر ''علم کلام'' کا کوئی وجود نہ تھا اور اس وقت اسلامی دنیا میں فلسفے اور منطق کا بھی کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ اہل علم سے مخفی نہیں کہ فلسفے اور منطق کی کتب پہلی بار بنوعباس کے دور میں منتقل ہوئیں اور انہی سے پیدا شدہ بداعتقادیوں کی تردید کے لیے مناظر علماء نے ''علم کلام'' ایجاد کیا۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مناقب کے ذیل میں ان کی طرف علم کلام کی نسبت کی تردید کی ہے اور لکھا ہے: وھل کان فی ذالک الوقت وجد علم الکلام! (بھلا اس زمانے میں علم کلام کا وجود ہی کہاں تھا!) (سیر اعلام النبلاء: ۳۹۷/۱) درحقیقت امام صاحب اپنی طبعی ذہانت اور فطری حاضر جوابی کے بل بوتے پر مناظرہ کرتے تھے۔ یہ خداداد صلاحیت، کتب منطق و فلسفہ کی محتاج نہ تھی۔

پس مذکورہ روایت درحقیقت روایت بالمعنیٰ ہے۔ یہاں ''الکلام'' کی جگہ ''اعتقادی مسائل'' کے مفہوم کو ادا کرنے والا کوئی اور لفظ تھا جسے بعد کے کسی راوی نے اپنے دور کی اصطلاح کے لحاظ سے ''الکلام'' سے تعبیر کر دیا۔

[3] اخبار ابی حنیفۃ للصیمری، ص ۲۲، ۳۲، ۴۲؛ الطبقات السنیۃ فی تراجم الحنفیۃ، ص ۳۵

امام صاحب رحمہ اللہ بولے: "تو کیا حضور ﷺ نے اپنی بیٹی کسی یہودی کو دی ہوگی؟"

وہ شخص اپنے عقیدے پر سخت نادم ہوا اور اسی وقت توبہ کر لی۔[1]

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ضحاک نامی ایک خارجی سردار کوفہ کے اردگرد فساد مچاتا رہتا تھا۔ ایک بار وہ جامع مسجد کوفہ میں گھس آیا اور امام صاحب سے بحث شروع کر دی اور کہا: "تم تحکیم کو جائز کہتے ہو، اس سے توبہ کرو۔"[2]

امام صاحب رحمہ اللہ نے کہا: "تمہارا مقصد مجھے قتل کرنا ہے، یا بات چیت کرنا؟"

بولا: "بات چیت کرنا۔"

امام صاحب رحمہ اللہ نے کہا: "اگر کوئی بات ہمارے درمیان طے نہ ہو سکے تو فیصلہ کون کرے گا؟"

بولا: "آپ جسے چاہے مقرر کر دیں۔"

امام صاحب رحمہ اللہ نے ضحاک کے ساتھیوں میں سے ایک شخص کو کہا:

"تم درمیان میں بیٹھ جاؤ، اگر ہم اتفاق نہ کر پائیں تو فیصلہ تم کرو گے۔"

پھر ضحاک سے کہا: "تم اس پر راضی ہو؟"

وہ بولا: "ہاں بالکل۔"

امام صاحب رحمہ اللہ بولے: "یہی تو تحکیم ہے جسے تم نے خود جائز مان لیا۔"

ضحاک لاجواب ہو گیا۔[3]

فقہ میں دلچسپی:

ایک مدت بعد ان کی طبیعت مذہبی مناظروں سے ہٹ گئی، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ان سے کوئی فقہی مسئلہ پوچھا گیا اور وہ جواب نہ دے سکے۔ تب وہ ہمہ تن فقہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ ۱۰۲ھ کی بات ہے جبکہ ان کی عمر بائیس سال تھی۔[4]

عالم اسلام میں اس وقت فقہاء کے دو طبقے تھے: ایک حدیث کے ظاہری الفاظ پر فتویٰ دینے والے۔ دوسرے وہ جو قرآن وسنت کی روشنی میں قیاس واجتہاد کے ساتھ مسائل کا حل نکالا کرتے تھے۔ انہیں "اہل الرائے" کہا جاتا تھا۔ امام صاحب رحمہ اللہ فقط حدیث کے ظاہری مطالب پر اکتفا کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے بلکہ اس کی گہرائی تک پہنچنا چاہتے تھے؛ اس لیے ان کا رجحان طبعی طور پر اہل الرائے کی طرف ہو گیا۔

کوفہ اہل الرائے کا بڑا مرکز تھا۔ اس مکتبِ فکر کے بانی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔ ان سے فقہ واجتہاد کی تربیت لینے والوں میں قاضی شریح (م ۷۸ھ)، علقمہ (م ۶۲ھ) اور مسروق (م ۶۳ھ) رحمہم اللہ بہت نامور ہوئے۔

① الطبقات السنية في تراجم الحنفية، ص ۳۵

② خوارج حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی جنگ بندی میں حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی ثالثی کو کفر کہتے تھے۔

③ الطبقات السنية في تراجم الحنفية لتقي الدين التميمي: ۴۸/۱

④ الطبقات السنية في تراجم الحنفية: ۲۶،۲۵/۱

مسروق کے بعد ابراہیم نخعی رحمہ اللہ (م ۹۵ھ) نے فقہ کی اس بزم کو سجائے رکھا۔ پھر ان کے شاگرد حماد بن ابی سلیمان رحمہ اللہ نے اسے سنبھالا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ انہی کے دامن سے وابستہ ہوگئے اور پورے ۱۸ برس تک ان کی مجلس میں فقہی مسائل سیکھتے رہے۔ تاہم انہوں نے دیگر اہلِ علم سے بھی فیض حاصل کیا، انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی زیارت کی، ہر سال حج کے لیے جا کر وہ حجاز کے محدثین اور فقہاء سے برابر استفادہ کرتے رہے۔ چنانچہ ان کے شیوخ میں نافع مولیٰ ابن عمر، ہشام بن عروہ، سماک بن حرب، عطاء بن ابی رباح اور علقمہ بن مرثد رحمہم اللہ جیسے جبالِ علم شامل تھے۔[1]

مسندِ درس وافتاء پر:

۱۲۰ھ میں حضرت حماد رحمہ اللہ کی وفات کے بعد فقہائے شہر کے اصرار پر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے درسِ فقہ کی مسند سنبھالی اور عوام وخواص کو اپنی علمی صلاحیتوں سے فیض یاب کرنے لگے۔ یہ بنوامیہ کے نامور خلیفہ ہشام بن عبدالملک کا دور تھا۔ امن وامان کے اس دور میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو علمی کام کرنے کا خوب موقع ملا اور چند ہی سال میں عرب، وسطِ ایشیا، خراسان اور افریقہ میں ان کی فقاہت کا چرچا ہوگیا۔[2] بنوامیہ کا آخری دور نہایت ہنگامہ خیز تھا، خلفاء کمزور اور حکام لاپرواہ تھے، عوام حکام سے بدظن تھے اور جگہ جگہ بغاوتیں سر اٹھا رہی تھیں۔ یزید بن عمر بن ہبیرہ کوفہ کا گورنر بنا تو اس نے عوام کو اعتماد میں لینے کے لیے نمایاں حلقۂ اثر رکھنے والے کئی علماء کو جاگیروں اور عہدوں کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ جیسے زاہد اور متقی انسان کو اپنی طرف مائل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا؛ اس لئے انہیں قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کر کے رام کرنے کی کوشش کی گئی۔ امام صاحب رحمہ اللہ نے انکار کر دیا اور نتیجے میں حکومت کی طرف سے سختیاں جھیلیں۔ انہیں روزانہ دس کوڑے مارے جاتے تاکہ وہ مجبور ہو جائیں۔ مگر امام صاحب اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ ایک سو دس کوڑے لگنے کے بعد حکام کا جبر ہار مان گیا اور امام صاحب رحمہ اللہ رہا ہو گئے۔[3]

ذریعۂ معاش، امانت داری اور معاملات میں عملی مہارت:

معاش کے لیے آپ نے اپنا آبائی پیشہ تجارت اختیار کیا تھا۔ آپ ایک خاص قسم کے کپڑے ''خز'' کی تجارت کرتے تھے۔ آپ کا ایک کارخانہ تھا جس میں یہ کپڑا تیار ہو کر نہ صرف کوفہ بلکہ دور دراز کے شہروں میں فروخت ہوتا تھا۔[4] امام صاحب رحمہ اللہ کی امانت ودیانت پر اعتماد کی وجہ سے لوگ آپ کی تجارتی کوٹھی میں بکثرت امانتیں رکھواتے تھے، اس طرح یہ جگہ عملی لحاظ سے ایک بینک کی حیثیت اختیار کر گئی جس میں امام صاحب رحمہ اللہ کی وفات کے وقت پچاس ہزار درہم (تقریباً سوا کروڑ روپے) کی امانتیں محفوظ تھیں۔[5]

---

① تاریخ بغداد للخطیب: ۱۳/۳۲۵، ط العلمیة ② اخبار ابی حنیفة للصیمری، ص ۲۱

③ تاریخ بغداد: ۱۳/۳۲۸، ط العلمیة

④ مرآة الجنان وعبرة الیقظان لشیخ عبداللہ یافعی: ۱/۲۴۲، ط دار الکتب العلمیة

⑤ الطبقات السنیة فی تراجم الحنفیة، ص ۳۳۔ یہ ابوعبدالرحمٰن المسعودی کی روایت ہے۔ جبکہ موفق کی نے ایک دوسری سند سے یہ رقم پانچ کروڑ درہم (خمسین الف الف) نقل کی ہے۔ (مناقب ابی حنیفہ مکی: ۱/۲۲۰) یہ رقم آج کل کے لحاظ سے بارہ ارب پچاس کروڑ روپے کے لگ بھگ ہوگی۔

معیشت، تجارت اور اقتصادیات کے ان عملی تجربات کے باعث امام صاحب کو قانونِ شرع کے معاملاتی شعبوں میں فکر ونظر کی وہ گہرائی اور فہم کی وہ بلندی نصیب ہوئی جو صرف علوم پڑھنے اور یاد کرنے سے حاصل نہیں ہوسکتی۔

اخلاق وصفات:

امام صاحب رحمہ اللہ کی شخصیت بڑی پرکشش تھی۔ وہ خوبصورت اور جاذبِ نظر تھے۔ نفیس اور پاکیزہ لباس زیبِ تن کرتے جس سے عطر کی مہک آتی۔ [1] تحمل، بے خوفی اور عالی ہمتی کا یہ عالم تھا کہ بڑی سے بڑی ناگہانی آفت سے بھی ان کے قلبی اطمینان میں کوئی فرق نہ آتا۔ ایک بار درس دیتے ہوئے مکان کی چھت سے ایک سانپ سیدھا ان کی گود میں آگرا۔ مجلس میں موجود اکثر لوگ یہ دیکھتے ہی بھاگ نکلے مگر امام صاحب رحمہ اللہ نے بڑی بے فکری سے سانپ کو جھٹک کر ایک طرف پھینک دیا اور اپنی جگہ سے اٹھے تک نہیں۔ [2]

امام صاحب رحمہ اللہ ذاتی زندگی میں بہت نیک، پرہیزگار اور سخی انسان تھے۔ علماء وطلبہ پر اپنی دولت کھلے دل سے خرچ کیا کرتے تھے۔ اپنے بہت سے شاگردوں کے تمام اخراجات خود اٹھاتے تھے۔ اپنے سب سے ہونہار شاگرد امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے گھر کی پوری کفالت انہوں نے اپنے ذمے لے رکھی تھی؛ کیوں کہ ان کی والدہ مفلسی کی وجہ سے انہیں کسی محنت مزدوری میں لگانا چاہتی تھیں۔ [3]

انہوں نے اپنے کاروبار کے نفع کا ایک خاص حصہ اسی لیے مختص کر رکھا تھا، سال بھر تک وہ اس حصے سے علماء اور طلبہ کو باقاعدگی سے عطیات دیتے رہتے اور سال کے آخر میں جو کچھ بچتا وہ انہی میں بانٹ دیتے اور فرماتے:

''اسے اپنی ضرورتوں پر خرچ کریں اور اللہ کے سوا کسی کے احسان مند نہ ہوں۔ میں اپنے پاس سے کچھ نہیں دے رہا۔ یہ محض اللہ کا فضل ہے جو اس نے آپ حضرات ہی کے لیے مجھے دیا ہے۔'' [4]

اپنے بچوں کے اساتذہ کو بھی بڑے بڑے ہدایا دیتے۔ جب ان کے بیٹے حماد نے سورۃ الفاتحہ ختم کی تو امام صاحب رحمہ اللہ نے ان کے استاذ کو پانچ سو درہم (تقریباً سوا لاکھ روپے) کا ہدیہ دیا۔ [5]

ان کے تقویٰ، خدا خوفی اور زہد واخلاص کے واقعات بکثرت ہیں۔ اس قدر مصروفیات کے باوجود وہ عبادت و ریاضت میں اس مقام پر تھے کہ علماء وفقہاء تو کیا، تارک الدنیا درویش اور خانقاہوں کے لیے وقف صوفی بھی ان کو نہیں پہنچ سکتے تھے۔ انہیں کوفہ کا سب سے بڑا عابد کہا جاتا تھا۔ تیس برس تک مسلسل نفلی روزے رکھتے رہے۔ رات کو بالکل نہیں سوتے تھے۔ پوری شب نوافل، ذکر وتلاوت اور دعا ومناجات میں گزرتی تھی۔ [6] چالیس برس تک انہوں نے عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی۔ [7] آرام کا وقت بس ظہر سے عصر تک تھا۔ [8]

① مناقب ابی حنیفة وصاحبیه للذهبی، ص ۱۵، ۱۶
② مناقب ابی حنیفة وصاحبیه للذهبی، ص ۱۸
③ مناقب ابی حنیفة وصاحبیه للذهبی، ص ۶۲
④ تاریخ بغداد: ۳۵۸/۱۳
⑤ مناقب ابی حنیفة وصاحبیه للذهبی، ص ۱۸
⑥ مناقب ابی حنیفة وصاحبیه للذهبی، ص ۲۱؛ تاریخ بغداد: ۳۵۱/۱۳، ۳۵۳
⑦ مناقب ابی حنیفة وصاحبیه للذهبی، ص ۲۱؛ تاریخ بغداد: ۳۵۳/۱۳
⑧ مناقب ابی حنیفة وصاحبیه للذهبی، ص ۲۱

تلاوتِ قرآن مجید ان کی روح کی غذا اور ان کا سب سے بڑا وظیفہ تھی۔ کبھی ایک اور کبھی دو رکعتوں میں قرآن مجید پورا فرما لیتے تھے۔ اس طرح ہر شب میں ایک ختمِ قرآن کرتے تھے۔ کوفہ کی اپنی خلوت گاہ میں انہوں نے اپنی وفات تک سات ہزار بار قرآن مجید ختم کیا تھا۔① رمضان المبارک میں روزانہ دو بار ختم قرآن پاک کرتے۔ تلاوت میں اللہ کے عذاب اور وعید کا ذکر آتا تو ان آیات کو دہراتے اور زار و قطار روتے۔ ان کی ہچکیاں اور سسکیاں اتنی بلند ہوتیں کہ سننے والوں کو رحم آنے لگتا۔ ایک بار آیت ﴿بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ﴾ پڑھتے ہوئے اتنا روئے کہ اسی کو دہراتے ہوئے صبح ہوگئی۔②

وہ اپنی کاروباری زندگی میں بھی نہایت پرہیزگاری کا ثبوت دیتے رہے۔ ناتجربہ کار افراد اگر ان کی دکان پر مال فروخت کرنے آتے اور اپنے مال کی قیمت کم لگاتے تو امام صاحب رحمہ اللہ خود انہیں بتاتے کہ تمہارے مال کی قیمت زیادہ ہے۔ پھر انہیں مناسب قیمت دیتے۔③

ان کو اللہ نے جو غیر معمولی بلند مقام دیا تھا، وہ صدیوں میں کسی کو نصیب ہوتا ہے؛ اس لیے عوام ہی نہیں خواص بلکہ حلقۂ علماء میں بھی ان کے مخالفین کم نہیں تھے، کوئی انہیں منکرِ حدیث کہتا، کوئی مرجئی۔ مگر اکثر معاصر علماء خصوصاً انہیں قریب سے دیکھنے والے ہمیشہ ان کی خوبیوں کو یاد کرتے تھے۔ امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کے سامنے کسی نے ان کی عیب جوئی کی تو وہ بولے: ''ہرگز نہیں۔ وہ سب سے زیادہ نوافل پڑھنے والے، سب سے بڑے امانت دار اور سب سے خوش اخلاق تھے۔''④

ہارون الرشید نے ایک بار قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ سے ان کی عادات وصفات پوچھیں تو وہ بولے:

''اللہ کی قسم! وہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے سخت احتراز کرنے والے، دنیاداروں سے گریزاں اور اکثر خاموش رہنے والے آدمی تھے۔ ہمیشہ غور وفکر میں لگے رہتے۔ بلا ضرورت بات نہ کرتے۔ اگر ان سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا اور وہ جانتے تو جواب دے دیتے۔ وہ اپنے نفس اور اپنے دین کو برائیوں سے بچانے والے، لوگوں سے دور رہ کر اپنی دھن میں مصروف رہنے والے تھے۔ کبھی کسی کا ذکر برائی سے نہیں کرتے تھے۔''⑤

عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے تھے:

''میں نے ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے زیادہ متقی انسان کوئی نہیں دیکھا۔ ایسے آدمی کے بارے میں بھلا کیا کہا جائے جسے

① تاریخ بغداد: ۳۵۳/۱۳؛ مناقب ابی حنیفة وصاحبیه للذهبی، ص ۲۱

② مناقب ابی حنیفة وصاحبیه للذهبی، ۲۳

علامہ شبلی نعمانی نے ''سیرۃ النعمان'' (ص ۶۸، ۶۹) میں امام ابوحنیفہ کی عبادت وریاضت کی ان روایات کو اس لیے افسانے قرار دیا ہے کہ یہ درایت کے خلاف ہیں۔ مگر ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان میں کون سی بات ناممکنات میں داخل ہے۔ حافظ ذہبی نے ان کی عبادت وریاضت کی روایات کو اتنی اسناد سے نقل کیا ہے کہ یہ واقعات حدِ تواتر تک پہنچ جاتے ہیں۔ اگر اس دور کے عبادت گزاروں کو ہم اپنی ہمت وقوت پر قیاس کرنے لگیں تو سلف صالحین میں سے اکثر کی ریاضتوں کا انکار کرنا پڑے گا۔

③ مناقب ابی حنیفة وصاحبیه، ص ۳۸

④ مناقب ابی حنیفة وصاحبیه، ص ۱۷

⑤ مناقب ابی حنیفه وصاحبیه، ص ۱۷

دنیا اور اس کی دولت پیش کی گئی مگر اس نے ٹھکرا دی۔ جسے کوڑے مارے گئے مگر وہ کوہِ استقامت بنا رہا۔ اس نے کبھی ان عہدوں کو قابلِ اعتناء نہیں سمجھا جن کے پیچھے لوگ بھاگتے ہیں۔''[1]

حسن بن زیاد رحمہ اللہ کا کہنا تھا: ''امام صاحب نے کبھی کسی امیر یا حاکم کا ہدیہ قبول نہیں کیا۔''[2]

قاضی ابن شبرمہ رحمہ اللہ کہتے تھے:

''وہ دنیا سے بھاگتے رہے اور دنیا ان کے پیچھے دوڑتی رہی۔ ہم دنیا کے پیچھے دوڑے اور وہ ہم سے بھاگتی رہی۔''[3]

خلیفہ ہشام بن عبدالملک کی وفات کے بعد بنوامیہ کے اقتدار کو گھن لگ گیا اور اموی سلطنت تیزی سے زوال پذیر ہونے لگی۔ اس کے باوجود امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مسندِ درس کی ضیاء پاشیوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ انہوں نے لگاتار تیس سال تک درسِ فقہ، نئے مسائل کی تخریج اور افتاء کا وہ عظیم الشان کام کیا جو فقہ حنفی کی بنیاد بنا۔ اس فقہی کام پر ہم عباسی خلیفہ منصور کے عہد میں روشنی ڈالیں گے۔ یہاں امام صاحب رحمہ اللہ کے اس کارنامے کا ذکر کیا جاتا ہے جس کا تعلق اصولِ دین اور عقائد سے ہے۔

اُصولِ دین اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی خدمات:

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ عقائد ونظریات کے بارے میں جمہور امت کا مذہب طے شدہ تھا اور ائمہ وفقہاء اپنے اپنے حلقوں میں قرآن وسنت کے دلائل کے ساتھ ان کی وضاحت کرتے رہتے تھے تاہم انہیں ایک مربوط شکل میں اب تک پیش نہیں کیا گیا تھا۔ امام صاحب رحمہ اللہ نے سب سے پہلے ''الفقہ الاکبر'' میں امت کے سوادِ اعظم کے طے شدہ متفقہ عقائد کو مرتب کیا۔ اس دور میں عقیدے، اعمال اور احکام سبھی پر فقہ کا اطلاق ہوتا تھا تاہم اس میں سے عقائد کے حصے کو ''الفقہ الاکبر'' کہا جاتا تھا۔ اس نوشتے کی وجہ تسمیہ یہی ہے؛ کیوں کہ اس میں عقائد کا بیان تھا۔[4]

''الفقہ الاکبر'' اور اسی طرح امام صاحب سے مروی ''الفقہ الابسط'' درحقیقت ان سوالات کے جوابات ہیں جو گمراہ فرقوں کی منفی سرگرمیوں کی وجہ سے اس معاشرے میں خود بخود اٹھ رہے تھے۔

ان میں سے اہم ترین سوال یہ تھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں؟ ایمان کی تعریف کیا ہے؟ اس سوال سے آگے کئی سوالات جنم لیتے تھے مثلاً ایمان اور کفر میں اصولی فرق کیا ہے؟ گناہ کا اثر ایمان پر کیا پڑتا ہے؟ کیا اس طرح انسان ایمان سے خارج ہو جاتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا فاسق وفاجر حکام کی اقتداء میں نمازِ جمعہ وعیدین اور جہاد درست

[1] مناقب ابی حنیفة وصاحبیه، ص ۲۵

[2] مناقب ابی حنیفة وصاحبیه، ص ٤۲

[3] محاضرات الادباء، للراغب الاصفهانی، ۱ ص ٦۱۵، ط شرکة دارالارقم بیروت

[4] الفقہ الاکبر کے کچھ حصوں کو دورِ جدید کے بعض محققین نے بعد کا اضافہ قرار دیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ''الفقہ الاکبر'' کے اکثر مندرجات کی تائید امام ابوحنیفہ سے منقول علم عقائد کی دیگر روایات سے بھی ہوتی ہے، جیسا کہ امام صاحب سے ابومطیع بلخی رحمہ اللہ کی روایت کردہ ''الفقہ الابسط'' اور اسی طرح امام طحاوی رحمہ اللہ کی ''العقیدۃ الطحاویۃ'' جس میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے معتمد ترین تلامذہ امام ابویوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ سے عقائد نقل کیے گئے ہیں؛ اس لیے ''الفقہ الاکبر'' کی نسبت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف بالکل درست ہے۔ نیز یہاں ہم ان متفق الصحت روایات کو نقل کر رہے ہیں جو دیگر مآخذ میں بھی موجود ہیں۔

ہوگا؟ تقدیر کے بارے میں صحیح موقف کیا ہے؟ انسان مجبور ہے یا با اختیار؟

یہ سوالات ایسے تھے جو نہ صرف خوارج، معتزلہ اور مرجئہ کے درمیان موضوع بحث بنے ہوئے تھے بلکہ ان کا تعلق پورے اسلامی معاشرے کے حقوق کے ساتھ تھا؛ کیوں کہ کسی کو خارج از ایمان ماننے کی صورت میں اس کے حقوق کا معیار بھی بدل جاتا تھا اور اگر یہ بات اجتماعی طور پر لاگو کی جاتی تو پورے معاشرے کی نوعیت بدل جاتی تھی۔

امام صاحب رحمہ اللہ نے ان بحثوں کے جواب میں سوادِ اعظم کا مذہب یوں بیان کیا ہے:

''ایمان نام ہے، اقرار اور تصدیق کا۔''[1]

قرآن وسنت کی رو سے جن باتوں کا اقرار اور تصدیق ضروری ہے ان کا ذکر کرتے ہوئے وہ اللہ، اس کے رسول، فرشتوں، کتبِ سماویہ، مرنے کے بعد کی زندگی، اچھے برے حالات کی تقدیر اللہ کی طرف سے طے ہونے، حشر میں حساب وکتاب، اعمال تولے جانے، اور جنت ودوزخ کے موجود ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔

پھر اللہ کی وحدانیت کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ وہ اکیلا، وحدہٗ لاشریک ہے، والدین اور اولاد سے پاک ہے، کوئی اس کے مشابہ نہیں، وہ اپنی ذات وصفات کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ سے ہے۔[2]

اللہ کی صفتِ کلام، بصارت اور سماعت کے ذکر میں وہ واضح کرتے ہیں کہ اس کا سننا دیکھنا اور بولنا ہماری طرح نہیں بلکہ اسی کے شایان شان ہے۔[3]

حضور اکرم ﷺ کے بارے میں اسلامی عقیدہ بیان کرتے ہوئے وہ خاص طور پر عصمتِ انبیاء کا پہلو واضح کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''وہ اللہ کے حبیب، بندے اور رسول ہیں، ان کے منتخب کردہ ہیں، پاک وتقی ہیں، جنھوں نے کبھی بت پرستی نہیں کی، پلک جھپکنے کے برابر بھی شرک نہیں کیا۔ کبھی کسی چھوٹے یا بڑے گناہ کا ارتکاب نہیں کیا۔''[4]

اسی طرح باقی انبیائے کرام کے بارے میں فرماتے ہیں:

''تمام انبیائے کرام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے پاک ہیں۔''[5]

ایمان، اسلام اور دین کے درمیان فرق اور تعلق بتاتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''اسلام خود کو سپرد کردینے اور اللہ کے احکام کو مان لینے کا نام ہے۔ لغوی لحاظ سے ایمان اور اسلام میں فرق ہے۔ مگر وجود کے لحاظ سے نہ ایمان کے بغیر اسلام ہوسکتا ہے نہ اسلام کے بغیر ایمان۔ یہ دونوں ایک چیز کے دو پہلوؤں کی طرح ہیں۔ دین کا اطلاق، اسلام، ایمان اور شرعی احکام کے مجموعے پر ہوتا ہے۔''[6]

[1] الفقه الاكبر، ص ٥٥ ط مكتبة الفرقان الامارات
[2] الفقه الاكبر، ص ٥ تا ٢٠
[3] الفقه الاكبر، ص ٣٩
[4] الفقه الاكبر، ص ٢٦
[5] الفقه الاكبر، ص ٣٧
[6] الفقه الاكبر، ص ٥٧

رہا یہ سوال کہ کیا گناہ گار کو کافر کہہ دیا جائے گا جیسا کہ خوارج کہتے ہیں تو امام صاحب اس بارے میں فرماتے ہیں:

''ہم کسی مسلمان کو گناہوں کی بناء پر کافر قرار نہیں دیتے اگر چہ وہ کبیرہ گناہوں کا مرتکب ہو۔ بشرطیکہ گناہ کو حلال نہ سمجھے۔ ہم اس سے ایمان کا عنوان نہیں ہٹاتے بلکہ اسے حقیقتاً مؤمن مانتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک شخص مؤمن اور فاسق ہو، کافر نہ ہو۔''①

گناہ گار مسلمان کے اخروی انجام کے بارے میں وہ گمراہ فرقوں کی افراط وتفریط پر مبنی آراء کی تردید کرتے ہوئے جمہورِ امت کا مذہب یوں نقل کرتے ہیں:

''ہم یہ نہیں کہتے کہ مؤمن کے لیے گناہ نقصان دہ نہیں، نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ گناہگار مؤمن دوزخ میں نہیں جائے گا۔ نہ ہم اس کے قائل ہیں کہ اگر وہ فاسق ہو تو ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔''②

نیز فرماتے ہیں:

''ہم مرجئہ کی طرح یہ بھی نہیں کہتے کہ ہماری نیکیاں مقبول اور ہمارے گناہ ضرور معاف ہو جائیں گے۔''③

اس کے ساتھ ہی نجات کی شرائط کا ذکر کرتے ہوئے بات یوں مکمل کرتے ہیں:

''بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جو تمام شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے نیک عمل کرے جو اسے فاسد کرنے والے عیوب سے خالی ہو، پھر کفر، ارتداد اور برے اخلاق کے ذریعے اسے ضائع نہ کرے تو بے شک اللہ اس عمل کو ضائع نہیں کرے گا بلکہ اسے قبول کرے گا اور اس پر اجر وثواب عطا کرے گا۔''④

وہ واضح کرتے ہیں کہ گناہ گار مؤمنوں کی مغفرت کا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ فرماتے ہیں:

''شرک اور کفر کے سوا دیگر گناہوں کا ارتکاب کرنے والا مسلمان توبہ کیے بغیر حالتِ ایمان پر مر گیا تو وہ اللہ کے نزدیک مؤمن ہی ہوگا۔ اس کا معاملہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ چاہے تو اسے دوزخ کا عذاب دے، چاہے تو بخش دے اور بالکل عذاب نہ دے۔''⑤

تقدیر کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''اللہ ازل میں اشیاء کی موجودگی سے بھی پہلے انہیں جانتا تھا اور اس نے ان کی تقدیر طے کی اور اس کا فیصلہ کر دیا۔ دنیا وآخرت کی ہر شے اللہ کے ارادے اور اس کی قضاوقدر کے مطابق اور اس کے ہاں لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی ہے۔''⑥

معاشرے میں ایک بہت بڑا سوال خلفائے راشدین کی حیثیت اور مرتبے کا تھا کہ آیا ان میں سے کون افضل ترین تھا؟ کس کا مرتبہ کس سے کم اور کس سے زیادہ تھا؟ ان سب کی خلافت صحیح تھی یا ایک دو کی؟ بعض نے خلفائے ثلاثہ اور

① الفقه الاكبر، ص ٤٣ ② الفقه الاكبر، ص ٤٥ ③ الفقه الاكبر، ص ٤٧
④ الفقه الاكبر، ص ٤٧ ⑤ الفقه الاكبر، ص ٤٩ ⑥ الفقه الاكبر، ص ٢٩

ان کو خلیفہ ماننے والوں کا ایمان درست ہونے نہ ہونے پر بھی سوال اٹھا دیے تھے۔

یہ کوئی فروعی بحث نہیں تھی بلکہ اس کا اثر براہِ راست عقیدے سے تھا؛ کیوں کہ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ خلیفہ اور خلافت کی اسلامی عقیدے میں کوئی اہمیت اور حیثیت ہے بھی یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کیا خلیفہ کی تقرری کا آئینی و شرعی طریقہ وہی ہے جس کے مطابق یہ حضرات مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے؟ یہ مسائل مبہم رہنے سے نہ صرف دورِ خلافتِ راشدہ کے متعدد اجماعی فیصلوں اور فتاویٰ کی حیثیت مشکوک ہو جاتی تھی بلکہ اسلام کے سب سے بنیادی مأخذ قرآن مجید کی صحت پر بھی حرف آتا تھا جو انہی حضرات کی نگرانی میں جمع اور محفوظ ہوا اور سرکاری طور پر اس کے نسخے پورے عالم اسلام میں نشر کیے گئے۔

امام صاحب رحمہ اللہ نے اس اہم سوال کے جواب میں اہلِ سنت والجماعت کا مذہب یوں پیش کیا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد لوگوں میں سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق ہیں، پھر عمر بن الخطاب، پھر عثمان بن عفان، پھر علی ابن ابی طالب (رضوان اللہ علیہم اجمعین)۔ اللہ ان سب سے راضی ہو، یہ عبادت گزار اور برحق تھے اور حق پر ثابت قدم رہے۔ ہم ان سب سے محبت کرتے ہیں۔"[1]

اسی طرح باقی صحابہ کرام کی حیثیت کے بارے میں بھی سوال اٹھایا جا رہا تھا جن کی اکثریت کو روافض اس وجہ سے گمراہ اور خارج از اسلام کہتے تھے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں خلفائے ثلاثہ کی بیعت کی۔ یہ بحث بھی محض تاریخی نہ تھی بلکہ اس کی وجہ سے صحابہ کرام کے واسطے سے نقل ہونے والا سارا دین ہی مشکوک ہو جاتا تھا۔ امام صاحب رحمہ اللہ نے اس بارے میں اہلِ سنت کا نکتہ نظر یوں واضح کیا:

"ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا ذکر خیر کے سوا نہیں کرتے۔"[2]

"الفقہ الابسط" میں ایک سوال کے جواب میں امام صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"صحابہ میں سے کسی سے بیزاری ظاہر نہ کرو، ایک کو چھوڑ کر دوسرے سے اظہارِ محبت نہ کرو۔"[3]

روافض پرچار کرتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں، باقی لڑکیاں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سابقہ شوہروں کی اولاد تھیں۔ امام صاحب رحمہ اللہ نے اس بارے میں بھی حقیقتِ حال کو عقائد کے ذیل میں بیان کیا؛ اس لیے کہ روافض اس تاریخی غلط بیانی کو عقیدۂ امامت کے پرچار کے لیے استعمال کرتے تھے۔ امام صاحب رحمہ اللہ نے وضاحت کی:

"فاطمہ، زینب، رقیہ اور ام کلثوم (رضی اللہ عنہن) یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں تھیں۔"[4]

فرقہ جہمیہ کے بانی جہم بن صفوان کے عقائد پر امام صاحب رحمہ اللہ نے برملا اس کے کفر کا فتویٰ دیا تھا۔[5] آپ اس

---

[1] الفقه الاكبر، ص ٤١ [2] الفقه الاكبر: ص ٤٣ [3] الفقه الابسط، ص ٧٨، ٨٢ [4] الفقه الاكبر: ص ٧٠

[5] ايضاح الدليل فى قطع حجج اهل التعطيل لبدر الدين الكنانى، ص ٣٥؛ تاريخ بغداد: ٣٧٣/١٣

فرقے کے عقائد کی تردید کرتے ہوئے فرماتے تھے:

''اللہ نے مخلوق میں سے کسی کو کفر پر مجبور کیا ہے نہ ایمان پر، نہ کسی کو مؤمن بنایا ہے نہ کافر۔ انہیں بطور انسان کے پیدا کیا ہے، ایمان لانا اور کفر کرنا یہ بندوں کے افعال ہیں۔''[1]

جہم بن صفوان جنت اور دوزخ کے ابدی ہونے کا قائل نہ تھا۔ امام صاحب نے رحمہ اللہ اس بارے میں صحیح عقیدہ یوں بیان کیا:

''جنت اور جہنم کبھی فنا نہیں ہوں گی۔''[2]

خوارج اور معتزلہ کے خیال میں فاسق کی امامت وخلافت، اس کے پیچھے نماز اور اس کی اقتداء میں جہاد کچھ بھی جائز نہیں تھا بلکہ ایسے حکام کے خلاف خروج ضروری تھا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے قرآن وسنت کی روشنی میں اس بارے میں سوادِ اعظم کا مسلک یوں پیش کیا:

''ہر نیک وبدکلمہ گو کے پیچھے نماز جائز ہے۔''[3]

مطلب یہ کہ فاسق ائمہ وحکام کی امامت وحکومت چاہے اسلامی لحاظ سے مطلوب ومحمود نہ ہو مگر معروضی حالات میں ایک زمینی حقیقت کے طور پر اسے قبول کرلیا جائے گا۔ ایسے حکام کی اقتداء میں نماز بھی جائز ہوگی اور اسی طرح ان کی حکومت بھی۔ اسی لیے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور جمہور فقہاء کا مسلک فاسق حکام کے خلاف خروج کے عدم جواز کا رہا۔

''الفقہ الابسط'' میں اس کی مزید وضاحت ملتی ہے۔ اس کے مؤلف امام صاحب رحمہ اللہ کے شاگرد ابومطیع بلخی رحمہ اللہ ہیں جنہوں نے اس میں امام صاحب رحمہ اللہ سے براہِ راست سنے گئے اعتقادی مسائل جمع کیے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

میں نے (امام صاحب رحمہ اللہ سے) پوچھا:

''آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو نیکی کا حکم دیتا اور برائی سے روکتا ہے۔ لوگ اس کے گرد جمع ہوجائیں اور پھر وہ حکومت کے خلاف خروج کرے۔ کیا آپ اسے جائز سمجھتے ہیں؟''

فرمایا: ''نہیں۔''

میں نے کہا: ''کیوں؟ اللہ نے تو نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا کہا ہے اور یہ لازمی فریضہ ہے۔''

فرمایا: ''وہ بات اسی طرح ہے، مگر ایسا کرنے سے اصلاح کی جگہ فساد بڑھتا ہے، خوں ریزی، ہتکِ عزت اور لوٹ مار عام ہوجاتی ہے۔''

میں نے پوچھا: ''کیا ہم باغیوں سے تلوار کے ساتھ جنگ کریں؟''

فرمایا: ''ہاں! نیکی کا حکم دو، بُرائی سے منع کرو، اگر وہ مان لیں تو ٹھیک ہے ورنہ فئہ عادلہ (آئینی حکمران کے ماتحت گروہ) کے ساتھ ہوکر ان سے قتال کرو چاہے حکمران غلط کار ہی کیوں نہ ہو۔''[4]

(1) الفقہ الاکبر، ص ۳۳ (2) الفقہ الاکبر، ص ۶۳ (3) الفقہ الاکبر، ص ۴۵ (4) الفقہ الابسط، ص ۱۰۸

سیاسی مسائل میں امام صاحب رحمہ اللہ کی دقتِ نگاہ اور شرعی دلائل پر نگاہ کی دلیل اس واقعے سے بھی ملتی ہے جو بنوامیہ کے آخری ایام میں پیش آیا۔ اس وقت خوارج کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ ان کی تھوڑی سی جمعیت رہ گئی تھی جو حکومت سے اس شرط پر صلح کرنا چاہتی تھی کہ ان کے سابقہ تمام کیے دھرے کو نظر انداز کر کے عام معافی کا اعلان کیا جائے۔ عراق کے گورنر ابن ہبیرہ نے فقہاء سے اس بارے میں رائے لی۔ قاضی ابن شبرمہ رحمہ اللہ نے کہا:

''ان سے اس شرط پر صلح جائز نہیں؛ کیوں کہ وہ اسے مزید جانی و مالی نقصانات کا ذریعہ بنالیں گے۔''

قاضی ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ نے اس کے برعکس کہا: ''ان سے بہر صورت صلح جائز ہے۔''

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے دونوں آراء کو غلط قرار دیتے ہوئے فرمایا: ''خوارج نے فتنہ اور ہنگامہ برپا کرنے سے پہلے جو جانی و مالی نقصان کیا اس کا مؤاخذہ کیا جائے گا اور اس کی معافی کی شرط پر صلح جائز نہیں ہوگی۔ حالتِ شورش و فتنہ میں جو جانی و مالی نقصان ہوا، اس کا ضمان نہیں ہوگا، اس کی معافی کی شرط پر صلح جائز ہے۔''

ابن ہبیرہ نے اس فتوے کو سرکاری قانون کے طور پر لکھوالیا۔[1]

غرض امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے مختلف فرقوں کے عقائد و نظریات کی موجودگی میں قرآن و سنت سے مأخوذ ایک ایسا متوازن اور معتدل موقف پیش کیا جو نہ صرف افراط و تفریط سے پاک اور فرقہ بندی و انتشار سے بچاؤ کا ضامن تھا بلکہ معاشرے کو منکرات اور فسق و فجور پر جرأت سے روک کر اسے ایک مثالی شکل دینے کا بھی ذریعہ تھا۔[2]

سوادِ اعظم کے عقائد و نظریات پر مشتمل یہ دستاویز پیش کر کے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے یہ ثابت کر دیا کہ اُمت مسلمہ اعتقادی فتنوں کے متعدد طوفانوں کی موجودگی میں بھی اسی دین پر من و عن ایمان رکھتی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے۔ سوا صدی گزر جانے کے باوجود امت کو مدینہ منورہ کے اس معاشرے پر پورا بھروسہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا اور جسے صحابہ نے پروان چڑھایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صفِ اوّل کے جن چار صحابہ کرام نے یکے بعد دیگرے اُمت کی قیادت سنبھالی، اُمت انہیں بلاشبہ برحق مانتی ہے اور ان کی پیروی کرنے والے صحابہ و تابعین پر بھی اعتماد رکھتی ہے۔ ان حضرات نے عبادات و معاملات اور سیاسی قضایا میں اتفاقِ رائے یا اکثریت کی حمایت کے ساتھ جو فیصلے کیے وہ سب برحق تھے۔ اسی طرح دین کا وہ سارا علم جو اس معاشرے کے افراد یعنی صحابہ کرام کے ذریعے امت تک پہنچا، اُمت اسے بسر و چشم قبول کرتی ہے اور اس بارے میں کسی ابہام یا تذبذب کا شکار نہیں۔

❖ ❖ ❖

---

① الطبقات السنية في تراجم الحنفية: ١/ ٤٨

② امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں یہ خیال کہ وہ قولاً بھی فاسق اور ظالم حکمرانوں کے خلاف خروج کے حامی تھے اور عملی طور پر بھی انہوں نے اموی اور عباسی دور میں خروج کی تحریکوں سے تعاون کیا، ایک مشہور مگر خلافِ تحقیق بات ہے۔ ہم حصہ سوئم کے آخری باب میں اس قضیے کی حقیقت واضح کریں گے۔

دورِ بنو مروان

اہم حالات کی جھلکیاں

۷۳ھ......تا......۱۳۲ھ

692ء......تا......750ء

پہلی صدی ہجری

۷۳ھ.....۶۹۲ء.....۶۹۳ء

* عبدالملک بن مروان کی خلافت کا آغاز.....۱۷ جمادی الاولیٰ (۱۱۶ کتوبر ۶۹۲ء)
* حجاج بن یوسف حجاز کا گورنر مقرر
* حجاج کے حکم سے کعبہ کی تعمیر نو.....ذوالحجہ (مئی ۶۹۳ء)
* ابوفدیک خارجی کا قتل.....

۷۴ھ.....۶۹۳ء

* عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی وفات.....یکم محرم (۱۲ مئی ۶۹۳ء)
* حسان بن نعمان کی افریقہ میں تقرری اور نئی فتوحات کا آغاز
* خراسان میں رتبیل کی بغاوت
* غزوۂ احد کے زخم سے رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی شہادت
* وفات حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ.....ربیع الاول (جولائی ۶۹۳ء)
* وفات حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ.....ربیع الآخر (اگست ۶۹۳ء)

۷۵ھ.....۶۹۴ء.....۶۹۵ء

* وفاتِ حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ.....شعبان (نومبر ۶۹۴ء)
* حجاج بن یوسف کا عراق میں تقرر.....رمضان (دسمبر ۶۹۴ء)
* محمد بن مروان کا رومی سرحد پر جہاد
* صلہ بن اشیم رحمہ اللہ سجستان کے جہاد میں شہید
* اسلامی تاریخ میں پہلی بار ٹکسال کا قیام، سکوں کی ڈھلائی
* حجاج کا کوفہ کی امارت پر تقرر.....ذوالحجہ (اپریل ۶۹۵ء)

۷۶ھ ۶۹۵ء

* محمد بن مروان کی مَلَطیَہ پر یلغار
* پہلے اسلامی سکّے کا اجراء
* عراق میں خوارج کی بغاوت......ربیع الاوّل (جولائی ۶۹۵ء)
* شبیب خارجی سے معرکے۔شبیب کوفہ میں گھس گیا...... جمادی الآخرہ (اکتوبر ۶۹۵ء)

۷۷ھ...... ۶۹۶ء

* شبیب خارجی کی موت
* ولید بن عبدالملک کی رومی سرحد مصّیصہ پر یلغار...... جمادی الاولیٰ (اگست ۶۹۶ء)

۷۸ھ...... ۶۹۷ء

* مُحرز بن ابی مُحرز کا ایشیائے کوچک میں ''ازقلہ'' پر قبضہ
* موسیٰ بن نُصیر رحمۃ اللہ کو پورے شمالی افریقہ کی گورنری سپرد
* وفات جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ
* وفات قاضی شُریح رحمۃ اللہ، عمر ۱۰۰ سال......ربیع الاوّل (مئی ۶۹۷ء)

۷۹ھ...... ۶۹۸ء

* خارجی سردار قَطَری بن فُجاۃ ہلاک......رجب (ستمبر ۶۹۸ء)
* شام میں طاعون کی وبا......شوال (دسمبر ۶۹۸ء)
* حسان بن نعمان کی فتوحات کی تکمیل۔افریقی ملکہ قتل
* ولید بن عبدالملک مَلَطیَہ کے محاذ پر

۸۰ھ...... ۶۹۹ء

* عبدالرحمٰن بن اشعث کی خراسان میں تقرری
* مکہ میں سیلاب، عبدالملک کے حکم سے حفاظتی پشتوں کی تعمیر
* وفات جنادہ بن ابی امیہ رضی اللہ عنہ
* وفات عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ......ربیع الآخر (جون ۶۹۹ء)
* وفات حسان بن نعمان امیرِ افریقہ
* ولادتِ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ......جمادی الآخرہ (اگست ۶۹۹ء)

۸۱ھ......۷۰۰ء۔۷۰۱ء

* عبدالرحمٰن بن اشعث کا حجاج کے خلاف خروج
* وفات محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ......محرم (مارچ ۷۰۰ء)
* وفات عِکرِمہ مولیٰ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ......جمادی الآخرہ (جولائی ۷۰۰ء)
* ابن اشعث کا بصرہ پر قبضہ......۱۰ ذوالحجہ (24 جنوری ۷۰۱ء)

۸۲ھ......۷۰۱ء۔۷۰۲ء

* زاویہ، نزد بصرہ میں ابن اشعث اور سرکاری افواج میں جنگ......آغازِ محرم (فروری ۷۰۱ء)
* ظہر المربد، نزد بصرہ میں ابن اشعث اور سرکاری فوج میں جنگ......آغازِ صفر (مارچ ۷۰۲ء)
* وفات خالد بن یزید بن معاویہ، اسلامی تاریخ میں اوّلین کیمیادان
* مُہلَّب بن ابی صفرہ کی وفات، عمر ۷۵ سال......ذوالحجہ (جنوری ۷۰۲ء)
* صِقلِّیہ (سسلی) پر مسلمانوں کا حملہ

۸۳ھ......۷۰۲ء

* واسط شہر کی تعمیر......ربیع الاوّل (اپریل ۷۰۲ء)
* دیر جماجم نزد کوفہ میں حجاج اور ابن اشعث میں طویل جنگ کا آغاز......ربیع الآخر (مئی ۷۰۲ء)
* دیر جماجم میں ابن اشعث کو شکست......۱۴ جمادی الآخرہ (۱۴ جولائی ۷۰۲ء)
* دُجیل، نزدِ بصرہ میں ابن اشعث کی نئی صف بندی اور شکست......شعبان (ستمبر ۷۰۲ء)

۸۴ھ......۷۰۳ء

* موسیٰ بن نُصَیر رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں مراکش فتح
* عبداللہ بن عبدالملک اموی کے ہاتھوں مِصّیصہ فتح......رجب (جولائی 703ء)

۸۵ھ......۷۰۴ء

* اسلامی تاریخ کے سب سے کم عمر امام حضرت عَمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات
* رُتبیل کے ہاتھوں عبدالرحمٰن بن اشعث کا قتل......
* نئے شہر اردبیل کی تعمیر......جمادی الاولیٰ (مئی ۷۰۴ء)
* عبدالعزیز بن مروان کی وفات......جمادی الاولیٰ (مئی ۷۰۴ء)
* عبدالملک کے بیٹوں: ولید اور سلیمان کی ولی عہدی کا اعلان
* قُتیبہ بن مسلم کی خراسان تقرری

۸۶ھ......۷۰۵ء

* وفات حضرت ابو اُمامہ باہلی رضی اللہ عنہ......صفر (فروری ۷۰۵ء)
* فتح اَرزَنُ الروم...... جمادی الاولیٰ (اپریل ۷۰۵ء)
* عبدالملک بن مروان کا انتقال......۱۵شوال (۲۰/اکتوبر ۷۰۵ء)
* ولید بن عبدالملک کی خلافت کا آغاز......۱۵شوال (۲۰/اکتوبر ۷۰۵ء)
* وفاتِ عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ، کوفہ میں فوت ہونے والے آخری صحابی......ذوالقعدہ (اکتوبر ۷۰۵ء)

۸۷ھ......۷۰۵ء۔۷۰۶ء

* مدینہ منورہ میں بطورِ گورنر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا تقرر...... جمادی الاولیٰ (اپریل ۷۰۶ء)
* جامع اموی دِمشق کی تعمیر شروع......رجب (جون ۷۰۶ء)
* قُتَیبہ بن مسلم کا بیکند پر قبضہ

۸۸ھ......۷۰۶ء

* وسطِ ایشیا میں خاقانِ چین اور قُتَیبہ بن مسلم کی جنگ
* عالم اسلام کی شاہراہوں پر سنگ میل کی تنصیب
* مسجدِ نبوی میں توسیعی کام کا آغاز، امہات المؤمنین کے حجرے منہدم
* شام کے آخری صحابی عبداللہ بن بسر مازنی رضی اللہ عنہ کی وفات
* فرغانہ اور صفد کی فتح

۸۹ھ......۷۰۷ء

* قُتَیبہ کا بخارا پر پہلا حملہ

۹۰ھ......۷۰۸ء

* قُتَیبہ بن مسلم کے ہاتھوں بخارا کی فتح
* فتح طالقان...... جمادی الاولیٰ (مارچ ۷۰۹)

۹۱ھ......۷۰۹ء

* قُتَیبہ بن مسلم کا فاریاب، بلخ، بادغیس، سمنگان اور خُلم پر قبضہ
* مسجدِ نبوی کی توسیع مکمل......
* مدینہ منورہ کے آخری انصاری صحابی سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی وفات
* وفات حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب، الحسن المثنیٰ رحمہ اللہ

۹۲ھ......۷۱۰ء۔۷۱۱ء

* محمد بن قاسم کی سندھ آمد...... جمادی الآخرہ (مارچ ۷۱۱ء)
* طارق بن زیاد کا بیڑا اَندلُس پر لنگر انداز...... ۵رجب (۲۸/اپریل ۷۱۱ء)
* سندھ کی فیصلہ کن جنگ۔ راجہ داہر قتل...... ۱۰رمضان (یکم جولائی ۷۱۱ء)
* اَندلُس کا بادشاہ راڈرک میدانِ جنگ میں قتل، اسلامی حکومت قائم...... ۵شوال (۲۶ جولائی ۷۱۱ء)
* جامع اموی دِمشق کی تعمیر مکمل......

۹۳ھ......۷۱۱ء۔۷۱۲ء

* قُتَیبَہ بن مسلم کا خوارزم اور سمرقند پر قبضہ
* اَندلُس کے پایۂ تخت طُلَیطلَہ پر قبضہ...... ربیع الآخر (جنوری ۷۱۲ء)
* حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی وفات...... شعبان (مئی ۷۱۲ء)

۹۴ھ......۷۱۲ء

* قُتَیبَہ بن مسلم کے ہاتھوں تاشقند، فرغانہ اور سرحداتِ کاشغر کی فتح، اسلامی سرحدیں چین تک وسیع
* وفات حضرت عروہ بن زبیر رحمہ اللہ...... صفر (نومبر ۷۱۲ء)
* وفات حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ...... جمادی الآخرہ (مارچ ۷۱۳ء)
* وفات حضرت زین العابدین رحمہ اللہ...... شوال (جون ۷۱۳ء)

۹۵ھ......۷۱۳ء۔۷۱۴ء

* سعید بن جُبیر رحمہ اللہ کی شہادت...... شعبان (اپریل ۷۱۴ء)
* حجاج بن یوسف کا انتقال...... ۲۷رمضان (۱۵جون ۷۱۴ء)
* وفات ابراہیم نخعی رحمہ اللہ

۹۶ھ......۷۱۴ء

* ولید بن عبدالملک کا انتقال...... ۱۵ربیع الاوّل (۹دسمبر ۷۱۴ء)
* سلیمان بن عبدالملک کی خلافت کا آغاز...... ۱۵ربیع الاوّل (۹دسمبر ۷۱۴ء)
* قُتَیبَہ بن مسلم کا قتل...... ذوالحجہ (اگست ۷۱۵ء)

۹۷ھ......۷۱۵ء۔۷۱۶ء

* موسیٰ بن نُصیر رحمہ اللہ کی وفات...... ذوالقعدہ (جولائی ۷۱۶ء)

۹۸ھ......۷۱۶ء

* محمد بن قاسم کا قتل
* عبداللہ ابو ہاشم کا انتقال، بنو ہاشم کی انقلابی تحریک کے بانی
* سلیمان بن عبدالملک کا دابق میں قیام اور مَسلَمہ کا قُسطَنطِینیہ پر حملہ

۹۹ھ......۷۱۷ء

* سلیمان بن عبدالملک کی وفات......۲۰ صفر (۱۳ اکتوبر ۷۱۷ء)
* عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی خلافت کا آغاز......۲۰ صفر (۱۳ اکتوبر ۷۱۷ء)

۱۰۰ھ......۷۱۸ء

* دنیا کے آخری صحابی ابو طفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہم کی مکہ میں وفات
* وفات مسلم بن یسار رحمہ اللہ، جلیل القدر تابعی، عابد و زاہد
* وفات رِبعی بن حراش رحمہ اللہ، جلیل القدر تابعی، راویٔ حدیث

◆◆◆

دوسری صدی ہجری

۱۰۱ھ......۷۱۹ء۔۷۲۰ء

* عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی وفات......۲۰ رجب (۱۶ فروری ۷۲۰ء)
* یزید ثانی کی خلافت کا آغاز......۲۰ رجب (۱۶ فروری ۷۲۰ء)

۱۰۲ھ......۷۲۰ء

* یزید بن مُہلَّب کا قتل
* یزید بن ابی مسلم والئ افریقہ کا قتل
* محمد بن علی عباسی نے خلافتِ ہاشمیہ کے لیے تحریک کی بنیاد رکھی

۱۰۳ھ......۷۲۱ء

* وفات یزید بن الاصم رحمۃ اللہ علیہ، ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے
* وفات عطاء بن یسار رحمۃ اللہ علیہ......ربیع الاول (اگست ۷۲۱ء)
* وسطِ ایشیا کی بغاوتوں کا انسداد

۱۰۴ھ......۷۲۲ء۔۷۲۳ء

* فرانس میں مسلمانوں کی پیش قدمی
* وفات امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ......جمادی الآخرہ (نومبر ۷۲۲ء)
* وفات ابوبردہ رحمۃ اللہ علیہ بن ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ......ذوالحجہ (مئی ۷۲۳ء)

۱۰۵ھ......۷۲۳ء۔۷۲۴ء

* وفات فرزدق شاعر......صفر (جولائی ۷۲۳ء)
* وفات فاطمہ بنت حسین رضی اللہ عنہا......ربیع الآخر (ستمبر ۷۲۳ء)
* یزید ثانی کی وفات......۲۵ شعبان (۷ فروری ۷۲۴ء)
* ہشام بن عبدالملک کی خلافت کا آغاز......۲۵ شعبان (۷ فروری ۷۲۴ء)

۱۰۶ھ.....۷۲۴ء

* آرمینیا میں جراح بن عبداللہ کی فتوحات.....محرم (مئی ۷۲۴ء)
* عراق میں خالد بن عبداللہ قسری کا تقرر
* فقیہِ مدینہ سالم بن عبداللہ بن عمر رحمہ اللہ کی وفات
* وفات طاؤس بن کیسان رحمہ اللہ.....ربیع الآخر (اگست ۷۲۴ء)

۱۰۷ھ.....۷۲۵ء۔۷۲۶ء

* سندھ میں جنید بن عبدالرحمٰن کی فتوحات
* اسد بن عبداللہ کا گرجستان پر حملہ
* وفات سلیمان بن یسار رحمہ اللہ، مدینہ کے فقہائے سبعہ میں سے ایک.....ذوالقعدہ (مارچ ۷۲۶ء)
* حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پوتے قاسم بن محمد رحمہ اللہ کی وفات.....ذوالحجہ (اپریل ۷۲۶ء)

۱۰۸ھ.....۷۲۶ء

* امام تفسیر محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ کا انتقال
* مَسلَمَہ بن عبدالملک کے ہاتھوں قیساریہ فتح

۱۰۹ھ.....۷۲۷ء

* عبداللہ بن عقبہ فہری کا بحری جہاد
* معاویہ بن ہشام کا بلادِ روم میں جہاد، قلعہ طیبہ فتح
* مَسلَمَہ بن عبدالملک کی آذربائی جان میں فتوحات
* حاکم افریقہ بشر بن صفوان کا صِقلِّیہ پر چھاپہ اور قیروان واپسی پر وفات

۱۱۰ھ.....۷۲۸ء

* مَسلَمَہ بن عبدالملک کی تفلیس پر فوج کشی، غزوۃ الطین میں فتح.....۲۳ جمادی الآخرہ (۲/۱ اکتوبر ۷۲۸ء)
* وفات حضرت حسن بصری رحمہ اللہ.....رجب (اکتوبر ۷۲۸ء)
* وفات ابن سیرین رحمہ اللہ.....شوال (دسمبر ۷۲۸ء)

۱۱۱ھ.....۷۲۹ء

* جنید بن عبدالرحمٰن سندھ کی ولایت سے برطرف
* وسطِ ایشیا میں خاقانِ چین کے مقابلے میں جنید کی فتح

۱۱۲ھ......۷۳۰ء

* آذربائی جان میں خاقانِ چین کے بیٹے کی بغاوت
* جَرّاح بن عبداللہ کی شہادت......۲۲ رمضان (۷ دسمبر ۷۳۰ء)
* مَسلَمَہ بن عبدالملک کی گرجستان میں دوبارہ فوج کشی اور درۂ باب پر قلعے کی تعمیر......شوال (دسمبر ۷۳۰ء)

۱۱۳ھ......۷۳۱ء

* رومیوں سے جہاد میں عبدالوہاب بن بُخت شہید
* عبدالرحمٰن بن عبداللہ الغافقی رحمہ اللہ افریقہ میں جہاد کے دوران شہید
* وفات حضرت مکحول رحمہ اللہ، محدثِ شام...... جمادی الآخرہ (اگست ۷۳۱ء)
* وفات وہب بن مُنَبِّہ رحمہ اللہ ثقہ راوی، مؤرخ

۱۱۴ھ......۷۳۲ء

* عبدالرحمٰن الغافقی کی معرکۂ بلاط الشہداء میں شہادت......۱۵ شعبان (۹/ اکتوبر)
* محدثِ مکہ عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ کی وفات
* مروان بن محمد کی روسی سرحدوں پر یلغار
* معاویہ بن ہشام کی کارروائی میں رومی سپہ سالار قسطنطین گرفتار
* وفات حضرت محمد باقر بن زین العابدین رحمہ اللہ، اثناعشریہ کے پانچویں امام

۱۱۵ھ......۷۳۳ء

* صِقِلِّیَہ پر عبیدہ بن عبدالرحمٰن کا حملہ
* شام میں طاعون کی وبا
* خراسان میں قحط

۱۱۶ھ......۷۳۴ء

* صِقِلِّیَہ پر عبیدہ بن عبدالرحمٰن کا دوسرا حملہ
* جنید بن عبدالرحمٰن کی خراسان سے معزولی اور وفات
* اَندلُس میں عقبہ بن حجاج کا تقرر اور ترقیاتی کام

۱۱۷ھ......۷۳۵ء

* معاویہ بن ہشام اور سلیمان بن ہشام بلادِ روم کی مہمات میں مصروف
* مروان بن محمد کی آرمینیا میں فتوحات

* خراسان میں بنو عباس کے داعی گرفتار
* وفات فاطمہ بنت حسن بن علی بن ابی طالب رحمہا اللہ
* وفات سُکینہ بنت حسین بن علی بن ابی طالب رحمہا اللہ ..... ۵ ربیع الاول (اپریل ۷۳۵ء)
* وفات عائشہ بنت سعد بن ابی وقاص رحمہا اللہ

۱۱۸ھ ۷۳۶ء

* حُمیمہ میں علی بن عبداللہ بن عباس رحمہ اللہ کی وفات، عمر ۷۸ سال
* قاضی اُردن عبادۃ بن نسی رحمہ اللہ کی وفات

۱۱۹ھ ۷۳۷ء

* اسد بن عبداللہ قسری کے ہاتھوں خاقانِ چین کی شکست
* بہلول خارجی کا ظہور، گرفتاری اور قتل

۱۲۰ھ ۷۳۷ء

* اسد بن عبداللہ قسری کا انتقال
* خالد بن عبداللہ قسری معزول
* امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ مسندِ تدریس و افتاء پر فائز

۱۲۱ھ ۷۳۸ء

* مَسلَمہ بن عبدالملک کی وفات
* ماوراء النہر میں نصر بن سیّار کی جہادی مہمات
* یعقوب بن عبداللہ بن اَشج بلادِ روم کے جہاد میں شہید

۱۲۲ھ ..... ۷۳۹ء ـ ۷۴۰ء

* صِقلّیہ پر حبیب بن ابی فہرہ کا حملہ اور سرقوسہ کا محاصرہ
* زید بن علی رحمہ اللہ کا خروج اور سانحۂ قتل ..... صفر (جنوری ۷۴۰ء)
* وفات ایاس بن معاویہ رحمہ اللہ، قاضی بصرہ، ذہانت میں ضرب المثل
* بلادِ روم کے مشہور غازی عبداللہ البطّال کی شہادت

۱۲۳ھ ۷۴۰ء

* افریقہ میں بربروں کی بغاوت، امویوں کی پسپائی
* وفات عقبہ بن حجاج، امیر اندلس

٭ وفات مالک بن دینار رحمہ اللہ

۱۲۴ھ......۷۴۱ء۔۷۴۲ء

٭ اموی سپاہ کی افریقہ میں تین لاکھ بربروں سے جنگ اور فتح

٭ وفات محدثِ مدینہ محمد بن مسلم ابن شہاب زہری رحمہ اللہ، عمر ۷۲ سال......۷ رمضان (۱۵ جون ۷۴۲ء)

۱۲۵ھ......۷۴۲ء۔۷۴۳ء

٭ ہشام بن عبدالملک کی وفات......۶ ربیع الآخر (۱۸ فروری ۷۴۳ء)

٭ عباسی تحریک کے بانی محمد بن علی کی وفات

٭ ولید بن یزید کی خلافت کا آغاز......۶ ربیع الآخر (۱۸ فروری ۷۴۳ء)

۱۲۶ھ......۷۴۳ء۔۷۴۴ء

٭ ولید بن یزید کا قتل......۲۷ جمادی الآخرہ (۱۲۷ اپریل ۷۴۴ء)

٭ یزید بن ولید کی خلافت کا آغاز......۲۷ جمادی الآخرہ (۱۲۷ اپریل ۷۴۴ء)

٭ یزید بن ولید کا انتقال......۲۰ ذوالحجہ (۱۴ اکتوبر ۷۴۴ء)

٭ ابراہیم بن ولید کی خلافت کا آغاز......۲۰ ذوالحجہ (۱۴ اکتوبر ۷۴۴ء)

۱۲۷ھ......۷۴۴ء۔۷۴۵ء

٭ ابراہیم بن ولید کی معزولی......۱۴ صفر (۶ دسمبر ۷۴۴ء)

٭ مروان بن محمد کی خلافت کا آغاز......۱۴ صفر (۶ دسمبر ۷۴۴ء)

۱۲۸ھ......۷۴۵ء۔۷۴۶ء

٭ علوی داعی حارث بن سُریج کا قتل......۲۸ جمادی الآخرہ (مارچ ۷۴۶ء)

٭ جہم بن صفوان کی گرفتاری اور قتل......رجب (اپریل ۷۴۶ء)

٭ ابومسلم خراسانی کی خراسان میں تقرری

٭ وفات امام القراء عاصم بن ابی النجود رحمہ اللہ

٭ وفات جابر بن یزید الجعفی، شیعہ راوی

۱۲۹ھ......۷۴۶ء۔۷۴۷ء

٭ ابومسلم خراسانی کی خراسان میں علانیہ دعوت......رمضان (مئی ۷۴۷ء)

٭ وفات وہب بن کیسان رحمہ اللہ، محدثِ مدینہ

٭ وفات یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ، ثقہ محدثِ یمامہ

* وفات یحییٰ بن یعمر نحوی، تلمیذ ابوالاسود دؤلی

۱۳۰ھ ...... ۷۴۷ء۔۷۴۸ء

* مدینہ کے قریب ابوحمزہ خارجی اور اہلِ مدینہ میں خونریز معرکہ ...... ۲۳ محرم (۳/ اکتوبر ۷۴۷ء)
* ابوحمزہ خارجی مدینہ پر قابض ...... ۱۳ صفر (۲۲/ اکتوبر ۷۴۷ء)
* ابوحمزہ خارجی کا قتل
* ابومسلم خراسانی مَرو پر قابض، حاکم خراسان نصر بن سیار فرار
* وفات یزید بن قعقاع القاری رحمہ اللہ، مولیٰ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

۱۳۱ھ ...... ۷۴۸ء۔۷۴۹ء

* گورنر خراسان نصر بن سیار کی موت، عمر ۸۵ سال ...... ۱۲ ربیع الاوّل (۸ نومبر ۷۴۸ء)
* فارس اور عراق کے بڑے حصے پر عباسی داعیوں کا قبضہ

۱۳۲ھ ...... ۷۴۹ء۔۷۵۰ء

* کوفہ میں سفاح کی خلافت کا اعلان ...... ۱۲ ربیع الاول (۲۹ اکتوبر ۷۴۹ء)
* معرکۂ زاب، آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد کو شکست ...... ۱۱ جمادی الآخرہ (۱۹ جنوری ۷۵۰ء)
* اموی پایۂ تخت دِمشق پر عباسی قابض ...... رمضان (اپریل ۷۵۰ء)
* مروان بن محمد کا قتل ...... ۲۷ ذوالحجہ (۱۷/ اگست ۷۵۰ء)
* نہر ابی فُطرُس پر امرائے بنوامیہ کا قتل

خلافتِ بنومروان۔اسباق وعبر

① مسلمانوں کی کامیابی اللہ اور رسول ﷺ کی اتباع اور قرآن وسنت کی پیروی پر منحصر ہے۔جس جس دور میں مسلمان اس اصل الاصول کو تھامے رہے وہ کامیاب وسربلند رہے، جب جب وہ اس اصول سے جس حد تک منحرف ہوئے، اسی قدر زوال اور ابتری کا شکار ہوئے۔

② صحبتِ نبوی اور رفاقتِ صحابہ میں انسانوں کی تربیت کے لیے ایک خاص تاثیر تھی؛ اس لیے اس زمانے میں جیسی عظیم اور عبقری شخصیات نے جنم لیا بعد کے دور کے لوگ اس مقام کو نہیں پہنچ سکتے۔

③ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں ذکر وعبادت، دعاومناجات، خشیتِ الٰہیہ، فکرِ آخرت، دینی غیرت وحمیت، جودو سخاوت اور اخلاقِ عالیہ کے مظاہر بہت عام تھے اور وہ لوگ بھی ان صفات سے بالکل خالی نہ تھے جنہیں عام طور پر سفاک اور بے رحم سمجھا جاتا رہا۔جبکہ آج کل دین دار لوگ بھی ان خوبیوں سے خالی ہوتے جارہے ہیں۔نمازیں بے روح ہیں، دل بے حس اور آنکھیں خشک۔شاید یہی وہ زمانہ ہے جس کے بارے میں ایک روایت میں ہے کہ بھری مسجد میں خشوع سے نماز پڑھنے والا ایک بھی نہ ہوگا۔[1]

④ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے اُمت کو دوبارہ شورائی سیاست اور معیارِ خلافتِ راشدہ پر لانے کی کوششیں کامیاب نہ ہوئیں اور ان ہستیوں کے حسرت ناک انجام کے بعد بنوامیہ کی حکومت عسکری طاقت کے ساتھ پوری طرح قائم ہوگئی۔اس حکومت میں خوبیاں بھی تھیں اور خامیاں بھی۔اس کے بعض حکمران بہت اچھے تھے، بعض قابلِ قبول اور بعض نااہل۔تاہم یہ کمزوریاں سیاسی سطح کی حد تک ہی تھیں اور بنوامیہ کے دور تک مسلمانوں کے درمیان یہ اختلاف سیاسی دائرے ہی میں رہا۔

مگر بنوہاشم کی انقلابی تحریک کے دوران بنوامیہ کو زیر کرنے کے لیے اس اختلاف کو اعتقادی اختلاف بنادیا گیا۔ ہاشمی گروہ کے بعض افراد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو افضل ترین ہستی قرار دینے اور قیادت کو سادات کے لیے مخصوص بتانے کی روایات گھڑ لیں۔علوی اور عباسی قائدین نے ایسا اعتقاد نہ رکھتے ہوئے بھی سیاسی مصلحتوں کے تحت ان باتوں کو عام ہونے دیا۔اس غلطی کی وجہ سے اُمت میں جو اختلاف پھیلا وہ سیاسی حد تک محدود نہ رہا بلکہ رفتہ رفتہ عقیدے کا مسئلہ بن گیا۔سیاسی اختلاف وقت گزرنے کے ساتھ مٹ جاتا ہے لیکن عقیدے کا اختلاف پیدا ہوجائے تو پھر کسی کے مٹائے نہیں مٹتا؛ لہٰذا اُمت آج تک انتشار وافتراق کا شکار چلی آرہی ہے۔

[1] سنن الترمذی، ح: ۲۶۵۳، ابواب العلم، باب فی ذهاب العلم

⑤ صحابۂ کرام کی موجودگی، بہت سے فتنوں سے حفاظت کا سبب تھی۔ ۱۰۰ھ میں آخری صحابی حضرت ابوطفیل رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد علوی واموی کش مکش کا دور شروع ہوا اور تین عشروں بعد خون کی سرخی سے امت کی تاریخ کا نیا باب لکھا گیا۔ جب تک صحابہ کے اکا دکا افراد بھی موجود تھے، اُمت ایسے ہمہ گیر بحرانوں سے محفوظ رہی۔ معلوم ہوا کہ اکابر کی موجودگی انتہائی باعثِ خیر ہوتی ہے اور ان کی رخصتی فتنوں کی آمد کا اشارہ ہوا کرتی ہے۔

⑥ مسلمانوں میں ہمیں جو کمزوریاں بار بار ابھرتی اور تباہی کا سبب بنتی دکھائی دیتی ہیں، ان میں سے اکثر کسی زمانے یا کسی معاشرے کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ یہ وہ نفسانی کمزوریاں ہوتی ہیں جو بعض اوقات لوگوں پر غالب آجاتی ہیں مثلاً عدم برداشت، ذاتی رائے پر اصرار، مشاورت کو اہمیت نہ دینا، عاقبت اندیشی سے کام نہ لینا، طاقت سے ہر مسئلے کا حل نکالنے پر زور، خانہ جنگیاں، خفیہ سازشیں، بدعہدی اور مکروفریب۔ مختلف زمانوں میں مختلف شکلوں میں یہ انسانی کمزوریاں معاشرے پر حملہ آور رہی ہیں۔ علاقے، نسل اور خاندان کے لحاظ سے لوگوں کا ان برائیوں میں مبتلا ہونا یکساں نہیں رہا۔ کسی قوم یا خاندان پر ایک خرابی غالب رہتی ہے تو کسی پر دوسری۔ اسلامی تعلیمات سے روشنی حاصل نہ کرنا ان برائیوں کے پنپنے کا سبب بنتا ہے اور یہی چیزیں تاریخی المیوں کا باعث بنتی ہیں۔

⑦ اگر انسان میں ذاتی جوہر موجود ہو تو وہ مختصر مدت میں ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دے سکتا ہے اور بگڑے ہوئے نظام کو بڑی حد تک سدھار سکتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا اڑھائی سالہ دور اس کی گواہی دیتا ہے۔

⑧ فتوحات کا جو جوش اسلام کی پہلی صدی ہجری میں تھا، وہ پھر کبھی اس انداز میں نہیں ابھر سکا۔ ویسا اتحاد واتفاق دوبارہ نصیب نہ ہوا، اندرونی فتنے اور خانہ جنگیاں مسلمانوں کی افرادی ومعاشی قوت کو مسلسل ضائع کرتے رہے، وہ جوہرِ کردار بھی نہ رہا جو صحابہ وتابعین کا طرۂ امتیاز تھا اور جسے دیکھ کر غیر مسلم جوق در جوق مشرف با اسلام ہوتے تھے؛ اس لیے پہلی صدی ہجری کے بعد عالم اسلام کا جغرافیہ زیادہ وسیع نہیں ہونے پایا۔

⑨ سیاسی یا انتظامی معاملات کے بارے میں صحیح فیصلہ کرنا عوام کے بس کی بات نہیں، یہ کام خواص ہی انجام دے سکتے ہیں۔ عوام بھیڑ چال کے عادی ہوتے ہیں۔ انہیں ابھار کر جس طرف چلایا جائے وہ چل پڑتے ہیں۔ رہنمائی کا حق صرف بلند پایہ افراد ادا کر سکتے ہیں؛ اس لیے سیاسی رہنمائی انہی لوگوں کو کرنی چاہیے جو ایمانی واخلاقی لحاظ سے عام لوگوں سے بلند ہوں، علمِ دین، تقویٰ اور اخلاص کی دولتوں سے بہرہ ور ہوں۔ ہمت واستقلال، فہم وتدبر، حالات شناسی، دور اندیشی اور نظم وضبط کی صفات سے آراستہ ہوں؛ اسی لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ دین کا معاملہ کب تک درست رہے گا؟ تو انہوں نے فرمایا:

بَقَائُكُمْ عَلَيْهِ مَا اسْتَقَامَتْ بِهِ اَئِمَّتُكُمْ.

''تم دین پر اس وقت تک برقرار رہو گے جب تک تمہارے رہنما اس پر جمے رہیں گے۔''[1]

① صحیح البخاری، ح: ۳۸۳۴، کتاب المناقب، باب ایام الجاھلیة

پس اگر یہ اہم ترین منصب نااہل افراد کو مل جائے تو پھر قوم کی ناؤ کسی بھی وقت ڈوب سکتی ہے۔خلفائے راشدین کے تمام اور بنو امیہ کے اکثر خلفاء قیادت کے معیار پر پورے اترتے تھے؛اس لیے اُمت روبہ ترقی رہی مگر جب ہشام بن عبدالملک کے بعد خلفاء مطلوبہ صفات میں کمزور ثابت ہوئے تو فتنہ وفساد کا دروازہ کھل گیا۔

⑩ عبدالرحمٰن بن اشعث نے جب بنو مروان کے خلاف خروج کیا تو اس کی بڑی وجہ حجاج بن یوسف کی زیادتیوں کے خلاف اشتعال تھا۔حجاج سے ناراض بہت سے سپاہی اور پھر عوام کا جم غفیر ابن اشعث کے گرد جمع ہو گیا اور سعید بن جُبیر اور امام شعبی جیسے لوگ بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے۔اس دوران عبدالملک کی طرف سے حجاج کو برطرف کرنے کی پیش کش ہوئی جو نہایت معقول تھی اور ابن اشعث نے اسے قبول کرنا چاہا بھی،مگر ان لوگوں کی رائے غالب آ گئی جو بنو مروان کی خلافت کا سرے سے خاتمہ چاہتے تھے۔چنانچہ خلیفہ کی پیش کش مسترد ہو گئی اور جنگ ہو کر رہی جس کا نتیجہ ابن اشعث کی شکست اور ہزاروں افراد کے قتل کی صورت میں نکلا۔

یہ واقعہ اور اس سے ملتے جلتے کئی واقعات ثابت کرتے ہیں کہ کسی عوامی تحریک کو شروع کرنا کوئی کھیل نہیں بلکہ اس کے لیے نہایت حزم واحتیاط،سوچ بچار،مشاورت،دوراندیشی اور ماضی کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔تحریک کے لیے لوگوں کو ابھارنا اتنا مشکل نہیں مگر انہیں کنٹرول کرنا اور تحریک کا رُخ صحیح سمت میں باقی رکھنا نہایت دشوار ہے۔ایسے میں چاہے سعید بن جُبیر اور امام شعبی جیسے رجالِ علم بھی صف میں موجود ہوں تب بھی تحریک ناکام ہو سکتی ہے؛کیوں کہ عوام کی بھیڑ جمع ہونے کے بعد تحریک کی باگ قائدین کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور عوام اس تحریک کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتے ہیں۔چونکہ ان کی رائے سطحی ہوتی ہے؛اس لیے ایسی تحریکیں ناکام ہو کر حسرت ناک انجام پر ختم ہوتی ہیں۔

⑪ عوامی بغاوتیں اور شورشیں درحقیقت اضطراب اور ہیجان کی انتہاء کی علامت ہوتی ہیں۔عام طور پر ایسی تحریکیں تبھی برپا ہوتی ہیں جب لوگوں کو ان کے حقوق نہ مل رہے ہوں۔اگر حکام عدل وانصاف سے کام لیں تو ایسی تحریکوں کی کوئی بنیاد ہی نہ رہے۔ایسے میں اگر کچھ شرپسند بلاوجہ لوگوں کو ابھارنے کی کوشش بھی کریں گے تو ناکام رہیں گے۔مگر جب لوگ اپنے حقوق سلب ہونے کے باعث پہلے ہی حکام کے خلاف بھرے بیٹھے ہوں تو انہیں مقابلے میں لا کھڑا کرنا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔پس اگر حکمران چاہتے ہیں کہ اللہ نے اقتدار کی شکل میں انہیں جو نعمت نصیب کی ہے،وہ مدتِ دراز تک باقی رہے تو انہیں سب سے پہلے عوام کی تکالیف کا احساس کرنا ہوگا شہریوں کو بے انصافی اور مظالم سے بچانا اور انہیں تمام حقوق وسہولیات فراہم کرنا حکومت کے پائیدار اور مستحکم ہونے کی ضمانت ہے۔

◆◆◆

دوسرا باب

خلافتِ عباسیہ بغداد

۱۳۲ ھجری تا ٦٥٦ ھجری

۷٤۹ عیسوی تا ۱۲٥۸ء عیسوی

ابوالعباس سَفّاح

عبداللہ بن محمد

ربیع الاوّل ۱۳۲ھ......تا......ذوالحجہ ۱۳۶ھ

اکتوبر 749ء......تا......جون 754ء

خلافتِ عباسیہ کے بانی سَفاح کا اصل نام عبداللہ بن محمد تھا۔ اُمت کی قیادت سنبھالتے وقت اس کی عمر چوبیس سال سے زائد نہ تھی۔ امت کی گزشتہ تاریخ میں کبھی اتنے کم عمر نوجوان کو عالم اسلام کی قیادت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ سَفاح کا بنوامیہ سے بھی قریبی رشتہ تھا؛ کیوں کہ اس کی والدہ پہلے عبدالملک بن مروان کے نکاح میں تھی۔ اس کی وفات کے بعد محمد بن علی (سَفاح کے والد) کے عقد میں آئی۔ [1] علامہ سیوطی رحمہ اللہ سَفاح کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہ نہایت سخی انسان تھا۔ جو بھی وعدہ کرتا اسے پورا کرنے میں وقتِ مقررہ سے ذرا بھی دیر نہ کرتا۔ اپنی مجلس سے اٹھنے سے پہلے ضرورت پوری کرا دیتا۔" [2]

عباسی خاندان کا فاطمی بزرگوں سے فریب:

انقلاب میں بنوعباس کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے عام مسلمانوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ ہم خاندانِ رسالت کے افراد ہیں؛ اس لیے پوری طرح کتاب وسنت کے مطابق حکومت کریں گے۔ مسلمانوں نے اسی اطمینان پر ان کا ساتھ دیا تھا اور خانوادۂ نبوی پر پورے اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ تحریک کے نعرے "الرضا من آل محمد" کا مطلب یہی تھا۔ تحریک کے دوران "خاندانِ رسالت" کا مفہوم عام تھا اور بنوعباس یا بنوفاطمہ کا امتیاز نہ تھا۔ بنوعباس تنہا اس تحریک میں کامیاب نہیں ہوسکتے تھے؛ اس لیے انہوں نے بڑی ہوشیاری سے بنوفاطمہ کے کچھ بزرگوں کو اپنے ساتھ رکھا جن میں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے پوتے عبداللہ بن حسن اور ان کے فرزند محمد بن عبداللہ نمایاں تھے جنہیں ان کی نیکی اور پرہیزگاری کے باعث "نفسِ زکیہ" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

[1] مروج الذهب: ٩٤/٤

[2] تاريخ الخلفاء، ص ١٩٢، ط نزار

مگر علامہ سیوطی یہ بھی لکھتے ہیں: وكان السَفّاح سريعاً الى سفك الدماء، فاتبعه عماله فى المشرق والمغرب، وكان مع ذلك جواداً بالمال.

"وہ خون بہانے میں بھی تیز تھا۔ اس کے گورنروں نے بھی مشرق ومغرب میں اس کی پیروی کی۔ اس کے ساتھ وہ سخی بھی تھا۔" ﴿ص ١٩٣﴾

جب تک انقلابی تحریک ابتدائی مراحل میں تھی، یہ بھی طے نہیں کیا گیا کہ انقلاب کی کامیابی کی صورت میں خلیفہ کس خاندان سے چنا جائے گا؟ بنوفاطمہ سے یا بنوعباس سے؟ اس طرح تحریک کو ہر طبقے کے عوام کی حمایت حاصل رہی۔ جب مروان بن محمد کے دور میں بنوامیہ کی حکومت چند دنوں کی مہمان دکھائی دینے لگی تو ۱۳۰ھ کے ایام حج کے دوران مکہ معظمہ میں بنوہاشم کے سیاسی قائدین کا خفیہ اجلاس ہوا جس میں سَفاح کا بڑا بھائی ابوجعفر منصور بھی شامل تھا۔ اس مجلس میں یہ طے کیا گیا کہ کامیابی کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے محمد بن عبداللہ نفس زکیہ کو خلیفہ مانا جائے گا۔ [1]

تاہم بنومروان کی حکومت ختم کرتے ہی بنوعباس نے یہ وعدہ فراموش کر دیا۔ ربیع الاول ۱۳۲ھ میں عباسی فاتحین کوفہ میں داخل ہوئے۔ لوگوں نے عید کی دن کی طرح زرق برق کپڑے پہن کر خوشیاں مناتے ہوئے نہایت گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ اگلے دن ۱۲ ربیع الاول بروزِ جمعہ کو ان کے قائد ابوالعباس سَفاح کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا۔ [2]

سَفاح کی پہلی تقریر۔ سبائیوں پر چوٹ۔ عدل وانصاف کا وعدہ:

نمازِ جمعہ کے اجتماع میں سَفاح نے لوگوں سے بیعت لی اور اپنی پہلی تقریر کی۔ چند ابتدائی جملوں کے بعد اس نے واضح طور پر ان سبائیوں پر چوٹ کی جو شیعانِ بنوفاطمہ کی ''امامت'' قائم کرنا چاہتے تھے۔ سَفاح نے کہا:

''یہ گمراہ سبائی سمجھتے ہیں کہ سیادت، حکومت اور خلافت ہمارے (بنوعباس کے) سوا دوسرے لوگوں (بنوفاطمہ) کا حق ہے۔ ان (سبائیوں) کے چہرے خوار ہو جائیں! بھلا کیوں اور کیسے؟ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہی ذریعے تو لوگوں کو گمراہی کے بعد ہدایت دی، ہمارے ذریعے جہالت کے بعد بصیرت دی، ہمارے ذریعے انہیں ہلاکت کے بعد نجات دی۔ ہمارے ذریعے لوگ باہمی دشمنی اور عداوت کے بعد بھائی بھائی ہو گئے جس سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشی نصیب ہوئی۔''

اس کے بعد اس نے اپنی تحریک کا پسِ منظر بیان کرتے ہوئے کہا:

''حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حکومت ان کے صحابہ کو ملی۔ وہ شورائیت کے ذریعے عدل کے ساتھ معاملات چلاتے رہے، انہوں نے دوسری قوموں کو مسخر کر لیا اور عدل قائم کیا، جہاں خرچ کا موقع تھا وہاں خرچ کیا اور باقی مستحقین کو دیتے رہے، خود دنیا سے خالی پیٹ چلے گئے۔ یہاں تک کہ بنوحرب اور بنومروان نے آکر حکومت پر قبضہ جما لیا اور اسے آپس میں ایک دوسرے کے حوالے کرتے رہے۔ انہوں نے ظلم وستم کا بازار گرم کر دیا۔ جب انہوں نے اللہ کو ناراض کیا تو اللہ نے ہمارے ذریعے ان سے انتقام لیا اور ہمیں ہمارا حق لوٹا دیا۔ مجھے امید ہے کہ یہ خاندان جس سے تمہیں خیر اور صلاح ملی ہے، اس سے کبھی ظلم اور فساد نہیں ملے گا۔'' [3]

---

[1] تاریخ ابن خلدون: ۲۳۵/۳، ۲۳۶؛ تجارب الامم وتعاقب الهمم لابن مسكويه: ۳۷۹/۳

[2] تاریخ الطبری: ۴۲۵/۷؛ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۴۰۹

[3] تاریخ الطبری: ۴۲۵/۷، ۴۲۶

سَفاح کے چچا داؤد بن علی کا خطاب۔ کتاب اللہ اور سیرتِ نبویہ پر چلنے کا وعدہ:

اس کے بعد سَفاح کے چچا داؤد بن علی نے خطاب کیا اور کہا:

''اللہ کی قسم! ہم اس لیے انقلاب نہیں لائے کہ نہریں نکالیں اور قلعے تعمیر کریں۔ ہمارے کھڑے ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ جب بنوامیہ نے ہمارے حقوق کو پامال کیا، ہمارے چچیرے بھائیوں (علویوں) پر مظالم کیے، تو ہمیں سخت غیرت آئی اور ہم ان حالات کو برداشت نہ کر سکے۔ اسی طرح تمہارے ساتھ ان کی بدسلوکی، مظالم اور توہین آمیز رویے کے باعث ہمیں بستروں پر سکون نہیں ملتا تھا۔

بنوامیہ نے تمہارے ساتھ جو برتاؤ کیا اور جس طرح تمہاری تذلیل کرتے رہے اور تمہارے محصولات پر قابض رہے، اس کی بناء پر ہم سخت پیچ وتاب کھاتے رہے۔

اب ہم تمہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ، ان کی آل کی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی ضمانت دیتے ہیں کہ ہم معاشرے میں اللہ کے احکام کا نفاذ کریں گے، کتاب اللہ پر عمل پیرا ہوں گے اور عوام و خواص سبھی سے سیرتِ نبوی کے مطابق معاملہ کریں گے۔

اللہ نے تمہیں وہ منظر دکھا دیا جس کا تمہیں شوق اور انتظار تھا۔ اب ایک ہاشمی تمہارا خلیفہ ہے جس کے باعث تم سرخ رو ہو گئے ہو۔ اللہ نے اہلِ شام پر تمہیں مسلط کر دیا، سلطنت تمہیں دے دی، اسلام کو قوی کر دیا اور تمہیں ایسا حکمران عطا فرمایا جسے اللہ نے عدل اور تدبیر دونوں سے مالا مال کیا ہے۔ اس پر تمہیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ تم ہماری فرمان برداری کو خود پر لازم کر لو۔ خود اپنے خلاف کوئی دھوکہ یا فریب نہ کرو؛ کیوں کہ ہماری حکومت درحقیقت تمہاری حکومت ہے۔ ہر خاندان کا ایک شہر ہوتا ہے اور ہم تمہیں (اہلِ کوفہ کو) اپنا شہر سمجھتے ہیں۔''

خطاب کے آخر میں اس نے کہا:

''یاد رکھنا! یہ اقتدار اب ہم سے کہیں جانے والا نہیں، یہاں تک کہ ہمارا آخری خلیفہ خود اسے حضرت عیسیٰ بن مریم کے سپرد نہ کر دے۔''[1]

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وقتی کامیابیاں اور راہِ اقتدار کی عارضی فتوحات اچھے خاصے ہوشیار لوگوں کو بھی کیسی کیسی خوش فہمیوں میں مبتلا کر دیتی ہیں اور ان کی آراء کو کس حد تک مفروضوں پر استوار کر دیتی ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ بنوعباس کی خلافت بھی آخر کار ختم ہوئی اور وہ بھی بنوامیہ سے کہیں زیادہ حسرت ناک انداز میں۔

سَفاح کے دربار میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی گفتگو:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بنوامیہ کے آخری ایام میں عراق کے حالات کی خرابی، بدامنی اور حکام کی سختی کے باعث حجاز چلے

[1] تاریخ الطبری: ۴۲۵/۷ تا ۴۲۷؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۳۲ھ

گئے تھے۔ مگر سَفّاح کی خلافت کے اعلان کے وقت وہ کوفہ میں موجود تھے۔ [1]

سَفّاح نے اپنی خلافت کے لیے علماء سے بیعت لینے کا خاص اہتمام کیا اور انہیں بلا کر کہا:

''اللہ کے فضل سے اقتدار تمہارے پیغمبر کے اہلِ بیت کو مل گیا ہے۔ اللہ نے حق کو غالب کر دیا ہے۔ آپ علماء، حق کی مدد کے اوّلین ذمہ دار ہیں۔ اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے آپ جتنا چاہیں گے، اس سے آپ کے اعزاز و اکرام اور ضیافت کا اہتمام ہوگا۔ آپ اپنے خلیفہ سے ایسی بیعت کریں جو آپ کے حق میں بھی حجت ہو اور (بغاوت کی صورت میں) آپ کے خلاف بھی، ایسی بیعت ہو جو آپ کے لیے امان کی ضمانت بن جائے۔ اللہ سے ایسے حال میں مت ملیں کہ آپ کا کوئی خلیفہ نہ ہو، ورنہ آپ اس گروہ میں شامل ہو جائیں گے جس کے حق میں کوئی دلیل نہیں۔''

علمائے کرام امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف دیکھنے لگے۔ ان میں قاضی ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ اور قاضی ابن شبرمہ رحمہ اللہ جیسے بزرگ فقہاء بھی تھے۔ مگر انہوں نے بھی امام صاحب رحمہ اللہ کی طرف دیکھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ یہ دونوں حضرات بنواُمیہ کے قاضی اور سرکاری ملازم چلے آرہے تھے؛ اس لیے انہیں ایک نئی حکومت کی بیعت میں پہل کرنا مناسب نہ لگا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا سابق حکومت سے ملازمت کا کوئی تعلق نہیں تھا؛ اس لیے وہ نسبتاً آزادانہ اور بہتر فیصلہ کر سکتے تھے۔ امام صاحب رحمہ اللہ نے علمائے مجلس کی نگاہوں کو بھانپ کر فرمایا:

''کیا آپ پسند کرتے ہیں کہ میں اپنی اور آپ کی طرف سے گفتگو کروں؟''

سب نے اثبات میں جواب دیا تو امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا:

''اللہ کی حمد ہے جس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں کو حق پہنچایا، ہمیں ظلم کے اندھیروں سے نکالا، اور ہماری زبانوں پر حق جاری کیا۔ ہم آپ سے اللہ کے حکم پر تا قیامت وفاداری کی بیعت کرتے ہیں۔ اللہ اس منصب کو قیامت تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں سے زائل نہ کرے۔''

سَفّاح یہ جملے سن کر بہت خوش ہوا اور بولا: ''آپ ہی جیسا شخص علماء کی نمائندگی کر سکتا تھا۔ انہوں نے آپ کو نمائندہ بنا کر اچھا کیا اور آپ نے بات کے مقصد کو اچھی طرح ادا کیا۔'' [2]

[1] امام صاحبؒ کے سوانح نگار اس پر متفق ہیں کہ اموی دور میں گورنر ابن ہبیرہ کے ظلم وستم کے بعد وہ کوفہ چھوڑ کر حجاز چلے گئے تھے۔ اس پر بھی اتفاق ہے کہ وہ منصور عباسی کے دور میں دوبارہ کوفہ آگئے تھے۔ مگر مذکورہ روایت سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ سفاح کی بیعت کے وقت وہ موجود تھے بلکہ اس بیعت میں ان کا کردار بہت اہم تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ منصور کے دور سے پہلے بھی وہ کم از کم ایک بار کوفہ ضرور آئے تھے۔ دونوں قسم کی روایات میں تطبیق کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام صاحب نے بنوامیہ کے آخری اور بنوعباس کے ابتدائی دور کی اکھاڑ پچھاڑ کے دوران کہیں مستقل قیام نہیں کیا۔ اگرچہ وہ حجاز چلے گئے تھے مگر کبھی کبھار عارضی طور پر کوفہ بھی تشریف لاتے رہتے تھے۔ کوفہ میں دوبارہ مستقل قیام انہوں نے منصور کی خلافت قائم ہو جانے کے بعد کیا۔ قرینِ قیاس بھی یہی ہے؛ کیوں کہ بدامنی کے دور میں لوگ کہیں مستقل جم نہیں سکتے اور امن قائم ہونے کے بعد ایک جگہ ٹک جاتے ہیں۔ شیخ محمد ابوزہرہ مرحوم نے اپنی محققانہ تصنیف ''ابوحنیفۃ، حیاتہ وعصرہ'' (ص ۴۰ تا ۴۴) میں اس موضوع پر عمدہ محققانہ کلام کیا ہے۔ اسے دیکھ لیا جائے۔

[2] مناقب ابی حنیفة کردری: ۱/۱۹۹، ۲۰۰

سَفاح کا مطلب:

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ سفاح کا معنی ''خوں خوار'' ہے اور یہ لقب خلافتِ عباسیہ کے بانی کو لوگوں نے اس کے ظلم وستم کی بناء پر دیا تھا، مگر یہ بات تحقیق کے خلاف ہے۔ سفاح نے اپنے لیے یہ لقب خود پسند کیا تھا؛ کیوں کہ وہ فیاض اور سخی تھا۔ مگر چونکہ وہ ایک خونی انقلاب کا بانی تھا؛ اس لیے مخالفین نے اسے منفی معنی میں زیادہ شہرت دی۔ ①

انبار میں پایۂ تخت:

چونکہ بنو عباس کے حامیوں کی زیادہ تعداد عراق اور خراسان میں تھی؛ اس لیے سیاسی حکمتِ عملی کے تحت سَفاح نے ۱۳۴ھ میں عراق کے ایک شہر ''انبار'' کو اپنا پایۂ تخت بنالیا جو دریائے فرات کے شمال مشرق میں موجودہ بغداد سے ۶۸ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ②

سخاوت:

سَفاح کی سخاوت اور داد ودہش مشہور ہے۔ نواز نے پر آتا تو اس کا ہاتھ رو کے نہیں رکتا تھا۔ بنوامیہ کے دور کے خزانوں کو اس نے بے دریغ لٹایا۔ سادات کو خوب نوازا چاہے وہ انقلابی تحریک میں حصہ دار تھے یا نہیں۔ حضرت زین العابدین کے پوتے عبید اللہ الاعرج کو مدائن میں اتنی بڑی جاگیر دی جس کی سالانہ آمدن ۸۰ ہزار دینار تھی۔ ③

ایک لطیفہ:

عام لوگوں پر بھی اس کا دستِ کرم کشادہ تھا۔ اس دور کا مشہور ظریف شاعر ابودُلامہ اس کے پاس آیا تو سَفاح نے کہا: ''کوئی ضرورت ہو تو بتاؤ۔'' وہ بولا: ''بس ایک شکاری کتا دے دیں۔''

سَفاح نے کہا: ''اسے شکاری کتا دے دیا جائے۔''

---

① لغت میں سَفاح کے متعدد مطالب درج ہیں جن میں سے چند یہ ہیں: الرجل المعطاء، قادر علی الکلام، اوّل خلفاء بنی عباس، رئیس للعرب.
''بکثرت عطیے دینے والا شخص، قادر الکلام آدمی، پہلے عباسی خلیفہ کا لقب، ایک عرب رئیس۔'' ﴿تاج العروس: ۶/۴۷۶، ط دار الھدایة﴾
اگرچہ سَفاح کا ایک معنی خون بہانے والا بھی ہے مگر قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ خطاب اس نے خود اپنے آپ کو دیا تھا اور وہ بھی اپنے پہلے خطبے میں، وہ بھی ایسے موقع پر جب وہ لوگوں کو اپنے حسنِ سلوک کی امید دلا رہا تھا۔ اس نے کہا تھا: ''قدزدتکم فی اعطیاتکم مائة درھم فاستعدوا، فانا السفاح المبیح والثائر المبیر.''
''میں نے تمہاری تنخواہوں میں سو سو درہم کا اضافہ کردیا ہے۔ پس (اسے لینے کے لیے) تیار ہو جاؤ؛ کیوں کہ میں ہوں کسی روک ٹوک کے بغیر دینے والا، اور سفاک منتقم۔''
﴿تاریخ الطبری: ۷/۴۲۶﴾

یہاں اس نے اپنی دو صفتیں بیان کی ہیں: ایک سخاوت۔ دوسری سفاکی۔ پہلی صفت کے لیے ''السفاح المبیح'' کا لفظ استعمال کیا یعنی ایسا سخی جو سب کچھ اٹھا لے جانے کو مباح کردے۔ دوسری صفت ''الثائر المبیر'' بتائی یعنی دشمنوں سے بھرپور انتقام لینے والا۔ پس ثابت ہوا کہ یہاں ''سَفاح'' سخی کے معنی میں ہے۔
حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سَفاح کی خلافت کے آغاز میں درج ذیل عنوان لگایا ہے: ''ذکر استقلال ابی العباس عبداللہ بن محمد بن علی بن عبد اللہ بن عباس، الملقب بالسفاح، وما اعتمده فی ایامه من السیرة الحسنة والعدالة التامة.''
(ابوالعباس عبداللہ بن محمد سَفاح کے اقتدار کا ذکر اور اس کے دورِ حکومت میں اس کی حسنِ سیرت اور کامل عدل وانصاف کے وہ حالات جو معتبر ہیں۔)
﴿البدایه والنھایه: ۱۳/۲۷۵﴾
اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سفاح ایسا بھی ظالم وجابر نہ تھا جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ اس کی سیرت میں خوبیاں غالب تھیں۔ ہاں کسی قدر سفاکی ضرور تھی۔

② الکامل فی التاریخ: سنة ۱۳۴ھ

③ عمدة الطالب لابن عنبه جمال الدین الحسینی، ص ۳۱۸...... یہ رقم بیس کروڑ روپے کے لگ بھگ ہے۔

ابودلامہ نے کہا: ”ایک سواری بھی تو ہو جس پر سوار ہو کر میں شکار کے لیے جاؤں۔“

سفاح نے کہا: ”ایک سواری دے دی جائے۔“

ابودلامہ بولا: ”ایک غلام بھی تو چاہیے ہوگا جو کتے کے ساتھ چل کر شکار کرے۔“

سفاح نے کہا: ”اسے غلام بھی دے دیا جائے۔“

ابودلامہ نے کہا: ”ایک باندی بھی درکار ہوگی جو شکار کا گوشت پکا کر دے اور کھلائے۔“

سفاح نے کہا: ”باندی بھی دے دی جائے۔“

ابودلامہ نے کہا: ”آپ کے یہ خدام رہیں گے کہاں؟ ایک گھر بھی مرحمت ہو۔“

سفاح نے کہا: ”ایک گھر بھی ان کے نام کر دیا جائے۔“

ابودلامہ نے کہا: ”اگر اتنے لوگوں کی کوئی جائیداد نہ ہوئی تو گزر بسر کیسے ہوگی؟“

سفاح نے کہا: ”سوا ایکڑ زرخیز زمین اور سوا ایکڑ بنجر زمین اس کے نام کر دو۔“

ابودلامہ نے منہ بنا کر کہا: ”بنجر زمین؟ میں ہی بنو اسد کے صحرا کی پانچ سوا ایکڑ بنجر زمین آپ کے نام کرتا ہوں۔“

سفاح ہنس پڑا اور بولا: ”ساری زمین زرخیز ہی دے دو۔“[1]

غرض سفاح فیاض اور کشادہ دل تھا۔ البتہ اس کا چچا عبداللہ بن علی اور ابومسلم خراسانی سخت طبع آدمی تھے۔ امرائے بنوامیہ کے قتل میں زیادہ تر یہی دونوں ملوث تھے۔ سفاح کا جرم یہ تھا کہ اس نے انہیں کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔

بنوامیہ پر مظالم:

اس میں شک نہیں کہ نئے حکمران خانوادے نے عوام کے ساتھ عدل وانصاف اور سخاوت وفیاضی کا سلوک کیا مگر دوسری طرف بنوامیہ کو بے دریغ انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ بہت سے شہزادوں، امراء اور سابق سرکاری افسران کو قتل کیا گیا۔ ان مظالم سے بچنے کے لیے بہت سے اموی گھرانوں کو فرار ہونا پڑا۔ مفرور اموی شہزادوں میں سے ایک عبدالرحمٰن الداخل تھا جس نے اندلس جا کر وہاں اموی سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔[2]

مقتول شہزادوں اور امراء میں عبداللہ بن عبدالملک، اسحٰق بن عبداللہ، عبدالملک بن مروان کا پوتا غمر بن یزید اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے پوتے عمر بن ابی سلمہ بھی شامل تھے۔ اسی طرح سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کے پانچ پڑپوتے: عمران بن موسیٰ، ایوب بن موسیٰ، یحییٰ بن امیہ، اسماعیل بن امیہ اور عبداللہ بن عَنبَسہ قتل کیے گئے۔ عبداللہ بن عنبسہ کے دو بیٹے: عیاض اور محمد کا انجام بھی یہی ہوا۔ سزائے موت کی یہ کارروائیاں سفاح کے چچا عبداللہ بن علی اور داؤد بن علی کے ہاتھوں عمل میں آئیں۔[3]

بنوعباس کے انقلابی قائدین بنوامیہ کے بارے میں کیا جذبات رکھتے تھے، اس کا اندازہ درج ذیل واقعے سے

---

[1] الاغانی لابی الفرج الاصبهانی: ۳۰/۱۸ [2] تاریخ الطبری: ۴۴۳/۷، ۴۵۹ [3] تاریخ خلیفه بن خیاط، ص ۴۱۰

ہوگا کہ آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد کے قتل کے بعد اس کی بیویاں اور بیٹیاں مصر سے گرفتار کر لی گئیں۔ انہیں سَفاح کے چچا صالح کے پاس بھیج دیا گیا۔ جب ان قیدی خواتین نے رحم کی درخواست کی تو صالح نے کہا:

''کیا تمہارے باپ مروان نے میرے بھتیجے ابراہیم کو قتل نہیں کرایا۔ کیا ہشام بن عبدالملک نے زید بن علی کو کوفہ میں سولی نہیں دلوائی تھی؟ کیا ولید بن یزید نے یحییٰ بن زید کو خراسان میں نہیں مروایا تھا؟ کیا عبیداللہ بن زیاد نے مسلم بن عقیل کو قتل نہیں کیا؟ کیا یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کو قتل نہیں کرایا؟ پس میں تمہیں کیوں بخشوں؟''

مروان کی بڑی بیٹی نے کہا: ''آپ کی بخشش کا دامن ہمارے لیے کشادہ ہونا چاہیے۔''

صالح نے کہا: ''یہ بات الگ ہے۔ اور اگر چاہو تو اپنے بیٹے فضل سے تمہارا نکاح کرا دوں۔''

بنت مروان نے کہا: ''یہ نکاح کا کونسا موقع ہے، ہاں آپ ہمیں ہمارے شہر بھیج دیں۔''

صالح نے ان کی درخواست پوری کر دی۔[1]

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دشمنی اور عداوت کے ماحول میں درگزر اور مہربانی کے واقعات بھی پیش آتے رہے۔ اموی دور کے بعض نامور امراء جیسے محمد بن اَشعَث کو اس شرط پر امان دے دی گئی کہ وہ کسی مجمع عام سے کبھی خطاب نہیں کریں گے اور اپنی تلوار کو جہاد کے لیے وقف رکھیں گے۔ محمد بن اَشعَث نے ایسا ہی کیا اور عباسی حکومت کے سالار کے طور پر جہاد میں مصروف رہے۔[2]

عباسی دربار کے عالم بلاذُری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بنوامیہ سے سلوک کے بارے میں خود عباسی امراء میں اختلافِ رائے تھا۔ بعض نے ان سے اچھا سلوک کیا اور بعض تشدد کے درپے رہے۔ سَفاح کا چچا سلیمان بن علی بصرہ کا حاکم تھا، اس نے یہاں بنوامیہ کو کوئی گزند نہ پہنچائی۔ خلیفہ سَفاح نے حکم دیا کہ بصرہ کے امویوں کی جائیدادیں ضبط کر لو۔ سلیمان بن علی نے شہر کے امویوں کو جمع کر کے اس حکم سے آگاہ کیا اور کہا:

''اگر میں امیر المؤمنین کو یہ لکھوں کہ ان لوگوں کے پاس کچھ نہیں تو وہ کسی دوسرے کو مقرر کر دیں گے جو تم سے زبردستی لے گا۔ بہتر یہی ہے کہ تم خود ایک مناسب مقدار میرے سپرد کر دو تا کہ خلیفہ کو کوئی بدگمانی نہ ہو۔''

امرائے بنوامیہ نے آٹھ سو ایکڑ زمین حوالے کر دی اور باقی مال و دولت کے ساتھ آرام سے رہتے بستے رہے۔

اموی امیر سَلم بن حرب بصرہ میں بڑی شان و شوکت سے سواری کرتا تھا، کوئی روک ٹوک نہ ہوتی۔ ایک بار سَفاح کے چچا عبداللہ بن علی نے اسے دیکھا تو سلیمان سے پوچھا: ''یہ لوگ ابھی تک اس خوشحالی کے ساتھ جی رہے ہیں؟''

سلیمان نے کہا: ''مجھے ان پر دست درازی کی کوئی گنجائش نہیں نظر آتی۔ حق پرستی نے مجھے ایسے اقدام سے روکا ہے۔''

عبداللہ بن علی نے کہا: ''اگر میں ہوتا تو انہیں ملیا میٹ کر دیتا۔''[3]

---

[1] الكامل في التاريخ: سنة: ١٣٢هـ
[2] تاريخ الطبري: ٤٥٨/٧
[3] انساب الأشراف: ٩١/٤

بعض اموی امراء کو اعلیٰ عہدے دیے گئے مثلاً: یعقوب بن داؤد کو مہدی عباسی کے دور میں وزارت ملی۔[1] ربیع بن یونس اموی تین خلفاء: یعنی منصور، مہدی اور ہادی کے دور میں عباسیوں کا حاجب رہا۔[2] اس کا بیٹا فضل، ہارون اور مامون کے دور میں حاجب رہا۔[3] یوں سلطنت کا یہ مرکزی عہدہ تقریباً پون صدی تک اموی امراء کے پاس رہا۔

ابنِ ہُبیرہ کو امان دینے کے بعد سزائے موت:

تاہم بنوامیہ کے بعض امراء سے سفّاح نے بدعہدی بھی کی۔ کچھ ایسے امراء کو موقع پاتے ہی قتل کرا دیا جو صلح کر چکے تھے۔ ابنِ ہُبیرہ (یزید بن عمر) عربوں کا نامور شہ سوار اور اموی اقتدار کا ستون تھا۔ وہ واسط میں قلعہ بند ہو کر عباسیوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ سفّاح نے اپنے بھائی منصور کو اس کی سرکوبی پر مقرر کیا تھا۔ ابنِ ہُبیرہ گیارہ ماہ تک مورچہ بند رہا۔ آخر مروان بن محمد کی موت کی خبر ملنے کے بعد اس کی ہمت ٹوٹ گئی۔ اُدھر سے منصور کا نمائندہ حسن بن قَحطَبہ اس کے پاس پہنچا اور بولا: ''اب گردن اونچی کرنے کا کیا فائدہ! اب تو کوئی بھی باقی نہیں رہا جو امیر المؤمنین کا حلقہ بگوش نہ بن گیا ہو۔ تمہیں اللہ کے عہد و میثاق کے ساتھ اطمینان دلایا جاتا ہے کہ تم اور تمہاری ہر چیز محفوظ رہے گی۔''

اگلے دن خازم بن خزیمہ اور حارث بن نوفل جیسے چوٹی کے سرکاری امراء یکے بعد دیگرے ابنِ ہبیرہ سے ملے، ہر ایک نے اسے یقین دلایا کہ وہ جس طرح چاہے، اس کے مطابق اس سے تحریری معاہدہ کر لیا جائے گا۔ آخر کار ابن ہبیرہ نے ان کے وعدوں پر یقین کر کے تحریری معاہدہ کر لیا۔ پھر منصور کے خیمے میں حاضری دی۔ منصور نے اس وقت اچھا برتاؤ کیا اور کہا: ''ہم بنوہاشم ہیں۔ بروں سے درگزر کرتے ہیں اور فضیلت والوں کا خیال رکھتے ہیں۔ تم ہمارے نزدیک عام لوگوں کی طرح نہیں ہو۔ امیر المؤمنین کو تم جیسے لوگوں سے حسنِ سلوک میں بہت زیادہ دلچسپی ہے۔ آپ کے ساتھ ایفائے عہد ہوگا۔ مطمئن اور خوش و خرم رہیں۔''

ابنِ ہُبیرہ نے یہ حسنِ سلوک دیکھا تو نیک مشورہ دیتے ہوئے کہا: ''امیر! آپ کی حکومت نئی نئی ہے۔ لوگوں کو اس کی مٹھاس کا عادی بنائیے۔ اس کی تلخی نہ چکھائیے تاکہ وہ آپ کے گرویدہ ہوں۔''

بظاہر امن و امان ہو گیا تھا مگر دو ہفتے بھی نہ گزرے تھے کہ منصور نے ابنِ ہُبیرہ اور اس کے متعدد سرکردہ ساتھیوں کو یکدم دھوکے سے گرفتار کر لیا اور معاہدے کا لحاظ کیے بغیر سب کو قتل کرا دیا۔ یہ واقعہ ۱۳۲ھ کا ہے۔[4]

عباسی تحریک کے معاشی ستون ابوسلمہ وزیر آلِ محمد کا قتل:

یہی نہیں بلکہ عباسی تحریک کے وہ پکے جانثار بھی سفّاح کی شمشیر سے نہ بچ پائے جن کی وفاداری پر بعد میں شک و شبہے کا کوئی دھبہ پڑ گیا۔ اس کی سب سے بڑی مثال ابوسلمہ خلال کے قتل کی ہے۔ یہ شخص کوفہ کے مالدار ترین شرفاء

[1] تاریخ الطبری: ۱۸۳/۶ [2] سیر اعلام النبلاء: ۳۳۵/۷

[3] البدایۃ والنہایۃ: ۵۹۷/۱۳

[4] تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۴۰۰ تا ۴۰۲؛ انساب الاشراف: ۱۴۵/۴ تا ۱۵۲؛ تاریخ الطبری: ۴۵۰/۷ تا ۴۵۵؛ البدایۃ والنہایۃ: ۲۸۰/۱۳، ۲۸۱؛ الکامل فی التاریخ: ۲۹/۵ تا ۳۳

میں سے تھا۔ سادات کے اقتدار کے لیے اس نے اپنا مال بے دریغ خرچ کیا اور یوں انقلاب کی کامیابی میں بہت بڑا حصہ لیا۔ سَفّاح نے اس کے مقام ومرتبے، قابلیت اور انقلابی تحریک کے لیے نمایاں ترین خدمات کے باعث اسے اپنا وزیر بنالیا تھا۔ اس اقدام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ عجمی رعایا اور اہلِ عراق کا اعتماد برقرار رہے۔

ابوسلمہ اسلامی تاریخ میں وزارت کا عہدہ پانے والا پہلا فرد تھا۔ اس کا لقب ''وزیرِ آلِ محمد'' تھا۔ وہ اس پر ناراض تھا کہ بنوعباس نے بنوفاطمہ کو نظر انداز کر کے خلافِ معاہدہ اپنی حکومت قائم کی ہے۔ سَفّاح کو اس کے خیالات کا علم تھا اور اسے اندیشہ تھا کہ کہیں ابوسلمہ بنوفاطمہ سے نہ جا ملے؛ اس لیے وہ موقع پاتے ہی اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا مگر صرف اس خیال سے رکا رہا کہ اہلِ خراسان اس کے انتقام کے لیے نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ جب ابومسلم خراسانی نے خراسان و عراق پر غلبہ حاصل کرلیا اور سَفّاح کو ہر طرف سے اطمینان ہوگیا تو اس نے ابوسلمہ کا کانٹا نکال دینے کا فیصلہ کرلیا۔ ۱۳۲ھ میں اس کے حکم سے ابومسلم نے اپنے آدمی بھیج کر اپنے اس پرانے مددگار کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔[1]

اس طرح بنوعباس نے شروع سے فریب اور بدعہدی کا مظاہرہ کیا۔ بعد میں یہ چیز رفتہ رفتہ ان کی سیاسی پالیسی کا حصہ بن گئی۔ چند غیر معمولی متقی اور پرہیزگار خلفاء کے سوا اکثر نے اسی قسم کے غلط سیاسی رویے کا مظاہرہ کیا۔

بغاوتیں:

عباسیوں کے اس طرزِ عمل نے بہت جلد عوام کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ نہ صرف یہ کہ عرب ان سے مایوس ہوئے بلکہ عجم میں بھی بہت سے قبائل اور طبقات متنفر ہوگئے۔ یہی وجہ تھی کہ سَفّاح کا اقتدار پوری طرح مستحکم ہونے سے پہلے ہی عالمِ اسلام میں خروج اور بغاوتوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا جو سَفّاح کی موت کے بعد اس کے بھائی ابوجعفر منصور کے زمانے میں بھی جاری رہا۔ بنوعباس کا شعار سیاہ عمامے اور سیاہ لباس تھا۔ اس کے مقابلے میں بغاوت کرنے والوں نے سفید لباس کو اپنی پہچان بنایا۔ جہاں بھی بغاوت ہوتی لوگ سفید لباس پہن کر منظرِ عام پر آتے۔[2]

پہلی بڑی بغاوت ۱۳۲ھ میں شام کے علاقے قِنَّسْرِین میں ایک امیر ابوالورد نے کی، اس کے بعد اس بغاوت کی قیادت سابق اموی خلیفہ یزید بن معاویہ کے پڑپوتے ابومحمد سفیانی نے کی تاہم اس پر بڑی سرعت سے قابو پالیا گیا۔ قنسرین کے باغیوں سے شہ پا کر الجزیرہ میں دو سرکردہ بھائیوں بکار بن مسلم اور اسحاق بن مسلم نے ساٹھ ہزار افراد کے ساتھ خروج کیا۔ سَفّاح نے اپنے بھائی ابوجعفر منصور اور چچا عبداللہ بن علی کو بھیج کر بمشکل یہ بغاوت فرو کی۔[3]

اسی سال دوسری بڑی بغاوت مُوصِل میں ہوئی جسے سَفّاح کے بھائی یحییٰ نے بڑی سختی سے کچل ڈالا۔[4] ہر شورش کا بنوعباس کے پاس ایک ہی جواب تھا کہ شورش پسندوں کو تہس نہس کردیا جائے؛ تاہم بغاوتوں کے طوفان مختلف مقامات

[1] تاريخ الطبري: ٤٤٩/٧، ٤٥٠؛ انساب الأشراف: ١٥٤/٤ تا ١٥٧؛ الكامل في التاريخ: ٢٨/٥

[2] تاريخ الطبري: ٤٤٣/٧؛ البداية والنهاية: ٢٧٦/١٣

[3] البداية والنهاية: ٢٧٦/١٣، ٢٧٧، ٢٧٨

[4] الكامل في التاريخ: ٣٣/٥، ٣٤

پر امنڈتے رہے۔ ۱۳۴ھ میں بسام بن ابراہیم نے خراسان، شیبان یشکری نے عمان اور منصور بن جمہور نے سندھ میں بغاوت کی، اگلے سال زیاد بن صالح نے وسطِ ایشیا میں خروج کیا۔ [1]

خراسان کے باغی سردار شریک بن شیخ نے برملا کہا:

''ہم نے اس بات پر تو آلِ محمد کا ساتھ نہیں دیا تھا کہ وہ خونریزی کریں اور ناحق راہ اختیار کریں۔''

تیس ہزار آدمی اس کے ساتھ ہو گئے۔ یہ مہم ابو مسلم خراسانی کے سپرد ہوئی، دیگر مقامات کی طرح یہاں بھی باغیوں کا زور توڑ کر انہیں نشانۂ عبرت بنا دیا گیا۔ [2]

امام ابراہیم بن میمون کا قتل:

ان علمی شخصیات کو بھی نہ چھوڑا گیا جو پہلے انقلاب میں ہمنوا تھیں اور بعد میں انقلابی زعماء کی غلطیوں پر احتجاج کرنے لگی تھیں۔ امام ابراہیم بن میمون الصائغ خراسان کے نامور محدث اور فقیہ تھے، امام ابوداؤد اور امام نسائی نے ان کی روایات لی ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ ان کے تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ علمی خدمات کے ساتھ آہن گری کا کام بھی کرتے اور اس سے گزر بسر فرماتے۔ کام کے دوران اذان کی آواز سنتے ہی اوزار ہاتھ سے رکھ دیتے اور نماز کو چل دیتے۔ انہوں نے عباسی تحریک کا بھرپور ساتھ دیا اور ابومسلم خراسانی کے بہت قریب رہے۔

مگر بعد میں جب انہوں نے عباسی حکام سے قرآن وسنت پر پوری طرح عمل پیرا ہونے اور ظلم وستم سے اجتناب کرنے کا مطالبہ شروع کیا تو ابومسلم خراسانی نے انہیں سزائے موت دے دی۔ انہیں اس طرح ضرب لگائی گئی کہ کچھ رمق باقی رہ گئی۔ تین دن تک زخم سے خون بہتا رہا اور وہ پڑے پڑے کراہتے رہے۔ [3]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو ان کے قتل کی خبر ملی تو اتنا روئے کہ جیسے جان نکل جائے گی۔ [4]

ابومسلم کی حیثیت بلّی کے برابر۔ منصور کی رائے:

اپنی حکومت کے کامل استحکام کے بعد سفاح چاہتا تھا کہ ابومسلم خراسانی کو بھی ٹھکانے لگا دے؛ کیوں کہ ڈر تھا کہ وہ مملکت کے سیاہ وسپید پر قابض ہو کر عجمیوں کی بالادستی نہ قائم کر دے مگر ابومسلم کے احسانات کی وجہ سے وہ کوئی حتمی فیصلہ کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ سفاح کے بھائی منصور کی دوٹوک رائے تھی کہ ابومسلم غداری پر تلا بیٹھا ہے؛ لہٰذا اسے نمٹانے میں بالکل دیر نہ کی جائے۔ سفاح نے جب کہا: ''اس کے ہم پر بڑے احسانات ہیں۔ اس کا مرتبہ بھی تم جانتے ہو۔'' تو منصور نے جواب دیا: ''یہ سب کچھ ہمارے دم سے ہے۔ اللہ کی قسم! ابومسلم کی جگہ کسی بلّی کو بھی ان کاموں کے لیے بھیجا جائے تو وہ کر گزرے گی۔'' [5]

---

① الکامل فی التاریخ: ۴۱/۵، ۴۲، ۴۳، ۴۵ ② تاریخ الطبری: ۴۵۹/۷، ۴۶۲، ۴۶۴، سنة ۱۳۳ھ
③ تهذيب الكمال: ۲۲۳/۲، ۲۲۴؛ اكمال تهذيب الكمال: ۳۰۴/۱
④ الطبقات السنية في تراجم الحنفية: ۷۳/۱
⑤ تاريخ الطبری: ۴۶۸/۷، ۴۶۹

تاہم سفاح کو اس کا موقع نہ ملا اور یہ کام منصور نے پورا کیا۔

سفاح کی وفات ۔ دورِ حکومت کی خصوصیات:

سفاح چار سال نو ماہ حکومت کر کے چیچک کی بیماری میں مبتلا ہو کر ۱۱ ذوالحجہ ۱۳۶ھ کو فوت ہو گیا۔ اس کی عمر لگ بھگ تیس سال تھی۔ اس کی حکومت کا زیادہ وقت بنوامیہ اور ان کے وفاداروں کو ختم کرنے میں گزرا۔ ①

ملکی انتظامات کے لحاظ سے یہ مدت مختصر تھی تاہم کچھ نئے کام اس نے کر دکھائے۔ پہلے مسلم حکومتوں میں منصب وزارت کبھی نہیں رہا۔ دربار میں چند لوگ خاص مشیر اور منتظم ہوا کرتے تھے۔ سفاح نے سب سے قابلِ اعتماد مشیر ابوسلمہ کو بھرپور انتظامی اختیارات دے کر ''وزیر'' قرار دیا۔ اس عہدے کی حیثیت تقریباً وہی تھی جو آج کل ''وزیر اعظم'' کی ہوتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ وزیر اعظم عوام کا نمائندہ ہوتا ہے اور یہ وزیر خلیفہ کا نائب ہوا کرتا تھا۔ یاد رہے کہ صدیوں تک اسلامی حکومتوں میں وزارت کا یہی ایک عہدہ چلتا رہا۔ وزیرِ خارجہ، وزیرِ داخلہ وغیرہ کی کوئی تقسیم نہ تھی۔

سفاح نے دوسرا اہم کام یہ کیا کہ دارالخلافہ کو شام سے عراق میں منتقل کر دیا۔ یہ اس کی دور اندیشی تھی کہ اس نے عراق میں بنوہاشم کے سابقہ دارالخلافہ کوفہ کا انتخاب نہ کیا بلکہ ''انبار'' کو مرکز قرار دیا؛ کیوں کہ اہلِ کوفہ کی تاریخ اس کے سامنے تھی۔ اس کا جانشین منصور بھی تقریباً نو سال تک ''انبار'' میں رہا۔

طبیعت کے لحاظ سے جہاں ابوالعباس دشمنوں کے لیے شمشیرِ بے نیام تھا وہاں دوستوں کے لیے نہایت کشادہ دل بھی تھا۔ اسے شعروادب کا بہت اچھا ملکہ تھا۔ شعراء کو ساتھ بٹھا کر کلام سنتا اور انہیں خوب نوازتا۔

بنوہاشم کی فاطمی شاخ کے بزرگوں کو اس نے حکومت سے تو محروم رکھا تاہم ان پر بہت کھلے دل سے خرچ کرتا رہا تاکہ وہ مطمئن رہیں اور کسی باغیانہ سرگرمی کی طرف مائل نہ ہوں۔ ②

سفاح نے تعمیراتی کام بھی کرائے۔ کوفہ سے لے کر مکہ تک ہر منزل پر سنگِ میل نصب کرائے۔ رات کو سفر کرنے والوں کی سہولت کے لیے اس شاہراہ پر روشنی کے مینار بھی تعمیر کرائے گئے۔ ③

❖❖❖

بعض بدعات کا ازالہ

اس میں شک نہیں کہ بنوعباس کی حکومت کا آغاز بھی کسی مثالی طریقے سے نہیں ہوا تھا اور اقتدار مستحکم کرنے کے بعد بھی وہ بعض اُمور میں بنواُمیہ کے ہم پلہ نہیں ہو سکے، بلکہ موازنہ کیا جائے تو انتظام وانصرام، استحکام اور فتوحات کے لحاظ سے بنواُمیہ کا زمانہ بہتر لگے گا۔ تاہم بنوعباس نے آتے ہی کچھ ایسے اقدامات کیے جن پر ان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ اقدامات بعض مٹی ہوئی سنتوں کے احیاء سے متعلق تھے۔

① البدایة والنہایة: ۱۳/۲۹٤ ② التاریخ الاسلامی العام، ص ۳۳٦ تا ۳۳۸ ③ الکامل فی التاریخ: سنة ۱۳٤ھجری

کھڑے ہوکر جمعے کا خطبہ دینے کی سنت:

سنت یہ ہے کہ جمعہ وعیدین کا خطبہ کھڑے ہوکر دیا جائے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کا معمول تھا۔[1] مگر بنومروان اس کے برخلاف بیٹھ کر خطبہ دیا کرتے تھے۔[2] ابوالعباس سَفاح نے اس بدعت کا خاتمہ کیا اور کھڑے ہوکر خطبہ دینے کی سُنت زندہ کی۔ اس پر مسلمان بے حد مسرور ہوئے۔[3]

نمازِ عیدین کے بعد خطبہ دینے کی سُنت:

حضور اکرم ﷺ کی سنت اور خلفائے راشدین کے تعامل کے مطابق عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کی نمازوں کا خطبہ نماز کے بعد ہوتا ہے مگر بنومروان کے خلفاء اور امراء عیدین کا خطبہ نماز سے پہلے دے دیا کرتے تھے تا کہ مجمع کو چاروناچار ان کی لمبی لمبی تقریریں سننا پڑیں۔ اس بدعت کا آغاز مروان بن الحکم نے کیا تھا اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ جیسے فقہاء کے سمجھانے کے باوجود اس نے یہ بدعت ترک نہیں کی تھی بلکہ انہیں یہ طنزیہ جواب دیا تھا:

---

① مسند الشافعي، ص ٦٦

② سب سے پہلے بیٹھ کر خطبہ دینا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے شروع کیا تھا۔ امام شافعی نقل کرتے ہیں:

عن ابی هريرة عن النبی ﷺ وابی بكر وعمر وعثمان انهم كانوا يخطبون الجمعة خطبتين على المنبر قياما يفصلون بينهما بجلوس حتىٰ جلس معاوية فى الخطبة الاولىٰ فخطب جالسا وخطب فى الثانية قائما. (مسند الشافعي، ص ٦٦)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر بیٹھ کر خطبہ دینے کے حوالے سے اس لیے کوئی الزام نہیں کہ انہیں عذر تھا۔ وہ کبرسِنی اور بدن بھاری ہو جانے کے باعث کھڑے ہونے میں تکلیف محسوس کرنے لگے تھے۔

عن الشعبي قال: اول من خطب جالساً معاوية حين كثر شحمه وعظم بطنه. (تاريخ دمشق: ٥٩/٢٠٢)

کھڑے ہوکر خطبہ دینا شوافع کے نزدیک واجب ہے اور احناف کے نزدیک سنت۔ عذر کی بناء پر بیٹھ کر خطبہ دیا جا سکتا ہے مگر اسے معمول بنانا غلط ہے۔

بنومروان نے بلاعذر مستقل طور پر یہی طرزِ عمل اختیار کر لیا تھا۔ صحابہ کرام نے اس طرزِ نو کے آغاز پر احتجاج کیا مگر شنوائی نہ ہوئی۔

ایک بار اُموی گورنر عبدالرحمٰن بن اُم الحکم بیٹھ کر خطبہ دے رہا تھا تو کعب بن عُجرہ رضی اللہ عنہ نے دیکھ کر فرمایا:

انظروا إلى هذا الخبيث يخطب قاعدا! ''اس خبیث کو دیکھو کہ بیٹھ کر خطبہ دے رہا ہے۔''

پھر انہوں نے سورۃ الجمعۃ کی آیت: ''وتركو ك قائما.'' پڑھی جس سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوکر خطبہ دیا کرتے تھے۔

(صحيح مسلم، ح: ٢٠٣٨، كتاب الجمعة، باب في قوله تعالى: وإِذا رأوا تجارة)

کعب بن عُجرہ رضی اللہ عنہ نے جس وقت عبدالرحمٰن بن اُم الحکم کو ڈانٹا تھا اس دور میں یہ روش ایک آدھ حاکم ہی نے اختیار کی تھی؛ کیوں کہ علامہ بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری میں کعب بن عُجرہ رضی اللہ عنہ کی یہی روایت ابن خزیمہ کے حوالے سے بھی نقل کی ہے جس کے مطابق کعب بن عُجرہ رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا تھا:

ما رأيت كاليوم قط امام يؤم المسلمين يخطب وهو جالس. ''میں نے آج تک مسلمانوں کا کوئی امام نہیں دیکھا جو بیٹھ کر خطبہ دیتا ہو۔''

(عمدة القارى: ٦/٢١٩، ط دار احياء التراث العربى)

غرض اس دور میں یہ بدعت اِکادُکا گورنروں نے شروع کی تھی تاہم بعد میں بنومروان نے اس طرز کو اپنی مستقل روایت بنالیا۔

نوٹ: عبدالرحمٰن بن اُم الحکم کی نسبت اپنی ماں کی طرف ہے، اصل نام عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن ربیعہ ہے۔ (المحبر، ص ٣٨٠)

اُم الحکم ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں، یعنی عبدالرحمٰن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا بھانجا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے ۵۸ھ میں کوفہ کا حاکم بنایا تھا۔ (تاريخ الطبرى: ١٢/٣١٢)

عبدالرحمٰن بن اُم الحکم کی کوفہ پر حکومت مختصر مدت تک ہی رہی؛ کیوں کہ اس نے ایک ذمی کو ناحق سزائے موت دے دی، جس پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے معزول کر دیا۔ (العلل ومعرفة الرجال للامام احمد بن حنبل برواية ابنه عبدالله: ٢/٤٦٤، ط دار الخانی)

③ مرآة الزمان في تواريخ الاعيان لسبط ابن الجوزى: ١٢/١٥، ط الرسالة العالمية؛ الوافي بالوفيات للصفدى: ١٧/٢٣٢

''قد تُرِكَ مَا تَعلَم.'' (جو چیز تم جانتے ہو، وہ متروک ہو چکی ہے۔)[1]

بنوعباس نے اقتدار سنبھال کر بنومروان کی اس پُرانی بدعت کا خاتمہ کیا اور دوبارہ نمازِ عید کے بعد خطبہ دینے کی سُنت جاری کر دی۔[2] چونکہ دو تین نسلوں سے خطبۂ عید نماز سے پہلے ہوتا چلا آیا تھا؛ اس لیے عوام کی بہت بڑی تعداد اسی کو سُنت سمجھنے لگی تھی، چنانچہ ہر طرف یہ بات پھیل گئی کہ بنوعباس نے سُنت میں تحریف کر دی ہے۔[3] حالانکہ انہوں نے ایک بدعت کا خاتمہ کیا تھا۔ بہرحال آہستہ آہستہ علماء وفقہاء کی نظریاتی محنت نے لوگوں کو یقین دلا دیا کہ سنت وہی ہے جس پر بنوعباس عمل پیرا ہیں۔

محدثین وفقہاء بنوعباس کے دور کو اس اعتبار سے پسند کرتے تھے کہ نمازوں میں رائج بعض بدعات ختم ہو گئیں اور ان کی جگہ سنتیں زندہ ہو گئی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ایک بار ہارون الرشید نے کوفہ کے مشہور فقیہ ومحدث امام ابوبکر بن عیاش رحمہ اللہ سے پوچھا: ''آپ نے بنواُمیہ کا دور بھی دیکھا اور ہمارا بھی۔ بتائیے ہم دونوں میں سے بہتر کون ہے؟''

ابوبکر بن عیاش رحمہ اللہ نے جواب دیا:

''آپ حضرات نماز کے زیادہ پابند ہیں اور وہ لوگوں کے لیے زیادہ نافع تھے۔''

ہارون الرشید نے اس معتدل جواب پر انہیں چھ ہزار دینار انعام دیے۔[4]

ابوبکر بن عیاش رحمہ اللہ کا مطلب یہ تھا کہ جہاد اور ترقیاتی وتعمیراتی کاموں کے لحاظ سے بنواُمیہ زیادہ فعال تھے جبکہ مسنون اُمور کی پابندی میں بنوعباس ان سے بڑھ کر ہیں۔ تاہم یاد رہے کہ بنوعباس کی یہ فوقیت ہمیشہ نہیں رہی۔ بعض خلفاء مثلاً مامون اور معتصم کے دور میں تو سرکاری سرپرستی میں باقاعدہ بدعات کی ترویج ہوتی رہی تھی۔

---

[1] صحیح البخاری، ح: ۹۵۶، کتاب الجمعة، باب الخروج الی المصلّٰی بغیر المنبر؛ صحیح مسلم، ح: ۲۰۹۰، کتاب صلوٰۃ العیدین؛ ح: ۱۸۶، کتاب الایمان، باب النهی عن المنکر من الایمان

وقال ابن حزم: واحدث بنو امية تاخير الخروج الی العيد و تقديم الخطبة قبل الصلوٰة والاذان والاقامة. (المحلّٰی بالآثار: ۲۹۴/۳)

[2] ائمہ اربعہ میں سے کوئی بھی خطبۂ عید کے قبل الصلوٰۃ ہونے کا قائل نہیں۔ اس پر اجماع ہے کہ ایسا کرنا خلافِ سنت ہے۔ اگر خطبہ نمازِ عید سے پہلے دے دیا گیا تو امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کے نزدیک وہ کالعدم ہوگا، اسے لوٹانا لازم ہوگا چاہے طویل وقت ہی کیوں نہ گزر جائے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک نماز کے بعد اسے لوٹایا جائے بشرطیکہ بہت زیادہ وقت نہ گزر جائے۔ احناف کے نزدیک خطبۂ عید کا نماز کے بعد ہونا سنت ہے۔ اگر کسی نے نمازِ عید سے پہلے خطبہ دے دیا تو لوٹانا ضروری نہیں مگر یہ فعل خلافِ سنت ضرور ہوگا۔ (الفقه علیٰ مذاهب الاربعة للشيخ عبدالرحمٰن الجزيری: ۳۲۲/۱، ط العلمية)

فقد كانت الخطبة بعد الصلاة فی عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم والخلفاء الراشدين حتى أحدث بنو أمية الخطبة قبل الصلاة لأنهم كانوا فی خطبتهم يتكلمون بما لا يحل فكان الناس لا يجلسون بعد الصلاة لسماعها فأحدثوها قبل الصلاة ليسمعها الناس. (المبسوط للسرخسی: ۳۷/۲)

إن خطب قبل الصلاة أجزأه مع الإساءة ولا تعاد بعد الصلاة. (الجوهرة النيرة علی مختصر القدوری: ۹۴/۱)

إن بدأ بالخطبة قبل الصلاة رأيت أن يعيد الخطبة بعد الصلاة. (كتاب الام للشافعی: ۲۷۰/۱)

فلو خطب قبل الصلاة لم يعتد بها فی قول جمهور العلماء. (المبدع فی شرح المقنع: ۱۸۹/۲)

[3] لما قدم بنو العباس بدأوا بالصلوٰة قبل الخطبة فانصرف الناس وهم يقولون: بُدّلت السنة بُدّلت السنة يوم العيد. (سير اعلام النبلاء: ۵۶/۹)

[4] سير اعلام النبلاء: ۴۹۸/۸

بنوامیہ پر مظالم سے متعلق بعض روایات کا محاکمہ

عباسی انقلاب، مسلح شورش کے بل پر برپا ہوا تھا؛ اس لیے اس میں بڑے پیمانے پر خونریزی ہوئی۔ ایک بنی بنائی حکومت کا تختہ الٹتے ہوئے اگر اس قدر ناروا خون بہہ گیا ہو تو یہ دنیاوی سیاست کے لحاظ سے معمولی بات ہے۔ ہاں اسلامی اقدار ناحق اتنی خونریزی کی بھی اجازت نہیں دیتیں۔ لیکن انقلاب کی حرارت اور انتقالِ اقتدار کے جوش وخروش میں بھی اسلامی تقاضوں کو یاد رکھنا تاریخ میں خال خال ہی کسی کو نصیب ہوا ہے؛ اس لیے بنوعباس بھی اس انقلاب میں اپنے ہاتھوں کو ناحق خونریزی سے نہ روک سکے۔ تاہم اس بارے میں جہاں بعض روایات حقیقت ہیں، وہاں بعض روایات مبالغہ آمیزی پر مبنی معلوم ہوتی ہیں۔

ان میں سے ایک مشہور قصہ یہ ہے کہ سفاح کے چچا عبداللہ نے ۸۰ یا ۹۰ امرائے بنوامیہ کو اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھا رکھا تھا کہ ایک شاعر نے آکر بنوامیہ کے مظالم کے بارے میں کچھ اشتعال انگیز اشعار سنا دیے جنہیں سنتے ہی عبداللہ نے ان امرائے بنوامیہ کو ڈنڈوں سے پٹوا کر قتل کرا دیا اور پھر ان دم توڑتے سسکتے لوگوں کے اوپر دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا اور کہا: ''آج حسین بن علی کا بدلہ ہوگیا۔''[1]

اسی قسم کا واقعہ سفاح کی طرف بھی منسوب ہے کہ اس نے امرائے بنوامیہ کو قتل کرا کے ان کی لاشوں پر بیٹھ کر کھانا کھایا اور کہا: ''کھانے میں ایسی لذت پہلے کبھی نہیں آئی۔'' پھر اس کے حکم سے لوگ لاشوں کو گھسیٹ کر لے گئے اور انہیں راستے میں پھینک دیا تاکہ لوگ ان پر لعنت کرتے ہوئے گزریں۔ ان لاشوں کو کتے بھنبھوڑتے رہے۔ جب ان کے گلنے سڑنے سے علاقے میں تعفن پھیلنے لگا تو انہیں کسی گڑھے میں پھینک دیا گیا۔[2]

یہ روایات مبالغہ آمیز ہیں۔ ان واقعات کو اس انداز سے ابوالفرج اصفہانی نے ''الاغانی'' میں اور یعقوبی نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ ان حضرات کا تعلق اہلِ تشیع سے تھا۔ یہ لوگ شیعی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے؛ اس لیے جس طرح وہ بنوامیہ کے بارے میں بہت سی جھوٹی اور مبالغہ آمیز روایات پھیلاتے رہے، اسی طرح بنوعباس کو بدنام کرنے اور لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکانے میں بھی ملوث رہے۔

درست بات اتنی ہے کہ عبداللہ بن علی نے نہر ابی فُطرُس کے کنارے اسّی سے زائد اموی عمائد کو لاٹھیوں سے پٹوا کر قتل کرا دیا تھا جیسا کہ خود عباسی دور کے معتمد مؤرخ البلاذری کی تاریخ ''انساب الاشراف'' میں منقول ہے۔[3]

---

① تاریخ یعقوبی، ص ۲۵٤ ② الاغانی لابی الفرج الاصبہانی: ٤/٣٤١، ٣٤٢، ط دار الفکر

③ انساب الاشراف: ٩/٣٣١، ٣٣٢، ط دار الفکر

لاشوں پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھانا عبداللہ بن علی کے بارے میں ثابت ہے نہ سفاح کے بارے میں۔

ایک قصہ یہ بھی ہے کہ سفاح کا بھائی یحییٰ جب اہلِ موصل کی بغاوت کو کچلنے گیا تو وہاں اس کی فوج کے ہاتھوں گیارہ ہزار امان یافتہ پناہ گزینوں کو سزائے موت دی گئی، عورتوں اور بچوں کا قتل عام کیا گیا اور فوج کے حبشی سپاہیوں نے موصل کی خواتین سے زنا بالجبر کیا۔

مگر یہ قصہ کسی معتبر روایت میں موجود نہیں۔ ہماری تلاش کے مطابق صرف ابن اثیر رحمہ اللہ نے انہیں نقل کیا ہے مگر کوئی حوالہ نہیں دیا بلکہ شروع میں یہ عنوان لگایا ہے: "ذکر ولایۃ یحییٰ بن محمد الموصل و ماقیل فیھا۔"

یہاں "ماقیل" کے صیغے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بے سند باتوں کو نقل کر دیا ہے۔[1]

اس قسم کے قصے شیعہ مؤرخ یعقوبی نے نقل کیے ہیں اور موصل کے مقتولین کی تعداد ۱۸ ہزار تک بتاتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ ان کے خون سے دریائے دجلہ سرخ ہو گیا تھا۔[2]

بنوامیہ کے خلفاء کی لاشوں کی بے حرمتی کرنے کے قصے بھی یعقوبی نے مبالغے کے ساتھ نقل کیے ہیں۔ مثلاً اس نے بیان کیا ہے کہ سفاح نے عبداللہ بن علی کو لکھ دیا کہ بنوامیہ سے جیسے چاہو اپنا انتقام لو۔ چونکہ اُموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے سفاح کے والد محمد بن علی کو ساٹھ کوڑے مارے تھے؛ لہٰذا عبداللہ بن علی نے ہشام کی لاش کو قبر سے نکلوایا اور ہر کوڑے کے بدلے اسے دو دو کوڑے مارے، یہاں تک کہ پوری لاش کی تکہ بوٹی ہو گئی۔[3]

حالانکہ ہشام بن عبدالملک سادات کے تمام بزرگوں کا احترام کرتا تھا۔ کسی معتبر سند سے منقول نہیں کہ اس نے محمد بن علی پر مظالم ڈھائے ہوں۔ فقط ایک بار اس نے انہیں قید کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر پھر درگزر سے کام لیا۔[4]

شیعہ راویوں کا کہنا ہے کہ عباسیوں نے امویوں کے پایۂ تخت دِمشق کو فتح کر کے وہاں پچاس ہزار افراد کو قتل کیا اور جامع مسجد اموی میں ستر دن تک عباسی فوجوں کے گھوڑے بندھے رہے۔[5]

مگر تاریخِ طبری، الکامل فی التاریخ، تاریخ ابن خلدون اور البدایۃ والنہایۃ سمیت اہل سنت کے کسی تاریخی مأخذ میں یہ روایت نہیں ملی؛ اس لیے یہ روایت سخت مشکوک ہے۔

علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ نے دودھ پیتے بچوں یا اندلس فرار ہو جانے والوں کے سوا سب کے تہ تیغ کر دیے جانے کا ذکر بھی کیا ہے مگر کوئی حوالہ نہیں دیا۔[6] اسے ابن خلدون رحمہ اللہ نے بھی نقل کیا ہے، نیز بصرہ میں سلیمان بن علی کے حکم سے بنوامیہ کے قتل عام، ان کی لاشوں کو گھسیٹ کر کتوں کے آگے ڈالنے کے واقعات بھی ذکر کیے ہیں مگر یہ سب "قیل" (کہا گیا) کہہ کر بیان کیا ہے اور آخر میں کہا ہے: واللہ اعلم بصحۃ ذالك. (اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ باتیں صحیح ہیں یا نہیں۔)[7] اس سے پتا چلتا ہے کہ علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ کو بھی ان واقعات کی صحت میں شک تھا۔

① الكامل في التاريخ: سنة ۱۳۲ھ
② تاريخ يعقوبی، ص ۲۵٤
③ تاريخ يعقوبی: ۲۵٤/۱
④ انساب الاشراف: ۸۵/٤
⑤ تاريخ يعقوبی، ص ۲۵٤
⑥ الكامل في التاريخ: سنة ۱۳۲ھ
⑦ تاریخ ابن خلدون: ۱٦٦/۳

خلاصہ یہ ہے کہ قدیم مآخذ میں شیعہ مؤرخین کے سوا ہم کسی کو یہ مبالغہ آمیز باتیں نقل کرتا نہیں دیکھتے۔ خلیفہ بن خیاط، امام طبری اور حافظ ابن کثیر رحمہم اللہ نے مذکورہ ستم رانیوں کی کوئی روایت نقل نہیں کی۔ علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ نے انہیں نقل کیا ہے مگر بلا حوالہ۔ علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے انہیں شک کے ساتھ بیان کیا ہے۔ البتہ امام بلاذری نے نقل کیا ہے کہ دِمشق پر قبضے کے بعد عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے سوا تمام اموی خلفاء کی قبریں اکھاڑ دی گئی تھیں۔[1] امام طبری اور بلاذری رحمہما اللہ اس روایت پر بھی متفق ہیں کہ عبداللہ بن علی نے نہرابی فُطرس پر اموی امراء کو قتل کیا تھا۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ سفّاح کے چچا داؤد نے مکہ اور مدینہ میں بنوامیہ کو قتل کیا تھا۔[3] اب یہ کتنے افراد تھے؟

اس کی وضاحت امام خلیفہ بن خیاط اور امام بلاذری رحمہما اللہ کی روایات سے ہوتی ہے کہ دِمشق کی فتح کے موقع پر امرائے بنوامیہ میں سے ولید بن معاویہ کو قتل کیا گیا تھا جبکہ مروان کے پوتے یزید بن معاویہ اور عبدالملک بن مروان کے پڑپوتے عبداللہ بن عبدالجبار کو گرفتار کر کے سولی دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ عبداللہ بن علی نے بنوامیہ کے اسی سے زائد افراد کو قتل کرایا تھا۔[4] اس سے انکار نہیں کہ شمشیر کے بل پر حاصل کیے جانے والے اس انقلاب میں مظالم ہوئے تھے اور بہت سے لوگوں کو شک وشبہے کی بناء پر قتل کیا گیا تھا، مگر اس بارے میں مبالغہ آمیز روایات سے احتراز کرنا چاہیے۔ جس قدر بات روایتاً اور درایتاً ثابت ہے، اسے اسی حد تک رکھنا چاہیے۔

عباسی خلفاء پر ایک اعتراض:

تمام عباسی خلفاء پر بڑی شدت سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے عربوں کی جگہ عجمیوں پر بھروسہ کیا۔ ان کی غفلت کی وجہ سے ایرانی تمام شعبوں پر مسلط ہو گئے جس کی وجہ سے مختلف فتنے پھیلے اور خلافت کمزور ہوتی چلی گئی۔

مگر یہ اعتراض بالکل سطحی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ خلفائے بنوعباس کے ایوان سے عرب کبھی بے دخل نہیں ہوئے۔ کسی بھی خلیفہ کے نائبین اور سرکردہ عہدے داروں کے نام ونسب کا جائزہ لیں تو خاصی تعداد خود بنوعباس کی دکھائی دے گی اور ظاہر ہے کہ یہ سب عرب تھے۔ البتہ عجمی ارکانِ دولت رفتہ رفتہ بڑھتے گئے جو ایک فطری بات تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی عباسی خلیفہ کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ عربوں پر پورا انحصار کرتا؛ کیوں کہ اس دور تک اسلام اتنے دور دراز علاقوں میں پھیل گیا تھا کہ عرب مسلم آبادی کا ایک مختصر عنصر بن گئے تھے۔ ایسے میں سرکاری عہدے عربوں ہی کے لیے مخصوص رکھے جاتے تو یہ دوسری تمام قوموں کے استحصال کے مترادف ہوتا جو بجائے خود شورش اور خانہ جنگی کا باعث بنتا۔ یہ ایک مصنوعی چیز ہوتی جو زیادہ مدت برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ یہ پالیسی ایک قسم کا قبائلی تسلط ہوتا جو اسلامی مساوات کے بھی خلاف تھا اور حکمت وسیاست کے بھی؛ اس لیے عباسی خلفاء عربوں کو پہلے جیسی بالادستی دلانا چاہتے تو یہ ممکن نہ تھا۔

---

[1] انساب الاشراف للبلاذری: ١٠٤/٤
[2] تاریخ الطبری: ٤٤٣/٧؛ انساب الاشراف للبلاذری: ١٠٤/٤
[3] البدایة والنهایة: ٢٨٦/١٢: سنة ١٣٣ھ؛ نیز حافظ ذہبی نے امام اوزاعی (٨٨ھ۔١٥٧ھ) سے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن علی نے شام میں بنوامیہ کے ستر سے زائد امراء کو ہتھوڑوں اور ڈنڈوں سے قتل کیا اور پھر امام اوزاعیؒ سے جواز کا فتویٰ لینے کی کوشش کی مگر اسے ناکامی ہوئی۔ (سیر اعلام النبلاء: ١٢٤/٧)
[4] تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ٤٠٣، ٤٠٤؛ انساب الاشراف: ٣٣١/٩، ٣٣٢

عباسی تحریک کی کامیابی اور ایک سوالیہ نشان:

بظاہر عباسی قائدین کامیاب ہوئے اور عالمِ اسلام میں ان کے خاندان کی حکومت قائم ہوگئی مگر بنوعباس کا اندازِ سیاست کم از کم ''انتقالِ اقتدار'' کے مرحلے میں قابلِ تقلید نہیں کہا جاسکتا؛ کیوں کہ اس سے اُمت میں خانہ جنگی کا دروازہ کھلا، گمراہ جماعتوں کے حوصلے بلند ہوئے اور ان کی وجہ سے بدعقیدگی، بے اصولی اور لاقانونیت پھیلی اور کشت و خون ہوتا رہا۔ ان میں سے کوئی بھی چیز باعثِ رشک ہے نہ قابلِ تقلید۔

ہاں! عباسی خلفاء کے بہت سے کارنامے یقیناً قابلِ تعریف ہیں۔ ان کا دورِ عروج علمی، اخلاقی، تہذیبی اور معاشرتی لحاظ سے مسلمانوں کی تاریخ کا سنہرا دور شمار ہوتا ہے۔ دورِ زوال میں بھی اسی خلافت کی برکت تھی کہ مسلمان افتراق وانتشار کا شکار ہوکر بھی کسی نہ کسی درجے میں ایک مرکز سے وابستہ رہے۔

اسی لیے عباسی انقلاب پر تبصرہ کرتے ہوئے حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ہمیں خلافت کے بنوعباس میں منتقل ہونے پر خوشی ہے مگر اللہ کی قسم! جس طرح یہ کام ہوا، وہ ہمیں ناگوار ہے؛ کیوں کہ اس میں خونریزی، قید وبند اور لوٹ مار ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون پس امن کے قیام اور جانوں کی حفاظت کرنے کے باوجود ظالم حکومت قائم ہوئی۔ ایسی حکومت کو عادل نہیں کہا جاسکتا جس کی موجودگی میں حرام کام ہوتے رہیں۔ ایسے میں انصاف کہاں؟ یہ تو ایک خراسانی وعجمی جابر حکومت قائم ہوگئی۔ آہ! یہ رات بھی گزشتہ رات ہی جیسی (اندھیری) ثابت ہوئی۔''[1]

سچ یہ ہے کہ بنوامیہ کے حکام کی غلطیوں کے جواب میں بنوعباس نے جوابِ آں غزل کے طور پر ماورائے دین سیاست کا راستہ اپنا کر اتنی بھاری غلطی کی کہ سالہا سال کی وہ تمام کش مکش، وہ ساری محنت اور انسانی ومادی وسائل کا وہ سارا استعمال اُمت کے نفع ونقصان کے لحاظ سے بالکل اکارت گیا جس کے ذریعے ایک خاندان، دوسرے خاندان پر حاوی ہوا۔

◆◆◆

[1] سیر اعلام النبلاء: ۵۸/۶

ابو جعفر المنصور

عبداللہ بن محمد

ذوالحجہ ۱۳۶ھ......تا...... ذوالحجہ ۱۵۸ھ

جون 754ء......تا......اکتوبر 775ء

سَفاح کے بعد اس کا بڑا بھائی ابو جعفر المنصور ۴۱ سال کی عمر میں خلیفہ بنا۔ وہ گندمی رنگت، بلند ناک، ہلکی ڈاڑھی اور لمبی زلفوں والا جوان تھا۔ جسم دبلا پتلا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں عزم کی بجلیاں چمکتی تھیں۔ اس نے اپنی نوجوانی کے زمانے میں حدیث اور فقہ کا علم بڑی لگن سے حاصل کیا تھا۔[1]

اس نے پورے بائیس سال حکومت کی اور تمام باغیوں اور مخالفین کا قلع قمع کر کے عباسی خلافت کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا۔ اس نے بے شمار ترقیاتی کام کرائے جن میں سب سے بڑا کارنامہ دارالخلافۃ ''بغداد'' کی تعمیر تھا۔ منصور ایک نہایت ماہر سیاست دان تھا۔ اس نے پورے عالم اسلام پر مرکزِ خلافت کی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے کئی سیاسی گُر کامیابی سے آزمائے۔ اس نے کسی کو حجاج بن یوسف کی طرح کسی صوبے کا مطلق العنان حاکم نہیں بننے دیا بلکہ گورنروں کے اختیارات محدود رکھے اور انہیں جلدی جلدی تبدیل کرتا رہا۔ اس نے خلیفہ کی روحانی حیثیت کو اجاگر کر کے مسلمانوں کو دلی طور پر مرکزِ خلافت کا وفادار بنانے کی کوشش بھی کی اور ایک حد تک اس میں کامیابی حاصل کی۔ منصور کی حیثیت بنو عباس میں ویسی ہی تھی جیسی بنو امیہ میں عبدالملک بن مروان کی۔ عباسی خاندان کی حکومت کو مستحکم کرنے میں اصل کردار اسی کا تھا۔

مخالفین کا خاتمہ...... چچا عبداللہ بن علی سے کش مکش:

منصور کو حکومت سنبھالتے ہی اپنے چچا عبداللہ بن علی کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ سَفاح کی کامیابیوں میں عبداللہ بن علی کا بڑا ہاتھ تھا، اسی نے آخری اموی خلیفہ مروان ثانی کو زاب کے معرکے میں فیصلہ کن شکست دی تھی اور امویوں

---

[1] البداية والنهاية: ۱۲/٤٥٩، ترجمة: ابی جعفر المنصور: سنة ۱۵۸ھ

نوٹ: سَفاح اور منصور دونوں کا اصل نام عبداللہ تھا، یہ باپ شریک بھائی تھے، منصور سَفاح سے دس سال بڑا تھا، سَفاح کی ماں ریطہ بنت عبید اللہ عرب تھی، منصور کی ماں سلامہ بربری تھی۔ (التاريخ الاسلامی، محمود شاكر: ٥/٦٦، ٩٢) غالباً خالص عرب ہونے کی بناء پر سَفاح کو حکومت پہلے ملی۔

کے مرکز شام کو فتح کیا تھا۔ اس کی خدمات کے بدلے سفاح نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اپنے بعد خلافت اسے سونپ کر جائے گا۔ لیکن مرتے وقت اس نے خلافت کی وصیت اپنے بھائی ابو جعفر منصور کے لیے کر دی۔ عبداللہ بن علی کو بھتیجوں کی اس بدعہدی پر سخت غصہ آیا۔ منصور کی تخت نشینی کی خبر سنتے ہی اس نے بیعت سے انکار کر دیا اور لشکر جمع کر کے الجزیرہ کے علاقے حران میں آمادۂ پیکار ہو گیا۔

منصور نے اپنے چچا کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک بار پھر پرانے نمک خوار ابو مسلم خراسانی کو آزمایا۔ ابو مسلم نے میدانِ جنگ میں عبداللہ بن علی کو شکست دی اور وہ فرار ہو کر بصرہ میں اپنے بھائی سلیمان بن علی کے پاس روپوش ہو گیا۔ منصور اسے قتل کرنے پر تلا ہوا تھا مگر سلیمان بن علی نے آکر اس کی جان بخشی کی پرزور سفارش کی۔

آخر منصور مان گیا۔ عبداللہ بن علی کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ نو سال بعد سلاخوں کے پیچھے ہی اس کی روح جسم کے بندھن سے آزاد ہوئی۔[1] یہ اس شخص کا انجام تھا جس نے خاندانی تعصب میں اندھے ہو کر دوسرے خاندان کے بے قصور لوگوں کو بلا جواز قتل کیا۔ آخر کار اسے اپنے ہی خاندان کے ہاتھوں ذلت و خواری کی موت نصیب ہوئی۔

ابو مسلم خراسانی کا انجام:

ابو مسلم خراسانی نے اپنی سیاست، مکاری اور ہوشیاری سے بنو عباس کی سلطنت کو وجود بخشا تھا اور اس کے مخالفین کو چن چن کر ختم کیا تھا؛ اس لیے وہ پوری سلطنت پر اپنی اجارہ داری سمجھتا تھا اور خلیفہ کو اپنا محتاج تصور کرتا تھا۔ سفاح کے زمانے میں آخر تک وہ خراسان ہی میں مقیم تھا اور ایک طرح سے وہاں اس نے اپنی مستقل حکومت قائم کی ہوئی تھی۔ کسی بڑے سے بڑے اقدام کے لیے وہ خلیفہ سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔

مملکت کے تمام امراء نے عراق آکر سفاح سے بذاتِ خود بیعت کی تھی مگر ابو مسلم خود کو سفاح کا سرپرست سمجھتا تھا؛ اس لیے اس کے پاس حاضری دینا بھی گوارا نہ کیا۔ آخر سفاح نے اپنے بھائی منصور کو اس کے پاس خراسان بھیجا تا کہ اس سے باقاعدہ بیعت لے۔ منصور نے کچھ دن وہاں رہ کر محسوس کر لیا کہ ابو مسلم کی بد دماغی حد سے تجاوز کر رہی ہے۔ اس نے واپس آکر سفاح کو مشورہ دیا کہ مناسب موقع ملتے ہی اس کا کام تمام کر دینا چاہیے۔ سفاح نے اس مشورے سے اتفاق کیا مگر اسے اس کام کا مناسب موقع نہ مل سکا۔

خراسان میں سلیمان بن کثیر عباسی خلافت کا بہت بڑا محسن تھا جس نے انقلاب کی کامیابی میں غیر معمولی کردار ادا کیا تھا۔ ابو مسلم نے محض شک کی بنیاد پر اسے قتل کرا دیا۔ منصور نے اس واقعے کا ذکر کر کے سفاح سے کہا:

"اگر آپ نے ابو مسلم کو چھوڑ دیا تو خلیفہ نہیں رہ سکتے؛ کیوں کہ وہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔"[2]

اُدھر ابو مسلم کو بھی سفاح اور منصور کی نیت کا اندازہ ہو گیا تھا؛ اس لیے اس نے خراسان کے علاوہ شام اور حجاز پر بھی تسلط حاصل کرنے کی تگ و دو شروع کر دی۔ تا کہ اگر خلفاء اس کے خلاف کچھ کرنا چاہیں تو بھی نہ کر سکیں۔ وہ منصور کی

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۳۰۳/۱۳ تا ۳۰۶؛ انساب الاشراف: ۱۱۱/۴ تا ۱۱۳ [2] الکامل فی التاریخ: ۲۹/۵، تحت ۱۳۲ھ

قوتِ ارادی اور فولادی گرفت سے واقف تھا؛ اس لیے اس کے خلیفہ بننے پر ذرا بھی خوش نہیں ہوا۔ تمام صوبے داروں نے منصور کی تخت نشینی پر اسے مبارکباد کے پیغامات بھیجے تھے مگر ابومسلم نے اتنی زحمت بھی نہ کی۔ آخر منصور کی طرف سے اسے ملامت آمیز خط لکھا گیا تب اس نے رسمی مبارکباد کا پیغام بھیجا۔ منصور کو یہ اطلاع بھی ملی کہ ابومسلم اس کے خطوط کو بے ادبی سے ایک طرف پھینک کر طنزیہ قہقہے لگایا کرتا ہے۔ اب منصور کو یقین ہو گیا کہ وہ بغاوت پر آمادہ ہے۔[1]

اس دوران ابومسلم نے منصور کے حکم پر الجزیرہ جا کر عبداللہ بن علی کی سرکوبی کی تاکہ اس بہانے شام اور گرد و نواح پر تسلط کا موقع بھی مل جائے مگر منصور نے اس کی مطلق العنانی کی راہ مسدود کرنے کی حکمتِ عملی اپنائی تھی۔

عبداللہ بن علی کو شکست دے کر ابومسلم نے بھاری مقدار میں مالِ غنیمت حاصل کیا تھا۔ منصور نے ایک افسر کو بھیجا تاکہ وہ ابومسلم سے مالِ غنیمت کا حساب لے۔ ابومسلم اس پر بھڑک اٹھا اور بولا:

''جانیں لینے کے بارے میں مجھ پر اعتماد ہے اور مال کے بارے میں نہیں۔''[2]

اس نے منصور کو صاف صاف لکھ دیا:

''میں نے اللہ کی طرف سے عائد کردہ فرض کی تکمیل کی خاطر رسول اللہ ﷺ کی رشتہ داری کا شرف رکھنے والے خلیفہ سے بیعت کی تھی۔ مگر خلیفہ نے مجھے قرآن سے جاہل سمجھا اور قرآن کے مطلب میں تحریف کرتے ہوئے میری تلوار کو بے نیام کرایا اور حکم دیا کہ میں رحم دلی چھوڑ دوں، معذرت قبول نہ کروں، کسی کی لغزش معاف نہ کروں۔ پس میں نے آپ کی سلطنت کی خاطر یہ سب کچھ کیا۔ مگر اب اللہ نے مجھے توبہ کی توفیق دی ہے۔ اب اگر اللہ مجھے معاف کر دے تو اس کی مہربانی۔ اگر سزا دے تو میری بداعمالی اس قابل ہے۔''[3]

منصور اور ابومسلم میں کشیدگی اور بداعتمادی کی یہ فضا بڑھتی گئی۔ آخر منصور نے سفیر بھیج کر ابومسلم کو منانے اور اپنے پاس بلانے کی کوشش کی۔ مگر ابومسلم کے مشیروں نے اسے سمجھایا کہ منصور کے پاس جانے کا مطلب اپنی موت کو دعوت دینا ہے، خراسان میں فوج اور عوام سب اپنے ہیں۔ منصور نے اگر ہمیں بحال رہنے دیا تو ٹھیک ہے، ورنہ ہم اس سے نمٹنے کے لیے کافی ہیں۔

منصور بھی باز آنے والا نہ تھا۔ اگر ابومسلم عیاروں کا عیار تھا تو منصور بھی معمولی سیاست دان نہ تھا۔ اس نے ابومسلم کو شیشے میں اتارنے کے لیے سہ طرفہ چالیں چلنا شروع کر دیں۔ اس وقت ابومسلم الجزیرہ میں مقیم تھا، منصور چاہتا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر خراسان واپس نہ جا سکے؛ اس لیے اسے شام اور مصر کی گورنری کا پروانہ لکھ بھیجا۔ ابومسلم سمجھ گیا کہ یہ مجھے خراسان کی بے تاج بادشاہی سے محروم کرنے کی ایک چال ہے۔ وہ اس حکم نامے کو مسترد کر کے خراسان روانہ ہو گیا جہاں وہ ابوداؤد نامی ایک شخص کو نائب بنا کر آیا تھا۔ ادھر منصور نے تیز رفتار قاصد بھیج کر ابوداؤد کو پیش کش کر دی کہ اگر وہ ابومسلم کو خراسان واپس آنے سے روک لے تو بدلے میں اسی کو خراسان کا گورنر بنا دیا جائے گا۔

---

① البداية والنهاية: ۳۰۶/۱۳ ② تاريخ الطبرى: ۴۸۲/۷، ۴۸۳

③ تاريخ الطبرى: ۴۸۳/۷، ۴۸۴؛ انساب الاشراف: ۲۰۳/۴، ۲۰۴

ابوداؤد کے لیے یہ ترغیب بڑی دلفریب تھی۔اس نے اپنے آقا ابومسلم کو پیغام بھیجا:

''خلفائے اہلِ بیت سے ناراضی رکھنا مناسب نہیں۔آپ ان کی منشاء کے بغیر خراسان واپس نہ آیئے۔پہلے ان کے پاس تشریف لے جا کر صلح وصفائی کر لیں۔''

ابومسلم اس وقت عراق کے سرحدی شہر حلوان تک پہنچ چکا تھا۔اس خط کے ملنے پر اس نے خراسان کی طرف سفر ملتوی کر دیا اور سوچ بچار میں پڑ گیا۔

آخر اس نے مزید اطمینان کے لیے اپنے دستِ راست ابواسحٰق کو منصور کے پاس بھیجا تاکہ دربارِ خلافت کے اصل عزائم معلوم ہوں۔ابواسحٰق دارالخلافہ پہنچا تو منصور کے حکم سے تمام امرائے مملکت نے شاندار استقبال کیا۔خود منصور نے اسے ساتھ بٹھا کر اس قدر اعزاز واکرام کیا کہ ابواسحٰق کے تمام شکوک دور ہو گئے۔اس کے بعد منصور نے اسے کہا کہ کسی طرح ابومسلم کو ہمارے پاس لے آؤ، بدلے میں خراسان کی حکومت تمہیں دے دی جائے گی۔

ابواسحٰق شیشے میں اتر چکا تھا۔وہ فوراً حلوان واپس گیا اور اپنے اعزاز واکرام کا ذکر کر کے ابومسلم کو یقین دلایا کہ منصور آپ پر نہایت مہربان ہے۔اس کے بارے میں آپ کے تمام شکوک بے بنیاد ہیں۔اس کے پاس ضرور جانا چاہیے تاکہ معاملات صاف ہو جائیں اور مقام ومرتبے میں اضافہ ہو۔

ابومسلم کو ابواسحاق پر بے حد اعتماد تھا؛ لہٰذا ان باتوں پر یقین کر کے وہ خراسان کا سفر ترک کر کے تین ہزار سپاہیوں کے ساتھ مدائن روانہ ہو گیا جہاں منصور اس کا منتظر تھا۔

منصور نے اسے مزید بے فکر کرنے کے لیے ایک اور چال چلی۔منصوبے کے مطابق اس کا ایک سرکاری اعلیٰ افسر راستے میں ابومسلم سے ملا اور اسے کہا:''میں چاہتا ہوں خلیفہ ''کسکر'' کی حکومت مجھے بخش دیں؛ کیوں کہ آج کل وہاں کی پیداوار بہت زیادہ ہے۔اگر آپ خلیفہ سے ملاقات میں میری سفارش کر دیں تو کام بن جائے گا۔''

ابومسلم یہ سن کر بہت خوش ہوا اور سمجھا کہ منصور کے ہاں اسے اب بھی بہت اونچا مقام حاصل ہے۔

اس امیر نے مزید کہا:''آج کل خلیفہ اپنے وزیر ابوایوب سے بھی کچھ ناراض ہیں۔آپ سفارش کر دیں تو خلیفہ کی ابوایوب سے ناراضی بھی ختم ہو سکتی ہے۔''

یہ سن کر ابومسلم کے رہے سہے شکوک بھی جاتے رہے۔وہ پورے اطمینان سے سفر کرتا ہوا مدائن پہنچا۔یہاں تمام امراء اور افسران نے اس کا شاندار استقبال کیا۔منصور نے بھی خوب خاطر مدارات کی اور اگلے دن خصوصی ملاقات کا وقت دیا۔منصور اور اس کا وزیر ابوایوب طے کر چکے تھے کہ اس ملاقات میں ابومسلم کو نمٹا دیا جائے گا۔

اگلے دن جب ابومسلم منصور کے خاص کمرے میں ملاقات کے لیے پہنچا تو پردے کے پیچھے شمشیر بکف سپاہی تیار کھڑے تھے۔اب منصور نے ابومسلم کو اس کی گستاخیاں ایک ایک کر کے یاد دلانا شروع کیں۔

ابومسلم اپنی ہر حرکت پر معذرت کرتا رہا۔جب منصور کا غصہ پھر بھی نہ تھما تو ابومسلم نے کہا:

"امیر المؤمنین! میں سمجھا تھا کہ آپ کی ناراضی دور ہو چکی ہے اور آپ راضی ہو چکے ہیں۔"

منصور نے کہا: "اللہ کی قسم! میرا غصہ پہلے سے کہیں بڑھ چکا ہے۔"

ابو مسلم کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اسے دھوکہ دیا گیا ہے اور اب موت سر پر کھڑی ہے۔ اس نے آخری کوشش کے طور پر کہا: "امیر المؤمنین! میں نے آپ کی سلطنت کے لیے جو کچھ کیا وہ ساری دنیا جانتی ہے۔"

منصور نے کہا: "ہمیں جو کچھ ملا ہے وہ ہمارا نصیب اور ہماری خوش بختی ہے۔ جو کام تم نے کیا وہ تو کوئی حبشن باندی بھی کر سکتی تھی۔"

یہ کہہ کر اس نے تالی بجائی۔ جلاد فوراً اندر آئے اور تلواریں سونت کر ابو مسلم خراسانی پر حملہ آور ہو گئے۔ جب اسے تلوار کی پہلی ضرب لگی تو وہ کراہتے ہوئے بولا:

"امیر المؤمنین! مجھے اپنے دشمنوں کی سرکوبی کے لیے زندہ رہنے دیجیے۔"

منصور نے سپاٹ لہجے میں کہا: "تجھ سے بڑھ کر میرا دشمن اور کون ہو سکتا ہے۔"

اگلے ہی لمحے سپاہیوں نے ابو مسلم کا سر تن سے جدا کر دیا۔ پھر لاش کو دریائے دجلہ کی موجوں کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ۲۶ شعبان ۱۳۷ھ کا ہے۔ ابو مسلم کی عمر ۳۸ سال تھی۔[1]

اس طرح دوسری صدی ہجری کا یہ زبردست سیاست دان جس کی خطابت اور سیاسی مہارت نے چند سالوں میں بنوامیہ کی حکومت کو فنا کر کے ان کی لاشوں پر عباسیوں کا قصرِ اقتدار تعمیر کیا، حکومتی ایوانوں میں صرف پانچ سال گزار کر ایک عبرت ناک انجام کو پہنچا۔ اس نے جو کچھ دوسروں کے ساتھ کیا تھا، اس کے ساتھ بالکل ویسا ہی معاملہ ہوا۔

ابو مسلم خراسانی کے قتل پر خود بنو عباس کے کئی سرکردہ امراء کو دکھ ہوا۔ عیسیٰ بن موسیٰ عباسی جسے سفاح نے منصور کے بعد ولی عہد مقرر کیا تھا، یہ خبر سن کر بے اختیار کہہ اٹھا:

"امیر المؤمنین! آپ جانتے تھے کہ امام ابراہیم نے اس کے حق میں حسن سلوک کی وصیت کی تھی! آپ کو معلوم ہے اس نے ہماری کتنی اطاعت کی، کس قدر خیر خواہی کی!!"

منصور نے لاپرواہی سے کہا: "بھولے آدمی! زمین کی سطح پر اس سے بڑھ کر ہمارا دشمن اور کوئی نہ تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے تمہارا کوئی اختیار نہیں چل سکتا تھا۔ اب اللہ نے تمہیں بے فکر کر دیا ہے۔"[2]

ابو مسلم کو ختم کر کے منصور نے ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے اس اقدام کی ضرورت بیان کی اور کہا:

"لوگو! ہم نہ تمہارے حقوق بھولے ہیں نہ تمہارے ساتھ حسن سلوک کو فراموش کیا ہے۔ مگر جو ہم سے یہ اقتدار کی پوشاک چھیننا چاہے گا اسے تلوار سے جواب ملے گا۔ ابو مسلم نے بھی ہم سے اس بات پر بیعت کی تھی

---

[1] تاریخ الطبری: ۴۸۵/۷ تا ۴۹۱؛ البدایۃ والنہایۃ: ۳۱۰/۱۳ تا ۳۱۳؛ انساب الاشراف: ۲۰۳/۲ تا ۲۱۰

[2] تاریخ الطبری: ۴۹۲/۷

کہ جو ہم سے غداری کرے گا، اس کا خون حلال ہوگا۔ اس نے ہم سے بدعہدی اور سرکشی کی اور ناشکری کا ثبوت دیا۔ ہم نے اس کے بارے میں وہی حکم صادر کیا جو وہ غداری کی بناء پر دوسروں کے لیے جاری کرتا رہا۔ وہ شروع میں اچھا اور آخر میں خراب ہوا۔ اس کے حقوق ہمیں اس کے بارے میں برحق فیصلہ کرنے سے نہ روک سکے۔'' [1]

کچھ لوگ ابومسلم خراسانی کو اسلام دشمن طاقتوں کا آلۂ کار یا بدعقیدہ انسان کہتے ہیں مگر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ ان باتوں کو مشکوک قرار دیتے ہیں۔ وہ ابومسلم خراسانی کے کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بعض لوگوں نے اس کے اسلام کو مشکوک قرار دیا ہے اور اس پر بے دینی کا الزام عائد کیا ہے مگر مجھے ان کے ذکر کردہ الزامات کی کوئی دلیل نہیں ملی۔ بلکہ اس کے برعکس ایسی روایات ملی ہیں کہ وہ اپنے گناہوں کے باعث اللہ سے ڈرتا تھا اور عباسی حکومت قائم کرنے کے لیے جو اس نے خونریزی کی اس سے توبہ کا دعوے دار تھا۔ اس کے حال کی حقیقت اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔'' [2]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے محتاط انداز اسی لیے اختیار کیا ہے کہ انہیں ابومسلم کا کوئی کفر پر مبنی قول یا فعل نہیں ملا۔ تاہم بعد میں ابومسلم کے پیروکاروں نے جس جس انداز میں زندیقیت کی تحریکیں چلائیں اور اسلام سے بالکل متصادم عقائد و نظریات کی اشاعت کی، انہیں دیکھتے ہوئے مشہور مورخ اکبر شاہ نجیب آبادی کا ایک تجزیہ بھی نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ منصور اور اس کے جانشینوں کے دور میں ابھرنے والی لادین تحریکوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ سب ابومسلم کی جماعت کے لوگ تھے۔ اور ابومسلم ہی کی عجیب در عجیب دعوت و تبلیغ کے کرشمے تھے۔ وہ جس حیثیت اور جس قسم کے لوگ دیکھتا تھا، انہی کے حسب حال وہ اپنی دعوت کا رنگ تبدیل کر کے ان کے سامنے پیش کرتا تھا۔ یہ تمام فرقے، دعوتِ اہلِ بیت کو مختلف سانچوں میں ڈھالنے کے مختلف نتائج تھے۔'' [3]

قارئین! ان لادین تحریکوں کا جائزہ ہم اگلی سطور میں لے رہے ہیں۔

◆◆◆

---

[1] البداية والنهاية: ۱۳/۳۲۳، ۳۲٤

[2] البداية والنهاية: ۱۳/۳۲٤

[3] تاریخ اسلام، نجیب آبادی: ۲/۶۸

اعتقادی فتنے

منصور کے دور میں ہم اعتقادی فتنوں کی ایک نئی لہر ابھرتے دیکھتے ہیں جس کا زیادہ تر شکار اہلِ عجم ہی ہوئے۔اس تبدیلی کے پیچھے عوامل کا ایک پورا سلسلہ کارفرما تھا۔دراصل اہلِ عجم میں سے بہت سے لوگ نسلی فخر وغرور میں مبتلا چلے آرہے تھے اور عربوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔پہلی صدی ہجری میں جب وہ عربوں سے مغلوب ہوئے تو ابتداء میں انہیں شدید ذلت کا احساس ہوا مگر جلد ہی خلفائے راشدین کے عدل وانصاف،صحابہ وتابعین کی نیک سیرتی اور علمائے امت کے روشن کردار نے ان کے دل موہ لیے،وہ بڑی تیزی سے اسلامی معاشرے میں اس طرح جذب ہوتے گئے کہ انہیں مکمل مساوات حاصل تھی۔مگر بنوامیہ کی خلافت میں عرب وعجم کی تفریق بتدریج واضح ہوتی چلی گئی۔پھر جب عباسی تحریک شروع ہوئی تو عرب وعجم کی کش مکش پوری طرح ابھر کر سامنے آگئی۔

بنوامیہ کا اعتماد عربوں پر اور بنوعباس کی افرادی قوت کا دارومدار عجمیوں پر تھا۔اہلِ عجم کی بڑی تعداد نے اسی توقع پر بنوعباس کا ساتھ دیا کہ جب ہماری مدد سے نئی حکومت بنے گی تو ملک کی باگ ڈور ہمارے ہاتھوں میں ہوگی۔ان کی یہ توقع ایک حد تک پوری بھی ہوئی اور بنوامیہ کے دور کے برخلاف بنوعباس کے دور میں عجمی امراء روز بروز عروج حاصل کرتے گئے۔حکومتی پالیسی میں تبدیلی کے پیچھے کارفرما بنیادی سوچ تو مثبت اور درست تھی کہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت حاصل نہیں اور تمام مسلمان حقوق اور ترقی کے مواقع کے لحاظ سے برابر ہیں۔یقیناً مسلم اہلِ عجم کا حق تھا کہ ان کے لیے ترقی کے راستے کھلے رکھے جاتے مگر ہوا یہ کہ بعض متشدد مزاج عجمی ادیبوں اور دانش وروں نے اسلامی مساوات کی حدود توڑ کر عربوں سے نفرت عام کرنے کو اپنی مساعی کا محور بنالیا اور یوں عالمِ اسلام میں ''شعوبی تحریک'' نے جنم لیا جس کی بنیاد نسلی منافرت پر تھی۔

منافرت کی اس لہر کے پیچھے عجمی تعصب کے علاوہ نصرانیت اور رفض کے افکار بھی کارفرما ہوئے اور بڑھتے بڑھتے عرب سے تنفر نے عجمی زِندیقیت یعنی مکمل بے دینی کی شکل اختیار کرلی۔زندیقیت کا لفظ مجوسیوں کے پیشوا ''زرتشت'' کی مذہبی کتاب ''زِنداُوستا'' کی طرف منسوب ہے؛ کیوں کہ ان نظریات کے داعی باطن میں مجوسی تھے اور لوگوں کو زہد وعبادت کے روپ میں آہستہ آہستہ ''زِنداُوستا'' کی تعلیمات کی طرف راغب کیا کرتے تھے،ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات کو بگاڑنے کے لیے جھوٹی احادیث گھڑ گھڑ کر عام کرتے تھے۔ایسا ایک دجال ابن ابی العوجاء تھا جسے منصور کے گورنر محمد بن سلیمان نے سزائے موت دی تھی۔مرنے سے پہلے اس نے خود حلفیہ طور پر کہا تھا:''میں نے چار ہزار

احادیث خود گھڑ کر پھیلائی ہیں جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا گیا ہے۔میں تمہارے روزوں کے ایام میں ہمیشہ کھاتا پیتا رہا اور جن دنوں میں تمہارے نزدیک روزہ حرام تھا،ان میں روزے رکھتا رہا۔''[1]

ایسے بعض زندیقوں نے باغیانہ تحریکیں بھی برپا کیں جن کا آغاز ابو مسلم خراسانی کے قتل کے کچھ ہی عرصے بعد ہوا۔

سُنباذ مجوسی کا خروج:

ابو مسلم کے قتل کے چند ہفتوں بعد اس کا ایک مجوسی عقیدت مند سُنباذ اٹھا۔اس نے ابو مسلم کا انتقام لینے کا اعلان کیا اور اصفہان سے رے (موجودہ تہران) تک کے علاقے پر قابض ہوگیا۔وہ عربوں کا سخت دشمن تھا،انہیں پکڑتا اور لاٹھیوں سے پٹوا کر قتل کر ڈالتا۔اس نے دیلم کے کوہستان میں بسنے والے مجوسی النسل امراء کو پیغام دیا کہ عربوں کی حکومت ختم ہو چکی۔اب ہم سے آملو۔دور دراز کے بہت سے مجوسی اس کے گرد جمع ہوگئے۔

منصور کا دور ایفائے عہد اور سیاست کی اخلاقی اقدار کے حوالے سے ہرگز قابلِ تعریف نہیں۔مگر اس کی ایک خوبی ماننا پڑے گی کہ وہ صحیح العقیدہ مسلمان تھا اور مسلم معاشرے میں کسی اعتقادی خرابی کو پنپنے کا موقع نہیں دیتا تھا۔

اس نے ایسی تمام تحریکوں کو بڑی شدت سے کچل ڈالا۔اس نے سُنباذ کے خلاف دس ہزار سپاہی بھیجے۔سنباذ بہت بڑا لشکر جمع کر کے نکلا۔ہمدان کے قریب زبردست لڑائی ہوئی۔سرکاری فوج نے اسے شکست دے دی،اس کے ساٹھ ہزار بدعقیدہ مرید میدان جنگ میں قتل ہوئے۔وہ خود گرفتار ہوا اور بعد میں قتل کر دیا گیا۔[2]

راوندی تحریک:

کچھ مدت بعد ایک اور عجیب وغریب تحریک اسی علاقے سے ظاہر ہوئی جسے ''راوندی تحریک'' کہا جاتا تھا؛ کیوں کہ اس کا مرکز اصفہان کا ایک نواحی قصبہ ''راوند'' تھا۔جس طرح ایرانی سلطنت میں کسریٰ کو خدائی طاقت واختیارات کا مظہر اور مقدس ہستی سمجھ کر اس کی عبادت کی جاتی تھی،اسی طرح یہ لوگ بھی مسلمان حکمرانوں میں خدا کے حلول کا فاسد عقیدہ پھیلا رہے تھے۔ان کا نظریہ یہ تھا کہ عیسیٰ بن مریم کی روح حضرت علی بن ابی طالب میں حلول کر گئی تھی،ان کے بعد ان کی اولاد کے تمام ائمہ میں یہ روح اسی طرح سرایت کرتی رہی اور ایک سے دوسرے کو منتقل ہوتی رہی۔یہاں تک کہ یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے ابراہیم بن محمد میں آگئی۔

یہ لوگ خود کو ابو مسلم خراسانی کا مرید کہتے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ ابو مسلم قتل نہیں ہوا بلکہ جب اس پر تلوار کا وار کیا گیا تو وہ اسم اعظم کا ورد کر کے بچ گیا اور ایک کبوتر کی شکل میں اڑ گیا۔اب عن قریب وہ واپس آئے گا۔یہ عقیدہ فارسی دیو مالائی افسانوں سے اخذ کیا گیا تھا؛ کیوں کہ اہلِ فارس اپنے فاتحین کے بارے میں ایسے کئی قصے سناتے تھے کہ وہ مر کے بھی نہیں مرے بلکہ کسی اور شکل میں ڈھل گئے اور جلد ہی ان کی دنیا میں واپسی ہوگی۔ان میں سے کچھ لوگوں کی جہالت

---

① المنتظم لابن جوزی: ۱۸۵/۸؛ سنة ۱۵۵ھ

② البدایة والنهایة: ۳۲۶/۱۲، ۲۷؛ انساب الاشراف: ۲۴۶/۴، ۲۴۷ نوٹ: سُنباذ کو سُنفاذ اور سندباذ بھی لکھا گیا ہے۔

یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ وہ بلندیوں سے چھلانگیں لگا دیتے تھے تاکہ اپنے امام کی اقتداء میں پرواز کرسکیں۔ یہ الگ بات کہ ان میں سے کوئی زندہ نہیں بچ پاتا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ابومسلم کے یہ مرید خلیفہ منصور کے سخت مخالف ہوتے مگر اس کے برعکس یہ منصور کو بھی ''مظہرِ خدا'' کہہ کر اس کی عبادت کی دعوت دیتے تھے۔ جو لوگ انکار کرتے یہ انہیں قتل کرنے سے بھی نہ چوکتے۔ ان کا نعرہ تھا: ''أنتَ أنتَ'' (تو ہی تو ہے۔) یعنی تو ہی خدا ہے۔ (نعوذ باللہ)

ظاہر ہے کہ اس فرقے کے داعی اسلام کا حلیہ بگاڑنا چاہتے تھے۔ انہیں منصور سے کوئی عقیدت تھی نہ سادات سے۔ وہ ان کا نام استعمال کر کے ایک الگ گروہ بنانا اور اقتدار حاصل کرنا چاہتے تھے۔

منصور نے ان لوگوں کی جھوٹی عقیدت اور بدخیالی کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور سیاسی اغراض کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ۱۴۱ھ میں ان کے خلاف سخت کارروائی کی۔ ان میں سے بہت سے لوگ گرفتار کیے گئے مگر ان بدعقیدہ لوگوں کی طاقت اتنی بڑھ چکی تھی کہ انہوں نے کوفہ کی جیل توڑ کر اپنے قیدیوں کو رہا کرا لیا۔

منصور اس وقت وہیں قصرِ شاہی میں تھا۔ یہ لوگ اس کی خدائی کے نعرے لگاتے ہوئے محل کا طواف کرنے لگے۔ منصور جوش سے لبریز ہو کر اسی وقت پا پیادہ تھوڑے سے سپاہیوں کے ساتھ ان کے مقابلے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ سخت لڑائی میں وہ خود خطرے کی زد میں آ گیا۔ اس دوران معن بن زائدہ نامی ایک مفرور امیر نے اچانک سامنے آ کر زبردست جاں نثاری کا مظاہرہ کیا اور منصور کی حفاظت کے لیے اس کے دائیں بائیں لڑتا رہا۔ اس کی دلیری اور منصور کی ثابت قدمی کے باعث ان بدعقیدہ لوگوں کو شکست ہوئی اور تقریباً سبھی مارے گئے۔[1]

مَعن بن زائدہ کا قتل:

مَعن بن زائدہ عرب قبیلے بنو شیبان کا مشہور رئیس تھا۔ بنو امیہ کے دور میں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی اور وہ مُوصل کے اموی حاکم یزید بن ہبیرہ کا دستِ راست تھا جس نے اموی خلافت کا تختہ الٹ جانے کے باوجود مُوصل کو عباسیوں کے حوالے نہیں کیا اور ایک مدت تک محصور رہ کر عباسیوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ عباسیوں کے خلاف اس جنگ میں معن بن زائدہ بھی پیش پیش تھا۔ مُوصل پر عباسیوں کے قبضے کے بعد یزید بن ہبیرہ کو قتل کر دیا گیا جب کہ معن بن زائدہ روپوش ہو گیا۔ منصور نے اس کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر دیے اور اس کی خبر لانے والے کے لیے بھاری انعام بھی مقرر کر دیا اس کے باوجود اس کا کچھ اتا پتا نہ چلا۔

فرقہ راوندیہ کے خلاف اس لڑائی میں معن نے اچانک ظاہر ہو کر منصور کی حفاظت میں جان کی بازی لگا دی۔ وہ اس وقت زرہ بکتر میں ملبوس تھا؛ اس لیے منصور پہچان نہ سکا۔

لڑائی کے بعد منصور نے پوچھا: ''تم کون ہو؟''

مَعن بن زائدہ نے چہرے سے نقاب ہٹا کر کہا: ''امیر المؤمنین! آپ کا مطلوبہ مجرم، معن''

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/۳۳۶، ۳۳۷؛ انساب الاشراف: ۴/۴۳۵، ۴۳۶؛ تاریخ الطبری: ۸/۸۳ تحت ۱۵۸ھ

منصور نے اس کا احسان مانتے ہوئے اسے نہ صرف معاف کر دیا بلکہ اسے پہلے یمن اور پھر بجستان کا حاکم بنا دیا۔
مَعن بن زائدہ کی سخاوت اور شجاعت ضرب المثل تھی۔ عربی ادب میں اس کی شرافت اور فیاضی کے واقعات بکثرت منقول ہیں۔ مَعن بجستان میں نہایت عدل وانصاف سے حکومت کر رہا تھا کہ ضلع زرنج کے خوارج نے اچانک حملہ کر کے خنجر سے اس کا شکم چاک کر ڈالا۔ مَعن زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔ یہ ۱۵۱ھ کا واقعہ ہے۔[1]

استاذ سیس کا فتنہ:

۱۵۰ھ میں خراسان میں ایک شخص استاذ سیس نمودار ہوا، اس نے کفریہ عقائد کا پرچار کر کے لاکھوں لوگوں کو گمراہ کر ڈالا۔ اس کے کارکن شاہراہوں پر قابض ہو کر مسلمانوں کے قافلے لوٹتے اور سرکاری عملے کو مار بھگاتے۔ بہت جلد اس نے تین لاکھ مسلح افراد جمع کر لیے اور بہت بڑے رقبے پر تسلط جما لیا۔
آخر منصور نے اپنے بیٹے مہدی کو اس کے مقابلے پر بھیجا۔ مہدی نے اس مہم میں ایک سچے ہاشمی مجاہد ہونے کا ثبوت دیا اور کئی جان توڑ معرکوں کے بعد آخر کار استاذ سیس کو عبرت ناک شکست دی۔ اس جنگ میں ستر ہزار بدعقیدہ لوگ قتل اور چودہ ہزار گرفتار ہوئے۔ اس طرح یہ بہت بڑا فتنہ ٹھنڈا ہو گیا۔[2]

افریقہ میں خوارج کا ظہور:

۱۵۳ھ میں افریقہ میں اباضی خوارج نے بغاوت کی اور بڑی قوت حاصل کر لی۔ منصور کے حکام ان کے سامنے بے بس ہو گئے۔ یہ دیکھ کر ۱۵۴ھ میں منصور نے بہت بڑا خطرہ مول لیا اور عراق وخراسان میں بغاوتوں کا خطرہ نظر انداز کرتے ہوئے شام کا سفر کیا، بیت المقدس میں حاضری دی اور افریقہ میں لشکر کشی کی خود منصوبہ بندی کرتے ہوئے یزید بن ابی حاتم کی قیادت میں خوارج سے مقابلے کے لیے لشکر بھیجے۔ آخر کار ۱۵۵ھ میں یزید بن ابی حاتم کے ہاتھوں خوارج کو فیصلہ کن شکست ہوئی اور افریقہ میں امن قائم ہو گیا۔[3]
منصور بعد میں ان واقعات کو یاد کرتے ہوئے کہتا تھا:

> ”میں نے کئی بار غلطی کی مگر اللہ نے مجھے اس کے شر سے بچا لیا۔ ایک بار تب جب میں نے ابو مسلم کو قتل کرایا، اس وقت میرے ارد گرد ایسے لوگ تھے جو میری اطاعت پر اس کی اطاعت کو ترجیح دیتے تھے۔ اگر وہ مجھ پر جھپٹ پڑتے تو میں ختم ہو جاتا۔ دوسری بار تب جب میں راوندیوں سے لڑنے باہر نکل آیا، اگر مجھے کوئی تیر لگتا تو میرا قصہ تمام ہو جاتا۔ تیسری بار اس وقت جب میں (خوارج سے لڑنے) شام چلا گیا، اگر پیچھے عراق میں دو تلواریں آپس میں ٹکرا جاتیں تو خلافت وہیں ختم ہو جاتی۔[4]

① سیر اعلام النبلاء: ۹۷/۷، ۹۸؛ وفیات الاعیان: ۲۴۴/۵، ط دار صادر؛ الکامل فی التاریخ: سنة ۱۵۱ھ
② البدایہ والنھایة: ۴۱۴/۱۳
③ العبر فی خبر من غبر: ۱۶۷/۱، ۱۷۰، ۱۷۲
④ انساب الاشراف: ۲۰۸/۴

منصور عباسی کے دور میں تدوینِ فقہ

منصور کے دور میں ایک طرف کوفہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ (۸۰ھ ۔ ۱۵۰ھ) اور دوسری طرف مدینہ منورہ میں امام مالک بن انس رحمہ اللہ (۹۳ھ ۔ ۱۷۹ھ) نے اسلامی فقہ کو مدوّن کر کے اُمت کی عظیم الشان خدمت انجام دی۔ ذیل میں ان حضرات کی فقہی خدمات کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی فقہی خدمات:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بنوامیہ کے آخری ایام میں عراق کے حالات کی خرابی، بدامنی اور حکام کی سختی کے باعث کوفہ اور حجاز کے درمیان آتے جاتے رہتے تھے۔ سفاح کے دور میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا؛ کیوں کہ اس وقت حکومت مستحکم نہیں ہوئی تھی اور کسی بھی وقت شورش برپا ہونے کا خوف لاحق رہتا تھا۔

منصور عباسی کے دور میں جب امن قائم ہو گیا تو امام صاحب واپس آئے اور کوفہ میں دوبارہ قیام اختیار کر لیا۔ اس دوران آپ کی علمی شخصیت کا شہرہ علماء اور عوام سے نکل کر قصرِ خلافت تک پہنچ چکا تھا۔ انہی دنوں خلیفہ منصور نے ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ رحمہما اللہ کو زکوٰۃ وصدقات اور خرید وفروخت کے کچھ احکام مدوّن کر کے پیش کرنے کا حکم دیا۔ ان حضرات نے ایک عرصے کی جانفشانی کے بعد جو کچھ لکھا، منصور نے اسے پسند نہ کیا۔ ایسے میں کسی نے منصور کو بتایا کہ کوفہ میں نعمان نامی ایک عالم ہیں جو یہ کام کر سکتے ہیں۔ منصور نے انہیں بلوا کر کچھ سوالات کیے اور جوابات سے ان کی علمی وسعت کا اندازہ لگا کر مطلوبہ مسائل کی تدوین کا کام امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ذمے لگا دیا اور انہیں دو ماہ کا وقت دیا۔ امام صاحب نے صرف دو دن میں ان احکام کا مجموعہ لکھ کر پیش کر دیا جس کی ترتیب کا حسن اور مسائل کی صحت و وضاحت دیکھ کر منصور حیران رہ گیا۔ انعام میں ۱۰ ہزار درہم پیش کیے۔ امام صاحب نے قبول کرنے سے انکار کر دیا؛ کیوں کہ عہدوں اور سرکاری ہدایا سے گریزاں رہ کر ہی وہ اپنے اصل مقصد یعنی تدوینِ فقہ کے لیے یکسو رہ سکتے تھے۔[1]

حدیث کی خدمت اور کتاب الآثار:

علمِ عقائد کے سلسلے میں امام صاحب کی تصنیف ”الفقہ الاکبر“ پر ہم اموی دور کے ضمن میں تفصیلی کلام کر چکے ہیں۔ امام صاحب نے اسی طرح علم حدیث کی یہ عظیم خدمت انجام دی کہ احکام سے متعلقہ ایسی روایات کا انتخاب کیا جو سند کے لحاظ سے صحیح ہوں اور ان کے مندرجات پر اُمت کا تواتر کے ساتھ عمل چلا آ رہا ہو۔ اس مجموعے کو ”کتاب الآثار“

[1] مناقب ابی حنیفۃ، کردری: ۲/ ۱۴، ۱۵ ..... امام صاحب کی تدوین فقہ میں خدمات پر ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے۔

کا نام دیا گیا۔ آج تک اُمت کے پاس فقہی روایات کا قدیم ترین مرتب مجموعہ یہی ہے جو دوسری صدی ہجری کے نصفِ اوّل میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے مدوّن کیا۔ یہ کتاب فقہی ابواب کے مطابق تشکیل پانے والا پہلا نمونہ تھا جسے امام مالک رحمہ اللہ سمیت بعد کے تمام مؤلفینِ حدیث نے اپنایا۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں:

''امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے علمِ شرع کو مدوّن کیا اور اسے ابواب کی شکل میں پیش کیا۔ امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا میں انہی کی پیروی کی۔ اس شرف میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر کسی نے پہل نہ کی۔ صحابہ اور تابعین نے علمِ شریعت کو کتب اور ابواب میں مرتب نہیں کیا تھا بلکہ وہ اپنے حافظے پر اعتماد کرتے تھے۔''[1]

کتاب الآثار کی خصوصیات:

کتاب الآثار کی اسناد اس قدر صحیح ہیں کہ کسی بھی طرح مؤطا مالک اور صحیح بخاری سے کم نہیں۔ محدثِ جلیل حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی رحمہ اللہ کے بقول: ''مؤطا کو کتاب الآثار سے وہی نسبت ہے جو صحیح مسلم کو صحیح بخاری سے ہے۔''

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے دور تک علمِ حدیث کی اسناد کی تعداد چالیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ (دو تین نسلوں بعد جب صحیح بخاری اور صحیح مسلم مرتب کی گئیں تو راویوں اور طرق کی تعداد بڑھتے بڑھتے لاکھوں تک پہنچ گئی تھی۔) امام صاحب رحمہ اللہ نے ان چالیس ہزار اسناد میں سے صحیح اسناد کو الگ کر لیا۔[2]

امام ابوداؤد رحمہ اللہ کے مطابق حلال وحرام کے احکام پر مشتمل (غیر مکرر) روایات کی تعداد ۴۸۰۰ ہے۔[3] عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کے بقول ان میں سے صحیح روایات نوسو ہیں۔[4] جبکہ بعض حضرات نے یہ تعداد آٹھ سو بتائی ہے۔[5]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ان آٹھ یا نوسو میں سے ایسی روایات کا انتخاب کیا جنہیں اُمت کے معمول میں شامل ہونے کی وجہ سے تواترِ عملی کی قوت بھی حاصل ہو۔ یہ ان کی احتیاط کی انتہا تھی کہ لوگوں کو اختلافِ آراء اور ذہنی تشویش سے بچانے کے لیے روایات کے اتنے بڑے سمندر سے یکتا موتی نکال کر اُمت کے سامنے پیش کر دیے۔

امام صاحب رحمہ اللہ خود فرماتے تھے: ''میرے پاس روایات کے صندوق بھرے ہوئے موجود ہیں مگر میں نے ان سے تھوڑی سی روایات چن لیں جن سے فائدہ اٹھایا جائے۔''[6]

روایتِ حدیث میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی شرائط:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ روایتِ حدیث میں کس قدر محتاط تھے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کسی روایت کے مقبول ہونے کے لیے جو شرائط لگاتے تھے وہ امام مسلم اور امام بخاری رحمہما اللہ نے بھی نہیں لگائیں۔ مثلاً:

---

① تبیض الصحیفة بمناقب ابی حنیفة للامام جلال الدین السیوطی، ص ۱۱۹
② مناقب ابی حنیفة موفق مکی: ۹۵/۱، ۹۶؛ طرق حدیث کی تعداد کے متعلق تفصیل کے لیے دیکھیے: توضیح الافکار للامیر الصنعانی: ۱/ ۶۰ تا ۶۴
③ رسالة امام ابی داؤد السجستانی، ص ۳۵ — ④ رسالة امام ابی داؤد السجستانی: ص۲۶
⑤ توضیح الافکار للامیر یمانی الصنعانی: ۱/ ۶۴
⑥ مناقب ابی حنیفة موفق مکی: ۹۵/۱، ۹۶

① امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک یہ شرط تھی کہ راوی نے روایت کو صرف لکھ کر نقل نہ کیا ہو بلکہ وہ اس کا حافظ بھی ہو اور اس کو سمجھتا بھی ہو۔ [1]

② ایک شرط یہ تھی کہ متقی لوگوں کی ایک جماعت اس روایت کو صحابی سے برابر نقل کرتی آ رہی ہو۔ [2]

امام صاحب رحمہ اللہ خود فرماتے تھے:

''میں کتاب اللہ سے دلیل لیتا ہوں، اگر نہ ملے تو ان سنن و آثار سے لیتا ہوں جو ثقہ حضرات سے ثقہ راویوں نے نقل کیے ہیں۔ پھر بھی نہ ملے تو صحابہ کرام کے قول سے لیتا ہوں۔'' [3]

③ امام صاحب رسول اللہ ﷺ کے آخری زمانے کی احادیث کو ترجیح دیتے تھے۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے تھے:

''امام ابوحنیفہ وہی احادیث لیتے جو ان کے نزدیک صحیح ہوتیں اور جنہیں ثقہ راوی نقل کرتے اور جو رسول اللہ ﷺ کے آخری زمانے کا عمل ہوتا۔'' [4]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہم سبق امام مسعر بن کدام رحمہ اللہ فرماتے تھے:

''میں نے ان کے ساتھ حدیث سیکھنا شروع کی تو وہ مجھ سے آگے رہے۔ پھر ہم زہد و عبادت میں لگے تو اس میں بھی ہم سے بازی لے گئے۔ پھر ہم نے فقہ سیکھنا شروع کی تو اس میں ان کے وہ کمالات ظاہر ہوئے جو تم جانتے ہی ہو۔'' [5]

دوسری صدی ہجری کے ایک نامور محدث امام وکیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جیسی احتیاط امام ابوحنیفہ کی روایت میں دیکھی گئی، ویسی کہیں اور نہیں دیکھی۔'' [6]

نامور محدث مکی بن ابراہیم رحمہ اللہ فرماتے تھے: ''ابوحنیفہ اس زمانے کے سب سے بڑے عالم ہیں۔'' [7]

محدثین اور راویوں کی جانچ پڑتال کے ماہر، فن رجال کے امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے تھے:

''امام ابوحنیفہ ثقہ ہیں اور وہی حدیث نقل کرتے ہیں جو انہیں یاد ہو اور اسی سے نقل کرتے ہیں جسے حفظ ہو۔'' [8]

اسی دور میں جرح و تعدیل کے ایک اور امام یحییٰ بن سعید القطان رحمہ اللہ کہتے تھے:

''اللہ کی قسم! ہم نے ابوحنیفہ کے فتاویٰ سے بہتر فتاویٰ نہیں سنے۔ ہم ان میں سے اکثر پر عمل پیرا ہیں۔'' [9]

علی بن عاصم رحمہ اللہ کہتے تھے: ''اگر ابوحنیفہ کے علم کا وزن ساری دنیا کے علم سے کیا جائے تو وہ بھاری پڑ جائے گا۔'' [10]

---

① الكفايه في علم الرواية للخطيب البغدادي: ۱/۲۳۱؛ توضيح الافكار لمعاني تنقيح الانظار للامير عزالدين صنعاني، ص ۹۱

② ميزان الشعراني: ۱/۶۲

③ آخذ بكتاب الله، فما لم اجد فبسنة رسول الله والآثار الصحاح عنه التي فشت في ايدي الثقات عن الثقات فان لم اجد فبقول اصحابه. ﴿مناقب ابي حنيفة وصاحبيه، للذهبي، ص ٣٤﴾

④ الانتقاء في فضل الثلاثة الائمة الفقهاء، لابن عبدالبر، ص ۴۳

⑤ مناقب ابي حنيفة وصاحبيه، للذهبي، ص ۴۳

⑥ مناقب ابي حنيفة موفق مكي: ۱/۱۹۷

⑦ مناقب ابي حنيفه وصاحبيه للذهبي، ص ۳۲

⑧ تاريخ بغداد: ۱۳/۴۱۹

⑨ مناقب ابي حنيفه وصاحبيه للذهبي، ص ۳۲

⑩ مناقب ابي حنيفه وصاحبيه للذهبي، ص ۳۲

کوفہ کے مشہور محدث حفص بن غیاث رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ابوحنیفہ کے ارشادات بال سے زیادہ باریک ہوتے ہیں۔ ان کی مذمت فقط جاہل کر سکتا ہے۔''[1]

حافظ سمعانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''وہ اس قدر انہماک کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول ہوئے کہ انہیں جو حاصل ہوا وہ کسی اور کو حاصل نہ ہو سکا۔''[2]

سند کی صحت کے علاوہ کتاب الآثار کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عالم اسلام کے ہر علمی مرکز کے صحابہ اور تابعین سے روایات لی گئی ہیں۔ مؤطا مالک میں یہ خوبی نہیں ہے۔ اس میں اکثر روایات علمائے مدینہ کی ہیں۔[3]

کتاب الآثار میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سبھی کی روایات ایک تناسب سے موجود ہیں۔ یہ وہ کتاب ہے جس پر اُمتِ مسلمہ کی اکثریت کا تیرہ صدیوں سے عمل چلا آ رہا ہے اور یہی فقہِ حنفی کی بنیاد ہے۔[4]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کتاب الآثار میں فقہ کی صحیح ترین روایات مدوّن کر کے امت پر جو عظیم احسان کیا اُمت اس سے تاقیامت سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ یہ مجموعہ امام صاحب کی زندگی ہی میں اسلامی ممالک میں مشہور ہو گیا اور اہل علم نے اس کی نقول تیار کر کے گراں مایہ موتیوں کی مانند اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ عدالتوں کے قاضیوں نے بھی اسے ناگزیر سمجھا اور اس کے نسخے حاصل کیے جس سے ان کے لئے شریعت کے مطابق فیصلے کرنا نہایت آسان ہو گیا۔ جبکہ دیگر ائمہ

---

① مناقب ابی حنیفہ و صاحبیہ للذہبی، ص ۳۲ ② الانساب للسمعانی: ۶/ ۵ ۶، ط دائرۃ المعارف العثمانیہ دکن

③ جن اکابر صحابہ کے فتاویٰ سے اُمت کو علمِ شریعت نصیب ہوا ہے ان میں خلفائے راشدین کے بعد سب سے نمایاں حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم ہیں۔ ان میں سے بھی پہلے چار کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔ ان میں سے حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا علم کوفہ میں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا مکہ میں اور حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما کا مدینہ میں پھیلا اور ہر جگہ لوگوں نے ان صحابہ کے فتاویٰ کے مطابق شریعت پر عمل کیا۔ چونکہ ان فتاویٰ میں بعض اوقات اختلاف بھی ہوتا تھا؛ اس لیے اہلِ کوفہ، اہلِ مکہ اور اہلِ مدینہ کے الگ الگ فقہی حلقے ظہور میں آ گئے۔ (اعلام الموقعین لابن قیم الجوزیۃ: ۱/ ۸)

امام مالک رحمہ اللہ چونکہ عمر بھر مدینہ میں ہی رہے تھے؛ اس لیے انہوں نے مؤطا میں اکثر مدنی صحابہ و تابعین کی روایات کو جمع کیا۔ باہر کے شیوخ سے اکا دکا ہی روایات لی ہیں مثلاً: مؤطا میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی فقط ۴ روایات ہیں۔ ہارون الرشید نے جب امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا کہ آپ نے حضرت علی اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کم روایات کیوں لی ہیں؟ تو ان کا جواب تھا: ''یہ حضرات میرے شہر کے نہیں تھے اور میری اُن سے ملاقات بھی نہیں ہوئی۔'' (مصفّیٰ از شاہ ولی اللہ: ۱/ ۱۵)

④ یاد رہے کہ بہت سے حضرات کتاب الآثار کو امام محمد رحمہ اللہ کی تالیف قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ ایک مشہور غلط فہمی ہے۔ کتاب الآثار کو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے متعدد شاگردوں نے نقل کیا ہے۔ اس میں سے وہ نسخہ جسے امام محمد رحمہ اللہ نے نقل کیا، اس لیے زیادہ مشہور ہو گیا کہ امام محمد رحمہ اللہ نے اس میں تشریحاتی جملوں کا اضافہ کر دیا تھا، بالکل ویسے ہی جیسے انہوں نے مؤطا امام مالک کو نقل کرتے ہوئے تشریحاتی اضافے کیے ہیں۔ جس طرح مؤطا کا وہ نسخہ مؤطا امام محمد رحمہ اللہ کہلانے لگا، اسی طرح کتاب الآثار کا یہ نسخہ بھی امام محمد رحمہ اللہ کے نام سے منسوب ہو گیا، جبکہ دیگر نسخے رفتہ رفتہ معدوم یا کمیاب ہو گئے۔ اگر وہ سب نسخے مشہور ہوتے تو یہ سمجھنا بہت آسان ہوتا کہ اصل کتاب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہی کی تھی جسے مختلف علماء نقل کر رہے ہیں جیسا کہ مؤطا امام مالک میں امام محمد رحمہ اللہ کے نسخے کے علاوہ دیگر نسخے بھی موجود ہیں؛ اس لیے اسے کوئی بھی امام محمد رحمہ اللہ کی تالیف نہیں سمجھتا۔ بہرکیف کتاب الآثار کے دیگر نسخے بھی ایک زمانے میں مروّج تھے جنہیں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے دیگر شاگردوں نے نقل کیا تھا۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا نسخہ شائع ہو چکا ہے۔ امام زفر رحمہ اللہ کا نسخہ کتاب الآثار ایک زمانے میں علماء کے ہاں معروف تھا۔ ﴿الاکمال لابن ماکولا، باب الجصینی و الحصینی: ۳/ ۱۳۹؛ معرفۃ علوم الحدیث حاکم نیشاپوری، ص ۱٦٤﴾ ایک نسخہ امام حسن بن زیاد رحمہ اللہ کا تھا جو انہوں نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے خود سن کر نقل کیا تھا۔ ﴿لسان المیزان: ۵/ ۳۱﴾

اور ان کے تلامذہ نے بھی اسی ترتیب کو اپنایا اور فقہی روایات کے مجموعے تیار کیے۔

امام صاحب رحمہ اللہ نے فقہ کو جس انداز پر ترتیب دیا، آج تک فقہی کتب اسی کے مطابق تالیف ہوتی چلی آرہی ہیں، جس میں سب سے پہلے عبادات یعنی طہارت، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم اور حج کے مسائل بیان کیے جاتے ہیں، اس کے بعد معاملات (نکاح وطلاق، بیع وشراء وغیرہ) کا ذکر ہوتا ہے پھر عقوبات (حدود، قصاص وغیرہ) کا تذکرہ اور آخر میں وصایا اور میراث کے مسائل بیان کیے جاتے ہیں۔

تدوینِ فقہ۔سب سے بڑا چیلنج اور عظیم ترین کارنامہ:

ایک مدت سے طاقت کے بل پر نظام سیاست چلنے اور اہلِ علم وفضل کی بااختیار مجلسِ شوریٰ نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے پاس کوئی ایک ایسا متفقہ قانونی ادارہ نہیں تھا جو ان مسائل کو حل کرتا جو انہیں انفرادی اور اجتماعی طور پر پیش آرہے تھے۔ گزشتہ ایک صدی میں اسلامی سلطنت کی حدود چاروں طرف پھیلی تھیں اور کئی نئی اقوام اسلام میں داخل ہوئی تھیں۔ تجارت، معیشت، سیاست، جرم وسزا، دیوانی وفوجداری مقدمات، جہاد، باغیوں، ذمیوں اور کافر حربیوں سے معاملات اور بین الاقوامی معاہدوں سمیت درجنوں معاملات ایسے تھے جہاں مسلمانوں کو اجتماعی آئینی رہنمائی کی ضرورت تھی مگر چونکہ اب ایک طویل مدت سے خلفاء کی حیثیت مذہبی رہنما کی نہیں تھی بلکہ محض سیاسی وعسکری قائدین کی سی تھی؛ اس لیے لوگوں کے پاس ان تمام مسائل میں اپنے اپنے علاقوں کے علماء وفقہاء کی طرف رجوع کیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ ضرورت پڑنے پر حکام بھی انہی سے رابطہ کرتے تھے۔

مگر اوّل تو اس قدر متنوع مسائل کو حل کر لینا ہر مفتی، قاضی یا فقیہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ دوسرے فقہاء کے ان انفرادی فیصلوں سے متضاد فتووں کا ایک انبار تو یقیناً جمع ہو رہا تھا مگر اُمت کو ایسی رہنمائی نہیں مل رہی تھی جس میں عوام وحکام سب کے لیے انفرادی واجتماعی مسائل کا کوئی مستقل لائحہ عمل ہوتا جس سے سب کی تشفی ہو جاتی۔ اس دور کا سب سے بڑا چیلنج یہ تھا قانون کو مدوّن کر کے اس انتشار کو دور کیا جاتا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو اس ضرورت کا پوری طرح احساس تھا اور ان کے معاصر دیگر علماء وفضلاء بھی اسے محسوس کر رہے تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم لکھتے ہیں:

> ''ان کے ہم عصر ابن المقفع نے اپنے نظم ونسقی تجربے کے باعث ایک درد بھرے رسالے (الصحابۃ) میں حکومت کو توجہ دلائی ہے کہ قضاۃ ساختہ قانونِ نظائر، نیز فتاویٰ میں تضاد اور اختلافِ رائے کی اتنی کثرت ہوگئی ہے کہ صحیح اسلامی حکم کا کسی مسئلے میں بھی پتا چلنا ناممکن ہوگیا ہے۔ اور ضرورت ہے کہ مختلف اقوال کو کھنگال کر کسی کو ترجیح دی جائے اور خلیفہ کے حکم سے واجب التعمیل قرار دیا جایا کرے۔''[1]

مگر ظاہر ہے کہ اگر منصور ایسی کوئی تحقیقی مجلس قائم کر بھی دیتا تو اس کے فیصلوں کو دلی رغبت سے صرف وہی لوگ

---

[1] امام ابو حنیفہ کی تدوین قانونِ اسلامی از ڈاکٹر حمید اللہ، ص ٤٣، ٤٤

قبول کرتے جنہیں حکمران سے مذہبی عقیدت ہوتی حالانکہ ایسے لوگ بنو عباس میں تلاش کرنا بھی مشکل تھے۔

ایسے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اپنے طور پر اس کمی کو پورا کرنے کی جدوجہد شروع کی اور تمام علوم وفنون کے ماہر علماء کے اشتراک سے ایک ایسا تحقیقی ادارہ قائم کیا جو پیش آمدہ شرعی مسائل کو ہر پہلو سے پوری سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ دیکھ کر اپنا فیصلہ دیتا تھا۔ اگرچہ اس ادارے کو قوتِ نافذہ حاصل نہیں تھی مگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو یقین تھا کہ اس ادارے کے مدوّن کردہ اسلامی قوانین اپنے تحقیقی معیار اور احوالِ واقعہ سے مطابقت کی وجہ سے اپنے آپ کو منوالیں گے اور ان کے مدوّن کرنے والوں کے مقام ومرتبے کا اخلاقی اثر اُمت کو از خود اپنی طرف متوجہ کر لے گا۔

اس مجلسِ علماء کے شرکاء میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے چالیس تلامذہ شامل تھے جن میں امام ابویوسف، امام زُفر، حسن بن زیاد، اسد بن عَمرو، یوسف بن خالد سمتی، یحییٰ بن زکریا بن زائدہ، عبداللہ بن مبارک، وکیع بن الجراح اور حفص بن غیاث رحمہم اللہ قابلِ ذکر ہیں۔[1] ان میں سے ہر ایک اپنے علاقے اور اپنے زمانے کا امامِ حدیث اور فقیہ شمار ہوا۔ یہ حضرات نہ صرف سالہاسال تک امام صاحب سے فقہ، افتاء اور استخراجِ مسائل کی تربیت لے چکے تھے بلکہ ان میں سے اکثر کو کسی نہ کسی علم وفن میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ اس طرح اس مجلسِ فقہاء میں تفسیر، حدیث، سیرت، بلاغت و بیان، لغت وادب، صرف ونحو، قیاس اور ریاضی سمیت مختلف علوم وفنون کے ماہرین شامل تھے۔[2]

اس مجلس کے طریقۂ تحقیق کے بارے میں موفق مکی رحمہ اللہ اپنی سند سے نقل کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

> ''امام صاحب رحمہ اللہ نے اپنا مذہب ان (تلامذہ) کی مشاورت سے مدوّن کیا۔ دین کے لیے زیادہ سے زیادہ جانفشانی کے جذبے اور اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کے لیے انتہائی دلی اخلاص کے باعث انہوں نے یہ کام تلامذہ کو چھوڑ کر محض اپنی ذاتی رائے سے کرنا پسند نہ کیا۔ وہ ایک ایک مسئلہ ان کے سامنے پیش کرتے تھے۔ اس کے مختلف پہلوان کے سامنے لاتے تھے۔ جو علم اور خیال تلامذہ کے ذہن میں ہوتا، اسے سنتے اور اپنی رائے بھی بیان کرتے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ایک ہی مسئلے پر تحقیق کرتے ہوئے مہینے سے بھی زیادہ وقت لگ جاتا۔ جب کوئی مسئلہ طے ہو جاتا تو قاضی ابویوسف رحمہ اللہ اسے لکھ لیتے۔''[3]

عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک بار تین دن تک ایک مسئلے پر صبح سے شام تک بحث ہوتی رہی۔ تیسرے دن شام کو سب نے مل کر ''اللہ اکبر'' کہا تو مجھے پتا چلا کہ اس بحث کا فیصلہ ہو گیا ہے۔[4]

---

① قال الطحاوی: کتب الیّ ابن ابی ثور یحدثنی عن سلیمان بن عمران حدثنی اسد بن الفرات، قال کان اصحاب ابی حنیفة الذین دونوا الکتب اربعین رجلا، فکان فی العشرة المتقدمین ابویوسف وزفر واسد بن عَمرو ویوسف بن خالد السمتی، ویحییٰ بن زکریا الزائدة وھوالذی کان یکتبھا لھم ثلاثین سنة. ﴿الجواھر المضیه: ۲/۲۱۲﴾

② مناقب ابی حنیفة مکی: ۲/۱۳۳۔۔۔ بعض حضرات امام محمد کو بھی اس مجلس میں شمار کرتے ہیں مگر یہ درست نہیں۔ امام صاحب کی وفات کے وقت امام محمد کی عمر ۱۸ برس تھی، وہ اس وقت فقہاء میں شمار نہیں ہوتے تھے، ہاں حلقۂ درس میں ضرور تھے۔ غالب گمان ہے کہ وہ تلامذہ کے علاوہ فتاویٰ نقل کرنے والے کاتبوں میں بھی شامل ہوں؛ کیوں کہ ان کے پاس امام صاحب کے علوم کی نقول بہت زیادہ تھیں۔

③ مناقب ابی حنیفة مکی: ۲/۱۳۳، ۱۳۴ ، ④ مناقب ابی حنیفة مکی: ۲/۵٤

اگر کبھی کسی مسئلے کا حل کسی طرح نہ نکلتا تو امام صاحب رحمہ اللہ فرماتے:

''میرے کسی گناہ کے سبب مسئلے کا حل سمجھ نہیں آ رہا۔''

یہ کہہ کر نماز، دعا اور توبہ واستغفار میں مشغول ہو جاتے یہاں تک کہ مسئلے کا حل ذہن میں آ جاتا اور آپ فرماتے:

''لگتا ہے میری توبہ قبول ہو گئی ہے۔''

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ یہ حالات سن کر زار و قطار روتے تھے:

''ابوحنیفہ کے گناہ کم ہیں تبھی بروقت متنبہ ہو جاتے ہیں ورنہ لوگ تو پروا بھی نہیں کرتے۔''①

علامہ کردری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ان کے تلامذہ ایک ایک مسئلے پر بھرپور بحث کرتے اور ہر فن کے زاویۂ نگاہ سے بات کرتے۔ اس دوران امام صاحب خاموشی سے ان کی بحث سنتے۔ پھر جب امام صاحب زیرِ بحث مسئلے پر گفتگو شروع کرتے تو مجلس میں ایسا سناٹا چھا جاتا جیسے ان کے سوا وہاں کوئی نہیں۔''②

اس مجلس میں فقط انفرادی یا اجتماعی طور پر پیش آمدہ مسائل ہی پر بحث نہیں ہوتی تھی بلکہ بعض معاملات کی ممکنہ صورتوں پر بھی غور کر کے ان کے بارے میں بھی آراء پیش کی جاتی تھیں تاکہ اگر بعد میں کوئی ایسا نیا مسئلہ پیش آ جائے تو قانونِ اسلامی میں پہلے سے اس کا حل موجود ہو۔③

مجلسِ بحث کی کارروائی کے دوران امام صاحب رحمہ اللہ جو کلام کیا کرتے تھے، وہ ساتھ ساتھ لکھ لیا جاتا تھا اور امام صاحب رحمہ اللہ بعد میں تصحیح کے لیے اسے اہتمام کے ساتھ سنا کرتے تھے۔④

ان ابحاث کو الگ الگ عنوانات کے تحت مرتب کرنے کا کام بھی امام صاحب رحمہ اللہ نے بڑی حد تک کرا دیا تھا۔⑤

ایک بار کسی نے امام صاحب رحمہ اللہ سے ایک خاص مسئلے کے حوالے سے پوچھا کہ اس بارے میں صحابہ کرام تک متفق نہ ہو سکے، آپ نے ایک قطعی رائے کیسے قائم کر لی؟

فرمایا: ''تم کیا سمجھتے ہو میں نے یوں ہی یہ رائے قائم کی ہے۔ میں نے بیس سال تک اس پر غور کیا ہے۔ اس کے نظائر و شواہد کو دیکھا بھالا ہے اور ہر صحابی کے قول کو مسلمہ اصولوں پر جانچا ہے۔''⑥

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ''بین الاقوامی تعلقات'' کو بھی ایک مستقل علم قرار دیا اور ''کتاب السیر'' کے مسائل پوری وضاحت سے قلم بند کرائے جن میں جنگ اور امن اور ممالک کے دوطرفہ تعلقات کے بارے میں احکام تھے۔

---

① مناقب ابی حنیفة، مکی: ۱۸۱/۱. عقود الجمان، ص ۲۲۸ ② مناقب ابی حنیفة، کردری: ۱۰۸/۲

③ فقہ حنفی کے قدیم ذخائر میں ایسی مثالیں کم نہیں۔ اہلِ علم ان سے بخوبی واقف ہیں۔

④ مناقب ابی حنیفة، کردری: ۱۰۹/۲

⑤ دوّنه ابو حنیفة فجعله ابوابا مبوبة و کتبا مرتبة. ﴿مناقب ابی حنیفة، موفق مکی: ۱۳۶/۲﴾

⑥ مناقب ابی حنیفة، کردری: ۱/۱۵۰، ۱۵۱

اس نئی چیز کو دیکھ کر بعض فقہاء کو حیرت بھی ہوئی؛ اسی لیے امام اوزاعی رحمہ اللہ نے اس کی تردید کی جس کے جواب میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے ''الرَّدُّ عَلٰی سیر الْاَوْزَاعِی'' نامی رسالہ لکھا۔

تدوین فقہ کا یہ کام ۱۲۰ھ میں شروع ہوا، اور درمیان میں کوفہ سے غیر حاضری کے کچھ عرصے کو چھوڑ کر ۱۴۴ھ تک ۲۲ برس جاری رہا۔ اپنے تلامذہ اور ہم عصر علماء کی جماعت کے ساتھ امام صاحب ہر مسئلے کے لئے پہلے کتاب اللہ، پھر سنت رسول اللہ ﷺ، اس کے بعد آثار صحابہ اور آخر میں قیاس کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ حدیث کی حیثیت (مثلاً صحیح، حسن، ضعیف، متواتر، مشہور، خبر واحد وغیرہ) جانچنے کے علاوہ وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ اس بارے میں نبی اکرم ﷺ کا وصال سے پہلے آخری عمل کیا تھا۔ ۱۴۴ھ تک تیار شدہ فقہی دفعات کی تعداد ۸۳ ہزار تھی جن میں ۳۸ ہزار مسائل عبادات اور ۴۵ ہزار مسائل معاملات اور عقوبات سے متعلق تھے۔ [1]

امام صاحب رحمہ اللہ کی وفات تک یہ کام جاری رہا۔ قید و بند کے دوران بھی یہ کام نہ رکا [2] اور جب امام صاحب دنیا سے رخصت ہوئے تو فقہ کا ایک ایسا عظیم الشان ذخیرہ مرتب ہو چکا تھا جو تا قیامت امت کی رہنمائی کے لئے کافی تھا۔

امام صاحب رحمہ اللہ کے زمانے میں ان کی مدون کردہ فقہ کو وہ بالاتر قانونی حیثیت نہ مل سکی جو اس کا حق تھا مگر امام صاحب کی کاوش کے نتیجے میں ہر دور اور ہر خطے کے لئے شرعی احکام کا مدون مجموعہ تیار ہو چکا تھا جس سے کام لے کر امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قلم سے ''کتاب الخراج'' اور امام محمد رحمہ اللہ کے ہاتھوں ''الجامع الصغیر''، ''الجامع الکبیر''، ''السیر الصغیر''، ''السیر الکبیر''، ''المبسوط'' اور ''الحجۃ علیٰ اہل المدینۃ'' جیسی عظیم الشان تصانیف سامنے آئیں۔

جونہی احناف کا یہ علمی ذخیرہ منظرِ عام پر آیا عوام و خواص، قاضی و مفتی، امراء اور خلفاء بھی اس سے استفادے پر مجبور ہو گئے؛ کیوں کہ یہ ایک ایسی متاع تھی جس کی ایک مدت سے اُمّت کو ضرورت تھی اور ہر جگہ اس کی شدید طلب تھی۔ اس اجتماعی تحقیق اور تدوینِ قانون کا نتیجہ یہ ہوا کہ انفرادی طور پر فتاویٰ دینے والے فقہاء و مجتہدین کی آراء غیر معتبر سمجھی جانے لگیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہ کارنامہ ایک ایسا انقلابی اقدام تھا جسے آیندہ کے لئے ہر اسلامی ریاست کی اساس کہا جا سکتا ہے۔ نصف صدی بھی نہ گزری تھی کہ اسے مملکت کے سرکاری قانون کی حیثیت مل گئی اور اکثر اسلامی ریاستوں کے حکام، قاضی حضرات اور مفتیان کرام اس کے مطابق فیصلے کرنے لگے۔ [3]

◆◆◆

---

[1] مناقب ابی حنیفة، کردری: ۱۴۴/۲؛ امام ابو حنیفه کی قانون تدوینِ اسلامی از ڈاکٹر حمید اللّٰه، ص ۴۹

[2] قدیم مآخذ میں ایسی کوئی صریح عبارت نہیں ملی مگر قرائن اور واقعات کی رفتار سے اس کی تائید ہوتی ہے؛ اسی لیے علامہ شبلی نعمانی مرحوم لکھتے ہیں: ''قید کے دوران درس کا سلسلہ بھی جاری رہا اور امام محمد رحمہ اللہ نے اسی دوران آپ سے اکتساب فیض کیا۔'' (سیرۃ النعمان از شبلی نعمانی، ص ۶۴)

[3] تفصیل کے لیے دیکھیے: وفیات الاعیان: ۴۰۹/۵ تا ۴۱۲، نیز ''مناقب ابی حنیفة و صاحبیه للذهبی'' اور ''الجواهر المضیة فی طبقات الحنفیة'' میں امام صاحب کے تلامذہ کے حالات دیکھیے۔

امام مالک بن انس رحمہ اللہ اور مؤطا

امام مالک بن انس رحمہ اللہ حجاز کے فقیہ اعظم تھے۔ منصور کے عہد میں انہوں نے احادیثِ صحیحہ، آثارِ صحابہ اور تعاملِ اہلِ مدینہ کی روایات کو جمع کر کے فقہ اسلامی کی ایک مبوّب اور مرتب کتاب "مؤطا" تالیف کی جو صحت و معیار کے لحاظ سے "کتاب الآثار" اور "صحیح بخاری و مسلم" سے کم نہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے اُمت کی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ مجموعہ اس انداز میں مرتب کیا کہ مدنی صحابہ کی بیشتر صحیح فقہی روایات ایک ترتیب کے ساتھ محفوظ ہو گئیں۔

جب مؤطا کی تکمیل ہو چکی اور اس عظیم علمی کارنامے کی شہرت حکومتی ایوانوں تک پہنچی تو خلیفہ منصور نے حج کے موقع پر امام مالک رحمہ اللہ سے ملاقات کر کے اس دینی خدمت کو بہت سراہا اور ساتھ ہی اسے پورے عالم اسلام میں نافذ کرنے کی پیش کش کی۔ صحیح سند کے مطابق امام مالک رحمہ اللہ خود یہ واقعہ اس طرح بیان کرتے تھے:

"ابوجعفر (منصور) نے ایک بار مجھے کہا: کیا روئے زمین پر آپ سے بڑا کوئی عالم ہے؟"

میں نے کہا: "ہاں بالکل"

ابوجعفر نے کہا: "مجھے ان کے نام بتایئے۔"

میں نے کہا: "مجھے سب کے نام یاد نہیں۔"

ابوجعفر نے کہا: "آپ کو معلوم ہے، بنوامیہ کے دور میں، میں نے بھی اس علم کے لیے جدوجہد کی تھی۔ اہلِ عراق (کی روایات پر مجھے بھروسہ نہیں؛ کیوں کہ وہ) جھوٹ اور دروغ گوئی کے عادی ہیں۔ اہلِ شام مجاہد لوگ ہیں، علم سے زیادہ واسطہ نہیں رکھتے۔ ہاں اہلِ حجاز میں علم باقی ہے اور آپ ان میں سب سے بڑے عالم ہیں۔ آپ امیر المؤمنین کی (یعنی میری) بات نہ ٹالیے گا۔ میرا ارادہ ہے کہ علم (فقہ) کو ایک ہی طرز پر طے کر دوں۔ اسی کو امرائے لشکر اور قاضیوں کی طرف لکھ بھیجوں۔ جو سرتابی کرے اس کی گردن اڑا دوں۔"

میں (امام مالک رحمہ اللہ) نے کہا: "امیر المؤمنین! حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس امت میں رہے اور لشکر بھیجتے رہے اور خود بھی (جہاد کے لیے) نکلتے رہے، زیادہ علاقہ فتح نہیں ہوا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسند نشین ہوئے اور انہوں نے بھی زیادہ علاقہ فتح نہ کیا تھا کہ فوت ہو گئے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور بہت سے ممالک فتح کیے۔ انہیں ضرورت محسوس ہوئی کہ دور دراز کے علاقوں میں صحابہ کو معلم بنا کر بھیجیں۔ پس لوگ ان حضرات کے علوم نسل در نسل نقل کرتے آئے یہاں تک کہ موجودہ زمانہ آ گیا۔

اب اگر آپ ان لوگوں کو ان کے جانے پہچانے طریقوں سے ہٹانے کی کوشش کریں گے تو وہ اس کوشش کو کفر سمجھیں گے۔ آپ کو چاہیے کہ ہر علاقے کے لوگوں کو انہی کے (فقہی) علم پر رہنے دیں۔ ہاں اپنے لیے آپ یہ علم (مؤطا) پسند کر لیں۔''

منصور نے کہا:

''آپ نے بہت دور کی سوچی۔ اچھا یہ علم محمد (ولی عہد مہدی بن منصور) کے لیے لکھ دیں۔''[1]

بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مؤطا کی تالیف منصور کی فرمائش پر ہوئی تھی جیسا کہ علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے مقدمۂ تاریخ میں لکھا ہے۔ اس روایت کے مطابق منصور حج کے لیے گیا تو امام مالک رحمہ اللہ سے اس سلسلے میں بات چیت کی اور کہا: ''آپ ایک ایسی کتاب تصنیف فرما دیجیے جس سے لوگ فیض یاب ہوں۔ جس میں نہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے مسلک جیسی رخصت ہو، نہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے اقوال جیسی شدت۔ لوگوں کے لیے مسائل کو بہت سہل کر کے پیش کیجیے۔''[2]

بعض روایات میں اس کے برعکس یہ ہے کہ مؤطا کی تالیف منصور کے بیٹے مہدی کے کہنے پر ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا: ''ابوعبداللہ! مجھے ایسی کتاب لکھ دیں کہ اُمت کو اس پر متحد کر دوں۔''[3]

درحقیقت ان اقوال میں کوئی تعارض نہیں؛ کیوں کہ مؤطا کو کئی بار مرتب کیا گیا تھا۔ اسے مزید بہتر انداز میں مرتب کرنے میں منصور اور پھر مہدی کا ایماء بھی شامل ہو سکتا ہے۔ عتیق الزبیری رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے پہلی بار اسے مرتب کیا تو یہ دس ہزار احادیث پر مشتمل تھی۔ پھر ہر سال وہ اس پر غور کرتے اور روایات کم کرتے چلے گئے۔[4]

یہ بھی ثابت ہے کہ مؤطا کو ہر سال مختلف تلامذہ سماعت کرتے تھے اور ہر بار اس میں فرق ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ مؤطا بروایۃ یحییٰ، مؤطا بروایۃ ابومصعب اور مؤطا بروایتِ امام محمد رحمہ اللہ میں واضح فرق ہے۔ پہلی میں ۱۷۲۰، دوسری میں ۳۰۶۹، اور تیسری میں صرف ۱۰۰۸ روایات ہیں۔

تمام روایات کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا جسے ان کے تلامذہ سنتے اور نقل کرتے تھے۔ خلیفہ منصور فقہِ اسلامی کو احادیث کی روشنی میں مرتب کرانے کا شائق تھا۔ امام مالک رحمہ اللہ یقیناً اس سے کہیں زیادہ مسلمانوں کی اس ضرورت کو محسوس کرتے تھے؛ کیوں کہ وہ خود اس فن کے امام تھے اور اپنے علم کو محفوظ و

---

① الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم، ص ۱۲۹ بسند عن الحجاج الصیدنانی، عن عتبۃ بن حماد عن مالک بن انس
صیدنانی ثقہ ہیں اور عتبہ بن حماد صدوق ہیں کما قال ابن حجر رحمہ اللہ فی التقریب۔ ڈاکٹر محمد مصطفیٰ اعظمی نے مؤطا امام مالک کے مقدمے میں اس کے سبب تالیف کے تحت اس صحیح روایت کی تائید میں مزید متعدد ضعیف روایات بھی نقل کی ہیں جو بہرحال تائید کا فائدہ دیتی ہیں۔

② مقدمہ ابن خلدون، ص ۱۸ (تاریخ ابن خلدون، جلد اوّل)

③ الانتقاء فی فضل الثلاثۃ الائمۃ الفقہاء لابن عبدالبر: ۱/۴۰

④ الدیباج المذھب فی معرفۃ اعیان علماء المذھب لابن فرحون: ۱/۱۱۹، ط دار التراث، قاھرہ

مرتب کرنے کی فکر سب سے زیادہ انہی کو ہوسکتی تھی۔ مؤطا کی تالیف کے اولین محرک وہ خود اور ان کے تلامذہ تھے۔ تاہم اس وقت اس مجموعے کی اتنی شہرت نہیں ہوئی تھی اور یہ کام تنقیح کے مرحلے میں تھا۔ منصور کے کہنے پر امام مالک رحمہ اللہ نے اس مجموعے کو دوبارہ مرتب کیا اور شدت یا رخصت والی بعض مشکوک روایات کو نکال دیا۔ پھر مہدی کے کہنے پر اس میں مزید چھان پھٹک کی۔ منصور اور مہدی نے اس علمی خدمت کی حوصلہ افزائی کی اور اسے پورے عالم اسلام کا قانون بنا دینا چاہا مگر امام مالک رحمہ اللہ کی دور اندیشی، بے غرضی اور وسعتِ ظرفی تھی کہ حکومت کو اس اقدام سے منع کر دیا تاکہ امت کے لیے وسعت پیدا ہو اور اختلافِ علماء کا رحمت ہونا ثابت رہے۔

✦✦✦

علوی حضرات کا خروج

منصور کو اپنے دورِ حکومت میں ایک بہت ہی نازک اور سخت ترین امتحان سے گزرنا پڑا۔ یہ بعض فاطمی حضرات کا خروج تھا جس سے عراق وحجاز میں زبردست ہل چل مچ گئی اور ایسا لگا کہ بنوعباس کی حکومت چند دنوں کی مہمان ہے۔

فاطمی خاندان کے ان بزرگوں نے اپنے عقیدت مندوں سمیت انقلاب میں بنوعباس کے شانہ بشانہ کام کیا تھا مگر جب خلافِ توقع حکومت کے تمام تر عہدوں پر عباسی براجمان ہوگئے اور بنو ہاشم کے دیگر خانوادوں کو نہ صرف بالکل محروم رکھا گیا بلکہ مستقبل کی حکومت بھی ایک ہی گھرانے کے لیے خاص کر لی گئی تو فاطمی حضرات کو بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ بنوعباس کی حکومت کو اسی نگاہ سے دیکھنے لگے جیسے بنوامیہ کی حکومت کو دیکھا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اب ضروری تھا کہ ایک اور انقلاب لاکر فاطمی خانوادے کی حکومت قائم کی جاتی؛ کیوں کہ ان کے نزدیک خانوادۂ عباس رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھرانے کا شرف ومرتبہ زیادہ تھا۔

عبداللہ بن حسن مثنیٰ رحمہ اللہ:

اس گھرانے کے ایک معزز بزرگ عبداللہ بن حسن مثنیٰ رحمہ اللہ تھے۔ یہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے سگے پوتے تھے۔ ۹۰ برس سے زائد عمر پائی تھی۔ اپنے دور کے محدث تھے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ جیسے محدثین نے ان سے روایت لی تھی۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے دور میں ان کا بڑا اعزاز واکرام کیا تھا۔[1]

اموی خلفاء سے ان کے بہت اچھے تعلقات اور رشتے ناتے تھے۔ ان کی بہن زینب جو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی پوتی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی نواسی تھیں، اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے نکاح میں آئی تھیں۔

بڑے فصیح وبلیغ اور عبادت گزار انسان تھے۔ عقیدے میں اہلِ سنت والجماعت کے ہم آہنگ تھے۔ چمڑے کے موزوں پر مسح کیا کرتے تھے۔ کسی نے حیرت کا اظہار کیا تو فرمایا: ''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ موزوں پر مسح کرتے تھے، جو ان کی پیروی کرے اس نے ایک مضبوط حلقے کو پکڑ رکھا ہے۔''

سَفاح خلیفہ بنا تو یہ اس سے ملنے 'انبار' گئے۔ سَفاح نے بے حد تعظیم وتوقیر کی، ان کے دونوں بیٹوں: محمد اور ابراہیم کا حال بھی پوچھا کہ وہ کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا: ''دیہات میں ہیں۔ انہیں گوشہ نشینی پسند ہے۔''

سَفاح آدھی رات تک ان سے گفتگو کرتا رہا۔ پھر بنوامیہ کے خزانوں سے حاصل کیا گیا ایک صندوقچہ کھول کر دکھایا جو نادر ونایاب جواہر سے پُر تھا۔ سَفاح نے آدھے جواہر انہیں دے دیے۔[2]

[1] البدایۃ والنھایۃ: ۳۸۱/۱۳؛ نسب قریش للزبیری: ۵۳، ط دار المعارف قاھرہ　[2] طبقات ابن سعد: القسم المتمم: ۲۵۲/۱

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں کہ سفاح نے انہیں دس لاکھ دراہم کا خطیر نذرانہ پیش کیا تھا۔[①]

محمد نفس زکیہ کی طرف سے مہدی ہونے کا دعویٰ:

سفاح کی نوازشوں کی وجہ سے فاطمی بزرگ اس سے خوش رہے۔ مگر منصور ویسا سخی تھا نہ کشادہ دل۔ اس نے فاطمیوں کو عطیات اور مالی نوازشوں میں بھی یاد نہ رکھا بلکہ انہیں اپنے اقتدار کے لیے خطرہ تصور کیا۔ اگرچہ شروع میں اس نے بنو فاطمہ کے ایک بزرگ حسن بن زید ابو محمد کو جو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پوتے تھے، مدینہ کا گورنر بنایا تھا مگر بعد میں انہیں معزول کر کے قید کر دیا۔[②]

ان وجوہ سے فاطمی حضرات کی منصور سے ناراضی بڑھتی رہی۔ انہوں نے خفیہ طور پر لوگوں کو اپنی بیعت کی دعوت دینا شروع کر دی۔ اس تحریک کی قیادت عبداللہ بن حسن رحمہ اللہ کے دو بیٹے کر رہے تھے۔ بڑے محمد بن عبداللہ تھے اور چھوٹے ابراہیم بن عبداللہ۔ دونوں علم وفضل، ورع وتقویٰ اور امانت و دیانت کے اعتبار سے مشہور تھے۔ خاص کر محمد بن عبداللہ کا حلقۂ اثر بہت بڑا تھا۔ ان کی پاکیزہ طبعی کی بناء پر انہیں ''نفسِ زکیہ'' کہا جاتا تھا۔

ان کے پیروکاروں کا کہنا تھا کہ تحریک کے دوران موجودہ خلیفہ منصور سمیت سادات کے تمام سیاسی قائدین نے نفس زکیہ کی خلافت پر اتفاق کیا تھا؛ لہٰذا کسی اور کا مسندِ خلافت پر بیٹھنا غداری اور ناقابلِ معافی جرم ہے۔

اس خفیہ تحریک میں انہوں نے ''مہدی'' کا لقب اختیار کیا۔ مہدی کی کئی علامات ان میں جمع ہو گئی تھیں۔ نام محمد اور والد کا نام عبداللہ تھا، سیّد تھے، بولتے وقت ہکلاتے تھے اور جب اچھی طرح نہ بول پاتے تو اپنا ہاتھ سینے پر مارتے تھے۔[③]

ان کے عقیدت مندوں نے مشہور کر دیا کہ یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کے وہ فرد ہیں جو دنیا کو ظلم وستم سے نجات دلا کر عدل وانصاف سے آباد کریں گے۔ مگر درحقیقت یہ بات درست نہ تھی۔ ممکن ہے یہ ایک سیاسی چال ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ نفسِ زکیہ کو مہدی سے متعلقہ احادیث دیکھ کر اپنے بارے میں غلط فہمی ہو گئی ہو۔ بعد میں بھی ایسے کئی لوگ آئے جنہوں نے سیاسی مقاصد کے تحت یا خوش فہمی یا غلبۂ حال میں خود کو مہدی کے طور پر متعارف کرایا۔

چونکہ خلافتِ عباسیہ کے گزشتہ بیس سالوں میں ہونے والی خونریزی اور خلفاء کی بدعہدیوں اور اخلاقی اقدار کی متعدد بار خلاف ورزی نے اُمت کے ایک بڑے طبقے کو حکومت سے بددل کر رکھا تھا؛ اس لیے فاطمی حضرات کی یہ تحریک بہت تیزی سے پھیلی، خاص کر حجاز اور عراق میں ہزاروں افراد نے بیعت کر کے ان کا ساتھ دینے کا عہد کیا۔

حجاز میں صحابہ کرام کی اولاد کے کئی خانوادے اس تحریک کے حامی بن گئے۔ حضرت علی، حضرت جعفر، حضرت زبیر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم کی اولاد سے کئی اعیان نے اپنی ہمدردیاں اور خدمات اس تحریک کو سونپ دیں۔[④]

منصور کو اس تحریک کا جونہی علم ہوا، اس نے تحریک کے قائدین: نفس زکیہ اور ابراہیم کی گرفتاری کے احکام جاری

① البداية والنهاية: ۳۸۱/۱۳
② العبر في خبر من غبر: ۱۹۴/۱
③ تاريخ الطبري: ۵۶۳/۷
④ تاريخ الطبري: ۵۵۹/۷، ۵۶۱

کر دیے۔ یہ دونوں حجاز کے دیہی علاقے میں روپوش ہو گئے۔ ①

باپ کی وصیت۔ روپوشی اور تلاشی:

روپوشی سے قبل جب یہ باپ سے آخری ملاقات کے لیے آئے تو دانا باپ نے وصیت کرتے ہوئے کہا:

''بیٹا! کسی کو ایذاء دینے سے بچتے رہنا۔ اکثر خاموشی کو اپنی حفاظت کا ذریعہ بنائے رکھنا، کہ جہاں کلام کی ضرورت نہ ہو وہاں بہر صورت خاموشی بہتر ہے۔ بعض اوقات ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں انسان کا درست اقدام رائیگاں جاتا ہے اور غلط اقدام سخت نقصان دیتا ہے۔ سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ آدمی موقع آنے سے پہلے جلد بازی کر گزرے اور موقع ملنے پر سستی کرے۔ جس طرح ہوشیار دشمن سے بچ کر رہنا چاہیے اسی طرح بے وقوف دوست سے بھی دور رہنا چاہیے۔''

باپ سے یہ ہدایات لینے کے بعد دونوں بھائی روپوش ہو گئے۔ کبھی یہ حجاز میں ہوتے کبھی یمن یا عراق میں، کبھی کسی اور صوبے میں۔ چونکہ ان کی قدر و منزلت ہر جگہ تھی؛ اس لیے انہیں پناہ ملتی رہی اور کوئی ان کی مخبری پر تیار نہ ہوا۔ منصور کے لیے یہ صورتحال بڑی پریشان کن تھی۔ وہ اس قضیے کو نمٹانے کے لیے خود حجاز پہنچا۔ اسے اندازہ تھا کہ دونوں بھائی حجاز میں ہی کہیں چھپے ہوئے ہیں۔ اس نے اپنے جاسوس علاقے میں پھیلا دیے جو تاجروں کے بھیس میں عطر اور دیگر اشیاء فروخت کرنے کے ساتھ خبریں کھوجتے رہے مگر بے سود۔

آخر اس نے ایک جاسوس کو خطیر رقم دے کر نفسِ زکیہ کے والد عبداللہ بن حسن رحمہ اللہ کے پاس بھیجا۔ جاسوس نے خود کو تحریک کا وفادار ظاہر کیا اور وہ رقم بطورِ عطیہ پیش کر کے عبداللہ بن حسن رحمہ اللہ کا اعتماد جیت لیا۔ جلد ہی اسے نفسِ زکیہ کا پتا چل گیا جو ''جُہینہ'' میں چھپے ہوئے تھے۔ جاسوس نفسِ زکیہ تک پہنچا ہی تھا کہ اس کی اصلیت کھل گئی۔ اسے پکڑ لیا گیا اور یوں منصور کی یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ آخر اس نے عبداللہ بن حسن رحمہ اللہ کو مدینہ سے گرفتار کر کے وہیں قید کرا دیا۔ جب اس سے بھی کام نہ بنا تو حجاز سے واپس جاتے ہوئے اس نے یہاں ریاح بن عثمان مُرّی کو حاکم بنا دیا۔ یہ شخص واقعۂ حرہ کے مجرم مسلم بن عقبہ کا رشتے میں پوتا لگتا تھا۔ اس نے یہاں خانوادۂ بنی فاطمہ پر مزید سختی کی۔ عبداللہ بن حسن رحمہ اللہ کے ایک اور بیٹے حسن کو خاندان کے کئی افراد سمیت گرفتار کر لیا۔ ②

گرفتاریاں اور تشدد:

۱۴۴ھ میں منصور پھر حج کے لیے آیا تو ایک بار پھر بڑی شدت سے خانوادۂ بنی فاطمہ کے روپوش حضرات کو تلاش کروایا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے محمد بن عبداللہ بھی اس تفتیش کی زد میں آئے؛ کیوں کہ وہ ابراہیم بن عبداللہ کے سسر تھے۔ انہوں نے زبان نہ کھولی تو منصور نے ساٹھ کوڑے لگوائے۔ انہوں نے احتجاج کیا تو مزید ڈیڑھ سو کوڑے لگوائے۔ ③

---

① انساب الاشراف: ۸۳/۳، ط دار الفکر ② انساب الاشراف: ۸۸/۳، ۸۹، ۹۱ ③ انساب الاشراف: ۸۹/۳

پھر بھی کچھ نہ بنا تو منصور نے تنگ آ کر اپنے چچا عیسیٰ بن علی کو بھیج کر عبداللہ بن حسن کو پیش کش کی کہ جو چاہیں ضمانت لے لیں، بس اپنے بیٹوں کو حاضر کرا دیں۔ نفسِ زکیہ ان دنوں کوہِ رضوی میں روپوش تھے۔ عبداللہ بن حسن رحمۃ اللہ نے کہا:

''میں اس پیش کش کا جواب اسی صورت میں دوں گا جب امیر المؤمنین منصور خود مجھ سے بات کریں۔''

منصور نے خود بات کرنے سے انکار کر دیا اور کہا:

''وہ اپنی گفتگو سے مجھ پر ویسا ہی جادو کر دیں گے جیسا دوسروں پر کرتے ہیں۔''

عراق واپس جاتے ہوئے منصور، عبداللہ بن حسن رحمۃ اللہ اور ان کے بڑے صاحبزادے حسن کو ساتھ لے گیا اور کوفہ میں سرکاری افسران کے محلے ''ہاشمیہ'' کی جیل میں قید کرا دیا۔ عبداللہ بن حسن رحمۃ اللہ ۹۲ سال کی عمر میں اسی قید و بندکی حالت میں فوت ہوئے، اسی طرح حسن بن عبداللہ نے بھی جیل خانے میں دم توڑ دیا۔[1]

نفسِ زکیہ کا خروج:

نفسِ زکیہ اب تک خفیہ طور پر تحریک چلا کر عالمِ اسلام میں رائے عامہ کو ہموار کر رہے تھے۔ منصوبہ یہ تھا کہ سب کا اتفاق حاصل کرنے کے بعد ہر جگہ ایک ہی دن خروج کر دیا جائے تاکہ حکومت بے دست و پا ہو جائے۔ کئی سالوں کی خفیہ تحریک کے بعد انہیں یقین ہو چکا تھا کہ پورے عالم اسلام میں لوگ ان کے ساتھ ہیں اور یہ تحریک کامیاب ہو جائے گی۔ چنانچہ جب انہیں باپ اور بھائی کی موت کی اطلاع ہوئی تو مزید صبر نہ کر سکے اور ۲۷ جمادی الآخرہ ۱۴۵ھ کو پہلی بار منظرِ عام پر آتے ہوئے مسلح خروج کا اعلان کر دیا۔

وہ ابتداء میں صرف ڈیڑھ سو افراد کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچے اور جیل توڑ کر اپنے قیدیوں کو رہا کرا لیا۔ پھر مدینہ کے سرکاری حاکم ریاح بن عثمان کے قصر پر حملہ کیا اور اعلان کرایا: ''کسی کو قتل نہ کیا جائے۔''

ریاح بن عثمان کو گرفتار کر لیا گیا اور کسی کشت و خون کے بغیر مدینہ پر نفسِ زکیہ کی حکومت قائم ہو گئی۔ اگلے دن نفسِ زکیہ نے اہلِ مدینہ سے بیعت لی اور ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''مدینہ والو! میں نے خروج کی ابتداء تمہارے شہر سے اس لیے نہیں کی کہ تمہارے ذریعے اپنی طاقت بڑھاؤں؛ کیوں کہ دوسرے شہروں کے لوگ تم سے زیادہ طاقت والے ہیں۔ درحقیقت تم ہماری برادری اور میرے نانا کے انصار ہو؛ اس لیے میں نے تمہی کو پسند کیا۔ اللہ کی قسم! دنیا کے جس بھی شہر میں اللہ کی عبادت کی جا رہی ہے وہاں میرے داعی لوگوں سے بیعت لے چکے ہیں۔''[2]

اس کے بعد نفسِ زکیہ کے حکم پر عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کے پوتے حسن بن معاویہ کچھ حامیوں کو لے کر مکہ پہنچے اور وہاں سے عباسی حاکم کو بے دخل کر کے لوگوں سے نفسِ زکیہ کے لیے بیعت لی۔[3]

---

[1] انساب الاشراف: ۸۹/۳، ط دار الفکر

[2] انساب الاشراف: ۹۲/۳، ۹۳

[3] انساب الاشراف: ۹۳/۳

منصور اور نفسِ زکیہ کے مابین خط و کتابت:

منصور کا مخبر دن رات سفر کر کے نو دن میں حجاز سے انبار پہنچا اور یہ اطلاع دی۔ منصور نے فوراً نفسِ زکیہ کو مکتوب لکھا:

"اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ○ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهِمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○"

(بے شک بدلہ ان لوگوں کا جو کہ جنگ کرتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول ﷺ سے اور زمین میں فساد مچانے کی کوشش کرتے ہیں ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں، یا انہیں سولی پہ لٹکا دیا جائے یا ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیے جائیں، یا انہیں زمین سے جلا وطن کر دیا جائے، ایسے لوگوں کے لئے دنیا کی زندگی میں رسوائی ہے اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے سوائے ان لوگوں کے جو کہ توبہ کریں اس سے پہلے کہ تم ان کے اوپر قابو پا لو، تو پھر جان لو کہ اللہ تبارک و تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا۔)[1]

اگر تم توبہ کر لو اور ہماری پکڑ میں آنے سے پہلے پہلے اپنے موقف سے رجوع کر لو تو میں تمہیں، تمہاری اولاد، تمہارے بھائیوں، تمہارے خاندان اور تمہارے پیروکاروں کو جان و مال اور عزت کی امان دیتا ہوں۔"[2]

طبری کی روایت میں یہ اضافہ ہے:

"تمہارے خاندان کے جو لوگ قیدی ہیں انہیں رہا کر دوں گا۔ تم جس شہر میں چاہو رہ سکتے ہو۔ تمہارے ساتھیوں سے بعد میں بھی کبھی کوئی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ تمہیں مزید ایک لاکھ درہم دوں گا۔ اس کے علاوہ اپنی ضروریات کے لیے جو چاہو مانگ سکتے ہو۔ اگر تم اپنا اطمینان کرنا چاہو تو اپنے قابل اعتماد رفقاء کو بھیج کر مجھ سے جو چاہو تحریری معاہدہ لکھوا سکتے ہو۔"[3]

نفسِ زکیہ نے اس کے جواب میں لکھا:

طٰسٓمٓ ○ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ○ نَتْلُوْا عَلَیْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰی وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ○ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَیَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ○ وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِیْنَ ○ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَنُرِیَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَحْذَرُوْنَ ○

[1] سورۃ المائدۃ، آیت: ۳۳، ۳۴ [2] انساب الاشراف: ۹۵/۳، ط دار الفکر [3] تاریخ الطبری، تحت: ۱۴۵ھ

(یہ واضح کتاب کی آیات ہیں۔ہم آپ کو سناتے ہیں موسیٰ اور فرعون کی خبر ایک مقصد کے تحت ٹھیک ٹھیک۔ان لوگوں کے لئے جو ایمان لانا چاہیں۔یقیناً فرعون زمین میں سرکشی کر رہا تھا اور اس نے زمین والوں کو گروہ گروہ میں تقسیم کر رکھا تھا،کمزور کر رکھا تھا اس نے ان میں سے ایک جماعت کو۔وہ ذبح کرتا تھا ان کے بیٹوں کو،اور زندہ رکھتا تھا ان کی عورتوں کو۔بے شک وہ فساد مچانے والوں میں سے تھا۔اور ہم چاہتے تھے کہ احسان کریں ان لوگوں پر کہ جنہیں زمین میں کمزور کر دیا گیا تھا،اور ہم انہیں بنا دیں امام،اور ہم انہیں بنا دیں وارث،اور ہم انہیں بسا دیں زمین میں،اور ہم دکھائیں فرعون کو اور ہامان کو اور جو بھی ان کے لشکر ہیں وہ چیز کہ جس سے وہ ڈر رہے تھے۔)[1]

اللہ نے ہمیں منتخب کیا ہے اور ہمیں شرف بخشا ہے کہ ہم اولاد ہیں انبیائے کرام میں سب سے افضل حضرت محمد ﷺ کی، اسلاف میں سب سے پہلے اسلام لانے والے (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کی، ازواج مطہرات میں سے سب سے افضل حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی، سب سے پہلے قبلہ رخ ہو کر نماز پڑھنے والوں (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ) کی، بناتِ رسول میں سب سے بلند مرتبہ بیٹی سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی، اور جنتی نوجوانوں کے سردار حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی۔ہاشم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دُہرے باپ تھے۔(دادا بھی تھے اور نانا بھی) اسی طرح عبدالمطلب حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے دُہرے باپ تھے۔پس میں بنو ہاشم میں نسب کے لحاظ سے سب سے بہتر اور ماں باپ کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ ہوں جس کے نسب میں عجمیت کا کوئی اثر نہیں۔میں جنت میں سب سے بلند مرتبہ انسان (حضور اکرم ﷺ) اور جہنم میں سب سے کم عذاب دیے جانے والے شخص (ابوطالب) کی اولاد ہوں۔

اگر تم ہماری اطاعت کرو تو ہم تمہارے لیے ویسی ہی امان کی ضمانت دیتے ہیں، جیسی تم نے دی۔بلاشبہ ہم وعدہ پورا کرنے میں زیادہ قابلِ اعتماد ہیں۔تم ہمیں کون سی امان دے رہے ہو؟ ویسی جیسے تم نے ابن ہبیرہ کو دی؟ یا ویسی جیسی تم نے اپنے چچا عبداللہ بن علی کو دی؟"[2]

منصور کو یہ خط ملا تو اس کے وزیر ابوایوب نے جواب لکھنے کی اجازت مانگی۔منصور نے کہا:

"رہنے دو۔اس نے نسب اور رشتوں پر فخر کیا ہے تو جواب میں خود لکھوں گا۔"[3]

اس کے بعد منصور نے اپنے خاندان کی فضیلتوں پر مشتمل درج ذیل طویل خط لکھا:

"تمہارا خط ملا تو معلوم ہوا کہ تمہارے فخر کا دارومدار عورتوں کے ذریعے ثابت ہونے والے نسب پر ہے، تاکہ اس طرح تم جاہلوں اور عوام کو بے وقوف بنا سکو۔اللہ نے عورتوں (کے رشتے) کو مردوں کی رشتہ داریوں جیسا مقرر ہی نہیں کیا۔اللہ نے چچا کو باپ کی جگہ رکھا ہے اور اس کا ذکر باپ سے بھی پہلے کیا ہے، ارشاد باری ہے:

① سورۃ القصص، آیات: ۱ تا ۶

② انساب الاشراف: ۹۶/۳ تا ۹۸۔طبری کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں:"یا وہ امان جو تم نے ابومسلم کو دی تھی؟"

③ تاریخ الطبری: سنۃ ۱۴۵ھ

قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ

(انہوں نے کہا: ہم عبادت کریں گے آپ کے معبود کی، اور آپ کے آباؤ اجداد ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق علیہم السلام کے معبود کی، اور وہ ایک ہی معبود ہے، اور ہم اسی کی فرمانبرداری اختیار کرنے والے ہیں۔)[1]

پس اللہ نے یعقوب کے چچا اسماعیل کو ان کا باپ کہا۔

اور جب اللہ نے حضور اکرم ﷺ کو مبعوث فرمایا تو ان کے چار چچا تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں اسلام کی دعوت دی اور ڈرایا۔ ان میں سے دو نے انکار کیا اور دو نے قبول کیا۔ قبول کرنے والوں میں ایک میرے دادا (عباس رضی اللہ عنہ) تھے۔ انکار کرنے والوں میں سے ایک تمہارا دادا (ابوطالب) تھا؛ اسی لیے اللہ نے ان دونوں انکار کرنے والوں (ابوطالب اور ابولہب) کی وراثت اور قرابت کو آپ ﷺ سے منقطع قرار دیا۔

تمہارا دعویٰ ہے کہ تم قیامت کے دن سب سے کم عذاب دیے جانے والے کے اور شریروں میں سب سے بہتر کے بیٹے ہو۔ حالانکہ اللہ سے کفر کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ نہ ہی اللہ کا تھوڑا سا عذاب بھی ہلکا ہے۔ نہ ہی شریروں میں کوئی خیر ہو سکتی ہے۔ اللہ پر ایمان رکھنے والا کوئی مؤمن اہلِ جہنم کی اولاد ہونے پر فخر نہیں کر سکتا۔

تم نے جو لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہاشم سے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو عبدالمطلب سے دُہرا نسبی رشتہ حاصل تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اولین و آخرین سب میں بہتر ہیں ان کا تو ہاشم اور عبدالمطلب سے دُہرا نسبی رشتہ نہیں تھا۔ (لہٰذا دُہرا نسبی رشتہ فخر کی بات نہیں۔ اگر ہوتی تو حضور ﷺ کو ضرور نصیب ہوتی۔)

تم نے لکھا ہے کہ تمہارے نسب میں عجم کی کوئی ملاوٹ نہیں، تمہارے خاندان میں کوئی باندی کی اولاد نہیں۔ یہ تو تم نے تمام کائنات کے افضل ترین فرد کی اولاد پر برتری کا دعویٰ کر دیا؛ کیوں کہ حضور ﷺ کے ایک بیٹے ابراہیم باندی ماریہ قبطیہ کے بطن سے تھے۔ تمہارے خاندان میں علی بن حسین (حضرت زین العابدین) سے بہتر کوئی نہیں مگر وہ ایک باندی کے بیٹے تھے اور وہ تمہارے دادا حسن (المثنیٰ) بن حسن رضی اللہ عنہ سے بہتر تھے۔ زین العابدین کے بعد تمہارے درمیان ان کے بیٹے محمد بن علی سے بہتر کوئی نہ تھا۔ وہ بھی ایک باندی کے بیٹے تھے۔

تمہارا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ تم رسول اللہ ﷺ کے بیٹے ہو؛ کیوں کہ قرآن مجید کہتا ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا

(محمد نہیں ہیں تمہارے مردوں میں سے کسی کے والد لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور آخری نبی ہیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے۔)[2]

ہاں! تم ان کی قابلِ احترام بیٹی کے بیٹے ضرور ہو مگر یہ رشتہ نہ وراثت کا حق رکھتا ہے نہ اختیارات کی منتقلی کا۔ جب عورت نماز میں امامت نہیں کرا سکتی تو اس کے ذریعے سیادت و امامت کے اختیارات کی وراثت آ گئے کیسے

[1] سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۳۳
[2] سورۃ الاحزاب، آیت: ۴۰

منتقل ہو سکتی ہے۔ تم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت نماز کا حکم ان کی جگہ کسی اور (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) کو دیا تھا۔ ①

حضرت حسن رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلافت کپڑوں اور دراہم کے عوض بیچ دی۔ پس اگر خلافت میں تمہارا حق تھا، تو تم اسے فروخت کر چکے ہو اور اس کا معاوضہ وصول کر چکے ہو۔

پھر تم نے بنوامیہ کے خلاف خروج کیا۔ انہوں نے تمہیں قتل کیا، سولی پر چڑھایا، شہروں سے جلاوطن کیا۔ (یہ اشارہ ہے زید بن علی کے قتل اور سولی کی طرف) یہاں تک کہ ہم نے خروج کیا اور تمہارا انتقام لیا۔ تمہارے خون کا بدلہ لیا۔ تمہیں ان زمینوں اور شہروں کا وارث بنا دیا۔ تمہارے بڑوں کو فضیلت اور عزت دی۔ اب تم انہی باتوں کو ہمارے خلاف دلیل بنانا چاہتے ہو۔ شاید تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ ہم تمہارے باپ (علی رضی اللہ عنہ) کا ذکرِ خیر اس وجہ سے کرتے ہیں کہ وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔ حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے خاندان (بنوہاشم) کی دورِ جاہلیت میں فضیلت حاجیوں کو پانی پلانے کی وجہ سے تھی۔ یہ شرف اپنے بھائیوں میں سے صرف حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو نصیب ہوا۔ تمہارے باپ (علی رضی اللہ عنہ) نے اس بارے میں عمر رضی اللہ عنہ سے بحث کی مگر انہوں نے فیصلہ ہمارے حق ہی میں کیا۔ ②

جب مدینہ میں قحط پڑا تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ہمارے دادا کے وسیلے ہی سے اللہ سے بارش کی دعا کی اور اللہ نے پانی برسایا۔ ③ حالانکہ تمہارے باپ موجود تھے مگر ان کا توسل نہ کیا۔

پھر جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو عبدالمطلب کی اولاد میں سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی زندہ نہ تھا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت انہی کی طرف منتقل ہوئی اور خلافت ان کی اولاد میں آ گئی۔ دنیا و آخرت کا کوئی شرف اور اعزاز ایسا نہیں جس کے وارث حضرت عباس رضی اللہ عنہ نہ ہوئے ہوں۔ وہ نہ ہوتے تو ابوطالب اور عقیل بھوکے مر جاتے۔ انہوں نے تمہاری آبرو رکھی۔ تمہاری کفالت کرتے رہے۔ عقیل قید ہوئے تو فدیہ دے کر انہیں چھڑایا۔ ہم نے زمانہ جاہلیت میں بھی تمہارے خاندان کی کفالت کی تمہاری ناموس کی حفاظت کرتے رہے۔ ہم خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کے وارث بھی بنے۔ تمہارا بدلہ بھی ہم نے لیا اور جس چیز کو تم حاصل نہ کر سکے اسے ہم نے حاصل کر کے دکھایا۔"

① انساب الاشراف میں یہ مکتوب یہیں تک منقول ہے، دیکھئے: ۳/۹۸ تا ۱۰۲، آگے خط کا بقیہ حصہ تاریخ الطبری سے لیا گیا ہے۔

② صحیح البخاری، ح: ۱۰۱۰، کتاب الاستسقاء ③ صحیح البخاری، ح: ۳۷٤٦، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم

خط و کتابت کا یہ بقیہ حصہ طبری ۱۴۵ھ کے حالات میں مذکور ہے۔ طبری کے بقول یہ مراسلے محمد بن یحییٰ نے محمد بن بشیر سے نقل کیے ہیں۔ ان کے والد بشیر ان خطوط کو صحیح قرار دیتے تھے۔ تاہم ہم نے ترجمے میں بعض رکیک حصوں کو چھوڑ دیا ہے جن کے بارے میں امکان تھا کہ یہ کسی متعصب راوی کا اضافہ ہوں۔
یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ منصور نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل ہونے کا جو موقف پیش کیا ہے، وہ اہل سنت کے اجماعی نقطہ نظر کے خلاف ہے۔ اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ خلفائے راشدین تمام صحابہ سے افضل ہیں۔ منصور کا مکتوب اسلام کی صحیح ترجمانی نہیں کر رہا بلکہ اپنے خاص خاندانی موقف کی وکالت کر رہا ہے جس میں طنز، بڑائی اور تعصب کا عنصر صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

غرض فریقین نے طویل خط و کتابت کے ذریعے اپنے اپنے خاندانوں کی فضیلت ثابت کرنے کی پوری کوشش کی اور ہر ایک اس بات کا مدعی رہا کہ خاندانی شرف کی بناء پر خلافت کا اصل حق دار وہی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مصالحت کی کوئی صورت نہ بنی۔

نفسِ زکیہ کے خلاف فوج کشی:

آخر منصور نے نفسِ زکیہ کے خلاف فوجی کارروائی کا حکم دے دیا۔ تاہم وہ چاہتا تھا کہ نفسِ زکیہ کی جان لیے بغیر مسئلہ حل ہو جائے؛ کیوں کہ نفسِ زکیہ سے اس کے اپنے گھر کے بہت قریبی رشتے تھے۔ نفسِ زکیہ کے چھ بیٹے اور دو بیٹیاں فاطمہ اور زینب تھیں جن میں سے زینب سابق عباسی خلیفہ سفاح کی بیوی تھی۔ سفاح کی وفات کے بعد اس کا نکاح منصور کے چچا عیسیٰ بن علی سے ہو گیا تھا۔[1]

نیز منصور کو شہر نبی میں خونریزی ہرگز پسند نہ تھی؛ اس لیے عیسیٰ بن موسیٰ کو فوج کی کمان دے کر کہا:

"تم اللہ کے حرم میں جا رہے ہو۔ جہاں تین طبقات ہیں: ایک قریش جو رسول اللہ ﷺ کے قرابت دار ہیں۔ دوسرے مہاجرین و انصار۔ تیسرے وہ تاجر جو روضۂ اطہر اور مسجد الحرام کے پڑوس میں آباد ہو گئے ہیں۔ جب محمد نفسِ زکیہ قتل ہو جائیں تو تلوار نیام میں کر لینا، کسی مفرور کا تعاقب نہ کرنا، کسی زخمی کو ٹھکانے مت لگانا، کسی پرندے کو بھی ذبح نہ کرنا۔ اگر محمد امان طلب کریں تو انہیں امان دے دینا۔ یہ باتیں تم نے اچھی طرح سمجھ لیں؟"

عیسیٰ نے اثبات میں جواب دیا۔ منصور نے دوبارہ سہ بارہ پوچھا کہ ہدایات سمجھ چکے ہو۔ عیسیٰ کے تین بار اطمینان دلانے پر کہا: "یا اللہ! تو گواہ رہنا، یا اللہ! تو گواہ رہنا۔"

آخر کار عیسیٰ بن موسیٰ چار ہزار سپاہی لے کر نہایت تیزی سے حجاز پہنچا۔ اس کے ساتھ حمید بن قحطبہ اور کثیر بن حصین جیسے نامور عباسی جرنیل تھے۔ ان میں سے بعض جرنیل ایسے تھے جو کسی وقت میں نفسِ زکیہ سے بیعت کر چکے تھے مگر اب عین امتحان کے وقت وہ حکومت کے ساتھ تھے۔ تاہم نفسِ زکیہ کو یقین تھا کہ بہت سے عباسی افسران جنگ کے دوران ان کے ساتھ مل جائیں گے۔[2]

نفسِ زکیہ نے مقابلے کے لیے مدینہ کے گرد خندقیں کھدوائی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہی خندق تھی جو غزوۂ خندق میں کھودی گئی تھی۔[3] تاہم ابھی دفاعی تیاری پوری ہو سکی تھی نہ کوئی بڑی فوج اکھٹی ہوئی تھی کہ دس رمضان ۱۴۵ھ کو عباسی لشکر آن پہنچا۔ عیسیٰ بن موسیٰ نے اہلِ مدینہ کو محمد نفسِ زکیہ کا ساتھ چھوڑ دینے پر امان کی پیش کش کی۔[4]

اہلِ مدینہ کی بہت بڑی تعداد جنگ کی زد سے محفوظ رہنے کے لیے پہاڑوں کی طرف نکل گئی۔ نفسِ زکیہ نے کوشش کی کہ وہ واپس آ جائیں مگر بے سود۔[5]

---

① نسب قریش للزبیری، ص ۵۵ ② انساب الاشراف: ۱۰۳/۳، ۱۰۴، ط دار الفکر ③ تاریخ الطبری: ۵۸۲/۷
④ انساب الاشراف: ۱۰۵/۳ ⑤ تاریخ الطبری: ۵۸۳/۷

اس کے بعد نفس زکیہ کو خود بھی اندازہ ہو گیا کہ فتح بہت مشکل ہے؛ اس لیے انہوں نے اعلان کر دیا:

''لوگو! دشمن لاؤ لشکر لیے سر پر آن پہنچا۔ میں تمہیں بیعت سے آزاد کرتا ہوں۔ جو رہنا چاہے رہے۔ جو جانا چاہے چلا جائے۔''

لوگ بھی جنگ میں کسی کامیابی سے ناامید تھے۔ بس بیعت کی مجبوری کی وجہ سے ان کے گرد جمع تھے۔ یہ اعلان سنتے ہی اکثریت منتشر ہو گئی۔ نفسِ زکیہ کے گرد تھوڑے سے لوگ رہ گئے۔ [1]

ایسے میں بعض ہمدردوں نے مشورہ دیا کہ وہ حجاز کو چھوڑ کر عالمِ اسلام کے کسی گنجان شہر کو عسکری مرکز بنائیں اس کے بغیر عباسیوں کے لاؤ لشکر کا مقابلہ ممکن نہیں مگر نفسِ زکیہ نے نبی اکرم ﷺ کے اُس ارشاد کو سامنے رکھتے ہوئے جس میں مدینہ کو ''دِرْعٌ حَصِیْنَۃٌ'' (مضبوط زرہ) کہا گیا تھا، مدینہ ہی کو مورچہ بنانے کا فیصلہ برقرار رکھا۔ [2]

مذاکرات کی ناکام کوشش:

جنگ سے پہلے عیسیٰ بن موسیٰ نے سفیر بھیج کر نفسِ زکیہ کو جان کی امان کی پیش کش کی مگر انہوں نے قبول نہ کی۔ [3]

نفسِ زکیہ فاطمیوں یا علویوں کے متفقہ قائد نہ تھے۔ سادات کے بہت سے لوگ ان سے لاتعلق تھے بلکہ بہت سے عباسیوں کے ہمنوا تھے جن میں سے کئی حضرات عیسیٰ کے لشکر میں شامل تھے۔ عیسیٰ نے ان میں سے دس ہاشمی حضرات کا وفد بنا کر نفسِ زکیہ کے پاس صلح کی گفتگو کے لیے بھیجا۔ ان میں چند نمایاں حضرات یہ تھے:

① حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے...... قاسم بن حسن بن زید...... نفسِ زکیہ کے چچازاد

② حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے...... عبداللہ بن حسین الاصغر بن علی زین العابدین

③ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے...... عمر بن محمد بن عمر

④ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے...... عبداللہ بن محمد بن عمر

⑤ عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کے پوتے...... عبداللہ بن اسماعیل

⑥ عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے...... ابوالکرام محمد بن عبداللہ بن علی

⑦ عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے...... محمد بن عبداللہ بن محمد بن عقیل رضی اللہ عنہ بن ابوطالب

مگر ان حضرات کو نفسِ زکیہ کے حامیوں نے راستے ہی میں روک لیا اور کہا:

''رسول اللہ ﷺ کے بیٹے ہمارے ساتھ ہیں اور ہم ان کے ساتھ۔''

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے قاسم بن محمد نے کہا:

''میں بھی رسول اللہ ﷺ کا بیٹا ہوں۔ اس وفد کے اکثر لوگ بھی رسول اللہ ﷺ کے بیٹے ہیں۔ ہم تمہیں کتاب

① تاریخ الطبری: ۵۸۲/۷، ۵۸۳

② تاریخ الطبری: ۵۸۰/۷، ۵۸۱

③ تاریخ الطبری: ۵۸٤/۷، ۵۸۵

وحشت اور خونریزی سے بچنے کی دعوت دینے آئے ہیں۔'' مگر ان کی بات نہ سنی گئی اور انہیں بھی ناکام لوٹنا پڑا۔[1]

آخر پندرہ رمضان کو فریقین آمنے سامنے ہوئے۔ عباسی سپہ سالار عیسیٰ بن موسیٰ نے جنگ سے پہلے نفسِ زکیہ کو پکار کر کہا: ''امیر المؤمنین کا حکم ہے کہ میں آپ کو امان دینے سے پہلے جنگ شروع نہ کروں۔ آپ کو، آپ کے گھر والوں، بچوں، اور ساتھیوں کو امان دی جاتی ہے۔ خطیر رقم دینے اور قرضے ادا کرنے کا وعدہ کیا جاتا ہے۔''

مگر نفسِ زکیہ نے کوئی سمجھوتہ قبول نہ کیا۔[2]

فیصلہ کن جنگ۔ نفسِ زکیہ جاں بحق:

آخر جنگ شروع ہوئی اور صبح سے ظہر تک لڑائی ہوتی رہی۔ عباسیوں نے اتنی زوردار تیراندازی کی کہ محمد نفسِ زکیہ کے بیشتر ساتھی زخمی ہوگئے، بہت سے فرار ہوگئے۔ عیسیٰ بن موسیٰ نے میدان جنگ کے اردگرد جا بجا پرچم نصب کر کے اعلان کرادیا کہ جو ان کے پاس آکر کھڑا ہو جائے اسے امان دی جاتی ہے۔ اس طرح بہت سے لوگ میدان جنگ سے ہٹ گئے۔ ظہر تک اندازہ ہو چلا تھا کہ سرکاری فوج کا مقابلہ بہت مشکل ہے۔ مِسْوَر بن مَخْرَمہ رضی اللہ عنہ کے پوتے عبداللہ بن جعفر نے نفسِ زکیہ کو مکہ چلے جانے کا مشورہ دیا مگر انہوں نے کہا:

''اگر میں غائب ہوگیا تو اہلِ مدینہ سے وہی سلوک ہوگا جو حرہ والوں سے ہوا تھا۔''

ظہر کے بعد نفسِ زکیہ خود دست بدست لڑائی میں شریک رہے۔ ان کے بالمقابل عباسی امیر حُمید بن قَحْطَبہ کے دستے تھے۔ جنگ سے پہلے نفسِ زکیہ کہہ رہے تھے:

''حُمید بن قَحْطَبہ مجھ سے بیعت ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے ساتھ ہو جائے گا۔''

مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ حُمید بن قَحْطَبہ پوری شدت سے ان کا مقابلہ کرتا رہا۔ عباسیوں کا دباؤ بڑھتا چلا گیا اور نفسِ زکیہ کے حامی منتشر ہوتے گئے۔ اس وقت کسی نے کہا: ''آپ اپنے بھائی ابراہیم کے پاس عراق چلے جائیں۔''

نفسِ زکیہ کو اب تک اپنی بے تدبیری کا اندازہ ہوگیا تھا، وہ بولے:

''میں اہلِ مدینہ کو دُہری آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا، ایک خروج کر کے، دوسرے فرار ہو کر۔''

ان کا خیال بالکل درست تھا کہ ان کے قتل کی صورت میں سرکاری فوج کو عوام کی پکڑ دھکڑ کی کوئی ضرورت نہ تھی لیکن اگر وہ بچ کر نکل جاتے تو ان کی مدد اور اعانت کے شبہے میں مدینہ کا شاید کوئی گھر بھی عتابِ شاہی سے محفوظ نہ رہتا۔

نفسِ زکیہ عصر تک مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ میدان میں جمے رہے اور اپنے ہاتھ سے حریف کے بارہ آدمیوں کو قتل کیا۔ ان کے ساتھی ایک ایک کر کے ان کے دائیں بائیں گرتے رہے۔ آخر کار ایک تیرانداز نے انہیں تیر کا نشانہ بنادیا۔ ساتھ ہی ایک شخص نے پشت سے حملہ کر کے نیزہ جسم سے پار کردیا۔ ان کے گرتے ہی لڑائی ختم ہوگئی۔ ان کا جسم رات بھر میدان میں پڑا رہا۔ اس شب بہت زور کی بارش ہوئی جس سے سارا مدینہ جل تھل ہوگیا۔

[1] تاریخ الطبری: ۵۸۶/۷

[2] تاریخ الطبری: ۵۸۶/۷

اگلے دن مقتول کی بہن نے عیسیٰ بن موسیٰ سے اجازت لے کر نعش کی تدفین کی۔تاہم سرکاری افسران نے اس سے پہلے سر کاٹ کر منصور کے پاس بھیج دیا تھا۔اس طرح خروج کی ایک اور دردناک داستان انجام کو پہنچی۔ ①

نفسِ زکیہ کی عمر تقریباً ساٹھ سال تھی، رنگت سانولی تھی۔ سر کے بالوں پر مہندی لگاتے تھے۔ ②

نفسِ زکیہ کا خروج بلاشبہ جرأت اور شجاعت کی ایک تاریخ کے طور پر یادگار حیثیت رکھتا ہے مگر ٹھنڈے دل ودماغ سے سوچا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس سے اُمت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اس تحریک کی ناکامی کے آثار بھی شروع سے واضح تھے۔تحریک میں منصوبہ بندی اور تدبیر کی کمی صاف دکھائی دیتی ہے۔خروج کے وقت نفسِ زکیہ کا کہنا تھا:

''میں نے اس وقت خروج کیا ہے جب کوفہ، بصرہ، موصل، واسط اور الجزیرہ والے میری بیعت کر چکے ہیں اور انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ جس رات میں خروج کروں گا، اسی شب وہ سب بھی خروج کر گزریں گے۔'' ③

مگر ان کا اندازہ بالکل غلط نکلا اور لوگوں نے ان کا ویسا ساتھ قطعاً نہیں دیا جیسی انہیں توقع تھی۔

ابراہیم سے جنگ:

نفسِ زکیہ کے جواں سال اور قوی الجثہ چھوٹے بھائی ابراہیم بن عبداللہ اس وقت عراق میں روپوش تھے اور خفیہ طور پر وہاں تحریک کی قیادت کر رہے تھے۔ جب نفسِ زکیہ کے خروج کی اطلاع عراق پہنچی اور منصور نے اس کے خلاف لشکر روانہ کیا تو ابراہیم کے ہمدردوں نے انہیں مشورہ دیا کہ آپ بھی فوری طور پر خروج کر دیں ورنہ کوئی مخبری کر دے گا اور آپ پکڑے جائیں گے۔ ابراہیم کی اپنی رائے اس وقت خروج کی نہ تھی مگر اس مشورے کو مان کر انہوں نے بصرہ میں خروج کا اعلان کر دیا۔ اس وقت ان کے ساتھ صرف بیس افراد تھے۔تاہم جوں جوں ان کے خروج کی خبر پھیلی لوگ جوق در جوق ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ بصرہ اور گردونواح میں آباد قبائل نے سفید لباس پہن کر حکومت کی اطاعت سے دست کش ہونے کا اعلان کیا اور بصرہ کی سرکاری عمارتوں پر قبضہ کر کے عباسی عملے کو باہر کر دیا۔ ④

عید الفطر کے دن جب ابراہیم نمازِ عید کا خطبہ دے رہے تھے، حجاز سے نفسِ زکیہ کے قتل کی اطلاع آئی۔اس سے تحریک کے حامیوں میں منصور کے خلاف مزید اشتعال پھیلا۔ان لوگوں نے کسکر، اَہواز اور واسط پر بھی قبضہ کر لیا اور عباسیوں سے ایک بڑی جنگ کی تیاری کرنے لگے۔ ⑤

منصور اس صورتحال سے سخت پریشان ہوا۔اس وقت اس کی اکثر افواج دور دراز کے محاذوں پر مصروف تھیں۔اس کا بیٹا مہدی تیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ ''رے'' کے محاذ پر تھا۔محمد بن اَشعث چالیس ہزار فوج کے ساتھ افریقہ میں تعینات تھا۔باقی فوج عیسیٰ بن موسیٰ کے ساتھ حجاز گئی ہوئی تھی۔ دارالخلافہ ہاشمیہ میں صرف دو ہزار سپاہی تھے۔اگر حریف حملہ کر دیتا تو شکست یقینی تھی۔منصور نے مخالفین کو دھوکا دینے کے لیے رات کو معسکر میں جگہ جگہ الاؤ روشن کرنے

---

① انساب الاشراف: ۱۰۶/۳ تا ۱۰۹
② انساب الاشراف: ۱۱۳/۳
③ انساب الاشراف: ۱۱۳/۳
④ انساب الاشراف: ۱۱۳/۳، ۱۲۲، ۱۲۳
⑤ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۴۲۲؛ انساب الاشراف: ۱۳۲/۳

کا حکم دیا تا کہ دور سے یہی محسوس ہو کہ معسکر سپاہیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ساتھ ہی اس نے عیسیٰ بن موسیٰ ... کیے بغیر فوراً دارالخلافہ واپس آنے کا حکم بھیج دیا اور دیگر مقامات سے بھی فوری کمک طلب کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ... علویوں کا نظامِ خبر رسانی کمزور تھا، اگر انہیں منصور کی حالت کا علم ہو جاتا تو دارالخلافہ پر حملے کا یہ بہترین موقع تھا۔

اپنی مجبوری کے پیشِ نظر منصور نے فیصلہ کن جنگ کو حجاز جانے والی فوج کی واپسی تک ملتوی رکھا۔ جب پتا چلا کہ عیسیٰ بن موسیٰ حجاز کی مہم میں کامیاب ہو کر واپس چل پڑا ہے تو منصور نے حکم نامہ بھیج کر اسی کو ابراہیم کی سرکوبی کی ذمہ داری سونپی۔ اس وقت تک پندرہ ہزار سپاہیوں کا انتظام ہو چکا تھا۔[1] عباسی فوجوں کی تیاری کی خبر ملتے ہی ابراہیم نے گیارہ ہزار رضا کاروں کے ساتھ بصرہ سے کوچ کر دیا۔ اس فوج میں سات سو گھڑ سوار اور باقی سب پیادے تھے۔ زید بن علی کے عقیدت مند بھی ان کے ساتھ تھے جنہیں زیدیہ کہا جاتا ہے۔ اکثریت عوام پر مشتمل تھی جنہیں جنگ کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا۔ فوج کا رخ کوفہ کی طرف تھا تا کہ فیصلہ کن جنگ سے پہلے اہلِ کوفہ کو ساتھ ملا لیا جائے۔ اگر عیسیٰ بن موسیٰ کو حجاز سے کوفہ پہنچنے میں دیر ہو جاتی تو ابراہیم کا کوفہ پر قابض ہو جانا یقینی تھا۔ منصور کو اس خطرے کا اندازہ تھا، اس نے عیسیٰ کو ہدایت کی تھی کہ کوفہ کو اس کے حال پر چھوڑ کر سیدھا حریف لشکر کی طرف لپکو؛ اس لیے عیسیٰ نے تیز تر پیش قدمی کی اور کوفہ سے سولہ میل دور ''باخمریٰ'' کے مقام پر ابراہیم کی فوج کو جا لیا۔

اس موقع پر بعض کہنہ مشق لوگوں نے احتیاط کے پیشِ نظر ابراہیم کو مشورہ دیا کہ خیمہ گاہ کے گرد خندقیں کھود کر مورچہ بندی کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔ مگر ابراہیم نے اسے پسند نہ کیا۔ کچھ لوگوں نے کہا: ''ہمیں دشمن پر شب خون مارنا چاہیے۔'' ابراہیم نے اس مشورے کو بھی مسترد کر دیا۔ بعض رفقاء نے رائے دی: ''ہمیں اپنی فوج کو چھوٹے چھوٹے دستوں میں تقسیم کر کے جنگ کرنی چاہیے تا کہ اگر فوج کے ایک حصے کو شکست بھی ہو تو باقی حصے محفوظ رہیں۔''

ابراہیم نے اس رائے کو بھی قبول نہ کیا اور یہ آیت پڑھی:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ﴾

''بے شک اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اس کی راہ میں صف بنا کر لڑتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔''[2]

آخر کار عرب کے قدیم طرز کے مطابق لمبی صفیں بنا کر لڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔ دونوں افواج مقابل آئیں تو ابراہیم نے آگے بڑھ کر حریف پر زوردار دھاوا بول دیا۔ اس جارحانہ حملے سے عباسی سپاہی مرعوب ہو گئے، ان کی صفیں درہم برہم ہو گئیں، عیسیٰ بن موسیٰ اور بڑے بڑے جرنیل منہ پھیر کر بھاگنے لگے تاہم اس دوران عباسیوں کے ایک امیر نے میدانِ جنگ کی پشت پر واقع نہر پار کر کے ابراہیم کی فوج پر عقب سے حملہ کر دیا۔ اس ناگہانی آفت سے ابراہیم کے حامی بوکھلا گئے۔ ادھر سے عیسیٰ بن موسیٰ نے بھی پلٹ کر ہلہ بول دیا۔ دو طرفہ حملے کی زد میں آ کر ابراہیم کے رضا کار بری طرح پھنس گئے۔ عیسیٰ بن موسیٰ نے منادی کرا دی کہ جو ہتھیار ڈال دے وہ مامون ہے۔

[1] البدایة والنهایة: ۱۳/۳۷۶ [2] سورۃ الصف، آیت: ٤

بہت سے لوگوں نے مایوسی کے عالم میں جان بچانے کو ترجیح دی۔ تاہم ابراہیم اور ان کے ساتھ کچھ زیدی رضا کار دیر تک مقابلے میں جمے رہے۔ ابراہیم نے اپنی زرہ اتار دی اور مردانہ وار لڑتے رہے۔ آخر ایک تیر آ کر انہیں لگا۔ زخم ایسا کاری تھا کہ انہوں نے وہیں جان دے دی۔ عباسی سپاہیوں نے سر اتار کر منصور کے پاس بھیج دیا۔

یہ واقعہ ۲۵ ذوالقعدہ ۱۴۵ھ کا ہے۔[1]

منصور کا رنج وغم:

جب ابراہیم کا سر منصور کے سامنے رکھا گیا تو اس کے آنسو بہہ پڑے۔ وہ بولا:

''اللہ کی قسم! مجھے ایسا کرنا سخت ناگوار تھا۔ مگر تم میری وجہ سے آزمائش میں پڑنے اور میں تمہاری وجہ سے۔''

کچھ دیر بعد درباری آئے، ہر ایک نے منصور کو مبارک باد دی اور ابراہیم کو برا بھلا کہا۔ منصور لاتعلق بنا بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلتا رہا۔ ایک سمجھ دار مشیر جعفر بن حنظلہ نے تاڑ لیا اور سلام کے بعد کہا: ''امیر المؤمنین! اللہ آپ کے چچازاد کی مصیبت پر آپ کے اجر میں اضافہ کرے اور ان سے آپ کے حق میں جو غلطی ہوئی اس کی بخشش فرمائے۔''

منصور نے پہلی بار سر اٹھا کر سلام کا جواب دیا اور اسے خوش آمدید کہا۔ یہ دیکھ کر باقی درباریوں نے بھی اسی طرح منصور سے تعزیت کی۔[2]

اگرچہ اس لڑائی میں اہل کوفہ نے خود حصہ نہیں لیا تھا مگر منصور جانتا تھا کہ کوفہ اور مضافاتی دیہاتوں کی بہت بڑی تعداد ابراہیم کی حامی تھی اور انہی لوگوں کے حوصلہ دلانے پر ابراہیم نے بصرہ کو مرکز بنایا تھا؛ اس لیے منصور اہلِ کوفہ سے سخت بددل تھا۔ اس نے کوفہ کے گلی کوچوں میں ابراہیم کے سر کی نمائش کرائی۔ پھر جلسۂ عام میں اہلِ کوفہ کو برا بھلا کہہ کر دل کی بھڑاس نکالی۔ بغاوت کے مرکزی قائدین تو ختم ہو چکے تھے۔ ان کے دیگر حامیوں پر بھی بہت جلد قابو پالیا گیا۔ سندھ تک سے ایسے افراد کا تعاقب کیا گیا۔ جو ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہ تھے، انہیں گرفتار کر کے سزائے موت دی گئی۔[3] البتہ جنہوں نے شورش کو خیر باد کہہ کر امان مانگی ان سے اچھا سلوک کیا گیا۔ خود محمد نفسِ زکیہ اور ابراہیم کے سگے بھائی موسیٰ نے خروج کی ناکامی کے بعد بغداد آ کر منصور کے پاس حاضری دی تو منصور نے بہت خاطر تواضع کی اور مالا مال کر دیا۔ موسیٰ نے اس کے بعد بغداد ہی میں سکونت اختیار کر لی۔[4]

مقامِ عبرت:

اگر دیکھا جائے تو اس خونریزی کا ذمہ دار منصور اکیلا نہ تھا بلکہ خروج کرنے والے بھی اس میں حصہ دار تھے؛ کیوں کہ ایک حکومت چاہے جیسی بھی تھی، بن چکی تھی۔ اس کی کچھ خرابیاں اپنی جگہ لیکن ان خرابیوں کا علاج مسلح تحریک چلانا نہیں تھا۔ ماضی میں ایسی تحریکوں سے کچھ حاصل ہوا تھا نہ اب کوئی نتیجہ نکل سکتا تھا۔ خاص طور پر اس لیے کہ اس تحریک کا اصل

① تاریخ الطبری: ۶۳۹/۷ تا ۶۴۸؛ انساب الاشراف: ۱۳۳/۳؛ الکامل فی التاریخ: سنة ۱۴۵ھ
② تاریخ الطبری: ۶۴۸/۷، ۶۴۹ ③ انساب الاشراف: ۱۳۱/۳ ④ تاریخ بغداد: ۲۷/۱۳، ط العلمیة

ہدف ایک خاندان کو ہٹا کر دوسرے خاندان کو لانا تھا۔ پس اگر خاندان تبدیل ہو بھی جاتا تو خرابیوں کے ازالے کی زیادہ امید نہیں کی جا سکتی تھی جیسا کہ خود امویوں کی جگہ عباسیوں کے آنے سے کوئی خاص بہتر تبدیلی نہیں آئی۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ اسلامی فقہ کے لحاظ سے ان حالات میں خروج کی گنجائش نہ تھی جیسا کہ ہم ایک سے زیادہ مواقع پر واضح کر چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں مسلمانوں کی کسی بنی ہوئی حکومت کو گرانے کی گنجائش اسی وقت نکلتی ہے جب حکمران اسلامی شعائر کو پامال کرنے اور کھلم کھلا کفر کے ارتکاب پر اتر آئیں۔ ظاہر ہے ایسا یزید کے دور میں ہوا تھا نہ منصور کے زمانے میں۔ پس اس خروج کو کسی بھی لحاظ سے امت کے لیے درست یا مفید نہیں کہا جا سکتا تھا۔

ہمارے پاس اس تاویل کی بھی کوئی گنجائش نہیں کہ نفسِ زکیہ اور ابراہیم حاکم کے فسق کی وجہ سے خروج پر مجبور ہوئے ہوں گے؛ اس لیے کہ نہ تو ان سے کہیں یہ موقف منقول ہے نہ منصور کے فسق و فجور کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔

درحقیقت منصور کے نام نفسِ زکیہ کا مراسلہ اختلاف کے بنیادی نکتے کو بالکل واضح کر دیتا ہے کہ یہ خاندانی اور سیاسی کش مکش تھی۔ یقیناً یہ حضرات اس نظریاتی غلطی کا شکار ہو گئے تھے کہ بنو فاطمہ کی موجودگی میں کسی اور کو خلافت کا حق حاصل نہیں۔ اگرچہ اس سے ویسا عقیدۂ امامت ثابت نہیں ہوتا جو بعد میں اہلِ تشیع کے بعض فرقوں نے اپنایا جس میں ائمہ کو نام بنام منصوص مانا گیا ہے اور انہیں نہ صرف معصوم بلکہ پیغمبروں سے بھی فائق تصور کر لیا گیا ہے۔

تحریکِ نفسِ زکیہ کے اعتقادی اثرات:

یہ بات نظرانداز نہیں کی جا سکتی کہ مذہب کے نام پر اٹھائی جانے والی تحریکیں اگر فکری و نظریاتی تربیت میں احتیاط کا دامن نہ تھامیں اور سیاسی مصلحت کی خاطر خالص اسلام سے تھوڑے بہت انحراف کی بھی گنجائش نکال لیں تو بعد میں بہت بڑی بدعقیدگی کے فروغ کا باعث بن جاتی ہیں۔ ایسی تحریکیں خروج کی حد تک پہنچ جائیں تو نہ صرف اُمت کا خون رائیگاں جانے کا سبب بنتی ہیں بلکہ ان کے مابعد اثرات کے طور پر عموماً کچھ نئے اعتقادی فتنے بھی زیرِ زمین نشوونما پانے لگتے ہیں؛ کیوں کہ تحریک کے کارکن اپنے حامیوں کی مایوسی دور کرنے کے لیے نئی باتیں، روایات، خواب اور بشارتیں گھڑ لیتے ہیں، یہ تحریک پھر ان نئی ایمانیات کے سہارے اندر ہی اندر چلتی ہے اور یوں ایک نیا مذہب وجود میں آ جاتا ہے۔ نفسِ زکیہ کے قتل کے بعد بالکل ایسا ہی ہوا۔ ان کے کچھ عقیدت مندوں نے جو درحقیقت رافضی تھے، یہ مشہور کر دیا کہ وہ قتل نہیں بلکہ غائب ہو گئے ہیں۔ میدانِ جنگ میں جس شخص کو منصور کے لشکر نے قتل کیا وہ ان کا ہم شکل کوئی شیطان تھا۔ محمد نفسِ زکیہ کی طرف منسوب ہو کر یہ لوگ ایک مستقل رافضی فرقہ ''محمدیہ'' بن گئے جس کا عقیدہ تھا کہ نفسِ زکیہ مہدی کی شکل میں پردۂ غیب سے دوبارہ ظاہر ہوں گے اور ساری دنیا پر حکومت کریں گے۔[1]

---

[1] إن المهدي محمد بن عبد الله وإنه لم يقتل وإنما غاب عن عيون الناس وهو في جبل حاجر من ناحية نجد مقيم هناك الى ان يؤمر بالخروج فيخرج ويملك الارض وتعقد البيعة بمكة بين الركن والمقام ويحيا له من الاموات سبع سبعة عشر رجلا يعطى كل واحد منهم حرفا من حروف الاسم الأعظم فيهزمون الجيوش وزعم هؤلاء أن الذى قتله جند عيسى بن موسى بالمدينة لم يكن محمد بن عبد الله بن الحسن فهذه الطائفة يقال لهم المحمدية لانتظارهم محمد بن عبد الله بن الحسن وكان جابر بن يزيد الجعفي على هذا المذهب وكان يقول برجعة الاموات الى الدنيا قبل القيامة. (الفرق بين الفرق لابى منصور الاسفرائينى، ص ٤٤، ٢٣٢)

فاطمیوں کے خروج ناکام کیوں ہوتے رہے؟

ہم نفسِ زکیہ اور ابراہیم کے خروج سے پہلے اور اس کے بعد بھی تاریخ کے کئی مواقع پر بنوفاطمہ کی طرف سے خروج کی کوششوں کو ناکامی کا سامنا کرتے دیکھتے ہیں۔ ان حضرات کی جرأت وشجاعت میں تو کوئی کلام نہیں مگر تاریخ کے گزشتہ اوراق پڑھ کر یہ بات کسی سے مخفی نہیں رہی ہوگی کہ اکثر وبیشتر تدبیر، حکمتِ عملی اور منصوبہ بندی کے لحاظ سے ان حضرات کی کوششیں کمزور تھیں۔

تاریخ کے ان متواتر اور یکساں حوادث پر مزید غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنوفاطمہ کو حکومت نہ دینا اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تھا جس میں کوئی بہت بڑی حکمت پوشیدہ تھی۔ ایک بڑی حکمت یہ نظر آتی ہے کہ اگر امت کی سیاسی قیادت آلِ رسول ﷺ کے پاس ہوتی تو اس سے خود ان غیر مسلموں کے نزدیک اسلام کی حقانیت مشکوک ہوسکتی تھی جو کسی بھی زمانے میں سچائی کی تلاش میں نکلتے۔ جب وہ دیکھتے کہ حضورِ اکرم ﷺ اور ان کے جانثاروں کی طویل جاں گسل جدوجہد کے بعد قائم ہونے والے مسلم معاشرے کا اقتدار اور وسائل واموال کا اختیار آپ ﷺ کی اولاد ہی کے پاس رہا تو انہیں سخت شبہ ہوسکتا تھا کہ دعوتِ اسلام کی یہ ساری محنت کہیں اپنی آل واولاد کے اقتدار اور مال وجاہ کے لیے تو نہ تھی۔ ایسے میں دنیا کے نزدیک خود اسلام کی صداقت مشکوک ہوجاتی۔ پس تکوینی حکمت اسی میں تھی کہ ایسے شبہے کی گنجائش نہ رکھی جاتی۔

اگرچہ بعد میں بنوعباس کو حکومت ملی اور وہ ہاشمی ضرور تھے مگر ظاہر ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی اولاد میں سے نہ تھے۔ نیز عباسی خلافت اور دورِ رسالت مآب ﷺ کے مابین ایک صدی سے زائد فاصلہ تھا؛ اس لیے یہاں اس شبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد اپنے گھرانے کو اقتدار دلانے کے لیے تھی۔

◆◆◆

بنو فاطمہ کا خروج۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کا مسلک؟

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ اُس وقت اُمت کے سب سے سرکردہ فقہاء شمار ہوتے تھے۔ بنو فاطمہ کے خروج کے قضیوں کے بارے میں ان کا موقف کیا تھا؟ یہ ایک بہت اہم سوال ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ ان دونوں حضرات نے تحریک کی بھرپور حمایت کی تھی۔ کوفہ میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے نہ صرف ابراہیم کی مالی اعانت کی تھی بلکہ خود بھی لڑائی میں شرکت کرنا چاہتے تھے مگر کسی عذر کی وجہ سے نہ جا سکے۔ مدینہ میں امام مالک رحمہ اللہ بھی لوگوں کو تحریک سے تعاون پر آمادہ کرتے رہے البتہ لڑائی کے وقت گھر میں رہے۔

مگر دوسری طرف یہ بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ بنو امیہ یا بنو عباس کے خلاف بنو فاطمہ کا کوئی خروج، ان شرائط پر پورا نہیں اترتا تھا جو جمہور علمائے اہلِ سنت کے ہاں جوازِ خروج کے لیے لازمی ہیں۔ (یعنی کفرِ بواح کی شرط نہ بنو امیہ کے دور میں پوری ہوتی تھی نہ منصور اور بعد کے عباسی خلفاء کے زمانے میں۔) امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کا فقہی مسلک، ان کا مدوّن مذہب اور ان سے منقول فقہی روایات جو ان کے تلامذہ نے سند اور متن کی صحت کا پورا اہتمام کرتے ہوئے جمع کی ہیں، ثابت کرتی ہیں کہ یہ حضرات کفرِ بواح کے بغیر حکام کے خلاف خروج کے قائل نہ تھے۔ احناف کے عظیم فقیہ امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''ہم اپنے حکام اور منتظمین کے خلاف خروج کے قائل نہیں ہیں اگرچہ وہ ظلم کریں، ہم ان کے خلاف بددعا بھی نہیں کرتے اور ان کی اطاعت سے دست کش نہیں ہوتے۔''[1]

ان فقہی روایات کی سند کا صحیح ہونا شک وشبہے سے بالاتر ہے۔ پھر اگر ان روایات کی صحت، ان کے طُرق کی کثرت اور صدیوں سے جمہور علمائے امت کے اس مسلک پر اجماع کا لحاظ کیا جائے تو ان حضرات کا یہ مذہب ایک حقیقتِ متواترہ بن جاتا ہے۔ پس اگر بعض تاریخی روایات یہ بتاتی ہے کہ یہ حضرات اپنے ہی فتوے اور مسلک کے خلاف عمل کر رہے تھے (یعنی خلافِ شرائط برپا کیے گئے خروج کے حامی تھے) تو ایسی تاریخی روایات یقیناً قابلِ تحقیق ہیں۔ ہمیں ان کی سند دیکھنا ہوگی کہ وہ صحیح ہیں یا ضعیف؟ اگر سند ضعیف ہو تو ایسی روایات کو بالکل لغو تصور کیا جائے گا؛ کیوں کہ صحیح روایات سے متصادم ضعیف مواد قابلِ استدلال نہیں ہو سکتا۔[2]

---

[1] ولا نرى الخروج على ائمتنا و ولاة امورنا وان جاروا، و لا ندعوا عليهم ولا ننزع يداً من طاعتهم. ﴿العقيدة الطحاوية، ص٦٨﴾

[2] ہم نے جہاں تک ہو سکا امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کی طرف منسوب بنو ہاشم کے خروج کی حمایت کی روایات کا سنداً جائزہ لیا ہے، جس سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ان میں سے ایک روایت بھی صحیح یا حسن نہیں۔ یہ مفصل بحث اس حصے کے آخری باب میں ''اہم سوالات کے جوابات'' کے تحت دیکھی جا سکتی ہے۔

نفسِ زکیہ اور ابراہیم کے خروج کے مابعد اثرات

نفسِ زکیہ اور ابراہیم کے خروج کا اختتام ویسا ہی ہوا جیسا زید بن علی رضی اللہ عنہ کی تحریک کا ہوا تھا۔ بالفاظِ دیگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد کا انجام شہدائے کربلا سے ذرا بھی مختلف نہ تھا۔ ان میں سے بعض برسرِ میدان قتل ہوئے اور بعض جیل خانے کی دیواروں کے پیچھے دم توڑ گئے۔ چاہے منصور ایک حکمران کی حیثیت سے اس تحریک کو کچلنے میں خود کو حق بجانب سمجھتا ہو مگر اس اقدام کے باعث عباسی خاندان نے امویوں سے کہیں بڑھ کر بدنامی مول لی۔ امویوں کو کوئی یہ طعنہ نہیں دے سکتا تھا کہ وہ سادات کی محبت کا نعرہ لگا کر حکومت میں آئے اور انہی کے خلاف تلوار سونتی۔ مگر عباسی اس الزام سے محفوظ نہیں رہ سکے کہ جس گھرانے کی سیادت کا نعرہ لگا کر انہوں نے حکومت کی راہ ہموار کی، اقتدار حاصل کر کے، انہی کا خون بہانے میں کوئی عار محسوس نہ کی۔ پس عباسی خلافت کے ابھی پندرہ سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ اس کے دامن پر بالکل ویسا ہی داغ لگ گیا جیسا اُموی خلافت کی قبا پر واقعۂ کربلا سے لگا تھا۔

یہ وہ نقطہ تھا جہاں اُمت کے ایک طبقے کا خلافتِ عباسیہ پر اعتماد ختم ہو گیا، خاص کر نفسِ زکیہ، ابراہیم اور ان کے مکتبِ فکر کے لوگ عباسیوں سے بالکل مایوس ہو گئے۔ دن بدن ان کی مرکز گریز سوچ پختہ ہوتی گئی۔ ذہنی فاصلوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ سوچ نسل در نسل پرورش پاتی اور پھیلتی رہی۔ اس نفرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اندرونِ خانہ سادات کے لیے الگ اقتدار کی سوچ مزید پروان چڑھتی رہی جس کے باعث لگ بھگ ایک صدی تک عباسی خلفاء کے خلاف بغاوت کی تحریکیں مسلسل ابھرتی رہیں۔ مرکزِ خلافت کے قریبی صوبوں میں ایسی کوششوں کو بے سود دیکھ کر کچھ سیاست دان دور دراز علاقوں میں ایسی تحریکوں کے بیج بونے لگے۔ جب تک عباسیوں کا عروج رہا، یہ تحریکیں دبی رہیں مگر جوں ہی ان کا زور ٹوٹا، بعض علویوں نے اپنے حامیوں کی مدد سے یمن میں دولتِ زیدیہ اور مراکش میں دولتِ ادارسہ قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اسی طرح کچھ طالع آزما سادات کا نام استعمال کر کے خالص رافضی حکومتیں قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جیسا کہ بحرین میں قرامطہ، افریقہ میں بنوعبید اور ایران میں بنوبُویَہ۔ یہ مرکز گریز تحریکیں عالمگیر خلافت کے ایک محدود دائرے میں سمٹ جانے کا اہم ترین سبب بنیں۔

جمہور سادات اور روافض کے عقائد کا فرق:

تیسری صدی ہجری میں ابھرنے والی خروج کی تحریکوں کے کچھ قائدین نے ہاشمی النسب نہ ہوتے ہوئے بھی

صرف سیاسی مقاصد کے لیے اولادِ علی یا اولادِ فاطمہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ ان میں سے بعض متعصب رافضی تھے، ان کے عقائد جمہور سادات اور جمہور اُمت سے ہٹ کر تھے۔ بعض سادات کا خروج عموماً حکومتی مظالم کے ردِ عمل، کبھی کسی فقہی واجتہادی غلطی، کبھی حالات کو سمجھنے میں غلط فہمی اور بسا اوقات خالص سیاسی مقاصد کے تحت ہوا ہے۔ اس میں کسی نئے عقیدے و مذہب کو اپنانے کا دخل یا اسے رائج کرنے کا جذبہ کارفرما نہ تھا۔ ان سادات میں سے کوئی بھی خود کو امام معصوم نہیں کہلواتا تھا۔ یہ لفظ روافض نے اپنی تحریکوں کے دوران مشہور کیا تھا جس کے پیچھے امام کے مفترض الطاعۃ (جس کی پیروی فرض ہو) ہونے کا عقیدہ کارفرما تھا۔ حالانکہ ساداتِ کرام خود اس عقیدے کی تردید کرتے تھے۔

حضرت محمد باقر رحمہ اللہ کے سگے بھائی عمر بن علی رحمہ اللہ سے پوچھا گیا:

هَلْ فِيكُمْ أَهْلِ الْبَيْتِ إِنْسَانٌ مُفْتَرَضَةٌ طَاعَتُهُ؟

(کیا آپ اہلِ بیت حضرات میں کوئی انسان ایسا گزرا ہے جس کی اطاعت فرض ہو؟)

انہوں نے جواب دیا: ”لَا، وَاللّٰهِ مَا هٰذَا فِينَا، مَنْ قَالَ هٰذَا فَهُوَ كَذَّابٌ.

(نہیں۔ اللہ کی قسم! ایسا کوئی نہیں۔ جو ایسا کہے وہ بہت بڑا جھوٹا ہے۔)[1]

روافض میں مروجہ غلط عقائد سے جمہور سادات کے بری ہونے کے ایسے ثبوت ہم گزشتہ اوراق میں کئی جگہ دے چکے ہیں۔ لیکن اگر کوئی کتابی دنیا میں تحقیق کی فرصت نہیں رکھتا تو اسے اس زمینی حقیقت پر غور کر لینا چاہیے کہ روافض کے عقائد باقی مسلمانوں کے نزدیک بلاشبہ غلط ہیں بلکہ ان میں سے بعض چیزیں تو زندقہ اور کفر ہیں۔ یہ بات بھی طے ہے کہ مسلم معاشرے میں بدعقیدگی کے پرچار کو برداشت نہیں کیا گیا۔ علماء وفقہاء نے ہر دور میں ایسے عقائد پھیلانے والوں کے خلاف تحریکیں چلائیں اور انہیں کیفرِ کردار تک پہنچا کر دم لیا۔ حکام نے بھی کبھی ایسے لوگوں کو رعایت نہ دی۔ پس یہ کیسے ممکن تھا کہ یہ سادات حضرات خود کو پیغمبروں کی طرح معصوم، مفترض الطاعۃ اور حلال وحرام کا مختار بھی قرار دیتے، قرآن مجید کو تحریف شدہ، خلفائے ثلاثہ کو غاصب اور اکثر صحابہ کو بے دین و مرتد کہتے اور پھر بھی ان کے خلاف کوئی ہل چل نہ مچتی۔ اگر ایسا تھا تو علماء خاموش کیوں رہے؟ کسی نے ان کے کفر یا گمراہی کا فتویٰ کیوں نہ دیا؟

اس کے برعکس محدثین ان سے دینی روایات پورے اعتماد سے نقل کرتے رہے۔ خلفاء ان کا اکرام واحترام کرتے رہے، انہیں جاگیروں اور مال ودولت سے نوازتے رہے۔ ہم یہاں تک دیکھتے ہیں کہ عباسی خلیفہ مامون الرشید جس نے خلقِ قرآن کے مسئلے میں نہایت شدت دکھائی، وہ حضرت علی الرضا رحمہ اللہ کو اپنا داماد اور ولی عہد بنالیتا ہے۔ اگر ان سادات کے عقائد باقی مسلمانوں سے مختلف تھے تو کیا مامون الرشید اپنے داماد کے عقیدے سے لاعلم تھا؟ اور اگر نہیں تو پھر آخر کسی عدالت میں ان کے عقیدے اور مذہب پر جرح کیوں نہیں کی گئی؟ ظاہر ہے شریعت کے پیمانے عوام کے لیے الگ اور سادات کے لیے الگ نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ چوری کے ایک مقدمے کا فیصلہ کرتے

[1] نسب قریش للزبیری، ص ٦٢

ہوئے ہرگز یہ نہ فرماتے: ''اللہ کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔'' ①

پس اگر شرعی قانون سب کے لیے ایک ہے تو پھر ایسے ملحدانہ عقائد کی اشاعت پر سادات سے چشم پوشی کیوں کی جاتی رہی؟ انہیں بدعقیدگی کے باوجود اس قدر عزت واحترام کیوں دیا گیا؟ کم از کم انہیں عدالتی تحقیق کے مرحلے سے تو گزارا جاتا۔ یہ کہہ دینا بے وزن ہوگا کہ خلفاء ظاہری طور پر ان حضرات کا اکرام کرتے رہے اور خفیہ طور پر انہوں نے ہی بعض سادات کو زہر دے کر مروایا؛ اس لیے کہ اگر واقعی یہ حضرات بدعقیدہ ہوتے یا ان پر بدعقیدگی کا صرف الزام بھی ہوتا تو خلفاء کے لیے محفوظ اور باوقار راستہ انہیں عدالت میں لانا ہی ہوسکتا تھا کہ اس طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا۔ تاریخی حقیقت یہی ہے کہ خلفاء بدعقیدہ لوگوں کو خفیہ طور پر مروانے کی بجائے، عدالت میں بلا کر تفتیش کراتے تھے، جرم ثابت ہونے پر توبہ کا موقع دیا جاتا تھا۔ نہ ماننے پر سرعام سزا دی جاتی تھی تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔ بنو امیہ ہوں یا بنو عباس، ہر حکومت نے ایسے لوگوں کو ہمیشہ سرعام سزائیں دیں۔ عبدالملک اموی کا دمشق کے کذاب حارث بن سعید کے خلاف کارروائی کرکے اسے سولی دینا اور منصور عباسی کا فرقہ راوندیہ کے مقابلے میں خود نکلنا اور ان کے پیشواؤں کو قتل کرنا آپ گزشتہ اوراق میں پڑھ چکے ہیں۔ بعد کے خلفاء کا منصور حلاج کو ''انا الحق'' کہنے پر سزائے موت دینا بھی سب کو معلوم ہے۔ غرض اسلامی معاشرے میں بدعقیدگی کا پرچار علماء برداشت کرتے تھے نہ حکام۔ محمود غزنوی کا قرامطی پیشواؤں کو مارنا، صلاح الدین ایوبی کا سہروردی نامی زندیق کو موت کے گھاٹ اتارنا اور سلطان جلال الدین خوارزمی کا باطنی فرقے کے ملحدین کو قتل کرانا ایسے تاریخی حقائق ہیں جن پر سب کا اتفاق ہے۔

اسلامی معاشرے میں پیغمبر کے سوا کسی کی معصومیت کا عقیدہ کبھی قابلِ برداشت نہیں رہا۔ اسی طرح صحابہ کرام پر تبرا بازی بھی گوارا نہیں کی گئی۔ کیونکہ ''عقیدۂ معصومیتِ ائمہ'' ختم نبوت کے انکار کے مترادف ہے اور صحابہ پر تبرابازی، دین کے وسائط سے بداعتمادی کا ثبوت ہے۔ پس اگر سادات کا ایسے غلط عقائد سے واقعی کوئی تعلق ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ انہیں اسلامی معاشرے میں یہ عزت ومحبت نصیب رہتی۔

اس وضاحت کے بعد ایک اور نکتے پر غور کریں۔ یہ ثابت ہے کہ سادات میں سے جب بھی کسی نے خروج کی تحریک چلائی تو سادات کے اکثر بزرگ اس سے کنارہ کش رہے۔ اگر اپنی بیعت کی دعوت دینے والے حضرات ''عقیدۂ امامت'' کے قائل اور بذاتِ خود ''امام معصوم'' اور ''مفترض الطاعۃ'' تھے تو ایسے میں سادات کے دیگر بزرگوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ وہ اس وقت موجود ہوتے ہوئے بھی اس مدعی امامت کی بیعت سے کنارہ کش کیوں رہے؟ اگر مدعیٔ امامت کی امامت فرض تھی تو تمام سادات نے بیعت کیوں نہ کی؟ اور بیعت نہ کرنے پر انہیں امامت کے مدعی نے گمراہ اور کافر کیوں قرار نہ دیا؟ اور اگر اس کا دعویٰ جھوٹا تھا تو دیگر سادات نے اسے گمراہ اور کذاب کیوں نہ کہا؟

اگر امامت آلِ حسین کے لیے خاص ہے جیسا کہ بعض رافضی فرقے کہتے ہیں تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے

① ایم اللہ لو سرقت فاطمة بنت محمد لقطعت یدھا. ﴿صحیح البخاری، ح: ٣٤٧٥؛ سنن النسائی، ح: ٤٩٠١، بسند صحیح﴾

زین العابدین (م۹۴ھ) نے محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کے بیٹے ابو ہاشم عبداللہ کی دعوتِ امامت کو گمراہی کیوں قرار نہ دیا؟

جب حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کے بیٹے زید بن علی رحمہ اللہ نے ۱۲۲ھ میں خروج کیا تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پوتے محمد بن علی بھی اس وقت اپنی دعوت خفیہ طور پر دے رہے تھے۔ اگر واقعی ''منصبِ امامتِ معصومہ'' کا کوئی وجود تھا، تو ان دو مدعیوں میں سے ایک کو دوسرے کی بیعت کر لینی چاہیے تھی ورنہ دوسرے کو جھوٹا مدعی امامت ضرور کہنا چاہیے تھا۔ اسی طرح جب محمد نفسِ زکیہ نے اپنی بیعت کی دعوت دی تو حضرت جعفر الصادق (م۱۴۸ھ) زندہ تھے۔ وہ یا تو نفسِ زکیہ کی بیعت کر کے ان کا ساتھ دیتے یا انہیں جھوٹا کہہ کر اپنی امامت کا حق جتاتے۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

اب نہ تو یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ ان حضرات کو ایک دوسرے کی تحریکوں اور بیعت لینے کی کوششوں کا علم ہی نہ ہوگا؛ کیوں کہ جس تحریک کا پیغام عام لوگوں تک پہنچ رہا ہو، خود سادات کے بزرگ اس سے کیسے ناواقف ہوں گے!!

یہ عذر بھی نہیں پیش کیا جا سکتا کہ ان حضرات نے ایک دوسرے کو گمراہ، جھوٹا اور منکرِ امامت تو کہا ہوگا مگر ہم تک یہ حالات نہ پہنچ سکے ہوں گے؛ کیوں کہ یہ حضرات عالمِ اسلام کی مشہور ترین شخصیات تھے اور ان کے حالات بہت تفصیل کے ساتھ محفوظ ہیں۔ پس اگر یہ ایک دوسرے کو منکرِ امامت اور جھوٹا مدعی کہتے تو یہ تردیدی بیانات ضرور مشہور ہوتے۔ خاص کر اس لیے کہ یہ خروج خلفاء کی مخالفت میں تھے تو خلفاء ان تردیدی بیانات کو اپنے حق میں استعمال کر کے ضرور مشتہر کرواتے۔ لیکن اس کی بجائے ہم دیکھتے ہیں کہ ان حضرات نے جہاں بھی ایک دوسرے کا ذکر کیا، عزت و احترام کے ساتھ کیا۔ حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ اپنے چچا زید بن علی رحمہ اللہ کا ذکر یوں کرتے تھے:

> ''اللہ کی قسم! وہ ہم سب سے زیادہ قرآن مجید کے قاری، دین کے فقیہ اور صلہ رحمی کے عادی تھے۔ اب کون ہے جو ان جیسا ہو۔''[1]

یہ حقائق پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ سادات کا خروج کسی عقیدۂ امامت کا کرشمہ ہرگز نہیں تھا بلکہ اس کے اسباب اکثر و بیشتر سیاسی رہے ہیں۔ کبھی یہ خروج کسی واقعے کے ردِعمل میں ہوا، کبھی کسی سازش کا نشانہ بن کر یہ اقدام کیا گیا اور کبھی کسی اور سبب سے۔

ہاں! بعد میں روافض کے خروج کے پسِ پردہ نئے گمراہ کن عقائد رائج کرنے کا ولولہ ضرور کارفرما رہا ہے مگر ان عقائدِ باطلہ سے بھلا اکابر سادات کا کیا تعلق!!

❖❖❖

[1] سیر اعلام النبلاء: ۳۹۰/۵، ط الرسالۃ

سادات کے خروج کی تحریکیں......خلاصۂ کلام

❁ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا میلان اس طرف تھا کہ انہیں امت کی سیاسی قیادت نصیب ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں وصیت کروالی جائے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ ان سے متفق نہ ہوئے۔[1] بعد میں سادات کے بعض دیگر بزرگوں کا میلان بھی اس جانب رہا۔ ان حضرات کی مخلصانہ رائے تھی کہ بنو ہاشم کی قیادت پر اُمت کی شیرازہ بندی زیادہ بہتر انداز میں ممکن ہے۔ اس رائے کے پیچھے امت کی خیر خواہی کا جذبہ کارفرما تھا، حب مال و جاہ نہیں۔

❁ جب اُمت نے دینی مقام و مرتبے کا لحاظ کرتے ہوئے سادات کے سوا دیگر حضرات کو یکے بعد دیگرے خلیفہ چنا تو سادات نے اپنے ذاتی میلان یا رائے کو پس پشت ڈالتے ہوئے ان خلفاء سے پوری وفاداری کا ثبوت دیا۔

❁ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو خود امت کی سیاسی قیادت سادات کے سپرد کی، نہ ایسی وصیت کی، نہ سادات کو ایسی کسی وصیت کا علم تھا، نہ ہی کبھی انہوں نے ایسی وصیت کا دعویٰ کیا۔ عقیدۂ امامت سے ان کا کوئی واسطہ نہ تھا۔

❁ وصیت کا پروپیگنڈا سب سے پہلے عبداللہ بن سبا نے کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبی کا وصی اور دیگر خلفاء کو غاصب قرار دیا۔ تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے صاحبزادوں کا دیگر خلفاء سے بیعت کر کے ان کا وفادار رہنا اور سبائی نظریات کی مذمت کرنا واضح ثبوت ہے کہ عقیدۂ امامت و وصیت محض ایک پروپیگنڈا تھا۔

❁ پہلی صدی ہجری کے اواخر تک شیعانِ علی میں سے بہت سے لوگ سبائی پروپیگنڈے سے متاثر ہو چکے تھے اور سیاسی قیادت کو سادات کے لیے خاص سمجھنے لگے تھے۔

❁ بنو امیہ کے زمانے میں ساداتِ کے بزرگوں: حضرت محمد بن حنفیہ، حضرت علی بن حسین (زین العابدین) حضرت محمد باقر، جعفر صادق رحمہم اللہ اور ان کی اولاد نے کبھی خروج کی کوشش نہیں کی۔ یہ بھی ثابت نہیں کہ انہوں نے دوسروں کو خفیہ طور پر اس کے لیے آمادہ کیا ہو یا سیاسی قیادت کی خواہش ظاہر کی ہو۔ یہ بزرگ سادات، عقائد و نظریات اور اصول و فروع میں جمہور اُمت سے ہم آہنگ تھے۔

❁ سادات کے پہلے فرد جو نظریاتی انحراف کا شکار ہو کر خروج کی منصوبہ بندی پر آمادہ ہوئے، وہ محمد بن حنفیہ کے بیٹے ابو ہاشم عبداللہ تھے۔ وہ سبائی روایات پڑھنے اور جمع کرنے کے شوقین تھے، جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے "التاریخ الکبیر" میں نقل کیا ہے۔ غالباً انہی روایات سے متاثر ہو کر اپنے بڑوں کی رائے اور روش سے منحرف ہوئے۔[2]

[1] صحیح البخاری، ح: ٤٤٤٧، باب مرض النبی ﷺ و وفاته

[2] التاریخ الکبیر: ١٨٧/٥ نیز دیکھیے: سیر اعلام النبلاء: ١٣٠/٤

❁ ابو ہاشم کے بعد عباسی خاندان کے ایک فرد محمد بن علی (عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پوتے) اور فاطمی خانوادے کے ایک فرد زید بن علی (حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے) بھی اس سوچ سے متاثر ہوئے۔

❁ ان حضرات کی فکری تبدیلی کفر، بدعت یا گمراہی کی حد تک نہیں بلکہ اسی حد تک تھی کہ پہلے سادات کی سیاسی قیادت کا خیال بعض ہاشمی بزرگوں کے دلوں میں ایک خواہش یا طبعی میلان کے درجے میں تھا، خروج کو کوئی جائز نہیں سمجھتا تھا۔ اب ان چند حضرات کے نزدیک یہ طبعی میلان بڑھ کر ایک ارادے اور عزم کی حیثیت اختیار کر گیا اور یہ حضرات خروج کو جائز بلکہ ضروری تصور کرنے لگے۔ مگر ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ انہوں نے گزشتہ خلفاء کو برا بھلا یا غاصب کہا ہو یا عقیدۂ امامت ووصیت کے قائل رہے ہوں۔

❁ زید بن علی رحمہ اللہ نے ایک وقتی ناراضی کی بناء پر اہلِ کوفہ کے بہکاوے میں آ کر کسی خاص تیاری کے بغیر اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے خلاف اچانک خروج کیا، کوفی دغا دے گئے اور زید بن علی رحمہ اللہ نے لڑتے ہوئے جان دے دی۔

❁ محمد بن علی اور ان کے بیٹوں نے سالہا سال کی خفیہ تیاری کے بعد خراسانی قبائل کی مدد سے اموی خلیفہ مروان ثانی کے خلاف خروج کیا۔ اس وقت بنوامیہ اپنے اندرونی اختلافات کی وجہ سے کمزور ہو چکے تھے؛ اس لیے یہ تحریک کامیاب ہوگئی اور محمد بن علی کی اولاد نے امت کی زمامِ سیاست سنبھال لی۔ یہ حکومت خلافتِ عباسیہ کہلائی۔

❁ فاطمی بزرگوں میں سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پوتے عبداللہ بن حسن مثنیٰ اور ان کے دو بیٹوں: محمد نفسِ زکیہ اور ابراہیم کو جمہور امت کی سوچ سے اس حد تک اختلاف تھا کہ یہ بھی خلفاء پر خروج کو درست سمجھتے تھے۔ مزید یہ کہ خلافت پر بنوعباس کی بہ نسبت بنوفاطمہ کا حق تصور کرتے تھے۔ عقیدۂ وصیت وامامت سے ان کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔

❁ ان اکابر سادات کا بعد میں مروج ہونے والے کفریہ عقائد سے پاک ہونے کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ جمہور محدثین ان سے روایات لیتے اور انہیں ثقہ مانتے رہے ہیں۔ قضاۃ یا خلفاء میں سے کسی نے ان کو کبھی فاسد عقائد کے الزام میں گرفتار نہیں کیا جبکہ اس دور کے قضاۃ یا خلفاء ایسی بدعقیدگی کو پنپنے نہیں دیتے تھے۔

❁ نفسِ زکیہ اور ابراہیم کو یہ غلط فہمی رہی کہ اُمت کا سوادِ اعظم ان کے ساتھ ہو چکا ہے، حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ اس خروج کے نتیجے میں ان کا خاندان قید وبند کا نشانہ بنا اور انہیں بھی شکست ہوئی۔ یہ دونوں اپنے بہت سے ساتھیوں سمیت میدانِ جنگ میں جاں بحق ہوئے۔ اللہ ان کی اس سیاسی لغزش کو معاف فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔

❁ امام ابوحنیفہ، امام مالک یا اہلِ سنت کے کسی بڑے امام یا فقیہ کا خروج کی ان تحریکوں سے متفق ہونا ثابت نہیں ہے۔

❁ خود سادات، بنوہاشم، بنوفاطمہ اور علوی حضرات کے اکثر بزرگ ان تحریکوں سے کنارہ کش رہے۔

❖ ❖ ❖

بغداد کی تعمیر

منصور عباسی کا زندہ وجاوید رہنے والا کارنامہ نئے دارالخلافہ بغداد کی تعمیر ہے۔اس سے پہلے عباسی خلیفہ کا قیام کوفہ سے متصل نئے محلے ''ہاشمیہ'' میں ہوتا تھا۔وہاں فرقہ راوندیہ سے نبرد آزمائی کے بعد منصور نے بجا طور پر محسوس کیا کہ یہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔چنانچہ اس نے مرکزِ عالم اسلام کے شایانِ شان ایک مستقل دارالخلافہ کی تعمیر کا منصوبہ بنایا۔کافی تلاش اور غور وخوض کے بعد اسے ساسانی بادشاہوں کے پایۂ تخت مدائن کے جنوب میں ''بغداد'' نامی بستی موزوں لگی۔ یہ دجلہ کے ساحل پر ایک جاگیر تھی جس میں پھلوں کے باغ تھے۔کسریٰ نے اپنے کسی خادم کو یہ جاگیر بخشی تھی،اس مناسبت سے اس کا نام ''باغ داد'' (باغ عطا کیا) پڑ گیا تھا۔پھر رفتہ رفتہ لفظ مختصر ہوکر ''بغداد'' بن گیا۔ایرانی بادشاہوں کے دور میں یہاں ایک بازار بھی لگا کرتا تھا۔اس مقام کو سب سے پہلے مثنیٰ بن حارثہ رحمہ اللہ نے فتح کیا تھا۔

دارالخلافہ کے لیے اس مقام کو منتخب کرنے کی کئی وجوہ تھیں:ایک یہ کہ اس کی آب وہوا بہت خوش گوار تھی۔دوسرے یہ کہ اس کے گرد نہروں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔دشمن کے حملے کے وقت نہروں کے پل توڑ کر اس کی پیش قدمی آسانی سے روکی جاسکتی تھی۔دریائے دجلہ کے ذریعے الجزیرہ اور آرمینیا تک سے کمک ورسد منگوائی جاسکتی تھی۔یہی دریا آگے بحرِ ہند میں پہنچتا تھا جہاں سے بیرونِ ممالک تجارت کے راستے میسر تھے۔مغرب میں دریائے فرات بھی زیادہ دور نہ تھا جس کے ذریعے شام اور مصر کی افواج برابر پہنچ سکتی تھیں۔فرات کی کئی نہریں یہاں تک آتی تھیں جن سے ایک وسیع علاقہ سیراب ہوتا تھا۔

منصور موسم گرما میں خود اس جگہ آیا اور ایک رات گزاری۔اسے بہت پرسکون نیند آئی۔مچھروں نے پریشان کیا نہ گرمی نے۔ہر لحاظ سے اس جگہ کو بہترین پانے کے بعد اس نے یہیں نیا شہر بسانے کا فیصلہ کرلیا۔

آخر کار ۱۴۵ھ میں یہاں تعمیری کام کا آغاز ہوا۔اس سے پہلے سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب منعقد کی گئی۔مملکت کے نامی گرامی امراء اور علماء وفضلاء کو مدعو کیا گیا۔پہلی اینٹ خلیفہ منصور نے خود یہ کہتے ہوئے رکھی:

''بِسْمِ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ،وَالْاَرْضُ لِلّٰهِ،یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ،وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ۔''

اب زور وشور سے تعمیری مہم شروع ہوئی۔سینکڑوں انجینئر،اور ہزاروں مزدور دن رات کام کرتے رہے۔شہر کی فصیل کی چوڑائی نیچے سے ۷۵ فٹ اور اوپر سے ۳۰ فٹ رکھی گئی۔اسی طرح خندق بھی بہت گہری رکھی گئی۔حفاظتی انتظامات کا یہ کام اتنا وسیع تھا کہ چار سال میں مکمل ہوا۔درمیان میں نفسِ زکیہ اور ابراہیم کے خروج کی وجہ سے کچھ

مدت کے لیے کام بند بھی ہوا۔ بغاوت کو کچلنے کے بعد کام بہت تیزی سے دوبارہ شروع کیا گیا۔ سرکاری عمارتیں، سڑکیں، باغ اور پل وغیرہ بنائے گئے۔

منصور تعمیرات کی منصوبہ بندی خود کرتا تھا۔ تعمیری کام کے دوران ہی وہ صفر ۱۴۶ھ میں ہاشمیہ سے بغداد منتقل ہوگیا۔ اس نے اپنی کفایت شعاری کے باوجود بغداد کی تعمیر کے لیے دل کھول کر رقم خرچ کی۔ تاہم وہ ایک ایک پیسے کا حساب کتاب خود رکھتا تھا۔ عربی میں پیسے کو ''دانق'' کہا جاتا ہے؛ اسی لیے منصور ''دوانقی'' کے لقب سے مشہور ہوگیا۔

بغداد کا نقشہ دائرے کی شکل میں تھا۔ شہر کی فصیل کے چار دروازے تھے اور ہر دروازے سے دوسرے دروازے تک ایک میل کا فاصلہ تھا۔ شہر کے بالکل وسط میں قصرِ خلافت تھا، شاید اس طرح یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ خلیفہ کو تمام شہریوں کے ساتھ یکساں تعلق ہے۔ قصرِ خلافت کے گرد شہزادوں کے محلات، جامع مسجد، امراء و وزراء کی حویلیاں اور خدمت گار عملے کی رہائش گاہیں تھیں جن میں محافظ سپاہی، غلام اور خواجہ سرا سب کے الگ الگ محلّے تھے۔ خلیفہ کا محل جو سرکاری امور کا مرکزی دفتر بھی تھا، ''قصر الذہب'' کے نام سے مشہور ہوا۔

تعمیری کام کی تکمیل ۱۴۹ھ میں ہوئی اور اس پر سرکاری خزانے سے دو کروڑ درہم (تقریباً پانچ ارب روپے) خرچ ہوئے۔ شہر کا نام ''مدینۃ السلام'' (سلامتی کا شہر) رکھا گیا۔ مگر عام لوگ اسے خلافتِ اسلامیہ کا مرکز ہونے کی وجہ سے ''مدینۃ الاسلام'' کہا کرتے تھے۔

آبادی کو فوج کے اختلاط سے بچانے کے لیے منصور نے بغداد کے مشرق میں الگ سے فوجی زون تعمیر کرایا جو ''رصافہ'' کے نام سے موسوم ہوا۔ یہاں گھڑ سواری اور فنونِ حرب کی مشق کے لیے وسیع میدان تھے، افسران اور سپاہیوں کی رہائش گاہیں تھیں۔ رصافہ کی جامع مسجد الگ تھی۔ اسی طرح ایک مستقل فصیل اور خندق کے ذریعے اسے محفوظ بنایا گیا۔

بغداد کی تعمیر و ترقی میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ ہر سمت سے تاجر، صنعت کار، ہنر مند اور مزدور بہتر سے بہتر معاش کی جستجو میں اِدھر کھنچے چلے آتے تھے۔ علماء و فضلاء بھی بڑی تیزی سے یہاں آباد ہوئے۔ ان سے استفادے کے لیے طلبہ نے بھی جوق در جوق اِدھر کا رخ کیا۔

اگلے سالوں میں یہاں بے شمار عالی شان عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ درباری امراء کی اپنی رہائش گاہیں بھی ایسی عالی شان تھیں کہ انسان دنگ رہ جاتا تھا۔ امیر عیسیٰ بن علی کا محل جو دجلہ کے کنارے تھا، چار ہزار افراد کی گنجائش رکھتا تھا۔ شہر کی سب سے بلند عمارت ''قبۃ الخضراء'' تھی۔ یہاں سے پورے شہر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا، عمارت کا عالی شان سبز گنبد ۸۰ گز اونچا تھا اور میلوں دور سے دکھائی دیتا تھا۔ اسے ''شہر کا تاج'' اور ''بغداد کا پرچم'' بھی کہا جاتا تھا۔ یہاں غیر ملکی سفیروں کو ٹھہرایا جاتا تھا۔

جب شہر بہت گنجان آباد ہوگیا اور گلیوں میں رش کی وجہ سے کھوے سے کھوا چھلنے لگا تو خلفاء اور امراء نے اپنی رہائش

گاہیں دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر بنائیں۔ یہاں تعمیر کیے گئے خلافتی محل کو "قصر الخلد" کہا جاتا تھا۔

شہر کی منڈیوں میں روزانہ درجنوں قافلے آتے اور سامانِ تجارت دوسرے شہروں کے لیے روانہ ہوتا۔ اس بھیڑ بھاڑ سے گزرگاہیں بند ہو جاتیں اور عام لوگوں کو بڑی دقت ہوتی؛ اس لیے ۱۵۷ھ میں منصور نے تجارتی مراکز کے لیے شہر کے جنوب میں ایک علاقہ مخصوص کر دیا۔ تمام بازار وہاں منتقل کر دیے گئے۔ یہ علاقہ "کرخ" کے نام سے مشہور ہوا۔

بغداد کی تعمیر و آبادی کے فوائد اپنی جگہ، مگر ایک نقصان ہوا کہ رفتہ رفتہ کوفہ کے جید علماء و فقہاء اور محدثین بغداد منتقل ہو گئے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بعد کوفہ کی فقہی مسند بالکل ویران ہوگئی۔ کوفہ میں شیعانِ علی کو گمراہ کرنے والے عناصر کا دور دورہ ہو گیا۔ اگرچہ وہاں اگلی صدیوں میں بھی علمائے حق موجود رہے مگر تیسری صدی ہجری میں کوفہ واضح طور پر رفض کا مرکز بن چکا تھا۔ جبکہ بغداد کی رونق دن بدن بڑھتی رہی۔ مؤرخین اسے "جنۃ الارض" اور "قبۃ الاسلام" کہہ کر یاد کرتے تھے۔ پانچ صدیوں تک یہ شہر مسلسل آباد ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ۶۵۶ھ میں ہلاکو خان نے اسے نیست و نابود کر دیا۔[1]

◆◆◆

① بغداد کی تعمیر، بناوٹ اور خوبیوں کے بارے میں مؤرخین اور جغرافیہ نگاروں نے طویل کلام کیا ہے، راقم نے درج ذیل مآخذ کا خلاصہ نقل کر دیا ہے:

(١) تاریخ بغداد للخطیب بغدادی: ١/٨٧ تا ١١٥؛

(٢) تاریخ الطبری: ٧/٦١٤ تا ٦١٨؛

(٣) کتاب البلدان للیعقوبی، ص، ٥، ١٣ تا ٥٥؛

(٤) معجم البلدان: مادہ، بغداد

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی قید و بند اور سفرِ آخرت

منصور کے دور میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔ امام صاحب نے ابراہیم کے خروج کے موقع پر حکومتی پالیسیوں کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ اسی وجہ سے انہیں گرفتار کر کے منصور کے سامنے پیش کیا گیا۔[1]

منصور نے انہیں قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا۔ امام صاحب رحمہ اللہ نے اسے مسترد کر دیا۔ منصور نے قسم کھائی کہ آپ کو سرکاری ملازمت قبول کرنا پڑے گی۔ امام صاحب رحمہ اللہ نے بھی قسم کھالی کہ میں کوئی عہدہ قبول نہیں کروں گا۔ اس پر منصور نے انہیں جبراً بغداد کے تعمیری کام کی نگرانی پر لگا دیا۔[2]

عہدۂ قضا پیش کرنے کی وجہ یہ تھی کہ منصور کو خطرہ تھا کہ امام صاحب کی تنقید کہیں عوام میں شورش کا ذریعہ نہ بن جائے حالانکہ امام صاحب کا یہ مقصد نہ تھا۔ غالباً منصور کو حاسدین نے یقین دلا دیا تھا کہ امام صاحب باغیوں کے سرپرست ہیں۔ ایسے میں منصور کے نزدیک بہترین راستہ یہ تھا کہ امام صاحب عہدۂ قضا سنبھال لیں تاکہ اگر ان کی طرف باغیوں کی سرپرستی غلط طور پر منسوب کی گئی ہے تو اس کا ازالہ ہو جائے اور ان کی شخصیت کی سرکاری صف میں شمولیت سے حکومت کے پائے مضبوط ہوں۔ مگر سرکاری عہدہ قبول کرنا چونکہ امام صاحب کے اصول حیات کے خلاف تھا؛ اس لیے آپ نے انکار کر دیا۔ غالباً یہ انکار منصور کو یہ یقین دلانے کا سبب بنا ہوگا کہ ان کے متعلق بغاوت کی سرپرستی کی اطلاعات درست ہیں۔ چنانچہ اس نے انہیں حراست میں رکھا۔ اس دوران بغداد زیرِ تعمیر تھا۔ منصور نے امام صاحب کو وہاں تعمیری کام کی نگرانی اور خرچے کے حساب کتاب کا کام سونپا۔[3]

بعض تواریخ کے الفاظ سے وہم ہوتا ہے کہ انہیں بس اینٹیں شمار کرنے کا کام دیا گیا تھا[4] مگر حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ اس بارے میں تاریخِ طبری کی درج ذیل روایت سے اصل حقیقت پر روشنی پڑتی ہے:

''منصور نے امام صاحب کو شہر کی تعمیر، اینٹوں کی تیاری، ان کے شمار اور لوگوں کو کام پر لگانے کی ذمہ داری سونپی۔ منصور نے یہ اس لیے کیا تاکہ وہ اپنی قسم پوری کر لے۔ راوی (سلیمان بن مجالد) کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ اس کے ذمہ دار رہے حتیٰ کہ وہ شہر کی فصیل کی تعمیر مکمل کرا کے فارغ ہو گئے جو خندق سے ملی ہوئی ہے۔''[5]

---

[1] اخبار ابی حنیفہ: ۱/۹۲، ۹۳

[2] تاریخ الطبری: ۷/۶۱۹

[3] تاریخ الطبری: ۷/۶۱۹ تحت ۱۴۵ھ

[4] الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۴۵

[5] "فولاہ القیام ببناء المدینۃ وضَرْبِ اللبن وعَدِّہٖ وَأَخْذِ الرِّجالِ بالعمل وانما فعل المنصور ذلك لِيَخْرُجَ عن یمینہ، قال وکان ابو حنیفۃ المتولی لذلك حتیٰ فرغ من استتمام بناء حائط المدینۃ مما یلی الخندق. (تاریخ الطبری: ۷/۶۱۹ تحت ۱۴۵ھ)

اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ اینٹیں گننے کے حقیر کام پر مقرر نہیں تھے بلکہ تعمیری کام کے نگران تھے اور افراد کی بھرتی بھی انہی کے ذمہ تھی۔

تاریخِ طبری کی دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ نے رضا کارانہ طور پر یہ خدمات انجام دی تھیں تاکہ منصور کی قسم پوری ہو جائے۔ اس روایت میں ہے:

''منصور نے قسم کھائی کہ وہ اس سے چھوٹ نہیں سکتے جب تک کہ اس کی ملازمت نہ کرلیں۔ یہ بات امام ابوحنیفہ کو معلوم ہوئی تو انہوں نے ایک بانس منگوایا اور اینٹیں بنانے والے ایک شخص کے پاس جا کر اینٹیں گنیں، امام ابوحنیفہ پہلے شخص تھے جنہوں نے بانس کے ساتھ اینٹیں گنیں۔ اس طرح انہوں نے ابو جعفر منصور کی قسم پوری کر دی۔''

غور کریں کہ منصور نے کہا تھا: ''اللہ کی قسم! ابوحنیفہ اس کی ملازمت کر کے رہیں گے۔'' اس میں ''قضاء'' کا لفظ نہیں تھا۔[1] یعنی انہیں بہر حال سرکاری ملازم بننا پڑے گا۔ امام صاحب رحمہ اللہ نے اس گنجائش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک سرکاری کام میں شرکت کر لی اور اینٹیں گن دیں تاکہ خلیفہ کی قسم پوری ہو جائے اور انہیں عہدۂ قضا کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔ اس کے بعد منصور نے تعمیر کی نگرانی اور حساب کتاب جیسا ذمہ دارانہ کام بھی انہیں سونپ دیا۔

۱۴۹ھ میں بغداد کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس دوران امام صاحب رحمہ اللہ گھر آنے جانے کے لیے آزاد نہیں تھے بلکہ ان کا قیام جیل میں تھا۔ ۱۵۰ھ میں وہیں ان کی وفات ہوگئی[2] بعض روایات کے مطابق انہیں زہر دیا گیا تھا۔[3]

امام صاحب رحمہ اللہ عمر بھر سرکاری مناصب سے گریزاں رہے۔ یہ ان کا اٹل فیصلہ تھا۔ وہ اموی اور عباسی دونوں حکومتوں میں اس عزم پر جمے رہے۔ اس فیصلے کی متعدد وجوہ ہو سکتی ہیں تاہم یہ خیال درست نہیں کہ امام صاحب ان حکومتوں کو سراسر ظلم و تعدی پر مبنی تصور کرتے ہوئے ان میں کسی بھی قسم کی ملازمت کو قطعاً حرام تصور کرتے ہوں گے؛ کیوں کہ اگر ان کی رائے یہ ہوتی تو امام صاحب کے تلامذہ سے زیادہ اس سے کون واقف ہو سکتا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امام صاحب کی زندگی ہی میں ان کے شاگرد زفر بن ہذیل رحمہ اللہ عباسی خلافت کے ماتحت بصرہ کے قاضی تھے۔ امام صاحب رحمہ اللہ نے انہیں اس خدمت سے منع نہیں کیا تھا بلکہ اس کام میں ان کی کامیابی کے لیے فکر مند رہتے تھے۔[4]

اسی طرح امام ابو یوسف رحمہ اللہ ہارون الرشید کے دور میں پورے عالمِ اسلام کے قاضی القضاۃ ہوئے۔ امام صاحب کے ایک اور شاگرد اسد بن فرات رحمہ اللہ عباسی دور میں شمالی افریقہ کے قاضی اور سپہ سالار فوج رہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قضا کا عہدہ قبول کرنا شرعی طور پر ناجائز نہ تھا۔ بلکہ امام صاحب کا قضا سے احتراز کرنا احتیاط کے طور پر تھا۔

① "فحلف ان لایقلع عنه حتیٰ یعمل، فأخبر بذالك ابو حنیفة فدعا بقصبة فعدّاللبن علیٰ رجلٍ قد لبنه وكان ابو حنیفة اوّل من عدّ اللبن بالقصب فاخرج اباجعفر عن یمینه." (تاریخ الطبری: ۶۱۹/۷ تحت ۱۴۵ھ)

② اخبار ابی حنیفه: ۹۲/۱، ۹۳؛ سیر اعلام النبلاء: ۴۰۲/۶

③ اخبار ابی حنیفه: ۹۲/۱، ۹۳

④ الانتقاء فی فضائل الثلاثة الائمة الفقهاء لابن عبدالبر: ۱۷۳/۱

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے عہدۂ قضا قبول نہ کرنے کے اسباب:

اب رہی یہ بات کہ اس قدر احتیاط کیوں تھی؟ تو اس کا ایک سبب امام صاحب کا طبعی استغناء تھا، دوسرے انہیں یہ خدشہ تھا کہ سرکاری عہدے پر متمکن آدمی حکومتی اثر سے آزاد نہ رہ سکے گا اور کسی موقع پر اسے اپنی تحقیق کے خلاف فتویٰ دینے پر مجبور کیا جائے گا یا اس کی توقع رکھی جائے گی۔ ظاہر ہے امام صاحب جیسا شخص ایسی توقع پر پورا نہیں اتر سکتا تھا۔ چنانچہ منصور نے جب امام صاحب کو مقرب بنانے کی کوششیں کیں تو امام صاحب نے صاف انکار کرتے ہوئے فرمایا:

''ایسا نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ اگر آپ مجھے مقرب بنائیں گے تو آزمائش میں ڈالیں گے۔ دھتکاریں گے تو رنجیدہ کریں گے۔ آپ کے پاس ایسا کچھ نہیں جس کی میں توقع کروں۔ میرے پاس کچھ ایسا نہیں جس کے ضایع ہونے کا مجھے خوف ہو۔ آپ کے پاس جو لوگ آتے جاتے ہیں وہ آپ کے لیے کافی ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے آپ کو کسی اور کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔''[1]

تدوینِ فقہ کے لیے یکسوئی کی ضرورت:

امام صاحب رحمۃ اللہ کے اس جواب پر غور کریں تو استغناء کے اظہار اور فتنے کے خوف کے ساتھ یہ بات بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ انہیں اپنی غیر سیاسی خالص علمی وفقہی مصروفیات بہت عزیز تھیں جنہیں وہ اپنے مقصدِ حیات کا درجہ دیتے تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے وہ کسی اور کام میں لگنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے خیال میں قضا کے عہدے کے لیے اور بہت سے قابل لوگ موجود تھے جن کا منصور کے پاس آنا جانا بھی تھا۔ جو کام امام صاحب کر رہے تھے وہ قضا سے کہیں بلند تر نوعیت کا تھا۔ پس امام صاحب کا سرکاری عہدہ قبول کرنا اہم کام کی جگہ کم اہم کام میں لگنے یعنی ضیاعِ وقت کے مترادف تھا۔ سرکاری عہدے پر فائز ہونے کے بعد تدوینِ فقہ کے لیے وہ یکسوئی نصیب نہ رہتی جو درکار تھی۔ وہ وقت جس کا ایک ایک لمحہ امت کی امانت تھا، دو ذمہ داریوں میں بٹ جاتا۔ اس سے مقصدِ زندگی کو نقصان پہنچتا۔ بڑے لوگ بڑے مقاصد کے لیے بہت سی جائز چیزوں سے بھی بچتے ہیں؛ کیوں کہ وہ ان کے مقصد میں خلل ڈالتی ہیں۔

جانب داری کی تہمت سے بچنے کی ضرورت:

یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ امام صاحب رحمۃ اللہ خود کو کسی بھی قسم کی جانبداری کی تہمت سے بچانا چاہتے تھے؛ کیوں کہ وہ تدوینِ فقہ میں مصروف تھے جس میں عبادات سے لے کر سیاسیات تک ہر معاملے میں فتاویٰ دیے اور مرتب کیے جارہے تھے۔ یہ کام کسی ایک طبقے کے لیے نہیں، پوری امت کی خاطر ہو رہا تھا۔ یہ دور جس میں امام صاحب فقہ مدون کر رہے تھے، امت کے دو بڑے طبقوں کے درمیان شدید کشمکش کا تھا۔ ۱۲۰ھ سے ۱۵۰ھ تک کے اس دور میں ابتدائی بارہ سال امویوں کی حکومت کے تھے جس میں ان کے خلاف عباسی طوفان برپا کیے رہے۔

---

[1] الجواهر المضيئة في طبقات الحنفية: ۲/۵۰۷، ط مير محمد كتب خانه، وانظر الرواية باسنادها في مناقب ابي حنيفة للموفق المكي

پھر ۱۳۲ھ میں عباسی برسر اقتدار آئے تو لگ بھگ پندرہ سالوں تک انہیں مسلسل بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ غرض اس وقت سیاسی اختلاف حد سے بڑھا ہوا تھا۔ مسلمانوں کی اکثریت جو صحیح العقیدہ تھی، سیاسی اعتبار سے دھڑے بندیوں کا شکار تھی۔ کچھ لوگ حکومت کے حامی تھے اور کچھ احزاب مخالفہ کے۔ ایسے حالات میں امام صاحب اگر کسی حکومتی عہدے پر ہوتے تو ان کی مرتب کردہ فقہی آراء اور فتاویٰ کو چاہے حکومت کے حامی طبقے میں قابلِ اعتماد سمجھا جاتا مگر حکومت مخالف حلقوں میں انہیں ہمیشہ شک وشبے کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ اس طرح وہ مقصد فوت ہو جاتا جس کے لیے آپ دن رات ایک کیے ہوئے تھے۔

بہر حال منصور کی قید میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی وفات ایک ایسا سانحہ تھا جس کا دھبہ منصور کی بہت سی خوبیوں کو گہنا دیتا اور اس کے عیوب کو نمایاں کر دیتا ہے۔ کاش کہ! ایسا نہ ہوتا مگر تقدیر میں یہی لکھا تھا کہ امت کے سب سے بڑے فقیہ کی وفات اس طرح قید و بند کی حالت میں ہو۔

بیرونی ممالک کے ساتھ منصور کی سیاست

اندرونی معاملات نمٹانے کے ساتھ ساتھ منصور ایک لمحے کے لیے بھی بیرونی طاقتوں اور حریف ممالک سے بے خبر نہیں رہا۔ ان کے ساتھ بھی صلح یا جنگ میں وہ بڑی ہوشیاری برتتا رہا۔

اندلس اور عبدالرحمٰن بن معاویہ:

اَندَلُس کا معاملہ سب سے اہم تھا جو بنوامیہ کی خلافت کا ایک اہم حصہ رہا تھا۔ اسے ولید بن عبدالملک کے دور میں موسیٰ بن نُصَیر اور طارق بن زیاد نے فتح کیا تھا۔ بنوامیہ کے زوال کے ساتھ ہی اَندَلُس میں بھی سیاسی بحران پیدا ہوگیا۔ جب ۱۳۲ھ میں پہلا عباسی خلیفہ ابوالعباس سَفّاح اموی خلافت کا خاتمہ کر کے برسرِاقتدار آیا اور بنوامیہ کے لیے زمین تنگ ہوگئی تو اس افراتفری میں بنوامیہ کا ایک شہزادہ عبدالرحمٰن بن معاویہ جو اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کا پوتا تھا، جان بچا کر افریقہ پہنچ گیا اور کئی سال روپوش رہا۔ اس وقت تک اَندَلُس میں بنوعباس کا قبضہ مستحکم نہیں ہوا تھا بلکہ وہاں بنوامیہ کے حامیوں کی خاصی تعداد موجود تھی؛ اس لیے عبدالرحمٰن بن معاویہ نے اَندَلُس کے بعض امراء سے خفیہ خط و کتابت کر کے انہیں اپنا حامی بنایا اور اس کے بعد ۱۳۸ھ (۷۵۵ء) میں عبدالرحمٰن بن معاویہ نے اَندَلُس پہنچ کر وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔

مقامی حاکم یوسف بن عبدالرحمٰن الفہری نے جو قُرطُبہ، طُلَیطُلَہ اور اِشبیلیہ جیسے مرکزی شہروں کا حاکم تھا، اس کا مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ یوں عبدالرحمٰن بن معاویہ نے پورے اَندَلُس پر قبضہ کر لیا۔ [1]

اللہ کا شکر ہے کہ سمندر حائل ہے:

منصور دیگر مہمات میں مشغولیت اور اَندَلُس کے زمینی فاصلے کی وجہ سے اس نقصان کا تدارک نہ کر سکا۔ تاہم اس نے موقع پاتے ہی ۱۴۶ھ (۷۶۳ء) میں افریقہ کے حاکم علاء بن مغیث کو لشکرِ جرار دے کر عبدالرحمٰن کے مقابلے پر بھیجا مگر عبدالرحمٰن نے مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ عباسیوں کے کئی گنا بڑے لشکر کو شکستِ فاش دی اور علاء بن مغیث سمیت کئی عباسی افسران کے کٹے ہوئے سر عباسی خلیفہ منصور کے پاس بھیج دیے۔

یہ منظر دیکھ کر منصور کے منہ سے بے ساختہ نکلا:

''اللہ کا شکر ہے کہ میرے اور عبدالرحمٰن کے درمیان سمندر حائل ہے۔'' [2]

---

[1] نفح الطيب: ۳۲۷/۱ تا ۳۳۰؛ العقد الفريد: ۲۲۹/۵، ۲۳۰

[2] نفح الطيب: ۳۳۲/۱

اس کے بعد عباسیوں کو سمندر عبور کر کے اندلس پر حملے کی جرأت تو نہیں ہوئی۔ تاہم منصور نے دوسری تدبیر آزمائی اور فرانس کے حکمرانوں کو عبدالرحمن کے خلاف ابھارا۔

عباسیوں اور امویوں کی خانہ جنگی کے دوران شمالی اندلس اور جنوبی فرانس میں عیسائیوں کی طاقت مستحکم ہوتی جا رہی تھی۔ جنوبی فرانس جسے اندلس کے اولین مسلم فاتحین فتح کر چکے تھے، چالیس سال بعد دوبارہ عیسائیوں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ فرانس کا حکمران شارلیمین پہلے سے اندلس پر حملے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ منصور کی طرف سے شہ ملنے پر وہ مزید جری ہو گیا اور اس نے لاکھوں سپاہی تیار کر کے اندلس پر حملہ کر دیا۔ تاہم عبدالرحمن بن معاویہ نے اس ٹڈی دل فوج کو بھی پسپا کر دیا۔ اس دلیری پر خود منصور بھی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے کہا:

''عبدالرحمن بن معاویہ قریش کا شہباز ہے جو نیزوں کی انیوں اور تلواروں کی دھاروں کے بیچ سے اپنی ہوشیاری کے ذریعے بچ کر نکل گیا، بے آب و گیاہ میدانوں کو عبور کیا، سمندر پار کیا، یہاں تک کہ تنہا ایک اجنبی ملک میں داخل ہوا وہاں شہر پر شہر فتح کیے۔ فوجیں ترتیب دیں اور حسن تدبیر اور اولوالعزمی سے اپنی کھوئی ہوئی حکومت دوبارہ قائم کر لی۔''

اس کے بعد منصور نے اندلس کے بارے میں عدمِ مداخلت کی پالیسی اپنائی اور اس میں شک نہیں کہ وقت کے لحاظ سے یہی بہتر تھا۔ [1]

رومی سلطنت:

عالم اسلام کی سب سے بڑی حریف روم کی بازنطینی سلطنت تھی۔ مسلمان اس سے پہلے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور سلیمان بن عبدالملک کے دور میں قیصر کا پایہ تخت قُسْطَنْطِینِیَہ فتح کرنے کی کوشش کر چکے تھے مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ جواب میں رومی حکمران بھی عالم اسلام پر دھاوا بولنے کا موقع تاکتے رہتے تھے۔

منصور کی خلافت کے پہلے ہی سال ۱۳۷ھ میں قیصر قُسْطَنْطِین چہارم نے شام کے ساحل اور ایشیائے کوچک پر فوج کشی کی۔ اس مہم میں رومی ایشیائے کوچک کے علاقے مَلَطْیَہ پر قابض بھی ہو گئے۔

منصور نے اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے صالح بن علی کو سرحدوں پر بھیجا۔ ادھر سے قُسْطَنْطِین چہارم نے ایک لاکھ فوج لے کر پیش قدمی کی۔ ۱۳۸ھ میں ایشیائے کوچک کے سرحدی علاقے ''دابق'' کی وادی میں ایک گھمسان کی جنگ ہوئی۔ قُسْطَنْطِین کو شکستِ فاش ہوئی اور وہ پسپا ہو کر قُسْطَنْطِینِیَہ چلا گیا۔ مسلمانوں نے اپنا علاقہ واپس لے لیا تاہم رومی جاتے جاتے مَلَطْیَہ کو تباہ کر گئے تھے۔

اس کے بعد منصور نے ہر سال موسم گرما میں یہاں تازہ دم افواج بھیجنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہر سال بڑے بڑے جرنیلوں کی کمان میں رومیوں کے قلعوں پر حملے کیے جاتے۔ رومیوں کو اس کے بعد برسوں تک کسی حملے کی جرأت نہ ہوئی۔ بلکہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی قوت دیکھ کر انہیں خطرہ لاحق رہا کہ کسی بھی وقت قُسْطَنْطِینِیَّہ پر حملہ ہو سکتا ہے۔ [2]

① العقد الفرید: ۵/ ۲۳۰

② تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۲۶، ۴۲۷

کہا جاتا ہے کہ ۱۵۵ھ میں رومی سلطنت نے سالانہ خراج کی ادائیگی کی شرط قبول کرتے ہوئے منصور سے صلح کر لی تھی۔ مگر یہ درست نہیں۔ منصور کی وفات تک رومیوں کے خلاف جہاد جاری رہا۔ ۱۵۸ھ میں جب اس کا انتقال ہوا تو معیوف بن یحییٰ کی قیادت میں رومی سرحدوں پر چھاپہ مار کارروائیاں جاری تھیں۔ [1]

منصور کی وفات:

منصور کئی سال سے بدہضمی کے عارضے میں مبتلا تھا۔ اس کے لیے وہ ہاضمے کی یونانی دوائیں مستقل طور پر استعمال کرتا رہتا تھا۔ ۱۵۸ھ میں حج کے لیے جاتے ہوئے راستے میں بیماری بہت بڑھ گئی۔ مکہ پہنچ کر حج سے تین دن پہلے چھ ذوالحجہ ۱۵۸ھ کو اس کا انتقال ہو گیا۔ گورستانِ مکہ ''جَنَّةُ الْمُعَلّٰی'' میں تدفین ہوئی۔ اس کی عمر ۶۴ سال تھی۔ وفات سے کچھ مدت پہلے وہ اپنے بیٹے مہدی کو جانشین نامزد کر چکا تھا۔ [2]

اس کے آخری الفاظ یہ تھے: ''الٰہی! اگرچہ میں نے بہت سی چیزوں میں تیری نافرمانی کی مگر تیری سب سے پسندیدہ چیز میں اطاعت کی، یعنی لا الٰہ الا اللہ کی سچے دل سے گواہی دی۔''

پھر یہ دعا کی: ''یا اللہ! اپنی ملاقات میرے لیے بابرکت بنا دے۔''

انہی الفاظ پر اس کی روح پرواز کر گئی۔

اس کی انگوٹھی پر نقش تھا: "اَللّٰهُ ثِقَةُ عَبْدُاللّٰهِ وَبِهٖ يُؤْمِنُ." (عبداللہ کو اللہ ہی پر بھروسہ ہے اور اسی پر ایمان ہے۔) [3]

منصور کی سیرت پر ایک نظر

منصور کی زندگی ایک حکمران کے طور پر سخت جدوجہد میں گزری۔ وہ آرام اور عیش پسندی سے کوسوں دور تھا۔ قصرِ خلافت میں اس کی رہائش ایک معمولی چہار دیواری میں تھی جس میں ایک کمرہ، ایک صحن اور ایک سائبان تھا۔ کمرے میں ایک بستر اور ایک لحاف اس کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ [3]

معمولات و مصروفیات:

اس کی عادت تھی کہ روزانہ رات کے آخری پہر بیدار ہو کر فجر کی اذان تک نوافل اور ذکر و تلاوت میں مشغول رہتا۔ نمازِ فجر سب کے ساتھ باجماعت ادا کرتا۔ اس کے فوراً بعد اس کا دربار لگ جاتا۔ ظہر تک دربار میں وفود سے ملاقاتوں، احکام کے اجراء اور دیگر سرکاری امور میں مصروف رہتا۔ نمازِ ظہر ادا کر کے گھر چلا جاتا اور کھانے سے فارغ ہو کر عصر تک آرام کرتا۔ نمازِ عصر کے بعد سے عشاء تک کا وقت خاندان کے لوگوں سے ملنے، ان کی ضروریات پوری کرنے، گھر والوں کی خیر خبر لینے اور غیر معمولی نوعیت کے کام انجام دینے میں گزرتا۔

① تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۴۲۹
② تاریخ الطبری: ۵۹/۸؛ البدایة والنهایة: ۴۵۸/۱۳
③ البدایة والنهایة: ۸۷۲/۱۳
④ تاریخ الطبری: ۶۳/۸، ۸۰

عشاء کی نماز ادا کر کے وہ پورے ملک سے آنے والی ڈاک کا مطالعہ کرتا اور جواب لکھواتا۔ اس کے بعد کچھ دیر گھر کے ساتھ گپ شپ لگاتا اور آدھی رات سے پہلے سونے کے لیے لیٹ جاتا۔[1]

جفاکشی اور قوتِ عمل:

اس قدر گوناں گوں مصروفیات اور مہمات کے ساتھ اس نے اپنے دورِ خلافت میں پانچ بار حج کا سفر کیا۔ پہلا حج ۱۴۰ھ میں، دوسرا ۱۴۴ھ، تیسرا ۱۴۷ھ اور چوتھا ۱۵۲ھ میں کیا۔ پانچویں سفر میں اس کی وفات ہوگئی۔

سیر و تفریح کو نہ خود پسند کرتا نہ اپنے کسی نائب کو اس کی اجازت دیتا۔ ایک بار کسی حاکم کے بارے میں اسے پتا چلا کہ وہ شکار کے لیے جاتا ہے اور اس مقصد کے لیے اس نے کتے اور باز سدھا کر رکھے ہیں۔ منصور نے فوراً اسے معزول کر دیا اور اپنے حکم نامے میں سخت ملامت آمیز فقروں کے بعد اسے لکھا:

''ہم نے تمہیں مسلمانوں کی خدمات انجام دینے کے لیے رکھا ہے، جانوروں میں مشغولیت کے لیے نہیں۔''[2]

عیش و آرام اور لہو و لعب سے لاتعلقی:

آلاتِ تعیش سے اس کی کنارہ کشی کا یہ عالم تھا کہ موسیقی کے مشہور آلات کے نام تک نہیں جانتا تھا۔ ایک دن اسے کہیں سے گانے بجانے کی آواز آئی۔ اس نے ایک افسر کو دوڑایا کہ معاملہ دیکھ کر آئے۔ اس نے جا کر دیکھا تو ایک غلام طنبورہ بجانے میں مگن تھا۔ اس نے آ کر منصور کو خبر دی، منصور نے پوچھا: ''یہ طنبورہ کیا ہوتا ہے؟''

افسر نے اس کی شکل و صورت بتائی تو منصور نے حیران ہو کر پوچھا: ''تمہیں یہ کیسے پتا چلا؟''

افسر نے کہا: ''میں خراسان گیا تھا تو وہاں یہ چیز دیکھی تھی۔''

منصور اسی وقت اس افسر کے ساتھ وہاں پہنچا جہاں غلام طنبورے سے دل بہلا رہا تھا۔ منصور کو دیکھ کر اس کے گرد جمع ہونے والے لوگ بھاگ گئے۔ غلام پکڑا گیا۔ منصور نے حکم دیا کہ طنبورہ اسی کے سر پر مار کر توڑا جائے۔ اس کے بعد افسر سے کہا کہ اس غلام کو فوراً بازار لے جا کر فروخت کر دو۔[3]

اصولِ حکومت، منصور کی نگاہ میں:

منصور کا کہنا تھا کہ حکمران کا تخت چار پایوں پر قائم رہتا ہے۔ اگر ان میں سے ایک پایہ بھی کمزور ہو جائے تو حکومت کمزور پڑ جاتی ہے:

پہلا پایہ: عدلیہ ہے جو اللہ کی شریعت کے نفاذ میں کسی ملامت کی پروا نہ کرے۔

دوسرا پایہ: پولیس افسران ہیں جو کمزوروں کو زور آوروں کے مقابلے میں انصاف فراہم کریں۔

تیسرا پایہ: محصولات کے افسران ہیں جو رعایا پر کسی زیادتی کے بغیر خراج وصول کریں۔

---

[1] البداية والنهاية: ۴۶۷/۱۳ [2] البداية والنهاية: ۴۶۷/۱۳

[3] تاريخ الطبري: ۶۳/۸

چوتھا پایہ: خبر رساں عملہ ہے جو سب کی خبریں صحیح صحیح پہنچائے۔ [1]

اس قول سے سیاسی امور کے بارے میں منصور کے تجربے اور عمق نظر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سیاست ایک فن:

وہ سیاست کو باقاعدہ ایک فن کے طور پر دیکھتا اور سیکھتا تھا۔ اس بارے میں وہ اپنے مخالفین تک سے استفادہ کرتا رہتا تھا۔ ایک بار اس نے ایک اموی امیر کو گرفتار کرنے کے بعد اسے جان کی امان دیتے ہوئے پوچھا: ''بنوامیہ کی حکومت کے تار و پود کیسے بکھرے؟'' اس نے جواب دیا: ''خبر رسانی کے نظام سے لاپرواہی کی وجہ سے؟''

منصور نے پوچھا: ''اثاثوں کی کونسی قسم تھی جو مصیبت میں انہیں سب سے زیادہ کام آئی؟''

اس نے کہا: ''ہیرے جواہرات!''

منصور نے سوال کیا: ''ان سے آخر تک کس نے وفاداری نبھائی؟''

افسر نے کہا: ''ان کے آزاد کردہ غلاموں نے!!''

منصور کا ارادہ تھا کہ وہ خبر رسانی کے نظام پر اپنے خاندان کے لوگوں کو تعینات کرے گا مگر اس گفتگو کے بعد اس نے یہ شعبہ اپنے موالی کے حوالے کر دیا۔ [2]

ذہانت اور حساسیت:

اس کی ذہانت کا اندازہ لگانے کے لیے یہ واقعہ کافی ہے کہ جب وہ خلیفہ بننے کے بعد پہلی بار مدینہ منورہ گیا تو شہر کو بدلا ہوا پایا۔ اس نے اپنے حاجب ربیع سے کہا: ''مجھے کوئی ایسا شخص ڈھونڈ کر لا دو جو مجھے شہر کے گلی کوچوں کا تعارف کرائے کہ میں ایک مدت بعد یہاں آیا ہوں۔'' ربیع مدینہ کے ایک ہوشیار نوجوان کو لے آیا جو شہر کے چپے چپے کی تاریخ کا حافظ تھا۔ منصور اس کی رہنمائی میں مدینہ میں گھومتا پھرتا تھا۔ نوجوان آداب شاہی سے پوری طرح واقف تھا۔ بولنے میں پہل نہیں کرتا تھا۔ منصور خود کسی جگہ کے بارے میں پوچھتا تو وہ بڑے عمدہ انداز میں معلومات دیتا۔ منصور نے خوش ہو کر حاجب کو کہا کہ اسے انعام سے نوازنا۔ حاجب کو حکم کی تعمیل میں دیر ہو گئی۔ کچھ دن گزر گئے۔ ایک دن ایک محلے کی سیر کراتے ہوئے نوجوان نے ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے از خود کہا:

''امیر المؤمنین! یہ وہ گھر ہے جس کے بارے میں احوص شاعر کہہ گیا ہے:

يَـا بَيْـتَ عَـاتِـكَـةَ الَّتِـي أَتَـغَـزَّلُ ۔۔۔ حَـذَرَ الْـعِـدٰى وَبِـهِ الْـفُـؤَادُ مُـوَكَّـلُ

''اے عاتکہ کے وہ گھر جس سے میں دشمنوں کے ڈر کے باعث جدا ہو گیا ہوں..... مگر دل اسی میں اٹکا ہوا ہے۔''

إِنِّـي لَأَمْـنَـحُـكَ الـصُّـدُوْدَ وَإِنَّـنِـي ۔۔۔ قَـسَـمًـا إِلَيْـكَ مَـعَ الـصُّـدُوْدِ لَأَمْـيَـلُ

''میں تجھ سے قطع تعلق کا عزم کرتا ہوں مگر بخدا اس کے باوجود میں تیری طرف ہی مائل ہوں۔''

---

[1] تاريخ الطبري: ٨/٦٧

[2] تاريخ الطبري: ٨/٨٠

بات معمولی تھی مگر منصور سوچنے لگا کہ آج اس نوجوان نے عادت کے خلاف بولنے میں پہل کیوں کی۔ اس نے احوص شاعر کی یہ پوری نظم دل ہی دل میں دہرانا شروع کی اور ایک ایک شعر پر غور کرتا رہا۔ آخر یہ شعر سامنے آگیا:

وَاَرَاكَ تَفْعَلُ مَاتَقُوْلُ وَبَعْضُهُمْ مَذِقُ اللِّسَانِ يَقُوْلُ مَالَا يَفْعَلُ

''میں دیکھتا ہوں کہ آپ جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں مگر بعض لوگ زبان کا مزا لیتے ہیں۔ جو کہتے ہیں کرتے نہیں۔''

منصور یہ پڑھتے ہی چونکا اور ربیع حاجب سے کہا:

''ارے! تم نے اس نوجوان کو وہ انعام دیا جس کا میں نے وعدہ کیا تھا۔''

ربیع شرمندہ ہو کر بولا: ''کسی وجہ سے دیر ہوگئی۔'' منصور نے نوجوان کو فوراً دوگنی رقم دلوادی۔[1]

اس سے منصور کے ذہن کی تیزی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہزاروں مسائل کے بوجھ، ہر آن نت نئی مصروفیات اور ہنگاموں کے باوجود ایک معمولی سی بات پر اتنی گہرائی سے غور کر کے فوراً صحیح نتیجہ نکال لینا نہایت کمال کی بات ہے۔

حسرتِ نایافت:

منصور کی زندگی کے ابتدائی پچیس تیس سال حدیث کے ایک طالب علم کے طور پر گزرے تھے اور اس وقت شاید اس کے ذہن میں بھی نہ تھا کہ اسے کل اتنی بڑی حکومت کی ذمہ داری ملے گی۔ اس وقت اس کی تمنا ایک محدث بننے کی تھی۔ مگر میدانِ سیاست میں اترنے کے بعد اسے علمی خدمات کا موقع مل سکتا تھا نہ ملا۔ تاہم اس کی وہ تمنا اب بھی باقی تھی۔ ایک بار دنیا کے اس سب سے بڑے حکمران سے پوچھا گیا:

''کیا دنیا کی کوئی لذت اب بھی ایسی ہے جس سے آپ محروم ہیں؟''

کہنے لگا: ''ہاں! ایک بات کے سوا کوئی تمنا باقی نہیں؟'' پوچھا گیا: ''وہ کیا؟''

بولا: ''یہ آرزو کہ طلبا اپنے استاذ کی طرح مجھ سے حدیث نقل کیا کریں؟''

یہ سنتے ہی امراء اور وزراء جلدی جلدی ارد گرد جمع ہو گئے اور طلبہ کی طرح حلقہ بنا کر کہنے لگے:

''امیر المؤمنین! ہمیں حدیث املاء کرادیں!!'' منصور نے ایک نگاہ ان پر ڈالی اور بولا:

لَسْتُمْ بِهِمْ! اِنَّمَا هُمُ الدَّنِسَةُ ثِيَابُهُمْ، اَلْمُشَقَّقَةُ اَرْجُلُهُمْ، اَلطَّوِيْلَةُ شُعُوْرُهُمْ، بُرُدُ الْآفَاقِ، وَنَقَلَةُ الْحَدِيْثِ.

''تم ویسے کہاں! حدیث کے طلبہ وہ ہوتے ہیں جن کے کپڑے میلے ہوں، پاؤں پھٹ چکے ہوں، بال بڑھ چکے ہوں، دور دراز کا سفر کر کے آئے ہوں اور حدیث نقل کرتے ہوں۔''[2]

---

[1] وفيات الاعيان: ۲/۲۹۷

[2] البداية والنهاية: ۱۳/۴۶۸ :سنة ۱۵۸ھ

علمی کارنامے:

منصور کے دور میں بغداد علوم وفنون کا ایسا مرکز بنا جہاں ہر شعبے کے استاد جمع تھے۔ ان میں غیر ملکی زبانوں کے ماہرین بھی تھے۔ حکومت ان سب کی سرپرستی کرتی تھی۔ اس دور میں دیگر اقوام کی بعض مشہور کتب کے عربی میں تراجم ہوئے مثلاً حکیم ابن المقفع نے فارسی قصوں کی مشہور کتاب "کلیلة و دمنة" کو عربی میں ڈھالا۔ اسی طرح ہندوستان کی تاریخ پر ایک کتاب کا ترجمہ "کتاب السند والہند" کے نام سے کیا گیا۔ ریاضی میں اقلیدس کی مشہور تصنیف کا ترجمہ ہوا۔ اس دور کے مشہور طبیب حنین بن اسحٰق نے بقراط اور جالینوس کی بعض طبی کتب کو عربی کا جامہ پہنایا۔[1]

منصور اور عبدالملک میں مشابہت:

منصور کئی اعتبار سے عبدالملک اموی سے خاصا مشابہ معلوم ہوتا ہے، مثلاً:

1. عبدالملک بھی بنو مروان کا دوسرا حکمران تھا۔ منصور بنو عباس کا دوسرا حکمران تھا۔
2. عبدالملک بھی عالم فاضل اور حدیث کا ماہر تھا۔ منصور بھی عالم فاضل اور حدیث کا ماہر تھا۔
3. عبدالملک نے ہر مخالف قوت کو شکست دے کر بنو مروان کی ہچکولے کھاتی ہوئی حکومت کو قائم اور مستحکم کر دیا۔
منصور نے بھی ہر مخالف کو کچل کر بنو عباس کے پائے مضبوط کر دیے۔
4. عبدالملک کا مقابلہ جلیل القدر اسلامی شخصیات سے ہوا۔ جن میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور سعید بن جُبیر رحمہ اللہ علیہ جیسی ہستیاں شامل تھیں۔
منصور کا مقابلہ نفسِ زکیہ اور ابراہیم جیسی بزرگ ہستیوں سے ہوا۔
5. عبدالملک کو بھی بعض زندیق گروہوں سے پالا پڑا۔ اس نے انہیں مٹا کر دم لیا۔
منصور کو بھی بعض مرتد اور بے دین گروہوں سے سابقہ پڑا۔ اس نے انہیں فنا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔
6. عبدالملک اتنا کفایت شعار تھا کہ بخیل مشہور ہو گیا تھا۔
منصور بھی کفایت شعاری اور خرچ میں حد درجے احتیاط کی وجہ سے بخیل مشہور تھا۔
7. عبدالملک نے پہلے شام کے باغی حکمران اور پھر خلیفہ کی حیثیت سے مجموعی طور پر ۲۱ سال حکومت کی۔
منصور نے ۲۲ سال حکومت کی۔
8. عبدالملک نے اپنے دستِ راست عَمرو بن سعید کو قتل کیا۔
منصور نے اپنے دستِ راست ابو مسلم خراسانی کو مار ڈالا۔

دونوں کے اخلاق و کردار میں بڑا فرق صرف یہ دکھائی دیتا ہے کہ منصور نے لوگوں کو امان دینے کے بعد بھی بدعہدی کر کے قتل کرایا۔ جبکہ عبدالملک (عَمرو بن سعید کے معاملے کے سوا) کہیں بدعہدی کا مرتکب نہیں دکھائی دیتا۔

[1] التاریخ الاسلامی العام لعلی ابراهیم حسن، ص ۳۵۵

مستحکم حکومت کا قیام، منصور کا کارنامہ:

منصور عباسی حکومت کو ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم کر گیا کہ تقریباً ایک صدی تک دولتِ عباسیہ کی اقبال مندی اور عروج کو گہن نہ لگ سکا۔ اس کے بعد جب دورِ زوال شروع ہوا تو وہ بھی اتنا طویل تھا کہ طرح طرح کے حوادث اور بحرانوں کا سامنا کرنے کے باجود بغداد میں خلافتِ عباسیہ نے مزید چار صدیوں تک اپنا وجود کسی نہ کسی صورت میں برقرار رکھا۔

فقط اندلس ایک ایسا صوبہ تھا جو اس کے بس سے باہر رہا اور وہاں بنو امیہ نے اپنی مستحکم حکومت قائم کر لی۔ اسی طرح افریقہ میں بھی بنو عباس کی گرفت مضبوط نہ ہو سکی جس کے باعث مراکش میں خوارج صفریہ نے دولتِ بنی مدرار اور الجزائر میں خوارجِ اِباضِیّہ نے دولتِ رستمیہ قائم کر لیں۔ [1]

❖❖❖

---

[1] موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲۰۰

المہدی بن منصور

محمد بن عبداللہ

ذوالحجہ ۱۵۸ھ......تا......محرم ۱۶۹ھ

اکتوبر 775ء......تا......اگست 785ء

منصور اپنے دورِ حکومت میں تمام مخالفین کا قلع قمع کر گیا تھا؛ اس لیے اس کے ولی عہد مہدی کو ایک مضبوط و مستحکم مملکت کی سربراہی نصیب ہوئی۔ مہدی نے گیارہ برس تک حکومت کی اور اس دوران رومیوں سے جنگوں کے سوا، ہر طرف امن وامان ہی رہا۔ مہدی کی ولادت ۱۲۱ھ میں ہوئی تھی۔ منصور نے اس کا نام اس امید پر محمد رکھا کہ شاید یہی وہ محمد بن عبداللہ یعنی مہدی ہو جس کا ذکر بعض احادیث میں آیا ہے۔ (منصور کا اصل نام عبداللہ تھا)۔ اس کی امید تو پوری نہ ہوئی البتہ بیٹا مہدی کے لقب سے مشہور ہو گیا۔[1]

اخلاق وکردار:

مہدی عالم فاضل آدمی تھا، قرآن مجید اور حدیث کا علم بڑی توجہ سے حاصل کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ عربی ادب اور شعروشاعری کا بھی خاص ذوق رکھتا تھا۔ ہزاروں اشعار اسے نوکِ زباں تھے۔ اس کی مجالس میں علماء فضلاء اور ادباء وشعراء کا ہجوم رہتا تھا۔ ابوالعتاہیہ اور ابودُلامہ جیسے نامور شعراء اس کے جلیس وہم نشین تھے۔

وہ شرم وحیا، مروت ورحم دلی اور عدل وانصاف میں معروف تھا۔ لوگوں کی فریاد رسی کے لیے خود کھلی عدالت لگایا کرتا۔ مظلوم کو انصاف فراہم کرتا اور مظالم کی روک تھام کرتا۔ اس کی پرہیزگاری کا یہ حال تھا کہ نبیذ کو بھی ہاتھ نہ لگاتا تھا حالانکہ اموی اور عباسی درباروں میں نبیذ نوشی معروف چیز تھی۔[2] اس کی خدا خوفی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار شدید آندھی آئی۔ مہدی یہ دیکھ کر سجدے میں گر پڑا اور گڑگڑا کر دعا کرنے لگا: ''الٰہی! امتِ محمدیہ کی حفاظت فرما۔ الٰہی! دشمن قوموں کو ہم پر خوش ہونے کا موقع نہ دے۔ الٰہی! اگر میرے گناہوں کی وجہ سے یہ پکڑ آئی ہے تو میری پیشانی حاضر ہے۔'' کچھ ہی دیر میں مطلع صاف ہو گیا اور آندھی کا نام ونشان بھی نہ رہا۔[3]

[1] البداية والنهاية: ۵۴۱/۱۳

[2] تاریخ یعقوبی: ۲۷۰ تا ۲۷۳؛ المختصر فی اخبار البشر: ۸/۲ تا ۱۰؛ تاریخ الخلفاء، ص ۲۰۱ تا ۲۰۶

[3] تاریخ الطبری: ۱۷۵/۸

وہ عفو ودرگزر کا عادی، دوراندیش اور عوام کا نفسیات شناس تھا۔ مصلحتاً لوگوں کی غلطیوں ہی نہیں، مکاریوں سے بھی درگزر کر جاتا تھا۔ ایک بار ایک شخص نے یہ کہہ کر اسے ایک جوتا ہدیہ کیا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا جوتا ہے۔ مہدی نے اسے چوما، آنکھوں سے لگایا اور اس شخص کو دس ہزار درہم دے کر رخصت کیا۔ بعد میں اپنے ہم نشینوں سے کہا:

''جانتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس جوتے کو پہنا تو درکنار، دیکھا تک نہیں ہوگا۔ مگر میں اس شخص کو مایوس لوٹا دیتا تو یہ لوگوں میں کہتا پھرتا کہ میں نے خلیفہ کو نعلین مبارک پیش کیے، انہوں نے قبول نہیں کیے۔ اکثر لوگ اس کی بات پر یقین کر لیتے؛ کیوں کہ عوام طاقتور کے خلاف کمزور سے ہمدردی رکھتے ہیں اور ایسی باتوں کو فوراً مان لیتے ہیں۔ ہم نے دس ہزار دے کر اس کی زبان بند کر دی تو یہ نفع کی بات ہوئی۔''[1]

اندازِ سیاست

بنوامیہ کے آخری اور بنوعباس کے ابتدائی خلفاء کے حالات میں دوستوں کو بھی دشمن بنانے کی مثالیں ملتی ہیں مگر مہدی کا اندازِ سیاست دشمنوں کو بھی دوست بنانے کا تھا۔ سفاح اور منصور کے دور میں بنوامیہ اور بنوفاطمہ کے سرکردہ امراء اور ان کے وفاداروں کو بے دریغ جیلوں میں بھرا گیا تھا۔ مہدی نے اس کے برعکس جیل خانوں کے دروازے کھول دیے۔ خراسان کے نامور اموی امیر نصر بن سیار کے کاتب داؤد کے لڑکے جیل میں تھے۔ مہدی نے انہیں آزاد کر دیا اور ان میں سے ایک قابل فرد یعقوب بن داؤد کو دولتِ عباسیہ کا وزیر بنا دیا۔ نفسِ زکیہ کے بھائی ابراہیم منصور کے خلاف جنگ میں قتل ہوئے تھے۔ ان کے بیٹے بھی جیل میں تھے۔ منصور نے انہیں بھی رہا کر دیا اور ان میں سے حسن بن ابراہیم کو نہ صرف اپنا مقرب بنایا بلکہ اپنا بھائی قرار دے دیا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پوتے ابومحمد حسن بن زید بھی منصور کے دور سے جیل میں تھے۔ مہدی نے انہیں بھی رہا کر کے اپنا ہم نشین بنالیا۔ وہ ۸۵ سال کی عمر پا کر ۱۶۸ھ میں فوت ہوئے۔ اس وقت وہ مہدی کے ہمراہ مکہ کے سفر پر جا رہے تھے۔

اس حسن سلوک سے مہدی نے بنوامیہ اور بنوفاطمہ دونوں خانوادوں کے دل جیت لیے۔[2]

خَیزُران اور مُریہ بنت مروان...... انسانی ہمدردی کا ایک سبق آموز واقعہ:

مہدی کی سیرت اور حسن سلوک کے ذیل میں اس کی بیگم خَیزُران اور ایک اموی شہزادی مُریہ کا واقعہ بڑا سبق آموز ہے۔ خَیزُران ایک باندی تھی جو اپنی خوبیوں کی بدولت مہدی کے دل میں گھر کر گئی تھی۔ خلیفہ بننے کے دوسرے سال مہدی نے اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیا تھا۔ وہ مہدی کے دونوں بیٹوں: ہارون اور ہادی کی ماں تھی۔[3]

یہی ملکہ خَیزُران ایک دن زنانہ محل کے صحن میں تخت پر براجمان تھی۔ دائیں بائیں قالین بچھے تھے جن پر شہزادیاں

① البداية والنهاية: ۵۴۴/۱۳ سنة ۱۶۹ھ

② الكامل في التاريخ: سنة ۱۶۶ھ؛ البداية والنهاية: سنة ۱۵۹ھ؛ العبر في خبر من غبر: ۱۹۴/۱

③ تاريخ الطبري: ۱۲۱/۸

تکیے لگائے بیٹھی تھیں۔ کنارے پر باندیاں دست بستہ کھڑی تھیں۔ اتنے میں دروازے پر ایک مفلوک الحال عورت آئی اور خیزران سے ملاقات کی اجازت مانگی۔ محل کی خادمہ نے نام پوچھا تو اس نے کہا ملکہ ہی کو بتا سکتی ہوں۔ خیزران نے اسے اندر بلوایا۔ بوسیدہ کپڑے پہنے ایک خوش شکل اور باوقار عورت اندر داخل ہوئی، وہ قالین کے کنارے پر آ کر رک گئی، نحیف سی آواز میں سلام کیا اور بولی: "اے زوجۂ امیر المؤمنین! میرا نام مُزنیہ ہے۔ آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد کی بیٹی ہوں۔ گردشِ ایام نے تباہ کیا اور اس حال کو پہنچی۔ آج کوئی نہیں جو میری پردہ پوشی کرے۔"

یہ سن کر خیزران کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر ساتھ بیٹھی ایک شہزادی زینب بنت سلیمان کو پرانی تلخ باتیں یاد آ گئیں، اس نے جلدی سے خیزران کو کہا:

"زوجۂ امیر المؤمنین! اللہ نہ کرے کہ آپ اس کے بارے میں رحم دلی برتیں۔"

پھر اس نے مُزنیہ کو ڈانٹ کر کہا:

"اچھا تو تم وہی مُزنیہ ہو۔ اللہ تمہارا بھلا نہ کرے۔ تم ہمیشہ اسی حال میں رہو جس میں ہو۔ شکر ہے اللہ کا اس نے تمہاری نعمت چھینی، تمہیں رسوا کیا۔ بھول گئیں کہ حران میں ہم تمہارے پاس آئی تھیں، تم اسی طرح قالینوں پر باندیوں اور سہیلیوں کے جمگھٹے میں بیٹھی تھیں۔ میں نے گڑگڑا کر فریاد کی تھی کہ تم امام ابراہیم بن محمد [1] کی لاش خلیفہ مروان سے ہمیں دلوا دو کہ اسے نوچا کھسوٹا نہ جائے، کفن دفن کے لیے ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ اس وقت تم ہم پر چڑھ دوڑی تھیں اور ہمیں برا بھلا کہہ کر گھر سے نکال باہر کیا تھا۔ میں مجبور ہو کر مروان کے پاس گئی تھی۔ تمہاری بہ نسبت اس نے بہتر سلوک کیا، اس نے کہا کہ مجھے اپنے چچازاد کی موت کا افسوس ہے اور اس کی لاش کی بے حرمتی میرے حکم سے نہیں ہوئی اور بھلا میں اپنے چچازاد کی نعش کی توہین کیسے کر سکتا تھا۔ پھر اس نے مجھے اختیار دیا کہ چاہوں تو وہیں کفن دفن کرا دوں، چاہوں تو لاش کو ساتھ لے جاؤں، میں نے لاش کو ساتھ لے جانا پسند کیا اور مروان نے اسے ساتھ بھیجنے کا انتظام کرا دیا۔ اس دن جو سلوک تم نے کیا، اس کے بدلے آج تم بھی اسی طرح نکل جاؤ!"

یہ سن کر مُزنیہ تلخ انداز میں ہنس دی اور بولی:

"بنت سلیمان! شاید تمہیں میرے جیسی بدسلوکی اپنانا اچھا لگا۔ بھتیجی! تم نے میرے انجام میں کون سی بھلائی دیکھی جو آج چاہتی ہو کہ تمہارے ساتھ بھی اللہ ویسا ہی کرے جیسا میرے ساتھ کیا۔ میں نے تمہارے گھرانے کے ساتھ جو کچھ کیا، اس کے بدلے آج اللہ نے مجھے ذلیل و خوار کر کے تمہارے دروازے پر لا کھڑا کیا ہے۔ اللہ نے تمہیں مجھ پر فوقیت دے کر جو احسان کیا ہے، کیا اس کا شکر تم اس طرح ادا کرو گی؟"

پھر وہ ملکہ خیزران کی طرف دیکھ کر گویا ہوئی: "زینب نے جو کچھ کہا سچ کہا، میرے اسی سلوک نے میری یہ حالت کی ہے۔ خوش بخت ہے وہ جو دوسرے سے عبرت حاصل کرے۔"

[1] عباسی دعوت کے پیشوا، سفاح کے بڑے بھائی جو آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد کے دور میں خروج کی تیاری کے باعث قتل کیے گئے تھے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد مُریّہ السلام علیکم کہہ کر واپسی کے لیے مڑ گئی۔ ملکہ خیزران سے برداشت نہ ہوا، اس نے شہزادی زینب کو ڈانٹ کر کہا: ''تمہیں کچھ کہنے کا حق نہ تھا، یہ مجھ سے ملنے آئی تھی۔''

یہ کہہ کر وہ مُریّہ کی طرف لپکی کہ اسے گلے لگائے۔ مگر مُریّہ نے پیچھے ہٹ کر کہا: ''میری حالت اس قابل نہیں۔''

ملکہ خیزران نے باندیوں کو حکم دیا کہ اسے غسل خانے میں لے جائیں۔ باندیاں کچھ دیر میں اسے نہلا دھلا کر بنا سنوار کر نئے لباس میں لے آئیں۔ خیزران نے اسے گلے سے لگایا اور ساتھ تخت پر بٹھایا۔ اتنے میں دسترخوان لگا دیا گیا۔ خیزران نے اسے اچھی طرح کھلایا پلایا۔ پھر پوچھا: ''پیچھے تمہارے گھر میں کون ہے؟''

بولی: ''اللہ کے سوا کوئی نہیں، روئے زمین پر کوئی عزیز رشتہ دار نہیں۔''

خیزران نے فوراً کہا: ''تو میرے ساتھ چلو! محل کی جو کوٹھی چاہو پسند کرلو۔ جب تک زندہ ہیں ساتھ رہیں گے۔''

خیزران مُریّہ کو ساتھ لے گئی۔ جو کوٹھی اسے اچھی لگی، تمام ساز وسامان کے ساتھ اس کے نام کر دی، ایک خطیر رقم بھی دے دی۔ مہدی دربار سے لوٹا تو یہ قصہ سن کر خیزران سے خوش ہوا اور شہزادی زینب کو ملامت کرتے ہوئے بولا:

''اللہ سے ڈرو! اس کی نعمتوں کا شکر کیا ایسے ادا کیا جاتا ہے؟ اگر میرے دل میں تمہاری عزت نہ ہوتی تو عمر بھر تم سے بات نہ کرتا۔'' پھر خادم کے ہاتھ مُریّہ کے لیے دراہم کی سو تھیلیاں بھیجیں اور ساتھ یہ پیغام دیا:

''آپ کی یہاں تشریف آوری سے مجھے اس قدر خوشی ہوئی ہے کہ پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ میں آپ کا بھائی ہوں، آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو فوراً کہیے گا، اسے پورا کرنا میری ذمہ داری ہے۔''[1]

حضرت موسیٰ کاظم رحمہ اللہ کا اکرام:

عباسیوں اور بنو فاطمہ کی کش مکش میں شک وشبے کی بناء پر جو لوگ گرفتار کیے گئے تھے، ان میں حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کے صاحبزادے موسیٰ بن جعفر رحمہ اللہ (۱۲۸ھ۔۱۹۰ھ) بھی تھے جو ''موسیٰ کاظم'' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ مہدی ایک بار نماز پڑھ رہا تھا کہ قرأت میں یہ آیت زبان پر آ گئی:

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ

(پس کیا امکان ہے کہ اگر تمہیں حکومت مل جائے تو تم زمین میں فساد مچاؤ اور رشتے داریاں توڑو؟)[2]

مہدی لرز گیا اور سلام پھیر کر فوراً موسیٰ کاظم رحمہ اللہ کو جیل خانے سے بلوایا اور یہ وعدہ لے کر کہ وہ کبھی خروج نہیں کریں گے، عزت واحترام کے ساتھ رہا کر دیا۔ موسیٰ کاظم رحمہ اللہ عمر بھر عباسیوں کے ہاں معزز اور محترم رہے۔[3]

✧ ✧ ✧

① تاریخ دمشق: ۱۲۶/۷۰
② سورۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آیت: ۲۲
③ تاریخ الطبری: ۱۷۷/۸

بیرونی مہمات......رومیوں سے معرکے

مہدی کا دور پرسکون تھا۔ وہ خود بھی مزاج کے لحاظ سے خانہ جنگی اور خونریزی سے نفرت کرتا تھا؛ اس لیے اس نے بیرونی سیاست میں عدم مداخلت کی پالیسی اپنائی۔ اندلس میں قائم شدہ امویوں کی نئی متوازی اسلامی مملکت کو اس نے بالکل نہ چھیڑا۔ ویسے بھی امرائے اندلس نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا تھا بلکہ وہ صرف ''امیر'' کہلاتے تھے۔

تاہم علم وفضل اور اخلاقِ عالیہ سے آراستگی کا مطلب بزدلی نہیں؛ اس لیے مہدی شمشیر زن بھی تھا۔ اس کے دور میں رومیوں کے خلاف جہاد جاری رہا۔ رومیوں نے منصور کے دور میں عالمِ اسلام پر بحری اور بری حملے شروع کر دیے تھے، جن کی روک تھام کے لیے ہر سال صائفہ لشکر سرحدوں پر بھیجے جاتے تھے۔

مہدی کی خلافت کے تیسرے سال ۱۶۱ھ میں رومی جرنیل میخائیل پیٹرک نے شمالی شام اور ایشیائے کوچک کے ساحلوں پر دھاوا بول دیا اور کئی اہم چوکیوں پر قابض ہوگیا۔ [1]

عباس بن محمد اور سالم برنسی یکے بعد دیگرے اس کے مقابلے میں گئے مگر رومیوں کی تاخت وتاراج رکنے میں نہ آئی۔ ثمامہ بن ولید نے دابق تک فوج کشی کی مگر رومیوں کے آگے کوئی پیش نہ گئی۔ [2]

۱۶۲ھ میں حسن بن قَحطَبہ جیسا تجربہ کار امیر اس مہم پر مامور ہوا، اس نے ۸۰ ہزار پیشہ ور سپاہیوں کو لے کر میخائیل کا تعاقب کیا۔ رومیوں کو پسپا ہونا پڑا۔ ان کی بہت سی چوکیاں فتح اور بکثرت سپاہی گرفتار ہوئے۔ تاہم ان کا زور پوری طرح نہ ٹوٹ سکا۔ [3]

آخرکار اگلے سال (۱۶۳ھ میں) مہدی نے ایک عظیم لشکر تیار کیا اور بغداد میں شہزادہ موسیٰ الہادی کو نائب بنا کر بذاتِ خود لشکر کے ساتھ ایشیائے کوچک کی سرحدوں تک یلغار کی۔ یہاں آرمینیا میں ایک نئے شہر ''مہدیہ'' کی بنیاد رکھتے ہوئے اس نے فوج کو اپنے بیٹے ہارون الرشید کی کمان میں آگے بڑھایا۔ ہارون الرشید نے رومیوں پر متواتر حملے کیے اور کئی معرکوں میں انہیں شکستِ فاش دی۔ آخرکار رومیوں نے کئی شرائط منظور کرتے ہوئے صلح کر لی۔

تاہم ہارون کی واپسی کے بعد رومیوں نے شرائطِ صلح پس پشت ڈال دیں اور میخائیل نے ۹۰ ہزار سپاہیوں کے ساتھ اسلامی سرحدوں پر بہت بڑا حملہ کیا۔ اِدھر سے عباسی سالار عبدالکبیر مقابلے کے لیے نکلا مگر اتنے بڑے لشکر کے سامنے ثابت قدمی کا مظاہرہ نہ کر پایا۔ جب وہ شکست کی خبر کے ساتھ بغداد واپس پہنچا تو مہدی کو اپنی نرم خوئی کے

---

[1] تاریخ خلیفه بن خیاط، ص ۴۳۶
[2] البدایة والنهایة: سنة ۱۶۱ھ؛ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ۴۳۷
[3] البدایة والنهایة: سنة ۱۶۲ھ

باوجود اتنا غصہ آیا کہ اسے قتل کرنے کا تہیہ کر لیا تاہم مصاحبین کی سفارش پر اس کی جاں بخشی ہوگئی۔

مہدی نے اس کے بعد ہارون الرشید کی قیادت میں ایک غیر معمولی لشکر سرحدوں پر بھیجا جس میں تقریباً ایک لاکھ سپاہی تھے۔ اس جنگ کی تیاری پر دولاکھ طلائی دینار اور ایک کروڑ چودہ لاکھ درہم خرچ کیے گئے۔ (آج کل کے لحاظ سے یہ تین ارب ۳۵ کروڑ روپے بنتے ہیں)

یہ لشکرِ جرار ایشیائے کوچک میں رومیوں کی چوکیوں کو روندتا چلا گیا اور انہیں جگہ جگہ شکست دی۔ ان لڑائیوں میں ۴۵ ہزار رومی قتل اور پانچ ہزار سے زائد گرفتار ہوئے۔ فتوحات پاتے ہوئے لشکرِ اسلام خلیج قُسطَنطِینیہ تک پہنچ گیا۔ اس وقت قُسطَنطِینیہ میں قیصر لیون بن قسطنطین مر چکا تھا اور اس کی بیوہ "رینی" حکمرانی کر رہی تھی۔ اس نے پایۂ تخت کے سقوط کا خطرہ سامنے دیکھا تو ستر ہزار دینار سالانہ کی ادائیگی پر مسلمانوں سے صلح کر لی۔ یہ ۱۶۵ھ کا واقعہ ہے۔

ایک سال بعد ہارون الرشید کی فاتحانہ واپسی ہوئی تو عالمِ اسلام میں بڑی خوشی منائی گئی اور ہر طرف امن وامان کا دور دورہ ہوگیا۔ ①

زندقہ کا فتنہ اور مہدی کا کردار

مہدی کا دور اندرونی بغاوتوں سے محفوظ گزرا تاہم اسے نظریاتی اور فکری محاذ پر اٹھنے والے زندقہ اور لادینیت کے فتنے سے نبرد آزما ہونا پڑا جو عباسی دور کے خطرناک ترین فتنوں میں سے ایک تھا۔

اس طوفان کے کچھ تھپیڑے منصور نے بھی برداشت کیے تھے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ لادینیت اور زندقہ کی تحریک بعض عجمیوں نے اسلام کے خلاف اس لیے چھیڑی تھی کہ یہ ان عربوں کا لایا ہوا دین تھا جن کو وہ ہمیشہ سے حقیر سمجھتے تھے۔ ابومسلم خراسانی کی پر فریب دعوت اور اسلام کے غلط تعارف کے علاوہ جہم بن صفوان جیسے عقل پرستوں کے افکار نے ایسی لادین تحریکوں کی آبیاری کی۔

مقنع کا فتنہ:

مہدی کے دور کا سب سے بڑا زندیق "مُقنّع" تھا۔ یہ ایک خراسانی شخص تھا جو یک چشم اور نہایت بدصورت تھا، اپنی بدروئی کو چھپانے کے لیے وہ سونے کا نقاب استعمال کرتا تھا؛ اس لیے مُقنّع کہلایا۔ وہ خراسان کے ایک دور افتادہ علاقے "کش" کے ایک قلعے میں رہتا تھا۔ لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے اس نے ایک مصنوعی چاند بنایا تھا جو دو ماہ کی مسافت سے دکھائی دیتا تھا۔ یہ چاند شام کو ایک کنویں سے طلوع ہوتا اور صبح اسی میں غائب ہو جاتا۔

مؤرخین کے مطابق وہ جادوگر تھا اور یہ چاند اس کی ساحری کا ایک کرشمہ تھا۔ ایک خیال یہ ہے کہ مُقنّع سائنسدان تھا اور یہ اس کا ایک سائنسی کھیل تھا۔ بہرکیف اس کرشمے کو دیکھ کر جاہلوں کی بہت بڑی تعداد اس کی معتقد بن گئی۔ ان

① البدایة والنهایة: سنة ۱۶۳ھ، ۱۶٤ھ، ۱۶۵ھ؛ تاریخ خلیفه بن خیاط: سنة ۱۶۳ھ، ۱۶٤ھ، ۱۶۵ھ

کی عقیدت سے فائدہ اٹھا کر مُقنّع نے ابو مسلم خراسانی کو حضور ﷺ سے بھی افضل قرار دے دیا (نعوذ باللہ) اور ہندوؤں کی طرح خدا کے بندوں میں حلول کر جانے کا نظریہ پیش کیا۔ اس کا کہنا تھا: ''اللہ تعالیٰ آدم کو پیدا کرنے کے بعد ان کے بدن میں حلول کر گیا تھا۔ پھر وہ یکے بعد دیگرے حضرت نوح علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں میں حلول کرتے کرتے ابو مسلم خراسانی کے جسم میں ظاہر ہوا۔ اب وہ میرے بدن میں سرایت کر چکا ہے۔ (نعوذ باللہ)''

چنانچہ عجمی اسے خالق مان کر اسے سجدے کرنے لگے۔

مُقنّع کا ظہور مہدی کی حکومت کے ابتدائی سالوں میں ہوا تھا۔ مہدی کے حکم سے ۱۶۳ھ میں سرکاری فوج نے اس کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ مُقنّع نے راہِ فرار مسدود دیکھی تو اپنے خاندان کی خواتین سمیت زہر پھانک کر خودکشی کر لی۔ سرکاری سپاہیوں نے اس کا سر قلم کر کے مہدی کے پاس بھیج دیا۔[1]

شعوبی تحریک کا خاردار جنگل:

مگر اس قسم کے کھلم کھلا زندقہ سے کہیں زیادہ خطرناک تحریک وہ تھی جو اندر ہی اندر چل رہی تھی اور جس کا کوئی ایک متعین لیڈر نہیں تھا۔ یہ عالمِ اسلام میں جنم لینے والی ''شعوبی تحریک'' تھی جس کی بنیاد نسلی منافرت پر تھی۔ اس منافرت کے ایک حد تک ذمہ دار خود عباسی تھے؛ کیوں کہ خفیہ دعوت کے دور میں ان کے امام ابراہیم بن محمد نے تاکید کی تھی کہ عربوں کو فنا کر دیا جائے۔[2]

یہ الگ بات ہے کہ بنو عباس نے حکومت بنانے کے بعد کلیدی عہدے اپنے حامی عربوں خاص کر اپنے خاندان کو دیے مگر عرب و عجم کی منافرت کا جو بیج بویا گیا تھا، وہ بالآخر پھوٹ کر رہا اور رفتہ رفتہ ایک خاردار جنگل بن گیا جس میں مختلف الخیال لوگ شامل تھے۔ بعض صرف عربوں کو تنقید و مذمت کا نشانہ بناتے تھے، بعض اسلامی عقائد اور شرعی احکام کا بھی تمسخر اڑاتے۔ وہ اسلام سے اس لیے نالاں تھے کہ اس مذہب کو عرب لے کر آئے تھے۔ انہوں نے قدیم ایرانی فلسفیوں: مانی، مزدک اور زرتشت کی تعلیمات کو زندہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ الجاحظ لکھتا ہے:

> ''اکثر وہ لوگ جو اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار ہوئے، ان میں یہ بیماری شعوبیت کے ذریعے داخل ہوئی ہے، جس کی وجہ سے ایسے جھگڑے کھڑے ہوئے کہ نوبت قتل وقتال تک جا پہنچی۔ ایسے لوگ جب کسی شخص سے نفرت کرتے ہیں تو اس کے گھر والوں سے، اس کی زبان سے اور اس کے ملک سے بھی نفرت کرتے ہیں اور اس کے دشمن سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ تو رفتہ رفتہ ان کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ اسلام سے نکل گئے؛ کیوں کہ اسے لانے والے عرب تھے اور دین میں پیشوا اور نمونہ یہی حضرات ہیں۔''[3]

---

[1] البداية والنهاية: سنة ١٦٣هـ؛ المختصر في اخبار البشر: ٩/٢؛ الملل والنحل للشهرستاني: ١٥٤/١، ط مؤسسة الحلبي

[2] البداية والنهاية: ٢٤٧/١٣ تحت ١٢٩هـ

[3] الحيوان: ١٣١/٧، ط دار الكتب العلمية

مشہور ادیب اور مصنف ابوعبیدہ بصری (۱۱۲ھ۔۲۱۱ھ) اس تحریک کے بانیوں میں سے تھا جس نے اپنی صد سالہ زندگی میں ۲۰۰ سے زائد رسائل لکھے جن میں سے کئی عربوں کی مذمت کے بارے میں تھے۔ اس کی تصنیف ''کتاب المثالب'' میں جا بجا قابلِ احترام مسلم شخصیات کی توہین ملتی ہے۔ اس کا رسالہ ''فضائل فرس'' عجمیوں کی فضیلتوں سے بھرا ہوا تھا۔ یوں اس نے مذہبی و نسلی منافرت کو عام کیا۔ یہ ابوعبیدہ دینی علوم میں اس قدر کمزور تھا کہ قرآن مجید تک تجوید سے نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اس دور کا کوئی شریف اس کی زبان اور تحریر سے محفوظ نہ تھا؛ اس لیے جب وہ مرا تو اس کے جنازے کو کاندھا دینے والا کوئی نہ تھا۔ نامور شاعر ''ابونُواس'' ابوعبیدہ کا شاگرد تھا اور کسی حد تک اسی قسم کے خیالات کا حامل تھا اگرچہ وہ زندیق نہ تھا۔[1]

عباسی دور میں اس تحریک کا مشہور ترین پیشوا ایک عجمی، علّان الشعوبی تھا جس نے عرب قبائل کی مذمت میں کئی رسالے لکھے مثلاً: مثالب قریش، مثالب فزارہ، مثالب یمن، مثالب عبدالقیس، مثالب اسد، مثالب ہذیل وغیرہ۔ ایسی کتب کی تعداد پچاس سے زائد تھی۔ اسی فہرست میں ابوحسین اصفہانی کا نام ہے جس نے ''مثالب ثقیف'' لکھی۔[2] مؤرخ ہیثم بن عدی جس نے ''مثالب ربیعہ'' لکھی، اس تحریک سے خاصا متاثر تھا۔[3]

یہ تو عام شعوبیوں کی کارگزاریاں تھیں جبکہ انتہا پسند قسم کے شعوبی عربوں ہی کو نہیں، اسلام کو بھی اپنے فکری حملوں کا نشانہ بناتے تھے اور اسلام کی حرام کردہ چیزوں کو حلال سمجھتے تھے۔ مہدی عباسی کے درباری قاضی شریک کا کہنا تھا:

''شراب نوشی، زناکاری اور رشوت ستانی زندیقیت کی کھلی علامات ہیں۔''[4]

اس دور کا ایک زندیق یزدان بن باذان شعائر اسلامیہ کا مذاق اڑاتا تھا۔ مکہ میں لوگوں کو طواف کرتے دیکھ کر کہتا تھا: ''یہ لوگ ایسے بیل معلوم ہوتے ہیں جو کھلیان میں فصل کو روند رہے ہوں۔''[5]

یونس بن ابی فروہ اس دور کا نامور شاعر و ادیب تھا۔ وہ عباسی دربار میں اتنا معزز تھا کہ منصور عباسی کے دور میں حاجب کا عہدہ اسی کے بیٹے ربیع کے پاس تھا۔ یہ یونس ذاتی زندگی میں زندیق اور شرابی تھا۔ حد یہ تھی کہ اس نے اسلام کی مذمت میں ایک کتاب لکھ کر قیصرِ روم کو بھیجی۔ اس کی زندیقیت کی شہرت عام ہوئی تو منصور نے اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی، وہ بھاگ کر مصر چلا گیا اور وہیں روپوشی کی حالت میں ۱۵۰ھ میں مر گیا۔[6]

ایسی کتب سے زندیقیت اور لادینی اثرات چند برسوں میں عراق سے شام تک پھیل چکے تھے۔ کتنے ہی لوگ تھے جنہیں گرفتار کیا گیا۔ بعض لوگوں نے اعترافِ جرم کر کے توبہ کی جیسے داؤد بن روح، اسماعیل بن سلیمان، محمد بن طیفور اور محمد بن ابی ایوب۔ انہیں چھوڑ دیا گیا۔[7] بہت سے تائب نہ ہوئے جنہیں سزائے موت دی گئی۔ زندیقوں کی

---

① الفہرست لابن ندیم: ۱/۷۶، ۷۷، ط دار المعرفة بیروت؛ ابجد العلوم للقنوجی: ۱/۵۸۱، ۵۸۲؛ کہا جاتا ہے کہ بعد میں ابونواس نے توبہ کر لی تھی۔

② الفہرست لابن ندیم: ۱/۱۳۵، ۱۳۶

③ ھدیة العارفین للبابانی: ۲/۵۱۱، ط داراحیاء التراث العربی

④ العقد الفرید: ۲/۵۲

⑤ تاریخ الطبری: ۸/۱۹۰

⑥ الرسائل للجاحظ: ۱/۱۲۷؛ الاعلام للزرکلی: ۸/۳۶۸، ۳۶۹

⑦ تاریخ الطبری: سنة ۱۶۶ھ

خانہ تلاشی پر لادینیت پر مبنی کتنی ہی کتابیں برآمد ہوئیں جنہیں مہدی نے اپنے ہاتھوں سے پارہ پارہ کیا۔ ①

عباسی دور کا ایک مؤرخ اس تحریک سے متاثر کاتبوں، ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ یہ لوگ بزرجمہر کی دانائی، اردشیر کے واقعات اور ابن مقفع کے ادب سے متاثر ہیں۔ مزدک کی کتاب کو علم کا سرچشمہ اور ''کلیلۃ ودمنہ'' کو حکمت کی دستاویز قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

''یہ لوگ ابتداء میں قرآن مجید کی ترتیب پر اعتراض کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ اس میں تناقض ہے۔ روایات وآثار کی تکذیب اور احادیث پر اعتراضات کرتے ہیں۔ اگر ان کے سامنے صحابہ کی خوبیوں کا ذکر ہو تو ان کی زبان بند ہو جاتی ہے اور وہ اس موضوع سے کترا کر گزر جاتے ہیں۔ قاضی شریح کی بات ہو تو ان پر الزامات لگاتے ہیں۔ حسن بصری کا ذکر آئے تو انہیں ناگوار گزرتا ہے۔ شعبی کی تعریف ہو تو یہ انہیں احمق قرار دیتے ہیں۔ سعید بن جبیر کو جاہل کہتے ہیں، ابراہیم نخعی کو حقیر سمجھتے ہیں۔ مگر اردشیر بابکان، نوشیروان اور آلِ ساسان کا ذکر کرتے ہوئے یہ لوگ ان کی سیاست اور تدبر کی خوب داد دیتے ہیں۔ اگر جاسوسوں کا ڈر ہو یا مسلمان ان کی ٹوہ لینے لگیں تو یہ فوراً احادیث کا ذکر کرتے ہیں اور پھر عقلی دلائل پر آجاتے ہیں، اس بحث میں قرآن مجید کی محکم آیات پر منسوخ کو ترجیح دیتے ہیں، جو چیز حواس سے غائب ہو، اس کا انکار کر دیتے ہیں، موجود چیز کو غائب سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایسا نہیں جو قرآن مجید کو راتوں کا ہم نشین بناتا ہو، تفسیر جانتا ہو، علم فقہ کو دین کا شعار سمجھتا ہو، سنن وآثار کو یاد کرتا ہو۔ اگر ان میں سے کوئی قرآن وحدیث سے واقف ہو بھی تو یہ واقفیت معمولی ہوگی اور کسی حلاوت کے بغیر۔ اگر ان میں سے کوئی احادیث جمع کرنے اور فقہی کتب پڑھنے لگے تو اس کے ساتھیوں کو ناگوار گزرتا ہے، وہ اسے بیمار سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب یہ معاشی لحاظ سے برباد ہو کر رہے گا۔'' ②

زنادقہ کی سرکوبی کے لیے مستقل محکمے کا قیام:

مہدی شعوبی تحریک اور زندقہ کے یہ خوفناک نتائج دیکھ کر سخت فکر مند تھا۔ اس نے اس فتنے کے استیصال میں اپنے طور پر کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس نے عمر کلواذی نامی امیر کی سرکردگی میں ایک مستقل محکمہ قائم کر دیا تھا جس کا کام ایسے بے دینوں کا سراغ لگانا اور انہیں سزا دینا تھا۔ جب اس محکمے نے کام شروع کیا تو خود مہدی کے اپنے کاتب یزید بن فیض کے خلاف بھی ایسے ثبوت ملے۔ جب اسے گرفتار کر کے پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے ان نظریات کا اعتراف کیا، اسے جیل میں ڈال دیا گیا جہاں سے وہ بھاگ نکلا اور پھر کبھی ہاتھ نہ آیا۔ ③

یعقوب بن فضل نامی ایک شخص اتنا بڑا زندیق تھا کہ اپنی بیٹی سے جنسی ہوس پوری کرتا تھا۔ اسے مہدی کے سامنے لایا گیا تو اس نے کہا: ''میں صرف آپ کے سامنے ان باتوں کا اقرار کر رہا ہوں۔ لیکن اگر آپ مجمع عام میں مجھ سے اعتراف کرانا چاہیں تو میں کبھی نہیں کروں گا چاہے میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں۔''

① تاریخ الطبری: سنۃ ۱۶۳ھ ② الرسائل للجاحظ، ص ۱۹۲ تا ۱۹۴ ③ تاریخ الطبری: ۱۶۵/۸ تحت ۱۶۷ھ

مہدی نے کہا: ''تجھے شرم آنی چاہیے۔ اگر تیری خاطر آسمان کے دروازے کھل جاتے تب بھی تجھے اسی دین پر جے رہنا چاہیے تھا جو حضرت محمد ﷺ لے کر آئے ہیں۔''

مہدی نے اسے توبہ کا موقع دیتے ہوئے جیل میں ڈال دیا اور ہادی کو تاکید کر دی کہ اگر یہ توبہ نہ کرے تو اسے زندہ نہ چھوڑنا۔ ہادی نے اپنے دورِ خلافت میں اسے سزائے موت دے دی۔ ①

زنادقہ کی اس پکڑ دھکڑ میں بعض مشکوک اور بعض بے قصور لوگ بھی نشانہ بنے تھے؛ کیوں کہ ایسے لوگوں کو شک وشبہے کی بناء پر گرفتار کر لیا جاتا تھا اور بعض اوقات پختہ ثبوت نہ ہوتے ہوئے بھی انہیں سزا دے دی جاتی تھی۔

ایسے لوگوں میں سے ایک مادر زاد نابینا شاعر بشار بن بُرد تھا جسے ۱۶۷ھ میں سزائے موت دی گئی، اس کی عمر ۹۰ سال سے زائد تھی۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ وہ زندیق نہیں تھا بلکہ اس نے مہدی کی ہجو کی تھی جس پر وزیروں نے بگڑ کر اسے زندیق مشہور کر دیا اور مہدی کو اس کے خلاف بھڑکا کر سزائے موت دلوا دی۔ ②

تاہم عام طور پر پختہ ثبوت کے بغیر کسی کو سزا نہیں دی جاتی تھی۔ نامور شاعر ابونُواس (۱۳۰ھ تا ۱۹۵ھ) کو جب آزاد خیالی کی وجہ سے زندیق کہا گیا تو اسے بلا کر پوچھ گچھ کی گئی اور جب اس نے اطمینان دلایا کہ وہ توحید کا قائل اور پانچوں نمازوں کا پابند ہے، حرام کو حلال کہنے والا یا زندیق نہیں، تو اسے چھوڑ دیا گیا۔ ③

اسی طرح دِعبل نامی مشہور رافضی شاعر جس کی بدزبانی اور ہجوگوئی سے دنیا تنگ تھی، بہت بڑا زندیق تھا مگر چونکہ اس کے خلاف کوئی گواہی نہ تھی؛ اس لیے کئی عباسی خلفاء کا دور گزار کر وہ ۲۴۶ھ میں فوت ہوا۔ دِعبل کہتا تھا:

''پچاس برس سے اپنا کھمبا اُٹھائے گھوم رہا ہوں کہ کون ہے جو مجھے سولی دے۔'' ④

رفض اور زندیقیت میں خاصی مناسبت تھی۔ ابو ہاشم حِمیَری بھی ایسا ہی ایک زندیق رافضی تھا، وہ صحابہ کرام خصوصاً حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور سیدہ عائشہ صدیقہ اور سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہما کے بارے میں گستاخانہ اشعار کہتا تھا۔ بے دھڑک شراب پیتا تھا اور ہندوؤں کی طرح دوبارہ جنم لینے کا عقیدہ رکھتا تھا۔

ایک بار اس نے کسی سے قرض مانگا اور بڑے یقین سے کہا: ''اگلے جنم میں قرضہ ادا کر دوں گا۔''

اس شخص نے کہا: ''اس صورت میں دوں گا جب تم ضمانت دو کہ انسان بن کر دوبارہ جنم لو گے؛ کیوں کہ مجھے خدشہ ہے کہ تمہارا اگلا جنم کتے یا خنزیر کی شکل میں ہوگا۔''

جب اس کی موت کا وقت آیا تو چہرہ کالا سیاہ ہو گیا، اس کی رگ رگ سے اذیت کے آثار عیاں تھے۔ کبھی وہ کہتا: ''خدایا! آلِ محمد سے محبت کا یہ صلہ!''...... کبھی چیختا: ''امیر المؤمنین! اپنے عاشق سے ایسا سلوک کیوں؟'' ⑤

① تاریخ الطبری: ۱۹۰/۸ سنة ۱۶۹

② البدایة والنهایة: سنة ۱۶۷ھ؛ تاریخ بغداد: ۱۱۶/۷؛ وفیات الاعیان لابن خلکان: ۲۷۳/۱

③ البدایہ والنہایہ تحت: ۱۹۵ھ؛ الاعلام زرکلی، ۲۲۵/۲

④ تاریخ بغداد: ۳۷۹/۸ ط العلمیة؛ وفیات الاعیان: ۲۶۶/۲؛ العبر فی خبر من غبر: ۳۵۲/۱؛ الاعلام زرکلی: ۳۳۹/۲

⑤ المنتظم لابن جوزی، ص ۴۱۹

زندیقوں کے استیصال کے لیے مہدی کی وصیت:

یہ تھے اس زندیقیت کے کچھ نمونے جس کے آثار عجم میں خاص طور پر ظاہر ہو چکے تھے۔ مہدی اس فتنے سے سخت پریشان تھا؛ اسی لیے اس نے اپنے بیٹے اور ولی عہدِ مملکت موسیٰ الہادی کو وصیت کرتے ہوئے کہا:

"مانی کے پیروکاروں کی سرکوبی میں کوئی کسر نہ چھوڑنا۔ یہ لوگ پہلے عوام کو ظاہری بھلائیوں کی دعوت دیتے ہیں جیسے فواحش سے احتراز، دنیا میں زہد وقناعت اور آخرت کے لیے عمل۔ پھر انہیں تلقین کرتے ہیں کہ گوشت حرام ہے، پانی کو چھونا (غسل کرنا) ممنوع ہے، کسی بھی جاندار کو ہلاک کرنا غلط ہے۔ پھر انہیں دو خداؤں کے عقیدے کی طرف لے جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ بہنوں اور بیٹیوں سے نکاح اور پیشاب سے غسل کرنا حلال کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ بچوں کو اغوا کرتے ہیں تاکہ ان کی پرورش کر کے انہیں گمراہ کر سکیں۔"[1]

ہادی نے اس وصیت پر عمل کیا اور اپنے دور میں کئی بڑے زندیقوں کو تلاش کر کے سزائے موت دی۔[2]

تعمیری وترقیاتی کام:

مہدی اپنے باپ کے برعکس نہایت سخی اور فیاض تھا۔ اس کے دربار سے کوئی خالی ہاتھ نہ جاتا تھا۔ اسے بھرا پرا خزانہ اور امن کا زمانہ میسر آیا تھا؛ اس لیے قدرتی طور پر اس کا رخ تعمیری وترقیاتی کاموں کی طرف رہا۔ حرمین شریفین کی خدمت اور حرم مکی ومدنی کی توسیع اس کے یادگار کارنامے ہیں۔ اس زمانے تک کعبہ مسجد الحرام کے درمیان میں نہ تھا۔ مہدی نے نئے نقشے کے مطابق مسجد الحرام میں اس طرح توسیع کرائی کہ کعبہ صحن کے بالکل بیچ میں ہو گیا۔

اس وقت تک پرانے غلاف اتارے بغیر کعبہ کو نئے غلاف پہنائے جاتے تھے۔ سالہا سال سے کعبہ کی عمارت غلافوں میں دبتی چلی جا رہی تھی۔ خدشہ تھا کہ کہیں ان کے وزن سے عمارت مخدوش نہ ہو جائے۔ مہدی کو معلوم ہوا تو پرانے غلاف ہٹوا دیے اور نیا دیدہ زیب اور بیش قیمت غلاف چڑھایا۔ اس نے مسجد نبوی میں بھی توسیع کرائی، وہاں سنگ مرمر کے ستون لگائے اور آرائشی کام کرا کے اسے نہایت خوبصورت شکل دے دی۔

منصور کے دور میں تعمیر کیا گیا بغداد دریائے دجلہ کے مغرب میں تھا۔ مہدی نے دریا کے مشرقی کنارے پر نئی سرکاری رہائش گاہیں اور کوٹھیاں تعمیر کرائیں۔ نیا قصرِ خلافت بھی یہیں بنوایا گیا، اس طرح دریائے دجلہ شہر کے عین درمیان میں آ گیا اور اس سے شہر کی خوبصورتی بہت بڑھ گئی۔ تاہم اس سے ایک نقصان یہ ہوا کہ شدید بارشوں میں دریا کی طغیانی سے آبادی متاثر ہونے لگی۔

---

① تاریخ الطبری: ۸/۲۲۰ ...... مانی قدیم ایرانی دور کا ایک دجال تھا جو ساسانی بادشاہ کسریٰ شاپور کے عہد میں ظاہر ہوا تھا، اس نے ہر برائی کو جائز قرار دے دیا تھا، اس کے پیروکار انتہائی بدعقیدہ تھے۔ دوسری صدی ہجری کے بہت سے زندیق اس کے افکار باطلہ سے متاثر تھے۔

② تاریخ الطبری: ۸/۱۹۰ سنة ۱۶۹ھ

بصرہ کی جامع مسجد میں توسیعی اور آرائشی کام کرایا۔ پوری مملکت کی تمام جامع مساجد کے منبر تبدیل کرا کے نئے منبر رکھوائے اور پابندی لگائی کہ کوئی منبر مسجد نبوی کے منبر سے بلند نہ ہونے پائے۔ حاجیوں کے قافلوں کو تمام ممکنہ سہولتیں دیں، ان کے راستوں میں جگہ جگہ مسافر خانے تعمیر کرائے۔ سنگِ میل نصب کیے اور حوض بنوائے تاکہ کہیں بھی پانی لینے میں تکلیف نہ ہو۔ گزشتہ ادوار میں قیدیوں کے کھانے پینے کی ذمہ داری ان کے گھر والوں کے سر ہوتی تھی، وہ گھروں سے ان کے لیے کھانا بھیجا کرتے تھے۔ مہدی نے اسے حکومت کی ذمہ داری قرار دیا اور جیل خانوں میں ہی کھانا پکا کر قیدیوں کو مہیا کرنے کا انتظام شروع کرایا۔ کوڑھیوں اور جذام کے مریضوں کو گھر بیٹھے خرچہ بھیجنے اور ان کی ضروریات پوری کرنے کو سرکاری پالیسی کا حصہ قرار دیا۔ غرض اس نے فلاحی اور ترقیاتی کاموں میں بے دریغ خرچ کیا۔ منصور نے جو کچھ بائیس سالوں میں جمع کیا تھا، مہدی نے گیارہ سال میں وہ سب خرچ کر ڈالا۔[1]

نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک بار بیت المال کے خازن نے آکر چابیاں مہدی کے سامنے رکھ دیں اور کہا:

''ان چابیوں کی اب کیا ضرورت! بیت المال خالی ہو چکا ہے۔''

تاہم جلد ہی محصولات کی مد میں ایک بڑی رقم مزید آگئی اور خازن نے اسے بیت المال میں داخل کر لیا۔ یہ دیکھ کر مہدی نے کہا: ''جب بھی ہمیں ضرورت ہوتی ہے، اس کے مطابق مال آہی جاتا ہے۔''

خازن نے کہا: ''اگر کوئی حادثاتی ضرورت آپڑے تو آپ کے پاس محصولات کے انتظار کا وقت کہاں ہوگا۔''[2]

جانشینی:

موروثی نظام حکومت کی ایک بہت بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ تاج و تخت کے مزے لوٹنے کے بعد اکثر حکمران گزشتہ عہد و پیمان توڑ کر حکومت کو اپنے کنبے میں محدود کرنے پر تل جاتے ہیں جس سے خود حکمران خاندان میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ بنو مروان کی حکومت کو کمزور کرنے کا ایک بڑا سبب یہی تھا۔ بنو عباس بھی اسی راہ پر چل رہے تھے۔ منصور ہی کے دور سے یہ خاندانی اختلاف شروع ہو گیا تھا۔

سَفاح نے اپنے بعد اپنے بھائی منصور اور پھر اپنے چچازاد عیسیٰ بن موسیٰ کو بالترتیب جانشین بنایا تھا۔ عیسیٰ بن موسیٰ نے عباسی خلافت کے قیام اور اس کے استحکام میں جو کردار ادا کیا تھا اس کے لحاظ سے وہ بلاشبہ اس منصب کا حق دار تھا۔ مگر منصور نے سَفاح کی وصیت کے خلاف عیسیٰ بن موسیٰ کو ولی عہدی سے استعفاء دینے پر مجبور کر دیا۔ طے ہوا کہ اس کے بعد اس کا بیٹا مہدی خلیفہ ہوگا اور مہدی کے بعد عیسیٰ بن موسیٰ۔

مہدی جیسا نیک سیرت حکمران بھی اس مرض سے نہ بچ سکا۔ اس نے عیسیٰ بن موسیٰ کو ایک بار پھر ولی عہدی سے استعفاء دینے پر مجبور کیا اور اپنے دو بیٹوں: ہادی اور ہارون الرشید کو یکے بعد دیگرے ولی عہد بنا دیا۔

---

[1] تاریخ یعقوبی، ص ۲۷۰ تا ۲۷۳؛ البدایة والنهایة: ۵۴۱/۱۳ تا ۵۴۹؛ تاریخ الخلفاء، ص ۲۰۱ تا ۲۰۶، ط نزار

[2] مروج الذهب: ۱۶۹/۴، ۱۷۰، ط جامعة اللبنانیة؛ تاریخ الطبری: ۱۷۲/۸ تا ۱۸۶

عیسٰی بن موسیٰ سے طلاق کی قسمیں لی گئیں کہ وہ استعفے پر قائم رہے گا۔ یہ واقعہ ۱۶۰ھ کا ہے۔ عیسیٰ بن موسیٰ عمر بھر گوشہ نشین رہا یہاں تک کہ ۱۶۷ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔[1]

موت کا پیغام:

مشیت الٰہیہ عموماً اچھے لوگوں کو ان کے بلاوے سے پہلے کچھ اشارے دے دیا کرتی ہے تاکہ وہ آخری وقت سے پہلے معافی تلافی کر لیں۔ مہدی کے ساتھ بھی ایسا ہوا۔

وہ جائز تفریحات خصوصاً شکار کا شیدائی تھا۔ اکثر اپنے مصاحبین اور خادموں کے ساتھ جنگلات کو نکل جاتا، شکاری چیتے، کتے اور باز ساتھ ہوتے۔ دن ڈھلے واپسی ہوتی۔ اچھی طرح کھا پی کر خلوت میں قیلولہ کرتا۔ ایک دن وہ کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں جاتے ہوئے خدام کو کہہ گیا کہ کوئی ادھر کا رخ نہ کرے، جب تک میں خود نہ جاگوں کوئی نہ اٹھائے۔ لیٹا تو نیم خوابی کے عالم میں دیکھا ایک عجیب شکل کا بوڑھا کمرے کے دروازے پر کھڑا کہہ رہا ہے۔

كَأَنِّي بِهٰذَا الْقَصْرِ قَدْ بَادَ أَهْلُهُ ۔۔۔ وَأَوْحَشَ مِنْهُ رَبْعُهُ وَمَنَازِلُهُ

"گویا وہ محل میرے سامنے ہے جس میں رہنے بسنے والے مٹ چکے۔ اس کا صحن اور کوٹھیاں ویران ہو چکیں۔"

وَصَارَ عَمِيدُ الْقَوْمِ مِنْ بَعْدِ بَهْجَةٍ ۔۔۔ وَمُلْكٍ إِلَى قَبْرٍ عَلَيْهِ جَنَادِلُهُ

"قوم کا رئیس اپنے عیش و نشاط اور بادشاہت کے بعد قبر میں چلا گیا جس پر پتھر کی سلیں نصب ہیں۔"

وَلَمْ يَبْقَ إِلَّا ذِكْرُهُ وَحَدِيثُهُ ۔۔۔ يُنَادِي بِلَيْلٍ مُعْوِلَاتٍ حَلَائِلُهُ

"اس کی یادوں اور باتوں کے سوا کچھ نہیں بچا۔ رات کو اس کی خواتین بلند آواز سے اس کا ماتم کرتی ہیں۔"

تَزَوَّدْ مِنَ الدُّنْيَا فَإِنَّكَ رَاحِلٌ ۔۔۔ وَقَدْ أَزِفَ الْأَمْرُ الَّذِي بِكَ نَازِلُهُ

"دنیا سے توشہ لے لے، کیونکہ تو کوچ کرنے والا ہے...... وہ آفت قریب آچکی جو تجھ ہی پر ٹوٹے گی۔"

تَزَوَّدْ مِنَ الدُّنْيَا فَإِنَّكَ مَيِّتٌ ۔۔۔ وَإِنَّكَ مَسْئُولٌ فَمَا أَنْتَ قَائِلُهُ

"دنیا سے توشہ لے لے۔ کیونکہ تو مرنے والا ہے...... تجھ سے پوچھ گچھ ہوگی، پس تو کیا کہے گا؟"

مہدی کے منہ سے بے ساختہ نکلا:

أَقُولُ بِأَنَّ اللّٰهَ حَقٌّ شَهِدْتُهُ ۔۔۔ فَذَا لَكَ قَوْلٌ لَيْسَ تُحْصٰى فَضَائِلُهُ

"میں کہوں گا کہ اللہ برحق ہے، میں اس کا گواہ ہوں...... یہ ایسی بات ہے جس کے فضائل بے شمار ہیں۔"

بوڑھا یکدم نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ مہدی ہڑبڑا کر باہر نکلا اور خدام سے پوچھنے لگا:

"جسے میں نے دیکھا وہ تمہیں نظر آیا؟"

مگر خادموں نے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ اس پُراسرار شخص کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔[2]

[1] البداية والنهاية: سنة ۱۶۰ھ، ۱۶۷ھ

[2] البداية والنهاية: ۱۳/ ۵۵۰، ۵۵۱؛ تاریخ الطبری: ۸/ ۱۷۰ تا ۱۷۲

مہدی کی وفات:

اس واقعے کے کوئی دس دن بعد وہ شکار کھیلنے ماسبذان کی طرف نکلا جو کوفہ کے قریب صحرا کے ساتھ ایک سرسبز پہاڑی علاقہ ہے۔ یہاں شکار کے دوران وہ ایک ہرن کا پیچھا کر رہا تھا، شکاری کتے ہرن کے پیچھے تھے اور مہدی گھوڑے پر کتوں کے پیچھے سرپٹ آرہا تھا۔ ہرن ایک کھنڈر میں گھس گیا۔ مہدی بھی اس کا تعاقب کرتے ہوئے کھنڈر میں داخل ہونے لگا مگر دروازے سے ٹکرا کر شدید زخمی ہوگیا اور کچھ دیر بعد اس کی موت واقع ہوگئی۔ یہ واقعہ ۲۲ محرم ۱۶۹ھ کا ہے۔

اسے اسی شکار گاہ میں اخروٹ کے ایک درخت کے نیچے دفنا دیا گیا جو اس کی پسندیدہ نشست گاہ تھی۔ کچھ ہی عرصے بعد بارشوں اور طوفانوں نے ویرانے میں بنی اس کچی قبر کو مٹا دیا، اس پر شاعر بکار بن رباح نے بے ساختہ کہا:

أَلَا رَحْمَةُ الرَّحْمٰنِ فِيْ كُلِّ سَاعَةٍ ۔۔۔ عَلٰى رُمَّةٍ رُمَّتْ بِمَاسَبَذَانِ

''ہاں! رحمٰن کی رحمتیں ہر گھڑی ہوں...... ان ہڈیوں پر جو ماسبذان میں بے نام ونشان ہوگئیں۔''

لَقَدْ غَيَّبَ الْقَبْرُ الَّذِيْ ثَمَّ سُؤْدَدًا ۔۔۔ وَكَفَّيْنِ بِالْمَعْرُوْفِ تَبْتَدِرَانِ

''اس قبر نے ایسے شخص کو اپنے اندر چھپالیا...... جو مکمل قائد تھا اور جس کی ہتھیلیاں تیزی سے سخاوت کرتی تھیں۔''

مہدی نے ۴۳ سال عمر پائی اور دس سال سے کچھ زائد مدت تک حکومت کی۔ وہ ایک طویل القامت، گندمی رنگت اور گھنگھریالے بالوں والا باوقار انسان تھا جس کے اچھے اخلاق نے اسے ہر طبقے کا محبوب بنا دیا تھا۔[1]

❖❖❖

---

[1] البداية والنهاية: ۱۲/۵۵۱، ۵۵۲؛ تاريخ الطبري: ۸/۱۷۰ تا ۱۷۲؛ تاريخ خليفة بن خياط، ص ۴۴۳ تا ۴۴۵

الہادی بن مہدی

موسیٰ بن محمد

محرم ۱۶۹ھ......تا......ربیع الاول ۱۷۰ھ

جولائی 785ء......تا......ستمبر 786ء

مہدی کا جانشین موسیٰ ہادی ۱۴۷ھ میں پیدا ہوا تھا۔ بائیس سال کی عمر میں خلافت کی ذمہ داریاں اس پر آن پڑیں۔ اس نے اپنے باپ کی وصیت کے مطابق زنادقہ کا تعاقب جاری رکھا اور انہیں چن چن کر ختم کرنے کی کوشش کی۔ ہادی نے منصب خلافت کا رعب داب قائم رکھنے کے لیے پہلی بار محل سے باہر نکلتے ہوئے شمشیر بکف، نیزہ بردار اور تیرانداز محافظ ساتھ رکھنے کا رواج شروع کیا۔ بعد میں اکثر خلفاء اور سلاطین نے اسے معمول بنالیا۔ اس سے پہلے خلفاء معمولی انتظام کے ساتھ آیا جایا کرتے تھے۔[1]

حسین بن علی کا خروج:

ہادی کا دور بہت پرامن گزرا۔ کوئی بیرونی خطرات تھے نہ اندرونی۔ راوی ہر طرف چین ہی چین لکھتا تھا۔ البتہ اس پرامن زمانے ہی میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس کے منفی اثرات دیر تک خلافتِ عباسیہ کے لیے سوہانِ روح بنے رہے۔ ہادی کی خلافت کے آغاز پر مدینہ منورہ میں ایک فاطمی بزرگ حسین بن علی نے خروج کیا جو حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے تھے۔ ان کا نسب حسین بن علی بن حسن بن حسن بن حسن بن علی ہے۔ ہوا یہ کہ حاکم مدینہ نئے خلیفہ کو مسند نشینی کی مبارک باد دینے بغداد گیا تھا۔ پیچھے کچھ لوگ حسین بن علی کے گرد جمع ہو کر انہیں خروج پر اکسانے لگے۔ انہوں نے کتاب وسنت کی پیروی اور سادات کی سربراہی پر رضامندی کے ساتھ ان سے بیعت کر لی اور مسجد نبوی کو مرکز بنا کر عام نمازیوں کا داخلہ بند کر دیا۔ جیل خانہ توڑ کر قیدیوں کو آزاد کرا لیا۔ اہل مدینہ نے اس خروج میں کوئی دلچسپی نہ لی؛ اس لیے حسین بن علی اس کے بعد مکہ روانہ ہوگئے۔ ادھر سے ہادی نے شورش روکنے کے لیے دارالخلافہ سے ایک بڑا لشکر بھیج دیا۔ شورش کا دورانیہ کوئی نو ماہ تک رہا۔ حج سے چند دن پہلے مکہ سے چھ میل دور ''فخ'' کے مقام پر سرکاری لشکر اور حسین بن علی کے حامیوں میں جھڑپ ہوئی جس میں حسین بن علی سمیت کئی روسائے سادات جاں بحق ہوگئے۔[2]

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۰۷، ۲۰۸
[2] البدایة والنهایة: ۱۳/۵۵۳ تا ۵۵٤؛ تاریخ الطبری: ۸/۱۹۳ تا ۲۰۳

بظاہر بات یہیں ختم ہوگئی۔ مگر کچھ مدت بعد اس افسوس ناک واقعے کے نہایت ضرر رساں نتائج ظاہر ہونے لگے۔ کچھ سادات اور ان کے متعلقین جزیرۃ العرب کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ کر افریقہ چلے گئے، ان میں نفس زکیہ کے بھائی ادریس بن عبداللہ سب سے نمایاں تھے۔ بربر قبائل ان کے گرد جمع ہوگئے۔ تین سال بعد رمضان ۱۷۲ھ میں ادریس بن عبداللہ نے افریقی قبائل سے خلافت کی بیعت لی۔ رفتہ رفتہ یہ حکومت مضبوط ہوکر ''دولتِ ادارسہ'' بن گئی جو عباسی خلافت کے متوازی چلتی رہی۔ اگلی صدی میں اسی حکومت سے بغاوت کر کے رافضیت کے علمبردار خاندان بنوعبید کی حکومت قائم ہوئی جو تین صدیوں تک عباسی خلافت کے مقابل رہی۔[1]

ہادی کا ایک نامناسب ارادہ جو پورا نہ ہوسکا:

ہادی کم عمر اور ناتجربہ کار تھا، اسی وجہ سے اس کی ماں ملکہ خیزران جو سیاست کی ماہر تھی، حکومتی امور میں دخیل رہتی تھی۔ ہادی کی عاقبت نااندیشی کا مظاہرہ اس وقت ہوا جب تخت نشینی کے پہلے ہی سال اس نے کوشش شروع کر دی کہ اپنے بھائی ہارون کی جگہ منصبِ ولی عہدی اپنے کم سن بیٹے جعفر کے لیے طے کر دے۔ ہادی خود بائیس سال کا تھا۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا بیٹا کتنا کم عمر ہوگا۔ یہ ایک انتہائی غیر معقول سوچ تھی جو موروثیت کے مرض کی پیداوار تھی جس پر عمل کی صورت میں دولتِ عباسیہ کا زوال اسی وقت شروع ہوسکتا تھا۔ ہادی کی والدہ ملکہ خیزران اس خیال سے متفق نہ تھی۔ اس اختلاف کی وجہ سے ماں بیٹے میں ناچاقی پیدا ہوگئی، ہادی نے والدہ کو سیاسی امور میں دخل دینے سے سختی کے ساتھ منع کر دیا۔ خیزران ناراض ہوکر الگ محل میں منتقل ہوگئی۔

ہارون بھی اسی وجہ سے شروع میں دل برداشتہ رہا مگر پھر ہادی سے متفق ہوگیا۔ ہادی نے اسے حکومت کی نصف آمدنی دے دی۔ تاہم ہارون کی دست برداری اور جعفر کی جانشینی کے اعلان سے پہلے ۱۵ ربیع الاوّل ۱۷۰ھ کی شب ہادی خالقِ حقیقی سے جاملا۔ اسی رات ہارون الرشید کے ہاں مأمون کی ولادت ہوئی جو بنوعباس کا نامور خلیفہ بنا۔ اس لحاظ سے یہ رات تاریخ کی عجیب رات تھی کہ ایک خلیفہ رخصت ہوا، دوسرا مسند نشین ہوا، اور تیسرا پیدا ہوا۔

ہادی کو صرف ایک سال دو ماہ مسندِ اقتدار پر بیٹھنے کا موقع ملا۔ مشہور ہے کہ اس کے پیٹ میں ایک پھوڑا نکل آیا تھا جو مہلک ثابت ہوا۔[2] یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہادی کی موت میں خیزران کا ہاتھ تھا؛ کیوں کہ وہ ہارون کو ولی عہد برقرار رکھنا چاہتی تھی جس پر ہادی آمادہ نہ تھا۔ ہوسکتا ہے ایسا ہوا ہو۔ تاہم یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔[3] پھر ماں کا اپنے بیٹے کو قتل کرانا، ناممکن نہ سہی مگر بعید ضرور ہے، خاص کر اس لیے کہ ہادی اور ہارون دونوں خیزران کے سگے بیٹے تھے۔ اگر ہادی سوتیلا ہوتا تو بات اور تھی۔ پھر ہارون خود اپنی برطرفی پر راضی تھا تو خیزران کو ضرورت نہ تھی کہ ہادی کو قتل کراتی۔ تاہم سیاسی کھیل بسا اوقات رشتوں سے بالاتر ہو جاتے ہیں؛ اس لیے قطعی طور پر اس روایت کی تردید بھی نہیں کی جاسکتی۔

[1] الاعلام زرکلی: ۲۷۹/۱ [2] البدایۃ والنہایۃ: ۵۵۶/۱۳

[3] کیوں کہ یہ روایت کمزور ذرائع سے منقول ہے۔ طبری نے اسے بعض ہاشمیوں کا بیان کہہ کر نقل کیا ہے یعنی اصل راوی مجہول ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اسے "یقال" (کہا جاتا ہے) کے الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

الرشید بن مہدی

ہارون بن محمد

ربیع الاول ۱۷۰ھ...... تا...... جمادی الآخرہ ۱۹۳ھ

ستمبر 786ء...... تا...... اپریل 809ء

خلافتِ عباسیہ میں ہارون الرشید کو منصور کے بعد سب سے بااثر، کامیاب اور مضبوط ترین حکمران کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے دور میں بغداد سیاسی، تہذیبی، تمدنی اور اقتصادی لحاظ سے اس مقام پر پہنچا کہ دنیا کے باقی ممالک اسے رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ہارون کو حکومت کے لیے ۲۳ سال کا طویل عرصہ ملا۔ یہ دور مکمل امن وامان کا رہا۔ عدل و انصاف کا دور دورہ تھا۔ اندرونی دشمنوں نے کہیں سر اٹھایا تو جلد مغلوب کر دیے گئے۔ رومی سلطنت پر دھاوے جاری تھے۔ علماء، فقہاء اور مشائخ کی عزت وتوقیر حکومت کا شعار تھی۔ ان کے حلقوں کا فیض عام تھا۔ سادات کا اعزاز واکرام کیا جاتا تھا۔ غیر مسلم ممالک بغداد سے دوستانہ تعلقات کے لیے پہل کر رہے تھے۔

ہارون الرشید کی سیرت:

ہارون ۱۴۸ھ میں پیدا ہوا۔ ۲۳ سال کی عمر میں مسندِ خلافت پر بیٹھا۔ وہ علم وعمل، عبادت وریاضت، شجاعت و سخاوت، عفو ودرگزر، بیدار مغزی و دانائی اور تدبر و بصیرت جیسی صفات سے آراستہ تھا۔ وہ آرام سے بیٹھنے کا عادی نہ تھا۔ شہسواری اور مجاہدانہ زندگی کا شیدائی تھا۔ بغداد جیسے پُر رونق اور عالی شان شہر میں اسے سکون نہیں ملتا تھا؛ اس لیے اس نے ابتدائی کچھ مدت کے سوا بغداد کو اپنا مستقل ٹھکانہ نہیں بنایا۔ کبھی وہ رَقّہ میں ہوتا، کبھی بغداد میں۔ اس کے ۲۳ سالہ دورِ اقتدار میں صرف چار سال ایسے گزرے جو اسفار سے خالی تھے۔ تقریباً ہر سال وہ ایک طویل سفر کرتا جو جہاد، حج یا بغاوتوں کی سرکوبی کے لیے ہوتا۔ حج کا سفر وہ پیدل طے کرتا تھا جس میں علماء ومشائخ اور ان کے متعلقین کا ایک بڑا مجمع ہم رکاب ہوتا جن کے اخراجات ہارون خود اٹھاتا۔ وہ روزانہ اپنے ذاتی مال سے ایک ہزار درہم صدقہ کیا کرتا تھا۔ وہ جب بھی حج پر جاتا ایک سو علماء وفقہاء اور ان کی اولاد کو ساتھ لے جاتا۔ جس سال اسے حج کا موقع نہ ملتا تو تین سو عالم فاضل افراد کو پورے خرچے اور ضروریات کے ساتھ حج کراتا۔ وہ ایک رحم دل اور فیاض انسان تھا۔ عبادت وریاضت کا یہ حال تھا کہ دن بھر امورِ مملکت میں مشغولیت کے باوجود شب کو روزانہ سو رکعت نفل ادا کرتا۔[1]

[1] البدایة والنهایة: ۱۴/ ۲۹

علماء وفضلاء اور شعراء وادباء کو اس نے اتنا نوازا کہ ہر سمت سے اہلِ قلم، اصحابِ علم اور اربابِ سخن کشاں کشاں بغداد آنے لگے۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ، امام محمد بن حسن الشیبانی رحمہ اللہ، ابو العتاہیہ، عباس بن احنف، اصمعی، مروان بن ابی حفصہ، ابراہیم مُوصلی، اسحٰق مُوصلی اور واقدی جیسے مشاہیر اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ امام مالک بن انس رحمہ اللہ اور عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ جیسے فقہاء، فضیل بن عیاض رحمہ اللہ اور رابعہ بصریہ رحمہا اللہ جیسی عابد وزاہد ہستیاں خلیل بن احمد رحمہ اللہ اور سیبویہ جیسے ائمۂ عربیت اور امام کسائی رحمہ اللہ جیسے امام قراءات اس کے معاصر تھے۔ جاحظ کا کہنا تھا:

''ہارون الرشید کے پاس ایسے افراد جمع ہوگئے تھے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوئے۔ اس کے وزیر برامکہ تھے۔ اس کے قاضی ابو یوسف تھے۔ اس کا شاعر مروان بن ابی حفصہ تھا۔ اس کا ندیم عباس بن محمد تھا۔ اس کا حاجب فضل بن ربیع تھا۔ اس کا گویا ابراہیم مُوصلی تھا اور اس کی ملکہ زبیدہ خاتون تھی۔'' [1]

برامکہ کا عروج اور خَیزُران کی وفات:

ہارون الرشید کی پرورش اور تعلیم وتربیت میں دربار سے وابستہ ایک فارسی گھرانے خاندانِ برامکہ کا بڑا حصہ تھا؛ اس لیے اسے اہلِ فارس سے بڑی محبت تھی؛ اسی لیے اس کے دور میں فارسیوں کو دربار میں بڑے بڑے عہدے ملے۔ فوج کے بہت سے بڑے جرنیل فارسی تھے۔ لباس اور وضع قطع میں بھی عرب کا سادہ تمدن متروک ہونے لگا اور فارسی تمدن کی چھاپ گہری ہوتی گئی۔ قلمدانِ وزارت، خاندانِ برامکہ کے پاس رہا۔

امورِ مملکت میں خواتین کی محدود شرکت مہدی کے دور سے شروع ہوگئی تھی کہ اس کی بیوی ملکہ خَیزُران ایک ماہر سیاست دان تھی۔ یہی خَیزُران اپنے بیٹے ہادی کے دور میں بھی امورِ سلطنت میں شریک رہی۔ ہارون الرشید کے دور میں بھی یہ رجحان باقی رہا بلکہ اس میں اضافہ ہوا۔ خَیزُران اس کی ماں تھی اور زبیدہ خاتون اس کی بیوی۔ دونوں ہی غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل اور امورِ مملکت میں شریک تھیں۔ [2]

خَیزُران ہارون کی خلافت کے چوتھے سال ۱۷۳ھ میں انتقال کرگئی۔ اس کے بعد امورِ مملکت میں خواتین کی شمولیت کی تمام تر نمائندگی زبیدہ خاتون نے کی۔ تاہم یہ نمائندگی دربار میں بیٹھنے یا حکمران پر تسلط کی حد تک نہ تھی۔ خواتین کا دائرہ کار بعض معاملات مثلاً جانشین کی تقرری میں مشورے دینے اور فلاحی وترقیاتی کاموں کے اخراجات فراہم کرنے کی حد تک تھا۔ [3]

اہلِ عجم کی شراکتِ اقتدار۔ سیاسی انقلاب:

ہارون الرشید کا دور تاریخِ امت میں ایک انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ انقلاب اہلِ عجم کی شراکتِ اقتدار کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ہارون نے حالات کی نبض کو پہچانتے ہوئے اہلِ عجم کو سیاسی امور میں پورا حصہ دے کر زمانے

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۱۱، ط نزار
[2] التاریخ الاسلامی العام، علی ابراهیم حسن، ص ۳۷۱، ۳۷۲
[3] تاریخ الطبری: سنة ۱۷۳ھ

ایک اہم ضرورت کو پورا کیا اور اسلامی مساوات اور اس کے عالمگیر مزاج کی صحیح ترجمانی کی۔ یہ وہ دور تھا کہ مشرق و مغرب پھیلی ہوئی اسلامی آبادی میں عرب اقلیت بن گئے تھے اور اہلِ عجم اکثریت میں آچکے تھے۔ نومفتوحہ اقوام کے قبولِ اسلام کی وجہ سے یہ ایک فطری انقلاب تھا جس کی پیش گوئی کتاب وسنت میں موجود تھی۔ حق تعالیٰ شانہ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:

هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

وہی ہے اللہ جس نے اُمّی قوم میں رسول بھیجا جو انہی میں سے ہے..... وہ ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور اس سے پہلے وہ لوگ کھلی گمراہی میں تھے اور کچھ دوسرے بھی ہیں جو ابھی ان سے نہیں ملے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ زبردست ہے کمال حکمت والا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے وہ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل والا ہے۔[1]

یہ آیاتِ مبارکہ واضح طور پر بتارہی ہیں کہ اسلام کے اوّلین مخاطب اور داعی عرب کے خانہ بدوش تھے مگر ان کے بعد اللہ اپنا بے پایاں فضل اس طرح ظاہر کرے گا کہ غیر عرب قومیں بھی جوق در جوق اسلام میں داخل ہوں گی اگرچہ آیت کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں مگر محقق مفسرین نے اس کا یہی مفہوم سمجھا ہے۔[2]

صحیح حدیث سے بھی یہی مطلب ظاہر ہوتا ہے۔ جب صحابہ نے پوچھا اس آیت میں بعد میں آنے والوں سے کیا مراد ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر ہاتھ رکھ کر کہا:

''اگر دین کہکشاں پر بھی ہو تو اس کی قوم کے لوگ وہاں جا کر بھی اسے حاصل کریں گے۔''[3]

اس میں بھلا کسے شک ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت ساری دنیا اور تمام اقوام کے لیے تھی اور عرب وعجم سمیت سبھی آپ ﷺ کے اُمتی ہیں؛ اس لیے یہ دین اپنی روح اور توانائی کے مطابق مسلسل پھیلتا چلا گیا یہاں تک کہ دوسری صدی ہجری کے وسط میں مسلمانوں کی مجموعی آبادی میں غیر عربوں کو اکثریت حاصل ہوگئی اور عرب قبائل مسلمانوں کے اس سمندر میں ایک مختصر مگر محترم اور فعال گروہ کی حیثیت میں رہ گئے۔ ایسے میں ہارون الرشید کا عجمی مسلمانوں کو حکومت میں شریک کرنا کوئی عجیب بات نہیں تھی بلکہ یہ اقدام اس دور کی ضرورت تھا؛ کیوں کہ عباسی خلافت کا قیام بھی عجم کی حمایت سے ہوا تھا اور اب بھی بڑی حد تک یہ انہی کے بل بوتے پر قائم تھی۔

(1) سورۃ الجمعۃ، آیت: ۲تا۴

(2) تفسیر روح المعانی، علامہ محمود آلوسی: تحت سورۃ الجمعۃ

(3) صحیح مسلم، ح: ۶۶۶۱، کتاب الفضائل، باب فضل فارس ؛ سنن الترمذی، ح: ۳۳۱۰

منصور اور مہدی نے کلیدی عہدے عرب امراء کے لیے مختص رکھے تھے، اس سے عجمیوں میں جو احساسِ محرومی پھیلا اس کا نتیجہ نہ صرف مسلسل بغاوتوں کی شکل میں نکلا بلکہ زندقہ اور ارتداد کی تحریکوں کے پھیلنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فتنہ باز عجمی اپنی قوم کو احساس دلاتے رہتے تھے کہ عربوں نے انہیں حکومت میں شمولیت سے محروم رکھا ہے۔ اقلیت کا اکثریت پر بلاشرکتِ غیرے حکومت کرتے رہنا جس تناؤ کو جنم دیتا ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں؛ اس لیے ہارون نے عجمیوں کے احساسِ محرومی کا ازالہ کیا اور انہیں کھلے دل سے نظامِ حکومت میں شریک کر لیا۔

بعض مبصرین نے ہارون الرشید کے اس اقدام پر تنقید کر کے اسے عباسی خلافت کے زوال کی بنیاد قرار دیا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اہلِ عجم کا امورِ خلافت پر تسلط بہت سے مسائل اور پیچیدگیوں کا باعث بنا اور جب یہ لوگ خلفاء پر حاوی ہوئے تو سلطنت کی آن بان کو نقصان پہنچا۔

مگر اس صورتحال کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ بنوعباس کی اسی رواداری نے ان کی خلافت کو اس کی کمزوری کے باوجود پانچ صدیوں تک قائم رکھا۔ اس کے برخلاف بنوامیہ معاشرے میں پیدا شدہ فطری تبدیلی کے تقاضوں کو پورا نہ کرنے کے باعث یکدم سیاسی قیادت سے ہاتھ دھو بیٹھے، حالانکہ وہ بے پناہ طاقت اور وسیع ترین مملکت کے مالک تھے۔ اگر بنوعباس غیر عرب اقوام سے رواداری کا سلوک نہ کرتے تو یہ قومیں بہت جلد اجتماعی طور پر ان کے مقابلے میں نکل آتیں اور بنوعباس شاید دو صدیاں بھی پوری نہ کر پاتے۔

✦✦✦

اندرونی مہمات

حکومتی استحکام، عوامی مقبولیت اور عدل وانصاف میں شہرت کے باوجود ہارون کو اندرونی آزمائشوں سے پالا پڑ کر رہا۔ ان اندرونی مہمات کا ذکر مختصراً درج ذیل ہے۔

بغاوتیں:

ہارون کے دور میں عجمی سیاست دانوں اور جرنیلوں کو عروج ملا تو یہ تبدیلی بعض عرب امراء کے لیے ناگوار ثابت ہوئی؛ لہٰذا ہارون کو ان کی شورش کا سامنا کرنا پڑا۔

۱۷۸ھ میں اس قسم کی ایک بغاوت مصر میں برپا ہوئی جہاں قیس اور قضاعہ کے عرب قبائل پر مشتمل ایک جماعت نے جسے حوفیہ کہا جاتا تھا، عباسی گورنر کے خلاف خروج کیا۔ ہارون نے ہرثمہ بن اَعیَن کو بھیج کر اس بغاوت پر قابو پایا۔ اسی سال دوسری بغاوت افریقہ میں ہوئی جہاں عبدویہ نامی ایک جرنیل اٹھ کھڑا ہوا۔ وزیر مملکت یحییٰ برمکی نے کچھ معتمد جرنیل بھیج کر اس باغی کو مذاکرات کے ذریعے رام کیا اور بغداد بلا کر انعام واکرام اور عہدے سے نوازا۔[1]

[1] تاریخ الطبری: سنة ۱۷۸ھ

۱۷۸ھ میں ایک خارجی سردار ولید بن طَرِیف نے جس کا تعلق بنوتغلب سے تھا، الجزیرہ میں تیس ہزار کا لشکر جمع کر لیا اور ایک سے زائد بار سرکاری افواج کو شکست دی۔ اس کی قوت اتنی بڑھ گئی کہ وہ دریائے دجلہ عبور کر کے نصیبین اور آذربائی جان تک جا پہنچا۔ اس کی روک تھام میں ان دونوں علاقوں کے گورنر مارے گئے۔ ولید بن طَرِیف وہاں زبردست فساد مچا کر واپس الجزیرہ آیا تو ہارون الرشید کا جرنیل یزید شیبانی اس سے فیصلہ کن جنگ کی تیاری کر چکا تھا۔ اس نے اچانک حملہ کر کے ولید بن طَرِیف کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد اس کی بہن فَرِوَہ نے خوارج کی قیادت سنبھالی اور لڑائیوں کے اس سلسلے کو جاری رکھنے کی کوشش کی مگر جلد ہی اس کا قصہ پاک کر دیا گیا۔ ایشیا میں یہ خوارج کی آخری شورش تھی۔ اس کے بعد ان کا زور ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔ البتہ ان کی کچھ باقیات افریقہ میں پنپتی رہیں۔ خاص کر ان کے اباضیہ اور صُفرِیہ فرقے وہاں اپنی رکنیت سازی کرتے رہے۔ [1]

یحییٰ بن عبداللہ ہاشمی کا خروج:

ہارون الرشید کے لیے سب سے خطرناک دوعلوی بھائیوں کا وجود تھا: ایک بھائی یحییٰ بن عبداللہ نے شمالی ایران کے بلندترین پہاڑی علاقے دَیلَم میں ایک فلک بوس قلعے کو مرکز بنا کر خروج کیا۔ دوسرے بھائی ادریس بن عبداللہ نے شمالی افریقہ میں بربر قبائل کو اپنے گرد جمع کر لیا۔ یہ دونوں منصور کے عہد میں قتل ہونے والے نفسِ زکیہ کے حقیقی بھائی تھے۔

ہارون الرشید نے یحییٰ بن عبداللہ سے مقابلے کے لیے فضل برمکی کو پچاس ہزار کا لشکر دے کر بھیجا جس نے اس کے قلعے کو گھیر لیا۔ یحییٰ نے کوئی چارہ نہ دیکھا تو ہارون الرشید کی طرف سے امان کی ضمانت ملنے کی شرط پر ہتھیار ڈال دینا قبول کر لیا۔ ہارون الرشید نے امان نامہ لکھ بھیجا اور یحییٰ نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس طرح یہ مہم کسی خونریزی کے بغیر تکمیل کو پہنچی۔ یحییٰ بن عبداللہ کو عزت واحترام سے بغداد لایا گیا تو ہارون الرشید سمیت تمام عمائد نے شاندار استقبال کیا۔ ہارون کے حکم سے مملکت کے وزیر اور امراء بذاتِ خود یحییٰ بن عبداللہ کی خدمت کیا کرتے تھے۔ بعض رؤساء کو یہ دیکھ کر حسد ہوا، انہوں نے جھوٹی شکایات لگا کر ہارون کو اتنا بھڑکایا کہ اس نے یحییٰ بن عبداللہ کو جعفر برمکی کے حوالے کر کے قید کرا دیا۔ [2]

۱۸۳ھ میں خاقانِ ترکستان نے بحیرۂ خزر کے کوہستانی درّے عبور کر کے آذربائی جان اور آرمینیا پر حملہ کر دیا۔ اس لڑائی کی وجہ یہ بنی کہ ہارون الرشید کے وزیر فضل بن یحییٰ نے خاقان کی بیٹی کا رشتہ مانگا تھا۔ خاقان نے اسے منظور کرتے ہوئے شہزادی کی رخصتی کر دی۔ وہ حشم وخدم کے ساتھ راستے میں تھی کہ عالم اسلام کے سرحدی علاقے برزعہ میں اچانک اس کی موت واقع ہوگئی۔ خاقان نے اسے مسلمانوں کی سازش تصور کیا اور فوج کشی کر دی۔ وہ سرحدی علاقوں سے ایک لاکھ کے لگ بھگ مسلمانوں کو قیدی بنا چکا تھا کہ ہارون کی مرتب کردہ افواج پہنچ گئیں اور انہوں نے کئی لڑائیوں کے بعد خاقان کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد کوہستانی درّوں کو بند کر دیا گیا تاکہ ترکستانی وہاں سے دخل اندازی نہ کر سکیں۔ [3]

---

(1) تاریخ الطبری: سنة ۱۷۸ھ، ۱۷۹ھ ؛ تاریخ ابن خلدون: ۲۱۲/۳

(2) البدایة والنهایة: ۵۸۱/۱۳

(3) العبر فی خبر من غبر: ۲۲۱/۱

عالمگیر خلافت کی تحلیل کا آغاز

ہارون الرشید کا دور بنوعباس بلکہ اسلامی تاریخ کا عہدِ زریں کہلاتا ہے مگر دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ اسی عروج کے زمانے میں عالمگیر خلافت آہستہ آہستہ تحلیل ہونا شروع ہوئی۔

پورے عالمِ اسلام پر ایک خلیفہ کا اقتدار صرف خلفائے راشدین یا خلفائے بنوامیہ کو نصیب ہوا تھا۔ بنوعباس کا اقتدار قائم ہونے کے صرف چھ برس بعد یعنی ۱۳۸ھ میں اندلس ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ تاہم خلافت کی حدود بحرِ اوقیانوس سے کوہِ پامیر تک وسیع تھیں۔ منصور اور مہدی کے دور میں یہی صورتحال رہی۔ مگر ہارون الرشید کے دور میں افریقہ اس تیزی سے خلافت کی گرفت سے نکلا کہ سوائے مصر کے کوئی صوبہ خلافت کے پاس نہیں رہا۔ پہلے مراکش اور الجزائر پر دولتِ ادارسہ قائم ہوتی، پھر تیونس اور لیبیا خودمختار دولتِ اغالبہ میں تبدیل ہو گئے۔

دولتِ ادارسہ کا قیام:

دولتِ ادارسہ کے بانی نفسِ زکیہ کے ایک بھائی ادریس بن عبداللہ تھے۔ انہوں نے شمالی افریقہ جا کر ۱۷۲ھ میں بربر قبائل کی مدد سے مراکش میں یہ خودمختار حکومت قائم کی۔ ادریس بن عبداللہ نے ۱۷۷ھ تک حکومت کر کے وفات پائی۔ پھر اولادِ ادریس میں حکومت کا سلسلہ نسل در نسل چلتا رہا۔ مراکش اور الجزائر کا علاقہ ان کے تسلط میں رہا۔ یہ حکومت ایک طرف عباسیوں کے مخالف رہی تو دوسری طرف اندلس کے مسلم حکمرانوں سے بھی اس کی چپقلش چلتی رہی۔ تقریباً سوا صدی تک بنوادریس خودمختار رہے۔ پھر شیعہ گروہ بنوعبید نے غلبہ پا کر انہیں اپنا باج گزار بنالیا۔ اس حالتِ زوال میں تقریباً نصف صدی گزار کر بنوادریس کا عملاً خاتمہ ہو گیا۔[1]

افریقی قبائل کی شورش اور دولتِ اغالبہ کا قیام:

۱۸۱ھ سے ۱۸۷ھ تک ہارون الرشید کو افریقہ میں بربر قبائل کی شورش کا سامنا رہا۔ ان کو دبانے کے لیے ہارون نے پہلے مشہور جرنیل ہَرثمہ بن اَعیَن کو بھیجا مگر اسے شکست ہوئی۔ اس کے بعد ہارون نے ابراہیم بن اغلب کو ایک بڑی فوج دے کر مستقل طور پر افریقہ کے اہم عسکری شہر قیروان میں تعینات کر دیا تاکہ وہ بربروں کو مغلوب کرے اور نوخیز دولتِ ادارسہ کی طرف سے عباسی مقبوضات پر حملوں کی کوششوں کا دفاع کرے۔

ابراہیم بن اغلب نے اتنی بڑی فوج کی قیادت سے سیاسی فائدہ اٹھایا اور کچھ ہی مدت بعد وہاں اپنی ایک مستقل ریاست قائم کر لی۔ کچھ عرصے تک یہ ریاست عباسیوں کی باج گزار بن کر رسمی تعلق نبھاتی رہی مگر جب دیکھا کہ

[1] الکامل فی التاریخ: سنة ۱۷۲ھ؛ ۱۷۷ھ۔ اگرچہ بنوادریس کے کچھ علامتی باج گزار حکمران مزید دو صدیوں تک ایک محدود علاقے پر حاکم رہے۔

عباسیوں کا افریقہ میں کوئی زور نہیں تو خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ یہ حکومت دولتِ اغالبہ کے نام سے مشہور ہوئی اور تقریباً ایک صدی تک قائم رہ کر ۲۹۷ھ میں بنوعبید کے ہاتھوں ختم ہوئی۔ ①

مرکزِ خلافت کی طرف سے ان صوبوں کو واپس لینے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی۔ حالانکہ اس وقت خلافتِ عباسیہ کی عسکری طاقت مخالفین سے کہیں زیادہ تھی۔ اسی طرح معاشی قوت بھی عروج پر تھی۔ پس کوئی مشکل نہ تھا کہ ان علاقوں کو واپس لیا جاتا۔ مگر ہارون نے کبھی اس طرف فوج کشی نہیں کی بلکہ اپنا دفاع مضبوط رکھنے کو کافی سمجھا۔ یہ کوئی غفلت یا نادانی نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے ایک گہری حکمت کارفرما تھی۔ وہ یہ کہ اس طرح بنوعباس اندلس کے امویوں کی متوقع لشکر کشی سے محفوظ ہو گئے تھے۔ چونکہ بنوعباس نے بنوامیہ سے بزورِ شمشیر حکومت چھینی تھی؛ اس لیے انہیں ہر وقت خطرہ لاحق رہتا تھا کہ کہیں اموی قوت پا کر بدلہ نہ لیں۔ بنوامیہ کی باقی ماندہ ساری طاقت اندلس میں جمع تھی اور تعمیر و ترقی کے لحاظ سے ان کی حکومت عروج پر تھی۔ اس کی شان و شوکت دیکھ کر منصور جیسا اولوالعزم حکمران شکر ادا کرتا تھا کہ ہمارے اور ان کے بیچ میں سمندر حائل ہے۔ لیکن سمندر عبور کر کے افریقہ سے گزرنا اور بغداد تک پہنچ جانا اموی شہسواروں کے لیے کوئی محال بات نہ تھی؛ لہٰذا عباسیوں کے نزدیک اندلس اور عباسی خلافت کے مابین ایک ایسی ریاست کی آڑ ہونا ضروری تھا جو امویوں کی مخالف ہو؛ اس لیے ہارون الرشید اور اس کے جانشینوں میں سے کسی نے بھی دولتِ ادارسہ کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کی۔

تاہم دولتِ ادارسہ فاطمی ہونے کی وجہ سے عباسیوں کی بھی مخالف تھی اور اس کے پھلنے پھولنے کے امکانات اس لیے بہت روشن تھے کہ عوام فاطمی نسب کو بہت مانتے تھے؛ اس لیے یہ خطرہ موجود تھا کہ کہیں یہی فاطمی پورے افریقہ پر نہ چھا جائیں اور اس کے بعد عباسی حکومت سے بدلہ لینے کی کوشش نہ کریں؛ اس لیے ضروری تھا کہ خود فاطمیوں کی اس زیرِ حکومت اور بنوعباس کی عمل داری کے درمیان ایک اور آزاد ریاست حدِ فاصل کے طور پر موجود رہے جو عباسیوں کی دوست ہو۔

چنانچہ جب ابراہیم بن اغلب نے تیونس اور لیبیا میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا تو عباسیوں کی یہ ضرورت از خود پوری ہوگئی؛ اس لیے انہوں نے دولتِ اغالبہ کو اپنے دفاع کے لیے ضروری سمجھ کر باقی رہنے دیا۔

بہرکیف اس میں شک نہیں کہ ان حکومتوں کے قیام کے باعث عالمگیر خلافت ٹکڑوں میں تحلیل ہوگئی۔ ہارون الرشید جب تخت پر بیٹھا تھا تو عالم اسلام میں مسلمانوں کی صرف دو حکومتیں تھیں: خلافتِ عباسیہ اور امارتِ اندلس۔ جب اس کی وفات ہوئی تو عالم اسلام چار حصوں میں تقسیم تھا۔ یہ درست ہے کہ اس وقت اور اس کے بعد لگ بھگ نصف صدی تک خلافتِ عباسیہ ہی عالم اسلام کا سب سے بڑا حصہ رہی مگر اگلی ایک صدی کے اندر وہ خود سمٹ کر ایک چھوٹی سی حکومت رہ گئی جو خود مختار سلاطین کے رحم و کرم پر تھی۔

① تاریخ ابن خلدون: ۱۸/٤، ۱۹، ۲۰

برامکہ کا عروج وزوال

ہارون الرشید کے دور کا سب سے عبرتناک باب خاندان برامکہ کا عروج وزوال ہے۔ یہ وہ خاندان تھا جو خلافتِ عباسیہ کے قیام، استحکام اور عروج کے دوران مملکت کے نظم ونسق پر حاوی رہا۔ نصف صدی سے زائد عرصے تک اس خانوادے کا طوطی بولتا رہا۔ مگر پھر یکا یک یہ لوگ ایسے بے نام ونشان ہوئے کہ دنیا انہیں تلاش کرتی رہ گئی۔

برامکہ کون تھے؟

برمکی خاندان نسلاً مجوسی تھا۔ ان کا مرکز خراسان کا مشہور شہر بلخ تھا۔ خراسانی مجوسیوں کا سب سے بڑا مذہبی مرکز یعنی آتش کدہ یہیں تھا جسے ''نوبہار'' کہا جاتا تھا۔ خلفائے راشدین کے دور میں جب ایران وخراسان کے اکثر شہر فتح ہوگئے تو مجوسیوں کے نزدیک بلخ کے آتش کدے کی اہمیت مزید بڑھ گئی اور وہ ہر طرف سے یہاں جمع ہونے لگے۔ اسی آتش کدے کا مہا پجاری ''جاماس'' تھا۔ ولید بن عبدالملک کے زمانے میں قُتَیبَہ بن مسلم نے بلخ بھی فتح کرلیا۔ اس وقت تک ''جاماس'' فوت ہوچکا تھا۔ اس کا بیٹا حکیم بَرمَک جو مشہور طبیب تھا ۸۶ھ میں دِمَشق آگیا۔[1]

حکیم بَرمَک کی مہارت وحذاقت کے باعث اموی خلفاء اور شہزادے اس سے علاج کرانے لگے۔[2]

پھر اس کا رتبہ اتنا بڑھا کہ حاکمِ عراق اسد بن عبداللہ قسری نے اسے بلخ میں اپنا نائب مقرر کردیا۔ حکیم برمک نے بلخ کو از سرِ نو تعمیر کرا کے عالی شان شہر بنا دیا۔[3] برمکی خاندان اسی برمک کی طرف منسوب ہے۔

حکیم بَرمَک کے اسلام لانے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ بظاہر وہ اپنے آبائی مذہب ہی پر قائم تھا۔[4]

خالد برمکی، ابومسلم خراسانی کا دستِ راست:

خالد برمکی اسی برمک کا بیٹا تھا۔ وہ نہایت عاقل ودانا انسان اور بہترین منتظم تھا۔ ۹۰ھ میں پیدا ہوا تھا۔ عباسی تحریک شروع ہوئی تو وہ امام ابراہیم عباسی کا داعی اور ابومسلم خراسانی کا دستِ راست بن گیا۔ عباسی تحریک کے بارہ نقباء کے بعد جن ۲۱ سرکردہ داعیوں کا مقام تھا، خالد برمکی ان میں سے ایک تھا۔ وہ دعوتِ آلِ محمد کو لے کر عراق، ایران اور خراسان کے ایک ایک قریے میں جاتا۔ شک وشبے سے بچنے کے لیے مویشی ساتھ رکھتا اور خود کو مویشیوں کا بیوپاری

---

① الکامل فی التاریخ: سنة ۸٦ھ؛ الاعلام زرکلی: ۲۹۵/۲؛ نوادر اللخلفاء للاتلیدی (اعلام الناس بما وقع للبر امکة مع بنی عباس)، ص ۱٦۷

② تاریخ الطبری: ٤۲٥/٦، ٤۲٦؛ السیرة الحلبیة: ۱۰٥/۱؛ بغیة الطلب لابن عدیم: ۳۰۱۹/۷، ۳۰۲۰، ط دار الفکر

③ تاریخ الطبری: ٤۱/۷؛ البدایة والنهایة: سنة ۱۰۷ھ

④ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بنوامیہ کے دور میں بھی ماہرین فنون کے لیے ترقی کے دروازے پوری طرح کھلے تھے۔ اس میں عربی وعجمی اور مسلم وغیر مسلم کی تفریق نہیں تھی۔ ہاں سیاسی اور عسکری امور میں وہ دور عربوں ہی کی قیادت کا تھا۔

نا بر کرتا۔ کئی بار وہ پکڑا گیا مگر اپنی ہوشیاری کے بل بوتے پر چھوٹ گیا۔ اس طرح وہ عباسی حکومت کے قیام میں بھرپور انداز سے شامل رہا۔ ان خدمات کے عوض سفاح نے حکومتِ عباسیہ قائم کرتے ہی اسے ناظمِ مالیات بنادیا۔ [1]

خالد برمکی کا دورِ وزارت:

جب سفاح نے اپنے پہلے وزیر ابوسلمہ کو قتل کرایا تو ابومسلم نے نئے وزیر کے لیے خالد برمکی کا نام پیش کیا؛ لہٰذا خالد برمکی بنوعباس کا وزیر یعنی پوری مملکت کا منتظمِ اعلیٰ بن گیا۔ منصور کے دور میں بھی وہ کچھ مدت تک اس عہدے پر رہا۔ تاہم منصور نے ابومسلم خراسانی کو قتل کرانے کے بعد خطرہ محسوس کیا کہ کہیں خالد برمکی بھی کوئی گل نہ کھلائے؛ کیوں کہ وہ عجمی اور ابومسلم کا گہرا دوست تھا۔ مگر خالد برمکی کی کوئی حرکت مشکوک نہ تھی؛ اس لیے منصور نے اسے کوئی سزا نہ دی بلکہ وزارت سے معزول کرنے پر اکتفا کیا اور طبرستان جیسے دور دراز علاقے میں اس کی تقرری کردی۔

خالد برمکی ابومسلم کا انجام دیکھنے کے بعد غیر معمولی حد تک محتاط ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنی کارکردگی سے منصور کا کھویا ہوا اعتماد دوبارہ جیت لیا۔ سات سال بعد منصور نے اسے موصل کا حاکم بنادیا۔ پھر مزید اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے اسے اپنے ولی عہد مہدی کا اتالیق مقرر کردیا۔ [2]

عجم کے غلبے کی خواہش:

آثار و قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح ابومسلم خراسانی عجم کے غلبے کا خواہش مند تھا، اسی طرح اس کا ہم نوالہ ہم پیالہ خالد برمکی بھی اسی ہدف کو سامنے رکھے ہوئے تھا اور یہ ایک فطری بات تھی؛ کیوں کہ وہ ان مجوسی پیشواؤں کی اولاد تھا جو ایک زمانے میں بے مثال شان وشوکت کے مالک تھے۔ خالد اسلام لا کر بھی اپنے آباؤ اجداد پر نازاں تھا۔ نیز مجوسیوں کا بہت خیال رکھتا تھا۔ وہ اپنے تہوار ''نوروز'' پر اسے تحائف دیتے اور شعراء اس کی شان میں قصیدے کہتے۔ جب بغداد کی تعمیر کے دوران خلیفہ منصور عباسی کو مشورہ دیا گیا کہ کسریٰ کے شاہی محل کو توڑ کر بغداد کے تعمیری کام میں استعمال کیا جائے تاکہ اخراجات کا بوجھ کم ہو سکے تو خالد برمکی نے بڑی پرکاری سے اس کی مخالفت کی تھی اور کہا تھا:

> ''کسریٰ کا محل اسلام کی نشانی ہے۔ اسے دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ آسمانی مدد ہے تبھی ایسی عظیم الشان طاقت پر وہ غالب آئے۔''

خالد کی ایسی باتوں کی وجہ سے کچھ لوگوں کو شبہ تھا کہ وہ اندر سے مجوسی ہے۔ [3]

بہرکیف خالد برمکی بلا کا ہوشیار تھا اور ابومسلم سے کہیں زیادہ گہری منصوبہ بندی کے ساتھ ایک ایک قدم آگے بڑھا رہا تھا؛ اس لیے لوگوں کی چہ می گوئیاں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔

[1] بغیۃ الطلب لابن عدیم: ۷/۳۰۲۰ تا ۳۰۲۲، ط دار الفکر؛ اخبار الدولۃ العباسیہ، ص ۲۴۰؛ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۱۳۰ھ، ۱۳۲ھ
[2] الاعلام زرکلی: ۲/۲۹۵
[3] الفخری فی الآداب السلطانیۃ والدول الاسلامیۃ لابن الطقطقی، ص ۱۵۴، ط دار القلم العربی؛ سیر اعلام النبلاء: ۷/۲۲۹

خلفاء سے رضاعت کا رشتہ:

منصور کے دور میں مہدی کا اتالیق بن کر اس نے ایک مدت گزاری۔ مہدی نے خیزران سے نکاح کر لیا جس سے ۱۴۸ھ میں ہارون الرشید کی ولادت ہوئی۔ انہی دنوں خالد کے بیٹے یحیٰی کے ہاں بچہ ہوا جس کا نام فضل رکھا گیا۔ خالد برمکی نے استاذ ہونے کے ناطے مہدی سے فرمائش کی کہ باہمی محبت کو مضبوط تر کرنے کے لیے میرے پوتے فضل اور آپ کے فرزند ہارون کو باہم رضاعی بھائی بنا دیا جائے۔ مہدی نے اپنے استاذ کی پیش کش کو بلا تردد قبول کر لیا۔ مہدی کی بیگم خیزران نے فضل بن یحیٰی کو دودھ پلایا اور یحیٰی برمکی کی بیوی نے ہارون الرشید کو۔ یوں مستقبل کا خلیفہ اور اولاد برامکہ رضاعی رشتہ دار بن گئے۔[1]

استاذ اور استاذ زادے کا ناطہ:

۱۵۹ھ میں مہدی خلیفہ بنا تو خالد برمکی کو استاذ اور اس کے بیٹے یحیٰی برمکی کو استاذ زادہ ہونے کی حیثیت سے مزید عزت ملی۔ آخر ۱۶۵ھ میں خالد برمکی کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۷۵ برس تھی۔ اس کی زندگی کا بڑا حصہ سیاسی انقلابات دیکھنے اور حکومتوں کے جوڑ توڑ میں گزرا تھا، اس نے اپنے تجربات اپنے بیٹے یحیٰی برمکی کو منتقل کر دیے تھے جو باپ کی موت کے وقت تقریباً ۵۰ سال کا تھا۔[2]

ہارون یحیٰی برمکی کو باپ کہہ کر پکارتا تھا:

یحیٰی کے لیے راہیں بالکل ہموار تھیں۔ وہ مہدی کا مشیر خاص رہا تھا۔ مہدی نے مکمل اعتماد کے ساتھ اپنے بیٹے ہارون کی پرورش اور تعلیم و تربیت اسی کے سپرد کر رکھی تھی۔ چونکہ وہ ہارون کا رضاعی باپ تھا؛ اس لیے ہارون اس کا بہت ادب و احترام کرتا تھا اور ہمیشہ اسے ''یا أبتِ'' کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔[3]

ہارون کے اقتدار کے لیے یحیٰی برمکی کی کوشش:

ہارون کا خلیفہ بننا درحقیقت یحیٰی کے حکمران بننے کے مترادف تھا، یہی برامکہ کی خواہش تھی؛ اس لیے جب مہدی کے بعد ہادی نے خلیفہ بن کر ہارون کی ولی عہدی منسوخ کرنے اور اپنے بیٹے جعفر کو ولی عہد بنانے کا ارادہ کیا تو یحیٰی برمکی کی امنگوں پر اوس پڑنے لگی۔ اس نے پوری کوشش کی کہ اس پر کسی قسم کا حرف آئے بغیر ہادی کا ارادہ ملتوی ہو جائے؛ اسی لیے اس نے ہادی سے کہا:

''اگر آپ نے لوگوں کو حلف ترک کرنے کی اجازت دی تو ان کی نگاہ میں قسمیں بے وقعت ہو جائیں گی۔ بہتر ہوگا کہ آپ اپنے بھائی کی ولی عہدی باقی رکھیں، اس کے بعد جعفر کی ولی عہدی کی بیعت لیں۔''[4]

---

[1] تاریخ ابن خلدون ۳/۲۸۰، اخبار البرامکہ
[2] العبر فی خبر من غبر: ۱/۱۸۸
[3] سیر اعلام النبلاء: ۹/۶۰، تر: جعفر برمکی
[4] تاریخ الطبری: ۸/۲۰۹

ہارون کے لیے یحییٰ کی یہ خلوص مندی ہادی کو پسند نہ آئی اور اس نے یحییٰ کو جیل میں ڈال دیا۔

ہارون خلیفہ بنا تو سب سے پہلے یحییٰ برمکی کو جیل سے نکالا اور قلمدانِ وزارت اسی کے حوالے کر دیا۔ پھر اگلے سال مہرِ خلافت اور ذاتی انگشتری بھی اسی کو دے دی۔ ①

یحییٰ برمکی نے اختیارات کو بڑی حکمت، خوش اسلوبی اور ہوشیاری سے برتا۔ سرکاری مصارف، امورِ داخلہ، تعمیری و زیاتی منصوبوں اور عوام کو عدل وانصاف کی فراہمی تک تمام ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے انجام دیں۔ ساتھ ہی اس نے ہارون کی والدہ ملکہ خیزران کا اعتماد بھی برقرار رکھا۔ جب تک وہ زندہ رہی، یحییٰ ہر کام میں اس کی رائے لیتا۔ خیزران کی وفات کے بعد سارا انتظام یحییٰ برمکی کے ہاتھ میں آگیا۔ ②

جعفر بن یحییٰ برمکی کا اقتدار:

یحییٰ نے ہارون کو بڑا اعتماد کیے بغیر حکومتی امور میں اپنے چاروں نوجوان لڑکوں: فضل، جعفر، محمد اور موسیٰ کو شریک کر لیا۔ ان چاروں میں سے پہلے دو یعنی: فضل اور جعفر صلاحیت و قابلیت میں غیر معمولی تھے۔ ۱۷۴ھ میں یحییٰ کے بڑھاپے کے سبب یہی دونوں اکثر حکومتی معاملات کو سنبھالنے لگے تاہم اہم معاملات میں یحییٰ سے مشورہ لینے کا سلسلہ جاری رہا۔

جعفر برمکی ذہانت، دوراندیشی اور فصاحت و بلاغت میں سب پر بھاری تھا۔ وہ ہارون الرشید کا لنگوٹیا یار تھا۔ دونوں میں سگے بھائیوں سے زیادہ بے تکلفی تھی۔ سفر ہو یا حضر، ہارون اسے ساتھ رکھتا تھا۔ جعفر ہر عہدے کے لیے موزوں تھا۔ اسے مصر کا گورنر بھی بنایا گیا مگر ہارون اس سے جدائی برداشت نہیں کر سکتا تھا؛ اس لیے جعفر بغداد میں رہ کر اپنے نائب کے ذریعے مصر کا انتظام سنبھالتا تھا۔ ۱۸۰ھ میں شام میں فسادات ہوئے تو جعفر ہی نے جا کر ان پر قابو پایا۔ جعفر قصرِ خلافت کا نگرانِ اعلیٰ اور ہارون کی سرکاری مہر کا امین اور مختار بھی تھا۔ دارالخلافہ کی حکومت اور انتظامیہ کا سربراہ بھی وہی تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی محبت ہارون کے دل میں اتنی گھر کر گئی کہ ہارون نے اسے وزیرِ خلافت بنا لیا۔ اس طرح عباسی خلافت کا نظم ونسق بڑی حد تک اس کے ہاتھ میں آگیا۔

جعفر کو اپنے عہدِ وزارت میں وہ مقام ملا جو اس کے باپ دادا کو بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ مؤرخین کہتے ہیں:

> ”ہارون کے نزدیک وہ قدر ومنزلت، اختیارات کے نفاذ اور عظمت ومقام میں بلاشرکتِ غیرے سب سے بلند حیثیت رکھتا تھا۔“ ③

فضل بن یحییٰ برمکی کے کارنامے:

فضل برمکی سخاوت اور نیکی میں مشہور ومعروف تھا۔ وہ ہارون کا رضاعی بھائی تھا۔ ۱۷۶ھ میں یحییٰ بن عبداللہ کے خروج کو فضل ہی نے نمٹایا تھا۔ ہارون نے ۱۷۸ھ میں اسے خراسان طبرستان، رے اور ہمدان کا گورنر بھی بنا دیا۔ اس

① البدایة والنهایة: ۵۶۱/۱۳؛ التاریخ الاسلامی العام لعلی ابراهیم حسن، ص ۳۷۷
② تاریخ ابن خلدون ۲۸۰/۳، باب اخبار البرامكه؛ البدایة والنهایة: ۵۶۲/۱۳
③ تاریخ بغداد للخطیب بغدادی: ۱۶۷/۷، ط العلمیة

کی انتظامی صلاحیتوں کا یہ حال تھا کہ اس نے وہاں پانچ لاکھ افراد پر مشتمل سرکاری فوج تیار کی جسے ''العباسیہ'' کہا جاتا تھا۔ اس سے پہلے مسلمانوں کی تاریخ میں اتنی بڑی فوجی بھرتی کہیں نہیں ہوئی تھی۔ اس نے تمام سرکشوں کو زیر کر کے کچھ ہی عرصے میں خراسان کا امن وامان قابلِ رشک بنا دیا۔ اس نے وہاں جگہ جگہ مساجد بنوائیں اور مسافر خانے تعمیر کرائے۔ دو سال بعد جب وہ بغداد لوٹا تو ان کارناموں پر ہارون الرشید نے اسے خراجِ تحسین پیش کیا، شہر سے باہر آ کر استقبال کیا اور پندرہ لاکھ درہم کے انعام سے نوازا۔ پھر اسے ملک کا وزیر مقرر کر دیا۔

محمد بن یحییٰ برمکی ہمت وحوصلے میں نمایاں تھا۔ وہ ایک مدت تک حاجب رہا۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی ہارون سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔ موسیٰ برمکی بہادری اور دلیری میں بے مثال سمجھا جاتا تھا۔ ہارون کو ان سب بھائیوں پر مکمل اعتماد تھا جس سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے مختلف شعبوں میں اپنے اعزہ واقارب اور اپنے ہم خیال عجمی امراء کو بھرتی کرنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہی لوگ اکثر محکموں پر حاوی ہو گئے۔ [1]

برامکہ کی شان وشوکت اور اختیارات:

یہ وقت خاندانِ برامکہ کے عروج کا تھا۔ شاہی خزانہ ان کے پاس تھا اور وہ اسے بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ انتظامی خوبیوں کے علاوہ ان کی فیاضی اور سخاوت نے عوام وخواص کو ان کا گرویدہ بنا دیا۔ لوگ دور دراز سے جوق در جوق ان کے گرد جمع ہوتے تھے۔ ان کے محل کے دروازے پر ملاقاتیوں، ضرورت مندوں اور فریادیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ادباء اور شعراء ان کی نوازشوں سے متاثر ہو کر زبان وقلم کو ان کی ثنا خوانی میں استعمال کر رہے تھے۔ ان کے قصیدے گھر گھر عام ہو چکے تھے۔

آمدن وخرچ کا سارا اختیار جعفر برمکی کے پاس رہتا تھا۔ بعض اوقات ہارون الرشید کو اخراجات کے لیے رقم کی ضرورت پڑتی تو اسے جعفر سے کہنا پڑتا۔ فوج کے سوا اکثر کلیدی عہدوں پر برمکی خاندان کے افراد کی اتنی زبردست اجارہ داری قائم ہو گئی تھی کہ کسی دوسرے کو ان شعبوں میں پر مارنے کی سکت نہ رہی۔ لکھت پڑھت، حساب کتاب، خزانوں اور اثاثوں کا سارا اختیار ایک ہی کنبے کے ہاتھ میں تھا۔ صرف قصرِ خلافت میں برمکی خاندان کے پچیس امراء مقرر تھے جو دفتری امور سے لے کر عسکری معاملات تک انجام دے رہے تھے۔

برامکہ کے محلات کی شان وشوکت، لباس کی وضع قطع اور ان کی محفلوں کی سج دھج نے عجم کے بادشاہوں کی یادیں تازہ کر دیں۔ اہلِ علم وادب کا جمِ غفیر ان کے گرد جمع تھا۔ خلیفہ کے محل سے کہیں زیادہ چہل پہل برامکہ کے محلات میں دکھائی دیتی تھی۔ لوگ ہارون سے کہیں زیادہ سخاوت وفیاضی کی امید برامکہ سے کرتے تھے اور قصرِ خلافت کو چھوڑ کر برامکہ کی چوکھٹ پر قطار باندھے کھڑے رہتے تھے۔ [2]

---

[1] تاریخ ابن خلدون ۳/۲۸۰، باب اخبار البرامکہ؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/۵۹۵

[2] مقدمہ ابن خلدون، ص ۲۱، ۲۲ (تاریخ ابن خلدون جلد اول)

ہارون نے برامکہ کو اتنے اختیارات کیوں دیے؟

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہارون نے برامکہ کو اتنے اختیارات کیوں دیے؟ آیا یہ کوئی انتظامی ضرورت تھی یا اپنے فرائض سے فرار اور بزمِ رنگ وطرب میں انہماک کے لیے فراغت کا راستہ؟

اردو اور فارسی کے بعض تاریخ نگاروں نے بلاشبہ یہی تاثر دیا ہے کہ برامکہ کے عروج کے دوران ہارون الرشید کی حیثیت محض ایک رسمی حکمران کی رہ گئی اور قصیدہ گو شعراء کی نظمیں سننے اور بے مقصد کاموں کے سوا اس کی کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ حالانکہ یہ بات بالکل خلافِ تحقیق ہے۔

اگرچہ برامکہ کا عروج بھی ایک تاریخی صداقت ہے اور ان کے وسیع اختیارات بھی ایک حقیقت۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ خلیفہ بے اختیار اور اہم ذمہ داریوں سے فارغ تھا اور سب کچھ برامکہ ہی کے ہاتھ میں تھا۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو برامکہ کو صرف ایک رات میں ختم کرنا ممکن نہ ہوتا بلکہ کئی خونریز جنگوں کے بعد جا کر بمشکل اس مقصد میں کامیابی حاصل ہوتی۔

صحیح بات یہ ہے کہ ہارون الرشید آخر تک مکمل بااختیار حکمران تھا۔ برامکہ کو اس نے اختیارات دو وجہ سے دیے تھے: ایک اس مصلحت کے تحت کہ وہ سیاسی امور میں عجمیوں کو زیادہ سے زیادہ شریک رکھ کر اسلامی رواداری کا نمونہ پیش کرنا چاہتا تھا اور خلافتِ اسلامیہ پر خلافت عربیہ کی لگی ہوئی چھاپ کو دور کرنا چاہتا تھا۔ دوسری مصلحت یہ تھی کہ وہ خود کو زیادہ اہم سیاسی وعسکری امور کے لیے فارغ رکھنا چاہتا تھا۔

پس برامکہ کی صحیح حیثیت یہ تھی کہ وہ مستقل طور پر جملہ دفتری امور کے ذمہ دار اور ہارون الرشید کے مشیر تھے۔ خزانہ اور شعبۂ آمدن وخرچ بلاشبہ ان کے تصرف میں تھا۔ نیز قصرِ خلافت اور بغداد شہر کے انتظامی اور بلدیاتی امور ان کے پاس تھے۔ یہ ان کے مستقل کام تھے۔ ان کے علاوہ عارضی طور پر ہارون انہیں جو مہم یا ذمہ داری سونپتا وہ اسے انجام دے دیا کرتے تھے۔ کبھی کبھار ان میں سے کسی کو مصر، خراسان یا کسی اور صوبے کا والی بنایا گیا تو وہ ایک عارضی عہدہ تھا جو بہت جلد تبدیل کر دیا گیا۔ یہ درست ہے کہ اس نے یحییٰ برمکی کو وزارت دیتے ہوئے کہا تھا:

> ''میں نے رعایا کے امور آپ کے سپرد کر دیے ہیں۔ اپنی گردن سے آپ کی گردن میں ڈال دیے ہیں۔ آپ جس کا چاہیں تقرر کریں جسے چاہے معزول کریں۔''[1]

مگر اس کا مطلب خاص شعبوں میں افسران وملازمین کا عزل ونصب تھا۔ یہ شعبے وہی تھے جن کا تعلق مفادِ عامہ اور ضروریاتِ رعایا سے تھا۔ تاریخی ریکارڈ میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ گورنروں اور فوجی جرنیلوں کی تقرری اور برخواستگی بھی برامکہ کررہے ہوں۔ عملی طور پر پورے ملک میں حکام کا عزل ونصب شروع سے آخر تک خلیفہ ہی کے ہاتھ میں تھا جیسا

---

[1] "قد فوضت اليك امر الرعية وخلعت ذلك من عنقي وجعلته في عنقك، فولّ من رايت واعزل من رايت." (البداية والنهاية: ۵۶۲/۱۳)
ہارون کے الفاظ ''امر الرعیۃ'' سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یحییٰ کو رعایا کی دیکھ بھال کے امور سپرد کیے گئے تھے نہ کہ تمام اختیارات۔

کہ خلفائے راشدین کے دور سے یہی دستور چلا آ رہا تھا۔ ہاں ہارون برامکہ سے اہم تقرریوں کے بارے میں مشورہ لے لیا کرتا تھا۔ فوج مکمل طور پر ہارون کے ماتحت تھی۔ بغاوتوں کی سرکوبی یا جہاد سمیت تمام فوجی مہمات اسی کے حکم سے ہوا کرتی تھیں۔ ہارون خود کو ایسی مہمات کے لیے فارغ رکھنا چاہتا تھا۔ ولی عہدی کے زمانے سے وہ سپاہی پیشہ تھا۔ اکثر و بیشتر جہاد کے لیے نکلتا رہتا تھا۔ خلیفہ بننے کے بعد بھی اسے شہ سواری اور مجاہدانہ زندگی پسند تھی اور علماء وفقہاء کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا مرغوب تھا۔ دفتری امور میں الجھنا اور حساب کتاب کی گھتیاں سلجھانا اس کی فطرت میں نہ تھا؛ اس لیے اس نے ایسے تمام کام برامکہ کے سپرد کر دیے جو بلاشبہ ان شعبوں کے ماہر تھے۔ خود وہ کبھی جہاد کے لیے نکلتا، کبھی بغاوت فرو کرنے کے لیے۔ کبھی حج وعمرے کے لیے، کبھی کسی صوبے کے معاملات دیکھنے کے لیے۔ ہمارے اس تجزیے کی تصدیق ہارون کے ان اسفار سے ہو سکتی ہے جو اس نے دورِ خلافت میں کیے۔ چوبیس سالہ دورِ خلافت میں چار سالوں کو چھوڑ کر کوئی سال اسفار یا مہمات سے خالی نہیں رہا۔ ایک جھلک ملاحظہ ہو:

1. ۱۷۰ھ...... بیعتِ خلافت بغداد سے باہر عیسیٰ آباد میں۔ سفرِ حج۔ پھر سفرِ جہاد
2. ۱۷۱ھ...... نیا شہر بسانے کے لیے مناسب مقام کی تلاش میں سفر
3. ۱۷۲ھ...... سفر سے خالی
4. ۱۷۳ھ...... سفرِ حج
5. ۱۷۴ھ...... سفرِ حج
6. ۱۷۵ھ...... سفرِ حج [1]
7. ۱۷۶ھ...... حج سے واپسی میں بصرہ کا سفر
8. ۱۷۷ھ...... سفرِ حج
9. ۱۷۸ھ...... سفر سے خالی
10. ۱۷۹ھ...... سفرِ عمرہ...... ادائیگی حج...... مدینہ میں قیام
11. ۱۸۰ھ...... دوبارہ مکہ آمد۔ سفرِ بصرہ۔ سفرِ شام...... رقہ میں قیام اور وہاں مستقل سکونت کی نیت
12. ۱۸۱ھ...... سفرِ حج...... ایک روایت کے مطابق اس سال ایشیائے کوچک کا جہادی سفر بھی کیا۔
13. ۱۸۲ھ...... حج سے واپسی اور رقہ میں قیام
14. ۱۸۳ھ...... سفر سے خالی۔
15. ۱۸۴ھ...... رقہ سے بغداد واپسی
16. ۱۸۵ھ...... سفر سے خالی

[1] تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۴۴۹ کے مطابق مسلسل تین سال سفرِ حج ہوا۔

⑰ ۱۸۶ھ...... سفرِ حج

⑱ ۱۸۷ھ...... حج سے واپسی پر حیرہ میں پڑاؤ، پھر کشتیوں سے براستہ دریائے فرات انبار آمد۔ پھر جہاد کے لیے ایشیائے کوچک کا سفر

⑲ ۱۸۸ھ...... آخری سفرِ حج

⑳ ۱۸۹ھ...... حج سے واپسی پر ''رے'' کی سمت سفر۔ وہاں علی بن عیسیٰ سے ملاقات۔ ۲۷ ذوالحجہ کو بغداد آمد۔ پھر بغداد سے رقہ کی طرف کوچ۔

㉑ ۱۹۰ھ...... رجب میں جہاد کے لیے ایشیائے کوچک روانگی۔ سال کے اواخر میں واپسی

㉒ ۱۹۱ھ...... رومیوں کی عہد شکنی پر دوبارہ ایشیائے کوچک کا سفر۔

㉓ ۱۹۲ھ...... ربیع الاول میں رقہ سے کشتیوں کے ذریعے بغداد آمد۔ شعبان میں خراسان کا سفر

㉔ ۱۹۳ھ...... دورانِ سفر طوس میں انتقال [1]

غرض ہارون الرشید پوری طرح فعال اور متحرک تھا۔ اس کا برامکہ کو وسیع اختیارات دینا کسی سہل پسندی کی وجہ سے نہیں بلکہ اسلامی رواداری کا نمونہ پیش کرنے اور خود کو زیادہ اہم امور میں مصروف رکھنے کے لیے تھا۔

ہارون کو غلطی کا احساس:

تاہم یہ ہارون کی سیاسی غلطی تھی کہ اس نے برامکہ کو صرف بقدرِ ضرورت اختیارات دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ غیر معمولی قوت بخش دی۔ برامکہ نے موقعے سے فائدہ اٹھا کر اختیارات کے استعمال میں رتی بھر کمی نہ کی، اپنے خاندان کو ملک کا کرتا دھرتا بنا دیا اور یہ نہ سوچا کہ اگر وہ سیاست میں ابومسلم خراسانی کے شاگرد ہیں تو ہارون بھی آخر منصور جیسے سیاست دان کی اولاد ہے؛ لہٰذا بازی الٹ بھی سکتی ہے اور مناصب کا عروج، زوال کا سبب بھی بن سکتا ہے۔

ہارون الرشید جیسا باریک بین انسان اپنی غلطی اور اس کے نتائج کو زیادہ عرصے تک نظر انداز نہ کر سکا۔ اس کے باوجود اس نے ایک مدت تک ان پر ہاتھ نہ ڈالا۔ لیکن پھر ایک دن انقلاب آ گیا۔ جس قدر اعتماد اور جتنی تیزی کے ساتھ ہارون نے برامکہ کو سیادت وقیادت اور شان وشوکت بخشی تھی، اس سے کہیں زیادہ تیزی سے اس نے ۱۸۷ھ میں اچانک انہیں بے اختیار کر ڈالا۔

❖❖❖

[1] ہارون کے اسفار سے متعلق یہ تمام معلومات ''البدایۃ والنہایۃ'' سے لی گئی ہیں۔

برامکہ کو سزا کیوں دی گئی؟

لازمی طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے آخر برامکہ سے کیا قصور ہوا تھا کہ انہیں یکدم ثریا سے تحت الثریٰ میں پھینک دیا گیا۔ اس بارے میں مختلف قیاس آرائیاں کی گئی ہیں مگر تحقیقی بات یہ ہے کہ یہ کایا پلٹ درحقیقت امرائے دولت عباسیہ کی باہمی چپقلش کی پیداوار تھی۔

ربیع حاجب کا خاندان:

عباسی دور میں وزارت، حجابت اور انتظامی امور میں ایک اور گھرانہ برامکہ کا مدمقابل تھا۔ یہ ربیع بن یونس کا کنبہ تھا جو گرچہ برامکہ جیسا عروج حاصل نہیں کر سکا مگر اس کی تگ و دو ضرور کرتا رہا۔

ربیع بن یونس اموی دور کے ان افسران کی اولاد تھا جن کا نسب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے غلاموں سے جاملتا تھا۔ ربیع، خلیفہ منصور کا حاجب یعنی اس کا مشیرِ خاص اور اس کے حفاظتی دستے کا امیر تھا۔[1]

منصب پرستی اور اس کے لیے دوسروں کو گرانا اس کی فطرت میں رچا بسا تھا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ جیسے حضرات بھی اس کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہیں تھے۔ اسے معلوم تھا کہ امام ابوحنیفہ حکام کی سخت گیری اور عوام کی پکڑ دھکڑ کے خلاف ہیں؛ لہٰذا ایک بار اس نے امام صاحب کو پھنسانے کے لیے سب کے سامنے ان سے پوچھا: ''امیر المؤمنین ہمیں لوگوں کو قتل کرنے اور ان اموال ضبط کرنے کا حکم دیتے ہیں تو کیا ان کے حکم کی تعمیل میں مجھ پر کوئی گناہ تو نہیں؟''

امام صاحب رحمہ اللہ اس کی غرض سمجھ گئے اور اپنا پہلو بچاتے ہوئے الٹا اسی سے پوچھنے لگے:

''امیر المؤمنین کے احکام برحق ہوتے ہیں یا نہیں؟'' ربیع اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکا کہ ''جی برحق ہوتے ہیں۔''

امام صاحب رحمہ اللہ بولے: ''جب وہ حق کا حکم دیتے ہیں تو بجالانے میں ثواب ہی ہوگا۔''[2]

اس واقعے سے ربیع حاجب کی طبیعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس طرح دوسروں کا مقام گرانے بلکہ انہیں معتوب بنا کر مقتل تک پہنچانے میں بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔

سفاح کے دور میں برمکیوں کے دادا خالد برمکی کا دور دورہ تھا مگر منصور کے دور میں ربیع کا پلہ بھاری ہوتا گیا۔ ابومسلم کے قتل کے بعد منصور نے احتیاطاً خالد برمکی کو بھی وزارت سے معزول کر دیا تھا اور ربیع کو مقرب بنا لیا تھا۔ ۱۵۳ھ میں منصور نے ربیع کو وزیر بنا دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنے سابقہ لقب حاجب ہی کے ساتھ مشہور رہا۔ منصور کی وفات

① سیر اعلام النبلاء: ۷/۳۳۵، ۳۳۶

② اخبار ابی حنیفہ للصیمری، ص ۷۰

کے وقت ربیع حاجب مملکت کا منتظم اعلیٰ تھا؛ لہٰذا نئے خلیفہ مہدی کی بیعت کا اہتمام اسی نے کرایا تھا۔ ①

مہدی کے دور میں بھی اصل منتظم اعلیٰ وہی تھا۔ اگرچہ وزارت دوسروں کے پاس چلی گئی مگر وہ مہدی پر اتنا اثر انداز تھا کہ جب چاہتا وزراء کو نیچا کر دکھاتا۔ مہدی کا پہلا وزیر ابوعبید اللہ ہر لحاظ سے قابل، امانت دار اور حکومت کا وفادار تھا مگر ربیع نے مہدی کو اس سے اتنا متنفر کیا کہ اسے معزول کرا کے دم لیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی وزارت ربیع کو نہیں ملی تاہم اس پر مہدی کا اعتماد مزید بڑھ گیا۔ ②

مہدی کی موت کے بعد خلیفہ ہادی کے مختصر دورِ حکومت میں وزارت ایک اور نامور امیر ابراہیم بن ذکوان کے پاس رہی۔ ربیع بدستور حاجب رہا اور یحییٰ برمکی سلطنت کا اہم ستون۔ اس دور میں ہم یحییٰ برمکی کا مقام بڑھا ہوا دیکھتے ہیں؛ کیوں کہ وہ خلیفہ ہادی کا استاذ اور ولی عہد ہارون کا رضاعی باپ بھی تھا۔ اگرچہ یحییٰ کا رویہ ربیع حاجب کے ساتھ دوستانہ رہا اور ربیع بھی اس سے تواضع و انکسار برتتا رہا مگر یہ صرف اس لیے تھا تا کہ اس کا اور اس کی اولاد کا مرتبہ محفوظ اور بلند ہو۔ اسے پسند نہ تھا کہ مقربِ خلیفہ کا اعلیٰ مرتبہ کسی اور کو حاصل ہو۔ ③ ربیع اعلیٰ مناصب اپنی اولاد کے لیے چاہتا تھا۔ ایک بار اس نے منصور سے سفارش کی تھی کہ وہ اس کے بیٹے کو اپنا محبوب و مقرب بنا لے۔ ④

فضل بن ربیع:

ہادی کی وفات کے بعد ربیع حاجب بھی جلد چل بسا اور ہارون کے عہد میں اختیارات کی اکثر کنجیاں برامکہ کے پاس چلی گئیں۔ ربیع حاجب کا بیٹا فضل باپ کی توقع کے خلاف کوئی ترقی نہ کر سکا۔ برامکہ نے اسے کوئی عہدہ نہ لینے دیا اور تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھے۔ اس صورتحال میں فضل بن ربیع کو برامکہ سے جتنی بھی جلن ہوتی وہ کم تھی۔ ⑤

سالہا سال بعد فضل بن ربیع کی قسمت جاگی جب ۱۷۹ھ میں ہارون الرشید نے محمد بن یحییٰ برمکی کی جگہ اسے حاجب بنایا۔ ⑥ اس طرح فضل بن ربیع کو ہارون کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع مل گیا۔ تاہم یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ برامکہ کے خلاف ہارون کے کان بھرتا؛ اس لیے کہ برامکہ اپنا حساب بہت صاف رکھتے تھے اور کسی قسم کے شک وشبے کا کوئی موقع نہیں دیتے تھے۔ ہارون کو بھی ان پر اندھا اعتماد تھا۔ فضل بن ربیع ان کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ برامکہ فضل بن ربیع جیسے امراء کی جو درخواست چاہتے ٹھکرا دیتے۔

اس بارے میں یہ واقعہ قابلِ غور ہے کہ ایک بار فضل بن ربیع عوام کی دس درخواستیں لیے دفترِ وزارت میں پہنچا۔ وہاں یحییٰ برمکی کے حکم کے مطابق جعفر برمکی درخواستوں پر منظوری کی مہر لگا رہا تھا۔ فضل بن ربیع کی درخواستیں دیکھے بغیر واپس کر دی گئیں۔ اسے بڑا غصہ آیا اور وہ کچھ اشعار پڑھتے ہوئے لوٹنے لگا جن میں برے انجام کی دھمکی دی گئی

---

① تاریخ الطبری: ج ۸/۱۱۱، ۱۱۲ تحت ۱۵۸ھ
② تاریخ الطبری: ۸/۱۳۹: سنة ۱۶۱ھ
③ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ٤٤٧؛ تاریخ الطبری: سنة ۱۵۸ھ، ۱۵۹ھ
④ وفیات الاعیان: ۲/ ۲۹٤
⑤ وفیات الاعیان: ٤/ ۳۷، فضل بن الربیع
⑥ تاریخ خلیفة بن خیاط، ص ٤٦٥؛ تاریخ الطبری: سنة ۱۷۹ھ

تھی۔ یہ سن کر یحییٰ برمکی نے اسے بلایا اور درخواستیں منظور کر لیں۔[1]

اگرچہ فضل بن ربیع اس وقت برامکہ کی عزت و منزلت اور اختیارات کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا تاہم وہ موقعے کی تلاش میں رہا کہ کب اسے ہارون کے دل میں اترنے اور اپنے رقیبوں کا مرتبہ گرانے کا موقع ملے۔

برامکہ کے بارے میں ہارون کے شکوک وشبہات:

ادھر جعفر برمکی کو غیر معمولی اختیارات سونپنے کے چند سالوں بعد ہارون کو بھی مختلف قسم کے شکوک وشبہات گھیرنے لگے؛ کیوں کہ جس قسم کا اثر ورسوخ برامکہ کو حاصل تھا اس کے ہوتے ہوئے وہ بنوعباس کے لیے زبردست خطرہ بھی بن سکتے تھے۔ ہارون دیکھ رہا تھا کہ برامکہ کا اثر ورسوخ بے پناہ ہے اور ان کی دولت اندازے سے بالاتر۔

ہارون اکثر و بیشتر سفر میں رہتا تھا۔ جس بھی گاؤں، جاگیر اور باغ سے اس کا گزر ہوتا اور وہ پوچھتا کہ یہ کس کی ملکیت ہے تو اکثر و بیشتر یہی جواب ملتا: ''جعفر برمکی کی۔''[2]

جعفر برمکی نے اپنی نئی رہائش گاہ پر بیس لاکھ درہم (تقریباً پچاس کروڑ روپے) خرچ کیے تھے۔ ہارون کو یہ اسراف اور شاہانہ خرچے بھی کبھی کبھار نا گوار گزرتے تھے۔[3]

اس کے دل میں برامکہ کے بارے میں عجیب عجیب خیالات آتے رہتے۔ مؤرخین نے اس بارے میں جو واقعات نقل کیے ہیں، ان سے صاف پتا چلتا ہے کہ ایک مدت تک ہارون متضاد کیفیات ورجحانات میں مبتلا تھا۔ ایک طرف برامکہ سے گہرے تعلقات، ان کی قابلِ تعریف خدمات، استادی شاگردی کا ناطہ، رضاعی رشتے، سالہا سال کی دوستی، طبعی محبت اور دلچسپ ہم نشینی...... دوسری طرف موروثی اقتدار کے یکدم چھن جانے کا خوف، قید و بند کی صعوبتوں کے وہم، عوام میں اپنی کم تری اور اپنے ماتحتوں کی زیادہ مقبولیت کا احساس۔

بعض ہم نشینوں کی باتیں اس کے خدشات کو تقویت دیا کرتی تھیں۔ بعض عمائدِ قوم بھی ہارون کو خبردار کرتے تھے کہ وہ برامکہ کو تمام اختیار دے کر دنیا و آخرت خراب کر رہا ہے۔ بغداد کے ثقہ محدث محمد بن لیث رحمہ اللہ (م ۲۹۱ھ) نے اپنے مراسلے میں لکھا تھا:

> ''آپ نے اپنے اور اللہ کے درمیان برمکی کو آڑ بنا لیا ہے۔ مگر کل جب آپ اللہ کے سامنے پیش ہوں گے تو وہ آپ کے کچھ کام نہیں آئے گا۔ جب اللہ آپ سے پوچھے گا کہ آپ نے اس کے بندوں اور اس کے شہروں کو کیسے سنبھالا تو کیا آپ جواب میں یہ کہیں گے کہ میں نے بندوں کا معاملہ یحییٰ برمکی کے حوالے کر رکھا تھا۔ کیا یہ جواب اللہ کو راضی کر سکے گا!!''

ہارون نے اس وقت تو برامکہ کی محبت میں مغلوب ہو کر مراسلہ یحییٰ برمکی ہی کو تھما دیا اور جب یحییٰ نے اپنی کارکردگی کو شک سے پاک ظاہر کرنے کے لیے محمد بن لیث کے اسلام میں شبہ ظاہر کیا تو ہارون نے سوچے سمجھے بغیر محمد بن لیث کو

[1] شذرات الذهب: ۲/۲۱ [2] البداية والنهاية: سنة ۱۸۷ھ [3] تاريخ الطبری: ۸/۲۹۱

جیل میں پھینکوا دیا۔[1]

مگر دوسرے وقت میں جب محمد بن لیث جیسے لوگوں کی باتیں اس کے ذہن میں گونجتیں تو وہ برامکہ سے دل برداشتہ ہونے لگتا۔ ایسے میں اس کا رضاعی باپ یحییٰ برمکی بھی دربار میں اپنی عادت کے مطابق بلا اجازت آجاتا تو ہارون ناگواری ظاہر کرتا۔ پھر اپنی اس حرکت پر خود ہی شرمندہ ہوتا اور معذرت کرتا۔[2]

کیا برامکہ واقعی آمادۂ بغاوت تھے؟

تاریخ میں ایسا کوئی پختہ ثبوت نہیں ملتا کہ آیا واقعی برامکہ بغاوت کا کوئی منصوبہ بنا رہے تھے یا نہیں۔ ہاں یہ درست ہے کہ وہ عجمیوں اور مجوسیوں کا اثر و رسوخ بڑھا رہے تھے؛ اسی لیے جعفر برمکی نے ایک مجوسی فضل بن سہل کو ولی عہد مامون الرشید کا خادم خاص بنا دیا تھا جو ہارون کی موت کے بعد دولتِ عباسیہ کا مطلق العنان وزیر بن گیا۔

غالباً انہی پہلوؤں کے پیش نظر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایک جگہ لکھا ہے:

''کہا گیا ہے کہ برامکہ ہارون کی خلافت ختم کرنے اور زندیقیت ظاہر کرنے کا عزم کیے ہوئے تھے۔''[3]

تاہم تاریخ کے اوراق ان کی سازش کا کوئی پختہ ثبوت دینے سے قاصر ہیں۔ شاید برامکہ اتنے ہوشیار تھے کہ انہوں نے کوئی ثبوت نہیں ہاتھ لگنے دیا۔

ہارون کے شک کا پہلا اہم سبب:

ویسے تو ہارون کے دور میں برامکہ کو جو اختیارات نصیب تھے وہ بادشاہت سے کم نہیں تھے؛ اس لیے انہیں مسندِ خلافت پر قبضہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ تاہم یہ امکان ہے کہ وہ حکومت کو اولادِ عجم میں لے جانا چاہتے ہوں۔ غالباً اسی لیے آخری ایام میں، ہارون برامکہ کو سخت شک وشبہے کی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔ ہم ہارون جیسے محتاط، رحم دل اور فیاض انسان کے ان شبہات کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور سمجھ سکتے ہیں کہ اندر ہی اندر کوئی کھچڑی پک رہی تھی جسے ہارون کی چھٹی حس نے محسوس کر لیا تھا۔

مگر چونکہ وہ جانتا تھا کہ برامکہ تمام امور پر قابض ہیں؛ اس لیے اس نے اپنے شک کو ایک لمحے کے لیے بھی برامکہ یا ان کے ہمدردوں پر ظاہر نہیں ہونے دیا؛ اس لیے برامکہ اس کی ذہنی کش مکش سے آگاہ نہ ہو سکے۔ اگر کبھی وہ چوکنا ہونے بھی لگتے تو ہارون فوراً مہربانی اور دلداری کر کے انہیں بے فکر کر دیتا۔ اُسے خدشہ تھا کہ اگر برامکہ کو اس بداعتمادی کا اندازہ ہو گیا تو وہ راست اقدام میں پہل کر دیں گے۔

یحییٰ اور اس کے بیٹوں پر اس کی نوازشیں اسی طرح جاری تھیں تاہم جعفر برمکی نے تاڑ لیا تھا کہ ہارون کچھ بدلا بدلا سا ہے؛ کیوں کہ اس کی سنجیدہ باتوں کو اب ہارون مذاق میں اڑا دیتا تھا اور اس کے مذاق پر سنجیدہ ہو جاتا تھا۔[4]

[1] تاریخ الطبری: ۲۸۸/۸
[2] تاریخ الطبری: ۲۸۷/۸
[3] البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۱۸۷ھ
[4] تاریخ الطبری: ۲۹۱/۸، ۲۹۲

ہارون کے شک کا دوسرا اہم سبب:

ہارون کے شکوک کا دوسرا اہم سبب وہ شکایات تھیں جو برامکہ کے مخالفین کی طرف سے ہارون کو پہنچا کرتی تھیں۔ اگر چہ یہ مخالفین گنے چنے ہی تھے۔

فضل بن ربیع کے بعد برامکہ کا دوسرا بڑا مخالف علی بن عیسیٰ بن ماہان تھا۔ یہ منصور، مہدی اور ہادی کے دور میں محل کا داروغہ تھا۔ خلفاء کا پکا وفادار و جاں نثار تھا۔ منصور کی موت کے بعد مہدی کی بیعت کو تمام امراء سے منوانے میں اس کا اہم کردار تھا۔ حکومت کے مخالفین کی سرکوبی کرنے اور خاص کر زندیقوں کو ٹھکانے لگانے میں وہ بڑا فعال تھا۔ ہارون نے ۱۸۰ھ میں اسے خراسان کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ اس تقرری کی سب سے زیادہ مخالفت یحییٰ برمکی نے کی تھی۔ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ ہارون نے کسی معاملے میں اس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ کچھ مدت بعد جب علی بن عیسیٰ نے محصولات کی مد میں گراں قدر رقم بھیجی تو ہارون نے یحییٰ برمکی کو کہا: ''یہ وہی شخص ہے جس کے بارے میں تم نے مشورہ دیا تھا کہ اسے حاکم نہ بنایا جائے، ہم نے تمہاری رائے سے اتفاق نہ کیا تو اس میں برکت ہوئی۔''

یحییٰ برمکی نے جواب میں بڑے شدومد سے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ محصولات کی یہ بھاری مقدار عوام پر ظلم وستم کے ذریعے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔

اس کے بعد خراسان سے علی بن عیسیٰ کے عوام پر ظلم وستم کے شکایتی خطوط مرکزِ خلافت پہنچنے لگے۔ یہ بھی مشہور کیا گیا کہ علی بن عیسیٰ بغاوت پر تیار ہے۔ بظاہر عوام پر زیادتی کی کچھ شکایات درست تھیں؛ کیوں کہ علی بن عیسیٰ کا مزاج سخت تھا، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برامکہ بات کو مبالغہ آمیز رنگ دے رہے تھے؛ کیوں کہ خط وکتابت سمیت ہر شعبہ ان کے پاس تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہارون نے یہ خطوط پڑھ کر یحییٰ برمکی کے مشورے کے برخلاف علی بن عیسیٰ کو فوراً معزول نہیں کیا بلکہ حقیقتِ حال جاننے کے لیے خود خراسان کے مرکز ''مرو'' کا رخ کیا، ساتھ ہی علی بن عیسیٰ کو بھی لکھ دیا کہ وہ ملاقات کے لیے مرو سے کوچ کرے۔ یہ ۱۸۳ھ کا واقعہ ہے۔

ہارون رے تک پہنچا تھا کہ علی بن عیسیٰ آن ملا۔ اس نے ہارون کو بیش قیمت تحائف پیش کیے اور تمام شکایات کے بارے میں مطمئن کر دیا۔ یہ ثابت ہوگیا کہ اس کے بارے میں باغیانہ عزائم کی اطلاعات جھوٹی ہیں۔ ہارون نے نہ صرف اسے خراسان کی حکومت پر بحال رکھا بلکہ اعزاز کے طور پر اسے رخصت کرنے کے لیے ساتھ پیدل چلتا رہا۔

اس کے بعد ۱۸۶ھ میں علی بن عیسیٰ نے ابوالخصیب نامی ایک حکومت مخالف امیر کی سرکوبی کر کے ہارون سے اپنی وفاداری کا ثبوت دیا۔[1]

چونکہ علی بن عیسیٰ کی برامکہ سے اب ٹھن گئی تھی؛ اس لیے اسے جونہی ان کی کوئی کمزوری پتا چلتی وہ ہارون الرشید کو اطلاع پہنچا دیتا۔ ایک دن اسے اطلاع ملی کہ یحییٰ برمکی کا بیٹا موسیٰ خراسان میں بغاوت کرانے والا ہے؛ کیوں کہ وہاں اس خاندان

[1] تاریخ الطبری: ۱۱۲/۸، ۱۱۳، ۱۴۴، ۱۸۹، ۲۶۶، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۲۷۰، ۲۷۵

علی بن عیسیٰ نے یہ خبر ہارون کو دے دی۔

اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہ اطلاع صحیح تھی یا غلط۔ مگر ہارون جو پہلے ہی شکوک وشبہات میں گھرا ہوا تھا، یہ سن کر بڑا پریشان ہوا۔ اس نے واقعے کی تحقیق کے لیے موسیٰ برمکی کو تلاش کرایا تو پتا چلا وہ غائب ہے۔ اگرچہ برامکہ کے حامیوں کا کہنا تھا کہ وہ کسی قرض خواہ سے ڈر کر غائب ہوا ہے مگر برامکہ کی دولت اور شان وشوکت کے پیشِ نظر ان کے کسی فرد کا مقروض ہونا اور پھر قرض خواہوں سے ڈر کر چھپ جانا سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی؛ اس لیے ہارون کو یقین تھا کہ موسیٰ برمکی بغاوت کرانے خراسان گیا ہے۔

بعد میں موسیٰ پکڑا گیا۔ اگرچہ اس کے خلاف الزام کا کوئی ثبوت نہ ملا مگر ہارون نے احتیاطاً اسے نظر بند کردیا۔ پھر جب اس کی والدہ یعنی ہارون کی رضاعی ماں سفارش کرنے آئی تو ہارون مجبور ہوگیا اور موسیٰ برمکی کو معاف کردیا۔ [1]

تاہم ہارون ایسا غافل نہ تھا کہ اس واقعے کے بعد بھی برامکہ پر اسی طرح اعتماد کرتا رہتا۔ درحقیقت اس کے بعد اس کا بھروسہ بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے بعد کوئی بھی واقعہ اسے برامکہ کے استیصال پر مجبور کرسکتا تھا۔ کچھ دنوں بعد ایسا ہی ایک واقعہ پیش آگیا جس کے بعد ہارون کو تاب ضبط نہ رہی۔

نمبر ۱۱ اہم سبب:

یحییٰ بن عبداللہ ہاشمی کو ہارون نے جعفر برمکی کی تحویل میں دے رکھا تھا؛ کیوں کہ ہارون کو ان سے خروج کا خطرہ تھا۔ جعفر برمکی نے انہیں چپکے سے رہا کردیا۔ ہارون کو کانوں کان خبر نہ تھی کہ کیا ہو چکا ہے۔ قسمت کی بات کہ ایک مسافر نے اس ہاشمی کو کسی سرائے میں دیکھا اور پہچان لیا۔ وہ تیزی سے بغداد آیا، قصرِ خلافت پہنچا اور دربان سے کہا کہ خلیفہ کو تنہائی میں ایک نصیحت کرنی ہے۔

ہارون اس وقت یحییٰ برمکی اور دوسرے اعیانِ سلطنت کے ساتھ محوِ گفتگو تھا۔ اس شخص کو الگ بلا کر ماجرا پوچھا۔ جب اس نے بتایا کہ یحییٰ بن عبداللہ ہاشمی کو آزاد دیکھا گیا ہے تو ہارون کو یقین نہیں آیا۔ اس نے ہاشمی کی شکل وصورت اور حلیے سے لے کر عادات وسکنات تک کے بارے میں سوالات کیے۔ مخبر نے درست جواب دیے تو ہارون کو نہ صرف یقین ہوگیا بلکہ وہ جعفر برمکی کی اس جرأت پر ششدر رہ گیا۔

ہارون وقت کا مایہ ناز سیاست دان تھا، اس وقت چوکنے پن کا اظہار کرکے برامکہ کو ہوشیار کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا جن کے آدمی محل کے ہر کونے میں موجود تھے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے مخبر کو کہا:

''اگر میری خیر خواہی میں تمہیں کچھ تکلیف پہنچے تو برداشت کروگے؟''

وہ بولا: ''دل وجان سے۔''

ہارون نے اسے دو ہزار دینار کی تھیلی انعام میں دی اور کہا: ''اسے اپنی چادر میں چھپالو۔''

[1] تاریخ الطبری: ۲۹۳/۸

پھر آواز لگا کر غلاموں کو بلایا۔ پہلے اس مخبر کو ٹھاپ نچے لگوائے، پھر مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''اسے دھکے دے کر نکال دو اور آواز لگا دو کہ جو بھی امیر المؤمنین کے دوستوں کی شکایات لگائے گا، اس کی یہی سزا ہے۔'' غلاموں نے حکم کی تعمیل کی۔

ادھر فضل بن ربیع کو بھی پتا چل گیا تھا کہ جعفر برمکی نے ہاشمی قیدی کو رہا کر دیا ہے۔ اس نے بھی جا کر ہارون الرشید کو اطلاع دی۔ ہارون نے یہاں بھی مصنوعی ناراضی کا اظہار کیا اور کہا:

''تمہیں اس سے کیا؟ ہو سکتا ہے جعفر نے میری مرضی سے رہا کیا ہو۔''[1]

ہارون کا مقصد صرف یہ تھا کہ برامکہ کو محسوس نہ ہونے پائے کہ ان کے خلاف کسی شکایت پر یقین کیا گیا ہے۔ اگلے دن اس نے جعفر برمکی کو ناشتے پر بلایا اور باتوں باتوں میں ہاشمی قیدی کا حال پوچھا۔

جعفر نے کہا: ''وہ ویسے ہی قید خانے میں پڑا ہوا ہے۔''

ہارون نے کہا: ''میرے سر کی قسم کھا کر کہو۔''

جعفر بھانپ گیا کہ ہارون حقیقت سے واقف ہو چکا ہے اور اب جھوٹ بولنا مہلک ہوگا۔ اس نے کہا:

''امیر المؤمنین! میں نے اسے آزاد کر دیا ہے۔ درحقیقت وہ مرنے ہی والا ہے۔ اس سے کوئی خطرہ نہیں۔''

ہارون نے بے فکری سے کہا: ''تم نے جو کیا اچھا ہی کیا۔''

اس کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں کر کے جعفر کو رخصت کر دیا۔ جب وہ دور چلا گیا تو ہارون اسے گھورتا رہا۔ پھر بولا:

''اگر میں اسے قتل نہ کرا دوں تو اللہ مجھے کفر کی حالت میں اسلام کی تلوار سے ہلاک کرے۔''

مگر ہارون نے اس وقت کچھ بھی نہ کیا۔ برامکہ کو اس نے بالکل بے فکر رکھا اور بظاہر ''سب ٹھیک ہے'' کا تاثر دیتے ہوئے سارے شہزادوں سمیت حج کے لیے چلا گیا۔ یہ ۱۸۶ھ کی بات ہے۔[2]

ولی عہدی کا اعلان:

حج کے موقع پر اس نے وہاں اجتماعِ عام میں اپنے بیٹوں کی بالترتیب ولی عہدی اس طرح طے کی کہ پہلے امین الرشید حکمران ہوگا، پھر مامون الرشید۔ اس کے بعد اگر مامون راضی ہو تو تیسرا بیٹا قاسم الرشید ولی عہد ہوگا۔

ولی عہدی کی اس ترتیب میں ہارون کی بیگم زبیدہ خاتون کا اصرار شامل تھا ورنہ اصولِ سیاست کا تقاضا تھا کہ صرف بڑے بیٹے مامون کو ولی عہد بنایا جاتا جس کی عمر اس وقت سترہ سال تھی۔ وہ عقل و فہم میں بھی غیر معمولی تھا۔ ہارون خود بھی اسی کو پسند کرتا تھا۔ مگر وہ ایک باندی کے بطن سے تھا؛ اس لیے زبیدہ خاتون اپنے سگے بیٹے محمد امین الرشید کو ولی عہد بنانے پر بضد تھی۔ ہارون زبیدہ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا؛ اس لیے اس نے یہ تدبیر نکالی کہ پہلے امین اور پھر مامون بالترتیب

① تاریخ الطبری: ۲۹۰/۸، ۲۹۱، ۲۸۹

② تاریخ الطبری: ۲۸۹/۸

ولی عہد ہوں گے اور مامون چاہے تو اپنے بعد قاسم کو ولی عہد بنا دے۔
ہارون کو چونکہ یہ بھی خطرہ تھا کہ امین خلیفہ بننے کے بعد باقی بھائیوں سے ناانصافی نہ کرے؛ اس لیے ولی عہدی کی بیعت لینے کے ساتھ ہی اس نے مملکت کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا: بغداد، عراق اور شام امین الرشید کے نام کر دیے۔ مامون کو خراسان اور مشرقی صوبوں کا اور قاسم کو الجزیرہ اور شمالی و مغربی صوبوں کا تاحیات حاکم بنا دیا تاکہ پہلا ولی عہد حکمران بننے کے بعد دوسرے بھائیوں کو وہاں سے معزول نہ کر سکے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہارون کے چوتھے بیٹے معتصم کو ولی عہدی کی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا جو اس وقت چھ سال کا تھا۔ وہ کم عمر اور لکھنے پڑھنے میں نہایت کند ذہن تھا؛ اسی لیے اسے کسی قابل نہیں سمجھا گیا۔ مگر اللہ کی شان کہ آگے چل کر نہ صرف یہ کہ معتصم بنو عباس کا بہت نامور خلیفہ بنا بلکہ مستقبل میں عباسی خلافت اسی کی نسل میں چلی۔

جانشینوں کی تقرری اور مملکت کی تقسیم کے متعلق ہارون کا فیصلہ چاہے اس کے لحاظ سے کتنی ہی دور اندیشی پر مبنی ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے عواقب اچھے نہیں نکلے۔ اہلِ دانش نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ اولاد کے درمیان جنگ کی بنیاد رکھ دی گئی ہے جس کا نقصان رعایا کو بھگتنا پڑے گا۔[1]

بلاشبہ اس طرح مملکت کی تقسیم کا جو خطرہ پیدا ہوا وہ ہارون کی وفات کے کچھ ہی عرصے بعد حقیقت بن گیا اور دنیا نے دیکھا کہ امین اور مامون میں پہلے کشیدگی پیدا ہوئی اور پھر باہم جنگ شروع ہوگئی۔

برامکہ کے خلاف راست کارروائی:

ولی عہدی اور تقسیم مملکت کے اعلانات کے بعد ۱۸۷ھ کے آغاز میں ہارون حج سے واپس روانہ ہوا تو جعفر کے قتل اور باقی برامکہ کو قید کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ مگر جو انداز اس نے اپنایا تھا، اسے دیکھ کر کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ سر پر بغاوت کی تلوار لٹکتے دیکھ رہا ہے۔ کوئی نہیں سوچ سکتا تھا کہ مرکز میں اتنے بڑے انقلاب کی ٹھاننے والا شخص شہزادوں سمیت تین چار ماہ تک حج کے سفر پر رہ سکتا ہے اور وہاں اطمینان سے مملکت کی ذمہ داریاں شہزادوں کو سونپنے میں مشغول ہو سکتا ہے؛ اس لیے برامکہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔

برامکہ کو نمٹانا نہایت نازک معاملہ تھا۔ اس میں دو چیزیں انتہائی اہم تھیں: پہلی یہ کہ برامکہ کو بھنک نہ پڑے۔ دوسری یہ کہ کارروائی میں انتہائی با اعتماد لوگوں سے کام لیا جائے۔ کارروائی کی منصوبہ بندی میں فضل بن ربیع اور اس کا بیٹا عباس بن فضل شامل تھے جو برمکی خاندان کے روایتی حریف تھے۔ ہرثمہ بن اعین اور اپنے خادم خاص مسرور کبیر کے سوا ہارون کو بغداد کے کسی اور افسر پر یقین نہیں تھا کہ وہ برامکہ پر ہاتھ اٹھانے کا حوصلہ کرے گا۔

ہارون مکہ سے چل کر دریائے فرات پہنچا اور یہاں سے کشتیوں میں سفر کرتے ہوئے بغداد کی راہ لی۔ اس سے

---

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۱۴، ط مکتبة نزار

پہلے اس نے دور دراز علاقے میں تعینات ایک افسر سندی بن شاہک کو رقعہ بھیج کر ایک دستے سمیت فوری طور پر پاس بلوالیا تھا۔ سندی بن شاہک فرات کے کنارے پہنچا۔ ہارون اس وقت کشتی میں بیٹھا تھا۔ فضل بن ربیع کا بیٹا عباس کنارے پر کھڑا تھا۔ ہارون نے سندی بن شاہک کو کشتی میں بلاکر تنہائی میں ملاقات کی اور پوچھا:

''معلوم ہے میں نے تمہیں کیوں بلوایا ہے؟''

اس نے لاعلمی ظاہر کی تو ہارون نے کہا: ''یہ ایسا کام ہے کہ اگر اس کا علم میری قمیص کو ہوجائے تو میں اسے بھی دریائے فرات میں پھینک دوں۔'' اس کے بعد ہارون نے اسے فوراً بغداد پہنچ کر دستے کے ساتھ تیار حالت میں رہنے کا حکم دیا اور کہا: ''بگل بجتے ہی برامکہ کے محلات کا محاصرہ کر لینا۔''[1]

اب ہارون بغداد پہنچا۔ اس نے برامکہ کو ذرا بھی چوکنا نہ ہونے دیا۔ سرِ شام جعفر برمکی کو ساتھ کھلا پلاکر اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا۔ اس کے بعد اس کے گھر تحائف بھی بھیجے۔

یہ یکم صفر ۱۸۷ھ کی شب تھی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ برامکہ کی ہوش رُبا سج دھج اور خیرہ کن چمک دمک کی آخری جھلک ہے۔ رات کے کسی پہر بگل بجا اور خاصہ فوج نے برامکہ کے محلات کو گھیر لیا۔ ہَرثمہ بن اَعیَن، جعفر برمکی کی رہائش گاہ میں داخل ہوا اور اسے گرفتار کر لیا۔ اسے فی الفور سزائے موت دے دی گئی۔

خاندان کے سربراہ یحییٰ برمکی کو باقی بیٹوں سمیت جیل میں ڈال دیا گیا۔ یحییٰ برمکی اور اس کے بیٹے فضل نے جیل ہی میں دم توڑا۔ البتہ محمد اور موسیٰ کو بعد میں ہارون کے بیٹے امین نے رہا کر دیا اور ان کی بقیہ زندگی گمنامی میں گزری۔[2]

یہ تھی اس خاندان کے عروج و زوال کی کہانی جس کے ہاتھوں نصف صدی تک بنوعباس کی تاریخ کے دور زریں کے کئی اوراق لکھے گئے مگر اس کا انجام ایسا ہوا کہ عبرت بھی ٹھٹک جاتی ہے۔

برامکہ کا قتل، صحیح یا غلط؟

ہم نے قیاس آرائی سے دامن بچاتے ہوئے معتبر کتبِ تاریخ کے حوالوں کے ساتھ معاملے کو تحقیقی انداز میں پیش کر دیا ہے۔ اسے پڑھ کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ:

① ہارون کو برامکہ کی بغاوت کا پورا یقین تھا۔

② اگرچہ بظاہر برامکہ خلیفہ کے وفادار تھے مگر ہارون کا قطعی فیصلہ، حتمی کارروائی اور نہایت احتیاط اور چابک دستی سے انہیں زیر کرنا یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس کے پاس برامکہ کی سازشوں کی کچھ پختہ اطلاعات تھیں۔

یہ تو معاملے کا وہ پہلو تھا جس کو ہم ہارون الرشید کی سمت کھڑے ہوکر دیکھ رہے ہیں۔

مگر اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ ہمیں انصاف سے کام لیتے ہوئے اسے بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ وہ یہ کہ اگر برامکہ کا کوئی کھلم کھلا اقدام قابلِ تنقید تھا تو یہی کہ وہ عجمیوں کو غالب کر رہے تھے۔ برامکہ کی طرف سے خلیفہ

---

① تاریخ الطبری: ۲۹۸/۸ ② تاریخ الطبری: ۲۹۱/۸ تا ۲۹۷

یہ صریح احکام کو نظر انداز کر جانے کا صرف ایک ہی واقعہ ملتا ہے یعنی یحییٰ بن عبداللہ ہاشمی کی رہائی کا۔ جہاں تک عجمیوں کو بھرتی کرنے کے الزام کی بات ہے تو یہ صرف برامکہ کا قصور نہیں تھا بلکہ اس میں خلفاء کی رضامندی یا کم از کم غفلت ضرور شامل تھی۔ اگر خلفاء عجمیوں کی بھرتی ناپسند کرتے تھے تو برامکہ کو منع کر سکتے تھے۔ وہ چاہتے تو حسبِ پسند اوپر سے نیچے تک عربوں ہی کو رکھ لیتے؛ کیوں کہ ان کا اختیارِ عزل ونصب سلب نہیں ہو گیا تھا۔ منصور، مہدی یا ہارون نے کئی بڑے بڑے برمکیوں کو مختلف عہدوں سے برطرف کیا یا ان کے تبادلے کیے۔

ایسے میں برامکہ کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس پر اگر خود عباسی دور کے غیر جانب دار مؤرخین نے حیرت وافسوس کا اظہار کیا ہے تو یہ بات ہرگز قابلِ تعجب نہیں۔ مانا کہ ہارون کو پختہ ذرائع سے برامکہ کی کسی باغیانہ سازش کا علم ہوا ہو گا مگر سزا دینے کا قانونی وعرفی طریقہ یہ تھا کہ انہیں گرفتار کر کے عدالت میں لایا جاتا اور ان کے جرائم کے ثبوت پیش کیے جاتے تا کہ عوام وخواص میں سے کسی کو ان کے قابلِ سزا ہونے میں شک نہ رہتا۔ اسی میں منصبِ خلافت کے وقار کا تحفظ اور خلافت مآب کی نیک نامی تھی۔ ماورائے عدالت سزا دینا ہمیشہ حکومت کو بدنام کرتا ہے، ملزم کو نہیں۔

ہمیں اس معاملے کا یہ پہلو بھی سامنے رکھنا چاہیے کہ برامکہ کے مخالف امراء اس کایا پلٹ میں برابر کے شریک تھے۔ جیسا کہ اکثر مؤرخین نے برامکہ کی ہلاکت کا ذمہ دار فضل بن ربیع کو ٹھہرایا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''وہ برامکہ کو ناپسند کرتا تھا؛ لہٰذا ان سے انتقام لیا۔''[1]

علامہ عکری حنبلی رحمہ اللہ فضل بن ربیع اور برامکہ میں کشیدگی کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:

''برامکہ کی تباہی اسی کے ہاتھوں آئی تھی۔''[2]

علی بن عیسیٰ کا اس میں جو کردار تھا وہ اوپر تفصیل سے گزر چکا ہے۔ دولتِ عباسیہ کے کاتب اسماعیل بن صبیح کا بھی اس لگائی بجھائی میں اچھا خاصا حصہ تھا۔ اس دور کے ایک دانشور کا کہنا تھا:

''جب اللہ کسی قوم کی ہلاکت اور اس کی خوشحالی کے زوال کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کے اسباب پیدا کر دیتا ہے۔ برامکہ کے زوال کے اسباب یہ تھے کہ انہوں نے فضل بن ربیع کا مرتبہ گھٹایا، فضل نے ان کے خلاف شکایات لگائیں، اسے خلیفہ کے پاس بیٹھنے کا موقع مل گیا، اس نے خلیفہ کو ان کے خلاف بھڑکا دیا اور کاتب اسماعیل بن صبیح نے خلیفہ کو اس پر آمادہ کیا، یہاں تک کہ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔''[3]

ایک بے سروپا قصہ اور اس کی حقیقت:

برامکہ کی بربادی کے بارے میں بعض مؤرخین نے زبان وبیان کا مزا لینے کے لیے بالکل بے سروپا قصے نقل کر دیے ہیں جن میں سے ایک مشہور قصہ یہ ہے کہ ہارون الرشید اور جعفر برمکی روزانہ ساتھ بیٹھ کر شراب نوشی کرتے تھے اور اس بزمِ عیش ونشاط میں ہارون الرشید کی بہن عباسہ بھی شریک ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ جعفر اور عباسہ میں معاشقہ ہو گیا۔

[1] سیر اعلام النبلاء: ۱۰۹/۱۰ [2] شذرات الذھب: ۲۱/۲ [3] وفیات الاعیان: ۳۷/۴، ط دار صادر

ہارون کو علم ہوا تو جعفر اور عباسہ کا نکاح کرا دیا تاکہ جعفر کے لیے عباسہ کو دیکھنا شرعاً جائز ہو جائے۔ ساتھ ہی ہارون نے شرط لگا دی کہ دونوں کبھی تنہا نہیں ملیں گے اور ایک دوسرے کو دیکھنے یا باتیں کرنے کے سوا کچھ نہیں کریں گے۔ بعد میں جعفر اور عباسہ اس شرط پر قائم نہ رہے اور خلوت میں مل بیٹھے۔ ہارون کو جب پتا چلا تو غصے سے بھڑک اٹھا اور پورے برمکی خاندان کو اپنے انتقام کا نشانہ بنا دیا۔

یہ قصہ جو ہارون الرشید کی وفات سے ایک صدی بعد گھڑا گیا اور تاریخ طبری میں نقل کیا گیا ہے، کسی بھی طرح معیارِ تحقیق پر پورا نہیں اترتا۔ سند کے لحاظ سے یہ نہایت ضعیف ہے کہ زاہر بن حرب نامی ایک مجہول راوی اسے بیان کر رہا ہے۔ درایتاً یہ درج ذیل وجوہ سے ناقابلِ قبول ہے:

① ہارون الرشید جیسے متقی اور تہجد گزار خلیفہ سے توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ شراب وکباب میں منہمک رہ کر رات گزارتا ہو۔ علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''ہارون الرشید کا مے نوشی سے اجتناب اس کے رفقاء اور ہم نشینوں کے ہاں ایک معروف بات تھی۔ یہ بات ثابت ہے کہ جب اسے ابونواس شاعر کی مے نوشی کا پتا چلا تو اسے اس وقت تک قید رکھا جب تک اس نے توبہ نہ کر لی۔ ہاں! وہ اہلِ عراق کے مذہب وفتاویٰ کے مطابق نبیذ پیا کرتا تھا۔ جہاں تک مے نوشی کا تعلق ہے تو ہارون پر ایسا الزام لگانے کی کوئی گنجائش نہیں۔ نہ ہی ایسی واہیات خبروں پر یقین کرنا چاہیے۔ ہارون ایسا شخص نہ تھا کہ کبیرہ گناہوں میں سے ایسے بڑے گناہ کا ارتکاب کرتا۔''[1]

② ہارون کی بہن عباسہ ایک پردہ دار ہاشمی خاتون تھی، دورِ حاضر کی کوئی ''سوسائٹی گرل'' نہیں۔ وہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی پڑپوتی تھی جنھیں گزرے اس وقت ایک صدی ہی ہوئی تھی۔ یہ پورا خاندان حتیٰ کہ عباسہ کے باپ اور دادا مہدی اور منصور بھی ذاتی زندگی میں پرہیزگار، عبادت گزار اور لہو ولعب سے دور تھے۔ علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ عباسہ کی شرافت وعفت کا ذکر کر کے فرماتے ہیں:

> ''اگر اس خاندان (بنی ہاشم) ہی سے عفت اٹھ جائے تو اسے اور کہاں تلاش کیا جائے گا؟ اگر طہارت وپاکیزگی اپنے مرکز ہی سے معدوم ہو جائے تو پھر کہیں اور کیسے ملے گی۔''[2]

یہ بھی ذہن میں رہے کہ عباسہ شادی شدہ تھی۔ اس کا پہلا نکاح ہارون بن محمد سے ہوا تھا۔ اس کی وفات کے بعد وہ ابراہیم بن صالح کے نکاح میں آئی تھی جو شام کا گورنر اور ہارون الرشید کا چچیرا بھائی تھا۔[3]

③ جعفر برمکی بھی عادات واخلاق کے لحاظ سے دین دار اور پرہیزگار تھا۔ اس نے قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ سے تعلیم حاصل کی تھی اور علماء وفقہاء سے اس کی نشست وبرخاست رہتی تھی۔[4]
گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایسی گری ہوئی حرکتوں میں مبتلا ہو گا۔

① مقدمہ ابن خلدون، ص ۲۵ ② مقدمہ ابن خلدون، ص ۲۱
③ انساب الاشراف: ۶۳/۲ ④ تاریخ بغداد: ۱۵۲/۷

④ اس قصے میں یہ چیز بھی انہونی ہے کہ ہارون کو ایک طرف شریعت کی اتنی پروا ہے کہ جعفر کے لیے عباسہ کو دیکھنا ناجائز سمجھتا ہے اور اسے شرعاً جائز کرنے کے لیے دونوں کا نکاح کرادیتا ہے۔ مگر دوسری طرف شراب نوشی کی مجلس گرم کرتے ہوئے اسے شریعت کی پامالی کی کوئی پروا نہیں ہوتی حالانکہ شراب ام الخبائث ہے۔

⑤ ان تمام باتوں سے قطع نظر یہ بات تو آج کل کے گئے گزرے دور میں بھی ناقابلِ تصور ہے کہ کوئی شخص اپنے یار دوستوں کے ساتھ شراب نوشی کرتے ہوئے اپنی بہن کو بھی ساتھ بٹھائے۔ شریف گھرانے تو شراب کو آج بھی ہاتھ نہیں لگاتے۔ مگر کیا کوئی شرابی بھی ایسی حالت میں بہن کی موجودگی برداشت کر سکتا ہے؟ اور کیا کوئی بہن اسے ایسی حالت میں دیکھ سکتی ہے؟ صرف پکے بے دین، حلال وحرام سے قطعی بے پروا، شرم وحیا سے بالکل عاری اور خاندانی لحاظ سے نہایت پست لوگ ہی اتنی گری ہوئی حرکت کر سکتے ہیں۔

وہ دور دینی اقدار میں ایسے انحطاط سے پاک تھا۔ حکمران گھرانوں کی وضع داری مثالی ہوا کرتی تھی۔ یادش بخیر! قریبی دور کے مسلمان رئیسوں اور نوابوں تک میں شرافت، دین داری اور وقار کے یہ آثار موجود تھے اور ان کی اولاد میں آج تک دکھائی دیتے ہیں۔ پھر بنوعباس کا خاندان عرب اور ہاشمی تھا جن کی غیرت وحمیت تاریخی حقیقت ہے، اس لیے ان کے بارے میں ایسے گھٹیا اخلاق کا تصور کرنا مشکل ہے۔

برامکہ کے بعد:

برامکہ کے بعد ان کے حاسدین کو بھی زیادہ عرصے پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملا۔ خراسان کا گورنر علی بن عیسیٰ کچھ ہی عرصے بعد عوام پر سختی کے الزامات میں ہارون کی ناراضی کا شکار ہوا۔ ۱۹۲ھ میں ہارون نے نہ صرف اسے برطرف کر دیا بلکہ اسے جیل کی ہوا کھانی پڑی اور اس کی ساری دولت ضبط کر لی گئی۔ [1]

فضل بن ربیع کچھ مدت تک ترقی کی طرف گامزن رہا۔ برامکہ کے خاتمے کے بعد چھ سالوں تک وہی مملکت کا مختارِ کل رہا۔ ہارون کے بعد اس نے امین الرشید کا دستِ راست بن کر مزید تین سال خوش عیشی میں گزار لیے۔ مگر اس کے بعد مامون کے اقتدار نے اسے گھر سے بے گھر کر دیا۔ وہ مدتوں تک روپوش رہا۔ آخر مامون نے جاں بخشی کر دی اور وہ ایک معمولی آدمی کی زندگی گزار کر ۲۰۸ھ میں فوت ہو گیا۔ [2]

تاہم یہ یاد رہے کہ برامکہ کے بعد بھی ہارون کی پالیسی میں عرب وعجم سے رواداری برقرار رہی اور وہ سب کے لیے یکساں برتاؤ کے اصول پر قائم رہا۔ برامکہ سے اس کی کش مکش کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ عجمی مسلمانوں سے بداعتماد تھا۔ عجمی مسلمانوں کا اثر ورسوخ قدرتی اور فطری طور پر اس عالمگیر حکومت میں برابر بڑھتا رہا اور ہارون نے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ ہاں کسی ایک خاندان کو بے پناہ اختیارات دینے کی غلطی اس نے دوبارہ نہیں کی۔

---

① تاریخ الطبری: ۳۲۴/۸، ۳۲۵ تحت ۱۹۲ھ

② وفیات الأعیان: ۳۷/۴ تا ۳۹

بیرونی مہمات

رومیوں سے جنگیں:

بیرونی ممالک میں عالم اسلام کی سلطنتِ روما سے کش مکش اکثر و بیشتر جاری رہتی تھی۔ مہدی کے دور میں جب ہارون شہزادہ تھا، روما کے خلاف ایک بڑی فوج کشی ہوئی تھی جس کی قیادت ہارون خود کر رہا تھا۔ یہ فوج خلیج باسفورس تک جا پہنچی تھی۔ اس وقت روما کی حکومت ملکہ رینی کے ہاتھ میں تھی جس نے عاقبت اندیشی سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کی باج گزاری قبول کر لی تھی۔ تاہم ہارون الرشید کی خلافت کے سترہویں سال ۱۸۷ھ میں یہ صلح ٹوٹ گئی۔ ملکہ رینی جس نے ہارون سے صلح کی تھی، رومی جرنیلوں کی سازش کا شکار ہو کر تاج و تخت سے محروم ہو گئی۔ باغی جرنیلوں کا سردار ایک فوجی افسر نقفور تھا جو پہلے کبھی افسرِ خراج ہوا کرتا تھا اس نے تخت پر قبضہ کرتے ہی مسلمانوں سے معاہدہ توڑ دیا اور مطالبہ کیا کہ صلح کی مدت میں وصول کیا گیا خراج واپس کیا جائے۔ اس نے اپنے خط میں لکھا تھا:

”نقفور شاہِ روم کی طرف سے شاہِ عرب ہارون کے نام! اس سے پہلے ملکہ نے تمہیں شطرنج کا رخ اور اپنے کو پیادہ بنا لیا تھا۔ اسی کمزوری کا وہ تمہیں تاوان دے رہی تھی۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ تم اسے خراج دیتے۔ مگر عورتوں کی فطری کمزوری اور حماقت کی وجہ سے وہ یہ توہین گوارا کرتی رہی۔

میرا یہ خط پڑھتے ہی گزشتہ لیا گیا خراج واپس کرو اور آئندہ کے لیے اپنی جان کی ضمانت کے طور پر خراج ادا کرتے رہو۔ ورنہ فیصلہ تلوار کرے گی۔“

جب یہ خط دربارِ خلافت میں پہنچا تو کسی کی مجال نہ تھی کہ پڑھ کر سناتا۔ ہارون نے حکم دیا کہ سنایا جائے۔ جوں جوں وہ خط کے الفاظ سنتا گیا اس کا چہرہ سرخ ہوتا چلا گیا۔ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ درباری یہ حالت دیکھ کر اتنے خوفزدہ تھے کہ کسی کو لب کشائی کی ہمت نہ تھی۔ ہارون کو خاموش دیکھ کر اکثر مزاج شناس درباری آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر ہو گئے۔ وزیر کی گویائی سلب ہو چکی تھی اور عقل ماؤف کہ خلیفہ کو کیا مشورہ دے۔

ہارون نے خط اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کی پشت پر یہ جواب لکھ دیا:

”ہارون الرشید کی طرف سے رومی کتے نقفور کے نام! اے کافر زادے! میں نے تیرا خط پڑھا۔ تو اپنے پیغام کا جواب اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا، سننے کی نوبت نہیں آئے گی۔“

یہ کہہ کر اس نے حکم دیا کہ اسی وقت جنگ کے لیے کوچ کیا جائے۔ اسی دن وہ فوج لے کر ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوا اور رومیوں کی بستیوں کو فتح کرتے ہوئے ان کے اہم مرکز ”ہِرَقْلَہ“ (ہرکولیس) پر قابض ہو گیا۔ نقفور نے دب کر سابقہ معاہدے کی پابندی اور جزیے کی ادائیگی کا وعدہ کیا۔[1]

[1] تاریخ الطبری: ۳۰۸،۳۰۷/۸، تحت ۱۸۷ھ

ہارون کی واپسی کے بعد معاہدے کی پھر خلاف ورزی ہوئی۔ اس کے بغداد پہنچتے ہی رومی اسلامی سرحدوں میں گھس گئے؛ کیوں کہ انہیں یقین تھا کہ ہارون اتنی جلد دوبارہ واپس نہیں آسکے گا۔ انہوں نے ہرَقلَہ واپس لے لیا اور ایشیائے کوچک کے جنوب تک قتل وغارت شروع کر دی۔

ہارون کو یہ قہر انگیز خبر دینے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ آخر عبداللہ بن یوسف تیمی اور ابوالعتاہیہ نے دربار میں قصیدہ گوئی کے دوران اشعار میں یہ خبر سنا دی۔ عبداللہ بن یوسف نے کہا:

نَقَضَ الَّذِی اَعْطَیْتَهٗ نِقْفُوْر　　فَعَلَیْهِ دَائِرَةُ الْبَوَارِ تَدُوْر

''نقفور نے آپ کا عہد و پیمان توڑ ڈالا۔ پس اس کی ہلاکت آنے والی ہے۔''

ہارون نے یہ سنتے ہی بلا تاخیر اپنے بیٹے قاسم کو ایک لشکر دے کر دابق کی سرحد پر بھیج دیا اور جوابی فوج کشی کے لیے ابراہیم بن جبرئیل کو نِقفُور کی طرف روانہ کیا۔ ادھر سے نِقفُور نے بھی پیش قدمی کی مگر اچانک اسے کسی غیر معمولی پریشانی کی وجہ سے پیچھے ہٹنا پڑا۔ مسلمان عقب سے اس پر حملے کرتے رہے۔ ان لڑائیوں میں چالیس ہزار رومی ہلاک ہوئے اور ان کے چار ہزار جانور ہاتھ آئے۔[1]

ہارون خود ایک بہت بڑی جنگ کی تیاری کرتا رہا۔ تیاری مکمل ہونے پر وہ اتنا بڑا لشکر لے کر جہاد کے لیے نکلا کہ مسلمانوں کی تاریخ میں اس کی مثال اب تک نہیں دیکھی گئی تھی۔ اس فوج میں ایک لاکھ ۳۵ ہزار پیشہ ور سپاہی اور بہت بڑی تعداد میں رضا کار اور خدام شامل تھے۔

ہارون ۲۰ رجب ۱۹۰ھ کو نِقفُور سے فیصلہ کن جنگ کے لیے سرحد پر پہنچا۔ یہاں اس نے فوج کے کئی حصے کیے اور انہیں الگ الگ سمتوں میں فتوحات کے لیے پھیلا دیا۔ داؤد بن عیسیٰ کو ستر ہزار سپاہی دے کر رومی مقبوضات میں آگے بڑھتے چلے جانے کا حکم دیا۔ مَعن بن زائدہ کا بیٹا شراحیل ''حصن صقالبہ'' اور ''دبسہ'' کی طرف بڑھا اور انہیں فتح کر کے دم لیا۔ ماہ رمضان ۱۹۰ھ میں ہارون نے خود ہرَقلَہ (ہرکولیس) کا محاصرہ کیا۔ ایک ماہ بعد اسے فتح کر کے تمام مرد وزن کو قیدی بنالیا اور اس خدشے سے شہر کی فصیل اور قلعے کو توڑ پھوڑ دیا کہ کہیں رومی دوبارہ قابض ہو کر اسے اپنا مورچہ نہ بنالیں۔ ان معرکوں میں دس ہزار دشمن گرفتار اور کئی اہم جنگی مقامات فتح ہوئے۔

اسی دوران ہارون کی بحریہ حرکت میں آئی اور اس کے جرنیل حمید بن معیوف نے قبرص پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں قبرص کے لاٹ پادری سمیت سولہ ہزار رومی قیدی بنے۔ آخر کار قیصر نِقفُور نے بہت مجبور ہو کر نہایت عاجزی کے ساتھ صلح کا پیغام بھیجا، ساتھ ہی ایک گرفتار شدہ لڑکی کی آزادی کی درخواست بھیجی جو قیصر کے بیٹے کی منگیتر تھی۔

ہارون نے غور وفکر کے بعد تین شرائط پیش کیں: ❶ ہماری واپسی کے بعد ہرَقلَہ شہر میں رومی دوبارہ آباد نہیں ہوں گے۔ ❷ فی الفور تین لاکھ دینار ادا کیے جائیں گے۔ ❸ پچاس ہزار دینار سالانہ ادا کیے جائیں گے۔

[1] تاریخ الطبری: ۸/ ۳۱۳؛ سنة ۱۸۸ھ

قیصر نے شرائط منظور کرلیں۔ ہارون نے مطلوبہ لڑکی واپس بھیج دی۔ ①

ہارون کی واپسی کے بعد رومی سردار دوبارہ گاہے گاہے سرحدوں پر ترک وتاز کرنے لگے جس کے لیے ہارون کو ۱۹۱ھ میں ہَرثمہ بن اَعیَن اور مسرور خادم کی قیادت میں تیس ہزار سپاہی سرحدوں پر بھیجنے پڑے۔ ہارون خود بھی پیچھے روانہ ہوا اور ''حدث'' کے مقام پر پڑاؤ ڈال کر انہیں مدد دیتا رہا۔ اس مہم میں سرحدوں پر واقع تمام گرجے تباہ کردیے گئے اور پورے عالم اسلام میں ذمیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنا لباس اور وضع قطع مسلمانوں سے الگ رکھیں۔ ②

۱۹۲ھ میں ثابت بن نصر کو اس محاذ پر بھیجا گیا جس نے مطمورہ نامی شہر فتح کیا۔ اسی سال رومیوں سے قیدیوں کا تبادلہ ہوا۔ ہارون نے ایک بھی مسلمان قیدی رومیوں کے پاس نہ رہنے دیا جس پر شعراء نے اس کی تعریف میں قصیدے کہے۔ ③

خوش قسمتی سے اگلے سال ۱۹۳ھ میں قیصر نقفور مرگیا۔ جنگوں میں لگنے والے کچھ زخم اس کے لیے مہلک ثابت ہوئے۔ وہ مکار اور بدطینت انسان تھا جس نے کئی سال تک جنگ کے شعلے بھڑکائے رکھے۔ ④

اس کی موت کے بعد برسوں تک امن سکون رہا۔ مسلمانوں کی طرف سے بھی جہاد کا سلسلہ سالہا سال تک بند رہا۔ امام طبری کے بقول ۱۹۲ھ کے بعد پھر ۲۱۵ھ تک کوئی مہم نہ بھیجی گئی۔ ⑤

اَندلس اور فرانس:

اَندلُس اسلامی ملک تھا جہاں اموی امراء کی خود مختار حکومت تھی۔ ہارون نے سابقہ عباسی خلفاء کی طرح اَندلُس کے بارے میں عدم مداخلت کی پالیسی اپنائے رکھی۔ تاہم ہارون اپنی مملکت کے دفاع کے لیے یہ ضروری سمجھتا تھا کہ اَندلُس کی حکومت مضبوط نہ ہو اور اسے عباسیوں سے خوف ضرور لاحق رہے؛ اسی لیے اس نے اسلامی اَندلُس کے سب سے بڑے دشمن فرانس سے دوستانہ مراسم رکھے۔ شاہِ فرانس شارلیمین اور دولتِ عباسیہ کے مابین سفیروں کی آمد ورفت اور تحائف کا تبادلہ مسلسل ہوتا رہا۔ ہارون الرشید نے شارلیمین کو ایک سدھایا ہوا ہاتھی بھیجا تھا۔ ایک عجیب وغریب گھڑی بھی دی تھی جس کے بارے میں اہلِ یورپ ایک مدت تک سمجھتے رہے کہ یہ جادو سے چلتی ہے۔

شارلیمین نے ہارون کی فیاضی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پیش کش کی کہ فرانس اور عالم اسلام کے مابین تجارت کو فروغ دیا جائے اور اہلِ یورپ کو اپنے ہاں مشرقی علوم کی اشاعت میں مدد دی جائے۔ ساتھ یہ مطالبہ بھی کیا کہ اہلِ یورپ کو بیت المقدس کی زیارت کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ ہارون الرشید نے نہ صرف یہ تمام مطالبات قبول کر لیے بلکہ شارلیمین کی خواہش پر بطورِ اعزاز بیت المقدس کی چابیاں بھی اسے پیش کردیں۔

---

① تاریخ الطبری: ۸/ ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲؛ البدایة والنهایة: ۱۴/ ۴، ۵، ۶

② البدایة والنهایة: سنة ۱۹۱ھ　③ البدایة والنهایة: سنة ۱۹۱ھ، ۱۹۲

④ الکامل فی التاریخ: ۱۹۳ھ　⑤ تاریخ الطبری: ۸/ ۳۳۷

اس وقت یہ اقدام بظاہر بے ضرر دکھائی دے رہا تھا مگر اس کا اثر مستقبل پر بہت منفی پڑا۔ فرانس نے اس کے بعد خود کو بیت المقدس کا وارث تصور کر لیا۔ مدتوں تک اکثر یورپی ممالک کے قافلے فرانس کے انتظامات کے تحت بیت المقدس کی زیارت کے لیے آتے رہے۔

پانچویں صدی ہجری میں جب صلیبی جنگیں چھڑیں تو ان میں سب سے بڑا کردار فرانس ہی کا رہا۔ صلیبی جنگوں کی قیادت بھی فرانس کو ملی؛ کیوں کہ بیت المقدس کی چابیاں رکھنے کی وجہ سے وہ القدس پر اپنا حق جتاتا آیا تھا۔[1]

ہارون کی آخری مہمات۔ علی بن عیسیٰ کا قضیہ۔ رافع بن لیث کی بغاوت

ہارون الرشید کی زندگی کے آخری سال بھی ہنگاموں سے بھرپور گزرے۔ ۱۸۸ھ سے ۱۹۲ھ تک اس کی فوجیں رومیوں سے لڑتی رہیں۔ ہارون کو خود خراسان اور وسطِ ایشیا کی طرف متوجہ ہونا پڑا؛ کیوں کہ وہاں رافع بن لیث نامی ایک نامی گرامی امیر نے بغاوت کر دی تھی جس سے خطرہ پیدا ہو گیا کہ یہ پورا خطہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔

رافع کی بغاوت کی وجہ بڑی عجیب تھی۔ وہ مال و دولت اور عہدے کا لالچی تھا؛ اس لیے سمرقند کے رئیس ابن اَشعث کی بیوی سے نکاح کرنا چاہتا تھا جو خود بڑی مالدار عورت تھی۔ ابن اَشعث اس زمانے میں بغداد میں تھا اور اس نے ایک عرصے سے مڑ کر بیوی کی خبر نہیں لی تھی؛ اس لیے عورت بھی اپنے شوہر سے ناراض اور رافع سے نکاح کے لیے تیار تھی مگر اس فعل کی کوئی قانونی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ آخر رافع کے ذہن میں ایک شیطانی ترکیب آئی۔ اس نے عورت کو کہا کہ وہ مرتد ہو جائے۔ اس طرح اس کا نکاح ٹوٹ جائے گا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ اسلام قبول کر لے۔ اس طرح دونوں کی شادی ہو سکتی ہے۔[2]

عورت نے اس حیلے پر عمل کر لیا جس کے بعد رافع بن لیث نے اس سے نکاح کر لیا۔ اس کے شوہر کو پتا چلا تو اس نے ہارون الرشید سے فریاد کی۔ ہارون نے حاکمِ خراسان علی بن عیسیٰ کو حکم دیا کہ وہ رافع کو گرفتار کر کے طلاق پر مجبور کرے اور پھر اسے گدھے پر بٹھا کر شہر بھر میں تذلیل کرے اور قید میں ڈال دے۔

علی بن عیسیٰ نے یہ سزا جاری کر دی۔ رافع کچھ مدت تک سمرقند کی جیل میں قید رہا۔ پھر کسی طرح موقع پا کر فرار ہو گیا۔ جلد ہی اس نے شورش پسندوں کو ساتھ ملا کر بغاوت کر دی اور سمرقند کے عامل سلیمان بن حمید کو قتل کر کے شہر پر قابض ہو گیا۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ رافع بن لیث برامکہ کا پروردہ تھا اور انہی کے کہنے پر بغاوت کی تیاری

---

[1] التاریخ الاسلامی العام لعلی ابراھیم حسن، ص ۳۸۲، ۳۸۳

[2] نکاح توڑنے کا یہ حیلہ تاریخ میں سب سے پہلے رافع بن لیث ہی نے ایجاد کیا تھا۔ فقہائے احناف کا اس حیلے کے بارے میں فتویٰ یہ ہے کہ جو عورت اس طرح نکاح سے آزاد ہونا چاہے گی اس کا نیا نکاح منعقد نہیں ہوگا بلکہ اسے سابقہ شوہر کے ساتھ تعلق نبھانے پر مجبور کیا جائے گا۔ (فتاویٰ شامیہ ۳/۱۹٤)

کر رہا تھا مگر ہمیں اس کے برامکہ سے تعلق کا کہیں ثبوت نہیں ملا۔ کتبِ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ اس نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے بغاوت کی تھی۔

ہارون نے علی بن عیسیٰ کو رافع کی سرکوبی کا حکم دیا۔ اس نے اپنے بیٹے کو فوج کی کمان دے کر رافع کے خلاف بھیجا مگر اسے کامیابی نہ ہوئی اور وہ جنگ میں مارا گیا۔ علی بن عیسیٰ نے یہ اطلاع سنی تو اپنے مرکز بلخ کو چھوڑ کر مرو کی طرف روانہ ہوا کہ کہیں رافع وہاں قبضہ نہ کر لے۔

اس کے جاتے ہی پیچھے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوگیا۔ وہ یہ کہ علی بن عیسیٰ کے مقتول بیٹے نے بے اندازہ دولت جمع کر کے بلخ کے کسی باغ میں دفن کر رکھی تھی جس کا علم اس کے باپ کو بھی نہیں تھا۔ صرف ایک خاص باندی اس راز سے واقف تھی۔ اس نے راز فاش کر دیا۔ چنانچہ بلخ کے عمائد نے آ کر وہ ساری دولت نکال لی اور اس خیال سے کہ یہ عوام پر ناجائز ٹیکس لگا کر جمع کی گئی ہے، اسے عوام ہی میں تقسیم کر دیا۔

یہ بات ہارون الرشید کو معلوم ہوئی تو وہ علی بن عیسیٰ سے ناراض اور بدگمان ہوگیا؛ کیوں کہ چند دنوں پہلے اس کی عرضی آئی تھی جس میں رافع سے جنگ کے لیے مالی امداد طلب کی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ ہمیں باغیوں سے جنگوں کے لیے اپنی عورتوں کا زیور تک فروخت کرنا پڑا ہے۔ ہارون کو یہ بات بھی ناگوار گزری کہ علی بن عیسیٰ اس سے پوچھے بغیر بلخ سے مَرْو کیوں گیا۔

ان وجوہ سے ہارون نے ہَرثَمہ بن اَعیَن کو علی بن عیسیٰ کی برطرفی اور گرفتاری کا حکم دے کر خراسان بھیج دیا۔ ہَرثَمہ نے ہارون کی بتائی ہوئی حکمتِ عملی کے مطابق علی بن عیسیٰ سے اس طرح ملاقات کی جیسے وہ اس کی عرضی کے جواب میں مالی امداد لے کر آیا ہے۔ ملاقات کے دوران اس نے یکدم علی بن عیسیٰ کو گرفتار کر لیا اور اس کی ساری دولت ضبط کر لی جس کی مالیت اِکسٹھ (۶۱) کروڑ درہم تھی۔

جیسا کہ ہم پیچھے بتا چکے ہیں علی بن عیسیٰ غدار نہیں تھا مگر اس کی تند مزاجی اور ٹیکسوں کی مد میں بے جا سختی سے لوگ تنگ تھے؛ اس لیے اس کی برطرفی پر خراسان کے لوگوں نے ہَرثَمہ کا شکریہ ادا کیا اور خلیفہ کو بہت دعائیں دیں۔

ہَرثَمہ نے اس کے بعد رافع بن لیث کے خلاف یلغار کی۔ رافع کے پاس زیادہ فوج نہیں تھی؛ اس لیے وہ سمرقند میں مورچہ بند ہوگیا۔ ہَرثَمہ نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ چونکہ فصیل بہت مضبوط تھی؛ اس لیے کئی ماہ تک محاصرے کے باوجود کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ [1]

ہارون کی وفات:

آخر شعبان ۱۹۲ھ میں ہارون خود اس مہم کے لیے روانہ ہوا۔ مامون الرشید بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہارون گزشتہ کئی سالوں سے زیادہ وقت سفر میں گزار رہا تھا۔ ایک عرصے سے اسے مناسب آرام کا موقع نہیں ملا تھا۔ طبیعت مسلسل علیل

[1] تاریخ الطبری: ۳۱۹/۸ تا ۳۳۰؛ البدایة والنہایة: سنة ۱۹۱ھ، ۱۹۲ھ، ۱۹۳ھ

چل رہی تھی۔ وسطِ ایشیا کے راستے میں وہ شدید بیمار پڑ گیا۔ آخر اسے سمرقند کا خیال چھوڑ کر طوس میں ٹھہرنا پڑا۔ اس دوران نیا سال ۱۹۳ھ شروع ہو گیا۔

سمرقند کی فصیلوں کی آڑ میں رافع بن لیث سرکاری افواج سے لڑ رہا تھا۔ اس کا بھائی بشیر بن لیث گرفتار ہو گیا۔ اسے خلیفہ کے پاس بھیج دیا گیا جو صحت یابی سے مایوس ہو کر طوس میں زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا تھا۔ ایک باغی کو سامنے پا کر ہارون کا غصے سے برا حال ہو گیا۔ اس نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرا دیے۔

۳ جمادی الآخرہ ۱۹۳ھ کو ہارون الرشید نے ۴۵ سال کی عمر میں جان جاں آفرین کے سپرد کر دی۔ وفات سے پہلے اپنی قبر کھدوا کر کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر اس پر نزع کا عالم طاری ہو گیا۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے:

''اے وہ ذات جسے کبھی موت نہیں آئے گی، اس پر رحم فرما جو مر رہا ہے۔''[1]

ہارون حج کے مواقع پر اکثر یہ دعا کیا کرتا تھا: ''اے وہ ذات جس کی بارگاہ میں سارے لوگ اپنی اپنی زبانوں میں اپنی اپنی حاجتیں عرض کر رہے ہیں، میری التجا ہے، جب تو مجھے دنیا سے اٹھائے اور جب میں قبر میں رکھا جاؤں اور جب مجھے اپنے پرائے سب چھوڑ کر چلے جائیں تو اس وقت میری بخشش کر دینا۔''[2]

امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے عفو و درگزر کا معاملہ کیا ہوگا۔

ہارون کے عہد اور کردار پر تبصرہ

ہارون بنو عباس میں وہی حیثیت رکھتا تھا جو بنو امیہ میں ولید بن عبدالملک۔ اس میں اپنے باپ مہدی اور دادا منصور کی عادات جمع ہو گئی تھیں۔ ذاتی طور پر وہ اپنے دادا منصور سے بڑا متاثر تھا اور اس کا اخلاق و کردار اپنانے کی کوشش کرتا تھا۔ تاہم منصور جس قدر کفایت شعار طبیعت اور فولادی دست و بازو رکھتا تھا، ہارون اسی قدر فیاض اور مہربان تھا۔ ہاں باغیوں کو سزا دیتے ہوئے وہ ہو بہو منصور کی تصویر دکھائی دیتا تھا۔

علوم وفنون کی ترقی اور کاغذ سازی کا انقلاب:

ہارون الرشید کا دور علم و دانش کی ترقی کا سنہرا دور تھا۔ اسلامی تاریخ کے مایہ ناز علماء، مجتہدین، شعراء و ادباء اور دانشور اس کے ایام سے تعلق رکھتے ہیں۔ دنیا کو کاغذ سازی کی صنعت اسی کے دور میں نصیب ہوئی۔ اگرچہ چینی ۱۰۵ قبل از مسیح میں کاغذ ایجاد کر چکے تھے مگر یہ فن دنیا کی نگاہ سے پوشیدہ تھا۔ اس فن کے کچھ ہنر مند ترکستان کے شہر سمرقند میں موجود تھے۔ مسلمانوں نے ۹۳ھ (۷۱۲ء) میں جب سمرقند فتح کیا تو ان ہنر مندوں سے یہ فن سیکھ لیا جس میں کپاس اور دیگر چھال دار پودوں سے ایک خمیر نکالا جاتا ہے۔ پھر اس خمیر کو خشک کر کے باریک پارچے تیار کیے جاتے ہیں۔

---

① تاریخ الطبری: ۳۳۰/۸ تا ۳۴۰؛ البدایة والنهایة: سنة ۱۹۳ھ

② تاریخ الطبری: ۳۵۵/۸

۹۳ھ سے ۱۷۹ھ تک مسلمان اس فن کو ترقی دیتے رہے یہاں تک کہ ۱۷۹ھ (۷۹۴ء) میں ہارون الرشید کے وزیر فضل بن یحییٰ نے بغداد میں کاغذ سازی کا پہلا کارخانہ قائم کیا۔ اس طرح لکھنا اور علوم کو محفوظ کرنا بہت آسان ہو گیا اور عالم اسلام ایک علمی انقلاب سے آشنا ہوا۔[1]

اقتصادی وسیاسی استحکام:

اس دور میں خلافتِ عباسیہ پوری دنیا کی سب سے بڑی اور طاقتور ترین حکومت تسلیم کی جاتی تھی۔ روم جیسی عظیم سلطنت کو اس نے خراج دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ فرانس کا بادشاہ ہارون کو تحائف بھیجتا تھا۔ اندلس، مراکش اور تیونس کو چھوڑ کر سارا عالم اسلام اس کے زیرِ نگیں تھا۔ عوام خوشحال اور فارغ البال تھے، زندگی کی ہر آسائش انہیں میسر تھی۔ کوئی لوٹ مار تھی نہ ٹیکسوں کی سختی تھی بلکہ حکومت دل کھول کر ان پر خرچ کر رہی تھی اس کے باوجود ہارون کی وفات کے وقت سرکاری خزانہ بیس کروڑ پچیس ہزار دینار کی مالیت تک پہنچ چکا تھا۔[2]

اس کے دور میں خلافتِ عباسیہ عروج پر تھی۔ علویوں اور خوارج کی بغاوتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ کسی باغی کو اس کے مقابلے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ حالات پر اس کی مضبوط گرفت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے سالہا سال تک برامکہ کو مملکت کا منتظم بنائے رکھا مگر جب ان سے بداعتماد ہوا تو آن کی آن میں ان سے سب کچھ سلب کر لیا اور اتنے بڑے انقلاب کے باوجود مملکت کے نظم ونسق میں ذرا بھی فرق نہ آنے پایا۔

سیرتِ ہارون، علامہ سیوطی کی زبانی:

علامہ سیوطی ہارون کے صفات وسیرت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وہ گورا، دراز قامت، حسین، جاذبِ نظر اور فصیح وبلیغ انسان تھا۔ علم وادب سے واقف تھا۔ اپنے عہدِ خلافت میں مرتے دم تک روزانہ سو نفل پڑھتا رہا، کسی مجبوری کے بغیر اسے نہیں چھوڑتا تھا۔ اپنی جیب سے روزانہ ایک ہزار درہم صدقہ کرتا تھا۔ علم اور اہل علم سے محبت کرتا تھا۔ شعائر اسلام کی تعظیم کرتا تھا۔ اسے دینی امور کے بارے میں کج بحثی اور شرعی نص کے مقابلے میں تاویل سے نفرت تھی۔ اسے بشر مریسی کے متعلق

---

[1] قصة الحضارة، وليم جيمس ديورانت، تعريب: دكتور زكي نجيب: ۱۳/۱۶۹، ۱۷۰، ط دار الجيل
باقی دنیا نے کاغذ سازی مسلمانوں ہی سے سیکھی۔ بغداد میں کاغذ کا کارخانہ لگنے کے چند برسوں بعد پوری اسلامی دنیا میں کاغذ عام ہو گیا۔ ۱۸۴ھ (۸۰۰ء) میں مصر بھی کاغذ سازی کا مرکز بن گیا۔ یہ مراکز نہ صرف باقی عالم اسلام بلکہ یورپی ممالک کو بھی کاغذ برآمد کرتے تھے۔ ۳۳۸ھ سے قبل اندلس میں کاغذ درآمد کیا جاتا تھا۔ ۳۳۸ھ (۹۵۰ء) میں اندلس نے خود کاغذ سازی شروع کر دی۔ آہستہ آہستہ باقی یورپ بھی اس سے استفادہ کرنے لگا۔ ۴۹۳ھ (۱۱۰۰ء) میں کاغذ سازی قسطنطنیہ پہنچی۔ اس کے دو سال بعد صقلیہ میں بھی یہ صنعت لگ گئی (اس وقت صقلیہ سے مسلمانوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی)۔ ۵۴۹ھ (۱۱۵۴ء) میں یعنی پہلی صلیبی جنگ کے ساٹھ سال بعد درمیان یہ فن اٹلی نے سیکھا۔ ۶۲۵ھ (۱۲۲۸ء) میں جرمنی اور ۷۰۸ھ (۱۳۰۹ء) میں برطانیہ میں کاغذ سازی کا آغاز ہوا۔ (قصة الحضارة: ۱۳/۱۷۰)

[2] تاريخ الخلفاء، ص ۲۱۸. خلف الرشيد مائة الف الف دينار، ومن الاثاث والجوهر والورق والدواب ماقيمته مائة الف الف دينار وخمسة وعشرون الف دينار. آج کل کے لحاظ سے یہ رقم ۵ کھرب ۱۶ ارب ۲۵ کروڑ روپے یا تقریباً ۶ ارب ڈالر کے بقدر ہے۔

پتا چلا کہ وہ قرآن کو مخلوق مانتا ہے تو کہا: اگر میرے ہاتھ لگ جائے تو اس کی گردن مار دوں گا۔ وہ اپنے آپ پر، اپنی زیادتیوں اور گناہوں پر رویا کرتا تھا خاص کر جب اسے کوئی نصیحت کی جاتی۔ اسے مدح وستائش پسند تھی اور اس پر گراں قدر انعامات دیا کرتا تھا۔"[1]

عشقِ نبوی:

حضور اکرم ﷺ سے اسے گہری محبت تھی۔ جب بھی نام نامی سنتا تو بے ساختہ کہتا: "صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِيْ." حرمین شریفین کی حفاظت اور خدمت کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس کا منصوبہ تھا کہ مصر میں ایک بڑی نہر نکال کر بحیرۂ روم کو بحیرۂ قلزم سے ملا دیا جائے تاکہ عالمی تجارت اور وفود کی آمد ورفت آسان تر ہو جائے۔ مگر جب یحییٰ برمکی نے اس منصوبے کے بارے میں خطرہ ظاہر کیا کہ اس طرح رومی بحریہ حجاز تک پہنچ کر حرمین شریفین پر تاخت وتاراج کرسکتی ہے تو ہارون نے فوراً یہ خیال ترک کر دیا۔[2]

ابومعاویہ رحمہ اللہ نے ایک بار یہ حدیث سنائی کہ آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام میں مباحثہ ہوا۔ ایک شخص بیچ میں بول پڑا کہ ان دونوں ہستیوں کی ملاقات بھلا کہاں ہوئی تھی؟ یہ سنتے ہی ہارون غصے سے بے قابو ہو گیا اور بولا: "میری تلوار لاؤ۔ زندیق! بے دین! نبی ﷺ کی حدیث پر اعتراض کرتا ہے!!" ابومعاویہ رحمہ اللہ نے بمشکل سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا۔

نہایت بہادر انسان اور جہاد کا دلدادہ تھا۔ ایک محدث یہ فرمان نبوی سنا رہے تھے: "مجھے یہ پسند ہے کہ میں اللہ کی راہ میں شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید کیا جاؤں۔" ہارون سن کر اتنا رویا کہ بے حال ہو گیا۔[3]

صحابہ کا ادب واحترام:

صحابہ کا نہایت ادب واحترام کرتا تھا۔ ایک بار وہ بہی دانہ چھیل چھیل کر کھا رہا تھا کہ کوئی خوشامدی بولا: "امیر المومنین نے رعایا کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیا ہے لوگ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو بھول گئے ہیں۔"

یہ سن کر ہارون مشتعل ہو گیا، بہی دانہ اٹھا کر اسے دے مارا اور بولا:

"کیا بکتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں تو ہم خاموش ہو بھی جائیں مگر تو کیا سمجھتا ہے، عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ گستاخی ہم برداشت کر لیں گے۔"[4]

اعتقاد میں وہ مسلکِ اہل سنت والجماعت کا پابند تھا۔ علماء سے اصولی اور اعتقادی مسائل میں بات چیت کرتا رہتا۔ جب مسکت دلائل پیش کیے جاتے تو اظہارِ مسرت کرتا۔ ایک بار مصعب بن عبداللہ سے پوچھا:

---

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۱۰

[2] تاریخ الخلفاء، ص ۲۱۱ ... گزشتہ صدی میں اسی جگہ نہر سوئز نکالی گئی۔

[3] تاریخ الخلفاء، ص ۲۱۰

[4] تاریخ الطبری: ۳۵۳/۸، ۳۵۴

”حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں کیا مقام تھا؟“

وہ بولے: ”جو مقام وفات کے بعد ہے، وہی زندگی میں تھا۔“

یہ جواب سن کر ہارون بہت خوش ہوا اور بولا: ”تم نے سوال کا کافی شافی جواب دے دیا۔“

ایک بار انہی سے پوچھا: ”حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہنے والوں کے بارے میں کیا رائے ہے؟“

مصعب نے کہا: ”یہ دیکھ لینا کافی ہے کہ جن لوگوں نے ان پر اعتراض کیا وہ کئی فرقے بن گئے جن میں خوارج، روافض اور بدعتی ہیں۔ جن لوگوں نے ان کا ساتھ دیا وہ ایک ہی جماعت اہل سنت ہیں۔“

ہارون نے خوش ہوکر کہا: ”اس کے بعد اس معاملے میں کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔“[1]

علماء ومشائخ سے تعلق:

علماء کی بڑی عزت وتوقیر کرتا تھا۔ انہیں عطیات سے خوب نوازتا۔ سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کو ایک لاکھ درہم کا ہدیہ پیش کیا۔ ابومعاویہ رحمہ اللہ ایک نابینا محدث تھے۔ ہارون نے ان کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد خود ان کے ہاتھ دھلائے اور کہا: ”آپ کے علم کی تعظیم میں ایسا کررہا ہوں۔“

ایک بار ابن سماک واعظ رحمہ اللہ اس کے پاس گئے۔ ہارون بڑی انکساری سے پیش آیا۔ ابن سماک بولے: ”آپ کا اس مرتبے کے باوجود تواضع کرنا، اس خلافت سے بھی بڑا مقام ہے۔“ پھر کچھ نصیحت کی تو ہارون رونے لگا۔

ہارون فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کے گھر جاکر ان سے نصیحت لیتا۔ ایک بار فضیل رحمہ اللہ نے کہا: ”اے حسین چہرے والے! تجھ سے اس اُمت کے بارے میں سوال ہوگا۔“ ہارون پر اتنا گریہ طاری ہوا کہ چیخیں نکل گئیں۔

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ ایک بار مکہ میں تھے کہ ہارون کا گزر ہوا۔ فرمانے لگے: ”لوگ اسے ناپسند کرتے ہیں مگر دنیا میں میرے نزدیک اس سے زیادہ معزز آدمی اور کوئی نہیں۔ یہ مرجائے گا تو تم بڑے بڑے مصائب دیکھو گے۔“[2]

رقت قلبی:

ہارون نہایت رقیق القلب انسان تھا۔ عموماً نصیحت کی باتیں سن کر، دعاؤں کے وقت اور قبولیت کے مقامات پر وہ بے تحاشا رو دیتا تھا۔ اس دور کے علماء کہتے تھے کہ فضیل اور ہارون سے زیادہ رونے والا کوئی نہیں دیکھا گیا۔[3]

ابراہیم بن عبداللہ خراسانی کا بیان ہے کہ میں اپنے والد کے ساتھ حج پر گیا تو میدانِ عرفات میں ہارون الرشید کو ننگے سر، ننگے پیر، ہاتھ پھیلائے، کنکریوں پر کھڑے، تھراتے اور گڑگڑاتے دیکھا، وہ کہہ رہا تھا:

”اے اللہ! تُو تُو ہے اور میں میں۔ تو بار بار معاف کرنے والا ہے اور میں بار بار گناہ کرنے والا۔ پس میری مغفرت فرمادے۔“[4]

[1] تاریخ الطبری: ۸/۳۵۳، ۳۵٤
[2] تاریخ الخلفاء، ص ۲۱۱
[3] تاریخ الخلفاء، ص ۲۱۱
[4] فضائح الباطنیہ امام غزالی، ص ۲۱۸

حج کے لیے جاتا تو حرم شریف اور عرفات میں نہایت بے تابی سے دعائیں مانگتا۔ کعبہ میں یوں دعا کرتا:

''اے وہ جو مانگنے والوں کی ضروریات کا مالک ہے، جو خاموش نفوس کے دلوں کی آرزوؤں سے واقف ہے، تیرے وعدے سچے ہیں، تیرے احسانات بے پایاں ہیں، تیری رحمت وسیع ہے، تو حضرت محمد ﷺ اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما اور ہمارے گناہ معاف کر دے، ہماری برائیوں کو دور کر دے۔''

کبھی یہ دعا کرتا:

''اے وہ ذات کہ جسے بندوں کے گناہوں سے کوئی ضرر نہیں پہنچتا، جس سے کوئی عیب پوشیدہ نہیں، جسے گناہ کی مغفرت کر دینے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا، جس نے زمین کو جمایا اور آسمان کو قائم کیا، جس نے اپنے لیے اسمائے حسنیٰ مقرر کیے، حضرت محمد ﷺ پر رحمت نازل فرما اور میرے تمام کاموں کو آسان کر دے۔''[1]

سلطنت کی قیمت ایک پیالہ پانی:

ایک بار ابن سماک رحمہ اللہ، ہارون الرشید سے ملنے آئے۔ ہارون الرشید کو پیاس لگی تو پانی منگوایا اور پینے لگا۔ ابن سماک رحمہ اللہ نے کہا: ''امیر المؤمنین! ٹھہریے اور سوچ کر بتائیے کہ اگر اس حالت میں یہ پانی آپ کو نہ ملے تو اسے حاصل کرنے کے لیے آپ کیا کچھ دے سکتے ہیں؟''

ہارون نے کہا: ''آدھی سلطنت۔''

ابن سماک رحمہ اللہ نے کہا:

''اور اگر پینے کے بعد اس کا مخرج بند ہو جائے تو اسے جاری کرنے کے لیے آپ کیا دیں گے؟''

ہارون نے کہا: ''باقی آدھی سلطنت۔''

ابن سماک رحمہ اللہ بولے:

''تو جس سلطنت کی قیمت ایک پیالہ پانی ہو، وہ اس قابل کہاں کہ اس کی حرص کی جائے۔''

یہ سن کر ہارون روتے روتے بے حال ہو گیا۔[2]

سخاوت:

ہارون الرشید مدح و ستائش کو پسند کرتا تھا اور اس کے بدلے دل کھول کر انعامات دیتا تھا۔ خود بھی شعر کہا کرتا تھا۔ مروان بن ابی حفصہ کا قصیدہ سن کر اتنا خوش ہوا کہ پانچ ہزار دینار، خلعت، شاہی گھوڑا اور دس رومی غلام عنایت کیے۔ ایک بار اسحٰق موصلی کو دو لاکھ درہم دیے۔ اصمعی کا ایک مدحیہ شعر سن کر پانچ ہزار اشرفیاں دیں۔[3]

---

[1] تاریخ الطبری: ۳۵۱/۸ تا ۳۶۴ تحت ذکر بعض سیر الرشید
[2] تاریخ الطبری: ۳۵۷/۸
[3] تاریخ الخلفاء، ص ۲۱۱

بعض بشری کمزوریوں اور ان کے تحت ہونے والے چند جذباتی فیصلوں کو چھوڑ کر مجموعی طور پر ہارون الرشید، عباسی دور کا گلِ سرسبد تھا۔ اس کی زندگی خوبیوں کا مرقع اور اس کی داستانِ حیات کامیابیوں سے بھرپور تھی۔

فقہ حنفی کا عروج:

ہارون الرشید کے دور میں فقہ حنفی کو غیر معمولی عروج حاصل ہوا۔ اس سے قبل چوتھے عباسی خلیفہ ہادی کے زمانے میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ قاضی بنے تو فقہ حنفی عدالتوں میں باقاعدہ طور پر متعارف ہوئی۔ یہ ۱۶۵ھ کی بات ہے۔ اس کے بعد ۱۷۰ھ میں خلیفہ ہارون الرشید نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کو ''قاضی القضاۃ'' کا عہدہ دیا۔ اس سے پہلے عالمِ اسلام میں یہ عہدہ موجود نہ تھا۔ قاضی القضاۃ کو وسیع اختیارات دیے گئے اور تمام شہروں کے قاضی حضرات ان کے ماتحت شمار ہوئے۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ فقہ حنفی کے مطابق فیصلے کرتے تھے؛ لہٰذا یوں فقہ حنفی عدالتِ عظمیٰ کا عمومی دستور بن گئی۔[1]

تب سے لے کر تاتاریوں کے ہاتھوں سقوطِ بغداد تک (تقریباً ۴۹۱ برس تک) عباسی عملداری میں زیادہ تر فقہ حنفی ہی کا رواج رہا۔ اگرچہ بعض فقہاء حنبلی، شافعی اور مالکی فقہ پر بھی فتویٰ دیتے تھے اور درمیان میں کبھی کبھی معتزلہ اور دیگر فرقوں کے علماء بھی عدلیہ اور امورِ سلطنت میں دخیل ہوئے مگر یہ ادوار عارضی ثابت ہوئے۔ عمومی طور پر خلافت عباسیہ کی عدلیہ میں فقہ حنفی کا غلبہ رہا۔

❖❖❖

---

① وفیات الاعیان: ۶/۳۷۹ تا ۳۸۲؛ ۵/۴۰۹ تا ۴۱۲؛ العبر فی خبر من غبر: ۱/۲۱۹؛ سیر اعلام النبلاء: ۶/۴۰۰ تا ۴۰۵

امین بن الرشید

محمد بن ہارون

جمادی الآخرہ ۱۹۳ھ......تا......محرم ۱۹۸ھ

اپریل 809ء......تا......اکتوبر 813ء

ہارون کی وفات کے بعد اس کی وصیت کے مطابق اس کا منجھلا بیٹا امین الرشید بغداد میں مسندِ خلافت پر براجمان ہوا۔ مامون الرشید جو باپ کے ساتھ خراسان کے سفر میں تھا، وہیں ٹھہر گیا کہ یہی علاقہ اس کے نام تھا۔ اس کا وزیر فضل بن سہل اور اس کے معتمد امراء طاہر بن حسین اور ہَرثمہ بن اعین اس کے ساتھ تھے۔

امین الرشید احساسِ ذمہ داری سے عاری، ناتجربہ کار اور خوشامد پسند تھا۔ شکار، کھیل کود اور تفریحات کا شوقین تھا۔ امورِ سلطنت سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا؛ لہٰذا بغداد میں امورِ سیاست وزیر فضل بن ربیع کے ہاتھ میں آ گئے۔ امین کو اس پر پورا اعتماد تھا۔ فضل بن ربیع کے بعد اسماعیل بن صبیح اس کا کاتب و مشیر اور علی بن عیسیٰ اور عبدالرحمن بن جبلہ اس کے قابلِ اعتماد فوجی جرنیل تھے۔

فضل بن ربیع جانتا تھا کہ امین کی بہ نسبت مامون زیادہ ہوشیار ہے؛ اس لیے اگر کل خلافت اسے ملی تو میرے اختیارات اور وجاہت میں کمی واقع ہوگی؛ اس لیے اس نے امین الرشید کو آمادہ کر لیا کہ وہ مامون کو ولی عہدی سے برطرف کر کے اپنے بیٹے موسیٰ کو یہ اعزاز بخش دے۔ یہ غلط تدبیر امین کو پسند آئی۔ اس نے مامون کو ولی عہدی اور حکومتِ خراسان سے دست بردار کرنے کا حکم نامہ لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر اسماعیل بن صبیح نے کہا: ''اس طرح وہ چوکنا ہو جائے گا۔ مناسب یہ ہے کہ خط میں اسے صرف یہ دعوت دی جائے کہ وہ بغداد آ کر امورِ حکومت میں مددگار بنے۔''[1]

امین نے مامون کو خط میں یہی لکھوا بھیجا۔ مامون یہ پڑھ کر شش و پنج میں پڑ گیا کہ کیا کرے۔ اس کے وزیر فضل بن سہل نے کہا: ''آپ اپنی جگہ ٹھہرے رہیں۔ خطرہ مول نہ لیں۔ یہ آپ آسانی سے کر سکتے ہیں۔'' مامون نے کہا:

''کیسے ممکن ہے کہ میں یہاں بیٹھ کر امین کی مخالفت کروں۔ اکثر فوج اس کی ہے۔ سارا خزانہ اسی کے پاس ہے۔''

فضل بن سہل نے کہا: ''تعلقات خراب ہو جائیں تو اپنی حفاظت کی تدبیر کرنا زیادہ اہم ہوتا ہے۔ خدشہ ہے کہ امین آپ سے بدعہدی کرے گا۔ آپ اپنی فوج کے ساتھ رہیں۔ اگر کوئی مخالفت پیش آئی تو آپ مقابلہ کر سکیں گے۔''

[1] تاریخ الطبری: ۳٦٤/۸ تا ۳۷۳

اس مشورے کے مطابق مامون نے امین کے پاس بغداد آنے سے انکار کردیا اور جوابی خط میں لکھا:

''امیر المؤمنین! میں آپ کا ماتحت اور مددگار ہوں، مگر مرحوم خلیفہ نے مجھے اس سرحد پر تعینات کیا تھا تاکہ میں دشمنوں سے مملکت کا دفاع کروں۔ یہ آپ کی خدمت میں حاضری سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔ بہتر ہے کہ آپ مجھے حاضری سے معذور سمجھیں۔''[1]

مامون الرشید کا اعلانِ خلافت:

آخر صفر ۱۹۵ھ میں امین نے یک طرفہ طور پر بغداد میں مامون کی برطرفی اور اپنے بیٹے موسیٰ کی جانشینی کا اعلان کردیا۔ اس موقع پر نئے ولی عہد کو ''ناطِق بالحَق'' کا لقب دیا گیا۔ (اگرچہ اس ولی عہد کی تخت نشینی کبھی نہ ہوسکی۔) مامون کی برطرفی کے فیصلے نے ایک ایسی کش مکش کا آغاز کیا جس سے عالم اسلام ہل کر رہ گیا۔ مامون کے حامی خراسانی قبائل نے اس فیصلے کو مسترد کردیا اور اس کی حمایت میں کھڑے ہوگئے۔ ادھر عرب قبائل امین کے گرد جمع ہوگئے۔ امین کے نزدیک اب مامون ایک باغی تھا۔ اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ فوج کشی کر کے مامون کے علاقے چھین لے۔ امین نے علی بن عیسیٰ کو یہ ذمہ داری سونپ دی۔ جنگ کے شعلے بھڑکتے دیکھ کر بغداد کے ایک شاعر نے کہا:

اَضَاعَ الْخِلَافَةَ غِشُّ الْوَزِیْرِ ۔۔۔ وَفِسْقُ الْاِمَامِ وَجَهْلُ الْمُشِیْرِ

(وزیر کی بددیانتی، حکمران کی بے راہ روی اور مشیر کی جہالت نے خلافت کو تباہ کردیا۔)

ہم اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بہت سے سیاسی امور کے بارے میں عام لوگوں کی رائے بالکل درست ہوتی ہے۔ وہ جن کاموں کے نقصانات کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں، حکام کو وہ بالکل دکھائی نہیں دیتے؛ کیوں کہ عموماً ذاتی اغراض، ہوسِ مال وجاہ اور جذبۂ انتقام انہیں اندھا کردیتا ہے۔

علی بن عیسیٰ پچاس ہزار کا لشکرِ جرار لے کر نکلا۔ اس کی یلغار کی خبر سن کر مامون نے طاہر بن حسین کو فی الفور سرحد پر بھیجا۔ شعبان ۱۹۵ھ میں رَے کے قریب دونوں فوجوں میں تصادم ہوا۔ علی بن عیسیٰ کو شکستِ فاش ہوئی اور وہ خود مارا گیا۔ بغداد کے عام افسران مامون کو پسند کرتے تھے؛ اس لیے شکست کے بعد وہ طاہر کے ساتھ ہوگئے۔

فتح کے بعد طاہر نے مامون کو درج ذیل خط لکھا: ''علی بن عیسیٰ کا سر میرے سامنے ہے۔ اس کی انگشتری میری انگلی میں ہے۔ اس کی فوج میرے ماتحت ہے۔ والسلام۔''

اس فتح کے بعد مامون نے مشیروں کے کہنے پر اپنی خلافت کا اعلان کردیا اور خراسان وایران کے عوام وخواص نے اس سے بیعت کرلی۔[2]

امین کی لاپرواہی:

امین کی لاپرواہی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب اسے علی بن عیسیٰ کی شکست کی خبر دی گئی تو اس وقت وہ

---

[1] تاریخ الطبری: ۳۷۴/۸ تا ۳۸۷

[2] تاریخ الطبری: ۳۹۰/۸ تا ۴۳۰

دجلہ کے کنارے اپنے غلام کے ساتھ مچھلیاں شکار کررہا تھا۔اس نے خبر سنانے والے کوڈانٹتے ہوئے کہا:

"چپ رہو!میرا غلام کوثر صبح سے دو مچھلیاں پکڑ چکا ہے اور میرے ہاتھ ایک بھی نہیں لگی۔"①

اُدھر طاہر بن حسین یکے بعد دیگرے امین الرشید کے علاقوں پر قبضہ کرتا چلا گیا۔ پہلے اس نے شمال میں بحیرۂ کیپین کے ساتھ شمالی ایران کو فتح کیا۔ پھر جنوب کا رخ کیا اور عراقی صوبوں: اہواز، واسط اور مدائن کو زیرنگین کیا۔ ۱۹۶ھ انہی فتوحات میں گزرا، یہاں تک کہ اس کی فوجیں بغداد کے قریب پہنچ گئیں۔②

بغداد کا محاصرہ:

۱۹۷ھ میں مامون نے بغداد کے محاصرے کا منصوبہ مرتب کیا۔شہر کی مشرقی جانب کو ہرثمہ اور مغربی سمت کو طاہر بن حسین نے گھیر لیا۔ بغداد کی تعمیر کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اس کا محاصرہ ہوا تھا۔ برسوں سے پرامن زندگی گزارنے والے شہری اس حملے سے سخت پریشان ہوئے۔انہوں نے حملہ آوروں کے خلاف امین الرشید کا ساتھ دیا اور فصیلوں پر مردانہ وار لڑتے رہے۔ دونوں طرف سے منجنیقوں سے سنگ باری اور آتش زنی ہوتی رہی۔جھڑپوں اور خوراک ورسد کی لوٹ مار کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ رفتہ رفتہ بغداد میں غذا کم یاب ہوگئی،لوگ بھوک کا شکار ہونے لگے۔ ہر چیز کے نرخ دوگنے چوگنے ہوگئے۔امین شہریوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنے خزانے لٹاتا رہا۔جب وہ ختم ہوگئے تو محل میں موجود سونے چاندی کے برتن تک فروخت کر ڈالے۔

اس دوران شہر کی فصیل بھی کئی جگہ سے منہدم ہوچکی تھی۔ سنگ باری اور آتش زنی سے بہت سی عمارتیں ڈھے گئیں اور بے شمار مکانات سوختہ ہوگئے۔شہر میں سرکاری اہلکار ڈھونڈے نہیں ملتے تھے۔غنڈے اور اوباش کھلے عام پھرتے تھے اور جسے چاہتے لوٹ لیتے تھے۔محاصرے کی حالت میں ۱۹۷ھ گزر گیا اور نیا سال شروع ہوگیا۔

امین الرشید کی غیر ذمہ داری کا یہ حال تھا کہ وہ ایسے حالات میں بھی کھیل کود میں مگن تھا۔یہ دیکھ کر عوام حکومت سے سخت بددل ہوگئے اور شہر چھوڑ چھوڑ کر جانے لگے۔علم وادب،تجارت ومعیشت اور تہذیب وتمدن کے مرکز کی یہ حالت دیکھ کر شعراء مرثیے کہنے پر مجبور ہوگئے۔ایک شاعر نے کہا:

بَکَیْتُ دَمًا عَلٰی بَغْدَادَ لَمَّا ... فُقِدَتْ غَضَارَۃُ الْعَیْشِ الْاَنِیْقِ

(میں بغداد پرخون کے آنسو رونے لگا، جب خوش گوار اور پاک وصاف زندگی گم ہوگئی)

تَبَدَّلْنَا ھُمُوْمًا مِنْ سُرُوْرٍ ... وَمِنْ سَعَۃٍ تَبَدَّلْنَا بِضِیْقٍ

(خوشیوں کے بدلے ہمیں غموں سے پالا پڑا......وسعت کی جگہ تنگی نے لے لی۔)

اَصَابَتْھَا مِنَ الْحُسَّادِ عَیْنٌ ... فَاَفْنَتْ اَھْلَھَا بِالْمَنْجَنِیْقِ

(بغداد کو حاسدوں کی نظر لگ گئی۔جس نے اس کے باشندوں کو منجنیقوں سے فنا کردیا۔)

① البدایۃ والنہایۃ: ۶۲/۱۴ ② تاریخ الطبری: ۴۳۲/۸ تا ۴۴۴

اگر کبھی کسی مسئلے کا حل کسی طرح نہ نکلتا تو امام صاحب رحمہ اللہ فرماتے:

''میرے کسی گناہ کے سبب مسئلے کا حل سمجھ نہیں آ رہا۔''

یہ کہہ کر نماز، دعا اور توبہ واستغفار میں مشغول ہو جاتے یہاں تک کہ مسئلے کا حل ذہن میں آ جاتا اور آپ فرماتے:

''لگتا ہے میری توبہ قبول ہو گئی ہے۔''

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ یہ حالات سن کر زار و قطار روتے تھے:

''ابوحنیفہ کے گناہ کم ہیں تبھی بر وقت متنبہ ہو جاتے ہیں ورنہ لوگ تو پروا بھی نہیں کرتے۔''[1]

علامہ کردری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ان کے تلامذہ ایک ایک مسئلے پر بھرپور بحث کرتے اور ہر فن کے زاویۂ نگاہ سے بات کرتے۔ اس دوران امام صاحب خاموشی سے ان کی بحث سنتے۔ پھر جب امام صاحب زیرِ بحث مسئلے پر گفتگو شروع کرتے تو مجلس میں ایسا سناٹا چھا جاتا جیسے ان کے سوا وہاں کوئی نہیں۔''[2]

اس مجلس میں فقط انفرادی یا اجتماعی طور پر پیش آمدہ مسائل ہی پر بحث نہیں ہوتی تھی بلکہ بعض معاملات کی ممکنہ صورتوں پر بھی غور کر کے ان کے بارے میں بھی آراء پیش کی جاتی تھیں تاکہ اگر بعد میں کوئی ایسا نیا مسئلہ پیش آ جائے تو قانونِ اسلامی میں پہلے سے اس کا حل موجود ہو۔[3]

مجلسِ بحث کی کارروائی کے دوران امام صاحب رحمہ اللہ جو کلام کیا کرتے تھے، وہ ساتھ ساتھ لکھ لیا جاتا تھا اور امام صاحب رحمہ اللہ بعد میں تصحیح کے لیے اسے اہتمام کے ساتھ سنا کرتے تھے۔[4]

ان ابحاث کو الگ الگ عنوانات کے تحت مرتب کرنے کا کام بھی امام صاحب رحمہ اللہ نے بڑی حد تک کرا دیا تھا۔[5]

ایک بار کسی نے امام صاحب رحمہ اللہ سے ایک خاص مسئلے کے حوالے سے پوچھا کہ اس بارے میں صحابہ کرام تک متفق نہ ہو سکے، آپ نے ایک قطعی رائے کیسے قائم کر لی؟

فرمایا: ''تم کیا سمجھتے ہو میں نے یوں ہی یہ رائے قائم کی ہے۔ میں نے بیس سال تک اس پر غور کیا ہے۔ اس کے نظائر و شواہد کو دیکھا بھالا ہے اور ہر صحابی کے قول کو مسلّمہ اصولوں پر جانچا ہے۔''[6]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ''بین الاقوامی تعلقات'' کو بھی ایک مستقل علم قرار دیا اور ''کتاب السیر'' کے مسائل پوری وضاحت سے قلم بند کرائے جن میں جنگ اور امن اور ممالک کے دوطرفہ تعلقات کے بارے میں احکام تھے۔

---

① مناقب ابی حنیفة، مکی: ۱/۱۸۱. عقود الجمان، ص ۲۲۸ ② مناقب ابی حنیفة، کردری: ۲/۱۰۸

③ فقہ حنفی کے قدیم ذخائر میں ایسی مثالیں کم نہیں۔ اہلِ علم ان سے بخوبی واقف ہیں۔

④ مناقب ابی حنیفة، کردری: ۲/۱۰۹

⑤ دوّنه ابو حنیفة فجعله ابوابا مبوبة و کتبا مرتبة. ﴿مناقب ابی حنیفة، موفق مکی: ۲/۱۳۶﴾

⑥ مناقب ابی حنیفة، کردری: ۱/۱۵۰، ۱۵۱

اس نئی چیز کو دیکھ کر بعض فقہاء کو حیرت بھی ہوئی؛ اسی لیے امام اوزاعی رحمہ اللہ نے اس کی تردید کی جس کے جواب میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے ''الرَّدُّ عَلٰی سیر الْاَوْزَاعِی'' نامی رسالہ لکھا۔

تدوینِ فقہ کا یہ کام ۱۲۰ھ میں شروع ہوا، اور درمیان میں کوفہ سے غیر حاضری کے کچھ عرصے کو چھوڑ کر ۱۴۴ھ تک ۲۲ برس جاری رہا۔ اپنے تلامذہ اور ہم عصر علماء کی جماعت کے ساتھ امام صاحب ہر مسئلے کے لئے پہلے کتاب اللہ، پھر سنت رسول اللہ ﷺ، اس کے بعد آثارِ صحابہ اور آخر میں قیاس کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ حدیث کی حیثیت (مثلاً صحیح، حسن، ضعیف، متواتر، مشہور، خبرِ واحد وغیرہ) جانچنے کے علاوہ وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ اس بارے میں نبی اکرم ﷺ کا وصال سے پہلے آخری عمل کیا تھا۔ ۱۴۴ھ تک تیار شدہ فقہی دفعات کی تعداد ۸۳ ہزار تھی جن میں ۳۸ ہزار مسائل عبادات اور ۴۵ ہزار مسائل معاملات اور عقوبات سے متعلق تھے۔ [1]

امام صاحب رحمہ اللہ کی وفات تک یہ کام جاری رہا۔ قید و بند کے دوران بھی یہ کام نہ رکا [2] اور جب امام صاحب دنیا سے رخصت ہوئے تو فقہ کا ایک ایسا عظیم الشان ذخیرہ مرتب ہو چکا تھا جو تا قیامت امت کی رہنمائی کے لئے کافی تھا۔

امام صاحب رحمہ اللہ کے زمانے میں ان کی مدون کردہ فقہ کو وہ بالاتر قانونی حیثیت نہ مل سکی جو اس کا حق تھا مگر امام صاحب کی کاوش کے نتیجے میں ہر دور اور ہر خطے کے لئے شرعی احکام کا مدون مجموعہ تیار ہو چکا تھا جس سے کام لے کر امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قلم سے ''کتاب الخراج'' اور امام محمد رحمہ اللہ کے ہاتھوں ''الجامع الصغیر''، ''الجامع الکبیر''، ''السیر الصغیر''، ''السیر الکبیر''، ''المبسوط'' اور ''الحجۃ علیٰ اہل المدینۃ'' جیسی عظیم الشان تصانیف سامنے آئیں۔

جونہی احناف کا یہ علمی ذخیرہ منظرِ عام پر آیا عوام و خواص، قاضی و مفتی، امراء اور خلفاء سبھی اس سے استفادے پر مجبور ہو گئے؛ کیوں کہ یہ ایک ایسی متاع تھی جس کی ایک مدت سے اُمت کو ضرورت تھی اور ہر جگہ اس کی شدید طلب تھی۔ اس اجتماعی تحقیق اور تدوینِ قانون کا نتیجہ یہ ہوا کہ انفرادی طور پر فتاویٰ دینے والے فقہاء و مجتہدین کی آراء غیر معتبر سمجھی جانے لگیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا یہ کارنامہ ایک ایسا انقلابی اقدام تھا جسے آئندہ کے لئے ہر اسلامی ریاست کی اساس کہا جا سکتا ہے۔ نصف صدی بھی نہ گزری تھی کہ اسے مملکت کے سرکاری قانون کی حیثیت مل گئی اور اکثر اسلامی ریاستوں کے حکام، قاضی حضرات اور مفتیانِ کرام اس کے مطابق فیصلے کرنے لگے۔ [3]

◆◆◆

---

[1] مناقب ابی حنیفۃ، کردری: ۱۴۴/۲؛ امام ابو حنیفہ کی قانونِ تدوینِ اسلامی از ڈاکٹر حمید اللہ، ص ۴۹

[2] قدیم مآخذ میں ایسی کوئی صریح عبارت نہیں ملی مگر قرائن اور واقعات کی رفتار سے اس کی تائید ہوتی ہے؛ اسی لیے علامہ شبلی نعمانی مرحوم لکھتے ہیں: ''قید کے دوران درس کا سلسلہ بھی جاری رہا اور امام محمد رحمہ اللہ نے اسی دوران آپ سے اکتسابِ فیض کیا۔'' ﴿سیرۃ النعمان از شبلی نعمانی، ص ۶۴﴾

[3] تفصیل کے لیے دیکھیے: وفیات الاعیان: ۴۰۹/۵ تا ۴۱۲، نیز ''مناقب ابی حنیفۃ وصاحبیہ للذہبی'' اور ''الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیۃ'' میں امام صاحب کے تلامذہ کے حالات دیکھیے۔

''میں نے اس معاملے پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر امین اس مجبوری اور بے کسی سے کسی طرح نکل گیا تو فتنے کا خاتمہ نہیں ہوگا بلکہ اِدھر اُدھر کے خود غرض لوگ اسے استعمال کر کے مزید خلفشار کا ذریعہ بنتے رہیں گے۔ میں نے اس سے کسی قسم کا عہد و پیمان نہیں کیا تھا؛ اس لیے میرے آدمیوں نے اسے پکڑ لیا اور ہر ایک کی کوشش تھی کہ وہ اسے قتل کر کے سرخروئی حاصل کرے۔ پس انہوں نے اسے مار کر اللہ، رسول اور خلیفہ کی حمایت کا حق ادا کر دیا۔''[1]

مامون کو امین کے قتل کا سخت صدمہ ہوا۔ وہ طبعی طور پر عفو و درگزر کا عادی تھا۔ وہ نہیں چاہتا کہ بات اس کے قتل تک پہنچ جائے تاہم اس نے طاہر بن حسین سے اس بارے میں کوئی باز پرس نہ کی۔[2]

امین الرشید کی سیاسی غلطیاں:

امین الرشید کے قتل اور اس کی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی عرب اور عجمی مسلمانوں کے درمیان چھڑی جنگ ختم ہوگئی۔ امین کا یہ انجام اس کی چند سنگین غلطیوں کا قدرتی نتیجہ تھا۔ اس نے بلا وجہ اپنے بھائی کی حکومت ختم کرنے کی کوشش کی اور اس کے عواقب کا اندازہ نہ کیا۔ لوگوں کو پہچاننے، عہدے داروں کے چناؤ اور انہیں مہمات سپرد کرنے میں وہ مسلسل غلطیاں کرتا رہا۔ اس نے فضل بن ربیع کی رائے پر اعتماد کر کے جنگ کا آغاز کیا حالانکہ یہ شخص مطلب پرست اور خود غرض تھا، اسے عباسیوں کے نفع نقصان سے کوئی غرض نہ تھی۔ مامون سے خراسان کی حکومت چھیننے کے لیے اس نے علی بن عیسیٰ کو بھیجا جسے اہلِ خراسان ناپسند کرتے تھے؛ اس لیے خراسانی علی بن عیسیٰ کے خلاف طاہر بن حسین کے گرد جمع ہوگئے۔ بغداد کے دفاع میں اس نے کسی منصوبہ بندی سے کام نہ لیا بلکہ ان نازک حالات میں بھی تفریح طبع میں منہمک رہا جس کی وجہ سے شہر کے انتظامات ابتر ہوئے، عوام کو مایوسی ہوئی اور خود اس کے افسران حریف سے جا ملے۔

سلطنتِ روما:

ہارون کی زندگی میں رومیوں سے معرکے جاری تھے۔ مگر امین و مامون کے جھگڑے کے دوران جہاد رک گیا۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ اس دوران سلطنتِ روما شدید سیاسی بحران میں مبتلا ہونے کے باعث کوئی حملہ نہ کر سکی ورنہ مسلمانوں کو سخت نقصان کا اندیشہ تھا مگر جس سال ہارون کی وفات ہوئی، اسی سال قیصر روم ''نقفور'' نو برس کی حکومت کے بعد دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس کی جگہ اس کے بیٹے نے تخت سنبھالا مگر دو ماہ بعد وہ بھی چل بسا۔ اب اس کا بہنوئی ''میخائیل بن جرجس'' مسندِ اقتدار پر بیٹھا مگر اگلے سال ۱۹۴ھ میں اسے امراء کی بغاوت کے باعث معزول ہونا پڑا اور قیصر لیون تخت نشین ہوا۔ اس اکھاڑ پچھاڑ نے روما کو مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ کا موقع نہ دیا۔[3]

◆◆◆

---

① تاریخ الطبری: ۴۷۸/۸ تا ۴۹۸، تحت ۱۹۸ھ   ② تاریخ الخلفاء، ص ۲۲۱؛ البدایة والنهایة: ۱۰۶/۱۴

③ العبر فی خبر من غبر: ۲۴۴/۱

مامون بن الرشید

عبداللہ بن ہارون

محرم ۱۹۸ھ......تا......رجب ۲۱۸ھ

اکتوبر 813ء......تا......اگست 833ء

مامون الرشید خلافتِ عباسیہ کا نہایت نامور خلیفہ تھا۔ اگرچہ اس کا دورِ اقتدار سیاسی لحاظ سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا؛ کیوں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد جیسا بڑا سیاست دان نہیں تھا، البتہ علم وادب، ذہانت وفطانت، قوتِ حافظہ، اخلاق وعادات، مختلف اور متنوع فنون میں مہارت کے لحاظ سے وہ تاریخ کی ایک عجیب وغریب شخصیت تھا جس کی مثال حکمرانوں میں بہت کم کہیں ملے گی۔ حافظے کا یہ عالم تھا کہ جو چیز ایک بار پڑھ یا سن لیتا وہ عمر بھر کے لیے ذہن میں نقش ہو جاتی تھی۔ ذکاوت ایسی تھی کہ غیر محسوس قسم کے اشارے سے بھی بہت دور کی بات حتمی طور پر سمجھ لیتا تھا۔ حقیقت میں مامون کی صلاحیتیں علم وادب کی بلند پایہ خدمات کے لیے موزوں تھیں نہ کہ سیاست کے لیے مگر تقدیر نے اسے مسندِ خلافت پر لا بٹھایا۔ وہ ربیع الاول ۱۷۰ھ میں پیدا ہوا تھا۔ یہ وہی رات تھی جس میں خلیفہ ہادی کی وفات ہوئی تھی اور مامون کا باپ ہارون مسندِ خلافت پر بیٹھا تھا۔[1]

ابتدائی حالات......سیرت وقابلیت:

مامون کی والدہ مراجل نامی ایک باندی تھی جو اس کی ولادت کے چند روز بعد مر گئی۔ اس طرح مامون کو ماں کی شفقت نصیب نہ ہو سکی۔[2] پانچ برس کا ہوا تو باپ نے اس کی ذہانت اور ہوشیاری کو بھانپتے ہوئے بڑے بڑے علماء سے اسے تعلیم دلوانا شروع کی۔ امام قراءت حضرت کسائی رحمہ اللہ اس کے استاذ مقرر ہوئے۔ مامون ان سے قرآن مجید پڑھنے لگا۔ امام کسائی رحمہ اللہ کی عادت تھی کہ سر جھکا کر بیٹھے رہتے۔ اگر مامون درست پڑھتا تو خاموش رہتے۔ غلطی کرتا تو نگاہ اٹھا کر اسے دیکھ لیتے۔ مامون سمجھ جاتا اور اصلاح کر لیتا۔ ایک بار وہ یہ آیت پڑھ رہا تھا:

يَاۤأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (ایمان والو! تم وہ کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔)[3]

امام کسائی رحمہ اللہ نے آیت سنتے ہی یکدم نگاہ اٹھائی۔ مامون سمجھا غلطی ہو گئی ہے۔ توجہ دے کر آیت دوبارہ پڑھی تو دیکھا کہ پہلی بار بھی اسی طرح پڑھی تھی۔ امام کسائی رحمہ اللہ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ مطلب یہ کہ قراءت میں غلطی نہیں تھی۔

① تاریخ الطبری: سنة ۱۷۰ھ؛ سیر اعلام النبلاء: ۲۷۳/۱۰ ② سیر اعلام النبلاء: ۲۷٤/۱۰ ③ سورة الصف، آیت: ۲

استاد کے جاتے ہی مامون باپ کے پاس پہنچا اور کہا:

''اگر آپ نے میرے استاذ کو کچھ دینے کا وعدہ کیا تھا تو اسے پورا کیجیے۔''

ہارون نے کہا: ''ہاں! انہوں نے قراء حضرات کے لیے کچھ وظیفہ مقرر کرنے کا کہا تھا۔ میں نے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ کیا انہوں نے تمہیں یاد دلایا ہے؟''

مامون نے کہا: ''نہیں۔'' پھر سبق کا واقعہ سنا کر کہا: ''استاذ کی اس آیت پر نگاہ اٹھ جانا بلا وجہ نہیں ہو سکتا۔''

ہارون بچے کی اس ذہانت پر جھوم اٹھا۔[1]

اسی زمانے میں مامون نے قرآن مجید حفظ کیا جو بہت بڑی سعادت تھی۔[2]

حفظ قرآن کے بعد امام کسائی رحمہ اللہ ہی سے نحو، ادب اور علوم عربیت کی تعلیم حاصل کی۔

علامہ یزیدی اس کی اخلاقی تربیت پر مامور تھے۔ وہ طبیعت کے سخت تھے۔ ایک بار آئے تو مامون کو حاضر ہونے میں دیر ہوگئی۔ علامہ یزیدی کو ناگوار ہوا۔ نوکروں سے پوچھا تو وہ بولے:

''آپ کی عدم موجودگی میں صاحبزادے ہمیں بہت تنگ کیا کرتے ہیں۔''

کچھ دیر میں مامون آن پہنچا۔ علامہ یزیدی نے دیکھتے ہی سات بید کھینچ کھینچ کر مارے۔ مامون رونے لگا۔

اتنے میں خدام نے آواز لگائی: ''وزیرِ مملکت جعفر برمکی تشریف لا رہے ہیں۔''

مامون جلدی سے آنسو پونچھ کر قالین پر بیٹھ گیا۔ جعفر برمکی نے آکر مامون سے کچھ گپ شپ لگائی اور چلا گیا۔ اس دوران علامہ یزیدی گھبراہٹ کے عالم میں باہر کھڑے رہے۔

جب وزیر چلا گیا تو یزیدی نے آکر مامون سے پوچھا: ''تم نے وزیر سے میری شکایت تو نہیں لگائی؟''

مامون نے کہا: ''استغفر اللہ! میں جعفر کو بھلا کیا شکایت کرتا، میں تو خلیفہ سے بھی کچھ نہیں کہوں گا۔ کیا مجھے معلوم نہیں کہ تعلیم اور ادب سکھانے میں میرا ہی فائدہ ہے۔''[3]

مامون کے ادب کا یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ ایک بار زبیدہ خاتون اور ہارون میں امین اور مامون کی قابلیت کے بارے میں بحث ہوگئی۔ ہارون مامون کی تعریف کر رہا تھا اور زبیدہ اپنے بیٹے امین کی۔

آخر ہارون نے آزمائش کے لیے ایک غلام کو بلوایا اور حکم دیا کہ امین اور مامون کے پاس باری باری جاؤ اور پوچھو:

''اگر خلیفہ وفات پاگئے اور آپ کو خلافت ملی تو ہم جانثاروں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟''

غلام نے پہلے امین سے جا کر یہ سوال کیا۔ اس نے معصومیت سے کہا کہ اتنی اتنی جاگیریں اور دولت تمہیں دے دوں گا۔ اب غلام نے جا کر یہی سوال مامون سے کیا۔ مامون نے قلمدان اٹھا کر غلام کے منہ پر دے مارا اور کہا:

''بے ادب! امیر المؤمنین نہ ہوئے تو ہم جی کر کیا کریں گے۔ ان پر فدا نہ ہو جائیں گے۔''

---

[1] المختار من نوادر الاخبار للانباری، ص ۲۳۰۲۲، ط دارکنان بغداد
[2] تاریخ الخلفاء، ص ۲۳۱
[3] تاریخ الخلفاء، ص ۲۳۰، ۲۳۱

غلام نے آکر ہارون اور زبیدہ کو دونوں شہزادوں کے جوابات سنائے جس سے ثابت ہوگیا کہ مامون ادب و اخلاق اور فہم و ذکاوت میں کہیں بڑھ کر ہے۔[1]

ابو معاویہ، ہشیم، حجاج اعور، عباد بن عوام اور یوسف بن عطیہ رحمہم اللہ جیسے محدثین سے اس نے حدیث پڑھی تھی۔ ہارون الرشید کے دور کے سب سے بڑے محدث اور فقیہ امام مالک رحمہ اللہ تھے۔ وہ مدینہ منورہ میں مقیم تھے۔ ہارون کی خواہش تھی کہ وہ بغداد تشریف لائیں اور شہزادوں کو اپنی شہرہ آفاق کتاب مؤطا پڑھا دیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے معذرت کی اور جواب میں کہلوایا: ''یہ علم آپ کے گھر سے چلا ہے۔ اگر آپ ہی اس کی عزت نہ کریں گے تو کون کرے گا۔''

ہارون اس کے بعد مدینہ حاضر ہوا اور شہزادوں کو امام مالک رحمہ اللہ سے مؤطا پڑھوائی۔[2] علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس نسخے میں مامون نے امام مالک سے مؤطا پڑھی تھی وہ ایک زمانے تک مصر کے کتب خانے میں محفوظ تھا۔[3]

فن حدیث میں اس کی مہارت کا اندازہ اس واقعے سے لگائیے کہ ایک بار ایک شخص اس کی خدمت میں آیا اور دربار میں قرب حاصل کرنے کے لیے کہا: ''میں محدث ہوں اور عمر اسی فن میں کھپادی ہے۔''

مامون نے ایک مسئلہ پیش کر کے اس سے متعلقہ احادیث کے بارے میں پوچھا تو وہ ایک حدیث بھی نہ سنا سکا۔ اب مامون نے اس مسئلے پر اَسناد سمیت کئی حدیثیں سنا دیں۔ پھر اس سے ایک دوسرے مسئلے پر حدیث پوچھی۔ وہ چپ رہا۔ مامون نے اس بارے میں بھی سند سمیت کئی حدیثیں سنا ڈالیں۔ پھر کہا:

''لوگ تین دن حدیث پڑھ کر سمجھتے ہیں کہ محدث ہوگئے۔ چلو اس کو تین درہم دے ہی دو۔''[4]

ایک بار ایک عورت نے آکر شکایت کی کہ میرا بھائی چھ سو اشرفیاں چھوڑ کر مرا ہے مگر مجھے ورثاء نے صرف ایک اشرفی دی ہے۔ مامون نے ایک لمحے میں حساب لگا لیا اور کہا:

''اگر میرا اندازہ درست ہے تو شرعاً تمہارے حصے میں ایک ہی آتی ہے۔''

حاضرین حیران رہ گئے۔ علماء نے پوچھا: ''امیر المؤمنین! وہ کس طرح؟''

مامون نے کہا: ''مرحوم کی دو بیٹیاں ہوں گی۔''

عورت نے اثبات میں جواب دیا تو مامون نے کہا: ''دو ثلث یعنی چار سو اشرفیاں انہیں ملی ہوں گی۔''

پھر کہا: ''ماں بھی زندہ ہوگی۔'' عورت نے اقرار کیا تو مامون بولا: ''چھٹا حصہ یعنی سو اشرفیاں اسے مل گئیں۔''

پھر پوچھا: ''اس کی بیوی بھی ہوگی۔'' عورت نے کہا: ''جی ہاں۔''

مامون بولا: ''تو باقی سو اشرفیوں کا آٹھواں حصہ یعنی ۷۵، اسے ملا۔ اب سچ بتا کہ کیا تیرے بارہ بھائی ہیں۔''

عورت بولی: ''جی ہاں۔'' مامون نے کہا: ''دو دو اشرفیاں انہیں ملیں۔ تو تیرے لیے باقی ایک ہی رہ گئی۔''[5]

---

① الدراری فی الذراری لابن عدیم، ص ۸۳، ط دار الهدایة
② المامون، شبلی نعمانی، ص ۱۷، ۱۸ بحواله الحکم والآداب للیاقوت المستعصمی، ص ۷۱
③ تاریخ الخلفاء: للسیوطی، ص ۲۱۷، ط نزار
④ تاریخ الخلفاء، ص ۲۴۲ ⑤ تاریخ الخلفاء، ص ۲۳۱؛ البدایة والنهایة: سنة ۲۱۸ھ

قرآن مجید کی تلاوت کا بہت شائق تھا، بعض اوقات ماہ رمضان میں روزانہ ایک ختم کرتا تھا۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ خلفائے بنو عباس میں اس سے بڑا عالم فاضل شخص اور کوئی نہیں گزرا۔ مامون نے عالم اسلام میں مروجہ سارے علوم وفنون میں مہارت حاصل کی مگر شعر وادب اور تاریخ اس کی دلچسپی کا خاص محور تھے۔ ①

خلافت کا آغاز اور خاندان سہل کا تسلط:

مامون کی خلافت کا آغاز امین کے قتل کے بعد ۲۶ محرم ۱۹۸ھ کو ہوا۔ مگر دراصل یہ مامون کی نہیں اس کے وزیر فضل بن سہل کی حکومت تھی۔ فضل کا بھائی حسن بھی حکومت میں برابر کا شریک تھا۔ فضل کی ولادت ۱۵۴ھ میں ہوئی تھی اور حسن کی ۱۶۶ھ میں۔ ان کا باپ سہل مجوسی تھا اور یہ دونوں بھائی بھی جوانی تک اسی مذہب پر کاربند تھے۔

مامون ابھی بچہ تھا کہ ہارون الرشید کو اس کے لیے ایک خدمت گار کی ضرورت پیش آئی۔ جعفر برمکی نے فضل بن سہل کو پیش کر دیا۔ ہارون نے دیکھنے بھالنے کے لیے اسے پاس بلوایا۔ فضل بن سہل ہارون کے سامنے پہنچ کر کانپ گیا۔ ہارون نے وجہ پوچھی تو بولا: ''امیر المؤمنین! غلام کی خوش بختی یہ ہے کہ اس کا دل آقا کی ہیبت سے بھر جائے۔''

ہارون اس جواب سے خوش ہوا اور اسے مامون کی خدمت سپرد کر دی۔ بہت جلد اس نے مامون کا دل جیت لیا۔

۱۹۰ھ میں جب مامون بیس سال کا تھا، فضل بن سہل نے اس کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا اور شیعہ مذہب اختیار کر لیا۔ اس وقت فضل بن سہل ۳۶ سال کا تھا۔ اب وہ مامون کا مزید مقرب بن گیا۔ ہارون کی وفات کے بعد اس نے مامون کو پوری طرح اپنی مٹھی میں لے لیا۔ ②

حقیقت یہ ہے کہ برامکہ ہارون الرشید کو اس طرح رام نہیں کر سکے تھے جس قدر فضل بن سہل نے مامون کو غیر مرئی حصار میں لے رکھا تھا۔ ہارون ہر طرف کی خبر رکھتا اور اپنے فیصلے خود کرتا تھا۔ جبکہ مامون کو امورِ سیاست سے بس رسمی تعلق تھا۔ حکومت کا کرتا دھرتا فضل بن سہل ہی تھا۔ اسے ''ذوالریاستین'' کا خطاب ملا تھا یعنی صاحب قلم وسیف۔ دوسرے لفظوں میں امورِ دربار وسیاست سے لے کر افواج کا نظم ونسق سب اسی کے ہاتھ میں تھا۔

مامون کے خلیفہ بننے کے بعد بھی فضل بن سہل نے اسے بغداد جانے سے باز رکھا؛ کیوں کہ بغداد میں بنو عباس اور دیگر عرب امراء مجوسی نسل کے ایک شیعہ کو امورِ حکومت پر ہرگز مسلط نہ رہنے دیتے۔ البتہ خراسان میں جہاں سب عجمی تھے، فضل بن سہل کو پوری آزادی حاصل تھی۔ چنانچہ مامون فضل بن سہل کی تجویز کے مطابق بغداد فتح کر کے بھی وہاں نہ گیا بلکہ خراسان کے مرکز ''مَرْو'' ہی میں رہا۔ اس کے بعد فضل بن سہل نے اپنی بالادستی کے لیے مامون کے جرنیلوں کو امورِ حکومت سے باہر کرنے کی تگ ودو شروع کر دی؛ کیوں کہ وہ مملکت کی اصل صورتحال مامون کے سامنے لا کر اسے فضل بن سہل کے جال سے باہر لا سکتے تھے۔

فضل بن سہل نے پہلے مامون کو طاہر بن حسین کے خلاف اکسانا شروع کیا۔ اس نے مامون کو یاد دلایا کہ طاہر کو

---

① تاریخ الخلفاء، ۲۲۶　② الاعلام زرکلی: ۱۴۹/۵؛ وفیات الاعیان: ۴۱/۴

امین کی صرف گرفتاری کا حکم دیا گیا تھا نہ کہ قتل کا۔ اس وقت مامون نے یہ شکایت اَن سنی کر دی مگر اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ طاہر کو مرکز کے کسی عہدے پر نہیں رہنا چاہیے۔ چنانچہ اس نے طاہر بن حسین کو حکم لکھ دیا کہ وہ بغداد اور عراق و شام کا مفتوحہ علاقہ فضل بن سہل کے بھائی حسن بن سہل کے سپرد کر دے اور خود شام کے سرحدی شہر رقّہ چلا جائے اور الجزیرہ کا نظام سنبھالے۔ طاہر بن حسین کی سخت دل شکنی ہوئی مگر وہ حکم کی تعمیل میں رقّہ چلا گیا اور عملی طور پر ایک عضو معطل بن گیا۔

حسن بن سہل نے بغداد پہنچ کر اپنا عہدہ سنبھال لیا۔ یوں یہ دونوں فارسی نژاد بھائی عالمِ اسلام کے سیاسی امور پر پوری طرح حاوی ہو گئے اور مامون کو مہرہ بنا کر استعمال کرتے رہے۔[1]

✦✦✦

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۱۰۹/۱۴

فتنہ وفساد اور خروج کی تحریکیں

شام کے باغیوں کی سرکوبی:

امین الرشید کے دور میں یزید بن معاویہ کی اولاد سے ایک رئیس ابوعُمیطر سفیانی نے بغاوت کر کے دمشق سمیت شام کے خاصے علاقے پر قبضہ کرلیا تھا۔ امین اپنی کمزوری اور لاپرواہی کے باعث اس کا تسلط ختم نہ کرسکا مگر مامون کے تخت نشین ہوتے ہی حالات بدل گئے۔ مامون کے وفادار ایک عرب امیر ابن بَیہس کلابی نے قبائل کو جمع کر کے سفیانی کو مار بھگایا اور یوں شام دوبارہ خلافتِ عباسیہ میں شامل ہوگیا۔ ①

سادات کی بغاوتیں:

ساداتِ بنوہاشم میں سے بہت سوں نے عباسیوں کی حکومت کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ اُدھر مامون کی بغداد میں عدم موجودگی اور انتظامی امور پر حسن بن سہل جیسے شیعہ کی بالادستی سے بعض شیعانِ بنی فاطمہ کو خیال ہوا کہ وہ حکومت پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ اس ماحول سے ایک عرب سردار ''ابوالسّرایا'' نے فائدہ اٹھایا۔ اس کا اصل نام ''سَرِیّ بن منصور شیبانی'' تھا۔ پہلے وہ فوج میں تھا، پھر لوٹ مار کرنے لگا اور ڈاکو بن گیا۔ کوفہ اب اہلِ تشیع کا گڑھ بن چکا تھا۔ وہاں ایک فاطمی بزرگ محمد بن ابراہیم جو ''ابن طباطبا'' کے لقب سے مشہور تھے، اچھا خاصا حلقہ رکھتے تھے۔ مؤرخین کے مطابق یہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے سکڑ پوتے تھے۔

ابوالسّرایا نے خروج کی ایک منظم سازش تیار کی۔ اس نے ابن طباطبا کا اعتماد جیتا اور ''الرضا من آل محمد'' اور نفاذِ کتاب وسنت کا نعرہ بلند کر کے بیک وقت کئی مقامات پر بغاوت کرادی۔ ہر جگہ الگ الگ سادات کو استعمال کیا اور ابن طباطبا کو اس پوری تحریک کے سربراہ کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ دس جمادی الآخرہ ۱۹۹ھ کو خروج کا اعلان ہوا، شیعوں نے ابن طباطبا کی بیعت کر کے کوفہ پر قبضہ کرلیا۔ بنوعباس کے مکانات جلا دیے گئے۔ ان کے کھیت اور باغات تباہ کر دیے گئے۔ دیگر صوبوں میں ان کی نیابت کے طور پر متعدد سادات کو کھڑا کیا گیا۔ یوں عراق اور فارس سے لے کر حجاز ویمن تک ہر جگہ فساد مچ گیا۔

۲۹ جمادی الآخرہ کو بغداد سے دس ہزار سرکاری سپاہی کوفہ پہنچے مگر ابوالسّرایا انہیں شکست دینے میں کامیاب رہا۔ چونکہ ابن طباطبا کی موجودگی میں ابوالسّرایا اپنی ہوسِ اقتدار پوری نہیں کرسکتا تھا، اس لیے فتح کے فوراً بعد اس نے زہر دے کر ابن طباطبا کا خاتمہ کردیا اور برائے نام روحانی قیادت کے لیے ایک نابالغ لڑکے محمد بن محمد کو آگے کر کے

① العبر فی خبر من غبر: ۲۵۶/۱

لوگوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت لے لی۔ مشہور تھا کہ یہ لڑکا حضرت زین العابدین کا پڑپوتا ہے۔ اس کی آڑ میں ابوالسرایا پوری تحریک کا سربراہ بن گیا اور بڑی تیزی سے واسط اور مدائن پر قبضہ کر کے عراق میں اپنا سکہ جاری کرا دیا۔ اس کے دو نائب تھے: ایک حسین اَفطس اور دوسرا زیدُ النار۔ مؤرخین کے مطابق زیدُ النار حضرت جعفر صادق کا پوتا تھا اور حسین اَفطس حضرت زین العابدین کا پڑپوتا۔ (واللہ اعلم)

علویوں کی ان تحریکوں کا سابقہ تحریکوں سے فرق:

علویوں کی یہ تحریک جو مامون کے تخت نشین ہوتے ہی یکدم اٹھ کھڑی ہوئی، اس لحاظ سے سابقہ تمام تحریکوں سے مختلف تھی کہ سابقہ تحریکوں کے اکثر قائدین علم وعمل اور ورع وتقویٰ میں مشہور تھے۔ ان کا سادات اور صحیح العقیدہ ہونا متواتر اور یقینی تھا۔ انہوں نے کہیں بھی لوٹ مار، خونریزی اور مظالم کا ارتکاب نہیں کیا۔ ان کے حامیوں میں معتدل اہل تشیع اور رافضی ملے جلے تھے۔ مگر مامون کے دور سے شروع ہونے والی سادات کی تحریکیں جو اگلی صدی میں بھی چلتی رہیں، الگ رنگ لیے ہوئے تھیں۔ ان کے اکثر قائدین علم وفضل یا زہد وعبادت میں معروف نہ تھے۔ ان کا سادات ہونا مشہور ضرور ہے مگر تواتر کی حد تک نہیں۔ اس بات کا امکان ہے کہ بعض نے خود کو غلط طور پر سادات مشہور کر دیا ہو یا بعض کے بارے میں کسی راوی نے غلط بیانی سے کام لیا ہو۔ ان میں سے بعض کا کردار قبیح تھا۔ بعض کے بارے میں بدعقیدگی کا شبہ بھی ہوتا ہے۔ ان کی اکثریت نے جہاں بھی قبضہ کیا وہاں انتقامی کارروائیوں میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان کے حامیوں میں بڑی تعداد روافض کی تھی۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک عامۃ المسلمین کی جان ومال بے قیمت تھی جیسا کہ روافض کا عقیدہ ہے؛ اسی لیے ہر جگہ بے قصور لوگوں کو بے دریغ ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا۔ غرض دوسری صدی ہجری کے اختتام اور تیسری صدی ہجری کے آغاز سے سادات کی طرف منسوب تحریکیں روافض کے ہاتھوں میں آ کر سخت پرتشدد رنگ اختیار کر چکی تھیں۔ ان میں اور عام باغیوں میں کوئی فرق نہیں رہا بلکہ فتنہ وفساد میں یہ عام باغیوں سے بڑھ گئے۔

زیدُ النار نے بصرہ میں بنوعباس اور ان سے تعلق رکھنے والوں کے گھروں کو بے دریغ نذر آتش کرا دیا۔ آگ لگانے کی کارروائیاں اتنی کثرت سے کیں کہ نام ہی ''زیدُ النار'' پڑ گیا۔ ①

تاہم کچھ دنوں بعد سرکاری افواج ہَرثمہ بن اَعیَن کی قیادت میں آن پہنچیں۔ ۱۶ محرم ۲۰۰ھ کو ہَرثمہ نے کوفہ پر لشکر کشی کر کے ابوالسَّرایا اور اس کے گروہ کو بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے بعد تعاقب کر کے ابوالسَّرایا اور تحریک کے برائے نام پیشوا محمد بن محمد کو پکڑ لیا گیا۔ ابوالسَّرایا کو حسن بن سہل کے پاس لایا گیا جس نے اس کا سر قلم کرا دیا اور جسم کے دو ٹکڑے کر کے بغداد کے پل پر لٹکا دیے۔ ②

تحریک کے دوسرے قائد زیدُ النار کو گرفتار کر کے مامون الرشید کے سامنے پیش کیا گیا۔ مامون نے معاف کر دیا

---

① البدایة والنهایة: ۱۱٤/۱٤
② البدایة والنهایة: ۱۱٤/۱٤

اور حضرت علی رضا رحمہ اللہ کے پاس بھیج دیا جو زیدُ النار سے اتنے ناراض تھے کہ عمر بھر اس سے بات چیت نہ کی۔
اس سے قبل تحریک کا ایک داعی حسین افطس رضائے آلِ محمد کی دعوت لے کر حج کے موسم میں مکہ پہنچ چکا تھا۔ عباسی امراء خوف کے مارے حجاز چھوڑ کر چلے گئے تھے اور حج کے مناسک کسی امام کے بغیر ادا کیے گئے تھے۔ حسین افطس نے مکہ میں جو کچھ کیا اسے لوگوں نے سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اس نے مسجد الحرام میں جا کر کہا:
''ہم کعبہ کو بنو عباس کی غلاظت سے پاک کریں گے۔''
یہ کہہ کر کعبہ سے قیمتی غلاف اتار لیے اور اسے ایک سادہ زرد غلاف پہنا دیا جس پر ابوالسّرایا کا نام کڑھا ہوا تھا۔
ابن افطس نے آگے جو کچھ کیا اس سے صاف لگتا ہے کہ کعبہ کا غلاف بدلنا بھی لوٹ مار کا ایک بہانہ تھا۔ اس نے کعبہ کے خزانے اور وقف اموال کو بھی لوٹ لیا۔ کعبہ میں یہ خزانہ مدتِ دراز سے محفوظ چلا آتا تھا۔ افطس نے کہا:
''کعبہ کو اس کی کیا ضرورت۔ ہم اس سے اپنی جنگ میں مدد لیں گے۔''
اس کے بعد سے کعبہ کے لیے خزانہ رکھنے کی روایت ختم ہوگئی۔ ①
افطس نے مسجد الحرام کے کونے کونے کی تلاشی لی، بعض جگہوں پر بنو عباس کے خزانے مدفون تھے۔ کھدائی کر کے انہیں نکلوایا۔ پھر حرم کے ستونوں پر چڑھائے گئے سونے کو کھرچ کھرچ کر اتار لیا۔ پھر مسجد کی کھڑکیاں اور جالیاں اکھاڑ کر اونے پونے فروخت کر دیں۔ جو لوگ ہاتھ لگے انہیں مار پیٹ کر ان کے مال و دولت پر قبضہ کر لیا۔ لوگ یہ طوفانِ بدتمیزی دیکھ کر پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے۔ ②
خدشہ تھا کہ کہیں اب مدینۃ الرسول کا یہی حال نہ ہو۔ مگر اس دوران عراق سے خبر آئی کہ مامون کے جرنیل ہَرثمہ بن اَعْیَن نے ابوالسّرایا کو شکست دے دی ہے اور اس کے جتھے کا قلع قمع ہوگیا ہے۔
حسین افطس کو جب یہ اطلاع ملی تو بہت پریشان ہوا۔ اس نے فوراً مکہ میں مقیم محمد بن جعفر الصادق کے پاس حاضری دی۔ وہ اپنے دور کے عالم فاضل آدمی اور محدث تھے۔ حسین افطس نے انہیں ورغلایا کہ ابوالسّرایا کے قتل اور محمد بن محمد کی گرفتاری کے بعد سارے مسلمان آپ سے بیعت کے لیے بے تاب ہیں۔ آپ ان سے بیعت لیجیے۔ محمد بن جعفر صادق نے پہلے پہل انکار کیا مگر پھر اپنے بیٹے علی کے اصرار پر بیعت لے لی اور اس تحریک کے نئے امیر بن گئے۔ مگر ان کا لڑکا علی بھی فسادی تھا۔ اس نے حسین افطس کے ساتھ مل کر مکہ میں وہ اودھم مچایا کہ عورتوں اور بچوں تک کی عزت محفوظ نہ رہی۔ لوگ الامان والحفیظ پکارنے پر مجبور ہوگئے۔
اس دوران باغیوں کی سرکوبی کے لیے عباسی فوج آگئی۔ مکہ میں مدعیٔ امامت محمد بن جعفر صادق نے معافی چاہی۔ انہیں چھوڑ دیا گیا مگر انہوں نے بدعہدی کرتے ہوئے جہینہ میں دوبارہ ایک جتھا جمع کر لیا اور مدینہ پر قبضہ

---

① تاریخ ابن خلدون: ۴۴۰/۱، مقدمۃ؛ البدایۃ والنھایۃ: ۱۱۰/۱۴، ۱۱۳
شیعہ مؤرخین کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ واخذ مال الکعبۃ. ﴿عمدۃ الطالب: ۳۳۸/۱﴾

② البدایۃ والنھایۃ: ۱۱۰/۱۴، ۱۱۳

کرنے کی کوشش کی۔ تاہم انہیں شکست ہوئی اور لڑائی میں ان کی ایک آنکھ ضائع ہوگئی۔ گرفتار ہوئے تو معذرت کرتے ہوئے کہا: ''مجھے امیر المؤمنین مامون کی موت کی جھوٹی خبر دی گئی تھی؛ اس لیے خروج پر آمادہ ہوا۔''

انہوں نے عباسیوں سے عہدِ وفاداری کیا اور بیعت کی تجدید کی۔ انہیں امان دے دی گئی۔ وہ مامون کے ساتھ رہے اور ۲۰۳ھ میں ان کا انتقال ہوا تو مامون نے خود نمازِ جنازہ پڑھائی۔ ①

اس دوران یمن میں ابراہیم بن موسیٰ نے خروج کر دیا۔ مؤرخین اس شخص کو حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کا پوتا اور حضرت موسیٰ کاظم رحمہ اللہ کا بیٹا بتاتے ہیں۔ اس نے یمن میں عباسیوں اور ان کے حامیوں کو اس کثرت سے قتل کرایا اور اس قدر لوٹ مار کی کہ لقب ہی ''جزار'' (قصائی) پڑ گیا۔ کچھ عرصے بعد ابراہیم جزار کے ایک بیٹے جعفر نے بھی خروج کیا۔ مگر یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ مامون نے یہاں بھی درگزر کا معاملہ کیا۔ چند سالوں کے وقفے سے ۲۰۷ھ میں ایک علوی طالع آزما عبدالرحمٰن بن احمد نے یمن میں خروج کیا۔ قابو پا کر مامون نے حسبِ معمول اچھا سلوک کیا اور بغداد بلا کر دربار میں جگہ دی۔ تاہم یہ پابندی لگائی کہ اب علوی عباسیوں کا سیاہ درباری لباس استعمال کریں۔ ②

یہ واضح ہے کہ ان حضرات کی تحریکیں حکومت حاصل کرنے کی عاجلانہ کوششوں کے سوا کچھ نہ تھیں جن میں مسلمانوں کا فائدہ کچھ نہ تھا اور نقصان بے حد و حساب۔ ③

ہرثمہ بن اعین کا قتل:

۱۹۹ھ میں بغاوتوں کی یہ لہر جس تیزی سے اٹھی تھی اسے دیکھتے ہوئے لگتا تھا کہ دولتِ عباسیہ چند دنوں کی مہمان ہے مگر مامون کے جرنیلوں کی مستعدی اور چابک دستی کی بدولت دو سال کے اندر اندر اس کے شعلے بجھا دیے گئے۔ ایک طرف تو یہ بات شک و شبہے سے بالاتر ہے کہ اس مہم کی کامیابی میں سب سے بڑا کردار ہرثمہ بن اعین کا تھا۔ دوسری

---

① تاریخ ابن خلدون: ۳/۳۰۵، ۳۰۶؛ الکامل فی التاریخ: سنة ۲۰٤هـ ③ البدایة والنهایة: ١٤/١١٥، ١٦١

② مامون کے دور کی ان تحریکوں کے بعض قائدین کے متعلق شک ہوتا ہے کہ انہوں نے سادات ہونے کا جھوٹا دعویٰ نہ کیا ہو۔ تاہم ان کا نسب جعلی ہونے کا کوئی حتمی ثبوت نہیں ملا۔ اس دور کے سب مؤرخین نے ان باغیوں کو فاطمی یا علوی ہی مانا ہے۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ زید النار نے بصرہ میں، حسین افطس نے مکہ میں اور ابراہیم جزار نے یمن میں جو کچھ کیا وہ سادات کی شان سے بہت بعید ہے۔

خروج کی اس نئی لہر میں شریک قائدین کے انساب مؤرخین نے یوں بیان کیے ہیں:

- تحریک کے پہلے سربراہ: ابن طباطبا محمد، بن ابراہیم، بن اسماعیل، بن ابراہیم، بن حسن، بن حسن، بن علی، بن ابی طالب
- دوسرے سربراہ: محمد، بن محمد، بن زید، بن علی زین العابدین، بن حسین، بن علی، بن ابی طالب
- تیسرے سربراہ: محمد، بن جعفر، بن محمد، بن علی زین العابدین، بن حسین، بن علی، بن ابی طالب
- نائب سربراہ حجاز: حسین افطس، بن حسن، بن علی، بن علی زین العابدین، بن حسین بن علی، بن ابی طالب
- نائب سربراہ عراق: زید النار، بن موسیٰ کاظم، بن جعفر صادق، بن محمد باقر، بن علی زین العابدین، بن حسین بن علی، بن ابی طالب
- یمن کا پہلا مدعی امامت: ابراہیم جزار بن موسیٰ کاظم، بن جعفر صادق، بن محمد باقر، بن علی زین العابدین، بن حسین بن علی، بن ابی طالب
- یمن کا دوسرا مدعی امامت: ابراہیم جزار کے فرزند جعفر
- یمن میں تیسرے مدعی امامت: عبدالرحمٰن، بن احمد، بن عبداللہ، بن محمد، بن عمر، بن علی، ابن ابی طالب

طرف شک ہوتا ہے کہ ان بغاوتوں کے پیچھے شیعہ وزیر فضل بن سہل کا خفیہ ہاتھ ضرور تھا؛ کیوں کہ جب ہَرثمہ بن اعین باغیوں پر قابو پانے کے بعد تفصیلی روداد سنانے کے لیے مامون کے پاس جانے لگا تو فضل بن سہل نے اسے حکم نامہ بھیج کر ''مرو'' آنے سے سختی کے ساتھ منع کر دیا۔ ہَرثمہ کے پاس کچھ ایسی معلومات تھیں کہ جو مامون کو بتانا ضروری تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ معلومات فضل بن سہل کے خلاف جاتی تھیں تبھی تو فضل بن سہل کو گوارا نہیں تھا کہ ہَرثمہ مامون سے ملے۔ مگر ہَرثمہ بہرصورت فضل بن سہل کی ممانعت کو نظر انداز کر کے مَرو پہنچ گیا۔

فضل بن سہل کو ہَرثمہ کی آمد کی خبر ملی تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے دربار میں ہَرثمہ کی حاضری سے پہلے ہی مامون کو یہ کہہ کر ہَرثمہ سے سخت بدظن کر دیا کہ باغی اسی کی شہ پر کھڑے ہوئے تھے۔ یہ بات اگرچہ زمینی حقائق کے بالکل خلاف تھی مگر مامون کو فضل بن سہل پر اتنا بھروسہ تھا کہ اس نے کوئی ثبوت مانگے بغیر اس پر یقین کر لیا۔

ادھر ہَرثمہ کو اندازہ تھا کہ فضل بن سہل اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرے گا؛ اس لیے وہ نقارے اور طبل بجاتا ہوا شہر میں داخل ہوا تاکہ مامون کو اس کی آمد کی اطلاع مل جائے اور وہ فوراً سے دربار میں بلوا لے۔

جب مامون نے نقاروں کی آواز سن کر پوچھا: ''اس دھوم دھام سے یہ کون آ رہا ہے؟''

تو فضل بن سہل کے مقرر کردہ کارندوں نے کہا: ''یہ ہَرثمہ ہے جو فوج لیے گرجتا چمکتا آ رہا ہے؟''

مامون مزید مشتعل ہو گیا۔ ہَرثمہ نے دربار میں حاضری دی تو مامون نے اسے صفائی کا موقع دیے بغیر کہا:

''تمہی نے کوفہ میں علویوں کو سرکشی کا موقع دیا۔ ابوالسَّرایا کو بھی تمہی نے برانگیختہ کیا۔''

یہ کہہ کر اس نے ہَرثمہ کو جیل میں ڈال دیا۔ کچھ ہی دنوں بعد فضل بن سہل نے مامون کو بتائے بغیر اسے جیل ہی میں قتل کرا دیا۔[1]

مامون کا یہ طرزِ عمل ثابت کرتا ہے کہ وہ نہایت زیرک اور ذہین ہونے کے باوجود سیاسی سوجھ بوجھ میں کمزور تھا۔ ہَرثمہ مامون کا سب سے بڑا مددگار تھا۔ اسے قتل کرا کے مامون نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی۔ اگر مامون کانوں کا کچا نہ ہوتا تو کسی حتمی فیصلے سے پہلے ہَرثمہ کا مدعا ضرور سن لیتا۔

مامون کی عدم موجودگی میں بغداد کا حال:

مامون کی بغداد سے غیر حاضری مسلسل بدامنی کا باعث بن رہی تھی مگر فضل برادران نے اسے بالکل بے خبر رکھا ہوا تھا۔ ادھر ۲۰۱ھ میں بغداد ایک نئے فتنے کا سامنا کر رہا تھا۔ وزیرِ بغداد حسن بن سہل اس وقت یہاں موجود نہ تھا۔ بدانتظامی عروج پر تھی۔ غنڈوں، اور لٹیروں نے عوام کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔

کئی ماہ اسی طرح گزر رے اور کہیں کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ عوام نے مامون سے مایوس ہو کر اس کے چچا منصور بن

[1] البداية والنهاية: ۱۱۵/۱۴

مہدی کو خلیفہ بنانے کی کوشش کی، اس نے انکار کیا تاہم عوام کا مسلسل اصرار دیکھ کر وہ نائب السلطنت بننے پر آمادہ ہوگیا۔ اس دوران رہزنوں اور ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے عوام نے خالد دریوش اور سہل بن سلامہ نامی دو حوصلہ مند افراد کی قیادت میں اپنا ایک مسلح گروہ بنا کر مجرموں کا تعاقب شروع کر دیا۔ ایک مشہور محدث نصر بن مالک نے بھی لوگوں کو منظم کر کے امن بحال کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ عارضی انتظامیہ اس وقت تک برقرار رہی جب تک وزیر بغداد حسن بن سہل بیرونی امور نمٹا کر بغداد واپس نہ آیا۔ اس کے آنے کے بعد انتظامی امور بحال ہوگئے۔ منصور بن مہدی اور اس کے حامی حالات کو معمول پر آتا دیکھ کر خاموش ہوگئے۔ [1]

علی رضا رحمہ اللہ کی ولی عہدی کا فیصلہ۔ عباسیوں کا ردِّ عمل اور مامون کا سفرِ بغداد:

اس دوران مامون الرشید نے جو ملکی حالات کی ابتری سے بے خبر مرو میں علوم وفنون کی باریک گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھا، ایک عجیب ترین فیصلہ کیا۔ اس نے طے کیا کہ عباسی خاندان اپنے ہاتھ سے خلافت علویوں کے سپرد کر دے۔ اس نے پورے عالم اسلام میں بنو عباس کی مردم شماری کرائی اور پھر ان سب کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ یہ ۳۳ ہزار افراد تھے۔ مامون چاہتا تھا کہ ان کی موجودگی میں مسئلہ خلافت حل کر دیا جائے۔

نئی صدی ہجری کے آغاز میں مامون نے حضرت علی رضا بن موسیٰ کاظم رحمہ اللہ کو جو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں درس وتدریس میں مشغول تھے، اپنے پاس خراسان بلوا کر ان کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا۔

مامون کا کہنا تھا کہ اس وقت بنو ہاشم میں علم وفہم، زہد وتقویٰ اور حسب ونسب کے لحاظ سے ان سے افضل کوئی نہیں؛ لہٰذا وہی حکومت کے اصل حق دار ہیں۔ ساتھ ہی اس نے عباسیوں کا شعار یعنی سیاہ لباس ممنوع قرار دے دیا اور علویوں کے شعائر کو پورے عالم اسلام میں سرکاری طور پر رائج کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ [2]

تاریخ کے طالب علم کو یہاں بڑی حیرت ہوتی ہے کہ مامون نے اچانک یہ فیصلہ کیسے کر لیا۔ اس بارے میں عام مؤرخین کا کہنا ہے کہ مامون الرشید سادات سے بڑی محبت کرتا تھا؛ اسی لیے وہ ان کی مسلسل بغاوتوں کو معاف کرتا چلا گیا اور دشمنی کا بدلہ انعام واکرام سے دیا اور اسی لیے اس نے اقتدار سادات کو دینا قبول کر لیا؛ کیوں کہ اس کے خیال میں کھینچا تانی کا خاتمہ اسی طرح ممکن تھا کہ عباسی اقتدار سے ازخود دست بردار ہو جاتے۔

ہمیں مامون کے ان رجحانات یا اس کی نیک نیتی سے انکار نہیں، مگر ہمارا اندازہ ہے کہ مامون سے یہ فیصلہ کرانے میں اہم ترین کردار اس کے شیعہ وزیر فضل بن سہل کا تھا۔ اس دور میں مامون اس ناہنجار کی ہر رائے کو آنکھیں بند کر کے مان رہا تھا۔ کوئی بعید نہیں کہ جب فضل نے علویوں کی حالیہ بغاوتوں کو (جن کے پسِ پردہ ہمیں اسی کا ہاتھ محسوس ہوتا ہے) ناکام ہوتے دیکھا ہو، تو اسی نے پینترا بدل کر مامون کو ازخود اقتدار پر علویوں کا حق ماننے کی راہ سجھائی ہو۔

[1] البدایة والنهایة: ۱۴/۱۱۸، ۳۱۰

[2] البدایة والنهایة: ۱۴/۱۱۶، ۱۱۹؛ تاریخ بغداد: ۱۹/۱۳۵، ترجمة علی رضا، ط العلمیة

وجوہ جو بھی ہوں، حالات نے بہت جلد ثابت کر دیا کہ مامون نے یہ فیصلہ عالمِ اسلام کے معروضی حالات کو سامنے رکھ کر نہیں کیا تھا۔ اگر اسے حالات کا صحیح علم ہوتا تو وہ جان لیتا کہ یہ فیصلہ نافذ ہونے والا نہیں۔ اور اگر اسے جبراً نافذ کیا گیا تو اس سے اتفاق واتحاد کی جگہ افتراق کے نئے دروازے کھل جائیں گے؛ کیوں کہ اوّل تو عباسی اسے ماننے والے نہ تھے، دوسرے علویوں میں بھی اقتدار کے خواہش مند متعدد افراد علی رضا رحمہ اللہ پر خود کو ترجیح دیتے تھے۔

آخر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ عباسیوں کے مرکز بغداد میں امراء کی اکثریت نے یہ فیصلہ مسترد کر دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ ہرثمہ کے قتل کی وجہ سے مشتعل تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ عباسی امراء کو علویوں کی ماتحتی پسند نہ تھی۔ تیسری اور سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ فضل بن سہل شیعی کی بالادستی انہیں بالکل گوارا نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ علویوں کے نام پر فضل بن سہل حکومت کرے گا؛ اس لیے وہ برملا کہتے تھے کہ ہم ایک مجوسی زادے کی غلامی نہیں کر سکتے۔

چنانچہ امرائے بغداد نے ۲۵ ذوالحجہ ۲۰۱ھ کو ایک اجتماع میں مامون کی بیعت فسخ کر کے اس کے چچا ابراہیم بن مہدی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یکم محرم ۲۰۲ھ کو ابراہیم نے نئے عباسی خلیفہ کے طور پر بیعت لے لی۔

مگر بغداد میں بھی مامون کے وفادار موجود تھے جو حسن بن سہل کی قیادت میں اس فیصلے کے خلاف کھڑے ہوگئے اور پورے شہر میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ یہ سلسلہ چھ ماہ تک چلتا رہا جس سے اہلِ بغداد کی زندگی اجیرن ہوگئی۔

اُدھر مَرْو میں مامون الرشید علمی وفنی مشاغل میں منہمک تھا، اسے کانوں کان خبر نہ تھی کہ ملک میں کیا افراتفری برپا ہے۔ فضل بن سہل نے جان بوجھ کر مامون کو حالات سے بے خبر رکھا۔ باقی درباریوں میں یہ جرأت نہ تھی کہ مامون کو حقائق بتا کر وزیر سے دشمنی مول لیتے؛ کیوں کہ ہَرثمہ اور طاہر بن حسین کا انجام وہ دیکھ چکے تھے۔

ان حالات میں خود امام علی رضا بن موسیٰ کاظم رحمہ اللہ نے ایک غیر معمولی قدم اٹھایا۔ وہ ثابت النسب وصحیح العقیدہ سید، عالم فاضل اور ملک وقوم کے خیر خواہ تھے۔ انہوں نے مامون کے دور میں جاری سادات کی کسی بھی باغیانہ تحریک کو پسند نہیں کیا تھا۔ انہیں اپنی ولی عہدی اور حکومت سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ انہوں نے ضروری سمجھا کہ مامون کو اصل حالات بتا دیے جائیں۔ وہ جانتے تھے کہ اس طرح فضل بن سہل کی عزت خاک میں مل جائے گی اور وہ ان کی جان کا دشمن ہو جائے گا، اس سے خود ان کی اپنی ولی عہدی کا خلافِ حکمت ہونا بھی ثابت ہو جائے گا اور مامون کو یہ فیصلہ واپس لینا پڑے گا۔ پھر بھی ملت کی خیر خواہی کے تحت انہوں نے اپنی تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ دیا اور موقع پا کر مامون کو بتا دیا۔ ملک کے حالات کس قدر دگرگوں ہیں، بغداد میں مہینوں سے کیسی خانہ جنگی چل رہی ہے اور ان کی ولی عہدی کو کس طرح مسترد کر دیا گیا ہے۔

مامون ششدر رہ گیا۔ اسے یقین نہ آیا کہ فضل بن سہل جھوٹ موٹ ''سب ٹھیک ہے'' کی رٹ لگاتا ہے۔ اس نے کچھ معتبر امراء کو بلا کر تصدیق چاہی۔ سب نے جان کی امان چاہی؛ کیوں کہ ذوالریاستین سے سب خوفزدہ تھے۔ مامون نے اپنے ہاتھ سے انہیں دستاویز لکھ دی کہ ذوالریاستین انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

تب امراء نے نہ صرف ان خبروں کی توثیق کی بلکہ یہ بھی کہا: ’’فضل بن سہل نے ہرثمہ کو جو آپ کا خیر خواہ تھا، بلاوجہ قتل کرایا۔ طاہر بن حسین نے آپ کی حکومت کے لیے راہ ہموار کی تھی، اسے بھی بلاوجہ رقہ بھیج کر عضو معطل بنا دیا گیا۔‘‘

اب مامون کی آنکھیں کھلیں۔ وہ اندھا نہ تھا کہ روشنی ہو جانے پر بھی کچھ نہ دیکھ سکتا۔ حالات کا یہ رخ سامنے آنے پر شیعہ وزیر کا وہ طلسم جو سالہا سال سے طاری تھا، یکدم کافور ہوگیا۔

ان امراء نے مشورہ دیا کہ بغداد کو مرکز بنانے سے یہ ساری افراتفری دور ہو جائے گی اور ملکی انتظامات قابو میں آجائیں گے۔ مامون یہ مشورہ قبول کر کے بلا تاخیر بغداد کی طرف روانہ ہوگیا۔

یہ ایک عظیم الشان جلوس تھا جو سرکاری خزانے، دفاتر اور تمام ساز وسامان سمیت منزل بمنزل طویل قیام کرتے ہوئے بغداد جا رہا تھا۔ فضل بن سہل اور علی رضا رحمہ اللہ سمیت سارے خواص ہمراہ تھے۔ فضل بن سہل دل ہی دل میں سخت شش و پنج میں مبتلا تھا۔ اس کے سارے ارمانوں پر پانی پھرنے والا تھا۔ اس نے مامون کو حقائق بتانے والے امراء کا پتا لگا کر ہر ایک کو سزا دی۔ کسی کو کوڑے لگوائے، کسی کی ڈاڑھی اکھاڑی۔ حضرت علی رضا رحمہ اللہ کے سوا جس جس پر اس کا بس چلا، اسے ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ حضرت علی رضا رحمہ اللہ نے مامون کو ان زیادتیوں کا حال بتایا تو اس نے کہا: ’’میں غافل نہیں ہوں۔ مناسب تدبیر سے کام لوں گا۔‘‘

مامون کے لیے حالات بہت دگرگوں تھے۔ اسے کئی فیصلے بیک وقت کرنے تھے۔ فضل بن سہل امور مملکت پر حاوی تھا اور تمام خرابیوں کا ذمہ دار۔ اس کا خاتمہ ضروری تھا۔ مگر اس کا بھائی حسن بن سہل بغداد کے باغیوں کا مقابلہ کر رہا تھا، اسے بدظن ہونے سے بچانا اور اپنا وفادار بنائے رکھنا بھی بہت اہم تھا ورنہ بغداد پوری طرح ہاتھ سے نکل جاتا۔ ابراہیم بن مہدی کے خاتمے کے لیے علویوں کو ساتھ لینا یا کم از کم ان کی بغاوتوں سے پیچھا چھڑانا ضروری تھا۔ اس کے لیے حضرت علی رضا رحمہ اللہ کی ولی عہدی برقرار رکھنا بلکہ ان سے رشتے ناطے مزید پختہ کرنا ضروری تھا۔ مامون نے یہ سارے کام اسی سال ۲۰۲ھ میں مَرْو سے بغداد کی طرف سفر کے دوران مختلف شہروں میں قیام کے دوران انجام دے ڈالے۔

سَرَخس میں قیام کے دوران وزیر ذوالریاستین فضل بن سہل پر اچانک قاتلانہ حملہ ہوا اور وہ مارا گیا۔ مامون نے حملہ آوروں کو سزائے موت دے کر اس کارروائی سے خود کو بری الذمہ قرار دیا۔ اس طرح ایک غدار سے اس کی جان چھوٹ گئی۔ یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ مامون نے ذوالریاستین کی چالوں کا جواب اسی کے انداز میں دے دیا تھا۔

اس کے بھائی حسن بن سہل کو بغداد میں اپنے حامی کے طور پر ابراہیم بن مہدی کے سامنے کھڑا رکھنا ضروری تھا؛ لہٰذا مامون نے پہلے مراسلہ بھیج کر اس سے بھائی کی ناگہانی موت پر تعزیت کی۔ پھر بھائی کی جگہ اسے وزیرِ دولتِ عباسیہ بنانے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد حسن بن سہل کی بیٹی بوران سے نکاح کر کے اس سے سسر اور داماد کا رشتہ بھی قائم کر لیا۔ دوسری طرف حضرت علی رضا رحمہ اللہ کا نکاح اپنی بیٹی سے کر کے انہیں اپنا داماد بنا لیا۔[1]

[1] البداية والنهاية: ١٢٥/١٤

علی رضا رحمہ اللہ کی وفات:

۲۰۲ھ میں شروع ہونے والا یہ سفر ۲۰۳ھ میں بھی جاری رہا۔ مامون ایران میں داخل ہو چکا تھا۔ طوس پہنچا تو پھر طویل قیام کیا۔ یہاں اپنے والد کی قبر پر حاضری دی۔ ابھی آگے سفر شروع نہیں ہوا تھا کہ حضرت علی رضا رحمہ اللہ بیٹھے بیٹھے مبتلا ہو کر دار فانی سے کوچ کر گئے۔ انہوں نے انگور نوش کیے تھے جو بیماری کا سبب بن گئے۔ مامون نے سخت رنج و غم کا اظہار کیا اور انہیں اپنے والد ہارون الرشید کے پہلو میں دفن کر دیا۔[1]

علی رضا رحمہ اللہ ۱۴۸ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنے دور کے نامور عالم، عابد و زاہد اور طبیب تھے۔ مامون کو ان سے بڑی عقیدت اور انہیں مامون سے دلی محبت تھی۔

شیعہ مؤرخین نے مامون پر انہیں زہر دے کر قتل کرنے کا الزام لگایا ہے مگر یہ درست نہیں۔ مامون کی زندگی گواہ ہے کہ اس نے خروج کرنے والے سادات کا بھی احترام کیا اور قابو پانے کے بعد انہیں عزت و توقیر سے رکھا۔ مخالفین سے حسن سلوک کرنے والا بھلا علی رضا رحمہ اللہ جیسے محسن پر ظلم کیوں کرتا۔ مامون نے اپنی آخری وصیت میں بھی اپنے جانشین کو علویوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے، انہیں مصاحب بنانے اور ان کی لغزشوں کو معاف کرنے کا حکم دیا تھا؛[2] یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے علویوں کے سرخیل کو مشق ستم بنایا ہو اور وہ بھی بلا قصور۔[3]

ہاں یہ درست ہے کہ علی رضا رحمہ اللہ کی وفات سے مامون کو یہ سیاسی فائدہ ہوا کہ بغداد کے جو امراء علی رضا رحمہ اللہ کی جانشینی کے مخالف تھے، وہ نرم پڑ گئے۔ اسی مناسبت سے مامون نے اہلِ بغداد کے نام اپنے مراسلے میں علی رضا رحمہ اللہ کی وفات پر دلی صدمے کا اظہار کرنے کے بعد لکھا:

"آپ مجھ سے اس لیے ناراض تھے کہ میں نے حضرت علی رضا رحمہ اللہ کو جانشین بنایا ہے۔ تو دیکھیے اب وہ وفات پا گئے ہیں؛ لہٰذا اب اطاعت اختیار کر لیں۔"[4]

بغداد میں مامون کی تخت نشینی:

بغداد میں اس کے بعد بھی کئی ہفتوں تک ابراہیم بن مہدی اور مامون کے حامیوں میں خانہ جنگی جاری رہی تاہم جوں جوں مامون بغداد کے قریب آتا گیا، اس کے حامیوں کی تعداد بڑھتی گئی اور آخر میں ابراہیم بن مہدی کے ساتھ تھوڑے سے لوگ رہ گئے۔ مامون اس وقت ہمدان تک پہنچ چکا تھا۔ اسے اطلاع ملی کہ بغداد میں حالات معمول پر

---

① البداية والنهاية: ۱۲٦/۱٤ ② تاريخ الطبری: سنة ۲۱۸ھ

③ ہم امکان کی نفی نہیں کر رہے۔ مگر تاریخی ریکارڈ میں کوئی ضعیف قول بھی نہیں ملتا جس میں مامون پر اس قتل کا الزام لگایا گیا ہو۔ تمام مؤرخین نے ان کی وفات کو طبعی قرار دیا ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ انہیں زہر دیا گیا تھا تو پھر قرینِ قیاس یہ ہے کہ فضل بن سہل کے کسی وفادار نے یہ حرکت کی ہوگی؛ کیوں کہ فضل بن سہل کا اصل روپ سامنے لانے اور مامون کو خود مختار بنانے میں سب سے بڑا کردار حضرت علی رضا کا تھا۔ پس حضرت علی رضا سے کسی کو دشمنی ہو سکتی تھی تو وہ خود فضل بن سہل شیعی کے گروہ کو ہی ہو سکتی تھی۔ یا پھر ایسی سازش وہ عباسی امراء کر سکتے تھے جو حضرت علی رضا کی ولی عہدی سے خوش نہ تھے۔

④ البداية والنهاية: ۱۲٦/۱٤

آ گئے ہیں۔[1]

بغداد پہنچنے سے پہلے مامون نے طاہر بن حسین کو اپنی خدمت میں بلوالیا اور اس کے ہمراہ ۱۶ صفر ۲۰۴ھ کو بڑی شان وشوکت سے بغداد میں داخل ہوا۔ خلیفہ بننے کے چھ سال بعد وہ دارالخلافہ میں مسندِ خلافت پر بیٹھا۔[2]

تقریباً ایک صدی سے بنوعباس نے سیاہ لباس، سیاہ عمامے اور سیاہ پرچموں کو اپنا شعار بنایا ہوا تھا۔ علویوں نے سفید کپڑے، سفید عمامے اور سفید پرچم اختیار کیے تھے۔ مامون نے علویوں اور عباسیوں میں اتحادِ راہ نکالنے کے لیے یہ جدت اختیار کی کہ ان دونوں رنگوں کی بجائے سبز کپڑوں اور سبز پرچموں کو رواج دینا شروع کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ حضرت علی رضا سبز پوشاک استعمال کرتے تھے۔ مامون نے شروع میں اس معاملے میں اس قدر شدت برتی کہ سیاہ کپڑوں کو دیکھتے ہی جلا دینے کا حکم جاری کیا، ایک ماہ تک یہ سختی جاری رہی مگر چونکہ عباسی سیاہ رنگ ہی پسند کرتے تھے؛ اس لیے طاہر بن حسین کے مشورے پر اس نے سیاہ رنگ کی اجازت دے دی اور اہلِ دربار نے سابقہ معمول اختیار کر لیا۔[3]

طاہر بن حسین کا خراسان میں تقرر:

طاہر بن حسین نے مامون کی حکومت بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ مامون نے ایک طویل عرصے تک اسے دور رکھنے کے بعد اب دوبارہ اپنا مقرب بنالیا تھا۔ طاہر ''ذُو الیمینین'' کے لقب سے مشہور ہوا اور ہر طرف اس کی عزت و وجاہت کا شہرہ ہوگیا۔ مامون اسے ساتھ بٹھا کر اکثر گپ شپ لگایا کرتا تھا مگر جب بھی وہ طاہر کو دیکھتا، اسے یاد آجاتا کہ اسی کے ہاتھوں اس کے بھائی امین کا بڑی بے دردی سے قتل ہوا تھا۔ ایسے میں مامون کا خون جوش مارتا مگر وہ طاہر کی خدمات کو سامنے رکھتے ہوئے خود پر قابو پالیتا۔

جلد ہی طاہر مامون کی اس اندرونی کیفیت سے واقف ہوگیا۔ اس نے خود کو ممکنہ عتابِ شاہی سے بچانے کی ترکیب سوچی اور اپنے بعض وفادار امراء کے ذریعے مامون کو یقین دلا دیا کہ اس وقت خراسان کے حالات قابو میں رکھنے کے لیے طاہر کی وہاں تقرری ضروری ہے۔ مامون آمادہ ہوگیا اور ۲۰۵ھ میں اس نے خراسان کی ولایت طاہر بن حسین کے نام کر دی۔[4]

طاہر اسی سال خراسان کے مرکز مرو پہنچا اور پھر عمر بھر دوبارہ مامون کے پاس آنے کا خطرہ مول نہ لیا۔ یہ نہایت وسیع صوبہ داری تھی جو عراق کی سرحد سے ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھی؛ اس لیے یہاں آ کر اگر طاہر کو خود مختاری کے خیالات آتے تو بعید نہ تھا۔ تاہم ۲۰۷ھ میں طاہر کا اچانک انتقال ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے جمعے کے خطبے میں مامون کا نام نہیں لیا تھا۔ اگلی صبح وہ اپنی خوابگاہ میں مردہ پایا گیا۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ مامون نے کسی خفیہ اہلکار کو مامور کر رکھا تھا کہ اگر طاہر میں خود مختاری کا میلان محسوس ہو تو اسے ٹھکانے لگا دیا جائے۔[5]

[1] ابراہیم بن مہدی ایک سال گیارہ ماہ کی باغیانہ روش کے بعد روپوش ہوگیا۔ چھ سال روپوش رہ کر جب وہ سامنے آیا تو مامون نے اسے معاف کر دیا۔
[2] البدایة والنهایة: ۱۲۷/۱٤، ۱۳۱، ۱۲۸
[3] البدایة والنهایة: ۱۳۱/۱٤
[4] تاریخ الطبری: سنة ۲۰۵ھ۔
[5] الکامل فی التاریخ: سنة ۲۰۵ھ۔

طاہر بن حسین کا پند نامہ:

طاہر بن حسین بہت بڑا سیاست دان تھا۔اس کی گہری سیاسی سوجھ بوجھ کا اندازہ اس مراسلے سے ہوتا ہے جو اس نے اپنے بیٹے عبداللہ کو رقہ کی گورنری ملنے پر تحریر کیا تھا۔یہ مراسلہ درحقیقت علم سیاست کا ایک بہترین متن ہے۔ذیل میں اس کے چند اہم اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں:

❀ عدل کے بارے میں تعلقات کو کبھی خاطر میں نہ لانا۔

❀ علمائے دین، کتاب اللہ اور اس کی پیروی کرنے والوں کی اقتداء کرنا۔

❀ خیر کی اشاعت اور برائی کی روک تھام وہی کرسکتا ہے جسے دین کی معرفت نصیب ہو۔

❀ تمام کاموں میں میانہ روی اختیار کرنا؛ کیوں کہ اس سے بڑھ کر مفید شے اور کوئی نہیں۔

❀ گناہوں سے بچنا۔اپنے متعلقین کو گناہوں سے بچانے کا اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں۔

❀ ہر کام میں اللہ پر بھروسہ کرو گے تو تمہارا اقبال بلند رہے گا۔

❀ کسی عہدے دار پر جب تک الزام ثابت نہ ہو جائے اسے عہدے سے برطرف نہ کرنا۔

❀ شیطان کو کبھی اپنے اوپر سوار نہ ہونے دینا ورنہ تمہاری زندگی تلخ ہو جائے گی۔

❀ حسن ظن میں قوت اور راحت ہے۔اس طرح تمام مطلوبہ کام بخیروخوبی پورے ہو جاتے ہیں، لوگوں کے دل جڑے رہتے ہیں اور حکومت پائیدار رہتی ہے۔

❀ حسن ظن کی وجہ سے امور کی انجام دہی یکسر دوسروں پر نہ چھوڑ دینا بلکہ عہدے داروں کی حالت کی دیکھ بھال کرتے رہنا اور رعایا کی ضروریات سے واقف رہنا۔

❀ مجرم کو سزا ضرور دینا ورنہ تمہاری نیک نامی میں فرق آ جائے گا۔

❀ جب کسی سے خیر کا وعدہ کرو تو اسے ضرور پورا کرنا۔

❀ چغل خوروں کو اپنے سے دور رکھنا۔

❀ جھوٹوں کو اپنے ہاں جگہ مت دینا ورنہ تمہارے معاملات بگڑنا شروع ہو جائیں گے۔

❀ غصے کے وقت خود پر قابو رکھنا۔وقار اور تحمل کو لازم پکڑنا۔

❀ کبھی مت کہنا کہ میں جو چاہوں کرسکتا ہوں، اس سے اللہ پر یقین کی کمی ظاہر ہوتی ہے۔

❀ یاد رکھو مُلک اللہ کا ہے۔جسے چاہے دے، جس سے چاہے چھین لے۔

❀ روپیہ خزانوں میں جمع کیا جائے تو بے کار ہو جاتا ہے۔اسے رعایا کے حقوق اور خوشحالی میں خرچ کرنا۔

❀ غدار کو کبھی امان نہ دینا۔سائل کو روکھا جواب نہ دینا۔ہنسی مذاق کی بات کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا۔

❀ بخیلوں کو کبھی مشیر مت بنانا، رعایا کو فساد پر آمادہ کرنے کا سب سے بڑا سبب بخل ہے۔

⊛ فوج کے دفاتر اور حسابات کی جانچ پڑتال کرتے رہنا۔ ان کی تنخواہیں جتنا ممکن ہو، بڑھانا۔
⊛ اللہ کی حدود کو فوراً جاری کرنا، حریف سے بھی انصاف برتنا، ہر معاملے پر اچھی طرح غور وخوض کرنا۔
⊛ ایسے لوگوں کو افسر مقرر کرنا جو تجربہ کار اور سمجھ دار ہوں۔
⊛ ہر ضلعے میں ایک مخبر مقرر رکھنا جو تمہیں حالات کی اطلاع دیتا رہے۔
⊛ ہر کام میں اللہ سے استخارہ کرنا۔ آج کا کام کل پر مت چھوڑنا۔
⊛ شرفاء اور مہذب لوگوں کا خاص خیال رکھنا۔
⊛ کمزوروں اور مظلوموں کے حالات خود معلوم کرنا؛ کیوں کہ بہت سے مظلوم مظالم کی فریاد نہیں کر سکتے۔
⊛ لڑائیوں میں بہادری دکھانے والوں کے لیے انعامات رکھنا۔ شہداء کی بیواؤں اور یتیموں کی کفالت کرنا۔
⊛ نابینا افراد کا سرکاری خرچ مقرر کرنا۔ نابینا، حفاظ اور قراء کا وظیفہ زیادہ رکھنا۔
⊛ شفا خانے قائم کرنا اور وہاں طبیب اور ملازم مقرر کرنا۔ مریضوں کی سہولیات پر خاطر خواہ خرچ کرنا۔
⊛ جب عوام کو حقوق دیے جاتے ہیں اور ان کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں تو وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ حکام سے مزید سہولیات حاصل کرنے کے در پے رہتے ہیں؛ اس لیے حاکم مسلسل ایسی درخواستوں کا سامنا کرنے کے باعث تنگ دل اور بدمزاج ہو جاتا ہے۔ مگر یاد رکھو جو اللہ کی رضا کے لیے عدل کرتا ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے جو شہرت کے لیے ایسا کرتا ہے۔ پس لوگوں کے سوالات پر شائستگی سے پیش آنا اور ان پر احسان جتائے بغیر مہربانی کرنا۔
⊛ تمہارا سب سے زیادہ خیر خواہ وہ شخص ہوگا جو تمہارے عیب کو تنہائی میں تم سے بیان کرے۔
⊛ ماتحت حکام کے لیے روزانہ ایک وقت مقرر کر کے ان کی موجودگی میں تمام معاملات کا اچھی طرح غور وخوض کے بعد فیصلہ کرنا۔ نہ حرام مال جمع کرنا، نہ ہی خرچ میں اسراف کرنا۔ موجودہ اور گزشتہ قوموں اور حکمرانوں کے حالات پر غور کر کے ان سے سبق سیکھتے رہنا۔ اس نصیحت نامے کو کبھی کبھار دیکھتے رہنا۔''

طاہر بن حسین کا یہ خط دیکھ کر مامون الرشید کہہ اٹھا: ''اس نے دین ودنیا کی کوئی بات نہیں چھوڑی۔''
اس کے بعد اس کی نقلیں بنوا کر پورے عالم اسلام کے حکام کو ارسال کی گئیں کہ اسے اپنے سامنے رکھا کریں۔[1]

خراسان اور یمن کی نئی حکومتیں۔ دولتِ طاہریہ۔ دولتِ زیادیہ:

۲۰۷ھ میں جب طاہر بن حسین فوت ہوا تو مامون نے اس کی خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے خراسان کی ولایت اسی کے بیٹے طلحہ کے سپرد کر دی۔ اس کے بعد ایک طویل مدت تک خراسان کی حکومت طاہر بن حسین کی اولاد میں چلتی رہی اور آگے چل کر اس نے ایک مستقل ریاست کی شکل اختیار کر لی جو ''دولتِ طاہریہ خراسان'' کے نام سے موسوم ہوئی۔[2]

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۰۶ھ
② وفیات الأعیان: ۵۲۲/۲

اسی طرح ۲۱۳ھ میں یمن کی ولایت محمد بن ابراہیم زیادی کو دی گئی۔اس صوبے کی حکومت آگے نسل در نسل اسی خاندان میں چلتی رہی اور یہ علاقہ بھی آگے چل کر خودمختار ہو گیا۔ تیونس میں خودمختار دولتِ اغالبہ پہلے ہی قائم ہو چکی تھی۔ یہ تینوں ریاستیں یعنی: خراسان، یمن اور تیونس رسمی طور پر خلافتِ عباسیہ سے منسلک تھیں کہ وہاں سے خراج کی کچھ رقم بغداد بھیج دی جاتی تھی اور خطبے میں خلیفہ کا نام پڑھا جاتا تھا۔ باقی معاملات میں یہ ممالک خودمختار تھے۔

بوران سے شادی:

مامون ۲۰۴ھ میں بغداد آیا تھا۔اس کے بعد اپنی وفات تک اس نے بڑی آب و تاب کے ساتھ حکومت کی۔ رمضان ۲۱۰ھ میں اس نے وزیر حسن بن سہل کی بیٹی بُوران سے شادی کر لی۔بُوران کا اصل نام خدیجہ تھا۔ شادی کے وقت وہ ۲۰ سال کی تھی اور مامون ۴۰ سال کا۔شادی اس دھوم دھام سے ہوئی کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ کہا جاتا ہے کہ کسی شادی میں اتنی دولت خرچ نہیں کی گئی۔دلہن مامون کے ساتھ آ کر بیٹھی تو ایک ہزار ہیروں سے بھرا ایک طشت اس کی گود میں الٹ دیا گیا، ان جواہر کی قیمت قیاس سے بالاتر تھی۔

دولہا اور دلہن کے خاص مہمانوں پر مشک میں لپٹی گولیاں بکھیری گئیں۔ ہر ایک گولی کے اندر انعامی ٹکٹ تھے۔ کسی میں غلاموں اور باندیوں کے، کسی میں سواریوں کے اور کسی میں جاگیروں کے۔عام باراتیوں پر اشرفیوں اور دراہم کی بارش کی گئی۔ مشک کی شیشیاں اور عنبر کے ڈبے بکھیرے گئے۔بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ اس شادی میں مجموعی طور پر پانچ کروڑ درہم (تقریباً بارہ ارب پچاس کروڑ روپے) خرچ کیے گئے تھے۔[1]

اس تقریب میں مامون اور بُوران کو ایک سے ایک بڑھ کر بیش قیمت ہدایا دیے گئے۔شادی میں شریک ایک مفلس ادیب نے بھی دو تھیلیاں ہدیے میں پیش کیں۔ایک میں نمک تھا اور دوسرے میں صابن۔مامون نے اسے بھی قدر دانی سے قبول کیا اور دونوں تھیلیاں اشرفیوں سے بھر کر اس ادیب کے گھر بھیج دیں۔[2]

شعراء نے دولہا دلہن کی تعریف میں اشعار بھی کہے۔ابن حازم باہلی نامی ایک مزاحیہ شاعر نے کہا:

بَارَكَ اللّٰهُ لِلْحَسَنْ   وَلِبُوْرَانَ فِی الْخَتَنْ

''اللہ حسن کو برکت دے، اور سسرال میں بوران کو بھی۔''

یَا ابْنَ هَارُوْنَ قَدْ ظَفَرْ   ......تَ وَلٰكِنْ بِبِنْتِ مَنْ؟

''اے ہارون کے بیٹے! تجھے لڑکی ملی بھی تو کس کی؟''

کوئی اور بادشاہ ہوتا تو شاید ایسے شاعر کا سر قلم کرا دیتا مگر مامون یہ شعر سن کر بڑا محظوظ ہوا؛ کیوں کہ اس میں معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ یہ تعریف ہے یا طنز۔[3]

---

[1] تاریخ الطبری: سنة ۲۱۰ھ   [2] البدایة والنهایة: ۲۲٦/۱٤

[3] مروج الذهب: ۳۲۸/٤، ط جامعه لبنانیه؛ وفیات الاعیان: ۲۸۹/۱

نوٹ: بعض کتب میں شعر کے دوسرے مصرعے میں ''یابن ھارون'' کی جگہ ''یاامام الھدیٰ'' ہے جو یقیناً غلط ہے؛ کیوں کہ اس طرح وزنِ شعر ٹوٹ جاتا ہے۔

احمد بن ابی خالد کی وزارت:

مامون کی بغداد آمد کے کچھ ہی عرصے بعد حسن بن سہل کسی دماغی مرض میں مبتلا ہو گیا تھا؛ اس لیے ایک معزز رکن سلطنت ہونے کے سوا اس کی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔ وزارت کا منصب احمد بن ابی خالد کو مل گیا اور وہی امور سلطنت میں مامون کا دستِ راست رہا۔ ان چند سالوں میں عراق، الجزیرہ، مصر اور افریقی مقبوضات میں بعض بغاوتیں بھی ہوئیں مگر انہیں جلد کچل دیا گیا۔ [1]

بابک خرمی:

جاویداں نامی ایک مجوسی نے قدیم مزدکی مذہب میں کچھ تبدیلیاں کر کے ایک نیا مذہب شروع کیا تھا جس کے مطابق انسان مرتا نہیں بلکہ نئی نئی شکلوں میں جنم لیتا رہتا ہے؛ اسی لیے اس شخص نے اپنا نام جاویداں یعنی ہمیشہ رہنے والا رکھ لیا۔ مامون کے عہد میں بابک نامی ایک باغی نے دعویٰ کیا کہ جاویداں کی روح میرے اندر حلول کر گئی ہے۔ اس نے مزدکی عقائد کو پھیلانا شروع کیا جس میں خوش وخرم رہنے کے لیے ہر حرام چیز کو حلال کر دیا گیا تھا؛ اسی لیے اس کے پیروکار خرمی کہلائے اور اسی لیے بابک کو ''بابک خرمی'' کے نام سے شہرت ملی۔

بابک شمالی ایران کے علاقے ماژندران کے فلک بوس پہاڑوں کو مرکز بنا کر آس پاس کی مسلم آبادیوں کو قتل و غارت کا نشانہ بناتا رہا۔ اس کی چیرہ دستیوں نے عباسی افواج کی ناک میں دم کر دیا۔ اس کا فتنہ ۲۰۱ھ میں ابھرا تھا۔ اس کے بعد ۲۰۶ھ، ۲۰۹ھ اور ۲۱۲ھ میں آذربائی جان اور آرمینیا کے گورنروں اور مامون کے نامور جرنیلوں نے اس کے خلاف بار بار فوج کشی کی مگر دشوار گزار پہاڑی راستوں اور حریف کی زبردست مزاحمت کی وجہ سے ہر بار ناکامی ہوئی۔ کئی قابل افسران اور متعدد سپاہی ان مہمات میں کام آئے۔ [2]

فلسفیانہ علوم کی اشاعت

اگرچہ مامون کو بغداد آ کر بھی پوری طرح اطمینانِ قلبی میسر نہیں آیا بلکہ سیاسی الجھنیں ہمیشہ اسے اپنی طرف متوجہ کرتی رہیں۔ تاہم اتنی مصروفیات کے باوجود اسے نت نئے علوم وفنون کا چسکہ لگا رہا۔ تفسیر وحدیث سمیت دینی وعربی علوم وہ گھول کر پی چکا تھا مگر نئی نئی چیزیں سیکھنے کے لیے اس کے دماغ میں بڑی گنجائش موجود تھی۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ منصور عباسی کے دور میں ''کلیلۃ و دمنۃ'' جیسی بعض عجمی کتب کا عربی میں ترجمہ کرایا گیا تھا۔ ہارون الرشید کے دور میں بغداد میں ''بیت الحکمۃ'' کے نام سے باقاعدہ ایک محکمہ ترجمہ قائم ہو گیا تھا۔

① تاریخ الطبری: سنة ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳ھ

② تاریخ الطبری، البدایة والنهایة: سنة ۲۰۱، ۲۰۶، ۲۰۹، ۲۱۲ھ

مامون الرشید نے اس سلسلے کو کمال تک پہنچا دیا اور ہر قوم اور مذہب کی کتب منگوا کر ان کے تراجم کرانا شروع کیے۔ یہ زمانہ روم سے صلح کا تھا۔ مامون نے قیصر روم میخائیل کو پیغام بھیجا کہ ارسطو کی کتب جمع کر کے بغداد بھیج دی جائیں۔ روما میں پادری عروج پر تھے اور فلسفی گمنام۔ ایک مدت سے پادریوں نے فلسفے کی تعلیم پر پابندی لگا رکھی تھی؛ کیوں کہ اس سے مذہبی عقائد میں رخنے کا اندیشہ تھا۔ بہرحال قیصر مامون کا پیغام نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے فلسفے کی کتب تلاش کرانا شروع کرائیں۔ ایک راہب نے بتایا کہ یونان میں ایک عمارت ہے جسے قسطنطین کے زمانے سے تالا لگا ہوا ہے اور ہر نیا حاکم اس پر ایک مزید تالا لگا دیتا ہے۔ قسطنطین نے ہر جگہ سے فلسفے کی کتب جمع کر کے وہاں بند کر دی تھیں تا کہ یہ علوم مٹ جائیں اور دینِ عیسوی پر عقلی اعتراضات کرنے والا کوئی نہ رہے۔

راہب کی نشان دہی پر اس عمارت کو کھولا گیا تو بہت سی کتب محفوظ حالت میں مل گئیں۔ تاہم قیصر کو خدشہ تھا کہ مسلمانوں کو علوم منتقل کرنے میں ایسی فیاضی برتنا کہیں مذہبی اعتبار سے ممنوع یا سیاسی لحاظ سے نقصان دہ نہ ہو۔

اس نے جب ارکانِ دولت سے مشورہ کیا تو ایک پادری نے کہا: ''اس میں کوئی حرج نہیں۔ اگر فلسفہ مسلمانوں میں پھیلا تو ان کی مذہبی روح کو مردہ کر کے چھوڑے گا؛ کیوں کہ یہ علوم جس قوم میں بھی رائج ہوئے ہیں وہاں مذہب زبوں حال ہو کر رہا۔'' قیصر نے مطمئن ہو کر پانچ اونٹوں کے بوجھ کے برابر کتب مامون کو بھیج دیں۔ [1]

کتبِ فلاسفہ کی تلاش:

مامون نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بیت الحکمۃ کے افسران حجاج بن مطر، یوحنا بن بطریق اور سَلما کو روم بھیجا کہ وہ خود بھی وہاں سے کتبِ فلسفہ تلاش کر کے لائیں۔ اس کے علاوہ دور دراز کے ملکوں میں قاصد بھیجے کہ جس طرح ممکن ہو فلسفیوں کی تصانیف جمع کر کے بھیجیں۔ اس مہم کے لیے مامون نے خزانے کے دروازے کھول دیے اور لاکھوں درہم و دینار پانی کی طرح بہا دیے۔ [2]

کتبِ فلاسفہ کا ترجمہ:

کتب کا ایک ذخیرہ جمع ہونے پر اس نے نامور دانش ور اور مترجم یعقوب بن اسحق کندی (م ۲۶۰ھ) کو ترجمے کی ذمہ داری سونپی۔ یعقوب بن اسحق کو ''فیلسوفِ عرب'' کہا جاتا تھا۔ وہ حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھا۔ اسلامی، یونانی اور ہندی علوم وفنون کا جامع تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں اس دور تک اس کے سوا کوئی شخص ''فیلسوف'' کے لقب سے مشہور نہیں ہوا۔ اس نے مختلف زبانوں کے عقلی علوم کو بڑی خوش اسلوبی سے عربی زبان کا جامہ پہنایا۔ اس کا کمال یہ تھا کہ اس نے لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ فن میں مجتہدانہ بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے ان کتب کی تسہیل بھی ساتھ ساتھ کر دی اور مشکل عبارات کو عام فہم بنا دیا۔ وہ خود صاحبِ تصانیف شخص تھا۔ اس نے طب، فلسفہ،

---

① اخبار العلماء باخبار الحکماء للقفطی، ص ۳۰، ط دار الکتب العلمیۃ

② عیون الانباء فی طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ، ص ۲۶۰، ط دار مکتبۃ الحیاۃ بیروت؛ طبقات الامم لابن الصاعد الأندلسی، ص ۴۸

منطق، ریاضی اور جغرافیہ سمیت متعدد علوم وفنون پر دو سو سے زائد کتب تصنیف کیں۔ اس کے علاوہ اثباتِ توحید اور اثباتِ نبوۃ پر بھی رسائل لکھے۔ اس کے شاگردوں میں حَسنَوَیہ، نِفْطُویہ، سَلْمُوَیہ اور احمد بن طیب مشہور ہیں۔[1]

انہی دنوں قسطا بن لوقا ایک نصرانی فلسفی عالم اسلام سے روم گیا اور بہت سی کتب تلاش کر کے لایا۔ مامون نے اسے بھی بیت الحکمۃ میں ترجمے کا کام سونپ دیا۔[2] ترجمے کے کام کی ماہانہ تنخواہ پانچ سو دینار تھی۔[3]

دربارِ خلافت سے وابستہ نوجوان نصرانی طبیب حُنَین بن اسحٰق (۱۹۴ھ۔۲۶۰ھ) بھی یورپ گیا اور حتی الامکان دوڑ دھوپ کر کے یونانیوں سے فلسفے اور حکمت کی بہت سی کتب حاصل کر لایا۔ اس خدمت پر عباسی دربار میں اس کی بڑی عزت افزائی ہوئی اور اسے بھی کتب حکماء کے ترجمے پر مامور کر دیا گیا۔[4] مامون ہر رسالے کے ہم وزن سونا انعام دیتا رہا۔[5] اس نے قدیم یونانی حکیم جالینوس کے لگ بھگ چالیس رسائل کا ترجمہ کیا۔[6]

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

> ''یہ کہنا قریباً صحیح ہے کہ یونان، اٹلی، سسلی واسکندریہ کا کوئی علمی سرمایہ ایسا باقی نہیں رہا جو ترجمہ کے ذریعے سے عربی زبان میں منتقل نہیں ہوا۔ یہی چیز ہے جس کی وجہ سے علمی دنیا میں دولتِ عباسیہ کی شہرت کی بازگشت آج تک آرہی ہے۔''[7]

مامون کو خود فلسفہ سیکھنے سے شغف:

جس بھی کتاب کا ترجمہ ہوتا مامون اس کا بغور مطالعہ کرتا۔ جو بات سمجھ نہ آتی اسے فن کے اساتذہ سے سیکھتا اور انہیں گراں قدر معاوضے دیتا۔ یونان میں ''لیو'' نامی ایک مشہور فلسفی تھا۔ مامون نے شاہِ یونان کو لکھا کہ اسے بغداد بھیج دیا جائے تاکہ اس سے حکمت پڑھ سکوں۔ بدلے میں پانچ ٹن سونا دینے اور دوائی صلح رکھنے کا وعدہ کیا۔[8]

ایک ہندوستانی حکیم نے اسے بتایا کہ کسریٰ کے قدیم محل میں نوشیرواں کے وزیر کی ایک نادر تصنیف موجود ہے جو کسی صندوق میں مقفل ہے۔ مامون نے فوراً وہ صندوق تلاش کرایا۔ اس میں سے سو ورق کا ایک رسالہ نکلا۔ مامون نے اس کا ترجمہ کرایا۔ سنا تو کہہ اٹھا: ''خدا کی قسم! کلام اسے کہتے ہیں۔''[9]

---

[1] اخبار العلماء باخیار الحکماء، ص ۲۷۳ تا ۲۸۰؛ عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ص ۲۸۵ تا ۲۸۹

[2] اخبار العلماء باخیار الحکماء، ص ۱۹۹

[3] عیون الانباء فی طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ، ص ۲۶۰ یہ رقم آج کل کے حساب سے بارہ ہزار ڈالر یا بارہ لاکھ روپے بنتی ہے۔

[4] عیون الانباء فی طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ، ص ۲۶۰؛ اخبار العلماء باخیار الحکماء، ص ۳۰

حُنین عربی، یونانی، سریانی، فارسی اور رومی زبانوں کا ماہر تھا۔ اس نے طویل عمر پائی اور نو خلفاء کے دربار سے وابستہ رہا۔ ترجمے کے علاوہ اس نے فنِ طب پر خود بھی ۲۷ کتب تصنیف کیں۔ (اخبار العلماء باخیار الحکماء، ص ۱۳۲، ۱۳۳؛ الاعلام زِرِکلی: ۲/۲۸۷)

[5] عیون الانباء فی طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ، ص ۲۶۰؛ طبقات الاطباء، ص ۱۶۵، باب حنین بن اسحاق، قلمی نسخہ

[6] عیون الانباء فی طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ، ص ۱۰۳ تا ۱۰۵، ۱۳٤

[7] المامون از شبلی نعمانی، ص ۱۲۵

[8] المامون از شبلی نعمانی، ص ۱۳۱ بحوالہ چیمبرس انسائیکلو پیڈیا: ۱/۳٤۷ ...... یہ کہیں منقول نہیں ملا کہ وہ فلسفی بغداد بھیجا گیا تھا یا نہیں۔

[9] المامون از شبلی نعمانی، ص ۱۲۵ بحوالہ واسطۃ السلوک

سائنسی اور علمی کارنامے:

ترجمے کے علاوہ علوم وفنون کو آگے بڑھانے کا کام بھی ہوا۔ مامون کے دارالترجمہ کے ایک رکن اور مشہور مسلم حکیم محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے اسی دور میں فن ریاضی پر ''الجبر والمقابلہ'' جیسی بے مثل کتاب تصنیف کی جس میں الجبرا کے بنیادی اصول بیان کیے گئے ہیں۔ اس طرح الخوارزمی ''الجبرا'' کے موجد ٹھہرے۔

الخوارزمی نے علم فلکیات پر بھی کام کیا اور فلاسفہ یونان کی قدیم جنتریوں کو سامنے رکھ کر ایک بہترین جنتری ترتیب دی جس کی صحت اور معیارِ تحقیق نے سابقہ تمام جنتریوں کو بے حیثیت کر دیا۔ [1]

مامون کے حکم سے کرۂ زمین کو علم طبیعات کے ذریعے ناپا گیا اور قدیم یونانی حکماء کے اس قول کی عملی تصدیق کی گئی کہ کرۂ زمین کی پیائش ۲۴ ہزار میل ہے۔ [2] اسی دور میں شماسیہ کے مقام پر اسلامی تاریخ کی پہلی رصدگاہ (خلائی تحقیق کا ادارہ) قائم کی گئی جس میں نہایت بیش قیمت اور نادر روزگار آلاتِ رصد نصب کیے گئے۔ یحییٰ بن ابی المنصور، خالد بن عبدالملک اور عباس بن سفید کو یہاں کی خدمات تفویض ہوئیں۔ اس رصدگاہ کے ذریعے ستاروں اور سیاروں کے حالات نوٹ کیے جاتے رہے اور کئی نئی تحقیقات سامنے آئیں۔ [3]

عباسی دور کا سب سے بڑا طبیب جبرئیل بن بَختَیشُوع نامی ایک نصرانی تھا۔ [4] وہ برامکہ، ہارون الرشید، امین اور مامون کا معالجِ خصوصی رہا۔ امین اس کے مشورے کے بغیر کچھ کھاتا پیتا تک نہیں تھا۔ مامون کے دور میں اس کا مرتبہ یہ تھا کہ دربارِ خلافت سے جب بھی کسی شخص کو کسی منصب پر فائز کیا جاتا تو وہ اپنے عہدے کا چارج لینے سے پہلے جبرئیل کے پاس حاضر ہوتا تھا۔ مامون اسے باپ کا درجہ دیتا تھا۔ اس کے پاس دولت کی فراوانی اس قدر تھی کہ طبیبوں میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ [5] اس کے بیٹے بَختَیشُوع کو بھی بڑا عروج حاصل ہوا۔ وہ مال ودولت اور شان وشوکت میں عباسی خلفاء کے ہم پلہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کی نگرانی میں مختلف قابل حکماء کتبِ یونان کے ترجمے کرتے تھے۔ [6]

نحو، ادب، شاعری اور تاریخ پر کام:

نحو اور ادب پر بھی کام جاری رہا۔ فراء نحوی کو جو اپنے دور کے امامِ عربیت تھے، نحو میں ایک جامع کتاب لکھنے کی خدمت سپرد کی گئی۔ ان کے لیے شاہی محل کا ایک کمرہ خاص کر کے بکثرت ملازم اور معاون فراہم کر دیے گئے۔ فراء صبح تا عشاء مصروف رہتے۔ صرف نماز کے وقت یاد دلایا جاتا کہ وقت ہو گیا ہے۔ دو سال کی مسلسل محنت سے انہوں نے جو شاہکار پیش کیا وہ ''کتاب الحدود'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے علمِ تفسیر میں ''المعانی'' تصنیف کی

---

① اخبار العلماء باخبار الحکماء، ص ۲۰۵، ۲۱۶ ② وفیات الاعیان: ۵/۱۶۲، ۱۶۳، ط دار صادر

③ کشف الظنون از حاجی خلیفہ، ۱/۹۰۵، ۹۰۶، ط دار الکتب العلمیۃ

④ بختیشوع دراصل سُریانی زبان کا لفظ ''بَختَیشُوع'' ہے اور دو کلمات ''بخت'' اور ''یسوع'' کا مرکب ہے۔ بخت کا معنی بندہ اور یسوع کا مطلب حضرت عیسیٰ۔ پس بختیشوع ''عبدالمسیح'' کے ہم معنی ہے۔ (عیون الانباء فی طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ، ص ۱۸۶)

⑤ عیون الانباء فی طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ، ص ۱۸۷ تا ۱۹۰

⑥ عیون الانباء فی طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ، ص ۲۰۱

جس میں نہ صرف قرآن مجید کے بدائع وصنائع پر بحث کی گئی تھی بلکہ فقیہانہ اور محدثانہ کلام بھی کیا گیا تھا۔ المعانی کو مرتب کرنے میں امام فراء کے معاونین کی تعداد شمار کی گئی تو فقط ان کے معاون قاضیوں کی تعداد اسی تھی۔ ①

مامون کی مادری زبان فارسی تھی؛ اس لیے اسلامی تاریخ میں اس نے پہلی بار فارسی شعر وادب کی سرپرستی شروع کی اور اپنے دربار میں شعرائے عجم کو جگہ دی جن میں عباس مروزی بہت مشہور ہوا۔ عباس نے پہلی بار دربارِ خلافت میں فارسی قصیدہ گوئی کی داغ بیل رکھی ورنہ اس سے پہلے عجمی شعراء بھی فقط عربی کلام پیش کیا کرتے تھے۔ ②

بغداد کے قاضی محمد بن عمر واقدی (۱۳۰ھ۔۲۰۷ھ) نے اسلامی تاریخ کے مختلف مراحل اور خاص واقعات کے بارے میں روایات کے مجموعے تیار کیے، جن سے بعد میں تمام مؤرخین نے استفادہ کیا۔ ③

فلسفیانہ علوم کے فوائد:

مامون نے علوم وفنون کے تراجم کا جو سلسلہ شروع کرایا، اس میں شک نہیں کہ اس سے عالمِ اسلام میں حکمت کے مختلف شعبوں کو ترقی ملی۔ انہی کتب سے طب، ریاضی، طبعیات، کیمیا، فنِ تعمیر اور فلکیات کے میدانوں کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم ہوئی۔ مسلم حکماء نے ان علوم کو تقلیداً نہیں لیا بلکہ پوری تحقیق کے ساتھ ان پر کام کیا۔ انہوں نے تصوراتی اور تخیلاتی فلسفے کی جگہ عملی رجحانات کو عام کیا اور ''تھیوری'' کو ''پریکٹیکل'' کے ذریعے جانچنے کی بنیاد ڈالی۔ یوں انہوں نے جدید اضافوں کے ذریعے ان فنون کو اوجِ کمال پر پہنچا دیا۔ قاضی ابن صاعد اندلسی لکھتے ہیں:

''مامون کے دور میں اہلِ علم وفن نے کتبِ فلاسفہ پر عبور حاصل کیا اور اپنے بعد والوں کے لیے علمِ طب کا منہج اور اس کے اصول مقرر کر دیے۔ یہاں تک کہ خلافتِ عباسیہ رومی سلطنت کے دورِ عروج کے ہم مثل ہوگئی۔'' ④

فلسفیانہ علوم کا ضرر:

مگر یونانی علوم کا ایک بڑا حصہ خالص فلسفیانہ مباحث اور عقلی موشگافیوں پر مشتمل تھا۔ ان ابحاث میں پڑنے سے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ بعض اہلِ علم نے قرآن وسنت سے ثابت شدہ خالص اعتقادی مسائل کو عقلیات کی کسوٹی پر

① وفیات الاعیان: ۱۷۷/۶، ۱۷۸، تر: ابوزکریا الفراء ..... المعانی ''معانی القرآن'' کے نام سے تین جلدوں میں ''دارالمصریہ، مصر'' سے طبع ہو چکی ہے۔

② المامون از شبلی نعمانی، ص ۱۳۱، ۱۳۲ بحوالہ تذکرہ مجمع الفصحاء: تحت عباس مروزی

③ یہ روایات واقدی کے ضعف کی وجہ سے سنداً کمزور ہیں اور ان میں بعض روایات میں صحابہ سے متعلق غیر محتاط مواد بھی ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ مامون کے دربار میں تشیع کا اثر واضح تھا۔ پھر واقدی پر برامکہ کی خاص نظرِ کرم تھی جن کا میلان تشیع کی طرف تھا۔ واقدی نے اپنا حال خود بتایا ہے کہ میں مدینہ میں کپڑے سلائی کرنے کا کام کرتا تھا۔ ایک روایت کے مطابق گندم فروش تھا۔ لوگوں کا ایک ہزار کا مقروض تھا۔ ادائیگی کی کوئی صورت نہ نکلی تو بغداد آگیا۔ یحییٰ برمکی نے خطیر رقم عطیہ دے دی۔ میں نے مدینا کر قرض ادا کیا اور پھر واپس بغداد پہنچ کر مستقل طور پر برامکہ کے درِ دولت سے وابستہ ہوگیا۔ ﴿مرآۃ الجنان: ۱/ ۴۲۸؛ الاعلام زرکلی: ۶/ ۳۱۱﴾
مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ بنو عباس نے محض ایک درزی یا گندم فروش کو بغداد کا قاضی بنا دیا تھا۔ اس دور کے بہت سے اہلِ علم کوئی نہ کوئی ہنر سیکھ کر کسبِ حلال کیا کرتے تھے۔ واقدی کی روایات سے امام شافعی اور امام طحاوی جیسے علماء نے اصول وشرائط کے تحت استفادہ کیا ہے۔ واقدی کی روایات کی حیثیت پر ہم حصہ دوئم کے آغاز میں ''ہماری تاریخ۔ مطالعہ اور تحقیق کے اصول'' کے تحت متن اور حاشیے میں بحث کر چکے ہیں۔ اسے دیکھ لیا جائے۔

④ طبقات الامم، ص ۴۸، ۴۹

پرکھنے کی کوشش شروع کردی اور جہاں کوئی اعتقادی مسئلہ انہیں اس معیار پر پورا اترتا نہ دکھائی دیا، انہوں نے اس کا انکار کردیا یا اس کی ایسی تاویل شروع کردی جو اسلاف سے منقول نہیں۔ ایسے اہلِ علم مامون کے دربار میں موجود تھے اور مامون ان سے ہر قسم کے مسائل میں کھلی بحثیں کیا کرتا تھا۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ منگل کا دن مامون کے محل میں مباحثے کے لیے خاص تھا۔ ایک خاص ایوان ''دارالمناظرہ'' کے نام سے تھا جہاں لوگ جمع ہوتے۔ مشروبات اور پھلوں سے تواضع کی جاتی۔ درباری، علماء اور ہر مذہب وملت کے دانشور مختلف متنازعہ مسائل کو لے کر بحث کرتے۔ خلیفہ خود مباحثے میں شریک ہوتا۔ ہر ایک کو پوری بے تکلفی سے اظہار رائے کی آزادی تھی۔ صبح سے لے کر ظہر تک یہ مجلس چلتی۔ ظہر سے پہلے انواع واقسام کے پکوان لائے جاتے۔ بھرپور ضیافت سے لطف اندوز ہونے کے بعد حاضرین رخصت ہوتے۔[1]

ان کھلے مباحثوں میں بعض اوقات کچھ ایسی چیزیں پیش ہوتیں جو طرزِ اسلاف سے ہٹ کر تھیں۔ مامون ان سے متاثر ہو جاتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بعض اعتقادات میں وہ بھی اسلاف کے طرز سے ہٹ کر کج فکری کا شکار ہوگیا۔ اسے اعتزال کی طرف مائل کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ بشر بن غیاث مَرِیسی نامی ایک معتزلی مناظر کا تھا۔ یہ صاحب کوفہ کے ایک یہودی کے بیٹے تھے۔ چوٹی کے علمائے اہلِ سنت سے علم حاصل کیا اور پھر عقلی علوم اور اعتقادی مباحثوں میں پڑ گئے۔ نئی نئی آراء پیش کیں اور لوگوں کو فتنے میں مبتلا کرنے لگے۔ ان کا کہنا تھا کہ سورج اور چاند کو سجدہ کرنا کفر نہیں، علامتِ کفر ہے۔ مامون نے انہیں اتنی عزت دی کہ اپنا شیخ مان لیا۔ اس کے علاوہ معتزلہ کی جماعت بھی مامون کے گرد جمع تھی جس میں قاضی احمد بن ابی دُواد، عبداللہ بن طاہر اور اسحٰق بن ابراہیم پیش پیش تھے۔ اسحٰق بن ابراہیم پر مامون کا اعتماد اتنا بڑھا کہ آخر میں اسی کو بغداد کا حاکم مقرر کر دیا تھا۔[2]

ابوصاعد اندلسی صاحب طبقات الامم لکھتے ہیں:

> ''مامون نے شاہانِ روم سے حکمائے یونان کی کتب کی فرمائش کی، انہوں نے افلاطون، ارسطو، بقراط، جالینوس، اقلیدس اور بطلیموس وغیرہ کی کتب ہدیہ کردیں۔ مامون نے بڑے اہتمام سے ان کے تراجم کرائے اور لوگوں کو ان کے مطالعے پر ابھارا اور ان کا علم حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ اس کے زمانے میں ان کتب کا رواج عام ہوگیا اور فلسفے کو عروج ہوا۔ مامون کی قدردانی کی بدولت ذہین اور قابل نوجوانوں اور اہلِ علم ودانش نے ان فنون میں مہارت حاصل کی؛ کیوں کہ مامون ایسے لوگوں کو خلوت میں بلاتا تھا اور ان سے علمی بحثیں کرتا تھا۔''[3]

یہ یونانی فلسفہ جس کے بانی افلاطون اور ارسطو تھے، درحقیقت ایک گمراہی کا گورکھ دھندا تھا جس پر یورپ کے کم نظر

---

[1] مروج الذهب: ٤/ ٣١٤، باب خلافة المامون، ط جامعة اللبنانية
[2] البداية والنهاية: ١٤/ ٢١٧، ٢٢٧، ٢٣٤
[3] طبقات الامم، ص ٤٨

علماء فریفتہ رہے تھے۔ اگرچہ اس فلسفے میں طبعیات اور معاشرت و سیاست سے متعلق بہت سی مفید باتیں بھی موجود تھیں مگر اس کا وہ حصہ جو الٰہیات پر مبنی تھا، شیطانی وساوس اور ذہنی اوہام کے سوا کچھ نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ خالقِ کائنات کے بارے میں ناچیز مخلوق اپنی مجرد عقل سے جو اندازے لگائے گی وہ ناقص ہی ہوں گے۔ اگر ان ناقص اندازوں کو "یقینی علوم" کا مقام دے دیا جائے تو اس سے بڑی گمراہی کیا ہو سکتی ہے۔ خالق اور اس کے غیبی نظام کے بارے میں صحیح علم وہی ہو سکتا ہے جو اسی کی جانب سے عطا ہوا ہو۔ یہ علم مسلمانوں کے پاس قرآن و حدیث کی شکل میں موجود تھا؛ اس لیے مسلمانوں کو فلسفیانہ الٰہیات کی طرف متوجہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی مگر جب کتبِ فلاسفہ عربی اور فارسی میں منتقل ہوئیں تو دیکھتے ہی دیکھتے مسلمان اہل علم کا ایک بڑا طبقہ یونانی فلسفے سے متاثر نظر آنے لگا۔

یہ وہ لوگ تھے جو پہلے ہی عقلیت پسند اور ہر نئی آواز سے متاثر ہونے کے عادی تھے۔ وہ اسلاف کی پیروی کی بجائے خودرائی کے مریض تھے۔ ان کے علم میں وسعت ضرور تھی مگر گہرائی کی کمی تھی۔ ایسے علماء نے فلسفے کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ دین کے محکم عقائد کو بھی عقل کی بنیادوں پر ناپنا، تولنا اور ثابت کرنا شروع کر دیا اور رویتِ باری، استواء علی العرش، کلام الٰہی اور تقدیر جیسے نازک مسائل تک کو عقلیات کی زد میں لے لیا۔ یہی گروہ "معتزلہ" کے نام سے مشہور ہوا۔

مامون کج فکری کا شکار کیسے ہوا؟

چونکہ خلیفہ مامون الرشید خود فلسفے سے متاثر ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اسے دین کی دعوت کو عام کرنے کا شغف بھی تھا؛ اس لیے اس نے معتزلی گروہ کی بھرپور سرپرستی کی؛ کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ دین کو عام کرنے کے لیے یہی اسلوب بہتر ہے اور یہی تعبیرات ہر قوم کے نزدیک قابل قبول ہو سکتی ہیں۔

مامون کی سرپرستی کی وجہ سے جلد ہی معتزلہ دربارِ خلافت میں ایک مؤثر قوت بن گئے۔ مامون کے جانشین معتصم کے دور میں نامور معتزلی عالم قاضی احمد بن ابی دُواد بغداد کے قاضی القضاۃ ہو گئے۔ انہوں نے عقیدۂ خلقِ قرآن (یعنی کلام اللہ مخلوق ہے) کو اپنے گروہ کا شعار بنا لیا اور اس کی مخالفت کرنے والوں پر سختی کی انتہاء کر دی۔ راسخ العقیدہ علماء جو عقل کی جگہ قرآن و حدیث پر اعتماد کرتے تھے، اس دور میں حکومت کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بنے۔[1]

اعلیٰ عہدوں پر معتزلہ کی اجارہ داری کی وجہ سے عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ معتزلی ذہن کے لوگ زیادہ زیرک، معاملہ فہم اور حقائق شناس ہوتے ہیں اور ان کی تحقیقات غیر جانبدارانہ اور زیادہ قابل اعتماد ہوتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں فقہاء و محدثین کو قدامت پسند، دورِ حاضر کے تقاضوں سے نابلد اور زمانے کے اسلوبِ بیان سے جاہل باور کیا جانے لگا۔

مامون کا اعتقادی گمراہیوں کا شکار ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ علم کی وسعت اور عقل کی تیزی کے ساتھ اگر

[1] سیر اعلام النبلاء: ۱۱/۱۶۹ تا ۱۷۱؛ الاعلام زرکلی: ۱/۱۲۴

اسلاف پر اعتماد نہ ہو تو کوئی بھی انسان دور دراز کی گمراہی کا شکار ہو سکتا ہے۔

مامون کا اعتقادی انحراف دو حصوں میں بٹا ہوا تھا: ایک تشیع۔ دوسرا اعتزال۔ تشیع کی طرف میلان کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ وہ ماں کی طرف سے فارسی تھا اور اہلِ فارس شروع سے تشیع کی طرف میلان رکھتے تھے۔ پھر فضل بن سہل جیسا شیعہ اس کا خادم خاص تھا جو بعد میں اس کا وزیر بنا۔ وہ مامون کے دل و دماغ پر جس قدر بھی حاوی ہوتا، کم تھا۔

اعتزال کی طرف میلان کی داغ بیل خاندانِ برامکہ کے اثرات کی وجہ سے پڑی جو شہزادوں پر پوری طرح اثر انداز تھے۔ یہ لوگ حکمت اور فنون کے ماہر اور عقلیت پسند تھے۔ ایسے لوگوں کی صحبت نے مامون کو بھی لڑکپن سے عقلیت پسند بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر مذہب اور فرقے کے دانش وروں کو ساتھ رکھنے لگا۔ اس کے دربار میں یہودی، عیسائی، ہندو اور مجوسی سبھی شامل تھے۔ پھر جب اسے فلسفے اور حکمتِ یونان و مجوس کی کتب ملیں تو وہ ان کا دیوانہ ہو گیا۔ عقلیات کی گرم بازاری سے قرآن و حدیث کی اہمیت پس منظر میں چلی گئی اور نصوص شرعیہ میں من مانی عقلی تاویلات کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھل گیا۔ یوں ''فرقہ معتزلہ'' کو غیر معمولی تقویت ملی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ مامون کے ذہن اور حکومت کے سیاہ و سفید پر چھا گئے۔

اس کے بعد اگر مامون میں اہل سنت کا کوئی اثر رہ گیا تھا تو بس وہ اس کے باپ دادا کی نشانی یا ان محدثین کی برکت تھی جس سے وہ کبھی فیض یاب ہوا۔ مگر فطری بات ہے کہ صحبتِ ثانی اگر برعکس ہو، تو وہ صحبتِ اول کا اثر بڑی حد تک زائل کر دیتی ہے۔ مامون قرآن و حدیث کا حافظ پہلے بنا اور فلسفے کا طالب علم بعد میں۔ یہ دوسری شے اسلامی علوم پر غالب آگئی اور اس نے قرآن و سنت کو بھی عقلیات کا تابع بنا دیا۔ اگر کوئی طے شدہ اسلامی مسئلہ بھی اس کی عقل میں نہ آتا تو وہ اسے جھٹلا دیتا۔ مذہبی معاملات میں مامون کی طبیعت کا اندازہ دو واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔

۲۱۶ھ میں اس نے پوری مملکت میں حکم جاری کیا کہ ہر نماز کا سلام پھیرنے کے بعد لوگ کھڑے ہو کر تین بار نعرۂ تکبیر بلند کیا کریں۔ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ مامون نے یہ بدعت کس دلیل سے متاثر ہو کر شروع کی مگر علماء کا کہنا تھا کہ غالباً وہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث کو دیکھ کر غلط فہمی میں پڑ گیا تھا جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں نماز کے بعد آواز سے ذکر اللہ ہوتا تھا۔[1]

یہ حدیث پہلے بھی علماء کے سامنے تھی مگر کسی نے اس کا یہ مطلب نہیں سمجھا بلکہ ائمہ اربعہ سمیت تمام علمائے امت دیگر احادیث کو دیکھ کر کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا دائمی عمل نماز کے بعد زیرِ لب ذکر و دعا کا تھا۔ کبھی کبھی آپ ﷺ اُمت کو یہ بتانے کے لیے کہ کیا کیا اذکار مسنون ہیں، آواز سے بھی وظائف پڑھ لیتے تھے۔ مگر مامون ایک حدیث کو دیکھ کر باقی سب کچھ بھول گیا اور ذکر کا مطلب بھی اس نے جہری تکبیر لیا اور اسے سرکاری طور پر نافذ کر دیا۔[2]

---

① ان ابن عباس رضی اللّٰہ عنہ اخبرہ ان رفع الصوت بالذکر حین ینصرف الناس من المکتوبۃ کان علی عھد النبی ﷺ۔ (صحیح البخاری، ح: ۸۴۱، کتاب الاذان، باب الذکر بعد الصلوۃ)

② البدایۃ والنھایۃ: ۲۰۱/۱۴

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک بار شیعہ علماء سے متاثر ہو کر اس نے منادی کرادی کہ متعہ جائز ہے۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول پر سخت برافروختہ تھا کہ ''دو متعے رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں حلال تھے، میں انہیں حرام کرتا ہوں۔'' وہ برملا کہتا تھا: ''جسے رسول اللہ ﷺ حلال کریں، عمر کون ہے کہ اسے حرام کرے۔''

کسی کو ہمت نہیں تھی کہ مامون کی اس بد دماغی کے آگے کلمۂ حق کہتا۔ ایسے میں دربار کے مشہور عالم قاضی یحییٰ بن اکثم رحمہ اللہ (۱۵۹ھ۔۲۴۲ھ) آگئے۔ انہیں یہ حکم معلوم ہو چکا تھا۔ کہنے لگے: ''اسلام میں ایک رخنہ پڑ گیا ہے۔''

مامون نے پوچھا: ''وہ کیا؟'' بولے: ''زنا حلال کر دیا گیا ہے۔''

مامون نے پوچھا: ''بھلا وہ کیسے؟'' قاضی صاحب کہنے لگے: ''متعہ زنا ہی تو ہے؟''

مامون نے کہا: ''اس کی دلیل؟'' قاضی صاحب رحمہ اللہ نے آیت پڑھ دی:

''وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حٰفِظُونَ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُونَ'' ①

پھر پوچھا: ''جس عورت سے متعہ کیا جاتا ہے، وہ کنیز ہے؟'' مامون نے کہا: ''نہیں۔''

قاضی صاحب رحمہ اللہ نے پوچھا: ''کیا وہ شرعاً بیوی ہے اور اسے میراث میں حصہ ملتا ہے؟''

مامون نے پھر نفی میں جواب دیا۔ قاضی صاحب رحمہ اللہ نے کہا:

''تو پھر ان کے علاوہ تسکینِ شہوت کے لیے کوئی اور راستہ تلاش کرے وہ حد سے گزرنے والا ہی ہوا۔''

اس کے بعد انہوں نے متعہ کی حرمت پر صحیح حدیث پڑھ کر سنائی جو امام زہری رحمہ اللہ نے محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کے صاحبزادوں عبداللہ اور حسن سے اور انہوں نے اپنے والد (محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ) سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے خیبر کے دن منادی کا حکم دیا کہ متعہ حرام کر دیا گیا ہے۔

مامون حیران ہو کر علماء سے پوچھنے لگا: ''کیا یہ حدیث صحیح ہے؟''

سب نے تصدیق کی تو مامون استغفار پڑھنے لگا اور متعہ کے جواز کا سرکاری حکم واپس لے لیا۔ ②

① ترجمہ: اور یہ وہ لوگ ہیں جو کہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں سوائے اپنی بیویوں کے...... یا جو ان کی کنیزیں ہیں ...... اس معاملے میں ان پر کوئی ملامت نہیں تو جو کوئی بھی اس کے علاوہ کوئی اور راہ تلاش کرے گا پس وہی لوگ حد سے گزرنے والے ہیں۔ ﴿المومنون، آیت: ۵، ۶، ۷﴾

② وفیات الاعیان: ۶/۱۵۰ ترجمہ: یحییٰ بن اکثم۔ مذکورہ حدیث درج ذیل ہے: عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ، وَالْحَسَنِ، ابْنَيْ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ، عَنْ أَبِيهِمَا، عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ نَهَى عَنْ مُتْعَةِ النِّسَاءِ يَوْمَ خَيْبَرَ، وَعَنْ أَكْلِ لُحُومِ الْحُمُرِ الْإِنْسِيَّةِ. (صحیح البخاری، ح: ۴۲۱۶) یہی الفاظ امام مسلم نے نقل کیے ہیں۔ (صحیح مسلم، ح: ۳۴۹۷)

امام ترمذی نے اس روایت کے بعد رجال پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ، وَالْحَسَنِ، ابْنَيْ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ، عَنْ أَبِيهِمَا، عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ مُتْعَةِ النِّسَاءِ زَمَنَ خَيْبَرَ، وَعَنْ لُحُومِ الْحُمُرِ الْأَهْلِيَّةِ حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ الْمَخْزُومِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ، وَالْحَسَنِ هُمَا ابْنَا مُحَمَّدِ ابْنِ الْحَنَفِيَّةِ وَعَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدٍ يُكْنَى أَبَا هَاشِمٍ قَالَ الزُّهْرِيُّ: وَكَانَ أَرْضَاهُمَا الْحَسَنُ بْنُ مُحَمَّدٍ فَذَكَرَ نَحْوَهُ، وَقَالَ غَيْرُ سَعِيدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ: عَنِ ابْنِ عُيَيْنَةَ، وَكَانَ أَرْضَاهُمَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدٍ: هٰذَا حَدِيثٌ صَحِيحٌ. (ح: ۱۷۹٤)

ان واقعات سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ مامون درحقیقت رافضی نہ تھا۔ وہ ایک جدت پسند اور آزاد خیال مسلمان تھا جسے جو بات سمجھ آجاتی، اسے مان لیتا تھا۔ بعض اوقات وہ بات صحیح ہوتی اور بعض اوقات بالکل غلط۔

مامون کی شروع کردہ بدعات:

تشیع اور عقلیت پسندی کے اسی رجحان کی وجہ سے ۲۱۱ھ میں مامون سے اس شر کا ظہور ہوا جس نے اس کی ساری خوبیوں پر پانی پھیر دیا۔ ۲۱۱ھ میں اس نے اہلِ تشیع کے بعض عقائد کا پرچار شروع کیا اور یہ فرمان جاری کیا:

''حضور ﷺ کے بعد مخلوق میں سب سے افضل ہستی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ذکرِ خیر کرنے سے برأت ظاہر کی جائے۔''[1]

اگلے سال اس نے عقیدۂ خلق قرآن کی تشہیر بھی شروع کر دی، یعنی قرآن مجید اللہ کی مخلوق ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مامون نے دو خطرناک بدعات شروع کیں جو ایک دوسرے سے بڑھ کر تھیں: ایک قرآن مجید کو مخلوق کہنا۔ دوسرے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کے بعد تمام انسانوں سے افضل کہنا۔ ان دونوں مسائل میں اس نے شدید غلطی کی اور گناہِ عظیم کا مرتکب ہوا۔''[2]

یہ تو ظاہر ہے کہ مامون رافضی نہ تھا یعنی صحابہ پر تبرا بازی کا قائل نہیں تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر بھی تنقید نہیں کرتا تھا۔ بس یہ کہتا تھا کہ ان کا ذکرِ خیر کرنے کی ضرورت نہیں۔ باقی صحابہ کے بارے میں اس کا عقیدہ اس کے اپنے درج ذیل اشعار سے ظاہر ہے:

اَصْبَحَ دِیْنِی الَّذِی اَدِیْنُ بِهِ ۔۔۔ وَلَسْتُ مِنْهُ الْغَدَاةَ مُعْتَذِرًا

میرا دین جس پر میں کاربند ہو چکا ہوں...... اور جس پر میں کل معذرت نہیں کروں گا۔

حُبُّ عَلِیٍّ بَعْدَ النَّبِیِّ وَلَا ۔۔۔ اَشْتِمُ صِدِّیْقًا وَلَا عُمَرَا

یہ ہے کہ نبی کے بعد علی رضی اللہ عنہ سے محبت ہو...... اور میں صدیق و عمر رضی اللہ عنہما کو برا بھلا نہیں کہتا

ثُمَّ ابْنُ عَفَّانَ فِی الْجِنَانِ مَعَ ۔۔۔ الْاَبْرَارِ ذَاكَ الْقَتِیْلُ مُصْطَبِرًا

عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ صالحین کے ساتھ جنت میں ہیں، وہ صبر کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

لَا وَلَا اَشْتِمُ الزُّبَیْرَ وَلَا ۔۔۔ طَلْحَةَ اِنْ قَالَ قَائِلٌ غَدَرَا

میں زبیر اور طلحہ رضی اللہ عنہما کو بھی برا بھلا نہیں کہتا، چاہے کوئی کہے کہ دونوں نے غداری کی۔

وَعَائِشَةُ اُمٌّ لَسْتُ اَشْتِمُهَا ۔۔۔ مَنْ یَفْتَرِیْهَا فَنَحْنُ مِنْهُ بُرَا

عائشہ رضی اللہ عنہا ام المؤمنین ہیں، میں انہیں ملامت نہیں کرتا۔ جو ان پر الزام لگائے، ہم اس سے بری الذمہ ہیں۔[3]

---

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۲۷ [2] البدایة والنهایة: ۱۸۶/۱۴ [3] البدایة والنهایة: ۲۲۲/۱۴

غرض مامون نے اپنے طور پر ایک محتاط قسم کا تشیع اختیار کیا تھا تاکہ اہل سنت بھی ناراض نہ ہوں اور اہلِ تشیع بھی حامی رہیں۔ اگرچہ اعتقادی مسائل میں اتنا انحراف بھی بہت بڑی گمراہی تھی؛ اسی لیے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے مامون کے مذکورہ عقیدے کا ذکر کر کے کہا ہے کہ مامون نے یہ عقیدہ اختیار کر کے تمام صحابہ حتیٰ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بھی مخالفت کردی جو فرماتے تھے کہ جو مجھے ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت دے گا میں اسے کوڑوں کی سزا دوں گا۔ ①

خلقِ قرآن کے مسئلے میں مامون کا تشدد:

تاہم مامون نے تشیع پر مبنی عقیدوں کو عوام پر جبراً تھوپنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے برعکس خلقِ قرآن کے مسئلے میں اس نے اس قدر تشدد اختیار کیا کہ حیرت ہوتی ہے۔ عام حالات میں وہ دلیل کی بات مانتا تھا، مگر یہاں وہ اپنی رائے سے اتفاق نہ کرنے والوں کے لیے شعلۂ جوالا بن گیا۔

قاضی یحییٰ بن اکثم رحمہ اللہ اس کے مقرب تھے، اور اس نے متعہ کے مسئلے میں ان کی دلیل سن کر اپنی رائے بدل لی تھی مگر خلقِ قرآن کے مسئلے میں ان کی ایک نہ سنی بلکہ ان سے بالکل بددل ہوگیا اور تعلق ختم کردیا۔ ②

اس نے بغداد کے سارے قاضیوں کو جمع کر کے اپنا مسلک سنایا اور کہا:

''جو اس سے اختلاف کرے اس کی گواہی قبول نہیں ہوگی۔ وہ عدالتی وسرکاری خدمات کا اہل نہیں رہے گا۔''

پھر اس نے بڑے بڑے علماء کو جمع کیا اور اپنے عقیدے کی ہم نوائی چاہی۔ اِکا دُکا معتزلی علماء کے سوا کوئی اس عقیدے کا قائل نہ تھا مگر مامون کی انتہاء پسندانہ کیفیت دیکھ کر کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ دوٹوک تردید کرتا۔

خلقِ قرآن کے مسئلے میں مامون کا تشدد روز بروز بڑھتا گیا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ علمائے حق کے لیے کوڑوں کی مار، قید وبند کے مصائب اور سولی تک بھی نوبت پہنچ جاتی مگر مغرب سے رومیوں کے حملوں نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ ③

رومیوں سے جہاد:

مامون الرشید کی تخت نشینی کے وقت قیصر الیون برسرِ اقتدار تھا، ساڑھے سات سال کی حکومت کے بعد وہ ایک بغاوت میں مارا گیا اور اس کی جگہ سابق قیصر میخائیل کو جو معزولی کے بعد راہبانہ زندگی گزار رہا تھا، دوبارہ حکومت مل گئی۔ قیصر میخائیل ایک صلح پسند انسان تھا؛ لہٰذا اس نے دولتِ عباسیہ کے ساتھ اچھے تعلقات رکھے مگر جب ۲۱۴ھ میں اس کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے قیصر توفیل نے تخت نشین ہوتے ہی اعلانِ جنگ کردیا اور شام کے ساحلی علاقوں پر حملے شروع کردیے۔ مقامی گورنر حتی الامکان سرحدوں کا دفاع کرتے رہے مگر خطرہ بڑھتا چلا گیا۔

آخر کار مامون الرشید ۲۷ محرم ۲۱۵ھ کو بہت بڑی فوج لے کر سرحدوں کے دفاع کے لیے بغداد سے نکلا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اب اسے پایۂ تخت کی طرف واپسی نصیب نہیں ہوگی۔ وہ موصل سے ہوتا ہوا تین ماہ کے سفر کے بعد

① البدایة والنهایة: ۲۲۲/۱٤　③ البدایة والنهایة: ۲۳۱/۱٤

② تاریخ الطبری: ۶۳۱/۸ تا ۶٤۲

جمادی الاولیٰ میں شام کے ساحل طرطوس پہنچ گیا جہاں رومی حملے کر رہے تھے۔انہیں پسپا کر کے مامون انطاکیہ اور پھر ایشیائے کوچک کے رومی شہروں: مَصِیصَہ اور مَلَطْیَہ تک گیا۔رومیوں نے دب کر صلح کر لی۔مامون احتیاطاً واپس بغداد نہ گیا بلکہ دِمشق میں ٹھہر کر حالات دیکھتا رہا۔

اس کی توقع کے عین مطابق رومیوں نے بدعہدی کر کے دوبارہ ساحل پر حملہ کیا اور طرطوس میں ۱۶۰۰ مسلمان تہ تیغ کر ڈالے۔یہ ۲۱۶ھ کا واقعہ ہے۔مامون نے خبر سنتے ہی جوابی حملہ کیا۔ایک جانب سے اس نے خود فوج کشی کی اور ایشیائے کوچک میں گھس گیا۔دوسری طرف سے ایک اور جرنیل کو روانہ کیا جس نے طوانہ کی بہت سی بستیاں فتح کر لیں۔تیسری طرف سے مامون کا بھائی ابو اسحٰق معتصم بڑھا اور رومیوں کے تیس قلعے فتح کر ڈالے۔[1]

زبیدہ خاتون کا انتقال۔زبیدہ کی سیرت و کردار۔نہرِ زبیدہ:

مامون ابھی ان مہمات میں مصروف تھا کہ جمادی الاولیٰ ۲۱۶ھ میں اس کی سوتیلی ماں زبیدہ خاتون بغداد میں وفات پا گئی۔امین کے قتل اور مامون کی بغداد میں تخت نشینی کے بعد وہ اس کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آتی رہی۔ کہتی تھی: ''اگر ایک بیٹا کھویا ہے تو دوسرا پا لیا ہے۔''

وہ خلیفہ منصور کے بیٹے جعفر کی نورِ چشم تھی۔اصل نام اَمَۃُ العزیز تھا۔بچپن میں دادا اس کے ساتھ کھیلتا اور ''زبیدہ زبیدہ'' کہتا۔یہی نام مشہور ہو گیا۔ہارون الرشید نے اس سے ۱۶۵ھ میں نکاح کیا تھا۔ایسی چہیتی ملکہ تھی کہ ہارون نے عمر بھر اس کے سوا کسی اور سے نکاح نہ کیا۔نہایت عالی نسب اور متقی خاتون تھی۔اس کی سو باندیاں تھیں جو سب کی سب قرآن مجید کی حافظات تھیں۔ان کا کام مسلسل تلاوت کرنا تھا۔زنانہ محل میں ان کی ہلکی ہلکی صدائے تلاوت ہر وقت سنائی دیتی تھی۔[2]

زبیدہ خاتون کا وہ کارنامہ جس نے اسے تاریخ میں زندہ وجاوید بنا دیا،نہرِ زبیدہ ہے۔زمانۂ قدیم سے مکہ میں پانی کی بڑی قلت تھی۔خاص کر حج کے دوران حاجیوں کو پانی کے لیے بڑی مشکل پیش آتی تھی۔کبھی ایسا بھی ہوتا کہ پانی کا ایک مٹکا ایک ایک دینار میں فروخت ہونے لگتا۔۱۸۶ھ میں زبیدہ خاتون حج کے لیے گئی تو اپنی آنکھوں سے لوگوں کی یہ پریشانی دیکھ کر بڑی فکر مند ہوئی۔اس نے ماہرینِ تعمیرات کو بلوایا اور کہا کہ کسی بھی طرح مکہ والوں کے لیے پانی کا بندوبست کرو اور ان کے لیے پانی کے چشمے تلاش کرو۔

انہوں نے کافی تگ ودو کے بعد ایک چشمہ طائف کے قریب وادیٔ حنین کے کوہِ طاد میں اور دوسرا کوہِ قرا میں تلاش کیا جس کا پانی وادی نعمان کو سیراب کرتا تھا۔مگر ان چشموں کا پانی مکہ تک پہنچانا تقریباً ناممکن تھا۔راستے میں پہاڑ اور چٹیل علاقے تھے جہاں کھدائی بہت ہی دشوار تھی۔پھر آگے مکہ تک صحرائی علاقہ تھا جہاں پانی زمین میں جذب ہو جانے کا خطرہ تھا؛اس لیے ماہرین نے جائزہ لینے کے بعد کہا:اس پر بے پناہ لاگت آئے گی۔''

---

[1] البداية والنهاية:سنة ٢١٥هـ، ٢١٦هـ ؛ العبر في خبر من غبر: ٢٥٩/١ تا ٢٧٠

[2] البداية والنهاية: ٢٠٤/١٤

زبیدہ نے کہا: ”اگر کدال کی ہر ضرب کے بدلے ایک اشرفی دینی پڑے تو میں دینے کو تیار ہوں۔“
آخر کام شروع ہوا۔ سب سے مشکل کام زمین کی کھدائی تھا۔ ہزاروں مزدور اس میں جت گئے۔ نہر کی تہہ اور کنارے نہایت پختہ بنائے گئے اور ان میں ایسا مصالحہ لگایا گیا کہ پانی رس کر ریتلی زمین میں جذب نہ ہو۔ نہر کو اوپر سے ڈھانپنے کا انتظام بھی کیا گیا تاکہ پانی ٹھنڈا رہے اور صحرائی آندھیوں سے اڑنے والی ریت نہر میں نہ گرے۔
منیٰ کے جنوبی صحرا میں ایک بہت بڑا کنواں نما تالاب 'بئر زبیدہ' بنایا گیا تاکہ بارش کے دنوں میں پہاڑوں سے بہہ کر آنے والا پانی بھی ضایع نہ ہو۔ اس پانی کو سات کاریزوں (زمین دوز آبی نالیوں) کے ذریعے نہر تک پہنچانے کا انتظام کیا گیا۔ نہر کا پانی میدانِ عرفات میں مسجدِ نمرہ تک، پھر مزدلفہ اور منیٰ تک پہنچایا گیا۔ پھر آگے جا کر ایک چھوٹی نہر شہر مکہ کی طرف لے جائی گئی۔ اس عظیم الشان منصوبے پر سترہ لاکھ دینار خرچ ہوئے تھے۔ وزن کے لحاظ سے یہ پانچ ہزار نو سو پچاس کلوگرام سونا بنتا ہے۔ (آج کل کے لحاظ سے ۴ ارب ۲۵ کروڑ روپے بنیں گے)۔
زبیدہ نے اپنا سارا خزانہ اس کام کے منتظمین کے حوالے کر دیا تھا تاکہ وہ بلا تردد خرچ کرتے رہیں۔ یہ اتنا بڑا سرمایہ تھا کہ کبھی رقم کی کمی نہیں ہوئی۔ کام کی تکمیل کے بعد جب زبیدہ کو حساب کتاب کی دستاویز دی گئی تو وہ دجلہ کے کنارے بیٹھی تھی۔ اس نے پڑھے بغیر دستاویز دریا میں پھینک دی اور بولی:
”حساب کو حساب کے دن کے لیے رہنے دو۔ جو خرچ ہوا سو ہوا۔“
حاجیوں اور اہلِ مکہ کے لیے پانی کی فراوانی ہوئی تو زبیدہ کو وہ دعائیں ملیں کہ شاید و باید۔ اس کا نام نہر المشاش رکھا گیا مگر مسلمان شروع سے آج تک اسے نہرِ زبیدہ ہی کہتے آئے ہیں جو اس نیک خاتون سے عقیدت کا ثبوت ہے۔
زبیدہ کی وفات کے بعد کسی نے اسے خواب میں دیکھا اور پوچھا:
”تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟“
جواب دیا: ”اللہ نے کدال کی اس پہلی ضرب پر ہی میری مغفرت کر دی جو نہر کھودنے کے لیے ماری گئی۔“
آج بھی یہ نہر موجود ہے اور ہنگامی حالات میں اس کا پانی نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوتا ہے۔[1]

مامون کا سفرِ مصر اور باغیوں کی سرکوبی:

روم کی سرحدوں پر جنگ جاری تھی۔ مامون کی مہم جوئی سے دب کر آخر قیصر نے ازراہِ مصلحت معافی مانگی تو مامون نے واپسی اختیار کی۔ دراصل اسے بھی جنگ میں وقفہ چاہیے تھا؛ کیوں کہ مصر میں ایک سردار عبدوس فہری نے بغاوت کر کے عباسیوں کو وہاں سے بے دخل کر دیا تھا۔ ضروری تھا کہ وہاں کی خبر لی جاتی۔
اسی لیے مامون جنگ بندی کے بعد بغداد نہ گیا بلکہ دِمَشق میں کچھ دن ٹھہر کر ۱۴ ذوالحجہ ۲۱۶ھ کو مصر کا رخ کیا۔ وہاں حالات پر قابو پا کر باغی سردار کا سر قلم کرا دیا۔

① وفیات الاعیان: ۳۱۴/۲؛ اعلام زِرِکلی: ۴۲/۳؛ البدایة والنهایة: سنة ۲۱۶ھ

مامون کو باغیوں سے نبرد آزما دیکھ کر رومیوں نے پھر حملہ کر دیا۔ مامون نے ۲۱۷ھ میں مصر سے شام واپس آ کر جوابی کارروائی شروع کی۔ قیصر ''توفیل'' خود مقابلے پر تھا مگر مامون کے مقابلے میں ٹک نہ سکا اور پسپا ہو کر ایک بار پھر صلح کی درخواست کی۔ مامون اس کی بدعہدیوں سے تنگ آ چکا تھا۔ اس نے جواب میں لکھا:

''اب صلح کی صرف ایک صورت ہے۔ تم اسلام قبول کر لو۔''

ساتھ ہی اس نے فیصلہ کیا کہ رومیوں کے خلاف مستقل طور پر ایک بہت بڑی فوج رکھی جائے اور اس کے لیے ایک عظیم الشان چھاؤنی تعمیر کرائی جائے۔ ایشیائے کوچک میں طوانہ کے مقام پر مامون کے بھائی عباس کی نگرانی میں یہ منصوبہ شروع ہوا۔ چھاؤنی کا طول وعرض ایک ایک میل تھا۔ دور دراز کے شہروں سے ان گنت معمار اور مزدور اس کام میں شریک ہوئے۔ فصیل کے اندرونی جانب تین سمتوں میں ایک ایک قلعہ بنایا گیا۔[1]

مسئلہ خلقِ قرآن۔ امام احمد بن حنبل کی گرفتاری

مامون کی رومیوں سے بات چیت جاری تھی۔ وہ ساحلی شہر طرطوس میں مقیم تھا۔ جنگ بندی کے معاملات طے نہیں ہوئے تھے۔ اس دوران اچانک اسے محسوس ہوا کہ جب تک وہ امت مسلمہ سے خلقِ قرآن کا عقیدہ جبراً نہیں منواتا، وہ اپنی دینی ذمہ داری سے سبک دوش نہیں ہو سکتا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے والیٔ بغداد اسحق بن ابراہیم کے نام ایک تفصیلی فرمان بھیجا جس میں عام مسلمانوں خاص کر محدثین کی سخت الفاظ میں مذمت تھی۔ انہیں خلقِ قرآن کا عقیدہ نہ ماننے کی وجہ سے گمراہ اور بدترین لوگ قرار دیا تھا۔ ساتھ ہی والیٔ بغداد کو حکم دیا تھا کہ جو علماء اس عقیدے کو قبول نہ کریں انہیں عہدوں سے معزول کر کے خلیفہ کو اطلاع دی جائے۔

یہ فرمان مامون کی وفات سے چار ماہ پہلے روانہ کیا گیا۔ صوبہ داروں کو اس کی نقول بھیج کر پابند کیا گیا کہ اپنے اپنے صوبوں کے قاضیوں سے ان کا عقیدہ پوچھیں اور جو انکار کرے اسے معزول کر دیا جائے۔

اس کے بعد مامون نے حاکم بغداد کو ایک اور مراسلہ بھیجا جس میں کہا گیا کہ قاضیوں کے علاوہ دیگر مشہور علماء کو بھی جمع کر کے ان کا عقیدہ پوچھا جائے اور ان کے جوابات خلیفہ کو بھیج دیے جائیں۔

اسحق بن ابراہیم نے مشاہیر علماء کو بلوا کر ان سے سوال و جواب کیے۔ کسی نے کہا کہ اس بارے میں خاموشی اختیار کرنا بہتر ہے۔ کسی نے گول مول بات کی۔ کسی نے جان بچانے کے لیے تائید کر دی۔ کسی نے انکار کر دیا۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ بھی انکار کرنے والوں میں شامل تھے۔ ان کا تعلق محدثین وفقہاء کے طبقے سے تھا۔ آپ معتزلہ کی فلسفیانہ تعبیرات سے اظہارِ بیزاری کرتے تھے۔ آپ کا موقف تھا کہ کلام اللہ، رؤیت باری اور اس جیسے مسائل کی صحیح تعبیر وہی ہے جو اسلاف سے چلی آ رہی ہے۔ اسی پر اجمالی ایمان رکھنا ضروری ہے۔ اس سے ہٹ کر

[1] البداية والنهاية: سنة ٢١٧هـ، ٢١٨هـ

فلسفیانہ طرز اختیار کرنا گمراہی کے سوا کچھ نہیں؛ اس لیے ان کا جواب تھا:

''قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اس کے سوا میں کچھ نہیں کہتا۔''

بشر بن الولید رحمہ اللہ نے بھی یہی جواب دیا۔ مامون نے ان کے جوابات پڑھے تو آگ بگولا ہو گیا۔ تائید کرنے والے ایک دو علماء کو چھوڑ کر باقی ایک ایک عالم کو رشوت خور، دنیا پرست، احمق، ریاکار، چور اور جھوٹا کہہ کر کوسا۔ دو علماء: ابراہیم بن مہدی رحمہ اللہ اور بشر بن الولید رحمہ اللہ کے بارے میں لکھا کہ یہ دونوں توبہ نہ کریں تو سر کاٹ کر میرے پاس بھیج دو۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے متعلق لکھا: ''اس کا عقیدہ جہالت کی دلیل ہے۔ اسے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔''

اس کے بعد مامون نے ان علماء کو گرفتار کر کے پابہ زنجیر طرطوس کے محاذ پر اپنے سامنے پیش کرنے کا حکم دیا تاکہ اتمامِ حجت کر کے انھیں کڑی سزا دے۔ اس سختی نے بڑے بڑے علماء کو مرعوب کر دیا۔ اکثر نے بادلِ نخواستہ مامون کی تائید کر دی۔ علمائے بغداد میں سے صرف امام احمد بن حنبل اور محمد بن نوح رحمہما اللہ ثابت قدم رہے۔ مامون کے حکم کے مطابق ان دونوں کو پابہ زنجیر ایک ہی اونٹ پر بٹھا کر شام روانہ کر دیا گیا۔ اس وقت تمام مسلمانوں میں ایک بے چینی پھیلی ہوئی تھی کہ دیکھیں کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اگر یہ دو حضرات بھی جھک جاتے تو پھر امت کا خدا حافظ تھا۔ شہری تو کیا دیہاتی بھی اس عقیدے سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ تھے جو اسلاف سے منقول چلا آ رہا تھا مگر اس صحیح عقیدے کی بقا علماء کی استقامت پر منحصر تھی۔

یہ حضرات رَحبہ پہنچے تو ایک عرب بدو عبداللہ بن عامر آ کر ملا۔ اس نے احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے کہا:

''قوم کے نمائندے بن کر جا رہے ہو۔ کہیں قوم کے لیے منحوس نہ ثابت ہونا۔ آج تم امت کے پیشوا ہو۔ بچتے رہنا کہ کہیں تم نے یہ غلط عقیدہ مان لیا تو باقی لوگ بھی مان لیں گے۔ اگر تمھیں اللہ سے محبت ہے تو اپنی بات پر جمے رہنا کہ تمھارے اور جنت کے درمیان بس قتل ہو جانے کی دیر ہے۔ اور قتل نہ ہوئے تب بھی مرو گے ضرور۔ لیکن اگر ثابت قدم رہ کر جیے تو نیک نامی نصیب ہوگی۔''

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے تھے: ''اس کی بات نے میرے عزم کو مضبوط تر کر دیا کہ میں حکومت کا موقف نہیں مانوں گا۔''

مامون کے پڑاؤ سے ایک دن کی مسافت رہ گئی کہ ایک سرکاری نوکر روتا ہوا امام احمد رحمہ اللہ کے پاس آیا اور بولا:

''مجھے کتنا دکھ ہو رہا ہے کہ مامون ایک بالکل نئی تلوار تیار کیے اور چمڑے کا ایک بالکل نیا فرش بچھائے بیٹھا ہے اور رسول اللہ ﷺ سے رشتے کی قسم کھا کر کہہ رہا ہے کہ اگر آپ نے عقیدہ تبدیل نہ کیا تو وہ اسی تلوار سے آپ کو مار ڈالے گا۔''

امام احمد رحمہ اللہ یہ سن کر بے اختیار گھٹنوں کے بل گر گئے اور آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر مناجات کی:

''یارب! تیری بردباری سے اس فاسق کو اتنا دھوکا ہو رہا ہے کہ وہ تیرے دوستوں کو کوڑوں اور قتل کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ اے اللہ! اگر تیرا کلام مخلوق نہیں تو ہمیں مامون کے شر سے بچا لے۔''

ابھی صبح صادق طلوع نہیں ہوئی تھی کہ مامون کے انتقال کی خبر آ گئی۔ سرکاری افسران نے امام احمد اور محمد بن

نوح رحمہ اللہ کو کشتی میں کچھ دوسرے قیدیوں کے ساتھ واپس بغداد روانہ کر دیا۔ بیڑیاں اسی طرح ان کے پیروں میں بندھی تھیں۔ سفر کی مشقت کی وجہ سے محمد بن نوح رحمہ اللہ راستے میں وفات پا گئے۔ امام احمد رحمہ اللہ رمضان ۲۱۸ھ میں واپس بغداد پہنچے، سفر کے سخت مصائب جھیل کر وہ بیمار پڑ چکے تھے۔ ان کی عمر اس وقت ۵۷ برس تھی۔ انہیں قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ وہاں بھی انہیں دو دو بیڑیاں لگی رہیں۔ اسی حالت میں وہ قیدیوں کو نمازیں پڑھایا کرتے تھے۔[1]

مامون کی موت کیسے ہوئی؟

مامون کی موت کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ ۱۳ جمادی الآخرہ کو اسے تازہ پسندیدہ کھجوریں پیش کی گئیں۔ مامون نے مزے سے نوش کیں، پھر نہر کا ٹھنڈا ٹھار پانی پیا۔ جب محفل برخاست ہوئی تو مامون کو بدن میں حرارت محسوس ہوئی۔ یہ بخار تھا جو بڑھتا چلا گیا۔ آخر کار حالت غیر ہوگئی اور موت کے سائے آنکھوں کے سامنے لہرانے لگے۔

مامون عمر کی ۴۸ بہاریں دیکھ چکا تھا۔ بیٹا عباس ہمراہ تھا، چاہتا تو اسے ولی عہد بنا دیتا۔ وہ ہر لحاظ سے اہل بھی تھا مگر مامون نے ملکی مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے بھائی ابواسحٰق کو جانشین مقرر کر دیا۔ یہی ابواسحٰق، معتصم باللہ کے لقب سے مشہور ہوا۔ مامون نے آخری لمحات میں اسے اللہ سے ڈرنے، رعایا کا خیال رکھنے، کمزوروں سے نرمی برتنے، رفقاء کی لغزشیں معاف کرنے اور علویوں سے حسن سلوک کی وصیت کی۔

عقیدۂ خلقِ قرآن پر اسے آخر تک یقین بالجزم تھا، اور اس بارے میں اس کا تشدد باقی تھا؛ اسی لیے جانشین کو وصیت کرتے ہوئے کہا: ''قرآن کے بارے میں وہی عقیدہ رکھنا جو میرا ہے۔ لوگوں کو اسی کی طرف بلانا۔''

اسے تاکید کی کہ معتزلی عمائد عبداللہ بن طاہر، احمد بن ابی دُواد اور اسحٰق بن ابراہیم کو اپنے قریب رکھے اور قاضی یحییٰ بن اکثم جیسے حضرات کو منہ نہ لگائے۔ ان وصیتوں کے بعد اس پر نزع کا عالم طاری ہوا اور کچھ دیر میں اس کی روح پرواز کر گئی۔ یہ واقعہ ۱۸ رجب ۲۱۸ھ کا ہے۔ مامون نے ساڑھے بیس سال تک حکومت کی تھی۔[2]

مامون کے سیاسی تصورات:

مامون جدّت پسند تھا اور یہ خصلت اس کے سیاسی تصورات میں بھی جھلکتی ہے۔ وہ اکثر و بیشتر سیاسی مخالفین سے نرمی اور درگزر کا قائل تھا مگر نظریۂ ضرورت کے تحت وہ سیاسی اخلاقیات کا دائرہ وسیع کر لیتا تھا۔ اس کے نزدیک حکمرانوں کے لیے ایسی بہت سی چیزیں جائز تھیں جو عام قاعدے اور قانون کے لحاظ سے ناروا اور معیوب شمار ہوتی ہوں؛ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ مامون نے جہاں بہت سے غداروں اور باغیوں کو معاف کیا، وہاں ذوالریاستین جیسے قریبی مصاحب کو اس نے بڑی خاموشی سے مروا دیا۔

مامون کے ان سیاسی نظریات و تصورات پر سب سے زیادہ روشنی خود اسی کے ایک بیان سے پڑتی ہے۔ اس

[1] تاریخ الطبری: سنة ۲۱۸هـ؛ البداية والنهاية: ۱۴/۳۹۷

[2] البداية والنهاية: ۱۴/۲۳۱

نے ایک بار اپنے مصاحب قاضی احمد بن ابی دُواد سے کہا:

''حکمران بعض اوقات اپنے خاص ارکان کے ساتھ جو کچھ کر گزرتا ہے، اس بارے میں عوام ہرگز منصفانہ رائے اختیار نہیں کر سکتے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ وزیر یا نائب السلطنت نے اتنی وفاداری کا مظاہرہ کیا کہ اس کے بوجھ سے حکمران کی گردن کبھی آزاد نہیں ہو سکتی۔ پس وہ بلا تکلف یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ حکمران نے جو کچھ کیا وہ صرف حسد یا بدمزاجی کی وجہ سے کیا، انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ ان ارکان کی بعض حرکات خود اپنے گھر کو ڈھانے کے مترادف تھیں۔ اب حکمران دو مجبوریوں میں گھر جاتا ہے: نہ ہی وہ اس راز کو عوام پر کھول سکتا ہے، نہ ہی اس وزیر یا نائب السلطنت سے درگزر کر سکتا ہے۔ مجبوراً اُسے کوئی ایسا فیصلہ کرنا پڑتا ہے جو بظاہر نہیں کرنا چاہیے۔ حکمران جانتا ہے کہ عوام تو کجا خواص بھی اسے معذور نہیں سمجھیں گے۔ لیکن ضرورت کی حالت میں کسی کی نکتہ چینی کی پروا نہیں کی جاتی۔''[1]

◆◆◆

عہدِ ماموئی پر ایک تبصرہ

قریبی دور کے بعض مؤرخین نے مامون کو خلافتِ اسلامیہ کا مثالی، کامیاب ترین اور جامع الصفات حکمران قرار دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مامون بہت بڑا حکمران تھا اور اس میں بہت سی خوبیاں جمع تھیں مگر اس کا دور سیاسی لحاظ سے زیادہ کامیاب نہیں تھا اور مذہبی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس کا زمانہ مسلمانوں کے لیے سراسر آزمائش تھا۔

خامیاں:

مامون کو ہم ایک نامور حکمران ضرور مانتے ہیں مگر فی الواقع اس کی وجہِ شہرت اس کی علمی وفنی مہارت اور اخلاقی خوبیاں ہیں۔ حکمران بننے سے پہلے اور حکومت کے دوران بھی اس کی توجہ زیادہ تر علمی، فنی وادبی امور پر تھی۔ اپنے دور میں پیش آنے والے سیاسی امور کو اس نے بالغ نظری سے حل نہیں کیا۔

اس نے عراق اور شام فتح کر لینے کے بعد بھی طویل عرصے تک خود بغداد کا رخ نہیں کیا بلکہ خراسان میں قیام پذیر رہا۔ سیاسی اور انتظامی امور اس نے اپنے وزیر فضل بن سہل ذوالریاستین کے سپرد کر رکھے تھے۔ اسی کا بھائی حسن بن سہل عراق اور شام کا نائب تھا۔ یہ دونوں فارسی النسل اور مذہباً شیعہ تھے۔ ان دونوں نے خلافتِ عباسیہ کو اہلِ فارس کے ڈھب پر

[1] البيان والتبيين للجاحظ م ٢٥٥هـ: ٣/٢٤٢.
اگر ایک پہلو سے دیکھا جائے تو مامون کے یہ خیالات حکمران کے لیے قانون سے آزادی کی راہ کھولتے ہیں، مگر ایک دوسرے پہلو سے یہ حکمران کی بعض سیاسی مجبوریوں کی ایک بلیغ تعبیر ہے جو مامون سے پہلے کسی سے منقول نہیں۔ اہل علم غور کریں تو یہ معاملات کچھ اسی قسم کے ہیں جن میں فقہاء ''قضاءً'' اور ''دیانۃً'' کا فرق ملحوظ رکھتے ہیں یعنی اگر اس معاملے کو شواہد اور ثبوتوں کے اعتبار سے عدالت میں لا کر دیکھا بھالا جائے تو کوئی منصف ملزم کو بری نہیں کر سکتا، تاہم شواہد سے قطع نظر کر کے ممکن ہے کہ انسان کی حالت جو اس کے اور اس کے ربّ کے درمیان دائر ہے، اسے مجرم نہ ٹھہراتی ہو۔ پس مخلص اور عادل حکمران کو تو کسی مجبوری میں گنجائش دی جا سکتی ہے۔ رہے جاہل اور ظالم حکام، وہ اس پہلو کو دلیل بنا کر اپنے ظلم، بدعنوانی اور لاقانونیت کو جائز قرار نہیں دے سکتے۔

چلایا۔اس سے ایک طرف عربوں میں حکومت سے بددلی پیدا ہوئی تو دوسری طرف علویوں کے بعض گروہوں کو ایک بار پھر اندرونِ ملک شورش کی ہمت پیدا ہونے لگی۔اس طرح دولتِ عباسیہ ایک طرف عربوں کی ناراضی کا شکار ہوئی تو دوسری طرف علویوں کی بغاوت کی زد میں آئی۔اس کے ساتھ ہی تیسری طرف سے بازنطینی رومی بھی سرحدوں پر حملے کرتے رہے اگرچہ مسلمانوں نے اپنا دفاع کامیابی سے کیا تاہم مامون کی حکومت کے خاتمے تک ان جھڑپوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

درحقیقت مامون حکمران سے زیادہ ایک فلسفی کا سا ذہن رکھتا تھا جو بہت سے معاملات میں زمینی حقائق کو نظر انداز کر دیتا ہے۔یہ اسی سوچ کا ایک کرشمہ تھا کہ وہ علویوں کی شورش ختم کرنے کے لیے انہیں خلافت دینے کے لیے بھی تیار ہو گیا اگرچہ یہ ارادہ عمل میں نہ آسکا اور نہ ہی اس کا نفاذ ہو سکتا تھا؛ کیوں کہ بنو عباس کبھی اس انقلاب کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔

یہ بھی اس کے فلسفیانہ مزاج کا اثر تھا کہ حکمران ہو کر بھی وہ ایک مدت تک اعتقادی مباحث میں الجھا رہا۔کبھی اس نے تشیع میں قدم رکھا، کبھی اعتزال میں۔وہ دنیا کے ذہین ترین لوگوں میں سے ضرور تھا مگر اسلاف پر اعتماد سے محروم اور فقیہانہ بصیرت سے تہی دست تھا۔طبیعت میں بالغ نظری کی جگہ نوجوانوں کی سی عجلت پسندی تھی جو ہر نئی بات کو بڑی جلدی قبول کرتے اور اس کی دعوت دینے لگتے ہیں۔یہ اس کے کردار کا کمزور ترین پہلو تھا جس کی وجہ سے اس نے خلقِ قرآن کے مسئلے میں انتہا پسندانہ کردار ادا کیا اور امت کو ایک بڑے فتنے میں مبتلا کر گیا۔

عجیب ترین بات یہ ہے کہ مامون ایک طرف اس قدر عقلیت پسند تھا کہ شرعی نصوص کو بھی عقلِ ناقص کے ترازو میں تولتا اور پرکھتا تھا۔دوسری طرف وہ اس قدر وہمی تھا کہ نجومیوں کی باتوں پر یقین کرتا تھا۔ہماری تلاش کے مطابق مامون وہ پہلا مسلم حکمران ہے جس نے قدیم عجمی بادشاہوں کی طرح دربار میں نجومی رکھے اور ان کے مشوروں کو قابلِ توجہ سمجھا۔[1]

اسی لیے امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے تھے:

> ''مامون سے پہلے بنو امیہ یا بنو عباس میں کوئی خلیفہ ایسا نہیں گزرا جو اسلاف کے عقیدے پر نہ ہو یہاں تک کہ مامون خلیفہ بنا اور یہ لوگ (اہل تشیع اور معتزلہ) اس کے گرد جمع ہو گئے اور اسے راہِ حق سے باطل کی طرف موڑ دیا۔''[2]

خوبیاں:

ان خامیوں کے باوجود وہ طبعی طور پر نہایت فیاض، رحم دل، بے تکلف اور منصف مزاج آدمی تھا۔عدل کی کھلی کچہری لگاتا جہاں ہر کوئی آکر اپنا دکھ درد بیان کر سکتا تھا۔

ایک بار ایک بڑھیا نے حاضر ہو کر اس کے بیٹے عباس کے ظلم کا شکوہ کیا۔عباس مامون کے سرہانے کھڑا تھا۔مامون نے وزیر احمد بن ابی خالد کو حکم دیا کہ عباس کو فریادی خاتون کے ساتھ کھڑا کر دیا جائے۔خاتون نے فریاد شروع

---

[1] تاریخ مختصر الدول لابن العبری، ص ۱۷۵

[2] [illegible] النہایۃ: ۲۹۶/۱۴

کی کہ عباس نے اس کی زمین پر قبضہ کرلیا ہے۔عباس اپنی صفائی پیش کرنے لگا تو خاتون اونچی آواز سے اپنا موقف بیان کرنے لگی۔عباس کے ادھورے جملے اس کی آواز تلے دب گئے۔احمد بن ابی خالد نے خاتون کو روکنا چاہا تو مامون نے منع کردیا اور کہا: ''چپ رہو۔سچائی نے اس خاتون کو گویائی بخشی ہے اور جھوٹ نے عباس کو گونگ کردیا ہے۔''

یہ کہہ کر حکم دیا کہ عورت کی زمین لوٹائی جائے اور عباس اسے دس ہزار درہم جرمانہ دے۔

ایک باراس نے اپنے ایک امیر کو خط میں لکھا: ''یہ کوئی مروت کی بات نہیں کہ تم سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا نوش کرو جبکہ تمہارے مقروض کے پاس پہننے کو کپڑا بھی نہ ہو اور تمہارے ہمسایے کے گھر میں فاقہ ہو۔''

نرم دلی کا یہ حال تھا کہ کہا کرتا تھا:

''اگر لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ مجھے معاف کرنے میں کیسا سرور ملتا ہے تو وہ جان جان کر میری نافرمانی کریں۔''

طبعاً خوش مزاج اور مرنجاں مرنج تھا۔کوئی اس پر جملہ بھی کس دیتا تو اسے پروانہ ہوتی۔ایک بار وہ رفقاء کے ساتھ دجلہ کا نظارہ کررہا تھا۔ایک ملاح نے اسے دیکھا اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا:

''مامون کو دیکھ رہے ہو۔جب سے اس نے اپنے بھائی امین کو قتل کرایا ہے میری نظر سے گرگیا ہے۔''

یہ آواز مامون تک پہنچ گئی۔وہ مسکرا کر اپنے رفقاء سے کہنے لگا:

''کوئی طریقہ بتاؤ کہ میں اس عظیم ہستی کی نگاہ میں دوبارہ مقام پاسکوں۔''

وہ بنوہاشم کی روایتی غیرت وشجاعت سے آراستہ تھا۔اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لیے کمربستہ تھا؛اسی لیے خود قیصر کے مقابلے پر نکلا اور اسی سفرِ جہاد میں اس کی وفات ہوئی۔[1]

❖❖❖

[1] البداية والنهاية: ١٤/٢٢٣، ٢٢٤

معتصم باللہ بن الرشید

ابو اسحاق محمد بن هارون، المُعْتَصِم

رجب ۲۱۸ھ......تا......ربیع الاوّل ۲۲۷ء

اگست 833ء......تا......دسمبر 841ء

معتصم باللہ کا اصل نام محمد تھا۔ ۱۸۰ھ میں ماردہ نامی ایک باندی کے ہاں پیدا ہوا تھا۔ مامون کے بعد اس کی وصیت کے مطابق وہ معتصم باللہ کا لقب اختیار کر کے خلیفہ بنا۔ وہ اسلامی تاریخ کا پہلا حکمران ہے جس نے اس قسم کا لقب اختیار کیا۔ اس سے پہلے کے تمام خلفاء اپنے اصل نام یا کنیت سے مشہور تھے۔ بعد میں نہ صرف ہر عباسی خلیفہ نے ایسے القاب اپنائے بلکہ دیگر کئی حکومتوں اور سلطنتوں نے اس رواج کی تقلید کی۔ [1]

پڑھائی سے نابلد......شہ زوری میں یکتا:

اپنے آباؤ اجداد کے برعکس اسے علوم وفنون سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بچپن ہی سے وہ پڑھنے لکھنے سے دور بھاگتا تھا۔ ہارون الرشید نے دیگر بیٹوں کی طرح اس کی تعلیم وتربیت کی بڑی کوشش کی مگر وہ کسی طرح پڑھائی کی طرف راغب نہ ہوسکا۔ آخر ہارون نے ایک تعلیم یافتہ غلام کو اس کا ساتھی بنادیا کہ وہ دوستی ہی دوستی میں اسے کچھ پڑھاتا لکھاتا رہے۔ ایک دن وہ غلام مرگیا۔ باپ نے افسوس کرتے ہوئے کہا: ''ارے محمد! سنا ہے تمہارا غلام مرگیا!''

اس نے جواب دیا: ''جی ہاں! وہ مرگیا اور مجھے پڑھائی سے نجات ملی۔''

ہارون حیران ہوکر بولا: ''تم پڑھائی سے اس قدر تنگ ہو!!'' پھر ماتحتوں کو کہا: ''اسے چھوڑ دو۔ اسے کوئی نہیں پڑھا سکتا۔'' اتنی مدت کی مغزماری سے بس اتنا ہوا کہ وہ اٹک اٹک کر عبارت پڑھ لیتا تھا۔ [2] اس کے بعد معتصم کی فوجی تربیت ہوئی جس میں اس نے کمال حاصل کیا۔ جسمانی لحاظ سے نہایت مضبوط اور طاقتور تھا۔ بدن کی سختی کا یہ حال تھا اس میں دانت نہیں گڑتے تھے۔ قوی سے قوی آدمی کی کلائی کو دو انگلیوں میں دبا کر توڑ سکتا تھا۔ [3]

مسند نشینی:

مامون کی وفات کے بعد بعض امرائے فوج نے مامون کے بیٹے عباس کی بیعت کرنی چاہی مگر اس نے صاف کہہ دیا کہ میں اپنے چچا سے بیعت کرچکا ہوں۔ اس طرح معتصم کی خلافت کسی رخنہ اندازی کے بغیر منعقد ہوگئی۔ اس وقت

① تاریخ الخلفاء، ص ۲۴۳　② تاریخ الخلفاء، ص ۲۴۳　③ تاریخ الخلفاء، ص ۲۴۴

سب لوگ طرطوس کے محاذ پر تھے اور جنگ بندی ہو چکی تھی۔ معتصم سب امراء اور فوج کے ساتھ رمضان ۲۱۸ھ میں بغداد پہنچا اور اپنی خاندانی مسند سنبھالی۔ ①

محمد بن قاسم علوی کا خروج:

معتصم کو جس پہلے امتحان سے پالا پڑا وہ سادات کے ایک فرد محمد بن قاسم کا خروج تھا جو حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کے پڑپوتے تھے۔ مسجدِ نبوی میں ہر وقت مصروفِ عبادت رہتے تھے۔ خراسان کا ایک چرب زبان حاجی مدینہ آیا تو ان کا مرید بن گیا اور انہیں خلافت کا بہترین حق دار قرار دے کر انہیں دعوائے خلافت پر ابھارا۔ اور بھی بہت سے خراسانی حاجی ان سے بیعت ہو گئے اور انہیں اپنے ساتھ خراسان کے شہر جوز جان لے گئے۔ وہاں انہوں نے جمعیت اکٹھی کر کے بغاوت کر دی، تاہم والی خراسان عبداللہ بن طاہر کے افسران نے کئی معرکوں کے بعد انہیں گرفتار کر لیا۔ معتصم نے انہیں قید کی سزا دی۔ کچھ مدت بعد عید الفطر کے دن پہرے داروں کی مشغولیت سے فائدہ اٹھا کر وہ روشن دان میں رسی لگا کر نکل بھاگے۔ معتصم نے ان کی نشان دہی پر ایک لاکھ درہم کا انعام رکھا مگر ان کا پھر کبھی کوئی نام و نشان نہ ملا۔ ②

ترک افسران کی ترقی:

معتصم کے دور میں نظامِ حکومت میں جو انقلابی تبدیلی آئی وہ یہ کہ اس نے پہلی بار ایرانی افسران اور عرب امراء کو چھوڑ کر ترکوں پر اعتماد کرنا شروع کیا اور حکومت کا بار انہی کے کاندھوں پر رکھ دیا۔ اصل میں معتصم ایوانِ اقتدار میں برسوں سے جاری فارسی و عربی امراء کی باہمی چپقلش سے تنگ تھا۔ اس کا حل اسے یہی سمجھ آیا کہ ان دونوں طبقوں کو نظر انداز کر کے کسی تیسری نسل کے لوگوں کو آگے بڑھائے۔ معتصم ایرانیوں اور خراسانیوں پر بھروسہ نہیں کرتا تھا؛ کیوں کہ ان کی سازشیں اور غداریاں دیکھتا آیا تھا، اسے معلوم تھا کہ علویوں سمیت تمام باغی جماعتیں ایرانی و خراسانی عناصر کے بل بوتے پر ہی کھڑی ہوتی آئی ہیں۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ فارسی ارکانِ دولت فطری طور پر سیاسی گٹھ جوڑ کے ماہر تھے۔ ان کی ذہانت اور سیاسی مہارت انہیں نچلا نہیں بیٹھنے دیتی تھی اور اسی لیے مہدی کے دور سے لے کر مامون تک ہر فارسی وزیر و امیر ایوانِ خلافت کو اپنی مٹھی میں رکھنے کا خواہش مند رہا۔ معتصم باللہ سپاہی پیشہ، غیور اور آزاد منش آدمی تھا۔ کسی کا مہرہ بن کر رہنا اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ ایسے لوگوں سے بھی اسے سخت نفرت تھی جو طبعی طور پر عیار و مکار ہوں۔ اکثر فارسی امراء اسی ذہن کے تھے؛ اس لیے معتصم ان سے بددل تھا۔ ان کی بجائے اسے ترک غلام پسند تھے جو بہادر، جاں نثار اور سرفروش تھے۔ ان کا وطن ترکستان یعنی وسطِ ایشیا تھا جہاں سمرقند، بخارا اور دیگر شہروں کی فتوحات کے دوران ہزاروں افراد غلام بنائے گئے۔ یہ لوگ غلاموں کی منڈیوں میں فروخت ہوتے تھے اور امراء انہیں ذاتی خدمات کے لیے ہاتھوں ہاتھ خریدتے تھے۔ معتصم کی اپنی تربیت بھی فوجی ماحول میں ہوئی تھی جہاں ترکوں کی بڑی تعداد تھی؛ اس لیے ترکوں سے اس کا دلی تعلق ایک فطری بات تھی۔ معتصم سے پہلے ترکوں کی حیثیت غلاموں، خادموں اور سپاہیوں سے زیادہ

① البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۲۱۸ھ؛ المختصر فی اخبار البشر: ۳۳/۲

② الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۱۹ھ؛ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۲۱۹ھ

نہ تھی مگر معتصم نے انہیں آگے بڑھایا۔ ان میں سے درجنوں کو اس نے دربار میں کلیدی عہدے دیے۔ بیسیوں کو فوج کی قیادت سونپی اور انہیں ترقیاں دیتا چلا گیا۔ اس کے ذاتی ترک غلام دس ہزار سے زائد تھے۔ یہ لوگ جنگ کے دوران صفِ اوّل میں لڑا کرتے تھے اور جان پر کھیل کر خطرناک سے خطرناک خدمات انجام دیتے تھے۔ اس طرح چند برسوں میں نچلی سطح سے اوپر تک ہر جگہ ترکوں کا دور دورہ ہوگیا۔[1]

یہاں سے تاریخ نے ایک نیا موڑ لیا۔ آگے چل کر عالمِ اسلام کی سیاسی وعسکری قیادت ترکوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ معتصم کے بعد بنوعباس کے اگلے کئی خلفاء ترک امراء کے بل بوتے پر تخت نشین رہے، اور جیسے جیسے خلفاء کمزور پڑتے گئے، ترک امراء کو بالادستی حاصل ہوتی گئی، یہاں تک کہ خلافتِ عباسیہ ترکوں کی زیرِ دست بن گئی۔

پھر انہی ترکوں کی اگلی نسلوں نے عالمِ اسلام میں بڑی بڑی خودمختار سلطنتیں قائم کیں۔ سلجوقی، مغل اور خوارزم شاہی سلاطین سب ترک تھے۔ اسی طرح چھ صدیوں تک قائم رہنے والی خلافتِ عثمانیہ اور مصر کے مملوک سلاطین بھی ترک تھے۔ اگلی صدیوں کے اس انقلاب کی داغ بیل معتصم کے دور میں ترکوں کو ترقی دیتے وقت رکھ دی گئی تھی۔

نیا شہر...... سامرا:

بغداد میں ترکوں کی کثرت کی وجہ سے عوام کو دِقت ہونے لگی؛ کیوں کہ یہ لوگ سپاہی منش اور سخت مزاج تھے۔ شہر میں سرپٹ گھوڑے دوڑاتے تھے۔ معتصم کو یہ پسند نہ تھا کہ سرکاری عملے کی وجہ سے عوام کو کوئی تنگی اور پریشانی ہو۔ چنانچہ ۲۲۱ھ میں اس نے بغداد سے ۱۲۵ کلومیٹر شمال مغرب میں دریائے دجلہ کے کنارے ایک نیا شہر بنوایا جس کا نام ''سُرَّ مَن رَأیٰ'' تجویز کیا۔ اس کا مطلب ہے، جو دیکھے وہ خوش ہوجائے۔ بعد میں یہی لفظ مختصر ہوکر ''سامرا'' رہ گیا۔

معتصم نے اسی شہر کو دارالخلافہ قرار دیا اور وہیں رہائش اختیار کی۔ یہاں بکثرت رہائشی مکانات، بازار، سرکاری عمارتیں، محلات اور باغات بنائے گئے اور جلد ہی اس کی خوبصورتی اور رونق کئی قدیم شہروں سے بڑھ گئی۔

معتصم کے بعد مزید سات عباسی خلفاء: واثق، متوکل، منتصر، مستعین، معتز، مہتدی اور معتمد نے اسی شہر کو مرکزِ خلافت بنائے رکھا۔ سامرا، بغداد کے بعد عباسی خلفاء کا قائم کردہ دوسرا بڑا شہر ہے جو آج تک آباد ہے۔[2]

بابک خُرّمی کا خاتمہ:

معتصم باللہ کے دور میں کئی بڑی جنگیں ہوئیں اور ہر جگہ کامیابی نے اس کے قدم چومے۔ اقتدار سنبھالتے ہی اسے بابک خُرّمی سے جنگ لڑنا پڑی۔ شمالی ایران میں جنم لینے والے اس دجال کا فتنہ اب پورے ایران میں پھیل گیا تھا۔ ہمدان، اصفہان اور ماسبذان کے ہزاروں لوگ اس کے پیروکار بن گئے تھے۔ اس فرقے کے جنگجو سرخ پوش تھے جو ''مُحَمِّرَہ'' کہلاتے تھے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے بقول بابک بہت بڑا زندیق بلکہ شیطان الرجیم تھا۔

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۲۴۴

② البلدان للیعقوبی، ص ۵۲ تا ۶۲؛ معجم البلدان: ۱۷۴/۳ ...... آج کل سامرا کی آبادی تین لاکھ سے زائد ہے۔ اثنا عشریہ کے دو اماموں: علی ہادی اور حسن عسکری کے مزار یہیں ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ بارہویں امام ''مہدیٔ منتظر'' کا ظہور یہیں ایک غار سے ہوگا۔

درحقیقت اس کی بغاوت حکومت سے نہیں دینِ اسلام سے تھی؛ لہٰذا اس سے کوئی نرمی نہیں برتی جاسکتی تھی۔
معتصم نے تخت نشینی کے فوراً بعد ذوالقعدہ ۲۱۸ھ میں بابک خرّمی کے مقابلے کے لیے شمالی ایران افواج بھیجنا شروع کردیں۔ تین سال تک یہاں لڑائیاں جاری رہیں۔ ایک موقعے پر بابک کے پیروکاروں کو ایشیائے کوچک کی طرف پسپائی پر مجبور ہونا پڑا تاہم بابک ہاتھ نہ آیا۔ ہر شکست کے بعد وہ اپنے پیروکاروں کو منظم کرکے دوبارہ مقابلے پر آجاتا تھا۔ اس کا فتنہ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ بعض عباسی حاکم، خلیفہ کو چھوڑ کر اس کے حلقہ بگوش بن گئے تھے۔
آخر معتصم نے اپنے ترکش کا سب سے کڑا تیر استعمال کیا۔ یہ اس کا ترک سالار افشین حیدر تھا۔ معتصم نے اسے ایک لشکرِ جرار کے ساتھ محاذ پر بھیجا۔ ساتھ ہی اخراجات کے لیے تین کروڑ درہم (تقریباً سات ارب ۵۰ کروڑ روپے) دیے تاکہ طویل عرصے تک جنگ جاری رکھی جاسکے۔ بابک کے حامی ہر طرف سے سمٹ کر برف پوش کوہستان میں پیچھے ہٹ گئے۔ بابک نے ''برزند'' کی گھاٹیوں میں اصل فوج تیار کر رکھی تھی۔ یہاں کئی ماہ تک دونوں فوجوں میں جھڑپیں ہوتی رہیں۔ معتصم مسلسل کمک بھیجتا رہا یہاں تک کہ خلافتِ عباسیہ کے تمام قلعوں کے محافظ سپاہی اسی محاذ پر بھیج دیے گئے۔ برف باری شروع ہوئی تو جنگ رک گئی۔
موسم بہار آتے ہی افشین نے فیصلہ کن یلغار کی اور رمضان ۲۲۲ھ میں بابک کے فصیل بند مرکز ''برزند'' تک پہنچ گیا۔ گھمسان کی جنگ کے بعد ۲۰ رمضان کو عباسی سپاہی شہر میں داخل ہوگئے۔ بابک جان بچا کر ایشیائے کوچک کی نصرانی ریاستوں کی طرف نکل گیا۔ عباسی سپاہ نے بابک کے پایۂ تخت سے ۷۶۰۰ مسلمان قیدیوں کو بازیاب کیا۔
افشین ہر قیمت پر اس فتنے کو ختم کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا؛ اس لیے اس نے منادی کرادی کہ بابک کو پکڑنے والا دس لاکھ درہم کا حق دار ہوگا۔ یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، سبھی بابک کی تلاش میں لگ گئے۔ بابک نے ایک پادری کے ہاں پناہ لی ہوئی تھی اور شراب و کباب میں منہمک تھا۔ پادری کو اتنے بڑے انعام کی خبر ملی تو فوراً مسلم افسران کو اطلاع دے کر بابک کو گرفتار کرادیا۔ افشین، بابک کو زنجیروں میں جکڑ کر دارالخلافہ سامرا روانہ ہوگیا۔
بابک کی فتنہ انگیزی ۲۰ سال سے جاری تھی اور کوئی اس پر قابو نہیں پاسکا تھا۔ اس دوران اس نے دو لاکھ ۵۵ ہزار انسانوں کو قتل کیا تھا۔ اس کے ظلم وستم سے سارا عالمِ اسلام پریشان تھا۔ اسے زندہ گرفتار کرنا افشین کا بہت بڑا کارنامہ اور مسلمانوں کی بہت بڑی فتح تھی۔ سامرا میں افسرانِ فوج نے شہر سے کئی میل باہر آکر فاتح سپہ سالار کا استقبال کیا۔
معتصم نے افشین کی جرأت پر خراجِ تحسین پیش کیا۔ اسے ایک بیش قیمت تاج پہنایا اور دو کروڑ درہم کا گراں قدر انعام دیا۔ بابک کے ہاتھ پاؤں کٹوا کر اس کی لاش سولی پر لٹکادی گئی۔ اس کے بھائی کو جو اسی کی طرح فتنہ باز تھا، بغداد میں سولی دی گئی۔ تمام صوبوں میں اس خوش خبری کی منادی کرائی گئی اور ہر جگہ مسلمانوں نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اظہارِ مسرت کیا۔ ①

① البدایۃ والنہایۃ: ۲۳۹/۱۴ تا ۲۴۹

رومیوں سے جہاد

معتصم کا سب سے بڑا کارنامہ جس کی وجہ سے اس کا نام تاریخ میں زندہ ہے، رومیوں کے خلاف اس کے طوفانی حملے ہیں جنہوں نے قیصر کو ناک رگڑنے پر مجبور کر دیا۔

قیصر روم توفیل ایک بزدل، ستم پیشہ اور کم ظرف انسان تھا اور مسلمانوں کا عروج دیکھ کر جلتا رہتا تھا۔ اسے مامون الرشید کے زمانے میں اتنی سزا مل چکی تھی کہ شاید وہ عمر بھر اسلامی سرحدوں کو پامال کرنے کی جراَت نہ کرتا۔ اسے دوبارہ جنگ پر اکسانے والا بابک خرمی تھا۔ افشین سے جنگ کے دوران اس نے قیصر کو پیغام بھیجا کہ مسلمانوں کی ساری طاقت میرے خلاف لگ چکی ہے اور ان کے قلعے بالکل خالی ہیں۔ اگر تم کامیاب حملہ کرنا چاہتے ہو تو اس سے بہتر موقع نہیں ملے گا۔

قیصر نے چند مہینے کی تیاری کے بعد ایک لاکھ فوج کے ساتھ ۲۲۳ھ میں اسلامی سرحدوں پر یلغار کر دی۔ بابک کے باقی ماندہ مفرور سرخ پوش بھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ مَلَطْیَہ شہر اس حملے کا سب سے بڑا نشانہ بنا۔ یہاں قیصر نے ہزاروں مرد و زن گرفتار کیے اور ان پر ایسے مظالم ڈھائے کہ دھرتی کانپ اٹھی۔ ناک کان کاٹ کر چہرے مسخ کر دیے گئے اور آنکھوں کو گرم سلائیوں سے پھوڑ دیا گیا۔ ان قیدیوں میں ایک ہاشمی خاتون بھی تھی، اس نے چیخ کر کہا:

”وَا مُعْتَصِمَاہ......“ (ہائے معتصم!)

دار و گیر سے بچ نکلنے والے کسی شخص نے آ کر یہ دردناک صدا معتصم باللہ کو سنائی۔ وہ اس وقت تخت پر بیٹھا تھا۔ یہ خبر سن کر غیرت اور جوش سے بے حال ہو گیا: ”لبیک...... لبیک“ کہتا ہوا تخت سے نیچے اترا اور آواز لگائی:

”اَلنَّفِیْرُ اَلنَّفِیْرُ“ (چلو جہاد کے لیے۔ چلو جہاد کے لیے۔)

دیکھتے ہی دیکھتے امرائے فوج جمع ہو گئے اور چھاؤنی میں افواج کوچ کے لیے تیار ہو گئیں۔ معتصم اپنے طور پر زندگی اور موت کی بازی کھیلنے جا رہا تھا۔ اس نے ساری جائیداد کے تین حصے کیے: تہائی اپنی اولاد کے نام کی۔ تہائی اپنے غلاموں کو دی اور تہائی راہِ خدا میں وقف کر دی۔ [1]

جواب تُو خود دیکھ لے گا:

اس دوران قیصر کا مراسلہ آن پہنچا جس میں شیخیاں بگھارتے ہوئے مسلمانوں کو سخت دھمکیاں دی گئی تھیں۔ معتصم نے اس کے جواب میں فقط اتنا لکھوایا:

”میں نے تیرا خط پڑھا، تیری بات سنی، جواب تو خود دیکھ لے گا۔ عن قریب کفار کو اپنا انجام معلوم ہو جائے گا۔“ [2]

---

(1) الکامل فی التاریخ: سنة ۲۲۳ ھجری (2) البدایة والنهایة: ۲۸۵/۱۴

لشکر کی روانگی اور خونریز معرکے:

۲ جمادی الاولیٰ ۲۲۳ھ کو لشکر روانہ ہوا۔ نامور ترک افسران: اَفشین، اِیتاخ اور اَشناس فوج کے الگ الگ حصوں پر مامور تھے۔ راستے میں خبر آئی کہ قیصر آگے بڑھ کر اسلامی شہر "زِبطرہ" کا محاصرہ کر چکا ہے۔ لشکر پوری تیزی سے کوچ کرتا ہوا محاذ کی طرف بڑھتا رہا مگر یہ کئی ہفتوں کی مسافت تھی۔ معتصم نے چند افسران کو طوفانی دستوں کے ساتھ زِبطرہ کے محصورین کی مدد کے لیے آگے روانہ کر دیا۔ مگر جب یہ دستے وہاں پہنچے تو قیصر وہاں خون کی ندیاں بہا کر اور شہر کو راکھ کا ڈھیر بنا کر اَنقرہ (انگورہ) جا چکا تھا۔ افسران نے آکر معتصم کو یہ خبر دی۔

معتصم قیصر کے دیے ہوئے زخموں کا بدلہ لیے بغیر واپس جانے والا نہیں تھا۔ اس نے عجیب جنگی چال چلتے ہوئے فوج کے تین حصے کر دیے: ایک حصہ اَفشین کو دے کر آرمینیا کی طرف بھیجا تا کہ قیصر کو دھوکے میں رکھا جائے۔ دوسرا حصہ اشناس کی قیادت میں انقرہ کی طرف بھیجا تا کہ قیصر جب اَفشین کو روکنے کے لیے آرمینیا کی سرحد کی طرف جائے تو انقرہ پر قبضہ کر لیا جائے۔ تیسرا حصہ اپنی کمان میں رکھا اور طے کیا کہ الگ الگ علاقے فتح کرتی ہوئی یہ تینوں افواج انقرہ میں آملیں گی۔

توقع کے عین مطابق قیصر نے مغرب سے اَفشین کی یلغار کی خبر سن کر انقرہ سے آرمینیا کی سمت کوچ کر دیا۔ اس کے نکلتے ہی اشناس کی فوج انقرہ پہنچ گئی اور اسے گھیر لیا۔ اُدھر قیصر اور اَفشین کی فوجوں میں خونریز جنگ ہوئی اور قیصر عبرتناک شکست کھا کر الٹے پاؤں اَنقرہ کی طرف بھاگا مگر اس کے پہنچنے سے پہلے اَشناس یہاں قبضہ کر چکا تھا۔ قیصر نے ہر طرف سے ناکام ہو کر عَمُّورِیّہ کا رخ کیا اور وہاں مورچہ بند ہو کر جنگ کی تیاری کرنے لگا۔

عَمُّورِیّہ کئی صدیوں سے ایشیائے کوچک میں رومیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ قُسطنطِینیہ کے بعد بازنطینی اسے اپنا سب سے مضبوط فوجی اڈا سمجھتے تھے جس سے پورے خطے پر گرفت رکھی جاتی تھی۔ ابتدائے اسلام سے اس وقت تک اسے کبھی فتح نہیں کیا گیا تھا۔

اسلامی افواج ہر طرف سے سمٹ کر اَنقرہ میں جمع ہوئیں اور شعبان ۲۲۳ھ میں معتصم ان سب کی کمان کرتے ہوئے عَمُّورِیّہ کی طرف بڑھا۔ قیصر خوفزدہ ہو کر وہاں سے نکل گیا اور اپنے نائب کو شہر کی ذمہ داری سونپ گیا۔

۱۷ رمضان کو اسلامی افواج نے یہاں پہنچ کر شدید محاصرہ کر لیا۔ ۵۵ دن تک محصورانہ جنگ ہوتی رہی۔ آخر مسلمانوں نے سنگ باری کر کے شہر پناہ میں شگاف ڈال دیا اور خندق میں مٹی سے بھرے ہوئے بورے ڈال کر اسے پاٹ دیا۔ اَفشین اور اَشناس دو دن تک لگاتار شہر کی دیوار پر حملے کرتے رہے۔ تیسرے دن معتصم خود میدان میں نکلا اور صبح سے شام تک گھمسان کی جنگ کے بعد شہر فتح کر لیا۔ اس لڑائی میں تیس ہزار دشمن قتل ہوئے اور تیس ہزار قیدی بنائے گئے۔ بے پناہ مالِ غنیمت ہاتھ آیا جسے فوج پانچ روز تک جمع کرتی اور بیچتی رہی۔

کوچ سے پہلے معتصم نے عَمُّورِیّہ کو مسمار کرا دیا اور مدتوں تک یہ شہر بالکل ویران رہا۔ یہ کارروائی فوجی نقطۂ نظر سے ضروری تھی؛ کیوں کہ یہاں اردگرد رومیوں ہی کی آبادی تھی۔ مسلمان یہاں قیام کرتے تو ان کی زد میں رہتے۔ شہر کو

مسمار نہ کیا جاتا تو مسلمانوں کی واپسی کے بعد رومی اسے دوبارہ اپنا مورچہ بنالیتے۔اس کے علاوہ رومیوں نے دو اسلامی شہروں کو تودۂ خاک بنا کر آبادی کے قابل نہیں چھوڑا تھا؛ اس لیے معتصم نے بھی یہاں ایسی ہی جوابی کارروائی کرنا ضروری سمجھا تا کہ حریف آئندہ ایسی بہیمانہ حرکات سے پہلے اپنا انجام سوچ لے۔

معتصم عَمُّوریّہ کا پھاٹک اکھاڑ کر بغداد لے گیا جہاں اسے قصرِ خلافت کی چہار دیواری میں لگادیا گیا۔آٹھویں صدی ہجری کے مؤرخ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ:اب تک یہ دروازہ قصرِ خلافت میں نصب ہے۔[1]

ترکوں کی بغاوت:

ترک سردار معتصم کے دست وباز و تھے۔یہ سب نومسلم تھے،ان کا آبائی مذہب مجوسیت تھا۔اسلام قبول کرنے اور دربارِ خلافت میں اہم عہدوں پر فائز ہونے کے بعد بھی ان میں سے کئی سردار اپنے خاندانوں کی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔بعض اندرونی طور پر اب بھی مجوسی تھے اور نجی مجالس میں زرتشت کی تعلیمات کو زندہ کرنے کا عزم ظاہر کرتے تھے۔

معتصم نے ترکوں کو بے پناہ قوت اور ترقی بخش کر ایک سیاسی غلطی کی تھی۔اصولِ سیاست اور اسلامی مساوات دونوں کا تقاضا یہ تھا کہ ایوانِ اقتدار میں عربوں،ایرانیوں اور ترکوں کو ایک تناسب کے ساتھ جگہ دی جاتی کہ کوئی کسی پر غالب نہ آنے پاتا۔ایرانیوں کے بارے میں اس کی پالیسی درست تھی؛ کیوں کہ اگر ان کا تسلط یوں ہی بڑھتا چلا جاتا تو دولتِ بنوعباس چند دنوں کی مہمان ہوتی۔تاہم جس طرح اس نے دو تین سالوں میں ترکوں کو وسیع اختیارات بخش دیے یہ بھی متوازن حکمتِ عملی نہیں تھی۔

ترک اگر فطری طور پر بتدریج اوپر آتے تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔یہ اسلامی مساوات کا تقاضا تھا کہ ہر قوم کو ترقی کے مواقع دیے جاتے مگر اس سے کہیں زیادہ ضروری یہ تھا کہ ہر قوم کو اسلامی شعور وآگہی،اعتقادِ خالص،علم دین اور اخلاق وآداب سے مالا مال کیا جاتا۔ترک ان معاملات میں عربوں اور خراسانیوں سے بہت پیچھے تھے۔اگرچہ ترکستان میں اسلام کو پھیلے ایک صدی سے زیادہ مدت ہو چکی تھی مگر اب تک اس خطے میں اسلامی اثرات ایسے گہرے نہیں ہوئے تھے جیسے حجاز،شام،عراق یا مصر میں۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اس علاقے میں عموماً ترک سردار ہی خود مختار نوابوں کی طرح حکومت کرتے تھے اور حکومت ان سے خراج لے کر مطمئن رہتی تھی۔

جب ایسے نیم تربیت یافتہ افراد کے ہاتھوں میں یکدم خلافت کی باگ ڈور آئی تو ان میں سے بعض اپنی اوقات میں نہ رہے اور خود مختاری کے خواب دیکھنے لگے۔

ایسے ترک سرداروں میں معتصم کا سب سے مایہ ناز جرنیل اَفشین بھی شامل تھا۔اسی طرح افشین کا دستِ راست مازیار بھی یہی خیالات رکھتا تھا۔بابک خُرّمی سے جنگ کے دوران معتصم افشین پر حد سے زیادہ اعتماد کرتے ہوئے اسے بے حساب دولت اور بے اندازہ سامانِ رسد بھجواتا رہا۔افشین ضرورت کے مطابق محاذ پر خرچ کر کے باقی سازو

[1] البدایة والنهایة: ۱۴/ ۲۸۵

سامان اور دولت وسطِ ایشیا میں اپنے آبائی شہر ''اشروسنہ'' منتقل کراتا رہا تا کہ مستقبل میں وہاں ایک خودمختار حکومت بنا سکے۔ یہ حرکات معتصم کو معلوم ہوگئی تھیں مگر وہ ازراہِ مصلحت خاموش رہا؛ کیوں کہ افشین بابک سے نبرد آزما تھا۔ بابک کے بعد رومیوں سے جنگ میں بھی افشین سے کام لینا ضروری تھا؛ اس لیے معتصم اسے ڈھیل دیتا رہا۔

اس دوران افشین کا اثر و رسوخ بہت بڑھ چکا تھا۔ اس نے اپنے رازدار ترک جرنیل مازیار کو جو طبرستان کا حاکم تھا، خفیہ مراسلہ بھیج کر بغاوت پر ابھارا اور لکھا:

''اس وقت دینِ زرتشت کا حامی میرے اور تمہارے سوا کوئی نہیں۔ تمہارے پاس فوج کا بہت بڑا حصہ ہے۔ تم بغاوت کر دو۔ حکومت تمہارے مقابلے میں مجھ کو بھیجے گی۔ میں باقی فوج لے کر تمہارے ساتھ مل جاؤں گا۔ ہمت کرو تو ملوکِ عجم کا دین پھر قائم ہو سکتا ہے۔''

مازیار نے اس سازش کے مطابق اعلانِ بغاوت کر دیا۔ معتصم کو اطلاع ہوئی تو فوج کو وہاں روانہ کیا مگر افشین کی بجائے یہ مہم ایک اور جرنیل عبداللہ بن طاہر کو سونپ دی۔ یوں افشین کا منصوبہ ناکام ہوگیا۔ مازیار شکست کھا کر گرفتار ہوا تو اس سے افشین کا وہ خط بھی برآمد ہوگیا جس میں اسے بغاوت پر ابھارا گیا تھا۔ یہ ۲۲۴ھ کا واقعہ ہے۔ معتصم نے اس کے باوجود خاموشی کی حکمتِ عملی اختیار کی۔

اس کے بعد ایک دو مزید ایسے واقعات پیش آئے جن سے معتصم کو افشین کی غداری کا پورا یقین ہوگیا۔ افشین نے بھی معتصم کا ذہن بھانپ لیا اور کوشش کی کہ پکڑ میں آنے سے پہلے اپنے وطن ترکستان کی طرف نکل جائے مگر ایک اور ترک سردار ایتاخ کو پتا چل گیا اور اس نے معتصم کو بروقت اطلاع دے کر افشین کو گرفتار کرا دیا۔

معتصم نے وزیرِ خلافت اور امرائے دولت کی ایک مجلس قائم کر کے انہیں افشین کے مقدمے کی تحقیق کا حکم دیا۔ یہ لوگ اس کے خلاف ثبوت اکٹھے کرتے رہے۔ ان شواہد اور خود ملزم کے اقبالی بیان سے ثابت ہوا کہ وہ خلافت کا تختہ الٹ کر مجوسی سلطنت کو از سرِ نو قائم کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ شعبان ۲۲۶ھ میں افشین کو سزائے موت دے دی گئی۔ اس کے بعد اسحٰق بن یحییٰ کو نیا سپہ سالار مقرر کر دیا گیا۔[1]

✦✦✦

[1] تاریخ الطبری: سنة ۲۲۴ھ، ۲۲۵ھ، ۲۲۶ھ۔

مسئلہ ''خلقِ قرآن'' میں امام احمد بن حنبل کی استقامت

مامون وفات کے وقت معتصم کو ''مسئلہ خلقِ قرآن'' جبراً منوانے کی وصیت کر گیا تھا؛ اس لیے معتصم نے اختیارات سنبھالنے کے بعد اس کے مطابق کارروائی شروع کی اور مامون سے کہیں زیادہ انتہا پسندی کا ثبوت دیا۔ مامون کے معتزلی شیخ بشر بن غیاث کا انتقال ہو چکا تھا۔ معتصم نے معتزلہ کے دوسرے سرخیل احمد بن ابی دُواد کو وہی جاہ و مرتبہ دیا اور اسے اسلامی خلافت کا قاضی القضاۃ مقرر کر دیا۔

مامون نے جن علماء کو گرفتار کرنے کا حکم دیا تھا ان میں سے امام احمد بن حنبل اور شیخ محمد بن نوح رحمہما اللہ کے سوا سب نے ازراہِ مصلحت حکومت کی موافقت اختیار کر لی تھی۔ مامون کی وفات کے بعد ان علماء کو بغداد واپس روانہ کر دیا گیا تھا۔ محمد بن نوح رحمہ اللہ راستے میں انتقال کر گئے تھے اور امام احمد رحمہ اللہ بغداد کی جیل میں ڈال دیے گئے تھے۔

اب عالمِ اسلام کی نمایاں ہستیوں میں صرف ایک امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ہی رہ گئے تھے جو استقامت و عزیمت کا ایک نیا باب رقم کرتے ہوئے صحابہ، تابعین اور اسلاف کے مسلک و مشرب کو ببانگِ دُہل بیان کر رہے تھے۔ وہ کسی سزا سے خوفزدہ تھے نہ کسی سمجھوتے پر آمادہ۔

ولادت اور تعلیم:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ربیع الآخر ۱۶۴ ہجری (۷۸۰ء) میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت عالم اسلام کے مرکزِ خلافت ''مدینۃ الاسلام بغداد'' میں ہوئی۔ آپ کے والد محمد بن حنبل ایک سپاہی تھے۔ احمد بن حنبل کم سن تھے کہ والد کی وفات ہو گئی۔ عالم اسلام کا یہ گوہرِ نایاب یتیمی کی حالت میں سنِ شعور کو پہنچا اور خداداد شوق اور لگن کی بناء پر علم کی تحصیل میں مصروف ہو گیا۔ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کے حلقۂ درس میں شرکت کی۔ ان کی وفات ہو گئی تو حضرت سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ جیسے عظیم محدث کا دامن تھام لیا اور ان سے وراثتِ نبوی کا بڑا ذخیرہ حاصل کیا۔

پانچ بار مکہ معظمہ جا کر وہاں کے علماء سے استفادہ کیا اور ہر بار حج کی سعادت حاصل کر کے لوٹے۔ مدینہ منورہ کے علماء سے بھی فیض یاب ہوئے۔ محدث عبدالرزاق رحمہ اللہ کی شہرت سُنی تو یمن کے دارالحکومت صنعا جا کر ان سے بھی علمی جواہر حاصل کیے۔ بصرہ کے شیخ عبدالرحمٰن بن مہدی اور کوفہ کے وکیع بن الجراح رحمہما اللہ آپ کے ممتاز اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ ۱۹۵ ہجری میں بغداد آئے تو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ان کی بھی خوشہ چینی کی۔[1]

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۱۱/۱۷۷ تا ۲۰۰، ط الرسالۃ

خطرناک چیلنج اور اس کا مقابلہ:

جب مامون اور پھر معتصم نے خلقِ قرآن کے مسئلے میں علماء کو جبراً ہم نوا بنانے کی کوشش کی تو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے بھانپ لیا کہ گمراہی کے اس طوفان کو جس کی سرپرستی خود عباسی خلافت کر رہی ہے، جان پر کھیل کر روکنا ضروری ہے ورنہ حقیقی اور سچے اسلام کا نام ونشان مٹ جائے گا چنانچہ انہوں نے پوری امت کی جانب سے فرض کفایہ ادا کرتے ہوئے حکومت اور معتزلہ کے موقف کی اس شدت سے تردید کی کہ قصرِ خلافت کی دیواریں لرز کر رہ گئیں اور حق کی صدائے بازگشت سے مشرق ومغرب میں زلزلہ سا آ گیا۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی داستانِ عزیمت، ان کی اپنی زبانی:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے تقریباً اڑھائی سال جیل میں گزارے۔ اس دوران انہیں بار بار ڈرا دھمکا کر کوشش کی گئی کہ وہ اپنے موقف سے دستبردار ہو جائیں اور قرآن مجید کو مخلوق کہہ دیں، مگر امام صاحب کمالِ پامردی سے حق پر جمے رہے۔ آخر رمضان ۲۲۱ ہجری میں معتصم نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو حتمی فیصلے کے لیے دربار میں طلب کیا۔

امام صاحب رحمہ اللہ اس واقعے کی روداد خود یوں سناتے تھے:

''جب معتصم نے مجھے بلوایا تو میرے پیروں میں مزید بیڑیاں ڈال دی گئیں، میں ان کے بوجھ کی وجہ سے چل نہیں سکتا تھا۔ میں نے انہیں ازار بند میں باندھ کر ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ جب ہم باب البستان پہنچے تو میرے لیے سواری لائی گئی اور سوار ہونے کا حکم دیا گیا۔ مجھے کوئی سہارا دینے والا نہیں تھا۔ پاؤں میں بھاری بیڑیاں تھیں۔ میں سوار ہونے کی کوشش میں کئی بار منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔ کسی نہ کسی طرح سوار ہوا اور معتصم کے محل میں پہنچا۔ مجھے ایک اندھیری کوٹھری میں داخل کر کے دروازہ بند کر دیا گیا۔ نصف شب ہو چکی تھی۔ وہاں روشنی کے لیے چراغ تک نہیں تھا۔ میں نے نماز کے لیے تیمم کرنا چاہا اور ہاتھ بڑھایا تو پانی کا ایک پیالہ اور طشت رکھا ہوا تھا، میں نے وضو کر کے نماز ادا کی۔

اگلے دن معتصم کا قاصد آیا اور مجھے دربار میں لے گیا۔ وہاں معتصم کے ساتھ قاضی ابن ابی دُواد اور ان کے حامی درباریوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ ابوعبدالرحمٰن شافعی بھی حاضر تھے۔ ابھی ابھی دو آدمیوں کے سر قلم کیے گئے تھے۔ میں نے ابوعبدالرحمٰن شافعی سے کہا: ''تمہیں امام شافعی رحمہ اللہ سے مسح کے بارے میں کچھ یاد ہے؟'' یہ سن کر ابن ابی دُواد نے کہا: ''دیکھو! اس آدمی کی گردن کٹنے کو ہے مگر یہ فقہ کا مسئلہ پوچھ رہا ہے؟''

معتصم نے کہا: ''انہیں میرے پاس لاؤ'' وہ مجھے برابر آگے بلاتا رہا۔ یہاں تک کہ میں اس کے بالکل قریب چلا گیا۔ میں بیڑیوں کے وزن سے بے حال تھا۔ اس نے کہا: ''بیٹھ جاؤ۔''

کچھ دیر بعد میں نے کہا: ''مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے؟''

اس نے کہا: ''کہو کیا کہنا ہے۔''

میں نے کہا: ''میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے کس چیز کی دعوت دی ہے؟''

اس نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا: ''لا الٰہ الا اللہ کی۔''

میں نے کہا: ''میں اس کی گواہی دیتا ہوں۔''

پھر میں نے کہا: ''آپ کے جدِ امجد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب عبدالقیس کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا تو آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم جانتے ہو ایمان کیا ہے۔ وہ بولے اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ معلوم ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز ادا کرنا اور زکوۃ دینا اور مالِ غنیمت سے خمس نکالنا۔''

معتصم نے کہا: ''اگر آپ گزشتہ خلیفہ کے ہاتھ میں نہ آئے ہوتے تو میں آپ کو کچھ نہ کہتا۔''

پھر عبدالرحمٰن بن اسحٰق سے کہا: ''میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ اس آزمائش کو ختم کردو۔''

میں نے کہا: ''اللہ اکبر! یعنی اس مسئلے میں مسلمانوں کے لیے وسعت ہے۔''

خلیفہ نے حاضرین سے کہا: ''ان سے بحث کرو۔''

عبدالرحمٰن بن اسحٰق نے کہا: ''آپ قرآن کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

میں نے کہا: ''آپ اللہ کے علم کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

وہ چپ رہا۔ میں نے کہا: ''امیر المؤمنین! قرآن اللہ کے علم کا حصہ ہے۔ جس نے کہا کہ قرآن اللہ کی مخلوق ہے اس نے اللہ کے ساتھ کفر کیا۔''

معتصم خاموش رہا۔ درباری کہنے لگے:

''امیر المؤمنین! اس نے آپ کو کافر قرار دے دیا اور ہمیں بھی۔''

معتصم نے کوئی توجہ نہ دی۔ اب عبدالرحمٰن بن اسحٰق نے کہا: ''قرآن نہیں تھا تب بھی اللہ موجود تھا۔''

میں نے کہا: ''کیا اللہ اپنی صفتِ علم کے بغیر موجود تھا؟''

وہ چپ ہوگیا۔ اب ایک آدمی اِدھر سے بات کرتا اور میں جواب دیتا۔ دوسرا اُدھر سے بات کرتا میں اسے بھی جواب دیتا۔ خلیفہ مجھ سے کہتا: ''احمد! آپ کیا کہتے ہیں؟''

میں کہتا: ''آپ قرآن وحدیث سے مجھے کوئی دلیل لا دیں میں مان لوں گا۔''

احمد بن ابی دُواد کہنے لگا: ''کیا تم قرآن یا حدیث کے سوا کوئی بات نہیں کرو گے؟''

میں نے کہا: ''کیا اسلام کا دارومدار انہی پر نہیں؟''

معتصم کہتا: ''اگر یہ میری بات مان لیں تو میں اپنے ہاتھ سے انہیں کھول دوں اور اپنی فوج سمیت ان کے

دروازے پر حاضری دیا کروں۔"

پھر کہتا: "احمد! میں آپ سے نرمی برت رہا ہوں۔ مجھے آپ کا ایسا ہی خیال ہے جیسا اپنے بیٹے ہارون کا۔[1] اب آپ کیا کہتے ہیں؟"

میں پھر کہتا: "قرآن وحدیث سے مجھے کوئی دلیل لادیں۔ مان لوں گا۔"

احمد بن ابی دُواد کہتا: "امیر المؤمنین! یہ گمراہ اور گمراہ کرنے والا بدعتی ہے۔ آپ کے قاضی اور فقہاء موجود ہیں، ان سے پوچھ لیں۔" معتصم ان سے پوچھتا۔ وہ وہی کہتے جو ابن ابی دُواد کہتا تھا۔

بہت دیر گزر گئی۔ آخر معتصم تھک گیا اور مجھے پھر اسی جگہ قید کر دیا گیا۔ اگلے دن پھر مجھے بلایا گیا اور مناظرہ ہوتا رہا۔ میں سب کو جواب دیتا رہا۔ یہاں تک کہ ظہر کا وقت ہو گیا۔ معتصم اکتا گیا تو حکم دیا کہ انہیں لے جاؤ۔ تیسری رات مجھے اندازہ ہو گیا کہ کل کچھ ضرور ہو گا۔ میں نے ڈوری منگوا کر اپنی بیڑیوں کو مضبوط باندھ لیا اور ازار بند کو خوب کس لیا کہ کل کہیں سزا کے دوران برہنہ نہ ہو جاؤں۔

تیسرے روز مجھے پھر بلایا گیا۔ میں ڈیوڑھیاں طے کرتا ہوا دربار میں پہنچا۔ دیکھا کہ کچھ لوگ تلواریں سونتے اور کوڑے لیے کھڑے ہیں۔ گزشتہ دو دن کے بہت سے حاضرین آج نہیں تھے۔ جب میں معتصم کے پاس پہنچا تو اس نے کہا: بیٹھ جاؤ۔ پھر حاضرین سے کہا: "ان سے مناظرہ کرو۔"

لوگ بحث کرنے لگے۔ میں ایک ایک کو جواب دیتا رہا۔ میری آواز سب پر غالب تھی۔ جب سب چپ ہو جاتے تو احمد بن ابی دُواد بولنے لگتا۔ وہ ان سب سے بڑھ کر جاہل تھا۔ ان لوگوں کو سنن و آثار کا زیادہ علم نہیں تھا۔ وہ احادیث کا انکار کرتے تھے اور ان سے استدلال کی تردید کرتے تھے۔ میں نے آخرت میں اللہ کے دیدار کی (صحیح) حدیث سنائی تو وہ اسے ضعیف بتانے لگے اور اس کی سند اور راویوں پر اعتراض کرنے لگے۔

معتصم مجھے کہتا: "احمد! مان جائیں، میں آپ کو مقرب بنالوں گا۔ آپ دربار میں جگہ پائیں گے۔"

میں پھر کہتا: "قرآن وحدیث سے مجھے کوئی دلیل لادیں۔ مان لوں گا۔"

جب دیر ہو گئی تو مجھے الگ کر دیا گیا۔ اور خلیفہ حاضرین سے کچھ کہنے لگا۔

پھر مجھے بلا کر کہا: "احمد! اللہ آپ پر رحم کرے۔ میری بات مان لیں۔ میں خود آپ کو رہا کر دوں گا۔"

میں نے وہی جواب دیا۔ معتصم کے درباریوں نے کہا:

"امیر المؤمنین! یہ کافر، بے ہدایت اور گمراہی پھیلانے والا آدمی ہے۔"

بغداد کے حاکم اسحٰق بن ابراہیم نے کہا: "یہ سیاست کے خلاف ہو گا کہ آپ اسے چھوڑ دیں۔ لوگ کہیں گے کہ ایک آدمی کو دو خلفاء قابو نہ کر سکے۔"

[1] ہارون معتصم کا ولی عہد تھا جو اس کے بعد واثق باللہ کے لقب کے ساتھ خلیفہ ہوا۔

یہ سن کر معتصم مشتعل ہوگیا حالانکہ وہ بہت نرم طبع آدمی تھا۔ وہ چلایا: ''پکڑو اور گھسیٹو۔''

یہ کہہ کر وہ تخت پر بیٹھ گیا۔ جلادوں اور کوڑے لگانے والوں کو بلایا۔ مجھے پکڑ کر گھسیٹا جانے لگا۔ میرے کپڑے اتار لیے گئے۔ میرے لباس میں رسول اللہ ﷺ کا موئے مبارک سلا ہوا تھا۔ وہ لباس چھین لیا گیا۔ صرف تہ بند رہ گیا۔ مجھے ٹکٹکی کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ میں نے کہا:

''امیر المؤمنین! رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ کسی کا خون حلال نہیں سوائے اس کے کہ وہ کسی کو قتل کرے یا شادی شدہ ہو کر بدکاری کرے یا دین سے نکل جائے۔ میں نے ان میں سے کوئی کام نہیں کیا۔ یہ بھی فرمان نبوی ہے کہ جب لوگ لا الٰہ الا اللہ کہہ لیں تو ان کی جانیں اور اموال محفوظ ہیں۔ پس آپ کیوں میرا خون بہانا چاہتے ہیں؟ امیر المؤمنین! آپ اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کو یاد کریں کہ وہاں آپ اسی طرح کھڑے ہوں گے جیسے میں یہاں کھڑا کیا گیا ہوں۔''

معتصم کا ارادہ بدلنے لگا مگر درباری مسلسل کہتے رہے:

''امیر المؤمنین! یہ کافر، بے ہدایت اور گمراہی پھیلانے والا آدمی ہے۔''

تب معتصم نے حکم دیا اور مجھے دو ستونوں کے درمیان ایک کرسی پر کھڑا کر دیا گیا۔ [1]

کوڑے مارنے والے کوڑے لیے آگئے۔ ایک آدمی پوری قوت سے مجھے دو کوڑے مارتا۔ معتصم کہتا:

''تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور زور سے مار۔''

عُجیف نامی ایک آدمی مجھے اپنی تلوار کے دستے سے ٹھوکا دیتا اور کہتا: ''تم ان سب پر غالب آنا چاہتے تھے!!'' پھر دوسرا آدمی آگے آتا اور دو کوڑے لگاتا۔ ۱۹ کوڑوں کے بعد معتصم میرے پاس آیا اور بولا:

''کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو۔ واللہ! مجھے تمہارا بہت خیال ہے۔''

مگر میں کوئی بات قبول نہیں کر رہا تھا۔ کوئی کہتا: ''اللہ کے بندے! خلیفہ تمہارے سر پر کھڑے ہیں۔''

کوئی کہتا: ''امیر المؤمنین! آپ روزے سے ہیں اور دھوپ میں کھڑے ہیں۔''

معتصم پھر مجھ سے بات کرتا۔ میں وہی بات دہراتا۔ وہ پھر جلاد کو حکم دیتا کہ پوری قوت سے کوڑے لگاؤ۔ اس دوران میں بے ہوش ہوگیا۔ کچھ دیر بعد ہوش آیا تو دیکھا بیڑیاں کھول دی گئی ہیں۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا: ''ہم نے تمہیں اوندھے منہ گرایا تھا۔ پیروں سے روندا تھا۔''

میں نے کہا: ''مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔'' [2]

---

[1] یہ ماہِ رمضان تھا اور ستمبر کے گرم دن۔ امام صاحب پابندی سے روزے رکھ رہے تھے، پیاس سے حالت غیر ہونے کے باوجود پانی نہیں پیتے تھے۔ کسی ہمدرد نے کہا کہ ایسی حالت میں جان بچانے کے لیے لچک کی گنجائش نکلتی ہے۔ مگر انہوں نے اس بات پر توجہ نہ دی۔ (تاریخ الاسلام للذھبی: ۱۸/۱۱۰، للعربی)

[2] البدایة والنهایة: ١٤/٤٠٠ تا ٤٠٤

دربار کی اس فضا سے ظاہر ہوتا ہے کہ معتصم ذاتی طور پر امام احمد رحمہ اللہ سے رعایت کرنا چاہتا تھا مگر قاضی ابن ابی دُواد معتزلی اسے برابر اشتعال دلاتا رہا اور اس کی حمیت پر چوٹ کرتا رہا کہ لوگ کیا کہیں گے: خلیفہ اپنے بھائی کے مذہب سے ہٹ گیا ہے۔ اس طرح معتصم کو غصہ دلایا گیا۔ امام سیوطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ معتصم کو جب غصہ آتا تھا تو آپے میں نہیں رہتا تھا، اس حال میں وہ کسی کو قتل بھی کرا دیتا تو اسے پروا نہ ہوتی۔ ①

شاید ایسی ہی کیفیت میں اس نے امام احمد رحمہ اللہ پر سزا جاری کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ معتزلی علماء اور ان کے حاشیہ بردار افسران تو پہلے ہی تلے بیٹھے تھے؛ اس لیے جی بھر کر سزا دی گئی۔ محمد بن اسماعیل کہتے ہیں کہ امام احمد رحمہ اللہ کو جو کوڑے مارے گئے ان میں سے ایک کوڑا اگر کسی ہاتھی کو مارا جاتا تو وہ چیخ مار کر بھاگ جاتا۔ ②

ابوالہیثم کے لیے دعا:

سزا جاری ہونے سے پہلے مشیتِ الٰہیہ نے امام احمد رحمہ اللہ کے کانوں میں ایک جرائم پیشہ شخص ابوالہیثم کی زبان سے چند ایسے فقرے ڈلوا دیے جنھوں نے انھیں استقامت کا پہاڑ بنا دیا۔ امام احمد رحمہ اللہ کے صاحبزادے کہتے ہیں کہ میرے والد اکثر و بیشتر کہا کرتے تھے: ''اللہ ابوالہیثم پر رحم کرے، اللہ اس کی مغفرت کرے، اللہ اس سے درگزر کرے۔''

ایک بار میں نے پوچھ ہی لیا: ''یہ ابوالہیثم کون تھا؟''

فرمایا: ''تم ابوالہیثم کو نہیں جانتے؟'' میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو فرمایا:

''جب مجھے کوڑے مارنے کے لیے لے جانے لگے تو کسی نے میرا کپڑا کھینچا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک جوان تھا، وہ بولا: مجھے پہچانتے ہیں؟ میں نے کہا: نہیں۔ وہ بولا: میں مشہور چور اور بدمعاش ابوالہیثم ہوں۔ میرا نام سرکاری فائلوں میں درج ہے۔ مجھے مختلف اوقات میں اب تک اٹھارہ سو کوڑے پڑ چکے ہیں۔ یہ سب میں نے شیطان کی اطاعت میں محض دنیا کے لیے برداشت کیا ہے۔ آپ اللہ کی اطاعت میں دین کے لیے جو بھی ہو برداشت کیجیے گا۔'' ③

ان جملوں سے امام صاحب کی ہمت اور قوتِ برداشت بہت بڑھ گئی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یہ واقعہ ۲۵ رمضان ۲۲۱ھ (۱۱ ستمبر ۸۳۶ء) کا ہے۔ امام صاحب کو تیس سے زائد کوڑے مارے گئے۔ ایک قول یہ ہے کہ ۸۰ کوڑے مارے گئے۔ یہ کوڑے نہایت شدید ضرب کے تھے۔'' ④

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۲۴۴

② تاریخ الاسلام للذهبي: ۱۱۲/۱۸، للمرى

نوٹ: منقول ہے کہ سزا کے دوران امام صاحب کا ازار بند ٹوٹنے لگا، آپ نے دعا کی: ''یا الٰہی! اگر میں برحق ہوں تو میرا پردہ نہ کھلنے دے۔'' اللہ کے حکم سے اسی وقت ازار بند جڑ گیا۔ ﴿البداية والنهاية: ۴۰۴/۱۴﴾

بعض حضرات نے سند کا ضعف دیکھتے ہوئے اس واقعے کا انکار کیا ہے اور عقلاً بھی اسے مستبعد کہا ہے، مگر اسے کرامت ماننے میں آخر کیا حرج ہے؟ دیگر اولیائے کرام کے لیے اس سے کہیں زیادہ عجیب کرامات تسلیم کی گئی ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ جیسے ولی کے لیے ایسی معمولی کرامت کے ظہور میں کیا استبعاد ہے؟

③ صفوة الصفوة، ابن جوزى: ۳۴۷/۱

④ البداية والنهاية: ۴۰۳/۱۴، ۴۰۴

امام صاحب رحمہ اللہ کی عزت وتوقیر:

سزا کے بعد امام صاحب رحمہ اللہ کو اٹھا کر وزیر اسحق بن ابراہیم کے گھر لے جایا گیا۔ وہ خون میں لت پت تھے۔ روزہ دار تھے۔ لوگوں کو خطرہ تھا کہ وہ جانبر نہیں ہو سکیں گے؛ اس لیے افطار کرانے کے لیے پانی اور ستو پیش کیے۔ امام صاحب رحمہ اللہ نے انکار کر دیا۔ ظہر کی نماز اسی حالت میں باجماعت ادا کی۔ اس کے بعد جراح حاضر ہوا۔ کوڑوں کی ضرب سے جگہ جگہ گوشت پھٹ کر ادھڑ گیا تھا، اس نے نشتر لگا لگا کر یہ گوشت الگ کیا۔ ①

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ان ایام میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اس واقعے کو یاد کیا کرتے تھے جب انہیں اُموی گورنر یزید بن ہُبیرہ نے ایک سو دس کوڑے لگائے تھے مگر وہ اپنے موقف پر اٹل رہے تھے۔ امام احمد رحمہ اللہ یہ واقعہ یاد کر کے زار و قطار رویا کرتے تھے۔ ②

بہر حال اذیت کے ان دنوں کے بعد اللہ عزّ وجل نے سہولت کے راستے کھول دیے۔ امام احمد رحمہ اللہ امتِ مسلمہ کے نمایاں ترین بزرگ تھے۔ آپ کی جلالتِ قدر اور پرہیزگاری کو اپنے اور پرائے سب مانتے تھے۔ دربار میں بھی آپ کی عزت تھی۔ ایسی نیک ہستی پر ستم ڈھا کر خود معتصم کو بھی ندامت ہوئی۔ اس نے انہیں آزاد کر دیا اور وزیر اسحق بن ابراہیم کے ذمے لگایا کہ ان کا ہر طرح خیال رکھے۔ روزانہ وہ وزیر سے امام صاحب کی خیریت پوچھتا۔ امام صاحب صحت یاب ہوئے تو لوگوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ان کی رہائی اور شفایابی حق کی فتح اور باطل کی شکست تھی۔ خود معتصم نے ان کی صحت پر مسرت ظاہر کی۔ امام صاحب نے خلیفہ سمیت ان تمام لوگوں کو بڑی فراخ دلی سے معاف کر دیا جن سے انہیں ایذا پہنچی۔ ③

امام احمد رحمہ اللہ کی اولوالعزمی اور استقامت نے تاریخ کا دھارا موڑ دیا اور امت کو ایک زبردست اعتقادی لغزش میں مبتلا ہونے سے بچا لیا۔ تاہم حکمران طبقے میں اعتزال کے اثرات، رفتہ رفتہ ہی دور ہوئے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

معتصم کی وفات:

معتصم باللہ نے ۸ سال آٹھ ماہ حکومت کر کے اپنے پایۂ تخت سامرا میں ۱۸ ربیع الاوّل ۲۲۷ھ کو وفات پائی۔ علماء لکھتے ہیں کہ اگر اس کا دامن مسئلۂ خلقِ قرآن میں تشدد سے داغ دار نہ ہوتا تو وہ بنوعباس کا سب سے باعظمت خلیفہ کہلاتا۔ اس نے تمام مخالفین پر فتح حاصل کی اور ملکی استحکام کو برقرار رکھا۔ ④

زراعت سے دلچسپی:

چونکہ وہ خود پڑھا لکھا نہ تھا؛ اس لیے اس کے دور میں علوم وفنون کو کوئی ترقی نہیں ہوئی البتہ محکمۂ فوج اور زرعی ترقی کو

① البداية والنهاية: ٤٠٥،٤٠٤/١٤ ② تاريخ بغداد: ٣٢٨/١٣، ط العلمية؛ وفيات الأعيان: ٤٠٧/٥، ط دار صادر
③ البداية والنهاية: ٤٠٥،٤٠٤/١٤
④ البداية والنهاية: ٢٨٣،٢٨٢/١٤

اس نے انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ زراعت کے متعلق وہ کہا کرتا تھا:

''زمین کو آباد کرنے کے کئی فائدے ہیں: لوگ اسی کی وجہ سے جیتے ہیں۔ اس سے خراج ملتا ہے۔ پیداوار بڑھتی ہے۔ جانوروں کو چارہ ملتا ہے۔ اشیاء سستی ہو جاتی ہیں۔ روزگار کے مواقع زیادہ ہو جاتے ہیں۔ معیشت کو ترقی ملتی ہے۔''

اپنے نائبین کو اس نے کہہ رکھا تھا: ''اگر کوئی بھی زمین ایسی ہو جہاں دس درہم خرچ کر کے ایک سال بعد گیارہ درہم مل سکیں تو مجھ سے پوچھے بغیر اسے کاشت کرادو۔''[1]

معتصم اور آٹھ کا ہندسہ:

معتصم کی زندگی میں آٹھ کا عدد خصوصیت کا حامل رہا ہے۔ مؤرخین نے اس کی درج ذیل مثالیں پیش کی ہیں:

- وہ بنو عباس کا آٹھواں خلیفہ تھا۔
- حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی آٹھویں پشت سے تھا۔
- اپنے باپ کا آٹھواں بیٹا تھا۔
- ۴۸ سال عمر پائی۔
- ۲۱۸ھ میں تخت نشین ہوا۔
- آٹھ سال آٹھ ماہ اور آٹھ دن حکومت کی۔
- اس کے آٹھ بیٹے تھے۔
- آٹھ ہی بیٹیاں تھیں۔
- اس نے آٹھ دشمنوں کو قتل کیا۔
- آٹھ فتوحات حاصل کیں۔[2]

عباسی حکومت کس حد تک اسلامی آئین کے مطابق تھی؟

مامون الرشید اور معتصم باللہ کا غلط عقائد کا حامل اور گمراہی کا داعی بن کر بھی مسندِ خلافت پر متمکن رہنا، اس سوال کا جواب دے دیتا ہے کہ عباسی حکومت کس حد تک اسلامی آئین کے مطابق تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافتِ عباسیہ کا اسلامی حدود کا پابند ہونا، حکمران کی منشأ پر موقوف تھا۔ حکومتی ضوابط میں حکمران کا صحیح العقیدہ ہونا بھی شرط نہ تھا۔ اگر عباسی آئین میں یہ شق ہوتی تو مامون الرشید یا معتصم باللہ کو بدعقیدگی کا شکار ہوتے ہی معزول ہونا پڑتا۔

---

[1] مروج الذهب: ٤/٣٤٤، ٣٤٥، ط الجامعة اللبنانية

[2] تاريخ الخلفاء، ص ٢٤٤، ط نزار

معتصم کے بعد واثق بھی معتزلی تھا۔ وہ بھی اپنی زندگی پوری کر کے رخصت ہوا۔ عباسی خلافت کے آخری دور میں خلیفہ الناصر اثناعشری تھا مگر وہ ۴۷ سال خلیفہ رہا اور مروجہ سیاست کے کسی اصول کو بنیاد بنا کر اس کی معزولی ممکن نہ ہوئی۔ دربارِ خلافت میں کوئی ایسا ضابطہ نہ تھا کہ جس کے تحت درباری ان بدعقیدہ خلفاء کو معزول کر سکتے۔

اسلامی نظامِ حکومت میں حکمرانی ''امامتِ کبریٰ'' ہے۔ جس طرح ''امامتِ صغریٰ'' یعنی نماز کی امامت میں، امام کا صحیح العقیدہ ہونا شرط ہے، اسی طرح قوم کی سیاسی امامت میں سربراہِ حکومت کا صحیح العقیدہ ہونا بھی شرطِ اوّل ہے۔ پس عباسی حکومت میں مامون، معتصم، واثق اور ناصر جیسی مثالیں یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں کہ عباسی خلافت چاہے صورۃً خلافت ہو مگر حقیقت میں وہ ''ملوکیت'' تھی جو دیگر بادشاہتوں کی طرح طاقت، مطلق العنانی، موروثیت اور خاندانی احترام جیسے اصولوں پر قائم تھی۔ اگرچہ عدالتوں میں فقہ اسلامی رائج تھی مگر انتقالِ اقتدار کا مرحلہ اور سربراہانِ مملکت کا عزل ونصب اسلامی سیاست کے بنیادی اصولوں کا بھی پابند نہیں تھا۔

پس نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمانِ مبارک بالکل سچا ہے:

''اَلْخِلَافَةُ بَعْدِی ثَلٰثُوْنَ سَنَةً،ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا .'' [1]

◆◆◆

[1] میرے بعد خلافت تیس سال رہے گی۔ اس کے بعد بادشاہت ہوگی۔ (صحیح ابن حبان، ح: ۶۹۴۳، ط الرسالة؛ مجمع الزوئد: ۲۳۹/۱) یہ حدیث سنداً صحیح ہے۔ اس پر مفصل بحث ہم حصہ دوم کے آخری باب میں اعتراضات کے جوابات کے تحت کر چکے ہیں۔

الواثق باللہ بن معتصم

ہارون بن محمد

ربیع الاوّل ۲۲۷ھ......تا......ذوالحجہ ۲۳۲ھ

دسمبر 841ء......تا......اگست 847ء

معتصم کے بعد اس کی وصیت کے مطابق اس کا بیٹا ہارون، ''الواثق باللہ'' کا لقب اختیار کر کے خلیفہ بنا۔ وہ قراطیس نامی ایک رومی باندی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اس کی خلافت کا زمانہ بیرونی خطرات سے محفوظ گزرا؛ کیوں کہ عالمِ اسلام کا سب سے بڑا حریف قیصر توفیل بارہ برس حکومت کے بعد اسی سال فوت ہوا تھا۔ توفیل کا بیٹا کم سن تھا؛ لہٰذا اس کی بیوی نے حکومت سنبھال لی، یوں سالہا سال تک روم کی طرف سے اسلامی سرحدوں پر کوئی حملہ نہ ہوا۔[1]

واثق کے دور میں بھی ترک امراء امورِ حکومت کے مختار رہے۔ سالارِ فوج اشناس نے واثق کے دور میں بہت ترقی کی۔ واثق کی طرف سے اسے ہیروں جڑا تاج پہنایا گیا تھا اور نائب حکومت کی حیثیت دی گئی تھی۔ تاہم آخر میں واثق نے احتیاطاً اس کے اختیارات کم کر دیے۔ جس کے بعد ۲۳۰ھ میں اشناس کا انتقال ہو گیا۔[2]

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی روپوشی:

معتصم کے آخری سالوں میں امام احمد بن حنبل مجلسِ حدیث اور مسندِ افتاء کو رونق بخشتے رہے۔ مگر واثق کے آتے ہی علمائے حق کے گرد گھیرا تنگ ہو گیا۔ امام احمد بن حنبل کو شہر بدر ہونے کا حکم دے دیا گیا جس کے بعد وہ واثق کی وفات تک روپوشی کی زندگی گزارتے رہے۔[3]

احمد بن نصر کا خروج اور انجام:

واثق کے دور کا سب سے دل فگار واقعہ احمد بن نصر رحمہ اللہ کا خروج اور قتل ہے۔ یہ عراق کے مشہور محدث اور عابد و زاہد بزرگ تھے۔ تاریخ میں ایسے واقعات بکثرت ہیں جب کچھ لوگوں نے علماء و مشائخ اور بزرگانِ دین کو خوش کن امیدیں دلا کر خلافتِ راشدہ کا نظام زندہ کرنے کے لیے کھڑا کیا۔ بعض مواقع پر علماء کو کھڑا کرنے والے مخلص مگر نادان دوست ہوا کرتے تھے۔ وہ اس سیاسی بصیرت سے بالکل کورے ہوتے تھے جو کسی تحریک یا انقلاب کی کامیابی کے لیے

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۲۸۹/۱۴ [3] تاریخ الخلفاء، ص ۲۶۲
[2] تاریخ الاسلام للذھبی: ۱۱۶/۱۸، تدمری

لازمی ہوتی ہے۔ بہت سے مواقع پر ایسی تحریکوں کو ابھارنے والے سازشی اور مکار نکلے جن کے اصل اہداف کچھ اور تھے؛ اسی لیے ایسی تحریکیں جان بوجھ کر کمزور بنیادوں پر شروع کی جاتی رہیں تاکہ وہ مقصد حاصل ہی نہ ہو جو علماء کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ دونوں صورتوں میں مصائب کا نشانہ علماء اور بزرگانِ دین ہی بنتے رہے اور ان کے پاک خون کے چھینٹوں سے اوراقِ تاریخ سرخ ہوتے رہے۔

احمد بن نصر رحمہ اللہ بھی ایسے ہی ایک بزرگ تھے۔ وہ ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد نصر بن مالک رحمہ اللہ بغداد کے ان اساتذۂ حدیث میں سے تھے جن پر شاگرد ٹوٹے پڑتے تھے۔ اس کے ساتھ وہ ترکِ منکرات، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ ۲۰۱ھ میں جب خلیفہ مامون کی بغداد سے طویل غیر حاضری کے سبب شہر میں غنڈہ گردی عام ہوئی تھی تو نصر بن مالک رحمہ اللہ نے لوگوں سے اپنی اطاعت کی بیعت لے کر شہر کا نظام سنبھالنے اور غنڈہ گردی ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

یہی اصلاحی اور داعیانہ ذوق احمد بن نصر رحمہ اللہ کو ورثے میں ملا تھا۔ وہ بغداد کو ہر قسم کی معصیت سے پاک کر کے ایک مثالی اسلامی معاشرے میں تبدیل کرنے کا زبردست جوش رکھتے تھے۔ ان کے بیانات اور تقاریر سے یہی پیغام ملتا تھا کہ مسلمان پورے پورے مسلمان بن جائیں اور حکمران سے لے کر ایک چرواہے تک ہر شخص سو فی صد شریعت کی پابندی کرنے لگے۔ اسلام کی بالادستی کا یہ جذبہ رکھنے والا عالم بھلا ایک اعتقادی مسئلے میں کہاں خاموش رہ سکتا تھا؛ اس لیے احمد بن نصر رحمہ اللہ مسئلہ خلقِ قرآن پر بھی تقاریر کرتے تھے اور برملا کہتے تھے: ''قرآن مخلوق نہیں۔ یہ اللہ کا کلام ہے جو نازل کیا گیا ہے۔'' ان کی خوبیوں اور حق گوئی نے انہیں شہر کے دیندار لوگوں کا محبوب بنادیا تھا۔

واثق باللہ مسئلہ خلقِ قرآن میں مامون اور معتصم سے کہیں زیادہ تشدد پسند تھا۔ وہ احمد بن نصر رحمہ اللہ کی ان سرگرمیوں سے سخت نالاں تھا اور ان پر ہاتھ ڈالنے کا مناسب موقع دیکھ رہا تھا۔

ان دنوں احمد بن نصر کے گرد جانثاروں کی ایک بھیڑ جمع ہونے لگی تھی۔ ان میں ابو ہارون اور طالب نامی دو شہری پیش پیش تھے۔ انہوں نے ترکِ منکرات اور اصلاحِ عقائد کی اس تحریک کو باقاعدہ ایک انقلابی جماعت کی شکل دینے کی کوشش شروع کر دی۔ ایک نے شہر کے مشرقی ضلعے میں لوگوں سے احمد بن نصر کے لیے بیعت لینا شروع کی اور دوسرے نے شہر کے مغربی ضلعے میں۔ اس وقت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ بقیدِ حیات تھے اور بغداد ہی میں تھے۔ خلقِ قرآن کے مسئلے میں ان کی استقامت کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔ علم میں بھی وہ احمد بن نصر رحمہ اللہ سے کہیں بڑھ کر تھے مگر انہوں نے خود کوئی ایسی تحریک چلائی نہ دوسروں کو اپنے گرد جمع ہونے دیا اور نہ ہی احمد بن نصر رحمہ اللہ کی اس تحریک سے کوئی تعلق رکھا۔

یکم شعبان ۲۳۱ھ کو احمد بن نصر رحمہ اللہ کے لیے نیکی کا حکم دینے، گناہوں سے روکنے اور حکمران کے بدعتی ہونے کے سبب اس کے خلاف خروج کرنے پر ہزاروں افراد سے خفیہ طور پر باقاعدہ بیعت لی گئی، کارکنان کی حوصلہ افزائی کے لیے ابو ہارون اور طالب نے ہر ایک کو ایک ایک دینار ہدیہ پیش کیا۔ طے ہو گیا کہ ۳ شعبان کی شب شہر کے ہر محلے میں

طبل اور نقارے بجائے جائیں گے، یہ آواز سنتے ہی تحریک کے تمام کارکن یکدم جمع ہو کر ہلہ بول دیں گے۔
تحریک جس قدر سطحی اور سرسری انداز میں چلائی جارہی تھی وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اگر ابو ہارون اور طالب خود کسی کے کمانتے نہیں تھے اور احمد بن نصر کو پھنسوانے کا تہیہ نہیں کیے ہوئے تھے تو پھر انہیں عقل سے پیدل ماننا پڑے گا۔ ایک صدی سے قائم دنیا کی سب سے بڑی حکومت جسے نفسِ زکیہ جیسے عالی نسب سادات اور برامکہ جیسے سیاست دان نہ ہلا سکے، راتوں رات کس طرح گرائی جاسکتی تھی۔ حریف کی طاقت، وسائل کے تناسب اور حالات کے رخ کو نظر انداز کر کے جو بھی تحریک چلائی جائے گی اس کا انجام عبرت ناک ہی ہوگا۔
احمد بن نصر رحمہ اللہ کی تحریک کا بھی یہی حال ہوا کہ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہوگئی۔ ان کے کارکنوں میں بھلے برے بھی قسم کے لوگ شامل تھے۔ ان میں دو شرابی بھی تھے۔ ابو ہارون کے دیے ہوئے دیناروں سے انہوں نے شراب خریدی۔ ۲ شعبان کی شب وہ پی پلا کر فارغ ہوئے تو حالتِ خمار میں انہیں خیال ہوا کہ آج ۳ شعبان ہے۔ انہوں نے اپنے محلے میں طبل بجانا شروع کر دیے۔ دوسرے کارکنوں نے یہ آواز سنی تو ٹھٹک گئے مگر کوئی باہر نہیں نکلا۔ اس دوران پولیس والوں کے کان کھڑے ہو چکے تھے۔ انہوں نے چھاپہ مار کر دونوں شرابیوں کو پکڑ لیا۔ انہیں مار پیٹ کر آدھی رات کو اس اودھم بازی کی وجہ پوچھی گئی تو دونوں نے ساری کہانی سنادی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ احمد بن نصر گرفتار کر لیے گئے۔ بغداد کے نائب حاکم محمد بن ابراہیم نے جب باز پرس کی تو احمد بن نصر رحمہ اللہ نے اپنے عزائم کا اقرار کر لیا۔
تحریک کے ۲۷ سرکردہ افراد بھی پکڑے گئے جنہیں کال کوٹھریوں میں پھینک دیا گیا۔ ان میں ابو ہارون اور طالب کا نام کہیں نہیں ملتا۔ ان کی گرفتاری کا کہیں کوئی ذکر ہے نہ سزا پانے کا۔
جب احمد بن نصر رحمہ اللہ کو خلیفہ کے پاس سامرا بھیجا گیا تو غیر متوقع طور اس نے ان سے بغاوت کی تیاری کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا بلکہ براہِ راست عقائد کے بارے میں پوچھنے لگا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاید احمد بن نصر کی تحریک انہیں پھانسنے کا ایک جال تھا تاکہ انہیں صحیح عقیدہ بیان کرنے کی عبرت ناک سزا دی جائے۔ جب انہیں رسیوں میں جکڑ کر چمڑے کے فرش پر دربار میں کھڑا کیا گیا تو خلیفہ نے پوچھا: ''کیا قرآن مخلوق ہے؟''
وہ بولے: ''قرآن اللہ کا کلام ہے؟'' خلیفہ نے پوچھا: ''اللہ کے دیدار کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''
فرمایا: ''اللہ کا ارشاد ہے: وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ
''اس روز کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھنے والے ہوں گے۔''[1]
اور حدیث میں ہے کہ تم اپنے رب کو قیامت میں یوں دیکھو گے جیسے کسی دھکم پیل کے بغیر چاند کو دیکھتے ہو۔[2]
واثق نے جھلا کر کہا: ''تم ہلاک ہو جاؤ۔ کیا میں اپنے رب کو ایسا مان کر کافر نہ ہو جاؤں گا۔''
پھر اس نے درباریوں سے مشورہ لیا کہ کیا سزا دی جائے۔

[1] سورۃ القیامۃ، آیت: ۲۲، ۲۳
[2] انکم سترون ربکم کما ترون هذا القمر لا تضامون فی رؤیته. (صحیح البخاری، ح: ۷۴۳٤، کتاب التفسیر)

مغربی بغداد کے قاضی عبدالرحمٰن بن اسحٰق نے کہا: ''اس کا خون حلال ہے۔''

قاضی احمد بن ابی دُواد نے ذرا نرمی سے کام لیا اور کہا: ''کافر تو ہے مگر اسے توبہ کا موقع دینا چاہیے۔ شاید اس کی عقل جاتی رہی ہو۔'' ابو عبداللہ ارمنی بولا: ''امیر المومنین! اس کا خون مجھے پلا دیجیے۔'' واثق بولا: ''ایسا ہی ہوگا۔''

اس نے عَمرو بن معدی کرب کی مشہورِ زمانہ تلوار ''صمصامہ'' اٹھائی جو خلفائے بنوعباس کے پاس نسل در نسل چلی آرہی تھی۔ اس کے تین وار کر کے احمد بن نصر کو قتل کر دیا۔ یہ افسوس ناک واقعہ ۲۹ شعبان ۲۳۱ھ کا ہے۔

قتل کے بعد احمد بن نصر رحمہ اللہ کا سر قلم کر کے بغداد میں نصب کر دیا گیا اور ساتھ ایک تختی آویزاں کر دی گئی جس پر لکھا تھا: ''یہ کافر مشرک احمد بن نصر کا سر ہے جسے واثق باللہ نے اتمام حجت کے بعد قتل کیا۔''①

احمد بن نصر رحمہ اللہ سے خروج میں یقیناً غلطی ہوئی تھی مگر انہوں نے جان کی بازی لگا کر جابر حکمران کے سامنے جس ہمت و استقلال کے ساتھ صحیح عقیدہ بیان کیا، اس نے ان کا نام تاریخ میں ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا۔

ان کی شہادت کے بعد اللہ کی طرف سے کچھ ایسی نشانیاں بھی دکھائی گئیں جن سے اہلِ حق کی صداقت اور اہلِ بدعت کا جھوٹ ثابت ہو گیا۔ واثق کے بھائی متوکل کا رجحان اہلِ سنت کی طرف تھا؛ اس لیے اسے احمد بن نصر کے قتل پر بڑا دکھ ہوا۔ اس نے ایک بار دربار کے سرکردہ عمائد اور سرکاری علماء سے الگ الگ پوچھا کہ احمد بن نصر کا قتل بھلا کس طرح جائز تھا؟ جواب میں ایک وزیر نے کہا: ''امیر المؤمنین واثق نے اسے کفر کی وجہ سے قتل کیا تھا۔ اگر یہ بات نہ ہو تو اللہ مجھے آگ میں جلائے۔'' ایک نامور امیر نے کہا: ''اگر وہ کفر کی وجہ سے قتل نہ ہوا ہو تو اللہ میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔'' قاضی احمد بن ابی دُواد نے کہا: ''اگر وہ کفر پر نہ قتل کیا گیا ہو تو اللہ مجھے فالج میں مبتلا کر دے۔''

ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ وہ وزیر آگ میں جل کر مرا۔ وہ امیر دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور اس کی بوٹی بوٹی الگ کر دی گئی۔ قاضی احمد بن ابی دُواد پر فالج گرا اور آخری عمر معذوری میں گزری۔②

رومیوں سے قیدیوں کا تبادلہ:

اس دوران واثق باللہ نے سلطنتِ روما سے گزشتہ کئی سالوں کی جنگوں میں قید کیے گئے مسلمانوں کو چھڑانے کا فیصلہ کیا۔ ۱۰ محرم ۲۳۱ھ کو طرطوس سے کچھ دور سلوقیہ کی نہر لامس پر قیدیوں کا تبادلہ شروع ہوا۔ یہاں واثق نے ایک بار پھر اعتقادی مسئلے میں غیر معمولی تشدد کا مظاہرہ کیا۔ اس کا حکم تھا کہ جو قیدی معتزلہ کے عقائد کا اقرار کرتے ہوئے کہے کہ قرآن مخلوق ہے اور آخرت میں اللہ کا دیدار نہیں ہوگا، اسے لے لیا جائے۔ جو یہ کہنے سے انکار کرے، اسے واپس رومیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اس طرح چار ہزار ۳۶۲ قیدی آزاد ہو کر اپنے گھروں کو واپس پہنچے۔③

---

① البداية والنهاية: ۱٤/ ۳۱۰ تا ۳۱۵

② البداية والنهاية: ۱٤/ ۳۱۹

③ البداية والنهاية: ۱٤/ ۳۱۰

امام ابوعبدالرحمٰن الازدی رحمہ اللہ کی حق گوئی...... واثق باللہ کے خیالات میں تبدیلی:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی عزیمت و قربانی کی وجہ سے صحیح عقیدے اور ایمان و ایقان پر جم گئے تھے تاہم حکمران کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، مگر مشیتِ الٰہیہ جب ہدایت کا فیصلہ کرتی ہے تو کبھی اس کے لیے ایسے بندوں کو منتخب کر لیتی ہے جنہیں شہرت تو نصیب نہیں ہوتی مگر ان کی ہمت، بصیرت اور حق گوئی تاریخ کا رخ موڑ دیتی ہے۔

وفات سے کچھ مدت پہلے واثق باللہ کے خیالات میں بھی مثبت تبدیلی آ گئی جس کا سہرا ایک گمنام عالم کے سر تھا۔ یہ ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن محمد الازدی رحمہ اللہ تھے۔ یہ امام ابوداؤد اور امام نسائی رحمہما اللہ کے استاذ تھے۔ بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے مگر دنیا ان سے زیادہ واقف نہ تھی۔ شام کے قصبے مصیصہ کے رہائشی تھے جو انطاکیہ کے شمال میں ایشیائے کوچک کی سرحد پر ہے۔ انہیں خلقِ قرآن کا انکار کرنے کی پاداش میں ایک مدت تک قید رکھا گیا۔

ایک دن واثق کو خیال آیا تو کہا: ''اس شیخ کو میرے پاس لاؤ۔''

انہیں بیڑیاں پہنا کر دربار میں پیش کیا گیا۔ ان کا قد طویل، وضع قطع باوقار اور چہرہ بے حد نورانی تھا۔ دیکھتے ہی واثق کی آنکھوں میں احترام جھلکنے لگا۔ ابوعبدالرحمٰن رحمہ اللہ نے آتے ہی السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا۔ واثق نے جواب نہ دیا۔

ابوعبدالرحمٰن رحمہ اللہ بولے: ''امیر المؤمنین! آپ نے میرے ساتھ ان آداب کے مطابق برتاؤ نہیں کیا جن آداب کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

وَإِذَا حُيِّيْتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا

''اور جب تمہیں دعائے سلامتی دی جائے تو تم اُس سے بہتر دعا دو، یا اسی کو لوٹا دیا کرو۔ بے شک اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔''[1]

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سلام کا جواب دینے کا حکم دیا ہے۔''

اب واثق نے کہا: وعلیکم السلام۔'' پھر کہا: ''اے شیخ! قاضی احمد بن ابی دُواد جو پوچھیں اس کا جواب دیں۔''

پھر قاضی سے کہا: ''ان سے سوال و جواب کرلو۔''

ابوعبدالرحمٰن رحمہ اللہ بولے: ''امیر المؤمنین! میں قیدی ہوں، بیڑیوں میں بندھا ہوا ہوں۔ جیل میں تیمم کر کے نماز پڑھتا رہا۔ مجھے وضو کے لیے پانی تک نہیں دیا جاتا تھا۔ آپ میری بیڑیاں کھولنے کا حکم دیں اور میرے لیے پانی لانے کا حکم دیں تاکہ میں پاک ہو کر نماز ادا کرلوں۔ پھر آپ ضرور سوال کریں۔''

واثق کے حکم پر انہیں پانی لا کر دیا گیا۔ وہ وضو کر کے نماز سے فارغ ہوئے تو واثق نے قاضی ابن ابی دُواد سے کہا: ''اب ان سے سوال کرو۔''

---

[1] سورة النساء، آيت: ٨٦

ابوعبدالرحمٰن رحمہ اللہ بولے: ''قاضی صاحب مباحثے کے موقع پر کمزور، معمولی اور ناکارہ ثابت ہوتے ہیں۔''

واثق کو غصہ آ گیا۔ کہنے لگا: ''تم قاضی صاحب کے بارے میں کہہ رہے ہو کہ وہ بحث میں کمزور اور ناکارہ ہیں۔''

ابوعبدالرحمٰن رحمہ اللہ نے کہا: ''امیر المؤمنین! تحمل سے کام لیں۔ کیا مجھے ان سے بات کرنے کی اجازت ہے؟''

واثق نے کہا: ''ہاں اجازت ہے۔''

ابوعبدالرحمٰن رحمہ اللہ نے کہا: ''میں سوال کروں گا۔ انہیں کہیے کہ جواب دیں۔''

واثق نے کہا: ''ٹھیک ہے، آپ سوال کریں۔''

ابوعبدالرحمٰن رحمہ اللہ نے قاضی سے پوچھا: ''آپ کس بات کی دعوت دے رہے ہیں؟''

قاضی نے کہا: ''اس بات کی کہ قرآن مخلوق ہے۔''

ابوعبدالرحمٰن رحمہ اللہ بولے: ''یہ بات جس کی آپ لوگوں کو دعوت دے رہے ہیں کہ قرآن مخلوق ہے، کیا یہ دین کا ایسا حصہ ہے جس کے بغیر دین مکمل نہیں ہوتا؟'' قاضی صاحب بولے: ''ہاں بالکل۔''

ابوعبدالرحمٰن رحمہ اللہ نے پوچھا: ''جس چیز کا آپ پرچار کرتے ہیں کیا اس کی دعوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی؟''

قاضی نے کہا: ''نہیں۔''

ابوعبدالرحمٰن رحمہ اللہ نے فرمایا: ''کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کی تبلیغ کی تھی؟''

قاضی نے کہا: ''نہیں۔''

ابوعبدالرحمٰن رحمہ اللہ نے دریافت کیا: ''کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی دعوت دی تھی؟'' قاضی نے کہا: ''نہیں۔''

ابوعبدالرحمٰن رحمہ اللہ نے سوال کیا: ''کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کا پرچار کیا تھا؟''

قاضی نے کہا: ''نہیں۔''

ابوعبدالرحمٰن رحمہ اللہ نے پوچھا: ''کیا ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کی طرف بلایا تھا؟''

قاضی نے کہا: ''نہیں۔''

ابوعبدالرحمٰن رحمہ اللہ نے کہا: ''تو یہ ایک ایسی بات ہے جس کی دعوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے نہیں دی اور آپ اس کی دعوت دے رہے ہیں؟ اب یہ بتائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم کو اس عقیدے کا علم تھا یا نہیں؟''

قاضی نے کہا: ''علم تو تھا۔''

ابوعبدالرحمٰن رحمہ اللہ بولے: ''آپ کہتے ہیں کہ انہیں علم تھا مگر وہ خاموش رہے۔ تو پھر آپ ایسی چیز کی دعوت کیوں

رہے ہیں جس کی دعوت رسول اللہ ﷺ نے نہیں دی اور لوگوں کو اس کے بغیر چھوڑ دیا۔ پھر تو ہمارے، آپ کے اور تمام مسلمانوں کے لیے گنجائش ہے کہ ہم اس بارے میں خاموش رہیں۔ اور اگر آپ کہتے ہیں حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم کو اس عقیدے کا علم نہیں تھا مگر مجھے علم ہے تو میں کہوں گا، اے احمق بن احمق! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ اور خلفائے راشدین کو ایک عقیدے کا علم نہ ہو اور تم اور تمہارے ساتھی اس سے آگاہ ہوں؟''

قاضی احمد بن ابی دُواد کو چپ لگ گئی۔ واثق بھی دنگ رہ گیا۔

ابوعبدالرحمن رحمہ اللہ نے کہا: ''امیر المؤمنین! یہ ایک بات ہوئی۔''

پھر قاضی سے کہا: ''مجھے بتایئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کہا ہے: اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ [1]

(آج کے دن میں نے مکمل کردیا تمہارے لئے تمہارا دین)

مگر آپ کہتے ہیں کہ دین اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک آپ کے خلقِ قرآن کے عقیدے کو نہ اپنایا جائے۔ اب اللہ سچے ہیں جو دین کو مکمل کہہ رہے ہیں یا تم سچے ہو جو دین کو ناقص کہتے ہو؟''

قاضی ابن ابی دُواد سے اب بھی کوئی جواب نہ بنا۔

ابوعبدالرحمن رحمہ اللہ نے کہا: ''امیر المؤمنین! یہ دو باتیں ہوگئیں۔''

دربار میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شیخ نے چند لمحوں کے توقف کے بعد قاضی صاحب سے پوچھا:

''اللہ نے اپنے رسول سے کہا: یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ

(اے رسول! تبلیغ کیجیے اس چیز کی جو آپ کی طرف نازل کی گئی آپ کے رب کی طرف سے۔) [2]

تو آپ کا یہ عقیدہ جس کی آپ لوگوں کو دعوت دے رہے ہیں، ان چیزوں میں شامل تھا یا نہیں جو کہ رسول اللہ ﷺ نے امت تک پہنچائیں؟''

قاضی صاحب اب بھی کوئی جواب نہ دے سکے۔ بزرگ نے کہا: ''امیر المؤمنین! یہ تین باتیں ہوگئیں۔''

پھر فرمایا: ''اچھا یہ بتایئے اگر حضور ﷺ کو اس عقیدے کا علم تھا جس کا آپ پرچار کرتے ہیں تو کیا حضور ﷺ کے لیے اس بارے میں خاموشی اختیار کرنے کی گنجائش تھی یا نہیں؟''

قاضی نے کہا: ''ہاں ان کے لیے اس کی گنجائش تھی۔''

ابوعبدالرحمن رحمہ اللہ نے پوچھا: ''اور کیا اسی طرح حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے لیے بھی؟'' قاضی نے کہا: ''ہاں ان کے لیے بھی گنجائش تھی۔''

ابوعبدالرحمن رحمہ اللہ واثق کی طرف متوجہ ہو کر بولے: ''امیر المؤمنین! جس چیز کی رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابہ کے لیے گنجائش ہو اور پھر بھی ہمیں اس کی گنجائش نہ ملے تو اللہ ہمیں کبھی فراخی نصیب نہ کرے۔''

[1] سورۃ المائدۃ، آیت: ٤ [2] سورۃ المائدۃ، آیت: ٦٦

واثق بھی کہہ اٹھا: ''ہاں! جس چیز کی وسعت رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابہ کے لیے ہو اور ہمیں نہ ملے تو اللہ ہمیں کبھی فراخی نصیب نہ کرے۔'' پھر حکم دیا: ''ان کی زنجیریں کھول دی جائیں۔''

جب سپاہی زنجیریں کھولنے آگے بڑھے تو ابوعبدالرحمٰن رحمہ اللہ زنجیروں کو اپنی طرف کھینچنے لگے۔

واثق نے سپاہیوں کو کہا: ''ٹھہر جاؤ۔'' پھر ابوعبدالرحمٰن رحمہ اللہ سے پوچھا: ''انہیں کیوں اپنی طرف کھینچ رہے ہیں؟''

وہ بولے: ''چاہتا ہوں کہ جب میں مروں تو وصیت کر جاؤں کہ یہ زنجیریں میرے ساتھ میرے کفن اور بدن کے درمیان رکھ دی جائیں۔ پھر قیامت کے دن میں اللہ کی بارگاہ میں کہوں: میرے رب! اس بندے سے پوچھ کہ اس نے کیوں مجھے قید کیا اور کیوں مجھے پکڑ کر میرے اہل وعیال کو پریشان کیا۔''

یہ سن کر واثق کا دل بھر آیا اور وہ زاروقطار رونے لگا۔ شامی بزرگ بھی رو رہے تھے اور دربار کا کوئی فرد ایسا نہ تھا جس کی ہچکیاں نہ بندھ گئی ہوں۔ جب آنسو تھمے تو واثق نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: ''شیخ! مجھے معاف کر دیجیے۔''

ابوعبدالرحمٰن رحمہ اللہ بولے: ''میں نے تو اسی وقت رسول اللہ ﷺ کے خاندان کے احترام میں آپ کو معاف کر دیا تھا جب مجھے گھر سے نکالا گیا تھا۔''

واثق کا چہرہ مسرت سے کِھل اٹھا۔ کہنے لگا: ''آپ ہمارے پاس ہی رہیے۔ مجھے خوشی ہوگی۔''

ابوعبدالرحمٰن رحمہ اللہ نے کہا: ''میرا سرحد پر رہنا زیادہ مفید ہے، میں بوڑھا بھی ہوں۔ میری کچھ ضروریات بھی ہیں۔''

واثق نے کہا: ''آپ جو چاہیں مانگ سکتے ہیں۔''

وہ بولے: ''مجھے اسی جگہ جانے دیں جہاں سے اس ظالم نے مجھے نکالا تھا۔''

واثق نے قاضی احمد بن ابی دُواد کو کہا: ''ان بزرگ کو راستے کا خرچ دے کر روانہ کر دو۔''

واثق نے انہیں مال ودولت پیش کیا مگر وہ کچھ بھی قبول کیے بغیر رخصت ہو گئے۔

یہ پورا واقعہ واثق کے بیٹے مہتدی نے نقل کیا ہے جو اس مجلس میں موجود تھا اور بعد میں خلیفہ بھی بنا۔ اس کا کہنا تھا: ''میں نے اسی مجلس میں غلط عقیدے سے توبہ کر لی تھی اور میرا گمان ہے کہ واثق نے بھی اپنی رائے سے رجوع کر لیا تھا۔''[1]

اس طرح علمائے حق کی کوششیں رنگ لا کر رہیں، ان کی دعوت حکومتی ایوانوں اور شاہی محلات کے بالاخانوں تک پہنچی، عباسی شہزادے، وزراء اور امراء جوق در جوق غلط عقیدے سے تائب ہونے لگے۔ وہ سب دیکھ رہے تھے کہ معتزلی علماء کے پاس صرف الفاظ ہیں جبکہ دوسری طرف حقیقت کی روشنی بھی ہے اور کردار کی وہ بلندی بھی جس کے آگے دل خود بخود جھکنا چاہتے ہیں۔

---

[1] كتاب الاعتصام للشاطبي: ۱/۳۰۸ تا ۳۱۱ ط دار ابن عفان؛ الشريعة للآجري: ۱/٤٥۳، ط دار الوطن؛ قال العصامي بعد ذكر هذه القصة: والشيخ المذكور هو ابو عبدالرحمن عبدالله بن محمد الازدي شيخ ابي داوٗد والنسائي. (سمط النجوم العوالي للعصامي: ۳/٤٥۹، ٤٦۰)

واثق کی وفات:

واثق استسقاء کے مرض میں مبتلا ہوگیا تھا۔ بہت علاج کرایا گیا مگر افاقہ نہ ہوا۔ آخر ۲۴ ذوالحجہ ۲۳۲ھ کو اس کی روح پرواز کرگئی۔ واثق باللہ ۱۹۷ھ میں پیدا ہوا تھا۔ پانچ سال نو ماہ حکومت کی اور ۳۶ سال کی عمر میں وفات پائی۔ [1]

اس کا دور عمومی طور پر امن وامان کا تھا۔ اس کا قیام سامرا میں رہا اور وہیں اس کی تدفین ہوئی۔ سادات بنو فاطمہ اور علویوں سے حسنِ سلوک میں اس نے گزشتہ خلفاء کو پیچھے چھوڑ دیا۔ انہیں مال ودولت سے اس قدر نوازا کہ اس کی وفات کے وقت اس خانوادے کا کوئی فرد ایسا نہ تھا جو مالی لحاظ سے خوش حال نہ ہوگیا ہو۔ [2]

البتہ علمائے حق کے لیے واثق کے ابتدائی پانچ سال سخت آزمائش کے تھے۔ ان کی بہت بڑی تعداد قید کی گئی اور بعض کو سزائے موت دی گئی۔ کئی ایسے تھے جو طرح طرح کے مصائب جھیلتے ہوئے جیل ہی میں دنیا سے رخصت ہوئے۔

✦✦✦

① البداية والنهاية: ١٤/٣٢٥، ٣٢٦

② البداية والنهاية: ١٤/٣٣٠

المتوکل علی اللہ

جعفر بن محمد المعتصم

ذوالحجہ ۲۳۲ھ......تا......شوال ۲۴۷ھ

اگست 847ء......تا......دسمبر 861ء

واثق کے انتقال کے بعد اس کا بھائی جعفر بن معتصم ''متوکل علی اللہ'' کا لقب اختیار کر کے تخت نشین ہوا۔ بعض امراء سابق خلیفہ کے بیٹے محمد سے بیعت کرنا چاہتے تھے مگر ترک افسران متوکل کے حامی تھے؛ اس لیے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ ہوئی۔ متوکل کی بیعت میں آٹھ عباسی خلفاء کے صاحبزادے شریک ہوئے یعنی: منصور بن مہدی، عباس بن ہادی، ابواحمد بن ہارون الرشید، عبداللہ بن امین الرشید، موسیٰ بن مامون، احمد بن معتصم، محمد بن واثق اور خود متوکل کا بیٹا منتصر۔[1] متوکل ۲۰۵ھ میں پیدا ہوا تھا۔ فقہاء و محدثین سے اسے بڑی عقیدت تھی۔ امام شافعی رحمہ اللہ اس کی ولادت سے ایک سال پہلے ۲۰۴ھ میں فوت ہوئے تھے، وہ بعض اوقات انہیں یاد کر کے کہتا تھا:

''کاش! میں ان کا زمانہ پاتا، ان کی زیارت کرتا اور ان سے علم دین سیکھتا۔''[2]

سنت کا احیاء اور بدعات کا خاتمہ:

متوکل معتزلہ، فلاسفہ اور شیعوں کا سخت مخالف تھا۔ اس نے گزشتہ خلفاء کے حکم سے تشیع اور اعتزال کی مخالفت کی پاداش میں قید کیے گئے لوگوں کو آزاد کر دیا۔ اور تمام صوبوں میں احکام بھیج دیے کہ سنتِ نبویہ کی اشاعت اور اہلِ سنت کی حمایت کی جائے۔[3] عقیدۂ خلقِ قرآن پر اس نے پابندی عائد کر دی اور معتزلی و فلسفیانہ نظریات کی تردید کے لیے اس نے محدثین کی خوب حوصلہ افزائی کی اور انہیں پایۂ تخت بلا کر گراں قدر انعامات سے نوازا۔[4] اس طرح سرکاری سطح پر اعتزال اور فلسفے کو پسپائی ہوئی۔ علمی مجالس میں یہ نظریات اگرچہ باقی تھے مگر ان کا زور و شور کم ہو گیا تھا۔

معتصم اور واثق کے دور میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے فتاویٰ اور درس پر پابندی تھی، متوکل نے ہر پابندی اٹھا دی اور ان کے اعزاز و اکرام میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔[5] معتزلہ کے پیشوا قاضی احمد بن ابی دُواد کو برطرف کر کے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مشورے سے اہل سنت کے نامور عالم دین یحییٰ بن اکثم رحمہ اللہ کو قاضی القضاۃ مقرر کر دیا گیا۔[6]

① تاریخ الخلفاء، ص ۲۵۵ ② تاریخ الخلفاء، ص ۲۵٦ ③ سیر اعلام النبلاء: ۳۱/۱۲
④ سیر اعلام النبلاء: ۳٤/۱۲ ⑤ البدایة والنهایة: ۳۵۰/۱٤
⑥ سیر اعلام النبلاء: ۳٦/۱۲؛ البدایة والنهایة: ۳۵۰/۱٤

قاضی احمد بن ابی دُواد نے گزشتہ ادوار میں علمائے حق کو جی بھر کے مشقِ ستم بنایا تھا۔ اب مکافاتِ عمل کے دور میں پہلے ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ پھر وہ عہدے سے معزول ہوئے [1] پھر ان کی دولت اور جاگیروں کو ضبط کر لیا گیا۔ پھر ان کے بیٹے ابوالولید کو گرفتار کیا گیا۔ ذوالحجہ ۲۳۹ھ میں ابوالولید فوت ہوا۔ محرم ۲۴۰ھ میں ابن ابی دُواد بھی چل بسے۔ [2]

متوکل نے حکومتی صفوں سے بدعتی اور بدعقیدہ افراد کو چن چن کر نکال دیا۔ مصر کا قاضی ابن ابی لیث جہمیہ کے عقائد رکھتا تھا اور عوام پر ظلم کرتا تھا۔ اسے معزول کر کے گدھے پر گشت کرایا گیا اور اس سے تمام مظالم کا حساب لیا گیا۔ [3]

اس کی جگہ مشہور مالکی فقیہ و محدث حارث بن مسکین الاموی رحمہ اللہ (۱۵۴ھ۔۲۵۰ھ) کو قاضی بنایا گیا جو مامون الرشید کے زمانے سے قید خانے میں طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے۔ [4]

متوکل کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے پورے عالم اسلام میں احیائے سنت کی حوصلہ افزائی کی۔ محدثین کو کہا کہ وہ قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کا عقیدہ عام کریں اور اس کے مخلوق ہونے کے جدید خیال کی نفی کریں، آخرت میں اللہ کے دیدار سے متعلق صحیح احادیث بیان کریں۔ یوں علماء و محدثین کے حلقے پھر اسی طرح آباد ہو گئے جیسے ہارون الرشید اور اس سے پہلے ہوا کرتے تھے۔ ابوبکر بن ابی شیبہ رحمہ اللہ رصافہ کی جامع مسجد میں اور ان کے بھائی عثمان بن ابی شیبہ رحمہ اللہ جامع منصور میں درسِ حدیث دیتے تو حاضرین کا مجمع تیس ہزار تک پہنچ جاتا۔ [5]

کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مزار پر زائرین طرح طرح کی بدعات کیا کرتے تھے۔ ۲۳۶ھ میں متوکل نے نہ صرف وہاں زائرین کی آمد پر سخت پابندی عائد کر دی بلکہ مقبرے کو بھی منہدم کرا دیا۔ اس اقدام نے متوکل کی ساکھ کو بڑا نقصان پہنچایا اور نہ صرف شیعہ بلکہ سنی علماء نے بھی اس تشدد کو ناپسند کیا۔ [6]

---

① البداية والنهاية: ۳۳۵/۱۴

② البداية والنهاية: ۳۴۹/۱۴؛ الطبقات السنية في تراجم الحنفية، ص ۹۱، ۹۲

③ تاریخ الخلفاء، ص ۲۵۳

④ سیر اعلام النبلاء: ۵۴/۱۲، ۵۵، ط الرسالة

⑤ تاريخ الخلفاء، ص ۲۵۲

① تاريخ الطبري: سنة ۲۳۶ هجری.

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی متوکل کے بارے میں لکھا ہے "فيه نصب وانحراف" (اس میں کچھ ناصبیت اور گمراہی تھی۔) ﴿سیر اعلام النبلاء: ۳۵/۱۲﴾

بعض حضرات نے متوکل کی طرف مقبرے کے انہدام کے اقدام کی نسبت کو مشکوک قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ "طبری نے اسے بلا سند نقل کیا ہے، وہ تو ۲۳۶ھ میں طبرستان میں تھے اور فقط ۱۲ سال کے تھے؛ لہٰذا اس واقعے کے چشم دید گواہ نہیں تھے۔" حالانکہ یہ کوئی وجہ تردید نہیں بن سکتی۔ امام طبری کے حالات سے عیاں ہے کہ وہ ۲۴۱ھ میں (مقبرے کے انہدام کے پانچ سال بعد سولہ سال کی عمر میں) بغداد پہنچے تھے اور یہاں کے محدثین سے استفادہ کرتے رہے تھے۔ ﴿معجم الادباء: ۵۶/۱۸﴾ یہ متوکل ہی کا دور تھا۔ علمی اسفار کے بعد وہ بغداد آ کر مستقل رہائش پذیر بھی ہوئے تھے۔ مقبرے کی بے حرمتی کا یہ واقعہ انہوں نے یقیناً عینی شاہدین اور ثقہ لوگوں سے بار بار سنا ہوگا۔ اگر مقبرۂ حسین کی پامالی محض افسانہ ہوتی تو امام طبری اس سے ضرور آگاہ ہوتے۔ بعد میں علامہ ابن جوزی نے "المنتظم" حافظ ذہبی نے "تاریخ الاسلام" اور حافظ ابن کثیر نے "البدایہ والنہایہ" میں اس سانحے کو اسی طرح نقل کیا ہے۔ یہ تینوں نقد و تحقیق میں مشہور ہیں مگر انہوں نے اس واقعے کی صحت میں کوئی شک ظاہر نہیں کیا۔ عین ممکن ہے کہ واقعے کی بعض جزئیات (مثلاً مقبرے کو ملیامیٹ کر کے وہاں ہل چلوا دینا اور وہاں کھیتی باڑی کرانا اور مقاتل الطالبین میں اصفہانی کی اس بارے میں بعض دیگر تفاصیل) میں مبالغہ آرائی ہو مگر اصولِ روایت کے مطابق نفسِ واقعہ ثابت ہو جاتا ہے اور اس کا انکار کرنا خود تعصب سے خالی نہیں۔ یاد رہے کہ یہاں ہم نفسِ واقعہ پر بحث کر رہے ہیں، مقابر کی تعمیر یا انہدام کے فقہی پہلو پر نہیں۔

جہادی مہمات:

متوکل کے دور میں ایک بار پھر سرحدوں پر رومیوں سے جنگیں شروع ہوگئیں۔اس سلسلے کا آغاز ۲۳۸ھ میں اس وقت ہوا تھا جب رومی بحریہ نے مصر کے شہر دمیاط پر حملہ کر کے بہت سے مسلمانوں کو قیدی بنالیا تھا۔رومی ملکہ انہیں جبراً عیسائی بنانے کی کوشش کرتی رہی۔ادھر متوکل کے نائب علی بن یحییٰ نے سمندر میں جوابی حملہ کیا اور رومیوں کے جزائر سے بہت سے لوگوں کو قیدی بنالایا۔مجبوراً رومی حکومت قیدیوں کے تبادلے پر آمادہ ہوگئی اور یوں مسلمان قیدی چھڑا لیے گئے۔

کچھ مدت بعد رومی بحریہ نے ساحل پر دوبارہ اسی قسم کا حملہ کیا اور بہت سے شہریوں کو قیدی بنا کر لے گئے۔متوکل نے پہلے علی بن یحییٰ کو جوابی کارروائی کا حکم دیا اور پھر ۲۴۴ھ میں خود دارالخلافہ سامرا سے نکلا اور لاؤ لشکر سمیت شام میں ڈیرے ڈال دیے۔تمام سرکاری دفاتر اور عمائدِ سلطنت کو بھی دمشق بلالیا گیا اور طے کیا گیا کہ اب بنوامیہ کی طرح دمشق ہی کو دارالخلافہ بنایا جائے گا۔تاہم دوماہ بعد شام میں ایک وبا پھیل جانے کی وجہ سے خلیفہ کو واپس عراق آنا پڑا۔اس دوران بحری فوج برابر سرگرم تھیں اور امیر بُغا کبیر کی قیادت میں رومی مقبوضات پر چھاپہ مار کارروائیاں جاری تھیں۔ ۲۴۵ھ میں بھی جھڑپوں، جنگ بندیوں، رومیوں کی بدعہدیوں اور جوابی حملوں کا سلسلہ جاری رہا۔آخر ۲۴۶ھ میں متوکل نے ایک بہت بڑی فوج کو کئی سمتوں سے رومی مقبوضات کی طرف بھیجا جس سے مرعوب ہو کر رومیوں نے مستقل جنگ بندی کا پختہ عہد و پیمان کیا جس کے بعد قیدیوں کا تبادلہ ہوا اور امن وامان قائم ہوگیا۔[1]

سیرت واخلاق:

متوکل حق شناس اور دین دار انسان تھا۔حق گوئی کی قدر کرتا تھا۔ایک بار دربار میں آیا تو درباری اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے۔صرف ایک مہمان عالم احمد بن معدل رحمہ اللہ بیٹھے رہے۔متوکل نے وزیر سے پوچھا:

''انہیں کیا ہوا، کیا انہوں نے بیعت نہیں کی؟''

وزیر نے مہمان کو عتاب سے بچانے کے لیے کہا:''یہ بیعت کر چکے ہیں مگر ان کی نگاہ بہت کمزور ہے۔''

یہ سن کر احمد بن معدل رحمہ اللہ بولے:''میری نگاہ ٹھیک ہے مگر میں آپ کو اللہ کے عذاب سے بچانا چاہتا ہوں۔آپ نے شاید رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ جو شخص یہ پسند کرے کہ لوگ اس کی تعظیم کے لیے کھڑے رہیں تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں سمجھے۔''[2] متوکل اس حق گوئی پر اتنا خوش ہوا کہ تخت سے اتر کر احمد بن معدل رحمہ اللہ کے ساتھ آ بیٹھا۔[3]

متوکل نہایت سخی انسان تھا۔کہا جاتا تھا کہ شعراء کو جتنا اس نے نوازا اس کی مثال ماضی میں کہیں نہیں ملتی۔

---

① الكامل في التاريخ: سنة ٢٤٤ھ تا ٢٤٦ھ

② سنن ابي داؤد، ح:٥٢٢٩، باب في قيام الرجل للرجل

③ تاريخ الخلفاء، ص ٢٥٦

مروان بن ابی الجنوب کو ایک قصیدے پر ایک لاکھ بیس ہزار درہم دیے۔ علی بن جہم سے کچھ اشعار سنے تو اسے دو ایسے موتی دیے جن کی نظیر پوری دنیا میں نہیں تھی۔ ①

متوکل نے تعمیراتی کام بھی کرائے مثلاً: ۲۴۵ھ میں دو لاکھ دینار خرچ کر کے جعفریہ نامی ایک نیا شہر آباد کیا۔ ②

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی وفات:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ آخر دم تک امت کی علمی واعتقادی خدمت کرتے رہے۔ معتصم اور اس کا جانشین واثق ان کے سامنے دنیا سے رخصت ہوئے۔ آخر کار خلیفہ متوکل کے دور میں ۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ ہجری (۳۰ جولائی ۸۵۵ء) کو عالم اسلام کا یہ آفتاب بغداد کی خاک میں روپوش ہوگیا۔ انہیں شہیدوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ ③

علی بن مدینی رحمہ اللہ نے امام احمد رحمہ اللہ کی اس بے مثال عزیمت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے:

"اللہ تعالیٰ نے اس دین کی عظمت واعزاز کا کام دو افراد سے اس طرح لیا ہے کہ (اپنے اپنے دور میں) کوئی تیسرا ان کے ساتھ نہیں شریک کار تھا۔ فتنہ ارتداد کے وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور فتنہ خلق قرآن کے موقع پر امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ۔" ④

اسحٰق بن راہویہ فرماتے تھے:

"اگر امام احمد نہ ہوتے اور اپنی جان کی بازی نہ لگاتے تو اسلام مٹ جاتا۔" ⑤

عالم اسلام کو معتزلہ کی گمراہ کن سرگرمیوں سے بچانے کے علاوہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے علمی کارناموں کی بھی ایک طویل فہرست ہے۔ ان کی فقہی مہارت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ انہیں امت کے چار ائمہ مجتہدین میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے بعد "مجتہد مطلق" کا اعزاز کوئی حاصل نہیں کر سکا۔ ان کے فتاوے ان کی فقیہانہ شان کی واضح دلیل ہیں۔ ابن عقیل کہتے ہیں:

"امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی ترجیحات کو احادیث پر مبنی کیا ہے جسے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ بہت سے مواقع پر اس فن کے اکابر سے بڑھ گئے ہیں۔" ⑥

مسند امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ایک بہت بڑا کام تدوین حدیث کے سلسلے میں کیا اور "مسند احمد" مرتب کی۔ یہ حروف تہجی کے لحاظ سے صحابہ کرام کے ناموں کی ترتیب کے مطابق ساڑھے ۲۷ ہزار احادیث کا ضخیم مجموعہ ہے۔

① تاریخ الخلفاء، ص ۲۵۴ ② الکامل فی التاریخ: سنة ۲۴۵ھ
③ البدایة والنهایة: ۴۱۹/۱۴ تا ۴۲۳
④ تاریخ بغداد، خطیب بغدادی، ۱۸۴/۵، ط العلمیة
⑤ تاریخ الاسلام للذهبی: ۱۸ ص ۷۱، تدمری
⑥ سیر اعلام النبلاء: ۳۲۱/۱۱

مسندِ احمد میں ہر صحابی سے منقول روایات الگ الگ کردی گئی ہیں۔ مسندِ احمد سے فقہی احکام تلاش کرنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں؛ کیوں کہ اس میں موضوعات کی ترتیب نہیں ہے۔ ایک ہی موضوع کی بہت سی احادیث مکرر بھی ہیں۔ تاہم الگ الگ صحابہ کی مرویات جاننے کے لیے مسندِ احمد سے زیادہ معتبر مأخذ کوئی اور نہیں مل سکتا۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے تھے:

''میں نے مسند کو ساڑھے سات لاکھ احادیث (یعنی طرق و اسانید) سے منتخب کر کے مرتب کیا ہے۔''

وہ مسند کو ایک بنیادی اسلامی مأخذ کی حیثیت دینا چاہتے تھے تاکہ حضور ﷺ کی جس حدیث کی حیثیت میں اختلاف ہو، اس کے لیے اس مأخذ کو دیکھ لیا جائے۔ اگر وہ حدیث اس میں مل جائے تو قابلِ استدلال سمجھی جائے، ورنہ نہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ اس معیار کے لیے مسند کی تنقیح و تصحیح اور اضافے کا کام کر رہے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا؛ اس لیے کام ادھورا رہ گیا۔ لگ بھگ دو سو صحابہ کرام جن کی روایات بخاری و مسلم میں ہیں، مسند میں درج ہونے سے رہ گئیں۔ اس کے باوجود مسندِ احمد کو مآخذِ شرع میں اہم حیثیت حاصل ہے؛ کیوں کہ یہ ایک ایسے فقیہ و مجتہد کا علمی شاہکار ہے جس پر پوری امت کو اعتماد رہا ہے۔ ①

ولی عہدی اور قتل:

۲۳۵ھ میں متوکل نے اپنے تین بیٹوں: منتصر، معتز اور مؤید کو یکے بعد دیگرے جانشین طے کر دیا تھا۔ ماضی میں بھی ایسے فیصلے انتشار، بدنظمی اور خانہ جنگیوں کا سبب بنتے رہے تھے۔ اس بار اس فیصلے کا خمیازہ خود متوکل کو بھگتنا پڑا۔ ولی عہدی کی یہ ترتیب طے کرنے کے کئی سال بعد اس نے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کی۔ دراصل منتصر اپنے دادا کی طرح معتزلہ اور شیعہ علماء سے متاثر تھا اور اپنے باپ کی مذہبی پالیسی پر چیں بجبیں تھا۔ متوکل بھی صاحبزادے کے خیالات سے واقف ہو گیا تھا؛ اس لیے اس نے اسے برطرف کر کے معتز کو پہلا ولی عہد مقرر کر دیا۔

منتصر یہ برداشت نہ کر سکا۔ اس نے کچھ ترک امراء کو ساتھ ملایا۔ ان سب نے سازش کر کے متوکل کو قتل کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ ۵ شوال ۲۴۷ھ کو متوکل اپنے وزیر فتح بن خاقان کے ساتھ بیٹھا تھا کہ پانچ ترک امراء شمشیر بکف کمرے میں گھس گئے۔ متوکل اور فتح بن خاقان دونوں کو وہیں قتل کر دیا گیا۔ اس طرح اسلامی تاریخ میں پہلی بار یہ گھناؤنی مثال قائم ہوئی کہ بیٹے نے خود اقتدار کے لیے باپ کے خون میں ہاتھ رنگے۔

متوکل کی عمر چالیس سال تھی۔ اس نے چودہ سال دس ماہ حکومت کی۔ متوکل کے دور میں کئی زلزلوں، آسمانی آفتوں اور ناگہانی حوادث کا ظہور ہوا۔ شاید یہ غیبی اشارے بتا رہے تھے کہ خلافتِ اسلامیہ پر ایک طویل دورِ زوال طاری ہونے کو ہے۔ جس کے آخر میں اُمت فنا و بقا کی کش مکش میں مبتلا ہو جائے گی۔ ②

① فتح المغیث: ۱/۱۱۸؛ تدریب الراوی: ۱/۱۸۸، ۱۸۹

② البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۲۴۷ھ

بشارت:

متوکل کو وفات کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا اور حال پوچھا۔اس نے جواب دیا:

''اللہ نے سنت کو زندہ کرنے کی بدولت میری مغفرت فرمادی۔''[1]

اس دور کے قاضی بصرہ، ابراہیم بن محمد تیمی رحمہ اللہ کا قول ہے:

''تین خلفاء نے کارنامہ کر دکھایا: ایک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جنہوں نے ارتداد کے فتنے کی سرکوبی کی۔ دوسرے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جنہوں نے امت کو زندہ کیا اور اس کی تجدید کی، تیسرا متوکل جس نے بدعت کو مٹا کر سنت کو زندہ کیا۔''[2]

جعلی روایات:

چونکہ متوکل سنت کا حامی اور بدعات ورفض سے متنفر تھا؛ اس لیے شیعہ مؤرخین نے اس کی کردارکشی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔اسے عیاش، شہوت پرست، رانگ رنگ اور شراب وکباب کا عادی اور ظالم وجابر مشہور کیا گیا۔مگر صحیح یہ ہے کہ وہ اس قسم کی گھٹیا حرکات سے دور تھا۔مقبرۂ حسین کے انہدام کے سوا اس پر لگائے گئے اکثر الزامات پروپیگنڈا معلوم ہوتے ہیں۔محققین کے نزدیک وہ ظالم وجابر نہیں بلکہ عموماً نرمی ومہربانی کا عادی تھا۔متوکل یہ حقیقت اچھی طرح جانتا تھا کہ جبراً کرائی جانے والی تابع داری ناپائیدار ہوتی ہے۔اصل حمایت وہ ہے جو عوام کا دل جیت کر حاصل کی جائے۔اپنی اس پالیسی کے بارے میں وہ خود کہا کرتا تھا: ''گزشتہ خلفاء عوام پر سختی کرتے تھے تاکہ انہیں اپنا تابع دار رکھیں۔میں ان سے نرمی برتتا ہوں تاکہ وہ مجھ سے محبت کریں اور میری بات مانیں۔''[3]

ختم قرآن کی تقریب:

متوکل علم اور علماء کا بڑا قدردان تھا۔اس کے بیٹے معتز نے قرآن مجید حفظ کیا تو اس خوشی میں ایک عظیم الشان تقریب منعقد کرائی جس میں عوام وخواص کی بہت بڑی تعداد شریک ہوئی۔جب شہزادہ آکر منبر پر بیٹھا اور اس نے کلماتِ تشکر ادا کیے تو حاضرین پر ایک لاکھ دینار کی لاگت کے ہیروں، ایک لاکھ اشرفیوں اور دس لاکھ درا ہم کی بارش کی گئی۔خلعتوں، پوشاکوں، کھانے پینے کی اشیاء اور دیگر انعامات کا کوئی حدوحساب ہی نہ تھا۔شہزادے کی والدہ اور اس کے استاذ محمد بن عمران رحمہ اللہ کا خصوصی اعزاز واکرام کیا گیا اور انہیں ہیرے جواہرات اور سونے سے نہال کر دیا گیا۔[4]

اصل خوش حال کون ہے؟:

متوکل کی بالغ نظری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ حکومت کی شان وشوکت کو بڑی چیز نہیں سمجھتا تھا۔

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۵۸

[2] تاریخ بغداد: ۱۷۹/۷، ۱۸۰، ط العلمیة

[3] تاریخ الخلفاء، ص ۲۵۶

[4] البدایة والنهایة: ۷۰۵/۱۴

اس کے نزدیک اصل قابلِ رشک زندگی عام آدمی کی تھی۔ حکومت وسیاست کے بکھیڑوں کو وہ سراسر فتنہ اور دردِ سر سمجھتا تھا۔ ایک بار اس کے وزیر فتح بن خاقان نے اسے فکرمند دیکھ کر کہا:

''آپ سے بڑھ کر دولت وثروت اور جاہ ومنصب کا مالک دنیا میں کوئی نہیں، پھر یہ فکر کیسی؟''

متوکل نے جواب دیا: ''مجھ سے کہیں زیادہ خوش حال شخص وہ ہے جس کا ایک کشادہ سا مکان ہو، نیک بیوی ہو اور اسے روزی میسر ہو۔ نہ وہ ہمیں جانتا ہو کہ ہم اسے تکلیف دیں، نہ وہ ہمارا محتاج ہو کہ ہم اس کی تحقیر کریں۔''[1]

دورِ عروج کا آخری خلیفہ:

متوکل عباسیوں کے دورِ عروج کا آخری خلیفہ تھا۔ اس کے حالات پڑھ کر ہم تاریخ امت کے ایک بڑے مرحلے یعنی ''بنوعباس کے دورِ عروج'' کا مطالعہ مکمل کر چکے ہیں۔

اس کے بعد خلافتِ عباسیہ بڑی تیزی سے زوال پذیر ہوئی اور اُمت مسلمہ میں انتشار وافتراق کے نئے دروازے کھل گئے۔ خودمختار حکمرانوں نے ہر طرف اجارہ داری قائم کر لی۔ باطل فرقوں نے اپنے داعی پھیلا دیے اور جگہ جگہ خروج کرنے لگے۔ بیرونی طاقتوں نے مسلمانوں کو کمزور دیکھ کر پے در پے حملے شروع کیے اور ماضی کے برعکس انہیں غیر متوقع کامیابیاں ملیں۔ متوکل کی وفات تک عراق، فارس، سندھ، شام، الجزیرہ، حجاز، مصر، آذربائی جان، ماوراء النہر اور ایشیائے کوچک کے مفتوحہ شہر براہِ راست دربارِ خلافت کے زیرِ انتظام تھے جب کہ خراسان اور وسطِ ایشیا کے کچھ علاقوں پر حاوی دولتِ طاہریہ اور تیونس میں دولتِ اغالبہ دربارِ خلافت کی ماتحت آزاد ریاستیں تھیں۔ متوکل کے بعد بھی کچھ مدت تک یہ جغرافیہ باقی رہا مگر بہت جلد ان میں سے اکثر علاقے خلافت سے آزاد ہو گئے اور ان پر عباسی خلافت کے مخالفین کا قبضہ ہو گیا۔

❖❖❖

---

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۵۷

نوٹ: فتح بن خاقان متوکل کا وزیر تھا اور اس کے ساتھ ہی قتل ہوا تھا۔ وہ اپنے دور کا نامور ادیب، شاعر اور شخصیت نگار تھا۔ ''قلائد العقیان'' اس کی بہترین تصنیف ہے جو آج بھی موجود ہے۔ اس میں مشاہیر کے حالات مسجع ومقفیٰ عبارت میں پیش کیے گئے ہیں۔

علاقائی حکومتیں اور عباسی خلافت

عباسیوں کے دورِ عروج ہی میں اسلامی تاریخ کا یہ انقلاب آ چکا تھا کہ ایک متحدہ اور وسیع مملکت کی جگہ متعدد علاقائی حکومتیں قائم ہوگئی تھیں۔ ان حکومتوں میں سے کچھ خلافتِ عباسیہ کی وفادار تھیں جیسے دولتِ طاہریہ اور دولتِ اغالبہ۔ کچھ حکومتیں مخالف تھیں جیسے دولتِ ادارسہ اور امارتِ اندلس۔ اس کے بعد اسلامی تاریخ کی بقیہ بارہ صدیوں میں بھی سارے مسلم ممالک ایک خلافت یا ایک حکومت کے تحت نہیں آ سکے۔ اس غیر معمولی تبدیلی کے اسباب وعلل آخر کیا تھے؟ آیا یہ مسلمانوں کی کمزوری تھی یا دشمنوں کی سازش؟ حالات کا دباؤ تھا یا اس زمانے کی سیاست کا تقاضا یہی تھا!! یہ ایک اہم موضوع ہے اور فقہی و تاریخی دونوں لحاظ سے اچھی خاصی تحقیق کا تقاضا کرتا ہے۔ تاہم ہم یہاں مختصراً اس بارے میں چند اہم باتیں بیان کریں گے۔

تاریخ کا سبق یہ ہے کہ ایک وسیع اور عالمگیر قسم کی حکومت بنانا اور پھر اسے قائم رکھنا اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے جب: ① قوم میں اتحاد واتفاق کی روح موجود ہو۔ ② نظم وضبط عمدہ ہو۔
③ مرکز کی عسکری طاقت بھرپور ہو۔ ④ مالی حالت مضبوط ہو۔

ہشام بن عبدالملک اموی کے دور تک یہ نعمتیں بڑی حد تک میسر تھیں؛ اس لیے خلافت عالمگیر رہی۔ مگر ہشام کے بعد نظم وضبط بگڑ گیا، افتراق کی دبی ہوئی چنگاریوں نے بھڑک کر اتحاد واتفاق کا ماحول خاکستر کر دیا، عرب قبائل کی خانہ جنگی نے عسکری طاقت توڑ کر رکھ دی؛ اس لیے دیکھتے ہی دیکھتے اموی حکومت قصۂ پارینہ بن گئی۔

بنوعباس کے دورِ عروج میں ہم ان مثالوں کی تکرار دیکھتے ہیں۔ سفاح اور منصور قوت وہیبت کے نشان تھے جبکہ مہدی اور ہارون الرشید قوت کے ساتھ عوامی محبت سے بھی بہرہ ور تھے۔ لوگوں کو عمومی طور پر امن وامان اور عدل و انصاف میسر تھا۔ مال ودولت کی کثرت تھی۔ ان چیزوں نے خاص کر اہلِ ریاست میں بڑی سے بڑی جاگیروں کے حصول، اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب پر ترقی اور زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کا ایک ناپسندیدہ ذوق پیدا کر دیا تھا۔ اس قسم کے رجحانات نے جابجا مرکز گریزی، شورشوں اور بغاوتوں کو جنم دیا۔ کچھ مذہبی لوگ اور علوی حضرات نیک نیتی سے بھی ایسی کوششوں میں آگے آگے ہوئے۔ یوں بار بار ہونے والی بغاوتوں اور ان میں مختلف طبقات کی شرکت نے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کا سیاسی شعور اب اس قابل نہیں کہ وہ ایک عالمگیر خلافت کا بار اٹھا سکے۔

ظاہر تھا کہ اس صورتحال میں فوجی قوت کی گرہ ذرا بھی ڈھیلی ہوتے ہی خلافتِ عباسیہ کا وہی انجام ہوتا جو بنوامیہ کا ہوا تھا۔ اور ایک صدی کے اندر اندر یہی ہوا کہ عالم اسلام میں ایک درجن کے لگ بھگ حکومتیں بن گئیں۔

بنوعباس کے دور میں جب تک علاقائی حکومتیں نہیں بنیں تھیں، الگ حکومتیں بنانے کی سرتوڑ کوششیں بار بار ہوتی رہیں۔ ایسے مدعیانِ خلافت میں ہاشمی حضرات سرفہرست رہے ہیں۔ ہم ہشام بن عبدالملک کی خلافت کے ذیل میں تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ بنو ہاشم کا اہلِ تشیع والے عقیدۂ امامت سے کوئی واسطہ نہ تھا بلکہ ان میں سے متعدد حضرات نے جب بھی امامت کا دعویٰ کر کے خروج کیا تو ان کا مقصد ایک اسلامی خلافت قائم کرنا ہی تھا۔ بنوامیہ اور بنوعباس کے دور میں لگ بھگ ایسے ۶۵ خروج ہوئے جن میں سے ادریس بن عبداللہ کے خروج کے سوا کوئی تحریک کامیاب نہ ہوئی۔ خود ادریس بن عبداللہ ایک بلند پایہ ہاشمی بزرگ ہونے کے باوجود کوئی غیر معمولی حکومت قائم نہ کر سکے۔ ان کی مملکت جو مراکش اور الجزائر میں قائم ہوئی تھی، سوا صدی بعد چند قلعوں تک ہی محدود ہوگئی۔ البتہ ۱۳۶ھ میں تشکیل پانے والی اندلس کی آزاد مسلم مملکت اپنے قیام سے لے کر سقوط تک ایک الگ مملکت کی شکل میں رہی۔ یہی نہیں بلکہ بنوعباس کے دورِ زوال میں امیر عبدالرحمٰن سوم نے اندلس میں الگ خلافت کی بنا بھی ڈال دی تھی۔

عباسی خلفاء کے پاس ایسے میں اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ان حکومتوں کو قبول کرتے اور ان سے مناسب سفارتی مراسم رکھتے یا کم از کم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتے۔ اگر آزاد حکمرانوں کو بہرصورت تابع بنانے کی کوشش کی جاتی تو دشمنی کبھی ختم نہ ہوتی اور کشت و خون ہمیشہ جاری رہتا۔ اس کش مکش میں خود خلافت بھی ختم ہو سکتی تھی۔

فقیہِ شام، امام اوزاعی رحمہ اللہ (۸۸ھ تا ۱۵۷ھ)

امام اوزاعی رحمہ اللہ دوسری صدی ہجری میں عالم اسلام کے جلیل القدر فقیہ تھے۔ وہ ۸۸ھ میں بعلبک میں پیدا ہوئے تھے۔ اصل نام عبدالرحمٰن بن عمرو تھا۔ دِمَشق کے ایک مضافاتی قصبے ''اوزاع'' سے تعلق کی وجہ سے ''اوزاعی'' کہلائے۔ امام ابوزرعہ دِمشقی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ وہ نسلاً سندھی تھے، وہاں کے قیدیوں میں شامل ہوکر شام آئے تھے اور ''اوزاع'' میں ٹھہرے تھے۔ ①

انہوں نے صحابہ کا زمانہ پایا اگرچہ ان سے روایت نہ لے سکے۔ ان کا بچپن یتیمی اور فقر کی حالت میں گزرا۔ ان کی والدہ انہیں لے کر شہر شہر در بدر پھرتی رہیں۔ ایک دن بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ عرب کے ایک رئیس کا گزر ہوا۔ باقی بچے ہیبت کی وجہ سے بھاگ گئے مگر یہ کھڑے رہے۔ رئیس بڑا متاثر ہوا اور انہیں طلبہ کے وفد میں شامل کر کے یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ کے پاس یمامہ بھیج دیا۔ ان کی قابلیت سے یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ بھی خوش ہوئے اور اپنے علم سے فیض یاب کرنے کے بعد انہیں بصرہ روانہ کردیا جہاں وہ سب سے پہلے محمد بن سیرین رحمہ اللہ کی خدمت میں گئے جو مرض الموت میں مبتلا تھے۔ چند دن بعد محمد بن سیرین رحمہ اللہ کی وفات ہوگئی۔ ②

اس کے بعد انہوں نے نافع مولیٰ عمر، عمرو بن شعیب، علقمہ بن مرثد، میمون بن مہران، ابن المنکدر اور ابن شہاب زہری رحمہم اللہ جیسی ہستیوں سے علم حاصل کیا۔ جب مسندِ درس پر بیٹھے تو امام مالک، عبداللہ بن مبارک، ابواسحٰق الفزاری، بقیہ بن ولید، بقیہ بن مسلم اور یحییٰ قطان رحمہم اللہ جیسی شخصیات ان کے تلامذہ کے حلقے میں شامل ہوئیں۔ ③

وہ فقیہ ہونے کے ساتھ بڑے عابد و زاہد بھی تھے۔ ان کی رات نوافل میں تلاوتِ قرآن کرتے اور روتے ہوئے گزر جاتی۔ ان کی سجدہ گاہ آنسوؤں سے بھیگ جایا کرتی تھی۔ ④

۱۵۰ھ میں ان کے ساتھ حج کا سفر کرنے والے ایک حاجی کا بیان ہے کہ دورانِ سفر انہیں دن یا رات میں کبھی سوتے نہیں دیکھا۔ وہ نماز پڑھتے رہتے تھے۔ جب نیند آنے لگتی تو پالان سے ٹیک لگا لیتے۔ ⑤

ان کے مواعظ اور ملفوظات اصلاحِ نفس اور فکرِ آخرت کی تعلیم پر مشتمل ہوتے تھے۔ ایک بار دورانِ وعظ فرمایا:

① الاعلام زرِکلی: ۳/۳۲۰؛ مشاہیر علماء الامصار لابن حبان، ص ۲۸۵
اگرچہ محمد بن سعد کے قول کے مطابق ان کا نسلی تعلق قبیلہ ہمدان کی شاخ ''اوزاع'' سے تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۷/۴۸۸، ط صادر)
② سیر اعلام النبلاء: ۷/۱۱۰، ۱۱۱
③ سیر اعلام النبلاء: ۷/۱۰۸
④ سیر اعلام النبلاء: ۷/۱۲۰
⑤ سیر اعلام النبلاء: ۷/۱۱۹

فقیہِ شام، امام اوزاعی رحمہ اللہ (۸۸ھ تا ۱۵۷ھ)

امام اوزاعی رحمہ اللہ دوسری صدی ہجری میں عالم اسلام کے جلیل القدر فقیہ تھے۔ وہ ۸۸ھ میں بعلبک میں پیدا ہوئے تھے۔ اصل نام عبدالرحمن بن عمرو تھا۔ دمشق کے ایک مضافاتی قصبے "اوزاع" سے تعلق کی وجہ سے "اوزاعی" کہلائے۔ امام ابوزرعہ دمشقی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ وہ نسلاً سندھی تھے، وہاں کے قیدیوں میں شامل ہوکر شام آئے تھے اور "اوزاع" میں ٹھہرے تھے۔ ①

انہوں نے صحابہ کا زمانہ پایا اگرچہ ان سے روایت نہ لے سکے۔ ان کا بچپن یتیمی اور فقر کی حالت میں گزرا۔ ان کی والدہ انہیں لے کر شہر شہر دربدر پھرتی رہیں۔ ایک دن بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ عرب کے ایک رئیس کا گزر ہوا۔ باقی بچے ہیبت کی وجہ سے بھاگ گئے مگر یہ کھڑے رہے۔ رئیس بڑا متاثر ہوا اور انہیں طلبہ کے وفد میں شامل کر کے یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ کے پاس یمامہ بھیج دیا۔ ان کی قابلیت سے یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ بھی خوش ہوئے اور اپنے علم سے فیض یاب کرنے کے بعد انہیں بصرہ روانہ کر دیا جہاں وہ سب سے پہلے محمد بن سیرین رحمہ اللہ کی خدمت میں گئے جو مرض الموت میں مبتلا تھے۔ چند دن بعد محمد بن سیرین رحمہ اللہ کی وفات ہوگئی۔ ②

اس کے بعد انہوں نے نافع مولیٰ عمر، عمرو بن شعیب، علقمہ بن مرثد، میمون بن مہران، ابن المنکدر اور ابن شہاب زہری رحمہم اللہ جیسی ہستیوں سے علم حاصل کیا۔ جب مسندِ درس پر بیٹھے تو امام مالک، عبداللہ بن مبارک، ابواسحٰق الفزاری، بقیہ بن ولید، بقیہ بن مسلم اور یحییٰ قطان رحمہم اللہ جیسی شخصیات ان کے تلامذہ کے حلقے میں شامل ہوئیں۔ ③

وہ فقیہ ہونے کے ساتھ بڑے عابد وزاہد بھی تھے۔ ان کی رات نوافل میں تلاوتِ قرآن کرتے اور روتے ہوئے گزر جاتی۔ ان کی سجدہ گاہ آنسوؤں سے بھیگ جایا کرتی تھی۔ ④

۱۵۰ھ میں ان کے ساتھ حج کا سفر کرنے والے ایک حاجی کا بیان ہے کہ دورانِ سفر انہیں دن یا رات میں کبھی سوتے نہیں دیکھا۔ وہ نماز پڑھتے رہتے تھے۔ جب نیند آنے لگتی تو پالان سے ٹیک لگا لیتے۔ ⑤

ان کے مواعظ اور ملفوظات اصلاحِ نفس اور فکرِ آخرت کی تعلیم پر مشتمل ہوتے تھے۔ ایک بار دورانِ وعظ فرمایا:

① الاعلام زرکلی: ۳۲۰/۳؛ مشاهیر علماء الامصار لابن حبان، ص ۲۸۵
اگرچہ محمد بن سعد کے قول کے مطابق ان کا نسلی تعلق قبیلہ ہمدان کی شاخ "اوزاع" سے تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۴۸۸/۷، ط صادر)
② سیر اعلام النبلاء: ۱۱۰/۷، ۱۱۱
③ سیر اعلام النبلاء: ۱۰۸/۷
④ سیر اعلام النبلاء: ۱۲۰/۷
⑤ سیر اعلام النبلاء: ۱۱۹/۷

''لوگو! اللہ کی نعمتوں کے ذریعے اس آگ سے بچو جسے اللہ نے سلگایا ہے، جو دلوں تک پہنچ جاتی ہے۔ تم ایسے وطن میں ہو جس میں قیام کی مدت بہت تھوڑی ہے۔ تم کوچ کرنے والے ہو۔ تم سے پہلے بہت سی نسلیں گزر چکی ہیں جنہوں نے دنیا کی رونق دیکھی۔ وہ تم سے زیادہ طویل عمروں والے، تم سے زیادہ لحیم شحیم اور تم سے زیادہ عمارتیں بنانے والے تھے۔ انہوں نے پہاڑوں کو چیر دیا اور ملکوں میں راج کیا۔ وہ بااثر اور سخت گرفت کرنے والے تھے۔ ان کے جسم ستونوں جیسے تھے مگر دن اور رات گزرتے چلے گئے یہاں تک کہ ان کی عمریں ختم ہو گئیں، ان کے نشانات مٹ گئے، ٹھکانے اجڑ گئے، ان کا ذکر بھی فراموش ہو گیا۔''[1]

آپ فرماتے تھے: ''علم وہی ہے جو اصحاب محمد ﷺ سے منقول ہے۔ جو ان سے منقول نہیں، وہ علم نہیں۔''

فرمایا کرتے تھے: ''عثمان اور علی رضی اللہ عنہما کی محبت انہی لوگوں کے دلوں میں جمع ہوتی ہے جو مؤمن ہیں۔''[2]

ایک بار فرمایا: ''جب اللہ کسی قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ کر لیتا ہے تو ان کے لیے بحث بازی کے دروازے کھول دیتا ہے اور انہیں عمل سے روک دیتا ہے۔''[3]

ان کا یہ بھی ارشاد ہے: ''مؤمن کم بولتا اور زیادہ عمل کرتا ہے۔ منافق زیادہ بولتا اور کم عمل کرتا ہے۔''

فرمایا کرتے تھے: ''جب بھی کوئی شخص کوئی بدعت نکالتا ہے، اس سے تقویٰ سلب کر لیا جاتا ہے۔''

ان کا کہنا تھا: ''جو شخص بھی علماء کے نادر اور شاذ مسائل پر عمل پیرا ہوتا ہے، وہ اسلام سے نکل جاتا ہے۔''[4]

فرماتے تھے: ''جو آدمی موت کو کثرت سے یاد کرتا ہے، اسے تھوڑی چیز بھی کافی ہو جاتی ہے۔''[5]

وہ ہلکے پھلکے میانہ قامت گندمی رنگت کے آدمی تھے۔ ڈاڑھی پر مہندی لگاتے تھے۔ سراپا بڑا باوقار تھا۔ اکثر خاموش رہتے۔ بولتے تو موتی رولتے۔ انہیں دیکھنے والے کہتے تھے:

''ان سے کبھی کوئی بے کار لفظ نہیں سنا گیا، اتنا ہی بولتے جس کی سننے والوں کو ضرورت ہوتی۔ کبھی انہیں قہقہہ لگاتے نہیں دیکھا گیا۔ جب وہ آخرت کا ذکر کرتے تو مجلس میں کوئی ایسا نہ ہوتا جس پر رقت طاری نہ ہو جاتی۔''[6]

وہ حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق کہنے میں کسی چیز کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے بنوامیہ کی شکست اور بنوعباس کے غلبے کے مناظر دیکھے۔ جب ابوالعباس سَفّاح کے چچا عبداللہ بن علی نے دِمَشق پر قبضہ کر کے اموی امراء اور عمائد کو بے دردی سے قتل کیا تو امام اوزاعی رحمہ اللہ وہیں تھے۔

عبداللہ بن علی نے اس قہر سامانی کے متعلق جواز کا فتویٰ لینے کے لیے انہیں اپنے پاس بلوالیا۔ وہ اس وقت خود ایک تخت پر بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں بائیں مسلح افراد کی چار ٹولیاں تھیں۔ ایک ٹولی برہنہ شمشیریں سونتے ہوئے تھی۔

---

[1] سير اعلام النبلاء: 117/7
[2] سير اعلام النبلاء: 120/7
[3] سير اعلام النبلاء: 125/7
[4] سير اعلام النبلاء: 121/7
[5] سير اعلام النبلاء: 122/7
[6] سير اعلام النبلاء: 110/7، 111

دوسری کلہاڑیاں اٹھائے ہوئے تھی۔ تیسری کے پاس بڑے بڑے لٹھ تھے۔ چوتھی کے ہاتھوں میں ہتھوڑے تھے۔ دو سپاہیوں نے امام اوزاعی رحمہ اللہ کے بازو پکڑ لیے اور انہیں عبداللہ بن علی کے سامنے کچھ فاصلے پر کھڑا کر دیا۔

عبداللہ بن علی نے پوچھا: ''عبدالرحمن بن عمرو اوزاعی تمہی ہو؟''

فرمایا: ''اللہ امیر کو سلامت رکھے۔ میں ہی ہوں۔''

عبداللہ بن علی نے سوال کیا: ''بنوامیہ کا خون بہانے کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟''

امام اوزاعی رحمہ اللہ نے کہا: ''آپ کے اور بنوامیہ کے درمیان کچھ عہد اور میثاق تھا۔''

عبداللہ بن علی نے طیش میں آ کر کہا:

''تمہارا بیڑا غرق! تم مجھے اور انہیں ایسے لوگ تصور کرو جن کے درمیان کوئی معاہدہ نہ ہو۔''

امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ میں نے اس جیسا منہ پھٹ آدمی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میرے نفس کو اس وقت قتل ہونا گوارا نہ تھا مگر میں نے اللہ کے سامنے جوابدہی کا تصور کیا اور فیصلہ کیا کہ میں سچ سچ کہوں گا۔ میں نے خود کو سزائے موت کے لیے تیار کر لیا اور جواب دیا: ''ان کا خون آپ پر حرام ہے۔''

یہ سن کر عبداللہ بن علی کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ رگیں پھول گئیں۔ اس نے چیخ کر کہا:

''تم ہلاک ہو جاؤ! بھلا کیوں؟''

فرمایا: ''کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: مسلمان کا خون تین وجوہ کے بغیر حلال نہیں۔''[1]

عبداللہ بن علی نے کہا: ''تمہارا ستیاناس! کیا دینی لحاظ سے خلافت ہمارا حق نہیں؟''

امام اوزاعی رحمہ اللہ نے پوچھا: ''بھلا وہ کیسے؟''

عبداللہ بن علی نے کہا: ''کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت کی وصیت نہیں کی تھی؟''

امام اوزاعی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اگر یہ وصیت کی ہوتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ حکمین مقرر کرنے پر راضی نہ ہوتے۔''

ایک دوسری روایت کے مطابق عبداللہ بن علی نے کہا:

''مجھے خلافت کے بارے میں بتاؤ۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے بارے میں وصیت کی تھی؟''

امام اوزاعی رحمہ اللہ نے جواب دیا: ''اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کی ہوتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کسی کو اس وصیت کی خلاف ورزی نہ کرنے دیتے۔''

عبداللہ بن علی نے پوچھا: ''بنوامیہ کے مال و دولت کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

---

[1] پوری حدیث یہ ہے: لا یحل دم امرىء مسلم الا باحدی ثلاث: الثیب الزانی، والنفس بالنفس، والتارك لدینه المفارق للجماعة.

''مسلمان کا خون تین صورتوں کے سوا جائز نہیں: شادی شدہ آدمی زنا کرے۔ جان کے بدلے جان لی جائے۔ آدمی دین سے نکل جائے یعنی مرتد ہو جائے۔'' (صحیح البخاری، باب الدیات)

فرمایا: ''اگر وہ مال و دولت ان کے پاس حلال طریقے سے تھا تو تمہارے لیے حرام ہے۔ اور اگر ان کے پاس حرام طریقے سے تھا تو تمہارے لیے اور زیادہ حرام ہے۔''

عبداللہ بن علی چپ ہو گیا مگر وہ غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ سے سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ انہیں باہر لے جاؤ۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ واپس مڑتے ہوئے مجھے لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے میرا سر تن سے جدا کر دیا جائے گا۔ میں گھوڑے پر سوار ہو کر کچھ ہی دور گیا تھا کہ ایک گھڑ سوار تیزی سے میرے پیچھے آیا۔ میں نے دل میں کہا یہ میرا سر اتارنے آیا ہے۔ میں نے فوراً گھوڑے سے اتر کر آخری نماز کے لیے تکبیر کہہ دی۔ گھڑ سوار انتظار کرتا رہا۔ جب میں نے سلام پھیرا تو اس نے سلام کیا اور اشرفیوں کی ایک تھیلی پیش کرتے ہوئے کہا: یہ امیر نے آپ کے لیے بھیجی ہے۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ گھر پہنچنے سے پہلے پہلے میں نے وہ تمام اشرفیاں تقسیم کر دیں۔[1]

غرض خوف و دہشت کی ایسی فضا بھی انہیں حق گوئی سے نہ روک سکی۔

ایک بار خلیفہ منصور نے انہیں لکھا کہ مجھے کوئی نصیحت لکھ بھیجیے۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ نے جواب دیا:

''میں آپ کو تقویٰ اور تواضع کی وصیت کرتا ہوں، اللہ جس دن متکبر لوگوں کو خوار کرے گا، اس دن آپ کو بلند مرتبہ کرے گا۔ یاد رکھیے! رسول اللہ ﷺ کی رشتہ داری کے باعث آپ پر اللہ کے حقوق اور اس کی اطاعت اور بھی زیادہ واجب ہو جاتی ہے۔''[2]

امام اوزاعی رحمہ اللہ نے زیادہ عمر بیروت میں گزاری اور وہیں صفر ۱۵۷ھ میں وفات پائی۔ اپنے دور میں وہ اہل شام کی فقہی روایات کے سب سے بڑے عالم تھے۔ ان کی قدر و منزلت بادشاہوں سے کم نہ تھی۔ اس دور کے بعض فقہاء فرماتے تھے کہ وہ خلیفہ بننے کے قابل ہیں۔[3] وہ مجتہد تھے۔ ان کے فتاویٰ کی تعداد ستر ہزار تک بتائی جاتی ہے۔[4]

امام اوزاعی رحمہ اللہ منقطع روایات اور اہلِ شام کی مراسیل سے بھی استدلال کرتے تھے؛ اس لیے ائمہ اربعہ کی فقہ کے سامنے اس کا چراغ زیادہ دیر نہ جل سکا۔ اگرچہ امیر عبدالرحمٰن اوّل کے دور تک اندلس میں انہی کی فقہ رائج رہی مگر امیر ہشام الرضی کے دور میں وہاں فقہ مالکی کا رواج ہو گیا۔ فقہِ اوزاعی رفتہ رفتہ دنیا سے ختم ہو گئی۔ تاہم علمی ابحاث میں اب بھی امام اوزاعی رحمہ اللہ کے اقوال اور فتاویٰ ذکر کیے جاتے ہیں۔[5]

◆ ◆ ◆

[1] تاریخ دمشق: ۳۵/۷۹؛ ۳۵/۲۱۲؛ سیر اعلام النبلاء: ۷/۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۸، ۱۲۹
یہ واقعہ تین مختلف روایات میں ہے جنہیں راقم نے ایک سیاق میں جمع کر دیا ہے۔ ایک روایت یعقوب بن شیبہ کی ہے۔ دوسری سلیمان بن عبدالرحمٰن کی ہے۔ تیسری روایت حاکم کی ہے۔ حافظ ذہبی اور علامہ ابن عساکر نے انہیں اپنی اسناد سے نقل کیا ہے۔

[2] سیر اعلام النبلاء: ۷/۱۲۵

[3] سیر اعلام النبلاء: ۷/۱۱۳

[4] سیر اعلام النبلاء: ۷/۱۱۱

[5] سیر اعلام النبلاء: ۷/۱۱۴، ۱۱۷

امام دارالہجرۃ...... مالک بن انس رحمہ اللہ (۹۳ھ-۱۷۹ھ)

امام مالک بن انس رحمہ اللہ امام دارالہجرۃ کے لقب سے مشہور ہیں۔ وہ ۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ یہ وہی سال تھا جس میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تھے۔[1] امام مالک رحمہ اللہ تبع تابعین کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اساتذہ بکثرت تھے۔ صرف مؤطا کے راویوں کی تعداد ۱۱۰ ہے۔[2] ان کی علمی مجلس بڑی باوقار اور سنجیدہ ہوتی۔ بڑے بڑے علماء وفقہاء اس میں شریک ہوتے۔[3]

امام مالک رحمہ اللہ کی جوانی کا دور سیاسی لحاظ سے بڑی افراتفری کا تھا جس میں بنو امیہ کی خلافت جو عرصے سے تدریجاً زوال پذیر تھی، دیکھتے ہی دیکھتے انجام کو پہنچی اور زبردست کش مکش کے بعد بنو عباس برسراقتدار آ گئے۔ بنو عباس کے ابتدائی دور میں امام مالک رحمہ اللہ کی عمر ۴۰ سے اوپر ہو چکی تھی۔ اسی دور میں مدینہ منورہ میں ان کا حلقۂ درس چہار سو مشہور ہوا اور دنیا کے کونے کونے سے شائقینِ علم کشاں کشاں آنے لگے۔[4] امام مالک رحمہ اللہ کی دینی پختگی کا یہ عالم تھا کہ کتاب وسنت اور اجتہاد کی روشنی میں جس موقف کو برحق سمجھتے اسی پر ڈٹ جاتے۔ منصور عباسی کی ہیبت ودبدبے سے بڑے بڑے امراء کانپتے تھے۔ ملاقات کے وقت اس کی دست بوسی کرتے تھے۔ امام مالک رحمہ اللہ اس سے ملے تو دست بوسی کی نہ عاجزی کا اظہار کیا۔[5] بڑے سے بڑا ظلم انہیں ان کے موقف سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ نفسِ زکیہ کے خروج کے دنوں میں انہوں نے طلاق کے مسئلے میں ایک حدیث سنائی۔ حاسدین نے مدینہ کے حاکم جعفر بن سلیمان کو بہکایا کہ امام مالک ایسی احادیث سنا کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حاکموں کی بیعت کی کوئی حیثیت نہیں۔ جعفر بن سلیمان نے یہ سن کر امام مالک کو بلوایا اور کپڑے اتروا کر کوڑوں کی سزا دی۔ اسی تشدد میں ان کا کاندھا اتر گیا۔ مگر امام صاحب نے اپنے موقف سے رجوع نہ کیا۔[6] امام صاحب کی وسعتِ ظرفی کا یہ حال تھا کہ فرماتے تھے:

''میں ان لوگوں کا ایک ایک کوڑا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتہ داری کے لحاظ سے معاف کر چکا ہوں۔''[7]

تکالیف ومصائب کے دور میں حق پر اس بے مثال التفات کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے عزت وتکریم

---

① سیر اعلام النبلاء: ۴۹/۸
② مقدمہ مؤطا مالک، ص ۲۸ از محمد مصطفیٰ الاعظمی
ایک قول کے مطابق امام مالک کے اساتذہ وشیوخ کی تعداد ۹۰۰ سے کم نہ تھی جس میں ۳۰۰ تابعین اور ۶۰۰ تبع تابعین تھے۔
③ سیر اعلام النبلاء: ۶۳/۸
④ وفیات الاعیان: ۱۳۵/۴
⑤ الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الائمۃ الفقہاء، لابن عبدالبر، ص ۴۲
⑥ الانتقاء فی فضل الثلاثۃ الائمۃ الفقہاء لابن عبدالبر، ص ۴۴
⑦ وفیات الاعیان: ۱۳۷/۴
یہ اس طرف اشارہ ہے کہ سزا دینے والا جعفر بن سلیمان، بنو عباس سے تھا۔ خاندانِ نبوت سے قرابت کا خیال کر کے امام مالک رحمہ اللہ نے اسے معاف کر دیا۔

کے دروازے کھول دیے، تمام عالم اسلام میں ان کے استقلال اور عظمت و کردار کی دھوم مچ گئی۔[1]

بنوعباس کا تیسرا خلیفہ مہدی اپنے بیٹوں: ہارون الرشید اور موسیٰ الہادی کو لے کر حاضر ہوا۔ پہلے مہدی نے انہیں مدینہ میں اپنی قیام گاہ پر مدعو کیا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ مہدی نے وجہ پوچھی تو امام مالک رحمہ اللہ نے کہلوا بھیجا:

''امیر المؤمنین! اہل علم کے پاس حاضری دی جاتی ہے۔''

مہدی نے کہا: ''سچ فرمایا'' اور شہزادوں کو ان کے پاس بھیج دیا۔ امام مالک رحمہ اللہ نے انہیں تعلیم دی۔[2]

ان دنوں خاندانِ بنوامیہ کے بچے کھچے حوصلہ مندوں نے اَندَلُس کو عباسی حکمرانوں کی گرفت سے آزاد کرا کے وہاں خود مختار حکومت قائم کر لی تھی۔ خاندانِ بنواُمیہ کا اصل وطن حجاز اور سیاسی مرکز شام رہا تھا؛ اس لیے انہیں فقہ حجازی و شامی سے زیادہ مناسبت تھی، کچھ مدت پہلے امام اوزاعی رحمہ اللہ اس مکتبِ فکر کے سب سے بڑے فقیہ شمار ہوتے تھے اور ان کے بعد اب امام مالک رحمہ اللہ کا شہرہ تھا۔ فقہی جلالتِ شان کے ساتھ جب عباسی حکام کے جبر و تشدد کے مقابلے میں امام مالک رحمہ اللہ کی استقامت کی خبریں بھی اَندَلُس پہنچیں تو وہاں کے حکمران جو عباسیوں کے حریف تھے، بڑے متاثر ہوئے۔ خصوصاً امیر ہشام الرضی پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ بیش قیمت تحائف کے ساتھ کئی قاصد امام مالک رحمہ اللہ کی خدمت میں بھیجے کہ آپ اسپین تشریف لا کر ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک بخشیں، مگر امام مالک رحمہ اللہ مدینہ منورہ میں پیوندِ خاک ہونے کی تڑپ رکھتے تھے؛ اس لئے معذرت کر دی۔ آخر ہشام الرضی نے اَندَلُس کو مالکی علوم سے مالا مال کرنے کے لئے اَندَلُس کے بہترین دماغ امام مالک کی خدمت میں تحصیل فقہ کے لیے روانہ کیے جن میں یحییٰ بن یحییٰ کا نام ممتاز ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے انہیں خصوصی توجہ کے ساتھ پڑھایا، سالہا سال کی محنت کے بعد جب یہ افراد فقہ مالکی کا ذخیرہ لے کر اَندَلُس واپس آئے تو امیر ہشام الرضی نے انہیں عدلیہ اور حکومت میں اعلیٰ عہدے دیے۔[3]

اَندَلُس کی عدالتوں میں امام مالک رحمہ اللہ کی تصنیف ''مؤطا'' کو بنیادی حیثیت حاصل رہی۔ رفتہ رفتہ اَندَلُس کے مسلمان مکمل طور پر فقہ مالکی کے رنگ میں رنگ گئے۔ چونکہ اَندَلُس اور شمالی افریقہ کے حالات اکثر ادوار میں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں؛ اس لئے اگلی صدیوں میں فقہ مالکی شمالی افریقہ بالخصوص الجیریا اور مراکش میں بھی عام ہو گئی اور یہ علاقے جنہیں عالمِ اسلام کا ''مغرب'' کہا جاتا ہے، فقہ مالکی پر عمل کرنے والوں سے آباد ہو گئے۔[4]

امام مالک رحمہ اللہ نے خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں ۱۴ ربیع الاوّل ۱۷۹ھ کو وفات پائی۔ آج بھی الجزائر، مراکش، سوڈان اور دیگر مسلم افریقی ممالک میں ان کی فقہ کے پیروکار اکثریت میں ہیں۔[5]

---

[1] وفیات الاعیان: ۴/۱۳۷، ط دار صادر [2] سیر اعلام النبلاء: ۸/۶۳

[3] نفح الطیب: ۲/۹ تا ۱۲؛ تاریخ العرب و حضارتهم فی الاَندَلُس از ڈاکٹر خلیل ابراهیم السامرائی، ص ۱۱۱

[4] تاریخ العرب و حضارتهم فی الاَندَلُس از ڈاکٹر خلیل ابراهیم السامرائی، ص ۱۱۲

[5] تاریخ الاسلام للذهبی: سنة ۱۷۹ھ

حافظ ذہبی اور علامہ ابن اثیر کا کہنا ہے کہ پانچویں صدی ہجری سے قبل افریقہ کے اہل سنت زیادہ تر حنفی مذہب پر عمل پیرا تھے۔ وہاں فقہ مالکی کا غلبہ پانچویں صدی ہجری میں امیر معز بن بادیس کی غیر معمولی لگن کے باعث ہوا۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۸/۱۴۰؛ الکامل فی التاریخ: ۷/۶۰۵)

اوّلین قاضی القضاۃ......امام ابو یوسف رحمہ اللہ (۹۳ھ۔۱۸۲ھ)

امام ابو یوسف رحمہ اللہ امام ابوحنیفہ کے سب سے ہونہار، ذی استعداد اور قابل فخر شاگرد تھے۔ وہ ۹۳ ہجری (۷۱۲ء) میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ اصل نام یعقوب بن ابراہیم تھا۔ وہ حضرت سعد بن حَبتہ انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے جو دورِ خلافتِ راشدہ میں مدینہ سے کوفہ منتقل ہوئے تھے۔① بچپن ہی سے علم کے شوقین تھے، مگر چونکہ ایک نادار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے؛ اس لئے والدین نے انہیں بچپن سے محنت مزدوری پر لگا دیا تھا، ابو یوسف گھر سے مزدوری کے لئے نکلتے مگر راستے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا حلقۂ درس دیکھ کر وہاں ٹھہر جاتے۔ والدین کو معلوم ہوا تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے شکوہ کیا۔ امام صاحب نے انہیں تسلی دے کر رخصت کیا اور نوعمر ابو یوسف کی خود کفالت کرنے لگے۔②

امام ابو یوسف رحمہ اللہ نہایت حاضر دماغ، قوی الحافظہ، ذہین وفطین، عالی ہمت اور سعادت مند تھے۔ علم کی تحصیل میں ایسا مجاہدہ کیا کہ بڑے بڑے انگشت بدنداں رہ گئے۔ ان کے ذمے والدہ کی خدمت بھی تھی اور اپنے گھر والوں کی کفالت بھی، مگر کبھی ان مجبوریوں کو علمی مشاغل میں رکاوٹ نہ بننے دیا۔ اس حیران کن محنت، مجاہدے اور پابندی نے انہیں اس مقام پر پہنچا دیا جس پر خود ان کے استاد بھی فخر کیا کرتے تھے۔③

ایک بار امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ روئے زمین کے سب سے بڑے عالم ہیں۔‘‘④

یہی وجہ تھی کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی وفات کے بعد امام ابو یوسف رحمہ اللہ سب کے اتفاق سے ان کے جانشین مقرر ہوئے اور مجالسِ فقہ کی رونقیں بڑھتی چلی گئیں۔⑤ خلیفہ منصور کے بعد مہدی کی حکومت آئی جو ایک فیاض اور بردبار انسان تھا، عالمِ اسلام میں امن وامان کا دور دورہ تھا، حکومت اہل علم کی قدر دانی کر رہی تھی، علماء وقضاۃ کو سرکاری دباؤ سے آزاد کر دیا گیا تھا۔ انہی دنوں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کو بغداد کے مشرقی ضلع کا عہدۂ قضا پیش کیا گیا، چونکہ اب عدلیہ کی بالادستی بحال ہو چکی تھی؛ اس لئے امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے یہ عہدہ قبول کر لیا اور بغداد چلے آئے۔⑥

① وفیات الاعیان: ۳۷۸/۶، ۳۷۹ ...... سعد بن حَبتہ کو سعد بن بُجَیر بھی کہا جاتا ہے۔ انصار کے حلیفوں میں سے تھے۔ حَبتہ ان کی والدہ کا اور بُجَیر والد کا نام تھا۔ غزوۂ احد میں کم سنی کی وجہ سے واپس کر دیے گئے تھے۔ ﴿الطبقات الکبری: ۵۲/۶ دار صادر﴾

② وفیات الاعیان: ۳۸۰/۶ ...... ایک روایت کے مطابق شکوہ کرنے والے ان کے والد تھے جبکہ دوسری روایت کے مطابق ابو یوسف یتیم ہو چکے تھے اور یہ شکوہ والدہ نے کیا تھا۔ امام صاحب نے جواب دیا تھا: ’’جاؤ بی بی! یہ لڑکا روغن پستہ کے ساتھ فالودہ کھانا سیکھ رہا ہے۔ ﴿مری یا رعناء هذا هو ذا يتعلم أكل الفالوذج بدهن الفستق. مناقب ابی حنیفۃ از موفق مکی: ۲۱۳/۲﴾

③ مناقب ابی حنیفہ، موفق مکی: ۲۱۵/۲ ④ وفیات الاعیان: ۲۴۹/۱۴

⑤ وفیات الاعیان: ۳۷۹/۶ ⑥ الطبقات الکبری: ۳۳۰/۷، دار صادر؛ اخبار القضاۃ لابن حیان البغدادی: ۲۵۶/۳

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا عہدۂ قضا کو قبول کرنا امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی اس علمی و انقلابی جدوجہد کی تکمیل کے لیے تھا جو ایک عرصے سے حکومت اور عہدوں سے علیحدہ رہ کر اسلامی احکام کی فقہی تدوین کی شکل میں جاری تھی۔ اس علمی محنت کے اثرات معاشرے میں پھیل چکے تھے اور نہ صرف فقہاء و قضاۃ بلکہ حکام اور شہزادے بھی اس سے متاثر تھے۔ لہٰذا اب وہ وقت آ چکا تھا کہ اسلامی احکام و قوانین کی اس مرتب شکل کو عدالتوں میں رائج کیا جائے۔ اس کے بغیر معتزلہ، زنادقہ اور دیگر گمراہ فرقوں کا زور توڑنا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے عدلیہ کے راستے نفاذِ دین کی خدمت پوری تندہی سے انجام دی۔ قضا کا عہدہ سنبھالنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ انہیں مسجد، مدرسے یا مسندِ افتاء سے کہیں زیادہ وسیع ایک ایسا میدان مل گیا جس میں ہر وقت ایک بہت بڑی سلطنت کے عوام و حکام کے مختلف مسائل اور عملی قضیوں سے سابقہ پڑ رہا تھا۔ اس صورتحال میں انہیں خوب موقع ملا کہ وہ فقہِ اسلامی کو زمینی حقائق پر منطبق کر کے ایک ایسا نظامِ قانون مرتب کر سکیں جو تصوراتی سے زیادہ عملی ہو جیسا کہ خود اسلام کا مزاج بھی ہے۔

اس دوران انہیں یہ موقع بھی ملا کہ وہ نظامِ خلافت کو جو اُموی دور سے مطلق العنان حکمرانی کے طرز پر چل رہا تھا، ایک منضبط آئین کے تحت لانے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ''کتاب الخراج'' کی شکل میں حکومتی اہم قوانین کا ایک مسودہ تحریر کیا جس میں خراج و محصولات کے علاوہ اسلامی حکومت کے تصور، خلیفہ کے فرائض، رعایا کے حقوق اور ذمہ داریوں، غیر مسلم شہریوں کے حقوق، عدلیہ کے اختیارات، جیل خانوں کی اصلاحات، مظالم کے انسداد، بیت المال کی تشکیل، محاصل اور مصارف سمیت متعدد قانونی پہلوؤں کو اسلامی نقطۂ نگاہ سے واضح کیا گیا ہے۔①

ان کی علمی خدمات دیکھ کر یحییٰ برمکی کو کہنا پڑا: ''ابو یوسف ہمارے ہاں آئے تو فقہ کا رواج بہت کم تھا۔ انہوں نے

---

① کتاب الخراج کے بعد عباسی دورِ خلافت میں اس طرز کی اور بھی متعدد کتب لکھی گئیں جو ضخامت اور موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے زیادہ وسیع ہیں مثلاً: طرطوشی کی ''سراج الملوک''، الماوردی کی ''الاحکام السلطانیہ''، امام غزالی کی ''التبر المسبوک'' وغیرہ۔ ان تمام کتب میں ایک بات مشترک ہے کہ ان میں اسلام کے سیاسی نظام کی بعض ایسی بنیادی خصوصیات کی بحث نہیں چھیڑی گئی جو خلافتِ راشدہ کا مایۂ امتیاز تھیں اور جن کی طرف لوٹے بغیر ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کا مقصد کماحقہ حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مثلاً ان میں مسلم سربراہ کے انتخاب کے لیے ایسی شورائیت کے اصول کی دعوت نہیں دی گئی جس میں قوم کے علماء و فضلاء اور علم و تقویٰ کے لحاظ سے بہترین افراد صفِ اول میں ہوں۔ موروثی حکومتوں کے نقصانات پر بعض اسلاف کی تحریروں میں اظہارِ افسوس ملتا ہے مگر اس جمود کو توڑنے کی دعوت نہیں ملتی۔ مگر اس کا یہ مطلب نکالنا غلط ہوگا کہ یہ حضرات اسلامی حکومت کی اصل اور مطلوب خصوصیات سے ناآشنا تھے اور ان کے نزدیک شاہانہ حکومتیں عین اسلامی تھیں اور یہ کہ ان کے نزدیک اسلامی حکومت کا تصور انہی موضوعات و عناوین تک محدود تھا جو انہوں نے اپنی کتب میں درج کیے۔

اصل بات یہ تھی کہ ایسی کتب حکمرانوں کو پیش کر کے انہی کے ہاتھوں ملک کا نظام بہتر کرنے کی امید پر لکھی گئی تھیں۔ اس دور میں حکمرانی کا موروثی طریقہ ایک ایسے اصولِ موضوعہ کی حیثیت اختیار کر گیا تھا کہ اس میں تبدیلی کی کوئی آواز حکمرانوں کے لیے سرے سے ناقابلِ برداشت تھی اور وہ ایسی ہر تحریر کو بغاوت کی کھلی دعوت ہی تصور کر سکتے تھے۔ ایسی تحریر کا نتیجہ فقط یہ نکلتا کہ حکمران اس کتاب کو حرفِ غلط سمجھ کر مٹا دیتے جبکہ کچھ لوگ حکمرانوں سے منحرف ہو کر باغیانہ روش اختیار کر لیتے اور کشت و خون کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ایسے میں ان بزرگوں نے یہی مناسب سمجھا کہ اسلامی حکومت کا وہ زیادہ سے زیادہ نقشہ جو حکمرانوں کے لیے قابلِ قبول ہو، انہیں پیش کر دیا جائے۔ چاہے وہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے ''درجۂ جواز'' ہی تک ہو، اور اسلامی حکومت کے محض واجبی مقاصد کو پورا کرتا ہو۔ ایک ایسا نظام پیش کرنا جو مکمل تو ہو مگر حکمرانوں سے اس کی قبولیت کی توقع بالکل نہ ہو، ان بزرگوں کے نزدیک کارِ عبث تھا۔ اسلامی حکومت کے بنیادی اصول تو کتاب و سنت اور خلفائے راشدین کی سیرت میں اتنے واضح تھے کہ ہر سنجیدہ و فہمیدہ شخص کو معلوم تھے۔ مگر جب حکمران جان بوجھ کر ان سے نظریں چراتے آرہے تھے تو انہیں ایسی بدیہی باتیں جتلاتے رہنا بے فائدہ تھا۔ سیاست شرعیہ پر کام کرنے والے بزرگوں نے اپنی بساط بھر کوشش ان زمینی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے کی تھی۔

انہوں نے اپنی فقہ سے مشرق و مغرب کو پُر کر دیا۔''[1]

مہدی کے بعد ہادی نے عنانِ حکومت سنبھالی تو اس نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کو پورے بغداد کا قاضی بنا دیا۔[2]

ہادی کی وفات کے بعد ۱۷۰ھ (۷۸۶ء) میں ہارون الرشید کی حکومت شروع ہوئی تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ کو خلافت کے ماتحت تمام ممالک کا قاضی القضاۃ مقرر کر دیا گیا۔ وہ پہلے شخص تھے جنہیں قاضی القضاۃ کا لقب ملا۔[3]

قاضی القضاۃ بننے کے بعد تمام صوبوں قاضیوں کا تقرر انہی کے ذمے ہو گیا جس کے باعث حنفی فقہاء کو آگے آنے کے زیادہ مواقع ملے اور ان کے ذریعے خود بخود پوری خلافتِ عباسیہ میں فقہ حنفی رائج ہوتی چلی گئی۔[4]

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ چونکہ ایک سرکاری عہدے دار تھے؛ اس لیے انہوں نے جس فقہ کی ترویج کی، اس میں بذاتِ خود کوئی خاص خوبی نہیں تھی، نہ ہی وہ کسی آزادانہ تحقیق کا نتیجہ تھی بلکہ اسے عباسیوں نے اپنی سیاسی مصلحت کی خاطر رائج کرایا تھا اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے ان کا آلہ کار بن کر یہ کام کیا تھا۔

یہ اعتراض اس لیے بے حقیقت ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی سیرت و کردار پر دوسرے مسلکوں کے علماء، فقہاء اور محدثین نے بھی انگلی نہیں اٹھائی بلکہ سب ان کی نیکی، سچائی اور عدل و انصاف کی تعریف کرتے رہے ہیں۔[5]

پھر تاریخی شواہد موجود ہیں کہ قاضی بن کر انہوں کسی بھی موقع پر سرکاری دباؤ قبول نہیں کیا۔ خلیفہ ہادی کے دور میں جب وہ فقط بغداد کے مشرقی ضلع کے قاضی تھے، انہوں نے ایک مقدمے میں ہادی کے خلاف فیصلہ دیا تھا۔[6]

ملزم چاہے کتنا ہی بڑا عہدیدار کیوں نہ ہو، اسے فریادی کے ساتھ انصاف کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔

ہارون الرشید کے عہد میں ایک بوڑھے نصرانی نے اس کے خلاف ایک باغ کا دعویٰ دائر کر دیا۔ قاضی ابو یوسف نے دربار میں بلا کر خلیفہ کے اس کی عرض داشت سنی۔ چونکہ مدعی کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا؛ اس لیے قاضی صاحب نے خلیفہ سے اس دعوے کی تردید میں حلف اٹھوایا۔ اس دوران ہارون اپنے تخت پر بیٹھا رہا۔

قاضی صاحب مرتے دم تک اس پر افسوس کرتے تھے کہ انہوں نے اس مقدمے کی سماعت میں خلیفہ کو اس نصرانی کے برابر کیوں نہ کھڑا کیا۔ بسترِ مرگ پر وہ فرما رہے تھے: ''الٰہی! تو جانتا ہے کہ اس ایک واقعے کے سوا میں نے کبھی فریقین میں برابری ترک نہیں کی۔ تو میری یہ لغزش معاف کر دے۔''[7]

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۸/۵۳۷، ط الرسالۃ

[2] فلما استخلف موسیٰ وقدم بغداد کان قاضیہ ابویوسف فی جمیع بغداد. ﴿اخبار القضاۃ لابن حیان: ۳/۲۵۶﴾

[3] اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ للصیمری، ص ۹۷؛ تاریخ بغداد: ۱۶/۳۵۹، ت بشار

[4] لما ولی قضاء القضاۃ ابویوسف کانت القضاۃ من قبلہ فکان لا یولی قضاء البلاد من اقصی المشرق الی اقصی اعمال الافریقیۃ الا اصحابہ والمنتمین الی مذھبہ. (جذوۃ المقتبس فی ذکر ولاۃ الاندلس للمیورقی، ص ۳۸۳؛ نفح الطیب، ۲/۱۰)

[5] امام احمد بن حنبل نے حدیث سیکھنے کا آغاز انہی سے کیا۔ یحییٰ بن معین انہیں اصحابِ رائے کا ''اثبت فی الحدیث'' کہتے تھے۔ امام مزنی انہیں ''اتبع للحدیث'' فرماتے تھے۔ ﴿مناقب ابی حنیفۃ وصاحبیہ للذھبی، ص ۶۳ تا ۶۵﴾ امام نسائی اور ابن حبان نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے۔ ﴿لسان المیزان: ۸/۵۱۸﴾

[6] مناقب ابی حنیفۃ للکردری: ۲/۱۲۸ [7] المبسوط للسرخسی: ۱۶/۶۱، ط دار المعرفۃ، مناقب ابی حنیفۃ للمکی: ۲/۲۴۳، ۲۴۴

ہارون الرشید سے ایک بار پوچھا گیا کہ آپ نے قاضی ابو یوسف کو اتنا اونچا مقام کیوں دے رکھا ہے؟ ہارون نے جواب دیا: ''میں نے انہیں علم کے جس باب میں بھی جانچا، کامل پایا۔ مزید یہ کہ وہ ایک حق گو اور مضبوط کردار کے انسان ہیں۔ ان جیسا کوئی اور ہو تو مجھے لاکر دکھاؤ۔''[1]

یہی وجہ تھی کہ قاضی ابو یوسف کی سواری شاہی محل کے دیوانِ خاص کے پردے تک جاتی تھی (جہاں وزیر کو بھی پیدل چلنا پڑتا تھا) جب وہ تشریف لاتے تو خلیفہ خود آگے بڑھ کر انہیں سلام کرتا تھا۔[2]

ہارون الرشید کے گورنر علی بن عیسیٰ کو قاضی ابو یوسف نے اس بناء پر نا قابلِ اعتبار گواہ شمار کیا تھا کہ وہ نماز باجماعت کی پابندی نہیں کرتا تھا۔ علی بن عیسیٰ نے اس پر شرمندہ ہو کر اپنی حویلی کے ساتھ ایک مسجد تعمیر کرائی اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے لگا۔[3]

ہارون کے ایک سپہ سالار کو انہوں نے اس وجہ سے ساقط الشہادۃ قرار دیا تھا کہ وہ خود کو خلیفہ کا غلام کہتا تھا۔ امام ابو یوسف کا کہنا تھا کہ اگر وہ اس قول میں سچا ہے (یعنی واقعی غلام ہے) تو غلام کی گواہی نا قابلِ قبول ہے۔ اور اگر وہ محض خلیفہ کی خوشامد کے لیے جھوٹ موٹ ایسا کہتا ہے تو ظاہر ہے کہ جھوٹے کی گواہی قبول نہیں کی جا سکتی۔[4]

ایسے بے لاگ کردار کے حامل شخص کے بارے میں بھلا کوئی باور کر سکتا ہے کہ وہ کسی کی سیاسی مصلحتوں کو پورا کرنے کے لیے اپنا دین وایمان بیچتا ہوگا!!

امام ابو یوسف رحمہ اللہ حکمرانوں کی اصلاح کے لیے بھی کوشاں رہے۔ انہوں نے ''کتاب الخراج'' کے آغاز میں ہارون الرشید کو جس انداز سے مخاطب کیا ہے، اس کے ایک ایک لفظ سے پتا چلتا ہے کہ وہ عدل وقضا کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ حکومت اور حکمران کی اصلاح کے لیے بھی فکرمند تھے اور اس سلسلے میں حکام کو نصیحت وفہمائش کے ہر مناسب موقع کو استعمال کرتے تھے۔ ''کتاب الخراج'' کے آغاز میں وہ فرماتے ہیں:

''امیر المؤمنین! اللہ نے آپ پر بہت بڑی ذمہ داری ڈالی ہے جس کا ثواب عظیم ترین ہے اور عذاب شدید ترین۔ جب اللہ نے آپ کو اس کا ذمہ دار بنا دیا تو آپ شب وروز جدو جہد کر کے ان لوگوں کے حقوق کی بنیادوں کو مضبوط کریں جن کے آپ امین ہیں۔ وہ عمارت کبھی پائیدار نہیں ہوتی جو تقویٰ کی بنیاد پر قائم نہ ہو۔ اللہ اسے بنانے والوں اور ان کے معاونین پر ڈھا کر چھوڑتا ہے۔

آپ اس ذمہ داری کو ضایع نہ کریں جو اس امت کے حوالے سے آپ پر عائد ہے۔ عمل میں قوت اللہ کے حکم ہی سے آتی ہے۔ آج کا کام کل پر مت چھوڑیے۔ اگر ایسا کیا تو نقصان ہوگا۔ آرزوئیں پوری ہونے سے پہلے موت آجاتی ہے۔ پس عمل کو موت سے پہلے کر لیجیے۔ موت کے بعد عمل کا کوئی امکان نہیں۔ قیامت کے

[1] مناقب ابی حنیفة للمکی: ۲/۲۳۲
[2] مناقب ابی حنیفة للمکی: ۲/۲۲۶، ۲۲۷
[3] مناقب ابی حنیفة للمکی: ۲/۲۴۰
[4] مناقب ابی حنیفة للمکی: ۲/۲۴۰

دن وہی بادشاہ خوش قسمت ثابت ہوگا جس نے عوام کو خوش حال رکھنے کی کوشش کی۔ خبردار! کسی معاملے میں سیدھی راہ سے نہ ہٹیے ورنہ عوام بھی سیدھے راستے سے ہٹ جائیں گے۔ خبردار! کسی معاملے میں نفس کی خواہش اور غصے کو شامل نہ ہونے دیں۔ جب دین و دنیا کی کش مکش ہو تو دین کے پہلو کو اختیار کریں، دنیا کو چھوڑ دیں۔''[①]

۱۷ برس تک عدلیہ کی ذمہ داریاں سرانجام دینے کے بعد قاضی صاحب مرض الموت میں مبتلا ہوگئے۔ وفات سے پہلے ان پر بار بار رقت طاری ہوتی تھی۔ جب جان کنی کا وقت آیا تو روتے ہوئے فرمایا:

''اے اللہ! تو خوب جانتا ہے، میں نے کسی پر زیادتی نہیں کی، کسی پر ظلم نہیں کیا، تیرے بندوں پر جان بوجھ کر کوئی غلط حکم نہیں لگایا۔ میں نے تیرے قرآن اور تیرے پیغمبر ﷺ کی سنت کو سامنے رکھ کر اجتہاد کیا۔ جب کوئی مشکل حل نہ ہوئی تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو اپنے اور تیرے درمیان (حق بات تک رسائی کا) پل بنا لیا کہ وہ تیرے احکام سے زیادہ واقف تھے اور تیرے حکم کے دائرے سے کبھی باہر نہیں نکلتے تھے۔ اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں تو میری مغفرت فرما دے۔''

یہ کہتے ہوئے جان جانِ آفریں کے سپرد کردی۔ یہ یکم ربیع الآخر ۱۸۲ھ (۲۲ مئی ۷۹۸ء) کا واقعہ ہے۔[②]

قاضی ابویوسف رحمہ اللہ کی کاوشوں سے فقہ اسلامی کو مشرق و مغرب میں اس قدر مقبولیت نصیب ہوئی کہ بعد میں معتزلہ اور اہلِ تشیع اپنا پورا زور لگا کر بھی اس کے اثرات کو محو نہیں کر سکے۔

مامون الرشید کے دور میں اس کے شیعہ وزیر فضل بن سہل کو کسی نے مشورہ دیا کہ عدالتوں سے فقہ حنفی ختم کر دی جائے۔ فضل بن سہل نے اپنے مشیروں سے اس بارے میں رائے لی تو انہوں نے کہا:

''یہ بات چلنے والی نہیں۔ سارا ملک بپھر جائے گا۔ جس نے آپ کو یہ مشورہ دیا ہے وہ نادان ہے۔''

فضل بن سہل نے ان کی رائے کا وزن تسلیم کرتے ہوئے کہا:

''میرا خیال ہے کہ امیر المؤمنین بھی اسے پسند نہیں کریں گے اور میں خود بھی اس تجویز کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔''[③]

حالانکہ مامون کے دربار میں تشیع اور اعتزال کا غلبہ تھا مگر یہ لوگ بھی سمجھتے تھے کہ فقہ حنفی جس طرح کلیات و جزئیات کو حاوی ہے، کوئی دوسری فقہ اس کی ہمسری نہیں کر سکتی اور قاضیوں کے لیے فقہ حنفی کو سامنے رکھ کر مقدمات کے فیصلے کرنا جس قدر آسان ہے، کسی دوسری فقہ میں اس قدر سہولت نہیں۔

الغرض فقہ حنفی کی افادیت عملی طور پر تسلیم کرانے میں امام ابویوسف رحمہ اللہ کی ان عظیم خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جو انہوں نے ایک فقیہ، مفتی اور قاضی القضاۃ کے طور پر پیش کیں۔

---

① الخراج، ص ۱۳، ۱۴، ط مکتبة الازهرية

② مناقب ابی حنیفة للمکی: ۱۵۷/۲، ۱۵۸

③ مناقب ابی حنیفة للمکی: ۲۴۲/۲

امام محمد بن الحسن الشیبانی رحمہ اللہ (۱۳۲ھ۔۱۸۹ھ)

فقہ حنفی کے مؤسس امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تھے، اس کے نفاذ کا کارنامہ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کے ہاتھوں انجام پایا جبکہ اسے جامعیت، نفاست اور سلیقے کے ساتھ محفوظ کرنے کا عظیم کام امام محمد بن الحسن رحمہ اللہ نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

امام محمد رحمہ اللہ ۱۳۲ھ (۷۴۹ء) میں واسط (عراق) میں پیدا ہوئے تھے، بعدازاں آپ کا خاندان کوفہ آ گیا۔[1]

۱۴۶ھ میں جب وہ چودہ برس کے تھے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے حلقے سے وابستہ ہوئے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فقاہت کے لیے قرآن مجید میں رسوخ کو بنیاد مانتے تھے اور ان کے حلقے میں شمولیت کے لیے قرآن مجید حفظ کر کے آنا شرط تھا۔ امام محمد حافظ نہیں تھے۔ یہ شرط سنی تو قرآن مجید کے حفظ میں مشغول ہو گئے اور صرف ایک ہفتے میں حفظ قرآن کی تکمیل کر کے حلقۂ درس میں شرکت کے اہل بن گئے۔ اس سے ان کے بے مثل حافظے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انہیں چار سال تک امام اعظم رحمہ اللہ سے استفادے کا موقع ملا۔ اس دوران انہوں نے علم کا بہت بڑا ذخیرہ محفوظ کر لیا تھا۔[2]

۱۵۰ھ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی وفات ہوگئی جس کے بعد امام محمد نے ان کے جانشین امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا دامن تھام لیا۔ اور ان سے طویل عرصے تک فیض حاصل کیا، اس طرح حدیث وفقہ کے علوم کی تکمیل کی۔[3]

اگرچہ امام محمد رحمہ اللہ نے امام اعظم اور قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کی مجالس میں رہ کر قرآنی علوم اور حدیث وفقہ میں مہارت حاصل کر لی تھی مگر اس کے باوجود ان کی علمی تڑپ باقی رہی چنانچہ وہ بصرہ، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور شام کے دیگر محدثین سے استفادے کے لیے ایک عرصے تک جہاں نوردی کرتے رہے۔ اس دوران انہوں نے امام اوزاعی، امام ثوری اور امام مالک رحمہم اللہ جیسے محدثین اور فقہاء کے علوم کو اپنے سینے میں جمع کر لیا۔[4]

حدیث، فقہ اور تفسیر کے علاوہ نحو، ادب اور لغت کے ائمہ سے بھی خوب استفادہ کیا۔ فرماتے تھے: ''والد کی میراث سینتیس ہزار درہم ملے جن میں سے نصف میں نے نحو اور شعر پر اور نصف فقہ وحدیث پر خرچ کیے۔''[5]

امام محمد رحمہ اللہ نے تین سال تک امام مالک رحمہ اللہ سے حدیث پڑھی اور ان کی کتاب مؤطا حرف بحرف سنی اور یاد کی۔[6] پھر اس کتاب کو انہوں نے استاذ کی اضافی تشریحات اور دیگر اہم افادات کے ساتھ خود لکھا۔ اس طرح یہ

---

[1] الجواہر المضیة: ۱/۵۲۶، ط میر محمد کتب خانہ
[2] مناقب ابی حنیفة للکردری: ۲/۱۵۴، ۱۵۵
[3] اخذ عن ابی حنیفة بعض الفقه و تمم الفقه علی القاضی ابی یوسف. ﴿سیر اعلام النبلاء: ۹/۱۳۴، ط الرسالة﴾
[4] الجواہر المضیة: ۱/۵۲۶
[5] مناقب ابی حنیفة للکردری: ۲/۱۵۵
[6] سیر اعلام النبلاء: ۹/۱۳۵، ط الرسالة

مستقل تصنیف بن گئی جو ''موطا محمد'' کے نام سے مشہور ہے اور ذخیرۂ حدیث میں اہم مقام رکھتی ہے۔انہوں نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ''کتاب الآثار'' کو بھی اپنی تشریحات کے ساتھ نقل کیا اور اسے زیادہ مفید بنا دیا۔

امام محمد رحمہ اللہ نے اساتذہ کے علوم کی اشاعت وحفاظت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ان کا حلقۂ درس بھی دنیا بھر میں مشہور تھا۔امام شافعی رحمہ اللہ نے ان کی شاگردی کی اور حدیث کا بڑا ذخیرہ حاصل کیا۔فرماتے تھے:

''میں نے امام محمد سے اتنا کچھ نقل کیا ہے جسے اٹھانے کے لیے ایک بختی اونٹ چاہیے۔''[1]

امام محمد رحمہ اللہ نے ''المبسوط''، ''الجامع الصغیر'' اور ''الجامع الکبیر'' جیسی متعدد شہرۂ آفاق کتابیں تصنیف کیں اور ان میں فقہ حنفی کو مکمل تشریح وتفصیل اور دلائل وبراہین کے ساتھ محفوظ کر دیا۔

امام محمد رحمہ اللہ کی یہ کتب اتنی جامع، مرتب، مدلل اور مفصل ہیں کہ انہیں پڑھتے ہوئے انسان خود کو علوم کے دریا میں غوطہ زن محسوس کرتا ہے اور قلب وذہن میں اسلام کی حقانیت اور جامعیت کا احساس پختہ تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

امام محمد رحمہ اللہ تصنیف وتالیف کے کام میں رات کا بیشتر حصہ جاگ کر گزارتے تھے۔چاروں طرف نوشتوں اور کاغذات کا انبار ہوتا۔ان کی دس بہترین تعلیم یافتہ باندیاں عبارات پڑھ کر سنانے، نقل کرنے اور تصحیح کرانے میں ان کے ساتھ ہوتیں۔کوئی پوچھتا کہ آپ سوتے کیوں نہیں؟ تو فرماتے: ''لوگ ہم پر بھروسہ کر کے سو رہے ہیں کہ جب کوئی مسئلہ پیش آئے گا، محمد سے پوچھ لیں گے۔ہم بھی سو گئے تو علمِ دین ضایع ہو جائے گا۔''[2] جب انہوں نے ''السیر الکبیر'' جیسی عظیم کتاب تصنیف کی جو جہاد ومغازی، داخلہ وخارجہ امور اور اسلامی حکومت کے جملہ معاملات کو محیط ہے تو دنیا حیران رہ گئی۔یہ کتاب اپنی ضخامت کی وجہ سے بیل گاڑی پر لاد کر قصرِ خلافت میں پہنچائی گئی تھی۔[3]

ہارون الرشید نے جب بغداد چھوڑ کر شام کے شہر ''رقہ'' کو اپنا پایۂ تخت بنانے کا فیصلہ کیا تو وہاں کے قاضی کے لیے اس کی نگاہِ انتخاب امام محمد رحمہ اللہ پر پڑی مگر جب انہیں عہدۂ قضا پیش کیا گیا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ہارون الرشید نے انہیں قید کر دیا اور سخت نگرانی شروع کرا دی۔[4]

آخر کار امام محمد نے اس التزام کے ساتھ یہ عہدہ قبول کر لیا کہ کسی معاملے میں حکمران کی رعایت نہیں کی جائے گی۔ رقہ کے قاضی بننے کے بعد ان کی موجودگی میں ایسا جو بھی قضیہ پیش آیا جس میں ہارون نے شریعت سے تجاوز کی کوشش کی تو انہوں نے فوراً وہاں کلمۂ حق بلند کیا۔ایک بار ہارون الرشید بنوتغلب کے ایک نصرانی پر تشدد کرتے ہوئے درباریوں سے کہہ رہا تھا: ان کا عہد وپیمان انہیں واپس کر دو۔''

امام محمد رحمہ اللہ نے یہ منظر دیکھا تو فرمایا: ''ان سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معاہدہ کیا تھا۔اسے توڑنے کی کوئی گنجائش نہیں۔'' ہارون نے اپنے طور پر کچھ حجت پیش کی مگر امام محمد رحمہ اللہ نے مدلل جواب دے کر چپ کرا دیا۔[5]

① سیر اعلام النبلاء: ۱۳۵/۹، ط الرسالة ② مناقب ابی حنیفة للکردری: ۱۶۳/۲

③ شرح السیر الکبیر للسّرخسی: ۴،۳/۱ ④ مناقب ابی حنیفة للکردری: ۱۶۲/۲

⑤ مناقب ابی حنیفة للکردری: ۱۶۳/۲

ایک بار ایک ہاشمی کو خروج کے شبہے میں قید کر کے ہارون کے پاس لایا گیا جس کے پاس حکومت کا امان نامہ موجود تھا۔ امام محمد رحمہ اللہ نے وہ امان نامہ پڑھ کر کہا: ''یہ امان نامہ درست ہے اور اس شخص کو قتل کرنا حرام ہے۔''

اس پر ایک درباری عالم ابوالبختری نے بیچ میں آ کر وہ امان نامہ چاک کر دیا اور ہارون سے کہا:

''امان نامہ منسوخ ہو چکا ہے۔ قیدی کو قتل کر دیں۔ اس کے خون کا میں ذمہ دار ہوں۔''

ہارون الرشید اس وقت آپے سے باہر تھا۔ اس نے دوات اٹھا کر امام محمد کے سر پر دے ماری۔ اس سلوک پر امام محمد مجلس سے نکل گئے۔ گھر پہنچے تو رونے لگے۔ وجہ پوچھی گئی تو فرمایا: ''اپنی تقصیر پر روتا ہوں۔ مجھے ابوالبختری سے پوچھنا چاہیے تھا کہ تم نے یہ قول کس دلیل کی بنیاد پر کیا۔ مجھے ان پر حجت تمام کر دینی چاہیے تھی چاہے میں قتل ہو جاتا۔''[1]

بعد میں ہارون کو اپنے کیے پر شرمندگی ہوئی۔ اس نے امام محمد کو پہلے سے بڑھ کر مقرب بنایا اور ''قاضی القضاۃ'' کا عہدہ دے دیا۔ ۱۸۹ھ میں ہارون الرشید کچھ سیاسی تنازعات حل کرنے ''رَے'' کے سفر پر روانہ ہوا تو امام محمد بن الحسن کو بھی ساتھ لے لیا۔ رَے کے ایک دیہات ''اَرَنْبُوْیَہ'' پہنچ کر امام محمد رحمہ اللہ کا وقتِ موعود آ گیا۔ ان کی عمر ۵۷ سال تھی۔ اسی دن اسی قافلے میں شامل مشہور قاری اور نحوی امام کسائی رحمہ اللہ کا انتقال ہوا۔ ہارون الرشید نے ''اَرَنْبُوْیَہ'' کی خاک میں ان دونوں کی تدفین کے بعد کہا: ''آج ہم نے فقہ اور نحو دونوں کو دفن کر دیا۔''[2]

امام محمد رحمہ اللہ دنیا سے رخصت ہو کر بھی اپنی تصانیف میں زندہ رہے۔ صرف حنفی علماء نے نہیں، ہر مسلک کے مجتہدین، فقہاء، علماء اور دانشوروں نے ان کے علمی ذخائر سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے اتنے باریک مسائل کا علم کہاں سے حاصل کیا؟ تو ان کا جواب تھا: ''امام محمد کی تصانیف سے۔''[3]

ایک عیسائی عالم نے امام محمد رحمہ اللہ کی کتاب ''المبسوط'' کا مطالعہ کیا تو اس کے دل میں اسلام کی صداقت کا یقین پیدا ہو گیا اور اس نے یہ کہتے ہوئے قبولِ اسلام کا اعلان کر دیا کہ جب مسلمانوں کے چھوٹے محمد (امام محمد) کے علوم کا یہ حال ہے تو بڑے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کیا شان ہوگی!''[4]

آج تک علمائے امت امام محمد رحمہ اللہ کی کتب سے استفادہ کر رہے ہیں۔ فقہِ اسلامی کی بہاریں ہمیشہ امام محمد رحمہ اللہ کی یاد دلاتی رہیں گی۔

❖ ❖ ❖

[1] اخبار ابی حنیفۃ للصیمری، ص ۱۲۶، ۱۲۷

[2] سیر اعلام النبلاء: ۹/۱۳۶، ط الرسالۃ

[3] اخبار ابی حنیفۃ للصیمری، ص ۱۳۱

[4] کشف الظنون: ۲/۱۵۸۱، ط دار الکتب العلمیۃ

امام محمد بن ادریس الشافعی رحمہ اللہ (۱۵۰ھ-۲۰۴ھ)

جس برس آفتاب اجتہاد حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ دنیا سے رخصت ہوئے، اسی سال حدیث وفقہ کے باغ کو سیراب کرنے والی وہ عظیم شخصیت دنیا میں آئی جسے ہم ''امام محمد بن ادریس الشافعی'' کے نام سے جانتے ہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ نسباً قریشی تھے۔ ۱۵۰ھ میں فلسطین کے علاقے غزہ میں پیدا ہوئے جو بیت المقدس سے قریب ہے۔ والد صاحب کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا، مگر والدہ نے غربت کے باوجود بڑے اہتمام سے ان کی تعلیم و تربیت کی۔ وہ دو برس کے تھے جب ان کی والدہ محترمہ اسی مقصد کے لیے انہیں لے کر پہلے حجاز اور پھر یمن چلی آئیں، دس برس یہاں گزارے پھر مکہ معظمہ میں رہائش اختیار کی۔[1]

امام شافعی رحمہ اللہ بچپن ہی سے انتہائی ذہین و فطین، ہوشیار اور دوراندیش تھے۔ پڑھنے کا اتنا شوق تھا کہ سات سال کی عمر میں پورا کلام اللہ حفظ کرلیا۔[2] اس کے بعد علوم وفنون کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ زمانہ ان کی مفلسی اور فقروفاقہ کا تھا۔ ان کی واحد سرپرست ماں تھیں جن کے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ بیٹے کو لکھنے کے لیے کاغذ دلا دیتیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ چوڑی ہڈیاں چن چن کر رکھتے اور ان پر اسباق تحریر کر کے محفوظ کر لیتے۔[3]

اسی زمانے میں انہوں نے تیراندازی کی مشق شروع کی اور اس فن میں اتنی مہارت پیدا کی کہ دس میں سے نو نشانے بالکل صحیح ہدف پر لگتے۔[4] عربی لغت اور حفظِ اشعار کا چسکا بھی لگ گیا۔ خود بھی نہایت عمدہ اشعار کہنے لگے۔[5] دس سال کی عمر میں وہ مؤطا امام مالک بھی حفظ کر چکے تھے۔[6] اس کے بعد مکہ کے فقیہ مسلم بن خالد زنجی رحمہ اللہ کی خدمت میں رہ کر علم فقہ کا ملکہ حاصل کیا۔[7] پندرہ برس کے تھے کہ استاد نے افتاء نویسی کی اجازت دے دی۔[8]

۲۳ برس کی عمر میں ''امام دارالہجرۃ'' امام مالک بن انس رحمہ اللہ سے مؤطا براہِ راست پڑھنے کے لیے مدینہ منورہ کا سفر کیا۔ امام مالک رحمہ اللہ کی جوہر شناس نگاہوں نے اس ہیرے کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگایا اور خاص توجہ اور محبت سے پڑھایا۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے انہیں مؤطا حفظ سنا کر چند دنوں میں تکمیل کر لی۔[9]

اس کے بعد وہ ان سے وقتاً فوقتاً فقہ کی تحصیل میں مشغول رہے۔ اس دوران والدہ کی دیکھ بھال کے لیے مکہ معظمہ اور دیگر علماء سے ملنے دوسرے شہروں میں بھی جاتے رہے۔[10] یمن کے فقہاء ومحدثین سے بھی استفادہ کیا۔[11]

① سیر اعلام النبلاء: ۶۰۵/۱۰، ط الرسالۃ　② تاریخ بغداد: ۶۰/۲ ط دار الکتب العلمیۃ
③ سیر اعلام النبلاء: ۱۱/۱۰　④ تاریخ بغداد: ۵۸/۲　⑤ تاریخ بغداد: ۶۱/۲
⑥ تاریخ بغداد: ۶۰/۲　⑦ سیر اعلام النبلاء: ۶/۱۰　⑧ تاریخ بغداد: ۶۲/۲
⑨ سیر اعلام النبلاء: ۷/۱۰　⑩ الامام الشافعی لابی زهرة، ص ۲۱　⑪ سیر اعلام النبلاء: ۷/۱۰

۱۷۹ھ میں امام مالک رحمہ اللہ وفات پا گئے۔ امام شافعی رحمہ اللہ دوبارہ مکہ میں مقیم ہوگئے۔ اب انہیں کسبِ معاش کی ضرورت محسوس ہوئی۔ قسمت کی بات کہ یمن کا عباسی گورنر ان دنوں مکہ آیا ہوا تھا۔ اس نے امام شافعی رحمہ اللہ کے علم وفضل کی شہرت سنی تو انہیں ساتھ لے گیا اور یمن کے ضلع نجران کا عامل مقرر کر دیا۔[1] امام شافعی رحمہ اللہ نے نہایت عدل وانصاف کے ساتھ اس منصب کو نبھایا۔ ان کی اصول پسندی سے وہ لوگ ناخوش ہوئے جو رشوت اور خوشامد کے ذریعے اپنے کام نکلوانے کے عادی تھے۔ ایسے حاسدوں نے یمن کے گورنر کے کان بھر کر اسے امام شافعی رحمہ اللہ سے متنفر کر دیا۔[2]

عباسیوں کو ہر وقت علویوں کے خروج کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ امام شافعی رحمہ اللہ بھی نسب کے لحاظ سے حضور اکرم ﷺ کے قرابت دار تھے۔ اہلِ بیت سے انہیں خاص محبت وعقیدت تھی۔ اسی بناء پر بعض لوگ انہیں تشیع میں ملوث قرار دیتے تھے۔ ایسے لوگوں کے لیے انہوں نے یہ شعر کہا تھا:

إِنْ كَانَ رَفْضًا حُبُّ آلِ مُحَمَّدٍ ۔۔۔ فَلْيَشْهَدِ الثَّقَلَانِ أَنِّي رَافِضِي

(اگر آلِ محمد کی محبت رافضیت ہے تو دنیا گواہ رہے کہ میں بھی رافضی ہوں۔)[3]

امام شافعی رحمہ اللہ کی ان باتوں کو لے کر حاسدوں نے مشہور کر دیا کہ وہ علویوں کے حامی اور ان کی بغاوت کے پشت پناہ ہیں۔ یہ اطلاعات خلیفہ ہارون الرشید تک پہنچا دی گئیں۔ وہاں سے امام شافعی رحمہ اللہ سمیت تمام مشتبہ افراد کو گرفتار کر کے "رقہ" پہنچانے کا حکم جاری ہوا۔ امام شافعی رحمہ اللہ (غالباً ان دنوں والدہ سے ملنے یمن سے) مکہ آئے ہوئے تھے۔ انہیں وہیں سے حراست میں لے کر خلیفہ کے پاس بھیج دیا گیا۔[4]

یہ ۱۸۴ھ کا واقعہ ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کی عمر اس وقت ۳۴ برس تھی۔ اس آزمائش میں اللہ نے ان کے لیے بڑی خیر رکھی تھی۔ ہارون الرشید نے امام شافعی رحمہ اللہ سے ان پر لگائے گئے الزامات کے متعلق پوچھا تو انہوں نے مضبوط دلائل کے ساتھ ان الزامات کی نفی کی۔ ہارون کے دربار میں امام محمد رحمہ اللہ بھی موجود تھے۔ ہارون نے ان سے امام شافعی کے متعلق پوچھا۔ اگرچہ اس سے پہلے ان دونوں بزرگوں کی ملاقات نہیں ہوئی تھی مگر غائبانہ تعارف تھا؛ اس لیے امام محمد رحمہ اللہ نے کہا: "یہ بہت بڑے عالم ہیں۔ ان پر جو الزامات لگائے گئے ہیں، وہ ان کی شان کے مطابق نہیں۔"

ہارون الرشید نے کہا: "اچھا تو آپ ہی انہیں اپنے پاس رکھیں۔"

یوں امام شافعی رحمہ اللہ کو نہ صرف رہائی نصیب ہوئی بلکہ انہیں امام محمد رحمہ اللہ سے استفادے کا بھی موقع مل گیا۔[5]

ایک اندازے کے مطابق وہ لگ بھگ دو برس تک امام محمد رحمہ اللہ کے پاس رہے اور احناف کے علوم، قواعد اور فتاویٰ

---

[1] طبقات الشافعية للسبكی: ۱۲۱/۲
[2] الامام الشافعی، ابوزهرة، ص ۲۲
[3] الانتقاء فی فضل الثلاثة الائمة الفقهاء، ص ۹۱
[4] طبقات الشافعية للسبكی: ۱۲۲/۲
[5] الانتقاء فی فضائل الثلاثة الائمة الفقهاء، ص ۹۸؛ الامام الشافعی، ابوزهرة، ص ۲۳، ۲۴

حافظ ذہبی نے امام محمد اور امام شافعی کی اس ملاقات کو "رقہ" کی بجائے بغداد میں بتایا ہے: "قلت قد قدم بغداد سنة بضع وثمانين ومائة واجازه الرشيد بمال ولازم محمد بن الحسن مدة." (سير اعلام النبلاء: ۵۰/۱۰) اگر یہ درست ہے تو پھر امام شافعی کی بغداد آمد تین بار ثابت ہوگی۔ یعنی پہلی بار سن ۱۸۴ھ، دوسری بار سنہ ۱۹۵ھ میں، تیسری بار ۱۹۸ھ میں۔

سے اچھی طرح واقف ہو کر مکہ معظمہ واپس لوٹے۔ ①

اب ان کے پاس اُمت کے دونوں طبقات یعنی علمائے فقہ اور علمائے حدیث کے علوم جمع ہو گئے تھے۔ ان دونوں سے کام لے کر انہوں نے غیر منصوص مسائل کے حل کے لیے جدید فقہی اصول وضع کیے اور فقہ شافعی کی بنیاد ڈالی جس میں ایک طرف اہلِ حجاز کی حدیث دانی کا رنگ نمایاں تھا اور دوسری طرف اہلِ عراق کی طرح قیاس و استنباط کے اصول بھی کارفرما تھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے نو سال تک مکہ میں قیام کر کے اس فقہ کے اصول و ضوابط پر کام کیا۔ ②

ہارون الرشید کی وفات کے دو سال بعد امین الرشید کے دورِ خلافت میں امام شافعی رحمہ اللہ بغداد گئے۔ یہ ۱۹۵ھ کا واقعہ ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۴۴ برس تھی۔ بغداد میں ان کے علوم کی خوب شہرت ہوئی اور طلبہ ہر طرف سے ٹوٹ پڑے۔ اگر انہیں وہاں طویل قیام کا موقع ملتا تو کوئی بعید نہ تھا کہ عراق سے خراسان تک ان کی فقہ چھا جاتی مگر حالات ایسے بن گئے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کو دو سال بعد حجاز واپس آنا پڑا۔ یہ وہ وقت تھا جب امین الرشید کی مامون سے جنگ چھڑ چکی تھی اور غالباً اسی بدامنی نے امام شافعی رحمہ اللہ کو واپسی پر مجبور کر دیا۔ تاہم ان کے اس دو سالہ قیام نے مشرقی صوبوں میں شافعی علماء کا ایک حلقہ قائم کر دیا جو ہمیشہ باقی رہا۔ ③

امین الرشید کے قتل اور مامون کی فتح کے بعد ۱۹۸ھ میں امام شافعی رحمہ اللہ دوسری مرتبہ بغداد گئے مگر چونکہ مامون الرشید کے پایۂ تخت سے دور خراسان میں قیام کے باعث بغداد بدانتظامی اور لاقانونیت کا شکار تھا؛ اس لیے چند ماہ وہاں قیام کے بعد امام شافعی رحمہ اللہ مصر کے والی کی دعوت پر مصر تشریف لے گئے۔ ④

مصر میں قیام کے دوران درسی مصروفیات کے باوجود انہوں نے ''کتاب الام''، ''الامالی الکبیر''، ''مختصر المزنی''، ''مختصر الربیع'' اور ''السنن'' تصنیف کیں جن کا مجموعہ ہزاروں صفحات تک پہنچتا ہے اور یہ سارا کام صرف چار سال میں ہوا۔ اس سے قبل امام شافعی کو مالکی فقہاء میں شمار کیا جاتا تھا مگر مصر آ کر انہوں نے کئی مسائل میں امام مالک سے اصولی اختلاف کیا اور فقہ شافعی کو از سرِ نو مرتب کیا جس کی وجہ سے ان کی فقہ کی الگ شناخت قائم ہو گئی۔ ⑤

① امام محمد کے حلقۂ درس میں شرکت سے ان کا مقصد محض تقلید نہ تھا بلکہ فقہ حنفی کو سیکھ کر محققانہ طور پر حجازی اور عراقی فقہ کا موازنہ کرنا تھا؛ اس لیے وہ اہلِ حجاز کی فقہ کا دفاع بھی کرتے تھے۔ بعض مسائل میں خود امام محمد سے بھی ان کا مناظرہ ہوا۔ ﴿کتاب الام: ۷/۳۵۰، ط دار المعرفۃ﴾

مگر یہاں یہ یاد رہے کہ امام شافعی کے ہارون الرشید کے پاس جانے اور امام محمد سے بحث و مباحثے کی ایک طویل روایت تاریخ دمشق (۵۱/۲۹۱) میں منقول ہے جس میں امام شافعی کی زبانی امام محمد کے متعلق کئی معیوب باتیں منقول ہیں۔ یہ روایت امام شافعی کی طرف منسوب ''جزء برحلۃ الشافعی'' کا حصہ ہے جس کا راوی عبداللہ بن محمد البلوی کذاب اور وضاع ہے۔ اس میں امام محمد اور امام ابو یوسف کو بری طرح بدنام کیا گیا ہے۔ ایسی باتیں بھی نقل کی گئی ہیں جو متواتر تاریخ سے متصادم ہیں۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی اس سفرنامے کو جعلی قرار دیا ہے۔ انہوں نے امام شافعی رحمہ اللہ کے حالات پر تقریباً سو صفحات لکھے ہیں مگر اس سفرنامے کو جان بوجھ کر ترک کر دیا۔ وہ فرماتے ہیں: ''سمعنا جزء من رحلة الشافعي فلم اسق منه شيئا؛ لانه باطل لمن تامله۔'' (سیر اعلام النبلاء: ۱۰/۷۸)

سیر اعلام النبلاء (ط الرسالۃ) کے محشی نے کلام کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس روایت کو امام بیہقی نے مناقب الشافعی (۱/۱۳۰) میں بالسند اور امام رازی نے مناقب الشافعی (ص ۲۳) میں بلاسند ذکر کیا ہے مگر حافظ ابن حجر نے ''توالی التاسیس'' (ص ۷۱) میں مفصل کلام کر کے ثابت کیا ہے یہ سفرنامہ بالکل بے اصل ہے۔

② الامام الشافعی، ابوزھرۃ، ص ۲۶ ③ سیر اعلام النبلاء: ۱۰/۵۰؛ الامام الشافعی، ابوزھرہ، ص ۲۷

④ سیر اعلام النبلاء: ۱۰/۵۰؛ الامام الشافعی، ابوزھرہ، ص ۲۴

⑤ سیر اعلام النبلاء: ۱۰/۵۵؛ الامام الشافعی، ابوزھرہ، ص ۲۷

امام شافعی رحمہ اللہ طب کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اس دور میں زیادہ تر بڑے طبیب یہودی یا نصرانی تھے۔ مسلمان طب کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اس صورتحال پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے تھے:

ضَیَّعُوْا ثُلُثَ الْعِلْمِ وَوَکَّلُوْہُ اِلَی الْیَھُوْدِ وَالنَّصَارٰی.

(مسلمانوں نے ایک تہائی علم کو ضایع کر دیا اور اسے یہود ونصاریٰ کے سپرد کر دیا)

آپ علم طب کی فضیلت بیان کرتے ہوئے یہاں تک فرماتے تھے:

لَا اَعْلَمُ عِلْمًا بَعْدَ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ اَنْبَلَ مِنَ الطِّبِّ، اِلَّا اَنَّ اَھْلَ الْکِتَابِ قَدْ غَلَبُوْنَا عَلَیْہِ.

(میں حلال وحرام کے بعد طب سے بڑھ کر افضل علم کسی کو نہیں سمجھتا۔ مگر اہلِ کتاب اس میدان میں ہم پر غالب ہیں۔)[1]

امام شافعی رحمہ اللہ کی یہ ترغیبات بے اثر نہیں رہیں اور ہم اگلے دور کے مسلمانوں میں صفِ اوّل کے اطباء کو ابھرتے دیکھتے ہیں جنہوں نے دنیا کی تمام اقوام کو پیچھے چھوڑ دیا اور مشرق ومغرب کے حکماء ان کے خوشہ چینی پر مجبور ہو گئے۔

مسلسل محنت، بے آرامی اور امراض کی وجہ سے امام شافعی رحمہ اللہ بہت نحیف ہو گئے۔ ان کی صحت بگڑتی چلی گئی، بالآخر ۳۰ رجب ۲۰۴ھ (۲۰ جنوری ۸۲۰ء) کو انہوں نے ۵۴ سال کی عمر میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔[2]

مصر میں امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنے چند سالہ قیام کے دوران بڑے بڑے نامور تلامذہ تیار کیے جن میں امام ابویعقوب البویطی، ربیع بن سلیمان اور ابوابراہیم المزنی رحمہم اللہ مشہور ہیں۔ عالم اسلام کے چیدہ چیدہ علماء وفقہاء ان کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد بھی ان تلامذہ کے ہاتھوں فقہ شافعی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی قرآن وسنت کی واضح تعلیمات کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا اور لوگ جہل کی تاریکیوں سے بچ کر علم کی روشنی میں آتے چلے گئے۔

رفتہ رفتہ مصر کے عوام میں امام شافعی رحمہ اللہ کی محبت وعقیدت اور ان کے مسلک سے وارفتگی اس طرح رچ بس گئی کہ صدیوں بعد ابھرنے والی گمراہ کن تحریکوں میں بھی ان کا ایمان متزلزل نہ ہوا۔ روافض کی عبیدی خلافت کا تین سو سالہ دور بھی ان کو حقیقی اسلام سے منحرف نہ کر سکا۔ بعد میں امام غزالی، شیخ الماوردی، امام الحرمین، امام نووی اور امام عزالدین عبدالسلام رحمہم اللہ جیسے شافعی علماء، قرن در قرن عالمِ اسلام کے مختلف مراکز میں ایمانی، علمی اور عملی تربیت کی فصل کاشت کرتے رہے۔

◆◆◆

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱۰/۵۷

② معجم الادباء: ۶/۲۴۱۴، ط دار الغرب الاسلامی بیروت

اہلِ سیف و قلم

اس دور کے مشاہیر اہلِ علم کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ ان بزرگوں کی خدمات کا دائرہ درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور افتاء وقضا تک محدود تھا بلکہ بعض عبقری شخصیتیں اہلِ علم وقلم ہونے کے ساتھ ساتھ اصحابِ سیف بھی تھیں۔ ان میں ایسے رجال کار بھی تھے جو اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لیے شمشیر بکف ہو کر کفار سے نبرد آزما ہوئے اور گمراہی کی اندھیر نگریوں میں ایمان کی شمع روشن کرنے کے لیے انہوں نے مجاہدین کے شانہ بشانہ جہاد میں حصہ لیا۔ ان حضرات میں قاضی اسد بن فرات اور عبداللہ بن مبارک کے نام سب سے نمایاں ہیں۔

قاضی اسد بن فرات (۱۴۴ھ۔۲۱۳ھ)

قاضی اسد بن فرات رحمہ اللہ اسلامی تاریخ کی ان عظیم شخصیات میں سے ہیں جو بیک وقت بلند پایہ فقیہ، نابغۂ روزگار محدث، انصاف پسند قاضی اور عظیم المرتبت مجاہد تھے۔ وہ ۱۴۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ایک مجاہد گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ دو برس کے تھے کہ ان کے والد انہیں لے کر افریقہ جانے والے اسلامی لشکر کے ساتھ شامل ہو گئے۔[1]

اسد بن فرات کا بچپن یہیں گذرا، ابتدائی علوم شمالی افریقہ کے علماء سے حاصل کیے۔ جید عالم بننے کے بعد بھی ۱۷۲ھ میں علم کا شوق انہیں مدینہ منورہ لے گیا جہاں انہوں نے امام مالک رحمہ اللہ سے فقہی تشریحات کے ساتھ مؤطا کی احادیث سنیں، پھر بھی ان کی علمی پیاس نہ بجھی۔ امام مالک رحمہ اللہ سے اجازت لے کر کوفہ چلے آئے اور امام ابوحنیفہ کے جانشینوں: امام محمد رحمہ اللہ اور امام ابویوسف رحمہ اللہ سے فقہ حنفی کا گہرا ادراک حاصل کیا۔[2]

وقت کے تین جلیل القدر ائمہ سے فیض پا کر امام اسد بن فرات ''مجمع البحار'' بن گئے تھے، علم کے شائقین ان کی طرف لپکتے تھے اور بڑے بڑے علماء ان کے دامن سے وابستگی اپنے لیے اعزاز سمجھتے تھے۔

عراق سے وہ مصر پہنچے اور وہاں فقہ مالکی پر ''الاسدیہ'' مرتب کی جس کی دوسری مشہور نقل ''المدونۃ الکبریٰ'' کے نام سے مقبولِ عام ہے جو امام سحنون نے مرتب کی اور جسے فقہ مالکی کی سب سے پہلی اور معتبر کتاب تسلیم کیا جاتا ہے۔[3]

۱۸۱ھ میں وہ اپنے وطن قیروان (تیونس) واپس آ گئے اور یہاں علم کی روشنی پھیلاتے رہے۔[4]

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱۰/۲۲۶ ② تاریخ الاسلام للذہبی: ۱۵/۶۶، ۶۷ تدمری؛ الاعلام زرکلی: ۱/۲۹۸، ۲۹۹

③ ترتیب المدارک وتقریب المسالک للقاضی عیاض: ۳/۲۹۶ ط مکتبۃ فضالۃ؛ المکتبۃ الاسلامیۃ لعماد علی جمعۃ، ص ۱۷۴

④ الدیباج المذہب فی معرفۃ اعیان علماء المذہب لابن فرحون یعمری، ص ۹۸

خلیفہ مامون الرشید کی خلافت کا زمانہ تھا مگر تیونس خلافتِ عباسیہ کی سرپرستی میں ایک خود مختار ملک بن چکا تھا۔ یہاں کی حکومت دولتِ اغالبہ کہلاتی تھی۔ یہاں کا حاکم زیادۃ اللہ بن ابراہیم امام اسد بن فرات کے علم و فضل سے بہت متاثر تھا؛ لہٰذا اس نے ۲۰۳ھ میں انہیں قیروان کا قاضی بنا دیا۔ انہوں نے اپنی ذمہ داریاں بخوبی نبھائیں۔[1]

مالکی و حنفی نسبتوں کے جامع ہونے کی وجہ سے ہر دو طبقوں کے فقہاء ان کے فتاویٰ پر اعتماد کرتے تھے۔ اگرچہ وہ اصلاً مالکی تھے مگر احناف کا فقہی ذوق ان پر حاوی تھا۔ ان کی وقتِ نگاہ میں فقہ حنفی کی دور بینی خوب جھلکتی تھی؛ اس لیے کہا جاتا تھا کہ ان پر ''اصحاب الرائے'' کا علم غالب آ چکا ہے۔[2]

صِقلّیہ (سسلی) کی فتح:

صِقلّیہ (سسلی) بحیرہ روم کا ایک مشہور اور بڑا جزیرہ ہے۔ یہ مثلث شکل کا ہے اور اٹلی کے جنوب میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً ۱۰ ہزار مربع میل ہے۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں اس پر رومی بازنطینی حکمرانوں کا قبضہ تھا اور اس جزیرے کے قزاق فطرت نصرانی، آئے دن مسلم مقبوضات پر حملے کرتے رہتے تھے۔

سب سے پہلے اسے فتح کرنے کا خیال حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو آیا۔ اس وقت وہ شام کے گورنر تھے۔ انہوں نے ۳۳ھ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے اجازت لے کر ۳۰۰ بحری جہازوں پر مشتمل ایک لشکر صِقلّیہ کی فتح کے لیے بھیجا۔ گھمسان کی جنگ کے بعد مسلمانوں کو پسپا ہونا پڑا۔ بعد میں مختلف خلفاء نے اسے فتح کرنے کے لیے لشکر بھیجے مگر کامیابی نہ ہوئی۔[3]

قاضی اسد بن فرات رحمہ اللہ ایک عرصے سے بحیرہ روم کے اس زرخیز و شاداب جزیرے کو اسلامی مقبوضات میں لانے کے لیے بے تاب تھے اور گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے اس بارے میں کی جانے والی ادھوری مہمات کی تکمیل کے خواہاں تھے۔ اس سلسلے میں وہ حکام کو جھنجھوڑتے رہتے تھے۔ آخر قاضی اسد بن فرات کے مشورے پر حاکم زیادۃ اللہ نے صِقلّیہ پر حملے کا فیصلہ کر لیا۔ چوں کہ مشاورت میں جنگی منصوبہ بندی قاضی اسد بن فرات کی رائے کے مطابق طے ہوئی تھی؛ اس لئے زیادۃ اللہ کو لشکر کی قیادت کے لیے ان سے زیادہ موزوں شخصیت کوئی اور نظر نہ آئی۔[4]

جب اس نے قاضی صاحب کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو قاضی صاحب کو حیرت ہوئی؛ اس لیے کہ قاضی کے منصب سے معزولی انہیں پسند نہ تھی، تاہم گورنر نے انہیں مطمئن کرتے ہوئے کہا: ''آپ قاضی کے منصب پر بھی برقرار رہیں گے اور لشکر کی قیادت بھی آپ کے ہاتھ میں ہوگی۔ آپ کو ''قاضی امیر'' کہا جائے گا۔''[5]

① الاعلام زرکلی: ۲۹۸/۱
② وغلب علیه علم الرای. ﴿سیر اعلام النبلاء: ۲۲۵/۱۰﴾
③ نهاية الارب فی فنون الادب للنویری: ۲۱/۲۴ تا ۵۷؛ تاریخ خلیفه بن خیاط: سنة سنه ۸۶ هجری
④ البیان المغرب فی اخبار الأندلس والمغرب: ۱۰۲/۱
⑤ تاریخ الاسلام للذهبی: ۶۸/۱۵، ۶۹، ت تدمری

افریقہ میں اسد بن فرات سے قبل کوئی ان دو عہدوں پر بیک وقت فائز نہیں ہوا تھا۔

۱۵ ربیع الاول ۲۱۲ھ کو قاضی اسد بن فرات رحمہ اللہ ۷۰۰ کشتیوں کا بیڑا لے کر قیروان کے ساحل سے بحیرۂ روم میں اُترے۔ بیڑے میں ۷۰۰ سوار اور ۱۰ ہزار پیادہ مجاہدین تھے۔

تین دن کے بحری سفر کے بعد ۱۸ ربیع الاول کو اسلامی لشکر صِقلّیہ کے ساحلی شہر ''ماذر'' کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ ادھر صِقلّیہ کے نصرانی حاکم کو قیصر روم اور وینس کے بادشاہ سے مدد مل چکی تھی چنانچہ ڈیڑھ لاکھ رومی سپاہی دس ہزار مسلمانوں سے معرکہ آزمائی کے لیے میدان میں آدھمکے۔ اب ایک مسلمان کے مقابلے میں پندرہ پندرہ نصرانی تھے، یہ منظر دیکھ کر بہت سے مسلمان گھبراہٹ کا شکار ہونے لگے۔

قاضی اسد بن فرات رحمہ اللہ نے اس ٹڈی دل کے سامنے مسلمانوں کے مجمعے پر نظر ڈالی اور انہیں حوصلہ دلانے کے لیے اس خوش الحانی سے سورۂ یٰسین کی تلاوت کی کہ سب کے دل ایمان کے جوش اور جنت کے شوق سے لبریز ہوگئے۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے ایک ولولہ انگیز تقریر کی جس میں مجاہدین کو للکارتے ہوئے کہا:

''مجاہدو! یہ وہی ساحلوں پر ڈاکہ زنی کرنے والے عجمی بھگوڑے ہیں جو چھپ کر یہاں جمع ہوگئے ہیں۔ یہ تو تمہارے بھگوڑے غلام ہیں۔ خبردار! ان سے مرعوب نہ ہونا۔''

اس کے بعد وہ سورۂ یاسین کی آیات اور رجز پڑھتے ہوئے رومی لشکر کی طرف لپکے، مجاہدین بھی تلواریں سونت کر دشمن پر جھپٹے اور کشتوں کے پشتے لگادیے۔ گھمسان کی اس جنگ میں رومیوں نے لشکرِ اسلام کے قائد کو شہید کرنے کے لیے پورا زور لگا دیا۔ انہیں یقین تھا کہ قاضی صاحب کا کام تمام ہوتے ہی مسلمان حوصلہ چھوڑ بیٹھیں گے، مگر اللہ تعالیٰ نے قاضی صاحب کی حفاظت کی، وہ رومیوں سے لڑتے لڑتے بری طرح گھر گئے مگر پوری تندہی سے ہر حملے کا دفاع کرتے رہے۔ اس دوران انہوں نے کئی کاری زخم کھائے، وہ ہاتھ جس میں لشکر کا جھنڈا تھا خون سے رنگین ہوگیا مگر انہوں نے جھنڈا گرنے نہ دیا۔ ان کی ہمت واستقلال کے نتیجے میں آخرکار مسلمان یہ معرکہ جیت گئے اور جزیرے کا بڑا حصہ فتح ہوگیا۔[1] کچھ مدت بعد قاضی صاحب نے مزید پیش قدمی کی اور سَرَقُوسَہ کا محاصرہ کرلیا۔ یہاں بھی سخت لڑائی ہوئی جس میں قاضی صاحب شدید زخمی ہوگئے۔ آخر انہی زخموں کی تاب نہ لاکر ربیع الآخر ۲۱۳ھ (جولائی ۸۲۸ء) میں شہادت پائی اور اسی جزیرے میں دفن ہوئے۔[2]

قاضی اسد بن فرات کا امت مسلمہ پر بہت بڑا احسان تھا کہ وہ جان کی بازی لگا کر صِقلّیہ جیسے ناقابل تسخیر یورپی مورچے کو عالم اسلام کے لیے مسخر کر گئے۔ ان کے بعد مسلمانوں نے ان کے دیے ہوئے اس تحفے کی تقریباً پونے تین صدیوں تک حفاظت کی مگر پھر عیش وعشرت، باہمی انتشار اور خانہ جنگیوں نے دشمنوں کو سر اٹھانے کا موقع فراہم کردیا۔

---

① نهاية الارب فى فنون الأدب للنويرى، ۲۴/۳۵۵، ۳۵۶، ط قاهره؛ المرقبة العليافيمن يستحق القضاء والفتيا. (تاريخ قضاة الأندلس) ابو الحسن المالقى، ص ۵۴

② نهاية الارب فى فنون الأدب: ۲۴/۳۵۷

چنانچہ نصرانیوں نے بتدریج طاقت حاصل کرتے کرتے ۴۸۴ھ میں صِقِلّیہ پر دوبارہ قبضہ کرلیا اور یوں بحیرۂ روم کے اس شاندار عظیم جزیرے سے اسلامی تہذیب کے اثرات تک مٹ گئے۔ [1]

قاضی اسد بن فرات رحمہ اللہ کی مرقد آج بھی سسلی کے کسی گمنام گوشے میں ائمہ مجتہدین اور فقہاء کرام کی ان کاوشوں کی گواہی دے رہی ہے جو مساجد و مدارس، درس و تدریس کے حلقوں اور افتاء اور عدلیہ کے ایوانوں سے لے کر جہاد کی رزم گاہوں تک قدم قدم، سطر سطر نقش ہیں۔

عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ (۱۱۸ھ۔۱۸۱ھ)

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ ۱۱۸ھ میں ''مرو'' میں مبارک نامی ایک نیک سیرت ترک غلام کے ہاں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ خوارزم کی تھیں۔ [2] اس دور کے ترکوں میں شاذ و نادر ہی کوئی علم حدیث حاصل کرتا تھا۔ عبداللہ بن مبارک اس خطے کے پہلے شخص تھے جو حافظ الحدیث کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ [3]

عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے علم حاصل کرنے کے لیے اس قدر سفر کئے کہ ان کے اساتذہ و شیوخ کی تعداد چار ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ [4] حد یہ ہے کہ ایک محدث ربیع بن انس کی شہرت سن کر ان کے شہر پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ جیل خانے میں ہیں۔ عبداللہ بن مبارک کو اس وقت تک چین نہ آیا جب تک کسی بہانے سے جیل کی چہار دیواری میں جا کر ان محدث سے چالیس احادیث نہ یاد کرلیں۔ [5]

ان کے اساتذہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: ''جب یہ دونوں (امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری) کسی مسئلے پر متفق ہوں تو اسے مضبوط پکڑ لو۔'' [6]

ایک بار فرمایا: ''میرے پاس جو فقہ ہے، وہ ابوحنیفہ ہی سے تو سیکھی ہے۔'' [7]

حدیث میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ بعض محدثین انہیں امیر المؤمنین فی الحدیث کہہ کر یاد کرتے تھے۔ [8]

ایک بار کچھ علماء آپس میں ان کی سیرت کا تذکرہ کرنے بیٹھے تو ان کی درج ذیل خصوصیات شمار کیں:

''علم، فقہ، ادب، نحو، لغت، زہد، فصاحت، شعر، تہجد گزاری، عبادت، حج، جہاد، شجاعت، شہ سواری، قوت، فضول گوئی سے اجتناب، انصاف، اپنے لوگوں کے ساتھ اختلاف میں کم سے کم پڑنا۔''

عوام میں ان کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ ہر فرد ان سے دلی محبت کرتا تھا۔ ایک بار وہ رَقّہ پہنچے جہاں خلیفہ ہارون

---

① الكامل في التاريخ: سنة ٤٨٤هـ
② سير اعلام النبلاء: ٣٧٩/٨، ٣٨١. ط الرسالة
③ سير اعلام النبلاء: ٣٨٢/٨
④ سير اعلام النبلاء: ٣٩٧/٨
⑤ سير اعلام النبلاء: ٣٧٩/٨، ط الرسالة
⑥ الانتقاء في فضل الثلاثة الائمة الفقهاء لابن عبدالبر، ص ١٣٢
⑦ اخبار ابي حنيفة للصيمري، ص ٨٤
⑧ تذكرة الحفاظ للذهبي: ٢٠٢/١

بھی موجود تھا۔ عوام ان کی آمد کا سنتے ہی اس طرح جھپٹے کہ گرد وغبار کے بادل چھا گئے اور لوگوں کے جوتے ٹوٹ ٹوٹ گئے ۔ ہارون الرشید کی والدہ نے محل کے بالا خانے سے یہ مجمع دیکھا تو پوچھا:

''یہ کون آیا ہے؟'' کہا گیا: ''خراسان کے ایک عالم ہیں۔'' خلیفہ کی والدہ کہنے لگی:

''اصل حکمران تو یہ ہیں، ہارون نہیں کہ جس کے گرد پولیس اور فوج کی مدد سے مجمع لگایا جاتا ہے۔''[1]

عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ فقیہ، مجتہد اور محدث ہونے کے ساتھ ساتھ زبردست معرکہ آرا مجاہد بھی تھے، ان کی زندگی ہو بہو صحابہ کرام کے نمونے کے مطابق تھی۔ وہ رات کے عابد اور دن کے شہ سوار تھے۔[2]

مجاہدین اور حاجیوں پر خرچ:

جہاد کے سفر میں ہر طرف سے صالحین جمع ہو کر ان کے ساتھ چلا کرتے تھے۔ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ آنے جانے کے سفر اور محاذِ جنگ پر دل کھول کر ان پر خرچ کرتے مگر اس طرح کہ کسی کی خودداری متاثر نہ ہو۔

ان کے ساتھ جہاد کے سفر پر جانے والے ایک درویش عمر بن حفص صوفی رحمہ اللہ کہتے تھے:

''ابن مبارک بغداد سے جہاد کے لیے مِصّیصہ کی سرحد کی طرف روانہ ہوئے تو صوفیاء کی ایک جماعت ان کے ساتھ ہو گئی۔ ابن مبارک انہیں کہنے لگے: ''تم درویش لوگوں کو پسند نہیں کہ کوئی تم پر خرچ کرے۔''

یہ کہہ کر طشت منگوایا، اس پر رومال رکھ دیا اور کہا: 'ہر کوئی اپنی اپنی رقم رومال کے نیچے رکھتا جائے۔' اب کسی نے دس درہم رکھے، کسی نے بیس درہم۔ ابن مبارک سفر میں اور مِصّیصہ کے محاذِ جنگ پر بھی ان کے اخراجات اٹھاتے رہے۔ مہم ختم ہوئی تو فرمایا: ''اب واپسی کا سفر ہے؛ للہذا باقی رقم ہم آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔''

یہ کہہ کر ہر شخص کو بیس بیس دینار دینے لگے۔ کوئی کہتا کہ میں نے تو بیس درہم دیے تھے تو فرماتے:

''اگر اللہ نے مجاہد کے مال میں برکت دی ہے تو تمہیں عجیب کیوں لگتا ہے۔''[3]

حج کے سفر پر روانہ ہوتے ہوئے اپنے شہر مَرْو کے لوگوں کو جمع کرتے اور کہتے: ''اپنے اخراجات جمع کراؤ۔'' یہ رقم ایک صندوق میں رکھ کر اسے تالا لگا دیتے۔ اس کے بعد تمام قافلے والوں کے لیے مکہ تک سواریاں کرائے پر لیتے۔ اس طرح منزل بمنزل بغداد پہنچتے۔ سارے راستے عبداللہ بن مبارک اہلِ قافلہ کو بہترین قسم کے کھانے فراہم کرتے جس میں حلوے اور مٹھائیاں بھی شامل ہوتیں۔ عبداللہ بن مبارک اہلِ قافلہ کو بہترین لباس پہناتے اور عمدہ ترتیب کے ساتھ بغداد سے لے کر روانہ ہوتے۔ قافلہ مدینہ منورہ پہنچتا تو وہاں یہ قافلے کے ایک ایک فرد سے پوچھتے:

''تمہارے گھر والوں نے تم سے مدینہ کی کن کن چیزوں کی فرمائش کی تھی؟''

ہر شخص اپنے خاندان کی فرمائشیں بتاتا۔ پھر یہ قافلہ مکہ پہنچتا۔ وہاں مناسکِ حج کی ادائیگی کے بعد یہ قافلے کے ہر فرد سے پوچھتے: ''تمہارے گھر والوں نے مکہ کی کون کون سی چیزیں لانے کی فرمائش کی تھی؟'' لوگ فرمائشیں بتاتے۔

[1] تاریخ بغداد: ۱۵۶/۱۰ [2] سیر اعلام النبلاء: ۳۸۲/۸ [3] تاریخ بغداد: ۱۵۸،۱۵۷/۱۰

عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ واپسی کے سفر سے پہلے ہر شخص کو اس کی مطلوبہ چیزیں لے دیتے۔ اپنے وطن مَرْو پہنچنے تک یہ فیاضی جاری رہتی۔ شہر پہنچ کر تمام حاجی ساتھیوں کے گھروں اور دہلیزوں پر چونے سے لپائی کراتے۔

پھر سب کی ایک بھرپور دعوت کرتے جس کے اختتام پر سب کو کپڑے اور جوڑے دیتے۔ رخصت کرنے سے پہلے وہ صندوق منگوا کر کھولتے جس میں ہر شخص کی رقم الگ تھیلی میں اس کے نام کے ساتھ من وعن موجود ہوتی۔ ان سب کو ان کی رقم واپس کر کے الوداع کہتے۔ ہر سال مفلسوں، غریبوں اور ضرورت مندوں پر ایک لاکھ درہم (تقریباً اڑھائی کروڑ روپے) خرچ کرنا ان کا معمول تھا۔[1]

جہاد کا ولولہ:

اس دور میں روم کے نصرانیوں سے سرحدوں پر بار بار جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ ان لڑائیوں میں بھرپور انداز میں شریک ہوتے اور حیرت انگیز کارنامے انجام دیتے۔ ان کے ایک رفیقِ سفر عبدہ بن سلیمان نقل کرتے ہیں کہ ایک معرکے میں عام لڑائی سے پہلے ایک رومی پہلوان نے مسلمانوں کو دعوتِ مبارزت دی۔ ایک مجاہد چہرہ چھپا کر مقابلے میں نکلا اور اسے پہلے ہی وار میں نمٹا دیا، اس کے بعد دوسرا رومی لڑنے آیا، اسے بھی فوراً ڈھیر کر دیا، اس کے بعد لگاتار کئی رومی آئے اور خاک وخون میں لت پت ہوتے گئے۔ آخر مسلمانوں نے داد وتحسین کے نعروں کے ساتھ اس مجاہد کو گھیر لیا۔ اس کے منہ سے نقاب ہٹا کر دیکھا گیا تو وہ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ تھے۔[2]

عبداللہ بن سنان نقل کرتے ہیں کہ طرطوس کی جنگ میں ہم عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کے ساتھ تھے۔ ایک رومی نے آکر دعوتِ مبارزت دی اور اپنے مقابلے میں آنے والے چھ مسلمانوں کو یکے بعد دیگرے قتل کر دیا۔ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے یہ دیکھ کر مجھے کہا: ''دیکھو! اگر میں شہید ہو گیا تو فلاں فلاں کام کر دینا۔''

یہ کہہ کر وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس رومی کے مقابلے کے لیے نکلے اور اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد دوسرا رومی سامنے آیا تو اس کا بھی یہی انجام ہوا، یہاں تک کہ یکے بعد دیگرے چھ رومی مارے گئے۔ اس کے بعد بھی عبداللہ بن مبارک دعوتِ مبارزت دیتے رہے مگر رومیوں کو مقابلے پر آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ تب عبداللہ بن مبارک نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور مسلمانوں کے لشکر میں غائب ہو گئے۔ عبداللہ بن سنان کہتے ہیں کہ بعد میں وہ مجھے ملے تو کہنے لگے:

''اگر میری زندگی میں یہ راز کسی کو بتایا تو اچھا نہ ہوگا۔''[3]

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کے نام رزمیہ نظم:

وہ جہاد کو گوشہ نشینی کی عبادت وریاضت پر ترجیح دیتے تھے، اس سلسلے میں ان کے وہ اشعار مشہور ہیں جو انہوں نے حرمین میں عبادت کرنے والے حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کو لکھے تھے اور انہیں مخاطب کر کے کہا تھا:

---

[1] تاریخ بغداد: ۱۵۸/۱۰ [2] تاریخ بغداد: ۱۶۷/۱۰ [3] سیر اعلام النبلاء: ۴۰۹/۸

يَا عَابِدَ الْحَرَمَيْنِ لَوْ اَبْصَرْتَنَا لَعَلِمْتَ اَنَّكَ فِي الْعِبَادَةِ تَلْعَبُ

''اے حرمین کے عبادت گزار! اگر تو ہمیں (میدانِ جہاد میں) لڑتا ہوا دیکھ لے
تو تجھے یوں معلوم ہوگا گویا تو عبادت میں تفریح کر رہا ہے۔''

مَنْ كَانَ يَخْضِبُ خَدَّهُ بِدُمُوْعِهِ فَنُحُوْرُنَا بِدِمَائِنَا تَتَخَضَّبُ

''کوئی اپنے رخساروں کو اپنے اشکوں سے تر کرتا ہے..... مگر ہمارے سینے ہمارے لہو سے رنگین ہوتے ہیں۔''

اَوْ كَانَ يُتْعِبُ خَيْلَهُ فِيْ بَاطِلٍ فَخُيُوْلُنَا يَوْمَ الصَّبِيْحَةِ تَتْعَبُ

''یا کوئی اپنے گھوڑوں کو فضول مشاغل میں تھکاتا ہے..... مگر ہمارے گھوڑے جنگ کے دن تھکتے ہیں۔''

رِيْحُ الْعَبِيْرِ لَكُمْ وَنَحْنُ عَبِيْرُنَا رَهْجُ السَّنَابِكِ وَالْغُبَارُ الْاَطْيَبُ

''تمہارے لیے عبیر کی خوشبو ہے مگر ہماری خوشبو..... گھوڑوں کی ٹاپوں کا پاکیزہ گرد وغبار ہے۔''

وَلَقَدْ اَتَانَا مِنْ مَقَالِ نَبِيِّنَا قَوْلٌ صَحِيْحٌ صَادِقٌ لَا يُكْذَبُ

''ہمارے پاس ہمارے نبی کا فرمان آچکا ہے..... جو صحیح اور سچا ہے، کبھی جھوٹ نہیں ہوسکتا۔''

لَا يَسْتَوِيْ وَغُبَارُ خَيْلِ اللّٰهِ فِيْ اَنْفِ امْرِئٍ وَغُبَارُ نَارٍ تَلْهَبُ

''کسی شخص کی ناک میں اللہ کے راستے میں دوڑنے والے گھوڑوں کا گرد وغبار
اور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ جمع نہیں ہوسکتے۔''

هٰذَا كَلَامُ اللّٰهِ يَنْطِقُ بَيْنَنَا لَيْسَ الشَّهِيْدُ بِمَيِّتٍ لَا يُكْذَبُ

''یہ اللہ کا کلام ہمارے سامنے کہہ رہا ہے..... کہ شہید مردہ نہیں، یہ بات جھٹلائی نہیں جاسکتی۔''[1]

قیدی خواتین کا صدمہ:

اس دور میں اسلامی سرحدوں پر رومیوں کی تاخت وتاراج جاری تھی۔ ان کے اچانک حملوں میں سرحدی بستیاں نشانہ بنتیں اور بہت سے مسلمان مرد وزن قید ہوجاتے۔ اگرچہ عباسی خلفاء بہت جلد جوابی کارروائی کر کے دشمن سے بدلہ لے لیا کرتے تھے مگر اس کے باوجود عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کو کفار کے چنگل میں پھنسی مسلمان خواتین کی بے بسی اکثر تڑپاتی تھی۔ آپ انہیں آزاد کرنے کے لیے جہاد کی ترغیب دیتے ہوئے اپنے یہ اشعار پڑھا کرتے تھے:

كَيْفَ الْقَرَارُ وَكَيْفَ يَهْدَأُ مُسْلِمٌ وَالْمُسْلِمَاتُ مَعَ الْعَدُوِّ الْمُعْتَدِيْ

''کیوں کر قرار آئے اور کیسے کوئی مسلمان چین سے رہ سکتا ہے جبکہ مسلمان عورتیں سرکش دشمن کے پاس ہیں۔''

اَلضَّارِبَاتُ خُدُوْدَهُنَّ بِرَنَّةٍ اَلدَّاعِيَاتُ نَبِيَّهُنَّ مُحَمَّدٌ

''وہ آہ وبکا کے ساتھ اپنے رخسار پیٹتی ہیں اور اپنے نبی محمد ﷺ کو یاد کرتی ہیں (کہ وہ ہوتے تو ایسا نہ ہوتا)''

[1] سیر اعلام النبلاء: ۸/ ۴۱۲

مَا تَسْتَطِيعُ وَمَا لَهَا مِنْ حِيلَةٍ إِلَّا التَّسَتُّرُ مِنْ أَخِيهَا بِالْيَدِ

''ان کا بس نہیں چلتا اور ان کے پاس ہاتھ کے سوا اپنے (قیدی) بھائی سے پردے کا کوئی ذریعہ نہیں۔''①

عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے حدیث کی کئی کتابیں لکھیں جن میں ''کتاب التفسیر''، ''کتاب السنن''، ''کتاب الزہد'' اور ''کتاب البر والصلۃ'' مشہور ہیں۔ ان کی مرویات کی تعداد اکیس ہزار تک بتائی جاتی ہے۔②

فضول میل جول سے سخت پرہیز کرتے تھے۔ تبلیغ، جہاد اور حج کی مشغولیات کے سوا اپنا وقت گھر میں مطالعے اور تصنیف و تالیف میں گزارتے تھے۔ کسی نے پوچھا: ''آپ نماز کے بعد ہمارے ساتھ کیوں نہیں بیٹھتے؟'' فرمایا: ''میں صحابہ اور تابعین کے آثار کا مطالعہ کرتا ہوں۔ تم لوگ غیبتیں کرتے ہو۔ تمہارے ساتھ بیٹھ کر کیا کروں گا۔''③

۶۳ سال عمر پا کر ایک جہادی مہم سے واپسی کے دوران فوت ہوئے۔ ''عانات'' میں تدفین ہوئی۔ ہارون الرشید نے ان کی وفات پر کہا: ''آج سید العلماء کی وفات ہوئی ہے۔'' یہ رمضان ۱۸۱ھ کا واقعہ ہے۔④

بلاشبہ وہ ایک ایسی شخصیت تھے جن کی عظمت، پرہیز گاری اور فقاہت عالم اسلام کے ہر طبقے میں مسلم تھی۔

◆◆◆

① سیر اعلام النبلاء: ۴۱۶/۸
② سیر اعلام النبلاء: ۳۹۱/۸
③ سیر اعلام النبلاء: ۳۹۸/۸
④ سیر اعلام النبلاء: ۴۱۸/۸۔ یہ جگہ الجزیرہ کے شہر رقہ اور ہیت کے درمیان دریائے فرات کے قریب ہے۔

مؤلفینِ صحاحِ ستہ

بنوعباس کے ایامِ عروج میں جو علمی کارنامے انجام پائے ان میں سے فقہ کی تدوین کا ذکر ہم تفصیل سے کر چکے ہیں۔ یہی زمانہ اُن کتبِ حدیث کی تدوین کا ہے جن پر گیارہ بارہ صدیوں سے پوری اُمت کا اعتماد چلا آ رہا ہے اور وہ اسلامی عقائد، عبادات، معاملات، سیر و تاریخ اور اخلاق و آداب کے لیے اساس اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حدیث کی حفاظت کا کام دورِ نبوت ہی سے شروع ہو گیا تھا اور صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد حفاظِ حدیث تھی۔ دوسری صدی ہجری کے آغاز تک احادیث کو زبانی یاد کرنے کا سلسلہ بہت عام رہا۔ بعض صحابہ اور تابعین احادیث کو لکھا بھی کرتے تھے مگر ان کی تعداد کم تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دور میں سرکاری حکم کے تحت احادیث کے کئی تحریری مجموعے مرتب کیے گئے۔[1] تاہم اس کے بعد بھی روایتِ حدیث میں زیادہ دار و مدار حافظے پر ہی رہا۔ محدثین کا ہزاروں احادیث اوران کی اسناد یاد کرنا کیسے ممکن تھا؟ اس بارے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''محدثین کی یہ جماعت ایران اور ترکستان کا بہترین دماغی جوہر تھا۔ وہ نسلاً بڑے تندرست، توانا، جفاکش، عالی حوصلہ، علم کے حریص اور حافظہ کے نہایت قوی تھے۔ حافظہ پر اعتماد اور اس سے کام لینے کی وجہ سے (تمام انسانی اعضاء کی طرح جو پرورش اور ورزش سے غیر معمولی طور پر طاقتور ہو جاتے ہیں) ان کا حافظہ اپنی قوتِ حفظ کے غیر معمولی نمونے پیش کرتا تھا، جو ضعف اور کمزوری کے اس خالص کتابی دور میں بعض اوقات ناقابلِ فہم معلوم ہوتے ہیں، لیکن تاریخ ان کے وقوع کی متواتر شہادتیں بہم پہنچاتی ہے اور تجربات ان کے امکان کی تصدیق کرتے ہیں اور ان کی علمی توجیہ بالکل مشکل نہیں۔ کثرتِ کار، مناسبتِ تام اور اپنے موضوع سے عشق و شغف ایسا ملکہ پیدا کر دیتا ہے اور انتقالِ ذہنی کے ایسے نمونے ظاہر ہوتے ہیں جو غیر متعلق اشخاص کے لیے حیرت انگیز ہوتے ہیں۔''[2]

دوسری صدی ہجری کے وسط تک علوم کا دار و مدار قوتِ حافظہ پر ہی تھا۔ اس زمانے میں لکھنے کے آلات ناقص قسم کے ہوا کرتے تھے۔ چمڑے، چھال یا گتے سے ملتے جلتے موٹے کاغذ کو لکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ کاغذ گراں قیمت اور کم یاب تھا؛ اس لیے بہت کم لوگ اس کی استطاعت رکھتے تھے۔ غرض روایات کے کسی بڑے ذخیرے کو لکھ کر محفوظ رکھنے کے لیے حالات سازگار نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی صدی ہجری کی جو علمی دستاویزات کتابی شکل میں

[1] فتح الباری: ۱/۱۹۴، ۱۹۵

[2] تاریخ دعوت و عزیمت: ۱/۷۸

محفوظ چلی آ رہی ہیں، ان کی تعداد گنی چنی ہے۔[1] قرآن مجید چونکہ شریعت کی اساس ہے اور ذخیرۂ حدیث کے مقابلے میں مختصر بھی ہے، نیز اللہ نے تکوینی طور پر اس کی یاد سہل کر دی ہے؛ اس لیے اسے حافظوں میں بھی بکثرت محفوظ رکھا گیا اور کتابی شکل میں بھی۔ حدیث کے میدان میں اس زمانے کے علماء وطلبہ اکثر اپنے حافظے پر اعتماد کرتے تھے۔ ان کی قوتِ حافظہ بہت مضبوط ہوتی تھی۔ بلکہ یہ کہا جائے تو صحیح ہوگا کہ اس دور میں حدیث کا عالم وہی بن سکتا تھا جس کا حافظہ غیر معمولی ہو۔ صحابہ کرام اور تابعین میں سے جتنے بھی مشہور راویانِ حدیث تھے، سب قوی الحافظہ تھے، جیسے حضرت ابوہریرہ، ام المؤمنین عائشہ صدیقہ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم، امام شعبی، حسن بصری، ابن سیرین، سعید بن جبیر رحمہم اللہ۔

مگر دوسری صدی ہجری کے وسط میں ایک علمی انقلاب آیا۔ بغداد میں کاغذ کی صنعت قائم ہوئی اور عمدہ کاغذ متعارف ہوا۔ چنانچہ سرکاری اور کاروباری معاملات سے لے کر علمی کاموں تک سب میں رفتہ رفتہ لکھنا لکھانا عام ہوتا گیا۔[2]

مگر یہ تبدیلی بھی دو چار سال میں نہیں آ گئی بلکہ اس میں کم از کم پچاس ساٹھ سال لگے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں جب کوئی نیا، آسان اور زیادہ مفید طریقہ متعارف ہوتا ہے تو سابقہ طریقہ یک دم بالکل متروک نہیں ہو جاتا بلکہ دو تین نسلوں میں دونوں طریقے چلتے رہتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ پرانا مشکل طریقہ متروک ہوتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً ۱۹۹۰ء تک کتابت عموماً ہاتھ سے ہوا کرتی تھی۔ پھر کمپوزنگ کا دور شروع ہوا مگر کتابت کا کام بھی چلتا رہا۔ اور اب فقط کمپوزنگ ہوتی ہے۔

کاغذ کے عام ہونے کے بعد ہر قسم کے علوم رفتہ رفتہ حافظوں کے ساتھ ساتھ کتابوں میں بھی منتقل ہونے لگے۔ ساٹھ ستر برس میں یعنی دوسری صدی ہجری کے اختتام تک لکھنے کا رواج عام ہو گیا تاہم حافظے پر اعتماد کا رجحان بھی باقی رہا۔ اساتذۂ حدیث اپنے لکھے ہوئے مسودوں کو سامنے رکھ کر طلبہ کو سناتے تھے۔ طلبہ انہیں لفظ بلفظ نقل کرتے تھے۔ بڑے بڑے اساتذۂ حدیث کا اعتماد حافظے کے ساتھ ساتھ اپنے مسودوں پر ہوتا تھا۔ جس استاذ نے جس قدر زیادہ گھوم پھر کر زیادہ احادیث جمع کی ہوتی تھیں، اس کا حلقۂ درس اتنا ہی مقبول ہوتا تھا۔ کتابوں کو نقل کرنے والے کاتبین کا باقاعدہ پیشہ وجود میں آ گیا جو بڑی بڑی کتابوں کو چند دنوں میں نقل کر کے پیش کر دیتے تھے۔ اس طرح پہلی صدی ہجری کا علمِ سینہ دوسری صدی ہجری میں علمِ سفینہ بھی بن گیا۔ پہلی صدی ہجری کی اِکا دُکا کتب ہم تک پہنچی ہیں مگر دوسری صدی ہجری کی درجنوں اور تیسری صدی کی سینکڑوں کتب آج تک محفوظ ہیں۔

[1] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ (م ۶۸ھ) اور مجاہد بن جبر (م ۱۰۴ھ) کی تفاسیر، حضرت حسن بصری (۱۱۰ھ) کی "فضائلِ مکہ" محمد بن سیرین (م ۱۱۰ھ) کی "تفسیر الاحلام" قتادہ بن دعامہ (م ۱۱۸ھ) کی "الناسخ والمنسوخ" اور ہمام بن منبہ (۱۳۱ھ) کے صحیفۂ حدیث کو پہلی صدی ہجری یا اس کے قریب تر دور کی یادگار شمار کیا جا سکتا ہے۔ روافض سلیم بن قیس نامی ایک فرضی راوی کی کتاب "کتاب سلیم بن قیس" کو پہلی صدی ہجری کی تصنیف بتاتے ہیں جو محض جھوٹ ہے۔ درحقیقت یہ تیسری صدی ہجری کی تصنیف ہے؛ کیوں کہ اس میں حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی شدید کردار کشی ہے جبکہ خود شیعانِ علی دوسری صدی ہجری تک حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی تعظیم وتوقیر کرتے تھے۔

[2] قصة الحضارة، ولیم جیمس دیورآنت، تعریب: دکتور زکی نجیب: ۱۶۹/۱۳، ۱۷۰، قال الذهبی: "وفی هذا العصر شرع علماء الاسلام فی تدوین الحدیث والفقه والتفسیر ..... الی قوله: واخذ الحفظ یتناقص." (تاریخ الاسلام للذهبی: ۱۳/۹ تحت: ۱۴۳هـ) وانظر: النجوم الزاهرة للتغری بردی: ۳۵۱/۱، ط دار الکتب مصر

کتب نگاری کے اس ابتدائی دور میں فقہی روایات پر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ (م ۱۵۰ھ) کی کتاب الآثار، امام مالک رحمہ اللہ (۱۷۹ھ) کی الموطا اور امام شافعی رحمہ اللہ (م ۲۰۴ھ) کی ''مسند امام شافعی'' منظر عام پر آئیں۔ یہ سب فقہی ترتیب پر تالیف کی گئی تھیں۔ اسی دور میں معمر بن راشد رحمہ اللہ (م ۱۵۳ھ) اور پھر عبداللہ بن وہب مصری رحمہ اللہ (م ۱۹۷ھ) نے اپنے مجموعے پیش کیے۔ یہ دونوں ''الجامع'' کے نام سے تھے جو اپنے اپنے مؤلفین کی طرف منسوب ہوئے۔ اس کے بعد بعض نامور محدثین نے ''مسانید'' پیش کیں جن میں صحابہ کی روایات الگ الگ منقول تھیں ان میں مسندِ ابوداؤد طیالسی (م ۲۰۴ھ)، مسندِ حمیدی (م ۲۱۹ھ)، مسندِ علی بن جعد (م ۲۳۰ھ) مسندِ اسحٰق بن راہویہ (م ۲۳۸ھ) اور مسندِ دارمی (۲۵۵ھ) مشہور ہیں۔ اسی دور میں امام عبدالرزاق صنعانی رحمہ اللہ (م ۲۱۱ھ) اور امام ابوبکر بن ابی شیبہ رحمہ اللہ (م ۲۳۵ھ) نے فقہی تبویب کے مطابق ''مُصَنَّف'' کے عنوان سے دو نہایت ضخیم اور عظیم الشان مجموعے پیش کیے۔ مصنف عبدالرزاق میں ۱۹ ہزار ۴۱۸ اور مصنف ابن ابی شیبہ میں ۳۷ ہزار ۹۴۳ روایات ہیں۔ بعض علماء نے مختلف عناوین پر احادیث جمع کیں جیسے عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ (م ۱۸۱ھ) کی الزہد والرقائق، قاسم بن سلام رحمہ اللہ (م ۲۲۴ھ) کی الایمان، نعیم بن حماد رحمہ اللہ (م ۲۲۸ھ) کی ''الفتن'' اور ابن زنجویہ رحمہ اللہ (م ۱۵۱ھ) کی ''الاموال۔'' احادیث کے یہ مجموعے اس دور کی ضرورت کے لحاظ سے کافی تھے مگر اگلے دور میں یہ مسئلہ ضرور سر اٹھا سکتا تھا کہ اگر امت کو دور جنوں ذخائر احادیث میں سے محفوظ ترین روایات کا انتخاب کرنا پڑے تو وہ کس کو ترجیح دے۔

یہ وہ دور تھا کہ اعتزال کا آغاز ہو چکا تھا۔ معتزلی علماء قرآن وسنت کو عقل کے تابع کر رہے تھے۔ اُدھر جہم بن صفوان کے پیروکاروں کا عقل پرست گروہ بھی موجود تھا جسے جہمیہ کہا جاتا تھا۔ تشیع رفض میں تبدیل ہو رہا تھا اور زندیقیت کی وہ تحریکیں جنہیں مہدی اور ہارون الرشید نے بڑی شدت سے دبا دیا تھا، اب بھی زیرِ زمین موجود تھیں۔ گمراہ فرقے عقائد، احکام، سیرت اور تاریخ میں جعلی روایات گھڑنے کا کام جاری رکھے ہوئے تھے۔ ان کی چھان بین فقط محدثین ہی کر سکتے تھے چنانچہ ہارون الرشید کے دربار میں ایک زندیق کو لایا گیا اور سزائے موت دی جانے لگی تو اس نے کہا:

''تم مجھے تو قتل کر دو گے مگر ان ایک ہزار حدیثوں کا کیا کرو گے جو میں نے پھیلا دی ہیں۔''

یہ سن کر ہارون نے فوراً کہا: ''اے اللہ کے دشمن! تو ابو اسحٰق فزاری اور عبداللہ بن مبارک کو کیسے بھول گیا؟ وہ ان کو چھلنی میں چھان کر ان کا ایک ایک حرف نکال پھینکیں گے۔''[1]

صحاحِ ستہ کی تالیف کی ضرورت:

پس اس زمانے میں بعض ماہرینِ حدیث نے یہ ضرورت شدت سے محسوس کی کہ جعلی روایات سے بچتے ہوئے معتبر اور قابلِ استدلال احادیث کے ایسے مجموعے تیار کیے جائیں جو معیار کے اعتبار سے مروجہ مجموعوں پر فائق ہوں، دین کے ہر شعبے سے متعلق احادیث ان میں جمع کر دی جائیں، ائمہ اربعہ یعنی: امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور

[1] تذكرة الحفاظ: ۱/ ۲۰۱

امام احمد ﷫ کے فقہی مستدلات بھی ان میں حسنِ ترتیب کے ساتھ موجود ہوں اوران کے علاوہ گمراہ فرقوں کے باطل عقائد کی تردید کے لیے بھی یہ مجموعے کافی ہوں اور آئندہ علمائے اُمت عقائد واحکام سمیت تمام شعبوں میں انہی مجموعوں سے رہنمائی لیں۔ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے کئی محدثین نے سالہا سال کام کیا۔

ان میں سے جن چھ شخصیات کو اللہ نے خاص الخاص مقبولیت نصیب فرمائی انہیں ''مؤلفینِ صحاحِ ستہ'' کہا جاتا ہے۔ یہ حضرات امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی اور امام ابن ماجہ ﷭ ہیں۔ صحاح ستہ سے مراد انہی چھ حضرات کی مرتب کردہ چھ کتب حدیث ہیں جن پر بارہ صدیوں سے امت کا اعتماد چلا آرہا ہے۔ اگلی سطور میں ان محدثین اور کتب کا تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

یہاں یہ نکتہ پیشِ نظر رکھنا دلچسپی کا باعث ہوگا کہ جس طرح فقہ کے پہلے مدوّن امام ابوحنیفہ عجمی تھے، اسی طرح حدیث کے امیر المؤمنین امام بخاری ﷫ بھی عجمی تھے۔ بلکہ صحاحِ ستہ کے چھ مؤلفین میں سے امام ابوداؤد ﷫ کے علاوہ باقی سب عجمی تھے جیسا کہ آگے ان کے حالات میں آرہا ہے۔ یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اسلام کی حفاظت واشاعت میں عرب وعجم کے مخلص مسلمان بلاکسی نسلی تفریق کے یکجا اور ایک ہی سمت میں گامزن تھے۔

یہ وہ دور تھا کہ عالمِ اسلام کی آبادی میں اہلِ عجم کی اکثریت ہوچکی تھی۔ عراق وفارس میں اسلام پھیلے ہوئے پونے دو صدیاں گزر چکی تھیں مگر ترکستان بھی مسلم حکام کی بصیرت وتدبیر اور علماء ومبلغین کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں ایک مسلم اکثریتی خطے میں تبدیل ہوچکا تھا۔ عجم سے پھوٹنے والی جن غیر اسلامی تحریکوں کا ذکر ہم نے پیچھے کیا ہے، وہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہیں مگر اس کے باعث سارے عجمیوں کے بارے میں منفی ذہن بنانا اور ان کی دینی وسیاسی خدمات کو نظرانداز کرنا بھی سخت ناانصافی ہے۔ اب مؤلفینِ صحاحِ ستہ کی علمی کاوشیں مختصر انداز میں پیش کی جارہی ہیں۔

❖❖❖

امیر المؤمنین فی الحدیث امام محمد بن اسماعیل البخاری رحمہ اللہ

امام بخاری رحمہ اللہ وہ ہستی ہیں کہ جنہیں اپنے دور کا سب سے بڑا محدث تسلیم کیا گیا۔ ان کا مجموعہ حدیث جو ''صحیح بخاری'' کے نام سے مشہور ہے، سنتِ نبویہ کا سب سے معتبر اور مقبول مأخذ رہا ہے۔ اسے ''اصح الکتب بعد کتاب اللہ'' کہا جاتا ہے یعنی قرآن مجید کے بعد صحیح ترین کتاب۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا اصل نام محمد بن اسماعیل تھا۔ وہ ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ عجمی نومسلموں کے خاندان سے تھے۔ ان کے پردادا مجوسی تھے جنہوں نے بنوامیہ کے دور میں بخارا کے حاکم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور ان کا نام مغیرہ رکھا گیا۔[1] مغیرہ کا گھرانہ علماء و صلحاء کا عقیدت مند تھا۔ امام بخاری کے والد اسماعیل کا اہلِ علم و فضل سے نیاز مندانہ تعلق تھا۔ انہوں نے امام مالک سے حدیث سنی تھی، حماد بن زید رحمہ اللہ سے ملاقات کی تھی اور عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے مصافحہ کیا تھا۔[2]

امام بخاری بچپن میں کسی بیماری کی وجہ سے نابینا ہو گئے تھے۔ ان کی والدہ رو رو کر اللہ سے دعائیں کیا کرتی تھیں کہ بچے کی بصارت لوٹ آئے۔ ایک دن خواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زیارت کی جنہوں نے بشارت دیتے ہوئے کہا: ''اللہ نے تمہاری آہ و بکا پر رحم فرماتے ہوئے تمہارے بچے کی بینائی لوٹا دی ہے۔'' وہ اٹھیں تو دیکھا کہ بچہ واقعی صحیح و سالم ہو چکا ہے۔[3] یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اللہ نے اس بچے سے کوئی غیر معمولی کام لینا طے کر رکھا ہے۔

امام بخاری اس دور میں قدرتِ الٰہیہ کا ایک کرشمہ تھے۔ ان کا حافظہ اتنا مضبوط تھا کہ جو چیز کانوں میں پڑتی وہ ہمیشہ کے لیے ازبر ہو جاتی۔ خود بتاتے تھے کہ میں نو یا دس سال کا تھا اور لکھنے کی مشق کرنے والے لڑکوں میں شامل تھا، تبھی علم حدیث میرے دل میں ڈال دیا گیا۔

حدیث میں اسناد کا علم خاص طور پر مشکل شمار ہوتا ہے مگر امام بخاری کو لڑکپن سے اس میں حیرت انگیز ملکہ حاصل ہو گیا تھا۔ وہ کسی بھی غلط سند کو فوراً بھانپ لیتے۔ وہ آنکھیں بند کر کے بتا سکتے کہ کس روایت کی اصل سند کیا ہے اور اس میں کیا تبدیلی کی گئی ہے۔ گیارہ سال کی عمر میں وہ محدثین کے حلقوں میں بیٹھنے لگے تھے۔ ایک دن استاد کے حلقے میں بیٹھے تھے۔ استاد ایک مسوّدہ سامنے رکھے روایات سنا رہے تھے۔ ایک سند سناتے ہوئے کہا: ''سفیان نے ابی الزبیر سے اور انہوں نے ابراہیم سے نقل کیا ہے۔''

امام بخاری رحمہ اللہ فوراً بولے: ''سفیان نے ابوالزبیر سے کوئی روایت نہیں سنی، ان کی ملاقات ثابت نہیں۔''

استاد نے انہیں ڈانٹ کر چپ کرانا چاہا مگر انہیں اپنی یادداشت پر اتنا بھروسہ تھا کہ بولے:

''آپ اصل کتاب سے موازنہ کر کے دیکھ لیں۔''

---

[1] وفیات الاعیان: ۱۹۰/۴ [2] سیر اعلام النبلاء: ۳۹۲/۱۲ [3] تهذيب الكمال: ٤٤٥/٢٤

استاد اندر گئے اور اصل نسخے کو کھول کر دیکھا تو امام بخاری صحیح کہہ رہے تھے۔ استاذ نے واپس آ کر پوچھا:
''بچے! تم کیا بتا رہے تھے؟'' امام بخاری نے صحیح سند بتائی اور استاد نے قلم لے کر مسودے میں اصلاح کر لی۔ [1]
مَرْو کے فقہاء کے حلقوں میں بیٹھنے لگے تو کم عمری کی وجہ سے سلام کرتے ہوئے شرماتے اور ایک طرف چپ چاپ بیٹھ جاتے۔ ان کے ہم درس کبھی کبھار ان پر ہنستے مگر استاد ان کی صلاحیتوں کو تاڑ چکے تھے۔ وہ کہتے تھے:
''اس پر نہ ہنسو۔ ہو سکتا ہے ایک دن یہ تم پر ہنسے۔'' [2]

اس دور کے ایک عالم سلیم بن مجاہد کہتے ہیں کہ میں ایک محدث کے ہاں گیا تو بولے: ''ابھی ایک بچہ یہاں سے اٹھ کر گیا ہے جسے ستر ہزار حدیثیں یاد ہیں۔'' وہ عالم جلدی سے اٹھ کر گئے اور اس بچے تک جا پہنچے۔ یہ بچہ امام بخاری رحمہ اللہ تھے۔ عالم نے حیرت سے پوچھا: ''تمہیں ۷۰ ہزار احادیث یاد ہیں؟'' وہ بولے: ''نہ صرف حدیثیں یاد ہیں بلکہ راویوں کا نام و نسب، سن ولادت، سن وفات اور مسکن بھی معلوم ہے۔ اور ہر روایت کے بارے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کتاب و سنت میں اس کی اصل اور بنیاد کہاں ہے۔'' [3]

سولہ سال کی عمر میں وہ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ اور وکیع بن جراح رحمہ اللہ جیسے نامور محدثین کی کتب یاد کر چکے تھے۔ [4]

اسی زمانے میں وہ اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ حج کے لیے گئے۔ مناسکِ حج ادا کر کے والدہ تو بھائی کے ساتھ واپس وطن چلی گئیں مگر یہ علم کے شوق میں وہیں رہ گئے۔ [5]

حدیث کی تحصیل کے لیے سفر شروع کیا تو بلخ، نیشاپور، رے، بغداد، بصرہ، کوفہ، مکہ، مدینہ، شام اور مصر تک گھومے۔ خود کہتے تھے کہ: میں نے ۱۰۸۰ محدثین سے علم حاصل کیا ہے۔ جہاں بھی جاتے وہاں پورے انہماک سے علم حاصل کرنے میں مشغول رہتے۔ ان کے ایک ہم درس ہانی بن نضر کہتے تھے: ''ہم شام میں محمد بن یوسف کے حلقے میں تھے۔ ہم لوگ نوجوانوں کی طرح میوے کھانے کا شغل کرتے مگر محمد بن اسماعیل حدیث ہی میں مگن رہتے۔'' [6]

حدیث میں اتنا کمال تھا کہ سند یا متن میں کسی بھی قسم کی ملاوٹ کو فوراً پکڑ لیتے تھے۔ بغداد گئے تو وہاں کے محدثین نے ان کا امتحان لینے کے لیے ایک سو احادیث کی اسناد میں ہیر پھیر کر کے ان کے سامنے وہ احادیث اس طرح پیش کیں کہ دس علماء یکے بعد دیگرے کھڑے ہوئے۔ ہر ایک نے دس دس احادیث اس طرح سنائیں کہ ان کی اسناد اور متن باہم خلط ملط کر دیے۔ یہ ہر حدیث کو سن کر کہتے رہے: ''میں نے نہیں سنی، میں نہیں جانتا۔''

لوگ سمجھے کہ ان کا حدیث دانی کا دعویٰ محض خام ہے۔ مگر ساری احادیث سننے اور لاعلمی کا اظہار کرنے کے بعد انہوں نے پہلے عالم سے کہا: ''تم نے پہلی حدیث یوں سنائی تھی وہ اصل میں اس طرح ہے، دوسری اس طرح ہے، تیسری اس طرح ہے۔'' اس طرح ان دس علماء میں سے ہر ایک کو اس کی غلط احادیث کی جگہ اسی طرح نمبروار درست

---

[1] تهذيب الكمال: ٤٣٩/٢٤
[2] تهذيب الكمال: ٤٣٩/٢٤
[3] سير اعلام النبلاء: ٤٠١/١٢
[4] سير اعلام النبلاء: ٤١٧/١٢
[5] سير اعلام النبلاء: ٤٠٠/١٢
[6] سير اعلام النبلاء: ٤٠٥/١٢

احادیث سناتے چلے گئے۔ یہ دیکھ کر لوگ دنگ رہ گئے۔[1]

سترہ سال کی عمر میں جبکہ ان کے چہرے پر ابھی ڈاڑھی کا ایک بال بھی نہیں نکلا تھا، وہ حدیث کے استاذ بن گئے۔ درس میں اتنی برکت ہوئی کہ امام مسلم، امام ترمذی، اور امام نسائی رحمہم اللہ ان کے شاگردوں میں شامل تھے۔[2]

اٹھارہ سال کی عمر میں وہ روایات پر اتنا عبور حاصل کر چکے تھے کہ ان کے اساتذہ علمی مباحث میں ان کے فیصلے پر اعتماد کرتے تھے۔[3] یہ تھے اس علمی ہستی کے کچھ کمالات جس نے دنیا کے لیے حدیث کا مستند ترین ذخیرہ مدون کیا۔

امام بخاری رحمہ اللہ مامون الرشید کے دور میں پیدا ہوئے تھے، معتصم کے دور میں وہ جوان تھے اور ان کے علم وفضل کا شہرہ ہونے لگا تھا۔ واثق باللہ کے زمانے میں انہیں امت کے سرکردہ محدثین میں شمار کیا جاتا تھا۔ امت کو درپیش علمی ضرورت کو پورا کرنا وہ اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ اس وقت محدثین کے پاس الگ الگ مشائخ سے مروی حدیث کے مجموعے تو موجود تھے مگر ایک تو ان روایات کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ دوسرے ان میں صحیح اور کمزور ہر قسم کی روایات ملی جلی تھیں۔ تیسرے ان مجموعوں میں ایسی ترتیب نہیں تھی کہ مطلوبہ مسائل کی روایات آسانی سے مل سکیں۔ اس صورتِ حال میں ایک دن محدثین کی مجلس میں کسی نے کہا:

''کاش! تم لوگ حضور ﷺ کی سنتوں کی ایک مختصر کتاب مرتب کر لیتے۔''[4]

یہ بات امام بخاری رحمہ اللہ کے دل میں بیٹھ گئی اور وہ بڑے اہتمام سے اس مجموعے کی تیاری میں مصروف ہوگئے جسے صحیح بخاری کہا جاتا ہے۔ اگر وہ عام محدثین کی طرح صرف روایات جمع کرتے تو یہ کام چند ماہ میں ہو جاتا مگر امام بخاری جانتے تھے کہ صرف روایات جمع کرنے سے، املائی مجموعوں میں ایک نئے مجموعے کا اضافہ ہو جائے گا جو پہلے سے سینکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کی توجہ کام کی ضخامت پر نہیں، اس کے معیار پر تھی اور انقلاب آفریں کام کرنے والے لوگوں کی یہی سوچ ہوتی ہے؛ اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک بلند تر معیار طے کیا اور اسے مسلسل بہتر بناتے رہے۔ صحیح بخاری میں جوان کی ساری زندگی کی محنت کا نچوڑ ہے، انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو نچوڑ کر رکھ دیا اور معیار کو سند، متن اور حسنِ ترتیب کے لحاظ سے اس نہج پر پہنچا دیا جس سے زیادہ کسی کے لیے ممکن نہیں ہو سکتا۔ یہ نہ صرف اُس دور بلکہ اگلی نسلوں کی دینی ضروریات کو سامنے رکھ کر مرتب کیا جانے والا ایک جامع منصوبہ تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ احادیث کو موزوں اور مفید ترین ترتیب کے ساتھ سامنے لانے کے لیے اکثر وبیشتر سوچتے رہتے تھے۔ جب کوئی نئی بات ذہن میں آتی تو فوراً اوراق اٹھاتے اور کتاب میں تبدیلیاں شروع کر دیتے۔

بعض اوقات راتوں کو بستر سے اٹھ اٹھ کر قلم سنبھالتے اور ترمیم وتصحیح کرتے۔ سفر میں بھی یہ کام ساتھ جاتا اور میزبان کا گھر ایک محدث کا حجرہ بن جاتا۔

---

[1] وفیات الاعیان: ۱۸۹/٤
[2] سیر اعلام النبلاء: ۴۰۱/۱۲
[3] سیر اعلام النبلاء: ۴۰۱/۱۲
[4] تاریخ بغداد: ۸/۲

اس کے ساتھ ہی کتاب کی اللہ کے ہاں مقبولیت کے لیے وہ بڑے فکرمند رہتے۔ خلوص اور خشوع وخضوع کی کیفیت ہر آن ان پر طاری رہی۔ ہر حدیث لکھنے سے پہلے غسل کرتے اور دو رکعت نفل ادا کرتے۔ احادیث پر عنوانات لگانے کا کام مدینہ منورہ جا کر ریاض الجنۃ میں کیا۔ بارگاہِ ربوبیت کے اس ادب اور کلام رسول کے اس احترام نے اس علمی مجموعے کو وہ مقام بخش دیا کہ تمام مصنفین اس پر رشک کرتے ہیں۔ اس مجموعے کا نام ''الجامع المسند الصحيح المختصر من امور رسول الله ﷺ وسننه وايامه'' رکھا گیا مگر یہ اپنے مؤلف کی طرف منسوب ہو کر ''صحیح البخاری'' کے نام سے مشہور ہوئی۔[1] امام صاحب نے مختلف مسودات، مجموعوں اور ذخائرِ حدیث میں پھیلی ہوئی تقریباً چھ لاکھ روایات سے صحیح سند کی ۷۵۶۳ روایات منتخب کر کے اس مجموعے میں جمع کیں۔ بہت سی صحیح روایات اختصار کی غرض سے ترک بھی کر دیں۔ یہ عظیم منصوبہ سولہ سال میں مکمل ہوا جسے آپ اپنے لیے ذریعۂ نجات قرار دیتے تھے۔[2] اس مجموعۂ احادیث کی سب سے بڑی خوبیاں تین ہیں:

❶ اس کی صحت۔ ❷ اس کی ترتیب۔ ❸ اس کی سرخیاں یا عنوانات جنھیں تراجم ابواب کہا جاتا ہے۔

صحت کا یہ حال ہے کہ کسی ضعیف راوی سے کوئی روایت نہیں لی گئی۔ ترتیب میں یہ کتاب الآثار اور مؤطا مالک سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس کی سرخیاں احادیث اور واقعات سے نہایت دور رس، باریک اور مفید نتائج نکال کر قلب کو بصیرت اور ذہن کو روشنی بخشتی ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے نہ صرف اس میں فقہی مسائل یعنی: طہارت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد اور خرید و فروخت کے احکام بلکہ ایمان وعقیدے، تفسیر قرآن مجید، گزشتہ انبیائے کرام کے حالات، سیرت نبویہ، اور صحابہ کے مناقب سے متعلقہ احادیث بھی پیش کی ہیں۔ اس مجموعے سے دورِ صحابہ کی صحیح تاریخ کے بارے میں بھی بیش قیمت مواد ملتا ہے۔

اپنے دور کے اس جلیل القدر محدث کو بھی حکام کی درشت مزاجی کا نشانہ بننا پڑا۔ بخارا کے حاکم خالد بن احمد نے فرمائش کی کہ امام بخاری اس کے ہاں آ کر اسے صحیح بخاری پڑھائیں۔ امام صاحب نے فرمائش کے جواب میں فرمایا:

''میں علم کو بے عزت نہیں کر سکتا۔ اگر حاکم حدیث پڑھنا چاہتا ہے تو خود حاضر ہو۔''

اس پر حاکم بخارا بگڑ گیا اور انھیں شہر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ رمضان کا مہینہ تھا، آپ شہر چھوڑ کر کسی نئی منزل کی طرف چلے۔ راستے میں بیمار پڑ گئے۔ ۳۰ رمضان ۲۵۶ھ کا سورج غروب ہوا تو لوگ عیدالفطر کا چاند دیکھ کر خوشیاں منا رہے تھے جبکہ سمرقند کے نواحی قصبے ''خرتنگ'' میں آسمانِ حدیث کا یہ ماہتاب نگاہوں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ خرتنگ میں اس محدثِ اعظم کی مرقد پر آج بھی زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔[3]

❖❖❖

[1] سير اعلام النبلاء: ۴۰۴/۱۲، ۴۰۵. [2] طبقات الحنابلة لابن ابي يعلى: ۲۷۶/۱، ط دار المعرفة بيروت.

[3] المنتظم: سنة ۲۵۶ھ؛ تقريب التهذيب، تر: ۵۷۲۷

امام مسلم بن حجاج نیشاپوری رحمہ اللہ

احادیث کی حفاظت واشاعت میں دوسرا غیر معمولی کام امام مسلم رحمہ اللہ نے کیا۔ وہ ۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے یعنی امام بخاری رحمہ اللہ سے دس سال بعد۔ ان کا تعلق نیشاپور کے قصبے ''قشیر'' کے ایک عجمی گھرانے سے تھا۔ امام بخاری کے بعد اس دور کا سب سے بڑا محدث انہی کو مانا گیا۔ انہوں نے پندرہ سال کی محنت کے بعد تین لاکھ احادیث سے بارہ ہزار ایسی روایات منتخب کیں جن کے صحیح ہونے پر اس دور کے مشائخِ حدیث کا اتفاق تھا۔

اس مجموعے کو وہ اپنے زمانے کے عظیم محدث اور ناقد امام ابوزُرعہ رحمہ اللہ کے پاس لے گئے۔ انہوں نے جس روایت کو کسی وجہ سے نامناسب سمجھا، اسے خارج کر دیا۔ اس طرح ''المسند الصحیح'' کے نام سے اسلامی عقائد و احکام اور سنن نبویہ کا یہ عظیم مجموعہ مرتب ہوا جو صحت اور معیار کے لحاظ سے صحیح بخاری کے ہم پلہ مانا جاتا ہے۔ بلکہ بعض علماء تو اسے صحیح بخاری پر ترجیح دیتے ہیں۔ عظیم محدث ابوعلی نیشاپوری فرماتے تھے: ''آسمان کے نیچے صحیح مسلم سے زیادہ مستند کتاب کوئی اور نہیں۔'' اس میں کوئی شک نہیں کہ صحیح مسلم حسنِ ترتیب میں صحیح بخاری سے بڑھ کر ہے۔ امام مسلم رحمہ اللہ کا کہنا تھا: ''محدثین اگر دو صدیوں تک بھی احادیث لکھتے رہیں تو ان کا دارومدار اسی کتاب پر ہوگا۔''

امام مسلم رجب ۲۶۱ھ میں وفات پا گئے مگر ان کی یہ بات اتنی درست ثابت ہوئی کہ آج بارہ صدیاں گزر جانے کے باوجود ان کی کتاب کو دینِ اسلام کے بنیادی مآخذ کی حیثیت حاصل ہے۔

ان کی وفات کا واقعہ بھی ان کے علمی انہماک کی دلیل ہے۔ وہ کتابیں کھولے کوئی حدیث تلاش کر رہے تھے کہ کسی نے کھجوروں کی ٹوکری ہدیہ بھیجی۔ یہ ورق گردانی کرتے ہوئے ایک ایک کھجور منہ میں ڈالتے چلے گئے یہاں تک کہ پوری ٹوکری خالی ہوگئی اور انہیں احساس بھی نہ ہوا۔ اسی وجہ سے بیمار ہو گئے اور یہی بیماری مرض الموت بن گئی۔ [1]

امام نسائی رحمہ اللہ

امام احمد بن شعیب نسائی رحمہ اللہ ۲۱۵ھ میں خراسان کے شہر ''نساء'' میں پیدا ہوئے۔ وہ بھی عجمی النسل تھے۔ انہوں نے اس زمانے کے دیگر محدثین کی طرح ملکوں ملکوں گھوم پھر کر علم حدیث حاصل کیا۔ اس دور میں خراسان علوم کا مرکز بن چکا تھا۔ چھوٹے چھوٹے شہروں میں بڑے بڑے محدثین موجود تھے۔ امام نسائی نے بغلان میں قُتَیبہ بن سعید رحمہ اللہ جیسے نامور محدث کے پاس پورے چودہ ماہ گزار کر احادیث حاصل کیں۔ پھر عراق، حجاز، شام اور اسلامی سرحدوں تک جا کر محدثین کو ڈھونڈتے رہے۔ آخر میں مصر کو وطن بنا لیا۔ وہیں ان کا حلقۂ درس لگا جس سے ان گنت طلبہ مستفید ہوتے تھے۔

---

(1) المنتظم: سنة ۲۶۱ھ؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۲/۵۵۷ تا ۷۶۵؛ شرح صحیح مسلم از امام نووی رحمہ اللہ: ۱/۹، ۱۰، ط دار احیاء التراث العربی

امام نسائی ایک شاندار اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ بڑھاپے کے باوجود چہرے پر خون کی لالی جھلکتی تھی۔ صحت بہت عمدہ تھی؛ کیوں کہ وہ اس کا پورا خیال رکھتے تھے۔ مرغ کا گوشت ان کی مرغوب غذا اور نبیذ ان کا پسندیدہ مشروب تھی۔ چار بیویاں تھیں اور مالی ثروت میسر تھی۔ گھربار کو انہوں نے کبھی علمی مصروفیات میں آڑے نہ آنے دیا۔

وہ جتنے بڑے عالم تھے، اتنے بڑے عبادت گزار بھی تھے۔ رات کا خاصا وقت تلاوت اور نوافل میں گزارتے۔ مصر کے حکام ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ امام نسائی عام طور پر حکام سے میل جول سے احتراز کرتے تھے مگر جب بھی مسلمان قیدیوں کو رومیوں سے چھڑانے کا مسئلہ آتا، وہ اس میں پیش پیش ہوتے۔ حکام کے ساتھ سرحد پر جاتے اور قیدیوں کی آزادی کے مراحل ان کی ہدایات کے مطابق طے ہوتے۔

ذوالقعدہ ۳۰۲ھ میں وہ شام گئے تو دیکھا کہ وہاں ناصبی بکثرت ہیں۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے انہیں سمجھانے کی خاطر ''خصائص علی رضی اللہ عنہ'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ وہیں ایک دن مجمعِ عام میں لوگوں نے ان سے ایسی بات کہلوانی چاہی جس سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حضرت علی رضی اللہ عنہ پر فوقیت ثابت ہو۔ امام نسائی نے ان لوگوں کی خواہش کے برخلاف سخت جواب دیا تو انتہاء پسند لوگ ان پر ٹوٹ پڑے۔ رفقاء انہیں زخمی حالت میں اٹھا کر رملہ روانہ ہوئے۔ شہر کے قریب پہنچ کر ان کی وفات ہوگئی اور رملہ میں تدفین ہوئی۔ یہ شعبان ۳۰۳ھ کا واقع ہے۔[1]

انہوں نے ''السنن الکبریٰ'' کے نام سے بارہ ہزار احادیث کا مجموعہ مرتب کیا جس میں ایسی تمام روایات کو لے لیا گیا جن کے ترک پر محدثین کا اجماع نہ ہو۔ بعد میں اس میں سے صحیح احادیث کا ایک الگ انتخاب ''المجتبیٰ'' کے نام سے پیش کیا جو ''۵۷۵۴'' احادیث پر مشتمل تھا۔ اسی کو ''سنن نسائی'' کہا جاتا ہے جو دینی مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ امام نسائی رحمہ اللہ خود فرماتے تھے کہ میری سنن صحیح احادیث پر مشتمل ہے۔

امام ابن رُشید کہتے تھے: ''امام نسائی کی یہ تصنیف تمام کتب حدیث سے انوکھی اور ترتیب کے لحاظ سے بہترین ہے۔ بخاری و مسلم کے طرق اس میں جمع ہیں اور علم حدیث کی بہت سی الجھنوں کو بھی اس میں دور کر دیا گیا ہے۔''[2]

سند کے معاملے میں امام نسائی، بخاری و مسلم سے بھی زیادہ سخت معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے بعض ایسے راویوں کو بھی ترک کر دیا جن سے بخاری و مسلم نے روایات لی ہیں۔ اسی لیے امام معافری رحمہ اللہ فرماتے تھے: ''جس روایت کی تخریج امام نسائی نے کی ہو، وہ دیگر محدثین کی روایات کے مقابلے میں زیادہ صحیح ہوگی۔''[3] اسی لیے بعض افریقی علماء سنن نسائی کو بخاری و مسلم پر ترجیح دیتے آئے ہیں۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام نسائی حدیث، عللِ حدیث اور رجالِ حدیث کے بارے میں مسلم، ترمذی اور ابوداؤد سے بڑھ کر ہیں۔ وہ بخاری اور ابوزُرعہ کے ہم پلہ ہیں۔[4]

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۱۴/ ۱۳۰ تا ۱۳۴ بعض حضرات کا خیال ہے کہ انہیں مکہ لے جایا گیا تھا اور صفا و مروہ کے درمیان ان کی تدفین ہوئی ہے۔ یہ خلاف تحقیق ہے جیسا کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے وضاحت کی ہے۔

[2] مقدمة زهر الربیٰ علی المجتبی (انظر هذه المقدمة فی سنن النسائی بشرح السیوطی: ۱/ ۵، ۶، ط دار المعرفة بیروت)

[3] مقدمة زهر الربیٰ علی المجتبی (سنن النسائی بشرح السیوطی: ۱/ ۵)

[4] توضیح الافکار لمعانی تنقیح الافکار للامیر الصنعانی، ص ۱۹۸

امام ابوداؤد سجستانی رحمہ اللہ

امام ابوداؤد کا اصل نام سلیمان بن الاشعث تھا۔۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے۔عرب قبیلے بنواز د سے تعلق تھا۔ان کے آباؤ اجداد سجستان (جنوبی افغانستان) میں آبسے تھے۔یہاں یہ ایک خوشحال خاندان تھا جو زمینوں اور جائیدادوں کا مالک تھا۔مگر ابوداؤد رحمہ اللہ کو علم کا چسکا لگا تو یہاں سے نکل پڑے۔ملکوں ملکوں سفر کر کے علم حدیث سیکھا۔بصرہ پہنچ کر سلیمان بن حرب، ابوالولید اور ابوالنعمان جیسے محدثین سے فیض حاصل کیا۔پھر شام اور مصر گئے اور محدثین کے حلقوں کو کھنگال ڈالا۔پھر عراق آئے اور نیشاپور میں کچھ وقت گزار کر آبائی وطن سجستان کو واپسی کی،مگر کچھ عرصے بعد دوبارہ رختِ سفر باندھا اور بغداد آگئے۔امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے استفادہ کیا اور ان کی فقہ میں کمال حاصل کیا۔ایک مدت تک بغداد میں رہے اور اس دور کے نامور محدثین میں شمار ہونے لگے۔وہ حسنِ کردار، اخلاقِ عالیہ، ورع وتقویٰ اور عفت وامانت جیسی صفات سے آراستہ تھے۔ذکر وتلاوت اور عبادت وریاضت میں نمایاں تھے۔محدثین کہتے تھے:

''امام ابوداؤد کے لیے حدیث اس طرح موم کردی گئی ہے جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے لوہا موم کردیا گیا تھا۔''

بصرہ اس زمانے میں حبشیوں کی شورش کی وجہ سے علماء سے خالی ہوگیا تھا۔بغداد کے ولی عہد الموفق کی درخواست پر آپ بصرہ تشریف لے گئے اور وہاں قیام کر کے علم وفضل کے چشمے جاری کیے۔شوال ۲۷۵ھ میں وہیں وفات پائی۔[1]

امام ابوداؤد رحمہ اللہ محدث ہونے کے ساتھ فقیہ بھی تھے۔انہوں نے پانچ لاکھ احادیث میں سے پانچ ہزار احادیث کا انتخاب کر کے ''سنن ابی داؤد'' مرتب کی اور اپنے فقیہانہ ذوق کے مطابق اس بات کا خاص خیال رکھا کہ فقہی احادیث کا زیادہ سے زیادہ معتبر ذخیرہ جمع ہوجائے۔یہی وجہ ہے کہ اس میں سیرت کے واقعات اور فضائل کی احادیث کم ہیں مگر ہمیں فقہی استدلالات کے لیے جتنا مواد سنن ابی داؤد سے فراہم ہوتا ہے، اتنا کہیں اور سے نہیں مل پاتا۔سنن ابوداؤد میں اکثر احادیث صحیح یا حسن ہیں۔بعض احادیث کسی لحاظ سے کمزور ہیں جن کی امام ابوداؤد نے خود وضاحت کردی ہے۔اسی لیے علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ابوداؤد نے اپنی سنن میں جن احادیث پر سکوت کیا ہے، وہ ان کے نزدیک صحیح ہیں۔''[2]

امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے سنن اپنے عہدِ شباب ہی میں مکمل کرلی تھی۔اسے وہ اپنے استاذ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے پاس لے گئے تو انہوں نے دیکھ کر اسے بہت پسند کیا۔[3]

امام غزالی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ یہی ایک کتاب مجتہد کے لیے کافی ہے۔[4]

علامہ زکریا ساجی رحمہ اللہ فرماتے تھے:''اسلام کی اصل ''کتاب اللہ'' ہے اور اسلام کا فرمان ''سننِ ابوداؤد''۔''[5]

① سیر اعلام النبلاء: ۲۰۵/۱۳ تا ۲۲۰
② فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث للسخاوی: ۱۰۴/۱، ط مکتبۃ السنۃ مصر
③ سیر اعلام النبلاء: ۲۰۹/۱۳
④ فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث للسخاوی: ۱۰۱/۱
⑤ سیر اعلام النبلاء: ۲۱۵/۱۳

امام ترمذی رحمہ اللہ

امام محمد بن عیسیٰ الترمذی رحمہ اللہ کا تعلق وسطِ ایشیا کے ایک عجمی گھرانے سے تھا۔ ۲۱۰ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا حافظہ نادرِ روزگار تھا۔ کبھی کوئی بات بھولتے نہ تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں کسی محدث سے منقول احادیث لکھ کر پاس رکھی تھیں۔ خوش قسمتی سے وہ محدث مکہ کے راستے میں مل گئے۔ امام ترمذی کو شوق ہوا کہ وہ احادیث ان محدث سے براہِ راست سماعت کرلیں۔ ان سے درخواست کی کہ میں نے آپ کی احادیث لکھ کر رکھی ہیں مگر آپ سے سماعت کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے درخواست قبول کرلی۔ امام ترمذی نے طلبہ کے معمول کے مطابق احادیث والے اوراق سامنے رکھنا چاہے تو دیکھا کہ وہ اوراق گم ہو چکے ہیں۔ انہوں نے سادہ صفحے اٹھا کر سامنے دھر لیے۔ محدث زبانی احادیث سناتے جا رہے تھے کہ اچانک ان کی نگاہ سادہ صفحات پر پڑگئی۔ ناراض ہو کر کہنے لگے: ''تمہیں شرم نہیں آتی۔'' انہوں نے عرض کیا: ''جو احادیث آپ نے سنائی ہیں وہ مجھے زبانی یاد ہوگئی ہیں۔'' استاد نے کہا: ''سناؤ''۔ انہوں نے سب لفظ بلفظ سنا دیں۔ استاد نے کہا: ''تم نے آنے سے پہلے یاد کرلی ہوں گی۔'' یہ بولے: ''آپ کچھ نئی احادیث سنا کر دیکھ لیں۔'' استاد نے مزید کچھ احادیث سنائیں اور انہوں نے اسی طرح حرف بحرف سنا دیں۔[1]

امام ترمذی رحمہ اللہ امام بخاری رحمہ اللہ کے شاگرد تھے مگر بعض روایات کا سماع خود امام بخاری رحمہ اللہ نے ان سے کیا تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ انہیں فرماتے تھے: ''تم نے مجھ سے اس قدر نفع نہیں اٹھایا جتنا میں نے تم سے اٹھایا۔''[2]

علم حدیث، حافظے اور زہد و عبادت میں وہ اہلِ خراسان میں ممتاز تھے۔ یادِ الٰہی میں اکثر روتے تھے۔ مطالعے اور رونے کی کثرت کے باعث آخر میں نابینا ہوگئے تھے۔ رجب ۲۷۹ھ میں اپنے آبائی شہر ترمذ ہی میں وفات پائی۔[3]

امام ترمذی رحمہ اللہ کا کارنامہ سنن ترمذی درحقیقت احادیث کا ایک منفرد مجموعہ ہے۔ اس میں ایک طرف احکام کی ان تمام فقہی احادیث کو لے لیا گیا ہے جن پر کسی کا عمل رہا ہے۔ دوسرے اسے صرف احکام کی احادیث کے لیے مخصوص نہیں رکھا گیا بلکہ اس میں بخاری و مسلم کی طرح ہر موضوع سے متعلق روایات کو جمع کر دیا گیا ہے؛ اس لیے اسے ''جامع'' بھی کہا جاتا ہے۔ حدیث سے متعلقہ فقہی مذاہب، صحیح، حسن یا ضعیف ہونے کے لحاظ سے روایت کا درجہ کیا ہے؟ کن روایات پر اُمت کا عمل ہے اور کن پر نہیں؟ ایک موضوع کی احادیث کے بعد یہ وضاحت کہ اور کون کون سے صحابہ سے اس بارے میں روایات موجود ہیں؟ راویوں کے نام اور کنیت کی وضاحت تاکہ دوسرے راویوں سے اشتباہ نہ ہو، راویوں کی جرح و تعدیل۔ جامع ترمذی میں یہ تمام پہلو واضح کیے گئے ہیں۔ یہ خصوصیت کسی اور مجموعۂ حدیث میں نہیں ملتی؛ اس لیے جامع ترمذی کو محدثین کے ہاں غیر معمولی مقبولیت حاصل رہی ہے۔[4]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ للذہبی: ۱۵۴/۲، ۱۵۵، ط العلمیۃ
[2] تہذیب التہذیب: ۳۸۹/۹، تر: الامام الترمذی، ط دکن
[3] سیر اعلام النبلاء: ۲۷۰/۱۳ تا ۲۷۷
[4] عارضۃ الاحوذی بشرح الترمذی لابن العربی: ۵/۱، ۶

امام ابن ماجہ قزوینی رحمہ اللہ

محمد بن زید ابو عبداللہ ابن ماجہ القزوینی رحمہ اللہ بھی عجم کے ان محدثین میں سے ایک ہیں جنہوں نے علم حدیث کی تدوین میں اہم حصہ لیا۔ ان کی ولادت ۲۰۹ھ میں شمالی ایران کے شہر قزوین میں ہوئی تھی۔ ۶۴ سال عمر پا کر رمضان ۲۷۳ھ میں قزوین ہی میں فوت ہوئے۔ ①

ان کی تالیف ''سنن ابن ماجہ'' حسنِ ترتیب اور اختصار کے لحاظ سے دیگر کتب حدیث پر فوقیت رکھتی ہے۔ جب امام ابن ماجہ نے یہ کاوش امام ابوزرعہ رحمہ اللہ کی خدمت میں پیش کی تو انہوں نے اسے ملاحظہ کر کے بہت پسند کیا۔ ②
اس میں تبویب اس عمدگی سے کی گئی ہے کہ روایات کا کہیں تکرار نہیں ہونے پاتا۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کتاب میں ایسی بہت سی روایات جمع کر لی گئی ہیں جو دیگر کتبِ حدیث میں نہیں ہیں۔ امام ابن ماجہ رحمہ اللہ چاہتے تھے کہ بعض ضعیف احادیث بھی جو کسی نہ کسی لحاظ سے فضائل یا معلومات کا کام دے سکتی ہیں، اہلِ علم کے مطالعے میں آجائیں، چنانچہ انہوں نے اپنی تالیف میں حدیث درج کرنے کی شرائط کو نرم رکھا۔ اس طرح اس میں کوئی ایک ہزار کے قریب ایسی احادیث آگئی ہیں جن سے عقائد یا فقہی مسائل میں استدلال نہیں کیا جا سکتا اور تیس کے لگ بھگ ایسی روایات ہیں جو شدید ضعیف ہیں۔ ③

❖ ❖ ❖

① سیر اعلام النبلاء: ۱۳/۲۷۷ تا ۲۸۰
② تذکرۃ الحفاظ: ۲/۱۵۵
③ سیر اعلام النبلاء: ۱۳/۲۷۹

ائمہ تزکیہ و احسان

بنوعباس کے دورِ عروج میں مال و دولت کی کثرت اور عام خوشحالی نے لوگوں میں دنیاداری کو عام کر دیا تھا اور دین کی وہ روح جسے اللہ کی معرفت اور رسول ﷺ کی محبت سے تعبیر کیا جاتا ہے، مدہم پڑنے لگی تھی۔ اخلاص و احسان، خشوع و خضوع، فکرِ آخرت اور عبادت کا ذوق کم ہونے لگا تھا۔ ایسے میں کچھ ہستیوں نے اپنے قول و عمل سے اسلاف کے اس مزاج کو زندہ رکھنے کی پوری کوشش کی۔ ان حضرات کو عام طور پر عُبّاد، زُہّاد یا صوفیائے کرام کہا جاتا ہے۔

صوفیاء ہر دور میں کئی طرح کے رہے ہیں۔ کچھ وہ جو غلبۂ حال یا جہالت کی وجہ سے ایسے قول و فعل میں مبتلا ہوئے جو شریعت کے دائرے سے باہر ہو جاتا ہے۔ کچھ وہ تھے جو نصرانیوں کی رہبانیت، عجمی افکار، یونانی فلسفے اور ہندو مت سے متاثر ہو کر کھلی زندیقیت کا شکار ہوئے اور ایسی زندگی کی طرف دعوت دیتے رہے جس کا اسلامی عقیدے اور عمل سے کوئی میل نہیں تھا۔ بہت سے ایسے تھے جو عقیدے یا اعمال کے لحاظ سے بظاہر کسی کج روئی کا شکار نہیں تھے بلکہ زہد و ریاضت میں معروف تھے مگر ساتھ ہی حُبِ جاہ میں مبتلا تھے اور لوگوں کو اپنے گرد جمع کرنے کے لیے عجیب و غریب حیلے کرتے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو لوگوں کے دلوں کو نرم کرنے کے لیے قبر، حشر، جنت اور جہنم کے متعلق احادیث گھڑ گھڑ کر سناتے تھے۔ ائمۂ اسلام کے ہاں ایسا تصوف کبھی بھی مقبول نہیں رہا بلکہ وہ ہمیشہ اس کی تردید کرتے آئے ہیں جیسا کہ علامہ ابن جوزی، امام غزالی، حضرت مجدّد الف ثانی (شیخ احمد سرہندی)، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہم اللہ کی تصانیف سے واضح ہے۔

اصل صوفیائے کرام صحیح العقیدہ، شریعت کے عالم اور سنت کے پابند تھے۔ یہ حضرات جس راہ کے داعی تھے، اس کا جعلی تصوف سے کوئی واسطہ نہیں تھا بلکہ یہ نیت کو خالص کرنے، گناہوں سے بچتے ہوئے، ذکر و تلاوت، مسنون اعمال اور نوافل کی کثرت کے ساتھ اللہ سے تعلق کو پختہ کرنے، عبادات میں دل لگانے، اور سنت کی پیروی کرنے کی ایک مشق کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ظاہر ہے یہ سب چیزیں شرعاً مطلوب ہیں۔ ان کے حصول کی کوشش کو تصوف کا نام دیں، یا تزکیہ کہہ لیں، یا سلوک و احسان سے تعبیر کر لیں، بہر حال مردہ دلوں کو بیدار کرنے کا نسخہ یہی تھا اور اُمت کی روح اسی کے ذریعے زندہ رہ سکتی تھی۔ ائمۂ تزکیہ و احسان کے ذیل میں اب ہم جن بزرگوں کا ذکر کر رہے ہیں، وہ حقیقی تزکیۂ نفس و احسان کے داعی تھے جن کی کوشش ہمیشہ یہ رہی کہ اللہ کی فرماں برداری اور اس کے رسول ﷺ کی اتباع کو ہر چیز پر فوقیت دیں اور اپنی کیفیات و احوال پر ہمیشہ شریعت کو مقدم رکھیں۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ

ابراہیم بن اذہم بلخ کے رئیس زادے اور سیر وشکار کے شوقین تھے۔غفلت کی زندگی گزارا کرتے تھے کہ ایک دن شکار کے پیچھے گھوڑا دوڑا رہے تھے کہ یہ آواز کانوں میں پڑی:

''ہم نے تمہیں اس لیے پیدا نہیں کیا!

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ.

''کیا تم نے یہ سمجھا ہے کہ ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے بیکار......اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے۔''[1]

یہ سنتے ہی دل کی دنیا بدل گئی۔ ریاست اور خاندانی وجاہت کو لات ماری اور دین سیکھنے کے لیے اللہ والوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا قول ہے:

''خراسان سے ہم ساٹھ نوجوان دین سیکھنے نکلے تھے جن میں ابراہیم بن ادہم بھی تھے۔''

انہوں نے ضروری حد تک فقہ وحدیث کی تعلیم حاصل کی تھی جیسا کہ ان سے محدثین نے بعض روایات نقل بھی کی ہیں۔تاہم ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر زہد وعبادت اور ذکر وفکر کا اس قدر غلبہ ہو چکا تھا کہ بقدرِ ضرورت ہی علم دین سیکھ سکے۔اہل اللہ سے تعلق ان کا سب سے بڑا مشغلہ تھا۔مکہ جا کر فضیل بن عیاض اور سفیان ثوری رحمہما اللہ جیسے بزرگوں کی خدمت میں رہے۔زیادہ وقت شام میں گزارا اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کی۔

کسبِ حلال کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ان کی اکثر نصیحتوں میں حلال کمائی پر زور ہوتا تھا۔نفلی عبادات کو وہ اتنا اہم نہیں سمجھتے تھے جتنا حرام سے بچنے کو۔اتنے بڑے ولی ہو کر بھی وہ محنت مزدوری سے پیٹ بھرتے تھے۔کسی کے ہاں کھیتی باڑی کرتے تو کسی کے ہاں باغبانی۔شام کے ایک رئیس نے انہیں اناروں کے باغ کا چوکیدار بنایا۔ایک مدت تک وہ یہ نوکری کرتے رہے۔رئیس نے ایک دن ان سے کہا:''ایک عمدہ اور بڑا سا انار لا کر کھلاؤ۔''

یہ ایک بڑا سا انار توڑ لائے۔رئیس نے چکھا تو نہایت ترش نکلا۔وہ جھلا کر بولا:

''تم اتنی مدت سے یہاں کام کر رہے ہو۔ابھی تک کھٹے اور میٹھے پھل کی پہچان نہیں ہوئی؟''

یہ بولے:''اللہ کی قسم! جب سے کام پر لگا ہوں ایک بار بھی کوئی پھل توڑ کر نہیں کھایا۔''

رئیس نے کہا:''لگتا ہے آپ ابراہیم بن ادہم ہیں!''

اس واقعے سے ان کی شہرت ہو گئی مگر یہ اتنے عزلت پسند تھے کہ علاقہ چھوڑ کر چلے گئے۔

ان کی زندگی اسی طرح ذکر وعبادت اور خود کو چھپاتے ہوئے قریہ قریہ پھرنے اور اہل اللہ سے ملاقاتوں میں گزری۔شقیق بلخی اور عبداللہ بن مبارک رحمہما اللہ جیسے خراسانی بزرگوں سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔

[1] سورۃ المؤمنون، آیت: ۱۱۵

ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ جہاد کا زبردست ولولہ رکھتے تھے۔ ان کی وفات ۱۶۰ھ میں بحیرۂ روم کے ایک جزیرے میں مجاہدین کے ساتھ پہرا دیتے ہوئے ہوئی۔ آخری شب بیماری کی وجہ سے انہیں ۲۰ مرتبہ قضائے حاجت کے لیے اٹھنا پڑا، مگر ہر بار تازہ وضو بنایا تاکہ کامل پاکی میسر رہے۔ جب حالتِ نزع طاری ہوئی تو اپنی کمان منگوائی اور اسے تھامے ہوئے جان جاں آفرین کے سپرد کردی۔ وہ عمر بھر خود کو گمنام رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ خود نمائی اور شہرت سے انہیں سخت نفرت تھی۔ مگر خود کو چھپانے کی ہر کوشش کے باوجود ان کا شمار اُمت کے اکابر اولیاء میں ہوا۔ اللہ نے انہیں وہ مقام اور مقبولیت بخشی کہ آج تک ان کا نام بڑے ادب واحترام سے لیا جاتا ہے۔[1]

اس میں عبرت ہے آج کے ان نام نہاد درویشوں اور جعلی صوفیوں کے لیے جو شہرت کے پیچھے بھاگتے ہیں اور اس کے لیے نہایت گھٹیا طریقے اختیار کرتے ہوئے ذرا نہیں شرماتے۔

حضرت داؤد طائی رحمہ اللہ

یہ کوفہ کے مشہور مشائخ میں سے تھے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد اور اپنے دور کے فقیہ تھے مگر زہد وعبادت میں زیادہ شہرت پائی۔ انہوں نے اپنے والد سے وراثت میں بیس دینار پائے تھے۔ باقی عمر انہی پر گزارا کیا۔ ہر سال فقط ایک دینار (تقریباً اڑھائی ہزار روپے) خرچ کرتے تھے، اپنے اخراجات بھی پورے کرتے اور صدقہ بھی نکالتے۔

جب تک شدید بھوک نہ لگتی کچھ نہ کھاتے۔ ایک بار کسی نے دیکھا کہ نمک کے ساتھ سوکھی روٹی کھا رہے ہیں۔ پوچھا: ''آپ یہ کیسے کھالیتے ہیں؟'' فرمایا: ''میں نے نفس کو بھوکا رکھا یہاں تک کہ اسے یہی کھانا پسند آنے لگا۔''

ایک بار بازار گئے تو تازہ کھجوریں دیکھ کر خریدنے کا جی چاہا مگر جیب خالی تھی۔ دکاندار سے کہا: ''ایک درہم کی کھجوریں دے دو۔ کل تک پیسے دے دوں گا۔'' وہ بولا: ''جاؤ اپنا راستہ ناپو۔''

ایک شخص نے انہیں پہچان لیا اور دکاندار کو کہا: ''انہیں ایک درہم کی کھجوریں پیش کرو۔ اگر وہ قبول کرلیں تو میں تمہیں سو درہم دے دوں گا۔'' دکاندار ان کے پیچھے دوڑا اور کہا: ''چلیے جو ضرورت ہے لے لیں۔''

انہوں نے فرمایا: ''بس میں تو اپنے نفس کو اس کی حیثیت دکھا رہا تھا۔ یہ اس دنیا میں ایک درہم کی قیمت بھی نہیں رکھتا مگر کل جنت پانا چاہتا ہے۔''

فرمایا کرتے تھے: ''جس بندے کو بھی اللہ نے گناہوں سے نکال کر تقویٰ کی توفیق دی تو اسے بغیر مال کے غنی کردیا، بغیر خاندان کے عزت بخش دی اور بغیر کسی ساتھی کے اس کو دلجمعی نصیب فرما دی۔''

داؤد طائی رحمہ اللہ کا انتقال ۱۶۵ھ میں ہوا۔[2]

---

[1] البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۱۶۲ھ؛ حلیۃ الاولیاء: ۳۶۸/۷ تا ۳۷۱

[2] المنتظم لابن الجوزی: سنۃ ۱۶۵ھ؛ طبقات الاولیاء لابن الملقن، ص ۲۰۱ تا ۲۰۳، ط الخانجی قاہرہ

حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ عباسی دور کی سب سے مشہور اور نامور عابد و زاہد ہستی تھے۔ نوجوانی میں وہ بہت بڑے ڈاکو تھے۔ قافلے ان کے نام سے کانپا کرتے تھے۔ اس دوران وہ کسی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔ طے کیا کہ اسے اغواء کر لیا جائے۔ جب اس مقصد کے لیے اس کے گھر کی دیوار پھاندی تو اندر سے قرآن مجید کی یہ آیت سنائی دی:

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ [1]

''کیا اب بھی ایمان والوں کے لیے وہ گھڑی نہیں آئی کہ ان کے دل کانپ جائیں اللہ کی یاد سے۔''

یہ آیات سنتے ہی ان کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ پکار اُٹھے: ''کیوں نہیں کیوں نہیں میرے رب!''

یہ کہہ کر سابقہ زندگی کو یک لخت ترک کر دیا اور توبہ تائب ہو کر علمِ دین کی تحصیل اور ذکر و عبادت میں مشغول ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس راہ میں ایسی ریاضتیں اور مجاہدے کیے کہ ہر طرف ان کی شہرت ہو گئی۔ [2]

اس دور کے ایک بزرگ ابراہیم بن اشعث رحمہ اللہ کا بیان ہے: ''وہ اکثر کسی فکر میں منہمک رہتے تھے۔ پڑھنے پڑھانے، لینے دینے، خرچ کرنے اور روکنے، محبت اور نفرت کرنے میں ان جیسا اخلاص میں نے کسی میں نہیں دیکھا۔ دل کی نرمی، خدا خوفی اور فکرِ آخرت کا ان پر اس قدر غلبہ تھا کہ جب بھی قرآن مجید سنتے اشک بار ہو جاتے۔ کبھی اس طرح چیخیں مار کر روتے کہ دیکھنے والوں کو رحم آتا۔ جب کسی جنازے کے ساتھ قبرستان جاتے تو وعظ و نصیحت کرتے اور اس قدر روتے کہ لگتا تھا وہ خود سب کو الوداع کہہ کر سفرِ آخرت پر روانہ ہو رہے ہیں۔''

انہوں نے مکہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اکثر وقت حرم میں گزرتا۔ ایک بوریے پر نوافل میں ساری رات گزار دیتے۔ اس دوران نیند کا غلبہ ہوتا تو وہیں سو جاتے، جب آنکھ کھلتی تو وضو کر کے پھر نوافل شروع کر دیتے۔ ان کی قرأت بہت عمدہ تھی۔ تلاوت کے وقت لہجے میں غم واندوہ گھل جاتا تھا۔ ٹھہر ٹھہر کر یوں تلاوت کرتے جیسے کسی کو مخاطب کر کے بات سمجھا رہے ہوں۔ تلاوت میں کہیں جنت کا ذکر آ جاتا تو اسے دہراتے رہتے۔

آپ پر اللہ کا خوف غالب تھا۔ کہا کرتے تھے: ''جو اللہ سے ڈرتا ہے، وہ کسی چیز سے دھوکا نہیں کھاتا اور جو اللہ کے سوا دوسروں سے ڈرے اسے کوئی چیز نفع نہیں دے سکتی۔''

آپ اکثر غم زدہ رہتے تھے۔ غم و حزن کو تعلق مع اللہ کی کلید تصور کرتے تھے۔ فرماتے تھے: ''جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اس کا غم بڑھا دیتا ہے اور جب کسی کو ناپسند کرتا ہے تو اس پر دنیا کشادہ کر دیتا ہے۔''

اللہ کی رضا کے لیے نفس کے محاسبے پر بہت زور دیتے تھے۔ فرماتے تھے:

''جو اللہ کے لیے اپنے نفس سے ناراض ہوتا ہے، اللہ اسے اپنی ناراضی سے محفوظ رکھتا ہے۔''

[1] سورۃ الحدید، آیت: ١٦ [2] البدایۃ والنھایۃ: سنۃ ١٨٧ھ

اللہ سے اُمید اور خوف میں توازن رکھنے کے لیے آپ فرماتے تھے:

''جب تک آدمی صحیح وسالم ہو تو اُمید کی بہ نسبت اللہ کا خوف غالب رہنا زیادہ مفید ہے۔ اور جب موت کا وقت آجائے تو اُمید کو خوف پر غالب رکھنا چاہیے۔ جو شخص صحت کی حالت میں نیک کام کرتا ہے آخری وقت میں اس پر اُمید کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور جو صحت کی حالت میں اعمالِ بد کا عادی ہو، اسے آخری وقت میں اللہ سے اچھا گمان نہیں ہوتا اور اس کی اُمید کمزور ہوتی ہے۔''

آپ گمنامی اور گوشہ نشینی کو پسند کرتے تھے اور شہرت سے بچنے کی تاکید کرتے تھے۔ فرماتے تھے:

''تم سب سے چھپا کر اللہ کی سچے دل سے اطاعت کرو۔ بلند مرتبہ وہی ہوتا ہے جسے اللہ بلند کرے۔ جب وہ کسی بندے کو پسند کرتا ہے تو اس کی محبت بندوں کے دلوں میں اتار دیتا ہے۔''

آپ علم اور اس کے ساتھ زہد وقناعت کو بہت ضروری سمجھتے تھے۔ فرماتے تھے:

''اللہ کا خوف انسان کے علم کے بقدر ہوتا ہے۔ اور دنیا سے زہد اتنا ہی ہوتا ہے جتنی آخرت میں رغبت ہو۔''[1]

آپ کو دنیا سے ایسی بے رغبتی تھی کہ فرماتے تھے: ''اگر ساری دنیا میرے لیے حلال کر دی جائے تب بھی میں اس سے ایسی ہی نفرت کروں گا جیسے تم مردار جانور سے کرتے ہو۔''

اصلاحِ نیت اور اخلاص پر بہت زور دیا کرتے تھے اور اس بارے میں نفس کے مکائد کو اچھی طرح سمجھاتے تھے۔ فرماتے تھے: ''لوگوں کو دکھانے کے لیے عمل کرنا شرک ہے۔ اور لوگوں کو دکھانے سے بچنے کے لیے عمل چھوڑ دینا ریاکاری ہے۔ اخلاص یہ ہے کہ اللہ تمہیں ان دونوں حالتوں سے محفوظ رکھے۔''

گناہوں سے بچنے کا خاص اہتمام کرتے اور اس کی تاکید فرماتے۔ آپ کا کہنا تھا کہ اطاعت سے زندگی میں برکت ہوتی ہے اور گناہوں کا اثر ہمیشہ منفی ظاہر ہوتا ہے۔ کہتے تھے:

''اگر مجھ سے کوئی گناہ ہو جائے تو اس کا اثر اپنی سواری اور اپنے خادم تک میں محسوس کرتا ہوں۔''

آپ محض گوشہ نشین عابد نہیں تھے بلکہ اصلاحِ معاشرہ کے لیے فکر مند رہتے تھے، خاص کر حکام کو نصیحتوں کا موقع ضائع نہیں کرتے تھے۔ آپ کا کہنا تھا: ''اگر مجھے ایک مقبول دعا کا اختیار مل جائے تو میں حکمران کی اصلاح کی دعا کروں گا؛ کیوں کہ اگر وہ صالح ہو تو لوگ اور ملک سب ٹھیک رہیں گے۔''

ہارون الرشید ان کا بہت معتقد تھا۔ ایک بار اس نے ان سے پوچھا: ''آپ زاہد کیسے بنے؟''

انہوں نے کہا: ''تم مجھ سے بڑے زاہد ہو۔ میں تو فانی دنیا سے زہد اختیار کیے بیٹھا ہوں مگر تم باقی رہنے والی آخرت سے زہد پر راضی ہو۔''

۱۸۷ھ میں ان کی وفات ہوئی۔[2]

[1] حلیۃ الاولیاء: ۸/۸۵ تا ۱۰۴

[2] البدایۃ والنھایۃ: سنۃ ۱۸۷ھ

حضرت معروف الکرخی رحمہ اللہ

معروف کرخی رحمہ اللہ بغداد کے ایک نصرانی فیرزان کے بیٹے تھے، مگر ہوش سنبھالتے ہی اللہ کی توحید کے قائل ہو گئے۔ بچوں کو کھیل کھیل میں نماز پڑھایا کرتے، یہ دیکھ کر ان کے والدین سخت ناراض ہوتے۔ پادری انہیں پڑھاتا کہ اللہ تین میں سے تیسرا ہے۔ یہ کہتے: ''اللہ ایک ہے۔''

آخر ایک دن پادری نے غصے میں آکر انہیں خوب پیٹا۔ یہ گھر سے بھاگ گئے۔ والدین کو بہت افسوس ہوا اور وہ کہنے لگے: ''کاش! وہ واپس آجائے چاہے مسلمان ہو کر ہی سہی۔ ہم بھی اسی کا دین قبول کر لیں گے۔''

ادھر معروف کرخی علمائے بغداد کے دامنِ فیض سے وابستہ ہو کر مشرف با اسلام ہو گئے۔ گھر واپس آئے تو والدین بھی قبولِ اسلام پر آمادہ تھے۔ انہوں نے بھی کلمہ پڑھ لیا۔[1]

معروف کرخی رحمہ اللہ باقاعدہ عالم نہیں تھے مگر امام جعفر صادق (۸۰ھ۔۱۴۸ھ) ربیع بن صبیح (م ۱۶۰ھ)، ابن سماک (م ۱۸۳ھ) اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ جیسے علمائے بغداد کی مجالس میں بیٹھا کرتے تھے۔ خود روایات کم بیان کرتے تھے، پھر بھی ان سے مروی احادیث سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علومِ شرعیہ سے بقدرِ ضرورت واقف تھے۔ طبقات حنابلہ میں ان کا ذکر ظاہر کرتا ہے کہ وہ حنبلی تھے۔

ایک بار کسی نے ان سے پوچھا: ''آپ نے احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے کچھ سنا ہے؟''

بولے: ''ہاں! یہ بات سنی ہے کہ جو سمجھ جائے کہ مرنے کے بعد وہ بھولا بسرا ہو جائے گا وہ اچھے عمل کرے گا، برائی نہیں کرے گا۔''[2]

مکہ کے محدث سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ (۱۰۷ھ۔۱۹۸ھ) ان کی بزرگی کے قائل تھے اور اہلِ بغداد سے ان کی خیر خیریت پوچھا کرتے تھے۔ ایک بار فرمایا: ''جب تک یہ بزرگ تمہارے درمیان ہیں، تم خیر و عافیت سے رہو گے۔''[3]

بشر حافی رحمہ اللہ (۱۵۰ھ۔۲۲۷ھ) ان کے رفقاء میں سے تھے اور ان کے مداح تھے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ بھی ان کے کمالات کے قائل تھے۔ ایک بار ان کی مجلس میں کسی نے کہہ دیا کہ معروف کرخی کا علم کم ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا: ''علم کا مقصد اور مراد وہی تو ہے جس تک معروف کرخی پہنچے ہیں۔''

ایک بار امام احمد رحمہ اللہ کے صاحبزادے نے پوچھ لیا: ''معروف کرخی کے پاس علم بھی ہے؟''

فرمایا: ''معروف کے پاس علم کی جڑ ہے۔ یعنی اللہ کا خوف۔''

حضرت معروف کرخی رحمہ اللہ نے عمر بھر نکاح نہیں کیا۔ محلّہ کرخ میں دریائے دجلہ کے کنارے ایک مسجد کو اپنا ٹھکانہ

---

[1] تاریخ بغداد: ۲۰۲،۲۰۱/۱۳، ط العلمیة

[2] طبقات الحنابلة لابن ابی یعلیٰ: ۳۸۱/۱، ط دار المعرفة

[3] طبقات الحنابلة لابن ابی یعلیٰ: ۳۸۲/۱

بنالیا تھا۔ ساری عمر وہیں گزاری۔

کرخ میں رہائش کی وجہ سے انہیں کرخی کہا جاتا تھا۔[1] وہ اسی مسجد میں عبادت کرتے اور وہیں آرام کرتے۔ صرف طہارت کے لیے باہر نکلا کرتے تھے۔[2] وہ ۲۰۰ھ میں فوت ہوئے اور بغداد ہی میں دفن ہوئے۔[3]

حضرت بشر حافی رحمہ اللہ

بشر حافی رحمہ اللہ کا اصل نام بشر بن حارث تھا۔ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ نوجوانی میں یہ جرائم پیشہ آدمی تھے۔ لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ ایک دن کہیں سے گزر رہے تھے کہ ایک کاغذ پڑا دیکھا جس پر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھا تھا۔ انہوں نے ادب سے اٹھا کر کاغذ کو صاف کیا پھر بازار سے عمدہ خوشبو خرید کر اس کاغذ پر لگائی اور اونچی جگہ پر رکھ دیا۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے: ''تم نے ہمارے نام کو گلی سے اٹھایا اور مہکایا، ہم تمہارا نام دنیا و آخرت میں مہکا دیں گے۔''

خواب سے بیدار ہوئے تو دل کی دنیا بدل چکی تھی۔ اس کے بعد علماء و صلحاء کی صحبت اختیار کی اور علم و عمل سے آراستہ ہو کر بغداد کے نامور ولی شمار ہوئے۔ فقر کا یہ حال تھا کہ ننگے پاؤں رہتے تھے؛ اسی لیے ان کا لقب ''حافی'' پڑ گیا۔

انہوں نے زیادہ وقت گوشہ نشینی میں گزارا، اس کے باوجود اللہ نے وہ مقام دیا کہ بڑے بڑے علماء ان کی زیارت کے لیے آتے تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ جیسے امامِ مجتہد ان کی بزرگی کے قائل تھے۔ یہ بھی امام صاحب کی علمی شان اور ہمت و مجاہدے کے مداح تھے۔ خلقِ قرآن کے مسئلے میں امام احمد رحمہ اللہ کی استقامت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے انہوں نے کہا: ''احمد بن حنبل کو آگ کی بھٹی میں جھونکا گیا، وہ کھرا سرخ سونا بن کر وہاں سے نکلے۔''

---

[1] تاریخ بغداد: ۲۰۲/۱۳، ۲۰۵ ط العلمیة...... نوٹ: بعد میں محلہ کرخ میں شیعوں کی اکثریت ہو گئی؛ اس لیے آج بعض لوگ معروف کرخی کو شیعہ سمجھتے ہیں مگر یہ درست نہیں۔ ان سے اہلِ سنت کے مذہب کے خلاف کوئی عقیدہ و عمل منقول نہیں۔

نوٹ: بعض مؤرخین کے بقول معروف کرخی رحمہ اللہ نے حضرت علی رضا رحمہ اللہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا، مگر در حقیقت یہ بات غلط ہے: کیوں کہ معروف کرخی رحمہ اللہ نے جعفر صادق رحمہ اللہ (حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کے پوتے) سے بھی حدیث سنی ہے جن کی وفات ۱۴۸ھ میں ہوئی۔ ﴿تاریخ دمشق: ۲۲۸/۱۵؛ تقریب التہذیب، تر: ۹۵۰﴾

یہی ۱۴۸ھ علی رضا رحمہ اللہ کا سنِ ولادت ہے۔ یعنی علی رضا رحمہ اللہ کی ولادت سے پہلے معروف کرخی رحمہ اللہ نہ صرف اسلام لا چکے تھے بلکہ ضروری علم دین بھی سیکھ چکے تھے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ علی رضا رحمہ اللہ مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں مسجدِ نبوی میں درس دیتے ہوئے ان کی عمر گزر گئی۔ ہمیں کوئی روایت ایسی نہیں ملی کہ وہ کبھی بغداد میں رہے ہوں۔ ہماری تلاش کے مطابق حجاز سے پہلی بار وہ ۲۰۱ھ میں اس وقت نکلے تھے جب مامون الرشید نے ان کی ولی عہدی کا اعلان کرنے کے لیے انہیں اپنے پاس مرو (خراسان) بلوایا تھا۔ اسی سفر میں ان کی وفات ہو گئی۔ یہ ۲۰۳ھ کا واقعہ ہے۔ اگر اس سفر میں وہ بغداد میں ٹھہرتے تب بھی معروف کرخی رحمہ اللہ سے ملاقات ممکن نہیں تھی؛ کیوں کہ معروف کرخی اس سے تین سال پہلے ۲۰۰ھ میں وفات پا چکے تھے۔ دونوں حضرات معاصر ضرور تھے مگر ان کی باہمی ملاقات کی نوبت آنا بھی ثابت نہیں سوائے اس کے کہ کسی روایت میں اس کی تصریح دکھائی جا سکے۔ بہر صورت ان کے علی رضا رحمہ اللہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے کی روایت محض ایک افسانہ ہے۔ بالفرض اگر ایسا ہوتا تب بھی اس بناء پر انہیں اثنا عشری شیعی عقائد کا حامل قرار دینا بالکل بے تکی بات ہوتی۔

[2] تاریخ بغداد: ۲۰۵/۱۳، ط العلمیة

[3] تاریخ بغداد: ۲۰۹/۱۳، ط العلمیة

... پہنچے تو فرمایا: ''اللہ کا شکر ہے جس نے بشر کو ہمارے عمل سے خوش کیا۔''
... تھے۔ فرماتے تھے:
... مجھے نجات کی امید ہو، سوائے صحابہ کی محبت کے۔''
... ۲۲۷ھ کی صبح بغداد میں وفات پائی۔ جنازے میں اتنا ہجوم تھا کہ تدفین ہوتے ...[1]

حضرت ذُوالنون مصری (ثوبان بن ابراہیم) رحمہ اللہ

... مصری رحمہ اللہ مصر میں علم معرفت کی روشنی پھیلانے والے مشہور صوفی بزرگ ہیں۔ وہ اپنے دور کے پہلے ... جنہوں نے اولیاء اللہ کے مقامات اور کیفیات کے بارے میں کلام کیا۔ چونکہ یہ چیزیں اسلاف سے منقول ... نہیں اس لیے بعض علماء نے انہیں زندیق قرار دیا۔ خلیفہ متوکل نے ان کے بارے میں یہ باتیں سنیں تو انہیں فوراً ... سواریوں کے ذریعے مصر سے بغداد بلایا۔ یہ ۲۴۴ھ کا واقعہ ہے۔ قصرِ خلافت جاتے وقت یہ زیرِ لب درود ... پڑھتے جارہے تھے۔ اس ورد کا ایسا اثر ہوا کہ متوکل انہیں دیکھتے ہی متاثر ہوگیا اور اٹھ کر معانقہ کیا۔ بات چیت ... بعد متوکل ان کے علوم ومعارف کا پوری طرح قائل ہوگیا اور بے حد اعزاز واکرام کا معاملہ کرنے لگا۔

متوکل ان کی نصیحتیں سن کر زار وقطار رویا کرتا تھا۔ ایک دن ان سے پوچھا: ''اولیاء کی صفات سے آگاہ فرمایئے۔'' فرمایا: ''امیر المؤمنین! یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے اپنی محبت کی تیز روشنی دی ہے اور انہیں کرامت کا لباس پہنایا ہے اور ان کے سروں پر ابدی مسرتوں کا تاج رکھ دیا ہے۔''

ذوالنون رحمہ اللہ کچھ مدت بغداد میں رہ کر واپس مصر چلے گئے۔ ۲ ذوالقعدہ ۲۴۶ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۹۰ سال تھی۔ ذوالنون مصری رحمہ اللہ پر اگرچہ درویشی کا غلبہ تھا مگر علم حدیث سے بھی واقف تھے۔ امام مالک، سفیان بن عیینہ، لیث بن سعد اور فضیل بن عیاض رحمہم اللہ سے سماعِ حدیث کیا تھا۔ بعض اوقات پوری سند کے ساتھ احادیث سنایا کرتے تھے جو عموماً اخلاق، فکرِ آخرت اور خشوع وخضوع سے متعلق ہوتی تھیں۔ ذوالنون رحمہ اللہ فرماتے تھے:

''اللہ سے دل لگنا ایک چمک دار روشنی کی طرح ہے اور مخلوق سے دل لگنا سوائے غم کے کچھ نہیں۔''

یہ بھی فرماتے تھے: ''عارف کبھی ایک حالت میں نہیں رہتا بلکہ ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ چمٹا رہتا ہے۔'' (اللہ کے حکم کے مطابق اس کی حالت بدلتی رہتی ہے)[2]

---

① المنتظم: سنة ۲۲۷ھ؛ البداية والنهاية: سنة ۲۲۷ھ؛ حلية الاولياء: ۳۳۸/۸ تا ۳۴۵

② سير اعلام النبلاء: ۵۳۳/۱۱ تا ۵۳۶؛ طبقات الصوفيه، ص ۲۷ تا ۳۴

حضرت سَرِیّ السقطی رحمۃ اللہ

حضرت سَرِی السقطی رحمۃ اللہ ایک تجارت پیشہ شخص تھے۔ اشیائے خوردونوش کی دکان چلاتے تھے۔ اس دوران نہایت ایمان داری سے معاملات کرتے اور ضرورت مندوں کی مدد بھی کرتے رہتے۔ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ کا کبھی کبھی اُدھر سے گزر ہوتا۔ ان کی دیانت اور سخاوت دیکھ کر دعائیں دیتے۔

ایک بار ایک باندی اپنے آقا کے لیے بازار سے کوئی چیز خرید کر برتن میں لے جارہی تھی کہ برتن ٹوٹ گیا اور وہ چیز ضائع ہوگئی۔ باندی رونے لگی کہ اب آقا ڈانٹے گا۔ سَرِی السقطی رحمۃ اللہ نے اس کا حال دیکھا تو اسے اتنی رقم دے دی جس سے اس کے نقصان کی تلافی ہوگئی۔ معروف کرخی رحمۃ اللہ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان کی زبان سے نکلا:

''اللہ دنیا کو تمہارے لیے قابلِ نفرت بنا دے۔''

ایک بار عید کے دن معروف کرخی رحمۃ اللہ ایک مفلوک الحال بچے کے ساتھ کھڑے تھے جس کے کپڑے پھٹے پرانے تھے۔ سَرِی السقطی رحمۃ اللہ نے ماجرا پوچھا تو معروف کرخی رحمۃ اللہ نے فرمایا: ''یہ بچہ دوسرے بچوں کو کھیلتا دیکھ کر غم زدہ کھڑا تھا۔ میں نے حال پوچھا تو اس نے بتایا کہ میں یتیم ہوں، اتنے پیسے بھی نہیں کہ اخروٹ خرید کر ان سے کھیل سکوں۔''[1]

سَرِی السقطی رحمۃ اللہ اس بچے کو ساتھ لے گئے، اسے نئے کپڑے پہنائے اور اخروٹ خریدنے کے لیے پیسے بھی دے دیے۔ معروف کرخی رحمۃ اللہ نے اس نیکی پر انہیں دعا دی: ''اللہ تمہارے دل کو غنی کردے۔''

سَرِی السقطی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں: ''اس دن کے بعد دنیا میرے نزدیک بے حیثیت ہوگئی۔''

انہوں نے معروف کرخی رحمۃ اللہ کا دامن تھام لیا اور اپنے عہد میں اولیاء کے سرتاج ہوگئے۔

وہ مستجاب الدعوات تھے۔ کوئی بھی مشکل آپڑتی تو نماز میں مشغول ہوکر اللہ سے مانگ لیتے۔ ایک بار ایک عورت نے آکر فریاد کی کہ اس کے بیٹے کو تھانے دار پکڑ کرلے گیا ہے۔ آپ سفارش کردیں کہ وہ میرے بیٹے پر تشدد نہ کرے۔ آپ نے اس کی بات سنتے ہی نماز کی نیت باندھ لی۔ وہ عورت اس دوران پیچ وتاب کھاتی رہی۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو اس نے کہا: اللہ کے واسطے میرے بیٹے پر رحم کریں۔''

فرمایا: ''اسی کام میں تو لگا ہوا تھا۔'' کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اس عورت کا بیٹا رہا ہوکر آگیا۔[2]

سَرِی السقطی رحمۃ اللہ کی عبادت وریاضت کے حالات انسان کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ دکان داری کے سوا باقی سارا وقت عبادت میں گزارتے۔ جب عبادت کرتے کرتے تھک جاتے تو سہارا لگا کر کچھ دیر اونگھ لیتے۔ کہا جاتا تھا کہ کبھی انہیں لیٹے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔

[1] اخروٹ کھیلنا عراق کے چھوٹے بچوں کا عام کھیل تھا جیسے گلیوں میں کھیلا جاتا تھا۔ یہ کھیل تقریباً اسی طرح کا تھا جیسے ہمارے پاک وہند میں بچے گولیاں (کنچے) کھیلا کرتے ہیں۔

[2] البدایة والنهایة: ١٤/٤٩٦، ٤٩٧

شرم وحیا اور خدا خوفی کا یہ حال تھا کہ ایک بار بازار میں آگ لگ گئی۔ کسی نے خبر دی کہ سب کی دکانیں جل گئیں مگر آپ کی دکان بچ گئی۔ سن کر بے ساختہ الحمدللہ کہا۔ بعد میں خیال آیا کہ دوسروں کے نقصان کی کوئی پروا کیے بغیر الحمدللہ کیسے کہہ دیا۔ اس قدر شرمسار ہوئے کہ جب بھی یہ بات یاد آتی استغفار کرنے لگتے۔

۹۸ برس عمر پا کر ۶ رمضان ۲۵۳ ہجری کو فجر کی اذان کے کچھ دیر بعد ان کا انتقال ہوا۔ وفات سے پہلے آپ یہ اشعار پڑھ رہے تھے۔

اَلْقَلْبُ مُحْتَرِقٌ وَالدَّمْعُ مُسْتَبِقٌ   وَالْكَرْبُ مُجْتَمِعٌ وَالصَّبْرُ مُفْتَرِقُ

''دل جل رہا ہے اور آنسو بہہ رہے ہیں۔ درد جمع ہے اور صبر بکھر رہا ہے۔''

كَيْفَ الْقَرَارُ مَنْ لَا قَرَارَ لَهُ   مِمَّا جَنَاهُ الْهَوىٰ وَالشَّوْقُ وَالْقَلَقُ

''اس بے قرار کو قرار کیسے آئے، جسے محبت، شوق اور تڑپ نے نشانہ بنالیا ہے۔''

يَارَبِّ اِنْ كَانَ شَيْءٌ فِيهِ لِي فَرَجٌ   فَامْنُنْ عَلَيَّ بِهِ مَادَامَ بِي رَمَقُ

''یارب! اگر مجھے کسی طرح نجات ومغفرت مل سکتی ہے تو سانس نکلنے سے پہلے، مجھے وہ مرحمت فرمادے۔''

ان کی وفات کے بعد کسی نے انہیں خواب میں دیکھا اور حال پوچھا تو فرمایا:

''اللہ نے میری مغفرت فرمادی اور ان سب لوگوں کی بھی جو میرے جنازے میں شریک ہوئے۔''[1]

حضرت ابو یزید بُسطامی رحمہ اللہ

یہ اپنے دور کے نامور ولی تھے اور سلطان العارفین کہلاتے تھے۔ عام طور پر انہیں بایزید بسطامی کہا جاتا ہے۔

فرماتے تھے: ''میں نے تیس سال مجاہدے کیے، مگر علم پر عمل کرنے سے زیادہ سخت چیز کوئی نہیں دیکھی۔''

فرماتے تھے:

''میں اپنے نفس کو اللہ کی طرف کھینچتا رہا اور نفس روتا رہا۔ جب میں اسے اللہ کی طرف لے جاچکا تو وہ ہنسنے لگا۔''

فرماتے تھے: ''وہ شخص نفس کی معرفت حاصل نہیں کرسکتا جس کی شہوت اس کے ساتھ ساتھ رہے۔''

کسی نے پوچھا: ''درویش کسے کہتے ہیں؟''

فرمایا: ''جو خود بھی کسی چیز کا مالک نہ ہو اور نہ ہی کوئی اس کا مالک بن سکے۔''

کسی نے سوال کیا: ''عارف کون ہے؟'' فرمایا: ''جو اللہ کے ذکر سے نہ اکتائے، اس کا حق ادا کرنے (کی کوشش سے) نہ تھکے اور اس کے سوا کسی سے دل نہ لگائے۔''

---

[1] وفيات الاعيان: ۲/۳۵۷، ۳۵۸؛ البداية والنهاية: سنة ۲۵۳ھ

پوچھا گیا: ''آپ نے اللہ کو کس طرح پایا؟'' فرمایا: ''بھوکے پیٹ اور ننگے بدن کے ساتھ۔''
کسی نے پوچھا: ''کوئی ایسا عمل بتایئے کہ میں اللہ کا مقرب بن جاؤں!!''
فرمایا: ''اولیاء اللہ سے محبت کرو تا کہ وہ تم سے محبت کریں، اللہ اپنے اولیاء کے دلوں کو دیکھتا ہے، ممکن ہے ان کے دلوں میں تمہاری جگہ دیکھ کر وہ تمہاری بھی مغفرت کر دے۔''
اپنی مناجات میں کہتے تھے: ''الٰہی! یہ حیرت کی بات نہیں کہ مجھ سا بندۂ فقیر تجھ سے محبت کرتا ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے تو شہنشاہِ قدیر ہو کر مجھ سے محبت کرتا ہے۔''
فرماتے تھے:

''ایسے بھی لوگ ہیں جو پانی پر چلتے ہیں مگر اللہ کے ہاں ان کی کوئی قیمت نہیں۔ اگر کسی کی کرامات یہاں تک دیکھو کہ وہ ہوا میں اڑتا ہے تب بھی دھوکہ نہ کھانا جب تک یہ نہ دیکھ لو کہ وہ اوامر و نواہی اور احکام شرع کا کس قدر پابند ہے۔''

ابو یزید بسطامی رحمہ اللہ نے ۷۳ سال کی عمر پائی اور ۲۶۱ھ میں فوت ہوئے۔ [1]
حافظ ذہبی رحمہ اللہ ان کے مناقب نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''ان سے بعض ایسی چیزیں بھی منقول ہیں جن کی شرعاً گنجائش نہیں نکل سکتی۔ یا تو وہ چیزیں ان کی طرف غلط طور پر منسوب ہیں۔ یا وہ ان سے غلبۂ خوف، از خود رفتگی اور خود فراموشی کے عالم میں صادر ہوئی ہیں؛ کیوں کہ ان کا ظاہری مطلب الحاد ہے۔'' [2]

---

[1] طبقات الاولیاء لابن الملقن، ص ۳۹۸ تا ۴۰۳؛ طبقات الصوفیه للسلمی النیسابوری، ص ۶۷ تا ۷۴؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۳/۸۶ تا ۸۸
[2] سیر اعلام النبلاء: ۱۳/۸۸

بنوعباس کا دورِ عروج......اسباق وعبر

* دو مختلف الخیال جماعتیں جب کسی متحدہ مقصد کے لیے جمع ہوتی ہیں تو اکثر و بیشتر کامیابی کے ثمرات بڑی اور طاقتور جماعت کے حصے میں آتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کامیابی کے بعد بڑی جماعت اپنے کمزور اتحادی کو شک وشبہے کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اسے عتاب وعذاب کا نشانہ بنانے لگتی ہے۔ علویوں اور عباسیوں نے بنوامیہ کی حکومت کو گرانے میں اشتراکِ عمل کیا۔ عباسی جماعت زیادہ منظم، مضبوط اور طاقت ور تھی؛ اس لیے حکومت بنانے کے بعد نہ صرف علویوں کو اقتدار سے محروم رکھا گیا بلکہ انہیں شک وشبہے کی نگاہ سے دیکھا گیا کہ کہیں وہ اقتدار میں پوری حصہ داری نہ مانگنے لگیں۔ اگلے دور میں کئی علوی اس بناء پر خروج کرتے اور عبرت ناک انجام سے دوچار ہوتے رہے۔

* دنیا میں غیر معمولی صلاحیتوں کے لوگ ہمیشہ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ کامیابی کا راستہ یہ ہے کہ ایسا ہر شخص اپنی ممتاز صلاحیتوں کو پہچان کر انہی کے ذریعے دنیا کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے۔ مسائل اس وقت پیدا ہوتے اور بڑھتے ہیں جب غیر معمولی دل ودماغ رکھنے والے کئی افراد بیک وقت اپنی قیمتی صلاحیتوں کو سیاست کے تنگ اکھاڑے کی نذر کرنے لگتے ہیں۔ اس کوشش میں ان کا آخری ہدف خود کو سب سے بڑا بنانا ہوتا ہے۔ کبھی ایسی کوششیں موجودہ حکمرانوں کو چہ اقتدار سے بے دخل کرنے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ کبھی اس سوچ کی وجہ سے اقتدار میں شامل ہر ہوشیار فرد اپنا الگ گروہ بنالیتا ہے۔ کبھی یہ ذہنیت محلاتی سازشوں کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ ایسی مصروفیات کا نتیجہ بہت کم مثبت نکلتا ہے۔ عموماً اس سے فساد ہی پھیلتا ہے؛ کیوں کہ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سماتیں۔ ایک ملک، ایک معاشرے اور ایک ادارے میں جب باصلاحیت اور ممتاز استعداد رکھنے والے لوگ سیاسی اور انتظامی امور میں بالادستی اور اختیارات میں اضافے کی تگ ودو شروع کر دیں تو قوم کی خدمت فراموش ہو جاتی ہے اور مثبت اہداف اوجھل ہو جاتے ہیں۔ جب قدآور لوگ نیچے دیکھے بغیر اقتدار کے سنگھاسن کی طرف دوڑ لگاتے ہیں تو کمزور اور پستہ قد لوگوں کا کچلے جانا لازمی ہے۔ بنوامیہ اور بنوعباس دونوں ادوار میں ہمیں قدم قدم پر ایسی غلط مثالیں دکھائی دیتی ہیں اور آج بھی ان کا اعادہ جاری ہے۔

* اللہ کی قائم کردہ یہ کائنات ٹھوس اصولوں پر قائم ایک نظامِ حیات ہے۔ یہ کوئی جادو نگری نہیں جہاں سب کچھ اتفاقات اور کرشموں کے ذریعے وجود میں آرہا ہو۔ اگر کوئی شخص قوم کی رہنمائی کرنا چاہتا ہے، ملت کے لیے اچھے مستقبل کی خواہش رکھتا ہے یا کم از کم اپنے اور اپنے بچوں ہی کے لیے ایک بہتر زندگی کا خواہاں ہے تو اسے اللہ کی طاقت اور اس کے اٹل نظام پر ایمان بھی لانا ہوگا، اس کے نظامِ قدرت کو سمجھنا بھی ہوگا اور اس کے مطابق اپنے عمل کی منصوبہ بندی بھی کرنا ہوگی۔ اس کے برعکس جو شخص محض وقتی جوش واشتعال کی بنیاد پر کوئی ہدف طے کرے گا اور اپنے لائحہ عمل کو منصوبہ بندی کی جگہ خوش فہمی پر استوار کرے گا، اسے ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا چاہے وہ کتنا ہی بڑا آدمی

کیوں نہ ہو۔ متعدد نیک وصالح حضرات کی ناکام انقلابی کوششیں اس کی گواہ ہیں۔

⊛ انقلاب کے دوران عباسیوں کا انحصار عجمی قبائل کی افرادی وعسکری طاقت پر تھا۔ انہیں عربوں کی زیادہ حمایت حاصل نہ تھی۔ اگرچہ حصولِ اقتدار کے بعد انہوں نے کلیدی عہدے زیادہ تر اپنے ہی خاندان کے لوگوں کو دیے جو قریشی تھے مگر عجمیوں کی عسکری قوت کو وہ نظرانداز نہیں کر سکتے تھے؛ اس لیے انہیں عجمیوں کو شریک اقتدار کرنا پڑا۔ یوں قصرِ خلافت سے لے کر عوامی زندگی تک بہت جلد ایرانی وخراسانی تہذیب وتمدن کی چھاپ لگ گئی۔ حرصِ دنیا کا مرض تو پہلے ہی عام ہو چکا تھا۔ اب اسراف وتبذیر، رہن سہن میں تکلفات، عیش وتنعم اور نمود ونمائش کا چلن عام ہو گیا جس سے آگے چل کر بہت سے مسائل پیدا ہوئے۔ ایک یہی المیہ کچھ کم نہ تھا کہ جو سرمایہ اسلام کی دعوت اور جہاد پر صرف ہو سکتا تھا اس کا بڑا حصہ نسل در نسل فانی دنیوی خواہشات میں ضائع ہوتا رہا۔

تاریخ کا یہ منظر بتاتا ہے کہ حصولِ اقتدار کے لیے جس کا سہارا لیا جاتا ہے، بعد میں اسی کے مرہونِ منت ہو کر رہنا پڑتا ہے۔ ہم جس کے کاندھوں پر سوار ہو کر مسندِ اقتدار تک پہنچیں گے، اس کے اثرات سے پیچھا چھڑانا ہمارے لیے بہت مشکل ہوگا؛ اس لیے اقتدار کی خاطر کسی سے ہاتھ ملاتے وقت عواقب کو اچھی طرح سوچ سمجھ لینا چاہیے۔

⊛ تمام کامیابیوں کے پیچھے اتفاق واتحاد کی طاقت کارفرما ہوتی ہے۔ تمام ناکامیوں کے پسِ پردہ اختلاف و افتراق کا زہر موجود ہوتا ہے۔ اگر بنو امیہ اور بنو ہاشم اپنے سیاسی اختلاف کو ختم کر لیتے جیسا کہ حضرت حسن اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی صلح میں ہوا تھا، تو ہماری ناکامیوں کی داستان بہت مختصر رہ جاتی۔ اور اسی طرح اگر بنو عباس کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ان کے خلاف بار بار خروج نہ ہوتا تو ان کا دورِ زوال اتنی جلد شروع نہ ہوتا۔

⊛ اختلاف کا ہونا کوئی عجیب بات نہیں بلکہ اختلافِ رائے تو انسانی فطرت اور معاشرت کا حصہ ہے۔ مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب اس کی وجہ سے راستے الگ کر لیے جائیں اور تباہی تب پھیلتی ہے جب اختلاف سے بڑھ کر تصادم شروع ہو جائے۔ کامیابی انہی قوموں اور جماعتوں کو ملتی ہے جن کے بڑے باہمی اختلافات کو دبا دیں، ذاتی، علاقائی اور خاندانی مفادات پر اصرار نہ کریں اور عظیم مقاصد کے لیے چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظرانداز کر دیں۔

⊛ کارخانۂ عالم کو سمجھنے کے اصول ہمیں قرآن مجید میں ملیں گے اور اس کی مثالیں ہمیں تاریخ میں دکھائی دیں گی، اسی کو تاریخ سے عبرت حاصل کرنا کہتے ہیں جس کی دعوت قرآن مجید نے جگہ جگہ دی ہے۔ تاریخ پڑھنا دراصل حقائق کا مشاہدہ کرنا ہے؛ کیوں کہ تاریخ انسانی تجربات کے ریکارڈ کا دوسرا نام ہے۔ اگر اسے صحیح ذرائع سے اخذ کیا جائے اور متوازن ذہن کے ساتھ سمجھا جائے تو بے شمار مفید اسباق حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن اگر اسے مشکوک ذرائع سے حاصل کیا جائے یا اسے جی خوش کرنے والی کہانیوں کے طور پر پڑھا جائے تو اس سے دوسروں کے بارے میں غلط فہمیوں یا اپنے متعلق خوش فہمیوں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں لگتا۔

تیسرا باب

خلافتِ عباسیہ بغداد
عہدِ زوال

۲۴۷ھ......۶۵۶ھ

۸۶۱ء......۱۲۵۸ء

بنوعباس کے دورِ زوال کا اجمالی جائزہ

متوکل بنوعباس کا آخری عظیم الشان خلیفہ تھا جس نے اس خاندان کے ایامِ عروج دیکھے۔ متوکل کے بعد خلافتِ بنوعباس بڑی تیزی سے زوال کا شکار ہوئی۔ متوکل اپنے بیٹے منتصر کی سازش کا شکار ہو کر ترک امراء کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ اس جسارت کے بعد ترکوں کے دلوں سے مسندِ خلافت کی ہیبت نکل گئی۔ منتصر ترک امراء کے کاندھوں پر بیٹھ کر مسندِ خلافت پر بیٹھا تھا۔ ترکوں نے اسے صرف چھ ماہ ایوانِ خلافت کے مزے لوٹنے دیے۔ پھر اسے قتل کر کے خلافت اپنے من پسند فرد کو سونپ دی، اس طرح خلفاء ترکوں کے محتاج بن گئے۔ ان کے اختیارات سلب ہوتے چلے گئے اور خلافت کا وہ ادارہ جو افریقہ سے سرحداتِ چین تک کے وسیع علاقے کو اپنی گرفت میں رکھتے ہوئے بازنطینی روما سے خراج وصول کرتا تھا، ایک صدی کے اندر اندر جغرافیائی لحاظ سے بھی سمٹ کر صرف عراق اور حجاز میں محدود رہ گیا۔

سفاح سے منصور تک (۱۳۲ھ تا ۱۵۸ھ) بنوعباس کا دورِ استحکام تھا۔ پھر مہدی سے متوکل تک (۱۵۸ھ تا ۲۴۷ھ) عباسی خاندان کا دورِ عروج تھا۔ متوکل کے بعد دورِ زوال شروع ہوا جو غیر معمولی طور پر بہت طویل تھا۔ ۲۴۷ھ سے ۶۵۶ھ تک ۴۰۹ برس کی طویل مدت خلفائے بنوعباس نے زوال کی حالت میں گزاری۔ اس تمام عرصے میں عراق یا حجاز سے باہر ان کا کوئی اختیار نہ تھا۔ البتہ ان کی حیثیت روحانی پیشواؤں کی سی تھی۔ وہ عالم اسلام کا نقطۂ وحدت شمار ہوتے تھے، اُمت کے عوام وخواص تسلیم کرتے تھے کہ بنوعباس کے ہوتے ہوئے کسی اور کا دعوائے خلافت درست نہیں اور ایسا کرنے والا خلافت کا باغی اور اسلامی ممالک کی اکائیوں سے خارج شمار ہوگا۔ عالم اسلام کا ہر حکمران جو عالمگیر اسلامی دھارے میں پہنچنا چاہتا، وہ خلیفہ سے اظہارِ وفاداری کرتا اور حکمرانی کے لیے خلیفہ سے رسمی طور پر اجازت نامہ لینا ضروری سمجھتا تھا۔

کیا کمزور خلافت کا نہ ہونا ہی بہتر تھا؟

بعض لوگوں کا اس وقت بھی یہ خیال تھا اور اب بھی ہے کہ ایسی کمزور خلافت کو ختم ہی کر دیا جاتا تو بہتر تھا۔ اس کی جگہ کوئی مضبوط خلافت وجود میں آتی تو مسلمانوں کی حفاظت اور رہنمائی کی ذمہ داریاں صحیح معنوں میں انجام دیتی۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ خلافت ایسی ہی ہونی چاہیے۔ مگر اس دور کے معروضی حالات کے تحت مسلمانوں نے بنوعباس کی کمزور اور برائے نام خلافت کو چار صدیوں تک سر پر بٹھائے رکھا اور کبھی کوئی اجتماعی قسم کی بغاوت کر کے اسے بے نام ونشان نہیں کیا تو اس تحمل وبرداشت کی وجہ مسلم معاشرے کے وہ دوصد سالہ تجربات تھے جو انہیں بتاتے

آ ئے تھے کہ ایک خاندان کی جگہ دوسرے خاندان کے آجانے سے دینِ اسلام کی کوئی ترقی ہوتی ہے نہ عامۃ المسلمین کو کوئی فائدہ ہوتا ہے۔ بنوامیہ کو ہٹا کر بنوعباس کے آنے سے ایسا کوئی مثالی انقلاب نہیں آیا کہ اب دوبارہ ایسے انقلاب سے کسی خیر کی توقع کی جاتی۔ سب جان گئے تھے کہ شکلیں اور خاندان تبدیل ہو جاتے ہیں باقی کچھ بھی نہیں بدلتا۔ انقلابات میں اگر نقصان ہوتا ہے تو عام مسلمانوں ہی کی جان و مال کا۔ پس مسلمانوں کے اجتماعی شعور اور رائے عامہ کا یہ فیصلہ بالکل درست تھا کہ خلافت کو جو پہلے ہی کمزور اور شکستہ ہے، کم از کم برائے نام ہی باقی رہنے دیا جائے۔ بار بار نت نئے خاندانوں کی تبدیلی کے تجربات کر کے اسے بازیچۂ اطفال نہ بنایا جائے۔ بنوعباس کی موجودگی میں کم از کم یہ خیر تو تھی کہ مسلمانوں کا خلیفہ ایک ہی تھا۔ اگر اس خاندان کو مسندِ خلافت سے ہٹایا جاتا تو کوئی بعید نہ تھا کہ الگ الگ ملکوں کے کئی حکمران خلافت کا منصب بزورِ شمشیر اپنی نسل میں منتقل کرنے کی کوشش کرتے؛ جس کے نتیجے میں ایک خلیفہ پر اتفاق کا امکان کم اور بہت سارے خلیفوں کا زمانہ شروع ہونے کے امکانات زیادہ تھے۔

۴۰۹ سالہ دورِ زوال کے ۲۷ خلفاء گمنام کیوں؟

متوکل کے بعد خلافتِ عباسیہ کا زوال شروع ہوا جو چار صدیوں تک جاری رہا۔ اس دوران ۲۷ خلفاء مسندِ خلافت پر بیٹھے۔ بعض نے چند ماہ حکومت کی اور بعض نے چند سال۔ بعض نے طویل زمانہ گزارا۔ اس دور کا سب سے طویل المیعاد خلیفہ ''ناصر لدین اللہ'' ہے جس نے ۴۷ سال ایوانِ خلافت کے مزے لوٹے۔ مگر مہلت کی زیادتی اہلِ خرد کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی اگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دورِ حکومت اڑھائی سال بھی نہ تھا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تین سال پورے نہ کر سکے مگر اس کے باوجود ان کے کارنامے آج تک ہر شخص کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ اس کے برخلاف بنوعباس کے ان ۲۷ خلفاء کے نام بھی بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ خود تاریخ پڑھنے پڑھانے والوں کو بھی ان کے نام کم ہی یاد رہتے ہیں؛ کیوں کہ دو چار کے سوا کسی نے بھی اُمت کی ڈوبتی کشتی کو پار لے جانے کی کوشش نہیں کی اور اُمت کی کوئی ایسی بڑی خدمت انجام نہیں دی جس کی بناء پر اسے یاد رکھا جاتا۔ اس کے برعکس انہی عباسی خلفاء کے دور میں گزرنے والے بعض دیگر بادشاہوں کے نام بہت مشہور ہیں۔ محمود غزنوی، ملک شاہ، صلاح الدین ایوبی، شہاب الدین غوری اور جلال الدین خوارزم شاہ اسی دورِ زوال میں امت کی حفاظت اور اسلام کی سربلندی کے لیے سربکف دکھائی دیتے ہیں؛ اس لیے آج بھی لوگ انہیں دعائیں دیتے ہیں۔

دورِ زوال کو اختصار سے پیش کرنے کی وجہ:

قارئین دیکھ چکے ہیں کہ سیرتِ نبویہ اور دورِ صحابہ و تابعین کی تاریخ میں ہم نے دورِ حاضر کے عام مؤرخین کی بہ نسبت زیادہ تفصیلات پیش کیں اور بعض ایسے مسائل پر بطورِ خاص بحث کی جنہیں مؤرخین نظر انداز کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ دور امت کے لیے بہت سے اعتقادی و عملی مسائل میں سند اور حجت کی حیثیت رکھتا ہے اور ایک اُمت کی حیثیت سے ہمارا سرمایۂ فخر اور ہماری اصل واساس وہی ہے۔ پھر چونکہ اس نازک دور کے بعض پہلو متنازعہ بھی بنا

دیے گئے ہیں؛ اس لیے ہم نے وہاں صحیح اور معتبر اسناد کی تحقیق کر کے مختلف فیہ واقعات کی اصل تصویر پیش کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔

اس کے بعد بنوامیہ کا دور بھی اس لحاظ سے بہت اہم تھا کہ اس میں بڑی بڑی فتوحات ہوئیں اور نئے ممالک اسلامی حدود میں داخل ہوئے۔ بنوعباس کا دورِ عروج بھی ہمارے لیے کئی پہلوؤں سے اسباقِ عبرت اور رموزِ سیاست لیے ہوئے ہے۔ اُمت کی کئی نہایت سرکردہ شخصیات اس دور میں گزری ہیں؛ اس لیے ہم اُمت کی ضرورت سمجھتے ہوئے وہاں خاصی تفصیل سے حالات پیش کرتے رہے۔

اس کے بعد بنوعباس کے دورِ زوال کے متعلق ہمارے سامنے دو راستے تھے: (1) تطویل کا۔ (2) اختصار کا۔

تطویل کا مطلب یہ ہے کہ ہم عام مؤرخین کی طرح بنوعباس کے دورِ زوال سے متعلقہ تاریخی ریکارڈ کو من وعن بیان کرتے چلے جائیں اور ان ۴۰۹ سالوں کو ڈیڑھ دو ہزار صفحات پر پھیلا دیں۔ مگر بار بار غور کر کے بھی ہمیں اس میں قارئین کا کوئی فائدہ سمجھ نہیں آیا؛ کیوں کہ اس خامہ فرسائی سے ہمارا مقصد اُمت کی تاریخ پیش کرنا ہے جیسا کہ اس کا نام بھی "تاریخِ امتِ مسلمہ" ہے؛ اس لیے ہم قارئین کے سامنے وہی چیزیں لانا چاہتے ہیں جن کا تعلق کسی لحاظ سے امتِ مسلمہ سے ہو اور جن سے آج امت کو اعتقادی، سیاسی اور اخلاقی لحاظ سے کوئی رہنمائی ملنے کا امکان ہو۔ ایسا مواد حکمرانوں کے حالات میں ملے یا دیگر مشاہیر کی زندگیوں میں، ہم اسے قارئین کے سامنے لانا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کے برخلاف جو چیزیں اس مقصد سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں چاہے وہ مؤرخین نے اپنے دور کی امانت سمجھ کر ریکارڈ مکمل کرنے کے لیے نقل کر دی ہوں مگر ہم بلاضرورت انہیں دُہرانا اضاعتِ وقت تصور کرتے ہیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خلافتِ عباسیہ کے زوال کی چار صدیاں کچھ خاص حالات و واقعات کو چھوڑ کر ہمارے لیے اپنے اندر کوئی کشش یا سبق نہیں رکھتیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک سو سالہ شخص کی زندگی کے ان پچیس تیس سال کے حالات جو آزمائشوں سے گزرنے، امتحانات میں کامیابیاں پانے اور ترقی کے راستے طے کرنے سے متعلق ہوتے ہیں، سننا اور سنانا اس قدر مفید ہوتا ہے کہ گھنٹوں سننے سے بھی دلچسپی ختم نہیں ہوتی۔ لیکن اسی شخص کے وہ چالیس پچاس سال کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے جو گھر کے کونے میں بیٹھنے یا ہسپتالوں کے چکر لگانے میں گزر جاتے ہیں۔ ان چالیس پچاس سالوں کے حالات چند صفحات میں سمیٹنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اسی طرح امتِ مسلمہ کی ابتدائی اڑھائی صدیوں کے حالات چونکہ بوجوہ بہت اہم تھے؛ اس لیے انہیں بیان کرنے کے لیے ہمیں ڈیڑھ دو ہزار صفحات درکار ہوئے جبکہ بنوعباس کے دورِ زوال کی چار صدیوں کی داستان ڈیڑھ دو سو صفحات میں سمیٹی جا سکتی ہے۔

یاد رہے کہ بنوعباس کا دورِ زوال امت کی گزشتہ تاریخ سے اس لیے بھی مختلف ہے کہ پہلے اندلس، مراکش اور تیونس کو چھوڑ کر باقی تمام عالمِ اسلام کی زمام بنوعباس کے ہاتھ میں تھی؛ اس لیے اکثر اسلامی دنیا کے سیاسی امور بنوعباس ہی کے گرد گردش کرتے تھے۔ مگر دورِ زوال بٹوارے کا دور ہے۔ اس میں الگ الگ خاندان علیحدہ علیحدہ مملکتوں میں راج

کرتے اور اپنے سیاسی معاملات سے اپنے اپنے طور پر نمٹتے دکھائی دیں گے۔ جس طرح ایک گھر جب کئی خاندانوں میں بٹتا ہے تو ان کی کہانیاں بھی الگ الگ ہو جاتی ہیں، اسی طرح ایک امت کی تاریخ بھی یہاں آ کر کئی حصوں میں تقسیم ہونے لگتی ہے۔ ان چار صدیوں میں بنو عباس کی معاصر حکومتیں مثلاً: ادارسہ، اغالبہ، بنو زیری، صفاری، بنو بویہ غزنوی، سلجوقی، غوری، ایوبی، خوارزم شاہی اور اپنی ایک مستقل تاریخ رکھتی ہیں۔ ہم ان کے احوال اپنے مقام پر علیحدہ بیان کریں گے۔ جبکہ یہاں بنو عباس کے حالات کے ذیل میں ان حکومتوں اور سلاطین کے حالات کہیں کہیں حسب ضرورت بیان کر دیے جائیں گے۔

بنو عباس۔ عہدِ زوال کے تین ادوار

بنو عباس کے زوال کی داستان کو ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

❶ ابتدائی دور (۸۷ سال): منتصر کی تخت نشینی سے بغداد پر بنو بُویہ کے قبضے تک (۲۴۷ھ تا ۳۳۴ھ)

❷ وسطی دور (۱۱۶ سال): بنو بُویہ کے تسلط سے القائم کی معزولی تک (۳۳۴ھ تا ۴۵۰ھ)

❸ اختتامی دور (۲۰۶ سال): وقارِ خلافت کی بحالی سے آخری خلیفہ مستعصم کے قتل تک (۴۵۰ھ تا ۶۵۶ھ)

❶ ابتدائی دور

ابتدائی دور میں خلافت زوال پذیر ہونا شروع ہوئی۔ اس مدت کے تین مرحلے تھے:

پہلا مرحلہ: زوال کا آغاز، ترکوں کا خالص تسلط...... منتصر کے قتل سے معتمد کی معزولی تک۔ (۲۴۷ھ تا ۲۷۹ھ)

دوسرا مرحلہ: عارضی افاقہ...... مُعتَضِد کی خلافت سے مکتفی کے انتقال تک (۲۷۹ھ تا ۲۹۵ھ)

تیسرا مرحلہ: دوبارہ سیاسی بحران...... مقتدر کی خلافت سے بنو بُویہ کے بغداد پر تسلط تک (۲۸۹ھ تا ۳۳۴ھ)

پہلا مرحلہ: اس میں ۳۲ برس تک ترکوں کا خالص تسلط رہا۔ اس دوران خلافت زوال پذیر رہی۔ خلفاء کا پایۂ تخت سامرا تھا جہاں ترکوں نے انہیں گھیر رکھا تھا۔ نظامِ مملکت ابتر تھا۔ علوی مسلسل خروج کر رہے تھے۔ ایوانِ اقتدار میں ترک ہی غالب تھے۔ وہ ایک خلیفہ کو اتارتے اور دوسرے کو بٹھاتے۔ ضرورت سمجھتے تو قتل بھی کر ڈالتے۔ اس دوران صرف مہتدی باللہ میں حکمرانی کی آن بان تھی مگر ترکوں کے آگے وہ بھی بے بس رہا اور انہی کے ہاتھوں قتل ہوا۔

اس دور کا سب سے بڑا فتنہ "علی بن محمد" (صاحب الزنج) کا خروج تھا۔ اس بدبخت نے علوی ہونے کا دعویٰ کر کے ہزاروں لوگوں کو ساتھ ملا لیا اور چودہ سال تک بصرہ سمیت عراق کے اکثر حصے پر قابض رہا۔ لاکھوں مسلمان اس کے ہاتھوں مارے گئے۔ آخر کار ۲۶۷ھ میں اس کے بھائی مُوَفّق اور اس کے بیٹے ابوالعباس نے جو بعد میں مُعتَضِد باللہ کے لقب سے خلیفہ بنا، فوج کشی کر کے تین سال کی مسلسل لڑائیوں کے بعد اس کی سرکوبی کی۔

اس دور میں خلافتِ عباسیہ کا سیاسی جغرافیہ بھی بدل گیا۔ بعض صوبے مرکز سے الگ ہو کر خود مختار ہو گئے۔ مراکش میں آزاد دولتِ ادارسہ، تیونس میں باج گزار دولتِ اغالبہ اور خراسان میں وفادار دولتِ طاہریہ تو پہلے ہی قائم ہو چکی تھیں۔ ان ۳۲ سالوں میں شام اور مصر بھی ہاتھ سے نکل گئے اور وہاں دولتِ طولونیہ قائم ہو گئی۔ وسطِ ایشیا میں دولتِ سامانیہ اور خراسان میں دولتِ صَفّاریہ نے جنم لے کر دولتِ طاہریہ کا خاتمہ کر دیا۔ فارس اور عراق کا خاصا حصہ بھی ایک طویل مدت تک زنجی شورش پسندوں کے پاس رہا۔

دوسرا مرحلہ: تقریباً سترہ سال کا تھا۔ اس میں مُعتَضِد باللہ کی جرأت و بصیرت سے خلفاء کے اختیارات خاصی حد تک بحال ہو گئے۔ سامرا کی جگہ بغداد پھر مرکزِ خلافت بن گیا اور امورِ مملکت سدھرنے لگے۔ تاہم یہ مرحلہ مختصر رہا۔

تیسرا مرحلہ: تقریباً ۳۸ برس کا تھا۔ جو نہایت اضطراب و انتشار کا تھا۔ اس میں سیاسی ابتری بڑھتی چلی گئی۔ ان ۳۸ سالوں میں ہر طرف باطل فرقوں کا غلبہ تھا جو کسی نہ کسی لحاظ سے رافضیت کے مختلف روپ تھے۔ افریقہ اور مصر پر بنوعبید، حجاز پر قرامطہ اور بغداد سمیت پورے ایران و عراق پر آلِ بُویہ قابض ہو گئے۔

❷ وسطی دور۔ بنوبُویہ کا تسلط: ۳۳۴ھ تا ۴۵۰ھ

وسطی دور جو تقریباً ۱۱۶ سال کو محیط ہے، خلفاء کی انتہائی زبوں حالی اور منصب خلافت کی صد درجے پامالی کا تھا۔ اس پوری مدت میں خلفائے بنوعباس بُویہی امراء کے ہاتھوں میں کھلونا بنے رہے۔ اس مدت کے دو مرحلے تھے:

پہلا مرحلہ: ۷۴ برس: بنوبُویہ کے تسلط سے القادر کی خلافت کے اٹھائیسویں سال تک: ۳۳۴ھ تا ۴۰۸ھ

اس میں دَیلَم کے اثنا عشری امراء بنوبُویہ نے خلفاء کو یرغمال بنالیا۔ ان کے اختیارات سلب کر لیے۔

دوسرا مرحلہ: ۴۲ برس: القادر کے اٹھائیسویں سال سے القائم کی دوبارہ تخت نشینی تک: ۴۰۸ھ تا ۴۵۰ھ

اس میں خلیفہ نے اپنے اختیارات کسی حد تک بحال کرا لیے اور اس کی حیثیت پہلے سے بہتر ہو گئی۔

❸ اختتامی دور۔ وقارِ خلافت کی بحالی سے سقوطِ بغداد تک: ۴۵۰ھ تا ۶۵۶ھ

تیسرا دور ۲۰۶ برس طویل ہے جو طُغرل سلجوقی کے ہاتھوں بنوبُویہ کی بیخ کنی اور القائم باللہ کی دوبارہ تخت نشینی سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کو ہم دو مرحلوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

پہلا مرحلہ: خلافتِ عباسیہ سلجوقی سلاطین کے سائے میں: ۴۵۰ھ تا ۵۴۷ھ (۹۷ برس)

سلجوقیوں نے آ کر منصبِ خلافت کے وقار کو بحال کیا۔ وہ تقریباً ساٹھ برس تک خلفاء کے محافظ رہے پھر انہوں نے خلفاء کو دبانا شروع کر دیا مگر اس بار خلفاء نے جھکنا قبول نہیں کیا جس سے سلاطین اور خلافتِ بغداد میں کش مکش شروع ہو گئی جو تقریباً ۳۷ برس تک جاری رہی۔ آخر سلطان مسعود کی موت اور سلطان سنجر کی ترکانِ غز کے ہاتھوں گرفتاری کے ساتھ سلجوقیوں کا دم خم ختم ہو گیا۔ [1]

[1] سلجوقیوں کے حالات کی تفصیل خلیفہ القائم باللہ عباسی کے حالات کے ضمن میں آ رہی ہے۔

دوسرا مرحلہ: خلافت کی آزادانہ حیثیت کی بحالی۔ ۵۴۷ھ تا ۶۵۶ھ (۱۰۹ برس)

سلجوقیوں کے زوال کے بعد خلافتِ عباسیہ کی آزادانہ حیثیت بحال ہوگئی۔ اگرچہ اب خلافت پہلے کی طرح وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی نہیں تھی مگر اس کی دولت وثروت اور شان وشوکت ایک حد تک لوٹ آئی تھی۔ اس دور میں عراق اور شام میں اتابک امراء کا اقتدار قائم تھا۔ کچھ مدت بعد مصر میں ایوبی سلطنت کی بنیاد رکھی گئی جو چند سالوں بعد شام کو بھی محیط ہوگئی۔ اتابک اور ایوبی امراء نے خلفاء کا احترام قائم رکھا اور ان پر مسلط ہونے کی کوشش نہ کی۔ ①

چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں خراسان اور وسطِ ایشیا کی خوارزم شاہی سلطنت نہایت طاقتور ہوگئی اور اس نے سلاجقہ کی طرح بغداد پر تسلط حاصل کرنے کی کوشش بھی کی جس کے باعث دونوں مملکتوں کے تعلقات بہت کشیدہ ہوگئے۔ اسی دور میں چین سے تاتاری حکمران چنگیز خان کا ظہور ہوا اور خلفائے بغداد نے خوارزم کے مقابلے میں تاتاریوں سے گٹھ جوڑ کر لیا۔ ہمسایہ حکومتوں سے دشمنی، غلط سیاسی فیصلوں، جہاد سے گریز اور غداروں کی سازشوں کی وجہ سے خلافت غیر محسوس طور پر تباہی کی جانب بڑھتی رہی یہاں تک کہ تاتاری حملہ آوروں نے اسے مٹا ڈالا۔ ②

اس اجمالی جائزے کے بعد اب اگلے اوراق سے ہم بنوعباس کے دورِ زوال کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔

◆◆◆

① اتابکی اور ایوبی حکمرانوں کے حالات کی تفصیلات ان شاء اللہ حصہ چہارم میں پیش کی جائیں گی۔
② خوارزم شاہی حکام، فتنۂ تاتار اور سقوطِ بغداد کی تفصیل ان شاء اللہ حصہ چہارم میں آئے گی۔

زوال خلافتِ بغداد

ابتدائی دور

پہلا مرحلہ

زوال کا آغاز۔ ترکوں کا خالص تسلط

منتصر کے قتل سے معتمد کی معزولی تک

(۲۴۷ھ تا ۲۷۹ھ)

تقریباً ۳۲ سال

اَلْمُنْتَصِر بِاللّٰہ

محمد بن جعفر المتوکل

شوال ۲۴۷ھ تا ربیع الآخر ۲۴۸ھ

دسمبر ۸۶۱ء تا مئی ۸۶۲ء

منتصر نے اپنے باپ کو ترکوں کے ہاتھوں قتل کرا کے خلافت چھینی تھی۔ اس جسارت نے ترکوں کو بڑا بے باک بنا دیا۔ بُغا کبیر اور وصیف ترکی اس دور کے سب سے بارسوخ ترک افسران تھے اور متوکل کے قتل میں پیش پیش تھے۔ ان ترک سرداروں کو بہت جلد خیال آ گیا کہ منتصر ہوشیار اور رعب داب والا انسان ہے؛ اس لیے ہمیں نکیل ڈال سکتا ہے۔ منتصر واقعی اس فکر میں تھا کہ کسی طرح ترکوں کا زور گھٹا دے۔ وہ کہتا تھا: ''ترک خلفاء کے قاتل ہیں۔''

ایک دن وہ خزانے کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایک پرانا قالین برآمد ہوا جس پر ایک تاج پوش گھڑسوار کی تصویر بنی گئی تھی۔ نیچے فارسی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اس نے مترجم کو بلا کر عبارت پڑھوائی تو لکھا تھا:

''میں کسریٰ شیرویہ بن کسریٰ پرویز ہوں۔ میں نے اپنے باپ کو قتل کیا مگر چھ ماہ سے زیادہ نہ جی سکا۔''

منتصر کانپ گیا اور اسے اپنا انجام بھی کچھ ایسا ہی لگنے لگا۔ کچھ دنوں بعد بیمار ہوا تو طبیب نے فاسد خون نکالنے کے لیے پچھنے لگوانے کا مشورہ دیا۔ ادھر ترک امراء نے طبیب کو بھاری رشوت دے کر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ اس کام کے لیے زہر آلود نشتر استعمال کرے۔ اس سازش کے نتیجے میں منتصر کے جسم میں زہر پھیل گیا اور تختِ خلافت پر بیٹھنے کے صرف چھ ماہ بعد ۵ ربیع الآخر ۲۴۸ھ کو وہ چل بسا۔ آخری وقت میں وہ اپنی والدہ سے کہہ رہا تھا:

''ماں! میری دنیا بھی برباد ہوئی اور آخرت بھی۔ میں نے اپنے باپ کو مارنے میں جلدی کی تو میرا وقت بھی جلدی آ گیا۔''[1]

❖ ❖ ❖

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۶۰ ط نزار؛ تاریخ ابن خلدون: ۳/۳۵۰

اَلْمُسْتَعِیْن بِاللّٰہ

احمد بن محمد المعتصم

ربیع الآخر ۲۴۸ھ تا محرم ۲۵۲ھ

مئی ۸۶۲ء تا فروری ۸۶۶ء

منتصر کو مارنے کے بعد ترک امراء نے باہم مشورہ کیا کہ اب کسی ایسے آدمی کو تخت پر بٹھانا چاہیے جو ہمارے ڈھب کا ہو۔ انہیں خدشہ تھا کہ خلیفہ متوکل کی اولاد میں سے کوئی بھی اوپر آیا تو وہ اپنے باپ کے قاتلوں سے بدلہ لے کر رہے گا؛ اس لیے آخر انہوں نے اپنے ولی نعمت خلیفہ معتصم کے بیٹے احمد کو خلیفہ چن لیا۔ جو مستعین باللہ کے لقب سے مسندِ خلافت پر بیٹھا۔ وہ ایک نیک مگر کمزور شخص تھا۔ اس کے دور میں رومیوں نے ایک بار پھر اسلامی سرحدوں پر حملے شروع کر دیے۔ ۱۵ رجب ۲۴۹ھ کو لڑی جانے والی جنگ میں ان کی بڑی تعداد میدانِ جنگ میں کام آئی اور دو بہترین امرائے لشکر: عمر بن عبداللہ اور علی بن یحییٰ شہید ہو گئے۔ یہ بہت بڑی شکست تھی جس کے غم میں بغداد میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ سب ترک امراء کو الزام دینے لگے کہ وہ خلفاء کو قتل کرنے میں بڑے جری ہیں مگر کفار کے مقابلے میں دب رہے ہیں۔ پرجوش عوام نے جہاد کی آواز لگا دی اور جیل توڑ کر سب قیدیوں کو رہا کرا لیا۔ اسی قسم کی عوامی بغاوت سامرا میں بھی ہوئی اور وہاں بھی جیل سے قیدیوں کو نکال لیا گیا مگر ترک افسران نے جلد ہی مار دھاڑ کر کے اس شورش پر قابو پا لیا۔[1]

علویوں کا خروج:

خلافت بنو امیہ اور بنو عباس کے دورِ عروج میں حسن بصری، امام شعبی، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور عبداللہ بن مبارک رحمہم اللہ جیسی ہستیوں کی مسلسل علمی و فکری محنت کے باعث اسلام کی اصل تعلیمات کو فروغ ملتا رہا؛ اس لیے جعلی اسلام کے پنپنے کی کوششیں ناکام ہوتی رہیں۔ مامون پہلا خلیفہ تھا جو کچھ شیعہ اور کچھ معتزلی تھا۔ معتصم اور واثق پکے معتزلی تھے مگر علمائے حق کی کاوشوں نے بہت جلد حکمران خانوادے کو اس جال سے آزاد کرا لیا اور متوکل نے سرکاری طور پر بدعات کی سرکوبی کر کے دربارِ خلافت میں گمراہ فرقوں کی پیش قدمی کو روک دیا۔

مگر تیسری صدی ہجری کے وسط میں متوکل کے قتل کے بعد مرکزِ خلافت کمزور ہوا تو حالات تبدیل ہو گئے۔ اب کچھ نکمی قسم کے لوگ خلیفہ تھے اور نظامِ حکومت ابتر؛ لہٰذا ہر فرقے کے داعیوں کو آزادانہ کام کے مواقع میسر آ گئے۔ اب وہ

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۶۱ ط نزار؛ البدایة والنهایة: ۱۴/ ۴۶۸ تا ۴۷۲

صفِ اوّل کے سادات بھی نہ تھے جن پر سب کو اعتماد تھا اور جن کا رفض سے اظہارِ برأت تحریکاتِ رفض کو کمزور کر دیتا تھا۔

ایسے میں اسلام سے بغض وعناد رکھنے والی ہر قوم نے اسلام سے بدلہ لینے کے لیے تشیع کو آڑ بنا لیا۔ ابن سبا کے افکارِ باطلہ کو اب نئی شدت کے ساتھ عام کیا جانے لگا۔ انتہا پسند شیعوں نے مستقل بنیادوں پر اپنے مذہب کی بنیاد رکھی جس کے اصولِ موضوعہ وہی تھے جو عبداللہ بن سبا نے پیش کیے تھے۔ اس نئے اسلام کو لانے کے لیے علمی طاقت کی ضرورت بھی تھی اور سیاسی قوت کی بھی۔ مگر سیاسی قوت کی ضرورت پہلے تھی؛ اس لیے بنوعباس کا زوال شروع ہوتے ہی روافض نے علویوں کا نام استعمال کر کے جگہ جگہ سیاسی وعسکری قوت حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ چند عشروں بعد قرامطہ، بنوعبید، اثناعشری بُویہی اور باطنی حکومتیں اسی جذبے کے تحت وجود میں آئی تھیں۔

علویوں کا جگہ جگہ خروج عین اس وقت شروع ہوا جب خلافت کمزور ہو چکی تھی اور رومیوں کے حملوں سے دفاع میں ناکامی نے عوام کو حکام سے بداعتماد کر دیا تھا۔ ایسے میں علویوں کے خروج سے پوری مملکت میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ سب سے پہلے ۲۵۰ھ میں ایک حسینی امیر ابوالحسین (یحیٰی بن عمر بن یحیٰی بن حسین بن زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ) نے کوفہ میں خروج کا اعلان کیا۔ بغداد کے بہت سے لوگ بھی اس خروج میں شامل ہو گئے تاہم شروع میں کچھ کامیابیوں کے بعد آخر کار ۱۵ رجب ۲۵۰ھ کو باغی سرکاری فوج سے مقابلے میں شکست فاش سے دوچار ہوئے اور ابوالحسین کو قتل کر دیا گیا۔

۲۵۱ھ میں تین علوی کھڑے ہوئے: کوفہ میں حسین بن محمد (بن حمزہ بن عبداللہ بن حسین بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ) نے خروج کیا اور سرکاری فوج سے شکست کھائی۔

مکہ میں اسماعیل بن یوسف (بن ابراہیم بن موسیٰ، بن عبداللہ بن حسن، بن حسن رضی اللہ عنہ) نے علمِ بغاوت بلند کیا اور شہرِ مقدس میں لوگوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ کعبہ کا غلاف اتار لیا، حرم سے سونے چاندی کی ہر چیز حتیٰ کہ عطر اور خوشبو تک لوٹ لی۔ شہر میں لوگوں سے جبراً دولاکھ درہم وصول کیے۔ پھر مدینہ پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد دوبارہ مکہ کا رخ کیا اور اتنا سخت محاصرہ کیا کہ لوگ بھوک اور پیاس سے مرنے لگے۔ پانی کا ایک گھونٹ تین تین درہم کا فروخت ہونے لگا۔ پھر جدہ کی بندرگاہ پہنچ کر تاجروں کا سازوسامان لوٹا اور کشتیوں پر قبضہ کر کے اہلِ مکہ کی خوراک ورسد بند کر دی۔ اس کے بعد حج کے موقع پر دوبارہ مکہ آیا اور حاجیوں کو تہ تیغ کرنے لگا، گیارہ سو حاجیوں کو قتل کر کے اس نے میدانِ عرفات خالی کرا لیا۔ یومِ عرفہ میں وہاں اس کے جتھے کے سوا کسی کو پھٹکنے کی اجازت نہیں تھی۔ سرکاری افواج آئیں تو اسے فرار ہونا پڑا۔

اسی سال قزوین میں حسین بن احمد کوکبی (بن اسماعیل بن محمد، بن اسماعیل الارقط بن محمد، بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ) نے حکومت سے اعلانِ جنگ کیا اور دو سال تک اس علاقے پر قابض رہا۔ آخر ۲۹ ذوالقعدہ ۲۵۳ھ کو عباسی امیر موسیٰ بن بُغا کبیر بڑی خونریز جنگ کے بعد اسے شکست دینے میں کامیاب ہوا۔ یہ تینوں علوی گرفتار نہیں ہو سکے۔ کوکبی دیلم کے کوہستان میں روپوش ہو گیا۔[1]

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲٦۱ ط نزار ؛ البدایة والنهایة: ۱٤/٤٦۸ تا ٤۷۲

مستعین کا قتل:

اس دوران خلیفہ مستعین ترک امراء سے بددل ہو کر محرم ۲۵۱ھ میں سامرا سے بغداد منتقل ہوگیا۔ ترک امراء نے اسے واپس بلانے کی بڑی کوشش کی مگر وہ نہ مانا۔ آخر ترکوں نے متوکل کے بیٹے معتز باللہ کو خلافت کے لیے کھڑا کر کے مستعین سے جنگ شروع کر دی۔ مستعین کے وفادار بغدادی امراء اور ترکوں کی فوجیں ایک مدت تک لڑتی رہیں۔ بدامنی کے باعث اشیاء خورد ونوش نایاب ہونے لگیں اور بغداد کی آبادی کا برا حال ہوگیا۔

آخر کار مستعین نے مجبور ہو کر ۴ محرم ۲۵۲ھ کو استعفیٰ دے دیا اور جان کی امان کے وعدے پر معتز باللہ سے بیعت کر لی مگر معتز نے اس معاہدے کا کوئی پاس نہ کیا اور اسے نو ماہ تک قید رکھنے کے بعد ۳ شوال ۲۵۲ھ کو قتل کرا دیا۔[1]

◆◆◆

---

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۶۱؛ البدایة والنهایة: ۱۴/۴۷۸ تا ۴۹۰

اَلْمُعْتَزّ بِاللّٰہ

محمد بن جعفر المتوکل

محرم ۲۵۲ھ تا رجب ۲۵۵ھ

فروری ۸۶۶ء تا جولائی ۸۶۹ء

معتز ۱۹ برس کی عمر میں مسندِ خلافت پر بیٹھا مگر وہ بھی ترکوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا۔ وصیف ترکی دربار کا رئیسِ اعظم تھا جس کے سامنے خلیفہ بالکل بے بس تھا۔ اس کے بعد دوسرا ترک امیر بُغا صغیر امورِ حکومت پر مسلط تھا۔ وصیف ترکی ایک دن خود اپنے سر پھرے سپاہیوں کے ہاتھوں مارا گیا جبکہ بُغا صغیر کو خلیفہ نے موقع پا کر قتل کرا دیا۔ اس کے باوجود ترکوں کا زور کم نہ ہوا۔ وہ خلیفہ سے منہ مانگی رقمیں مانگتے تھے اور وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ آخر خزانہ خالی ہو گیا مگر ترکوں کے مطالبے جاری رہے۔ معتز نے تنگ آ کر اپنی ماں سے مطلوبہ رقم مانگی۔ اس جہاں دیدہ عورت نے انکار کر دیا۔ ترک مطالبہ پورا نہ ہونے پر آپے سے باہر ہو گئے۔ محل میں گھس کر معتز کو پکڑ لیا اور بڑی بے دردی سے گھسیٹ کر باہر لائے۔ سخت گرمی کے موسم میں اسے صبح سے شام تک تیز دھوپ میں کھڑا رکھا اور طمانچے مار مار کر استعفے کا مطالبہ کیا گیا۔ جب اس نے معزول ہونے کا اقرار کیا تب اسے محل میں جانے دیا گیا۔ یہ ۲۷ رجب ۲۵۵ھ کا واقعہ ہے۔

مگر بات یہیں ختم نہ ہوئی۔ معزولی کے بعد ۲ شعبان کو معتز غسل کرنے گرم حمام میں داخل ہوا۔ باہر نکلا تو پیاس سے حالت غیر تھی۔ ترکوں نے اسے پکڑ کر اتنی دیر تک پیاسا رکھا کہ وہ تڑپنے لگا۔ پھر یکدم اسے برف ملا پانی پلا دیا جس سے اس کی حالت بگڑتی چلی گئی یہاں تک کہ روح پرواز کر گئی۔ یہ ایسا حربہ تھا کہ قتل کا کوئی طبی ثبوت سامنے نہ آ سکا۔ [1]

مصر میں دولتِ طولونیہ کا قیام:

المعتز کے دور کا ایک اہم واقعہ مصر میں "دولتِ طولونیہ" کا قیام تھا جس کا بانی احمد بن طولون تھا۔ اس کا باپ طولون ایک ترک غلام تھا جسے بخارا کے حاکم نے مامون عباسی کو بطورِ ہدیہ بھیجا تھا۔ معتصم کے دور میں طولون سامرا میں مقیم ہو گیا جہاں ۲۲۰ھ میں اس کا بیٹا احمد پیدا ہوا۔ احمد نے بہترین اساتذہ سے تعلیم و تربیت لی، قرآن مجید حفظ کیا اور علمِ حدیث حاصل کیا۔ وہ خوبصورت آواز میں قرآن کی تلاوت کرتا تھا۔ اسے علماء و صالحین کی مجالس بہت پسند تھیں۔ [2]

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۲٦۲ ط نزار؛ تاریخ ابن خلدون: ۳/۳٦۵، ۳٦٦ ..... معتز کی مدتِ حکومت دو سال دس ماہ بنتی ہے۔
② وفیات الاعیان: ۱/۱۷۳، ۱۷٤

خلیفہ معتز کے دور میں احمد بن طولون کو مصر کا ولی بنایا گیا تھا۔ مگر خلافتِ عباسیہ کا حال ابتر دیکھ کر اس نے ۲۵۴ھ میں مصر میں خود مختار حکومت قائم کر لی۔[1] ۲۶۵ھ میں اس نے شام پر بھی قبضہ کر لیا۔[2]

احمد بن طولون نے ایسے وقت میں شام اور مصر کو سنبھال کر رومیوں کے تسلط سے بچایا جب خلافتِ عباسیہ سرحدوں کی حفاظت سے عاجز آ چکی تھی۔ خراسان کی ''دولتِ طاہریہ'' اور تیونس کی ''دولتِ اغالبہ'' کی طرح یہ حکومت بھی عباسیوں کی وفادار تھی جہاں خطبے میں عباسی خلیفہ کا نام لیا جاتا تھا اور خلیفہ کو سالانہ خراج بھیجا جاتا تھا۔[3]

ابن طولون نے ۲۷۰ھ میں وفات پائی۔ قاہرہ کی جامع مسجد طولونیہ اور فلسطین میں یافا کا قلعہ اس کی یادگار ہیں۔[4]

ابن طولون کی سیرت کے متعلق علامہ ابن خلکان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وہ عادل، سخی، دلیر، ملنسار، نیک سیرت اور سچی فراست رکھنے والا انسان تھا۔ امورِ حکومت بذاتِ خود انجام دیتا تھا۔ رعایا کے حالات کی خبر رکھتا اور شہر آباد کرتا تھا۔ اہلِ علم سے محبت کرتا تھا۔ اس کا دسترخوان ہر خاص وعام کے لیے کشادہ تھا۔ روزانہ ایک ہزار دینار خیرات کیا کرتا تھا۔ ایک بار اس کے وکیل نے آ کر کہا: میرے پاس چادر اوڑھے ایک ایسی عورت آتی ہے جس نے انگوٹھی پہنی ہوتی ہے۔ کیا اسے بھی دینار دے دیا کروں؟ ابن طولون نے کہا: ''جو بھی ہاتھ پھیلائے اسے دے دیا کرو۔''[5]

ابن طولون کے خاندان کی خود مختار حکومت ۲۹۲ھ تک قائم رہی۔[6]

دولتِ صَفّاریہ کا قیام:

معتز کے دور میں خراسان میں دولتِ صَفّاریہ قائم ہوئی جس کا بانی یعقوب بن لیث صَفّاری تھا۔ وہ ایک پرہیزگار مسلمان تھا اور سجستان میں ان رضا کاروں کے ایک گروہ کا رکن تھا جو برائیوں کے خلاف سرگرم رہتے تھے۔ اس گروہ کے قائد صالح مطوعی کی وفات کے کچھ عرصے بعد قیادت یعقوب بن لیث کو مل گئی جس نے ۲۵۳ھ میں سجستان پر قبضہ کر کے ایک آزاد حکومت کی بنیاد رکھ دی۔ ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' اس حکومت کا شعار تھا۔[7]

◆◆◆

---

[1] وفیات الاعیان: ۱۷۳/۱؛ تاریخ ابن خلدون: ۳۸۵/٤؛ الکامل فی التاریخ: سنة ۲۵٤ھ
[2] الکامل فی التاریخ: سنة ۲٦٤ھ
[3] تاریخ ابن خلدون: ۳۸٦/٤، ۳۸۷
[4] التاریخ الاسلامی محمود شاکر: ۸۱/٦
[5] الکامل فی التاریخ: سنة ۲۷۰ھ؛ وفیات الاعیان: ۱۷۳/۱
[6] التاریخ الاسلامی محمود شاکر: ۹۷/٦
[7] الکامل فی التاریخ: سنة ۲۵۳ھ

اَلْمُهْتَدِي بِاللّٰه

محمد بن هارون الواثق

رجب ۲۵۵ھ تا رجب ۲۵۶ھ

جولائی ۸۶۹ء تا جولائی ۸۷۰ء

ترکوں نے معتز کی موت سے پہلے خلیفہ واثق کے بیٹے محمد کو بغداد سے سامرا بلوا کر امورِ خلافت اسے تفویض کر دیے تھے۔ ۲۷ رجب ۲۵۵ھ کو وہ مہتدی باللہ کے لقب سے مسند نشین ہوا۔ (1) اس کی تخت نشینی کے وقت ترک سردار صالح بن وصیف امورِ حکومت پر غالب آ چکا تھا۔ مگر خود ترکوں کے گروہوں میں بھی کشیدگی چل رہی تھی؛ اس لیے بغداد کے ایک ترک سردار موسیٰ بن بغا نے سامرا پر چڑھائی کر کے صالح بن وصیف کو بے بس کر دیا اور بعد میں قتل کرا دیا۔ (2)

مہتدی صحیح العقیدہ، پابندِ سنت، عابد و زاہد اور متقی انسان تھا۔ عمر بن عبدالعزیز اس کی پسندیدہ شخصیت تھے اور وہ ان کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتا تھا۔ اس نے گزشتہ خلفاء جیسی شان و شوکت ترک کر دی تھی۔ ہمیشہ نفلی روزے رکھتا اور نہایت سادہ زندگی گزارتا تھا۔ (3) کھلی کچہری لگاتا تھا اور عوام کے مسائل سنتا تھا۔ (4)

اس کے خلیفہ بننے کے چند بعد کا یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ ایک امیر اس سے ملنے گیا۔ ماہِ رمضان شروع ہو چکا تھا۔ اس دور میں افطار سادہ پانی اور کھجور سے ہوتا تھا۔ کھانے پینے کے تمام لوازمات نمازِ مغرب کے بعد پیش کیے جاتے تھے۔ مہتدی نے مغرب کی نماز پڑھائی اور اس امیر کو روک لیا کہ کھا پی کر جانا۔ کھانے کے لیے بیٹھے تو دسترخوان پر صرف ایک روٹی، تھوڑا سا سرکہ، زیتون کا تیل اور نمک دیکھ کر امیر کو حیرت ہوئی۔ وہ اچھے پکوانوں کے انتظار میں آہستہ آہستہ کھانے لگا تو مہتدی نے کہا: ''اچھی طرح کھاؤ۔ کھانے کے لیے اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔''

امیر نے حیران ہو کر اس کفایت شعاری کی وجہ پوچھی تو کہا:

''سوچتا ہوں بنوامیہ میں ایک عمر بن عبدالعزیز تھے جن کی قناعت اور سادگی تمہیں بھی معلوم ہے۔ مجھے غیرت آئی کہ بنوامیہ میں ایسا شخص ہو اور بنوہاشم میں اس کی کوئی مثال نہ ہو۔'' (5)

(1) سیر اعلام النبلاء: ۱۲/۵۳۵، ۵۳۶ (2) سیر اعلام النبلاء: ۱۲/۵۳۷، ۵۳۸

(3) البدایة والنهایة: ۱۴/۵۲۳

(4) المنتظم: ۱۲/۱۴۱۲/ ۸۴

(5) سیر اعلام النبلاء: ۱۲/۵۳۶

مہتدی "اسم با مُسَمّیٰ" [1] تھا۔ اس نے دارالحکومت "سامرا" کو رقص و سرود سے پاک کرا دیا۔ قصرِ خلافت میں شکار کے لیے پالے گئے درندوں کو مار ڈالنے اور کتوں کو شہر سے نکالنے کا حکم دیا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ دوبارہ خلافتِ راشدہ کی یادیں تازہ ہوں۔ [2]

وہ آہستہ آہستہ اپنے حامیوں کو منظم بھی کر رہا تھا۔ مگر ابھی اس کی قوت زیادہ نہیں ہوئی تھی کہ ترک چوکنا ہو گئے۔ انہوں نے اسے کسی اصلاحی منصوبے کو عمل میں لانے کا موقع نہیں دیا اور اسے معزول کرنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ مہتدی کو ان کے عزائم کا پتا چلا تو تلوار باندھ کر دربار میں آیا اور ایک بے باکانہ تقریر کی۔ اس نے کہا:

"تم مجھے گزشتہ خلفاء کی طرح مت سمجھو۔ مجھے تمہارے مشوروں کا علم ہو چکا ہے۔ میں وصیت لکھوا کر آیا ہوں اور مرنے مارنے کے لیے تیار ہوں۔ جب تک میرے ہاتھ میں تلوار ہے، میں تم میں سے بہت سوں کی جان لے کر رہوں گا۔ مجھ سے دشمنی تمہیں مہنگی پڑے گی۔ کیا تمہارے اندر دین داری، شرم و حیا اور شرافت کی کوئی رمق باقی ہے! ایک مدت سے تم خلفاء کے دشمن ہو! اللہ سے بے خوف ہو! کوئی خلیفہ تمہارا بھلا چاہے، یا تمہیں ختم کرنا چاہے یا تمہارے دیے ہوئے صدموں کو بھلانے کے لیے ناؤنوش میں ڈوب جائے، تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جا کر میرے اور میرے بھائیوں کے گھروں میں دیکھ لو۔ گزشتہ خلفاء جیسا کوئی ساز و سامان نہیں۔ بس وہی ہے جو عام لوگوں کے گھروں میں ہوتا ہے۔" [3]

مہتدی کا قتل:

وقتی طور پر کچھ ترک امراء شرمسار ہوئے، کچھ دب گئے مگر اکثر جوابی کارروائی کا موقع ڈھونڈتے رہے۔ آخر کار انہوں نے خلیفہ کو قتل کرنے کے لیے قصرِ خلافت پر ہلہ بول دیا۔ مہتدی اپنے وفاداروں کو لے کر بڑی بہادری سے لڑا۔ اس خونریزی میں چار ہزار ترک مارے گئے، تاہم آخر میں ان کا پلہ بھاری ہو گیا۔ مہتدی کو گرفتار کر کے سخت زدوکوب کے بعد قتل کر دیا گیا۔ یہ ۱۶ رجب ۲۵۶ھ کا واقعہ ہے۔ اس نیک حکمران کی خلافت فقط ساڑھے گیارہ ماہ تک رہی۔ [4]

❖❖❖

---

[1] یعنی جیسا نام تھا ویسے ہی کام تھے۔
[2] الکامل فی التاریخ: سنة ۲۵۵ھ
[3] البدایة والنهایة: ۵۱۹/۱۴؛ تاریخ ابن خلدون: ۳۷۲/۳، ۳۷۳
[4] تاریخ الطبری: سنة ۲۵۶ھ؛ تاریخ الخلفاء، ص ۲۶۳ ط نزار

اَلْمُعْتَمِد علی اللّٰہ

احمد بن جعفر المتوکل

رجب ۲۵۶ھ تا اواخرِ محرم ۲۷۹ھ

جولائی ۸۷۰ء تا مارچ ۸۹۲ء

اب متوکل کے ایک اور بیٹے احمد کو خلافت سونپی گئی جو المعتمد علی اللہ کا لقب لے کر کانٹوں کی اس سیج پر بیٹھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ترکوں کو ایسا خلیفہ چاہیے جو کسی کام کا نہ ہو؛ اس لیے اس نے امورِ مملکت پر توجہ دینا فضول سمجھا اور خلافت کے سنہرے پنجرے میں لہو ولعب کو اپنی مشغولیت کا ذریعہ بنالیا۔ اسے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس کی حرم سرا اور نشاط گاہ سے باہر کیا ہورہا ہے۔ ترک واقعی ایسا نکما خلیفہ چاہتے تھے؛ اس لیے معتمد کے دن طویل ہوگئے۔ دورِ زوال میں وہ ۲۳ برس تک خلیفہ رہا حالانکہ اس سے پہلے ۹ سالوں میں پانچ خلفاء تبدیل ہوئے تھے۔[1]

بغاوتیں:

معتمد کے دور میں مسلسل بغاوتیں ہوتی رہیں۔ ۲۵۰ھ میں یحییٰ بن عمر زیدی نے خروج کیا مگر قتل ہوئے۔ اسی سال حسن بن زید طالبی نامی ایک سید نے طبرستان پر اپنی حکومت قائم کرلی اور وہاں "دولتِ زیدیہ طالبیہ" کی بنیاد رکھی۔

۲۵۶ھ میں علی بن زید طالبی نے خروج کر کے کوفہ پر قبضہ کرلیا۔ تاہم یہ خروج ناکام رہا۔[2]

اس دوران خراسان میں یعقوب بن لیث صَفّاری نے ایک آزاد حکومت قائم کر کے دولتِ عباسیہ کو پریشان کردیا تھا۔ صَفّاری کا زور اس قدر بڑھا کہ اس نے بغداد کو بھی دبانے کی کوششیں شروع کردیں۔ یہ دیکھ کر معتمد سامرا سے بغداد آگیا اور افواج مرتب کرلیں۔ ۲۶۲ھ میں یعقوب بن لیث واسط تک آن پہنچا۔ ادھر سے ولی عہد مُوفّق خلافتی افواج کو لیے مقابلے پر نکلا۔ ایک خونریز جنگ کے بعد یعقوب بن لیث کو شکست ہوئی اور بغداد پر اس کے تسلط کا خطرہ ٹل گیا۔[3]

ولی عہد کا اعلان:

۲۶۱ھ میں معتمد نے اپنے جانشینوں کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ میرے بعد میرا بیٹا جعفر اور اس کے بعد میرا بھائی ابواحمد مُوفّق ولی عہد ہوں گے۔ لیکن اگر میں اپنے بیٹے کے بالغ ہونے سے پہلے ہی مرگیا تو میرا بھائی المُوفّق ولی عہد ہوگا۔[4]

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۶۴ تا ۲۶۷

[2] الکامل فی التاریخ: سنة ۲۵۰ھ، سنة ۲۵۶ھ

[3] العبر فی خبر من غبر: ۳۷۶/۱

[4] البدایة والنهایة: ۵۲۵/۱۴

صاحب الزنج علی بن محمد کا فتنہ:

معتمد کے دور میں علی بن محمد (صاحب الزنج) کا قہر انگیز فتنہ جس کا آغاز گزشتہ خلفاء کے زمانے میں ہو چکا تھا، پوری طرح ابھر آیا۔ علی بن محمد قبیلہ عبدالقیس کا ایک عیار تھا جس کی جائے پیدائش رے تھے۔ یہ شخص اس دور کا مسیلمہ کذاب تھا۔ نت نئی پیش گوئیوں، جھوٹی کرامتوں اور شعبدہ بازیوں کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کرتا تھا۔ اس کے حالات دیکھ کر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ یہ لکھنے پر مجبور ہوئے: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے ساتھ شیطان تھا جو اس سے گفتگو کرتا تھا۔ جیسا کہ شیطان ایک مسیلمہ سے دوسرے مسیلمہ کے پاس آیا کرتا ہے۔''[1]

گھناؤنے عقائد اور جھوٹے دعوے:

علی بن محمد کے عقائد نہایت گھناؤنے تھے۔ اس کے نمائندے کھلے عام خلفائے راشدین، سادات اور امہات المؤمنین پر تبرابازی کرتے تھے۔ وہ یہاں تک کہا کرتا تھا:

''مجھے نبوت کی پیش کش ہوئی، میں ڈرا کہ کہیں اس کا بوجھ نہ سہار سکوں؛ اس لیے معذرت کر لی۔''[2]

۲۴۹ھ میں اس نے سامرا میں محمد بن فضل بن عبیداللہ بن عباس بن علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہونے کا دعویٰ کیا۔ جب اس کی حقیقت کھلی تو بھاگ کر بحرین چلا گیا اور دعویٰ کیا کہ میں احمد بن عیسیٰ بن زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ کا پوتا علی بن محمد ہوں۔ یہ بھی بالکل جھوٹ تھا؛ کیوں کہ اصلی علی بن محمد بن احمد بن عیسیٰ خود کوفہ میں موجود تھے۔

عربوں میں دال گلتی نہ دیکھ کر اس نے اپنے مریدوں کو کہا کہ میں نے بادلوں کی گرج میں آواز سنی کہ بصرہ کی طرف کوچ کرو۔ اس طرح ۲۵۴ھ میں وہ اپنی جماعت کے ساتھ بصرہ کے نواح میں آ گیا اور کچھ مدت خفیہ رکنیت سازی کرتا رہا۔ بغداد بھی آیا اور کرشمے دکھا کر ایک خلقت کو گمراہ کیا۔

شوال ۲۵۵ھ میں وہ کھل کر سامنے آیا اور ہزاروں حبشی غلاموں کو آزادی دلانے کا وعدہ کر کے اپنا مرید بنا لیا۔[3]

مسلمانوں کا قتل عام:

اس کے علوی ہونے پر یقین کر کے ہزاروں عام شہری و دیہاتی بھی اس کے پیچھے چل پڑے۔ وہ زبردست خطیب اور شاعر تھا۔ اپنی جوشیلی تقاریر سے ایرانیوں اور غلاموں کو مشتعل کر کے حکومت سے لڑاتا رہا۔ بعض صحیح النسب سید بھی دھوکا کھا کر اس سے جا ملے تھے مگر اس نے انہیں استعمال کر کے جلد ہی قتل کرا دیا۔ اسے روکنے کے لیے رمضان ۲۵۵ھ میں بصرہ سے چار ہزار سپاہیوں پر مشتمل سرکاری فوج آئی مگر صاحب الزنج کے مرید اس طرح دیوانہ وار لڑے کہ فوج شکست کھا کر بھاگ نکلی۔ یہ بد بخت گروہ بے دریغ مسلمانوں کا قتل عام کرتا اور عورتوں کو باندیاں بناتا رہا۔[4]

---

[1] البداية والنهاية: ۵۳۷/۱۴: سنة ۲۵۷ھ
[2] البداية والنهاية: ۵۳۹/۱۴
[3] اسے صاحب الزنج کہنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے مریدوں میں زیادہ تعداد ان حبشی غلاموں کی تھی جو بصرہ کے اردگرد کان کنی کا کام کرتے تھے۔ حبشی کو فارسی میں زنگی اور عربی میں ''زنجی'' کہا جاتا ہے۔
[4] البداية والنهاية: ۵۱۲/۱۴ تا ۵۱۳

بصرہ میں خون کی ندیاں:

۲۵۷ھ میں عباسی امیر سعید حاجب نے ایک خونریز جنگ کے بعد اسے پسپا کر کے بے شمار عورتوں کو آزاد کرایا مگر صاحب الزنج نے بہت جلد شب خون مار کر اس شکست کا بدلہ لیا اور سرکاری فوج کو تتر بتر کر دیا۔ اسی سال شوال میں وہ بصرہ کی فصیلوں کے سامنے آن پہنچا اور بڑی سختی سے اس کی ناکہ بندی کر لی۔ اہلِ شہر محصور ہو کر لڑتے رہے۔

ایک دن اس مکار نے حبشیوں کو کہا: ''میں نے اللہ کی بارگاہ میں اہلِ بصرہ کے خلاف بددعا کی تو زمین وآسمان میرے لیے کھول دیے گئے۔ میں نے دیکھا کہ اہلِ بصرہ کی لاشیں بچھی ہوئی ہیں اور فرشتے میرے ساتھیوں کے ہمراہ لڑ رہے ہیں۔ میں نے جان لیا کہ مجھے فتح ہوگی۔ مجھے کہا گیا کہ اہل بصرہ روٹی کی طرح ہیں، تو جب روٹی کناروں سے توڑے گا تو بصرہ تباہ کر دیا جائے گا۔ میں نے اس کا مطلب یہ لیا کہ چاند گرہن ہونے پر بصرہ فتح ہو جائے گا۔''

۱۴ شوال ۲۵۷ھ کی شب چاند گرہن ہوا۔ حبشیوں کا جوش وخروش آسمان تک پہنچ گیا۔ انہوں نے زوردار دھاوا بول کر صبح تک شہر پر قبضہ کر لیا۔ یہاں حبشیوں نے ایسا قتل عام کیا کہ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ ہر طرف لاشیں پھڑک رہی تھیں، زخمی تڑپ رہے تھے، ان کی چیخوں، کراہوں اور لا الٰہ الا اللہ کی دردناک آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ حبشیوں نے شہر کی جامع مسجد کو جلا کر راکھ کر دیا اور جیل کا دروازہ توڑ کر قیدی رہا کرا لیے جو سب انہی میں شامل ہو گئے۔ کئی دنوں تک بصرہ میں قتل وغارت گری کا بازار گرم رہا۔ حبشی ایک ایک محلے کو لوٹ کر نذر آتش کرتے رہے۔ وہی لوگ بچ سکے جو فرار ہو گئے۔ چھپنے والوں کو امان دینے کا وعدہ کر کے جمع کیا گیا اور پھر انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا گیا۔ ان میں بڑے بڑے علماء، محدثین، شعراء اور ادیب شامل تھے جن کے نام حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے نقل کیے ہیں۔

بصرہ کی فتح کے بعد صاحب الزنج نے عراقی شیعوں کو ساتھ ملانے کے لیے خود کو یحییٰ بن زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد کہا۔ مگر یہ بھی جھوٹ تھا؛ کیوں کہ یحییٰ بن زید کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ صرف ایک لڑکی تھی جو بچپن میں فوت ہوگئی تھی۔ [1]

زنجیوں کو پہلی شکست:

۲۵۸ھ میں صاحب الزنج کو پہلا دھچکا اس وقت پہنچا جب اس کا سپہ سالار یحییٰ حرانی گرفتار ہوا۔ خلیفہ معتمد نے اسے دوسو کوڑے لگوائے اور پھر ہاتھ پاؤں کٹوا کر ذبح کرا دیا۔ [2] ۲۵۹ھ میں ترک امیر موسیٰ بن بُغا نے زنجیوں کو ایک اور عبرتناک شکست دی اور ان کی بہت بڑی تعداد کو قتل کیا۔ پھر بھی ان کا فتنہ ختم نہ ہوا۔ ۲۶۱ھ میں صاحب الزنج نے اہواز پر حملہ کیا اور آبادی کا وہی حشر کیا جو بصرہ میں کیا تھا۔ پچاس ہزار مسلمانوں کو قتل اور چالیس ہزار مرد وزن کو قیدی بنایا۔ ۲۶۵ھ میں اس نے نعمانیہ پر لشکر کشی کی اور وہاں بھی ایسی ہی قیامت ڈھائی۔ اگلے برس اس نے بندرگاہ ''رام ہُرمُز'' پر بھی قبضہ کر لیا۔ [3]

---

① البدایة والنهایة: ۱٤/۵۳۵ تا ۵۳۷ ② البدایة والنهایة: ۱٤/۵٤۰

③ سیر اعلام النبلاء: ۱۲/۵٤٤؛ البدایة والنهایة: ۱٤/۵٤۵ تا ۵۵۵

عباسی افواج کی یلغار اور زنجیوں کی شکست:

صاحب الزنج نے دجلہ کی شاخوں کے درمیان دلدلی علاقے میں المختارہ کے نام سے اپنا مرکز قائم کیا تھا جہاں سرکاری افواج کا پہنچنا بہت مشکل تھا۔اس کے علاوہ اس نے دو مستحکم شہر''مَنیعَہ''اور''منصورہ''تعمیر کرا کے انہیں فوجی مراکز بنادیا تھا۔معتمد کے دور میں وہ چودہ برس تک برابر مار دھاڑ کرتا رہا۔متعدد بار اسے شکست بھی ہوئی مگر پھر بھی عراق کا بڑا حصہ اس کی جولان گاہ بنا رہا۔اس کے خلاف مہمات کی کمان خلیفہ کے بھائی ابواحمد مُوَفّق کے سپرد تھی جو بڑی پامردی سے زنجیوں کا مقابلہ کرتا رہا۔اس نے کئی بار حبشیوں کو پسپا کیا مگر یہ مرتدین ہر شکست کے بعد پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اپنے پیشوا کے گرد جمع ہو جاتے۔

آخر کار ۲۶۷ھ میں مُوَفّق نے اپنے ۲۵ سالہ بیٹے احمد ابوالعباس (جو بعد میں مُعتضِد باللہ کے لقب سے خلیفہ بنا) کو دس ہزار گھڑ سوار دے کر مرتدین کے خلاف بھیجا اور خود ایک بڑا لشکر لے کر پیچھے روانہ ہوا۔اس لشکر نے گھمسان کی جنگ کے بعد حریف کے شہر مَنیعَہ کو فتح کر کے وہاں سے پانچ ہزار مسلم خواتین کو بازیاب کرایا۔اس کے بعد مَنیعَہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔

حریف کا دوسرا مرکز منصورہ تھا جہاں مَنیعَہ سے بھاگنے والے سارے مرتد جمع ہو گئے تھے۔اس شہر کے گرد پانچ خندقوں کا دائرہ تھا۔پھر یکے بعد دیگرے پانچ فصیلیں تھیں۔۲۶ ربیع الآخر کو مُوَفّق خود لشکر لے کر یہاں پہنچا۔چار رکعت نماز ادا کر کے نہایت خشوع و خضوع سے دعا کی اور پھر حریف پر دھاوا بول دیا۔مسلمانوں نے اس دن اسلاف کی یادیں تازہ کر دیں،قدم قدم پر لاشیں چھوڑتے ہوئے وہ ایک کے بعد دوسری خندق عبور کرتے گئے۔اور فصیلوں پر چڑھ گئے۔مرتدین ایک فصیل سے پسپا ہو کر دوسری پر قدم جمالیتے مگر ان کی سخت ترین مزاحمت کے باوجود آخر کار مسلمان پانچوں فصیلیں پھلانگ کر شہر میں گھس گئے۔ہزاروں مرتد یہاں قتل اور گرفتار ہوئے۔ان کی خاصی تعداد فرار ہوگئی جن کا تعاقب جاری رہا۔گرفتار شدگان کو توبہ کی ترغیب دی گئی اور تائب ہونے والوں کو الگ الگ علاقوں کی فوج میں بکھیر کر مختلف خدمات پر لگادیا گیا۔شہر پر قبضے کے بعد یہاں سے دس ہزار مسلم خواتین بازیاب کرائی گئیں۔

مُوَفّق نے اس عظیم فتح کے بعد صاحب الزنج کو مکتوب بھیج کر توبہ کی دعوت دی۔مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔
آخر مُوَفّق پچاس ہزار کا لشکر لے کر اس بدبخت کے پایۂ تخت المختارہ تک جا پہنچا۔یہاں حریف نے تین لاکھ جنگجو جمع کر رکھے تھے اور شہر کے حفاظتی انتظامات اتنے مضبوط تھے کہ فتح مشکل دکھائی دیتی تھی۔

مُوَفّق اور اس کا بیٹا ابوالعباس احمد نہایت دلیری سے شہر پر حملے کرتے رہے مگر فتح کی کوئی صورت نہ بنی۔آخر کار مُوَفّق نے یہاں طویل محاصرے کی منصوبہ بندی کی اور المختارہ کے سامنے المُوَفّقیہ کے نام سے ایک شہر آباد کر ڈالا جہاں فوجی و عسکری ضروریات سمیت ہر چیز موجود تھی۔ساتھ ہی اس نے اعلان کیا کہ صاحب الزنج کے سوا مرتدین میں جو بھی توبہ کر لے اسے امان ہے۔اس منادی پر بہت سے لوگ موقع ملتے ہی المختارہ سے بھاگ کر مُوَفّق کے پاس آنے

لگے اور وہ انہیں المُوَفقیہ میں آباد کرتا رہا۔ محاصرہ جاری رہا یہاں تک کہ المختارہ میں خوراک نایاب ہونے لگی اور صاحب الزنج کے بڑے بڑے سردار اپنے ساتھیوں سمیت مُوَفق کے پاس حاضر ہونے لگے۔ وہ سب کو صحیح عقیدے کی تعلیم کے ساتھ مشرف باِسلام کرتا اور امان دیتا گیا۔

دو سال بعد ربیع الآخر ۲۶۹ھ میں شہر کی فصیل پر مزاحمت کمزور پڑ گئی۔ تب مُوَفق نے فوج کو حکم دیا کہ فصیل میں شگاف کر دیا جائے مگر تا حکمِ ثانی اندر گھسنے کی کوشش نہ کی جائے۔ بہت سے سپاہیوں نے فصیل میں شگاف ڈالنے کے بعد جلد بازی کی اور اندر داخل ہوگئے جہاں حبشیوں نے انہیں گھیر کر ختم کر دیا۔

مُوَفق نے کچھ دنوں بعد دوبارہ سپاہیوں کو حوصلہ دلا کر فصیل کو تڑوانا شروع کیا۔ فصیل شکستہ ہو جانے سے فتح قریب دکھائی دیتی تھی کہ حریف کے ایک رومی نشانہ باز نے مُوَفق کو تاک کر ایسا تیر مارا جو سینے میں گھس گیا۔ مُوَفق شدید زخمی ہو کر بستر سے لگ گیا مگر اس نے امراء کے شدید اصرار کے باوجود بغداد واپس جانا گوارا نہ کیا اور فوج کی ہمت بڑھاتا رہا۔

مُوَفق کی ان فتوحات کے دوران عوام میں اسے قومی رہنما کی سی حیثیت حاصل ہوگئی تھی اور خلیفہ معتمد بالکل پس منظر میں چلا گیا تھا۔ ویسے بھی وہ ترکوں سے دبا ہوا تھا۔ اس صورتحال میں مصر کے حاکم احمد بن طولون نے اسے مصر آکر قاہرہ کو دارالخلافہ بنانے کی تجویز دی۔ معتمد کو یہ رائے پسند آئی اور وہ سامرا سے مصر روانہ ہوگیا مگر مُوَفق کو بروقت یہ اطلاع مل گئی اور اس نے مُوصِل کے امراء کو کہلوا کر خلیفہ کو راستے میں روک لیا۔ ان امراء نے خلیفہ کو سمجھایا کہ اس وقت مرتد زنجیوں سے لڑائی فیصلہ کن مرحلے میں ہے، ایسے میں آپ کے دارالخلافہ سے بھاگ نکلنے سے حکومت کی سبکی ہوگی اور افواج پست ہمت ہو جائیں گی۔ مُوَفق نے ان وفادار امراء کے ذریعے خلیفہ کو زبردستی واپس سامرا بھیج دیا۔ اس کے بعد معتمد کے تھوڑے بہت اختیارات بھی ختم ہوگئے اور امورِ حکومت مُوَفق ہی کے ہاتھ میں آگئے۔

شعبان ۲۶۹ھ میں مُوَفق کا زخم بھر گیا اور اس نے دوبارہ حملہ شروع کرایا۔ اس وقت تک حریف نے فصیل کی مرمت کر کے اسے ازسرِنو مضبوط بنا دیا تھا۔ تاہم مُوَفق نے کئی ہفتوں کی مسلسل سنگ باری کے ذریعے اسے گرا کر دم لیا۔ المختارہ بہت بڑا شہر تھا، مغربی اور مشرقی حصے الگ الگ تھے، درمیان میں نہریں اور پل تھے۔ مُوَفق نے کئی قہر انگیز لڑائیوں کے بعد پہلے مغربی حصے کو فتح کیا اور پھر مشرقی حصے کو۔ آخر کار صاحب الزنج اپنے اہل وعیال کو پایہ تخت میں چھوڑ کر فرار ہوگیا۔ سرکاری فوج نے یہاں لاتعداد دشمنوں کو قتل اور گرفتار کیا اور ان گنت قیدی مرد وزن آزاد کرائے۔

مُوَفق نے اس شاندار فتح کے باوجود صاحب الزنج کا بذاتِ خود تعاقب جاری رکھا۔ وہ شکست کھا کر ایک علاقے سے دوسرے کی طرف فرار ہوتا رہا۔ آخر کار ۲۷۰ھ میں ایک معرکے کے دوران وہ مارا گیا۔ اس کا سر مُوَفق کے سامنے لایا گیا تو وہ سجدے میں گر گیا۔ ۱۲ جمادی الاولیٰ کو مُوَفق کا بیٹا احمد ابوالعباس (مُعتَضِد باللہ) یہ کٹا ہوا سر لیے بغداد پہنچا جہاں عوام کا سمندر فاتحین کے استقبال کے لیے موجود تھا۔[1]

[1] البداية والنهاية: ١٤/٥٤٠، ٥٤٩، ٥٦٦، ٥٦٩، ٥٧٠، ٥٧١، ٥٧٢، ٥٨٥، ٥٨٦؛ العبر في خبر من غبر: ١/٣٨٠ تا ٣٨٧

خلافتِ عباسیہ اور دولتِ طولونیہ کے مابین جنگ:

مُوَفَّق کی اقبال مندی کو مصر کا حاکم احمد بن طولون تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا اور مُوَفَّق کی بالادستی اور ولی عہدی قبول کرنے سے انکار کر چکا تھا؛ اس لیے مُوَفَّق نے زنجیوں سے فارغ ہو کر ۲۷۱ھ میں اپنے بیٹے ابوالعباس مُعتضِد کو مصر روانہ کر دیا۔ اس وقت تک احمد بن طولون مر چکا تھا، اس کے بیٹے اور جانشین خُمارَوَیہ نے مصر کے دفاع کے لیے فلسطین کی حدود میں آکر عباسی لشکر سے ٹکر لی۔ یہ گھمسان کی جنگ ''وقعۃ الطواحین'' کے نام سے مشہور ہے جس میں فریقین کا بھاری جانی نقصان ہوا۔ جنگ کے پہلے معرکے میں عباسی لشکر غالب آیا مگر دوسرے مرحلے میں مصریوں نے عباسیوں کو پسپا کر کے اپنے علاقے کو بچا لیا۔ یوں مصر میں دولتِ طولونیہ مضبوط ہوگئی۔ ①

رومیوں کے حملے:

معتمد کی خلافت کے ابتدائی ایام میں بازنطینی روما میں ایک انقلاب آیا تھا۔ قیصر میخائیل بن توفیل ۲۴ سالہ دورِ اقتدار کے بعد ایک باغیانہ کارروائی میں مارا گیا تھا اور باغی سردار بُسیل صقلبی نے روما کا تاج و تخت سنبھال لیا تھا۔ جلد ہی اس نے اسلامی خلافت کو کمزور پا کر سرحدوں پر حملے شروع کر دیے۔ ②

ہر دوسرے تیسرے سال رومیوں کی لشکر کشی ہوتی۔ کبھی وہ ایک دو قلعوں پر قبضہ کر لیتے، کبھی لوٹ مار کر کے بھاگ جاتے۔ ۲۶۰ھ میں انہوں نے حصن لولؤۃ پر قبضہ کر لیا۔ ۲۶۶ھ میں وہ دیارِ ربیعہ پر حملہ آور ہوئے اور مسلمانوں کا قتل عام کر کے ان کی لاشوں کو پامال کیا اور اڑھائی سو افراد کو قیدی بنا لیا۔ نصیبین اور مُوصِل کے مسلمان ان کے خلاف جہاد کے لیے نکلے تو رومی فرار ہو گئے۔ ③

۲۶۸ھ میں قیصر صقلبی نے خود یلغار کی اور مَلَطْیَہ کا محاصرہ کر لیا۔ تاہم مَرعَش کے مسلمان محصورین کی مدد کو بروقت پہنچ گئے اور قیصر کو فرار ہونا پڑا۔ اسی سال دولتِ طولونیہ مصر نے بازنطینیوں کے خلاف ایک لشکر بھیجا جو سترہ ہزار رومیوں کو تہِ تیغ کر کے لوٹا۔ ④

۲۷۰ھ کو ایک لاکھ رومیوں کا ٹڈی دل شام کے شمالی شہر طرطوس کے سامنے خیمہ زن ہوا۔ مسلمانوں نے رات کی تاریکی میں ان پر حملہ کیا اور صبح تک برابر تلوار چلتی رہی۔ آخر رومی ستر ہزار لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ مسلمانوں کو بے پناہ مالِ غنیمت ملا، صرف سواری کے جانور پندرہ ہزار سے زیادہ تھے۔ ⑤

غرض اس گئے گزرے دور میں بھی غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف مسلمانوں کی قوتِ مزاحمت زندہ تھی۔

---

① العبر في خبر من غبر: ۳۹۱/۱

② البداية والنهاية: ۵۳۷/۱٤

③ البداية والنهاية: ۵٤٦/۱٤، ۵٦۹

④ البداية والنهاية: ۵۸۰/۱٤

⑤ البداية والنهاية: ۵۸٦/۱٤، ۵۸۷

دولتِ صَفاریہ کا عروج:

معتمد کے دور میں خراسان اور وسطِ ایشیا بھی یکے بعد دیگرے خلافتِ عباسیہ کے ہاتھ سے نکل گئے۔ دولتِ صَفاریہ عروج پا کر خراسان پر قابض ہوگئی جبکہ وسطِ ایشیا میں دولتِ سامانیہ کی داغ بیل پڑ گئی۔

دولتِ صَفاریہ کے بانی یعقوب بن لیث صَفاری نے ۲۵۷ھ میں کابل فتح کر کے موجودہ افغانستان کا سارا علاقہ قبضے میں لے لیا اور اگلے سال نیشاپور کو فتح کر کے دولتِ طاہریہ کا خاتمہ کر دیا جو مامون الرشید کے دور میں قائم ہوئی تھی۔ یوں دولتِ صَفاریہ تقریباً پورے خراسان کو محیط ہوگئی۔ یہ حکومت ۲۹۸ھ تک قائم رہی، اس میں چند سالوں تک برائے نام عباسی خلیفہ کا خطبہ پڑھا جاتا رہا۔ پھر اس کی خلافتِ بغداد سے ٹھن گئی۔ یعقوب بن لیث کے بعد اس کا بھائی عمرو بن لیث اور پھر اسی خاندان کے دوسرے وارث اسے چلاتے رہے۔ آخر کار خلفائے بغداد نے دولتِ سامانیہ کے امیر اسماعیل سامانی کے ذریعے اس حکومت کا خاتمہ کرا دیا۔[1]

دولتِ سامانیہ:

اسی دور میں ۲۶۱ھ میں وسطِ ایشیا میں امیر نصر بن احمد سامانی نے اپنی حکومت قائم کی جس میں خلافتِ عباسیہ کا خطبہ قائم رہا۔ اس کا مرکز سمرقند تھا۔ نصر بن احمد کے بعد اس کا بھائی اسماعیل حکمران ہوا جس نے بخارا کو پایۂ تخت بنا کر ریاست کو وسطِ ایشیا کے علاوہ خراسان، فارس اور طبرستان تک وسیع کر دیا۔ یہ حکومت لگ بھگ سوا صدی تک چلی۔ اس نے خراسان کی دولتِ صَفاریہ اور شمالی ایران کی دولتِ زیدیہ کو بھی اپنے اندر ضم کر لیا۔ آخر ۳۹۰ھ میں ترک سردار ایلک خان کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا۔[2]

ولی عہد کی تبدیلی۔ ایک خوش آئند فیصلہ:

تاریخ کے متعدد واقعات شہادت دیتے ہیں کہ جب بھی حکمرانوں نے اپنے خانگی مفادات کو ترجیح دے کر سیاسی فیصلے کیے تو ملک تباہی کی راہ پر چل پڑا۔ اس کے برعکس اگر ذات اور گھر کو پس پشت ڈال کر فیصلے کیے گئے تو مثبت نتائج برآمد ہوئے۔ معتمد نے مدتوں بعد گھر کو نظر انداز کر کے قومی مفاد میں فیصلہ کرنے کی مثال قائم کی۔ اس کا بھائی ابواحمد المُوَفّق فوت ہو چکا تھا۔ اب معتمد کا کم سن بیٹا جعفر ہی ولی عہدی کے لیے طے تھا مگر اس نے حالات کی ابتری دیکھتے ہوئے اواخر محرم ۲۷۹ھ میں بیٹے کی جگہ بھتیجے ابوالعباس احمد کو ولی عہد مقرر کر دیا جو واقعی حکمرانی کا حق دار تھا۔ اس فیصلے کے چند ماہ بعد ۱۸ رجب ۲۷۹ھ کو معتمد کا انتقال ہو گیا۔[3]

---

① التاریخ الاسلامی، محمود شاکر: ۹۹/۶، ۱۰۰؛ موجز التاریخ الاسلامی للعسیری، ص ۲۲۲

② الاعلام زرکلی: ۷۳/۳ ط دار العلم؛ موجز التاریخ الاسلامی للعسیری، ص ۲۲۳ ط مکتبۃ الملک فھد

③ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۷۹ھ

زوال خلافتِ بغداد

ابتدائی دور

دوسرا مرحلہ

عارضی افاقہ

مُعتَضِد کی خلافت سے مکتفی کے انتقال تک

(۲۷۹ھ تا ۲۹۵ھ)

تقریباً سترہ سال

اَلمُعتَضِد باللہ

احمد بن طلحة المُوَفق بن المتوکل

محرم۲۷۹ھ تا ربیع الآخر ۲۸۹ھ

مارچ ۸۹۴ء تا اپریل ۹۰۲ء

نیا خلیفہ، مُوَفّق کا بیٹا اور متوکل کا پوتا ابوالعباس احمد تھا جو مُعتَضِد باللہ کے لقب کے ساتھ ۱۹ رجب ۲۷۹ھ کو مسند نشین ہوا۔ وہ صفات میں اپنے آباؤ اجداد کی مثل تھا۔ بہادر، غیور، بیدار مغز، حوصلہ منداور بارعب۔ اس نے نوجوانی کے زمانے میں زنجیوں کے خلاف جنگوں میں نہایت پامردی سے لڑ کر قوم کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔

جب وہ خلیفہ بنا تو دارالخلافہ سامرا ایک پنجرہ تھا جہاں خلفاء ترکوں کے گھیرے میں رہتے تھے۔ مُعتَضِد نے گزشتہ سات خلفاء کی تقلید میں ''سامرا'' کو مرکز بنائے رکھنے کی غلطی نہ کی بلکہ قدیم دارالخلافہ بغداد میں جا کر قیام کیا اور اس کی مرکزی حیثیت کو بحال کر دیا۔ اس جرأت مندانہ اقدام سے اس نے ترکوں کے دباؤ کو کم کر کے مسندِ خلافت کو بااختیار بنادیا۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ اگر وہ نہ ہوتا تو خلافتِ عباسیہ اسی دور میں دم توڑ دیتی مگر اس نے خلافت کا وقار کسی نہ کسی حد تک دوبارہ بحال کر دیا۔ مؤرخین اسے ''سَفاح ثانی'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں؛ کیوں کہ اس نے خلافتِ عباسیہ کو دوبارہ قائم کیا تھا۔

اس نے ان خودمختار حکومتوں سے بھی دوستانہ مراسم قائم کیے جن سے ماضی میں تعلقات کشیدہ رہے۔ اس نے مصر کے حکمران خُمارَوَیہ طولونی کی بیٹی سے شادی کر کے اس سے تعلقات مضبوط کر لیے۔ خراسان کے حاکم عَمرو بن لیث صَفّاری سے بھی صلح کر کے اسے اپنے حامیوں میں شامل کر لیا۔

وہ زندیقوں اور بددینوں کا سخت مخالف تھا اور ان کی کتب نذرِ آتش کرا دیتا تھا۔ اس نے مسند نشینی کے دوسرے برس ۲۸۰ھ میں فلسفے کی کتب پر قدغن لگا دی۔ بغداد میں نجومیوں کی بڑی ریل پیل تھی۔ دربار سے لے کر بازاروں تک ہر جگہ وہ لوگوں کے دین و ایمان سے کھیل رہے تھے۔ مُعتَضِد نے ان کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی۔

اس کے دور میں مدتوں بعد جہاد کی یاد تازہ ہوئی اور ۲۸۱ھ کے دوران ایشیائے کوچک میں رومیوں کا ایک قلعہ ''مَلُوریہ'' فتح ہوا۔ مکہ میں دورِ جاہلیت کی قومی مشورہ گاہ ''دارالندوہ'' اب تک موجود تھی، مُعتَضِد نے اسے منہدم کرا کے مسجد میں تبدیل کر دیا۔ مجوسیوں کی عید نیروز مسلم معاشرے میں رواج پذیر تھی، اس دن الاؤ روشن کیے جاتے اور لوگوں پر پانی چھڑکا جاتا۔ مُعتَضِد نے ۲۸۲ھ میں اسے ممنوع قرار دیا۔[1]

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۶۸، ۲۶۹ط نزار؛ العبر في خبر من غبر: ۱/۴۰۰ تا ۴۰۵

مُعْتَضِد کا ایک سنگین اقدام اور رجوع:

مگر اس دور میں تشیع اور رفض اس تیزی سے پھیل رہا تھا کہ مُعتَضِد جیسا زیرک آدمی بھی ایک بار اس سے متاثر ہوگیا تھا۔ گیارہ جمادی الآخرہ ۲۸۴ھ بروز جمعہ کو بغداد کے مشرقی اور مغربی حصے کی دونوں جامع مساجد میں یہ منادی کر دی گئی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ذکر دعائے رحمت اور بھلائی کے ساتھ نہ کیا جائے۔

چند دن بعد مُعتَضِد نے یہ ارادہ بھی کر لیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر لعنت کرنے کا حکم جاری کیا جائے (نعوذ باللہ)۔ اس سلسلے میں ایک طویل محضرنامہ تیار کیا گیا تا کہ اسے جامع مسجد بغداد کے اجتماع جمعہ میں سنایا جائے۔

اس اشتعال انگیز اقدام سے بڑا فتنہ پھیلنے کا خطرہ تھا۔ وزیر عبیداللہ بن سلیمان نے بڑی کوشش کی کہ خلیفہ یہ حکم واپس لے لے مگر اس کی دال نہ گلی۔ آخر وزیر نے قاضی ابوعمر محمد بن یوسف رحمہ اللہ کو خلیفہ کے پاس بھیجا۔ انہوں نے بڑی حکمت کے ساتھ اسے اس کے مضرات سے آگاہ کیا اور سمجھا بجھا کر یہ گھناؤنا حکم واپس لینے پر آمادہ کیا۔[1]

قرامطہ کا ظہور:

مُعتَضِد کے دور میں شروع ہونے والی سب سے بڑی شورش ''قرامطی تحریک'' تھی جس کا بانی ابوسعید قرامطی تھا۔ اس کا ظہور ۲۸۶ھ میں ہوا۔ اگلے سالوں میں اس تحریک نے عالم اسلام میں اس قدر فساد برپا کیا کہ ماضی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ بلا مبالغہ لاکھوں بے گناہ لوگ اس کی خون آشامی کی بھینٹ چڑھے اور حرمین شریفین کا تقدس بھی محفوظ نہ رہا۔ مُعتَضِد بیمار ہو کر ۲۲ ربیع الآخر ۲۸۹ھ کو چل بسا۔ اس کا دور کم از کم بغداد کی حد تک امن وامان کا تھا۔ اس نے بہت سے ٹیکس ساقط کر کے عوام کو خوشحال بنا دیا تھا۔ اس کے دور میں لوگ نہایت آرام وسکون سے زندگی بسر کرتے رہے۔[2]

❖ ❖ ❖

---

[1] تاریخ الطبری: ص ۱۰ ص ۵۵ تا ۶۳

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ محضرنامہ مامون الرشید کے دور میں تیار کیا گیا تھا اور سرکاری ریکارڈ میں محفوظ تھا۔ مُعتَضِد نے اسی کی اشاعت کا فیصلہ کیا مگر آخر کار بغداد کے قاضی ابوعمر رحمہ اللہ کے سمجھانے پر اس ارادے سے رجوع کر لیا۔ یہ محضرنامہ امام طبری رحمہ اللہ نے پورا نقل کیا ہے۔ (تاریخ الطبری: ص ۱۰ ص ۵۵ تا ۶۳)

چونکہ امام طبری رحمہ اللہ مُعتَضِد کے دور میں بغداد ہی میں تھے اس لیے کسی ذریعے سے اس کی نقل ان تک پہنچ گئی۔ یہ محضرنامہ جھوٹی روایات سے پُر ہے اور اسے بلاشبہ کسی رافضی نے مدون کیا تھا۔ امام طبری رحمہ اللہ کا اسے نقل کرنا اس مصلحت کے تحت تھا تا کہ اندازہ ہو جائے کہ اس دور میں رفض کس حد تک خلفاء پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ اسے نقل کرنے سے امام طبری رحمہ اللہ پر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی عالم قادیانیوں کا کوئی خرافات بھرا مضمون بلا تبصرہ شائع کر دے تا کہ دنیا کو ان کی بھیانک ذہنیت معلوم ہو سکے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اس محضرنامے کا ذکر کیا ہے مگر ان سے تسامح یہ ہو گیا کہ انہوں نے یہ لکھ دیا ہے کہ یہ محضرنامہ جامع مساجد میں سنایا گیا تھا۔ جامع مساجد میں فقط حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ذکر خیر کی ممانعت کا اعلان ہوا تھا۔ مراسلہ اس کے بعد کسی جمعے کو سنایا جانا طے تھا مگر قاضی ابوعمر رحمہ اللہ نے اس فتنے کو ابھرنے سے قبل ٹھنڈا کر دیا۔ (البدایہ والنہایہ: ۱۴/۶۷۱، ۶۷۲)

نوٹ: قاضی صاحب کا نام اصل مآخذ (تاریخ الطبری) میں یوسف بن یعقوب منقول ہے مگر تاریخ الاسلام للذہبی کے محشی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے۔ یہ قاضی محمد بن یوسف بن یعقوب ابوعمر (م ۳۲۰ھ) ہیں۔ (تاریخ الاسلام ذہبی: ۱۷/۲۱، ت تدمری)

راقم کے نزدیک یہی راجح ہے۔ اس دور میں بغداد کے کسی قاضی کا نام یوسف بن یعقوب منقول نہیں ملتا۔

[2] تاریخ الخلفاء، ص ۲۷۰، ۲۷۱

اَلْمُکْتَفِی باللہ

علی بن احمد المُعتضِد

ربیع الآخر ۲۸۹ھ تا ذوالقعدہ ۲۹۵ھ

اپریل ۹۰۲ء تا اگست ۹۰۸ء

مُعتضِد کے بعد اس کا بیٹا علی، مکتفی باللہ کا لقب اختیار کر کے خلیفہ بنا۔ یہ بھی انصاف پسند حکمران تھا۔ عوام اسے پسند کرتے تھے۔ وہ کوشش کرتا تھا کہ سرکاری مال صرف عوامی ضروریات میں خرچ ہو۔ ایک بار اس نے سات سو دینار کی سرکاری تعمیر میں لگا دیے جو زیادہ ضروری نہیں تھی۔ جب بھی یہ بات یاد آتی تو استغفار کرتا اور کہتا:

''مسلمانوں کا مال ایسی تعمیر پر خرچ کر ڈالا جس کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔''[1]

دولتِ طولونیہ کا خاتمہ، مصر دوبارہ خلافتِ عباسیہ میں شامل:

مصر کی دولتِ طولونیہ اب کمزور پڑ چکی تھی۔ موقع غنیمت جان کر ۲۹۲ھ میں خلیفہ مکتفی نے اپنے جرنیل محمد بن سلیمان کو دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ مصر کی فتح کے لیے روانہ کیا۔ دولتِ طولونیہ کا سربراہ ہارون بن خُمارَوَیہ مقابلے کے لیے میدان میں نکل تو آیا اور فریقین میں کچھ جھڑپیں بھی ہوئیں مگر ہارون طبعاً صلح پسند شخص تھا۔ اس نے اپنے امراء کو خلیفہ کی اطاعت پر آمادہ کرنا چاہا مگر بعض امراء بپھر گئے اور ان کی ضد کے باعث خود مصری فوج میں پھوٹ پڑ گئی۔ انہی امراء نے ایک تیرانداز کو متعین کر کے عین اس وقت ہارون کو تیر نشانہ بنا دیا جب وہ فوج کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہارون کی موت کے بعد مصر میں اس کے چچا شیبان نے حکومت سنبھالی مگر اس میں عباسیوں سے مقابلے کی طاقت نہ تھی۔ آخر کار کچھ دنوں بعد اس نے خود کو عباسی فوج کے حوالے کر دیا اور محمد بن سلیمان نے مصر پر قبضہ کر کے دولتِ طولونیہ کا خاتمہ کر دیا۔ اس طرح یہ علاقہ دوبارہ براہِ راست خلافتِ بغداد کی عمل داری میں شامل ہو گیا۔ خلیفہ مکتفی نے آلِ طولون کے تمام افراد کو بغداد بلوا کر نظر بند کر دیا تا کہ ان لوگوں کی طرف سے کسی بغاوت کا امکان نہ رہے۔[2]

روس کی وحشی قوموں کا وسطِ ایشیا پر حملہ:

۲۹۳ھ میں وسطِ ایشیا کے شمال میں آباد روس کی نیم وحشی قوموں کا ایک سیلاب ماوراء النہر پر ٹوٹ پڑا مگر امیر اسماعیل سامانی نے سخت ترین جنگ کے بعد انہیں پسپا کر دیا۔[3]

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۷۳، ۲۷٤

[2] الکامل فی التاریخ: سنة ۲۹۲ھ

[3] مرآۃ الزمان لسبط ابن الجوزی: ۳۰۸/۱٦؛ الکامل فی التاریخ: سنة ۲۹۳ھ

رومیوں سے معرکے:

اس دور میں رومیوں سے معرکے جاری رہے۔۲۹۱ھ میں ایک لاکھ رومیوں نے سرحدوں پر حملہ کیا مگر شکست کھا کر بھاگ نکلے۔۲۹۳ھ میں انہوں نے صلح کر لی۔

مگر اس کے کچھ ہی دنوں بعد انہوں نے بے خبری میں ''قورس'' پر شب خوں مار کر ہزاروں مسلمانوں کو شہید اور گرفتار کیا اور فرار ہو گئے۔اگلے سال مسلمانوں نے جوابی کارروائی کی اور طرطوس سے رومی سرحدوں پر یلغار کر کے بکثرت رومیوں کو گرفتار کیا۔ان میں شامل ایک پادری مشرف باسلام ہو گیا۔[1]

مکتفی کی وفات:

مکتفی نے ساڑھے چھ سال تک کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔آخر کار ۲۹۵ھ میں بیمار ہوا اور کئی ماہ تک مبتلائے مرض رہنے کے بعد ۱۲ ذوالقعدہ ۲۹۵ھ کو دنیا سے رخصت ہو گیا۔اس کی عمر ۳۳ سال تھی۔[2]

◆◆◆

① الکامل فی التاریخ: سنة ۲۹۱ھ، ۲۹۳ھ، ۲۹۴ھ

② الکامل فی التاریخ: سنة ۲۹۵ھ

زوالِ خلافتِ بغداد

ابتدائی دور

تیسرا مرحلہ

انتشار و اضطراب

مقتدر کی خلافت سے بنو بُویہ کے بغداد پر تسلط تک

(۲۹۵ھ تا ۳۳۴ھ)

تقریباً ۳۸ برس

اَلْمُقْتَدِر بِاللہ

جعفر بن احمد المُعتَضِد

ذوالقعدہ ۲۹۵ھ تا شوال ۳۲۰ھ

اگست ۹۰۸ء تا نومبر ۹۳۲ء

مکتفی کی موت پر ایک بار پھر ایسی سیاسی بے تدبیری کا مظاہرہ ہوا کہ بنوعباس کی وہ حکومت جو مُعتَضِد کے دور سے دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑی ہونے لگی تھی، ایک بار پھر تیزی سے زوال کی کھائی میں گرنے لگی اور چند سالوں میں پہلے سے کہیں زیادہ کمزور اور بے وقعت ہوگئی۔

مکتفی کی زندگی میں اس کا بھائی جعفر بن مُعتَضِد ولی عہد تھا۔ کسے معلوم تھا کہ اس کے بالغ ہونے سے پہلے ہی مکتفی چل بسے گا۔ مگر قضا وقدر کا فیصلہ یہی ہوا۔ ایسے میں امرائے سلطنت نے کسی قابل شخص پر اتفاق کرنے کی بجائے اسی نابالغ جعفر کو خلیفہ بنادیا جو ۲۸۲ھ میں پیدا ہوا تھا اور اس وقت صرف تیرہ سال کا تھا۔ وہ مقتدر باللہ کے لقب کے ساتھ مسندِ خلافت پر براجمان ہوا۔ اس کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد کچھ امراء نے بغاوت کرکے سابق خلیفہ معتز کے بیٹے عبداللہ کو خلیفہ بنانے کی کوشش کی جس سے بغداد میں افراتفری پھیل گئی۔ تاہم بغاوت ناکام رہی۔[1]

عبیدیوں کا تیونس، مصر اور مراکش پر قبضہ:

مقتدر باللہ کی کم عمری سے فائدہ اٹھا کر امرائے دربار سیاہ وسپید کے مالک بن گئے اور نظام حکومت پھر ڈانواں ڈول ہوگیا۔ اس دوران افریقہ میں یہ انقلاب آیا کہ مہدی ہونے کے جھوٹے دعوے دار ایک طالع آزما عبیداللہ بن میمون نے تیونس میں اپنی مضبوط حکومت قائم کرکے بنوعباس کی باج گزار دولتِ اغالبہ کا خاتمہ کردیا۔ اس طرح تیونس ہمیشہ کے لیے عباسی خلافت سے الگ ہوگیا۔ ۳۰۱ھ میں عبیداللہ بن میمون نے مصر پر حملہ کیا۔ قریب تھا کہ وہ قاہرہ پر قبضہ کرلیتا کہ دریائے نیل میں طغیانی آگئی اور اسے واپس جانا پڑا۔ ۳۰۶ھ اور ۳۰۸ھ میں اس نے مصر پر مزید حملے کیے اور دریائے نیل کے مغرب کا سارا علاقہ زیرِ نگین کرلیا۔[2]

۳۰۵ھ میں اس نے مراکش سے دولتِ ادارسہ کا خاتمہ کردیا جو ۱۷۰ھ میں قائم ہوئی تھی، اس کے بانی ایک صحیح النسب علوی ادریس بن عبداللہ (م ۱۷۷ھ۔ نفسِ زکیہ کے بھائی) تھے۔ ان کے بعد ان کی اولاد میں یہ حکومت چلتی ایک مدت تک چلی۔ ان کا بیٹا ادریس بن ادریس (م ۲۱۳ھ) ان کا وارث ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمد بن ادریس (م ۲۲۱ھ) پھر اس کے بیٹے علی بن محمد (م ۲۳۴ھ) اور یحییٰ بن محمد یکے بعد دیگرے حکمران ہوئے۔

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۷۴، ۲۷۵ ط نزار؛ العبر فی خبر من غبر: ۴۳۱/۱

[2] تاریخ الخلفاء، ص ۲۷۶؛ العبر فی خبر من غبر: ۴۴۰/۱

ان سادات کے عقائد و اعمال وہی تھے جو اہلِ سنت والجماعت کے ہیں۔ صحیح النسب سادات کی یہ حکومت آخر میں مہدویت کے جھوٹے مدعی عبید اللہ بن میمون کے رافضی جانشینوں کے ہاتھوں دم توڑ گئی۔ [1]

منصور حلاج کا قتل:

۳۰۱ھ میں مشہور صوفی حسین بن منصور حلاج کو گرفتار کر کے بغداد لایا گیا اور منادی کی گئی کہ یہ قرامطیوں کا داعی ہے۔ آٹھ سال قید رکھنے کے بعد ۳۰۹ھ میں قاضی ابو عمر کے فتوے کے مطابق حلاج کو سزائے موت دے دی گئی۔ [2]

منصور حلاج کو تاریخ کی انتہائی متنازعہ شخصیات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ایک طبقے نے انہیں درویشِ خدامست، عاشق صادق اور فانی فی اللہ قرار دیا اور دوسرے نے مرتد و زندیق۔ آج تک یہ بحث جاری ہے۔ حقیقت اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ [3]

رومیوں سے صلح اور جنگ:

۳۰۵ھ میں قیصرِ روم نے باہمی تعلقات بہتر بنانے اور پائیدار دوستی کے لیے اپنے سفیر دربارِ خلافت بھیجے۔ مقتدر نے پورے شہر کو دلہن کی طرح سجا کر ایک لاکھ ساٹھ ہزار سپاہیوں کے جلو میں ان کا استقبال کیا اور صلح نامے کی توثیق کر دی۔ مگر یہ صلح نامہ ایک نئی جنگ کی تیاری کے سوا کچھ نہ تھا۔ رومیوں نے اندرونی خلفشار کی وجہ سے صلح کی تھی۔ ۹ سال بعد جونہی ان کی حکومت مضبوط ہوئی، انہوں نے عالمِ اسلام پر زوردار حملے شروع کر دیے۔ ۳۱۴ھ میں مَلَطْیہ، اگلے سال سمیساط اور ۳۱۶ھ میں خلاط پر بھی قبضہ کر لیا۔ یہاں کی مساجد کے منبر گرا کر انہیں گرجوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ [4]

دیلمی شیعوں اور قرامطہ کی یورش:

اس دوران عالمِ اسلام کو ایک نئی مصیبت سے سابقہ پڑا۔ یہ شمالی ایران کے کوہستانی علاقے دَیلم کے مجوسیوں کی عالمِ اسلام پر یورش تھی۔ ان کا سردار مَرداویج دیلمی تھا۔ اس کا کہنا تھا: ''میں عربوں کی حکومت مٹا دوں گا اور عجم کی سلطنت قائم کروں گا۔'' ان بدبختوں نے رے پر قبضہ کر کے مسلمانوں کا بے دریغ خون بہایا اور بچوں تک کو ذبح کرتے چلے گئے۔ دوسری طرف حجاز تک قَرامِطہ کا تسلط ہو گیا۔ ۳۱۶ھ میں انہوں نے حاجیوں کے قافلوں کو اس قدر لوٹا کہ مکہ کے راستے بند ہو گئے۔ اہلِ مکہ کو شہر چھوڑنا پڑا اور باہر کے مسلمانوں کے لیے حج کا سفر ناممکن ہو گیا۔ [5]

---

① الاستقصاء لاخبار دول المغرب الاقصی: ۲۰۳/۱ تا ۲۲۸ ② تاریخ الخلفاء، ص ۲۷۶؛ العبر فی خبر من غبر: ۴۴۹/۱

نوٹ: یہ قاضی ابو عمر محمد بن یوسف رحمہ اللہ (۲۴۳۔۳۲۰) ہیں۔ ۲۸۴ھ میں قاضی بنے۔ عقل و دانش اور تدبر و بردباری میں وہ ضرب المثل تھے۔ فقہ اور حدیث کے امام تھے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ کے شیخ تھے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لانظیر له فی الحکام عقلاً و حلماً و ذکاءً. ﴿تاریخ الاسلام: ۶۱۵/۲۳﴾

③ بہت سے صوفیائے کرام اور قریبی دور کے اکثر مؤرخین اور سوانح نگاروں کی کتب میں منصور حلاج کے کلام کی تاویلات پیش کی گئی ہیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے بھی حلاج کے کلام کی تاویل کی ہے اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے حکم سے مولانا ظفر احمد عثمانی مرحوم نے ''سیرتِ منصور حلاج'' کے عنوان سے ایک مفصل کتاب لکھی ہے جو قابلِ مطالعہ ہے، اس میں حلاج کو تمام الزامات سے بری قرار دیا گیا ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ قدیم مؤرخین اور محققین جیسے: حافظ ابن حجر، حافظ ذہبی اور حافظ ابن کثیر رحمہم اللہ نے منصور حلاج کو گمراہ اور ملحد کہا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس پر بہت تفصیل سے کلام کیا ہے جو البدایہ والنہایہ اور تاریخ الاسلام ذہبی میں ۳۰۹ھ میں فوت ہونے والی شخصیات کے تحت دیکھا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

④ تاریخ الخلفاء، ص ۲۷۷ ⑤ تاریخ الخلفاء، ص ۲۷۷

قرامطہ حجرِ اسود اکھاڑ کر لے گئے:

پھر قرامطہ کے ہاتھوں عالمِ اسلام کو ایک ایسا سانحہ پیش آیا کہ مسلمان گزشتہ تمام مصائب کو بھول گئے۔ ان ظالموں نے ۳۱۷ھ میں عین حج کے دنوں میں مکہ پر دھاوا بولا اور حاجیوں کا قتل عام کرنے کے بعد حجرِ اسود کو اکھاڑ کر اپنے مرکز ''الاحساء'' (بحرین) لے گئے۔ بیس سال تک یہ ان کے پاس رہا اور مسلمان حجرِ اسود کے بغیر حج ادا کرتے رہے۔ آخر کار ۳۳۹ھ میں حجرِ اسود مسلمانوں کو واپس ملا اور اسے دوبارہ نصب کیا گیا۔ [1]

مذہبی مناظرے:

ایک طرف عالمِ اسلام کا یہ حال تھا اور دوسری طرف مسلمانانِ بغداد مذہبی مناظروں میں ایک دوسرے کا سر پھوڑ رہے تھے۔ ۳۱۷ھ میں بغداد میں علماء کا اس آیت پر مناظرہ چل رہا تھا:

عَسٰٓی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا [2]

ایک جماعت کہتی تھی کہ اس سے مراد یہ ہے کہ حضور ﷺ کو شفاعت کا اعزاز ملے گا۔ دوسرے فریق کا موقف تھا کہ اس کا مطلب ہے کہ اللہ حضور ﷺ کو اپنے عرش پر بٹھائے گا۔ بات بڑھتی چلی گئی اور فریقین ایک دوسرے پر پل پڑے۔ یہاں تک کہ میدانِ مناظرہ میں بیسیوں لاشیں گر گئیں۔ [3]

خواتین کا راج اور ناکام بغاوت:

مقتدر نے ۳۲۰ھ تک حکومت کی جو درحقیقت برائے نام ہی تھی۔ ہر جگہ امراء اپنے اپنے طور پر فیصلے کیا کرتے تھے۔ اس کی خلافت کے آخری پندرہ سال نہایت افراتفری میں گزرے۔ اس کی نااہلی کے سبب امورِ مملکت اس کی والدہ نے سنبھال لیے اور ۳۰۶ھ میں باقاعدہ دربار لگا کر احکام جاری کرنے لگی۔ خواتین کی اس دخل اندازی نے دربارِ خلافت کا وقار مزید گرگیا۔ بدنظمی، گرانی، قحط اور طرح طرح کے مسائل نے عوام کی زندگی اجیرن کردی۔

ملک کی بدحالی، مقتدر کی نااہلی اور قصرِ خلافت پر خواتین کا راج دیکھ کر خود بنوعباس کے کچھ امراء نے ۴محرم ۳۱۷ھ کی شب بغاوت کردی، قصرِ خلافت میں گھس کر سب کچھ لوٹ لیا اور خلیفہ مقتدر کے بھائی کو قاہر باللہ کا لقب دے کر خلیفہ بنادیا۔ مگر صرف ایک دن بعد نئے خلیفہ پر ان کا اعتماد ختم ہوگیا اور انہوں نے دوبارہ مقتدر کو خلیفہ مان لیا۔

اس موقع پر قاہر نے گڑگڑا کر اپنے بھائی سے جان بخشی کی درخواست کی۔ مقتدر نرم دل تھا، اس نے کہا:

''جو کچھ ہوا، اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں کبھی تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچاؤں گا'' اور اس نے ایسا ہی کیا۔ [4]

دوسری بغاوت اور مقتدر کا قتل:

۳۱۹ھ میں عراق میں بدامنی کی انتہاء ہوگئی۔ ایک طرف سے قرامطہ کوفہ تک پہنچ گئے اور اہلِ بغداد کو اپنے گھر

---

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۷۸؛ البدایۃ والنہایۃ: ۳۳۹ھ

[2] ترجمہ: امید ہے کہ آپ کا رب آپ کو فائز کرے مقام محمود پر۔ (سورۃ الاسراء، آیت: ۷۹)

[3] تاریخ الخلفاء، ص ۲۷۸

[4] تاریخ الخلفاء، ص ۲۷۷

خطرے کی زد میں دکھائی دینے لگے۔ دوسری طرف دَیلم کے شیعہ، دینور تک آن پہنچے اور وہاں قتل وغارت کا بازار گرم کر دیا۔ مگر خلیفہ مقتدر بے فکری کے ساتھ عیش وآرام میں منہمک تھا۔ اس صورتحال میں لوگ سخت مضطرب تھے۔

آخر ۲۷ شوال ۳۲۰ھ کو ایک درباری مؤنس خادم نے بربروں کو ساتھ ملا کر بغاوت کر دی۔ خلیفہ کو قتل کر کے نعش سے لباس تک اتار لیا گیا۔ کچھ لوگوں نے ترس کھا کر اسے ڈھانپا اور وہیں دفن کر دیا۔ مقتدر کی عمر ۳۸ سال تھی۔ [1]

❖❖❖

[1] البدایة والنهایة: ۱۵/۵۹؛ العبر فی خبر من غبر: ۲/۷

القاہر باللہ

محمد بن احمد المُعتضِد

شوال ۳۲۰ھ تاجمادی الآخرہ ۳۲۲ھ

نومبر ۹۳۲ء تا جون ۹۳۴ء

مقتدر کی جگہ اس کے ۳۴ سالہ بھائی محمد بن مُعتضِد کو خلیفہ بنادیا گیا جس نے قاہر باللہ کا لقب اختیار کیا۔ وہ اپنے لقب کی طرح واقعی سخت گیر تھا۔ اس نے اقتدار حاصل کر کے سب سے پہلے، سابق خلیفہ مقتدر (جو اس کا باپ شریک بھائی تھا) کے پورے خاندان کو انتقام کا نشانہ بنایا۔ مقتدر کی والدہ کو جو امور خلافت پر حاوی تھی، حراست میں لے کر اتنا تشدد کیا گیا کہ وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

قاہر کی سختی کا یہ حال تھا کہ اس نے ایسے لوگوں کو بھی قتل کرا دیا جن کی بدولت اسے اقتدار ملا تھا۔

مؤنس خادم دربار میں سب سے زیادہ بارسوخ امیر تھا۔ مقتدر کے خلاف بغاوت کا سربراہ وہی تھا۔ قاہر کو یقین تھا کہ مؤنس اسے کٹھ پتلی بنا کر رکھے گا۔ چنانچہ ایک دن قاہر نے موقع پا کر اسے حیلے بہانے سے حراست میں لے لیا اور بلا تامل ذبح کرا دیا۔ یہی سزا کچھ دوسرے سرکردہ امراء کو دی گئی اور ان کے کٹے ہوئے سر شہر میں گھمائے گئے۔

قاہر کا بھتیجا شہزادہ محمد بن مکتفی یقیناً حسنِ سلوک کا مستحق تھا؛ کیوں کہ اس نے قاہر کا ساتھ دیا تھا۔ جب مقتدر کے قتل کے بعد باغی امراء کے اجلاس میں یہ طے کیا جانے لگا تھا کہ اب کس شہزادے کو خلیفہ بنایا جائے تو محمد بن مکتفی نے اپنا نام امیدوارانِ خلافت سے خارج کرا کے کہا تھا: ''میرے چچا قاہر باللہ خلافت کے بہتر حق دار ہیں۔''

مگر قاہر باللہ کو پھر بھی شک تھا کہ مستقبل میں کہیں وہ بغاوت نہ کر دے، چنانچہ اسے ایک کوٹھری میں بند کرا کے اس پر مٹی کا پلستر کرا دیا اور وہ بے چارہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ یہی انجام اسماعیل بن اسحاق کا ہوا جس نے قاہر کو خلیفہ بنانے کی سفارش کی تھی۔ کسی پرانی ناراضی کی بناء پر اسے اندھے کنویں میں پھینک دیا گیا اور کنویں کو مٹی سے پاٹ دیا گیا۔

زوال کے اس دور میں بغداد میں گانے بجانے اور شراب نوشی کا رواج عام ہو گیا تھا۔ قاہر نے سختی سے ان تمام منکرات کو روک دیا۔ گلوکاراؤں، ہیجڑوں اور گویّوں کو شہر سے نکال دیا۔ مگر دوسری طرف قاہر خود اکثر پینے پلانے اور رقص و سرود سے جی بہلایا کرتا تھا۔ گفتار و کردار میں اس قدر تضاد کے ساتھ اصلاحِ معاشرہ بھلا کہاں ہو سکتی ہے۔[1]

[1] تاریخ الخلفاء: ص ۲۷۹، ۲۸۰

دیلمیوں کا تسلط۔ قاہر کا انجام:

قاہر کی حکومت کے آخری سال ۳۲۲ھ میں دیلمیوں کا سردار مرداویج اصفہان اور شیراز سمیت پورے فارس پر قابض ہوگیا۔ اس طرح وسطِ ایشیا، خراسان، شام و مصر اور افریقہ کے بعد ایران بھی خلافت عباسیہ سے الگ ہوگیا۔ عباسی عمل داری صرف عراق تک محدود رہ گئی۔ قاہر کا دور صرف دو سال رہا۔ اسے یہ غلط فہمی تھی کہ وہ لرزہ خیز مظالم ڈھا کر بہت بڑا حکمران بن جائے گا مگر اس کے ظلم وستم سے تنگ آئے ہوئے امراء اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ٦ جمادی الآخرہ ۳۲۲ھ کو انہوں نے قاہر کو گرفتار کرلیا اور اس کی آنکھوں میں گرم سلائیاں گھونپ دیں۔ قاہر گیارہ سال تک قید رہا۔[1]

۳۳۳ھ میں اسے رہائی ملی تو بغداد کی مساجد میں بھیک مانگنے لگا۔ اس سے دربارِ خلافت کی سبکی ہوئی؛ لہٰذا اسے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ اسی حال میں وہ ۳۳۹ھ میں فوت ہوگیا۔[2]

◆◆◆

---

① تاريخ الخلفاء، ص ٢٨١، ٢٨٢

② تاريخ الخلفاء، ص ٢٨٢

الراضی باللہ

محمد بن جعفر المقتدر

جمادی الآخرہ ۳۲۲ھ تا ربیع الاوّل ۳۲۹ھ

جون ۹۳۴ء تا دسمبر ۹۴۰ء

قاہر کی جگہ سابق خلیفہ مقتدر باللہ کے بیٹے محمد کو راضی باللہ کا لقب دے کر مسندِ خلافت پر بٹھایا گیا۔ وہ اس وقت ۲۵ سال کا تھا۔ ایک عالم فاضل اور ادیب وشاعر نوجوان تھا۔ نیک، رحم دل، مہربان اور شریف النفس تھا۔ تاہم اس کا دورِ حکومت امراء کی خانہ جنگیوں میں گزر گیا اور وہ رضا بالقضا پر عمل پیرا رہا۔ بلاشبہ وہ ''اسم با مُسَمّیٰ'' تھا۔

اس کی حکومت کے پہلے سال ۳۲۲ھ میں دولتِ بنوعبید کا بانی عبید اللہ مہدی بن میمون چل بسا جو سخت متعصب رافضی تھا۔ اسی نے دنیائے اسلام کی پہلی رافضی حکومت قائم کی جو تین صدیوں تک باقی رہی اور اس سے فتنہ وفساد کا ایسا مادہ پھوٹا جس کے نقصانات کی صدیوں تک تلافی نہ ہوسکی۔[1]

دولتِ بنو بُوَیہ کا قیام:

راضی کی حکومت کے پہلے سال ۳۲۲ھ میں ایک نئی رافضی حکومت قائم ہوئی جس کا بانی علی بن بُوَیہ تھا۔ دیلمیوں کا سردار ''مَرداوِیج'' جو فارس پر قابض ہو چکا تھا، اسی سال مرا تھا۔ علی بن بُوَیہ جو پہلے اسی کا سپہ سالار تھا، بزورِ قوت اس کے کئی علاقوں پر قبضہ کر چکا تھا مگر وہ اپنی حکومت کے استحکام سے پہلے خلافتِ عباسیہ کو چوکنا نہیں کرنا چاہتا تھا؛ لہٰذا اس نے راضی باللہ کو پیغام بھیجا کہ اسے خلافتِ عباسیہ کے وفادار حکمرانوں میں شمار کرکے پروانۂ حکومت عنایت کیا جائے۔ اس کے عوض وہ سالانہ ۸۰ کروڑ درہم خراج دیا کرے گا۔

راضی باللہ ایک تو سیاسی شعور سے نابلد تھا، دوسرے مددگاروں سے یکسر محروم تھا۔ اس نے علی بن بُوَیہ کی فریب آمیز پیش کش کو غنیمت سمجھا اور اس کو ''عمادالدولہ'' کا لقب دے کر فارس کا جائز حکمران مان لیا مگر علی بن بُوَیہ نے خراج کی رقم کبھی وقت پر اور مکمل ادا نہیں کی بلکہ ہمیشہ ٹال مٹول کرتا رہا۔ علی بن بُوَیہ کی قائم کردہ اسی ''دولتِ بنی بُوَیہ'' نے آگے چل کر خلفاء کو یرغمال بنالیا۔ یہ رافضی ریاست مسلمانوں کے لیے طویل عرصے تک دردِ سر بنی رہی۔

علی بن بُوَیہ کے ''عمادالدولہ'' بننے کے بعد عالم اسلام میں ''دَولوں'' کا دور دورہ ہوتا گیا۔ مُعِزّ الدولہ، رکن الدولہ، سیف الدولہ، ناصر الدولہ، تاج الدولہ، شمس الدولہ...... ہر شہر میں ایک ''دَولہ'' تھا مگر جسے دیکھیں ''اونچی دکان پھیکا پکوان'' کا مصداق تھا۔ ایسے ''دَولوں'' کی اکثریت رافضی تھی یا تشیع کی طرف مائل تھی۔[2]

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۲

② البدایة والنهایة: ۷۱/۱۵، ۷۷، ۸۱، ۹۵، ط دارهجر؛ تاریخ ابن خلدون: ۴۹۰/۳ تا ۴۹۵، ط دارالفکر

ابن رائق کی خود مختاری۔ حکمرانِ اندلس کا دعوائے خلافت:

راضی باللہ بہت کمزور خلیفہ تھا؛ اس لیے اس کی حکومت کے تیسرے برس ۳۲۴ھ میں واسط کا حاکم محمد بن رائق عراق کا خود مختار حکمران بن بیٹھا اور دربارِ خلافت کو محصولات کی فراہمی بند ہوگئی۔ اس طرح راضی باللہ برائے نام خلیفہ رہ گیا۔ یہ دیکھ کر ۳۲۵ھ میں اندلس کے خود مختار اموی امیر عبدالرحمن سوئم نے وہاں خلافت کا دعویٰ کر دیا اور ''الناصر لدین اللہ'' کا لقب اختیار کر لیا۔[1]

پرآشوب حالات:

مسلمانوں کی کمزوری کا یہ عالم تھا کہ قرامطی حجاز کے راستوں پر قابض تھے اور کوئی حج کے لیے نہیں جا سکتا تھا۔ آخر ۳۲۷ھ میں ان بدبختوں کو یہ پیش کش کی گئی کہ اگر وہ ناکہ بندی کھول دیں تو انہیں فی حاجی پانچ دینار ادا کیے جائیں گے۔ تب قرامطی مانے اور مشرقی ممالک کے لوگ حج کو جا سکے۔ حکومت کی کمزوری اور دیوالیہ پن کی رہی سہی کسر ۳۲۸ھ میں دریائے دجلہ کی سیلابی تباہ کاریوں نے نکال دی۔ بغداد اس کا سب سے زیادہ شکار ہوا۔ شہر کی گلیوں میں بارہ بارہ فٹ پانی چڑھ آیا اور بے پناہ جانی و مالی نقصان ہوا۔

راضی باللہ کے آخری سالوں میں خلافت کا اختیار بغداد اور گردونواح ہی تک رہ گیا تھا۔ بصرہ پر محمد بن رائق، فارس و ایران پر علی بن بُوَیہ اور اس کا بھائی حسن بن بُوَیہ، موصل، الجزیرہ اور کردستان پر بنو حمدان، طبرستان پر دَیلمی اور بحرین و حجاز پر قرامطی قابض تھے۔ ان میں سے جن حکمرانوں نے وفاداری کا وعدہ کر کے سندِ حکومت لے رکھی تھی وہ کبھی کبھی تھوڑا بہت خراج بھی دے دیتے تھے۔

بغداد کا یہ حال تھا کہ معتزلہ کا زور یقیناً کم ہوگیا تھا مگر خود اہلِ سنت کے مکاتبِ فکر فروعی مسائل پر لڑ جھگڑ رہے تھے۔ ہر گروہ دین کے بارے میں اپنی تعبیر کو حتمی سمجھتا اور اسی کو نافذ کرنا چاہتا تھا۔ حنبلی علماء کو اس زمانے میں غلبہ حاصل تھا؛ اس لیے ۳۲۳ھ میں انہوں نے بزورِ طاقت پورے شہر میں اپنے مسلک کے نفاذ کی کوشش شروع کر دی۔ اس پر دوسرے مکاتبِ فکر میں اشتعال پھیل گیا۔ ہر گروہ کے عوام دوسرے پر چڑھ دوڑے۔ آخر خلیفہ کی مداخلت اور سرکاری طاقت استعمال کر کے اس ہنگامے پر قابو پایا گیا۔[2]

عباسی وزیر ابن مُقلَہ کا قتل:

بغداد اندرونی سازشوں کی آماجگاہ تھا اور عراق و شام خانہ جنگیوں کی۔ ہر امیر دوسرے کو دبانے پر تلا ہوا تھا۔ محلاتی سازشوں کا حال یہ تھا کہ اچھے اچھے قابل لوگ اپنی صلاحیتوں کو اس گورکھ دھندے میں ضائع کر رہے تھے۔

اس دور میں ابوعلی ابن مُقلَہ (۲۷۲ھ۔ ۳۲۸ھ) دربارِ خلافت کا ایک سرکردہ رئیس تھا۔ وہ سرکاری دفتر میں چھ

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۳

② تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۳

دینار ماہوار پر منشی مقرر ہوا تھا مگر علمی قابلیت نے بہت جلد اسے بلند مرتبہ بنا دیا۔ وہ عباسی عہد کا عظیم ترین خوش نویس تھا۔ اس نے عربی کتابت کو ایک نیا رخ دیا اور خطِ کوفی کی جگہ خطِ نسخ کو متعارف کرایا جو آج تک رائج چلا آ رہا ہے۔
وہ گزشتہ خلفاء کے زمانے میں دو مرتبہ وزیر رہا تھا۔ خلیفہ راضی باللہ نے اس کی قابلیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے اسے ۳۲۶ھ میں دوبارہ وزیر بنایا تو اس نے ابن رائق کا اقتدار ختم کرنے کی منصوبہ بندی کی مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر پاتا، ابن رائق کو پتا چل گیا۔ انجام یہ ہوا کہ ابن مُقلہ کا ایک ہاتھ اور زبان کاٹ کر اسے کال کوٹھری میں پھینک دیا گیا۔ یہ شوال ۳۲۶ھ کا واقعہ ہے۔ دو برس بعد ابنِ مُقلہ کی جیل ہی میں وفات ہوئی۔ [1]
مگر ابن رائق کو اس کے بعد زیادہ دنوں تک بغداد پر مسلط رہنے کا موقع نہ ملا؛ کیوں کہ اس کا نائب بجکم دَیلمی اس کی اطاعت سے آزاد ہو کر بغداد میں گھسنے لگا تا کہ خلیفہ پر حکم چلائے۔ ابن رائق نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر مقابلے میں منہ کی کھائی اور بغداد پر اس نئے طالع آزما "بجکم" کا راج ہو گیا جسے خلیفہ "امیر الامراء" کا خطاب دینے پر مجبور ہوا۔ یہ ایک نیا لقب تھا جس کا مطلب "بادشاہ گری" تھا۔ اگلے عشروں کی سیاست میں ایسے کئی "امیر الامراء" آئے اور وہی بغداد کے اصل کرتا دھرتا رہے۔ [2]

راضی کی وفات:

سیاسی لحاظ سے راضی باللہ کا دور سراسر ناکامی کا مرقع تھا۔ وہ آخری خلیفہ تھا جو جمعے کا خطبہ خود دیتا تھا۔ ۱۵ ربیع الاوّل ۳۲۹ھ کو وہ بیمار ہو کر چل بسا۔ اس کے بعد خلفاء نے خطبۂ جمعہ کی ذمہ داری بھی اپنے نائبین کو سونپ دی۔ [3]

دولتِ اِخشِید یہ کا قیام:

راضی باللہ کے عہدِ خلافت میں مصر و شام کی "دولتِ اِخشِید یہ" قائم ہوئی۔ اس کا بانی ایک ترک سردار ابوبکر محمد بن طُغج تھا۔ جب مصر اور شام سے دولتِ طولونیہ کا خاتمہ ہوا تو وہاں کے گورنر ایک بار پھر خلافتِ عباسیہ کی طرف سے مقرر ہونے لگے تھے۔ اس عہدے کے لیے مقامی امراء کی کش مکش نے مصر اور شام کو بدحال کر دیا۔ آخر ایک قابل رئیس محمد بن طُغج کو اس کی قابلیت کی بناء پر ۳۲۱ھ میں مصر کی گورنری سپرد کر دی گئی۔ محمد بن طغج بڑا دلیر اور زور آور انسان تھا۔ اس کا دادا ان ترک غلاموں میں شامل تھے جنہیں خلیفہ معتصم نے فرغانہ سے منگوا کر اپنے ہاں ملازم رکھا تھا۔ اس کا باپ طغج حاکمِ مصر احمد بن طولون کا مقرب تھا۔ [4]
محمد بن طغج نے نہ صرف سیاسی افراتفری ختم کر کے امن و امان قائم کیا بلکہ افریقہ سے یلغار کرنے والے بنوعبید کا بڑی پامردی سے مقابلہ کر کے مصر کو محفوظ بھی رکھا جس کے صلے میں عباسی خلیفہ راضی باللہ نے ۳۲۳ھ میں شام کی حکومت بھی اسی کو سونپ دی اور اسے "اِخشِید" کا لقب عنایت کیا جو ترکی زبان میں "امیر الامراء" کے ہم معنی ہے۔

---

[1] الاعلام زرکلی: ۲۷۳/۶، ۲۷٤؛ البدایة والنهایة: ۱۰۷/۱۵
[2] تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۳؛ العبر فی خبر من غبر: ۳٤/۲ تا ٤٨
[3] الکامل فی التاریخ: ۳۲۲ھ تا ۳۲۷ھ
[4] تاریخ الاسلام ذهبی: ۱۱۲/۲۵، تدمری

۳۲۶ھ میں محمد بن رائق کے تسلط کے باعث عباسی خلیفہ راضی باللہ کی حیثیت برائے نام رہ گئی۔ یہ دیکھ کر اخشید نے ۳۲۷ھ میں شام و مصر پر اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ محمد بن رائق نے اسے زیر کرنے کے لیے ۳۲۸ھ میں شام پر لشکر کشی کی اور شام کے کچھ حصے پر قبضہ کر لیا۔ تاہم ۳۳۰ھ میں (اگلے خلیفہ متقی کے دور میں) ابن رائق قتل کر دیا گیا جس کے بعد پورا شام اخشید کے ہاتھ آ گیا۔ [1]

اِخشید کی وفات اور کافور کا عروج:

اِخشید تیرہ سال حکومت کر کے ذوالحجہ ۳۳۴ھ میں فوت ہوا۔ اس کی عمر ۶۶ سال تھی۔ [2]

اس کے بعد اس کا پندرہ سالہ بیٹا ابوالقاسم اَنوجور، تخت نشین ہوا مگر وہ کم عمری کی وجہ سے حکومت چلانے کے قابل نہیں تھا؛ اس لیے ایک بہادر اور زیرک حبشی غلام کافور نے امورِ سیاست اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ [3]

۳۴۹ھ میں ابوالقاسم کی وفات ہوئی تو اس کا بھائی علی تخت نشین ہوا۔ کافور بدستور سلطنت کا منتظمِ اعلیٰ رہا۔ ۳۵۵ھ میں علی بھی فوت ہو گیا اور کافور خود حکمران بن گیا۔ ۳۵۶ھ میں کافور فوت ہو گیا۔ [4]

دولتِ اِخشیدیہ کا زوال اور خاتمہ:

کافور کے بعد دولتِ اِخشیدیہ کمزور پڑ گئی۔ اِخشید کا پوتا احمد بن علی تخت نشین تو ہوا مگر اسے زیادہ مہلت نہ ملی اور ۳۵۸ھ میں بنوعبید نے مصر فتح کر کے دولتِ اِخشیدیہ کا خاتمہ کر دیا۔ یوں ''دولتِ اِخشیدیہ'' فقط ۳۱ سال چل سکی۔ [5]

❖❖❖

---

① التاریخ الاسلامی از محمود شاکر: ۶/۱۳۰، ۱۳۱

② سیر اعلام النبلاء: ۱۵/۳۶۶

③ النجوم الزاهرہ: ۳/ ۲۹۱؛ تاریخ الاسلام ذهبی: ۲۵/۳۰ ت تدمری؛ الاعلام زرکلی: ۶/۱۷۴، ۱۷۵

④ العبر فی خبر من غبر: ۲/۹۹

مشہور عرب شاعر متنبی جو پہلے سیف الدولہ کا ندیم تھا، بعد میں مصر جا کر کافور کا درباری بنا اور اس کی قصیدہ گوئی کرتا رہا۔ جب کافور کی ملازمت چھوڑ کر بھاگا تو اس کی بدترین ہجو کی جس سے کافور کی بڑی سبکی ہوئی، حالانکہ وہ بڑا قابل اور رعایا پرور حاکم تھا۔ دولتِ اخشیدیہ کا دماغ وہی تھا۔ (وفیات الاعیان: ۴/۱۰۰تا۱۰۴)

⑤ موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲۳۲

المُتّقی للّٰہ

ابراھیم بن جعفر المقتدر

ربیع الاوّل ۳۲۹ھ تا صفر ۳۳۳ھ

دسمبر ۹۴۰ء تا اکتوبر ۹۴۴ء

راضی کی موت کے بعد اس کا بھائی ابو اسحٰق المتقی للہ کے لقب سے مسندِ خلافت پر بیٹھا۔ وہ بھی ''اسم با مُسَمّیٰ'' تھا۔ نہایت پرہیز گار اور عابد و زاہد انسان تھا۔ شراب تو دور کنار کبھی نبیذ کو بھی ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ محفلِ رقص و سرود تو کجا کبھی فضول مجلس بازی بھی نہیں کی۔ ہر وقت قرآن مجید ساتھ رکھتا تھا اور کہتا تھا: ''یہی بہترین ہم نشین ہے۔''

تاہم اس کا سیاسی کردار کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف نام کا حکمران تھا۔ سارے اختیارات امراء کے پاس تھے۔ جس سال وہ خلیفہ بنا، بغداد کے قدیم قصرِ خلافت کا مشہور و معروف سبز گنبد جو شہر کا تاج سمجھا جاتا تھا، اچانک منہدم ہوگیا۔ اسے خلافت کا بچا کھچا وقار ختم ہونے کی علامت سمجھا گیا اور ایسا ہی ہوا۔ اس دور میں خلافت کی نبضیں ڈوبنے لگیں اور وہ مکمل طور پر پابندِ سلاسل ہوگئی۔ ①

ظالم امراء کا خلیفہ اور شہریوں سے سلوک:

دارالخلافہ کے چاروں طرف خود سر اور سرکش امراء فوجیں لیے ایک دوسرے سے لڑ بھڑ رہے تھے۔ ان میں سے جس کا جی چاہتا وہ بغداد میں گھس کر خلیفہ سے اپنا ہر مطالبہ منوا لیتا تھا۔ شعبان ۳۲۹ھ میں بصرہ کے حاکم ابو عبداللہ بَریدی نے بغداد میں گھس کر خلیفہ سے مطالبہ کیا کہ پانچ لاکھ دینار دے ورنہ قتل ہونے کے لیے تیار ہو جائے۔ خلیفہ کو یہ رقم دینی ہی پڑی۔ ② بَریدی نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ شہر کے لوگوں سے مویشی، غلہ اور دیگر اثاثے بھی لوٹنا شروع کر دیے۔ علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ نے یہ واقعات نقل کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے:

''ظالم جان لیں کہ ان کی کرتوتوں کی خبریں نقل ہوتی رہیں گی اور تا قیامت دنیا میں باقی رہیں گی۔ اگر وہ اللہ سے ڈر کر ظلم نہیں چھوڑتے تو (کم از کم) بدنامی کے ڈر سے ہی چھوڑ دیں۔'' ③

''امیر الامراء'' کے منصب کے لیے امراء کی لڑائیاں:

پہلے خلفاء پر صرف ترکوں کی اجارہ داری تھی۔ اب ہر طالع آزما یہ شوق پورا کرنا چاہتا تھا۔ دیلمی شیعوں، بنو بُویہ کے رافضیوں اور ترک امراء میں سے ہر ایک ''امیر الامراء'' یعنی بغداد کا بادشاہ گر بننا چاہتا تھا۔

متقی کے دور میں سب سے پہلے کورتکین نامی ایک دیلمی سردار نے یہ اعزاز جبراً حاصل کیا اور امیر الامراء کے اختیارات میں یہ بات بھی شامل کرا دی کہ وہ دجلہ اور فرات کے درمیانی زرخیز علاقے دوآبہ کا آزاد حاکم ہوگا۔ اس

① تاریخ الخلفاء، ص ۲۸٤ ② الکامل فی التاریخ، سنة ۳۳۰ھ ③ تاریخ الخلفاء، ص ۲۸٤

سے پہلے یہ علاقہ خلیفہ کے ماتحت تھا۔ یوں خلفاء کا اختیار بغداد کے مضافات سے بھی ختم ہو گیا۔ صرف بغداد میں ان کی تھوڑی بہت حکومت رہ گئی۔ کورتکین کی شان وشوکت حاکم بصرہ محمد بن رائق سے برداشت نہ ہوئی تو وہ لاؤ لشکر لیے بغداد آن پہنچا اور کورتکین کو بھگا کر یہ منصب چھین لیا۔ پھر یکے بعد دیگرے امیر الامراء بدلتے چلے گئے۔

خانہ جنگی کے اس دور میں مسلمانوں کی سرحدیں اس قدر غیر محفوظ ہو گئیں کہ ۳۳۱ھ میں رومی کردستان تک آن پہنچے۔ نصیبین اور میافارقین میں انہوں نے جی بھر کے غارت گری کی اور لوگوں کو قیدی بنالیا۔ [1]

رومال کے بدلے روم سے مسلمان قیدیوں کی رہائی:

ان ایام کا ایک دلچسپ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ قیصرِ روم کی جانب سے خلیفہ متقی کو پیغام بھیجا گیا کہ رُہا کے قدیم گرجے کے کسی صندوق میں ایک رومال محفوظ ہے جس سے حضرت مسیح نے اپنا منہ پونچھا تھا اور ان کے چہرے کی شبیہ اس رومال پر آ گئی۔ قیصر نے پیش کش کی کہ اگر وہ رومال قُسطَنطِینِیَہ بھیج دیا جائے تو اس کے عوض وہ بہت سے مسلمان قیدیوں کو آزاد کر دے گا۔ خلیفہ متقی نے علماء وفقہاء کو بلا کر اس بارے میں رائے لی۔ سب نے الگ الگ رائے دی۔ کسی نے کہا: ''پیش کش کو قبول کیا جا سکتا ہے۔'' کسی نے کہا: ''یہ رومال صدیوں سے ہمارے پاس ہے، اس سے پہلے کسی بادشاہ نے ہم سے طلب نہیں کیا۔ اب اسے واپس کرنے میں ہماری بے عزتی ہے۔''

آخر میں وزیرِ دولتِ عباسیہ علی بن عیسیٰ نے کہا:

''امیر المؤمنین! مسلمانوں کو قید وبند کی اذیت سے نکالنا اس رومال کی حفاظت سے کہیں زیادہ اہم ہے۔''

اسی رائے پر فیصلہ ہوا، اور رومال کے بدلے قیدیوں کی بڑی تعداد آزاد کرالی گئی۔ [2]

عالم اسلام پر رُوس کا حملہ:

مسلمان اس قدر کمزور سمجھے جانے لگے تھے کہ سینکڑوں میل دور شمال مشرق میں آباد رُوس کی وحشی اقوام بھی عالم اسلام کو تر نوالہ سمجھنے لگیں۔ ۳۳۲ھ میں ان کا ایک لشکر گرجستان کے دریائے کُر کو عبور کر کے مسلم آبادیوں تک پہنچ گیا۔ ان کی آمد سے ہر طرف خوف پھیل گیا۔ ''بَردَعَہ'' کا رئیس مَرزُبان بن محمد پانچ ہزار رضا کار لے کر مقابلے پر نکلا مگر اسے شکست ہوئی اور رُوسی بَردَعہ پر قابض ہو گئے۔ انہوں نے تین دن کے اندر شہر خالی کرنے کا حکم دیا۔ جو لوگ نکل گئے، وہ بچ گئے۔ باقی آبادی کو انہوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا اور حسین عورتوں کو باندیاں بنا کر ساتھ لے گئے۔

اس دوران مَرزُبان بن محمد اردگرد کے علاقوں میں جہاد کی صدا لگا کر تیس ہزار رضا کاروں کی ایک اور فوج تیار کر چکا تھا۔ وہ رُوسیوں کے تعاقب میں نکلا اور صبح وشام حملے کر کے انہیں روکنے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر ایک جگہ کھلے میدان میں آمنا سامنا ہوا۔ گھمسان کی جنگ کے بعد مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔ مَرزُبان یہ دیکھ کر اپنے خاص دستے سمیت دشمن پر حملہ آور ہوا۔ اس کی شجاعت نے مفرور مسلمانوں کو بھی حوصلہ بخشا اور وہ واپس لوٹ آئے۔

[1] تاريخ الخلفاء، ص ٢٨٤، ٢٨٥ [2] الكامل في التاريخ: سنة ٣٣٢هـ

مرزبان بن محمد نے جنگ سے پہلے ہی کچھ فوج دشمن کے عقب میں چھپا دی تھی۔ اس کا اشارہ ملتے پر وہ بھی دشمن پر ٹوٹ پڑی۔ رُوسیوں کا سردار قتل ہوگیا اور وہ پسپا ہو کر جستان کے قلعے "شہرستان" میں محصور ہو گئے جسے وہ اپنا ہیڈ کوارٹر بنائے ہوئے تھے۔ شدید برف باری کے باوجود مسلمانوں نے قلعے کا محاصرہ نہ چھوڑا۔ آخر ایک شب رُوسی مالِ غنیمت اور قیدیوں سمیت خاموشی کے ساتھ قلعے سے نکلے اور کشتیوں میں بیٹھ کر دریائے کُر عبور کر گئے۔ مسلمان ان کا تعاقب نہ کر سکے تاہم ایک ناگہانی بلا سے نجات نصیب ہوگئی۔ [1]

بنوحمدان کی طرف سے خلیفہ کی حمایت:

اس دور میں خانوادۂ بنوحمدان کے دو بھائی: حسن بن عبداللہ اور علی بن عبداللہ خلیفہ کے حامی تھے۔ حسن بن عبداللہ مُوصِل کا حاکم تھا اور علی بن عبداللہ حلب کا۔ انہوں نے ۳۳۰ھ میں امیر الامراء محمد بن رائق کو قتل کر کے خلیفہ متقی کو اس کے چنگل سے نکالا جس پر خوش ہو کر خلیفہ نے حسن بن عبداللہ کو "امیر الامراء" بنا دیا۔ ساتھ ہی اسے "ناصر الدولہ" اور اس کے چھوٹے بھائی علی بن عبداللہ کو "سیف الدولہ" کے خطابات سے نوازا۔ [2]

بنوحمدان کو مسلسل فارس، عراق، شام اور مصر کے حکام کی چیرہ دستیوں کا سامنا رہا؛ لہٰذا وہ بغداد پر زیادہ توجہ نہ دے سکے اور کچھ ہی مدت بعد ۳۳۱ھ میں تُوزُون نامی ایک سرکش سردار بغداد میں آدھمکا اور خلیفہ سے زبردستی "امیر الامراء" کا خطاب اپنے لیے منظور کروایا۔ خلیفہ کو اندازہ ہوگیا کہ وہ بغداد میں بالکل غیر محفوظ ہے۔ چنانچہ ایسے بدبختوں سے بچنے کے لیے خلیفہ کو بغداد چھوڑ کر رَقّہ میں بنوحمدان کے پاس پناہ لینا پڑی۔ وہ ۳۳۳ھ تک وہیں چھپا رہا۔ [3]

خلیفہ متقی کا قتل:

بغداد پر قابض نئے امیر الامراء تُوزُون کی شان اس وقت تک بلند نہیں ہو سکتی تھی جب تک خلیفہ اس کے انگوٹھے تلے نہ ہو۔ اس نے متقی کو معزول کر کے کسی کمزور ترین شہزادے کو کٹھ پتلی خلیفہ بنانے کا منصوبہ بنایا اور جھوٹی خوشامدیں کر کے متقی کو واپسی کی دعوت دی۔ خلیفہ جھانسے میں آ کر ۴ محرم ۳۳۳ھ کو رَقّہ سے بغداد روانہ ہو گیا۔ ۱۴ صفر کو وہ انبار اور ہِیت کے درمیان "سِندِیّہ" پہنچا جہاں تُوزُون اس کا منتظر تھا۔ اس ظالم نے اسی دن خلیفہ کو گرفتار کر کے اندھا کر دیا اور جیل میں ڈال دیا جہاں یہ نیک و صالح خلیفہ پچیس سال تک مصائب جھیلنے کے بعد ۳۵۷ھ میں فوت ہوا۔ [4]

سابق خلیفہ قاہر پہلے ہی اندھا کر کے قید میں ڈالا گیا تھا۔ اس نے متقی کے قید ہونے کی خبر سنی تو خوش ہو کر کہا:

"چلو پہلے ایک اندھا تھا، اب دو ہو گئے۔ بس تیسرے کی کمی ہے۔"

تقدیر کی بات کہ ایسا ہی ہوا۔ کچھ دنوں بعد اگلے خلیفہ مستکفی کا بھی یہی انجام ہوا۔ [5]

---

[1] الکامل فی التاریخ: سنة ۳۳۲ھ، ذکر ملك الروس مدینة بردعة

[2] یہی علی بنوحمدان کا وہ سیف الدولہ ہے جو برسہا برس رومیوں کے حملے روکنے کی کوشش کرتا رہا۔

[3] الکامل فی التاریخ: سنة ۳۳۳ھ؛ الاعلام زرکلی: ۳۵/۹، ط دار العلم

[4] تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۴، ۲۸۵

[5] الکامل فی التاریخ: سنة ۳۳۰ھ تا ۳۳۳ھ؛ العبر فی خبر من غبر: ۵۹/۲

اَلْمُسْتَکْفِی باللّٰہ

عبداللّٰہ بن علی المکتفی

صفر ۳۳۳ھ تا جمادی الآخرہ ۳۳۴ھ

اکتوبر ۹۴۴ء تا فروری ۹۴۶ء

صفر ۳۳۳ھ میں متقی کو نشانۂ عبرت بناتے ہی تُوزُون نے سابق خلیفہ مکتفی باللہ کے بیٹے ابوالقاسم کو بلوا کر مسند خلافت پر بٹھا دیا۔ وہ مستکفی باللہ کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ بدبخت تُوزُون جلد ہی مر گیا مگر خلافت کی لاش پر درجنوں کرگس منڈلا رہے تھے؛ لہٰذا ایک اور عجمی سردار ابن شیرزاد بغداد پر حاوی ہوگیا اور ''امیر الامراء'' بن کر خزانے کی رقم اس بے رحمی سے اڑائی کہ کچھ ہی مدت میں خزانہ خالی ہوگیا۔

تاہم ابھی بغداد کی قسمت میں اس سے کہیں بڑھ مصائب لکھے تھے۔ مستکفی کے خلیفہ بننے کے سوا سال بعد جمادی الآخرہ ۳۳۴ھ میں بنوبُوَیہ کے حاکم احمد بن بُوَیہ نے بغداد پر چڑھائی کی اور ابن شیرزاد کو مار بھگایا۔[1]

◆◆◆

خلیفہ المستکفی کی حکومت برائے نام ہی تھی۔ وہ فقط ایک سال چار ماہ مسندِ خلافت پر بیٹھ سکا اور ۲۲ جمادی الآخرہ ۳۳۴ھ کو معزول کر دیا گیا۔ اس کی معزولی ایک بڑے انقلاب کے باعث ہوئی جس کی وضاحت کے لیے یہاں پر ہم ایک وقفہ کریں گے؛ کیوں کہ یہاں سے امت کی تاریخ کا ایک نیا اور نہایت دردناک باب شروع ہوتا ہے جو ۳۳۴ھ سے ۴۵۱ھ تک محیط ہے اور اس میں نہ صرف بغداد بلکہ پورے ایران اور عراق کا اکثر حصہ اثنا عشری شیعوں: بنوبُوَیہ کے چنگل میں آجاتا ہے۔ ان پرآشوب حالات کا جائزہ ہم اگلے اوراق میں لیں گے۔

مگر اس سے پہلے ان علماء و مشائخ کی علمی و اصلاحی کوششوں پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے جو بنوبُوَیہ کے تسلط سے پہلے کی ایک صدی میں اعتقادی و اخلاقی بگاڑ کو انتہائی حد تک پہنچنے سے روکنے کی مردانہ وار کوشش کرتے رہے۔

---

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۶، ط نزار

بنو عباس کے دورِ زوال کی پہلی صدی میں مشاہیرِ علماء کا کردار

۲۵۰ھ تا ۳۵۰ھ

امام محمد بن جریر الطبری رحمہ اللہ

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور اس دور کے بعض علماء کی کوششوں سے دربارِ خلافت میں خلق قرآن کا مسئلہ ختم ہو چکا تھا مگر معتزلہ کی چھیڑی ہوئی بحثیں علمی حلقوں میں اب بھی زیر بحث رہتی تھیں۔ معتزلی علماء بڑے بڑے عہدوں پر تھے۔ اعتزال ایک عقلیت پسند دینی مکتبِ فکر کے طور پر اب بھی موجود تھا۔ اسی طرح تشیع کے اثرات نے بڑھ کر اب رفض کی شکل اختیار کر لی تھی۔ دوسری طرف رفض کی تردید میں بعض علماء ناصبیت کی طرف مائل ہونے لگے تھے۔ ضرورت تھی کہ ان فتنوں کی روک تھام کے لیے مربوط و پائیدار کوششیں کی جائیں۔ ان حالات میں فقہاء و محدثین کے حلقے میں ایک بلند پایہ شخصیت ظاہر ہوئی جنہیں اسلامی تاریخ امام ابوجعفر محمد بن جریر الطبری رحمہ اللہ کے نام سے جانتی ہے۔

والد کا خواب:

وہ ایک جلیل القدر محدث، فقیہ اور مجتہد تھے۔ ان کی ولادت ۲۲۵ھ میں شمالی ایران کے صوبے طبرستان کے شہر آمل میں ہوئی۔ ان کے والد نے خواب دیکھا کہ یہ بچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا کسی کو کنکریاں مار رہا ہے۔ علماء نے تعبیر دی کہ بچے سے دین و شریعت کی حفاظت کا کام لیا جائے گا۔ والد نے یہ سن کر بچے کو دین کے لیے وقف کر دیا۔[1]

[1] سیر اعلام النبلاء: ۱۴/۲۷۶؛ طبقات الحفاظ سیوطی: ۱/۳۱۹

امام طبری رحمہ اللہ کی سیرت کو ہم اس ضرورت کے تحت نسبتاً زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ پیش کرنے لگے ہیں کہ ان کے بارے میں بے بنیاد پروپیگنڈا بہت زیادہ کیا گیا ہے۔ یہ دنیائے اسلام کی وہ مظلوم شخصیت ہیں جنہیں اپنے دور میں بھی ناسمجھ لوگوں کی زیادتیاں سہنا پڑیں اور آج بھی بعض لوگ جنہیں "محقق" ہونے کا دعویٰ ہے، انہیں جی بھر کر کوستے ہیں۔ اس سلسلے کی ابتداء علامہ تمنا عمادی نے کی جو پاک و ہند میں فتنۂ انکار حدیث کی داغ بیل ڈالنے میں اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ تمنا عمادی کھل کر حدیث کا انکار نہیں کرتے تھے مگر ان کی "تحقیقات" پر یقین کرنے کے بعد ذخیرۂ حدیث پر اعتماد برقرار رکھنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ غلام احمد پرویز جیسے حضرات نے "تحقیقات" کے اس سلسلے کو بڑھایا اور فتنۂ انکار حدیث کو ہر طرف پھیلا دیا۔

یہ بات شاید عام قارئین کو معلوم نہ ہو کہ انکار حدیث کا فتنہ جن مختلف دروازوں سے معاشرے میں داخل ہوا ہے، ان میں سے ایک دروازہ انکار تاریخ ہے۔ تمنا عمادی کا زیادہ زور انکار تاریخ پر تھا۔ شنا وہ ذخیرۂ حدیث میں مروی تاریخ و سیرت کی روایات کو بھی سبائی روایات کہہ کر جھٹلا دیتے تھے، یہاں تک کہ بخاری و مسلم کے راویوں کو بھی بلا تامل کذاب قرار دے دیتے تھے۔ تمنا عمادی صاحب نے تاریخ کے مدونِ اوّل امام ابن جریر طبری کو تقیہ باز رافضی قرار دے کر اسلامی تاریخ پر قلم تنسیخ پھیر دیا۔ آج کل ابن جریر طبری کے متعلق جو کچھ کہا جا رہا ہے، یہ تمنا صاحب کے افکار کی بازگشت ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے "امام زہری و ابن جریر طبری۔ تصویر کا دوسرا رُخ" کے عنوان سے شائع بھی کر دیا ہے۔ ایسے "محققین" کی تحریروں میں ابن جریر طبری کی تصویر کا دوسرا رُخ دیکھنے والوں کو ہم پہلا رُخ دکھانا چاہتے ہیں: اس لیے ان سطور میں ہم گزشتہ گیارہ صدیوں کے جلیل القدر علماء کی آراء کی روشنی میں امام طبری کی سیرت کے کچھ گوشے پیش کر رہے ہیں۔ تاکہ جن حضرات نے یک طرفہ باتیں سنی یا پڑھی ہیں، ان کے سامنے دوسرا پہلو بھی آ جائے۔ اگر اسلاف اور علم اسماء الرجال پر اعتماد کی کچھ رمق بھی باقی ہو تو اس کے بعد آسانی سے فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ امام طبری کی حیثیت کیا تھی۔ امام طبری کے متعلق اٹھائے جانے والے کچھ مشہور اعتراضات کے جوابات اس حصہ کے آخری باب میں پیش کیے جائیں گے۔ قارئین بہت سے سوالات کے جوابات وہاں پڑھ کر مزید تسلی کر سکتے ہیں۔

علم کی خاطر جہاں نوردی:

امام طبری رحمہ اللہ سات سال کے تھے کہ قرآن مجید حفظ کر لیا۔ نو سال کی عمر میں حدیث لکھنے لگے۔ انہوں نے علم حاصل کرنے میں بڑی محنت کی۔ بارہ سال کے تھے تو والد سے سفر کی اجازت لی اور آمل سے رخصت ہو گئے۔ ①

پہلے وہ رے میں ابن حمید الرازی رحمہ اللہ سے مستفیض ہوئے، پھر دیگر شہروں کے قراء و محدثین کی خدمت میں رہے۔ تین سال بعد وہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا شہرہ سن کر بغداد روانہ ہوئے، مگر ان کے بغداد پہنچنے سے کچھ دن پہلے امام احمد رحمہ اللہ کی وفات ہو گئی۔ بغداد میں رہ کر دیگر شیوخ حدیث سے روایات سنیں۔ پھر بصرہ میں محمد بن بشار بندار، محمد بن مثنیٰ اور محمد بن عبدالاعلیٰ رحمہم اللہ جیسے ائمہ سے استفادہ کیا۔ پھر کوفہ میں امام خلاد رحمہ اللہ کے جانشین سلیمان بن عبدالرحمٰن رحمہ اللہ سے علم قراآت سیکھا۔ کوفہ ہی میں محمد بن علاء رحمہ اللہ جیسے عظیم محدث کی شاگردی کی اور ان سے ایک لاکھ روایات سنیں۔ حافظہ اتنا قوی تھا کہ روایات زبانی یاد ہو جاتیں۔ ایک دن استاد نے پوچھ لیا کہ آموختہ کس کس کو یاد ہے۔ سب خاموش رہے، امام طبری رحمہ اللہ نے روایات فر فر سنا دیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ کونسی روایت کب سنائی گئی تھی۔ ②

طویل مدت تک ان کے والد نے ان کی تعلیم کا خرچہ اٹھائے رکھا۔ وہ جس شہر میں بھی ہوتے، والد صاحب طبرستان سے وہاں کچھ رقم بھیج دیتے۔ ③

کوفہ سے وہ پھر بغداد آئے تو یہاں ساتھ موجود رقم کچھ دنوں میں ختم ہو گئی۔ ادھر والد صاحب کی طرف سے خرچہ ملنے میں دیر ہو گئی۔ کچھ بھی پاس نہ رہا۔ آخر اپنے کپڑے فروخت کرنا پڑے۔ ان دنوں وزیر عبیداللہ بن خاقان کو اپنے چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کسی اچھے استاد کی ضرورت تھی۔ ابن جریر کے ایک دوست نے ان کی یہ حالت دیکھی تو مشورہ دیا کہ وزیر کے گھر پڑھانے چلے جایا کریں۔ ابن جریر اسی دوست سے مانگا ہوا لباس پہن کر وزیر کے پاس گئے۔ یہ شرط رکھی کہ وہ اپنی طالب علمانہ مشغولیت اور عبادت سے بچنے والا وقت ہی بچوں کی تعلیم میں صرف کریں گے۔ ماہانہ دس دینار تنخواہ طے ہو گئی۔ بچوں نے لکھنے کی ابتداء کی تو محل کے حشم و خدم رواج کے مطابق دراہم اور اشرفیوں کے طشت لے کر حاضر ہوئے۔ ابن جریر نے قبول نہ کیا اور فرمایا: ''طے شدہ تنخواہ سے زیادہ کچھ نہ لوں گا۔'' ④

---

① معجم الادباء: ۱۸/ ۴۹ یعنی یہ ۲۳۷ ہجری کا واقعہ ہے؛ کیوں کہ امام طبری کی ولادت ۲۲۵ ہجری کی ہے۔
بعض حضرات نے اتنی کم عمری میں بیرونی شہروں کے سفر کو بعید از قیاس قرار دے کر کہا ہے کہ امام طبری کی عمر علمی اسفار کے آغاز میں بیس سال ضرور ہو گی۔ مگر یہ قیاس اس لیے غلط ہے کہ اول تو مؤرخین نے بارہ سال کی صراحت کی ہے۔ دوسرے بعض روایات میں یہ تصریح بھی ہے کہ وہ کئی شہروں کے علماء و قراء سے مستفید ہونے کے بعد امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے استفادے کے لیے بغداد پہنچے تھے مگر اس سے چند دن پہلے امام احمد رحمہ اللہ کی وفات ہو گئی تھی۔ یعنی یہ ربیع الاول ۲۴۱ ہجری تھا۔ ظاہر ہے اس وقت امام طبری کی عمر سولہ سال تھی۔ اس سے پہلے دیگر شہروں کے اہل علم کی شاگردی میں دو تین برس گزرے ہی ہوں گے؛ اس لیے آغاز سفر کے وقت بارہ سال کی عمر ثابت ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی بارہ برس کی عمر میں تحصیل علم کے لیے نکلنا کس طرح خلاف قیاس کہا جا سکتا ہے۔ آج بھی دینی مدارس میں جا کر دیکھ لیں۔ دور دراز کے علاقوں کے نہ صرف جوان بلکہ نابالغ بچے بھی بکثرت مل جائیں گے۔ اس انحطاط کے دور میں بھی یہ جذبہ علم باقی ہے تو اس دور میں ایسی ہمت کو کس طرح بعید از قیاس سمجھا جا سکتا ہے۔
② معجم الادباء: ۱۸/ ۴۹ تا ۵۲
③ طبقات الشافعیہ سبکی: ۳/ ۱۲۵ ..... اخرجہ ابو محمد الفرغانی فی التاریخ المذیل بالسند المتصل
④ سیر اعلام النبلاء: ۱۴/ ۲۷۱، ۲۷۲؛ طبقات الشافعیہ: ۳/ ۱۲۵، اخرجہ ابن عساکر بسند حسن

بغداد میں قیام کے دوران قرآنی علوم کی دھن لگی رہی۔ شیخ القراء احمد بن یوسف رحمہ اللہ سے استفادہ کرتے رہے۔ اس کے بعد فقہ شافعی کا چسکا لگا تو حسن بن محمد الصباح رحمہ اللہ جیسے شافعی فقیہ کا دامن پکڑ لیا۔[1]

کچھ مدت بعد شام کا سفر کیا۔ بیروت میں شیخ القراء عباس بن ولید رحمہ اللہ سے اہلِ شام کی قراءت سیکھی اور جامع مسجد میں سات راتوں کے اندر ختم قرآن کیا۔ ۲۵۶ھ میں وہ بیروت سے مصر پہنچے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۰ سال تھی۔[2]

محمد بن ہارون، محمد بن نصر اور محمد بن خزیمہ رحمہم اللہ جیسے محدثین طالب علمی میں ان کے ساتھی تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو اہلِ سنت کا امام مانا جاتا ہے۔ یہ چاروں حدیث اور فقہ سیکھنے ایک ساتھ مصر گئے۔ وہاں شافعی اور مالکی علماء سے علم سیکھتے رہے۔ اس دور میں آج کل جیسے دینی مدارس نہیں تھے۔ محدثین اور فقہاء مساجد میں درس دیتے تھے۔ طلبہ کو اپنی رہائش اور کھانے پینے کا انتظام خود کرنا پڑتا تھا۔ یہ تینوں تنگ دستی اور فاقہ کشی کا شکار ہوئے تو ایک شب قرعہ ڈالنے لگے کہ جس کا نام قرعے میں نکلے وہ کہیں سے کھانا مانگ کر لائے۔ ابن خزیمہ رحمہ اللہ کے نام قرعہ نکلا۔ انہوں نے ساتھیوں سے کہا: مجھے ذرا دیر کی مہلت دو۔ یہ کہہ کر نماز پڑھی اور اللہ سے دعا کی۔

کچھ دیر گزری تھی کہ ایک غلام نے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا: ''تم میں سے محمد بن نصر کون ہے؟ محمد بن جریر کون ہے؟ محمد بن خزیمہ اور محمد بن ہارون کون ہیں؟'' ہر ایک نے اپنا نام بتایا۔ غلام نے ہر ایک کو پچاس پچاس دینار کی ایک ایک تھیلی دی اور کہا: ''آج دوپہر کو حاکمِ مصر کو خواب آیا کہ محمد نامی کچھ طالب علم بھوکے ہیں۔ اس نے یہ رقم دے کر آپ کی تلاش میں بھیجا اور آپ کو قسم دی ہے کہ جب بھی رقم ختم ہو، انہیں اطلاع کر دیا کریں۔''[3]

ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے مصر میں شعر و ادب کے ماہرین سے بھی استفادہ کیا اور صرف ایک دن میں خلیل بن احمد کی عروض پڑھ کر اس میں ملکہ حاصل کر لیا۔[4] وہ جس علم وفن کا مطالعہ کرتے اس میں ماہر ہو جاتے تھے۔ منطق، ریاضی، الجبرا اور طب میں بھی انہیں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔[5]

بغداد میں افتاء اور حدیث کا درس:

تقریباً تیس سال کی علمی آبلہ پائی کے بعد بغداد آئے اور یہیں قیام کر کے فتویٰ نویسی اور تصنیف وتالیف کا مشغلہ اختیار کیا۔[6] روایتِ حدیث میں بھی ان کا حلقہ مشہور ہو گیا۔

تلامذہ:

ان کے ان گنت تلامذہ میں چوٹی کے ائمہ اسلام بھی شامل تھے۔ بطورِ نمونہ چند نام درج ذیل ہیں:

---

① معجم الادباء: ۵۵/۱۸ — ② معجم الادباء: ۵٦/۱۸

③ تاریخ بغداد: ۱٦٤/۲؛ طبقات الشافعیہ: ۱۲۸/۳؛ سیر اعلام النبلاء: ۲۷۱/۱٤، واخرجہ ابن عساکر بسندہ فی تاریخ دمشق: ۱۹۲/۵۲

④ معجم الادباء: ۵٦/۱۸ — ⑤ بحوالہ بالا، ص ۷۲

⑥ طبقات الحفاظ للسیوطی: ۳۲۰/۱

❶ امام ابوالقاسم الطبرانی ❷ ابواحمد ابن عدی ❸ ابوبکر قفال الشاشی الشافعی ❹ قاضی احمد بن کامل ❺ احمد بن قاسم الخشاب ❻ ابوعمر و محمد بن احمد بن حمدان ❼ عبدالغفار بن عبیداللہ الحضینی المقری ❽ محمد بن عبداللہ ابوبکر الشیبانی ❾ ابوشعیب الحرانی ① ❿ ابوبکر ابن السنی ② ...... رحمہم اللہ

امام طبری رحمہ اللہ بنیادی طور پر شافعی المسلک تھے۔ اصول میں امام شافعی رحمہ اللہ کے پیروکار رہے۔ تحصیل علم کے بعد جب بغداد آئے تو دس سال تک افتاء کی خدمت میں مشغول رہے۔ اس دوران وہ فقہ شافعی کے مطابق فتاویٰ دیتے رہے۔ ③ امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وہ پہلے شافعی المذہب تھے۔ پھر انہوں نے ایک مستقل مذہب اختیار کر لیا جس میں اپنے اقوال اور اختیارات تھے۔'' ④ اس کے باوجود ان کا شمار چوٹی کے شافعی فقہاء میں ہوتا ہے۔ شافعی علماء نے ان کا ذکر جس محبت وعقیدت سے کیا ہے وہ اس کا واضح ثبوت ہے۔ علامہ تاج الدین سبکی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ابن جریر ہمارے چنے ہوئے اصحاب میں سے ایک تھے، اس بات میں کسی کو کوئی شک نہیں۔'' ⑤

مگر چونکہ وہ مقام اجتہاد پر فائز تھے؛ اس لیے بعض مسائل میں الگ اجتہادی رائے رکھتے تھے اور ایک حلقہ ان کا پیروکار تھا۔ ⑥

معمولاتِ روز وشب:

امام طبری رحمہ اللہ عبادت گزار انسان تھے۔ کوئی رات تلاوت قرآن سے خالی نہیں گزرتی تھی۔ ہر چار شب میں ختم قرآن کا معمول تھا۔ ہر کام نظام الاوقات کے مطابق کرتے۔ ظہر سے عصر تک تصنیف کا کام کرتے۔ انہیں قرآن مجید پڑھانے کا بہت شوق تھا۔ اتنی سخت مصروفیات کے باوجود اس سعادت کے حاصل کرنے کے لیے عصر تا مغرب مسجد میں قرآن مجید کی تعلیم دیتے۔ مغرب سے عشاء تک فقہ وحدیث کا درس ہوتا۔ ⑦

① دیکھیے: تهذیب الاسماء واللغات: ۱/۷۸، طبقات الشافعیین، ص ۲۲۳؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۴/۲۶۹

② ابن السنی صاحب عمل الیوم واللیلة اپنی اس شہرہ آفاق تالیف میں انہوں نے امام طبری سے بالمشافہ سماعت کی گئی روایات بھی نقل کی ہیں۔

③ طبقات الشافعیه للسبکی: ۳/۱۲۳

④ طبقات المفسرین، ص ۹۶

⑤ طبقات الشافعية: ۳/۱۲۷

⑥ اسی لیے انہیں مجتہد بھی کہا جاتا ہے مگر یہ اختلاف ایسا ہی تھا جیسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے تلامذہ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ بعض مسائل میں امام صاحب سے الگ رائے رکھتے تھے۔ جس نے امام طبری کے اجتہادات کو دیکھا، اس نے انہیں مجتہد کہا۔ جس نے ان کے فقہ شافعی کے مطابق فتاویٰ کو دیکھا، اس نے انہیں شوافع میں شمار کیا۔ علمائے اہلِ سنت میں سے بعض نامی گرامی ہستیاں امام طبری کے فقہی مسلک سے بھی وابستہ رہیں، جن میں علی بن عبدالعزیز دولابی، احمد بن یحییٰ اور قاضی ابوبکر بن کامل مشہور ہیں۔ (معجم الادباء للحموی: ۱۸/۶۲)

امام طبری رحمہ اللہ کے فقہی مسلک کے سب سے مشہور ترجمان علامہ المعافی بن زکریا رحمہ اللہ (م ۳۹۰ھ) تھے جن کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل کا کہنا ہے کہ وہ اپنے دور میں فقہ، نحو، لغت اور ادب کے سب سے بڑے عالم تھے۔ (طبقات الحفاظ للسیوطی: ۱/۴۰۱؛ طبقات الشافعیین لابن کثیر، ص ۳۳۸)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ابن زکریا کو ''العلامة، الفقیه، الحافظ، القاضی، المتفنن، عالم عصره'' کے الفاظ سے متعارف کرایا ہے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۶/۵۴۴)

⑦ معجم البلدان: ۱۸/۸۰ تا ۸۲

قرآن مجید سے شغف:

امام طبری رحمہ اللہ بہترین قاری تھے۔ انہوں نے طویل اسفار کر کے اپنے دور کے ائمہ قرآت سے تربیت لی تھی۔[1] قرآن مجید کو نہایت خوش الحانی اور تجوید سے پڑھتے تھے۔ ورش اور حمزہ کی قرآت میں انہیں مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ دور دور سے قرّاء، علماء اور عوام ان کے پیچھے نماز پڑھنے آتے اور ان کی حسنِ قرأت کا لطف اٹھاتے۔[2]

اس دور کے ایک بڑے قاری ابوبکر بن مجاہد رحمہ اللہ رمضان کے آخری عشرے میں نمازِ تراویح پڑھانے جا رہے تھے کہ اپنی مسجد کو چھوڑ کر محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ کی مسجد کی طرف مڑ گئے۔ جب وہاں پہنچے تو امام طبری رحمہ اللہ نمازِ تراویح کی امامت شروع کر چکے تھے اور سورۃ الرحمٰن کی تلاوت کر رہے تھے۔ ابوبکر بن مجاہد رحمہ اللہ مبہوت ہو کر ان کی قرأت سنتے رہے۔ ان کے ساتھی کہنے لگے: ''حضرت! آپ اپنی تراویح چھوڑ کر ان کی قرأت سننے لگے ہیں، وہاں مسجد میں لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' ابوبکر بن مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا: ''چپ رہو! میں تصور نہیں کر سکتا تھا کہ اللہ نے کوئی ایسا انسان پیدا کیا ہوگا جو اس امام جیسی خوبصورت قرأت کر سکتا ہو۔''[3]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ابوبکر محمد بن خزیمہ رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے ابن جریر کی تفسیر دیکھ کر کہا:

''روئے زمین پر اس وقت ان سے بڑا عالم کوئی نہیں۔ حنابلہ نے ان پر ظلم کیا ہے۔''[4]

---

① علامہ جزری رحمہ اللہ (صاحب مقدمۃ الجزری) نے امام طبری رحمہ اللہ کو نامور قراء میں شمار کیا ہے اور ان کے اساتذۂ قرآت وتجوید میں سلیمان بن عبدالرحمٰن صاحب خلاد، یونس بن عبدالاعلیٰ، ابوکریب محمد بن العلاء، اور احمد بن یوسف تغلبی رحمہم اللہ کے نام نقل کیے ہیں۔ یہ بھی بتایا ہے کہ امام طبری رحمہ اللہ نے ''الجامع'' کے نام سے علم قرأت پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ امام جزری رحمہ اللہ نے علم قرأت میں ان کے تلامذہ میں محمد بن احمد الدجوانی، عبدالواحد بن عمر، عبداللہ بن احمد فرغانی، ابن مجاہد اور محمد بن محمد بن فیروز الاہوازی کے اسماء نقل کیے ہیں۔ (غاية النهاية في طبقات القراء: ۲/ ۱۰۷)
حافظ ابن کثیر نے ان کے اساتذۂ قرأت میں عبدالرحمٰن بن ابی ہاشم کا نام بھی نقل کیا ہے۔ (طبقات الشافعيين، ص ۲۲۳، ط مكتبة الثقافة)

② معجم الادباء: ۱۸/ ۷۳ ③ رواه الخطيب البغدادي في تاريخه باسناده: ۲/ ۱۶۴، وانظر طبقات الشافعية للسبكي: ۳/ ۱۲٤

④ سير اعلام النبلاء: ۱٤/ ۲۷۳ ... یہ اس واقعے کی طرف اشارہ ہے جب بعض حنبلیوں نے جمعہ کے دن جامع مسجد میں ان سے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مسلک کے متعلق کچھ سوالات پوچھے اور ان کے جوابات کو غلط رنگ دیتے ہوئے ان پر حملہ کیا اور گھر پر بھی پتھراؤ کیا۔ مجبوراً سرکاری پولیس نے آکر انہیں بچایا اور ایک دن رات تک گھر پر پہرہ دیا۔ (معجم الادباء: ۱۸/ ۷۰)

ظاہر ہے متعصب حنبلیوں کے الزامات اور ایذا رسانی سے علامہ طبری کی جلالتِ شان کچھ کم نہیں ہو جاتی۔ ان ایام میں بعض حنبلی حضرات امام ابوحنیفہؒ کے خلاف بھی اسی طرح کی متعصبانہ مہم میں مشغول تھے۔ اس دور میں تالیف کردہ حنابلہ کی کتاب ''السنۃ'' میں امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کو قرآن کے مخلوق ہونے کا قائل، بدعتی، خارجی اور منکرِ شریعت تک کہا گیا ہے۔ (السنۃ: روایات نمبر: ۱۶۵، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۸، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۲۷، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۴۲)
مؤرخین کے مطابق امام طبریؒ کی کردار کشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ امام ابوحنیفہؒ کے مداح تھے۔ انہوں نے اپنی تصنیف ''ذیل المذیل'' میں امام ابوحنیفہؒ کی تعریف وتوصیف کرتے ہوئے لکھا: ''وہ فقیہ، عالم اور متقی تھے۔'' اس پر بعض علماء مشتعل ہو کر انہیں بدنام کرنے لگے۔ (معجم الادباء: ۱۸/ ۷۷)
بغداد کا ماحول ناسازگار دیکھ کر امام طبری اپنے وطن طبرستان چلے گئے تھے مگر وہاں روافض کے مظالم نے انہیں پھر بغداد واپسی پر مجبور کر دیا۔ (معجم الادباء: ۱۸/ ۷۰) امام طبری کی کردار کشی کی مہم میں بغداد کے ایک حنبلی عالم ابوبکر ابن ابی داود پیش پیش تھے۔ ان کے پیروکار حضرات، بغداد کے باشندوں اور وہاں آنے والے طلبہ کو امام طبری کے خلاف اکساتے رہتے۔ امام طبری رحمہ اللہ نے اس صورتحال میں گوشہ نشینی کو ترجیح دی، اور عام مجلس میں درس ترک کر کے خود کو گھر میں تصنیفی وتالیفی کام تک محدود کر لیا۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۴/ ۲۷۷)..... ﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر﴾

مال وجاہ اور حکمرانوں سے بے نیازی:

وہ حکومت سے تعلق اور دنیا کی حرص وطمع سے بہت دور تھے۔ ابو محمد الفرغانی رحمہ اللہ (م ۳۶۲ھ) فرماتے ہیں:

''ابن جریر اللہ کی رضا کی خاطر کسی کی ملامت کی پروانہیں کرتے تھے۔ حالانکہ انہیں جاہلوں، حاسدوں اور بے دین لوگوں سے سخت اذیتیں برداشت کرنا پڑیں جبکہ اہلِ علم اور دین دار لوگ ہمیشہ ان کے علم وفضل اور زہد وقناعت کے معترف رہے۔ ان کا گزارا صرف اس زمین کی پیداوار میں اپنے تھوڑے سے حصے پر تھا جوان کے والد نے طبرستان میں چھوڑی تھی۔''[1]

بغداد کے وزیر الخاقانی نے انہیں بھاری مقدار میں مال پیش کیا مگر انہوں نے قبول نہ کیا۔ وزیر نے انہیں قاضی کا عہدہ پیش کیا۔ وہ اس پر بھی آمادہ نہ ہوئے۔ دوستوں نے کہا: اس میں ثواب ملے گا، آپ مٹی ہوئی سنتوں کو زندہ کر سکتے تھے،'' مگر وہ تیار نہ ہوئے۔ دوستوں کو توقع تھی کہ وہ کم از کم ''ولایۃ مظالم'' (مظلوموں کی فریاد رسی کا عہدہ) قبول کرلیں گے؛ لہٰذا اگلے دن صبح سویرے سواری لے کر آگئے کہ وزیر کے ہاں تشریف لے چلیں۔ مگر وہ اس پر بھی راضی نہ ہوئے اور ناراض ہو کر فرمایا: ''مجھے تو توقع تھی کہ اگر میں خود ایسے عہدوں کی طرف مائل ہوا تو آپ حضرات مجھے منع کریں گے۔'' ساتھی شرمندہ ہو کر واپس چلے گئے۔[2]

---

① نقله ابن عساكر من التاريخ المذيل لابي محمد الفرغاني تلميذ الطبري. (تاريخ دمشق: ۱۹۸/۵۲، وانظر: سير اعلام النبلاء: ۲۷٤/۱٤)

② اخرجه ابن عساكر من التاريخ المذيل لابي محمد الفرغاني تلميذ الطبري. (تاريخ دمشق: ۲۰۰/۵۲، وانظر: طبقات الشافعية الكبرىٰ للسبكي: ۱۲٦/۳)

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: ...... حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''ابوبکر ابن ابی داؤد اور ان کے ساتھی جو بکثرت تھے، ابن جریر پر چڑھ دوڑے اور انہیں بدعتی مشہور کر دیا۔ اس پر انہوں نے اپنے عقیدے پر ایک عمدہ کتاب لکھی جسے ہم نے سنا ہے۔'' (لسان المیزان: ۲۹۵/۳)

ایک عالم ابن علی نیشاپوری کے واقعے سے اس صورتحال پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ وہ بغداد سے ہو کر نیشاپور آئے اور محدث ابن خزیمہ (مؤلف صحیح ابن خزیمہ) سے ملے۔ ابن خزیمہ نے ان سے پوچھا: ''کیا آپ محمد بن جریر سے روایات لکھ چکے؟'' وہ بولے: ''نہیں؛ کیوں کہ وہ (عام مجالس) میں ظاہر نہیں ہوتے اور حنبلی ان کے پاس آنے جانے سے روکتے تھے۔'' ابن خزیمہ بولے: ''آپ نے اچھا نہیں کیا۔ آپ کسی اور کی روایات نہ لیتے مگر کاش کہ ابن جریر سے روایات سن لیتے۔''

علامہ سبکی اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''ابن جریر طبری کے مجمع عام میں نہ آنے کا یہ مطلب نہیں کہ ان پر کوئی پابندی تھی۔ حنبلیوں کی اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ ایسا کر سکتے۔ ابن جریر طبری کا مقام اتنا بلند تھا کہ ان کے مخالفین انہیں محبوس نہیں کر سکتے تھے۔ مگر ابن جریرؒ نے خود ہی اپنے آپ کو محدود کر لیا تھا تاکہ اپنی عزت کے پیچھے پڑنے والے گھٹیا لوگوں سے دور رہیں۔ پس وہ اسی سے ملتے تھے جسے پسند کرتے تھے اور جس کے بارے میں یقین ہوتا کہ وہ سنت کا پیروکار ہے۔ ابن علی نیشاپوری کی طرح دوسرے شہروں سے آنے والے اصل حالات نہیں جانتے تھے اور ابن جریر کے حال سے ناواقفیت کی بناء پر وہ ان کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والوں کی باتوں سے متاثر ہو جاتے تھے؛ اس لیے ان سے ملاقات ترک کر دیتے تھے۔'' (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: ۱۲۶،۱۲۵/۳)

امام طبری رحمہ اللہ کے حالات زندگی اور تصانیف میں ایسی کوئی چیز قطعاً نہیں ملتی جس سے ان کا امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے عقیدے میں کسی اختلاف کا کوئی اشارہ بھی ملتا ہو۔ انہوں نے اپنی تصنیف ''صریح السنۃ'' میں تین جگہ امام احمد رحمہ اللہ سے روایت لی ہے۔ ایک جگہ امام احمد رحمہ اللہ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: ''جن کا قول کافی و شافی ہے، اللہ کی رحمت ورضامندی جن کے شاملِ حال ہے اور جن کی پیروی رُشد وہدایت ہے، وہ ہیں احمد بن حنبل۔ اللہ ان سے راضی ہو۔'' (صریح السنۃ، ص ۲۵)

رہا فروعی مسائل میں اختلاف، تو وہ اصولاً شافعی اور اپنے علم کی وسعت کی بناء پر مجتہد تھے؛ اس لیے امام احمد رحمہ اللہ کی پیروی ان پر لازم نہیں تھی۔ بعض متعصب لوگوں کی ایذا رسانی سے امام طبری کی ذات پر کوئی الزام آسکتا ہے نہ ان کے مقام ومرتبے اور مقبولیت پر۔ علمائے حق کو ہر دور میں کم ظرف لوگوں نے ایذائیں پہنچائی ہیں، اس کے باوجود آج تک ان کی کاوشیں اُمت سے خراجِ تحسین وصول کر رہی ہیں۔ مخالفین کی منفی مہم ان کے کام کو کوئی ٹھیس پہنچا سکی نہ پہنچا سکے گی۔

امام طبری رحمہ اللہ معتمد عباسی کے دور میں بغداد آکر بسے تھے۔ پھر انہوں نے مُعتضِد، مُکتفی، مقتدر اور قاہر جیسے خلفا کا دور بھی دیکھا۔ مگر خلیفہ مُکتفی کے سوا کسی اور سے ان کا تعلق ثابت نہیں۔ ①

مکتفی ان کا نیاز مند تھا۔ اسے رفاہی کاموں کا شوق ہوا تو ایسا وقف (ٹرسٹ) ادارہ کھولنے کا فیصلہ کیا جس کے اصول وضوابط میں کسی فقیہ کا اختلاف نہ ہو۔ یہ اصول وضوابط طے کرنے کے لیے امام طبری کی خدمات حاصل کی گئیں۔ انہوں نے فقہاء کے متفقہ مسائل لکھوا دیے۔ مکتفی نے خوش ہو کر انہیں گراں قدر انعام دینے کا اعلان کیا۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ خلیفہ نے کہلوایا: ''یا تو انعام قبول کریں یا اپنی کوئی اور ضرورت بتائیں؟''

فرمایا: ''ہاں! ایک ضرورت ہے۔ جمعہ کی نماز میں سوالی اگلی صفوں پر لگا حفاظتی جنگلہ عبور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پولیس اہلکاروں کی ذمہ داری لگائی جائے کہ وہ انہیں روکیں۔''

مکتفی ان کی اس خودداری اور استغناء سے بہت متاثر ہوا۔ ②

ایک بار مکتفی کو علم فقہ میں ایک مختصر کتاب کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ خدمت ان کے ذمے لگائی گئی۔ انہوں نے ایک مختصر رسالہ لکھ دیا۔ مکتفی نے معاوضے کے طور پر ایک ہزار دینار بھیجے۔ انہوں نے قبول کرنے سے معذرت کر لی۔ ان سے درخواست کی گئی کہ ہدیہ قبول کر کے پھر صدقہ کر دیں۔ مگر وہ اس پر بھی آمادہ نہ ہوئے اور فرمایا:

''آپ حضرات کو زیادہ معلوم ہے کہ خیرات کے مستحق کون لوگ ہیں۔'' ③

غرض صرف ایک خلیفہ سے ان کا تعلق رہا اور اس میں بھی حد درجہ بے نیازی اور زہد و استغناء کا رنگ غالب تھا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں کہ ایک بار وزیر سلطنت ابن فرات ان سے قرأت سیکھنے گیا۔ ان کے پاس پہلے سے ایک اور شخص قرآن مجید کا سبق لینے پہنچا ہوا تھا۔ امام طبری رحمہ اللہ نے اس شخص سے پوچھا:

''تم اپنے سبق کی قرأت کیوں نہیں کر رہے؟'' اس نے وزیر کی طرف اشارہ کیا (یعنی ان کی باری پہلے ہو جائے)۔

امام طبری نے فرمایا: ''بھائی! جب تمہاری باری ہے تو نہ دجلہ کی پروا کرو، نہ فرات کی۔'' ④

(یہ وزیر کی طرف اشارہ تھا جس کی کنیت ابن فرات تھی۔)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ یہ واقعہ نقل کر کے فرماتے ہیں:

''یہ امام طبری کی لطافتِ حس، ان کی فصاحت وبلاغت اور اہلِ دنیا سے ان کی بے رغبتی کی دلیل ہے۔'' ⑤

① مکتفی سے تعلق میں رعایت کی وجہ شاید یہ تھی کہ یہ ایک نیک سیرت اور انصاف پسند خلیفہ تھا۔ سرکاری مال خرچ کرنے میں بڑا محتاط تھا۔ ایک بار اس نے سات سو دینار کسی سرکاری تعمیر میں لگا دیے جو زیادہ ضروری نہ تھی۔ جب بھی یہ بات یاد آتی تو استغفار پڑھتا اور کہتا: ''مسلمانوں کا مال ایسی تعمیر پر خرچ کر ڈالا جس کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔'' (تاریخ الخلفا، ص۲۷۳، ۲۷۴)

② طبقات الشافعیہ الکبری: ۱۲٤/۳؛ واخرجه ابن عساکر باسنادہ

③ طبقات الشافعیہ الکبری: ۱۲٤/۳؛ سیر اعلام النبلاء: ۲۷۲/۱٤؛ واخرجه ابن عساکر باسنادہ المتصل

④ اخرجه ابن عساکر باسنادہ المتصل. (تاریخ دمشق: ۲۰۱/۵۲)

⑤ لسان المیزان: ۱۰۳/۵

دربارِ خلافت میں بے نیازانہ حاضری:

ایک بار انہیں کسی عباسی خلیفہ نے قصرِ خلافت میں طلب کیا۔ دربار میں لوگوں کے جمع ہونے کے بعد وزیر کی آمد ہوئی۔ سب تعظیماً کھڑے ہو گئے مگر امام طبری رحمہ اللہ کی عادت یہی تھی کہ کسی کے لیے بطورِ تعظیم کھڑے نہیں ہوتے تھے؛ اس لیے وہ بیٹھے رہے۔ وزیر نے اپنی جگہ بیٹھنے کے بعد حاضرین سے پوچھا:

''یہ کون ہے جو بیٹھا ہوا ہے؟''

حاضرین نے کہا: ''یہ ابوجعفر الطبری ہیں۔''

وزیر نے پوچھا: ''ان کا شہر میں کوئی گھر ہے؟''

لوگوں نے کہا: ''ہاں چھوٹا سا۔''

وزیر نے پوچھا: ''کیا ان کی شہر کے باہر کوئی جائیداد ہے؟''

لوگوں نے کہا: ''کوئی نہیں۔''

وزیر نے پوچھا: ''سرکار کی طرف سے انہیں کتنا وظیفہ ملتا ہے؟''

درباریوں نے کہا: ''سرکار کی طرف سے ان کا کوئی وظیفہ مقرر نہیں۔''

وزیر یہ سن کر بہت متاثر ہوا اور کہنے لگا:

''اس جیسے شخص کو حق ہے کہ وہ حکمران کے لیے بھی کھڑا نہ ہو۔''[1]

اصلاحِ عقائد میں ان کی کاوشیں:

امام طبری رحمہ اللہ ہمیشہ اصلاحِ عقائد کے میدان میں باطل فرقوں کے سامنے سینہ سپر رہے۔ معتزلہ کے وہ سخت حریف تھے۔ معتزلہ کا کہنا تھا کہ آخرت میں اہلِ جنت کو اللہ کی زیارت نہیں ہو سکتی؛ کیوں کہ یہ ایک ناممکن اور خلافِ عقل بات ہے۔ امام طبری رحمہ اللہ نے ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: ''ہمارا عقیدہ جس پر ہم نے اہلِ سنت کو قائم پایا ہے، یہ ہے کہ اہلِ جنت کو اللہ کا دیدار ہوگا جیسا کہ صحیح احادیث میں منقول ہے۔''[2]

معتزلی عقیدے ''خلقِ قرآن'' کی تردید میں وہ واضح طور پر لکھتے ہیں:

> ''ہمارے نزدیک قرآن مخلوق نہیں چاہے وہ لکھا جائے، تلاوت کیا جائے یا پڑھا جائے...... جو ہم سے اس کے خلاف عقیدہ نقل کرے یا منسوب کرے یا دعویٰ کرے کہ ہم اس کے سوا کچھ کہتے ہیں تو اس پر اللہ کی لعنت اور غضب نازل ہو۔ اللہ اسے سب کے سامنے رُسوا کرے۔''[3]

معتزلہ، کبیرہ گناہوں کے مرتکبین کو کافر اور جہنمی بتاتے تھے۔ امام طبری رحمہ اللہ اس بارے میں فرماتے ہیں:

---

[1] بغية الطلب في تاريخ حلب: ٤٦٥٨/١٠، ط دار الفكر [2] صريح السنة، ص ٢٠، ط دار الخلفاء، كويت

[3] صريح السنة، ص ١٨، بددعا کے الفاظ اس لیے کہے کہ مخالفین ان کی طرف غلط عقائد منسوب کر رہے تھے۔

"وہ فاسق اور نافرمان مسلمان ہیں، ہم انہیں جنتی کہتے ہیں نہ جہنمی۔ ان کا معاملہ اللہ کی مشیت پر ہے، چاہے تو انہیں عذاب دے، چاہے تو اپنے فضل سے معاف کردے۔"[1]

معتزلہ قبر میں مردے کو عذاب ہونے کا انکار کرتے تھے اور کہتے تھے جب جسم سے روح نکل جائے تو اسے عذاب کیسے ہوسکتا ہے۔ ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اس بارے میں اہل سنت کے عقائد کی وکالت میں دلائل پیش کیے اور فرمایا:

"رسول اللہ ﷺ سے منقول روایات سے ثابت ہے کہ قبر کا عذاب برحق ہے۔"[2]

معتزلہ نصوص میں مذکور اللہ کی بعض صفات متشابہات مثلاً: استواء علی العرش، آسمانِ دنیا پر نزول وغیرہ کے لیے عقلی تاویلات پیش کرتے تھے اور ان کے ظاہری مطلب کا انکار کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے لے کر امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تک علمائے اہلِ سنت کا محتاط ترین طبقہ، کسی تاویل کے بغیر ان نصوص پر ایمان لانے کا قائل تھا۔ یہی ابن جریر طبری رحمہ اللہ کا مسلک تھا۔ انہوں نے عقلیت پرستوں کے پیشوا، جہم بن صفوان پر بھی نکیر کی اور عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ معتزلی عقائد کی جڑوں پر اس طرح تیشہ چلایا کہ مخالفین کے لیے کوئی جواب نہیں رہ گیا۔[3]

رفض کی تردید میں ان کی کوششیں:

امام طبری رحمہ اللہ روافض کے خلاف بھی شمشیرِ بے نیام رہے۔ اپنی تفسیر میں وہ روافض کے عقیدۂ تقیہ کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "وہ تقیہ جس کا ذکر اللہ نے اس آیت میں کیا ہے، وہ تقیہ فقط کفار سے ہے نہ کہ غیر سے۔"[4]

"تہذیب الآثار" میں وہ غلو فی الدین کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"غالی روافض حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت میں حد سے بڑھ گئے اور ان میں سے بعض انہیں خدا ماننے لگے، بعض نے انہیں پیغمبر مبعوث قرار دیا اور بعض نے ان کے بارے میں عجیب عجیب اقوال اختیار کر لیے۔"[5]

اثناعشریوں کے نزدیک امام حسن عسکری رحمہ اللہ کے بیٹے محمد بارہویں امام غائب ہیں جو قربِ قیامت میں ظاہر ہوں گے۔ امام طبری رحمہ اللہ نے اس عقیدے کی حقیقت کھولتے ہوئے بتایا کہ امام حسن عسکری رحمہ اللہ کا کوئی بیٹا سرے سے نہیں تھا۔ وہ لاولد تھے؛ اس لیے امام کے غائب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[6]

وہ شیعی عقائد کا ذکر کرکے فرماتے ہیں: "ہمارے نزدیک یہ سب گمراہی ہے، امت کے دائرے سے خروج ہے۔"[7]

وہ علمائے اسلام میں سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے عبداللہ بن سبا کی دسیسہ کاریوں سے متعلق روایات کو جمع کر کے سبائی سازشوں کی حقیقت کو کھولا۔ بعد کے تمام مؤرخین نے یہ مواد انہی سے لیا۔ آج بھی اگر کوئی شخص عبداللہ بن سبا کے حالات کی تحقیق کرنا چاہے تو امام طبری رحمہ اللہ کی "تاریخ الرسل والملوک" پر بھروسہ کیے بغیر وہ کچھ نہیں کرسکتا۔

---

① التبصیر فی معالم الدین: ۱۸۴، ط دار العاصمہ
② التبصیر فی معالم الدین، ص ۲۰۷
③ التبصیر فی معالم الدین، ص ۱۴۱ تا ۱۴۳
④ تفسیر طبری: سورۃ آل عمران، آیت: ۲۸
⑤ تہذیب الآثار: ۲۸۷/۳، مسند علی رضی اللہ عنہ، مطبع مدنی قاہرہ
⑥ قال ابن تیمیۃ: وان الحسن العسکری لم ینسل ولم یعقب کما ذکر ذلک، محمد بن جریر الطبری. (منہاج السنۃ: ۱۲۲/۱؛ ۸۷/۴)
⑦ التبصیر فی معالم الدین، ص ۱۶۳ تا ۱۶۵

''امامت وخلافت'' کا مسئلہ اہلِ سنت اور اہلِ تشیع میں اختلاف کی بڑی بنیاد ہے۔ امام طبری رحمہ اللہ نے اپنی بلند پایہ تصنیف ''التبصیر فی معالم الدین'' میں اس مسئلے پر عقلی ونقلی دلائل کے ساتھ اس خوبی سے روشنی ڈالی ہے کہ غیر جانبدار آدمی صحیح عقیدے کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ [1]

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے بارے میں وہ نہایت حساس اور غیور تھے۔ سورۃ الفاتحہ کی تفسیر میں ''صراطِ مستقیم'' کی تشریح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منہج اور ابوبکر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم کے منہج کی پیروی کرنا۔'' [2]

وہ ''صریح السنۃ'' میں وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں: ''اصحابِ رسول میں افضل ترین، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں۔ پھر عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ ہیں۔ پھر علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔'' [3]

ایک بار ان کی موجودگی میں کسی عالم سے پوچھا گیا کہ جو شخص حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو ہدایت یافتہ امام نہ مانے اس کا کیا حکم ہے؟ وہ عالم فرمانے لگے: ''وہ بدعتی ہے۔''

اس پر ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے غضبناک ہو کر کہا: ''صرف بدعتی! اسے تو قتل کیا جانا چاہیے۔'' [4]

امام طبری رحمہ اللہ ایک طویل مدت سے اپنے آبائی وطن طبرستان سے دور تھے۔ اس دوران وہاں روافض کا غلبہ ہو چکا تھا اور حکومت بھی انہی کی قائم ہو گئی تھی۔ ادھر بغداد میں بعض حنبلی علماء نے بلاوجہ امام طبری رحمہ اللہ کو بدنام کرنے کی مہم چلا رکھی تھی۔ امام طبری رحمہ اللہ نے ایسے میں اپنے وطن جا کر دین کی خدمت کرنا بہتر سمجھا۔

چنانچہ ۲۹۰ھ میں جبکہ ان کی عمر ۶۵ برس ہو چکی تھی، وہ طبرستان چلے گئے۔ وہاں انہوں نے لوگوں کے عقائد کی اصلاح کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فضائل پر رسائل لکھے جس پر وہاں بھی ان کی سخت مخالفت شروع ہو گئی۔ طبرستان کے رافضی حاکم نے ان کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ امام طبری رحمہ اللہ کو ایک بزرگ نے بروقت اطلاع دے دی اور وہ وہاں سے نکل گئے۔ حاکم نے ان بزرگ کو گرفتار کر کے ایک ہزار کوڑے مارے۔

بہرکیف امام طبری رحمہ اللہ خیریت سے واپس بغداد پہنچ گئے۔ [5]

ناصبیوں کی تردید:

ناصبیوں نے اس دور میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کی صحیح احادیث کو بھی جھٹلانا شروع کر دیا تھا جن میں حدیث "من کنت مولاہ فعلیّ مولاہ۔" (جس کا میں آقا، اس کا علی بھی آقا) بھی شامل تھی۔

---

[1] التبصیر فی معالم الدین، ص ۱۵۴ تا ۱۵۹   [2] تفسیر طبری: ۱۷۱/۱، ط دار ھجر

[3] صریح السنۃ، ص ۲۴

[4] لسان المیزان: ۱۰۱/۵ یعنی وہ مرتد وزندیق ہے، شرعی عدالت اس پر مرتد کی سزا نافذ کرے۔ امام طبری سے رفض کی تردید کا یہ ثبوت کافی ہے۔ یاد رہے کہ اس واقعے کو ابن عساکر نے سندِ متصل سے پیش کیا ہے۔ اس کے چشم دید راوی محمد بن علی ابوبکر البغدادی (م ۳۵۷ھ) امام طبری کے شاگرد ہیں۔

[5] معجم الادباء: ۷۷/۱۸ .. اندازہ لگایا جا سکتا ہے جب مددگار کو ایک ہزار کوڑے مارے گئے تو اگر امام طبری ان رافضیوں کے ہاتھ لگ جاتے تو شاید انہیں قتل سے کم کوئی سزا نہ دی جاتی۔

روافض کی ضد میں حنبلی محدث ابوبکر بن ابی داؤد نے بھی اس حدیث کے ثبوت میں شکوک وشبہات کا اظہار کیا تھا۔[1] امام طبری رحمہ اللہ کو گوارا نہ ہوا کہ روافض سے دشمنی کی وجہ سے ایک صحیح حدیث کی تکذیب کی جائے۔ انہوں نے اس حدیث کے ثبوت پر دلائل دیتے ہوئے ایک رسالہ ''کتاب الفضائل'' لکھا جس میں پہلے خلفائے راشدین کے مناقب بیان کیے گئے، پھر اس حدیث پر اعتراضات کا جواب دیا گیا۔[2]

توحید کے دفاع میں امام طبری کی حق گوئی:

امام طبری رحمہ اللہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق تھے اور اسی لیے مقام توحید کے دفاع میں وہ نہایت حساس تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا رکنِ اعظم تھا۔ انہیں کبھی یہ گوارا نہیں ہوا کہ شانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی شخص ایسی باتیں بیان کرے جن سے نبوت اور الوہیت کا فرق مٹ جائے۔

ایک بار ایک واعظ نے بغداد کی مسجد میں آیت: ''عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا'' کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا: ''قیامت کے دن اللہ، اپنے حبیب کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھائے گا۔''

ابن جریر طبری رحمہ اللہ کو یہ خبر ملی تو اس شخص کے جاہلانہ کلام پر سخت نکیر کی۔ پھر اس غلط عقیدے کی مستقل تردید کے لیے اپنے گھر کے دروازے پر یہ کتبہ لکھوا دیا:

سُبْحَانَ مَنْ لَیْسَ لَهُ اَنِیْسٌ وَلَا لَهُ فِیْ عَرْشِهِ جَلِیْسٌ

(پاک ہے وہ ذات جس کا کوئی ہم دم نہیں...... اور نہ ہی عرش پر اس کا کوئی ہم نشین ہے۔)

امام طبری رحمہ اللہ کی اس حق گوئی پر جاہل لوگ مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے امام طبری رحمہ اللہ کے گھر پر اس قدر پتھراؤ کیا کہ وہاں پتھروں کا ڈھیر لگ گیا۔[3] مگر امام طبری رحمہ اللہ کو ایسی حرکات حق گوئی سے کبھی بھی باز نہ رکھ سکیں۔

---

① حدیث "من كنت مولاه فعلي مولاه." سند کے لحاظ سے ثابت اور طرق کے لحاظ سے مشہور ہے، اور ''حدیث غدیر خم'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ سنن ترمذی اور سنن ابن ماجہ میں بھی منقول ہے۔ امام ترمذی نے اسے حسن اور امام طحاوی نے صحیح کہا ہے۔ شیخ البانی نے بھی اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام ابوبکر ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں، امام احمد بن حنبل نے فضائل صحابہ اور اپنی مسند میں، امام نسائی نے السنن الکبری میں، امام طبرانی نے اپنی تینوں معاجم میں، ابو یعلیٰ موصلی اور امام بزار نے اپنی مسانید میں اور ابن حجر نے ''اتحاف المہرۃ'' میں اسے متعدد طرق سے نقل کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے اس کے طرق کو ''رسالة طرق حديث من كنت مولاه'' میں جمع کر دیا ہے۔ روافض کا اسے عقیدۂ امامت کی بنیاد بنانا ایک غلط استدلال ہے مگر کسی مقبول روایت سے غلط استدلال کی تردید کا یہ طریقہ نہیں کہ روایت ہی کا انکار کر دیا جائے۔ افسوس کہ اس بارے میں امام طبری کا رسالہ ہم تک نہیں پہنچا۔ تاہم انہی کے معاصر امام ابو جعفر الطحاوی رحمہ اللہ نے اس حدیث پر نہایت محققانہ بحث کی ہے۔ انہوں نے روایت کو صحیح قرار دیتے ہوئے اس کا وہ معنی واضح کیا ہے جو اصول قرآن وسنت، لغت اور عقل کے عین مطابق ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ اس سے روافض کا عقیدہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ (شرح مشكل الآثار: ٥/١٨، ط الرسالة)

② سير اعلام النبلاء: ١٤/٢٧٤...... نیز حافظ ذہبی فرماتے ہیں: ''میں نے حدیث غدیر خم کے بارے میں ان کا رسالہ دیکھا جو چار اجزاء میں تھا، میں نے اس کا ایک جزو دیکھا ہے، ان کی روایات کی وسعت نے مجھے حیران کر دیا اور مجھے اس واقعے کی صحت کا یقین ہو گیا۔'' (سير اعلام النبلاء: ١٤/٢٧٧) اس حدیث کے دفاع کے باعث ناصبی بھی امام طبری کے دشمن بن گئے اور انہیں رافضی مشہور کرنا شروع کر دیا۔ آج بھی امام طبری کی کردارکشی کرنے والے اکثر ناصبی ہیں جو یزید کے نام کے ساتھ ''رحمۃ اللہ علیہ'' لگانا عین ایمان سمجھتے ہیں اور حضرت علی وحسنین کریمین رضی اللہ عنہم کی تنقیص کے درپے رہتے ہیں۔

③ تحذير الخواص من اكاذيب القصاص، سيوطي، ص ١٦١، ط المكتب الاسلامي بيروت

حلیہ اور عادات واطوار:

امام طبری رحمہ اللہ دراز قامت، دبلے جسم اور سانولی رنگت والے آدمی تھے۔ آنکھیں بڑی اور خوبصورت تھیں۔ زبان فصیح و بلیغ تھی۔ صحت بہت اچھی تھی۔ [1] طبیعت کے بڑے خوش مزاج اور شائستہ انسان تھے۔ کھانے پینے، لباس، وضع قطع اور نشست و برخاست میں نفاست کا بہت خیال رکھتے تھے۔ طب سے واقف تھے؛ اس لیے نقصان دہ چیزیں بالکل استعمال نہیں کرتے تھے۔ چربی سے پرہیز کرتے تھے۔ گوشت پسند تھا جسے کشمش کے ساتھ پکایا جاتا تھا۔ بکری کا دودھ، انگور، انجیر اور کھجوریں مرغوب تھیں۔ اپنے ہم مجلسوں سے محبت وشفقت سے باتیں کرتے۔

کوئی دوست ہدیہ پیش کرتا تو اس کے بدلے ہدیہ ضرور بھیجتے۔ امراء کے مہنگے تحائف کو پسند نہ کرتے۔ امیر ابوالہیجاء نے تین ہزار دینار بھیجے تو یہ کہہ کر لوٹا دیے کہ میں اس کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ [2]

وفات:

۸۵ سال عمر پائی مگر ڈاڑھی اور سر کے بال آخر تک سیاہ رہے۔ علالت کے بعد اتوار ۲۷ شوال ۳۱۰ھ کو علم وفضل کا یہ آفتاب دنیائے فانی سے رخصت ہوا۔ [3] آخری دن کے دو واقعات قابلِ ذکر ہیں: نمازِ ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔ پانی منگوا کر تازہ وضو کیا۔ ساتھیوں نے بیماری کا خیال کر کے کہا: ''آپ ظہر کو مؤخر کر دیں اور عصر ساتھ ملا کر پڑھ لیں۔''

مگر وہ نہ مانے۔ ظہر کی نماز اپنے وقت پر اچھی طرح ادا کی۔ پھر نمازِ عصر اپنے وقت پر عمدہ طریقے سے پڑھی۔ [4]

وفات سے کچھ دیر پہلے ان کے سامنے ایک روایت پڑھی گئی جس میں حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ سے منقول ایک دعاء کا ذکر تھا۔ امام طبری رحمہ اللہ نے قلم دوات اور کاغذ منگوایا اور اسے نقل کر لیا۔

کسی نے پوچھا: ''اس حالت میں بھی آپ لکھ رہے ہیں!!''

فرمایا: ''انسان کو چاہیے کہ کبھی بھی علم حاصل کرنا نہ چھوڑے، یہاں تک کہ اس کی موت آجائے۔'' [5]

نزع کے وقت علماء کی ایک جماعت ارد گرد جمع تھی۔ انہوں نے آخری وصیت کی درخواست کی تو فرمایا:

''میں اپنی کتب میں وہ سب کچھ لکھ چکا ہوں جس پر قائم رہنا چاہیے۔ اسی پر عمل کرو۔''

اس کے بعد اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے اور کلمہ شہادت پڑھتے پڑھتے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ [6]

سانحۂ وفات کی کوئی تشہیر نہیں کی گئی۔ پھر بھی نمازِ جنازہ میں اتنی خلقت تھی کہ اسے شمار کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ بغداد میں اپنے گھر ہی میں دفن کیے گئے۔ کئی ماہ تک دن رات لوگ ان کی قبر پر آکر دعا کرتے رہے۔ [7]

رحمہ اللہ رحمة واسعة

---

① سیراعلام النبلاء: ۲۸۲/۱۴ ② معجم البلدان: ۱۸/ ۸۰ تا ۸۲ ③ سیراعلام النبلاء: ۲۸۲/۱۴

④ سیراعلام النبلاء: ۱۴/ ۲۷۶ ... اخرجه ابومحمد الفرغانی فی التاریخ المذیل بسند متصل

⑤ تاریخ دمشق: ۱۹۹/۵۲

⑥ سیراعلام النبلاء: ۱۴/ ۲۷۶ ...اخرجه ابومحمد الفرغانی فی التاریخ المذیل بسند متصل

⑦ سیراعلام النبلاء: ۱۴/ ۲۷۶، ۲۸۲

بغداد کے ایک ہاشمی بزرگ ابوعلی بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے انہیں وفات کے بعد خواب میں دیکھا کہ وہ بہت عمدہ فراخ لباس پہنے ہوئے ہیں۔ میں نے پوچھا: ''آپ نے موت کو کیسا پایا؟'' فرمایا: ''خیر کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔'' پوچھا: ''منکر نکیر کے سوال کا کیا ہوا؟'' فرمایا: ''خیر کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔''

میں نے کہا: ''آپ کا رب تو آپ پر بڑا مہربان ہے۔ اپنے رب کے پاس ہمیں بھی یاد رکھیے گا۔''

فرمایا: ''ابوعلی! آپ کہتے ہیں کہ میں آپ کو رب کے ہاں یاد رکھوں اور میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں آپ کا وسیلہ پکڑتا ہوں۔''[1]

امام طبری کی علمی یادگاریں:

امام طبری رحمہ اللہ کا تصنیفی و تالیفی کام اتنا ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اسلامی لٹریچر میں پہلی جامع تفسیر انہی کی کاوش ہے۔ ۲۴ جلدوں پر مشتمل یہ تفسیر ''جامع البیان'' کے نام سے موسوم ہے مگر عام طور پر اسے ''تفسیر طبری'' کہا جاتا ہے۔

انہوں نے ''ذیل المذیل من تاریخ الصحابۃ'' کے نام سے صحابہ کرام و تابعین کے حالات پر ایک مفصل تصنیف بھی پیش کی جو ان کی اسلاف سے عقیدت و محبت کا ثبوت ہے۔[2] ان کا سب سے عظیم الشان کام وہ مجموعۂ سنن ہے جو ''تہذیب الآثار'' کے نام سے موسوم ہے۔[3] جس کے بارے میں علامہ تاج الدین سبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''انہوں نے اپنی کتاب تہذیب الآثار مرتب کرنا شروع کی جو ان کی بہترین تصانیف میں سے ہے، اس کا آغاز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ان مرویات سے کیا جو صحیح سند سے ان تک پہنچی تھیں۔ انہوں نے ہر حدیث کے علل اور طرق پر بحث کی۔ اس میں موجود فقہی مسائل اور سنتوں کی وضاحت کی، ہر حدیث کے متعلق علماء کے اختلافات اور ان کے دلائل ذکر کیے۔ اس کے معانی اور مشکل لغات کی تشریح کی۔ انہوں نے ایک اور کتاب ''البسیط'' شروع کی جس میں صرف کتاب الطہارۃ ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل تھی۔''[4]

---

① اخرجه ابن عساکر بالاسناد المتصل فی تاریخ دمشق: ۵۲/۲۰۷، ۲۰۸

② افسوس کہ یہ کتاب اس وقت نایاب ہے۔ اس کی صرف درمیان کی ایک جلد مطبوعہ ہے جو منتخب ذیل المذیل کے نام سے ملتی ہے۔

③ یہ کتاب ادھوری رہ گئی۔ جس قدر ہوئی اس میں سے صرف ۴ جلدیں مطبوعہ دستیاب ہیں۔ حافظ ذہبی کا کہنا ہے کہ اگر یہ مکمل ہوتی تو ۱۰۰ جلدوں تک ہوتی۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۴/۲۷۳)

علماء و فقہاء کو وسعت نظر پیدا کرنے کے لیے امام طبری کی تہذیب الآثار کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ یہ فقہ میں اسی قسم کا کام تھا جیسا کہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے بھی شرح معانی الآثار مرتب فرمائی۔ مگر شرح معانی الآثار میں مختلف فیہ فقہی مسائل کی احادیث لی گئی ہیں جبکہ تہذیب الآثار میں اس وقت تک میسر تمام سنن کو لینے کی کوشش کی گئی تھی۔ نیز اس میں سند کی علتوں اور رجال پر جا بجا دقیق بحث کی ہے جس سے امام طبری کی ژرف نگاہی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ احادیث کے ساتھ مذاہب فقہاء بھی بیان کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ حنفی ''تہذیب الآثار'' کو محض شافعی مذہب کی مؤید خیال کر کے اس کی طرف توجہ نہیں دیتے مگر درحقیقت تہذیب الآثار میں امام طبری نے احناف کے لیے جس وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کیا ہے، وہ کم دکھائی دیتا ہے۔ وہ جگہ جگہ امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ جو حضرات حدیث سے احناف کے مؤیدات جمع کرنے کا کام کرنا چاہتے ہیں، انہیں تہذیب الآثار کی دستیاب جلدوں کو ضرور سامنے رکھنا چاہیے۔

④ طبقات الشافعیہ الکبری: ۳/ ۱۲۰ تا ۱۲۲

ان کی تفسیر نے عظیم المرتبت ائمہ سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ شیخ ابو حامد اسفرائنی رحمہ اللہ (جنہیں ابن صلاح رحمہ اللہ قرنِ رابع کا مجدد قرار دیتے ہیں) فرماتے تھے: ''یہ تفسیر حاصل کرنے کسی کو چین کا سفر بھی کرنا پڑے تو کوئی بڑی بات نہیں۔'' نیز فرماتے تھے: ''اللہ کا مجھ پر کرم ہے کہ میں اس تفسیر کا ہمیشہ مطالعہ کرتا اور اس سے استفادہ کرتا ہوں۔''[1]

جب امام طبری رحمہ اللہ نے یہ تفسیر مرتب کرنے کا ارادہ کیا تو ساتھیوں سے کہا: ''کیا تمہیں قرآن مجید کی تفسیر دیکھ کر خوشی نہ ہوگی؟'' ساتھیوں نے پوچھا: ''ضخامت کتنی ہوگی؟'' فرمایا: ''تیس ہزار اوراق ہوں گے۔'' ساتھی کہنے لگے: ''اسے پڑھنے سے پہلے ہی عمریں تمام ہو جائیں گی۔'' تب امام طبری رحمہ اللہ نے تفسیر کو مختصر کر کے تین ہزار اوراق میں سمیٹا۔[2]

مگر یہ مختصر تفسیر بھی درحقیقت بڑی ضخیم ہے۔ اسی لیے شیخ ابو حامد اسفرائینی رحمہ اللہ فرماتے تھے:

''میں چاہتا ہوں کہ اس کا اختصار پیش کروں تاکہ ہر کسی کے لیے اس سے استفادہ آسان ہو جائے۔''[3]

امام طبری رحمہ اللہ تاریخ لکھنے بیٹھے تو اس وقت بھی ساتھیوں سے پوچھا: ''کیا حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک کی تاریخ دیکھ کر تمہیں مسرت نہ ہوگی؟'' سوال ہوا: ''ضخامت کتنی ہوگی؟'' اس بار بھی انہوں نے لگ بھگ تیس ہزار صفحات بتائے اور ساتھیوں نے پھر عذر کیا کہ اسے پڑھنے میں زندگی ختم ہو جائے گی۔ یہ سن کر امام طبری رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اناللہ! ہمتیں پست ہو گئیں۔'' اس کے بعد تاریخ کو بھی تقریباً تین ہزار صفحات میں مرتب کیا۔[4]

انہوں نے تاریخ کو انبیائے کرام سے شروع کر کے ۳۰۲ھ کے احوال پر ختم کیا ہے۔ اس میں دورِ رسالت، دورِ خلافتِ راشدہ اور خلافتِ بنو امیہ کے علاوہ عہدِ بنو عباس کی پونے دو صدیوں کی تفصیلات موجود ہیں۔

''طبقات الفقہاء'' ان کی فقہی بصیرت اور وسعتِ نگاہ کا ایک اور ثبوت ہے۔ اس میں ائمہ اربعہ کے مابین مختلف فیہ مسائل کو لیا گیا ہے۔ ہر امام کا مذہب اور اس کی دلیل پیش کی گئی ہے۔ ان مباحث میں اسناد اور علل پر دقیق عقلی و نقلی بحث بھی کی گئی ہے۔ آج کل اس کی فقط ایک جلد دستیاب ہے جو معاملات سے متعلق ہے۔

عقائدِ اسلام کے ثبوت میں ان کی لاجواب کتاب ''صریح السنۃ'' بھی لائقِ مطالعہ ہے۔ باطل فرقوں کی تردید میں ان کے رسالے ''التبصیر فی معالم الدین'' کی بھی ہر ہر سطر ایمان افروز ہے۔ ان کی تصانیف بہت زیادہ تھیں مگر ان میں سے لگ بھگ سات آٹھ ہی باقی رہ سکیں۔ تاریخِ طبری کے مقدمے میں ڈاکٹر ابو الفضل ابراہیم نے ان کی ۲۶ تصانیف کا تعارف کرایا ہے۔ علامہ سبکی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے زندگی کے چالیس برس اس طرح گزارے کہ روزانہ چالیس اوراق تحریر کرتے رہے۔''[5]

---

[1] طبقات المفسرین للاذنهوی، ص ۵۰، ۵۱　[3] طبقات الشافعیه الکبری: ۱۲۳/۳

[2] طبقات المفسرین للاذنهوی، ص ۵۱.

نوٹ: یہ تین ہزار اوراق قدیم زمانے کے تھے۔ آج کل مطبوعہ تفسیر طبری کئی جلدوں میں آرہی ہے جس کے مجموعی صفحات دس ہزار سے بھی زائد ہیں۔

[4] طبقات الشافعیه الکبری: ۱۲۳/۳

[5] طبقات الشافعیه الکبری: ۱۲۳/۳، اخرجه الخطیب فی تاریخ بغداد باسناده

امام ابوجعفر الطحاوی رحمہ اللہ

انہی علمائے راسخین میں امام ابوجعفر احمد بن محمد الطحاوی رحمہ اللہ بھی شامل تھے۔ وہ ۲۳۹ھ میں مصر کے ایک گاؤں "طحا" میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ مشہور شافعی محدث ابراہیم مزنی رحمہ اللہ کے بھانجے تھے اور انہی سے پڑھتے تھے۔ ایک دن ماموں نے غصے میں آکر کہہ دیا: "تم سے کچھ نہیں ہوگا۔"

یہ ناراض ہوکر قاضیِ مصر احمد بن ابی عمران رحمہ اللہ کے حلقۂ درس میں چلے گئے۔ رفتہ رفتہ علمائے احناف کی فکر ونظر سے متاثر ہوکر فقہ حنفی کے قائل ہوگئے اور اس میں اتنی مہارت حاصل کی کہ اپنے دور میں احناف کے ترجمان کہلائے۔ جب انہیں مصر کا قاضی بنایا گیا تو ان کی عمر تیس سال سے کچھ اوپر تھی۔ ان کا انتقال ۳۲۱ھ میں ہوا۔

امام طحاوی رحمہ اللہ کی تصانیف بکثرت ہیں جن میں "شرح معانی الآثار"، "شرح مشکل الآثار"، "اختلاف الفقہاء"، "المختصر فی الفقہ"، "احکام القرآن" اور "الوصایا" مشہور ہیں۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جو شخص اس امام کی تصانیف کا مطالعہ کرے گا وہ ان کے علمی مقام اور وسعتِ نظری کا قائل ہوجائے گا۔"[1]

علمِ حدیث میں ان کی تصنیف "شرح معانی الآثار" تمام کتبِ حدیث سے الگ طرز کی ہے۔ اس میں وہ ہر باب میں باہم متعارض روایات کو الگ الگ پیش کرتے ہیں اور آخر میں اپنی "نظر" پیش کر کے ثابت کرتے ہیں کہ فقہ حنفی عقل ونقل اور اصولِ شرع سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اہل سنت والجماعت کے تمام مکاتبِ فکر کے متفق عقائد پر مشتمل ایک مختصر مگر جامع متن مرتب کیا جو "العقیدۃ الطحاویۃ" کے نام سے مشہور ہوا۔ آج تک اسے اہل سنت کے "سرنامے" کی حیثیت حاصل ہے؛ کیوں کہ یہ ایک ایسے بلند پایہ مجتہد کا پیش کردہ متن ہے جس کی جلالتِ قدر، علمی شان اور امانت ودیانت پر سب کا اتفاق ہے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ نے یہ متن لکھ کر اسلامی عقائد کے دفاع کے لیے ایسا قابلِ قدر کام کیا کہ آج تک عقائد کی بحث میں حوالہ دینے کے لیے "العقیدۃ الطحاویۃ" کو سب سے پہلے پیش کیا جاتا ہے۔

امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ

امام احمد بن حنبل، امام طبری اور امام طحاوی رحمہم اللہ کے کام کے باوجود اُمت کو ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جو جدید ذہن کو سامنے رکھتے ہوئے نئے شکوک وشبہات کو دور کرتی۔ چونکہ معتزلی علماء عقلی دلائل کے ساتھ بحث کرتے تھے؛ اس لیے عام طور پر وہ ذہین اور نکتہ رس مشہور ہوگئے تھے۔ نئے فقہاء ومحدثین نے عقلی طریقۂ بحث سیکھنے کی طرف توجہ نہیں کی جس کی وجہ سے عام تاثر یہ پھیلنے لگا تھا کہ فقہاء ومحدثین کے دلائل کمزور ہوتے ہیں۔ اس صورتِ حال کو بدلنے کے لیے کسی ایسے عالم کی ضرورت تھی جو علم، ذہانت، عقل، زبان آوری اور ذہنی سطح کے اعتبار سے وقت سے کہیں آگے ہو۔

[1] سیر اعلام النبلاء: ۲۸/۱۵ تا ۳۰

ایسے میں اللہ نے امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ (۲۶۰ھ۔۳۲۴ھ) کو علمائے حق کی نمائندگی کے لیے کھڑا کر دیا۔ وہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے تھے۔ پہلے وہ ایک مشہور معتزلی عالم تھے۔ چالیس سال کی عمر تک فقہاء اور محدثین سے مناظرے کرتے رہے۔ انہیں معتزلہ کی زبان مانا جاتا تھا۔ مگر مناظرے کرتے کرتے انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ عقلی دلائل محض ایک ذہانت کے اظہار کے سوا کچھ نہیں۔ حقیقت وہی ہے جو فقہاء و محدثین بتاتے ہیں اور جو صحابہ کرام کا مسلک تھا۔ انہوں نے کچھ دن غور و فکر میں گزارے اور پھر ایک دن بھرے مجمع میں معتزلی عقائد سے تو بہ تائب ہونے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد ان کی زندگی علمائے حق کے مسلک کی اشاعت کے لیے وقف ہوگئی۔

انہوں نے معتزلہ کو مشتعل کرنے یا ان کی تحقیر کے درپے ہونے کے بجائے پوری سنجیدگی سے انہیں اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کے لیے انہوں نے معتزلہ اور محدثین کے مابین ایک معتدل طریقہ اختیار کیا۔ نہ تو انہوں نے معتزلہ کی طرح عقل کو حرفِ آخر مانا، نہ ہی فقہاء و محدثین کی طرح عقلی دلائل کو بے کار قرار دیتے ہوئے زیرِ بحث اعتقادی مسائل میں سکوت اور توقف کو واجب کہا۔ ان کا کہنا تھا کہ جس طرح عوام سے عوامی زبان میں بات کرنا ضروری ہے اسی طرح اہلِ عقل سے ان کی زبان اور اصطلاحات میں بحث کرنا لازمی ہے۔

انہوں نے مناظروں، مباحثوں اور اپنی تحریروں میں اہلِ سنت کے عقائد کو عقلی دلائل سے واضح کیا اور باطل فرقوں کے ایک ایک نظریے کو انہی کی زبان و اصطلاحات کے ساتھ اور انہی کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں غلط ثابت کر دیا۔ عقائد کے ثبوت کا یہ عقلی، منطقی اور فلسفیانہ طرز ''علمِ کلام'' کہلاتا ہے اور اہلِ سنت میں اس کے بانی ابوالحسن اشعری ہیں۔ ان کی کوششوں نے معتزلہ کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا اور اہلِ حق سے احساسِ کمتری کو دور کر کے ان کے قدموں کو جما دیا۔ عقائد، علم کلام اور دیگر دینی موضوعات پر ابوالحسن الاشعری رحمہ اللہ کی کتب کی تعداد اڑھائی سو تک بتائی جاتی ہے۔ ان میں سے ''الابانۃ''، ''رسالۃ الی اہل الثغر'' اور ''مقالات الاسلامیین'' آج بھی موجود ہیں اور اپنے مصنف کے علمی کمالات کی گواہ ہیں۔ ان کے دلائل کا آج تک جواب نہیں دیا جا سکا۔

ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ ۳۲۴ھ میں فوت ہوئے۔ علماء نے انہیں اس دور کا محافظِ سنت قرار دیا ہے۔ ابوبکر اسماعیلی نے دین کی حفاظت کے سلسلے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے بعد انہی کا نام ذکر کیا ہے۔ ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ کے طرز پر اہلِ سنت کے عقائد کی وکالت کرنے والے ''اشاعرہ'' کہلاتے ہیں۔ وہ خود فقہ شافعی کے پیروکار تھے؛ اس لیے شافعی علما، متکلمین اور مناظرین نے زیادہ تر ان کی پیروی کی۔ اسی لیے آج تک شوافع کی اکثریت اعتقادی و اصولی لحاظ سے اشعری چلی آرہی ہے۔ چونکہ ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ نے عالم اسلام کے مرکز بغداد میں کام کیا تھا اور معتزلہ سے براہِ راست ٹکر لی تھی؛ اسی لیے عالم اسلام میں ان کے علم کلام کو غیر معمولی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی۔[1]

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۸۵/۱۵ تا ۹۰؛ ابو الحسن الاشعری از شیخ حماد انصاری/۵ تا ۲۱؛ تبیین کذب المفتری: /۵۳ تا ۱۲۰؛ تاریخ دعوت وعزیمت از مولانا ابو الحسن علی ندوی: ۱۰۳/۱ تا ۱۱۶

امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ

ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ کے بعد عقائد کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہونے والے علماء میں وسطِ ایشیا کے ابومنصور محمد بن محمد الماتریدی رحمہ اللہ (م ۳۳۳ھ) سب سے نمایاں ہوئے۔ وہ سمرقند کے ایک محلّے ''ماترید'' کے رہنے والے تھے۔ اس دور کے جید عالم اور بے مثل مناظر تھے۔ وسطِ ایشیا و خراسان میں منقولات و معقولات پر یکساں دسترس رکھنے والا ان جیسا عالم اور کوئی نہ تھا۔ باطل فرقے ان کا سامنا کرنے سے گھبراتے تھے۔ ان کی گفتگو بڑی دوٹوک، مدلل اور مؤثر ہوتی تھی۔ انہوں نے بے شمار مناظروں اور مباحثوں میں معتزلی، رافضی اور قرامطی مناظرین کو چاروں شانے چت کیا۔

وہ بڑے معتدل مزاج آدمی تھے اور عقائدِ صحیحہ کے لیے وہی دلائل پسند کرتے جو واقعی سوفی صد وزنی ہوں۔ ان سے پہلے معتزلہ کی ضد کی وجہ سے ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ کے کلام میں بعض تشدد آمیز باتیں آگئی تھیں اور ان کے پیرو کاروں نے ان کی وکالت میں بات کو مزید بڑھا دیا تھا۔ ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ نے علمِ کلام سے ایسی کم وزن اور زائد باتوں کو نکال دیا جو محض معتزلہ کی ضد میں اس کا جزو بنادی گئی تھیں۔ انہوں نے اہلِ سنت کے عقائد کے عقلی دلائل کو مزید سلیقے، اعتدال اور خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا۔ مناظروں کے علاوہ انہوں نے عقائدِ باطلہ کی تردید میں عظیم الشان تصنیفی کام کیا جس میں ''کتاب التوحید''، ''الرد علی القرامطہ''، ''اوہام المعتزلہ''، ''تاویلات اہل السنۃ''، ''تاویلات القرآن''، ''کتاب الجدل'' اور ''مآخذ الشرائع'' مشہور ہیں۔ انہوں نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے رسالے ''الفقہ الاکبر'' کی شرح بھی لکھی۔ (1)

''کتاب التوحید'' ان کی علمی عبقریت، معقولات میں ان کی غیر معمولی مہارت اور اسلامی فرقوں کے علاوہ دیگر ادیان کے اصول و فروع سے ان کی گہری واقفیت کا ثبوت ہے۔ اس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ان تصورات و اوہام سے بلند و بالا ہے جن میں دہریے، بت پرست، مجوسی اور نصرانی مبتلا ہیں۔ اسی طرح اس میں معتزلہ اور قدریہ کے خیالات کی بھی تردید ہے۔ ابن راوندی جیسے فلسفیوں کے خیالات کا پردہ بھی چاک کیا گیا ہے۔ (2)

''تاویلات القرآن'' اپنے موضوع پر ایک منفرد تصنیف ہے جس سے ان کی قرآن فہمی، نکتہ رسی، وسعتِ علمی اور قوتِ استدلال کا اندازہ قدم قدم پر ہوتا ہے۔

ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ ۳۳۳ھ میں سمرقند میں فوت ہوئے۔ (3) وہ حنفی المسلک تھے اور وسطِ ایشیا، خراسان اور ہندوستان میں فقہِ حنفی ہی رائج تھی؛ اس لیے ان کا علمِ کلام زیادہ تر احناف میں مقبول ہوا۔ آج بھی احناف اعتقادی اور اصولی لحاظ سے ''ماتریدی'' کہلاتے ہیں۔ (4)

(1) الجواهر المضيه فی طبقات الحنفية: ۲/۱۳۰؛ الاعلام زرکلی: ۷/۱۹

(2) یہ کتاب ڈاکٹر فتح اللہ خلیف کی تحقیق کے ساتھ دار الجامعات المصریہ اسکندریہ سے شائع ہو چکی ہے۔

(3) الجواهر المضيه فی طبقات الحنفية: ۲/۱۳۰

(4) الجواهر المضيه فی طبقات الحنفية: ۱/۵۶۲

ماتریدیوں اور اشعریوں کا اختلاف ایک دور میں بہت معرکۃ الآراء میدان رہا مگر درحقیقت ایسے تمام نکات جن میں ان دونوں مکاتبِ فکر کا اختلاف ہے، تیس سے زیادہ نہیں اور محققین کے نزدیک یہ اختلاف بھی عقائد کا نہیں، ان کے دلائل پیش کرنے کے انداز پر ہے؛ اس لیے اسے لفظی اختلاف کہنا ہی بجا ہے۔

فضائلِ صحابہ پر بعض علماء کی کاوشیں:

اس دور میں علمائے کرام نے صحابہ کرام کے حالات پر تالیفات کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ شامی محدث خیثمہ بن سلیمان رحمہ اللہ (۲۵۰ھ۔۳۴۳ھ) نے ''فضائل الصحابہ'' تصنیف کی۔ [1]

بغداد کے ایک محدث ابن حسب بخاری رحمہ اللہ (۲۶۶ھ۔۳۵۰ھ) نے ''فضائل علی رضی اللہ عنہ'' کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا۔ [2] ایک اور عالم عبدالواحد بغدادی رحمہ اللہ (۲۶۱ھ۔۳۴۵ھ) نے ''جزء فضائل معاویہ رضی اللہ عنہ'' تالیف کیا۔ اس موضوع پر یہ پہلی کاوش تھی؛ اس لیے عبدالواحد بغدادی رحمہ اللہ اپنے حلقۂ درس میں شامل ہونے والے ہر طالب علم کو پہلے یہ رسالہ پڑھاتے تھے۔ [3]

علمِ حدیث کی خدمت، ابو یعلیٰ مُوصلی:

حدیث پر بھی خاصا اہم کام ہوا۔ ابو یعلیٰ مُوصلی رحمہ اللہ (۲۱۱ھ۔۳۰۷ھ) نے تیرہ جلدوں میں ''مسند ابی یعلیٰ'' مرتب کی جس نے تمام علمی حلقوں سے دادِ وصول کی۔ [4]

امام طبرانی رحمہ اللہ:

فلسطین کے شہر طبریہ سے تعلق رکھنے والے شامی محدث ابوالقاسم الطبرانی رحمہ اللہ (۲۶۰ھ۔۳۶۰ھ) نے "المعجم الکبیر"، "المعجم الاوسط" اور "المعجم الصغیر" جیسے قیمتی ذخائرِ حدیث پیش کیے۔ [5]

امام ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ کے کارنامے:

بعض علمائے کرام نے دربارِ خلافت سے رابطہ رکھا اور کوشش کرتے رہے کہ وہاں قرآن وسنت کے علوم زندہ رہیں۔ ان میں شیخ ابن ابی الدنیا بغدادی رحمہ اللہ (م ۲۸۱ھ) کا نام نامی سرِ فہرست ہے۔ وہ بغداد کے نامور واعظ، مصلح اور مصنف تھے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر ۱۶۴ کتب لکھیں جن میں سے بیشتر آج بھی موجود ہیں۔

ان کتب کی خصوصیت ان کا اختصار اور جامعیت ہے۔ اس کے ساتھ یہ عام فہم بھی ہیں۔ معاشرے کی برائیوں پر ان کی خاص نگاہ تھی؛ اس لیے الگ الگ منکرات پر انہوں نے الگ الگ تالیفات پیش کیں۔ مثلاً غیبت کی مذمت

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۴۱۳/۱۵
[2] سیر اعلام النبلاء: ۵۲۴/۱۵
[3] سیر اعلام النبلاء: ۵۱۰/۱۵
[4] سیر اعلام النبلاء: ۱۷۴/۱۴
[5] سیر اعلام النبلاء: ۱۱۹/۱۶

میں ''ذم الغیبۃ''، جھوٹ کے خلاف ''ذم الکذب''، نشے کے نقصانات کے بارے میں ''ذم المسکر''، اور گانے بجانے کی خرابیوں سے آگاہ کرنے کے لیے ''ذم الملاہی'' لکھیں۔ اسی طرح رمضان کے اجر وثواب پر ''فضائل رمضان''، جنت کا شوق دلانے کے لیے ''صفۃ الجنۃ''، اخلاقیات پر ''مداراۃ الناس'' اور ''مکارم الاخلاق'' اور شیطان کی چالوں سے خبردار کرنے کے لیے ''مکائد الشیطان'' لکھیں۔ ہر کتاب اپنی جگہ بے نظیر ہے۔

امام ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ ان علمی، عملی اور ادبی خوبیوں کی وجہ سے ہر طبقے کے نزدیک معزز رہے۔ ایوانِ حکومت میں وہ اس قدر محترم تھے کہ خلفاء کی اولاد کے استاذ مقرر ہوئے۔ مُعتضِد اور مکتفی جیسے خلفاء ان کی تربیت میں پلے بڑھے۔ ①

ابن الانباری رحمہ اللہ:

بغداد کے مشہور عالم ابوبکر ابن الانباری رحمہ اللہ (۲۷۱ھ۔ ۳۲۸ھ) کا نام بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ عالم و محدث ہونے کے ساتھ ادیب اور ماہرِ لغت بھی تھے۔ قرآن مجید کے الفاظ وتراکیب کے لیے انہیں شعر وادب کے ذخائر میں سے تین لاکھ مثالیں یاد تھیں۔ ''ایضاح الوقف والابتداء فی کتاب اللّٰہ'' اور ''عجائب علوم القرآن'' سے ان کے علمی مقام کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انہیں خلیفہ راضی باللہ کے محل میں شہزادوں کو تعلیم دینے کا موقع ملا۔ ②

علی بن عیسیٰ الجراح، وزیر خلافتِ عباسیہ:

ان علماء میں علی بن عیسیٰ الجراح رحمہ اللہ کا نام نامی بھی قابلِ ذکر ہے۔ وہ ایک نامور محدث، فقیہ اور سیاست دان تھے۔ امورِ سیاست میں ان کے مقام کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مقتدر عباسی اور قاہر عباسی کے دور میں خلافت کے وزیر بنائے گئے۔ انہوں نے ۹۰ سال عمر پائی اور خلیفہ متقی للہ کے دور میں ۳۳۴ھ میں وفات پائی۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وزراء میں ان کی حیثیت ایسی تھی جیسے خلفاء میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی۔ ③

ان حضرات کی کوششیں اگرچہ فوری طور پر حالات کا رخ نہ بدل سکیں مگر ان کا یہ اثر ضرور ہوا کہ آئندہ عشروں کی خطرناک اعتقادی ونظریاتی لہر میں حکمران خاندان، تشیع، اعتزال اور ناصبیت میں ابتلاء سے بڑی حد تک محفوظ رہا۔

❖❖❖

① تاریخ بغداد: ۸۹/۱۰ تا ۹۱، ط العلمیۃ؛ سیر اعلام النبلاء: ۳۹۷/۱۳ تا ۴۰۴، ط الرسالۃ

② وفیات الاعیان: ۳۴۱/۴ تا ۳۴۳، ط دار صادر

③ العبر فی خبر من غبر: ۴۸/۲

صوفیائے کرام

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ (۲۲۰ھ۔۲۹۷ھ)

اسلامی تاریخ کے یہ مایہ ناز صوفی ۲۲۰ھ میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن نہاوند تھا۔ اپنے ماموں سرّی سقطی رحمہ اللہ سے حدیث اور ابوثور رحمہ اللہ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ بیس سال کے تھے جب وہ ابوثور رحمہ اللہ کے حلقے میں مسندِ افتاء پر بیٹھ آگئے۔ تاہم جلد ہی ان کا رجحان سلوک واحسان کی طرف ہوگیا۔ سرّی سقطی رحمہ اللہ خود بھی بہت بڑے عارف تھے۔ جنید رحمہ اللہ بچپن سے ان کی تربیت میں رہے تھے۔ ان کی نگاہ کا اثر یہ تھا کہ معرفت کا نور اسی وقت سے دل میں سرایت کر چکا تھا اور کبھی کبھی زبان سے اس کا اظہار بھی ہو جاتا۔ سات سال کے تھے جب ماموں کی مجلسِ وعظ کے سامنے کھیل رہے تھے، اُدھر شکر کے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی کہ حضرت سرّی رحمہ اللہ نے انہی سے پوچھ لیا:

''بچے! بتاؤ شکر کا کیا مطلب ہے؟''

فوراً بولے: ''آدمی اللہ کی نعمتیں پا کر اس کی نافرمانی نہ کرے۔''

یہ تھے جنید بغدادی رحمہ اللہ جنہوں نے جوان ہو کر اس دور کے دوسرے نامور مشائخ سے بھی فیض حاصل کیا تو جامع الکمالات بن گئے۔ صوفی بن کر انہوں نے عام درویشوں کی طرح کسبِ معاش کو ترک نہیں کیا بلکہ بازار میں ان کی ایک دکان تھی جس میں بیٹھا کرتے تھے۔ تاہم وہاں بھی روزانہ ہزار تسبیحات اور تین سو رکعت نوافل کا معمول تھا۔[1]

پہلے وہ وعظ وارشاد سے گریز کرتے تھے اور خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ ایک بار شبِ جمعہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ ارشادِ نبوی ہوا: ''لوگوں کی مجلس میں وعظ کرو۔''

اگلے دن وہ جامع مسجد میں وعظ کے لیے بیٹھے تو ہر طرف چرچا ہوگیا اور لوگ امنڈنے لگے۔ پہلے ہی دن کے وعظ میں ایک نصرانی لڑکا مشرف باسلام ہوگیا۔[2] اس کے بعد بغداد میں جیسی مقبولیت ان کی مجلسِ وعظ کو نصیب ہوئی وہ ان سے پہلے کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ اللہ نے ان کی زبان میں بڑی تاثیر رکھی تھی۔ قرآن وسنت کا علم جب دلی کیفیات کے ساتھ گندھ کر ان کی زبان سے ادا ہوتا تو معارف کے دریا بہنے لگتے۔

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱۴/۶۶ تا ۶۸

② وفیات الاعیان: ۱/۳۷۳، ۳۷۴

اس دور میں بعض صوفی بزرگوں کے احوال وکیفیات کی شہرت نے تصوف کے بارے میں یہ تاثر قائم کر دیا تھا کہ وہ شریعت سے الگ کوئی چیز ہے۔ جنید بغدادی رحمہ اللہ خود بھی ایسے تصوف کے قائل نہیں تھے جو شریعت سے متصادم ہو، اس لیے وہ واضح طور پر فرماتے تھے: ''ہمارے اس علم کا دار و مدار رسول اللہ ﷺ کی سنت پر ہے۔''

اس دور کے ایک صاحب کا کہنا ہے:

''میں نے بغداد میں جنید کو دیکھا، میری آنکھوں نے ان جیسی کوئی اور شخصیت نہیں دیکھی۔ ادیب ان کے الفاظ نقل کرنے، فلسفی ان کے باریک نکات سننے اور متکلمین اپنے علم کو وسعت دینے ان کی مجلس میں حاضر ہوا کرتے تھے اور ان کا کلام ہر ایک کے علم وفہم کے لحاظ سے الگ الگ محسوس ہوتا تھا۔''

زمانے کے حالات اور مختلف شہروں کے احوال پر ان کی بڑی گہری نگاہ تھی، اسی کے مطابق لوگوں سے کلام کرتے تھے۔ ایک بار فرمایا: ''اہلِ بغداد نرے دعووں اور زبان آوری کے عادی ہیں۔ خراسان کے لوگ اہلِ دل اور فیاض ہیں۔ بصرہ والوں میں زہد وقناعت ہے۔ شام کے لوگ متحمل مزاج اور امن پسند ہیں۔ اہلِ حجاز صابر اور اللہ کی طرف متوجہ رہنے والے ہیں۔''

اسی طرح وہ درویشوں کے دعووں اور معرفت پر مبنی اظہارِ کیفیات کے قائل بھی نہیں تھے۔ فرماتے تھے:

''ہم نے تصوف قیل وقال سے حاصل نہیں کیا بلکہ بھوک، ترکِ دنیا اور پسندیدہ چیزوں کو چھوڑ کر سیکھا ہے۔''

حافظ ذہبی رحمہ اللہ جو عام طور پر جاہل صوفیاء پر بڑی شدت سے نکیر کرتے ہیں، حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''اللہ کی رحمت ہو جنید پر۔ بھلا کون ہے جو علم اور حال میں ان کی مثل ہو۔''[1]

۲۹۷ھ میں تلاوت کرتے ہوئے ان کی وفات ہوئی۔ کسی نے خواب میں دیکھا اور حال پوچھا۔ فرمایا: ''وہ لطائف ومواعظ غائب ہو گئے، وہ معارف فنا ہو گئے۔ بس وہ چند رکعات کام آئیں جو ہم تہجد کے وقت پڑھا کرتے تھے۔''[2]

شیخ ابو بکر شبلی رحمہ اللہ (۲۴۷ھ۔۳۳۴ھ)

شیخ ابو بکر شبلی رحمہ اللہ مالکی مذہب کے عالم اور عابد وزاہد بزرگ تھے، سامرا میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد سمرقند کے قریب ''اُشروسَنہ'' کی ایک بستی ''شِبلِیَہ'' کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے بیس سال تک حدیث اور بیس سال تک علم فقہ کی تحصیل کی تھی۔

ان کے والد کو دربارِ خلافت میں حجابت کا عہدہ ملا تھا، اس لحاظ سے وہ بڑے رئیس آدمی تھے۔ والد کے بعد شبلی رحمہ اللہ خلیفہ معتمد کے بھائی مُوَفَّق کے حاجب بنے، مگر جب بغداد کے مشہور بزرگ خیر بن عبداللہ النساج رحمہ اللہ (م۳۲۲ھ) کی مجلس میں بیٹھے تو دنیا سے دل اچاٹ ہو گیا اور سرکاری عہدہ چھوڑ کر حلقۂ اولیاء سے وابستہ ہو گئے۔

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱۴/ ۶۸ تا ۷۰ ② وفیات الاعیان: ۱/ ۳۷۴

والد سے ترکے میں جو نقد رقم ملی تھی وہ ۶۰ ہزار دینار (پندرہ کروڑ روپے) تھے، جائیدادیں اس کے علاوہ تھیں مگر رفتہ رفتہ یہ سب راہِ خدا میں لٹا دیا اور خود فقر و فاقے کی زندگی اختیار کر لی اور بغداد میں علوم و معرفت کی بزم سجائی۔

حضرت شبلی رحمہ اللہ سخت مجاہدے اور ریاضت کے عادی تھے۔ بسا اوقات ان پر غلبۂ حال ہو جاتا اور ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتے، ایسے میں ان کی کیفیات کو عام لوگ نہیں سمجھ سکتے تھے۔

تاہم وہ شریعت اور سنت کے پوری طرح پابند تھے۔ اپنی وفات تک بغداد میں اصلاحی خدمات میں مشغول رہے۔

وفات سے کچھ دیر پہلے فرمایا: ''مجھ پر کسی کا ایک درہم رہ گیا تھا۔ اب تک حق دار کی طرف سے ہزاروں درہم صدقہ کر چکا ہوں مگر اس کا بوجھ ابھی تک دل پر ہے۔''

۳۳۴ھ میں وفات پائی۔ آخری لمحات میں بھی نماز کا خیال تھا۔ اپنے خادمِ خاص ابوبکر دینوری رحمہ اللہ کو وضو کرانے کا کہا۔ وہ ڈاڑھی میں خلال کرانا بھول گئے۔ ادھر شبلی رحمہ اللہ پر نزع کا عالم طاری تھا، آواز بند ہو چکی تھی، اسی حالت میں ابوبکر دینوری رحمہ اللہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی ڈاڑھی میں داخل کیا کہ خلال کرا دیں۔

اسی حالت میں حضرت شبلی رحمہ اللہ کی روح پرواز کر گئی۔[1]

اللہ کی رحمتیں ہوں، ان ہستیوں پر۔ آخری سانس میں بھی ایک سنت چھوڑنا گوارا نہ کی۔

◆◆◆

[1] سیر اعلام النبلاء: ۳۶۹/۱۵؛ طبقات الاولیاء: ۳۴/۱ تا ۳۶؛ الاعلام زرکلی: ۳٤۱/۲

زوالِ خلافتِ بغداد

وسطی دور

بنو بُویہ کا تسلط

بغداد پر بنو بُویہ کے قبضے سے القائم کی دوبارہ تخت نشینی تک
(۳۳۴ھ تا ۴۵۰ھ)
۱۱۶ سال

اب ہم لگ بھگ سوا صدی پر مشتمل اس دور کا مطالعہ کرنے لگے ہیں جس میں اندلس کے سوا تقریباً پورے عالم اسلام پر باطل فرقوں کی اجارہ داری قائم ہو چکی تھی جن کی سرپرستی میں حقیقی اسلام کی بنیادیں کھود کر باطل عقائد کی جڑیں پھیلائی گئیں۔ وہمی باتوں، ڈھکوسلوں اور من گھڑت روایتوں اور افسانوں پر مشتمل نئے ادیان کو نام نہاد علمی بنیادیں فراہم کی گئیں۔ یوں اسلام میں ایسا گہرا نقب لگایا گیا جس کے باعث مسلمانوں کا ایک ہونا ممکن نہ رہا۔ اس خدردرجے افسوس ناک انقلاب میں تین جماعتوں کا کردار سب سے زیادہ تھا:

❶ بنوبُوَیہ ❷ قرامطہ ❸ بنوعبید

قرامطہ اور بنوعبید کے کچھ حالات ہم گزشتہ اوراق میں پڑھ چکے ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ تیسری صدی ہجری کے وسط میں ان کا ظہور ہوا اور صدی کے اختتام تک بنوعبید افریقہ پر اور قرامطہ حجاز اور شام پر قابض ہو چکے تھے۔ ان دونوں جماعتوں کے تفصیلی حالات ہم آگے ایک مستقل باب میں بیان کریں گے۔ یہاں ہماری توجہ زیادہ تر بنوبُوَیہ کی طرف رہے گی؛ کیوں کہ یہی وہ گروہ تھا جو مرکزِ اسلام بغداد پر قابض رہا اور اسی کی کوششوں کے سے اس سوا صدی میں ایران وخراسان میں بدعقیدگی کو اس قدر رواج ملا کہ آج تک اس خطے میں اس کے اثرات موجود ہیں۔

کوہستانِ دَیلم کی پراسرار داستان:

عالم اسلام پر اس ابتلاء کے سرے شمالی ایران کے دشوار ترین کوہستانی علاقے دَیلم سے جا ملتے ہیں۔ یہ بات سابقہ تاریخ سے سامنے آچکی ہے کہ اکثر خروج کی تحریکوں میں پسِ پردہ غالی شیعوں کا ہاتھ رہا ہے۔ اس قسم کے کتنے ہی لوگ اموی اور عباسی حکومتوں کی پکڑ دھکڑ سے بچ کر اس کوہستان میں جہاں سرکاری افواج کی پہنچ بہت مشکل تھی، مسلسل آباد ہوتے رہے۔[1]

زیدی شیعوں کی تبلیغِ مذہب:

تیسری صدی ہجری کے وسط میں زیدی شیعوں کے ایک رئیس حسن بن زید علوی نے شمالی ایران کے ضلع طبرستان میں اپنی آزاد حکومت قائم کر لی جو دولتِ زیدیہ طالبیہ کے نام سے جانی جاتی ہے۔[2] حسن بن زید کے بعد ان کی جگہ ان کے بھائی محمد بن زید نے سنبھالی مگر ۲۸۷ھ میں خراسان پر قبضے کی کوشش کے دوران وہ سامانی حاکم اسماعیل بن احمد کے مقابلے میں قتل ہو گئے جبکہ اس خاندان کے ارکان کوہستان دیلم میں روپوش ہو گئے، جن میں حسن بن علی اطروش کا

① الکامل فی التاریخ: سنة ۲۸۷ھ، ۳۰۱ھ، ۳۳۴ھ

② یاد رہے کہ یہ حضرات روافض نہ تھے بلکہ روافض سے متنفر تھے۔ (السیف المسلول للسبکی، ص ۴۲۰)

نام نمایاں ہے۔ یہ مقامی لوگوں میں اپنے مذہب کی اشاعت کرتے رہے۔ چوتھی صدی کے آغاز میں یہاں شیعوں کی اچھی خاصی قوت جمع ہوگئی تھی جو کسی کمزور ملک کو تاراج کرنے کے لیے کافی تھی۔ شمالی ایران کے اضلاع طبرستان، جرجان، اور آمد تک ان کا غلبہ ہوگیا۔ اس دوران خلافتِ عباسیہ مسلسل کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ [1]

دَیلمی امراء کا عروج:

اُدھر شیعیت قبول کرنے والے دیلمی سرداروں نے جو دولتِ زیدیہ کے عسکری افسران تھے، غداری کر دی اور اپنے پیشوا زیدی رہنماؤں کو ہٹا کر ان کی جگہ لے لی۔ دیلمیوں نے ۳۱۶ھ میں زیدی رئیس حسن بن قاسم علوی کو قتل کرکے اس کا علاقہ بھی چھین لیا۔ دیلمیوں کا مزاج انتہاء پسندانہ تھا؛ لہٰذا وہ زیدیت کی جگہ رفض کی طرف مائل ہوتے چلے گئے۔ خلافتِ عباسیہ کو کمزور تر دیکھ کر بہت جلد وہ کوہستانِ دَیلم سے خراسان اور ایران وعراق کے میدانوں میں اتر گئے اور مختلف علاقے فتح کرتے چلے گئے۔ اس دوران یہ دَیلمی سردار جو الگ الگ علاقوں پر حاوی تھے، آپس میں بھی لڑتے رہے۔ ان سرداروں میں اسفار بن شیرویہ، اخار بن شیرویہ، ماکان اور علی خورشید نمایاں تھے۔ مگر آخر میں ایک جنگجو رئیس مَرداوِیج سب پر غالب آگیا۔ [2]

بنوبُویہ کا ظہور:

دَیلمی افسران میں سے تین بھائی: علی، حسن اور احمد بھی شامل تھے۔ ان کا باپ بُویہ ایک غریب ماہی گیر تھا۔ غربت کا یہ حال تھا کہ شروع میں اس نے تینوں بیٹوں کو جنگل سے لکڑیاں چننے پر لگا رکھا تھا۔ تاہم یہ تینوں لڑکے بہت ہوشیار تھے؛ اس لیے وہ مَرداوِیج کی فوج میں شامل ہوگئے اور ترقی کرتے کرتے بڑے افسر بن گئے۔

جب مَرداوِیج نے فارس پر قبضہ کیا تو علی بن بُویہ اور اس کے بھائی اس مہم میں پیش پیش تھے چنانچہ مَرداوِیج نے انہیں یہاں کلیدی عہدے دیے مگر قوت حاصل کرتے ہی علی بن بُویہ مَرداوِیج سے لڑ پڑا اور بزورِ شمشیر یہ علاقے اپنے نام کر لیے۔ اسی علی بن بُویہ نے فارس میں ''دولتِ بنی بُویہ'' کی بنیاد ڈالی۔

چند سالوں کے اندر اندر دولتِ بنوبُویہ خلافتِ بنوعباس پر بھی غالب آگئی۔ اس کے ساتھ بنوبُویہ نے عجمیوں کو اپنا عقیدت مند بنانے اور اپنا رعب داب قائم رکھنے کی خاطر اپنا نسب قدیم شاہانِ ایران سے جوڑ لیا جو ایک کامیاب سیاسی چال تھی۔ بُویہی برادران میں سب سے چھوٹا احمد بن بُویہ جو اَہواز کا حاکم تھا، زیادہ موقع شناس نکلا۔ اس نے گیارہ جمادی الاولیٰ ۳۳۴ھ کو بغداد پر قبضہ کرلیا۔ پھر وہ قوت وشہرت پائی کہ باقی بھائیوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ [3]

خلفاء اور بنوبُویہ کے تعلقات:

بغداد پر احمد بن بُویہ کے قبضے سے تاریخ کا وہ ۱۱۶ سالہ سیاہ دور شروع ہوتا ہے جسے ''عہدِ بُویہی'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے ابتدائی ۷۴ سال بُویہیوں کے عروج، خلفاء کی بے بسی اور عوام کی انتہائی تباہ حالی کے تھے۔

(1) موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲۲۰؛ الکامل فی التاریخ: سنة ۲۸۷ھ، ۳۰۱ھ، ۳۳٤ھ (2) بحوالہ بالا (3) بحوالہ بالا

بغداد پر بنو بُویہ کی ۱۱۶ سالہ حکومت میں پانچ خلفاء گزرے:

❶ مستکفی ❷ مطیع ❸ طائع ❹ قادر ❺ قائم

ان کی حیثیت شطرنج کے مہرے سے زیادہ نہیں تھی جن سے بنو بُویہ مختلف چالیں چلتے تھے۔ان خلفاء کے پاس کچھ محافظ، سپاہی اور نوکر چاکر ضرور ہوا کرتے تھے مگر درحقیقت ان کا بغداد کے اندر بھی کوئی بس نہیں چلتا تھا۔ہاں قاضی القضاۃ کا تقرر خلیفہ کے ہاتھ میں تھا اور یہ واحد اختیار تھا جس میں عموماً بنو بُویہ آڑے نہیں آتے تھے۔

خلفاء دربار بھی لگاتے تھے اور ظاہری طور پر بنو بُویہ ان کا اعزاز و اکرام بھی کرتے تھے،ان کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوتے اور زمین بوسی بھی کیا کرتے مگر یہ نمائشی احترام اسی وقت تک رہتا تھا جب تک خلیفہ ان کی مرضی کے مطابق چلتا رہتا۔خلفاء مختلف اجتماعات اور تقاریب کی شان بھی بڑھاتے تھے اور بعض اوقات ارکانِ دولت کو خلعتوں اور انعامات سے بھی نوازتے تھے مگر ان میں سے کوئی کام بنو بُویہ کے ایماء کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔خلفاء ذاتی اخراجات کے لیے بھی بنو بُویہ کے محتاج تھے۔ان کی ایک لگی بندھی یومیہ تنخواہ مقرر تھی۔بعض اوقات یہ نوبت بھی آئی کہ خرچہ بند ہوجانے پر خلیفہ کو گزارہ کرنے کے لیے گھر کا سامان بیچنا پڑا۔

اس طویل دور میں سنت کے شعائر بری طرح پامال ہوئے۔بدعقیدگی کو وہ فروغ ملا کہ الامان والحفیظ۔شیعہ امامیہ مذہب کا دور دورہ اسی زمانے میں ہوا۔یوں وہ رفض جو خلفائے اسلام اور علمائے کرام کی مساعی کے نتیجے میں زیرِ زمین چھپا ہوا تھا،بڑی تیزی سے ابھرا اور مشرق تا مغرب پھیل گیا۔

خلیفہ مستکفی کی معزولی:

بغداد پر احمد بن بُویہ کے قبضے کے وقت خلیفہ مستکفی مسند نشین تھا۔اس نے احمد بن بُویہ کو ''معز الدولہ''،اس کے بھائی علی بن بُویہ کو ''عماد الدولہ'' اور دوسرے بھائی حسن بن بُویہ کو ''رکن الدولہ'' کا خطاب دیا۔تاہم احمد بن بُویہ نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خلیفہ سے ''مَلِک'' کا خطاب بھی لیا۔جلد ہی اس نے خلیفہ کو بے دست و پا کر کے اس کی حیثیت بالکل مٹا دی۔سکے تک اپنے نام کے جاری کرا دیے۔

کچھ دنوں بعد اسے شک ہوا کہ خلیفہ اس کا مخالف ہے۔چند روز بعد دربار میں خراسان کے سفیر کے اعزاز میں تقریب تھی۔احمد بن بُویہ نے سرِ دربار اپنے دو دَیلمی وفاداروں کو اشارہ کیا۔وہ خلیفہ کے پاس پہنچے تو خلیفہ سمجھا کہ میری دست بوسی کرنا چاہتے ہیں۔اس نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔دَیلمی افسروں نے وہی ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹا اور تخت سے نیچے دے مارا۔پورے دربار میں کسی کو چوں کرنے کی مجال نہیں ہوئی۔یہ واقعہ ۲۲ جمادی الآخرہ ۳۳۴ھ کا ہے۔

احمد بن بُویہ نے خلیفہ کی آنکھیں نکلوا دیں اور جیل میں پھینک دیا۔اس طرح مستکفی ایک سال چار ماہ حکومت کرکے زنداں کا لقمہ بنا اور وہیں ۳۳۸ھ میں دنیا سے چل بسا۔[1]

[1] الکامل فی التاریخ، سنة ۳۳٤ھ

بنوبُویہ نے خلافت بنوعباس میں کیوں رہنے دی؟

مستکفی کو نمونہ عبرت بنا کر بنوبُویہ خلافتِ عباسیہ کو مکمل طور پر ختم کر کے کسی علوی شیعہ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے مگر مشیروں نے سمجھایا کہ اگر کسی علوی کو خلیفہ بنایا گیا تو لوگ آپ کو چھوڑ کر اس کی اطاعت کرنے لگیں گے۔ عباسی خلفاء کو باقی رکھنے کا فائدہ یہ ہے کہ وہ بہت کمزور ہیں؛ لہٰذا نام انہی کا چلتا رہے گا اور لوگ آپ کے سامنے جھکے رہیں گے۔[1]

بنوبُویہ کو براہِ راست حکومت کرنے میں ایک خدشہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ایسے میں علماء کی طرف سے خروج یا جہاد کا فتویٰ جاری ہو جاتا۔ عباسی خلفاء کو باقی رکھنے میں یہ خطرہ بہت کم تھا؛ کیوں کہ صورۃً تو خلافت باقی تھی؛ اس لیے نہ صرف بنوبُویہ بلکہ اگلی صدیوں کی متعدد مملکتوں میں روافض کی پالیسی یہی رہی کہ نام دوسروں کا چلے مگر زیادہ سے زیادہ اختیارات انہی کے پاس ہوں۔

احمد بن بُویہ کی دلچسپیاں اور ترجیحات:

احمد بن بُویہ (معز الدولہ) قدیم شاہانِ عجم جیسی شان وشوکت کا حامل تھا۔ اس نے خبر رسانی کے نظام کو ترقی دی اور ڈاک کے گھوڑوں کی جگہ ایسے مشاق، سخت جان اور تیز رفتار پیادے استعمال کرنا شروع کیے جن میں سے ہر ایک ۳۶ فرسخ (۱۰۸ میل) کی مسافت دوڑ کر ایک دن میں طے کر لیتا تھا۔ یہ پیادے شاہی احکام اور خبریں اس کے بھائی رکن الدولہ تک بہت جلد پہنچا دیتے تھے۔

احمد بن بُویہ کشتی کے مقابلوں کا بھی شوقین تھا۔ وہ کھلے میدانوں میں یہ مقابلے منعقد کراتا۔ اسی طرح پیراکی کے مقابلے کرانا بھی اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ عوام وخواص بڑی تعداد میں یہ تماشے دیکھنے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ حکومت کی دلچسپی دیکھ کر بغداد کے لوگ اپنے لڑکوں کو تیز دوڑنے، کشتی لڑنے اور پیراکی کی تربیت دینے لگے۔ کچھ مدت میں بغداد کے کچھ نوجوان پیراکی میں اس قدر ماہر ہو گئے کہ وہ ایک ہاتھ میں جلتا چولہا لے کر جس پر ہانڈی رکھی ہوتی تھی، دریا میں کود جاتے اور اس وقت تک تیرتے رہتے جب تک ہانڈی میں گوشت نہ پک جاتا۔ لوگ یہ مہارت دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے۔[2]

---

① البدایة والنهایة: ۱۵/۱۶۸، ۱۶۹ تحت ۳۳۴ھ

② تاریخ الاسلام ذهبی: ۲۵/۲۵؛ البدایة والنهایة: ۱۵/۱۶۹

المطیع للّٰہ

الفضل بن جعفر المقتدر

جمادی الآخرہ ۳۳۴ھ تا ذوالقعدہ ۳۶۳ھ

فروری ۹۴۶ء تا اگست ۹۷۴ء

بنوبُویہ کے مقرر کردہ پہلے خلیفہ مطیع للہ عباسی کا اصل نام ابوالقاسم الفضل تھا۔ وہ سابق خلیفہ مقتدر بن مُعتضِد کا بیٹا تھا۔ مکتفی کی معزولی کے بعد جمادی الآخرہ ۳۳۴ھ میں اس کا تقرر ہوا تو احمد بن بُویہ کی طرف سے اس کا یومیہ خرچہ سو دینار طے کر دیا گیا۔ احمد بن بُویہ (مُعز الدولہ) نے بغداد پر تسلط کے چوتھے سال ۳۳۸ھ میں اپنے بھائی حسن بن بُویہ (رکن الدولہ) کو بھی حکومتِ بغداد میں شریک کر لیا۔ [1]

قدرتی آفات:

بنوبُویہ کا دور شروع ہوتے ہی بغداد پر حرمان وادبار کے بادل چھا گئے اور عالم اسلام شدید قدرتی آفات کی زد میں آ گیا۔ ۳۴۴ھ میں مصر شدید زلزلے کا شکار ہوا اور ہر طرف ایک قیامت مچ گئی۔

۳۴۶ھ میں ایران سے لے کر خراسان تک ایسا ہولناک زلزلہ آیا کہ طالقان کا شہر زمین میں دھنس گیا۔ شیعہ اکثریتی علاقے رے (تہران) میں ڈیڑھ سو بستیاں صفحۂ ہستی سے غائب ہو گئیں۔ شہر کے نواح میں ایک پہاڑ پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک بستی مکانات سمیت زمین سے سینکڑوں فٹ اوپر اچھلی اور واپس گر کر بے نام ونشان ہو گئی۔ زلزلے کے جھٹکے چالیس دن تک محسوس ہوتے رہے۔ زمین میں جگہ جگہ بڑی بڑی ہولناک دراڑیں پڑ گئیں اور چشمے پھوٹ نکلے۔ سمندر کا پانی ایک سو بیس فٹ نیچے چلا گیا اور جگہ جگہ جزیرے ابھر آئے۔ اگلے سال قم، حلوان اور ایران کے کوہستانی علاقوں میں پھر زلزلہ آیا اور ہزاروں لوگ مارے گئے، اگلے سال زلزلے سے بغداد کے بعض محلے تباہ ہو گئے۔ پھر ٹڈی دل دیہی علاقوں پر چھا گئے اور اناج کا کوئی دانہ چھوڑا نہ پھل اور میوہ جات۔ [2]

قحط سالی اور اموات:

قدرتی آفات کے باعث قحط پھیل گیا اور گرانی عام ہو گئی۔ عام شہر تو درکنار بعض اوقات بغداد کی یہ حالت رہتی تھی کہ اشیائے خورد ونوش دسترس سے باہر ہوتی تھیں۔ لوگ چند من گندم کے بدلے جائیدادیں فروخت کرتے دکھائی دیتے تھے۔ عالم اسلام کا سرتاج کہلانے والے شہر میں فاقہ کشوں کی لاشیں سڑکوں پر نظر آتی تھیں جنہیں کتے نوچا

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۲۸٦

② تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۷؛ البدایة والنهایة: ۳۳٤ھ - ۳۳۵ھ

کرتے تھے۔ عجیب وغریب امراض اور اچانک اموات عام ہوگئیں۔ چور کسی گھر میں گھستا اور وہیں ڈھیر ہو جاتا، قاضی فیصلے سنانے لگتا اور وہیں اس کی روح پرواز کر جاتی۔[1]

بنوبُویہ کی عیاشی:

ملک کا یہ حال تھا اور دوسری طرف بنوبُویہ بغداد کو اپنا عشرت کدہ بنانے میں مصروف تھے۔ انہوں نے یہاں اپنے لیے ایسے شاندار محلات تعمیر کیے جن کی نظیر کہیں نہیں ملتی تھی۔ احمد بن بُویہ کے محل کی بنیادیں ۵۴ فٹ گہری کھودی گئیں تھیں۔ اس پر ایک کروڑ تیس لاکھ درہم (۳ ارب ۲۵ کروڑ روپے) خرچ کیے گئے تھے۔

لوگ اس فلک بوس عمارت کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ پھر بھی احمد بن بُویہ مطمئن نہ تھا؛ اس لیے مزید آرائشی کام کرانے کے لیے اس نے بعض امراء پر بیس لاکھ دینار (۵ ارب روپے) کا تاوان ڈال دیا۔ اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو محل کو خوبصورت اور مضبوط بنانے کے بہانے سابق عباسی خلفاء کی کئی قدیم تعمیرات کو جو بغداد کی پہچان تھیں، توڑ پھوڑ دیا اور ان کے دروازوں اور کھڑکیوں تک کو اکھاڑ کر اپنے محل میں لگا دیا۔ احمد بن بُویہ کی موت تک اس محل کی تعمیر چلتی رہی اور کروڑوں اربوں روپیہ اس میں پھونکا جاتا رہا۔[2]

حجرِ اسود کی واپسی:

حجرِ اسود بیس سال سے قرامطہ کے پاس تھا۔ اس دور میں ایک علوی بزرگ عمر بن یحییٰ رحمہ اللہ جن کی قرامطہ عزت کرتے تھے، خلیفہ مطیع کی طرف سے سفیر بن کر قرامطہ کے پاس بحرین گئے اور حجرِ اسود کی واپسی کی درخواست کرتے ہوئے اس کے عوض خطیر مال ودولت کی پیش کش کی۔ قرامطہ مان گئے اور حجرِ اسود بیس سال بعد واپس کیا گیا۔ اس موقع پر ایک قرامطی نے علمائے مکہ سے پوچھا: ''آپ کیسے تصدیق کریں گے کہ یہ اصلی حجرِ اسود ہے۔ اس سے ملتا جلتا کوئی اور پتھر نہیں؟'' علماء نے کہا: ''ہم آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں۔ اصلی حجرِ اسود پانی میں نہیں ڈوبتا۔''

یہ کہہ کر انہوں نے حجرِ اسود کو پانی میں ڈالا تو وہ سطحِ آب پر تیرتا رہا۔ علماء نے مطمئن ہو کر اسے اپنی جگہ نصب کرا دیا۔[3]

شیعوں کو کھلی چھٹی:

اگر عوام کو صرف اقتصادی لحاظ سے تباہی کا سامنا ہوتا تو شاید قابلِ برداشت ہوتا مگر حد یہ تھی کہ اب عالم اسلام میں اگر کوئی شیعہ کھلم کھلا کفریہ عقائد کا اظہار بھی کرتا تو اس پر کوئی پابندی نہ تھی۔ ۳۴۱ھ میں ایک شخص نے دعویٰ کر دیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روح اس میں سرایت کر گئی ہے۔ اسی طرح ایک عورت نے اعلان کیا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی روح اس میں آ گئی ہے۔ ایک آدمی یہ دعویٰ لے کر اٹھا کہ وہ جبرئیل ہے۔ بنوبُویہ نے ان سے پوچھ گچھ تو کی مگر جب انہوں نے بتایا کہ وہ شیعہ اور محبِ سادات ہیں۔ اس پر انہیں چھوڑ دیا گیا۔[4]

---

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۷؛ البدایة والنهایة: ۳۳۴هـ ـ ۳۳۵هـ
[2] البدایة والنهایة: سنة ۳۵۰هـ؛ تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۸
[3] آثار البلاد واخبار العباد، ص ۷۸
[4] تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۷، ط نزار

عموماً ایسے مدعیوں کا پول بہت جلد کھل جاتا تھا۔ آذربائی جان میں ایک مدعی کھڑا ہوا۔ وہ کہتا تھا کہ مجھے علم غیب حاصل ہے۔ اس نے کئی احکام بھی جاری کر دیے۔ چربی اور گوشت کو حرام قرار دیا۔ ایک خلقت اس کے گرد جمع ہوگئی۔ ایک بار کسی میزبان نے اس کی دعوت کی اور شوربے میں چربی شامل کر دی۔ علم غیب کا مدعی مزے سے کھاتا رہا۔ تب میزبان نے کہا: ''دعویٰ تو ہے علمِ غیب کا اور یہ بھی نہیں معلوم کہ سالن میں چربی ہے جسے تو حرام کہتا ہے۔''

لوگ اسے لعنت ملامت کرتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹے اور وہ شرمندہ ہو کر وہاں سے چل دیا۔ ①

شیعہ سنی فساد:

بغداد میں سوا دو سو سال سے اہل سنت کے علاوہ ہر مسلک اور فرقے کے مسلمان امن وامان سے رہ رہے تھے۔ کبھی فرقہ ورانہ فسادات کا نام بھی نہیں سنا گیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام مذہبی اختلافات علمی سطح پر رہتے تھے اور سب ایک دوسرے کے اسلاف کا نام عزت سے لیتے تھے مگر بنوبُوَیہ کے دور میں بغداد روافض کا گڑھ بن گیا۔ وہ جی بھر کے اہلِ سنت کے شعائر کو پامال کرتے اور قانون حرکت میں نہ آتا۔ یہی نہیں بلکہ صحابہ کرام کی کردار کشی شروع کر دی گئی جو قابلِ برداشت نہیں تھی۔ اس سے لوگوں میں سخت اشتعال پھیلا اور بار بار شہر میں فرقہ ورانہ فسادات ہونے لگے۔ ②

صحابہ پر تبرا بازی:

۳۵۱ھ میں شیعوں نے بغداد کی مساجد پر درج ذیل انتہائی اشتعال انگیز اشتہار لکھوا دیا:

''اللہ کی لعنت ہو معاویہ بن ابی سفیان پر، اور اس پر جس نے حضرت فاطمہ کو باغِ فدک نہ دیا (یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ) اور اس پر جس نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو شوریٰ میں شریک نہ ہونے دیا (یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ) اور اس پر جس نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو جلا وطن کیا (یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) اور اس پر جس نے حسن رضی اللہ عنہ کو اپنے نانا کے پاس دفن نہ ہونے دیا۔ (یعنی مروان بن حکم)'' ③

احمد بن بُوَیہ (معز الدولہ) سے اس کی شکایت کی گئی تو اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ آخر ایک شب اہلِ سنت نے خود یہ الفاظ مٹا دیے۔ احمد بن بُوَیہ کو پتا چلا تو سرکاری حکم کے تحت ہر مسجد پر یہ اشتعال انگیز الفاظ آویزاں کرا دیے:

''اللہ کی لعنت ہو معاویہ پر، اور آلِ محمد پر ظلم کرنے والے سب لوگوں پر'' ④

ماتمی جلوس اور عیدِ غدیر کی بدعت کا آغاز:

اگلے سال ۳۵۲ھ میں احمد بن بُوَیہ نے تاریخ میں پہلی بار دس محرم کے جلوس اور ماتم کی رسم شروع کی۔ اس نے حکم دیا کہ اس دن بازار بند رہا کریں گے، لوگ بوسیدہ کپڑے پہنے شہادتِ حسین کے غم میں جلوس نکالیں گے۔ عورتیں بھی چہرے کھولے، بال بکھیرے، سینہ کوبی کرتی ہوئی جلوس کے ساتھ چلیں گی۔

---

① البداية والنهاية: ۲۲۲/۱۵ ② البداية والنهاية: ۱۹۹/۱۵، ۲۳۱، ۲۳۷، ۲۴۲، ۲۶۴ ..... سنة ۳۳۸ھ، ۳۴۶ھ، ۳۴۸ھ، ۳۴۹ھ، ۳۵۲ھ

③ البداية والنهاية: سنة ۳۵۱ھ

④ تاريخ الخلفاء، ص ۲۸۸ ''نقل کفر، کفر نہ باشد'' کے اصول کے تحت یہ اقتباسات نقل کیے گئے ہیں۔ نعوذ باللہ منها

اسی سال عید الاضحیٰ کے بعد ۱۸ ذوالحجہ کو (جس دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تھی) احمد بن بُویہ نے ایک اور عید منانے کی رسم جاری کی۔ اسے "عیدِ غدیرِ خم" کا نام دیا گیا۔

یہ عید اس جھوٹے دعوے کے حوالے سے منائی جا رہی تھی کہ اس دن حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امام مقرر کیا تھا۔ سرکاری احکام یہ تھے کہ رات کو بھی بازار کھلے رہیں گے، ڈھول باجے بجائے جائیں گے۔ چراغاں ہوگا اور جگہ جگہ آگ کے الاؤ روشن کیے جائیں گے۔ اس طرح ہر سال شیعہ ماتمی جلوس نکالنے اور عید غدیر منانے لگے۔ ان رسموں کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ [1]

بغداد سمیت پورے عالم اسلام میں ہر جگہ اہلِ سنت کی اکثریت تھی، ایران کے کچھ علاقوں کو چھوڑ کر شیعہ کہیں بھی دس پندرہ فیصد سے زیادہ نہ تھے۔ مگر علمائے اہلِ سنت صبر کر رہے تھے اور نقضِ امن کے خطرے سے خاموش تھے؛ کیوں کہ وہ اُمت کو خانہ جنگی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ تاہم کبھی کبھار عوام کا صبر و تحمل جواب دے جاتا اور ماتمی جلوسوں کے نکلنے سے فسادات بھی شروع ہو جاتے جن میں فریقین کا جانی و مالی نقصان ہوتا۔ [2]

بختیار عز الدولہ کا دور...... پورے عالم اسلام میں رفض کا دور دورہ:

۳۵۶ھ میں ۵۳ سالہ احمد بن بُویہ ۲۱ برس حکومت کر کے مر گیا اور اس کا بیٹا بختیار "عز الدولہ" کے لقب کے ساتھ عراق کا نیا حکمران بن گیا۔ حالات بدستور اسی ڈگر پر جاتے رہے۔ ۳۵۷ھ میں عالم اسلام کو دو مزید بڑے صدمے برداشت کرنا پڑے: ایک طرف قرامطی شیعوں نے دمشق پر قبضہ جما لیا اور یوں پورا شام ان کے ماتحت آ گیا۔

دوسری طرف مصر کا حاکم کافور اِخشیدی جو بنو عباس کا خطبہ پڑھتا تھا، فوت ہو گیا اور عبیدی حکمرانوں نے جو دریائے نیل کے مغرب تک قابض تھے، ایک لاکھ گھڑ سوار بھیج کر ۳۵۸ھ میں مصر پر قبضہ کر لیا۔ وہاں بنو عباس کا خطبہ ختم کر دیا گیا اور خطبے میں بارہ اماموں کا نام لیا جانے لگا۔ اہلِ سنت کے شعائر تیزی سے مٹائے جانے لگے۔ ۳۵۹ھ میں مصر میں سرکاری حکم کے تحت شیعوں کے طرز پر اذان میں "حیّ علیٰ خیر العمل" کے الفاظ کا اضافہ کر دیا گیا۔ ۳۶۰ھ میں یہی اذان شام میں بھی رائج ہو گئی۔ ۳۶۳ھ میں حجاز بھی بنو عبید کے ماتحت آ گیا اور وہاں بنو عباس کی جگہ عبیدی اماموں کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ اس طرح ایران و عراق سے لے کر حجاز، شام اور مصر تک روافض کا تسلط ہو گیا۔ [3]

رومیوں کے تباہ کن حملے اور مسلمانوں کی بے بسی:

گزشتہ تاریخ میں عالم اسلام کو کبھی اتنے بڑے ایمانی و اعتقادی اور سیاسی و جغرافیائی بحرانوں کا بیک وقت سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ امتِ مسلمہ کی اس اندرونی توڑ پھوڑ کو سنہرا موقع سمجھتے ہوئے بازنطینی رومانے اسلامی سرحدوں پر ایسے شدید ترین حملے شروع کر دیے جن کی ماضی میں مثال نہیں ملتی۔

[1] البداية والنهاية: سنة ٣٥٢هـ [2] البداية والنهاية: ١٤/٢٦٤، ٢٦٩

[3] تاريخ الخلفاء، ص ٢٨٨؛ البداية والنهاية: سنة ٣٥٦هـ، ٣٥٩هـ، ٣٦٠هـ

قیصر روم نقفور اور اس کا ارمنی جرنیل دُمستق عالم اسلام کو فتح کرنے کے لیے نہایت پر جوش تھے۔ ابتداء میں انہوں نے مسلمانوں کو ان سرحدی مہمات سے روکا جو اس دور میں بھی کبھی کبھی جہاد کی روایت زندہ کرنے کے لیے بھیجی جاتی تھیں۔ ۳۳۹ھ میں انہوں نے سرحد پر حاکم موصل و حلب سیف الدولہ کا حملہ روکا اور اسے ایسی شکست دی کہ وہ چند افراد کے ساتھ واپس آ سکا۔

سیف الدولہ جوابی حملے کی تیاری کرتا رہا۔ ۳۴۲ھ میں اس نے رومی سپہ سالار دُمستق کے بیٹے قسطنطین کو گرفتار کر کے اس شکست کا داغ دھوڈالا مگر مرکزِ خلافت کی کمزوری نے رومیوں کی ہمت بڑھادی تھی۔ ربیع الاول ۳۴۳ھ میں وہ پھر سرحدوں پر آدھمکے تاہم سیف الدولہ نے مردانہ وار دفاع کیا اور رومیوں کی پیش قدمی روک دی۔

اسی سال شعبان میں دُمستق روسی اور بلغاری قبائل کو ساتھ ملا کر ایک بار پھر حملہ آور ہوا۔ اس بار بھی اسے شکست ہوئی اور اس کے داماد سمیت درجنوں نواب اور سینکڑوں سپاہی گرفتار ہو گئے۔

اس کے باوجود رومیوں کے حملے رکنے میں نہ آئے۔ اِدھر مسلمانوں کا انتشار ان کی قوت کو کم کرتا جا رہا تھا، بنوحمدان کو عراق، شام اور مصر کی سرحدوں پر مسلم امراء سے مسلسل جنگوں کا سامنا تھا؛ اس لیے سیف الدولہ میں پہلے جیسا دم خم نہ رہا تھا۔ رومی چھوٹے چھوٹے حملوں سے مسلمانوں کی قوت کا اندازہ لگاتے رہے اور رفتہ رفتہ اپنی تباہ کاری کو بڑھاتے گئے۔ ۳۴۵ھ میں انہوں نے خشکی سے کردستان اور سمندری راستے سے طرطوس پر حملہ کیا اور ۱۸۰۰ مسلمانوں کو قتل اور درجنوں بستیوں کو نذرِ آتش کر کے واپس گئے۔

۳۴۷ھ میں رومی میا فارقین اور آمد تک آن پہنچے جو عراق کی سرحد پر تھے۔ یہاں ڈیڑھ ہزار مسلمان قتل کیے گئے اور شہر سمیساط کو تباہ کر دیا گیا۔

۳۴۸ھ میں رُہا اور طرطوس پر حملہ ہوا اور قتل و غارت کا بازار گرم رہا۔ ۳۴۹ھ میں سیف الدولہ نے جوابی کارروائی کے لیے فوج کشی کی مگر اسے شکست ہوئی اور وہ بمشکل ۳۰۰ گھڑ سواروں کے ساتھ زندہ واپس آ سکا۔

۳۵۱ھ میں دُمستق دو لاکھ کا لشکر جرار لیے حلب کی طرف بڑھا۔ راستے میں عین زربہ کے مسلمانوں نے اس سے امان طلب کی تو اس نے تماشا دیکھنے کے لیے کہا:

''سب مسجد میں پناہ لے لو۔ جو مسجد سے باہر نظر آیا قتل کر دیا جائے گا۔''

یہ اعلان سنتے ہی سب لوگ گھروں سے نکل کر دیوانہ وار مسجد کی طرف دوڑ پڑے۔ مسجد میں اتنا ہجوم ہو گیا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ اب اس نے کہا: ''فوراً مسجد چھوڑ کر علاقے سے نکل جاؤ۔ جو پیچھے رہا قتل کر دیا جائے گا۔''

لوگ بدحواس ہو کر مسجد سے بھاگے، بہت سے اس ہنگامے میں گر کر زخمی ہوئے، بہت سے پیروں تلے کچلے گئے۔ جس کا جدھر منہ اٹھا، نکل گیا۔ سینکڑوں افراد راستہ بھٹک کر بیابانوں میں مر گئے۔ باقی لوگ بھی سواری اور زادِ سفر کے بغیر کہاں تک جا سکتے تھے، بہت سے بوڑھوں، بچوں، عورتوں اور مریضوں نے راستے میں دم توڑ دیا۔

دُمُستُق نے شہر کی جامع مسجد مسمار کردی، مضافاتِ شہر میں کھجور کے چالیس ہزار درخت اکھاڑ کر باغات ویران کردیا۔ ۲۱ دن یہاں قیام کے دوران اس نے آس پاس کے ۴۵ قلعے فتح کر لیے۔ پھر قیساریہ کی طرف بڑھا اور اس کے دفاع کے لیے نکلنے والی طرطوس کی فوج کو جس میں چار ہزار سپاہی تھے، روندتے ہوئے حلب پہنچ گیا۔ یہاں سیف الدولہ نے آگے بڑھ کر اسے روکنے کی کوشش کی مگر دو لاکھ کا سیلاب کسی سے روکے نہ رکا۔

سیف الدولہ کو عراق کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ دُمُستُق نے فوراً حلب کو گھیر لیا۔ کئی دن کی شدید جنگ کے بعد اس کے ہزاروں سپاہی فصیل پھلانگنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے اندر گھس کر ڈیڑھ ہزار رومی قیدیوں کو آزاد کرا لیا اور سب مل کر نو دن تک آبادی کا قتل عام کرتے رہے۔ شہر کی ہر قیمتی چیز لوٹ لی گئی۔ دو ہزار مردوں اور ایک ہزار عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا گیا۔ جاتے جاتے جامع مسجد زمین بوس کر دی گئی اور تیل کے ذخائر سمیت ہر اس چیز کو تباہ کر دیا جو وہ ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے۔

رومیوں کے حملے بتدریج زیادہ خطرناک ہوتے گئے۔ ہر سال رومی زیادہ تیاری کے ساتھ آتے اور عالم اسلام کے دفاع کو پہلے سے کمزور تر پاتے۔ ۳۵۳ھ میں دُمُستُق نے مِصِّیصَہ پر حملہ کیا مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی اور وہ اذنہ اور طرطوس کے گرد و نواح میں لوٹ مار کر کے چلا گیا۔ چند ماہ بعد قیصرِ روم نے دُمُستُق کو ساتھ لے کر طرطوس کا محاصرہ کیا مگر طویل محاصرے کے باوجود شہر فتح نہ ہو سکا اور حملہ آور واپس ہو گئے۔

۳۵۴ھ میں قیصر روم نے ایک ٹڈی دل فوج کے ساتھ حملہ کیا۔ اس مہم کے لیے اس نے ایشیائے کوچک میں ایک نیا عسکری شہر ''قیصریہ'' تعمیر کرایا تھا تاکہ کسی بھی وقت عالمِ اسلام پر چڑھائی کی جا سکے۔ طرطوس اور مِصِّیصَہ کے مسلمانوں نے خوفزدہ ہو کر اس کی طرف سفیر بھیجا جس نے قیصر کو پیش کش کی کہ وہ سالانہ خراج کی ادائیگی، اپنے شہروں میں قیصر کی طرف سے نائب کے تقرر اور اطاعت کے لیے تیار ہیں، بشرطیکہ انہیں جان و مال کی امان دی جائے۔

قیصر نے اس کا وعدہ کر لیا مگر کچھ دنوں بعد جاسوسوں نے اسے خبر دی کہ طرطوس اور مِصِّیصَہ کا دفاع کرنے والا کوئی نہیں اور وہاں قحط کی وجہ سے روزانہ تین چار سو جنازے اٹھ رہے ہیں۔ یہ سن کر قیصر نے اپنے وعدے کو پس پشت ڈال دیا۔ اس نے مسلم سفیر کو بلایا اور عہد نامہ کے مسودے کو آگ لگا کر جلتا ہوا کاغذ اس کے سر پر رکھ دیا۔ سفیر کی داڑھی جلا ڈالی اور غراتے ہوئے کہا: ''دفع ہو جاؤ۔ میرے پاس تمہارے لیے صرف تلوار ہے۔''

اب اس نے مِصِّیصَہ پر حملہ کیا اور یہاں دو لاکھ مسلمانوں کو قیدی بنایا۔ پھر طرطوس کو بزورِ شمشیر فتح کیا۔ یہاں کی آبادی کو جلا وطن کر دیا اور جامع مسجد کو گھوڑوں کے اصطبل میں تبدیل کر دیا۔

اگلے سال (۳۵۵ھ میں) رومیوں کی ایک فوج آمِد پر حملہ آور ہوئی اگرچہ اسے فتح نہ کر سکی مگر تین سو مسلمانوں کو قتل کرنے کے بعد چار سو کو قیدی بنا کر لے گئی۔ [1]

---

[1] البداية والنهاية: ۲۱۹/۱۵ تا ۲۶۲

سیف الدولہ کی وفات:

۳۵۶ھ میں عالم اسلام کا بازوئے شمشیر زن، حاکم حلب، سیف الدولہ حیاتِ فانی کی پچاس سے کچھ اوپر بہاریں دیکھنے کے بعد وفات پا گیا۔ اس کا نام علی بن عبداللہ بن حمدان تھا۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''وہ بہادر اور شجاع تھا۔ بکثرت جہاد کرتا تھا۔ سمجھ دار انسان تھا۔ شعر و ادب کا ذوق رکھتا تھا۔ سخی تھا جس کے قصیدے پڑھے جاتے تھے۔ فالج یا پتھری میں مبتلا ہو کر فوت ہوا۔ اس نے وہ گرد و غبار جمع کر رکھا تھا جو جہادی مہمات میں اسے لگا تھا۔ یہ ایک ہتھیلی جتنی کچی اینٹ کے برابر تھا۔ اس نے وصیت کی تھی کہ قبر میں لٹاتے ہوئے یہ اینٹ اس کے گال کے نیچے رکھ دی جائے۔''[1]

سیف الدولہ کے بعد بنوحمدان کی حکومت رو بہ زوال ہوگئی۔ اس کا بڑا بھائی ناصر الدولہ حاکمِ موصل اس کے فراق میں ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گیا اور دو سال بعد انتقال کر گیا۔ ناصر الدولہ کے بیٹے غضنفر ابوتغلب نے حکومت سنبھالی تھی مگر وہ ایک کمزور حکمران تھا اس لیے دولتِ بنوحمدان اپنی شان و شوکت کھو بیٹھی۔[2]

رومیوں کی غارت گری:

سیف الدولہ اور ناصر الدولہ کی وفات عالم اسلام کے لیے ایک بڑا دھچکا تھی۔ اس کے بعد رومی بالکل بے فکر ہو کر حملے کرنے لگے۔ ۳۵۷ھ میں انہوں نے انطاکیہ کا محاصرہ کیا اور بارہ ہزار مسلمانوں کو گرفتار کر کے واپس ہوئے۔ ۳۵۸ھ میں حمص پر حملہ ہوا اور یہاں گرد و نواح سے ایک لاکھ مسلمان قیدی بنائے گئے۔[3]

قیصر روم کا طنزیہ اور دھمکی آمیز منظوم مراسلہ:

اس قدر سخت صدمات کے باوجود مسلمان گم صم تھے۔ ان میں انتقام لینے کی سکت نہ تھی۔ کوئی قابلِ ذکر جوابی کارروائی نہ ہوتے دیکھ کر قیصرِ روم نقفور نے خلیفہ مطیع کو ایک طنزیہ اور دھمکی آمیز منظوم مراسلہ لکھا جس میں کہا گیا تھا:

''تمہاری سستی اور کمزوری کی وجہ سے تمہاری سرحدوں کی جگہ چند مٹے ہوئے نشانات رہ گئے ہیں۔ الجزیرہ، قنسرین، کرکر، مَلَطیہ، سُمیساط اور کیسوم کے کتنے ہی معزز لوگوں کو ہم نے ذلیل کر دیا اور اب وہ ہمارے غلام اور خادم ہیں۔ ہم نے راس العین میں لشکر کشی کر کے کھوپڑیاں اڑائیں اور میافارقین پر شہ سواروں سے حملہ کیا۔ ہم نے باشندوں کو قیدی اور نرم و نازک عورتوں کو باندیاں بنا لیا۔ ہم حلب کی لڑکیوں کو ہانک کر لے جاتے رہے اور تمہارا دینی بھائی سیف الدولہ بھاگ نکلا۔

---

[1] العبر فی خبر من غبر ۹۸/۲ [2] العبر فی خبر من غبر ۱۰۲/۲

خاندان بنوحمدان کے اکثر امراء شیعہ تھے۔ اگرچہ ان کے تشیع کا رفض کی حد تک ہونا محقق نہیں ہوا، بلکہ ان میں سے ناصر الدولہ کا شعائرِ اہل سنت کی حمایت کرنا مشہور ہے۔ بہر کیف اس خاندان کو عموماً شیعہ مانا جاتا ہے۔ اس کے باوجود اہلِ سنت مؤرخین کا ان کے کارناموں کو نقل کرنا اور انہیں خراجِ تحسین پیش کرنا، ہمارے اسلاف کی امانت و دیانت اور منصف مزاجی کی روشن مثال ہے۔ کاش کہ! دوسرے بھی ہمارے بارے میں اس اعتدال کا مظاہرہ کر سکیں۔

[3] البدایۃ والنہایۃ: ۲۹۰/۱۵ تا ۲۹۰

طرطوس میں باعزت ہاشمی عورتوں کو ہم نے برہنہ سر گرفتار کیا۔ بہت جلد میں انطاکیہ اور اپنے آباؤ اجداد کے وطن دمشق کو بھی فتح کر لوں گا۔ میں عن قریب نصیبین، موصل اور سامرا بھی چھین لوں گا۔

بغداد والو! بربادی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تم حقیر لوگ ہو جو دیلمیوں کے حکم اور رافضیوں کے طریقے پر چلتے ہوئے غلام بن گئے ہو۔ اب حجاز کی طرف لوٹ جاؤ اور رومیوں کے علاقے خالی کر دو۔ میں اب مکہ کی طرف ایسا زبردست لشکر لے کر جاؤں گا جو آنسو بہانے والی رات کی طرح ہوگا۔ میں وہاں طویل مدت تک غائبیر حکومت کی کرسی لگا کر حکومت کرتا رہوں گا۔"

اگر ہارون یا معتصم کا دور ہوتا تو قیصر کو ایسا خط لکھنے کی جرأت نہ ہوتی اور اگر وہ ایسی گستاخی کرتا تو مسلمان اسے مزا چکھا دیتے۔ مگر یہاں بنو بُویہ کی بے حسی اور خلیفہ کی بے بسی کا یہ عالم تھا کہ بغداد پر سکوتِ مرگ طاری رہا۔ [1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مجھے اس دور کے کسی شخص کے بارے میں خبر نہیں کہ اس نے قیصر کے مکتوب کا جواب دیا ہو۔ ممکن ہے کسی نے جواب دیا ہو مگر وہ مشہور نہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لوگوں نے قیصر کو اس قابل نہ سمجھا ہو کہ اس کے مراسلے کا جواب دیا جائے۔ بہر حال یہ مراسلہ نظم کرنے والا کوئی بہت شیطان مردود قسم کا شخص تھا۔" [2]

البتہ اگلی صدی میں علامہ ابن حزم الظاہری رحمہ اللہ (م ۴۵۶ھ) کو اس مراسلے کی نقل ملی تو انہوں نے اسلامی غیرت و حمیت کے باعث اسی وقت فی البدیہہ ایک نظم کہہ ڈالی جو "الفریدة الاسلامیة المنصورة المیمونة" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے چند اشعار کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"رب العالمین اور رسولِ ہاشمی ﷺ کے حامی کی طرف سے یہ اس شخص کو جواب ہے جو جہالت اور گمراہی کی بناء پر جھوٹی باتیں کہتا ہے۔ تم نے ایسے خلیفہ کو مخاطب کیا جس کے ہاتھوں میں مٹی ہوئی نشانیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اگر وہ اپنے آباؤ اجداد کی طرح ہوتا تو تمہیں سانپوں کے زہر جیسا تلخ جواب ملتا۔

اللہ کی رحمت سے کوئی بعید نہیں کہ وہ اپنے دین کے ماننے والوں میں مٹی ہوئی عظمتوں کو تازہ کرنے والے پیدا کر دے۔ یاد کرو کہ ہم نے تم سے ڈنکے کی چوٹ پر (ملک) چھینا اور تم نے بزدلوں کی طرح دھوکے سے حملے کیے۔ اس پر تم خوش اور مغرور ہو گئے جیسا کہ کمینے، گھٹیا اور بڑائی دکھانے والے کیا کرتے ہیں۔ کیا ہم نے پوری قوت کے ساتھ تمہاری کھوپڑیاں اڑا کر تم سے شام کے تمام شہر، مصر، تیونس، اندلس اور سسلی نہیں چھین لیے؟ ذرا ٹھہرو کہ خلافت کی روشنی واپس آئے گی اور گرد آلود چہرے روشن ہوں گے۔ جب برابر طاقت کا ایک لشکر تمہاری طرف آئے گا تو تم سوچو گے کہ تمہارے لیے فرار کا راستہ کونسا ہے۔

---

[1] العبر فی خبر من غبر: ۱۱۳/۲

[2] البدایة والنهایة: ۲۸۹/۱۵، ۲۹۰

آذر بجستان، کابل، بلادِ ہند، فارس واصفہان اور بصرہ، کوفہ اور واسط کے لوگ جن کی تعداد ریت کے ذرّوں کے برابر ہے، جنگ کے لیے نکل آئیں تو ان سے لڑنے والا بچ کر نہیں جا سکے گا۔ ہم تو عن قریب قسطنطنیہ اور اس کے متصل علاقے بھی فتح کر لیں گے اور تمہیں گدھوں کی خوراک بنا کر چھوڑیں گے یہاں تک کہ شمشیر زن لشکروں کے ذریعے دینِ اسلام کا حکم تمام دنیا پر نافذ ہو جائے گا۔

افسوس کہ تم یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ تمہارے خدا کو ذلیل یہودیوں نے سولی پر چڑھا دیا۔ ہمارے نبی ﷺ تو وہ ہیں جن کے لیے چاند دو ٹکڑے ہو گیا، جن کی برکت سے ایک صاع غذا سب لوگوں کو کافی ہو گئی اور جن کی ہتھیلی سے پانی کے چشمے پھوٹے اور سارا لشکر سیراب ہوا۔ جب تک سورج چمکتا رہے اور شب تاریک آتی رہے، ان پر اللہ کا سلام ہو۔ ان کے دلائل سورج کی طرح روشن ہیں۔ وہ تمہاری باتوں کی طرح نہیں جس میں اچھی اور بُری باتیں ملی جلی ہیں۔ (ان کی برکت سے) ہمیں جدید وقدیم تمام علوم نصیب ہیں مگر تم ایسے گدھوں کی مانند ہو جن کی پشتیں (بوجھ اٹھا اٹھا کر) خون آلود ہو گئی ہوں۔''[1]

قیصر کا دوسرا حملہ اور سرحدوں کی پامالی:

مسلمانوں کو عاجز دیکھ کر ۳۵۹ھ میں قیصر نے انطاکیہ پر فیصلہ کن حملہ کیا۔ رومی شہر میں گھس گئے۔ تمام عمر رسیدہ مرد وعورت جلاوطن کر دیے گئے، بارہ ہزار جوان عورتیں اور بچے قیدی بنا لیے گئے اور شہر پر باقاعدہ قبضہ کر لیا گیا۔

اسی سال قیصر روم نے خود طرابلس اور حمص پر حملہ کیا اور دو ماہ تک اس علاقے میں لوٹ مار کرتا رہا۔ یہاں اس نے ۱۸ چھوٹے شہروں کی جامع مساجد کو مسمار کیا، ہزاروں افراد کو جبراً نصرانی بنایا اور ایک لاکھ لڑکوں اور لڑکیوں کو پکڑ کر لے گیا۔[2] مسلمانوں نے ایسی رسوائی کبھی نہیں دیکھی تھی۔

بغداد کا بازار نذرِ آتش۔ شیعہ وزیر مکافاتِ عمل کا شکار:

بنوبُویہ کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی کہ اغیار کس طرح عالم اسلام کی سرحدوں کو پامال کر رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی نہ تھا جو حملہ آوروں کو للکارتا۔ الٹا یہ حکام عوام پر ناقابلِ بیان مظالم ڈھا رہے تھے۔ رمضان ۳۶۲ھ میں ایک سرکاری افسر نے بازار میں کسی شخص کو قتل کر دیا جس سے موقع پر موجود لوگ مشتعل ہو گئے اور انہوں نے افسر کو مار ڈالا۔ بنوبُویہ کے شیعہ وزیر عباس بن حسین (ابوالفضل) کو جو سنیوں کا سخت دشمن تھا، یہ خبر ملی تو اس نے اپنے حاجب کو بھیج کر بازار میں آگ لگوا دی جو اس قدر پھیلی کہ سترہ ہزار انسان جل کر کوئلہ ہو گئے۔ ۳۳ مساجد، ۳۱۷ دکانیں اور ۳۲۰ گھر راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ بغداد میں پہلے کبھی اتنی بڑی آتش زدگی نہیں ہوئی تھی۔ شہر کو جلتا دیکھ کر ایک مظلوم نے فریاد کی:

''الٰہی! وزیر نے ہمیں اپنی طاقت دکھا دی۔ اب تو اسے اپنی طاقت دکھا۔''

---

[1] البدایة والنهایة: ۲۹۰/۱۵ تا ۳۰۵

[2] البدایة والنهایة: ۲۵۵/۱۵ تا ۳۲۲؛ العبر في خبر من غبر: ۵۰/۶ تا ۹۳

اللہ کی شان کہ کچھ ہی دنوں بعد یہ وزیر بُو یہی حاکم مُعزّ الدولہ کے عتاب کا نشانہ بنا اور قید کر دیا گیا۔ اس دوران اس کی بیوی اور حاجب مرگئے۔ گھر برباد ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد وزیر کو بھی جیل ہی میں زہر پلا کر قتل کر دیا گیا۔ ①

بنو بُوَیہ کا تحریکِ جہاد کے ساتھ مذاق:

۳۶۱ھ میں رومیوں کی تاخت و تاراج دیارِ بکر اور الجزیرہ تک آن پہنچی، نصیبین اور رُہا ان کی غارت گری کا نشانہ بنے۔ ہزاروں مسلمان قتل اور گرفتار ہوئے۔ لٹے پٹے مسلمانوں کے کچھ نمائندے بغداد پہنچے تاکہ خلیفہ کو اپنی مظلومیت کا حال بتا کر امداد چاہیں مگر انہیں خلیفہ سے ملنے نہ دیا گیا۔ بنو بُوَیہ کا نیا حکمران بختیار عیاش آدمی تھا اور اس وقت بھی شکار میں مصروف تھا۔ ایسے میں علماء نے عوام کو جہاد کی ترغیب دی، خطیبوں نے جگر سوز تقاریر کیں۔ خطیب عبدالرحیم بن نباتہ رحمہ اللہ نے مسلمانوں کا لہو گرمانے کے لیے تاریخی خطبے دیے جو ''الجہادیات'' کے نام سے مشہور ہوئے۔ عوام نے مظلوم مسلمانوں کا بدلہ لینے کا عزم کیا اور ترک امراء کی سرکردگی میں رضا کار دستے بنا کر جہاد کے لیے نکلنے پر کمر باندھ لی۔ ایک بڑا مجمع روانگی کے لیے تیار تھا مگر کوچ سے پہلے ہی اس ہجوم میں سنی شیعہ فساد شروع ہو گیا جس پر قابو پاتے پاتے جہاد کی فضا مکدر ہو گئی۔

روانگی سے قبل اسلحے اور رسد کے اخراجات کا انتظام ضروری تھا۔ جب بختیار بن بُوَیہ سے درخواست کی گئی تو اس نے اپنے کروڑوں اربوں کے خزانے سے ایک پیسہ تک نہ دیا بلکہ خلیفہ کو حکم بھیجا کہ وہ جہاد کی مد میں چار لاکھ درہم بھیجے۔ خلیفہ نے جواب میں کہلوایا: ''اگر ملکی محصولات میرے پاس جمع ہوتے ہوں تو میں یقیناً مسلمانوں کی ضرورت پر خرچ کرتا۔ مگر میرے پاس ایسا کوئی سرکاری مال نہیں کہ آپ کو بھیجوں۔ خزانہ آپ کے پاس ہے، آپ یہ ضرورت پوری کریں۔ میری حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ خطبے میں میرا نام لیا جاتا ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں مستعفی ہو جاؤں۔''

مگر بختیار نے خلیفہ کو سخت نتائج کی دھمکی دے کر رقم ادا کرنے پر مجبور کیا۔ آخر کار خلیفہ نے قصرِ خلافت کا ساز و سامان جس میں محل کی چھت، دروازے، کھڑکیاں اور ذاتی کپڑے تک شامل تھے، فروخت کر کے یہ رقم حاصل کی اور بختیار کو بھیج دی۔ اس نے جہاد کے نام پر جبراً لی گئی یہ رقم اپنی عیاشی میں اڑا دی اور مسلمان دیکھتے رہ گئے۔ ②

خلیفہ مطیع کا استعفیٰ اور وفات:

اس واقعے نے خلیفہ کو غم سے بے حال کر دیا۔ اس پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ بالکل معذور ہو گیا۔ ۱۳ ذوالقعدہ ۳۶۳ھ کو اس نے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور بغداد چھوڑ کر واسط چلا گیا۔ دو ماہ بعد محرم ۳۶۴ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا رسمی عہدہ ۲۹ سال سے چند ماہ اوپر تک رہا۔ ③

---

① العبر في خبر من غبر: ۱۹۳/۲؛ الكامل في التاريخ: ۳۱۱/۷

② البداية والنهاية: ۳۳۰/۱۵ تا ۳۳۷؛ العبر في خبر من غبر: ۷۰/۲ تا ۷۸؛ الكامل في التاريخ تحت ۳۶۱ھ

③ تاريخ الخلفاء، ص ۲۹۰، ط نزار

اللہ کی غیبی مدد:

مطیع کے مستعفی ہونے سے کچھ دنوں پہلے اللہ کی غیرت جوش میں آئی، اس نے اپنی قدرت کا کرشمہ دکھایا اور مسلمانوں کے دونوں بڑے دشمنوں کو اچک لیا۔ قیصر روم نے دُمُستق کو مزید فتوحات کے لیے بھیجا تھا۔ وہ آمد کا محاصرہ کیے ہوئے تھا کہ سیف الدولہ کا بھتیجا ہبۃ اللہ ایک چھوٹی سی فوج کے ساتھ آمد والوں کی کمک کے لیے آ گیا۔ دُمُستق اسے روکنے کے لیے بڑھا تو دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ایک نہایت تنگ گھاٹی میں ہوگیا۔ یہ ۲۹ رمضان ۳۶۲ھ کا واقعہ ہے۔ یہاں مسلمانوں نے ایسی شدید جنگ لڑی کہ رومیوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ گھاٹی کی تنگی کی وجہ سے بہت سے رومی بھاگ بھی نہ سکے، انہی میں دُمُستق تھا۔ اسے جیل میں ڈالا گیا جہاں وہ بیمار پڑ گیا اور علاج کے باوجود اگلے برس (۳۶۳ھ میں) مر گیا۔

جب یہ خبر قُسْطَنْطِینِیہ پہنچی تو اس سے پہلے بدبخت قیصرِ روم نقفور جس نے مکہ پر قبضہ کرنے کی شیخی بگھاری تھی، اپنے ہی گھر میں بیگمات کی سیاست کا شکار ہو کر چند باندیوں کے ہاتھوں ذلت کی موت مر چکا تھا۔ [1]

مؤرخین نے ان دونوں دشمنوں کی موت کو اللہ کی خاص مدد شمار کیا ہے؛ کیوں کہ مسلمانوں کی بدحالی کے پیش نظر کوئی بعید نہ تھا کہ اگر رومیوں کے دھاوے چند برس اسی طرح جاری رہتے تو وہ سارے عالم اسلام کو روند ڈالتے۔

سچ ہے: اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ...... (بلا شبہ تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔)

⁂

[1] البداية والنهاية: سنة ۳٦۲هـ، ۳٦۳هـ

نوٹ: بعض مؤرخین کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ قیصر نقفور اور دمستق کو ایک ہی شخص تصور کرتے ہیں حالانکہ حالات وواقعات پر غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ نقفور بادشاہ تھا اور دمستق اس کا سپہ سالار تھا۔ یہ دو الگ الگ اشخاص تھے۔

الطائع للہ

عبدالکریم بن الفضل المطیع

ذو القعدہ ۳۶۳ھ تا شعبان ۳۸۱ھ

اگست ۹۷۴ء تا نومبر ۹۹۱ء

مطیع للہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا طائع للہ کے لقب سے رسمی خلیفہ بنا۔ اس کا اصل نام عبدالکریم تھا۔ اس کے دور میں بنو بُوَیہ کا ایک اور فرد بغداد پر چھا گیا۔ یہ حسن بن بُوَیہ (رکن الدولہ) کا بیٹا عضد الدولہ تھا۔ نہایت شاطر، ہوشیار اور بارعب انسان۔ طائع کی خلافت کے دوسرے سال جمادی الاولیٰ ۳۶۴ھ میں وہ کسی سیاسی مسئلے میں اپنے چچازاد بختیار (عزالدولہ) کی مدد کے لیے بغداد آیا تھا مگر اس شہر کی دولت وثروت اور وسعت وآبادی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ بغداد کی حکمرانی اسی کو زیبا ہے نہ کہ بختیار جیسے عیاش کو۔ اس نے بزورِ طاقت بختیار کو ہٹا کر بغداد کی زمام اختیار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ خلیفہ طائع نے اس کی ماتحتی قبول کرنے سے انکار کیا تو اسے معطل کر دیا گیا۔ دو ماہ تک خلافت سلب رہی۔ آخر طائع نے معذرت کی تو رجب ۳۶۴ھ میں اسے دوبارہ خلافت سونپ دی گئی۔ [1]

اس دوران بنو بُوَیہ کے کہنہ سال سربراہ حسن بن بُوَیہ (رکن الدولہ) نے مقبوضہ علاقوں کو اولاد میں باہم تقسیم کر دیا تاکہ بعد میں لڑائی جھگڑے نہ ہوں۔ مؤید الدولہ کو اصفہان اور رَے، اور فخر الدولہ کو ہمدان اور دینور بخش دیے۔ عضد الدولہ بغداد، فارس اور کرمان کا بدستور حاکم رہا۔ [2]

عَضُدُ الدولہ بُوَیہی کا عروج:

یہاں سے عَضُدُ الدولہ کا دورِ حکومت شروع ہوتا ہے جو اب فارس سے لے کر عراق تک مطلق العنان حکمران تھا۔ اس نے ایسی شان وشوکت اختیار کی جو اس کے بڑوں کو بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس کی سیاست قدیم شاہانِ ایران سے مشابہ تھی۔ وہ ہیرے جواہرات سے مرصع تاج پہنتا تھا۔ فجر، مغرب اور عشاء کی نمازوں کے وقت اس کے محل کے سامنے نقارے پیٹے جاتے۔ اس نے خلیفہ سے فرمائش کر کے اپنے ساتھ "تاج الملۃ" کا خطاب بھی لگا لیا۔ [3]

پہلا لقبِ شہنشاہی:

آگے چل کر عَضُدُ الدولہ نے "شہنشاہ" کا لقب بھی اختیار کر لیا جو اس سے پہلے کسی مسلمان حکمران نے نہیں اپنایا تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے نجف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر کی موجودگی کا دعویٰ کیا اور وہاں مزار بنوایا۔ اس نے بعض

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۹۱ [2] البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۳۶۵ھ [3] تاریخ الخلفاء، ص ۲۹۲

ترقیاتی کام بھی کرائے۔ شفا خانے بنوائے اور مدینہ منورہ کی نئی فصیل تعمیر کرائی۔

وہ نہایت باہیبت، زیرک اور سخت گیر آدمی تھا۔ فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا۔ مجرموں سے سختی برتتا اور معمولی جرائم پر بھی عبرت ناک سزائیں دلواتا تھا۔ شعر و ادب کا اچھا ذوق رکھتا تھا۔ فنونِ حرب کا ماہر تھا۔[1]

اس کے دور میں بنوبُویَہ کے مخالف کمزور ہو چکے تھے؛ اس لیے اس نے پے در پے جنگیں کر کے بُویَہی حکومت کا دائرہ دور دور تک پھیلا دیا۔ قرامِطہ کو ساتھ ملا کر اس نے سارا عراق ہتھیا لیا۔ بنوبُویَہ کا سابق حاکم بختیار کوچۂ اقتدار میں واپسی کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ عَضُدُ الدولہ نے اسے زیادہ موقع نہ دیا اور ایک جنگ کے بعد اسے گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔[2]

شہزادی جمیلہ بنت حمدان کا دردناک واقعہ:

عَضُدُ الدولہ کے مزاج میں انتقام کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور ظلم اس کے لیے معمولی چیز تھی جس کا ایک نمونہ بنوحمدان کی شہزادی جمیلہ کا واقعہ ہے۔ یہ نیک سیرت اور خوبصورت خاتون سابق حاکم مُوصِل ناصر الدولہ کی بیٹی اور غازی سیف الدولہ کی بھتیجی تھی۔ باپ اور چچا دونوں فوت ہو چکے تھے اور اس کا بھائی غضنفر ابوتغلب حکومت چلا رہا تھا۔ جمیلہ ۳۶۶ھ میں حج کے لیے گئی تو پردے کا ایسا اہتمام کیا کہ چار سو پالکیوں کے بیچ میں اپنی پالکی چھپا کر رکھی۔ مسجد الحرام میں خوب صدقہ و خیرات کرتی رہی۔ حرمین کے خادموں کو مالا مال کر دیا۔ کعبہ کی خدمت کے لیے دس ہزار دینار پیش کیے۔ اس زمانے کے شاہی گھرانوں میں اس کی خوبیوں کا بڑا چرچا تھا۔[3] عَضُدُ الدولہ جمیلہ سے نکاح کا خواہش مند تھا مگر جمیلہ نے رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ عَضُدُ الدولہ یہ سن کر غصے سے بھر گیا اور اسے سزا دینے کا تہیہ کر لیا۔

اس نے ۳۶۷ھ میں مُوصِل پر حملہ کر کے بنوحمدان کو بے دخل کر دیا۔ غضنفر کو اپنی بہن جمیلہ اور باقی کنبے سمیت بھاگ کر شام میں پناہ لینا پڑی جہاں اس کے خاندان کے پاس صرف حلب رہ گیا تھا۔ غضنفر کی کوشش تھی کہ اسے شام میں بنوعبید کے باج گزار حاکم کی حیثیت مل جائے تاکہ وہ عضد الدولہ کے پنجے سے محفوظ ہو جائے۔ چنانچہ محرم ۳۶۹ھ میں وہ اپنے کنبے سمیت مصر کے سرحدی شہر رملہ پہنچا تاکہ بنوعبید سے مذاکرات کرے مگر بنوعبید نے اس کی آمد کو فوج کشی کے مترادف سمجھا اور جنگ کے بعد اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا۔[4] جمیلہ کو جو اس کے ہمراہ تھی، بنوعُقیل کے لوگ اس کے چچازاد سعد الدولہ بن سیف الدولہ کے پاس حلب لے گئے۔ مگر مصیبت میں سگے رشتے بھی کام نہ آئے۔ سعد الدولہ نے اس بے چاری کو عضد الدولہ کے حوالے کر دیا۔ اس نے مصیبت زدہ لڑکی کو اپنے گھر میں قیدی بنا کر رکھ لیا۔[5]

---

① تاریخ الاسلام للذهبي: ۲۶/۵۲۲، ۵۲۳، ت تدمری؛ تاریخ الاسلام ذهبی: ۳۷۶/۸، ت بشار
② البدایة والنهایة: سنة ۳۶۷ھ
③ المنتظم: ۲۴۸/۱۴
④ تاریخ دِمشق لابن قلانسي (م۵۵۵ھجری)، ص ۳۸ تا ۴۰، ط دار احسان دِمشق
⑤ الکامل في التاریخ: سنة ۳۶۹ ھجری

عَضُدُ الدولہ نے جمیلہ کو نکاح پر آمادہ کرنے کے لیے ہر طرح کا دباؤ ڈالا۔ وہ نہ مانی تو بھاری تاوان عائد کر کے تمام جائیداد چھین لی اور بالکل قلاش کر دیا۔ اس پر بھی غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تو اسے کچھ سپاہیوں کے حوالے کر دیا کہ اسے کسی قحبہ خانے میں بٹھادیں تاکہ یہ پیسے کما کر تاوان ادا کرے۔ یہ تھا ان رافضی حکمرانوں کا طرزِ عمل۔ کہاں معتصم جو ایک مسلمان بہن کی عزت بچانے خود محاذ پر جا پہنچا تھا! کہاں عضد الدولہ جو ایک مظلومہ کی ناموس فروخت کر رہا تھا!

اس افسوس ناک واقعے کا انجام نہایت دردناک ہوا۔ سپاہی جمیلہ کو بازار لیے جا رہے تھے کہ اس نے دریائے دجلہ میں چھلانگ لگا کر عزت کی نیلامی سے پہلے ہی اپنی جان دے دی۔[1]

عبیدیوں کے ہاتھوں ترک امیر کو شکست:

عَضُدُ الدولہ کے استبداد سے خوفزدہ ہو کر بغداد کے کچھ سرکردہ امراء نقل مکانی کر گئے تھے۔ ہفتکین ترکی ایک ایسا ہی بارسوخ امیر تھا۔ وہ اپنی فوج سمیت بغداد سے نکل کر شام پہنچا اور دِمشق پر قابض ہو گیا۔ مگر اسے امن کے دن میسر نہ آئے۔ بنوعبید نے اسے اپنے لیے خطرہ سمجھا اور اس کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ ۳۶۸ھ میں عبیدی سربراہ العزیز خود ۷۰ ہزار کا لشکر لے کر مصر کی سرحد پر اس کے مقابلے کے لیے آیا اور اسے شکست دے کر قتل کر دیا۔[2] یوں ثابت ہو گیا کہ بغدادی امراء کے لیے شام عراق سے بھی زیادہ غیر محفوظ ہے اور بنوعبید، بنوبُویہ سے کہیں زیادہ خطرناک ہیں۔

عَضُدُ الدولہ کی موت۔ بنوبُویہ کے تنزل کا آغاز:

۴۸ سالہ عَضُدُ الدولہ شوال ۳۷۲ھ میں مرگی کے مرض میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ اس کے بیٹے نے صمصام الدولہ کے لقب کے ساتھ باپ کی جگہ سنبھال لی۔ باپ "تاج الملۃ" تھا تو صاحبزادے "شمس الملۃ" بن گئے۔

مگر اب بغداد کے بارے میں بنوبویہ کی وہی حالت ہو گئی تھی جو ڈاکوؤں کی لوٹ مار کے مال پر ہوا کرتی ہے۔ صمصام الدولہ کی حکومت کے چوتھے سال ۳۷۶ھ میں اس کا بھائی شرف الدولہ تین ہزار ترکوں کے ساتھ بغداد میں آ گھسا۔ صمصام الدولہ نے ۱۹ ہزار دیلمیوں کے ساتھ مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ دیلمی ۳ ہزار لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ شرف الدولہ نے صمصام الدولہ کو گرفتار کر کے اس کی آنکھیں پھوڑنے کا حکم جاری کیا۔ حکم پر عمل سے پہلے خوف کے باعث صمصام الدولہ کی حرکتِ قلب بند ہو گئی۔ اس کی موت کے بعد بھی لاش کی آنکھیں پھوڑ کر سزا جاری کی گئی۔

شرف الدولہ نے بغداد پر قبضہ کر لیا۔ خلیفہ کی مجال نہ تھی کہ کچھ کہتا۔ اس نے حسبِ سابق نئے حکمران کی آؤ بھگت کی اور خلعتوں سے نواز کر حکمرانی کی رسمی منظوری دے دی۔ شرف الدولہ گزشتہ بویہی حکمرانوں کی بہ نسبت نرم مزاج تھا۔ اس نے شہر میں امن وامان قائم رکھا، ترقیاتی کام کرائے اور ایک بڑی رصدگاہ بھی بنوائی۔[3]

---

① ثمار القلوب لابی منصور الثعالبی (م۴۲۹ھجری)، ص ۲۰۵، ط دار المعارف قاهره ؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۵/۱۲۰، ۱۲۱، ط الرسالة

② اتعاظ الحنفاء باخبار أئمة الفاطميين الخلفاء للمقريزی: ۱/۲۴۳، ط جامعه قاهره

③ تاريخ الخلفاء، ص ۲۹۳

تین برس حکمرانی کر کے ۳۷۹ھ میں شرف الدولہ مر گیا اور اس کا بھائی ابونصر بہاؤ الدولہ کا لقب اپنا کر حکمران بنا۔
ایک دن خلیفہ طائع نے اس کے کسی خاص کارندے کو کچھ کہہ دیا۔ بہاؤ الدولہ بھڑ گیا۔ خلیفہ کے پاس آیا اور درباری رسم کے مطابق زمین بوسی کی اور خلیفہ کے ساتھ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے اشارے پر اس کے اہلکاروں نے خلیفہ کو تخت سے گھسیٹ کر ایک چادر میں لپیٹ لیا اور شرف الدولہ کے محل میں لے گئے۔ یہاں اسے جبراً معزول کر دیا گیا۔ یہ ۹ شعبان ۳۸۱ھ کا واقعہ ہے۔ طائع خوش قسمت تھا کہ معزولی کے بعد اسے قتل کیا گیا نہ اس کی آنکھیں پھوڑی گئیں بلکہ اسے نئے خلیفہ کے محل میں زندگی کے باقی دن آرام سے پورے کرنے کا موقع دیا گیا۔ وہ مزید بارہ سال زندہ رہا اور یکم شوال ۳۹۳ھ کو فوت ہوا۔[1]

❖ ❖ ❖

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۹۲ تا ٤٩٤؛ العبر فی خبر من غبر: ۲/ ۱۳۰ تا ۱٤۷

القادر باللہ

احمد بن اسحاق المقتدر

شعبان ۳۸۱ھ تا ذوالحجہ ۴۲۲ھ

نومبر ۹۹۱ء تا دسمبر ۱۰۳۱ء

طائع کی جگہ سابق خلیفہ مقتدر کا پوتا احمد بن اسحاق قادر باللہ کے لقب کے ساتھ مسند خلافت پر بیٹھا۔ اس نے پورے چالیس سال یہ رسم نبھائی۔ وہ علم و فضل اور زہد و عبادت میں علماء اور مشائخ کے ہم پلہ تھا۔ تہجد کا پابند اور مطالعہ کا شوقین تھا۔ اس نے مشہور شافعی فقیہ ابو بشر ہروی سے فقہ میں مہارت حاصل کی تھی۔ خود بھی مصنف تھا۔ اس کی ایک تصنیف عقائد کے موضوع پر تھی جس میں صحابہ کے فضائل ان کے مراتب کے لحاظ سے بیان کیے گئے تھے۔ دوسری تصنیف معتزلہ کی تردید میں تھی۔ تیسری تصنیف حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی سیرت پر تھی۔

قادر باللہ کے اکتالیس سالہ دور کے ابتدائی بیس سالوں میں عالم اسلام کی حالت ایسے بے حس و حرکت مریض کی سی تھی جس کی قوت مزاحمت دم توڑ چکی ہو۔ سلطنت روما اپنے اندرونی بحران کی وجہ سے بیرونی حملوں سے رکی ہوئی تھی ورنہ اس وقت عالم اسلام رو بہ زوال تھا۔ روافض کی حکومتیں اپنی جگہ قائم تھیں مگر ان میں بھی خاندانی کشمکش کی وجہ سے توڑ پھوڑ شروع ہو چکی تھی۔ اسلامی ممالک کئی ٹکڑوں میں بٹے ہوئے تھے اور افریقہ کی رافضی عبیدی حکومت کے سوا ہر ریاست کمزور تھی؛ اس لیے جگہ جگہ خروج اور خود مختاری کے دعوے دار کھڑے ہوتے رہتے تھے مگر اب کسی باغی کو پہلے جیسی عوامی حمایت نہیں ملتی تھی۔ ہاں تھوڑے بہت لوگ ہر کسی کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے تھے جنھیں آس پاس کا کوئی بھی حاکم سیدھا کر دیتا تھا۔ ۳۸۱ھ میں ایک اعرابی سردار ''اصیفر'' نے عراق اور حجاز کے درمیان ناکہ بندی کر دی اور حاجیوں کو روک کر مطالبہ کیا کہ جب تک وہ اس کی حکومت تسلیم نہیں کریں گے انہیں راستہ نہیں ملے گا۔ بدامنی کی وجہ سے اس سال عراق، شام اور یمن سے کوئی قافلہ حج کے لیے نہ پہنچ سکا۔

حاکم بغداد بہاؤ الدولہ ملک کو چلانے میں ناکام ہو چکا تھا؛ اس لیے ۳۸۲ھ میں اس نے ابوالحسن کوکبی کو جو ابن معلم کے لقب سے مشہور تھا، بغداد کا منتظم بنا دیا۔

اس نے قیام امن کی ضمانت کے لیے عاشوراء کے ماتمی جلوس بند کرا دیے جو گزشتہ تیس سال سے جاری تھے۔ شہر میں امن قائم ہو گیا مگر فوج کے کچھ افسران بگڑ گئے اور انہوں نے ابن معلم کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ اس کے بعد ماتمی جلوس پھر شروع ہو گئے۔[1]

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۹۵، ۲۹۶؛ العبر فی خبر من غبر: ۲/۱۵۱ تا ۱۷۰

بغداد میں بدامنی۔ شیعوں کے جلوس:

بغداد پر اکثر ایک گھمبیر سکوت طاری رہتا تھا جسے کبھی کبھی بدامنی کا شور شرابا توڑ ڈالتا۔ ۳۸۹ھ میں شیعوں نے غیر معمولی اہتمام کے ساتھ یوم عاشوراء منایا، گنبد نما تعزیے نکالے اور شور وغوغا سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ ۱۸ ذوالحجہ کو اسی جوش وخروش کے ساتھ عیدِ غدیر بھی منائی گئی۔ یہ دیکھ کر اہلِ سنت نے عیدِ غدیر کے آٹھویں دن (۲۶ ذوالحجہ) کو ''یوم غار'' کے طور پر منانا شروع کر دیا اور دعویٰ کیا کہ اس دن حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ غار میں روپوش ہوئے تھے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یہ ایک جاہلانہ اور غلط بات تھی؛ کیوں کہ حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی غار میں روپوشی کے دن یقینی طور پر ماہِ صفر یا ربیع الاوّل میں تھے۔''[1]

یوم مصعب بن زبیر منانے کی بدعت:

اسی طرح یوم عاشوراء کے ردِّعمل میں سُنیوں کے جہلاء نے ۱۸ محرم کو ''یوم شہادتِ مصعب بن عمیر'' منانا شروع کر دیا۔ اس دن عوام کے قافلے حضرت مصعب بن زبیر کی مرقد پر جاتے اور آہ وزاری کرتے۔ وہ ان کی شہادت کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی نظیر قرار دیتے؛ کیوں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نواسۂ رسول تھے تو حضرت مصعب بن زبیر نواسۂ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ رسم دس سال تک برقرار رہی۔[2]

شہر میں غنڈوں اور ٹھگوں کے گروہ موجود تھے جو لوگوں کو لوٹتے رہتے تھے۔ مہنگائی اور قحط کے دورے اب بھی پڑتے رہتے تھے اور ان دنوں جرائم پیشہ افراد کی کارروائیاں بڑھ جاتی تھیں۔[3]

عمید الجیوش کا دورِ نظامت۔ جلوس بند۔ فسادات ختم:

بہاؤ الدولہ نے حالات قابو سے باہر دیکھ کر ابوعلی الحسین کو پورے عراق کا انتظام سونپ دیا۔ یہ امیر ''عمید الجیوش'' کے لقب سے مشہور تھا اور انتظامی لحاظ سے بڑا ہوشیار اور سخت تھا۔ وہ ۳۹۲ھ میں بغداد آیا۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ چوروں ڈاکوؤں کے خلاف کارروائیاں کیں اور کئی کو پکڑ کر قتل کرا دیا۔ دوسرا کام یہ کیا کہ اہلِ سنت اور شیعہ دونوں کو شاہراہوں پر اپنے مذہبی مظاہروں سے منع کر دیا، عاشوراء کے ماتمی جلوس بند کرا دیے، روزمرہ کے فسادات اور ناقابلِ تحمل جانی ومالی نقصانات نے یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ فرقہ ورانہ اختلافات کو ہوا دے کر کبھی کوئی حکومت باقی نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ ۳۹۳ھ میں عاشوراء کا ماتمی جلوس نہیں نکلا اور مرقدِ مصعب بن زبیر پر سنیوں کا اجتماع بھی نہیں ہوا۔ اس طرح شہر میں امن قائم ہوگیا۔ شیعہ سنی فسادات بند ہوگئے۔[4]

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۲۹۵، ۲۹۶؛ العبر فی خبر من غبر: ۲/۱۵۱ تا ۱۷۰

② البدایة والنهایة: ۱۵/۴۸۳، ۵۰۰ ③ العبر فی خبر من غبر: ۲/۱۷۶

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس رسم کا ذکر کر کے فرماتے ہیں: ''وهذا من باب مقابلة البدعة بمثلها، ولا يرفع البدعة الا السنة الصحيحة. (یہ بدعت کا مقابلہ اسی جیسی بدعت کے ذریعے کرنے کی قبیل سے ہے۔ جبکہ بدعت کو فقط سنتِ صحیحہ ہی مٹا سکتی ہے۔)

④ البدایة والنهایة: ۱۵/۴۹۶ ⑤ سیر اعلام النبلاء: ۱۷/۲۳۱؛ البدایة والنهایة: ۱۵/۵۰۰

مصحف عبداللہ بن مسعود کا ظہور، سنی شیعہ کش مکش میں یہود کا کردار:

فساد کی چنگاری ایک بار پھر اس وقت بھڑکی جب رجب ۳۹۸ھ میں شیعوں نے قرآن مجید کا ایک نسخہ جو عام نسخوں سے مختلف تھا، علمائے اہلِ سنت کے سامنے پیش کر کے اس کی صحت پر اصرار کیا اور کہا کہ یہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مصحف ہے۔ علماء اور شہر کے شرفاء جمع ہو کر اسے دیکھتے بھالتے رہے۔ آخر بغداد کے سب سے بڑے فقیہ امام ابوحامد اسفرائنی رحمہ اللہ نے فتویٰ دیا کہ اس نسخے کو پڑھنا اور باقی رکھنا فتنے کا باعث ہے؛ لہٰذا اسے تلف کر دیا جائے جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں صحابہ نے یہی فیصلہ کیا تھا۔

اس فتوے پر شیعہ طیش سے بے قابو ہو گئے اور شیخ ابوحامد اسفرائنی رحمہ اللہ کے گھر پر حملہ کر دیا۔ وہ جان بچا کر بمشکل وہاں سے نکل پائے۔ خلیفہ قادر کو پتا چلا تو کچھ کارندوں کو بھیجا جنہوں نے شیعوں کے محلے پر دھاوا بول دیا۔ اس تصادم میں کئی مکانات نذرِ آتش ہوئے۔ نصف شعبان کی شب شیعوں نے مجلسِ بددعا منعقد کی جس میں اپنے مخالفین کے لیے ہلاکت کی بددعائیں کیں۔ کافی دنوں تک ہنگامہ آرائی رہی۔ آخر فریقین کے عمائد نے جمع ہو کر فیصلہ کیا کہ آئندہ کوئی واعظ فتنہ انگیزی نہیں کرے گا اور صحابہ کرام کے بارے میں کوئی سوال نہیں اٹھایا جائے گا۔

بغداد میں عمید الجیوش ابوعلی کا انتظامی عہدہ دس سال تک رہا اور اس دوران اس نے ماتمی جلوسوں پر پابندی عائد رکھی، یوں امن وامان قائم رہا۔ ۴۰۱ھ میں عمید الجیوش فوت ہو گیا۔ نئے ناظم شہر فخر الملک نے ماتم کی اجازت دے دی۔ چنانچہ محرم ۴۰۲ھ سے ایک بار پھر شاہراہوں پر جلوس نکلنے لگے۔ پہلے کی طرح شیعہ عیدِ غدیر اور سنی یوم غار منانے لگے۔ ساتھ ہی شیعہ سنی فساد بھی شروع ہو گئے۔ بغداد میں یہودی بھی آباد تھے، وہ ایسے مواقع پر شیعوں کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ لگتا ہے کہ فساد کرانے میں بعض اوقات یہودیوں کا ہاتھ ہوا کرتا تھا؛ کیوں کہ ۴۳۷ھ کے شیعہ سنی فسادات میں جب فریقین لڑ لڑ کر تھک گئے تو پتا چلا کہ بھُس میں چنگاری ڈالنے والے یہی لوگ تھے۔ اس کے بعد شیعہ اور سنی دونوں یہودیوں کے محلے پر ٹوٹ پڑے اور وہاں کئی مکانات کو جلا ڈالا۔[1]

بنوبُویہ کے مابین اقتدار کی کش مکش:

۴۰۳ھ میں بنوبُویہ کا حکمران بہاؤالدولہ مر گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا سلطان الدولہ کا خطاب اپنا کر حکمران بنا۔ ۴۱۱ھ میں سلطان الدولہ اور اس کے بھائی حاکمِ عراق مشرف الدولہ میں اقتدار کی کش مکش ہوئی، نتیجہ یہ نکلا کہ مشرف الدولہ نے سلطان الدولہ کو ہٹا کر خود بغداد کی حکومت سنبھال لی۔ پانچ سال بعد ۴۱۶ھ میں مشرف الدولہ مر گیا۔ بغداد کی حکومت بہاؤالدولہ کے ایک اور بیٹے جلال الدولہ کو مل گئی۔[2]

---

① البداية والنهاية: ۴۹۶/۱۵، ۵۰۰، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۳۷، ۵۶۳، ۵۷۳، ۶۲۹، ۶۳۹، ۶۴۱، ۶۹۷، ۷۰۷، ۷۱۰؛ العبر في خبر من غبر: ۱۷۰/۲ تا ۲۰۰

② العبر في خبر من غبر: ۲۰۴/۲

خلیفہ قادر باللہ اسلام اور خلافت کا وقار بحال کرنے کے لیے کوشاں:

اس دوران خلیفہ قادر باللہ اسلام اور مسندِ خلافت کے وقار کو دوبارہ بحال کرنے کی اپنی حد تک کوشش ضرور کرتا رہا تھا۔ اگرچہ بنو بُویہ کے دباؤ کی وجہ سے وہ زیادہ کامیاب نہ ہو سکا مگر گزشتہ خلفاء کی بہ نسبت اس دور میں خلیفہ کچھ نہ کچھ بااختیار دکھائی دیتا ہے۔ اس نے ہمت کر کے اہلِ سنت کے حقوق کے لیے بعض اقدامات کیے جس کی وجہ سے عوام اسے پسند کرنے لگے اور وہ بنو بُویہ کے مقابلے میں کچھ مضبوط ہو گیا۔[1]

سلطان محمود غزنوی کا ظہور اور خلافتِ عباسیہ کی پشت پناہی:

خلیفہ قادر کی تقویت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے دور میں ہمیں سلطان محمود غزنوی کی شمشیر چمکتی دکھائی دیتی ہے۔ غزنی کے اس مجاہد نے اسلاف کا کردار دُہراتے ہوئے مدت سے مٹ جانے والی رسمِ جہاد کو زندہ کر دیا۔ اس کی پوری زندگی جہاد میں گزری۔ اس دوران اس نے خراسان، وسطِ ایشیا اور ہندوستان کے بہت بڑے رقبے پر قائم ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی اور یوں مسلمانوں کو لگ بھگ ڈیڑھ صدی بعد ایشیا میں کوئی مضبوط حکمران نصیب ہوا۔ اگرچہ محمود غزنوی کا علاقہ بغداد سے دور تھا تاہم خلافتِ بغداد سے اس کے بڑے اچھے مراسم تھے۔ خلیفہ قادر نے اسے یمین الدولہ کا خطاب دیا تھا۔[2]

عبیدی حکمران کی خلعت نذرِ آتش:

محمود غزنوی کے عروج کے ساتھ ہی خلافتِ بغداد کی ساکھ بھی کچھ بہتر ہو گئی؛ کیوں کہ اب اس کے نیاز مندوں میں ایک طاقتور حکمران شامل ہو چکا تھا۔ خلافتِ بغداد سے محمود غزنوی کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ ۴۰۳ھ میں اسے عبیدی حکمران الحاکم کی طرف سے پیش کش کی گئی کہ وہ اس کے حلقۂ امامت میں شامل ہو جائے۔ غزنوی نے اس مراسلے پر تھوک کر اسے نذرِ آتش کر دیا اور سفیر کو سختی سے جھڑک کر واپس بھیج دیا۔[3] ۴۱۵ھ میں عبیدی حکمران نے محمود غزنوی کے لیے خلعت بھیجی تو سلطان نے اسے خلیفہ کے پاس روانہ کر دیا تاکہ اسے مجمعِ عام میں نذرِ آتش کر دیا جائے۔[4]

خلیفہ قادر اور سلطان محمود غزنوی عقائدِ باطلہ کی بیخ کنی کے لیے سرگرم:

بنو بُویہ اب قادر باللہ کو اہلِ سنت کی حمایت پر کچھ نہیں کہہ سکتے تھے جبکہ چند سال پہلے خلفاء کو ایسی حرکات کا خمیازہ قتل یا کم از کم معزولی کی صورت میں بھگتنا پڑتا تھا۔ یہ دیکھ کر ۴۰۸ھ میں خلیفہ کو ہمت ہوئی۔ اس نے بغداد کے علماء کو جمع کر کے ان سے تحریری اقرار لیا کہ وہ اعتزال اور رافضیت سے اظہارِ برأت کرتے ہیں اور جو شخص اس قسم کے خلافِ اسلام عقائد کا پرچار کرے گا اسے سخت سزا دی جائے گی۔

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۹۴ تا ۲۹۶

[2] المنتظم لابن الجوزی: ۱۵/۲۱۱

[3] البدایة والنهایة: ۱۵/۵۴۴، ۶۳۳

[4] البدایة والنهایة: ۱۵/۶۰۲

اسی بارے میں ایک مراسلہ سلطان محمود غزنوی کو بھی بھیجا گیا اور تاکید کی گئی کہ وہ عقائدِ باطلہ کی بیخ کنی کی کوشش کرے۔ سلطان نے ایسا ہی کیا اور اپنے مفتوحہ علاقوں میں قرامطہ، اسماعیلیہ، معتزلہ و جہمیہ کو توبہ تائب ہونے کی ترغیب دی۔ انکار کرنے والوں کو پابندِ سلاسل کیا گیا اور بہت سے سرکشوں کو قتل بھی کیا گیا۔[1]

محمود غزنوی کی جانب سے خلیفہ کو زہر شناس پرندے کا تحفہ:

سلطان محمود، قادر باللہ کو مراسلوں میں اپنی فتوحاتِ ہند کی تفصیل اہتمام سے لکھ کر بھیجتا تھا اور ساتھ ہی بڑے نادر و نایاب تحائف بھی ارسال کرتا تھا۔ ۴۱۴ھ میں ہندوستان پر کامیاب حملے سے واپسی پر سلطان نے خلیفہ کو مالِ غنیمت میں ملنے والا ایک عجیب و غریب پرندہ بھیجا جو آس پاس زہر کی موجودگی کو فوراً محسوس کر لیتا اور اس کی آنکھوں سے پانی جاری ہو جاتا۔ ہندوستانی مہاراجے اس پرندے کو دسترخوان پر ساتھ رکھا کرتے تھے تاکہ کھانے میں زہر ملا ہو تو فوراً پتا چل جائے۔ یہ واقعات خلیفہ قادر سے سلطان محمود غزنوی کی محبت و عقیدت کی دلیل تھے۔[2]

حجاج کے قافلوں پر ڈاکہ زنی، وزیرِ بغداد کی جوابی کارروائی:

اس زمانے تک قرامطہ کا زور ٹوٹ چکا تھا مگر جزیرۃ العرب اور اس کے راستے حسبِ معمول بے امان تھے۔ حاجیوں کے قافلے قبائلی ڈاکوؤں کی غارت گری کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔ ۴۰۳ھ میں عراقی حاجیوں کے قافلے کو قبیلہ خفاجہ کے چھ سو ڈاکوؤں نے عراق کی سرحد واقصہ کے قریب ایک گھاٹی میں گھیر لیا۔ اس سے پہلے وہ راستے کے تالابوں کو مٹی سے پاٹ چکے تھے اور کنوؤں کا پانی تلخ آمیزوں کی ملاوٹ کے ذریعے ناقابلِ استعمال بنا چکے تھے؛ اس لیے قافلہ سخت پیاس کی حالت میں تھا۔ ڈاکوؤں نے انہیں راستہ دینے کے لیے پچاس ہزار دینار طلب کیے۔ جب قافلے والے یہ رقم ادا نہ کر سکے تو ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا۔ اس خونریزی میں پندرہ ہزار حاجی جاں بحق ہوئے اور سواری کے جانوروں سمیت ان کا سارا مال و متاع لٹ گیا۔ مقتولین میں حنابلہ کے مفتی اعظم حسن بن حامد بغدادی رحمہ اللہ بھی شامل تھے۔

اس حادثے کی خبر سن کر وزیرِ بغداد فخر الملک نے سالارِ فوج علی بن مزید کو متحرک کیا۔ وہ تیزی سے نکلا اور تعاقب کر کے کئی ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیا جنہیں دجلہ کے کنارے باندھ کر بھوکا پیاسا رکھا گیا یہاں تک کہ وہ مر گئے۔[3]

بنوبُویہ کا باہمی انتشار اور غزنوی سے ان کی مرعوبیت:

بنوبویہ کی حکومت اب رفتہ رفتہ اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بُویہی حکام جگہ جگہ ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے۔ ان میں سے کرمان کے حاکم قوام الدولہ (ابوالفوارس) نے اپنے مدمقابل روافض پر غلبہ پانے کے لیے سلطان محمود غزنوی سے اچھے مراسم قائم کر لیے اور سلطان نے بھی سیاسی مصلحت کے تحت اس کی مدد کی۔[4]

① البداية والنهاية: ۵۷۴/۱۵

② المنتظم لابن الجوزي: ۱۵۹/۱۵

③ العبر في خبر من غبر: ۲۰۴/۲؛ البداية والنهاية: ۵۴۳/۱۵

④ تاریخ ابن خلدون: ۵۴۸/۳

قوام الدولہ کے مظالم اور موت:

قوام الدولہ بُویہی عجیب شخص تھا۔ شراب کے نشے میں دُھت ہو کر اپنے مقرب ہم نشینوں کو بُری طرح مارتا پیٹتا تھا۔ ایک بار اسے اپنے وزیر پر طیش آیا تو اسے قسم کھلائی کہ اگر مار کھاتے ہوئے اس نے آہ کی تو اس کی بیوی کو طلاق ہو جائے گی۔ پھر اسے ہتھوڑے کی دو سو ضربیں لگائیں اور قسم کھلائی کہ وہ اس ظلم کی کسی کو خبر بھی نہیں دے گا۔

قوام الدولہ کی وفات ۴۱۹ھ میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے اپنے امراء نے تنگ آکر اسے زہر دیا تھا۔ [1]

سلطان محمود کا ایران پر قبضہ:

سلطان محمود غزنوی رفتہ رفتہ مغرب کی طرف بڑھتا گیا اور بُویہی جو اپنے باہمی اختلافات کا تصفیہ نہ کر سکے تھے، پسپا ہوتے گئے۔ سلطان کا فیصلہ کن حملہ ۴۱۹ھ میں اس وقت شروع ہوا جب وہ ہندوستان اور ترکستان کے تمام محاذوں سے فارغ ہو چکا تھا جبکہ دو بڑے بُویہی امراء: جلال الدولہ اور ابو کالیجار کے مابین عراق میں محاذ گرم تھا۔ ان کے مابین صلح کی تمام کوششیں ناکام رہیں اور آخر جلال الدولہ کے مقابلے میں ابو کالیجار کو بدترین پسپائی ہوئی۔

اُدھر ۴۲۰ھ میں سلطان محمود نے اصفہان سمیت پورے ایران پر قبضہ کر لیا۔ بُویہوں کا اہم ترین مرکز رَے (موجودہ تہران) بھی سلطان کے سامنے مسخر ہو گیا۔ علاقے کے بہت سے بے دین رافضیوں اور باطنیوں کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔ یہاں کا رافضی حاکم مجد الدولہ بن فخر الدولہ (رستم بن علی بن بُویہ) اس قدر عیاش تھا کہ اس نے پچاس عورتوں سے شادی رچا رکھی تھی۔ سلطان محمود نے اسے بے دخل کر کے اس کے خزانے کے دس لاکھ دینار ضبط کر لیے جو اس نے ظلم و ستم کر کے جمع کیے تھے۔ سلطان نے جب اس سے پچاس شادیوں کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا:

"یہ میرے آبا و اجداد کی رسم ہے۔"

ایسے عیاش حکمرانوں کو نمونۂ عبرت بناتے ہوئے سلطانی افواج برابر آگے بڑھتی رہیں یہاں تک کہ بلادِ جبل اور شمالی ایران کے آخری ضلع قزوین کو بھی بنی بُویہ سے بازیاب کرا لیا گیا۔ اگلے کچھ دنوں میں سلطان کی افواج آرمینیا کے طول و عرض میں بھی اپنے پرچم گاڑ چکی تھی۔ [2]

بغداد میں روافض کے کفریہ الفاظ پر مبنی خطبے پر پابندی:

اُدھر بغداد میں خلیفہ کی طرف سے دینی شعائر کے احیاء کی کوششیں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ بغداد میں "جامع مسجد براثا" کی حیثیت روافض کے اہم مرکز کی تھی جہاں جمعے کے خطبے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدائی تک کے دعوے کیے جاتے تھے۔ وہاں خطبۂ جمعہ میں کہا جاتا تھا:

"صلوٰۃ وسلام ہو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بھائی امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب پر جو بوسیدہ کھوپڑیوں کو گویائی عطا کرتے تھے اور انہیں زندہ کر دیتے تھے، جو بشریت اور الوہیت کی صفات کے حامل تھے۔"

[1] الكامل في التاريخ: سنة ٤١٩هـ

[2] البداية والنهاية: ١٥/٦٢٥؛ الكامل في التاريخ: سنة ٤٢٠هـ

قادر باللہ نے یہ سن کر ایک رسالہ تصنیف کیا جس میں روافض اور معتزلہ کے عقائد کی تردید تھی۔ یہ رسالہ علماء اور عوام کے مجمع عام میں پڑھ کر سنایا گیا۔ پھر جامع براثا میں شیعہ کی جگہ سنی خطیب کا تقرر کر دیا گیا۔

جب سنی عالم نے وہاں جمعے کا خطبہ شروع کیا تو حاضرین نے اینٹوں اور پتھروں سے استقبال کیا۔ خلیفہ قادر باللہ اس اطلاع پر سخت غضب ناک ہوا، اس نے جامع براثا میں جمعہ بند کرا دیا۔ آخر شیعوں کے قائد سید شریف مرتضیٰ نے ایک وفد کے ساتھ حاضری دی اور اس سانحے پر معذرت کر کے کہا: ''یہ جاہل عوام کا کام تھا جنہیں معلوم نہیں تھا وہ کیا کر رہے ہیں۔''

تب خلیفہ نے جامع براثا میں سنی امام کی اقتداء میں دوبارہ نماز جمعہ اور خطبے کی اجازت دے دی۔ یہ ۴۲۰ھ کا واقعہ ہے۔[1]

سلطان محمود اور خلیفہ قادر کی وفات:

۴۲۱ھ میں سلطان محمود غزنوی کا انتقال ہو گیا۔[2] اس وقت تک سلطان نے بنی بُویہ کو بڑی حد تک پسپا کر دیا تھا اور اب اس خاندان کے پاس فقط عراق رہ گیا تھا۔

اگلے سال ۱۱ ذوالحجہ ۴۲۲ھ کو قادر باللہ بھی ۴۱ سال تین ماہ کی طویل خلافت کے بعد دنیا سے رخصت ہو گیا۔[3]

رومیوں کے حملے:

قادر باللہ کے آخری ایام میں رومیوں کا ناکام حملہ تاریخ کا ایک عجیب واقعہ ہے۔ گزشتہ کئی عشروں سے عالم اسلام پر رومیوں کے حملوں کا سلسلہ رکا ہوا تھا۔ اس کی وجہ خود سلطنتِ روما کے اندرونی اختلافات تھے ورنہ اس زمانے میں مسلمانوں کا دفاع کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ تاہم رومی عالم اسلام پر حملوں کے ارادوں سے دست بردار نہیں ہوئے تھے؛ اس لیے ۴۲۱ھ میں قیصرِ روم ارمانوس نے بڑے کرّ وفرّ کے ساتھ تین لاکھ سپاہی لے کر یلغار کی اور بلا روک ٹوک حلب کے قریب پہنچ گیا۔

مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ یہ شدید گرمی کے دن تھے اور رومی لشکر کو پانی کی قلت کا سامنا تھا۔ ایسے میں قیصر کے ایک نواب کی غداری نے فوج کے حوصلے پست کر دیے۔ اس دوران عرب بدوؤں کے ایک گروہ نے رات کو لشکر پر شب خون مارا۔ قیصر سمجھا کہ کسی بہت بڑی فوج نے چڑھائی کی ہے؛ اس لیے وہ دیکھے بھالے بغیر بھاگ کھڑا ہوا۔ باقی فوج بھی تتر بتر ہو کر اس کے پیچھے نکل گئی۔ اس طرح اللہ نے عالم اسلام کو ایک بڑی آفت سے بچا لیا۔[4]

اگلے سال قیصر نے ایک اور حملہ کیا، اس بار اس کے ساتھ زیادہ فوج نہیں تھی مگر مسلمان سرحدوں کا دفاع نہ کر سکے اور قیصر رُہا جیسے اہم عسکری علاقے پر قابض ہو گیا۔[5]

---

① العبر فی خبر من غبر: ۲۳۹/۲؛ الکامل فی التاریخ: سنة ۴۲۰ هجری

② البدایة والنهایة: ۶۲۸/۱۵

③ البدایة والنهایة: ۶۳۷/۵

④ البدایة والنهایة: ۶۳۰/۱۵؛ تاریخ الخلفاء، ص ۲۹۷؛ الکامل فی التاریخ: سنة ۴۲۱ھ

⑤ الکامل فی التاریخ: سنة ۴۲۲ھ

القائم بِاَمْرِ اللّٰہ

عبداللہ بن احمد القادر

ذوالحجہ ۴۲۲ھ تا شعبان ۴۶۷ھ

دسمبر ۱۰۳۱ء تا اپریل ۱۰۷۵ء

۱۲ ذوالحجہ ۴۲۲ھ کو قادر باللہ کا فرزند ابوجعفر عبداللہ، القائم بامر اللہ کے لقب کے ساتھ مسندِ خلافت پر بیٹھا۔ اپنے باپ کے برعکس وہ ایک کمزور آدمی تھا اور عالی ہمتی سے محروم تھا۔ پھر اب سلطان محمود غزنوی بھی رخصت ہو چکا تھا؛ اس لیے خلافتِ بغداد کی سیاسی ساکھ پہلے کی طرح گرتی چلی گئی۔

اسی دوران بُویہی حکمران جلال الدولہ کے امراء میں پھوٹ پڑ گئی جس سے حکومتِ بنوبُویہ بھی کمزور ہو گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بغداد میں لاقانونیت کا دور دورہ ہو گیا۔ ماتمی جلوس ہر سال نکل رہے تھے۔ ان پر نہ قادر باللہ قدغن لگا سکا تھا نہ قائم میں یہ ہمت تھی؛ لہٰذا ہر سال محرم میں فرقہ ورانہ لڑائیاں معمول بن گئیں۔ [1]

بنوبُویہ اندرونی ٹوٹ پھوٹ کا شکار:

بدامنی نے جرائم پیشہ لوگوں کو جری کر دیا تھا اور ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ ۴۲۲ھ سے ۴۳۵ھ تک پورے تیرہ سال شہر میں غنڈوں کا راج رہا۔ فوج اور پولیس بے بس تھی۔ حکومتی خزانہ خالی تھا۔ ترک سپاہیوں کو تنخواہیں ملنے میں جب بھی دیر ہوتی وہ ہنگامہ کھڑا کر دیتے اور سیدھے جلال الدولہ کو جا پکڑتے۔ وہ جائیدادیں اور اثاثے بیچ کر اخراجات کا انتظام کرتا رہا۔ ایک بار اسے خرچ پورے کرنے کے لیے اپنی پوشاکیں تک فروخت کرنا پڑیں۔ [2]

بساسیری کے مظالم اور جلال الدولہ کی بے اعتنائی:

آخر جلال الدولہ نے مصلحت کے تحت بغداد کے مشرقی محلے کرخ میں جہاں شیعہ آباد تھے، سکونت اختیار کر لی [3] اور مغربی بغداد کو ایک ترک شیعہ سردار بساسیری (ارسلان ترکی) کے حوالے کر دیا۔ [4] یہ شخص بڑا بے رحم اور خود غرض تھا۔ اس نے بغداد کے عوام پر بڑے بڑے مظالم ڈھائے اور خلیفہ کو بھی طرح طرح کی ایذائیں دیتا رہا۔ [5]

بساسیری کے مظالم نے سنیوں کو مزید مشتعل کیا اور شیعہ سنی فسادات کی آگ مزید تیز ہو گئی۔ اس صورتحال سے فوج بھی متاثر ہوئی اور اس کا حکومت پر اعتماد ختم ہو گیا۔ ترک سپاہیوں نے ۴۲۷ھ میں بغاوت کر دی اور جلال الدولہ کا محل تک لوٹ لیا۔ [6]

---

[1] البداية والنهاية: ۱۵/۶۲۹، ۶۳۶، ۶۵۰، ۶۹۷، ۷۰۳، ۷۰۷، ۷۱۰

[2] البداية والنهاية: ۱۵/۶۲۹، ۶۳۶، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۵۳، ۶۵۸

[3] الكامل في التاريخ: ۷/۷۵۹

[4] الكامل في التاريخ: ۷/۷۶۴، ۷۶۵

[5] البداية والنهاية: ۱۵/۷۲۹

[6] الكامل في التاريخ: ۴۲۷ھ

جلال الدولہ کو شہنشاہِ اعظم کے لقب کی حرص:

جلال الدولہ کی ساکھ بالکل گر چکی تھی مگر اسے اپنی شان بڑھانے کا خبط تھا۔ ۴۲۹ھ میں اس نے علماء کی اکثریت کے اعتراض کے باوجود اپنے ساتھ ''شہنشاہِ اعظم، ملک الملوک'' کا لقب لگا لیا۔ اس نے یہ حکم بھی دیا کہ ہر نماز کے وقت اس کے لیے نقارے بجائے جائیں۔ خلیفہ اس بدعت کو پسند نہیں کرتا تھا مگر جلال الدولہ کے اصرار کے آگے چپ ہو گیا۔ تاہم عوام نے اس پر سخت احتجاج کیا اور جمعے کے خطبے میں بعض خطیبوں نے جلال الدولہ کے نام کے ساتھ یہ القاب پڑھے تو لوگوں نے پتھر برسا کر اپنی نفرت کا اظہار کیا۔[1]

◆◆◆

جاں بلب خلافت اور سلجوقیوں کا ظہور

جلال الدولہ کے عجیب وغریب احکام اور مطالبات سے عوام، فوج اور خلیفہ سب تنگ تھے۔ نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ ۴۳۴ھ میں خلیفہ نے علماء وفقہاء کو ساتھ لے کر بغداد کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ چونکہ سلطان محمود غزنوی کے بعد غزنوی حکومت کے جانشین باہم دست وگریباں ہونے کے باعث اس قابل نہیں تھے کہ بغداد کی کوئی مدد کر سکتے؛ لہٰذا ایسا لگ رہا تھا کہ شاید عباسی خلافت یہیں ختم ہو جائے گی۔ مگر اس نازک وقت میں اللہ نے خلافت کے وقار کی بحالی اور امتِ مسلمہ کی سرحدوں کے دفاع کے لیے سلاجقہ کو منتخب کر لیا۔

سلاجقہ ایک غیر معروف ترک قبیلہ تھا جس کی حکومت کچھ مدت قبل قائم ہوئی تھی۔ اس قبیلے کا سردار ایک بہادر ترک طُغرل بیگ تھا۔ اس نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے ترکمانوں کو مجتمع کر کے چند سالوں کے اندر اندر ترکستان کے وسیع علاقے پر قبضہ کر لیا۔ سلطان محمود غزنوی کی وفات کے بعد غزنوی حکومت کمزور ہو گئی تھی؛ اس لیے سلجوقیوں نے ترکستان کے بعد خراسان کے بھی بڑے حصے کو اپنی عمل داری میں شامل کر لیا۔

طُغرل بیگ ۴۲۹ھ میں نیشاپور اور ۴۳۳ھ میں طبرستان پر بھی قابض ہو گیا۔ اگلے سال خوارزم، رے، قزوین اور کرمان بھی اس کے آگے سرنگوں ہو گئے۔ وہ ایک دیندار آدمی تھا اور بغداد کی خلافت کا وقار بحال کرنا ضروری سمجھتا تھا؛ لہٰذا اس نے ۴۳۵ھ میں جلال الدولہ بُویہی کو مراسلہ لکھ کر تاکید کی کہ وہ عوام سے حسن سلوک کرے اور خلافت مآب کا احترام برقرار رکھے ورنہ اسے سنگین نتائج بھگتنا ہوں گے۔[2]

جلال الدولہ کی موت اور بغداد پر ابو کالیجار بُویہی کی حکومت:

جلال الدولہ کو اس مراسلے پر عمل کی نوبت نہیں آئی تھی کہ اس کا وقتِ اجل آن پہنچا۔ اب عملی طور پر اس کا بھائی ابو کالیجار ''سلطان الدولہ'' اور ''محی الدین'' کے القابات لگا کر بغداد کا حکمران بنا۔ جبکہ اس کا بیٹا ''المَلِکُ العزیز'' کے

---

① البداية والنهاية: ١٥/٦٦٩.
② البداية والنهاية: ١٥/٦٦٩ تا ٦٨٩

لقب کے ساتھ رسماً تخت نشین ہوا۔[1]

چار سال بعد ۴۴۰ھ میں ابوکالیجار بھی فوت ہوگیا اور اس کے بیٹے ابونصر فیروز نے ''الملک الرحیم'' کے لقب کے ساتھ یہ عہدہ سنبھالا۔ یہی بنوبُویہ کا آخری حکمران تھا۔[2]

سلاجقہ نے اصفہان فتح کرلیا:

۴۴۲ھ میں طغرل نے اصفہان بھی فتح کرلیا اس طرح وہ خراسان کے ساتھ پورے ایران کا حکمران بن گیا۔ خلیفہ کی طرف سے طغرل بیگ کو پروانۂ سلطنت اور خلعت بھیجی گئی۔ طغرل نے شکریہ کے جوابی مراسلے کے ساتھ خلیفہ کو بیس ہزار دینار کا ہدیہ پیش کیا۔[3]

سلاجقہ کی فتوحات کا دائرہ ایشیائے کوچک تک وسیع:

اس دوران ۴۴۰ھ میں طغرل کے بھائی ابراہیم ینال نے برسوں بعد روما کی سرحدوں پر اقدامی جہاد کی سنت زندہ کی اور قُسطَنطِینیہ سے صرف پندرہ منازل تک جا پہنچا۔ اس نے ایک لاکھ رومیوں کو قیدی بنایا اور دس ہزار بیل گاڑیوں پر لدا بے پناہ مالِ غنیمت لے کر اس مہم سے لوٹا۔ قیصرِ روم نے قیدیوں میں سے بعض شہزادوں کی رہائی کی درخواست بھیج کر خطیر فدیے کی پیش کش کی تو طغرل بیگ نے احسان کرتے ہوئے بلا معاوضہ انہیں رہا کردیا۔[4]

اہلِ سنت اور شیعوں میں کش مکش:

بغداد میں شیعہ سنی کشیدگی اسی طرح باقی تھی۔ محرم میں فرقہ ورانہ فسادات شہری زندگی کا ایک معمول بن گئے تھے۔ ۴۴۱ھ میں حکومت نے ایک بار پھر ماتمی جلوسوں پر پابندی کا حکم جاری کیا مگر شیعوں نے پرزور احتجاج کرتے ہوئے حکم مسترد کردیا۔ اس ہنگامہ آرائی نے پھر فرقہ ورانہ لڑائی کی شکل اختیار کرلی اور فریقین کا بھاری جانی ومالی نقصان ہوا۔ شیعوں نے اپنے محلے کرخ کے گرد ایک الگ فصیل تعمیر کرلی تاکہ سنی ان کے علاقے میں داخل نہ ہوسکیں۔

۴۴۲ھ میں شیعہ اور سنی علماء نے فسادات ختم کرنے کی کوشش کی۔ طے ہوا کہ آئندہ کوئی کسی کی جان ومال پر دست درازی نہیں کرے گا۔ شیعوں نے اپنے محلے کرخ میں تمام صحابہ سے رضامندی ظاہر کی اور ان کے لیے دعائے رحمت کا اہتمام کیا اور اہلِ سنت کی مساجد میں نمازیں ادا کیں۔ اہلِ سنت کا ایک بڑا وفد حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی مراقد اور آثار کی زیارت کے لیے گیا۔

---

① البدایة والنهایة: ۱۵/۶۸۹، ۷۰۶

② دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے بعد لقب ''الملک'' اتنا مقبول ہوا کہ اگلی اڑھائی تین صدیوں میں عالم اسلام کے اکثر حکمرانوں اور نوابوں نے ایسے القابات پسند کیے۔ یوں ''دولوں'' کا دور ختم ہوا اور ''ملکوں'' کا زمانہ شروع ہوگیا۔ الملک المظفر، الملک الناصر، الملک الاشرف، الملک العادل، الملک الصالح جیسے ''ملکوں'' کی ایک طویل فہرست ہے جس کے افراد اگلے دور میں جابجا دکھائی دیں گے۔

③ البدایة والنهایة: ۱۵/۶۶۹ تا ۶۸۹، ۷۰۸، ۷۲۰

④ البدایة والنهایة: ۱۵/۷۰۶، ۷۱۰

مگر اگلے سال محرم میں کچھ شرپسندوں نے ایک اشتعال انگیز حرکت کی کہ فسادات پہلے سے کہیں زیادہ شدت سے بھڑک اٹھے۔ انہوں نے بڑے بڑے کتبے نصب کیے جن پر لکھا تھا:

''محمد اور علی ہیں خیر البشر۔ جو اسے مانے، وہ ہے شاکر۔ جو نہ مانے وہ ہے کافر۔''

اس پر اہلِ سنت نے احتجاج کیا تو پھر لڑائی شروع ہوگئی جو دو ماہ تک چلتی رہی اور اس میں فریقین نے ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے میں انتہاء کر دی۔ اگلے سال شیعوں نے پھر اس قسم کے کتبے آویزاں کیے اور دوبارہ فسادات کی آگ بھڑکی۔ طقیطقی نامی ایک شخص ان لڑائیوں میں شیعوں کے خلاف بھرپور حصہ لیتا رہا۔ روافض اس سے بہت ڈرتے تھے۔ [1]

طغرل سلجوقی کی بغداد آمد:

اُدھر طغرل بیگ کو اب سلطان کا لقب مل چکا تھا، اس کی قوت بہت بڑھ چکی تھی۔ ۴۴۶ھ میں وہ آذربائی جان پر قابض ہو کر ایشیائے کوچک سے گزرتا ہوا رومیوں کی سرحدوں تک پہنچ چکا تھا اور بازنطینی روما کو اس کی شمشیر میں ایک بار پھر ہارون الرشید اور معتصم کی کاٹ دکھائی دے رہی تھی۔

اس دوران طغرل بیگ کو بغداد کے پرآشوب حالات کی اطلاعات بھی مسلسل مل رہی تھیں۔ وہاں ترک سردار بساسیری نے اودھم مچا رکھا تھا اور لاقانونیت کی انتہا ہو چکی تھی۔ آخر سلطان طغرل بیگ نے ضروری سمجھا کہ بغداد جا کر امورِ حکومت درست کیے جائیں اور کمزور و بدعقیدہ رافضی بُویہی حکومت کو ختم کر دیا جائے۔ رمضان ۴۴۷ھ میں سلطان طغرل بڑی شان و شوکت کے ساتھ بغداد پہنچا۔ خلیفہ قائم اور امرائے بغداد نے اس کا پرتپاک استقبال کیا۔

طغرل نے بغداد کے انتظامی امور کو درست کیا اور بُویہی حکمران الملک الرحیم کو معزول کر کے دولتِ بنو بُویہ کا خاتمہ کر دیا۔ الملک الرحیم رَےّ کے قلعے میں قید کر دیا گیا جہاں تین سال بعد ۴۵۰ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

بغداد کے امراء نے طغرل سے وفاداری کا عہد کیا اور طغرل نے خلیفہ کو یقین دلایا کہ اس کی تلوار خلافتِ عباسیہ کی خدمت کے لیے وقف رہے گی۔ سلطان طغرل نے دربارِ خلافت سے اظہارِ عقیدت کرتے ہوئے اپنی بھتیجی ارسلان خاتون کا نکاح بھی خلیفہ سے کرا دیا اس طرح خلیفہ اور سلجوقیوں کے باہمی تعلقات مضبوط تر ہو گئے۔ [2]

بساسیری کی سازش..... خلیفہ جلاوطن:

بغداد کے فتنہ پرور ترک امیر بساسیری نے طغرل کی اطاعت قبول نہیں کی تھی بلکہ اس کی آمد پر شہر سے بھاگ گیا تھا۔ وہ متعصب رافضی تھا اور خلافتِ عباسیہ کا استحکام برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ سلطان طغرل کی بغداد سے واپسی کے بعد اس نے ایک بہت بڑی سازش شروع کی جس کا مقصد بغداد سے خلافتِ عباسیہ کا خاتمہ کرنا تھا۔

---

① البدایة والنهایة: ۷۱۷/۱۵، ۷۱۹، ۷۲۱؛ العبر فی خبر من غبر: ۲۷۰/۲ تا ۲۷۸

② البدایة والنهایة: ۷۲۷/۱۵؛ العبر فی خبر من غبر: ۲۹۷/۲

اس نے مصر کے عبیدی حکمرانوں سے رابطہ کر کے اپنے لیے ان کی نیابت کی سند حاصل کی اور ۴۵۰ھ میں پورے عراق میں سلطان طغرل کے خلاف بغاوت کی آگ لگادی۔ ساتھ ہی بغداد میں یہ افواہ اڑادی کہ سلطان طغرل ہمدان میں باغیوں کے محاصرے میں آچکا ہے۔ یہ سنتے ہی بغداد کے تمام سپاہی سلطان طغرل کی کمک کے لیے روانہ ہوگئے۔ شہر محافظ سپاہیوں سے بالکل خالی ہوگیا۔

بساسیری اسی وقت کا منتظر تھا وہ تیزی سے بغداد کی طرف بڑھا۔ اہلِ بغداد اس سے نفرت کرتے اور اس کے مظالم سے خوفزدہ تھے۔ وہ شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ خلیفہ قائم بھی فرار ہونا چاہتا تھا مگر عین وقت پر اس نے ارادہ بدل دیا۔ آخر ۸ ذوالقعدہ ۴۵۰ھ کو بساسیری مسلح شیعوں کے جم غفیر کے ساتھ بغداد آن پہنچا۔ یہ لوگ دولتِ عبیدیہ کے سفید پرچم اٹھائے ہوئے تھے۔ کچھ خدام اس جلوس کے آگے بہت بڑا کتبہ اٹھا کر چل رہے تھے جس پر درج تھا:

"الامام المستنصر باللّٰہ، ابو تمیم، امیر المؤمنین."

بغداد کے شیعوں نے اس جلوس کا بھر پور استقبال کیا اور بساسیری کو اپنے محلے کرخ میں ٹھہرایا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بغداد کے شیعہ زیادہ تر اثنا عشری تھے جبکہ عبیدی امام اسماعیلی تھا۔ شیعوں کے یہ دونوں فرقے ایک دوسرے کو کافر کہتے تھے۔ مگر اہلِ سنت کی دشمنی میں دونوں ایک ہو چکے تھے۔ انہوں نے مل کر بغداد کی سرکاری عمارتوں کو لوٹنا اور تباہ کرنا شروع کیا۔ عدالت پر قبضہ کیا اور دفاتر کی تمام فائلیں اٹھا کر لے گئے۔ اس کے بعد خلیفہ کی معزولی کا اعلان کر کے عبیدی حکمران کے نام کا خطبہ جاری کر دیا گیا اور اسی کے نام کے سکے ڈھالے گئے۔

خلیفہ قائم محل میں محصور اور نہایت سراسیمہ تھا۔ روافض کے ہجوم نے محل کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ بساسیری خلیفہ قائم کو عبرت ناک سزا دینا چاہتا تھا مگر اس دوران خلیفہ نے بساسیری کی فوج کے ایک عرب سردار قریش بن بدران سے رابطہ کرلیا۔ یہ شخص خلیفہ کا ہمدرد تھا مگر اس وقت مصلحتاً بساسیری کے شانہ بشانہ تھا۔ خلیفہ نے اپنے اہل وعیال اور اپنے وفاداروں کے لیے اس سے امان طلب کی اور اس نے اپنی ذمہ داری پر اس کی ضمانت دے دی۔ خلیفہ قصرِ خلافت سے باہر آیا تو ابن بدران اسے اس کے اہل وعیال سمیت اپنے خیمے میں لے گیا۔ بساسیری اس پر بہت بھنایا مگر ابن بدران خلیفہ سے بدعہدی پر تیار نہ ہوا۔ بڑی بحث کے بعد طے یہ پایا کہ خلیفہ کو شہر سے باہر قید کر دیا جائے۔

خلیفہ نے بہت منت سماجت کی کہ اسے اپنے آباؤ اجداد کی اس یادگار میں زندگی کے باقی دن پورے کرنے دیے جائیں مگر بساسیری نہ مانا اور اسے بغداد سے باہر ایک قلعے میں تنہا نظر بند کرادیا۔ اس کے بعد شہر میں روافض کا ہر دن عید اور ہر شب شب برأت تھی۔ قصرِ خلافت کو مکمل طور پر لوٹ لیا گیا، وہاں کوئی پیالہ تک نہ چھوڑا گیا۔ اذانوں میں "حیّ علیٰ خیر العمل" کے الفاظ بڑھا دیے گئے۔ شیعی رسمیں جاری کر دی گئیں۔ بغداد کی سنی اکثریت سے جی بھر کے انتقام لیا گیا۔ کتنے ہی لوگ دجلہ میں ڈبو دیے گئے اور کتنوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا۔

خلیفہ کے وزیر ابوالقاسم بن مسلمہ رحمہ اللہ جو "رئیس الرؤساء" کہلاتے تھے، اپنے دور کے بڑے عالم، محدث اور متقی

انسان تھے۔ خلیفہ نے ان کے لیے بھی امان منظور کرائی تھی مگر بساسیری نے خلیفہ کو نظر بند کرانے کے بعد ابوالقاسم ابن مسلمہ رحمۃ اللہ کے ساتھ نہایت لرزہ خیز سلوک کیا۔ انہیں اونٹ پر بٹھا کر بغداد میں اس طرح گھمایا گیا کہ ایک سپاہی انہیں چمڑے کے ٹکڑے سے طمانچے مارتا جاتا تھا۔ کرخ کے شیعہ ان پر تھوکتے رہے، ان پر پھٹے پرانے جوتے برساتے اور انہیں لعنتیں دیتے رہے۔ پھر انہیں سینگوں سمیت بیل کی کھال پہنائی گئی۔ آخر میں ان کے جبڑوں میں لوہے کی کنڈیاں ڈال کر صلیب پر لٹکا دیا گیا۔ دن بھر وہ تڑپتے رہے اور آخر شام کو یہ کہتے ہوئے خالقِ حقیقی سے جا ملے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانِیْ سَعِیْدًا وَ اَمَاتَنِیْ شَهِیْدًا."

(اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے خوش بخت زندہ رکھا اور شہادت کی موت نصیب فرمائی۔)[1]

سلطان طغرل کے ہاتھوں خلافت کی بحالی:

ایک سال تک بغداد میں رفض کا وہ دور دورہ رہا کہ اہلِ سنت گزشتہ ایام کی تلخیاں بھول گئے۔ اس دوران سلطان طغرل بغاوت کے ان شعلوں کو ٹھنڈا کرنے میں مصروف تھا جو بساسیری نے بھڑکائے تھے اور جن کی وجہ سے خود طغرل کا بھائی اس کے خلاف کھڑا ہو گیا تھا۔ دونوں بھائیوں میں کئی ماہ تک معرکے جاری رہے۔ اہلِ بغداد بڑی بے تابی سے سلطان طغرل کی فتح کی دعائیں کر رہے تھے۔ ان کی امیدیں اب اسی سے وابستہ تھیں۔ آخر کار سلطان کی فتح کی خبر آن پہنچی۔ بغداد میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مگر روافض کے خوف سے کوئی اس کا اظہار بھی نہ کر سکا۔

سلطان طغرل کی پوری توجہ اب بغداد کی طرف تھی مگر سب سے زیادہ ضروری خلیفہ کی جان بچانا تھا جو بساسیری کے ایک امیر مہارش بن مجلی کے ہاں انبار کے نواح میں نظر بند تھا۔ طغرل نے بساسیری کے حامیوں کو نفسیاتی طور پر دباتے ہوئے پہلے ایک دھمکی آمیز خط لکھا، انہیں روافض کا ساتھ دینے پر سخت ملامت کی اور مطالبہ کیا کہ خلیفہ کو واپس بغداد میں اس کے منصب پر بحال کیا جائے ورنہ سلجوقی لشکر کو بغداد کا رخ کرنا پڑے گا۔

بساسیری کے ساتھی قریش بن بدران نے یہ خط پڑھ کر حالات کا اندازہ لگا لیا اور بساسیری کو سمجھایا کہ طغرل سے جنگ مول لینے کا مطلب موت کے سوا کچھ نہیں۔ مگر بساسیری جنگ پر اڑ گیا۔ وہ اپنے حامیوں کے ساتھ بغداد سے نکلا تو روافض کی بڑی تعداد فتح کا یقین کر کے ساتھ ہو گئی۔ بساسیری واسط پہنچ کر جنگ کی تیاریاں کرنے لگا۔

اس دوران خلیفہ کو "قلعہ عکبرا" میں منتقل کر دیا گیا تھا جو بغداد سے ۲۱ میل دور تھا۔ سلطان طغرل نے اپنے دربار کے معزز ارکان کو سفیر بنا کر وہاں روانہ کر دیا۔ قلعے کے نگران امراء ہوا کا رخ دیکھ کر پہلے ہی خلیفہ کے نیاز مند بن چکے تھے، انہوں نے کوئی روک ٹوک نہ کی اور سلطان کے سفیروں نے خلیفہ کو گراں قدر تحائف پیش کر کے اس کی آزادانہ حیثیت کی بحالی کا اعلان کر دیا۔

اس دوران سلطان طغرل خود بغداد آ چکا تھا۔ اس نے یہاں کے انتظامی امور درست کر کے خلیفہ کی خدمت میں

---

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۱۵/۷۵۷ تا ۷۵۹

حاضری دی اور اپنی مجبوریاں بتاتے ہوئے اتنی مدت بغداد سے دور رہنے پر معذرت کی۔ ۲۵ ذی قعدہ کو خلیفہ القائم ایک شاندار جلوس میں سلطان طغرل کے ہمراہ بغداد پہنچا اور دوبارہ مسندِ خلافت پر براجمان ہوا۔

کچھ دنوں بعد طغرل افواج لے کر بساسیری کو سبق سکھانے کے لیے نکلا۔ اس نے ایک فوج کو نہ بھیج کر حریف کے لیے شام اور مصر کی طرف راہِ فرار مسدود کر دی۔ دوسری فوج لے کر وہ واسط پہنچا۔ بساسیری نے کھلے میدان میں مقابلہ کیا مگر اسے شکستِ فاش ہوئی۔ بغداد سے اس کے ساتھ نکل کر فتح کے سہانے سپنے دیکھنے والے رافضی بڑی تعداد میں مارے گئے، اکثریت فرار ہوگئی، بساسیری ایک غلام کے ہاتھوں قتل ہوا اور اس کا سر کاٹ کر بغداد میں قصرِ خلافت کے سامنے نصب کر دیا گیا۔ یوں ایک طویل مدت بعد عباسی خلفاء بدعقیدہ امراء کے تسلط سے آزاد ہوئے۔

یہ تو ظاہر ہے ایوانِ خلافت کو اب ہارون الرشید اور معتصم باللہ کے دور جیسی آن بان نصیب نہیں ہو سکتی تھی مگر یہ بھی غنیمت تھا کہ دربارِ خلافت کو سچے محافظ مل گئے تھے جو اس کی عزت و توقیر قائم رکھنے کو اپنا اہم ترین ہدف سمجھتے تھے۔

خلیفہ القائم مزید نو سال زندہ رہا۔ اب سلجوقی سلاطین اس کے خادم تھے اور ہر طرف بنوعباس کا خطبہ اور سکہ چل رہا تھا۔ القائم زوال کی انتہاء دیکھنے کے بعد یہ عزت و توقیر ملنے پر بارگاہِ الٰہی میں سراپا شکر بن گیا۔ اس نے تمام دشمنوں کو معاف کر دیا اور زیادہ وقت مصلے پر عبادت میں گزارنے لگا۔ تھک جاتا تو وہیں پڑ کر سو جاتا۔ ۱۷ سال بعد شعبان ۴۶۷ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔[1]

◆◆◆

---

[1] البدایة والنهایة: ۱۵/۵٦۵ تا ۵۷۲

بنو بُوَیہ کا دور ایک نظر میں

بنو بُوَیہ لگ بھگ ڈیڑھ صدی تک عراق وفارس پر حکمران رہے، اس دوران ۱۱۶ سال تک بغداد بھی ان کا محکوم رہا۔ مجموعی طور پر بنو بُوَیہ کا دور عالم اسلام کے لیے ایک سخت ابتلاء اور آزمائش تھا۔

یہ حکومت اس انتقامی جذبے کو تسکین دینے کا مظہر تھی جو مجوسی اذہان میں گزشتہ تین صدیوں سے پنپ رہا تھا۔ اس خاندان نے مسلمانوں کے مرکزِ وحدت کو ایک سازش کے تحت غلام بے دست و پا بنا کر پورے عالم اسلام میں انتشار و افتراق کو ہوا دی۔

اس دور میں عالم اسلام کی بقا مسلسل خطرے میں رہی۔ رومی اسلامی سرحدوں کو روندتے رہے اور مسلمانوں کی عزت وناموس کی آئے دن دھجیاں اڑائی جاتی رہیں۔ مگر عجمی شراب میں مست بُوَیہی اس سے بالکل بے فکر تھے۔ وہ اہلِ سنت کو ستانے، ان کے شعائر کی توہین کرنے اور فرقہ ورانہ فسادات کو شہ دینے میں مصروف رہتے تھے۔ انہوں نے اس ڈیڑھ صدی میں قدیم تشیع کی جگہ رافضیت کو لانے اور اسی کو شیعیت اور حقیقی اسلام کے طور پر متعارف کرانے کی پوری کوشش کی۔ محرم کی رسومات سمیت ایسی ایسی بدعات رائج کیں جو آج تک مسلمانوں میں فتنہ وفساد کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ ان کے نزدیک حکمرانی کا اصل مقصد یہی تھا کہ عربوں کے اسلام کو مٹا کر من پسند اسلام کو رواج دیا جائے۔

بنو بُوَیہ اور ساداتِ کرام کا مسلک:

بنو عباس کے دورِ عروج میں خروج کرنے والے کئی صحیح النسب سادات کے حالات ہم پڑھ چکے ہیں اور یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ان کا خلفاء سے اختلاف مذہبی نہیں سیاسی تھا۔ ان کی بڑی تعداد ایک معروف گھرانے سے تعلق رکھتی تھی یعنی محمد نفس زکیہ کا خانوادہ۔ ان کے بعد انہی کے کچھ بھائی اور ہمدرد خروج کرتے رہے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر کامیابی سے کوسوں دور رہے۔ صرف ایک فرد ادریس بن عبداللہ نے مراکش میں حکومت ''دولتِ ادارسہ'' قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ یہ ثابت ہے کہ وہ اور ان کے جانشین اہلِ سنت کے عقائد پر کاربند تھے۔ باقی حضرات میں سے بہت سوں نے خلفائے بنو عباس کی اطاعت قبول کرلی اور ان کے ہاں معزز رکن کے طور پر رہے۔ حضرت موسیٰ کاظم اور حضرت علی رضا رحمہما اللہ تو بنو عباس کے سرکردہ ارکانِ دولت میں شمار ہوتے رہے۔ یہ بات بھی طے ہے کہ جب تک یہ معروف سادات موجود تھے، تشیع اپنی حدود و قیود میں تھا۔ ان کی وفات کے بعد ہی تشیع سے یکدم مختلف شاخیں پھوٹیں اور ہر شاخ نے ایک الگ مذہب کی شکل اختیار کرلی۔

ہم پڑھ چکے ہیں کہ مامون الرشید پر تشیع کے اثرات شروع سے تھے مگر جب تک حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کے پوتے علی رضا رحمہ اللہ اس کے ساتھ رہے، وہ بھی تشیع میں اعتدال پر رہا۔ مگر ان کی وفات کے دس سال بعد وہ اس حد تک پہنچ گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما پر بھی فضیلت دینے لگا۔ اگر حضرت علی رضا رحمہ اللہ زندہ ہوتے تو یقیناً مامون کو تنبیہ کر کے اس غلط عقیدے سے باز رکھتے۔ یہ اصل سادات تھے جن کا تشیع اسلام سے متصادم نہیں تھا۔

ہم یہاں ایک بار پھر اس بات کو دہراتے ہیں کہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کا کام یہود اور منافقینِ مدینہ نے شروع کیا تھا۔ پھر یہودی گماشتے عبداللہ بن سبا نے اصل اسلام کی جگہ ایک متبادل مذہب لانے کی پوری کوشش کی۔ یہ درست ہے کہ اہلِ کوفہ میں تشیع حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت میں مبالغے سے شروع ہوا تھا اور دورِ یزید میں سادات پر ٹوٹنے والے مصائب نے مسلمانوں میں سادات کے لیے ہمدردانہ جذبات پیدا کر کے انہیں تشیع کی طرف مزید مائل کر دیا تھا اور اس طرح شیعانِ علی کی ایک مستقل جماعت پیدا ہوگئی تھی جس کے اکثر ارکان اموی حکومت سے بددل تھے۔ مگر ان اعتدال پسند اہلِ تشیع کا جمہور علماء سے اختلاف کوئی اتنا بڑا نہیں تھا۔ معاشرے میں سب شیر وشکر تھے۔ ان کے علماء میں باہم استادی شاگردی کا تعلق برابر قائم تھا جیسا کہ امام بخاری، امام مسلم، امام نسائی، امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ رحمہم اللہ کے متعدد شیوخ شیعی تھے۔ شیعی اکابر اور بعض سادات کا اگر حکومت سے کوئی اختلاف تھا تو وہ بھی ایک سیاسی کش مکش تھی نہ کہ عقیدے کی۔ چونکہ خروج کی کوششیں کرنے والے سادات کا موقف شرعاً مضبوط نہیں تھا؛ اس لیے ان کی کوششیں جمہور کے نزدیک زیادہ قابلِ التفات نہ ہوئیں، اور اسی وجہ سے ایسے خروج عموماً کسی طویل خانہ جنگی یا کسی حکومت سازی میں کامیابی کا باعث نہیں بن سکے۔

مگر ابن سبا کی سوچ سے متاثر تشدد پسند لوگ ڈیڑھ صدی تک شیعانِ علی کو ورغلاتے اور انتہا پسندی کی طرف مائل کرتے رہے۔ ابن سبا کا پیش کردہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وصی رسول ہونے کا نظریہ تیسری صدی ہجری میں شیعہ مذہب کا بنیادی رکن عقیدۂ امامت بن چکا تھا؛ اس لیے روافض کو ہر وقت کسی امام کی تلاش رہتی تھی۔ اس تلاش وجستجو میں ان کا اختلاف بھی ہوتا رہتا تھا اور بیک وقت روافض کی مختلف ٹولیاں آلِ علی رضی اللہ عنہ کے الگ الگ بزرگوں کو 'امام' مانتی رہتی تھیں۔

بنوعباس کے دورِ عروج میں تحریکاتِ رفض کیوں کامیاب نہ ہوئیں؟

تمام تر کوششوں کے باوجود معتصم اور متوکل جیسے باعظمت خلفاء کے دور تک رافضیت کو نہ تو عام مسلمانوں میں پذیرائی ملی نہ ہی اعتدال پسند اہلِ تشیع میں۔ اس کی دو بڑی وجوہ تھیں:

① خلافتِ اسلامیہ مضبوط تھی۔ مسلم ممالک ایک لڑی میں بندھے ہوئے تھے؛ اس لیے رفض کی اشاعت کا کام کھلم کھلا نہیں ہوسکتا تھا۔ رفض کی بھرپور اشاعت اسی جگہ ہوسکتی تھی جہاں حکومتی انتظامات معطل یا کمزور ہوں۔

② خود مشہور ومعروف اکابرِ سادات اس وقت موجود تھے، ان میں سے چوٹی کے بزرگ بنوعباس کی حمایت اور

روافض کے عقائد سے برأت ظاہر کرتے رہتے تھے؛ اس لیے خود شیعہ عوام کو بھی روافض کے عقائد و نظریات کی طرف زیادہ التفات نہیں تھا۔

ائمہ سادات کی رفض سے بے زاری:

ہم بتا چکے ہیں کہ حضرت علی رضا رحمہ اللہ (جنہیں شیعہ اثناعشریہ اپنا آٹھواں امام مانتے ہیں) مامون الرشید کے ولی عہد اور داماد تھے۔ انہوں نے کبھی امامت کا دعویٰ نہیں کیا حالانکہ اس دور میں کتنے ہی علویوں نے خروج کیا تھا۔

اسی طرح ان کے بیٹے محمد بن علی رحمہ اللہ (عرف محمد تقی ۱۹۵ھ۔۲۲۰ھ) جنہیں اثناعشریہ اپنا نواں امام مانتے ہیں، وہ بھی مامون الرشید کے داماد تھے۔ وہ معتصم کے عہد میں اپنی وفات تک خلافت کے وفادار رہے اور کبھی امامت کا دعویٰ نہیں کیا۔ ان کی وفات کے وقت ان کے صاحبزادے علی بن محمد رحمہ اللہ (ابوالحسن عرف علی الہادی ۲۱۲ھ۔۲۵۴ھ) آٹھ سال کے تھے۔ اثناعشریہ انہیں دسواں امام کہتے ہیں۔ وہ خلیفہ متوکل کے حکم سے سامرا میں جا کر مقیم ہوئے اور وفات تک وہیں رہے۔ نہایت عابد و زاہد اور سیاست سے کنارہ کش ہستی تھے۔ یہ غلط طور پر مشہور ہے کہ خلفاء نے انہیں قید کیا تھا۔ وہ اپنی زاہدانہ طبیعت کی وجہ سے سامرا میں از خود گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے رہے۔ ہاں اگر خلفاء نے ان پر نگاہ رکھی تو سیاستِ ملکی کے لحاظ سے یہ غلط نہ تھا؛ کیوں کہ اس دور میں ہر طرف علوی خروج کر رہے تھے؛ اس لیے کسی خلیفہ کو ان کے بارے میں شبہ ہو جانا کوئی عجیب بات نہ تھی۔ ایک بار متوکل نے ایسی کسی شکایت سے متاثر ہو کر علی الہادی کو اپنے پاس بلوایا تھا مگر پھر ان کی بے نفسی دیکھ کر شرمندہ ہوا، اور ان کی نصیحتیں سن کر زار و قطار روتا رہا۔ ان کے اعزاز و اکرام میں اضافہ کر دیا۔ پھر آخر تک خلفاء کا ان سے یہی سلوک رہا۔ یہ علی الہادی رحمہ اللہ بھی کبھی امامت کے مدعی نہیں رہے۔ ان کی وفات خلیفہ معتز کے زمانے میں ہوئی۔[1]

ان کے بیٹے حسن بن علی رحمہ اللہ (عرف حسن عسکری اثناعشریہ کے گیارہویں امام: ۲۳۲ھ۔۲۶۰ھ) نے چھ خلفاء: متوکل، منتصر، مستعین، معتز، مہتدی اور معتمد کا زمانہ پایا مگر کبھی امامت کا دعویٰ کیا نہ خروج کیا۔[2] اگر امامت دینی عقائد وارکان میں سے کوئی چیز ہوتی تو یہ حضرات نہ صرف اس کا اظہار کرتے بلکہ اس کے لیے خاطر خواہ جدوجہد کرتے۔

حسن عسکری رحمہ اللہ کی کوئی اولاد نہیں تھی مگر مشہور کر دیا گیا کہ ان کا ایک بیٹا محمد تھا جو ۱۵ شعبان ۲۵۵ھ کو پیدا ہوا تھا اور ۲۶۵ھ میں جب کہ اس کی عمر ۹ یا ۱۰ سال تھی، وہ اپنے آبائی گھر کی ایک سرنگ میں گھس کر لاپتا ہو گیا۔ اسی محمد بن حسن کو شیعہ اثناعشریہ اپنا بارہواں امام مانتے ہیں، اسے مہدی، صاحب الزمان، امام غائب اور امام منتظر کہتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ زندہ مگر نگاہوں سے غائب اور غار میں پوشیدہ ہے، قیامت کے قریب ظاہر ہو کر پوری دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے گا۔[3]

---

[1] البدایة والنهایة: ۱۴/۵۰۲، ۵۰۳

[2] وفیات الاعیان: ۲/۹۴؛ مروج الذهب: ۵/۱۰۷، ۱۰۸

[3] سیر اعلام النبلاء: ۱۳/۱۱۹، ۱۲۰؛ الاعلام زر کلی: ۶/۸۰

بنو بُویہ اور اثنا عشریت:

بہر کیف ان اکابر سادات کے دنیا سے گزر جانے کے پچاس ساٹھ سال بعد جب خلافت انتہائی کمزور پڑ چکی تھی اور ہر طرف الگ الگ چھوٹی چھوٹی حکومتیں بننے سے باطل فرقوں کے لیے اپنے عقائد کی کاشت آسان ہو چکی تھی تو ایسے میں تشیع کے بطن سے رافضیت کی نت نئی شاخوں نے جنم لیا۔

''اثنا عشریہ'' فرقہ شیعوں کے لگ بھگ ستر فرقوں میں سے ایک تھا جو عقائد کے اعتبار سے ان مقاصد کے لیے بہت موزوں تھا جو بنو بُویہ کے پیش نظر تھے۔ اس وقت تک اس فرقے کے ماننے والے چند ہزار سے زیادہ نہیں تھے۔ مگر بلاشبہ اسلام پر ضربِ کاری لگانے کی سب سے زیادہ صلاحیت اسی میں تھی؛ کیوں کہ اللہ، رسول اور آخرت کے تصور اور کعبہ و حج کی تعظیم جیسی چند باتوں کے سوا اس کی تعلیمات اکثر مقامات پر اس دین سے ٹکراتی تھیں جو گزشتہ تین صدیوں سے متواتر چلا آرہا تھا۔

اثنا عشریہ کی ''صحاحِ اربعہ'':

ہم دیکھتے ہیں کہ جس زمانے میں بنو بُویہ، دیلم کے کوہستان میں مستقبل کی عرب مخالف حکومت کی تشکیل کے لیے جدوجہد کر رہے تھے، انہی دنوں ایک شیعہ عالم حسن بن موسیٰ نوبختی (م ۳۱۰ھ) نے ''کتاب الامامۃ'' اور ''فرق الشیعہ'' جیسی کتب لکھ کر اثنا عشریہ مذہب کے حق میں دلائل پیش کیے۔ ①

اسی زمانے میں رے کی بستی کلین سے تعلق رکھنے والا ایک رافضی مصنف ابو جعفر کلینی (م ۳۲۹ھ) بغداد میں ''الکافی فی علوم الدین'' (اصولِ کافی) کے نام سے ائمہ سادات کی طرف منسوب ان روایات کو جمع کر رہا تھا جو اس نے مختلف شیعہ و رافضی راویوں سے سنی تھیں۔ ②

یہ کتاب تین انواع پر مشتمل ہے: پہلی نوع اصول کہلاتی ہے جس میں عقائد سے متعلقہ روایات ہیں۔

دوسری نوع فروع کہلاتی ہے جس میں احکام کی روایات ہیں۔

تیسری ''الروضہ'' کہلاتی ہے جس میں خطبات، مکاتیب اور آداب پر مشتمل روایات پیش کی گئی ہیں۔ ③

اس کاوش کے باعث کلینی کو روافض کے ہاں اثنا عشری مذہب کے مدوِّنِ اوّل کا رتبہ مل گیا۔ انہی روافض میں بنو بُویہ بھی تھے جنہیں ''الکافی'' عقائد و نظریات کے اعتبار سے اپنے مقاصد کے لیے موزوں تر لگی۔

بنو بُویہ کی حکومت مستحکم ہو جانے کے بعد ابن بابُویہ قمی (۳۰۶ھ۔۳۸۱ھ) نے ''مَنْ لَا یَحْضُرُہُ الْفَقِیْہُ'' کے نام سے ایک فقہی مجموعہ تیار کیا۔ ابن بابُویہ کا تعلق بھی رے سے تھا۔ خراسان میں اس نے بہت شہرت پائی۔ اس کی

---

① الاعلام زرکلی: ۲/۲۲۴
② الاعلام زرکلی: ۷/۱۴۵
③ الشیعۃ والتشیع لاحسان الٰہی ظہیر، ص ۳۲۵، ۳۲۶

دیگر تصانیف کی تعداد تین سو تک بتائی جاتی ہے۔[1]

ابو جعفر الطوسی (۳۸۵ھ۔۴۶۰ھ) نے خراسان سے بغداد آکر چالیس سال کام کیا، پھر نجف منتقل ہو گیا۔اس نے "تہذیب الاحکام" اور "الاستبصار" لکھیں۔اس کے علاوہ بھی درجنوں کتابیں تصنیف کیں۔[2]

اثناعشریہ کی صحاحِ اربعہ میں روایات کی تعداد:

"الکافی" میں روایات کی تعداد "۱۶۱۹۹" ہے۔

"من لا یحضرہ الفقیہ" میں "۶۵۹۳" روایات ہیں۔

"تہذیب الاحکام" میں "۱۳۵۹۰" روایات ہیں۔

"الاستبصار" میں "۶۵۳۱" روایات ہیں۔

اثناعشریوں نے ان چاروں کتب کو "صحاحِ اربعہ" کے نام سے موسوم کیا۔یوں انہوں نے حدیث کے مستند ترین ذخیرے "صحاحِ ستہ" کو کالعدم قرار دے دیا۔[3]

اثناعشریوں کی "صحاحِ اربعہ" کی بہت سی روایات اسلامی عقائد اور قرآن وسنت کی واضح نصوص سے اس قدر متصادم ہیں کہ اللہ اور رسول کی باتوں پر یقین رکھنے والا کوئی شخص ان روایات کو اسلام کے خلاف ایک سازش کے سوا کوئی اور نام نہیں دے سکتا۔جو لوگ اکابر سادات کی سیرت سے واقف ہیں وہ ہرگز باور نہیں کر سکتے کہ ایسے کفریہ، شرکیہ اور وہمی خیالات ان ہستیوں کے ہو سکتے ہیں۔نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کتنی روایات مؤلفین نے خود وضع کیں اور کتنی روایات دوسروں سے نقل کیں، تاہم یہ طے ہے کہ ایسی اکثر روایات اہلِ سنت کے اسماء الرجال کی روشنی میں کذاب، متعصب یا مجہول راویوں کے حوالے سے منقول ہیں۔اگرچہ ان مؤلفین کے یہودی ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا مگر بہت سی روایات پر یہودی عقائد ونظریات کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہودیوں نے اسلام کا روپ دھار کر انہیں شیعہ حلقے میں عام کیا ہے۔[4]

یہاں یہ یاد رہے کہ اس دور میں کئی معروف سادات کرام موجود تھے مگر بنوبُویہ نے کبھی انہیں آگے نہیں آنے دیا۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دَیلم کا علاقہ جہاں بنوبُویہ کی نشوونما ہوئی تھی، زیدی شیعہ مبلغین کا گڑھ تھا جو عقائد ونظریات میں اہلِ سنت سے بہت دور نہ تھے۔اثناعشری وہاں بہت کم تھے مگر چونکہ سادات کرام کو ساتھ لینا، ان کے مسلک ومشرب کو اپنانا اور زیدی عقائد کی تشہیر کرنا بنوبُویہ کے سیاسی مقاصد کے کچھ کام نہیں آسکتا تھا؛ اس لیے انہوں نے اثناعشری مذہب اختیار کیا جو ان کے سیاسی اہداف کے لیے بہت معاون تھا۔

---

① الاعلام زر کلی: ۲۷٤/٦

② الاعلام زر کلی: ۸٤/٦

③ الشیعة والتشیع لاحسان الٰهی ظهیر، ص ۳۲۵، ۳۲٦

④ الشیعة والتشیع لاحسان الٰهی ظهیر، ص ۷۲، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۸۲، ۳۸٤،

اثنا عشری عقائد اور بنوبُویہ کے سیاسی مقاصد:

کلینی کی اصولِ کافی سے وجود میں آنے والا اثنا عشری مذہب بنوبُویہ کے اقتدار کے لیے کس طرح موزوں تر تھا؟ اس کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

اثنا عشری عقیدے کے مطابق منصبِ امامت فقط بارہ افراد کو ملا ہے: ان میں پہلے امام حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ دوسرے حضرت حسن رضی اللہ عنہ، تیسرے حضرت حسین رضی اللہ عنہ، چوتھے حضرت زین العابدین رحمہ اللہ، پانچویں حضرت محمد باقر رحمہ اللہ، چھٹے حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ، ساتویں حضرت موسیٰ کاظم رحمہ اللہ، آٹھویں علی رضا رحمہ اللہ، نویں حضرت محمد تقی رحمہ اللہ، دسویں حضرت علی الہادی رحمہ اللہ، گیارہویں حسن عسکری رحمہ اللہ (م ۲۶۰ھ)، بارہویں اور آخری امام ان کے بیٹے محمد مہدی ہیں جو زندہ مگر غائب ہیں اور قربِ قیامت میں ظاہر ہوں گے۔[1]

چونکہ امامِ غائب کے ہوتے ہوئے کسی سید یا علوی کو اقتدار سونپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا؛ اس لیے حکومت کی باگ ڈور بنوبُویہ کے ہاتھ سے نہیں نکل سکتی تھی۔ گویا بنوبُویہ کا اقتدار امامِ غائب کے مفروضے کے گرد گھوم رہا تھا۔

اثنا عشری عقائد کا فلسفہ:

اثنا عشریہ کے بعض دیگر عقائد بھی پست طبع لوگوں کے لیے پرکشش اور بُویہیوں کی سیاست کے لیے کارآمد تھے۔

❶ مثلاً اثنا عشریہ کا عقیدہ تھا کہ امام کی امامت ماننے والوں کو مرنے کے بعد کوئی عذاب نہیں ہوگا۔ کسی صغیرہ و کبیرہ گناہ کی ان سے پوچھ نہیں ہوگی۔ بلکہ اماموں کی محبت اور اطاعت ان کی نجات کے لیے کافی ہے۔ اور جو امام کو نہیں مانتے وہ کافر ہیں۔ ان کے سارے اعمال برباد ہوں گے۔ ان کی نیکیاں کچھ کام نہیں آئیں گی۔"[2]

بنوبُویہ کے لیے یہ عقیدہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے گرد جمع کر کے سیاست چمکانے کا نسخہ تھا۔ نفس کے بندوں اور فسق و فجور کے عادی لوگوں کو جو علماء اور صالحین سے دور بھاگتے تھے، اپنے گرد جمع کرنے کا اس سے بہتر حربہ اور کیا ہوسکتا تھا کہ بس اپنی جماعت میں شمولیت اور امام کے نام کا نعرہ لگانے پر انہیں جنت کی سند دے دی جائے۔

درحقیقت یہ عقیدہ یہودیوں کا تھا جو کہتے تھے کہ اسرائیلی جو کچھ بھی کرلیں، یقیناً بخشے جائیں گے۔ اور دیگر اقوام نیک اعمال کر کے بھی جہنمی ہوں گی۔[3]

---

[1] تحفہ اثنا عشریہ، ص ۵۳ یہ بارہواں امام محض ایک فرضی شخصیت ہے؛ کیوں کہ حسن عسکری کی کوئی اولاد نہ تھی۔ (منہاج السنۃ: ۱/۱۲۲؛ ۴/۸۷)
بارہ اماموں کے اس عقیدے کا وزن معلوم کرنے کے لیے اتنا دیکھ لینا کافی ہے کہ خود شیعوں کے ستر کے لگ بھگ فرقوں میں سے اثنا عشریہ کے سوا کوئی بھی اس عقیدے کا قائل نہیں۔ اگر اس بات میں ذرا بھی وزن ہوتا تو زیادہ نہ سہی، دو چار شیعہ فرقے اس پر متفق ہو جاتے۔ جس وقت ان عقائد کا ظہور ہوا، اس وقت ان میں سے کوئی امام دنیا میں موجود نہیں تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے گزرنے کے بعد ہی یہ پرفریب عقیدہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پھیلایا گیا تاکہ صحیح النسب اور معروف اکابرِ سادات سے رہنمائی لینے کا سوال ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ بنوبُویہ سے لے کر آج تک جب بھی دنیا کے کسی خطے میں شیعہ سیاست والوں نے حکومت بنائی ہے انہوں نے لوگوں کو امامِ غائب کی طرف متوجہ کر کے ایسے صحیح النسب سادات کی اتباع سے دور رکھا ہے۔

[2] بحار الانوار مجلسی: ۲۷/۲۱۸، ۲۳۴، ۲۹/۳۳

[3] تفسیر ابن کثیر، تحت سورۃ البقرہ، آیت: ۸۰

❷ ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ ''تقیہ'' کرنا یعنی اپنے دین کو چھپانا اور جھوٹ بولنا اماموں کی سنت ہے۔[1]

یہ عقیدہ کئی مقاصد کے لیے گھڑا گیا تھا۔ اول: اس لیے کہ جن لوگوں نے صحیح النسب سادات سے یہ عقائد منقول نہ تھے بلکہ ان کے قول و فعل کو اہلِ سنت کے مطابق دیکھا تھا، انہیں فریب دیا جائے کہ یہ بزرگ سادات باطن میں اثنا عشری شیعہ تھے، ان کا سنی مذہب پر عمل کرنا اور سنی خلفاء سے وفاداری برتنا دراصل ''تقیہ'' تھا۔

تقیہ کا عقیدہ گھڑنے کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ اثنا عشریہ کے بعض عقائد جمہور علماء کی نظر میں کفرِ صریح تھے؛ اس لیے جس معاشرے میں اسلامی قانون نافذ ہوتا وہاں ان عقائد کے اظہار پر ارتداد کی سزا نافذ ہونے کا خطرہ موجود تھا؛ اس لیے پوچھ گچھ کے موقعے پر تقیہ کر کے اپنے عقیدے کو چھپایا اور سزا سے بچا جا سکتا تھا۔

نیز اس طرح اہلِ سنت کے معاشرے میں رہتے ہوئے، انہیں دھوکہ دینا، ان سے فریب کرنا اور انہیں نقصان پہنچانا آسان ہو جاتا تھا اور دروغ گوئی کے ردِعمل میں ابھرنے والی ضمیر کی فطری ملامت سے بھی پناہ مل جاتی تھی۔

❸ یہ عقیدہ بھی تھا کہ متعہ یعنی ایسا عارضی جنسی تعلق جو نکاح کی شرائط سے آزاد ہو، جائز بلکہ بہت بڑی عبادت ہے۔[2] پست فطرت لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے کا اس سے بہترین ذریعہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

❹ یہ عقیدہ بھی تھا کہ عام مسلمانوں کا خون حلال اور ان کا مال لوٹنا جائز ہے۔[3]

مسلمانوں کی حکومتوں کو تباہ کرنے اور ان کے معاشرے کو فتنہ و فساد اور بدامنی کے ذریعے کمزور تر کر کے ان پر غالب آنے کے لیے یہ عقیدہ بنوبُویہ جیسے شاطر لوگوں کے لیے بہت مفید مطلب تھا۔

چونکہ امام نے ہمیشہ غائب ہی رہنا تھا اور قرنہا قرن تک اس کی عدم موجودگی معتقدین کے لیے خاصی اکتاہٹ کا باعث ہو سکتی تھی؛ اس لیے بنوبُویہ نے اس مذہب میں اور کئی چیزیں شامل کرا دیں مثلاً: شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ کے واقعے میں نت نئے اضافے کرا کے انہیں ایمان کا حصہ بنا لیا۔ محرم کے ماتمی جلوس، ۱۸ ذوالحجہ کی عید غدیر اور امام غائب کی یاد میں نصف شعبان کی آتش بازی جیسے تہوار شروع کرا دیے۔[4]

حقیقت یہ ہے کہ اثنا عشریہ عقائد اسلام سے اتنے متصادم تھے کہ کتبِ رجال میں مذکور کوئی سچا راوی، کوئی معروف سید، کوئی فقیہ، کوئی محدث یا کوئی بزرگ ایسا نہیں ملے گا کہ جو ان عقائد کا قائل ہو۔ قائل ہونا تو دور کی بات ہے، کوئی ایک ثقہ شخص بھی ایسا نہیں جس پر ان عقائد میں مبتلا ہونے کا الزام لگایا گیا ہو۔

بنوبُویہ نے سادات کو اقتدار کیوں نہ دیا؟

بنوبُویہ خود تو سادات ہونے کا دعویٰ کر نہیں سکتے تھے؛ کیوں کہ ان کا دیلمی عجمی ہونا ظاہر تھا۔ مگر اقتدار کے ان عاشقوں کو

---

① علل الشرائع: ابن بابویہ: ۶۰۱/۲؛ الدر المنضود: سید کلپیکانی: ۲۵۳/۲؛ وسائل الشیعۃ الحر عاملی: ۲۹۴/۹

② البدایۃ والنھایۃ: سنۃ ۳۵۲ھ ③ الکافی: باب التقیہ ۲۱۷/۲

کہتے ہیں ایک جھوٹ چھپانے کے لیے سو جھوٹ بولنا پڑتے ہیں۔ مگر ان لوگوں نے بے شمار جھوٹ چھپانے کے لیے جھوٹ بولنے کو عبادت قرار دے دیا۔

④ الکافی کلینی: ۵/۵۴۰، من لا یحضرہ الفقیہ: ۳/۴۶۱

سادات کے عشق کا دعویٰ کر کے بھی کسی طرح یہ گوارا نہیں ہو سکتا تھا کہ سربراہِ حکومت علوی ہو۔ حالانکہ اہلِ تشیع کے تمام زنوں کے نزدیک حکومت علویوں ہی کا حق ہے۔ اب جبکہ تین صدیوں کے انتظار کے بعد خود کو عاشقانِ اہلِ بیت کہلانے والے بُویہی بادشاہ گر بن چکے تھے تو انہیں سادات کو حکومت سونپنے میں کیا رُکاوٹ تھی؟

ہماری گزشتہ معروضات پر غور کریں تو صاف سمجھ آ جائے گا کہ اس کی وجہ یہی تھی کہ بنوبُویہ جس اسلام کو متعارف کرا کے مسلمانوں کو دین وایمان سے محروم کرنا چاہتے تھے، اسے حقیقی ساداتِ کرام کبھی قبول نہیں کر سکتے تھے۔ سادات میں یقیناً بعض حضرات تشیع سے متاثر رہے تھے اور بعض نے روافض کی منافقت اور سادات سے ان کے اظہارِ عقیدت، ان کے بیانِ حمایت اور کھوکھلے وعدوں سے متاثر ہو کر امویوں اور عباسیوں کے خلاف خروج بھی کیا تھا مگر اب جبکہ بنوبُویہ تشیع کی حدود پار کر کے کھلم کھلا رفض اور زندقہ پھیلانے پر تلے تھے، یہ بہت بعید تھا کہ کوئی صحیح النسب عالم فاضل علوی ان کی سرپرستی کرتا۔ سچے سادات تو بنوبُویہ کے دور میں بھی حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ اور ان کے باپ دادا کے مسلک پر تھے۔ مثلاً ابوعبداللہ الحسنی رحمہ اللہ (بن دَوّاد بن علی بن عیسیٰ بن محمد بن قاسم بن حسن بن زید بن علی) چوتھی صدی ہجری کے مشہور سید تھے۔ ان کے متعلق امام حاکم نیشاپوری رحمہ اللہ (صاحبِ مستدرک) کہتے ہیں:

''وہ اپنے دور میں خراسان میں اہلِ بیت کے شیخ تھے۔ اپنے دور کے علویوں کے سردار تھے۔ نماز، صدقہ و خیرات اور صحابہ سے محبت میں سب سے بڑھ کر تھے۔ میں ایک مدت ان کے ساتھ رہا۔ جب بھی ان سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ذکر سنا تو انہوں نے یہ ضرور کہا: ''وہ شہید تھے۔'' پھر زاروقطار رویا کرتے۔ میں نے جب بھی ان سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ سنا تو وہ فرماتے تھے: ''صدیق کی بیٹی صدیقہ! اللہ کے حبیب کی حبیبہ!'' یہ کہہ کر رو پڑتے۔''[1]

اسی طرح محمد بن الحسن بن القاسم علوی رحمہ اللہ نامور سید تھے۔ انہوں نے بنوبُویہ کے دور میں خروج بھی کیا تھا۔ وہ صحابہ میں سے کسی پر اعتراض کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ ان سے حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کے بارے میں پوچھا گیا تو بولے:

''وہ جنتی ہیں؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بشارت دی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت غلط نہیں ہو سکتی۔''

فقہی مسائل میں وہ ائمہ اربعہ کے دائرے سے باہر نہیں جاتے تھے۔ تین طلاق کے مسئلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فتوے پر عمل پیرا تھے اور اسی کو سادات کا مسلک قرار دیتے تھے۔[2]

چونکہ بنوبُویہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ سادات سے ان کا کام نہیں نکل سکتا؛ اس لیے انہوں نے ان حضرات کے دروازے کا رخ کرنا حماقت سمجھا۔ یہی نہیں بلکہ نامی گرامی سادات کو انہوں نے زیادتیوں کا نشانہ بھی بنایا مثلاً محمد بن عمر بن یحییٰ (۳۱۰ھ۔۳۹۰ھ) مشہور حسنی سید تھے۔ اللہ نے انہیں بکثرت مال دولت سے نوازا تھا۔ بُویہی حکمران عضدالدولہ کی رال ٹپک پڑی اور اس نے انہیں قید کر کے ان کی ساری دولت ضبط کر لی۔[3]

[1] البدایۃ والنہایۃ: سنۃ وفیات ۳۵۵ ہجری [2] سیر اعلام النبلاء: ۱۱۵/۱۶، ۱۱۶ [3] العبر فی خبر من غبر: ۱۷۹/۲

قارئین کے ذہن میں یہ سوال آسکتا ہے کہ آخر بنوبُویہ نے اپنی حمایت کے لیے کسی جعلی شخص کو سید بنا کر کیوں نہ پیش کر دیا جو ان جیسے عقائد کا اظہار کرتا؟ اس کی دو وجوہ تھیں: ایک یہ کہ اس دور تک جلیل القدر سادات کرام موجود تھے، ان کی موجودگی میں یقیناً یہ سوال اٹھتا کہ ایک غیر معروف سید کو جسے دنیا پہلے نہیں جانتی تھی، سربراہِ حکومت کیوں بنا دیا گیا؟ اسی لیے بُویہی حکام نے امام غائب کا قائل ہو کر زندہ سادات کی اتباع اور سرپرستی سے آزاد رہنا پسند کیا۔

دوسری اور اہم ترین وجہ یہ تھی کہ بنوبُویہ کا اصل ہدف اقتدار تھا۔ اگر وہ کسی حقیقی یا جعلی سید کو (چاہے امام معصوم مانے بغیر بھی) سیاسی حاکم بناتے تو یقیناً اختیارات اسی کو منتقل ہو جاتے، اس طرح بنوبُویہ کے اقتدار کا خاتمہ ہو جاتا؛ لہٰذا ایک صدی سے زائد حکومت کے دوران انہوں ایک بار بھی کسی سید کو حکمرانی کا موقع نہ دیا تاکہ اپنا اقتدار محفوظ رہے۔

بنوبُویہ کی علمی وفکری مہمات:

دیلمیوں کے ظہور کے دور میں کُلینی کی ''اصول کافی'' مرتب ہوئی تھی۔ کُلینی کی وفات سے ۷ سال پہلے ۳۲۲ھ میں بنوبُویہ فارس میں اپنی حکومت قائم کر چکے تھے اور ان کی حکومت کا آئین اور منشور قرآن وسنت سے نہیں کُلینی کی ''اصول کافی'' سے ماخوذ تھا۔ تاہم علمائے اہلِ سنت اس سے پہلے عقائد، تفسیر، حدیث اور دیگر علوم میں جو عظیم الشان ذخائر پیش کر چکے تھے، اس کے مقابلے میں ''اصول کافی'' بالکل ناکافی تھی۔ اپنی حکومت کے پائے مضبوط کرنے کے لیے بنو بُویہ کے نزدیک اس کمی کو پورا کرنا ضروری تھا؛ کیوں کہ اب تک رفض کسی دلیل پر نہیں نفرت برائے نفرت پر مبنی تھا؛ اس لیے سوائے جاہلوں کے کسی کو اس میں دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ بنوبُویہ نے اثنا عشری قلم کاروں سے خوب کام لیا جنھوں نے اپنے مذہب کو علمی طور پر مضبوط بنانے کے لیے مسلمانوں کے ذخیرۂ حدیث کے مقابلے میں اپنی کتب حدیث اور مسلمانوں کی فقہ کے مقابلے میں اپنی فقہ تیار کی گئی جسے آج فقہ جعفریہ کہا جاتا ہے۔ من گھڑت روایات کو باقاعدہ مدوّن کیا گیا۔ عقائد کی جزوی تفصیلات مرتب کی گئیں اور فقہی احکام کی تدوین کی گئی۔ یوں بنوبُویہ کے دور میں رافضی علماء حکومتی سرپرستی میں نئے مذہب کے خدوخال درست کرنے میں مصروف رہے۔

عبداللہ بن الحسین الغضائری (م ۴۱۱ھ) نے ''یوم الغدیر''، ''مواطئی امیر المؤمنین'' اور ''الرد علی الغلاۃ'' لکھیں۔[1]

''الشیخ المفید'' کے لقب سے مشہور محمد بن نعمان بغدادی نے ۷۶ سال عمر پائی اور دو سو کے لگ بھگ کتابیں لکھیں۔ اس نے مفلس گھرانوں کے ذہین بچوں کو تلاش کر کے خطیر رقم کے عوض ان کے والدین سے حاصل کیا اور انہیں حلقۂ درس میں داخل کر کے عالم بنایا۔ یوں نصف صدی میں عراق کے اندر رافضی علماء کا ایک بہت بڑا حلقہ پیدا ہو گیا۔[2]

ابوجعفر محمد بن جریر ابن رستم طبری نے رُواۃ اہل البیت، نوادر المعجزات اور دلائل الامامۃ جیسی کتب لکھیں۔[3]

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱۷/۳۲۹۔ ② سیر اعلام النبلاء: ۱۷/۳۴۴، ۳۴۵

③ نوادر المعجزات اور دلائل الامامۃ بلاشبہ یہ اثنا عشری عقائد کے لیے بنیاد کا کام دیتی ہیں۔ ابن رستم طبری کے کام کا زمانہ اہلِ سنت کے امام طبری رحمہ اللہ کی وفات سے تقریباً نصف صدی بعد کا ہے۔ اس نے اپنی کتب میں محمد بن ہارون بن موسیٰ (م ۳۸۷ ہجری)، ابوالمفضل الشیبانی (م ۳۸۵ ہجری) اور عبداللہ بن الحسین الغضائری (م ۴۱۱ ہجری) جیسے رافضی راویوں کی روایات بھی نقل کی ہیں۔

قابلِ غور نکتہ:

یہ بات ثابت ہے کہ مدوّنینِ رفض میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کا نسلی تعلق ساداتِ کرام سے ہو۔ یہ سارے کے سارے عجمی تھے اور عربوں کے اسلام سے نفرت کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ وہ عجمی کاتب اور منشی تھے جو دولت یا مذہبی تعصب کی خاطر کچھ بھی گھڑ کر پیش کرنے کے عادی تھے۔[1]

اسلامی تاریخ میں ملاوٹ:

اس دور میں اسلامی تاریخ میں من گھڑت روایات بھرنے کا کام بڑی تیزی سے ہوا۔ مؤرخ ''المسعودی'' (م ۳۴۶ھ) نے بغداد سے مصر پہنچ کر عبیدیوں کی سرپرستی میں ''مروج الذھب'' اور ''التنبیہ والاشراف'' لکھیں۔[2]

شعر وادب میں جو کام ہوا اس کا اندازہ شیعی شاعر وادیب ابن حجاج بغدادی کی تصانیف سے لگایا جاسکتا ہے جو عضُدُ الدولہ بُویہی اور اس کی اولاد کا مداح تھا۔ اس کی تصانیف فحش نگاری سے بھری ہوئی ہیں۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے بقول وہ فحاشی اور بے ہودگی کا جھنڈا بلند کرنے والوں میں سے ایک تھا۔[3]

ملحد اور بے دین ادیبوں کو بھی بنو بُویہ کے ہاں بڑا مقام حاصل تھا۔ اس دور کا مشہور ادیب اور شاعر ابراہیم بن ہلال حرانی (م ۳۸۴ھ) بُویہی حکمران عز الدولہ بختیار کا منشی رہا۔ وہ صابی مذہب کا پیروکار تھا۔ قرآن مجید پڑھتا تھا، رمضان کے روزے بھی رکھتا تھا مگر اسلام قبول نہیں کرتا تھا۔ اس کی تحریریں بے دینی اور کج فکری سے بھری ہوتی تھیں۔[4]

الاغانی کی روایات اور خلفائے بنوامیہ وبنوعباس کا اخلاقی کردار؟

انہی دنوں بغداد کے ابوالفرج اصفہانی (۲۸۳ھ۔ ۳۵۶ھ) کا شہرہ ہوا۔ ابوالفرج اصفہانی کا تعلق اہلِ سنت خاندان سے تھا۔ اس کا نسب اموی خلیفہ مروان بن محمد سے جاملتا تھا مگر اُس دور میں شیعہ حکمرانوں کا عروج دیکھ کر بہت سے موقع پرست اہلِ قلم شیعہ مذہب اختیار کر چکے تھے۔ ابوالفرج نے بھی موقعے سے فائدہ اٹھا کر شیعہ مذہب اپنا لیا اور اپنے قلم کو شیعی حکمرانوں کی خوشنودی کے لیے وقف کردیا۔ چونکہ حکایات واشعار سے بھرپور اس کی کتابیں بہت دلچسپ تھیں؛ اس لیے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور پورے عالم اسلام میں ان کی دھوم مچ گئی۔[5]

---

① یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ منکرینِ حدیث صحاحِ ستہ پر یہ کہہ کر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ بھی عجم کی پیداوار ہیں؛ کیوں کہ چھ میں سے پانچ مؤلفینِ صحاحِ ستہ عجمی تھے۔ مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ صحاحِ اربعہ اور صحاحِ ستہ میں واضح فرق ہے۔ صحاحِ اربعہ کو فقط عجم کے کچھ علاقوں میں ہی مقبولیت ملی۔ عربوں نے انہیں یکسر مسترد کردیا۔ جبکہ صحاحِ ستہ کو پوری دنیا میں مقبولیت نصیب ہوئی اور عرب وعجم سب نے بھی دل وجان سے انہیں اپنایا۔ دوسری بات یہ ہے کہ صحاحِ ستہ کے علاوہ بھی حدیث پر عربوں کی تالیفات بکثرت ہیں، مثلاً: مسند احمد، مؤطا مالک، مسند الشافعی، مصنف عبدالرزاق، مسندِ دارمی، الآحاد والمثانی، شرح معانی الآثار وغیرہ، جو اپنے مندرجات میں صحاحِ ستہ سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہیں؛ کیوں کہ یہ سچا ذخیرۂ حدیث تمام مسلمانوں کی مشترکہ متاع ہے اور یہی اصل اسلام ہے جس میں عرب وعجم کا کوئی فرق نہیں۔ دوسری طرف ''صحاحِ اربعہ'' جس دین کی ترجمان ہیں، وہ دین نہ صرف اس مشترکہ متاع بلکہ قرآنِ مجید سے بھی متصادم ہے۔

② الاعلام زِرِکلی: ۲۴۳/۶

③ سیر اعلام النبلاء: ۶۰/۱۷

④ العبر فی خبر من غبر: ۱۶۴/۲

⑤ سیر اعلام النبلاء: ۲۰۲/۱۶

ابوالفرج اصفہانی کو نامور بنانے میں اس کی دو تصانیف: "الاغانی" اور "مقاتل الطالبین" نے اہم کردار ادا کیا۔ "الاغانی" میں بے سروپا روایتیں جمع کر کے اموی و عباسی خلفاء کے کردار و حالات کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے جیسے انہیں گانے بجانے، مے نوشی، رقص و سرود، شعر و شاعری، مسخرے پن اور بیگمات و باندیوں کے ساتھ عیاشی کے سوا اور کوئی کام نہ ہو۔ ابوالفرج اصفہانی اور مسعودی جیسی جعل سازیاں اس دور کے بعض دوسرے قلم کاروں اور ادیبوں نے بھی کیں۔ بعد کے ادوار کے بیشتر مؤرخین نے ان میں سے بہت سی باتوں کو دلچسپ محسوس کر کے خلفاء کی تاریخ میں شامل کر لیا۔

خلفاء کا عیش و تنعم اور مشکوک روایات:

ہم مسلم حکمرانوں کے عیش و تنعم کا یکسر انکار نہیں کر رہے مگر اس بارے میں الاغانی جیسی کتب کی روایات میں مبالغہ آمیزی بلکہ جعل سازی کا عنصر یقیناً ہے جس کا اندازہ تاریخ کے دیگر قدیم مآخذ کے ساتھ تقابل کر کے لگایا جا سکتا ہے۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ الاغانی جیسی کتب میں عموماً انہی خلفاء و امراء کا عیش و طرب زیادہ مذکور ہے جن کے دور میں مسلمانوں کو سیاسی استحکام حاصل تھا یعنی: عبدالملک، ولید، سلیمان، مہدی، ہارون الرشید، مامون، معتصم اور متوکل وغیرہ۔

اگر ان روایات کو اسی طرح صحیح مانا جائے تو کوئی بھی شخص یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ عیاش اور آزاد خیال حکمران سلطنت کی ترقی کا باعث بنتے ہیں (اور آج کل سیکولر طبقہ یہی دعویٰ کر رہا ہے۔) اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ سوچ انسان کو کس قدر گمراہ کر سکتی ہے۔ قرآن کی روشنی میں دیکھا جائے تو سچائی اس کے برعکس ہے:

﴿وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا۟ فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا ٱلْقَوْلُ فَدَمَّرْنَـٰهَا تَدْمِيرًا﴾

"اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش عیش لوگوں کو حکم دے دیتے ہیں، پھر وہ لوگ وہاں شرارت مچاتے ہیں تب ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے پھر اس بستی کو تباہ و غارت کر ڈالتے ہیں۔"[1]

عقل و فکر اور زندگی کے تجربات بھی اس خیال کی قطعاً نفی کرتے ہیں کہ عیاشی سے ترقی اور سادگی سے تباہی آتی ہے۔ پس قرآن کا فرمان، عقل و نظر کا فیصلہ اور تجرباتِ زندگی اپنی جگہ صحیح ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خلفائے بنوامیہ و بنوعباس میں سے چند کو مستثنیٰ کر کے اکثر سمجھ دار اور محتاط افراد تھے۔ بعض خلفاء کے اس عیش و تنعم یا غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل سے ہمیں انکار نہیں جو معتبر کتبِ تواریخ میں مذکور ہے۔ اس کے علاوہ وہ سیاسی غلطیاں یا نادانیاں بھی اپنی جگہ قابلِ افسوس اور باعثِ عبرت ہیں جو مختلف ادوار میں ہوتی رہیں۔ نیک سیرت یا نیک نیت آدمی سے بھی اگر اپنے ادارے کے معاملات کو سلجھانے میں غلطی یا زیادتی ہو جائے تو بعض اوقات ادارہ تباہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بعض خلفاء کی ذاتی شرافت کے باوجود ان کے بعض غلط فیصلے زوال کا باعث بنتے رہے۔ بعض خلفاء کا برا کردار، ان کی بداعتقادی یا ان کے ماتحت حکام کا ظلم و ستم بھی ابتری اور خلفشار کا باعث بنا۔

[1] سورۃ بنی اسرائیل، آیت: ١٦

یہ اصول صرف خلفائے بنوامیہ و بنوعباس پر نہیں، مسلمانوں کی ساری حکومتوں پر لاگو ہوتا ہے اور اس کے شواہد ہر دور میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اوراقِ تاریخ اور مناظرِ حیات کا منصفانہ مشاہدہ یہی بتاتا ہے کہ اچھے اور مخلص لوگوں کا نیک کردار اور ذمہ دارانہ طرزِ عمل کامیابی کا باعث بنتا ہے جبکہ بڑے لوگوں کی بدسیرتی اور لاپرواہی تباہی و بربادی کا سبب ہوتی ہے۔ یہی قرآنی صداقت ہے اور یہی عقل و نقل کا فیصلہ ہے۔ تجرباتِ تاریخ بھی یہی ثابت کرتے ہیں کہ کسی بھی قوم، ملک، ادارے یا تحریک کے دورِ تاسیس، دورِ استحکام اور دورِ عروج کے عہدے دار عموماً نیک نیت، باکردار، سمجھ دار اور ذمہ دار ہوتے ہیں جبکہ دورِ زوال میں عموماً عہدے دار غیر ذمہ دار اور بدکردار ہوتے ہیں۔

بنوبُویہ کے حکمرانوں کی فہرست درج ذیل ہے:

#	نام	مدت	کیفیت
۱	عماد الدولہ۔ علی بن بُویہ	۳۲۲ھ تا ۳۳۴ھ ۹۳۴ تا ۹۴۶ء	بانی سلطنت: ایران و فارس پر قبضہ
۲	معز الدولہ۔ ابوالحسین احمد بن بُویہ	۳۳۴ تا ۳۵۶ھ ۹۴۶ء تا ۹۶۷ء	بغداد پر قبضہ کیا۔ خلیفہ کو قتل کیا۔ خلفاء بے بس ہو گئے۔
۳	عز الدولہ۔ بختیار بن احمد بن بُویہ	۳۵۶ھ تا ۳۶۴ھ ۹۶۷ء تا ۹۷۵ء	عیاش، بے رحم
۴	عضد الدولہ بن حسن بن بُویہ	۳۶۴ھ تا ۳۷۲ھ ۹۷۵ء تا ۹۸۲ء	طاقتور، سخت گیر اور ظالم
۵	صمصام الدولہ بن عضد الدولہ	۳۷۲تا۳۷۶ھ ۹۸۲ تا ۹۸۶ء	بنوبُویہ میں خانہ جنگی
۶	شرف الدولہ بن عضد الدولہ	۳۷۶تا۳۷۹ھ ۹۸۶ء تا ۹۸۹ء	نرم مزاج حکمران۔ ترقیاتی کام
۷	بہاؤ الدولہ بن عضد الدولہ۔ ابونصر فیروز	۳۷۹تا۴۰۳ھ ۹۸۹ء تا ۱۰۱۲ء	بغداد میں سنی شیعہ کشمکش کی انتہاء
۸	سلطان الدولہ بن بہاؤ الدولہ	۴۰۳ھ تا ۴۱۱ھ ۱۰۱۲ء تا ۱۰۲۰ء	عباسی خلیفہ طاقتور، بُویہی کمزور
۹	مشرف الدولہ بن بہاؤ الدولہ	۴۱۱ھ تا ۴۱۶ھ ۱۰۲۰ء تا ۱۰۲۵ء	بُویہیوں میں انتشار

۱۰	جلال الدولہ بن بہاؤ الدولہ	۴۱۶ھ تا ۴۳۵ھ ۱۰۲۵ء تا ۱۰۴۳ء	خلیفہ پھر کمزور، بویہی طاقتور
۱۱	ابوکالیجار سلطان الدولہ بن بہاؤ الدولہ	۴۳۵ھ تا ۴۴۰ھ ۱۰۴۳ء تا ۱۰۴۸ء	ظالم و جابر
۱۲	الملک العزیز بن جلال الدولہ	۴۴۰ھ تا ۴۴۲ھ ۱۰۴۸ء تا ۱۰۵۰ء	برائے نام حکمران
۱۳	الملک الرحیم بن ابوکالیجار۔ابونصر فیروز	۴۴۲ھ تا ۴۴۷ھ ۱۰۵۰ء تا ۱۰۵۵	آخری بویہی حکمران

بنو عباس کے دورِ زوال کی دوسری صدی میں مشاہیرِ علماء کا کردار

۳۵۰ھ تا ۴۵۰ھ

خلیفہ متوکل کے قتل کے بعد سے بنو بُوَیہ کے اقتدار کے خاتمے تک لگ بھگ دو صدیاں ایسی گزریں کہ خلافتِ بغداد زوال کا مرقع تھی اور اُمت زبوں حال۔ اس دوران اہلِ باطل علمی وفکری رنگ میں جو کوششیں کررہے تھے ان کا جائزہ ہم لے چکے ہیں۔ باطل فرقوں کے رد میں امام طحاوی، ابوالحسن اشعری، امام ابومنصور ماتریدی اور امام طبری رحمہم اللہ کے کارنامے ہم پڑھ چکے ہیں۔ مگر چوتھی صدی ہجری کے وسط میں حالات کہیں زیادہ پُرآشوب ہوچکے تھے اور علمائے حق پر سرکاری جبر کے باعث زمین تنگ ہوگئی تھی۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''عالم اسلام کو چوتھی صدی ہجری میں مغرب میں دولتِ بنوعبید، مشرق میں بنوبُوَیہ اور عرب میں قرامطہ کی وجہ سے سخت آزمائش سے گزرنا پڑا تھا۔''①

ایسے میں بعض اہلِ علم ایسے بھی تھے جو اصلاحِ احوال سے مایوس ہوکر بنوبُوَیہ کے رنگ میں رنگ گئے، جیسے ایک عالم ابن ابی دارم (م ۳۵۲ھ) نے رفض اختیار کرلیا تھا۔②

حالات کے جبر سے تنگ آکر بعض علماء نقل مکانی پر مجبور ہوگئے تھے جیسے عمر بن حسین الخرقی رحمہ اللہ (م ۳۳۴ھ) صحابہ پر سب وشتم برداشت نہ کرتے ہوئے بغداد چھوڑ کر دِمشق چلے گئے۔ ان کی ذاتی تصانیف کا ذخیرہ اور کتب خانہ پیچھے رہ گیا جو بغداد کے حوادث میں نذرِ آتش ہوگیا۔③

فقہائے شافعیہ کے رئیس ابواسحٰق المروزی رحمہ اللہ (م ۳۴۰ھ) بھی بغداد سے مصر چلے گئے۔④

چونکہ اس دور میں حجاز قرامطہ کے ہاتھوں برباد ہورہا تھا؛ اس لیے مکہ کے عظیم محدث دعلج بن احمد رحمہ اللہ (م ۳۵۱ھ) بھاگ کر بغداد آگئے۔ وہ کپڑے کے تاجر تھے اور لوگوں سے رقم لے کر مضاربت پر کاروبار کرتے تھے۔ ان کی ایمان داری ضرب المثل تھی۔ خوب کماتے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے۔ مساجد، مدارس اور اوقاف میں بہت تعاون کرتے۔ ان کی ثروت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے مکہ میں ''دارالعباسیہ'' کو ۳۰ ہزار دینار (ساڑھے سات کروڑ روپے) میں خریدا تھا۔ جب وہ حجاز کی مستقل بدامنی سے تنگ آکر بغداد منتقل ہوئے تو یہاں بنوبُوَیہ ان کی ثروت دیکھ کر بے چین ہوگئے اور ان کی وفات کے بعد ان کا سارا ترکہ ہڑپ کرلیا جو تین لاکھ دینار سے کم نہ تھا۔⑤

① سیر اعلام النبلاء: ۲۵۲/۱۶ ② میزان الاعتدال: ۱۳۹/۱ ③ طبقات الحنابلۃ: ۷۵/۲
④ تاریخ بغداد: ۱۱/۶ ⑤ سیر اعلام النبلاء: ۳۲/۱۶ ...... تین لاکھ دینار، آج کل کے تقریباً ۷۵ کروڑ روپے

باطل فرقوں کا علمی تعاقب

مسلمان جس نازک صورتحال سے گزر رہے تھے، علمائے اُمت نے اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اصلاحِ احوال کے لیے اپنا کردار پوری طرح ادا کیا۔ اس مدت میں علماء کا کام کئی شعبوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک طبقہ دین کی حفاظت کے لیے حجرہ نشین رہا اور تحقیق وتصنیف کے ذریعے اپنی ذمہ داری ادا کرتا رہا۔ ان علماء نے عقائد، حدیث، اصولِ حدیث، جرح وتعدیل، فقہ اور تاریخ سمیت متعدد علوم پر گراں قدر کام کیا۔ ایک طبقے نے میدان میں آکر باطل فرقوں سے مناظرے کیے اور انہیں ہر جگہ منہ توڑ جواب دیا۔

ابوبکر الآجری رحمہ اللہ:

عقائدِ اسلام کی حفاظت کے لیے ابوبکر محمد بن حسین الآجری بغدادی رحمہ اللہ (م ۳۶۰ھ) نے بہت نمایاں کام کیا۔ انہوں نے علم عقائد میں ''الشریعۃ'' جیسی رہنما کتاب تصنیف کی جو قرآن وسنت کے دلائل سے مزین ہے۔ اس میں جہاں معتزلہ کے عقائد کی تردید ہے وہاں روافض کے نظریات کو بھی ٹھوس انداز میں رد کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں صحیح احادیث کے ذریعے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافتِ بلافصل کو ثابت کیا گیا ہے۔ نیز خلفائے اربعہ اور اہلِ بیت کے فضائل کے ساتھ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل ومناقب بھی اہمیت سے شامل کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب پانچ حصوں میں ہے اور اس میں دو ہزار سے زائد احادیث سے استدلال کیا گیا ہے۔[1]

قاضی ابوبکر ابن باقلانی رحمہ اللہ:

اس دور میں قاضی ابوبکر محمد بن طیب ابن باقلانی مالکی رحمہ اللہ (۳۳۸ھ۔۴۰۳ھ) نے مسلمانوں کی ترجمانی کا حق ادا کیا اور باطل فرقوں کو ہر بحث میں دندان شکن جوابات دیے۔ وہ بصرہ میں پیدا ہوئے اور جوانی میں بغداد کو اپنی علمی ضیا پاشیوں کا مرکز بنایا۔ عراق میں وہ فقہائے مالکیہ کے سرتاج اور اشاعرہ کے سرخیل سمجھے جاتے تھے۔[2]

ان کے مقام کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۳۷۱ھ میں خلیفہ نے انہیں اپنا سفیر بنا کر قیصرِ روم کے پاس بھیجا تھا۔ قیصر چاہتا تھا کہ وہ سر جھکا کر دربار میں حاضر ہوں؛ لہٰذا ان کے لیے ایک چھوٹا سا دروازہ کھلوایا۔ وہ بادشاہ کا مقصد سمجھ گئے اور پشت کر کے اندر داخل ہوگئے۔ دورانِ گفتگو قیصر نے ان پر چوٹ کرتے ہوئے پوچھا:

''اپنے نبی کی اہلیہ عائشہ رضی اللہ عنہا (پر الزام) کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

انہوں نے فوراً کہا: ''ایسی (الزام زدہ) دو عورتیں تھیں: ایک ہمارے نبی کی زوجہ اور ایک حضرت مریم۔ ہمارے نبی کی اہلیہ شادی شدہ تھیں مگر بے اولاد۔ حضرت مریم کنواری تھیں مگر اولاد والی۔ الزام دونوں پر لگا مگر اللہ نے دونوں کو بری

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱۶/۱۳۳، ۱۳۴

② اعلام زرکلی: ۶/۱۷۶؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۷/۱۹۰

قرار دے دیا۔" شاہِ روم کو یہ سن کر ایسی چپ لگی کہ کچھ کہنے کا یارا نہ رہا۔

قیصر کے دربار میں راہب بھی آیا کرتے تھے۔ ایک دن امام ابنِ باقلانی رحمہ اللہ نے ایک راہب سے پوچھا:

"آپ کے بیوی بچوں کا کیا حال ہے؟"

قیصر نے ٹوک کر کہا: "خاموش! آپ نہیں جانتے کہ راہب ان چیزوں سے پاک ہوتے ہیں۔"

امام ابنِ باقلانی رحمہ اللہ نے فوراً کہا: "آپ راہب کو ان چیزوں سے پاک مان لیتے ہیں مگر تمام جہانوں کے پروردگار کو ان چیزوں سے پاک نہیں مانتے۔"

قیصر گنگ رہ گیا۔ [1]

حلقۂ علماء میں ابوبکر ابنِ باقلانی رحمہ اللہ کی عزت بیش از بیش تھی۔ ایک بار امام دار قطنی رحمہ اللہ کی بغداد میں سرِ راہ ان سے ملاقات ہوگئی۔ امام دار قطنی رحمہ اللہ نے انہیں گلے سے لگا لیا اور ان کے چہرے اور پیشانی پر بوسہ دیا۔

ان کے مصاحب ابوذر الہروی نے پوچھا: "یہ کون ہیں کہ آپ نے امامِ وقت ہو کر بھی ان کی ایسی تعظیم کی؟"

امام دار قطنی رحمہ اللہ نے فرمایا: "یہ مسلمانوں کے امام اور دین کے وکیلِ صفائی قاضی ابوبکر ہیں۔" [2]

ابوبکر ابنِ باقلانی رحمہ اللہ کا معمول تھا کہ سفر ہو یا حضر، روزانہ عشاء کے بعد بیس رکعات نفل پڑھتے، پھر تصنیفی کام شروع کرتے اور سونے سے پہلے ۳۵ صفحات تحریر کر دیتے۔ ابوبکر خوارزمی کہتے ہیں کہ بغداد کا ہر مصنف دوسروں کی تصانیف دیکھ کر کتب تحریر کرتا تھا سوائے ابنِ باقلانی کے۔ ان کا سینہ ہی علوم کا گنجینہ تھا۔ اپنے حافظے اور ذہن سے سب کچھ لکھتے چلے جاتے۔ انہوں نے ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ کے علوم کو جو ان کی کتابوں: "الابانۃ" اور "اللمع" میں موجود ہے، مزید نکھار کر تشریحات کے ساتھ پیش کیا۔ اس ضمن میں انہوں نے "شرح الابانۃ" اور "شرح اللمع" تحریر کر کے ایک گراں قدر خدمت انجام دی۔ اس کے علاوہ انہوں نے "مناقب الائمۃ الاربعۃ" تحریر کی اور حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کا یکساں احترام قائم رکھتے ہوئے اہلِ سنت کے مختلف مکاتبِ فکر کے درمیان ہم آہنگی بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ "اعجاز القرآن" تحریر کر کے انہوں نے قرآن مجید کا بے مثل و بے نظیر ہونا اس طرح ثابت کیا ہے کہ دہریے، فلاسفہ اور غیر مسلم حکماء آج تک اس کا جواب نہیں دے پائے۔

"تمہید الاوائل و تلخیص الدلائل" علم عقائد میں ان کی ایک اور لاجواب کتاب ہے جس میں یہود و نصاریٰ اور آتش پرستوں سمیت غیر مسلموں کے اسلام پر اعتراضات کے مسکت جوابات دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ خود اسلامی فرقوں کی طرف سے مسلکِ اہل سنت والجماعت پر کیے گئے مشہور شبہات کو بھی حل کیا گیا ہے۔ نیز اس میں اہلِ سنت کے نزدیک "خروج" کے مسئلے کو اس خوبی سے واضح کیا گیا ہے کہ اہلِ علم داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

انہوں نے "کشف الاسرار و ہتک الاستار" نامی بے مثل کتاب لکھی جس کی اس دور میں سخت ضرورت تھی۔ اس

[1] سیر اعلام النبلاء: ۱۷/۱۹۱، ۱۹۲؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۳۷۱ھ
[2] سیر اعلام النبلاء: ۱۷/۵۵۸

ہیں مصر اور افریقہ پر قابض رافضی حکومت ''دولتِ بنی عبید'' کا کچا چٹھا پہلی بار کھولا گیا تھا اور ثابت کیا گیا تھا کہ ان حکمرانوں کا سادات سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ ایک جعلی نسب کے ذریعے لوگوں کی عقیدت بٹورنے اور ان کے دین و ایمان سے کھیلنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔[1]

ابوبکر ابنِ باقلانی رحمہ اللہ صرف زبان وقلم ہی کے نہیں شمشیر وسناں کے بھی دھنی تھے۔ جب بنوعبید نے عراق پر قبضے کی کوشش شروع کی تو مُوصل کا گورنر خوف زدہ ہو کر ان کا وفادار بن گیا۔ خلیفہ نے بہاؤالدولہ کو اس کے خلاف لشکر کشی پر آمادہ کرنے کے لیے ابوبکر باقلانی رحمہ اللہ کو سفیر بنا کر بھیجا۔ انہوں نے پہلے بہاؤالدولہ کو لشکر کشی پر تیار کیا۔ پھر خلیفہ کے سفیر کی حیثیت سے مُوصل کے گورنر کے پاس جا کر اسے سمجھایا اور ڈرایا۔ آخر مُوصل کا گورنر دوبارہ خلافتِ عباسیہ سے منسلک ہو گیا اور یوں عراق بنوعبید کے شر سے بچ گیا۔ ان کارناموں کی وجہ سے انہیں ''شمشیرِ سنت'' اور ''لسان الامت'' کے القاب سے یاد کیا جاتا تھا۔[2]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''بغداد میں یہی وہ فرد تھے جو حدیث وسنت اور عقلیات ومنطق کے ساتھ استدلال کر کے معتزلی، رافضی، قدری اور دوسرے بدعتی فرقوں کے امراء کی موجودگی میں مناظرے کرتے تھے حالانکہ اس وقت حکومت انہی لوگوں کی تھی اور بنوبُویہ غالب تھے۔''[3]

شیخ ابواسحٰق اسفرائنی رحمہ اللہ:

ان کے بعد نیشاپور کے عالم جلیل شیخ ابواسحٰق اسفرائنی رحمہ اللہ (م ۴۱۸ھ) نے مسلمانوں کی ترجمانی کا فریضہ ادا کیا، ان کا مقام اتنا بلند تھا کہ ان کے لیے نیشاپور میں ایک عظیم الشان درسگاہ قائم کی گئی جہاں وہ حدیث اور عقائد کا درس دیتے تھے۔ باطل فرقوں کی پرزور تردید کرنے کی وجہ سے انہیں ''نارِ محترق'' (جلا دینے والی آگ) کہا جاتا تھا۔

ردِّ فتن میں مشغولیت کے باعث ان کے مزاج میں کچھ شدت آگئی تھی؛ اس لیے ان کی کچھ آراء منفرد بھی تھیں تاہم ان کا کام مجموعی طور پر بہت مفید تھا۔ ان کی کتاب "الجامع فی اصول الدین والرد علی الملحدین" پانچ جلدوں میں ہے۔ فرقِ باطلہ کی تردید میں یہ لاجواب کوشش مانی جاتی ہے۔[4]

الفشید یزجی رحمہ اللہ:

رے کے حنفی فقیہ اور مناظر الفشید یزجی رحمہ اللہ (م ۴۲۴ھ) بھی قابلِ ذکر شخصیات میں سے ایک ہیں۔ وہ اپنے

---

① الاعلام زرکلی: ۱۷۶/۶

② المنتظم لابن الجوزی: ۷۷/۱۵؛ العبر فی خبر من غبر فی خبر من غبر: ۱۹۷/۲، ۱۹۸

③ سیر اعلام النبلاء: ۵۵۸/۱۷

④ سیر اعلام النبلاء: ۳۵۴/۱۷

آبائی علاقے سے بغداد آئے اور یہاں باطل فرقوں سے مناظرے کر کے شہرت پائی۔

مشہور شیعہ عالم شریف مرتضیٰ سے ان کا مسئلہ باغ فدک پر مناظرہ ہوا۔ اہلِ سنت کا موقف ہے کہ پیغمبروں کا ترکہ ورثاء میں تقسیم نہیں ہوتا بلکہ صدقہ ہوتا ہے۔ شیعوں کا مذہب اس کے خلاف ہے۔ شریف مرتضیٰ نے اہلِ سنت کی دلیل حدیث "مَا تَرَكْنَا صَدَقَة" کو مسترد کرتے ہوئے کہا: "یہاں مانافیہ ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم نے کوئی صدقہ نہیں چھوڑا۔" الشید یزجی نے فوراً کہا: "اگر یہ مان لیا جائے تو رسول اللہ ﷺ کا یہ کلام بے فائدہ کہلائے گا؛ کیوں کہ بھی جانتے ہیں کہ میت کا ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوتا ہے، صدقہ نہیں ہوتا۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کا حال اُمت سے الگ تھا، تبھی آپ نے وضاحت فرمائی کہ ہمارا ترکہ صدقہ ہوگا۔" یوں انہوں نے شریف مرتضیٰ کو لاجواب کر دیا۔ ①

ابو منصور عبدالقاہر بغدادی الاسفرائینی رحمہ اللہ:

اسی دور کے ایک مایہ ناز عالم امام ابو منصور عبدالقاہر بغدادی رحمہ اللہ (م ۴۲۹ھ) تھے جو امام ابو اسحاق اسفرائینی رحمہ اللہ کے تلمیذ خاص اور ان کے جانشین تھے۔ وہ بغداد سے نیشاپور جا کر سکونت پذیر ہوئے اور اپنے استاذ کی مسندِ درس پر بیٹھ کر سترہ علوم وفنون کا درس دیتے رہے۔ انہوں نے "الفرق بين الفِرَق" نامی زندہ وجاوید کتاب لکھی جو مختلف فرقوں کے تعارف اور ان کی تاریخ پر آج تک بہترین کاوش مانی جاتی ہے۔ ②

خانوادۂ بنو مندہ:

اسی دور میں اصفہان کے ایک خاندان "بنو مندہ" کی چار پشتوں نے یکے بعد دیگرے سنت کی حفاظت میں مردانہ وار کام کیا۔ اس خاندان کا ہر عالم "ابنِ مندہ" کی کنیت سے مشہور تھا۔ پہلے عالم محمد بن یحییٰ بن مندہ (۲۲۰ھ۔۳۰۱ھ) تھے جو حافظ الحدیث شمار ہوتے تھے۔ ③

پھر ان کے پوتے محمد بن اسحٰق بن محمد (۳۱۰ھ۔۳۹۵ھ) آئے جنہوں نے "الایمان"، "التوحید"، "الرد علی الجہمیۃ" اور "معرفۃ الصحابۃ" جیسی عظیم الشان کتب تصنیف کر کے علم کلام، عقائد اور تاریخ کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کیا۔ ④

اگلا دور ان کے صاحبزادے عبدالرحمٰن بن محمد (۳۸۱ھ۔۴۷۰ھ) کا تھا جنہوں نے سنت کی حمایت اور بدعات کی تردید میں کئی کتب لکھیں۔ ⑤ ان کے بھائی عبدالوہاب بن محمد (۳۸۸ھ۔۴۷۵ھ) کا درسِ حدیث بہت مشہور رہا۔ ⑥

پھر ان کے فرزند یحییٰ بن عبدالوہاب (۴۳۴ھ۔۵۱۱ھ) نے "التنبیہ علی الجہال والمنافقین" اور تاریخ میں "مناقب امام احمد بن حنبل" اور "تاریخ اصبہان" لکھیں۔ ہر تصنیف اپنے موضوع کا حق ادا کرتی تھی۔ ابن خلکان ان کا تعارف یوں کراتے ہیں: "محدث بن محدث بن محدث بن محدث." ⑦

---

① سیر اعلام النبلاء: ۴۲۵/۱۷ ② الاعلام زرکلی: ۴۸/۴ ③ الاعلام زرکلی: ۱۳۵/۷

④ سیر اعلام النبلاء: ۲۸/۱۷ تا ۳۰؛ الاعلام زرکلی: ۲۹/۶ ⑤ الاعلام زرکلی: ۳۲۷/۳

⑥ سیر اعلام النبلاء: ۴۴۱/۱۸ ⑦ وفیات الاعیان: ۱۶۸/۶

باطل حکومتوں اور عوام کے درمیان پُل کا کردار ادا کرنے والے علماء

اس دور کے بعض علماء نے عوام اور باطل فرقوں کی حکومتوں کے مابین پُل کا کردار ادا کیا۔ وہ اپنے اثر و رسوخ سے جبر و تشدد کو کم کرانے، عوام کو رعایتیں دینے، سخت گیر پالیسی کو بدلنے اور امن وامان کو بہتر بنانے کے لیے متحرک رہے۔ کچھ علماء نے سرکاری عہدے مثلاً قضا بھی قبول کیے اور عوام کو انصاف فراہم کرنے میں مددگار بنے۔ اس عہدے کو قبول کرنے کی شرعی گنجائش تو تھی ہی، حکمت بھی یہی تھی کہ معاشرے پر اثر اندازی کا کوئی موقع ضائع نہ کیا جائے۔

قاضی عسال اصفہانی رحمہ اللہ:

ان میں قاضی محمد بن احمد عسال اصفہانی رحمہ اللہ (۲۶۹ھ۔۳۴۹ھ) بھی تھے۔ وہ اصفہان کے ایک رئیس خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ حدیث اور فقہ میں وہ ایران کے سب سے مایہ ناز عالم تھے۔ ابوسعید نقاش جنھوں نے دارقطنی اور امام حاکم رحمہما اللہ جیسے محدثین کی صحبت پائی تھی، کہتے تھے کہ میں نے عسال جیسا عالم کہیں نہیں دیکھا۔

انہیں اصفہان کا قاضی بننے کی پیش کش کی گئی تو وہ شروع میں آمادہ نہ ہوئے، جب حکومت کی طرف سے بہت اصرار کیا گیا تو یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ رکن الدولہ حسن بن بُوَیہ نے انہیں ۳۳۹ھ میں یہ عہدہ سونپا۔ انہوں نے قضا کی خدمات اس طرح انجام دیں کہ لوگوں کو قاضی شریح رحمہ اللہ کا دور یاد آ گیا۔

ہر وقت ان کا دروازہ فریادیوں کے لیے کھلا رہتا تھا۔ زہد و عبادت کا یہ حال تھا کہ ایک رکعت میں پورا قرآن پڑھنا ان کے لیے معمولی بات تھی۔ لوگ ان کے علم وفضل اور عدل وانصاف کی شہرت سن کر دور دور سے دوڑے آتے تھے، کچھ اپنے تنازعے حل کرانے، کچھ حدیث سننے اور کچھ صرف ان کی ایک جھلک دیکھنے حاضر ہوتے تھے۔

جب ان کی وفات ہوئی تو اصفہان میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ اسی دن کچھ مسافر وہاں پہنچے تھے۔ یہ خبر سن کر وہ پچھاڑیں کھانے اور رونے لگے۔ وجہ پوچھی گئی تو بولے:

"ہم ڈیڑھ سال میں مراکش سے یہاں پہنچے ہیں، یہ آرزو لے کر چلے تھے کہ ان سے حدیث سنیں گے۔"[①]

حافظ عبدالغنی ابو محمد الازدی رحمہ اللہ:

اسی دور میں مصر کے محدث حافظ عبدالغنی بن سعید رحمہ اللہ (۳۳۲ھ۔۴۰۹ھ) نے جو ابو محمد ازدی کی کنیت سے مشہور ہیں، حدیث کے مختلف موضوعات پر شہرہ آفاق کام کیا۔ وہ امام دارقطنی رحمہ اللہ کے تلامذہ میں سے تھے جنھیں اپنے اس شاگرد پر فخر تھا۔ فرماتے تھے: "وہ آگ کا شعلہ ہیں۔" امام دارقطنی رحمہ اللہ مصر کے دورے سے واپس جانے لگے تو ان کے عقیدت مند رو پڑے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے کہا: "روتے کیوں ہو؟ تمہارے پاس عبدالغنی ہیں۔ وہ کافی ہیں۔"

① سیر اعلام النبلاء: ۹/۱۶ تا ۱۲

حافظ عبدالغنی رحمہ اللہ نے بنوعبید کے جبر وتشدد زدہ ماحول میں بھی ڈٹ کر علمی کام کیا ''المؤتلف والمختلف''، ''الغوامض والمبہمات''، ''الاوہام التی فی مدخل الحاکم'' اور ''المتوارین'' جیسی کتب لکھیں۔

''المتوارین'' ماضی کے ان علماء کے حالات پر لکھی گئی جو سرکاری عتاب کا شکار ہوئے۔ اس کتاب میں درحقیقت انہوں نے اپنے دور کے اہلِ علم کو ماضی کا آئینہ دکھا کر صبر وتحمل کا درس دیا ہے۔ انہیں خود بھی ایسے حالات سے گزرنا پڑا عبیدی حکمران الحاکم کے دور میں انہیں روپوش ہونا پڑا۔ کئی سال بعد حالات میں کچھ نرمی آنے پر ظاہر ہوئے۔

اب انہوں نے خود بھی بنوعبید کے بارے میں رویہ نرم کرلیا۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے بقول: حافظ عبدالغنی رحمہ اللہ نے ایک حکومتی عہدہ بھی قبول کرلیا تھا جس کی بناء پر بعض علماء بدگمان ہوکر ان سے روایت لینے سے احتراز کرنے لگے۔ حالانکہ حافظ عبدالغنی رحمہ اللہ کا مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی انداز میں سنت کی اشاعت کا کام ہوتا رہے۔ حافظ عبدالغنی رحمہ اللہ کے ثقہ اور عادل ہونے پر جمہور محدثین کا اتفاق ہے۔ حافظ عبدالغنی رحمہ اللہ قاہرہ ہی میں فوت ہوئے۔ [1]

قاضی یحییٰ بن منصور رحمہ اللہ:

انہی میں قاضی یحییٰ بن منصور رحمہ اللہ (م ۳۵۱ھ) بھی تھے جو دس سال سے زائد مدت تک نیشاپور کے قاضی رہے اور ۳۳۹ھ میں معزول ہوئے۔ امام حاکم نیشاپوری رحمہ اللہ جیسے محدثین ان کے شاگرد تھے۔ [2]

امام ابوالحسن قزوینی رحمہ اللہ:

انہی علماء میں امام ابوالحسن قزوینی رحمہ اللہ (۳۶۰ھ۔۴۴۲ھ) بھی تھے جو حافظ، عشرہ قراآت کے قاری، محدث، عابد زاہد اور صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔ تلاوتِ قرآن ان کا ہمہ وقتی وظیفہ تھا۔ نہایت درویشانہ زندگی گزارتے تھے۔ صرف نماز کے لیے گھر سے نکلا کرتے۔ باقی وقت میں ان کا گھر درسگاہ تھا اور خانقاہ بھی۔ علوم قراآت اور علوم حدیث کے شائقین ہر وقت ان کے گرد جمع رہتے۔ اللہ نے ایسی مقبولیت نصیب کی تھی کہ خود خلیفہ قادر باللہ بھیس بدل کر ان کی مجلس میں حاضر ہوتا اور استفادہ کرتا تھا۔ یہ راز صرف امام ابوالحسن قزوینی رحمہ اللہ جانتے تھے کہ خلیفہ بھی مجلس میں ہے۔

بُویہی امراء بھی ان سے عقیدت ظاہر کرتے۔ ابوطاہر بن بُویَہ اور ابوکالیجار ان سے ملنے آتے اور احترام سے کھڑے رہتے اور بیٹھنا خلافِ ادب سمجھتے۔

جب ان کی وفات ہوئی تو سارا بغداد بند ہوگیا۔ کہا جاتا تھا کہ اس صدی میں یہ بغداد کا سب سے بڑا جنازہ تھا۔ [3]

امام ابوحامد الاسفرائینی رحمہ اللہ:

امام ابوحامد اسفرائنی رحمہ اللہ (۳۴۴ھ۔۴۰۶ھ) بغداد میں شوافع کے سب سے بڑے مفتی تھے۔ کئی شافعی علماء انہیں مجدد صدی قرار دیتے تھے۔ انہوں نے طالب علمی کا زمانہ بڑی عسرت میں گزارا تھا۔ رات کو مطالعے کے لیے چراغ میں تیل ڈالنے کے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے۔ آخر ایک حویلی میں رات کی چوکیداری کرنے لگے۔ اس دوران مشغلہ کا

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۱۷/۲٦۸ تا ۲۷۰؛ وفیات الاعیان: ۳/۲۲۳

[2] سیر اعلام النبلاء: ۱٦/۲۸

[3] سیر اعلام النبلاء: ۱۷/٦۰۹ تا ٦۱٤

رشنی میں کتابیں پڑھتے رہتے تھے۔اس محنت کا صلہ یہ ملا کہ سترہ سال کی عمر میں مسندِ افتاء پر فائز ہو گئے۔بیس سال کی عمر میں بغداد آئے۔یہاں ان کا حلقۂ درس اتنا مشہور ہوا کہ بیک وقت تین سو سے سات سو تک فقہاء سامنے بیٹھ کر استفادہ کرتے۔دربارِ خلافت اور امرائے بغداد کے ہاں ان کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔روافض کے غلبے کے باوجود ان کی پوری کوشش رہی کہ حکومت، ریاست اور قصرِ اقتدار میں دینی شعائر زندہ ہوں۔[1]

امام حسن بن احمد سبیعی رحمہ اللہ:

انہی میں ہمدان کے حسن بن احمد سبیعی رحمہ اللہ (۲۸۱ھ۔۳۷۱ھ) بھی تھے جو امام دارقطنی رحمہ اللہ کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ان کا قیام حلب میں تھا۔علمائے حلب کا کہنا تھا کہ اس شہر میں ان کے ہم پلہ محدث کوئی اور نہیں تھا۔سیف الدولہ حمدانی ان کی بہت عزت کرتا اور ان کے گھر حاضری دیتا رہتا تھا۔انہوں نے ۹۰ سال عمر پائی اور ۳۷۱ھ میں فوت ہوئے۔[2]

امام حاکم الکبیر رحمہ اللہ:

ابواحمد حاکم الکبیر رحمہ اللہ (۲۸۵ھ۔۳۷۸ھ) بھی اس دور کی ایک نامور شخصیت تھے۔''شعار اصحاب الحدیث''، ''الاسماء والکنیٰ''، ''عوالی مالک''، ''العلل''، ''الشیوخ والابواب''، ''المخرج علیٰ کتاب المزنی'' اور ''فوائد ابی احمد''، ان کی بلند پایہ تصانیف ہیں۔ان کا تعلق وسطِ ایشیا سے تھا۔ایک بار بخارا کے سامانی حاکم نوح بن نصر نے علماء سے پوچھا کہ صدقات ومحصولات کے بارے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کیا منقول ہے؟ سب خاموش رہے۔ابواحمد حاکم سب سے پیچھے بیٹھے تھے۔انہوں نے اس بارے میں حدیث سنادی۔نوح بن نصر نے کہا: ''قاضی انہی جیسے کو ہونا چاہیے۔'' چنانچہ اس کے بعد وہ قاضی بنے۔کئی شہروں میں ان کی تقرری ہوئی۔شاش اور طوس میں لوگ ان کے عدل وانصاف کے گرویدہ ہو گئے۔۳۴۵ھ میں نیشاپور واپس آئے اور باقی زندگی درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں گزاری۔[3]

امام الماوردی رحمہ اللہ:

اس دور میں ایک بہت بڑا نام امام ابوالحسن الماوردی رحمہ اللہ (۳۶۴ھ۔۴۵۰ھ) کا ہے۔وہ بصرہ کے رہنے والے تھے۔نیشاپور کے قصبے ''استوا'' کے قاضی رہے۔پھر بغداد آکر ایک مدت تدریس میں گزاری۔ایک طویل عرصے تک وہ دربارِ خلافت کے سفیر کی حیثیت سے بھی بیرونی دوروں پر رہے۔انہیں ۴۲۹ھ میں دربارِ خلافت سے اقضی القضاۃ (سب سے بڑے قاضی) کا خطاب ملا۔[4]

۴۲۹ھ میں بُویہی حکمران جلال الدولہ نے خلیفہ سے اصرار کر کے اپنے نام کے ساتھ ''مَلِکُ الْمُلُوک'' (شہنشاہ) کا لقب منظور کرایا۔بغداد کے کئی علماء نے حکمران کے دباؤ میں آکر اس کے جواز کا فتویٰ دیا حالانکہ حدیث میں واضح

[1] سیر اعلام النبلاء: ۱۹۳/۱۷ تا ۱۹۵

[2] سیر اعلام النبلاء: ۲۹۶/۱۶ تا ۲۹۹

[3] سیر اعلام النبلاء: ۳۷۰/۱۶ تا ۳۷۶

[4] سیر اعلام النبلاء: ۶۴/۱۸ تا ۶۷

طور پر اس سے منع کیا گیا ہے۔① جلال الدولہ جانتا تھا کہ جب تک قاضی القضاۃ الماوردی رحمہ اللہ جواز کا فتویٰ نہیں دیں گے، عوام مطمئن نہیں ہوں گے؛ اس لیے وہ قاضی صاحب کی حمایت چاہتا تھا مگر قاضی صاحب نے اس اقدام کی تائید نہ کی بلکہ دربار میں آنا ہی چھوڑ دیا۔ اڑھائی ماہ بعد جلال الدولہ نے خود انہیں بلوایا اور کہا:

''آپ علماء وفقہاء میں سب سے زیادہ بلند مرتبہ ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے میرے حق میں دیے گئے فتوے کی مخالفت صرف اس لیے کی ہے کہ آپ حق کی پیروی کرنا چاہتے ہیں اور اس بارے میں کسی کی پروا نہیں کرتے۔ اس واقعے سے میرے نزدیک آپ کا مقام اور بڑھ گیا ہے۔''②

سلجوقی سلطنت کے بانی طغرل بیگ نے اپنی ابتدائی فتوحات میں عوام کے جان ومال کے احترام کو نظر انداز کر دیا تھا۔ قاضی الماوردی رحمہ اللہ سفیر بن کر اس کے پاس گئے اور اسے اس طرزِ عمل کے نقصانات بتا کر عوام سے لطف و احسان کے ساتھ پیش آنے پر زور دیا۔ طغرل بیگ ان سے بہت متاثر ہوا، ان کی نصیحتوں کو پلے سے باندھ لیا اور ان کا بے حد اعزاز واکرام کیا۔③

اللہ نے انہیں اسلامی سیاست کو سمجھنے کا خاص ملکہ دیا تھا۔ انہوں نے اپنے علم، تجربے اور دقیق النظری کا نچوڑ علم سیاست کی اس کتاب میں پیش کیا جو ''الاحکام السلطانیہ'' کے نام سے موسوم ہے اور آج تک علماء سے داد وتحسین وصول کر رہی ہے۔ اس تصنیف میں خلافت، امامت، وزارت، ولی عہدی، خلافت کے ماتحت حکومتوں، قضاء، جہاد، جزیہ وخراج، جرائم کی سزاؤں اور شعبۂ احتساب سمیت اسلامی سیاسیات کے ہر شعبے پر بھرپور بحث کی گئی ہے۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی کتاب ''الخراج'' اور ابن زنجویہ کی ''کتاب الاموال'' سمیت اسلامی سیاست پر گزشتہ علماء وفقہاء کے جملہ علوم اس کتاب میں سمو دیے گئے ہیں۔ الماوردی کی یہ تصنیف ظاہر کرتی ہے کہ وہ حقیقت کی دنیا میں جینے والے انسان تھے اور اسلام کے سیاسی اصولوں میں موجود اس لچک سے اچھی طرح آگاہ تھے جس سے فائدہ اٹھا کر ہر دور اور ہر زمانے کے مطابق بہترین نظامِ حکومت وضع کیا جا سکتا ہے۔

''الاحکام السلطانیہ'' کے علاوہ الماوردی نے مسلم حکمرانوں کے اخلاق وکردار کو بہتر بنانے کے لیے دو بہت عمدہ کتابیں: ''تسہیل النظر وتعجیل الظفر فی اخلاق الملک'' اور ''دُرَرُ السلوک فی سیاسۃ الملوک'' تحریر کیں جو نصیحتوں اور حکمتوں کے خزانے ہیں اور کوئی بھی حکمران انہیں پڑھ کر ان غلطیوں کی اصلاح کر سکتا ہے جن کے سبب ماضی کی بڑی بڑی حکومتیں تباہ ہوئیں۔ الماوردی ایک بڑے مفسر اور فقیہ بھی تھے۔ ۶ جلدوں میں ''تفسیر الماوردی'' اور فقہ پر ۱۸ جلدوں میں ''الحاوی'' ان کی علمی وسعت کا ثبوت ہیں۔④

---

① ''اخنع اسم عند اللّٰہ تبارک وتعالیٰ یوم القیامۃ رجل تسمی ملک الاملاک.'' (سنن ابی داؤد، ح: ۴۹۶۱، کتاب الادب، باب فی تغییر الاسم، قال الالبانی صحیح) قال ابن الجوزی: الذی ذکرہ الاکثرون فی جواز ان یقال ملک الملوک وھو القیاس اذا قصد بہ ملوک الدنیا الا انی لا اری الا ما رآہ الماوردی لان قد صح فی الحدیث ما یدل علی المنع ولکن الفقہاء المتاخرین عن النقل بمعزل. (المنتظم: ۲۶۵/۱۵)

② المنتظم لابن الجوزی: سنۃ ۴۲۹ھ ③ العبر فی خبر من غبر: ۲۷۰/۲ ④ سیر اعلام النبلاء: ۶۴/۱۸تا۶۷

اخلاقی و باطنی اصلاح کی مساعی:

اصلاحِ اخلاق اور تزکیۂ باطن کے میدان میں سمرقند کے ایک دیہات ''خرقان'' کے نامور صوفی بزرگ شیخ ابوالحسن خرقانی رحمہ اللہ (۳۵۲ھ۔ ۴۲۵ھ) اس دور میں بہت مشہور ہوئے۔ انہوں نے اصلاح ودعوت اور تزکیہ وسلوک کے سلسلے کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ بے شمار لوگ ان کے حلقے سے وابستہ ہو کر صفائے باطن کی دولت سے آراستہ ہوئے۔

ان کا مقام اتنا بلند تھا کہ سلطان محمود غزنوی ان کی خدمت میں دست بستہ حاضر ہوا اور بہت کچھ زر وجواہر پیش کیے مگر انہوں نے ایک درہم تک نہ لیا اور فرمایا:

''میں اپنے لشکر کی غذا کا انتظام کرا چکا ہوں، تم اسے اپنے لشکر پر خرچ کرو۔''

مشہور ہے کہ محمود غزنوی کی فتوحات میں ان بزرگ کی دعاؤں کا بڑا دخل تھا۔ ①

فقیہ ابواللیث سمرقندی رحمہ اللہ (م ۳۷۵ھ) بھی اس دور کی ایک نامور شخصیت ہیں جنہوں نے درسِ فقہ وحدیث کے علاوہ عوامی اصلاح پر توجہ مرکوز کی۔ ان کی ایک مختصر کتاب ''تنبیہ الغافلین'' کو ایسی شہرت نصیب ہوئی کہ دنیا کی تمام عالمی زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں اور اَن گنت لوگوں کی زندگیاں اس کی وجہ سے پلٹ چکی ہیں۔ ②

جرح وتعدیل:

باطل فرقے جعلی روایات سازی کے بل بوتے پر پھلتے پھولتے تھے جس کی روک تھام کے لیے علم اسمائے رجال اور جرح وتعدیل کا فن ایجاد ہوا۔ چوتھی صدی ہجری میں اعتقادی فتن کی کثرت کے پیشِ نظر فنِ جرح وتعدیل کو بہتر بنانے کے لیے کئی علماء نے اَن تھک کوشش کی۔ مایہ ناز محدث اور نقاد ابن حِبّان بُستی رحمہ اللہ (م ۳۵۴ھ) نے ٹھوس اور منفرد کام کیا۔ ''الثقات'' میں معتبر راویوں اور ''المجروحین'' میں کمزور راویوں کے حالات قلم بند کیے۔ انہوں نے صحیح احادیث کا ایک بیش قیمت ذخیرہ بھی جمع کیا جو ''صحیح ابن حبان'' کے نام سے پورے عالمِ اسلام میں مقبول ہوا۔ اسی طرح سیرت پر ایک نہایت عمدہ کتاب لکھی جو ''سیرت ابن حبان'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ ③

اس دوران ابن عدی رحمہ اللہ (م ۳۶۵ھ) نے ضعیف اور کذاب راویوں کے حالات پر نہایت جامع کام کیا جو ''الکامل فی ضعفاء الرجال'' کے نام سے سات جلدوں میں منظرِ عام پر آیا۔ ④

پھر امام دار قطنی رحمہ اللہ (م ۳۸۵ھ) نے قلم اٹھایا اور ''الضعفاء والمتروکون'' اور ''المؤتلف والمختلف'' جیسی عظیم الشان کتب تحریر کیں۔ ⑤

---

① الانساب للسمعانی: ۵/۹۳، ۹۴، ط حیدر آباد دکن
② سیر اعلام النبلاء: ۱۶/۳۲۲
③ سیر اعلام النبلاء: ۱۶/۹۲
④ سیر اعلام النبلاء: ۱۶/۱۵۴
⑤ سیر اعلام النبلاء: ۱۶/۴۴۹

دیگر علوم وفنون:

اسی دور میں ابوعبداللہ الحاکم نیشاپوری رحمۃ اللہ (۳۲۱ھ۔۴۰۵ھ) نے ''المستدرک'' جیسا ضخیم مجموعہ حدیث پیش کیا جس میں اگرچہ بہت سی روایات ضعیف ہیں مگر تقریباً ایک تہائی مواد بخاری اور مسلم کی شرط پر ہے۔اس لحاظ سے اس مجموعے میں بہت سی قیمتی روایات محفوظ ہوگئیں۔ ①

امام ابوبکر بیہقی رحمۃ اللہ (۳۸۴ھ۔۴۵۸ھ) نے ''السنن الصغریٰ''، ''السنن الکبریٰ''، ''دلائل النبوۃ''، ''شعب الایمان'' اور ''معرفۃ السنن والآثار'' جیسے حدیثی مجموعے مرتب کیے۔اس کے علاوہ عقائد میں ''الاعتقاد''، ''حیاۃ الانبیاء فی قبورہم'' اور ''البعث والنشور'' جیسی تصانیف پیش کیں۔ان کی ہر تصنیف آج تک علماء سے دادوصول کررہی ہے۔ ②

اسی دور میں فقہ پر بھی قابلِ قدر کام ہوا۔بغداد کے فقیہ امام قدوری رحمۃ اللہ (م ۴۲۸ھ) نے مختصر القدوری مرتب کی جو فقہ کا جامع اور مختصر متن ہے اور آج تک متداول ہے۔ ③

اسلامی تاریخ پر بھی نیا کام ہوا۔ابونعیم اصفہانی رحمۃ اللہ (۳۳۶ھ۔۴۳۰ھ) نے ''حلیۃ الاولیاء'' میں دورِ صحابہ سے چوتھی صدی ہجری تک کے عابدوں، زاہدوں، بزرگوں اور صوفیاء کے حالات جمع کیے۔ ④

اسی طرح خطیب بغدادی رحمۃ اللہ (۳۹۲ھ۔۴۶۳ھ) نے ''تاریخ بغداد'' مرتب کی جس میں بغداد کے محدثین، فقہاء، علماء ومشائخ اور دیگر مشاہیر کے حالات سند کے ساتھ روایات کی شکل میں جمع کیے گئے ہیں۔خطیب رحمۃ اللہ نے اصولِ حدیث پر بھی کام کیا اور ''الکفایہ فی علوم الروایۃ'' جیسی بہترین کتاب تصنیف کی۔ ⑤

علمائے اندلس کی خدمات:

اس دور میں اَندَلُس کے علماء نے بھی اُمت کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے قابلِ قدر علمی خدمات انجام دیں۔ان میں سے دو علماء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں: ایک علامہ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ (۳۶۸ھ۔۴۶۳ھ) جنہوں نے فقہ مالکی میں ''التمہید لمافی المؤطا من المعانی والاسانید'' اور صحابہ کے حالات پر ''الاستیعاب فی اسماء الصحابۃ'' جیسی ضخیم اور مفصل کتاب لکھی۔ ⑥

دوسرے علامہ ابن حزم ظاہری رحمۃ اللہ (۳۸۴ھ۔۴۵۶ھ) ہیں جنہیں علمائے اَندَلُس اپنے دور کا مجدد اور مجتہد مانتے تھے۔انہوں نے ''الفصل فی الملل والاھواء والنحل'' جیسی معرکۃ الآراء کتاب لکھ کر اسلام اور مذاہبِ باطلہ کے مابین فرق کو واضح کیا۔اسی طرح انہوں نے فقہ میں ''المُحلّٰی'' جیسا عظیم الشان شاہکار پیش کیا۔علم تفسیر میں ان کی ''الناسخ والمنسوخ''، علم انساب میں ''جمہرۃ انساب العرب'' اور سیرت پر ''جوامع السیرۃ'' بھی اپنی مثال آپ ہیں۔

① سیر اعلام النبلاء: ۱۷۶/۱۷
② سیر اعلام النبلاء: ۱۶۳/۱۸ تا ۱۶۶
③ سیر اعلام النبلاء: ۵۷۵/۱۷
④ سیر اعلام النبلاء: ۴۵۹/۱۷
⑤ سیر اعلام النبلاء: ۲۷۰/۱۸
⑥ سیر اعلام النبلاء: ۱۵۳/۱۸

اس کے علاوہ تاریخ، عقائد، تفسیر، حدیث اور دیگر موضوعات سے متعلق ان کے چھوٹے چھوٹے کئی رسائل ہیں جو علوم کا گنجینہ ہیں اور ''رسائلِ ابن حزم'' کے نام سے ان کا مجموعہ عام ملتا ہے۔[1]

ایک گمنام عالم کا کارنامہ:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ بغداد میں بنوبُویہ کے پہلے حکمران احمد بن بُویہ (معز الدولہ) نے مرنے سے پہلے اپنے عقائدِ باطلہ اور مظالم سے توبہ کر لی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اپنے محل میں وہ ایک متقی عالم کے ساتھ ہم کلام ہوا۔ باتوں باتوں میں ان عالم نے اس کے سامنے اہلِ سنت کے عقائد ونظریات کی تائید میں کچھ دلائل ذکر کیے۔ اسی دوران یہ بھی بتایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی صاحبزادی ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کرایا تھا۔

یہ سنتے ہی معز الدولہ چونک اٹھا اور کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! میں نے یہ بات کبھی نہیں سنی تھی۔''

اس دوران نماز کا وقت ہوا تو وہ عالم محل سے باہر جانے لگے۔

مُعز الدولہ نے پوچھا: ''کہاں جارہے ہیں؟''

فرمایا: ''نماز ادا کرنے۔''

مُعز الدولہ نے کہا: ''یہیں محل میں نماز کیوں نہیں ادا کر لیتے؟''

انہوں نے کہا: ''تمہارا محل غصب کی گئی زمین پر تعمیر کیا گیا ہے۔'' اور وہاں سے تشریف لے گئے۔

قوتِ استدلال، بے غرضی اور پرہیز گاری کے اس منظر سے معزالدولہ بہت متاثر ہوا۔ اس نے شیعی عقائد سے توبہ کر لی اور مرنے سے پہلے اپنے گناہوں اور ظلم وستم پر بھی توبہ واستغفار کرتا رہا۔[2]

معز الدولہ کے توبہ تائب ہونے کا اس کے جانشینوں کے کردار پر کوئی اثر نہ پڑا۔ وہ بدستور رفض اور ظلم وستم کی سرپرستی کرتے رہے۔ تاہم اس واقعے سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حکمت واخلاص اور للّٰہیت کے ساتھ کی گئی تبلیغ بے دین لوگوں پر بھی کچھ نہ کچھ اثر کیے بغیر نہیں رہتی اور بعض اوقات غیر متوقع طور پر کایا پلٹ جاتی ہے۔

نتائج:

غرض چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں گمراہ فرقوں اور فتنوں کی سرکوبی کے لیے علمی وتبلیغی میدانوں میں اَن تھک جدوجہد کی گئی جو بارآور ہوئی۔ ان علماء کی کوششوں سے پہلی اور دوسری صدی ہجری میں پیدا ہونے والے اکثر گمراہ فرقے جیسے: خوارج، مرجئہ، قدریہ، جہمیہ وغیرہ پانچویں صدی ہجری کے بعد بالکل ختم ہوگئے۔ معتزلی فتنے کا زور بھی ٹوٹ گیا اور انجامِ کار اہل سنت والجماعت ہی عوامی اور سرکاری سطح پر غالب رہے۔

◆◆◆

[1] سیر اعلام النبلاء: ۱۸/۱۸۶

[2] البدایۃ والنہایۃ: ۱۵/۳۰۵، ۳۰۶

زوال خلافتِ بغداد

اختتامی دور

پہلا مرحلہ

خلافتِ عباسیہ سلجوقی سلاطین کے سایے میں

القائم کی دوبارہ تخت نشینی سے سلطان مسعود سلجوقی کی وفات تک

۴۵۰ھ تا ۵۴۷ھ

(۹۷ برس)

سلاجقہ

عباسی خلیفہ القائم سلجوقی سلطان طُغرل بیگ کی مدد سے ۴۵۱ھ میں دوبارہ مسند نشین ہوا تھا۔اس کے بعد وہ سترہ سال زندہ رہا۔خلفائے بغداد کی عزت وحرمت اب دوبارہ بحال ہوگئی تھی۔سلجوقی سلاطین ان کے مددگار تھے۔شرط یہ تھی کہ بغداد کی جامع مسجد میں جمعے کے خطبے کے دوران خلیفہ کے ساتھ سلجوقی سلطان کے لیے بھی دعائے خیر کی جائے گی۔رمضان ۴۵۵ھ میں سلطان طُغرل زندگی کی ۷۰ بہاریں دیکھنے کے بعد دنیا سے کوچ کر گیا۔اس کی وفات رَے میں اور تدفین مَرو میں اپنے بھائی چغر بیگ کی قبر کے ساتھ ہوئی۔[1]

سلطان طُغرل بیگ۔بانیٔ سلجوقی سلطنت:

اس سے پہلے کہ ہم خلیفہ القائم اور اس کے جانشینوں کے حالات بیان کریں،مناسب ہے کہ ایک نگاہ سلجوقی سلاطین کے حالات پر ڈال لی جائے۔

ترکستان میں ترک دو حصوں میں تقسیم چلے آرہے تھے:ایک وہ جو سابقہ مذاہب پر تھے۔دوسرے وہ جو ایمان لا چکے تھے۔یہ لوگ''ترک الایمان'' کہلاتے تھے۔یہی لفظ رفتہ رفتہ''ترکمان'' بن گیا۔ترکمان ترکستان کے مغربی حصے میں آباد تھے جو ماوراءالنہر کہلاتا ہے۔غیر مسلم ترک زیادہ تر دریائے سیحوں (سیر دریا) کے پار شرقی ترکستان میں آباد تھے۔یہ لوگ''ترکانِ غُز'' کہلاتے تھے۔پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں ترکانِ غُز وسطِ ایشیا اور خراسان کے مسلم حکمرانوں کے لیے دردِ سر بنے رہے۔غزنوی اور سلجوقی سلاطین کو اکثر و بیشتر ان کی چیرہ دستیوں کا سامنا رہا۔

مسلم ترکستان کی سرحد پر ایک چھوٹا سا شہر''جند'' واقع تھا جس پر ترکانِ غُز حملے کرتے رہتے تھے۔چوتھی صدی ہجری میں سلجوق نامی ایک غیر مسلم ترک اپنا علاقہ چھوڑ کر دریائے سیحون کے پار جند کے مضافات میں آبسا۔پھر اسی شہر کے حاکم کی دعوت سے متاثر ہو کر ایمان لے آیا۔اس کے بعد اس کی زندگی جہاد کے لیے وقف ہوگئی۔وہ عمر بھر غیر مسلم ترکوں کے خلاف مجاہدین کی صفِ اوّل میں لڑتا رہا۔ترک بہادروں کی بڑی عزت کرتے ہیں؛اس لیے سلجوق کی دلیری اسے سردار بنانے کے لیے کافی ثابت ہوئی۔جب چینی حکمران ایلک خان نے حاکمِ بخارا نوحِ ثانی کے خلاف حملہ کیا تو سلجوق نے دفاعی لڑائی میں سرفروشانہ کارنامے دکھائے یہاں تک کہ اسی لڑائی میں اس کا جوان بیٹا میکائیل کام آگیا،یوں میکائیل کے کم سن بچے طُغرل بیگ اور چغر بیگ یتیم ہوگئے۔سلجوق نے اپنے پوتوں کو کڑی تربیت دے کر انہیں

[1] العبر فی خبر من غبر: ۲/۳۰۳

شجاعت وقیادت کے وہ سارے گُر سکھائے جو کسی فاتح کے لیے لازمی ہیں۔سلجوق نے ۱۰۷ سال کی عمر میں وفات پائی اور جند میں مدفون ہوا۔میکائیل کے علاوہ بھی سلجوق کے کئی بیٹے تھے اور اُس وقت تک ہر ایک کی اولاد فنونِ حرب میں نام پیدا کر چکی تھی مگر سلجوقی سلطنت کی تاسیس میکائیل کے دو بیٹوں: طغرل بیگ اور چغر بیگ ہی نے کی۔

طُغرل بیگ:

طغرل بیگ کا اصل نام محمد تھا۔وہ ۳۸۵ھ میں پیدا ہوا تھا۔اس نے اپنے دادا سلجوق سے تربیت حاصل کی تھی؛ لہٰذا اپنی ریاست کو اسی کی طرف موسوم کر کے ''سلجوقی سلطنت'' کا نام دیا۔وسطِ ایشیا کے دوسرے حکمرانوں نے جو سلجوقیوں کو طغرل بیگ کی قیادت میں منظم ہوتا دیکھ کر خوفزدہ تھے، اس نئی طاقت کو دبانے کی پوری کوشش کی مگر انہیں ہر جگہ منہ کی کھانا پڑی اور طغرل بیگ نے پہلے ترکستان اور پھر خراسان کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔اس کے بعد خوارزم اور رے بھی مسخر کر لیے۔حیرت انگیز طور پر یہ ساری فتوحات صرف پانچ سالوں میں ہوئیں۔

سلجوقیوں کا ظہور سچ مچ ایک کرشمۂ قدرت تھا جس نے بدعقیدہ حکومتوں کی بیخ کنی کر کے اسلام کو از سرِ نو زندہ کیا اور خلافتِ عباسیہ میں ایک نئی روح ڈال کر مسلمانوں کو اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا۔

فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو سلجوقیوں نے دو مراکز بنا لیے: ایران وعراق کے لیے رَے کو پایۂ تخت قرار دیا گیا جہاں طغرل کا دربار لگتا تھا۔ترکستان کے لیے مَرو کو مرکز بنایا گیا جہاں طغرل کا بھائی چغر بیگ حکومت کرتا تھا۔دونوں بھائی یک جان دو قالب کی طرح کام کرتے تھے۔

ان کی اولاد میں الپ ارسلان اور پھر ملک شاہ ان دونوں مراکز اور ماتحت تمام صوبوں کے تنہا حکمران رہے۔تاہم تین پشتوں کے بعد یہ دونوں مراکز دوبارہ الگ ہوگئے۔جن سلجوقی حکمرانوں نے مَرو کو مرکز بنا کر وسطِ ایشیا اور خراسان کا انتظام سنبھالا وہ سلاجقۂ خراسان کہلائے۔جنہوں نے رَے کو مرکز قرار دے کر ایران وعراق میں جہانبانی کی وہ سلاجقۂ عراق کے طور پر مشہور ہوئے۔اس کے بعد ایشیائے کوچک کے سلجوقی امراء بھی خود مختار ہوگئے اور سلجوقیوں کا یہ تیسرا گروہ ''سلاجقۂ روم'' کے نام سے موسوم ہوا۔[1]

طغرل رعایا پرور، دیندار اور نماز باجماعت کا پابند انسان تھا۔ہر پیر اور جمعرات کو روزہ رکھتا تھا۔مساجد کی تعمیر اور صدقہ وخیرات کا شائق تھا۔اس نے ترکوں کو متحد کر کے چند سال کی مدت میں اتنی بڑی حکومت بنالی کہ مؤرخ انگشت بدنداں ہیں۔طغرل کی کوئی اولاد نہیں تھی۔اس کے انتقال سے کچھ مدت پہلے اس کا بھائی چغر بیگ بھی فوت ہو چکا تھا؛ اس لیے طغرل کے بعد اس کے بھتیجے یعنی چغر بیگ کے بیٹے الپ ارسلان نے حکومت سنبھال لی۔[2]

الپ ارسلان اور معرکۂ مَلاز کُرد:

الپ ارسلان اپنے باپ اور چچا کی طرح شجاعت کا پیکر تھا۔اس کے دور میں عراق، خراسان، آذربائی جان اور

[1] المنتظم: ۲۳۳/۸
[2] سیر اعلام النبلاء: ۱۰۹/۱۸ تا ۱۱۱

ایشیائے کوچک تک سلجوقی پرچم لہرانے لگے۔ اسلام کے ان نئے محافظوں کو دیکھ کر نصرانی طاقتیں جل بھن رہی تھیں۔
قیصر روم ارمانوس سالہا سال سے جنگ کی بھرپور تیاریاں کر رہا تھا۔ اس نے دوسرے یورپی ممالک کی افواج کو ساتھ ملا کر ایک بہت بڑا لشکر تیار کر لیا تھا جس میں دو سو پادری اور نواب تھے جن کی قیادت میں ۳۵ ہزار منتخب شہ سوار تھے۔ ۳۵ ہزار فرنگی دوسرے یورپی ممالک کے تھے۔ ۱۵ ہزار فوج خاص قُسطَنطِینِیَہ کی تھی۔ ایک لاکھ سپاہی شہروں کے محاصرے کے لیے تھے جبکہ ایک لاکھ رضا کار الگ بھرتی کیے گئے۔ بھاری سامان کی نقل وحمل کے لیے چار سو بیل گاڑیاں تھیں۔ بیسیوں مناجنیق تھیں جن میں سے بڑی منجنیق اتنی بھاری بھرکم تھی کہ اسے بارہ سو افراد ل کر چلاتے تھے۔ اس کی مار مضبوط سے مضبوط فصیل کو توڑنے کے لیے کافی تھی۔

منصوبہ یہ تھا کہ ایشیائے کوچک اور کردستان سے ہوتے ہوئے لشکر سیدھا سلجوقیوں کے پایۂ تخت رَے پہنچے گا۔ وہاں سے بغداد کا رخ کرے گا۔ اسے فتح کر کے پھر شام اور بیت المقدس پر قبضہ کرے گا۔

روانگی سے پہلے قیصر نے الگ الگ اسلامی صوبے مختلف نوابوں کے نام کر دیے۔ جس نواب کو بغداد کی گورنری کے لیے نامزد کیا تھا، اسے مذاقاً کہا: ''وہاں قبضہ کر کے بوڑھے شریف خلیفہ کو کچھ نہ کہنا، وہ اپنا دوست ہے۔''

پادری جو اس مہم پر بڑے جوش وخروش سے جا رہے تھے، بولے: ''بادشاہ سلامت! ہم سردیوں کا موسم رَے میں گزاریں گے اور گرمیاں عراق میں۔ شام کے مقدس مقامات واپسی پر دیکھیں گے۔''

ان امنگوں کے ساتھ ۴۶۳ھ میں قیصر لگ بھگ تین لاکھ افراد کا لشکر لیے آبنائے قُسطَنطِینِیَہ کے پار اترا اور عالم اسلام کی سرحدیں روندنے لگا۔

الپ ارسلان ان دنوں شام آیا ہوا تھا اور افواج کو رخصت دے کر واپسی کے سفر میں کردستان کی ایک بستی ''خوئی'' میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اسے جب یہ اطلاع ملی تو ششدر رہ گیا۔ اس کے پاس بمشکل ۱۵ ہزار سپاہی تھے۔ باقی افواج پوری مملکت میں دور دراز کے علاقوں میں تعینات تھیں۔ ادھر قیصر پیش قدمی کرتا ہوا ''مَلازگرد'' تک پہنچ گیا تھا۔ راستے کی ہر اسلامی بستی میں آگ اور خون کا وحشیانہ کھیل جاری تھا۔

الپ ارسلان اپنے نام کی طرح شیر دل تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ پیچھے ہٹا تو عراق وخراسان تک اس طوفان کو روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اس نے اپنے اہل وعیال کو وزیر سلطنت نظام الملک طوسی کی نگرانی میں ہمدان بھیج دیا اور امراء کو وصیت کرتے ہوئے کہا: ''میں خطروں سے کھیلنے والوں کی طرح یہ لڑائی لڑ کر رہوں گا۔ اگر بچ گیا تو ٹھیک، ورنہ میرے بعد میرا بیٹا ملک شاہ حکمران ہوگا۔ امید ہے تم اس کی اطاعت کرو گے۔''

اس نے ہراول دستے کو آگے بھیجا جس نے حریف کے ہراول کو شکست دے کر ان کے سالار کو گرفتار کر لیا۔ تاہم ابھی اڑھائی لاکھ کا ٹڈی دل پیچھے آ رہا تھا۔ الپ ارسلان اپنے پندرہ ہزار سپاہیوں کو لے کر ان کی طرف بڑھا۔ بدھ ۲۵ ذوالقعدہ ۴۶۳ھ کو ''رہوہ'' نامی ایک وادی میں لشکر آمنے سامنے ہوئے۔ الپ ارسلان نے اپنے

سامنے ایک سیلاب ناپیدا کنار کو ٹھاٹھیں مارتا دیکھا تو محسوس کیا کہ اس فوج سے مقابلہ تدبیر کے خلاف ہے۔ اس نے اپنی کمزوری ظاہر کیے بغیر قیصرِ روم کی طرف پیغام بھیجا کہ خلیفۂ بغداد کو ضامن بنا کر صلح کر لی جائے اور دونوں لشکر اس مقام کو سرحد قرار دے کر واپس ہو جائیں۔ قیصر نے سلطان کے ایلچی کو متکبرانہ لہجے میں جواب دیا:

''میں نے بھاری سرمایہ خرچ کر کے اتنی زبردست فوج کشی اس لیے نہیں کی کہ فتح کے قریب پہنچ کر لوٹ جاؤں۔ سلطان کا پایۂ تخت رے فتح کر کے ہی میری واپسی ہوگی۔ میں باقی اسلامی شہروں کا وہی حال کروں گا جو ایشیائے کوچک کا کر چکا ہوں۔''

یہ جواب سن کر الپ ارسلان کا چہرہ غیرت سے سرخ ہو گیا۔ اس نے جان کی بازی لگا کر ایسی لڑائی لڑنے کا فیصلہ کر لیا جس میں بظاہر کامیابی کے امکانات بہت کم تھے۔ ایک ہی آسرا تھا کہ اللہ کی وہ مدد شاملِ حال ہو جائے جو بدر و حنین میں نازل ہوئی تھی۔ سلطان کے امامِ صلوٰۃ نے بھی اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا:

''آپ اللہ کے دین کی خاطر اور اس کی نصرت کے بھروسے پر لڑ رہے ہیں، امید ہے آپ کو فتح نصیب ہوگی۔''

دو دن تک فریقین صف بندی کرتے رہے۔ جمعے کے دن سلطان کے امامِ صلوٰۃ نے کہا:

''آپ جمعے کے خطبے کے وقت حملہ کریں جب خطیب ہمارے لیے دعا کر رہے ہوں گے۔''

سورج بلند ہونے تک سپاہی صف بستہ ہو چکے تھے۔ الپ ارسلان سفید کپڑے پہنے پہلی صف میں کھڑا ہو گیا۔ وقت ہوتے ہی اس نے نماز پڑھائی۔ پھر دیر تک خاک پر سربسجود رہا اور زار و قطار روتے ہوئے فتح و نصرت کی دعا مانگتا رہا۔ اس کے بعد امرائے فوج سے خطاب کر کے کہا:

''میں نے ٹھان لی ہے کہ دشمن پر ٹوٹ پڑوں۔ یا تو مراد پاؤں گا یا شہید ہو کر جنت میں جاؤں گا۔ نہ اب کوئی سلطان ہے نہ ماتحت۔ تم میں سے جو واپس جانا چاہتا ہے، چلا جائے۔ میں تمہاری طرح عام مجاہد ہوں۔ ساتھ دینے والے کے لیے مالِ غنیمت ہے یا جنت۔ بھاگنے والے کے لیے دوزخ ہے یا ذلت۔''

امراء اور سپاہیوں نے بیک آواز کہا: ''ہم آپ کے تابعدار ہیں۔ آپ حملہ کریں۔ ہم ساتھ ہیں۔''

الپ ارسلان نے کمان لٹکائی، ترکش باندھا، تلوار سونتی اور نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے فوج کو حملے کا حکم دیا۔ دونوں لشکر قہر و غضب کے پیکر بن کر بری طرح ٹکرا گئے اور گھمسان کی جنگ ہونے لگی۔ چند گھنٹوں کی خوں بار لڑائی کے بعد الپ ارسلان نے حریف کے قلب پر دھاوا بول دیا۔ اس حملے نے اڑھائی لاکھ کے ٹڈی دل کو چیر کر رکھ دیا۔ رومیوں کے قدم اس طرح اکھڑے کہ دوبارہ نہ جم سکے۔ وہ اندھادھند راہِ فرار اختیار کرنے لگے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب شروع کیا جو پوری رات جاری رہا۔ رومیوں کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے اور ان کے بے شمار افراد قیدی بن گئے۔

اسلامی لشکر میں ایک غلام تھا جسے سب بالکل بدھو سمجھتے تھے۔ وہ زخمی دشمنوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ اسے زرق برق لباس میں ایک زخمی نصرانی دکھائی دیا۔ غلام تلوار سونت کر اس کی طرف دوڑا تو ایک فرنگی نے چیخ کر کہا:

''نہیں نہیں۔ یہ بادشاہ ہے۔''

یہ قیصر ارمانوس تھا جو انتہائی ذلت کے ساتھ ایک معمولی غلام کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ جب اسے خیمہ گاہ میں لاکر سلطان کو اطلاع دی گئی تو کسی کو یقین نہ آیا۔ سلطان کا ایک خادم کچھ دنوں پہلے سفارتی وفد کے ساتھ قیصر کے دربار میں جا چکا تھا۔ سلطان نے اسے تصدیق کے لیے بھیجا۔ وہ ہانپتے ہوئے واپس آیا اور بولا: ''جی ہاں۔ یہ تو وہی ہے۔''

اب ارمانوس کو سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ سلطان نے اسے تین چار بید رسید کیے اور ڈانٹ کر کہا:

''کیا میں نے صلح کی پیش کش نہیں کی تھی۔ تم نے قبول نہیں کی۔ آخر اتنی سرکشی کی کیا وجہ تھی!''

توہین کے احساس سے قیصر کا برا حال تھا۔ وہ بولا: ''مجھے ڈانٹ ڈپٹ سے مستثنیٰ رکھیے۔ باقی جو چاہے کیجیے۔''

الپ ارسلان نے کہا: ''اچھا بتاؤ! اگر تم مجھے گرفتار کرتے تو کیا سلوک کرتے؟'' وہ بولا: ''بہت برا۔''

سلطان نے کہا: ''تم نے سچ کہا۔ تم لوگ ایسا ہی کرتے۔ اب مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو کہ میں کیا کروں گا؟''

کہنے لگا: ''دو ہی باتیں ہوں گی: قتل کرو گے یا قیدی بنا کر ان سارے شہروں میں میرا تماشا دکھاؤ گے جنہیں میں فتح کرنے نکلا تھا۔ تیسری بات تو ہو نہیں سکتی؛ اس لیے کہنا بے کار ہے۔''

سلطان نے پوچھا: ''تیسری بات سے کیا مراد ہے؟''

ارمانوس نے کہا: ''یعنی تاوان لے کر مجھے چھوڑ دیں۔ اس کی توقع بہت مشکل ہے۔''

سلطان نے کہا: ''مگر میں یہی تیسری صورت اختیار کروں گا۔''

سلطان نے پندرہ لاکھ دینار کی ادائیگی اور روم میں قید ہر مسلمان کو رہا کر دینے کی شرطیں رکھیں۔ قیصر نے مان لیں اور سلطان نے اسے آزاد کر کے کچھ افراد کے ساتھ واپس بھیج دیا۔ قیصر ارمانوس اپنے ملک پہنچا تو امرائے روم اس شکستِ فاش پر اتنے بددل تھے کہ انہوں نے اسے معزول کر کے ایک اور رئیس کو تخت پر بٹھا دیا۔

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اسلام کی تاریخ میں یہ ایسی عجیب فتح تھی کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔''

الپ ارسلان کی فتوحات کا دائرہ پھیلتا چلا گیا، وہ مصر فتح کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ ۴۶۵ھ میں اچانک ایک قیدی کے حملے کا نشانہ بن کر قتل ہو گیا۔ اس کی عمر چالیس سال تھی۔ [1]

ملک شاہ:

الپ ارسلان کے بعد اس کا بیٹا ملک شاہ تخت نشین ہوا۔ اس نے ۲۲ سال حکومت کی اور مسلسل فتوحات کے ذریعے اتنی بڑی حکومت قائم کی جو شرقاً غرباً چین کے صوبے کاشغر سے مصر کی سرحد تک، اور شمالاً جنوباً خلیج قُسطَنطِینیہ سے بحرِ ہند تک وسیع تھی۔ اس کے دور میں ماوراء النہر، آذربائی جان، الجزیرہ، شام کا اکثر علاقہ اور ایشیائے کوچک سمیت متعدد ممالک سلجوقی سلطنت میں شامل ہو گئے۔ مؤرخین کے بقول اتنی بڑی بادشاہت ماضی میں کبھی دیکھنے سننے میں

[1] المنتظم: ۸/۲۷۶ تا ۲۷۸؛ دول الاسلام للذهبی: ۱/۲۷۲، ۲۷۳

نہیں آئی تھی۔ وہ ایک عادل اور علم دوست حکمران تھا۔ اس نے ہر قسم کے ٹیکس معاف کر کے عوام کو خوش حال کر دیا تھا۔ سیر و شکار اور عمارتیں بنوانے کا شوقین تھا۔ اس نے بکثرت مساجد، مدارس، پل اور قلعے تعمیر کرائے۔ بغداد کی سب سے بڑی مسجد جامع کبیر اس کی یادگار تھی۔ ① رسول اللہ ﷺ سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ ذکرِ گرامی پر اشک بار ہو جاتا تھا۔ ایک بار حاجیوں کے قافلے کو رخصت کرتے ہوئے کہنے لگا: ''روضۂ اطہر پر سلام عرض کرنا۔ کہنا کہ ایک نالائق غلام سلام عرض کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا: اگر حاضری کا مقدور ہوتا تو اس قافلے سے کبھی پیچھے نہ رہتا۔'' یہ کہہ کر خود بھی رویا اور سب حاضرین کو رُلا دیا۔ شوال ۴۸۵ھ میں وہ بیمار پڑ کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کی عمر ۳۹ سال تھی۔ ②

مشہور مہندس عمر خیام:

ملک شاہ کے دور میں علوم و فنون کو بھی بہت ترقی ملی۔ اس نے نیشا پور میں ایک بہترین رصدگاہ بنوائی جس کا انتظام اس دور کے مشہور فلکیات دان اور مہندس عمر خیام (م ۵۱۵ھ) کے سپرد تھا۔ عمر خیام کو دنیا اس کی نکتہ آفریں فارسی رباعیوں کی وجہ سے جانتی ہے جن کا ترجمہ یورپ کی ہر زبان میں ہو چکا ہے اور ایک ہزار سال گزرنے پر بھی مغربی فضلاء ان پر سر دُھن رہے ہیں۔ وہ مذہب کے لحاظ سے زیدی معتزلی تھا مگر تعصب سے دور تھا۔ خود کہتا تھا کہ میں زیدی ہوں مگر عمل سلطان کے حنفی مسلک پر عمل کرتا ہوں۔ عمر خیام کی رباعیات سے آزاد مشربی جھلکتی ہے مگر وہ عام رِند مذہب فلاسفہ کے برخلاف حلال و حرام کے درمیان فرق کرتا تھا۔ اس کی آخری عمر کے معمولات سے بھی پتا چلتا ہے کہ وہ توبہ تائب ہو چکا تھا۔ اس کے ایک شاگرد کا کہنا ہے کہ اس کی وفات عشاء کی نماز ادا کرتے ہوئے سجدے کی حالت میں ہوئی تھی۔ عمر خیام کا اصل فن علمِ ہیئت، ریاضی اور فلکیات تھا۔ اس نے الجبرا پر ایک عمدہ کتاب لکھی جس میں ریاضی دانوں کی بہت سی مشکلات کا حل موجود ہے۔ وہ ایک اچھا طبیب بھی تھا اور نحوی بھی۔ طب اور نحو میں اس کی تصانیف بڑی مقبول رہیں۔ اس نے ''زیج ملک شاہی'' کے نام سے ایک نئی شمسی تقویم بھی پیش کی۔ ③

نظام الملک طوسی:

ملک شاہ کا وزیر نظام الملک طوسی اسلامی تاریخ کی مشہور و معروف شخصیت ہے۔ ملک شاہ کی حکومت کو مثالی بنانے میں اس کا سب سے بڑا حصہ تھا۔ ملک شاہ فتوحات کرتا جاتا اور نظام الملک نہایت خوش اسلوبی سے مختصر وقت میں مفتوحہ علاقوں کے انتظامی امور قابلِ رشک بنا دیتا تھا۔

---

① وفیات الاعیان: ۲۸٤/۵ ② سیر اعلام النبلاء: ۵٦/۱۹

③ تتمة صوان الحکمة، ص ۲٤؛ خیام از سید سلیمان ندوی ص ۱۲۰ تا ۱۴۰، ۲۹۶ تا ۳۳۰؛ فارسی ادب کے چند گوشے از انور مسعود، طدوست پبلیکشنز
ملحوظہ: مشہور ہے کہ عمر خیام کی تقویم گریگوری تقویم سے بہتر ہے۔ گریگوری تقویم میں فطری نظام شمسی سے ۳۳۰۰ سالوں میں ایک دن کا فرق پڑتا ہے۔ جبکہ عمر خیام کی تقویم میں پانچ ہزار سالوں میں ایک سال کا فرق ہوتا ہے۔ اسی کو اہلِ یورپ نے معمولی رد و بدل کے ساتھ عام کیا جس پر آج ساری دنیا عمل پیرا ہے اور جس میں ہر دو تین سال بعد فقط دو چار سیکنڈ کا فرق نکلتا ہے۔ یہ بات اسی طرح منقول چلی آ رہی ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ پانچ ہزار سال میں ایک دن ساقط ہونے کی بات غالباً کسی کاتب کے سہو کی بناء پر منقول چلی آ رہی ہے۔ درست پچاس ہزار سال ہوگا؛ کیوں کہ پانچ ہزار سال میں ایک دن کے فرق کا مطلب ہے ہر سال ۱۷ سیکنڈ کا فرق ہو، جبکہ پچاس ہزار سال میں ایک دن کا فرق ہو تو ایک سال میں ایک اعشاریہ سات سیکنڈ کا فرق پڑتا ہے جو مروجہ شمسی تقویم کے انتہائی قریب تر ہے۔

عالم اسلام کا یہ مایہ ناز وزیر ۴۰۸ھ میں بیہق کے ایک کاشت کار کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ دس سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ مروجہ علوم کے ساتھ فقہ شافعی کی تعلیم حاصل کی اور فقہائے شافعیہ میں شمار ہوا۔ ریاضی اور انتظامی امور میں اس کی مہارت ضرب المثل بن گئی۔ سلجوقی دربار میں ملازم ہوا تو حکمرانوں نے اس کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا۔ اس طرح ترقی کرتے کرتے وہ الپ ارسلان کے دور میں وزیر بن گیا۔

اس کا معمول تھا کہ ہر صبح سو دینار (تقریباً پچیس ہزار روپے) خیرات کرتا۔ دفتری کام کے لیے ہمیشہ باوضو بیٹھتا اور دو رکعت نفل پڑھ کر کام شروع کرتا۔ پیر اور جمعرات کو روزہ رکھتا۔ علماء، بزرگانِ دین اور صالحین کا بے حد احترام کرتا اور ان کی ہر ممکن خدمت بجا لاتا۔ وہ ذہین وفطین، مہربان، رعایا پرور اور تجربہ کار انسان تھا۔ ملک شاہ کی وسیع وعریض سلطنت کو سنبھالنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اگر منتظم کمزور ہو تو ایک چھوٹا ملک بھی ابتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ نظام الملک کی حیرت انگیز انتظامی قابلیت تھی کہ اس نے اتنی بڑی مملکت کو اس خوبی سے سنبھال رکھا تھا کہ ہر زبان پر اس کی تعریف تھی۔ اس نے خوارزم (اورگنج)، مشہد اور طوس جیسے شہر از سر نو تعمیر کرا کے ان کی رونق کو چار چاند لگا دیے۔

اس کے دورِ وزارت کو علوم کے فروغ اور اہلِ علم کے احترام کا دور کہا جاتا ہے۔ اس نے بڑے بڑے کتب خانے قائم کیے۔ دینی کتب کی تصنیف واشاعت کی سرپرستی کی۔

تعلیم کو وہ اسلامی معاشرے کی بنیاد سمجھتا تھا اور اپنے پورے دورِ وزارت میں جابجا مدارس قائم کرتا چلا گیا۔ بغداد کا شہرۂ آفاق ''مدرسہ نظامیہ'' اسی کا تعمیر کردہ تھا۔ یہ عالم اسلام کی پہلی باقاعدہ جامعہ تھی جہاں مختلف علوم وفنون کے ماہرین جمع تھے اور طلبہ کی خوراک ورہائش کا انتظام بھی تھا۔ مدرسہ نظامیہ کی تعمیر ۴۵۷ھ میں شروع ہوئی اور ۴۵۹ھ میں وہاں تعلیمی سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے بعد نظام الملک نے نیشاپور اور اصفہان میں بھی ایسی ہی عظیم الشان درسگاہیں قائم کیں۔ نیز طوس، مرو، ہرات، بلخ اور بصرہ میں بھی مدارس کھلوائے جن میں سے ہر ایک ''مدرسہ نظامیہ'' کہلایا۔ نظام الملک عدلیہ اور انتظامی عہدوں کے لیے قابل افراد انہی درسگاہوں سے حاصل کرتا تھا۔

مشہور اسماعیلی ملحد حسن بن صباح اور نظام الملک طوسی لڑکپن میں ہم سبق تھے۔ حسن بن صباح نے اس کے ساتھ سلجوقی دربار میں کچھ عرصہ کام بھی کیا مگر اس کی ترقی سے جلتا رہا۔ بعد میں حسن بن صباح بے دینی کی راہ پر چل نکلا اور نظام الملک طوسی نیک کاموں میں آگے بڑھتا گیا۔ آخر کار حسن بن صباح نے ایک دہشت گرد گروہ تیار کر لیا اور نظام الملک کو قتل کرنے کے درپے رہا۔ رمضان ۴۸۵ھ میں نظام الملک طوسی حج کے سفر پر نکلا۔ جمعے کی شب نہاوند کے قریب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا کہ حسن بن صباح کا ایک گماشتہ درویش کے بھیس میں حاضر ہوا۔ طوسی نے حسب معمول اسے پاس بٹھا لیا۔ درویش نے موقع پاتے ہی خنجر نکالا اور اس کے دل میں اتار دیا۔

طوسی کے آخری الفاظ یہ تھے: ''قاتل کو کچھ نہ کہنا۔ میں نے اسے معاف کیا۔ لا الٰہ الا اللہ''[1]

[1] طبقات الشافعیہ للسبکی: ۳۱۲/۴؛ المنتظم: ۶۷/۹، ۶۸؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۴۸۵ھ

نظام الملک کا قتل ملک شاہ کے انتقال سے ایک ماہ پہلے ہوا تھا۔ بعض لوگ نظام الملک کے قتل میں ملک شاہ کو شریک قرار دیتے ہیں مگر یہ درست نہیں۔ یہ تو طے ہے کہ قاتل حسن بن صباح کے گروہ کا آدمی تھا۔ چونکہ اسے موقع واردات پر ہی لوگوں نے پکڑ کر قتل کر دیا تھا؛ اس لیے حسن بن صباح کا نام اس کے منہ سے نہ اگلوایا جا سکا۔ تاہم حملے کا انداز بھی باطنی فدائیوں جیسا تھا اور یہ بھی ثابت ہے کہ حسن بن صباح نظام الملک طوسی کو اپنا بدترین دشمن سمجھتا تھا۔

نظام الملک طوسی کے بعد اس کا بیٹا فخر الملک وزیر سلطنت بنا۔ پانچ سال بعد محرم ۵۰۰ھ میں وہ بھی ایک باطنی کے ہاتھوں شہید ہو گیا۔ اس کے بعد نظام الملک کا دوسرا بیٹا احمد اسی عہدے پر فائز ہوا۔[1]

دینی مدارس کا قیام۔ نظام الملک طوسی کا عظیم کارنامہ:

نظام الملک طوسی کا سب سے زندہ وجاوید کارنامہ اس طرز کے دینی مدارس کا قیام ہے جو آج تک چلے آرہے ہیں جہاں مختلف علوم وفنون کے اساتذہ جمع ہوتے ہیں، باقاعدہ نصاب کے تحت طلبہ کو تعلیم دی جاتی ہے اور طعام ورہائش سمیت ہر ضروری سہولت مہیا کی جاتی ہے۔ پہلی ساڑھے چار صدیوں میں ایسے مدارس کا کہیں وجود دکھائی نہیں دیتا۔

قدیم طرز یہ تھا کہ علوم وفنون کے ماہرین مساجد میں یا اپنے گھروں میں درس کے حلقے لگاتے تھے۔ طلبہ طے شدہ وقت میں حاضر ہوتے اور ان سے مستفید ہوتے۔ پردیسی طلبہ اپنی رہائش اور کھانے پینے کا انتظام خود کیا کرتے تھے۔ ان کی رہائش کرائے کے گھروں میں، کسی جان پہچان والے کے ہاں، کسی سرائے یا کسی مسجد میں ہوتی تھی۔ کھانے کی فکر بھی خود ہی کرنا پڑتی تھی۔ اس سلسلے میں مثال کے طور پر ایک واقعہ پیشِ خدمت ہے کہ علامہ برقانی (۳۳۶ھ۔ ۴۲۵ھ) زمانۂ طالب علمی میں اسفرائن گئے تاکہ مشہور محدث احمد بن بشر اسفرائنی (م ۳۷۰ھ) کی روایاتِ حدیث حاصل کریں۔ راستے میں ان کی رقم ضائع ہو گئی صرف ایک درہم رہ گیا۔ برقانی کہتے ہیں کہ میں نے وہ درہم ایک نان بائی کو دے دیا اور اس کے عوض روزانہ وہاں سے پکی پکائی روٹیاں کھا لیتا۔ اس دوران احمد بن بشر رحمہ اللہ سے روزانہ احادیث کا ایک جزو اپنے اوراق پر نقل کر لیتا۔ ایک ماہ گزرا تو اِدھر احادیث کا مجموعہ پورا نقل ہوا، اُدھر ایک درہم پورا ہو گیا اور مجھے وہاں سے کوچ کرنا پڑا۔[2]

نادار طلبہ کے لیے اس دور میں علم حاصل کرنا واقعی بہت مشکل تھا مگر وہ جفاکش لوگ تھے۔ کچھ نہ ملتا تو جب تک ہمت ہوتی فاقے کر کے بھی تعلیم کا سلسلہ نہ ٹوٹنے دیتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ لوگ ان کی ضرورت محسوس کر کے صدقہ وخیرات دے دیتے۔ جو اساتذہ خوشحال تھے وہ باصلاحیت اور ضرورت مند طلبہ کی مشکلات بھانپ کر بسا اوقات خود بھی مالی تعاون کر دیا کرتے تھے۔ دو چار خاص طلبہ کی خوراک ورہائش کا انتظام اپنے گھر یا مسجد میں کر دیتے تھے مگر ضابطہ یہی تھا کہ خوراک ورہائش کی ذمہ داری استاد پر نہیں ہوگی۔ اس طرزِ تعلیم میں دوسری بڑی مشکل یہ تھی کہ مختلف علوم وفنون کے لیے طلبہ کو درجنوں شہروں اور ملکوں کا سفر کرنا پڑتا تھا؛ کیوں کہ ماہرِ فن اساتذہ الگ الگ شہروں اور ملکوں میں آباد

[1] الکامل فی التاریخ: سنۃ ۵۰۰ھ

[2] سیر اعلام النبلاء: ۴۶۶/۱۷

تھے۔اس طرح طلبہ کی زندگی کا بڑا حصہ سفر میں گزر جاتا تھا۔

اگرچہ نظام الملک سے قبل بعض ایسے مدارس قائم ہو چکے تھے جہاں طلبہ کے لیے قیام وطعام کی سہولت مہیا تھی مثلاً: نیشاپور میں چار مدارس تھے۔ایک مدرسہ بیہقیہ، دوسرا مدرسہ سعدیہ جسے سلطان محمود غزنوی کے بھائی نصر بن سبکتگین نے تعمیر کرایا تھا، تیسرا صوفی اسماعیل بن علی استرابادی کا تعمیر کردہ مدرسہ اور چوتھا وہ مدرسہ جو امام ابواسحاق اسفرائنی کے لیے بنوایا گیا تھا، مگر ان مدارس میں طلبہ کے لیے کوئی نصاب مقرر نہ تھا۔[1] مختلف فنون کے اساتذہ یہاں آ کر بیٹھ جاتے اور طلبہ اپنے اپنے ذوق اور طلب کے مطابق ان کے حلقوں میں جا بیٹھتے تھے۔

نظام الملک طوسی نے باقاعدہ نصاب مقرر کر کے اور باضابطہ مدارس کی داغ بیل ڈال کر شعبۂ تعلیم کو ایک نئی جہت دی۔کہنے کو یہ درسگاہیں ''مدرسہ'' کہلاتی تھیں مگر درحقیقت یہ ''جامعات'' تھیں جہاں ہر علم وفن کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام تھا۔طلبہ کے لیے دارالاقامہ اور خوراک سمیت ہر سہولت مہیا تھی۔اساتذہ کے لیے معقول مشاہرے مقرر تھے۔

چونکہ اس نئے طرز کی افادیت سب پر عیاں تھی؛ اس لیے بہت تیزی سے دوسرے حکام اور امراء نے بھی اس کی تقلید کی اور اس کے بعد اس جدید طرز کے مدارس اور جامعات کے قیام کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔اگرچہ تقریباً ایک ڈیڑھ صدی تک علماء کے حلقوں میں تعلیم کا پرانا طرز بھی جاری رہا مگر رفتہ رفتہ مدارس کا طرز غالب آ گیا اور دو صدیوں بعد تعلیمی نظام دینی مدارس پر منحصر ہو گیا۔

سلجوقی حکمرانوں کی مختلف شاخیں:

سلجوقی حکمرانوں نے لگ بھگ ڈیڑھ صدی تک وسطِ ایشیا، خراسان، ایران، عراق اور شام پر حکومت کی۔ان کے عروج کا دور تقریباً ۶۰ سال تک رہا۔ملک شاہ کی وفات کے بعد مختلف علاقوں میں سلجوقی نوابوں اور امراء نے خود مختاری اختیار کر لی جس کی وجہ سے سلجوقی حکومت کمزور ہو گئی۔تقریباً ۲۵ سال تک خانہ جنگی کا شکار رہنے کے بعد سلطان سنجر سلجوقی کے زمانے میں اس خاندان نے دوبارہ قدم جمانے کی کوشش کی مگر اسے سابقہ عروج نصیب نہ ہوا۔

سلطان سنجر چار عشروں تک حکومت کر کے ۵۵۲ھ میں فوت ہوا۔اس کے آخری چار سال بڑی کس مپرسی میں گزرے۔وہ ترکانِ غز کے ہاتھوں قیدی بن گیا تھا۔جب رہا ہوا تو اس کی سلطنت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔اب سلجوقیوں کی صرف ایک قابلِ ذکر حکومت باقی رہ گئی جو ایشیائے کوچک میں تھی اور ساتویں صدی ہجری کے آخر تک قائم رہی۔

بنوعباس کے حالات کے ضمن میں سلاجقہ کا تذکرہ اس لیے ضروری تھا کہ وہ اس دور میں عالمِ اسلام کی سیاست کا اہم ترین کردار تھے۔اب آگے ہم دوبارہ خلفائے بنوعباس کے حالات بیان کرتے ہیں۔

---

[1] طبقات الشافعیه للسبکی: ۴/ ۳۱۴...... ہماری تلاش کے مطابق نظام الملک طوسی سے پہلے اس قسم کی کوئی تعلیم گاہ عالم اسلام میں موجود نہیں تھی۔علامہ عبدالقادر دمشقی (م ۹۲۷ھ) کی مدارس کی تاریخ پر تحقیقی کتاب ''الدارس فی تاریخ المدارس'' میں اسلامی ممالک کے سینکڑوں مدارس کا حال درج ہے۔ان میں سے کوئی بھی مدرسہ ''جامعہ نظامیہ'' سے پہلے قائم نہیں ہوا تھا۔

القائم

دوبارہ حکمرانی

ذوالقعدہ ۴۵۱ھ تا شعبان ۴۶۷ھ

۱۴ جنوری ۱۰۶۰ء تا ۱۴ اپریل ۱۰۷۵ء

سلطان طغرل سلجوقی کی مدد سے عباسی خلیفہ القائم نے ۲۵ ذوالقعدہ ۴۵۱ھ کو دوبارہ اقتدار سنبھالا تھا۔اس نے شعائرِ اسلام کو دوبارہ زندہ کیا اور ہر طرف امن وامان ہو گیا۔شیعہ کبھی کبھار ماتمی جلوس نکال لیتے تھے مگر محرم ۴۵۸ھ میں جلوس فسادات کا ذریعہ بنے تو سرکاری طور پر انہیں بند کر دیا گیا۔ساتھ ہی علماء کے اتفاق کے ساتھ دربارِ خلافت سے حکم نامہ جاری ہوا کہ صحابہ کو گالیاں دینے والے خارج از اسلام سمجھے جائیں گے۔[1]

سلجوقی وزیر نظام الملک کے تعاون سے ۱۰ ذوالقعدہ ۴۵۹ھ کو بغداد میں مدرسہ نظامیہ کا اجراء ہوا جس سے یہاں علماء وطلبہ کی وہ رونق ہوئی کہ اسلاف کے دور کی یادیں تازہ ہو گئیں۔اسی سال امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مزار کے ساتھ ایک اور بڑا مدرسہ قائم کیا گیا جہاں حنفی فقہاء درس دینے لگے۔[2]

بنو بُویہ کے دور میں شراب خانے کھل گئے تھے اور جسم فروشی کا دھندہ بھی شروع ہو چکا تھا۔علماء نے خلیفہ کو آگاہ کر کے ان برائیوں کو بند کرایا۔اقتدار کے ۴۴ سال پورے کرنے کے بعد القائم بیمار ہو کر ۱۳ شعبان ۴۶۷ھ میں انتقال کر گیا۔اس کی عمر تقریباً ۷۵ سال تھی۔[3]

نکتہ:

۳۳۴ھ سے ۴۶۷ھ تک مسندِ خلافت پر مسلسل متمکن رہنے والے چاروں خلفاء المطیع، الطائع، القادر اور القائم ''اِسمِ بَامُسَمّٰی'' تھے۔مطیع اور طائع نے بنو بُویہ کی انتہائی اطاعت کرتے ہوئے وقت گزارا۔قادر باللہ نے قدرت حاصل کر لی اور بنو بُویہ کا مدمقابل ثابت ہوا۔القائم کی حکومت چار عشروں سے زائد مدت تک قائم رہی اور اس دوران ایک بار برطرف ہونے کے بعد دوبارہ نئی شان کے ساتھ قائم ہو گئی۔

◆◆◆

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۷/۱٦
② البدایۃ والنہایۃ: ۱۲/۱٦
③ المنتظم: ۱٦۱/۱٦؛ البدایۃ والنہایۃ: ٤۷/۱٦

اَلْمُقْتَدِی بِاَمْرِ اللّٰہ

عبداللّٰہ بن محمد بن عبداللّٰہ القائم

شعبان ٤٦٧ھ تا محرم ٤٨٧ھ

اپریل ۱۰۷۵ء تا فروری ۱۰۹۴ء

القائم کے بعد اس کا پوتا المقتدی لامر اللہ کے لقب کے ساتھ خلیفہ بنا۔ اس کا زمانہ بڑا بابرکت رہا۔ معیشت روبہ ترقی تھی۔ سارے حکمران خلیفہ کی تعظیم وتوقیر کرتے تھے۔ حرمین، بیت المقدس اور شام میں اسی کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ اس نے بغداد سے گویّوں اور گلوکاراؤں کو نکال دیا اور اسے ایک مثالی اسلامی معاشرہ بنانے کی پوری کوشش کی۔ ①

تین مجاہد صفت بادشاہوں کا عروج:

اس کے دور میں تین عظیم مجاہد صفت بادشاہوں کو عروج حاصل ہوا: ایک ملک شاہ سلجوقی، جس نے چین سے ایشیائے کوچک تک کا علاقہ فتح کرلیا۔ دوسرا سلاجقۂ روم کا حکمران سلیمان بن قتلمش: جس نے ۴۷۷ھ میں رومیوں سے انطاکیہ اور رُہا واپس لے لیے۔ ② تیسرا یوسف بن تاشفین: جس نے مراکش کا شہر آباد کیا اور شمالی افریقہ میں مرابطین کی عالی شان امارت قائم کردی۔ خلیفہ نے اسے ''امیر المسلمین'' کا لقب دیا۔

سقوطِ صِقلّیہ:

تاہم اسی دور میں ایک بڑا سانحہ بھی رونما ہوا۔ وہ یہ کہ ۴۸۴ھ میں بحیرۂ روم کا اہم عسکری مرکز جزیرہ صِقلّیہ (سسلی) جہاں اڑھائی صدیوں سے اسلامی حکومت قائم تھی، مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ ③

شیعہ سنی فساد:

خلیفہ مقتدی کا دور پُرامن گزرا تاہم ۴۸۱ھ اور ۴۸۲ھ میں بغداد کو شیعہ سنی فسادات کا سامنا کرنا پڑا۔ ۴۸۱ھ کے فسادات معمولی تھے مگر ۴۸۲ھ میں یہ سلسلہ بڑھتا چلا گیا اور بے اندازہ جانی ومالی نقصان ہوا۔ ایک مرحلے پر فریقین کے قائدین نے مل کر طے کیا کہ شیعہ اپنی عبادت گاہوں پر یہ الفاظ آویزاں کریں گے: ''خیر الناس بعد رسول اللّٰہ ﷺ ابو بکر.'' جو شیعہ علماء صلح کے خواہاں تھے انہوں نے فیصلے پر عمل کیا مگر شیعہ عوام یہ دیکھ کر بھڑک اٹھے اور فیصلہ ماننے سے انکار کردیا جس سے دوبارہ کشت وخون شروع ہوگیا۔ آخر فوج کی مداخلت سے یہ ہنگامہ تھما۔ ④

خلیفہ مقتدی ۱۹ سال ۵ ماہ حکومت کرکے ۱۸ محرم ۴۸۷ھ کو فوت ہوا۔ اس کی عمر ۳۹ سال تھی۔ ⑤

① البدایة والنهایة: ١٦/ ٥٠؛ العبر فی خبر من غبر: ٢/٣٥٥

② الکامل فی التاریخ: سنة ٤٨٢ هـ، انطاکیہ ۱۱۸ سال اور رُہا ۵۵ برس سے رومیوں کے قبضے میں تھے۔

③ الکامل فی التاریخ: سنة ٤٨٢ هـ

④ الکامل فی التاریخ: سنة ٤٨٢ هـ

⑤ تاریخ الخلفاء، ص ٣٠٣؛ العبر فی خبر من غبر: ٢/٣٥٥

اَلْمُسْتَظْهِر بالله

احمد بن عبدالله المقتدی

محرم ۴۸۷ھ تا ربیع الآخر ۵۱۲ھ

فروری ۱۰۹۴ء تا اگست ۱۱۱۸ء

المقتدی کے بعد اس کا ۱۷ سالہ بیٹا احمد ''المستظہر'' کا لقب اختیار کر کے خلیفہ بنا۔ وہ نیک، مہربان، خوش اخلاق، عادل اور عوام کا محبوب حکمران تھا۔ تاہم اس کا دور فتنوں اور افراتفری سے بھرپور تھا۔ ①

ملک شاہ کے جانشینوں میں پھوٹ:

اس دور میں ملک شاہ سلجوقی کے جانشینوں میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ ملک شاہ کا بھائی تاج الدولہ تتش شام، الجزیرہ اور عراق کے وسیع علاقوں پر قابض ہوگیا اور ملک شاہ کے ۱۳ سالہ بیٹے سلطان برکیارُق سے حکومت چھیننے کے لیے لڑتا رہا یہاں تک کہ ۴۸۸ھ میں تتش خود اسی کش مکش میں قتل ہوگیا۔ ② سلطان برکیارُق قدم جمانے کے بعد اپنے چچا ارسلان ارغون سے خراسان چھیننے کے لیے آمادۂ پیکار رہا یہاں تک کہ ارسلان ارغون ۴۹۰ھ میں ایک قاتلانہ حملے کے دوران مارا گیا۔ خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر شام کے سلجوقی امراء خود مختار بن گئے اور اس عظیم ملک کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ ③

پہلی صلیبی جنگ۔ سقوطِ بیت المقدس:

سلجوقیوں کو باہم لڑتا بھڑتا دیکھ کر مصر سے بنوعبید نے شام پر چڑھائی کی اور بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ مسلمانوں کے انتشار سے فائدہ اٹھا کر یورپ نے صلیبی جنگ کا طبل بجا دیا اور لاکھوں نصرانی سپاہی انڈا کیے کو فتح کرنے کے بعد شعبان ۴۹۲ھ میں بیت المقدس پر قابض ہو گئے۔ مسلمانوں کے خوف کا یہ عالم تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مصحف جو طبریہ میں محفوظ تھا، دِمشق لے جانا پڑا کہ کہیں فرنگی اسے نہ چھین لیں۔ ④

سلجوقیوں میں طویل جنگ وجدل کے بعد صلح:

مسلم حکمران اس دوران بھی باہمی تنازعوں کا شکار تھے۔ ملک شاہ کا ایک بیٹا محمد اپنے بھائی سلطان برکیارُق کے خلاف کھڑا ہوگیا اور اسے خراسان سے دھکیل دیا۔ خلیفہ نے محمد کو سلطان مان لیا اور بغداد میں دستور کے مطابق اس کا نام خطبے میں شامل کر دیا۔ مگر برکیارُق نے محمد کو سلطان تسلیم نہ کیا اور آمادۂ پیکار رہا۔ ۴۹۳ھ اور ۴۹۴ھ میں دونوں بھائیوں کے درمیان دو بڑی جنگیں ہوئیں۔ ۴۹۵ھ میں مزید دو لڑائیاں ہوئیں۔ ۴۹۶ھ میں پانچواں معرکہ ہوا۔

① تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۳، ط نزار
② العبر فی خبر من غبر للذهبی: ۳۵۶/۲، ط العلمیة
③ العبر فی خبر من غبر: ۳۶۲/۲
④ تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۴، ۳۰۵

آخر پانچ سال کی زبردست خانہ جنگی کے بعد ۴۹۷ھ میں عمائدِ قوم اور علماء وفضلاء نے بیچ میں پڑ کر صلح کرائی۔ طے ہوا کہ ایران، الجزیرہ اور حجاز برکیارُق کے ہوں گے اور بغداد میں اس کا خطبہ پڑھا جائے گا۔ عراق، آذربائی جان اور اصفہان محمد کے ہوں گے جبکہ خراسان سنجر کے پاس رہے گا۔ اس فیصلے کے اگلے سال ۴۹۸ھ میں برکیارُق فوت ہو گیا اور محمد بن ملک شاہ اس کے پانچ سالہ بیٹے کی ولی عہدی منسوخ کرا کر خود سلطان بن گیا۔ ①

شام میں فرنگیوں کی مسلسل فتوحات:

سلطان محمد کے دور میں فرنگیوں کی غاصبانہ یلغار جاری رہی۔ ۴۹۷ھ میں وہ جُبَیل اور عکا پر قابض ہونے کے بعد حران کی طرف بڑھے۔ وہاں کے حاکم سقمان نے دس ہزار سپاہی لے کر ان کا سامنا کیا مگر اسے پسپائی ہوئی اور فرنگی اس کا تعاقب کرنے لگے۔ چھ میل دور جا کر سقمان نے قدم جما لیے اور جوابی حملہ کیا۔ اللہ کی مدد شاملِ حال ہوئی اور فرنگی پشت پھیر کر بھاگ نکلے۔ ②

تاہم فرنگیوں کے دھاوے وقتاً فوقتاً اس کے بعد بھی جاری رہے۔ ۵۰۳ھ میں بانیاس اور طرطوس ان کے آگے سرنگوں ہو گئے۔ اسی سال ذوالحجہ میں وہ سات سال کے طویل محاصرے کے بعد طرابلس کے ناقابلِ تسخیر شہر پر بھی قابض ہو گئے۔ ۵۰۴ھ میں حصنِ اثارب، بیروت اور صیدا بھی ان کے قبضے میں چلے گئے۔

مسلمانوں کے اضطراب کا کوئی حال نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ فرنگی کچھ ہی دنوں میں سارے شام کو روند دیں گے۔ شام کے مسلم امراء نے فرنگیوں سے صلح کی التماس کی جسے فرنگیوں نے پہلے مسترد کر دیا۔ پھر بڑی نخوت کے ساتھ بھاری رقم کے عوض جنگ بندی قبول کی مگر کچھ ہی دنوں بعد عہد شکنی شروع کر دی۔ ③

سلجوقی افواج کی ناکام مہم جوئی:

اس صورتحال میں بغداد کے عوام نے زبردست احتجاج کیا، جامع مسجد کا منبر توڑ دیا گیا، جہاد کے لیے رضا کاروں کی ٹولیاں تیار ہونے لگیں۔ عوام کا جوش وخروش دیکھتے ہوئے سلطان محمد نے جہاد کا اعلان کر دیا۔ کئی ماہ کی تیاریوں کے بعد ۵۰۵ھ میں عراق اور الجزیرہ کی مسلم افواج نے فرنگیوں کے خلاف یلغار کر کے رُہا اور تل باشر کا محاصرہ کر لیا مگر ۴۵ دن کے محاصرے کے باوجود کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اس دوران سپہ سالار فوج فوت ہو گیا اور افواج واپس آ گئیں۔ ④

طبریہ میں مسلمانوں کی فرنگیوں کے خلاف فتح:

محرم ۵۰۷ھ میں دِمَشق اور الجزیرہ کی فوجوں نے طبریہ کے قریب فرنگیوں سے ٹکر لی۔ اس لڑائی میں یروشلم کا فرنگی بادشاہ زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا مگر مسلمانوں نے لاعلمی میں اسے فدیہ لے کر چھوڑ دیا اور کچھ دنوں تک چھاپہ مار حملے کر کے واپس ہو گئے۔ لشکر کا امیر مودود دِمشق واپس پہنچا تو نمازِ جمعہ کے دوران جامع مسجد میں کسی باطنی نے اسے شہید کر دیا۔ ⑤

① تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۴، ۳۰۵؛ العبر فی خبر من غبر: ۳۶۷/۲، ۳۶۸، ۳۷۰، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۶
② العبر فی خبر من غبر: ۳۷۴/۲
③ العبر فی خبر من غبر: ۳۸۴/۲، ۳۸۵؛ تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۵
④ العبر فی خبر من غبر: ۳۸۵/۲، ۳۸۶
⑤ العبر فی خبر من غبر: ۳۸۹/۲

اس پر فرنگیوں نے مسلمانوں کو ایک طنز بھرا مکتوب لکھا جس میں تحریر تھا:

''جو قوم اپنے سردار کو ایسے مبارک دن میں اپنے خدا کے گھر میں قتل کرے، وہ اس کی حق دار ہے کہ خدا اُسے تباہ کردے۔''①

مسلم امراء کا فرنگیوں کی مدد سے ایک دوسرے کو دبانے کا سلسلہ:

اگر مسلمانوں کی اس مہم سے فرنگیوں پر کچھ خوف طاری ہوا تھا تو وہ ۵۰۹ھ میں اس وقت ختم ہو گیا جب سلطان محمد کی فوج نے اپنے حریف طغ تکین کے خلاف حماۃ پر حملہ کیا اور طغ تکین نے تنگ آکر فرنگیوں سے مدد مانگ لی۔ یہ غالباً پہلا موقع تھا جب اس خطے کے مسلمانوں نے باہمی جنگوں میں فرنگیوں سے باقاعدہ عسکری مدد لی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ فرنگی ایک کا ساتھ دے کر دوسرے کو روندتے رہے۔ یوں مسلمانوں کے انتشار کی خلیج گہری ہوتی گئی۔②

باطنیوں کا فتنہ:

خلیفہ مستظہر کے دور میں حسن بن صباح کا فتنہ ہر طرف چھا گیا تھا۔ اس کے خنجر بردار ایران سے شام تک پھیل چکے تھے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی شخصیت ان خنجروں کا نشانہ بن جاتی تھی۔③ کبھی کبھار یہ دہشت گرد عوام کے ہاتھوں پکڑے بھی جاتے تھے اور مشتعل لوگ انہیں موقع پر ہی مار ڈالتے تھے۔④ بعض مواقع پر سلجوقی امراء نے بھی باطنیوں کا سراغ ملنے پر ان کے خلاف سخت کارروائیاں کیں اور ان کی بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اتارا۔⑤

آخر سلطان محمد بن ملک شاہ سلجوقی نے ان کے خلاف ایک طویل مہم شروع کی اور ان کی بڑی تعداد کو تہ تیغ کیا۔⑥

سلطان محمد سلجوقی کی وفات، محمود سلجوقی کی تخت نشینی:

سلطان محمد کی حکومت ۵۱۱ھ تک رہی۔ وہ فوت ہوا تو اس کا بیٹا محمود بن محمد حکمران بن گیا۔⑦

مسلمانوں کی زبوں حالی اور اس کی وجہ:

۱۶ ربیع الآخر ۵۱۲ھ کو خلیفہ مستظہر باللہ خناق کے مرض میں مبتلا ہو کر چل بسا۔ اس کی عمر ۴۲ سال تھی۔ مدتِ حکومت ۲۵ سال تھی۔⑧ اس کا دور سراسر خانہ جنگی، بیرونی طاقتوں کے غلبے اور مسلمانوں کی زبوں حالی کا مرقع ہے۔

سیاسی بحران کی ذمہ داری کس پر؟

اس بدتر صورتحال کی ذمہ داری بڑی حد تک سلجوقی حکمرانوں پر عائد ہوتی تھی۔ مشیتِ الٰہیہ نے انہیں ایک عظیم الشان سلطنت اور غیر معمولی طاقت عطا کر کے پورے عالم اسلام کی نگہبانی کی ذمہ داری سونپ دی تھی مگر اس خاندان

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۶
② العبر فی خبر من غبر: ۳۹۳/۲
③ الکامل فی التاریخ: ۳۵۴/۸، ۴۱۳، ۴۲۳، ۴۳۰
④ الکامل فی التاریخ: ۴۵۰/۸
⑤ الکامل فی التاریخ: ۴۵٤/۸
⑥ العبر فی خبر من غبر: ۳۹۷/۲
⑦ العبر فی خبر من غبر: ۳۹۷/۲
⑧ العبر فی خبر من غبر: ۳۹۷/۲

کی چوتھی نسل میں وارثانِ حکومت انتہائی عاقبت نااندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اقتدار کے لیے دست وگریباں ہوگئے، یہاں تک کہ صلیبیوں کا حملہ اور بیت المقدس کا سقوط بھی انہیں متحد نہ کرسکا۔

اقتدار کے لیے اس قسم کی خانہ جنگیوں کو ہم اُمت کی تاریخ میں پہلی صدی ہجری سے دیکھتے چلے آرہے ہیں اور آگے بھی یہ سلسلہ چلتا دکھائی دے گا۔ ایک بار پھر غور کیا جائے تو اس کی بنیادی وجہ یہی دکھائی دے گی کہ مسلمانوں نے اسلام سے رہنمائی لینے میں شدید تساہل سے کام لیا تھا۔ ان کا رشتہ قرآن وسنت سے کمزور پڑ گیا تھا۔ ان کا ایک بہت بڑا جرم یہ تھا کہ انہوں نے انتقالِ اقتدار کے لیے مصادرِ شریعت اور سیرتِ خلفائے راشدین سے کوئی مربوط اور محفوظ لائحہ عمل اخذ نہیں کیا۔ ان کے ہاں انتقالِ اقتدار کا بظاہر ایک ہی اصول لاگو تھا یعنی موروثیت اور اعلانِ جانشینی۔ مگر خود موروثیت کی کوئی مربوط تعریف موجود نہیں تھی۔ عام تصور یہ تھا کہ حکمران کے بعد اس کا بیٹا یا بھائی جانشین ہوگا۔ لیکن اگر کئی بیٹے یا کئی بھائی ہوں تو پھر مسئلہ کس طرح حل ہوگا! ایسے ہر سوال کا عملی جواب ایک ہی تھا کہ جس کا بس چلے وہ اقتدار پر قابض ہوجائے، یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔

موروثیت یا جانشینی کا اصول طاقت کا غلام تھا۔ پس انتقالِ اقتدار اور حصولِ اقتدار کے لیے جس طرح قدیم ہندوستان اور یورپ میں طالع آزما باہم لڑتے مرتے رہتے تھے، یہی حال عالم اسلام کا تھا۔ اس غلطی کا خمیازہ مسلمانوں کو بار بار کے سیاسی بحران، بڑی بڑی حکومتوں کی تقسیم در تقسیم اور بار بار سخت تباہی کی صورت میں بھگتنا پڑا۔

◆◆◆

اَلْمُسْتَرْشِد باللّٰہ

الفضل بن احمد المستظہر

ربیع الآخر ۵۱۲ھ تا ذوالقعدہ ۵۲۹ھ

اگست ۱۱۱۸ء تا ستمبر ۱۱۳۵ء

مستظہر کے بعد اس کے بیٹے ابومنصور الفضل نے المسترشد باللہ کا لقب اختیار کر کے مسندِ خلافت سنبھالی۔ وہ پرہیزگار، عبادت گزار، سادگی پسند، ہوشیار، بہادر اور جنگجو حکمران تھا۔ اون کا موٹا لباس پہنتا۔ لڑائیوں میں بذاتِ خود حصہ لیتا تھا۔ اس کے علم و فضل کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسے شافعی فقہاء میں شمار کیا گیا ہے۔ [1]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''معتضد کے بعد مسترشد سے زیادہ بہادر خلیفہ کوئی نہیں گزرا۔ وہ دلیر، شجاع، آگے بڑھ کر حملہ کرنے والا، انتہائی رعب دار، سمجھدار، بیدار مغز اور عالی ہمت تھا۔'' [2]

عراق میں خانہ جنگیاں:

المسترشد باللہ کے دور میں عراق مسلسل خانہ جنگیوں کا شکار رہا۔ سلجوقی بادشاہت کے وارث آپس میں بری طرح دست و گریباں رہے۔ بغداد پر کبھی ایک مسلط ہوتا کبھی دوسرا۔ خراسان پر سلطان سنجر سلجوقی کی حکومت تھی اور عراق میں سلطان محمود بن محمد سلجوقی حکمران تھا۔ ان کے علاوہ سلطان مسعود سلجوقی بھی اس منظرنامے کا اہم حصہ تھا۔ بصرہ کا حاکم عمادالدین زنگی اور عرب سردار دبیس بن صدقہ بھی ان لڑائیوں میں شریک رہے۔ [3]

شام میں روافض کی چیرہ دستیاں:

شام میں شیعوں کے کئی غالی فرقے مضبوط ہو چکے تھے ان میں نُصیری اور دُروزی نہایت خطرناک تھے جن کے عقائد بلاشبہ کفریہ تھے۔ اسماعیلی باطنی ان کے ساتھ مل کر فرنگیوں کو اقتدار دلانے کی سازشیں کر رہے تھے جو پہلے ہی مزید علاقے فتح کرنے کی تگ و دو میں تھے۔ ۵۲۳ھ میں دِمشق کے اسماعیلیوں نے فرنگیوں سے ساز باز کر کے شہر ان کے حوالے کرنے کی سازش تیار کی مگر خوش قسمتی سے سازش طشت از بام ہو گئی۔ حاکم شہر تاج الملوک بوری نے سازش کے سرغنہ کو پکڑ کر قتل کرا دیا اور اس کا سر قلعے کے برج پر نصب کرا دیا۔ پھر شہر میں ان اسماعیلیوں کو جو بغاوت کے لیے تیار تھے، گرفتار کر لیا گیا۔ اس دار و گیر میں چھ ہزار اسماعیلی قتل کیے گئے۔ اس دوران فرنگی طے شدہ منصوبے کے مطابق دِمشق کے باہر جمع ہو چکے تھے۔ دِمشق کی سپاہ نے ترکمانوں اور بدوؤں کے ساتھ مل کر ان کو شب خون کا نشانہ بنایا۔ آخر فرنگی منہ لٹکائے واپس چلے گئے۔ [4]

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۷

② تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۷، ۳۰۸؛ دول الاسلام للذھبی: ۱۵/۲ تا ۲۴

③ العبر فی خبر من غبر: ۴۱۸/۲؛ الکامل فی التاریخ: سنة ۵۲۳ھ

④ العبر فی خبر من غبر: ۴۳۴/۲

دُبیس بن صدقہ کا فتنہ:

مسترشد کے دور میں عراق کے ایک شیعہ عرب جاگیردار دبیس بن صدقہ الاسدی نے بڑا فتنہ برپا کیا جو فصاحت و بلاغت اور ادباء وشعراء کی قدردانی کے علاوہ سفاکی اور عیاری میں بھی مشہور تھا۔[1] ۵۱۶ھ میں اس نے دربارِ خلافت سے کھلا باغی ہو کر عراق میں اس قدر اودھم مچایا کہ عازمینِ حج، حجاز نہ جا سکے۔[2] آخر محرم ۵۱۷ھ میں مسترشد اس کے مقابلے پر نکلا۔ تین صدیوں بعد یہ پہلی لڑائی تھی جس میں کسی خلیفہ نے خود قیادت کی ہو۔ خلیفہ کی موجودگی نے بغدادی افواج کے حوصلے بڑھا دیے تھے۔[3] دُبیس کے لشکر میں گلوکاراؤں، ہیجڑوں اور موسیقاروں کی کثرت تھی جن کے گانے بجانے کی آواز دور دور تک گونج رہی تھی۔ دوسری طرف خلیفہ کے لشکر میں قرآن، تکبیر اور تسبیح کے سوا کوئی چیز سنائی نہ دیتی تھی۔ آخر گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں دُبیس بُری طرح شکست کھا کر بھاگ نکلا۔[4]

۵۱۹ھ میں دُبَیس نے سلجوقی شہزادے محمد بن طغرل کو ساتھ ملا کر بغداد پر حملہ کیا اور شہر کے اندر گھس گیا، تاہم جب خلیفہ نے فوج کی کمان خود سنبھالی تو پانسا پلٹ گیا۔ دُبَیس نے گڑگڑا کر معافی مانگی اور خلیفہ نے جاں بخشی کر کے دھتکار دیا۔ دُبَیس یہاں سے نکل کر سلطان سنجر کے پاس خراسان پہنچ گیا تاکہ اسے ساتھ ملا کر خلیفہ کے خلاف اتحاد بنا لے مگر سلطان سنجر نے دربارِ خلافت کے احترام میں اسے نظر بند کر دیا۔[5]

۵۲۲ھ میں سنجر نے دُبیس کو عراق میں اپنے کچھ اضلاع کا نائب بنا دیا اور خلیفہ سے سفارش کی کہ دُبیس کو معاف کر دیا جائے۔ مگر دُبیس نے علاقے کا انتظام سنبھالتے ہی بغداد پر حملے کی تیاری شروع کر دی۔[6] ساتھ ہی اس نے پیغام بھیجا کہ اگر خلیفہ اس سے راضی ہو جائے تو وہ دربارِ خلافت میں گراں قدر ہدیے پیش کرے گا مگر خلیفہ نے اس پر بھروسہ کرنے کی غلطی نہ کی۔[7] دُبیس کو اس کے بعد بھی چین نہ آیا۔ ۵۲۶ھ میں اس نے عماد الدین زنگی کو ساتھ ملا کر بغداد پر قبضے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔[8]

سلطان مسعود سلجوقی اور خلیفہ کے مابین کش مکش:

اہلِ بغداد کو سخت ترین آزمائش کا سامنا اس وقت کرنا پڑا جب ۵۲۵ھ میں عراق کا سلجوقی بادشاہ محمود بن محمد فوت ہوا اور تخت پر سلطان مسعود سلجوقی نے قبضہ کر لیا۔ خلیفہ مسترشد نے بغداد میں سلطان مسعود کے نام کا خطبہ شروع کرا دیا تھا مگر اس کے باوجود بعض وجوہ سے سلطان مسعود خلیفہ سے بددل ہو گیا اور فوج لے کر بغداد کی طرف روانہ ہو گیا۔[9]

سلطان نے مسترشد کے خلاف جو فوج بھیجی تھی، اس کا ہراول دستہ دُبیس کی کمان میں تھا جو کچھ مدت قبل سلطان مسعود کے ساتھ وابستہ ہو چکا تھا۔[10]

---

① سیر اعلام النبلاء: ۶۱۳/۱۹ ② المنتظم: ۲۰۹/۱۷ ③ تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۷
④ المنتظم: ۲۱۷/۱۷ ⑤ المنتظم: ۲۲۹/۱۷ ⑥ المنتظم: ۲۴۹/۱۷، ۲۵۰
⑦ المنتظم: ۲۵۳/۱۷ ⑧ المنتظم: ۲۷۱/۱۷
⑨ تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۷، ۳۰۸؛ الکامل فی التاریخ تحت ۵۲۹ھ ⑩ المنتظم: ۲۹۲/۱۷، ۲۹۳

سلطان مسعود اور دُبیس کی فوج کشی کا حال سن کر مسترشد بھی بغدادی امراء کو اپنی کمان میں لے کر نکلا۔ ارمضان ۵۲۹ھ کو ہمدان کے قریب جنگ ہوئی جس میں امرائے بغداد نے غداری کر کے خلیفہ کو تنہا چھوڑ دیا اور سلطان مسعود خلیفہ کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ مراغہ لے گیا۔ خلیفہ سے علاماتِ خلافت: چادرِ نبوی اور عصائے مبارک چھین لیے گئے۔ اس واقعے سے بغداد میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ہر شخص اشک بار دکھائی دینے لگا۔ مشتعل لوگ ہنگامہ آرائی پر اتر آئے۔ عورتیں خلافت کی رسوائی کا ماتم کرنے لگیں۔ بغداد سمیت تمام شہروں میں عوام غم کی شدت سے بے حال تھے۔ ①

زلزلوں اور قدرتی آفات کا تواتر:

ادھر عراق میں یکے بعد دیگرے کئی زلزلے آئے اور ہر شخص اللہ کے عذاب سے پناہ مانگنے لگا۔ امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے اس زلزلے کا چشم دید مشاہدہ کیا تھا، وہ بتاتے ہیں:

''گیارہ شوال سے ۲۷ شوال تک بار بار جھٹکے لگتے رہے۔ ۲۷ شوال کی شب ایسا زلزلہ آیا کہ بہت سی دیواریں اور چھتیں گر گئیں۔ اس شب میں اپنے گھر کی چھت پر سو رہا تھا، میری نیند بہت گہری تھی مگر زلزلے کے جھٹکوں سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ رات سے صبح تک جھٹکے لگتے رہے اور لوگ گڑگڑا کر دعائیں مانگتے رہے۔'' ②

خراسان کے سلجوقی حکمران سلطان سنجر کو ان حالات پر اتنا دکھ ہوا کہ اس نے سلطان مسعود کو فوراً ایک ملامت آمیز خط لکھ کر خلیفہ سے معافی مانگنے اور اسے پوری تعظیم و توقیر کے ساتھ بغداد واپس بھیجنے کی تاکید کی اور خبردار کیا کہ حالیہ زلزلے قدرتِ الٰہیہ کی طرف سے ایک تنبیہ ہیں؛ اس لیے مسلمانوں کی علامتِ وحدت کی توہین سے توبہ کرنی چاہیے۔

سلطان سنجر نے لکھا:

''میرے عزیز بیٹے! تم خلیفہ کے پاس جا کر زمین بوسی کرو، اپنے جرم کی معافی مانگو۔ اس وقت جو آسمانی آفات آ رہی ہیں، ان کے سننے کی بھی تاب نہیں، چہ جائے کہ ان آندھیوں، بجلی کے کڑکوں اور زلزلوں کا مشاہدہ کیا جائے جو بیس دن تک لگاتار رہے۔ افواج میں تشویش اور شہروں میں اضطراب ہے۔ مجھے اللہ کی طرف سے اپنی پکڑ کا ڈر ہے جبکہ لوگوں اور افواج کی طرف سے بھی خطرہ ہے۔ لوگوں نے جامع مسجدوں میں جانا چھوڑ دیا ہے۔ منبر توڑ دیے ہیں۔ خطیبوں کو خطبہ دینے سے روک دیا ہے۔ اللہ سے ڈرو! اللہ کے لیے اپنی غلطیوں کی تلافی کرو۔ مسلمانوں کے خون سے دامن بچاؤ، امیر المؤمنین کو واپس ان کے مقامِ عزت پر لوٹا دو، دُبیس کو ان کے حوالے کر دو جس کی امیر المؤمنین کو بڑی ضرورت ہے۔''

سلطان مسعود نے یہ مراسلہ پڑھ کر ظاہر کیا کہ وہ اپنی حرکات پر سخت شرمندہ ہے۔ وہ خلیفہ مسترشد کے خیمے میں حاضر ہوا، معافی مانگی اور دُبیس کو ہاتھ پاؤں باندھ کر خلیفہ کے سامنے پیش کر دیا اور کہا: ''ہمارے درمیان جو کچھ ہوا، اس کا ذمہ دار یہی شخص ہے۔ یہ اب آپ کے حوالے ہے۔ آپ جو کہیں گے، اس کے ساتھ وہی ہوگا۔''

① تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۷، ۳۰۸؛ الکامل فی التاریخ تحت ۵۲۹ھ

② المنتظم: ۲۹۶/۱۷

خلیفہ مسترشد نے سلطان کا عذر قبول کر لیا۔ جب دُبیس نے گڑ گڑا کر معذرت کی تو اسے بھی معاف کر دیا۔ [1]

خلیفہ المسترشد کا قتل:

اس دوران سلطان سنجر اپنے سفیر کو ایک فوجی دستے کے ساتھ مراغہ بھیج چکا تھا تاکہ وہ خلیفہ کو بغداد پہنچا کر آئے۔ دورانِ سفر اس فوج میں سترہ باطنی بھی شامل ہو گئے۔ جب یہ قافلہ مراغہ پہنچا تو سلطان مسعود اپنے آدمیوں سمیت سلطان سنجر کے سفیر کے استقبال کے لیے چلا گیا جبکہ خلیفہ مسترشد اپنے چند خواص کے ساتھ تنہا رہ گیا۔

اس دوران باطنی خلیفہ کے خیمے میں گھس گئے اور خنجروں کے پے در پے وار کر کے اسے شہید کر دیا۔ قاتلوں میں سے کچھ فرار ہو گئے اور کچھ پکڑ کر قتل کر دیے گئے۔ یہ افسوس ناک واقعہ ۱۷ ذوالقعدہ ۵۲۹ھ کا ہے۔ [2]

یہ خبر بغداد پہنچی تو وہاں ماتم کا سماں پیدا ہو گیا۔ عورتیں روتی پیٹتی گھروں سے نکل آئیں۔ مسترشد کی عمر ۴۳ سال تھی۔ اس نے سترہ سال چھ ماہ حکومت کی۔ وہ آخری خلیفہ تھا جو جمعے اور عیدین کا خطبہ دیا کرتا تھا۔ [3]

اصل مجرم کون تھا:

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ سلطان مسعود کو معلوم نہ تھا کہ باطنی بھی وہاں موجود ہیں۔ جبکہ ظاہری حالات اس رائے کے خلاف تھے۔ ان لوگوں نے خلیفہ کے قتل کا منصوبہ بنایا ہوا تھا؛ اسی لیے اس کے خیمے کو دوسرے خیموں سے الگ تھلگ نصب کیا گیا تھا۔'' [4]

امام سیوطی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں: ''کہا جاتا ہے کہ مسعود کو اس کا علم نہ تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسے معلوم تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسی نے باطنیوں کو قتل پر آمادہ کیا تھا۔'' [5]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''کہا جاتا ہے کہ باطنیوں کو سلطان مسعود نے قتل پر تیار کیا تھا۔'' [6]

سلطان مسعود کے حکم سے دُبیس کا قتل:

خلیفہ کے قتل کے ایک ماہ بعد دُبیس سلطان مسعود سے ملنے آیا تو سلطان کے اشارے پر ایک غلام نے پیچھے سے تلوار چلا کر اسے اچانک قتل کر دیا۔ سلطان نے ظاہر کیا کہ دُبیس کو خلیفہ مسترشد کے قتل کی پاداش میں قتل کیا گیا ہے۔ [7]

مؤرخین کا کہنا ہے کہ سلطان مسعود نے خود باطنیوں کو خلیفہ کے خیمے پر حملے کے لیے بھیجا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ یہ قتل اس کے ذمے نہ لگ جائے۔ چنانچہ اس نے دُبیس پر الزام ڈالنے کا منصوبہ بنایا اور اسے مروا کر یہ ظاہر کیا کہ سابق خلیفہ کا اصل قاتل انجام کو پہنچ گیا ہے۔ [8]

---

[1] المنتظم: ۲۹۸/۱۷

[2] تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۸؛ الکامل فی التاریخ: سنة ۵۲۹ھ؛ البدایة والنهایة: ۳۰۵/۱۶، ۳۰۶

[3] البدایة والنهایة: ۳۰۵/۱۶

[4] المنتظم: ۲۹۸/۱۷

[5] تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۸

[6] العبر فی خبر من غبر: ۴۳۴/۲

[7] وفیات الاعیان: ۲۶۵/۲

[8] وفیات الاعیان: ۲۶۵/۲

الراشد باللہ

منصور بن الفضل المسترشد

ذوالقعدہ ۵۲۹ھ تا ذوالقعدہ ۵۳۰ھ

ستمبر ۱۱۳۵ء تا اگست ۱۱۳۶ء

خلیفہ مسترشد کی شہادت کے بعد بغداد میں اس کا بیٹا ابوجعفر منصور راشد باللہ کے لقب کے ساتھ تخت نشین ہوا۔ وہ ایک لحیم شحیم خوبصورت آدمی تھا۔[1]

مسندِ خلافت پر متمکن ہوتے ہی اس نے منادی کرادی کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے، اگر کسی پر ظلم ہوا ہو تو وہ براہِ راست خلیفہ سے ملے۔ یہ سن کر لوگ مطمئن ہو گئے۔ تاہم فقط دو دن بعد منادی کر دی گئی کہ لوگ مظالم کی شکایات اعلیٰ افسران کے سامنے پیش کریں۔[2] اس واقعے سے راشد باللہ کی غیر مستقل مزاجی کا اندازہ ہوتا ہے۔

خلیفہ اور سلطان مسعود کے مابین کش مکش:

سلطان مسعود نئے خلیفہ کو اپنے زیر نگین رکھنا چاہتا تھا۔ ۵۳۰ھ کے اوائل میں جبکہ راشد کو مسندِ خلافت سنبھالے ہوئے چند ہفتے ہوئے تھے، سلطان نے خلیفہ سے سات لاکھ دینار طلب کیے۔ خلیفہ نے اپنے امراء سے مشورہ کر کے سلطان کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا اور جنگ کی تیاری شروع کر دی۔

سلطان مسعود سلجوقی نے یہ دیکھ کر خلیفہ کو معزول کرنے کا فیصلہ کر لیا اور بغداد آکر علمائے شہر کے سامنے استفتاء پیش کیا کہ خلیفہ نے برے کاموں، خونریزی اور ناجائز امور کا ارتکاب کیا ہے، کیا وہ اس کے بعد بھی خلیفہ رہ سکتا ہے؟

سلطان کے نائب کے ڈرانے دھمکانے پر ۱۶ ذوالقعدہ ۵۳۰ھ کو بعض علماء نے خلیفہ کی معزولی کا فتویٰ دے دیا اور سلطان نے راشد باللہ کے چچا سابق خلیفہ مستظہر کے بیٹے محمد کو خلیفہ طے کر دیا۔ راشد کو معزول کر دیا گیا۔[3]

راشد باللہ کا قتل:

راشد باللہ سلطان کی بغداد آمد سے پہلے ہی گرفتاری کے ڈر سے فوج سمیت فرار ہو گیا تھا۔ پہلے موصل اور پھر آذربائی جان پہنچا۔ پھر ہمدان سے ہوتا ہوا اصفہان چلا گیا۔ ہر جگہ اس نے سخت ظلم وستم کا ثبوت دیا۔ علماء سے وہ اتنا بیزار ہو چکا تھا کہ بعض علماء کی ڈاڑھیاں منڈوا دیں۔ ۲۶ رمضان ۵۳۲ھ کو کچھ لوگوں نے حملہ کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حملہ باطنیوں نے کیا تھا۔[4]

[1] تاريخ الخلفاء، ص ۳۰۹، ۳۱۰
[2] المنتظم: ۳۰۰/۱۷
[3] البداية والنهاية: ۴۳۷/۲؛ تاريخ الخلفاء، ص ۳۰۹، ۳۱۰
[4] تاريخ الخلفاء، ص ۳۱۰

اَلْمُقْتَفِی لِاَمْرِ اللّٰہ

محمد بن احمد المستظہر

ذوالقعدہ ۵۳۰ھ تا ربیع الاول ۵۵۵ھ

اگست ۱۱۳۶ء تا مارچ ۱۱۶۰ء

بغداد میں اس دوران مقتفی خلیفہ بن چکا تھا۔ وہ ۵۳۰ھ میں راشد باللہ کے فرار کے فوراً بعد سلطانِ عراق مسعود سلجوقی کی حمایت سے مسند نشین ہوا تھا۔ وہ ذاتی طور پر نیک وصالح اور قابل وعادل حکمران تھا مگر سلطان مسعود کا رویہ اس کے ساتھ بھی اچھا نہیں تھا۔ سلطان اس پر مسلط تھا؛ اس لیے خلیفہ تقریباً بے بس تھا۔ [1]

خراسان میں ترکانِ غز کا فتنہ اور سلجوقیوں کا زوال:

اس دوران خراسان کے سلجوقی کمزور پڑ چکے تھے اور ان کے علاقے میں ''ترکانِ غز'' اودھم مچا رہے تھے اور ان کی طاقت بہت بڑھ چکی تھی۔ ترکانِ غز کے کئی سردار مسلمان ہو چکے تھے مگر ان میں جہالت اور گنوار پن کے سارے اثرات موجود تھے۔ بختیار، دینار، طوطی، چغر، ارسلان اور محمود ان کے بڑے سردار تھے۔ [2] ان کی لشکرگاہ میں خیموں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی جس سے ان کی افرادی قوت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ [3]

ترکانِ غز کے مقابلے میں سلطان سنجر سلجوقی کی شکست اور اسارت:

۵۳۶ھ میں سلطان سنجر نے ماوراء النہر کے میدانوں میں ترکانِ غز کے تین لاکھ سپاہیوں سے ٹکر لی، اس جنگ کا انجام نہایت افسوس ناک ہوا۔ ایک لاکھ سے زائد مسلمان شہید ہوئے اور سلطان سنجر بمشکل چھ آدمیوں کے ساتھ فرار ہو کر بلخ پہنچ سکا۔ اسے اپنی حالت درست کرنے میں کئی سال لگے۔

بارہ سال بعد ۵۴۸ھ میں بلخ کے قریب سنجر کی ''ترکانِ غز'' سے ایک اور بڑی جنگ ہوئی جس میں اس کے ۷۰ ہزار سپاہی کام آئے۔ فاتحین نے اس کے بڑے بڑے امراء کو گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ خود سلطان سنجر سلجوقی بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ترکانِ غز نے اسے نظر بند کر دیا اور ہر مہم میں اسے ساتھ ساتھ لیے پھرتے رہے۔ اس کا مذاق بھی اڑاتے رہے۔ وہ اس کے سامنے آ کر زمین بوسی کرتے اور کہتے: ''ہمارے سلطان تو آپ ہی ہیں۔'' کوئی ہانک لگاتا: ''سلطان معظم! ہمیں جاگیریں عنایت فرمایئے۔'' کوئی کہتا ''حضور! مرو مجھے عطا کر دیجیے۔''

اسی کے نام، خطبے اور سکے کے ساتھ وہ خراسان میں فساد مچاتے رہے۔ اس دوران سلطان کو ایک معمولی غلام جیسا کھانا اور وظیفہ ملتا تھا۔ سلطان سنجر ایک مدت تک ان کی حراست میں رہا۔ وہ ان سیاسی غلطیوں پر زار و قطار آنسو بہاتا تھا

① تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۰ ② الکامل فی التاریخ: سنة ۵۳۶ھ، ۵۴۸ھ ③ العبر فی خبر من غبر: ۴/۳

جن کی وجہ سے آلِ سلجوق کو یہ دن دیکھنے پڑے تھے۔[1]

سلطان سنجر کی رہائی اور وفات:

سلطان سنجر کے کچھ علاقے پر خوارزم شاہی امراء اور کچھ پر غوری سلاطین قبضہ کر چکے تھے۔ باقی صوبے تُرکانِ غُز کے پاس تھے۔ کئی ماہ بعد ترکانِ غز سلطان کو اس کے پایۂ تخت مرو لے آئے اور اسے تختِ شاہی پر بٹھا کر خوب مذاق اڑایا۔ سلطان سے مزید برداشت نہ ہوا۔ وہ اٹھ کر مرو کی خانقاہ میں چلا گیا اور سیاست سے بالکل دلبرداشتہ ہو گیا۔

تُرکانِ غز کے پاس تین سال چار ماہ تک یرغمال رہنے کے بعد رمضان ۵۵۱ھ میں وہ موقع پا کر فرار ہو گیا اور ترمذ کے قلعے میں پناہ لی۔ اس دوران خوارزم شاہ اُتسز سلطان کی مدد کے لیے آ گیا اور اس نے سلطان کا تعاقب کرنے والے تُرکانِ غز کو جنگوں میں الجھائے رکھا۔ سلطان سنجر ترکانِ غز سے نجات پانے کے بعد اپنے پایۂ تخت مرو آ گیا مگر وہ سخت بیمار تھا۔ آخر رہائی کے فقط چھ ماہ بعد ربیع الاوّل ۵۵۲ھ میں اس کی وفات ہو گئی۔ عمر ۷۲ سال تھی۔[2]

ترکانِ غز نے اس کے بعد ملک شاہ سلجوقی کے نواسے محمود بن محمد کو خاقان کا لقب دے کر اپنا برائے نام بادشاہ بنا لیا اور جگہ جگہ فساد مچاتے رہے۔ محمود ۵۵۶ھ میں ان کے ہاتھ سے نکل بھاگا اور گمنامی دبے کسی کی موت مر گیا۔[3]

دنیائے اسلام کا نیا محافظ، عماد الدین زنگی:

آلِ سلجوق باہم لڑ بھڑ کر نہایت کمزور پڑ چکے تھے مگر اللہ نے انہی سالوں میں اسلام کے کچھ اور محافظ کھڑے کر دیے تھے۔ یہ اتابک عماد الدین زنگی تھا جو پہلے بصرہ کا گورنر، پھر بغداد کا ناظم اور پھر مُوصل کا خود مختار حکمران بنا۔ اس نے شام کے ساحل پر قابض صلیبیوں سے کئی جنگیں لڑیں اور مسلمانوں کی پژمردہ مدافعانہ قوت کو پھر زندہ کر دیا۔[4]

عماد الدین کا پہلا ہدف ایشیائے کوچک اور شام سے عراق تک وسیع اڈیسہ کی عیسائی سلطنت تھی۔ آخر کار جمادی الآخرہ ۵۳۹ھ میں عماد الدین زنگی نے اڈیسہ کے مرکز رُہا پر حملہ کیا اور ۲۸ دن کی شدید جنگ کے بعد اس پر قابض ہو گیا۔ اس فتح سے دنیائے اسلام میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ خلیفہ مقتفی نے شادمان ہو کر عماد الدین زنگی کا نام بغداد میں خطبے میں داخل کر لیا۔[5] مسلم مؤرخین اس واقعے کو "فتح الفتوح" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔[6]

عماد الدین زنگی کی شخصیت بڑی جاذبِ نظر تھی۔ چہرہ حسین اور رنگت گندمی تھی۔ آنکھیں بڑی پُرکشش تھیں۔ اس نے ساٹھ برس سے اوپر عمر پائی۔ وہ ایک عظیم سیاست دان تھا۔ اس کے ہاں کوئی طاقتور کسی کمزور پر ظلم نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے پہلے الجزیرہ کے کئی شہر فرنگیوں کے حملوں اور مسلم حکام کی بے تدبیری کے باعث اجڑ چکے تھے۔ عماد الدین نے ان شہروں کو محفوظ، مستحکم اور آباد بنا دیا۔[7] زنگی عورتوں کے متعلق نہایت غیور تھا۔ متعدد دشمنوں میں گھرے رہنے کے

[1] الکامل فی التاریخ: سنة ۵۳۶ھ، ۵۴۸ھ؛ العبر فی خبر من غبر: ۴/۳

[2] الکامل فی التاریخ: سنة ۵۴۸ھ، ۵۵۱ھ، ۵۵۲ھ

[3] الکامل فی التاریخ: سنة ۵۵۲ھ، ۵۵۳ھ، ۵۵۶ھ؛ العبر فی خبر من غبر: ۲۷/۳

[4] وفیات الاعیان: ۳۲۷/۲، ۳۲۸

[5] الکامل فی التاریخ: سنة ۵۳۹ھ

[6] عیون الروضتین فی اخبار الدولتین لابی شامة: ۴۳/۱، ط مؤسسة الرسالة

[7] الکامل فی التاریخ: ۱۴۲/۹، ۱۴۳

باوجود نہ صرف اپنے علاقے کے دفاع میں کامیاب تھا بلکہ اس کی مملکت روز بروز وسیع ہوتی چلی جارہی تھی۔ [1]

نورالدین زنگی:

عمادالدین کے بعد اس کی مملکت دو حصوں میں بٹ گئی: شام اس کے چھوٹے بیٹے نورالدین محمود زنگی کے پاس آگیا جبکہ مُوصل اور الجزیرہ کی حکومت اس کے بڑے بیٹے سیف الدین غازی کو مل گئی۔ نورالدین زنگی اپنی وفات تک شام کے نصرانیوں سے لڑتا رہا۔ اس کی تخت نشینی کے فوراً بعد یورپی نصرانیوں نے ۵۴۲ھ میں شام پر مشترکہ حملہ کیا جو دوسری صلیبی جنگ کے نام سے موسوم ہوا۔ ۵۴۳ھ میں وہ دِمشق تک پہنچ گئے تاہم نورالدین زنگی اور امرائے دمشق کی بہترین دفاعی وسیاسی تدابیر کی بدولت نصرانیوں کو آخر کار ناکام ونامراد ہو کر واپس لوٹنا پڑا۔ [2]

سلطان مسعود اور خلیفہ کے مابین سخت کش مکش:

ادھر خلافتِ بغداد اور عراق کے سلجوقی حکمران سلطان مسعود کے درمیان کش مکش جاری تھی۔ سلطان مسعود خلیفہ کو اسی طرح دبانے کی کوشش کرتا رہا جیسے بنوبُویہ خلفاء کو مغلوب رکھتے تھے۔ اس نے ایک موقع پر خلیفہ کی خاص جائیداد کو چھوڑ کر خلافتِ بغداد کی تمام جاگیروں کا حق حاصل کرلیا۔ پھر مزید ایک لاکھ دینار طلب کیے۔ خلیفہ نے جواب میں کہلوایا: ''ہمارے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ اور رعایا پر ٹیکس لگا کر میں کچھ وصول نہیں کروں گا کہ میں نے قسم کھائی ہے عوام پر ایک پیسے کی زیادتی بھی نہیں کروں گا۔''

سلطان مسعود نے مطالبہ ترک کردیا۔ تاہم اس کے امراء اور نائبین بار بار خلیفہ سے بے ادبی کا معاملہ کیا کرتے تھے۔ [3] خلیفہ کی معیشت مفلوج کردی گئی تھی۔ اس کے اصطبل میں چار گھوڑوں اور آٹھ خچروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ [4]

خلیفہ کی بددعاء اور سلطان کی وفات:

خلیفہ سلطان مسعود کی زیادتیوں سے عاجز آگیا تو اس نے قنوتِ نازلہ کا سلسلہ شروع کردیا۔ ایک مہینہ پورا ہونے سے پہلے سلطان مسعود کا بستر پر انتقال ہوگیا اور بغداد کو ایک جابر سلطان سے نجات ملی۔ یہ ۵۴۷ھ کا واقعہ ہے۔ [5]

دشمنوں کے خلاف دعائے قنوت نازلہ پڑھنا حضور اکرم ﷺ کی سنت ہے۔ آپ ﷺ نے بعض ظالم قبائل کی زیادتیوں سے تنگ آکر ان کے خلاف نمازِ فجر میں ایک ماہ تک دعائے قنوت نازلہ پڑھی تھی۔ [6] اندازہ لگایئے کہ حضور اکرم ﷺ کی سنتوں میں کتنا اثر ہے۔ وہ زورآور سلاطین جن کی زیادتیاں کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آرہی تھیں، دعائے قنوتِ نازلہ کے عمل کے بعد ایسے ضعیف ہوئے کہ خلافتِ بغداد کسی جنگ وجدل کے بغیر خود بخود ان کے چنگل سے آزاد ہوگئی۔ اس کے بعد خلافتِ بغداد آخر تک بیرونی حکمرانوں کے تسلط اور دباؤ سے محفوظ رہی۔ یوں ایک نئے دور کا آغاز ہوا جس میں دربارِ بغداد میں کسی سلطان کا دخل نہیں ہوتا تھا۔

---

[1] الکامل فی التاریخ: ۱۴۲/۹، ۱۴۳
[2] وفیات الاعیان: ۱۸۴/۵، ۱۸۵؛ العبر فی خبر من غبر: ۴۶۳/۲، ۴۶۴
[3] تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۰، ۳۱۱
[4] تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۰
[5] تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۲
[6] صحیح البخاری، ح: ۱۰۰۲، باب القنوت

سلاجقہ کے دور پر ایک نظر:

سلجوقیوں کا ظہور اس وقت ہوا تھا جب اُمتِ مسلمہ کے سیاسی ایوان باطل فرقوں کے قبضے میں تھے۔ سلجوقیوں نے سیاست کے اس بگاڑ کو ختم کر دیا۔ انہوں نے خلافتِ عباسیہ کے پامال شدہ وقار کو ایک بار پھر بحال کر کے جو کارنامہ انجام دیا وہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے درجنوں چھوٹے چھوٹے حکمرانوں اور حکومتوں کو ختم کر کے ایک متحدہ اور وسیع سلطنت کو خلافتِ عباسیہ کا حلقہ بگوش بنا کر اس کا نام پوری دنیا میں چمکا دیا۔

سلجوقی نومسلم اور دین دار تھے۔ جہاد ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے رومیوں کو اپنی شمشیرِ خارا شگاف سے چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا اور نصرانیت کے سیلاب کی امنڈتی ہوئی موجوں کو بہت پیچھے دھکیل دیا۔ وہ علماء اور صالحین سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ایرانیوں کی سی مکاری اور شیعوں کی سازشوں سے انہیں کوئی مناسبت نہ تھی۔ انہوں نے عباسیوں اور علویوں کی سابقہ کش مکش سے بھی کوئی سروکار نہیں رکھا بلکہ تمام خاندانوں کی برابر عزت کرتے رہے اور ایک فریق کی حمایت میں آکر دوسرے کو کچلنے کی کوشش نہیں کی۔ انہیں یہی دھن لگی تھی کہ خلافت سربلند اور مسلمان متحد رہیں۔ البتہ انہوں نے عسکری طاقت اپنے پاس ہی رکھی اور اس لحاظ سے وہ خلافتِ عباسیہ سے زیادہ طاقتور تھے اور بعض اوقات وہ عملی طور پر یہ باور بھی کراتے رہتے تھے۔ دراصل ہر حکمران کی طرح سلاجقہ بھی دربارِ خلافت کے احترام کے باوجود مرکزِ اسلام پر اپنی گرفت رکھنا چاہتے تھے؛ اسی لیے بغداد کا منتظمِ اعلیٰ انہی کی طرف سے مقرر ہوتا تھا۔

اگر غور کیا جائے تو خلافت کو بدعقیدہ امراء کے تسلط سے آزاد کرانے کے بعد سلجوقیوں کے پاس دو ہی راستے تھے:

ایک یہ کہ اپنی ساری فوج اور خزانے خلیفہ کے ہاتھ میں دے کر خود بغداد کی سیاست سے لاتعلق ہو جاتے۔ اس کا نتیجہ شاید اچھا نہ نکلتا؛ کیوں کہ اگر اس دور کی خلافتِ عباسیہ اپنی سابقہ آن بان حاصل کرنے یا باقی رکھنے کے قابل ہوتی تو اس کے پاس دولت یا افرادی قوت کم نہ تھی۔ مسئلہ قیادت ہی کی کمزوری کا تھا۔ اگر سلجوقی سب کچھ خلیفۂ بغداد کو سونپ کر خود سیاست سے لاتعلق ہو جاتے تو ان کی بخشی ہوئی افرادی و مالی طاقت ضائع ہو جاتی۔

دوسری صورت یہ تھی کہ اپنی عسکری و مادّی طاقت اپنے ہاتھ میں رکھتے ہوئے بیرونی طور پر خلافت کو سہارا دیا جائے۔ اس وقت کے حالات میں یہی مناسب تھا اور سلجوقیوں نے اسی کو اختیار کیا۔ اس طرح عالمِ اسلام میں طاقت کا مرکز الگ اور سیاسی وحدت کا مرکز الگ ہو گیا۔ سلجوقی شاہِ جنگ تھے اور خلیفہ شاہِ سیاست۔ یہ ایک بالکل نئی، پیچیدہ اور نازک صورتحال تھی اور طاقت کے ان دونوں مراکز کے مابین توازن کو برقرار رکھنا بڑی وسیع النظری، ذہانت اور سیاسی تدبّر کا تقاضا کرتا تھا۔ یہ فریقین کی سیاسی سوجھ بوجھ اور دوراندیشی کا بہت بڑا امتحان تھا۔

جب تک سلجوقی سلاطین اور خلفاء کے مابین خلوص، نیک نیتی اور احترام کے جذبات قائم رہے معمولی لغزشیں نظرانداز بھی ہوتی رہیں مگر آگے چل کر فریقین میں تعلقات سرد مہری اور بعض اوقات سخت کشیدگی کا شکار بھی ہوئے۔

◆◆◆

سلجوقیوں کے زوال کے اسباب:

سلجوقیوں کے زوال کا پہلا سبب ان کی آپس کی خانہ جنگی تھی۔ مختلف مواقع پر متعدد سلجوقی شہزادے آپس میں اقتدار کے لیے دست وگریباں ہوئے۔ ان میں سے کسی نے خودمختاری حاصل کر کے الگ حکومت بنالی اور کوئی ناکام ہو کر نمونہ عبرت بن گیا۔ اس سے سلطنت کمزور ہوئی اور اغیار کو ان کے خلاف اٹھنے کا موقع مل گیا۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ ان کی ساری طاقت فوجی عناصر پر مشتمل تھی۔ ہر سپہ سالار اپنے علاقے کا صوبے دار تھا۔ اس لیے جونہی مرکزی حکومت کمزور پڑی، ان سپہ سالاروں نے جگہ جگہ خودمختار حکومتیں بنالیں۔

تیسرا سبب ان کے آخری چند حکمرانوں کا خلفاء کے ساتھ نامناسب سلوک اور جارحانہ رویہ تھا۔ مرکزی قیادت کے ساتھ ایسا طرزِ عمل کسی بھی قوم میں ہمیشہ انتشار کا باعث بنتا ہے۔ امتِ مسلمہ میں بھی اس رویے نے افتراق اور خانہ جنگی کو جنم دیا، اس کی وجہ سے آخری دور کے سلجوقی حکمران بزرگانِ دین، صالحین اور عوام کی دعاؤں اور دلی حمایت سے محروم ہو گئے۔ پس اللہ کی نصرت کا سایہ اٹھ گیا اور وہ بھی گزشتہ حکمران خانوادوں کی طرح تقسیم ہوتے ہوتے آخرکار منظرِ عام سے غائب ہو گئے۔

زوالِ خلافتِ بغداد

اختتامی دور

آخری مرحلہ

خلافت کی آزادانہ حیثیت کی بحالی

القائم کی دوبارہ تخت نشینی سے سلطان مسعود سلجوقی کی وفات تک

۵۴۷ھ تا ۶۵۶ھ

۱۰۹ برس

خلیفہ مقتفی، خلافت کی آزادانہ حیثیت کی بحالی کے بعد

۵۴۷ھ میں سلطان مسعود سلجوقی کی وفات کے بعد خلافتِ بغداد کی قدیم آزادانہ حیثیت از سرِ نو بحال ہوگئی۔ بغداد اور عراق دوبارہ خلفائے بنوعباس کی دسترس میں آگئے اور ان سے مقابلے والا کوئی نہیں رہا۔ خراسان میں سلاجقہ کمزور پڑ چکے تھے اور خلافت سے اظہارِ وفاداری کر رہے تھے۔ اُدھر مُوصِل والجزیرہ کا اتابک خانوادہ بھی اب خلافتِ عباسیہ کے دردولت سے وابستہ ہو چکا تھا۔ عراق میں کوئی سلطان نہ تھا جو خلیفہ پر حکم چلاتا۔ غرض گزشتہ سوا دو صدیوں میں مقتفی پہلا خلیفہ تھا جو ''دَولوں''، ''مُلوک'' اور ''سلاطین'' سے یکسر آزاد تھا۔[۱] ایک مدت سے بغداد کی پیشہ ور فوج فقط چھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ مقتفی نے ۵۴۹ھ میں تین لاکھ دینار خرچ کر کے اسے دوگنا کر دیا۔[۲]

خلیفہ کی دقوقا اور خوزستان پر فوج کشی:

حالات کی باگ اپنے ہاتھوں میں آجانے سے مدتوں بعد ایسا ہوا کہ خلیفہ نے خود کسی علاقے پر لشکر کشی کی ہو۔ چنانچہ ۵۵۰ھ میں خلیفہ نے ''دقوقا'' اور ''خوزستان'' کی طرف فوجیں بھیجیں۔ چونکہ خلافتی افواج ایک زمانے سے لڑنے کی عادی نہیں رہی تھیں، غالباً اسی لیے دونوں مہمات میں کوئی علاقہ فتح نہ ہوسکا اور خلافتی افواج کو ناکام واپس آنا پڑا تاہم خوزستان کے حاکم ملک شاہ بن محمد نے بعد میں از خود خلیفہ سے معافی مانگی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس نئے دور میں خلیفہ کی حیثیت ماضی کے مقابلے میں کتنی بلند تر ہوگئی تھی۔[۳]

بغداد پر ایک ناکام حملہ:

۵۵۱ھ میں رَے کے سلجوقی حکمران محمد بن محمود نے خلیفہ سے مطالبہ کیا کہ اس کا نام خطبے میں شامل کیا جائے مگر خلیفہ نے انکار کر دیا۔ محمد بن محمود نے ناراض ہو کر ۵۵۲ھ کے آغاز میں بغداد پر یلغار کر دی۔ محصورانہ جنگ شروع ہوئی تو خلیفہ نے اعلان کر دیا کہ بغداد کا جو شخص بھی لڑائی میں زخمی ہوگا، اسے پانچ دینار دیے جائیں گے۔ چنانچہ فوج کے ساتھ عوام نے بھی نہایت پامردی کے ساتھ سلجوقی لشکر کا مقابلہ کیا۔ آخر محمد بن محمود کو ناکام واپس لوٹنا پڑا۔ واپسی کے سفر میں اس کے لشکر کو بیماریوں نے گھیر لیا اور بہت سے سپاہی جاں بحق ہوگئے، حتیٰ کہ محمد بن محمود بھی بیمار ہو کر چل بسا۔[۴]

خلیفہ مقتفی کی وفات:

اس اطمینان بخش ماحول میں آٹھ برس تک حکومت کرنے کے بعد ۲ ربیع الاوّل ۵۵۵ھ کو خلیفہ مقتفی کا انتقال ہوگیا۔ عمر ۶۶ سال تھی اور مدتِ خلافت ۲۴ سال ساڑھے تین ماہ۔[۵]

---

[۱] البدایة والنهایة: ۳۹۳/۱۶؛ تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۱، ۳۱۲
[۲] العبر فی خبر من غبر: سنة ۵۴۹ھ
[۳] الکامل فی التاریخ: سنة ۵۵۰ھ
[۴] الکامل فی التاریخ: سنة ۵۵۱ھ
[۵] البدایة والنهایة: ۳۹۳/۱۶؛ تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۱، ۳۱۲

اَلْمُسْتَنْجِد باللّٰہ

یوسف بن محمد المقتفی

ربیع الاوّل ۵۵۵ھ تا ربیع الآخر ۵۶۶ھ

مارچ ۱۱۶۰ء تا دسمبر ۱۱۷۰ء

مقتفی کے بعد اس کا بیٹا المستنجد باللہ خلیفہ بنا۔ یہ بھی اپنے باپ کی طرح علم دوست، ذہین، عادل اور نیک سیرت تھا۔ اس نے عوام پر کوئی ٹیکس باقی نہیں چھوڑا، ظالم حکام کو معزول کر دیا اور ہر قسم کے شر و فساد کا خاتمہ کر دیا۔[1] وہ کتب فلاسفہ کو سخت مضر تصور کرتا تھا چنانچہ اس نے اس قسم کی کتب کے ایک بڑے ذخیرے کو تلف کرا دیا۔[2] تاہم وہ مفید علوم وفنون کا قدردان تھا۔ سائنسی علوم خصوصاً فلکیات میں اسے خاص درک حاصل تھا۔[3]

فتنہ پرور لوگوں سے نجات کی کوشش:

مستنجد کی کوشش تھی کہ دار الخلافہ میں کوئی فتنہ پرور شخص نہ رہنے پائے۔ ایک بار اس نے ایسے شخص کو جیل میں ڈال دیا جو لوگوں کی جھوٹی شکایات لگاتا تھا۔ کچھ مدت بعد اس کا کوئی ہمدرد خلیفہ کے پاس آیا اور دس ہزار دینار زرِ ضمانت کے طور پر پیش کر کے درخواست کی کہ اس قیدی کو آزاد کر دیا جائے۔ خلیفہ نے کہا: ''میں تمہیں دس ہزار دینار انعام دوں گا اگر تم ایسے کسی اور آدمی کی نشاندہی کر دو، تاکہ میں اسے بھی جیل میں ڈال دوں اور لوگوں کو اس کے شر سے بچالوں۔''[4]

وزیر علامہ ابن ہُبیرہ کی وفات:

مستنجد کے زمانے میں خلافتِ عباسیہ کے نامور وزیر علامہ یحییٰ بن محمد ابن ہُبیرہ کی وفات ہوگئی۔ علامہ ابن ہُبیرہ حدیث، قرآت، نحو، لغت اور عروض کے جامع عالم تھے۔ ان کا شمار فقہائے حنابلہ میں ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ فقیرانہ حالت میں علمی مشغولیت کو اوڑھنا بچھونا بناتے ہوئے گزرا۔ بعد میں وہ سرکاری خدمات سے وابستہ ہوئے اور خلافتِ عباسیہ کو سلاجقہ کے تسلط سے آزاد کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی قابلیت دیکھتے ہوئے مقتفی نے انہیں وزیر خلافت مقرر کر دیا۔ اتنے بڑے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود وہ شرعی حدود کے مطابق لباس پہنتے تھے۔ انہوں نے کبھی ریشم استعمال نہیں کیا۔ خلیفہ مقتفی کا کہنا تھا: ''بنو عباس کو ان جیسا وزیر کبھی میسر نہیں آیا۔''

ابن ہُبیرہ کی تواضع کا یہ حال تھا کہ ایک بار انہوں نے کسی فقیہ کو کوئی سخت لفظ کہہ دیا۔ فوراً ندامت ہوئی اور کہا: ''آپ بھی یہی الفاظ مجھے کہہ دیں۔'' انہوں نے انکار کیا۔ اس پر ابن ہُبیرہ نے انہیں دو سو دینار دے کر راضی کیا۔ مقتفی کے بعد وہ مستنجد کے بھی وزیر رہے۔ وہ مسلمانوں کے معاملات کو اتنی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے کہ خود مستنجد کو ان پر فخر تھا۔ چنانچہ ایک دن مستنجد نے علامہ ابن ہُبیرہ کو مخاطب کر کے یہ اشعار کہے:

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۴
[2] البدایہ والنہایۃ: ۲۷۲/۹؛ تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۴
[3] تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۴
[4] بحوالہ بالا

صَفَتْ نِعْمَتَانِ خَصَّتَا كَ وَعَمَّتَا ۔۔۔ فَبِذِكْرِهِمَا حَتَّى الْقِيَامَةِ تُذْكَرُ

"دو ایسی نعمتیں ہیں جو آپ کے ساتھ خاص اور عام ہیں۔ ان کے ذکر سے آپ کا تذکرہ تا قیامت رہے گا۔"

وُجُوْدُكَ وَالدُّنْيَا اِلَيْكَ فَقِيْرَةٌ ۔۔۔ وَجُوْدُكَ وَالْمَعْرُوْفُ فِي النَّاسِ يُنْكَرُ

"ایک آپ کا وجود اور دوسری آپ کی جود وسخا، جبکہ لوگوں میں نیکی کرنا اجنبی ہوگیا ہے۔"[1]

علامہ ابن ہُبیرہ نے "الافصاح عن معانی الصحاح" کے نام سے صحیح احادیث کی شرح لکھی جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ رہتی دنیا تک ان کا یادگار علمی کارنامہ ہے۔[2]

وزیر جمال الدین اصفہانی کی وفات:

مستنجد کے دور میں اتابک خانوادے کے وزیر باتدبیر جمال الدین اصفہانی کی وفات ہوگئی۔ وزیر موصوف کو رفاہی کاموں کی کثرت کے باعث "الجواد" کہا جاتا تھا۔ انہوں نے حجاج کرام کے لیے خاص طور پر بڑی خدمات انجام دیں۔ ایک چشمے سے نہر نکال کر اسے میدانِ عرفات تک پہنچایا۔ حاجیوں کے لیے حمام تعمیر کرائے۔ مسجد عرفات اور مسجد خیف تعمیر کرائی۔ کعبۃ اللہ کے دروازے پر سونے کی ملمع سازی کرائی اور اس کی عمارت کو سنگِ مرمر سے آراستہ کیا۔ مدینہ منورہ کے گرد ایک مضبوط فصیل چنوائی۔ دریائے دجلہ پر پُل بنوائے۔ مسافروں کے لیے جابجا سرائیں کھلوائیں۔ وزیر موصوف ہر صبح اپنے دروازے پر ایک سو دینار صدقہ کرتے تھے۔ ہر سال دس ہزار دینار کی رقم مسلمان قیدیوں کو آزاد کراتے تھے۔ وزیر موصوف کی وفات رمضان ۵۵۹ھ میں ہوئی اور بقیع کی خاک میں دفن ہوئے۔[3]

نورالدین زنگی کے کارنامے:

المستنجد باللہ کے دور میں سلطان نورالدین زنگی کا ستارۂ اقبال عروج پر تھا۔ اسلام کے اس محافظ نے ۵۵۹ھ میں فرنگیوں کا مضبوط ترین قلعہ "حارم" فتح کرلیا۔ اس جنگ میں دس ہزار فرنگی مارے گئے اور ان کے بڑے بڑے نامور سپہ سالار اور نواب گرفتار ہوگئے۔[4] ۵۶۲ھ میں نورالدین زنگی نے مصری حکمران العاضد کی درخواست پر اپنے امیر شیرکوہ کو ایک فوج دے کر مصر کی حفاظت کے لیے بھیجا۔ یہ اقدام مصر پر مکمل قبضے کی تمہید ثابت ہوا۔[5]

مستنجد کی وفات:

المستنجد باللہ کا دور بہت پرامن گزرا۔ گیارہ برس تک عدل وانصاف کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد وہ بیمار ہوکر ۸ ربیع الآخر ۵۶۶ھ میں فوت ہوگیا۔ عمر ۴۸ برس تھی۔[6]

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۱۱٤ البدایه والنهایه: ۱٦/٤١٦، ٤١٧..... مستنجد کے یہ فی البدیہ اشعار انتہائی بلاغت اور لطافت پر مبنی ہیں جس سے اس کی سخن دانی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ نیز خلیفہ کا اپنے وزیر کی شان میں قصیدہ کہنا تاریخی نوادرات میں سے ہے۔ ورنہ وزراء ہی خلفاء کی مدح وتوصیف کرتے رہے ہیں۔

② یہ کتاب "دارالوطن" سے دکتور فؤاد عبدالمنعم احمد کی تحقیق کے ساتھ ۱۴۱۷ھ میں شائع ہوچکی ہے۔

③ البدایه والنهایة: ١٦/٤١١، ٤١٢

④ البدایه والنهایة: ١٦/٤١٠

⑤ تاریخ الخلفاء، ص ٣١٤، ٣١٥

⑥ تاریخ الخلفاء، ص ٣١١، ٣١٢؛ البدایه والنهایة: ١٦/٤٤٤

اَلْمُسْتَضِیُٔ بِاَمْرِ اللّٰہ

الحسن بن یوسف المستنجد

ربیع الآخر ۵۶۶ھ تا شوال ۵۷۵ھ

دسمبر ۱۱۷۰ء تا اپریل ۱۱۸۰ء

المستنجد باللہ کے بعد اس کا بیٹا حسن ''المستضی'' کے لقب سے خلیفہ بنا۔ وہ ایک نیک سیرت، بردبار، فیاض اور خوش قسمت حکمران تھا۔ بغداد میں امن وامان تھا، شعائرِ اہل سنت زندہ تھے اور رفض دب چکا تھا۔ ①

علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس نے عدل اور کرم کا ایسا مظاہرہ کیا کہ اس کی نظیر ہم نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ ②

خلیفہ بن کر اس نے جو خلعتیں عطا کیں ان کی تعداد تیرہ سو سے زائد تھی۔ اس نے بنو ہاشم اور علویوں کو بہت نوازا۔ علماء، مدارس اور خانقاہوں پر خوب خرچ کیا۔ ③

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے عقیدت:

خلیفہ المستضی کو علماء سے بہت محبت تھی۔ علامہ ابن جوزی کی مجلسِ وعظ میں وہ عموماً شریک ہوتا تھا اور علامہ اس کی اصلاح وتربیت کے لیے خصوصی کلمات ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ ④

المستضی کو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے بڑی عقیدت تھی۔ ۵۷۴ھ میں اس نے امام صاحب کی قبر پر یہ لوح آویزاں کرائی:

هذا قبر تاج السنة، وحيد الامة، العالی الهمة، العالم العابد، الفقيه الزاهد، الامام ابی عبدالله احمد بن محمد بن حنبل الشيبانی رحمه الله.''

''یہ قبر ہے اہلِ سنت کے تاج، اُمت کی منفرد ہستی، عالی ہمت، عالم وعابد، فقیہ اور زاہد، امام ابوعبداللہ احمد بن محمد بن حنبل شیبانی رحمہ اللہ کی'' ⑤

توہینِ صحابہ پر مشتمل کتب تلف:

حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے بقول اس دور میں بغداد کے روافض اتنے پست ہو گئے تھے کہ گزشتہ اڑھائی سو سال میں اس

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۶
② المنتظم لابن الجوزی: ۱۹۱/۱۸
③ تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۶
④ المنتظم: ۲۵۰/۱۸
⑤ البداية والنهاية: ۵۳۱/۱۶

دارالحکومت میں ایک گھوڑا تک نہ بچا کہ مستنصر اس پر سواری کر سکتا۔ ایک بار اسے سواری کی سخت ضرورت پڑی تو بہت ڈھونڈنے کے بعد ایک خچر مل سکا۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے بقول یہ عہد یوسف علیہ السلام کے قحط کا نقشہ تھا۔ [1]

ابتری کا دور۔ مستنصر کی موت:

مستنصر ۴۸۷ھ میں فوت ہوا۔ اس کا دور نہایت ابتری کا تھا۔ عوام مفلوک الحال تھے۔ بار بار قحط اور مستقل گرانی نے لوگوں کو عاجز کر دیا تھا۔ ملکی معیشت بدحالی کی انتہاء کو پہنچ گئی تھی۔ [2]

◆◆◆

[1] سیر اعلام النبلاء: ۱۵/۱۹۰ تا ۱۹۵

[2] وفیات الاعیان: ۵/۲۳۰

اَلنَّاصِرلِدِیْنِ اللّٰه

احمد بن الحسن المستضی

شوال ۵۷۵ھ تا رمضان ۶۲۲ھ

اپریل ۱۱۸۰ء تا اکتوبر ۱۲۲۵ء

المستضی کے بعد اس کا ۲۲ سالہ بیٹا احمد ابوالعباس، الناصر لدین اللہ کے لقب کے ساتھ مسندِ خلافت پر براجمان ہوا۔ اس کی مدتِ خلافت ۴۷ سال رہی جو کسی اور خلیفہ کو نصیب نہیں ہوئی۔ [1]

جاسوسی کا حیرت انگیز نظام:

الناصر کا نظامِ خبر رسانی حیرت انگیز تھا، جس کے بل بوتے پر اس نے اپنے دشمنوں کا قلع قمع کر دیا اور اپنے خلاف بغاوت کرنے والے ہر ایک کو نیست و نابود کر دیا، اس کے جاسوس دنیا بھر کے درباروں کی خبریں اس کے پاس لایا کرتے تھے۔ [2] ایک بار ایک مسافر اس کے لیے ہندوستان سے ایک طوطا لے کر آیا جو سورۂ اخلاص پڑھتا تھا مگر بغداد آ کر دربار میں پیش کرنے سے پہلے طوطا مر گیا۔ وہ شخص پریشان بیٹھا تھا کہ خلیفہ کا خادمِ خاص آیا اور اس سے مطالبہ کیا کہ وہ طوطا دربارِ خلافت میں بھیجا جائے۔ مسافر آنسو بہاتے ہوئے بولا: ''افسوس کل رات طوطا مر گیا۔''

خادم نے کہا: ''ہمیں معلوم ہے۔ اس کی لاش ہی دے دو۔''

پھر پوچھا: ''تمھیں کیا امید تھی کہ خلیفہ اس کے بدلے کتنا انعام دے گا؟''

مسافر نے کہا: ''پانچ سو دینار!'' خادم نے پانچ سو دینار اسے تھمائے اور کہا:

''خلیفہ نے تمہارے لیے بھیجے ہیں۔ جب تم ہندوستان سے چلے تھے تو خلیفہ کو اطلاع ہو گئی تھی۔'' [3]

خفیہ داؤ پیچ کا ماہر خلیفہ:

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں: ''وہ ایسے باریک داؤ پیچ، ایسی پوشیدہ سازشوں اور ایسی چالوں کا عادی تھا جنہیں کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ دو دوست بادشاہوں کے بیچ میں دشمنی ڈال دیتا اور انہیں احساس تک نہ ہوتا۔ وہ دو دشمن حکمرانوں کو متحد کرا دیتا اور کسی کو خبر نہ ہوتی۔'' [4]

---

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۸

[2] سیر اعلام النبلاء: ۱۹۶/۲۲

[3] تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۸

[4] تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۸

الناصر کے معاصر مؤرخ ابن واصل کا بیان ہے:

''اس کے وقائع نگار عراق سمیت ہر طرف پھیلے ہوئے تھے جو اسے ہر بات کی تحریری اطلاعات دیتے تھے۔ ایک دن اسے پرچہ موصول ہوا کہ فلاں دعوت میں میزبان نے مہمانوں سے پہلے ہاتھ دھولیے۔ ناصر نے جواب میں لکھا ''میزبان کا یہ عمل خلافِ مروت تھا اور پرچہ نگار کا اتنی سی بات نوٹ کرنا فضول ہے۔''[1]

الناصر کی بدسیرتی اور بدعقیدگی:

مگر الناصر کی سیرت کے کئی پہلو افسوس ناک تھے۔ اس بارے میں ابن واصل کے درجِ ذیل بیانات قابلِ غور ہیں:

1. ''وہ رعایا کے حق میں بدسلوک تھا۔ ظلم وستم کی طرف مائل تھا۔ اس کے دور میں عراق ویران ہوگیا۔ شہریوں نے اس کا ملک چھوڑ دیا اور اس نے ان کی دولت اور جائیدادیں دبالیں۔''[2]
2. ''اس کے اقدامات باہم متضاد ہوا کرتے تھے۔ اس نے لوگوں کو افطار کرانے کے لیے بغداد میں ایک لنگر خانہ کھولا جو کچھ عرصہ چلا، پھر الناصر نے اسے بند کردیا۔ اس نے حاجیوں کے لیے مہمان خانے بنوائے جو کچھ مدت چلتے رہے، پھر انہیں بھی ختم کردیا۔ اس نے اہلِ بغداد پر عائد کچھ خاص ٹیکس ختم کیے، پھر انہیں دوبارہ لاگو کردیا۔''[3]
3. ''وہ اپنے آباؤ اجداد کے برخلاف شیعہ امامی مذہب کا قائل ہوگیا تھا۔''[4]

خلیفہ ناصر کے بعض وزراء بھی شیعہ تھے جو اسے ایسی حرکات پر ابھارتے تھے۔ ہبۃ اللہ بن علی ایسا ہی ایک رافضی درباری تھا جسے خلیفہ ناصر کے دور میں بڑا عروج ملا۔[5]

ماتمی جلوسوں کی اجازت، شیعہ سنی فسادات دوبارہ شروع:

الناصر کے دور میں عاشوراء کے ماتمی جلوس جو ایک صدی سے زائد مدت سے بند تھے، پھر شروع ہوگئے اور شیعہ سنی فسادات بھی دوبارہ بھڑک اٹھے۔ اس سلسلے کا پہلا جلوس محرم ۵۸۲ھ میں نکلا۔ شیعوں نے سڑکوں پر آکر نعرے لگائے اور کہا: ''اب خاموش رہنے اور تقیہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' انہوں نے سرِ عام صحابہ کی توہین کی جس پر لوگ مشتعل ہوئے اور حالات کشیدہ ہوگئے۔ اگلے سالوں میں یہ کشیدگی اہلِ بغداد کی زندگی کا حصہ بن گئی۔[6]

خلیفہ کی کینہ پروری اور عالمِ اسلام کے مفادات سے بے اعتنائی:

الناصر ہوشیاری اور ذہانت کے باوجود کج فکر، تنگ نظر اور کینہ پرور تھا۔ اس کا دور اس لحاظ سے بے حد نازک تھا کہ ایک طرف صلیبی جنگیں چھڑیں اور دوسری طرف منگولیا سے چنگیز خان کی قیادت میں مسلمانوں کی نسل کشی کرنے

---

[1] مفرج الکروب لابن واصل: ۱۶۳/٤، ط المطبعة الامیریہ مصر
[2] مفرج الکروب: ۱٦٤/٤
[3] مفرج الکروب: ۱٦٤/٤
[4] مفرج الکروب: ۱٦٦/٤
[5] مجدالدین ابن الصاحب هبة الله بن علی، ولی استاذ داریة المستضئ، ولما ولی الناصر رفع منزلته وبسط یده، وکان رافضیا سبابا، لسکن واحیا شعار الامامیة، وعمل کل قبیح، الی ان طلب الی الدیوان فقتل واخذت حواصله فمن ذالك الف الف دینار، وعاش احدی واربعین سنة. ﴿العبر فی خبر من غبر: ۸۷/۳﴾
[6] العبر فی خبر من غبر: سنة ۵۸۲ھ

والے تاتاری نمودار ہوئے۔ ایسے میں جس سیاسی دور اندیشی، وسعتِ ظرفی اور بالغ نظری کی ضرورت تھی، الناصر اس سے کوسوں دور رہا۔ ایسے وقت میں جب کہ مشرق و مغرب کے کفار نے پورے عالم اسلام کی بقا داؤ پر لگا دی تھی، الناصر کی ساری توجہ اہلِ تشیع کو بالادستی بخشنے اور بغداد کا وقار بحال رکھنے پر مرکوز تھی۔ اسلامی دنیا کے حالات سے اسے کوئی واسطہ تھا تو بس اس قدر کہ وہاں عباسیوں کے خلاف ہونے والی باتوں کا علم اسے ہوتا رہے۔ بلاشبہ وہ اس میں کامیاب تھا اور اس کے تیز ترین جاسوسی نظام نے دنیا میں مشہور کر دیا تھا کہ اس کے قبضے میں جنات ہیں۔ امراء اس کے خلاف منہ سے کوئی لفظ نکالتے ہوئے ڈرتے تھے۔[1]

اگر خلیفہ اپنی ذہانت، ہوشیاری اور عیاری امت کے اجتماعی مفاد میں کفار کے خلاف استعمال کرتا تو عالم اسلام کی خوش قسمتی ہوتی مگر افسوس کہ خلیفہ کو کبھی یہ توفیق نہ ہوئی بلکہ اس کی سازشوں نے خود اپنے چمن کو بھی پھونک ڈالا۔

فنونِ حرب کی جگہ کھیل تماشوں کی حوصلہ افزائی:

اس کے دور میں ایک بڑی کمزوری یہ پیدا ہوئی کہ مسلم معاشرے میں شمشیر زنی، نیزہ بازی اور گھڑ سواری جیسے حربی فنون اور عسکری کھیلوں کا رجحان کم ہو گیا؛ کیوں کہ خلیفہ ناصر کی توجہ کھیل تماشوں کی طرف تھی۔ وہ غلیل بازی کا بے حد شوقین تھا۔ اس کا دوسرا مشغلہ پرندوں سے دل بہلانا تھا خصوصاً کبوتر بازی سے اسے بے حد شغف تھا۔[2]

ان مشاغل سے خلیفہ کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اس نے "الفُتُوَّة" (جوان مردی) کے نام سے باقاعدہ ایک ٹیم بنائی اور اس کی سرپرستی کے لیے خود بھی کھلاڑیوں جیسا لباس پہننے لگا جسے "سَراوِیلُ الْفُتُوَّة" کہا جاتا تھا۔ پھر اس نے کوشش کی کہ حربی، ورزشی اور تفریحی کھیلوں سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص اس ٹیم میں شامل ہو۔ چنانچہ حکم جاری کر دیا کہ اس ٹیم کے باقاعدہ ارکان کے سوا، کسی بھی شخص کو حربی، ورزشی اور تفریحی کھیل کھیلنے یا کھلاڑیوں کا لباس پہننے کی اجازت نہیں۔ اس حکم کا اثر یہ ہوا کہ جو لوگ اپنے کسی عذر کے باعث خلیفہ کی ٹیم میں شامل نہیں ہو سکتے تھے، یا انہیں خلیفہ کی طرف منسوب ہونے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ مردانہ ورزشوں سے محروم ہو گئے۔ جو لوگ آزادانہ کھیل کود یا نشانہ بازی کے شوقین تھے اور اس شوق سے کسی طرح دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے، انہیں عراق چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں جانا پڑا۔[3]

بغداد میں ایک شخص بڑا ماہر نشانہ باز تھا۔ اس پر خلیفہ کی ٹیم میں شامل ہونے کے لیے دباؤ ڈالا گیا تو وہ ملک چھوڑ کر شام چلا گیا۔ خلیفہ نے قاصد بھیج کر اسے گراں قدر معاوضے کا لالچ دیا مگر وہ نہ مانا۔ اس پر کسی نے اسے ملامت کی تو اس نے جواباً کہا: "میرے لیے یہی اعزاز کافی ہے کہ تمام نشانہ باز آج خلیفہ کی ٹیم میں ہیں سوائے میرے۔"[4]

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۸

② وکان مع ذلك كثيراً يشتغل برمي البندق واللعب بالحمام المناسيب ويلبس سراويل الفتوة شأن العيارين من بغداد. (تاریخ ابن خلدون: ۳/۶۶۰، ط دار الفکر)

③ مفرج الکروب: ۴/۱۶۴ ط المطبعة الامیریه مصر

④ مفرج الکروب: ۴/۱۶۵

غرض عراق میں فنون حرب کے ماہر لوگ کم ہوتے چلے گئے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے: ''یہ سب حکومت کے زوال اور اس کے حکمرانوں سے حکومت چھن جانے کا پیش خیمہ تھا۔''[1]

رافضیوں سے نفرت کی پاداش میں ولی عہد کی معزولی اور اسارت:

خلیفہ ناصر کا ولی عہد اس کا بڑا بیٹا ابونصر محمد تھا مگر اسے رافضیوں سے سخت نفرت تھی؛ اس لیے جب خلیفہ ناصر نے امامیہ مذہب اختیار کیا تو ابونصر محمد کو معزول کر کے جیل میں ڈال دیا اور اپنے چھوٹے بیٹے ابوالحسن علی کو جو شیعہ عقائد اختیار کر چکا تھا، ولی عہد بنا دیا۔ ابونصر محمد کو جیل میں سخت مشقت اور اذیت میں رکھا گیا تھا؛ کیوں کہ اس کی دلیری اور ہوشیاری کی وجہ سے خلیفہ اس سے سخت خطرہ محسوس کرتا تھا۔

مگر اللہ کے فیصلوں پر کسی حکمران کو اختیار نہیں ہوتا۔ ۶۱۲ھ میں ابوالحسن علی فوت ہو گیا جس سے خلیفہ ناصر کو سخت صدمہ ہوا۔ پورے بغداد میں اس پر ماتم کرایا گیا۔ چھ سال تک خلیفہ ناصر شش و پنج میں رہا کہ آخر جانشینی کے مسئلے کو کس طرح حل کرے۔ آخر ۶۱۸ھ میں اس نے ابونصر محمد کی ولی عہدی کا دوبارہ اعلان کرا دیا۔[2]

ناصر پر فالج کا حملہ اور وفات:

زندگی کے آخری سالوں میں فالج نے الناصر کے تمام جسم کو ناکارہ کر دیا تھا۔ بصارت بھی سلب ہو گئی تھی۔ بستر سے زبانی احکام جاری کرتا تھا۔ ایک باندی حکم نامہ تحریر کر کے مہر لگا دیتی تھی۔ خلیفہ پانی پینے میں اتنی احتیاط برتتا تھا کہ اس کے لیے بغداد سے ۲۱ میل دور سے ایک خاص مقام کا عمدہ پانی لایا جاتا، جسے سات بار اُبالا جاتا، پھر ٹھنڈا کر کے پیش کیا جاتا، مگر اس قدر احتیاط کے باوجود آخری دنوں میں اسے پتھری کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ بیس دن بڑی تکلیف میں گزارے، پیشاب بند ہو گیا تھا، انجام کار شاہی طبیب نے مثانہ چیر کر پتھری نکالی۔ چند دن بعد اس زخم کی تاب نہ لاتے ہوئے ۷۰ سالہ خلیفہ دنیا سے چل بسا۔ یہ ۲۹ رمضان ۶۲۲ھ کا واقعہ ہے۔ اس دوران مشرق میں تاتاری عالم اسلام کے بڑے حصے پر قبضہ کر چکے تھے اور مغرب میں صلیبی جنگیں جاری تھیں۔[3]

صلیبی جنگیں اور تاتاری حملہ:

صلیبی جنگوں اور تاتاری یلغار کو تاریخِ اسلام ہی نہیں، عالمی تاریخ میں بھی غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ خلیفہ ناصر کے ۴۷ سالہ دور میں برپا ہونے والے یہ دو بہت بڑے انقلابات تھے جنہوں نے دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ قوموں کی قومیں اِدھر سے اُدھر ہو گئیں۔ ان لڑائیوں کے تہذیبی، تمدنی، سماجی، اخلاقی اور نظریاتی اثرات پورے کرۂ ارض پر پڑے۔[4]

---

[1] وكان ذالك كله دليلاً على هرم الدولة و ذهاب الملك عن اهلها بذهاب ملاكها منهم. (تاريخ ابن خلدون: ۳/۶۶۰)

[2] مفرج الكروب: ۳/۲۲۹؛ ۴/۱۶۷

[3] تاريخ الخلفاء، ص ۳۱۷ تا ۳۲۳؛ الكامل في التاريخ ۶۱۶ هجری تا ۶۲۳ هجری

[4] صلیبی جنگوں اور پھر تاتاری حملے کا تفصیلی ذکر ان شاء اللہ ہم اتابک، ایوبی اور خوارزم شاہی حکمرانوں کے حالات کے تحت حصہ چہارم میں کریں گے۔ اگر کوئی ان موضوعات کو زیادہ تفصیل سے دیکھنا چاہے تو راقم کی تصانیف ''شیر خوارزم سلطان جلال الدین'' اور ''صلاح الدین ایوبی'' کا مطالعہ کرے۔

الظاھر بامر اللہ

محمد بن احمد الناصر

رمضان ۶۲۲ھ تا رجب ۶۲۳ھ

اکتوبر ۱۲۲۵ء تا جولائی ۱۲۲۶ء

خلیفہ ناصر کی موت کے بعد اس کا بیٹا محمد ابونصر، الظاہر بامر اللہ کے لقب کے ساتھ مسند نشین ہوا۔ وہ سرخ و سپید رنگت والا خوبصورت، قوی الجثہ اور خوش اخلاق انسان تھا۔ مسندِ خلافت سنبھالتے وقت اس کی عمر ۵۲ سال ہو چکی تھی۔ [1]

نیک سیرت خلیفہ:

جب وہ خلیفہ بنا تو لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ان مخالفین کو چن چن کر قتل کرے گا جنہوں نے اسے قید کرایا تھا مگر اس نے کسی سے انتقام نہ لیا اور دستِ کرم کو سب کے لیے کشادہ رکھا۔ وہ حالات پر دردمندانہ غور کیا کرتا تھا۔ اس کی گفتگو سے سنجیدگی اور غم ظاہر ہوتا تھا۔ ایک بار اس سے کہا گیا: ''آپ گھومنے پھرنے کیوں نہیں جاتے؟'' اس نے جواب دیا: ''بازار اجڑ چکا ہے؟'' [2] وہ کہتا تھا: جس نے شام کو دکان کھولی ہو، وہ بھلا کیا نفع کما سکتا ہے۔'' [3]

وہ لوگوں سے کھلے عام ملتا تھا۔ حالانکہ گزشتہ عباسی خلفاء اکثر مستور رہا کرتے تھے اور شاذ و نادر ہی کبھی عام جلسوں میں دکھائی دیتے تھے۔ [4] وہ نہایت متقی، رحم دل، عابد و زاہد آدمی تھا۔ علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ کا بیان ہے:

''اگر کہا جائے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے بعد ایسا نیک سیرت خلیفہ اور کوئی نہیں گزرا تو یہ سچ ہوگا۔'' [5]

وہ سرکاری خزانے جو اس کے آباؤ اجداد نے جمع کیے تھے، اس نے غریبوں اور مستحق افراد پر بے دریغ خرچ کیے اور لطف و احسان سے سب کو گرویدہ بنا لیا۔ اپنے باپ کے برعکس وہ صحیح العقیدہ تھا اور پوری امت کے نفع نقصان کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ کرتا تھا۔ جہاد کو بڑی اہمیت دیتا تھا اور امت کے اتحاد کا داعی تھا۔ [6]

مگر اس نیک سیرت انسان کو صرف نو ماہ چوبیس دن حکومت کا موقع ملا۔ ۱۴ رجب ۶۲۳ھ کو اس کی وفات ہوگئی۔ [7]

زمانہ قابل لوگوں کا حق دار نہیں:

علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں: ''جب سے الظاہر خلیفہ بنا تھا، تو زمانے کی پر آشوبی اور اہل زمانہ کا فسادی پن دیکھ کر مجھے اندیشہ لاحق تھا کہ اس کی حکومت مختصر ہوگی۔ اور میں اپنے بہت سے دوستوں سے کہہ چکا تھا: ''مجھے کس قدر خوف ہے کہ اس کا زمانہ مختصر ہوگا؛ کیوں کہ ہمارا دور اور آج کل کے لوگ اس کی خلافت کے مستحق نہیں۔'' پس ایسا ہی ہوا۔ [8]

[1] سیر اعلام النبلاء: ۲۶۶/۲۲، قال السیوطی: ولد سنة احدیٰ وسبعین و خمس مائة. (تاریخ الخلفاء، ص ۳۲۴)

[2] مرآة الزمان لسبط ابن الجوزی: ۲۷۵/۲۲ ط الرسالة العالمية

[3] تاریخ الخلفاء، ص ۳۲۴؛ مفرج الکروب: ۱۶۸/۴

[4] مفرج الکروب: ۱۷۱/۴

[5] الکامل فی التاریخ: ۴۰۱/۱۰ .۶۲۲ ھجری، ط دار الکتاب

[6] بحوالہ بالا

[7] الکامل فی التاریخ: ۴۱۳/۱۰

[8] الکامل فی التاریخ: ۴۱۴/۱۰ .۶۲۳ ھجری، ط دار الکتاب

اَلْمُسْتَنْصِر باللّٰہ

منصور بن محمد الظاهر

رجب ۶۲۳ھ تا جمادی الآخرہ ۶۴۰ھ

جولائی ۱۲۲۶ء تا دسمبر ۱۲۴۲ء

الظاہر کے بعد اس کا بیٹا ابوجعفر منصور، المستنصر باللہ کے لقب کے ساتھ خلیفہ بنا۔ اس وقت اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ خوش اخلاق، نیک کردار اور شریف آدمی تھا۔ علمی اور فلاحی کاموں کا شوقین تھا۔ [1]

عظیم الشان درسگاہ، کتب خانہ اور ہسپتال:

اس نے بغداد میں ایک بہت بڑی درسگاہ ''المستنصر یہ'' قائم کی جس میں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی فقہاء کی نگرانی میں ائمہ اربعہ کی فقہ میں مہارت کے الگ الگ شعبے قائم تھے۔ اسی طرح علم حدیث، عربیت، طب اور دیگر فنون کے ماہر اساتذہ جمع تھے جنہیں شیخ الحدیث، شیخ الطب، شیخ النحو اور شیخ الفرائض وغیرہ کہا جاتا تھا۔ جامعہ کی تعمیر ۶۲۵ھ میں شروع ہوئی اور ۶۳۱ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ علماء وفقہاء، امراء اور خواص کی ایک شاندار تقریب میں جامعہ کا افتتاح کیا گیا۔

جامعہ مستنصریہ کا کتب خانہ بے نظیر تھا جہاں دنیا بھر کی کئی نایاب کتب موجود تھیں۔ طلبہ کو ہر سہولت مفت میسر تھی۔ ان کی غذا میں روٹی سالن کے علاوہ حلوے اور پھل بھی شامل ہوتے تھے۔ یتیم بچوں کا الگ کوٹہ مقرر تھا جو اہتمام سے داخل کیے جاتے تھے۔ مستنصر نے ایک ہسپتال بھی تعمیر کرایا اور بے شمار ترقیاتی کام کر کے بغداد کو قابلِ رشک بنا دیا۔ [2]

عظیم الشان فوج:

تاتاریوں سے حفاظت کے لیے اس نے عسکری شعبے کو مضبوط بنایا اور ایک لاکھ بیس ہزار سے زائد گھڑ سواروں کی فوج تیار کی۔ اس سے پہلے تین صدیوں میں بغداد میں اتنی بڑی فوج مرتب نہیں ہوئی تھی۔ [3]

حق شعاری:

وہ حق شعار انسان تھا، بے جا خوشامد پسند نہ کرتا تھا۔ ایک محفل میں کسی عالم نے اس کی تعریف میں یہ شعر کہہ دیا:

لَوْ كُنْتَ فِي يَوْمِ السَّقِيفَةِ حَاضِرًا　　كُنْتَ الْمُقَدَّمَ وَالْإِمَامَ الْأَوْرَعَا

''اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کے دن آپ موجود ہوتے تو آپ ہی کو ترجیح ہوتی اور آپ ہی متقی خلیفہ ہوتے۔''

اس پر ایک امیر داؤد بن الملک المعظم نے فوراً کہا: ''یہ جھوٹ ہے۔ اس دن امیر المؤمنین کے جدِ امجد حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی حاضر تھے مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کو ترجیح دے کر خلیفہ مانا گیا۔'' مستنصر نے اس کلمۂ حق کی تائید کی اور اس خوشامدی عالم کو سزا کے طور پر جلاوطن کر دیا۔ [4] ۱۰ جمادی الآخرہ ۶۴۰ھ کو مستنصر کا انتقال ہو گیا۔ [5]

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۳۲۵
[2] مفرج الکروب: ۲۱۷/۵
[3] مفرج الکروب: ۲۰۱/۴
[4] تاریخ الاسلام للذھبی: ۴۵۴/۴۶ ط تدمری؛ تاریخ الخلفاء، ص ۳۲۶
[5] تاریخ الخلفاء، ص ۳۲۷

اَلْمُسْتَعْصِم باللّٰه

عبدالله بن منصور المستنصر

جمادی الآخرہ ٦٤٠ھ تا صفر ٦٥٦ھ

دسمبر ۱۲۴۲ء تا مارچ ۱۲۵۸ء

مستنصر کے بعد اس کا بھائی ''خفاجی'' خلافت کا بہترین حق دار تھا۔ وہ بڑا اولوالعزم جرنیل تھا اور بغداد کی حفاظت کے لیے اس قدر پرعزم تھا کہ دریائے آمو عبور کر کے تاتاریوں سے دو دو ہاتھ کرنے پر آمادہ تھا۔ مگر ''خفاجی'' کی صلاحیتوں سے خود غرض امراء کو خدشہ تھا۔ ان ارکانِ دربار نے مستنصر کے ۳۱ سالہ فرزند عبداللہ ابواحمد کو خلیفہ مقرر کر دیا تاکہ اس کی نرم طبعی سے فائدہ اٹھا کر خود حکومت کریں۔ اس طرح ابواحمد ''مستعصم باللہ'' کا لقب لگا کر خلیفہ بن گیا۔[1]

کمزور حکمران:

مستعصم بغداد کے عباسی خلفاء کا آخری چشم و چراغ تھا۔ اپنے باپ اور دادا کی طرح دین دار، نرم مزاج، سخی اور نیک سیرت تھا مگر حوصلہ مندی، بیدار مغزی اور فراست سے عاری تھا۔[2]

نبوی پیش گوئی کا ظہور:

مستعصم کے آخری سالوں میں متعدد آسمانی آفات نازل ہوئیں۔ ۶۵۴ھ میں مدینہ کے مضافات میں وہ آگ ظاہر ہوئی جس کی پیش گوئی احادیث میں ہے۔ یہ آگ پتھروں کو جلا دیتی تھی، اس کی روشنی بُصریٰ تک دکھائی دیتی تھی۔[3]

سقوطِ بغداد۔ خلافتِ عباسیہ کا خاتمہ:

مستعصم کے دور میں تاتاری ہر طرف قابض تھے۔ مستعصم کا چچا ''خفاجی'' امراء کی سازشوں کے باعث عضوِ معطل بن چکا تھا۔ جبکہ ابن علقمی رافضی خلافتِ عباسیہ کا وزیر تھا۔ اس غدار نے عباسی خاندان کو مٹا کر شیعی خلافت کی داغ بیل ڈالنے کے لیے تاتاریوں سے ساز باز کر لی اور انہیں بغداد پر چڑھائی کی دعوت دی۔ آخر کار محرم ۶۵۶ھ میں تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا۔ ۱۴ صفر کو خلیفہ مستعصم پورے خاندان سمیت قتل کر دیا گیا۔ اس طرح خلافتِ بغداد کا خاتمہ ہو گیا۔ اس خاندان میں کل ۳۷ خلفاء گزرے۔ پہلا ابوالعباس سفاح اور آخری مستعصم تھا۔[4]

صلیبی جنگیں اور یورشِ تاتار اسلامی تاریخ کے دو خونچکاں اور سبق آموز ابواب ہیں جن کا ذکر ہم اتابک، ایوبی اور خوارزم شاہی حکمرانوں کے حالات کے تحت تفصیل سے کریں گے۔ وہیں سقوطِ بغداد اور اس کے اسباب و علل پر بھی بحث ہوگی۔ یہاں ہم نے یہ حالات مختصراً بیان کیے ہیں تاکہ عباسی خلفاء کا تذکرہ ایک تسلسل کے ساتھ مکمل ہو جائے۔

---

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۳۲۸
[2] سیر اعلام النبلاء: ۱۷۵/۲۳
[3] سیر اعلام النبلاء: ۱۸۰/۲۳۔ نبوی پیش گوئی کے لیے دیکھیے: صحیح البخاری، ح: ۷۱۱۸، باب خروج النار
[4] البدایة والنهایة: سنة ٦٥٦ھ؛ تاریخ الخلفاء، ص ۳۲۸، ۳۳۲

خلافتِ عباسیہ کا زوال...... اسباق و عبر

❀ بنوعباس کے دورِ زوال میں ہمیں اکثر خلفاء نیک اور متقی دکھائی دیتے ہیں، معاشرے میں علماء و صلحاء کی بھی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی، اس کے باوجود زوال بڑھتا چلا جاتا ہے اور اسلام دشمن طاقتیں سیاسی منظرنامے پر حاوی ہوتی جاتی ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کامیاب اسلامی حکومت کے لیے صرف حکمران کا اسلام پر عمل پیرا ہونا یا معاشرے میں علماء و صلحاء کی موجودگی کافی نہیں۔ بلکہ اس کے لیے جو سب سے بڑا جوہر درکار ہے وہ ہے عمومی دینی رجحان۔ اگر اس جوہر میں کمی ہو تو اسلامی حکومت یقیناً کمزور ہوگی۔ ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: ''کیا وجہ ہے گزشتہ خلفاء کے دور میں اختلاف نہیں ہوا مگر آپ کے دور میں اختلاف پیدا ہوگیا؟'' امیر المؤمنین نے جواب میں فرمایا:

''لِاَنَّ اَبَا بَکْرٍ وَعُمَرَ کَانَا وَالِیَیْنِ عَلٰی مِثْلِیْ وَاَنَا وَالٍ عَلٰی مِثْلِكَ.''

(کیوں کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی حکومت مجھ جیسوں پر تھی اور میری تم جیسوں پر ہے۔)[①]

معلوم ہوا کہ اگر عوام میں دینی جوہر کمزور پڑ گیا ہو تو نیک سے نیک حکمران بھی مطلوبہ اہداف حاصل نہیں کرسکتا بلکہ لوگ خود ایسے دیندار حاکم کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے اس دینی جوہر اور اسلامی رجحان کو ''الوازع الدینی'' کا نام دیا ہے اور اسی کو خلفائے راشدین کی کامیابی کی اصل وجہ قرار دیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

''خلفائے راشدین ایسے دور میں تھے جب ملوکیت کا مزاج پیدا نہیں ہوا تھا اور معاشرے پر دینی رجحان غالب تھا؛ اس لیے لوگوں نے اپنے رجحان کے مطابق صرف ایسے افراد کو خلافت سونپی جو دینی اعتبار سے قابل ترین تھے اور دوسرے افراد جن کی نگاہیں خلافت کی طرف اٹھ رہی تھیں، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔''[②]

اس کے بعد ہم بنوامیہ اور بنوعباس کے دور کا مشاہدہ کرتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ اموی دور میں اس دینی جوہر میں کمزوری آگئی تھی تاہم یہ ضعف ایسا بھی نہ تھا کہ مملکت کے دینی خدوخال مٹ جاتے بلکہ مسلمان اب بھی اسلام ہی کے نام پر اکٹھے ہوتے اور جہاد کرتے تھے اور اسی لیے بنوعباس ''الرضا من آلِ محمد'' کے ساتھ اسلام کا نعرہ لگا کر ایک مضبوط حکومت بنانے میں کامیاب ہوئے جو ایک صدی سے زائد مدت تک روبہ عروج رہی۔

تاہم اس دینی رجحان کو قبائلی عصبیت اندر ہی اندر کاٹ رہی تھی۔ قبائلی تفاخر کی وجہ سے پہلی صدی ہجری کے ختم ہوتے ہی ربیعہ اور مضر کا اختلاف پھیلا اور عرب قبائل آپس میں بھڑ گئے۔ پھر بنوہاشم کی انقلابی تحریک کے دوران

---

① مقدمہ ابن خلدون، ص ۲۰۴ (تاریخ ابن خلدون، جلد اول، ط دار الفکر)

② فلسانهم غیر شأن اولئك الخلفاء فانهم كانوا على حين لم تحدث طبيعة الملك وكان الوازع دينيا فعند كل احد وازع من نفسه فعهدوا الى كل من يرتضيه الدين فقط، وآثروه على غيره. (مقدمہ ابن خلدون، ص ۲۶۳. تاریخ ابن خلدون، جلد اول، ط دار الفکر)

اموی اور ہاشمی کا اختلاف پھیلا اور امت مزید دو ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ کچھ لوگ حکمران خاندان یعنی بنوامیہ کے حامی رہے اور کچھ حزبِ مخالف بنو ہاشم کے ساتھ ہو گئے۔ پھر بنوعباس کی حکومت آتے ہی خود بنو ہاشم میں علوی اور عباسی کی افضلیت کا سوال کھڑا ہوا اور بنو عباس کو افضل نہ ماننے والوں نے خروج کی کئی تحریکیں برپا کیں۔ اس طرح دینی روح پسِ منظر میں چلی گئی اور خاندانی گروہ بندی غالب آ گئی جس نے اُمت کے مزاج کو بری طرح متاثر کیا۔ پس اصلاح کی ساری کوششیں ناکام ہوتی چلی گئیں اور زوال کا دور طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا۔

❀ کئی صدیوں کا تجربہ ثابت کرتا ہے کہ اُمت کا اتحاد "اسلامی روح" سے پیدا ہوتا ہے۔ اس روح کے کمزور پڑتے ہی اتحاد بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔ اس روح کے ختم ہونے سے، اتحاد ختم ہو جاتا ہے۔ اُمت کو متحد کرنا نہایت ضروری ہے مگر اس کے لیے کبھی بھی قرار دادیں، مطالبات، جلسے اور جلوس کافی نہیں ہو سکتے بلکہ یہ اتحاد اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب معاشرے میں بڑی حد تک دینی رجحان کا غلبہ ہو جائے۔ دینی رجحان، معاشرے کی اصلاح سے پیدا ہوگا اور معاشرے کی اصلاح، افراد کی تربیت اور ذہن سازی سے ہوتی ہے۔

❀ اتحادِ اُمت کہنے کو ایک لفظ ہے مگر درحقیقت یہ ایک طویل سفر ہے۔ سڑکوں پر اتحاد اتحاد کے نعرے لگوا دینے سے یہ ہدف حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے قدم قدم پر ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرنا پڑے گا۔ دولت و منصب اور عزت و شہرت کا ایثار کرنا ہوگا۔ اپنی رائے، اپنے ذاتی رجحان اور اپنے مفاد کو بار بار قربان کرنا ہوگا۔ جب ایک بڑی تعداد اس نہج پر آ جائے گی تو کوئی نعرہ لگائے بغیر اتحاد کی فضا قائم ہونے لگے گی۔

❀ معاشرتی اقدار میں تغیر اور ایوانِ اقتدار میں تبدیلیاں ایک دوسرے کو لازم و ملزوم ہیں۔ حالات کے لحاظ سے کبھی پہلے بالائی سطح پر صالح تبدیلی آتی ہے اور اس کے اثرات آہستہ آہستہ نیچے منتقل ہوتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پہلے معاشرے میں تغیر رونما ہوتا ہے اور پھر اس کے اثرات اقتدار کے بالا خانوں تک جا پہنچتے ہیں۔

عام طور پر کہا جاتا ہے: "اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِم." (لوگ اپنے حکمرانوں کے مذہب پر چلا کرتے ہیں۔) یہ بات تاریخ کے بہت سے ادوار پر صادق آتی ہے۔ قیصر و کسریٰ اور پھر بنو بُوَیہ اور بنو عبید کے دور میں ہم اس کی مثالیں دیکھ سکتے ہیں۔ حکمران طبقہ عموماً اپنے اعتقادی، نظریاتی، اخلاقی اور تہذیبی اثرات نیچے منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے، کہیں ظلم و جبر سے اور کہیں ترغیب و دلجوئی کے ساتھ۔ ظلم و جبر کی کوشش عموماً ناپائیدار ہوتی ہے جبکہ ترغیب کا وار اکثر کارگر ہوتا ہے۔ بنو عبید نے شیعی اثرات کی ترویج کے لیے سخت جبر و تشدد سے کام لیا؛ اس لیے ان کی دعوت دلوں میں نہ اتری اور تین صدیوں تک حکومت کے باوجود ان کے ہٹتے ہی مراکش سے مصر تک دوبارہ شعائرِ اہلِ سنت زندہ ہو گئے۔ بنو بُوَیہ نے سیاسی داؤ پیچ کا راستہ اپنایا اور علمی و فکری تلبیسات سے کام لیا؛ اس لیے ان کے دور میں اثنا عشریت کی جو اشاعت ہوئی اس کے اثرات صدیوں بعد بھی باقی ہیں۔

❀ یہ تجزیہ کرنا زیادہ مشکل نہیں کہ ماضی کے کس دور میں اوپر سے نچلی سطح کی طرف انقلاب آیا اور کب کب زیریں

دستوں نے بالادستوں کو متاثر کیا۔ مگر اپنے دور کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ آج کونسی صورت زیادہ کارگر ہوگی۔ تاہم تاریخ کا مطالعہ اس مشکل کو آسان کر دیتا ہے۔ تاریخ کے ذریعے ہم اپنے دور کے حالات کا موازنہ ماضی کے معاشروں سے کر سکتے ہیں۔ متنوع حالات اور مختلف زمانوں میں کامیاب یا ناکام ہونے والی تحریکوں سے سبق لے سکتے ہیں۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ ہم یہ موازنہ ذاتی رجحانات اور طبعی میلان کو بالائے طاق رکھ کر پوری ہوش مندی سے اور بالکل ٹھنڈے دل ودماغ کے ساتھ کریں۔ ورنہ ممکن ہے کہ کسی خوش فہمی یا غلط فہمی کا شکار ہو کر ہم ماضی کی کسی ایسی تحریک کی تقلید شروع کر دیں جو درحقیقت آج سے مختلف حالات میں کامیاب ہوئی ہو۔ اگر ہمارا موازنہ غلط ہوا تو ہمارا فیصلہ اور اقدام بھی غلط ہوگا اور ایسے میں ہمیں یقیناً ناکامی ہی کا سامنا ہوگا۔

❁ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اگر برائی اس پیانے پر پھیل گئی ہو کہ اوپر سے نیچے تک سبھی اس میں ملوث ہوں تو اصلاح کی کوشش نچلی سطح سے شروع کرنا کارگر ہوتا ہے۔ معاشرے میں عمومی تبدیلی آنے کے بعد ہی سیاست کی اصلاح ہو پاتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو رحمتِ عالم ﷺ کی کوشش ایسے ہی دور میں ہوئی تھی جب ہر طرف گمراہی کا راج تھا۔ چنانچہ اس دعوت کا آغاز معاشرے میں نچلی سطح پر محنت اور افراد سازی سے ہوا تھا۔

ہاں اگر شر اور خیر کا تناسب قریب قریب ہو تو طاقت کے ذریعے شر کو دفع کیا جا سکتا ہے۔ پس اگر طاقت حاصل کرنے کے ذرائع دسترس میں ہوں اور کامیابی کا گمان غالب ہو تو پھر سیاسی سطح پر تبدیلی لا کر شر کو دور کرنے کی کوشش کامیاب ہو سکتی ہے۔ یہ تبدیلی ایک عملِ جراحی کی طرح ہوتی ہے جس سے فوری طور پر فاسد مادہ خارج ہو جاتا ہے۔ مگر یاد رہے کہ آپریشن کے لیے ہمیشہ سرجن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کوئی اناڑی یہ کام کرے گا تو ممکن ہے مریض کی حالت پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو جائے اور عین ممکن ہے کہ وہ جانبر نہ ہو سکے۔

❁ قدرتِ الٰہیہ کا ایک ضابطہ ہے جس پر تاریخ کی ہزاروں گواہیاں ثبت ہیں، وہ یہ کہ جسے جو کچھ ملتا ہے، وہ اس کے ظرف، استعداد اور صلاحیت کے مطابق ملتا ہے۔ جس سے جو چھینا جاتا ہے وہ اس کی کم ظرفی اور خراب استعداد کی وجہ سے چھینا جاتا ہے۔ چوتھی صدی ہجری میں بنوعباس کی سیاسی استعداد خراب ہو چکی تھی۔ اُدھر بنوبُویہ اور بنوعبید نے ملک گیری کا سبق سیکھ لیا تھا۔ پس بنوعباس اہلِ حق ہو کر اور مسندِ خلافت پر متمکن رہ کر بھی غلام بن گئے۔ بنوبُویہ اور بنوعبید شیعہ اقلیت ہو کر بھی سنی اکثریت پر حکومت کرتے رہے۔

❁ تاریخ بتاتی ہے کہ جب اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی گئی تو اللہ نے قحط سالی، گرانی، دشمنوں کے غلبے اور باہمی خانہ جنگی کا عذاب مسلط کر دیا۔ اس انجام کی پیش گوئی خود کلام اللہ میں موجود ہے:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ

"اور اللہ نے مثال بیان کی ایک بستی کی جو امن اور چین سے تھی اور اس بستی کے لیے رزق آتا تھا وافر مقدار

میں ہر طرف سے، پس اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کی تو اللہ نے چکھایا اسے بھوک اور خوف کے لباس کا مزا۔ بسبب ان افعال کے جو وہ کر رہے تھے۔''[1]

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ

''اے نبی! ان سے کہیے کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ (تمہاری نافرمانی کے سبب) تمہارے اوپر بھیج دے عذاب تمہارے اوپر سے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے، یا (اسے کوئی عذاب بھیجنے کی ضرورت ہی نہ پڑے بلکہ) وہ تمہیں بھڑا دے گروہ بنا کر، پس تم میں سے بعض کو بعض کی لڑائی کا مزہ چکھا دے، اے نبی! دیکھیے کہ ہم کس طرح اپنی آیات کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں تاکہ وہ بات کو سمجھ سکیں۔''[2]

بنو عباس کے دورِ زوال اور آج اپنے حالات میں ہم ان آسمانی عذابوں کی جھلکیاں جگہ جگہ دیکھ سکتے ہیں۔

❁ تاریخ کا ایک سبق یہ بھی ہے کہ جو افراد، جو معاشرے اور جو ممالک دینے پر یقین رکھتے ہیں اور وہ استعداد و صلاحیت میں اضافے کی وجہ سے نفع رسانی کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں، وہی ممتاز حیثیت میں باقی اور غالب رہتے ہیں، چاہے یہ نفع رسانی دینی ہو یا دنیاوی۔

اس کے برعکس جو افراد، جو معاشرے اور جو ممالک نہ دینی لحاظ سے نفع رساں رہیں نہ دنیاوی اعتبار سے، بلکہ وہ صرف لینے پر اکتفا کریں، وہ اپنی نفع رسانی کا پہلو کھو دیتے ہیں اور بہت جلد حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتے ہیں۔ اللہ کا قانون ہے کہ جو چیز نفع رساں ہوگی وہ باقی رہے گی، جو چیز بے کار ہوگی وہ ضائع کر دی جائے گی۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ○

''اللہ تعالیٰ نے آسمان سے نازل فرمایا پانی۔ پھر وادیاں بہہ نکلیں اپنی اپنی وسعت کے مطابق، پس پانی کے ریلے نے اُٹھا لیا ابھرنے والا جھاگ۔ اور وہ دھاتیں جن کو یہ آگ کے اندر گرم کرتے ہیں تاکہ ان دھاتوں کے ذریعے سے کچھ زیورات یا کچھ اور ساز و سامان حاصل کریں اس پر بھی اسی طرح کا جھاگ (زنگ) آجاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ بیان کرتا ہے حق اور باطل کو۔ پس وہ جو جھاگ ہوتا ہے وہ تو سوکھ کر اڑ جاتا ہے اور وہ جو کہ لوگوں کو فائدہ دینے والی چیز ہوتی ہے وہ زمین کے اندر باقی رہتی ہے۔ بیشک باطل ہے ہی مٹ جانے کے لیے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ مثالیں بیان کر رہا ہے۔''[3]

---

① سورة النحل، آیت: ۱۱۲ ② سورة الانعام، آیت: ۶۵

③ سورة الرعد، آیت: ۱۷

اُمتِ محمدیہ کو آخری اُمت ہونے کے ناطے سارے انسانوں کی نفع رسانی کے لیے وجود بخشا گیا ہے۔یہی اس کا فرض منصبی اور مقصدِ وجود ہے کہ سارے عالم کو فائدہ پہنچائے۔دین و دنیا میں ان کی رہنمائی کرے۔انہیں نارِ جہنم سے بچانے کی تگ و دو کرے، کفر و شرک، ظلم و ستم اور بد اخلاقی و بے حیائی کے ماحول سے نکال کر ایمان و یقین، عدل و انصاف اور شرافت و حیاداری کے ماحول میں لائے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

''(اے مسلمانو!) تم ہو بہترین امت، تمہیں نکالا گیا ہے لوگوں (کی نفع رسانی) کے لئے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، اور برائی سے روکتے ہو اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''[1]

جب تک امت نے یہ فرضِ منصبی انجام دیا اور خود کو انسانیت کے لیے نفع مند ثابت کیا، اللہ نے انہیں عزت و توقیر کے ساتھ غالب رکھا۔ جب تک وہ دعوتِ اسلام دیتے رہے، علم پھیلاتے رہے اور صداقت و عدالت کا پرچم لہراتے رہے، دنیا ان کے پیچھے تھی مگر جب وہ ان مقاصدِ عالیہ سے غافل ہو کر عام قوموں کی طرح رہنے بسنے، کھانے پینے، حکومتیں بنانے اور توڑنے میں منہمک ہو گئے تو ان کی نفع رسانی کا پہلو ختم ہو گیا اور وہ اللہ کی ناراضی کے مستحق بن گئے۔

❁ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ پیغمبر آخر الزماں ﷺ کی اُمت ہونے کے ناطے اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسلمانوں پر درِ رحمت ہمیشہ کشادہ رہا ہے۔مشیتِ الٰہیہ انہیں آخری حد تک مواقع فراہم کرتی رہی ہے۔ہاں! اگر مسلمانوں نے خود ہی اس کی بارگاہ سے منہ موڑ کر اس کے عذاب کو دعوت دی ہو تو یہ ان کی اپنی بدبختی تھی۔

❁ تاریخ کے یہ اوراق بتاتے ہیں کہ مسلمانوں میں باہمت، صائب الرائے، اولوالعزم اور سرفروش رجال کار ہر دور میں موجود رہے ہیں۔رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق ایک جماعت ہمیشہ دین کی سربلندی کے لیے اَن تھک جدوجہد کرتی رہی ہے اور کسی کا ظلم یا خوف انہیں دعوتِ حق اور اعلائے کلمۃ اللہ سے نہیں روک سکا۔[2]

❁ تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمان ڈوب ڈوب کر ابھرے ہیں۔وہ کبھی مستقل مغلوب نہیں ہوئے۔اگر انہیں ایک میدان میں شکست ہوئی تو بہت جلد وہ دوسرے میدان میں فتح کا پرچم لہراتے ہوئے نمودار ہوئے۔دعائے رسالت مآب ﷺ کی بدولت کوئی ایسا دشمن ان پر غلبہ پا سکا ہے نہ پا سکے گا جو اسلام اور فرزندانِ توحید کو بالکل مٹا دے۔[3] اسی لیے تا قربِ قیامت یہ دین باقی رہے گا۔

❁ تاریخ کا آخری اور اہم ترین سبق یہ ہے کہ دنیا فانی ہے، باقی اور ہمیشہ رہنے والی ذات صرف ایک اکیلے اللہ کی ہے۔کیا تاریخ میں مذکور کوئی اچھی یا بری شخصیت ایسی ہے جو آج تک زندہ ہو؟؟ کوئی فرد ایسا نہیں جو موت سے نجات پا سکے۔پس ضروری ہے کہ اپنی روانگی کے وقت کو یاد رکھا جائے اور اس سے پہلے ایسے کام کر لیے جائیں جو خالق کی رضا مندی، مخلوق کی دعا اور آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بن سکیں۔

[1] سورۂ آل عمران، آیت: ۱۱۰ [2] صحیح مسلم، ح: ۵۰۵۹ [3] صحیح مسلم، ح: ۷۲۴۰

جدول خلفائے بنوعباس......خلفاء کا آغاز وانجام

نمبر	خلیفہ	آغازِ حکومت واختتام حکومت	انجام
۱	ابوالعباس سفاح	۱۲ربیع الاول ۱۳۲ھ تا ۱۱ذوالحجہ ۱۳۶ھ ۱۱اکتوبر ۷۴۹ء تا ۱۹جون ۷۵۴ء	طبعی وفات
۲	ابوجعفر المنصور	۱۱ذوالحجہ ۱۳۶ھ تا ۶ذوالحجہ ۱۵۸ھ ۱۹جون ۷۵۴ء تا ۱۸اکتوبر ۷۷۵ء	طبعی وفات
۳	المہدی	۶ذوالحجہ ۱۵۸ھ تا ۲۲محرم ۱۶۹ھ ۱۸اکتوبر ۷۷۵ء تا ۱۵اگست ۷۸۵ء	شکار کھیلتے ہوئے زخمی ہوکر فوت ہوا
۴	الہادی	۲۲محرم ۱۶۹ھ تا ۱۵ربیع الاوّل ۱۷۰ھ ۱۵اگست ۷۸۵ء تا ۲۶ستمبر ۷۸۶ء	اچانک پراسرار موت
۵	ہارون الرشید	۱۵ربیع الاوّل ۱۷۰ھ تا ۳جمادی الآخرہ ۱۹۳ھ ۲۶ستمبر ۷۸۶ء تا ۱۵اپریل ۸۰۹ء	طبعی وفات
۶	امین الرشید	اوسط جمادی الآخرہ ۱۹۳ھ تا ۲۵محرم ۱۹۸ھ وسط اپریل ۸۰۹ء تا ۱۷اکتوبر ۸۱۳ء	قتل ہوا
۷	مامون الرشید	۲۵محرم ۱۹۸ھ تا ۱۸رجب ۲۱۸ھ ۱۷اکتوبر ۸۱۳ء تا ۲۰اگست ۸۳۳ء	طبعی وفات
۸	معتصم باللہ	۱۸رجب ۲۱۸ھ تا ۱۸ربیع الاوّل ۲۲۷ھ ۲۰اگست ۸۳۳ء تا ۱۸دسمبر ۸۴۱ء	طبعی وفات
۹	واثق باللہ	۱۸ربیع الاوّل ۲۲۷ھ تا ۲۴ذوالحجہ ۲۳۲ھ ۱۸دسمبر ۸۴۱ء تا ۱۲اگست ۸۴۷ء	طبعی وفات
۱۰	متوکل علی اللہ	۲۴ذوالحجہ ۲۳۲ھ تا ۵شوال ۲۴۷ھ ۱۲اگست ۸۴۷ء تا ۲۴دسمبر ۸۶۱ء	قتل ہوا

۱۱	المنتصر	۵شوال ۲۴۷ھ تا ۵ربیع الآخر ۲۴۸ھ ۲۴دسمبر ۸۶۱ء تا ۲۰ مئی ۸۶۲ء	زہر دے کر مارا گیا
۱۲	المستعین	۵ربیع الآخر ۲۴۸ھ تا ۴محرم ۲۵۲ھ ۲۰مئی ۸۶۲ء تا ۶فروری ۸۶۶ء	معزول کر کے بعد میں قتل کیا گیا
۱۳	المعتز	۴محرم ۲۵۲ھ تا ۲۸رجب ۲۵۵ھ ۶فروری ۸۶۶ء تا ۲۴جولائی ۸۶۹ء	گرم سرد کر کے قتل کیا گیا
۱۴	المہدی	۲۸رجب ۲۵۵ھ تا ۱۶رجب ۲۵۶ھ ۲۴جولائی ۸۶۹ء تا یکم جولائی ۸۷۰ء	قتل کیا گیا
۱۵	المعتمد	۱۶رجب ۲۵۶ھ تا اواخرِ محرم ۲۷۹ھ یکم جولائی ۸۷۰ء تا اواخرِ مارچ ۸۹۴ء	استعفیٰ دے دیا
۱۶	المعتضد	اواخرِ محرم ۲۷۹ھ تا ۲۲ربیع الآخر ۲۸۹ھ اواخرِ مارچ ۸۹۴ء تا ۱۶اپریل ۹۰۲ء	طبعی وفات
۱۷	المکتفی	۲۲ربیع الآخر ۲۸۹ھ تا ۱۲ذوالقعدہ ۲۹۵ھ ۱۶اپریل ۹۰۲ء تا ۱۳اگست ۹۰۸ء	طبعی وفات
۱۸	المقتدر	۱۲ذوالقعدہ ۲۹۵ھ تا ۲۷شوال ۳۲۰ھ ۱۳اگست ۹۰۸ء تا ۱۱ نومبر ۹۳۲ء	قتل کیا گیا
۱۹	القاہر	۲۷شوال ۳۲۰ھ تا ۶جمادی الآخرہ ۳۲۲ھ ۱۱نومبر ۹۳۲ء تا ۴جون ۹۳۴ء	معزول کر کے اندھا اور قید کر دیا گیا
۲۰	الراضی	۶جمادی الآخرہ ۳۲۲ھ تا ۱۵ربیع الاوّل ۳۲۹ھ ۴جون ۹۳۴ء تا ۳۰ دسمبر ۹۴۰ء	طبعی وفات
۲۱	المتقی	۱۵ربیع الاوّل ۳۲۹ھ تا ۱۲صفر ۳۳۳ھ ۳۰ دسمبر ۹۴۰ء تا ۱۷اکتوبر ۹۴۴ء	معزول کر کے اندھا اور قید کر دیا گیا
۲۲	المستکفی	۱۲صفر ۳۳۳ھ تا ۲۲جمادی الآخرہ ۳۳۴ھ ۱۷اکتوبر ۹۴۴ء تا ۹فروری ۹۴۶ء	معزول کر کے اندھا اور قید کیا گیا
۲۳	المطیع	۲۲جمادی الآخرہ ۳۳۴ھ تا ۱۳ذوالقعدہ ۳۶۳ھ ۹فروری ۹۴۶ء تا ۱۷اگست ۹۷۴ء	استعفیٰ دے دیا

۲۴	الطائع	۱۳ ذوالقعدہ ۳۶۳ھ تا ۹ شعبان ۳۸۱ھ ۱۷ اگست ۹۷۴ء تا ۲ نومبر ۹۹۱ء	معزول کر کے محل میں نظر بند کیا گیا
۲۵	القادر	۹ شعبان ۳۸۱ھ تا ۱۱ ذوالحجہ ۴۲۲ھ ۲ نومبر ۹۹۱ء تا ۱۱ دسمبر ۱۰۳۱ء	طبعی وفات
۲۶	القائم	۱۱ ذوالحجہ ۴۲۲ھ تا ۱۳ شعبان ۴۶۷ھ ۱۱ دسمبر ۱۰۳۱ء تا ۱۴ اپریل ۱۰۷۵ء	طبعی وفات
۲۷	المقتدی	۱۳ شعبان ۴۶۷ھ تا ۱۸ محرم ۴۸۷ھ ۱۴ اپریل ۱۰۷۵ء تا ۱۹ فروری ۱۰۹۴ء	طبعی وفات
۲۸	المستظہر	۱۸ محرم ۴۸۷ھ تا ۱۶ ربیع الآخر ۵۱۲ھ ۱۹ فروری ۱۰۹۴ء تا ۱۹ اگست ۱۱۱۸ء	طبعی وفات
۲۹	المسترشد	۱۶ ربیع الآخر ۵۱۲ھ تا ۱۷ ذوالقعدہ ۵۲۹ھ ۹ اگست ۱۱۱۸ء تا ۱۰ ستمبر ۱۱۳۵ء	قتل کیا گیا
۳۰	الراشد	۱۰ ذوالقعدہ ۵۲۹ھ تا ۱۶ ذوالقعدہ ۵۳۰ھ ۳ ستمبر ۱۱۳۵ء تا ۱۲۸ اگست ۱۱۳۶ء	قتل کیا گیا
۳۱	المقتفی	۱۶ ذوالقعدہ ۵۳۰ھ تا ۲ ربیع الاوّل ۵۵۵ھ ۱۲۸ اگست ۱۱۳۶ء تا ۲۴ مارچ ۱۱۶۰ء	طبعی وفات
۳۲	المستنجد	۲ ربیع الاوّل ۵۵۵ھ تا ۸ ربیع الآخر ۵۶۶ھ ۲۴ مارچ ۱۱۶۰ء تا ۳۰ دسمبر ۱۱۷۰ء	طبعی وفات
۳۳	المستضی	۸ ربیع الآخر ۵۶۶ھ تا ۲۹ شوال ۵۷۵ھ ۳۰ دسمبر ۱۱۷۰ء تا ۹ اپریل ۱۱۸۰ء	طبعی وفات
۳۴	الناصر	۲۹ شوال ۵۷۵ھ تا ۲۹ رمضان ۶۲۲ھ ۹ اپریل ۱۱۸۰ء تا ۱۶ اکتوبر ۱۲۲۵ء	طبعی وفات
۳۵	الظاہر	۲۹ رمضان ۶۲۲ھ تا ۱۴ رجب ۶۲۳ھ ۱۶ اکتوبر ۱۲۲۵ء تا ۲۳ جولائی ۱۲۲۶ء	طبعی وفات
۳۶	المستنصر	۱۴ رجب ۶۲۳ھ تا ۱۰ جمادی الآخرہ ۶۴۰ھ ۲۳ جولائی ۱۲۲۶ء تا ۱۷ دسمبر ۱۲۴۲ء	طبعی وفات

۳۷	المستعصم	۱۰ جمادی الآخرہ ۶۴۰ھ تا ۱۴ صفر ۶۵۶ھ ۱۷ دسمبر ۱۲۴۲ء تا ۳ مارچ ۱۲۵۸ء	قتل کیا گیا

◆◆◆

جدول خلفائے بنو عباس۔ کیفیات وحالات

دورِ عروج کے دس خلفاء

نمبر	خلیفہ	دورِ حکومت	کردار	خاص انقلاب
۱	ابوالعباس سفاح	۱۳۲ھ تا ۱۳۶ھ ۷۴۹ء تا ۷۵۴ء	سخت گیر، فیاض	عباسی خلافت کا قیام
۲	ابوجعفر المنصور	۱۳۶ھ تا ۱۵۸ ۷۵۴ء تا ۷۷۵ء	سخت گیر، کفایت شعار	باغیوں کی سرکوبی
۳	المہدی	۱۵۸ھ تا ۱۶۹ھ ۷۷۵ء تا ۷۸۵ء	نیک سیرت، فیاض، نرم	زندیقوں کا قلع قمع
۴	الہادی	۱۶۹ھ تا ۱۷۰ھ ۷۸۵ء تا ۷۸۶ء	سخت طبع	برامکہ کا اثر ورسوخ بڑھ گیا
۵	ہارون الرشید	۱۷۰ھ تا ۱۹۳ھ ۷۸۶ء تا ۸۰۹ء	نیک، عادل، دلیر، سخی	علاقائی حکومتوں کے قیام کا آغاز
۶	امین الرشید	۱۹۳ھ تا ۱۹۸ھ ۸۰۹ء تا ۸۱۳ء	نیک، اعلیٰ نسب، ناسمجھ	ملک تقسیم، بغداد میں فسادات
۷	مامون الرشید	۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ ۸۱۳ء تا ۸۳۳ء	ذہین، علم دوست، کج فکر	تشیع اور اعتزال کا دور دورہ
۸	معتصم باللہ	۲۱۸ھ تا ۲۲۷ھ ۸۳۳ء تا ۸۴۱ء	ان پڑھ، بہادر، جنگجو	ترکوں کا عروج، جہادِ روم
۹	واثق باللہ	۲۲۷ھ تا ۲۳۲ھ ۸۴۱ء تا ۸۴۷ء	نیک طبع، معتزلی	آخر میں اعتزال سے تائب ہو گیا

۱۰	متوکل علی اللہ	۲۳۲ھ تا ۲۴۷ھ ۸۴۷ء تا ۸۶۱ء	سنت کا شیدائی	احیائے سنت

دورِ زوال کے ۲۷ خلفاء

نمبر	خلیفہ	دورِ حکومت	کردار	خاص انقلاب
۱	المنتصر	۲۴۷ھ تا ۲۴۸ھ ۸۶۱ء تا ۸۶۲ء	کمزور، جلد باز	ترکوں کا غلبہ۔ خلفاء بے دست وپا
۲	المستعین	۲۴۸ھ تا ۲۵۲ھ ۸۶۲ء تا ۸۶۶ء	کمزور، نیک سیرت	
۳	المعتز	۲۵۲ھ تا ۲۵۵ھ ۸۶۶ء تا ۸۶۹ء	کمزور، بد سیرت	خراسان میں دولتِ صفاریہ اور مصر میں دولتِ طولونیہ کا قیام
۴	المہدی	۲۵۵ھ تا ۲۵۶ھ ۸۶۹ء تا ۸۷۰ء	نیک اور ہوشیار	
۵	المعتمد	۲۵۶ھ تا ۲۷۹ھ ۸۷۰ء تا ۸۹۴ء	کمزور ترین، بے اختیار	وسطِ ایشیا میں دولتِ سامانیہ کا قیام
۶	مُعتضِد	۲۷۹ھ تا ۲۸۹ھ ۸۹۴ء تا ۹۰۲ء	مضبوط اور ہوشیار	خلافت کی آن بان بحال
۷	المکتفی	۲۸۹ھ تا ۲۹۵ھ ۹۰۲ء تا ۹۰۸ء	نیک اور متقی	
۸	المقتدر	۲۹۵ھ تا ۳۲۰ھ ۹۰۸ء تا ۹۳۲ء	کمزور ترین۔ بے اختیار	خلافت پھر کمزور تر۔ خواتین امورِ حکومت پر غالب
۹	القاہر	۳۲۰ھ تا ۳۲۲ھ ۹۳۲ء تا ۹۳۴ء	تشدد پسند، ظالم وجابر	
۱۰	الراضی	۳۲۲ھ تا ۳۲۹ھ ۹۳۴ء تا ۹۴۰ء	کمزور، بے اختیار	

نمبر	خلیفہ	مدت	سیرت	اہم واقعات
۱۱	المتقی	۳۲۹ھ تا ۳۳۳ھ ۹۴۰ء تا ۹۴۴ء	کمزور، بے اختیار	
۱۲	المستکفی	۳۳۳ھ تا ۳۳۴ھ ۹۴۴ء تا ۹۴۶ء	کمزور، بے اختیار	بنو بُویہ کا تسلط
۱۳	المطیع	۳۳۴ھ تا ۳۶۳ھ ۹۴۶ء تا ۹۷۴ء	کمزور، بے اختیار	
۱۴	الطائع	۳۶۳ھ تا ۳۸۱ھ ۹۷۴ء تا ۹۹۱ء	کمزور، بے اختیار	
۱۵	القادر	۳۸۱ھ تا ۴۲۲ھ ۹۹۱ء تا ۱۰۳۱ء	ہوشیار۔ دین دار۔ عالم فاضل	محمود غزنوی کا ظہور، بنو بُویہ کے مقابلے میں خلیفہ کے اختیارات کچھ بہتر ہوئے
۱۶	القائم	۴۲۲ھ تا ۴۶۷ھ ۱۰۳۱ء تا ۱۰۷۵ء	نیک سیرت اور خوش قسمت	سلاجقہ کا ظہور، بنو بُویہ کا خاتمہ، وقار خلافت بحال
۱۷	المقتدی	۴۶۷ھ تا ۴۸۷ھ ۱۰۷۵ء تا ۱۰۹۴ء	نیک سیرت، سعادت مند	سلاجقہ کا عروج، الپ ارسلان کی فتوحات
۱۸	المستظہر	۴۸۷ھ تا ۵۱۲ھ ۱۰۹۴ء تا ۱۱۱۸ء	نیک سیرت	سلاجقہ میں انتشار۔ پہلی صلیبی جنگ۔ سقوط بیت المقدس
۱۹	المسترشد	۵۱۲ھ تا ۵۲۹ھ ۱۱۱۸ء تا ۱۱۳۵ء	بہادر، سادگی پسند، عوام کا محبوب	عراق میں مسلسل خانہ جنگی
۲۰	الراشد	۵۲۹ھ تا ۵۳۰ھ ۱۱۳۵ء تا ۱۱۳۶ء		
۲۱	المقتفی	۵۳۰ھ تا ۵۵۵ھ ۱۱۳۶ء تا ۱۱۶۰ء	نیک سیرت	عماد الدین زنگی کا جہاد۔ دوسری صلیبی جنگ
۲۲	المستنجد	۵۵۵ھ تا ۵۶۶ھ ۱۱۶۰ء تا ۱۱۷۰ء	نیک سیرت	نور الدین زنگی کا عروج اور جہاد

۲۳	المستضی	۵۶۶ھ تا ۵۷۵ھ ۱۱۷۰ء تا ۱۱۸۰ء	نیک سیرت	صلاح الدین ایوبی کا ظہور، مصر سے دولتِ بنوعبید کا خاتمہ
۲۴	الناصر	۵۷۵ھ تا ۶۲۲ھ ۱۱۸۰ء تا ۱۲۲۵ء	کیر، بدعقیدہ۔ سازشی	سخت فتح بیت المقدس، تیسری، چوتھی اور پانچویں صلیبیں جنگیں، خوارزم شاہیوں کا عروج، تاتاریوں کا عالم اسلام پر حملہ
۲۵	الظاہر	۶۲۲ھ تا ۶۲۳ھ ۱۲۲۵ء تا ۱۲۲۶ء	نیک سیرت	سلطان جلال الدین کا تاتاریوں سے جہاد جاری
۲۶	المستنصر	۶۲۳ھ تا ۶۴۰ھ ۱۲۲۶ء تا ۱۲۴۲ء	نیک، سخی، فلاحی کاموں کا شوقین	تاتاریوں کے خلاف فوج کی تیاری
۲۷	المستعصم	۶۴۰ھ تا ۶۵۶ھ ۱۲۴۲ء تا ۱۲۵۸ء	نیک، کم حوصلہ، ناسمجھ	غداروں کا غلبہ۔ سقوطِ بغداد

چوتھا باب

خلافتِ عباسیہ بغداد کی معاصر حکومتیں

خلافتِ عباسیہ کے دور میں قائم بعض اہم حکومتیں

بنو عباس کے دور میں اندلس، خراسان، وسط ایشیا، شام، مصر، یمن، ایران اور شمالی افریقہ میں متعدد آزاد حکومتیں قائم ہوئیں۔ ان میں سے کچھ اہم حکومتوں کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔ ان میں سے بعض کا ذکر عباسی خلافت کے ضمن میں آچکا ہے مگر وہ غیر مرتب اور ناکافی ہے۔ لہٰذا مرتب تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

مصر کی حکومتیں

دولتِ طولونیہ: ۲۵۴ھ تا ۲۹۲ھ (۸۶۸ء تا ۹۰۵ء)

❶ احمد بن طولون: اس حکومت کا بانی احمد بن طولون تھا جو خلافت بغداد کی طرف سے مصر کا گورنر تھا۔ خلافتِ عباسیہ کو روبہ زوال دیکھ کر ۲۵۴ھ میں احمد بن طولون نے مصر میں خود مختار حکومت قائم کرلی جو کچھ مدت بعد شام کو بھی محیط ہوگئی۔ احمد بن طولون نے دریائے نیل کے کنارے "فسطاط" کے شمال میں "سامرا" کے طرز پر ایک عظیم الشان شہر تعمیر کیا جو اربابِ صنعت وحرفت کی کثرت کے باعث "قطائع" کے نام سے مشہور ہوگیا۔ اس کی تعمیر کردہ مسجد "جامع ابن طولون" آج تک قائم ہے اور اپنے بانی کے حسنِ ذوق کی گواہی دے رہی ہے۔ اس کا تعمیر کردہ "قلعہ کبش" جو ان قدیم ترین اسلامی یادگاروں میں سے ہے، اب تک اصل شکل میں باقی ہیں۔

دولتِ طولونیہ کے ایام مصر اور شام کی خوشحالی کا دورِ عروج تھے۔ یہ ملک پارچہ سازی، چاندی کے سکوں اور برتنوں کی ڈھلائی، اسلحہ سازی، صابن کی صنعت اور شکر سازی کے لیے مشہور تھا۔ زراعت پر بھی خاص توجہ دی گئی۔ دریائے نیل کی صفائی کرائی گئی اور نہریں نکالی گئیں۔ کاشتکاروں کو زمینوں کی ملکیت دینے کے لیے ایک مستقل محکمہ "دیوان ...." کے نام سے کام کرتا تھا۔ ٹیکس کم کردیے گئے تھے۔ دریائے نیل پر پل تعمیر کرائے گئے تھے اور صحرائی راستوں میں مسافروں کو پانی کی سہولت مہیا کرنے کے لیے جابجا کنویں کھودے گئے تھے۔

❷ خُمارَوَیہ: احمد بن طولون کے بعد اس کا بیٹا خُمارَوَیہ حکمران ہوا۔ اس نے عباسی خلافت سے تعلق بڑھانے کے لیے اپنی بیٹی "قطر الندیٰ" کی شادی خلیفہ مُعتضِد سے کردی اور شادی کی تقریب میں دولت پانی کی طرح بہائی۔

❸ ہارون بن خُمارَوَیہ: خُمارَوَیہ کی وفات کے بعد دولتِ طولونیہ کمزور پڑ گئی۔ اس کے جانشین ابوالعساکر جیش کے خلاف فوج نے بغاوت کردی اور اسے برطرف کر کے اس کے بھائی ہارون کو تخت پر بٹھا دیا جو فقط چودہ سال لڑکا تھا۔

موقع سے فائدہ اٹھا کر عباسیوں نے ۲۹۲ھ میں لشکر کشی کر کے ہارون کو شکست دے دی۔

❷ شیبان بن احمد: اس کے بعد اس کا چچا شیبان چند دن تخت نشین رہا مگر پھر اس نے عباسیوں کے سامنے ہار مان لی۔ یوں دولتِ طولونیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے حکمران درج ذیل ہیں:

۱	احمد بن طولون	۲۵۴ھ تا ۲۷۰ھ	۸۶۸ء تا ۸۸۳ء
۲	خُمارَوَیہ بن احمد	۲۷۰ھ تا ۲۸۲ھ	۸۸۳ء تا ۸۹۵ء
۳	جیش بن خُمارَوَیہ	۲۸۲ھ تا ۲۸۳ھ	۸۹۵ء تا ۸۹۶ء
۴	ہارون بن خُمارَوَیہ	۲۸۳ھ تا ۲۹۲ھ	۸۹۶ء تا ۹۰۵ء
۵	شیبان بن احمد	۲۹۲ھ	۹۰۵ء

دولتِ طولونیہ فقط ۳۸ سال قائم رہی مگر مؤرخین اسے اچھے الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔ ①

✦✦✦

دولتِ اِخشیدیہ: ۳۲۷ھ تا ۳۵۸ھ (۷۵۷ء تا ۸۷۶ء)

دولتِ طولونیہ کے خاتمے کے بعد خلافتِ عباسیہ کی طرف سے مصر اور شام کے جو گورنر مقرر ہوئے ان میں سے ایک محمد بن طغج تھا جو ''اِخشید'' کے لقب سے مشہور ہوا۔ دولتِ عباسیہ کو کمزور دیکھ کر اس نے ۳۲۷ھ میں شام و مصر پر اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ اِخشید ۳۳۴ھ میں فوت ہوا۔ اس کے بعد اس کی اولاد میں یہ حکومت چلتی رہی۔

اِخشیدیوں نے بھی دولتِ طولونیہ کی طرح مصر اور شام کو ترقی دی۔ ''فسطاط'' کی توسیع ہوئی۔ مصر کی حکومت میں پہلی بار ''وزیر'' کا عہدہ بھی اِخشیدیوں نے شروع کیا اور فضل بن جعفر پہلا وزیر مقرر ہوا۔ اِخشیدی حکمران ہر ہفتے ایک دن کھلی کچہری لگاتے تھے جس میں کوئی بھی شخص اپنی فریاد حکمران کے سامنے پیش کر سکتا تھا۔

دولتِ اِخشیدیہ فقط ۳۱ سال باقی رہی۔ اس میں درج ذیل حکمران گزرے:

۱	ابوبکر محمد بن طغج اِخشید (بانی حکومت)	۳۲۷ھ تا ۳۳۴ھ	۷۵۷ء تا ۷۷۱ء
۲	ابوالقاسم انوجور بن اِخشید	۳۳۴ھ تا ۳۴۹ھ	۷۷۱ء تا ۷۸۴ء
۳	علی بن اِخشید	۳۴۹ھ تا ۳۵۵ھ	۷۹۰ء تا ۸۲۳ء
۴	ابوالمسک کافور مولیٰ اِخشید	۳۵۵ھ تا ۳۵۶ھ	۸۲۳ء تا ۸۳۸ء
۵	احمد بن علی بن اِخشید	۳۵۶ھ تا ۳۵۸ھ	۸۳۸ء تا ۸۷۶ء

۳۵۸ھ میں بنوعبید نے مصر پر قبضہ کر کے اس حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ②

① وفيات الاعيان: ۱۷۳/۱؛ تاريخ ابن خلدون: ۳۸۵/٤؛ الكامل في التاريخ: سنة ۲۹۲هـ؛ التاريخ الاسلامي محمود شاكر: ۱۹۷/٦؛ الموسوعة الموجزة في التاريخ الاسلامي: ۱/۱٤ تا ۱٤؛ موجز التاريخ الاسلامي، ص ۲۲۰، ۲۲۱

② الموسوعة الموجزة في التاريخ الاسلامي: ٥/۱٤ تا ۸؛ موجز التاريخ الاسلامي، ص ۲۳۲

وسطِ ایشیا، خراسان اور ایران وعراق کی حکومتیں

دولتِ طاہریہ: ۲۰۵ھ تا ۲۵۹ھ (۸۲۰ء تا ۸۷۳ء)

اس حکومت کی بنیاد اس وقت پڑی جب مامون الرشید نے اپنے معتمد جرنیل طاہر بن حسین کو ۲۰۲ھ میں مشرقی صوبوں کا گورنر بنایا۔ یہ ولایت مشرقی عراق، فارس، شمالی ایران اور خراسان سے ماوراء النہر کی حدود تک وسیع تھی۔ ۲۰۵ھ میں طاہر بن حسین نے خود مختاری اختیار کر لی۔ تاہم اسے آزادانہ حکومت چلانے کے لیے فقط دو سال ملے۔ اس کے بعد یہ حکومت اس کی اولاد میں چلتی رہی۔ اس کا پایۂ تخت نیشاپور تھا۔ یہ عباسیوں کی وفادار اور باج گزار تھی، اس کی حدود میں عباسی خلفاء کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ دولتِ طاہریہ میں درج ذیل حکمران گزرے:

۱	طاہر بن حسین (بانی حکومت)	۲۰۵ھ تا ۲۰۷ھ	۸۲۰ء تا ۸۲۲ء
۲	طلحہ بن طاہر	۲۰۷ھ تا ۲۱۳ھ	۸۲۲ء تا ۸۲۸ء
۳	عبداللہ بن طاہر	۲۱۳ھ تا ۲۳۰ھ	۸۲۸ء تا ۸۴۵ء
۴	طاہر ثانی بن عبداللہ بن طاہر	۲۳۰ھ تا ۲۴۸ھ	۸۴۵ء تا ۸۶۲ء
۵	محمد بن طاہر	۲۴۸ھ تا ۲۵۹ھ	۸۶۲ء تا ۸۷۳ء

طاہر کے بیٹے عبداللہ نے اپنے دورِ حکومت میں ریاست کی سرحدوں کو مزید وسیع کر دیا تھا۔ تاہم اس کے جانشین طاہر ثانی کے دور میں حکومت کمزور پڑنے لگی۔ طاہر ثانی کا بیٹا محمد بن طاہر بالکل لاابالی نکلا۔ اسی کے دور میں صفاریوں کے ہاتھوں اس حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔[1]

◆◆◆

دولتِ زیدیہ طالبیہ (طبرستان) ۲۵۰ھ تا ۳۱۶ھ (۸۶۴ء، ۹۲۸ء)

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ایک بزرگ حسن بن زید نے خلافتِ عباسیہ اور دولتِ طاہریہ خراسان سے شمالی ایران کے اضلاع رے، دیلم اور طبرستان کا وسیع علاقہ آزاد کرا کے ۲۵۰ھ (۸۶۴ء) میں وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔[2] اس حکومت میں پہلے تین حکمران حسنی تھے۔ اس دوران یہ حکومت دولتِ زیدیہ حسنیہ کہلاتی تھی۔ آخری تین حکمران حسینی تھے۔ ان کے دور میں یہ حکومت دولتِ زیدیہ حسینیہ کہلاتی رہی۔[3]

---

① الموسوعة الموجزة فی التاریخ الاسلامی: ۲۸۶/۱۴ ② موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲۲۰
③ تاریخ الخلفاء: ص ۳۶۸؛ الموسوعة الموجزة فی التاریخ الاسلامی: ۳۳/۹۱

اس حکومت کے بانی حسن بن زید بڑے عالم فاضل اور عابد وزاہد شخص تھے۔شیعہ مخلصین (شیعہ اولیٰ) کے مذہب پر عمل پیرا تھے۔اون کا موٹا لباس پہنتے تھے۔نیکی کا حکم دینے اور گناہوں سے روکنے کا زبردست ولولہ رکھتے تھے اور اسی مقصد کے لیے انہوں نے الگ حکومت قائم کی تھی۔ [1]

حکومت کے قیام کا قصہ یہ ہوا کہ اس دور میں خراسان کے گورنر سلیمان بن عبداللہ بن طاہر اور اہلِ طبرستان میں زبردست بداعتمادی پیدا ہوگئی۔حسن بن زید رے میں رہائش پذیر تھے۔اہلِ طبرستان نے انہیں دعوت دی کہ وہ آ کر ان کی رہنمائی کریں۔چنانچہ وہ آئے، بیعت لی اور عوامی طاقت کے ساتھ سلیمان کو بے دخل کر کے طبرستان میں حکومت قائم کر لی۔پھر انہوں نے دیار بکر اور رے پر بھی قبضہ کر لیا۔ان کا سارا دور سامانیوں سے جھڑپوں میں گزرا۔ [2]

صحابہ کرام سے انہیں بڑی محبت تھی۔صحابہ کرام کی نسل کے چھوٹے بچوں کے لیے ہر سال بیس ہزار دینار (تقریباً پانچ کروڑ روپے) بھیجا کرتے تھے۔وہ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی توقیر کو ایمان کا حصہ سمجھتے تھے۔ایک بار کسی شخص نے ان کے سامنے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شان میں گستاخی کر دی۔حسن بن زید نے فوراً اپنے غلام کو کہا: ''اس کا سر قلم کر دو۔'' کسی نے سفارش کرتے ہوئے کہا: ''یہ شخص تو شیعوں میں سے ہے۔''

فرمایا: ''میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں (کہ یہ شخص شیعانِ علی میں سے ہو) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ أُولَٰئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ○

''گندی عورتیں گندے مردوں کے لائق ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لائق ہوتے ہیں۔اور پاکباز عورتیں پاکباز مردوں کے لائق ہیں اور پاکباز مرد پاکباز عورتوں کے لائق ہیں۔یہ (پاکباز مرد اور عورتیں) ان باتوں سے بالکل مبرأ ہیں جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔ان (پاکبازوں) کے حصے میں تو مغفرت ہے اور باعزت رزق۔'' [3]

یہ آیت سنا کر حسن بن زید نے فرمایا: ''اگر کسی کے نزدیک حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا خراب تھیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی بُرے ثابت ہوں گے۔پس یہ آدمی کافر ہو گیا ہے۔اس کی گردن اڑا دو۔'' چنانچہ اس بدبخت کو قتل کر دیا گیا۔ [4]

حسن بن زید ۲۷۰ھ میں وفات پا گئے۔ان کے بعد ان کے بھائی محمد بن زید حکمران ہوئے۔اس زمانے میں خراسان کی دولتِ سامانیہ سے ان کی کش مکش تیز تر ہوگئی۔آخر سامانی غالب آگئے اور ۲۸۷ھ میں دولتِ زیدیہ کا خاتمہ ہوگیا۔محمد بن زید کو طبرستان سے نکلنا پڑا۔۲۸۸ھ میں وہ فوت ہوگئے۔ [5]

---

① موسوعة مواقف السلف فی العقيدة والمنهج والتربية: ٢٩٩/٤

② الاعلام زِرِکلی: ١٩١/٢، ١٩٢؛ التاريخ الاسلامی محمود شاكر: ٨٤/٦، ٨٥

③ سورۃ النور، آیت: ٢٦

④ موسوعة مواقف السلف فی العقيدة والمنهج والتربية: ٢٩٩/٤، ٣٠٠

⑤ تاريخ الخلفاء، ص ٣٦٨؛ الموسوعة الموجزة فی التاريخ الاسلامی: ٣٣/١١؛ التاريخ الاسلامی، محمود شاكر: ١٠١/٦

۳۰۱ھ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی نسل میں سے ایک شخص ناصر الاطروش نے طبرستان کا علاقہ دوبارہ واگزار کر کے "دولتِ زیدیہ" کی نشأۃ ثانیہ میں کامیابی حاصل کر لی۔ اب یہ حکومت "دولتِ زیدیہ حسینیہ" کہلائی۔

اطروش نے ۳۰۴ھ میں وفات پائی۔ ان کے بیٹے ہادی نے مسندِ حکومت سنبھالی۔ کچھ مدت بعد وہ خود ہی گوشہ نشین ہو گئے اور حکومت ان کے بھائی الناصر احمد کو حکومت مل گئی۔

الناصر احمد کے بعد جعفر بن محمد کی حکومت آئی۔ اس دور میں پورا طبرستان دولتِ زیدیہ کے ماتحت آ گیا۔[1]

تاہم ۳۴۵ھ میں جعفر کی وفات کے بعد دیلمی سردار مَرداویج نے بنو زید کو بے دخل کر کے طبرستان پر قبضہ کر لیا۔[2]

یوں دولتِ زیدیہ قصۂ پارینہ بن گئی۔

دولتِ صَفّاریہ: ۲۵۳ھ تا ۲۹۸ھ (۸۶۴ء تا ۹۱۱ء)

اس حکومت کی بنیاد ۲۵۳ھ میں یعقوب بن لیث صَفّاری نے سجستان (جنوبی افغانستان) میں رکھی۔ ۲۵۷ھ میں اس نے کابل پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۲۵۸ھ میں اس نے نیشاپور کو فتح کر کے دولتِ طاہریہ کا خاتمہ کر دیا۔ آخر کار دولتِ صَفّاریہ پورے خراسان اور فارس کو محیط ہو گئی۔ اس میں چند سال تک عباسی خلیفہ معتز باللہ کا خطبہ پڑھا گیا۔ پھر خلافت بغداد سے تعلقات اس وقت کشیدہ ہو گئے جب خلیفہ معتمد مسند نشین ہوا۔ خلافتِ عباسیہ کی کوشش تھی کہ دولتِ صَفّاریہ کا خلافتِ بغداد سے الحاق محض رسمی نہ ہو بلکہ حقیقی معنوں میں وہ خلافتِ عباسیہ کی باج گزار بن جائے۔ یعقوب بن لیث نے اسے قبول نہ کیا جس کے بعد خلافتِ بغداد اور دولتِ صَفّاریہ کے مابین جنگوں کی نوبت آ گئی۔ تاہم نہ تو دولتِ صَفّاریہ خلافتِ بغداد کو مغلوب کر سکی اور نہ ہی خلافتِ بغداد، دولتِ صَفّاریہ کے مقبوضات پر حاوی ہو سکی۔ یہاں تک کہ ۲۶۵ھ میں یعقوب بن لیث کی وفات ہو گئی۔

یعقوب بن لیث سادہ زندگی گزارنے کا عادی تھا۔ خزانے کو فقط ضروری مصارف پر خرچ کرتا تھا۔ اس کی حکومت معاشی لحاظ سے مضبوط تھی۔ یعقوب کی وفات کے وقت خزانے میں ساڑھے آٹھ کروڑ دینار تھے۔

یعقوب بن لیث کے بعد اس کا بھائی عَمرو بن لیث حکمران ہوا۔ اس نے خلافتِ بغداد سے اچھے تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں خلیفہ معتمد نے اسے خراسان، سندھ، سجستان، کرمان، فارس اور اصفہان کی ولایت کی سند دے دی۔ خلیفہ معتمد عباسی کے بعد خلیفہ مُعتَضِد نے بھی عَمرو بن لیث کو اس ولایت پر برقرار رکھا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر عَمرو بن لیث نے خلیفہ کی مرضی کے خلاف دریائے آمو کے پار ماوراء النہر کی دولتِ سامانیہ پر یورش کی تاہم سامانی حکمران اسماعیل بن احمد نے زبردست مزاحمت کی اور جوابی حملے میں عَمرو بن لیث کو گرفتار کر کے خلیفہ مُعتَضِد کے حوالے کر دیا۔ ۲۸۷ھ میں عَمرو کی وفات جیل خانے ہی میں ہوئی۔

---

[1] تاریخ الخلفاء، ص ٣٦٨؛ الموسوعة الموجزة في التاريخ الاسلامي: ٣٣/١١

[2] موجز التاريخ الاسلامي، ص ٢٢٠

عمرو بن لیث کی غیر موجودگی میں اس کی اولاد حکومت چلاتی رہی۔ آخر کار بنو عباس نے دولتِ سامانیہ کے امیر اسماعیل سامانی کے ذریعے ۲۹۸ھ میں اس حکومت کا خاتمہ کرا دیا۔

دولت صَفاریہ کے حکمران درج ذیل ہیں:

۱	یعقوب بن لیث	۲۵۳ھ تا ۲۶۶ھ	۸۶۸ء تا ۸۸۰ء	بانی حکومت
۲	عمرو بن لیث	۲۶۶ تا ۲۸۷ھ	۸۸۰ء تا ۹۰۰ء	
۳	طاہر بن محمد بن عمرو بن لیث	۲۸۷ تا ۲۹۶ھ	۹۰۰ء تا ۹۰۹ء	
۴	لیث بن علی بن لیث	۲۹۶ھ تا ۲۹۸ھ	۹۰۹ء تا ۹۱۱ء	
۵	محمد بن علی بن لیث	۲۹۸ھ	۹۱۱ء	آخری حکمران

دولتِ صَفاریہ فقط ۴۸ سال قائم رہی۔ صَفاری حکمران اسلام پر عمل پیرا، عادل اور عوام پرور تھے۔ ان کے حکمران کا رہن سہن اپنے سپاہیوں سے مختلف نہ ہوتا تھا۔ لوگوں پر مساوات کے ساتھ خرچ کیا جاتا تھا جس کے باعث رعایا خوش حال اور مطمئن تھی۔ [1]

◆◆◆

دولتِ سامانیہ: ۲۶۱ھ تا ۳۹۵ھ (۸۷۵ء تا ۱۰۰۵ء)

''سامان'' سمرقند کا نواحی قصبہ ہے جہاں کے ہر رئیس کو ''سامان خدا'' کہا جاتا تھا۔ اموی دور میں اس قصبے کے رئیس نے اسلام قبول کیا اور اپنے بیٹے کا نام خراسان کے گورنر اسد بن عبداللہ قسری کے نام پر ''اسد'' رکھا۔ اسد مامون الرشید کے دور تک زندہ رہا اور مامون کے مرو میں قیام کے زمانے میں وہ اپنے بیٹوں احمد، نوح، الیاس اور یحییٰ کے ساتھ اس کی خدمت میں کچھ مدت رہا اور اپنی وفاداری کا ایسا سکہ بٹھایا کہ مامون نے بغداد میں مسندِ خلافت سنبھالنے کے بعد اس کے بیٹوں میں سے نوح کو سمرقند، احمد کو فرغانہ، یحییٰ کو شاش اور الیاس کو ہرات کی گورنری دے دی۔

ان میں سے فرغانہ کا حاکم احمد بن اسد زیادہ بارسوخ ثابت ہوا۔ ۲۵۰ھ میں اس کی وفات ہوئی تو اس کے سات بیٹے: نصر، یحییٰ، یعقوب، اسماعیل، اسحٰق، اسد اور حمید اس کے وارث ہوئے۔ ان میں سے نصر باپ کا جانشین قرار پایا۔

۲۶۱ھ میں اس وقت نصر بن احمد کا ستارۂ اقبال مزید بلند ہوا جب خلیفہ معتمد عباسی نے اسے پورے ماوراء النہر کی ولایت لکھ دی۔ نصر بن احمد خود سمرقند میں رہا جبکہ اپنے بھائی اسماعیل کو اس نے بخارا کا گورنر بنا دیا۔ اسی طرح باقی بھائیوں کو بھی مختلف شہروں کی ولایت دے دی۔

۲۷۹ھ میں نصر بن احمد کی وفات ہوئی تو اس کا بھائی اسماعیل غالب آ کر خاندان کا حکمران بن گیا۔ اس نے سمرقند کو بھی بخارا کی ولایت میں شامل کر لیا۔ درحقیقت دولتِ سامانیہ کا حقیقی بانی یہی تھا۔ حکومت اسی کی اولاد میں چلتی رہی۔

[1] الموسوعة الموجزة فی التاریخ الاسلامی: ۱۴/۲۷۴ تا ۲۷۶

سامانی امراء دلیر اور جنگجو تھے۔ وہ سُنی تھے اور خلافتِ عباسیہ بغداد کا پورا احترام کرتے تھے؛ اس لیے دولتِ سامانیہ میں خلافتِ عباسیہ کا خطبہ آخر تک قائم رہا۔ یہ حکومت لگ بھگ سوا صدی تک باقی رہی۔

سامانیوں نے اپنے ہاں علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کو خوب ترقی دی۔ ان کے دور میں سمرقند اور بخارا کی علمی، تمدنی اور تجارتی رونقیں بغداد کے قریب قریب جا پہنچی تھیں۔ بڑے بڑے علماء، فضلاء، ادباء، شعراء اور حکماء اس دربار سے وابستہ تھے۔ رئیس الاطباء ابوبکر بن زکریا الرازی (م ۳۲۰ھ) کا تعلق اسی دور سے ہے۔ اس نے اپنی ایک کتاب ''المنصوری'' اسی خاندان کے ایک حاکم امیر منصور سامانی کے نام موسوم کی تھی جو بجستان کا گورنر تھا۔

مشہور طبیب اور فلسفی بوعلی سینا کو بھی اسی حکومت میں شہرت ملی۔ نوح ثانی بن منصور کا کامیاب علاج کرنے کے بعد وہ اس کے عظیم الشان کتب خانے سے استفادہ کرتا رہا۔

سامانیوں نے فارسی شعروادب کی بھی سرپرستی کی۔ نامور فارسی شاعر فردوسی کا تعلق اسی دور سے ہے۔

دولتِ سامانیہ کا خاتمہ سلاطینِ غزنی اور ترکستانی جنگجو سردار ایلک خان کے ہاتھوں ہوا۔

سامانی خاندان کے حکمران درج ذیل ہیں:

۱	نصر بن احمد	۲۶۱ھ تا ۲۷۹ھ	۸۷۵ء تا ۸۹۲ء	بانی حکومت
۲	اسماعیل بن احمد	۲۷۹ھ تا ۲۹۵ھ	۸۹۲ء تا ۹۰۸ء	
۳	احمد بن اسماعیل	۲۹۵ھ تا ۳۰۱ھ	۹۰۸ء تا ۹۱۳ء	
۴	نصر بن احمد	۳۰۱ھ تا ۳۳۱ھ	۹۱۳ء تا ۹۴۳ء	
۵	نوح بن نصر	۳۳۱ھ تا ۳۴۳ھ	۹۴۳ء تا ۹۵۴ء	
۶	عبدالملک بن نوح	۳۴۳ھ تا ۳۵۰ھ	۹۵۴ء تا ۹۶۱ء	
۷	منصور بن نوح	۳۵۰ھ تا ۳۶۵ھ	۹۶۱ء تا ۹۷۶ء	
۸	نوح ثانی بن منصور بن نوح	۳۶۵ھ تا ۳۸۷ھ	۹۷۶ء تا ۹۹۷ء	
۹	منصور بن نوح ثانی بن منصور	۳۸۷ھ تا ۳۸۹ھ	۹۹۷ء تا ۹۹۹ء	
۱۰	عبدالملک بن نوح ثانی:	۳۸۹ھ تا ۳۹۵ھ	۹۹۹ء تا ۱۰۰۵ء	
۱۱	المنتصر اسماعیل بن نوح ثانی	۳۹۵ھ	۱۰۰۵ء	آخری حکمران

دولتِ سامانیہ ۱۳۴ سال تک قائم رہی۔[1]

❖❖❖

[1] التاریخ الاسلامی، محمود شاکر: ۶/۹۹، ۱۰۰؛ الموسوعة الموجزة فی التاریخ الاسلامی: ۱۴/۲۷۶

دولتِ بنوحمدان: ۳۰۸ھ تا ۳۹۲ھ (۹۲۰ء تا ۱۰۰۲ء)

اس خاندان کا تعلق نصرانی عربوں کے قبیلے بنوتغلب سے تھا جو الجزیرہ کے ضلع دیار ربیعہ میں آباد تھا۔ اس گھرانے کا سربراہ حمدان بن حمدون تھا۔ تیسری صدی ہجری کے وسط میں جب خلافتِ بغداد کمزور پڑی اور نت نئے طالع آزما سامنے آئے تو حمدان نے ایک خارجی سردار ہارون الشاری کے ساتھ مل کر الجزیرہ کے مشہور شہر ماردین پر قبضہ کر لیا۔
خلیفہ مُعْتَضِد کی فوجوں نے کچھ عرصے بعد ماردین پر جوابی حملہ کیا تو حمدان بن حمدون فرار ہوگیا۔ اس کے بیٹے حسین نے جو قلعے میں اس کا نائب تھا، خلیفہ کی اطاعت قبول کر لی۔ خلیفہ کی افواج نے تعاقب کر کے آخر حمدان کو پکڑ لیا اور بغداد کے جیل خانے میں ڈال دیا۔ حسین نے اپنے باپ کو چھڑانے کے لیے خلیفہ سے وعدہ کیا کہ وہ خارجی سردار ہارون الشاری کو پکڑ کے بغداد لے آئے گا۔ اس نے ایسا کر دکھایا۔ اس پر خلیفہ نے اسے اپنے سالاروں میں شامل کر لیا۔
قرامطہ کے خلاف لڑائیوں میں حسین اور اس کے بھائیوں: عبداللہ، نصر، سعید، داؤد اور ابراہیم نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ سب مختلف مناصب سے نوازے گئے۔ پھر خلافت کے مختلف امیدواروں کے حامی بن کر یہ بھائی ترقی یا تنزل سے بھی دوچار ہوئے۔ بعض اوقات ان کی آپس میں بھی جھڑپیں ہوئیں۔ حمدانی برادران کا مختصر احوال یہ ہے:

❶ حسین بن حمدان: اس نے ۲۹۲ھ میں مصر کی دولتِ طولونیہ پر عباسیوں کے حملے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس فتح کے بعد بنوعباس کے ہاں اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ تاہم اس نے ۲۹۶ھ میں مقتدر کی جگہ عبداللہ بن معتز کی دو روزہ خلافت کی حمایت کر دی؛ اس لیے مقتدر نے خلیفہ بن کر اسے قید کر دیا۔ بعد میں اسے معاف کر دیا اور رہا کر کے قم، قاشان اور الجزیرہ کے دیارِ ربیعہ کا والی بنا دیا۔ آخر میں مقتدر کے وزیر علی بن عیسیٰ سے اس کا تنازعہ ہوگیا جس کے باعث اسے پھر جیل میں ڈال دیا گیا۔ حسین بن حمدان جیل خانے ہی میں ۳۰۶ھ میں فوت ہوا۔

❷ ابراہیم بن حمدان: اس نے ۳۰۶ھ میں اپنے بھائی حسین کی وفات کے بعد اس کی جاگیر "دیار ربیعہ" کو سنبھالا مگر فقط دو سال بعد ۳۰۸ھ میں مر گیا۔

❸ داؤد بن حمدان: یہ خلیفہ مقتدر کے ساتھ رہا اور باغیوں سے اس کا دفاع کرتے ہوئے ۳۲۰ھ میں قتل ہوا۔

❹ نصر بن حمدان: ۳۱۸ھ میں اپنے بھائی عبداللہ بن حمدان کی جگہ مُوصِل کا حاکم بنا۔ قاہر باللہ نے ۳۲۲ھ میں اسے قتل کرا دیا۔

❺ سعید بن حمدان: یہ نہاوند کی جاگیرداری سنبھالے ہوئے تھا۔ ۳۱۷ھ سے ۳۱۹ھ کے درمیان خلیفہ مقتدر کے حکم سے مُوصِل پر بھی قابض رہا۔ مُوصِل پر اپنے بھتیجے حسن سے تنازعے کی وجہ سے ۳۲۳ھ میں مارا گیا۔[1]

آگے چل کر اس خاندان کی سیاست دو حصوں میں بٹ گئی:

① دولتِ حمدانیہ مُوصِل ② دولتِ حمدانیہ حلب

[1] التاریخ الاسلامی، محمود شاکر: ۱۱۸/۶، ۱۱۹، ۱۲۰؛ الموسوعۃ الموجزۃ فی التاریخ الاسلامی: ۲۷۹/۱۴

دولتِ حمدانیہ مُوصِل: (۳۰۸ھ تا ۳۶۸ھ)

❶ عبداللہ بن حمدان ابوالہیجاء: ''دولتِ بنوحمدان مُوصِل'' کا بانی یہی ہے۔ خلیفہ مکتفی نے ۳۰۸ھ میں اسے مُوصِل کی حکومت بخشی جہاں سے بنوحمدان کی خود مختاری کا آغاز ہوا۔ عبداللہ بن حمدان نے نو برس حکومت کی۔ بدقسمتی سے اس نے خلیفہ مقتدر کے خلاف ناکام بغاوت میں قاہر کا ساتھ دیا۔ اس پر مقتدر نے ۳۱۷ھ میں اسے قتل کرا دیا۔ تاہم اس کے خاندان میں حکومت باقی رہی اور اس کے بیٹے ناصر الدولہ اور سیف الدولہ بہت نامور ہوئے۔[1]

❷ حسن بن عبداللہ ناصر الدولۃ: یہ بنوحمدان کا سب سے عظیم حکمران تھا۔ ۳۰۸ھ سے ۳۱۷ھ تک اس نے مُوصِل پر اپنے باپ عبداللہ بن حمدان کی نیابت میں حکومت کی۔ ۳۱۷ھ میں باپ کے قتل کے بعد یہ مُوصِل کا مستقل حاکم بن گیا مگر ۳۱۹ھ تک اسے بے دخل رہنا پڑا جبکہ خلیفہ کی سرپرستی کی وجہ سے اس کے چچا نصر اور سعید مُوصِل پر تسلط حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ آخر میں نصر ۳۲۲ھ میں خلیفہ قاہر باللہ کے حکم سے قتل ہوا جبکہ سعید ۳۲۳ھ میں مُوصِل پر قبضے کی کش مکش میں مارا گیا۔ حسن نے ۳۳۲ھ میں قنسرین پر بھی قبضہ کر لیا۔ اپنے چچازاد حسین بن سعید کو وہاں نائب بنا دیا۔ خلیفہ راضی کی اجازت سے اس نے دیارِ بکر، دیارِ ربیعہ اور دیارِ مضر کو بھی اپنی ولایت میں لے لیا۔[2]

حسن بن عبداللہ کے دور میں خانوادۂ بنوحمدان کا اقبال نصف النہار پر تھا۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی علی بن عبداللہ کو ساتھ ملا کر عباسی خلفاء کی پشت پناہی کرتا رہا۔ جب امیر الامراء ابن رائق کی عباسی خلیفہ متقی پر زیادتیاں حد سے بڑھیں تو حسن نے ابن رائق کو قتل کر کے خلیفہ کو بچایا جس پر خلیفہ نے اسے ''امیر الامراء'' اور ''ناصر الدولہ'' کے خطابات سے نوازا جبکہ اس کے بھائی علی بن عبداللہ کو ''سیف الدولہ'' کا خطاب دیا۔[3] ۳۳۱ھ میں جب تُوزُون نامی ایک سرکش سردار نے بغداد پر تسلط حاصل کر کے خلیفہ متقی کو ذلیل کیا تو خلیفہ نے بغداد چھوڑ کر بنوحمدان ہی کے پاس پناہ لی۔[4]

ناصر الدولہ نے سیف الدولہ کے ساتھ مل کر بنوعباس کی حمایت اور رومیوں سے سرحداتِ اسلام کی حفاظت میں اہم کردار ادا کیا۔ اسے سیف الدولہ سے غیر معمولی محبت تھی جبکہ سیف الدولہ اس کا بے حد اکرام و احترام کرتا تھا۔ جب ۳۵۶ھ میں سیف الدولہ کی وفات ہوئی تو ناصر الدولہ غم کی شدت سے مخبوط الحواس ہو گیا اور اسی غم میں دو سال بعد وفات پا گیا۔ عمر ساٹھ برس تھی۔ اس سے قبل ۳۵۴ھ میں وہ حکومت اپنے بیٹے ابوتغلب غضنفر کے حوالے کر چکا تھا۔[5]

❸ ابوتغلب غضنفر: ناصر الدولہ کو ۳۳۴ھ سے اپنے ہمسایہ بُویہی امراء کے حملوں کا سامنا رہا۔ اس کے بیٹے غضنفر کو بھی یہی آزمائش درپیش رہی۔ ابوتغلب غضنفر میں باپ جیسی اولوالعزمی نہ تھی۔ اگرچہ وہ بُویہیوں سے اپنا دفاع کرتا رہا مگر ۳۶۸ھ میں اسے شکست ہوئی، یوں مُوصِل میں بنوحمدان کی حکومت ختم ہو گئی۔[6]

---

[1] التاریخ الاسلامی، محمود شاکر: ۱۱۹/۶، ۱۲۰؛ الموسوعۃ الموجزۃ فی التاریخ الاسلامی: ۲۷۹/۱۴

[2] التاریخ الاسلامی، محمود شاکر: ۱۱۹/۶، ۱۲۰؛ الموسوعۃ الموجزۃ فی التاریخ الاسلامی: ۲۷۹/۱۴

[3] تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۴، ۲۸۵ — [4] الکامل فی التاریخ: سنۃ ۳۳۲ھ

[5] العبر فی خبر من غبر ۱۰۲/۲ — [6] الموسوعۃ الموجزۃ فی التاریخ الاسلامی: ۲۷۹/۱۴

دولتِ حمدانیہ حلب: (۳۳۳ھ تا ۳۹۲ھ)

❶ علی بن عبداللہ سیف الدولہ: دولتِ حمدانیہ کا سب سے مشہور بطلِ جلیل یہی شخص ہے۔ اس نے ۳۳۳ھ میں اِخشیدیوں سے حلب چھین کر دولتِ حمدانیہ کی نئی شاخ قائم کی۔ ۳۳۶ھ میں وہ حمص، قنسرین، عواصم اور الجزیرہ کے بعض اضلاع پر بھی قابض ہو گیا۔ خلافتِ عباسیہ ان دنوں مسلمانوں کے دفاع سے عاجز تھی جبکہ رومی ساحلی شہروں پر مسلسل حملے کر رہے تھے۔ سیف الدولہ نے ان کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا اور عمر بھر رومیوں سے برسرِ پیکار رہا۔ جہاد کے باعث اس کا نام تاریخ میں زندہ ہے۔

وہ علوم و فنون کا قدر دان اور بذاتِ خود ادیب اور شاعر تھا۔ ابونصر الفارابی، ابن خالویہ، ابوطیب متنبی، ابوفراس حمدانی، ابن نباتہ اور سری بن الوفاء جیسے اصحابِ علم و فن اس کے دربار کی زینت تھے۔[1]

❷ سعد الدولہ: ۳۵۶ھ میں سیف الدولہ وفات پا گیا اور اس کے بیٹے ابوالمعالی سعد الدولہ نے حکومت سنبھال لی۔ سیف الدولہ کی موت کے بعد ایک طرف رومی، دوسری طرف بُویہی اور تیسری طرف بنوعبید دولتِ حمدانیہ کو مٹا دینے کے درپے ہو گئے۔ یوں دولتِ حمدانیہ دن بدن کمزور ہوتی گئی۔ تاہم سعد الدولہ نے حلب کو محفوظ رکھا۔[2]

❸ سعید الدولہ: ۳۸۱ھ میں سعد الدولہ کی وفات ہوگئی۔ اس کی جگہ اس کے بیٹے ابوالفضائل سعید الدولہ نے حکومت سنبھالی۔ بنوعبید کے باج گزاروں کے حملوں سے عاجز آ کر اس نے اپنے دفاع کے لیے رومیوں سے معاہدہ کرلیا۔ ۳۹۲ھ میں اس کے وزیر لؤلؤ حاجب نے اسے قتل کرا دیا۔ یوں دولتِ بنوحمدان (حلب) بھی اختتام کو پہنچی۔[3]

دولتِ بنوحمدان میں درج ذیل سربراہ گزرے:

دولتِ بنوحمدان (مُوصل):

۱	عبداللہ بن حمدان ابوالہیجاء	۳۰۸ھ تا ۳۱۷ھ	۹۲۰ء تا ۹۲۹ء	بانی حکومت
۲	حسن بن عبداللہ ناصر الدولہ	۳۱۸ھ تا ۳۵۳ھ	۹۲۹ء تا ۹۶۴ء	
۳	ابوتغلب غضنفر	۳۵۳ھ تا ۳۶۸ھ	۹۶۴ء تا ۹۶۸ء	آخری حکمران

دولتِ بنوحمدان (حلب):

۱	علی بن عبداللہ سیف الدولہ	۳۳۳ھ تا ۳۵۶ھ	۹۴۵ء تا ۹۶۷ء	بانی حکومت
۲	ابوالمعالی سعد الدولہ	۳۵۶ھ تا ۳۸۱ھ	۹۶۷ء تا ۹۹۱ء	
۳	سعید الدولہ	۳۸۱ھ تا ۳۹۲ھ	۹۹۱ء تا ۱۰۰۲ء	آخری حکمران

مجموعی طور پر بنوحمدان کی حکومت ۸۶ سال تک رہی۔[4]

---

[1] الاعلام زرِکلی: ۳۰۳/۴، ۳۰۴، ط دار العلم؛ الموسوعة الموجزة فی التاریخ الاسلامی: ۲۸۰/۱۴
[2] الموسوعة الموجزة فی التاریخ الاسلامی: ۲۸۰/۱۴ [3] الموسوعة الموجزة فی التاریخ الاسلامی: ۲۸۰/۱۴، ۲۸۱
[4] موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲۲۸؛ الموسوعة الموجزة فی التاریخ الاسلامی: ۲۷۹/۱۴ تا ۲۸۱

بنوحمدان کے دور پر ایک نظر:

بنوحمدان نے جہاں رومیوں کے خلاف زبردست جہاد کیا وہاں انہوں نے بنوعبید کی طاقت کو کم کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ بنوحمدان کا اصل علاقہ دیارِ ربیعہ، دیارِ بکر اور موصل تھا۔ ناصر الدولہ اور سیف الدولہ نے ریاست کو وسعت دے کر شمالی شام پر بھی قبضہ کرلیا تھا۔[1] بنوحمدان کو فارس وعراق کی شیعہ حکومتوں اور شام اور مصر کی دولتِ اِخشید یہ اور دولتِ عبیدیہ کی مخالفت کا سامنا بھی رہا۔ تاہم بنوحمدان عباسی خلفاء کے حامی اور معاون رہے۔[2]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے بنوحمدان کے سب سے بڑے حکمران ناصر الدولہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ شعائر اہل سنت ظاہر کرتا تھا اور عبیدی حکمرانوں کوان کے رفض اور گھناؤنے عقائد کی وجہ سے ناپسند کرتا تھا۔[3] اسی طرح سیف الدولہ علمائے اہل سنت کا بہت اکرام کرتا تھا اور ان کے پاس نیاز مندانہ حاضری دیتا تھا۔[4]

غالباً اہلِ سنت سے اسی قربت کے باعث بنوحمدان شیعہ حکومتوں کی بجائے بنوعباس کے حامی تھے۔ ان کی سیاسی مصلحت بھی اسی میں تھی؛ کیوں کہ بنوعبید سمیت اپنی رقیب شیعہ ریاستوں کے سامنے ڈٹے رہنا اسی طرح ممکن تھا۔

بعض مؤرخین نے دولتِ صَفاریہ، دولتِ سامانیہ اور دولتِ بنوحمدان کو شیعہ حکومتیں قرار دیا ہے مگر وہ اس کا کوئی پختہ ثبوت پیش نہیں کرسکے۔ یقیناً اس دور میں عالم اسلام کے بہت بڑے رقبے پر روافض کے تسلط نے باقی مسلم حکمرانوں میں ایک مرعوبیت کا رویہ پیدا کردیا تھا؛ اس لیے مذکورہ حکومتوں بلکہ خود خلافتِ بنوعباس کے انداز واطوار میں کہیں کہیں تشیع کی جھلک نظر آنا عین ممکن ہے مگر اس بناء پر حکمران خاندان ہی کو شیعہ سمجھ لینا کوئی انصاف کی بات نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس دور میں بعض سنی خانوادوں نے نمائشی تشیع اختیار کرلیا تھا۔ غالباً بنوحمدان انہی میں سے تھے۔

❖❖❖

بحرین

دولتِ عیونیہ (بحرین): ۴۶۶ھ تا ۶۳۶ھ (۱۰۷۳ء تا ۱۲۳۸ء)

بحرین کے علاقے ''احساء'' میں بنوعبدالقیس کا ایک خاندان آباد تھا جو اپنی بستی ''عیون'' کی نسبت سے ''عیونی'' کہلایا۔ اس خاندان کے ایک سردار عبداللہ بن علی عیونی نے خلفائے بنوعباس اور سلجوقی سلاطین کی پشت پناہی حاصل کرکے بحرین کے قرامطہ سے ٹکرلی۔ ۴۶۶ھ سے ۴۷۰ھ تک اس کی مہم جاری رہی، حتیٰ کہ اس نے قرامطہ کو پورے بحرین سے بے دخل کرکے وہاں اپنی حکومت قائم کرلی۔ عیونی نے ۵۰۰ھ تک یہاں حکومت کی۔ بعد میں یہ کمزور اور مختصر ہوتی چلی گئی تاہم ۶۳۶ھ تک کسی نہ کسی شکل میں باقی رہی، اس کے بعد اس پر فارسیوں کا قبضہ ہوگیا۔[5]

---

① التاریخ الاسلامی، محمود شاکر: ۱۱۹/۶، ۱۲۰
② تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۴، ۲۸۵
③ سیر اعلام النبلاء: ۱۹۱/۱۵
④ سیر اعلام النبلاء: ۲۹۶/۱۶ تا ۲۹۹
⑤ موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲۴۷، ۲۴۸

سلطنتِ سلاجقہ

سلاجقہ کا جدِ امجد وسطِ ایشیا کے ایک ترکمان خاندان سے تعلق رکھنے والا ایک شخص سلجوق تھا۔ اس کے دو پوتوں: طغرل بیگ اور چغر بیگ نے پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں ترکستان اور خراسان پر قابض ہوکر ''دولتِ سلجوقیہ'' کی بنیاد ڈالی۔ اس سلطنت کے ابتدائی چند حکمران ''عظیم سلاجقہ'' کہلاتے ہیں جو بیک وقت وسطِ ایشیا، خراسان، ایران، عراق اور شام پر حکومت کرتے تھے۔

عظیم سلاجقہ:

عظیم سلاجقہ میں مندرجہ ذیل حکمران گزرے ہیں:

❶ طغرل بیگ: ۴۲۹ھ تا ۴۵۵ھ (۱۰۳۸ء تا ۱۰۶۳ء): عظیم سلاجقہ میں سب سے پہلا نام طغرل بیگ کا ہے جو اس سلطنت کا بانی تھا۔ اس نے مختصر مدت میں وسطِ ایشیا، خراسان اور ایران کو فتح کر لیا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے عباسی خلیفہ القائم کو بنو بُوَیہ کے تسلط سے نکال کر خلافت کو حیاتِ نو بخشی۔ ۴۵۵ھ میں طغرل بیگ کی وفات ہوگئی۔

❷ الپ ارسلان: ۴۵۵ھ تا ۴۶۵ھ (۱۰۶۳ء تا ۱۰۷۳ء): طغرل لاولد فوت ہوا تھا، چنانچہ اس کا نوجوان بھتیجا الپ ارسلان بن چغر بیگ تخت نشین ہوگیا۔ وہ نہایت عالی ہمت اور عظیم الشان بادشاہ تھا۔ ۴۶۳ھ میں اس نے فقط پندرہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ اڑھائی لاکھ رومیوں کے لشکرِ جرار کو شکستِ فاش دے کر یورپ پر ایک بار پھر مسلمانوں کی دھاک بٹھادی۔ اس نے دس سال حکومت کی۔

❸ ملک شاہ: ۴۶۵ھ تا ۴۸۵ھ (۱۰۷۳ء تا ۱۰۹۲ء): الپ ارسلان کی جگہ اس کے بیٹے ملک شاہ نے لی جس نے سلجوقی سلطنت کو وسطِ ایشیا سے مصر تک پھیلا دیا۔ اتنی بڑی حکومت خلفائے راشدین اور خلفائے بنوامیہ کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ملک شاہ نے ۲۱ سال بہترین حکومت کرکے ۴۸۵ھ میں وفات پائی۔ عمر ۳۹ سال تھی۔

❹ ارسلان ارغون بن الپ ارسلان: ۴۸۵ھ تا ۴۹۰ھ (۱۰۹۲ء تا ۱۰۹۷ء): الپ ارسلان کے بیٹے ارسلان ارغون نے خراسان میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ وہ پانچ سال حکمران رہا۔ آخر ۴۹۰ھ میں وہ اپنے بھتیجے برکیارُق بن ملک شاہ سے کش مکش میں قتل ہوگیا۔

❺ برکیارُق بن ملک شاہ: ۴۹۰ھ تا ۴۹۸ھ (۱۰۹۷ء تا ۱۱۰۵ء): ارسلان ارغون کے قتل کے بعد خراسان ملک شاہ کے بیٹے برکیارُق کے قبضے میں آگیا۔ برکیارُق نے گیارہ سال حکومت کی۔ اس کا تمام دور اپنے بھائی محمد سے لڑائیوں میں گزر گیا۔ آخر ۴۹۶ھ میں علماء نے بیچ میں پڑ کر دونوں میں صلح کرائی۔ برکیارُق کو سلطانِ عراق اور محمد کو حاکم

آذربائی جان مان لیا گیا۔ جبکہ خراسان پر ان کے تیسرے بھائی سنجر کا حق تسلیم کر لیا گیا۔

❻ محمد بن ملک شاہ: ۴۹۸ھ تا ۵۱۱ھ (۱۱۰۵ء تا ۱۱۱۷ء): برکیارُق کی وفات کے بعد محمد اس کے بیٹے کی ولی عہدی منسوخ کرا کے تختِ عراق پر براجمان ہو گیا۔ اس نے ۱۳ سال حکومت کی مگر یہ زمانہ خانہ جنگیوں میں کٹ گیا۔

عظیم سلاجقہ کی فہرست درج ذیل ہے:

۱	طغرل بیگ بن میکائیل	۴۲۹ھ تا ۴۵۵ھ	۱۰۳۸ء تا ۱۰۶۳ء	بانی حکومت
۲	الپ ارسلان بن چغر بیگ	۴۵۵ھ تا ۴۶۵ھ	۱۰۶۳ء تا ۱۰۷۳ء	
۳	ملک شاہ	۴۶۵ھ تا ۴۸۵ھ	۱۰۷۳ء تا ۱۰۹۲ء	
۴	ارسلان ارغون بن الپ ارسلان	۴۸۵ھ تا ۴۹۰ھ	۱۰۹۲ء تا ۱۰۹۷ء	
۵	برکیارُق بن ملک شاہ	۴۹۰ھ تا ۴۹۸ھ	۱۰۹۷ء تا ۱۱۰۵ء	
۶	محمد بن ملک شاہ	۴۹۸ھ تا ۵۱۱ھ	۱۱۰۵ء تا ۱۱۱۷ء	آخری حکمران

سلجوقی سلطنت کی تقسیم

سلجوقیوں کے عروج کا دور تقریباً ۶۰ سال تک رہا۔ ملک شاہ کی وفات کے بعد مختلف علاقوں میں سلجوقی نوابوں اور امراء نے خود مختاری اختیار کر لی اور جگہ جگہ ورثاء میں اقتدار کی کش مکش شروع ہو گئی۔ یہ اکھاڑ پچھاڑ سلطنت کی مستقل تقسیم اور حد بندیوں پر منتج ہوتی چلی گئی۔

اب جن سلجوقیوں نے اپنے آباؤ اجداد کے اصل مرکز مَرو میں تخت نشین ہو کر وسطِ ایشیا اور خراسان کا انتظام سنبھالا وہ ''سلاجقۂ خراسان'' کہلائے۔ انہی کا سکہ سب سے زیادہ چلتا تھا۔ جن سلجوقیوں نے رَے کو مرکز قرار دے کر ایران وعراق پر حکومت کی وہ ''سلاجقۂ عراق'' کے نام سے موسوم ہوئے۔ جو شہزادے ایشیائے کوچک پر خود مختار حکومت کرنے لگے وہ ''سلاجقۂ روم'' کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی ایک شاخ شام اور الجزیرہ پر بھی حکومت کرتی رہی۔

سلاجقۂ عراق:

❶ محمود بن محمد: ۵۱۱ھ تا ۵۲۵ھ (۱۱۱۷ء تا ۱۱۳۱ء): ''عظیم سلاجقہ'' میں سے محمد بن ملک شاہ نے جب ۵۱۱ھ میں وفات پائی تو امرائے سلطنت نے مرکزِ سلطنت رَے کی گدی پر اس کے بارہ سالہ لڑکے محمود کو بٹھا دیا۔ اس کے ساتھ ہی خراسان کے سلجوقی رَے کی اطاعت سے آزاد ہو گئے۔ چنانچہ تختِ رَے کا دائرہ کار فقط عراق تک رہ گیا۔ اس طرح ''عظیم سلاجقہ'' کی حکومت ''سلاجقۂ عراق'' میں تبدیل ہو گئی۔

محمود نے ۱۴ سال حکومت کی اور ۵۲۵ھ میں وفات پائی۔ اس کے دور میں عراق کی سلجوقی حکومت مزید کمزور ہو گئی۔

❷ طغرل بن محمد: ۵۲۵ھ تا ۵۲۹ھ (۱۱۳۱ء تا ۱۱۳۵ء): محمود کی وفات کے بعد اس کے بھائی طغرل کو تخت پر

بٹھایا گیا۔ اس نے فقط دو سال حکومت کی اور فوت ہو گیا۔

۳ مسعود بن محمد: ۵۲۹ھ تا ۵۴۷ھ (۱۱۳۵ء تا ۱۱۵۲ء): طغرل کی وفات کے بعد اس کا بھائی مسعود تخت نشین ہوا۔ اس نے پورے بیس سال حکومت کی۔ اس کا دور خلفاء کو مغلوب کرنے کی کوششوں میں گزرا۔ اسی دور میں موصل کی دولتِ اتابکیہ کا ظہور ہوا جس کے بانی عماد الدین زنگی نے ایک مضبوط مدمقابل کی حیثیت اختیار کر کے سلاجقۂ عراق کا زور خاصا کم کر دیا۔ سلطان مسعود ۵۴۷ھ میں بیمار ہو کر فوت ہو گیا۔ اس کے بعد سلاجقۂ عراق کا زوال شروع ہو گیا۔

۴ ملک شاہ ثانی: ۵۴۷ھ تا ۵۴۸ھ (۱۱۵۲ء تا ۱۱۵۳ء): اس کی حکومت کچھ ہی دنوں تک رہی۔ یہ لہو ولعب میں مشغول رہتا تھا۔ آخر محمد ثانی نے اس کا تختہ الٹ کر حکومت سنبھال لی۔ ملک شاہ ثانی فرار ہو گیا۔

۵ محمد ثانی: ۵۴۸ھ تا ۵۵۱ھ (۱۱۵۳ء تا ۱۱۵۶ء): اس کا دور سلاجقۂ عراق کے انحطاط کا تھا۔ اس نے اپنی عظمت کی بحالی کے لیے بغداد کو زیر کرنے کی کوشش کی مگر اس کا حملہ ناکام رہا اور واپسی میں بیمار ہو کر اس کی وفات ہو گئی۔

۶ سلیمان شاہ بن محمد بن ملک شاہ: ۵۵۱ھ تا ۵۵۵ھ (۱۱۵۶ء تا ۱۱۶۰ء) محمد ثانی کی وفات کے بعد امرائے سلطنت نے اس کے چچا سلیمان شاہ کو تخت پر بٹھایا مگر وہ شراب نوشی کا عادی تھا۔ ہر وقت مسخروں میں گھرا رہتا تھا۔ یہاں سے اس ریاست میں آذر بائی جان کے گورنر ایلدِ گز کا عروج شروع ہوتا ہے۔ جو سلاجقۂ عراق کے ہاں سب سے زیادہ بارسوخ امیر سمجھا جاتا تھا، اس نے مرحوم طغرل بن محمد کی بیوہ سے نکاح کر کے اس کے بیٹے ارسلان کو اپنی کفالت میں لیا ہوا تھا؛ اس لیے وہ ''اتا بک'' کہلاتا تھا۔[1] اس نے سلیمان شاہ کی خرمستیاں دیکھیں تو دیگر امراء کو ساتھ ملا کر سلیمان شاہ کو گرفتار کر لیا۔ پھر زہر دے کر اسے مار دیا۔

۷ ارسلان بن طغرل ثانی: ۵۵۵ھ تا ۵۷۱ھ (۱۱۶۰ء تا ۱۱۷۵ء): سلیمان شاہ کو برطرف کر کے ایلدگز نے اپنے سوتیلے بیٹے ارسلان بن طغرل کو علامتی بادشاہ کے طور پر تخت نشین کر دیا اور خود اس کی آڑ میں حکومت کرنے لگا۔ ۵۶۸ھ میں ''ایلدِ گز'' کی وفات کے بعد اس کا بیٹا جہان پہلوان ارسلان بن طغرل پر مسلط ہو گیا۔ غرض ارسلان بن طغرل برائے نام حکمران تھا۔ ۵۷۱ھ میں جہان پہلوان نے اسے زہر دے کر مار دیا اور اس کی جگہ اس کے کم سن لڑکے طغرل کو تخت پر بٹھا دیا۔

۸ طغرل بن ارسلان: ۵۷۱ھ تا ۵۹۰ھ (۱۱۷۵ء تا ۱۱۹۴ء): یہ سلاجقۂ عراق کا آخری حکمران تھا اور اپنے آباؤ اجداد جیسی صفات رکھتا تھا۔ جوان ہو کر اس نے خود کو اتابکانِ آذر بائی جان کے چنگل سے آزاد کرا لیا۔ اس کی شجاعت نے ایک طرف خوارزم شاہی سلطنت اور دوسری طرف خلافتِ بغداد کو خائف کر دیا تھا۔ آخر خوارزم کے بادشاہ علاؤ الدین تکش نے ۵۹۰ھ میں ایک خونریز جنگ کے بعد طغرل بن ارسلان کو شکست دی اور اسے قتل کر کے اس کا سر عباسی خلیفہ ناصر کے پاس بھیج دیا۔ یوں سلاجقۂ عراق کی ریاست خوارزم شاہی سلطنت کا حصہ بن گئی۔

[1] طغرل کی بیوہ سے بھی اس کے ہاں ایک لڑکا جہان پہلوان پیدا ہوا جو آگے چل کر اس ریاست کی سیاست پر چھا گیا۔

سلاجقۂ عراق کی فہرست درج ذیل ہے:

۱	محمود بن محمد بن ملک شاہ	۵۱۱ھ تا ۵۲۵ھ	۱۱۱۷ء تا ۱۱۳۱ء	پہلا حکمران
۲	طغرل بن محمد بن ملک شاہ	۵۲۵ھ تا ۵۲۹ھ	۱۱۳۱ء تا ۱۱۳۵ء	
۳	مسعود بن محمد بن ملک شاہ	۵۲۹ھ تا ۵۴۷ھ	۱۱۳۵ء تا ۱۱۵۲ء	
۴	ملک شاہ ثانی بن محمود بن محمد بن ملک شاہ	۵۴۷ھ تا ۵۴۸ھ	۱۱۵۲ء تا ۱۱۵۳ء	
۵	محمد ثانی بن محمود بن محمد بن ملک شاہ	۵۴۸ھ تا ۵۵۱ھ	۱۱۵۳ء تا ۱۱۵۶ء	
۶	سلیمان شاہ بن محمد بن ملک شاہ	۵۵۱ھ تا ۵۵۵ھ	۱۱۵۶ء تا ۱۱۶۰ء	کٹھ پتلی
۷	ارسلان بن طغرل بن محمد	۵۵۶ھ تا ۵۷۱ھ	۱۱۶۱ء تا ۱۱۷۵ء	کٹھ پتلی
۸	طغرل بن ارسلان	۵۷۱ھ تا ۵۹۰ھ	۱۱۷۵ء تا ۱۱۹۴ء	آخری حکمران

◆◆◆

سلاجقۂ خراسان:

❶ **سنجر بن ملک شاہ:۵۱۱ھ تا ۵۵۲ھ (۱۱۱۷ء تا ۱۱۵۷ء):** ۴۹۰ھ میں سلطان ارسلان ارغون کے قتل کے بعد برکیارُق بن ملک شاہ نے خراسان کی حکومت اپنے بھائی سنجر کے سپرد کردی۔ سنجر نے ۲۱ سال تک یہاں سلجوقی سلاطین کے نائب کی حیثیت سے حکومت کی۔ اسے خطبۂ جمعہ میں ''مَلِک'' کہا جاتا تھا۔ ۵۱۱ھ میں محمد بن ملک شاہ کی موت کے بعد سنجر نے خراسان کے مرکز مرو میں آزاد حکومت قائم کر لی اور اسی کو سلاجقہ کا سربراہ تسلیم کیا گیا۔ چنانچہ ۵۱۱ھ تا ۵۵۲ھ تک دنیائے اسلام کے اکثر شہروں کے خطبۂ جمعہ میں سنجر ہی کو ''سلطان'' کہا جاتا تھا۔

سلطان سنجر ایک عادل حکمران تھا۔ اس کی ساری زندگی فوجی مہمات میں گزری۔ اس نے افغانستان سے غزنوی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اسی کے دور میں اس کے نائب اَتسِز نے خوارزم میں خودمختار حکومت قائم کی جو سلطنتِ خوارزم شاہی کہلائی۔ سلطان سنجر چار عشروں تک حکومت کر کے ۵۵۰ھ میں فوت ہوا۔ اس نے سلجوقیوں کے قدم دوبارہ جمانے کی بڑی کوشش کی مگر اس سلطنت کو سابقہ عروج نصیب نہ ہوا۔

سلطان سنجر کے آخری چار سال بڑی کس مپرسی میں گزرے۔ وہ تُرکانِ غُز کے ہاتھوں یرغمال بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے تخت چھوڑ دیا اور گوشہ نشینی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔

❷ **محمود خان خواہرزادہ:۵۵۲ھ تا ۵۵۶ھ (۱۱۵۷ء تا ۱۱۶۱ء):** سلطان سنجر کے بعد تُرکانِ غُز نے اس کے بھانجے محمود خان خواہرزادہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ وہ جبراً وقہراً کچھ مدت تخت نشین رہا۔ اس کی برائے نام حکومت خراسان تک محدود تھی۔ آخر ۵۵۶ھ میں وہ تاج وتخت چھوڑ کر نکل بھاگا۔ نیشاپور پہنچا تو وہاں کے گورنر مؤید نے اسے اندھا کر کے جیل میں ڈال دیا۔ یوں سلاجقۂ خراسان کی حکومت تُرکانِ غُز، خوارزمی اور غوری حکمرانوں کے قبضے میں آ کر ختم ہو گئی۔

سلاجقہ خراسان درج ذیل ہیں:

۱	سنجر بن ملک شاہ	۵۱۱ھ تا ۵۵۲ھ	۱۱۱۷ء تا ۱۱۵۷ء	پہلا حکمران
۲	محمود خان خواہر زادہ	۵۵۲ھ تا ۵۵۶ھ	۱۱۵۷ء تا ۱۱۶۱ء	آخری حکمران

◆◆◆

سلاجقہ شام والجزیرہ:

سلاجقہ کی ایک شاخ نے شام اور الجزیرہ میں بھی اپنی حکومت قائم کی۔ اس کا بانی ملک شاہ کا بھائی (الپ ارسلان کا بیٹا) تُتش تھا جس نے ۴۷۱ھ میں شام فتح کر کے وہاں کی نیابت سنبھالی۔

تتش: ۴۸۵ھ میں ملک شاہ کی موت کے بعد تتش شام اور الجزیرہ کا خودمختار حکمران ہوگیا۔ ۴۸۸ھ میں وہ مرو روانہ ہوا تاکہ ملک شاہ کے خالی تخت پر قبضہ کر لے مگر راستے میں برکیارق بن ملک شاہ سے معرکے میں مارا گیا۔

دُقاق بن تتش: تتش کے قتل کے بعد اس کے بیٹے دُقاق نے دِمشق میں اپنی خودمختار حکومت قائم کر لی۔

طغ تکین: ۴۹۷ھ میں دُقاق کی وفات ہوگئی۔ اس کا بیٹا بہت کم سن تھا؛ اس لیے اس کے سسر ظہیر الدین طغ تکین نے دِمشق کی حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ طغ تکین نے ۲۵ برس تک حکومت کی اور ۵۲۲ھ میں فوت ہوا۔ وہ ایک بہادر سپاہی تھا۔ اس کے دور میں فرنگیوں نے دِمشق پر قبضے کی بڑی کوشش کی مگر اس نے ان کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ اس کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

> ”وہ دلیر، شجاع، باہیبت اور فرنگیوں کے خلاف مجاہد تھا۔ عادل حکمران تھا...... اگر اللہ اسلام کے دفاع کے لیے طغ تکین کو فرنگیوں کے سامنے نہ کھڑا کر دیتا تو وہ دِمشق پر قابض ہوجاتے مگر اس نے انہیں متعدد بار شکستوں سے دوچار کیا۔“[1]

تاج الملوک بوری: طغ تکین کی وفات کے بعد اس کا بیٹا تاج الملوک بوری حکمران بنا۔ وہ بھی فرنگیوں سے اسلامی سرحدوں کی حفاظت میں مستعد رہا۔ اس نے شام میں اسماعیلیوں کی بھی بیخ کنی کی۔ اس کے ردِعمل میں اس پر باطنی خنجر برداروں نے حملہ کیا۔ وہ زخمی ہوگیا اور آخر ایک سال بعد ۵۲۶ھ میں انہی زخموں کی تاب نہ لا کر فوت ہوگیا۔

شمس الملوک اسماعیل: اس کے بعد اس کا بیٹا شمس الملوک اسماعیل حکمران ہوا۔ وہ ظالم حاکم تھا۔ لوگوں کی بددعاؤں کا شکار ہو کر ایک محلاتی سازش کے تحت ۵۲۹ھ میں مارا گیا۔

محمود شہاب الدین: اس کے بعد اس کا بھائی محمود شہاب الدین حاکم بنا۔ ۵۳۳ھ میں وہ بھی ایک محلاتی سازش کا نشانہ بن کر قتل ہوگیا۔

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۱۹ ص ۵۱۹ ...... نوٹ: دقاق کے بعد شام کی حکومت سلجوقی نسل سے ختم ہوگئی؛ کیوں کہ اس کے بعد حکومت سنبھالنے والا اس کا سسر طغ تکین نسلاً سلجوقی نہ تھا مگر چونکہ اس کی سلجوقیوں سے رشتہ داری تھی، اس لیے اس کی اور اس کی اولاد کی حکومت کو سلاجقہ شام ہی میں شمار کیا جاتا ہے۔

جمال الدین محمد: شہاب الدین کے بعد اس کے بھائی جمال الدین محمد نے ایک سال حکومت کی۔

مجیر الدین: جمال الدین کے بیٹے مجیر الدین نے ۵۳۴ھ سے ۵۴۹ھ تک حکومت کی۔ ۵۴۹ھ میں دمشق پر سلطان نور الدین زنگی کی حکومت قائم ہوگئی۔ یوں سلاجقۂ شام کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

سلاجقۂ شام کی حکمرانوں کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱	تتش بن الپ ارسلان	۴۸۵ھ تا ۴۸۸ھ	۱۰۹۲ تا ۱۰۹۵ء	بانی حکومت
۲	دُقاق بن تتش	۴۸۸ھ تا ۴۹۷ھ	۱۰۹۵ء تا ۱۱۰۴ء	
۳	طغ تگین	۴۹۷ھ تا ۵۲۲ھ	۱۱۰۴ء تا ۱۱۲۸ء	
۴	تاج الملوک بوری	۵۲۲ھ تا ۵۲۶ھ	۱۱۲۸ء تا ۱۱۳۲ء	
۵	شمس الملوک اسماعیل	۵۲۶ھ تا ۵۲۹ھ	۱۱۳۲ء تا ۱۱۳۵ء	
۶	محمود شہاب الدین	۵۲۹ھ تا ۵۳۳ھ	۱۱۳۵ء تا ۱۱۳۹ء	
۷	جمال الدین محمد	۵۳۳ھ تا ۵۳۴ھ	۱۱۳۹ء تا ۱۱۴۰ء	
۸	مجیر الدین	۵۳۴ھ تا ۵۴۹ھ	۱۱۴۰ء تا ۱۱۵۴ء	آخری حکمران

◆◆◆

سلاجقۂ روم:

سلاجقۂ خراسان اور سلاجقۂ روم چھٹی صدی ہجری کے اواخر تک ختم ہو چکے تھے۔ البتہ ان کی ایک شاخ ''سلاجقۂ روم'' ایشیائے کوچک میں ساتویں صدی ہجری کے آخر تک باقی رہی۔ سلاجقۂ روم کا بانی سلیمان بن قُتُلمِش (بن اسرائیل بن سلجوق) تھا جو سلجوقی خانوادے کا نہایت جری سالار تھا۔ اس نے سلجوقی سلطنت کے قیام کے وقت طغرل بیگ کے دور میں ایشیائے کوچک کو فتح کیا تھا اور اپنی وفات تک وہیں صوبہ دار کے طور پر حکومت کرتا رہا تھا۔ ۴۷۹ھ میں اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا قلج ارسلان حکمران ہوا۔ پھر حکومت اس کی نسل میں چلتی رہی۔ سلاجقۂ روم کے حالات حصۂ چہارم میں سلطنتِ عثمانیہ کے تذکرے کے ساتھ آئیں گے؛ کیوں کہ سلطنتِ عثمانیہ کے بانی سلاجقۂ روم ہی کے نائبین تھے اور ان کی حکومت کی بنیادیں سلاجقۂ روم کے حدودِ اربعہ پر ہی استوار ہوئی تھی۔[1]

[1] الکامل فی التاریخ: سنة ۴۲۹ هـ تا ۵۵۶ هـ؛ التاریخ الاسلامی محمود شاکر: ۲۱۲/۶ تا ۲۱۴، ۲۱۸ تا ۲۲۲، ۲۳۳ تا ۲۳۶، ۲۵۱ تا ۲۵۴، ۲۶۵ تا ۲۶۷، ۲۸۷؛ الموسوعة الموجزة فی التاریخ الاسلامی: ۲۸۲/۱۴ تا ۲۸۵؛ موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲۳۸، ۲۴۱

دولتِ سلاجقہ اور اس کی مختلف شاخوں کے بارے میں مزید معلومات کے لیے ملاحظہ فرمائیے:

دولة السلاجقة: لمحمد علی محمد الصلابی، مؤسسة اقرا، قاهرة

دولة السلاجقة: لدکتور عبد النعیم محمد حسنین، ط مکتبة الانجلو المصریة

السلاجقة، تاریخهم السیاسی و العسکری: لابی النصر محمد عبدالعظیم یوسف، ط عین للدراسات والبحوث الانسانیة

تاریخ السلاجقة فی بلاد الشام: لدکتور سهیل طقوش، ط دار النفائس بیروت

تاریخ دولة آل سلجوق: لعماد الدین الاصفهانی

اتابکانِ آذربائی جان:

عباسیوں کے دورِ زوال میں آذربائی جان نے ایک طاقتور خودمختار ریاست کی شکل اختیار کر لی جو سلاجقۂ عراق پر پوری طرح اثر انداز تھی۔ بعد میں یہ عراق پر پوری طرح حاوی ہوگئی۔

ایلدِگز: اس ریاست کا بانی ''ایلدِگز'' نامی ایک نہایت ہوشیار شخص تھا جو سلطان مسعود سلجوقی کے وزیر کا غلام تھا۔ رفتہ رفتہ وہ سلطان مسعود کا مقرب بن گیا یہاں تک کہ شہزادہ ارسلان بن طغرل کی تربیت اسی کے سپرد ہوگئی اور یوں اسے ''اتابک'' کہا جانے لگا۔ پھر اس نے سلطان طغرل کی بیوہ سے نکاح کر کے اپنا قد مزید بلند کر لیا۔

۵۳۱ھ میں سلطان مسعود نے اسے آذربائی جان کا والی بنا دیا۔ سلجوقیوں کے کمزور پڑتے ہی اس نے وہاں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی جو اس قدر طاقتور ہوگئی کہ عراق کے سلجوقی حکمرانوں کا عزل و نصب اس کی مرضی سے ہونے لگا۔

ایلدِگز نے اس مقصد کے لیے ''اتا بکِ اعظم'' کا لقب اختیار کر کے اپنے لیے ایسا منصب حاصل کر لیا جو سلجوقی حکمران سے بھی بالاتر تھا۔ اسی منصب کے زور پر اس نے عراق کے سلجوقی حکمران سلیمان شاہ کو برطرف کر کے مروا دیا اور اس کی جگہ اپنے سوتیلے بیٹے ارسلان بن طغرل کو برائے نام حکمران بنا دیا۔

محمد جہان پہلوان: ۵۶۸ھ میں ایلدِگز کی وفات ہوگئی اور اس کا منصب اس کے بیٹے ''محمد جہان پہلوان'' نے سنبھالا۔ اس نے بھی اپنے سوتیلے بھائی ارسلان بن طغرل کو کٹھ پتلی بنائے رکھا۔ کچھ عرصے بعد جب یہ دیکھا کہ اسے مزید دبائے رکھنا مشکل ہوگا تو ۵۷۱ھ میں اسے زہر دے کر مروا دیا اور اس کے سات سالہ لڑکے طغرل بن ارسلان کو تخت پر بٹھا دیا تاکہ اپنی بالادستی کو برقرار رکھے۔ ۵۸۲ھ میں محمد جہان پہلوان کی وفات ہوگئی۔ اس وقت تک اس کی حکومت بلادِ جبل، رے اور اران تک وسیع ہو چکی تھی۔

عثمان قزل ارسلان: جہان پہلوان کی جگہ اس کا بھائی عثمان قزل ارسلان ''اتابک'' بن گیا۔ اس وقت تک طغرل بن ارسلان اٹھارہ برس کا ہو چکا تھا۔ اس نے قزل ارسلان کی بالادستی ماننے سے انکار کر دیا اور لڑ بھڑ کر عراق پر اپنی مستقل حکومت قائم کر لی۔ آذربائی جان اور اس کے ملحقات پر ایلدِگز کے بیٹوں اور پوتوں کی حکومت چلتی رہی۔ ان میں سے ہر ایک حکمران کو ''اتابک آذربائی جان'' کہا جاتا تھا۔

اُزبک مظفر الدین: ''اتابکانِ آذربائی جان'' کی حکومت ۹۰ سال قائم رہی۔ اس کا آخری حکمران اُزبک مظفر الدین تھا جس کی حکومت کا خاتمہ ۶۲۲ھ میں سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کے ہاتھوں خاتمہ ہوا۔[1]

◆◆◆

[1] دولة السلاجقة: لعبد النعيم: ۱۱۹ تا ۱۲۶

شمالی افریقہ کی حکومتیں (جو بنو عباس کے دورِ عروج میں قائم ہوئیں)

دولتِ رستمیہ: ۱۶۰ھ تا ۲۹۶ھ (۷۷۶ء تا ۹۰۸ء)

❶ عبدالرحمٰن بن رُستم: عبدالرحمٰن بن رستم ایک طالب علم تھا جس نے اِباضی فقیہ مسلم بن ابی کریمہ سے علم حاصل کیا تھا۔ تعلیم مکمل کر کے وہ اپنے مذہب کا داعی بن گیا۔ [1]

وہ بڑا عابد و زاہد انسان تھا، اس سے متاثر ہو کر افریقہ کے متعدد قبائل مثلاً: مکناسہ، لمایہ، سدرانہ، مزاتہ، لواتہ، غمارہ، ازدلجہ، ہوارہ اور نفوسہ اس کے پیروکار بن گئے۔ یہ قبائل ایک وسیع علاقے میں جو تلمسان سے طرابلس (لیبیا) تک پھیلا ہوا تھا، آباد تھے۔ عبدالرحمٰن بن رُستم کا دستِ راست ابوخطاب تھا جس نے قیروان جا کر حکومتی ادارے چلانے کا علم اور تجربہ حاصل کیا تھا۔ اس کی مدد سے عبدالرحمٰن نے نہایت عدل و انصاف سے حکومت کی۔

عبدالرحمٰن نے ''تاہرت'' کا شہر تعمیر کر کے اسے اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ وفات سے قبل اس نے اگلے حکمران کا انتخاب شوریٰ پر چھوڑ دیا جس نے اس کے بیٹے عبدالوہاب کو منتخب کر لیا۔

❷ عبدالوہاب: عبدالوہاب نے چالیس برس حکومت کی۔ اس دور میں اندرونی بغاوتوں کی وجہ سے حکومت کچھ کمزور ہوئی۔ عبدالوہاب نے وفات سے قبل اپنے والد کے برعکس اپنے بیٹے افلح کو باضابطہ طور پر جانشین متعین کر دیا۔

❸ افلح بن عبدالوہاب: افلح کا دور دولتِ رستمیہ کا ''عہدِ زرّیں'' تھا۔ اس زمانے میں تاہرت علوم و فنون اور تجارت کا عظیم الشان مرکز بن گیا۔ مشرق کی طرف سے دولتِ رستمیہ کبھی کبھار عباسیوں یا ان کے باج گزار مصری حکمرانوں کے حملوں کی زد میں آ جاتی تھی۔ چنانچہ ایک موقع پر افلح کا بیٹا ابوالیقظان جو ولی عہد بھی تھا، عباسیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ بیٹے کی گرفتاری کے صدمے نے باپ کو بستر سے لگا دیا اور اسی بیماری میں اس کی موت واقع ہو گئی۔

❹ ابوبکر بن افلح: اس کے بعد اس کا دوسرا بیٹا ابوبکر تخت نشین ہوا جو لاپروا اور عیش پسند تھا۔ دو سال بعد ابوالیقظان بنو عباس کی قید سے رہا ہو کر آیا اور شریکِ کار کی حیثیت سے ابوبکر کا ہاتھ بٹانے لگا۔ مگر ابوبکر کی نااہلی کے باعث ریاست میں خانہ جنگی ہونے لگی۔ آخر کار ابوبکر کو معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ ابوالیقظان کو حکومت مل گئی۔

❺ ابوالیقظان محمد بن افلح: ابوالیقظان نے تمام قبائلی سرداروں پر مشتمل ایک مجلسِ شوریٰ قائم کر کے سب کو مطمئن کر دیا۔ اس نے مساوات اور انصاف کے ساتھ بارہ سال تک حکومت کی۔

❻ ابوحاتم یوسف: اس کا بیٹا ابوحاتم یوسف اس کے بعد تخت نشین ہوا۔ وہ شریف الطبع اور نرم دل آدمی تھا جس سے فائدہ اٹھا کر عوام نے حکام کو کھلونا بنا لیا اور ایک گروہ نے ابوحاتم کے چچا یعقوب بن افلح کی قیادت میں بغاوت

---

[1] اباضی مکتبِ فکر کے خوارج سنتِ نبویہ سے استفادے کے قائل تھے؛ اس لیے دیگر خوارج کے برعکس ان کے ہاں کتب حدیث اور فقہ کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ خوارج کا واحد فرقہ ہے جو آج بھی موجود ہے۔ بحرین اور مسقط میں ان کی خاصی تعداد ہے۔

کردی۔ یوں دولتِ رستمیہ خانہ جنگی کا شکار ہو کر کمزور ہوگئی۔ کچھ مدت بعد صلح ہوگئی مگر دلوں میں نفرتیں برقرار تھیں۔ چنانچہ مخالفین نے سازش کر کے ابوحاتم کو قتل کر دیا۔

❻ یقظان: اس کے بعد ابوحاتم کا بھائی یقظان بن ابی الیقظان حکمران بنا۔ اس کا دور انتشار اور کمزوری کا تھا۔ یہی دولتِ رُستمیہ کا آخری حکمران ثابت ہوا۔ اس دور کے خوارج میں تشیع اور اعتزال کی طرف مائل الگ الگ گروہ پیدا ہو چکے تھے۔ یقظان نے ان کی سرکوبی کی حتی الامکان کوشش کی، تاہم اس دوران بنوعبید کا داعی ابوعبداللہ شیعی افریقہ میں آ چکا تھا۔ یقظان کے مخالفین اس سے جا ملے۔ ان میں سابق مقتول حکمران ابوحاتم کی بیٹی ''دوسر'' بھی شامل تھی جو اپنے باپ کے قاتلوں سے بدلہ لینے کے درپے تھی۔ ابوعبداللہ شیعی کو نادر موقع ہاتھ آ گیا اور ۲۹۷ھ میں اس نے تاہرت پر حملہ کر کے یقظان اور اس کے اہل وعیال کو قتل کر دیا۔ یوں دولتِ رستمیہ کا خاتمہ ہو گیا۔

اس حکومت کے حکمرانوں کی فہرست یہ ہے:

۱	عبدالرحمٰن بن رستم	۱۶۰ھ تا ۱۶۸ھ	۷۷۶ء تا ۷۸۴ء	بانی حکومت
۲	عبدالوہاب بن عبدالرحمٰن	۱۶۸ھ تا ۲۰۸ھ	۷۸۴ء تا ۸۲۳ء	
۳	افلح بن عبدالوہاب	۲۰۸ھ تا ۲۴۰ھ	۸۲۳ء تا ۸۵۴ء	
۴	ابوبکر بن افلح	۲۴۰ھ تا ۲۶۸ھ	۸۵۴ء تا ۸۸۱ء	نالائق
۵	ابوالیقظان محمد بن افلح	۲۶۸ھ تا ۲۸۱ھ	۸۷۳ء تا ۸۹۴ء	
۶	ابوحاتم یوسف بن محمد	۲۸۱ھ تا ۲۹۴ھ	۸۸۱ء تا ۹۰۷ء	
۷	یقظان بن محمد بن افلح	۲۹۴ھ تا ۲۹۷ھ	۹۰۷ء تا ۹۱۰ء	آخری حکمران

دولتِ رُستمیہ مجموعی طور پر ۱۳۶ سال تک باقی رہی۔[1]

✦✦✦

دولتِ بنی مِدرار (سِجلماسہ۔ مراکش): ۱۴۰ھ تا ۲۹۷ھ (۷۵۷ء تا ۹۰۹ء)

❶ عیسیٰ بن یزید: ۱۲۲ھ میں صفری خوارج کے رئیس میسرہ مضفری نے اموی خلفاء سے بغاوت کر کے مراکش میں آزاد حکومت بنانے کی کوشش کی تھی جو اگرچہ ناکام رہی تاہم صفری مراکش کے جنوبی علاقے میں منظم ہوتے چلے گئے اور عباسی دور کے آغاز میں مراکش کو کسی مرکزی حکومت کی گرفت سے آزاد دیکھ کر انہوں نے اپنے ایک سردار عیسیٰ بن یزید بن اسود کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ یہ ۱۴۰ھ کا واقعہ ہے۔

❷ ابوالقاسم مِدراری: پندرہ برس بعد عیسیٰ بن یزید کو قتل کر دیا گیا اور اس کی جگہ ''ابوالقاسم بن سمنون مِدراری'' مسند نشین ہوا۔ اس کے بعد حکومت اسی کی نسل میں چلتی رہی اور یہ حکومت ''دولتِ بنومِدرار'' کہلائی۔

[1] الموسوعة الموجزة فی التاریخ الاسلامی: ۱۴/۷۵ تا ۷۸؛ موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲۰۰، ۲۰۱

❹ الیسع: ۱۷۴ھ میں ابوالقاسم کا بیٹا الیسع حکمران ہوا جس نے ''سِجِلْمَاسَہ'' کی بنیاد رکھی اور اسے مرکز بنا کر طویل عرصے تک حکومت کی۔ اسے دولتِ بنو مِدرار کا حقیقی بانی کہا جاتا ہے۔ اس کے دور میں سِجِلْمَاسَہ علوم وفنون کا ایک بڑا مرکز اور ایک وسیع تجارتی واقتصادی شہر بن گیا۔

بنو مدرار نے عباسیوں سے صلح کر لی تھی اور اپنے داخلی امور مثلاً تجارت و زراعت میں مصروف رہتے تھے۔ آخر کار ۲۹۷ھ میں بنوعبید نے اس حکومت کا خاتمہ کر دیا۔[1]

بنو مدرار کی حکومت تقریباً ۱۵۷ سال تک چلی۔ اس کے اہم حکمران یہ تھے:

۱	عیسیٰ بن یزید الاسود	۱۴۰ھ تا ۱۵۵ھ	۷۵۷ء تا ۷۷۱ء	بانی حکومت
۲	ابوالقاسم سمکو	۱۵۵ھ تا ۱۶۸ھ	۷۷۱ء تا ۷۸۴ء	
۳	الیاس ابوالوزیر	۱۶۸ھ تا ۱۷۴ھ	۷۸۴ء تا ۷۹۰ء	
۴	الیسع بن ابوالقاسم	۱۷۴ھ تا ۲۰۸ھ	۷۹۰ء ۸۲۳ء	
۵	مِدرار المنتصر	۲۰۸ھ تا ۲۲۴ھ	۸۲۳ء تا ۸۳۹ء	
۶	میمون بن مِدرار	۲۲۴ھ تا ۲۶۳ھ	۸۳۹ء تا ۸۷۶ء	
۷	محمد	۲۶۳ھ تا ۲۷۰ھ	۸۷۶ء تا ۸۸۳ء	
۸	الیسع	۲۷۰ھ تا ۲۹۷ھ	۸۸۳ء تا ۹۱۰ء	آخری حکمران

❖❖❖

دولتِ ادارسہ (مراکش) ۱۷۲ھ تا ۳۱۲ھ: (۷۸۸ء تا ۹۲۴ء)

❶ ادریس بن عبداللہ: منصور عباسی کے خلاف خروج کرنے والے مشہور فاطمی پیشوا نفسِ زکیہ کے ایک بھائی ادریس بن عبداللہ تھے جو نفسِ زکیہ کے قتل کے بعد بھی خروج کی تیاری کرتے رہے۔ ۱۶۹ھ میں اسی خاندان کے ایک فرد حسین بن علی (بن حسن بن حسن بن حسن بن علی) نے مدینہ کے گورنر کے خلاف خروج کیا جس میں ادریس بن عبداللہ بھی شامل تھے۔ خروج ناکام ہوا تو ادریس بن عبداللہ نے اپنے کنبے اور اپنے غلام راشد کے ساتھ فرار ہو کر شمالی افریقہ میں پناہ لی اور مراکش کے شہر ''ولیلی'' میں مقیم ہوئے۔ وہاں قبیلہ ''الاوربہ'' کے سردار اسحٰق بن محمد نے انہیں خوش آمدید کہا اور ان کی داستان سن کر ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس قبیلے کی مدد سے رمضان ۱۷۲ھ میں ادریس بن عبداللہ نے ایک خودمختار حکومت قائم کر لی جو کچھ ہی مدت میں الجزائر کے شہر تلمسان تک وسیع ہو گئی۔

ادریس بن عبداللہ ۱۷۷ھ میں اچانک ایک حملے میں (جس کا الزام بنوعباس پر لگایا جاتا ہے) قتل ہو گئے۔

---

① الموسوعة الموجزة فی التاریخ الاسلامی: ۸۲/۱۴ تا ۸۴؛ موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲۰۰؛ التاریخ الإسلامی محمود شاکر: ۱۱۵/۶

❷ ادریس بن ادریس: ادریس کے قتل کے بعد ان کی باندی کنزہ جو اُمید سے تھی، ایک بچے کی ماں بنی جس کا نام باپ کے نام پر ادریس رکھا گیا۔ بچے کی تعلیم و تربیت ادریس بن عبداللہ کے آزاد کردہ غلام راشد کے سپرد ہوئی اور دولتِ ادارسہ کی قیادت بھی اسی کے ہاتھ میں رہی۔ لوگ اس کی قیادت میں متحد رہے۔ بنو عباس نے یہ دیکھ کر خطرہ محسوس کیا اور تیونس میں اپنی باج گزار حکومت دولتِ اغالبہ کے بانی ابراہیم بن اغلب کے ذمے لگایا کہ وہ ادارسہ کے قائم مقام قائد راشد کو ٹھکانے لگا دے۔ چنانچہ ۱۸۶ھ میں راشد کو ایک خفیہ کارروائی کے ذریعے قتل کر دیا گیا۔ راشد کے مرنے کے بعد دو سال تک دولتِ ادارسہ کی قیادت اور ادریس بن ادریس کی تربیت کی ذمہ داریاں ابوخالد بن یزید نے انجام دیں۔ آخر ۱۸۸ھ میں ادریس بن ادریس نے تجدیدِ بیعت کے ساتھ اپنا منصب سنبھال لیا۔ قیروان اور اندلس کے عرب رؤساء جوق در جوق اس کے گرد جمع ہونے لگے اور اس نئی حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر زیادہ تر وہی فائز کیے گئے۔ انہی کے مشورے پر ادریس بن ادریس نے مراکش میں ایک نیا شہر ''فاس'' تعمیر کر کے اسے اپنا پایہ تخت بنایا۔ اگلے سالوں میں اس نے الجزائر کے شہر تلمسان سے لے کر سوسِ اقصیٰ تک ایک وسیع علاقہ فتح کر لیا۔

❸ محمد بن ادریس: ۲۱۳ھ میں ادریس بن ادریس کی وفات ہوگئی اور ولی عہد محمد بن ادریس نے مسندِ حکومت سنبھالی۔ اس نے اپنی دادی ''کنزہ'' کے مشورے پر ریاست کو بھائیوں میں تقسیم کر دیا جس سے دولتِ ادارسہ اپنے قیام کے چالیس برسوں کے اندر اندر کمزور اور منتشر ہوگئی اور بھائیوں میں تنازعات اٹھ کھڑے ہوئے۔

محمد بن ادریس کو اس غلطی کے ازالے کے لیے بھائیوں سے جنگیں لڑنا پڑیں اور اس نے خاصا رقبہ دوبارہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ تاہم جو نقصان ہو چکا تھا اس کا پوری طرح ازالہ نہ ہو سکا۔ محمد بن ادریس کے بعد ریاست اس قدر کمزور ہوگئی کہ کبھی اسے بنوعبید کا باج گزار بننا پڑا اور کبھی امویانِ اندلس کا۔

❹ یحییٰ ثالث: تقسیمِ سلطنت کے بعد ادارسہ میں فقط یحییٰ ثالث ایسا حکمران تھا جس نے ایک معقول زمانے تک بڑے کرّوفر کے ساتھ حکومت کی۔ تاہم ۳۰۵ھ میں اسے بھی بنوعبید کی بے پناہ طاقت کے سامنے جھکنا پڑا اور اس نے جھوٹے مہدی عبیداللہ بن میمون کی باج گزاری قبول کر لی۔ ۳۱۰ھ میں اسے حکومت سے برطرف کر دیا گیا۔ بنوعبید نے اس کی جگہ اسی خاندان کے حسن بن محمد کو کٹھ پتلی کی حیثیت سے دو سال تک مسند پر رہنے دیا۔ پھر اسے بھی معزول کر دیا گیا۔ یوں ۳۱۲ھ میں ادارسہ کی خودمختار حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ دولتِ ادارسہ کی مدت ۱۴۰ ہوئی۔

اگرچہ ادریسی خانوادے کے کچھ رؤساء مزید دو صدیوں تک افریقہ کے بعض گوشوں میں محدود علاقوں پر قابض رہے مگر ان کی کوئی سیاسی حیثیت نہ تھی۔ دولتِ ادارسہ کے حکمران مندرجہ ذیل ہیں: [1]

۱	ادریس بن عبداللہ	۱۷۲ھ تا ۱۷۷ھ	۷۸۸ء تا ۷۹۳ء بانی حکومت
	راشد مولیٰ ادریس (قائم مقام حکمران)	۱۷۷ھ تا ۱۸۶ھ	۷۹۳ء تا ۸۰۲ء
	ابوخالد بن یزید (قائم مقام حکمران)	۱۸۶ھ تا ۱۸۸ھ	۸۰۲ء تا ۸۰۴ء

۲	ادریس الثانی بن ادریس	۱۸۸ھ تا ۲۱۳ھ	۸۰۳ء تا ۸۲۸ء	
۳	محمد بن ادریس الثانی	۲۱۳ھ تا ۲۲۱ھ	۸۲۸ء تا ۸۳۶ء	
۴	علی بن محمد	۲۲۱ھ تا ۲۳۴ھ	۸۳۶ء تا ۸۴۹ء	
۵	یحیٰی اوّل، بن علی	۲۳۴ھ	۸۴۹ء	
۶	یحیٰی ثانی، بن محمد	۲۳۴ھ تا ۲۵۰ھ	۸۴۹ء تا ۸۶۴ء	
۷	علی بن عمر بن ادریس ثانی	۲۵۰ھ تا ۲۶۵ھ	۸۶۴ء تا ۸۷۹ء	
۸	یحیٰی ثالث، بن قاسم بن ادریس ثانی	۲۶۵ھ تا ۲۹۲ھ	۸۷۹ء تا ۹۰۵ء	
۹	یحیٰی رابع بن ادریس بن عمر بن ادریس ثانی	۲۹۲ھ تا ۳۱۰ھ	۹۰۵ء تا ۹۲۲ء	
۱۰	الحسن بن محمد بن قاسم بن ادریس ثانی	۳۱۰ھ تا ۳۱۲ھ	۹۲۲ء تا ۹۲۴ء	آخری حکمران

◆◆◆

دولتِ اغالبہ، تیونس: ۱۸۴ھ تا ۲۹۶ھ (۸۰۰ء تا ۹۰۹ء)

بنوتمیم کے ایک سردار اغلب بن سالم نے عباسی تحریک کی کامیابی اور اموی حکومت کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ہارون الرشید نے اپنے دورِ خلافت میں اس کے بیٹے ابراہیم کو بربروں کی بغاوتوں کا سر کچلنے اور دولتِ ادارسہ کی روک تھام کے لیے افریقہ کی چھاؤنی قیروان میں تعینات کیا۔ ابراہیم ایک عالم فاضل شخص تھا۔ اس نے اپنے عنفوانِ شباب میں فسطاط (مصر) کی جامع مسجد میں جو علوم دینیہ کا مرکز تھی، امام لیث بن سعد جیسے بزرگوں سے علم دین حاصل کیا تھا۔ اس نے ہارون الرشید کی دی ہوئی ذمہ داری کو بخوبی نبھایا۔

تاہم جب افریقہ میں عباسیوں کی دسترس نہ رہی تو ابراہیم بن اغلب نے ۱۸۴ھ میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس کے دور میں قیروان اسلامی علوم وفنون اور تجارت و اقتصاد کا اہم مرکز بن گیا اور اس کی ولایت میں شامل دیگر شہروں: تیونس، سوسہ، قابس، قفصہ، توزر، نفطہ، طبنہ، مسیلہ اور بجایہ کی اہمیت بھی پہلے سے بہت بڑھ گئی۔ مؤرخین نے ابراہیم بن اغلب کا ذکر تعریفی انداز میں کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ عہد کا پکا، نیک سیرت اور رعایا پرور تھا۔ سیاست میں اس کی مہارت غیر معمولی تھی۔ وہ اپنی ذمہ داریاں بڑی تندہی اور خوش اسلوبی سے انجام دیتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۶ھ میں اس کی وفات ہوگئی۔ یہ حکومت جو دولتِ اغالبہ کے نام سے مشہور ہوئی، اس کے بیٹے زیادۃ اللہ نے سنبھال لی۔

زیادۃ اللہ کے دور میں قیروان، عباسیہ، تیونس اور سوسہ جیسے شہر پہلے سے زیادہ آباد ہوگئے۔ جزیرہ صِقِلّیہ (سسلی) میں بھی جہاد ہوا اور اس کا بڑا حصہ دولتِ اغالبہ میں شامل ہوگیا جبکہ باقی علاقے میں جہاد جاری رہا۔

---

① التاریخ الاسلامی محمود شاکر: ٦/١١١ تا ١١٣؛ الموسوعة الموجزة فی التاریخ الاسلامی: ١٤/٧٩ تا ٨١؛ موجز التاریخ الاسلامی، ص ٢٠١؛ تاریخ ابن خلدون: ٤/١٦ تا ٢٠

زیادۃ اللہ کا بیٹا ابوعفان اغلب بھی ایک نیک سیرت حکمران ثابت ہوا جو شرعی احکام کے نفاذ میں بے لچک تھا۔

احمد بن محمد نے پندرہ سال حکومت کی اور عوام پروری کی بہترین مثالیں پیش کیں۔ وہ ہر سال شعبان اور رمضان کے دوران باہر گشت کرتا اور مفلس لوگوں پر دل کھول کر خرچ کرتا۔ اس نے شہریوں کے لیے پانی کا نظام بھی بہتر بنایا۔

ابراہیم بن احمد کا دور ۲۸ برس طویل تھا۔ اس نے ابتداء میں عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی۔ مساجد تعمیر کرائیں، ساحلوں پر قلعے بنوائے، قیروان کے قریب اس نے ''رقادہ'' نامی نیا شہر بسایا اور اس میں ایک شاندار جامع مسجد بھی بنوائی۔ تاہم بعد میں وہ کسی دماغی مرض کا شکار ہو گیا اور اس دوران اس نے بے تحاشا مظالم ڈھائے۔ آخر مرض کی تصدیق ہو جانے کے بعد اسے معزول کر دیا گیا اور حکومت اس کے بیٹے ابوالعباس عبداللہ نے سنبھال لی۔

ابوالعباس نے صِقلّیہ کی مہم کو جو سالہا سال سے جاری تھی، انجام تک پہنچانے میں مستعدی دکھائی۔ اس دوران اس کے والد کو شفا ہو گئی اور وہ تلافی مافات کے لیے صِقلّیہ کے جہاد میں شامل ہو گیا اور ۲۸۹ھ میں وہیں فوت ہوا۔

اس دوران افریقہ میں بنوعبید کے داعی ابوعبداللہ شیعی کا ظہور ہوا جو دولتِ اغالبہ کے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔ مزید ستم یہ ہوا کہ ابوالعباس عبداللہ کو اس کے نالائق بیٹے زیادۃ اللہ ابومضر نے قتل کر دیا اور خود حکومت سنبھال لی مگر وہ بنوعبید کا مقابلہ نہ کر سکا اور بہت جلد ہمت ہار کر فرار ہو گیا۔ ۲۹۷ھ میں بنوعبید نے کسی دشواری کے بغیر دولتِ اغالبہ کے مرکز قیروان اور دیگر شہروں پر قبضہ کر لیا۔ دولتِ اغالبہ تقریباً ۱۱۳ سال تک قائم رہی۔ اس کے حکمران مندرجہ ذیل ہیں:[1]

نمبر	نام	ہجری	عیسوی	کیفیت
۱	ابراہیم بن اغلب	۱۸۴ھ تا ۱۹۶ھ	۸۰۰ء تا ۸۱۲ء	بانی حکومت
۲	عبداللہ اوّل بن ابراہیم	۱۹۶ھ تا ۲۰۱ھ	۸۱۲ء تا ۸۱۷ء	
۳	زیادۃ اللہ اوّل بن ابراہیم	۲۰۱ھ تا ۲۲۳ھ	۸۱۷ء تا ۸۳۸ء	
۴	اغلب ابوعفان بن ابراہیم	۲۲۳ھ تا ۲۲۶ھ	۸۳۸ء تا ۸۴۱ء	
۵	محمد اوّل بن اغلب ابوعفان	۲۲۶ھ تا ۲۴۲ھ	۸۴۱ء تا ۸۵۶ء	
۶	احمد بن محمد اوّل	۲۴۲ھ تا ۲۴۹ھ	۸۵۶ء تا ۸۶۳ء	
۷	زیادۃ اللہ ثانی بن محمد اوّل	۲۴۹ھ تا ۲۵۰ھ	۸۶۳ء تا ۸۶۴ء	
۸	محمد ثانی بن احمد	۲۵۰ھ تا ۲۶۱ھ	۸۶۴ء تا ۸۷۵ء	
۹	ابراہیم ثانی بن احمد	۲۶۱ھ تا ۲۸۹ھ	۸۷۵ء تا ۹۰۲ء	
۱۰	عبداللہ ثانی بن ابراہیم ثانی	۲۸۹ھ تا ۲۹۰ھ	۹۰۲ء تا ۹۰۳ء	
۱۱	ابومضر زیادۃ اللہ ثالث بن عبداللہ ثانی	۲۹۰ھ تا ۲۹۶ھ	۹۰۳ء تا ۹۰۹ء	آخری حکمران

✦✦✦

[1] التاریخ الاسلامی محمود شاکر: ۱۰۶/٦؛ الموسوعة الموجزة فی التاریخ الاسلامی: ۷۱/۱٤ تا ۱۷٤؛ موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲۰۱، ۲۰۲

شمالی افریقہ کی حکومتیں (جو بنوعباس کے دورِ زوال میں قائم ہوئیں)

دولتِ زیریہ (تیونس، الجزائر): ۳۶۲ھ تا ۵۶۳ھ (۹۷۲ء تا ۱۱۶۷ء)

یہ حکومت بربروں کے طاقتور قبیلے صنہاجہ کی تھی۔ بربروں کی تقریباً ایک تہائی تعداد اسی قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی قبیلے کے ایک سردار زیری بن مَناد نے ۳۳۵ھ میں ابو یزید خارجی کے خلاف بنوعبید کا بھرپور ساتھ دے کر عبیدی حکمران المنصور سے خلعت حاصل کی تھی۔ اس کے بعد زیری اور اس کا گھرانہ بنوعبید کے خصوصی وفادار شمار ہونے لگے۔ ۳۵۸ھ میں بنوعبید نے مصر پر قبضہ کیا اور ۳۶۱ھ میں عبیدی حکمران المُعز وہیں منتقل ہوگیا۔ جاتے جاتے اس نے تیونس اور الجزائر کے وسیع علاقے پر جہاں سے بنوعبید کی سلطنت شروع ہوئی تھی، زیری بن مناد کے بیٹے یوسف بُلُگّین کو نائب بنادیا۔

❶ یوسف بُلُگّین: یوسف بُلُگّین نے بڑی آن بان سے حکومت کی۔ اسی نے "الجزائر" شہر تعمیر کرایا اور اس علاقے کو پُر امن بنادیا۔ تاہم اسے کئی بغاوتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ذوالحجہ ۳۷۳ھ میں سِجِلْمَاسَہ کو باغیوں سے بازیاب کرانے کی مہم کے دوران اس کی وفات ہوگئی۔

❷ منصور بن یوسف: اس کی وفات کے بعد اس کی وصیت کے مطابق اس کا بیٹا منصور حکمران بنا جو باپ کے برخلاف نرم مزاج تھا۔ اس کا دورِ حکومت زیادہ تر بغاوتیں فرو کرنے میں گزرا۔ ۳۸۶ھ میں اس کی وفات ہوگئی۔

❸ بادیس بن منصور: اب منصور کا بیٹا بادیس تخت نشین ہوا جو مراکش کا گورنر تھا۔ اس نے ۳۹۸ھ میں اپنے چچا حماد بن یوسف کو الجزائر کے شہر "اشیر" کا انتظام مکمل طور پر سونپ دیا۔ یہاں سے دولتِ بنوزیری دو حصوں میں تقسیم ہوگئی: موجودہ تیونس اور لیبیا کے اضلاع بادیس کی اولاد کے پاس رہے۔ الجزائر کے اضلاع حماد کی اولاد کے پاس چلے گئے۔

❹ مُعِز بن بادیس: بادیس ۴۰۶ھ میں فوت ہوا اور اس کا کم سن بیٹا مُعِز اس کا جانشین بنا جو لڑکپن میں علماء سے تعلیم حاصل کرنے کے باعث پختہ فکر سُنّی تھا۔ مُعِز نے اپنی ریاست کو بنوعبید کی حلقہ بگوشی سے آزاد کرالیا اور بنوعبید کی بجائے بنوعباس کا خطبہ جاری کردیا۔ مُعِز بن بادیس کا دور بنوزیری کا عہدِ زرّیں تھا جس میں دینی علوم عام ہوئے اور لوگ جبراً مسلط کیے گئے اسماعیلی مذہب کی قید سے آزاد ہوئے۔ مُعِز نے اپنے چچازاد بنوحماد کے ساتھ صلح رکھی اور امن وامان قائم رکھا۔ اب تک بنوزیری کا پایۂ تخت قیروان تھا مگر بنوعبید کی طرف سے اُکسائے ہوئے عرب قبائل کی یلغار نے مُعِز کو قیروان سے پسپائی پر مجبور کردیا اور ایک وسیع علاقہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کے بعد بنوزیری نے آخر تک "مہدیہ" کو اپنا مرکز بنائے رکھا۔

❺ تمیم بن مُعزّ: ۴۵۴ھ میں مُعزّ کی وفات ہوگئی اور اس کا بیٹا تمیم حکمران بنا۔ اس نے متعدد ہنگاموں اور شورشوں کے باوجود اپنی حکومت کو مستحکم رکھا۔ ۵۰۱ھ میں تمیم کی وفات ہوگئی۔

❻ یحییٰ بن تمیم: بعد اس کا بیٹا یحییٰ حکمران بنا۔ وہ ایک مجاہد شخص تھا۔ اس نے ایک طاقتور بحری بیڑہ بنا کر بحیرۂ روم میں رومیوں کے ان جزائر پر جو عسکری اڈے تھے، چھاپہ مار حملوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ۵۰۹ھ میں عین عید الاضحیٰ کے دن وہ اچانک فوت ہوگیا۔

❼ علی بن یحییٰ: اب یحییٰ کا بیٹا علی تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی بحری جہاد جاری رکھا اور بغاوتوں پر بھی قابو پایا۔ ۵۱۵ھ میں اس کی وفات ہوگئی۔

❽ حسن بن علی: علی کی جگہ اس کا بارہ سالہ لڑکا حسن اس کا جانشین ہوا۔ اس کے دور میں رومیوں نے دولتِ زیریہ کے ساحلی شہروں پر حملے شروع کر دیے تھے۔ حسن ایک مدت تک کامیاب دفاع کرتا رہا۔ تاہم ۵۴۷ھ میں رومیوں نے بہت بڑا بیڑہ تیار کر کے مہدیہ پر حملہ کر دیا۔ حسن بن علی میں مقابلے کی تاب نہ تھی۔ وہ اپنے اہل و عیال سمیت فرار ہو کر اپنے چچازادوں بنوحماد کے پاس الجزائر چلا گیا جنہوں نے اسے نظر بند کر دیا۔ پیچھے رومیوں نے کسی مزاحمت کے بغیر مہدیہ پر قبضہ کر لیا۔ یوں دولتِ بنی زیری کا خاتمہ ہوگیا۔[1]

دولتِ بنو زیری کی مدت ۱۳۶ سال تھی۔ اس کے حکمرانوں کی فہرست درج ذیل ہے:

۱	یوسف بُلُگّین بن زیری	۳۶۱ھ تا ۳۷۳ھ	۹۷۲ء تا ۹۸۴ء	بانی حکومت
۲	منصور بن یوسف	۳۷۴ھ تا ۳۸۶ھ	۹۸۴ء تا ۹۹۵ء	
۳	بادیس بن یوسف	۳۸۶ھ تا ۴۰۶ھ	۹۹۵ء تا ۱۰۱۵ء	
۴	مُعزّ بن بادیس	۴۰۶ھ تا ۴۵۴ھ	۱۰۱۵ء تا ۱۰۶۲ء	حقیقی مؤسس
۵	تمیم بن مُعزّ	۴۵۴ھ تا ۵۰۱ھ	۱۰۶۲ء تا ۱۱۰۸ء	
۶	یحییٰ بن تمیم	۵۰۱ھ تا ۵۰۹ھ	۱۱۰۸ء تا ۱۱۱۵ء	
۷	علی بن یحییٰ	۵۰۹ھ تا ۵۱۵ھ	۱۱۱۵ء تا ۱۱۲۱ء	
۸	حسن بن علی	۵۱۵ھ تا ۵۴۷ھ	۱۱۲۱ء تا ۱۱۴۲ء	آخری حکمران

◆◆◆

دولتِ بنی حماد۔ الجزائر: ۳۹۸ھ تا ۵۴۷ھ (۱۰۰۷ء تا ۱۱۵۲ء)

❶ حماد بن بُلُگّین: یہ حکومت آلِ زیری ہی کی ایک شاخ تھی جسے حماد بن بُلُگّین نے ۳۹۸ھ میں المغرب الاوسط (الجزائر) میں تشکیل دیا تھا۔ پھر یہ حکومت مراکش کے علاقے ''فاس'' پر بھی قابض ہوگئی۔

[1] تاریخ ابن خلدون: ۶/۲۰۵ تا ۲۱۴؛ موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲۳۵؛ الموسوعۃ الموجزۃ فی التاریخ الاسلامی: ۱۴/۸۶ تا ۹۰

❷ القائد بن حماد: اس حکومت کے دوسرے سربراہ القائد بن حماد نے جو دولتِ زیریہ کے سربراہ مُعز بن بادلیس کا معاصر تھا، ۲۷ سال طویل مدت تک حکومت کی اور ۴۴۷ھ میں فوت ہوا۔

❸ محسن بن قائد: اس کا بیٹا محسن اس کا جانشین ہوا مگر وہ نااہل اور ظالم شخص تھا۔ وہ فقط نو ماہ تک تخت نشین رہا اور اپنے ہی خاندان کی بغاوت کا شکار ہو کر قتل ہو گیا۔

❹ بُلُکّین محمد بن حماد: اس کی جگہ اس کا چچازاد بُلُکّین محمد بن حماد برسرِ اقتدار آیا۔ وہ بھی سخت گیر اور سفاک حاکم تھا۔ اس کے دور میں مراکش پر مرابطین کا قبضہ ہو گیا تھا اور ان کے امیر یوسف بن تاشفین کا ستارۂ اقبال بلندی پر تھا۔ تاہم بُلُکّین نے ۴۵۴ھ میں مرابطین کو اپنی سرحدوں سے صحراء کی طرف پسپائی پر مجبور کر دیا اور پیش قدمی کرتا ہوا ''فاس'' تک پہنچ گیا۔ اسی مہم سے واپسی پر بُلُکّین اپنے چچازاد الناصر کی سازش کا نشانہ بن کر ان افسرانِ فوج کے ہاتھوں قتل ہو گیا جو اس کی سخت گیری سے نالاں تھے۔

❺ الناصر: ۴۵۴ھ میں الناصر نے اقتدار سنبھالا۔ اس نے طویل مدت تک حکومت کی۔ اس کا عہد بنوحماد کا دورِ عروج تھا جس میں بڑی بڑی عالی شان عمارتیں بنائی گئیں اور شہروں کی توسیع و تعمیرِ نو کا کام بڑے اہتمام سے ہوا۔

❻ المنصور بن الناصر: ۴۸۱ھ میں الناصر کے بعد اس کا بیٹا المنصور مسند نشین ہوا۔ اس نے ۴۸۳ھ میں ''بجایہ'' کو اپنا پایۂ تخت بنا لیا۔ وہاں تعمیراتی اور ترقیاتی کام ہوئے۔ محلات، قلعے اور مینار تعمیر کیے گئے اور باغ لگائے گئے۔ اس کے دور میں مرابطین عروج پر تھے۔ بنوحماد سے ان کے کئی معرکے ہوئے۔ تاہم المنصور نے اپنا کامیاب دفاع کیا۔

❼ بادیس بن المنصور: ۴۹۸ھ میں المنصور کی وفات ہو گئی۔ اس کا بیٹا بادیس اس کا جانشین ہوا مگر وہ ایک سال پورا کرنے سے قبل فوت ہو گیا۔

❽ عبدالعزیز بن المنصور: اس کی جگہ اس کے بھائی عبدالعزیز نے سنبھالی۔ اس نے طویل مدت تک حکومت کی۔ اس کا زمانہ امن اور استحکام کا تھا۔

❾ یحیٰی بن عبدالعزیز: ۵۱۵ھ میں عبدالعزیز کی وفات کے بعد اس کا نالائق بیٹا یحیٰی تخت نشین ہوا۔ جو عورتوں اور سیر و شکار میں منہمک رہتا تھا۔ اس کی حکومت کمزور ہونے کے باوجود طویل زمانے تک رہی۔ اس دور میں بنوعبید بہت کمزور ہو چکے تھے، موقع سے فائدہ اٹھا کر یحیٰی نے پہلی بار دولتِ بنی حماد میں بنوعبید کے سکے کی جگہ اپنا ریاستی سکہ جاری کیا جس پر عباسی خلیفہ کا نام بھی کندہ تھا۔

یحیٰی کے دور میں رومیوں نے بنوزیری کے پایۂ تخت مہدیہ پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے آخری حکمران حسن بن علی نے یحیٰی کے پاس آ کر بجایہ میں پناہ لی۔ مگر بجایہ بھی زیادہ دنوں تک محفوظ نہ رہا؛ کیوں کہ شمالی افریقہ میں مؤحدین زور پکڑ چکے تھے۔ ان کی یلغار کے آگے یحیٰی کو بھی پسپا ہونا پڑا اور بجایہ پر مؤحدین کا قبضہ ہو گیا۔ یحیٰی کچھ مدت تک اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر ۵۴۷ھ میں اس نے عبدالمؤمن کی بیعت کر لی۔ ۵۵۸ھ میں اس کی وفات ہو گئی اور یوں دولت

بنی حماد کا آخری وارث بھی پیوندِ خاک ہو گیا۔

دولتِ بنی حماد کے حکمران یہ تھے:

۱	حماد بن بُلُکّین	۳۹۸ھ تا ۴۱۹ھ	۱۰۰۷ء تا ۱۰۲۸ء	بانی حکومت
۲	القائد بن حماد	۴۱۹ھ تا ۴۴۷ھ	۱۰۲۸ء تا ۱۰۵۵ء	
۳	محسن بن قائد	۴۴۷ھ (نو ماہ)	۱۰۵۵ء	
۴	بلکّین محمد بن حماد	۴۴۷ھ تا ۴۵۴ھ	۱۰۵۵ء تا ۱۰۶۲ء	
۵	الناصر بن علناس	۴۵۴ھ تا ۴۸۱ھ	۱۰۶۲ء تا ۱۰۸۸ء	
۶	المنصور بن الناصر	۴۸۱ھ تا ۴۹۸ھ	۱۰۸۸ء تا ۱۱۰۴ء	
۷	بادیس بن المنصور	۴۹۸ھ، ایک سال سے کم	۱۱۰۴ء	
۸	عبدالعزیز بن المنصور	۴۹۸ھ تا ۵۱۵ھ	۱۱۰۴ء تا ۱۱۲۱ء	
۹	یحییٰ بن عبدالعزیز	۵۱۵ھ تا ۵۴۷ھ	۱۱۲۱ء تا ۱۱۵۲ء	آخری حکمران

بنو حماد نے ۱۴۹ سال تک حکومت کی۔ ①

بنو حماد اور بنو زیری کا دور شمالی افریقہ کی مسلم ریاستوں میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ دور امن اور خوشحالی کا تھا۔ تیونس سے الجزائر تک زراعت عروج پر تھی جس پر اکثر افریقی قبائل کی معاش کا انحصار تھا۔ کپاس، گنے، زیتون، جو، کھجور، انگور اور کیلے کی پیداوار بکثرت تھی۔ کپڑا فروشوں، قصابوں اور شیشہ گروں کے الگ الگ بازار لگتے تھے۔ کپڑے کی بُنائی، مٹی کے برتنوں کی صناعی، چمڑا سازی اور مرغ بانی کے پیشے عام تھے۔ گندم اور روغنِ زیتون سمیت یہاں کی مختلف اجناس ساحلوں کے راستے مشرقی اور مغربی ممالک میں پہنچتی تھیں۔ ②

❖❖❖

دولت آلِ خزرون (بنی زناتہ) لیبیا، ۳۹۰ھ تا ۵۴۰ھ (۹۹۹ء، ۱۱۴۵ء):

آلِ زیری کی طرف سے طرابلس الغرب (لیبیا) کے گورنر فلول بن سعید بن خزرون الزناتی نے بنو عبید اور آلِ زیری کے درمیان کش مکش سے فائدہ اٹھایا اور ۳۹۰ھ میں اپنے علاقے پر خود مختار حکومت قائم کر لی۔ مگر یہ حکومت زیادہ مستحکم اور پائیدار نہ ہو سکی۔ بنو عبید اور بنو زیری سے اس کی کھینچا تانی چلتی رہی۔ آخر میں بنو مطروح نامی ایک خاندان نے آلِ خزرون کو بے دخل کر دیا اور خود حکومت سنبھال لی۔ تاہم ۵۴۱ھ میں فرنگیوں نے انہیں شکست دے کر یہاں تسلط حاصل کر لیا۔ ۵۵۵ھ میں موحدین نے فرنگیوں کو بھگا کر اس علاقے کو اپنی عمل داری میں شامل کر لیا۔ ③

---

① تاریخ ابن خلدون: ۲۲۸/۶ تا ۲۳۵؛ موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲۴۱، ۲۴۲

② الموسوعۃ الموجزۃ فی التاریخ الاسلامی: ۹۲/۱۴ ③ موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲۳۵

یمن کی حکومتیں

دولتِ یعفریہ (صنعاء،یمن): ۲۲۵ھ تا ۳۹۳ھ (۸۳۹ء تا ۱۰۰۲ء)

ابراہیم بن یعفر حمیری نے جو عباسی حکومت کی جانب سے یمن کا والی تھا، خود مختاری اختیار کر لی۔ اس نے ۲۲۵ھ (۸۳۹ء) سے ۲۴۷ھ (۸۶۱ء) تک یہاں حکومت کی۔ اس کے پوتے یعفر بن عبدالرحیم بن ابراہیم نے ۲۴۷ھ (۸۶۱ء) سے ۲۶۹ھ (۸۷۲ء) تک حکومت کی اور اس ریاست کو حقیقی معنوں میں خود مختار اور مستحکم بنایا۔

اس حکومت کی ایک طرف زیدی اماموں اور دوسری طرف قرامطہ سے جنگیں ہوتی رہیں۔ قرامطہ کی سرکوبی میں اس نے بڑا کردار ادا کیا۔ آخر ۳۹۳ھ (۱۰۰۲ء) میں یہ حکومت امام عیانی الزیدی کی تابع ہو کر ختم ہو گئی۔ ①

◆◆◆

دولتِ زیادیہ (زبید۔یمن): ۲۰۳ھ تا ۴۱۲ھ (۸۱۸ء تا ۱۰۲۱ء)

مامون الرشید نے محمد بن عبداللہ بن زیاد نامی ایک افسر کو (جو زیاد بن ابی سفیان کی اولاد میں سے تھا) یمن بھیجا تاکہ وہ "تہامیہ" میں علویوں کی بغاوتوں پر قابو پائے، مگر یہاں آ کر اس نے ایک مستقل ریاست قائم کر لی اور زبید نامی شہر تعمیر کر کے اسے اپنا پایۂ تخت بنا لیا۔ ۲۰۳ھ سے ۲۴۵ھ تک اس نے حکومت کی۔ اس کی اولاد میں کچھ مدت تک یہ حکومت چلی اور پھر افتراق کا شکار ہو کر ختم ہو گئی۔ ②

◆◆◆

دولتِ نجاحیہ (زبید۔یمن): ۴۰۳ھ تا ۵۵۴ھ (۱۰۱۲ء تا ۱۱۵۹ء)

دولتِ زیادیہ کے ایک آزاد کردہ حبشی غلام نجاح نے ۴۰۳ھ میں زبید پر حکومت قائم کر لی۔ اپنی وفات تک وہ یہاں حکومت کرتا رہا۔ اس کے بعد بنو صلیح نے یہاں قبضہ کر لیا۔ تاہم کچھ مدت بعد نجاح کے ورثاء نے بنو صلیح سے اپنا علاقہ واگزار کرا لیا۔ دونوں خاندانوں میں ایک مدت تک کش مکش جاری رہی، آخر سعید بن نجاح نے یہاں مستحکم حکومت قائم کر لی۔

سعید بن نجاح کے بعد دولتِ نجاحیہ کمزور پڑ گئی اور یہاں حبشیوں نے قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ بنو نجاح کے منصور بن فاتک نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر آخر کار قتل ہو گیا۔ انجام کار یہاں بنو عبید کے ایک حمایتی ٹولے نے تسلط حاصل کر لیا مگر ۵۵۴ھ میں خوارج کے ایک قبیلے بنو مہدی نے انہیں مار بھگایا۔ ۵۶۹ھ میں یہ علاقہ سلطان صلاح الدین ایوبی کی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ ③

◆◆◆

① موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲۱۹ ② موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲۱۹ ③ موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲۲۵

دولتِ صلیحیہ (یمن): ۴۲۹ھ تا ۵۶۹ھ (۱۰۳۷ء تا ۱۱۷۳ء)

علی بن محمد صلیحی نامی ایک باطنی اسماعیلی داعی نے یمن میں بنوعبید کی دعوت کو عام کیا اور انہی کی مدد سے پانچویں صدی ہجری میں پورے یمن پر قبضہ کر کے صنعاء کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ اس کے حریف قبیلے بنونجاح نے اسے قتل کر دیا مگر اس کا بیٹا مکرم بنوعبید کے تعاون سے اپنا تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ مکرم کے بعد یہ حکومت کمزور ہوتی چلی گئی۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے جب مصر سے اسماعیلی حکومت ختم کر دی تو اس کے بعد اس کے باج گزاروں کو بھی زیر تگین کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ صلاح الدین ایوبی کی اجازت سے اس کے بھائی توران شاہ نے ۵۶۹ھ میں یمن پر فوج کشی کر کے اس حکومت کا خاتمہ کر دیا۔[1]

اس حکومت کے اہم حکمران درجِ ذیل تھے:

۱	علی بن محمد صلیحی	۴۲۹ھ تا ۴۵۹ھ	۱۰۳۷ء تا ۱۰۶۶ء
۲	مکرم بن علی	۴۵۹ھ تا ۴۸۴ھ	۱۰۶۶ء تا ۱۰۹۱ء
۳	اروی بنت احمد صلیحی زوجہ مکرم بن علی	۴۹۲ھ تا ۵۳۲ھ	۱۰۹۸ء تا ۱۰۳۷ء

✦✦✦

دولت بنوزریع (عدن، یمن): ۴۷۶ھ تا ۵۶۹ھ (۱۰۸۳ء تا ۱۱۷۳ء)

مکرم صلیحی نے جب عدن اور اس کے مضافات پر قبضہ کیا تو بنوزریع کے دو اشخاص: عباس اور مسعود کو جو اس کے ہم مذہب تھے، اس علاقے کا والی بنا دیا۔ یہ دونوں بنوصلیح کو سالانہ خراج دیتے رہے۔ اسی طرح ان کی اولاد بھی یہاں دولتِ صلیحیہ کی باج گزار بن کر حکومت کرتی رہی۔ تاہم بعد میں یہ حکومت خود مختار ہوگئی اور دولتِ صلیحیہ کے بعد یمن کی سب سے مضبوط حکومت شمار ہونے لگی۔ یہاں حکمرانوں کا عزل و نصب بنوعبید کیا کرتے تھے۔ صلاح الدین ایوبی کے بھائی توران شاہ نے ۵۶۹ھ میں اس حکومت کا خاتمہ کر دیا۔[2]

✦✦✦

---

① موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲۴۷
اس دور کے ایک عالم شیخ محمد بن مالک یمانی (۴۷۰ھ) باطنیوں کے حقیقی عقائد و نظریات معلوم کرنے کے لیے بنوصلیح کے حلقے میں شامل ہو گئے تھے۔ انہوں نے رفتہ رفتہ ان کے سارے حالات معلوم کر لیے اور پھر "کشف اسرار الباطنیہ" جیسی لاجواب کتاب لکھی جس میں باطنیوں کا سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا گیا ہے اور علی بن محمد صلیحی کی کارستانیاں بھی مختصراً نقل کی گئی ہیں۔ (ملاحظہ ہو: کشف اسرار الباطنیہ، ص ۲۲؛ ص ۲۷ تا ۵۷۔ ط مکتبۃ الساعی ریاض)

② موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲۴۹

دولتِ ہمدانیہ (صنعاء): ۴۹۲ھ تا ۵۹۶ھ (۱۰۹۹ء تا ۱۱۷۴ء)

حاتم بن غشم ہمدانی نے صنعاء کو بنوصلیح سے چھین کر یہاں اپنی حکومت قائم کر لی تھی اور بنوعبید سے وابستگی اختیار کر لی تھی۔ ہمدانی کی اولاد ایک صدی تک یہاں حکومت کرتی رہی۔ آخر صلاح الدین ایوبی کے جانشینوں نے ۵۹۶ھ میں اسے ''دولتِ ایوبیہ'' میں ضم کر لیا۔ ①

◆◆◆

دولتِ زیدیہ۔ آل الرسی (صنعاء۔ یمن): ۲۸۰ھ تا ۱۳۸۳ھ (۸۹۳ء تا ۱۹۶۲ء)

حسین بن قاسم الرسی (آلِ حسن بن علی) نے ۲۸۰ھ میں یمن کو اپنا ٹھکانہ بنایا اور اپنی بیعت کے لیے دعوت دی۔ پھر اس کے بیٹے یحییٰ بن حسین نے یہ مسند سنبھالی اور ''ہادی'' کے لقب کے ساتھ لوگوں سے بیعت لینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ آخر ''صعدہ'' کو مرکز بنا کر ۲۸۴ھ میں باقاعدہ بیعتِ امامت لی اور اپنی حکومت کا آغاز کر دیا۔ وہ ایک سخی اور عادل حکمران ثابت ہوا۔ اس نے صنعاء پر بھی قبضہ کر لیا اور ایک وسیع رقبے پر اپنا سکہ چلایا۔

یحییٰ بن حسین کی اولاد میں یہ حکومت طویل زمانے تک چلتی رہی۔ یمن میں قائم ہونے والی دوسری حکومتوں سے اس کی اکھاڑ پچھاڑ بھی جاری رہی۔ اس حکومت کو زوال بھی آیا اور ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) میں یہ ''صعدہ'' کے محدود رقبے میں منحصر رہ گئی، اس کے باوجود یہ اسلامی تاریخ کی سب سے طویل حکومت تھی جو ۱۰۹۸ برس تک قائم رہی۔ اس حکومت کے اہم حکمران درج ذیل ہیں:

۱	الہادی، یحییٰ بن حسن	۲۸۴ھ تا ۲۹۸ھ	۸۹۸ء تا ۹۱۱ء
۲	المتوکل، احمد بن سلیمان	۵۳۲ھ تا ۵۶۷ھ	۱۱۳۷ء تا ۱۱۷۱ء
۳	المہدی، محمد بن المطہر	۶۹۷ھ تا ۷۲۸ھ	۱۲۹۸ء تا ۱۳۲۷ء
۴	شرف الدین بن المہدی	۹۱۲ھ تا ۹۶۵ھ	۱۵۰۷ء تا ۱۵۵۸ء
۵	یحییٰ بن محمد بن حمید الدین	۱۳۲۲ھ تا ۱۳۶۷ھ	۱۹۰۹ء تا ۱۹۴۸ء
۶	البدر بن احمد	۱۳۸۲ھ	۱۹۶۲ء

البدر کے دور میں یمن میں انقلاب آیا اور یہ حکومت ختم ہو گئی۔ ②

نوٹ: مذکورہ حکومتوں کے علاوہ غزنوی، غوری، خوارزمی، اتابکی، ایوبی اور ممالیک کی حکومتوں کا تعلق بھی خلافتِ عباسیہ بغداد کے دور سے ہے مگر ہم ان کو تاریخ اُمت مسلمہ کے حصہ چہارم میں تفصیل سے بیان کریں گے؛ کیوں کہ ان کی اہمیت تاریخ عالم پر اثر انداز ہونے کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔ یہاں ہم نے قارئین کو بنیادی معلومات فراہم کرنے کے لیے بعض حکومتوں کا مختصراً تذکرہ کر دیا ہے۔

① موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲٤۹ ② موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲۲٤

پانچواں باب

عباسی خلافت کے متوازی گمراہ فرقوں کی حکومتیں

خلافت کے متوازی گمراہ فرقوں کی تحریکوں کا پسِ منظر

بنوعباس کی معاصر حکومتوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ ان کی ہم عصر کچھ پُرفتن تحریکوں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے جو بغداد کی حدود سے باہر پلی بڑھیں اور ان کے عالمِ اسلام اور ہماری تاریخ پر گہرے اثرات رہے۔ اس ضمن میں درج ذیل اہم موضوعات ہمارے سامنے ہیں:

① فرقہ اسماعیلیہ

② قرامطہ

③ دولتِ بنوعبید

④ باطنیہ دولتِ باطنیہ اَلَمُوت

⑤ یونانی فلسفے کا دوبارہ حملہ اور باطنیت کا فتنہ

⑥ فلسفیانہ فتنوں کے مقابلے میں اس دور کے علماء کا کردار

اب ہم ان موضوعات کا الگ الگ جائزہ لیتے ہیں۔ یہ ذہن میں رہے کہ ان موضوعات کی کڑیاں تیسری صدی ہجری سے چھٹی صدی ہجری تک پھیلی ہوئی ہیں۔

◆◆◆

خلافتِ بغداد کے دورِ زوال میں گمراہ فرقوں نے بڑی تیزی سے اپنے داعی عالمِ اسلام میں پھیلائے اور اپنی اپنی حکومتیں قائم کرنے کی سرتوڑ کوشش کی۔ ان تمام فرقوں نے تشیع میں انتہا پسندی سے جنم لیا تھا۔ ان نئے فرقوں کے بعض اصولِ موضوعہ وہی تھے جو عبداللہ بن سبا نے پیش کیے تھے مگر ساتھ ہی مزدک، زرتشت اور فلاسفہ کی تعلیمات کو بھی ملا لیا گیا تھا۔ ان بناوٹی مذاہب میں عقلی اصول سازی کی کھلی چھوٹ تھی؛ اس لیے ہر بانیِ تحریک سیاسی اغراض کے لیے اپنے طور پر من مانے اجتہادات کرتا رہا۔

اس ''نئے اسلام'' کو لانے کے لیے سب سے پہلے سیاسی وعسکری طاقت کی ضرورت تھی جس کے لیے عوام کو اپنے گرد جمع کرنا پہلا مرحلہ تھا۔ عوامی مقبولیت میں اعلیٰ نسبی کا دخل ہمیشہ ہر معاشرے میں رہا ہے۔ اسلامی معاشرے میں آلِ ہاشم سے بڑھ کر نجابت کوئی نہیں ہوسکتی تھی؛ اس لیے ہاشمی، علوی اور فاطمی ہونے کا دعویٰ کسی بھی طالع آزما کے لیے پُرکشش اور نہایت مفید تھا۔ غیر سادات کو اس مقصد کے لیے سادات سے نسلی تعلق کا ڈھونگ رچانا ضروری تھا۔ یہ

جسارت پرلے درجے کے بے ضمیر اور انتہائی عیار افراد ہی کر سکتے تھے۔

ان پہلوؤں کو سامنے رکھنے کے بعد تیسری صدی ہجری میں خلافتِ عباسیہ کے زوال پذیر ہونے کے بعد عالم اسلام کا جائزہ لیا جائے تو یہ عجیب منظر دکھائی دے گا کہ یکے بعد دیگرے کئی غیر معروف لوگ سادات ہونے کا دعویٰ کر کے سامنے آئے، شیعوں اور سادہ لوح عوام کو ساتھ ملایا اور قتل وغارت کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ ان میں سے کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس نے اپنی جائے پیدائش میں کوئی نیک شہرت پا کر وہیں سے تحریک کا آغاز کیا ہو اور اپنے ہم قبیلہ لوگوں کے درمیان پہلے سے مشہور ومعروف ہو۔ یہی ایک نکتہ ان لوگوں کو مشکوک بنانے کے لیے کافی ہے۔

روحانیت کے نام پر فریب دینے اور راتوں رات غیر معمولی شہرت پانے والے شعبدہ بازوں کو آج بھی دیکھیں تو ان میں یہ بات مشترک دکھائی دے گی کہ وہ اچانک کسی جگہ اونچی اونچی نسبتوں اور عجیب وغریب دعوؤں کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں اور یکدم مشہور ہو جاتے ہیں۔ اگر تحقیق کی جائے کہ وہ کس گاؤں یا کس محلے کے ہیں، ان کے والدین کہاں کے ہیں، ان کے پڑوسیوں کی ان کے بارے میں کیا رائے ہے؟ تو عموماً ان سوالات کے جوابات کبھی نہیں مل پاتے۔ سادہ لوح عوام ان کے دعوؤں پر ''ایمان بالغیب'' لے آتے ہیں جبکہ سمجھ دار لوگ ان سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر کبھی کوئی محقق ایسے مدعیوں کا حسب نسب معلوم کرنے نکلتا ہے تو کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوا واپس آتا ہے۔

تیسری صدی ہجری کے جعلی طالع آزما بھی جانتے تھے کہ جب بھی کوئی شخص خود کو حسنی، حسینی، علوی یا فاطمی کہہ کر کھڑا ہوتا ہے تو عوام کا جم غفیر اندھی عقیدت میں مبتلا ہو کر اس کے پیچھے چل دیتا ہے۔ خاص کر جب کوئی خود کو مہدی کہہ دے تو سادہ دل مسلمان اس کی حکومت قائم کرنے کے لیے جان لڑا دیتے ہیں۔ ان عیار ومکار لوگوں کے پاس حسب و نسب، مال ودولت، عزت وشہرت یا علوم وفنون کی کوئی قابلیت نہیں تھی جس کے ذریعے وہ کوچۂ اقتدار میں قدم رکھ سکتے؛ اس لیے انہوں نے ایوانِ اقتدار کا مختصر زینہ اسی کو سمجھا کہ فاطمی اور حسنی وحسینی بن جائیں اور اگر موقع ملے تو مہدی ہونے کا دعویٰ بھی کر دیں۔

یہاں ایک اہم چیز قابل غور ہے وہ یہ کہ اموی اور عباسی دور میں خروج کرنے والے صحیح النسب علوی حضرات میں سے سوائے ادریس بن عبداللہ یا حسن بن زید کے کوئی اور حکومت بنانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ اکثر خروج ناکام ہی رہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان حضرات کے عقائد ونظریات وہی تھے جو جمہور مسلمین کے تھے۔ وہ جھوٹی کرامات دکھانے اور پیش گوئیاں کرنے کے عادی تھے نہ پرفریب داؤ پیچ آزما کر عوام کو اُلّو بنانے کے قائل تھے؛ اس لیے عوام کو ان میں کوئی ایسا نیا پن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ان کی دعوت میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو لوگوں کو انتہا پسندانہ انداز میں جمہور مسلمین کی حکومتوں کے خلاف برانگیختہ کر دیتی۔

ان کے برخلاف جب تیسری صدی ہجری میں کچھ نام نہاد علوی نئے عقائد ونظریات کے ساتھ کھڑے ہوئے تو بلاشبہ ان کی دعوت اس اسلام کی بالکل نفی کر رہی تھی جو صحابہ اور اسلاف سے منقول اور تین صدیوں سے تین براعظموں

میں رائج تھا۔ اس نئی دعوت میں نفس کی آزادی بھی تھی اور حکومت میں شمولیت کا لالچ بھی۔ نت نئی شعبدہ بازیوں کا تڑکا بھی تھا اور قہر واشتعال کی آگ بھی۔ پس ان تحریکوں کے کارکن مسلمانوں کے خلاف اسی جوش وخروش سے کھڑے ہوئے جیسے ایک دین کے پیروکار کسی دوسرے دین والوں سے لڑتے ہیں۔ جمہور مسلمین کو ناک رگڑوانے کا یہی وہ ولولہ تھا جس کی بناء پر صاحب الزنج، قرامطہ اور بنوعبید جیسے نام نہاد علویوں کی تحریکیں وسیع وعریض علاقوں میں پھیل گئیں۔

ان سب نے ''حبِ آلِ محمد'' کا نعرہ لگا کر چھوٹی بڑی حکومتیں بنائیں۔ یہ سب بدعقیدہ تھے اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ خود کو غلط طور پر علوی یا فاطمی کہتے رہے۔ ان کا نسب ساداتِ کرام کے ساتھ ثابت نہیں کیا جا سکتا اور ان کے عقائد اور اعمال دیکھ کر کوئی مسلمان یہ باور نہیں کر سکتا کہ بنوہاشم اور خانوادۂ رسالت مآب ﷺ کا خون ایسا ہو سکتا ہے بلکہ ان کے حالات پڑھ کر ہر غیر جانب دار شخص یہی کہے گا کہ یہ عیار اور موقع پرست لوگ تھے جو باطل اہداف کی تکمیل کے لیے میدان میں آئے تھے۔

نسب کے دعوے کے ذریعے لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے بعد ان مدعیان کے پاس سب سے کارگر ہتھیار وہ عقائد تھے جو درحقیقت ان مذموم تحریکوں کو تحفظ دینے کے لیے وضع کیے گئے تھے۔

ان میں سے پہلا عقیدہ امامت کا تھا جو اگرچہ سادہ شکل میں عبداللہ بن سبا کے دور سے چلا آرہا تھا مگر اب اسے مزید تفصیلات کے ساتھ پیش کیا گیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا:

> ''امامت ایک مخصوص منصب ہے جو توحید ورسالت کی طرح دین کا بنیادی ستون ہے۔ سب سے پہلے یہ منصب امام حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملا جو نص قطعی کی بناء پر امام ہیں۔ امامت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد ہی کے لیے مخصوص ہے۔ امام معصوم ہوتا ہے، اس کی تابعداری اسی طرح فرض ہے جیسے نبی کی۔ امام اور پیغمبر میں مرتبۂ رسالت کے سوا کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ہر امام کے بعد نیا امام لازمی طور پر گزشتہ امام کے صریح حکم کے ساتھ ہی متعین ہوگا۔''[1]

امامت کا ہر مدعی کبھی اپنی زبان سے اور کبھی اپنے شاگردوں کی زبانی عوام پر یہ ظاہر کرتا تھا کہ امامت کا منصب اسی کے گھرانے میں چلا آرہا ہے اور گزشتہ امام نے اس کے حق میں امامت کی وصیت کردی تھی؛ لہٰذا پوری دنیا میں اس وقت صرف یہی ایک واحد شخصیت ہے جس کی اطاعت فرض ہے۔ یہ کیسی کمال کی فنکاری تھی کہ صرف جھوٹا نسب بنا کر اور امامت کا دعویٰ کر کے کوئی بھی انسان خود کو پیغمبروں کے ہم پلہ یعنی ان کی طرح معصوم اور ''مفترض الطاعۃ'' ظاہر کر سکتا تھا۔ آخرت میں انجام جو ہوسو ہو مگر دنیا میں پھر اسے کسی بڑے سے بڑے بادشاہ اور خلیفہ کی ماتحتی کی بھی ضرورت نہیں رہتی تھی۔

یہ عقیدہ گھناؤنی سیاست کے ایک داؤ کے طور پر کتنی بار استعمال کیا گیا؟ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ان صدیوں کی

[1] الملل والنحل للشهرستاني: ص ۱ ص ۱٤٦، ط حلبي

تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو پتا چلے گا کہ اس ڈھونگ کے ذریعے بیک وقت کئی کئی مدعیانِ امامت ایک ہی وقت میں موجود تھے اور ہر ایک کے مرید بضد تھے کہ سابق امام نے ہمارے امام کے حق میں وصیت کی تھی۔ایسا ہر امام دنیائے اسلام کا واحد حکمران بننے کی جدوجہد کر رہا تھا اور اس کارستانی سے عالم اسلام میں فساد کی آگ لگا رہا تھا۔یہ ثمرات تھے ان عجیب وغریب ادیان کے جو تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں وجود میں آئے۔نئے نئے اماموں اور مختلف علاقوں کے جعلی مجتہدین کے ہاتھوں اس کی شکلیں موقع بموقع تبدیل بھی ہوتی رہیں اور ان چند عقائد کے ساتھ الحاقی عقائد و عبادات کے اضافوں سے یہ دین جگہ جگہ مختلف صورتوں میں ابھرتا اور تقسیم در تقسیم کا شکار ہوتا رہا۔ان گمراہ فرقوں کا شمار سو سے بھی متجاوز ہے جن میں سے ہر ایک کے ائمہ کا شجرہ نسب الگ ہے۔

چونکہ ہمارا موضوع تاریخ ہے؛ اس لیے ہم ان بیسیوں فرقوں کو چھوڑ کر انہی چند فرقوں یا مدعیانِ امامت پیشواؤں کا ذکر کر رہے ہیں جو بنو عباس کے دورِ زوال میں طاقتور حکومتیں بنا کر مسلم معاشرے پر سیاسی، اعتقادی یا امنِ عامہ کے حوالے سے ہمہ گیر طور پر اثر انداز رہے۔

♦♦♦

فرقہ اسماعیلیہ

ہم گزشتہ اوراق میں بنو بُویہ اور اثنا عشریت کے ضمن میں پڑھ چکے ہیں کہ رافضیوں کے اثنا عشری فرقے کا دعویٰ یہ چلا آرہا تھا کہ حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ نے اپنے بیٹے موسیٰ کاظم کو امام بنایا تھا اور پھر امامت انہی کی اولاد میں چلتے ہوئے بارہویں امام محمد مہدی امام منتظر تک پہنچی۔

مگر اسی دوران ایک اور فرقہ یہ پرچار کر رہا تھا کہ جعفر صادق کی امامت ان کے بڑے بیٹے اسماعیل کو منتقل ہوئی ہے۔ یہ فرقہ اسماعیلیہ کہلایا۔ اس کا بانی کوئی نامعلوم پراسرار شخص تھا جس کے داعی اندر ہی اندر کام کر رہے تھے۔

چونکہ حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کی حقیقی اولاد (چاہے وہ موسیٰ کاظم کی نسل سے ہو یا اسماعیل کی) اس قسم کی تحریکوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی؛ اس لیے ہر فرقے نے ان حضرات کی لاتعلقی سے پیدا ہونے والے شکوک دور کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ پیدا کیا اور اسے عقیدے کا نام دے دیا۔ اثنا عشریہ نے حضرت موسیٰ کاظم کی اولاد کی طرف سے امامت کا دعویٰ نہ کرنے اور ان کی خلفائے بنو عباس سے وفاداری کو "تقیہ" کا نام دے دیا۔

اسماعیلیہ نے اس سے بھی زیادہ عجیب چال چلی اور اپنے ائمہ کو "ائمہ مستورین" کا نام دیا۔ اسماعیلی داعیوں کا کہنا تھا کہ ائمہ کرام صرف ہمارے واسطے سے لوگوں سے رابطہ کرتے ہیں اور خود "مستور" رہتے ہیں۔

اگر ان ائمہ مستورین کے ناموں کی جستجو کی جائے تو پتا چلے گا کہ تاریخی لحاظ سے خود اسماعیل بن جعفر صادق کی نسل کا آگے چلنا ہی ثابت نہیں۔ ان میں سے کوئی ایسی معروف شخصیت نہیں جس کا تاریخ میں ذکر ہو۔ بلکہ ان ائمہ مستورین کے ناموں پر خود اسماعیلی داعی بھی متفق نہیں رہے۔ ہر ایک اپنی اپنی ہانکتا رہا۔ ان کے دعووں کی حقیقت اسی ایک نکتے پر غور کرنے سے کھل جاتی ہے۔

۱۴۸ھ میں حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کی وفات سے لے کر ایک صدی تک اسماعیلی فرقے کا کوئی اتا پتا نہیں ملتا۔ تاہم اس کے بعد جونہی خلافتِ عباسیہ کمزور پڑی، فارس، یمن اور بعض دیگر مقامات پر اسماعیلی عقائد کے حامل کچھ لوگ ظاہر ہوئے۔ ان میں تین افراد سب سے زیادہ مشہور ہوئے:

ایک "فرج بن عثمان کاشانی" تھا جس کا اصل نام "زِکرَوَیہ" تھا (نام سے ظاہر ہے کہ وہ مجوسی النسل تھا)۔ وہ عراق میں امام مستور کی طرف دعوت دیتا تھا۔

دوسرا "حمدان قرمط بن اشعث" تھا جو کوفہ کے گردونواح میں اسی قسم کی دعوت عام کر رہا تھا۔

تیسرا "عبیداللہ بن میمون" (۲۵۹ھ۔۳۲۲ھ) تھا جو افریقہ میں دولتِ فاطمیہ عبیدیہ کا مؤسس بنا۔

اسماعیلیہ کے عقائد کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱ امام کی موجودگی ہر زمانے میں ضروری ہے اور وہ حضرت جعفر صادق کے بیٹے اسماعیل کی اولاد سے ہوگا۔

۲ اپنے دور کے امام (امام زمان) کی پہچان فرض ہے۔ جسے یہ پہچان نہ ہو وہ کافر مرے گا۔

۳ دنیا امام سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یا تو امام ظاہر ہوگا یا مستور۔

۴ امام کی صفات خدا کی صفات کے مشابہ ہوتی ہیں۔ وہ مشکل کشا، ہر حاضر اور غائب کو جاننے والا ہوتا ہے۔

۵ امام معصوم ہوتا ہے، وہ اگر گناہ بھی کرے تو اس کے معصوم ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ گناہ دراصل نیکی ہوتی ہے جس کی حقیقت عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔

۶ تقیہ کرنا چاہیے اور اپنے عقائد کو خفیہ رکھنا چاہیے۔ عام حالات میں مسلمانوں کے سامنے معتدل خیالات ظاہر کیے جائیں۔[1]

اسماعیلی فرقے کی حقیقت کو علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے اپنی شہرہ آفاق تاریخ "المنتظم" میں بہت وضاحت سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"بے دینی پھیلانے والے لوگ زرتشت اور مزدک کی تعلیمات کو اپنانا چاہتے تھے۔ اسلام کا غلبہ دیکھ کر ان بت پرستوں، مجوسیوں، ملحدوں اور فلسفیوں نے اپنی اپنی آراء پیش کیں۔ انہوں نے کہا: ہمارے مذاہب کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بڑھ کر کسی نے نہیں مٹایا، عربوں نے ان کے لیے جان اور مال کی بازی لگائی اور ہمارے ممالک چھین لیے۔ اب ایک طویل مدت گزر چکی ہے۔ مسلمان مال کمانے، عمارتیں بنانے اور کھیل کود جیسے مختلف مشاغل میں لگے ہیں۔ ان کے علماء ایک دوسرے کی تکفیر کر رہے ہیں۔ اب ہم ان کے دین کو مٹانے کی توقع کر سکتے ہیں۔ مگر ابھی ہم ان کی کثرت کے وجہ سے جنگ کے قابل نہیں۔ پس اس کا طریقہ یہی ہے کہ ان کو دین کی دعوت دی جائے اور انہی کے ایک فرقے کا نام استعمال کیا جائے۔ چونکہ ان میں رافضیوں سے بڑھ کر احمق فرقہ اور کوئی نہیں؛ لہٰذا ہم ان میں گھل مل کر انہیں سمجھائیں گے کہ تمہارے آباؤ اجداد پر ظلم کیا گیا، انہیں حقِ امامت نہیں دیا گیا۔ جب ان داعیوں نے یہ دعوت دی تو لوگ ان کی مدد کے لیے جمع ہو گئے۔ ان لوگوں نے خود کو جعفر صادق کے بیٹے اسماعیل کی طرف منسوب کر لیا۔"[2]

اسماعیلیوں کے آگے چل کر کئی فرقے بن گئے اور ہر فرقے کے عقائد ایک دوسرے سے بڑھ کر کفریہ تھے۔

اسماعیلیہ کے مشہور فرقوں کے نام یہ ہیں:

۱ قرامطہ ۲ فاطمیہ ۳ باطنیہ ۴ نزاریہ ۵ داؤدی بوہری ۶ سلیمانی بوہری ۷ آغاخانی

[1] الملل والنحل شہرستانی: ۱/۱۹۰ تا ۱۹۵ [2] المنتظم: ۱۲/۲۸۸

قرامطہ

قرامطہ کا بانی اسماعیلی داعی حمدان بن اشعث تھا۔ لوگ اسے ''قرمط'' کہتے تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ نام پڑنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ پستہ قد تھا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر چلتا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کی آنکھیں سرخ تھیں؛ اس لیے یہ نام پڑ گیا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ قرمط کا مطلب ''خفیہ داعی'' کے ہیں۔ بہرکیف یہ لفظ اس پر ایسا چسپاں ہوا کہ اس کا پورا گروہ ہی ''قرامطہ'' کہلانے لگا۔

یہ شخص ایرانی علاقے خوزستان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں سے کوفہ کے گرد و نواح میں آ کر ایک درویش کی صورت میں ظاہر ہوا اور زہد و عبادت کا ڈھونگ رچا کر بہت سے لوگوں کو مرید بنالیا۔ کچھ مدت بغداد میں بھی رہا۔ اس نے خفیہ طور پر مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ پھر کہا کہ عیسیٰ مسیح کی روح میرے اندر اتر آئی ہے۔ اسی طرح ترقی کرتے کرتے اس نے روح القدس اور جبرئیل ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا۔

عراق کا زندیق علی بن محمد (صاحب الزنج) اس کا معاصر تھا۔ دونوں میں ایک بار اپنے اپنے خود ساختہ مذاہب پر مناظرہ بھی ہوا۔ قرمط کا کہنا تھا کہ اگر میں ہار گیا تو ایک لاکھ مسلح افراد کے ساتھ بیعت کر لوں گا۔ مگر کوئی نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی قرمط نمازِ ظہر کے وقفے میں وہاں سے کھسک گیا۔ اس مناظرے کے کچھ عرصے بعد ۲۷۰ھ میں صاحب الزنج عباسی افواج کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ یوں قرمط کے لیے میدان خالی ہو گیا۔ قرمط مزید آٹھ سال تک اپنے باطل افکار پھیلاتا رہا۔ اس کی دعوت کا چرچا سب سے پہلے ۲۷۸ھ میں ہوا۔ وہ اپنے مریدوں کو پانچ نمازوں سے منع کر کے صرف دو نمازوں کا حکم دیتا تھا یعنی دو رکعت طلوعِ آفتاب اور دو رکعت غروبِ آفتاب کے وقت۔ [1] اس نے بیت اللہ کی جگہ بیت المقدس کو قبلہ بنایا۔ رمضان کے روزوں کی جگہ پورے سال میں صرف دو دن یعنی مجوسیوں کے تہواروں: نوروز اور مہرجان کو روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ شراب کو حلال اور نبیذ کو حرام کہا۔ غسلِ جنابت کی جگہ صرف وضو کو کافی بتایا۔ [2]

قرامطہ کے عقائد کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس دعوت کو خفیہ طور پر اسلام دشمن طاقتوں کے پراسرار کارندے عام کرتے رہے۔ جیسا کہ قرمط کے بعض داعیوں کے بارے میں ثابت ہے کہ وہ مجوسی النسل یا یہودی النسل تھے۔ یہ عقائد لے کر قرمط کے داعی عراق میں ہر طرف پھیل گئے۔ جاہل لوگ جو شرعی پابندیوں سے آزادی چاہتے تھے، قرمط کے گرد جمع ہوتے چلے گئے۔ صاحب الزنج کے باقی ماندہ بہت سے لوگ بھی اس کے حلقے میں آ گئے۔ [3]

قرمط کا خود کچھ پتا نہیں چلتا کہ اس کا انجام کیا ہوا۔ مگر یہ ثابت ہے کہ خلفائے بنو عباس اس کی سرکوبی کے لیے

---

① اسلام میں ان دونوں اوقات میں نماز ممنوع ہے۔ ② تاریخ الطبری: ۱۰/۲۵ تا ۲۷ ③ تاریخ الطبری: ۱۰/۲۵ تا ۲۷

فرمند رہے۔ مُعتَضِد عباسی نے اس کے عقائد سے آگاہ ہونے کے بعد اس کے پیروکاروں کی بڑے پیمانے پر دار و گیر شروع کردی تھی۔ مُعتَضِد نے ان کے بعض داعیوں کو گرفتار کر کے ان سے بحث بھی کی اور جب اندازہ ہو گیا کہ یہ لوگ نہایت سرکش ہیں تو سخت ترین سزائیں دے کر قتل کرا دیا۔ مُعتَضِد کی کارروائیوں سے قَرامِطہ کو خدشہ ہوا کہ ان کا بالکل صفایا ہو جائے گا۔ ① ان حالات میں قرمط کے شاگردوں نے عالم اسلام کے مختلف علاقوں میں اپنی پناہ گاہیں تلاش کیں اور ان کے کئی داعیوں نے الگ الگ حلقے بنا لیے۔

شام میں قَرامِطہ کا راج:

۲۸۹ھ میں ان کے ایک داعی ذکرویہ بن مہرویہ نے شام میں آباد بعض عرب قبائل سے رابطہ کر کے خود کو حضرت جعفر صادق کے بیٹے اسماعیل کا پڑپوتا قرار دیا۔ یہ عرب قبائل اس کے دھوکے میں آ گئے اور اسے اپنے ہاں پناہ دے دی اور اس کی تعلیمات قبول کر لیں۔ یوں شام میں بھی قَرامِطیوں کا زور ہو گیا۔ ②

ابوسعید جنابی، بحرین میں قَرامِطی حکومت کا بانی (۲۸۰ھ تا ۳۰۱ھ):

اس سے قبل ایک داعی جو خود کو یحییٰ بن مہدی کہلواتا تھا، ۲۸۰ھ میں بحرین پہنچ کر بہت سے لوگوں کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ انہیں امام مستور کے عن قریب ظہور کی خوشخبری دیتا رہا۔

اس کے مریدوں میں ایک شخص حسن بن بہرام تھا جس نے ۲۸۳ھ میں دعوتِ قَرامِطیہ کو عام کیا اور ہزاروں اعرابیوں کو ساتھ ملا لیا۔ وہ فارس اور بحرین کی سرحدی بستی جنابہ کا رہنے والا تھا اور ابوسعید جنابی کی کنیت سے مشہور تھا۔ قَرامِطہ کی ناپاک تحریک کو عام کرنے میں سب سے بڑا کردار اسی شخص کا تھا۔ اس نے بحرین کے شہروں: ہجر، حفیر یہ اور قطیف پر قبضہ کر کے ایک باقاعدہ مملکت قائم کر دی۔ اس کی طاقت اتنی بڑھ چکی تھی کہ وہ بار بار جزیرۃ العرب سے بصرہ اور بغداد کے ارد گرد حملے کرتا تھا۔ ایک بار اس نے خلیفہ کے لشکر کو بھی شکست دے کر بھگا دیا۔ ۳۰۱ھ میں ابوسعید جنابی اپنے ہی ایک خادم کے ہاتھوں حمام میں قتل ہو گیا۔ ③

ابوطاہر قَرامِطی (۳۰۱ھ تا ۳۳۲ھ):

ابوسعید اپنے بڑے بیٹے سعید کو ولی عہد بنا کر مرا تھا مگر اس کے چھوٹے بیٹے ابوطاہر سلیمان نے اس کی جگہ خود تخت پر قبضہ کر لیا۔ ابوطاہر نہایت سفاک انسان تھا۔ اس نے پورے ۳۱ سال تک عالم اسلام کو ضیق میں رکھا۔ خلیفہ مقتدر عباسی کے دور میں وہ عراق کے بڑے بڑے شہروں پر مسلسل حملے کر کے مسلمانوں کا قتل عام کرتا رہا۔ بصرہ پر حملے کے دوران اس نے جامع مسجد کو بالکل مسمار کر دیا۔ اس کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ اس نے حاجیوں کے راستے بند کر دیے تھے جس کی وجہ سے سالہا سال تک عراق اور شام کے حاجیوں کے لیے سفرِ حج ممکن نہ رہا۔ شام میں قَرامِطہ کے جس گروہ

① الکامل فی التاریخ: ۵۲۳/۶　② الکامل فی التاریخ: ۵۲۳/۶

③ تاریخ ابن خلدون: ۱۱۴/۴ تا ۱۱۵؛ وفیات الاعیان: ۱۴۸/۲؛ کشف اسرار الباطنیة والقرامطة لمحمد بن مالک الیمانی، ص ۳۸، ۳۹

کی حکومت تھی وہ بھی ابوطاہر کو خراج دیا کرتا تھا۔ ابوطاہر نے بحرین کے قدیم شہر ''ھَجَر'' کو ویران کر کے اس کی جگہ اپنے دارالحکومت کے طور پر ایک نیا شہر بسایا جو ''الاحساء'' کے نام سے مشہور ہوا۔

۳۱۵ھ میں ابوطاہر نے خلیفہ مقتدر سے بصرہ اور اہواز کی حکومت کا پروانہ طلب کیا مگر خلیفہ نے انکار کر دیا۔ ابوطاہر نے غضب ناک ہو کر کوفہ کی طرف یلغار کی اور جگہ جگہ سرکاری افواج کو شکست دیتا ہوا انبار پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے رحبہ اور رقہ کو بھی زیر نگیں کر لیا اور ان علاقوں سے خراج لیتا رہا۔ ذوالحجہ ۳۱۹ھ میں اس نے مکہ پر حملہ کر کے ہزاروں حاجیوں کو قتل کیا، کعبہ کا غلاف اتار کر اسے پرزے پرزے کر کے ساتھیوں میں بانٹ دیا، میزاب رحمت کو گرا دیا اور حجر اسود کو اکھاڑ کر بحرین لے گیا۔ ابوطاہر قرامطی ۳۳۲ھ میں چیچک میں مبتلا ہو کر نہایت اذیت ناک موت مرا۔[1]

ابومنصور قرامطی (۳۳۲ھ تا ۳۵۹ھ):

اب اس کا بیٹا احمد ابومنصور قرامطہ کا سردار بنا۔ چونکہ وہ اپنے بھائیوں سے لڑ جھگڑ کر مصر کے عبیدی حکمران کی سفارش پر حاکم بنا تھا؛ اس لیے اس کی حکومت کمزور اور بنوعبید کی محتاج تھی۔ حجر اسود ۳۳۹ھ تک قرامطیوں کے قبضے میں رہا۔ آخر ایک علوی بزرگ عمر بن یحییٰ رحمہ اللہ خلیفہ مطیع عباسی کے سفیر بن کر ابومنصور قرامطی کے پاس گئے اور حجر اسود کے عوض خطیر دولت کی پیش کش کی۔ یوں حجر اسود بیس سال بعد دوبارہ کعبہ میں نصب ہوا۔[2]

اعصم قرامطی ...... بنوعبید سے کش مکش اور قرامطہ کا زوال:

ابومنصور ۳۵۹ھ میں فوت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا حسن بن احمد (ابوعلی اعصم) تخت نشین ہوا۔ اس کے دور میں قرامطہ کی حکومت کمزور ہو گئی؛ اس لیے اس نے بھی تشدد ترک کر کے نرم پالیسی اپنائی اور خلافتِ بغداد کی حمایت کا دم بھرنے لگا۔ اس کے دور میں بنوعبید نے دِمَشق کے قرامطہ کو شکست دے کر شام پر قبضہ کر لیا تھا۔ چونکہ دِمَشق سے بحرین کو خراج ملا کرتا تھا؛ اس لیے حسن بن احمد نے حسبِ معمول بنوعبید کے گورنرِ شام سے خراج طلب کیا۔ یہاں آ کر اسماعیلی شیعوں کے یہ دونوں فرقے: یعنی قرامطہ اور بنوعبید آپس میں الجھ گئے اور شام میں ان کی کش مکش طویل مدت تک جاری رہی۔ اُدھر بحرین میں قرامطہ کے دو گروہ ہو گئے: ایک بنوعبید کا حامی تھا اور دوسرا مخالف۔ آخر میں بنوعبید کے حامیوں نے بغاوت کر کے پایۂ تخت احساء پر قبضہ کر لیا۔ بنوعبید کے مخالف اعصم قرامطی کو اقتدار سے محروم کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ باغی سرداروں: جعفر اور اسحٰق نے بحرین میں بنوعبید کی باج گزار قرامطی حکومت قائم کر لی۔ کچھ مدت تک یہ حکومت بڑے ٹھاٹھ سے چلی اور اس نے عراق کے مزید کچھ علاقے بھی فتح کیے مگر آخر کار قرامطی سرداروں: جعفر اور اسحٰق میں پھوٹ پڑ گئی۔ ادھر سے ایک عرب سردار اصغر بن ابوالحسن تغلبی اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے ۳۷۵ھ میں بحرین کے اکثر علاقے پر قبضہ کر لیا۔ یوں قرامطہ کی حکومت الاحساء کے علاقے تک محدود ہو گئی۔[3]

---

① الاعلام زِرِکلی: ۱۲۳/۳؛ سیر اعلام النبلاء: ۳۲۵/۱۵؛ تاریخ ابن خلدون: ۱۱۶/٤

② آثار البلاد و اخبار العباد، ص ٤٦. بعض مؤرخین کے مطابق حجر اسود عبیدی حکمران مُعز کے کہنے پر واپس کیا گیا تھا، مگر یہ روایت ضعیف ہے اور خلافِ قرائن بھی ہے۔

③ تاریخ ابن خلدون: ٤٧١/۳ تا ٤٧٢؛ ۱۱٦/٤

قرامطہ ایران اور سندھ میں:

شام وعراق میں قرامطہ کے زوال کے بعد بہت سے قرامطی بھاگ کر ایران اور سندھ آگئے۔ یہاں وہ مزید تین چالیس سال تک خفیہ دعوت کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کرتے رہے۔ ان کے ایک داعی ابوالفتح نے سندھ میں بڑی خلقت کو ورغلایا اور ملتان کو اپنا مرکز بنا کر فتنہ وفساد مچاتا رہا۔ سلطان محمود غزنوی نے ۴۰۱ھ میں ملتان فتح کیا تو ان قرامطیوں میں سے توبہ تائب نہ ہونے والوں کو بے دریغ قتل کیا اور ان کے بہت سے افراد کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر انہیں نشانِ عبرت بنادیا۔ ابوالفتح کو زندہ گرفتار کر کے غور کے قلعے میں قید کر دیا گیا جہاں وہ طبعی موت مرگیا۔

۴۱۸ھ میں جب سلطان محمود نے "رے" پر قبضہ کیا تو وہاں بھی قرامطی اور دیگر گمراہ فرقوں کے افراد پکڑے گئے۔ سلطان نے اس علاقے کے تمام بے دینوں اور زندیقوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

قرامطی مدتِ دراز سے عالمِ اسلام کے لیے ناقابلِ تلافی نقصانات کا باعث بنتے چلے آرہے تھے؛ اس لیے سلطان نے ان سے کوئی رعایت نہ برتی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے بعد ہندوستان وایران میں قرامطی تقریباً ناپید ہوگئے۔ [1]

الاحساء میں قرامطہ کی حکومت:

الاحساء (بحرین) کی چھوٹی سی قرامطی حکومت خلافتِ بغداد کی کمزوری، بنوبُویہ کے عروج اور بنوعبید کی دوستی سے فائدہ اٹھا کر مزید ۹۵ سال چلتی رہی۔ مگر بنوبُویہ کے زوال، سلجوقیوں کے عروج، خلافتِ بغداد کے وقار کی بحالی اور بنو عبید کی کمزوری کے بعد اس کا دم اکھڑنے لگا۔ اور آخر ملک شاہ سلجوقی نے ۴۶۷ھ میں یہاں فوج بھیجی جس نے کئی معرکوں کے بعد ۴۷۰ھ میں قرامطہ کو الاحساء سے بھی بے دخل کر دیا۔ یوں قرامطی حکومت مکمل طور پر مٹ گئی جس نے دو صدیوں تک عالمِ اسلام کا امن وسکون تہہ وبالا کیے رکھا تھا۔ [2]

قرامطہ ایک نظر میں:

قرمط (حمدان بن اشعث)		تیسری صدی ہجری بانی فرقہ
حسن بن بہرام (ابوسعید جنابی)	۲۸۰ھ تا ۳۰۱ھ	بانی دولتِ قرامطہ، بحرین
سلیمان بن حسن (ابوطاہر)	۳۰۱ھ تا ۳۳۲ھ	۳۱ سال حکومت کی۔ حجرِ اسود کو اکھاڑ کر لے گیا۔
ابومنصور قرامطی (ابوطاہر کا بیٹا)	۳۳۲ھ تا ۳۵۹ھ	حجرِ اسود واپس کر دیا۔
حسن الاعصم بن سلیمان (ابوطاہر کا پوتا)		بنوعبید سے الجھ کر حکومت سے محروم ہوا۔

◆◆◆

[1] تاریخ فرشتہ: ۲/۶۶ تا ۶۸، ۸۷

[2] تاریخ ابن خلدون: ۳/۴۷۲ تا ۴۷۳، ۴/۱۱۸

نوٹ: قرامطہ کے حالات، اس فرقے کے بانی اور دیگر پیشواؤں کے نام ونسب اور حالات میں سخت اختلافات ہیں۔ ہم نے اپنی حد تک معتبر ترین مآخذ سے یہ حالات چنے ہیں۔ اگر قارئین کو کسی جگہ اس کے خلاف ملے تو اسے اختلافاتِ روایات پر محمول کیا جائے۔

دولتِ بنوعبید (دورِ تاسیس)

افریقہ ومصر میں اسماعیلی فرقے کی حکومت

عبیداللہ بن میمون عرف المہدی

دورِ حکومت: ۲۹۷ھ تا ۳۲۲ھ

اسماعیلی شیعوں کا جو گروہ طاقت، اقتدار اور شہرت میں سب سے آگے نکلا وہ ''بنوعبید'' تھا۔ اس کا بانی عبیداللہ بن میمون بن القدّاح تھا جس نے تیسری صدی ہجری کے اواخر میں حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کے بیٹے اسماعیل کی اولاد سے ہونے کا جھوٹا دعویٰ کیا۔ وہ شام کے شہر سلمیہ کا رہنے والا تھا۔

اس کا دادا میمون آنکھوں کا طبیب (آئی اسپیشلسٹ) تھا، اسی لیے اسے ''قدّاح'' کہا جاتا تھا۔

عبیداللہ بن میمون نے انتہائی عیاری کا ثبوت دیتے ہوئے خود کو ''امامِ مستور'' کے طور پر پوشیدہ رکھا۔ ایک عرصے تک اس کی خفیہ رہائش سلمیہ کے ایک یہودی کے ہاں تھی۔ یہودی کے مرنے پر عبیداللہ نے اس کی بیوی سے شادی کر لی۔[1]

عبیداللہ خود پوشیدہ رہ کر صرف دو تین خاص الخاص ساتھیوں کو عوامی رابطے کے لیے استعمال کرتا رہا۔ ان میں سے ایک رستم بن حوشب تھا جس نے یمن میں ''امامِ مستور'' کی بیعت کی دعوت دی۔ یہ مقام مرکزِ خلافت سے دور جزیرۃ العرب کے ایک کونے میں تھا؛ اس لیے ایک مدت تک وہ آرام سے دعوت دیتا رہا اور اچھے خاصے مرید بنالیے۔[2]

اس کے بعد عبیداللہ نے اپنے کچھ داعی افریقہ بھیج دیے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''عبیداللہ شام کے علاقے سلمیہ کا رہنے والا تھا۔ ہوشیار، چالاک، مکار اور عالی ہمت تھا۔ وہ اس علی بن محمد (صاحب الزنج) نامی خبیث کے نقشِ قدم پر چلا، جس نے بصرہ کو تباہ کیا تھا اور دس سال وہاں قابض رہا تھا اور انسانوں اور شہروں کو برباد کیا تھا اور جو کہ امت کے لیے ایک بلاء تھا اور ۲۷۰ھ میں قتل ہوا تھا۔ عبیداللہ نے سمجھ لیا کہ جیسی بادشاہت اسے درکار ہے، وہ عراق یا شام میں نصیب نہیں ہو سکتی؛ اس لیے اس نے اپنے داعی افریقہ بھیجے۔''[3]

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱۴۳/۱۵، ۱۴۶ ② الاعلام زرکلی: ۲۳۰/۲ ③ سیر اعلام النبلاء: ۱۴۳/۱۵

تحریک بنو عبید اور فری میسن میں مشابہت:

عبیداللہ کے مبلغ لوگوں کو ورغلاتے اور ان کی جہالت کے مطابق انہیں گمراہ کرتے۔ بعض کو بتاتے کہ عبیداللہ مہدی اور ابنِ رسول اللہ ہے۔ کسی کو سکھاتے کہ وہ خود رسول اللہ ہے۔ خواص کو یہ یقین دلاتے کہ مہدی خدا ہے۔ [1]

عبیداللہ نے مریدوں کے لیے ترقی کے سات درجات مقرر کیے تھے۔ ہر درجے کو "بلاغ" کہا جاتا تھا۔ بلاغ اول سے بلاغ سابع تک سات درجات تھے:

① بلاغ اول عوام کے لیے تھا اور اس میں تشیع کی تعلیم دی جاتی تھی اور بتایا جاتا کہ عبیداللہ "مہدی" ہے۔

② بلاغ ثانی میں رافضیت سکھائی جاتی تھی۔

③ بلاغ ثالث ایسے پختہ مریدوں کے لیے تھا جو ہر بات پر یقین کر سکیں۔ اس میں مہدی کے رسول اللہ ہونے کا یقین دلایا جاتا تھا۔

④ بلاغ رابع ان کے لیے تھا جنہیں دو سال تک آزمایا گیا ہو، یہاں مہدی کو خدا کہا جاتا تھا۔

⑤ بلاغ خامس ان کے لیے تھا جنہیں تین سال آزمایا گیا ہو۔

⑥ بلاغ سادس اس کے لیے تھا جو چار سال تک اس تحریک کے لیے جدوجہد کرتا رہا ہو۔

⑦ بلاغ سابع میں مرید کو "ناموس اعظم" کے مقام پر فائز کر دیا جاتا تھا یعنی اسے ہر حرام کام کی اجازت مل جاتی تھی اور وہ ہر شرعی پابندی سے آزاد ہو جاتا تھا۔ [2]

اگر غور کیا جائے تو یہ ترتیب فری میسن تنظیم کی ترتیبات سے بے حد مشابہ ہے۔ [3]

---

① الروضتين في اخبار الدولتين لابي شامه: ٢/٢١٤ تا ٢٢٤ ② سير اعلام النبلاء: ١٥/١٤٤

③ فری میسن یہودیوں کی قدیم خفیہ تنظیم ہے جو دنیا میں فتنہ و فساد برپا کرنے اور یہودیوں کی عالمگیر بادشاہت قائم کرنے کے لیے سرگرم ہے۔ اس تنظیم میں کئی درجات اور طبقات ہیں، اعلیٰ طبقے کے افراد گنے چنے اور زیریں طبقے کے ارکان لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ ہر درجے کے استاد (گرینڈ ماسٹر) کی الگ علامات تھیں۔ گرینڈ ماسٹر کو عربی میں مُقدّم کہا جاتا ہے۔ طبقات کی تفصیل یہ ہے:

طبقہ اول: الرمزية العامة (عوامی خفیہ حلقہ) اس میں تمام مذاہب، قوموں اور نسلوں کے لوگ آ سکتے ہیں۔ اس کے ارکان لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ ارکان کی چار ڈگریاں ہیں: (۱) بھائی (۲) ماسٹرز (۳) ورشپ فل ماسٹرز (۴) گرینڈ ماسٹرز۔ ایک عام کارکن کئی درجے چڑھ کر بھائی سے گرینڈ ماسٹر بن سکتا ہے۔ ترقی کا فیصلہ تنظیم سے وفاداری کے کارناموں پر ہوتا ہے۔ جب کوئی کارکن ترقی کرتا ہوا تیسری ڈگری ورشپ فل ماسٹر تک آتا ہے تو اس کے تمام خانگی و معاشرتی تعلقات منقطع کر دیئے جاتے ہیں اور اُس سے درج ذیل الفاظ کی قسم لی جاتی ہے: 'میں قسم کھاتا ہوں کہ ہر انسان سے اپنے ہر طرح کے تعلقات منقطع کر رہا ہوں جیسے ماں، باپ، بھائی، بہن، بیوی، شوہر، اعزہ و اقارب۔ جن سے بھی میں نے امانت، اطاعت، شکرگزاری یا خدمت کا کوئی معاہدہ کر رکھا تھا، وہ ختم کرتا ہوں۔"

اس معاہدے کے بعد کارکن مردہ بدست زندہ کی طرح یہودیوں کے لیے کام کرتا ہے۔ وفاداریوں کے کڑے امتحانات سے گزر کر وہ گرینڈ ماسٹر بن سکتا ہے۔

دوسرا طبقہ: الماسونية الملوكية (شاہی معمار): اس طبقے میں صرف یہودی شامل ہو سکتے ہیں۔ یہاں آ کر فری میسنری کے ارکان بہت محدود رہ جاتے ہیں۔

تیسرا طبقہ: الماسونية الكونية (عالمی معمار): یہ دوسرے طبقے کے لاجز کے سربراہوں سے تشکیل پاتا ہے۔ یہ دنیا بھر کے چنے ہوئے یہودی ہوتے ہیں۔ جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔

رئیس: تمام طبقوں اور عہدے داروں کے اوپر فری میسنری کا سربراہ ہوتا ہے جسے رئیس یا "حاخام اعظم" کہا جاتا ہے، لیکن اُس کی شخصیت ہمیشہ پوشیدہ رہتی ہے۔

(تفصیل کے لیے دیکھیے: (١) موسوعة اليهود، اليهودية والصهيونية: ازعبدالوهاب المسيرى؛ (٢) یهودی خباثتیں: ازعبدالله التل، مترجم مولانا سید سلمان حسینی الندوی؛ (٣) فری میسنری کی رسومات: از رضی الدین سید)

پس اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ عبیداللہ شیطانی قوتوں کا پلا پلایا آلۂ کار تھا۔

افریقہ میں ابوعبداللہ شیعی کی کارستانیاں:

عبیداللہ نے پسِ پردہ رہ کر صنعائے یمن کے ایک ہوشیار اسماعیلی ابوعبداللہ شیعی (حسین بن احمد) اور اس کے بھائی ابوالعباس کو اپنا آلۂ کار بنایا۔ یہ دونوں بھائی اسماعیلی مذہب کی اشاعت کے لیے غیر معمولی حد تک پرجوش تھے۔ عبیداللہ نے محسوس کیا کہ اسماعیلی مذہب کی اشاعت کے لیے افریقہ موزوں علاقہ ہے؛ لہٰذا اس نے ابوعبداللہ کو افریقہ جانے کے لیے تیار کیا۔[1] ابوعبداللہ اپنی مہم کو انجام دینے کے لیے پہلے موسمِ حج میں مکہ پہنچا اور افریقی حاجیوں سے میل جول پیدا کر کے ان پر اپنے زہد و عبادت اور علم و فضل کی دھاک بٹھادی۔ قبیلہ کتامہ کے افریقی اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کی خاطر اسے ساتھ لے جانے پر مصر ہو گئے۔ ابوعبداللہ شیعی کو اور کیا چاہیے تھا۔ وہ علمِ دین کی اشاعت کا جذبہ ظاہر کرتے ہوئے ان کے ساتھ افریقہ چلا گیا۔ ابوعبداللہ شیعی نے تیونس کے شہر قیروان میں قیام کیا اور وہ حالات کو دیکھتا بھالتا رہا۔ اس نے اندازہ لگالیا کہ افریقہ میں سب سے مضبوط قبیلہ کتامہ ہے جسے ساتھ ملا کر حکومت سے ٹکرلی جاسکتی ہے۔ چنانچہ ۲۸۰ھ میں وہ کتامہ کے شیوخ سے ملا اور انہیں اپنی چرب زبانی، فلسفیانہ گفتگو اور شعبدہ بازیوں سے متاثر کرنے کے بعد وہیں رہائش پذیر ہو گیا۔ اس نے اس قبیلے کو ''مہدی مستور'' کی بیعت کی دعوت دی اور کہا کہ عن قریب مہدی کا ظہور ہونے والا ہے۔ اس نے یہ کہہ کر انہیں بے دام مرید بنالیا کہ ان کے قبیلے کا نام ''کتامہ'' کتمان سے مشتق ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہی لوگ مہدی موعود کے راز کو محفوظ رکھنے کے اہل ہیں۔[2]

غرض خفیہ طور پر یہ دعوت جاری رہی۔ اس دوران تیونس کے حکمران ابراہیم بن احمد اغلبی نے ابوعبداللہ شیعی کی مقبولیت سے خدشہ محسوس کر کے مقامی گورنر سے معلومات لیں۔ اس نے کہا: ''یہ ایک درویش ہے۔ اس سے کوئی خطرہ نہیں۔''[3]

ابوعبداللہ شیعی موقع سے فائدہ اٹھا کر کئی سالوں تک قبیلہ کتامہ کے لوگوں کو عسکری اور سیاسی طور پر منظم کرتا رہا۔[4] وہ لوگوں کو یہ یقین دلاتا تھا کہ مہدی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور مغرب سے سورج نکال سکتا ہے اور وہ ساری زمین پر حکومت کرے گا۔[5] امام مستور کے عن قریب ظہور کی خوش خبریاں سن کر کتامہ کے علاوہ دیگر کئی قبائل بھی اس کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ آخر ابوعبداللہ شیعی نے آس پاس کے علاقوں پر یورش شروع کر دی اور جلد ہی خاصا علاقہ فتح کر ڈالا۔ ابراہیم بن احمد اغلبی کو اب ہوش آیا اور اس نے اپنے کہنہ مشق جرنیل اَحول کی کمان میں ابوعبداللہ کی سرکوبی کے لیے فوج بھیج دی۔ کئی سخت معرکوں کے بعد ابوعبداللہ کو پسپا ہو کر جنگلوں میں روپوش ہونا پڑا۔ حکومت سمجھی کہ معاملہ رفع دفع ہو گیا مگر ابوعبداللہ نے اپنی قوت چھپا کر محفوظ کر لی تھی۔[6]

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱۵/۱۴۳

② البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب لابن عذاری: ۱/۱۲۴، ۱۲۵؛ الکامل فی التاریخ: ۶/۵۸۴ تحت ۲۹۶ھ؛ اتعاظ الحنفاء باخبار الائمة الفاطمیین الخلفاء للمقریزی، ص ۵۵ تا ۵۸؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۴/۵۸

③ الکامل فی التاریخ: ۶/۵۸۵ تحت ۲۹۶ھ؛ الاعلام زِرِکلی: ۲/۲۳۰ ④ البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۱/۱۱۸

⑤ الکامل فی التاریخ: ۶/۲۸۷: سنة ۲۹۶ھ ⑥ الکامل فی التاریخ: ۶/۵۸۶ تحت ۲۹۶ھ

افریقہ کی حکومتوں کی صورتحال:

اس وقت افریقہ میں تین حکومتیں تھیں: مصر میں دولتِ اِخشید یہ، تیونس اور الجزائر میں دولتِ اغالبہ، اور مراکش میں دولتِ ادارسہ۔ اس وقت دولتِ اِخشید یہ اور دولتِ ادارسہ قدرے مضبوط تھیں جبکہ دولتِ اغالبہ اپنے حکمران ابراہیم بن احمد اغلبی کی بیماری کے سبب ڈگمگا رہی تھی۔ ابراہیم بن احمد نے کئی سال تک اچھی حکومت کی تھی مگر ۲۸۷ھ میں اسے ایک دماغی بیماری لاحق ہوگئی، اس حالت میں اس نے بے قصور لوگوں کو بے دریغ قتل کرا دیا۔ اس کے عجیب وغریب اقدامات سے امرائے تیونس اور عوام سخت مضطرب تھے۔[1]

دولتِ اغالبہ کا سیاسی بحران اور ابوعبداللہ شیعی کے لیے سازگار مواقع:

آخر ابراہیم بن احمد کو معزول کر دیا گیا اور وہ ۲۸۹ھ میں معزولی کی حالت ہی میں فوت ہوگیا۔ اس کی جگہ اس کے بیٹے ابوالعباس نے سنبھالی مگر اگلے برس ابوالعباس کو اس کے نالائق لڑکے ابومضر زیادۃ اللہ نے قتل کر دیا اور تخت پر بیٹھتے ہی رنگ رلیوں میں مشغول ہوگیا۔ جب امرائے دولت نے تنگ آکر بغاوت کی کوشش کی تو اس نے اپنے سیاسی حریفوں ہی کو نہیں بلکہ اپنے دوستوں اور خیر خواہوں کو بھی مروا ڈالا۔[2]

ابوعبداللہ شیعی کو پسپا کرنے والا جرنیل اَحول بھی قتل کر دیا گیا جس سے ابوعبداللہ کا حوصلہ بہت بڑھ گیا۔ اُدھر ابومضر زیادۃ اللہ کی بے تدبیری اور مظالم سے تنگ آکر تیونس کے تمام امراء بنواغلب کے مخالف بن گئے۔[3]

ابوعبداللہ شیعی کا قیروان پر قبضہ:

اب ابوعبداللہ کے لیے راستہ صاف ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا لشکر آس پاس کے سارے علاقے میں پھیلا دیا۔ اس نے اعلان کیا: ''چند دنوں کے اندر مہدی کا ظہور ہونے کو ہے۔ خوش قسمت ہے جو اس کا حلقہ بگوش بن جائے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے لوگوں کو تیونس کے موجودہ حکمران ابومضر کے خلاف بھی بھڑکا دیا۔[4]

آخر ابوعبداللہ شیعی نے ۲۹۶ھ میں ایک جم غفیر کے ساتھ تیونس کے پایۂ تخت قیروان کا رُخ کیا۔ آرام پسند ابومضر زیادۃ اللہ اس طوفان کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھا۔ وہ تمام خزانے اونٹوں پر لاد کر افریقہ سے مصر کی طرف نکل گیا اور ۲۹۶ھ میں وہیں گمنامی کی موت مر گیا۔ اس کی عدم موجودگی میں ابوعبداللہ شیعی نے پہلے قیروان کی کلید سمجھے جانے والے مضافاتی شہر ''اُربس'' پر قبضہ کیا جہاں ابومضر زیادۃ اللہ کی اکثر فوج جمع تھی۔ گھمسان کی جنگ کے بعد ابوعبداللہ ''اُربس'' پر قابض ہوگیا۔ یہاں اس نے جامع مسجد میں پناہ لینے والے تین ہزار مسلمانوں کا قتل عام کیا جو عصر سے رات گئے تک جاری رہا۔ یہاں اس قدر خون بہایا کہ مسجد سے خون کی ندیاں بہہ نکلیں۔[5]

① البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۱/۱۳۲، ۱۳۳

② نهایة الارب فی فنون الادب للنویری: ۲۴/۱۳۰ تا ۱۴۶؛ الکامل فی التاریخ: سنة ۲۸۷ھ تا ۲۸۹ھ

③ الکامل فی التاریخ: ۶/۵۸۶، ۲۸۷: سنة ۲۹۶ھ

④ الکامل فی التاریخ: ۶/۲۸۷: سنة ۲۹۶ھ

⑤ البیان المغرب: ۱/۱۴۶، ۱۴۷؛ نهایة الارب فی فنون الادب: ۲۴/۱۵۰ تا ۱۵۳؛ الکامل فی التاریخ: ۲۹۰ھ تا ۲۹۶ھ

رجب ۲۹۶ھ میں ابوعبداللہ شیعی تین لاکھ پیادہ وگھڑ سوار فوج کے ساتھ تیونس کے پایۂ تخت قیروان پہنچا۔ اہل شہر میں مزاحمت کی قوت نہ تھی۔ انہوں نے جان کی امان پر شہر حوالے کر دیا۔ ابوعبداللہ نے ابن ابی خنزیر نامی ایک تخت گیر افسر کو یہاں کا گورنر بنا دیا۔[1] اسی سال ابوعبداللہ شیعی نے مراکش میں خوارجِ اباضیہ کی دولتِ رستمیہ کو بھی مٹا ڈالا۔[2]

عبیداللہ بن میمون کی افریقہ آمد اور گرفتاری:

ان فتوحات کے بعد ابوعبداللہ نے اعلان کیا کہ امام مستور ''عبیداللہ المہدی'' ہے جو جعفر صادق کے بیٹے اسماعیل کی اولاد ہے اور بہت جلد اس کا ظہور افریقہ میں ہونے والا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو لاکھ بھولے بھالے افراد ''آل رسول'' کی خاطر جان دینے کے لیے اس کے ساتھ ہو گئے۔ جعلی مہدی عبیداللہ جو شام کے شہر ''سلمیہ'' میں تھا، یہ حالات سن رہا تھا۔ ابوعبداللہ نے حالات سازگار دیکھ کر اسے افریقہ بلا لیا۔ وہ زمین ہموار ہو جانے کی خبر سن کر تاجروں کے بھیس میں مصر، بَرقہ اور طرابلس سے ہوتا ہوا ذوالحجہ ۲۹۶ھ میں تیونس پہنچا۔ سِجلماسہ میں (جہاں خوارج صفریہ کی ''دولتِ بنی مِدرار'' قائم تھی) مقامی امراء کو اس کی حقیقت پتا چل گئی؛ لہٰذا اسے پکڑ کر وہیں قید کر دیا گیا۔[3]

نام نہاد ''دولتِ فاطمیہ'' کا قیام:

ابوعبداللہ شیعی کو معلوم ہوا تو وہ تین لاکھ کا لشکر لے کر طرابلس کو فتح کرتے ہوئے سِجلماسہ پہنچا اور دولت بنی مِدرار کا خاتمہ کر کے عبیداللہ بن میمون کو رہا کرا لیا۔ ''نام نہاد مہدی'' قیروان میں داخل ہوا تو بربر جوش وخروش سے بے قابو ہو گئے۔ ان کی قوت کو بروئے کار لا کر ربیع الآخر ۲۹۷ھ میں اس جھوٹے مہدی نے آل رسول کی حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا جسے حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب کر کے ''دولت فاطمیہ'' کا نام دیا گیا۔[4] اس کے لیے نارنجی پرچم مخصوص کر دیے گئے۔[5] اس حکومت کو ''دولتِ فاطمیہ'' کا نام دینا لوگوں کی عقیدت بٹورنے کی چال تھی ورنہ یہ حکومت درحقیقت آلِ رسول کے دین کو مٹانے کے لیے وجود میں آئی تھی۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میں اس بات کو حلال نہیں سمجھتا کہ (اس خاندان کو) علوی فاطمی کہا جائے؛ اس لیے کہ میرے دل میں یہ بات راسخ ہے کہ یہ جھوٹے دعوے دار تھے۔''[6]

علماء کا بے دریغ قتل:

عبیداللہ کے جال میں پھنسنے والے زیادہ تر دیہاتوں کے جاہل اور ناخواندہ لوگ تھے۔ شہروں کے لوگ اس نئے دین ومذہب کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ہر جگہ علماء اس نئے دین کی مخالفت کر رہے تھے۔

[1] البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۱/۱۴۹، ۱۵۰

[2] موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲۰۰، ۲۰۱ [3] الکامل فی التاریخ: ۶/۵۸۹: سنة ۲۹۶ھ

[4] اخبار بنی عبید وسیرتهم للقلعی، ص ۳۹، ۴۰ ط دار الصحوة قاهره؛ الکامل فی التاریخ: ۶/۵۸۹ تا ۵۹۳: سنة ۲۹۶ھ

[5] سیر اعلام النبلاء: ۱۶/۱۸۱

[6] "لااستحل ان اقول العلوی الفاطمی، لما وقر فی نفسی من انه دعیّ." (سیر اعلام النبلاء: ۱۵/۱۸۴)

عبیداللہ نے ان کا قلع قمع کرنے میں ذرا بھی رعایت نہ برتی۔ ان گنت علماء کو گرفتار اور قتل کیا گیا۔ بہت سوں کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔ بہت سوں کو قدموں تلے کچل دیا گیا۔

محمد بن بَرْدُون ضبی اور ابوبکر بن ہُذَیل رحمہما اللہ قیروان کے نامور مالکی فقہاء میں سے تھے۔ عبیداللہ بن میمون جب قیروان کے مضافاتی شہر رَقادہ پہنچا تو ان دونوں کو قیروان سے وہاں بلوالیا؛ کیوں کہ ان کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی افضلیت کے قائل نہیں۔ جب یہ دونوں عبیداللہ کے پاس پہنچے تو وہ تخت پر براجمان تھا۔ ابوعبداللہ شیعی اور اس کا بھائی ابوالعباس دائیں بائیں کھڑے تھے۔ ابوعبداللہ شیعی نے ان دونوں سے پوچھا:

''کیا تم گواہی دیتے ہو کہ یہ (عبیداللہ) خدا کا رسول ہے؟''

دونوں بیک زبان بولے: اللہ کی قسم! اگر اس کے دائیں جانب سورج اور بائیں طرف چاند آ کھڑے ہوں اور وہ گواہی دیں کہ یہ اللہ کا رسول ہے، تب بھی ہم یہ نہیں کہیں گے۔''

اس جرأت پر قیروان کے گورنر ابن ابی خنزیر کو حکم دیا گیا کہ ابوبکر بن ہذیل رحمہ اللہ کو پانچ سو کوڑے مارے جائیں اور ابن بردون رحمہ اللہ کا سر قلم کر دیا جائے۔ گورنر نے غلطی سے پانچ سو کوڑے ابن بردون کو لگوا دیے اور ابوبکر بن ہذیل رحمہ اللہ کا سر قلم کر دیا۔ اگلے دن جب غلطی کا احساس ہوا تو ابن بردون کو بلوایا اور کہا: ''او خنزیر!''

ابن بَرْدُون رحمہ اللہ نے فوراً کہا: ''خنزیر اپنی کچلیوں سے پہچانا جاتا ہے۔''

ابن ابی خنزیر نے انہیں قتل کرنے کا حکم دیا۔ جب ان کے کپڑے اتارے جانے لگے تو ابن ابی خنزیر نے آخری بار تنبیہ کرتے ہوئے کہا: ''کیا تم اپنے مذہب سے توبہ کرتے ہو؟''

وہ بھڑک کر بولے: ''کیا میں اسلام سے نکل جاؤں!''

آخر انہیں سولی پر چڑھا دیا گیا۔ یہ ۲۹۹ھ کا واقعہ ہے۔

محمد بن خیرون معافری رحمہ اللہ ایک جلیل القدر عمر رسیدہ عالم تھے۔ عبیداللہ کے حکم پر ابن ابی خنزیر نے انہیں طلب کیا اور انہیں بتایا کہ آقا کا حکم ہے کہ تمہیں اس وقت تک روندا جائے جب تک تم مر نہ جاؤ۔ اس کے بعد حبشیوں نے محمد بن خیرون رحمہ اللہ کو گرایا اور ایک تخت پر چڑھ کر ان پر جستیں لگاتے رہے یہاں تک کہ ان کی روح پرواز کر گئی۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ یہ واقعہ نقل کر کے بے اختیار کہتے ہیں: ''ہائے! اسلام اور مسلمانوں کو عبیداللہ زندیق کے ہاتھوں کیا کچھ سہنا پڑا۔''[1]

مسلمانوں پر مظالم۔ مساجد کی بے حرمتی:

جھوٹے مہدی کی بے دینی کا یہ حال تھا کہ ایک مہم میں اس کے سپاہی گھوڑوں سمیت جامع مسجد میں گھس گئے۔ خانۂ خدا کی یہ بے حرمتی دیکھ کر لوگوں نے احتجاج کیا تو سپہ سالار نے کہا:

''ان گھوڑوں کا گوبر اور پیشاب پاک ہے؛ کیوں کہ یہ مہدی کے گھوڑے ہیں۔''

[1] سیر اعلام النبلاء: ۱۴/۲۱۶ تا ۲۱۹

مسجد کے ناظم نے گھوڑوں کو باہر نکالنے پر اصرار کیا تو سپاہی اسے پکڑ کر عبید اللہ کے پاس لے گئے جس نے اسے قتل کرادیا۔[1]

مخالف علماء اور فقہاء کو دربار میں طلب کر کے اپنے سامنے قالین پر ذبح کرانا اس کے لیے عام سی بات تھی۔[2]

مسلمانوں کی مزاحمت اور ان کا قتل عام:

ان حالات میں طرابلس (لیبیا) میں قبیلہ ہوارہ کے سربراہ ہارون الہواری نے ۲۹۸ھ میں اس جھوٹے مہدی کے خلاف تلوار اٹھالی۔ اس بغاوت کا دائرہ پھیلتا گیا جسے کچلنے کے لیے ۲۹۹ھ کے آغاز میں عبیدی افواج نے قبیلہ زناتہ کے مرکز "فلک مدیک" پر حملہ کیا اور اسے مسخر کر کے بے شمار انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد "سمہرت" شہر پر یلغار ہوئی اور صفر ۲۹۹ھ میں اسے فتح کر کے بے شمار مردوں کو قتل کر دیا گیا، عورتوں کو باندیاں اور بچوں کو غلام بنا لینے کے بعد شہر کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔[3]

یہ سارا علاقہ صاف کرنے کے بعد ۳۰۰ھ میں عبیدی افواج نے خشکی اور سمندر دونوں طرف سے طرابلس (ٹریپولی) کا محاصرہ کیا جو اتنا سخت تھا کہ شہریوں کو مردار جانور کھانے کی نوبت آگئی۔ آخر عبید اللہ کا لشکر غالب آگیا اور اہلِ طرابلس کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔[4]

اگلے سال اہلِ بَرقہ نے خروج کیا تو عبید اللہ نے اپنے درندہ صفت جرنیل حَباسَہ بن یوسف کو ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ اس ظالم نے جہاں بھی فتح پائی وہاں لوگوں کو بڑی بے رحمی سے قتل کیا۔ ایک جگہ اس نے لوگوں کو الاؤ کے گرد جمع کرایا، پھر ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے گئے اور آگ پر بھونے اور پکائے گئے۔ اس کے بعد ان تڑپتے سسکتے افراد کو آگ میں جھونک دیا گیا۔

بَرقہ پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے اعلان کرایا کہ جان کی امان چاہنے والے اور خوراک کے ضرورت مند ادھر آجائیں۔ ایک ہزار شرفائے شہر وہاں جمع ہوئے تو حَباسَہ بن یوسف نے سب کی گردنیں اڑانے کا حکم دیا۔ پھر ان کی لاشوں پر کرسی لگا کر شہریوں کو اکٹھا کیا اور حکم دیا کہ کل تک ایک لاکھ مثقال (تقریباً گیارہ من) سونا جمع کر کے دیا جائے ورنہ سب کو قتل کر دیا جائے گا۔ بَرقہ ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ لوگوں نے اپنا سب کچھ سمیٹ کر حوالے کر دیا، تب جا کر بمشکل یہ مقدار پوری ہوئی۔ اس کے بعد بھی انہیں معاف نہ کیا گیا۔ شہر کی ہر چیز لوٹ لی گئی۔ عورتوں کو باندیاں بنا کر بیچ دیا گیا۔[5] کچھ شہریوں نے جا کر عبید اللہ سے فریاد کی تو اس مکار نے جھوٹی قسم کھا کر کہا کہ میرا ان باتوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان مظالم کی تلافی کے لیے اس نے پھر بھی کچھ نہ کیا۔[6]

---

[1] البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۲۸٤/۱
[2] الروضتین فی اخبار الدولتین لابی شامہ: ۲۲٤/۲
[3] البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۱٦۳/۱ تا ۱٦٥
[4] البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۱٦۸/۱، ۱٦۹؛ الکامل فی التاریخ: ٦۱٥/٦: سنة ۳۰۰ھ
[5] البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۱۷۰/۱
[6] البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۱۷۱/۱

ابوعبداللہ شیعی نے بھانڈا پھوڑ دیا:

جھوٹ بہرحال جھوٹ ہوتا ہے۔ اسماعیلیوں کے سمجھ دار افراد سے جھوٹے مہدی کی حقیقت چھپ نہ سکی۔ خود عبیداللہ کے لیے افریقہ کو زمین ہموار کرنے والے اس کے نائب ابوعبداللہ شیعی نے تاڑ لیا کہ اس کا امام بہروپیا ہے۔ عبیداللہ کے چھوٹے بیٹے کے انتقال کے بعد تو اسے یقین ہوگیا کہ یہ امامت بالکل جھوٹی ہے؛ کیوں کہ عبیداللہ نے چھوٹے بیٹے کے جانشین بننے کی پیش گوئی کی تھی۔ اگر وہ مہدی اور عالم الغیب ہوتا تو یہ پیش گوئی غلط نہ ہوتی۔

ابوعبداللہ شیعی قبائلی سرداروں کو اس راز سے آگاہ کرنے لگا۔ اس نے انہیں جمع کر کے کہا:

''امام عالم الغیب ہوتا ہے مگر اس امام سے جب میں نے پوچھا کہ کونسا بیٹا آپ کا جانشین ہوگا؟ تو امام نے کہا: چھوٹا بیٹا۔ مگر بیس دن بعد چھوٹا بیٹا مرگیا۔ اگر یہ سچا امام ہوتا تو اسے علم ہوتا کہ چھوٹے کی امامت کی نوبت نہیں آئے گی۔ پھر یہ کہ شریعت میں ریشم پہننا جائز نہیں مگر یہ امام ریشمی کپڑے پہنتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے تیونس پر قبضہ کر کے وہاں کے امیر زیادۃ اللہ کی بیویوں سے جبراً ہم بستری کی تھی۔'' سرداروں نے پوچھا: ''تو اب کیا کرنا چاہیے؟''

ابوعبداللہ شیعی نے کہا: ''ہم امام کو قید کر دیتے ہیں۔ پھر اس کے نسب کی چھان بین کرتے ہیں۔''

ادھر یہ مشورے ہو رہے تھے کہ عبیداللہ کو اطلاع ہوگئی۔ ہوا یہ کہ ایک قبیلے کتامہ کا سردار عبیداللہ کے پاس پہنچ گیا اور وہ شکوک دہرادیے جو ابوعبداللہ شیعی نے پیش کیے تھے۔ عبیداللہ بولا: ''پہلی بات یہ ہے کہ تمہیں میرے امام ہونے کا یقین تھا۔ اب صرف شک ہوا ہے۔ تو یقین کو شک کی بناء پر ترک نہیں کیا جاتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرا چھوٹا بیٹا مرا نہیں، وہ امام ہے، امام ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ نئے نئے جسموں میں جنم لیا کرتے ہیں۔ اس وقت وہ کسی اور ملک میں کسی اور بدن میں اصلاحِ معاشرہ کر رہا ہے۔ رہی بات ریشمی کپڑے پہننے کی تو میں خدا کا نائب ہوں، مجھے حرام کو حلال کرنے کا اختیار ہے۔ زیادۃ اللہ کی بیویوں سے جماع کرنا بھی میرے لیے حلال تھا۔ ویسے بھی وہ سرکش دشمن کی عورتیں تھیں۔''[1]

عبیداللہ کے حکم سے ابوعبداللہ کا قتل:

سردار نے ان باتوں پر یقین کر لیا اور عبیداللہ نے پہل کرتے ہوئے ابوعبداللہ شیعی اور اس کے ساتھیوں پر قابو پا لیا۔ یہ جعلی مہدی جو حکومت کے لیے عقائد تک گھڑ سکتا تھا وہ ابوعبداللہ کے احسانات کو کیا اہمیت دیتا۔ اس نے حکم دیا کہ اسے اور اس کے بھائی ابوالعباس دونوں کو قتل کر دیا جائے۔

جب ابوعبداللہ شیعی کو قتل کیا جانے لگا تو اس نے جلاد کی منت سماجت کی کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔ جلاد نے جواب دیا: ''تم جس کی اطاعت کی دعوت دیتے تھے، یہ اسی کا حکم ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ابوعبداللہ پر نیزے کا ایسا وار کیا کہ وہ وہیں گر کر چند لمحوں میں مرگیا۔ اس کے بھائی ابوالعباس کو نیزے کے ۱۹ وار کر کے قتل کیا گیا۔[2]

مقامِ عبرت ہے کہ جس بدبخت کے لیے ابوعبداللہ نے دین ودنیا کو برباد کیا، اسی کے حکم سے مارا گیا۔

① سیر اعلام النبلاء: ۱۴۶/۱۵ ② البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۱۶۴/۱

دولتِ ادارسہ کا خاتمہ:

عبیداللہ بن میمون کے پیروکاروں میں افریقی قبیلہ مِکناسَہ کا سردار مصالہ بن حبوس بھی شامل تھا۔ عبیداللہ کے حکم پر اس نے ۳۰۵ھ میں مغرب کی طرف یلغار کی اور دولتِ ادارسہ کے آخری خودمختار حکمران یحییٰ بن ادریس کو مغلوب کر کے اپنا باج گزار بنالیا۔ ۳۱۰ھ میں یحییٰ بن ادریس سے برائے نام حکمرانی بھی چھین لی گئی اور اسے جلاوطن کر دیا گیا۔ وہ دردر کی ٹھوکریں کھا کر گمنامی کی موت مرگیا۔ ایک سچے سید سے ایک نقلی سید ایسا ہی سلوک کر سکتا تھا۔[1]

عبیداللہ بن میمون کی مسلسل فتوحات:

عبیداللہ بن میمون ۳۲۲ھ تک زندہ رہا اور اپنی حکومت کا دائرہ برابر بڑھاتا رہا۔ نہ صرف مراکش سے لے کر دریائے نیل تک سارا شمالی افریقہ اس کے زیرنگیں ہوگیا بلکہ صِقِلّیہ (سسلی) بھی اس کی عملداری میں آ گیا۔

اس نے ۳۰۱ھ میں مصر پر بھی لشکرکشی کی اور اسکندریہ پر قبضہ کر لیا تاہم یہ قبضہ برقرار نہ رہا اور عبیدی لشکر لوٹ مار کر کے واپس آ گیا۔ عباسی خلیفہ مقتدر باللہ نے اس طوفانِ بے اماں کو روکنے کے لیے دوبارہ فوجیں بھیجیں مگر بے سود۔ ۳۰۶ھ اور ۳۰۸ھ میں عبیداللہ نے مصر پر مزید دو حملے کیے اور دریائے نیل کے مغرب کا سارا علاقہ فتح کرلیا۔[2]

بنواغلب کے محلات اور قلعوں کا انہدام:

بنواغلب اپنے دور میں بڑے بڑے محلات، قلعے اور عمارتیں بنا گئے تھے۔ عبیداللہ بن میمون نے اکثر عمارتوں کو منہدم کرادیا تاکہ گزشتہ حکام کی یادیں تک مٹ جائیں۔ بہت سی عمارتوں پر ان کے بانی قدیم خلفاء اور وزراء کے نام لکھے تھے۔ عبیداللہ نے یہ نام مٹوا کر ہرجگہ اپنا نام کندہ کرادیا۔[3]

مہدیہ کی تاسیس:

اپنا نام زندہ رکھنے کے لیے اس نے ۳۰۰ھ میں تیونس کے شہر رقادہ کے قریب ایک نیا شہر بسایا اور اسے اپنی طرف منسوب کر کے ''مَہدِیّہ'' کا نام دیا اور اسی کو اپنا پایہ تخت بنالیا۔[4]

شریعت میں تحریف۔ اسلام کے نام پر کفر کی ترویج:

عبیداللہ شریعت میں تحریف کر کے تدریجاً اپنا نیا دین نافذ کرتا گیا۔ نمازِ تراویح پر پابندی لگادی۔ رمضان سے دو دن قبل روزے رکھنے کا حکم جاری کیا۔ نمازِ فجر کی اذان سے ''اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم'' کے الفاظ حذف کرا کے ان کی جگہ ''حَیَّ عَلٰی خَیْرِ الْعَمَل...... مُحَمَّدٌ وَعَلِیٌّ خَیْرُ الْبَشَر'' کہنے کی بدعت شروع کرائی۔ پھر یہی الفاظ پنج وقتہ اذانوں میں لازم کرادیے اور ان کے بعد امام زمان پر سلام بھیجنا بھی ضروری قرار دیا۔[5]

---

① البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۱/۱۹۵ تا ۱۹۷
② تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۰ تا ۳۰۱
③ اخبار بنی عبید، ص ۴۲
④ اخبار بنی عبید، ۴۲؛ البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۱/۱۶۹
⑤ اخبار بنی عبید، ص ۵۰

جو دین دار اور سمجھ دار لوگ اس کے عقیدے کو قبول نہ کرتے، یہ انہیں بے دردی سے مروا دیتا۔ اس کے لیے اس نے ایک خصوصی عقوبت خانہ ''دَارُ النَّحْر'' (قربان گاہ) کے نام سے بنوایا تھا۔ تیونس کے ایک مالکی عالم ابوالحسن ابن القابسی سے منقول ہے کہ عبیداللہ اور اس کی آل نے ''دَارُ النَّحْر'' میں جن عالموں اور درویشوں کو محض اس لیے قتل کیا کہ وہ صحابہ سے محبت کرتے تھے (اور ان پر تبرا بازی سے انکار کرتے تھے) ان کی تعداد چار ہزار سے کم نہیں۔ ان سب کو ''مستتیر'' کے ایک قدیم مندر میں دفن کیا جاتا رہا۔[1]

جو لوگ اس کا دین قبول کرتے انہیں یہ بڑے بڑے عہدے دیتا اور ان پر مال و دولت کی بارش کر دیتا۔ پھر عجیب و غریب طریقے سے انہیں یقین دلاتا کہ وہ شرعی پابندیوں سے آزاد ہیں۔ اس دور کا ایک مؤرخ بتاتا ہے کہ ایک بار عبیداللہ جانور کی طرح دونوں ہاتھوں پیروں پر چلتے ہوئے عوام کے مجمعے میں ظاہر ہوا۔ اس نے جبہ بھی الٹا پہن رکھا تھا۔ سامنے آ کر اس نے آواز لگائی: ''بخ'' لوگ حیران ہو کر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ جب وجہ پوچھی گئی تو عبیداللہ بولا:

''جانور کی طرح چلنے کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ جانوروں جیسے ہو۔ نہ تمہاری نماز نماز ہے، نہ تمہاری زکوۃ زکوۃ، نہ تمہارا وضو وضو۔ جبہ الٹا پہننے کا مطلب یہ ہے کہ تم الٹے دین پر عمل پیرا تھے۔ اور ''بخ'' کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے سب مباح ہے۔ چاہے شراب نوشی ہو یا زنا کاری۔''[2]

رسالت کا کھلم کھلا اعلان:

عبیداللہ نے صرف مہدی اور امام ہونے کے دعوے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ رفتہ رفتہ خود منصبِ رسالت تک لے گیا اور انکار کرنے والوں کو قتل کرا تا گیا۔ بعض مفتیوں کو اس لیے قتل کیا گیا کہ انہوں نے عبیداللہ کو اللہ کا رسول کہنے سے انکار کر دیا تھا۔[3]

جھوٹی شکایات پر علماء کو سولی:

مخالفین کو قتل کرنے کا آسان حربہ یہ تھا کہ ان پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی توہین کا الزام لگا دیا جائے۔ ایسی جھوٹی شکایات پر بھی فوری کارروائی کی جاتی تھی۔ بعض مشائخ کو اسی بناء پر کوڑے اور نیزے مارے گئے اور سولی دے دی گئی۔[4]

عبیداللہ کی عبرتناک موت:

فتنوں کا سوداگر عبیداللہ ۶۲ سال گزار کر ۳۲۲ھ میں موت کی نیند سو گیا۔[5] اس کی موت بڑی عبرت ناک ہوئی تھی۔ شدید بواسیر کی وجہ سے اس کے مبرز میں کیڑے پڑ گئے تھے جس سے وہ تڑپتا رہتا تھا۔ کسی دوا سے افاقہ نہ ہوا۔ یہ کیڑے اس کے آلات بول و براز میں گھس کر انہیں کھا گئے اور یوں وہ بدترین اذیت کا نشانہ بن کر واصلِ جہنم ہو گیا۔

[1] سیر اعلام النبلاء: ۱۴۵/۱۵؛ شذرات الذهب فی خبر من ذهب لابن عماد العکری الحنبلی: ۱۱۴/۴، ۱۱۵
[2] ریاض النفوس فی طبقات علماء افریقیه لابی بکر المالکی: ۵۰۵/۲، ۵۰۶، ط دار الغرب الاسلامی
[3] سیر اعلام النبلاء: ۲۱۵/۱۴، ۲۱۶
[4] المحن لابی العرب التمیمی، ص ۲۹۴، ۲۹۵
[5] اخبار بنی عبید، ص ۴۹

بہت ہی بری جگہ ہے اترنے کی:

اس کی موت کے بعد مشہور حافظ وقاری ابن اخت الغسانی کو بلایا گیا کہ وہ اس کے سرہانے کچھ آیاتِ قرآنی پڑھ دیں۔ قاری صاحب نے بڑی کوشش کی مگر انہیں کوئی آیت یاد نہ آئی، البتہ ایک آیت خود بخود زبان پر آگئی:

يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ○

''وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا، پھر انہیں دوزخ میں جا اتارے گا۔ اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے اترنے کی جس میں یہ لوگ اتارے جائیں گے۔''[1]

قاری صاحب فرماتے تھے کہ میں نے بہت کوشش کی کہ کوئی اور آیت یاد آ جائے مگر نا کام رہا اور یہی آیت دہراتا رہا۔ اس دوران میت کے ورثاء رونے دھونے میں مشغول تھے۔ میں نے سوچا کہیں ایسا نہ ہو، ان کی توجہ آیت کے مفہوم کی طرف ہو جائے اور میں قتل کر دیا جاؤں۔ چنانچہ میں کچھ دیر تلاوت کر کے وہاں سے کھسک گیا۔[2]

عبیداللہ کا نسب:

عبیداللہ کا نام و نسب ہمیشہ ایک معمہ رہا ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس کا یہ دعویٰ تھا:

''میں عبیداللہ بن محمد بن عبداللہ بن میمون بن محمد بن اسماعیل بن جعفر صادق ہوں۔''

دوسری روایت کے مطابق اس نے اپنا نسب یوں بتایا تھا:

''میں عبیداللہ بن احمد بن اسماعیل بن محمد بن اسماعیل بن جعفر صادق ہوں۔''

تیسری روایت ہے کہ اس کا نام سعید بن احمد تھا۔ چوتھی روایت ہے کہ اس کا نام سعید بن حسین تھا۔

پانچویں روایت ہے کہ عبیداللہ کا اصل نام ''فیما'' تھا اور یہ دیصان نامی ایک مجوسی کی نسل سے تھا جس نے بے دینی پر مبنی عقائد کی اشاعت کی تھی۔ چھٹی روایت یہ ہے کہ اس کا باپ یہودی تھا۔[3]

عبیداللہ خود بھی اپنے حسب نسب کے بارے میں کوئی ثبوت پیش کر سکا نہ اس کی اولاد یہ ہمت کر سکی۔ جب بھی ان سے یہ سوال کیا گیا انہوں نے ٹال دیا۔ عبیداللہ کے ایک جانشین المُعزّ سے جب ایک سید نے اس کا نسب پوچھا تو اس نے کہا: ''کل جواب دوں گا۔'' اگلے دن اس نے دربار میں اشرفیوں کا ایک ڈھیر لگایا۔ پہلے تلوار میان سے کھینچ کر کہا: ''یہ ہے میرا نسب۔'' پھر حاضرین میں اشرفیاں لٹاتے ہوئے کہا: ''یہ ہے میرا حسب۔''[4]

بعض مؤرخین کی ایک سنگین غلطی اور اس کا ازالہ:

بعض مؤرخین نے بنوعبید کے سید ہونے کی تائید کی ہے جیسا کہ علامہ ابن خلدون کا خیال ہے مگر وہ اس کی کوئی

---

① سورۃ ھود، آیت: ٩٨
② البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ١٨٤/١
③ سیر اعلام النبلاء: ١٤١/١٥، ١٤٢
④ وفیات الاعیان: ٨٢/٣؛ سیر اعلام النبلاء: ١٤٢/١٥

دلیل پیش نہیں کر سکے، محض قیاس کے طور پر کہا ہے کہ اگر وہ سید نہ ہوتے تو صدیوں تک لاکھوں لوگ انہیں سید کیوں مانتے رہے اور ان کے لیے جانیں کیوں دیتے رہے۔ علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ بھی اسی طرف مائل دکھائی دیتے ہیں۔ مگر یہ کوئی دلیل نہیں؛ کیوں کہ بے شمار لوگ صدیوں تک نمرود اور فرعون جیسے بادشاہوں کو خدا مانتے رہے اور ان کے اشارے پر سر دھڑ کی بازی لگاتے رہے، تو کیا ایسے لوگوں کا بے وقوف یا مجبور و مقہور بن کر کسی نظریے کا مؤید بنے رہنا، نظریے کی صداقت کی دلیل ہو سکتا ہے؟

اسی لیے تحقیقی نگاہ رکھنے والے علماء جیسے امام ابوبکر باقلانی، حافظ ابن کثیر، حافظ ذہبی اور علامہ ابن تیمیہ رحمہم اللہ اسی بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ عبیداللہ جھوٹا تھا۔ اس کا یہودیوں کے ہاں رہنا، ان کی عورت سے شادی کرنا، صہیونی فری میسنریوں کے انداز میں تحریک چلانا، اس کے حاشیہ برداروں میں یہودیوں کی موجودگی اور اسلام کی جگہ جعلی اسلام کو کہیں مکروفریب کے ذریعے اور کہیں جبراً رائج کرنا، اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ وہ یہود کا ایجنٹ تھا۔ جیسے پولس یہودی نے نصرانی بن کر نصرانیوں کو توحید سے تثلیث کے جال میں پھنسایا، اسی طرح عبیداللہ بھی اسلام کی جگہ شعوری طور پر کفر و شرک رائج کرنے کے لیے کمر بستہ تھا۔ ایسے دجال کو سید کیسے مانا جا سکتا ہے۔ اس کا سید ہونے کا دعویٰ فقط اس کی زبانی منقول ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو اس کے لیے کوئی دلیل چاہیے۔

خارجی دلائل سے قطع نظر کریں تو نسب کے نفسِ دعویٰ میں سچ یا جھوٹ دونوں احتمال موجود ہوتے ہیں۔ سڑک پر کھڑا کوئی بھکاری بھی سید ہونے کا دعویٰ کر دے تو دونوں احتمال موجود ہوں گے۔ مگر اسے احتمال ہی کی حیثیت دی جائے گی نہ کہ یقینی علم کی۔ یقینی علم مضبوط دلیل کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔ اگر کسی مضبوط دلیل سے کسی کافر کا نسب کسی پیغمبر سے ثابت ہو جائے تو اسے مان لیا جائے گا جیسا کہ ایک کافر کا نوح علیہ السلام کا بیٹا ہونا اور ایک کافر کا ابراہیم علیہ السلام کا باپ ہونا قرآن میں ہے۔ مگر جہاں کوئی دلیل نہ ہو بلکہ محض احتمال ہو تو ''اصولِ درایت'' کا استعمال ضروری ہے جو پکار پکار کر کہتا ہے کہ ایسے دجال سید نہیں ہو سکتے۔ آم کے درخت پر کانٹے نہیں لگتے اور گلاب کے پودے پر برگِ حشیش نہیں اُگتا۔

عبیدی حکومت کے خلاف علماء کا ردِ عمل:

بنوعبید کی حکومت قائم ہوتے ہی علماء نے ان سے مکمل قطع تعلق کا راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے واضح طور پر فتویٰ دیا کہ یہ لوگ اہلِ قبلہ میں شامل نہیں۔ ان کے پیچھے نماز پڑھنا، ان سے شادی بیاہ کرنا، مبارکباد دینا، ان سے تعزیت کرنا، ان کے جنازوں میں شریک ہونا بالکل ناجائز ہے۔[1] جب قیروان میں بنوعبید کے سربراہ عبیداللہ کا پہلا خطبہ پڑھا گیا تو اسی وقت شہر کے سب سے بڑے فقیہ جبلہ بن حمود رحمہ اللہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کر چل دیے: ''اللہ انہیں غارت کرے۔'' اس کے بعد علماء اور دین دار لوگوں نے بنوعبید کے پیچھے جمعہ اور دیگر نمازیں پڑھنا ترک کر دیں۔[2]

[1] الدولة الفاطمية لدکتور محمد علی محمد الصلابی، ص ۷۹، بحوالة مدرسة اهل الحديث فی قيروان: ۷۸/۱

[2] رياض النفوس لابی بکر المالکی: ۴۳/۲

شمالی افریقہ کے تمام علمائے اہل سنت نے فتویٰ جاری کیا کہ بنوعبید کی مذہبی دعوت قبول کرنے والے اور ان کے لیے خطبہ پڑھنے والے دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائیں گے۔ فتویٰ دینے والوں میں مشہور افریقی فقیہ شیخ ابواسحٰق رحمہ اللہ سب سے نمایاں تھے۔ ان فتاویٰ کی اشاعت سے عوام و خواص سب جان گئے کہ بنوعبید کی حقیقت کیا ہے؛ اس لیے سوائے احمقوں اور جاہلوں کے اکثریت ان کے فتنے میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہی۔[1] صرف افریقہ ہی نہیں باقی عالم اسلام کے علماء نے بھی بنوعبید کی حقیقت کو طشت از بام کیا۔ بغداد کے علماء نے درج ذیل مضمون کا فتویٰ جاری کیا:

"یہ لوگ زندیق ہیں، ان کا نسب دیصان بن سعید خرمی سے جاملتا ہے، یہ کافروں کے بھائی ہیں۔ یہ گواہی محض اللہ کی رضا کے لیے دی جارہی ہے اور سب اس پر گواہ ہیں...... عبیداللہ کے نام سے موسوم شخص جس نے افریقہ جا کر مہدی کا لقب اختیار کیا ہے، وہ ناپاک لوگوں کی اولاد ہے، یہ لوگ باغی اور جھوٹے دعوے کرنے والے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کا کوئی نسبی تعلق نہیں۔ ہمارے علم کے مطابق ابوطالب کی اولاد میں سے کسی شخص نے ان باغیوں کے دعووں کو جھوٹا ماننے میں ذرا بھی تأمل نہیں کیا۔ یہ بات حرمین شریفین میں بھی مشہور ہے۔ اور یہ کہ یہ لوگ کافر اور فاسق ہیں، ان کا مذہب بت پرستوں اور مجوسیوں جیسے اعتقادات پر مشتمل ہے۔ انہوں نے حدودِ شرعیہ کو معطل کر دیا ہے، حرام کاری کی اجازت دی ہے، انبیاء کی توہین اور اسلاف پر لعنت کی ہے اور خدائی کا دعویٰ کیا ہے۔"

اس فتوے پر شیخ الشوافع امام ابوحامد اسفرائنی (۳۴۴ھ۔ ۴۰۶ھ)، امام ابوالحسین قدوری (۳۶۲ھ۔ ۴۲۸ھ مصنف مختصر القدوری) اور قاضی القضاۃ ابومحمد بن الاکفانی (۳۱۶ھ۔ ۴۰۵ھ) رحمہم اللہ کے علاوہ شیعہ علماء مثلاً سید شریف مرتضیٰ (۳۵۵ھ۔ ۴۳۶ھ، مؤلف نہج البلاغۃ) اور ان کے بھائی سید شریف الرضی کے دستخط بھی تھے۔[2]

اسی طرح ۴۴۴ھ میں علمائے بغداد نے ایک اور متفقہ فتویٰ جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ بنوعبید یہودی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کی اولاد سے ہونے کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ اس فتوے پر اہلِ سنت کے علاوہ شیعہ علماء کی مہریں بھی ثبت تھیں۔[3]

بنوعبید سے مناظرے:

غرض علمائے کرام نے بنوعبید کے کفریہ عقائد کو کھلم کھلا کفر کہا۔ افریقی اور شامی علماء نے اس کے بدلے قید و بند اور قتل تک کی سزائیں جھیلیں۔ بعض علماء مختلف مواقع پر روافض کو کھلے مناظرے کی پیش کش بھی کرتے رہے۔ علامہ ابوبکر قمودی رحمہ اللہ کا رافضی عالم ابوالعباس شیعی سے مناظرہ مشہور ہے جس میں ابوالعباس شیعی کو منہ کی کھانا پڑی۔[4]

---

[1] رياض النفوس للمالكي: ۳۳۹/۲

[2] العبر في خبر من غبر: ۲۰۰/۲

[3] العبر في خبر من غبر: ۲۸۴/۲

[4] الدولة الفاطمية للصلابي، ص ۸۳، بحواله مدرسة اهل الحديث في قيروان: ۸۰/۲

ان مناظرین میں شیخ عبداللہ بن تبان رحمہ اللہ بھی تھے جنہوں نے رافضی علماء کو ہر جگہ لاجواب کیا۔ سب سے زیادہ جرأت کا مظاہرہ شیخ ابوعثمان سعید بن محمد الحداد رحمہ اللہ نے کیا جو بانی فرقہ عبیداللہ کے روبرو مناظرے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ عبیداللہ نے ان سے سوال کیا: ''حدیث میں ہے کہ: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ. (جس کا میں مولا، اس کا علی مولا) تو ثابت ہوا کہ تم سب ہمارے غلام ہو۔''

شیخ ابوعثمان رحمہ اللہ نے جواب دیا: ''حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ لوگ غلام ہیں اور ہم آقا۔ اس کا مطلب صرف دینی رہنمائی میں سرداری ہے۔ (یعنی میں اور علی دینی رہنما ہیں۔)

پھر فرمایا: ''دیکھیے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ

''کسی بھی انسان کو حق نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دے کتاب و حکمت اور نبوت پھر وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم میرے بندے بن جاؤ اللہ کو چھوڑ کر۔ بلکہ (وہ یہی کہے گا کہ) ہو جاؤ اللہ والے جیسا کہ تم خود کتاب پڑھتے پڑھاتے ہو۔ وہ (نبی ہرگز) تمہیں حکم نہیں دے گا تم فرشتوں کو اور نبیوں کو رب بنالو۔ کیا وہ (نبی) تمہیں کفر کا حکم دے گا اس کے بعد کہ تم فرمانبرداری اختیار کر چکے ہو۔''[1]

علی، نبی نہیں، نبی کے وزیر تھے۔ اس آیت کے مطابق اللہ نے نبی کو بھی یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ لوگوں سے اپنی غلامی کرائے تو کسی غیر نبی کو یہ حق کیسے مل سکتا ہے۔''

عبیداللہ لاجواب ہو کر بولا: ''آپ جائیے۔ آپ سے کوئی نہیں بچ سکتا۔''[2]

ایک بار وزیر سلطنت ابوعبداللہ شیعی نے ان سے کہا: ''رسول اللہ ﷺ آخری نبی نہیں تھے؛ کیوں کہ قرآن خود کہتا ہے: وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ. (لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور آخری نبی)[3] معلوم ہوا کہ رسول اللہ الگ ہیں اور خاتم النبیین کوئی اور ہے۔''

شیخ ابوعثمان رحمہ اللہ بولے: ''یہ واؤ ابتدائے کلام کا نہیں، عطف کا ہے۔ جیسے اللہ کا ارشاد ہے: هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (وہ اللہ اول بھی ہے اور وہ آخر بھی ہے اور وہ ظاہر بھی اور وہ چھپا ہوا بھی ہے)[4] کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اول کی صفت کسی اور کے لیے ہے اور آخر، ظاہر و باطن کی صفات دوسری ہستیوں کے لیے!!''

ابوعبداللہ شیعی کو چپ لگ گئی۔[5]

---

[1] سورۃ آل عمران، آیت: ۷۹، ۸۰ [2] ریاض النفوس للمالکی: ۲/۵۹، ۶۰ [3] سورۃ الاحزاب، آیت: ۴۰
[4] سورۃ الحدید، آیت: ۳ [5] ریاض النفوس للمالکی: ۲/۶۲

ایک بار انہی شیخ ابوعثمان رحمۃ اللہ کی دوٹوک گفتگو سے ایک رافضی سردار نے طیش میں آکر ان پر نیزہ تان لیا۔ کسی نے شیخ کو سمجھاتے ہوئے کہا: ''اس طرح کی باتوں سے سردار کو غصہ نہ دلائیں، اس کے ماتحت بارہ ہزار شمشیر زن ہیں۔''

شیخ ابوعثمان رحمۃ اللہ بلا جھجک بولے: ''میں اس اللہ واحد وقہار کی خاطر ایسا کرتا ہوں جس نے عاد وثمود کو برباد کر دیا۔''

مناظرہ کرنے والے علماء قتل ہونے کے لیے تیار رہتے تھے: کیوں کہ حکام اپنی شکست برداشت نہیں کرتے تھے۔ افریقہ کے نامور عالم اور مناظر شیخ ابراہیم بن محمد الضبی رحمۃ اللہ کو اسی لیے قتل کیا گیا۔[1]

علماء کے علاوہ دیگر مسلمان بھی اس جذبے میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ قیروان کی مسجد ابن عیاض میں عروس نامی ایک مؤذن تھا۔ اس نے اذانِ فجر میں ''حَيَّ عَلىٰ خَيْرِ الْعَمَل'' کہنے کا سرکاری حکم نہ مانا۔ حکام نے اسے گرفتار کر کے کوڑے لگائے، پھر نیزے کے زخم لگا کر گدھے پر گشت کرایا گیا، زبان کاٹ دی گئی اور آخر میں سولی پر چڑھا دیا گیا۔ امام ابوالعرب رحمۃ اللہ جو اس مؤذن سے واقف مگر اس کے قتل سے بے خبر تھے، لکھتے ہیں کہ اسی شب میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے: ''عروس مؤذن اب جنت کے حجلۂ عروسی میں ہے۔''[2]

معاشرے میں ایسے ہی حق گو انسانوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور انہی کا ذکرِ خیر زندہ رہا۔

دنیا پرست علماء:

اس کے برخلاف کچھ علماء نے بنوعبید کی حلقہ بگوشی اختیار کر لی۔ ان میں سے بعض نے تو اپنا دین وایمان دولت کے لیے بیچ دیا تھا جیسے ایک فقیہ قاضی نعمان بن محمد (ابوحنیفہ قیروانی) نے قاضی کا عہدہ پانے کے لیے بنوعبید کا مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اس نے بنوعبید کے حق میں اور اہلِ سنت کے خلاف کئی کتابیں لکھیں۔ شیعی فقہ کو مدوّن کیا اور امام ابوحنیفہ اور امام مالک کی فقہ کی تردید کی۔ بنوعبید کی دعوت کے برحق ہونے پر ایک کتاب ''ابتداء الدعوۃ'' تحریر کی۔ ان خدمات کے بدلے بنوعبید نے اسے قاضی القضاۃ بنا دیا۔ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

''یہ علامہ دین سے خارج ہو جانے والوں میں شامل تھا۔ مگر اللہ کی ناراضی کا مستحق ہوا''۔

پس ایسے علماء وقتی طور پر تو شہرت پا گئے مگر درحقیقت ہمیشہ کے لیے ذلیل وخوار ہو گئے۔[3]

بعض علماء ایسے بھی تھے جنہوں نے صحیح العقیدہ ہوتے ہوئے بھی بعض اغراض کے لیے سرکاری امراء کے ساتھ نشست وبرخاست رکھی۔ اگر ایسے علماء نے کسی دینی مصلحت کی خاطر بھی یہ روش اختیار کی تھی تب بھی معاشرے میں ان کا وقار گر گیا۔ ان کی علمی کاوشوں کو خواص میں مقبولیت حاصل ہوئی نہ عوام میں۔ ابوالقاسم برذعی ایک ایسے ہی مصلحت پسند عالم تھے جو بنوعبید کی حمایت کرتے تھے؛ اس لیے ان کی ساکھ بالکل گر گئی اور افریقی فقہاء نے ان کی کتب تلف کر دینے کا فتویٰ دیا۔[4]

---

[1] رياض النفوس: ٢/٦٢، ٦٣

[2] المحن لابي العرب التميمي، ص ٢٩٤

[3] سير اعلام النبلاء: ١٦/١٥٠، ١٥١؛ العبر في خبر من غبر: ٢/١١٧

[4] الدولة الفاطمية، ص ٨٢ بحواله مدرسة اهل الحديث في قيروان: ١/٧٨

دولتِ بنوعبید (دورِ عروج)

القائم

۳۲۲ھ تا ۳۳۴ھ

عبیداللہ کے بعد اس کا بیٹا محمد ابوالقاسم ''القائم'' کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ القائم بے دینی میں اپنے باپ سے کہیں بڑھ کے تھا۔ اس کا ایک بدبخت نمائندہ حسن الضریر جس کا لقب ہی ''سَبّاب'' (گالیاں بکنے والا) تھا، کھلے عام بازاروں میں آوازیں لگاتا پھرتا:

''اِلْعَنُوْا عَائِشَةَ وَبَعْلَهَا...... اِلْعَنُوْا الْغَارَ وَمَنْ حَوىٰ''

(عائشہ اور اس کے شوہر پر لعنت کرو۔ غار پر اور جو غار میں تھے ان پر لعنت کرو۔) نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ[1]

ابویزید کا خروج اور علمائے اسلام کی طرف سے حمایت:

بنوعبید نے شمالی افریقہ کی جن حکومتوں کو تہ و بالا کیا تھا ان میں خوارج کی حکومتیں بھی تھیں۔ خوارجِ اِباضیہ کی ریاست ''دولتِ رُستمیہ'' (الجزائر) ۲۹۶ھ میں اور خوارجِ صُفریہ کی ریاست ''دولتِ بنی مدرار'' (مراکش) ۲۹۷ھ میں ختم ہوئی تھیں۔ اس کے بعد اسماعیلی مذہب کو بزورِ شمشیر پھیلانے کی کوششوں نے ہر طرف ایک گھٹن اور احساسِ محرومی کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس صورتحال سے ایک خارجی شخص ابویزید نے فائدہ اٹھایا اور لوگوں کو بنوعبید کے خلاف جمع کر کے بغاوت کر دی۔ اس کی عمر کم و بیش ۹۰ سال تھی۔ وہ خود کو ''شیخ المؤمنین'' کہلواتا تھا۔ یہ چاق و چوبند بوڑھا ایک گدھے پر سوار ہو کر گاؤں گاؤں پھرتا اور لوگوں کو لڑائی پر ابھارتا تھا۔ بنوعبید اور اس کے مابین سخت معرکے ہوئے۔[2] کئی علمائے اہلِ سنت بھی اس تحریک میں پیش پیش رہے۔ ان میں شیخ مروان بن نصران، شیخ ابوالفضل ممسی اور شیخ ربیع القطان رحمہم اللہ کے نام مشہور ہیں جو بنوعبید کو ''بنوعدوّ اللہ'' کہہ کر یاد کرتے تھے۔ شیخ ابواسحٰق رحمہ اللہ علماء کی ایک جماعت سمیت ابویزید کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے ابویزید خارجی کے لشکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اعلان کیا:

''یہ اہلِ قبلہ ہیں۔ ہم ان کے ساتھ مل کر اللہ کے ان دشمنوں سے لڑیں گے جو اہلِ قبلہ سے خارج ہیں۔''[3]

---

① کتاب الروضتین لابی شامة: ۲۲۲/۲؛ سیر اعلام النبلاء: ۳۷۳/۱۵

② اتعاظ الحنفاء للمقریزی: ۷٤/۱ تا ۸۳

③ ریاض النفوس للمالکی: ۳٤۳/۲

بنوعبید کے خلاف خروج کی دعوت دینے والوں میں مالکی فقیہ علامہ ابوالعرب بن تمیم رحمہ اللہ بھی شامل تھے جو حدیث، رجال اور تاریخ میں بلند مقام رکھتے تھے۔ وہ امام مالک رحمہ اللہ کے شاگرد رشید امام سحنون رحمہ اللہ کے تلامذہ سے مستفید ہوئے تھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد ان کے اپنے بیان کے مطابق "۱۵۰۰" تھی جن میں المحن، طبقات اہل افریقہ، فضائلِ مالک، مناقب سحنون اور التاریخ (گیارہ جلدوں میں) مشہور ہوئیں۔ ①

ان علماء میں شیخ ربیع القطان رحمہ اللہ بھی تھے جنھوں نے سب سے پہلے خروج کا فتویٰ دیا اور اسے جہاد سے موسوم کیا۔ امام احمد بن ابی الولید رحمہ اللہ نے جمعے کے خطبے میں حاضرین کو ہمت دلاتے ہوئے یہ آیت پڑھی:

"لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ"

(برابر نہیں ہیں مومنوں میں سے بیٹھ رہنے والے بغیر کسی عذر کے اور جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے) ②

پھر فرمایا: "لوگو! اس کافر سے جہاد کرو جس نے اللہ کے سوا خود کو رب قرار دیا ہے اور اللہ کے احکام کو بدل دیا اور اصحابِ رسول اور امہات المؤمنین کو گالیاں دیں۔" یہ سن کر لوگ زاروقطار رونے لگے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا:

"الٰہی! یہ قرمطی کافر جو ابن عبید اللہ کہلاتا ہے، جو رب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، جو تیری نعمت کا منکر ہے، جو تیری الوہیت کا انکار کرتا ہے، جو تیرے انبیاء اور رسولوں پر اعتراض کرتا ہے، جو تیرے رسول محمد ﷺ کو جھٹلاتا ہے، جو تیرے رسول کے صحابہ کو اور امہات المؤمنین کو گالیاں دیتا ہے، جو امت کا خون بہائے جا رہا ہے، جو حرام چیزوں کی حدود پامال کر رہا ہے، جو تجھ پر جھوٹ باندھ رہا ہے اور تیری نرمی سے دھوکے میں پڑا ہوا ہے...... الٰہی! اس پر لعنت کر، اسے ہمیشہ کے لیے رسوا کر۔ اس پر صبح وشام غضب نازل کر، اسے واصل جہنم کر اور اس سے پہلے اسے دنیا میں عبرت کا نمونہ بنادے۔ اے اللہ! اس کی جماعت کو ہلاک کردے۔ اس کی قوت کو پارہ پارہ کردے اور اہلِ ایمان کے دل ٹھنڈے کر۔"

نمازِ جمعہ کے بعد امام احمد رحمہ اللہ نے اعلان کیا: "سن لو! کل خروج ہوگا۔" ③

جب لشکر روانہ ہوا تو شیخ ربیع القطان رحمہ اللہ پوری طرح مسلح صفِ اوّل میں تھے۔ قرآن مجید ان کے گلے میں لٹکا ہوا تھا اور وہ کہہ رہے تھے: "اللہ کی حمد ہے جس نے مجھے اپنے دشمنوں سے جہاد کرنے والی جماعت میں شریک کیا۔ یااللہ! تو نے میری کونسی نیکی پسند کی ہے کہ مجھے ایسے لوگوں میں شامل کرلیا۔"

یہ کہہ کر وہ اتنا روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں اور داڑھی تر ہوگئی۔

پھر حاضرین سے کہا: "اگر آج جناب رسول اللہ ﷺ تمھیں دیکھ لیتے تو کتنے خوش ہوتے۔"

① راقم کی تلاش کے مطابق آج کل صرف المحن دستیاب ہے۔

② سورة النساء، آیت: ٩٤

③ رياض النفوس للمالكي: ٣٤٤/٢

اسی مہم کے دوران ربیع القطان رحمہ اللہ نے ایک جگہ حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ○

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جنگ کرو ان کفار سے جو تمہارے قریب آباد ہیں اور وہ تمہارے اندر سختی پائیں اور جان لو بے شک اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے۔''①

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ اَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○②

''مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا۔ کیا تم ایسے لوگوں سے جنگ نہیں کرو گے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑا اور رسول کو نکالنے کا ارادہ کیا تھا اور سب سے پہلے چھیڑ انہوں نے کی تھی۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ تو اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم واقعی مومن ہو۔ ان سے جنگ کرو، اللہ تعالیٰ انہیں عذاب دے گا تمہارے ہاتھوں اور انہیں رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمہاری مدد کرے گا...... اور مومنوں کے دلوں کو ٹھنڈا کرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کی جلن کو دور کر دے گا اور اللہ تعالیٰ عنایت کرے گا جس پر چاہے گا اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور کمال حکمت والا ہے۔''

اس پر جوش تقریر کے بعد انہوں نے آواز لگائی: ''اللہ کو یاد کرو۔ اللہ تمہیں یاد رکھے گا۔''

لوگ نعرہ تکبیر بلند کر کے آگے بڑھے اور جنگ میں شریک ہوئے۔

یہ جنگ ۳۳۳ھ میں لڑی گئی، ابتداء میں مسلمانوں کو فتح ہوئی اور انہوں نے عبیدیوں کو مار بھگایا۔ پھر آگے بڑھ کر عبیدیوں کے مرکز مہدیہ کا محاصرہ کر لیا۔ شہر کے دروازے پر لڑائی کے دوران علمائے اہلِ سنت صفِ اوّل میں تھے۔ ایسے میں ابو یزید نے اپنے ساتھیوں کو تاکید کی کہ تم قیروان والوں (اہلِ سنت) کو تنہا چھوڑ کر پسپا ہو جاؤ تاکہ دشمن ان کو روند دے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۸۵ علمائے اہلِ سنت اپنے ساتھیوں سمیت شہید ہو گئے۔ ان علماء میں شیخ ربیع القطان اور شیخ ابو الفضل ممسی رحمہما اللہ بھی شامل تھے۔ شیخ ابو العرب رحمہ اللہ بھی اس جنگ کے کچھ دنوں بعد انتقال کر گئے۔③

۳۳۴ھ میں عبیدی حکمران محمد القائم فوت ہو گیا۔ اس وقت تک ابو یزید کی شورش جاری تھی۔④

◆◆◆

① سورة التوبة، آیت: ۱۲۳ ② سورة التوبة، آیت: ۱٤، ۱٥

③ رياض النفوس للمالكي: ۲/۳٤٤؛ الاعلام زر كلي: ۳/۳٦٤؛ سير اعلام النبلاء: ۱٥/۳۷۳

④ اتعاظ الحنفاء، ص ۷٤ تا ۸۳

المنصور

۳۳۴ھ تا ۳۴۱ھ

القائم کے بعد اس کا بیٹا المنصور حکمران بنا۔ اس کی عمر اس وقت ۲۱ سال تھی۔ اس نے ۳۴۱ھ تک حکومت کی۔ ①

ابویزید خارجی کی مہمات اور اہلِ سنت سے ناروا سلوک:

ابویزید خارجی کی بنوعبید سے جنگیں جاری رہیں۔ اس نے سخت غلطی کی کہ اہلِ سنت سے بُرا برتاؤ کیا۔ وہ جس طرح بنوعبید کے خلاف تھا اسی طرح اہلِ سنت کا بھی دشمن تھا۔ اس نے مختلف مواقع پر سنی آبادیوں پر حملے کیے اور وہاں بے دریغ قتل عام کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اہلِ سنت کی آبادیوں کو لوٹنا ہمارے لیے حلال ہے۔ اس کا ساتھ دینے والے سنی علماء نے بمشکل سمجھا بجھا کر اسے ان حرکات سے روکا۔ آخر علمائے اہلِ سنت نے ایسے میں مناسب طرزِ عمل یہی سمجھا کہ اپنی طاقت بچا کر رکھی جائے۔ یوں ابویزید کے متعصبانہ طرزِ عمل نے اسے تنہا کر دیا۔ اگر وہ وسعت ظرفی سے کام لیتا تو اہلِ سنت اس کا بھرپور ساتھ دیتے رہتے جیسا کہ کئی نامور علماء اس کے پرچم تلے شہید ہوئے تھے۔ اپنی سیاسی غلطیوں کی وجہ سے ابویزید کو آخر کار شکست ہوئی اور المنصور اپنی حکومت کو بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ ②

ابویزید کا قتل:

ابویزید کو گرفتار کرنے کے بعد منصور نے اسے عبرتناک سزا دی۔ اپنے سامنے کھڑا کروا کے اس کی کھال اتروائی اور سخت اذیت ناک موت مارا۔ ③ اتنی سخت بغاوت کا سامنا کرنے کے بعد المنصور نے ضرورت محسوس کی کہ عوام کا اعتماد جیتے؛ لہٰذا اس نے لوگوں سے نرم رویہ اپنا لیا اور اپنے عقائد میں تشیع کے اظہار پر اکتفا کافی سمجھا۔ ④

ایک نابینا عالم کا سرکاری منصب سے انکار:

المنصور کی کوشش تھی کہ علمائے کرام کو اپنے لیے استعمال کرے، چنانچہ اس نے ایک نابینا مالکی عالم ابو میسرہ قیروانی کو عہدۂ قضا کی پیش کش کی مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا: ''میں نابینا بھلا یہ ذمہ داری کہاں اٹھا سکتا ہوں۔''

چونکہ انہیں حکومتی دباؤ کے سامنے مجبور ہو جانے کا خدشہ تھا؛ اس لیے دعا کی:

''یا اللہ میں نے نوجوانی میں سب سے کٹ کر تجھ سے رشتہ جوڑا تھا۔ اب تو ایسے لوگوں کو مجھ پر مسلط مت فرما۔''

اسی دن عصر کے وقت ان کا انتقال ہو گیا۔ ⑤

---

① اتعاظ الحنفاء باخبار ائمة الفاطميين الخلفاء للمقريزي: ۸۸/۱

② اتعاظ الحنفاء، ص ۸۴ تا ۹۰

③ الروضتين في اخبار الدولتين: ۲۲۲/۲

④ سير اعلام النبلاء: ۱۵۷/۱۵

⑤ سير اعلام النبلاء: ۳۹۶/۱۵

دین کی حفاظت کے لیے علمائے حق کی کوششیں:

اس دوران علماء نے نسل درنسل خفیہ طور پر تعلیم وتعلم اور دعوتِ دین کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا۔ ہر عالم کا گھر اور ہر فقیہ کا حجرہ تعلیم ودعوت کا مرکز تھا۔ نوجوان ان کے پاس آتے اور عقائد، تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کرتے۔ اس طرح اس تاریک دور میں چاہے مساجد ویران اور مدارس غیر آباد رہے مگر مسلمانوں کی کوئی نسل علم دین سے خالی نہیں رہی اور ہر وقت ہر جگہ جید علماء وفقہاء موجود رہے۔

بنوعبید کی اصل طاقت افریقہ کے کتامی، صنہاجی اور بربری قبائل تھے۔ خروج کی کوششوں میں ناکامی کے بعد علماء نے ضروری سمجھا کہ ان قبائل کی ذہن سازی کی جائے؛ اس لیے علمائے کرام نے قبائلی سرداروں کے بچوں پر خاص توجہ دی اور بڑی حکمت سے ان تک رسائی حاصل کر کے انہیں بلا معاوضہ تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتے رہے۔ آگے چل کر یہی لڑکے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے تو ان کا میلان رفض کی بجائے سنت کی طرف تھا؛ اس لیے تیس چالیس سال بعد حالات آہستہ آہستہ تبدیل ہونے لگے اور جگہ جگہ کلیدی مناصب میں اہلِ سنت کے ہمدرد پیدا ہوگئے۔[1]

المنصور کی موت:

المنصور بیمار ہو کر شوال ۳۴۱ھ میں فوت ہو گیا۔[2]

◆◆◆

---

① الدولة الفاطمية للصلابي، ص ۸۲، ۸۳، بحواله مدرسة اهل الحديث فی قيروان: ۷۸/۲ تا ۸۰

② سير اعلام النبلاء: ۱۵۸/۱۵ ط الرسالة

المُعِزّ

۳۴۱ھ تا ۳۶۵ھ

یہ المنصور کا بیٹا تھا۔ ۳۴۱ھ میں حکمران بنا۔ اس نے اپنی حکومت کو بڑی ترقی دی۔ اس کا رومی خادم ''جوہر'' وزیر بن گیا تھا جس کے تعمیراتی وترقیاتی کارنامے مشہور ہیں۔ المعزّ مصر پر قبضہ کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ مصر کا اصل علاقہ دریائے نیل کے مشرق میں تھا جہاں ملک کا انتظامی مرکز ''فسطاط'' اور دوسرے اہم شہر آباد تھے۔ وہاں اس وقت ''دولتِ اخشدیدیہ'' قائم تھی اور کافور اِخشیدی وہاں کا حکمران تھا۔

۳۵۵ھ میں المعزّ نے فوج کی سہولت کے لیے مصر جانے والی شاہراہ پر جگہ جگہ کنویں کھدوا کر پانی کا بندوبست کرایا۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا؛ کیوں کہ کچھ ہی دنوں بعد مصر کے حکمران کافور کا انتقال ہوگیا۔ وہاں کی سیاسی ابتری سے فائدہ اٹھا کر المعزّ نے مصر پر حملے کی تیاری کی اور جوہر کو افواج دے کر روانہ کردیا۔ اِخشیدی اس ٹڈی دل فوج کا مقابلہ نہ کرسکے اور پسپا ہو کر شام کی طرف نکل گئے۔ ①

اسکندریہ پر قبضہ:

ذوالحجہ ۳۵۷ھ میں عبیدی اسکندریہ پہنچ چکے تھے۔ علمائے اہل سنت زندیقیت کے اس طوفان سے سخت بے زار تھے۔ اسکندریہ کے سب سے بڑے محدث حمزہ بن محمد ابوالقاسم الکنانی رحمہ اللہ دعا کر رہے تھے:

''الٰہی! مجھے نارنجی پرچم دیکھنے سے پہلے موت دے دے۔''

دعا قبول ہوئی اور شہر کے سقوط سے تین دن پہلے ان کی وفات ہوگئی۔ ②

شعبان ۳۵۸ھ میں عبیدیوں نے اس بھرے پرے اسلامی ملک پر قبضہ کرلیا۔ مصر اہلِ سنت علماء وفقہاء کا قدیم مرکز تھا۔ لوگ بنوعبید کے اقتدار سے سکتے کے عالم میں تھے، انہیں مطمئن کرنے کے لیے المعزّ نے اعلامیہ جاری کیا کہ اذان، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد اور تمام اسلامی احکام کتاب وسنت کے مطابق جاری رکھے جائیں گے۔ ③

مگر یہ صرف ایک سیاسی بیان تھا۔ شہروں میں اپنا عملہ تعینات کرتے ہی جبراً اپنے عقائد اور بدعات کا پرچار شروع کردیا۔ پہلی نمازِ جمعہ میں قنوت نازلہ پڑھی گئی اور اذانِ فجر میں ''حَیَّ عَلٰی خَیْرِ الْعَمَل'' کا اضافہ کردیا گیا۔ ④

المعزّ نے دس رمضان کو اعلان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد افضل ترین ہستی حضرت علی ہیں۔ ⑤

① اخبار بنی عبید، ص ۸۳ تا ۸۵
② سیر اعلام النبلاء: ۱۸۱/۱۶
③ اخبار بنی عبید، ص ۸۶ تا ۸۸
④ اخبار بنی عبید، ص ۸۵، ۸۶
⑤ اتعاظ الحنفاء: ۱۳۵/۱

عیدِ غدیر اور ماتمی جلوس:

۱۸ ذوالحجہ ۳۵۸ھ کو مصر کی تاریخ میں پہلی بار روافض کی رسم ''عیدِ غدیر'' منائی گئی۔[1] یوم عاشوراء کو ماتم منانے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا، ماتمی جلوس شہروں میں توڑ پھوڑ کرنے لگے، دکانیں بند کرائی جانے لگیں اور بغداد کی طرح یہاں بھی عوام میں فتنہ وفساد اور مار کٹائی کے سلسلے شروع ہو گئے۔[2]

قاہرہ اور جامع الازہر کی داغ بیل:

المعز کے نائب جوہر نے ۳۵۹ھ میں فسطاط کے بالمقابل ایک نئے شہر قاہرہ کی بنیاد رکھی جسے بنوعبید نے اپنا پایۂ تخت بنالیا۔ تب سے آج تک یہی شہر مصر کا دار الحکومت چلا آیا ہے۔[3] اسی جوہر نے ۳۶۱ھ میں یہاں ''جامع الازہر'' نامی مسجد کی داغ بیل ڈالی تا کہ اسے مرکز بنا کر اپنے عقائدِ فاسدہ کی اشاعت کی جائے۔[4]

کفریہ شاعری:

المعز کے مبلغین لوگوں کو یہ عقیدہ سکھاتے تھے کہ خلیفہ ہی سورج کو مشرق سے طلوع کرتا اور مغرب میں غروب کرتا ہے۔[5] المعز کے دربار میں بعض خوشامدی اور بدعقیدہ شاعر تھے جو اسے خوش کرنے کے لیے کفر وشرک بکتے رہتے تھے۔ المعز کا یہ سب کچھ سن کر خاموش رہنا ثابت کرتا ہے کہ یہ پورا خاندان ایسا ہی بدعقیدہ اور بے دین تھا۔ ایک شاعر ابن ہانی کے کچھ کفریہ اشعار یہ ہیں:

فَكَأَنَّمَا أَنْتَ النَّبِيُّ مُحَمَّدٌ ۔۔۔ وَكَأَنَّمَا أَنْصَارُكَ الْأَنْصَارُ

''لگتا ہے کہ آپ ہی نبی محمد ہیں...... اور گویا آپ کے مددگار ہی اصل انصار ہیں۔''

مَا شِئْتَ لَا مَا شَاءَتِ الْأَقْدَارُ ۔۔۔ فَاحْكُمْ فَأَنْتَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ

''جو تقدیر چاہتی ہے وہ نہیں ہوتا بلکہ جو آپ چاہیں وہی ہوتا ہے۔ آپ حکم دیں؛ کیوں کہ آپ واحد وقہار ہیں۔''

اَلنُّوْرُ أَنْتَ وَكُلُّ نُوْرٍ ظُلْمَةٌ ۔۔۔ وَالْفَوْقُ أَنْتَ وَكُلُّ فَوْقٍ دُوْن

''آپ نور ہیں اور باقی ہر نور اندھیرا ہے۔ آپ سب سے بلند ہیں اور باقی سب آپ سے پست ہیں۔''

شَهِدَتْ بِمَفْخَرِكَ السَّمَاوَاتُ الْعُلٰى ۔۔۔ وَتَنَزَّلَ الْقُرآنُ فِيْكَ مَدِيْحًا

''آپ پر بلند آسمان کو فخر ہے اور آپ کی شان میں قرآن نازل ہوا ہے۔''

وَعَلِمْتَ مِنْ مَكْنُوْنِ سِرِّ اللّٰهِ مَا ۔۔۔ لَمْ يُوْتَ فِي الْمَلَكُوْتِ مِيْكَائِيْلَا

''آپ کو اللہ کے وہ چھپے ہوئے راز معلوم ہیں جو میکائیل کو بھی معلوم نہیں۔''[6]

---

[1] اتعاظ الحنفاء: ۱/۱۴۲ [2] اتعاظ الحنفاء: ۱/۱۴۵ [3] اخبار بنی عبید، ص ۸۸؛ الکامل فی التاریخ: ۷/۲۸۰

[4] تاریخ الاسلام للذهبی: ۲۷/۳۲، تدمری؛ النجوم الزاهرہ فی ملوك مصر والقاهرہ: ۴/۵۴ ...... دو صدیوں بعد سلطان صلاح الدین ایوبی نے مصر میں اپنی حکومت قائم کر کے اس مسجد کو اسلامی درسگاہ بنا دیا اور تا حال یہ عالم اسلام کی عظیم اور قدیم ترین درسگاہوں میں سے ایک ہے۔

[5] الروضتین فی اخبار الدولتین: ۲/۲۲۱ [6] الدولة الفاطمية للصلابی، ص ۶۹، ۷۰ بحوالہ الفتح العربی فی لیبیا ...

ایک بار اس نے المعز کی طرف اشارہ کر کے کہا:

حَلَّ بِرَقَّادَةَ الْمَسِيْحُ   حَلَّ بِهَا آدَمُ وَنُوحُ

''یہاں رقادہ شہر میں مسیح تشریف لائے ہیں۔ یہاں آدم ونوح نازل ہوئے ہیں۔

حَلَّ بِهَا اللّٰهُ ذُوالْمَعَالِي   فَكُلُّ شَيْءٍ سِوَاهُ رِيْحُ

''بلکہ یہاں اللہ تعالیٰ ہی آگئے ہیں۔ان کے سوا ہر چیز فانی ہے۔''[1]

یہ بد بخت شاعر اَندَلُس کے شہر اشبیلیہ کا تھا۔عقل پرست، فلسفی اور شرابی کبابی تھا۔اہلِ اَندَلُس نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا تو یہ فرار ہو کر قیروان آ گیا اور بنوعبید کا نوکر بن گیا۔[2] اسے اللہ نے بدگوئی کی عبرت ناک سزا دی۔خود اس کے ہم نشینوں نے ۳۶۲ھ میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔اس کی عمر ۵۰ سال سے زائد تھی۔[3]

قَرامِطہ سے کش مکش:

المُعِزّ کے دور تک شام میں قَرامِطہ کی حکومت تھی اور حسن بن احمد (اعصم) قَرامطی ان کا سربراہ تھا۔بنوعبید اور قَرامطی ایک ہی شیعی فرقے اسماعیلیہ کے پیروکار تھے مگر محصولاتِ ملکی کے لین دین پر ان کے مابین اختلافات شروع ہو گئے اور آخر کار المُعِزّ نے نہ صرف یہ کہ قَرامِطہ کو بزورِ قوت شام سے نکال دیا بلکہ سازشیں کر کے انہیں ان کے قدیم مرکز بحرین کے بڑے حصے سے بھی بے دخل کر دیا۔[4]

اہلِ شام پر مظالم:

شام پر قبضے کے بعد بنوعبید کے شامی گورنر خُبیش بن محمد نے (جس کا تقرر ۳۶۳ھ میں ہوا) لوگوں پر روح فرسا مظالم ڈھائے۔یہاں تین ہزار کے لگ بھگ بے گناہ افراد کو تہ تیغ کیا گیا۔اس ظلم کی پاداش میں وہ چند ہفتوں بعد ایک شدید اذیت ناک بیماری میں مبتلا ہوا۔کہا جاتا ہے کہ ایک عابد ابوبکر بن الحرمی نے اس کے لیے بددعا کی تھی۔ خُبیش چلاتا رہتا تھا:''مجھے قتل کر کے اس اذیت سے نجات دلا دو۔'' آخر وہ اسی بیماری میں مبتلا رہ کر مر گیا۔[5]

فقیہ ابوبکر نابلسی پر انسانیت سوز ظلم:

المُعِزّ نہایت ظالم اور بے رحم انسان تھا۔شام پر قبضے کے بعد وہاں کے علماء کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔رملہ کے مشہور فقیہ ابوبکر ابن نابلسی (محمد ابن احمد بن سہل) رحمہ اللہ ایک مدت سے بنوعبید کے خلاف خروج اور جہاد کا فتویٰ دیتے آئے تھے۔شام کے گورنر ابو محمود کتامی کے حکم سے انہیں گرفتار کر کے لکڑی کے ایک پنجرے میں بند کرا کے قاہرہ بھیج دیا گیا۔ انہیں ایک سال قید رکھا گیا۔

[1] الدولة الفاطمية للصلابي، ص ۷۳؛ بحواله الفتح العربي في ليبيا: ۳۶۲/۱، اس شرکیہ کلام سے اللہ کی پناہ

[2] العبر في خبر من غبر: ۱۱۴/۲، ۱۱۵

[3] مرآة الجنان وعبرة اليقظان: ۲۸۲/۲، ۲۸۳؛ الدولة الفاطمية، ص ۷۰ بحواله الفتح العربي في ليبيا، ص ۳۶۲

[4] اخبار بن عبيد، ص ۸۳ تا ۹۰

[5] سير اعلام النبلاء: ۵۵/۱۷، ۵۶

۳۶۳ھ میں المُعِزّ کے نائب جوہر نے انہیں روبرو حاضر کر کے پوچھا:

''کیا تم نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر کسی کے پاس دس تیر ہوں تو وہ ایک تیر نصرانیوں کے اور نو تیر بنوعبید کے خلاف چلائے۔''

اس مردِ مجاہد نے کہا: ''نہیں یہ میرا فتویٰ نہیں۔ میرا فتویٰ تو یہ تھا کہ اگر کسی کے پاس دس تیر ہوں تو وہ دس کے دس تیر تمہارے خلاف چلائے؛ کیوں کہ تم نے دین کو مٹا دیا۔ صالحین کو قتل کیا۔ اللہ کے دیے ہوئے نورِ ہدایت کو بجھا دیا۔''

جوہر آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے ایک یہودی کو بلوایا جو انسانوں کی کھال اتارنے کا ماہر تھا۔ فقیہ نابلسی کو سامنے کھڑا کر کے یہودی کو ان کی کھال اتارنے کا حکم دیا گیا۔ اس نے سر کی چوٹی پر نشتر لگا کر کھال اتارنا شروع کی، اس انسانیت سوز سلوک کے دوران فقیہ نابلسی رحمہ اللہ نے رحم کی بھیک مانگی نہ آہ وزاری کی۔ وہ مسلسل اللہ کا ذکر کر رہے تھے۔ یہودی کا نشتر چہرے تک پہنچا تو فقیہ نابلسی یہ آیت پڑھ رہے تھے:

كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا

(یہ چیز لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی تھی) ①

سینے تک کھال ادھیڑنے کے بعد خود یہودی کو رحم آ گیا اور اس نے نشتر دل میں گھونپ کر انہیں ختم کر دیا۔

پورے عالمِ اسلام میں جہاں بھی اس دردناک واقعے کی خبر پہنچی لوگوں کی حالت غیر ہو گئی۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ جب بھی ابوبکر ابن نابلسی رحمہ اللہ کو یاد کرتے تو روتے روتے بے حال ہو جاتے۔ ②

اندلس پر قبضے کی ناکام کوشش:

المُعِزّ نے اَندَلُس پر قبضے کی بھی کوشش کی مگر ہر بار اَندَلُس کے دلیر مسلمانوں نے اس کی فوجوں کو مار بھگایا۔

اپنے آخری ایام میں المُعِزّ کا اثر ورسوخ اتنا بڑھ گیا تھا کہ ۳۶۵ھ میں مکہ اور مدینہ کے حکام بھی اس کے باج گزار بن گئے تھے اور سرکاری وظیفہ خور علماء مسجدِ الحرام اور مسجدِ نبوی کے منابر پر اس کے لیے دعائیں کرنے لگے۔ یہی المُعِزّ کی زندگی کا آخری سال تھا۔ ③

◆◆◆

① سورۃ الاحزاب، آیت: ٦
② سیر اعلام النبلاء: ١٤٨/١٦، ١٤٩
③ اتعاظ الحنفاء، ص ٩٣ تا ٢٣٦؛ اخبار بن عبید، ص ٩٠ تا ٩٣

العزیز

۳۶۵ھ تا ۳۸۶ھ

المُعِز کی موت کے بعد اس کا بیٹا العزیز کے لقب سے حکمران بنا۔ وہ اپنے باپ دادا جیسا ظالم و جابر نہ تھا۔ اس کے دور میں بنوعبید کا سکہ شام اور یمن میں بھی چلنے لگا۔ شام کے بڑے بڑے شہر مثلاً: حماہ، حمص اور حلب بھی ان کے ماتحت آ گئے۔ حتیٰ کہ ۴۰۱ھ میں کوفہ اور موصل میں بھی بنوعبید کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ [1]

اگر سچا ہے تو اپنا نسب بیان کر:

عوام بنوعبید سے تنگ آ چکے تھے مگر کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ ایک بار جمعے کی نماز سے بہت پہلے کسی ظریف شاعر نے ایک رقعہ لکھ کر منبر پر رکھ دیا اور غائب ہو گیا۔ العزیز خطبہ دینے منبر پر چڑھا تو یہ رقعہ دکھائی دیا۔ کھولا تو اس میں لکھا تھا:

إذا سَمِعْنَا نَسَبًا مُنْكَرًا ۔۔۔ نَبْكِي عَلَى الْمِنْبَرِ وَالْجَامِعِ

''جب ہم ایک جھوٹا نسب سنتے ہیں تو اس منبر اور جامع مسجد کے حال پر رو دیتے ہیں۔''

إنْ كُنْتَ فِيمَا تَدَّعِي صَادِقًا ۔۔۔ فَاذْكُرْ أَبًا بَعْدَ الْأَبِ الرَّابِعِ

''اگر تو اپنے دعوے میں سچا ہے تو چوتھی پشت سے اوپر باپ دادا کا نام بتا۔''

وَإِنْ تُرِدْ تَحْقِيقَ مَا قُلْتَهُ ۔۔۔ فَانْسُبْ لَنَا نَفْسَكَ كَالطَّائِعِ

اگر تو اپنی بات کو ثابت کرنا چاہتا ہے تو اپنا نسب ایسے بیان کر جیسے خلیفہ طائع عباسی اپنا نسب بیان کرتا ہے۔''

أَوْ لَا، دَعِ الْأَنْسَابَ مَسْتُورَةً ۔۔۔ وَادْخُلْ بِنَا فِي النَّسَبِ الْوَاسِعِ

''اگر نہیں تو نسب کو پوشیدہ رہنے دے اور ہماری طرح ایک عامی النسب آدمی بن جا۔''

فَإِنَّ أَنْسَابَ بَنِي هَاشِمٍ ۔۔۔ يَقْصُرُ عَنْهَا طَمَعُ الطَّامِعِ

''کیوں کہ بنوہاشم کے انساب (اتنے معروف ہیں کہ ان) میں کوئی لالچی (فریب کاری کا) لالچ نہیں کر سکتا۔''

العزیز اس کے جواب میں بغلیں جھانکنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ [2]

اسی طرح ایک بار کسی اور شاعر نے یہ رقعہ ڈال دیا:

بِالظُّلْمِ وَالْجَوْرِ قَدْ رَضِينَا ۔۔۔ وَلَيْسَ بِالْكُفْرِ وَالْحَمَاقَة

''ہم پر ظلم و ستم ہوتا رہے یہ تو گوارا ہے..... مگر کفر اور حماقت سے اللہ محفوظ رکھے۔''

[1] الكامل في التاريخ: ۵۷۱/۷

[2] سير اعلام النبلاء: ۱۶۹/۱۵، ط الرسالة

اِنْ کُنْتَ اُعْطِیْتَ عِلْمَ غَیْبٍ فَقُلْ لَنَا کَاتِبَ الْبِطَاقَةِ

''اگر تو علم غیب کے دعوے میں سچا ہے..... تو بتا دے کہ یہ رقعہ کس نے لکھا ہے۔''

العزیز بہت جھلایا مگر پرچہ لکھنے والے کو پہچان لینا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔[1]

العزیز نے ساڑھے پچیس سال حکومت کی۔ رمضان ۳۸۶ھ میں غسل کرتے ہوئے اس کی روح پرواز کر گئی۔[2]

یہودی النسل وزیر۔ ابن کلّس :

العزیز نے غیر مسلموں کو کلیدی عہدے دیے۔ ایک نصرانی عیسیٰ بن نسطورس کو مصر اور ایک یہودی منشّا کو شام کا گورنر بنا دیا۔[3] اس کے دور میں سلطنت کا وزیر ابن کلّس تھا۔ یہ ایک نہایت شاطر اور عیار یہودی تاجر تھا جو پہلے مصری حکمران کافور اخشیدی کا درباری بنا۔ اسی دوران اس نے بظاہر اسلام قبول کیا اور علوم عربیہ سیکھ لیے۔ بہت جلد اسے اتنی ترقی ملی کہ وزیر سلطنت بن گیا۔ مصر پر المُعز کے قبضے کے بعد اس نے بنوعبید کے دربار سے وابستہ ہونے کی کوشش کی۔ بنوعبید کے حاشیہ برداروں میں یہودیوں کو اچھا خاصا اثر ورسوخ حاصل تھا۔ انہی کی وساطت سے اس نے دربار میں رسائی حاصل کر لی۔ المُعز کے بعد العزیز نے حکمران بنتے ہی ابن کلّس کو وزیر سلطنت مقرر کر دیا۔

ابن کلّس نے اپنی خدمات سے بنوعبید کو ہمیشہ خوش رکھا۔ اس نے شیعہ فقہ پر ایک کتاب مدوّن کی جسے العزیز نے دربارِ عام میں سنوایا اور اسے پوری سلطنت کا قانون بنا دیا۔ اس دور میں قاضیوں پر لازم کر دیا گیا کہ وہ اسی کے مطابق فیصلے کریں۔ اس طرح عالم اسلام کے ایک بڑے رقبے پر ایک یہودی النسل رافضی کا مدون کردہ قانون نافذ ہو گیا۔[4]

یہودی وزیر کی موت پر العزیز کا رنج وغم :

پندرہ سال کی وزارت کے بعد ۳۸۰ھ میں ۶۲ سالہ ابن کلّس کا انتقال ہوا۔ العزیز ابنِ کلّس کا پیر و مرشد جیسا ادب کرتا تھا۔ اس کی عیادت کرتا رہا، اس کی موت پر بہت رویا اور شاہی محل میں اپنے ہاتھوں سے وہیں دفنایا جہاں وہ خود دفن ہونا چاہتا تھا۔ ابن کلّس نے العزیز کو جو وصیت کی تھی اس سے اس کے رجحانات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس نے کہا تھا: ''رومیوں سے صلح رکھیے جب تک وہ آپ سے دوستی رکھیں۔ بنوحمدان کے ہاں اپنی دعوت کی قبولیت اور اپنا سکہ جاری رہنے پر اکتفا کیجیے۔ مگر مفرج بن دغفل پر جب بھی قابو پائیں اسے زندہ نہ چھوڑیں۔''[5]

ابن کلّس کی سالانہ تنخواہ دو لاکھ دینار (تقریباً ۵۰ کروڑ روپے) تھی۔ اس کے علاوہ بھی اسے جو ملتا تھا، اس کا کوئی حد وشمار نہ تھا۔ اس کے ٹھاٹھ باٹ کسی بادشاہ سے کم نہ تھے۔ جب وہ مرا تو اس کے خزانے میں موجود جواہر و نوادرات کی

[1] وفیات الاعیان: ۳/ ۳۷۳، دار صادر

[2] اتعاظ الحنفاء... اخبار بنی عبید، ص ۹۴

[3] سیر اعلام النبلاء: ۱۵/ ۱۶۸، الرسالة

[4] قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جس فرقے کی فقہ ایک یہودی نے مدوّن کی ہو اس کا بھلا اسلام سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

[5] بنوحمدان سے الجزیرہ کے حکمران سیف الدولہ وغیرہ مراد ہیں۔ مفرج بن دغفل فلسطین میں بنوعبید کے خلاف خروج کرنے والا ایک عرب سردار تھا۔

قیمت قیاس سے بالاتر تھی۔ صرف اس کے غلاموں کی تعداد چار ہزار تھی۔ اس کے کفن کی لاگت دس ہزار دینار (تقریباً اڑھائی کروڑ روپے) تھی۔ [1]

جوہر کی وفات:

العزیز ہی کے دور میں سابق وزیرِ سلطنت جوہر کا انتقال ہوا۔ مصر اور شام پر بنوعبید کو قبضہ دلانے میں اس کا کردار سب سے نمایاں تھا۔ قاہرہ کی تعمیر نے اس کا نام تاریخ میں زندہ رکھا ہے۔ تاہم اس کے ساتھ اس نے علماء پر جو مظالم ڈھائے وہ اس کے دامن پر ایک بدنما داغ ہیں۔ [2]

قبیلہ صنہاجہ کا اقتدار:

العزیز کے دور کی خاص بات یہ تھی کہ اس نے بنوعبید کے قدیم نمک خوار قبیلے کتامہ کی جگہ بربری قبیلے صنہاجہ کو ترقی دی اور تیونس سے مراکش تک تمام علاقے اس کے سپرد کر دیے۔ اس طرح یہاں صنہاجی سردار ماتحت حکام کے طور پر حکومت کرنے لگے۔ ان میں سب سے بڑا سردار یوسف بُلُکّین بن زیری تھا جس نے ۳۶۲ھ سے ۳۷۳ھ تک حکومت کی۔ اس کے بعد یہ علاقے اسی کی اولاد کے ماتحت رہے۔

یہ شخص اہل سنت کے لیے نرم رویہ رکھتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی تیس سال پہلے علمائے اہلِ سنت نے صنہاجی سرداروں کی اولاد میں تعلیم اور اصلاح وارشاد کا کام شروع کیا تھا جس کے اثرات پورے قبیلے پر پڑے تھے؛ اس لیے یوسف بُلُکّین نے شمالی افریقہ میں اہلِ سنت پر پابندیوں کو نرم کر دیا اور علماء کو وعظ وارشاد، درس وتدریس اور تصنیف و افتاء کی آزادی دے دی۔ البتہ مساجد میں خطبہ بنوعبید ہی کا پڑھا جاتا تھا اور ان کی شروع کی ہوئی بہت سی بدعات بھی باقی تھیں۔ یوسف بن زیری کی یہ حکومت اگرچہ بنوعبید کی باج گزار تھی مگر بعد میں یہ خود مختار ہوگئی اور ''دولتِ آلِ زیری'' کہلائی۔ [3]

❖❖❖

[1] وفيات الاعيان: ٣٤/٧؛ النجوم الزاهرة: ١٤٦/٤؛ المنتظم: ١٥٥/٧

[2] وفيات الاعيان: ٣٧٨/١؛ سير اعلام النبلاء: ٤٦٨/١٦

[3] الدولة الفاطمية للصلابي، ص ٩٣، ٩٤ بحواله موسوعة المغرب العربي: ٢٤/٢ تا ٣٠

الحاکم

۳۸۶ھ تا ۴۱۱ھ

العزیز کی موت کے بعد اس کا بیٹا الحاکم کے لقب کے ساتھ حکمران بنا۔ تخت نشین ہوتے وقت اس کی عمر گیارہ سال تھی۔[1] اس کے دور میں خلافتِ بغداد بنو بُوَیہ کے اقتدار کی وجہ سے بہت کمزور ہو چکی تھی؛ اس لیے کوفہ اور مدائن میں بھی بنو عبید کا سکہ اور خطبہ چلنے لگا۔[2] اسی کے دور میں مشرقی افق پر سلطان محمود غزنوی کا ظہور ہوا۔ الحاکم نے اس شیرِ نر کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی مگر سلطان محمود نے اس زندیق کے مراسلے پر تھوک دیا۔[3]

تکبر، ضد، نخوت، نفرت، ظلم اور سفاکی جیسے عیب الحاکم کو وراثت میں ملے تھے؛ لہٰذا اس نے عوام پر ظلم وستم میں اپنے باپ داددں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اس نے ایک عقوبت خانہ بنایا تھا جس کا نام ''جہنم'' رکھا گیا۔ وہاں تشدد کے عجیب وغریب آلات تھے۔ جس شخص پر سرکاری عتاب ہوتا، اسے اس عقوبت خانے میں پھینک دیا جاتا۔[4]

وہ کم عمر تھا اور ساتھ ہی احمق بھی۔ مگر درباریوں کے نزدیک وہ ''امام معصوم'' تھا جس کی کوئی بات غلط ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ سابقہ عبیدی حکمرانوں کی طرح اس کا ہر حکم پتھر پر لکیر تھا؛ لہٰذا یہ دور بہت ہی عجیب وغریب گزرا۔ الحاکم ایک دن ایک حکم دیتا۔ کچھ دنوں بعد اسے منسوخ کر کے اس کے برعکس کوئی اور ہدایت جاری کر دیتا۔ اکثر کام جنہیں وہ بڑے اہتمام سے کراتا، کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ بعض احکام اچھے ہوتے، بعض مضحکہ خیز اور بعض افسوسناک۔

۳۹۵ھ میں اس نے گورنروں کو حکم دیا کہ صحابہ کرام پر سب وشتم کریں۔ صحابہ کے لیے توہین آمیز الفاظ کے کتبے بازاروں، مساجد اور بڑی عمارتوں پر نصب کرا دیے۔ صحابہ کرام کے خلاف گالم گلوچ لکھنا عام ہو گیا۔ سرکاری کارندے صحابہ کرام کی تعریف کرنے والوں کو گرفتار کرتے اور سرعام گردن اڑا کر کہتے:

''ابوبکر وعمر سے محبت کرنے والوں کا انجام یہ ہوتا ہے۔''[5]

حاکم کے عجیب وغریب احکامات:

۳۹۹ھ میں اس نے نمازِ تراویح کی اجازت دی مگر ۴۰۱ھ میں ممانعت کر دی۔[6] پورے مصر اور شام میں نماز

---

[1] اتعاظ الحنفاء باخبار ائمة الفاطميين الخلفاء: ۳/۲

[2] سير اعلام النبلاء: ۱۷۷/۱۵ . ط الرسالة

[3] البداية والنهاية: ۵۴۴/۱۵، ۶۳۳؛ سير اعلام النبلاء: ۱۷۸/۱۵. ط الرسالة

[4] سير اعلام النبلاء: ۱۷۷/۱۵ . ط الرسالة

[5] الروضتين في اخبار الدولتين: ۲۱۴/۲ تا ۲۲۴

[6] اتعاظ الحنفاء باخبار ائمة الفاطميين الخلفاء: ۷۸/۲، ۸۶

تراویح دوبارہ بند ہوگئی۔ ایک عالم ابوالحسن بن دقاق ہمت کر کے اپنی مسجد میں پورے ماہ نمازِ تراویح پڑھاتے رہے۔ الحاکم کو پتا چلا تو انہیں قتل کرادیا۔ ۷ سال تک افریقہ، مصر اور شام کے لوگ نمازِ تراویح سے محروم رہے۔ ۴۰۸ھ میں دوبارہ تراویح کی اجازت دے دی۔ (تاہم الحاکم کے بعد والے عبیدی حکمرانوں نے تراویح پر دوبارہ پابندی لگادی۔)

۳۹۵ھ میں الحاکم نے حکم دیا کہ کتے جہاں دکھائی دیں انہیں ماردیا جائے۔ اس نے بعض قسم کی مچھلیوں کو حرام قرار دے دیا۔ ان کے کاروبار پر پابندی لگادی۔ جو شخص مچھلی کی خرید وفروخت میں ملوث ہوتا قتل کردیا جاتا۔ جَو کی بنی ہوئی شراب کو حرام کردیا۔ باقی قسم کی شرابیں چلتی رہیں۔ ۴۰۲ھ میں کھجور اور انگور کی کاشت اور خرید وفروخت ممنوع قرار دے دی۔ ان کے باغ نذر آتش کرادیے۔ شہد پر پابندی عائد کردی اور پورے ملک سے شہد کے ذخائر تلاش کر کے انہیں بحیرۂ روم میں بہادیا گیا۔ اس شہد کی مقدار پانچ ہزار مٹکوں سے زائد تھی۔ ۴۰۳ھ میں یہودیوں کے لیے سیاہ عمامے پہننا اور عیسائیوں کے لیے گلے میں صلیب لٹکانا لازم کردیا۔ نجومیوں کو جلاوطن کردیا۔

۴۰۰ھ میں اس نے ''اسلام پسندی'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے قاہرہ میں ''الجامع الحاکمی'' کے نام سے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی، دارالعلم کے نام سے ایک درسگاہ بنوائی اور وہاں فقہاء ومحدثین کے درس کے حلقے لگوائے۔ یہ دیکھ کر لوگ اسے دعائیں دینے لگے اور سمجھے کہ شاید وہ صحیح مسلمان بن گیا ہے مگر تین سال بعد اس نے یک دم رخ بدلا، درسگاہ بند کرادی اور فقہاء ومحدثین کو قتل کرادینے کا حکم دیا۔

ایک موقع پر اس نے مصر کے گرجے منہدم کرادیے اور عیسائیوں کو جبراً مسلمان کرنے کی کوشش کی۔ عیسائیوں کا سب سے بڑا گرجا بھی مسمار کرادیا جو بیت المقدس میں تھا۔ کچھ عیسائیوں نے ڈر کر کلمہ پڑھ بھی لیا۔ چند سالوں بعد اس نے بیت المقدس کے گرجے کے سوا باقی گرجے دوبارہ تعمیر کرادیے اور کلمہ پڑھنے والے عیسائیوں کو دوبارہ سابقہ مذہب اختیار کرنے کا حکم دیا۔

ایک بار فقہ مالکی سے شغف رکھنے والے بعض افریقی حکمرانوں کو متاثر کرنے کے لیے اس نے دو مالکی فقہاء کو اپنے ہاں بلایا اور ان کا اعزاز واکرام کر کے انہیں جامع مسجد میں درس دینے کی ذمہ داری سونپ دی۔ مگر چند دنوں بعد موڈ بگڑا تو دونوں کے سر قلم کرادیے۔

ایک بار اس نے عورتوں کے گھروں سے نکلنے پر سخت پابندی لگادی۔ خلاف ورزی کرنے والی کئی جوان عورتوں کو قتل اور بوڑھی خواتین کو دریا میں غرق کردیا گیا۔ سات سال سات ماہ تک یہ پابندی لگی رہی۔ پھر حکم دیا کہ عورتیں آزادانہ گھوم پھر سکتی ہیں۔

ایک بار اسے تواضع وانکساری کا شوق ہوا تو اپنے لیے زمین بوسی کی ممانعت کرادی۔ خطبے اور مراسلوں میں اپنے لیے القاب وآداب اور دعائیں ممنوع قرار دے دیں اور صرف سلام پر اکتفا کرنے کا حکم دیا۔

آخری چند سالوں میں اسے روحانی (درحقیقت سفلی) علوم اور نجوم کا چسکا لگ گیا۔ وہ قاہرہ کے کوہِ مقطم پر خاصا

وقت تنہا گزارنے لگا۔ اب وہ محل سے نکلتا تو گدھے پر سوار ہوتا۔ ایک دیوقامت حبشی اس کے ساتھ ساتھ چلتا۔ راستے میں اسے کسی پر غصہ آجاتا تو اس حبشی کو حکم دیتا کہ اس سے بدفعلی کرے۔ جس بے چارے کی شامت آتی وہ بھرے بازار میں یہ عجیب وغریب سزا پاتا اور انسانیت منہ چھپانے پر مجبور ہو جاتی۔

ایک بار اس پر بڑا بننے کا بھوت سوار ہوا تو خدائی کا دعویٰ کرنے کی سوچنے لگا۔ اس کے درباریوں نے بڑی مشکل سے اسے سمجھایا اور عام بغاوت کا خوف دلا کر اس کفرِ بواح سے روکا۔

ایک بار غصہ آیا تو حکم دیا قاہرہ کی آبادی کو لوٹ کر نذرِ آتش کر دیا جائے۔ فوجی آبادی میں گھس گئے، عوام کا سب کچھ لوٹ لیا اور گھروں کو جلا کر خاک کر دیا۔ الحاکم نے اپنے خاص خادم سے آتش زنی کا چشم دید حال سنانے کی فرمائش کی تو اس نے اپنے طور پر بڑا مختصر اور جامع فقرہ بولا:

> ''اگر رومی بھی حملہ کرتے تو اس سے زیادہ تباہی نہیں مچا سکتے تھے جو میں دیکھ کر آیا ہوں۔''

خادم کو اس فصاحت وبلاغت پر انعام واکرام کی توقع ہوگی مگر الحاکم نے اسے قتل کرا دیا۔ [1]

ابورَکوَہ کا خروج:

الحاکم کے دور میں ایک اموی سردار ابورَکوَہ کا خروج قابلِ ذکر ہے جس نے قریب قریب بنوعبید کو بے بس کر ڈالا تھا۔ اس کا اصل نام ولید بن یزید تھا۔ وہ صوفیوں جیسا سادہ لباس پہنتا اور انہی جیسا خاص لوٹا اٹھائے پھرتا جسے ''رَکوَہ'' کہا جاتا ہے۔ اس لیے لوگ اسے ''ابورَکوَہ'' کہنے لگے۔ وہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک کی نسل سے تھا، عالم فاضل اور عابد وزاہد ہونے کے ساتھ چالاک اور ہوشیار بھی تھا۔ اس نے لوگوں کی ذہنیت کو سامنے رکھا کہ وہ ہر ''امام'' کے پیچھے چل دیتے ہیں؛ اس لیے خود امامت کا دعویٰ کر دیا۔ بنوعبید سے تنگ آئے ہوئے ہزاروں لوگ اس کے ساتھ ہو گئے۔

عرب قبیلے بنوہُذَیل نے خاص طور پر اس سے تعاون کیا۔ ابورَکوَہ نے بہت جلد بَرقہ اور گردونواح سے بنوعبید کو بے دخل کر کے وہاں حکومت بنالی۔ پھر یلغار کر کے مصر کے خاصے علاقے پر بھی قبضہ کر لیا۔ یہ دیکھ کر الحاکم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، اس نے شام سے تازہ دم افواج منگوائیں اور ابورَکوَہ سے کئی جنگیں لڑیں۔

ابورَکوَہ کا زور توڑنا مشکل تھا کہ عوامی طاقت اس کے ساتھ تھی؛ اس لیے الظاہر نے دھوکے سے کام لیا اور کچھ امراء کو حکم دیا کہ اس کے ساتھ مل جائیں اور موقع پا کر اسے اغواء کر لیں۔ اس منصوبے کے مطابق ولید بن یزید گرفتار ہو گیا۔ اس نے جاں بخشی کی درخواست کی جو مسترد کر دی گئی۔ [2]

ابورَکوَہ کی خودکشی:

ابورَکوَہ کو قاہرہ کی سمت اس طرح روانہ کیا گیا کہ ایک سدھایا ہوا بندر اس کی پشت پر بندھا ہوا تھا جو اسے طمانچے مارتا

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۱۵/۱۷۳ تا ۱۸٤؛ اخبار بنی عبید: ۹۵ تا ۱۰۳؛ العبر فی خبر من غبر: ۲/۱۹٦ تا ۲۰۸

[2] الکامل فی التاریخ: سنۃ ۳۹۷ ھ؛ اخبار بنی عبید، ص ۱۰٤۔ نوٹ: اخبار بنی عبید میں ابورَکوَہ کے خروج کا قصہ ۳۹۵ھ کے تحت ہے۔

جاتا تھا۔ یہ ذلت دیکھ کر ابورکوہ کو یقین ہو گیا کہ الحاکم اسے بدترین اذیتیں دے کر مارے گا؛ چنانچہ قاہرہ کے راستے میں اس نے کوئی زہریلی چیز کھا کر خودکشی کر لی۔ اس کے باوجود قاہرہ میں اس کا سر قلم کیا گیا اور لاش کو سرِ عام سولی دی گئی۔ ①

مظالم کی انتہاء۔ الحاکم اپنے خاندان کے ہاتھوں قتل:

الحاکم نے آخری ایام میں قاہرہ کے عوام پر مظالم کی انتہاء کر دی۔ مرد ہی نہیں عورتوں کو بھی حکومت کی مخالفت کے شبہے میں گرفتار کر کے طرح طرح کی اذیتوں کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ اس کی بد دماغی سے اس کے افسران اور اہلِ خانہ بھی تنگ آ گئے۔ اس کی ہمشیرہ اس کی احمقانہ سیاست پر اعتراض کیا کرتی تھی اور جواب میں اس کی دھمکیاں سنتی۔ آخر ہمشیرہ نے فوج کے ایک اعلیٰ افسر ابنِ دوّاس کو نئی حکومت میں بڑے عہدے کا لالچ دے کر الحاکم کے قتل پر آمادہ کر لیا۔ الحاکم کی عادت تھی کہ وہ گدھے پر سوار ہو کر پہاڑ کی طرف نکل جاتا اور کچھ وقت خلوت میں گزارتا تھا۔ قاتلوں نے اس تنہائی کے وقت کو غنیمت سمجھ کر اس پر کاری وار کیا اور قتل کر کے لاش غائب کر دی۔ یہ ۴۱۱ھ کا واقعہ ہے۔ کچھ دنوں تک لاش نہ ملنے پر اہلِ سلطنت کو یقین ہو گیا کہ الحاکم کو قتل کر دیا گیا ہے۔ ②

الحاکم نے ۳۶ سال نو ماہ عمر پائی اور ۲۵ سال حکومت کی۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے بقول:

''وہ اپنے دور کا شیطان مردود اور فرعونِ زمانہ تھا۔'' ③

مُعِز بن بادیس۔ افریقہ میں مسلمانوں کا مددگار:

اسی دور میں شمالی افریقہ میں بادیس بن منصور بنوعبید کے ماتحت حکمران کی حیثیت سے شمالی افریقہ کے انتظامات سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ بربری قبیلے صنہاجہ کی شاخ آلِ زیری کا سردار تھا۔ ۴۰۶ھ میں اچانک اس کی موت واقع ہوئی تو اس کے آٹھ سالہ بیٹے مُعِز بن بادیس نے اس کے جانشین کی حیثیت سے حکومت سنبھال لی۔ وہ عقیدے کے لحاظ سے پختہ سنی تھا۔ اس نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد عدلیہ کا شعبہ مالکی فقہاء کو سونپ دیا۔ اس طرح شعائرِ سنت زندہ ہونے لگے اور رافضی حکمرانوں کو فوری طور پر یہ احساس نہ ہوا کہ تیونس سے مراکش تک کتنی بڑی تبدیلی آ رہی ہے۔ ④

◆◆◆

---

① الکامل فی التاریخ: ۴۴۹/۷

② الکامل فی التاریخ: سنۃ ۴۱۱ھ

③ سیر اعلام النبلاء: ۱۷۴/۱۵، ط الرسالۃ

④ سیر اعلام النبلاء: ۱۴۰/۱۸

الظاھر

الحاکم کی موت پر اس کا سولہ سالہ بیٹا الظاہر کے لقب سے تخت نشین ہوا۔[①] وہ ایک عیاش نوجوان تھا اور زیادہ تر رنگ رلیوں میں منہمک رہتا تھا۔ امورِ مملکت زیادہ تر اس کی پھوپھی سِتُّ الملک کے ہاتھ میں تھے۔[②]

اپنے والد کی طرح وہ بھی عجیب وغریب احکامات جاری کرتا رہتا تھا۔ اس نے عورتوں کو کھلی اجازت دی کہ وہ گھروں سے نکلا کریں اور تمام کام کاج کیا کریں۔[③]

ایک بار اس کے جی میں آئی تو گائے اور بیل ذبح کرنے پر پابندی لگا دی۔ ملک میں بڑا گوشت نایاب ہوگیا۔ گائے کی سری کی قیمت ایک سو دینار تک پہنچ گئی۔ عوام سخت پریشان ہوئے اور قصابوں کی معیشت بھی ختم ہوگئی۔ الظاہر نے مجوسیوں کی عید نوروز کے موقع پر یہ حکم واپس لے لیا مگر تین دن گزرتے ہی یہ پابندی دوبارہ نافذ کر دی۔[④]

حکمرانوں کی عیاشیوں کا اثر عوام پر بھی تھا۔ نصرانی اپنے ہاں تہوار مناتے تو کھلے عام مے نوشی اور بدکاری کی تقاریب منعقد کرتے جن میں مسلم دکا فراور مرد وزن سبھی شریک ہوتے اور آپس میں خلط ملط ہوجاتے۔ عورتیں بھی اس قدر شراب میں دھت ہو جاتیں کہ انہیں ڈولیوں میں اٹھا کر لے جانا پڑتا۔[⑤]

اس کے دور میں عراق میں اثنا عشری بُویہیوں کا زور کم ہوگیا اور سلطان محمود غزنوی کی سرپرستی کے باعث عباسی خلیفہ القادر باللہ کی خلافت مستحکم ہوگئی۔ ایسے میں عراق کے روافض نے اپنی پشت پناہی کے لیے نمازِ جمعہ میں الظاہر کے نام کا خطبہ پڑھنا شروع کر دیا۔[⑥]

حجرِ اسود کی بے حرمتی:

الظاہر کے دور میں عبیدی اسماعیلی شیعوں کی جرأت کا یہ عالم تھا کہ ۴۱۲ھ میں اس فرقے کے چند افراد مسجد الحرام میں گھس گئے اور ان میں سے ایک نے حجرِ اسود کے پاس جا کر اسے ہتھوڑے سے تین ضربیں لگائیں۔ وہ کہہ رہا تھا:

---

① اخبار بنی عبید: ۱۰۳/۱
② اتعاظ الحنفاء: ۱۸۲/۲؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۸۶/۱۵
③ اتعاظ الحنفاء: ۱۲۶/۲
④ اتعاظ الحنفاء: ۱۴۹/۲، ۱۵۰
⑤ اتعاظ الحنفاء: ۱۳۷/۲
⑥ اتعاظ الحنفاء: ۱۶۸/۲

''اس پتھر کی پوجا کب تک کی جائے گی! آج محمد کہاں ہے جو مجھے روکے! میں بیت اللہ کو منہدم کر کے چھوڑوں گا۔'' (نعوذ باللہ)

ایک مسلمان نے خنجر سے اس بد بخت پر حملہ کر دیا اور اسے مار گرایا، اس کے باقی ساتھیوں کو بھی عوام نے گھیر کر مار دیا۔ ہتھوڑے کی ضرب سے حجرِ اسود میں دراڑیں پڑ گئیں اور کچھ ذرّات ٹوٹ کر گر پڑے۔ یہ نشانات آج تک موجود ہیں۔[1]

شام ہاتھ سے نکل گیا:

الظاہر کے دور میں رملہ کے حاکم حسان بن مُفرّج نے شام کے وسیع علاقے پر قبضہ کر لیا، یوں دولتِ بنو عبید کچھ کمزور پڑ گئی۔[2]

الظاہر سولہ سال حکومت کر کے ۴۲۷ھ میں فوت ہوا۔[3]

◆◆◆

① العبر فی خبر من غبر: ۲/۲۲۳

② سیر اعلام النبلاء: ۱۵/۱۸۳، ۱۸۵

③ اخبار بنی عبید، ص ۱۰۴

اَلْمُسْتَنْصِر

٤٢٧ھ تا ٤٨٧ھ

الظاہر کا بیٹا المستنصر سات سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔[1] وہ ۴۲۷ھ سے ۴۸۷ھ تک برابر ساٹھ سال حکمران رہا۔ اتنی طویل مدت بنو امیہ، بنو عباس اور بنو عبید میں سے کسی حکمران کو نصیب نہیں ہوئی۔[2]

بغداد میں بھی خطبہ:

وہ واحد عبیدی خلیفہ تھا جس کی سازشیں بغداد پر بھی اثر انداز ہوئیں اور وہاں کے رافضیوں نے عباسی خلیفہ کو ہٹا کر پورے ایک سال تک (۴۵۱ھ میں) اس کے نام کا خطبہ پڑھوایا۔[3]

صحابہ پر سب وشتم، علمائے اہلِ سنت محبوس:

صحابہ کرام پر سب وشتم جو بنو عبید کے آغاز کے ساتھ شروع ہوا تھا، مستنصر کے دور میں بھی جاری رہا۔ سنتیں مٹی رہیں۔ رفض عام تھا۔ علماء حسب سابق محبوس تھے اور احادیث کا درس نہیں دے سکتے تھے۔[4]

یورپی طاقتوں سے دوستی:

مستنصر کے دادا الحاکم نے بیت المقدس کا مرکزی کلیسا "قمامہ" منہدم کر دیا تھا۔ مستنصر یورپی طاقتوں سے دوستی کا خواہش مند تھا؛ لہٰذا اس نے رومی حکام کو پانچ ہزار قیدی واپس کر کے ان سے صلح کر لی اور انہیں اجازت دی کہ وہ بیت المقدس کا مرکزی گرجا دوبارہ تعمیر کر لیں۔ تعمیری اخراجات مستنصر نے ادا کیے۔[5]

مستنصر انتظامی قابلیت سے عاری۔ بدر جمالی کا عروج:

مستنصر میں انتظامی قابلیت نہیں تھی۔ ایک طویل مدت تک وہ برائے نام حکومت کرتا رہا اور امراء اس پر حاوی رہے۔ آخر شام میں اس کے نائب بدر جمالی نے اس کی خواہش پر مصر آ کر وزارت سنبھالی تو ملکی انتظامات میں کچھ جان آئی۔[6]

شمالی افریقہ میں اہلِ سنت کا غلبہ۔ دولتِ آلِ زیریہ کا قیام:

شمالی افریقہ کا گورنر مُعِز بن بادیس اہلِ سنت کا حامی تھا اور وہاں شعائرِ اہلِ سنت کو زندہ کرتے ہوئے خود مختاری کے لیے مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کی وفات کے بعد ۴۰۶ھ میں جب تیونس کا حاکم بنا تھا تو اس وقت

---

[1] الحافظ الحنفاء: ١٨٤/٢

[2] سیر اعلام النبلاء: ١٨٦/١٥؛ وفیات الاعیان: ٢٢٩/٥

[3] سیر اعلام النبلاء: ١٨٦/١٥

[4] سیر اعلام النبلاء: ١٩٦/١٥

[5] سیر اعلام النبلاء: ١٨٦/١٥

[6] الکامل فی التاریخ: ٣٨٢/٨؛ وفیات الاعیان: ٢٣٠/٥

اس کی عمر فقط آٹھ برس تھی۔ اس نے مالکی علماء سے تعلیم حاصل کی اور حکومت سنبھالنے کے بعد اپنی مملکت میں فقہ مالکی کو نافذ کرنے میں پوری دلچسپی لی۔ ① اس کی کردار سازی میں وزیر سلطنت ابوالحسن ابن ابی رجال کا بڑا دخل تھا، جو ایک نیک وصالح اور عالم فاضل شخص تھے۔ انہوں نے مُعِز کی تربیت صحیح خطوط پر کی، اسے اہلِ سنت والجماعت کے عقائد اور فقہ مالکی کا عالم بنایا۔ اس زمانے میں قیروان میں روافض کا زور تھا مگر انہیں وزیر موصوف کی کارگزاری کا علم نہ تھا۔

ایک بار نمازِ عید کے لیے جاتے ہوئے مُعِز کا گھوڑا بدک گیا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا: ''ابوبکر و عمر۔''

یہ پہلا موقع تھا جب لوگوں کو مُعِز کے اہلِ سنت ہونے کا علم ہوا۔ اس کے منہ سے ''ابوبکر و عمر'' کا نام سنتے ہی روافض غصے سے بے قابو ہو کر اسے قتل کرنے کے لیے لپکے تاہم مُعِز کے غلام ڈھال بن کر سامنے کھڑے ہوگئے، ساتھ ہی سنّی عوام نے جو سالہا سال سے روافض کے مظالم سہہ رہے تھے، اس کی مدد کی اور نہ صرف روافض کا حملہ روک دیا بلکہ ان کے بہت سے آدمیوں کو مار ڈالا۔ بنوعبید کے غلبے کے بعد پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ سنیوں نے روافض کے مظالم کا بزورِ قوت جواب دیا ہو۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے تیونس کے گرد و نواح میں اور بہت سے مقامات پر سنّی اٹھ کھڑے ہوئے۔ فسادات میں کم از کم تین ہزار رافضی مارے گئے۔ ②

۴۰۶ھ میں جب مُعِز بن بادیس نے حکومت سنبھالی تو وہ بالکل ناتجربہ کار تھا۔ اس نے لڑکپن سے جوانی کا سفر اور سیاسی تجربات کا خارزار ایک ساتھ طے کیا۔ اسے نہایت وفادار امراء میسر آئے تھے جن کے بل بوتے پر وہ ۴۴ سال تک رفتہ رفتہ اپنی مملکت کو مستحکم اور اہلِ سنت کو منظم کرتا رہا۔ اس کا ہدف یہی تھا کہ مناسب موقع پر اپنی قوم کو بنوعبید کے منحوس سائے سے نجات دلائے۔ ③

بنوعبید کے سائے سے نجات کا اعلان:

جوں جوں اہلِ سنت کو آزادی مل رہی تھی، قیروان کی جامع مسجد میں جہاں نمازِ جمعہ میں بنوعبید کا خطبہ پڑھا جاتا تھا، لوگوں کی حاضری کم ہوتی جارہی تھی؛ کیوں کہ منبر پر بنوعبید کے لیے دعائیں سننا ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ پھر وہ وقت آیا کہ جامع مسجد میں جمعے کے دن ایک نمازی بھی نہیں ہوتا تھا۔ لوگ گھروں پر نمازِ ظہر ادا کر لیتے تھے۔

آخر ۴۴۰ھ میں جب مستنصر عبیدی کی حکومت نہایت کمزور ہو چکی تھی، مُعِز نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ بنوعبید کے پرچم جلا دیے گئے، ان کا خطبہ اور سکہ منسوخ کر دیا گیا اور وہاں عباسی خلیفہ القائم کا خطبہ شروع کر دیا گیا۔ مُعِز بن بادیس نے خطیبوں کو تاکید کی کہ وہ خطبۂ جمعہ میں بنوعبید کا پول کھولیں اور ان کے خلاف شدومد سے بدعائیں کریں۔ ④

---

① الکامل فی التاریخ: سنة ٤٠٦ھ؛ البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ١/٢٦٧
حافظ ذہبی اور علامہ ابن اثیر کا کہنا ہے کہ مُعِز سے قبل افریقہ کے اہلِ سنت زیادہ تر حنفی مذہب پر عمل پیرا تھے۔ وہاں فقہ مالکی کا غلبہ مُعِز کی غیر معمولی لگن کے باعث ہوا۔ (سیر اعلام النبلاء: ١٨/١٤٠؛ الکامل فی التاریخ: ٧/٦٠٥)

② البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ١/٢٧٤ ③ البیان المغرب: ١/٢٧٤؛ الکامل فی التاریخ: ٤٠٦ھ تا ٤٢٤ھ

④ البیان المغرب: ١/٢٧٧، ٢٧٨؛ الکامل فی التاریخ: سنة ٤٣٥ھ

بنوعبید کا دعوتی مرکز ''دارالاسماعیلیہ'' مسمار کر دیا گیا۔ سرکاری عملہ تبدیل کر دیا گیا اور سیاہ لباس کو سرکاری لباس قرار دیا گیا جو عباسیوں سے وفاداری کی علامت تھا۔ ①

مسلمانوں کو باہم لڑانے کا منصوبہ:

تیونس میں اس انقلاب سے بنوعبید ہکا بکا رہ گئے۔ انہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو باہم لڑا کر یہ جنگ جیتی جائے۔ آخر مستنصر کے وزیر ''یازوری'' نے صعید مصر میں آباد بنوسلیم اور بنوہلال کے ان جنگجو عرب بدوؤں کو طلب کیا جو بنوعبید اور قرامطہ کی لڑائیوں میں مالِ غنیمت کی خاطر فریق بنتے رہے تھے۔ انہیں دولت دے کر کسی سے بھی لڑوایا جا سکتا تھا۔ ان میں تشیع کے کچھ اثرات بھی تھے مگر وہ رافضی نہ تھے بلکہ عام مسلمانوں جیسے تھے۔

یازوری نے انہیں بلا کر نہ صرف انعامات کا لالچ دیا بلکہ وعدہ کیا کہ جتنا علاقہ وہ فتح کریں گے وہ انہی کے نام کر دیا جائے گا اور ان علاقوں سے جو مال و دولت اور اثاثے ان کے ہاتھ آئیں گے، وہ بھی انہی کی ملکیت ہوں گے۔ اس اعلان نے ان بدو قبائل میں زبردست جوش بھر دیا اور وہ جوق در جوق مُعِزّ بن بادیس کے خلاف جنگ کے لیے چل پڑے۔ یازوری نے ان سب کو نقد رقم اور اونٹ فراہم کر دیے تھے۔ ۴۴۲ھ میں وہ تیونس میں داخل ہوئے۔ فریقین میں کئی جھڑپیں ہوئیں مگر بدوؤں کے جوش و خروش کے سامنے بربروں کی پیش نہ گئی اور یہ سیلاب رُکنے میں نہ آیا۔

بدوؤں نے بَرقہ پر کسی خاص مزاحمت کا سامنا کیے بغیر قبضہ کر لیا اور راستے کے تمام شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کو منہدم کرتے ہوئے قیروان کے مضافات تک پہنچ گئے۔ مُعِزّ بن بادیس تیس ہزار سپاہی لے کر ان کے مقابلے میں نکلا مگر اسے شکست ہوئی۔ دراصل مُعِزّ بن بادیس کے حامی جور و رفض کے خلاف اٹھے تھے، اپنے سامنے عرب مسلمانوں کو دیکھ کر کشمکش و پیچ میں پڑ گئے اور ان کے خلاف اس جوش و جذبے سے نہ لڑ سکے۔ معز تیزی سے قیروان کی طرف پلٹ گیا اور اس کے گرد ایک نئی فصیل تعمیر کرائی تاکہ طویل محاصرے میں شہر کو بچایا جا سکے۔

ایک مدت تک عرب قبائل قیروان پر حملے کرتے رہے۔ فریقین کا جانی نقصان ہوتا رہا۔ مُعِزّ بن بادیس سمجھ گیا کہ بنوعبید مسلمانوں کو لڑا لڑا کر مارنا چاہتے ہیں۔ اس نے ایک معقول فیصلہ کیا اور اپنا دارالحکومت قیروان کی بجائے المہدیہ کو قرار دے دیا۔ ساتھ ہی رعایا کو بھی مشورہ دیا کہ عربوں کے حملوں سے بچنے کے لیے مہدیہ منتقل ہو جائیں۔

شعبان ۴۴۹ھ میں مُعِزّ بن بادیس حکومتی عملے اور رعایا کی بڑی تعداد کے ساتھ لیبیا کے شہر مہدیہ منتقل ہو گیا جہاں اس کا بیٹا تمیم حکومت کر رہا تھا۔ رمضان میں عربوں نے قیروان کو تاراج کر دیا۔ اس فتح کو انہوں نے کافی سمجھا اور مزید آگے بڑھنے کی کوشش نہ کی۔ یوں یہ مہیب فتنہ فرو ہوا۔ اس کے بعد یہ عرب اسی علاقے میں آباد رہے۔ اگلی صدیوں میں افریقی قبائل اور ان کے اختلاط سے تیونس اور لیبیا میں عربوں کی مخلوط نسل عام ہو گئی۔ ②

① اتعاظ الحنفاء: ۲/۲۱٦

② الکامل فی التاریخ: ۴۴۲ھ؛ البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۱/۲۸۸ تا ۲۹۴؛ الموسوعۃ الموجزۃ فی التاریخ الاسلامی: ۱۴/۹۱، ۹۲

مُعز بن بادیس کی وفات۔سیرت و کردار پر ایک نظر:

۴۵۳ھ میں مُعز بن بادیس کا انتقال ہوگیا۔اس کی عمر ۵۵ سال تھی۔وہ گندمی رنگ کا خوبصورت اور بلند آہنگ انسان تھا۔دور اندیش اور خوش اخلاق تھا۔اس نے ۴۷ برس حکومت کی۔شمالی افریقہ میں اسلام کی حفاظت اور شعائرِ سنت کے احیاء میں اس کا کردار کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ①

مُعز کے بعد اس کے بیٹے تمیم نے ۵۶ سال حکومت کی اور اس سُنّی ریاست کو جو زیادہ تر موجودہ لیبیا اور الجزائر کے علاقوں پر مشتمل تھی ،ایک بہت طاقتور مملکت بنادیا جو ایک صدی تک آزادانہ حیثیت سے قائم رہی۔ ②

بنوعبید کا زوال شروع ،شام پر سلجوقیوں کا قبضہ:

بنوعبید کا زوال شروع ہو چکا تھا۔مشرق سے اٹھنے والے سلجوقی سلاطین تیزی سے مغرب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے نامور حکمران ملک شاہ کے نائبین نے ۴۷۱ھ میں شام پر فوج کشی کی اور دیکھتے ہی دیکھتے حلب اور دمشق کو سخر کرلیا۔۴۷۷ھ میں انطاکیہ تک تمام ساحلی علاقے سلجوقیوں کی عمل داری میں شامل ہو چکے تھے۔ ③

مصری وزیر اعظم بدر جمالی نے ۴۷۸ھ میں جوابی فوج کشی کر کے سلجوقیوں کو شام سے نکالنے کی بہت کوشش کی مگر اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ ④ اُدھر مراکش میں مرابطین کے امیر یوسف بن تاشفین نے ایک وسیع اور مستحکم اسلامی حکومت قائم کرلی تھی۔یوں مصر کو چھوڑ کر پورے افریقہ میں اہلِ سنت کو سیاسی بالادستی نصیب ہو چکی تھی۔ ⑤

یورپی طاقتوں کو شام پر حملے کی دعوت:

آخر کار مستنصر نے سلجوقیوں اور مرابطین کے اقتدار سے خطرہ محسوس کر کے یورپی طاقتوں کو شام پر حملے کی دعوت دے دی تاکہ اس کے مخالفین سُنّی کمزور پڑ جائیں۔یہ ایک ایسا بھیانک جرم تھا جس نے عالمِ اسلام پر صلیبی یلغار کے راستے کھول دیے اور بیت المقدس پر قبضے کے لیے یورپی ممالک کے حوصلے بہت بلند کردیے۔ ⑥

مصر میں ہولناک قحط:

مستنصر کے آخری سالوں میں مصر کا قحط بہت ہی خوفناک تھا۔دریائے نیل میں برائے نام پانی رہ گیا۔کھیت بنجر ہوگئے۔چراگاہوں میں گھاس کا نام و نشان تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔اَن گنت لوگ ملک سے ہجرت کرگئے جن میں مستنصر کی ماں اور اہل و عیال بھی شامل تھے۔بھوک کی وجہ سے لوگ سواری کے جانوروں کو بھی کاٹ کر کھا گئے۔

① الکامل فی التاریخ: ۴۵۳ھ؛ البیان المغرب: ۱/۲۹۵، ۲۹۶؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۸/۱۴۰؛ العبر فی خبر من غبر: ۲/۲۸۸ تا ۲۶۴

② وفیات الاعیان: ۱/۳۰۴، ۳۰۵

نوٹ:۵۰۱ھ میں تمیم کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا یحییٰ بن تمیم حکمران ہوا۔وہ ۵۰۹ھ میں فوت ہوا اور اس کا فرزند علی تخت نشین ہوا۔اس نے چھ سال حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا حسن بن علی حکمران بنا۔۵۳۷ھ میں مہدیہ (طرابلس۔ٹریپولی) پر فرنگی قابض ہوئے تو حسن بن علی کو فرار ہونا پڑا اور یوں یہ مملکت ختم ہوئی۔

③ العبر فی خبر من غبر: ۴۷۱ھ

④ المختصر فی تاریخ البشر: ۲/۱۹۶

⑤ العبر فی خبر من غبر: ۴۷۹ھ، ۴۸۴ھ

⑥ فراسلوا الفرنج واستدعوهم لملك الشام. (تاریخ ابن خلدون: ۵/۲۴)

دارالحکومت میں ایک گھوڑا تک نہ بچا کہ مستنصر اس پر سواری کر سکتا۔ ایک بار اسے سواری کی سخت ضرورت پڑی تو بہت ڈھونڈنے کے بعد ایک خچر مل سکا۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے بقول یہ عہد یوسف علیہ السلام کے قحط کا نقشہ تھا۔ ①

ابتری کا دور۔ مستنصر کی موت:

مستنصر ۴۸۷ھ میں فوت ہوا۔ اس کا دور نہایت ابتری کا تھا۔ عوام مفلوک الحال تھے۔ بار بار قحط اور مستقل گرانی نے لوگوں کو عاجز کر دیا تھا۔ ملکی معیشت بدحالی کی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ ②

◆◆◆

① سیر اعلام [illegible]

② وفیات الاعیان [illegible]

دولتِ بنوعبید (دورِ زوال)

المُستَعلِی

۴۸۷ھ تا ۴۹۵ھ

مستنصر نے اپنے بیٹے نزار کو ولی عہد مقرر کیا تھا مگر اس کے وزیر بدر جمالی نے نزار کی جگہ مستنصر کے دوسرے بیٹے مستعلی کو حکمران بنادیا۔ اس طرح بنوعبید دو حصوں میں بٹ گئے۔ مستعلی کے بھائی نزار نے یہ کہہ کر بغاوت کر دی کہ باپ نے مجھے امام مقرر کیا تھا۔ نزار اپنے حامیوں کے ساتھ ایک سال تک اسکندریہ پر قابض رہا۔ آخر میں اسے شکست ہوئی اور مستعلی نے اسے زندہ دیوار میں چن دیا۔[1]

فرقہ نزاریہ کا ظہور۔ حسن بن صبّاح اور شیخ الجبال سنان:

نزار کے عقیدت مند مشرقی علاقوں میں جا کر بس گئے۔ نزار کے ایک حامی حسن بن صبّاح نے ایران جا کر دیلم کے کوہستان میں ''قلعہ الموت'' کو اپنا مرکز بنایا اور ایک نئے فرقے ''باطنیہ اسماعیلیہ'' کی بنیاد رکھی۔[2]

کچھ نے شام کے ساحلی علاقوں: مصیاف اور بانیاس میں جا کر ڈیرے ڈال دیے اور ''روحانیت'' کا ڈھونگ رچا کر وہاں ایک حلقہ قائم کر لیا۔ اس گروہ کا ایک پیشوا راشد الدین سنان جو ''شیخ الجبال'' کہلاتا تھا، بہت مشہور ہوا۔[3]

پہلی صلیبی جنگ:

مستعلی کے دور میں شام پر یورپی طاقتوں نے وہ خونچکاں یلغار کی جو تاریخ میں پہلی صلیبی جنگ کے نام سے مشہور ہے۔ مستعلی کے تخت نشین ہونے سے دو سال پہلے سلجوقی بادشاہ ملک شاہ کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کے بیٹوں میں اقتدار کی جنگ چھڑ چکی تھی۔ فرنگیوں اور بنوعبید دونوں نے اسے سلجوقیوں سے بدلہ لینے کا بہترین موقع تصور کیا۔

جب شمال سے یورپی طاقتیں شام کے سلجوقیوں پر حملہ آور ہوئیں تو مستعلی نے اسلام دشمنی کا واضح ثبوت دیتے ہوئے جنوب سے شام پر چڑھائی کر دی۔ یوں سلجوقی دونوں طرف سے گھر گئے اور مستعلی کی افواج نے ربیع الاول ۴۹۰ھ (مارچ ۱۰۹۷ء) میں پہلے شام کے ساحلی شہر صور کو اور پھر شعبان ۴۹۱ھ (جولائی ۱۰۹۸ء) میں القدس کو سلجوقیوں سے چھین لیا۔[4] عبیدیوں کا نائب افتخار الدولہ القدس کا حاکم بن گیا۔[5]

① سیر اعلام النبلاء: ۱۵/۱۹۷
② الکامل فی التاریخ: ۸/۳۸۳، ۴۵۱
③ مسالک الابصار فی ممالک الامصار: ۳/۴۷۶؛ خطط الشام، لمحمد بن عبدالرزاق کرد علی: ۶/۲۵۶؛ الموسوعة المیسرة فی الادیان والمذاهب: ۱/۳۸۵
④ اتعاظ الحنفاء: ۳/۲۰، ۲۲
⑤ تاریخ ابن خلدون: ۵/۲۵

تاہم یورپی طاقتیں شام کو فتح کر کے جب القدس پہنچیں تو انہوں نے بنوعبید سے دوستی کا کوئی خیال نہیں کیا اور ۲۳ شعبان ۴۹۲ھ (۱۵ جولائی ۱۰۹۹ء) کو بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ یہاں کئی ہفتوں تک قتل عام ہوتا رہا۔ عالم اسلام کو یہ زخم لگانے میں یورپی طاقتوں کے ساتھ مستعلی پوری طرح حصہ دار تھا۔ مستعلی صفر ۴۹۵ھ میں فوت ہوا۔[1]

◆◆◆

الآمر

۴۹۵ھ تا ۵۲۵ھ

مستعلی کے بعد اس کا پانچ سالہ بیٹا الآمر حکمران بنا۔ اس نے ۲۹ سال نو ماہ حکومت کی۔ اس کا سارا زمانہ لہو ولعب اور عیاشی میں گزرا۔ اس دوران ایک طرف فرنگی شام کے ساحلوں پر پوری طرح قابض ہو گئے۔ دوسری طرف شمالی افریقہ میں ابن تومرت نامی ایک عالم فاضل امیر نے اسلامی حکومت قائم کر لی اور دولتِ مؤحدین کی بنیاد رکھ دی۔ اس نئی حکومت نے بنوعبید کو افریقہ سے اتنا پسپا کیا کہ ان کے پاس صرف مصر باقی رہ گیا۔ ۵۲۴ھ میں الآمر ایک دن سیر کے لیے نکلا تو اچانک اس کے مخالف حسن بن صباح کے گماشتوں نے حملہ کر کے اسے اس کے بیٹوں سمیت قتل کر دیا۔[2]

◆◆◆

الحافظ

۵۲۵ھ تا ۵۴۴ھ

الآمر کی کوئی اولاد باقی نہیں تھی؛ اس لیے بنوعبید نے اس کے چچازاد عبدالمجید بن محمد کو امام چن لیا۔ وہ سابق خلیفہ مستنصر کا پوتا تھا۔ اس نے الحافظ کا لقب اختیار کر کے حکومت سنبھالی۔ وہ ایک کمزور مگر سازشی حکمران تھا۔ اس کے دور میں آلِ عبید کا زور بہت گھٹ چکا تھا؛ اس لیے ایک بااثر اثنا عشری رئیس ابوعلی (سابق وزیر اعظم افضل بن بدر جمالی کا بیٹا) حکومت پر حاوی ہو گیا اور اس نے ہر طرف اثنا عشری شعائر کو عام کر دیا۔ ابوعلی کی موجودگی میں الحافظ دو سال تک بے اختیار رہا۔ ایک دن اس نے اپنے کسی وفادار کے ذریعے ابوعلی کو قتل کرا دیا، تب جا کر امورِ حکومت اس کے ہاتھ میں آئے۔ مگر الحافظ کی کمزوری کا یہ عالم تھا کہ جب بھی کسی کو وزیر بناتا تو اس سے دب جاتا اور وزیر ہر چیز پر حاوی ہو جاتا۔ پھر یہ سازشیں کر کے اسے مروا دیتا۔ اس نے بیس سال سات ماہ تک حکومت کی۔ ۵۴۴ھ میں فوت ہوا۔[3]

اس کے دور میں عماد الدین زنگی نے الجزیرہ اور شام میں ایک مضبوط اسلامی حکومت قائم کر کے شام پر قابض فرنگیوں سے جہاد شروع کیا جس سے مصر کے اہلِ سنت کو بھی بڑا حوصلہ ملا۔[4]

◆◆◆

① البدایة والنهایة: سنة ۴۹۲ھ
② سیر اعلام النبلاء: ۱۵/۱۹۹ تا ۲۰۲

③ سیر اعلام النبلاء: ۱۵/۱۹۸، ۱۹۹
④ وفیات الاعیان: ۲/۳۲۷، ۳۲۸

الظافر

٥٤٤ھ تا ٥٤٩ھ

الحافظ کے بعد اس کا بیٹا الظافر حکمران بنا۔ وہ کھیل کود، رقص و سرود اور عیاشی کا عادی تھا۔ پانچ سال حکومت کر کے ۵۴۹ھ میں اپنے ہی امراء کے ہاتھوں مارا گیا۔[1]

❖❖❖

الفائز

٥٤٩ھ تا ٥٥٥ھ

الظافر کے بعد اس کا پانچ سالہ بیٹا الفائز تخت نشین ہوا۔ چھ سال برائے نام حکومت کر کے ۵۵۵ھ میں فوت ہو گیا۔ اس کے دور میں شام پر سلطان نورالدین زنگی کی حکمرانی شروع ہوئی جو نہایت مجاہد اور ولی صفت انسان تھا۔ اس نے شام کے مسلمانوں کو اتنا مضبوط کر دیا کہ عالم اسلام میں فرنگیوں کی مزید پیش قدمی کا خطرہ نہ رہا۔[2]

❖❖❖

العاضد

٥٥٥ھ تا ٥٦٧ھ

الظافر کے بعد سابق خلیفہ الحافظ کا نو سالہ بیٹا یوسف ''العاضد'' کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ یہ بنو عبید کا آخری حکمران تھا۔ عاقل بالغ ہو کر نہایت متعصب رافضی ثابت ہوا۔ اہل سنت کے خون کا پیاسا رہتا تھا۔ تاہم آخر میں اسے ایک طرف فرنگیوں کے حملوں اور دوسری طرف اپنے مکار وزیر شاور کے فتنے سے بچنے کے لیے سلطان نورالدین زنگی سے مدد لینا پڑی۔ نورالدین کی امدادی فوج کے سالاروں میں صلاح الدین ایوبی بھی شامل تھا جس نے مصر آ کر عاضد کی وزارت سنبھالی اور بعد میں ملک کا تمام نظم و نسق ہاتھ میں لے کر بنو عبید کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

العاضد اپنی برطرفی کے چند دن بعد ۵۶۷ھ میں فوت ہو گیا۔ اس طرح ۲۷۰ سالہ طویل رافضی اسماعیلی حکومت کا سورج ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا اور مسلمانوں کو ایک سیاہ دور سے نجات ملی۔[3]

❖❖❖

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱۵/۲۰۵ تا ۲۰۷

② سیر اعلام النبلاء: ۱۵/۲۰۷ تا ۲۰۹

③ سیر اعلام النبلاء: ۱۵/۲۰۰ تا ۲۰۲

جدول بنوعبید کے حکمران

۱	عبیداللہ بن میمون	۲۹۷ھ تا ۳۲۲ھ	۹۱۰ء تا ۹۳۴ء	بانی فرقہ، بانی حکومت
۲	القائم	۳۲۲ھ تا ۳۳۴ھ	۹۳۴ء تا ۹۴۶ء	استحکام حکومت
۳	المنصور	۳۳۴ھ تا ۳۴۱ھ	۹۴۶ء تا ۹۵۲ء	
۴	المعز	۳۴۱ھ تا ۳۶۵ھ	۹۵۲ء تا ۹۷۶ء	پایہ تخت مصر منتقل کیا
۵	العزیز	۳۶۵ھ تا ۳۸۶ھ	۹۷۶ء تا ۹۹۶ء	
۶	الحاکم	۳۸۶ھ تا ۴۱۱ھ	۹۹۶ء تا ۱۰۲۰ء	نفسیاتی مریض حکمران
۷	الظاہر	۴۱۱ھ تا ۴۲۷ھ	۱۰۲۰ء تا ۱۰۳۶ء	
۸	المستنصر	۴۲۷ھ تا ۴۸۷ھ	۱۰۳۶ء تا ۱۰۹۴ء	طویل ترین حکمرانی
۹	المستعلی	۴۸۷ھ تا ۴۹۵ھ	۱۰۹۴ء تا ۱۱۰۲ء	دورِ زوال
۱۰	الآمر	۴۹۵ھ تا ۵۲۵ھ	۱۱۰۲ء تا ۱۱۳۱ء	
۱۱	الحافظ	۵۲۵ھ تا ۵۴۴ھ	۱۱۳۱ء تا ۱۱۴۹ء	
۱۲	الظافر	۵۴۴ھ تا ۵۴۹ھ	۱۱۴۹ء تا ۱۱۵۴ء	
۱۳	الفائز	۵۴۹ھ تا ۵۵۵ھ	۱۱۵۴ء تا ۱۱۶۰ء	
۱۴	العاضد	۵۵۵ھ تا ۵۶۷ھ	۱۱۶۰ء تا ۱۱۷۲ء	آخری حکمران

✦✦✦

بنوعبید کے دور پر ایک نظر

بنوعبید کا دور مسلمانوں کے لیے سراسر وبال تھا۔ وہ شہری آزادیاں جو لوگوں کو اسلام نے دی تھیں، سلب ہوگئی تھیں۔ عوام ایک قید خانے میں زندگی گزار رہے تھے۔ بنوعبید کی کارکردگی کے چند پہلو ملاحظہ فرمائیے:

بنیادی حقوق سلب:

شہریوں کے بنیادی حقوق سلب کر لیے گئے تھے۔ عوامی اجتماعات ممنوع تھے۔ رات کا کرفیو معمول کی بات تھی۔ اندھیرا پھیلتے ہی بگل بجایا جاتا۔ صبح پو پھوٹنے پر دوبارہ بگل بجتا۔ اس وقفے کے درمیان جو شخص دکھائی دیتا اسے بغاوت کے شبہے میں قتل کر دیا جاتا۔ ①

اسلامی علوم کی بیخ کنی:

علوم دینیہ کی نشر و اشاعت کے راستے مسدود کرنے کی پوری کوشش کی گئی۔ سرکاری رافضی علماء کی تصانیف کے سوا باقی دینی کتب پر پابندی عائد تھی۔ ان کے ذخائر ڈھونڈ ڈھونڈ کر تلف کیے جاتے۔ امام عبداللہ بن ابی ہاشم (م ۳۴۶ھ) اپنے ہاتھ سے لکھی کتب کی سات الماریاں چھوڑ کر فوت ہوئے تھے۔ بنوعبید نے انہیں ضبط کر لیا۔ ②

اہلِ سنت کے مدارس بند کر دیے گئے تھے۔ مساجد میں بھی علماء کا درس دینا ممنوع تھا۔ پھر بھی بنوعبید اسلام کو مٹا نہ سکے۔ علوم دینیہ کے شائقین خفیہ طور پر علماء کے پاس جا کر ان کے گھروں میں علمی استفادہ کیا کرتے تھے۔ مگر ظاہر ہے ایک وقت میں اکا دکا افراد ہی جا سکتے تھے تاکہ حکام کو بھنک نہ پڑ سکے۔ حکام کا خوف اتنا تھا کہ ابو محمد بن ابی زید اور ابو محمد بن تبان رحمہما اللہ قیروان کے ایک بزرگ عالم ابوبکر بن لباد رحمہ اللہ کے پاس چھپ چھپ کر پڑھنے جاتے تھے۔ سبق کے دوران وہ کتابوں کو گود میں رکھ کر ان پر اس طرح جھک جاتے تھے کہ کسی سوراخ سے بھی کوئی دیکھنے نہ پائے۔ بند کمرے میں سبق کے دوران کتابوں پر پسینہ گرتا رہتا اور سبق ختم ہوتے ہوتے کتاب بھیگ جاتی تھی۔ ③

صحابہ کی توہین عام:

عبیدیوں کی حکومت میں صحابہ کی توہین عام ہوگئی۔ جو صحابہ کرام کی تعریف کرتا یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو افضلِ کائنات ماننے سے انکار کرتا وہ قتل کر دیا جاتا یا جیل میں ٹھونس دیا جاتا۔ بازاروں میں گدھوں اور مویشیوں کے سر کاٹ کر نصب کر دیے جاتے اور ان پر صحابہ کے اسمائے گرامی لکھ دیے جاتے۔ ④

---

① الدولة الفاطمية للصلابی، ص ۷٤

② رياض النفوس: ۴۲۳/۲

③ رياض النفوس: ۲۸۷/۲، ۲۸۸

④ الدولة الفاطمية للصلابی، ص ۷۳

فقہ مالکی پر پابندی:

افریقی مسلمان فقہ مالکی پر عمل پیرا تھے، مگر بنوعبید نے مالکی فقہ کے مطابق فتویٰ دینے پر پابندی لگادی۔ خلاف ورزی پر کوڑے لگائے جاتے یا جیل میں ڈال دیا جاتا۔ بعض اوقات سزائے موت بھی دے دی جاتی اور مقتول مفتی کی لاش کو گشت کرا کے اعلان کیا جاتا: ''یہ مالکی فقہ پر فتویٰ دینے والے کی سزا ہے۔''[1] فقیہ محمد بن عباس ہذلی رحمہ اللہ کو فقط اس جرم کی پاداش میں کوڑے لگائے گئے اور برہنہ کر کے گدھے پر گشت کرایا گیا اور پھر جیل میں ڈال دیا گیا۔[2]

اذان اور نماز تبدیل۔ مساجد ویران:

اس دور میں اذان تبدیل کر دی گئی۔ نمازِ عیدین اور نمازِ تراویح پر پابندی رہی۔ ظہر کی نماز وقت سے پہلے پڑھنے کا رواج شروع کر دیا گیا۔ نمازِ جمعہ کے خطبے میں صحابہ پر تبرا بازی معمول بن گئی۔ بہت سے رافضی امام حکام کو خوش کرنے کے لیے مکہ کی بجائے ''مہدیہ'' کی طرف منہ کر کے نماز پڑھاتے تھے۔ اکثر لوگوں نے مساجد کا رخ کرنا چھوڑ دیا اور گھروں میں نماز پڑھنے لگے۔ مساجد ویران ہوگئیں اور دینی شعائر مٹ گئے۔[3] بعض اوقات عید کا چاند دکھائی دینے سے پہلے ہی روزے بند کرنے اور عید منانے کا سرکاری حکم جاری ہو جایا کرتا تھا۔[4]

♦♦♦

قاہرہ کی تعمیر پر ایک نگاہ

مصر میں عبیدیوں کی سب سے بڑی یادگار ان کا بسایا ہوا قاہرہ کا عظیم الشان شہر ہے جو آج دنیا کے چند بڑے شہروں میں سے ایک ہے۔ اس کی بنیاد عبیدی خلیفہ معز کے نائب جوہر نے رکھی تھی۔ تاہم ان دنوں قاہرہ اتنا وسیع نہ تھا۔ یہ دریائے نیل کے کنارے مضبوط فصیلوں سے گھرا ہوا ایک قلعہ نما شہر تھا جہاں صرف سرکاری لوگ رہتے تھے۔ عام آبادی قاہرہ سے متصل قدیم شہر فسطاط میں رہتی تھی۔ قاہرہ کو اس وقت ''المدینہ'' اور فسطاط کو ''مصر'' کہا جاتا تھا۔ اس سرکاری شہر میں عبیدی خلفاء کے دو بڑے محل تھے جو قصرِ شرقی اور قصرِ غربی کہلاتے تھے۔ دونوں محلات کے درمیان ایک بڑا میدان تھا اور ایک زیر زمین سرنگ ان دونوں محلوں کو ملاتی تھی۔

قصرِ غربی درحقیقت عبیدی حکمرانوں کا عشرت کدہ تھا جہاں وہ تفریح کی ہر نوع سے مزے لیتے تھے۔ اس سے متصل گلشنِ کافور تھا جس میں قصرِ غربی کے دروازے کھلتے تھے۔ قریب ہی عبیدیوں کا آبائی قبرستان تھا۔ اس شہر میں بے پناہ دولت خرچ کر کے تیار کیے گئے بڑے بڑے کتب خانے تھے جو کہ قرطبہ کے علمی خزانوں کے ہم پلہ شمار کیے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آخری عبیدی حکمران عاضد کے کتب خانے میں کم از کم ایک لاکھ بیس ہزار کتابیں تھیں۔

---

[1] الدولة الفاطمية للصلابي، ص ٧٤

[2] رياض النفوس: ٢/٢٦٥

[3] الدولة الفاطمية للصلابي، ص ٧٦، ٧٧

[4] سير اعلام النبلاء: ١٥/٣٧٤

قصر شرقی عبیدی خلیفہ کی قیام گاہ تھا۔ وہ اپنے اہل وعیال غلاموں، نوکروں اور باندیوں سمیت اس طلسم خانے میں رہا کرتا تھا۔ یہیں اس کا دربار لگتا تھا۔ عبیدی خلفاء کی دولت وثروت کا یہ عالم تھا کہ قصر شرقی میں خلیفہ کی نشست خالص سونے کے تخت پر ہوا کرتی تھی، جس کے آگے سونے کی جالی آویزاں تھی۔ شاہی ایوان مکمل طور پر سونے سے ملمع کیا گیا تھا۔ عبیدیوں کا یہ قصر چار ہزار کمروں پر مشتمل تھا۔ اس عمارت میں ایک بالا خانہ تھا جہاں ہر شام خلیفہ عوام کے مسائل سننے بیٹھتا تھا، اس سے کچھ دور وہ اندھا کنواں تھا جس کی تہہ میں عبیدیوں کے بے شمار مخالفین کی لاشیں پنجروں کی صورت میں پڑی تھیں۔ عبیدیوں کے خزانے میں دنیا بھر کے بے مثل اور نادر ونایاب جواہر کا انبار تھا۔

ایک بالشت پیمائش کا دنیا کا سب سے بڑا زمردا سی خزانے میں تھا۔ یہاں ''جبلِ نور'' نامی ایک بے نظیر یاقوت تھا جس کا وزن دو ہزار چار سو کیرٹ تھا۔ اس کے علاوہ ہیرے جواہرات، اشرفیوں اور نقد مال ودولت کے علاوہ انواع و اقسام کا سامان تھا جس میں سونے چاندی کے فریموں والے آئینے، دیدہ زیب زرتار ریشمی کپڑے، زرنگاری سے مزین نایاب قسم کے قیمتی ظروف، عمدہ مشک وکافور سے بھری ہوئی صراحیاں، اعلیٰ ترین سنگی فرنیچر، ہاتھی دانت اور صندل کا سامانِ آرائش وزیبائش، بہترین چینی برتن، خوبصورت الماریاں اور طلائی صندوق شامل تھے۔ [1]

لمحۂ فکریہ:

آج کل مستشرقین اور روافض ببانگِ دُہل دعوی کرتے ہیں کہ بنوعبید اور اسی طرح بنوبُویہ نے مسلمانوں کی بڑی خدمات انجام دیں۔ اس سلسلے میں وہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے فلاں فلاں عمارت بنوائی، فلاں فلاں شہر آباد کیے، فلاں فلاں کتب ان کے دور میں لکھوائی گئیں۔ اس طرح وہ ان کی تعریف وتوصیف کرتے ہوئے ان کی حکومتوں کو ایک روشن مثال قرار دیتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کسی مسلمان بلکہ کسی انسان کو ایسی حکومتیں گوارا نہیں ہوسکتیں۔ ایک شخص کو سب سے پہلے مذہبی آزادی چاہیے۔ اس پر قدغن کے زمانے کو وہ تاریک دور ہی کہہ سکتا ہے۔

مانا کہ بنوبُویہ اور بنوعبید کے بعض حکمران عالموں، ادیبوں، شاعروں اور فنونِ لطیفہ کے ماہرین کو خوب نوازتے تھے، انہوں نے ترقیاتی کام بھی کرائے۔ کتب خانوں اور عالی شان عمارتوں کی تعمیر پر خوب رقم خرچ کی...... مگر یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عام طور پر کوئی برے سے برا شخص بھی سراپا شر نہیں ہوتا بلکہ اس کی زندگی کے بعض پہلو قابلِ تعریف بھی ہوتے ہیں۔ پس بعض ترقیاتی کام اور قابلِ تحسین امور بنوبُویہ اور بنوعبید نے بھی انجام دیے۔ ان سے پہلے فرعون اور شداد جیسے بادشاہ بھی بڑی بڑی عمارتیں بنا گئے تھے مگر قرآن مجید ان کی تعریف نہیں کرتا بلکہ ان کے حالات اور انجام کو عبرت کے طور پر پیش کرتا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ ان لوگوں کے دور میں حکومتی سطح پر جو علمی کام ہوئے تھے وہ زیادہ تر فلکیات، نجوم، فلسفے اور ایسے فنون سے متعلق تھے جو یونان سے آئے تھے اور جن کا مسلمانوں کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ جو

[1] الروضتین فی اخبار الدولتین: ۲/۲۲۳ تا ۲۳٤

علمی کام ہوا وہ درحقیقت شیعیت کی مختلف شکلوں: اثنا عشریت اور اسماعیلیت کو پھیلانے کے لیے کیا گیا تھا۔

جہاں تک کتب خانوں کا تعلق ہے، بلاشبہ بنوعبید نے اپنے محلات میں دنیا بھر کی کتب جمع کر لی تھیں مگر اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ عوام کو دینی کتب سے محروم کر دیا گیا تھا۔ ایسی ساری کتب یا تو تلف کر دی جاتی تھیں یا کتب خانے کی زینت بنانے کے بہانے ضبط کر لی جاتی تھیں۔ ظاہر ہے محل کے ان کتب خانوں تک علماء وطلبہ کی رسائی کہاں ہو سکتی تھی۔ پس یہ علم دوستی کے نام پر لوگوں کو علوم اسلامیہ سے محروم کرنے کی ایک سازش تھی۔

بنوعبید اور بنوبُویہ کے خلاف خروج کا سوال:

ہم پڑھ چکے ہیں کہ جمہور اہلِ سنت کے نزدیک خروج کی جو شرائط ہیں انہیں دیکھتے ہوئے بنوامیہ یا بنوعباس کے کسی حکمران کے خلاف خروج جائز نہیں تھا؛ کیوں کہ ان میں سے کوئی بھی کفرِ بواح کا مرتکب نہیں تھا۔ مامون، معتصم اور واثق باللہ جیسے خلفاء کے معتزلی ہونے اور علمائے اہلِ سنت پر مظالم ڈھانے کے باوجود جمہور نے ان کے خلاف خروج کا فتویٰ نہیں دیا۔ خود امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ جیسے مجتہدین کلمۂ حق بلند کرنے کی وجہ سے مظالم کا شکار ہوئے مگر انہوں نے بھی خروج کی راہ اختیار نہ کی؛ کیوں کہ یہ حضرات بدعت اور کفرِ بواح کا فرق خوب سمجھتے تھے۔

تاہم، ہم دیکھتے ہیں کہ بغداد میں بنوبُویہ اور افریقہ میں بنوعبید کی حکومتیں دو ایسی مثالیں تھیں جن کے بعض اقدامات کا کفرِ بواح ہونا ظاہر تھا۔ اس کے باوجود ہم عراقی علمائے اہل سنت کو بنوبُویہ کے دور میں خروج سے گریزاں دیکھتے ہیں۔ البتہ بنوعبید کے دور میں کئی بار افریقہ میں اہل سنت نے خروج کیا تھا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ ان کوششوں کا ذکر پیچھے آچکا ہے۔

ہمارے تجزیے کے مطابق عراقی علماء کے خروج سے احتراز کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے نزدیک بنوبُویہ کے عقائد کفرِ بواح کی حد تک نہیں تھے۔ بلکہ درحقیقت اہلِ سنت کے نزدیک خروج کے لیے کفرِ بواح کے علاوہ بھی کچھ شرائط ہیں جن کا ہونا ضروری ہے۔ ان میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ خروج میں کامیابی کا امکان قوی ہو اور مزید فتنہ پھیل جانے کا خطرہ نہ ہو۔

عراقی علماء کے بنوبُویہ کے خلاف خروج نہ کرنے کی اصل وجہ یہی تھی کہ ان کے خیال میں اگر خروج کیا جاتا تو کامیابی کے امکانات کم تھے اور ناکامی کے زیادہ۔ اس صورت میں عوام وخواص کو مزید ابتلاء کا سامنا کرنا پڑتا۔

دولتِ بنوعبید کے قیام کے کوئی ۳۷ سال بعد دولتِ بنوبُویہ قائم ہوئی۔ چونکہ عراق کے علمائے اہلِ سنت زیادہ محتاط تھے اور وہ بنوعبید کے خلاف خروج کی کوششوں کی ناکامی کا مشاہدہ کر چکے تھے؛ اس لیے ان کی اکثریت نے ایسے کسی ناکام تجربے کا حصہ بننا مناسب نہ سمجھا۔ اس کی جگہ وہ اصلاحِ احوال کے دیگر محفوظ راستے اختیار کرکے مصروف کار رہے۔

دولتِ باطنیہ اَلَمُوت

بنوعبید کے دورِ زوال میں اسماعیلی شیعوں کا ایک نیا فرقہ ظاہر ہوا جس نے عالم اسلام میں گمراہی کا نیا تموج پیدا کر دیا۔ یہ فرقہ ''باطنیہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس فرقے کا بانی حسن بن صَبّاح (م ۵۱۸ھ) تھا جس کا تعلق خراسان کے مشہور شہر مَرو سے تھا۔ وہ نہایت شاطر اور دلیر انسان تھا۔ ریاضی، جیومیٹری، فلکیات اور جادو ٹونے کا ماہر تھا۔ [1]

اس کے اساتذہ میں عبدالملک بن عَطّاش طبیب ایک بہترین ادیب، خوش نویس اور حاضر جواب آدمی تھا۔ وہ شروع سے اسماعیلی عقائد رکھتا تھا۔ یقیناً حسن بن صَبّاح کے بگاڑ کی ابتداء اسی کی صحبت سے ہوئی۔ [2]

اس دور کے دو دیگر شہرہ آفاق انسان: نظام الملک طوسی اور عمر خیام نوجوانی میں اس کے گہرے دوست تھے۔ [3]

حسن بن صَبّاح عنفوانِ شباب میں ایک ایرانی رئیس عبدالرزاق بہرام کا منشی تھا۔ [4] جب نظام الملک طوسی کو سلجوقی سلطنت کی وزارتِ عظمیٰ نصیب ہوئی تو اس نے اپنے پرانے دوست کو فراموش نہ کیا اور اس کا اعزاز و اکرام کرتا رہا۔ تاہم حسن بن صَبّاح کی طبیعت کا رجحان جس آزادی کی طرف تھا، وہ کوئی بڑے سے بڑا عہدہ پا کر بھی نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔ رفتہ رفتہ نظام الملک حسن بن صَبّاح کی عجیب و غریب ذہنیت کو تاڑ گیا اور ایک بار کہہ اٹھا:

''عن قریب یہ شخص کمزور قسم کے لوگوں کو گمراہ کرے گا۔''

کچھ مدت بعد نظام الملک کے داماد ابومسلم کو جورے کا رئیس تھا، معلوم ہوا کہ حسن بن صَبّاح کا بنوعبید سے خفیہ تعلق ہے اور مصر کے جاسوس اور داعی اس کے پاس آتے جاتے ہیں۔ جب اس نے حسن بن صَبّاح پر یہ الزام لگایا تو وہ سزا کے خوف سے بھاگ نکلا۔ اسے تلاش کیا گیا مگر وہ کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ [5]

حسن بن صَبّاح اسماعیلی داعی کے روپ میں:

۴۷۹ھ میں حسن بن صَبّاح ایک تاجر کے بھیس میں بنوعبید کے حکمران مستنصر کے پاس مصر پہنچ گیا اور اس کے حلقے میں شامل ہو گیا۔ کچھ مدت بعد وہ اس کے داعی کے طور پر واپس آیا اور خفیہ طور پر خراسان، عراق اور ایران میں گھومنے لگا۔ وہ ٹاٹ کے کپڑے پہنتا اور زہد و تقویٰ ظاہر کرتا تھا۔ یوں اس نے بہت جلد بہت سے مرید بنالیے۔ [6]

---

① الکامل فی التاریخ: ۴۵۱/۸؛ المنتظم: ۶۳/۱۷

② الکامل فی التاریخ: ۵۴۲/۸؛ تاریخ الاسلام للذھبی: ۳۲/۳۴
اس کا بیٹا احمد بھی ایک اسماعیلی داعی تھا مگر اپنے باپ کے برعکس بالکل جاہل تھا۔ حسن بن صَبّاح اس کا بہت اکرام کرتا تھا۔ احمد نے اصفہان کے ایک نواحی قلعے پر قابض ہو کر خلقِ خدا کا ناطقہ بند کر دیا تھا، جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

③ الاعلام زِرِکلی: ۳۸/۵

④ المنتظم: ۶۳/۱۷

⑤ الکامل فی التاریخ: ۴۵۲/۸

⑥ الکامل فی التاریخ: ۷۷۵/۷

علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"حسن فقط ایسے بے وقوف کو اپنی طرف مائل کرتا تھا جسے دائیں بائیں کا پتا نہ ہو اور دنیا کے معاملات کی کوئی خبر نہ ہو۔ پھر اسے شہد کے ساتھ اخروٹ اور کلونجی کھلاتا یہاں تک کہ اس کا دماغ خشک ہو جاتا۔ پھر وہ اسے بتاتا کہ اہلِ بیت پر کیا کیا مظالم ہوئے، یہاں تک کہ یہ باتیں اس کے دل میں بیٹھ جاتیں۔ پھر وہ کہتا جب ازرقی اور خوارج بنو امیہ سے جنگ میں اپنی جانوں کی بازی لگا سکتے ہیں تو تمہیں کیا ہوا کہ تم اپنے امام کی نصرت کے لیے نہیں اٹھتے۔ ان باتوں کے ذریعے وہ اسے شکار کر لیتا۔"[1]

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

"حسن بن صَبّاح کسی شخص کو مسلسل یہ باتیں بتاتا رہتا یہاں تک وہ شخص قائل ہو جاتا اور اپنے ماں باپ سے بھی کہیں زیادہ حسن بن صَبّاح کا مطیع بن جاتا۔ پھر وہ اس کے سامنے کچھ شعبدے اور کرتب دکھاتا جو جاہلوں پر ہی اثر کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس طرح بہت سے لوگ اس کے مرید بن گئے۔"[2]

اَلَمُوت پر قبضہ:

۴۸۳ھ میں حسن بن صَبّاح نے شمالی ایران کے کوہستانی ضلع قزوین کے قلعہ "الَمُوت" کو اپنا عالمی مرکز بنا لیا جس تک کسی کی رسائی بہت مشکل تھی۔[3]

کہا جاتا ہے کہ یہ قلعہ دیلم کے کسی قدیم بادشاہ نے بنایا تھا جو شکار کا بڑا شوقین تھا۔ ایک بار اس نے عقاب اُڑایا اور اس کے پیچھے پیچھے گیا تو دیکھا کہ عقاب یہاں آ کر بیٹھ گیا ہے جہاں یہ قلعہ واقع ہے۔ بادشاہ نے دیکھا کہ یہ بہت ہی محفوظ جگہ ہے۔ اس نے یہاں یہ قلعہ تعمیر کرایا اور اس کا نام "اَلُہ مُوت" رکھا جس کا مطلب دیلمی زبان میں "عقاب کو سدھانا" ہے۔[4] بعد میں اس قلعے کو اَلَمُوت کہا جانے لگا۔ یہ قلعہ ایک علوی قلعہ دار کی نگرانی میں تھا۔ حسن بن صَبّاح گھومتا پھرتا اس قلعے کے پاس آیا اور اس کے باہر ڈیرا ڈال کر قلعہ والوں کو اپنے نمائشی زہد و تقویٰ سے متاثر کر دیا۔[5]

اہلِ قلعہ تمنا کرنے لگے کہ کاش! وہ قلعے میں آ کر رہے۔ مگر حسن بن صَبّاح انکار کرتا رہا۔ وہ کہتا تھا:

"تم دیکھتے نہیں کہ لوگوں میں معاصی کس طرح پھیل گئے ہیں۔ لوگ خراب ہو چکے ہیں۔"

آخر قلعے والوں کی طرف سے ایک ہجوم آ کر اسے قلعے میں لے گیا۔[6]

حسن بن صَبّاح ایک مرشدِ کامل کی طرح بڑی عزت کے ساتھ قلعے میں رہنے لگا۔ قلعہ دار اس سے اس قدر متاثر تھا کہ برکت حاصل کرنے کی نیت سے اس کے پاس آ بیٹھتا تھا۔[7]

---

[1] المنتظم: ۶۳/۱۷، ۶۴

[2] البدایۃ والنھایۃ: ۱۷۶/۱۶: سنۃ ۴۹۴ھ

[3] المختصر فی اخبار البشر: ۲۰۰/۲

[4] الکامل فی التاریخ: ۴۵۱/۸

[5] نھایۃ الارب فی فنون الادب: ۲۴۴/۳۰، ۲۴۵

[6] تاریخ الاسلام للذھبی: ۳۱/۳۴

[7] الکامل فی التاریخ: ۴۵۲/۸

کچھ دن قلعے میں قیام کے بعد اس نے قلعے والوں کو کہا: ''ہم صوفی لوگ ہیں۔تم ہمیں اس قلعے کا نصف حصہ فروخت کر دو۔ ہم یہیں تمہارے ساتھ رہ کر اللہ کی عبادت کرتے رہیں گے۔''

قلعہ دار نے نو ہزار دینار میں نصف قلعہ فروخت کر دیا۔ ①

جلد ہی قلعے والوں کی بڑی تعداد حسن بن صباح کی مرید بن گئی جس کے بعد حسن بن صباح نے قلعے پر قبضے کا فیصلہ کر لیا۔ قلعہ دار ایک دن شکار کے لیے نکلا تو حسن بن صباح کے مریدوں نے پورے قلعے پر قبضہ کر لیا اور اسے یہاں کا بے تاج بادشاہ مان لیا۔ قلعہ دار کے پیچھے ایک مرید کو بھیجا گیا جس نے اسے قتل کر دیا۔ ②

اس علاقے کے حاکم کو خبر ہوئی تو فوج لے کر آن پہنچا۔ حسن بن صباح کے ساتھ علی یعقوبی نامی ایک نہایت ماہر سپاہی تھا۔ اس نے پورے گروہ کو چار حصوں میں تقسیم کر کے حملہ آوروں کے چاروں طرف پھیلا دیا۔ پھر یہ لوگ بیک وقت نقارے بجاتے اور ''یا علی'' کے نعرے لگاتے ہوئے آگے آئے۔ حملہ آور سمجھے کہ ہم چاروں طرف سے گھر گئے ہیں۔ وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور ان کی خیمہ گاہ خالی رہ گئی۔ حسن بن صباح یہ سارا ساز و سامان قلعہ اَلَمُوت میں لے آیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں کو خنجر زنی کی تربیت دی اور انہیں دور دور تک پھیلا دیا۔ ③

رفتہ رفتہ وہ شمالی ایران سے فارس تک مختلف قلعوں پر قابض ہو گیا جن میں طبس، قہستان، ازدہن، کردکوہ، طنبور، خالیجان (مضافاتِ اصفہان) خلاد خان (مضافاتِ خوزستان) قابلِ ذکر ہیں۔ ④

مصنوعی جنت اور برگِ حشیش:

حسن بن صباح نے قلعہ الموت کے ارد گرد پھیلے ہوئے سرسبز و شاداب کہسار میں کئی میل پر پھیلی ہوئی ایک مصنوعی جنت تعمیر کروائی جس میں نفسانی لذتوں کا ہر سامان میسر تھا۔ اس جنت میں مخصوص مریدین کو کچھ عرصہ رہنے کا موقع دیا جاتا۔ یہ مخصوص لوگ ''فدائی'' کہلاتے۔ حسن انہیں برگِ حشیش (بھنگ) کا عادی بناتا؛ اس لیے یہ لوگ ''حشاشین'' بھی کہلاتے تھے۔ مصنوعی جنت میں حسین لڑکیاں حوروں کے طور پر ان سے ہم آغوش ہوتیں اور انہیں اپنا عاشق بناتیں۔ کچھ مدت بعد انہیں باہر نکالا جاتا اور امام کے لیے نثار ہونے پر دوبارہ جنت میں داخلے کا یقین دلایا جاتا۔ ان کی ایسی تربیت کی جاتی تھی کہ وہ ایک اشارے پر جان نچھاور کر دیتے۔ انہیں ''فدائی'' کا نام دیا جاتا اور خنجر زنی کی خاص مشق کرا کے دنیا کے اہم سیاسی و عسکری مراکز میں بطور جاسوس مقرر کر دیا جاتا۔ حسن کا اشارہ ملتے ہی بڑے بڑے جرنیل، امراء اور سلاطین فدائی خنجروں کی بھینٹ چڑھ جاتے۔ حسن بن صباح کی ان سرگرمیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام دنیا کے درباروں پر اس کی ہیبت چھا گئی اور اس کا ہر مطالبہ تسلیم کیا جانے لگا۔ ⑤

---

① نهاية الارب في فنون الادب: ۲۴۵،۲۴۴/۳۰
② تاريخ الاسلام للذهبي: ۳۱/۳۴
③ نهاية الارب في فنون الادب: ۲۴۵،۲۴۴/۳۰
④ المختصر في اخبار البشر: ۲۱۴/۲
⑤ قصة الحضارة: ۳۱۷/۱۳، ط دار الجيل

ملک شاہ کی سفارت اور حسن کی ہیبت:

ملک شاہ جیسا طاقتور حکمران بھی حسن بن صَبّاح کی چیرہ دستیوں پر قابو نہ پاسکا۔ امام ابن الجوزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''سلطان ملک شاہ نے اس کے پاس سفارت بھیج کر اسے اطاعت کی دعوت دی اور مخالفت کی صورت میں دھمکایا اور اسے حکم دیا کہ وہ اپنے آدمیوں کو علماء اور امراء کو قتل کرنے سے منع کردے۔

حسن بن صَبّاح نے سلطان کے سفیر کو کہا: ''جواب تم خود دیکھ لو گے۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنے سامنے کھڑی جماعت سے کہا: ''میں چاہتا ہوں کہ تم میں سے کسی کو ایک کام کے لیے تمہارے آقا کے پاس بھیج دوں۔ تم میں سے کون کون تیار ہے؟''

یہ سن کر حاضرین میں سے ہر ایک یہ خدمت بجالانے کے لیے بے تاب ہونے لگا۔ ملک شاہ کا سفیر سمجھا کہ حسن بن صَبّاح ان لوگوں کو کوئی مراسلہ دے کر بھیجنا چاہتا ہے۔ مگر حسن بن صَبّاح نے ایک نوجوان کی طرف اشارہ کیا اور اسے کہا: ''اپنے آپ کو قتل کردے۔'' اس نے فوراً ایک خنجر نکال کر اپنے حلق پر پھیر لیا اور مردہ ہو کر گر پڑا۔ پھر حسن بن صَبّاح نے ایک دوسرے مرید سے کہا: ''خود کو یہاں سے نیچے گرادو۔''

اس نے فوراً قلعے کی بلندی سے جست لگائی اور ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔

حسن بن صَبّاح نے سفیر سے کہا: ''سلطان کو بتادو کہ میرے پاس اس قسم کے بیس ہزار آدمی ہیں جو میری اطاعت اس حد تک کرتے ہیں۔ یہی میرا جواب ہے۔''

ملک شاہ کو یہ معلوم ہوا تو حیران ہوگیا اور اسے مراسلے بھیجنے سے باز آگیا۔''[1]

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حسن بن صَبّاح نے کس قدر فدا کار اور سرفروش قسم کا جتھہ تیار کر رکھا تھا۔

۴۸۵ھ میں نظام الملک طوسی نے حسن بن صَبّاح کی سرکوبی کے لیے فوج بھیجی مگر اس نے اپنے مریدوں کو لے کر زبردست مقابلہ کیا اور فوج کو آگے نہ بڑھنے دیا۔ اسی دوران اس نے اپنے خنجر زن بھیج کر نظام الملک طوسی کو شہید کرادیا جس کی وجہ سے سرکاری فوج کو بھی واپس جانا پڑا۔[2] ۵۰۳ھ میں نظام الملک کے بیٹے احمد نے جو سلطان محمد سلجوقی کا وزیر تھا، یہاں چڑھائی کی۔ حسن بن صَبّاح نے ہتھیار نہ ڈالے۔ اس دوران شدید برف باری شروع ہوگئی اور سلجوقی افواج کو محاصرہ اٹھانا پڑا۔ اس کے فوراً بعد دربار الموت سے وزیر کے قتل کا پروانہ جاری ہوگیا۔ ایک باطنی نے گھات لگا کر وزیر پر خنجر زنی کی، احمد بن نظام زخمی ہوا مگر جان بچ گئی۔ حملہ آور گرفتار کرلیا گیا۔ جب وہ کچھ بتانے پر تیار نہ ہوا تو اسے شراب پلا پلا کر ماؤف العقل کردیا گیا۔ اس حالت میں اس نے بتادیا کہ مسجد مامونیہ میں اس کے کچھ ساتھی موجود ہیں۔ چنانچہ وہ گرفتار کرکے قتل کردیے گئے۔[3]

---

[1] المنتظم: ۶۴/۱۷

[2] الکامل فی التاریخ: ۵۸۰/۸

[3] تاریخ الاسلام للذهبی: ۱۸/۳۵، تدمری

باطنیوں کا دوسرا بڑا مرکز۔ قلعہ خالنجان:

ایران کے شہر اصفہان کے قریبی کوہستان کی ایک چوٹی پر ایک قلعہ تھا جسے ملک شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ملک شاہ ایک بار شکار کے لیے یہاں آیا تو اس کا ایک شکاری کتا بھاگ نکلا۔ ملک شاہ اسے تلاش کرتے کرتے اس چوٹی تک پہنچا، اس وقت رومیوں کا ایک سفیر اس کے ساتھ تھا۔ اس نے یہ جگہ دیکھ کر کہا:

''اگر یہ چوٹی ہمارے ملک میں ہوتی تو ہم اس پر قلعہ بنا لیتے۔''

یہ سن کر ملک شاہ نے یہاں پر بارہ لاکھ دینار کے خرچ سے ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ تعمیر کرایا[1] جو ''خالنجان'' کے نام سے مشہور ہوا۔ نظام الملک طوسی کا فرزند مؤید الملک اس کا والی بنا۔[2]

۴۸۸ھ میں حسن بن صبّاح کے استاذ زادے ابن عطاش نے اس قلعے پر قبضہ کر لیا اور گرد و نواح کے سارے علاقوں کو دہشت گردی کی آماجگاہ بنا ڈالا۔ لوگ اس قلعے کو ''منحوس قلعہ'' کہنے لگے۔ وہ کہتے تھے: ''اس جگہ تک رہنمائی کتے نے کی۔ اسے بنانے کا مشورہ ایک نصرانی نے دیا اور اس پر قبضہ ایک زندیق کا ہے۔''[3]

حاجیوں کے قافلے بھی اس قلعے والوں کی بے رحمی سے محفوظ نہ تھے۔[4] خواص کے علاوہ وہ عام مسلمانوں کو بھی اغوا کر کے قتل کر دیتے تھے۔ اصفہان میں ان کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اکیلے کہیں نکلنے سے گھبرانے لگے۔ جب کسی شخص کو گھر واپسی میں دیر ہو جاتی تو اہلِ خانہ اس کی موت کی خدشے سے مضطرب ہو جاتے تھے۔[5] بعض امراء اور سالار ہر وقت اپنی پوشاک کے نیچے زرہیں پہننے لگے تا کہ باطنیوں کے اچانک حملے سے بچاؤ ہو سکے۔[6]

علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ملک شاہ کے مرنے کے بعد اصفہان میں معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ باطنی گروہ کے لوگ آدمی کو اغوا کر لیتے تھے اور قتل کر کے کنوؤں میں پھینک دیتے تھے۔ کوئی شخص عصر تک اپنے گھر نہ لوٹتا تو لوگ اس کی زندگی سے مایوس ہو جاتے تھے۔ جب لوگوں نے تفتیش شروع کی تو ایک محلے کے کسی گھر میں ایک عورت ملی جو چٹائی پر بیٹھی تھی۔ لوگوں نے چٹائی کو ہٹایا تو اس کے نیچے (کنویں میں) چالیس لاشیں پائیں۔ لوگوں نے عورت کو قتل کر دیا، اس گھر اور محلے کو اجاڑ دیا۔ دراصل اس محلے کے داخلی راستے پر ایک نابینا بیٹھا رہتا تھا۔ جب کوئی انسان وہاں سے گزرتا تو وہ اس سے درخواست کرتا کہ اسے چند قدم اس محلے کے اندر لے جائے۔ جب وہ آدمی اسے اندر لے جاتا تو اس گھر کے لوگ اس پر قابو پا لیتے۔ اصفہان کے لوگوں نے ایسے افراد کی تلاش

---

① البدایہ والنہایۃ: ۱۹۴/۱۶، ۱۹۵، یہ رقم آج کل کے حساب سے تقریباً تین کروڑ ڈالر (یا تقریباً تین ارب روپے) ہوگی۔

② تاریخ ابن خلدون: ۱۲۲/۴

③ البدایہ والنہایۃ: ۱۹۵/۱۶

④ الکامل فی التاریخ: ۵۱۱/۸

⑤ الکامل فی التاریخ: ۴۵۰/۸

⑥ الکامل فی التاریخ: ۴۳۹/۸

میں بڑی کوشش کی اور ان کے بہت سے آدمی قتل کیے۔''①

سرکاری ملازمین کی چھان بین:

اس زمانے میں سرکاری ملازمین کے بارے میں بھی بڑی چھان بین کی جانے لگی کہ کہیں ان میں کوئی باطنی تو نہیں، حتیٰ کہ بعض اوقات علماء کے بارے میں بھی یہ تحقیق کی جاتی تھی۔ ۴۹۴ھ میں جامعہ نظامیہ (بغداد) کے مدرس شافعی فقیہ اِلْکِیَا الہرّاسی رحمہ اللہ کے بارے میں بھی افواہ پھیل گئی کہ وہ باطنی ہیں۔ سلطان محمد سلجوقی نے انہیں حراست میں لے لیا۔ آخر خلیفہ مستظہر عباسی کی طرف سے ان کے عقائد کی صحت کی تصدیق کی گئی تب انہیں چھوڑا گیا۔②

فخر الملک باطنیوں کے ہاتھوں شہید:

نظام الملک طوسی کا بڑا فرزند علی (عرف فخر الملک) خراسان کے حکمران سلطان سنجر سلجوقی کا وزیر تھا۔ اس کی عمر ۷۶ سال ہو چکی تھی۔ وہ اپنے والد کی طرح نہایت پارسا اور دیندار تھا۔ دس محرم ۵۰۰ھ کی شب اس نے خواب میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو دیکھا جو فرما رہے تھے: ''جلدی کرو۔ روزہ ہمارے ساتھ افطار کرنا۔''

فخر الملک نے یہ خواب اپنے امراء کو سنایا تو انہوں نے اس دن گھر میں محبوس رہنے کا مشورہ دیا۔ اسی دن عصر کے وقت فخر الملک نے اپنی دہلیز پر ایک فریادی کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا:

''مسلمان ختم ہو گئے۔ کوئی نہیں جو مظلوم کی فریاد رسی کرے۔ کوئی نہیں جو فریادی کا ہاتھ تھامے۔''

یہ پکار سن کر فخر الملک بے تاب ہو گیا اور فریادی کو اندر بلوا لیا۔ فریادی نے ایک رقعہ پیش کیا۔ فخر الملک اسے پڑھ ہی رہا تھا کہ اس نے یکدم خنجر نکال کر فخر الملک کے سینے میں بھونک دیا۔ قاتل حسن بن صباح کا فدائی تھا۔③

سلطان محمد سلجوقی کی اصفہان کے قلعۂ باطنیہ پر چڑھائی اور شیخ سمنجانی رحمہ اللہ کی فراست:

باطنیوں کی کارروائیوں سے تنگ آ کر سلطان محمد سلجوقی نے ۵۰۰ھ میں ان کے خلاف ایک بڑی کارروائی شروع کی اور اصفہان میں ان کے مرکز قلعہ خالنجان کا محاصرہ کر لیا۔ جب باطنی مقابلے سے عاجز آ گئے تو صلح کا پیغام بھیج دیا۔ سلطان نے اسے مسترد کر دیا۔ باطنیوں نے یہ دیکھ کر ایک دوسری تدبیر اپنائی۔ انہوں نے ایک استفتاء مرتب کر کے علمائے اہلِ سنت کے پاس بھیج دیا جس میں درج تھا:

''فقہائے اسلام کیا فرماتے ہیں ایسے لوگوں کے متعلق جو اللہ، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محمد ﷺ جو بھی لے کر آئے وہ حق اور سچ ہے، بس وہ حکمران کے مخالف ہیں، تو حکمران کے لیے ان سے صلح کرنا، ان کی اطاعت کو قبول کرنا اور ان کی حفاظت کرنا جائز ہے یا نہیں؟''

---

① المنتظم: ۶۳/۱۷

② الکامل فی التاریخ: ۸ ص ۴۵۷ ...... یہ الکیا الہراسی علی محمد بن علی طبری (م ۵۰۴ھ) ہیں جو اپنے وقت کے نامور فقیہ، مفسر اور مناظر تھے۔

③ الکامل فی التاریخ: ۵۳۲/۸

اکثر علماء ان کی چال میں آ گئے اور جواب میں لکھ دیا کہ یہ بالکل جائز ہے۔ بعض نے جواب دینے میں توقف کیا۔ البتہ ایک شافعی فقیہ امام ابوالحسن علی سمجانی رحمہ اللہ نے ان کا مکر طشت از بام کر دیا۔ انہوں نے ایک جم غفیر کے سامنے کہا:

''ان سے قتال واجب ہے۔ انہیں یونہی ان کے مرکز میں بسنے دینا جائز نہیں۔ ان کا فقط کلمہ شہادت کا تلفظ کر لینا ان کے لیے کارآمد نہیں ہے۔ ان سے ذرا یہ پوچھ کر دیکھیے کہ کیا تمہارا امام تمہارے لیے شریعت کی حرام چیزیں حلال کر دے یا حلال چیزیں حرام کر دے تو تم اس کا حکم مانو گے؟ تو ان کا جواب یہی ہوگا کہ ہاں مانیں گے۔ ایسے میں بالاجماع ان کا خون حلال ہو جاتا ہے۔''[1]

ابن عطّاش کا قتل اور قلعہ خالنجان کا انہدام:

چنانچہ باطنیوں سے مصالحت کی کوشش ترک کر دی گئی اور سلطان محمد سلجوقی نے ایک سال کے محاصرے کے بعد قلعہ خالنجان مسخر کر لیا۔ چونکہ یہ قلعہ منحوس مشہور تھا؛ اس لیے سلطان نے اس کا ایک ایک پتھر اکھڑوا دیا۔ اس کارروائی میں اکثر باطنی مارے گئے۔ ان کا پیشوا ابن عطاش جس نے بارہ سال تک اس علاقے کو دہشت زدہ کر کے رکھا تھا، زندہ گرفتار ہو گیا۔ اسے مختلف شہروں میں گشت کرانے کے بعد چمڑی ادھیڑ کر قتل کر دیا گیا، اس کا سر قلم کر کے مختلف شہروں میں پھرایا گیا۔[2]

اپنے آخری ایام میں سلطان محمد نے باطنیوں کے عالمی مرکز ''الموت'' کو مسخر کرنے کے لیے ایک فوج بھیجی تھی مگر سلطان محمد کی وفات کی خبر ملنے پر یہ فوج مہم ادھوری چھوڑ کر واپس آ گئی۔[3]

حسن بن صبّاح کی موت اور اس کے جانشینوں کے کرتوت:

حسن بن صبّاح نے ۹۰ سال طویل عمر پائی اور ۵۱۸ھ (۱۱۲۴ء) میں فوت ہوا۔ اس کے بعد اس کے نائبین نے سفاکانہ کارروائیاں جاری رکھیں اور ملحدانہ افکار و نظریات کو پھیلاتے اور دہشت انگیز کارروائیاں کراتے رہے۔ قلعہ الموت ان کی سرگرمیوں کے لیے نہایت محفوظ مستقر کا کام دیتا رہا۔[4]

اگلے عشروں میں یہاں متعدد حکمرانوں نے بار بار حملے کیے مگر الموت ہمیشہ ناقابلِ تسخیر رہا۔[5]

حاجیوں کے قافلوں کو لوٹنا بھی باطنیوں کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ۵۵۲ھ میں انہوں نے خراسان کے قافلۂ حج پر حملہ کر کے لاشوں کے ڈھیر لگا دیے۔ حملے کے چند گھنٹے بعد ایک بوڑھا باطنی گھوم پھر کر یہ آواز لگانے لگا: ''مسلمانو! حملہ آور چلے گئے ہیں۔ ہے کوئی پیاسا! میں اسے پانی پلاؤں۔''

جو زخمی پانی کے لیے کراہتا، بوڑھا اسے قتل کر دیتا۔ اس طرح قافلے میں ایک شخص کو بھی زندہ نہ چھوڑا گیا۔[6]

---

① الکامل فی التاریخ: ۴۴۲/۸، ۴۴۳ ② البدایۃ والنہایۃ: ۱۹۵/۱۶

③ الکامل فی التاریخ: ۵۴۲/۸ تا ۵۴۴؛ العبر فی خبر من غبر: ۳۹۷/۲ ④ الکامل فی التاریخ: ۶۹۶/۸

⑤ الکامل فی التاریخ: ۶۲۱/۸؛ العبر فی خبر من غبر: ۳۶۹/۲؛ نہایۃ الارب فی فنون الادب: ۲۴۵/۳۰

⑥ الکامل فی التاریخ: ۲۴۳/۹

جلال الدین حسن کا اظہارِ اسلام:

عباسی خلیفہ ناصر ایک مدت تک الموت کے پیشواؤں کو اسلام کی دعوت دیتا رہا اور کہتا رہا کہ اگر تم اسلامی شعائر کو اپنالو تو ہم اور تم ایک ہو جائیں گے۔ حسن ثالث کے دور میں اس نے کچھ جعلی خطوط تیار کرائے جو خوارزم شاہ کی طرف سے دربارِ خلافت کو لکھے گئے تھے اور کہا گیا تھا کہ سلطنتِ خوارزم باطنیوں کے قلعوں پر حملہ کر کے انہیں نیست و نابود کر دینا چاہتی ہے اور اس سلسلے میں دربارِ خلافت سے مدد کی طالب ہے۔ اب بغداد میں رہائش پذیر ایک باطنی کو بلوا کر خطوط دکھائے گئے اور کہا گیا: ''دیکھو خوارزم شاہ کے عزائم کس قدر خطرناک ہیں۔ اگر اپنے آقا کی سلامتی چاہتے ہو تو یہ خطوط اس تک پہنچا دو۔'' اس کے بعد اس باطنی کو راتوں رات ڈاک کی سواریوں کے ذریعے الموت روانہ کر دیا گیا۔ حسن ثالث یہ سب کچھ پڑھ کر ڈر گیا۔[1] اس نے ایک چال چلی اور اپنے مریدوں کو کہا: ''میں نے خواب میں حضرت علی کو دیکھا۔ وہ کہہ رہے تھے تم شعائرِ اسلامیہ اور اس کے فرائض و سنن کو دوبارہ اختیار کر لو۔''

اس عجیب حکم پر باطنی حیران ہوئے تو حسن ثالث نے کہا: ''یہ دین ہمارا ہے۔ کبھی ہم تمہیں شریعت سے آزاد کر دیتے ہیں اور کبھی شرعی پابندیاں نافذ کر دیتے ہیں۔'' سب نے کہا: ''ہم نے سنا اور مانا۔''[2]

۶۰۸ھ میں اس کے سفیر بغداد آئے اور اطلاع دی کہ ہم باطنیت سے بری ہیں اور اسلام لا چکے ہیں۔ ہم مساجد اور جامعات بنا رہے ہیں اور رمضان کے روزے رکھ رہے ہیں۔ خلیفہ اور عام مسلمان اس اطلاع سے بہت مسرور ہوئے۔ حسن نے اپنی والدہ کو حج کے لیے بھیجا جس کا دربارِ خلافت کی طرف سے بڑا اعزاز و اکرام کیا گیا اور اسے حج کے لیے ہر ممکن سہولت فراہم کی گئی۔[3] جلال الدین حسن نے کلمۂ شہادت سے آراستہ بڑے بڑے دینار ڈھلوائے اور دو سو باطنی نوجوانوں نے بغداد جا کر عوام میں ان کی نمائش کی اور زبان سے کلمۂ شہادت دہراتے رہے۔[4]

مگر ایسا لگتا ہے کہ یہ اظہارِ اسلام فقط ایک سیاسی ڈھونگ تھا۔ چنانچہ ۶۱۷ھ میں جب سلطنتِ خوارزم تاتاریوں کے حملے کے سامنے ڈھیر ہو گئی اور اس سے لاحق خطرہ دور ہو گیا تو باطنی دوبارہ اپنی پرانی روش پر آ گئے؛ اسی لیے حافظ ذہبی جلال الدین حسن کا تعارف یوں کراتے ہیں: ''طاغوت الاسماعیلیة ضلال اللعین حسن بن علی الصباحی''[5]

اَلَموت کی تباہی:

حسن بن صباح کے جانشین دراصل دہشت گردوں کا ٹولہ اور کرائے کے قاتل تھے جو الَموت کے مضبوط قلعے سے احکام جاری کر کے مشہور شخصیات کو بدنی قتل کا نشانہ بنایا کرتے تھے یا دھمکیاں دے کر لاکھوں کروڑوں کے بھتے وصول کرتے تھے۔ مطالبہ پورا نہ کرنے والے حملے کا شکار ہو کر رہتے تھے۔ نظام الملک طوسی (م ۴۸۵ھ) فدائیوں کا پہلا

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۱۹۸/۲۲ [2] نهاية الارب في فنون الادب: ۲۴۷/۳۰
[3] العبر فی خبر من غبر: ۱۴۷/۳؛ النجوم الزاهره فی ملوك مصر والقاهره: ۲۰۳/۶
[4] سیر اعلام النبلاء: ۱۹۸/۲۲
[5] سیر اعلام النبلاء: ۱۱۴/۲۲ ..... اسماعیلیوں کا طاغوت، دین سے گمراہ کرنے والا حسن بن علی صباحی

نشانہ تھا۔ اس کے بعد شافعی فقیہ علامہ الرویانی رحمہ اللہ (م ۵۰۲ھ)، حاکمِ موصل مودود (م ۵۰۷ھ)، خلیفہ مسترشد (۵۲۹ھ) خلیفہ راشد (۵۳۲ھ) اورشہاب الدین غوری (۶۰۲ھ) ان کے خنجروں کا نشانہ بنے۔ سلطان سنجر، سلطان صلاح الدین ایوبی اور امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ جیسی شخصیات ان کی زد میں رہیں۔ بعض اوقات یہ قاتل جماعت ایک حکمران سے معاوضہ لے کر دوسرے حکمران کو قتل کیا کرتی تھی۔ ان کی سفا کانہ کارروائیوں سے مسلمان ڈیڑھ صدی تک پریشان رہے۔ آخر اس دہشت گرد گروہ کا خاتمہ چنگیز خان کے جانشینوں کے ہاتھوں ہوا۔

باطنیوں کا آخری حکمران رکن الدین خورشاہ تھا، اس کے دور میں بظاہر باطنی اپنی جگہ بہت مستحکم تھے؛ کیوں کہ تاتاریوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر ٹوٹنے والے مصائب نے باطنیوں کے حوصلے بڑھا دیے تھے مگر اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ ان کی مشرقی شکارگاہوں پر اب تاتاریوں کا راج تھا؛ اس لیے انہیں مسلم حکمرانوں کی جگہ اکثر اوقات تاتاری حکام سے سابقہ پڑتا تھا جن کی سفاکی اور غارت گری سے ایشیا کا کوئی حصہ محفوظ نہیں تھا۔

باطنیوں اور تاتاریوں کے مابین کش مکش بہت جلد رنگ لائی اور خراسان کا تاتاری حکمران ہلاکو خان ایک بہت بڑا لشکر لے کر ۶۵۵ھ میں باطنیوں کی ریاست میں گھس گیا۔ باطنیوں کے تمام قلعے مسمار کرنے کے بعد آخر کار وہ ''الموت'' تک جا پہنچا۔ یہ ناقابلِ تسخیر قلعہ سر کر کے اس نے رکن الدین خورشاہ کو قتل کرادیا اور ''الموت'' کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اسماعیلیوں کی روایات کے مطابق رکن الدین خورشاہ کا لڑکا شمس الدین ''الموت'' سے قفقاز کی طرف بھاگنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ بعد میں وہ اصفہان اور ہمدان کے درمیان کسی جگہ روپوش رہا اور آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں فوت ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ آغاخانی خاندان اسی کی نسل ہے۔[1]

اَلَموت کے باطنی پیشواؤں کی فہرست درجِ ذیل ہے:

۱	حسن بن صباح	۴۸۳ھ تا ۵۱۸ھ	۱۰۹۰ء تا ۱۱۲۴ء	بانی فرقہ
۲	محمد بن کیا بزرگ	۵۱۸ھ تا ۵۲۹ھ	۱۱۲۴ء تا ۱۱۳۵ء	
۳	حسن ثانی بن محمد	۵۲۹ھ تا ۵۶۱ھ	۱۱۳۵ء تا ۱۱۶۶ء	
۴	محمد ثانی بن حسن	۵۶۱ھ تا ۶۰۷ھ	۱۱۶۶ء تا ۱۲۱۰ء	
۵	حسن ثالث بن محمد، جلال الدین	۶۰۷ھ تا ۶۱۸ھ	۱۲۱۰ء تا ۱۲۲۱ء	اظہارِ اسلام
۶	محمد الثالث بن حسن ثالث	۶۱۸ھ تا ۶۵۳ھ	۱۲۲۱ء تا ۱۲۵۵ء	
۷	رکن الدین خورشاہ	۶۵۳ھ تا ۶۵۵ھ	۱۲۵۵ء تا ۱۲۵۷ء	آخری حکمران

اَلَموت کے مرکز میں باطنیوں کا اقتدار ۱۷۱ سال تک رہا۔[2]

---

[1] الموسوعة الميسرة في الاديان والمذاهب: ۴۰۵/۱؛ قصة الحضارة: ۳۱۷/۱۳

[2] الموسوعة الميسرة في الاديان والمذاهب: ۳۸۵/۱، ۴۰۳

اسماعیلیوں کے دیگر فرقے

دیگر باطل مذاہب کی طرح اسماعیلی بھی شاخ در شاخ تقسیم ہوتے چلے گئے۔ الگ الگ پیشواؤں نے اپنے علیحدہ علیحدہ فرقے بنالیے جو دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔ ان میں سے اہم فرقے درج ذیل ہیں:

نزاری:

اسماعیلی نزاری فرقے کے لوگ عبیدی حکمران مستنصر کے بیٹے نزار کو امام مانتے تھے اور اس کے بھائی مستعلی کی حکومت اور امامت کا انکار کرتے تھے۔ ان کے ائمہ شام کے علاقوں: سلمیہ، قدموس، مصیاف، خوابی، کہف اور بانیاس وغیرہ میں آباد رہے۔ انہوں نے حکمرانی کے بجائے درویشوں اور روحانی پیشواؤں کا روپ اختیار کیا۔ اس فرقے کا ایک اضافی عقیدہ یہ تھا کہ انسان بار بار مختلف شکلوں میں جنم لیتا ہے۔ شیخ راشد الدین سنان ان کا سب سے بڑا پیشوا تھا جو سلطان صلاح الدین ایوبی کے دور میں مصیاف (شام) میں قیام پذیر تھا۔ اس نے بھی فدائی خنجر زن تیار کر رکھے تھے۔[1]

بوہری:

عبیدی حکمران مستعلی کا بیٹا آمر اپنے دو بیٹوں سمیت حسن بن صبّاح کے آدمیوں کے ہاتھوں قتل ہوا تھا اور اس کے بعد حکومت مستعلی کے خاندان سے نکل کر اس کے چچا زاد الحافظ کے پاس آ گئی۔

مگر ایک گروہ مستعلی کی اولاد میں امامت باقی مانتا رہا۔ یہ گروہ بوہری کہلایا۔ ان کے نزدیک مستعلی کا بیٹا آمر اور پھر آمر کا بیٹا طیب امام تھے۔ یہ بوہریوں کا دعویٰ ہے ورنہ تاریخی ریکارڈ میں آمر کے طیب نامی کسی بیٹے کا وجود نہیں۔ بوہریوں کے عقیدے کے مطابق طیب ۵۲۵ھ میں مستور ہو گئے مگر امامت انہی کے بیٹوں پوتوں میں چلی آرہی ہے جو سب کے سب ہمیشہ مستور رہتے ہیں۔ ان مستور ائمہ کے نام اس فرقے کے علماء بھی نہیں جانتے۔

بوہری فرقے نے سیاست چھوڑ کر تجارت کو پیشہ بنایا۔ آگے بوہریوں میں دو فرقے بن گئے: ایک داؤدی بوہری جو خود کو اپنے پیشوا قطب شاہ بن داؤد کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ بمبئی (بھارت) اور کراچی (پاکستان) میں یہ لوگ اب بھی آباد ہیں۔ ان کا مرکز بمبئی میں ہے۔

دوسرے سلیمانی بوہری جو خود کو اپنے پیشوا سلیمان بن حسن کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یمن میں ان کا مرکز آج بھی قائم ہے۔ بوہری نماز پڑھتے ہیں مگر امام مستور کے لیے۔ حج کرتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ کعبہ امام مستور کا رمز ہے یعنی اس کا طواف امام مستور کا طواف ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی مساجد میں نماز جائز نہیں۔[2]

---

① الموسوعۃ المیسرۃ فی الادیان والمذاہب: ٤/٨٨

② الموسوعۃ المیسرۃ فی الادیان والمذاہب: ٣/٨٨ تا ٥

آغا خانی:

یہ فرقہ گیارہویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں) میں ایران میں ظاہر ہوا تھا۔ یہ لوگ خود کو اسماعیلی نزاری فرقے کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس کا پہلا پیشوا حسن علی شاہ (آغا خان اوّل) تھا جس نے ایران میں برطانوی ایجنٹ کے طور پر کام کرتے ہوئے اسماعیلی نزاری مذہب کی طرف دعوت دیتے ہوئے شورش کھڑی کی۔ اسے جلاوطن کیا گیا تو یہ افغانستان پہنچا۔ وہاں کابل کے شمال میں درۂ کیان کو مرکز بنایا۔ ایک مدت بعد وہاں سے بمبئی آ گیا۔ برطانوی حکومت نے اسے ''سر آغا خان'' کا خطاب دیا۔ ۱۸۸۱ء میں اس کی وفات ہوئی۔

اس کے بعد آغا خانی اماموں کی ترتیب یہ ہے:

- آغا علی شاہ (آغا خان دوئم) ۱۸۸۱ء تا ۱۸۸۵ء
- محمد الحسینی (آغا خان سوئم) ۱۸۸۵ء تا ۱۹۵۷ء

آغا خان سوئم کے لقب سے مشہور اور بے پناہ دولت کے مالک محمد الحسینی کا قیام زیادہ تر یورپ میں رہا۔ برطانوی ہندوستان کی سیاست پر آغا خان سوئم کے خاص اثرات رہے۔ محمد الحسینی نے پاکستان کی بانی سیاسی پارٹی آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام میں مدد کی اور ایک طویل مدت تک اس کی صدارت بھی سنبھالے رکھی۔ اس نسبت نے قیام پاکستان کے بعد یہاں آغا خانیوں کا اثر ورسوخ بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

- سر کریم (آغا خان چہارم) ۱۹۵۷ء تا دورِ حاضر

محمد الحسینی نے اپنے مذہب کا اصول توڑتے ہوئے اپنے بڑے بیٹے کی جگہ اپنے پوتے کریم کو پیشوا بنا دیا۔ کریم آغا خان نے امریکی جامعات میں تعلیم حاصل کی اور فرانس میں رہائش اختیار کی۔ دولت وثروت اور سیاسی سوجھ بوجھ کے لحاظ سے کریم آغا خان کو گزشتہ تمام اماموں پر فائق مانا جاتا ہے۔[1] یورپی طاقتوں اور امریکہ سے کریم آغا خان کے گہرے روابط ہیں۔ مسلم دنیا کی سیاست پر آغا خانیوں کے اثرات ناقابلِ انکار ہیں۔ پاکستان کے شمالی علاقہ جات خصوصاً چترال میں رفاہی کاموں کے ذریعے آغا خانیوں نے جو غیر معمولی اثر ورسوخ پیدا کیا ہے، یہ پرنس کریم آغا خان کی منصوبہ بندی کا کرشمہ ہے۔

---

[1] الموسوعة الميسرة في الأديان والمذاهب: ۸۸/۷ تا ۹

یونانی فلسفے کا حملہ اور باطنیت کی فکری تلبیسات

بنو بُویہ، قرامطہ اور بنو عبید کی سرپرستی میں کام کرنے والے بے دین مفکرین کا سب سے بڑا ہتھیار فلسفہ تھا۔ اسے اٹھا کر وہ اسلام پر ضرب لگانے کی بھرپور تگ و دو کرتے رہے۔

فلسفے میں منطق، ریاضی، فلکیات، طب اور طبعیات جیسے علوم تو یقیناً مفید تھے مگر اس میں ایک بڑا حصہ الٰہیات اور مابعد الطبعیات کا تھا۔ درحقیقت یہ یونانیوں کی دیومالائی داستانوں کی ایک نئی شکل تھی جسے فلسفیانہ اصطلاحات میں ڈھال دیا گیا تھا۔ اس میں عقولِ عشرہ اور افلاک کے شجرۂ نسب سے لے کر کتنی ہی عجیب و غریب چیزیں متعارف کرائی گئی تھیں جن کا کہیں کوئی وجود نہیں۔ یہ مفروضات اور تخیلات کا ایک دفترِ بے معنی تھا جسے عقلیات کا نام دے دیا گیا تھا۔ مسلمان جنہیں اللہ نے اپنی آخری کتاب، آخری رسول اور اس کی سنتِ مطہرہ کے ذریعے ایمان و معرفت سے آشنا کر دیا تھا، ہرگز ایسی ہفوات کے محتاج نہ تھے۔ مگر ارسطو اور افلاطون کے فلسفے سے مرعوب مسلم حکماء نے فلسفے کے دیگر علوم کی طرح ان خرافات کو بھی من و عن لے کر ان کی پورے شدومد سے اشاعت کی۔ اس سے جو گمراہی پھیلی اس کا پہلا اثر اعتزال کی شکل میں ظاہر ہوا۔ پھر اگلی صدیوں میں اس کے متعدد بہروپ سامنے آتے رہے۔

پہلی صدی ہجری سے لے کر چھٹی صدی ہجری تک معبد الجہنی، جہم بن صفوان، یعقوب بن اسحٰق کندی، ابن الراوندی، ابن المقفع، ابوعیسٰی ورّاق، ابوالعلاء مَعرّی، الفارابی، ابن سینا اور شہاب الدین سہروردی المقتول چند ایسے نام ہیں جو فلسفے اور جدت پسندی کے ذریعے عالم اسلام میں گمراہ نظریات کے بانی رہے۔[1]

فلسفے کے استعمال میں معتزلہ اور باطنیہ کے مابین فرق:

چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک مذہب کی حیثیت تسلیم کرتے ہوئے فلسفے کو مذہبی بحثوں میں استعمال کیا جا رہا تھا۔ عقلیت پسند معتزلی علماء عقل کی بالادستی کا پرچم بلند کرنے کے باوجود قرآن و حدیث اور فقہ کے اوامر و نواہی کو مانتے تھے اور گناہوں سے بچتے تھے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ دین کو عقل کے ساتھ ساتھ اس طرح چلایا جائے کہ یونانی فلسفہ اسلام کا وکیل نظر آئے اگرچہ وہ اس کوشش میں ناکام رہے اور اسلام کی صحیح وکالت کرنے کی بجائے خود کج فکری کا شکار ہوگئے مگر بہرکیف وہ اہلِ ایمان تھے۔ ان کے بارے میں سخت ترین موقف رکھنے والے علمائے اسلام نے بھی انہیں ''بدعتی'' ہی

① شہاب الدین سہروردی المقتول، سلطان صلاح الدین ایوبی کے زمانے میں گزرا ہے۔ وہ شام کا مشہور فلسفی تھا۔ بہترین شاعر اور ادیب تھا۔ نوجوان اس کے گرویدہ ہوتے جا رہے تھے۔ آخر کار اس کے ملحدانہ نظریات کی وجہ سے سلطان صلاح الدین ایوبی نے اسے قتل کرا دیا۔ یاد رہے کہ شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ، بانی سلسلہ سہروردیہ بھی صلاح الدین ایوبی کے دور کے بزرگ ہیں مگر شہاب الدین سہروردی المقتول الگ شخصیت ہے اور وہ الگ۔

شمار کیا ہے۔ان کو خارج از اسلام قرار نہیں دیا۔

مگر بنوبُویَہ اور بنوعبید کے روپ میں چوتھی ہجری کے دوران فلسفے کے دریا میں جو تلاطم آیا،اس کے پیچھے اسلام اور مذہب کو پس پشت ڈالنے بلکہ کالعدم تصور کرنے کا جذبہ ویسے ہی کارفرما تھا جیسے یونانی فلسفیوں کے دل ودماغ میں۔ اس نئی سوچ اور فکر کی داغ بیل تیسری صدی ہجری میں بغداد،خراسان اور مصر کے ان فلسفیوں کے ہاتھوں پڑ چکی تھی جنہوں نے فلاسفہ کی کتب کو تراجم کی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان کی تشریح بھی کی۔ان میں یعقوب بن اسحاق کندی (م ۲۵۸ھ) الراوندی (م ۲۹۸ھ)،ابونصر الفارابی (م ۳۳۹ھ) اور ابوالعلاء معرّی (م ۴۴۹ھ) سرفہرست ہیں۔

الراوندی ایک عجیب وغریب شخص تھا۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پہلے وہ معتزلی تھا پھر زندقہ کا شکار ہوا مگر محققین کا خیال ہے کہ اس کا کوئی دین ومذہب نہیں تھا۔وہ ایک بے دین فلسفی تھا اور پیسے کے لیے کچھ بھی کرسکتا تھا حتیٰ کہ اس نے یہودیوں سے خطیر معاوضہ لے کر انہیں اسلام کے خلاف ایک کتاب لکھ کر دی۔اس نے ۸۰ برس سے زیادہ عمر پائی۔ حکومت نے اسے گرفتار بھی کرنا چاہا مگر وہ کبھی ہاتھ نہ آیا؛ کیوں کہ یہودی اسے روپوشی کے ٹھکانے مہیا کردیتے تھے۔[1]

الفارابی اور بوعلی سینا:

الفارابی (م ۳۳۹ھ) نے ارسطو کے فلسفے کو ایک نئی آن بان کے ساتھ پیش کیا۔وہ ارسطو سے بے حد متاثر تھا؛اس لیے اس نے اس کے افکار پر جرح وتنقید کی کوئی خاص کوشش نہیں کی بلکہ تقلیدی انداز میں ان کی تدوین وتشریح کرکے اسے لوگوں کے سامنے پیش کردیا۔اس نے منطق وفلسفے کو ازسرِ نو اس خوبصورتی کے ساتھ مدوّن کیا کہ سینکڑوں علماء ان علوم کی تحصیل میں لگ گئے؛اسی لیے فارابی کو ارسطو کا سب سے بڑا ترجمان وشارح اور یونانی علوم کا معلّمِ ثانی کہا جاتا ہے۔[2]

اس کے بعد چوتھی صدی ہجری میں حکیم بوعلی ابن سینا (م ۴۲۸ھ) نے حکمت کا قلمدان سنبھالا اور یونانی فلاسفہ کے افکار کی بڑے پیمانے پر اشاعت کی۔اس کا باپ اسماعیلی مذہب کا داعی تھا،اس لیے ابن سینا شروع سے باطنی فلسفے سے متاثر تھا۔ابن سینا نے طب کے میدان میں جو عظیم الشان کام کیا ہے،اس کی افادیت کا اعتراف کرنا چاہیے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس نے فلسفے کے ذریعے عالم اسلام میں تشکیک اور آزادخیالی کی جو زمین ہموار کی اس پر اباحیت اور بے دینی کے سوا کوئی اور فصل نہ اُگ سکی۔[3]

فلاسفہ کا یہ طبقہ اگرچہ اعلانیہ طور پر مذہب کا منکر نہیں تھا مگر عملاً دین وشریعت کو بے کار چیز سمجھتا تھا اور بنیادی طور پر ارسطو اور افلاطون کی طرح صرف عقل کی کامل برتری کا قائل تھا۔یہ طبقہ فلسفے کو دین کے متوازی ایک الگ اور مکمل ضابطۂ حیات تصور کرتا تھا۔نہ صرف طبعیات فلکیات بلکہ سیاسیات واخلاقیات سے لے کر عقائد اور روحانیات تک اس کے نزدیک فلسفہ ہی کامل رہنما تھا۔جوں جوں لوگوں میں فلسفیانہ علوم کی رغبت بڑھتی گئی،ویسے ویسے خدا،رسول، مذہب اور شریعت کی وقعت دلوں سے رخصت ہوتی گئی اور عملی زندگیوں میں بھی فسق وفجور عام ہوگیا۔

---

① سیر اعلام النبلاء: ۶۱/۱۴ ② وفیات الاعیان: ۱۵۳/۵ تا ۱۵۶ ③ سیر اعلام النبلاء: ۵۳۱/۱۷ تا ۵۳۶

بنویہ کے تسلط کے دوران بغداد میں ''اخوان الصفا'' کے نام سے ایک خفیہ مدرسہ قائم ہوا جو ملحدین اور اباحیت پسندوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس مدرسے کا منشور یہ تھا:

''ان الشریعة الاسلامیة قد تنجست بالجهالات واختلطت بالضلالات ولا سبیل الیٰ غسلها وتطهیرها الا بالفلسفة.''

(بلاشبہ اسلامی شریعت جہالتوں اور گمراہیوں سے آلودہ ہو چکی ہے، اسے پاک کرنے کے لیے فلسفے سے رہنمائی لیے بغیر چارہ کار نہیں۔) نعوذ باللہ من ذالک۔

اس مکتب کے مفکرین صرف نوجوانوں اور طالب علموں کو خفیہ طور پر دعوت دے کر اپنا ہم خیال بناتے تھے؛ کیوں کہ پختہ فکر مسلمانوں اور عمر رسیدہ لوگوں کا ایسی جدت پسندانہ بلکہ ملحدانہ سوچ کو اپنانا بہت مشکل تھا۔ اس مکتب کے سرغنوں نے وقتاً فوقتاً مختلف چھوٹی چھوٹی کتب تصنیف کیں جن کی تعداد ''۵۲'' ہے۔ یہ کتب خراسان سے اندلس تک جدت پسندی، الحاد اور تشکیک کے بیج بوتی رہیں۔ [1]

ابوالعلاء معری (۳۶۳ھ۔۴۴۹ھ) اس الحادی تحریک کا مشہور رہنما تھا۔ وہ چیچک زدہ اور یک چشم تھا۔ رنگوں میں تمیز سے محروم تھا۔ درویشانہ زندگی گزارتا، موٹا جھوٹا پہنتا، گوشت کو ہاتھ نہ لگاتا، صرف سبزیوں پر گزارا کرتا تھا۔ سکہ بند شاعر اور ادیب تھا۔ اس نے اپنی ۸۶ سالہ زندگی میں بیسیوں قادر الکلام شاگرد پیدا کیے اور درجنوں کتب لکھیں جن میں جگہ جگہ الحاد اور بے دینی کی تعلیم تھی۔ آسمانی کتابوں اور رسولوں کا وہ صاف انکار کرتا اور عقل کو ہدایت کے لیے کافی قرار دیتا تھا۔ [2]

باطنیت:

پانچویں صدی ہجری میں ایک نئے نظریے نے اسلام کی بنیادوں میں نقب لگانے کی کوشش کی۔ اس نظریے کو ''باطنیت'' کہا جاتا تھا۔ اسلام دشمن عناصر نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اسلام کے تمام احکام قرآن وسنت اور فقہ میں بہت واضح اور مدلل انداز میں موجود ہیں اور صدیوں سے انہیں غلط ثابت کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوتی آئی ہے، انہوں نے یہ جان لیا تھا کہ ان شرعی مآخذ کے الفاظ کے محفوظ ہوتے ہوئے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ چونکہ الفاظ کو ختم کرنا ان کے بس سے باہر تھا؛ اس لیے انہوں نے ایک ایسا نظریہ ایجاد کیا جو ان مآخذ کے الفاظ سے لوگوں کا اعتماد ختم کردے۔ یہی نظریہ ''باطنیت'' کہلایا۔ اس نظریے کا خلاصہ یہ تھا کہ ہر لفظ کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ ظاہر کو علماء جانتے ہیں مگر باطن کا علم صرف امامِ وقت کو ہوتا ہے۔ اصل مراد یہی باطن ہوتا ہے؛ اس لیے قرآن وحدیث کی کسی عبارت سے چاہے کچھ بھی ثابت ہو رہا ہو، اگر امام اس کے خلاف حکم دے تو اس کی تعمیل ضروری ہے؛ کیوں کہ وہ باطن کو دیکھ کر حکم دے رہا ہے جو عام دنیا سے پوشیدہ ہے۔ [3]

---

[1] تاریخ فلاسفة الاسلام از محمد لطفی جمعہ، ص ۲۵۶ [2] البدایة والنهایة: ۱۵/۷۴۵ تا ۷۵۳؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۸/۲۳

[3] الموسوعة المیسرة فی الادیان والمذاهب: ۱/۸۸ تا ۵۱؛ الملل والنحل للشهرستانی: ۱/۱۹۰ تا ۱۹۵

اس نظریے کے اصل بانی بنوعبید کے وہ ائمہ تھے جو مصر پر مسلط تھے۔ان کے داعی اسلام کی ہر اصطلاح اور ہر مفہوم کو اپنی تحریک کے رنگ میں رنگ دیتے تھے مثلاً ان کے اماموں کا کہنا تھا کہ طہارت کا مطلب ہے ''باطنی مذہب کے سوا ہر مذہب سے پاک ہونا۔'' زکوۃ سے مراد ''اپنے مذہب کی اشاعت'' ہے۔حج سے مراد ''باطنی علوم کی طلب'' ہے۔ جنت سے مراد ''علم باطن'' ہے۔جہنم کا مطلب علم ظاہر (فقہاء و محدثین کا علم) ہے۔کعبہ سے مراد مسجد الحرام والا کعبہ نہیں بلکہ اس کا مصداق خود نبی ہے۔بابِ کعبہ سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔جبرئیل سے مراد کوئی وجود نہیں بلکہ وہ قوتِ قدسیہ کا فیضان ہے۔غرض اس طرح باطنیت پورے دین اسلام ہی کا صفایا کرنے کے درپے تھی؛اسی لیے علمائے اسلام باطنیوں کو ''ملحدین'' یا ''ملاحدہ'' کے نام سے یاد کرتے رہے۔

باطنیت کا سب سے بڑا اور کامیاب داعی حسن بن صَبّاح تھا۔وہ خود بھی ایک فلسفی تھا؛اس لیے اسے عقلی طور پر غلط کو صحیح کر کے دکھانے کا فن خوب آتا تھا۔اسی فن کو اس نے اپنی ''دینی دعوت'' کے لیے استعمال کیا۔اس کا کہنا تھا کہ کسی بھی موجود چیز کی کوئی حقیقت نہیں۔حقیقت اس کے اندر چھپی ہے جو صرف امام بتا سکتا ہے۔اس کی تعلیم تھی کہ اگر امام بت پرستی کو توحید قرار دے یا کسی بے گناہ مسلمان کو قتل کرنے کا حکم دے تو یہ بالکل درست ہوگا کہ اس فعلِ بد کا باطن اچھا ہوگا۔اگر وہ توحید کو شرک کہے یا نیکی کو گناہ کہے تو یہ بالکل درست ہوگا؛کیوں کہ باطن سے وہی واقف ہے۔

غرض اس تحریک نے الفاظِ شرع کے مشہور و معروف معانی کا انکار کر کے حلال و حرام کی قیود اٹھا دیں،ہر قسم کی شہوت پرستی جائز قرار دے دی اور اسلام سے متصادم ایک اور مذہب کو اسلام کا نام دے کر پیش کیا۔اس کے ساتھ ساتھ حسن بن صَبّاح کے فدائیوں نے اُمت کی بہترین شخصیات کو شہید کر کے مسلمانوں کو ایک خطرناک قحط الرجال میں بھی مبتلا کر دیا۔[1]

◆◆◆

[1] الموسوعة الميسرة فی الادیان والمذاهب: ۱/۸۸ تا ٥؛ الملل والنحل شهر ستانی: ۱/۱۹۰ تا ۱۹۵
کشف اسرار الباطنیه از محمد بن مالک یمانی، ص ١٤ تا ٧٨

فلسفیانہ فتنوں کے مقابلے میں علمائے کرام کا کردار

پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں

چوتھی صدی ہجری میں گمراہ کن تحریکوں کے ساتھ ایک کمزوری خود علمائے اہلِ سنت کے اندر پیدا ہوگئی تھی۔ امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ نے علم کلام کو فروغ دے کر مذہب کے اثبات کے لیے عقلی و منطقی دلائل کے جو حصار قائم کیے تھے، ان میں دراڑیں پڑ چکی تھیں۔ دراصل ان اصول وقواعد کے ذریعے دین کے اثبات میں بڑا دخل خود امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ کی زندہ وقد آور شخصیت کا تھا لیکن بعد میں آنے والے متکلمین (ماہرینِ علم کلام) نے ان کے طرز کی اندھی تقلید کی اور ان اصول وقواعد کو جو عقل پرست معتزلی علماء کو مسکت جواب دینے کے لیے وضع کیے گئے تھے، دین کے جزو جیسی حیثیت دے دی۔ مزید برآں یہ کہ بعض متکلمین نے فلسفیانہ مباحث کو بھی علم کلام کا حصہ بنا دیا۔ ظاہر ہے یہ طرزِ استدلال دینی عقائد ونظریات کے لیے کوئی قطعی ثبوت فراہم نہیں کرتے تھے؛ کیوں کہ ہر وقت یہ امکان موجود رہتا تھا کہ کوئی زیادہ ذہین وفطین آدمی عقلی بنیادوں پر ان میں کوئی کمزوری نکال کر انہیں بے ثبات کر دے۔ علاوہ ازیں یہ طرزِ استدلال قرآنِ حکیم اور سنتِ مطہرہ کی طرح پر کشش، دل آویز، فطری اور عام فہم بھی نہیں تھا۔

اس طرز کا ایک بہت بڑا نقصان یہ شروع ہوگیا تھا کہ جو لوگ علم کلام میں دلچسپی لیتے وہ ایک قسم کے ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتے تھے۔ ان میں دقیق اور پیچیدہ باتوں پر غور کرنے کا ذوق بیدار ہو جاتا تھا، چاہے وہ باتیں سرے سے بالکل بے بنیاد ہوں۔ چنانچہ لوگ فلسفیوں، باطنی داعیوں اور گمراہ فرقوں کی لچھے دار باتوں کو کان لگا کر اس طرح سننے لگے تھے جیسے واقعی ان میں بڑے غامض علوم اور عجیب اسرار پوشیدہ ہوں۔

غرض اس دور کے متکلمین، دین کی صحیح نمائندگی نہیں کر رہے تھے اور لگے بندھے اصول وقواعد پر ان کے اصرار سے خود دین کی بنیادیں کمزور ہونے لگی تھیں اور باطل فرقوں کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔ ایسے میں کچھ راسخ فی العلم حضرات نے علم کلام کی خرابیوں، فلسفے کی آفات اور باطنیت کی زہرناکیوں سمیت گمراہی کے ان تمام طوفانوں کے سامنے بند باندھنے کی بھرپور کوششیں کیں۔ ان میں سے چند نمایاں ترین شخصیات کے حالات پیشِ خدمت ہیں۔

◆◆◆

شیخ الاسلام ابو اسماعیل انصاری رحمہ اللہ (۳۹۶ھ۔۴۸۱ھ)

ان جلیل القدر علماء میں خراسان کے شیخ الاسلام ابو اسماعیل انصاری رحمہ اللہ جو حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی

اولاد سے تھے، سب سے زیادہ متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ان کا قیام ہرات میں تھا۔ وہ بیک وقت محدث، فقیہ، واعظ، مصلح اور صوفی تھے۔مجلسِ وعظ میں ہر حدیث مکمل سند کے ساتھ سنایا کرتے تھے اور سند قطع کر کے اپنی کوئی چیز نقل کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔انہیں بارہ ہزار احادیث نوکِ زبان تھیں۔

وہ کٹر حنبلی تھے اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ہی کے طرزِ استدلال کے قائل تھے۔ان کی زندگی بھی امام احمد رحمہ اللہ سے بہت مشابہ تھی۔انہیں علمِ کلام اور منطق وفلسفے سے نفرت تھی اور ان چیزوں کے نقصانات سے علماء کو آگاہ کیا کرتے تھے۔اس موضوع پر ان کی ایک کتاب ''ذم الکلام'' مشہور ہے۔ان کا طریقِ مناظرہ صرف کتاب وسنت سے استدلال کے ساتھ ہوتا تھا۔عقلی موشگافیوں اور منطق وفلسفہ کی دلیلوں کو وہ ایمان کی کمزوری تصور کرتے تھے۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

''وہ متکلمین کے سروں پر ایک شمشیرِ بے نیام تھے۔اپنے شہر میں ان کا بڑا دبدبہ، وقار اور اثر ورسوخ تھا۔ لوگ ان کا بے حد ادب واحترام کرتے تھے۔ان کے حکم پر جانیں قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔عوام حکمرانوں سے کہیں زیادہ ان کے فرمان کی تابعداری کرتے تھے۔وہ اہلِ سنت کا ایک ستون تھے جسے ہلانا یا زم کرنا ممکن نہ تھا۔''

وہ کبھی دنیا کمانے میں مشغول نہیں ہوئے۔ان کا مدرسہ خانقاہ بھی تھا جس میں وہ درسِ حدیث دینے کے ساتھ طلبہ ومریدین کی تربیت بھی کیا کرتے تھے۔ان کے کھانے پینے کا انتظام بھی خود کرتے تھے مگر خانقاہ پر کبھی کسی حکمران کے احسان کا بٹہ نہیں لگنے دیا۔سارا نظام توکل پر چل رہا تھا۔نان بائی، قصائی اور دوسرے سوداگروں کا قرض چڑھتا رہتا تھا۔کوئی مخلص مرید کبھی کبھار ہدیہ بھیج دیتا تو شیخ الاسلام فوراً یہ قرضے اتارتے۔کچھ بچ جاتا تو دوسری ضروریات پر صرف کرتے۔کبھی کوئی کپڑے اور جوڑے بھیجتا تو وہ بھی طلبہ اور مریدین میں تقسیم کر دیتے۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''وہ حکمران یا امرائے دولت سے کبھی کوئی چیز قبول نہیں کرتے تھے۔نہ ان کی رعایت کرتے نہ ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے بلکہ ان کی پروا بھی نہیں فرماتے تھے۔پس انہیں لوگوں میں ایسی مقبولیت اور محبوبیت نصیب رہی جو بادشاہت سے بڑھ کر تھی۔ساٹھ سال تک بلا شرکتِ غیرے لوگوں پر ان کا حکم چلتا رہا۔''

جب خطاب یا مناظرے کے لیے نکلتے تو بہترین لباس پہن کر عمدہ سواری پر بیٹھ کر نکلتے۔فرماتے: ''ایسا اس لیے کرتا ہوں تاکہ دین کی عزت ہو اور دشمنانِ دین کی ناک کٹے اور عام لوگ میری شان دیکھ کر دین کے قریب آئیں۔'' مگر واپس آکر خانقاہ میں پھر معمولی اور سادہ لباس پہن لیتے اور سب کے ساتھ اس طرح ملے جلے رہتے کہ خادم اور مخدوم کا کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔

سنت کے شیدائی تھے اور کسی سے خلافِ شرع بات برداشت نہیں کرتے تھے۔اپنے ایک استاذ ابوبکر حیری سے کچھ

خلافِ سنت باتیں سنیں تو ان سے تعلق ختم کر دیا۔ فرماتے تھے: ''میں نے انہیں اللہ کی خاطر چھوڑا ہے۔''

بڑے بڑے ظالم و جابر امراء کے پاس بے کھٹکے چلے جاتے اور اہلِ حق کا موقف پوری وضاحت سے بیان کر دیتے۔ حکام کی طرف سے انہیں سخت امتحانات سے گزرنا پڑا۔ کئی بار شہر بدری اور جلاوطنی مول لی۔ پانچ بار انہیں سزائے موت کے لیے لے جایا گیا۔ حکام کا مطالبہ یہ نہیں ہوتا تھا کہ اپنا مذہب ترک کر دیں بلکہ انہیں کہا جاتا تھا کہ اپنا موقف بیان کرنا چھوڑ دیں اور سکوت اختیار کر لیں۔ مگر وہ کبھی دبے نہ جھکے۔

حافظ ابونصر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''کسی بادشاہ یا وزیر کی پرواہ کیے بغیر دین اور سنت کی اشاعت ان کا کارنامہ ہے۔ حاسد ہر وقت ان کی سرگرمیوں کی وجہ سے انہیں تکالیف پہنچانے کے درپے رہتے تھے۔ انہوں نے کئی بار ان کی جان لینے اور قتل کرنے کی کوششیں کیں۔ مگر اللہ نے انہیں ہر شر سے بچائے رکھا۔''

ایک طرف ان کی عظمت اور شان یہ تھی کہ بادشاہوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے مگر دوسری طرف معاشرے میں کمزور سمجھے جانے والے مفلس علماء اور طلبہ کا معزز مہمانوں کی طرح احترام کرتے۔ لوگوں کو حیرت ہوتی تو فرماتے:

''یہ حالت انہی لوگوں کی ہوتی ہے جنہیں اس (علمِ دین) کے کام کے سوا کوئی کام نہ ہو۔''

شیخ ابواسماعیل انصاری رحمہ اللہ نے ۸۶ سال عمر پائی۔ اس دوران ساٹھ سال تک وہ مسلسل دینِ حق کی حفاظت و اشاعت کے لیے سربکف رہے۔ اپنی کوششوں کا پھل انہوں نے اپنی زندگی ہی میں اس وقت دیکھ لیا جب خراسان سے عراق تک سلجوقی سلاطین کو عروج ملا اور شعائرِ اہلِ سنت ایک بار پھر عام ہو گئے۔ ①

◆◆◆

امام ابواسحٰق شیرازی رحمہ اللہ (۳۹۳ھ۔۴۷۶ھ)

پانچویں صدی ہجری میں شیخ الاسلام ابواسحٰق شیرازی اُمتِ مسلمہ کے لیے رجالِ کار کی تیاری کا فریضہ انجام دینے میں نمایاں رہے۔ عراق، ایران اور کردستان کے اکثر بڑے علماء ان کے شاگرد تھے۔

امام ابواسحٰق رحمہ اللہ کا اصل نام ابراہیم بن علی تھا۔ شیراز کے نواحی قصبے فیروز آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ شیراز میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اپنے دور کے مختلف علماء سے اکتسابِ فیض کے بعد ۴۱۵ھ میں بغداد آئے تھے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ مناظرہ، فقہی و تدریسی مہارت اور قوتِ استدلال میں وہ اپنے دور کے یکتا فرد تھے۔ لوگ دور دور سے ان سے استفادے کے لیے کھنچے چلے آتے تھے۔ بغداد کے فقہائے شافعیہ میں ان کا مقام سب سے بلند تھا۔ بعض نامور حنفی علماء بھی انہیں ''امیر المؤمنین فی الفقہاء'' کہا کرتے تھے۔ ②

آخری دور میں اللہ نے انہیں وہ شان دی کہ بادشاہ بھی رشک کرتے تھے۔ خلفائے بنوعباس ان کے گرویدہ اور

① سیر اعلام النبلاء: ۱۸/۵۰۵ تا ۵۱۵
② سیر اعلام النبلاء: ۱۸/۴۵۲ تا ۴۵۴

سلجوقی سلاطین ان کے معتقد تھے۔ نظام الملک طوسی نے بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم کیا تو انہی کو صدر مدرس مقرر کیا۔ خلیفہ مقتدی نے انہیں اپنا سفیر بنا کر ملک شاہ سلجوقی کے پاس نیشاپور روانہ کیا۔ یہ راستے میں جس شہر سے گزرتے وہاں پورا شہر استقبال کے لیے امنڈ آتا تھا۔ لوگ ان کے پاؤں کی خاک برکت کے لیے اٹھاتے۔ پھلوں، مٹھائیوں اور قیمتی کپڑوں کے ہدیے پیش کرتے، تاجر اپنا سامانِ تجارت ان پر نچھاور کرتے۔

جب وہ نیشاپور پہنچے تو ساری آبادی استقبال کے لیے نکل آئی۔ نیشاپور کے سب سے بڑے عالم امام الحرمین جوینی رحمہ اللہ ان کا سامان اپنے کاندھوں پر اٹھا کر یہ کہتے ہوئے آگے آگے چلے کہ مجھے اس خدمت پر فخر رہے گا۔①

اس شان اور مقام کے باوجود ان کی زندگی بڑی سادہ تھی۔ بیوی بچوں کے جھنجھٹ سے آزاد تھے۔ اگرچہ وہ جامعہ نظامیہ کے صدر مدرس تھے مگر ان کے حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دینی خدمات کا معاوضہ لینا درست نہیں سمجھتے تھے؛ اس لیے نہ صرف یہ کہ خود بلا تنخواہ کام کرتے تھے بلکہ اپنے دوستوں کے لیے بھی یہی پسند کرتے تھے۔

شیخ رافع نامی ان کے ایک عالم دوست دن میں چند گھنٹے قلی کا کام کرتے تھے اور جو مزدوری ملتی اس سے اپنا اور ان کا خرچہ نکالتے۔ ۴۴۰ھ میں شیخ رافع حج کے لیے گئے تو حرم ہی میں آباد ہو گئے اور یوں ابو اسحاق شیرازی رحمہ اللہ کی معاش کا یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ اب کبھی کبھار فاقہ بھی ہونے لگا۔ بھوک زیادہ ستاتی تو اپنے ایک پرانے بے تکلف دوست کے ہاں چلے جاتے، وہ ثرید سے ان کی تواضع کرتا۔ ایک بار کوئی شخص تحریری فتویٰ لینے آیا، ان کے پاس اس وقت کاغذ تھا نہ روشنائی۔ ایک نان بائی کے پاس گئے۔ اس سے دوات لے کر وہیں کھڑے کھڑے جواب لکھا اور سائل کے حوالے کر دیا۔

تنگ دستی ہی کی وجہ سے عمر بھر کبھی حج کے لیے نہ جا سکے۔ ان کے ایک معاصر کہتے ہیں کہ اگر وہ کہتے تو لوگ انہیں کاندھوں پر اٹھا کر حج کرا دیتے۔

مناظرانہ ذکاوت اور علمی مہارت کے باوجود درویش منش آدمی تھے۔ ایک ہی عمامہ تھا جسے دریائے دجلہ میں خود ہی دھوتے اور پہن لیا کرتے۔ ایک بار عمامہ سوکھنے کے لیے لٹکایا تو کوئی چور اٹھا کر لے گیا اور اس کی جگہ ایک بہت بوسیدہ عمامہ چھوڑ گیا۔ یہ بے خیالی میں اسی کو پہن کر درسگاہ تشریف لے گئے۔ جب طلبہ نے توجہ دلائی تو عمامے کو دیکھا بھالا اور فرمایا: ''شاید اس شخص کو مجھ سے زیادہ ضرورت ہو۔''

انہوں نے ''طبقات الفقہاء''، ''التنبیہ''، ''اللمع فی اصول الفقہ''، ''المعونۃ فی الجدل'' اور ''المہذب'' جیسی عظیم الشان کتب بھی لکھیں۔ اس دوران ان کا یہ حال تھا کہ جب بھی کتاب کی کوئی فصل شروع کرتے تو پہلے نوافل ادا کرتے۔ ۴۷۶ھ میں ان کی وفات ہوئی تو نہ کوئی درہم وراثت میں چھوڑا تھا نہ دینار۔②

---

① الطبقات الشافعیہ الکبریٰ للسبکی: ۴/۲۱۹، ۲۲۲

② سیر اعلام النبلاء: ۱۸/۴۵۵ تا ۴۶۱؛ طبقات الفقہاء لابی اسحاق شیرازی (ترجمۃ المؤلف از احسان عباس): ۱/۶ تا ۱۲

امام الحرمین جوینی رحمہ اللہ (۴۱۷ھ۔۴۷۸ھ)

انہی علمائے ربانی میں شوافع کے سرخیل امام الحرمین عبدالملک ابوالمعالی الجوینی رحمہ اللہ بھی شامل ہیں۔ان کے والد ابومحمد عبداللہ بن یوسف الجوینی بھی بہت بڑے عالم تھے۔نیشاپور کے نواحی قصبے جُوین سے تعلق تھا۔اپنے والد کے علاوہ اس دور کے سرکردہ علماء سے علم حاصل کیا۔والد کی وفات کے وقت وہ ان کی مسندِ درس پر بیٹھے،اس وقت ان کی عمر صرف بیس سال تھی۔ایک خلقت نے ان سے فیض حاصل کیا اور ہر طرف ان کے علوم کی شہرت ہوگئی۔

مگر نیشاپور میں سخت سُنی شیعہ کش مکش چل رہی تھی جس سے تنگ آکر وہ بغداد چلے گئے۔کچھ مدت تک علمی استفادے اور افادے میں مشغول رہ کر حجاز کا رخ کیا اور چار برس تک مکہ معظمہ میں درس دیتے رہے۔پھر مدینہ منورہ میں بھی درس وافتاء کا حلقہ لگایا۔مکہ ومدینہ میں درس وتدریس کی وجہ سے انہیں امام الحرمین کا لقب ملا۔

آخر حالات بہتر ہونے پر وطن واپس آئے۔یہاں انہیں وہ مقام ملا کہ جو اس شہر میں شاید کسی کو ملا ہو۔انہوں نے ''العقیدۃ النظامیہ فی الارکان الاسلامیہ''،''نہایۃ المطلب فی درایۃ المذہب''اور''لمع الادلۃ فی قواعد عقائد اہل السنۃ'' جیسی بے نظیر کتب لکھیں جن میں اسلامی اصول وعقائد پر کیے گئے تمام اعتراضات کی بھرپور تردید کی گئی ہے اور جدت پسندوں،عقلیت پرستوں،فلسفیوں اور علم کلام سے گمراہ ہونے والے متکلمین کی کج فکری کا پول کھولا گیا ہے۔

اسلامی سیاست پر انہوں نے ''غیاث الامم'' جیسی شاہکار تصنیف پیش کی جو اس موضوع پر بلاشبہ ایک منفرد کاوش تھی۔اس کے علاوہ اصول فقہ میں ''الاجتہاد''،''البرہان فی اصول الفقہ''اور''التلخیص فی اصول الفقہ'' جیسی شاندار کتابیں علم فقہ میں ان کی بلند پروازی کی دلیل ہیں۔

اہل باطل کی تردید میں لاکھوں صفحات کھنگالنے،ہزاروں ورق لکھنے اور سینکڑوں دلائل مہیا کرنے کے باوجود امام الحرمین سب کو یہی نصیحت کرتے تھے کہ بوڑھی خواتین جیسا عقیدہ اختیار کرو۔ان کے نزدیک اصل مطلوب ومقصود ایسا ہی سادہ اور غیر متزلزل ایمان مطلوب ومقصود تھا جو لا الٰہ الا اللہ کہنے والی ایک سادہ لوح عورت کے دل میں جاگزیں رہتا ہے۔یہاں تک کہتے تھے کہ اگر امام الحرمین بوڑھی عورتوں کے ایمان پر نہ مرا تو اس کے لیے ہلاکت ہے۔[1]

امام الحرمین رحمہ اللہ کو سلجوقی سلاطین اور نظام الملک طوسی کی وزارت میں سب سے بلند مذہبی شخصیت کی حیثیت حاصل تھی۔تیس سال تک ان کا کوئی ہم پلہ دور دور تک موجود نہ تھا۔وہ جامع مسجد نیشاپور کے خطیب،اسلامی اوقاف کے نگران اور جامعہ نظامیہ نیشاپور کے ناظم تھے۔[2]

ان کے مقام کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک بار ملک شاہ سلجوقی نے عید کے چاند کا اعلان کرادیا۔امام الحرمین رحمہ اللہ کے نزدیک ابھی رویتِ ہلال ثابت نہیں ہوئی تھی؛اس لیے انہوں نے منادی کرادی کہ کل روزہ ہے۔ملک شاہ نے ان سے وجہ پوچھی تو فرمایا:''جو معاملات بادشاہ سے متعلق ہیں ان میں آپ کی اطاعت ہم پر لازم

---

① سیر اعلام النبلاء: ۴۶۵/۱۸ تا ۴۷۱

② وفیات الاعیان: ۲۴۱/۲

ہے مگر جو چیزیں فتوے سے متعلق ہیں وہ بادشاہ کو ہم سے پوچھنی چاہئیں۔ رؤیتِ ہلال، روزہ رکھنا، یا عید منانا فتوے سے متعلق مسائل ہیں۔ بادشاہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔"

آخرکار شاہ کو اعلان کرانا پڑا کہ میرا حکم غلط اور امام الحرمین کا فرمان درست ہے۔[1]

ان کی وفات پر نیشا پور کے بازار سنسان ہو گئے۔ ان سے فیض یافتہ علماء جو چار سو کے لگ بھگ تھے، سب نے تعلیم کا سلسلہ موقوف کر کے ایک دوسرے سے تعزیت کی۔ کہا جاتا ہے کہ سال بھر ان کی وفات کا غم تازہ رہا۔[2]

امام ابو اسحق شیرازی اور امام الحرمین جوینی رحمہ اللہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مدرسہ نظامیہ بغداد اور مدرسہ نظامیہ نیشاپور کو علمائے اہلِ سنت کے عالمی مراکز میں تبدیل کر دیا تھا۔ یقیناً اس کارِ خیر میں ان مدارس کے بانی نظام الملک طوسی کا بھی پورا حصہ ہے۔ ان مراکز نے اگلے عشروں میں امتِ مسلمہ کو امام غزالی، فقیہ الکیا ہراسی، علامہ ابن جوزی اور امام رازی رحمہ اللہ جیسے علماء مہیا کیے جنہوں نے امت کو پیش آمدہ تمام دینی تقاضوں کو پورا کرنے میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔

◆◆◆

امام ابو حامد غزالی رحمہ اللہ (۴۵۰ھ۔۵۰۵ھ)

اس دور کے فتنوں کے سامنے بند باندھنے والی سب سے بڑی شخصیت حجۃ الاسلام ابو حامد امام غزالی رحمہ اللہ کی تھی۔

وہ ۴۵۰ھ میں ضلع طوس کی بستی طاہران میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام محمد رکھا گیا۔ یہی ان کے والد کا نام تھا۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ میں امام الحرمین جوینی رحمہ اللہ سے حاصل کی اور درس و تدریس میں شہرت پانے کے بعد ۲۸ سال کی عمر میں نیشاپور سے رے جا کر نظام الملک طوسی کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔

ان کی غیر معمولی صلاحیتیں دیکھ کر نظام الملک نے ۴۸۴ھ میں انہیں مدرسہ نظامیہ بغداد کا صدر مدرس مقرر کر دیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۳۴ سال تھی۔ ایک سال کے اندر اندر ان کے درس کی وہ دھوم مچی کہ علماء اور طلبہ پروانہ وار ٹوٹنے لگے۔ دربارِ خلافت میں ان کی عزت ایک رئیسِ سلطنت سے کم نہیں تھی، اسی لیے ۴۸۵ھ میں خلیفہ مقتدی نے انہیں ملک شاہ سلجوقی کی ملکہ ترکان خاتون کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ مقتدی کے جانشین خلیفہ مستظہر سے بھی ان کے بہت اچھے تعلقات تھے؛ اسی لیے انہوں نے باطنی عقائد کی تردید میں اپنی ایک کتاب کا نام خلیفہ سے موسوم کر کے "المستظہری" رکھا۔ وجاہت اور شہرت کے اس عین عروج کے دوران انہیں محسوس ہوا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس میں اخلاص وللہیت کی وہ کیفیت اور خشوع وخضوع کا وہ معیار ہرگز نہیں جو قرآن وحدیث میں ایک مؤمن سے مطلوب ہے۔ چنانچہ اپنی اصلاح کے لیے ان کا میلان تصوف کی طرف ہو گیا اور ذوالقعدہ ۴۸۸ھ میں وہ اپنا عہدہ، گھربار سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صوفیائے کرام کے دامن سے وابستہ ہو گئے اور قریہ قریہ پھرنے لگے۔

---

[1] اخلاق جلالی از جلال الدین دوانی، ص ۱۱۸ تا ۱۲۱، طبع شیخ مبارک علی تاجر لاہور

[2] وفیات الاعیان: ۲/۲۴۲

اس ازخود رفتگی کے دور میں امام غزالی رحمہ اللہ حجاز، شام اور مصر تک گئے۔ دمشق میں قیام کے دوران انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''احیاء علوم الدین'' لکھنا شروع کی۔ گیارہ سال بعد ذوالقعدہ ۴۹۹ھ میں ان کی واپسی ہوئی اور وہ بغداد کی بجائے مدرسۂ نظامیہ نیشاپور میں مدرس لگ گئے۔ اب وہ مروجہ علوم اسلامیہ اور علوم عقلیہ کے علاوہ تزکیۂ نفس کی دولت سے بھی بہرہ ور ہو چکے تھے؛ اس لیے اب ان کے کام کی شان بھی جداگانہ تھی۔

دو تین ماہ بعد ۵۰۰ھ کے شروع میں انہوں نے اس عہدے سے بھی استعفیٰ دے دیا اور اپنے وطن طوس میں رہائش پذیر ہو کر گھر کے پاس ہی ایک مدرسے اور خانقاہ کی داغ بیل ڈالی اور طلبہ و مریدین کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہو گئے۔ لگ بھگ ڈیڑھ سو طلبہ ان کے ہاں جمع رہتے تھے۔ سلجوقی حکمران محمد بن ملک شاہ اور وزیر سلطنت احمد (نظام الملک طوسی کے بڑے بیٹے) نے پوری کوشش کی کہ وہ کسی طرح دوبارہ بغداد آ کر مدرسہ نظامیہ کی صدارت سنبھالیں مگر انہوں نے معذرت کر لی۔

موت نے انہیں مزید صرف سوا پانچ سال کی مہلت دی اور ۱۴ جمادی الآخرہ ۵۰۵ھ میں ۵۵ سال کی عمر میں وہ وفات پا گئے مگر اس محدود وقت میں انہوں نے جو کام کیا وہ سینکڑوں علماء کی کاوشوں سے زیادہ وزنی اور وقیع ہے۔[1]

امام غزالی رحمہ اللہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے فلسفے کی جڑوں پر حملہ کیا اور بیّن دلائل سے اس کا ناقابلِ اعتماد ہونا ثابت کیا۔ یہ کام ان سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔ فلسفہ تو اسلام پر ضرب لگاتا آ رہا تھا مگر متکلمین عقلی دلائل کے ذریعے صرف اپنا دفاع کر رہے تھے۔ کسی نے یہ کوشش نہیں کی تھی کہ تنقیدی نگاہ سے فلسفے کو اچھی طرح دیکھ بھال کر ان تصورات اور توہمات پر کاری وار کرے جن پر فلسفہ استوار ہے۔ یہ فرض علمائے امت کے ذمے قرض چلا آ رہا تھا۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے اس فرض کی انجام دہی کے لیے فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا اور اس میں ایسی مہارت حاصل کی کہ فلاسفہ کی کمزوریاں پوری طرح ان پر عیاں ہو گئیں۔

انہوں نے پہلے فلسفے کا تعارف کرانے کے لیے ''مقاصد الفلاسفہ'' نامی کتاب لکھی جس میں منطق، فلسفے اور اس کی الٰہیات اور دوسرے فلسفیانہ مباحث کو پوری غیر جانبداری کے ساتھ پیش کر دیا۔ انہوں نے کتاب کے مقدمے میں واضح کیا کہ حکمت و فلسفے کا ہر شعبہ اسلام سے متصادم نہیں مثلاً ریاضی کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں اور دین اس کی نفی کرتا ہے نہ اثبات۔ اسی طرح منطق میں بھی چند اکا دکا مقامات پر غلطیاں ہیں اور اس کے بیشتر مباحث قابلِ قبول ہیں۔ تاہم فلسفیانہ طبیعات میں حق و باطل ملا جلا ہے جبکہ فلاسفہ کی الٰہیات اور مابعد الطبیعات بالکل خلاف اسلام ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے ''تہافت الفلاسفہ'' نامی شہرۂ آفاق تصنیف پیش کی جس میں انہوں نے کسی قسم کی مرعوبیت کے بغیر فلسفے کے ان اصولوں کی صحت کو چیلنج کیا جنہیں صدیوں سے لوگ من و عن مانتے چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے ثابت کیا کہ فلسفیوں نے خدا، مذہب، روحانیت اور نبوت کے بارے میں جہاں بھی لب کشائی کی ہے، ٹھوکر کھائی ہے اور فلسفے کے الٰہیاتی مباحث اپنے اصول و فروع سمیت گمراہی در گمراہی کے سوا کچھ نہیں۔

[1] وفیات الاعیان: ۴/۱۲۱۷ سیر اعلام النبلاء: ۱۹/۳۲۲ تا ۳۲۷

امام غزالی رحمہ اللہ کی ان معرکۃ الآراء تصانیف نے جدت پسندوں کو مبہوت کر دیا اور یونانی فلسفے کی علمی دھاک کا خاتمہ کر دیا۔ ملحدین اور باطنیہ کے حملوں کے جواب میں امام غزالی رحمہ اللہ نے حجۃ الحق، مفصل الخلاف، قاصم الباطنیہ، فضائح الباطنیہ اور مواہم الاباحیۃ جیسی چشم کشا تصانیف پیش کیں اور ان میں باطنی عقائد کی پرزور تردید کی۔

امام غزالی رحمہ اللہ کا دوسرا بڑا کارنامہ ''احیاء علوم الدین'' نامی بے نظیر تصنیف ہے جس کا موضوع عام طور پر تصوف اور اصلاحِ نفس ہی سمجھا جاتا ہے، مگر درحقیقت اس میں انہوں نے انسان، انسانی معاشرے اور زندگی کی مختلف حالتوں کو اسلامی واخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھا بھالا ہے اور معاشرے میں پیدا ہونے والے فساد اور بحران کے ازالے اور ایک مثالی انسان اور مثالی معاشرے کی تشکیل کا نصاب پیش کر دیا ہے۔ یہ کتاب ان کی قلبی کیفیات، تجرباتِ زندگی، گہرے غور وفکر اور دلی تاثرات کی عکاس ہے جو انسان کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ اس میں بطورِ خاص اہلِ علم اور حکمران طبقے کی اصلاح پر زور دیا گیا ہے؛ کیوں کہ ان کی اصلاح کے بغیر معاشرے کا سدھرنا ممکن نہیں۔

امام غزالی رحمہ اللہ نے علم کلام میں پیدا ہونے والے جمود کو توڑنے کی بھی کوشش کی اور عقائدِ اسلام کے اثبات کے لیے اشعری مکتبِ فکر کے لگے بندھے قواعد سے ہٹ کر زیادہ مؤثر اور مضبوط اصول پیش کیے۔ اس بناء پر انہیں مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا؛ کیوں کہ روایتی علماء ان قواعدِ علم کلام سے ذرا سا انحراف بھی خلافِ اسلام تصور کرتے تھے۔

ان تجربات کے نتیجے میں امام غزالی رحمہ اللہ نے یہی فیصلہ کیا کہ علم کلام کا ضرر اس کے نفعے سے کہیں زیادہ ہے؛ اس لیے اسے ترک کر دینا ہی بہتر ہے۔ ان کی آخری تصنیف ''الجام العوام عن الکلام'' اسی موضوع پر تھی۔ ①

◆◆◆

امام اِلکیَا الہَرّاسی (۴۵۰ھ۔۵۰۴ھ)

امام علی محمد بن علی طبری اِلکیَا الہَرّاسی (م ۵۰۴ھ) بھی اس دور کے اجل علماء میں سے ایک تھے۔ ان کی ولادت طبرستان میں ہوئی، مختلف علماء سے علوم وفنون کی تکمیل کے بعد عنفوانِ شباب میں وہ نیشاپور آئے اور مدرسہ نظامیہ میں امام الحرمین سے مستفید ہوئے۔ امام الحرمین جوینی رحمہ اللہ کے ممتاز ترین تلامذہ میں امام غزالی رحمہ اللہ کے بعد انہی کا مقام ہے۔ چونکہ امام غزالی رحمہ اللہ بہت جلد جامعہ نظامیہ نیشاپور کی مسند چھوڑ گئے تھے، اس لیے اس درسگاہ میں امام الحرمین جوینی رحمہ اللہ کی مسند اِلکیَا الہَرّاسی رحمہ اللہ نے ہی سنبھالی۔ ایک مدت تک طلبہ کو فیض یاب کرنے کے بعد وہ بغداد منتقل ہوگئے اور مدرسہ نظامیہ بغداد میں درس دینے لگے۔ چھٹی صدی ہجری کے بے شمار علماء امام اِلکیَا الہَرّاسی رحمہ اللہ سے مستفید ہوئے جن میں امام سعد الخیر، امام عبداللہ بن غالب اور امام ابوطاہر سلفی رحمہم اللہ نمایاں ہیں۔

امام اِلکیَا الہَرّاسی رحمہ اللہ ایک باوقار اور پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ نہایت ذہین وفطین، نکتہ رس اور دقیق النظر تھے۔ ان کی آواز خوبصورت اور بلند تھی۔ قوتِ بیان اور فصاحت وبلاغت میں وہ یکتائے زمانہ تھے۔ مناظروں

① تاریخ دعوت وعزیمت: ۱۴۱/۱ تا ۱۹۰

میں وہ اکثر سنتِ نبویہ سے استدلال کرتے تھے۔ ①

وہ اصول شافعیہ کے سختی سے پابند تھے اور حدیث کے مقابلے میں قیاس آرائیوں کو بے حیثیت سمجھتے تھے۔ وہ فرماتے تھے: ''جب میدانِ مباحثہ میں علم حدیث کے شہ سوار وں مقابلے میں نکلتے ہیں تو اصحابِ قیاس کے سر ہوا میں اُڑ جاتے ہیں۔'' ②

تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، لغت اور دیگر متنوع علوم میں ان کی بکثرت تصانیف تھیں۔ اختلافی مسائل میں ان کی ''شفاء المسترشدین'' کو لاجواب مانا جاتا ہے۔ تاہم ان کی تفسیری کاوش ''احکام القرآن'' سب سے زیادہ مشہور ہے جو تین جلدوں میں ہے۔

وہ امام غزالی رحمہ اللہ کے ہم عمر تھے۔ دونوں ۴۵۰ھ میں پیدا ہوئے تھے، ایک ہی جگہ تعلیم حاصل کی، ایک مدت تک ایک ہی جگہ یعنی مدرسہ نظامیہ نیشاپور میں تدریس کرتے رہے۔ دونوں کی وفات میں صرف ایک سال کا فرق ہے۔ امام اِلْکِیَا الہَرَّاسی رحمہ اللہ ۵۰۴ھ اور امام غزالی رحمہ اللہ ۵۰۵ھ میں فوت ہوئے۔ ③

❖❖❖

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ (۵۴۴ھ۔۶۰۶ھ)

اس دور کی نمایاں اسلامی شخصیات میں امام فخر الدین الرازی رحمہ اللہ بھی شامل ہیں جنہیں معقولات و منقولات پر یکساں عبور تھا۔ وہ نسلاً طبرستان سے تعلق رکھتے تھے۔ رَے میں پیدا ہوئے تھے اور ہرات ان کی علمی سرگرمیوں کا

① وفیات الاعیان: ۳ ص ۲۸۶. الکامل فی التاریخ: ۸ ص ۵۸۶، البدایة والنهایة: ۱۶ ص ۲۱۱؛ طبقات الشافعیة الکبریٰ للسبکی: ۷ ص ۲۳۱ تا ۲۳۳

② وفیات الاعیان: ۲۸۷/۳

③ وفیات الاعیان: ۲۸۶/۳. الکامل فی التاریخ: ۵۸۶/۸، البدایة والنهایة: ۲۱۱/۱۶؛ طبقات الشافعیة الکبریٰ للسبکی: ۲۳۱/۷ تا ۲۳۳

فائدہ: ''اِلْکِیَا'' فارسی کا لفظ ہے۔ یہ ایک تعظیمی لقب ہے جس کا مطلب ہے: ''عظیم المرتبت'' اس میں ہمزہ مکسور ہے۔ یہ الف لام تعریف کا نہیں بلکہ اصل کلمہ کا جزو ہے۔ (طبقات الشافعیین لابن کثیر: ۵۲۸)

''الہراسی'' کی تحقیق بڑی مشکل ہے۔ صدیوں تک اس پر کسی نے روشنی نہیں ڈالی۔ نویں صدی ہجری کے قاضی ابن شہبہ لکھتے ہیں: ''میں نہیں جانتا کہ یہ نسبت کس کی طرف ہے؟'' (طبقات الشافعیة: ۲۸۸/۱، ط عالم الکتب بیروت)

ایک رائے یہ سامنے آئی کہ یہ فارسی کے لفظ ''ہراس'' کی طرف نسبت ہے جس کا مطلب ''خوف'' ہے۔

دیکھیے: ''البلغة فی تراجم ائمة النحو واللغة'' ص ۲۷۴، مطبوعہ دار سعد الدین (مصر) '' کا حاشیہ از حسان احمد راتب

راقم عرض کرتا ہے کہ اس صورت میں یہ لفظ ہا کے کسرہ اور را غیر مشدد کے ساتھ ہوگا کیونکہ فارس میں لفظ ھِراس ہے نہ کہ ھَرّاس۔

اگر وجہِ نسبت یہی ہے تو ممکن ہے کہ باطل فرقوں پر رعب کے سبب انہیں ''ہراسی'' کہا جاتا ہو۔

راقم کے نزدیک زیادہ امکان یہ ہے کہ یہ کسی مقام کی طرف نسبت ہو۔ یاد رہے کہ ''الہراس'' بغداد کے ایک محلے کا نام تھا۔ (تاریخ بغداد: ۱۷ ص ۱۶۷. یسکن فی خرابة الهراس؛ اخبار العلماء باخبار الحکماء، ص ۱۶۶)

چونکہ امام موصوف بھی ایک مدت تک بغداد سکونت پذیر رہے، اس لیے عین ممکن ہے وہ مذکورہ محلے میں مقیم ہوں اور اسی لیے ''ہراسی'' کہلاتے ہوں۔ واللہ اعلم

مرکز رہا۔ انہوں نے عقل ونقل کی روشنی میں ''مفاتیح الغیب'' جیسی بے نظیر تفسیر لکھی جو تفسیر رازی کے نام سے مشہور ہوئی، اس میں ایک جلد صرف سورۃ الفاتحہ کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ مکمل تفسیر ۳۲ جلدوں میں ہے۔

''اعتقاد فرق المسلمین والمشرکین'' ان کی ایک اور بہترین تصنیف ہے جس میں مختصر طور پر بدعتی اور خارج از اسلام فرقوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ نیز یہود ونصاریٰ اور ہنود کے عقائد اور ان کی فرقہ بندیوں کا حال بھی پیش کیا گیا ہے۔ ''معالم اصول الدین'' بھی ان کی نہایت مفید کتاب ہے جس میں اسلامی عقائد بیان کیے گئے ہیں اور ساتھ ہی باطل فرقوں خاص کر شیعوں کے اعتراضات کے ٹھوس جوابات دیے گئے ہیں۔ انہوں نے مُردہ علمِ کلام میں ایک نئی روح ڈال کر اسے فلسفیوں اور ملحدوں کی تردید میں اس طرح استعمال کیا کہ اہلِ باطل کو ہر جگہ منہ کی کھانا پڑی۔

امام رازی رحمہ اللہ بہترین خطیب اور واعظ بھی تھے۔ فارسی اور عربی میں یکساں فصیح وبلیغ تقریر کرتے تھے۔ خشک عالم نہیں بلکہ دردِ دل کی دولت سے مالا مال تھے۔ اکثر وعظ کے دوران خود بھی روتے اور حاضرین کو بھی اشک بار کرتے۔

یہ دور خراسان میں غوری اور وسطِ ایشیا میں خوارزم شاہی خاندان کی حکومت کا تھا۔ سلطان غیاث الدین غوری کے دربار میں انہیں بڑی عزت حاصل تھی۔ سلطان خود ان کا وعظ سنتا اور بعض اوقات زار وقطار روتا۔ سلطان شہاب الدین غوری کی ہندوستان میں جہادی مہمات میں امام رازی رحمہ اللہ ساتھ ساتھ تھے۔ وہ لشکر میں درسِ قرآن دے کر سپاہیوں کی ایمانی وعملی تربیت کرتے تھے۔

شہاب الدین غوری کو ہندوستان کی آخری مہم سے واپسی پر باطنی خنجر زنوں نے شہید کر دیا جس کے بعد خوارزم شاہی سلاطین نے امام رازی رحمہ اللہ کو اپنے ہاں بلا کر پایۂ تخت کی جامعہ کا صدر مدرس اور شہزادوں کا اتالیق مقرر کیا۔ امام رازی رحمہ اللہ ۶۰۶ھ میں ہرات میں فوت ہوئے اور شہر کے مضافاتی گاؤں مزداخان میں ان کی تدفین ہوئی۔ [1]

[1] وفیات الاعیان: ۲۵۲/۴؛ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: ۸۱/۸، ۸۲؛ الاعلام زرکلی: ۳۱۳/۶

چھٹی صدی ہجری کے مصلحین اور ائمہ سلوک واحسان

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (۴۷۰ھ۔۵۶۱ھ)

۴۸۸ھ میں جب امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے بغداد کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہا تو اسی سال مشیتِ الٰہیہ نے عالم اسلام کے اس مرکز میں اصلاح وتذکیر کا سلسلہ آگے بڑھانے کے لیے ایک اور عبقری شخصیت کو یہاں بھیج دیا۔

یہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو ۴۷۰ھ میں شمالی ایران کی بستی گیلان میں پیدا ہوئے تھے۔ جب وہ بغداد آئے تو صرف ۱۸ سال کے تھے اور تحصیل علم کے سوا ان کا کوئی اور مقصد نہ تھا۔ مگر اللہ کی تقدیر میں انہی کو اس شہر کی رہنمائی کے لیے چنا جا چکا تھا۔ یہاں آپ نے ابوالوفاء، ابن عقیل اور ابوزکریا تبریزی رحمہم اللہ جیسے نامور علماء سے علوم اسلامیہ کی تعلیم حاصل کی اور شیخ حماد بن مسلم الدباس رحمۃ اللہ علیہ (م ۵۲۵ھ) سے، جو بغداد کے اکثر علماء وفقہاء کے شیخِ طریقت تھے، بیعت ہوئے اور اجازت سے سرفراز ہوئے۔

فقہی لحاظ سے آپ حنبلی مسلک کے پیروکار تھے۔ فقہ کی اعلیٰ تعلیم قاضی ابوسعید مخرمی رحمۃ اللہ علیہ (م ۵۱۱ھ) سے حاصل کی اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد انہی کے مدرسے میں تدریس شروع کی۔ یہ حلقۂ درس اتنا مقبول ہوا کہ بہت جلد عمارت میں توسیع کی ضرورت پیش آگئی۔ ساتھ ہی آپ نے وعظ وارشاد کے حلقے کا آغاز کیا جس میں اتنی برکت ہوئی کہ علماء وفقہاء ہی نہیں بلکہ بادشاہ اور خلیفہ تک حاضر ہونے لگے۔

اللہ نے آپ سے مردہ دلوں کی مسیحائی کا کام لیا۔ آپ کی زبان میں ایسی تاثیر تھی کہ دل کانپ اٹھتے اور ساری کثافتیں اشکوں کے ساتھ دھل جاتیں۔ مجلسِ وعظ میں نصرانی، یہودی اور دوسرے غیر مسلم بکثرت شریک ہوتے۔ ہر مجلس کے اختتام پر غیر مسلم کلمہ پڑھتے، چور ڈاکو، رہزن اور فاسق وفاجر لوگ توبہ تائب ہوتے۔ آپ نے خود ایک بار فرمایا کہ میرے ہاتھ پر پانچ ہزار سے زائد لوگ مشرف باسلام ہو چکے ہیں اور ایک لاکھ سے زیادہ لوگوں نے توبہ کی ہے۔ آپ نے درس وارشاد کے ساتھ خدمتِ خلق کو اپنا شعار بنالیا۔ غریبوں فقیروں کا آپ بہت خیال کرتے، آپ کا دسترخوان وسیع ہوتا جس پر ضرورت مندوں کا ہجوم ہوا کرتا تھا۔ آپ ہر ایک کے کام آتے اور ہر ایک کی خدمت کے لیے تیار رہتے۔

ان مشاغل کے ساتھ آپ کی علمی مصروفیات کو دیکھا جائے تو حیرت ہوتی ہے۔ صبح تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ کے اسباق پڑھاتے۔ ظہر کے بعد تجوید اور نحو پڑھاتے۔ پھر فتاویٰ کے جوابات لکھتے۔

آپ رواجی تصوف کی جگہ سنت اور شریعت سے مربوط تزکیہ واحسان کے قائل تھے۔فرماتے تھے:

''اگر اللہ کی کوئی حد ٹوٹتی ہو تو سمجھ لو شیطان تم سے کھیل رہا ہے۔جس چیز کی شریعت تائید نہیں کرتی وہ باطل ہے۔''

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ ۴۸۸ھ میں بغداد آئے تھے اور یہیں ۵۶۱ھ میں وفات پائی۔اس طرح آپ نے ۷۳ سال یعنی لگ بھگ پون صدی کا وقت یہاں گزارا۔پانچ خلفاء کا دور آپ نے دیکھا۔آپ خلیفہ مستظہر باللہ (م ۵۱۲ھ) کے دور میں یہاں تشریف لائے تھے۔اس کے بعد مسترشد باللہ، راشد باللہ، المستعفی اور المستنجد کا دور دیکھا۔

اس دوران سلجوقی بادشاہوں اور خلفائے بنو عباس میں چپقلش عروج پر تھی۔سلجوقی بادشاہ خلفاء کو اپنا تابع دار بنانا چاہتے تھے جب کہ خلفاء اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے کوشاں تھے۔اس دوران کبھی جنگوں کی نوبت بھی آجاتی اور مسلمانوں کا خون ناحق بہنے لگتا۔اس دور کا سب سے طاقتور خلیفہ مسترشد باللہ تھا جس نے ایک سے زائد بار خود جنگوں کی قیادت کر کے سلجوقیوں کو پسپا کیا مگر ۵۲۹ھ میں سلطان مسعود سلجوقی سے جنگ میں اسے شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہو گیا۔سلطان نے بعد میں اسے رہا کر دیا مگر بغداد پہنچنے سے پہلے ہی خلیفہ کو باطنیوں نے شہید کر دیا۔

مسلمانوں کے انتشار وافتراق سے عالم اسلام جس زوال کی طرف گامزن تھا، شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ جیسے مصلحِ قوم اس سے لاتعلق نہیں رہ سکتے تھے۔ہر دردمند اُمتی کی طرح آپ کا دل بھی ان سانحوں پر کڑھتا تھا۔آپ نے اپنا یہ دردِ دل اپنے مواعظ وبیانات میں گھول دیا۔آپ جانتے تھے کہ ان سارے فسادات کی بنیاد دنیا کی محبت اور ہوسِ مال وجاہ ہے؛ اس لیے آپ کے اکثر خطبات میں حُبِّ دنیا کی مذمت اور فقیری وسادگی کی تعلیم ملتی ہے۔آپ پوری قوتِ قلبی کے ساتھ اُمت کو تواضع، رحم دلی، خوفِ خدا، فکرِ آخرت، احترامِ باہمی، اتحاد واتفاق اور شیر وشکر ہو کر رہنے کی تلقین کرتے رہے۔

مگر صرف وعظ وتذکیر سے ایسے معاشرے کی اصلاح بہت مشکل تھی جس کا ہر فرد دن کا اکثر وقت دنیاوی علائق میں گزارتا ہو اور کبھی کبھار طبیعت میں ہل چل مچانے والی نصیحتوں کو کاروبارِ زندگی کی کدورتیں اس کے دل سے محو کر دیتی ہوں؛ اس لیے آپ نے خانقاہی سلسلے پر بطورِ خاص توجہ دی اور فنِ تصوف کی سابقہ کمزوریوں کو دور کر کے اسے ایک مجتہدانہ شان کے ساتھ باقاعدہ مدوّن کیا۔آپ نے خانقاہ میں سینکڑوں مریدوں کو نگاہوں کے سامنے رکھ کر ان کی ایسی ظاہری وباطنی تربیت کی کہ وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں جا کر دعوت واصلاح کی ذمہ داریاں انجام دینے کے اہل بن گئے۔آپ کے یہ خلفاء افریقہ، یمن، حضر موت اور ہندوستان تک پھیل گئے اور یہ سلسلۂ احسان وتزکیہ ''سلسلہ قادریہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔اس سلسلے کے حضرمی مشائخ اور تاجر اگلی صدیوں میں جاوا اور ساٹرا تک گئے۔ہندوستان، انڈونیشیا وافریقہ میں لاکھوں لوگ اس نقل وحرکت کی بدولت مشرف باسلام ہوئے اور ان گنت لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب آیا۔[1]

[1] تاریخ دعوت وعزیمت: ۱۹۸/۱ تا ۲۲۲؛ سیر اعلام النبلاء: ۴۳۹/۲۰ تا ۴۵۰

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ (۵۰۸ھ۔۵۹۷ھ)

چھٹی صدی ہجری کے علماء ومشائخ کا تذکرہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن ابن جوزی رحمہ اللہ کا ذکر نہ کیا جائے۔ وہ ۵۰۸ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں یتیم ہوگئے تھے۔ ایک غریب گھرانے کے فرد تھے۔ ماں نے پیٹ کاٹ کر پڑھایا لکھایا۔ انہوں نے بچپن میں قرآن حفظ کیا۔ پھر بغداد کے نامور اساتذہ کی خدمت میں رہ کر علوم وفنون میں مہارت پیدا کی۔ بہت جلد ان کا شمار بغداد کے متبحر علماء میں ہونے لگا۔

ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ہر علم اور ہر فن کی جو بھی کتاب مل جاتی پڑھ کر چھوڑتے۔ اس کے ساتھ وہ انشاء، ادب، خطابت اور تعلیم وتدریس کے میدانوں میں بھی زبردست ملکہ رکھتے تھے۔ وہ مدرسہ نظامیہ بغداد کے ممتاز مدرس تھے۔ شیخ سعدی شیرازی رحمہ اللہ جیسے بزرگ ان کے شاگرد تھے۔ وعظ وخطابت میں وہ اپنے دور کے سحبان بن وائل تھے۔ ان کے مواعظ کی مجلس میں بلا مبالغہ تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی۔ امراء، شہزادے اور بعض اوقات خلفاء تک ان کا وعظ سننے آیا کرتے تھے۔ ہر وعظ کے بعد بکثرت لوگ توبہ تائب ہوتے اور سنت کے مطابق زندگی گزارنے کا عزم کرتے۔

وہ رواجی قسم کے صوفی نہ تھے مگر دعا ومناجات کی لذت اور خشوع وخضوع کی نعمت سے بہرہ ور تھے۔ اس قدر مصروفیات کے باوجود ذکر وعبادت کے لیے خاصا وقت نکالتے تھے۔ ہر ہفتے ایک قرآن مجید ختم کرنے اور قیام اللیل کے پابند تھے۔ عمر بھر کبھی مشتبہ چیز استعمال نہیں کی۔ اس کے ساتھ ان کی طبیعت میں بڑا نظم وضبط اور اعتدال تھا۔ ذہنی اور بدنی صحت کا خاص خیال رکھتے اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتے۔ عجمی طرز کی صوفیانہ ریاضتوں، مبالغے کی حد تک زہد وقناعت اور ترکِ دنیا کو اسلامی مزاج کے خلاف تصور کرتے تھے۔

ان کی زندگی کے آخری دور میں بغداد میں خلیفہ ناصر کی حکومت تھی جو شیعہ مذہب کا حامی تھا۔ بغداد میں اس نے عاشوراء کے جلوس دوبارہ شروع کرادیے تھے جس کی وجہ سے شہر میں فسادات کا خطرہ رہتا تھا۔ شر پسند رائی کا پہاڑ بنا کر اشتعال انگیزی کو ہوا دینے پر تلے رہتے تھے جبکہ علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ امنِ عامہ کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

اس سلسلے میں ان کی ذہانت کا یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ ایک بار ان سے مجمع عام میں یہ سوال کیا گیا کہ حضور ﷺ کے بعد لوگوں میں سب سے افضل شخص کون ہیں؟ چونکہ مجمعے میں شیعہ اور سنّی دونوں موجود تھے اور ذرا سی بات پر تلوار چل جانے کا خطرہ تھا؛ اس لیے علاّمہ جوزی رحمہ اللہ نے مصلحتاً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام نہ لیا بلکہ اشارے کنایے میں جواب دیتے ہوئے کہا:

"رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے افضل وہ شخص ہیں کہ ان کی بیٹی اُن کے نکاح میں تھی۔"

یہ کہہ کر وہ فوراً منبر سے اتر کر چلے گئے اور اپنی ذہانت سے مجمعے کو گتھم گتھا ہونے سے بچالیا۔ شیعہ سمجھے کہ ان کی مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں جبکہ اہلِ سنت نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مراد لیے۔ ①

① شذرات الذهب ۹۸/۵؛ العبر في خبر من غبر: سنة ۵۸۲هـ

تاہم وہ حق بات کہنے میں کسی ملامت کی پروا نہیں کرتے تھے۔ اپنی مجالس میں وہ ہمیشہ اہلِ سنت کے نظریات کی ترجمانی کیا کرتے تھے؛ اسی لیے وہ خلیفہ ناصر کے عتاب کا نشانہ بھی بنے۔ ۵۹۰ھ میں خلیفہ نے انہیں شیعہ نظریات کی تردید کے جرم میں بغداد سے جلاوطن کر کے واسط بھیج دیا، وہاں انہیں پانچ سال ایسی جیل میں گزارنے پڑے جہاں پانی کا انتظام بھی نہیں تھا اور انہیں خاصی دور سے پانی خود بھر کر لانا پڑتا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے مسلکِ حق کی وکالت ترک نہیں کی۔ پانچ سال تک وہ ایذائیں برداشت کرتے رہے، اس وقت ان کی عمر اسی سال سے متجاوز تھی۔ ۵۹۵ھ میں وہ رہا ہوئے تو ان کی مقبولیت پہلے سے کہیں بڑھ چکی تھی۔ [1]

خلیفہ کی طرف سے رفض کی سرپرستی نے بعض سنی علماء کو شیعوں کی تردید میں مبالغہ آرائی پر برانگیختہ کر دیا چنانچہ بغداد کے ایک عالم عبدالمغیث بن زہیر (م ۵۸۳ھ) نے یزید بن معاویہ کے حق میں ایک کتاب لکھ دی۔ اس موضوع پر یہ پہلی تصنیف تھی، اس سے پہلے اُمت کی تاریخ میں کبھی کسی عالم نے یزید کو قابلِ تعریف سمجھ کر اس کے حق میں کوئی کتاب نہیں لکھی تھی۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ اس تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں من گھڑت روایات ہیں۔ [2]

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ شیعیت کی تردید میں شمشیرِ بے نیام تھے مگر عبدالمغیث بن زہیر کی اس متعصبانہ تصنیف کو وہ بھی برداشت نہ کر سکے اور اس کی تردید میں ''الرد علی المتعصب العنید المانع من ذم یزید'' نامی کتاب لکھی اور ثابت کیا کہ یزید کی مذمت جائز ہے اور شیعوں کی ضد میں آ کر اس کی تعریف و توصیف اہلِ سنت کا وطیرہ ہرگز نہیں۔

ابن جوزی رحمہ اللہ کے تحریری کام کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ روزانہ چار جزو (تقریباً چالیس صفحات) لکھنے کا معمول تھا۔ اس طرح ایک تسلسل سے انہوں نے کئی عشروں تک تصنیفی کام کیا یہاں تک کہ ان کی تصانیف کی تعداد ایک ہزار تک جا پہنچی۔ ان میں سے بعض تصانیف کئی کئی جلدوں میں ہیں۔ اس دور کا شاید ہی کوئی علم وفن ہو جس پر انہوں نے اپنے منفرد انداز میں کام نہ کیا ہو۔ عقائد، تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، تاریخ، ادب، شعر، اخلاقیات، وعظ ونصیحت، ہر شعبے میں ان کے علمی شاہکار موجود ہیں۔

ان کی مشہور ترین تصنیف ''تلبیسِ ابلیس'' ہے جس میں مختلف گمراہ فرقوں کے علاوہ علماء، طلبہ، عابدوں، زاہدوں اور صوفیوں کی گمراہی کے اسباب لکھے ہیں اور واضح کیا ہے کہ شیطان انہیں کس کس طرح سے لغزش میں مبتلا کرتا آیا ہے۔ جاہل واعظوں اور صوفیوں میں ضعیف بلکہ من گھڑت احادیث بہت زیادہ رائج ہو رہی تھیں۔ ابن جوزی رحمہ اللہ نے اس کی اصلاح کے لیے ''کتاب الموضوعات'' تصنیف کی اور کمزور، مشکوک اور خانہ ساز روایات کا پردہ چاک کر دیا۔ اسی طرح ضعیف اور جھوٹے راویوں کے تعارف کے لیے انہوں نے ''الضعفاء والمتروکین'' لکھی۔

انہیں طبعی طور پر علمِ تاریخ سے خاص دلچسپی تھی اور وہ اسے علماء کے لیے ضروری قرار دیتے تھے۔ تاریخ پر ان کی تصنیف ''المنتظم'' بارہ جلدوں میں ہے جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اپنے دور تک کے حالات سن وار جمع کیے

[1] الذیل علی طبقات الحنابلة: ۷۴/۱، ۷۵

[2] العبر فی خبر من غبر: ۸۵/۳

ہیں۔ تاریخ طبری کے بعد یہ اسلامی تاریخ کا دوسرا بڑا ماخذ ہے۔ بعد کے مؤرخین مثلاً ابن اثیر الجزری، حافظ ابن کثیر اور ابن خلدون رحمہم اللہ نے تاریخ طبری کے بعد زیادہ تر اسی کتاب سے مواد لیا ہے۔ ''تلقیح فہوم الاثر'' بھی تاریخ پر ان کی ایک نادر تصنیف ہے جو تاریخی واقعات کا ایک خوبصورت انتخاب ہے۔ ''بستان الواعظین'' ایک بالکل منفرد کاوش ہے جس میں وعظ وخطابت کے آداب بتائے گئے ہیں اور فنِ تقریر کے رموز سے آگاہ کیا گیا ہے۔

انہوں نے ادب وحکمت سے بھرپور کئی دلچسپ تصانیف بھی پیش کی ہیں مثلاً ''صید الخاطر'' جو ان کے تاثرات و خیالات اور حکمتوں اور نصیحتوں کا ایک خوب صورت گلدستہ ہے۔ ''کتاب الاذکیاء'' میں انہوں نے ذہین لوگوں کی دلچسپ حکایات جمع کی ہیں۔ ''اخبار الحمقیٰ والمغفلین'' احمقوں کے خندہ آور واقعات پر مشتمل ہے۔

لکھنے کے دوران قلم تراشنے سے جو بُرادہ گرتا، وہ اسے محفوظ کرتے رہتے۔ ان کی وصیت تھی کہ ان کی لاش کو غسل دینے کے لیے پانی اسی بُرادے سے گرم کیا جائے۔ ۵۹۷ھ میں ان کی وفات ہوئی تو وصیت کے مطابق اسی برادے سے غسل کا پانی گرم کیا گیا۔ یہ اتنا تھا کہ پھر بھی اچھا خاصا بچ گیا۔[1]

◆◆◆

شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ (۵۳۹ھ۔۶۳۲ھ)

اس دور کے مشائخ میں شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ کا نام نامی ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا جو سلسلۂ عالیہ سہروردیہ کے بانی اور ''عوارف المعارف'' جیسی شہرہ آفاق کتاب کے مصنف ہیں۔ وہ اپنے دور کے مشہور شافعی عالم، واعظ اور صوفی بزرگ تھے۔ علامہ ابن خلکان رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ اخیر عمر میں ان کے زمانے میں ان کی کوئی نظیر نہ تھی۔ مریدین کی تربیت اور دعوت واصلاح کے کام میں وہ مرجع خلائق تھے۔

وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسل سے تھے، ان کا آبائی علاقہ سُہرَ وَرْد تھا جو شمالی ایران میں قزوین اور زنجان کی ایک نواحی بستی ہے۔ جب وہ بغداد آئے تو چہرے پر داڑھی کا ایک بال بھی نہیں اُگا تھا۔ اس وقت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ حیات تھے اور ان کا سلسلۂ فیض جاری تھا۔ شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ نے بھی ان سے استفادہ کیا مگر یہ ان کی تعلیم کا زمانہ تھا غالباً اسی لیے زیادہ صحبت نہ اٹھا سکے۔ البتہ ان کے چچا شیخ ابوالنجیب سہروردی رحمہ اللہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی تربیت میں رہے اور خلیفۂ مجاز بنے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ نے فقہ، حدیث اور دیگر علوم میں مہارت حاصل کرنے کے بعد تزکیۂ باطنی میں پہلے اپنے چچا اور پھر زمانے کے دیگر مشائخ سے اکتسابِ فیض کیا۔

انہوں نے بغداد کو مرکز بنا کر تقریباً ساٹھ سال تک وعظ واصلاح اور مریدین کی تربیت کا کام کیا۔ ان کے وعظ وخطبات میں بجلی کا سا اثر تھا جس سے مخلوقِ خدا نے بہت فائدہ اٹھایا، عوام تو عوام دور دور سے علماء ومشائخ بھی ان کے پاس حاضر ہوتے اور مستفید ہوتے۔ خلفائے بنوعباس ان کا بے حد احترام کرتے اور ان کی دعاؤں کے طالب رہتے۔

[1] وفیات الاعیان: ۱۴۰/۳ تا ۱۴۴؛ سیر اعلام النبلاء: ۳۷۷/۲۱ تا ۳۸۷؛ شذرات الذهب ۹۸/۵؛ ذیل طبقات الحنابلة: ۷۴/۱، ۷۵

انہوں نے تصوف کو عجمی اثرات اور بدعات ورسومات سے پاک کرنے کی پوری کوشش کی۔ان کی تصنیف "عوارف المعارف" اس سلسلے کی ایک کامیاب کوشش ہے جسے آج بھی اہل اللہ کے ہاں بڑی مقبولیت حاصل ہے۔

شیخ سعدی شیرازی اور شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی رحمہما اللہ جیسے مشائخ ان کے مریدین اور فیض یافتگان میں شامل ہیں۔ان میں سے ایک نے ایران اور دوسرے نے ہندوستان میں ہدایت ومعرفت کے ایسے چراغ روشن کیے جن کی کرنیں آج تک منتقل ہوتی آرہی ہیں۔①

① وفیات الاعیان: ۳/۴۴۶ تا ۴۴۸

خلافتِ عباسیہ بغداد کی پانچ صدیاں

ایک نظر میں

دوسری صدی ہجری

۱۳۲.....۷۴۹ء

☆سفاح کی خلافت۔۱۲ربیع الاوّل۱۳۲ھ(۱۱/اکتوبر۷۴۹ء)

۱۳۳ھ.....۷۵۰ء

☆شاہِ روم لیون بن قسطنطین کا مَلَطْیَہ پر حملہ،مسلمانوں کی جلاوطنی

☆عباسی وزیرابوسلمہ الخلال کا ابومسلم خراسانی کے ہاتھوں قتل

۱۳۴ھ.....۷۵۱ء

☆سفاح کا حیرہ(کوفہ)کو چھوڑ کر انبار میں قیام

☆کوفہ سے مکہ تک سنگ میل نصب کیے گئے

☆وفات اسماعیل بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

۱۳۵ھ.....۷۵۲ء

☆عبداللہ بن حبیب کا صِقِلّیہ پر چھاپہ

☆وفات محدثِ مدینہ زیاد بن ابی زیاد مولیٰ عبداللہ بن عیاش

۱۳۶ھ.....۷۵۳۔۷۵۴ء

☆ابوجعفر منصور اور ابومسلم خراسانی کا حج

☆اَندلُس میں انتشار اور وہاں خودمختار امراء کی حکومت کا قیام

☆سفاح کا انتقال......ذوالحجہ(جون۷۵۴ء)

☆خلافت ابوجعفر المنصور

۱۳۷ھ.....۷۵۴۔۷۵۵ء

☆ابومسلم خراسانی کا قتل......۲۶شعبان(۱۳فروری۷۵۵ء)

☆سُنباذ مجوسی کا خروج

۱۳۸ھ.....۷۵۵ء

☆قسطنطین بن الیون کا دابق پر حملہ اور صالح بن علی عباسی کے ہاتھوں شکست

☆اندلس میں عبدالرحمٰن اوّل کے ہاتھوں آزاد اموی حکومت کا قیام

۱۳۹ھ......۷۵۶ء

☆منصور عباسی کے حکم سے مَلَطْیَہ کی از سرِ نو تعمیر کا آغاز

۱۴۰ھ......۷۵۷ء

☆مِصّیصہ کی از سرِ نو تعمیر

☆منصور کا سفرِ حج اور سفرِ بیت المقدس

۱۴۱ھ......۷۵۸ء

☆فرقہ راوندیہ کا ظہور اور قلع قمع

☆وفات موسیٰ بن عقبہ رحمہ اللہ، صاحب المغازی

۱۴۲ھ......۷۵۹ء

☆مصر سے محمد بن اشعث کی معزولی اور حمید بن قحطبہ کا تقرر

☆محدّث خالد الحذاء رحمہ اللہ کی وفات

☆مشہور شاعر و ادیب ابن المقفع کی وفات۔ عمر ۳۶ سال۔ اہم تصانیف: کلیلۃ ودِمنہ، الادب الصغیر والکبیر

۱۴۳ھ......۷۶۰ء

☆دیلم کے باغیوں کی سرکوبی

☆محدّث حمید الطویل بصری رحمہ اللہ کی وفات

۱۴۴ھ......۷۶۱ء

☆منصور کا سفرِ حج، محمد نفس زکیہ اور ابراہیم کی تلاش

☆منصور کی قید میں عبداللہ بن حسن المثنیٰ رحمہ اللہ کی وفات

۱۴۵ھ......۷۶۲ء

☆محمد نفس زکیہ کا مدینہ میں خروج......یکم رجب (۲۵ ستمبر ۷۶۲ء)

☆سرکاری افواج سے جنگ میں نفسِ زکیہ قتل......۱۵ رمضان (۶ دسمبر ۷۶۲ء)

☆عراق میں ابراہیم کا خروج......یکم رمضان (۲۲ نومبر ۷۶۲ء)

☆ابراہیم کی شکست اور قتل......۲۵ ذوالقعدہ (۱۳ فروری ۷۶۳ء)

☆بغداد کی تعمیر کا آغاز

۱۴۶ھ......۷۶۳ء

☆منصور کا بغداد میں قیام

☆عباسی فوج اندلس پر قبضہ کرنے کی کوشش میں ناکام

☆وفات محدث وفقیہ ہشام بن عروۃ رحمہ اللہ

☆وفات محمد بن سائب کلبی شیعہ مؤرخ

۱۴۷ھ.....۷۶۴ء

☆عیسیٰ بن موسیٰ کی ولی عہدی منسوخ، نئے ولی عہد کے طور پر مہدی کا تقرر

☆عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے فرزند عبدالعزیز بن عمر رحمہ اللہ کی وفات۔ نامور محدث اور فقیہ

☆منصور عباسی کے چچا عبداللہ بن علی کا جیل میں انتقال

۱۴۸ھ.....۷۶۵ء

☆حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کی وفات، اثناعشریہ کے نزدیک چھٹے امام.....شوال (نومبر ۷۶۵ء)

☆ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ قاضی کوفہ کی وفات

۱۴۹ھ.....۷۶۶ء

☆بلادِ روم میں جہاد کے دوران محمد بن اشعث کا انتقال

☆وفات زکریا بن ابی زائدہ رحمہ اللہ، ممتاز تلمیذ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ

☆بغداد کی تعمیر مکمل

۱۵۰ھ.....۷۶۷ء

☆استاذ سیس کا خروج

☆وفات امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ.....رجب (اگست ۷۶۷ء)

۱۵۱ھ.....۷۶۸ء

☆وفات محمد بن اسحٰق بن یسار رحمہ اللہ، صاحب المغازی والسیرۃ

☆خوارج کے اچانک حملے میں معن بن زائدہ قتل

۱۵۲ھ.....۷۶۹ء

☆وفات یونس بن یزید ایلی، تلمیذ ابن شہاب الزہری

۱۵۳ھ.....۷۷۰ء

☆اباضی خوارج کی افریقہ میں بغاوت

☆منصور کے حکم سے ہرثمہ بن اعین گرفتار

☆عباسی درباریوں کے لیے لمبی ٹوپیاں لازمی

۱۵۴ھ......۷۷۰ء

☆منصور کا سفرِ شام ۔ افریقی خوارج پر قابو پانے کے لیے خصوصی اقدامات اور لشکر کشی

☆مشہور ظریف اشعب طامع کی وفات

☆وفات قرۃ بن خالد بصری رحمہ اللہ، محدثِ بصرہ

☆وفات ہشام الدستوائی رحمہ اللہ، محدثِ بصرہ

۱۵۵ھ......۷۷۱ء

☆یزید بن ابی حاتم کے ہاتھوں افریقہ میں خوارج کو شکست

☆وفات مِسعَر بن کِدام کوفی رحمہ اللہ، محدّثِ کوفہ

۱۵۶ھ......۷۷۲ء

☆وفات حمزۃ بن حبیب رحمہ اللہ، قراءِ سبعہ میں سے ایک

☆وفات عبدالرحمٰن بن زیاد بن انعم، قاضیِ افریقہ

۱۵۷ھ......۷۷۳ء

☆وفات امام اوزاعی رحمہ اللہ، محدثِ بیروت، عمر ۷۰ سال......۲ صفر (۲۱ دسمبر ۷۷۳ء)

☆وفات مصعب بن ثابت رحمہ اللہ، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پوتے

۱۵۸ھ......۷۷۴ء۔۷۷۵ء

☆خالد بن برمک کو موصل کا حاکم مقرر کیا گیا

☆وفات حَیوَہ بن شُریح رحمہ اللہ، محدثِ مصر

☆وفات امام زفر بن ہذیل رحمہ اللہ، تلمیذِ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، قاضی بصرہ

☆منصور کا سفرِ حج

☆وفات منصور عباسی رحمہ اللہ......۶ ذوالحجہ (۱۸/اکتوبر ۷۷۵ء)

☆خلافتِ مہدی عباسی

☆قیصر قسطنطین بن الیون کی موت

۱۵۹ھ......۷۷۵ء

☆مہدی کا عیسیٰ بن موسیٰ کی جگہ اپنے بیٹے ہادی کی ولی عہدی کا اعلان

☆امیر خراسان حمید بن قحطبہ کی وفات

۱۶۰ھ......۷۷۶ء

☆شعبہ بن حجاج کی وفات، محدث عراق

☆وفات ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ

۱۶۱ھ......۷۷۷ء

☆ابن مُقنع کا ظہور

☆وفات امام سفیان ثوری رحمہ اللہ

۱۶۲ھ......۷۷۸ء

☆حسن بن قحطبہ کی بلادِ روم میں لشکر کشی اور فتوحات

۱۶۳ھ......۷۷۹ء

☆ابن مقنع کی سرکوبی

☆ہارون الرشید کا بلادِ روم میں جہاد، رومی صلح پر مجبور

☆وفات محدثِ نیشاپور ابراہیم بن طہمان رحمہ اللہ

۱۶۴ھ......۷۸۰ء

☆میخائیل رومی کا سرحدوں پر حملہ۔ اسلامی فوج کی پسپائی

☆وفات مبارک بن فضالہ رحمہ اللہ مولیٰ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

۱۶۵ھ......۷۸۱ء

☆ہارون الرشید کی قیادت میں مسلمانوں کی جوابی فوج کشی اور فتح

☆وفات خالد بن برمک

☆وفات داؤد طائی رحمہ اللہ، صوفی، فقیہ، تلمیذِ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ

۱۶۶ھ......۷۸۲ء

☆خلیفہ مہدی کی وزیر یعقوب بن داؤد سے ناراضی

☆مکہ، مدینہ اور یمن کے درمیان گھوڑوں اور اونٹوں پر ڈاک کا انتظام

☆زندیق شاعر بشار بن بُرد قتل

۱۶۷ھ......۷۸۳ء

☆مہدی زنادقہ کے خاتمے کے لیے سرگرم

☆مسجد الحرام کی توسیع

☆وفات حماد بن سلمہ رحمہ اللہ محدث بصرہ

۱۶۸ھ......۷۸۴ء

☆رومیوں کی بدعہدی پر بلادِ روم میں جہادی مہم

☆عباسی امیر سعید جرشی کا طبرستان پر حملہ

۱۶۹ھ......۷۸۵ء

☆مہدی کی وفات......۲۲محرم (۱۵/ اگست ۷۸۵ء)

☆خلافتِ ہادی بن مہدی

☆خروج حسین بن علی بن حسن بن حسن رضی اللہ عنہ

☆وفاتِ امام القراء، نافع بن ابی نعیم المدنی رحمہ اللہ

۱۷۰ھ......۷۸۶ء

☆وفات ہادی بن مہدی......۱۵ربیع الاول (۲۶ستمبر ۷۸۶ء)

☆خلافتِ ہارون الرشید

☆ربیع حاجب کی وفات

۱۷۱ھ......۷۸۷ء

☆وفات ابودُلامہ شاعر

☆افریقہ میں دولتِ ادارسہ کا قیام

۱۷۲ھ......۷۸۸ء

☆امیر اندلس عبدالرحمٰن اوّل کی وفات اور ہشام بن عبدالرحمٰن کی تخت نشینی

۱۷۳ھ......۷۸۹ء

☆وفات جویریۃ بن اسماء رحمہ اللہ، محدثِ بصرہ......یکم رجب (۲۳نومبر ۷۸۹ء)۔ یہ مرد ہیں خاتون نہیں۔

☆ہارون الرشید کی والدہ ملکہ خیزران کی وفات

۱۷۴ھ......۷۹۰ء

☆ہارون الرشید کا حج

☆اسماعیل بن زیاد رحمہ اللہ موصل کے قاضی مقرر

۱۷۵ھ......۷۹۱ء

☆شام میں قیسی اور یمنی قبائل میں خانہ جنگی

☆ وفات خلیل بن احمد بصری الفراہیدی، بانی علم عروض

۱۷۶ھ.....۷۹۲ء

☆ روم میں قلعہ دبسہ کی فتح

☆ نعیم بن میسرہ نحوی کی وفات

۱۷۷ھ.....۷۹۳ء

☆ شیخ صوفیاء عبدالواحد بصری رحمہ اللہ کی وفات

☆ امیر اندلس ہشام بن عبدالرحمٰن کا فرنگیوں سے جہاد

۱۷۸ھ.....۷۹۴ء

☆ والیٔ خراسان فضل بن یحییٰ برمکی کا وسطِ ایشیا میں جہاد، مساجد کی تعمیر

☆ وفات عبدالوارث بن سعید محدثِ بصرہ

☆ وفات مفضل بن یونس رحمہ اللہ، محدث کوفہ

۱۷۹ھ.....۷۹۵ء

☆ وفاتِ امام مالک بن انس رحمہ اللہ.....۱۴ ربیع الاوّل (۷ جون ۷۹۵ء)

☆ وفات حماد بن زید بن درہم رحمہ اللہ محدثِ بصرہ.....۱۰ رمضان (دسمبر ۷۹۵ء)

☆ بغداد میں کاغذ سازی کا کارخانہ قائم ہوا۔

۱۸۰ھ.....۷۹۶ء

☆ شام میں یمنی اور نزاری قبائل میں خانہ جنگی

☆ اسکندریہ میں زلزلہ

☆ ہارون الرشید نے رقّہ کو پایۂ تخت بنالیا

☆ وفات حفص بن سلیمان الکوفی رحمہ اللہ، امام قرأت، تلمیذِ عاصم رحمہ اللہ

☆ وفات امیر اندلس ہشام بن عبدالرحمٰن۔ تخت نشینی حکم بن ہشام

☆ وفات امام نحو سیبویہ رحمہ اللہ۔ عمر ۳۲ سال۔ دوسرے قول کے مطابق چالیس سال سے کچھ زائد۔

۱۸۱ھ.....۷۹۷ء۔۷۹۸ء

☆ ہارون الرشید کا بلادِ روم میں جہاد۔ قلعہ صفصاف پر قبضہ

☆ منصور عباسی کے جرنیل حسن بن قحطبہ کا ۸۴ سال کی عمر میں انتقال

☆ وفات عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ، عمر ۶۳ سال.....رمضان (اکتوبر ۷۹۸ء)

۱۸۲ھ......۷۹۸ء

☆ وفات قاضی القضاۃ امام ابو یوسف رحمہ اللہ......یکم ربیع الآخر (۲۲ مئی ۷۹۸ء)

۱۸۳ھ......۷۹۹ء

☆ وفات ابن سماک واعظ رحمہ اللہ

☆ وفات حضرت موسیٰ کاظم رحمہ اللہ

☆ خاقان ترکستان کا آرمینیا پر حملہ

۱۸۴ھ......۸۰۰ء

☆ وفات حضرت عبداللہ بن عبدالعزیز رحمہ اللہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پوتے

☆ وفات معافی بن عمران رحمہ اللہ، محدث موصل، عمر ۸۵ سال

۱۸۵ھ......۸۰۱

☆ فرنگیوں کا اندلس کے شہر بارسلونہ پر قبضہ

☆ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پوتے عبدالصمد بن علی کی وفات

☆ مسجد الحرام میں آسمانی بجلی گرنے سے دو شخص ہلاک

۱۸۶ھ......۸۰۲ء

☆ وفات ابو اسحٰق فزاری رحمہ اللہ، فقیہ کوفہ

☆ وفات عباد بن عوام رحمہ اللہ، فقیہ بغداد

☆ وفات خالد بن حارث رحمہ اللہ، محدث بصرہ

۱۸۷ھ......۸۰۲ء۔۸۰۳ء

☆ قسطنطنیہ میں ملکہ رینی کی ہلاکت، قیصر نقفور کی تخت نشینی اور ایشیائے کوچک پر حملہ

☆ ہارون الرشید کی جوابی یلغار

☆ جعفر برمکی کا قتل۔ برامکہ کا زوال اور قید و بند......یکم صفر (۲۸ جنوری ۸۰۳ء)

۱۸۸ھ......۸۰۳ء

☆ رومیوں سے معرکے، قیصر نقفور زخمی حالت میں فرار

☆ ہارون الرشید کا آخری حج

۱۸۹ھ......۸۰۴ء

☆ رومیوں سے قیدیوں کا تبادلہ۔ تمام مسلم قیدی رہا۔

☆ رے میں ہارون الرشید کی معیت میں قاضی القضاۃ امام محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ اور امام نحو و قرأت کسائی رحمہ اللہ کی وفات، دونوں کی رے کے نواح میں تدفین

۱۹۰ھ......۸۰۵ء

☆ قاضی بغداد تلمیذ ابوحنیفہ اسد بن عمرو رحمہ اللہ کی وفات

☆ بلادِ روم کا شہر ہرقلہ (ہرکولیس) فتح

☆ سمرقند میں رافع بن لیث کی بغاوت

☆ مامون الرشید کے مجوسی اتالیق فضل بن سہل کا اسلام قبول کرنے کا اعلان

☆ ہارون الرشید ایشیائے کوچک کے محاذ پر......۲۰ رجب (۱۱ جنوری ۸۰۶ء)

☆ جیل میں یحییٰ بن خالد برمکی کی وفات، عمر ۷۰ سال

۱۹۱ھ......۸۰۶ء

☆ اندلس میں امیر الحکم کی فرنگیوں کے خلاف فتح

☆ علی بن عیسیٰ ماہان کی خراسان سے معزولی

☆ ہارون الرشید کی طرف سے سرحد کے گرجوں کے مسمار کر دینے کا حکم

۱۹۲ھ......۸۰۷ء

☆ دیلم میں زندیقوں کا ظہور

☆ فضل بن یحییٰ برمکی کا جیل میں انتقال

۱۹۳ھ......۸۰۸ء۔۸۰۹

☆ وفات ہارون الرشید......۳ جمادی الآخرہ (۵/ اپریل ۸۰۹ء)

☆ امین الرشید کی خلافت

☆ زبیدہ خاتون کی رقہ سے بغداد منتقلی

۱۹۴ھ......۸۰۹ء

☆ امین اور مامون الرشید میں چپقلش کا آغاز

۱۹۵ھ......۸۱۰ء۔۸۱۱ء

☆ صوفی بزرگ شقیق بلخی رحمہ اللہ کی دورانِ جہاد شہادت

☆ امین کی افواج کو خراسان میں شکستِ فاش......شعبان (اپریل ۸۱۱ء)

☆ وفات نابینا محدث ابو معاویہ کوفی رحمہ اللہ، عمر ۸۲ سال......

۱۹۶ھ......۸۱۱ء

☆وفات ابونُواس شاعر

☆طاہر بن حسین کا امین الرشید کے علاقوں پر قبضہ

۱۹۷ھ......۸۱۲ء

☆مامون کی افواج کا بغداد پر حملہ اور محاصرہ......

☆وفات وکیع بن جراح رحمہ اللہ، محدثِ کوفہ......اواخر ذوالحجہ (اگست ۸۱۳ء)

۱۹۸ھ......۸۱۳ء

☆امین الرشید کا قتل......۲۵ محرم (۷/ اکتوبر ۸۱۳ء)

☆خلافتِ مامون الرشید

☆وفات سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ، محدثِ مکہ......یکم رجب (۸ مارچ ۸۱۳ء)

☆وفات یحییٰ بن سعید القطان رحمہ اللہ، محدثِ بصرہ، فقیہِ احناف

☆حسن بن سہل کو عراق کی حکومت سپرد

۱۹۹ھ......۸۱۴ء۔۸۱۵ء

☆ابن طباطبا کا عباسیوں کے خلاف خروج......۱۰ جمادی الآخرہ (۲۵ جنوری ۸۱۵ء)

☆امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے تلمیذ، الفقہ الاکبر اور الفقہ الابسط کے ناقل، ابومطیع حکم بن عبداللہ بلخی رحمہ اللہ کی وفات

۲۰۰ھ......۸۱۵ء

☆علویوں کی بغاوتوں پر قابو پالیا گیا......

☆عباسی سپہ سالار ہرثمہ بن اَعین کی برطرفی، حراست اور قتل......

☆وفات حضرت معروف کرخی رحمہ اللہ......

تیسری صدی ہجری

۲۰۱ھ ۸۱۶ء

☆ مامون کی جانب سے حضرت علی رضا رحمہ اللہ کی ولی عہدی کا اعلان ...

☆ بابک خرمی کا ظہور ......

۲۰۲ھ ۸۱۷ء

☆ فضل بن سہل وزیر دولتِ عباسیہ کا قتل ......

☆ مامون کی بغداد آمد اور حکومت کا استحکام ......

۲۰۳ھ ۸۱۸ء

☆ وفات حضرت علی رضا رحمہ اللہ ......

☆ وفات محمد بن جعفر الصادق رحمہ اللہ

☆ وفات نضر بن شمیل رحمہ اللہ، فقیہ، لغوی، نحوی ......

☆ اسد بن فرات رحمہ اللہ قیروان کے قاضی مقرر ......

☆ خراسان میں زلزلے، بکثرت جانی ومالی نقصانات

۲۰۴ھ ...... ۸۱۹ء ۔ ۸۲۰ء

☆ مامون کی بغداد آمد اور باقاعدہ تخت نشینی ...... ۱۶ صفر (۱۱ اگست ۸۱۹ء)

☆ وفات امام شافعی رحمہ اللہ ...... ۳۰ رجب (۲۰ جنوری ۸۲۰ء)

☆ وفات امام ابوداؤد طیالسی رحمہ اللہ، محدثِ بصرہ ......

۲۰۵ھ ۸۲۰ء

☆ طاہر بن حسین کا خراسان میں تقرر

☆ وفات یزید بن ہارون، محدثِ واسط، فقیہ ......

☆ دجلہ میں طغیانی، بغداد میں سیلاب ......

☆ والی مصر سری بن الحکم کی وفات

۲۰۶ھ......۸۲۱ء

☆ وفات ہیثم بن عدی، ضعیف وکذاب راوی......

☆ وفات محمد بن مستنیر نحوی، تلمیذ سیبویہ......

☆ وفات امیر حکم بن ہشام، حکمرانِ اندلس

☆ عبداللہ بن طاہر بن حسین رقّہ کا حاکم مقرر، طاہر بن حسین کی جانب سے بیٹے کو پندنامہ روانہ

۲۰۷ھ......۸۲۲ء

☆ وفات وہب بن جریر بن حازم بصری رحمہ اللہ......محرم (جون ۸۲۲ء)

☆ وفات طاہر بن حسین، بانئ دولتِ طاہریہ خراسان......

☆ وفات فراء نحوی، تلمیذ امام کسائی......

۲۰۸ھ......۸۲۳ء

☆ وفات فضل بن ربیع حاجب مامون الرشید......

☆ وفات سیدہ نفیسہ، بنت حسن بن زید بن حسن رضی اللہ عنہ......

۲۰۹ھ......۸۲۴ء

☆ قیصرِ روم میخائیل بن جورجیس کی موت......

☆ وفات ابوعبیدہ معمر بن مثنّٰی، ماہرِ نحو ولغتِ عربی، عمر ۹۳ سال......

☆ وفات محدّثِ موصل فضل بن عبدالحمید رحمہ اللہ......

۲۱۰ھ......۸۲۵ء

☆ اندلس میں عبدالرحمٰن بن حکم اموی کی فتوحات......ربیع الاوّل (جولائی ۸۲۵ء)

☆ مامون کی اپنے وزیر حسن بن سہل کی بیٹی بوران سے شادی......رمضان (دسمبر ۸۲۵ء)

☆ مامون نے اپنے مخالفین ابراہیم بن مہدی اور ابن عائشہ پر قابو پالیا......

۲۱۱ھ......۸۲۶ء

☆ مامون کی طرف سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی تعریف کی ممانعت......

☆ وفات ابوالعتاہیہ شاعر......۳ جمادی الآخرہ (۹ ستمبر ۸۲۶ء)

☆ وفات امام عبدالرزاق بن ہمام صنعانی رحمہ اللہ، وجہِ شہرت مصنّف عبدالرزّاق

۲۱۲ھ......۸۲۷ء

☆ اسد بن فرات کی قیادت میں سسلی کے لیے بحری بیڑے کی روانگی......۱۵ ربیع الاول (۱۴ جنوری ۸۲۷ء)

☆بابک خُرّمی کے خلاف لشکر کشی......

☆دولتِ عباسیہ میں خلق قرآن کے عقیدے کا سرکاری طور پر نفاذ......

☆امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پوتے اسماعیل بن حماد رحمہ اللہ قاضی بصرہ کی وفات......

۲۱۳ھ......۸۲۸ء

☆وفات قاضی اسد بن فرات رحمہ اللہ......ربیع الآخر (جولائی ۸۲۸ء)

☆وفات علی بن جبلہ شاعر......

☆مشہور موسیقار ابراہیم مُوصلی کی موت......

۲۱۴ھ......۸۲۹ء

☆عباسی افواج کو بابک خُرّمی کے مقابلے میں شکست، سالار فوج ابن حمید طوسی قتل

☆ابودلف شاعر مامون کے دربار سے وابستہ......

☆وفات ضحاک بن مُخلد شیبانی، محدثِ بصرہ......

۲۱۵ھ......۸۳۰ء

☆مامون کی جہاد کے لیے ایشیائے کوچک میں طرطوس تک پیش قدمی......جمادی الاولیٰ (جولائی ۸۳۰ء)

☆وفات صوفی بزرگ ابوسلیمان دارانی رحمہ اللہ......

۲۱۶ھ......۸۳۱ء

☆مامون کی ایشیائے کوچک پر دوسری یلغار، شام اور مصر کا سفر......

☆وفات زبیدہ خاتون......جمادی الاولیٰ (جون ۸۳۱ء)

☆وفات امام عربیت اصمعی (عبدالملک بن قریب الباہلی)، عمر ۸۸ سال......

۲۱۷ھ......۸۳۲ء

☆مامون کی ایشیائے کوچک میں لشکر کشی، قیصر روم تو فیل سے جنگ......

☆وفات حجاج بن منہال رحمہ اللہ، محدثِ بصرہ......

۲۱۸ھ......۸۳۳ء

☆مامون کے حکم سے ایشیائے کوچک میں نئے شہر طوانہ کی تعمیر کا آغاز......

☆مامون الرشید کا مسئلہ خلقِ قرآن میں تشدد۔امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی گرفتاری......

☆مامون کی وفات......۱۸ رجب (۲۰ راگست ۸۳۳ء)

☆معتصم کی خلافت کا آغاز......

☆ بابک خُرّمی کے خلاف فوج کشی...... ذوالقعدہ (دسمبر ۸۳۳ء)
☆ سیرت ابن ہشام کے مؤلف عبدالملک بن ہشام بصری رحمہ اللہ کی وفات

۲۱۹ھ...... ۸۳۴ء

☆ وزیرِ بغداد اسحٰق بن ابراہیم کی مجوسی قیدیوں کے ساتھ دیلم سے واپسی...... جمادی الاولیٰ...... (مئی ۸۳۴ء)
☆ محمد بن قاسم علوی کا خروج، شکست، قید اور فرار
☆ وفات فضل بن دُکین رحمہ اللہ، شیخ امام بخاری رحمہ اللہ...... شعبان (اگست ۸۳۴ء)
☆ معتصم کا امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ پر مسئلہ خلقِ قرآن میں جبر و تشدد...... رمضان (ستمبر ۸۳۴ء)

۲۲۰ھ...... ۸۳۵

☆ عباسیوں کے نئے دارالخلافہ ''سر من رائی'' (سامرا) کی تعمیر......
☆ امام قرأت قالون ابوموسیٰ بن مینا المدنی رحمہ اللہ کی وفات......
☆ محمد تقی الجواد بن علی رضا رحمہ اللہ کی وفات، اثنا عشریہ کے نویں امام......

۲۲۱ھ...... ۸۳۵ء

☆ وفات آدم بن ابی ایاس رحمہ اللہ، محدثِ عسقلان......
☆ وفات عیسیٰ بن ابان بن صدقہ رحمہ اللہ، قاضی و محدثِ بصرہ، تلمیذ امام محمد بن حسن رحمہ اللہ......
☆ بُغا کبیر کی بابک خُرّمی سے شکست۔ افشین کی بابک کے خلاف فتح......
☆ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی معتصم کے دربار میں حاضری۔ کوڑوں کی سزا...... ۲۵ رمضان (۱۱ ستمبر ۸۳۶ء)

۲۲۲ھ...... ۸۳۶ء

☆ اسلامی فوج بابک کے پایۂ تخت ''برزند'' میں داخل...... ۲۰ رمضان (۲۶ اگست ۸۳۷ء)
☆ بابک خُرّمی معتصم کے سپہ سالار افشین کے ہاتھوں گرفتار...... ۱۰ شوال (۱۴ ستمبر ۸۳۷ء)

۲۲۳ھ...... ۸۳۷ء

☆ بابک خُرّمی کا قتل......
☆ قیصر توفیل بن میخائیل کا سرحدوں پر حملہ، مَلَطیہ پر قبضہ اور مسلمانوں کی جوابی لشکر کشی کے بعد پسپائی......

۲۲۴ھ...... ۸۳۸ء

☆ وفات ابوعبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ، ماہرِ لغت و فقہ......
☆ وفات ابراہیم بن مہدی...... رمضان

۲۲۵ھ...... ۸۳۹ء۔ ۸۴۰ء

☆ وفات ابودُلف، شاعر، نحوی......

☆ وفات ابوالحسن المدائنی، مؤرخ، عمر ۹۳ سال......
☆ ترک سپہ سالار افشین کی معزولی اور سزائے موت...... شعبان (جون ۸۴۰ء)

۲۲۶ھ...... ۸۴۰ء

☆ اہواز میں سخت زلزلہ......
☆ ابوالہذیل علاف بصری، شیخ المعتزلہ کی وفات، عمر ۱۰۰ سے زائد......
☆ وفات سلیمان بن حرب رحمہ اللہ، محدث بصرہ......

۲۲۷ھ...... ۸۴۱ء۔ ۸۴۲ء

☆ وفات معتصم باللہ...... ۱۸ ربیع الاول (۱۸ دسمبر ۸۴۱ء)
☆ وفات حضرت بشر حافی رحمہ اللہ...... ۲۰ ربیع الاول (۲۰ دسمبر ۸۴۱ء)
☆ خلافتِ واثق باللہ......

۲۲۸ھ...... ۸۴۲ء

☆ سسلی میں مسلمانوں کی فتوحات......

۲۲۹ھ...... ۸۴۳ء

☆ وفات شیخ القراء امام خلف بن ہشام رحمہ اللہ...... جمادی الاولیٰ (فروری ۸۴۴ء)
☆ خلیفہ واثق کی جانب سے سرکاری دفاتر کے افسرانِ اعلیٰ پر بھاری جرمانے عائد......

۲۳۰ھ...... ۸۴۴ء۔ ۸۴۵ء

☆ وفات حاکم خراسان عبداللہ بن طاہر......
☆ وفات محمد بن سعد رحمہ اللہ، صاحبِ طبقات...... جمادی الآخرہ (فروری ۸۴۵ء)

۲۳۱ھ...... ۸۴۵ء۔ ۸۴۶ء

☆ رومیوں سے قیدیوں کا تبادلہ...... ۱۰ محرم (۱۶ ستمبر ۸۴۵ء)
☆ عراق کے مشہور محدث احمد بن نصر رحمہ اللہ کا قتل...... ۳۰ شعبان (۳۰ اپریل ۸۴۶ء)
☆ وصیف ترکی دربار بغداد کے مقرب امراء میں شامل
☆ بغداد کے بیت المال میں نقب لگا کر ۴۲ ہزار دراہم کی چوری......
☆ وفات ابوتمام حبیب بن اوس طائی، مشہور شاعر، مؤلف دیوانِ حماسہ......

۲۳۲ھ...... ۸۴۶ء۔ ۸۴۷ء

☆ وفات واثق باللہ...... ۲۴ ذوالحجہ (۲۲ اگست ۸۴۷ء)

☆ وفات محمد بن عائذ دمشقی، مورخ

☆ خلافت متوکل علی اللہ۔

۲۳۳ھ......۸۴۷ء۔۸۴۸ء

☆ شام میں زلزلہ، پچاس ہزار افراد جاں بحق......

☆ وفات امام جرح وتعدیل یحییٰ بن معین رحمہ اللہ، محدث بغداد......ذوالقعدہ (جون ۸۴۸ء)

۲۳۴ھ......۸۴۸ء۔۸۴۹ء

☆ وفات علی بن مدینی رحمہ اللہ، محدث بصرہ......ذوالقعدہ (جون ۸۴۹ء)

۲۳۵ھ......۸۴۹ء

☆ وفات ابوبکر ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ، محدث کوفہ، مؤلف مصنف ابن ابی شیبہ......ربیع الآخر (نومبر ۸۴۹ء)

۲۳۶ھ......۸۵۰ء۔۸۵۱ء

☆ مامون کے سسر اور وزیر حسن بن سہل کی وفات عمر ۷۰ سال......رمضان (مارچ ۸۵۱ء)

۲۳۷ھ......۸۵۱ء۔۸۵۲ء

☆ قاضی احمد بن ابی دُواد معتزلی پر خلیفہ متوکل کا عتاب......

☆ آرمینیا کے نصرانیوں کی بغاوت پر عباسی سپہ سالار بُغا کبیر نے قابو پایا......

☆ وفات صوفی بزرگ حاتم اصم رحمہ اللہ......شوال (اپریل ۸۵۲ء)

۲۳۸ھ......۸۵۲ء

☆ رومیوں کا دمیاط پر حملہ......

☆ امیر اندلس عبدالرحمٰن بن حکم کا انتقال، ۳۲ سالہ اقتدار، عمر ۶۲ سال......

۲۳۹ھ......۸۵۳ء

☆ ایشیائے کوچک میں لشکر کشی، اسلامی افواج قُسطَنطِینیہ کے قریب......

۲۴۰ھ......۸۵۴ء

☆ قاضی احمد بن ابی داؤد معتزلی کی وفات......

۲۴۱ھ......۸۵۵ء

☆ وفات امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ......۱۲ ربیع الاول، عمر ۷۷ سال (۳۰ جولائی ۸۵۵ء)

۲۴۲ھ......۸۵۶ء

☆ وفات محمد بن اغلب والی افریقہ......۱۰ محرم (۱۸ مئی ۸۵۶ء)

☆ قاضی بغداد یحییٰ بن اکثم رحمہ اللہ کی وفات...... جمادی الاولیٰ (ستمبر ۸۵۶ء)
☆ شمالی ایران میں زلزلے، ۴۵ ہزار افراد جاں بحق......

۲۴۳ھ......۸۵۷ء

☆ وفات ابن سکّیت نحوی......
☆ وفات حارث بن اسد محاسبی صوفی رحمہ اللہ......

۲۴۴ھ......۸۵۸ء

☆ بُغا کبیر کا بلادِ روم میں جہاد، صملہ کی فتح......
☆ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نیزہ ''عنزہ'' خلیفہ متوکل کو پیش کیا گیا......
☆ عید الاضحیٰ، عیدِ نصاریٰ اور عیدِ یہود ایک دن واقع ہوئیں...... ۱۰ ذوالحجہ (۱۹ مارچ ۸۵۹ء)

۲۴۵ھ......۸۵۹ء۔۸۶۰ء

☆ کئی شہروں میں زلزلے، خلیفہ متوکل کی طرف سے متاثرین کے لیے تیس لاکھ درہم کی امداد جاری......
☆ متوکل کے حکم سے نئے شہر ''جعفریہ'' کی تعمیر......

۲۴۶ھ......۸۶۰ء

☆ امیر اندلس محمد بن عبدالرحمٰن کی فرنگی مقبوضات پر یلغار اور فتوحات......
☆ بغداد میں ۲۵ دن تک ہلکی بارش، گھروں کی چھتوں پر گھاس اگ آئی......
☆ وفات ذوالنون مصری رحمہ اللہ...... ۲ ذوالقعدہ (۱۷ جنوری ۸۶۱ء)
☆ رافضی شاعر دِعبل خزاعی کی موت......

۲۴۷ھ......۸۶۱ء

☆ امام نحو ابوعثمان مازنی رحمہ اللہ کی وفات......
☆ خلیفہ متوکل کا قتل...... ۵ شوال (۲۴ دسمبر ۸۶۱ء)

۲۴۸ھ......۸۶۲ء

☆ خلیفہ منتصر باللہ جاں بحق...... ۵ ربیع الآخر (۲۰ مئی ۸۶۲ء)
☆ المستعین کی خلافت
☆ سپہ سالارِ دولتِ عباسیہ بغا کبیر کی وفات...... جمادی الاولیٰ (جولائی ۸۶۲ء)

۲۴۹ھ......۸۶۳ء

☆ ایشیائے کوچک میں مسلمانوں کو شکست، سپہ سالار عمر بن عبیداللہ شہید...... ۱۵ رجب (۳ ستمبر ۸۶۳ء)

☆ الجزیرہ کی سرحد پر مسلمانوں کو دوسری شکست، امیر فوج علی بن یحییٰ شہید...... ۱۴رمضان (۳۱ اکتوبر ۸۶۳ء)

☆ بغداد میں شکست پر احتجاجی مظاہرہ، توڑ پھوڑ اور ہنگامہ آرائی، سامرا کی جیل توڑ کر قیدی آزاد کرا لیے گئے

۲۵۰ھ...... ۸۶۴ء

☆ قاضی مصر حارث بن مسکین رحمہ اللہ کی وفات، عمر ۹۶ سال...... ربیع الاول (اپریل ۸۶۴ء)

☆ ابو الحسین علوی کا خروج اور قتل...... ۱۵رجب...... (۲۲ اگست ۸۶۴ء)

۲۵۱ھ...... ۸۶۵ء

☆ وفات حافظ نیشا پوری اسحٰق بن ابراہیم...... جمادی الاولیٰ (جون ۸۶۵ء)

☆ اسماعیل بن یوسف علوی کا خروج، مسجد الحرام میں لوٹ مار، گیارہ سو حاجی قتل

۲۵۲ھ...... ۸۶۶ء

☆ خلیفہ مستعین عباسی کی معزولی...... ۴محرم (۶ فروری ۸۶۶ء)

☆ مستعین عباسی کا قتل...... ۳شوال (۲۸ اکتوبر ۸۶۶ء)

☆ اسماعیل بن یوسف طالبی علوی کی موت

☆ وفات بندار محمد بن بشار رحمہ اللہ، امام بخاری و امام مسلم کے استاذ

☆ وفات محمد بن المثنیٰ رحمہ اللہ، امام بخاری و امام مسلم کے استاذ

۲۵۳ھ...... ۸۶۷ء

☆ حضرت سری سقطی رحمہ اللہ کی وفات...... ۶رمضان (۸ ستمبر ۸۶۷ء)

☆ وصیف الترکی رئیسِ دولتِ عباسیہ کی وفات

☆ موسیٰ بن بغا کبیر کے مقابلے میں شکست کھا کر کوکبی علوی فرار

۲۵۴ھ...... ۸۶۸ء

☆ امیر دولتِ عباسیہ بغا صغیر کا قتل

☆ سامرا میں حضرت علی الہادی بن محمد تقی بن علی رضا رحمہ اللہ کی وفات، عمر ۴۰ سال...... اثنا عشریہ کے دسویں امام

۲۵۵ھ...... ۸۶۸ء۔ ۸۶۹

☆ مشہور معتزلی ادیب و مصنف ابو عثمان جاحظ کی وفات، عمر ۹۰ سال...... محرم (جنوری ۸۶۹ء)

☆ عراق میں زنجی فتنے کا ظہور

☆ وفات امام دارمی رحمہ اللہ مؤلف سنن دارمی

☆ خلیفہ معتز باللہ کی جبراً معزولی...... ۲۸رجب (۲۴ جولائی ۸۶ء)

☆ مہتدی عباسی کی خلافت......۲۸ رجب (۲۴ جولائی ۸۶۹ء)
☆ سابق خلیفہ معتز باللہ کا قتل......۲ شعبان (۲۷ جولائی ۸۶۹ء)
☆ ترک سردار صالح بن وصیف دولتِ عباسیہ پر مسلط

۲۵۶ھ......۸۶۹ء۔۸۷۰ء
☆ خلیفہ مہتدی باللہ کا قتل اور معتمد عباسی کی خلافت......۱۶ رجب (یکم جولائی ۸۷۰ء)
☆ وفات امام بخاری رحمہ اللہ......۳۰ رمضان (۳۰/ اگست ۸۷۰ء)

۲۵۷ھ......۸۷۰ء
☆ زنجیوں کی مار دھاڑ۔ بصرہ میں بارہ ہزار افراد قتل......۱۴ شوال (۳ ستمبر ۸۷۱ء)
☆ وفات عباس بن الفرج ماہرِ لغت

۲۵۸ھ......۸۷۱ء۔۸۷۲ء
☆ ولی عہد مُوَفّق عباسی کی زنجیوں کے خلاف مہمات اور کامیابیاں
☆ وفات یحییٰ بن معاذ الرازی رحمہ اللہ، مشہور واعظ اور صوفی...... جمادی الاولیٰ (مارچ ۸۷۲ء)

۲۵۹ھ......۸۷۲ء
☆ مُوَفّق عباسی اور موسیٰ بن بغا کی زنجیوں کے خلاف فتوحات
☆ مَلَطْیَہ میں رومیوں سے معرکہ اور فتح
☆ خراسان میں دولتِ صَفّاریہ کا استحکام

۲۶۰ھ......۸۷۳ء۔۸۷۴ء
☆ وفات حسن بن علی (حسن عسکری رحمہ اللہ، اثنا عشریہ کے گیارہویں امام)......ربیع الاول (جنوری ۸۷۴ء)
☆ طبیب حُنین بن اسحٰق کی موت......

۲۶۱ھ......۸۷۴ء
☆ یعقوب بن لیث صَفّاری کا عروج
☆ بغدادی افواج کی زنجیوں سے لڑائیاں
☆ امام قراءت ابوشعیب سوسی (صالح بن زیاد) رحمہ اللہ کا انتقال
☆ صوفی بزرگ ابویزید بسطامی رحمہ اللہ کی وفات
☆ وفات امام مسلم بن حجاج......رجب (اپریل ۸۷۵ء)

۲۶۲ھ......۸۷۵ء۔۸۷۶ء
☆ عمر بن شبہ بصری رحمہ اللہ مؤلف اخبار المدینہ کی وفات...... جمادی الآخرہ (مارچ ۸۷۶ء)

☆ واسط میں یعقوب بن لیث کے خلاف سالارِ دولتِ عباسیہ مُوفق کی فتح......

۲۶۳ھ......۸۷۶ء

☆ شام کا ساحلی قلعہ لؤلؤۃ فرنگیوں کے قبضے میں آ گیا......

☆ اندلس میں شہزادہ منذر کو نصرانیوں سے جنگ میں شکست......

۲۶۴ھ......۸۷۷ء۔۸۷۸ء

☆ عباسی امیر موسیٰ بن بغا کبیر کی وفات......محرم (ستمبر ۸۷۷ء)

☆ زنجیوں کا واسط پر حملہ......

☆ بلادِ روم میں مسلمانوں کو شکست، پوری فوج کام آ گئی......

☆ شافعی فقیہ ابوابراہیم مزنی رحمہ اللہ کی وفات......ربیع الاوّل (نومبر ۸۷۷ء)

☆ محدث ابوزرعہ رحمہ اللہ کی وفات......۲۹ ذوالحجہ (یکم ستمبر ۸۷۸ء)

۲۶۵ھ......۸۷۸ء

☆ تیونس کے مالکی فقہاء کے شیخ محمد بن سحنون رحمہ اللہ کی وفات......

☆ یعقوب بن لیث صفاری بانیٔ دولتِ صفاریہ خراسان کی وفات......

۲۶۶ھ......۸۷۹ء

☆ رومیوں کی پیش قدمی، الجزیرہ کے علاقے تک مار دھاڑ......

☆ زنجیوں کا رامہرمز پر قبضہ......

۲۶۷ھ......۸۸۰ء

☆ زنجیوں کا واسط پر قبضہ اور آبادی کا قتل عام......

☆ مُوفق کی اپنے بیٹے مُعتضِد کے ساتھ زنجیوں کے خلاف فوج کشی......

۲۶۸ھ......۸۸۱ء

☆ ترک سردار خلف الطّولی کا بلادِ روم میں جہاد، بڑی تعداد میں دشمن گرفتار......

☆ محدثِ خراسان احمد بن سیار مروزی رحمہ اللہ کی وفات......

۲۶۹ھ......۸۸۲ء

☆ مُوفق اور مُعتضِد کے ہاتھوں زنجیوں کا استیصال......

☆ خلیفہ معتمد عباسی کا احمد بن طولون کی دعوت پر مصر کا سفر اور جبراً واپسی......

۲۷۰ھ......۸۸۳ء۔۸۸۴ء

☆ احمد بن طولون بانیٔ دولتِ طولونیہ مصر کا انتقال، عمر ۶۰ سال......ذوالقعدہ (مئی ۸۸۴ء)

☆وفات ربیع بن سلیمان رحمہ اللہ، تلمیذِ امام شافعی رحمہ اللہ......شعبان (فروری ۸۸۴ء)

۲۷۱ھ......۸۸۴ء-۸۸۵ء

☆وفات بُوران، زوجۂ مامون الرشید......ربیع الاوّل (ستمبر ۸۸۴ء)

☆وقعۃ الطواحین۔ فلسطین میں عباسیوں کو مصریوں سے شکست، ۱۶ شوال (۱۶ اپریل ۸۸۵ء)

۲۷۲ھ......۸۸۵ء

☆مصر میں زلزلہ، ایک ہزار سے زائد افراد جاں بحق......جمادی الاولیٰ (اکتوبر ۸۸۵ء)

☆بغداد میں گرانی، اشیائے صرف کی کمیابی......

۲۷۳ھ......۸۸۶ء-۸۸۷ء

☆امیر اَندَلُس محمد بن عبدالرحمٰن کا ۳۵ سالہ اقتدار کے بعد انتقال......صفر (جولائی ۸۸۶ء)

☆وفات امام ابن ماجہ قزوینی رحمہ اللہ......رمضان (فروری ۸۸۷ء)

۲۷۴ھ......۸۸۷ء

☆عَمرو بن لیث صَفّاری اور خلافتی افواج میں جنگ......

☆حاکمِ طرطوس "یازمان" کی بلادِ روم پر یلغار، کامیاب حملہ اور واپسی......

۲۷۵ھ......۸۸۸ء-۸۸۹ء

☆بصرہ میں امام ابوداؤد سجستانی رحمہ اللہ کی وفات......شوال (فروری ۸۸۹ء)

۲۷۶ھ......۸۸۹ء

☆عباسیوں اور مصریوں میں ایک اور لڑائی۔ عباسیوں کو شکست......

☆محدث اَندَلُس بقی بن مخلد ابوعبدالرحمٰن رحمہ اللہ کی وفات عمر ۷۵ سال......جمادی الآخرہ (اکتوبر ۸۸۹ء)

☆وفات ابن قُتَیبَہ الدینوری رحمہ اللہ، مؤرخ۔ شعبان (دسمبر ۸۸۹ء)

☆وفات ابوعُمر واحمد بن حازم رحمہ اللہ، محدثِ کوفہ، ذوالحجہ (اپریل ۸۹۰ء)

۲۷۷ھ......۸۹۰ء

☆وفات یعقوب بن سفیان الفسوی رحمہ اللہ، مؤرخ، مصنف "المعرفۃ والتاریخ" عمر ۸۲ سال......جمادی الآخرہ (ستمبر ۸۹۰ء)

۲۷۸ھ......۸۹۱ء

☆قَرامِطہ کا ظہور

☆وفات ولی عہدِ دولتِ عباسیہ مُوَفّق بن متوکل علی اللہ عمر ۴۹ سال......صفر (مئی ۸۹۱ء)

۲۷۹ھ......۸۹۲ء

☆خلیفہ معتمد کا استعفیٰ......اواخرِ محرم (اواخر مارچ ۸۹۲ء)

☆معتضد عباسی کی خلافت

☆سابق خلیفہ معتمد عباسی کی وفات عمر ۵۰ سال......رجب (اکتوبر ۸۹۲ء)

☆وفات امام ترمذی رحمہ اللہ......رجب (اکتوبر ۸۹۲ء)

☆امام ابن ابی خیثمہ رحمہ اللہ مصنف التاریخ الکبیر کی وفات عمر ۹۴ سال......

۲۸۰ھ......۸۹۳ء

☆وفات قاضی احمد بن ابن عمران رحمہ اللہ، شیخ امام طحاوی رحمہ اللہ......

۲۸۱ھ......۸۹۴ء

☆وفات امام ابن دیزیل رحمہ اللہ (ابراہیم بن حسین)، محدثِ ہمدان، شعبان (نومبر ۸۹۴ء)

۲۸۲ھ......۸۹۵ء۔۸۹۶ء

☆معتضد کی خوارج کے خلاف فتح......

☆عَمرو بن لیث صَفاری کی فتوحات......

☆حاکمِ مصر خمارویہ بن ابن طولون قتل......ذوالقعدہ (جنوری ۸۹۶ء)

۲۸۳ھ......۸۹۶ء

☆وفات سہل بن عبداللہ تستری رحمہ اللہ......

۲۸۴ھ......۸۹۷ء

☆مصر میں سیاہ آندھی......ربیع الآخر (مئی ۸۹۷ء)

☆معتضِد عباسی کا توہینِ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا فیصلہ پھر اس سے رجوع......جمادی الآخرہ (جولائی ۸۹۷ء)

☆دربارِ خلافت کی جانب سے عَمرو بن لیث صَفاری کو پروانہ حکومت وخلعت روانہ

۲۸۵ھ......۸۹۸ء

☆امام نحو ابوالعباس المبرد رحمہ اللہ کی وفات......

۲۸۶ھ......۸۹۹ء

☆ماوراء النہر میں صَفاریوں کو شکست۔ دولتِ سامانیہ کا عروج......

☆بحرین میں ابوسعید جنابی کا عروج، قَرامطیوں کا مرکز قائم، بصرہ خطرے میں

۲۸۷ھ......۹۰۰ء

☆قَرامِطہ کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام، عرب جانے والے قافلے غیر محفوظ......

۲۸۸ھ......۹۰۰ء

☆شمالی افریقہ میں دعوتِ بنوعبید کا ظہور......

☆ آذربائی جان میں وبائی امراض سے بے شمار لوگ جاں بحق......

۲۸۹ھ......۹۰۱ء۔۹۰۲ء

☆ خلیفہ معتضد عباسی کی وفات، عمر ۴۶ سال......۲۲ ربیع الآخر (۶/ اپریل ۹۰۲ء)

☆ خلیفہ مکتفی عباسی کی مسند نشینی

۲۹۰ھ......۹۰۲ء

☆ شام میں قرامطیوں کی مار دھاڑ، دمشق کا محاصرہ، خلق خدا تنگ......

☆ افریقہ میں دولتِ بنو عبید کا قیام......

☆ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے صاحبزادے، مدونِ مسندِ احمد امام عبد اللہ رحمہ اللہ کی وفات عمر ۷۷ سال......

۲۹۱ھ......۹۰۳ء

☆ شام پر قرامطہ قابض......سلمیہ شہر کی تمام آبادی تہ تیغ

☆ ماوراء النہر پر غیر مسلم ترکوں کا حملہ، امیر اسماعیل سامانی کی کامیاب مزاحمت اور فتح......

☆ رومیوں کی ایشیائے کوچک میں تاخت و تاراج......

☆ وفات شیخ القراء امام قنبل محمد بن عبد الرحمٰن المکی رحمہ اللہ

۲۹۲ھ......۹۰۴ء

☆ دولتِ طولونیہ کا زوال۔ حاکم مصر ہارون بن خمارویہ باغیوں کے ہاتھوں قتل......مصر پر باغی سردار خلنجی کا قبضہ

☆ مسندِ بزار کے مؤلف حافظ ابو بکر بزار رحمہ اللہ کی وفات......

۲۹۳ھ......۹۰۵ء

☆ شام اور عراق میں قرامطہ کی خونریز کارروائیاں۔ کوفہ پر قبضہ اور قتل عام......

☆ مصر پر عباسی افواج کا حملہ۔ خلنجی شکست کھا کر قتل......

۲۹۴ھ......۹۰۶ء۔۹۰۷ء

☆ قرامطہ کے ہاتھوں بیس ہزار حاجی قتل......

☆ محدثِ اندلس صباح بن عبد الرحمٰن رحمہ اللہ کی وفات۔ عمر ۱۱۸ سال......محرم (نومبر ۹۰۶ء)

☆ قرامطی دجال زکرویہ سرکاری افواج کے ہاتھوں شکست کھا کر قتل......

۲۹۵ھ......۹۰۷ء۔۹۰۸ء

☆ وفات امیر خراسان اسماعیل بن احمد سامانی......

☆ وفات خلیفہ مکتفی عباسی عمر ۳۶ سال......۱۲ ذو القعدہ (۲۵/ اگست ۹۰۸ء)

☆خلافت مقتدر عباسی

۲۹۶ھ......۹۰۸ء

☆بغداد میں سیاسی بحران، خلیفہ مقتدر باللہ کو معزول کر کے عبداللہ بن معتز کی تخت نشینی کی ناکام کوشش......

☆امیرِ افریقہ زیادۃ اللہ بن اغلب بنوعبید کے مقابلے سے فرار ہو کر مصر پہنچ گیا......

۲۹۷ھ......۹۰۹ء

☆لیث بن علی صَفاری کا فارس پر قبضہ......

☆لیث بن علی کی شکست اور قتل......

☆وفات محمد بن سالم، سہل بن عبداللہ تستری رحمہ اللہ کے فیض یافتہ......

۲۹۸ھ......۹۱۰ء

☆نامور صوفی بزرگ ابوعثمان حیری رحمہ اللہ کی وفات......

۲۹۹ھ......۹۱۱ء

☆وفات محمد بن کیسان نحوی، تلمیذِ ثعلب ومبرد......

☆قیروان (تیونس) میں شدید زلزلہ

۳۰۰ھ......۹۱۲ء

☆امیر اندَلُس عبداللہ بن محمد اموی کی وفات، دورِ حکومت ۲۵ سال......ربیع الآخر (نومبر۹۱۲ء)

☆ملحد فلسفی ریوندی کی موت۔ الحاد پر مشتمل تصانیف: نعت الحکمۃ، قضیب الذہب، کتاب الزمردۃ......

چوتھی صدی ہجری

۳۰۱ھ......۹۱۳ء۔۹۱۴ء

☆منصور حلاج کی گرفتاری......

☆قرامطہ کے پیشوا ابوسعید جنابی کی ہلاکت......

☆امیر ماوراء النہر ابونصر احمد سامانی کا قتل......۲۳ جمادی الآخرہ (۲۳ جنوری ۹۱۴ء)

۳۰۲ھ......۹۱۴ء

☆ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ مکمل کی......

☆والی طرطوس بشر خادم کا بلادِ روم پر چھاپہ......

۳۰۳ھ......۹۱۵ء۔۹۱۶ء

☆وفات امام نسائی رحمہ اللہ......شعبان (فروری ۹۱۶ء)

☆الجزیرہ کی سرحدوں پر رومیوں کی چھاپہ مار کارروائیاں......

☆بغداد میں متعدد مقامات پر آتش زدگی......

☆وفات ابوعلی جبائی، شیخ المعتزلہ

۳۰۴ھ......۹۱۶ء

☆رملہ (شام) میں دولتِ اغالبہ کے جلاوطن آخری حکمران زیادۃ اللہ کی وفات......

☆بغداد میں عجیب الخلقت آدم خور جانور کی دہشت......

۳۰۵ھ......۹۱۷ء

☆خلافتِ عباسیہ اور سلطنتِ روما میں صلح۔ رومی سفیر کی بغداد آمد اور استقبال......

۳۰۶ھ......۹۱۸ء

☆بغداد میں خلیفہ مقتدر کی والدہ کی جانب سے نئے ہسپتال کا افتتاح......یکم محرم (۱۳ جون ۹۱۸ء)

☆اسکندریہ پر بنوعبید کا قبضہ......

۳۰۷ھ......۹۱۹ء

☆بغداد میں آتش زدگی، بھاری مالی نقصان......صفر (جولائی ۹۱۹ء)

☆ بصرہ پر قرامطہ کا حملہ۔ قتل عام......

۳۰۸ھ......۹۲۰ء

☆ مصر پر بنوعبید کا تسلط، قاہرہ پر قبضہ......

☆ عراق میں موسم گرما میں شدید سردی اور برف باری......محرم (جون ۹۲۰ء)

۳۰۹ھ......۹۲۱ء۔ ۹۲۲ء

☆ منصور حلاج کا قتل......۲۳ ذوالقعدہ (۲۵ مارچ ۹۲۲ء)

۳۱۰ھ......۹۲۲ء۔ ۹۲۳ء

☆ وفات ابن جریر طبری رحمہ اللہ، مؤلف تاریخ الرسل والملوک، عمر ۹۶ سال......۲۸ رمضان (۱۹ جنوری ۹۲۳ء)

☆ وفات ابواسحٰق الزجاج رحمہ اللہ، مفسر، نحوی......

☆ وفات ابوبکر خلال حنبلی رحمہ اللہ، مؤلف السنۃ، الجامع لمسائل احمد......

۳۱۱ھ......۹۲۳ء

☆ ابوطاہر قرامطی کا بصرہ پر حملہ، عوام کا قتل عام......

☆ مشہور طبیب محمد بن زکریا الرازی کی وفات......

۳۱۲ھ......۹۲۴ء

☆ حاجیوں کی واپسی میں قافلوں پر ابوطاہر قرامطی کا حملہ......محرم (اپریل ۹۲۴ء)

۳۱۳ھ......۹۲۵ء

☆ سسلی کے حاکم سالم بن راشد کی جہادی مہمات، فرنگیوں کے کئی قلعے فتح......

☆ قیصرِ روم کی اسلامی سرحدی بستیوں کو دھمکی، علاقہ خالی کرنے کا حکم......

۳۱۴ھ......۹۲۶ء

☆ ایشیائے کوچک پر رومیوں کا حملہ۔ مَلَطْیَہ پر قبضہ اور عوام کا قتل عام......

☆ قرامطہ کی ناکہ بندی، عراق کے حاجیوں کی راہ مسدود......

۳۱۵ھ......۹۲۷ء

☆ رومیوں کا سمیساط پر قبضہ، مساجد گرجوں میں تبدیل......

☆ کوفہ پر قرامطہ کا حملہ، عباسی سالار مقابلے میں قتل، بغداد خطرے میں......

☆ بغداد میں سو سے زائد عورتوں کے قتل کے مرتکب نجومی کو سزائے موت......جمادی الاولیٰ (جولائی ۹۲۷ء)

۳۱۶ھ......۹۲۸ء

☆ شام کے شہروں: رَحبہ اور رَقّہ پر قرامطہ کا قبضہ......

۳۱۷ھ......۹۲۹ء

☆ خلیفہ مقتدر باللہ جبراً معزول۔ قاہر باللہ کی عارضی خلافت

☆ فوج میں بغاوت اور مقتدر باللہ دوبارہ تخت نشین......

☆ مکہ پر قرامطہ کی چڑھائی۔۱۷۰۰ حاجی قتل۔حملہ آور حجرِ اسود اکھاڑ کر بحرین لے گئے

۳۱۸ھ......۹۳۰ء

☆ تنخواہیں نہ ملنے پر بغداد کی گھڑسوار اور پیادہ فوج کا باری باری احتجاج، خلیفہ مقتدر کی جانب سے یقین دہانی پر احتجاج ختم......

☆ وفات احمد بن اسحٰق تنوخی رحمہ اللہ، فقیہ احناف، نحوی ولغوی......

۳۱۹ھ......۹۳۱ء

☆ ایران پر دیلمی شیعہ رئیس مرداویج کا قبضہ......

۳۲۰ھ......۹۳۲ء

☆ عباسی خلافت کی طرف سے ایران وخراسان میں دیلمی حکومت کو تسلیم کر لیا گیا......

☆ خلیفہ مقتدر باللہ قتل، مدتِ خلافت ۲۵ سال......۲۷ شوال (۱۱/نومبر ۹۳۲ء)

☆ خلافت القاہر عباسی

☆ امام بخاری رحمہ اللہ کے تلمیذِ خاص، صحیح بخاری کے ناقل محمد بن یوسف فربری رحمہ اللہ کی وفات......

۳۲۱ھ......۹۳۳ء

☆ وفات امام طحاوی رحمہ اللہ......ذوالقعدہ (نومبر ۹۳۳ء)

☆ وفات ابوہاشم جبائی شیخ المعتزلہ......

۳۲۲ھ......۹۳۳ء۔۹۳۴ء

☆ محمد بن بُویہ کی دیلمی سردار مرداویج کی ماتحتی سے علیحدگی اور دولتِ بنوبُویہ کا قیام......

☆ جعلی مہدی، بانی دولتِ بنوعبید افریقہ، عبیداللہ بن میمون ہلاک......ربیع الاول (مارچ ۹۳۴ء)

☆ خلیفہ قاہر باللہ معزول......۶ جمادی الآخرہ (۴ جون ۹۳۴ء)

☆ خلافت راضی باللہ عباسی

☆ دیلمی حاکم مرداویج کی موت......

☆ وفات حضرت ابوعلی رودباری رحمہ اللہ، حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کے خلیفہ......

۳۲۳ھ......۹۳۴ء

☆ ابوطاہر قرامطی عراقی حاجیوں کی راہ میں حائل، حاجیوں کی واپسی......

☆بغداد۔ حنبلی اور شافعی گروہوں میں کشیدگی......

۳۲۴ھ......۹۳۵ء۔۹۳۶ء

☆وفات امام ابوالحسن الاشعری رحمہ اللہ......

☆وفات ابوبکر نیشاپوری رحمہ اللہ، شافعی فقیہ......ربیع الاول (فروری ۹۳۶ء)

۳۲۵ھ......۹۳۶ء

☆عالم اسلام میں خانہ جنگی، عراق وشام کے امراء دست وگریباں......

☆وفات ابوالحسین خزاز نحوی رحمہ اللہ، تلمیذ مبرد وثعلب......ربیع الاول (جنوری ۹۳۷ء)

۳۲۶ھ......۹۳۷ء۔۹۳۸ء

☆مسلمانوں اور رومیوں کے مابین ۶ ہزار ۳ سو قیدیوں کا تبادلہ......ذوالقعدہ (ستمبر ۹۳۸ء)

☆بغداد پر بجکم دیلمی کا تسلط......

۳۲۷ھ......۹۳۸ء

☆قرامطہ مال گزاری کے عوض حاجیوں کے لیے راستے کھولنے پر رضامند......

☆وفات امام جرح وتعدیل ابن ابی حاتم الرازی، مصنف ''الجرح والتعدیل''......

۳۲۸ھ......۹۳۹ء

☆وفات ابن عبدربہ الاموی رحمہ اللہ، ادیب، مورخ، مصنف ''العقد الفرید''۔ عمر ۸۰ سال......

☆وفات ابوبکر الانباری رحمہ اللہ، نحوی، ادیب، ماہر لغت عربی......

☆وفات ابن مُقلہ رحمہ اللہ، کاتب، وزیر دولت عباسیہ، خط کوفی کی جگہ خط نسخ ایجاد اور عام کیا

۳۲۹ھ......۹۴۰ء

☆وفات خلیفہ راضی باللہ......۱۵ ربیع الاوّل، عمر ۳۱ سال (۳۰ دسمبر ۹۴۰ء)

☆خلافت متقی عباسی

۳۳۰ھ......۹۴۱ء

☆بغداد میں بنوبُویہ کی مداخلت کا آغاز......

۳۳۱ھ......۹۴۲ء۔۹۴۳ء

☆بغداد پر بنوحمدان کا تسلط، بجکم دیلمی قید اور چشم سوزی کے بعد قتل......

☆بغداد پر ترک امیر تُوزون کا تسلط......

☆امیر وسط ایشیا نصر بن احمد سامانی کی وفات......رجب (مارچ ۹۴۳ء)

۳۳۲ھ......۹۴۳ء-۹۴۴ء

☆ قیصرِ روم کی پیش کش پر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب رومال کے بدلے قیدیوں کی آزادی......

☆ وفات سنان بن ثابت، استاذ الاطباء......یکم ذوالقعدہ (۲۵ جون ۹۴۴ء)

۳۳۳ھ......۹۴۴ء

☆ عراق وشام کے امراء میں خانہ جنگی......

☆ بنوحمدان اور حاکم مصر اِخشید میں کشیدگی، سرحدی جھڑپیں......

☆ خلیفہ متقی کی جبری معزولی......۱۴ صفر (۱۷ اکتوبر ۹۴۴ء)

☆ خلافت مستکفی عباسی

☆ افریقہ میں بنوعبید کے مقابلے میں کھڑے ہونے والے ابویزید کو شکست......

☆ وفات ابوالعرب تمیمی رحمہ اللہ، مصنف "المحن"، "طبقات علماء افریقہ"

۳۳۴ھ......۹۴۵ء-۹۴۶ء

☆ بغداد میں بنوبُویہ کی حکومت کا آغاز......۱۱ جمادی الاولیٰ (۳۱ دسمبر ۹۴۵ء)

☆ مستکفی کی جبری معزولی......۲۲ جمادی الآخرہ (۹ فروری ۹۴۶ء)

☆ خلافت مطیع عباسی

☆ دولتِ اِخشید یہ مصر کے بانی اِخشید محمد بن طُغج کی وفات......ذوالحجہ (جولائی ۹۴۶ء)

☆ وفات صوفی بزرگ ابوبکر شبلی بغدادی رحمہ اللہ

۳۳۵ھ......۹۴۶ء

☆ وفات ابوبکر الصولی، نحوی، ادیب، لغوی، تلمیذ مبرد وثعلب......

☆ سیف الدولہ اور رومیوں میں ۲۴۸۴ قیدیوں کا تبادلہ......

☆ بوتاہیوں اور بنوحمدان میں صلح......

۳۳۶ھ......۹۴۷ء

☆ مُعزّ الدولہ بُوَیہی کا بصرہ پر قبضہ......

☆ رکن الدولہ بُوَیہی کا جرجان اور طبرستان پر قبضہ......

۳۳۷ھ......۹۴۸ء

☆ بغداد میں سیلاب، ہولناک تباہی......

☆ بنوحمدان کو بُوَیہیوں کے مقابلے میں شکست، موصل پر بُوَیہی قابض......

۳۳۸ھ......۹۴۹ء

☆رومیوں کے مقابلے میں سیف الدولہ کو شکست، رومیوں کا مرعش پر قبضہ......

☆خلیفہ مستکفی باللہ کی وفات......

☆وفات علی بن بُوَیہ، بانی دولتِ بنی بُوَیہ، عمر ۵۳ سال

☆وفات ابوجعفر النحاس، ادیب، نحوی، ماہرِ لغت......

۳۳۹ھ......۹۵۰ء

☆حجرِ اسود کی واپسی، کعبہ میں دوبارہ تنصیب......

☆سیف الدولہ کی رومیوں سے جنگ۔ ابتداء میں فتوحات۔ آخر میں شکستِ فاش......

☆معزول خلیفہ قاہر باللہ کا جیل میں انتقال......

☆وفات فلسفی ابونصر الفارابی، عمر ۸۰ سال

۳۴۰ھ......۹۵۱ء

☆سیف الدولہ کا بلادِ روم میں حملہ اور فتوحات......

☆محدثِ اندلس قاسم بن اصبغ کی وفات......

☆عراق میں احناف کے شیخ ابوالحسن کرخی رحمہ اللہ کی وفات......

۳۴۱ھ......۹۵۲ء

☆رومیوں کا سروج پر قبضہ......

☆سسلی میں مسلمانوں کی رومیوں کے خلاف شاندار فتح......

۳۴۲ھ......۹۵۳ء

☆سیف الدولہ کی رومیوں کے خلاف فتح......

۳۴۳ھ......۹۵۴ء

☆رومیوں کے حملے۔ سیف الدولہ کا کامیاب دفاع......

۳۴۴ھ......۹۵۵ء

☆رَے میں وبائی امراض، بکثرت افراد جاں بحق......

☆بنوعبید اور اندلس کی بحری فوجوں کے درمیان معرکے......

۳۴۵ھ......۹۵۶ء

☆رومیوں کا طرطوس پر قبضہ......

☆ وفات مؤرخ مسعودی......

۳۴۶ھ......۹۵۷ء

☆ قحط سالی، آسمانی حوادث، زلزلے، لوگ بکثرت ہلاک......

۳۴۷ھ......۹۵۸ء

☆ رومیوں کا آمد، میافارقین اور قنسرین پر حملہ۔ مسلمان دفاع سے عاجز......

☆ وفات ابوالحسن شعرانی نیشاپوری رحمہ اللہ......

۳۴۸ھ......۹۵۹ء

☆ رومیوں کا رُہا، حران اور دیار بکر پر حملہ اور غارت گری......

۳۴۹ھ......۹۶۰ء

☆ سیف الدولہ کے غلام نجا کی رومیوں کے خلاف کامیاب کارروائی......

☆ سیف الدولہ کی بلادِ روم میں فوج کشی اور شکست کے بعد پسپائی

☆ بغداد میں شیعہ سنی تصادم......

☆ ترکستان میں قبائل جوق در جوق مشرف باسلام......

۳۵۰ھ......۹۶۱ء

☆ بغداد میں بنوبُویہ کے شاندار ''دارالسلطنت'' کی تعمیر......

☆ اندلُس کے پہلے اموی خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کی وفات......

۳۵۱ھ......۹۶۲ء

☆ دُمستق رومی کا بڑا حملہ۔ حلب پر قبضہ۔ مسلمانوں کا قتل عام......

۳۵۲ھ......۹۶۳ء

☆ بغداد میں عاشوراء کے ماتم اور تعزیہ داری کا آغاز......

☆ بغداد میں عیدِ غدیر کی رسم شروع

☆ قیصر نقفور اپنی بیگمات کی سازش کا شکار ہو کر قتل......

۳۵۳ھ......۹۶۴ء

☆ دُمستق رومی کا مصیصہ اور طرطوس پر حملہ......

۳۵۴ھ......۹۶۵ء

☆ ایشیائے کوچک میں رومیوں کے نئے عسکری شہر قیصریہ کی تعمیر......

☆ دمشق کا مقیصہ میں قتل عام۔ جامع مسجد اصطبل میں تبدیل......

☆ وفات متنبی شاعر......

☆ وفات امام ابن حبان رحمہ اللہ، صاحب صحیح ابن حبان والسیرۃ النبویۃ......

۳۵۵ھ......۹۶۵ء

☆ رومیوں کا آمد پر حملہ

☆ سیف الدولہ اور رومیوں کے درمیان قیدیوں کا تبادلہ، سیف الدولہ کا چچازاد ابوفراس بازیاب،......

۳۵۶ھ......۹۶۶ء

☆ وفات احمد بن بُویہ، سلطانِ بغداد......

☆ وفات ابوالفرج اصفہانی۔ مصنف الاغانی......

☆ وفات علی بن عبداللہ سیف الدولہ، حاکمِ حلب......صفر (جنوری ۹۶۷ء)

☆ وفات کافور اِخشیدی حاکمِ مصر

۳۵۷ھ......۹۶۷ء

☆ سابق خلیفہ متقی عباسی کا جیل میں انتقال......

۳۵۸ھ......۹۶۸ء

☆ وفات ناصر الدولہ برادر سیف الدولہ، حاکم مُوصل......

۳۵۹ھ......۹۶۹ء

☆ انطاکیہ پر رومیوں کا قبضہ......

☆ قیصر روم نقفور قتل......

۳۶۰ھ......۹۷۰ء۔۹۷۱ء

☆ وفات ابوبکر الآجری رحمہ اللہ مصنف الشریعۃ......محرم (نومبر ۹۷۰ء)

☆ وفات ابوالقاسم طبرانی رحمہ اللہ عمر ۱۰۰ اسال، صاحب معجم کبیر، اوسط، صغیر......ذوالقعدہ (ستمبر ۹۷۱ء)

☆ خلیفہ مطیع پر فالج کا حملہ......

۳۶۱ھ......۹۷۱ء

☆ قرطبہ کے محدث اور مؤرخ محمد بن حارث الحاسبی رحمہ اللہ کی وفات......

۳۶۲ھ......۹۷۲ء۔۹۷۳ء

☆ رومیوں کی نصیبین غارت گری اور قتل عام......

☆ ملحد شاعر ابن ہانی کی موت......

☆ بغداد میں بھیانک آتش زدگی...... رمضان (جون ۹۷۳ء)

۳۶۳ھ...... ۹۷۳ء۔ ۹۷۴ء

☆ حرمین پر بنو عبید کا تسلط۔ عبیدی اماموں کے خطبے کا آغاز......

☆ شہادت فقیہ ابوبکر نابلسی رحمہ اللہ......

☆ بنو عبید کے قاضی القضاۃ نعمان بن محمد کی موت......

☆ خلیفہ مطیع کا استعفاء...... ۱۳ ذوالقعدہ (۱۷/ اگست ۹۷۴ء)

☆ خلیفہ طائع کی مسند نشینی

۳۶۴ھ...... ۹۷۴ء

☆ وفات سابق خلیفہ مطیع عباسی...... عمر ۶۴ سال...... محرم (اکتوبر ۹۷۴ء)

☆ بغداد میں بنو بُویہ کی باہمی لڑائی۔ پچاس دن تک خلافت مسلوب۔ خلیفہ بے بس......

☆ عضد الدولہ بُویہی سلطانِ بغداد مقرر......

☆ وفات ابوبکر ابن سنی رحمہ اللہ، صاحب "عمل الیوم واللیلۃ"...... ۳۰ ذوالحجہ (۹ ستمبر ۹۷۶ء)

۳۶۵ھ...... ۹۷۵ء

☆ بنو بُویہ میں علاقوں کی تقسیم......

☆ وفات علامہ ابن عدی جرجانی رحمہ اللہ، مصنف الکامل فی الضعفاء......

☆ وسطِ ایشیا کے نامور محدث علامہ قفال شاشی الکبیر رحمہ اللہ کی وفات......

۳۶۶ھ...... ۹۷۶ء

☆ جمیلہ بنت ناصر الدولہ کا حج......

☆ قرامطی حاکم حسن بن احمد کی موت......

☆ بُویہی سربراہ حسن بن بُویہ (رکن الدولہ) ۴۵ سالہ اقتدار کے بعد فوت، عمر ۸۰ سال سے زائد......

☆ وفات امیرِ اندلس الحکم ثانی مستنصر باللہ بن عبدالرحمٰن الناصر، عمر ۶۳ سال، اقتدار ۱۶ سال

۳۶۷ھ...... ۹۷۷ء

☆ معزول بُویہی حکمران بختیار عزالدولہ قتل......

☆ عضد الدولہ کا موصل پر تسلط بنو حمدان بے دخل

۳۶۸ھ...... ۹۷۸ء

☆ وفات حسن بن عبداللہ سیرافی، امام قرأت ونحو ولغت عربی......

☆ بغدادی امیر منتکین ترکی بنوعبید کے مقابلے میں قتل......

۳۶۹ھ......۹۷۹ء

☆ بنوحمدان کا آخری حکمران غضنفر قتل......

☆ وفات ابوسہل صعلوکی رحمہ اللہ، فقیہ نیشاپور......

۳۷۰ھ......۹۸۰ء۔۹۸۱ء

☆ بغداد میں احناف کے سرتاج ابوبکر جصاص الرازی رحمہ اللہ کی وفات۔ عمر ۶۵ سال......ذوالحجہ (جون ۹۸۱ء)

۳۷۱ھ......۹۸۱ء

☆ سفیر بغداد ابوبکر ابن باقلانی رحمہ اللہ کی قیصر روم کے دربار میں حق گوئی......

۳۷۲ھ......۹۸۲ء۔۹۸۳ء

☆ عضد الدولہ حاکم بغداد وعراق کی موت......شوال (اپریل ۹۸۳ء)

۳۷۳ھ......۹۸۳ء

☆ بغداد میں صمصام الدولہ کی حکومت......بغداد میں قحط اور گرانی......

۳۷۴ھ......۹۸۴ء

☆ حافظ الحدیث ابوالفتح موصلی رحمہ اللہ کی وفات......

۳۷۵ھ......۹۸۵ء

☆ قیصر اور شاہِ روس میں اتحاد

☆ روس میں نصرانیت کا آغاز۔ شاہِ روس قیصرِ روم کی بیٹی سے شادی کرنے کی خاطر نصرانی بن گیا......

۳۷۶ھ......۹۸۶ء

☆ بغداد پر شرف الدولہ بُویہی کا قبضہ، صمصام الدولہ قتل......

۳۷۷ھ......۹۸۷ء

☆ مشہور نحوی ابوعلی فارسی کی وفات......

۳۷۸ھ......۹۸۸ء

☆ بغداد میں رصدگاہ کا قیام......

☆ وفات صوفی عبداللہ بن علی الطوسی رحمہ اللہ، مصنف "اللمع فی التصوف"

☆ وفات حاکم نیشاپوری مؤلف مستدرک عمر ۹۳ سال......ربیع الاول (جولائی ۹۸۸ء)

☆ اندلس کے نامور محدث علامہ ابن باجی الاشبیلی رحمہ اللہ کی وفات......رمضان (دسمبر ۹۸۸ء)

۳۷۹ھ......۹۸۹ء

☆بغداد میں سخت بدامنی، غنڈوں اور رہزنوں کا راج......

☆شرف الدولہ حاکم بغداد کی موت......

۳۸۰ھ......۹۹۰ء

☆مصر کے یہودی وزیر یعقوب بن کلس کی موت......

۳۸۱ھ......۹۹۱ء۔۹۹۲ء

☆خلیفہ طائع جبراً معزول......۹ شعبان ۳۸۱ھ (۲ نومبر ۹۹۱ء)

☆خلیفہ القادر مسند نشین

☆وفات ابوالقاسم الجوہری المصری رحمہ اللہ، مؤلف مسند المؤطا......رمضان (دسمبر ۹۹۱ء)

☆وفات ابوبکر اصفہانی نیشاپوری رحمہ اللہ......امام القراء، مصنف 'الغایۃ فی القراآت'......شوال (جنوری ۹۹۲ء)

۳۸۲ھ......۹۹۲ء۔۹۹۳ء

☆بغداد کے ناظم ابن معلم کوبکی کا قتل......

☆وفات ابواحمد عسکری رحمہ اللہ مؤرخ، ادیب......ذوالحجہ (فروری ۹۹۳ء)

۳۸۳ھ......۹۹۳ء

☆خلیفہ قادر باللہ کا بہاؤالدولہ بُویہی کی بیٹی سے نکاح......

☆بغداد کے وزیر ابونصر کے حکم سے محلہ کرخ میں دارالعلم کے نام سے کتب خانہ قائم......

۳۸۴ھ......۹۹۴ء

☆ملحد شاعر بنوبُویہ کے کاتب ابراہیم بن ہلال صابی کی موت......

۳۸۵ھ......۹۹۵ء

☆وفات امام دارقطنی رحمہ اللہ......

☆وفات علامہ ابن شاہین رحمہ اللہ......

۳۸۶ھ......۹۹۶ء

☆وفات ابوطالب مکی الصوفی رحمہ اللہ، مصنف قوت القلوب......

۳۸۷ھ......۹۹۷ء

☆وفات فخرالدولہ بُویہی، حاکم رے......

۳۸۸ھ......۹۹۸ء

☆وفات ابوسلیمان خطابی رحمہ اللہ، مؤلف معالم السنن وغریب الحدیث......

۳۸۹ھ......۹۹۸ء

☆بنوعبید کے قاضی القضاۃ محمد بن نعمان کی موت......

۳۹۰ھ......۹۹۹ء

☆وفات محمد بن عمر بن یحییٰ حسنی زیدی......

☆سلطان محمود غزنوی کا ہندوستان پر پہلا حملہ......

۳۹۱ھ......۱۰۰۰ء

☆بغداد میں ترکوں اور کرخ کے شیعوں میں لڑائی۔اہل سنت ترکوں کے ساتھ......

☆وفات قاضی ابوالحسن الجوزی رحمہ اللہ،ظاہری مذہب کے شیخ......

☆ ☆ سلطان محمود غزنوی کا ہندوستان پر دوسرا حملہ......

۳۹۲ھ......۱۰۰۱ء

☆بغداد میں چوروں ڈاکوؤں کا راج،بدامنی کی انتہاء......

☆بغداد عمید الجیوش ابوعلی الحسین کی نگرانی میں دے دیا گیا......

۳۹۳ھ......۱۰۰۲ء

☆بغداد۔ماتمی جلوسوں پر پابندی،امن وامان بحال

☆سابق خلیفہ طائع کی وفات عمر۷۳ سال......۲۹ رمضان (۱۳/اگست ۱۰۰۳ء)

☆وفات اسماعیل بن حماد الجوہری،ماہر لغت،مصنف صحاح......

☆وفات منصور حاجب محمد بن ابی عامر،نائب امیر اَندلُس

☆سلطان محمود غزنوی کا بحستان پر قبضہ

۳۹۴ھ......۱۰۰۳ء

☆بغداد میں مذہبی امور (عدلیہ،حج) کی وزارت ابواحمد موسوی (والد شریف الرضی) کے سپرد......

۳۹۵ھ......۱۰۰۴ء

☆افریقہ میں ہولناک قحط،یومیہ پانچ تا سات سو افراد جاں بحق......

☆سلطان محمود غزنوی کا ہندوستان پر تیسرا حملہ......

۳۹۶ھ......۱۰۰۵ء

☆سلطان محمود غزنوی کا ہندوستان پر چوتھا حملہ۔

☆محمود غزنوی کا ملتان پر قبضہ

۳۹۷ھ......۱۰۰۶ء

☆ افریقہ میں ابن رکوۃ اموی کا خروج اور قتل......

☆ سلطان محمود غزنوی کا ہندوستان پر پانچواں حملہ۔

۳۹۸ھ......۱۰۰۷ء

☆ بغداد میں شیعہ سنی فسادات......

☆ ایران میں زلزلے......

☆ الحاکم عبیدی کے حکم سے بیت المقدس کا سب سے بڑا گرجا مسمار......

☆ وفات بدیع الزمان احمد بن حسن الہمدانی رحمہ اللہ، مصنف مقامات

☆ وفات ابو الفرج الببغاء، سیف الدولہ کا مداح شاعر

۳۹۹ھ......۱۰۰۸ء

☆ وفات ابو العباس النامی، سیف الدولہ کا مداح شاعر، متنبی کا حریف......

☆ سلطان محمود غزنوی کا ہندوستان پر چھٹا حملہ۔ شمالی ہندوستان میں نگر کوٹ کی فتح

۴۰۰ھ......۱۰۰۹ء

☆ الحاکم عبیدی کے حکم سے قاہرہ میں جامع مسجد کی تعمیر......

☆ سلطان محمود غزنوی کا ہندوستان پر ساتواں حملہ۔ وسطی ہند کی ریاست ناران فتح

پانچویں صدی ہجری

۴۰۱ھ......۱۰۱۰ء

☆ عراق کے شہروں میں بھی عبیدی حکام کا خطبہ شروع......

☆ بغداد میں قیامِ امن کے ضامن امیر ابوعلی الحسین عمید الجیوش کی وفات......

☆ محمود غزنوی کا آٹھواں حملہ۔ ملتان میں قرامطیوں کی بڑی تعداد تہہ تیغ۔ قرامطی پیشوا ابوالفتح گرفتار

۴۰۲ھ......۱۰۱۱ء

☆ بغداد کے نئے ناظم فخر الملک کی نگرانی میں ماتمی جلوس پھر شروع......

☆ سلطان محمود غزنوی کا ہندوستان پر نواں حملہ۔ وسطی ہندوستان میں تھانیسر فتح

۴۰۳ھ......۱۰۱۲ء۔۱۰۱۳ء

☆ عراق عرب سرحد پر پندرہ ہزار حاجی ڈاکوؤں کے ہاتھوں جاں بحق......

☆ شیخ الحنابلہ حسن بن حامد بغدادی رحمہ اللہ قافلۂ حجاج میں لاپتا......

☆ بہاؤالدولہ دیلمی کی موت......

☆ وفات امام ابوبکر ابن باقلانی رحمہ اللہ......ذوالقعدہ (جون ۱۰۱۳ء)

☆ وفات ابوالولید ابن الفرضی اندلسی رحمہ اللہ، مصنف تاریخ اندلس

☆ محمود غزنوی کے حریف ترک سردار ایلک خان کی وفات

۴۰۴ھ......۱۰۱۳ء

☆ سلطان محمود غزنوی کا ہندوستان پر دسواں حملہ۔ پنڈ دادن خان اور کشمیر فتح

۴۰۵ھ......۱۰۱۴ء

☆ الحاکم عبیدی کی طرف سے عورتوں کے گھروں سے نکلنے پر پابندی

☆ وفات قاضی القضاۃ بغداد ابومحمد الاکفانی رحمہ اللہ، عمر ۸۹ سال......

☆ سلطان محمود غزنوی کا ہندوستان پر گیارہواں حملہ۔ برفباری کے باعث کشمیر میں زبردست جانی نقصان کے بعد واپسی......

۴۰۶ھ ۱۰۱۵ء

☆ وفات علامہ ابو حامد اسفرائینی رحمہ اللہ، شیخ الشوافع

☆ وفات بادیس بن منصور، حاکم شمالی افریقہ

☆ وفات سید الشریف الرضی، رئیس الشیعہ، شاعر و ادیب

☆ وفات علامہ ابوبکر ابن فورک الاصفہانی، متکلم اسلام

۴۰۷ھ ۱۰۱۶ء

☆ واسط میں شیعہ سنی فساد......

☆ کعبہ کا رکن یمانی شکستہ

☆ روضۂ اطہر کی دیوار گر گئی......

☆ بیت المقدس کا گنبد صخرہ منہدم

☆ کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مزار میں آتش زدگی......

☆ وزیر بغداد فخر الملک بویہی حکمران سلطان الدولہ کے حکم سے قتل

☆ سلطان محمود غزنوی کا خوارزم پر قبضہ۔ خوارزم شاہ التون تاش قتل

۴۰۸ھ ۱۰۱۷ء

☆ بغداد میں شیعہ سنی لڑائی، بکثرت لوگ قتل......

☆ خلیفہ قادر باللہ کا رفض اور اعتزال کے خلاف استفتاء......

☆ اندلس میں طوائف الملوکی کا آغاز......

۴۰۹ھ ۱۰۱۸ء

☆ سلطان محمود غزنوی کا ہندوستان پر بارہواں حملہ۔ گنگا جمنا کی وادی مسخر......

۴۱۰ھ ۱۰۱۹ء

☆ سلطان محمود غزنوی کا ہندوستان پر تیرہواں حملہ۔ کالنجر فتح، ۵۰ ہزار بت پرست قتل، ۲۰ ہزار مشرف باسلام

☆ وفات نابینا عالم ابوالقاسم ہبۃ اللہ بن سلامۃ البغدادی رحمہ اللہ، مؤلف ''الناسخ والمنسوخ''......

۴۱۱ھ ۱۰۲۰ء

☆ بغداد میں قحط سالی...... الحاکم عبیدی کا پراسرار قتل

۴۱۲ھ ۱۰۲۱ء

☆ محمود غزنوی کا چودھواں حملہ، شمالی ہندوستان کے کوہستان فتح......

۴۱۳ھ......۱۰۲۲ء

☆ اسماعیلی شیعوں کے ہاتھوں حجر اسود کی بے حرمتی و شکستگی......

☆ شیراز میں سلطان الدولہ بُویہی کی موت......

۴۱۴ھ......۱۰۲۳ء

☆ مشرف الدولہ بُویہی کی بغداد آمد......

☆ سلطان محمود غزنوی کا پندرھواں حملہ۔ وسطی ہندوستان میں جہاد، گوالیار فتح......

۴۱۵ھ......۱۰۲۴ء

☆ سلطان الدولہ بُویہی کی موت، ابو کالیجار نیا حکمران......شوال (نومبر ۱۰۲۴ء)

☆ وفات ابن دقیق نحوی......

☆ وفات ابن سمسمی ادیب

۴۱۶ھ......۱۰۲۵ء

☆ سلطان محمود غزنوی کا سولھواں حملہ۔ سومنات فتح......

☆ مشرف الدولہ بُویہی کی موت......بغداد میں غنڈوں کا راج، شدید بدامنی......

۴۱۷ھ......۱۰۲۶ء

☆ بغداد میں فوج اور لٹیروں کا ٹکراؤ۔ فوج حالات پر قابو پانے میں کامیاب......

۴۱۸ھ......۱۰۲۷ء

☆ بغداد میں جلال الدولہ بُویہی کی حکومت......

☆ وفات ابو اسحٰق اسفرائینی رحمہ اللہ، متکلم اسلام عمر ۸۰ سال......۱۰ محرم (۲۰ رفروری ۱۰۲۷ء)

☆ سلطان محمود غزنوی کا سترھواں حملہ۔ پنجاب میں جٹوں کی سرکوبی......

۴۱۹ھ......۱۰۲۸ء

☆ جلال الدولہ بُویہی کو امرائے بغداد کی مخالفت کا سامنا......

۴۲۰ھ......۱۰۲۹ء

☆ عراق میں شدید برف باری اور آندھی......

☆ خلیفہ قادر باللہ نے روافض کی تردید میں رسالہ تصنیف کر کے عام مجمعے میں سنایا......

۴۲۱ھ......۱۰۳۰ء

☆ عاشوراء کے جلوس پر بغداد میں لڑائی، جانی و مالی نقصان......

☆وفات سلطان محمود غزنوی...... جمادی الاولیٰ (مئی ۱۰۳۰ء)

☆رومیوں کا ناکام حملہ......

۴۲۲ھ......۱۰۳۰ء۔۱۰۳۱ء

☆وفات خلیفہ قادر باللہ......۱۱ ذوالحجہ (۱۱ر دسمبر ۱۰۳۱ء)

☆القائم عباسی کی مسند نشینی

۴۲۳ھ......۱۰۳۱ء

☆بغداد میں فوج کی جلال الدولہ بویہی کے خلاف بغاوت، جلال الدولہ فرار......

☆سلطان مسعود بن محمود غزنوی کا اصفہان پر قبضہ......

۴۲۴ھ......۱۰۳۲ء

☆بغداد میں امن وامان ناپید، لٹیروں کا راج، پولیس سربراہ قتل......

۴۲۵ھ......۱۰۳۳ء

☆بغداد میں وبائی امراض سے ۷۰ ہزار افراد جاں بحق......

☆بغداد کے لٹیروں کا سردار برجمی ہلاک......

۴۲۶ھ......۱۰۳۴ء

☆سلطان مسعود بن محمود کا ہندوستان میں جہاد......

☆ترکانِ غز کا خراسان پر تسلط......

۴۲۷ھ......۱۰۳۵ء

☆الظاہر عبیدی کی موت......

☆حاکمِ بغداد جلال الدولہ کے خلاف فوج کا احتجاج، جلال الدولہ پہلے کرخ اور پھر تکریت میں پناہ گزین

۴۲۸ھ......۱۰۳۶ء۔۱۰۳۷ء

☆بغداد میں مسلسل بدامنی، غنڈوں کا راج......

☆وفات ابوالحسین القدوری رحمہ اللہ، مؤلف مختصر القدوری، عمر ۶۶ سال......رجب (اپریل ۱۰۳۷ء)

☆ابوعلی ابن سینا، طبیبِ حاذق، عمر ۵۳ سال......

☆رافضی شاعر مہیار بن مرزویہ دیلمی کی موت......

۴۲۹ھ......۱۰۳۷ء

☆القدس میں کلیسائے قمامہ کی دوبارہ تعمیر کی شرط پر مستنصر عبیدی اور قیصر روم سے صلح

☆ سلجوقیوں کا ظہور، سلطان مسعود غزنوی مقابلے میں پسپا

☆ طغرل بیگ سلجوقی کا نیشاپور پر قبضہ......رمضان (جون ۱۰۳۸ء)

☆ وفات عبدالقاہر تمیمی البغدادی ابومنصور رحمۃ اللہ......مؤلف الفرق بین الفرق

۴۳۰ھ......۱۰۳۸ء۔۱۰۳۹ء

☆ سلجوقیوں اور سلطان مسعود غزنوی میں جھڑپیں، غزنوی سلطنت کمزور......

☆ بغداد میں شدید سردی اور برف باری......۲۳ ربیع الاوّل (۲۱ جنوری ۱۰۳۹ء)

۴۳۱ھ......۱۰۳۹ء

☆ بغداد میں ترک سپاہیوں کا جلال الدولہ کے خلاف مظاہرہ، حالات قابو سے باہر

☆ وفات ابونصر بن مشکان، کاتبِ سلطان سبکتگین ومحمود غزنوی......

۴۳۲ھ......۱۰۴۰ء

☆ سلجوقیوں کا خراسان پر قبضہ......

۴۳۳ھ......۱۰۴۱ء

☆ سلطان مسعود بن محمود غزنوی امراء کے ہاتھوں قتل......

۴۳۴ھ......۱۰۴۲ء

☆ تبریز میں زلزلہ، ۴۰ ہزار افراد جاں بحق......

۴۳۵ھ......۱۰۴۳ء

☆ امیر قرطبہ جہور بن محمد کی وفات، عمر ۷۱ سال......محرم (اگست ۱۰۴۳ء)

☆ طغرل بیگ سلجوقی کا رے پر قبضہ......

☆ جلال الدولہ بُویہی کی موت......

☆ بغداد میں جلال الدولہ کے بیٹے الملک العزیز اور ابی کالیجار بُویہی کا نام خطبے میں شامل......

۴۳۶ھ......۱۰۴۴ء۔۱۰۴۵ء

☆ وفات ابوعبداللہ الصیمری الحنفی رحمۃ اللہ، امام ابوحنیفہ کے حالات پر قدیم ترین کتاب ''اخبار ابی حنیفہ'' کے مصنف، عمر ۸۵ سال......شوال (مئی ۱۰۴۵ء)

☆ وفات شریف مرتضٰی مصنف نہج البلاغۃ، عمر ۸۱ سال......

۴۳۷ھ......۱۰۴۵ء

☆ بغداد میں اہلِ کرخ اور اہلِ باب البصرہ میں جھڑپ، کئی افراد مارے گئے......

☆ عراق میں وبائی امراض۔ بُویہی حکمران ابوکالیجار کے بارہ ہزار گھوڑے ہلاک......

۴۳۸ھ......۱۰۴۶ء۔ ۱۰۴۷ء

☆ وفات ابو محمد الجوینی رحمہ اللہ، امام الحرمین جوینی رحمہ اللہ کے والد......ذوالقعدہ (مئی ۱۰۴۷ء)

۴۳۹ھ......۱۰۴۷ء

☆ عراق میں بُویہی حکومت زوال وانتشار کا شکار......

☆ مصر میں بنوعبید کا زوال......

۴۴۰ھ......۱۰۴۸ء

☆ ابوکالیجار بُویہی کی موت......

☆ لیبیا کے حاکم مُعِزّ بن بادیس کے ہاں بنوعبید کی جگہ بنوعباس کا خطبہ شروع......

۴۴۱ھ......۱۰۴۹ء

☆ بغداد میں ماتمی جلوسوں پر پابندی کے سرکاری اعلان کے خلاف شیعوں کا احتجاج، شہر میں فسادات......

☆ وفات سلطان مودود بن مسعود غزنوی، مدتِ اقتدار دس سال......رجب (دسمبر ۱۰۴۹ء)

۴۴۲ھ......۱۰۵۰ء

☆ بغداد میں شیعہ اور سنی گروہوں کے درمیان مصالحت......

☆ وفات الملک العزیز بن جلال الدولہ بُویہی......

۴۴۳ھ......۱۰۵۱ء

☆ بغداد میں شیعہ سنی لڑائی......ترکانِ غز کی اہواز میں لوٹ مار......

☆ طُغرل بیگ کا اصفہان پر قبضہ......

☆ مُعِزّ بن بادیس حاکم تیونس اور بنوعبید کے حامیوں میں زبردست جنگ......

۴۴۴ھ......۱۰۵۲ء

☆ بغداد میں شیعہ سنی خونریزی، بُویہی حکمران تماشائی......

۴۴۵ھ......۱۰۵۳ء

☆ طُغرل بیگ اصفہان میں شدید بیمار، موت کا خطرہ......

☆ بغداد میں شیعہ سنی تصادم، پولیس کے ہاتھوں ایک شیعہ رہنما کے قتل کے بعد حالات خراب تر

۴۴۶ھ......۱۰۵۴ء

☆ مُعِزّ بن بادیس اور بنوعبید کے حامی عربوں میں جنگ

☆ابن بادیس کی قیروان سے مہدیہ کی طرف نقل مکانی......

☆طغرل بیگ کا آذربائی جان پر قبضہ......

۴۴۷ھ......۱۰۵۵ء

☆سلطان طغرل بیگ عراق پر قابض۔ بنوبُویہ کی حکومت کا خاتمہ......

۴۴۸ھ......۱۰۵۶ء

☆خلیفہ قائم عباسی کا سلطان طغرل بیگ کی بہن سے نکاح......

۴۴۹ھ......۱۰۵۷ء

☆ماوراء النہر میں وبائی امراض سے ۱۶ لاکھ افراد جاں بحق......

☆وفات علامہ ابن بطّال رحمہ اللہ، شارحِ صحیح بخاری......صفر (اپریل ۱۰۵۷ء)

۴۵۰ھ......۱۰۵۸ء

☆بغداد پر ارسلان بساسیری کا تسلط، بنوعبید کا خطبہ جاری......

☆خلیفہ قائم عباسی نظر بند......

☆وفات قاضی القضاۃ علامہ الماوردی رحمہ اللہ، مصنف الحاوی، الاحکام السلطانیہ، عمر ۸۶ سال......

☆آخری بُویہی حکمران الملک الرحیم بن ابوکالیجار قلعۂ رے میں فوت

۴۵۱ھ......۱۰۵۹ء

☆خلیفہ قائم باللہ کی دوبارہ تخت نشینی، خلافت کا وقار بحال......ذوالقعدہ (دسمبر ۱۰۵۹ء)

☆روافض کو سلجوقیوں کے مقابلے میں شکست، ان کا قائد بساسیری قتل......

☆سلطان ابراہیم بن مسعود غزنوی اور چغر بیگ سلجوقی کے درمیان صلح......

☆چغر بیگ سلجوقی کی وفات

۴۵۲ھ......۱۰۶۰ء

☆سلطان طغرل کی زوجہ ''خاتون'' کی وفات......خلیفہ قائم عباسی کی والدہ قطر الندیٰ کی وفات......

۴۵۳ھ......۱۰۶۱ء

☆والیٔ مُوصل قریش بن بدران کی وفات......

۴۵۴ھ......۱۰۶۲ء

☆دریائے دجلہ میں طغیانی، بغداد میں سیلاب......

☆مُعِزّ بن بادیس حاکم شمالی افریقہ کی وفات، عمر ۵۶ سال......

۴۵۵ھ......۱۰۶۳ء

☆ سلطان طغرل سلجوقی کی بغداد آمد

☆ سلطان طغرل کا انتقال، عمر ۷۰ سال......رمضان (ستمبر ۱۰۶۳ء)

☆ چغر بیگ سلجوقی کا بیٹا الپ ارسلان تخت نشین......

۴۵۶ھ......۱۰۶۳ء

☆ الپ ارسلان کے ہاں نظام الملک طوسی وزیرِ سلطنت مقرر......

☆ وفات علامہ ابو محمد ابن حزم الاموی اندلسی، عمر ۶۲ سال..........

☆ قتلمش بن اسرائیل بن سلجوق قتل، جدِ امجد سلاجقۂ روم......

۴۵۷ھ......۱۰۶۴ء

☆ الپ ارسلان کا جند اور دریائے سیحون کے ساحلی علاقوں پر قبضہ......

☆ لیبیا کے حکمران تمیم بن مُعز کے حکم سے نئے شہر "بجایہ" کی تعمیر......

۴۵۸ھ......۱۰۶۵ء

☆ وفات امام ابوبکر بیہقی رحمۃ اللہ، مؤلف دلائل النبوۃ، عمر ۷۴ سال......۱۰ جمادی الاولیٰ (۸ ر اپریل ۱۰۶۶ء)

۴۵۹ھ......۱۰۶۶ء

☆ بغداد میں عالم اسلام کی مثالی درس گاہ مدرسہ نظامیہ کی تعمیر مکمل، تعلیم کا آغاز......ذوالقعدہ (ستمبر ۱۰۶۷ء)

۴۶۰ھ......۱۰۶۷ء

☆ بغداد کی خاتون واعظہ خدیجہ بنت محمد رحمۃ اللہ علیہا کی وفات، عمر ۸۴ سال......محرم (ستمبر ۱۰۶۸ء)

☆ شام کے شہر رملہ میں زلزلہ، ۲۵ ہزار افراد جاں بحق......

☆ خاتون محدثہ عائشہ بنت حسن رحمۃ اللہ علیہا کی وفات......

۴۶۱ھ......۱۰۶۸ء

☆ جامع اموی دِمشق میں آتش زدگی، عمارت کو شدید نقصان......

۴۶۲ھ......۱۰۶۹ء۔۱۰۷۰ء

☆ رومیوں کا منبج پر حملہ اور غارت گری......

☆ حجاز سے بنو عبید کا خطبہ ختم، خلافتِ بغداد کا خطبہ جاری......

☆ مستنصر عبیدی کی جانب سے یورپ کو شام پر حملے کی دعوت......(۱۰۷۰ء)

۴۶۳ھ......۱۰۷۰ء۔۱۰۷۱ء

☆ حلب میں خلافتِ عباسیہ کا خطبہ جاری......

☆ رملہ اور بیت المقدس سمیت اکثر فلسطین پر سلجوقیوں کا قبضہ......

☆ شاعر ابن زیدون کی وفات، حاکم قرطبہ معتمد بن عباد کا مصاحب

☆ علامہ ابن عبدالبر اَندَلُسی کی وفات، عمر ۹۵ سال......۲۹ ربیع الآخر (۳ رفروری ۱۰۷۱ء)

☆ سلطان الپ ارسلان ۱۵ ہزار سپاہیوں کے ساتھ قیصرِ ارمانوس کی ٹڈی دل فوج پر غالب، قیصر گرفتار......۲۵ ذو القعدہ (۲۴ اگست ۱۰۷۱ء)

☆ وفات خطیب بغدادی رحمہ اللہ......۷ ذوالحجہ (۴ ستمبر ۱۰۷۱ء)

۴۶۴ھ......۱۰۷۱ء

☆ حاکم اشبیلیہ (اَندَلُس) مُعتَضِد باللہ کی وفات......

۴۶۵ھ......۱۰۷۲ء

☆ سلطان الپ ارسلان قتل، ملک شاہ سلجوقی تخت نشین......

☆ مصر میں قحط اور گرانی، بنوعبید کی حکومت کمزور تر......

☆ وفات حضرت ابوالقاسم قشیری رحمہ اللہ، مصنف رسالہ قشیریہ......

۴۶۶ھ......۱۰۷۳ء

☆ بغداد میں دجلہ کی طغیانی کے باعث سیلاب......

☆ بنوعبید کے وزیر بدر جمالی کی شام میں فتوحات......

۴۶۷ھ......۱۰۷۴ء۔۱۰۷۵ء

☆ وزیر بدر جمالی کی جزیرۃ العرب میں فتوحات......

☆ جزیرۃ العرب میں بنوعبید کا خطبہ پھر شروع......

☆ ملک شاہ سلجوقی کے حکم سے رصدگاہ کا قیام......

☆ وفات خلیفہ قائم عباسی، عمر ۷۶ سال، مدتِ خلافت ۴۴ سال......۱۳ شعبان (۱۴ راپریل ۱۰۷۵ء)

☆ خلافت المقتدی عباسی

۴۶۸ھ......۱۰۷۵ء

☆ دِمَشق پر سلجوقیوں کا قبضہ، شیعی رسومات پر پابندی......

۴۶۹ھ......۱۰۷۶ء

☆ بیت المقدس پر سلجوقیوں کا قبضہ......

☆ مدرسہ نظامیہ بغداد میں اشاعرہ اور حنابلہ میں جھگڑا، بکثرت افراد قتل......

☆ وفات ابوحیان قرطبی مصنف المقتبس من انباء اندلس......

۴۷۰ھ......۱۰۷۷ء

☆ نظام الملک طوسی کی بیٹی فوت، بطورِ اعزاز قصرِ خلافت میں تدفین......شوال (اپریل ۱۰۷۸ء)

۴۷۱ھ......۱۰۷۸ء

☆ تاج الدولہ تتش سلجوقی کا شام پر قبضہ، اتسز خوارزمی عوام پر ظلم کے الزام میں قتل......

☆ وفات علامہ عبدالقاہر جرجانی رحمہ اللہ، مصنف ''اسرار البلاغہ''، ''دلائل الاعجاز''، ''المغنی فی شرح الایضاح''

۴۷۲ھ......۱۰۷۹ء

☆ محمود غزنوی کے پوتے ابراہیم کی ہندوستان میں فتوحات......

۴۷۳ھ......۱۰۸۰ء

☆ وفات ابوعلی بن شبل شاعر......

۴۷۴ھ......۱۰۸۱ء

☆ تتش سلجوقی کا طرطوس پر قبضہ......

۴۷۵ھ......۱۰۸۲ء

☆ وفات علامہ ابن ماکولا رحمہ اللہ، مصنف الاکمال، الوزراء......ایک قول کے مطابق وفات ۴۸۷ھ میں ہوئی۔

۴۷۶ھ......۱۰۸۳ء

☆ وفات علامہ ابواسحٰق شیرازی رحمہ اللہ صدر مدرس مدرسہ نظامیہ بغداد......جمادی الآخرہ (اکتوبر ۱۰۸۳ء)

۴۷۷ھ......۱۰۸۴ء-۱۰۸۵ء

☆ حاکم قونیہ سلیمان بن قلتمش کے ہاتھوں ۱۱۸ سال بعد انطاکیہ کی نصرانیوں سے بازیابی......شعبان (جنوری ۱۰۸۵)

☆ وفات ابن عمار شاعرِ اندلس، مصاحبِ معتمد بن عباد......

☆ سنجار میں ملک شاہ کے بیٹے احمد کی ولادت، شہر کی مناسبت سے سنجر لقب پڑا......۲۵ رجب (۱۸ دسمبر ۱۰۸۲ء)

۴۷۸ھ......۱۰۸۵ء

☆ الفانسو کا اندلس کے شہر طلیطلہ پر قبضہ......

☆ وفات امام الحرمین ابوالمعالی جوینی رحمہ اللہ، عمر ۶۰ سال......ربیع الآخر (اگست ۱۰۸۵ء)

☆ ولادت عماد الدین زنگی......

۴۷۹ھ......۱۰۸۶ء

☆ حاکم قونیہ سلیمان بن قتلمش اور حاکم شام تتش سلجوقی میں جنگ۔ قتلمش قتل......

☆ جنگِ زلّاقہ، یوسف بن تاشفین کے ہاتھوں الفانسو کو شکست...... پیر ۵ رمضان (۱۴ر دسمبر ۱۰۸۶ء)

☆ ملک شاہ سلجوقی حلب اور الجزیرہ پر قابض......

☆ حرمین میں بنو عبید کا خطبہ بند۔ بنو عباس کا خطبہ جاری

۴۸۰ھ......۱۰۸۷ء۔۱۰۸۸ء

☆ خلیفہ مقتدی عباسی کا ملک شاہ سلجوقی کی بیٹی سے نکاح......

☆ خاتون عالمہ فاطمہ بنت ابو علی دقاق رحمہا اللہ کی وفات، عمر ۹۰ سال...... ذوالقعدہ (فروری ۱۰۸۸ء)

☆ خاتون عالمہ فاطمہ بنت الحسن بغدادیہ رحمہا اللہ کی وفات......

۴۸۱ھ......۱۰۸۸ء۔۱۰۸۹ء

☆ ہرات میں شیخ الاسلام ابو اسماعیل انصاری رحمہ اللہ کی وفات، عمر ۸۰ سال...... ذوالحجہ (مارچ ۱۰۸۹ء)

۴۸۲ھ......۱۰۸۹ء

☆ ملک شاہ سلجوقی کی اصفہان، سمرقند اور کاشغر میں فتوحات......

☆ وفات ابو اسحٰق حبال المصری رحمہ اللہ، حافظ الحدیث، مصنف ''وفیات المصریین''

۴۸۳ھ......۱۰۹۰ء

☆ بغداد میں شیعہ سنی لڑائی......

☆ بخارا میں علامہ خواہرزادہ حنفی رحمہ اللہ کی وفات...... جمادی الاولیٰ (جولائی ۱۰۹۰ء)

۴۸۴ھ......۱۰۹۱ء

☆ صِقِلِّیَہ (سسلی) پر رومی قابض......

☆ اَندُلُس پر امیر یوسف بن تاشفین کی حکومت کا آغاز، ملوک الطوائف کا خاتمہ......

☆ حاکم مریہ معتصم محمد بن معن کا انتقال......

۴۸۵ھ......۱۰۹۲ء

☆ الفانسو کو یوسف بن تاشفین کے مقابلے میں شکستِ فاش......

☆ باطنیوں کا پہلا شکار۔ نظام الملک طوسی شہید...... ۱۰ رمضان (۱۴ر اکتوبر ۱۰۹۲ء)

☆ ملک شاہ سلجوقی کی وفات...... شوال (نومبر ۱۰۹۲ء)

۴۸۶ھ......۱۰۹۳ء

☆ تتش سلجوقی شام، الجزیرہ اور عراق کے بڑے حصے پر قابض......

☆ سلطان برکیارق بن ملک شاہ اور تتش میں کش مکش......

۴۸۷ھ......۱۰۹۴ء

☆ خلیفہ مقتدی کی جانب سے سلطان برکیارُق کو پروانۂ سلطنت......یکم محرم (۲؍فروری ۱۰۹۴ء)

☆ وفات خلیفہ مقتدی عباسی......۱۸ محرم (۱۹؍فروری ۱۰۹۴ء)

☆ خلافت مستظہر عباسی

☆ حاکم حلب آق سنقر اور تتش سلجوقی میں جنگ۔ آق سنقر قتل......جمادی الاولیٰ (جون ۱۰۹۴ء)

☆ تتش کا حلب، خلاط اور آذربائی جان پر قبضہ......

☆ مستنصر عبیدی ساٹھ سال حکومت کرنے کے بعد فوت

۴۸۸ھ......۱۰۹۵ء

☆ رَے کے قریب برکیارُق اور تتش میں جنگ، تتش قتل......

☆ امام غزالی رحمۃ اللہ کی دمشق آمد، احیاء العلوم کی تصنیف میں انہماک......

☆ سابق حاکم قرطبہ معتمد چار سال تک مرابطین کا قیدی رہنے کے بعد فوت......شوال (اکتوبر ۱۰۹۵ء)

☆ فرانس میں کلرماؤنٹ کانفرنس، یورپی حکام صلیبی جنگ پر متفق......ذوالقعدہ (نومبر ۱۰۹۵ء)

☆ عمادالدین زنگی کے والد آق سنقر کی وفات

۴۸۹ھ......۱۰۹۵ء

☆ بغداد میں زبردست سیلاب۔ پیشگی حفاظتی انتظامات کے باعث محدود نقصانات......

۴۹۰ھ......۱۰۹۶ء

☆ الپ ارسلان کا بیٹا حاکم خراسان ارسلان ارغون اپنے غلام کے ہاتھوں قتل......

☆ خراسان میں سلطان سنجر سلجوقی کی حکومت......

☆ شام میں تتش سلجوقی کے بیٹوں رضوان اور دقاق میں جنگ......

☆ بنوعبید شام کے شہر صور پر قابض۔ ربیع الاول ۴۹۰ھ (مارچ ۱۰۹۷ء)

☆ پہلی صلیبی جنگ کا آغاز، یورپ سے لشکر کشی شروع......

۴۹۱ھ......۱۰۹۷ء

☆ صلیبی انطاکیہ پر قابض......۲۵ رجب (۲۸ جون ۱۰۹۸ء)

بنوعبید بیت المقدس پر قابض......شعبان ۴۹۱ھ (جولائی ۱۱۹۸ء)

۴۹۲ھ......۱۰۹۸ء

☆ صلیبیوں کا بیت المقدس پر قبضہ......۲۳ شعبان (۱۵؍جولائی ۱۰۹۹ء)

☆ علامہ مکی بن عبدالسلام اور علامہ ابوالقاسم بن رمیلی رحمہما اللہ بیت المقدس میں فرنگیوں کے ہاتھوں شہید

☆ بغداد میں برکیارُق کا خطبہ بند، محمد بن ملک شاہ کو سلطان تسلیم کر لیا گیا......

☆ حسن بن صبّاح کی باطنی دعوت زوروں پر......

۴۹۳ھ......۱۰۹۹ء

☆ یروشلم کے پہلے بادشاہ گاڈ فرے کی موت......رمضان (جولائی ۱۱۰۰ء)

☆ برکیارُق کی بغداد آمد۔ محمد بن ملک شاہ کی جگہ برکیارُق کا خطبہ جاری

☆ برکیارُق اور سنجر کو محمد بن ملک شاہ کے مقابلے میں شکست......

☆ برکیارُق سے دوسری جنگ میں محمد بن ملک شاہ کو شکست......

☆ برکیارُق کی بغداد آمد اور بیماری، فوج بے قابو، عوام بے اماں

☆ سلطان سنجر اور سلطان محمد کی بغداد آمد پر برکیارُق کی واسط روانگی......

☆ حیفا، سروج، ارسوف اور قیساریہ پر فرنگیوں کا قبضہ......

☆ عالم اسلام میں حسن بن صبّاح کے داعیوں کی گہما گہمی، فدائیوں کی خنجر زنی

۴۹۴ھ......۱۱۰۰ء

☆ حسن بن صبّاح کا گروہ شمالی ایران کے کوہستانی قلعوں پر قابض......

۴۹۵ھ......۱۱۰۱ء

☆ برکیارُق اور محمد بن ملک شاہ میں تیسری جنگ، افواج اور خوراک کی شدید قلت......

☆ برکیارُق اور محمد میں چوتھی جنگ، محمد ۷۰ سواروں کے ساتھ اصفہان میں پناہ گزین......

☆ مستعلی عبیدی کی موت......

۴۹۶ھ......۱۱۰۲ء

☆ آذربائی جان میں برکیارُق اور محمد کے درمیان پانچویں جنگ، محمد پسپا......

۴۹۷ھ......۱۱۰۳ء

☆ ملک شاہ کے بیٹوں سنجر، برکیارُق اور محمد میں صلح، علاقے تقسیم......

☆ عکا اور جبیل پر فرنگیوں کا قبضہ......

☆ حاکم دمشق دقاق بن تتش سلجوقی کی وفات......

۴۹۸ھ......۱۱۰۴ء

☆ سلطان برکیارُق کی وفات، عمر ۲۶ سال، مدتِ حکومت ۱۳ سال......ربیع الاوّل (دسمبر ۱۱۰۴ء)

☆وفات سقمان بن ارتق ترکمانی، حاکم ماردین......

۴۹۹ھ......۱۱۰۵ء

☆نہاوند میں مدعی نبوت کا ظہور اور قتل......

☆فرنگیوں کا قلعہ فامیہ پر قبضہ......

۵۰۰ھ......۱۱۰۶ء

☆یوسف بن تاشفین رحمہ اللہ کی وفات۔ عمر ۹۰ سال......۳ محرم (۳ ستمبر ۱۱۰۶ء)

◆◆◆

چھٹی صدی ہجری

۵۰۱ھ......۱۱۰۷ء

☆ حاکم شمالی افریقہ تمیم بن مُعزّ بن بادیس کی وفات، مدتِ حکومت ۵۶ سال، عمر ۷۹ سال......

☆ حاکم جزیرۃ العرب صدقہ بن دُبیس ۲۲ سالہ اقتدار کے بعد محمد سلجوقی سے جنگ میں قتل......

۵۰۲ھ......۱۱۰۸ء

☆ آمل۔ جامع مسجد میں جمعہ کے دن شافعی فقیہ قاضی ابوالمحاسن الرویانی رحمہ اللہ باطنیوں کے ہاتھوں شہید، عمر ۸۷ سال محرم (اگست ۱۱۰۸ء)

☆ عید الفطر کے دن اصفہان میں باطنیوں کے ہاتھوں احناف کے مفتی ابوالعلاء صاعد بن محمد البخاری رحمہ اللہ شہید

☆ حاکمِ قونیہ قلیج ارسلان بن سلیمان دورانِ جنگ ڈوب کر جاں بحق......ذوالقعدہ (۱۳ر جون ۱۱۰۹ء)

☆ باطنیوں کے ہاتھوں اصفہان کے قاضی القضاۃ عبید اللہ بن علی خطیبی رحمہ اللہ شہید

۵۰۳ھ......۱۱۰۹ء۔۱۱۱۰ء

☆ فرنگی بانیاس، طرطوس اور حصن الاکراد پر قابض......

☆ فرنگی طرابلس (شام) پر قابض......ذوالحجہ (جولائی ۱۱۱۰ء)

۵۰۴ھ......۱۱۱۰ء

☆ فرنگی بیروت، صیدا اور حصن الاثارب پر قابض......

☆ بغداد میں مسلمانوں کی شکست در شکست پر عوام کا احتجاج، سلجوقی سلطان کی طرف سے جہاد کا وعدہ......

۵۰۵ھ......۱۱۱۱ء

☆ عراقی افواج کی فرنگیوں سے جہاد کے لیے لشکر کشی، رُہا اور تل باشر کا ناکام محاصرہ اور واپسی......

☆ علی بن یوسف بن تاشفین کی الفانسو کے مقابلے میں شاندار فتح......

☆ وفات امام غزالی رحمہ اللہ......۱۴ جمادی الآخرہ (۲۹ر دسمبر ۱۱۱۱ء)

۵۰۶ھ......۱۱۱۲ء

☆ واعظِ بغداد ابوسعد بن ابوعمامہ رحمہ اللہ کی وفات......

☆ حاکم مُوصل مودود کی خیمہ گاہ پر شاہِ رُہا جوسلین کا چھاپہ، جانی و مالی نقصان......

۵۰۷ھ......۱۱۱۳ء

☆ دِمشق اور الجزیرہ کی افواج کا طبریہ میں فرنگیوں کے خلاف جہاد اور فتح، حاکم یروشلم زخمی

☆ حاکم مُوصل مودود اجتماع جمعہ میں جامع اموی دِمشق میں باطنی خنجر بردار کے ہاتھوں قتل ......محرم (جون ۱۱۱۳ء)

۵۰۸ھ......۱۱۱۴ء۔۱۱۱۵ء

☆ حاکم یروشلم زخموں کے باعث ہلاک......

☆ حاکم مراغہ احمدیل باطنیوں کے ہاتھوں شہید......

☆ وفات سلطان مسعود غزنوی، محمود غزنوی کا پڑپوتا......شوال (مارچ ۱۱۱۵ء)

۵۰۹ھ......۱۱۱۵ء۔۱۱۱۶ء

☆ حاکم شمالی افریقہ یحییٰ بن تمیم کی وفات......۱۰ ذوالحجہ (۲۵/ اپریل ۱۱۱۶ء)

۵۱۰ھ......۱۱۱۶ء

☆ طوس میں مشہدِ علی رضا رحمہ اللہ کے اجتماع میں ہنگامہ، متعدد افراد قتل......۱۰ محرم (۲۵ مئی ۱۱۱۶ء)

☆ مدرسہ نظامیہ بغداد کا کتب خانہ آتش زدگی کی لپیٹ میں، تمام کتب بچالی گئیں......

۵۱۱ھ......۱۱۱۷ء۔۱۱۱۸ء

☆ وفات محمد بن ملک شاہ......ذوالحجہ (اپریل ۱۱۱۸ء)

۵۱۲ھ......۱۱۱۸ء۔۱۱۱۹ء

☆ وفات خلیفہ مستظہر عباسی......۱۶ ربیع الآخر (۱۹/ اگست ۱۱۱۸ء)

☆ خلافت مسترشد عباسی

☆ عزاز پر فرنگیوں کا قبضہ......رمضان (جنوری ۱۱۱۹ء)

۵۱۳ھ......۱۱۱۹ء

☆ سلطان سنجر اور اس کے بھتیجے محمود بن محمد میں جنگ کے بعد صلح......

☆ انطاکیہ کا فرنگی نواب، حاکم دِمشق طغتگین کے مقابلے میں شکست کھا کر فرار......

☆ شام میں حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کی قبور کا ظہور، اجسادِ مبارکہ سلامت......

۵۱۴ھ......۱۱۲۰ء

☆ مراکش میں ابن تومرت کا ظہور......

☆ سگے بھائیوں محمود بن محمد سلجوقی اور مسعود بن محمد سلجوقی میں جنگ، مسعود کو شکست......

☆ گرجی عیسائیوں اور قبائلِ خزر کا حملہ، تفلیس پر قبضہ، مسلمانوں کو شکست......

۵۱۵ھ......۱۱۲۱ء

☆ بغداد میں قصرِ سلطنت جل کر تباہ......

☆ افضل بن بدر جمالی وزیرِ مصر باطنیوں کے حملے میں قتل......

۵۱۶ھ......۱۱۲۲ء

☆ وفات قاسم بن علی الحریری رحمہ اللہ، صاحبِ مقامات، ولادت ۴۴۶ھ......رجب (ستمبر ۱۱۲۲ء)

☆ وفات ابو محمد البغوی الشافعی رحمہ اللہ، صاحبِ تفسیرِ بغوی، شرح السنۃ......

۵۱۷ھ......۱۱۲۳ء

☆ خلیفہ مسترشد کی دُبیس بن صدقہ کے خلاف جنگ میں فتح......یکم محرم (۱۳/مارچ ۱۱۲۳ء)

۵۱۸ھ......۱۱۲۴ء

☆ صور پر فرنگیوں کا قبضہ......

☆ حسن بن صبّاح کی موت......

☆ صیدون پر فرنگیوں کا قبضہ......

۵۱۹ھ......۱۱۲۵ء

☆ امیر برسقی نے فرنگیوں کے قلعے کفرطاب پر قبضہ کرلیا

☆ جوسلین کے قلعے عزاز پر مسلمانوں کا ناکام حملہ اور پسپائی......

۵۲۰ھ......۱۱۲۶ء

☆ امیرِ مُوصل آق سنقر قسیم الدولہ باطنیوں کے ہاتھوں قتل......ذوالقعدہ (نومبر ۱۱۲۶ء)

۵۲۱ھ......۱۱۲۷ء

☆ سلطان محمود سلجوقی کا بغداد پر حملہ، شکست کے بعد خلیفہ سے صلح......

☆ بغداد میں امیر عماد الدین زنگی کا بطورِ نائبِ سلطان تقرر......

۵۲۲ھ......۱۱۲۸ء

☆ عماد الدین زنگی کا حلب پر قبضہ......یکم محرم (جنوری ۱۱۲۸ء)

۵۲۳ھ......۱۱۲۸ء

☆ عماد الدین زنگی کا حماۃ پر قبضہ......

☆ اسماعیلیوں کی فرنگیوں کو دِمشق کا قبضہ دلانے کی سازش ناکام، چھ ہزار اسماعیلی قتل......

۵۲۴ھ......۱۱۲۹ء۔۱۱۳۰ء

☆ عمادالدین زنگی نے فرنگیوں سے قلعہ اثارب بازیاب کرالیا......

☆ محمد بن عبداللہ بن تومرت کی وفات، دولتِ مؤحدین کا روحانی پیشوا......

☆ الآمر عبیدی کا باطنیوں کے ہاتھوں قتل، مدتِ حکومت ۳۰ سال......ذوالقعدہ (اکتوبر ۱۱۳۰ء)

۵۲۵ھ......۱۱۳۰ء

☆ سلطان محمود بن محمد بن ملک شاہ سلجوقی کی وفات......

☆ یروشلم کے بادشاہ بالڈدون دوئم کی موت......رمضان (اگست ۱۱۳۱ء)

۵۲۶ھ......۱۱۳۱ء۔۱۱۳۲ء

☆ دینور میں سلطان سنجر اور سلطان مسعود سلجوقی میں خونریز جنگ، ۴۰ ہزار افراد قتل......

☆ مسترشد کی عمادالدین زنگی اور دبیس بن صدقہ کے خلاف جنگ میں فتح......۲۷ رجب (۱۳ / جون ۱۱۳۲ء)

☆ حاکمِ دِمشق تاج الملوک بوری باطنیوں کے حملے سے زخمی ہو کر جاں بحق......

۵۲۷ھ......۱۱۳۲ء

☆ حاکمِ دِمشق شمس الملوک اسماعیل نے بانیاس فرنگیوں سے بازیاب کرالیا......

۵۲۸ھ......۱۱۳۳ء

☆ عمادالدین زنگی اور خلیفہ مسترشد میں صلح......

☆ سلطان سنجر اور خلیفہ میں تعلقات بہتر......

۵۲۹ھ......۱۱۳۴ء۔۱۱۳۵ء

☆ عمادالدین زنگی نے فرنگیوں سے معرّہ بازیاب کرالیا......

☆ خلیفہ مسترشد کی جانب سے سلطان مسعود کے لیے خلعت اور تاج روانہ......

☆ خلیفہ اور سلطان مسعود میں جنگ، خلیفہ شکست کھا کر گرفتار۔ خلیفہ سے علاماتِ خلافت چادرِ نبوی اور عصائے مبارک چھین لیے گئے......رمضان (جون ۱۱۳۵ء)

☆ خلیفہ مسترشد باطنیوں کے حملے میں شہید، عمر ۴۵ سال......۱۷ ذوالقعدہ (۱۰ / ستمبر ۱۱۳۵ء)

☆ خلافت راشد باللہ عباسی

☆ حاکمِ دِمشق شمس الملوک اسماعیل قتل

☆ حاکم عرب دُبیس بن صدقہ سلطان مسعود سلجوقی کے ہاتھوں گرفتار اور قتل......ذوالحجہ (اکتوبر ۱۱۳۵ء)

۵۳۰ھ......۱۱۳۵ء

☆ سلطان مسعود کی بغداد میں مداخلت، عراق میں نیا سیاسی بحران......

☆ نئے خلیفہ راشد باللہ کی معزولی، مقتفی عباسی کی مسند نشینی......۱۶ ذوالقعدہ (۲۸ اگست ۱۱۳۶ء)

۵۳۱ھ......۱۱۳۶ء

☆ شاہِ یروشلم فلپ کاؤنٹ آف انجو کو عماد الدین زنگی سے شکست......شوال (جولائی ۱۱۳۷ء)

☆ عماد الدین زنگی فرنگیوں سے قلعہ بعرین اور بعلبک چھیننے میں کامیاب......

۵۳۲ھ......۱۱۳۷ء۔۱۱۳۸ء

☆ معزول خلیفہ راشد باللہ باطنیوں کے ہاتھوں قتل......۲۶ رمضان (۶ جون ۱۱۳۸ء)

☆ بغداد کی مشہور خاتون محدثہ اُمّ الخیر فاطمہ بنت علی رحمہا اللہ کی وفات، عمر ۹۷ سال......

☆ ولادت سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ......

۵۳۳ھ......۱۱۳۸ء

☆ سنجر کی اتسز خوارزم شاہ سے جنگ، اتسز پسپا......

۵۳۴ھ......۱۱۳۹ء۔۱۱۴۰ء

☆ عراق میں قحط سالی، اشیائے صرف نہایت گراں......

☆ ناظم بغداد مجاہد الدین بہروز کے حکم سے نئی نہروں کی کھدائی

☆ سلطان مسعود کی خلیفہ مقتفی کی بیٹی سے شادی......جمادی الآخرہ (جنوری ۱۱۴۰ء)

☆ خلیفہ مقتفی کی سلطان مسعود کی بیٹی سے شادی، بغداد میں جشن......جمادی الآخرہ (جنوری ۱۱۴۰ء)

۵۳۵ھ......۱۱۴۰ء

☆ بغداد میں ایک نئی جامعہ ''مدرسہ کمالیہ'' کی تعمیر مکمل، اسباق شروع......

☆ باطنی گروہ شام کے قلعے مصیاف پر قابض......

☆ سلطان سنجر کے حکم پر عباسیوں سے غصب کردہ چادرِ نبوی اور عصائے مبارک خلیفہ مقتفی کو واپس۔

۵۳۶ھ......۱۱۴۱ء

☆ سلطان سنجر کو ترکانِ غز کے مقابلے میں شکست، ایک لاکھ افراد شہید......

☆ ماوراء النہر پر ترکانِ غز کا قبضہ......

۵۳۷ھ......۱۱۴۲ء۔۱۱۴۳ء

☆ حاکم مَلَطیہ محمد بن دانشمند کی وفات، حاکم قونیہ مسعود بن قلیج ارسلان کا اس کے علاقے پر قبضہ......

☆ امیر مراکش واندلس علی بن یوسف بن تاشفین کی وفات۔ عمر ۶۱ سال......رجب (فروری ۱۱۴۳ء)

۵۳۸ھ......۱۱۴۳ء

☆ وفات علامہ جاراللہ زمخشری معتزلی، صاحب تفسیر کشاف، عمر ۷۱ سال......

☆ شاہ یروشلم فلپ کی موت......ذوالقعدہ (نومبر ۱۱۴۳ء)

۵۳۹ھ......۱۱۴۴ء۔۱۱۴۵ء

☆ معرکہ فتح الفتوح، عمادالدین زنگی نے فرنگیوں سے رُہا کو بازیاب کرالیا......۶ جمادی الآخرہ (۲۳ دسمبر ۱۱۴۴ء)

☆ افریقہ میں مرابطین کا آخری حکمران تاشفین بن علی، دولتِ مؤحدین کے بانی عبدالمؤمن کے مقابلے میں قتل......رمضان (مارچ ۱۱۴۵ء)

☆ ولادت قاضی بہاؤالدین ابن شداد

☆ افریقہ میں مرابطین کی حکومت کا خاتمہ......

☆ اصفہان کی واعظہ ومحدثہ فاطمہ بنت محمد رحمہا اللہ کی وفات، عمر ۹۴ سال......

۵۴۰ھ......۱۱۴۵ء

☆ ناظم عراق مجاہدالدین بہروز تیس سال سے زائد ملازمت کے بعد فوت......

☆ اندلس میں نصرانی شنترین اور اشبونہ سمیت متعدد اسلامی قلعوں پر قابض......

۵۴۱ھ......۱۱۴۶ء

☆ فرنگیوں کا طرابلس (ٹریپولی، لیبیا) پر قبضہ، آلِ زیری کی حکومت کا خاتمہ......

☆ عمادالدین زنگی قاتلانہ حملے میں جاں بحق......۵ ربیع الآخر (۱۴ ستمبر ۱۱۴۶ء)

۵۴۲ھ......۱۱۴۷ء

☆ نورالدین زنگی کا فرنگیوں کے خلاف جہاد، تین قلعے فتح......

۵۴۳ھ......۱۱۴۸ء

☆ دوسری صلیبی جنگ، یورپی لشکر دِمشق کا ناکام محاصرہ کرکے واپس......ربیع الاوّل (اگست ۱۱۴۸ء)

☆ ابوالحجاج فندلاوی رحمہ اللہ دِمشق کے دفاع میں لڑتے ہوئے شہید......

۵۴۴ھ......۱۱۴۹ء

☆ سسلی کے فرنگیوں کا مہدیہ (لیبیا) پر قبضہ......

☆ نورالدین زنگی کا فرنگیوں کے قلعہ افامیہ پر قبضہ، فرنگی حاکم جوسلین گرفتار......

☆ حاکم دِمشق معین الدین انر کی وفات......ربیع الآخر (اگست ۱۱۴۹ء)

☆وفات مالکی فقیہ قاضی عیاض مراکشی رحمہ اللہ، مؤلف مشارق الانوار، الشفا...... جمادی الآخرہ (اکتوبر ۱۱۴۹ء)
☆وفات حاکم موصل سیف الدین غازی بن عماد الدین زنگی...... جمادی الاخریٰ (اکتوبر ۱۱۴۹ء)

۵۴۵ھ......۱۱۵۰ء

☆نورالدین زنگی کے ہاتھوں فرنگیوں کو شکست، عزاز پر قبضہ...... محرم (مئی ۱۱۵۰ء)
☆غوریوں کا ظہور، حسن بن حسین غوری ہرات پر قابض......

۵۴۶ھ......۱۱۵۱ء

☆نورالدین زنگی کا رُہا کی نصرانی ریاست کے خلاف جہاد شروع......
☆رُہا کے ۱۳ قلعے فتح، حاکمِ رُہا جوسلین گرفتار......

۵۴۷ھ......۱۱۵۲ء

☆وفات سلطان مسعود سلجوقی بن محمد بن ملک شاہ، عمر ۴۵ سال...... جمادی الآخرہ (ستمبر ۱۱۵۲ء)
☆سلطان سنجر ترکانِ غز سے مقابلے میں گرفتار......

۵۴۸ھ......۱۱۵۳ء

☆خراسان اور ماوراء النہر میں ترکانِ غز کا طوفان، ہزاروں افراد قتل......
☆عسقلان پر شاہِ یروشلم بالڈون سوئم کا قبضہ...... جمادی الآخرہ (ستمبر ۱۱۵۳ء)

۵۴۹ھ......۱۱۵۴ء

☆سلجوقی سلاطین کمزور......
☆خلیفہ مقتفی عباسی کی حکومت مضبوط، بغداد کی فوج ۶ ہزار سے بڑھ کر ۱۲ ہزار ہوگئی......
☆نورالدین زنگی دِمشق پر قابض...... صفر (اپریل ۱۱۵۴ء)

۵۵۰ھ......۱۱۵۵ء

☆تُرکانِ غز کا نیشاپور پر قبضہ، تیس ہزار مسلمان قتل......

۵۵۱ھ......۱۱۵۶ء

☆ملک شاہ سلجوقی کے پوتے سلیمان کی بغداد آمد اور پروانۂ حکومت کی وصولی......
☆سلیمان شاہ کو محمد شاہ بن محمود سلجوقی کے مقابلے میں شکست
☆سلطان سنجر ترکانِ غز کی قید سے فرار...... رمضان (نومبر ۱۱۵۶ء)
☆سنجر کے بھانجے محمود اور خوارزم شاہ اتسز میں معرکے......

۵۵۲ھ......۱۱۵۷ء

☆باطنیوں کا حاجیوں کے قافلے پر حملہ، تمام عازمینِ حج شہید......

☆ محمد شاہ سلجوقی کا بغداد پر ناکام حملہ......

☆ سلطان سنجر کی وفات، عمر ۷۳ سال...... ربیع الاوّل (اپریل ۱۱۵۷ء)

☆ خراسان میں طوائف الملوکی اور قحط......

☆ نورالدین زنگی کا بانیاس اور غزہ پر قبضہ

☆ مرابطین کی حکومت اندلس سے بھی ختم

۵۵۳ھ......۱۱۵۸ء

☆ متحارب بھائیوں ملک شاہ ثانی اور محمد شاہ سلجوقی میں صلح......

۵۵۴ھ......۱۱۵۹ء

☆ ترکانِ غُز کی نیشاپور میں تیسری بار غارت گری......

☆ عبدالمؤمن کا مہدیہ پر قبضہ، فرنگیوں کا انخلاء......

☆ رومیوں کی شام پر ناکام فوج کشی......

☆ محمد شاہ بن محمود بن ملک شاہ کی وفات، عمر ۳۳ سال

۵۵۵ھ......۱۱۶۰ء

☆ خلیفہ مقتفی کی وفات۔ عمر ۶۳ سال، مدتِ حکومت ۲۵ سال...... ۲ ربیع الاوّل (۲۴ مارچ ۱۱۶۰ء)

☆ مستنجد باللہ کی خلافت

☆ ملک شاہ بن محمود بن ملک شاہ کی اصفہان میں وفات

☆ سلیمان شاہ سلجوقی شراب نوشی کے باعث امراء کی بغاوت کا شکار ہو کر معزول

☆ ارسلان بن طُغرل بن محمد کا خطبہ جاری......

☆ سلطانِ غزنی خسرو شاہ کی وفات۔ خسرو بن مسعود بن ابراہیم بن مسعود بن محمود غزنوی......

۵۵۶ھ......۱۱۶۱ء

☆ وفات علاؤالدین غوری بانی غوری سلطنت......

☆ نظر بند سابق سلجوقی سلطان سلیمان شاہ قتل...... ربیع الآخر (اپریل ۱۱۶۱ء)

☆ شاہِ یروشلم بالڈون سوئم کی موت...... ذوالقعدہ (نومبر ۱۱۶۱ء)

۵۵۷ھ......۱۱۶۱ء

☆ وفات فقیہ شجاع حنفی رحمہ اللہ، مدرّسِ مدرسہ ابوحنیفہ بغداد......

☆ خراسان میں شدید برف باری اور موسلا دھار بارشیں، فصلیں تباہ......

۵۵۸ھ......۱۱۶۲ء۔۱۱۶۳ء

☆ عبدالمؤمن بانی دولتِ موحدین کی وفات...... جمادی الآخرہ (مئی ۱۱۶۳ء)

۵۵۹ھ......۱۱۶۳ء۔۱۱۶۴ء

☆ قیصرِ روم کی یلغار اور قلیج ارسلان کے ہاتھوں درگت......

☆ شیر کوہ کی مصر میں پہلی مہم، بنو عبید کے باغی ضرغام کی سرکوبی...... جمادی الآخرہ (مئی ۱۱۶۴ء)

☆ نورالدین زنگی کا حارم پر قبضہ، سرکردہ فرنگی حکام گرفتار...... رمضان (اگست ۱۱۶۴ء)

۵۶۰ھ......۱۱۶۴ء

☆ گرجیوں کی آذربائی جان اور آرمینیا میں غارت گری......

۵۶۱ھ......۱۱۶۵ء

☆ وفات حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ......

۵۶۲ھ......۱۱۶۶ء۔۱۱۶۷ء

☆ شیر کوہ کی مصر میں دوسری مہم...... ربیع الآخر (فروری ۱۱۶۷ء)

☆ شیر کوہ کی دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ فرنگی اور مصری افواج پر فتح...... ۲۶ جمادی الآخرہ (۱۸ اپریل ۱۱۶۷ء)

۵۶۳ھ......۱۱۶۷ء

☆ وفات شیخ ابوالنجیب شہرزوری رحمہ اللہ، فقیہ و صوفی......

☆ وفات شیخ ابوبکر سمعانی المروزی رحمہ اللہ، فقیہ، مؤرخ۔ مؤلف ذیل تاریخ بغداد، الانساب، التحبیر......

۵۶۴ھ......۱۱۶۸ء۔۱۱۶۹ء

☆ شیر کوہ کی مصر میں تیسری مہم...... ربیع الاوّل (دسمبر ۱۱۶۸ء)

☆ شاور کا قتل، شیر کوہ وزارتِ مصر پر فائز...... ۱۷ ربیع الآخر (۱۸ جنوری ۱۱۶۹ء)

☆ شیر کوہ کی وفات...... ۲۲ جمادی الآخرہ (۲۳ مارچ ۱۱۶۹ء)

☆ صلاح الدین ایوبی کا وزارتِ مصر پر تقرر...... اواخر جمادی الآخرہ (اواخر مارچ ۱۱۶۹ء)

۵۶۵ھ......۱۱۶۹ء۔۱۱۷۰ء

☆ فرنگیوں کو دمیاط کے محاذ پر شکستِ فاش...... ۲۱ ربیع الاوّل (۱۲ دسمبر ۱۱۶۹ء)

☆ نورالدین زنگی کا سنجار پر قبضہ......

☆ شام میں زلزلہ، ہزاروں افراد جاں بحق...... ۱۲ شوال (۲۸ جون ۱۱۷۰ء)

☆ حاکم مُوصل مودود بن عمادالدین زنگی کی وفات...... اواخر شوال (جولائی ۱۱۷۰ء)

۵۶۶ھ.....۱۱۷۰ء۔۱۱۷۱ء

☆ خلیفہ مستنجد کی وفات، عمر ۴۸ سال.....۸ ربیع الآخر (۳۰ دسمبر ۱۱۷۰ء)

☆ المستضی عباسی کی خلافت.....

☆ نورالدین زنگی کا موصل پر قبضہ.....۱۳ جمادی الاولیٰ (۳ فروری ۱۱۷۱ء)

☆ مصر کی عدالتوں میں سنی فقہاء کا تقرر.....۲۰ جمادی الآخرہ (۱۲ مارچ ۱۱۷۱ء)

۵۶۷ھ.....۱۱۷۱ء

☆ مصر میں بنوعبید کی حکومت کا خاتمہ، بنوعباس کا خطبہ جاری..... جمعہ یکم محرم (۱۵ ستمبر ۱۱۷۱ء)

☆ آخری عبیدی حکمران عاضد کی موت، عمر ۲۱ سال.....۱۰ محرم (۲۴ ستمبر ۱۱۷۱ء)

۵۶۸ھ.....۱۱۷۲ء

☆ خوارزم شاہ ارسلان بن آتسز کی ترکانِ خطا سے جنگ

☆ خوارزم شاہ ارسلان بن آتسز کی وفات.....

☆ ایوبی جرنیل قراقوش کے ہاتھوں طرابلس (لیبیا) کی فرنگیوں سے بازیابی.....

☆ نورالدین زنگی کے نصرانی حلیف ابن لاؤن کے ہاتھوں قیصرِ روم کو شکست.....

☆ وفات نجم الدین ایوب، والدِ صلاح الدین ایوبی.....۲۷ ذوالحجہ (۱۹ اگست ۱۱۷۲ء)

۵۶۹ھ.....۱۱۷۳ء

☆ سلطان صلاح الدین کے خلاف بغاوت ناکام، باغی امراء کو سزائے موت.....۲ رمضان (۵ مئی ۱۱۷۴ء)

☆ وفات سلطان نورالدین زنگی.....۱۱ شوال (۱۴ مئی ۱۱۷۴ء)

☆ شاہِ یروشلم ایلمرک کی موت.....ذوالحجہ (جولائی ۱۱۷۴ء)

۵۷۰ھ.....۱۱۷۴ء۔۱۱۷۵ء

☆ اسکندریہ کے محاذ پر فرنگیوں کو شکستِ فاش.....یکم محرم (یکم اگست ۱۱۷۴ء)

☆ دِمشق صلاح الدین ایوبی کی حکومت میں شامل.....۲۹ ربیع الاول (۲۷ اکتوبر ۱۱۷۴ء)

☆ وفات خاتون محدثہ خدیجہ بنت احمد رحمہا اللہ.....رمضان (اپریل ۱۱۷۵ء)

☆ صلاح الدین ایوبی اور امرائے شام میں قرونِ حماۃ کی جنگ.....۱۹ رمضان (۱۳ اپریل ۱۱۷۵ء)

☆ صلاح الدین ایوبی کا اعلانِ خودمختاری.....شوال (مئی ۱۱۷۵ء)

۵۷۱ھ.....۱۱۷۵ء۔۱۱۷۶ء

☆ وفات حافظ ابن عساکر دِمشقی رحمہ اللہ، مؤلف تاریخ دِمشق، عمر ۷۲ سال.....۱۱ رجب (جنوری ۱۱۷۶ء)

☆ سلطان ایوبی اور امرائے شام میں تل السلطان کا معرکہ......۹ شوال (۲۱ اپریل ۱۱۷۶ء)
☆ سلطان ایوبی پر باطنیوں کا قاتلانہ حملہ ناکام......۱۱ ذوالقعدہ (۲۲ مئی ۱۱۷۶ء)
☆ حاکم آذربائی جان ارسلان بن طغرل بن محمد بن ملک شاہ سلجوقی کی وفات......

۵۷۲ھ......۱۱۷۶ء

☆ صلاح الدین اور حکومتِ حلب میں صلح نامہ......۲۰ محرم (۲۹ جولائی ۱۱۷۶ء)
☆ صلاح الدین ایوبی کا خاتون عصمۃ الدین سے نکاح......۴ ربیع الاول (۹ ستمبر ۱۱۷۶ء)
☆ صلاح الدین ایوبی کی قاہرہ آمد......۱۶ ربیع الاوّل (۲۱ ستمبر ۱۱۷۶ء)
☆ صلاح الدین ایوبی کے حکم سے قاہرہ کی تعمیرِ نو شروع......

۵۷۳ھ......۱۱۷۷ء

☆ رملہ میں صلاح الدین ایوبی کو شکست......یکم جمادی الآخرہ (۲۴ نومبر ۱۱۷۷ء)
☆ شہاب الدین غوری کا ہندوستان پر پہلا حملہ، ملتان اور اُچ فتح......

۵۷۴ھ......۱۱۷۸ء

☆ شہاب الدین غوری کا دوسرا حملہ۔ گجرات میں بھیم دیو سے مقابلہ اور پسپائی
☆ بغداد میں توہینِ صحابہ پر مشتمل کتب تلف......
☆ حیص بیص شاعر کی وفات......
☆ فخر النساء شہدۃ بنت ابی نصر رحمہا اللہ کی وفات، خاتون محدثہ، عمر ۹۲ سال......۱۴ محرم (۲ جولائی ۱۱۷۸ء)

۵۷۵ھ......۱۱۷۹ء۔۱۱۸۰ء

☆ شہاب الدین غوری کا تیسرا حملہ۔ پشاور اور نواحی علاقے فتح
☆ صلاح الدین ایوبی کا حصن الاحزان پر قبضہ......۲۴ ربیع الآخر (۲۸ ستمبر ۱۱۷۹ء)
☆ وفات خلیفہ المستضئی عباسی، عمر ۴۵ سال......۲۹ شوال (۹ اپریل ۱۱۸۰ء)
☆ آغازِ خلافت خلیفہ ناصر عباسی......

۵۷۶ھ......۱۱۸۰ء

☆ وفات توران شاہ بن نجم الدین ایوب......محرم (جون ۱۱۸۰ء)
☆ وفات سیف الدین غازی دوئم حاکم موصل......۳ صفر (۱۰ جولائی ۱۱۸۰ء)
☆ وفات شیخ ابوطاہر سلفی رحمہ اللہ، محدثِ مصر، عمر سو سال سے زائد......۵ ربیع الآخر (۹ ستمبر ۱۱۸۰ء)
☆ شہاب الدین غوری کا چوتھا حملہ۔ سندھ کی بندرگاہ دیبل اور کئی شہر فتح

۵۷۷ھ......۱۱۸۱ء

☆ وفات الملک الصالح حاکم حلب......۲۵ رجب (۱۶ دسمبر ۱۱۸۱ء)

☆ وفات ابوالبرکات الانباری رحمۃ اللہ، مؤرخ، مصنف نزہۃ الالباء فی طبقات الاطباء......

۵۷۸ھ......۱۱۸۲ء

☆ وفات فرخ شاہ حاکم شام......جمادی الاولیٰ (ستمبر ۱۱۸۲ء)

☆ وفات علامہ ابن بشکوال، مصنف الصلۃ فی رجال اندلس، عمر ۸۴ سال......۸ رمضان (۱۷ جنوری ۱۱۸۳ء)

۵۷۹ھ......۱۱۸۳ء

☆ صلاح الدین ایوبی کا حلب پر قبضہ......۱۸ صفر (۲۳ جون ۱۱۸۳ء)

☆ اسلامی شاعرہ تقیہ بنت غیث کی وفات رحمہا اللہ، صلاح الدین کے جرنیلوں کی قصیدہ گو۔ عمر ۷۴ سال......

۵۸۰ھ......۱۱۸۴ء

☆ شہاب الدین غوری کا پانچواں حملہ۔ پنجاب میں قلعہ سیالکوٹ کی تعمیر......

☆ وفات سلطان مراکش ابویعقوب یوسف بن عبدالمؤمن......رجب (نومبر ۱۱۸۴ء)

☆ شاہِ یروشلم بالڈون چہارم مجذوم کی موت......ذوالقعدہ (مارچ ۱۱۸۵ء)

۵۸۱ھ......۱۱۸۵ء

☆ موصل کے محاصرے کے دوران صلاح الدین شدید بیمار......شعبان (نومبر ۱۱۸۵ء)

☆ سلطان ایوبی کو افاقہ اور حکومتِ موصل سے معاہدۂ صلح......۹ ذوالحجہ (۱۴ مارچ ۱۱۸۶ء)

☆ وفات عظیم نابینا عالم علامہ سہیلی اندلسی رحمۃ اللہ، مصنف الروض الانف، عمر ۷۳ سال......

☆ وفات عصمۃ الدین رحمہا اللہ، زوجہ صلاح الدین ایوبی، دمشق کی جامعہ حنفیہ کی بانی......

۵۸۲ھ......۱۱۸۶ء

☆ غزنویوں کے آخری تاجدار خسرو ملک کی وفات، غزنوی سلطنت کا خاتمہ......

۵۸۳ھ......۱۱۸۷ء

☆ وفات شیخ عبدالمغیث بن زہیر بغدادی، عمر ۸۳ سال......محرم (مارچ ۱۱۸۷ء)

☆ معرکہ حطین، شام کے فرنگیوں کو فیصلہ کن شکست......۲۵ ربیع الآخر (۱۶ جولائی ۱۱۸۷ء)

☆ بیت المقدس کی شاندار فتح......۲۷ رجب (۱۴ اکتوبر ۱۱۸۷ء)

۵۸۴ھ......۱۱۸۸ء

☆ ایوبی سپاہ کا کرک پر قبضہ......

☆سلطان طغرل بن ارسلان سلجوقی سے جنگ میں بغدادی افواج کو شکستِ فاش......۸ربیع الاوّل (۱۹مئی ۱۱۸۸ء)

☆وفات علامہ ابوبکر الحازمی رحمہ اللہ، مصنف الاعتبار فی الناسخ والمنسوخ والآثار، الاماکن، عجالۃ المبتدی فی النسب، عمر ۳۵ سال......جمادی الاولیٰ (جولائی ۱۱۸۸ء)

☆صاحبِ سیف وقلم اسامہ بن مرشد رحمہ اللہ کی وفات، عمر ۹۶ سال......۲۳رمضان (۲۷نومبر ۱۱۸۸ء)

☆فتح قلعہ کوکب......۱۴ذوالقعدہ (۳جنوری ۱۱۸۹ء)

۵۸۵ھ......۱۱۸۹ء

☆تیسری صلیبی جنگ کا آغاز......شعبان (ستمبر ۱۱۸۹ء)

☆صلیبی جنگ، عکا کا معرکہ کبریٰ......۲۱شعبان (۱۶/۱ اکتوبر ۱۱۸۹ء)

☆وفات قاضی القضاۃ شام ابن ابی عصرون رحمہ اللہ، عمر ۷۳ سال......

☆وفات فقیہ عیسیٰ ہکاری رحمہ اللہ......۹ذوالقعدہ (۸دسمبر ۱۱۸۹ء)

۵۸۶ھ......۱۱۹۰ء

☆شاہِ جرمن باربروسا کی موت......۲۷محرم (مارچ ۱۱۹۰ء)

☆صلیبی جنگ، معرکہ مرج عکا......۱۱شوال (۱۱نومبر ۱۱۹۰ء)

☆صلیبی جنگ، معرکہ نوبۃ النہر......۱۲شوال (۱۲نومبر ۱۱۹۰ء)

☆شاہِ جرمن فریڈرک کی موت......۲۲ذوالحجہ (۲۰جنوری ۱۱۹۱ء)

۵۸۷ھ......۱۱۹۱ء

☆صلیبی جنگ کے محاذ پر شاہِ فرانس فلپ آگسٹس کی آمد......۲۳ربیع الاوّل (۱۴اپریل ۱۱۹۱ء)

☆محاذ پر رچرڈ شاہِ برطانیہ کی آمد......۱۳جمادی الاولیٰ (۷جون ۱۱۹۱ء)

☆سقوطِ عکا......۱۷جمادی الاولیٰ (۱۱جولائی ۱۱۹۱ء)

☆حلب کے ملحد فلسفی شہاب الدین سہروردی کو سزائے موت، عمر ۳۶ سال......۵رجب (۲۸جولائی ۱۱۹۱ء)

☆معرکہ ارسوف......۱۴شعبان (۴ستمبر ۱۱۹۱ء)

☆عسقلان کا انہدام......۱۹شعبان (۹ستمبر ۱۱۹۱ء)

☆وفات شمشیرِ اسلام تقی الدین عمر......رمضان (اکتوبر ۱۱۹۱ء)

☆شہاب الدین غوری کا چھٹا حملہ۔ بھٹنڈہ فتح۔ تراوڑی میں پرتھوی راج سے شکست اور پسپائی

☆وفات علامہ نجم الدین خبوشانی

☆وفات قزل ارسلان حاکم آذربائی جان

۵۸۸ھ.....۱۱۹۲ء

☆صلیبی جنگ۔القدس کا محاصرہ..... جمادی الآخرہ(جون ۱۱۹۲ء)

☆صلیبیوں کی ناکام واپسی،محاصرہ ختم.....۲۱جمادی الآخرہ(۳جولائی ۱۱۹۲ء)

☆شہاب الدین غوری کا ساتواں حملہ۔فتحِ مبین،پرتھوی راج قتل.....یکم جمادی الآخرہ(۱۴جون ۱۱۹۲ء)

☆صلاح الدین ایوبی اور صلیبیوں میں جنگ بندی کا معاہدہ.....۲۴شعبان(۳ستمبر ۱۱۹۲ء)

☆صلیبی جنگ کے بطلِ جلیل امیر سیف الدین مشطوب کی وفات.....۲۳شوال(یکم نومبر ۱۱۹۲ء)

☆وفات حاکم قونیہ قلج ارسلان ثانی بن مسعود بن قلج ارسلان اول بن سلیمان

۵۸۹ھ.....۱۱۹۳ء

☆وفات سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ.....۲۷صفر(۳مارچ ۱۱۹۳ء)

☆وفات حاکم خلاط سیف الدین بکتمر..... جمادی الاولیٰ(مئی ۱۱۹۳ء)

☆وفات سلطان شاہ،برادرِ علاؤالدین تکش خوارزم شاہ.....

☆وفات حاکم مُوصِل عزالدین مسعود.....

۵۹۰ھ.....۱۱۹۳ء

☆شہاب الدین غوری کا ہندوستان پر حملہ اور فتح.....

☆طغرل بن ارسلان سلجوقی،علاؤالدین تکش سے جنگ میں قتل.....

☆وفات امام القراء ابومحمد الشاطبی الاندلسی ثم المصری رحمہ اللہ،صاحبِ حرز الامانی،عمر ۵۲سال.....

☆علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ اہلِ سنت کی وکالت پر واسط جیل میں قید

۵۹۱ھ.....۱۱۹۴ء۔۱۱۹۵ء

☆اَندَلُس میں زلاقہ کی دوسری جنگ،یعقوب بن یوسف کی نصرانیوں کے خلاف فتح،ایک لاکھ ۴۶ ہزار نصرانی قتل.....۹شعبان(۱۹جولائی ۱۱۹۵ء)

☆شام ومصر میں ایوبی شہزادوں میں سیاسی کش مکش.....

☆چوتھی صلیبی جنگ،شاہِ جرمن ہنری ششم کا حملہ اور ناکام واپسی

۵۹۲ھ.....۱۱۹۵ء

☆صلاح الدین کا بیٹا الافضل معزول،الملک العادل کی حکومت کا آغاز.....

☆یعقوب بن یوسف کی نصرانیوں کے خلاف ایک اور شاندار فتح،طلیطلہ کا محاصرہ.....

☆ شہاب الدین غوری کا ہندوستان پر آٹھواں حملہ......

۵۹۳ھ......۱۱۹۶ء

☆ الملک العادل کا یافا پر قبضہ......

☆ فرنگی بیروت پر قابض......

۵۹۴ھ......۱۱۹۷ء۔۱۱۹۸ء

☆ وفات ابدالِ وقت ابوعلی فارسی رحمۃ اللہ، عمر ۹۰ سال......محرم (نومبر ۱۱۹۷ء)..

☆ وفات حاکمِ سنجار عماد الدین بن مودود بن عماد الدین زنگی......

☆ علاؤ الدین تکش کی ترکانِ خطا سے جنگ، بخارا فتح......

۵۹۵ھ......۱۱۹۸ء۔۱۱۹۹ء

☆ وفات قاضی ابن رشد القرطبی رحمۃ اللہ، فقیہ، فلسفی، ادیب......صفر (دسمبر ۱۱۹۸ء)

☆ علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ واسط کی جیل سے پانچ سال بعد رہا......

☆ الملک العزیز بن صلاح الدین ایوبی کی وفات......

☆ ایوبی خاندان میں اقتدار کی کش مکش

☆ وفات یعقوب بن یوسف امیرِ مراکش واندلس

☆ امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ کی ہرات سے جلاوطنی

۵۹۶ھ......۱۱۹۹ء۔۱۲۰۰ء

☆ وفات علاؤ الدین تکش......۱۹ رمضان ۵۹۶ھ (۳ جولائی ۱۲۰۰ء)

☆ علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ کی حکومت......۲۰ شوال (۱۳ اگست ۱۲۰۰ء)

☆ الملک العادل کا مصر و شام پر قبضہ مکمل، الافضل محروم......

☆ دریائے نیل میں خشکی

۵۹۷ھ......۱۲۰۰ء۔۱۲۰۱ء

☆ وفات علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ......۱۳ رمضان (جون ۱۲۰۱ء)

☆ وفات عماد اصفہانی، کاتبِ صلاح الدین ایوبی......یکم رمضان (۴ جون ۱۲۰۱ء)

☆ ایشیا میں زلزلہ، مصر میں شدید قحط، ہزاروں لوگ جاں بحق......

☆ وفات امیر قراقوش، صلاح الدین ایوبی کا جرنیل......

☆ وفات قاضی القضاۃ محی الدین ابن زکی ابو المعالی رحمۃ اللہ، عمر ۴۲ سال، ۲۸ سال کی عمر میں بیت المقدس کی فتح

کے بعد منبر پر پہلا خطبہ دینے والے......

۵۹۸ھ......۱۲۰۱ء

☆ صلاح الدین ایوبی کے امیر البحر حسام الدین لولو کی وفات......صفر (نومبر ۱۲۰۱ء)

۵۹۹ھ......۱۲۰۲ء۔۱۲۰۳ء

☆ ستاروں کے بکثرت ٹوٹ کر گرنے سے قیامتِ صغریٰ......۲۹ محرم (۱۷/ اکتوبر ۱۲۰۲ء)

☆ وفات ابوالحسن ابن نجیہ (ابن نجا) الواعظ رحمہ اللہ، عمر ۹۱ سال......رمضان (جون ۱۲۰۳ء)

☆ پورے شام و مصر پر الملک العادل کی حکومت قائم......

☆ وفات سلطان غیاث الدین غوری، شہاب الدین غوری تخت نشین

۶۰۰ھ......۱۲۰۳ء

☆ وفات حافظ عبدالغنی المقدسی رحمہ اللہ، مصنف الکمال فی اسماء الرجال، الاقتصاد فی الاعتقاد، الدرۃ المضیہ فی السیرۃ النبویہ، عمر ۶۷ سال......

☆ وفات خاتون محدثہ فاطمہ بنت سعد مصریہ رحمہا اللہ، زوجہ ابن نجا الواعظ رحمہ اللہ، عمر ۸۷ سال......ربیع الاول (نومبر ۱۲۰۳ء)

✦✦✦

ساتویں صدی ہجری

۶۰۱ھ......۱۲۰۴ء

☆فرنگیوں کا قُسطَنطِینِیَہ پر قبضہ، قیصر بے اختیار......

☆گرجیوں کے اسلامی سرحدوں پر حملے......

۶۰۲ھ......۱۲۰۵ء

☆ابن لاؤن کی حلب کے مضافات میں غارت گری......

☆شہاب الدین غوری کا ہندوستان پر دسواں حملہ۔ گکھڑوں کی سرکوبی

☆جہلم کے نزدیک سلطان شہاب الدین غوری کی شہادت...... یکم شعبان (۱۳ مارچ ۱۲۰۵ء)

☆قطب الدین ایبک نے دہلی میں پہلی آزاد مسلم حکومت کی بنیاد رکھی......۱۸ ذوالقعدہ (۲۷ جون ۱۲۰۶ء)

۶۰۳ھ......۱۲۰۶ء

☆علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ پورے خراسان پر قابض......

۶۰۴ھ......۱۲۰۷ء۔۱۲۰۸ء

☆خوارزم شاہ اور ترکانِ خطا میں معرکے، خوارزم شاہ گرفتار......

☆وفات ابن ساعاتی شاعر، عمر ۵۱ سال......رمضان (اپریل ۱۲۰۸ء)

۶۰۵ھ......۱۲۰۸ء

☆خوارزم شاہ کی رہائی......

۶۰۶ھ......۱۲۰۹ء

☆خوارزم شاہ کے ہاتھوں ترکانِ خطا کو شکستِ فاش، شاہ طانیکوہ گرفتار......

☆خاتون محدثہ عفیفہ بنت احمد رحمہا اللہ کی وفات......ربیع الآخر (اکتوبر ۱۲۰۹ء)

☆وفات امام فخر الدین الرازی رحمہ اللہ......یکم شوال (۲۸ مارچ ۱۲۱۰ء)

☆وفات علامہ ابن اثیر مبارک بن محمد الجزری رحمہ اللہ محدث، متکلم، لغوی، مؤلف ''النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر''، ''جامع الاصول فی احادیث الرسول''......۳۰ ذوالحجہ (۶ جولائی ۱۲۱۰ء)

۶۰۷ھ......۱۲۱۰ء

☆ وفات محدثہ عائشہ بنت معمر رحمۃ اللہ علیہا......ربیع الآخر (اکتوبر ۱۲۱۰ء)

☆ وفات محدثہ تقیۃ بنت محمد رحمۃ اللہ علیہا......ذوالقعدہ (اپریل ۱۲۱۱ء)

۶۰۸ھ......۱۲۱۱ء۔۱۲۱۲ء

☆ باطنی سربراہ جلال الدین حسن کا اعلانِ اسلام......

☆ وفات قاضی ابن سناہبۃ اللہ بن جعفر، شاعر و ادیب، عمر ۶۳ سال......رمضان (فروری ۱۲۱۲ء)

۶۰۹ھ......۱۲۱۲ء

☆ موحدین اور فرنگیوں میں معرکۂ عقاب، مسلمانوں کا بھاری جانی نقصان......

۶۱۰ھ......۱۲۱۳ء

☆ وفات حکمرانِ اندلس محمد بن یعقوب بن یوسف بن عبدالمومن......شعبان (دسمبر ۱۲۱۳ء)

۶۱۱ھ......۱۲۱۴ء

☆ علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ کرمان، مکران اور سندھ پر قابض......

۶۱۲ھ......۱۲۱۵ء

☆ گرجیوں کا اسلامی سرحدوں پر حملہ، ایک لاکھ مسلمان قید......

☆ خوارزم شاہ غزنی پر قابض......

۶۱۳ھ......۱۲۱۶ء

☆ وفات الملک الظاہر بن صلاح الدین ایوبی، حاکمِ حلب......۲۰ جمادی الآخرہ (۴/ اکتوبر ۱۲۱۶ء)

۶۱۴ھ......۱۲۱۷ء

☆ خوارزم شاہ کی بغداد پر ناکام فوج کشی......شعبان (نومبر ۱۲۱۷ء)

☆ وفات ابن جُبیر اندلسی رحمہ اللہ، محدث، ادیب، سیاح......شعبان (نومبر ۱۲۱۷ء)

☆ پانچویں صلیبی جنگ کا آغاز، عین جالوت اور بیسان میں فرنگیوں کی غارت گری......رمضان (دسمبر ۱۲۱۷ء)

۶۱۵ھ......۱۲۱۸ء

☆ فرنگیوں کا مصر پر حملہ، دمیاط کا محاصرہ......صفر (مئی ۱۲۱۸ء)

☆ وفات الملک العادل حکمرانِ مصر و شام، عمر ۷۲ سال......۷ جمادی الآخرہ (ستمبر ۱۲۱۸ء)

☆ چنگیز خان اور خوارزم شاہ میں تجارتی معاہدہ......ذوالقعدہ (فروری ۱۲۱۸ء)

☆ وفات حاکم قونیہ کیکاؤس بن کے خسرو بن قلیج ارسلان ثانی

☆ قونیہ میں علاؤ الدین کیقباد کی حکومت کا آغاز

۶۱۶ھ......۱۲۱۹ء

☆ عالم اسلام کے خلاف چنگیز خان کی پیش قدمی کا آغاز...... رجب (ستمبر ۱۲۱۹ء)

☆ صلیبی جنگ جاری، فرنگی دمیاط پر قابض...... ۲۷ شعبان (۷ نومبر ۱۲۱۹ء)

☆ سرحد پر خوارزم شاہ کو شکستِ فاش...... ذوالقعدہ (جنوری ۱۲۲۰ء)

☆ وفات سِتُّ الشام رحمہا اللہ، صلاح الدین ایوبی کی ہمشیرہ...... ذوالقعدہ (۲۲ جنوری ۱۲۲۰ء)

۶۱۷ھ......۱۲۲۰ء

☆ صلیبی جنگ۔ مسلمانوں کے جوابی حملے، دمیاط میں دس ہزار فرنگی قتل......

☆ سقوطِ بخارا...... محرم (مارچ ۱۲۲۰ء)

☆ سقوطِ سمرقند...... ربیع الاول (مئی ۱۲۲۰ء)

تاتاری پورے وسطِ ایشیا پر قابض، لاکھوں مسلمان قتل......

☆ وفات علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ...... شعبان (اکتوبر ۱۲۲۰ء)

۶۱۸ھ......۱۲۲۱ء

☆ سقوطِ اورگنج پایۂ تخت دولتِ خوارزم، بارہ لاکھ افراد قتل...... صفر ۶۱۸ھ (اپریل ۱۲۲۱ء)

☆ امام نجم الدین کبریٰ رحمہ اللہ اورگنج کے دفاع میں شہید

☆ سقوطِ نیشاپور، آٹھ لاکھ افراد قتل...... ۱۲ صفر (۷ اپریل ۱۲۲۱ء)

☆ نیشاپور میں خواجہ فرید الدین عطار صاحب پند نامہ شہید

☆ ابوبکر بن صَفّار نیشاپوری رحمہ اللہ شہید، عمر ۸۵ سال

☆ سقوطِ ہرات، سولہ لاکھ افراد قتل...... ربیع الاول ۶۱۸ھ (مئی ۱۲۲۱ء)

☆ محدث اعظم عبدالمعز بن ابوالفضل البزاز رحمہ اللہ ہرات میں شہید

☆ سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کے مقابلے میں تاتاریوں کو شکست...... رجب ۶۱۸ھ (ستمبر ۱۲۲۱ء)

☆ پانچویں صلیبی جنگ کا اختتام، دمیاط پر مسلمانوں کا قبضہ، فرنگی امراء گرفتار...... ۹ رجب (۲۸ اگست ۱۲۲۱ء)

☆ پروان میں تاتاریوں کو دوسری شکست...... رمضان ۶۱۸ھ (اکتوبر ۱۲۲۱ء)

☆ معرکہ دریائے سندھ، سلطان جلال الدین کی دریا میں جست...... ۸ شوال (۲۴ نومبر ۱۲۲۱ء)

۶۱۹ھ......۱۲۲۲ء

☆ سلطان جلال الدین کی ہندوستان میں فتوحات......
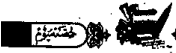
☆ تاتاریوں کا روسی علاقوں پر قبضہ......

۶۲۰ھ......۱۲۲۳ء

☆ وفات سلطانِ موحدین مستنصر باللہ ابو یعقوب ابن یوسف......شوال (نومبر ۱۲۲۳ء)

۶۲۱ھ......۱۲۲۴ء

☆ سلطان جلال الدین کی ایران آمد، آذر بائی جان پر قبضہ......

☆ حکمرانِ مراکش عبدالواحد بن ابو یعقوب قتل......شعبان (ستمبر ۱۲۲۴ء)

۶۲۲ھ......۱۲۲۵ء

☆ سلطان جلال الدین کا مراغہ پر قبضہ......وسطِ جمادی الآخرہ (جون ۱۲۲۵ء)

☆ سلطان جلال الدین کا تبریز پر قبضہ......۱۷ رجب (۲۵ جولائی ۱۲۲۵ء)

☆ سلطان جلال الدین کا گرجستان پر پہلا حملہ......شعبان (اگست ۱۲۲۵ء)

☆ وفات الملک الافضل بن صلاح الدین ایوبی......صفر (فروری ۱۲۲۵ء)

☆ خلیفہ ناصر عباسی کی وفات......۲۹ رمضان (۱۶/۱ اکتوبر ۱۲۲۵ء)

☆ الظاہر عباسی رحمہ اللہ کی مسند نشینی

۶۲۳ھ......۱۲۲۶ء

☆ تفلیس پر سلطان جلال الدین کا قبضہ......۸ ربیع الاول (۸ مارچ ۱۲۲۶ء)

☆ وفات خلیفہ ظاہر عباسی رحمہ اللہ، عمر ۵۲ سال، مدتِ خلافت چھ ماہ......۱۴ رجب (۲۳ جولائی ۱۲۲۶ء)

☆ مستنصر باللہ عباسی کی خلافت

☆ وفات علامہ عبدالکریم رافعی الشافعی رحمہ اللہ، مصنف التدوین فی اخبار قزوین......اواخر ذوالحجہ (۲۱ دسمبر ۱۲۲۶ء)

۶۲۴ھ......۱۲۲۶ء۔۱۲۲۷ء

☆ سلطان جلال الدین کی تاتاریوں سے جنگ، پلہ برابر......شعبان ۶۲۴ھ (جولائی ۱۲۲۷ء)

☆ چنگیز خان کی موت......۴ رمضان (۱۸ اگست ۱۲۲۷ء)

☆ وفات الملک المعظم حاکم دمشق......۳۰ ذوالقعدہ (۲۲ نومبر ۱۲۲۷ء)

۶۲۵ھ......۱۲۲۷ء

☆ چھٹی صلیبی جنگ۔ شاہ جرمن فریڈرک دوئم کی یلغار

☆ القدس کے بارے میں الملک الکامل اور فرنگیوں میں مذاکرات

☆ سلطان جلال الدین کو تاتاریوں کے خلاف اصفہان میں فتح......۲۲ رمضان (۲۴ اگست ۱۲۲۸ء)

۶۲۶ھ......۱۲۲۸ء

☆ القدس معاہدے کے تحت فرنگیوں کے سپرد......

☆ الملک الکامل اور اس کے بھتیجے ناصر بن الملک المعظم میں خانہ جنگی......

☆ وفات یاقوت حموی رحمہ اللہ، مصنف معجم البلدان، معجم المصنفین

۶۲۷ھ......۱۲۲۹ء

☆ سلطان جلال الدین خلاط پر قابض......۲۸ جمادی الاولیٰ (۱۴ اپریل ۱۲۲۹ء)

☆ سلطان جلال الدین کو قونیہ اور مصر کی متحدہ افواج کے مقابلے میں شکست......۲۸ رمضان (۱۹ اگست ۱۲۲۹ء)

۶۲۸ھ......۱۲۳۰ء

☆ تاتاری آذربائی جان پر قابض......

☆ سلطان جلال الدین کی گم شدگی......شوال (اگست ۱۲۳۱ء)

۶۲۹ھ......۱۲۳۱ء

☆ وفات مُوَفّق عبداللطیف بن یوسف بغدادی، فلسفی وادیب......۱۲ محرم (۸ نومبر ۱۲۳۱ء)

☆ تاتاری بغداد کے قریب شہرزور میں خیمہ زن۔ خلیفہ مستنصر بغداد کے دفاع کے لیے کمربستہ......

۶۳۰ھ......۱۲۳۲ء

☆ حاکم قونیہ کا الجزیرہ اور حران پر قبضہ......

☆ مُوَحدین کے سلطان ادریس بن یعقوب کی وفات......

☆ وفات علامہ ابن اثیر الجزری رحمہ اللہ، مؤرخ اسلام، عمر ۷۵ سال......۲۵ شعبان (۵ جون ۱۲۳۳ء)

☆ وفات مظفر الدین کوکبری حاکم اربل، عمر ۸۱ سال......۱۴ رمضان (۲۴ جون ۱۲۳۳)

۶۳۱ھ......۱۲۳۳ء

☆ سلطان صلاح الدین کے معالج ابوالحجاج یوسف کی وفات، عمر ۹۷ سال......۱۰ محرم (۱۶/۱ اکتوبر ۱۲۳۳)

☆ حاکم مصر الملک الکامل کو حاکم قونیہ علاؤالدین کیقباد سے جنگ میں شکست......

☆ بدرالدین لؤلؤ کا موصل پر قبضہ، اتابکی خاندان کی حکومت کا خاتمہ......

☆ بغداد میں جامعہ مستنصریہ کی تعمیر مکمل......

۶۳۲ھ......۱۲۳۴ء

☆ وفات شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ......محرم (اکتوبر ۱۲۳۴ء)

☆ اصفہان میں تاتاریوں سے جنگ، درجنوں علماء اور ہزاروں مسلمان شہید......

☆ وفات بہاؤ الدین ابن شداد رحمۃ اللہ، صلاح الدین ایوبی کے مشیر و سوانح نگار......

۶۳۳ھ......۱۲۳۵ء

☆ تاتاریوں کی مُوصل تک یلغار، بغداد کے حفاظتی انتظامات سخت......

☆ الملک الکامل نے حاکم قونیہ سے الجزیرہ کا علاقہ واپس لے لیا......

☆ وفات مؤرخ قیلوبی، عمر ۷۰ سال......

☆ خاتون عالمہ زہرہ بنت محمد رحمہا اللہ کی وفات، عمر ۷۹ سال...... جمادی الاولیٰ (جنوری ۱۲۳۶ء)

☆ وفات ابن دحیہ اندلسی، مؤرخ، ادیب......

۶۳۴ھ......۱۲۳۶ء

☆ وفات خاتون محدثہ یاسمین بنت سالم رحمہا اللہ...... دس محرم (۱۳ ستمبر ۱۲۳۶ء)

☆ تاتاریوں کا اربل پر قبضہ، عوام کا قتل عام......

☆ وفات حاکم قونیہ علاؤ الدین کیقباد......

☆ وفات شیخ ابوالحسن قطیعی رحمۃ اللہ، جامعہ مستنصریہ بغداد کے پہلے صدر مدرس......

۶۳۵ھ......۱۲۳۷ء

☆ دقوقا میں بغدادی افواج کو تاتاریوں سے جنگ میں شکست......

☆ شام میں ایوبی خاندان کے ورثاء میں کش مکش اور لڑائیاں......

☆ وفات سلطان شام و مصر الملک الکامل، عمر ۵۹ سال...... ۲۱ رجب (۲۰ مارچ ۱۲۳۷ء)

۶۳۶ھ......۱۲۳۸ء

☆ الملک الصالح بن کامل کا شام اور مصر پر قبضہ مضبوط......

۶۳۷ھ......۱۲۳۹ء

☆ شام میں ایوبی خاندان کی باہم محاذ آرائی جاری......

☆ الملک الصالح ایوب مصر کا بادشاہ بن گیا......

۶۳۸ھ......۱۲۴۰ء

☆ الملک الصالح اسماعیل نے قلعہ سقیف فرنگیوں کے حوالے کر دیا......

☆ علامہ عزالدین ابن عبدالسلام رحمۃ اللہ الملک الصالح اسماعیل پر نکتہ چینی کی وجہ سے پابندِ سلاسل......

۶۳۹ھ......۱۲۴۱ء

☆ تاتاری اصفہان پر قابض......

۶۴۰ھ......۱۲۴۲ء

☆ وفات خلیفہ مستنصر عباسی......۱۰ جمادی الآخرہ (۷ ادسمبر ۱۲۴۲ء)

☆ خلافت مستعصم باللہ۔ بغداد کا آخری عباسی خلیفہ

☆ وفات حاکم مراکش عبدالواحد بن ادریس (ابو محمد بن مامون)......

۶۴۱ھ......۱۲۴۳ء

☆ تاتاریوں نے حکومتِ قونیہ کو باج گزار بنالیا۔ یومیہ ایک ہزار دینار خراج مقرر......

۶۴۲ھ......۱۲۴۴ء

☆ حاکم مصر الملک الصالح ایوب اور حاکم دِمَشق الملک الصالح اسماعیل میں سخت کشیدگی......

☆ عسقلان میں مصری اور خوارزمی افواج کو دِمَشق اور اس کے اتحادی فرنگیوں پر فتح...... جمادی الاولیٰ (اکتوبر ۱۲۴۴ء)

۶۴۳ھ......۱۲۴۵ء

☆ وفات علامہ سخاوی رحمہ اللہ، شارحِ متن شاطبیہ......۱۲ جمادی الآخرہ (۴ نومبر ۱۲۴۵ء)

☆ خوارزمی اور مصری افواج دِمَشق کے محاصرے میں مصروف، الملک الصالح اسماعیل فرار......

☆ ربیعہ خاتون رحمہا اللہ ہمشیرہ صلاح الدین ایوبی کی وفات، عمر ۸۰ سال......

۶۴۴ھ......۱۲۴۶ء

☆ الملک الصالح اسماعیل کی حکومت کا خاتمہ......

☆ الملک الصالح ایوب کا دِمَشق میں فاتحانہ داخلہ......ذوالقعدہ (مارچ ۱۲۴۷ء)

۶۴۵ھ......۱۲۴۷ء

☆ وفات حاکم میافارقین الملک المظفر شہاب الدین غازی......

۶۴۶ھ......۱۲۴۸ء

☆ دِمَشق میں ماہر نباتات حکیم ابن بیطار مالقی کی وفات......شعبان (نومبر ۱۲۴۸ء)

☆ اشبیلیہ پر فرنگیوں کا قبضہ......شعبان (نومبر ۱۲۴۸ء)

☆ اشبیلیہ میں شیخ اَندلس ابوالحسن علی بن جابر رحمہ اللہ کی وفات......

☆ موحدین کے حکمران علی بن مامون (مُعتضِد ابوالحسن) کی وفات

☆ وفات القفطی وزیرِ حلب، مؤرخ، ادیب

۶۴۷ھ......۱۲۴۹ء

☆ ساتویں صلیبی جنگ شروع۔ شاہِ فرانس سینٹ لوئی کی یلغار

☆فرنگیوں کا دمیاط پر قبضہ......ربیع الاول (جون ۱۲۴۹ء)

☆الملک الصالح ایوب کا منصورہ (قاہرہ) میں انتقال، عمر ۴۲ سال......۱۵شعبان (۲۲نومبر ۱۲۴۹ء)

☆الملک المعظم توران شاہ نیا حکمران مصر مقرر

☆فرنگیوں کا قاہرہ پر حملہ، نائب مصر فخر الدین بن شیخ شہید......ذوالقعدہ (فروری ۱۲۵۰ء)

۶۴۸ھ......۱۲۵۰ء

☆صلیبی جنگ میں مسلمانوں کی شاندار فتح، شاہِ فرانس گرفتار......یکم محرم (۵/اپریل ۱۲۵۰ء)

☆الملک المعظم توران شاہ بغاوت میں قتل، ملکہ شجرۃ الدرّ کی حکومت شروع......

☆دمیاط کی بازیابی

☆شاہِ فرانس دس سالہ جنگ بندی کے معاہدے پر آزاد......صفر (مئی ۱۲۵۰ء)

☆امیر عز الدین ترکمانی، الملک المعز کے لقب کے ساتھ مصر کا نیا بادشاہ بن گیا......

☆شام پر حاکم حلب الملک الناصر کا قبضہ

۶۴۹ھ......۱۲۵۱ء

☆شام اور مصر کی حکومتوں میں کشیدگی......

۶۵۰ھ......۱۲۵۲ء

☆تاتاریوں کے ہاتھوں دیارِ بکر میں مسلمانوں کا قتل عام......

۶۵۱ھ......۱۲۵۳ء

☆عز الدین ایبک ترکمانی کی نگرانی میں الملک الاشرف علامتی حکمرانِ مصر مقرر......

۶۵۲ھ......۱۲۵۴ء

☆عز الدین ترکمان ملکہ شجرۃ الدرّ سے شادی کر کے مصر کا آزاد حکمران مقرر......

☆ممالیکِ بحری کے افسر رکن الدین بیبرس کی حاکم شام الناصر کے دربار میں شمولیت......

۶۵۳ھ......۱۲۵۵ء

☆وفات شیخ ضیاء الدین صقر بن یحییٰ رحمہ اللہ، فقیہ حلب......۱۸صفر (۲۹مارچ ۱۲۵۵ء)

۶۵۴ھ......۱۲۵۶ء۔۱۲۵۷ء

☆حضور ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق مدینہ کے نواحی آتش فشاں پہاڑ آگ اگلنے لگے......

☆بغداد میں ہولناک سیلاب......

☆مسجد نبوی میں آتش زدگی......

☆ ہلاکو خان کا ظہور، باطنیوں کے ناقابلِ تسخیر قلعے اَلَمُوت پر قبضہ

☆ وفات نجم الدین رازی رحمہ اللہ، صوفی بزرگ

☆ وفات ابوالمظفر سبط ابن جوزی رحمہ اللہ، مصنف، مؤرخ، ادیب......۲۱ ذوالحجہ (۹ جنوری ۱۲۵۷ء)

۶۵۵ھ......۱۲۵۷ء

☆ ہلاکو خان کا اَلَمُوت پر قبضہ۔ باطنیوں کی سلطنت کا خاتمہ

☆ بغداد میں شیعہ سنی فسادات

☆ ہلاکو خان کی بغداد کی طرف پیش قدمی......

☆ رکن الدین بیبرس شام چھوڑ کر دربارِ مصر سے وابستہ......

☆ سلطانِ مصر عزالدین ترکمانی اپنی بیگم شجرۃ الدرّ کی سازش سے قتل......

☆ ملکہ شجرۃ الدرّ عزالدین ترکمانی کے وفاداروں کے ہاتھوں قتل

☆ قطز کی نگرانی میں عزالدین کا کم سن لڑکا نورالدین المنصور کے لقب کے ساتھ شاہِ مصر مقرر

۶۵۶ھ......۱۲۵۸ء

☆ ہلاکو خان بغداد کے باہر پہنچ گیا، محاصرے کا آغاز......۱۲ محرم ۶۵۶ھ (۱۹ جنوری ۱۲۵۸ء)

☆ خلیفہ مستعصم باللہ مع خاندان قتل، خلافت عباسیہ بغداد کا خاتمہ......۱۴ صفر ۶۵۶ھ (۳ مارچ ۱۲۵۸ء)

☆ بغداد میں قتل عام، ۱۸ لاکھ افراد شہید......

چھٹا باب

اہم سوالات کے جوابات

ان صفحات میں ان سوالات کے جوابات دیے جا رہے ہیں جن کا تعلق تاریخ سے ہے اور بالمشافہہ یا بذریعہ ڈاک یا دیگر ذرائع (ای میل، فیس بک، واٹس ایپ) سے ان مسائل کی بابت وضاحت چاہی گئی۔ راقم نے پوری کوشش کی ہے کہ اعتدال اور انصاف کے دائرے میں رہتے ہوئے قارئین کو وہی بات بتائی جائے جو دلائل کی روشنی میں ثابت ہو۔ واللہ الموفق

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں اشکالات

﴿سوال﴾ ایک روایت ہے کہ امام ابوحنیفہ نے علوم حاصل کرنے سے پہلے غور کرنا شروع کیا کہ کس علم سے کیا عہدہ اور کتنا پیسہ ملے گا، انہوں نے قاری، محدث، شاعر، علم کلام کے ماہر سمیت ہر علم سے ملنے والے مرتبے پر غور کیا۔ قاری بننے کا انجام یہ معلوم ہوا کہ مسجد میں بیٹھ کر قرآن پڑھانا ہوگا، آس پاس بچے بیٹھے ہوں گے، پھر کوئی بڑا قاری نکل آیا تو مقام و مرتبہ خاک میں مل جائے گا۔ محدث بننے کی انتہاء یہ معلوم ہوئی کہ بڑھاپے میں حافظہ کمزور ہوگیا اور بچے آ کر حدیث پڑھیں گے، کوئی روایت غلط نقل ہوگئی تو ''کذاب'' کی تہمت لگ جائے گی۔ علم کلام سیکھنے سے یوں رُک گئے کہ اعتقادی مباحث میں کہیں پھسل گیا تو زندیق ہونے کا الزام لگ جائے گا۔ چنانچہ ان تمام علوم کو امام صاحب نے مسترد کر دیا۔ پھر معلوم ہوا کہ فقہ سیکھ کر وہ قاضی بن سکتے ہیں تو فقہ سیکھنا شروع کر دی۔[1]

کیا یہ روایت درست ہے؟

﴿جواب﴾ یہ روایت قطعاً من گھڑت ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ امام صاحب سرکاری عہدے کے طالب تھے، جبکہ ان کی زندگی گواہ ہے کہ وہ حکمرانوں کے اصرار کے باوجود سرکاری عہدوں کو بار بار ٹھکراتے رہے اور عمر بھر عہدوں سے دور رہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ اس روایت کو مسترد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں بعض راوی ثقہ نہیں۔

اس کے بعد حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس کے موضوع ہونے کے کئی ثبوت پیش کیے ہیں: پہلا یہ کہ مسجد سے بہتر کوئی جگہ نہیں اور معصوم بچوں کو قرآن مجید پڑھانے سے بہتر کوئی عمل نہیں، تو امام ابوحنیفہ اس کام کو کیسے حقیر سمجھ سکتے تھے۔

اسی طرح اس روایت میں ہے کہ انہوں نے علم حدیث کو بچوں کی صحبت اور حافظے میں فرق آنے کے خوف سے نہیں سیکھا، حالانکہ یہ ثابت ہے کہ انہوں نے محدثین کی صحبت اختیار کی اور حدیث سیکھنے میں بڑی محنت کی۔ نیز بچوں کے حدیث سیکھنے کا سلسلہ تیسری صدی ہجری کے بعد شروع ہوا۔ اُس زمانے میں تو بڑے بڑے علماء حدیث سیکھا کرتے تھے اور فقہ کے لیے قرآن کے بعد حدیث ہی سب سے اہم مأخذ ہے۔ امام صاحب اس سے بے نیاز کیسے ہو سکتے تھے۔ من گھڑت ہونے کا ایک اور واضح ثبوت یہ ہے کہ اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ امام صاحب نے ''علم کلام'' سیکھنے کا ارادہ کیا۔ نظرت فی الکلام مایکون آخرہ، حالانکہ ان کے زمانے میں علم کلام کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

چنانچہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں کہتا ہوں، اللہ اس شخص کو ہلاک کرے جس نے یہ کہانی گھڑی ہے۔ کیا اُس دور میں علم کلام کا کوئی وجود تھا؟؟''[2]

---

① الطبقات السنية في تراجم الحنفية: ۲۶/۱
② سير اعلام النبلاء: ۳۹۵/۶ تا ۳۹۷

امام ابوحنیفہ اور خروج کی حمایت

﴿سوال﴾ کیا امام اعظم رحمہ اللہ علویوں کے خروج کے حامی تھے؟ اس بارے میں مشہور روایات کیسی ہیں؟

﴿جواب﴾ ان روایات کی حیثیت ان کی اسناد کا جائزہ لے کر ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ ایسی روایات متعدد کتب میں منقول ہیں مگر ہم صرف قدیم مآخذ کا جائزہ لیں گے۔ اگر ان میں یہ بات ثابت نہ ہو سکے تو بعد والے مآخذ کی روایات کا بے وزن ہونا خود ظاہر ہو جائے گا۔ قدیم روایات کو ہم مصنفین کے زمانے کے لحاظ سے بالترتیب نقل کر رہے ہیں:

(۱) امام بلاذری رحمہ اللہ (م ۲۷۹ھ) کی روایت:

(زید بن علی نے) امام ابوحنیفہ کی طرف پیغام بھیجا۔ ان پر خوف سے غشی طاری ہونے لگی، فرمایا: ان (زید) کے پاس فقہاء میں سے کون کون آتا ہے؟ کہا گیا: سلمۃ بن کہیل، یزید بن ابی زیاد، ہاشم البرند اور ابوہاشم الرمانی وغیرہ۔ فرمایا: مجھ میں خروج کی طاقت نہیں۔ اور زید بن علی کی طرف مال بھیج کر ان کو تقویت دی۔[۱]

نقد: ہماری تلاش کے مطابق امام صاحب رحمہ اللہ کی طرف سے خروج میں اعانت کی یہ سب سے قدیم روایت ہے جسے بلاذری (م ۲۷۹ھ) نے نقل کیا ہے۔ یہ نہایت ضعیف ہے؛ کیوں کہ بلاذری نے اس کی کوئی سند بیان نہیں کی۔[۲]

(۲) عبداللہ بن احمد بن حنبل رحمہ اللہ (م ۲۹۰ھ) سے منقول روایات:

❶ ابواسحٰق فزاری کا بھائی ابراہیم کے ساتھ خروج میں شریک ہو کر مارا گیا۔ انہیں معلوم ہوا کہ بھائی نے امام ابوحنیفہ سے جواز کا فتویٰ لیا تھا۔ پس ابواسحٰق امام صاحب سے ملے اور پوچھا: آپ میرے بھائی کو فتویٰ دیتے تھے کہ وہ ابراہیم کے ساتھ خروج میں شریک ہو؟ امام صاحب بولے: "ہاں اور وہ تم سے بہتر تھا۔"[۳]

نقد: یہ روایت قابلِ استدلال نہیں کہ اس کا ایک راوی یزید بن یوسف الرجبی ضعیف ہے۔[۴]

❷ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کے سامنے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ذکر کیا گیا تو بولے:

"تم میرے سامنے ایسے شخص کا ذکر کر رہے ہو جو امت محمدیہ پر تلوار کا استعمال جائز سمجھتا ہے۔"[۵]

---

(۱) وبعث الیٰ ابی حنیفة فکاد یغشیٰ علیه فرقاً وقال من اتاہ من الفقهاء؟ فقیل له: سلمة بن کھیل، ویزید بن ابی زیاد، وھاشم البرند وابو ھاشم الرمانی وغیرھم، فقال لست اقویٰ علی الخروج. وبعث الیه بمال قواہ به." ﴿انساب الاشراف بلاذری: ۲۳۹/۳﴾

(۲) البتہ اس سے ایک دو صفحات پیچھے بلاذری زید بن علی رحمہ اللہ کے خروج کے واقعات بیان کرنا شروع کرتے وقت "عباس بن ہشام عن ابیہ عن ابی مخنف"...... "مدائنی عن اشیاخ"...... اور "عبداللہ بن صالح، عن عبثر بن القاسم بن زبید وابن کناسۃ" کی مرکب سند بیان کرتے ہیں۔ عبداللہ بن صالح (م ۲۲۲ھ) صدوق، ابن کناسۃ (۲۰۷ھ) صدوق اور عبثر بن قاسم (م ۱۷۹ھ) ثقہ ہیں۔ مدائنی بھی معتبر ہیں مگر ان کے "اشیاخ" مجہول ہیں۔ عباس بن ہشام، اس کا باپ ہشام کلبی اور ابو مخنف یہ تینوں متعصب شیعہ راوی ہیں۔ بلاذری اگر واقعے کے ہر ٹکڑے کے ساتھ اس کی سند ذکر کرتے تو تحقیق کرنا ممکن تھا کہ کونسا حصہ معتبر ہے اور کونسا ضعیف۔ مگر انہوں نے ایک بار مرکب سند بیان کرنے کے بعد جگہ جگہ واقعے کے ٹکڑوں کو "قالوا" کی تکرار کے ساتھ نقل کیا ہے۔ مطلب یہ کہ اس واقعے کو ان افراد کی جماعت نے ملا جلا نقل کیا ہے۔ اب یہ معلوم کرنا ممکن نہیں کہ روایت کا کونسا ٹکڑا کس راوی نے نقل کیا ہے؛ اس لیے پوری روایت ہی مشکوک ہو جاتی ہے۔

(۳) فقلت له "تفتی اخی بالخروج معه یعنی ابراھیم؟" قال: نعم وھو خیر منك...... ﴿السنة، عبد اللّٰہ بن احمد، ح: ۳۶۷﴾

(۴) ذہبی کے نزدیک ضعیف ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں "واہٍ" ﴿تقریب التھذیب، تر: ۷۷۹۴﴾

(۵) "تاتینی برجل یری السیف علیٰ امة محمد صلی الله علیه وسلم." ﴿السنة عبد اللّٰہ بن احمد، روایت نمبر: ۳۸۳﴾

نقد: اس روایت کی سند میں ایک راوی مجہول ہے جسے "عمن حدثه عن ابن المبارك" کہہ کر بیان کیا گیا ہے۔ پھر یہ روایت ظاہر کرتی ہے کہ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے اتنے نالاں تھے کہ ان کا ذکر سننا بھی پسند نہ کرتے تھے، حالانکہ انہوں نے خود علمِ فقہ امام صاحب سے سیکھا تھا، وہ اپنے استاد سے اظہارِ نفرت کیوں کرتے!![1]

③ ابوالفرج اصفہانی (م ۳۵۶ھ) سے منقول روایات:

❶ محمد بن جعفر کہتے تھے کہ اللہ ابوحنیفہ پر رحم کرے زید بن علی کی نصرت کی وجہ سے ان کی ہم سے محبت ثابت ہوگئی۔[2]

❷ فضل بن زبیر کہتے ہیں، امام ابوحنیفہ نے کہا: زید کے پاس اس بارے میں فقیہ حضرات میں سے کون کون آتا ہے؟ کہا گیا: سلمۃ بن کہیل، یزید بن ابی زیاد، ہارون بن سعد، ہاشم البرید، ابوہاشم الرمانی اور حجاج بن دینار وغیرہ۔ فرمایا: زید سے کہو کہ میرے پاس آپ کے لیے آپ کے دشمنوں کے خلاف جہاد کے لیے تعاون اور طاقت موجود ہے، پس آپ اس سے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے سواریوں کا انتظام کر لیں۔[3]

❸ ہم سے ابونعیم نے بیان کیا کہ میں نے امام زفر کو کہتے سنا کہ ابوحنیفہ ابراہیم کے قضیے میں کھلم کھلا سخت تقاریر کیا کرتے تھے اور لوگوں کو ان کے ساتھ خروج کا فتویٰ دیتے تھے، پس میں نے ان سے کہا:

---

① عبداللہ بن مبارک تو امام صاحب کی بُرائی سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک شخص نے امام صاحب کو برا بھلا کہا تو عبداللہ بن مبارک نے کہا: "كان يجمع القرآن في ركعتين في ليلة، وتعلمت الفقه الذي عندي من ابن حنيفة." "وہ تو پورے قرآن کو دو رکعت میں ایک ہی رات میں ختم کرتے تھے اور میں نے جو فقہ سیکھی ہے، انہی سے تو سیکھی ہے۔ (اخبار ابی حنیفة واصحابه للصيمري، ص ٨٤)

امام ابوحنیفہ کی مذمت پر مشتمل ایسی کئی اور روایات عبداللہ بن احمد نے "السنة" میں نقل کی ہیں جنہیں خود حنبلی حضرات بھی تعصب پر مبنی سمجھتے ہیں۔ مثلاً:

☆ بعض روایات میں امام ابوحنیفہ، ان کی اولاد اور تلامذہ کو قرآن کے مخلوق ہونے کا قائل بلکہ اس گمراہی کا بانی بتایا گیا ہے۔ (روایات ۱۹۵، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۸)

☆ بعض روایات میں انہیں منکرِ شریعت، عقل پرست اور فرقہ جہمیہ کا پیروکار کہا گیا ہے۔ (روایات: ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۷)

☆ بعض روایات میں انہیں مرجئہ، بدعتی، خارجی اور امت کا خون بہانے والا مشہور کیا گیا ہے۔ (روایات: ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۴۲)

☆ بعض روایات میں انہیں دین کا دشمن اور بے دین بتایا گیا ہے۔ (روایات: ۲۴۶، ۲۵۴)

حقیقت یہ ہے کہ اس مجموعے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے متعلق ہر قسم کی اچھی بُری روایات جمع کر دی گئی ہیں۔ ہم عبداللہ بن احمدؒ پر اعتراض اس لیے نہیں کرتے کہ روایات کو نقل یا جمع کرنے اور ان سے استدلال کرنے میں اصولی فرق ہے۔ عبداللہ بن احمد خود فرماتے تھے: "لم يصح عندنا ان اباحنيفة رحمه الله قال: القرآن مخلوق...... هومن العلم والورع والزهدو ايثار الدار الآخرة بمحلّ لايدركه فيه احمد، ولقد ضرب بالسياط علىٰ ان يلى القضاء لابى جعفر فلم يفعل." (ہمارے نزدیک یہ بات صحیح سند سے ثابت نہیں کہ امام ابوحنیفہ قرآن کو مخلوق کہتے ہوں...... وہ تو علم، تقویٰ، زہد اور آخرت کو ترجیح دینے میں اس مقام پر تھے جسے امام احمد بھی نہ پا سکے۔ انہیں کوڑے مارے گئے تاکہ وہ ابوجعفر منصور کا عہدۂ قضا قبول کر لیں مگر انہوں نے ایسا نہ کیا۔) ﴿مناقب الامام ابی حنيفة وصاحبيه للذهبی، ص ٤٣﴾ آج بھی حنبلی علماء امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے تلامذہ کا ذکر احترام کے ساتھ کرتے ہیں۔ بہرکیف ایسی روایات لے کر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر خروج کے مسئلے میں تفرد اختیار کرنے سمیت کوئی بھی الزام قبول نہیں کیا جا سکتا۔

② حدثنا عبدالله بن مروان بن معاوية قال سمعت محمد بن جعفر بن محمد يقول: رحم الله اباحنيفة لقد تحققت موده لنا في نصرته زيد بن علي. ﴿مقاتل الطالبين: ١/١٤٠﴾

③ عن فضل بن الزبير قال قال ابوحنيفة من ياتي زيدا في هذاالشان من فقهاء الناس؟ فقيل له: سلمة بن كهيل، ويزيد بن ابى زياد، وهارون بن سعد، وهاشم بن البريد وابو هاشم الرماني وحجاج بن دينار وغيرهم، فقال لي: قل لزيد ا لك عندى معونة وقوة علىٰ جهاد عدو ك، فاستعن بها انت واصحابـ لك في الكراع. ﴿مقاتل الطالبين: ١/١٤١﴾

''بخدا آپ اس وقت تک نہیں رکیں گے جب تک ہماری گردنوں میں پھندے نہ ڈال دیے جائیں۔'' ①

❹ ابو اسحٰق فزاری کہتے ہیں کہ میں ابوحنیفہ کے پاس گیا اور کہنے لگا: ''آپ کو اللہ سے ڈر نہ لگا جب آپ نے میرے بھائی کو ابراہیم بن عبداللہ کے ساتھ خروج کا فتویٰ دیا یہاں تک کہ وہ مارا گیا۔'' وہ بولے: ''تمہارا بھائی جہاں قتل ہوا ہے، وہاں اس کا قتل ہونا اس کے غزوۂ بدر میں شہید ہونے کے برابر ہے۔ ابراہیم کے ساتھ اس کا شہید ہو جانا اس کے لیے زندگی سے بہتر ہے۔'' میں نے کہا: ''پھر آپ کیوں نہ گئے؟'' بولے: ''ان امانتوں کی وجہ سے جو میرے پاس رکھی ہیں۔'' ②

❺ عبداللہ بن ادریس سے مروی ہے کہ میں نے ابوحنیفہ کو کہتے سنا جب وہ منبر پر کھڑے تھے اور دو شخص ان سے ابراہیم کے ساتھ خروج کرنے کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ امام صاحب نے کہا: ''روانہ ہو جاؤ۔'' ③

❻ ابو اسحٰق فزاری نے کہا: جب ابراہیم نے خروج کیا تو میرے بھائی نے جا کر ابوحنیفہ سے مسئلہ پوچھا، اس نے خروج کا مشورہ دیا تو وہ ابراہیم کے ساتھ قتل ہوا۔ پس میں ابوحنیفہ کو کبھی پسند نہیں کر سکتا۔ ④

❼ حسن بن حسین اور دوسرے لوگوں کا بیان ہے کہ ابراہیم بن عبداللہ نے جب عیسیٰ بن موسیٰ عباسی کی طرف پیش قدمی کی تو ابوحنیفہ نے ان کو لکھا کہ جب اللہ تمہیں عیسیٰ بن موسیٰ اور اس کے ساتھیوں پر غلبہ دے تو ان کے ساتھ ویسا سلوک نہ کرنا جیسا تمہارے باپ (علی رضی اللہ عنہ) نے اہلِ جمل کے ساتھ کیا تھا کہ نہ تو شکست کھانے والوں کو قتل کیا، نہ مال لوٹا، نہ بھاگنے والے کا تعاقب کیا اور نہ زخمی کو قتل کیا۔ ⑤

❽ ''ابراہیم بن سوید کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہ سے سوال کیا۔ وہ ابراہیم کے (خروج کے) دنوں میں میری بڑی عزت کیا کرتے تھے۔ میں نے پوچھا: فرض حج کے بعد آپ کو خروج پسند ہے یا حج؟ انہوں نے فرمایا: ''فرض حج کے بعد جہاد کرنا پچاس حج کرنے سے افضل ہے۔'' ⑥

نقد: مذکورہ آٹھوں روایات ابوالفرج اصفہانی (۲۸۴ھ-۳۵۶ھ) نے نقل کی ہیں۔ اصفہانی خود شیعہ تھے،

① حدثنا ابو نعيم قال سمعت زفر بن هذيل يقول: كان ابوحنيفة يجهر في امر ابراهيم جهرا شديدا ويفتي الناس بالخروج معه. فقلت والله ما انت بمنته عن هذا حتى نؤتى فتوضع في اعناقنا الحبال. ﴿مقاتل الطالبين: ۱/۳۰۱﴾

② عن عبدالله بن ادريس قال سمعت اباحنيفة وهو قائم على درجته ورجلان يستفتيانه في الخروج مع ابراهيم وهو يقول: اخرجا. (مقاتل الطالبين: ۱/۳۱۲)

③ قال ابو اسحق الفزاري: جئت اباحنيفة فقلت له: ما اتقيت الله حين افتيت اخي بالخروج مع ابراهيم بن عبدالله بن الحسن حتى قتل؟ فقال قتل اخيـ لك حيث قتل يعدل قتله لو قتل يوم بدر، وشهادته مع ابراهيم خير له من الحياة، فقلت له ما منعـ لك أنت من ذا لك؟ فقال: ودائع للناس كان عندى. ﴿مقاتل الطالبين: ۱/۳۱۲﴾

④ عن ابي اسحق الفزاري قال لما خرج ابراهيم ذهب اخي الى ابي حنيفة فاستفتاه، فاشار اليه بالخروج، فقتل معه فلا احب اباحنيفة ابداً. ﴿مقاتل الطالبين: ۱/۳۱۲، ۳۱٤﴾

⑤ عن الحسن بن الحسين وغيره من اصحابه: ان اباحنيفة كتب الى ابراهيم بن عبدالله لما توجه الى عيسى بن موسى: اذا اظفر لك الله بعيسى واصحابه فلا تسر فيهم سيرة ابيـ لك في اهل الجمل فانه لم يقتل المنهزم ولم يأخذ الاموال، ولم يتبع المدبر، ولم يذفف على جريح." ﴿مقاتل الطالبين: ۱/۳۱٥﴾

⑥ حدثني ابراهيم بن سويد الحنفي، قال سئلت اباحنيفة، وكان لي مكرما ايام ابراهيم، قلت ايهما احب اليـ لك بعد حجة الاسلام؟ الخروج الى هذا او الحج؟ ،قال: غزوة بعد حجة الاسلام افضل من خمسين حجة. ﴿مقاتل الطالبين: ۱/۳۲٤﴾

خطیب بغدادی کے بقول وہ ''اکذب الناس'' تھے۔ رسالے خرید کرانہیں اپنے نام سے منسوب کردیتے تھے۔ ①

ساتویں روایت کے جعلی ہونے کا ثبوت تو خود اس کے متن میں ہے۔ اس میں امام صاحب کی طرف یہ منسوب کیا جارہا ہے کہ وہ سادات کو جنگ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرت اپنانے سے منع کررہے تھے۔ جبکہ امام صاحب اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ایسے مواقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرت ہی اسوہ اور شرعی دلیل ہے۔

اگر یہ محض ایک تاریخی واقعہ ہوتا تو شاید ہم ان روایات کو قبول کرلیتے مگر ایک اعتقادی مسئلے میں ایک امام مجتہد کے صحیح السند قول اور اس کے مشہور مذہب کے خلاف بھلا ایک ضعیف شیعہ راوی کی روایات کا اعتبار کیسے کیا جاسکتا ہے؟

④ ابوبکر جصاص الرازی رحمہ اللہ (م ۳۷۰ھ) کا تبصرہ:

> امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا زید بن علی رحمہ اللہ کے بارے میں معاملہ مشہور ہے، ان کا انہیں مال بھیجنا اور لوگوں کو خفیہ طور پر ان سے تعاون واجب ہونے کا فتویٰ دینا اور اسی طرح عبداللہ بن حسن کے بیٹوں: محمد اور ان کے بھائی ابراہیم کے بارے میں ان کا یہی معاملہ تھا۔ ②

نقد: یہ تبصرہ امام ابوبکر جصاص الرازی نے کیا ہے جو بلاشبہ عظیم حنفی فقیہ تھے مگر انہوں نے زیرِ بحث قضیے کی کوئی سند بیان نہیں کی۔ بس یہ کہا کہ یہ قضیہ مشہور ہے۔ امام جصاص اور امام ابوحنیفہ کی وفات کے درمیان ڈیڑھ سو سال سے زیادہ مدت گزری ہے۔ اب چونکہ اس دوران یہ باتیں صرف شیعہ راویوں یا مشکوک وضعیف اسناد سے منقول ہیں؛ اس لیے صاف ظاہر ہے کہ انہی کمزور روایات کو کثرتِ نقل کی وجہ سے شہرت مل گئی۔ مگر ہر مشہور بات کا صحیح ہونا لازمی نہیں۔

⑤ خطیب بغدادی رحمہ اللہ (م ۴۶۳ھ) سے منقول روایت:

> ''ابراہیم بن سوید کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہ سے سوال کیا۔ وہ ابراہیم کے (خروج کے) دنوں میں میری بڑی عزت کیا کرتے تھے۔ میں نے پوچھا فرض حج کے بعد آپ کو اس شخص کے ہمراہ خروج کرنا پسند ہے یا حج؟ وہ بولے: فرض حج کے بعد جنگ کرنا پچاس حج کرنے سے افضل ہے۔'' ③

نقد: خطیب یہ روایت الصیمری (م ۴۳۶ھ) سے اور وہ ابراہیم بن سوید (م ۱۸۰ھ) سے نقل کررہے ہیں۔ اس لیے سند کا انقطاع ظاہر ہے۔ الصیمری نے امام صاحب پر ایک مستقل تالیف ''اخبار ابی حنیفہ'' مرتب کی تھی۔ اس میں یہ روایت ذکر نہیں کی۔ اگر وہ اس روایت کے ناقل ہوتے تو اسے وہاں درج کرتے۔ پس روایت کا ضعف ظاہر ہے۔

---

① میزان الاعتدال: ۱۲۳/۳، ۱۲۴. اس جرح سے ہمارا استدلال زیرِ بحث روایات کو مسترد کرنے پر ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ الاغانی کی ہر روایت جھوٹ ہے۔

② وقضیّته فی زید بن علی مشهورة وفی حمله المال الیه وفتیاه الناس سرًّا فی وجوب نصرته والقتال معه وکذلک امره مع محمد وابراهیم ابنی عبدالله بن الحسن. ﴿احکام القرآن، ابوبکر جصاص الرازی: ۸۵/۱، ط العلمیة﴾
یادرہے کہ بعد میں کئی مفسرین مثلاً: امام فخر الدین رازی (م ۶۰۳ھ) اور نظام الدین نیشاپوری (م ۸۵۰ھ) نے اس بے سند روایت کو احکام القرآن ہی کے حوالے سے من وعن نقل کیا ہے مگر ظاہر ہے اس سے روایت میں کوئی قوت پیدا نہیں ہوجاتی۔

③ اخبرنا القاضی ابوعبدالله الحسین بن علی بن محمد الصیمری عن ابراهیم بن سوید الحنفی قال سئلت اباحنیفة، وکان لی مکرما ایام ابراهیم، قلت ایهما احب الیک بعد حجة الاسلام، الخروج الی هذا الرجل او الحج؟ قال: غزوة بعد حجة الاسلام افضل من خمسین حجة. (المتفق والمفترق: خطیب بغدادی: ۲۴۷/۱)

⑥ موفق مکی رحمہ اللہ (م ۵۶۸ھ) سے منقول روایات:

❶ عبداللہ بن مالک بن سلیمان کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ سے سنا وہ کہتے تھے کہ زید بن علی نے امام ابوحنیفہ کی طرف سفیر بھیج کر انہیں اپنی طرف دعوت دی۔ امام صاحب نے سفیر کو کہا: اگر مجھے گمان ہوتا کہ لوگ انہیں بے سہارا نہ چھوڑیں گے اور نیک نیتی کے ساتھ ان کے ہمراہ کھڑے ہوں گے تو میں بھی ان کا ساتھ دیتا اور ان کے ساتھ ان کے مخالف سے جہاد کرتا؛ کیوں کہ وہ امام برحق ہیں، لیکن مجھے خدشہ ہے کہ لوگ انہیں اسی طرح تنہا چھوڑ دیں گے جیسے ان کے باپ (حضرت حسین رضی اللہ عنہ) کو چھوڑا تھا۔ مگر میں ان کی مالی امداد کروں گا جس سے وہ اپنے مخالفین کے خلاف قوت حاصل کریں گے۔ امام صاحب نے زید بن علی کے سفیر سے کہا: انہیں میرا عذر بیان کر دینا۔ اور امام صاحب نے دس ہزار درہم انہیں بھیجے۔

میں (موفق مکی) کہتا ہوں کہ دوسری روایت کے مطابق امام صاحب نے بیماری کا عذر کیا تھا جو ان ایام میں انہیں لاحق تھی۔ اس کی وجہ سے وہ خروج میں شرکت سے پیچھے رہ گئے۔ [1]

نقد: راوی عبداللہ اپنے باپ مالک بن سلیمان سے نقل کر رہے ہیں۔ باپ بیٹا دونوں ضعیف ہیں۔ [2]

---

① حدثنا عبداللّٰه بن محمد الهروی قال انبا عبداللّٰه بن مالك بن سليمان سمعت ابی يقول كان زيد بن علی ارسل الی ابی حنيفة يدعوه الی نفسه فقال ابو حنيفة لرسوله: "لو علمت ان الناس لايخذلونه و يقومون معه قيام صدق لكنت اتبعه واجاهد معه مع من خالفه لانه امام حق ولكنی اخاف ان يخذلوه كما خذلوا اباه لكنی اعينه بمالی فيتقوی به علیٰ من خالفه، وقال لرسوله: ابسط عذری عنده، وبعث اليه بعشرة آلاف درهم، قلت وفی غيرهذه الرواية: اعتذر بمرض يعتريه فی الايام حتی تخلف عنه. ﴿مناقب ابی حنيفه، موفق مکی: ۱/ ۲۶۰﴾

نوٹ: ''موفق بن احمد المکی الخوارزمی اخطب خوارزم'' خوارزم کے مشہور فقیہ اور خطیب تھے۔ ان کی اس کتاب کو ''مناقب الموفق'' یا ''مناقب للمکی'' بھی کہا جاتا ہے۔ موفق مکی تشیع اور اعتزال کی طرف میلان رکھتے تھے۔ نقل روایت میں محتاط نہیں تھے۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ایک کتاب ''فضائل علی'' لکھی جس کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں کمزور روایات بہت زیادہ ہیں۔ (تاریخ الاسلام ذہبی: ۳۹/ ۳۲۷)

موفق مکی یقیناً بڑے عالم تھے۔ مناقب ابی حنیفہ میں انہوں نے اکثر روایات کی سند بھی بیان کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مجموعی لحاظ سے ان کی یہ کتاب قابلِ تحسین ہے۔ اس میں شامل روایات دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف کی نگاہ بہت وسیع تھی۔ بعد میں امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ پر تحقیق کرنے والا کوئی عالم اس کتاب سے مستغنی نہیں رہ سکا۔ اگر اس تالیف میں شامل بہت سی روایات سنداً ضعیف بھی ہوں تو انہیں قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں؛ کیوں کہ فضائل ومناقب اور تاریخی واقعات میں ضعیف روایات کو قبول کرنے کی خاصی گنجائش ہے۔ مگر ہر ضعیف روایت کو ہر حال میں من وعن قبول کر لینا کوئی عقل کی بات نہیں۔ جب تک کسی ضعیف روایت کے خلاف کوئی قوی قرینہ موجود نہ ہو، اس کی تردید لازم نہیں۔ لیکن یہاں امام اعظم رحمہ اللہ کو تحریکاتِ خروج کا حامی مشہور کرنا چونکہ خود امام صاحب سے منقول عقائد کی روایات کے خلاف ہے؛ اس لیے ان ضعیف روایات سے استدلال کرنا خلاف اصول ہے۔ موفق مکی پر اعتراض اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے امام طبری اور دوسرے قدیم مؤرخین کی طرح صرف جمع روایات کا کام کیا ہے۔ روایات جمع کرنا الگ بات ہے اور استدلال کرنا الگ۔ جمع روایات میں ہر جامع اور ناقل نے اپنی اپنی شرائط رکھیں، کسی نے سخت، کسی نے نرم۔ مگر استدلال کی شرائط مختلف ہیں۔ پھر تاریخی استدلال کے اصول الگ ہیں اور شرعی استدلال کے الگ۔ اس لیے موفق مکی یا دیگر ناقلین نے اگر ایسی روایات جمع کی ہیں تو ان کے فن پر حرف گیری نہیں کی جا سکتی۔ غلطی ان لوگوں کی ہے جنہوں نے مذکورہ روایات دیکھ کر یہ پرچار شروع کر دیا ہے کہ احناف کا اصل مذہب فاسق اور ظالم کے خلاف خروج کرنا ہے۔ یہ نہ سوچا کہ امام صاحب کا فتویٰ اس کے خلاف ہے۔

② اس روایت کا مدار عبداللہ بن مالک اور ان کے والد مالک بن سلیمان پر ہے۔ دونوں ضعیف ہیں۔ امام دارقطنی فرماتے ہیں: هو وابوه من خبثاء المرجئة. (موسوعة اقوال الدارقطني: ۱۹۳۲) مالک بن سلیمان کے بارے میں ابن حبان فرماتے ہیں: واہ۔ (الثقات، تر: ۱٤٨٤٤) ابن جوزی فرماتے ہیں: ''وہ ثقہ راویوں سے ایسی روایات نقل کرتے ہیں جو معتبر رواۃ کی روایت سے مشابہ نہیں ہوتیں۔ (الضعفاء والمتروکون، تر: ۲۸۲۳) امام نسائی بھی ضعیف کہتے ہیں۔ ابن حبان نے تدلیس کا الزام بھی لگایا ہے۔ (طبقات المدلسین لابن حجر، ص ۵۷)

موفق مکی رحمہ اللہ نے امام صاحب کے بیمار ہونے کے باعث اس خروج میں شرکت نہ کر سکنے کی جو روایت نقل کی ہے، اس کی کوئی سند ہی بیان نہیں کی۔ پس ضعف ظاہر ہے۔

❻ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ہشام بن عبدالملک کے خلاف زید بن علی رحمہ اللہ کے خروج کو غزوۂ بدر کے مشابہ قرار دیا۔ جب پوچھا گیا کہ پھر آپ ان کے ساتھ کیوں نہ نکلے؟ تو فرمایا:

''لوگوں کی امانتوں نے مجھے روک لیا، میں نے ابن ابی لیلیٰ کے پاس رکھوانا چاہیں مگر انہوں نے قبول نہ کیا، میں ڈرا کہ کہیں ایسے حال میں نہ مرجاؤں کہ ان کے مالکان مجہول رہ جائیں۔''[1]

نقد: موفق مکی رحمہ اللہ نے اس روایت کی کوئی سند بیان نہیں کی۔ بس ''وفی روایۃ اخریٰ'' کہہ کر نقل کر دیا ہے۔

⑦ محی الدین عبدالقادر بن محمد حنفی رحمہ اللہ (م ۷۷۵ھ) کی روایت:

عبداللہ بن مالک بن سلیمان سے روایت ہے کہ زید بن علی نے امام ابوحنیفہ کی طرف پیغام بھیج کر انہیں بیعت کی دعوت دی۔ امام صاحب نے کہا: اگر مجھے گمان ہوتا کہ لوگ انہیں بے سہارا نہ چھوڑیں گے جیسے ان کے باپ کو چھوڑا تھا تو میں ان کے ساتھ جہاد کرتا؛ کیوں کہ وہ امام برحق ہیں۔ لیکن میں ان کی مالی مدد کروں گا۔ ایک روایت میں ہے کہ بیماری لاحق ہونے کا عذر کیا۔ اور دونوں عذر جمع ہو جانے میں کوئی مانع نہیں۔

پھر انہیں دس ہزار درہم بھیجے اور قاصد سے کہا کہ انہیں میرا عذر بتا دینا۔ جب پوچھا گیا کہ پھر آپ ان کے ساتھ کیوں نہ نکلے تو فرمایا: ''لوگوں کی امانتوں نے مجھے روک لیا، میں نے ابن ابی لیلیٰ کے پاس رکھوانا چاہیں مگر انہوں نے قبول نہ کیا، میں ڈرا کہ کہیں مرجاؤں اور ان کے مالکان کی شناخت ناممکن ہو جائے۔''[2]

نقد: سند سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت محی الدین حنفی نے عبداللہ بن مالک بن سلیمان سے اور انہوں نے براہ راست امام صاحب سے نقل کی ہے۔ حالانکہ یہ ممکن نہیں۔ محی الدین حنفیؒ آٹھویں صدی ہجری کے ہیں اور عبداللہ بن مالک تیسری صدی ہجری کے۔ دونوں کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے۔ پس روایت منقطع اور نہایت ضعیف ہے۔

⑧ جمال الدین حسینی (م ۸۲۸ھ) کی روایت:

جمال الدین حسینی کی ایک روایت میں ابراہیم کے خروج کے ذکر کے تحت منقول ہے: ''فقیہ امام ابوحنیفہ نے ابراہیم

---

① وفی روایۃ اخری سئل عن الجهاد معه فقال خروجه یضاهی خروج رسول الله ﷺ غزوة بدر، فقیل له: لم تخلفت عنه؟ قال لاجل ودائع كانت عندی للناس عرضتها علیٰ ابن لیلیٰ فما قبلها فخفت ان اقتل مجهلاً للودائع، وكان یبكی كلما ذكر مقتله. (مناقب ابی حنیفه للمكی: ۱/۲٦۰)

② عن عبدالله بن مالك بن سلیمان سمعت قال ارسل زید الیه یدعوه الی البیعة فقال: "لو علمت ان الناس لا یخذلونه كما خذلوا اباه لجاهدت معه لانه امام حق ولكن اعینه بمالی فبعث الیه بعشرة آلاف درهم وقال للرسول ابسط عذری و فی روایة اعتذر بمرض یعتریه ولا منع من الجمع وسئل عن خروجه فقال: ضاهیٰ خروجه خروج رسول الله صلی الله علیه وسلم یوم بدر." فقیل له: لم تخلفت؟ قال: حبسنی ودائع الناس، عرضتها علیٰ ابن لیلیٰ فلم یقبل فخفت ان اموت مجهلاً وكان كلما ذكر خروجه بكی." ﴿الجواهر المضیة فی طبقات الحنفیة: ۱/٤۹٦﴾

درحقیقت یہ روایت وہی ہے جس کی سند میں موفق مکی نے عبداللہ اور ان کے والد مالک بن سلیمان کا ذکر کیا ہے۔ اس سند کی حیثیت اوپر گزر چکی ہے؛ اس لیے اس کے ضعف میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔

سے بیعت کرلی تھی۔'' آگے لکھتے ہیں کہ: ''ایک خاتون کا لڑکا ابراہیم کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا تو امام صاحب نے تعزیت کرتے ہوئے کہا: ''کاش! تیرے بیٹے کی جگہ میں ہوتا۔''①

نقد: یہ روایت ضعیف ہے؛ کیوں کہ مصنف جمال الدین ابن عنبہ الحسینی (م ۸۲۸ھ) متعصب شیعہ ہیں۔

نتیجہ: ایک بھی صحیح السند روایت ایسی نہیں جو امام صاحب کو علویوں کے خروج کا حامی ثابت کرتی ہو۔

واحد روایت جو ضعف کے باوجود بڑی حد تک قابلِ اعتماد ہے:

امام ابوحنیفہ کے حالات کا سب سے قدیم اور معتبر ماٰخذ ابوعبداللہ الصیمری رحمہ اللہ (۳۵۱ھ-۴۳۶ھ) کی ''اخبار ابی حنیفہ'' (مناقب الامام ابی حنیفہ) ہے۔ مصنف بغداد کے قاضی اور حنفی فقیہ تھے، شیخ الحنفیہ کہلاتے تھے۔ ان کی کتاب میں امام صاحب کے حالات پر مشتمل روایات سند کے ساتھ ہیں۔ بعض کی سند عمدہ ہے اور بعض کی ضعیف۔ ان روایات میں سے کسی میں بھی خروج کی حمایت کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ ایک روایت میں حکومت پر تنقید اور اس کی پاداش میں جیل جانے کا ذکر ہے۔ یہ عمل امام صاحب کی فقاہت اور فتوے کے عین مطابق ہے۔ روایت یہ ہے:

فضل بن دکین نقل کرتے ہیں، امام زفر سے مروی ہے کہ جب بصرہ میں ابراہیم نے خروج کیا تو امام صاحب بلند آواز سے سخت تقاریر کیا کرتے تھے یہاں تک کہ میں نے ان سے کہا: بخدا! آپ اس وقت تک نہ رکیں گے جب تک ہماری گردنوں میں پھندے نہ ڈال دیے جائیں۔ اس کے بعد منصور نے عیسیٰ بن موسیٰ کو جو والی کوفہ تھا، لکھا کہ ابوحنیفہ کو پکڑ کے بغداد بھیج دو۔ پس وہ بغداد آئے اور پھر وہیں وفات پائی۔ اس وقت وہ ستر سال کے تھے، ابونعیم (فضل بن دکین) کہتے ہیں انہیں کوئی چیز پلائی گئی تھی جس سے وہ مر گئے۔

اور مجھے خبر دی گئی کہ جب وہ منصور کے پاس حاضر ہوئے تو منصور نے ان کے لیے ستو منگوایا اور پینے کا حکم دیا، انہوں نے انکار کیا۔ منصور نے کہا: ضرور پینا پڑے گا۔ انہوں نے پھر انکار کیا۔ منصور نے زبردستی کی تو انہوں نے پی لیا۔ پھر فوراً اٹھ کر چل دیے۔ منصور نے پوچھا: کہاں چلے؟ فرمایا: جہاں لے جانے کے لیے تم مجھے یہاں لائے ہو۔ پس منصور نے انہیں جیل بھیج دیا۔ جیل ہی میں وہ فوت ہوئے۔②

---

① ان اباحنیفة الفقیه بایعه...... لیتنی کنت مکان ابنك...... ﴿عمدة الطالب فی انساب ابی طالب: ۸۷/۱﴾

② کان ابوحنیفة یجهر حین خرج ابراهیم بالبصرة جهرا شدیدا فقلت واللّٰه ما انت بمنته حتی توضع فی اعناقنا الحبال، فلما کان بعد ذالك کتب المنصور الی عیسیٰ بن موسیٰ وهو علی الکوفة، ان یحمل اباحنیفة الی بغداد، قال ابونعیم فغدوت ارید اباحنیفة فلقیته راکبا یرید وداع عیسیٰ وقد کاد وجهه یسود خوفا، فقدم بغداد، فمات فیها، وهو ابن سبعین سنة، قال ابونعیم سقی شربة فمات منها، واخبرت انه لما حضر بین یدی المنصور، دعا له بسویق، وامره بشربة فامتنع، فقال لتشربنه، فامتنع، فاکرهه حتیٰ شربه، ثم قام مبادرا، فقال له ابوجعفر، الیٰ این؟ قال حیث بعثت بی، فمضیٰ به الی السجن، فمات فی السجن. ﴿اخبار ابی حنیفة: ۹۲/۱، ۹۳﴾

اہم نکات: ❶ یہ بات نوٹ کریں کہ اس روایت کو مقاتل الطالبین میں ابوالفرج اصفہانی شیعی نے بھی نقل کیا ہے مگر اس میں...... ''کان ابوحنیفة یجهر فی امر ابراهیم جهرا شدیدا'' کے ساتھ '' ویفتی الناس بالخروج معه'' کا اضافہ بھی پیش کیا ہے۔ جبکہ الصیمری نے صرف حکومت پر تنقید کا ذکر کیا ہے، خروج کے فتوے کا نہیں۔ پس یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے کہ امام ابوحنیفہ کی طرف خروج کے فتوے کی نسبت شیعی راویوں کا کام ہے۔

بقیہ اگلے صفحے کے حاشیے پر

اس روایت کی سند بھی ضعیف ہے، تاہم اس کے حاصلِ مطلب کو ماننے میں کوئی حرج نہیں؛ کیوں کہ اس سے فقط اتنا ثابت ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نفسِ زکیہ اور ابراہیم کے خروج کے قضیے میں حکام پر تنقید کرتے تھے اور ان کی ہمدردیاں علویوں کے ساتھ تھیں۔ ظاہر ہے اس پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔ علوی حسب ونسب کے لحاظ سے امویوں اور عباسیوں سے افضل تھے۔ مگر چونکہ عباسی قرآن وسنت کی بالادستی کا منشور لے کر اور علویوں کو ساتھ ملا کر کھڑے ہوئے تھے؛ اس لیے ابتداء میں امام صاحب نے بھی ان کی بیعت کر لی۔ مگر جب عباسیوں کی طرف سے ظلم وستم شروع ہوا تو امام صاحب کا عباسیوں سے بے زار ہونا اور علویوں کو مظلوم سمجھنا بھی ایک فطری بات تھی۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ

اب متن میں مذکور صیمری کی روایت کی سند دیکھیے: محمد بن عمران بن موسیٰ المَرزُباني ..... حسن بن محمد المخرمي ..... محمد بن عثمان (بن ابی شیبه) ..... نصربن عبدالرحمن بن بكار الوشاء ..... فضل بن الدكين ..... زفر بن هذيل ..... مَرزُبانی (م۳۸۴ھ) کو معتزلی شمار کیا گیا ہے اور ان کی روایتوں میں جھوٹ کا شبہ ظاہر کیا گیا ہے۔ بعض نے انہیں ثقہ بھی کہا ہے۔ ﴿سیر اعلام النبلاء: ۱۶/ ۴۴۸﴾

محمد بن عثمان بن ابی شیبہ (م ۲۹۷ھ) کو بعض نے ثقہ اور بعض نے لاباس بہ کہا ہے۔ بعض نے ان پر سخت جرح کی ہے۔ ﴿میزان الاعتدال، تر: ۷۹۴۳، ۶۴۳﴾

نصر بن عبدالرحمٰن اور فضل بن دکین یعنی ابونعیم ثقہ ہیں۔ امام زفر کا ثقہ ہونا کسی دلیل کا محتاج نہیں۔ البتہ حسن بن محمد مخرمی کا پتا نہیں چل سکا کہ کون ہیں۔

❷ واقعے کے بعض ٹکڑے جو ابونعیم نے الگ سے بیان کیے ہیں اور جن میں امام صاحب کی موت کا سبب مذکور ہے، وہ سند کے لحاظ سے منقطع ہیں؛ کیوں کہ ابونعیم ان کے عینی شاہد نہیں۔ پس روایت کی سند اور متن میں کمزوری ضرور ہے۔ اسی طرح امام صاحب کا چہرہ خوف سے سیاہ ہو جانا بھی بعید ہے۔

❸ اسی روایت کو خطیب بغدادی (م۴۶۳ھ) نے ذرا مختلف سند اور الفاظ کے معمولی فرق سے مختصراً نقل کیا ہے:

"كان ابو حنيفة يجهر بالكلام ايام ابراهيم جهارا شديدا ... ﴿تاريخ بغداد: ۱۳/ ۳۳﴾

خطیب بغدادی نے اس روایت کی یہ سند نقل کی ہے:

محمد بن احمد بن رزق ..... اسماعيل بن علي الخطبي ..... محمد بن عثمان (بن ابی شیبه) ..... نصربن عبدالرحمن بن بكار الوشاء ..... فضل بن الدكين ..... زفر بن هذيل.

یہ تمام راوی ثقہ ہیں البتہ محمد بن عثمان بن ابی شیبہ یہاں بھی موجود ہیں جن کی ثقاہت متنازعہ ہے۔

خطیب کی روایت میں ایک بات سخت مشکوک ہے کہ اس میں امام صاحب کا منصور کی طلب پر بغداد جا کر پندرہ دن بعد فوت ہونا مذکور ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ امام صاحب خروج کے قضیے کے پانچ سال بعد تک حیات رہے تھے اور ۱۵۰ھ میں فوت ہوئے تھے۔ اس روایت کو امام ابوعمر یوسف بن عبدالبر القرطبی م۴۶۳ھ نے بھی نقل کیا ہے۔ ﴿الانتقاء في فضائل الثلاثة الائمه الفقهاء: ۱/ ۱۷۰﴾ اس کی سند بھی اسی طرح ضعیف ہے۔

قارئین یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ امام صاحب رحمہ اللہ کو حکومت مخالف تحریکوں کا ہمدرد وسرپرست ثابت کرنا ان کی تعریف وتوصیف نہیں، ان کی تنقیص ہے۔ یہی وہ مشہور الزام ہے جو ان کے مخالف بعض قدیم علماء نے ان پر لگایا تھا۔ ہمیں زیب نہیں دیتا کہ اس الزام کو تمغۂ امتیاز سمجھ کر امام صاحب کی طرف منسوب کر دیں۔ اہلِ علم آگاہ ہیں کہ اپنے دور میں امام صاحب کا مقام ومرتبہ جتنا اونچا تھا اسی قدر ان سے حسد بھی بہت عام تھا۔

اہلِ تشیع نے ان کے مقام ومرتبے سے فائدہ اٹھا کر انہیں خروج کے مسئلے میں اپنا حامی مشہور کیا۔ جبکہ مخالف سنی علماء نے انہیں مرجئی، خارجی، عقل پرست اور بے دین کہہ کر بدنام کرنا شروع کر دیا تھا۔ ﴿السنة، عبدالله بن احمد بن حنبل، روايت نمبر: ۳۷۱﴾

یہ بھی مشہور کر دیا گیا تھا کہ "ابوحنیفہ مرجئی تھے جو امت کے خلاف تلوار چلانا درست سمجھتے تھے۔"

یہ بھی کہا جاتا تھا: "ابوحنیفہ ان احادیث کو خرافات کہتے ہیں جن میں امت پر تلوار چلانے سے منع کیا گیا ہے۔" ﴿السنة، عبدالله بن احمد بن حنبل، روايت: ۳۲۵، ۳۶۸، ۳۶۹﴾

بہر کیف کوئی شخص آج تک امام صاحب یا ان کے شاگردوں: امام ابویوسف، امام محمد اور امام زفر یا بعد کے فقہائے احناف سے ایک روایت بھی ایسی نہیں دکھا سکا جس سے یہ غلط عقیدہ ظاہر ہوتا ہو؛ لہٰذا ان روایات کی حیثیت بے بنیاد الزامات سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

یہ بھی تاریخ میں موجود ہے کہ عباسیوں نے انقلاب سے پہلے خفیہ اجلاس میں نفسِ زکیہ کو خلیفہ بنانا طے کیا تھا مگر بعد میں اس سے مکر گئے تھے۔ غالباً اس خفیہ اجلاس کی بات سفاح کی خلافت کے اعلان تک مشہور نہیں ہوئی تھی مگر منصور کے دور تک اس کا چرچا ہو چکا ہوگا۔ ظاہر ہے اس حوالے سے ہر شخص عباسیوں کو زیادتی کا مرتکب مانے گا۔

ان تمام پہلوؤں کے ہوتے ہوئے امام صاحب کا علویوں سے ہمدردی رکھنا ہرگز عجیب نہیں۔ مگر ہماری نگاہ میں یہ ہمدردی خروج میں شرکت کا فتویٰ دینے یا مالی اعانت کرنے کی حد تک نہیں تھی؛ کیوں کہ خروج کرنا خود امام صاحب کے فقہی مذہب کے خلاف تھا۔ البتہ حکومت پر ان کا تنقید کرنا بالکل بجا تھا؛ کیوں کہ حکومت کے کئی اقدامات واقعی قابلِ اعتراض تھے۔ خاص کر مخالفین کا بے دریغ خون بہانا اور شک وشبے کی بنیاد پر گرفتاریاں کرنا کسی بھی طرح درست نہ تھا۔ ایسے سخت برتاؤ اور بے جا پکڑ دھکڑ سے فتنے اور شورش میں مزید اضافہ ہوتا ہے، امن قائم نہیں ہوتا؛ اس لیے امام صاحب جیسے عالم کا حق تھا کہ وہ تنقید کرتے مگر اس تنقید کو مسلح خروج کی حمایت کا نام دینا کیسے درست ہو سکتا ہے۔

غالباً امام صاحب رحمہ اللہ کی تنقید سے کچھ لوگوں نے غلط فہمی پال لی کہ وہ خروج کے سرپرست ہیں۔ نیز ماضی میں امام صاحب کا علوی بزرگوں سے جو تعلقِ خاطر چلا آرہا تھا، اسے دیکھتے ہوئے کوئی بھی یہ شک کر سکتا تھا کہ اتنی بڑی باغیانہ تحریک کے پیچھے وہ ضرور ہوں گے۔ اس طرح اصل بات کو بڑھا کر اس میں سنے سنائے اضافے کر دیے گئے۔

❖❖❖

امام مالک رحمہ اللہ اور خروج کی سرپرستی

﴿سوال﴾ کیا امام مالک رحمہ اللہ نے نفسِ زکیہ کی حمایت کا فتویٰ دیا تھا؟

﴿جواب﴾ امام مالک رحمہ اللہ کے بارے میں یہ مشہور ضرور ہے کہ انہوں نے لوگوں کو نفس زکیہ کی حمایت اور خروج کا فتویٰ دیا تھا۔ مگر اس بارے میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں۔ جو روایات اکثر پیش کی جاتی ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

① ابن جریر طبری رحمہ اللہ (م ۳۱۰ھ) کی روایت:

> ''مالک بن انس سے محمد (نفسِ زکیہ) کے ساتھ خروج کرنے کا مسئلہ پوچھا گیا اور کہا گیا کہ ہماری گردنوں میں ابوجعفر (منصور) کی بیعت ہے۔ امام مالک نے کہا: تم نے مجبوراً بیعت کی تھی، اور ہر مجبور کیے گئے پر قسم لازم نہیں ہوتی۔ پس لوگ محمد کی طرف لپکے اور مالک گھر میں بند ہو گئے۔''[1]

نقد: یہ روایت ضعیف ہے؛ کیوں کہ طبری نے اسے سعید بن عبدالحمید بن جعفر سے نقل کیا ہے جنہوں نے نہیں بتایا کہ انہیں کس نے خبر دی ہے، بس یہ کہا ہے کہ ''اخبرنی غیر واحد'' ایک سے زائد لوگوں نے بتایا ہے۔ پس یہ سند راوی کے مجہول ہونے کی وجہ سے ضعیف ہی ہوگی۔

---

① ان مالک بن انس استفتی فی الخروج مع محمد، وقیل له، ان فی اعناقنا بیعة لابی جعفر، فقال انما بایعتم مکرهین، ولیس علی کل مکره یمین، فاسرع الناس الی محمد ولزم مالک بیته. (تاریخ الطبری: ۷/۵۶۰: سنة ۱۴۵ هجری)

④ جمال الدین حسینی (م ۸۲۸ھ) کی روایت:

’’مالک بن انس فقیہ نے لوگوں کو محمد کے ساتھ خروج کا فتویٰ دیا تھا اور خود بھی ان سے بیعت کی؛ اسی لیے منصوران پر بگڑا۔‘‘①

نقد: مؤلف جمال الدین حسینی نویں صدی ہجری کے متعصب شیعہ تھے۔ اس لیے ان کی روایت معتبر نہیں۔

⑤ ابن قتیبہ دینوری رحمہ اللہ (م ۲۷۶ھ) کی روایت:

’’لوگوں نے جعفر بن سلیمان (حاکمِ مدینہ) کو شکایت پہنچائی کہ امام مالک نے فتویٰ دیا ہے کہ بیعت کے وقت کھائی گئی قسموں کی کوئی حیثیت نہیں...... کہتے ہیں کہ انہوں نے تمام اہلِ مدینہ کو یہ فتویٰ دیا اور اس کے لیے حدیث ’’میری امت کے لیے بھول چوک اور زبردستی کرایا گیا عمل معاف ہے‘‘ سے استدلال کیا۔ یہ بات ابوجعفر (منصور) کو شاق گزری اور وہ ڈرا کہ کہیں اہلِ مدینہ اس وجہ سے اپنی پختہ بیعت کو نہ توڑ دیں۔‘‘②

نقد: یہ روایت بھی بلاسند ہے۔ ابن قتیبہ نے اسے ’’دسّوا‘‘ (لوگوں نے چغلی لگائی) اور ’’زعموا‘‘ (لوگوں کا دعویٰ ہے۔) کے الفاظ سے نقل کیا گیا ہے جس کا صاف مطلب ہے یہ افواہ اور ایک سنی سنائی بات تھی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ امام مالک رحمہ اللہ کی طرف خروج کے جواز کا فتویٰ منسوب کیے بغیر فرماتے ہیں:

’’محمد بن عبداللہ بن حسن (نفسِ زکیہ) کے خروج کے وقت امام مالک گھر میں بند ہو کر بیٹھ گئے، نہ کسی سے تعزیت کے لیے جاتے نہ مبارک باد دینے۔ نمازِ جمعہ اور جماعت کی نماز کے لیے بھی نہیں نکلتے تھے۔‘‘③

---

① كان مالك بن انس الفقيه قد افتى الناس بالخروج مع محمد و بايعه، ولذالك تغير المنصور عليه. ﴿عمدة الطالب: ۸٤/۱﴾

② فدسوا الى جعفر بن سليمان من قال له: ان مالكا يفتي الناس بان ايمان البيعة لاتحل ولا تلزمهم ..... وزعموا انه يفتي بذالك اهل المدينة اجمعين لحديث رواه عن النبي صلى الله عليه وسلم انه قال: "رفع عن امتي الخطاء والنسيان وما اكرهوا عليه." فعظم ذالك على جعفر وخاف ان ينحل عليه ما ابرم من بيعة اهل المدينة. ﴿الامامة والسياسة: ۳۲۱/۲﴾

نوٹ: ’’الامامۃ والسیاسۃ‘‘ عبداللہ بن مسلم ابن قتیبہ الدینوری کی تالیف کے طور پر مشہور ہے جو اہلِ سنت کے بہت بڑے عالم تھے۔ (وفیات الاعیان: ۳۴۳/۴؛ سیر اعلام النبلاء: ۲۹۶/۱۳؛ موسوعۃ مواقف السلف فی العقیدۃ: ۴۲۴/۴) ان کی طرف منسوب ’’الامامۃ والسیاسۃ‘‘ اگرچہ مجموعی طور پر ایک مفید کتاب ہے مگر اس میں کئی روایات قابلِ نقد اور سخت مشکوک ہیں۔ بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ یہ کتاب ابن قتیبہ کی طرف غلط طور پر منسوب ہے۔ (مع الاثنی عشریۃ فی الاصول والفروع، للدکتور سالوس: ۲۲۰) علامہ محب الدین الخطیب مرحوم نے اس کی دلیل یہ دی ہے کہ مؤلف اس کتاب میں دو مصری راویوں سے بھی روایت نقل کرتا جبکہ ابن قتیبہ نہ ہی کبھی مصر گئے اور نہ ہی انہوں نے ان دونوں راویوں سے سماع کیا ہے۔ (حاشیۃ ’’العواصم من القواصم لابن العربی‘‘ ص ۱۴۶، ط الاوقاف السعودیۃ)

بعض محققین کا کہنا ہے کہ عبداللہ بن مسلم ابن قتیبۃ الدینوری نامی دو شخصیات ہیں: ایک سنی اور ایک رافضی۔ دراصل یہ اہلِ باطل کی چال ہے کہ وہ کذاب راویوں یا مؤلفین کو اہلِ سنت کے جلیل القدر ائمہ کے ناموں، کنیتوں اور القاب سے موسوم کر لیتے ہیں اور پھر دنیا کو دھوکہ دیتے ہیں کہ دیکھیے! اہلِ سنت کے عظیم ائمہ نے بھی وہی لکھا ہے جو ہم کہتے ہیں۔ اس کی کئی مثالیں موجود ہیں مثلاً: اسماعیل بن عبدالرحمٰن نامی سُنی راوی ’’السدی‘‘ کے لقب سے مشہور ہیں اور وہ مسلم اور ابوداؤد کے راوی ہیں۔ مگر ایک کذاب راوی محمد بن مروان السدی کو ان کے ساتھ اس قدر خلط ملط کر دیا گیا کہ بعض لوگوں نے ثقہ سدی پر بھی تشیع کا الزام لگا دیا۔ بعد میں محققین نے فرق کے لیے ثقہ کو سدی الکبیر اور کذاب کو سدی الصغیر کے القاب سے یاد کیا۔ سُنی ابن جریر طبری کے ہم نام رافضی ابن جریر بن رستم طبری کو مشہور کیا گیا ہے۔ (الانتصار للصحب والآل من افتراءات السماوی الضال، ابراہیم بن عامر الرحیلی، ص ۱۱)

③ ومن وقت خروج محمد بن عبدالله بن حسن لزم مالك بيته فلم يكن يتردد الى احد لا لعزاء ولا لهناء حتى قبل ولا يخرج الى جماعة ولا جمعة. ﴿البداية والنهاية: ۶۰۱/۱۳، ط دار هجر﴾

خروج کے بارے میں امام احمد بن حنبل اور امام شافعی رحمہما اللہ کے رجحانات

﴿سوال﴾ خروج کے بارے میں امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کا قول اور عمل کیا تھا؟

﴿جواب﴾ امام شافعی رحمہ اللہ کا طرزِ عمل بھی ظلم کے خلاف کلمۂ حق بلند کرنے کا تھا۔ حکام کے ظلم اور فسق کی بنا پر ان سے خروج اور بغاوت کے وہ بھی قائل نہ تھے۔ جب وہ یمن میں تھے تو وہاں کا حاکم حماد البربری ظالم اور متکبر تھا۔ امام شافعی اس کی حرکات پر تنقید کرتے تھے اور اسے ظلم سے روکتے تھے۔ اس نے جلا کر خلیفہ ہارون الرشید کو لکھ دیا کہ ان سے علوی سے خروج کا خطرہ ہے۔ ہارون نے انہیں بغداد بلوالیا۔ جب یہ حاضر ہوئے تو دربار میں چمڑے کا فرش بچھا دیا گیا تھا اور شمشیریں بے نیام تھیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس موقع پر ایسی دل پذیر گفتگو فرمائی کہ ہارون الرشید کے تمام شکوک دور ہو گئے اور اس نے آپ کو آزاد کر دیا۔[1]

ہارون کے بعد اس کا بیٹا مامون الرشید سلطنت میں شریک اپنے بھائی امین کو مغلوب کر کے عالمِ اسلام کا حکمران بن گیا۔ وہ عقلیت پسندی، اعتزال اور تشیع کی طرف مائل تھا۔ طرح طرح کے فتوے اور احکام جاری کرتا رہتا تھا۔ ایک بار شیعہ علماء سے متاثر ہو کر اس نے منادی کرا دی کہ متعہ جائز ہے۔[2]

۲۱۱ھ میں اس نے یہ فرمان جاری کیا: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مخلوق میں سب سے افضل ہستی ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ معاویہ کا ذکرِ خیر کرنے سے برائت ظاہر کی جائے۔''[3]

اگلے سال اس نے عقیدۂ خلقِ قرآن کی تشہیر بھی شروع کر دی، یعنی قرآن مجید اللہ کی مخلوق ہے۔

مامون الرشید کی گمراہی کے اس دور میں امام شافعی رحمہ اللہ مصر جا چکے تھے جہاں خلافتِ عباسیہ کے ماتحت نیم خود مختار حکومت ''دولتِ اغالبہ'' قائم تھی جس کے امراء عباسی خلیفہ کی نیابت میں حکومت کرتے تھے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی زندگی میں دولتِ اغالبہ کے درجِ ذیل حکمران گزرے:

1. ابراہیم بن اغلب: ۱۸۴ھ تا ۱۹۶ھ
2. عبداللہ اوّل بن ابراہیم: ۱۹۶ھ تا ۲۰۱ھ
3. زیادۃ اللہ اوّل بن ابراہیم: ۲۰۱ھ تا ۲۲۳ھ[4]

---

[1] تاریخ دمشق: ۲۸۷/۵۱؛ سیر اعلام النبلاء: ۸۶/۱۰؛ حلیة الاولیاء: ۷۰/۹

[2] وفیات الاعیان: ۱۵۰/۶

[3] تاریخ الخلفاء، ص ۲۴۵

[4] تاریخ ابن خلدون: ۱۸/۴، ۱۹، ۲۵۰

زیادۃ اللہ کی حکومت کے تیسرے برس یعنی ۲۰۴ھ میں امام شافعی رحمہ اللہ کی وفات ہوئی۔ اس تمام عرصے میں ایک بار بھی انہوں نے مامون الرشید یا اس کے نائبین کے خلاف خروج کا فتویٰ نہیں دیا۔ اس دوران بعض جگہ عباسیوں کے خلاف خروج ہوا بھی، مگر امام شافعی رحمہ اللہ سے اس کی عملی یا قولی، خفیہ یا علانیہ حمایت کا ثبوت کہیں نہیں ملتا۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے مامون الرشید اور معتصم باللہ کے دور میں خلقِ قرآن کے غلط عقیدے کی بانگِ دہل مخالفت کی اور قید و بند سے لے کر کوڑوں تک کی سزائیں برداشت کر کے حق گوئی کی روشن مثال پیش کی مگر ایسے ظالم اور بدعتی حکمرانوں کے خلاف بھی انہوں نے نہ خود خروج کیا نہ کسی اور کو اس کا فتویٰ دیا۔

خلاصۂ کلام

قارئینِ کرام! امکانی حد تک تلاش کے باوجود ہمیں کسی معتبر سند یا حوالے سے کوئی ایسی روایت نہیں ملی جس سے ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک سے بھی اس زمانے کے کسی خروج کی حمایت ثابت ہوتی ہو۔

اگر اس کے اثبات میں کوئی صحیح روایت مل جائے یا ضعیف روایات کے مجموعے کو دیکھتے ہوئے یہ مان لیا جائے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ یا کسی اور مجتہد نے کسی وقت کسی حکومت مخالف تحریک کی حمایت کی تھی تب بھی اسے بنیاد بنا کر ائمہ اربعہ کے متواتر فقہی مسلک کی تردید نہیں کی جا سکتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان حضرات کا پہلے مسلک یہ تھا کہ حکام کے ظلم و ستم یا فسق کی وجہ سے ان کے خلاف خروج جائز ہے[1] مگر بعد میں جب اس طرزِ عمل کے نقصانات دیکھے اور سنتِ نبویہ پر مزید غور کیا تو آخری فتویٰ یہی دیا کہ خروج تبھی جائز ہے جب کفرِ بواح ہو، ورنہ خروج سے گریز ضروری ہے۔ اس سلسلے میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی رائے قابلِ غور ہے، انہوں نے نفسِ زکیہ کی تحریک کی بڑی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اس کے آخر میں فرماتے ہیں:

> "ائمہ کی ایک جماعت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ان دونوں (محمد نفس زکیہ اور ابراہیم) کے خروج کی طرف میلان رکھتے تھے۔ یہ بات قابلِ تحقیق ہے۔"[2]

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ جیسے محقق کے نزدیک بھی ائمہ مجتہدین کے بارے میں خروج کی حمایت کی روایات ثابت نہیں بلکہ مشکوک ہیں۔ ہم نے اس موضوع پر جو مفصل بحث پیش کی ہے، اس کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل ظاہر ہو چکی ہے کہ ائمہ مجتہدین اس قسم کے خروج کو فتنہ تصور کرتے تھے۔

---

① راقم نے یہ امکان کے طور پر لکھا ہے۔ جب فقہی میدان کے ماہر اکابر سے اس بارے میں پوچھا کہ کیا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا کوئی دوسرا قول (یعنی کفر بواح کے بغیر فاسق اور ظالم حکمرانوں کے خروج کے جواز کا) کہیں منقول ہے؟ تو یہی جواب ملا کہ امام صاحب سے ایک ہی قول منقول ہے۔ دوسرا کوئی قول فقہ حنفی کے ذخیرے میں موجود نہیں۔ اسی طرح ائمہ اربعہ میں سے کسی اور کا بھی فاسق و ظالم حکمرانوں کے خلاف خروج کے جواز کا کوئی قول ہمیں نہیں ملا۔

② وقد حکی عن جماعة من الائمة انهم مالوا الیٰ ظهورهما، وفی هذا نظر. ﴿البدایه والنهایة: ۱۲/۳۸۳: سنة ۱۴۵ هجری﴾

سیرت ابن اسحٰق اور محمد بن اسحٰق پر اعتراضات

﴿سوال﴾ بعض حضرات نے اپنے مضامین میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کے پاس سیرت یا اسلامی تاریخ کی کوئی معتبر کتاب نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سیرت کی پہلی کتاب محمد بن اسحٰق نے لکھی۔ ہشام بن عروہ انہیں کذاب کہتے تھے۔ امام مالک ان کی سیرت دیکھنے بھالنے کے بعد انہیں دجال قرار دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ محمد بن اسحٰق سیرت کے نام پر قصے کہانیاں گھڑتا ہے؛ اسی لیے ابن اسحٰق کی یہ سیرت علماء نے رد کر دی اور اس کے مرتے ہی یہ معدوم ہوگئی۔ ایک صدی بعد ابن ہشام نے اسے مختصر کر کے پیش کیا تو بعد والے اسے ابن ہشام کی سیرت سمجھ کر دیکھے بھالے بغیر نقل کرتے چلے گئے۔ طبری، البدایہ والنہایہ اور ابن خلدون وغیرہ نے اس سے خوب روایات لیں۔ اس طرح جھوٹ پر جھوٹ نقل ہوتا چلا آیا۔

ایسے مضامین پڑھ کر ذہن نہایت مضطرب ہے۔ درج ذیل سوالات بڑی شدت سے پیدا ہوگئے ہیں:

(۱) یہ محمد بن اسحاق کون تھے؟ کیا واقعی یہ مسلمانوں کے بھیس میں کوئی منافق قسم کی آدمی تھے؟

(۲) کیا واقعی امام مالک وغیرہ نے انہیں کذاب اور دجال کہا ہے۔ اگر ہاں تو پھر بعد کے اکابر نے امام مالک کی بات پر توجہ کیوں نہ دی؟ اور اس کے باوجود محمد بن اسحٰق سے مواد نقل کرنے کی صورت میں ہمارے چودہ صدیوں کے علماء کس صف میں شمار ہوں گے؟ کیا وہ سبھی ایک اہم ذمہ داری میں سنگین لاپرواہی کرنے والے شمار نہیں ہوں گے؟

﴿جواب﴾ جو حضرات اس قسم کے مضامین لکھ رہے ہیں، ان کی سوچ کی آخری منزل یہی ہوسکتی ہے کہ چودہ صدیوں کے علماء درحقیقت علم سے تہی دامن تھے۔ اگر یہ حضرات تائب نہ ہوئے تو خدشہ ہے کہ ایک وقت میں خود بھی اُمت کے پورے علمی اثاثے سے برگشتہ ہو جائیں گے اور آپ جیسے نوجوانوں کو بھی اسی سمت لے جائیں گے۔

اب میں آپ کے دونوں سوالات کے نمبر وار جوابات عرض کرتا ہوں:

❶ محمد بن اسحٰق رحمہ اللہ، اُمتِ مسلمہ کے نامور اہلِ علم اور مدینہ منورہ کے علماء میں سے ایک تھے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ ان کا تعارف یوں کراتے ہیں: ''العلامۃ، الحافظ، الاخباری''[1] ان کے والد اسحٰق بن یسار تابعی اور ثقہ راوی تھے۔[2]

نیز حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وہ مدینہ منورہ میں علمِ حدیث کو مدوّن کرنے والے پہلے عالم تھے۔ یہ کام انہوں نے امام مالک رحمہ اللہ اور ان کی صف کے علماء سے بھی پہلے کیا تھا۔ وہ علم کا متلاطم سمندر تھے، مگر وہ ایسا معیاری کام نہیں کرتے تھے جیسا محدثین کے ہاں ہونا چاہیے۔''[3]

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۳۳/۷، الرسالۃ [2] تہذیب الکمال: ۴۹۵/۲، الرسالۃ [3] سیر اعلام النبلاء: ۳۵/۷

محمد بن اسحٰق رحمۃ اللہ ایک مدت تک مدینہ میں رہے۔ پھر بغداد چلے گئے۔ وہاں جانے کے بعد ان کا علمی حلقہ زیادہ پھیلا۔ خطیب بغدادی رحمۃ اللہ کے بقول بغداد میں آنے والے محمد نامی علماء میں سے ان سے زیادہ عمر رسیدہ، عالی الاسناد اور دیر میں فوت ہونے والا کوئی نہ تھا۔ ①

خطیب بغدادی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں: ان سے علماء کے اماموں نے روایت لی ہے جن میں یحییٰ بن سعید الانصاری، سفیان الثوری، ابن جریج، شعبہ بن حجاج، جریر بن حازم، حماد بن سلمہ، حماد بن زید، ابراہیم بن سعد الزہری، شریک بن عبداللہ نخعی اور سفیان بن عیینہ رحمہم اللہ جیسی ہستیاں شامل ہیں۔ ②

وہ پہلے عالم ہیں جنہوں نے صحابہ اور تابعین سے مروی سیرت کی روایات کو جمع کیا اور ایک عمدہ ترتیب کے ساتھ پیش کیا۔ بعد کی تمام کتبِ سیرت کی بنیاد یہی کتاب ہے۔ روایات جمع کرنے میں انہوں نے ایک کھلا معیار رکھا، تاکہ حضور اکرم ﷺ سے منسوب ہر چھوٹی بڑی بات محفوظ ہو جائے؛ اس لیے راویوں کے ثقہ ہونے کی شرط نہیں رکھی۔ ہر روایت کو لیتے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سارے ماحول کو بھی محفوظ کر لیا جائے جس میں بعثت نبویہ ہوئی تھی؛ اس لیے زمانہ جاہلیت کے حالات، عرب کے قدیم حکمرانوں کی سیاست، قبائل کے جھگڑے، مشرکین کی فضول رسمیں، شاعروں کی قصیدہ گوئی اور طربیہ یا رزمیہ نظمیں سبھی کچھ انہوں نے سمیٹ لیا۔

غرض اس میں ایسا مواد بھی آ گیا جس کا سیرتِ نبویہ کے ماقبل و مابعد دور اور ماحول سے تو تعلق تھا مگر براہِ راست اس کا حضور ﷺ کی زندگی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یوں ان کی کتاب بہت ضخیم ہوگئی تھی اور ہیرے موتیوں کے ساتھ پتھر کنکر بھی جمع ہو گئے تھے؛ اس لیے تقریباً نصف صدی بعد ایک دوسرے عالم ابن ہشام نے اس میں سے ایسی اکثر چیزیں نکال دیں جو سیرت کو سمجھنے میں اہم نہ تھیں۔ یہ دوسری کتاب سیرت ابن ہشام کے نام سے مدون ہو کر اصل کتاب سے کہیں زیادہ مقبول ہوگئی یہاں تک کہ بعض لوگ ابن ہشام ہی کو اوّلین سیرت نگار سمجھنے لگے۔

یہ تھا محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ کی شخصیت اور ان کے کام کا مختصر سا جائزہ جو ہم نے اسماء الرجال کی معتبر کتب سے پیش کیا ہے۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ ایک بڑے عالم تھے۔ انہیں جھوٹا سمجھنا انصاف کے خلاف ہے۔

❷ محمد بن اسحٰق رحمۃ اللہ پر بعض علماء نے جرح کی ہے جیسا کہ آپ نے سوال میں نقل کیا۔ ان حضرات کی جرح اپنی جگہ ثابت ہے۔ ہم اس کا انکار نہیں کرتے۔ مگر دوسری طرف محدثین اور فقہاء کی بہت بڑی تعداد نے انہیں قابلِ اعتماد سمجھا ہے۔ انہوں نے اعتماد کی یہ سند آنکھیں بند کر کے نہیں دی بلکہ جرح کا بغور جائزہ لے کر اپنی رائے قائم کی ہے۔

جرح کو من وعن ماننے والوں نے فقط جرح کے الفاظ کو دیکھا ہے جبکہ دیگر علماء نے اس جرح کے پسِ منظر کو بھی دیکھا ہے۔ معاصر لوگوں میں نوک جھوک، کش مکش اور ایک دوسرے پر چوٹ ایک معمول کی بات ہے۔ اہلِ علم بھی فرشتے نہیں، انسان ہوتے ہیں۔ قدیم دور کے جلیل القدر ائمہ بھی معاصرانہ شکر رنجیوں سے بالکل محفوظ نہ تھے۔

① تاریخ بغداد: ۷/۲

② تاریخ بغداد: ۷/۲

مدینہ میں امام مالک رحمہ اللہ کی مقبولیت کا سورج نصف النہار پر تھا۔ مگر محمد بن اسحق رحمہ اللہ بھی کچھ کم نہ تھے۔ عمر میں وہ امام مالک رحمہ اللہ سے لگ بھگ دس سال بڑے تھے۔ [1] دونوں نے اپنے اپنے طور پر ایک معیار رکھ کر روایات جمع کی تھیں۔ منہج کے اختلاف کی وجہ سے بڑی بڑی علمی شخصیات میں اختلاف پیدا ہو ہی جاتا ہے۔

ایک بار ایک شخص نے (جس کا نام آج بھی مجہول ہے، اور روایات میں اس کا ذکر "رجل" کہہ کر آیا ہے) آکر امام مالک رحمہ اللہ کو کہا: "محمد بن اسحق کہتے ہیں کہ مالک کی حدیثیں مجھے دکھانا۔ اس علم کو پرکھنے والا میں ہوں۔"

امام مالک رحمہ اللہ اپنے علم پر حرف گیری برداشت نہ کر سکے اور فرمایا:

"وہ تو دجالوں میں سے ایک دجال ہے جو کہتا ہے کہ مالک کا علم مجھے دکھانا۔" [2]

امام مالک رحمہ اللہ کے یہ جملے محفوظ ہو کر علم جرح وتعدیل کا حصہ بن گئے۔ امام مالک رحمہ اللہ کی جرح کے جو الفاظ جرح وتعدیل کی کتب میں منقول ہیں، وہ یہی ہیں۔ راقم کو تلاش کے باوجود اس بات کا کہیں کوئی ثبوت نہیں ملا کہ امام مالک رحمہ اللہ نے سیرت ابن اسحق دیکھ کر فرمایا ہو کہ اس میں قصے کہانیاں ہیں۔

محمد بن اسحق رحمہ اللہ پر دوسری سخت جرح مشہور تابعی ہشام بن عروہ رحمہ اللہ نے کی تھی۔ ان کی اہلیہ فاطمہ بنت منذر اپنی دادی اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا اور ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے احادیث روایت کیا کرتی تھیں۔ [3] محمد بن اسحق رحمہ اللہ نے بھی فاطمہ بنت منذر سے روایت لی اور آگے نقل کی۔ ہشام بن عروہ رحمہ اللہ کو پتا چلا کہ محمد بن اسحق رحمہ اللہ نے ان کی اہلیہ سے روایات نقل کی ہیں تو حیران ہو کر فرمایا: "محمد بن اسحق کذاب ہے۔ وہ بھلا میری اہلیہ سے کب ملا؟" [4]

ہشام بن عروہ رحمہ اللہ کی یہ جرح بھی محفوظ ہوگئی۔

غرض محمد بن اسحاق رحمہ اللہ پر یہ دو جرحیں واقعی ہوئی ہیں؛ اس لیے ہم یہ دعویٰ ہرگز نہیں کرتے کہ جرح وتعدیل کے ہر امام نے محمد بن اسحق رحمہ اللہ کو ثقہ سمجھا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور ہشام بن عروہ رحمہ اللہ کی مذکورہ جرحوں کے علاوہ بعض نے ان پر تشیع کا الزام بھی لگایا ہے، بعض نے قدری ہونے کا طعن بھی کیا ہے۔ انہیں تدلیس میں ملوث بھی مانا گیا ہے۔ یہ الزامات لگانے والے صفِ اول کے محدثین اور نقاد تھے۔ مگر انہیں ثقہ کہنے والے اور ان پر لگائے گئے الزامات کو مسترد کرنے والے بھی اسی دور میں گزرے ہیں جو جلالتِ شان میں الزام لگانے والوں سے کم نہیں تھے۔

امام زہری رحمہ اللہ فرماتے تھے: "مدینہ میں علم باقی رہے گا جب تک یہاں محمد بن اسحاق ہیں۔"

جرح وتعدیل کے امام حافظ الحدیث امام علی بن مدینی رحمہ اللہ فرماتے تھے: "حدیث کا دارومدار چھ افراد پر ہے اور چھ کی روایات کا دارومدار بارہ افراد پر ہے، جن میں سے ایک محمد بن اسحق ہیں۔" [5]

---

① محمد بن اسحق کی ولادت ۸۰ھ کے کچھ بعد کی ہے اور امام مالک کی ولادت ۹۳ ہجری کی ہے۔
② الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم: ۲۰/۱، ط حیدر آباد دکن
③ تاریخ الاسلام ذہبی: ۵۹۲/۹، ت تدمری؛ ۲۹۶/۳، ت بشار
④ الجرح والتعدیل: ۱۹۳/۷
⑤ سیر اعلام النبلاء: ۳۶/۷

امام شافعی رحمہ اللہ کے بقول: ''جو مغازی کے علم کا سمندر بننا چاہتا ہے، تو اسے محمد بن اسحاق کی عیال بننا پڑے گا۔''①

ابن نمیر رحمہ اللہ فرماتے تھے: ان پر قدری ہونے کا الزام لگایا گیا جبکہ وہ سب لوگوں سے زیادہ اس سے دور تھے۔②

العجلی رحمہ اللہ اور ابنِ حبان رحمہ اللہ نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے۔③ یحییٰ بن مَعین رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔④

امام علی بن مدینی رحمہ اللہ نے محمد بن اسحق رحمہ اللہ کا دفاع کیا اور فرمایا: ''میرے نزدیک ان کی روایت صحیح ہے۔'' اس پر ایک عالم یعقوب بن شیبہ رحمہ اللہ نے پوچھا: اور جو امام مالک نے ان کے بارے میں کہا ہے؟ علی بن مدینی رحمہ اللہ بولے: ''امام مالک ان کے حلقے میں نہیں بیٹھے، وہ انہیں نہیں جانتے۔'' نیز فرمایا: ''انہوں نے مدینہ میں کون سی حدیث سنائی تھی جس پر انہیں ایسا کہا گیا۔'' یعقوب بن شیبہ رحمہ اللہ نے پوچھا: ''اور ہشام بن عروہ نے بھی ان پر جرح کی ہے۔''

علی بن مدینی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''جو جرح انہوں نے کی ہے، وہ حجت نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ محمد بن اسحق ان کی اہلیہ کے پاس اس وقت گئے ہوں جب وہ بچے ہوں۔''⑤

حافظ ذہبی رحمہ اللہ ہشام بن عروہ رحمہ اللہ کے اس حلفیہ قول کو کہ ''محمد بن اسحق نے فاطمہ کو کبھی نہیں دیکھا۔'' نقل کرکے فرماتے ہیں: ''ہشام اپنی قسم میں سچے ہیں۔ محمد بن اسحق نے فاطمہ کو نہیں دیکھا اور نہ ہی انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ انہوں نے دیکھا ہے، بلکہ یہ ذکر کیا ہے کہ انہوں نے ان سے حدیث بیان کی ہے۔ تو ہم نے بھی کئی خواتین سے حدیث سنی ہے مگر انہیں دیکھا نہیں۔ کتنے تابعین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث سنی ہے مگر ان کی صورت کبھی نہیں دیکھی۔''⑥

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے بیٹے عبداللہ فرماتے ہیں: میں نے اپنے والد کو محمد بن اسحق کی حدیثیں سنائیں تو وہ بولے: ''ہشام اس بات کا انکار کیوں کرتے تھے؟ شاید محمد بن اسحق آئے ہوں اور فاطمہ سے اجازت لی ہو۔ انہوں نے اجازت دے دی ہو۔'' امام احمد رحمہ اللہ کا مطلب یہ تھا کہ ہشام بن عروہ کو اس کا علم نہ ہوا ہو۔⑦

امام بخاری رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ کی جرح کو ثابت ماننے میں شک کرتے ہوئے فرمایا: ''اگر امام مالک سے ابن اسحق پر الزام لگانا ثابت ہو جائے، تو بعض اوقات انسان کوئی بات کہتا ہے اور کسی شخص کو کسی معاملے میں الزام دیتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اسے ہر معاملے میں الزام دے رہا ہے۔''⑧

① سیر اعلام النبلاء: ۳٦/۷
② تہذیب التہذیب: ٤٢/۹
③ الثقات للعجلی، ص ٤٠٠؛ الثقات لابن حبان: ۳۸۰/۷
④ تہذیب الکمال: ٤١١/٢٤ ط الرسالۃ
⑤ تہذیب التہذیب: ٤٢/۹ ..... راقم عرض کرتا ہے کہ یہ احتمال قوی ہے؛ کیوں کہ محمد بن اسحاق فاطمہ بنت المنذر رحمہا اللہ سے کم از کم ۳۲ سال چھوٹے تھے۔ فاطمہ بنت المنذر رحمہا اللہ کا سنِ ولادت اگرچہ کہیں منقول نہیں ملا مگر ہشام بن عروہ رحمہ اللہ کی ولادت ٦١ ہجری کی ہے۔ (سیر اعلام النبلاء: ٦/۳۸) بقول ہشام فاطمہ ان سے تیرہ برس بڑی تھیں۔ (تہذیب الکمال: ۳۵/۲٦٦) اس طرح فاطمہ کی ولادت ۴۸ھ کی بنتی ہے۔ وہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے بھی روایت کرتی ہیں۔ (رواہ الترمذی، ابواب الرضاع وقال حسن صحیح) جس سے ان کی عمر کا یہ قول بالکل درست ثابت ہوتا ہے۔ محمد بن اسحاق ۸۰ھ کے بعد پیدا ہوئے اس طرح وہ فاطمہ رحمہا اللہ سے ۳۲ سال چھوٹے تھے۔
⑥ سیر اعلام النبلاء: ۳۸/۷
⑦ سیر اعلام النبلاء: ۳۸/۷ ..... ظاہر ہے آدمی ہر وقت گھر میں نہیں بیٹھا رہتا۔ اور یہ ضروری نہیں کہ فاطمہ بنت المنذر رحمہا اللہ ہشام بن عروہ کو بعد میں بتاتی ہوں کہ میں نے آج فلاں فلاں کو حدیث سنائی تھی۔ بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ فاطمہ رحمہا اللہ حدیث سننے کے لیے آنے والے ہر شخص کا نام پوچھتی ہوں۔
⑧ سیر اعلام النبلاء: ٤٠/۷

حافظ ذہبی رحمہ اللہ ''سیر اعلام النبلاء'' میں امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کر کے فرماتے ہیں:

''یہ بات جانی بوجھی ہے کہ بہت سے معاصر علماء کی آپس میں ایک دوسرے پر تنقید بے حیثیت ہے۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں خصوصاً جب آدمی کو ایسی جماعت نے ثقہ قرار دیا ہو جو انصاف پسند ہے۔'' [1]

پھر جس طرح ایک فریق ان پر جرح میں سختی کر رہا تھا، ایک دوسرا فریق ان کی تعدیل میں بہت آگے تھا اور اس میں بھی چوٹی کے محدثین شامل تھے۔ ان میں سے ایک امام شعبہ رحمہ اللہ تھے جو انہیں ''امیر المحدثین'' کہتے تھے۔ [2]

جمہور ائمہ نے اس بارے میں اعتدال کا راستہ اختیار کیا۔ علمائے جرح وتعدیل نے جو اصول مقرر کیے ہیں، ان کے تحت ان کی اکثریت نے محمد بن اسحٰق رحمہ اللہ پر نہ تو سخت جرح کو قبول کیا ہے، نہ انہیں اعلیٰ درجے کا ثقہ مانا ہے۔ نہ تو انہیں ''امیر المحدثین'' قرار دیا ہے اور نہ کذاب اور دجال۔ نہ تو ان کی ہر روایت کو مسترد کیا ہے نہ ہی ان کی ہر روایت کو آنکھیں بند کر کے حجت سمجھا ہے۔ بلکہ انہوں نے محمد اسحٰق رحمہ اللہ کو درمیانے درجے کا سچا راوی اور سیرت وتاریخ کے لحاظ سے قابلِ اعتماد مانا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے محمد بن اسحٰق رحمہ اللہ کے بارے میں پوچھا گیا کہ وہ کیسے تھے؟ تو جواب ملا: ''حسن الحدیث۔'' مگر وہ ان سے سنن میں استدلال نہیں کرتے تھے۔ [3]

اس پورے مسئلے کو سب سے زیادہ واضح انداز میں ابن حبان رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

''محمد بن اسحٰق پر دو افراد نے جرح کی ہے: ہشام بن عروہ اور مالک بن انس۔ ہشام بن عروہ سے جب یحییٰ بن سعید نے پوچھا کہ کیا محمد بن اسحٰق نے فاطمہ بنت منذر سے روایت لی ہے؟ تو ہشام بن عروہ نے فرمایا: کیا وہ ان سے مل چکا ہے؟ .... (ابن حبان کہتے ہیں) ہشام بن عروہ کی اس بات سے کسی کو روایتِ حدیث میں مجروح نہیں سمجھا جاسکتا؛ کیونکہ عراقی تابعین مثلاً: اسود، علقمہ، ابوسلمہ اور عطاء، نیز ان کے علاوہ حجازی تابعین نے عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیکھے بغیر روایات سنی ہیں، بس ان کی آواز سنی تھی مگر لوگوں نے ان کی روایات کو قبول کیا ہے، حالانکہ ان میں سے کوئی بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روبرو نہیں ملا۔

پس اسی طرح ابن اسحٰق نے فاطمہ بنت منذر سے پسِ پردہ روایت سنی ہے، وہ ان کی آواز سن سکتے تھے۔ سماع کی یہ شکل درست ہے۔ اور اس کی بناء پر کسی پر جرح کرنا انصاف کے خلاف ہے۔

رہی امام مالک کی بات تو انہوں نے فقط ایک بار ایسا کہا تھا۔ اس کے بعد وہ محمد بن اسحٰق سے اسی برتاؤ پر لوٹ آئے تھے جو انہیں پسند تھا۔ اصل میں ہوا یہ تھا کہ حجاز میں محمد بن اسحٰق سے بڑھ کر عربوں کے نسب اور تاریخ کا ماہر کوئی نہ تھا۔ محمد بن اسحٰق کا کہنا تھا کہ امام مالک بنوذی اصبح کے موالی میں سے ہیں جبکہ امام مالک کا دعویٰ تھا کہ وہ بنوذی اصبح ہی میں سے ہیں۔ اس وجہ سے دونوں میں بحث ہوگئی۔

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۷/ ۴۰

[2] تهذيب الكمال: ۲۴/ ۴۱۷

[3] موسوعة اقوال احمد: ۳/ ۲۳۹

پس جب امام مالک نے موطا تصنیف کی تو محمد بن اسحق نے فرمایا کہ یہ مجھے دکھاؤ، میں اس کا طبیب ہوں۔
یہ بات امام مالک تک پہنچی تو فرمایا: وہ دجالوں میں سے ایک دجال ہے جو یہودیوں کی روایات لیتا ہے۔
اس کے بعد دونوں کے مابین وہ کچھ ہوا جو لوگوں کے مابین ہوتا ہے۔
آخر محمد بن اسحق نے عراق جانے کا عزم کرلیا۔تب دونوں میں صلح ہوگئی۔امام مالک نے انہیں رخصت کرتے ہوئے اپنی اس سال کی پیداوار کا نصف حصہ یعنی پچاس دینار ہدیہ کیے۔
امام مالک نے حدیث کی روایت میں ان پر جرح نہیں کی تھی بلکہ اس وجہ سے کی تھی کہ محمد بن اسحق نبی ﷺ کے غزوات کی تفصیلات جاننے کے لیے (دورِ رسالت کے) یہودیوں کی نومسلم اولاد کے پاس بھی چلے جاتے تھے جنہیں خیبر، قریظہ اور بنی نضیر اور ان جیسی دوسری جنگوں کے حالات یاد تھے۔ابن اسحق ان چیزوں کو تلاش کرتے تھے تاکہ انہیں جان لیں؛ اس لیے نہیں کہ ان سے (شرعی) استدلال کریں۔جبکہ امام مالک صرف ثقہ، صدوق، عالم فاضل آدمی سے روایت لیتے تھے جو اچھی طرح روایت بیان کرتا ہو اور اس روایت (کے معانی) کو جانتا ہو۔‘‘ ①

یہ تھا ابن حبان رحمہ اللہ کا بیان جس کی روشنی میں محمد بن اسحق رحمہ اللہ پر بعض ائمہ کی جرح کا سیاق وسباق اچھی طرح سامنے آجاتا ہے۔یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ جرح بڑے بڑے ثقہ راویوں پر بھی ہوئی ہے۔بخاری ومسلم کے بھی بیسیوں راوی ایسے ہیں جن پر کسی نہ کسی نے جرح کی ہے۔مگر ہر کسی پر ہر جرح من وعن قابلِ قبول نہیں ہوتی۔
مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’جرح جب تعصب، دشمنی یا نفرت کی وجہ سے صادر ہوئی ہو تو وہ جرح ناقابلِ قبول ہے اور اسے وہی شخص مانتا ہے جو خود دھتکارا ہوا ہو۔اسی لیے محمد بن اسحاق صاحبِ مغازی کے بارے میں امام مالک کا قول کہ وہ دجالوں میں سے ایک دجال ہے، قبول نہیں کیا گیا؛ کیوں کہ یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اس کا صدور کھلی منافرت کی وجہ سے ہوا ہے۔بلکہ علماء نے طے کردیا کہ محمد بن اسحق حسن الحدیث ہیں، اور ان پر ائمہ حدیث نے اعتبار کیا۔‘‘ ②

محمد بن اسحق رحمہ اللہ کے بارے میں بھی مثبت اور منفی دونوں آراء ہیں۔صدیوں پہلے جمہور محدثین ان آراء میں توازن رکھتے ہوئے یہ فیصلہ دے چکے ہیں کہ محمد بن اسحق رحمہ اللہ کی روایات سیرت، غزوات اور تاریخی واقعات میں معتبر ہیں جبکہ احکام میں اس درجے معتبر نہیں۔عمومی طور پر انہیں قابلِ قبول راوی مانا گیا ہے۔جس کا ثبوت یہ ہے کہ صحیح مسلم میں ۷، نسائی میں ۱۴، ترمذی میں ۴۱، ابن ماجہ میں ۷۰ اور ابوداؤد میں ۱۸۰ روایات انہی محمد بن اسحق رحمہ اللہ کی ہیں۔

① الثقات لابن حبان: ۷/۳۸۰ تا ۳۸۳ ② الرفع والتکمیل، ص ۴۱۱ ط حلب
امام مالک رحمہ اللہ سے ہشام بن عروہ رحمہ اللہ کے بارے میں بھی سخت جرح منقول ہے: ’’هشام بن عروة كذاب.‘‘ (تاریخ بغداد: ۱/۲۲۹، العلمية) مگر بعد کے محققین نے ہشام بن عروہ رحمہ اللہ پر اس جرح کی بھی تردید کی ہے۔یحییٰ بن معین رحمہ اللہ بھی اس قول کی تاویل کرتے ہیں۔خطیب بغدادی رحمہ اللہ اس قول کو سنداً مضبوط نہیں مانتے۔(سير اعلام النبلاء: ۷/۳۸، ۳۹) اور یہی حقیقت ہے کہ یہ جرح ثابت نہیں اور اگر ثابت ہو بھی تو یقیناً مؤول ہے۔

فقہاء نے بھی محمد بن اسحق رحمہ اللہ کی روایات کو نقل کیا ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ کی مسند میں ان کی ۱۴ روایات ہیں۔ جبکہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی مسند میں ۵۹۰۔ احناف کے عظیم فقیہ و محدث امام طحاوی رحمہ اللہ نے شرح معانی الآثار میں ان کی ۷۸ اور شرح مشکل الآثار میں ۷۷ روایات نقل کی ہیں جن میں سے اکثر فقہ سے متعلق ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں محمد بن اسحق رحمہ اللہ سے فقط تعلیقاً روایت لی ہے مگر اپنی ''التاریخ الاوسط'' میں ان کی ''۴'' اور التاریخ الکبیر میں ''۱۰۴'' روایات نقل کی ہیں جن میں ایک بڑی تعداد مرفوع احادیث کی ہے۔

ابن حبان رحمہ اللہ (م ۳۵۴ھ) نے صحیح ابن حبان میں محمد بن اسحق رحمہ اللہ کی ۷۵ روایات لی ہیں۔ ابن حبان رحمہ اللہ کی ''السیرۃ النبویہ'' کا اچھا خاصا حصہ محمد بن اسحق کی روایات پر مشتمل ہے۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ (م ۳۸۵ھ) نے جرح و تعدیل پر کام کے دوران محمد بن اسحق رحمہ اللہ پر جرح کی ہے مگر اس کے باوجود اپنی سنن میں محمد بن اسحق رحمہ اللہ کی ''۴۹'' روایات نقل کی ہیں جن میں سے اکثر شرعی احکام سے متعلق ہیں۔

روایات چاہے ذخیرۂ حدیث کی ہوں یا ذخیرۂ تاریخ کی، کسی بھی روایت کے سلسلۂ اسناد اور متن پر آج بھی بحث ہو سکتی ہے۔ بالکل قریبی دور میں یہ کام ہوا بھی ہے۔ مثلاً شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے ہزاروں احادیث کی اسناد کو چھان کر ان میں صحیح، حسن یا ضعیف کی نشان دہی کی ہے۔ اسی طرح تفسیر طبری اور تاریخ طبری پر بھی محققانہ کام ہوا ہے، راویوں پر بحث ہوئی ہے۔ صحیح، حسن اور ضعیف کو الگ الگ کیا گیا ہے۔ فن کے ماہرین کسی روایت کے متعلق کسی محقق کی رائے سے اختلاف بھی کر سکتے ہیں۔ مگر کسی محقق نے یہ حماقت کی ہے، نہ کر سکتا ہے کہ اگر حدیث، سیرت یا تاریخ کے کسی مجموعے میں کچھ روایات ضعیف ثابت ہو گئی ہوں، یا ان کے متون میں کچھ باتیں قابلِ اشکال ہوں اور ذہن میں خلش پیدا کرتی ہوں تو مؤلف ہی کو خائن، فریبی، اسلام دشمن اور کفار کا ایجنٹ قرار دے دیا جائے۔

قابلِ اشکال روایات اور ذہن میں خلجان پیدا کرنے والی چیزیں تو بخاری و مسلم سمیت تقریباً ہر مجموعۂ حدیث میں ہیں جنہیں لے کر مستشرقین نے ''الاستشراق فی الحدیث'' کا محاذ کھول رکھا ہے۔ مگر مکھی بیٹھ جانے پر ناک کو نہیں کاٹ دیا جاتا۔ ایسے اشکالات کے جوابات دیے جاتے ہیں اور دیے گئے ہیں جو شروحِ حدیث میں بھی موجود ہیں اور استشراق کے دفاع میں لکھی گئی کتب میں بھی۔ فنِ نقد میں اس کی گنجائش کسی نے نہیں سمجھی کہ مؤلفین اور تالیفات کو اسلام سے خارج کر دیا جائے۔ ایسی عوامی آراء عوام ہی کی ہو سکتی ہیں، ہماری نہیں۔

جرح و تعدیل کی چند آراء کو استعمال کر کے سیرتِ نبویہ کی عظیم الشان خدمات کو سبوتاژ کرنا، اسلام کا دفاع ہرگز نہیں۔ اگر ہوتا تو ہم سے کہیں زیادہ چوکنا علماء گزشتہ صدیوں میں تھے۔ انہیں یہ پتا تھا کہ ابن ہشام رحمہ اللہ کی سیرت کا سلسلۂ سند ابن اسحاق رحمہ اللہ سے جا ملتا ہے۔ مگر علمائے اسلام نے بارہ صدیوں تک سیرت ابن اسحق کو دریا برد کیا نہ ابن ہشام کی سیرت کو آگ میں جھونکا۔ بلکہ ان کی برابر خدمت کی۔ ان سے استفادہ کیا، حواشی لگائے۔

یہ بات بھی بالکل غلط ہے کہ ''محمد بن اسحق رحمہ اللہ کے مرتے ہی ان کی سیرتِ نبویہ معدوم ہو گئی اور ایک صدی تک

متروک رہی۔'' محمد بن اسحق رحمہ اللہ کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی اور ان کی سیرت کو بہتر انداز میں پیش کرنے والے ابن ہشام رحمہ اللہ کی وفات ۲۱۳ھ میں ہے۔ اگر اس دوران سیرتِ ابن اسحق معدوم ہو چکی ہوتی تو ابن ہشام اس کی ترتیب وتہذیب کیسے کرتے؟ پس محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کی سیرت اس دور میں بھی علماء کے پاس موجود تھی، اور بعد میں بھی مدتِ دراز تک مقبول رہی۔ ہاں گزشتہ دو تین صدیوں میں یہ ضرور گم نام رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یورپی استعمار نے عالم اسلام کے کتاب خانوں کی لوٹ مار کر کے جن اعلیٰ کتابوں کو اسلامی دنیا سے ناپید کیا، ان میں محمد بن اسحق رحمہ اللہ کی سیرت بھی تھی۔ جب استعمار کا سورج ڈھلا تو علمائے اسلام اس کی تلاش میں سرگرداں ہوئے اور برسوں تلاش کے بعد اسے ڈھونڈ نکالا اور اس نسخے کی تحقیق کر کے ازسرِ نو طبع کرایا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلاف کے علمی منہج کو سنجیدگی کے ساتھ سمجھا جائے اور اگر اس کی توفیق نہ ہو تو کم از کم ''جدید تحقیق'' کے نام پر کی جانے والی کسی ایسی کوشش کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے جو عنوان کے لحاظ سے جذبات کو اپیل کرنے والی مگر حقیقت میں مسلمانوں کی علمی میراث کو ڈبونے کے مترادف ہو۔

❖❖❖

علمائے اُمت کی نگاہ میں امام طبری رحمہ اللہ کا مقام

بعض حضرات نے مختلف فورمز پر متعدد حوالوں اور متنوع انداز سے یہ پروپیگنڈا شروع کر رکھا ہے کہ امام طبری رحمہ اللہ محدثین، فقہاء اور اصحابِ جرح وتعدیل کے نزدیک معتبر شخص نہیں تھے۔ ہمیں ان لوگوں کی ہر بات کا جواب دینے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ مگر ان کی تلبیسات سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ قارئین کو تصویر کا حقیقی رُخ ضرور دکھایا جائے۔ اس سلسلے میں ہم ان شاء اللہ نہایت معتمد حوالوں سے درجِ ذیل امور واضح کریں گے:

1. امام طبری رحمہ اللہ کے بارے میں جلیل القدر علمائے اسلام کی آراء
2. ان کے اہم اساتذہ کا مختصر تعارف
3. ان کے مشہور تلامذہ کا مختصر تعارف
4. کتبِ حدیث، تفسیر وعقائد میں ان سے نقلِ احادیث واقوال کے شواہد
5. راویوں کی توثیق وتضعیف میں ان کی رائے پر اعتماد کا ثبوت
6. احادیث کی تصحیح وتضعیف میں ان کی رائے پر محققین کے اعتماد کا ثبوت

① امام طبری رحمہ اللہ کے بارے میں جلیل القدر علمائے اسلام کی آراء:

ہر دور کے جلیل القدر علماء نے امام طبری رحمہ اللہ پر اظہارِ اعتماد کیا ہے۔ ان میں سے چند نمایاں ہستیوں کی آراء یہ ہیں:

امام ابوبکر ابن خزیمہ رحمہ اللہ (م ۳۱۱ھ) کی رائے:

امام ابوبکر بن خزیمہ رحمہ اللہ امام طبری رحمہ اللہ کے معاصر اور مصر کے تعلیمی دورے میں ہم سفر تھے۔ ان سے ایک یا دو برس بڑے تھے۔ [1] امام طبری رحمہ اللہ کے متعلق ان کا ارشاد ہے: ''اس وقت روئے زمین پر ان سے بڑا عالم کوئی نہیں۔'' [2]

امام ابن خزیمہ کے تلمیذِ خاص ابواحمد بغداد کا سفر کر کے بھی حنابلہ کی مخالفانہ تحریک کی وجہ سے امام طبری سے نہ مل سکے، اس پر ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے غمزدہ ہو کر کہا: ''کاش! تم کسی اور سے روایت نہ لیتے مگر ان سے روایت لے لیتے۔'' [3]

---

① حافظ ذہبی انہیں الحافظ، الحجة، الفقیه، شیخ الاسلام، امام الائمة کہہ کر متعارف کراتے ہیں۔ (سیر اعلام النبلاء: ۳۶۵/۱۴) ان کی تالیف صحیح ابن خزیمہ حدیث کے بنیادی اور قابلِ اعتماد مآخذ میں شمار ہوتی ہے۔

② ما اعلم علیٰ ادیم الارض اعلم من محمد بن جریر ...... اخرجه ابن عساکر باسناد متصل عن زاهر بن طاهر ابوالقاسم الشحامی، عن الامام البیهقی، عن ابی عبدالله النیسابوری (الحاکم)، عن ابی بکر بن بالویه ...... (تاریخ دِمَشق: ۱۹۶/۵۲)
وابن بالویه وثقه الذهبی بقوله: من اعیان المحدثین والامام المفید. (سیر اعلام النبلاء: ۴۱۹/۱۵؛ تاریخ الاسلام: ۷۴۰/۷) اسمه ابو بکر محمد بن احمد، لم اجد احداً یجرحه، وبعض ابناء هذا الزمان نسبوه الی الرفض، وهذا جهل عظیم لان الروافض لا یتکنون بابی بکر قط.

③ اخرجه ابن عساکر فی تاریخ دِمَشق: ۱۹۵/۵۲ باسناد متصل عن زاهر بن طاهر ابوالقاسم الشحامی، عن الامام البیهقی، عن ابی عبدالله الحافظ (الحاکم)، عن الحسین بن علی ابواحمد النیشابوری الذی وثقه الخطیب وقال: حجة.

عبدالرحمٰن بن یونس المصری الحافظ رحمہ اللہ (۳۴۷ھ) کی رائے:

عبدالرحمٰن بن یونس المصری رحمہ اللہ چوتھی صدی ہجری کے اصحابِ جرح وتعدیل میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ①
انہوں نے ابن جریر طبری رحمہ اللہ کا ذکرِ خیر یوں کیا ہے:

''محمد بن جریر جن کی کنیت ابوجعفر ہے، طبرستان کے شہر آمُل کے تھے۔ وہ فقیہ تھے۔ بہت پہلے ۲۶۳ھ میں مصر آئے اور یہاں حدیث لکھی۔ انہوں نے اچھی تصنیفات کی ہیں جو ان کے علم کی وسعت کا ثبوت ہیں۔'' ②

عبدالعزیز ابوالحسن الطبری رحمہ اللہ (م۳۶۰ھ) کی رائے:

یہ بزرگ امام ابوالحسن الاشعری رحمہ اللہ کے فیض یافتہ اور دمشق میں اشاعرہ کے مایہ ناز متکلم تھے۔ ③ ان کا قول ہے:

''ابن جریر رحمہ اللہ ایسے قاری تھے کہ لگتا تھا انہیں قرآن کے سوا کچھ نہیں آتا۔ ایسے محدث تھے کہ جیسے حدیث کے سوا کچھ نہ جانتے ہوں۔ ایسے فقیہ تھے کہ فقہ ہی ان کا سب کچھ ہے۔ نحو اور ریاضی میں ایسے تھے جیسے یہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہو۔'' ④

ابومحمد عبداللہ الفرغانی رحمہ اللہ (م۳۶۲ھ) کی رائے:

ابومحمد عبداللہ الفرغانی رحمہ اللہ امام دارقطنی رحمہ اللہ کے شیوخ حدیث میں سے ہیں۔ بغداد کے امام جرح وتعدیل علامہ ابن مسرور رحمہ اللہ نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ ⑤ الفرغانی رحمہ اللہ نے ابن جریر طبری رحمہ اللہ کے حالات پر مفصل کلام کیا ہے اور بعد میں اسماء الرجال کے بیشتر ماہرین نے امام طبری رحمہ اللہ کے احوال میں ان سے استفادہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''انہوں نے ایسی تفسیر مکمل کی جس میں تفسیر کے احکام، ناسخ ومنسوخ، مشکلات، غریب لغات، احکام و تاویلات میں مفسرین کے اختلاف، اپنے نزدیک صحیح قول کے تعین، حروف کے اعراب، گمراہ فرقوں کی تردید، قصص، گزشتہ قوموں کی خبروں سمیت احکام اور عجائب کو سمیٹ لیا گیا ہے...... اگر کوئی عالم چاہے کہ اس سے الگ الگ علوم پر دس کتب اخذ کرے تو وہ کر سکتا ہے...... اور انہوں نے تہذیب الآثار کی ابتداء کی

---

① قال الذهبي: كان اماما في هذا الشان، ثم قال: وله كلام في الجرح والتعديل يدل علىٰ بصره بالرجال ومعرفته بالعلل. (سير اعلام النبلاء: ۸۵۳/۷)

② "محمد بن جرير بن يزيد، يكنىٰ اباجعفر، طبري، من اهلِ آمل، كان فقيها، قدم الىٰ مصر قديما سنة۲۶۳ھ وكتب بها، وصنف تصانيف حسنة تدل علىٰ سعة علمه. (تاريخ ابن يونس المصري: ۱۹۵/۲، ۱۹۶)

③ امام عبدالعزیز الطبری رحمہ اللہ نے بدعتی فرقوں کی تردید میں ''رياض المبتدى وبصيرة المستهدى'' لکھ کر موضوع کا حق ادا کر دیا۔ اسی طرح معتزلہ کے خلاف ''الرد علی جعفر بن حرب'' لکھ کر علمائے اسلام سے دادوصول کی ہے۔ علامہ ابن عساکر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''میں نے ان کی بعض تالیفات دیکھیں جو ان کے علم وفضل میں راسخ ہونے کا ثبوت ہیں۔'' (تاريخ دِمَشق: ۳۶ / ۳۴۰)

④ معجم الادباء: ۶۱/۱۸
⑤ سير اعلام النبلاء: ۱۳۲/۱۶، ۱۳۳
ان کی توثیق کرنے والے علامہ ابوالفتح بن مسرور بغدادی رحمہ اللہ (م۳۸۵ ہجری) کوئی معمولی ہستی نہیں۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے انہیں الامام، القدوة، الربانی، الثقة کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ وہ مستجاب الدعوات اور ابدال میں سے تھے۔ ان کے بارے میں امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے تھے: ''جب وہ بچے تھے تب سے ہم ان سے برکت حاصل کرتے تھے۔'' دیگر تصانیف کے علاوہ انہوں نے فضائل معاویہ رضی اللہ عنہ پر بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ (سير اعلام النبلاء: ۴۷۴/۱۶، ۴۷۵)

جو عجیب کتب میں سے ہے۔ اس کی ابتداء حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ان روایات سے کی جو انہیں ان کی صحیح سند سے پہنچی ہیں۔ ہر حدیث پر انہوں نے کلام کیا، اس کی علل وطرق کے بیان سے ابتدا کر کے انہوں نے اس حدیث کے فقہی مسائل، سنن، اس میں علماء کے اختلاف، ان کے دلائل، اس حدیث کے معارف و نکات اور اس پر اہلِ باطل کے اعتراضات اور ان کی تردید اور ان کی دلیلوں کی خامیوں کو بھی بیان کر دیا۔ انہوں نے عشرہ مبشرہ، اہلِ بیت، اور ان کے موالی اور مسندِ ابن عباس کا بڑا حصہ مکمل کر لیا تھا۔ ان کا عزم یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر صحیح حدیث کو آخر تک بیان کر دیں گے اور سب پر اسی طرح کلام کریں گے جیسا کہ وہ ابتداء سے کرتے آئے ہیں، تا کہ کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم پر طعن کا موقع نہ رہے۔ اور وہ تمام چیزیں پیش کر دیں جن کی اہلِ علم کو ضرورت پڑتی ہے۔ جیسے انہوں نے تفسیر میں کی اور اس میں علم شریعت اور قرآن وسنت کو پیش کر دیا۔ مگر وہ (تہذیب الآثار کی) تکمیل سے پہلے فوت ہو گئے۔ ان کے بعد کسی کے لیے ممکن نہ ہوا کہ وہ کسی ایک حدیث کی بھی ایسی تشریح کر سکے اور اس پر ایسا کلام کر سکے جیسا انہوں نے کیا۔''[1]

امام ابوحامد الاسفرائنی رحمہ اللہ (م ۴۰۶ھ) کی رائے:

امام اسفرائنی کو علامہ ابن صلاح رحمہ اللہ نے چوتھی صدی ہجری کا مجدد قرار دیا ہے۔[2] یہی مجددِ شوافع فرماتے تھے:

''اگر کوئی شخص چین تک کا سفر کر کے ابن جریر کی تفسیر حاصل کر لے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔''[3]

الحافظ ابویعلی الخلیلی رحمہ اللہ (م ۴۴۶ھ) کی رائے:

حافظ الخلیلی رحمہ اللہ عالی سند کے حامل حافظِ حدیث، فقیہ اور رجال وعلل کے ماہر عالم تھے۔[4] وہ امام شافعی رحمہ اللہ کے تلمیذِ خاص ابراہیم المزنی رحمہ اللہ کے فیض یافتگان کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں ان میں ابن جریر الطبری بھی ہیں۔[5]

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: ''یہ ہیں اس قدر شہرہ آفاق کہ تعارف کی ضرورت نہیں۔ علوم کے جامع، امام۔''[6]

خطیب بغدادی رحمہ اللہ (م ۴۶۳ھ) کی رائے:

فرماتے ہیں: ''وہ علوم پر حاوی ہونے کے لحاظ سے اپنے دور میں بے نظیر تھے۔ کتاب اللہ کے حافظ، علم قرآت کے

---

① التاريخ المذيل على تاريخ الطبرى لابى محمد الفرغانى. اخرجه ابن عساكر وقال قرأت بخط ابى محمد التميمى، مما نقله من كتاب ابى محمد عبدالله بن احمدا لفرغانى، وقد لقى من حدث عنه. (تاريخ دمشق: ۱۹۶/۵۲)
وهذا ابومحمد رزق الله بن عبدالوهاب التميمى شيخ شيوخ ابن عساكر، وذكره اصحاب الجرح والتعديل بانه "رئيس الحنابلة فى البغداد"، و"كان كبير بغداد وجليلها."، و"كان من الاثبات." (تاريخ الاسلام ذهبى: ۵۹۵/۱۰)

② تهذيب الاسماء واللغات: ۲۰۹/۲، ۲۱۰

③ اخرجه الخطيب البغدادى فى تاريخه: ۱۶۴/۲. قال بلغنى عن ابى حامد احمد بن ابى طاهر الاسفرائينى انه قال لو سافر رجل الى الصين حتى يحصل كتاب تفسير محمد بن جرير لم يكن ذلك كثيرا. وانظر تاريخ الاسلام للذهبى (۲۸۱/۲۳، ت تدمرى)

④ القاضى، العلامة، الحافظ...... طال عمره وعلى اسناده، كان ثقه، حافظا، عارفا بالرجال والعلل. (سير اعلام النبلاء: ۶۶۶/۱۷، ط الرسالة)

⑤ "وابوجعفر محمد بن جرير بن يزيد بطبرستان." (الارشاد فى معرفة علماء الحديث: ۴۳۰/۱، ط الرشد)

⑥ "ابو جعفر محمد بن جرير بن يزيد الطبرى، اشهر من ان يذكر، جامع فى العلوم، امام. (الارشاد فى معرفة علماء الحديث: ۸۰۰/۲)

ماہر، تفسیر پر نگاہ رکھنے والے، احکام کے فقیہ، سنت کے عالم، صحیح وضعیف اور ناسخ ومنسوخ روایات سے واقف اور صحابہ کرام کے اقوال وحالات سے باخبر تھے۔"[1]

امام عبدالقاہر البغدادی ابومنصور الاسفرائینی رحمہ اللہ (م ۴۷۱ھ) کی رائے:

یہ بغداد کے نامور متکلم اسلام تھے۔ ان کا ارشاد ہے: "اسی طرح ائمہ قرأت اور تفسیر بالروایہ کرنے والے علماء، دورِ صحابہ سے لے کر محمد بن جریر الطبری کے دور تک، سبھی اہلِ سنت تھے۔"[2]

امام ابواسحق شیرازی رحمہ اللہ (م ۴۷۶ھ) کی رائے:

امام شیرازی رحمہ اللہ نامور محدث اور فقیہ تھے۔ عمر بھر سنت کی اشاعت کے لیے سینہ سپر اور اہلِ باطل کے خلاف شمشیر بے نیام رہے۔[3] انہوں نے امام طبری رحمہ اللہ کو فقہائے اسلام میں شمار کیا ہے۔[4]

علامہ ابن صلاح رحمہ اللہ (م ۶۴۳ھ) کی رائے:

شافعی علماء میں علامہ ابن صلاح رحمہ اللہ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، اصولِ حدیث اور فقہ پر ان کا کام علمائے دین سے خراجِ تحسین وصول کر رہا ہے۔[5] انہوں نے ابن جریر طبری رحمہ اللہ کو شافعی فقہاء کی صف میں شمار کیا ہے۔[6]

امام شرف الدین نووی رحمہ اللہ (م ۶۷۶ھ) کی رائے:

طبری رحمہ اللہ کے متعلق فرماتے ہیں: "وہ مختلف علوم کے ماہر تھے۔ امام ترمذی اور امام نسائی کے طبقے میں شامل تھے۔"[7]

علامہ تاج الدین سبکی رحمہ اللہ (۷۲۷ھ) کی رائے:

فرماتے ہیں: "ابن جریر ہمارے چنے ہوئے اصحاب میں سے ایک تھے، اس بات میں کسی کو کوئی شک نہیں۔"[8]

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ (م ۷۲۷ھ) کی رائے:

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے فتویٰ لیا گیا کہ کونسی تفسیر قرآن وسنت کے سب سے زیادہ قریب ہے؟ انہوں نے جواب دیا: "دستیاب تفاسیر میں محمد بن جریر الطبری کی تفسیر صحیح ترین ہے؛ کیوں کہ وہ اسلاف کے اقوال ثابت شدہ سند کے ساتھ نقل کرتے ہیں، اس میں کوئی بدعت نہیں اور وہ مقاتل بن بکیر اور کلبی جیسے متہم لوگوں سے روایت نہیں لیتے۔"[9]

---

① تاریخ بغداد: ۱۶۱/۲، ط العلمیة ② الفرق بین الفرق، الفصل السادس

③ ابواسحق شیرازیؒ کے بارے میں حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں: المشیخ، الامام، القدوة، المجتهد، شیخ الاسلام. (سیر اعلام النبلاء: ۴۵۲/۱۸)

④ ابواسحق شیرازیؒ نے یہاں ان محدثین کا ذکر کیا ہے جنہیں نہ صرف ثقہ بلکہ فقیہ بھی مانا گیا ہے۔ ان میں امام طبریؒ کا ذکر یوں مندرج فرمایا ہے:
"ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری: نزل بغداد، ومات سنة ثلاث وثلاث مائة وهو صاحب التاريخ والمصنفات الكثيرة." (طبقات الفقهاء: ۹۳/۱، دار الرائد العربی، بیروت)

⑤ الفقيه الشافعي، كان احد فضلاء عصره في التفسير والحديث والفقه واسماء الرجال، ومايتعلق بعلم الحديث. (وفيات الاعيان: ۲۴۳/۳)

⑥ محمد بن جرير بن يزيد بن كثير بن غالب، ابو جعفر الطبری، كان احد ائمة العلماء، يحكم بقوله ويرجع الى رايه، لمعرفته وفضله، وقد كان جمع من العلوم مالم يشاركه فيه احد اهل عصره. (طبقات الفقهاء الشافعية: ۱۰۶/۱، ۱۰۷، دار البشائر بیروت)
طبقات الفقہاء الشافعیہ میں بھی انہی محدثین وفقہاء کا ذکر کیا گیا ہے جو نہ صرف ثقاہت بلکہ فقاہت کے بھی اعلیٰ درجے پر تھے۔

⑦ تهذيب الاسماء واللغات: ۷۸/۱، ط دار الكتب العلمية ⑧ طبقات الشافعية الكبرى: ۱۲۷/۳

⑨ الفتاوی الكبرى ابن تيمية: ۸۴/۵ امام ابن تیمیہؒ نے خود "دقائق التفسير" میں امام طبریؒ کی روایات لی ہیں۔ (۲۹/۳، ۱۵۹)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ (۷۴۸ھ) کی رائے:

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے جا بجا، ابن جریر طبری رحمہ اللہ کی ثقاہت کی گواہی دی ہے۔ ان کے چند بیانات درج ذیل ہیں:

❶ ''محمد بن جریر بن یزید نامور امام، مجتہد، اپنے دور کے علامہ تھے۔''[1]

❷ ''علم، ذہانت اور کثرتِ تصانیف میں وہ اپنے زمانے کے یکتا فرد تھے۔ آنکھوں نے ان جیسا کم دیکھا ہوگا۔''[2]

❸ ''میں کہتا ہوں، وہ ثقہ، سچے، حافظ، تفسیر کے قائد، فقہ اور اجماعی و اختلافی مسائل کے امام، تاریخ اور لوگوں کے احوال کے بہت بڑے عالم، قراآت اور لغات کے ماہر تھے۔''[3]

❹ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے طبقہ (۱۱) کے تحت امام طبری رحمہ اللہ کا نام امام نسائی، ابو یعلیٰ مُوصلی اور امام ابن خزیمہ نیشاپوری رحمہم اللہ جیسے بلند پایہ محدثین میں شامل فرمایا ہے۔[4]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ (م ۷۷۴ھ) کی رائے:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے انہیں شافعی فقہاء و محدثین میں شمار کرتے ہوئے کہا ہے: ''امام، عالم، عظیم تصانیف والے۔''[5]
البدایہ والنہایہ میں ان کا ذکر یوں کیا ہے: ''وہ علماء کے امام تھے۔ ان کے قول پر فیصلہ ہوتا تھا۔ ان کے علم و فضل کے باعث ان کی رائے کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔''[6]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ (م ۸۵۲ھ) کی رائے:

حافظ ابن حجر نے امام طبری کو ''الامام الجلیل، المفسر، صاحب التصانیف الباھرۃ'' کہہ کر متعارف کرایا ہے۔[7]

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ کی رائے:

علامہ آلوسی رحمہ اللہ، امام طبری رحمہ اللہ کے متعلق فرماتے ہیں: ''وہ اہلِ سنت کے جلیل القدر علماء میں سے ایک ہیں۔''[8]

دورِ حاضر کے علمی مآخذ سے بطورِ تائید بعض مثالیں:

شیخ محمد بن عبدالرحمٰن المغراوی حفظہ اللہ جنہوں نے اسلامی عقائد کی حفاظت کے لیے دس جلدوں میں ''موسوعۃ مواقف السلف فی العقیدۃ والمنهج'' جیسا عظیم الشان کام کیا ہے، امام طبری رحمہ اللہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ ان ائمہ میں سے ہیں جن کی عمر میں اللہ نے برکت دی، انہوں نے اتنا لکھا کہ محنتی قاری بھی جسے پڑھنے سے عاجز آ جائے، چہ جائے کہ ان جیسا کوئی لکھ سکے۔ اس امام نے ایسی میراث چھوڑی جس پر اوّلین و آخرین سب ان کے شکر گزار رہوئے۔''[9]

---

① الامام، العلم، المجتھد، عالم العصر. (سیر اعلام النبلاء: ۱۴/۲۶۷، الرسالۃ)
② وکان من افراد الدھر علماً وذکاءً وکثرۃ التصانیف، قل من تری العیون مثله...... (سیر اعلام النبلاء: ۱۴/۲۶۷)
③ قلتُ: کان ثقۃ، صادقاً، حافظاً، رأساً فی التفسیر، اماماً فی الفقه والاجماع والاختلاف، علامۃ فی التاریخ وایام الناس، عارفاً بالقراآت واللغات. (سیر اعلام النبلاء: ۱۴/۲۷۰)
④ المعین فی طبقات المحدثین، ص ۱۰۸
⑤ "الامام العالم، صاحب التصانیف العظیمۃ. (طبقات الشافعیین: ۱/۲۲۲)
⑥ البدایۃ والنھایۃ: ۱۴/۸۴۶
⑦ لسان المیزان: ۵/۱۰۰
⑧ تفسیر روح المعانی، سورۃ المائدۃ، آیت: ۶
⑨ موسوعۃ مواقف السلف فی العقیدۃ والمنهج: ۵/۱

''الموسوعۃ العربیۃ العالمیہ'' میں امام طبری رحمہ اللہ کا تعارف یوں کرایا گیا ہے:

''وہ اہل سنت کے بڑے اماموں میں سے ایک تھے، ان کے اقوال اختیار کیے جاتے ہیں اور ان کی وسعت علمی اور صحیح منہج کے باعث ان کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ انہوں نے کئی مفید کتابیں لکھیں جن میں ان کی ''تفسیر جامع البیان عن تاویل آی القرآن'' سب سے زیادہ مشہور ہے جو تفسیرِ طبری کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ پہلی مکمل تفسیر ہے جو ہم تک پہنچی، ان کے بعد والے سبھی نے اس تفسیر سے استفادہ کیا ہے؛ اسی لیے علماء، طبری کو ''ابوالتفسیر'' شمار کرتے ہیں جیسا کہ انہیں ''ابوالتاریخ'' بھی مانا جاتا ہے؛ کیوں کہ انہوں نے تاریخ میں ایسی ضخیم کتاب تالیف کی جو بے مثال ہے۔ ہاں مگر اس میں انہوں نے معتبر روایات جمع کرنے کا التزام نہیں کیا۔''

④ اساتذہ حدیث

امام طبری رحمہ اللہ نے جن نامور شیوخِ حدیث سے استفادہ کیا، ان میں سے چند نمایاں شخصیات کے اسماء یہ ہیں:

1. ابوزُرعہ الرازی رحمہ اللہ (م ۲۶۱ھ) رے...... شیخِ مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ رحمہم اللہ[1]
2. ابراہیم بن سعید جوہری رحمہ اللہ (۲۵۰ھ) عینِ زربہ، شمالی شام...... شیخِ مسلم، ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ رحمہم اللہ
3. ابوکریب محمد بن العلاء رحمہ اللہ (۲۴۷ھ) کوفہ...... شیخِ بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ رحمہم اللہ
4. احمد بن مقدام رحمہ اللہ (م ۲۵۳ھ) بصرہ...... شیخِ بخاری، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ رحمہم اللہ
5. احمد بن منیع البغوی رحمہ اللہ (۲۴۴ھ) بغداد...... شیخِ بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداود، ابن ماجہ رحمہم اللہ
6. اسحاق بن ابی اسرائیل رحمہ اللہ (م ۲۴۵ھ) بغداد...... شیخِ بخاری، نسائی وابوداود رحمہم اللہ
7. اسماعیل بن موسیٰ السدی رحمہ اللہ (۲۴۵ھ) کوفہ...... شیخِ ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ رحمہم اللہ
8. بندار محمد بن بشار رحمہ اللہ (۲۵۲ھ) بصرہ...... شیخِ بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ رحمہم اللہ
9. حسن بن صباح بزار رحمہ اللہ (۲۴۹ھ) بغداد...... شیخِ بخاری، ابوداود، ترمذی، نسائی رحمہم اللہ
10. صالح بن مسمار رحمہ اللہ (م ۲۵۰ھ) مرو...... شیخِ مسلم، ترمذی، ابنِ خزیمہ رحمہم اللہ
11. عبدالحمید بن بیان رحمہ اللہ (۲۴۴ھ) واسط...... شیخِ مسلم، ابوداود، ابن ماجہ رحمہم اللہ
12. مجاہد بن موسیٰ رحمہ اللہ (م ۲۴۴ھ) بغداد...... شیخِ مسلم ونسائی، ابوداود، ابن ماجہ رحمہم اللہ
13. محمد بن عبدالاعلیٰ رحمہ اللہ (م ۲۴۵ھ) بصرہ...... شیخِ مسلم، ترمذی، نسائی رحمہم اللہ
14. محمد بن المثنیٰ ابوموسیٰ رحمہ اللہ (م ۲۵۲ھ) بصرہ...... شیخِ بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداود، نسائی، ابن ماجہ رحمہم اللہ[2]

---

① طبقات الحنابلة لابن ابی یعلیٰ م ٥٢٦: ١/ ٢٠٠، دار المعرفة بیروت

② انہی کے ہم نام وہم مکان بصرہ کے محمد بن عبداللہ ابن المثنیٰ الانصاری ہیں جنہیں مختصراً محمد بن المثنیٰ کہا جاتا ہے۔ صحاحِ ستہ میں ان کی روایات بھی ہیں مگر ایک واسطے سے۔ وہ ۲۱۵ھ میں یعنی امام طبریؒ سے دس برس پہلے فوت ہوئے۔ بعض حضرات کا یہ اعتراض بے جا ہے کہ امام طبری نے اپنی ولادت سے بھی دس برس پہلے کے شخص سے کیسے روایت لینے کا دعویٰ کیا ہے؛ کیوں کہ امام طبریؒ اور مؤلفین صحاحِ ستہ نے جس محمد ابن المثنیٰ بلا واسطہ سے روایت لی ہے، وہ متوفی ۲۵۲ ہجری ہیں۔

⑮ محمد بن عبدالحمید الرازی رحمہ اللہ ...... (م ۲۴۸ھ) رے ...... شیخ ابوداود سجستانی، ترمذی وابن ماجہ رحمہم اللہ

⑯ محمد بن عبدالملک بن ابی الشوارب رحمہ اللہ (م ۲۴۴ھ) بصرہ ...... شیخ مسلم، نسائی، ترمذی، وابن ماجہ رحمہم اللہ

⑰ محمد بن معمر قیسی رحمہ اللہ (بعد ۲۵۰ھ) ...... شیخ بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی، نسائی وابن ماجہ رحمہم اللہ

⑱ نصر بن علی جہضمی رحمہ اللہ (م ۲۵۰ھ) ...... شیخ بخاری، ابوداود، ترمذی، نسائی وابن ماجہ رحمہم اللہ [1]

⑲ ہناد بن السری رحمہ اللہ (م ۲۴۳ھ) ...... شیخ مسلم، ابوداود، ترمذی، نسائی وابن ماجہ رحمہم اللہ

⑳ یعقوب بن ابراہیم الدورقی رحمہ اللہ (م ۲۵۲ھ) بغداد ...... شیخ بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی، نسائی وابن ماجہ رحمہم اللہ

㉑ یونس بن عبدالاعلیٰ رحمہ اللہ (م ۲۶۴ھ) مصر ...... شیخ مسلم، نسائی وابن ماجہ رحمہم اللہ [2]

اس سے معلوم ہوا کہ امام طبری رحمہ اللہ کے اساتذہ ومشائخ میں خاصی تعداد ان عمر رسیدہ عالی الاسناد محدثین کی تھی جن سے مؤلفینِ صحاحِ ستہ سماعِ حدیث کر چکے تھے۔ ان کے علاوہ بھی انہوں نے سینکڑوں علماء ومحدثین سے علم حاصل کیا۔

یاد رہے کہ امام طبری رحمہ اللہ نے جب علم حدیث حاصل کرنا شروع کیا، تب تک مؤلفینِ صحاحِ ستہ کا دورِ تعلیم ختم ہو چکا تھا اور وہ درسِ حدیث اور تالیفی کام میں مشغول تھے۔ امام طبری ان سے ذرا بعد کی پیڑھی کے تھے؛ اس لیے ان حضرات کو امام طبری سے سماع کی ضرورت نہ تھی۔ [3] اسی لیے صحاحِ ستہ میں امام طبری رحمہ اللہ کی روایات نہیں۔

رہی یہ بات کہ امام طبری رحمہ اللہ نے مؤلفینِ صحاح کی حلقہ بگوشی کیوں نہیں کی، تو امام طبری رحمہ اللہ کے شیوخ کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عمر رسیدہ عالی الاسناد محدثین سے سماع کو ترجیح دیتے تھے۔ چونکہ اس وقت مؤلفینِ صحاحِ ستہ کے بہت سے طویل العمر شیوخ بقیدِ حیات تھے، اس لیے امام طبری رحمہ اللہ نے براہِ راست انہی سے حدیث کا سماع کر لیا۔ پس کم عمری کے باوجود سند عالی ہونے کی وجہ سے امام طبری رحمہ اللہ بھی امام نسائی رحمہ اللہ کے طبقے میں شمار کیے گئے اور بعد میں آنے والے بڑے بڑے محدثین اور محققین نے ان کی روایات کو قبول کیا ہے۔

---

① نصر بن علی جہضمی دو ہیں: ایک الکبیر (م ۱۵۰ھ) الازدی البصری ...... دوسرے الصغیر (م ۲۵۰ھ) جو کہ الکبیر کے پوتے ہیں۔ امام بخاری، ترمذی، ابوداود، نسائی اور امام طبری رحمہم اللہ نے انہی دوسرے (الصغیر) سے روایت لی تھی۔

② انظر اسماء شیوخ الطبری فی: سیر اعلام النبلاء: ۲۶۹/۱۴؛ طبقات الشافعیین، ص ۲۲۳؛ تهذیب الاسماء واللغات للنووی: ۱/ ۷۸ ان حوالہ جاتی کتب میں امام طبری کے مزید شیوخ وتلامذہ کے نام بھی ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ چند شیوخ وتلامذہ کے مقام ومرتبہ کی طرف اشارہ کرنے کے لیے متن میں چند تعارفی سطور پیش کی گئی ہیں۔ درخت سے پھل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور تلامذہ وشیوخ کی عظمت سے کسی عالم کے مقام کا۔

③ سنِ ولادت اور وفات کی درج ذیل فہرست سے ان حضرات کے زمانہ تعلیم وتعلم اور درس وتدریس کے مابین فرق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

امام بخاری رحمہ اللہ: ۱۹۴ھ تا ۲۵۶ھ

امام ابوداود رحمہ اللہ: ۲۰۲ھ تا ۲۷۵ھ

امام مسلم رحمہ اللہ: ۲۰۴ھ تا ۲۶۱ھ

امام ابن ماجہ رحمہ اللہ: ۲۰۹ھ تا ۲۷۳ھ

امام ترمذی رحمہ اللہ: ۲۱۰ھ تا ۲۷۹ھ

امام نسائی رحمہ اللہ: ۲۱۵ھ تا ۳۰۳ھ

امام طبری رحمہ اللہ: ۲۲۵ھ تا ۳۱۰ھ

③ امام طبری رحمہ اللہ کے چند مشہور تلامذہ

❶ امام ابوالقاسم الطبرانی رحمہ اللہ (م ۳۶۰ھ): شہرۂ آفاق محدث ہیں۔ الامام، الحافظ، الثقۃ، محدث الاسلام کے القاب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ معجم کبیر، معجم اوسط اور معجم صغیر ہی ان کے تعارف کے لیے کافی ہیں۔ [1]

❷ ابواحمد ابن عدی رحمہ اللہ (م ۳۶۵ھ): امام جرح وتعدیل تھے۔ ''الکامل فی معرفۃ الضعفاء'' سے ان کے مقام کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''عظیم ائمہ میں سے ایک، لوگوں کو پرکھنے والے، ستونِ اسلام۔'' [2]

ان کے معاصر امام دارقطنی رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ آپ ضعیف راویوں پر ایک کتاب لکھ دیں۔ انہوں نے فرمایا: ''کیا تمہارے پاس ابن عدی کی کتاب نہیں؟ وہ کافی ہے، اس میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں۔'' [3]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ابن عدی علل اور رجال کے ایسے حافظ تھے جن کے ہم پلہ کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔'' [4]

❸ ابوبکر قفال الشاشی الشافعی رحمہ اللہ (م ۳۶۵ھ): القفال الکبیر کے لقب سے مشہور ہیں۔ وسطِ ایشیا میں وہ شوافع کے امام تھے۔ ان کی تصانیف میں ''شرح الرسالۃ''، ''دلائل النبوۃ'' اور ''محاسن الشریعۃ'' مشہور ہیں۔ اصولِ فقہ میں انہوں نے بہت کام کیا۔ تفسیر، حدیث، علمِ اصول اور علم کلام کی کتب میں ان کے اقوال بکثرت بیان کیے جاتے ہیں۔ [5]

❹ احمد بن کامل رحمہ اللہ (م ۳۵۰ھ): فقہ، تفسیر اور تاریخ کے بہت بڑے عالم تھے۔ کوفہ کے قاضی رہے۔ کئی کتابیں لکھیں۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ کے شیخ تھے۔ بعض حضرات نے انہیں فقہائے حنفیہ میں شمار کیا ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ وہ مذہبا شافعی تھے اور امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ کے مسلک پر تھے۔ [6]

❺ احمد بن قاسم الخشاب رحمہ اللہ (م ۳۶۴ھ): حفاظِ حدیث میں شمار ہوتے تھے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ انہیں ''الحافظ الاوحد'' کہتے ہیں۔ امام طبری رحمہ اللہ کے علاوہ، یہ امام ابوالقاسم البغوی رحمہ اللہ اور امام طحاوی رحمہ اللہ کے بھی شاگرد تھے۔ [7]

❻ ابوعمرو محمد بن احمد بن حمدان رحمہ اللہ (م ۳۷۶ھ): امام سبکی رحمہ اللہ نے ''الزاہد، المقری، الفقیہ، المحدث، النحوی'' کے الفاظ سے ان کا تعارف کرایا ہے۔ [8] حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے انہیں ''محدث نیشاپور'' کہہ کر یاد کیا ہے۔ [9]

❼ عبدالغفار بن عبیداللہ الحضینی رحمہ اللہ: (م ۳۶۷ھ): اپنے دور کے امام قراءات اور اس فن میں مصنف تھے۔ [10]

❽ محمد بن عبداللہ ابوبکر الشیبانی رحمہ اللہ (م ۳۸۸ھ): امام سبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ابوبکر علم اور دین کے لحاظ سے ائمہ مسلمین میں سے ایک تھے۔ نیشاپور کے محدث تھے۔'' ''المسند الصحیح علی کتاب مسلم'' اور ''کتاب المحقق'' ان کی تصانیف ہیں۔ وہ فرماتے تھے: علم حدیث پر ایک لاکھ درہم خرچ کیے ہیں اور اس سے ایک درہم بھی نہیں کمایا۔ [11]

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱۱۹/۱۶ ② طبقات الشافعیین: ۲۸۳ ③ طبقات الشافعیین، ص ۲۸۳

④ تاریخ الاسلام: ۲۴۰/۸

⑤ تاریخ الاسلام ذہبی: ۳۴۵/۲۶، ۳۴۶، ت تدمری؛ ۲۴۵/۸، ت بشار...... جب القفال الکبیر کا ذکر ہو تو یہی مراد ہوتے ہیں، البتہ ایک القفال المروزی بھی مشہور ہیں جو پانچویں صدی ہجری کے ہیں اور ان کا ذکر عموماً فقہی ابحاث میں آتا ہے۔

⑥ الجواهر المضية في طبقات الحنفية: ۹۰/۱ ط میر محمد؛ الطبقات السنية في تراجم الحنفية، ص ۱۲۵

⑦ سیر اعلام النبلاء: ۱۵۱/۱۶ ⑧ طبقات الشافعية: ۶۹/۳ ⑨ میزان الاعتدال: ۴۵۷/۳

⑩ تاریخ الاسلام: ۳۷۳/۲۶، ۳۷۴ ت تدمری؛ ۲۶۸/۸ ت بشار ⑪ طبقات الشافعیہ: ۱۸۴/۳، ۱۸۵

❾ ابوشعیب عبداللہ بن الحسن الحرانی الاموی رحمہ اللہ (م ۲۹۵ھ): عمر میں بڑے اور اسناد اعلیٰ ہونے کے باوجود امام طبری سے سماع حدیث کیا۔[1]

❿ ابن السنی رحمہ اللہ (۳۶۴ھ): ''عمل الیوم واللیلۃ'' جیسی مفید کتاب کے مؤلف اور امام طبری رحمہ اللہ کے تلمیذ ہیں۔[2]

④ کتبِ حدیث، تفسیر وعقائد میں ان سے نقلِ احادیث واقوال کے شواہد

امام طبری رحمہ اللہ اتنے بڑے عالم تھے کہ ان کی روایات کو بعد کے جلیل القدر ائمہ نے علم حدیث، علم تفسیر اور علم عقائد سے متعلق اپنی تصانیف میں پورے اعتماد کے ساتھ پیش کیا۔ اس کی کچھ مثالیں درج ذیل ہیں:

کتبِ احادیث میں امام طبری رحمہ اللہ کی روایات:

❶ معجم صغیر: امام طبرانی رحمہ اللہ (م ۳۶۰ھ) کی تالیف ہے جس میں امام طبری رحمہ اللہ سے بھی احادیث لی گئی ہیں۔[3]

❷ معجم کبیر: امام طبرانی رحمہ اللہ کے اس عظیم الشان ذخیرۂ حدیث میں بھی امام طبری رحمہ اللہ کی احادیث لی گئی ہیں۔[4]

❸ عمل الیوم واللیلۃ: یہ ابن السنی الدینوری رحمہ اللہ (م ۳۶۴ھ) کی شہرۂ آفاق نہایت مفید تالیف ہے، اس میں بھی امام طبری رحمہ اللہ سے مروی مرفوع احادیث موجود ہیں۔[5]

❹ مستدرک حاکم: امام حاکم نیشاپوری رحمہ اللہ (م ۴۰۵ھ) کی مستدرک میں امام طبری رحمہ اللہ سے بکثرت احادیث لی گئی ہیں، جن میں سے بعض کو حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے صحیحین یا ان میں سے کسی ایک کے معیار پر قرار دیا ہے۔[6]

❺ سنن صغیر بیہقی: امام بیہقی رحمہ اللہ (م ۴۵۸ھ) کی اس تالیف میں امام طبری رحمہ اللہ سے احادیث منقول ہیں۔[7]

---

① تاریخ الاسلام: ۲۲/۱۷۷، ۲۳ ص ۲۸۰ ت تدمری؛ ۶/۹۶۳، ۷/۱۶۰ ت بشار

② انظر: عمل الیوم واللیلۃ، روایت نمبر: ۹۹

③ طبرانی: حدثنا محمد بن جریر الطبری الفقیہ، حدثنا اسماعیل بن المتوکل الحمصی...... عن علقمۃ عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: کنت مع النبی ﷺ، اذ اتاہ یہودی فقال: یا اباالقاسم! ماالروح؟ (المعجم الصغیر، ح: ۱۰۰۳)

④ حدثنا الطبری الفقیہ محمد بن جریر، ثنا یحییٰ بن ابراہیم...... الالعن من لعن رسول اللہ ﷺ الخ. (المعجم الکبیر، ح: ۹۴۶۹)

⑤ اخبرنا محمد بن جریر، حدثنا ابو کریب...... عن طارق بن شہاب، عن عبداللہ رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ، ما من مسلم یقول اذا سمع النداء بالصلوۃ. (عمل الیوم واللیلۃ، روایت نمبر: ۹۹) اخبرنا محمد بن جریر الطبری، حدثنا الفضل بن سہل الاعرج...... عن عمران بن حصین رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ ...... (عمل الیوم واللیلۃ، روایت نمبر: ۳۲۷)
اخبرنا محمد بن جریر الطبری وسلم بن معاذ، قالا حدثنا ابراہیم بن احمد بن عمرو الضحاک...... عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال کان رسول اللہ ﷺ ...... (عمل الیوم واللیلۃ، روایت نمبر: ۵۹۳)

⑥ حدثنا ابوعلی الحسین بن علی الحافظ، انبانا محمد بن جریر الطبری، ثنا عثمان بن یحییٰ القرقسانی .... عن عبداللہ، قال کان رسول اللہ ﷺ یعلمنا الخ (المستدرک للحاکم، روایت نمبر: ۹۷۸. قال الذہبی علیٰ شرط مسلم)
عن ابی ذر رضی اللہ عنہ قال طلب رسول اللہ ﷺ...... قال "اوتیت اللیلۃ خمسا ......الخ (ح: ۳۵۸۷، قال الذہبی علیٰ شرط البخاری ومسلم) نیز دیکھیے: روایات نمبر:
۱۷۵۹......۴۲۷۶......۴۵۱۸......۴۸۶۴......۵۵۴۸......۵۵۵۵......۵۶۲۵......۶۲۲۶......۶۴۲۳......۶۷۷۱......۶۸۱۷......۶۸۶۱......۶۹۴۳......۶۹۹۵، ۷۵۹۳

⑦ اخبرنا ابو عبداللہ الحافظ، انا ابو عبداللہ الفقیہ، انا محمد بن جریر الطبری، انا سعید بن یحییٰ بن سعید الاموی...... عن عروۃ، عن عائشۃ ان النبی ﷺ، قال ایما امراۃ نکحت بغیر اذن ولیہا وشاہدی عدل فنکاحہا باطل. (السنن الصغیر للبیہقی، ح: ۲۳۸۲)

⑥ السنن الکبریٰ بیہقی: یہ امام بیہقی رحمہ اللہ کا عظیم ذخیرۂ حدیث ہے جس سے ہر دور میں علماء استفادہ کرتے آئے ہیں۔ اس کی متعدد احادیث کی سند میں امام طبری رحمہ اللہ موجود ہیں۔ [1]

⑦ شعب الایمان: امام بیہقی رحمہ اللہ کی اس شاہکار تالیف میں بھی امام طبری رحمہ اللہ کی احادیث ہیں۔ [2]

⑧ الترغیب والترہیب: حافظ عبدالعظیم المنذری رحمہ اللہ (م ٦٥٦ھ) کے اس مقبولِ عام ذخیرۂ حدیث میں بھی امام طبری رحمہ اللہ کی روایات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ [3]

⑨ مسند الفاروق: حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ (م ٧٧٤ھ) نے مسند الفاروق میں امام طبری رحمہ اللہ سے حدیث لی ہے۔ [4]

⑩ اتحاف المهرة: یہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ (م ٨٥٢ھ) کی فنِ حدیث میں مایہ ناز تالیف ہے، جس میں پچیس ہزار سے زائد احادیث جمع کر دی گئی ہیں۔ نقد وجرح میں اعلیٰ معیار رکھنے والے ابنِ حجر رحمہ اللہ نے اس تالیف میں امام طبری رحمہ اللہ کی سند سے بکثرت احادیث نقل کی ہیں۔ [5]

کتبِ تفسیر میں امام طبری رحمہ اللہ کی روایات:

امام طبری رحمہ اللہ کو مفسرین کا امام مانا جاتا ہے، ان کے بعد آنے والا شاید ہی کوئی ایسا مفسر ہوگا جو ان کی روایات یا ان کے تفسیری اقوال سے بے نیاز رہا ہو۔ محتاط علماء بھی اس بارے میں امام طبری رحمہ اللہ پر پورا اعتماد کرتے تھے۔ امام ابوالحسن الواحدی رحمہ اللہ (م ٤٦٨ھ) کی "التفسیر الوسیط"، امام بغوی رحمہ اللہ (م ٥١٠ھ) کی "تفسیر معالم التنزیل"، امام رازی رحمہ اللہ (٦٠٦ھ) کی "تفسیر مفاتیح الغیب"، امام قرطبی رحمہ اللہ (م ٦٧١ھ) کی "الجامع لاحکام القرآن" امام خازن رحمہ اللہ (م ٧٥١ھ) کی "لباب التاویل"، حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی "تفسیر القرآن العظیم" امام ثعالبی رحمہ اللہ (م ٨٧٥ھ) کی "الجواہر الحسان"، امام سیوطی رحمہ اللہ (م ٩١١ھ) کی "الدر المنثور" اور علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ (م ١٢١٧ھ) کی "تفسیر روح المعانی" سمیت درجنوں تفاسیر میں امام طبری رحمہ اللہ کے اقوال اور روایات کو نقل کیا گیا ہے۔ [6]

---

① السنن الکبریٰ للبیهقی، روایات نمبر: ٥٧٦...... ١٠١١٢...... ١٢٥٥٥...... ١٥٥٥٥...... ١٨١٠٩،

② شعب الایمان، روایات نمبر: ١٢١٩...... ٢٦٦٥...... ٦٦١٢...... ١٠٣٨٤،

③ الترغیب والترهیب، روایات نمبر: ١٠٧٠...... ١٨١٠

④ مسند الفاروق: ٦٩١/٢، ط دارالوفاء المنصورہ

⑤ اتحاف المهرة: ٣٥٠/٣...... ٣٩٨/٤...... ٥٣٨/٤...... ٢١٠/٥...... ١٣٢/٥...... ١٣٥/٥...... ٣٢٧/٦...... ٥٠٢/٦...... ٥٣٩/٧...... ٢١٢/١٠...... ١٨٣/١٠...... ٢٢٩/١٠...... ٣٥٤/١١...... ٣٧٦/١١...... ٥١٥/١١...... ٥٩٦/١١...... ٦١٤/١١...... ٦٥٥/١١...... ٦٥٦/١١...... ٤٩/١٣...... ٦٢٤/١٣،...... ١٦٩/١٤...... ٦٨٥/١٤، ط مجمع الملک فهد

⑥ صرف تفسیر ابن کثیر کی سورۃ البقرہ سے چند حوالے پیش کیے جا رہے ہیں جو بڑی محتاط اور محققانہ تفسیر ہے:
سورۃ الفاتحہ، حدیث: هی ام القرآن وهی فاتحة الکتاب وهی السبع المثانی: ١٩/١
سورۃ البقرۃ، آیت: ٤٥، ٤٦: ١٥٤/١ ...... البقرۃ، آیت: ٦٧، ١٩١/١ ...... البقرہ، آیت: ٩٤ تا ٩٦، ٢٢١/١ ......
البقرہ، آیت: ١٨٦، ٣٧٤/١ ...... البقرہ، آیت: ٢٥٠ تا ٢٥٢، ٥١٠/١
اگر کتبِ تفاسیر میں امام طبری رحمہ اللہ کے حوالوں سے منقول اقوال اور روایات کو جمع کیا جائے تو ایک الگ ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔

کتب عقائد و احکام میں امام طبری رحمہ اللہ کی روایات سے استشہاد:

امام طبری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر اور دیگر کتب و رسائل میں عقائدِ صحیحہ و فقہی احکام کے اثبات اور باطل نظریات و بدعات کی تردید میں جو احادیث اور اقوال پیش کیے، علماء نے عقائد و احکام کی کتب میں انہیں جا بجا نقل کیا ہے۔ ان علماء میں حافظ ذہبی، امام سیوطی، علامہ شوکانی، ابن حجر ہیثمی اور امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ جیسے بلند پایہ حضرات شامل ہیں۔[1]

⑤ راویوں کی توثیق و تضعیف میں امام طبری کی آراء پر اعتماد

امام طبری رحمہ اللہ فنِ جرح و تعدیل اور علل میں قابلِ رشک دسترس رکھتے تھے۔ ''اختلاف الفقہاء'' اور ''تہذیب الآثار'' میں ان کی تحقیقات اس کی شاہد ہیں۔ ائمہ فنِ رجال نے اپنی شہرۂ آفاق موسوعات میں امام طبری رحمہ اللہ کے اقوال نقل کیے ہیں۔ جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فنِ جرح و تعدیل کے ائمہ، راویوں کے بارے میں ان کی رائے کو خاص اہمیت دیتے تھے۔[2]

---

① اس سلسلے میں ہم چند مثالیں پیش کر رہے ہیں:

❶ العرش: للحافظ الذهبی: ۲/۱۷ ...... ص ۱۸۲ ...... ص ۲۸۵ ...... ص ۳۵۷ ...... ص ۳۵۸ ...... مکتبة اضواء السلف. ریاض

❷ العلوّ للعلی الغفار للذهبی ...... ص ۸۳ ...... ص ۱۲٤ ...... ص ۲۰۵

❸ المنتقیٰ من منهاج الاعتدال للذهبی، ص ۳۱ ...... ص ۱۷۲، ۱۷۳ ...... ص ٤٤۹ ......

❹ ایثار الحق علی الخلق، لعز الدین الیمنی ...... ص ۱۸۹ ...... ص ٤١٤، دار الکتب العلمیه

❺ حقیقة السنة والبدعة للسیوطی ...... ص ۱۱۷، ط مطابع الرشید

❻ الصواعق المحرقة علیٰ اهل الرفض والضلال والزندقة لابن حجر الهیثمی ...... ۱/۲۹۰ ...... ۲/٤۲۲ ...... ٥۳۰

❼ اقاویل الثقات فی تاویل الاسماء والصفات، للمقدسی الحنبلی ...... ص ۵۷

❽ تطهیر الاعتقاد لمحمد بن اسماعیل الصنعانی امیر یمانی ومحمد بن علی الشوکانی، ص ۱۰۸ ط سفیر الریاض

❾ رفع الاستار لمحمد بن اسماعیل الصنعانی امیر یمانی، ص ۹۳، ۱۱۰، ط المکتب الاسلامی بیروت

❿ لوامع الانوار البهیة ...... للسفارینی الحنبلی: ۱/۳۷٦ ...... ص ٤٤۹ ...... ۲/۱۵۸ ...... ۱٦۱ ...... ۱٦۳ ...... ۱۹۱، ط مؤسسة الخافقین

⓫ اعتقاد اهل السنة لابی القاسم اللالکائی: ۱/۱۸۳ ...... ۱۸٤ ...... ۲/۲۳٤ ...... ۳۲۰ ...... ۳۵۳ ...... ۳۵۵ ...... ۳۵۹، ط دار طیبة ریاض

⓬ اقتضاء الصراط المستقیم لابن تیمیة: ۲/۱۹۲، ط دار عالم الکتب بیروت

⓭ الاخنائیة لابن تیمیه، ص ۲۱٦ ...... ص ۲۱۷، ط دار الخراز جدة

⓮ الجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح لابن تیمیه: ۱/۱۹۵ ...... ۲/۱۹۰، ط دار العاصمة

⓯ الحسنة والسیئة لابن تیمیة، ص ۱۵۷، ط دار الکتب العلمیة

⓰ الرد علیٰ من قال بفناء الجنة والنار لابن تیمیة، ص ٦۸، ط دار بلنسیة

⓱ منهاج السنة لابن تیمیة: ۵/۵۱۸ ...... ص ۷ ص ۱۳ ...... ۷/۱٤۱ ...... ۷/۲٤۹ ...... ۷/۳۰۰ ...... ۸/٤۹۵ ...... ص ۵۵۵

② یاد رہے کہ امام طبری رحمہ اللہ کے یہ اقوال صرف راویوں کے سنِ پیدائش، سنِ وفات، اسفار اور سماع وغیرہ ہی سے متعلق نہیں بلکہ ان کی ثقاہت، فقاہت یا ضعف اور نا قابلِ استدلال ہونے کے بارے میں بھی ہیں۔ جرح و تعدیل کے مشہور ماخذ ''تہذیب التہذیب'' (لابن حجر) سے چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

☆ قال ابو جعفر الطبری: لیس بذا لك. (تهذیب التهذیب، ۲/۱٦۲، ترجمة الحارث بن وجیه، مطبوعه نظامیه دکن)

☆ ذکره ابو جعفر الطبری فی طبقات الفقهاء. (۲/۱۷۹ ترجمة: حبیب بن ابی ثابت)

☆ قال ابو جعفر الطبری فی التهذیب: لیس بمعروف فی اهل النقل عندهم. (٤/۳۹٦ ترجمة: صالح بن عبدالله بن ابی فروه)

☆ قال ابو جعفر الطبری فی طبقات الفقهاء: کان ذا ادب وفقه وعلم. (۵/٦۹ ترجمة: عامر بن شراحیل الشعبی)

⑥ احادیث کی تصحیح وتضعیف میں امام طبری کی رائے پر محققین کا اعتماد

محققین نے احادیث کے معیار میں بھی امام طبری رحمہ اللہ کی رائے کو معتبر مانا ہے۔ جن احادیث کو امام بخاری رحمہ اللہ جیسے اساطین صحیح قرار دے چکے ہیں، ان کی صحت کی تائید میں بھی امام طبری رحمہ اللہ کی رائے کو پیش کیا گیا۔ جن احادیث کے متعلق پہلے کوئی رائے قائم نہیں کی گئی تھی، ان میں بھی امام طبری رحمہ اللہ کی رائے پر بھروسہ کیا گیا ہے۔ ①

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:

☆قال ابوجعفر الطبری: کان شاعرا، فقیها، ورعاً. (٥/٢٥١، ترجمة: عبدالله بن شبرمة)

☆قال ابوجعفر الطبری فی تهذیب الآثار: اختلط عقله فی آخر عمره. (٥/٣٧٩، ترجمة: عبدالله بن لهیعه)

☆قال ابن المدینی هو شیخ مجهول وکذا قال ابوجعفر الطبری. (٦/٨٥، ترجمة: عبدالله بن یسار)

☆قال ابوجعفر الطبری: کان مقدما فی العلم والمعرفة بالاحکام. (٧/٢٤، ترجمة: عبیدالله بن عبدالله بن عتبة بن مسعود)

☆قال ابوجعفر الطبری: عبیدالله بن الوازع غیرمعروف فی نقلة الآثار. (٧/٥٥، ترجمة: عبیدالله بن الوازع)

☆ قال ابوجعفر الطبری: وکثیر بن زیدعندهم ممن لایحتج بنقله. (٨/٤١٤ ترجمة: کثیر بن زید)

☆قال ابوجعفر الطبری: لایحتج بحدیثه. (٩/٤٣٦، ترجمة: محمد بن مروان بن عبدالله)

حافظ مزی رحمہ اللہ نے بھی راویوں کے بارے میں محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ کی آراء کو نقل کیا ہے، مثلاً:

وقال محمد بن جریر الطبری: وکان ثقة غیر انه کان یغلط احیاناً. (تهذیب الکمال: ١٤/ ١٣١، ترجمة: عباد بن شیبان، ط الرسالة بیروت)

قال ابوجعفر محمد بن جریر الطبری: ما رایت احفظ من ابی قلابة. (تهذیب الکمال، ١٨ ص٤٠٣، ترجمة: عبدالملک بن محمد ابی قلابة الضریر)

کیا ائمہ جرح وتعدیل اپنے فن میں کسی بدعقیدہ انسان کی آراء لے سکتے ہیں؟ اور کیا اس صورت میں فنِ جرح وتعدیل اور فنِ حدیث معتبر مانا جاسکتا ہے؟

حاشیہ صفحہ موجودہ:

① صرف حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی ''اتحاف المہرۃ'' پر ایک نگاہ سے جو مثالیں سامنے آسکیں، وہ پیش کی جارہی ہیں۔ ہمارے دعوے کے ثبوت کے لیے اتنا کافی ہے کہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ جیسا محقق امام طبری رحمہ اللہ کی تصحیح پر اعتماد کررہا ہے۔

رواه ابن جریر عن محمد بن سهل بن عسکر به وصححه. (٦/٢٣٦......) قال الطبری: هذاالخبر عندنا صحیح السند. (١١/٦١٤)

رواه البخاری وصححه ابن جریر. (١١/٥٥٦) اخرجه ابن جریر من حدیث مؤمل وصححه. (١٤/٦٨٥)

رواه ابن جریر...... وصححه (١٧/٤٥٤......)

ابوحیان اندلسی رحمہ اللہ جن کے بارے میں پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ وہ امام طبری رحمہ اللہ کو رافضی کہتے تھے، حدیث کے معیار میں امام طبری رحمہ اللہ کی رائے پر اعتماد کرکے فرماتے ہیں: وروی فی هذا المعنی حدیث طویل عن حذیفة، وذکر الطبری انه ضعیف السند، مکذوب فیه علی روایة ابن الجراح. ﴿تفسیر البحر المحیط: ٨/٥٦٥﴾

ہم نے حدیثی، تفسیری اور اعتقادی تصانیف وتالیفات میں امام طبری پر اعتماد کی مثالوں کی طرف محض اشارہ کیا ہے۔ اگر تمام عبارات پیش کی جائیں تو ایک ضخیم جلد تیار ہوسکتی ہے۔ یہ کام کا ایک مستقل موضوع ہے۔ اگر کوئی اس پر توجہ دے تو نہایت مفید تحقیقی کام ہوسکتا ہے۔

امام طبری رحمہ اللہ اور تاریخِ طبری پر بعض اعتراضات کے جوابات

کیا امام طبری رحمہ اللہ کی تدفین رات کو ہونا ان کے رافضی ہونے کی دلیل ہے؟

﴿سوال﴾ امام طبری رحمہ اللہ رافضی تھے؛ اس لیے بغداد کے لوگ ان سے اس قدر نفرت کرتے تھے کہ ان کی تدفین بھی چوری چھپے رات کے وقت ہوئی۔ پھر انہیں اہلِ سنت کا عالم کیوں کہا جا رہا ہے؟

﴿جواب﴾ رجال کے تمام ماہرین امام طبری رحمہ اللہ کو اہلِ سنت کا امام مانتے آئے ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ ان کے دعوے کی تردید اور اپنے دعوے کے ثبوت کے لیے اسماء الرجال ہی سے کوئی حوالہ پیش کریں۔ باقی رہی یہ بات کہ ان کی تدفین دن کو کیوں نہ ہوئی، اس کا جواب علامہ ابن اثیر جزری رحمہ اللہ نے دیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

''محمد بن جریر طبری کی وفات کا ذکر: اس سال (۳۱۰ھ میں) محمد بن جریر الطبری صاحب تاریخ کا بغداد میں انتقال ہو گیا۔ ان کی ولادت ۲۲۴ھ میں ہوئی۔ انہیں رات کے وقت ان کے گھر میں دفن کیا گیا؛ اس لیے کہ عوام جمع ہو گئے اور انہیں دن کے وقت دفن ہونے سے روک دیا۔ اور ان پر رفض کا الزام لگایا۔ پھر ان پر الحاد کا الزام لگایا۔ علی بن عیسیٰ کہتے تھے: اللہ کی قسم! اگر ان لوگوں سے رفض اور الحاد کا مطلب پوچھا جائے تو انہیں اس کا علم ہو گا نہ پہچان۔ ابنِ مسکویہ صاحب تجارب الامم نے یہ نقل کیا ہے۔

امام طبری جیسا امام ایسی باتوں میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک ابن مسکویہ نے عوام کے تعصب کا ذکر کیا ہے تو بات اس طرح نہیں تھی۔ بلکہ فقط کچھ حنبلیوں نے امام طبری سے تعصب برتا تھا اور ان پر طعنہ زنی کی تھی، پھر عوام ان کے پیچھے ہو لیے۔''[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ بھی امام طبری رحمہ اللہ کو ہر قسم کی بدعقیدگی سے پاک قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''امام طبری اپنے گھر میں دفن کیے گئے؛ کیوں کہ حنابلہ کے عوام میں سے بعض اوباشوں نے دن میں ان کی تدفین میں رکاوٹ ڈالی اور ان پر رفض کا الزام لگایا اور بعض جاہلوں نے ان پر الحاد کی تہمت دھری۔ جبکہ امام طبری اِس الزام سے بھی بالکل بری ہیں اور اُس الزام سے بھی۔ بلکہ وہ تو کتاب اللہ اور سنتِ رسول کے علوم میں اسلام کے ائمہ میں سے تھے۔''[2]

◆◆◆

---

① الکامل فی التاریخ: سنة ۳۱۰ھ

② ودفن فی داره لان بعض الرعاع من عوام الحنابلة منعوا من دفنه نهاراً و نسبوه الی الرفض ومن الجهلة من رماه بالالحاد، وحاشاه من هذا و من ذا ك ایضا، بل كان احد ائمة الاسلام فی علم بكتاب الله وسنة رسوله. (البداية والنهاية: ۸٤۹/۱٤)

کیا حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے امام طبری رحمہ اللہ کو شیعہ کہا ہے؟

﴿سوال﴾ آپ اپنے متعدد کالموں اور تحریروں میں امام طبری کی کتب کا حوالہ بھی دے چکے ہیں اور ان کا دفاع بھی کرتے آرہے ہیں۔ حالانکہ طبری کا شیعہ ہونا بلکہ رافضی ہونا محققین کے نزدیک طے ہے۔ رہے حاطب اللیل قسم کے مقلدین تو ان کی رائے کا کوئی اعتبار نہیں۔ حافظ ذہبی ''میزان الاعتدال'' میں طبری کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''فیہ تشیع'' (ان میں شیعیت ہی شیعیت بھری ہوئی تھی۔)

﴿جواب﴾ امام طبری رحمہ اللہ کی تعریف وتوثیق میں اصحاب جرح وتعدیل یک زبان ہیں۔ جو چاہے رجال کی کتب اٹھا کر دیکھ لے۔ جو حوالہ آپ نے پیش کیا ہے، وہ سراسر خیانت پر مبنی ہے۔ اگر آپ نے اصل کتاب دیکھے بغیر کسی کی اندھی تقلید میں یہ حوالہ دے دیا ہے تو آپ کو کم علمی کی بناء پر معذور سمجھا جاسکتا ہے، ورنہ ایسی حرکت بہت افسوس ناک ہے اور آخرت کے لحاظ سے قابلِ مواخذہ بھی۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ کی عبارت یہ ہے:

فیہ تشیع یسیر و موالاۃ لاتضر.

''ان میں معمولی سا تشیع اور (اہلِ بیت) سے موالات تھی جو مضر نہیں۔''[1]

''فیہ تشیع'' کا ترجمہ یہ نہیں ہوسکتا کہ ان میں شیعیت بھری ہوئی تھی۔ بلکہ صحیح ترجمہ ہے: ان میں کچھ تشیع تھا۔ ''تشیعٌ'' کی تنوینِ نکارت اس بات کو واضح کرنے کے لیے کافی تھی، جبکہ یہاں اس کے بعد ''یسیر'' کی وضاحت بھی ہے۔ اس کے بعد ''موالاۃ لاتضر'' نے معاملے کو بالکل صاف کردیا ہے۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ ''سیر اعلام النبلاء'' میں اس بات کو مزید واضح کرتے ہیں:

''وشُنّع علیہ بیسیر تشیع، وما رأینا الا الخیر.''[2]

یعنی معمولی تشیع بھی ثابت نہیں ہے، صرف اس کا الزام لگایا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ محض الزام سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ تحقیقی بات جو حافظ ذہبی نے اپنی رائے کے طور پر لکھی ہے، یہ ہے: وما رأینا الا الخیر.

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ سیر اعلام النبلاء، تاریخ الاسلام ذہبی اور میزان الاعتدال میں امام طبری کے حالات پڑھنے سے یہ بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے امام طبری رحمہ اللہ کے بارے میں اندھی تقلید کرکے کچھ نہیں لکھا بلکہ ان کی تصانیف کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ وہ جگہ جگہ بتاتے ہیں کہ میں نے ان کی فلاں فلاں کتاب پڑھی۔ پھر اس پر اپنا تبصرہ کرتے ہیں اور ہر تبصرہ تعریف سے مملوء ہے۔ ان میں ایسی کتب کا بھی ذکر ہے، جو آج معدوم ہیں۔[3]

یہی نہیں بلکہ تاریخ طبری سمیت امام طبری رحمہ اللہ کی متعدد کتب سے انہوں نے بکثرت روایات اپنی تصانیف میں نقل

---

[1] میزان الاعتدال: ۳/۴۹۸، ۴۹۹

[2] سیر اعلام النبلاء: ۱۴/۲۷۷

[3] انظر ترجمۃ ابن جریر الطبری فی تاریخ الاسلام للذہبی و سیر اعلام النبلاء

کی ہیں خصوصاً ''تاریخ الاسلام'' اور ''سیر اعلام النبلاء'' میں؛ لہٰذا اس گمان کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ سنی سنائی نقل کر رہے ہیں۔ اس تمام مطالعے کے بعد حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے جو فیصلہ دیا، وہ انہی کے الفاظ میں یہ ہے:

وکان ابن جریر من رجال الکمال، وشُنّع علیه بیسیر تشیع وما رأینا الا الخیر. [1]

''ابن جریر اہلِ کمال میں سے تھے۔ ان پر معمولی تشیع کا الزام لگایا گیا۔ ہم نے تو (ان میں) خیر ہی دیکھی ہے۔''

یہاں یہ بات یاد رہے کہ پہلی صدی ہجری سے تیسری صدی ہجری کے اواخر تک ''تشیع'' کا مطلب آج کل جیسی شیعیت نہ تھا جس کی بنیاد صحابہ سے بےزاری پر ہے۔ اس دور میں ''تشیع'' کا مطلب موالاۃ اہلِ بیت (اہلِ بیت کی طرف جھکاؤ) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فضائل ومناقب کے لحاظ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے افضل ماننا تھا۔ جبکہ صحابہ کو برا بھلا کہنے والے طبقے کو ''رافضی'' کہا جاتا تھا۔ بخاری ومسلم سمیت صحاحِ ستہ کے تمام مؤلفین کے شیوخ میں ایسے حضرات موجود تھے جن کے بارے میں کتب جرح وتعدیل ''رُمی بالتشیع، فیه تشیع، یا کان شیعیا.'' کا اعلان کرتی ہیں، مگر وہ بدعتی تھے نہ رافضی۔ ان کا تشیع عقائد کے لحاظ سے مضر نہ تھا؛ اس لیے ان حضرات کی امانت ودیانت میں کوئی شک نہ تھا۔ پس اگر بالفرض ابن جریر طبری پر ''تشیع'' کی ''جرح'' مان لی جائے، پھر بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

◆◆◆

کیا امام طبری رحمہ اللہ کا صحابہ کی توہین پر مشتمل مراسلہ نقل کرنا ان کے رافضی ہونے کی دلیل ہے؟

﴿سوال﴾ امام طبری نے خلیفہ مُعتضِد باللہ کے حالات کے ذیل میں اس کا ایک طویل مراسلہ نقل کیا ہے جس میں خلیفہ نے جھوٹی روایات کے بل بوتے پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں پر لعنت کی ہے۔ یہ پورا مراسلہ صحابہ کی متعدد گستاخیوں سے بھرپور ہے۔ امام طبری نے اسے نقل کرتے ہوئے نہ کوئی ایسا عنوان لگایا ہے جس سے اس مراسلے کی مذمت ثابت ہوتی ہو۔ نہ اس کے شروع یا آخر میں یا درمیان میں کہیں ''نعوذ باللہ، العیاذ باللہ، استغفر اللہ'' یا انا للہ وانا الیه راجعون کہا ہے۔ اتنا بھی نہ کر سکے کہ شروع میں یا آخر میں کوئی ایسا نوٹ یا عنوان لگا دیتے جس سے اس مراسلے کے ایمان کش ہونے کی وضاحت ہوتی ہو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امام طبری خود صحابہ کی اس توہین پر راضی تھے ورنہ انہیں ایسا فضول اور ایمان کش باتوں پر مشتمل پورا مراسلہ اتنے اہتمام سے نقل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر انہیں یہ کفر نقل کرنے کا بہت ہی زیادہ شوق تھا تو زیادہ سے زیادہ وہ چند جملے یا اپنے الفاظ میں اس کا خلاصہ ہی نقل کر دیتے تو کافی تھا۔ پس یہ تو طے ہے کہ تاریخ طبری کا کام نہایت ناقص ہے۔

﴿جواب﴾ کسی شخص کے کفریہ یا حرام قول یا فعل کو حکایت کے طور پر زبانی یا تحریراً نقل کر دینا جائز ہے بشرطیکہ اس حرام یا کفریہ قول وفعل کی تائید نہ کی جائے۔ ایسے مواد کی حکایت کرتے ہوئے اس حرام یا کفریہ قول وفعل کی تردید، اس

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۲۷۷/۱۴

سے اظہارِ برأت ونفرت یا ساتھ ساتھ الفاظِ استعاذہ (نعوذ باللّٰہ، العیاذ باللّٰہ وغیرہ) کہنا بہتر ضرور ہے لیکن اگر کسی نے تردید، اظہارِ برأت یا الفاظِ استعاذہ ادا نہیں کیے تو اس نے فقط ایک خلافِ اولیٰ کام کو چھوڑا ہے۔ اس کے باعث اس کے دین وایمان پر شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی؛ کیوں کہ ظاہر ہے جب کوئی مسلمان خصوصاً کوئی عالم کسی فاسق وفاجر یا کافر ومشرک کے بُرے افعال واقوال کو ذکر کرتا ہے تو اس کا مقصد تائید ہرگز نہیں ہوتا۔ اس لیے اس پر خواہ مخواہ شک کرنے کی کوئی بنیاد نہیں۔

کتبِ حدیث میں درجنوں مقامات پر کفار کے توہین آمیز الفاظ یا ان کے کفریہ شرکیہ اور بے دینی کے کام ذکر کیے گئے ہیں۔ ان میں سے متعدد مواقع پر ایسے مواد کے ساتھ محدثین نے کوئی ایسی عبارت نہیں بڑھائی جس سے ان کاموں سے اظہارِ نفرت ہوتا ہو۔ محدثین کے اس منہج پر شارحین کی طرف سے بھی کوئی تنقید دیکھنے میں نہیں آئی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ نقلِ روایت میں اس اصول پر سب متفق چلے آرہے ہیں کہ ''نقلِ کفر، کفر نباشد۔''

چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں؛

صحیح بخاری میں ابوجہل کے قتل کے قصے میں منقول ہے:

قَالَ: أَنْتَ أَبَا جَهْلٍ؟ قَالَ: وَهَلْ فَوْقَ رَجُلٍ قَتَلْتُمُوهُ قَالَ سُلَيْمَانُ: أَوْ قَالَ: قَتَلَهُ قَوْمُهُ قَالَ: وَقَالَ أَبُو مِجْلَزٍ: قَالَ أَبُو جَهْلٍ فَلَوْ غَيْرُ أَكَّارٍ قَتَلَنِي

یہی واقعہ اسی طرح صحیح مسلم میں بھی منقول ہے۔[1]

یہاں ابوجہل کے قتل کا قصہ بیان کرتے ہوئے اس کے آخری الفاظ نقل کیے گئے ہیں جس میں اس نے بدری صحابہ کو ''أکّار'' کہہ کر ان کی توہین کی ہے کہ کاش میں تم جیسے گڑھے کھودنے والوں اور کسانوں جیسے گھٹیا لوگوں کی بجائے عالی مرتبت لوگوں کے ہاتھوں قتل ہوا ہوتا۔ تمام شارحین نے اس کا مطلب یہی بتایا ہے کہ ابوجہل اپنے مدمقابل صحابہ کی تنقیص کر رہا تھا۔[2]

تاہم امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے ابوجہل کا یہ گستاخانہ جملہ نقل کیا تو اپنا کوئی تردیدی جملہ نہیں بڑھایا، اس پر نہ العیاذ باللہ کہا، نہ نعوذ باللہ۔ نہ کوئی سرخی ایسی لگائی جس سے اس فعل کی مذمت ثابت ہوتی ہو۔ بلکہ فقط ''باب قتل ابی جہل'' جیسا سادہ سا عنوان لگا دیا۔ امام نووی رحمہ اللہ نے بھی صحیح مسلم پر اس کی سرخی فقط ''باب قتل ابی جہل'' لگائی ہے۔

---

① صحیح البخاری، ح: ٤٠٢٠، باب قتل ابی جهل؛ صحیح مسلم، ح: ٤٧٦٣

② قال القاضی عیاض: قوله لو غیر أکار قتلني بِفَتْحِ الْهَمزَة وَتَشْدِيد الْكَاف هُوَ الحفار والحراث. (مشارق الانوار علی صحاح الآثار للقاضی عیاض: ٣١/١. ط المکتبة العتیقة)

قال ابن الاثیر الجزری: فِي حَدِيثِ قَتْلِ أَبِي جَهْلٍ فَلَوْ غَيْرُ أَكَّارٍ قَتَلَنِي؟ الأَكَّار: الزَّرَّاع، أَرَادَ بِهِ احْتِقَارَهُ وَانْتِقَاصَه. (النهایة فی غریب الحدیث والاثر: ٥٧/١)

قال ابن حجر العسقلانی: فَأَشَارَ إِلَى تَنْقِيصِ مَنْ قَتَلَهُ مِنْهُمْ بِذَلِكَ. (فتح الباری: ٢٩٥/٧)

قال العلامة بدرالدین العینی: يُرِيد بذلك استخفافهم. (عمدة القاری: ١١٢/١٧)

کیا امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ کے اس طرز تالیف پر کوئی احمق یہ تبصرہ کر سکتا ہے: ''امام بخاری اور امام مسلم نے یہ روایت اس لیے نقل کی ہے تاکہ لوگوں کو صحابہ سے نفرت ہو جائے، وہ صحابہ کو گھٹیا اور ابوجہل کو بہادر آدمی سمجھنے لگیں؟''

کیا امام طبری رحمہ اللہ پر اعتراض کرنے والوں کے نزدیک یہاں امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ پر لازم تھا کہ وہ یہ مواد نقل کر کے ابوجہل پر لعنت بھیجتے اور بتاتے کہ ابوجہل گھٹیا تھا اور صحابہ عظیم تھے؟ کونسا مسلمان ایسا ہوگا جو اتنا بھی نہ جانتا ہو؟ پس اگر امام بخاری و امام مسلم رحمہما اللہ نے ایسے الفاظ کا اضافہ نہیں کیا تو اس پر یہ کہنے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں کہ یہ حضرات عظمتِ صحابہ سے ناآشنا تھے یا صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ترتیب نہایت ناقص تھی۔

تیسری مثال ملاحظہ ہو۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے درج ذیل روایت نقل کی ہے:

عَنْ جَابِرٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ إِبْلِيسَ يَضَعُ عَرْشَهُ عَلَى الْمَاءِ، ثُمَّ يَبْعَثُ سَرَايَاهُ، فَأَدْنَاهُمْ مِنْهُ مَنْزِلَةً أَعْظَمُهُمْ فِتْنَةً، يَجِيءُ أَحَدُهُمْ فَيَقُولُ: فَعَلْتُ كَذَا وَكَذَا، فَيَقُولُ: مَا صَنَعْتَ شَيْئًا، قَالَ ثُمَّ يَجِيءُ أَحَدُهُمْ فَيَقُولُ: مَا تَرَكْتُهُ حَتَّى فَرَّقْتُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ امْرَأَتِهِ، قَالَ: فَيُدْنِيهِ مِنْهُ وَيَقُولُ: نِعْمَ أَنْتَ. قَالَ الْأَعْمَشُ: أُرَاهُ قَالَ: فَيَلْتَزِمُهُ[1]

اس روایت کا حاصل مطلب یہ ہے کہ شیطان سمندر میں اپنا دربار لگاتا ہے اور اپنے نائب شیطانوں کی کارگزاریاں سنتا ہے کہ کس کس طرح انہوں نے لوگوں کو گناہوں پر لگایا، اور زیادہ بُرا کام کرانے والے کو شاباش دیتا ہے اور اپنا مقرب بنالیتا ہے۔

اس روایت کے عنوان، شروع یا آخر میں امام مسلم رحمہ اللہ نے کہیں بھی شیطان کی مذمت نہیں کی بلکہ اس کے گھناؤنے کاموں کی روایت من وعن نقل کر دی۔ کیا ایسا اس لیے تھا کہ خاکم بدہن امام مسلم شیطان کے کاموں سے خوش تھے اور اس کے کارنامے دنیا تک پہنچانا چاہتے تھے؟

چوتھی مثال دیکھیے، امام ابوداؤد رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں:

عَنْ عَاصِمٍ، قَالَ: سَمِعْتُ الْحَجَّاجَ، وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ يَقُولُ: اتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ لَيْسَ فِيهَا مَثْنَوِيَّةٌ، وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا لَيْسَ فِيهَا مَثْنَوِيَّةٌ، لِأَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ عَبْدِ الْمَلِكِ، وَاللّٰهِ لَوْ أَمَرْتُ النَّاسَ أَنْ يَخْرُجُوا مِنْ بَابٍ مِنْ أَبْوَابِ الْمَسْجِدِ فَخَرَجُوا مِنْ بَابٍ آخَرَ لَحَلَّتْ لِي دِمَاؤُهُمْ وَأَمْوَالُهُمْ، وَاللّٰهِ لَوْ أَخَذْتُ رَبِيعَةَ بِمُضَرَ لَكَانَ ذٰلِكَ لِي مِنَ اللّٰهِ حَلَالًا، وَيَا عَذِيرِي مِنْ عَبْدِ هُذَيْلٍ يَزْعُمُ أَنَّ قِرَاءَتَهُ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ، وَاللّٰهِ مَا هِيَ إِلَّا رَجَزٌ مِنْ رَجَزِ الْأَعْرَابِ مَا أَنْزَلَهَا اللّٰهُ عَلَى نَبِيِّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ[2]

---

[1] صحيح مسلم، ح: ٧٢٨٤، باب تحريش الشيطان

[2] سنن ابى داؤد، ح: ٤٦٤٣، باب فى الخلفاء

اس روایت میں حجاج بن یوسف حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مذاق اڑا رہا ہے۔ انہیں ''عبدِ ہذیل'' کہہ رہا ہے اوران کی قرأت قرآن کو دیہاتیوں کا ''رجز'' قرار دے رہا ہے۔ اس کے باوجود امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے یہاں حجاج کے کلام سے بے زاری کا کوئی اظہار نہیں کیا۔

تو کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی تحقیر کے لیے یہ روایت نقل کر رہے تھے؟

ایک آخری مثال دیکھ لیجیے۔ امام مسلم رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں:

عَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ : لَمَّا صَوَّرَ اللّٰهُ آدَمَ فِي الْجَنَّةِ تَرَكَهُ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ يَتْرُكَهُ فَجَعَلَ إِبْلِيسُ يُطِيفُ بِهِ يَنْظُرُ مَا هُوَ فَلَمَّا رَآهُ أَجْوَفَ عَرَفَ أَنَّهُ خُلِقَ خَلْقًا لَا يَتَمَالَكُ [1]

اس روایت میں شیطان نے آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت ان کا مذاق اڑایا تھا اورانہیں بے وقوف مخلوق قرار دیا تھا۔ شیطان کی ان ہفوات کو امام مسلم رحمہ اللہ نے کسی تردیدی نوٹ یا نعوذ باللہ کے نقل کر دیا۔ کیا اس کا یہ مطلب لیا جاسکتا ہے کہ امام مسلم رحمہ اللہ شیطان کی زبان سے آدم علیہ السلام کی تضحیک کو درست سمجھتے تھے اوراس تضحیک میں خود شریک تھے؟

خدا کے لیے عقل کے ناخن لیجیے! اسلاف کی علمی کاوشوں کو اس کے صحیح پسِ منظر میں رکھ کر سمجھئے۔ صحیح پس منظر یہ ہے کہ تمام قدیم محدثین اور مؤرخین کا ایک خاص منہج تھا۔ ان کا کام روایات کو بطورِ ریکارڈ جمع کرنا تھا۔ کوئی تفتیشی افسر جب کسی شخص کے بارے میں ریکارڈ جمع کرتا ہے تو اس میں وہ اپنی طرف سے تعریف وتوصیف یا مذمت کے الفاظ شامل نہیں کرتا چلا جاتا۔ قدیم محدثین اور مؤرخین کا بھی یہی طریقہ تھا۔ انہیں جو بھی روایات ملتی تھیں، چاہے وہ مقدس اور بزرگ شخصیات کے احوال سے متعلق ہوں یا شیطان اوراس کے چیلوں کے حالات پر مبنی ہوں، وہ ہر روایت کو اصل الفاظ کے مطابق من وعن نقل کر دیتے تھے۔ اپنی طرف سے کوئی حاشیہ آرائی نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ تشریح یا حاشیہ آرائی ان کی ذمہ داری کے خلاف تھی۔ ہاں جب ان روایات کی شروحات لکھی گئیں تو وہاں ضروری مقامات پر شارحین نے وضاحتی کلام کر دیا مگر ہر جگہ انہوں نے بھی ضرورت نہیں سمجھی؛ کیوں کہ یہ برائیاں اتنی واضح تھیں کہ کسی مسلمان کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہی نہیں کہ یہ کفر ہے یا یہ فسق ہے۔

مُعتضِد باللہ کے اس مراسلے کو امام طبری رحمہ اللہ کا نقل کرنا محض ایک تاریخی ریکارڈ کو پیش کرنے کے لیے تھا۔ انہوں نے اہتمام کے ساتھ پورا مراسلہ اس لیے نقل کیا کہ بعد والوں کو اندازہ ہو جائے کہ اس دور میں اندرونِ خانہ رفض کس حد تک پہنچ چکا تھا۔ اگر وہ دوچار جملے نقل کرتے یا اپنے الفاظ میں اس کا حاصلِ مطلب بیان کر دیتے تو کسی کو شک ہو سکتا تھا کہ انہیں خلیفہ مُعتضِد سے کوئی دشمنی ہے اورانہوں نے نقل میں خیانت کی ہے۔ حقیقت تب ہی سامنے آسکتی تھی جب پورا مراسلہ بلا قطع وبرید نقل کیا جاتا۔ پس پورا مراسلہ نقل کرنے سے امام طبری رحمہ اللہ پر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی عالم مرزا قادیانی کا کوئی غیر مطبوعہ ہفوات بھرا رسالہ حاصل کر کے بلا تبصرہ شائع کر دے

[1] صحیح مسلم، ح: ۶۸۷۵، باب خلق الانسان۔

تا کہ دنیا کو مرزائیوں کے گھناؤنے خیالات معلوم ہوسکیں۔ اب اگر کوئی متعصب شخص اس عالم کو مرزا قادیانی کا ہم خیال قرار دینے پر تُل جائے تو اس کی عقل پر ماتم ہی کیا جائے گا۔

◆◆◆

کیا امام طبری رحمہ اللہ قدمین پر مسح کے قائل تھے؟

﴿سوال﴾ سب جانتے ہیں کہ وضو میں "مسح علی القدمین" (پیروں کو دھونے کے بجائے ان پر مسح کرنا) روافض کا مذہب ہے۔ اہلِ سنت میں سے کوئی اس کا قائل نہیں، جبکہ امام طبری کا مذہب یہی تھا۔ جیسا کہ علامہ ابن جوزی نے "المنتظم" میں لکھا ہے کہ امام طبری مسح علی القدمین کے قائل تھے:

"کان ابن جریر یری جواز المسح علی القدمین ولا یوجب غسلھما."

(ابن جریر پیروں پر مسح کے قائل تھے۔ انہیں دھونا واجب نہیں سمجھتے تھے۔)

اس سے ثابت ہو گیا کہ امام طبری پکے رافضی تھے۔ یہ نتیجہ ہم نے نہیں علامہ ابن جوزی نے نکالا ہے۔ وہ یہ ذکر کرنے کے بعد کہ طبری صاحب پیروں پر مسح کے قائل تھے، فرماتے ہیں:

فلھذا نسب الی الرفض.

(پس یہی وجہ تھی کہ انہیں رفض کی طرف منسوب کیا گیا۔)

﴿جواب﴾ علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت سے ظاہر ہے کہ وہ یہی سمجھتے تھے کہ امام طبری رحمہ اللہ "مسح علی القدمین" کے قائل تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ گمان بالکل غلط تھا۔

اگر انہوں نے یہ بات کسی تحقیق کی بناء پر کی تھی تو انہیں امام طبری رحمہ اللہ کی کتب سے اس کا ثبوت لانا چاہیے تھا مگر انہوں نے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں انہیں غلط فہمی ہوگئی تھی۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ اس کے باوجود علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے یہاں امام طبری رحمہ اللہ پر خود "رفض" کا حکم نہیں لگایا بلکہ یہ بتایا ہے کہ انہیں رفض کی طرف منسوب کیا گیا تھا۔ انہیں "رفض" کی طرف منسوب کرنے والے آخر کون لوگ تھے؟ کوئی جلیل القدر ائمہ تھے؟ یا اکا دُکا عنادی علماء یا عام لوگ؟ علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے اس کی کوئی وضاحت نہیں کی اور نہ ہی کسی کتاب کا حوالہ دیا اور نہ ہی کوئی سند پیش کی۔

پس یہ فقط اِکا دُکا متعصب وعنادی قسم کے علماء کا کام تھا جن کے شر سے شاید ہی کوئی عظیم شخصیت بچ پائی ہو۔ انہوں نے امام طبری رحمہ اللہ پر ایسا الزام لگا دیا جس سے امام موصوف کا دور دور بھی واسطہ نہ تھا۔

بعد میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس الزام کی تحقیق کے لیے امام طبری رحمہ اللہ کی کتب کا مطالعہ کیا اور آخر کار یہ نتیجہ نکالا:

---

① المنتظم: ۲۱۷/۱۳

وبعضهم ينقل عنه انه كان يجيز مسح الرجلين فى الوضوء، ولم نر ذالك فى كتبه۔"

(بعض لوگوں نے ان کے بارے میں نقل کیا ہے کہ وہ وضو میں پاؤں پر مسح کو جائز قرار دیتے تھے مگر ہم نے یہ ان کی کتب میں نہیں دیکھا۔)[1]

حقیقت یہی ہے کہ اس الزام کا کوئی ثبوت امام طبری رحمہ اللہ کی کتب یا کسی سند سے نہیں دیا جاسکا۔ اس سے بدتر الزامات بڑے بڑے ائمہ اسلام پر لگ چکے ہیں مگر جب تک کسی کی اپنی زبان، تحریر یا عمل سے کوئی خلافِ اسلام بات ثابت نہ ہو، اس الزام کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

اگر امام طبری رحمہ اللہ کی تفسیر کو دیکھ لیا جائے تو اس مسئلے میں کسی صفائی کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس میں بہت واضح ہے کہ وضو میں پیروں کو دھونا واجب ہے، مسح کافی نہیں، انہوں نے سورۃ المائدہ کی تفسیر میں تحریر فرمایا ہے۔

ان الله جل ثناؤه إنما أمر عباده بغسل الأرجل دون المسح بها.

"بے شک اللہ جل ثناؤہ نے اپنے بندوں کو پاؤں دھونے کا حکم دیا ہے نہ کہ ان پر مسح کرنے کا۔"[2]

اس کے بعد انہوں نے اس بارے میں اہلِ سنت کے مذہب کی تائید میں بہت سی روایات بھی پیش کی ہیں اور حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت علی اور حسنین کریمین رضوان اللہ علیہم اجمعین نیز متعدد تابعین سے نقل کیا ہے کہ ان سب کا مذہب وضو میں غسل القدمین تھا نہ کہ مسح علی القدمین۔[3]

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۲۷۷/۱۴

[2] تفسیر طبری: ۱۸۸/۸، سورۃ المائدۃ، آیت: ۶

[3] امام طبری رحمہ اللہ کی اس بارے میں اپنی سند سے پیش کردہ چند روایات درج ذیل ہیں:

حَدَّثَنَا حُمَيْدُ بْنُ مَسْعَدَةَ، قَالَ: ثنا يَزِيدُ بْنُ زُرَيْعٍ، قَالَ: ثنا خَالِدٌ الْحَذَّاءُ عَنْ أَبِي قِلَابَةَ: أَنَّ رَجُلًا صَلَّى وَعَلَى ظَهْرِ قَدَمِهِ مَوْضِعُ ظُفُرٍ، فَلَمَّا قَضَى صَلَاتَهُ، قَالَ لَهُ عُمَرُ: أَعِدْ وُضُوءَكَ وَصَلَاتَكَ.

حَدَّثَنَا حُمَيْدٌ، قَالَ: ثنا يَزِيدُ بْنُ زُرَيْعٍ، قَالَ: ثنا إِسْرَائِيلُ، قَالَ: ثنا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ حَسَنٍ، قَالَ: ثنا هُزَيْلُ بْنُ شُرَحْبِيلَ، عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ، قَالَ: خَلِّلُوا الْأَصَابِعَ بِالْمَاءِ لَا تُخَلِّلُهَا النَّارُ.

حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ الصَّبَّاحِ الْعَطَّارُ، قَالَ: ثنا حَفْصُ بْنُ عُمَرَ الْحَوْضِيُّ، قَالَ: ثنا مُرَجًّى، يَعْنِي ابْنَ رَجَاءٍ الْيَشْكُرِيَّ، قَالَ: ثنا أَبُو رَوْحٍ عُمَارَةُ بْنُ أَبِي حَفْصَةَ، عَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ حُنَيْنٍ: أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَى رَجُلًا يَتَوَضَّأُ وَهُوَ يَغْسِلُ رِجْلَيْهِ، فَقَالَ: بِهَذَا أُمِرْتُ.

حَدَّثَنَا ابْنُ بَشَّارٍ، قَالَ: ثنا عَبْدُ الرَّحْمَنِ، قَالَ: ثنا سُفْيَانُ، عَنْ وَاقِدٍ مَوْلَى زَيْدِ بْنِ خُلَيْدَةَ قَالَ: سَمِعْتُ مُصْعَبَ بْنَ سَعْدٍ، يَقُولُ: رَأَى عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ قَوْمًا يَتَوَضَّئُونَ، فَقَالَ: خَلِّلُوا.

حَدَّثَنَا ابْنُ بَشَّارٍ، قَالَ: ثنا عَبْدُ الْوَهَّابِ، قَالَ: سَمِعْتُ يَحْيَى، قَالَ: سَمِعْتُ الْقَاسِمَ، قَالَ: كَانَ ابْنُ عُمَرَ يَخْلَعُ خُفَّيْهِ، ثُمَّ يَتَوَضَّأُ فَيَغْسِلُ رِجْلَيْهِ، ثُمَّ يُخَلِّلُ أَصَابِعَهُ.

حَدَّثَنَا ابْنُ بَشَّارٍ، قَالَ: ثنا عَبْدُ الرَّحْمَنِ، قَالَ: ثنا سُفْيَانُ، عَنِ الزُّبَيْرِ بْنِ عَدِيٍّ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ، قَالَ: قُلْتُ لِلْأَسْوَدِ: رَأَيْتَ عُمَرَ يَغْسِلُ قَدَمَيْهِ غَسْلًا؟ قَالَ: نَعَمْ.

حَدَّثَنَا ابْنُ حُمَيْدٍ، قَالَ: ثنا الصَّبَّاحُ، عَنْ مُحَمَّدٍ وَهُوَ ابْنُ أَبَانَ، عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، عَنِ الْحَارِثِ، عَنْ عَلِيٍّ، قَالَ: اغْسِلُوا الْأَقْدَامَ إِلَى الْكَعْبَيْنِ.

حَدَّثَنَا ابْنُ وَكِيعٍ، قَالَ: ثنا عَبْدُ الْوَهَّابِ وَعَبْدُ الْأَعْلَى، عَنْ خَالِدٍ، عَنْ عِكْرِمَةَ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، أَنَّهُ قَرَأَهَا: وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ بِالنَّصْبِ، وَقَالَ: عَادَ الْأَمْرُ إِلَى الْغَسْلِ.

(بقیہ اگلے صفحے کے حاشیہ پر)

اس کے بعد مسح کے قائل حضرات کی بھی بعض روایات نقل کی ہیں اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ یہاں پیروں کے مسح کا مطلب محض مسح نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ پاؤں کو دھونے کے ساتھ ہاتھوں سے رگڑا بھی جائے۔ اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ اگر کوئی شخص فقط پاؤں پانی میں ڈال دے اور انہیں رگڑے نہیں تو اسے فقہاء کے ایک طبقے نے مکروہ سمجھا ہے۔[1]

پھر آگے اسی موضوع پر کلام کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر پیروں پر مسح کرنا کافی ہوتا تو نبی اکرم ﷺ ان لوگوں کو نہ ڈانٹتے جن کی ایڑیاں سوکھی رہ گئی تھیں۔[2]

اس بارے میں وہ بہت سے طرق سے ''وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ'' کی روایت لے کر آئے ہیں[3] جو پاؤں اچھی طرح دھونے کے باب میں اہلِ سنت کی نہایت مضبوط دلیل ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:

حَدَّثَنِي الْحُسَيْنُ بْنُ عَلِيٍّ الصُّدَائِيُّ ، قَالَ: ثنا أَبِي ، عَنْ حَفْصٍ الْغَاضِرِيِّ ، عَنْ عَامِرِ بْنِ كُلَيْبٍ ، عَنْ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمَنِ ، قَالَ: قَرَأَ عَلَيَّ الْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ رِضْوَانُ اللَّهِ عَلَيْهِمَا ، فَقَرَآ: وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ فَسَمِعَ عَلِيٌّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ ذَلِكَ ، وَكَانَ يَقْضِي بَيْنَ النَّاسِ ، فَقَالَ: وَأَرْجُلَكُمْ هَذَا مِنَ الْمُقَدَّمِ وَالْمُؤَخَّرِ مِنَ الْكَلَامِ.

حَدَّثَنَا ابْنُ وَكِيعٍ ، قَالَ: ثنا حُسَيْنُ بْنُ عَلِيٍّ ، عَنْ شَيْبَانَ ، قَالَ: أَلْبَتَ لِي عَنْ عَلِيٍّ ، أَنَّهُ قَرَأَ: وَأَرْجُلَكُمْ.

حَدَّثَنَا ابْنُ وَكِيعٍ ، قَالَ: ثنا أَبِي ، عَنْ سُفْيَانَ ، عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ ، عَنِ الْحَارِثِ ، عَنْ عَلِيٍّ ، قَالَ: اغْسِلِ الْقَدَمَيْنِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ.

حَدَّثَنِي عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مُحَمَّدٍ الزُّهْرِيُّ ، قَالَ: ثنا سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ ، عَنْ أَبِي السَّوْدَاءِ ، عَنِ ابْنِ عَبْدِ خَيْرٍ ، عَنْ أَبِيهِ ، قَالَ: رَأَيْتُ عَلِيًّا تَوَضَّأَ ، فَغَسَلَ ظَاهِرَ قَدَمَيْهِ ، وَقَالَ: لَوْلَا أَنِّي رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَعَلَ ذَلِكَ ، ظَنَنْتُ أَنَّ بَطْنَ الْقَدَمِ أَحَقُّ مِنْ ظَاهِرِهَا.

حَدَّثَنَا أَبُو كُرَيْبٍ ، قَالَ: ثنا ابْنُ يَمَانٍ ، قَالَ: ثنا عَبْدُ الْمَلِكِ ، عَنْ عَطَاءٍ ، قَالَ: لَمْ أَرَ أَحَدًا يَمْسَحُ عَلَى الْقَدَمَيْنِ.

(تفسیر الطبری: ۱۸۹/۸ تا ۱۹۴، سورۃ المائدۃ، آیت: ۶)

حاشیہ صفحہ موجودہ

① وَلِمَا قُلْنَا فِي تَأْوِيلِ ذَلِكَ إِنَّهُ مَعْنِيٌّ بِهِ عُمُومُ مَسْحِ الرِّجْلَيْنِ بِالْمَاءِ كَرِهَ مَنْ كَرِهَ لِلْمُتَوَضِّئِ الِاجْتِزَاءَ بِإِدْخَالِ رِجْلَيْهِ فِي الْمَاءِ دُونَ مَسْحِهِمَا بِيَدِهِ. (۱۹۸/۸)

② الدَّلِيلُ عَلَى ذَلِكَ تَظَاهُرُ الْأَخْبَارِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ وَبُطُونِ الْأَقْدَامِ مِنَ النَّارِ ، وَلَوْ كَانَ مَسْحُ بَعْضِ الْقَدَمِ مُجْزِيًا عَنْ عُمُومِهَا بِذَلِكَ لَمَا كَانَ لَهَا الْوَيْلُ بِتَرْكِ مَا تُرِكَ مَسْحُهُ مِنْهَا بِالْمَاءِ بَعْدَ أَنْ يَمْسَحَ بَعْضَهَا ، لِأَنَّ مَنْ أَدَّى فَرْضَ اللَّهِ عَلَيْهِ فِيمَا لَزِمَهُ غَسْلُهُ مِنْهَا لَمْ يَسْتَحِقَّ الْوَيْلَ ، بَلْ يَجِبُ أَنْ يَكُونَ لَهُ الثَّوَابُ الْجَزِيلُ ، فَوُجُوبُ الْوَيْلِ لِعَقِبِ تَارِكِ غَسْلِ عَقِبِهِ فِي وُضُوئِهِ ، أَوْضَحُ الدَّلِيلِ عَلَى وُجُوبِ فَرْضِ الْعُمُومِ بِمَسْحِ جَمِيعِ الْقَدَمِ بِالْمَاءِ ، وَصِحَّةِ مَا قُلْنَا فِي ذَلِكَ وَفَسَادِ مَا خَالَفَهُ.

(تفسیر الطبری: ۲۰۰/۸، سورۃ المائدۃ، آیت: ۶)

③ ذِكْرُ بَعْضِ الْأَخْبَارِ الْمَرْوِيَّةِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا ذَكَرْنَا:

حَدَّثَنَا أَبُو كُرَيْبٍ ، قَالَ: ثنا وَكِيعٌ ، عَنْ حَمَّادِ بْنِ سَلَمَةَ ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ زِيَادٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ، قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ.

حَدَّثَنَا أَبُو كُرَيْبٍ ، قَالَ: ثنا وَكِيعٌ ، عَنْ سُفْيَانَ ، عَنْ مَنْصُورٍ ، عَنْ هِلَالِ بْنِ يَسَافٍ ، عَنْ أَبِي يَحْيَى ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، رَأَى قَوْمًا يَتَوَضَّئُونَ وَأَعْقَابُهُمْ تَلُوحُ ، فَقَالَ: وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ ، أَسْبِغُوا الْوُضُوءَ.

حَدَّثَنِي إِسْمَاعِيلُ بْنُ مَحْمُودٍ الْحَجْرِيُّ ، قَالَ: ثنا خَالِدُ بْنُ الْحَارِثِ ، قَالَ: ثنا شُعْبَةُ ، عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ ، قَالَ: سَمِعْتُ سَعِيدًا يَقُولُ: سَمِعْتُ جَابِرًا يَقُولُ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ.

حَدَّثَنَا ابْنُ الْمُثَنَّى قَالَ: ثنا أَبُو عَامِرٍ ، قَالَ: ثنا عَلِيُّ بْنُ الْمُبَارَكِ ، عَنْ يَحْيَى بْنِ أَبِي كَثِيرٍ ، عَنْ سَالِمٍ مَوْلَى دَوْسٍ ، قَالَ: سَمِعْتُ عَائِشَةَ تَقُولُ لِأَخِيهَا عَبْدِ الرَّحْمَنِ: يَا عَبْدَ الرَّحْمَنِ أَسْبِغِ الْوُضُوءَ ، فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ.

(تفسیر الطبری: ۲۰۱/۸ تا ۲۰۷، سورۃ المائدۃ، آیت: ۶)

اس کے بعد امام طبری رحمہ اللہ مسح کے متعلق بعض آثار کا ذکر کر کے بتاتے ہیں کہ ان کا تعلق ایسی حالت سے ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باوضو ہونے کی حالت میں وضو پر وضو کیا تھا۔ [1]

یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے امام طبری رحمہ اللہ کی تفسیر میں یہ پوری بحث مطالعہ کرنے کے بعد واشگاف الفاظ میں امام طبری رحمہ اللہ کی طرف مسح علی القدمین کے قول کی نفی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''امام طبری کی طرف یہ منسوب ہے کہ وہ وضوء میں پیروں کے مسح کے جواز کے قائل تھے اور انہیں دھونا واجب نہیں سمجھتے تھے۔ یہ بات ان کے متعلق مشہور ہے۔ پس علماء میں سے بعض کا کہنا ہے کہ ابن جریر نامی دو افراد تھے۔ ان میں سے ایک شیعہ تھا اور یہ قول اسی کی طرف منسوب ہے۔ یہ علماء ابو جعفر طبری کو ان الزامات سے پاک قرار دیتے ہیں۔ امام طبری نے اپنی تفسیر میں اس بارے میں جو کلام کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پیروں کو دھونا واجب قرار دیتے تھے اور دھونے کے ساتھ رگڑنا بھی واجب سمجھتے تھے۔ مگر انہوں نے رگڑنے کو مسح سے تعبیر کر دیا، پس لوگوں میں سے بہت سے ان کی مراد کو صحیح طرح نہ سمجھ پائے، پس انہوں نے امام طبری کے بارے میں یہ نقل کر دیا کہ وہ دھونے اور مسح کرنے کو جمع کرتے تھے۔ [2]

◆◆◆

کیا امام طبری رحمہ اللہ باطل عقائد کے حامل تھے؟

﴿سوال﴾ ابن جوزیؒ نے ''المنتظم'' میں امام طبری کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے حنبلی عالم ابوبکر بن ابی داؤد کے سامنے اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے وقت روحِ محمدیہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے چہرے پر مَل لیا تھا۔ ایسے باطل عقیدے کا حامل اہلِ سنت کیسے ہوسکتا ہے؟

﴿جواب﴾ یہ الزام سنداً اس لیے ناقابلِ اعتبار ہے کہ علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ ابوبکر بن ابی داؤد سے لگ بھگ

---

[1] قَالَ: ثنا الْقَاسِمُ بْنُ سَلَّامٍ, قَالَ: ثنا هُشَيْمٌ, قَالَ: ثنا يَعْلَى بْنُ عَطَاءٍ, عَنْ أَبِيهِ, عَنْ أَوْسِ بْنِ أَبِي أَوْسٍ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتَى سُبَاطَةَ قَوْمٍ, فَتَوَضَّأَ وَمَسَحَ عَلَى قَدَمَيْهِ وَمَا أَشْبَهَ ذَلِكَ مِنَ الْأَخْبَارِ الدَّالَّةِ عَلَى أَنَّ الْمَسْحَ بِبَعْضِ الرِّجْلَيْنِ فِي الْوُضُوءِ مُجْزِءٌ؟ قِيلَ لَهُ: أَمَّا حَدِيثُ أَوْسِ بْنِ أَبِي أَوْسٍ فَإِنَّهُ لَا دَلَالَةَ فِيهِ عَلَى صِحَّةِ ذَلِكَ, إِذْ لَمْ يَكُنْ فِي الْخَبَرِ الَّذِي رُوِيَ عَنْهُ ذِكْرُ أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ بَعْدَ حَدَثٍ يُوجِبُ عَلَيْهِ الْوُضُوءَ لِصَلَاتِهِ, فَمَسَحَ عَلَى نَعْلَيْهِ, أَوْ عَلَى قَدَمَيْهِ, وَجَائِزٌ أَنْ يَكُونَ مَسْحُهُ عَلَى قَدَمَيْهِ الَّذِي ذَكَرَهُ أَوْسٌ كَانَ فِي وُضُوءٍ تَوَضَّأَهُ مِنْ غَيْرِ حَدَثٍ كَانَ مِنْهُ, وَجَبَ عَلَيْهِ مِنْ أَجْلِهِ تَجْدِيدُ وُضُوئِهِ, لِأَنَّ الرِّوَايَةَ عَنْهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ كَانَ إِذَا تَوَضَّأَ لِغَيْرِ حَدَثٍ, كَذَلِكَ يَفْعَلُ.

حَدَّثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ عُبَيْدٍ الْمُحَارِبِيُّ, قَالَ: ثنا أَبُو مَالِكٍ الْجَنْبِيُّ, عَنْ مُسْلِمٍ, عَنْ حَبَّةَ الْعُرَنِيِّ, قَالَ: رَأَيْتُ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ شَرِبَ فِي الرَّحَبَةِ قَائِمًا, ثُمَّ تَوَضَّأَ وَمَسَحَ عَلَى نَعْلَيْهِ, وَقَالَ: هَذَا وُضُوءُ مَنْ لَمْ يُحْدِثْ, هَكَذَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَنَعَ فَقَدْ أَنْبَأَ هَذَا الْخَبَرُ عَنْ صِحَّةِ مَا قُلْنَا فِي مَعْنَى حَدِيثِ أَوْسٍ.

[2] ونسب اليه انه يقول بجواز المسح على القدمين في الوضوء وانه لا يوجب الغسل، وقد اشتهر عنه هذا، فمن العلماء من يزعم ان ابن جرير اثنان، احدهما شيعي واليه ينسب ذالك، وينزهون ابا جعفر من هذه الصفات، والذى عول عليه كلامه فى التفسير انه يوجب غسل القدمين ويوجب مع الغسل دلكهما، ولكنه عبر عن الدالك بالمسح فلم يفهم كثير من الناس مراده جيدا، فنقلوا عنه انه يوجب الجمع بين الغسل والمسح. (البداية والنهاية: ١٤/٨٦٩)

دو صدیاں بعد کے ہیں۔ اس کے باوجود امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے ان کے اس قول کی نہ تو سند پیش کی ہے نہ کوئی کتابی حوالہ۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے امام طبری رحمہ اللہ کے خلاف ابوبکر بن ابی داؤد کے قول کو سختی سے مسترد کرتے ہوئے پہلے امام طبری رحمہ اللہ کے ناقدین کو ''عوام'' اور ''جہلہ'' سے تعبیر کیا ہے اور پھر اس بارے میں لکھا ہے:

''ان لوگوں نے یہ باتیں (اندھی) تقلید کرتے ہوئے ابوبکر محمد بن (ابی) داؤد سے لی ہیں جو امام طبری کے بارے میں کلام کرتے تھے اور ان پر ہولناک باتوں کی تہمتیں لگاتے تھے اور ان پر رفض کا الزام بھی لگاتے تھے۔''[1]

اگر ایسی بے سند باتوں سے جلیل القدر ائمہ پر جرح کو معتبر شمار کیا جانے لگے تو اساطینِ اُمت میں سے بہت سی ہستیاں محفوظ نہیں رہیں گی۔ ابن جوزی رحمہ اللہ کے بارے میں ویسے بھی ثابت ہے کہ وہ جرح میں متشدد تھے؛ اس لیے ابن جریر طبری رحمہ اللہ کے بارے میں جمہور کی بات مقبول ہوگی۔ امام طبری رحمہ اللہ کے متعلق ان حضرات کی توثیق سیر اعلام النبلاء، میزان الاعتدال، لسان المیزان، طبقات الحفاظ، طبقات الفقہاء اور طبقات الشافعیۃ سمیت متعدد کتب میں موجود ہے۔ جمہور علماء نے بھی اسی پر اعتماد کیا ہے۔

◆◆◆

کیا ابن جریر طبری رحمہ اللہ جھوٹی اسناد گھڑتے تھے؟

﴿سوال﴾ ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں نہ صرف جھوٹے واقعات بھر دیے ہیں بلکہ اسناد بھی خود گھڑ کر لگائی ہیں۔ اس کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ وہ بہت سی روایات یوں نقل کرتے ہیں: ''کتب الیّ السری'' یہ سری بن یحییٰ ہیں جو طبری کی پیدائش سے قبل ۱۷۰ھ میں فوت ہو چکے تھے۔ کیسے ممکن تھا کہ وہ طبری کو قبر سے روایات لکھ لکھ کر بھیجتے رہتے۔

﴿جواب﴾ سری بن یحییٰ دو ہیں: ایک سری بن یحییٰ بن ایاس بن حرملہ البصری جو ۱۷۰ھ میں فوت ہوئے جنہیں ''ثقہ'' کہا گیا ہے۔[2] دوسرے سری بن یحییٰ بن سری بن مصعب الکوفی جو ۲۵۸ھ میں فوت ہوئے جنہیں ''صدوق'' کہا گیا ہے اور وہ امام مسلم رحمہ اللہ کے استاذ ہناد بن السری رحمہ اللہ کے بھتیجے ہیں۔[3]

امام طبری رحمہ اللہ کی ولادت ۲۲۴ھ ہجری کی ہے؛ اس لیے ان دوسرے بزرگ سے ان کا روایات لینا ممکن تھا اور درحقیقت امام طبری رحمہ اللہ نے جن سری بن یحییٰ رحمہ اللہ سے روایات لی ہیں، وہ یہی ہیں۔[4]

◆◆◆

---

① وانما تقلدو اذالـ ك عن ابی بکر محمد بن داؤد حیث کان یتکلم فیه ویرمیه بالعظائم، ویرمیه بالرفض. (البدایة والنهایة: ۸٤۹/۱٤)

② تاریخ الاسلام ذهبی. ۲۰۳/۱۰، ۲۰٤، ت تدمری؛ ص ۳۷۲، ت بشار

③ تاریخ الاسلام ذهبی: ۳۵۳/۲۰، ت تدمری؛ ۵٤۷/٦، ت بشار

④ معجم شیوخ الطبری للشیخ اکرم بن محمد الاثری، ص ۲۵۰

سری بار بار امام طبری کو روایات کیسے لکھ کر بھیجتے رہے؟

﴿سوال﴾ ''کتب الی السری'' کی سند سے امام طبری نے بکثرت روایات نقل کی ہیں تو کیا ہر بار سری بن یحییٰ انہیں حسب ضرورت روایت لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ آخر کیسے؟ اس زمانے میں سفری صعوبتوں کے ہوتے ہوئے یہ ناممکن تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے امام طبری نے یہ جھوٹی سند خود گھڑ لی تھی۔

﴿جواب﴾ عرض ہے کہ ''کتب الیّ'' کی سند بار بار لانے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ راوی نے ہر بار الگ نوشتے پر روایت لکھ کر مکتوب الیہ کو بھیجی ہو بلکہ راوی اگر ایک بار اپنی روایات کا مجموعہ لکھوا کر مؤلف کو بھیج دے تو بھی مؤلف اس کی ہر روایت کو اپنے مقام پر ''کتب الیّ'' سے ہی نقل کرے گا جیسا کہ ایک نشست میں سنی ہوئی روایات میں سے ہر روایت کو الگ نقل کرتے وقت ہر بار ''حدثنا'' کہا جاتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہر بار مؤلف الگ سفر کر کے استاد کے پاس گیا اور حدیث سنی۔

◆◆◆

کیا حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے امام طبری پر روافض کے لیے روایات وضع کرنے کا الزام لگایا ہے؟

﴿سوال﴾ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے امام طبری کے بارے میں واضح کیا ہے کہ وہ روافض کے لیے روایات گھڑتے تھے۔ اس کا آپ کے پاس کوئی جواب ہے؟

﴿جواب﴾ مجھے حیرت ہے کہ آپ کس دیدہ دلیری سے ایک ایسی بات کا دعویٰ کر رہے ہیں جو کسی طرح ثابت نہیں کی جا سکتی۔ غالباً آپ نقل در نقل پر انحصار کر رہے ہیں۔ نقل بھی ایسی جو سراسر خیانت پر مبنی ہے۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے خود ہرگز ایسا نہیں کہا بلکہ کسی دوسرے کی بات نقل کی ہے اور پھر امام طبری رحمہ اللہ سے رافضیت کی تہمت دور کرنے میں وکیل صفائی کا کردار ادا کیا ہے۔ جس عبارت کی طرف آپ اشارہ کر رہے ہیں، وہ یہ ہے:

اقذع احمد بن علی السلیمانی، فقال کان یضع للروافض، کذا قال السلیمانی، وھذا رجم بالظن الکاذب، بل ابن جریر من کبار ائمة الاسلام المعتمدین، وما ندعی عصمته من الخطأ، ولا یحل لنا ان نؤذیه بالباطل، والھویٰ، فان کلام العلماء بعضھم فی بعض ینبغی ان یتأنی فیه، ولا سیما فی مثل امام کبیر، فلعل السلیمانی اراد الآتی...... محمد بن جریر بن رستم، ابوجعفر الطبری، رافضی له توالیف، منھا کتاب الرواۃ عن اھل البیت، رماہ بالرفض عبدالعزیز الکنانی.[1]

''حافظ احمد بن علی سلیمانی نے بہتان لگایا ہے کہ وہ روافض کے لیے روایتیں گھڑتے تھے۔ یہ ایک اڑائی ہوئی جھوٹی تہمت ہے۔ بلکہ ابن جریر تو مسلمانوں کے قابلِ اعتماد پیشواؤں میں سے ایک تھے۔ ہم ان کے

---

[1] میزان الاعتدال: ۳/۴۹۹، ط دار المعرفة

خطا سے معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے مگر ہمارے لیے یہ جائز نہیں کہ جھوٹی اور نفسانی باتیں لے کر ان کی کردار کشی کریں۔ علماء کی ایک دوسرے کے بارے میں آراء پر غور کرنا چاہیے۔ خصوصاً جب ایسے بڑے امام کا معاملہ ہو۔ شاید حافظ سلیمانی کی مراد (ابن جریر بن یزید طبری نہیں بلکہ) آگے مندرج شخصیت ہے۔

محمد بن جریر بن رستم ابو جعفر الطبری: یہ رافضی تھا، اس کی کئی کتابیں ہیں مثلاً الرواۃ عن اہل البیت۔ عبدالعزیز کنانی نے اس پر رفض کا الزام لگایا ہے۔''

حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے کلام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ابو جعفر محمد بن جریر الطبری دو تھے، تاریخ طبری والے ابن جریر اہل سنت تھے۔ انہی کے ہم نام وہم نسب، ابو جعفر محمد بن جریر ابن رستم الطبری رافضی تھے۔ نام ونسب اور کنیت کی غیر معمولی مشابہت کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔

امام طبری رحمہ اللہ کے اہل سنت ہونے کے لیے یہی ثبوت کافی ہے کہ انہوں نے اپنے فقہی شاہکار ''تہذیب الآثار'' کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی احادیث اور ان کی تشریح سے شروع کیا۔ نیز ''تہذیب الآثار'' میں پوری ایک جلد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی روایات اور ان کی فقہی تشریح پر تحریر کی۔ کسی رافضی کو حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی روایات مدون کرنے اور ان سے استدلال کرنے میں بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟

◆◆◆

کیا حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام طبری پر شیعوں کے لیے روایات سازی کا الزام عائد کیا ہے؟

﴿سوال﴾ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''لسان المیزان'' میں لکھا ہے کہ ابن جریر طبری شیعوں کے لیے روایات گھڑتے تھے۔ کیا ایسے جلیل القدر عالم کا بیان، ابن جریر کو شیعہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں؟

﴿جواب﴾ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی پوری عبارت پیش خدمت ہے، وہ آپ کے دعوے کی بھرپور تردید کر رہی ہے۔

محمد بن جرير بن يزيد الطبرى، الامام الجليل، المفسر ابو جعفر صاحب التصانيف الباهرة، مات سنة عشرو ثلاث مائة، ثقة صادق، فيه تشيع يسير وموالاة لاتضر، اقذع احمد بن على السليماني، فقال كان يضع للروافض، كذا قال السليماني، وهذا رجم بالظن الكاذب، بل ابن جرير من كبار ائمة الاسلام المعتمدين، وما ندعى عصمته من الخطأ، ولايحل لنا ان نؤذيه بالباطل، والهوى، فان كلام العلماء بعضهم في بعض ينبغى ان يتأتى فيه، ولاسيما فى مثل امام كبير، فلعل السليمانى ارادالآتى. انتهى[1] ....

① یہاں تک حافظ ابن حجر نے حافظ ذہبی کی میزان والی عبارت بعینہ نقل کی ہے، جو مع ترجمہ ہم پیچھے پیش کر چکے ہیں (اس لیے ترجمے کے اعادے کی ضرورت نہیں، قارئین پیچھے اسے دیکھ سکتے ہیں۔) حافظ ابن حجر کا اس عبارت کو کسی اعتراض کے بغیر نقل کرنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ حافظ ذہبی کے بیان سے متفق ہیں۔ اس کے بعد ان کا اپنا تبصرہ یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ابن جریر طبری کے دفاع میں حافظ ذہبی سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ حافظ ذہبی تو ''لعل'' کہہ رہے ہیں، حافظ ابن حجر قسم کھانے کے لیے تیار ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر نے ذہبی کی عبارت کے بعد اپنا تبصرہ یوں پیش کیا ہے...... ولو حلفت الخ

ولو حلفت ان السليماني ما اراد الا الآتي لبررت، والسليماني حافظ متقن، كان يدري ما يخرج من رأسه، فل ااعتقد انه يطعن مثل هذا الامام بهذا الباطل، والله اعلم، وانما نُبذ بالتشيع، لانه صحح حديث غدير خم.

اگر میں قسم کھا کر کہوں کہ سلیمانی نے اگلے شخص (محمد بن جریر بن رستم) ہی کو مراد لیا ہے تو میں قسم میں سچا ثابت ہوں گا۔ سلیمانی حافظ اور راسخ عالم تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے دماغ سے کیا نکل رہا ہے۔ میں یقین نہیں سکتا کہ وہ اس (طبری) جیسے امام کے بارے میں ایسا جھوٹا الزام لگائیں گے۔ واللہ اعلم۔ طبری پر تشیع کا الزام بس اس وجہ سے لگایا گیا تھا کہ انہوں نے حدیث غدیر خم کو صحیح قرار دیا تھا۔"[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے بیان سے یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ وہ امام طبری رحمہ اللہ کو ثقہ ائمہ مسلمین میں شمار کرتے ہیں اور اس بات پر قسم کھانے کے لیے تیار ہیں کہ حافظ سلیمانی رحمہ اللہ نے جس "محمد بن جریر طبری" کو رافضی کہا ہے، وہ صاحب تفسیر و تاریخ، مشہور امام طبری رحمہ اللہ نہیں بلکہ محمد بن جریر بن رستم طبری ہے۔

◆◆◆

کیا امام طبری رحمہ اللہ پر امام دارقطنی رحمہ اللہ نے جرح کی ہے؟

﴿سوال﴾ "سوالات السلمی للدارقطنی" میں ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ سے محمد بن جریر طبری کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: تکلموا فیه بانواع...... یعنی علماء، طبری پر طرح طرح کے الزامات لگاتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے طبری کی توثیق نہیں کی بلکہ اسے ایک مجروح شخصیت شمار کیا ہے۔

﴿جواب﴾ امام دارقطنی رحمہ اللہ کے کلام کا ترجمہ درست نہیں کیا گیا۔ صحیح ترجمہ یہ ہے: "علماء نے ان کے بارے میں کئی نوع کا کلام کیا ہے۔" ان الفاظ سے امام دارقطنی رحمہ اللہ کی جانب سے کوئی جرح ہرگز ثابت نہیں ہوتی۔ انہوں نے سوال کا کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ بس اتنا کہنا مناسب سمجھا کہ ان کے بارے میں مختلف آراء سننے میں آتی ہیں۔

بظاہر بغداد میں امام طبری رحمہ اللہ کا مخالف گروہ اس وقت بھی با اثر تھا؛ اس لیے کچھ علماء امام طبری رحمہ اللہ کے حامی ہوں گے اور کچھ مخالف۔ مختلف آراء کے ہوتے ہوئے امام دارقطنی رحمہ اللہ نے بلا تحقیق کوئی جواب دینے سے احتیاط کی۔ مگر اس سے بہر حال یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ امام طبری رحمہ اللہ امام دارقطنی رحمہ اللہ کی نگاہ میں وضاع اور کذاب نہیں تھے۔

---

[1] لسان المیزان: ۵/۱۰۰، ط مکتبہ نظامیہ حیدر آباد دکن

طبری کے بعض ناقدین نے یہاں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے "واللہ اعلم" کا یہ مطلب نکالا ہے کہ حافظ صاحب کو بھی معلوم تھا کہ طبری رافضی ہے اور سلیمانی کی جرح صحیح ہے، مگر ابن حجر جیسے روایت پسندوں کے نزدیک طبری کا دفاع اس لیے ضروری تھا کہ ذخیرہ روایات ہاتھ سے نہ جائے۔ مگر چونکہ دل میں اپنی غلطی کا کھٹکا بھی تھا؛ اس لیے آخر میں "واللہ اعلم" کہہ کر یقینی بات اللہ کے حوالے کر دی...... یہ حافظ ابن حجر جیسے حق گو عالم پر محض بہتان ہے۔ اگر انہیں حافظ سلیمانی کی جرح صحیح لگتی تو وہ طبری کا ذرا بھی دفاع نہ کرتے۔ درحقیقت وہ حافظ سلیمانی کی جرح کو فضول سمجھتے تھے مگر چونکہ ان کو حسن ظن کی گنجائش دینا چاہتے تھے؛ اس لیے کہہ دیا کہ سلیمانی ایسی نادانی کی بات کیسے کہہ سکتے تھے۔ یقیناً ان کی مراد محمد بن جریر بن رستم ہوگا۔ (مگر چونکہ سلیمانی کے دل کی بات اللہ بہتر جانتا ہے) اسی لیے آگے "واللہ اعلم" کے الفاظ بڑھا دیے۔

اگر وہ واقعی ایسے ثابت ہوتے تو امام دار قطنی رحمہ اللہ کو ان پر کھلی جرح میں کوئی تامل نہ ہوتا۔ غالباً اس وقت تک امام دار قطنی رحمہ اللہ نے امام طبری رحمہ اللہ کی تصانیف کا مطالعہ نہیں کیا ہوگا؛ اس لیے انہوں نے احتیاطاً سکوت اختیار کیا۔

مگر یہ ثابت ہے کہ امام دار قطنی رحمہ اللہ نے آخر الامر امام طبری رحمہ اللہ کی کتب پڑھ لی تھیں۔ اس کے بعد ان کی رائے اگر یہ بنتی کہ یہ شخص وضاع اور کذاب ہے تو وہ ہرگز ان کی تحریروں سے استفادہ نہ کرتے اور حقیقت طشت از بام کر دیتے انہوں نے ''الضعفاء والمتروکون'' اسی مقصد کے لیے مرتب کی تھی کہ ایسے راویوں سے ہوشیار رہا جائے جن کی غلط روایات عام ہو رہی ہیں۔ مگر انہوں نے اس فہرست میں امام طبری رحمہ اللہ کو بالکل شامل نہیں کیا۔

اس کے برعکس انہوں نے اپنی دوسری تالیف ''المؤتلف والمختلف'' میں متعدد مقامات پر امام طبری رحمہ اللہ کے حوالے دیے۔ وہ ''قال ابو جعفر محمد بن جریر الطبری'' کہہ کر ان کی تصانیف اور آراء سے استشہاد کرتے ہیں، حتیٰ کہ بعض افراد کے صحابی ہونے نہ ہونے کے بارے میں بھی ان کی رائے پر انحصار کرتے ہیں۔[1] کیا امام دار قطنی رحمہ اللہ کی طرف سے امام طبری رحمہ اللہ کی توثیق کے لیے یہ ثبوت کافی نہیں؟ کیا کسی کی صحابیت کے ثبوت لیے امام دار قطنی رحمہ اللہ روافض اور کذاب لوگوں کی روایات سے استشہاد کرتے ہوں گے؟

کیا امام طبری رحمہ اللہ کا حدیثِ غدیر خم کو صحیح قرار دینا شیعہ ہونے کی دلیل ہے؟

﴿سوال﴾ طبری کے شیعہ ہونے کے ثبوت میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ایک ناقابل تردید دلیل پیش کر دی ہے، وہ یہ کہ طبری نے شیعوں کے عقیدۂ امامت کی دلیل بننے والی جھوٹی روایت ''حدیث غدیر خم'' کو صحیح قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی عبارت پر غور کریں: وانما نُبِذ بالتشیع، لانہ صحح حدیث غدیر خم.

''بلاشبہ امام طبری کو شیعہ قرار دیا گیا؛ کیوں کہ اس نے حدیث غدیر خم کو صحیح حدیث قرار دے دیا تھا۔''[2]

﴿جواب﴾ عبارت کا ترجمہ غلط کیا گیا ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہے: ''امام طبری پر تشیع کا الزام لگایا گیا؛ کیوں کہ انہوں نے

---

① ومسعود بن رخیلۃ بن عائذ الاشجعی، کان قائد اشجع یوم الاحزاب مع المشرکین، ثم اسلم فحسن اسلامہ ذکر ذلک ابو جعفر محمد بن جریر الطبری. ﴿المؤتلف والمختلف: ۲/ ۱۰۹۰، ط دار الغرب﴾

وامّا غیث بکسر [illegible] فہو فیما ذکر ابو جعفر الطبری فی الصحابۃ [illegible] ﴿المؤتلف والمختلف: ۳/ ۱۹۵۵﴾

ابو قرۃ الحارث بن معاذ بن زرارۃ الظفری، شہد مع النبی ﷺ احدا، ذکر ذلک ابو جعفر الطبری. ﴿المؤتلف والمختلف [illegible]﴾

وامّا [illegible] فہو فیما ذکر ابو جعفر الطبری تمیم مولی بنی غنم بن السلم شہد بدرا واحدا. ﴿المؤتلف والمختلف [illegible]﴾

ابو حصین لقمان بن شبۃ بن معیط العبسی احد [illegible] علی رسول اللہ ﷺ [illegible] ذکر ذلک [illegible] جریر الطبری. ﴿المؤتلف والمختلف: ۳/ ۱۳۷۹﴾

[illegible]

[illegible] والقاضی محمد بن جریر بن یزید ابو جعفر الطبری [illegible] کلہ [illegible]

سؤالات [illegible] ص ۲۷۸.

② لسان المیزان: ۵/ ۱۰۰

حدیثِ غدیرِخم کو صحیح قرار دیا تھا۔'' اب سوال یہ ہے کہ آخر اس عبارت سے امام طبری رحمہ اللہ پر طعن کیسے ثابت ہوسکتا ہے؟

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تو امام طبری رحمہ اللہ پر لگائے گئے الزام کو ذکر کرکے اس کا دفاع کرتے ہوئے یہ بتا رہے ہیں کہ ان پر تشیع کا الزام جس وجہ سے لگایا گیا ہے، وہ وجہ کس قدر کمزور ہے۔ اس وجہ کی کمزوری اہلِ علم پر تو خوب واضح ہے مگر میرا خیال ہے کہ آپ کو یہ بات ذرا وضاحت سے سمجھانا پڑے گی؛ اس لیے عرض ہے کہ اگر حدیث غدیرخم کو صحیح قرار دینا کسی کے شیعہ ہونے کی دلیل بن سکتا ہے تو چوٹی کے ائمہ اہلِ سنت اس کی زد میں آئیں گے مثلاً:

امام ترمذی رحمہ اللہ جنہوں نے اسے نقل کرکے حسن قرار دیا ہے۔[1] امام نسائی رحمہ اللہ جنہوں نے اسے پورے اعتماد کے ساتھ پیش کیا ہے۔[2] امام ابن ماجہ رحمہ اللہ جنہوں نے اسے اپنی سنن میں نقل کیا ہے۔[3] امام بخاری وامام مسلم رحمہما اللہ کے استاذ ابوبکر ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ جنہوں نے اپنی ''مصنف'' میں اسے متعدد اسناد سے ذکر کیا ہے۔[4] امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ جنہوں نے اسے متعدد طرق سے نقل کیا ہے۔[5] امام طحاوی رحمہ اللہ جنہوں نے اسے صحیح کہہ کر اسے جھوٹا قرار دینے والوں کو مسکت جوابات دیے ہیں۔[6] حافظ ذہبی رحمہ اللہ جنہوں نے صراحت کی ہے کہ امام طبری رحمہ اللہ کا حدیث غدیرخم کے ثبوت پر رسالہ پڑھ کر میں اس حدیث کا قائل ہوگیا ہوں۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس موضوع پر خود بھی ایک رسالہ لکھ کر اس میں حدیث غدیرخم کے طرق کو جمع کردیا ہے۔[7] خود حافظ ابن حجر رحمہ اللہ جن کا کندھا آپ استعمال کررہے ہیں، تشیع کے اس اندھادھند فتوے کی زد میں آئیں گے؛ کیوں کہ انہوں نے ''اتحاف المہرۃ'' میں اس حدیث کو متعدد طرق سے نقل کیا ہے۔[8] یہی نہیں بلکہ انہوں نے ''فتح الباری'' میں واضح طور پر کہا ہے:

اما حديث من كنت مولاه فعلي مولاه، فقد اخرجه الترمذي والنسائي، وهو كثير الطرق جدا، وقد استوعبها ابن عقدة في كتاب مفرد، وكثير من اسانيدها صحاح وحسان.

(جہاں تک حدیث من كنت مولاه فعلي مولاه کا تعلق ہے تو اس کے طرق بہت زیادہ ہیں، ابن عقدہ نے انہیں ایک الگ کتاب میں جمع کردیا ہے اور اس کی بہت سی اسناد صحیح اور حسن ہیں۔)[9]

اگر کوئی کہے کہ: ''ان محدثین نے تو فقط اس روایت کو نقل کیا ہے یا زیادہ سے زیادہ اسے صحیح یا حسن قرار دیا ہے، اس سے کوئی غلط استدلال نہیں کیا، اس لیے ان پر کوئی الزام نہیں۔'' تو عرض ہے کہ امام طبری رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کے طرق جمع کرکے اسے فقط صحیح ثابت کیا ہے۔ اگر آپ کے زعم میں انہوں نے کوئی غلط استدلال بھی کیا ہے تو ان کی عبارت سے ثبوت پیش کریں۔ عاقل کے لیے اتنا جواب بہت کافی ہے۔ البتہ تعصب اور ضد کی کوئی دوا کسی کے پاس نہیں۔

---

(1) جامع الترمذي، ح: ٣٧١٣، باب في مناقب علي رضي الله عنه

(2) السنن الكبرىٰ للنسائي، روایات نمبر: ٨٠٨٩......٨٣٤٣......٨٤١٢......٨٤١٣......٨٤١٤

(3) سنن ابن ماجه، ح: ١٢١

(4) مصنف ابن ابي شيبه، ح: ٣٢٠٧٢، ٣٢٠٧٣، ٣٢٠٧٨، ٣٢٠٩١، ٣٢٠٩٢، ٣٢١١٨، ٣٢١٣٢

(5) مسند احمد بن حنبل، روایت نمبر: ٦٤١......٩٥٠......٩٦١......١٣١١......١٨٤٧٩

(6) شرح مشكل الآثار، ح: ١٧٦٥

(7) سير اعلام النبلاء: ٢٧٧/١٤ ...... اور ملاحظہ ہو حافظ ذہبی کا رسالہ: رسالة طرق حديث من كنت مولاه

(8) اتحاف المهرة، ح: ٢٣٨٢، ١٤٧٨١، ٢٠٩٥٢

(9) فتح الباري: ٧٤/٧، ط المعرفة

کیا ابوحیان اندلسی رحمہ اللہ نے امام طبری کو شیعوں کا امام کہا ہے؟

﴿سوال﴾ اندلس کے عظیم مفسر ابوحیان رحمہ اللہ نے بڑی تحقیق کے بعد ابوجعفر طبری کا پول کھول دیا۔ انہوں نے اپنی محققانہ تفسیر ''البحر المحیط'' میں طبری کا ذکر کرتے ہوئے فرمادیا ہے کہ وہ امامی شیعوں کا ایک امام تھا۔ عبارت یہ ہے:

''وحکیٰ ابو جعفر الطبری فی تفسیرہ ، وھو امام من ائمة الامامیة......''

﴿جواب﴾ یہ بالکل غلط الزام بلکہ تلبیس ہے۔ ابوحیان رحمہ اللہ نے امام طبری رحمہ اللہ (صاحب تفسیر وتاریخ) کے متعلق ہرگز ایسا نہیں کہا بلکہ ان کی مراد ایک اور ابوجعفر ہے۔ تفسیر البحر المحیط کے صحیح نسخے سے جو ڈاکٹر صدقی محمد جمیل کی تحقیق کے ساتھ دار الفکر بیروت سے شائع ہوا ہے، یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اس میں مذکورہ عبارت اس طرح ہے:

''وحکیٰ ابو جعفر الطوسی فی تفسیرہ ، وھو امام من ائمة الامامیة، الصراط بالصاد لغة قریش.''[1]

یعنی صحیح نسخے میں ابوجعفر الطوسی کا لفظ ہے۔ ''ابوجعفر طبری'' نسخے کی غلطی ہے۔

ڈاکٹر صدقی محمد جمیل کی تحقیق درست ہے یا نہیں؟ اس کا پتا لگانے کے لیے درج ذیل امور پر غور کریں:

اوّل: ابوحیان رحمہ اللہ نے یہاں ایک لغوی تحقیق نقل کی ہے (اور ظاہر ہے اس میں روافض کیا، دورِ جاہلیت کے اہلِ سخن سے بھی استشہاد کیا جاسکتا ہے۔) ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ جس ''ابوجعفر'' کا انہوں نے اس لغوی تحقیق میں حوالہ دیا ہے، وہ ''ابوجعفر طوسی'' ہے، یا ''ابوجعفر محمد بن جریر طبری''؟ اب ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ابوحیان رحمہ اللہ کی تفسیر کے اسی مقام پر چند سطر آگے ایک لغوی بحث ہے، وہاں بھی ''ابوجعفر طوسی'' لکھا ہوا ملے گا۔[2]

اسی سورۃ الفاتحہ میں دو تین صفحات پیچھے بھی ایک لغوی بحث ہے۔ وہاں بھی ''ابوجعفر طوسی'' ہے۔[3]

پھر اسی تفسیر میں یہ دو عبارتیں تو حقیقت کو بالکل کھول دیتی ہیں:

1. وقد رأیت لابی جعفر الطوسی من فضلاء الامامیة فیھا مجلدة کبیرة.[4]
2. وقد رأیت فیھا لابی جعفر الطوسی وھو من عقلاء الامامیة سفراً کبیراً ینصر فیہ مقالة اصحابه.[5]

دوم: امام طبری رحمہ اللہ کی تصانیف کھنگال لیں۔ کہیں بھی ''الصراط بالصاد لغة قریش'' یا اس کی ہم مفہوم کوئی عبارت نہیں ملے گی؛ اس لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ ابوحیان رحمہ اللہ نے امام طبری رحمہ اللہ سے یہ عبارت نقل کی ہو۔

سوم: ابوحیان رحمہ اللہ جب امام طبری رحمہ اللہ کے حوالے سے کوئی چیز نقل کرتے ہیں تو وہاں ''ابن جریر'' یا ''محمد بن جریر'' یا فقط ''الطبری'' کہتے ہیں۔ ''ابوجعفر الطبری'' نہیں کہتے۔ پوری تفسیر میں ان کا یہی انداز رہا ہے۔

---

[1] البحر المحیط: ۴۵/۱

[2] وقال ابو جعفر الطوسی: اھل الحجاز یؤنثون الصراط کالطریق. (البحر المحیط: ۴۵/۱، سورۃ الفاتحة)

[3] قال ابوجعفر الطوسی ھی لغة ھذیل. (البحر المحیط: ۴۲/۱، سورۃ الفاتحة)

[4] البحر المحیط: ۲۴۱/۱ ...... سورۃ البقرۃ، آیات: ۵۴ تا ۵۷

[5] البحر المحیط: ۶۰۶/۴، سورۃ الانعام، آیات: ۹۵ تا ۱۰۰

چہارم: اسی تفسیر میں ابوحیان رحمہ اللہ نے لگ بھگ تین سو مقامات پر کلام اللہ کے مرادی معنیٰ کی تعیین میں امام محمد بن جریر الطبری رحمہ اللہ کی تفسیر اور ان کی عبارات سے استفادہ کیا ہے۔ [1] یہ کیسے ممکن ہے کہ ابوحیان رحمہ اللہ ابن جریر طبری رحمہ اللہ کو رافضیوں کا امام بھی قرار دیں اور پھر قرآن کا مرادی معنیٰ سمجھنے اور سمجھانے کے لیے انہی پر بھروسہ کریں۔ کیا کوئی سُنی، روافض کے تفسیری اقوال مان سکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر ابوحیان رحمہ اللہ نے ایسا بار بار کیوں کیا؟ اور فقط انہوں نے ہی نہیں بلکہ حافظ ابن کثیر، امام فخر الدین رازی، امام ابن تیمیہ اور علامہ آلوسی رحمہم اللہ تک بڑے بڑے ائمہ اسلام اپنی تفاسیر میں ایسا کیوں کرتے رہے؟ کیا یہ سب جاہل تھے؟ یا سبھی چھپے ہوئے رافضی تھے؟ ان حقائق کو دیکھ کر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ابوحیان رحمہ اللہ کی تفسیر میں مذکورہ مقام پر کتابت کی غلطی نقل ہوتی چلی آئی ہے۔

ابوحیان رحمہ اللہ کا مقصود یہ بتانا تھا کہ ''ابوجعفر طوسی'' امامی شیعہ ہے مگر سہوِ کاتب نے اسے ''ابوجعفر طبری'' کر دیا۔ کچھ لوگوں نے ابوحیان کی تفسیر کے دیگر مقامات دیکھے بغیر اس سہوِ کاتب کو ابوحیان رحمہ اللہ کی کم نظری سمجھ لیا اور کچھ متعصب لوگوں نے ابوحیان رحمہ اللہ کا کندھا استعمال کر کے امام طبری رحمہ اللہ کو ''امامی'' قرار دے دیا۔

---

[1] ''البحر المحیط'' کی چند مثالوں کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جن میں امام ابن جریر طبری کی تفسیر سے استفادہ کیا گیا ہے:

❶ قال الطبری: قصة ابلیس تقریع لمن اشبهه من بنی آدم وهم الیهود الذین کفروا بمحمد ﷺ مع علمهم بنبوته.(۱/۲۴۵، البقرة)

❷ والمعنیٰ کما احیی قتیل بنی اسرائیل فی الدنیا کذلك یحیی الله الموتی یوم القیامة ،والیٰ هذا ذهب الطبری.(۱/۴۲۰، البقرة)

❸ وبالجملة فهی کما قال محمد بن جریر کلمة کرهها الله ان یخاطب بها نبیه.(۱/۵۴۳، البقرة)

❹ قال الطبری: انما امر الله بالصلوٰة والزکوٰة لیحط ما تقدم من میلهم الی قول الیهود راعنا.(۱/۵۶۰، البقرة)

❺ قال الطبری: امره للشیء بکن لا یتقدم الوجود ولا یتاخر عنه.(۱/۵۸۴، البقرة)

❻ وقال الطبری: لیس احد من خلق الله الا بینه وبین الله معان یجب ان یکون احسن مما هی.(۱/۶۲۴، البقرة)

❼ ورجّح محمد بن جریر انه ما نهی عنه الحاج فی احرامه لقوله تعالی: فمن فرض فیهن الحج .(۲/۲۸۰، البقرة)

❽ لا تأخذه سنة ولا نوم ......قال ابن جریر: معناه لا تحله الآفات والعاهات المذهلة عن حفظ المخلوقات.(۲/۶۰۹، البقرة)

❾ ونقل عن ابن جریر انه قال: یاتیهم بمحاسبتهم علی الغمام علیٰ عرشه تحمله ثمانیة من الملائکة.(۲/۳۴۴، البقرة)

❿ وقال ابن جریر: انزل بانزال القرآن الفصل بین الحق والباطل، فیما اختلف فیه الاحزاب واهل الملل .(۳/۱۸، آل عمران)

⓫ ودّوا ما عنتم ،قال ابن جریر :ودّوا اضلالکم.(۳/۳۱۷، آل عمران)

⓬ ان کنتم تعقلون......قال ابن جریر: معناه ان کنتم تعقلون عن امر الله ونهیه.(۳/۳۱۸، آل عمران)

⓭ وقال ابن جریر: الآیة محکمة فی الوصیة ،والضمیر فی" فارزقوهم" عائد الیٰ اولی القربیٰ الموصیٰ لهم،وفی "لهم "عائد الی الیتامیٰ والمساکین.(۳/۵۲۷، النساء)

⓮ وقال ابن جریر: یجوز ان یعفو عنهم فی غدرة، فعلوها، مالم ینصبوا حربا، ولم یمتنعوا من اداء جزیة. (۴/۲۰۶، المائدة)

⓯ وقال ابن جریر: ما اوتی احد من النعم فی زمان موسیٰ ما اوتوا، خصوا بفلق البحر لهم، وانزال المن والسلویٰ، واخراج المیاه العذبة من الحجر، ومد الغمام فوقهم .(۴/۲۱۶، المائدة)

⓰ وقال ابن جریر: لیس فی الآیة دلیل علیٰ ان المقتول علم عزل القاتل علیٰ قتله ،ثم تر ك الدفع عن نفسه. (۴/۲۲۹، المائدة)

⓱ وقال ابن جریر: قد بیّن ذلك فی الدنیا بالدلالة والحجج، وغداً یبینه بالمجازاة. (۴/۲۸۵، المائدة)

⓲ وقال ابن جریر: الحق هنا هو الله تعالیٰ، والمعنیٰ ماخلق الله ذلك الا بالله وحده لا شریك له. (۶/۱۵، سورة یونس)

⓳ وقال ابن جریر: هی العبر المعدودة فی هذه السورة. (۶/۶۱۳، سورة النحل)

⓴ وقال ابن جریر: لا یخطئ فی التدبیر فیعتقد فی غیر الصواب صواباً ،واذا عرفه لا ینساه.(۷/۳۴۲، سورة طٰه)

㉑ وقال ابن جریر: اورثهم الایمان، فالکتب تامر باتباع القرآن، فهم مؤمنون بها ،عاملون بمقتضاها، یدل علیه :والذی اوحینا الیك من الکتاب هو الحق ،ثم اتبعه بقوله ثم اورثنا الکتاب، فعلمنا انه امة محمد صلی الله علیه وسلم ،اذ کان معنیٰ المیراث انتقال شیء قوم الیٰ قوم ولم تکن امة انتقلها الیها کتاب من قوم کانوا قبلهم غیر امته. (۹/۳۲، سورة الفاطر)

㉒ وقال الطبری: خلق آدم من تراب وماء ونار وهواء، وهذا کله اذا خلط صار طینا لازباً یلزم ما جاوره.(۹/۹۴، الصافات)

㉓ وذکر الطبری: ان عباس قال الذبیح اسماعیل ویزعم الیهود انه اسحق وکذبت الیهود.(۹/۱۱۹، الصافات)

کیا حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام طبری کو شیعوں کا امام کہا ہے؟

﴿سوال﴾ آپ کے جواب میں نسخے کی غلطی کا عذر قابلِ قبول نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے سامنے تفسیر البحر المحیط کا جو نسخہ تھا، اس میں ''ابو جعفر الطبری'' ہی ہے؛ اسی لیے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ''لسان المیزان'' میں طبری کے متعلق ابو حیان کے اسی قول کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''امام من ائمة الامامیة.''

﴿جواب﴾ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے سامنے موجود تفسیر ''البحر المحیط'' کے نسخے میں ''ابو جعفر الطبری'' کا لفظ ہی ہوگا (تبھی انہیں ابو حیان رحمہ اللہ کے بارے میں غلط فہمی ہوئی۔) مگر ابو حیان رحمہ اللہ کی عبارت ''امام من ائمة الامامیة.'' کو انہوں نے امام طبری رحمہ اللہ پر جرح کے لیے نقل کیا ہے یا اس جرح کی تردید کے لیے؟

اس کا پتا حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی پوری عبارت کو دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے:

وقد اغترّ شیخ شیوخنا ابو حیان بکلام السلیمانی، فقال فی الکلام علی الصراط فی اوائل تفسیرہ: وقال ابو جعفر الطبری وھو امام من ائمة الامامیة، الصراط، بالصاد لغة قریش، الیٰ آخر المسئلة، ونبھت علیه لئلا یغتر به، فقد ترجمه ائمة النقل فی عصرہ وبعدہ فلم یصفوہ بذالک، وانما ضرہ الاشتراک فی اسمه واسم ابیه، ونسبه وکنیته ومعاصرته وکثرة تصانیفه.

''اور ہمارے استاذ الاساتذہ ابو حیان کو بھی سلیمانی کے کلام سے دھوکا لگ گیا۔ انہوں نے اپنی تفسیر کی ابتداء میں ''صراط'' پر کلام کرتے ہوئے کہا: ابو جعفر طبری نے کہا جو کہ امامیہ کے اماموں میں سے تھا، کہ صراط صاد کے ساتھ قریش کی لغت ہے۔ پھر آخر تک اسی مسئلے پر کلام ہے۔

میں نے اس پر تنبیہ اس لیے کر دی کہ اس سے دھوکا نہ کھایا جائے۔ طبری کے حالات ان کے معاصر اور بعد والوں نے نقل کیے ہیں مگر انہوں نے ان پر یہ الزام نہیں لگایا۔ طبری کو ان کے نام، باپ کے نام، نسب، کنیت، ہم عصر ہونے اور تصانیف کی کثرت میں (ابن جریر بن رستم) کے ساتھ مشابہت نے نقصان پہنچایا۔''[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ وہ امام طبری رحمہ اللہ پر الزام نہیں لگا رہے بلکہ دفاع کرتے ہوئے حافظ سلیمانی کے الزام کو غلط بتا رہے ہیں اور ساتھ ہی ابو حیان رحمہ اللہ کی رائے کو غلط فہمی پر مبنی قرار دے رہے ہیں۔[2]

حافظ صاحب رحمہ اللہ کی عبارت اپنے بیان میں اتنی واضح ہے کہ اس پر مزید کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔

① لسان المیزان: ۵/۱۰۰، ۱۰۱، ط مکتبہ نظامیہ حیدر آباد دکن

② صحیح یہ ہے کہ غلط فہمی ابو حیان رحمہ اللہ کو نہیں بلکہ سہوِ کاتب کے باعث حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کو ہوئی تھی؛ کیوں کہ ان کے سامنے موجود نسخے میں ''ابو جعفر طبری'' لکھا ہوا تھا۔ لیکن اگر تفسیرِ ابو حیان کو دیگر مقامات سے دیکھ لیا جاتا تو ثابت ہو جاتا کہ وہ ہر جگہ ابو جعفر طوسی کو ''فرقہ امامیہ'' کا بتاتے ہیں اور ان سے فقط لغوی بحث میں استشہاد کرتے ہیں جبکہ ابن جریر طبری سے وہ بیسیوں مقامات پر تاویلِ آیات اور عقائد و احکام میں بھی استشہاد کرتے ہیں۔
بہر کیف اس تمام بحث سے قطع نظر ہم مان لیں کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کو غلط فہمی نہیں ہوئی بلکہ ان کے بیان کے مطابق ابو حیان کو سہو ہوا ہے تب بھی یہ مدعا ثابت ہے کہ امام طبری رحمہ اللہ کو جس نے بھی رافضی کہا ہے، غلط فہمی کی بناء پر کہا ہے، اور یہ کہ حافظ ابن حجر اور حافظ ذہبی جیسے محققین نے اس غلط فہمی کی بھرپور تردید کی ہے۔

کیا امام طبری رحمہ اللہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر لعنت کی ہے؟

﴿سوال﴾ امام طبری نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید پر کھلم کھلا لعنت کی ہے۔ تاریخ طبری میں ایک جگہ لکھا ہے: توفی جعفرفی وسط خلافة معاويه لعنه الله .دوسری جگہ لکھا ہے: توفی نوفل بالمدينة فی خلافة يزيد بن معاوية لعنهما الله. کیا ان کی اس عبارت کی کوئی صفائی پیش کرنا ممکن ہے؟

﴿جواب﴾ اس ضمن میں چند باتیں ذہن میں رکھیں تا کہ انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے:

① اوّل تو یہ نوٹ فرمالیں کہ یہ دونوں عبارات تاریخ طبری میں نہیں، ایک اور کتاب ''منتخب ذیل المذیل'' کی ہیں۔ یہ تاریخ طبری کا حصہ نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ''ذیل المذیل'' امام طبری رحمہ اللہ کی تصنیف مانی جاتی ہے۔

② ''ذیل المذیل'' ایک عرصے سے دنیا میں ناپید ہو چکی تھی۔ مدتوں بعد اس کے بعض اجزاء دریافت ہوئے، جو اصل کتاب کا غالباً تہائی بھی نہیں۔ ان ناقص اجزا کو ''منتخب ذیل المذیل'' کے نام سے بعض ناشرین نے چھاپ دیا اور بعض ناشرین نے انہیں تاریخ طبری کے آخر میں ضمیمے کے طور پر بھی لگا دیا۔ الغرض طبری کی یہ کتاب اپنی اصل حالت میں معدوم ہے۔ دستیاب شدہ ناقص اجزاء کے بارے میں بھی جزوی تحریف یا سہو کاتب کا پورا امکان ہے۔[1]

③ ''منتخب ذیل المذیل'' کے ہر نسخے میں ایسا نہیں۔ مؤسسۃ الاعلمی بیروت کے نسخے میں عبارت اس طرح ہے:

توفی جعفرفی وسط خلافة معاويه رضی الله عنه.[2]

اس سے صاف پتا چل رہا ہے کہ بعض نسخوں میں ''رضی اللہ عنہ'' کی جگہ ''لعنہ اللہ'' لکھنا، کتابت کی غلطی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نہایت سنگین غلطی ہے۔ یہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ ایسا قصداً کیا گیا، یا سہواً ہو گیا۔

④ دوسری عبارت ''توفی نوفل بالمدينة فی خلافة يزيد بن معاوية لعنهما الله.'' ہمیں بیروت کے نسخے میں بھی اسی طرح ملی۔[3] مگر یہاں پر بھی اس کا پورا احتمال ہے کہ کسی کاتب نے ازخود اس لفظ کا اضافہ کر دیا ہو۔

اس احتمال کی تقویت کی دلیل یہ ہے کہ:

❶ امام طبری رحمہ اللہ کی تصانیف میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید کا ذکر متعدد جگہ پر ہے۔ کہیں بھی ان کے ناموں کے ساتھ اس طرح کا اضافہ نہیں آیا۔ حتیٰ کہ بعض روایات ان میں ایسی بھی ہیں جہاں ابومخنف جیسے راویوں کی سند سے

---

① اس قسم کے سہو کا امکان ہر فن کی کتاب میں رہتا ہے چاہے وہ تاریخ ہو یا حدیث یا فقہ۔ کتابت میں سہو کے خدشات اور نقل در نقل میں عبارت کا مفہوم بگڑ جانے کے امکانات کو دیکھتے ہوئے قدیم محدثین نے نقلِ روایت کے لیے سخت شرائط طے کی تھیں جن کی تفصیل اصول حدیث کے مآخذ میں موجود ہے۔ اسی طرح فقہاء نے بھی آداب الافتاء کے تحت لکھا ہے کہ مفتی کو فتویٰ دیتے ہوئے اصل مراجع کی جانب جانا چاہیے۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: لا بد من المراجعة الی المأخذ الاصلی وعدم الاعتماد علی المأخذ الثانوی: قلت: وقد يتفق نقل قول فی نحو عشرين كتابا من كتب المتاخرين ويكون القول خطأ اخطأ به اول واضع له، فياتی من بعده و ينقله عنه وهكذا ينقل بعضهم عن بعض. ﴿شرح عقود رسم المفتی، ص ۱۳، البشری﴾
اس کے بعد علامہ ابن عابدین شامی نے ایسی اغلاط کی مثالیں پیش کی ہیں۔
زیر بحث مسئلے میں اگرچہ ثانوی مأخذ نہیں بلکہ اصل مأخذ پر بات ہو رہی ہے مگر پھر بھی نسخے میں غلطی کا امکان تو ہے۔ جس کے قوی قرائن ہم پیش کر رہے ہیں۔

② المنتخب من ذيل المذيل، ص ۳۲ ③ المنتخب من ذيل المذيل، ص ۳۷

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نامناسب باتیں نقل کی گئی ہیں۔ بعض جگہ یزید کے مظالم اور برائیاں بھی بتائی گئی ہیں۔ اگر کسی بدباطن مؤلف پر جوش سوار ہوتا اور اسے لعنت کے الفاظ لکھنا ہوتے تو وہ ان مقامات پر ضرور لکھتا۔ فقط ایسی جگہ پر الفاظِ لعنت لکھنے کی کیا ضرورت تھی جہاں جعفر بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ یا نوفل رضی اللہ عنہ کی وفات کا ذکر ہورہا ہے اور بتایا جارہا ہے کہ یہ وفاتیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یا یزید کے دورِ حکومت میں ہوئیں۔ اس کے ساتھ اضافہ ہورہا ہے ''لعنه الله '' یا ''لعنهما الله '' کا۔ کوئی رافضی قلم کار بھی بحالتِ ہوش وحواس اپنے قلم سے ایسی بے تکی حرکت نہیں کرے گا، سوائے ایسے شخص کے جو ہر بار اور ہر جگہ ان شخصیات کے ناموں کے ساتھ لعنت لکھنے کا عادی ہو۔ صحیح وسالم ذہن والا آدمی چاہے رافضی ہی کیوں نہ ہو، صرف ان ایک دو غیر متعلقہ جگہوں کو ایسی حرکت کے لیے خاص کیوں کرے گا؟

❹ معترضین بھی امام طبری رحمہ اللہ کو تقیہ باز کہتے ہیں نہ کہ کھلم کھلا رافضی۔ تو اگر وہ تقیہ باز ہی تھے تو انہوں نے ان دو مقامات کو اپنا بھانڈا پھوڑنے کے لیے خود کیوں استعمال کیا؟ سنّی ہونے کے ڈھونگ پر خود کیوں پانی پھیر دیا؟

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ الفاظ مصنف کے نہیں کسی کاتب کے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ سہو کاتب ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کاتب رافضی ہو۔ اس نے بے تکے طور پر یہ الفاظِ لعنت کچھ سوچے سمجھے بغیر کہیں بھی ٹھونس دیے اور اپنے بغض کا غبار نکال لیا۔ بعد والے اسی طرح بلاتحقیق اسے نقل کرتے رہے۔

❺ ادنیٰ احتمال یہ بھی ہے کہ دوسری عبارت ''توفی نوفل بالمدينة فی خلافة يزيد بن معاوية لعنهما الله'' میں اصل لفظ ''لعنه الله '' ہو جسے بعد میں قصداً یا سہواً ''لعنهما الله '' بنادیا گیا ہو۔ جب کتابت کی غلطی سے رضی الله عنه کو ''لعنه الله '' بنانا ثابت ہو چکا تو صرف ''لعنه الله '' کو ''لعنهما الله '' بنانا کونسا بعید ہے۔ اس صورت میں زیادہ سے زیادہ یہ الزام آسکتا ہے کہ امام طبری رحمہ اللہ نے یزید پر لعنت کی ہے۔

یقیناً جمہور اہلِ سنت کا مختار مسلک یزید پر لعنت میں توقف کا ہے مگر علمائے اہلِ سنت میں بعض حضرات اس پر لعنت کے جواز کے قائل بھی رہے ہیں جیسا کہ علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ کا اس کے جواز میں ایک مستقل رسالہ ''الرد على المتعصب العنيد المانع من ذمّ يزيد '' مشہور ہے۔

بہرحال یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ امام طبری رحمہ اللہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ''لعنه الله '' ہرگز نہیں لکھا۔

❻ یہ کتابت کی غلطی ہے یا امام طبری رحمہ اللہ کے اپنے قلم کی، اس کے فیصلے کے لیے اتنا دیکھ لینا بھی کافی ہے کہ امام طبری رحمہ اللہ کی کتب صدیوں سے برابر علمائے کرام کے ہاتھوں میں رہیں۔ ابن خلکان، امام نووی، حافظ ابن کثیر، علامہ ابن خلدون، ابن تیمیہ، حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر رحمہم اللہ جیسے حضرات جو کتابوں کو گھول کر پی جانے کے عادی تھے اور سطر سطر پر ان کی نگاہ ہوتی تھی، ابن جریر طبری رحمہ اللہ کی کتب سے مستقل استفادہ کرتے رہے ہیں۔ اگر واقعی اس دور کے اصل نسخوں میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نام نامی کے ساتھ ''لعنه الله '' کا لفظ ہوتا تو یہ تمام اہلِ علم بیک زبان ہوکر امام طبری رحمہ اللہ کے دفاع سے دست بردار ہوجاتے اور ان کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے شروع میں ہی بتادیتے

کہ اس شخص نے ایک صحابی پر لعنت کی ہے؛ اس لیے یہ رافضی ہے۔ اس کی کوئی تصنیف قابلِ اعتماد نہیں۔

مگر کسی ایک بزرگ نے بھی ایسی کسی عبارت کی نشان دہی نہیں کی۔ اگر ہوتی تو وہ ضرور کرتے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سات آٹھ صدیوں تک ایک عبارت کسی بھی جید عالم کی نگاہ سے نہ گزری ہو۔ یا گزری ہو مگر سبھی اس پر مجرمانہ خاموشی اختیار کیے رہے ہوں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ الفاظِ لعنت بعد کا اضافہ ہیں۔

⑦ امام طبری رحمہ اللہ نے ''تہذیب الآثار'' کی فقہی ابحاث میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی احادیث لی ہیں۔[1] کوئی رافضی بلکہ کسی بھی قسم کا شیعہ، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے حدیث لے کر اپنے مذہب پر استشہاد ہرگز نہیں کرتا۔ منصف مزاج شخص کو یہی ایک بات یہ سمجھانے کے لیے کافی ہے کہ امام طبری رحمہ اللہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو وہی مقام دیتے تھے جو دیگر ائمہ مسلمین کے نزدیک مسلم ہے۔

◆◆◆

محمد بن جریر بن یزید الطبری اور محمد بن جریر بن رستم ایک ہی تھے یا دو؟

﴿سوال﴾ محمد بن جریر بن یزید اور محمد بن جریر بن رستم ایک شخص کے دو نام ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ نام، ولدیت، باپ، کنیت، علاقہ تک ایک ہے، تصانیف میں شیعوں کی تائید کرنے والا مواد بھی ایک ہی طرح کا ہے۔ طبریہ کے چھوٹے سے شہر میں اگر یہ دو افراد ہوتے تو اپنی الگ الگ پہچان کے لیے کچھ تو فرق رکھتے۔ رہی یہ بات کہ دادا کے نام میں فرق ہے، تو ہمیں یقین ہے کہ اس کے دادا کا نام پہلے رُستم ہوگا مگر قبولِ اسلام کے بعد اس نے نام یزید رکھ لیا ہوگا۔

﴿جواب﴾ یہ محض ہوائی بات ہے۔ ماہرین نے دونوں کو الگ الگ شخصیات کہا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ شیعہ طبری نے اپنی کتب میں محمد بن ہارون بن موسیٰ (م ۳۸۷ھ) اور ابوالمفضل الشیبانی (م ۳۸۵ھ) جیسے شیعہ راویوں سے بھی روایات نقل کی ہیں۔ ''دلائل الامامۃ'' میں بعض روایات عبداللہ بن الحسین الغضائری (م ۴۱۱ھ) سے بھی نقل کی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ شیعہ طبری کا زمانہ سنی طبری (م ۳۱۰ھ) سے تقریباً ایک صدی بعد کا ہے۔

آپ کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ دونوں کی تصانیف میں شیعوں کی تائید کرنے والا مواد یکساں طور پر موجود ہے۔ شیعہ طبری کی کتبِ عقائد مثلاً: ''نوادر المعجزات'' اور ''دلائل الامامۃ'' اٹھا کر دیکھیں تو واضح طور پر اس میں اثنا عشری عقائد کی دعوت ہے۔ سنی طبری کی کتبِ عقائد مثلاً: ''صریح السنۃ'' اور ''التبصیر فی معالم الدین'' میں اہلِ سنت کے مسلک کی بھرپور ترجمانی ہے۔

جہاں تک تاریخِ طبری کا تعلق ہے، یقیناً اس میں صحیح، ضعیف، رطب و یابس سبھی کچھ جمع کیا گیا ہے۔ شیعہ اس کی ضعیف روایات کو لے کر الزامات لگاتے ہیں جبکہ اہلِ سنت اسی تاریخ کی صحیح روایات سے استدلال کرتے ہیں۔ اس سے طبری پر کوئی الزام نہیں آسکتا؛ کیوں کہ شیعہ کتبِ حدیث کی بھی کئی ضعیف روایات سے استدلال کرتے ہیں جبکہ اہلِ سنت

[1] تہذیب الآثار، الجزء المفقود، ح: ۷۷، ۱۱۰، ۶۲۴؛ تہذیب الآثار، مسند عمر، ح: ۱۳۵، ۱۳۶، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۳

صحیح احادیث کو لے کر دلیل دیتے ہیں۔شیعوں کے اس قسم کے حملوں کا اصولی جواب یہی ہے کہ آپ جن روایات سے استدلال کر رہے ہیں وہ سنداً ضعیف ہونے کی وجہ سے ہمارے نزدیک عقائد میں لائقِ استدلال نہیں۔

اسماء الرجال کے ماہرین ایسے اندھے نہیں تھے کہ دو الگ افراد کو ایک سمجھتے رہے ہوں۔نام،کنیت، ولدیت اور علاقے میں یکسانیت کی مثالیں اسماء الرجال کی کتب میں متعدد مل جائیں گی۔یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔

رہی یہ بات کہ اگر طبری دو تھے تو طبریہ جیسے چھوٹے سے شہر میں ان کو اپنی اپنی الگ پہچان رکھنی چاہیے تھی تو عرض ہے کہ ان کا زمانہ الگ الگ تھا۔نیز یہ نسبت طبریہ (اردن کے شہر) کی طرف نہیں، طبرستان کی طرف ہے جو ایک بہت وسیع علاقہ ہے۔یہ بھی یاد رکھیں کہ امام طبری کی زندگی کا بڑا حصہ سفر میں اور باقی بغداد میں گزرا ہے، طبرستان میں نہیں۔

یہ خیال کہ رُستم ہی نے اسلام قبول کر کے نام یزید رکھ لیا ہوگا محض ایک وہم ہے۔محمد بن جریر سُنی کا نسب اوپر تک ثابت ہے۔محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب۔جس سے ثابت ہو رہا ہے کہ دادا سے اوپر بھی ان کے اجداد مسلمان تھے۔پس دادا کے اسلام قبول کر کے نام بدل لینے کی کہانی بالکل جھوٹی ہے۔

❖❖❖

کیا امام طبری رحمہ اللہ نے عصمتِ انبیاء اور عدالتِ صحابہ کے خلاف روایات گھڑیں؟

﴿سوال﴾ طبری کی تاریخ اور تفسیر میں بعض روایات ایسی ہیں جن سے انبیائے کرام اور صحابہ کرام کا مقام و مرتبہ مجروح ہوتا ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ شیعہ بلکہ رافضی تھے۔تقیہ کر کے سُنی بنے ہوئے تھے۔انہوں نے جان بوجھ کر ایسی روایات گھڑیں تاکہ اسلام کی عظیم شخصیات کی سیرت و کردار کو داغ دار کیا جائے۔

﴿جواب﴾ امام طبری رحمہ اللہ پر یہ اشکال درحقیقت فنِ روایت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔دوسری اور تیسری صدی ہجری میں روایت کی تدوین و ترتیب کا کام ہوا تھا۔روایات چاہے حدیث کی ہوں یا تاریخ کی، ان کے بارے میں بیشتر علماء کا ہدف یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس ذخیرے کو جو حافظے میں ہے اور زبانی نقل ہو رہا ہے، کتابوں میں جمع کر لیا جائے۔اگرچہ بعض محدثین نے اس جمعِ روایت میں اعلیٰ معیار کو بھی مدِ نظر رکھا جیسے امام مالک، امام بخاری اور امام مسلم رحمہم اللہ۔مگر اکثر حضرات کی توجہ ہر قسم کی صحیح و ضعیف روایات جمع کرنے پر مرکوز رہی۔ظاہر ہے کہ بحث، استدلال اور استنباط کا مرحلہ جمعِ روایات کے بعد ہی انجام پا سکتا تھا۔اگر ان حضرات نے یہ ذخائر نہ چھوڑے ہوتے تو بعد والوں کے پاس بحث کے لیے بھلا کونسا مواد ہوتا؟ مشہور محقق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمہ اللہ کا یہ بیان قابلِ غور ہے:

> ''قدیم محدثین، مفسرین اور مؤرخین کا یہی طرز رہا ہے۔ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ایک باب سے متعلق تمام احادیث اور خبریں اس کی سند کا ذکر کر کے اس کے سہارے بیان کر دیتے تھے۔چاہے ان کی سند صحیح نہ ہو، چاہے ان کی سند کے باطل ہونے کا انہیں علم ہو؛ کیوں کہ ان روایات کے ساتھ سند کا ذکر کر دینا انہیں

مواخذے سے بری کر دیتا ہے؛ کیوں کہ اس دور میں علم الاسناد پوری طرح لوگوں میں زندہ تھا۔'' ①

اس کے بعد شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمہ اللہ، امام طبری رحمہ اللہ کے منہج کے دفاع میں روافض کی تردید کے ماہر علامہ محب الدین الخطیب مرحوم کے حوالے سے درجِ ذیل اصولی بات نقل کرتے ہیں:

''طبری اور ان کے طبقے کے ثقہ اور راسخ علماء کے ضعیف روایات کو جمع کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے آج کل ابتدائی تفتیشی افسران جو کسی مقدمے پر بحث کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اس بارے میں ہاتھ لگنے والے تمام شواہد اور خبروں کو جمع کرتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ان میں مشکوک اور کمزور (بلکہ متضاد اور خلافِ واقعہ) چیزیں بھی ہوں گی (مگر وہ یہ جزئیات پھر بھی) اس بھروسے پر (جمع کرتے ہیں) کہ ہر چیز کو اپنی قدر و قیمت کے مطابق تولا جائے گا۔'' ②

اس لیے امام طبری رحمہ اللہ یا دیگر علماء کے ایسے ذخیرۂ روایات کو گمراہ کن کہنا، تعصب اور جہالت کے سوا کچھ نہیں۔

آپ کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ مجموعی طور پر تاریخِ طبری میں انبیائے کرام اور صحابہ و تابعین کے فضائل و مناقب اور کارناموں ہی کی روایات زیادہ ہیں۔ مشکوک یا قابلِ انکار روایات کا تناسب کُل روایات کے مقابلے میں کم ہے۔ ایسے میں پوری تصنیف ہی کو روافض کی کارستانی قرار دینا کیسے درست ہو سکتا ہے؟

◆◆◆

کیا امام طبری کا عجیب و غریب روایات جمع کرنا، ان کے بدعقیدہ ہونے کا ثبوت ہے؟:

﴿سوال﴾ امام طبری اگر سُنی ہوتے تو انہیں ایسی کوئی بھی روایت نقل نہیں کرنی چاہیے تھی جس سے ذہن میں کوئی خلجان یا تشکیک پیدا ہو۔ یہ بات لا حاصل ہے کہ طبری یا کسی مجموعے کی اکثر روایات قابلِ قبول ہیں اور بعض روایات غلط۔ زہر مٹھائی میں ہی چھپا کر دیا جاتا ہے اور اس کی مقدار مٹھائی سے بہت کم ہوتی ہے مگر پھر بھی اسے کوئی جان بوجھ کر نہیں کھاتا۔ طبری میں ایسی بہت سی روایات ہیں جنہیں ہم کسی بھی سمجھدار مسلمان کے سامنے پیش کریں تو وہ انہیں سخت قابلِ نفرت سمجھے گا۔ ایسی درجنوں روایات ہیں جنہیں کسی منبر پر یا مجمعِ عام میں سنایا نہیں جا سکتا۔ ایسا رکیک مواد خود ظاہر کر رہا ہے کہ اس کا جامع عجمی سبائی تحریک کا رکن تھا جس نے اسلام کے بھیس میں کفار کے لیے کام کیا۔ ③

ایسی روایات کو اپنی تاریخ میں جگہ دینا طبری کے شیعہ ہونے کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ غلط روایات تناسب میں کم ہوں یا زیادہ، دونوں صورتوں میں ایسا مجموعۂ روایات نالے میں پھینکنے اور غرق کیے جانے کے قابل ہے۔

---

① تعليقات شيخ عبدالفتاح على "الاجوبة الفاضلة لاسئلة العاشرة الكاملة" لابى الحسنات عبدالحئى الكهنوى، حاشيه ص ٩١، ط حلب

② تعليقات شيخ عبدالفتاح على "الاجوبة الفاضلة لاسئلة العاشرة الكاملة" لابى الحسنات عبدالحئى الكهنوى، حاشيه ص ٩١، ٩٢

③ اس کے بعد سائل نے طبری کی کئی روایات کا حوالہ دیا ہے، مثلاً روایتِ نکاحِ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا، واقعہ سقیفہ بنو ساعدہ، جنگِ صفین میں روایتِ رفعِ مصاحف، روایتِ واقعہ تحکیم...... چونکہ ان روایات پر ہم خود حصہ دوئم میں بحث کر چکے ہیں؛ اس لیے انہیں یہاں سوال میں نقل کرنے اور ایک ایک روایت کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ سائل کے اصل مدعا کا اصولی جواب دیا جا رہا ہے۔

﴿جواب﴾ آپ کے ذہن کو جہاں تک میں سمجھا ہوں، وہ یہ ہے کہ:

''کوئی ایسی روایت نقل نہیں ہونی چاہیے جس سے جلیل القدر شخصیات کے بارے میں تاثر تبدیل ہوتا ہو، یا جس سے کوئی ذہنی خلجان پیدا ہوتا ہو۔''

اس کے ساتھ دوسری بات آپ کے ذہن میں یہ جاگزیں ہے کہ:

''جو اس قسم کی روایات نقل کرے، چاہے تھوڑی ہوں یا زیادہ، وہ اسلام کے لبادے میں اسلام کا دشمن ہے۔''

اگر آپ اس کی جگہ یہ کہتے کہ ''کسی بھی روایت سے عظیم اسلامی شخصیات کے خلاف ایسا استدلال جائز نہیں جو قرآن وسنت کی قطعی نصوص اور اسلامی اعتقاد کے خلاف ہو'' تو یہ بالکل درست ہوتا۔ تمام علماء یہی فرماتے ہیں۔

مگر آپ کا مدعا یہ نہیں، بلکہ اس سے متجاوز ہے۔ آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر روایات کے کسی مجموعے میں مشکوک مواد ہے، تو وہ مجموعہ قابلِ ترک اور اس کا ناقل یا جامع دشمنِ اسلام ہے۔ آن جناب کے اس معیار پر تو کتب حدیث بھی پوری نہیں اترتیں۔ کسی محتاط سے محتاط محدث نے بھی اس معیار کو سامنے رکھ کر احادیث جمع نہیں کیں کہ ان میں کسی حدیث کے کسی جزو سے کسی عظیم شخصیت کے بارے میں کسی عام آدمی کو بھی کوئی ذہنی خلجان پیدا نہ ہونے پائے۔

آپ حدیث کی کوئی بھی کتاب بغیر شرح اور بغیر استاد کے پڑھیں تو اس کے مؤلف کو بھی امام طبری رحمہ اللہ کی صف میں کھڑا کر دیں گے۔ منکرینِ حدیث ایسی احادیث پیش کر کے لوگوں کو اسی طرح محدثین کے خلاف ورغلاتے ہیں جس طرح آپ کو امام طبری رحمہ اللہ کے خلاف ورغلایا گیا ہے۔[1]

---

[1] مستشرقین اور روافض بھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایسی چند روایات بلا ترجمہ پیش کی جارہی ہیں تاکہ عوام مشوش نہ ہوں اور خواص سنجیدگی سے غور کر سکیں:

❶ عن انس بن مالك قدمنا خيبر فلما فتح الله عليه الحصن ذكر له جمال صفية بنت حيي بن اخطب وقد قتل زوجها وكانت عروسا فاصطفاها النبي ﷺ لنفسه. ﴿صحيح البخاري، ح: ۴۲۱۱، كتاب المغازي، باب غزوة خيبر﴾

يستدل بها المستشرقون على اباطيلهم.

❷ عن سهل بن سعد ان امرأة جاءت رسول الله ﷺ فقالت يارسول الله جئت لاهب لك نفسي، فنظر اليها رسول الله ﷺ، فصعّد النظر اليها وصوّبه، ثم طأطأ رأسه، فلما رأت المرأة انه لم يقض فيها شيئا جلست. ﴿صحيح البخاري، ح: ۵۰۳۰، كتاب فضائل القرآن، باب القراءة عن ظهر القلب﴾

يستشهد بها المستشرقون على هفواتهم، قبحهم الله.

❸ ذكر لرسول الله ﷺ امرأة من العرب فامر ابا اسيد ان يرسل اليها فارسل اليها، فقدمت فنزلت في اجم بني ساعدة فخرج رسول الله ﷺ حتى جاءها فدخل عليها، فاذا امرأة منكسة رأسها فلما كلمها رسول الله ﷺ قالت: اعوذ بالله منك قال قد اعذتك مني. ﴿صحيح مسلم: كتاب الاشربة، باب اباحة النبيذ﴾

يستدل بها اعداء الاسلام على خرافاتهم، ابعدهم الله.

❹ عن جابر ان رسول الله ﷺ رأى امرأة فاتى امرأته زينب وهي تمعس منيئة لها، فقضى حاجته، ثم خرج الى اصحابه، فقال: ان المرأة تقبل في صورة شيطان، وتدبر في صورة شيطان، فاذا ابصر احدكم امرأة فليأت اهله، فان ذلك يرد ما في نفسه. ﴿صحيح مسلم، كتاب الحج، باب ندب من رأى امرأة فوقعت في نفسه﴾

وقع بها الملاحدة في شان رسول الله ﷺ، تبت ايديهم.

(بقیہ اگلے صفحے کے حاشیہ پر)

اگر اس معیار اور اس اصول کو مان لیا جائے، تو کتب تاریخ کی باری بعد میں آئے گی، سب سے پہلے کتب حدیث اور ان میں سے صحاحِ ستہ کے مؤلفین کو ناقابلِ اعتماد ماننا پڑے گا؛ کیوں کہ ایسی روایات تو بخاری اور مسلم میں بھی موجود ہیں کہ جب تک ان کی کوئی صحیح تاویل نہ کر لی جائے، انسان حیران رہتا ہے۔ چند ایک میں نہیں بیسیوں روایات میں اشکالات اور تاویلات ہیں۔ تبھی ان کی شروح پندرہ پندرہ بیس بیس جلدوں تک پھیل گئی ہیں۔ یہ وہ مشکلات ہیں جنہیں شروحِ حدیث کے بغیر سر کرنا عام عالم کے بس کی بات بھی نہیں۔

مگر شروح تو دو تین صدیوں بعد لکھی گئیں۔ اس سے پہلے کیا بخاری، مسلم اور ترمذی وغیرہ کی حیثیت مجروح تھی؟ اور بالفرض اگر یہ شروح نہ ہوتیں تو کیا امام بخاری و مسلم رحمہما اللہ کو بھی اسلام کے لبادے میں مجوسیوں کا آلہ کار ٹھہرا دیا جاتا؟ اور اگر آج تاریخ طبری کی کوئی شرح لکھ دی جائے جس میں قابلِ اشکال روایات کی تاویلات ہوں تو کیا آپ اپنے منہج کو چھوڑ کر امام طبری رحمہ اللہ کو ثقہ و دیانت دار تسلیم کر لیں گے؟

اگر اپنے ذہن کے برخلاف روایت لانے والوں کی تاویل قبول نہیں بلکہ ان کی دیانت اور ایمان تک مشکوک ہے تو پھر سیرت نگاروں اور مؤرخین کی نہیں، بڑے بڑے محدثین کی تالیفات اور ان کی اپنی شخصیات ناقابلِ اعتبار ٹھہریں گی۔ جب حدیث کے دو صحیح ترین مجموعے صحیح البخاری اور صحیح مسلم بھی اس معیار پر پورے نہیں اترتے جو آں جناب کو مطلوب ہے تو طبری کو جھوٹا اور شیعہ ثابت کر دینے سے بھی اسلام کا کونسا دفاع ہو جائے گا؟

چلئے! ہم آپ کا معیار مان لیتے ہیں۔ تاریخ طبری اور اس جیسی تمام کتب کے تمام نسخے اٹھا کر تلف کر دیتے ہیں مگر کیا بات ختم ہو جائے گی؟ کیا اس کے بعد ہم پر کوئی اشکال کرنے والا نہیں رہے گا؟

بات تو مزید بڑھ جائے گی۔ روافض، مستشرقین، سیکولر طبقہ اور باطل فرقے مزید جری ہو کر کہیں گے کہ تمہارے ذخیرۂ حدیث میں بھی ایسا مواد ہے۔ اس کی دلیل میں وہ ایسی بہت سی روایات پیش کر دیں گے جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ امام طبری رحمہ اللہ جیسے مؤرخین کا دفاع تو پھر بھی یہ کہہ کر کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے دیباچے میں روایات کی ذمہ داری اٹھانے سے معذرت کر دی تھی اور بتا دیا تھا کہ اس مجموعے میں بھلا بُرا، رطب و یابس سبھی کچھ ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

(۵) عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال رای رسول اللہ ﷺ امراۃ فاعجبتہ ،فاتی سودۃ وھی تصنع طیباً ،وعندھا نساء فاخلینہ،فقضیٰ حاجتہ،ثم قال :ایما رجل رای امراۃ تعجبہ فلیقم الیٰ اھلہ،فان معھا مثل الذی معھا. ﴿مشکوۃ المصابیح ،ح:۳۱۰۸، کتاب النکاح، باب النظر ؛ سنن دارمی،ح: ۲۲۶۱ بسند حسن﴾

یستدل بھا اعداء السنۃ علیٰ اساطیرھم، یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول غروراً.

(۶) لم یکذب ابراھیم علیہ السلام الا ثلاث کذبات. ﴿صحیح البخاری، احادیث الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ: واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا﴾

(۷) اقبلت امراۃ من خثعم وضیئۃ تستفتی رسول اللہ ﷺ فطفق الفضل ینظر الیھا واعجبہ حسنھا، فالتفت النبی ﷺ والفضل ینظر الیھا فاخلف بیدہ فاخذ بذقن الفضل فعدل وجھہ عن النظر الیھا. ﴿صحیح البخاری، ح: ۶۲۲۸، کتاب الاستئذان، باب﴾

(۸) فاخذ موسیٰ عصاہ و طلب الحجر فجعل یقول ثوبی حجر ثوبی حجر،حتیٰ انتھی الیٰ ملأ من بنی اسرائیل فراؤہ عریانا احسن ماخلق اللہ. ﴿صحیح البخاری،کتاب حدیث الانبیاء،باب حدیث الخضر مع موسی علیہما السلام﴾ (بقیہ اگلے صفحے کے حاشیہ پر)

مگر مؤلفینِ صحاحِ ستہ خصوصاً امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ پر تو زیادہ شدت کے ساتھ یہ اشکال وارد ہوگا کہ انہوں نے انتہائی چھان بین کے ساتھ فقط صحیح ترین روایات پیش کرنے کا دعویٰ کر کے بھی ایسی چیزیں کیوں نقل کر دیں جو ”منبر پر سنائی جاسکتی ہیں نہ کسی اخبار میں چھاپنے کے قابل ہیں۔“ اگر امام طبری کا ایسی روایات جمع کرنا، ان کے سبائی ہونے کی دلیل ہے تو کیا مؤلفینِ صحاحِ ستہ ایسی روایات لا کر اسی الزام کے حق دار نہیں ہوں گے؟

اگر نہیں تو کیا اس فرق کی کوئی معقول وجہ ہے؟ یہاں معصوم اور غیر معصوم یا صحابی اور غیر صحابی والا مسئلہ تو ہے نہیں۔ مؤلفینِ صحاحِ ستہ بھی بہر حال امتی تھے اور طبری بھی۔ یہ بھی عالم تھے اور وہ بھی۔ یہ بھی عجمی تھے اور وہ بھی۔ اکثر ائمہ جرح وتعدیل نے ان کی بھی توثیق کی ہے اور اُن کی بھی۔ اگر سبائی ہونے نہ ہونے کا مدار، اصحاب جرح وتعدیل کی آراء پر نہیں بلکہ اس کا معیار وہی ہے جو جناب نے طے کر رکھا ہے تو اس قدر قابلِ اشکال روایات کو سمونے کے باوجود مؤلفینِ صحاحِ ستہ کس طرح سُنی مانے جارہے ہیں؟ مؤرخین کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ تاریخی چیزیں پیش کر رہے تھے؛ اس لیے احتیاط کی ضرورت نہ سمجھی۔ محدثین کے دفاع میں یہ جواب بھی نہیں دیا جاسکتا۔

اگر یہ کہا جائے کہ مؤلفینِ صحاحِ ستہ سے ہمیں حسنِ ظن ہے کہ ان سے اُن جانے میں لغزش ہوگئی، غلطی کسی درمیان کے راوی کی ہے، اس نے اپنی طرف سے کچھ الفاظ گھٹا بڑھا دیے ہیں، تو یہی اَعذار امام طبری رحمہ اللہ کے بارے میں کیوں نہیں مانے جاسکتے؟ وجہِ فرق تو پھر بھی کوئی نہیں رہتی۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ مؤلفینِ صحاحِ ستہ نے روایات کو صرف من وعن نقل کر دیا ہے جبکہ طبری نے خود گھڑ گھڑ کر روایات لکھی ہیں، تو یہ محض ایک بے ثبوت بات اور پرلے درجے کی بدگمانی ہے۔ کوئی بھی بددماغ شخص ایسی ہی بدگمانی مؤلفینِ صحاحِ ستہ اور ائمہ مجتہدین سمیت ہر جلیل القدر امام کے بارے میں کر سکتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

9. شهدت عثمان بن عفان و اتى بالوليد قد صلى الصبح ركعتين ثم قال ازيدكم ،فشهد عليه رجلان:احدهما حمران، انه شرب الخمر والآخر انه رآه يتقيا،فقال عثمان :انه لم يتقيأ حتى يشربها ،قم يا عليّ فاجلده. ﴿مسلم، كتاب الحدود، باب حد الخمر﴾
اوردها الروافض في مثاليب الصحابة

10. لما اشتد بالنبي ﷺ وجعه قال :ائتوني بكتاب اكتب لكم،لا تضلوا بعده ،قال عمر : ان النبي ﷺ غلبه الوجع وعندنا كتاب الله حسبنا، فاختلفوا وكثر اللغط ،قال :قوموا عني ولا ينبغي عندي التنازع،فخرج ابن عباس يقول :ان الرزية كل الرزية ما حال بين رسول الله ﷺ و كتابته. ﴿صحيح البخاري،كتاب العلم: باب كتابة العلم﴾
يستشهد بها الروافض علىٰ ان عليا رضي الله عنه وصي رسول الله ﷺ

11. فوجدت فاطمة علىٰ ابي بكر في ذلك،فهجرته فلم تكلمه حتى توفيت،وعاشت بعد النبي ﷺ ستة اشهر،فلما توفيت دفنها زوجها ليلاً، ولم يؤذن بها ابابكر وصلىٰ عليها ،وكان لعلي وجه حياة فاطمة ،فلما توفيت استنكر عليٌ وجوه الناس فالتمس مصالحة ابي بكر ومبايعته ولم يكن يبايع تلك الاشهر. ﴿صحيح البخاري،ح: ٤٢٤٠، كتاب المغازي،باب غزوة خيبر﴾
بهذا يستدل الروافض علىٰ هفواتهم.

12. فبعثهم رسول الله ﷺ في ابل الصدقة وقال :اشربوا من البانها وابوالها.﴿سنن الترمذي،ابواب الطهارة ،باب في بول ما يوكل لحمه﴾
تستدل الاباحيّون والملاحدة بهذه الرواية علىٰ ان الابوال طاهرة وكذا الخمر والخنزير،في قلوبهم مرض فزادهم الله مرضاً.

(بقیہ اگلے صفحے کے حاشیے پر)

اگر یہ کہا جائے کہ مؤلفینِ صحاحِ ستہ نے روایات کو فقط جمع کیا ہے، کوئی غلط استدلال تو نہیں کیا، تو یہی بات تمام علماء ایک مدت سے کہتے چلے آرہے ہیں اور ہم شروع سے امام طبری رحمہ اللہ کے متعلق یہی سمجھانے کی کوشش کررہے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی اور جواب ہے بھی نہیں۔ اور یہ کوئی بناوٹی بات نہیں بلکہ یہی حقیقت ہے۔

مؤلفینِ صحاح رحمہم اللہ کا مقصد استدلال کے قابل روایات کو حسنِ ترتیب کے ساتھ جمع کرنا تھا۔ استدلال کرنے کا کام عام مسلمانوں کا نہیں، ائمہ مجتہدین، ائمہ اصولِ دین اور متکلمینِ اسلام کا تھا۔ عام مسلمان تو اس کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ یہ کام نہایت بلند پایہ علماء کا تھا اور وہ کرچکے ہیں۔ ان میں سے اعتقادی روایات سے استدلال کرکے کتبِ عقائد الگ مرتب کردی گئی ہیں جن میں اہلِ سنت کا کسی مسئلے پر اصولی اختلاف نہیں۔ ان روایات میں اعمال سے متعلق احادیث پر حنفیہ، شوافع، مالکیہ اور حنابلہ نے اپنے اپنے اصولِ استنباط کے مطابق بحث کی ہے اور ولادت سے موت تک ہر شرعی حکم کو فقہی ذخیرے میں مرتب کردیا ہے۔ کسی نے ایک روایت سے استدلال کیا، کسی نے اس کے متضاد دوسری روایت سے۔ نیز ذخیرۂ حدیث کی کتنی ہی روایات ہیں جن پر کسی بھی مجتہد کا عمل نہیں۔ بلکہ ان پر عمل سے منع کیا گیا ہے۔ بخاری و مسلم میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام کے حالات و واقعات کی بھی متعدد روایات ایسی مل جائیں گی، جن کے ظاہری مطلب کو متکلمینِ اسلام نے قبول نہیں کیا بلکہ دیگر صحیح روایات، پختہ قرائن یا اجماعِ امت کی روشنی میں صحیح نظریہ ثابت کیا ہے اور بخاری و مسلم کی ان روایات کا کوئی اور مناسب محمل پیش کیا ہے۔ بعض روایات کے بعض الفاظ کو راوی کے ادراج یا وہم پر محمول کرلیا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود یہ روایات نقل کی گئیں اور آج بھی پڑھی پڑھائی جارہی ہیں۔ نہ تو راویوں کی امانت و دیانت پر کوئی شک کیا گیا نہ مؤلفین کو سبائی مانا گیا۔ روایات کے نقل کرنے اور استدلال کرنے میں یہ بنیادی فرق ہے جو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ چاہے وہ روایات حدیثی ہوں یا تاریخی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

(13) عن الربيع بن سبرة الجهني عن ابيه سبرة أنه قال أذن لنا رسول الله ﷺ بالمتعة فانطلقت أنا ورجل إلى امرأة من بني عامر كأنها بكرة عيطاء فعرضنا عليها أنفسنا فقالت ما تعطي فقلت ردائي وقال صاحبي ردائي وكان رداء صاحبي أجود من ردائي و كنت أشب منه فإذا نظرت إلى رداء صاحبي أعجبها وإذا نظرت إلي أعجبتها ثم قالت أنت ورداؤك يكفيني فمكثت معها ثلاثا ثم إن رسول الله ﷺ قال من كان عنده شيء من هذه النساء التي يتمتع فليخل سبيلها. (صحيح مسلم، ح: ٣٤٨٥، باب نكاح المتعة)

يقذع بها اعداء الحديث وهم في طغيانهم يعمهون.

(14) عن ثمامة بن حزن القشيري قال شهدت الدار حين أشرف عليهم عثمان فقال ائتوني بصاحبيكم اللذين ألباكم علي قال فجيء بهما فكأنهما جملان أو كأنهما حماران قال فاشرف عليهم عثمان. (سنن الترمذي، ح: ٣٧٠٣، باب في مناقب عثمان)

(15) حدثني أبو بكر بن حفص قال سمعت أبا سلمة يقول دخلت أنا وأخو عائشة على عائشة فسألها أخوها عن غسل النبي ﷺ فدعت بإناء نحوا من صاع فاغتسل نحوا من صاع فاغتسلت وأفاضت على رأسها وبيننا وبينها حجاب (صحيح البخاري، ح: ٢٥١)

اوردهما الروافض في مطاعن الصحابة في طلحة والزبير وعثمان و عائشة الصديقة رضي الله عنهم

(16) وفد المقدام بن معد يكرب وعمرو بن الأسود ورجل من بني أسد من أهل قنسرين إلى معاوية بن أبي سفيان فقال معاوية للمقدام أعلمت أن الحسن بن علي توفي؟ فرجع (أي قال إنا لله وإنا إليه راجعون) المقدام فقال له رجل أتراها مصيبة؟ قال له ولم لا أراها مصيبة وقد وضعه رسول الله ﷺ في حجره فقال هذا مني وحسين من علي؟ فقال الأسدي ..... (بقیہ اگلے صفحے کے حاشیہ پر)

مگر افسوس کہ آپ کے نزدیک اس بات کی کوئی حیثیت نہیں ہے کہ روایات کے مجموعوں کے بارے میں علمائے اسلام کا رویہ کیا رہا ہے، یا ان کے مؤلفین کے بارے میں جمہور علماء کی رائے کیا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ مؤلفین کو یہ رعایت دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں کہ وہ صرف ناقل یا جامع ہیں؛ اس لیے ان کی دیانت پر شک نہ کیا جائے بلکہ اصرار ہے کہ جو مؤلف ایسی روایات لایا ہے، وہ جان بوجھ کر اسلام کو پامال کرنے والا ہے۔

میری گزارش ہے کہ تنگ نظری کی پٹی آنکھوں سے ہٹائیے۔ اگر تعصب کی عینک لگا کر دیکھیں گے تو تاریخ کے کئی اوراق ہی نہیں، فقہ میں کتاب الطہارۃ اور کتاب النکاح والطلاق کے کئی ابواب بھی شرمناک محسوس ہوں گے۔ اگر ایک عام آدمی میڈیکل کی کتب پر سرسری نگاہ ڈالے تو وہاں بھی بہت سی چیزیں انتہائی بے حیائی پر مبنی محسوس ہوں گی۔ گائناکولوجی، میڈیکل کا ایک شعبہ ہے۔ اس کی کوئی کتاب آپ اپنے بچوں کے سامنے نہیں کھول سکتے۔ ان کے مندرجات آپ کسی منبر پر یا کسی اخبار میں نقل نہیں کر سکتے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ بے ہودگی اور بے حیائی ہے اور اس شعبے کو بند ہو جانا چاہیے۔

پہلی صدی ہجری سے قریبی دور تک اُمت کا کوئی متکلم، کوئی محدث، کوئی فقیہ، کوئی محقق اور جرح وتعدیل کا کوئی امام اس منہج کا قائل نہیں رہا جسے آپ اُمت پر ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ اس منہج کے مطابق اسلاف کی علمی تراث پر مشق آزمائی رفض کے مقابلے کے جذبے اور جلیل القدر مؤرخین پر سبائیت کی تہمتوں سے شروع ہوتی ہے مگر دھیرے دھیرے یہ سفر ذخیرۂ حدیث میں شکوک وشبہات اور پھر محدثین سے بداعتمادی تک جا پہنچتا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ اس کے بعد فقہاء مع مسائلِ فقہ اور متکلمین مع اعتقادیات، اسی تنقید کی زد میں آ جاتے ہیں۔ یوں مروجہ اسلام کی تطہیر کے نام پر اسلام کی پوری عمارت کو ڈھا دینے کی کوشش ہوتی ہے۔ مگر الحمد للہ! اکابر کے خوشہ چین ہر دور میں زندہ رہے ہیں۔ وہ ایسی ''نادر تحقیقات'' کا مدلل ومسکت جواب بھی دیتے ہیں۔ جس کے نصیب میں ہدایت ہوتی ہے، وہ مان جاتا ہے، جو نہ مانے، وہ اپنا ہی کچھ کھوتا ہے۔ کتنے ہی لوگ اس قسم کی اندھیری گلیوں سے گزر کر انکارِ حدیث کی کھائی میں گر چکے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ آپ کو محفوظ رکھے اور ہدایتِ کاملہ مرحمت فرمائے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

جمرة أطفاها الله عزوجل قال فقال المقدام اما انا فلا ابرح اليوم حتى اغيظ لك واسمعه لك ما تكره ثم قال يا معاوية إن انا صدقت فصدقني وإن انا كذبت فكذبني قال افعل قال فانشد لك بالله هل سمعت رسول الله ﷺ نهى عن لبس الذهب؟ قال نعم قال فانشد لك بالله هل تعلم ان رسول الله ﷺ نهى عن لبس الحرير؟ قال نعم قال فانشد لك بالله هل تعلم ان رسول الله ﷺ نهى عن لبس جلود السباع والركوب عليها؟ قال نعم قال فوالله لقد رأيت هذا كله في بيتك يا معاوية فقال معاوية قد علمت اني لن انجو منك يا مقدام. ﴿سنن ابی داؤد، ح: ٤١٣١، باب في جلود السباع والنمور﴾

● عن عامر بن سعد بن أبي وقاص عن أبيه قال أمر معاوية بن ابي سفيان سعدا فقال ما يمنعك أن تسب أبا تراب؟ قال أما ما ذكرت ثلاثا قالهن ﷺ فلن أسبه. ﴿سنن الترمذی، ح: ٣٧٢٤﴾

● عن سعد بن أبي وقاص، قال: قدم معاوية في بعض حجاته، فدخل عليه سعد، فذكروا عليا فنال منه فغضب سعد، وقال: تقول هذا لرجل سمعت رسول الله ﷺ يقول من كنت مولاه فعلي مولاه. ﴿سنن ابن ماجة، ح: ١٢١﴾

اورد الروافض هذه الروايات في مطاعن معاوية بن ابي سفيان رضی اللہ عنہ، و قد اجبنا عنها كافيا شافيا في "تاريخ امت مسلمه، حصه دوئم"

فہرستِ ضعفاء وکذابین اور موضوعات میں امام طبری سے تعرض نہیں

قارئینِ کرام! ائمہ نقدِ روایات اور اصحابِ جرح وتعدیل نے ذخیرۂ حدیث وتفسیر اور سیرت وتاریخ کو ہر ہر پہلو سے اچھی طرح دیکھا بھالا ہے اور کسی موضوع کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ ان حضرات نے ضعیف اور کذاب راویوں کی پہچان پر خصوصی کام بھی کیا ہے اور ایسی درجنوں کتب تحریر کی ہیں جن میں ابتدائی پانچ چھ صدیوں کے تمام ضعیف، متروک، کذاب اور دجال راویوں کے احوال درج کر دیے گئے ہیں۔ اسی طرح ائمہ اسلام نے بے سروپا روایات کی شناخت پر بھی خصوصی محنت کی اور درجنوں ایسے مجموعے پیش کر دیے جن میں ساقط اور ناقابلِ اعتبار روایات الگ سے جمع ہیں۔

مگر ان دونوں اصناف میں کام کرنے والوں نے امام طبری رحمہ اللہ سے کبھی تعرض نہیں کیا۔

ضعفاء وکذابین کی فہرست میں امام طبری کو شامل نہیں کیا گیا:

جرح وتعدیل پر کچھ کتب تو امام طبری رحمہ اللہ کے زمانے سے پہلے لکھی گئی تھیں؛ اس لیے ہم انہیں نظر انداز کرتے ہوئے براہِ راست ان کتب پر آتے ہیں جو اس وقت لکھی گئی تھیں جب امام طبری رحمہ اللہ کی تصانیف کی شہرت ہر طرف پھیل چکی تھی اور علماء کا کوئی حلقہ ان سے ناواقف نہ تھا۔

جرح وتعدیل کے امام ابن ابی حاتم الرازی رحمہ اللہ (م ۳۲۷ھ) امام طبری رحمہ اللہ کے معاصر تھے۔ ان سے ۱۷ سال بعد فوت ہوئے تھے۔ انہوں نے ''الجرح والتعدیل'' میں لگ بھگ اڑھائی ہزار راویوں پر کلام کیا اور ضعفاء وکذابین نیز روافض کی خوب خبر لی مگر امام طبری رحمہ اللہ پر کوئی جرح نہیں کی۔ حالانکہ اگر امام طبری رحمہ اللہ اتنے بڑے پیمانے پر رفض پھیلا رہے تھے تو ان کی قلعی کھولنا، ابن ابی حاتم رحمہ اللہ پر فرض تھا۔

خراسانی محدث ابن حبان رحمہ اللہ (م ۳۵۴ھ) جو جرح وتعدیل کے امام بھی ہیں، امام طبری رحمہ اللہ سے ۴۴ سال بعد فوت ہوئے۔ انہوں نے ''المجروحین'' میں بارہ سو سے زائد ضعفاء وکذابین کے پردے فاش کیے ہیں مگر ایک بار بھی امام طبری رحمہ اللہ کی طرف اشارہ نہیں کیا۔

ابن عدی رحمہ اللہ (م ۳۶۵ھ) فنِ رجال کے امام تھے۔ انہوں نے نو جلدوں میں ''الکامل فی ضعفاء الرجال'' مرتب کر دی۔ ضعیف اور کذاب راویوں کے احوال کے بارے میں یہ کتاب اس قدر جامع ہے کہ فنِ جرح وتعدیل کے تاجدار امام دارقطنی رحمہ اللہ سے کسی نے درخواست کی کہ وہ ضعیف راویوں کے بارے میں ایک کتاب لکھیں۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''کیا تمہارے پاس ابن عدی کی کتاب نہیں؟ وہ کافی ہے۔ اس پر اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔''[1]

آخر کیا وجہ ہے کہ ضعفاء کے متعلق ایسی جامع کتاب میں بھی امام طبری رحمہ اللہ کو شامل نہیں کیا گیا؟

[1] سیر اعلام النبلاء: ۱۶/۱۵۵

مزید لطف کی بات یہ ہے کہ ابن عدی رحمہ اللہ نے بعض ضعیف روایات ایسی بھی نقل کی ہیں جن کی سند میں ''محمد بن جریر الطبری'' بھی ہیں مگر ابن عدی رحمہ اللہ ہرگز یہ نہیں کہتے کہ روایت میں ضعف کی وجہ محمد ابن جریر ہیں۔ بلکہ انہوں نے ان سے پہلے یا ان کے بعد والے کسی راوی کو وجہِ ضعف قرار دیا ہے۔[1]

بغداد کے عظیم نقاد محدث امام دارقطنی رحمہ اللہ (م ۳۸۵ھ) امام طبری رحمہ اللہ سے ۷۵ سال بعد فوت ہوئے۔ ان کا اور امام طبری رحمہ اللہ کا شہر ایک ہی تھا۔ اگر امام طبری رحمہ اللہ تقیہ باز رافضی ہوتے تو امام دارقطنی رحمہ اللہ ضرور تاڑ لیتے اور ان کا کچا چٹھا بیان کر دیتے۔ انہوں نے اپنا علمی شاہکار ''الضعفاء والمتروکون'' مشکوک اور جھوٹے راویوں کا حال بیان کرنے ہی کے لیے مرتب کیا تھا مگر اس ضمن میں انہوں نے امام طبری رحمہ اللہ کو بالکل شامل نہیں کیا۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ کے معاصر ابن شاہین رحمہ اللہ (م ۳۸۵ھ) کی ''تاریخ الضعفاء والکذابین'' کا مقصد بھی کذاب اور مشکوک راویوں کا پردہ فاش کرنا تھا مگر وہ بھی امام طبری رحمہ اللہ کو اس صف میں نہیں لاتے۔

امام ابونعیم اصفہانی رحمہ اللہ (م ۴۳۰ھ) امام طبری رحمہ اللہ سے ایک سو بیس سال بعد کے ہیں۔ انہوں نے بھی ضعیف راویوں کے حالات کو اپنی شہرۂ آفاق تالیف ''الضعفاء'' میں جمع کیا ہے مگر انہوں نے امام طبری رحمہ اللہ کو اس فہرست میں قطعاً شامل نہیں کیا۔

امام ابن جوزی رحمہ اللہ (م ۵۹۷ھ) نے ''الضعفاء والمتروکون'' میں چار ہزار سے زائد ضعیف، کذاب اور مجہول راویوں کے حالات جمع کرتے ہوئے ابن جریر طبری رحمہ اللہ کا نام شامل نہیں کیا۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ (م ۷۴۸ھ) کی ''المغنی فی الضعفاء'' میں بھی امام طبری رحمہ اللہ کا کوئی ذکر نہیں۔[2]

علامہ ابن قاسم قطلوبغا رحمہ اللہ (م ۸۷۹ھ) انہیں ثقات میں شمار کر رہے ہیں۔[3]

آخر علم رجال کے یہ ماہرین جان بوجھ کر امام طبری رحمہ اللہ کے کرتوتوں کی پردہ پوشی کر رہے تھے یا ان کا علم ناقص تھا؟ اگر اسماء الرجال کے ماہرین قصداً ایک کذاب کی اصلیت کو چھپاتے رہے تو ان حضرات کی اپنی امانت و دیانت ساقط ہو جاتی ہے۔ اور اگر وہ حقیقتِ حال سے ہی واقف نہ تھے تو ان کی رجال دانی پر سوال اٹھتا ہے اور ان کے مرتب کردہ مجموعوں کی صحت مشکوک ہو جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں ''علم اسماء الرجال'' کی حیثیت مجروح ہو جاتی ہے جس کے بعد ظاہری سی بات ہے کہ علمِ حدیث بھی قابلِ اعتماد نہیں رہے گا۔

① حدثنا محمد بن جرير الطبرى، حدثنا زكريا بن يحيىٰ الضرير، حدثنا بشر بن محمد السكرى ابو احمد، حدثنا عبدالله بن عمران، عن ابن اشوع عن الشعبى عن جابر بن عبد الله قال قال رسول الله ﷺ من مات مبطونا مات شهيدا ووقى عن عذاب القبر. قال الشيخ: وبشر بن محمد هذا له احاديث غير ما ذكرته فارجو انه لا باس به، ومقدار ماذكرته انكر ما رايت له من رواياته وارجو ان هذه الاحاديث ليست من قبله انما هو قبل من رواه عنه، وهو فى نفسه لا باس به. (الكامل فى ضعفاء الرجال: ۱۷۷/۲)

② ہوسکتا ہے کہ کوئی ''عظیم محقق'' یہاں یہ فرمادیں کہ ان حضرات کی کتب تو ضعیف راویوں کا حال کھولتی ہیں۔ ابن جریر طبری کو ان کتب میں اس لیے یاد نہیں کیا گیا کہ وہ تو کذاب اور دجال ہونے کی حد تک پہنچ گئے تھے۔ تو عرض ہے کہ یہ توجیہ بالکل بے فائدہ ہے۔ ''الضعفاء'' کے عنوان کی حامل کتب میں ایسے راویوں کے کوائف بھی موجود ہیں جو فقط ضعیف نہیں تھے بلکہ کذاب اور دجال بھی تھے۔

③ الثقات ممن لم يقع فى الكتب الستة: ۲۱۵/۸ تا ۲۱۷، ط دار النعمان صنعا، یمن، سنة ۱٤۳۲ھ

من گھڑت روایات کی پہچان کرانے والی کتب میں بھی امام طبری رحمہ اللہ سے تعرض نہیں کیا گیا:

اس کے ساتھ یہ پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ ضعیف و موضوع روایات کو الگ جمع کرنے کے لیے محدثین گراں قدر کام کرتے رہے جس کی وجہ سے قدیم دور کی موضوع روایات کو الگ کیا جا چکا ہے۔ اس نوع کی مفصل کتب میں وضعی روایات کے بعد یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کس علت یا کس راوی کی وجہ سے وضع کا حکم لگایا جا رہا ہے۔ ایسی کتب میں بھی امام طبری رحمہ اللہ سے تعرض نہیں کیا گیا۔ ہم نے موضوعات پر دستیاب متعدد کتب چھان کر دیکھیں تو ایک بھی روایت ایسی نہیں ملی جس پر امام طبری رحمہ اللہ کی وجہ سے وضع کا حکم لگا ہو۔ راقم نے اس سلسلے میں درج ذیل کتب کو دیکھا ہے:

① الاباطيل والمناكير والصحاح والمشاهير، علامه جورقاني (م ٥٤٣ هجرى)
② العلل المتناهية في الاحاديث الواهية، امام ابن الجوزى (م ٥٩٧ هجرى)
③ الموضوعات لابن الجوزى
④ الموضوعات، علامه الصغاني حنفي (م ٦٥٩ هجرى)
⑤ اللآلي المصنوعه في الاحاديث الموضوعة، سيوطى (م ٩١١ هجرى)
⑥ تنزيه الشريعة المرفوعة عن الاخبار الشنيعة الموضوعة، علامه نورالدين كناني (م ٩٦٣ هجرى)
⑦ تذكرة الموضوعات، علامه طاهر پتنى (م ٩٨٦ هجرى)
⑧ الاسرار المرفوعة في الاخبار الموضوعة، ملاعلى قارى (م ١٠١٤ هجرى)
⑨ الفوائد الموضوعة في الاحاديث الموضوعة، المقدسي الحنبلي (م ١٠٣٣ هجرى)
⑩ الجدالحثيث في بيان ماليس بحديث، احمدالغزى العامرى (م ١١٤٣ هجرى)
⑪ النخبة البهية في الاحاديث المكذوبة، محمدامير المالكي (م ١٢٢٨ هجرى)
⑫ الآثار المرفوعه في الاخبار الموضوعة، علامه عبدالحئى لكهنوى (م ١٣٠٤ هجرى)
⑬ اللؤلؤ المرصوع، ابوالمحاسن الطرابلسي الحنفي (م ١٣٠٥ هجرى)

اس پورے ذخیرے میں کوئی ایک روایت بھی ایسی نہیں ملی جس کے حوالے سے امام طبری رحمہ اللہ پر وضعِ روایت کا الزام لگایا گیا ہو۔[1]

---

① ہو سکتا ہے کہ کوئی صاحب یہ اعتراض کریں کہ ہم نے علل اور طبقات کی جن کتب کے حوالے دیے ہیں، وہ کذاب مؤرخین یا جھوٹے تاریخی راویوں سے متعلق نہیں بلکہ ان میں فقط احادیث کے حوالے سے ضعیف یا کذاب لوگوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔
مگر یہ اعتراض اوّل تو اس لحاظ سے غلط ہے کہ ان کتب میں تاریخ و سیرت کے حوالے سے ضعیف، مشکوک یا کذاب راویوں کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے، جیسا کہ ابو مخنف، محمد بن سائب الکلبی، ہشام بن محمد کلبی، واقدی، نصر بن مزاحم، ابوالفرج اصبہانی اور المسعودی وغیرہ۔
دوسرے یہ کہ امام طبری رحمہ اللہ نرے تاریخ کے راوی نہیں بلکہ ان سے بکثرت احادیث منقول ہیں جنہیں ان کی تفسیر اور ان کے فقہی شاہکار "تہذیب الآثار" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ امام طبری رحمہ اللہ کے بعد مرتب کیے جانے والے متعدد ذخائرِ حدیث میں یہ روایات نقل کی گئی ہیں، اس لیے امام طبری رحمہ اللہ کو محض تاریخی راوی کی حیثیت دینا حقائق سے نظریں چرانا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی ذخیرے میں امام ابن جوزی رحمہ اللہ کی تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ''الموضوعات'' بھی ہے۔

یہ ابن جوزی رحمہ اللہ وہ واحد ہستی ہیں جنہوں نے بلاشک وشبہ انہی امام محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ صاحب تاریخ وتفسیر پر یہ جرح نقل کی ہے: ''نُسبَ الی الرفض''[1] مزید یہ کہ انہوں نے ''الموضوعات' میں دو مقامات پر ایسی روایات کو بھی موضوع کہا ہے جن کے سلسلۂ اسناد میں محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ ہیں۔ مگر اصل قابلِ غور بات یہ ہے کہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے روایت کی آفت کسی اور کو قرار دیا ہے۔ امام طبری رحمہ اللہ کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کیا کہ ان کی وجہ سے روایت مشکوک ہوگئی ہے چہ جائے کہ وہ ''وضع'' کی نسبت ان کی طرف کرتے۔[2]

یہ تھی ہمارے اسلاف کی دیانت داری کہ اختلاف اور نقد کو اپنی حد تک رکھتے تھے۔ امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے ''المنتظم'' میں جب امام طبری رحمہ اللہ کے حالات پر مشتمل مواد کو جمع کر کے پیش کیا تو جہاں ان کے فضائل ومناقب اور کارناموں کا تذکرہ کیا، وہاں اِکا دُکا افراد کی طرف سے ان پر لگائے گئے ایک آدھ الزام کو بھی ریکارڈ مکمل کرنے کی خاطر نقل کر دیا۔

مگر جہاں تک وضع اور جعل سازی کا مسئلہ تھا، اس فن میں کلام کرتے ہوئے انہوں نے امام طبری رحمہ اللہ کے ساتھ انصاف ملحوظ رکھا اور فن کی آبرو کو بٹا نہ لگنے دیا۔

درحقیقت تاریخ، حدیث یا تفسیر کی کسی بھی کتاب میں ضعیف بلکہ بعض موضوع روایات کا نقل ہو جانا الگ بات ہے اور خود واضع یا جعل ساز ہونا الگ چیز ہے۔ ضعیف روایات ترمذی، ابوداؤد جیسی کتبِ حدیث میں بھی ہیں۔ سننِ ابن ماجہ اور مسندِ احمد میں تو چند موضوع روایات بھی موجود ہیں۔ مگر اس سے کسی محدث کی شان میں ذرا بھی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اسی طرح تفسیرِ طبری یا تاریخِ طبری میں ایسی روایات سے امام طبری رحمہ اللہ پر کوئی حرف نہیں آتا۔ یہ فنی بات ہے جسے اہلِ علم یا اربابِ خرد سمجھ سکتے ہیں۔ جاہلوں کو سمجھانا کسی کے بس کی بات نہیں۔ قدیم علماء اس فرق کو سمجھتے تھے؛ اس لیے انہوں نے ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھا؛ اسی لیے ضعفاء یا موضوعات پر لکھی گئی درجنوں کتب میں سے کسی میں امام طبری رحمہ اللہ کو بطورِ ضعیف یا کذاب راوی کے متعارف نہیں کرایا گیا۔

---

① ان کی اس جرح پر بحث آگے آرہی ہے۔

② انبانا محمد بن ناصر قال انبانا عبدالرحمن بن منده قال انبانا محمد بن علی النقاش قال انبانا احمد بن محمد بن اسحاق السنی، قال حدثنا محمد بن جریر الطبری، قال حدثنا احمد بن عبدالرحمن بن وهب قال حدثنا عبد اللّٰه بن عبدالرحمن بن سعد الوقاصی قال حدثنا عثمان بن عبدالرحمن عن عمته عائشة بنت سعد عن ابيها قال سمعت رسول اللّٰه ﷺ يقول:" هل امرأة من نساء حامل؟فقال رجل اظن امراتی حامل. فقال : اذا رجعت منزلك فضع يدك على بطنها و سمها محمدا فان اللّٰه عزوجل يأتى به رجلا. "هذا حديث لا يصح،اما عثمان بن عبدالرحمن،فقال يحيیٰ ليس بشیء ،وقال مرة كان يكذب ،وضعفه ابن المدينی جدا ،وقال الدار قطنی: متروك.(الموضوعات لابن الجوزی:۱/۱۵۵)

انبانا عبدالرحمن بن محمد قال انبانا احمد بن علی بن ثابت قال اخبرنی احمد بن عمر بن علی القاضی قال انبانا احمد بن علی بن محمد الجهم قال حدثنا محمد بن جرير الطبری قال حدثنی عمر بن اسماعيل بن مجالد،قال حدثنا ابن فضيل عن ابن جريج عن عطاء عن ابی الدرداء رضی اللّٰه عنه عن النبی ﷺ قال :رأيت ليلة اسری بی فی العرش فريدة خضراء فيها مكتوب بنور ابيض لا اله الا اللّٰه محمد رسول اللّٰه ،ابوبكر الصديق ،عمر الفاروق.هذا حديث لا يصح، والمتهم به عمر بن اسماعيل ،قال يحيیٰ:ليس بشیء كذاب، دجال سوء خبيث ،وقال النسائی والدارقطنی :متروك الحديث.(الموضوعات لابن الجوزی:۱/۳۲۷)

اگر یہ اصحابِ جرح وتعدیل کی غلطی تھی جو صدیوں تک مسلسل ہوتی رہی تو پھر فنِ رجال محفوظ ہی کہاں رہا۔ تب تو ہر راوی میں یہ احتمال پیدا ہو جائے گا کہ شاید وہ حقیقت میں ضعیف، کذاب اور جلا بھنا تقیہ باز رافضی ہو مگر کتبِ رجال میں خواہ مخواہ اسے صدوق، ثقہ، حافظ، علامۃ اور حجت مانا جا رہا ہو۔

یہ ذہن رکھنے والا سنت کو محفوظ کیسے مان سکتا ہے؟ وہ تو یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ طبری کو امام، ثقہ، صادق اور فقیہ کہنے والے اصحابِ جرح وتعدیل، ان سے روایات لینے والے علماء، طبری جیسی روایات لانے والے محدثین، ان کی حقیقت فاش کرنے سے کتراتے والے ائمہ دین، یہ سبھی تقیہ باز رافضی تھے۔

خلاصہ کلام

امام طبری رحمہ اللہ کے ناقدین سے میرا ابنیادی سوال یہ ہے کہ مجروحین، کذابین، ضعفاء پر اصحابِ جرح وتعدیل نے جو درجنوں کتب لکھی ہیں ان میں سے کسی ایک میں امام طبری رحمہ اللہ کے بارے میں یہ لکھا ہوا دکھا دیں کہ وہ رافضی، کذاب یا وضاع تھے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ فنِ رجال کے ماہرین محمد بن جریر الطبری رحمہ اللہ کے نام ونسب اور کام سے واقف نہ ہوں، جن کی تفسیر وتاریخ کے بارے میں ان کے دشمن بھی مانتے ہیں کہ وہ بے حد مشہور ومعروف رہی اور ہر کوئی اس سے روایات لیتا رہا ہے۔ تو اگر وہ کذاب تھے تو اُمتِ مسلمہ میں رجال کی پرکھ کرنے والا کوئی تو ہوتا جو اس راز کو فاش کرتا۔ ضعفاء وکذابین کی نشاندہی کرانے والے اصحابِ فنِ رجال پورے اہتمام اور ذمہ داری کے ساتھ یہ بتا دیتے کہ یہ بندہ دجال ہے اور اس کی کتب سے کفر پھیل رہا ہے۔

چار بودے حوالے:

امام طبری رحمہ اللہ کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والے "محققینِ زمانہ" ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بھی ان پر "جرح" کے صرف "چار بودے حوالے" پیش کر سکے ہیں جن کی تفصیل گزر چکی ہے۔ خلاصے کے طور پر عرض ہے کہ:

ان چار میں سے تین حوالے اس لیے ساقط ہیں کہ ان میں یا تو جرح ہے ہی نہیں۔ یا کوئی ایسا ثبوت نہیں جو متعین کرے کہ: محمد بن جریر بن یزید طبری رحمہ اللہ مراد ہیں یا محمد بن جریر ابن رستم طبری یا کوئی اور؟

① پہلا حوالہ امام دار قطنی رحمہ اللہ کا ہے۔ انہوں نے درحقیقت کوئی جرح کی ہی نہیں۔ بس اتنا کہہ دیا کہ ان کے بارے میں متنوع اقوال ہیں۔ خود اپنی کوئی رائے سرے سے نہیں دی۔

② دوسرا حوالہ مفسر ابو حیان اندلسی رحمہ اللہ کا ہے۔ اگر وہ ابن جریر طبری (درحقیقت طوسی) کو "امام من ائمۃ الامامیہ" کہتے ہیں تو پھر اسی کتاب میں تین سو سے زائد مقامات پر ابن جریر طبری کو تفسیر میں گویا اپنا مرشد مان کر ان کے حوالے کیوں دیتے چلے گئے؟ یا تو وہ ہوش وحواس میں نہیں تھے یا ان کی مراد ابو جعفر طبری نہیں بلکہ ابو جعفر طوسی تھے۔

③ تیسرا حوالہ حافظ سلیمانی (احمد بن علی السلیمانی البیکندی البخاری......م ۴۰۴ھ) کا ہے جو "کان یضع

للروافض" کہہ کر امام طبری رحمہ اللہ پر جرح کر گئے۔

حافظ سلیمانی یقیناً بڑے محدث تھے۔ مگر ان کی تصنیف دستیاب نہیں کہ اسے دیکھ کر سمجھا جاسکے کہ ان کے اصل الفاظ کیا تھے؟ سیاق وسباق کیا تھا؟ کس ثبوت کے ساتھ انہوں نے جرح کی؟ وضعی روایات کی کون کون سی مثالیں پیش کیں؟ ان کی تین لفظی جرح کا ثبوت صرف حافظ ذہبی رحمہ اللہ کی نقل سے مل رہا ہے۔ ہماری تلاش کے مطابق ائمہ جرح وتعدیل میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ واحد شخص ہیں جنہوں نے حافظ سلیمانی کے کسی رسالے میں جرح کے یہ الفاظ دیکھے اور (ظاہر ہے مع سیاق وسباق کے دیکھے ہوں گے؛ اسی لیے) اس جرح کو بے وزن سمجھا اور پھر حافظ سلیمانی کی اس جرح کو مسترد کرنے کے لیے "میزان الاعتدال" میں نقل کر دیا اور فرمایا کہ یہ جرح بالکل غلط ہے۔

ہاں مگر حافظ سلیمانی سے حسنِ ظن باقی رکھنے کے لیے یہ امکان ظاہر کیا کہ یہاں مفسر ومؤرخ طبری مراد نہیں، ابن رستم طبری مراد ہوگا۔ اسی بات کو لسان المیزان میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے دہرایا۔ وہ بھی اس جرح کو غلط سمجھتے تھے مگر سلیمانی کو حسنِ ظن کی گنجائش دینے کے لیے کہا کہ یقیناً ان کی مراد محمد بن جریر بن رستم ہوگا۔ مگر چونکہ سلیمانی سے اپنے حسنِ ظن کی توثیق کرانا ممکن نہ تھا؛ اسی لیے "واللہ اعلم" کے الفاظ بڑھا دیے۔

لیکن بالفرض مان لیجئے کہ حافظ سلیمانی نے کہیں صاف صاف لکھا ہو کہ میری مراد بھی مؤرخ طبری ہیں تو کیا باقی اساطینِ اُمت کی تعدیلاتِ مفسَّرہ کے مقابلے میں اس فردِ واحد کی جرحِ مبہم کافی ہوگی؟ [1]

امام ابن خزیمہ، ابوحامد اسفرائینی، ابواسحٰق شیرازی، ابن یونس مصری، حافظ خلیلی، ابن صلاح، امام نووی اور حافظ ابن کثیر رحمہم اللہ جیسے اساطینِ اُمت امام طبری رحمہ اللہ کی تعدیل وتوثیق کرتے ہوئے انہیں فقہاء میں شمار کر رہے ہیں۔

امام ابوالقاسم طبرانی، امام ابن عدی، امام ابن سنی اور امام بیہقی رحمہم اللہ ان سے روایت لے رہے ہیں۔ مستدرک حاکم میں ان کی روایات کو حافظ ذہبی رحمہ اللہ کہیں "علٰی شرط مسلم" اور کہیں "علٰی شرط البخاری ومسلم" کہہ رہے ہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اپنی تالیفات میں ان کی حدیثی وتاریخی روایات جگہ جگہ نقل کرتے جا رہے ہیں۔ علمائے اُمت حدیث کی تصحیح و تضعیف میں ان کی رائے پر بھروسہ کر رہے ہیں۔ راویوں کے ثقہ یا ضعیف ہونے کا مدار ان کی رائے پر رکھ رہے ہیں۔ اگر اس کے باوجود کسی کی ثقاہت ثابت نہیں ہوتی تو آخر ثقاہت کا معیار کیا ہے؟

④ متعین طور پر محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ پر جرح صرف ایک عالم ابن جوزی رحمہ اللہ کی تاریخ "المنتظم" (جس کا کم و بیش نصف مواد ابن جریر طبری رحمہ اللہ کی روایات پر ہی مشتمل ہے) میں ملتی ہے۔ مگر غور فرمایئے کہ یہ جرح کیا ہے؟

---

① حافظ ذہبی کے بقول حافظ سلیمانی اتنے بڑے عالم تھے کہ ہر ہفتے ایک نیا رسالہ تالیف کرتے اور بیکند سے بخارا جا کر اسے سناتے۔ مگر حافظ ذہبی یہ بھی بتاتے ہیں کہ حافظ سلیمانی اپنے علم اور مقام کے باوجود جرح میں متشدد اور اکابر پر جری تھے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے: "رأیت للسلیمانی کتابا فیه حط علٰی کبار، فلا یسمع منه ما شذ فیه." میں نے سلیمانی کی ایک کتاب دیکھی ہے جس میں اکابر کی تنقیص ہے۔ اس میں جو شاذ باتیں ہیں وہ نہ سنی جائیں۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۷/۲۰۲، الرسالة) حافظ سلیمانی کی تالیفات میں سے کسی کو مقبولیت نہیں ملی۔ رفتہ رفتہ سبھی ضائع ہوگئیں۔ آج ان میں سے کوئی ایک رسالہ بھی تلاش کے باوجود نہیں مل رہا۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ اکابر کے ادب واحترام کو علوم میں برکت اور دینی خدمات کی مقبولیت میں خاص دخل ہے۔

ابن الجوزی رحمہ اللہ نے صیغۂ مجہول کے ساتھ " نُسبَ الی الرفض" کہا ہے۔ خود کوئی حکم نہیں لگایا۔ نہ کسی کا حوالہ دیا کہ آخر یہ رفض کا حکم کس نے لگایا ہے؟ بعد میں اس معاملے کی تحقیق کرنے والے علماء مثلاً حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے واضح کر دیا کہ یہ تہمت فقط ایک عالم ابوبکر بن ابی داؤد کی تھی جو محض حسد اور عناد پر مبنی تھی۔ ①

مزید برآں جب ابن جوزی رحمہ اللہ نے خود تین جلدوں میں "الضعفاء والمتروکون" لکھی اور اس میں چار ہزار سے زائد ضعیف، کذاب اور مجہول راویوں کے حالات قلم بند کیے تو بھی اس فہرست میں ابن جریر طبری رحمہ اللہ کا نام شامل نہیں کیا۔ کیا وہ بھول گئے تھے یا ان پر کوئی دباؤ تھا؟ یا وہ بھی رافضیوں کے پشت پناہ تھے؟

اگر مان لیا جائے کہ یہ سارے علماء امام طبری رحمہ اللہ کی اصلیت پر پردہ ڈالتے آئے تھے تو علمِ رجال مشکوک اور ذخیرۂ حدیث ناقابلِ اعتبار ہو جائے گا۔ پھر آدمی لازماً انکارِ حدیث کی طرف جائے گا اور شرعی احکام کا دارومدار فقط نصِ قرآنی اور لغت دانی پر رکھنے کی دعوت دے گا۔ وہ دعویٰ کرے گا کہ ذخیرۂ تاریخ نرا جھوٹ اور ذخیرۂ حدیث تمام کا تمام مشکوک ہے۔ وہ کسی حدیث کے بارے میں ائمہ حدیث کے صحیح، حسن یا ضعیف کہنے پر کان دھرنے کو کارِ عبث کہے گا۔ وہ راویوں کے بارے میں اصحابِ جرح وتعدیل کی آراء کو بھی غیر تحقیقی تصور کرے گا۔

اس طرح ہر ایرے غیرے کو چھٹی مل جائے گی کہ وہ اپنے فہمِ ناقص اور رتی بھر علم پر اتراتا ہوا، کسی بھی حدیث کو مسترد کر دے اور اعتقادی امور اور حلال وحرام کے مسائل تک میں علمائے اُمت کی اجماعی آراء کو فضول قرار دے دے۔ بظاہر وہ محقق بنا ہوگا مگر درحقیقت ضال اور مضل ہوگا۔ وہ ہر صحیح یا غلط کا مدار اپنے ذوق اور وجدان یعنی ہوائے نفس پر رکھے گا اور کچھ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا کر ایک نیا فرقہ پیدا کر دے گا۔

اس سطح پر پہنچ جانے والوں کے پلے حدیث، سیرت اور تاریخ صحابہ میں سے کچھ بھی نہیں رہے گا۔ خلفائے راشدین کے فضائل ومناقب بلکہ ان کے نام ونسب تک ان کے نزدیک مشکوک ہو سکتے ہیں؛ کیوں کہ نصِ قرآنی میں "زید" کے سوا کسی صحابی کا نام مذکور نہیں۔ جب صحابہ کی شخصیات ہی مشکوک بن جائیں گی تو ان کا دفاع کس بنیاد پر کیا جائے گا؟

تطہیرِ دین اور دفاعِ صحابہ کے نام پر ان جانے میں دین کو مٹا دینے کی راہ پر نکل جانے والوں سے کیا بروزِ حشر صحابہ کرام خوش ہوں گے؟ جن کی ساری زندگیاں اس دین کی حفاظت کے لیے قربانیاں دیتے ہوئے گزر گئیں!!

یہ ہے گمراہی کی وہ گہری کھائی جس سے ہم قارئین کو بچانا چاہتے ہیں۔ اسی کے لیے یہ ساری دردسری کی گئی ہے۔ اس کے سوا کوئی مقصد نہیں۔ امام طبری رحمہ اللہ ہمارے ایمان کا حصہ نہیں کہ ہم محض ان کی ذات وشخصیت کو بچانے کے لیے اتنی سنجیدگی دکھائیں۔ وہ بہت سے عظیم علماء کی طرح ایک بڑے عالم تھے۔ اپنی علمی خدمات کی وجہ سے وہ اسی طرح قابلِ احترام ہیں جیسا کہ دوسرے اسلاف۔

مسئلہ صرف ایک بڑے عالم کی ذات کا ہوتا تو ہم اس بحث کو اتنی اہمیت نہ دیتے مگر ہو یہ رہا ہے کہ بہت سے لوگوں کا

① والما تقلدوا ذالك عن ابي بكر محمد بن داؤد حيث كان يتكلم فيه ويرميه بالعظائم، ويرميه بالرفض. (البداية والنهاية: ۸٤۹/۱٤)

پہلا قدم امام طبری رحمہ اللہ کی تنقیص، دوسرا سیرت و تاریخ سے بداعتمادی، تیسرا فنِ رجال میں تشکیک اور چوتھا ذخیرۂ حدیث کے انکار تک جارہا ہے۔ حالاں کہ یہ سنت ہمارے دین کی بنیاد ہے۔ اس کی حفاظت جس کام پر موقوف ہوگی، ہم اسے اپنی دینی ذمہ داری سمجھ کر انجام دیتے رہیں گے۔ ان شاء اللہ۔

متفرق سوالات

کیا اُموی دور کی تاریخ من گھڑت اور ان کے مخالف عباسی خلفاء کی نگرانی میں لکھوائی ہوئی ہے؟

﴿سوال﴾ آج کل ایک طبقہ بنوامیہ کی پوری تاریخ کو جو تاریخ کے متداول مآخذ میں موجود ہے، مشکوک بلکہ من گھڑت قرار دیتا ہے۔ اس طبقے کا کہنا ہے کہ تاریخ کے تمام مآخذ بنوعباس کے دور میں مرتب ہوئے ہیں جو بنوامیہ کے دشمن تھے۔ نیز ان کتب کے مؤلفین شیعہ اور روافض تھے۔ بنوامیہ کے دور میں تاریخ پر کوئی کام نہیں ہوا۔ بعد والوں نے جو چاہا، ان کی طرف منسوب کر دیا؛ اس لیے ان کی زبانی کسی اموی خلیفہ کی طرف منسوب کوئی غلطی قابلِ تسلیم نہیں۔ یہ بات کس حد تک درست ہے؟

﴿جواب﴾ آپ نے بہت اہم سوال اٹھایا ہے۔ ایک دور تک راقم خود اس دعوے سے ایک حد تک متاثر رہا اور یہ خیال کرتا رہا کہ اس دعوے میں بڑی حد تک صداقت ہوگی مگر جب رجال کی تحقیق کے ساتھ روایات کی چھان بین کا موقع ملا تو رفتہ رفتہ اس دعوے کی حقیقت کھل گئی اور معلوم ہوا کہ یہ دعویٰ مبالغہ آرائی پر مبنی ہے۔ تحقیقی بات یہ ہے کہ بنوامیہ کے دور کی تاریخ بعد کی تواریخ کی بہ نسبت نسبتاً زیادہ محفوظ حالت میں ہے۔ اس کی وجوہ درجِ ذیل ہیں:

- یہ دور عمومی امانت و دیانت کے لحاظ سے بعد سے بہتر تھا۔ عموماً لوگ احتیاط کے ساتھ باتیں نقل کرتے تھے۔
- سلسلۂ روایت مختصر تھا، اسناد محفوظ تھیں۔
- راویوں میں صحابہ کرام بھی تھے جبکہ بہت بڑی تعداد تابعین اور تبع تابعین پر مشتمل تھی۔
- اس دور کی تاریخ کے متعدد واقعات کتبِ حدیث میں نبوی پیش گوئیوں اور آثارِ صحابہ کے طور پر موجود ہیں۔
- اس دور کے حالات کے بارے میں ائمہ مجتہدین کے اقوال و احوال بھی محفوظ ہیں۔
- امام بخاری، امام مسلم، امام خلیفہ بن خیاط، امام یحییٰ بن مَعین اور امام ابن حبان رحمہم اللہ جیسے ناقد محدثین نے رجال پر جو کام کیا ہے، اس کے ذیل میں بھی اُموی دور کے بہت سے لوگوں کے صحیح حالات محفوظ ہوگئے ہیں۔
- اُموی دور کے اہم حوادث، کارناموں اور سانحات کے متعلق محدثین، متکلمین اور فقہاء کی تحریرات کا تاثر بھی، اکثر مقامات پر مؤرخین کے بیانات سے مختلف نہیں؛ اس لیے ہم اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ سیرتِ نبویہ اور سیرت

خلفائے راشدین کی طرح بنوامیہ کی تاریخ ہمارے پاس بعد کے حالات کی بہ نسبت زیادہ محفوظ شکل میں پہنچی ہے۔

یہ درست ہے کہ بعض مؤرخین یا راوی شیعہ، ناصبی، قدری یا دیگر فرقوں کے تھے، یہ بھی صحیح ہے کہ تاریخ میں جعل سازی ہوئی ہے اور تاریخی روایات کے ذخیرے میں صحیح، ضعیف، موضوع، ہر قسم کا مواد موجود ہے، مگر اس کے باوجود تاریخ چاہے بنوامیہ کی ہو یا بنوعباس کی، اس میں رخنہ اندازی جزوی طور پر ہوئی ہے۔ اموی تاریخ کے علی الاطلاق من گھڑت ہونے کا دعویٰ سراسر تعصب کا کرشمہ ہے۔ یہ بات سرے سے غلط ہے کہ ''تاریخ کی تدوین میں اموی خلفاء کا کوئی حصہ نہیں اور تاریخ پر کام عباسی خلفاء کے دور میں شروع ہوا۔''

یہ دعویٰ منکرینِ حدیث کے اس زعمِ باطل جیسا ہے کہ ''حدیث کی تدوین عباسی خلفاء کے دور میں جا کر ہوئی اور پورا ذخیرۂ حدیث تیسری صدی ہجری کی پیداوار ہے؛ لہٰذا اسے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنا غلط ہے۔''

منکرینِ حدیث اور منکرینِ تاریخ میں فکری اور نظریاتی لحاظ سے کوئی زیادہ فاصلہ نہیں بلکہ تجربہ اور مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ انکارِ تاریخ کے رجحانات کا دوسرا قدم انکارِ حدیث کی حدود میں جا پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح حدیث کی حفاظت کا سلسلہ پہلی صدی ہجری میں ہی شروع ہو چکا تھا، اسی طرح اسلامی تاریخ یعنی انبیائے سابقین، قدیم سلطنتوں، ایام جاہلیت کے احوال، سیرتِ نبویہ اور سیرتِ خلفائے راشدین پر مشتمل روایات کی حفاظت واشاعت کا کام بھی اسی وقت سے ہونے لگا تھا۔ بنوامیہ کے جو جو خلفاء گزرتے گئے، ان کے حالات اور ایام کے واقعات بھی تابعین اور تبع تابعین بڑی امانت ودیانت سے نقل کرتے رہے۔ خود اموی خلفاء تاریخ کو محفوظ رکھنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاں روزانہ تاریخی روایات سننے سنانے کی ایک نشست ہوتی تھی۔[1] عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے جہاں حدیث کو محفوظ رکھنے کا کام ایک مہم کے طور پر شروع کرایا، وہاں اسلامی تاریخ، سیرت اور شخصیات کے احوال کی حفاظت کے لیے بھی رجالِ کار مقرر کیے۔[2]

یہی روایات تھیں جو آگے چل کر عباسی دور میں طبقات ابن سعد، فتوح البلدان، انساب الاشراف، تاریخ خلیفہ، تاریخِ ابن ابی خیثمہ، تاریخِ طبری اور امام بخاری رحمہ اللہ کی التاریخ الکبیر اور التاریخ الاوسط جیسی مایہ ناز کتب کی زینت بنیں۔ ایسا نہ تھا کہ دو صدیوں تک تاریخ کہیں محفوظ نہ تھی اور عباسی دور میں یکا یک کچھ مؤلفین نے اٹھ کر اپنے طور پر کچھ افسانے گزشتہ لوگوں کی طرف منسوب کر دیے اور اپنے دشمن اموی خلفاء کی جی بھر کے کردار کشی کی۔

اگر ایسا ہوتا تو پھر ان مؤلفین کو اموی خلفاء کی فقط کردار کشی کرنا چاہیے تھی۔ ان کی نقل کردہ روایات میں اموی خلفاء کے فضائل، خصائل، اور خوبیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے تھی۔ بنوامیہ میں یزید سے بڑھ کر بدنام حکمران کون ہو سکتا ہے، مگر مؤرخین نے اس کی بعض خوبیوں مثلاً فصاحت وبلاغت، سخاوت اور شعر گوئی وغیرہ کی روایات بھی محفوظ

---

① معاوية بن ابی سفيان للصلابی، ص ۲٤٥، بحواله الشعب اللامعة، ص ۳۱۰

② مختصر تاريخ دمشق: ۱۱/۲٤۰، تر: عاصم بن عمر بن قتادة

رکھیں۔ نیز اس کے دور میں ہونے والی فتوحات اور ترقیاتی کاموں کو بھی پورے انصاف سے نقل کر دیا۔ یہ دیانت کی انتہاء تھی ورنہ یزید جیسی بدنام شخصیت کے بارے میں ذاتی رجحانات کا تقاضا یہی ہونا چاہیے تھا کہ اس کی کسی خوبی کا ذکر نہ ہوتا اور اس کے دور کی مہمات اور تعمیر و ترقی کے کاموں کو بالکل حذف کر دیا جاتا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو بعد والوں کو بھلا کیا خبر ہوتی کہ تاریخی مواد میں کوئی قطع و برید ہو چکی ہے! پھر یہ بھی دیکھیے کہ اسی یزید کے بیٹے معاویہ کو تمام مؤرخین نے تعریفی الفاظ سے یاد کیا ہے۔ اس کی خوبیاں ہی خوبیاں بیان کی ہیں۔ حالانکہ اگر اس کی کوئی خوبی ذکر نہ کی جاتی تو بھی تاریخی واقعات کی رفتار میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا؛ کیوں کہ اسے حکومت کے لیے فقط چالیس دن نصیب ہوئے تھے۔

یہی راوی اور مؤرخین نقل کرتے ہیں کہ یزید کا دوسرا بیٹا خالد اسلامی دور کا پہلا کیمیادان تھا۔ حالانکہ یزید کی برائی کا تاثر پختہ کرنے کے لیے کوئی مشکل نہ تھا کہ اس کی اولاد کو بھی بدترین مشہور کیا جاتا۔

یہ بھی دیکھیے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بھی اموی تھے مگر مؤرخین ان کی فقط خوبیاں بیان کرتے ہیں۔ اگر واقعی مؤرخین ایسے کذاب اور بنوامیہ کے بارے میں ایسے متعصب ہوتے، جیسا باور کرایا جا رہا ہے تو حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے کردار پر بھی کچھ دھبے لگا دینا کوئی مشکل نہ تھا۔ درحقیقت اگر اس دور کے راوی امویوں کے بارے میں ایسی متعصبانہ روش اختیار کرتے تو کسی اموی خلیفہ کی کوئی خوبی ہم تک نہ پہنچنے پاتی۔

اس بحث کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ انہی مآخذ میں خود عباسیوں کے خلاف بھی بہت سی منفی روایات موجود ہیں۔ اگر بالفرض یہ تواریخ عباسی خلفاء کی نگرانی میں تیار ہوتیں یا ان کی دی ہوئی پالیسی کے عین مطابق لکھی جاتیں تو ان میں عباسیوں کی فقط خوبیاں اور کارنامے نقل کیے جاتے۔ ان کے مظالم اور برائیاں نہ ہوتیں۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ اُموی حکام کے مظالم اور خرابیوں کی روایات ذخیرۂ حدیث میں بھی جا بجا موجود ہیں۔ کیا اسے بھی جعل سازی تصور کیا جائے گا اور مؤرخین کی طرح محدثین کو بھی ''عباسی دربار'' کے زرخرید ملازم تصور کیا جائے گا؟

انصاف کی بات یہ ہے کہ (کچھ جانے پہچانے جعل ساز راویوں کو مستثنیٰ کر کے) قرنِ اول وثانی کے راویوں نے عمومی طور پر دیانت اور انصاف سے کام لیا۔ جو باتیں انہیں جیسے پہنچیں، سلسلۂ سند کے ساتھ اسے آگے نقل کر دیا۔ اس ذخیرۂ روایات میں ضعیف، منکر، موضوع اور قابلِ ترک روایات ضرور ہیں مگر اصولِ روایت ودرایت کے تحت کسی روایت کے مقبول یا متروک ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اسماء الرجال کی مدد سے راویوں اور سند کی حیثیت جانی جا سکتی ہے۔ علی الاطلاق اموی دور کی تاریخ کو ناقابلِ اعتماد سمجھ لینا ہے، نری جہالت ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی حدیث کے مجموعوں میں ضعیف یا موضوع روایات دیکھ کر تمام ذخیرۂ حدیث سے دست بردار ہونے کی دعوت دینے لگے۔ پس تاریخی مصادر کا بیشتر مواد قابل قبول ہے۔ ہاں بعض خلفاء کے حالات کے بارے میں بعض باتیں مبالغہ آمیز ہیں۔ آنکھیں بند کر کے سب روایات کو ایک ہی حیثیت دینا تعصب ہے۔ معیاری طریقہ سند کی تحقیق کرنا ہے۔ سند پختہ ہو تو روایت قابلِ قبول ہوگی۔ کمزور ہو تو روایت محلِ نظر ہوگی۔ قرائن کو دیکھ کر اس کی تائید یا تردید کی جائے گی۔

اس وقت جہاں ایک طبقے نے تعصب کی بناء پر بنوامیہ کو ''کافر و منافق'' مشہور کر رکھا ہے، وہاں دوسرے طبقے نے انہیں اعتقاداً نہ سہی، عملاً ''معصومین'' کا درجہ دے دیا ہے؛ اس لیے وہ بنوامیہ کے کسی فرد کے کسی عیب پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یزید، مروان اور حجاج بن یوسف کے بارے میں کوئی بھی منفی بات قبول کر لینا انہیں اپنے ایمان کے خلاف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ ہمارا ایمان فقط انبیائے کرام کے بارے میں یہ ہے کہ وہ معصوم ہیں۔ اموی حکمران، فرشتے تھے نہ پیغمبر۔ عام انسان تھے۔ ان میں خوبیاں بھی تھیں اور عیوب بھی۔ خوبیاں زیادہ اور عیوب کم۔ ان میں اچھے لوگ بھی تھے اور برے بھی۔ اچھے زیادہ، برے کم۔

◆◆◆

کیا عباسی دور کی تاریخ میں ان کے معائب شیعہ راویوں نے داخل کیے؟

﴿سوال﴾ بعض حضرات کہتے ہیں کہ عباسی خلفاء کے متعلق مظالم اور بدعقیدگی وغیرہ کی جو روایات ہیں، وہ سب شیعہ راویوں اور بدعقیدہ مؤرخین کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ عباسیوں کا علویوں سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ نہ علویوں نے ان کے خلاف خروج کیے اور نہ ہی عباسیوں نے ان پر کوئی ظلم کیا۔ نہ ہی عباسیوں نے امام مالک، امام ابوحنیفہ یا امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ پر کوئی زیادتی کی۔ چونکہ عباسی خلفاء اہلِ سنت تھے؛ اس لیے انہیں مؤرخین نے جو تقریباً سبھی (کھلم کھلا یا چھپے ہوئے) رافضی تھے، اپنے پروپیگنڈے کا نشانہ بنالیا گیا۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

﴿جواب﴾ یہ بیانات علی الاطلاق درست نہیں۔ عباسی دور کی بعض کتب روایات شیعوں کی مرتب کردہ تھیں مثلاً تاریخ مسعودی، تاریخ یعقوبی، مقاتل الطالبین، الاغانی وغیرہ۔ مگر مشہور مآخذ مثلاً فتوح البلدان، انساب الاشراف اور تاریخِ طبری جید علمائے اہلِ سنت کے مرتب کردہ تھے۔ اسی طرح ائمہ اربعہ کی سیرت پر تو خود جید فقہاء نے کام کیا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی شیعہ نہیں تھا۔ رہی بات کسی کے چھپے ہوئے رافضی ہونے کی تو اگر آخرت میں جواب دہی کا خوف نہ ہو تو کسی پر بھی کفر و نفاق کا الزام لگا دینا چنداں مشکل نہیں۔ کوئی بدبخت مؤلفینِ صحاحِ ستہ اور ائمہ اربعہ کے متعلق بھی یہی ہذیان گوئی کر سکتا ہے۔ یہی بات کسی بھی عالم کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔

عباسی خلفاء کے متعلق منفی روایات سراسر جھوٹ ہیں، یا ان میں غالب حصہ درست ہے؟ اس کا پتا لگانے کے لیے اتنا دیکھ لینا کافی ہے کہ اگر یہ سب حالات افسانے ہوتے تو کیسے ممکن تھا کہ عباسی خلفاء ایسی کتب پر پابندی نہ لگاتے! کتنے ہی ملحدین اور زندیقوں کو انہوں نے قتل کرایا۔ اپنے خلاف جھوٹ پھیلانے والوں کو وہ کیسے آزادی دیتے!

یہ کتب خود عباسی خلفاء کے دور میں مرتب ہوئی تھیں، انہی میں ان کی تحریک، بنوامیہ کے خلاف بنوعباس کے خروج اور کامیابی کے بعد مفتوحین پر مظالم کا ذکر بھی ہے۔ کچھ بیانات میں مبالغے کا عنصر ہو سکتا ہے، بعض روایات کو کسی دوسری مستند روایت سے تعارض کی بناء پر ترک کیا جاسکتا ہے، اسی طرح کسی روایت کی سند میں کوئی راوی کذاب ثابت ہو جائے تو آج بھی احتیاط کا تقاضا ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے مگر جو روایات اس قسم کے سقم سے خالی ہوں انہیں بھی

بیک جنبشِ قلم مسترد کر دینا بلا جواز ہے۔ دراصل بعض حضرات اپنی تاریخ کو اپنی مرضی کے مطابق ہر جگہ خوبصورت اور قابلِ رشک دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک غلط سوچ ہے؛ کیوں کہ پھر تو ہمیں غزوۂ احد میں شکست، غزوۂ حنین کی ابتداء میں پسپائی، حادثۂ کربلا، عبدالرحمٰن الغافقی کی فرانس میں شکست اور محمد بن قاسم کی الم ناک موت سمیت ہر اس واقعے کا انکار کر دینا چاہیے جس میں ہمارے لیے فخر کا کوئی موقع نہ ہو۔ بلکہ دورِ حاضر کے بھی ان تمام تلخ حقائق کا انکار کر دینا چاہیے جو ہمارے سامنے پیش آئے ہیں۔ تاکہ کل کوئی ایسی تاریخ مرتب نہ کر سکے جو ہمارے لیے باعثِ عار ہو۔

مگر ایسی تاریخ سے کیا حاصل ہوگا۔ کیا صرف ماضی پر فخر کرنا ہی کسی قوم کی سربلندی کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔ کیا اپنی غلطیوں سے کچھ سیکھنا اہمیت نہیں رکھتا۔ عبرت آخر کس چیز کا نام ہے؟ غلطیوں کا اعتراف ہی نہ ہو تو پھر ان کے تدارک کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔؟ تعصب بہت بری چیز ہے جو دیانت کو ضائع اور علم کو مکدر کر دیتی ہے۔ بنوامیہ ہو یا بنوعباس، یا کوئی تیسرا خاندان...... کسی کی حمایت میں بھی تعصب برا ہے اور مخالفت میں بھی۔

◆◆◆

بنوعباس کے دور میں علاقائی حکومتوں کے قیام کو کیوں قبول کیا گیا؟

﴿سوال﴾ بنوعباس کے دور میں خلافت نے اپنی تقسیم کو کیوں قبول کیا؟ چھوٹی چھوٹی مملکتیں کیوں قائم ہو گئیں؟

﴿جواب﴾ پہلے ہمیں چار بنیادی چیزوں کو اچھی طرح سمجھنا اور ان کا باہمی فرق ذہن نشین کر لینا چاہیے:

❶ ماہیتِ خلافت ❷ مقاصدِ خلافت ❸ خلافت کے اجزائے ترکیبی ❹ خلافت کے انتظامی معاملات

❶ خلافت کی اصل و ماہیت کے بارے میں علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں:

"خلافت کا مطلب ہے شرعی نقطۂ نگاہ سے لوگوں کی دنیوی و اخروی ضروریات کی ذمہ داری اٹھانا۔"[1]

پھر اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں: "خلافت دین و دنیا کی حفاظت کے حوالے سے پیغمبر کی نیابت ہے۔"[2]

خلافت کی اصل و ماہیت میں کبھی ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔ اس کا وجود فرضِ کفایہ ہے۔

❷ مقاصدِ خلافت وہی چیزیں ہیں جو شرعاً مطلوب ہیں یعنی اسلام سربلند ہو، مسلمان متحد ہوں، جہاد جاری ہو، اسلامی نظام نافذ ہو، دینی شعائر قائم ہوں، سرحدیں محفوظ اور لوگ مامون ہوں، مسلمانوں میں خوں ریزی نہ ہو۔ کسی کی حق تلفی نہ ہو، مسلمان تو کیا کسی ذمی پر بھی زیادتی کا ارتکاب نہ ہو رہا ہو۔ بابِ سیاست میں شریعت کے اہداف یہی ہیں۔ خلافت چونکہ ان کا ذریعہ ہے؛ لہٰذا اس کی حفاظت یا اس کا احیاء بھی مطلوب ہے۔

مگر لازم ہے کہ کسی بھی مرحلے پر اصل مقاصدِ شرعیہ فوت نہ ہوں۔ یعنی خلافت اور مقاصدِ شرعیہ میں تعارض و تصادم نہ ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ خلافت کی ماہیت کا مقاصدِ شرعیہ سے کبھی ٹکراؤ نہیں ہو سکتا۔

① "والخلافة هي حمل الكافة على مقتضى النظر الشرعي في مصالحهم الاخروية والدنيوية الراجعة اليها." (مقدمه ابن خلدون، ص ۲۳۹)

② "فهي في الحقيقة خلافة عن صاحب الشرع في حراسة الدين وسياسة الدنيا به." (مقدمه ابن خلدون، ص ۲۳۹)

③ خلافت کے اجزائے ترکیبی خلیفہ کا ایک ہونا، شورائیت، ذہنی ہم آہنگی (استیناس)، عدل وانصاف، جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، خدا خوفی، اخلاص، اطاعتِ امیر جیسے امور ہیں۔ یہ بھی ہمیشہ مطلوب رہیں گے۔ ان کا ذکر قرآن وسنت کی نصوص میں موجود ہے اور ان سے سیاسی نظام کو جو تقویت ملتی ہے وہ ظاہر ہے۔ مثلاً خلیفہ کے ایک ہونے کی شرط اس لیے ہے تاکہ مسلمان متحد رہیں۔ اطاعتِ امیر اس لیے لازم ہے کہ نظم وضبط قائم رہے۔

④ خلافت کے انتظامی امور سے مراد انتقالِ اقتدار، ولایتِ عہد، اختیارات کی تقسیم وغیرہ ہیں۔ ان معاملات میں بڑی گنجائش دی گئی ہے۔ مثلاً انتقالِ اقتدار کے بارے میں حضور ﷺ نے کوئی قطعی طریقہ مقرر نہیں کیا بلکہ اس کے بارے میں لچک چھوڑ گئے جس سے صحابہ کرام نے فائدہ اٹھایا اور خلافت کے انعقاد کی کئی صورتیں سامنے آگئیں۔

اسی طرح دار الخلافہ کہاں ہو؟ صوبے کون کون سے ہوں؟ سرکاری وردی کیسی ہو؟ ملک کا پرچم کونسا ہو؟...... یہ سب بھی انتظامی امور سے متعلقہ چیزیں ہیں۔ ممکن ہے ان میں ردوبدل سے کبھی خلافت کو کوئی سیاسی نقصان اٹھانا پڑ جائے یا حالات کے دباؤ کے تحت ان میں ردوبدل کرنا پڑے مگر اس سے خود خلافت کے ادارے کی حیثیت میں فرق نہیں پڑ سکتا۔

ان بنیادی امور اور ان کے فرق کو جان لینے کے بعد یہ سمجھیے کہ بلاشک وشبہ تمام مسلمانوں کا سیاسی طور پر ایک پرچم تلے آجانا، درمیان کی سرحدوں کا مٹ جانا اور فوجیں صرف عالمِ کفر کی سرحدوں پر تعینات ہونا خلافتِ اسلامیہ کی ایک مثالی شکل ہے مگر قدیم دور کے علماء اچھی طرح جانتے تھے کہ سرحدوں کی وسعت سے کہیں زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ مقاصدِ خلافت برقرار رہیں۔ یعنی شعائرِ دین سربلند، مسلمان متحد، لوگ مامون، سرحدیں محفوظ اور اسلامی اقتدار قائم ہوں۔ خلافت کا براہِ راست تمام مسلم ممالک کو اپنی عسکری طاقت کے تحت چلانے یا بعض ممالک کو باج گزار ریاستوں کے طور پر قبول کر کے انہیں خود مختاری دینا یہ ایک انتظامی معاملہ تھا۔ یہ اس دور کی مروجہ سیاست کا ایک حصہ تھا جس پر اسلام نے قدغن نہیں لگائی۔ قیصر وکسریٰ کے ماتحت کئی علاقے باج گزار ریاستوں کے طور پر تھے جہاں حاکم خود مختار تھا اور صرف سالانہ خراج ادا کرتا تھا۔ حضور ﷺ نے غزوۂ تبوک میں شام کے سرحدی نصرانی حکام کو اسی طرح باج گزار بنایا تھا اور وہاں عسکری طور پر قبضہ نہیں کیا تھا۔①

مسلمان حکام کے لیے یہ گنجائش بدرجہ اولیٰ نکل سکتی تھی کہ انہیں بعض شرائط کے ساتھ آزادانہ حکومت برقرار رکھنے یا قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس سے اگر خلافت کا عسکری دباؤ کچھ کم ہو جاتا تو یہ کوئی ناقابلِ قبول بات نہیں تھی۔ حدود اربعہ کا تعلق خلافت کے ڈھانچے سے ہے۔ رقبہ گھٹنا یا بڑھنا ہر دور کے سیاسی حالات، مسلمانوں کے اتحاد یا افتراق، ان کے سیاسی شعور میں ترقی یا تنزلی، مرکزی قائد کی کارکردگی، اس پر اعتماد یا عدمِ اعتماد، امراء کی تائید یا مخالفت اور ماتحت عہدے داروں کی اطاعت یا سرکشی پر منحصر ہے۔ ان چیزوں پر ہمیشہ حکومت کا بس نہیں چلا کرتا۔

اگر بنوعباس کے دور میں خلافت کا رقبہ کم ہوا اور مسلم ممالک میں کئی حکومتیں بنیں تو یہ اس دور کے زمینی حقائق کا ایک

① سیرت ابن حبان: ۳۶۹/۱؛ تاریخ الطبری: ۱۴۴/۳

لازمی اثر تھا۔ اس سے خلافت کے ادارے کی ساکھ ضرور کم ہوئی مگر اس کا وجود معطل نہیں ہوا۔ از روئے شرع یہ اب بھی خلافت ہی تھی اور عالم اسلام کے اکثر حصے میں مسلمانوں کے ہاں یہی خلافت مقبول تھی۔ عباسی خلفاء کی موجودگی میں اہلِ سنت کے علماء، سلاطین اور عوام نے خلافت کے کسی دوسرے دعوے دار کو قبول نہیں کیا۔ خلافت کے باج گزار مسلم ممالک ہوں یا خلیفہ کے معاون سلاطین، سبھی دولتِ عباسیہ کو خلافت مانتے تھے۔ اس طرح مسلمانوں کا اتحاد و اتفاق بڑی حد تک قائم تھا اور خلافت کے بہت سے مقاصد اور مصالح بھی باقی تھے۔

ہارون الرشید اور بعد کے خلفاء نے اگر بعض نائبین کو خود مختار بننے دیا تو درحقیقت انہوں نے ایک سیاسی تدبیر اختیار کر کے فقط خلافت کے ڈھانچے میں تبدیلی کو قبول کیا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اس کا نتیجہ مسلسل خانہ جنگی کی شکل میں نکلتا۔ اگرچہ خلیفہ کو شرعاً باغیوں سے جنگ کی اجازت ہے مگر یہ درمیانی شکل جو بنو عباس نے اختیار کی، جنگ و جدل کی تباہ کاریوں سے بہتر تھی۔ درحقیقت یہ ان خلفاء کی دور اندیشی تھی کہ انہوں نے سیاستِ دوراں کے تقاضوں کو سمجھنے کے ساتھ اگلے دور کے حالات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگالیا اور شرعی حدود کے اندر ملنے والی ایک گنجائش پر عمل کر کے اُمت کو علاقائی حکومتوں کی آزادی دے دی۔ بظاہر اس طرح مسلمان کچھ ٹکڑوں میں بٹے دکھائی دینے لگے مگر ایسا نہ ہوتا تو صورتحال اس سے بھی بدتر ہوسکتی تھی؛ کیوں کہ کسی بھی علاقے کی حکومت مقامی لوگوں کی ذہنی آمادگی کے بغیر پھلتی پھولتی نہیں۔ جب ہم آہنگی نہ رہے تو مار باندھ کر کسی پر حکومت کرنا کہیں زیادہ فتنوں کو جنم دے سکتا ہے۔

◆◆◆

علاقائی حکومتیں اور فقہائے کرام کا کردار:

﴿سوال﴾ علاقائی حکومتوں کے قیام کے دوران ہمارے فقہاء اور بزرگانِ دین کا کردار اور موقف کیا رہا؟ کیا اسلام میں الگ الگ حکومتوں کا قیام جائز ہے؟ اگر ہاں تو اس کی دلیل کیا ہے؟ اگر نہیں تو ائمہ مجتہدین، علماء و فقہاء اور اس دور کے بزرگانِ دین کی طرف سے اتنی بڑی تبدیلی پر کوئی احتجاج سامنے آیا؟ اگر نہیں تو آخر کیوں؟

﴿جواب﴾ اس سوال کے جواب میں ہم فقط تاریخی لحاظ سے علماء کے کردار کا جائزہ لے رہے ہیں۔[1] ہمارے مطالعے کے مطابق اس دور کے جلیل القدر علماء نے علاقائی حکومتوں کے وجود کو کبھی خلافِ شرع نہیں کہا بلکہ انہیں ناگزیر حالات کے نتیجے کے طور پر قبول کیا۔ ان علاقائی حکومتوں کی تین صورتیں تھیں:

① ایک وہ جن کا خلافت سے رسمی عقدِ وفاداری تھا جیسے دولتِ اغالبہ تیونس، دولتِ طاہریہ خراسان، دولتِ سامانیہ ماوراء النہر اور سلجوقی سلطنت۔[2]

---

① فقہی بحث کے لیے کتب فقہ کا مطالعہ کیا جائے۔

② چوتھی صدی ہجری تک ایسی حکومتیں امارات کہلاتی تھیں اور ان کے حکمران امیر۔ پانچویں صدی ہجری میں جب ایسی حکومتیں زیادہ طاقتور ہوگئیں تو انہیں سلطنتیں کہا جانے لگا اور ان کے حکمران سلطان یا مَلِک کہلائے۔ اس خلافت کو ہم ایک قسم کا وفاق یا فیڈریشن کہہ سکتے ہیں جس کے ارکان اپنے دفاع، تشکیلِ حکومت، پیداوار، محصولات، کرنسی اور دوسرے ملکوں سے معاہدوں میں خود مختار تھے۔

③ دوسری وہ امارتیں یا سلطنتیں تھیں جو بنوعباس کی خلافت سے آزاد تھیں۔ وہاں عباسی خلیفہ کا خطبہ بھی نہیں پڑھا جاتا تھا مثلاً، دولتِ ادارسہ، دولتِ مرابطین، دولتِ موحدین۔ ان کی خلفاء سے چپقلش بھی ہوتی رہتی تھی۔ مگر انہوں نے خود بھی خلافت کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ ان کے حکمران خود کو امیر یا سلطان کہلوانے پر اکتفا کرتے تھے۔

④ تیسری قسم کی حکومتیں وہ تھیں جو خود خلافت کی مدّعی تھیں۔ صحیح العقیدہ مسلم حکومتوں میں ایسی مثال صرف اَندَلُس کی تھی جہاں اَندَلُس کے اموی حکمران تیسری صدی ہجری میں خلیفہ کے دعوے دار بنے۔ ①

یہ کہا جاسکتا ہے کہ خلیفہ کی بیعت نہ کرنے یا متوازی خلافت قائم کرنے والوں نے غلطی کی۔ تاہم ان میں سے بعض حکمرانوں کو زمانی و مکانی حالات کے لحاظ سے معذور سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً: اَندَلُس میں جس وقت عبدالرحمن سوئم نے خلافت کا دعویٰ کیا اس وقت بغداد میں خلفاء اتنے کمزور تھے کہ دارالخلافہ کے حالات بھی ان کے ہاتھ سے باہر تھے، یوں کم از کم اہلِ اَندَلُس کو جو ہر وقت یورپ کے دانتوں تلے تھے، اپنے ہاں طوائف الملوکی کی روک تھام کے لیے ایک بااختیار خلیفہ کی سخت ضرورت تھی۔

اسی طرح موحدین کے دورِ عروج میں خلافتِ عباسیہ بذاتِ خود کمزور تھی اور سلجوقیوں کی سہارے قائم تھی۔ ایسے میں موحدین جو افریقہ اور اَندَلُس میں یورپی طاقتوں سے برسرِ پیکار تھے، خلیفہ سے بیعت کر کے وفاداری کا عہد و پیمان کرنا سیاسی مصلحتوں کے خلاف سمجھتے تھے۔

اگر دیکھا جائے تو ایشیا میں جہاں سب سے زیادہ مسلمان بستے ہیں، خلافتِ عباسیہ کو متفقہ حیثیت حاصل تھی۔ اگر کوئی اختلاف تھا تو وہ افریقہ اور اَندَلُس میں تھا۔ وہاں کے مسلم حکمرانوں کو ان کے حالات کے لحاظ سے کسی حد تک معذور سمجھنے کے باوجود سیاسی غلطی سے پاک نہیں سمجھا جاسکتا؛ کیوں کہ مسلمانوں کا عالمی اتحاد اسی صورت میں برقرار رہتا ہے جب سب حکمران ایک خلیفہ کے تابع ہوں، چاہے مختلف ممالک فوج، محصولات اور کرنسی تک میں خود مختار ہوں مگر خلیفہ کی شکل میں ان کے پاس قومی وحدت کا کم از کم ایک پلیٹ فارم ضرور ہونا چاہیے۔

شریعت نے مسلمانوں پر جس خلافت کا قیام لازم کیا ہے، عباسی دور میں وہ چاہے اپنی اصل شکل (خلافت علیٰ منہاج النبوۃ) میں نہ سہی مگر کسی نہ کسی درجے میں موجود تھی؛ اس لیے علماء وفقہاء نے اس کا احترام ضروری قرار دیا۔ ایک طرف تو انہوں نے کسی خود مختار حکمران کو خلیفہ سے جنگ کی اجازت نہ دی اور دوسری طرف انہوں نے یہ فتویٰ بھی نہیں دیا کہ خلیفہ پر سب حکمرانوں کو بزورِ شمشیر زیرِ نگین کر کے ایک متحدہ حکومت بنانا لازم ہے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان کمزور خلفاء کے لیے ایسا کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ایسا فتویٰ جاری کرنے سے مسلمان جو پہلے ہی بہت منتشر تھے، مزید دست و گریباں ہو جاتے اور خوں ریزی کے نئے دروازے کھل جاتے۔

① ان تین قسم کی حکومتوں کے علاوہ باطل فرقوں نے بھی خلافتوں اور اماموں کے نام پر اپنی کئی خود مختار حکومتیں بنائیں جیسے: افریقہ کی دولتِ بنوعبید، بحرین میں قرامطہ کی حکومت۔ ان کی خلافت کا باطل ہونا بالکل واضح ہے۔

صحابہ اور ائمہ مجتہدین کا طرزِ عمل گواہ ہے کہ اگر کسی موقع پر مقاصدِ شرعیہ اور خلافت کے انتظامی امور میں (نہ کہ خلافت کی ماہیت میں) تصادم ہونے لگے اور مقاصد کی حفاظت کے لیے خلافت کو کوئی نئی شکل قبول کرنی پڑے یا انتظامی امور میں ردو بدل کرنا پڑے تو اس کی گنجائش ہے۔

اس میں پہلی مثال حضرت علی رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے بالمقابل ایک آزاد اور خود مختار حکومت قائم کر لی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پہلے متحدہ و عالمگیر خلافت کی ضرورت کے تحت ان کی خود مختاری پر راضی نہ تھے جس کے نتیجے میں جنگِ صفین ہوئی۔ بعد میں خونریزی کے نقصانات اور دیگر پہلو دیکھ کر ان کی رائے تبدیل ہوگئی اور انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی اور معاہدہ ہوگیا کہ فریقین اپنی اپنی مملکت میں آزادانہ طور پر حکومت کریں گے۔ اس فیصلے پر صحابہ کا اتفاق رہا۔ کسی نے اس صلح کو خلافِ اسلام نہیں سمجھا۔ ①

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ عالمگیر اور متحدہ و متفقہ خلافت ایک اعلیٰ درجے کی چیز ہے اور اس تک رسائی یا اس کی بقا کے لیے مناسب تدابیرِ عمل میں ضرور لانی چاہییں مگر اس دوران مسلمانوں کا خون محفوظ رکھنے کی حتی الامکان کوشش بھی ضروری ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں دو مملکتوں کو الگ الگ سندِ جواز دینے سے امن قائم ہو رہا تھا؛ اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے دور میں اپنی مملکت سے دست برداری سے امن قائم ہو رہا تھا؛ اس لیے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنا حصۂ مملکت بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو دے کر انہیں خلیفہ مان لیا۔ ②

اَندَلُس جب عباسی خلافت سے الگ ہوا تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ (م ۱۵۰ھ) اور امام مالک رحمہ اللہ (م ۱۷۹ھ) حیات تھے، انہوں نے کبھی یہ فتویٰ نہیں دیا کہ اَندَلُس کی حکومت کا وجود خلافِ اسلام ہے اور اسے دوبارہ عالمگیر خلافت میں ضم کرنا واجب ہے بلکہ یہ ثابت ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ اَندَلُس کے حکمران ہشام اموی کی تعریف کرتے تھے۔ ہشام اموی بھی ان کا اتنا مداح تھا کہ اس نے مؤطا مالک منگوا کر اسے اَندَلُس کا سرکاری قانون بنا دیا تھا۔ ③

امام مالک کی زندگی میں ہی خلافتِ عباسیہ سے آزاد "دولتِ ادارسہ" ۱۷۲ھ میں قائم ہوئی۔ اس وقت بغداد میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد رشید قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد الشیبانی رحمہ اللہ موجود تھے مگر ان حضرات سے اس پر کوئی تنقید ثابت نہیں۔ اگر علاقائی حکومتوں کی سرے سے کوئی گنجائش نہ ہوتی تو یہ ائمہ حضرات اس پر روک ٹوک کرتے اور اس "سیاسی بدعت" کا ناجائز ہونا واضح کرتے جو ان کی آنکھوں کے سامنے شروع ہوئی۔

امام ابو یوسف نے "کتاب الخراج" یا امام محمد رحمہ اللہ نے "السیر الکبیر" جیسی تصانیف میں بھی جن کا موضوع ہی اسلامی سیاست تھا، اس سیاسی تبدیلی کے عدمِ جواز کا ذکر نہیں کیا۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے سامنے مزید علاقے خلافتِ اسلامیہ سے الگ ہوئے مگر اس کے باوجود خلافت کی شرعی حیثیت پر ان کی طرف سے کوئی اعتراض سامنے نہیں آیا۔

---

① تاریخ الطبری: ۱۴۰/۵　② صحیح البخاری، ح: ۲۷۰۴　③ نفح الطیب: ۲۲۰/۳، ۳۳۷/۱

سلطان محمود غزنوی، ملک شاہ، شہاب الدین غوری اور صلاح الدین ایوبی جیسے اسلامی فاتحین بڑے بڑے ممالک فتح کر کے بھی خلفائے بنوعباس کے خادم تھے۔ ان ادوار میں امام طحاوی، امام غزالی، امام رازی اور ابن جوزی رحمہم اللہ جیسی ہستیاں موجود تھیں۔ انہوں نے کبھی اپنے دور کے سیاسی منظرنامے کو یکسر خلافِ اسلام یا خلافت کی اس شکل کو باطل نہیں کہا؛ کیوں کہ ایک خلافت چاہے کمزور سہی مگر موجود تھی اور فرضِ کفایہ کا درجہ اس سے ادا ہو رہا تھا۔

اس ساری بحث سے ہمارا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ ہم خلافت کے عالمگیر ہونے کے تصور کی نفی کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت مسلّم ہے کہ ایک مضبوط اور عالمگیر اسلامی حکومت بہتر اور مستحکم طور پر مثالی خلافت کا کردار ادا کر سکتی ہے۔ یہاں ہمارا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ہے کہ ماضی کے مسلمان خلافت کے مقصد اور اہمیت سے لاعلم نہیں تھے۔ اگر تاریخ کے ایک خاص دور میں خلافت محدود ہوئی اور اس کی شکل تبدیل ہوئی اور بعض عظیم مسلم حکمرانوں اور جلیل القدر علماء کی موجودگی میں یہ انقلاب آیا اور انہوں نے سیاست کی اس تبدیلی کو گوارا کیا تو اس کی وجوہ موجود تھیں۔

آخر میں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس قسم کے سوالات درحقیقت محض فکری و نظری ہیں۔ جبکہ اسلام کے سیاسی اصول و ضوابط (جو مختصر، مضبوط اور لچک دار ہیں) کی حیثیت نظری سے کہیں زیادہ عملی ہے۔ یعنی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کا سیاسی مزاج عملی اور حقیقت پسندانہ ہے جو فکری موشگافیوں اور فلسفیانہ تصورات سے کہیں زیادہ زمینی حقائق کی بنیاد پر قائم ہے۔ مسلمانوں کا اجتماعی نظام کیسا ہونا چاہیے؟ اس کے اہداف کیا ہونے چاہئیں؟ اس بارے میں اسلام نے ضروری اور اہم باتیں بتادی ہیں، جن کا خلاصہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کی تمام صورتوں کو قائم کرنا ہے۔ انفرادی و اجتماعی حیات میں اسلام کا مقصود یہی دو چیزیں ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ ”یہ کس طرح ہونا چاہیے؟“ تو اس کے لیے مختلف زمانوں اور علاقوں کے مسلمانوں نے پیش آمدہ حالات کے مطابق مختلف راستے اپنا کر اپنا سیاسی نظام چلایا ہے۔ ہر مسلمان قائد کے متعلق ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی ہی اس کا مقصد تھا بلکہ مسلم حکمرانوں میں دین دار، دنیادار، اچھے، برے، متوسط ہر قسم کے لوگ تھے۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ”کس طرح ہونا چاہیے؟“ کے جواب میں کی جانے والی سیاسی تشکیلات میں شرعی گنجائش وسیع ہے۔ اس نکتے سے اہلِ علم پہلے بھی آگاہ تھے اور اب بھی ہیں۔

مذکورہ بحث کے ساتھ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر آج ہم عالمگیر خلافت لانے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کے لیے پہلا قدم مسلمانوں کو ذہنی طور پر ایک لڑی میں پرونا ہے۔ جب مسلمانوں کے دل متحد ہوں گے تو آہستہ آہستہ ایک مشترکہ پلیٹ فارم کے لیے راستے بھی ہموار ہوتے چلے جائیں گے۔ اسی متحدہ پلیٹ فارم کو خلافت کہا جا سکتا ہے۔

مگر پہلے اتحاد کا ماحول پیدا کرنا ضروری ہے۔ اتحاد کا ماحول پیدا کرنے کے لیے قوم میں وہ دینی روح اور سیاسی شعور بیدار کرنا ضروری ہے جس نے قرونِ اولیٰ میں ساری امت کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا رکھا تھا۔ اس دیوار میں دراڑیں اسی وقت پڑیں جب اندر اترا ہوا ایمانی سیسہ پگھل گیا۔ اس دیوار کو اس انداز میں دوبارہ جوڑنا بھی اس کے

بغیر ممکن نہیں کہ وہی ایمانی روح زندہ کی جائے۔اس کے بغیر مسلم اُمت کا اتحاد اوّل تو ناممکن ہے۔ بالفرض اگر ایسا ہو بھی جائے کہ کوئی جماعت صرف طاقت کے بل پر کئی ملک فتح کر کے ایک وسیع وعریض حکومت بنا لے، تب بھی اندرونی روح مردہ ہونے کی صورت میں ایسی حکومت ہرگز پائیدار نہیں ہوگی۔ یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کسی کھوکھلی اور چٹخی ہوئی دیوار کو لوہے کے تاروں سے باندھ کر یکجا رکھا جائے۔

دورِ حاضر میں خلافت کے قیام کے لیے کوشاں حضرات کے لیے ضروری ہے کہ وہ تاریخ کے ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھیں تا کہ ہم ماضی کی غلطیوں سے بچ سکیں اور اب جو خلافت قائم ہو وہ مضبوط اور پائیدار ہو۔

کتابیات
جلد اول تا جلد سوم

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
	حرف الف	
1	آثار البلاد واخبار العباد	زکریا القزوینی
2	ابجد العلوم	صدیق حسن خان قنوجی
3	ابوالحسن الاشعری	حماد بن محمد الانصاری
4	ابوبکر الصدیق وبنوہ	محمود عبدالفتاح شرف الدین
5	ابوحنیفۃ حیاتہ وعصرہ	محمد ابوزہرۃ
6	اتحاف الخیرۃ المہرۃ بزوائد المسانید العشرۃ	شہاب الدین بوصیری الکنانی
7	اتحاف السائل بمانی الطحاویۃ من مسائل، شرح العقیدۃ الطحاویۃ	صالح بن عبدالعزیز آل شیخ
8	اتحاف المہرۃ بالفوائد المبتکرۃ من اطراف العشرۃ	ابن حجر عسقلانی
9	اتعاظ الحنفاء باخبار ائمۃ الفاطمیین الخلفاء	تقی الدین المقریزی
10	اجتماع الجیوش الاسلامیۃ	ابن قیم الجوزیۃ
11	احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم	ابوعبداللہ المقدسی البشاری
12	احسن الفتاوئ	مفتی رشید احمد لدھیانوی
13	احکام القرآن	الجصاص الرازی
14	احیاء علوم الدین	ابوحامد الغزالی
15	اخبار ابی حفص عمر بن عبدالعزیز	ابوبکر محمد بن الحسین الآجری
16	اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ	الحسین بن علی الصیمری
17	اخبار العلماء باخبار الحکماء	ابوالحسن علی بن یوسف القفطی
18	اخبار المکیین من تاریخ ابن ابی خیثمہ	ابوبکر ابن ابی خیثمہ
19	اخبار الوافدات من النساء علی معاویۃ بن ابی سفیان	عباس بن بکار
20	اخبار بن عبید وسیرتہم	محمد بن علی صنہاجی القلعی
21	اخبار الدولۃ العباسیۃ	مصنف: نامعلوم، محقق: عبدالعزیز الدوری
22	اخبار القضاۃ	ابوبکر وکیع بغدادی
23	اخبار مکۃ (تاریخ مکۃ)	ابوعبداللہ الفاکہی
24	اخبار مکۃ وما جاء فیہا من الآثار	ابوالولید الازرقی
25	اخلاق جلالی	جلال الدین دوانی
26	اردو دائرہ معارف اسلامیہ	جماعت مؤلفین
27	ارشاد الساری لشرح صحیح البخاری	احمد بن محمد القسطلانی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
		حرف الف	
۶۸۲ھ	1	دارصادر، بیروت	مذکورنہیں
۱۳۰۷ھ	1	دارابن حزم	۱۴۲۳ھ۔۲۰۰۲ء
۱۴۱۸ھ	1	الجامعۃ الاسلامیۃ، المدینۃ المنورۃ	۱۳۹۴ھ۔۱۹۷۴ء
معاصر	1	مکتبۃ الآداب، قاہرہ	مذکورنہیں
۱۳۹۴ھ۔۱۹۷۴ء	1	دارالفکر العربی	۱۹۴۷ء
۸۳۰ھ	8	دارالوطن، ریاض	۱۴۲۰ھ۔۱۹۹۹ء
معاصر	1	مکتبہ شاملہ	
۸۵۲ھ	19	مجمع الملک فہد: المدینۃ المنورہ	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۴ء
۸۴۵ھ	3	لجنۃ احیاء التراث الاسلامی، مصر	مذکورنہیں
۷۵۱ھ	1	دارعالم الفوائد	۱۴۳۱ھ
۳۸۰ھ	1	دارصادر، بیروت	۱۴۱۱ھ۔۱۹۹۱ء
۱۴۲۲ھ	10	ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی	۱۴۲۵ھ
۳۷۰ھ	3	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۴ء
۵۰۵ھ	4	دارالمعرفۃ، بیروت	مذکورنہیں
۳۶۰ھ	1	مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۴۰۰ھ۔۱۹۸۰ء
۴۳۶ھ	1	عالم الکتب، بیروت	۱۴۰۵ھ۔۱۹۸۵ء
۶۴۶ھ	1	دارالکتب العلمیۃ	۲۰۰۵ء
۲۷۹ھ	1	دارالوطن	۱۹۹۷ء
۲۲۲ھ	1	مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
۶۲۸ھ	1	دارالصحوۃ القاہرہ	مذکورنہیں
تیسری صدی ہجری	1	دارالطلیعۃ، بیروت	مذکورنہیں
۳۰۶ھ	3	عالم الکتب، بیروت	۱۳۶۶ھ۔۱۹۴۷ء
۲۷۲ھ	5	دارخضر، بیروت	۱۴۱۴ھ
۲۵۰ھ	2	دارالاندلس للنشر، بیروت	مذکورنہیں
۹۰۸ھ	1	شیخ مبارک علی تاجر کتب، لاہور	۱۳۰۲ھ
	24	دانش گاہ، پنجاب	۱۹۶۴ء۔تا۱۹۹۳ء
۹۲۳ھ	10	المطبعۃ الکبریٰ الامیریہ، مصر	۱۳۲۳ھ

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
28	ارشاد القاصی والدانی الی تراجم الشیوخ الطبرانی	ابوالطیب نائف بن صلاح المنصوری
29	اسد الغابۃ	ابن اثیر الجزری
30	اسماء المدلسین	جلال الدین سیوطی
31	اصول السنۃ (السنۃ)	امام احمد بن حنبل
32	اصول مذہب الشیعۃ الامامیۃ الاثنی عشریۃ عرض ونقد	دکتور ناصر بن عبداللہ القفاری
33	اضواء علی الہند (تاریخ الاسلام فی الہند)	عبدالمنعم النمر
34	اعتقاد اہل السنۃ (شرح اصول اعتقاد اہل السنۃ والجماعۃ)	ہبۃ اللہ بن الحسن ابوالقاسم الطبری الرازی اللالکائی
35	اعتقادات فرق المسلمین والمشرکین	امام فخر الدین رازی
36	اعلام الموقعین عن رب العالمین	ابن القیم الجوزیۃ
37	اقاویل الثقات فی تاویل الاسماء والصفات	مرعی بن یوسف المقدسی الحنبلی
38	اقتضاء الصراط المستقیم	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
39	اکمال المعلم بفوائد مسلم (شرح صحیح مسلم)	قاضی عیاض یحصبی السبتی
40	اکمال تہذیب الکمال	علاؤ الدین مغلطائی
41	الآحاد والمثانی	ابوبکر ابن ابی عاصم الشیبانی
42	الابانۃ عن شریعۃ الفرقۃ الناجیۃ	ابن بطۃ العکبری
43	الاحتجاج (احتجاج طبرسی)	ابومنصور الطبرسی
44	الاحکام السلطانیۃ	ابوالحسن الماوردی
45	الاحکام السلطانیۃ	ابویعلی الفراء
46	الاخبار الطوال	ابوحنیفۃ الدینوری
47	الاختیار لتعلیل المختار	عبداللہ بن محمود الموصلی، ابوالفضل الحنفی
48	الاخنائیۃ	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
49	الادب المفرد	امام محمد بن اسماعیل البخاری
50	الارشاد فی معرفۃ علماء الحدیث	ابویعلی خلیلی القزوینی
51	الاستقصاء لاخبار دول المغرب الاقصی	شہاب الدین الدرعی السلاوی
52	الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب	ابن عبدالبر قرطبی
53	الاسرار المرفوعۃ فی الاخبار الموضوعۃ	ملا علی قاری
54	الاشراف فی منازل الاشراف	ابن ابی الدنیا
55	الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ	ابن حجر العسقلانی

سن اشاعت	ناشر	جلدیں	سن وفات
مذکور نہیں	دار الکیان، ریاض	1	معاصر
۱۴۱۵ھ۔ ۱۹۹۴ء	دار الکتب العلمیۃ، بیروت	8	۶۳۰ھ
مذکور نہیں	دار الجیل	1	۹۱۱ھ
۱۴۱۱ھ	دار المنار، سعودیہ	1	۲۴۱ھ
۱۴۱۴ھ	دار النشر	3	معاصر
۱۹۶۰ء	دار العہد الجدید، مصر	1	۱۹۹۱ء
۱۴۰۲ھ	دار طیبۃ، ریاض	4	۴۱۸ھ
مذکور نہیں	دار الکتب العلمیۃ، بیروت	1	۶۰۶ھ
۱۴۱۱ھ۔ ۱۹۹۱ء	دار الکتب العلمیۃ	4	۷۵۱ھ
۱۴۰۶ھ	موسسۃ الرسالۃ، بیروت	1	۱۰۳۳ھ
۱۴۱۹ھ۔ ۱۹۹۹ء	دار عالم الکتب، بیروت	2	۷۲۸ھ
۱۴۱۹ھ۔ ۱۹۹۸ء	دار الوفاء، مصر	8	۵۴۴ھ
۱۴۲۲ھ۔ ۲۰۰۱ء	الفاروق الحدیثۃ	12	۷۶۲ھ
۱۴۱۱ھ۔ ۱۹۹۱ء	دار الرأیۃ، ریاض	6	۲۸۷ھ
۱۴۱۸ھ	دار الرأیۃ للنشر، سعودیہ	3	۳۸۷ھ
۱۳۸۶ھ۔ ۱۹۶۶ء	مطابع النعمان النجف الاشرف	2	پانچویں صدی ہجری
	دار الحدیث، قاہرہ	1	۴۵۰ھ
۱۴۲۱ھ۔ ۲۰۰۰ء	دار الکتب العلمیۃ	1	۴۵۸ھ
۱۹۶۰ء	دار احیاء الکتب العربی	1	۲۸۲ھ
۱۳۵۶ھ۔ ۱۹۳۷ء	مطبع حلبی، قاہرہ	5	۶۸۳ھ
۱۴۲۰ھ۔ ۲۰۰۰ء	دار الخراز، جدۃ	1	۷۲۸ھ
۱۴۰۹ھ۔ ۱۹۸۹ء	دار البشائر الاسلامیہ، بیروت	1	۲۵۶ھ
۱۴۰۹ھ	مکتبۃ الرشد، الریاض	3	۴۴۶ھ
مذکور نہیں	دار الکتاب	3	۱۳۱۵ھ
۱۴۱۲ھ۔ ۱۹۹۲ء	دار الجیل، بیروت	10	۴۶۳ھ
مذکور نہیں	موسسۃ الرسالۃ	1	۱۰۱۴ھ
۱۴۱۱ھ۔ ۱۹۹۰ء	مکتبۃ الرشد، الریاض	1	۲۸۱ھ
۱۴۱۵ھ	دار الکتب العلمیہ	8	۸۵۲ھ

مؤلف	نام کتاب	نمبر شمار
ہشام بن محمد الکلبی	الاصنام	56
ابوبکر ابن الانباری	الاضداد	57
ابراہیم بن موسیٰ الشاطبی	الاعتصام	58
ابوبکر بیہقی	الاعتقاد والہدایۃ الی سبیل الرشاد علیٰ مذہب السلف واصحاب الحدیث	59
ابوالبرکات النسفی	الاعتماد فی الاعتقاد۔شرح العمدۃ فی عقیدۃ اہل السنۃ والجماعۃ	60
ابن شداد الحلبی	الاعلاق الخطیرۃ فی ذکر امراء الشام والجزیرۃ،	61
خیرالدین الزرکلی	الاعلام	62
شمس الدین السخاوی	الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ	63
ابوالفرج اصفہانی	الاغانی	64
ابوالربیع الحمیری	الاکتفاء بما تضمنہ من مغازی رسول اللہ ﷺ والثلاثۃ الخلفاء	65
شمس الدین الحسینی الشافعی الدمشقی	الاکمال فی ذکر من لہ روایۃ فی مسند الامام احمد سوی من ذکر فی تہذیب الکمال	66
محمد بن ادریس الشافعی	الام (کتاب الام)	67
محمد ابوزہرہ	الامام الشافعی	68
ابن قتیبۃ الدینوری	الامامۃ والسیاسۃ	69
ابن زنجویہ	الاموال	70
ابراہیم بن عامر الرحیلی	الانتصار للصحب والآل من افتراءات السماوی الضال	71
ابن عبدالبر المالکی	الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الائمۃ الفقہاء	72
عبدالکریم بن محمد السمعانی	الانساب	73
ابوبکر ابن الباقلانی	الانصاف فیما یجب اعتقادہ ولا یجوز الجہل بہ	74
عبدالرحمن بن یحییٰ الیمانی	الانوار الکاشفۃ لما فی کتاب ''اضواء علی السنۃ'' من الزلل والتضلیل والمجازفۃ	75
ابوہلال العسکری	الاوائل	76
ابوعلی القالی	امالی القالی	77
ڈاکٹر حمید اللہ	امام ابوحنیفہ کی تدوینِ قانونِ اسلامی	78
تقی الدین مقریزی	امتاع الاسماع	79
مولانا اشرف علی تھانوی	امداد الفتاویٰ	80
احمد بن یحییٰ البلاذری	انساب الاشراف	81
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر	82
مولانا انوارالحسن شیرکوٹی	انوار النجوم (اردو ترجمہ مکتوباتِ قاسمی، از مولانا محمد قاسم نانوتوی)	83

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۲۰۴ھ	1	مکتبہ شاملہ	
۳۲۸ھ	1	المکتبۃ العصریہ، بیروت	۱۴۰۷ھ۔۱۹۸۷ء
۷۹۰ھ	1	دار ابن عفان، السعودیہ	۱۴۱۲ھ۔۱۹۹۲ء
۴۵۸ھ	1	دار الآفاق، بیروت	۱۴۰۱ھ
۷۱۰ھ	1	المکتبۃ الازہریۃ فی التراث، مصر	۱۴۳۳ھ۔۲۰۱۲ء
۶۸۴ھ	3	منشورات وزارۃ الثقافۃ، سوریا	۱۹۹۲ء
۱۳۹۶ھ	8	دار العلم للملایین	۲۰۰۲ء
۹۰۲ھ	1	دار الکتب العلمیہ، بیروت	مذکور نہیں
۳۵۶ھ	24	دار الفکر، بیروت	مذکور نہیں
۶۳۴ھ	2	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۲۰ھ
۷۶۵ھ	1	جامعۃ الدراسات الاسلامیہ کراچی	مذکور نہیں
۲۰۴ھ	8	دار المعرفۃ، بیروت	۱۴۱۰ھ۔۱۹۹۰ء
۱۳۹۴ھ۔۱۹۷۴ء	1	دار الفکر العربی	۱۹۷۸ء
۲۷۰ھ	1	مکتبۃ النیل، مصر	۱۳۲۲ھ۔۱۹۰۴ء
۲۵۱ھ	1	مرکز الملک فیصل، سعودیہ	۱۴۰۶ھ۔۱۹۸۶ء
معاصر	1	مکتبۃ العلوم والحکم، المدینۃ المنورۃ	۱۴۲۳ھ۔۲۰۰۳ء
۴۶۳ھ	1	دار الکتب العلمیۃ، بیروت	مذکور نہیں
۵۶۲ھ	13	دائرۃ المعارف العثمانیہ، دکن	۱۳۸۲ھ۔۱۹۶۲ء
۴۰۳ھ	1	المکتبۃ الازہریۃ	مذکور نہیں
۱۳۸۶ھ	1	عالم الکتب، بیروت	۱۴۰۶ھ۔۱۹۸۶ء
۳۹۵ھ	1	دار البشیر	۱۴۰۸ھ
۳۵۶ھ	4	دار الکتب المصریۃ	۱۳۴۴ھ۔۱۹۲۶ء
۲۰۰۲ء	1	اردو اکیڈمی، سندھ	۱۹۸۳ء
۸۴۵ھ	15	دار الکتب العلمیہ، بیروت	۱۴۲۰ھ۔۱۹۹۹ء
۱۳۴۳ھ۔۱۹۲۳ء	6	مکتبہ دار العلوم کراچی	۱۴۳۱ھ۔۲۰۱۰ء
۲۷۹ھ	13	دار الفکر، دمشق	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۶ء
۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۹ء	1	مجلس نشریات اسلام، کراچی	مذکور نہیں
۱۳۹۶ھ۔۱۹۷۶ء		ناشران قرآن لمیٹڈ، لاہور	مذکور نہیں

مؤلف	نام کتاب	نمبر شمار
سید سلیمان ندوی	اہل سنت والجماعت	84
شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی	اوجز المسالک الی مؤطا امام مالک	85
عز الدین الیمنی	ایثار الحق علی الخلق	86
بدر الدین الکنانی الحموی الشافعی	ایضاح الدلیل فی قطع حجج اہل التعطیل	87
ابو علی القیسی	ایضاح شواہد الایضاح	88
	﴿حرف ب﴾	
ابن نجیم المصری	البحر الرائق شرح کنز الدقائق	89
ابو حیان اندلسی	البحر المحیط فی التفسیر	90
المطہر بن الطاہر المقدسی	البدء والتاریخ	91
احمد بن اسحاق یعقوبی	البلدان (کتاب البلدان)	92
بدر الدین عینی	البنایۃ شرح الہدایۃ	93
ابن عذاری المراکشی	البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب	94
یحییٰ العمرانی الیمنی	البیان فی مذہب الامام الشافعی	95
اکرم ضیاء عمری	بحوث فی تاریخ السنۃ المشرفۃ	96
علاؤ الدین ابو بکر الکاسانی	بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع	97
مولانا خلیل احمد سہارنپوری	بذل المجہود فی حل ابی داؤد	98
کمال الدین ابن العدیم	بغیۃ الطلب فی تاریخ حلب	99
	﴿حرف ت﴾	
مولانا عبدالحی لکھنوی	الاجوبۃ الفاضلۃ لاسئلۃ العاشرۃ الکاملۃ (مع تعلیقات شیخ عبد الفتاح)	100
دکتور محمود شاکر	التاریخ الاسلامی	101
ابو زرعۃ ابن العراقی	تحفۃ التحصیل فی ذکر رواۃ المراسیل	102
مولف۔ ابن حجر ہیثمی (مترجم: مولانا عبدالشکور)	تنویر الایمان اردو ترجمہ تطہیر الجنان	103
علی ابراہیم حسن	التاریخ الاسلامی العام	104
دکتور عبدالرحمن علی الحجی	التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی حتی سقوط غرناطہ	105
محمد بن اسماعیل البخاری	التاریخ الاوسط	106
محمد بن اسماعیل البخاری	التاریخ الکبیر (مع حواشی محمود خلیل)	107
ابو بکر احمد ابن ابی خیثمۃ	التاریخ الکبیر لابن ابی خیثمۃ السفر الثالث	108
ابو بکر احمد ابن ابی خیثمۃ	التاریخ الکبیر لابن ابی خیثمۃ السفر الثانی	109

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۱۳۷۳ء	1	مجلس نشریات اسلام، کراچی	۱۹۹۷ء
۱۴۰۲ھ	17	دارالقلم، دمشق	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۳ء
۸۴۰ھ	1	دارالکتب العلمیہ	۱۹۸۷ء
۷۳۳ھ	1	دارالسلام للطباعۃ والنشر، مصر	۱۴۱۰ھ۔۱۹۹۰ء
قبل ۶۰۰ھ	1	دارالغرب الاسلامی	۱۴۰۸ھ۔۱۹۸۷ء
		حرف ب	
۹۷۰ھ	8	دارالکتاب الاسلامی	مذکورنہیں
۷۴۵ھ	10	دارالفکر بیروت	۱۴۲۰ھ
۳۵۵ھ	6	مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ، مصر	مذکورنہیں
۲۹۲ھ	1	دارالکتب العلمیہ	۱۴۲۲ھ
۸۵۵ھ	13	دارالکتب العلمیہ	۱۴۲۰ھ۔۲۰۰۰ء
۶۹۶ھ	2	دارالثقافۃ، بیروت	۱۹۸۳ء
۵۵۸ھ	13	دارالمنہاج، جدۃ	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۰ء
معاصر	1	بساط، بیروت	۱۹۷۲ء
۵۸۷ھ	7	دارالکتب العلمیہ	۱۴۰۶ھ۔۱۹۸۶ء
۱۳۴۶ھ	20	دارالکتب العلمیہ	مذکورنہیں
۶۶۰ھ	12	دارالفکر	مذکورنہیں
		حرف ت	
	1	حلب	مذکورنہیں
۲۰۱۴ء	22	المکتب الاسلامی، بیروت	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۵ء
۸۲۶ھ		مکتبۃ الرشد، الریاض	مذکورنہیں
۹۷۴ھ	1	المکتبۃ العربیہ لاہور	مذکورنہیں
بیسوی صدی عیسوی		مکتبۃ النہضۃ المصریۃ	۱۹۶۳ء
معاصر	1	دارالقلم، دمشق	۱۴۰۲ھ۔۱۹۸۲ء
۲۵۶ھ	2	دارالوعی، دارالتراث، حلب، قاہرہ	۱۳۹۷ھ۔۱۹۷۷ء
۲۵۶ھ	8	مطبعۃ عثمانیہ، حیدرآباد دکن	مذکورنہیں
۲۷۹ھ	3	الفاروق الحدیثۃ، قاہرہ	۱۴۲۷ھ۔۲۰۰۶ء
۲۷۹ھ	2	الفاروق الحدیثۃ، قاہرہ	۱۴۲۷ھ۔۲۰۰۶ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
110	التبصیر فی الدین وتمیز الفرق الناجیۃ من الفرق الہالکین	طاہر بن محمد الاسفرائینی
111	التحریر والتنویر	شیخ محمد بن طاہر العاشور
112	التحفۃ المقدسیۃ فی مختصر تاریخ النصرانیۃ	ابو محمد عاصم المقدسی
113	التذکرۃ الحمدونیۃ	ابن حمدون بہاؤالدین البغدادی
114	الترغیب والترہیب	عبدالعظیم المنذری
115	التشریع الجنائی الاسلامی مقارنا بالقانون الوضعی	عبدالقادر عودۃ
116	التعدیل والتجریح لمن خرج لہ البخاری فی الجامع الصحیح	ابو الولید الباجی
117	التفسیر الوسیط	وہبۃ الزحیلی
118	التقریب والتیسیر	یحییٰ بن شرف النووی
119	التقریر والتحبیر علی تحریر الکمال ابن الہمام	ابن امیر حاج ابن الموقت الحنفی
120	التقیید والایضاح شرح مقدمۃ ابن صلاح	زین الدین العراقی
121	التکمیل فی الجرح والتعدیل ومعرفۃ الثقات والضعفاء والمجاہیل	ابن کثیر دمشقی
122	التلخیص الحبیر فی تخریج احادیث الرافعی الکبیر	ابن حجر العسقلانی
123	التمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید	ابن عبدالبر القرطبی
124	التنبیہ والاشراف	ابو الحسن علی المسعودی
125	التنبیہ والرد علی اہل الاہواء والبدع	ابو الحسین الملطی العسقلانی
126	تاج العروس من جواہر القاموس	مرتضیٰ الزبیدی
127	تاریخ اسلام	شاہ معین الدین ندوی
128	تاریخ دمشق (۷۴ متن، ۶ فہارس)	حافظ ابن عساکر
129	تاریخ سندھ	عبدالحلیم شرر
130	تاریخ سندھ (تحقیق: ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتا)	میر معصوم شاہ بھکری
131	تاریخ ابن خلدون ومقدمہ	عبدالرحمن ابن خلدون
132	تاریخ ابن معین (روایۃ الدوری)	یحییٰ بن معین
133	تاریخ ابن یونس المصری	ابو سعید ابن یونس المصری
134	تاریخ ابی زرعۃ الدمشقی	ابو زرعۃ الدمشقی
135	تاریخ اسلام	اکبر شاہ نجیب آبادی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۴۷۱ھ	1	عالم الکتب، لبنان	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
معاصر	30	تیونس	۱۹۹۷ء
معاصر	1	مکتبہ شاملہ	مذکور نہیں
۵۶۲ھ	30	دار صادر، بیروت	۱۴۱۷ھ
۶۵۶ھ	4	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۷ھ
۱۳۷۴ھ	2	دار الکتاب العربی، بیروت	مذکور نہیں
۴۷۴ھ	3	دار اللواء، الریاض	۱۴۰۶ھ۔۱۹۸۶ء
	1	دار الفکر	۱۴۲۲ھ
۶۷۶ھ	1	دار الکتاب العربی، بیروت	۱۴۰۵ھ۔۱۹۸۵ء
۸۷۹ھ	3	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
۸۰۶ھ	1	مکتبۃ السلفیۃ، المدینۃ المنورۃ	۱۳۸۹ھ۔۱۹۶۹ء
۷۷۴ھ	4	مرکز النعمان، یمن	۱۴۳۲ھ۔۲۰۱۱ء
۸۵۲ھ	4	دار الکتب العلمیۃ، بیروت	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۹ء
۴۶۳ھ	24	وزارۃ عموم الاوقاف والشؤون الاسلامیہ، المغرب	۱۳۸۷ھ
۳۴۶ھ	1	دار الصاوی، قاہرہ	
۳۷۷ھ	1	المکتبۃ الازہریۃ، مصر	مذکور نہیں
۱۲۰۵ھ	40	دار الہدایۃ	مذکور نہیں
۱۹۷۴ء	2	دار الاشاعت	مذکور نہیں
۵۷۱ھ	80	دار الفکر	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۵ء
۱۹۲۶ء	1	دل گداز پریس لکھنؤ	۱۹۱۷ء
۱۰۴۴ھ	1	مرکز تحقیقات، اصفہان	مذکور نہیں
۸۰۸ھ	8	دار الفکر بیروت	۱۴۰۸ھ۔۱۹۸۸ء
۲۳۳ھ	4	مرکز البحث العلمی، مکۃ المکرمۃ	۱۳۹۹ھ۔۱۹۷۹ء
۳۴۷ھ	2	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۲۱ھ
۲۸۱ھ	1	مجمع اللغۃ العربیۃ، دمشق	مذکور نہیں
بیسویں صدی عیسوی	3	نفیس اکیڈمی، کراچی	۱۹۷۷ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
136	تاریخ الاسلام ووفیات المشاہیر والاعلام (تحقیق بشار) اکثر مقامات پر تاریخ الاسلام تدمری نسخہ استعمال کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر بشار نسخہ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ''ت تدمری'' اول الذکر کی اور ''ت بشار'' ثانی الذکر کی علامات ہیں۔	شمس الدین الذہبی
137	تاریخ الاسلام ووفیات المشاہیر والاعلام (تحقیق تدمری)	شمس الدین الذہبی
138	تاریخ الخلفاء	جلال الدین سیوطی
139	تاریخ الخمیس فی احوال انفس النفیس	حسین بن محمد الدیار بکری
140	تاریخ الطبری (تاریخ الرسل والملوک)	ابن جریر الطبری
141	تاریخ العرب وحضارتہم فی الاندلس	دکتور خلیل ابراہیم السامرائی
142	تاریخ الفکر الدینی الجاہلی	محمد ابراہیم الفیومی
143	تاریخ المدینۃ	عمر بن شبّۃ
144	تاریخ اندلس	مولانا ریاست علی ندوی
145	تاریخ برصغیر	پروفیسر ایم اے جمیل
146	تاریخ بغداد، وذیولہ	خطیب ابوبکر البغدادی
147	تاریخ دعوت وعزیمت	سید ابوالحسن علی ندوی
148	تاریخ دمشق	ابن القلانسی، حمزۃ بن اسد
149	تاریخ فلاسفۃ الاسلام	محمد لطفی جمعہ
150	تاریخ مکۃ المشرفۃ والمسجد الحرام والمدینۃ الشریفۃ والقبر الشریف	ابن ضیاء المکی الحنفی
151	تاریخ ہند	ڈاکٹر مقصود چودھری
152	تاریخ یعقوبی	احمد بن اسحاق یعقوبی
153	تالیفاتِ رشیدیہ	مولانا رشید احمد گنگوہی
154	تبییض الصحیفۃ بمناقب ابی حنیفۃ	جلال الدین السیوطی
155	تتمۃ صوان الحکمۃ	ابن فندمہ
156	تجارب الامم وتعاقب الہمم	ابن مسکویہ
157	تحریر علوم الحدیث	عبداللہ بن یوسف الجدیع
158	تحفۃ الفقہاء	ابوبکر علاؤ الدین السمرقندی
159	تحفۂ اثنا عشریۃ (اردو)	شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، ترجمہ مولانا خلیل الرحمن نعمانی المظاہری

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۴۷۸ھ	15	دارالغرب الاسلامی	۲۰۰۳ء
۴۷۸ھ	52	دارالکتاب العربی، بیروت	۱۴۱۳ھ۔۱۹۹۳ء
۹۱۱ھ	1	مکتبہ نزار	۱۴۲۵ھ۔۲۰۰۴ء
۹۶۶ھ	2	دار صادر	مذکور نہیں
۳۱۰ھ	11	دارالمعارف مصر، دارالتراث بیروت	۱۳۸۷ھ
معاصر	1	دارالکتاب الجدیدة، بیروت	۲۰۰۰ء
۱۴۲۷ھ	1	دارالفکر العربی	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۴ء
۲۶۲ھ	4	سید حبیب جدة	۱۳۹۹ھ
بیسوی صدی عیسوی	1	مکی دارالکتب، لاہور	۲۰۰۳ء
۱۹۷۷ء	1	جمیل پبلیکشنز، کراچی	۱۹۸۶ء
۴۶۳ھ	24	دارالکتب العلمیة	۱۴۱۷ھ
۱۴۱۹ھ	8	مجلس نشریات اسلام، کراچی	مذکور نہیں
۵۵۵ھ	1	داراحسان، دمشق	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
بیسوی صدی عیسوی	1	مؤسسة ہنداوی، مصر	۲۰۱۲ء
۸۵۴ھ	1	دارالکتب العلمیة	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۴ء
۱۹۸۶ء	1	مقصود اینڈ سنز، کراچی	۱۹۸۵
۳۹۲ھ	1	مکتبہ شاملہ	
۱۳۲۳ھ	1	ادارہ اسلامیات، لاہور	۱۴۱۲ھ۔۱۹۹۲ء
۹۱۱ھ	1	دارالکتب العلمیة	۱۴۱۰ھ۔۱۹۹۰ء
۵۶۵ھ	1	مکتبہ شاملہ	
۴۲۱ھ	7	سروش، تہران	۲۰۰۰ء
	2	مؤسسة الریان، بیروت	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۳ء
۵۴۰ھ	3	دارالکتب العلمیة	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۴ء
	1	عالمی مجلس تحفظ اسلام، پاکستان	مذکور نہیں

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
160	تحقیق منیف الرتبۃ لمن ثبت لہ شریف الصحبۃ	صلاح الدین علائی الدمشقی
161	تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی	جلال الدین سیوطی
162	تذکرۃ الحفاظ (طبقات الحفاظ)	حافظ ذہبی
163	ترتیب المدارک وتقریب المسالک	قاضی عیاض بن موسیٰ المالکی
164	ترجمان القرآن	مولانا ابوالکلام آزاد
165	تطہیر الاعتقاد	محمد بن اسماعیل الصنعانی امیر یمانی محمد بن علی الشوکانی
166	تعجیل المنفعۃ بزوائد رجال ائمۃ الاربعۃ	ابن حجر العسقلانی
167	تعظیم قدر الصلوٰۃ	محمد بن نصر المروزی
168	تفسیر ابن ابی حاتم	ابن ابی حاتم الرازی
169	تفسیر ابن کثیر	حافظ ابن کثیر دمشقی
170	تفسیر الآلوسی (تفسیر روح المعانی)	شہاب الدین محمود آلوسی
171	تفسیر الرازی (مفاتیح الغیب)	امام فخر الدین الرازی
172	تفسیر الطبری (جامع البیان)	ابن جریر الطبری
173	تفسیر القرطبی (الجامع لاحکام القرآن)	شمس الدین الانصاری القرطبی
174	تفسیر ثعلبی	ابواسحٰق الثعلبی
175	تفسیر عبدالرزاق	عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی
176	تفہیم البخاری	مولانا ظہور۔الباری الاعظمی
177	تقریب التہذیب	ابن حجر عسقلانی
178	تقریر بخاری شریف	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی
179	تقویم عہد نبوی	علی محمد خان
180	تقویم تاریخی	مولانا عبدالقدوس ہاشمی
181	تکملہ فتح الملہم	مفتی محمد تقی عثمانی
182	تلخیص المتشابہ فی الرسم	خطیب ابوبکر البغدادی
183	تلخیص کتاب الاستغاثۃ (الاستغاثۃ، الرد علی البکری لابن تیمیۃ)	حافظ ابن کثیر الدمشقی
184	تلقیح فہوم الاثر فی عیون التاریخ والسیر	عبدالرحمن ابن الجوزی
185	تمہید الاوائل وتلخیص الدلائل	ابوبکر باقلانی
186	تہذیب الآثار	ابن جریر الطبری
187	تہذیب الاسماء واللغات	محی الدین شرف النووی

سن اشاعت	ناشر	جلدیں	سن وفات
١٤١٠ھ	دارالعاصمة، الرياض		٧٦١ھ
مذکورنہیں	دارطیبہ	2	٩١١ھ
١٤١٩ھ۔١٩٩٨ء	دارالکتب العلمیة	4	٧٤٨ھ
١٩٨٣ء	مطبعہ فضالة، المغرب	8	٥٤٤ھ
مذکورنہیں	اسلامی اکادمی، لاہور	3	
١٤٢٤ھ	مطبعة سفیر الریاض	1	١١٨٢ھ۔١٢٥٠ھ
١٩٩٦ء	دارالبشائر، بیروت	2	٨٥٢ھ
١٤٠٦ھ	مکتبة الدار، المدینة المنورة	2	٢٩٤ھ
١٤١٩ھ	مکتبة نزار، سعودی عرب	3	٣٢٧ھ
١٤١٩ھ	دارالکتب العلمیة	9	٧٧٤ھ
مذکورنہیں	دارالکتب العلمیة	16	١٢٧٠ھ
١٤٢٠ھ	داراحیاء التراث العربی، بیروت	32	٦٠٦ھ
١٤٢٢ھ	دارہجر	24	٣١٠ھ
١٣٨٤ھ۔١٩٦٤ء	دارالکتب المصریة، قاہرہ	10	٦٧١ھ
١٤٢٢ھ۔٢٠٠٢ء	داراحیاء التراث العربی	10	٤٢٧ھ
١٤١٩ھ	دارالکتب العلمیة	3	٢١١ھ
مذکورنہیں	دارالاشاعت، کراچی	٣	معاصر
١٤٠٦ھ۔١٩٨٦ء	دارالرشید، سوریا	1	٨٥٢ھ
مذکورنہیں	مکتبة الشیخ، کراچی	4	١٤٠٢ھ
٢٠٠٧ء	ڈاکٹر نور محمد یوسف زئی، کراچی	1	١٩٩٧ء
١٩٨٧ء	ادارۃ تحقیقات اسلامیہ، اسلام آباد	1	
	مکتبہ دارالعلوم کراچی	2	معاصر
١٩٨٥ء	طلاس للدراسات والنشر، دمشق	1	٤٦٣ھ
١٤١٧ھ	مکتبة الغرباء الاثریة، المدینة المنورة	1	٧٧٤ھ
١٩٩٧ء	شرکة دارالارقم، بیروت	1	٥٩٧ھ
١٤٠٧ھ۔١٩٨٧ء	مؤسسة الکتب الثقافیة، لبنان	1	٤٠٣ھ
مذکورنہیں	مطبع المدنی، قاہرہ	3	٣١٠ھ
مذکورنہیں	دارالکتب العلمیة	4	٦٧٦ھ

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
188	تہذیب التہذیب	ابن حجر عسقلانی
189	تہذیب الکمال	ابو الحجاج المزی
190	تہذیب اللغۃ	ابو منصور الازہری الہروی
191	توضیح الافکار لمعانی تنقیح الانظار	امیر عز الدین صنعانی
192	توضیح المشتبہ فی ضبط اسماء الرواۃ وانسابہم والقابہم وکناہم	ابو بکر ابن ناصر الدین
	{حرف ث}	
193	الثقات (معرفۃ الثقات من رجال اہل العلم والحدیث)	ابو الحسن احمد بن صالح العجلی الکوفی
194	الثقات لابن حبان	ابن حبان البستی
195	الثقات ممن لم یقع فی الکتب الستۃ	القاسم بن قطلو بغا
196	ثمار القلوب فی المضاف والمنسوب	ابو منصور الثعالبی
	{حرف ج}	
197	الجامع لابن وہب	عبد اللہ ابن وہب
198	الجرح والتعدیل	ابن ابی حاتم الرازی
199	الجہاد	ابو بکر ابن ابی عاصم الشیبانی
200	الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح	احمد بن عبد الحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
201	الجواہر المضیئۃ فی طبقات الحنفیۃ	عبد القادر محی الدین الحنفی
202	الجوہرۃ النیرۃ علی مختصر القدوری	ابو بکر بن علی الحدادی الزبیدی
203	الجوہرۃ فی نسب النبی واصحابہ العشرۃ	محمد بن ابی بکر البری التلمسانی
204	جامع الاحادیث	جلال الدین سیوطی
205	جامع الاصول فی احادیث الرسول	مجد الدین ابن اثیر الجزری
206	جامع المسانید والسنن	حافظ ابن کثیر
207	جامع المسائل	احمد بن عبد الحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
208	جامع بیان العلم وفضلہ	ابن عبد البر
209	جذوۃ المقتبس فی ذکر ولاۃ الاندلس	ابو عبد اللہ المیورقی
210	جمع القرآن حفظا وکتابۃ	دکتور علی بن سلیمان العبید
211	جمہرۃ انساب العرب	ابن حزم الظاہری
212	جوامع السیرۃ النبویۃ	ابن حزم ظاہری

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۸۵۲ھ	12	مطبعہ نظامیہ، حیدرآباد دکن	۱۳۲۶ھ
۷۴۲ھ	35	مؤسسۃ الرسالۃ	۱۴۰۰ھ۔۱۹۸۰ء
۳۷۰ھ	8	داراحیاء التراث العربی	۲۰۰۱ء
۱۱۸۲ھ	۲	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء
۸۴۲ھ	10	مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۹۹۳ء
		{حرف ث}	
۲۶۱ھ	2	مکتبۃ الدار، المدینۃ المنورۃ	۱۴۰۵ھ۔۱۹۸۵ء
۳۵۴ھ	9	مطبعہ نظامیہ، دکن	۱۳۹۳ھ۔۱۹۷۳ء
۸۷۹ھ	8	مرکز النعمان، یمن	۱۴۳۲ھ۔۲۰۱۱ء
۴۲۹ھ	1	دارالمعارف، قاہرہ	مذکور نہیں
		{حرف ج}	
۱۹۷ھ	1	دارالوفاء	۱۴۲۵ھ۔۲۰۰۵ء
۳۲۷ھ	9	داراحیاء التراث العربی	۱۹۵۲ء
۲۸۷ھ	2	مکتبۃ العلوم والحکم، المدینۃ المنورۃ	۱۴۰۹ھ
۷۲۸ھ	6	دارالعاصمۃ، ریاض	۱۴۱۴ھ
۷۷۵ھ	2	میر محمد کتب خانہ، کراچی	مذکور نہیں
۸۰۰ھ	2	المطبعۃ الخیریۃ	۱۳۰۰ھ
۶۴۵ھ		دارالرفاعی، ریاض	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
۹۱۱ھ	13	دکتور حسن عباس ذکی	مکتبہ شاملہ
۶۰۶ھ	12	مکتبۃ دارالبیان	۱۳۹۲ھ۔۱۹۷۲ء
۷۷۴ھ	10	دارخضر، بیروت	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۸ء
۷۲۸ھ	6	دارعالم الفوائد	۱۴۲۲ھ
۴۶۳ھ	2	دارابن الجوزی، السعودیۃ	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۴ء
۴۸۸ھ	1	الدارالمصریۃ، قاہرہ	۱۹۹۶ء
	1	مجمع الملک فہد، المدینۃ المنورۃ	مذکور نہیں
۴۵۶ھ	1	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
۴۵۶ھ	1	دارالکتب العلمیۃ	مذکور نہیں

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
	{حرف ح}	
213	الحاوی الکبیر شرح مختصر المزنی	امام علی بن محمد الماوردی
214	الحجۃ علی اہل المدینۃ	محمد بن الحسن الشیبانی
215	الحسنۃ والسیئۃ	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
216	الحیوان (کتاب الحیوان)	عمرو بن بحر، ابوعثمان الجاحظ
217	حسن المحاضرۃ	جلال الدین سیوطی
218	حقیقۃ السنۃ والبدعۃ	جلال الدین السیوطی
219	حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء	ابونعیم اصبہانی
220	حیاۃ الصحابۃ (عربی)	مولانا محمد یوسف کاندھلوی
	{حرف خ}	
221	الخراج (کتاب الخراج)	قاضی ابویوسف
	{حرف د}	
222	دراسات تاریخیۃ	اکرم ضیاء عمری
223	دلائل النبوۃ	ابوبکر البیہقی
224	الدرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ	ابن حجر عسقلانی
225	دیوان الحماسۃ	ابوتمام
226	دول الاسلام	شمس الدین الذہبی
227	دولۃ الاسلام فی الاندلس	محمد عبداللہ عنان المصری
228	الدیباج المذہب فی معرفۃ اعیان علماء المذہب	ابن فرحون الیعمری
229	الدراری فی الذراری (تذکرۃ الآباء وتسلیۃ الابناء)	ابن عدیم الحلبی
230	الدیباج المذہب فی معرفۃ اعیان علماء المذہب	ابن فرحون الیعمری
231	الدولۃ الفاطمیۃ	محمد علی محمد الصلابی
	{حرف ذ}	
232	الذریۃ الطاہرۃ	ابوبشر الانصاری الدولابی
	{حرف ر}	
233	الرحلۃ فی طلب الحدیث	ابوبکر خطیب بغدادی
234	الرحیق المختوم	مولانا صفی الرحمن مبارک پوری
235	الرد علی من قال بفناء الجنۃ والنار	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
		﴿حرف ح﴾	
۴۵۰ھ	19	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۹ء
۱۸۹ھ	4	عالم الکتب، بیروت	۱۴۰۳ھ
۷۲۸ھ	1	دارالکتب العلمیۃ	مذکورنہیں
۲۵۵ھ	1	دارالکتب العلمیۃ، بیروت	۱۴۲۴ھ
۹۱۱ھ	2	داراحیاء الکتب العربیۃ	۱۳۸۷ھ۔۱۹۶۷ء
۹۱۱ھ	1	مطابع الرشید	۱۴۰۹ھ
۴۳۰ھ	12	السعادۃ	۱۳۹۴ھ۔۱۹۷۴ء
۱۳۸۴ھ	5	مؤسسۃ الرسالۃ	۱۴۲۰ھ۔۱۹۹۹ء
		﴿حرف خ﴾	
۱۸۲ھ	1	المکتبۃ الازہریۃ، مصر	
		﴿حرف د﴾	
معاصر	1	المجلس العلمی، المدینۃ المنورۃ	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
۴۵۸ھ	7	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۰۵ھ
۸۵۲ھ	2	دارالمعرفۃ، بیروت	مذکورنہیں
۲۲۱ھ	1	مکتبۃ البشریٰ	۱۴۳۲ھ۔۲۰۱۱ء
۷۴۸ھ	2	دارصادر، بیروت	۱۹۹۹ء
۱۴۰۶ھ	5	مکتبۃ الخانجی، قاہرہ	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء
۷۹۹ھ	2	دارالتراث، قاہرہ	مذکورنہیں
٢٦٠ھ	1	دارالہدایۃ	۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء
۷۹۹ھ	1	دارالکتب العلمیۃ، بیروت	مذکورنہیں
معاصر	1	مؤسس اقرأ، قاہرہ	۱۴۲۷ھ۔۲۰۰۶ء
		﴿حرف ذ﴾	
۳۱۰ھ	1	الدار السلفیۃ، کویت	۱۴۰۷ھ
		﴿حرف ر﴾	
۴۶۳ھ	1	دارالکتب العلمیۃ	۱۳۹۵ھ
۲۰۰۶ء	1	المکتبۃ السلفیۃ، لاہور	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۰ء
۷۲۸ھ	1	داربلنسیۃ، الریاض	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۶ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
236	الرسائل	عمرو بن بحر، ابوعثمان الجاحظ
237	الرفع والتکمیل	مولانا عبدالحی لکھنوی
238	الروض الانف (تحقیق: عمر عبدالسلام سلامی)	ابوالقاسم السہیلی
239	الروض الباسم فی تراجم شیوخ الحاکم	نایف بن صلاح المنصوری
240	الروض المعطار فی خبر الاقطار	ابوعبداللہ محمد الحمیری
241	الریاض النضرۃ فی مناقب العشرۃ	محب الدین الطبری
242	رأس الحسین	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
243	رجال الکشی (اختیار معرفۃ الرجال) جدید نسخہ	مؤلف: محمد بن عمر بن عبدالعزیز الکشی (م ۵۰ھ) ترتیب وتہذیب: ابوجعفر محمد بن الحسن الطوسی (م ۴۶۰ھ)
244	رجال الکشی (اختیار معرفۃ الرجال) قدیم نسخہ	مؤلف: محمد بن عمر بن عبدالعزیز الکشی (م ۵۰ھ) ترتیب وتہذیب: ابوجعفر محمد بن الحسن الطوسی (م ۴۶۰ھ)
245	رحمۃ للعالمین ﷺ	قاضی سلمان منصور پوری
246	رد المحتار علی الدر المختار	محمد امین ابن عابدین الدمشقی
247	رسالۃ ابی داؤد الی اہل مکۃ	امام ابوداؤد سجستانی
248	رسالۃ طرق حدیث من کنت مولاہ	حافظ ذہبی
249	رفع الاستار	عزالدین محمد بن اسماعیل الصنعانی امیر یمانی
250	روضۃ الاخیار المنتخب من ربیع الابرار	محی الدین الخطیب ابوالقاسم
251	ریاض النفوس	ابوبکر عبداللہ المالکی
	حرف ز	
252	الزہد (کتاب الزہد)	احمد بن حنبل
253	الزہد الکبیر	ابوبکر بیہقی
254	الزہد والرقائق (کتاب الزہد)	عبداللہ بن مبارک
255	زاد المعاد فی ہدی خیر العباد	ابن قیم الجوزیہ
256	زہر الاکم فی الامثال والحکم	نورالدین الیوسی
	حرف س	
257	السنۃ	عبداللہ بن احمد بن حنبل

سن اشاعت	ناشر	جلدیں	سن وفات
۱۳۸۴ھ۔۱۹۶۴ء	مکتبہ خانجی، قاہرہ	4	[illegible]
۱۴۰۷ھ	مکتب المطبوعات الاسلامیہ، حلب	1	[illegible]
۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۰ء	دار احیاء التراث العربی، بیروت	7	[illegible]
۱۴۳۲ھ۔۲۰۱۱ء	دار [illegible] للنشر، ریاض	2	معاصر
۱۹۸۰ء	مؤسسۃ [illegible]، بیروت	1	۵۰۰ھ
مذکور نہیں	دار الکتب العلمیہ	4	[illegible]
		1	[illegible]
۱۴۲۷ھ	مؤسسۃ نشر اسلامی، قم، ایران	1	
	دانش گاہ، مشہد	1	
۲۰۰۷ء	مرکز الحرمین الاسلامی، فیصل آباد	2	۱۹۳۰ء
۱۴۱۳ھ۔۱۹۹۲ء	دار الفکر، بیروت	6	۱۲۵۲ھ
مذکور نہیں	دار العربیہ، بیروت	1	۲۷۵ھ
	مکتبہ شاملہ	1	۷۴۸ھ
۱۴۰۵ھ	المکتب الاسلامی، بیروت	1	۱۱۹۲ھ
۱۴۲۳ھ	دار القلم العربی، حلب	1	۹۴۰ھ
۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۲ء	دار الغرب الاسلامی	2	بعد ۶۰۳ھ
	حرف ز		
۱۴۲۰ھ۔۱۹۹۹ء	دار الکتب العلمیہ	1	۲۴۱ھ
۱۹۹۶ء	مؤسسۃ الکتب الثقافیہ، بیروت	1	۴۵۸ھ
مذکور نہیں	دار الکتب العلمیہ	1	۱۸۱ھ
۱۴۱۵ھ ۱۹۹۴ء	مؤسسۃ الرسالۃ	5	۷۵۱ھ
۱۴۰۱ھ ۱۹۸۱ء	الشرکۃ الجدیدۃ، المغرب	3	۱۱۰۲ھ
	حرف س		
۱۴۰۶ھ	دار ابن القیم، دمام	2	۲۹۰ھ

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
258	السنن الکبریٰ للنسائی	احمد بن شعیب النسائی
259	السنن الصغیر	ابوبکر البیہقی
260	السنن الکبریٰ للبیہقی	ابوبکر البیہقی
261	السیرۃ الحلبیۃ	برہان الدین حلبی
262	السیرۃ النبویۃ	ابوالحسن علی الندوی
263	السیرۃ النبویۃ	ابن حبان البستی
264	السیرۃ النبویۃ	محمد علی محمد الصلابی
265	السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ محاولۃ لتطبیق قواعد المحدثین فی نقد روایات السیرۃ النبویۃ	دکتور اکرم ضیاء العمری
266	السیرۃ النبویۃ من البدایۃ والنہایۃ	حافظ ابن کثیر
267	السیرۃ والدعوۃ فی العہد المدنی	احمد غلوش
268	السیف المسلول علی من سب الرسول	تقی الدین بن عبد الکافی السبکی
269	سبل الہدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد	محمد بن یوسف الصالحی الشامی
270	سمط نجوم العوالی فی انباء الاوائل والتوالی	عبدالملک العصامی المکی
271	سنن ابن ماجہ	محمد ابن یزید، ابن ماجۃ قزوینی
272	سنن ابی داؤد	ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی
273	سنن الترمذی	محمد بن عیسیٰ الترمذی
274	سنن الدارقطنی	ابوالحسن الدارقطنی
275	سنن الدارمی	عبداللہ بن عبدالرحمن الدارمی
276	سنن سعید بن منصور	سعید بن منصور شعبۃ الخراسانی
277	سنن نسائی (المجتبیٰ)	احمد بن شعیب النسائی
278	سوالات الآجری لابی داؤد	ابوداؤد السجستانی
279	سیر اعلام النبلاء	شمس الدین الذہبی
280	سیرت ابن اسحٰق	محمد بن اسحٰق بن یسار المدنی
281	سیرت ابن ہشام	عبدالملک بن ہشام
282	سیرت النبی	علامہ شبلی نعمانی
283	سیرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم	مفتی محمد شفیع
284	سیرت خلفائے راشدین	مولانا عبدالشکور لکھنوی فاروقی
285	سیرت عمر بن عبدالعزیز	عبداللہ بن عبدالحکم المصری

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۴۰۳ھ	12	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۱ء
۴۵۸ھ	4	جامعۃ الدراسات الاسلامیہ، کراچی	۱۴۱۰ھ۔۱۹۸۹ء
۴۵۸ھ	10	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۳ء
۱۰۴۴ھ	3	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۲۷ھ
۱۹۹۹ء	1	دوحہ، قطر	۱۴۰۰ھ
۳۵۴ھ	2	الکتب الثقافیۃ، بیروت	۱۴۱۷ھ
معاصر	1	دار المعرفۃ، بیروت	۱۴۲۹ھ۔۲۰۰۸ء
معاصر	2	مکتبۃ العلوم والحکم، المدینۃ المنورۃ	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۴ء
۷۷۴ھ	4	دار المعرفۃ، بیروت	۱۳۹۵ھ۔۱۹۷۶ء
معاصر	1	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۴ء
۷۵۶ھ	1	دار الفتح، عمان، اردن	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۰ء
۹۴۲ھ	12	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۳ء
۱۱۱۱ھ	4	دار الکتب العلمیہ، بیروت	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۸ء
۲۷۳ھ	2	دار احیاء الکتب العربیہ	مذکور نہیں
۲۷۵ھ	4	المکتبۃ العصریہ، صیدا، بیروت	مذکور نہیں
۲۷۹ھ	5	مصطفی البابی الحلبی، قاہرہ	۱۹۷۵ء
۳۸۵ھ	5	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۴ء
۲۵۵ھ	4	دار المغنی، السعودیۃ	۱۴۱۲ھ
۲۲۷ھ	2	دار السلفیۃ، ہند	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۲ء
۳۰۳ھ	8	مکتب المطبوعات الاسلامیہ، حلب	۱۴۰۶ھ۔۱۹۸۶ء
	1	الجامعۃ الاسلامیۃ، المدینۃ المنورۃ	۱۳۹۹ھ۔۱۹۷۹ء
۷۴۸ھ	25	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۰۵ھ۔۱۹۸۵ء
۱۵۱ھ	1	دار الفکر، بیروت	۱۳۹۸ھ۔۱۹۷۸ء
۲۱۳ھ	2	مطبع مصطفی البابی الحلبی، قاہرہ	۱۳۷۵ھ۔۱۹۵۵ء
۱۹۱۴ء	7	دینی کتب خانہ، لاہور	۱۹۷۵ء
۱۳۹۶ھ۔۱۹۷۶ء	1	دار الاشاعت، کراچی	مذکور نہیں
۱۹۶۲ء	1	کتب خانہ مجیدیہ، ملتان	مذکور نہیں
۲۱۴ھ	1	عالم الکتب، بیروت	۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
286	سیرت ومناقب عمر بن عبدالعزیز	ابن الجوزی
	﴿حرف ش﴾	
287	شذرات الذہب فی خبر من ذہب	ابن عماد الحنبلی
288	شریعت وطریقت کا تلازم	شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی
289	الشذ الفیاح من علوم ابن الصلاح	لابی اسحق الابناسی
290	الشریعۃ	ابوبکر الآجری البغدادی
291	الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ	القاضی عیاض بن موسیٰ یحصبی
292	الشماریخ فی علم التاریخ	جلال الدین سیوطی
293	الشمائل المحمدیۃ (شمائل الترمذی)	محمد بن عیسیٰ الترمذی
294	الشیعۃ والتشیع	احسان الٰہی ظہیر
295	شرح عقائد نسفی	سعد الدین تفتازانی
296	شرح الاربعین النوویۃ	محمد بن صالح العثیمین
297	شرح التبصرۃ والتذکرۃ، الفیۃ العراقی	الحافظ زین الدین العراقی
298	شرح الزرقانی علی المواہب اللدنیۃ	ابوعبداللہ الزرقانی المالکی
299	شرح السنۃ	ابومحمد ابن الفراء البغوی
300	شرح السنۃ	اسماعیل بن یحییٰ المزنی
301	شرح صحیح مسلم (المنہاج)	امام شرف النووی
302	شرح عقود رسم المفتی	علامہ ابن عابدین شامی
303	شرح مشکل الآثار	ابوجعفر الطحاوی
304	شرح معانی الآثار	ابوجعفر الطحاوی
305	شرح نخبۃ الفکر	ملا علی قاری
306	شرف المصطفیٰ	ابوسعد الخرکوشی
307	شعب الایمان	ابوبکر بیہقی
308	شہادت امام حسین وکردار یزید (اردو ترجمہ از مولانا انوار الحسن شیر کوٹی)	مولانا محمد قاسم نانوتوی
	﴿حرف ص﴾	
309	الصحاح تاج اللغۃ	ابونصر الجوہری الفارابی
310	الصواعق المحرقۃ علیٰ اہل الرفض والضلال والزندقۃ	ابن حجر ہیثمی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۵۹۷ھ	1	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۲۲ھ۔۲۰۰۱ء
		حرف ش	
۱۰۸۹ء	11	دار ابن کثیر، دمشق	۱۴۰۶ھ۔۱۹۸۶ء
۱۴۰۲ھ۔۱۹۸۲ء	1	مکتبۃ الشیخ، کراچی	۱۹۹۳ء
۸۰۲ھ	2	مکتبۃ الرشد	۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۸ء
۳۶۰ھ	5	دار الوطن سعودیہ	۱۴۲۰ھ۔۱۹۹۹ء
۵۴۴ھ	2	دارالفکر	۱۴۰۹ء۔۱۹۸۸ء
۹۱۱ھ	1	مکتبۃ الآداب	مذکور نہیں
۲۷۹ھ	1	دار احیاء التراث العربی	مذکور نہیں
۱۴۰۷ھ	1	ادارہ ترجمان السنۃ، لاہور	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۵ء
۷۹۴ھ	1	مکتبۃ البشریٰ، کراچی	۱۴۳۰ھ
۱۴۲۱ھ	1	دار الثریا للنشر	۱۳۹۶ھ۔۱۹۷۶ء
۸۰۶ھ	2	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۲۳ھ۔۲۰۰۲ء
۱۱۲۲ھ	12	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۶ء
۵۱۶ھ	13	المکتب الاسلامی، دمشق	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
۲۶۴ھ	1	مکتبۃ الغرباء الاثریۃ، السعودیۃ	۱۴۱۵ھ ۱۹۹۵ء
۶۷۶ھ	6	دار احیاء التراث العربی، بیروت	۱۳۹۲ھ
۱۲۵۷ھ	1	مکتبۃ البشریٰ	۱۴۳۰ھ
۳۲۱ھ	16	مؤسسۃ الرسالۃ	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۴ء
۳۲۱ھ	5	عالم الکتب	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۴ء
۱۰۱۴ھ	1	دار الارقم، بیروت	مذکور نہیں
۳۰۷ھ	2	دار البشائر الاسلامیہ، مکہ	۱۴۲۴ھ
۳۵۸ھ	14	مکتبۃ الرشد	۱۴۲۳ھ۔۲۰۰۳ء
۱۳۹۷ھ	1	تحریک خدام اہل سنت والجماعت، لاہور	مذکور نہیں
		حرف ص	
۳۹۳ھ	6	دار العلم، بیروت	۱۴۰۷ھ ۱۹۸۷ء
۹۷۳ھ	2	مؤسسۃ الرسالۃ	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
311	صب العذاب علی من سب الاصحاب	علامہ محمود آلوسی
312	صحیح البخاری	محمد بن اسماعیل البخاری
313	صحیح مسلم	مسلم بن الحجاج القشیری
314	صفۃ الصفوۃ	عبدالرحمن ابن جوزی
315	صفۃ النفاق وذم المنافقین	ابوجعفر ابوبکر الفریابی
316	صفۃ جزیرۃ الاندلس	ابوعبداللہ الحمیری
	{حرف ض}	
317	الضعفاء الکبیر	ابوجعفر العقیلی المکی
318	الضعفاء والمتروکون	احمد بن شعیب النسائی
319	الضعفاء والمتروکون	عبدالرحمن ابن الجوزی
	{حرف ط}	
320	الطبقات السنیۃ فی تراجم الحنفیۃ	تقی الدین تمیمی
321	طبقات المحدثین باصبہان والواردین علیہا	ابی الشیخ الاصبہانی
322	طبقات ابن سعد (الطبقات الکبریٰ) جزء متمم الصحابۃ الطبقۃ الخامسۃ	محمد بن سعد
323	طبقات ابن سعد (الطبقات الکبریٰ) جزء متمم الصحابۃ الطبقۃ الرابعۃ	محمد بن سعد
324	طبقات ابن سعد (الطبقات الکبریٰ) نوٹ: اکثر مقامات پر طبقات ابن سعد دارصادر کا نسخہ استعمال کیا گیا ہے۔	محمد بن سعد
325	طبقات ابن سعد (الطبقات الکبریٰ)	محمد بن سعد
326	طبقات الاطباء	ابن ابی اُصَیبعہ
327	طبقات الامم	قاضی ابن ساعد الاندلسی
328	طبقات الاولیاء	ابن ملقن المصری
329	طبقات الحنابلۃ	ابوالحسین ابن ابی یعلی
330	طبقات الصوفیۃ	عبدالرحمن السلمی نیشاپوری
331	طبقات الفقہاء	ابواسحق شیرازی
332	طبقات الفقہاء الشافعیۃ	ابن الصلاح
333	طبقات المدلسین (تعریف اہل التقدیس بمراتب الموصوفین بالتدلیس)	ابن حجر عسقلانی
334	طبقات المفسرین	جلال الدین سیوطی
335	طبقات المفسرین	احمد بن محمد الاد نہوی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۱۳۴۲ھ	1	اضواء السلف، ریاض	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء
۲۵۶ھ	9	دار طوق النجاۃ	۱۴۲۲ھ
۲۶۱ھ	5	دار الجیل	۱۳۷۴ھ۔۱۹۵۴ء
۵۹۷ھ	2	دار الحدیث قاہرۃ، مصر	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۰ء
۳۰۱ھ	1	دار الصحابۃ للتراث، مصر	۱۴۰۸ھ ۱۹۸۸ء
۹۰۰ھ	1	دار الجیل، بیروت	۱۴۰۸ھ۔۱۹۸۸ء
		{حرف ض}	
۳۲۲ھ	4	دار المکتبۃ العلمیۃ بیروت	۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء
۳۰۳ھ	1	دار الوعی، حلب	۱۳۹۶ھ
۵۹۷ھ	3	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۰۶ھ
		{حرف ط}	
۱۰۱۰ھ	1	مکتبہ شاملہ	
۳۶۹ھ	4	موسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۴۱۲ھ۔۱۹۹۲ء
۲۳۰ھ	2	مکتبۃ الصدیق، طائف	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۳ء
۲۳۰ھ	1	مکتبۃ الصدیق، طائف	۱۴۱۶ھ
۲۳۰ھ	8	دار صادر	۱۹۶۸ء
۲۳۰ھ	8	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۰ھ۔۱۹۹۰ء
۶۶۸ھ	1	مکتبہ شاملہ	
۴۶۲ھ	1	بیروت	۱۹۱۲ء
۸۰۴ھ	1	مکتبۃ الخانجی، قاہرہ	۱۴۱۵ھ ۱۹۹۴ء
۵۲۶ھ	2	دار المعرفۃ، بیروت	مذکور نہیں
۴۱۲ھ	1	دار الکتب العلمیہ	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۸ء
۴۷۶ھ	1	دار الرائد العربی، بیروت	۱۹۷۰ء
۶۴۳ھ	2	دار البشائر الاسلامیہ، بیروت	۱۹۹۲ء
۸۵۲ھ	1	مکتبۃ المنار	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
۹۱۱ھ	1	مکتبۃ وہبہ قاہرہ	۱۳۹۶ھ
گیارہویں صدی ہجری	1	مکتبۃ العلوم والحکم، سعودیہ	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
	حرف ع	
336	العاشر من المشیخۃ البغدادیۃ	ابوطاہر السلفی
337	العبر فی خبر من غبر	حافظ شمس الدین الذہبی
338	العرش	حافظ ذہبی
339	العرف الشذی شرح سنن الترمذی	مولانا انور شاہ کشمیری
340	العقائد النسفیۃ	عمر بن محمد ابوحفص النسفی
341	العقد الفرید	ابوعمر ابن عبدربہ
342	العقیدۃ الطحاویۃ (مع تعلیقات الالبانی)	ابوجعفر الطحاوی
343	العقیدۃ الواسطیۃ	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
344	العقیدۃ الواسطیۃ	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
345	العلل ومعرفۃ الرجال	احمد بن حنبل
346	العلو للعلی الغفار	حافظ ذہبی
347	العنایۃ شرح البدایۃ	محمد بن محمد ابن الشیخ البابرتی
348	العواصم من القواصم	ابوبکر ابن العربی
349	العواصم والقواصم	ابن الوزیر القاسمی
350	العیون والحدائق فی اخبار الحقائق (جزء خلافۃ الولید بن عبدالملک) مع تجارب الامم وتعاقب الہمم لابن مسکویہ	نامعلوم
351	عارضۃ الاحوذی بشرح صحیح الترمذی	ابن العربی المالکی
352	عصر الخلافۃ الراشدۃ۔ محاولۃ لنقد الروایۃ التاریخیۃ وفق مناہج المحدثین	اکرم ضیاء عمری
353	عمدۃ الطالب فی انساب آل ابی طالب	ابن عنبہ جمال الدین الحسینی
354	عمدۃ القاری	بدرالدین عینی الحنفی
355	عمل الیوم واللیلۃ	ابراہیم بن بدیح، ابن السنی
356	عہد نبوی کے میدان جنگ	ڈاکٹر حمید اللہ حیدرآبادی
357	عون المعبود شرح سنن ابی داؤد	شرف الحق صدیقی عظیم آبادی
358	عیون الاخبار	ابن قتیبۃ الدینوری
359	عیون الانباء فی طبقات الاطباء	ابن ابی اصیبعۃ
360	عیون الرسائل والاجوبۃ عن المسائل	شیخ عبداللطیف بن عبدالرحمن آل شیخ

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
		حرف ع	
۵۷۶ھ	1	مکتبہ شاملہ	مذکور نہیں
۷۴۸ھ	4	دار الکتب العلمیۃ	مذکور نہیں
۷۴۸ھ	1	عمادۃ البحث العلمی، الجامعۃ الاسلامیۃ، المدینۃ المنورۃ	۱۴۲۴،۲۰۰۳ھ
۱۳۵۳ھ	5	دار التراث العربی	۱۴۲۵ھ۔۲۰۰۴ء
۵۳۷ھ	1	ضمیمہ شرح العقائد النسفیۃ مطبوعۃ المکتبۃ البشری	۱۴۳۰ھ۔۲۰۰۹ء
۳۲۸ھ	8	دار الکتب العلمیۃ، بیروت	۱۴۰۴ھ
۳۲۱ھ	1	المکتب الاسلامی، بیروت	۱۴۱۴ھ
۷۲۸ھ	1	اضواء السلف، ریاض	۱۹۹۹ء
۷۲۸ھ	1	اضواء السلف	۱۴۲۰ھ۔۱۹۹۹ء
۲۴۱ھ	3	دار الخانی، ریاض	۱۴۲۲ھ
۷۴۸ھ	1	مکتبۃ اضواء السلف، ریاض	۱۴۱۶ھ۔۱۹۹۵ء
۷۸۶ھ	10	دار الفکر	مذکور نہیں
۵۴۳ھ	1	دار الجیل، بیروت	۱۴۹۷ھ۔۱۹۸۷ء
۸۴۰ھ	9	مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۴ء
نامعلوم	1	لیڈن، ہالینڈ	۱۸۷۱ء
۵۴۳ھ	13	دار الکتب العلمیۃ	مذکور نہیں
معاصر	1	مکتبۃ العبیکان	۱۴۳۰ھ۔۲۰۰۹ء
۸۲۸ھ	2	مطبعہ حیدریہ، نجف	۱۹۶۹ء
۸۵۵ھ	25	دار احیاء التراث العربی	مذکور نہیں
۳۶۴ھ	1	دار القبلۃ للثقافۃ الاسلامیۃ بیروت	مذکور نہیں
۱۴۲۳ھ۔۲۰۰۲ء	1	ادارہ اسلامیات، لاہور	۱۹۸۲ء
۱۳۲۹ھ	14	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۵ھ
۲۷۶ھ	4	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۸ھ
۶۶۸ھ	1	دار مکتبۃ الحیاۃ، بیروت	مذکور نہیں
۱۲۹۳ھ	2	مکتبۃ الرشد، ریاض	مذکور نہیں

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
	﴿حرف غ﴾	
361	الغایۃ فی شرح الہدایۃ فی علم الراویۃ	شمس الدین السخاوی
362	غایۃ المقصد فی زوائد المسند	نور الدین ہیثمی
	﴿حرف ف﴾	
363	الفاروق	علامہ شبلی نعمانی
364	الفتاویٰ الکبریٰ	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
365	الفتاویٰ الہندیۃ (فتاویٰ عالمگیری)	لجنۃ الفقہاء من الہند
366	الفتنۃ ووقعۃ الجمل	سیف بن عمر تمیمی
367	الفخری فی الآداب السلطانیۃ والدول الاسلامیۃ	ابن الطقطقیٰ، محمد بن علی ابن طباطبا
368	الفرق بین الفرق	ابو منصور عبدالقاہر الاسفرائینی البغدادی
369	الفروق اللغویۃ	ابو ہلال العسکری
370	الفصل فی الملل والاہواء والنحل	ابن حزم الظاہری
371	الفصول فی الاصول	امام ابوبکر الجصاص الرازی
372	الفصول فی السیرۃ	حافظ ابن کثیر
373	الفقہ الابسط	امام ابوحنیفہ
374	الفقہ الاسلامی وادلتہ	وہبۃ الزحیلی
375	الفقہ الاکبر	امام ابوحنیفہ
376	الفقہ الاکبر	امام ابوحنیفہ
377	الفقہ المیسر فی ضوء الکتاب والسنۃ	مجموعۃ من المؤلفین
378	الفقہ علیٰ مذاہب الاربعۃ	عبدالرحمن الجزیری
379	الفہرست	ابن ندیم بغدادی
380	فتاویٰ ابن الصلاح	ابن الصلاح
381	فتاویٰ رشیدیہ	مولانا رشید احمد گنگوہی
382	فتاویٰ عثمانی	مفتی محمد تقی عثمانی
383	فتح الباری	حافظ ابن حجر عسقلانی
384	فتح الباری	ابن رجب حنبلی
385	فتح القدیر	کمال الدین ابن الہمام سیواسی
386	فتح القدیر	محمد بن علی الشوکانی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
حرف غ			
۹۰۲ھ	1	مکتبۃ اولاد الشیخ للتراث	۲۰۰۱ء
۸۰۷ھ	4	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۲۱ھ ۲۰۰۱ء
حرف ف			
۱۹۱۴ء	1	دار الاشاعت	۱۹۹۱ء
۷۲۸ھ	6	دار الکتب العلمیۃ، بیروت	۱۴۰۸ھ۔۱۹۸۷ء
نحو ۱۱۰۰ھ	6	دار الفکر	۱۳۱۰ھ
۲۰۰ھ	1	دار النفائس	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۳ء
۷۰۹ھ	1	دار القلم العربی، بیروت	۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۷ء
۴۲۹ھ	1	دار الآفاق الجدیدہ، بیروت	۱۹۷۷ء
۳۹۵ھ	1	دار العلم والثقافۃ، المصر	مذکور نہیں
۴۵۶ھ	5	مکتبۃ الخانجی، قاہرہ	مذکور نہیں
۳۷۰ھ	4	وزارۃ الاوقاف الکویتیۃ	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۴ء
۷۷۴ھ	1	موسسۃ علوم القرآن	۱۴۰۳ھ
۱۵۰ھ	1	مکتبۃ الفرقان، الامارات العربیۃ	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۹ء
۲۰۱۵ء	10	دار الفکر، دمشق	مذکور نہیں
۱۵۰ھ	1	مکتبۃ الفرقان، الامارات العربیۃ	۱۹۹۹ء
۱۵۰ھ	1	مکتبۃ الفرقان، الامارات العربیۃ	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۹ء
معاصرین	1	مجمع الملک فہد	۱۴۲۴ھ
۱۳۶۰ھ	5	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۳ء
۴۳۸ھ	1	دار المعرفۃ، بیروت	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء
۶۴۳ھ	1	مکتبۃ العلوم والحکم	۱۴۰۷ھ
۱۳۲۳ھ	1	دار الاشاعت	۲۰۰۳ء
معاصر		مکتبۃ معارف القرآن، کراچی	۱۴۳۱ھ۔۲۰۱۰ء
۸۵۲ھ	13	دار المعرفۃ، بیروت	۱۳۷۹ھ
۷۹۵ھ	9	دار الحرمین، قاہرہ	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۶ء
۸۶۱ھ	10	دار الفکر	مذکور نہیں
۱۲۵۰ھ	6	دار ابن کثیر	۱۴۱۴ھ

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
387	فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث	شمس الدین السخاوی
388	فتح مصر	جمال عبدالہادی
389	فتح نامہ سندھ (چچ نامہ)	ابوحامد الکوفی
390	فتنہ مقتل عثمان	محمد بن عبداللہ غبان الصبحی
391	فتنہ استشراق	علامہ شمس الحق افغانی
392	فتوح البلدان	احمد بن یحییٰ البلاذری
393	فتوح الشام الازدی	محمد بن عبداللہ الازدی
394	فتوح الشام للواقدی	محمد بن عمر الواقدی
395	فتوح مصر والمغرب	عبدالرحمن بن عبدالحکم ابوالقاسم المصری
396	فجر الاسلام	احمد امین
397	فرق الشیعہ	حسن بن موسیٰ النوبختی
398	فضائح الباطنیۃ	امام غزالی
399	فضائل الصحابۃ	امام احمد بن حنبل
	﴿حرف ق﴾	
400	القاموس الجدید (عربی سے اردو)	وحید الزمان کیرانوی
401	قاعدۃ فی المؤرخین	تاج الدین السبکی
402	قصۃ الحضارۃ	ولیم جیمس ڈیورآنٹ، تعریب: دکتور زکی نجیب
403	قصۃ العرب فی اسبانیا (دی اسٹوری آف مورس ان اسپین) تعریب: علی جازم بک	اسٹینلے۔لین پول
404	قصص من التاریخ	علی الطنطاوی
405	قضایا المرأۃ فی المؤتمرات الدولیۃ	دکتور فؤاد بن عبدالکریم
406	قواعد فی علوم الحدیث (اعلاء السنن جزء:۱۸)	مولانا ظفر احمد عثمانی
407	قوت القلوب	ابوطالب المکی
	﴿حرف ک﴾	
408	کیف نقرأ تاریخ الآل والاصحاب	عبدالکریم بن خالد الحربی
409	الکاشف فی معرفۃ من لہ روایۃ فی الکتب الستۃ	حافظ ذہبی
410	الکافی فی فقہ الامام احمد	ابن قدامۃ المقدسی
411	الکامل فی التاریخ	ابن اثیر الجزری
412	الکامل فی اللغۃ والادب	ابوالعباس المبرد

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۹۰۲ھ	4	مکتبۃ السنۃ،مصر	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۳ء
معاصر	1	دارالوفاء	۱۹۹۹ء
۶۱۳ھ،	1	مجلس مخطوطات فارسیہ،دکن	۱۹۳۹ء
معاصر	2	عمادۃ البحث العلمی، المدینۃ المنورۃ	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۳ء
۱۴۰۳ھ	1	صدیقی ٹرسٹ،کراچی	
۲۷۹ھ	1	دارومکتبۃ الہلال بیروت	۱۹۸۸ء
۱۶۵ھ	1	بپتسمہ مشن،کلکتہ	۱۸۵۴ء
۲۰۷ھ	2	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء
۲۵۷ھ	1	مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ	۱۴۱۵ھ
۱۳۷۳ھ	1	دارالکتاب العربی، بیروت	۱۹۳۳ء
تیسری صدی ہجری	1	مکتبہ حیدریہ،نجف	مذکورنہیں
۵۰۵ھ	1	موسسۃ دارالثقافۃ،کویت	مذکورنہیں
۲۴۱ھ	2	موسسۃ الرسالۃ	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
		حرف ق	
۱۹۹۵ء	1	ادارہ اسلامیات،لاہور	۱۴۱۱ھ۔۱۹۹۰ء
۷۷۱ھ	1	دارالبشائر، بیروت	۱۴۱۰ھ۔۱۹۹۰ء
۱۹۸۱ء	42	دارالجیل، بیروت	۱۴۰۸ھ۔۱۹۸۸ء
۱۹۳۱ء	1	کلمات عربیۃ،قاہرہ	۱۹۳۴ء
۱۴۲۰ھ	1	دارالمنارۃ،سعودیہ	۱۴۲۷ھ
معاصر	1	مکتبہ شاملہ	
۱۳۹۴ھ	1	دارالفکر	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۱ء
۳۸۶ھ	2	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۲۶ھ۔۲۰۰۵ء
		حرف ک	
معاصر	1	دارالکتب المصریۃ	۱۴۲۷ھ۔۲۰۰۶ء
۷۴۸ھ	2	دارالقبلۃ،جدۃ	۱۴۱۳ھ۔۱۹۹۲ء
۶۲۰ھ	4	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۴ء
۶۳۰ھ	10	دارالکتاب العربی، بیروت	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء
۲۸۵ھ	4	دارالفکر العربی،قاہرہ	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
413	الکامل فی ضعفاء الرجال	ابواحمد ابن عدی
414	الکفایۃ فی علم الروایۃ	خطیب البغدادی
415	الکنیٰ والاسماء	مسلم بن حجاج نیشاپوری
416	الکواکب الدراری فی شرح صحیح البخاری	شمس الدین الکرمانی
417	الکوثر الجاری الی ریاض احادیث البخاری	احمد بن اسماعیل الکورانی
418	کتاب الآثار	قاضی ابویوسف
419	کتاب الاذکیاء	عبدالرحمن ابن الجوزی
420	کتاب الولاۃ وکتاب القضاۃ (کتاب ولاۃ مصر)	ابوعمر الکندی
421	کتاب سلیم بن قیس الہلالی (تحقیق: باقر انصاری)	سلیم بن قیس الہلالی
422	کشف اسرار الباطنیۃ واخبار القرامطۃ	محمد بن مالک یمانی
423	کشف الاستار عن زوائد البزار	نورالدین ہیثمی
424	کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون (مع ایضاح المکنون)	حاجی خلیفہ کاتب چلپی
425	کشف المشکل من حدیث الصحیحین	عبدالرحمن ابن الجوزی
426	کنز الدقائق	عبداللہ بن احمد حافظ الدین النسفی
427	کنز العمال	علامہ علی متقی برہان پوری
	حرف ل	
428	اللباب الانساب	ابن فندمہ البیہقی
429	لباب النقول فی اسباب النزول	جلال الدین سیوطی
430	لسان العرب	ابن منظور الافریقی
431	لسان المیزان	ابن حجر عسقلانی
432	لوامع الانوار البہیۃ	ابوالعون السفارینی الحنبلی
	حرف م	
433	المامون	شبلی نعمانی
434	المبدع فی شرح المقنع	برہان الدین ابن مفلح
435	المبدع فی شرح المقنع	برہان الدین ابواسحاق ابراہیم
436	المبسوط	محمد بن احمد ابوسہل السرخسی
437	المتفق والمفترق	خطیب بغدادی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۳۶۵ھ	9	الکتب العلمیہ	۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۷ء
۴۶۳ھ	1	المکتبۃ العلمیۃ، المدینۃ المنورہ	مذکورنہیں
۲۶۱ھ	2	عمادۃ البحث العلمی الجامعۃ الاسلامیہ، المدینۃ المنورۃ	۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء
۷۸۶ھ	25	داراحیاء التراث العربی، بیروت	۱۴۰۱ھ۔۱۹۸۱ء
۸۹۳ھ	11	داراحیاء التراث العربی، بیروت	۱۴۲۹ھ۔۲۰۰۸ء
۱۸۲ھ	1	دارالکتب العلمیہ	مذکورنہیں
۵۹۷ھ	1	مکتبۃ الغزالی	مذکورنہیں
۳۵۵ھ	1	دارالکتب العلمیہ	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۳ء
نامعلوم	1	انتشارات دلیل ما، تہران	۱۴۲۸ھ
۴۷۰ھ	1	مکتبۃ الساعی، ریاض	مذکورنہیں
۸۰۷ھ	4	مؤسسۃ الرسالۃ	۱۳۹۹ھ۔۱۹۷۹ء
۱۰۶۷ھ	6	دارالکتب العلمیہ	۱۹۴۱ء
۵۹۷ھ	4	دارالوطن، الریاض	مذکورنہیں
۷۰۱ھ	1	دارالبشائر الاسلامیہ	۱۴۳۲ھ۔۲۰۱۱ء
۹۷۵ھ	16	مؤسسۃ الرسالۃ	۱۴۰۱ھ۔۱۹۸۱ء
		حرف ل	
۵۶۵ھ	1	مکتبہ شاملہ	مذکورنہیں
۹۱۱ھ	1	دارالکتب العلمیہ بیروت	مذکورنہیں
۷۱۱ھ	15	دارصادر، بیروت	۱۴۱۴ھ
۸۵۲ھ	7	مطبعہ نظامیہ، حیدرآباد دکن	۱۳۹۰ھ۔۱۹۷۱ء
۱۱۸۸ھ	1	مؤسسۃ الخافقین	۱۴۰۲ھ۔۱۹۸۲ء
		حرف م	
۱۹۱۴ء	1	دارالمصنفین اعظم گڑھ، یوپی	۱۸۸۹ء
۸۸۴ھ	8	دارالکتب العلمیہ	۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۷ء
۸۸۴ھ	8	دارالکتب العلمیہ	۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۷ء،
۴۸۳ھ	30	دارالمعرفۃ، بیروت	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۳ء
۴۶۳ھ	3	دارالقادری، دمشق	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
438	المجالسۃ وجواہر العلم	ابوبکر الدینوری المالکی
439	المجروحین من المحدثین والضعفاء والمتروکین	ابن حبان البستی
440	المجموع شرح المہذب	محی الدین شرف النووی
441	المحاسن والمساوی	ابراہیم بن محمد بیہقی
442	المحبر	محمد بن حبیب الہاشمی ابوجعفر البغدادی
443	المحتضرین	ابن ابی الدنیا
444	المحرر فی الفقہ علیٰ مذہب الامام احمد بن حنبل	عبدالسلام ابن تیمیۃ الحرانی
445	المحن	ابوالعرب التمیمی
446	المختار من نوادر الاخبار	محمد بن احمد بن اسماعیل المقری الابیاری
447	المختصر الکبیر فی سیرۃ الرسول	عبدالعزیز ابن جماعۃ الکنانی
448	المختصر فی اخبار البشر	ابوالفداء
449	المختصر فی علم التاریخ	محی الدین الکافیجی
450	المراسیل	ابن ابی حاتم
451	المرقبۃ العلیا فیمن یستحق القضاء والفتیا (تاریخ قضاۃ الاندلس)	ابوالحسن المالقی
452	المزہر فی علوم اللغۃ وانواعہا	جلال الدین سیوطی
453	المسائل والاجوبۃ	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
454	المستدرک علی الصحیحین	حاکم نیشاپوری
455	المسلمون وکتابۃ التاریخ	دکتور عبدالعلیم عبدالرحمن خضر
456	المصاحف	ابوبکر ابن ابی داؤد سجستانی
457	المصفی شرح الموطا مع المسوی	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
458	المعارف	ابن قتیبۃ الدینوری
459	المعالم الاثیرۃ فی السنۃ والسیرۃ	محمد بن محمد حسن شراب
460	المعجم الاوسط	ابوالقاسم الطبرانی
461	المعجم الصغیر	ابوالقاسم الطبرانی
462	المعجم الکبیر	ابوالقاسم الطبرانی
463	المعجم الکبیر المجلدان: الثالث عشر والرابع عشر	ابوالقاسم الطبرانی
464	المعرفۃ والتاریخ	یعقوب بن سفیان الفسوی
465	المعین فی طبقات المحدثین	حافظ شمس الدین الذہبی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۳۳۳ھ	10	جمعیۃ التربیۃ الاسلامیۃ، بحرین	۱۴۱۹ھ
۳۵۴ھ	3	دار الوعی، حلب	۱۳۹۶ھ
۶۷۶ھ	1	دار الفکر	مذکور نہیں
۳۲۰ھ	1	مکتبہ شاملہ	مذکور نہیں
۲۴۵ھ	1	دار الآفاق، بیروت	مذکور نہیں
۲۸۱ھ	1	دار ابن حزم، بیروت	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء
۶۵۲ھ	2	مکتبۃ المعارف، ریاض	۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء
۳۳۳ھ	1	دار العلوم، الریاض	۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء
ساتویں صدی ہجری	1	دار کنان، بغداد	۱۴۳۲ھ۔۲۰۱۱ء
۷۶۷ھ	1	دار البشیر، عمان	۱۹۹۳ء
۷۳۲ھ	4	المطبعۃ الحسینیۃ المصریۃ	مذکور نہیں
۸۷۹ھ	1	عالم الکتب	۱۴۱۰ھ۔۱۹۹۰ء
۳۲۷ھ	1	موسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۳۹۷ھ
۷۹۴ھ	1	دار الآفاق الجدیدۃ، بیروت	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
۹۱۱ھ	2	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۸ء
۷۲۸ھ	1	الفاروق الحدیثۃ	۱۴۲۵ھ۔۲۰۰۴ء
۴۰۵ھ	4	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۱ھ۔۱۹۹۰ء
معاصر	1	المعہد العالمی للفکر الاسلامی	۱۹۸۹ء
۳۱۶ھ	1	الفاروق الحدیثۃ، مصر	۱۴۲۳ھ۔۲۰۰۲ء
۱۱۷۶ھ	اول و دوم یکجا	مطبع فاروقی، دہلی	۱۲۹۳ھ
۲۷۶ھ	1	الہیئۃ المصریۃ العامۃ، قاہرہ	۱۹۹۲ء
معاصر	1	دار القلم، دمشق	۱۴۱۱ھ
۳۶۰ھ	10	دار الحرمین، قاہرہ	مذکور نہیں
۳۶۰ھ	2	دار عمار، بیروت	۱۴۰۵ھ۔۱۹۸۵ء
۳۶۰ھ	25	مکتبۃ ابن تیمیۃ	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۴ء
۳۶۰ھ	2	دکتور سعد بن عبداللہ	مذکور نہیں
۲۷۷ھ	3	موسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۴۰۱ھ۔۱۹۸۱ء
۷۴۸ھ	1	دار الفرقان، اردن	۱۴۰۴ھ

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
466	المغنی فی الضعفاء	شمس الدین الذہبی
467	المفصل فی تاریخ العرب	الدکتور جواد علی
468	المقالات والفرق	سعد بن عبداللہ الاشعری القمی
469	المقتبس من انباء الاندلس	ابن حیان القرطبی
470	المقصد العلیٰ فی زوائد مسند ابی یعلیٰ	نور الدین الہیثمی
471	المکتبۃ الاسلامیۃ	عماد علی جمعۃ
472	الملل والنحل	محمد بن عبدالکریم الشہرستانی
473	المنتخب من ذیل المذیل	محمد بن جریر الطبری
474	المنتخب من علل الخلال	ابن قدامہ المقدسی
475	المنتظم فی تاریخ الملوک والامم	عبدالرحمن ابن الجوزی
476	المنتقی شرح المؤطا	ابو الولید سلیمان بن خلف الباجی الاندلسی
477	المنتقی من السنن المسندۃ	ابن الجارود نیسابوری
478	المنتقی من منہاج الاعتدال	حافظ ذہبی
479	المنمق فی اخبار قریش	محمد بن حبیب الہاشمی ابو جعفر البغدادی
480	المواعظ والآثار بذکر الخطط والآثار (الخطط المقریزی)	تقی الدین المقریزی
481	الموسوعۃ المیسرۃ فی الادیان والمذاہب	جماعۃ من المؤلفین۔ تحقیق: مانع بن حماد الجہنی
482	الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ	لجنۃ من الفقہاء
483	الموسوعۃ الموجزۃ فی التاریخ الاسلامی	ابو سعید المصری
484	الموقظۃ فی علم مصطلح الحدیث	حافظ ذہبی
485	مآثر الانافۃ فی معالم الخلافۃ	احمد بن علی القلقشندی
486	ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین	سید ابو الحسن علی ندوی
487	مجلۃ السیرۃ	مقالہ پروفیسر نثار احمد
488	مجمع الانہر فی شرح ملتقی الابحر	عبدالرحمن شیخی زادہ داماد آفندی
489	مجمع الزوائد ومنبع الفوائد	نور الدین ہیثمی
490	مجمل اصول اہل السنۃ	الشیخ ناصر عبدالکریم العلی
491	مجموع الفتاویٰ	احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ الحرانی
492	محاضرات الادباء ومحاورات الشعراء والبلغاء	ابو القاسم الراغب الاصفہانی
493	مختصر التحفۃ الاثنی عشریۃ (شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی)	لخصہ وہذبہ: علامۃ العراق محمود الآلوسی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۷۴۸ھ	2	مکتبہ شاملہ	
۱۴۰۸ھ	20	دارالساقی	۱۴۲۲ھ۔۲۰۰۱ء
۲۲۹ھ	1	مطبع حیدری، تہران	۱۳۴۱ھ
۴۶۹ھ	1	المجلس الاعلیٰ لشؤون الاسلامیہ، قاہرہ	۱۳۹۰ھ
۸۰۷ھ	4	دارالکتب العلمیۃ	مذکور نہیں
معاصر	1	سلسلۃ التراث الاسلامی	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۳ء
۵۴۸ھ	3	مؤسسۃ الحلبی	مذکور نہیں
۳۱۰ھ	1	مؤسسۃ الاعلمی بیروت	۱۹۳۹ء
۶۲۰ھ	1	دارالرایۃ	مذکور نہیں
۵۹۷ھ	19	دارالکتب العلمیۃ	۱۴۱۲ھ۔۱۹۹۲ء
۴۷۴ھ	7	مطبعۃ السعادۃ، مصر	۱۳۳۲ھ
۳۰۷ھ	1	مؤسسۃ الکتب الثقافیۃ بیروت	۱۴۰۸ھ۔۱۹۸۸ء
۷۴۸ھ	1	مکتبہ شاملہ	مذکور نہیں
۲۴۵ھ	1	عالم الکتب، بیروت	۱۹۸۵ء
۸۴۵ھ	4	دارالکتب العلمیۃ، بیروت	۱۴۱۸ھ
معاصرین	2	دارالندوۃ العالمیۃ	۱۴۲۰ھ
	45	وزارۃ اوقاف والشؤن الاسلامیہ، کویت	۱۴۲۷ھ
معاصر	16	مکتبہ شاملہ	
۷۴۸ھ	1	مکتبۃ المطبوعات الاسلامیہ، حلب	۱۴۱۲ھ
۸۲۱ھ	3	مطبعۃ حکومۃ الکویت	۱۹۸۵ء
۱۴۲۰ھ۔۱۹۹۹ء	1	مکتبۃ الایمان، قاہرہ	مذکور نہیں
معاصر	...	زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، کراچی	رمضان ۱۴۲۴ ہجری
۱۰۷۸ھ	2	داراحیاء التراث العربی	مذکور نہیں
۸۰۷ھ	10	مکتبۃ القدسی، قاہرہ	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۴ء
معاصر	1	مکتبہ شاملہ	
۷۲۸ھ	35	مجمع الملک فہد	۱۴۱۶ھ۔۱۹۹۵ء
۵۰۲ھ	2	شرکۃ دارالارقم، بیروت	۱۴۲۰ھ
۱۳۴۲ھ	1	المطبعۃ السلفیۃ، قاہرہ	۱۳۷۲ھ

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
494	مختصر تاریخ دمشق	ابن منظور الافریقی
495	مختصر سیرۃ الرسول	شیخ محمد بن عبدالوہاب
496	مختصر قیام اللیل	محمد بن نصر المروزی (اختصرہ المقریزی م ۸۴۵ھ)
497	مختصر المزنی	ابو ابراہیم المزنی
498	مرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان	عبداللہ بن اسعد الیافعی
499	مرآۃ الزمان فی تواریخ الاعیان	سبط ابن الجوزی
500	مرآۃ الزمان فی تواریخ الاعیان	سبط ابن الجوزی
501	مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح	ملا علی قاری الہروی
502	مروج الذہب ومعادن الجوہر	علی بن الحسین المسعودی
503	مرویات غزوۃ خندق	دکتور ابراہیم بن محمد المدخلی
504	مسالک الابصار فی ممالک الامصار	شہاب الدین العدوی القرشی
505	مستخرج ابی عوانۃ	ابو عوانۃ یعقوب بن سفیان الاسفرائنی
506	مسند احمد	امام احمد بن حنبل
507	مسند ابن ابی شیبۃ	ابو بکر ابن ابی شیبۃ
508	مسند ابن الجعد	علی ابن الجعد الجوہری
509	مسند ابی داؤد طیالسی	ابوداؤد، سلیمان بن داؤد طیالسی
510	مسند ابی عوانۃ	ابو عوانۃ یعقوب بن اسحاق الاسفرائنی
511	مسند ابی یعلی	ابو یعلی تمیمی الموصلی
512	مسند البزار (البحر الذخار)	ابو بکر العتکی البزار
513	مسند الحارث (بغیۃ الباحث عن زوائد مسند الحارث)	الحارث ابن ابی اسامۃ ونور الدین ہیثمی
514	مسند الحمیدی	عبداللہ بن الزبیر الحمیدی
515	مسند الرویانی	ابو بکر محمد بن ہارون الرویانی
516	مسند الشامیین	ابو القاسم الطبرانی
517	مسند الفاروق	حافظ ابن کثیر
518	مسند الشافعی	محمد بن ادریس الشافعی
519	مسند الشہاب	ابو عبداللہ ابن حکمون القضاعی
520	مشاہیر علماء الامصار	ابن حبان البستی
521	مصطلح الحدیث	محمد بن صالح العثیمین

سن وفات	جلد نمبر	ناشر	سن اشاعت
۷۱۱ھ	29	دار الفکر، دمشق	۱۴۰۲ھ۔۱۹۸۲ء
۱۲۰۶ھ	1	وزارۃ الشؤون الاسلامیہ سعودی عرب	۱۴۱۸ھ
۲۹۴ھ	1	حدیث اکادمی فیصل آباد	۱۴۰۸ھ۔۱۹۸۸ء
۲۶۴ھ	1	دار المعرفۃ، بیروت	۱۴۱۰ھ۔۱۹۹۰ء
۷۶۸ھ	4	دار الکتب العلمیہ	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء
۶۵۴ھ	23	الرسالۃ العالمیۃ، دمشق	۲۰۱۳ھ۔۱۴۳۴ھ
۶۵۴ھ	23	الرسالۃ العالمیۃ، دمشق	۱۴۳۴ھ۔۲۰۱۳ء
۱۰۱۴ھ	9	دار الفکر، بیروت	۱۴۲۲ھ۔۲۰۰۲ء
۳۴۶ھ	5	الجامعۃ اللبنانیۃ	۱۹۶۴ء
معاصر	1	عمادۃ البحث العلمی بجامعۃ الاسلامیۃ المدینۃ المنورۃ	۱۴۲۴ھ
۷۴۹ھ	27	المجمع الثقافی، ابوظبی	۱۴۲۳ھ
۳۱۶ھ	20	الجامعۃ الاسلامیۃ، السعودیۃ العربیۃ	۱۴۳۵ھ۔۲۰۱۴ء
۲۴۱ھ	45	مؤسسۃ الرسالۃ	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۱ء
۲۳۵ھ	2	دار الوطن، ریاض	۱۹۹۷ء
۲۳۰ھ	2	مؤسسۃ نادر، بیروت	۱۴۱۰ھ۔۱۹۹۰ء
۲۰۴ھ	4	دار ہجر، مصر	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۹ء
۳۱۶ھ	5	دار المعرفۃ، بیروت	مذکور نہیں
۳۰۷ھ	13	دار المامون للتراث، دمشق	۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء
۲۹۲ھ	18	مکتبۃ العلوم والحکم، المدینۃ المنورۃ	۲۰۰۹ء
۲۸۲ھ۔و ۸۰۷ھ	2	مرکز خدمۃ السنۃ، المدینۃ	۱۴۱۳ھ۔۱۹۹۲ء
۲۱۹ھ	2	دار السقا، سوریا	۱۹۹۶ء
۳۰۷ھ	2	مؤسسۃ القرطبۃ، القاہرۃ	۱۴۱۶ھ
۳۶۰ھ	4	مؤسسۃ الرسالۃ	۱۴۰۵ھ۔۱۹۸۴ء
۷۷۴ھ	2	دار الوفاء، المنصورہ	۱۴۱۱ھ۔۱۹۹۱ء
۲۰۴ھ	1	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۰۰ھ
۴۵۴ھ	2	مؤسسۃ الرسالۃ	۱۴۰۷ھ۔۱۹۸۶ء
۳۵۴ھ	1	دار الوفاء، المنصورہ	۱۴۱۱ھ۔۱۹۹۱ء
۱۴۲۱ھ	1	مکتبۃ العلم	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۵ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
522	مصطلح الحدیث	محمد بن صالح العثیمین
523	مصنف ابن ابی شیبہ نوٹ: مصنف ابن ابی شیبہ کا پرانا نسخہ ۱۵ جلدوں میں ہے اور اس میں احادیث نمبر بھی جدید نسخے سے الگ ہیں، یعنی مکتبۃ الرشد کے جدید نسخے میں کل احادیث نمبر ۳۷۹۴۳ ہیں جبکہ ۱۵ جلد والے نسخے میں کل حدیث نمبر ۳۹۰۹۸ ہیں۔	ابوبکر ابن ابی شیبہ
524	مصنف عبدالرزاق مع جامع معمر بن راشد	عبدالرزاق بن ہمام
525	مع الاثنی عشریۃ فی الاصول والفروع	دکتور علی بن حمید السالوس
526	معارف الحدیث	مولانا محمد منظور نعمانی
527	معارف القرآن	مفتی محمد شفیع
528	معاملۃ غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی	دکتور ادوار غالی الدہبی
529	معاویۃ بن ابی سفیان	محمد علی محمد الصلابی
530	معجم ابن الاعرابی	ابوسعید ابن الاعرابی
531	معجم الادباء (ارشاد الاریب الی معرفۃ اللبیب)	یاقوت الحموی
532	معجم الادباء (الارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب)	یاقوت الحموی
533	معجم البلدان	یاقوت الحموی
534	معجم الصحابہ	ابوالقاسم البغوی
535	معجم شیوخ الطبری	اکرم بن محمد الاثری
536	معجم ما استعجم من اسماء البلاد والمواضع	ابوعبید البکری الاندلسی
537	معرفۃ السنن والآثار	ابوبکر البیہقی
538	معرفۃ الصحابۃ	ابونعیم الاصبہانی
539	معرفۃ القرآء الکبار	حافظ ذہبی
540	مغازی	محمد بن عمر الواقدی
541	مفرج الکروب فی اخبار بنی ایوب	ابن واصل الحموی
542	مقاتل الطالبیین	ابوالفرج الاصبہانی
543	مقالات الاسلامیین واختلاف المصلین	ابوالحسن الاشعری
544	مقام حسین ویزید	مولانا محمد حبیب اللہ علوی
545	مقام صحابہ	مفتی محمد شفیع عثمانی

سن وفات	مجلدات	ناشر	سن اشاعت
۱۴۲۱ھ	1	مکتبۃ العلم، قاہرہ	۱۴۱۵ھ۔۱۹۹۴ء
۲۳۵ھ	7	مکتبۃ الرشد، ریاض	۱۴۰۹ھ
۲۱۱ھ	11	المجلس العلمی، پاکستان	۱۴۰۳ھ
معاصر	1	دار الفضیلۃ، ریاض	۱۴۲۴ھ۔۲۰۰۳ء
۱۴۱۷ء۔۱۹۹۷ء		دار الاشاعت، کراچی	۲۰۰۷ء
۱۳۹۶ھ۔۱۹۷۶ء	8	ادارۃ المعارف، کراچی	مذکور نہیں
معاصر	1	مکتبۃ غریب	۱۹۹۳ء
معاصر	1	دار الاندلس، مصر	۱۴۲۹ھ۲۰۰۸ء
۳۴۰ھ	3	دار ابن الجوزی، السعودیۃ	۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۷ء
۶۲۶ھ	7	دار الغرب الاسلامی، بیروت	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۳ء
۶۲۶ھ	5	دار الغرب الاسلامی، بیروت	۱۴۱۴ھ۔۱۹۹۳ء
۶۲۶ھ	7	دار صادر، بیروت	۱۹۹۵ء
۳۱۷ھ	5	مکتبۃ دار البیان، کویت	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۰ء
معاصر	1	الدار الاثریۃ، اردن	۱۴۲۶ھ۔۲۰۰۵ء
۳۸۷ھ	4	عالم الکتب بیروت	۱۴۰۳ھ
۴۵۸ھ	15	دار الوفاء، قاہرۃ	۱۴۱۲ھ۔۱۹۹۲ء
۴۳۰ھ	7	دار الوطن للنشر، ریاض	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۸ء
۷۴۸ھ	1	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء
۳۰۷ھ	3	دار الاعلمی	۱۴۰۹ھ۔۱۹۸۹ء
۶۹۷ھ	5	دار الکتب والوثائق القومیۃ، قاہرہ	۱۳۷۷ھ۔۱۹۵۷ء
۳۵۶ھ	1	دار المعرفۃ، بیروت	مذکور نہیں
۳۲۴ھ	2	المکتبۃ العصریۃ	۱۴۲۶ھ۔۲۰۰۵ء
معاصر	1	مجلس دعوۃ الحق، پاکستان	مذکور نہیں
۱۳۹۶ھ۔۱۹۷۶ء	1	ادارۃ المعارف، کراچی	۲۰۰۵ء

نمبر شمار	نام کتاب	مولف
546	مقدمہ زہر الربی علی السنن النسائی المجتبی	جلال الدین سیوطی
547	مکتوبات مجدد الف ثانی (اردو ترجمہ: از مولانا سید زوار حسین شاہ)	شیخ احمد سرہندی
548	من کلام ابی زکریا یحییٰ بن معین بروایۃ طہمان	یحییٰ بن معین
549	مناقب ابی حنیفۃ وصاحبیہ	حافظ شمس الدین الذہبی
550	مناقب ابی حنیفہ کردری	محمد ابن شہاب الکردری
551	مناقب ابی حنیفہ مکی	موفق بن احمد المکی اخطب خوارزم
552	منہاج السنۃ النبویۃ	احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام ابن تیمیۃ الحرانی
553	منہاج الطالبین وعمدۃ المفتیین فی الفقہ	امام شرف النووی
554	منہاج المحدثین فی القرن الاول الہجری وحتی عصرنا الحاضر	علی عبدالباسط مزید
555	منہج السالکین وتوضیح الفقہ فی الدین	عبدالرحمن بن ناصر آل سعدی
556	موطا امام مالک	امام مالک بن انس
557	موجز التاریخ الاسلامی	احمد محمود العسیری
558	موسوعۃ اقوال احمد بن حنبل (جمعہ لجنۃ من المولفین)	احمد بن حنبل
559	موسوعۃ اقوال الدارقطنی فی رجال الحدیث وعللہ (جمعہ لجنۃ من المولفین)	ابوالحسن الدارقطنی
560	موسوعۃ مواقف السلف فی العقیدۃ والمنہج التربیۃ	ابوسہل محمد بن عبدالرحمن المغراوی
561	میزان الاعتدال فی نقد الرجال	شمس الدین الذہبی
	حرف ن	
562	النبراس علی شرح العقائد	عبدالعزیز فرہاری ملتانی
563	النجوم الزاہرۃ فی احوال ملوک مصر والقاہرۃ	یوسف بن تغری بردی
564	النکت علی مقدمۃ ابن الصلاح	بدرالدین الزرکشی الشافعی
565	النکت علی کتاب ابن الصلاح	ابن حجر العسقلانی
566	ناصبیت تحقیق کے بھیس میں	مولانا عبدالرشید نعمانی
567	نبی رحمت ﷺ	سید ابوالحسن علی ندوی
568	نخبۃ الفکر	حافظ ابن حجر عسقلانی
569	نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق	الشریف الادریسی الطالبی
570	نسب قریش	مصعب بن عبداللہ الزبیری
571	نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب	شہاب الدین المقری
572	نقوش رسول نمبر جلد دوئم مقالہ: سیرت النبی تو قیت کی روشنی میں	مولانا اسحاق النبی علوی (رام پور، بھارت)

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۹۱۱ھ	1	دارالمعرفة، بیروت	مذکور نہیں
۱۰۳۴ھ	3	ادارہ مجددیہ، کراچی	مذکور نہیں
۲۳۳ھ	1	دارالمامون، دمشق	مذکور نہیں
۷۴۸ھ	1	لجنة احياء المعارف النعمانية، دکن	۱۴۰۸ھ
۸۲۷ھ	2	مکتبہ نظامیہ دکن	۱۳۲۱ھ
۵۶۸ھ	2	مکتبہ نظامیہ دکن	۱۳۲۱ھ
۴۲۸ھ	9	جامعة الامام محمد بن سعود	۱۴۰۶ھ۔۱۹۸۶ء
۶۷۶ھ	1	دارالفکر	۱۴۲۵ھ۔۲۰۰۵ء
معاصر	1	مکتبہ شاملہ	مذکور نہیں
۱۳۷۶ھ	1	دارالوطن	۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۲ء
۱۷۹ھ	6	مؤسسة زايد بن سلطان الامارات	۱۴۲۵ھ۔۲۰۰۴ء
معاصر	1	مکتبة الملک فہد	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۶ء
۲۴۱ھ	4	دارالنشر، عالم الکتب	۱۴۱۷ھ۔۱۹۹۷ء
۳۸۵ھ	2	عالم الکتب	۲۰۰۱ء
معاصر	10	المکتبة الاسلامیہ، قاہرہ	مذکور نہیں
۷۴۸ھ	4	دارالمعرفة، بیروت	۱۳۸۲ھ۔[illegible]
		حرف ن	
بعد: ۱۴۳۹ھ	1	مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ	مذکور نہیں
۸۷۴ھ	16	دارالکتب، قاہرہ	مذکور نہیں
۷۹۴ھ	3	اضواء السلف، الریاض	۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۸ء
۸۵۲ھ	2	عمادة البحث العلمی، السعودیة	۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء
۱۴۲۰ھ۔۲۰۰۰ء	1	دارالتقویٰ، لاہور	
۱۴۲۰ھ۔۱۹۹۹ء	1	مجلس نشریات اسلام	مذکور نہیں
۸۵۲ھ	1	دارالحدیث، قاہرہ	۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۷ء
۵۶۰ھ	2	عالم الکتب، بیروت	۱۴۰۹ھ
۲۳۶ھ	1	دارالمعارف، قاہرہ	مذکور نہیں
۱۰۴۱ھ	8	دارصادر، بیروت	۱۹۹۷ء
	13	مدیر: محمد طفیل۔ ادارہ فروغ اردو، لاہور	دسمبر ۱۹۸۲ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
573	نہایۃ الارب فی فنون الادب	شہاب الدین النویری
574	نہایۃ الارب فی معرفۃ انساب العرب	احمد بن علی القلقشندی
575	نہایۃ المطلب فی درایۃ المذہب	ابوالمعالی امام الحرمین جوینی
576	نہج البلاغۃ	سید شریف رضی
577	نوادر الخلفاء (اعلام الناس بما وقع للبر امکۃ مع بنی عباس)	محمد دیاب الاتلیدی
578	نور البصر فی سیرۃ سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم	مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی
579	نیل الاوطار	محمد بن علی الشوکانی الیمنی
	﴿حرف و﴾	
580	الوافی بالوفیات	صلاح الدین الصفدی
581	الوسیط فی المذہب	ابوحامد الغزالی
582	الوفیات	ابن قنفذ
583	وسیلۃ الاسلام بالنبی علیہ الصلوٰۃ والسلام	ابن قنفذ القسنطینی
584	وصایا العلماء عند حضور الموت	ابن زبر الربعی
585	وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ	علی بن عبداللہ السمہودی
586	وفیات الاعیان	ابن خلکان
587	وقعۃ صفین	نصر بن مزاحم
	﴿حرف ہ﴾	
588	الہدایۃ فی شرح بدایۃ المبتدی	برہان الدین مرغینانی
589	ہدیۃ العارفین	اسماعیل بن میر سلیم البابانی البغدادی
	﴿حرف ی﴾	
590	الیہود فی العالم القدیم	دکتور مصطفیٰ کمال عبدالعلیم
591	الیواقیت والدرر شرح شرح نخبۃ الفکر	علامہ عبدالرؤف مناوی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۷۳۳ھ	33	دار الکتب والوثائق القومیۃ، قاہرہ	۱۴۲۳ھ
۸۲۱ھ	1	دار الکتاب اللبنانیین	۱۴۰۰ھ۔۱۹۸۰ء
۴۷۸ھ	20	دار المنہاج	۱۴۲۸ھ۔۲۰۰۷ء
۴۳۶ھ	4	المطبعۃ الادبیۃ، بیروت	۱۸۸۵ء
چوتھی صدی ہجری	1	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۲۵ھ۔۲۰۰۴ء
۱۹۶۲ء	1	معہد الخلیل الاسلامی	مذکور نہیں
۱۲۵۰ھ	8	دار الحدیث، مصر	۱۴۱۳ھ۔۱۹۹۳ء
		حرف و	
۷۶۴ھ	29	دار احیاء التراث	۱۴۲۰ھ۔۲۰۰۰ء
۵۰۵ھ	7	دار السلام، قاہرہ	۱۴۱۷ھ
۸۱۰ھ	1	دار الآفاق الجدیدۃ، بیروت	۱۴۰۳ھ۔۱۹۸۳ء
۸۱۰ھ	1	دار الغرب الاسلامی، بیروت	۱۴۰۴ھ۔۱۹۸۴ء
۳۷۹ھ	1	دار ابن کثیر، دمشق	۱۴۰۶ھ۔۱۹۸۶ء
۹۱۱ھ	4	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۹ھ
۶۸۱ھ	7	دار صادر	۱۹۹۴ء
۲۱۲ھ	1	دار الجیل، بیروت	۱۴۱۰ھ۔۱۹۹۰ء
		حرف ہ	
۵۹۳ھ	4	دار احیاء التراث العربی	مذکور نہیں
۱۳۹۹ھ	2	دار احیاء التراث العربی، بیروت	مذکور نہیں
		حرف ی	
معاصر	1	دار القلم، دمشق	۲۰۰۱ء
۱۰۳۱ھ	2	مکتبۃ الرشد، ریاض	۱۹۹۹ء

تاریخِ اُمّتِ مُسلمہ

جلدِ اوّل

تحقیق

مؤرخ اسلام مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ

المنہل پبلشرز
بلاک A-1، گلستان جوہر، یونیورسٹی روڈ، کراچی
0321-3135009|0321-2000870
www.almanhalpublisher.com
almanhalpublisher@gmail.com

تاریخ امتِ مسلمہ
جلدِ دوم
تحقیق
مورخِ اسلام مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ
المنہل پبلشرز
بلاک A-1، گلستانِ جوہر، یونیورسٹی روڈ، کراچی
0321-3135009|0321-2000870
www.almanhalpublisher.com
almanhalpublisher@gmail.com

تاریخ امت مسلمہ کے چھ حصے ایک نظر میں

مبادیات تاریخ، [illegible] اور ان کی معاشرت [illegible] اسلام [illegible] حالات، سیرت نبویہ ﷺ، عہد خلافت راشدہ، [illegible] خلافت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، [illegible] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، امہات المومنین، [illegible]

تاریخ روایات کی تحقیق و تنقیح کے اصول، دور مشاجرات، خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ، جنگ جمل، جنگ صفین، خلافت حضرت حسن رضی اللہ عنہ، خلافت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، دور یزید، حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی جدوجہد، سانحہ کربلا و سانحہ حرہ، خلافت و شہادت حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، دور فتن سے حاصل شدہ اسباق، پہلی صدی ہجری میں امت کی علمی و اخلاقی تربیت کرنے والے مشاہیر صحابہ و تابعین کا تعارف، اہم شبہات کے جوابات

خلافت بنو امیہ و بنو عباس، خلافت عباسیہ کی معاصر آزاد مسلم حکومتیں، ائمہ اربعہ اور عظیم محدثین و متکلمین کے کارنامے، فرقوں کے آغاز اور ظہور کی تاریخ، باطل فرقوں کی حکومتیں، اہم شبہات کے جوابات

تاریخ صقلیہ، صلیبی جنگیں، یورش تاتار، دولت ایوبیہ، دولت ممالیک، تاتاریوں میں اشاعت اسلام، تاریخ برصغیر، سلطنت عثمانیہ، دور تاسیس و استحکام، دولت اسلامیہ اندلس، دور تابعین تا دور مرابطین و موحدین، امت مسلمہ کی فکری و نظریاتی رہنمائی کرنے والے ائمہ مجددین، فقہاء اور صوفیاء کی جدوجہد کا تذکرہ

زوال و سقوط دولت اسلامیہ اندلس، سلطنت عثمانیہ دور عروج تا سقوط خلافت، سلطنت مغلیہ ہندوستان، بابر تا بہادر شاہ ظفر

برطانوی استعمار کی حکومت، تحریکات آزادی، تحریک پاکستان، عالم اسلام کے اہم ممالک کی مختصر تاریخ، غیر مسلم دنیا کے اہم ممالک کی مختصر تاریخ، مسلم تہذیب و تمدن اور مسلمانوں کے علمی و فنی کارناموں پر ایک نظر